# DUE DATE

Acc. No.

Late Fine Re. 1.00 per day for first 15 days
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date

# ہماری نئی مطبوعات

## اوراقِ پارینہ
از شیر جنگ۔

ایک انقلابی قیدی وہ بھی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات غریب مزدور و کسان کی تکالیف معاشی مشکلات اور سماج کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے۔ یہ کتاب انقلابی ذہنوں کے لئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین استعارے محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ۱)

## اُردو زبان اور ہندو
مصنفہ ناظم سید ہاشمی رضوی

اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع ممالک میں داخل میں ہندو اہلِ وطن نے جو گرانبہا خدمات سر انجام دی ہیں یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرے گی۔ تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔ قیمت مجلد (عہ۱)

## قرآنی اخلاق دو حصے
انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم کیا گیا ہو۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیاتِ مقدسہ سے اخلاق کے ان جزئیات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔

(قیمت ایک روپیہ)

## کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شیر جنگ۔ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے۔

تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے۔

قیمت مجلد چھ روپے

## معاشیاتِ قومی
ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی۔ یہ

کتاب فریڈرک لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی مرہونِ منت ہے۔ جسے ڈاکٹر صاحب نے اردو کا لباس پہنایا ہے۔ یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز اور تاریخی روداد ہے۔ اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیرِ مطالعہ رہنے والی تصنیف۔ قیمت مجلد ۲/۸ روپے۔

## مقالاتِ شیرانی
از حافظ محمود شیرانی

حافظ محمود شیرانی کا اگر پر زور قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کر چکا ہے۔ مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے یہ گرانمایہ تصنیف ہر اہلِ ذوق کے زیرِ مطالعہ ہونی چاہیئے۔ آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ کریں۔ قیمت تین روپے

## تاریخِ انقلابِ روس
مصنفہ شیر جنگ

روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی، اخلاقی اور مجلسی روداد کی روح فرسا تاریخ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو اختصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے۔ کہ شیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو کس خوش اسلوبی سے مرتب کر کے ایک لاجواب تصنیف بنا دیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔



"لکس
ٹائلیٹ صابن ہی میرے
حسن وجمال کا آسان طریقہ ہے"
مایا بینرجی کہتی
ہے
میں لکس ٹائلیٹ صابن کا جھاگ تیار کرتی ہوں اور اسے اپنی جلد پر ہلکا پھیت لگاتی ہوں۔
اس کے بعد میں صاف و ستھرے اور ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالتی ہوں۔
آخرش باہستگی اپنا چہرہ نرم تولیے سے خشک کرتی ہوں۔
LUX TOILET SOAP
فلمی اسٹار اپنے کمال جلد کی قدر اس لئے نہیں کرتی کہ وہ اس کے دلکش خوبصورتی کا ایک جز ہے۔ بلکہ وہ اس کے زندگی کی ایک انمول پونجی بھی ہے۔ اسی لئے ہندوستان کی فلمی اسٹارس لکس ٹائلیٹ صابن سے اپنے قیمتی حسن کی حفاظت کرتی ہیں۔ آپ خود اپنے مکان میں اس آسان طریقہ کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کا مسودن کے لئے تجربہ حاصل کیجئے۔ آپ اسکے صاف کرنے والے و ترغیب دینے والے انجام سے خوش ہونگے۔
فلمی اسٹارس کا
حسن بخش صابن




39098

آجکل
اردو کا پندرہ روزہ
نئی دہلی

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ - نمبر ۱۱ | فہرست | یکم نومبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے



مدیر اعلیٰ
**سید وقار عظیم**
ایم - اے

نائب مدیر
**فضل حق قریشی**
دہلوی

ادارۂ مطبوعات متحدہ
پوسٹ بکس ۱۶۹ دہلی

# رفتارِ زمانہ

## ہندوستان اور مسئلۂ خوراک

### وزیر اغذیہ کی تقریر

عبوری حکومت کے وزیر زراعت و اغذیہ، آنریبل ڈاکٹر راجندر پرشاد نے رانچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:- "جب تک میں حکومتِ ہند کا رکن ہوں، میں کسی قسم کے اناج کی قیمتوں میں کوئی اضافہ ہونے نہیں دونگا اور ان لوگوں کو جو زیادہ داموں پر بیچنے کے خیال سے اناج جمع کر رکھتے ہیں، زبردست مایوسی ہوگی۔" نیز مسئلۂ خوراک حل کرنے کے سلسلے میں ہر شخص سے اپیل کرتے ہوئے انھوں نے چار باتوں پر خاص طور سے زور دیا۔ (۱) اناجوں کی پیداوار میں اضافہ ہو، (۲) سرکاری تحصیلات کو کامیاب بنایا جائے (۳) چور بازار کو لازمی طور پر ختم کر دیا جائے۔ اور (۴)...جتنا کچھ بھی اناج دستیاب ہو، مساوی طور پر تقسیم کر دیا جائے۔ انھوں نے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ سرکاری تحصیلات کے سلسلے میں صوبہ بہار نے کوئی اچھی مثال پیش نہیں کی یعنی حکومت کو صرف ۳½ لاکھ من چاول اور دھان مل سکے۔

### گاندھی جی کے مشورے

ہندوستان کے مسئلۂ خوراک پر اظہار رائے کرتے ہوئے گاندھی جی نے "ہریجن" اخبار میں لکھا ہے: "ہندوستانیوں کو سمجھنا چاہیئے کہ ابھی تک باہر سے تو نام کی ہی خوراک ہندوستان میں آئی ہے۔ کئی دوسرے ملک مدد کرنا چاہتے ہیں، پر بہت کر کے وہ خود مصیبت میں ہیں، یا ان کے پاس اتنی مانگیں ہیں کہ وہ انھیں پورا نہیں کر سکتے...... اسلئے بیوہار بدھی (اچھی عقلمندی) یہی ہے کہ ہم کمر کس لیں اور ایک آواز سے اپنا ارادہ ظاہر کریں کہ ہم اپنی خوراک خود پیدا کرینگے اور ضرورت پڑی تو اس کوشش میں بہادری سے مر مٹیں گے۔ یہی ایک راستہ ہے دوسرا نہیں۔" اسی سلسلے میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "اس وقت تو ہندوستان کے سب ذمہ دار آدمی اگر اپنے اپنے صوبوں کو، ضلعوں کو اور ریاستوں کو صاف صاف کہدیں کہ خوراک کے لئے وہ دوسرے ملکوں کی طرف نہ دیکھیں۔ جتنا ہو سکے خود اگا دیں، اور اپنی ہی اپج پر گذارہ کرنا سیکھیں، تو میرا کام ہو جائے۔ میرے پاس بہت سے بھروسے لائق لوگوں کے خط آ رہے ہیں۔ اگر وہ اصلی حالت کے سوجھک (بتانے والے) ہوں، جیسا کہ انھیں ہونا چاہیئے، تو ہمیں بھوکوں مرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شاکاہاریوں کے لئے جیون دینے والی سبزیاں اور تھوڑا سا دودھ اور ماساہاریوں کے لئے مچھلی گوشت وغیرہ بس ہونگے۔"

### سمندر پار ملکوں سے

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں کے پاس جو کچھ اناج بچ رہتا ہے، اسمیں سے وہ ہندوستان کی مدد برابر کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس امداد و تعاون کی نوعیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

| اقسام اناج | ۲۶ ستمبر کو ختم ہونیوالے ہفتے میں | یکم جنوری سے ۲۶ ستمبر تک کل مقدار |
| --- | --- | --- |
| گیہوں | ۴۲,۰۰۰ ٹن | ۸,۹۰,۰۰۰ ٹن |
| چاول | ۲۳,۵۰۰ ٹن | ۱,۹۶,۰۰۰ ٹن |
| مکئی | ۱۹,۵۰۰ ٹن | ۱,۴۲,۸۰۰ ٹن |
| جوار، باجرہ وغیرہ | ۵,۰۰۰ ٹن | ۳۶,۰۰۰ ٹن |

### پیرس کانفرنس کے مصارف

یورپ بھر میں امن و عافیت قائم کرانے کے سلسلے میں جو کانفرنس پیرس میں ہو رہی تھی، وہ بارہ ہفتے قائم رہنے کے بعد بخیر و خوبی ۱۰ اکتوبر کی شام کو ختم ہوگئی۔ اس میں ان چار بڑے اتحادی ملکوں کے نمائندے شامل ہوئے تھے۔ امریکہ، برطانیہ، روس اور فرانس۔ اس کانفرنس کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ حکومتِ فرانس کو اس سلسلے میں زبردست مصارف برداشت کرنے پڑے۔ کُل رقم کا اندازہ ۲,۸۳,۸۵۰ پونڈ کے قریب ہے۔ پھر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اشیائے خوراک، قوتِ برقی اور پٹرول وغیرہ پر ۲۴,۲۵۰ پونڈ خرچ ہوئے۔ اس کانفرنس کے دفتری نظام کے سلسلے میں جو عملہ رکھا گیا تھا، اسمیں ۱,۲۰۴ اشخاص ملازم تھے جن کی تنخواہیں ۵۹,۰۰۰ پونڈ کے قریب ہوئیں۔ ۲۰۰ سرکاری موٹروں کے لئے ۱,۴۷,۴۴۴ گیلن پٹرول خریدا گیا۔ کاغذ کے ایک کروڑ بڑے تاؤ، جن کا

عمومی وزن تقریباً ایکہزار چار سومن تھا، اس سلسلے میں کام آیا۔ کاغذ کی زیادہ مقدار بزاء کی کارروائیوں کی نقلیں چھاپنے میں خرچ ہوئی۔ کارروائیوں میں تمام لندن اہل تقریریں وغیرہ بھی شامل ہیں۔" ذاتی اخراجات" کے ضمن میں ان ملازموں، نگاروں اور باورچیوں کی تنخواہیں درج ہیں جو قصر بکھمبرگ کے شراب خانوں قہوہ خانوں میں کام کرتے تھے۔ ۳۳۰ موٹر ڈرائیور، ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کے اکارکن، ۱۰۴ اسیکیوریٹی ایجنٹ اور بے شمار مترجم و ناشران کے علاوہ ہیں۔

### صدر جمہوریہ چین

کومنتانگ کی مرکزی مجلس انتظامیہ کے ۱۰ اکتوبر والے اجلاس میں صدر جمہوریہ چین کا انتخاب میں آیا۔ جنرلیسمو چیانگ کائی شیک کی شخصیت انکی سیاسی سرگرمیوں اور خلوص ہمدردیوں کے باعث اتنی اہم اور ہردلعزیز ہوگئی ہے کہ ان کے سوا کسی اور کو منتخب نہ کیا جاسکا۔ ان کا عہدہ تین سال کے لئے تھا جسکی معیاد ۹ اکتوبر کو ختم ہوگئی۔ آئندہ کے لئے کوئی خاص مدت مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ فیصلہ ہوا ہے کہ یہ سلسلہ اسوقت تک قائم رکھا جائے جب تک کہ مجلس ملی نئے دستور کے مطابق نئے صدر کا انتخاب نہ کرے۔ مجلس ملی حال ہی میں ایک نیا دستور اپنے ملک کے لئے وضع کرنے والی ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ اس کے ماتحت عمل میں آنے والے انتخابات میں بھی چیانگ کائی شیک کا مدمقابل کوئی نہ ہو اور ایکبار پھر انہی کو جمہوریہ چین کا صدر مقرر کیا جائے۔

### چینی تہواروں کی تجدید

چین کے بہت بڑے مشرقی حصہ پر جاپانی تسلط ہو جانے کے باعث یہاں کی سماجی زندگی کا شیرازہ بالکل بکھر گیا تھا۔ خصوصاً تہواروں کی دلچسپیاں مفقود ہوگئی تھیں۔ تاہم جاپان کی سپر اندازی کے بعد اب پہلی بار نئے جوش و خروش کے ساتھ انکی تجدید کی جارہی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ساتویں مہینے کی ساتویں تاریخ کو منعقد ہونے والا تہوار منایا جائیگا۔ اس تہوار کو آسمان پر رہنے والی جلاہے کی لڑکی، ویگا سے قریبی تعلق ہے۔ یہ دریائے فلک یعنی کہکشاں کے ایک طرف بیٹھی چرخہ کاتتی رہتی ہے اور صرف ساتویں مہینے کی ساتویں تاریخ کو اپنے محبوب سے ملنے کے لئے دریا کے پل کو عبور کرتی ہے جسے بہت سے راج ہنس ملکر اپنے پروں سے تیار کرتے ہیں۔ عام عقیدہ ہے کہ یہ دیوی نسوانی ہنروں کی سرپرستی کرتی ہے۔ چنانچہ نوجوان لڑکیاں اس کی پوجا کرتی اور اسپر بھینٹ چڑھاتی ہیں۔ دوسرا تہوار سات دن بعد منایا جاتا ہے۔ اسے مسلمانوں کے تہوار "شب برات" سے ایک حد تک مشابہ کیا جاسکتا ہے۔ چینیوں کا عقیدہ ہے کہ اس تاریخ کو رات کے وقت مرے ہوئے بزرگوں کی روحیں "دوزخ" سے نکل کر اپنے عزیزوں سے ملنے کے لئے دنیا میں آتی ہیں۔ چنانچہ ان روحوں کے لئے بہت سی مٹھائیاں وغیرہ تیار کی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں شب برات کے موقع پر آتشبازی چھوڑی جاتی ہے۔ چین کے لوگ اس رات ہوبان سلگاتے اور سڑکوں پر پیسے برساتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کو اچھا شگون سمجھا جاتا ہے۔ ان تہواروں کی تجدید سے ثابت ہوتا ہے کہ چینی اپنی پُرامن روایتی زندگی دوبارہ حاصل کررہے ہیں۔

### برطانیہ میں ہندوستانی طلبا

"لندن مجلس" کے صدر مسٹر ذکریا نے جو بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے علمی تحقیقات کے سلسلے میں لندن گئے ہوئے ہیں۔ برطانیہ میں رہنے والے ہندوستانی طلبا کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا کہ آجکل قیام و طعام کی دشواریاں انہیں بُری طرح تنگ کررہی ہیں۔ لندن میں انکی کل تعداد تقریباً پانچسو ہے۔ چار یا پانچ ہوسٹل صرف ان کے لئے مخصوص ہیں لیکن وہاں ڈیڑھ سو سے زیادہ طلباء کے رہنے سہنے کا انتظام نہیں ہوسکتا۔ پھر ان ہوسٹلوں کی حالت بھی اسدرجہ خراب ہے کہ ان میں قیام کرنا دوبھر ہوجاتا ہے۔ باقی طلبا ادھر اُدھر کوششیں کرتے ہیں اور کوئی معقول قابلِ اطمینان جگہ نہیں ملتی۔ مسئلۂ خوراک بھی بہت تکلیف دہ ثابت ہورہا ہے، کیونکہ کم مقدار میں مختلف قسم کی غذائیں ہندوستانی مزاج کے لئے موافق نہیں آتیں۔ اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ ہندوستان میں ایک طالب علم سو روپے خرچ کرکے خوب عیش کرسکتا ہے اور لندن میں چار سو میں بھی پوری نہیں پڑتی۔ چونکہ لندن میں کوئی اقامتی یونیورسٹی موجود نہیں ہے۔ اس لئے طلبا کو سماجی دلچسپیوں میں حصہ لینے کا کم موقعہ ملتا ہے۔ وہ دوسرے ہندوستانی طلبا کے ساتھ ربط ضبط بڑھاتے ہیں۔ کیونکہ برطانیہ کے لوگ عموماً ان سے کوئی تعلق پیدا کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس لئے ہر ہندوستانی طالب علم اپنی آمد سے روانگی تک ایک ایسے ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے جہاں اسکی شخصیت کو پوری طرح نشوونما پانے کا موقع نہیں ملتا۔ مسٹر ذکریا نے یہ بھی بیان کیا کہ ہندوستانی طلبا کے برعکس دوسرے ملکوں کے طالب علم خصوصاً چینی، امریکی اور مصری بڑے اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ ان کے لئے ایسی کلبیں بنی ہوئی ہیں جن کے مصارف ان کی حکومتوں کے سر ہیں۔ ان کلبوں میں دوسری قوموں کے لوگ آتے جاتے ہیں اور اسطرح دلچسپیاں حاصل ہونے کے علاوہ انکی معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مسٹر ذکریا نے آخر میں کہا کہ جمہوری حکومت کے لئے اس سلسلے میں فوراً قدم اٹھانا ضروری ہے۔

### سندھ کیلئے برق آبی

حکومت سندھ نے سکھر کے قریب نہر روہری کے دامن میں برق آبی کا ایک بہت بڑا اسٹیشن قائم کرنے کے لئے ایک نئی اسکیم مرتب کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک کروڑ چونسٹھ لاکھ روپے منظور کئے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے نہر مذکور کو سینے

سے کر سے درست کیا جائیگا تاکہ پانی زیادہ سے زیادہ مقدار اور تیزی کے ساتھ موقع پر پہنچ سکا کرے۔ اس کام کے لئے ایک کروڑ پینتالیس لاکھ روپے کی رقم علیحدہ منظور کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے مطابق دس ہزار کلو واٹ کا بجلی گھر تیار ہوگا جہاں سے سکھر، جیکب آباد، لاڑکانہ نامی ضلعوں کے پچیس بڑے بڑے شہروں قصبوں اور دیہاتوں میں بجلی کا انتظام کیا جائیگا۔ ان کے علاوہ آس پاس کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں حسب ضرورت بجلی پہنچائی جائے گی۔ بجلی گھر کے قریب ہی تیل سے چلنے والا ایک انجن بھی لگایا جائے گا تاکہ اگر نہر میں پانی کی کمی پڑے یا کوئی اور خرابی پیدا ہوجائے تو وقتِ ضرورت اس سے کام چلا لیا جائے۔ نہر کی نئی تشکیل کا کام فوراً شروع ہو جائیگا۔ لیکن بجلی گھر کا انتظام اس کے بعد یعنی تقریباً ۱۹۴۸ء میں شروع ہوگا۔

## نئے سکوں کی چند خصوصیات

اس سال ۳ مئی کو حکومت ہند نے ریزرو بنک کے منتظمین کو اختیار دیا تھا کہ وہ خالص نکل کی چونیاں اور اٹھنیاں ڈھال لیں۔ چنانچہ یہ نئے سکے کچھ عرصے سے ملک کے طول و عرض میں چلنے شروع ہوگئے ہیں۔ ان سکوں کے اجراء سے ہندوستان کی تاریخ سکہ سازی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے فی الحال یہ سکے بڑے بڑے شہروں میں چل رہے ہیں لیکن بہت جلد چھوٹے دیہاتوں تک بھی پہنچ جائیں گے۔ دنیا میں پہلے پہل ۱۸۸۱ء میں خالص نکل کے سکے سوئٹزرلینڈ میں جاری ہوئے تھے۔ پھر فرانس، بلجیم، اٹلی، کینیڈا اور آسٹریا میں بھی انکا رواج ہوگیا۔ چنانچہ آج ہندوستان سمیت دنیا کے انیس ملکوں میں ایسے سکے چل رہے ہیں نکل کے سکوں کی چند خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ وہ معمولی آگ میں پگھل نہیں سکتے کیونکہ نکل ایک ایسی دھات ہے جسے گلانے کے لئے تقریباً ساڑھے چودہ سو سنٹی گریڈ درجۂ حرارت کی ضرورت ہے۔ نکل میں مقناطیس کی طرف کھنچ جانے کی صلاحیت بھی موجود ہے اسی لئے اس کے سکوں کو مقناطیس کے ذریعہ آسانی سے پرکھا جاسکتا ہے۔ اگر اس میں کسی دوسری دھات کا میل کر دیا جائے تو یہ خصوصیت زائل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ نئی قسم کی اکنی اور ادھنے کو جن میں نکل کے ساتھ کچھ تانبا بھی ملا ہوا ہے، اس طرح جانچنا مشکل ہے۔ ان سکوں کی چمک دمک عرصۂ دراز تک قائم رہ سکتی ہے کیونکہ نکل پر زنگ نہیں لگتا۔ زیادہ سخت ہونے کے باعث نکل کے سکے کثرتِ استعمال سے گھس بھی نہیں سکتے۔ ان خصوصیات کے ہوتے ہوئے جعلی سکوں کا بننا تقریباً ناممکن ہے۔ ان سکوں کی آواز بھی نہیں ہوتی، اس لئے چٹکی لگانے کی بجائے ان کو مقناطیس کے ذریعہ جانچا جاسکتا ہے۔ ان دونوں کے کناروں پر لکیریں نہیں ہیں کیونکہ جعلسازی کا امکان نہ ہونے کے باعث انکی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ان پر ایک طرف بادشاہ کی اور دوسری طرف شیر بنگال کی تصویریں نقش ہیں۔ شیر یا کسی دوسرے جانور کی تصویر آج تک کسی ہندوستانی سکے پر نہیں بنائی گئی تھی۔ یہ بھی ہمارے ملک کی تاریخ سکہ سازی میں پہلی اور اہم مثال ہے۔

## ساحلی علاقوں کی غرقابی

سمندری موجوں کے تیز تھپیڑوں اور کھاری پانی کے اثرات سے ہر جگہ کے ساحلی علاقے کٹ کٹ کر سمندر کی تہ میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ کہیں اس غرقابی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے اور کہیں کم۔ کہا جاتا ہے کہ جبل الطارق کا ساحلی علاقہ بڑی تیزی کے ساتھ کٹتا ہے کیونکہ زمین کسیقدر نرم ہے اور موجیں اس کے برعکس بہت شدید طوفان برپا کئے رکھتی ہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ سرزمین برطانیہ کا کچھ نہ کچھ ساحلی علاقہ بھی اسی سرعت اور تیزی کے ساتھ ہر سال نذرِ آب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تمام ملک کے مقامی حکام نے پرزور الفاظ میں حکومت سے درخواست کی ہے کہ قومی مفاد کی خاطر سمندر سے بچاؤ کی مناسب تدابیر فوراً عمل میں لائی جائیں۔ مسٹر ہربرٹ موریسن نے ذاتی طور پر ایک علاقے کا معائنہ کیا جہاں ساحل کے کٹاؤ نے سڑکوں اور مکانوں کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ حکومت سے پانچ کروڑ پونڈ کی مدد مانگی گئی ہے تاکہ دیوارِ چین جیسی ایک طویل و دبیز اور مستحکم دیوار ساحل کے ساتھ ساتھ اس طرح تعمیر کردی جائے کہ وہ پشتے کا کام دے اور ساحل آئندہ کٹنے سے محفوظ رہے۔ طوفان خیز موجوں کا سب سے زیادہ تباہ کن اثر ضلع یورک شائر کے اطراف میں ہوتا رہا ہے جہاں گذشتہ تین سو سال کے عرصے میں پورے رقبے کے تقریباً پندرہ قصبات سمندر کی نذر ہوگئے اور ابھی سلسلہ جاری ہے۔

## سانحۂ ارتحال

بمبئی سے جناب عرش تیموری نے یہ افسوسناک خبر بھیجی ہے کہ ۲۹ ستمبر کی شام کو انکے والد بزرگوار میرزا نظام شاہ، لبیب گورگانوی کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ الخ۔ مرحوم دلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی اولاد میں سے تھے۔ ایک ممتاز شاعر ہونے کے علاوہ خاندانِ تیموریہ کی چند باقیماندہ معزز ہستیوں میں انکا شمار ہوتا تھا۔ اسوقت مرحوم کی عمر تقریباً ستر سال تھی۔ وہ سرطان جیسے موذی مرض میں آٹھ ماہ مبتلا رہنے کے بعد اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے۔ دریائے پوئیسر کے کنارے ان کی آخری آرام گاہ بنائی گئی ہے۔ ان کی وفات سے اردو شاعری کو ایک صدمۂ عظیم پہنچا ہے۔ دعا ہے کہ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

# غزل

## نوح ناروی

ہونے کو ٹھکانے لاکھوں ہیں لیکن مرے قابل کوئی نہیں
مدفن کے علاوہ دنیا میں آرام کی منزل کوئی نہیں

انداز سے اک اک دل میں خوش غماض سے خوش دل کوئی نہیں
جس قسم کی تیری محفل ہے اس قسم کی محفل کوئی نہیں

نازاں ہو تم اپنی صورت پر دعویٰ ہے بہت یکتائی کا
یہ شمع یہ گل یہ آئینہ کیا مد مقابل کوئی نہیں

غمزوں کی طرف بھی دھیان کرو عشووں کی طرف بھی غور کرو
اتنے تو ہمارے قاتل ہیں تم کہتے ہو قاتل کوئی نہیں

ہم کس پر اثر ڈالیں اپنا آداب وفا سے دور ہیں سب
جو درد جگر کا درد سنے یوں درد بھرا دل کوئی نہیں

کیا نجد کے صحرا میں جا کر دل اہلِ جنوں کا بہلے گا
محمل تو ہزاروں ہیں اب بھی ہاں لیلیٰ محمل کوئی نہیں

جو عشق و وفا میں جھیل سکے یہ جوش یہ ہمت کس میں ہے
دل ہو کہ جگر ہو کوئی ہو غم سہنے کے قابل کوئی نہیں

بدلی بھی اٹھی بارش بھی ہوئی شیشے بھی کھلے ساغر بھی چلے
ہشیار سب اپنے کام سے ہیں میخانے میں غافل کوئی نہیں

برمایا جگر کو ناوک نے زخمی کیا دل کو خنجر نے
لیکن ہے مرے قاتل کا گماں دونوں میں سے بسمل کوئی نہیں

اے حسن نکل آ خلوت سے تو قیر بڑھا دے جلوت کی
محفل میں سب اہل محفل ہیں رونق دہ محفل کوئی نہیں

میں ترک وفا کا قصد کروں وہ ترک جفا پر مائل ہو
یہ سب سے زیادہ مشکل ہے جیسی یہ ہے مشکل کوئی نہیں

یاران جہاں کو دیکھ لیا اخلاص و وفا کو جانچ لیا
آرام کے ساتھی کتنے تھے تکلیف میں شامل کوئی نہیں

وہ مجھ سے خفا دل سے بھی خفا سب اپنے پرایوں سے بھی خفا
کیا عشق و وفا کی دنیا میں احسان کے قابل کوئی نہیں

کم بخت کی ہمت کو دیکھو آزارِ محبت کو دیکھو
اُس کا متمنی دل ہے مرا جس کا متحمل کوئی نہیں

وہ رنگ محبت لوئے وفا وہ زخم ستم وہ داغ الم
جتنے نظر آئے غنچہ و گل ان میں سے مرا دل کوئی نہیں

زندانِ محبت کے قیدی آزاد ہمیشہ رہتے ہیں
ممنونِ سلاسل ہو کر بھی پابند سلاسل کوئی نہیں

اے نوح ڈبو دیگا تم کو امواجِ محبت کا طوفاں
ہر بحر میں ساحل ہوتے ہیں اس بحر میں ساحل کوئی نہیں

# ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

ایک موقع پر مجھے ڈاکٹر ذاکر صاحب کے اعزاز میں تقریر کرنی پڑی۔ میں نے تھوڑی دیر تک یہ سوچا کہ ان پچیس تیس سال میں ڈاکٹر صاحب کی کونسی بات مجھے سب سے زیادہ ممتاز نظر آئی۔ فی الفور میرے ذہن میں یہ آیا کہ ذاکر صاحب نے طالب علمی کے زمانہ سے لیکر آج تک کوئی کام ایسا نہیں کیا جو دوسرے درجہ کا ہو۔ تیسرے درجہ کا تو سوال ہی نہیں۔

ذاکر صاحب علی گڑھ کے طالبعلم تھے، نان کوآپریشن میں وہاں سے علیحدہ ہوئے اور جرمنی چلے گئے، وہاں سے آکر جامعہ کا کام سنبھالا۔ جامعہ کو ذاکر صاحب نے کس حال میں پایا، کیسے نازک مواقع پر اس کو سنبھالا اور کس طرح اس کو سنوارا، اس زمانہ میں ان پر اور ان کے ساتھیوں پر کیا گذری، اس کی داستان بڑی طویل ہے۔ اسکا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ کئی سال ہوئے دولت آصفیہ سے جامعہ کو گرانقدر مالی امداد ملی۔ ذاکر صاحب سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی۔ میں نے مبارکباد دی۔ تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔ رشید صاحب آج گیارہ سال بعد جامعہ کے اسٹاف کو پوری تنخواہ دی جاسکی۔ میں متحیر رہ گیا۔ میں نے کہا، ذاکر صاحب یہ واقعہ جامعہ کی تاریخ میں نہیں ہماری تمام قومی تحریکوں میں یاد رکھا جائیگا۔ جہاں ایسے کام کرنیوالے ہوں وہاں میرا گذر تو ہو نہیں سکتا۔ لیکن کسی دن ریڈیو پر تقریر کرنے دہلی آیا تو دو رکعت نفل پڑھنے جامعہ نگر ضرور آؤں گا!

نان کوآپریشن کی زد میں علی گڑھ ہی کا ایک حصہ ٹوٹ کر جامعہ بنا۔ "چشم زلیخا کو نور دیدۂ یعقوب" ہی روشن کئے ہوئے ہے۔ اس زمانہ کے بیشتر بہترین طالب علم بھی علی گڑھ سے نکلکر جامعہ میں شامل ہوگئے۔ لیکن جامعہ کو موجودہ شکل، حیثیت اور شہرت دینے کا سہرا تمامتر ذاکر صاحب اور ان کے بے لوث رفقا کے سر ہے۔

---

ذاکر صاحب نے سب سے الگ ہوکر لیکن سب کے لئے جامعہ کی بنیاد ڈالی۔ محنت سہی، بے بسی دیکھی، گالیاں سنیں، رسوائی اٹھائی، انتظار جھیلا، لیکن منہ نہ موڑا، مسکرانے سے باز نہ آئے، دشمن سے نہ ڈرے نہ اسے دھتکارا۔ اس نے مانگا تو دیدیا، اس نے چرالیا تو جانے دیا۔ خود سہتے رہے، جامعہ کو سپر نہ بنایا، اسکو صرف سنوارا۔ وہ انتظار کرنے سے گھبراتے نہیں اسلئے کہ اچھے اور بڑے کام کرنے میں انتظار کی منزل سرے سے مفقود ہوتی ہے، انجام کا ڈر نہیں ہوتا۔ کام اور انجام ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ انجام یا انعام کا جویا وہ ہوتا ہے جس کو اپنے کام پر ایمان ہو نہ اطمینان۔ سب سے بڑا اور سب سے اچھا انعام وہ ہے جو ہم خود اپنے آپکو دے سکیں نہ وہ جو دوسرے سے ملے!

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ جامعہ کا پروگرام لمبا ہے، اسکے نتائج دیر میں برآمد ہونگے ملک کے حالات اس کے مقتضی ہیں کہ سیاسی سرگرمیوں میں جلد سے جلد حصہ لیا جائے۔ اس سے جہاں اور فوائد ہیں، وہاں جامعہ کے کاموں کو بھی تقویت پہنچے گی۔ ملک و قوم کی حالت روز بروز دگرگوں ہورہی ہے تو لمبے پروگرام کو اپنی توجہ و محنت کا تنہا مرکز بنانا مناسب نہیں۔

لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ سیاسی سرگرمیاں بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان میں صحت و استواری اسی وقت آتی ہے جب انکی آبیاری کے لئے ہمارے ذہنوں میں صاف اور شفاف پانی کے گہرے اور نہ سوکھنے والے سوتے ہوں۔ یہ سوتے تعلیم ہی سے منکشف بھی ہوتے ہیں اور پیدا بھی۔ بازاروں اور اخباروں میں قومیں بنتی نہیں بدنام ہوتی ہیں۔ تعلیم کو سیاست پر قربان کرنا تنگ نظری اور خود غرضی ہے۔ سیاست کو تعلیم کی باندی ہونا چاہیئے۔ تعلیم میں نتائج کی دیر سویر بے معنی سی بات ہے۔

---

ذاکر صاحب جامعہ کو ۲۵ سال سے چلا رہے ہیں۔ اس دوران میں جامعہ اور جامعہ میں کام کرنے والوں کو طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ دونوں پر مسلسل اور بے پناہ غیر شریفانہ حملے ہوئے۔ لیکن نہ یہاں کوئی اسٹرائک ہوئی، نہ کوئی بد دل ہوا۔ نہ جامعہ کو چھوڑ کر شہرت یا روزی کمانے کہیں اور گیا۔ یہاں ایسے لوگ بھی نہ تھے جن پر رزق اور موت کے دروازے بند رہے ہوں اور جامعہ کے علاوہ کہیں اور ٹھکانا نہ ہو بلکہ ان میں سے اکثر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ایسی شہرت رکھتے تھے کہ ہندوستان کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں انکی پذیرائی احترام کے ساتھ ہوسکتی تھی۔ یہ صرف ذاکر صاحب کی بلند و برگزیدہ شخصیت تھی جس نے جامعہ کے تار و پود کو نہ صرف بکھرنے سے بچایا بلکہ اس کو مربوط و مستحکم کردیا!

جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہمہ وقت یہ دیکھتا تھا کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کر رہا ہے اور ذاکر صاحب کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ سارا تصفیہ اسی ترازو میں تل کر ختم ہوجاتا۔ ذہنی قابلیت میں جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا وہ ذاکر صاحب کی ذہنی قابلیت کے سامنے سر جھکا دیتا، اپنے ایثار، قربانی اور اخلاقی فضائل کا کسیکو خیال آتا تو وہ یہ پاتا کہ ان فضیلتوں میں بھی ترازو کا پلڑا ذاکر صاحب کی طرف جھکتا ہے۔ خاندانی شرافت و نجابت یا سوشل اور سرکاری تعلقات یا رسوخ پر کسی کو ناز ہوتا تو وہ یہ پاتا کہ ان کا سردار خاندانی اعتبار سے بھی زر خالص ہے اور اس کے تعلقات بھی زیادہ وسیع، زیادہ مستحکم اور زیادہ وسیع ہیں۔ محنت کرنے اور فرائض سے عہدہ برآ ہونے کو دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ذاکر صاحب جیسا محنت شاقہ

رشید احمد صدیقی

کرنے والا اور اپنے فرائض پر آرام و تفریح کو قربان کردینے والا حلقہ میں آن جیسا کوئی اور نہ تھا کسی کو اپنے ذوق ذہانت و فطانت کا دھیان ستاتا تو وہ دیکھتا، کہ اس وادی میں بھی امام ذاکر صاحب ہی ہیں۔ کلرک یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرتے ہیں۔ چپراسی یہ پاتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ دوڑ دھوپ اٹھاتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ بچہ یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب جیسا بچہ کوئی نہیں ہے، جوان یہ محسوس کرتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ جوان ہیں، اور بوڑھا یہ جانتا کہ جب بڑھاپا ذاکر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا تھا تو پھر وہ بڑھاپے کو کیوں خاطر میں لائے!

ان کے علاوہ ہر شخص کا عقیدہ تھا کہ ذاکر صاحب دوسروں کے فائدہ کے لئے جان کھپاتے ہیں، اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد اور اس کی عزت و ذلت کو اپنی عزت و ذلت سمجھتے ہیں تو پھر کون ایسا ہو سکتا تھا جو ذاکر صاحب کو چھوڑ کر اپنے ضمیر کی سرزنش گوارا کرتا۔

---

ذاکر صاحب سے میرے تعلقات بڑے گہرے اور بڑے پرانے ہیں لیکن قومی زندگی میں میرا ان کا کبھی ساتھ نہ ہوا۔ وہ قلندر ہیں دنیا دار۔ انھوں نے زندگی کے جو مصائب اٹھائے ہیں ان کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ زندگی کے جن آستانوں پر میں نے سر جھکایا۔ ان آستانوں نے ذاکر صاحب کے سامنے پیہم سجدے کئے اور ٹھکرائے گئے۔ ذاکر صاحب مجھ سے تھوڑی سی بھی قربانی کرنے کو کہیں تو شاید میں نہ کر سکوں۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ انھوں نے مجھ سے اس قسم کی فرمائش کبھی نہ کی۔ میں نے اُن سے بڑی سے بڑی فرمائش کی اور انھوں نے ذرہ برابر ہچکچائے بغیر اسے پورا کر دیا۔ ایک واقعہ سنئے۔ ۷۔۸ سال ہوئے ہوں گے۔ ایک دن صبح کو میں اور ذاکر صاحب ناشتہ کر کے کمرہ سے نکلے تھے کہ میرے دل میں اچانک خیال آیا۔ میں نے کہا ذاکر صاحب آپ فلاں صاحب سے صلح کیوں نہیں کر لیتے؟ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ ذاکر صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا۔ سبحان اللہ کیا مصرعہ موزوں فرمایا ہے۔ آخر آپ کو سوجھی کیا؟ میں نے کہا اس کو کیا کیجئے، مجھے تو ایسی ہی سوجھی ہے۔ کہنے لگے تو یہ کونسی بڑی بات ہے۔ آپ کہتے ہیں تو ہو جائیگا۔ میں نے کہا ابھی چلئے، مرشد تیار ہو گئے اور ہم دونوں وہاں پہنچے تو معلوم ہوا وہ صاحب موجود نہیں ہیں۔ بات آئی گئی ہوئی اور جہاں کی تہاں رہ گئی۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا جن صاحب سے میں صلح کرانے گیا تھا وہ ذاکر صاحب کے جب بھی سب سے بڑے دشمن تھے اور اب بھی ہیں!

جب کبھی اس واقعہ کی یاد آتی ہے تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے

لیکن ذاکر صاحب کی شرافت، وسعت قلب اور دوست نوازی پر نظر کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

---

ذاکر صاحب کی بلند نظری، دردمندی اور وسعت قلب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے مخالف بھی جب کبھی ان کی مدد کے خواستگار ہوئے تو انھوں نے نہ صرف بغیر پس و پیش کے بلکہ بڑے لطف اور خلوص سے انکی مدد کی۔ بنیادی تعلیمی کمیٹی رپورٹ کے سلسلہ میں ان کو جس سفاہت اور سفاکی سے رسوا کیا گیا وہ کوئی راز نہیں ہے اور کوئی قابل فخر کارنامہ بھی نہیں۔ اس رپورٹ کے بعد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی کی طرح ڈالی۔ جسکا کام اب تک ختم نہیں ہوا ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ جس زمانہ میں اس کمیٹی پر ایک نازک دور گذر رہا تھا، نواب کمال یار جنگ مرحوم جب کبھی دہلی آتے تو ذاکر صاحب سے ملتے اور کمیٹی کے کام کو حسن خاتمہ پر پہنچانے کی سبیل ذاکر صاحب سے دریافت کرتے اور اعانت کے طلبگار ہوتے تھے یہ رپورٹ جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف منازل سے گذر کر صوبہ متحدہ کی حکومت میں پہنچی تو کانفرنس کی حمایت میں اور کانفرنس کے ہی نقطۂ نظر کو ذاکر صاحب نے وہاں کے ماہرین فن کے سامنے واضح کیا اور منوایا! میں نے کہا مرشد یہ کیا بات ہوئی تو فرمایا، ہوئی کیا اغیار میں اپنوں کی رسوائی دیکھی نہیں جاتی۔

واردھا رپورٹ سب سے پہلے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پٹنہ کے اجلاس میں پیش ہوئی۔ ذاکر صاحب آنکھوں کی سخت اذیت میں مبتلا ہو کر بمبئی گئے ہوئے تھے، جہاں ان کی آنکھوں پر آپریشن کیا گیا تھا، ڈاکٹروں کی سخت ممانعت کے باوجود انھوں نے ایک صاحب کو خفیہ طور پر بلا کر اسی حالت میں کہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور طبیعت نڈھال تھی۔ ایک خط نواب صدر یار جنگ بہادر، سیکرٹری کانفرنس کو لکھوایا، جسمیں انھوں نے کمیٹی کی بنیادی سفارشات کی اہمیت بڑی قابلیت، اور بڑے ہی درد سے جتائی تھی۔ یہ خط ذاکر صاحب کے خلوص، قابلیت، دلسوزی اور زور انشا پردازی کا بڑا نادر نمونہ ہے یہ خط عام نظروں کے سامنے آیا یا نہیں مجھے نہیں معلوم، لیکن میں نے اسے دیکھا ہے غور سے اور دیر تک پڑھا ہے اسکا آخری شعر یہ ہے ؎

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری ٭ مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

موقع کی اہمیت اور خود لکھنے والے کی حالت کا اندازہ کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبالؔ نے بھی کچھ ایسے ہی عالم میں پہنچکر یہ شعر کہا ہوگا شاعری اور انشا پردازی میں بھی ایک مرحلہ آتا ہے جب ع

ریحاں دمد از مینا، رامش چکد از قلقل!

یہ بات صنعت گری کے بس کی نہیں ہے۔ یہ تو اسی وقت آتی ہے جب نظر میں وسعت، فکر میں گہرائی، دل میں سچائی اور اخلاق میں پاکی ہو!

---

بنیادی تعلیمی اسکیم کی رپورٹ ذاکر صاحب نے علی گڑھ میں میرے ہی مکان پر ایک کمرہ میں مشکل سے شاید ایک ہفتہ کے اندر مرتب کر ڈالی۔ کمرہ بھی ایسا جو بیک وقت سونے، بیٹھنے، کھانے، لکھنے پڑھنے اور ڈنڈ پیلنے کا کام دیتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، کچھ دیر تک تعلیمی مسائل پر بحث رہی، اسی سلسلے میں کچھ دوست ملنے آ گئے تو ان سے خوش گپی ہونے لگی، کتابوں، رپورٹوں، فائل وغیرہ کا انبار ہے۔ کاغذات پھیلے ہوئے ہیں۔ ٹریننگ کالج کے لوگ آ گئے تو ان سے تعلیمی مسائل پر بحث چھڑ گئی۔ کوئی خوانچہ والا آ گیا تو جو کچھ اس کے پاس رہا اسی سے شغل شروع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر آ گئے تو امراض و علاج کے لطائف چھڑ گئے، شعر و شاعری کا شائق آ گیا تو شعر خوانی کی مجلس گرم ہو گئی، کوئی اچھا طالب علم آ نکلا تو اسی کے مضمون پر باتیں ہونے لگیں، غرض جو آیا اسی کے مذاق کے مطابق گپ ہونے لگی۔ اس تمام بحث مباحثہ میں ذاکر صاحب اس خلوص و خوبی سے حصہ لیتے جیسے تمام عمر اسی شغل میں زندگی بسر ہوئی ہے۔ جو آتا بہت کچھ سیکھ جاتا اور ایسا خوش ہوتا جیسے اس نے اس دن کوئی بڑا کام کیا تھا۔ ذرا مہلت ملتی تو پھر رپورٹ کی ترتیب شروع ہو جاتی۔ وہ ہر شخص کے سامنے اپنے خیالات اور نتائج پیش کرتے، اس کا مشورہ طلب کرتے۔ اپنی سمجھاتے، اس کی سنتے اور پھر آخری رائے قائم کرتے۔

ایک دن میں نے تنگ آ کر کہا مرشد یہ کہاں کا کھٹراگ پھیلایا، جب دیکھئے بچوں کی عمر، بچوں کے مشاغل، گلی ڈنڈے اور سوت کپاس کی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ تمام دن خدا کی خواروں یا حق بخشوائے ہوئے لوگوں کا مجمع رہتا ہے۔ فرمایا، سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ آج اتفاق سے پنسل بنانے کے لئے کسی کے پاس چاقو نہ ملا ورنہ بقیہ مراحل بھی طے ہو جاتے۔ اب کل کوئی سبیل ایسی نکالئے کہ مجھے چند گھنٹے یکسوئی کے مل جائیں، سارا خاکہ ذہن میں ہے، رپورٹ مکمل ہو جائے گی۔

دوسرے دن میں نے اپنے پرانے مکان کے بالاخانہ پر ذاکر صاحب کو مقفل کر دیا، مقفل اس لئے نہیں کہ کوئی ملاقاتی بار نہ پائے بلکہ اسکا خطرہ تھا کہ خود مرشد نکل جائیں۔ ہوا وہی جس کا خطرہ تھا۔ صبح بالاخانہ پر مقفل ہوئے، دو گھنٹے گذرے ہوں گے، ایک صاحب ملنے آئے۔ نوکر نے کہا، ذاکر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے نقد و جرح شروع کی۔ مرشد کے کان تک آواز پہنچی، روشن دان کچھ اونچا نہ تھا۔ اسٹول رکھ کر غرفہ سے بولے "ارے میں یہاں مقفل ہوں، کنجی رشید صاحب کے پاس ہے، لیکن کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ اسباط کا پتہ لگا لائیے"۔ انھوں نے کہا، ہاں، رپورٹ نقل کرا لایا ہوں۔ فرمایا سنائیے، انھوں نے سنانا شروع کیا۔ میں یونیورسٹی سے آیا تو رومیو جولیٹ کا یہ ڈراما نظر آیا۔ میں نے کہا مرشد یہ کیا ہے، فرمایا ذرا ٹھہرئیے گا، بس ایک منٹ۔ افسانہ ختم ہو گیا۔ میں نے بالاخانہ پر پہنچ کر قفل کھولا۔ تو مرشد سارا کام ختم کئے ہوئے چاروں شانے چت کچھ گنگنا رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو لیٹے ہی لیٹے ایک زقند بھری اور سرو قد کھڑے ہو گئے۔ فرمایا ذرا پانی پلوائیے۔ کام ختم ہو گیا، میں نے کہا یہ آپ کیا سن رہے تھے۔ کہنے لگے فلاں رپورٹ کا حوالہ دینا تھا۔ ایک جگہ شبہ ہوتا تھا، اس لئے ان صاحب سے کہا تھا کہ اصل رپورٹ دیکھ آئیں، انھوں نے جو سنایا تو اطمینان ہو گیا کہ جو یاد تھا وہ ٹھیک تھا۔ میں نے کہا اب تو جب تک آپکا قیام ہے کوئی زق زق نہ ہوگی، فرمایا ہرگز نہیں۔ میں نے کہا اللہ کا شکر ہے۔ آج ڈاکٹر اصغر کے ہاں چائے پی جائے تو کیسی رہے گی؟ کہا ضرور، ان سے بلی کا بچہ بھی لینا ہے۔ میں نے کہا بلی نے تو بچہ نہیں دیا ہے، کتے نے البتہ دیا ہے۔ کہنے لگے اسی کا سہی! سعیدہ (ذاکر صاحب کی بچی) کے لئے کچھ نہ کچھ لے جانا ضروری ہے۔ گھر پہنچنے پر دو ہی تو سوال کئے جاتے ہیں۔ بیوی کہتی ہے کیا کھویا اور سعیدہ پوچھتی ہے کیا لائے!

---

ذاکر صاحب کی تقریر و تحریر دونوں میں ایک خاص چیز ملتی ہے جو کہیں اور کم دیکھی گئی ہے۔ ماہرین طبیعات کا مدتوں خیال رہا کہ روشنی کی رفتار بخط مستقیم ہوتی ہے۔ بعد کی تحقیقات یہ ہے کہ اس کی رفتار بخط مستقیم نہیں بلکہ جست و خیز کے ساتھ ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی تحریر و تقریر دونوں میں یہ بات ملتی ہے۔ وہ مروجہ طریقوں سے کام نہیں لیتے بلکہ شروع سے آخر تک سامع یا قاری کی توجہ کو اپنے الفاظ اور خیالات کی تازگی و توانائی سے تب و تاب دیتے رہتے ہیں اور اس کے تصورات کو نہ تھکنے دیتے ہیں نہ دم لینے دیتے ہیں۔ الفاظ و عبارت میں صفائی، خیالات میں رفعت اور جذبات میں سچائی ہوتی ہے۔ کم لوگوں کی تحریر و تقریر حشو و زوائد یا مبتذل الفاظ و عبارت سے اتنی پاک ہوتی ہے جتنی کہ ذاکر صاحب کی۔ ان کی تقریر میں نہ خطابت ہوتی ہے نہ موعظت لیکن خطابت کا زور اور گرمی اور موعظت کی رقت و شائستگی بدرجۂ اتم ملتی ہے۔ ذاکر صاحب تقریر کرتے ہیں تو مجھے پہاڑ کی فضا یاد آ جاتی ہے۔ پہاڑ ہی کا اوج، وزن و وقار۔ ان کی تقریر اس چشمہ کی مانند ہوتی ہے جو اپنی سبیل سفر کی ہر منزل میں شفاف، شاداں و شنگرف کار رہتا ہے لیکن جہاں کہیں

اکر صاحب نے ملک پر چھائی ہوئی تاریک کہر اور ساتھیوں کے تذبذب یا تھکن
طرف اشارہ کیا ہے، وہاں ان کا لہجہ دھیما اور حزیں ہو گیا ہے۔ الفاظ میں ہم
لیکن پیغام میں وہی گرمی اور جگر تابی ہے جو ذاکر صاحب کی رگ رگ میں
سرایت کئے ہوئے ہے۔

ذاکر صاحب کی تقریر کا لطف اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب حاضرین
ں سے کوئی بڑا اور بر خود غلط آدمی بے سمجھے بوجھے محض اپنی اہمیت جتانے
کے لئے اعتراض کر دے۔ طالبعلمی کے زمانہ میں یونین میں ذاکر صاحب کی جوابی
قریر سننے کے لئے ہم سب خاص طور پر جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک سال وائس
رسیڈنٹ کے عہدہ کے لئے ذاکر صاحب بھی امیدوار تھے۔ سارے طلبا
واص و عوام کے نام سے دو گروہ میں منقسم ہو گئے تھے۔ ذاکر صاحب عوام کی طرف
سے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر فریق کے امیدوار کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی قابلیت
یت جتانے کے لئے یونین میں تقریر کرے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کو بھی بحث کے
لئے عنوان دینا پڑا۔ مخالف جماعت نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ ذاکر صاحب کے
لئے فلاں پروفیسر نے تقریر لکھدی ہے اور وہ اس کے رٹنے میں مصروف ہیں۔
باحثہ کا وقت آیا۔ یونین میں تل رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ ذاکر صاحب کا نام لیا
یا اور ہال تالیوں اور سیٹیوں سے اس طور پر گونجا جیسے ہوئے فدا در و دیوار در و دیوار
اکر صاحب داہنی طرف کے اسٹینڈ پر آئے اور بولے، میں نہایت ادب کے ساتھ
ین ضابطہ سے اپنے موضوع بحث کو اس مجلس کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔
ے اس بارہ میں جو کچھ عرض کرنا ہے وہ میں اپنی جوابی تقریر میں عرض کرونگا۔
ی الحال اتنا ہی عرض کرنا ہے۔ یہ کہہ کر اپنی جگہ پر لوٹ آئے، لیکن فوراً ہی
یلے اودھم مچ گیا۔ فریق مخالف نے خوب خوب پھبتیاں کسیں اور شور مچایا۔
معلوم ہوا جیسے الکشن کے نتیجہ کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ذاکر صاحب کے
مائیتوں کا یہ حال کہ کوئی غصہ میں کوئی مایوس ہو کر کوئی اپنے آپ پر نفریں کرتا
! اور کوئی ذاکر صاحب کو آنکھوں آنکھوں میں تناول کرتا مجمع سے جانے لگا۔
ہ اس طور پر جم کے بیٹھ گئے کہ یا تو مار ڈالیں گے یا مر کے اٹھیں گے۔ مخالفین
ن بن آئی تھی۔ اسدن صرف مخالفین نے تقریریں کیں اور جسکے دل میں جو آیا
س نے ذاکر صاحب اور ان کے حمائیتوں کو سنا ڈالا۔

جواب کا وقت آیا تو ذاکر صاحب پھر اسٹیڈ پر آئے۔ انکے موافقین
ن جو یونین کے باہر آس پاس چہ میگوئیوں میں مصروف اور کچھ بپھرے ہوئے
دروازہ سے لگے کھڑے تھے۔ رفتہ رفتہ آئے۔ ذاکر صاحب پر عالم کچھ ایسا
اری تھا کہ کسی نے تالی تک نہ بجائی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ موضوع بحث پر
ب بھی میں کوئی تقریر نہ کروں گا، صرف مخالف تقریروں کا جواب دونگا۔ اسکے
بعد انھوں نے ہر مخالف کے دلائل کے جواب دینے شروع کئے اور جہاں تہا

ان کے آداب محفل انداز و لہجہ پر فقرے بھی چست کرتے گئے۔ مجمع سے صدائے
تحسین بلند ہونی شروع ہوئی۔ تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑا شاعر
اپنی بہترین نظم سنا رہا ہے جسکے ایک ایک شعر پر مجمع تلے اوپر ہو رہا ہے۔
تقریر ختم ہوئی رائے لی گئی تو سارا ہال موافقت میں کھڑا ہو گیا۔ صدر
نے نتیجے کا اعلان کیا۔ اب ذاکر صاحب کے موافقین کی بن آئی تھی۔ انہوں نے
مخالفین کا پیچھا گھر تک نہ چھوڑا۔ پانی پت کی آخری لڑائی کے بارے میں
کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ جنوبی ہند
میں کوئی مرہٹہ خاندان ایسا نہ تھا جس کے ہاں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ یہی حال
ذاکر صاحب کی تقریر اور ان کے نپے تلے برجستہ فقروں نے مخالفین کا کیا۔

---

مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ایک جلسہ میں سر سلیمان مرحوم صدر تھے۔ اراکین
میں سے ایک صاحب اپنے آپ کو بڑا طباع اور یگانہ روزگار سمجھتے تھے اور ہر لمحہ
اپنی نشست سے بیٹھے بیٹھے لوگوں پر فقرے چست کیا کرتے تھے اور کوشش
یہ کرتے تھے کہ ان کی موجودگی میں کسی کی پیش نہ جائے۔ ذاکر صاحب نے ایک
مسئلہ پر تقریر کی جس کو ہر شخص نے غور و احترام کے ساتھ سنا۔ بڑے سے بڑے
مخالف مجمعوں میں بھی ذاکر صاحب کی تقریر ہمیشہ خاموشی اور احترام سے سنی گئی۔ یہ
امتیاز میں نے کم لوگوں میں پایا۔ تقریر کے ختم ہوتے ہی، وہ صاحب تلملا اٹھے اور
فوراً اپنی نشست پر سے ایک پوائنٹ آف آرڈر ریز کیا جس میں تفاخر اور
خودنمائی کی شان پورے طور پر جلوہ گر تھی، بولے جناب والا نہایت ادب سے
عرض کرتا ہوں کہ ذاکر صاحب نے ابھی جو تقریر کی ہے وہ بالکل میری سمجھ میں نہیں
آئی۔ کچھ اور ارشاد فرمانے والے ہی تھے کہ ذاکر صاحب نے اٹھکر فرمایا، جناب
والا میں نے اپنی تقریر میں کہیں اسکا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میری تقریر محترم
ممبر کی سمجھ میں آئے گی۔ اسپر ایسا بے محابا قہقہہ پڑا کہ سر سلیمان مرحوم جیسے ثقہ
آدمی جو ایسے مواقع پر اپنی طرف سے کبھی بے تکلف نہیں ہوتے تھے بے اختیار
ہنس پڑے اور معترض صاحب کچھ ایسے سٹ پٹائے کہ دوران مجلس میں صرف
سکوت پر قانع رہے۔

کورٹ ہی کا ایک اور جلسہ بھی مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ اسمیں جو مسئلہ زیر بحث
تھا وہ اسدرجہ اہم اور متنازعہ فیہ تھا کہ کورٹ کے با اقتدار اراکین ہر گوشہ ملک سے
شریک ہوئے تھے اور جو کچھ فیصلہ ہونے والا تھا اسمیں کہیں شک و شبہ کی گنجائش
نظر نہیں آتی تھی۔ فضا ایسی دگرگوں تھی کہ بڑے سے بڑے شخص کی ہمت نہ ہوتی تھی
کہ مخالفت میں تقریر کرنا تو درکنار مخالفت میں چپکے سے ہاتھ اٹھانے کی بھی ہمت
کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر طرف سنگینیں کھچی ہوئی ہیں جس نے قدم اٹھایا وہ
جان سے گیا۔ معمولی ابتدائی کارروائی شروع ہو کر ختم ہو لی۔ تحریک پیش کرنے والوں نے

ایسے اصحاب تھے جو قانونی قابلیت، قومی خدمات، ذاتی جاہ و حشمت ہر اعتبار سے قوم اور ملک میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ یہ مرحلہ بھی ختم ہوا اور وہ لمحہ آیا جب اس کی مخالفت میں کوئی کھڑا ہو۔ چند لمحے ایسا سناٹا رہا کہ ہر شخص اپنے قلب کی حرکت سن سکتا تھا۔ معرکہ میں پہلا قدم اٹھانے والا اور پھر پیچھے مڑکر نہ دیکھنے والا ہی مرد کہلاتا ہے۔ ذاکر صاحب سب سے پیچھے کی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے، اُٹھے اور محض ایک جملہ کہہ کر بیٹھ گئے "یہ تحریک قانوناً پیش نہیں کی جاسکتی"! سارا مجمع مڑکر پیچھے دیکھنے لگا۔ قانون میں جن صاحب کا پایہ ہائی کورٹ تک مسلم تھا اور جو اس تحریک کے قانونی پشتبان تھے، کڑک کر بولے قانونی سقم کوئی نہیں ہے میں چیلنج کرتا ہوں! جلسہ میں جو لوگ بحث کرنے یا سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ ہاتھ اٹھانے یا ادھم مچانے کے لئے آتے ہیں یا بلائے جاتے ہیں ان کی بن آئی۔ ذاکر صاحب نے ایک لفظ نہ کہا، بڑی مشکلوں کے بعد جب مجمع کو کسیقدر خاموش کیا گیا اور فاضل معترض نے اپنا چیلنج دہرایا تو ذاکر صاحب نے انکو ایک ایسے موقع کی یاد دلائی جب انھوں نے پہلے ہی ایک مسئلہ میں ذاکر صاحب کو چیلنج دیا تھا اور بعد میں اپنی غلطی تسلیم کی اور فرمایا ایسے مواقع پر چیلنج نہیں دیتے سوچتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے اب ایک مختصر سی تقریر کی اور اپنے اعتراض کی بڑی سنجیدگی لیکن وثوق اور دبدبہ کے ساتھ وضاحت کی۔ جلسہ کے مدبّروں نے غور کیا تو ذاکر صاحب کا اعتراض صحیح نکلا، معترض نے اپنی غلطی تسلیم کرلی۔ ہال کے اندر بڑی دیر تک دوڑ دھوپ اور خفیہ سرگوشیاں ہوتی رہیں بالآخر ذاکر صاحب ہی کی مشورت سے مطالبہ کی نوعیت بدل گئی۔ اور کارروائی شروع ہوئی۔

ذاکر صاحب کے بارہ میں یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ ان کی اردو کی تقریر و تحریر بہتر ہوتی ہے یا انگریزی کی۔ طالب علمی کے زمانہ میں کالج میگزین میں رب کے نام سے وہ کالج کی زندگی پر بڑے دلکش مضامین لکھا کرتے تھے جنکا لوگ بڑے شوق سے انتظار کیا کرتے تھے۔ انگریزی کے بارہ میں ایکبار مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر مسٹر ریمز باتھم نے کہا تھا کہ "ڈاکٹر ذاکر حسین کی انگریزی تحریر و تقریر بالخصوص انکی حاضر جوابی کا مقابلہ برطانوی پارلیمنٹ کے بہترین اراکین سے کیا جاسکتا ہے۔" علی گڑھ میں رہ کر اور اس سے باہر بھی میں نے انگریزی ہی کی اچھی تقریریں سنی ہیں، لیکن ہر طرح کے تکلفات سے قطعاً بری، الواں، جنچی تلی، دلنشیں، فکر انگیز۔ انگریزی تقریریں نے ذاکر صاحب ہی سے سنی۔ انکی تقریر کا ایک جملہ بھی زائد از ضرورت نہیں ہوتا اور شروع سے آخر تک استوار، شریفانہ اور ہر فقرہ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے، آپ ان کے کسی فقرہ کے ابتدائی الفاظ سن کر یہ نہیں بتا سکیں گے کہ اس فقرہ کی یہ پرداخت ہوگی یا یوں ختم ہوگا۔ ہمیشہ وہ اسکو اس طرح ختم کرینگے کہ آپ متحیر بھی ہوں گے اور خوش بھی۔ عام تقریر کرنے والوں کی مانند وہ جسم کے کسی حصہ کو خاص طور پر جنبش یا جھٹکے نہ دینگے لیکن بحیثیت مجموعی آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں ان کے سارے جسم و جان کی کارفرمائی ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ اپنی تقریر سے اپنے گرد ویسی ہی فضا پیدا کرتے ہیں یا وہ خود ایک فضا ہیں جس کی وجہ سے ہی تقریر برآمد ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی خاموشی دیکھکر اکثر ذہن غالب کے اس مصرعہ کیطرف منتقل ہو جاتا ہے ع

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے!

## غزل

اوجِ مقام دوست پہ اپنا گزر کہاں
شایانِ سدرہ طائرِ بے بال و پر کہاں

تو ہی نہ ہو نظر میں تو ذوقِ نظر کہاں
دنیا بہت خراب ہے جائیں مگر کہاں

ہوتی ہے دیکھئے شبِ [illegible] کی سحر کہاں
[illegible]

موجود [illegible] بے خبر کہاں
حالی کی وہ غزل [illegible] لاکھ سہی تو مگر کہاں

[illegible]

### مطلعِ ثانی

تزئینِ زلف [illegible] رخ پر نظر کہاں
وہ [illegible] ذوق و شوق وہ شام و سحر کہاں

[illegible]

بیمِ نگاہِ ناز سے قابل جگر کہاں
[illegible]

محروم [illegible] کہاں اور اثر کہاں

تلوک چند محروم

# رُوپ

## فراق گورکھپوری

(۱)

[illegible] کی کروٹیں لیتا ہوں
[illegible] صبح [illegible] لیتا ہوں
اے جانِ بہار [illegible]
[illegible] صدیوں کو [illegible] لیتا ہوں

(۲)

ابرو پہ سجے ہیں یا بجلی کا نکھار
ہیں زیب کہ رحمتوں کی جیسے بوچھار
پیچ و خم [illegible] مسکراہٹ [illegible] نگاہ
ہر [illegible] نفس کو سانس لیتی ہے بہار

(۳)

انسان کے پیکر میں اتر آیا ہے ماہ
قد ہے کہ چڑھی ندی ہے امرت کی اتھاہ
لہرائے ہوئے بدن پہ پڑتی ہے جب آنکھ
رس کے ساگر میں ڈوب جاتی ہے نگاہ

(۴)

قامت ہے کہ انگڑائیاں لیتی سرگم
ہو رقص میں جیسے رنگ و بو کا عالم
جگ مگ جگ مگ سا شبستانِ ارم
[illegible]

(۵)

[illegible]

(۶)

نظروں کی شعاعوں میں ہواؤں کی پھوار
زلفوں کی گھٹا میں موجِ ابرِ گہربار
وہ جانِ وفا سراپا دل ہی دل ہے
سرتا بقدم بدن ہے یا جوئے بہار

(۷)

[illegible] پلکوں سے [illegible] کرن
[illegible] کنول کا [illegible]
[illegible] فضا میں لیلا [illegible]
[illegible]

(۸)

آنچل میں وہ جھلک، وہ رس، وہ جھنکار
پھولوں کے کھلنے کا وقت صبحِ گلزار
یا نور کی انگلیوں سے دیوی کوئی
جیسے شبِ ماہ میں بجاتی ہو ستار

(۹)

[illegible]

(۱۰)

خاموش فضا میں [illegible] چھا جاتی ہے
بجلی کوئی لہرا کے لپک جاتی ہے
امرت کی پھوار سے [illegible] آواز
[illegible] صبح چھلک جاتی ہے

(۱۱)

[illegible]

(۱۲)

[illegible] نرم [illegible] آواز یہ ترنمِ خواب
تاروں پہ [illegible] مضراب
بجتے ہیں [illegible] یہ جھنکار
چاندنی کی گھنٹیوں کا بجنا [illegible]

(۱۳)

[illegible]

(۱۴)

[illegible] صبح [illegible] چھوٹے
[illegible] چھلک کے [illegible] چھوٹے
[illegible]
[illegible] چھوٹے

(۱۵)

[illegible]
[illegible] انسان کا [illegible]
[illegible]

(۱۶)

دوشیزہ کی [illegible] قدم جھنکار
[illegible] رات بجائے ستار
سرشار فضاؤں کی [illegible] ہیں
چھلکا [illegible] انکھیاں جوانی کا خمار

(۱۷)
پچھلی رات، اداس آسماں کی فضا
پژمردہ فطرت کے نزع سے سرکا سرکا
تاروں کی چھاؤں میں چھلکتا ہوا روپ
جیسے وقت طلوع بن سنگھا

(۱۸)
پر روپ کے گرد سات رنگوں کی پھوار
جیسے دھنک [illegible] جسم [illegible]
پژمردہ فضا میں [illegible]
پاتوں میں قزح کے جھلملانے [illegible]

(۱۹)
وہ یاد سحر کا رس میں ڈوبا ہوا راگ
جیسے کنول نے دریا کا سہاگ
[illegible] گات سے لپٹی نفس
منزل کے بن میں جیسے [illegible] آگ

(۲۰)
یہ چہرہ کھلا ہوا کہ جیسے ہوں ہونٹ
گیسوؤں کی لپٹ پہ [illegible] ہونٹ
یہ تازہ وری [illegible] مسکراہٹ کہ نشاط
سانسوں کی [illegible] ہونٹ

(۲۱)
پیکر ہے کہ جو رات عمر کی کٹ جائے
سینہ دیکھو تو [illegible] کٹ جائے
سانچے میں ڈھلا ہوا [illegible] نشیں
[illegible] کھلے پھٹ جائے

(۲۲)
زلفوں کے فضاؤں میں [illegible] کا سماں
[illegible] آنگن میں ترا وٹ کا سماں
[illegible] عنبرا [illegible]
[illegible] کھلاوٹ کا سماں

(۲۳)
شیشے کی ادا، پست کہ قامت کا تناؤ
[illegible] عضو [illegible] کی چڑھاؤ
[illegible] کھڑی ہوتی [illegible]
دیکھو کوئی بجلی بدن کا [illegible]

(۲۴)
وہ رنگ بکھیر [illegible] کہ بجلی لہرائے
وہ رس آواز میں کہ امرت [illegible]
[illegible]
[illegible] بادل [illegible]

(۲۵)
[illegible] گلستاں کی جھلک
[illegible] شبستاں کی جھلک
زلفوں میں [illegible] شبستاں کی جھلک
[illegible] کی جھلک

(۲۶)
گہوارہ صدا [illegible] موج نفس
[illegible]
نظریں [illegible] اٹھتی ہیں
ہر عضو بدن [illegible]

(۲۷)
[illegible] کی زردی
[illegible] پھولوں کی [illegible]
گردش میں نگاہ [illegible] حیات
جنت بھی [illegible]

(۲۸)
[illegible] کرن
[illegible] بدن
[illegible] جھلک
ایک آدھ [illegible] بدن

(۲۹)
یہ شعلہ حسن جیسے بجتا ہوا ستار
ہم خط بدن کی لو میں [illegible] جھنکار
رنگین [illegible] ہیں جبین
[illegible] کی بہار

(۳۰)
[illegible] سکوت
[illegible] سکوت
[illegible]
[illegible] سکوت

(۳۱)
[illegible] نظر [illegible] کی کرن
[illegible]
[illegible] سرخ جھلملاتا [illegible]
[illegible] گیسوؤں کا چھایا ہوا بن

(۳۲)
پھولوں کی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

افسانہ

# ایک خواب

مصنفہ: جبران خلیل جبران

مترجمہ: حبیب اشعر دہلوی

"دائی کاؤنٹس (س۔ ل) کے نام، اس مکرمت نامہ کے جواب میں جس سے انھوں نے مجھے سرفراز فرمایا۔"

جوانی میرے سامنے سے گذری اور میں اس کے پیچھے پیچھے ہولیا ــــ دور ایک کھیت میں پہنچکر وہ کھڑی ہوگئی اور بادلوں اور درختوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی ــــ ان بادلوں کو جو خط شفق پر اس طرح رواں تھے گویا سفید بھیڑوں کا گلہ ریوڑ ہے۔ اور ان درختوں کو، جو اپنی ننگی، بوچی شاخوں سے بلندی کی طرف اس طرح اشارہ کر رہے تھے گویا آسمان سے اپنے سرسبز پتوں کو واپس مانگ رہے ہیں۔

آخر میں نے پوچھا:۔ "جوانی! اسوقت ہم کہاں ہیں؟"

اس نے جواب دیا:۔ "ہوشیار! کہ ہم حیرت کے سبزہ زاروں میں ہیں!"

میں نے کہا:۔ "چلو! واپس چلیں!! یہاں کی تنہائی مجھے ڈرا رہی ہے اور ان بادلوں اور درختوں کا نظارہ میرے دل کو تکلیف پہنچا رہا ہے۔"

جواب ملا:۔ "صبر کرو! کہ حیرت، معرفت کا سرچشمہ ہے!!"

میں نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ ایک حور، سائے کی طرح، ہماری طرف آ رہی ہے۔ میں متحیر ہوکر چلّایا:۔ "یہ کون ہے؟"

جوانی نے جواب دیا:۔ "ملپومین! جو جیوپٹر کی بیٹی اور غمگین کہانیوں کی دیوی[۱] ہے!!"

میں نے کہا:۔ "غم و الم کو مجھ سے کیا واسطہ؟ جبکہ اے نشاط افزا جوانی! تو میرے پہلو میں ہے!"

جوانی نے جواباً کہا:۔ "وہ تمہیں دنیا اور اس کے آلام و مصائب دکھلانے آئی ہے اور جو شخص مصیبت و الم کو نہیں دیکھتا، وہ فرحت و سرور سے ناآشنا اور محروم رہتا ہے۔"

حور نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھدیا اور جب ہٹایا، تو میں نے اپنے تئیں جوانی سے الگ اور مادّی لباس سے عاری پایا۔ میں نے اس سے پوچھا:۔ "اے دیوی کی لخت جگر! جوانی کہاں ہے؟"

اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اپنے بازوؤں میں لپیٹ کر ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر اڑا لے گئی۔ وہاں پہنچکر میں نے دیکھا کہ دنیا اور اس کی ہر چیز میرے سامنے صفحہ کی طرح کھلی رکھی ہے اور اس میں رہنے بسنے والوں کے راز تحریر کی طرح میری نگاہ کے سامنے نمایاں ہیں۔ میں سہم کر اس حور کے پہلو میں کھڑا ہوگیا اور انسان کے بھید دل پر غور و فکر اور زندگی کے اسرار و رموز کی تلاش و جستجو کرنے لگا۔ اسوقت جو کچھ میں نے دیکھا، کاش نہ دیکھتا!

ــــ میں نے دیکھا:۔ محبت اور نفرت انسان کے دل سے کھیل رہی ہیں۔ محبت اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کر رہی ہے اور اسے تسلیم و رضا کی شراب سے مدہوش کرکے اسکی زبان کو مدح و ستائش کے لئے کھول رہی ہے اور نفرت اسکی دشمنی کے جذبات کو بھڑکا رہی ہے اور اسے حقیقت کی طرف سے اندھا کرکے اس کے کانوں کو صحیح بات سننے سے روک رہی ہے۔

ــــ میں نے دیکھا:۔ آبادی ایک بھک منگی عورت کی طرح، انسان کے دامن سے چمٹی بیٹھی ہے اور حسین و خوشگوار ویرانی دور کھڑی اسکی قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے۔

میں نے دیکھا:۔ پادری لومڑیوں کی طرح مکر و فریب کے جال بچھا کر لوگوں کو پھانس رہے ہیں اور جھوٹے واعظ اپنی حیلہ کاریوں سے ان کے روحانی میلانات پر چھاپے مار رہے ہیں اور انسان چیخ چیخ کر عقل و حکمت سے مدد مانگ رہا ہے، لیکن عقل و حکمت اس کی ایک نہیں سنتی بلکہ نفرت و غضب کے ساتھ اسے ٹھکرا رہی ہے۔ اس بنا پر کہ جب اس نے کھلے بندوں، ہر بازار، ہر گلی اور ہر کوچہ میں انسان کو پکارا، تو کسی نے اسکی آواز کو در خور اعتنا نہ سمجھا۔

میں نے دیکھا:۔ مذہبی اجارہ دار بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں لیکن ان کے دل حرص و طمع کی قبروں میں مدفون ہیں ــــ

---

[۱]:۔ قدیم یونانیوں کے نزدیک فنون کی ۹ دیویاں (میوز) تھیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے ارادتمند کو اسکی محبت اور اہلیت کے مطابق اپنے عطیوں سے نوازتی تھی ان دیویوں کی تفصیل یہ ہے:۔ (۱) ملپومین:۔ غمگین کہانیوں کی دیوی ــ (۲) یوٹرپیا:۔ شعر و غنا کی دیوی ــ (۳) تالیا:۔ ہزلیات کی دیوی ــ (۴) کالیوپ:۔ فصاحت اور رزمیہ شاعری کی دیوی ــ (۵) اراتو:۔ غزل اور عاشقانہ شاعری کی دیوی ــ (۶) ترپسکوری:۔ رقص کی دیوی ــ (۷) اورانیا:۔ علم الفلک کی دیوی ــ (۸) کلیو:۔ تاریخ کی دیوی ــ (۹) اور نزبی فن موسیقی کی دیوی۔

میں نے دیکھا:۔ نوجوان زبانوں سے محبت کے دعوے کر رہے ہیں اور اپنے بے قابو جذبات سے چمٹے ہوئے ہیں لیکن ان کی "الوہیت" ان سے کوسوں دور ہے اور ان کے جذبات، محض خواب —— میں نے دیکھا:۔ خدا وندانِ قانون مکر و فریب کے بازار میں اپنی چرب زبانی سے باقاعدہ تجارت کر رہے ہیں اور طبیب یا دہ لوح معتقدین کی روحوں سے کھیل رہے ہیں۔ میں نے دیکھا:۔ جاہل عقلمند کی محبت میں مبتلا ہے اور اپنے ماضی کو عظمت و اقتدار کی بلندیوں پر پہنچا رہا ہے۔ اپنے حال کو بے فکری و فراخ دستی کی مسند کا تکیہ بنا رہا ہے اور اپنے مستقبل کے لئے شان و شوکت کا فرش بچھا رہا ہے۔ —— میں نے دیکھا:۔ مفلس و فاقہ کش بو رہے ہیں اور طاقتور دولت مند انکی محنتوں سے مزے اڑا رہے ہیں اور اس ظلم کا نام لوگوں نے قانون رکھا ہے —— میں نے دیکھا: تاریکی میں چوری کرنے والے عقل کے خزانوں کو لوٹ رہے ہیں اور روشنی کے چوکیدار سستی اور کاہلی کی چادر میں لپٹے پڑے سو رہے ہیں —— میں نے دیکھا:۔ عورت ایک رباب کی طرح اس مرد کے ہاتھ میں ہے، جو نہیں جانتا کہ تار پر مضراب کس طرح رکھی جاتی ہے، اسلئے جو نغمے اس سے نکلتے ہیں، ناپسندیدہ، ورناگوار ہوتے ہیں —— میں نے دیکھا:۔ نام نہاد شریفوں کی فوج نے موروثی شرافت کے شہر کا محاصرہ کر رکھا ہے اور اصل نسل شریف زادہ اپنی اقلیت و ناانصافی کی بنا پر ان کے مقابلہ میں پسپا ہو رہا ہے۔ —— میں نے دیکھا:۔ حقیقی آزادی تنہا بازاروں میں ماری ماری پھر رہی ہے وہ ہر دروازہ پر جا کر سر چھپانے کی جگہ چاہتی ہے لیکن لوگ اسے دھتکار دیتے ہیں۔ اسکے برخلاف رذالت دکھینگی ایک عظیم الشان جلوس کی شکل میں رواں ہے اور لوگ اسے "آزادی" کہہ رہے ہیں —— میں نے دیکھا:۔ مذہب کتاب کی تہوں میں دفن ہے اور وہم نے اس کی جگہ لے رکھی ہے —— میں نے دیکھا:۔ انسان نے بزدلی کو صبر کا لباس پہنا رکھا ہے۔ کاہلی کو استقلال کا لقب دے رکھا ہے اور خوف کو مہربانی کے نام سے موسوم کر رکھا ہے —— میں نے دیکھا:۔ تہذیب و شائستگی کے دسترخوان پر طفیلئے قبضہ کئے بیٹھے ہیں اور حقیقی مہمان خاموش ہیں —— میں نے دیکھا:۔ مسرف و عیاش کے ہاتھ میں دولت، اسکی بدمعاشیوں کا جال ہے اور بخیل و کنجوس کے ہاتھ میں لوگوں کی بدبختی کا آلہ، لیکن عقلمند کا ہاتھ مال و دولت سے بالکل خالی ہے۔

جب یہ سب کچھ میں نے دیکھ لیا، تو اس منظر کی تاب نہ لاکر، شدتِ الم سے چلا اٹھا: "اے دیوی کی نورِ نظر! کیا یہی دنیا ہے؟ کیا یہی انسان ہے؟"

ایک جراحت کار خاموشی کے ساتھ اس نے جواب دیا:۔ "یہ کانٹوں اور کیڑوں سے پٹی ہوئی روح کی راہ ہے! یہ انسان کا سایہ ہے!! یہ رات ہے، جس کی صبح ہونے والی ہے!!!"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھا اور جب ہٹایا تو میں نے دیکھا کہ میں اور شباب آہستہ آہستہ جا رہے ہیں اور امیدیں ہمارے سامنے ناچ رہی ہیں ✦

# جیون اُلجھن

عبدالمجید بھٹی

چھُن چھُن —— چھُن چھُن
چھُن چھُن —— چھُن چھُن
بن گئی اپنے جیون کی دُھن
پریت کی رانی آئی
من کی اک اک آشا جاگی لے لے کر انگڑائی
پریت کی رانی آئی
آشاؤں کے دیپ جلا کر
اپنی پیاری چھب دکھلا کر
اک تھالی میں پھول سجا کر
اوٹ میں جا مُسکائی
پریت کی رانی آئی
اتنے میں اک من کا راجا آیا مکٹ سجائے
من مندر کے دیپ جلائے پریت کی جوت جگائے
پریت کی رانی بولی راد ھے! چھم چھم کر کے آؤ
ان پھولوں سے مالا گوندھو راجا کو پہناؤ
جیون جوت جگاؤ
چھم سے آگے بڑھ کر جونہی گننے لگی میں پھول
من مندر کے دیپ بجھے جانے کچھ ہو گئی بھول
پریت کی رانی ——
من کے راجا ——
لوٹ کے پھر نہیں آئے۔
اس جیون میں کون اب آ کر من کے دیپ جلائے
جیون، اُلجھن!
اب ہے یہی دُھن
چھُن چھُن —— چھُن چھُن
چھُن چھُن —— چھُن چھُن

# جامعہ ملیہ اسلامیہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ ہر عمر کے ہندوستانی کے لئے تعلیم دینے کا ایک تجربہ ہے۔ یہاں چار برس کے تتلاتے ہوئے بچے سے لے کر اس بڈھے تک کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے، جس کے پوپلے منہ میں

وقار عظیم

ول میں نیکی، دھیان کام کی طرف، اور قدم آگے کو بڑھتے ہوئے۔ یہ سب کچھ کر کے جامعہ کو جامعہ بنایا ہے ـــ اور ایسا بنا لیا ہے کہ اب اس کی گنتی ہندوستان کے، بلکہ دنیا کے اچھے تعلیمی اداروں میں ہے۔

دہلی سے کوئی سات میل جنوب مشرق کی طرف اور سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار سے تین میل آگے جمنا کے کنارے اوکھلا ایک چھوٹی سی بستی ہے ـــ کچے کچے بے حیثیت گھروں اور پرانی دھرانی جھونپڑیوں کی ایک بستی۔ اسی بستی کے سامنے سے سرکار نے ایک نہر نکالی ہے۔ نہر اور جمنا کے آس پاس کچھ سایہ دار درخت لگا کر اور لال بجری بچھا کر کسی خوش مذاق انجینئر نے اس دور افتادہ جگہ کو خاصا خوش منظر بنا دیا ہے۔ اور شہری آبادی سے سات میل دور یہ ویران اور سنسان سی جگہ اب شہر والوں کی سیرگاہ ہے۔ صبح سے شام تک یہاں ہر طرح کے سیلانیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے ـــ امیر، غریب، بڈھے، جوان، ہندی، انگریز، امریکی، غرض ہر وہ شخص جو شہری ہنگاموں سے تھک ہار کر فطرت کی گود میں سکون کے کچھ لمحے گذارنا چاہتا ہے، یہاں آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ ان آنے والوں کو لانے والی موٹریں، بسیں، سائیکلیں، گاڑیاں اور طرح طرح کی سواریاں اوکھلے کی اس سیرگاہ تک پہنچنے سے کوئی چار فرلانگ پہلے ایک ایسے حصے سے گذرتی ہیں جہاں ایک طرف دو بڑی بڑی شاندار عمارتیں ہیں۔ سفید گنبدوں والی باوقار، باعظمت عمارتیں، جو ہر آنے جانے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور ہر گذرتے ہوئے سیلانی کے دل میں کسی عظمت کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ دوسری طرف، اونچی نیچی، ناہموار پتھریلی زمینوں پر کچھ چھوٹے، کچھ بڑے دور دور بکھرے ہوئے، نئی وضع کے تھوڑے سے مکان ہیں ـــ ایسے مکان، جن کی سادگی میں بھی ایک رنگینی اور پرکاری ہے، زندگی سے دوری کے باوجود زندگی کا سارا استقلال اور ساری توانائی ـــ یہ اونچی اونچی باعظمت، باوقار سفید گنبدوں والی شاندار عمارتیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ہیں اور اس کے دوسری طرف جامعہ کے استادوں کے مکان۔ جامعہ کی عمارتوں کو دیکھ کر اس بلند مقصد کی تصویر سامنے آتی ہے جو جامعہ کے سامنے ہے، اور استادوں کے مکان دیکھ کر اس سادگی اور سچائی کی جھلک جس کے بغیر کوئی مقصد، بلند نہیں بنتا، کسی آدرش میں جان نہیں پڑتی۔

جامعہ کی یہ شاہانہ عمارت ہمیشہ سے ایسی نہیں۔ ایسا بننے کے لئے اسے بڑے سخت اور کڑی آزمائشوں کے ۲۵ سالوں میں سے گذرنا پڑا ہے۔ جامعہ والوں نے ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں، ہر طرح کے دکھ جھیلے ہیں، جسمانی ذہنی اور روحانی اذیتیں اٹھائی ہیں۔ کڑی نظروں کے تیروں کا نشانہ بنے ہیں، بُری باتیں سنی ہیں، ملامتیں برداشت کی ہیں ـــ اور ان ساری باتوں کے باوجود نظر کو بلندی کی طرف رکھا ہے، قدموں میں جھجک نہیں آنے دی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں علی گڈھ میں پڑی تھی۔ گنتی کے چند آدمی اس کے ساتھ تھے۔ اور ان تھوڑے سے پڑھنے پڑھانے والوں کے پاس اپنا کام چلانے کے لئے کوئی عمارت نہ تھی اسلئے چھوٹے چھوٹے خیمے ڈیرے ہی ان کے گھر تھے، وہی ان کا دارالاقامہ، اور وہی ان کا مدرسہ۔ اسی سادگی سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد اور طالب علم اپنی اس ابتدائی منزل میں، قومی تعلیم کا کام خلوص اور سچائی سے انجام دیتے رہے۔ لیکن غلط فہمیوں نے علی گڈھ کی فضا کو کبھی جامعہ کے مقصد کے لئے سازگار نہ ہونے دیا، اور اس لئے ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں جامعہ کو دہلی لے آئے۔ دہلی میں قرولباغ کی کچھ عمارتیں کرائے پر لی گئیں اور جامعہ کا کام اسی خلوص، اور نیک نیتی سے چلنے لگا، جس سے وہ شروع ہوا تھا۔ جامعہ کو اس منزل میں قدم قدم پر کسی رہبر کامل کی ضرورت تھی۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کو اس سے بڑے بڑے اور بہت سے کام بھی تھے، اس لئے انتہائی ایثار اور خلوص کے باوجود وہ اپنا سارا وقت جامعہ کو نہیں دے سکتے تھے۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں یورپ سے واپس آئے اور جامعہ کا کام ان کے ہاتھوں میں آگیا، اور اسطرح جامعہ کو وہ رہبر کامل مل گیا جسکی اسے ضرورت تھی۔ جامعہ نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے آنے کے بعد کس کس طرح ترقی کی طرف قدم بڑھائے، اس کے راستے میں کیسے روڑے اٹکے۔ کیا کیا رکاوٹیں پیدا ہوئیں، شک، شبے بدگمانیاں، بڑے سے بڑے الزام اور بڑی سے بڑی باتیں، لیکن ان سب کی کہانی بڑی لمبی ہے، اور کچھ ایسی خوشگوار بھی نہیں ـــ جو بڑی باتیں خود اندھیرے میں جا چکی ہیں انھیں اجالے میں لا کر دوسروں کو دکھانے میں، فائدہ کسی کا بھی نہیں، نقصان بہتوں کا ہے۔ اسلئے گذری ہوئی باتوں کو چھوڑ کر صرف یہ دیکھیے کہ جامعہ اب کیا ہے۔ اس پچیس سال کے تجربہ کے بعد اس نے ملک اور قوم کو کیا دیا ہے ـــ اور جو کچھ دیا ہے اس میں کیا اچھا ہے، کتنا کام کا ہے

زبان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بالکل چھوٹی عمر کے بچوں کے لئے جامعہ کی طرف سے دو ابتدائی مدرسے ہیں ——— ایک قرول باغ میں اور دوسرا جامعہ نگر میں (اوکھلے کا وہ حصہ جہاں جامعہ کی بستی ہے، جامعہ نگر کہلاتا ہے) قرول باغ میں شہر کے ہر حصے کے بچے ——— لڑکے اور لڑکیاں دونوں ——— پڑھنے آتے ہیں۔ جو قریب ہیں وہ پیدل اور جو دور ہیں وہ جامعہ کی لاری پر۔ یہ ابتدائی مدرسہ ساتویں جماعت تک ہے۔ اسی طرح کا دوسرا مدرسہ جامعہ نگر میں ہے لیکن وہ اقامتی ہے۔ وہاں پڑھنے والے بچے رہتے بھی وہیں ہیں۔ پڑھائی دونوں مدرسوں میں ایک ہی طریقہ کے مطابق ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جامعہ نگر میں پڑھنے والے بچے چونکہ دن رات وہیں رہتے ہیں اس لئے ان کا پروگرام شہر والے بچوں کے مقابلہ میں زیادہ مکمل ہے۔ اگر آپ کبھی جامعہ نگر کے ابتدائی مدرسے میں جا کر رہیں تو آپ کو وہاں کا پروگرام کچھ اس طرح کا دکھائی دے گا۔ سورج نکلنے سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے چھوٹے چھوٹے بچے ایک ایک کرکے اٹھیں گے۔ اللہ رسول کا نام لے کر، اپنے بستروں کو صاف کریں گے۔ پھر ضروریات سے فارغ ہوکر وضو اور نماز۔ نماز کے بعد، اگر سردی ہے تو میدان میں کسرت اور گرمی ہے تو دریا میں تیراکی۔ اس کے بعد یہ بچے بورڈنگ واپس آتے ہیں، ناشتہ کا وقت آیا، ناشتہ کیا۔ اپنی جگہ پر آئے کتابیں درست کیں اور مدرسہ کی طرف چلنے لگے۔ جانے سے پہلے انہیں کے چنے ہوئے مانیٹروں نے ان کا معائنہ کیا اور ان سے بازپرس کی ——— دانت کیوں میلے ہیں؟ بالوں میں تیل کیوں نہیں ڈالا؟ بٹن کیوں کھلا ہوا ہے؟ ٹوپی کہاں ہے؟ بازپرس کے بعد اصلاح اور اس کے بعد اسکول۔ پڑھائی شروع ہونے سے پہلے سب بچے میدان میں اکٹھے ہوئے، سب نے مل کر ترانہ پڑھا ——— لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری، خبریں سنیں اور اپنی اپنی جماعتوں میں چلے گئے۔

ان بچوں کی جماعتوں کا کام بھی دوسرے مدرسوں سے ذرا مختلف ہے۔ یہاں بھی دوسرے مدرسوں کی طرح زبان پڑھائی جاتی ہے، حساب سکھایا جاتا ہے، حرفہ اور جنرل سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن ان میں سے ہر چیز کی بنیاد کسی پروجکٹ پر ہے ——— مثلاً بچوں کا بینک، بچوں کی دوکان دو مستقل چیزیں ہیں۔ بچے بینک کا سارا کام خود کرتے ہیں، لکھا پڑھی خط و کتابت، حساب کتاب، رجسٹر، کھاتے، چک بکیں۔ اس ننھے منے بینک میں سب کچھ وہی ہے جو ہمارے آپ کے بینک میں۔ اور اسی ننھے منے بینک کے کام سے بچہ سب کچھ سیکھتا ہے۔ زبان بھی، حساب بھی، حرفہ بھی۔ یہی حال دوکان کا ہے۔ پھر اس کے علاوہ بعض عارضی پروجکٹ بھی ہوتے رہتے ہیں اور انھیں بچے اپنا کام سمجھ کر کرتے ہیں اور اپنے اس کام کو کرکے وہ سب کچھ سیکھتے ہیں جو تعلیم سکھانا چاہتی ہے۔ جامعہ کی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم نہیں۔ صرف ذہن کی تربیت نہیں ——— وہ انسان کو انسان بننا سکھاتی ہے۔ انسان کو دنیا میں رہنا ہے۔ دنیا والوں کے ساتھ رہنا ہے اور اپنی آزادی اور دوسرے کے حق کو باقی رکھ کر رہنا ہے۔ انسان کی انفرادی زندگی، اجتماعی زندگی کا ایک حصہ ہے اور اس لئے ہر فرد کی اپنی ذمہ داری ہے، اپنا کام ہے۔ اس میں کوتاہی کا نتیجہ اجتماعی زندگی پر پڑتا ہے۔ جامعہ کے بچے اپنی جماعتوں سے نکل کر اس طرح کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہاسٹل کی زندگی میں وہ اپنے سارے کام خود کرتے ہیں خود اپنے لیڈر چنتے ہیں اور ان کے کہے پر چلتے ہیں۔ اپنا کام خود کرتے ہیں دوسرے کو اس کے کام میں مدد دیتے ہیں۔ کھانے کے وقت بزم ادب کے جلسوں میں، کتب خانوں کے انتظام میں، اپنے روزانہ اخبار کی ترتیب میں، اپنی پنچایت میں جامعہ کے یہ چھوٹے چھوٹے بچے، جس سلیقہ جس سوجھ بوجھ اور جس ذمہ داری اور انہماک سے کام لیتے ہیں اسے دیکھ کر ایک بے حد حسین اور جمیل مستقبل کی تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے ——— خدا نظر بد سے بچائے۔

جامعہ کے یہ چھوٹے بچے سال بھر ایک خاص طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس زندگی میں انہیں جو مختلف طرح کے کام کرنے ہوتے ہیں ان میں ان کے لئے ایک ابدی سرور اور مسرت ہے ——— لیکن شہر سے اتنا دور رکھ کر کیا انھیں زندگی سے دور رہنا نہیں سکھایا جاتا؟ جامعہ والوں کے پاس اس کا بھی جواب ہے۔ انھوں نے جامعہ کی زندگی کو شہری زندگی کی ہلچل سے دور نہیں ہونے دیا۔ بچوں میں یہ احساس پیدا ہی نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں سے الگ کچھ ہیں۔ ہر سال یہاں محمد علی ٹرافی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ کھیل، کود، اسکاؤٹنگ، کیمپنگ، تقریر، تحریر، لطیفہ گوئی، ہنسی مذاق، ہر چیز کا مقابلہ کرنے کے لئے دور دور کے مدرسوں کے سیکڑوں بچے ہر سال جامعہ آتے ہیں۔ کئی دن وہاں رہتے ہیں۔ ہر طرح کے مقابلوں میں شریک ہوتے ہیں، ہارتے ہیں، جیتتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور جامعہ کے بچوں کے دل میں یہ احساس چھوڑ جاتے ہیں کہ زندگی ان کی اپنی زندگی سے باہر بھی دور تک پھیلی ہوئی ہے اور اس میں ہار جیت بھی ہے، خدمت گزاری بھی ہے، ایثار اور قربانی بھی اور فرض شناسی بھی۔

پھر جامعہ میں ہر سال بچوں کا میلہ ہوتا ہے۔ اس میلے کی بچے بہت دن پہلے سے تیاری کرتے ہیں۔ دکانیں لگاتے ہیں، اپنی بنائی ہوئی چیزوں کی نمائش کرتے ہیں۔ ڈرامہ کرتے ہیں اور یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے ان کے بڑے بوڑھے دور دور سے آتے ہیں اور اس طرح جامعہ کی تعلیم میں یہ احساس جاری و ساری رہتا ہے کہ مدرسہ، سوسائٹی سے الگ کوئی چیز

نہیں — وہ اس سے الگ ہو کر کچھ بن ہی نہیں سکتا۔

---

اس خیال کو جامعہ نے کئی اور مختلف طریقوں سے بھی عملی جامہ پہنایا ہے اور اس سلسلے میں بے حد مفید کام کئے ہیں — مثلاً جامعہ کے قرول باغ والے بچوں کے مدرسے میں ایک حلقہ قائم ہوا ہے شام کو قرول باغ کی بستی کے ہندو، مسلمان، سکھ — وہ سارے لوگ جو دن بھر کا کام کرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو زندگی سے ہم آہنگ رکھنا چاہتے ہیں، یہاں آکر جمع ہوتے ہیں باتیں کرتے ہیں، اخبار پڑھتے ہیں، شعر و ادب پر، سیاست و معاشرت پر دوستانہ بحثیں کرتے ہیں۔ کھیل کود اور علم کے ہلکے پھلکے مشغلوں کے مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح زندگی کو محض ایک کاروباری یا کھوکھلا سمجھنے کے بجائے وہ اس میں لذت محسوس کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں، اس کے تنوع میں انہیں رنگینی اور معنویت دکھائی دیتی ہے۔

---

جامعہ کی تعلیم کا دوسرا حصہ مدرسہ ثانوی ہے۔ یہاں بھی تعلیم کے بنیادی اصول وہی ہیں جو مدرسہ ابتدائی میں۔ ابتدائی مدرسہ میں شہریت اور قومیت اور ان دونوں کی ذمہ داریوں کا جو احساس ایک ہلکے پھلکے انداز میں غیر محسوس طریقہ پر پیدا ہوتا ہے، اسکا انداز مدرسہ ثانوی میں آکر زیادہ واضح اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ مدرسے کے مضامین کی تعلیم کے سلسلے میں یہاں بھی دکان، بزم ادب، اسکا رسالہ، اخبار، یہ ساری چیزیں اور ان سے پیدا ہونے والے مختلف پروجکٹ درسی مضامین کی تعلیم کی بنیاد بنتے ہیں اور اپنی درسی تعلیم میں بھی طالب علم زندگی کے عملی پہلو کی طرف مائل اور اس کے احساس اور شعور سے پُر نظر آتے ہیں — مثلاً جب وہ سائنس کی کلاس میں جاتے ہیں تو اپنے کتابی سبق کے علاوہ، روزانہ کی ضرورتوں کی بہت سی اچھی اچھی چیزیں بناتے ہیں — مچھر مار تیل، کریم، منجن روشنائی، جام، جیلی اور مزے مزے کی چٹنیاں۔ اپنی اقامتی زندگی میں اور اس کے باہر جامعہ کی عام زندگی میں ہندوستان کے یہ آئندہ ہونے والے شہری عملی حیثیت سے اپنے آپ میں شہریت کا احساس پیدا کرتے ہیں اور شہری زندگی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے سروں پر اٹھاتے ہیں — جامعہ کے انہیں بچوں نے آس پاس کی پتھریلی کنکریلی زمین کو کھود کر اسے ہموار کیا، اور جہاں سے چوپایوں کا گذرنا بھی آسان نہ تھا، وہاں سے اب موٹریں گذر سکتی ہیں۔ یہی بچے باری باری رات کو جامعہ کی آبادی کے گرد گشت کرتے اور پہرہ دیتے ہیں، اور یہی بچے ہر سال [illegible] کی [illegible] سیلابیوں کو موت کے منہ سے نکال [illegible] اور اس طرح زندگی کی کشمکش میں داخل ہونے سے پہلے زندگی کا وہ بلند منصب ان کے ذہنوں میں رچ بس جاتا ہے

جس میں انسان دوسروں کی خدمت کو اپنا سب سے بڑا کام سمجھتا ہے — اپنے فرض کا احساس، دوسرے کے حق کی نگہبانی اور خدمت سے انسان کی زندگی کو بہتر بنانے کا کبھی نہ تھکنے والا جذبہ۔

---

جامعہ میں اس ثانوی مدرسہ کے بعد کالج ہے — یونیورسٹیوں کے عام کالجوں سے بالکل مختلف۔ یہاں طالب علموں کو انگریزی، اردو، تاریخ، سیاسیات، اور معاشیات سب کچھ پڑھنی پڑتی ہے اور ان کے ذہنوں میں پختگی ان کی فکر میں صفائی اور توانائی، اور ان کی زبان اور قلم میں اظہار کا جوش اور ٹھیراؤ پیدا ہوتا ہے اور یہاں پڑھنے والے زندگی کو مصیبت نہیں، راحت سمجھ کر نکلتے ہیں۔ زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنا، اور اسے قدم قدم پر زیر کرنا ان کی سیرت میں داخل ہے۔

---

جامعہ کی ابتدائی تعلیم کا نہج بنیادی تعلیم کے اصولوں پر ہے۔ اسی اصول کے ماتحت اوکھلے کے گاؤں میں بچوں کا ایک مدرسہ کھولا گیا ہے اور اس سے ذرا فاصلہ پر ٹریننگ اسکول ہے، جہاں بنیادی مدرسوں میں پڑھانے والے استادوں کو عملی اور نظری تعلیم دی جاتی ہے۔

---

جامعہ نے اپنا کام چار برس کی عمر کے بچوں سے شروع کیا، اور انسانی زندگی کی ہر منزل کو نظر میں رکھ کر ہر عمر کے لوگوں کی تربیت اور اصلاح کو اپنا مقصد بنایا۔ قرول باغ میں جامعہ نے تعلیم بالغان کا شعبہ قائم رکھا ہے تعلیم بالغان کے شعبہ نے اپنے کام کے دو حلقے کئے ہیں۔ ان میں سے ایک سے ایک مخصوص علاقہ کے باشندوں کو فائدہ ہوتا ہے اور دوسرے کا اثر اس علاقہ سے باہر بھی دور دور پڑتا ہے۔ تعلیم بالغان والے ایک خاص علاقہ میں اپنا کام اس طرح شروع کرتے ہیں کہ پہلے اس علاقہ کی پوری مردم شماری کی۔ اور یہ دیکھا کہ ہر گھر میں کتنے مرد، کتنی عورتیں ہیں، ان کی تعلیمی حالت کیسی ہے۔ اس جائزہ کے بعد اپنا کام شروع کیا۔ علاقہ میں ایک مرکز قائم کیا۔ اس مرکز میں ایک ریڈیو ہے، کچھ اخبار آتے ہیں۔ جو لوگ اخبار نہیں پڑھ سکتے ان کے لئے سرخیوں اور تصویروں سے ملا جلا کر ایک وال پیپر تیار کیا جاتا ہے۔ خبروں کا مطلب سمجھایا جاتا ہے۔ نقشے دکھائے جاتے ہیں۔ پھر ان آنے والوں میں سے جسکا جی چاہے اسے پڑھایا جاتا ہے۔ عورتوں کو گھروں پر کتابیں پہنچائی جاتی ہیں — اور اس طرح اس علاقہ کی عام فضا میں علم کا شوق، زندگی کو جاننے اور اس سے قریب آنے کی خواہش فطری بن جاتی ہے۔ اس خواہش اور شوق کو پورا کرنے کے لئے جامعہ نے تین سو چھوٹے چھوٹے رسالے تیار کرنے کی

اسکیم بنائی ہے — ان رسالوں میں قصے کہانیاں، اچھی اچھی کتابوں کے خلاصے دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں ہر طرح کے اخلاقی، اصلاحی، مذہبی معاشرتی، تاریخی، سیاسی مسائل، زندگی کی بہت سی اور چھوٹی بڑی باتیں — غرض وہ سب کچھ ہے، جس سے علم کی بھوک تیز ہوتی ہے اور پھر اس بھوک کی تسکین کی خواہش، پھر بھوک، اور پھر اس کی تسکین کی خواہش کا شدید جذبہ — یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اسطرح کے سو سے زیادہ رسالے جامعہ نے تیار بھی کئے ہیں۔ اگر ہندوستان کا ہر چھوٹا بڑا ان رسالوں کو پڑھ سکے تو اسکی ذہنی تربیت کے لئے ہماری سیاست کو پھر کسی کاوش کی ضرورت نہیں۔

---

اس سے اگلی منزل وہ ہے جب انسان صرف اچھے علم کا شیدائی بنجاتا ہے۔ اچھے اچھے مصنفوں کی، اچھی اچھی کتابیں پڑھنا چاہتا ہے۔ اس کام کے لئے جامعہ میں 'مکتبہ جامعہ' ہے — ایک ایسا ادارہ جس نے اردو کے ناشروں کو پبلشنگ کی وہ ساری روایات دیں، جن پر چل کر اب یہ ناشر اردو ادب کو حسن و جمال کا مرقع بنا رہے ہیں۔

---

جامعہ نے یہ سارا کام پچیس سال میں کیا ہے — بڑی بڑی مصیبتیں جھیل کر، دوسروں کی پابندیوں سے بچکر کہ اس طرح کہیں اس کے بلند مقصد میں فرق نہ آجائے — وہ بلند مقصد اب بھی جامعہ کے سامنے ہے اب بھی اسکا قدم آگے کی طرف بڑھ رہا ہے، اس کے سامنے بعض ایسی اسکیمیں ہیں جن پر جلد ہی عمل شروع ہونے والا ہے — لڑکیوں کا ایک مدرسہ، ایک پالی ٹکنیک، ایک بچوں کا اسپتال، جامعہ نے ہمیشہ نئی راہوں کی جستجو کی ہے، ایسی راہیں جن پر چل کر زندگی پہلے سے بہتر بن سکے، انسان کو ایک ابدی سکون اور مسرت مل سکے — وہ علم اور خدمت کو اپنے لئے سب کچھ سمجھے۔ جامعہ نے ۲۵ سال کی مختصر مدت میں ہندوستانی آبادی کے ایک حصے کو روشنی دی ہے، اسے بیدار کیا ہے اور اب بھی اس کے ہر گوشے سے یہ آواز آرہی ہے — "جاگو اور جگاؤ" جامعہ نے خود جاگنے اور دوسروں کو جگانے کے جس جذبہ کی مشعل جلائی ہے، جی چاہتا ہے کہ وہ ہندوستان کے چپہ چپہ میں عام ہو جائے۔

# اُردو - ایک ترقی پسند زبان

مسعود حسین

ترقی پسندی کی اصطلاح ادب کے ساتھ کچھ اس طرح نا تھی ہو گئی ہے کہ اسے علم کے کسی دوسرے شعبہ میں استعمال کرتے وقت تامل ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسندی کی اصطلاح کا جتنا صحیح اطلاق زبان کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے دھارے پر ہو سکتا ہے ادب پر نہیں ہوتا۔ ادب پھر بھی فن ہے۔ وہ اجتماعی زندگی کی اتنی بڑی لہر نہیں جتنی کہ زبان!

زبان سماجی پیداوار ہونے کی حیثیت سے آگے بڑھتی اور پیچھے ہٹتی رہتی ہے۔ لیکن مجموعی لحاظ سے تاریخ انسان اور تاریخ زبان دونوں کا ڈھنگ ایک ہے۔ زبان کی ترقی پسندی میں وہ تمام فنی حرکات شامل ہیں جن سے زندگی کا آہنگ تیار ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک بڑھتی ہوئی لہر ہے جو اٹکتی ٹھٹھکتی آگے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ہندوستان کی آریائی زبان کی تاریخ میں "دریا ہی کا سا پھیر" ہے۔ اس دریا کے بہاؤ پر بند بھی باندھے گئے، اس کے رخ پھیرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن تاریخ اور زبان کا بہاؤ کسی کے بس کا نہیں ہوتا۔ یہ ارتقا کے چند کڑے اصولوں کے ماتحت ہوتا ہے جس میں ادب کے برعکس انفرادیت کا بالکل دخل نہیں۔

موجودہ زمانے میں ہند آریائی زبان کی سب سے نکھری ہوئی شکل اردو ہے، جس کی ابتدا کے متعلق اب تک کئی دلچسپ نظریے پیش کئے جا چکے ہیں۔ یہ نظریے دلچسپ زیادہ ہیں اور نظریے کم۔ اردو کو کبھی تو شاہ جہاں کے اقبال سے منسوب کیا گیا ہے (سرسید) اور کبھی اکبر کے عہد سے (میرامن)۔ پروفیسر شیرانی نے اس بنا پر کہ فتح دہلی سے قبل مسلمان ڈیڑھ دو سو برس تک پنجاب میں قیام کر چکے تھے اسی سرزمین کو اردو کی جنم بھومی بتایا ہے۔ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی اسے کھینچ کر محمد بن قاسم کی فتح سندھ تک لے جاتے ہیں۔ لیکن ہند آریائی زبان کی تاریخ جاننے والا اس زبان کے تسلسل کی نشان دہی آریوں کے داخلۂ ہند (۱۵۰۰ ق-م) سے کرے گا۔ یہ زبان اس وقت بھی ہندوستان میں موجود تھی۔ البتہ نام اور روپ رنگ مختلف تھے۔ اسلئے اردو زبان کا جنم مسلمانوں کے ہاتھوں نہیں ہوا بلکہ یہ کسی نہ کسی شکل میں قدیم زمانے سے جمنا کی وادی میں رائج تھی۔ جمنا کے نیلے دھارے کی طرح ہماری زبان کا دھارا بھی قدیم زمانے سے اس سرزمین میں بہہ رہا ہے جس کی ہر عہد اور زمانے میں سب سے بڑی خصوصیت یہی رہی ہے کہ اس نے ہر قسم کے ترقی پسند اثرات کو قبول کیا ہے۔ اسکو بارہا ادبی شکل میں روکنے اور جامد کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن ہمیشہ ناکامی ہوئی۔ انہیں ناکام کوششوں کو ہم منفی لسانی تحریکوں کا نام دے سکتے ہیں۔

اس قسم کی پہلی تحریک ۶۰۰ ق-م کے لگ بھگ ہوئی جب کہ اس کی ارتقائی شکل کو سنسکرت کی صورت میں مسخ کیا گیا۔ ایک ہزار برس کے (۱۵۰۰ ق-م تا ۵۰۰ ق م-) عرصے میں آریہ پشاور سے لیکر بنگال اور دکن تک پھیل چکے تھے اور غیر آریوں کے میل جول کی بنا پر عوام میں نئی نئی زبانیں پراکرتوں کی شکل میں پھوٹ نکلی تھیں۔ انہیں پراکرتوں کے چلن اور رواج سے خائف ہو کر پنڈتوں اور برہمنوں نے آریائی زبان کی روح کو زندہ رکھنے کے لئے زبان کو سنسکرت (صاف) کیا اور بعد کو یہی زبان کا نام قرار پایا۔ یہ حقیقت ہے کہ باوجودیکہ سنسکرت زبان کو "بھاشا" (بولی جانے والی زبان) کہا گیا ہے یہ کبھی بھی بول چال کی زبان نہیں رہی ہے۔ بدھ اور جین مت کے بانیوں نے اسی لئے عوام کی پراکرتوں کو اپنا کر انہیں ادبی مرتبہ بخشا۔ علمی اور ادبی حیثیت سے گو سنسکرت مسلمانوں کے عہد تک استعمال میں لائی جاتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہند آریائی زبان کا ایک مردہ بچہ تھا جو اس کے بطن سے پیدا ہوا۔

مسلمانوں کے داخلۂ ہند کے وقت ہماری زبان زندگی کے پچیس سو زینے چڑھ چکی تھی۔ اس ڈھائی ہزار برس میں اسے ہر قسم کی منفی تحریکوں کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن وہ تمام رکاوٹوں کو ہموار کرتی ہوئی اپنے فطری میلانات کے مطابق ترقی کرتی رہی حتیٰ کہ گیارہویں صدی میں مسلمان ایک نئی زبان اور نئے تمدن کو لئے سیلاب کی شکل میں ہندوستان کے اندر داخل ہوئے۔ اس بڑے الٹ پھیر سے زندگی اور زبان کا ایک نیا آہنگ تیار ہوا جس نے سلاطین مغلیہ کے عہد میں ایک مفید شکل بھی اختیار کر لی۔ دہلی کے آس پاس کی سانولی سلونی ایک نئے رنگ روپ میں سامنے آئی اور تھوڑے ہی عرصے میں رانی بن کر سارے ہندوستان پر راج کرنے لگی۔ اس کے بنتے ہی تمام رجعت پسندانہ لسانی رجحانات کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمان چونکہ سنسکرت سے ناواقف تھے اسلئے اس کا طلسم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ مختلف صوبائی بولیاں

موقعہ پا کر چمک اٹھیں جنکی سرپرستی وہاں کے مسلمان حاکموں نے قبول کی۔ بنگالی زبان کا ارتقا مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی ہی میں ہوا۔ سیاسی مرکز سے تعلق رکھنے کی وجہ سے خسرو کی زبان دہلوی نے گجرات، دکن اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ادبی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ البتہ خود دہلی میں فارسیت کے غلبہ کی وجہ اسے ادبی حیثیت اختیار کرنے اور فارسی کی جگہ لینے میں چند سو سال کی دیر لگی۔ فارسی کا یہ چرچا جو سلاطین دہلی کے زیر سرپرستی شمالی ہند میں ہوا دوسری منفی لسانی تحریک تھی جس نے اردو کے ارتقا کو نقصان پہونچایا۔

دکن اور گجرات کے اجنبی ماحول میں اس کے برعکس یہ زبان خوب پھلی پھولی۔ دکنی زبان کی شکل میں شاید اس نے ترقی پسندی کا سب سے اونچا زینہ چھو لیا تھا۔ اگر قدیم دکنی کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں حسب ذیل ترقی پسند رجحانات ملیں گے جو شمالی ہند میں آکر رفتہ رفتہ زائل ہو جاتے ہیں۔

(۱) ہندوستان کی بنیادی زبان (دہلی کے آس پاس کی بولی) کے الفاظ کی کثرت (موجودہ اردو سے تقریباً بیس فی صدی زیادہ)

(۲) عربی فارسی الفاظ کو اپنی صوتیات پر ڈھال لینا (مثلاً نفع کی بجائے نفا وغیرہ)

(۳) اردو کی قواعد کو فارسی عربی کی قواعد پر ترجیح دیتے ہوئے ان زبانوں کے الفاظ اس پر ڈھالنا۔ اس میں اسماء اور افعال دونوں بکثرت مل جاتے ہیں۔

لیکن زبان کا یہ ڈول اور کینڈا عرصے تک نہ رہ پایا۔ دہلی والوں نے دکنی اور اس کے ادب کو "ایک بحر سی بات" سمجھا۔ چنانچہ دلی کے فوراً بعد ہی دہلی میں دکنی زبان کے خلاف سخت قسم کا رد عمل ہوتا ہے۔ اسے پہلی تحریک اصلاح زبان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاں تک متروکات کا تعلق ہے یہ ضرور ایک "مثبت لسانی تحریک" کی حیثیت رکھتی تھی۔ دکنی زبان جنوبی ہند کی زبانوں کے اجنبی ماحول میں جا کر کسی حد تک جامد ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس فارسی اور برج بھاشا کے باوجود دہلی کے بازاروں میں یہ تیزی سے ترقی کے مدارج طے کر رہی تھی۔ یہاں کے آس پاس کی بولی سے گہرا رشتہ ہونے کی وجہ سے اردو زبان کو ہر لحظہ نیا خون بھی پہونچتا رہتا تھا۔ لیکن اس تحریکِ اصلاح زبان نے اردو کو کسی حد تک نقصان بھی پہونچایا۔ ترک و اختیار دونوں میں غلو برتا گیا اور ایک طرف اگر فارسی کو بے جا طور پر جگہ دی گئی تو دوسری طرف ہندی کے اکثر الفاظ کو بلا وجہ نکال باہر کیا گیا۔ اس تحریک کا ایک پہلو یقیناً اردو کی ترقی میں ممد ثابت ہوا۔ سنسکرت کے اکثر تت سم (خالص) الفاظ جو خام مواد کی شکل قدیم زمانے میں دکن چلے گئے اور وہاں رائج تھے خارج ہو گئے اس میں سے بیشتر وہ تھے جنکی ارتقائی شکل شمالی ہند میں بدل چکی تھی۔

اردو کے ترقی پسند میلانات کو سب سے بڑی ٹھیس لکھنؤ اور وہاں کی تحریک اصلاح زبان نے پہونچائی جسطرح دکن والوں کی صدہا سال کی کوششوں کو دلی والوں نے تباہ کر دیا تھا، دہلوی زبان کے رنگ روپ کو لکھنوی لسانی اثرات نے کسی حد تک مسخ کر دیا۔ ناسخ کی تحریک اصلاح زبان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل عناصر نظر آئیں گے:۔

(۱) دہلوی زبان کے "ٹھیٹھ" روپ سے انحراف۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ لکھنؤ اودھی (پوربی) زبان کے علاقے میں ہے۔ دہلی کے آس پاس کی بولی لکھنؤ کی اس اودھی بولی سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اودھی نے جن پراکرت کے بطن سے جنم لیا ہے وہ دہلی اور مغربی یوپی کی شورسینی پراکرت سے مختلف تھی۔ زبان کا صحیح خمیر اٹھانے میں لکھنؤ والوں کو کسی حد تک انہیں دقتوں کا سامنا تھا جو ملا وجہی اور قلی قطب شاہ کو دکن میں درپیش آئی تھیں یہی وجہ ہے کہ شہر لکھنؤ کی زبان مضافات لکھنؤ کی زبان پر پوری طرح کبھی بھی حاوی نہ ہو سکی، اور نہ اودھی زبان اس کی رگوں میں تازہ خون پہونچا سکی۔ لکھنؤ کا روزمرہ اور محاورہ اسی لئے عرصے تک جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کا منہ تکتا رہا۔ ناسخ کے زمانے میں جا کر کہیں اہل لکھنؤ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور انہوں نے بعض الفاظ کو متروک قرار دیا۔ ان متروک الفاظ کی فہرست اٹھا کر دیکھئے معلوم ہو جائیگا کہ دہلی والے عوام سے قریب تر ہیں یا اہلِ لکھنؤ۔

(۲) لیکن لکھنؤ والوں کا ناقابل معافی جرم یہ تھا کہ انہوں نے فصاحت اور بلاغت کے نام پر اردو کو فارسی الفاظ اور تراکیب سے گراں بار کیا۔ دہلی کے ترقی پسند لسانی رجحانات نے غالب کا گلا گھونٹ دیا اور انہیں اپنی روش ترک کرنا پڑی۔ لیکن لکھنؤ نے زبان پر اپنا ٹھپہ اس طرح لگایا کہ وہ خالص شہری اور درباری زبان بن کر رہ گئی۔

لیکن اس عہد کی سب سے بڑی منفی لسانی تحریک جدید ہندی ہے جس کی داغ بیل انگریزوں کی حکمت عملی نے فورٹ ولیم کالج میں ڈالی تھی۔ جدید ہندی کی عمر کا اندازہ اس طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ اسکا پہلا بڑا شاعر تا حال بقید حیات ہے۔ للو لال جی اور فورٹ ولیم کے دوسرے پنڈتوں کو واضح طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ہندوؤں کے لئے ایک ایسی زبان تیار کریں جو ان تمام لسانی روایات کی حامل ہو جو انہیں عزیز ہیں۔ اس کے لئے ترکیب یہ نکالی گئی کہ عربی فارسی الفاظ نکال کر اردو کا جو ڈھانچہ باقی رہ جاتا تھا اس میں سنسکرت کے لفظ بٹھا دیئے گئے۔ سنسکرت کے

ایجاد کی یہ تحریک ہمیں یاد رکھنا چاہیئے، بنگال کی سرزمین سے اٹھی تھی جہاں کی زبان پہلے ہی سے سنسکرت آمیز تھی۔ جدید ہندی کی تشکیل میں تجزیہ کرنے پر حسب ذیل عناصر ملیں گے جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی منفی لسانی رجحان کا حامل ہوگا۔

(۱) عربی فارسی الفاظ سے اجتناب! خدا معاف کرے انشاء کی طبع ظریف کو جس نے رانی کیتکی کی مثال سامنے رکھکر ایک نئی راہ سجائی۔ شروع شروع میں صرف اصطلاحی اور ادبی الفاظ سے اجتناب کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ ہندی کے ادیب نے یہ التزام کر لیا کہ اردو کا عام مستعمل لفظ بھی ممکن ہو تو نہ آنے پائے۔ ہندی کی سب سے بڑی لغت "شبد ساگر" میں فارسی کے بے شمار الفاظ مل جائیں گے لیکن وہ بھی رفتہ رفتہ متروک ہوتے جا رہے ہیں۔

(۲) ہماری بنیادی زبان (کھڑی بولی) عالم تفصیلی میں ہے اسلئے بعض مطالب کے اظہار کے لئے اسے کسی نہ کسی ترکیبی زبان (فارسی یا سنسکرت) کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہندی والے اپنا رشتہ صرف سنسکرت سے رکھنا چاہتے ہیں اور اس طرح سنسکرت کو بنیادی زبان مان کر بنگالی، گجراتی اور مرہٹی کے دوش بدوش ہونا چاہتے ہیں۔ یہ رجحان ایک بڑے تمدنی نقطۂ نظر کے برخلاف۔ سخت قسم کی تنگ نظری پر مبنی ہے۔

(۳) ہندی والوں کا سب سے بڑا "زبان کش" میلان سنسکرت کے تت سم (خالص) الفاظ کا استعمال ہے۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔ صدیوں کے الٹ پھیر میں زبان کی صوتیات اور اس کی صرف و نحو بدلتی رہی ہیں۔ ہندی والے اس انتہا سے زبان کو ڈھائی ہزار برس پیچھے گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ زبان کے جس ارتقا کو ماہر لسانیات سنوارنے سے تعبیر کرتا ہے وہ اسے بگاڑ کہتے ہیں اور حتی الامکان زبان کی اس ترقی یافتہ شکل سے اجتناب کرتے ہیں۔ مثلاً

| سنسکرت کا لفظ | اسکی ترقی یافتہ مروجہ شکل | جدید ہندی میں |
|---|---|---|
| چھایا | چھاؤں | چھایا |
| شرنگار | سنگھار | شرنگار |
| سوریہ | سورج | سوریہ |
| استنبھ | کھمبا | استنبھ |
| ستیہ | سچ | ستیہ |
| راتری | رات | راتری |

ہندی کی تشکیل کے اس اصول پر ہندی والے بڑی سختی سے کاربند ہیں۔ یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

زبانوں کی موجودہ کشمکش میں اگر کوئی شخص یہ پوچھ بیٹھے کہ ترقی پسند زبان ہونے کی حیثیت سے اردو کے فطری میلانات کیا ہیں؟ اور کونسا ادیب ان پر عمل کر کے اپنے نقش کو ابدی بنا رہا ہے؟ تو اس کے جواب میں اس بولی طرف اشارہ کروں گا جو جدید ہندی اور اردو دونوں کی بنیاد ہے۔ اس کا اپنا لب ولہجہ اور محاورہ ہے۔ اسے بعض تاریخی انقلابات کی بنا پر کچھ بیرونی لسانی اثرات کو بھی قبول کرنا پڑا ہے۔ یہ بیرونی اثرات اب اس کے گوشت پوست کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں بدیسی نہیں کہا جاسکتا۔ ہماری زبان کے بڑھانے اور پھیلانے میں یہ اثرات مفید بھی ثابت ہوئے اسلئے شکرانہ کی جاہے نہ کہ رنجش کی۔ ہندوستان کی سب سے بڑی ترقی پسند زبان وہی ہو سکتی ہے جس میں اسلامی تمدن کے نقوش مناسب حد تک ملیں۔ اور جو سنسکرت کے مصنوعی رجحان سے دبا کرے۔ اردو زبان کی خصوصیات شروع سے یہی رہی ہیں۔ انہیں کو لیکر وہ آج بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ انہیں کی بنا پر وہ آج بھی عوام اور بازار کی رانی بنی ہوئی ہے۔ اس کی جیت پروپیگنڈے اور دولت کے زور پر نہیں بلکہ لسانی ارتقا کے ان اصولوں کے بل پر ہوگی جو اٹل ہیں۔ یہ دو تمدنوں کا ایک مقدس سمجھوتہ تھی اس لئے ہماری دیانت اسی میں ہے کہ اپنی زبان کے صاف شفاف دھارے کو تعصب اور تنگ نظری سے گدلا نہ کریں۔ پھر دیکھیں الٹی گنگا کون بہا سکتا ہے؟

## غزل

تصور بھی فریاد کرنے نہ پائے — مدد اے محبت! وہ پھر یاد آئے
خلش بن کے جب آپ دل میں سمائے — تسلی کو آنکھوں میں آنسو بھر آئے
ترا نام لیتا ہے دل چپکے چپکے — اکیلے میں جیسے کوئی گنگنائے
نہیں آج تک روٹھنا بھی نہ آیا — نگاہیں ملیں اور وہ مسکرائے
فریب محبت کی توہین ہے یہ — وہ کیا جو اک بار دھوکا نہ کھائے
میں فہرست آلام خود لکھ کے رکھ دوں — نہ جانے زمانہ کہاں چوک جائے

اسی سوچ میں اب تو رہتا ہوں دانش
مجھے ہو گیا کیا یہ بیٹھے بٹھائے

دانش

# ہجوم تجلی سے معمور ہو کر

## ۲ جگر کی شاعری کا روشن ترین پہلو ۲

قلب انسانی میں عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ "طلب صادق" پیدا ہوتی ہے۔ صوفی انتہائے شوق میں "محبوب حقیقی" سے اس کے دیدار سے مشرف ہونے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ملتجی ہوتا ہے اور نہایت عاجزی اور انکساری سے اپنی سچی محبت اور عمیق آرزو کا یقین کامل دلانے کے لئے محبوب کو اپنی طرف متوجہ کرتا اور مختلف انداز گفتگو اختیار کرتا ہے۔ جگر نے تصوف کے اس پہلو کو بھی نہایت دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے اور جہاں کہیں گفتگو کا انداز "حریفانہ" اختیار کیا ہے وہاں لطافت شعری اور دلکشی کو چار چاند لگ گئے ہیں ؎

نہیں معلوم کس وضع کے انساں ہونگے | جن پہ تیرے ستم خاص کے ساماں ہونگے!
میری حسرت کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب | میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہونگے!!

کبھی کبھی انتہائی سپردگی اور تسلیم و رضا اختیار کرتے ہوئے محبوب حقیقی کو اس طرح مخاطب کرتا ہے ؎

میرا جو حال ہو سو ہو برق نظر گرائے جا | میں یونہی نالہ کش رہوں تو یونہی مسکرائے جا
لحظہ بہ لحظہ دمبدم جلوہ بجلوہ آئے جا | تشنۂ حسن ذات ہوں تشنہ لبی بڑھائے جا

اور ساتھ ہی ساتھ اپنی حرماں نصیبی سے مایوس نہ ہوتے ہوئے اپنے قلب مضطرب کو اس طرح تسکین دیتا ہے ؎

لطف سے ہے کہ قہر سے ہوگا کبھی تو رو برو
اس کا جہاں پتہ چلے شور وہیں مچائے جا

حسن طلب کی چند اور دلکش مثالیں ملاحظہ فرمایئے ؎

تری امانت غم کا تو حق ادا کر لوں | خدا کرے شب فرقت ابھی دراز رہے
جراحتیں دل بسمل کی روح تک پہونچیں | دراز دستیٔ قاتل ابھی دراز رہے
ترے نثار عطا کردہ ایک لطیف خلش | تمام عمر محبت کو جس پہ ناز رہے

مجھے چاہئے وہی ساقیا جو چھلک چلے جو برس چلے
ترے حسن شیشہ بدست سے تری چشم بادہ بجام سے

مجھے خاک میں تو نہ یوں ملا ہوں اگر چہ میں ترا نقش پا
ترے جلوے جلوے کی ہے بقا مرے شوق نام بنام سے

اب زباں بھی دے ادائے شکر کے قابل مجھے | درد بخشا ہے اگر تو نے بجائے دل مجھے
پھونک دے اے غیرت سوز محبت پھونک دے
اب سمجھتی ہیں وہ نظریں رحم کے قابل مجھے

بات کہاں سے کہاں پہونچی۔ ذکر یہ تھا کہ جب تک اس عالم رنگ و بو کی تخلیق نہیں ہوئی تھی "حسن حقیقی" (جس کو "وجود حقیقی" "وحدت الوجود" "ذات باری" اسماء سے بھی تعبیر کرتے ہیں) ہزار ہا پردوں میں مخفی تھا اور تمام اسماء اور اعیان اسی میں مستغرق تھے۔ اسی مقام کو "وحدت" کہتے ہیں۔ جب یہ وجود حقیقی تعینات کی طرف مائل ہوا تو وہ شے پیدا ہوئی جس کو ہم عالم یا کائنات کہتے ہیں۔ کسی شاعر نے لکھا ہے ؎

پہلے کچھ بھی نہ تھا یہ ارض و سما | جلوہ فرما تھا بس خدا ہی خدا
مالک الملک لا شریک لہٗ | وحدہٗ لا الٰہ الا ہو
اس نے چاہا کہ اب ظہور کروں | سب پہ ظاہر میں اپنا نور کروں

لہٰذا بقول جگر ؎

کن کہتے ہی جلووں کی یہ کثرت نظر آئی | اللہ کو اللہ کی صورت نظر آئی

پس معلوم ہوا کہ "کائنات" "خالق کائنات" سے علیحدہ نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی مستقل وجود ہے بلکہ یہ عالم ذات باری تعالٰے کے تمام اسماء وصفات کا مظہر ہے جو مرتبۂ غیب یا پردۂ وحدت سے نکل تعینات کی شکل میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ یہ تعینات عوام الناس کے لئے حجاب نظر بن جاتے ہیں لیکن چشم بینا پر حقیقت آشکارا ہوئے بغیر نہیں رہتی ؎

بہار لالہ و گل شوخیٔ برق و شرر ہو کر | وہ آئے سامنے لیکن حجابات نظر ہو کر
لطافت مانع نظارۂ صورت سہی لیکن | دھڑکتا دل کا کہتا ہے وہ نکلے ہیں ادھر ہو کر

تمام تعینات میں افضل ترین انسان کا وجود ہے جو مظاہر صفات باری میں سب سے اکمل ہے اس لئے اس کو "اشرف المخلوقات" کہا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اس رفعت کمال پر خالق کو بھی ناز ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "فتبارک اللہ احسن الخالقین" اس ضمن میں جگر کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

تمہیں بھی خبر ہے جو تم کہہ گئے ہو؟! | خود اپنی اداؤں سے مسحور ہو کر!

تعینات کا دوسرا نام "مجاز" یا "کثرت" ہے۔ وحدت و کثرت مجاز و حقیقت کے متعلق جگر نے خوب خوب لکھا ہے ؎

نظر فروز رہے سامعہ نواز رہے | رہے مجاز کہ وہ زینت مجاز رہے
کچھ اس طرح وہ پس پردۂ مجاز رہے | حجاب ساز میں جیسے صدائے ساز رہے

آشنا قید مکاں سے کب رہی برق جمال
ذرے ذرے میں ہی وہ جو وادی ایمن میں تھا

اسیر فاروقی مرادآبادی

جس نگہ میں دیکھا ہے وہ پردہ نشیں ہے
اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہیں ہے
ہر ایک مکاں میں کوئی اس طرح مکیں ہے
پوچھو تو کہیں بھی نہیں دیکھو تو یہیں ہے
وحدتِ خاص عشق میں ذکر ہی غیریت کا کیا
اپنے ہی جلوے دیکھئے اپنی ہی بزمِ ناز میں

قرآن مجید میں آیا ہے "نَحْنُ اَقْرَبُ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" (یعنی ہم تو تمہاری رگِ گلو سے بھی زیادہ قریب ہیں) ایک اور آیہ کریمہ ہے هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (یعنی حق تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو) جگر لکھتا ہے ؎

سرِ تڑپ کیسا تھ اک جلوہ نمایاں ہوگیا | آج ثابت یار کا قربِ رگِ جاں ہوگیا
مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہوکر | بہت پاس نکلے بہت دور ہوکر

سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے
جس حال میں میں ہوں مجھے افسوس نہیں ہے
اس طرح نہ ہوگا کوئی عاشق بھی تو پابند
آواز جہاں دو اسے وہ شوخ وہیں ہے

آنکھوں میں نور جسم میں بنکر وہ جاں رہے | یعنی ہمیں میں رہ کے وہ ہم سے نہاں رہے
ہر چند وقفِ کشمکشِ دو جہاں رہے | تم بھی ہمارے ساتھ رہے ہم جہاں رہے

دبستانِ تصوف میں پہلا سبق یہ ہے کہ صوفی ماسوا اللہ کے تمام موجودات کو اپنے قلب سے دور کرکے صرف "ذاتِ حقیقی" کا تصور کرے یہاں تک کہ حسنِ حقیقی کی کامل معرفت حاصل۔ دوسرے الفاظ میں صوفی ذاتِ حقیقی کو اپنی ذات میں مشاہدہ کرتا ہے۔ کلمہ طیبہ کا پہلا حصہ یعنی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه اسی تعلیم متبرکہ کا حامل ہے۔ اصطلاحِ صوفیہ میں لا الٰہ (کوئی معبود نہیں) کو نفی اور الا اللہ (سوائے اللہ کے) کو اثبات کہتے ہیں۔ نظیری کا ایک شعر ہے ؎

کے از موذن بشنوم توحید شرک آموز را
کو عشق تا بکسو نہم شرعِ خلاف انگیز را

کلمۂ توحید مشاہدۂ ذات کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ یہی مشاہدۂ ذات تکمیل کو پہونچکر "شاہد" کو "مشہود" سے واصل کر دیتا ہے اور من و تو کے حجابات اٹھ جاتے ہیں اس منزل پر پہونچ کر صوفی بادۂ وحدت سے سرشار ہو جاتا ہے اور اس کے لئے "شش جہت" کی حقیقت "ایک ٹوٹے ہوئے پیمانہ" سے زیادہ نہیں رہتی۔ وہ ایک ایسے عالم میں پہونچ جاتا ہے جس کی لطافت کو بیان کرنا قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے ؎

کیا حسن کا افسانہ محدود ہو لفظوں میں | جگر آنکھیں ہی کہہ سکتی ہیں آنکھوں نے جو دیکھا ہے

صوفی منزلِ وحدت پر پہونچکر حسنِ حقیقی سے اس درجہ مسحور ہو جاتا ہے کہ حیرت اس کی زبان پر مہرِ سکوت لگا دیتی ہے لیکن اس کا رواں رواں شاہدِ مطلق کی حمد و ثنا میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت اور تحیر کو جگر نے کیسے دلکش انداز میں بیان کیا ہے ملاحظہ ہو ؎

نظر سے حسن دو عالم گرا دیا تو نے! | نہ جانے کونسا عالم دکھا دیا تو نے!!
ہزار جانِ گرامی فدا بایں نسبت | کہ میری ذات سے اپنا پتا دیا تو نے!!

غیر اللہ کی پرستش کو شریعت اسلامیہ کفر کہتی ہے۔ عشقِ حقیقی اور حسنِ حقیقی کو جس تفصیل بیان عبارت بالا میں ہوا ہے اسے پیش نظر رکھ کر جگر کا یہ شعر پڑھئے اور وجد کیجئے ؎

حسن ہے میرے سامنے حسن کے ماسوا نہیں
عشق میں مبتلا ہوں میں کفر میں مبتلا نہیں

مضمون ہذا غیر ضروری طور پر طویل ہو گیا ہے اس لئے جناب جگر کے چند اشعار اور پیش کرکے ختم کیا جاتا ہے۔

ارشادِ باری ہے کہ لَا يَسَعُنِيْ اَرْضِيْ وَلَا سَمَاوِيْ اِلَّا يَسَعُنِيْ فِيْ قَلْبِ عَبْدِ الْمُؤْمِن یعنی میری وسعت نہ زمین میں ہے نہ آسمان میں ہے لیکن اگر ہے تو مومن کے دل میں ؎

وہ حقیقت کہ جو محدود حقیقت میں نہیں
دل کی وسعت میں ہے کونین کی وسعت میں نہیں
جو نہ کعبے میں ہے محدود نہ بتخانے میں!
ہائے وہ دار ایک اجڑے ہوئے کاشانے میں!!

تجھی میں ہے جگر ایک حسن معنی نہاں
بہار در و بر و میخانہ در نظر پنہاں

بہت اشارۂ پیہم مگر لطیف ترین
ہزار بانگ ملتفت مگر پنہاں

جگر کو درسِ حقیقت بہت نہ دے واعظ
وہ بے خبر تو بہ ظاہر ہے باخبر پنہاں

# ثمرات

آئی وہ منزلِ مراد ختم ہے راہِ امتحاں
حوصلہ مند و تیز گام اے مری ہمتِ جواں

ہے مرے دستِ شوق میں ساغرِ مئے طرب فشاں
دور ہوائے غمِ جہاں، دور ہوائے غمِ جہاں

گرمئ عشق کے بغیر لطفِ حیات رائگاں
عشق ہے زندگی کا روپ، عشق سے زندگی جواں

عرصۂ کائنات پر رحمِ خدائے دو جہاں
عرصۂ کائنات ہے صیدگہِ درندگاں

ہائے وہ چند ساعتیں گذریں جو تیرے قرب میں
رشک سے دیکھتی رہی جنکو حیاتِ جاوداں

اف ری منازلِ بلند تیری حریمِ ناز کی
پائے طلب کو کتنے طے کرنے پڑے ہیں آسماں

برق کی دسترس سے دور، عصرِ نوی کے لئے طیور
اور بلند آشیاں، اور بلند آشیاں

تند ہوائے انتشار، روئے زمیں ہے پرغبار
گونج رہی ہے یہ پکار، آدمِ عصر ہے کہاں

گذری ہے جو نگاہ سے کیفیتِ چمن نہ پوچھ
مجھ پہ گراں ہے اندنوں لذتِ خوابِ آشیاں

گرمِ حصولِ جوئے شیر ہاں یونہی مردِ تیشہ گیر
تیشہ زنی ہے دہر میں، اصلِ حیاتِ کامراں

لاکھ ہو یورشِ الم، لاکھ ہو بارشِ ستم
ذوقِ حیات کی قسم، پھر بھی رہونگا نغمہ خواں

مشقِ سخن نے دیجئے، شعر کو زینتِ دوام
خونِ جگر سے کھینچئے نقشِ بہارِ بے خزاں

محتسبِ شراب تو بزمِ جہاں میں ہیں بہت
یہ بھی کہو کہ ہے کوئی محتسبِ غمِ جہاں

جذبۂ ہمت اے نہال جب ہو مرا شریکِ حال
میرے لبوں پہ آئے کیوں شکوۂ گردشِ زماں

نہال سیوہاروی

# غزل

سوزشِ دل کا اثر یہ شبِ ہجراں ہو جائے
کہ ہر اک اشک مرا برق بداماں ہو جائے

چشمِ دل میں ترا وہ رنگ نمایاں ہو جائے
کانٹے کانٹے کو بھی دیکھوں تو گلستاں ہو جائے

آتشِ سوزِ جگر گر کہیں عریاں ہو جائے
تو ہر اک قطرۂ خوں شعلۂ رقصاں ہو جائے

اثر انداز جو کچھ سوزشِ پنہاں ہو جائے
شبِ غم نالۂ دل شعلۂ رقصاں ہو جائے

جلوۂ بے پردہ جو اس بُت کا نمایاں ہو جائے
کافرِ عشق ہر اک گبر مسلماں ہو جائے

نورِ جاں سے جو منور ہر اک ارماں ہو جائے
خانۂ دل میں مرے بزمِ چراغاں ہو جائے

دو طرح یوں ترا اک رنگ نمایاں ہو جائے
کہیں پیدا ترا جلوہ کہیں پنہاں ہو جائے

دعوتِ وعظ کا میخانہ میں ساماں ہو جائے
پھر تو واعظ بھی خدا کے لئے انساں ہو جائے

خونِ ارماں کا مرے رنگ جو ملجائے کہیں
گلِ خوش رنگ ترے تیر کا پیکاں ہو جائے

انگلیاں رکھتا ہوں پیشانی پہ یوں بہرِ سلام
سجدۂ سنگِ درِ بت نہ نمایاں ہو جائے

گلِ نظارہ ترے اتنے بکھر جائیں یہاں
کہ مجھے پھر گلۂ تنگئ داماں ہو جائے

سوزشِ دل میں کمی آنے لگی ہے شاید
اب ہر اک سانس مرا جنبشِ داماں ہو جائے

جا سکے دیدۂ دل میرا نہ چوری چوری
حرمِ ناز کا ایک اور نگہباں ہو جائے

سن کے توحید میں اشعار ترے اے شیدا
چپ رہے گبر تو خاموش مسلماں ہو جائے

شیدا جلوی

# اهرین اثریات

ر کو نئی دهلی میں محکمه اثریات کی مرکزی
شاورت کا ایک جلسه منعقد هوا تها۔ اس
کمے کے ڈائرکٹر جنرل مورٹیرو هیلر نے
بر میں هڑپا اور موهنجودارو کے آثار
حواله دیتے هوئے ثابت کیا که عهد قدیم
ی سنده اور عراق کے رهنے والوں میں
ثقافتی تعلقات قائم تهے۔ اس سلسله میں انهوں
ی بتایا که دونوں جگه کے باشندے اپنے
کو یکساں طریقے سے دفن کرتے اور اپنے
کے گرد پخته اینٹوں کی دیواریں بناتے تهے۔

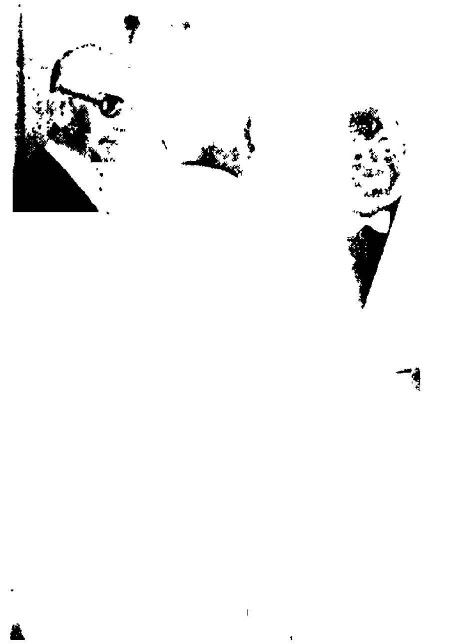


جلسے میں سر ایس۔ رادها کرشنن تقریر کر رهے هیں۔



# امن کانفرنس کے نمایندے

پیرس والی امن کانفرنس کے
هندوستانی نمائندوں کے
اعزاز میں سرسیموئل رنگا
نادهن نے ایک پرتکلف
دعوت دی ۔ یه تصویریں
اسی موقعه پر لی گئی تهیں۔



ی بحریه کے پہلے لارڈ مسٹر اے وی الیگزنڈر
ختم هونے کے بعد هندوستانی نمائندوں سے
گفتگو کر رهے هیں۔

برطانیه کے ناظم خارجه مسٹر ارنسٹ بیون
سرراگهون بلائی اور سر سیموئل رنگانادهن
کے درمیان تشریف فرما هیں۔

# ثقافتی جلسه



ی میں حیدرآباد کی عرب
ایسوسی ایشن کا ایک عام
ہوا جس میں ریاست کے علم
حضرات نے بهی شرکت کی۔
کی صدارت حیدرآباد کے
ظم مولانا عبدالقادر بدایونی
ائی جو تصویر کے بیچ میں
...

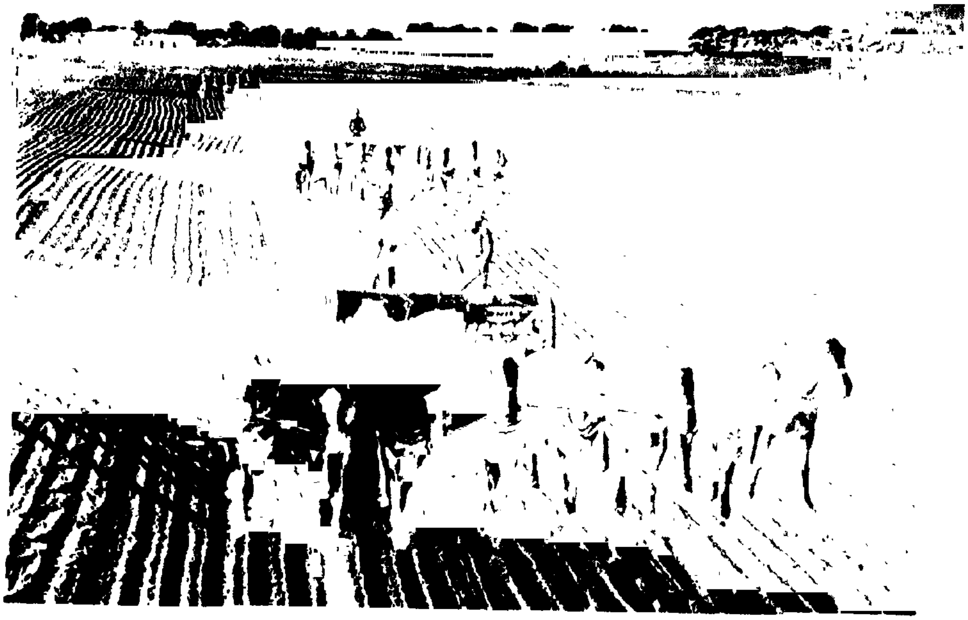


طاق بستان کا ایک حصہ۔ یہ ایران کی قدیم عظمت کا ایک روشن نمونہ ہے۔ یہ مضبوط عمارت کرمان شاہان کے قریب واقع ہے۔

# ایران میں نقاشی کا ایک قدیم شاہکار

طاق بستان کے باہر محراب کے اوپر یہ دلکش نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ دو فرشتے تاج کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ پچھلی دیوار دو حصوں میں منقسم ہے۔ نیچے کے حصے میں ایک زرہ پوش سوار ہے جس کے ہاتھ میں نیزہ ہے۔ اس دیوار پر نقاشی کا کام بہت اعلی اور نفیس ہے۔ اوپر کے حصے میں تین آدمی نظر آرہے ہیں جن کے بیچ میں بادشاہ ہے۔ اس کا ایک ہاتھ تلوار کے قبضے پر ہے۔ دونوں طرف شکار کے دو میدان ہیں۔ مغربی دیوار میں ایک بادشاہ کی تصویر ہے جو کشتی میں بیٹھا ہے اور ایک سؤر کو مار رہا ہے۔ ہاتھی شکار کا پیچھا کر رہے ہیں۔ رقاصائیں ساز بجا رہی ہیں۔ ایک طرف کچھ آدمی شکار کئے ہوئے جانوروں کی کھال اتار رہے ہیں۔ دائیں طرف کی تصویر نامکمل ہے۔ وہ ہرنوں کی شکار گاہ کا منظر پیش کرتی ہے۔ بادشاہ گھوڑے پر سوار ہے۔ عورتیں دائیں طرف تخت پر بیٹھی ہیں۔ چھوٹے دالان کی تصویریں اہمیت کے لحاظ سے بڑے دالان کی تصویروں کے برابر نہیں ہیں۔ کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام بن شاپور بن نرسی کے عہد میں یہ عمارت تعمیر ہوئی تھی۔ اس دالان کے داھنی طرف کی دیوار کے نقش میں دکھایا گیا ہے کہ بادشاہ کسی قیدی کے سینے پر پیر رکھے کھڑا ہے۔ اس کے قریب کے میدانوں میں ساسانی زمانے کے ستونوں کے بالائی حصہ ملا ہے۔ اثریات کے ماہرین نے ان میدانوں میں باقاعدہ کھدائی نہیں کی ہے لیکن بارہا ہل چلانے اور زمین کھودنے کے دوران میں کسانوں کو ساسانی سکے مل جاتے ہیں۔

# اسٹریلیا کی مشینیں اور زراعت



لونگرنونگ (آسٹریلیا) کے زراعتی کالج کے طالبا کھیتوں میں ھل چلا کر گیہوں بو رہے ھیں۔ پیٹرول کی کمی کے باعث اب یہ ھل آٹھ آٹھ گھوڑوں سے چلائے جاتے ھیں۔

نیچے کی تصویر میں ایک مشین زمین کھود کر آلو نکال رھی ہے۔

——:o:——

آسٹریلیا میں مشینوں سے کھیت میں ھل چلانے' بیج بونے' فصل کاٹنے اور اناج نکالنے کا کام لیا جاتا ھے۔ اسطرح اوسط پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ھوگیا ھے۔ آسٹریلیا کے گیہوں سے نہ صرف ھندوستان میں قحط کا خطرہ کم ھوگیا بلکہ اس نے دنیا بھر کے مسئلۂ خوراک کا حل پیش کردیا۔ مفصل مضمون اسی شمارہ کے صفحہ ۴۶ سے ملاحظہ کیجئے۔



ضلع ونڈسر (آسٹریلیا) کے باغات میں پھلوں کے درختوں پر پانی چھڑکنے کی مشین۔

——:o:——





دور نظر آنے والی مشین پھلیاں کاٹ رھی ھے۔ نزدیک والی دوسری مشین انہیں چن کر بوریوں میں بند کررھی ھے۔



کا ایک دلکش منظر۔ گول دائرہ سامنے والی عمارت کا ایک روشندان ہے

# جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مضمون اس شمارے کے صفحہ نمبر ۱۲ سے ملاحظہ ہو۔



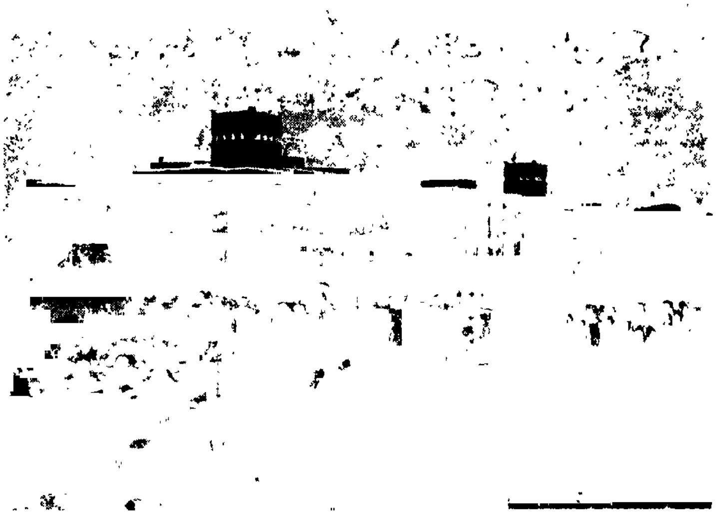
کا بنک۔ روپیے جمع کرانے یا نکالنے والے قطارین باندھے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔



کھانے کا کمرہ۔ کھانے کا سارا انتظام طالب علم اپنے آپ کرتے ہیں۔



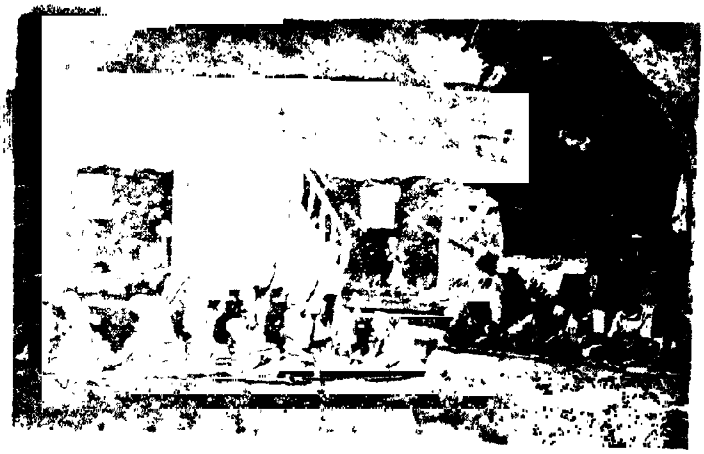
عمارت کے قریب ہی ایک وسیع میدان میں پھولوں اور ترکاریوں کی کیاریاں۔ طلبا کام میں لگے ہوئے ہیں۔



پوری عمارت کا ایک خوشنما منظر۔ کھلے میدان میں طلبا مختلف قسم کی ورزشیں کر رہے ہیں۔



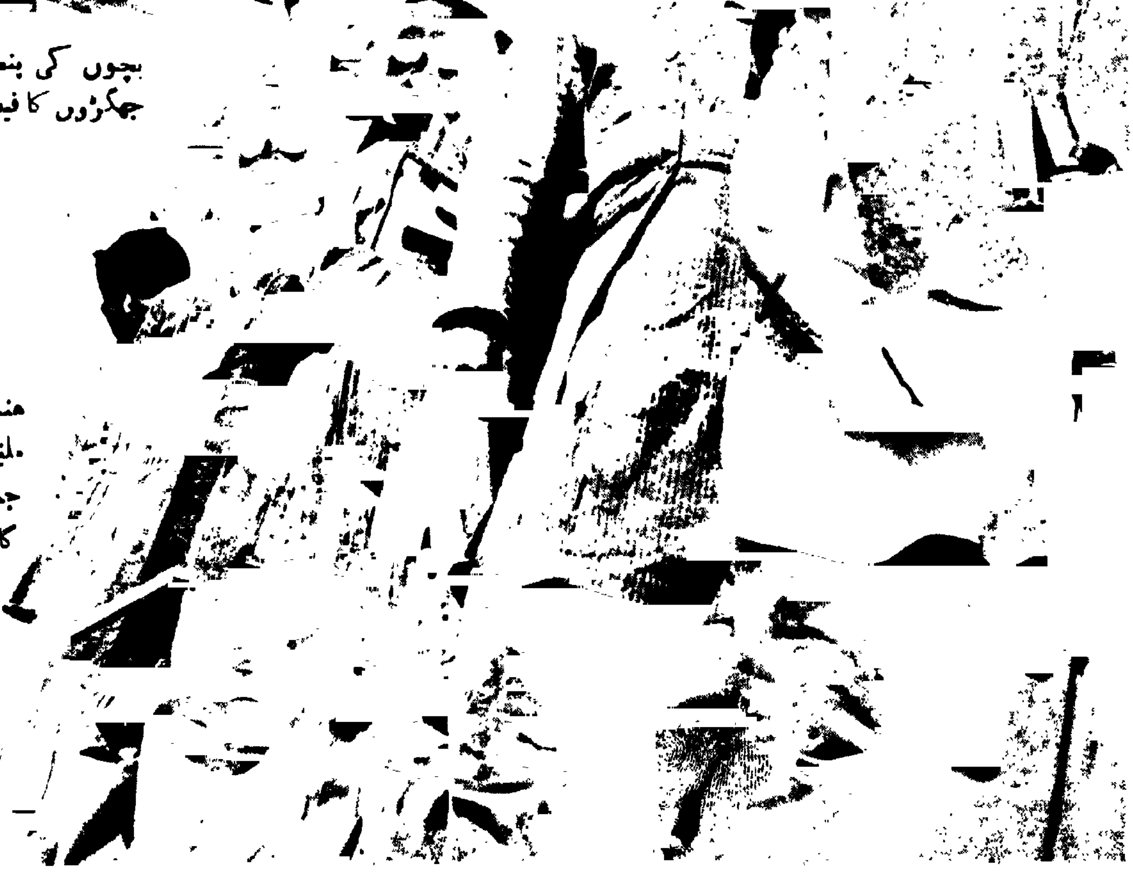
بچے کھیل کھیل میں کام کی باتیں سیکھ رہے ہیں۔



اوکھلا گاؤں کا مدرسے کا ایک منظر۔ کچھ بچے لکھ رہے ہیں، کچھ تکلی چلا رہے ہیں۔



بچوں کی پنچایت۔ آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ بھی پنچایت کرتی ہے۔



ہنس مکھ بچے چھٹی ملنے پر اپنی اپنی جماعت سے نکل کر قیام گاہ کی طرف جا رہے ہیں۔

# فغانستان کے کھلاڑی



ئوں ٹیموں کے کھلاڑی
ابلے کیلئے میدان میں
دوڑے آرہے ہیں۔



چند ماہ ہوئے کابل کی ٹیم "آریانا"
افغانستان کے وزیر تعلیم سردار محمد فا
کے ہمراہ ہندوستان آئی اور تمام بڑ
شہروں میں فٹ بال کے میچ کھیل کر چ
دہلی میں اسکے دو میچ جو مغل
جناح سپورٹنگ کلب کے ساتھ ہوئے
طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میچ
دیکھنے کیلئے افغانستان کے قونا
متعینہ ہند اور قائد اعظم محمد عل
بھی تشریف لائے تھے۔



ری ٹیموں کے کپتان کھیل
روع ہونے سے پہلے ہاتھ
ملا رہے ہیں

ڑیوں کے درمیان افغانستان
قونصل جنرل متعینۂ ہند اپنے
لے کے اراکین کے ساتھ
کھڑے ہیں

# برطانیہ میں مسلمان



کارڈف کی نئی مسجد کے افتتاح سے پہلے ساؤتھ ویلز کے مسلمان اپنے قائد شیخ حسام اسمعیل کے ساتھ مسجد میں داخل ہو رہے ہیں۔

مغربی دنیا کے مسلمانوں میں کارڈف کے رہنے والے مسلمان وسیع اور خوشحال گھرانوں کے رکن ہیں۔ ان میں عدن اور عربستان کے باشندے شامل ہیں۔ ۴۱ - ۱۹۴۰ء میں جب اہل جرمن نے کارڈف پر حملہ کیا تو نازی بموں سے مقامی مسجد بالکل فنا ہوگئی۔ تاہم مختلف ذرائع سے روپیہ جمع کرکے مسجد کو دوبارہ تعمیر کرلیا گیا اور ساتھ ہی ایک اسلامی ثقافتی مرکز قائم کیا گیا۔ دونوں کا افتتاح بڑے شاندار طریقے پر ہوا۔ یہ جشن تین دن تک منایا گیا۔ ویلز کے مسلمانوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شریک ہوئے۔ مسجد کے باہر کارڈف کے لارڈ میئر جیمز گریفتھ نے اس جلسے کی صدارت کی۔



کارڈف میں ایک مسلمان بچہ اذان کی آواز سنکر اسکی طرف متوجہ ہے۔ یہ ان خاندانوں میں سے ایک خاندان کا رکن ہے جو عرب سے ساؤتھ ویلز آکر آباد ہوگئے۔



رڈف میں مسلمان بچوں کو قرآن شریف کی تعلیم قائدشف یتے ہیں اس سے پہلے یہ جہازران تھے۔ لیکن ناروے کے حاصرہ میں جب انکے جہاز کو تارپیڈو کے ذریعہ اڑادیا گیا ور یہ جسمانی طور پر معذور ہوگئے تو انہوں نے خلوت نشینی اختیار کرلی۔



ممتاز شانتی۔ آسمان فلم کا ایک مسکراتا ستارہ۔

# غزل

ستم پذیر ہوں بیداد آشنا ہوں میں
جفائے دوست کے صدقے میں جی رہا ہوں میں

تلاشِ دوست میں کچھ ایسا گم ہوا ہوں میں
ہر اک سے اپنی خبر آپ پوچھتا ہوں میں

رواں دواں ہے سوئے نیستی مری ہستی
اجل کی گود میں مدت سے پل رہا ہوں میں

بنا دیا مرے احساس نے مجھے بندہ
خودی کی حد سے گزر جاؤں تو خدا ہوں میں

نمود و بودِ بشر کیا ہے؟ اک طلسمِ خیال
مگر فریبِ عناصر میں مبتلا ہوں میں

حریمِ قدس میں او چھپ کے بیٹھنے والے
تری شبیہہ تصور میں کھینچتا ہوں میں

نہ آنسوؤں میں کمی ہے نہ دل کی سوزش میں
برس رہی ہے گھٹا اور جل رہا ہوں میں

چھلک پڑے نہ کہیں زندگی کا پیمانہ
بذوقِ بادہ کشی جام بھر رہا ہوں میں

یہ مانتا ہوں کہ تم میری جان ہو، لیکن
خود اپنی زیست سے بھی ان دنوں خفا ہوں میں

کوئی دکھاؤ زمانے میں اور اپنا سا
تمھیں نہ چاہوں تو پھر اور کس کو چاہوں میں

جسے وفاؤں سے نفرت، جسے جفائیں عزیز
بھلا نباہوں تو ایسے سے کیا نباہوں میں

چراغِ کشتہ کے مانند بزمِ عالم میں
فروغ پانے سے پہلے بجھا ہوا ہوں میں

**مرا وجود تھا خنجرؔ اسکوں پذیرِ فنا**
**جگا کے بزم نشینوں کو سو گیا ہوں میں**

**خنجرؔ لکھنوی**

# کوئٹہ

**اسدؔ ملتانی**

(گیارہ برس ہوئے کوئٹہ کے زلزلے پر ایک نظم لکھی تھی جس کا ایک شعر تھا ؎

وہ دیارِ عشرت و زینت جسے ملک سلیماں کہتی تھی کوئٹہ
اسے زلزلے نے دیا مٹا اسے زلزلے نے مٹا دیا

اب جو کوئٹے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تو یکسر بشکل نو تعمیر شہر آباد پایا اور زلزلے کی تباہ کاری کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ اس نئے کوئٹے کی سیر کے تاثرات نے ذیل کی نظم کی صورت اختیار کی ہے ــــــــــ اسدؔ)

برداشت کی طاقت ہو تو کوئٹے کا سفر کر : جنت میں پہنچنا ہے جہنم سے گذر کر
سب خشک پہاڑ اور یہ اک قطعۂ سرسبز : اللہ کی قدرت کے کرشمے پہ نظر کر
گر شوقِ تماشا ہے تو چل شہر کے باہر : نظارۂ کشت و چمن و کوہ و کمر کر
وادیٔ اُڑک چل کے ذرا آبِ رواں دیکھ : کس زور سے بہتا ہے پہاڑوں سے اتر کر
محنت ہی سے خوشحال ہیں افغانِ تنومند : کھیتوں میں کس انداز سے پھرتا ہے سنور کر
کہسار کی عورت بھی ہے کس درجہ جفاکش : سر پر لئے جاتی ہے بڑی مشک کو بھر کر
ہیں کی چراگاہ میں دُنبوں کے ہیں گلّے : یاد آگئی کنعان کی تصویر اتر کر
یہ سیب کے پیڑ اور یہ انگور کی بیلیں : مسرور ہیں سب دامنِ امید کو بھر کر
ہر راہگذر کا ہے اشارہ کہ ادھر چل : ہر باغ یہ کہتا ہے یہیں عمر بسر کر
چلتن کے جو سائے میں ہیں گھر ڈنڈا کرن ڈیرا : کہسار ہیں اس شان کی وسعت پہ نظر کر
سڑکوں پہ فلک بوس چناروں کی قطاریں : سورج کی کرن آنہ سکے جن سے گذر کر
قدرت کے مناظر بھی ہیں بستی کی بھی رونق : جو سیر ہو منظور یہاں شام و سحر کر
یہ دامنِ کہسار میں پھیلے ہوئے بازار : کچھ وقت یہاں گشت ادھر اور ادھر کر
کہتے ہیں کہ اس شہر میں آئی تھی قیامت : ہے اب جو یہ آباد تو زندہ ہوا مر کر
کوئٹہ کا نیا شہر ہے پیغامِ مجسم : دل مُردہ جوانوں کو اسدؔ اس کی خبر کر

**منظور ہے تعمیر اگر عالمِ نو کی**
**دنیا جو پرانی ہے اسے زیر و زبر کر**

۱: اس شہر کا اصلی نام قلعہ ہے جو انگریزی میں بگڑ کر کوئٹہ ہو گیا۔
۲: کوئٹہ کے خشک پہاڑوں میں اُڑک کی وادی ہے جہاں پانی بکثرت پایا جاتا ہے یہیں سے کوئٹہ شہر کے لئے پانی کی بہم رسانی کا انتظام ہے۔
۳: خاص طور پر لٹن روڈ (ٹھنڈی سڑک) کے وہ چنار قابلِ دید ہیں جو ریذیڈنسی کے سامنے واقع ہیں۔ اسدؔ

# دھندلاہٹیں

افسانہ

انور سدید

جمال کو میں نے جب پہلی بار دیکھا تو میں ڈر گئی۔ اسکی موٹی موٹی سرخ وحشتناک آنکھیں دیکھ کر میں سہم سی گئی جی چاہا کہ امی سے لپٹ جاؤں کہ وہ بولیں۔

"شیریں! ان سے ملو یہ تمہارے چچا زاد بھائی جمال میں"۔ یہ کہہ کر انہوں نے ایک عجیب سی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر ظاہر کی اور میرا جی چاہا کہ انہیں آداب کرنے کی بجائے یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر اف! میرے ساتھ میری امی تھیں۔ اور ان کا غصہ ——— الامان الحفیظ ——— خدا کسی کو نہ دکھائے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جھجکتے آخر کہہ ہی دیا۔

"بھائی جان آداب"۔ اور میری آنکھیں افق پر پھیلے ہوئے بادلوں پر گڑ گئیں۔ جمال نے شاید مجھے مرغوب نگاہوں سے دیکھا تھا۔ . . .

"شیریں اب تو ماشاء اللہ بہت بڑی ہو گئی ہے۔ گڑیا سی تھی جب میں نے اسے دیکھا تھا"۔

مجھے غصہ آ گیا۔ ہونہہ! یہ کون ہوا میرے متعلق ایسے ریمارکس دینے والا۔ میرے ماتھے پر شکن پڑ گئے۔ اور افق کے پاس بادل حرکت میں آ گئے۔

"اب کے دسمبر میں پورے اٹھارہ سال کی ہو جائے گی اللہ رکھے" امی نے کہا۔

"اٹھارہ سال کی"! جمال نے حیرت سے کہا۔ جیسے انہیں اس میں کچھ اعتراض ہے۔

"ہاں ہاں، اٹھارہ سال کی"! امی اسے یقین دلانے لگیں۔

میری نگاہیں بادلوں سے ہٹ کر ان پرندوں کو دیکھنے لگیں۔ جو شام کے نزدیک جانے پر اپنے گھونسلوں کو اڑے جا رہے تھے۔

"اٹھارہ سال کی ہو گئی ہے! ورنہ آپ نے ابھی اسے یونہی . . . . ."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ میں اس کے ادھورے فقرے کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اور امی مغموم ہو گئیں۔ جانے کیوں؟

"کیا کہوں جمال۔ کوئی اچھا رشتہ ہی نظر نہیں آتا"۔

اب میں سمجھی! اور مجھے جمال پر غصہ آنے لگا۔ دیکھو بھلا یہ کہاں کی تہذیب ہے آخر یہ میرے سامنے ہی ایسی باتیں کر رہا ہے ہونق! میں نے اپنا ایک پاؤں الٹا رکھ دیا اور چلائی۔

"اوئی۔ امی میں گری"۔

اور پھر جو زور سے چیخ ماری تو امی بھی دہل گئیں۔ امی نے مجھے اٹھایا تو میں نے روتے ہوئے کہا۔

"امی موچ آ گئی پاؤں میں شاید سخت درد ہو رہا ہے"۔

جمال میرا پاؤں دبانے کیلئے جھک گیا۔

"میرے خیال میں واپس لوٹ چلیں چچی جان"۔ جمال نے کہا میں نے ایک اور چیخ ماری "اوئی امی چلا بھی نہیں جائیگا اب تو" امی جان بوکھلا گئیں۔ اور اس روز کی سیر یونہی گئی۔

جب گھر پہنچی تو مجھے اپنی ماما کی زبانی معلوم ہوا کہ جمال کی والدہ بھی کل آ رہی ہیں۔ اس کی مبہم مبہم باتوں سے مجھے پتہ چل گیا کہ یا دش بخیر مجھے جمال کے ساتھ باندھ دینے کے ارادے کئے جا رہے ہیں۔ معاً میرے ذہن کی سطح پر جمال کی موٹی موٹی سرخ وحشتناک آنکھیں ناچ گئیں اور اپنی قسمت کی لکیروں کو یوں تاریکی میں گم ہوتا دیکھ کر ڈر گئی۔ میرا جی چاہا رو دوں اور اگر بن پڑے تو دیدہ دہنی سے انکار ہی کر دوں۔

اس رات میں ایک پل بھی نہ سو سکی۔ ستارے چمکتے رہے۔ چاند کی ضیا باریاں زمین کو منور کرتی رہیں۔ لیکن میں چارپائی پر کروٹیں بدل بدل کر یہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح اس چغدِ صحرائی سے چھٹکارا حاصل کروں۔ وہ امی کا اکلوتا بھتیجا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ عالیہ چچی کے کہنے پر وہ جھٹ مان جائیں گی ——— صبح ہو بھی گئی لیکن میرے دماغ میں کوئی ایسی ترکیب نہ آئی جس سے میں نجات حاصل کر سکتی۔

دوپہر کو عالیہ چچی بھی آ گئیں انہوں نے خوب بڑھ بڑھ کر میری بلائیں لیں۔ جمال اپنی ابلی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔ اور میں غصے سے اپنے ہونٹ ہی کاٹتی رہی۔ تمام دن کوشش کے باوجود میں کسی کام میں بھی حصہ نہ لے سکی۔ شام کو جمال میرے کمرے میں آیا۔

"شیریں سیر کو نہ چلو گی"؟

"نہیں!" میں نے تنک کر اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اور وہ سہم گیا۔ پھر خاموشی سے باہر چلا گیا۔

میں کرسی پر دراز اپنے مستقبل کے دھندلے نقوش دیکھ رہی تھی کہ معاً ساتھ کے کمرے سے امی جان اور چچی عالیہ کی سرگوشیوں کی آوازیں مجھے آئیں۔ دبی دبی آوازیں۔ جیسے کوئی بہت رازداری کی باتیں ہو رہی ہوں ——— میرے کان کھڑے ہو گئے۔

اف! یہ سب باتیں میرے متعلق ہی ہو رہی تھیں۔

"مجھے اعتراض تو کچھ نہیں۔ مگر سوچتی ہوں لڑکی سے پوچھنا بھی تو ضروری ہے"۔

"توبہ آپا! یہ ہمارا تمہارا کام ہے۔ طے پایا۔ بات ختم ہوئی ———

یہ بھی کیا کہ لڑکیوں سے پوچھتے پھریں لڑکا تمہیں پسند ہے؟ نہیں ہے؟ تو رہم!"

ٹھیک ہے یہ۔ مگر آخر اس میں ہرج ہی کونسا ہے؟"

"جیسا آپ کہیں۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔"

اور پھر سرگوشیاں ختم ہوگئیں۔ مجھے امید کی ایک مدھم سی جھلک ر آئی۔

چاندنی رات میں میں ہار سنگھار کے ایک پودے کے قریب ی تھی۔ کہ جمال میرے قریب آہستگی سے آکر کھڑا ہوگیا۔ میں ایک ل توڑنے کے لئے جھک گئی۔

"شیریں!" میں نے اسکی از میں ایک قسم کی لجاجت پائی۔

"جی۔ فرمائیے۔"

"کیسی سہانی چاندنی رات ہے"

ں نے ذرا رومانی ہنتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں بہت"! میں نے ی نرمی سے کہا۔ وہ میرے ریب آگیا۔

"یہ آسمان پر پھیلی ہوئی شاہراہ دیکھ رہی ہو شیریں!"

"کہکشاں! جی ہاں" میرے انداز سے اب بھی نرمی ظاہر ہورہی تھی۔ اس نے قریب آکر اپنی انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرنی شروع کردی۔ میں ذرا نہیں ہچکچائی۔ خاموش رہی جیسے کچھ ہوہی نہیں رہا۔ اور وہ ہواؤں میں محل کھڑے کرنے لگا۔

"کاش ہم اس شاہراہ پر دونوں اکٹھے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے"

اس نے کچھ عجیب انداز سے کہا اور میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"یہ ٹھنڈی آہیں کیسی؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہی سوچ رہی ہوں کہ" میں نے بے حد مایوس انداز میں کہا "کاش میں آپ سے کچھ عرصہ پہلے ملی ہوتی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا شیریں" اس نے متحیر انداز میں پوچھا۔

"کیسے کہوں جمال کہ میں نے اپنا جیون ساتھی عرصہ ہوا انتخاب کرلیا ہے"

"جیون ساتھی!" اس نے انگلیاں میرے بالوں سے نکال لیں۔

## ضبطِ غم

**خورشید بیگم**

رازِ الفت چھپائے بیٹھے ہیں — آگ دل میں دبائے بیٹھے ہیں

آس جھوٹی ہم ان کے آنے کی — ہائے کب سے لگائے بیٹھے ہیں

دل بہلتا ہے ان خیالوں میں — فرض کرتے ہیں آئے بیٹھے ہیں

دل ہے مصروفِ گریہ لیکن ہم — ہنستی صورت بنائے بیٹھے ہیں

گھر کے گوشے کو آخرش خورشید

غم کا دفتر بنائے بیٹھے ہیں

"ہم دونوں کالج میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ بی اے تک زندگی کے چار سال اکٹھے رہ کر ہم نے ایک دوسرے کے جذبات و خیالات کا اچھی طرح سے مطالعہ کیا...... اور پھر...... اور پھر......"

میں آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ آواز تھرا گئی۔

"کاش میں آپ سے پہلے ملی ہوتی جمال!"

"مجھے نہایت افسوس ہے شیریں۔"

"کیسا افسوس بھائی جان!"

"یہی کہ تمہارے جذبات کو محض میری وجہ سے تکلیف پہنچی"۔

میں خاموش رہی۔ اور انہوں نے ایک خوبصورت پھول توڑ کر میرے بالوں میں ٹانک دیا۔ میرے جی میں آئی کہ جھٹ سے اتار پرے پھینکدوں۔ مگر پھر میں نے اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔

"ایک ناکامِ الفت کا یہ تحفہ تو نہ ٹھکراؤ گی"۔ اس نے ملتجی انداز میں کہا۔ اور مجھے ناکامِ الفت کی حالت پر ہنسی آگئی۔

اسی روز رات کو جمال عالیہ چچی سے کہہ رہا تھا کہ میں شیریں سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اور عالیہ چچی پریشانی کے عالم میں پوچھ رہی تھیں: "تم اس سے کیوں شادی نہیں کرتے۔ آخر اس میں کونسا عیب ہے؟"

دوسری صبح چچی عالیہ اور جمال جا رہے تھے۔ اور میں اپنے کمرے میں کرسی پر دراز اپنی اداکاری پر مسکرا رہی تھی۔ "کیسے جمال میاں سے نجات حاصل کی!" اگر میری شادی اس سے ہوجاتی تو! مستقبل مجھے دھندلا، دھندلا دکھائی دینے لگا۔ معاً باہر سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ جمال میاں جا رہے تھے۔ اور میرے مستقبل کی دھندلاہٹیں دور کسی اجالے میں غائب ہوتی جارہی تھیں۔

# افغانستان و ہند کے مابین ثقافتی تعلقات

احمد علی کہزاد

بدھ مت نے افغانستان میں گیان و دّیا اور ہندوستانی رنگ ڈھنگ کو رواج دیا چنانچہ اشوک کے زمانہ ہی میں گندھارا اور کپیسا میں اسٹوپا اور خانقاہیں بن چکی تھیں۔ نیز بدھ مت کی بہت سی قیمتی یادگاریں شاندار خانقاہوں میں محفوظ کرلی گئیں۔ افغانستان میں پھیلی ہوئی زرتشتی روح نے بدھ مت کے تنگ نظر فلسفے کو وسیع اور متاثر کرنے میں بڑا کام کیا۔

بدھ مت نے جو چھٹی صدی قبل مسیح میں مگدھ اور بنارس میں وجود میں آیا تھا صرف ایک تنگ زاویۂ نظر کا پرچار کیا یعنی "ہینا یانا" یا "مکتی کا چھوٹا راستہ" انہی دنوں افغانستان کے کشان شاہی خاندان کے شہنشاہ کنشک اور نئے مگدھ یعنی گندھارا کے پروہتوں اور راہبوں نے مل کر ایک دوسرے فرقے کو جنم دیا جو "مہایانا"، یا "مکتی کا بڑا راستہ" تھا۔ اس منزل میں ایک نئی ودّیا یعنی ورسرسوتی وادن" نے بدھ مت کے لئے ایک نیا افق پیدا کر دیا۔ چنانچہ افغانستان اور ہندوستان میں دونوں جگہ دھرم کے معاملوں میں اشوک کی سرگرمیاں کنشک کی سرگرمیوں کے برابر ہیں۔

بامیان میں ۳۵ میٹر لمبے بت کو یا کم سے کم اس کے دامن میں بنے ہوئے اسٹوپاؤں کو جو آگے چل کر اس مشہور وادی میں بودھی تعمیرات کے مرکز ثابت ہوئے اسی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنی موسم سرما کی قیامگاہ "پورشپور" (پشاور) میں ڈیڑھ سو فٹ اونچے اسٹوپا کے ساتھ ایک شاندار سنگھرام بنوایا تھا۔

افغانستان نے بدھ مت ہندوستان سے لیا لیکن اس کے عوض مذہبی خیالات کے تصویری پیکروں کی صورت میں ایک مکمل نمونۂ صنعت ہندوستان کو دیدیا۔ تیسری صدی قبل مسیح کے آخری نصف حصے میں یونانی ذوق نے قدیم باختری حسن کاروں کے خیالات کے ساتھ مل کر فن کو ایک نئی شکل میں ڈھالا جس کے بعد وہ عام طور پر یونانی باختری فن کہلانے لگا۔ مشہور روسی شائقینِ علم مسٹر اور مسز بزیور کا خیال ہے کہ یہی دلبستان فن ہندوستان، ایران، سنکیانگ اور منگولیا والوں کے لئے خیالات کی رفعت کا باعث بن گیا۔ اسی سے کشانی فن کے ذریعہ ساسانی فن بھی متاثر ہوا۔ بدھ مت کے افغانی حسن کاروں نے جنہوں نے یونانی باختری اسکول کی پیروی کی تھی ایک نئے یونانی بودھی طرز کو جنم دیا جو ہندوکش کے دونوں جانب پھیل گیا۔ ابھی چند سال پہلے اس فن کی ابتدا گندھارا (وادیٔ کابل) میں بتائی جاتی تھی لیکن ۱۹۳۶ء میں جب مسٹر ہاکن نے کندز میں اور ایک روسی ماہر آثارِ قدیمہ نے ترمذ کے قرب و جوار میں تحقیقات کیں تو باختر کو اس سلسلے کا مرکز قرار دیا۔ مسٹر ہاکن نے اپنے تخیلات کا نچوڑ ایک مختصر رسالہ میں پیش کیا جو کابل میں فارسی اور فرانسیسی زبانوں میں شائع ہوا تھا۔ چنانچہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یونانی بودھی فن نے باختر میں جنم لیا اور پھر گندھارا میں سن عیسوی کی پہلی صدی کے آخر اور دوسری صدی کے شروع میں عروج حاصل کیا خصوصاً جب کنشک کا عہد حکومت تھا۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ فن کے اس اسکول نے شمال مغربی ہندوستان پر کیا اثر ڈالا ہمیں چاہئے کہ مختصر طور پر اس ملک میں رونما ہونے والے فنی ارتقا پر بحث کریں۔

درحقیقت چوتھی صدی قبل مسیح کے آخر میں یا تیسری صدی قبل مسیح کے شروع میں ہندوستانی آرٹ نے سانچی فن کے اسکول کی صورت میں جنم لیا۔ اس وقت موریا اور سنگا خاندانوں کی حکومت تھی۔ اس فن نے جیسے جانوروں کی شکلیں بنانے یا بیل بوٹوں سے زینت دینے میں بڑا کمال حاصل تھا خود گوتم بدھ کی تصویر بنانے سے بالکل احتراز کیا کسی فنکار کی یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے مہاتما کو رمزیہ طریقۂ اظہار کی بجائے اصل روپ میں پیش کر سکتا۔ یہ ہندوستانی فن کا پہلا دور تھا۔

دوسرا دور سن عیسوی کے ساتھ شروع ہوا اور تقریباً پانچویں صدی تک برقرار رہا۔ اس ضمن میں تین خاص علاقوں کے فنون کے تین اسکول گنوائے جا سکتے ہیں۔ اول متھرا کا طرز جس نے وسطی اور شمالی علاقے میں رواج پایا (پہلی سے چوتھی صدی تک سانچی کی ایک نئی شکل)، دوسرا امراوتی طرز جو جنوب مشرق میں پھیلا (اس عہد کے متھرا اسکول کے ساتھ ساتھ) اور آخر میں یونانی بودھی فن جو شمال مغرب میں پھیلا اور جس نے دونوں اول الذکر طرزوں پر اپنا اثر جما لیا۔ اس طرح ہم آسانی سے پتہ چلا سکتے ہیں کہ وہ باختری فن کس طرح گندھارا سے شمال مغربی ہندوستان تک پہونچ گیا۔ تخت بہی (ڈاکٹر ڈی بی اسپونر کی تحقیقات) ٹیکسلا (سر جان مارشل کی تحقیقات) اکا پیکا اور ہڈا سے

برآمد ہونے والی چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں زبردست مشابہت ہے۔ مسٹر سے نوشر نے جلال آباد اور راولپنڈی کو ایک ہی ضمن میں رکھا ہے لیکن مسٹر جے ہاکن نے ہڈا کو ترجیح دی ہے جو جغرافیائی اعتبار سے گندھارا کے عین وسط میں واقع تھا۔

ہندوستانی فن کا آخری دور گپتا اسکول سے شروع ہوا جس نے زیادہ ترقی پانچویں اور نویں صدی کے درمیان حاصل کی۔ یہ ہندوستانی طرز میں یونانی بودھی فن کی ایک ارتقائی صورت تھی۔ اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور دوسری سے چھٹی صدی تک رہا۔ اس کے نمونے اجنتا میں ملتے ہیں۔ دوسرا دور چھٹی سے آٹھویں صدی تک رہا۔ اس کے نمونے الفنٹا اور ایلورا میں ملتے ہیں۔ گپتا اسکول نے اپنے طور پر بودھی فن کے آخری دور پر اثر ڈالا۔ یہ اثر افغانستان میں خصوصاً فوندوکستان (درۂ غوربند) میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے بدھ مت نصف افغانستان پر کم و بیش ایک ہزار سال تک پھیلا رہا۔ نصف مغربی ملک پر زرتشتی مذہب اور اس کی شاخیں اپنا اثر جمائے رہیں۔ یہ بات کشان بادشاہوں کے ان سکوں سے ثابت ہوتی ہے جن پر ادبستانی اور ہندوستانی دیوتا اور دیویاں نقش تھیں۔ عہد کشان گذرنے کے بعد چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں افغانستان میں کچھ لوگوں نے سورج کی پوجا شروع کی۔ ان کی نشان دار عبادت گاہیں اب بھی جبل اذر کابل اور کابل کے جانب جنوب لوگار میں ملتی ہیں۔ مسٹر جے ہاکن نے ونٹرنٹز کی تاریخ ہندوستانی ادبیات، جلد اول صفحہ ۵۶ کے حوالے سے درۂ خیرخانہ کے آثار قدیمہ کا ذکر کیا ہے۔ (یہ رپورٹ پیرس سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی) ان کا بیان ہے کہ "آگ اور سورج کا زردشتی مسلک سیستان کے سارے علاقے پر چھا گیا اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر وہ ہندوستان کے عین دروازے تک پہونچ گیا"۔ (اس طرح ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کیوں کر سورج کی پوجا جنوبی افغانستان سے چل کر ہندوستان میں رائج ہوئی)

ظہور اسلام کے وقت کشان قوم کا ایک خاندان کابل پر حکمراں تھا اور برہمنی بدھ مت کا سکہ چل رہا تھا۔ اس کی سلطنت سندھ سے بامیان تک یعنی ہندوکش کے جانب جنوب سارے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ عام طور پر صفحات تاریخ میں اس خاندان والوں کو برہمنی شاہان کابل یا رؤسائے کابل لکھا گیا ہے۔ ان بادشاہوں اور ہندوستان کے برہمنی اور ہندو راجکماروں میں بڑا ربط ضبط اور قریبی تعلق تھا۔ لوگار میں سگاوند جو تامنہ جنوبی افغانستان کے مذہبی عقائد کا مرکز تھا محمد عوفی کے بیان کے مطابق ہندوستان کے بے شمار یاتری ہر سال وہاں پہنچتے تھے پھر افغانستان میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا تو رؤسائے کابل کا صدر مقام کابل سے منتقل ہو کر پہلے اٹک کے قریب ویہند میں اور پھر اس کے بعد ہندوستان کے وسط میں قائم ہو گیا۔ اس منزل پر پہنچکر قدیم افغانستان و ہند کے مابین ثقافتی تعلقات کا پہلا باب ختم ہو جاتا ہے۔ نئے باب کا آغاز ظہور اسلام کے وقت سے ہوتا ہے۔

---

اسلامیات کے رائج ہوتے ہی افغانستان و ہندوستان نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ ذہنی انقلاب کے ساتھ ساتھ ثقافت، ادبیات، فنون لطیفہ اور فکر و نظر میں نت نئے پہلو پیدا ہونے لگے۔ ساتویں صدی کے نصف اول میں عربوں نے سیستان کو طے کیا اور افغانستان و ہندوستان کی جانب بڑھ گئے۔ لیکن ان کی یہ چڑھائی رتبیل شاہیوں کی رکاوٹوں سے التوا میں پڑ گئی۔ مکران اور سندھ نے مدافعت کی بیکار کوشش کی۔ محمد قاسم ثقفی نے سندھ پر دھاوا بول کر اس کے شہر منصوری، کسدار، کنداپل، بیضا، محفوظہ اور ملتان پر اپنا قبضہ جما لیا۔ افغانستان میں اسلام خاص شہر کابل تک رائج ہو گیا۔ بنی امیہ کے زمانہ میں اہل عرب سندھ سے آگے قدم نہ بڑھا سکے تھے۔ عہد عباسیہ میں خلیفہ معتمد نے ہندوستان کے پہلے اسلامی صوبے کی عنان حکومت یعقوب بن لیث صفاری کے ہاتھ میں دے دی۔

اس وقت جبکہ اسلام نے ایک طرف افغانستان کے صرف ایک حصے تک اور دوسری طرف بمشکل ہندوستان کی سرحد تک رسائی حاصل کی تھی ہم دیکھتے ہیں کہ افغانستان اور اسلامی ہندوستان کے مابین براہ راست کسی قسم کے ثقافتی تعلقات قائم نہیں ہو سکے تھے بلکہ یہ تعلق خلافت بغداد کی معرفت پیدا ہوا تھا۔ افغانی خاندان برامکہ کے افراد جو بلخ کے آتش پرستوں کی اولاد تھے، خلفائے بغداد کے وزیر تھے۔ اسی خاندان کے وسیلے سے ہندوستان اور دنیائے عرب کے مابین ثقافتی تعلقات پیدا ہوئے۔ انہی نے علم الادویات و فلکیات کے مطالعے کے لئے طالب علموں کو ہندوستان بھیجنے کی تجویز پیش کی اور انہی نے سائنسی کارناموں کو سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے ہندوستانی ارباب علم کو بغداد آنے کی دعوت دی۔

لیکن عربوں کے اس اثر و رسوخ کے باوجود اسلام سندھ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ صورت حال تقریباً کم سے کم دو سو سال تک قائم رہی حتیٰ کہ خاندان غزنوی کو افغانستان میں عروج حاصل ہوا۔ اس خاندان کے بادشاہوں خصوصاً محمود غزنوی کے حملوں کے ساتھ اسلام کے مذہبی اور ثقافتی اثرات خاص قلب ہندوستان تک پھیلتے چلے گئے۔ شاہان غزنی نے تاریخ ہند میں دو شاندار

ابواب کا اضافہ کیا۔ ان میں سے ایک مذہبی تھا اور دوسرا ادبی۔ پہلا ہمارے فاضل علمائے کرام کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور دوسرا ہمارے درباروں کی سرگرمیوں کا حاصل۔ فضلائے افغانستان میں سے، جو ہندوستان کے مختلف حصّوں میں آباد ہو گئے، ہجویری اور جلابی خاندانوں کے کچھ افراد خاص اہمیت رکھتے ہیں جنہوں نے شاہ مسعود کے عہد حکومت میں ہجرت کی تھی۔ ہجویر اور جلاب غزنی کے دو علاقے تھے۔ علی ابن عثمان ہجویری ۱۰۴۱ء میں لاہور پہنچے۔ یہ اس خاندان کے بڑے اہم رکن تھے۔ انھوں نے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کی اور اپنے مقلّدین پر تصوف کا رنگ جمایا۔ ان کی تصانیف میں سے چند قابل ذکر ہیں مثلاً منہاج الدین البیان الاہل العیان اسرار الخرق والمعنیات، کاشف الاسرار الرّاعیات بحقوق اللہ۔ اور آخر میں کاشف المحجوب جو ان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے۔ ہندوستان میں تمام عمر اپنے خیالات کی روحانی تبلیغ کرتے رہنے کے بعد ۴۶۵ھ میں ان کی وفات ہو گئی۔ سلطان مسعود پہلا شہنشاہ تھا جس نے غزنی جا کر اس فاضل اجل کے مقبرے کی زیارت کی اور اس پر ایک شاندار درگاہ تعمیر کرا دی۔

ہندوستان میں ادبی دور کا آغاز سلطان محمود کے زمانے سے ہوا۔ محمود کے ساتھ یا اس کے بعد افغان شاعروں اور ادیبوں کا ایک گروہ ہندوستان آیا۔ ان میں سے فرخی، انصاری، اسجدی، عوفی اور بیرونی قابل ذکر ہیں۔ ان کے دم سے ہندوستان میں ادبی ذوق کو نشوونما حاصل ہوئی۔ خراسان کی زبان "دری" میں جو عام طور پر فارسی کہلاتی تھی ایک خاص طرز شاعری رائج تھا جس کی نشاۃ الثانیہ کے لئے غزنی ایک اہم مرکز بن گیا یہ زبان شمال مغربی ہندوستان میں پھیلی اور بہت جلد مقبول عوام ہو گئی محمود کی سخن پروری اور ادب نوازی کے سلسلے میں گردیزی نے ایک دلچسپ حکایت بیان کی ہے۔ "طویل محاصرے کے بعد قلعہ کالنجار کے لوگوں نے محمود کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ قلعہ کے محافظ راجہ نندا نے اس محاصرے اور طویل مدافعت کو موضوع بناتے ہوئے ایک عمدہ نظم موزوں کی اور اس کی ایک نقل سلطان کے پاس بھیج دی۔ درباری شعرا نے ایک زبان ہو کر اعتراف کیا کہ فصاحت و ترنم کے لحاظ سے کوئی دوسری نظم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ بخشش کے طور پر سلطان محمود نے راجہ مذکور کو پندرہ قلعوں کا امیر بنا دیا۔" اس طرح سلاطین غزنی نے ہندوستانی شعرا کی ہمت افزائی کی، ان شاعروں کی بھی جو ہندوستانی بولیوں میں مشق سخن کرتے تھے۔ اس کی فیاضی نے عوام میں ایک ادبی ذوق پیدا کر دیا۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی کے شروع میں ادیب اور سائنس داں افغانستان سے ہندوستان آتے رہے۔ یہاں کافی عرصے رہنے کے باعث انھیں ہندوستان کی زبان، طور طریق، رنگ ڈھنگ اور رسم و رواج کا بخوبی علم ہو گیا۔ چنانچہ ہندوستان میں رہتے ہوئے یا افغانستان واپس جانے کے بعد انھوں نے مفید کتابیں تصنیف کیں ان میں سے صرف بیرونی، گردیزی اور ایک صدی بعد کے عوفی کا ذکر کروں گا۔

خوارزم جیسے مختصر سے گاؤں کے رہنے والے بیرونی نے ہندوستان کا خوب مطالعہ کیا اور اس کی روح کو اپنے ہمعصروں سے زیادہ سمجھا۔ اس نے جو خدمت اس ملک کے لئے کی، وہ ناقابل فراموش ہے۔ دربار غزنی سے متعلق ہونے کے باعث اس نے محمود کے عہد حکومت میں مطالعے کی غرض سے ہندوستان کا سفر کیا۔ اس نے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوستان کے مذہبی، سائنسی اور ثقافتی نظریوں کو سمجھ بوجھ کر اپنی واقفیت میں اضافہ کیا۔ غزنی واپس جا کر ۴۲۱ھ میں اس نے کتاب الہند" نامی کتاب لکھی۔ ہندوستان اور افغانستان کے ثقافتی تعلقات کو سمجھنے میں ابوریحان البیرونی اور اس کی قابل قدر کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہے اس نے انقلابی تغیّرات کی پیشین گوئی کی تھی۔ البیرونی نے یہی نہیں کیا کہ دنیائے اسلام کو ہندوستان سے روشناس کر دیا بلکہ اس نے بہت سی عمدہ کتابیں عربی سے سنسکرت میں ترجمہ کر ڈالیں۔ چنانچہ "مبادیِ اقلیدس" سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ اس نے ہندوستان کی سائنس کو ترقی دینے میں بھی نمایاں حصّہ لیا۔ پچاس سال بعد ہمارے مورخ اعظم گردیزی نے ہندوستان کے ہندوؤں کی مذہبی رسوم اور تعلیم وغیرہ پر بہت کچھ لکھا۔

---

غوریوں کے بعد حکومت کرنے والے بادشاہوں نے بھی جو مملوک کہلاتے تھے ہندوستان کی ثقافت، تعلیم اور فن تعمیر کو ترقی دینے میں بڑا حصّہ لیا۔ انھوں نے افغانی رسم و رواج اور خیالات و افکار کو رواج دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے تعمیری خاکوں خصوصاً مینار کے طرز تعمیر میں گردیزی فن تعمیر سے بہت کچھ اثر لیا گیا ہے۔ عہد غزنوی میں سے میں نے البیرونی اور گردیزی کا ذکر کیا ہے۔ عہد گردیزی میں سے میں طبقات ناصری کے مصنف منہاج السراج اور لبوب الالباب اور جامع الحکایات کے مصنف عوفی کا ذکر کروں گا۔ ہندوستان میں غوریوں کے دربار میں رہتے ہوئے ان دو فاضل مصنفوں نے اپنی اہم تصانیف تیار کیں۔ نیز افغانستان اور ہندوستان کی ثقافت، تاریخ اور ادب کے

سلسلے میں ایسی خدمات انجام دیں جن کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ طبقات ناصری ایک لائق تحسین کارنامہ ہے جس میں عام تاریخی حالات خصوصاً غزنوی اور غوری خاندانوں کے تاریخی واقعات درج ہیں۔ لبوب الالباب ہندی اور افغانی شعرا کے حالات زندگی کا مجموعہ ہونے کے باعث مشہور ہے۔ جامع الحکایات میں قصے کہانیوں کے انداز میں ایسے رسم و رواج اور طرز حیات کا ذکر کیا ہے جن کے مطالعہ سے افغانیوں اور ہندوستانیوں کے مختلف طبقوں کی زندگی پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ بلاشبہ یہ اہم کارنامہ بھی دونوں ملکوں کے لئے ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔

اس کے بعد چنگیز خاں اور تیمور لنگ کے حملے شروع ہوئے موخرالذکر کے جانشینوں نے دو سلطنتیں قائم کیں اور دو خاندان پیدا کئے۔ افغانی خاندان "تیموری" کہلایا اور ہندوستانی خاندان کو "مغل" کہا گیا۔ اس وقت سے دونوں ملکوں میں ادب و فنون کے نشاۃ الثانیہ کا ایک نیا باب کھلتا ہے۔ خراسان یا افغانستان کا ایک ادارہ ہرات میں قائم تھا۔ وہ مصوروں اور خوشنویسوں کے لئے مرکز بن گیا۔ چنانچہ بہزاد، میر علی اور سلطان محمد جیسے حسن کاروں نے اپنے عہد کے ذوق و شوق اور خیالات و رجحانات کی ترجمانی کی ہے۔ اسی طرح ہندوستان بھی خوبصورت اور دیدہ زیب طرز تعمیر اور ایرانی ادبیات کا خاص مرکز بن گیا۔ زبان بھی جو سلطان محمود ہی کے عہد میں افغان شعرا کے ذریعہ رائج ہو گئی تھی ہندوستانی ماحول میں ترقی کرنے لگی اور اس نے ایک خاص ہندوستانی طرز اختیار کر لیا۔ اس طرز نے ایسی مقبولیت حاصل کی کہ خود افغانستان میں رسائی حاصل کر کے وہاں کے لوگوں میں پسند کیا جانے لگا بہت سے افغان شاعر اور ادیب مغلوں کے دربار میں جمع رہے اور انھوں نے علم و ادب اور تاریخ و فنون کے ضمن میں بڑی خدمات پیش کیں۔ چونکہ ان کے نام اور کارنامے بھی خاص توجہ کے مستحق ہیں اس لئے میں بر سبیل تذکرہ صرف ایک ہستی نظام الدین احمد ہراوی کا ذکر کروں گا جس نے طبقات اکبری یا اکبر شاہی لکھ کر تاریخ میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔

اس دور کے بعد افغانستان و ہند کے مابین ثقافتی تعلقات میں کمی پیدا ہونے لگی لیکن پوری طرح اس کا خاتمہ کبھی نہیں ہوا۔ دونوں ملک اپنی اپنی جگہ ترقی کرتے رہے۔ چنانچہ آج ہم نہایت مسرت و شادمانی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے ادبی، تاریخی اور علمی ادارے اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ افغانستان اور ہند کے مابین ثقافتی تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔

اس مختصر خاکے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان و ہند کے پڑوسی ملک نہ صرف ظہور اسلام سے پہلے بلکہ قرون وسطیٰ اور موجودہ زمانے میں بھی آپس میں ثقافتی تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

اب ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کو بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی سے کس حد تک فائدہ پہونچا ہے۔ کیونکہ یہی ایک ادارہ ہے جو ہندوستان، ایشیا بلکہ سارے مشرق میں تاریخی، ادبی اور علمی موضوعات پر چھان بین کرتا رہتا ہے۔ وہ نور جو سر ولیم جونز نے ۱۷۸۴ء میں چمکایا تھا صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایشیا اور مشرق کے دوسرے ملکوں میں بھی روشنی پھیلا رہا ہے۔ اس کی جوت خصوصیت کے ساتھ افغانستان میں پھیل رہی ہے۔

بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی دنیا بھر میں پہلی تاریخی، ادبی اور علمی سوسائٹی ہے جس نے ہمارے ملک کے حالات کی چھان بین کی اور بتایا کہ وسطی ایشیا کے عین دروازے پر ہندوستان، چین اور ایران کے درمیان گھری ہوئی حالت میں اس کی تاریخی جغرافیائی اور ادبی حیثیت کس درجہ اہم ہے۔ اس ادارے نے تعصبات سے الگ ہو کر بالکل غیر جانبدارانہ انداز میں لائق اعتماد اور ٹھوس کام کیا ہے۔ چارلس میسن پہلا عالم ہے جس نے آج سے سو سال پہلے قدیم افغانی سکے جمع کرنے شروع کئے تھے۔ اس کا مقالہ بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا ہے۔ چارلس میسن اور جیمز پرنسپ پہلے دو عالم ہیں جنھوں نے خروشتی صرف ابجد کا مطالعہ شروع کیا۔ انھوں نے افغانستان اور ہندوستان کے خروشتی خط کے کتبات کو پڑھنے کی کوشش کی۔ بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک اور فاضل رکن پروفیسر ڈبلیو ایچ ایچ ولسن نے ان عالموں کے مقالات کو مربوط و مرتب کیا اور اپنی تحقیقات کے ساتھ ملا کر شائع کر دیا۔ اس کا نام "آریانہ اینٹیکا" رکھا جس کا ذکر میں شروع میں کر چکا ہوں۔ بعد ازاں دوسرے انگریزی عالم مثلاً جیرارڈ، ہیبٹ، ہونگبرگر، ٹالبوٹ، ڈبلیو سیمپسن اور میلانیک بعد دیگرے اسی قسم کی تحقیقات میں اضافہ کرتے رہے اور بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی انکے نتائج افکار و تحقیقات کو برابر شائع کرتی رہی۔ ان مطبوعات نے بہت مستشرقی اداروں کی توجہ افغانستان کی طرف مبذول کرائی۔ سب سے پہلے فرانس میں مسٹر روزنیتی اور مسٹر جیکیٹ نے باختری سکوں پر اپنی تحقیق کا حاصل پیش کیا۔ اسکے بعد جرمنی اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں تحقیقات و تصنیفات کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ میں اس مختصر مضمون میں ان مصنفوں اور ان مقالوں کی مکمل فہرست پیش نہیں کر سکتا جو افغانستان پر لکھے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات ثقافتی تاریخی اور ادبی اعتبار سے افغانستان اور ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی ثقافت کی قابل قدر ہیں۔

(مجلہ "افغانستان" سے ماخوذ)

# بہار کے دیہاتی گیت

شکیلہ اختر

دیہاتی شاعری آزاد آب و ہوا میں پروان چڑھی ہے۔ بیچارے جاہل دیہاتی خوشی و غم فکر و مسرت کی جو کیفیتیں اپنے دھڑکتے ہوئے دلوں میں محسوس کرتے ہیں، وہی جذبات بن کر ان کی زبان پر ٹوٹے پھوٹے جملوں کی شکل میں قافیہ اور ردیف کی کڑی پابندیوں سے عموماً آزاد گیت کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ دیہاتی [illegible] کانوں میں بھلے لگنے والے ترنم [illegible] ہیں وہ اسی سے خوش ہو لیتے ہیں۔ یادگار واقعات، جذبات [illegible] سات کی شدت کو محفوظ رکھنے کے لئے ان کے محدود دائرے میں کوئی اور ادبی صورت نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری ان کی اپنی روزمرہ زندگی کی طرح بہت ہی سادہ اور بے تکلف الفاظ میں ہوتی ہے۔ ان دیہاتی گیتوں کے بنانے والے زیادہ تر ان پڑھ اور گنوار مرد اور عورتیں ہوتی ہیں لیکن جہالت اور گنوارپن میں ڈوبے ہوئے تعلیم و طریقوں سے ناواقف ہونے پر بھی ان کے گیتوں کا نمایاں کمال اور انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ مہذب شاعری کے پرتکلف گلدستوں کے سامنے ان کا دامن ہر سال ہر موسم اور ہر روز کھلنے والے ان گنت قسم کے پھولوں سے بھرا پڑا ہے۔ آئے دن کے خیالات، چھوٹی چھوٹی باتیں، شادی بیاہ، میلے ٹھیلے، غمی و خوشی کے قصے، گذرے ہوئے واقعات اور بدلتے ہوئے رُت کی کیفیتیں، ان کی شاعری میں آزاد، انوکھی جدت اور مٹھاس کے ساتھ موجود ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو کے گانے ان کے یہاں اتنی کثرت سے ملتے ہیں کہ اگر صرف شادی ہی کے گیت لکھے جائیں تو ایک داستان سے کم نہ ہوں۔ بڑی خوبصورتی سے ایک ایک گھڑی کی گیتیں اپنی جداگانہ حیثیت کے ساتھ موزوں کی گئی ہیں اور یہ نمایاں حسن سوائے دیہاتی شاعری کے اور کہیں نہیں ملے گا۔ شادی بیاہ میں ساری رسموں کے مخصوص ناموں کے ساتھ ساتھ گیتیں منزل بمنزل اپنی امتیازی شان سے آگے بڑھتی جاتی ہیں۔ شہانے گیت لڑکے لڑکی اور اس کے عزیزوں کے دلی جذبات کے آئینہ دار ہوتے ہیں جو گ اور ٹونے دلہن اور دولہا کو محبت اور پیار میں جکڑ دینے والی مضبوط اور فولادی زنجیر سمجھے جاتے ہیں۔ سہاگ آنے والی خوشیوں کا پیغام بر ہے، جھومر پر مسرت جذبات کی گہرائیوں کا رسیلا اظہار ہے۔ جھومر کو ہم دیہاتیوں کی کامیاب نظمیں کہہ سکتے ہیں۔ گیتوں کی دوسری قسموں سے زیادہ جھومر میں شاعری کا عروج ترنم اور تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے۔ کہبر کی مخمور گیتیں اور رخصتی کے دلسوز گانے اس کے علاوہ ہیں۔ اتنے قسم کی رنگا رنگ شاعری اتنے رسیلے مدھو بول کے ساتھ نہیں اور کہیں نہ مل سکے گی۔ شہانے گیت میں شادی ہونے سے پہلے لڑکی اور اسکے باپ کی دلی کیفیتوں کی تھوڑی سی جھلک دیکھئے۔

(۱) "آبا جُوا، کھیلن تم کہاں جاؤ گے جی؟

بیٹی جوا کھیلن تمرے سُہرے جائینگے جی

آبا جُوا میں کس کو تم ہارو گے جی؟

بیٹی جُوا میں تم ہیں کو ہاریں گے جی

آبا مال مُلک سب ہاری جائیو جی

آبا لچھمی دھیا کیسے ہارو گے جی

بیٹی مال ملک بڑا لچھمی ہے جی

بیٹی لچھمی دھیا بڑی بھاری ہے جی

لڑکی اپنے باپ سے کہتی ہے کہ میرے ابا تم جوا کھیلنے کہاں جاؤ گے؟ اس کے جواب میں اس کا باپ کہتا ہے کہ "میں تمہارے سُسرال جوا کھیلنے جاؤں گا"۔ اس پر وہ لڑکی سوال کرتی ہے کہ "اگر تم جوا میں ہار گئے تو کیا کرو گے؟ اور کس چیز کو ہارو گے"؟ باپ جواب دیتا ہے کہ "جوا میں ہم تم کو ہی ہار دیں گے"۔ بیچاری لڑکی اس کی محبت کا واسطہ دے کر کہتی ہے کہ "اے میرے باپ تم مال اور ملک سب ہار جاتے لیکن اتنی دُلاری بیٹی کو کیسے ہار دو گے"؟ اس کا باپ کہتا ہے کہ "بیٹی مال و ملک عزیز تو ہے لیکن عزیز ترین کنواری بیٹی اپنے باپ پر بہت بھاری ہوتی ہے جس کا ہار ہی جانا بہتر ہے"

۲

دروازے پر بولی سُنایا لاڈو میں تیری ملن کو آیا

تمرے آبا نے بھیجا آبا نکھ بانے بھیجا پروانہ لاڈو پروانہ لاڈو

میں تیرے ملن کو آیا

"میری لاڈو۔ تو نے دروازے پر اپنی بولی سنا کر مجھ کو اپنے ملنے کا مشتاق بنایا اسی لئے میں تیرے ملن کو آیا ہوں۔ اور اس کے علاوہ تمہارے ابا نے بھی مجھ کو پروانہ پر پروانہ بھیجکر بلایا ہے اور اب میں تیرے ملن کو آیا ہوں۔

۳

ٹیکہ جو لائے مُنیا نہیں لائے کہو جائیے سو کہ اب لاڈو رو رہیں

لاڈو جو رُوٹھیں پلنگ چڑھی بیٹھیں ——— کہو جا بنیے سے

"جا کر بنیے سے کہو کہ اس نے دلہن کے لئے جو ٹیکہ لیا ہے اس کا موتی نہیں لایا۔ اسی لئے لاڈو روٹھی ہوئی ہیں۔ اور بنیے سے جاکر یہ کہو کہ لاڈو رُوٹھ کر پلنگ پر بیٹھی ہوئی ہیں۔"

—— ۴ ——

سَر بنے کے سونے کا سہرا، لڑیاں لگے ہیرے لال

بنے کو میں جانے نہ دوں گی

ساسو جو گنین کے دیس بنے کو میں جانے نہ دونگی

"میرے بنے کے سر پر سونے کا سہرا بندھا ہے اب ایسے ہیرے کی لڑیاں لگے ہوئے اپنے لال بنے کو میں اس کی جادوگرنی ساس کے دیس میں کبھی جانے نہ دونگی۔"

شادی کے موقعہ پر یہ گیت لڑکے کی طرف سے گایا جاتا ہے۔

—— ۵ ——

شہانے گیت کا ایک اور لطیف نمونہ دیکھئے شرمیلی دلہن اپنے شوہر سے ملنا چاہتی مگر وہ جھجک رہی ہے ۵

"ارے میں کیسے آون نئے دُلہے پائل بولے جی

پائل کی آواز سے میرے دادا جاگیں جی دادا اُٹھیا جاگیں جی

ارے میں کیسے آون نئے دلہے پائل بولے جی

پائل کو اُتار کے تم دھیرے آؤ جی ہولے ہولے آؤ جی

ارے میں کیسے آون یہاں بندرے پائل بولے جی

"اے نئے دلہے میں تم سے ملنے کو کیسے آوں۔ میرا پائل تو چلنے میں جھنا جھن بولنے لگتا ہے۔ میرے پاؤں میں جو پائل ہے اس کے جھنا کے سے تیرے دادا جاگ اٹھیں گے۔ نئے دلہے اب میں کیسے آؤں ——— ؟ اس کا دلہا کہتا ہے کہ آسان بات ہے پائل کو اتار کر آہستہ آہستہ چلی آؤ۔" لیکن دلہن اصرار کرتی ہے کہ میں آ ہی نہیں سکتی میرا پائل بہت بول رہا ہے۔"

——————

دیہاتی شاعری کی ان تھوڑی سی مثالوں سے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس، گنوار زبان میں جذبات کا کتنا خوبصورت اور فراوان بہاؤ ہے۔

جھومر میں نغموں کا ترنم اور لطیف اشارے اور کہیں کہیں پر شوخیاں ایک عجیب حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ جھومر میں ہمیں تسلسل خیال کے ساتھ تخیل کی بلند پروازیاں بھی ملتی ہیں اور شوق کی بے قراریاں بھی۔

جھومر

—— ۶ ——

پرو میا سدا بیرن بھے رے میرا کیسے کہ ملنا ہوئے

چلو سیّاں چلو باگوں میں ملنا ہوئے

ارے ہُواں تو مالی مالن جگے رے میرا ہُواں بھی نہ ملنا ہوئے

"دشمن پروہیا ہوا بہہ چلی جا رہی ہے اپنے ساجن سے میرا ملنا کیسے ہو۔ میرے سیاں چلو باغ میں شائد وہیں کسی طرح ملنا نصیب ہو جائے لیکن افسوس وہاں باغ میں بھی تو مالی اور مالن جاگ رہے ہیں وہاں بھی تو ہمارا ملنا نہیں ہو سکتا ہے۔"

—— ۷ ——

"چھچھل ندیا نبسی ڈوبت ناہیں ۔ پرائی تریا ہاتھ آوت ناہیں

گھونگھٹ والی گھونگھٹ کھولو ۔ گھونگھٹ لانبی بندیا چمکت ناہیں

لگائے نینا جیرا مانت ناہیں چھچھل ندیا نبسی ڈوبت ناہیں"

"جس طرح کم پانی میں بنسی نہیں ڈوبتی ہے اسی طرح پرائی عورت ہاتھ نہیں آسکتی ۔ اے گھونگھٹ والی گھونگھٹ کھولو۔ تمہارا آنچل اتنا لمبا کھینچا ہوا ہے کہ تمہاری پیشانی پر لگی ہوئی بندیا بھی نہیں چمک رہی ہے جب سے مجھ کو تم سے محبت ہوئی ہے کہیں میرا دل لگتا ہی نہیں ہے"

ایک اور

—— ۸ ——

کنکر دھیرے مار مُور مہراجا ۔ کنکر لگنے کا کچھ ڈر ناہیں

چندر بھینگ جئی ہیں مُور مہراجا ۔ کنکر دھیرے مار مُور مہراجا

چندر بھیگنے کا کچھ ڈر ناہین سامی دیکھ پائیہن مور مہراجا

"میرے مہراج دیکھو کنکر بہت آہستہ سے مارو رے۔ ہم کو کنکر کے لگنے کا تو کچھ ڈر نہیں ہے مگر میری ساری بھیگ جائے گی۔ اے میرے مہراجا ساری بھیگنے کا بھی ہم کو ڈر نہیں پڑا ہے مگر اسی کا خوف ہے کہ میری بھیگی ہوئی ساری کہیں میرے شوہر نہ دیکھ لیں اسی لئے اے میرے مہراجہ تم کنکر بہت آہستہ سے مارو۔" ——— (مطلب محبوب)

ان دیہاتی گیتوں میں اردو شاعری کی طرح کہیں کہیں قافیہ اور ردیف کا بھی خیال کیا گیا ہے۔ دیہاتی شاعری میں محبت اور ایثار کے جذبات بھی اجاگر ہیں۔

—— ۹ ——

جھومر سانولا رے تیرے لئے بدنام۔ سانولا رے

جیسے کوکت بن بن کی کوئیلیا ویسے ڈولوں تیرے ساتھ سانولا رے"

اور "تیرے کارن سیاں سب ہیولے لگا اپورا ما۔ تیرے کارن"

"اے میرے ساجن میں تو صرف تیرے لئے بدنام ہوئی ہوں دیکھو جیسے بن میں کوئل کوک رہی ہے ویسے ہی میں بھی تیرے ساتھ ہر ہر جگہ کو کنے کو ساری مصیبتیں سہنے کو تیار ہوں۔"

——————

ہمیں ان گیتوں میں کہیں کہیں لطیف جذبات سلجھی ہوئی زبان بھی نظر آتی ہیں اور کسی جگہ ٹھیٹھ زبان کا مکمل حُسن۔

— ۱۰ —

راتے کہے سیّان چوڑیا منگادے، چوڑیا جھنر جھنر کریلا ہو بالما
تیا شنن شنن کریلا ہو بالما، جیرا دھڑکتہ لاگے لا ہو بالما

"رات وہ ہمیں کہہ رہی تھی کہ سیاں چوڑی منگا دیے، وہی چوڑی جو کلائیوں میں چھن چھن کرتی ہے میرے بالم۔ رات کیسی خاموش ہے میرے بالم ایسی خاموش جس کے سناٹے میں صرف میرا دل ہی زور زور سے دھڑکتا رہتا ہے"۔

"بدیسیا" ایک بے بس اور مایوس جوانی کی نڈھال مگر بولتی ہوئی تصویر ہے۔ بہار کے دیہاتی گیتوں میں یہ ایک مخصوص گیت ہے، یہ چیت سے بیساکھ تک گایا جاتا ہے اور یہ گانا بہت ہی رومانی سمجھا جاتا ہے۔

— ۱۱ —

"آموا ن جُو جھڑی کے پھن لگ لیئی ٹیکوُ رَ وا
سے تیوُ پیارا ہی پیارا ہی رہے بدیسیا
ہمرا سے چھوٹی چھوٹی بھیلن لرکوُ ریا
سے ہمرا کے دن بیتے رُوئی رے بدیسیا
سے کُجنیاں لُوٹے لا لمبی کیس رے بدیسیا"

"آم کا پھل لگ کر جھڑ گیا اور پھر دوبارہ اس میں ٹیکوڑا[1] بھی لگ گیا ہے۔ دنوں پر دن بیتے چلے گئے مگر تب بھی میرا پیارا ہی کارا ہی ہے رے بدیسی۔ ہم سے چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بچوں کی ماں بن گئی ہیں۔ لیکن ایک ہم بدنصیب ہیں کہ میرا دن روتے ہی بیتا ہے۔ اے بدیسی۔ میرے لمبے بال کس کام کے جو حزن وملال میں صرف زمین ہی پر لوٹتے رہے ہیں"۔

ایک اور خالص بہار کا دیہاتی گیت سن لیجئے:۔

۱۲— "منیا گے منیا دَماد ال ہُوُ۔ املی کے سُور پر بیٹھل ہُوُ۔
حُکہ تماکُل نا منگت ہُوُ۔ چلیا منگادے سکتے جادن
چندری رنگادے لچکتے جاؤن"

"ارے ماں رے ماں تیرا داماد آیا ہے جو املی کی جڑھ پر بیٹھا ہوا ہے وہ حقہ اور تمباکو پینے کو مانگ رہا ہے۔ ارے ماں مجھ کو چولی منگا دے جس کو پہن کے مسکاتی ہوئی میں وہاں پر جاؤں جلدی سے چندری رنگادے جس کو پہن کر لچکتی ہوئی میں اس کے پاس جاؤں"۔

غربت اور بیچارگی کا کتنا نمایاں اظہار ہے اس گیت میں جھنگی ہوئی آنکھوں کے سامنے کبھی کبھی موہوم سے خواب جھلک آتے ہیں مگر تھکی ہوئی مضمحل روح ایک غمناک آہ کے ساتھ ان کے آنسوؤں کو پونچھ دیتی ہے۔

— ۱۳ —

"بابا مورا رہی تن، بگیا لگئی تن
ہم پھلوا لُوڑھے جیتی تو ہیے یار گوئیاں
پھلوا لُوڑھی اِیے لوڑھی بھرتی چنگریا
بلموان پر چڑھیتی تو ہیے یار گوئیاں"

"اگر میرا باپ زندہ رہتا تو وہ ایک باغ لگاتا اور ہم وہاں پھول چُننے کے لئے جاتے سنتی ہو میری سہیلی اور سکھیاں۔ ہم اتنا پھول چنتے کہ جس سے چنگریاں بھر جاتیں اور پھر ہم وہ سارے پھول اپنے بالم پر لاکر چڑھا دیتے"۔

حسرت و یاس کے کتنے شعلے اِن گیتوں میں بھر دیے گئے ہیں غیر مانوس زبان کے ہوتے ہوئے بھی ان گیتوں کے نشتر دلوں میں تیر کے نگا دیتے ہیں۔ بدیسیا چیت اور بسنت بھی بہار کے خاص گیتوں میں سے ہے۔

— ۱۴ —

"کوُن بن کُوکت کوئیلا ہو راما۔ کوُن بن کُوکت"
"یہ کوئل کس جنگل میں کوک رہی ہے۔ رام جس کی آواز سے میرے دل میں بھی ہوک اُٹھ رہی ہے"۔

اور

— ۱۵ —

"چیت ماسا چُندری رنگا دے ہو راما، چیت ماسا چندری"
میرے محبوب[2] چیت کا جنوں خیز موسم آگیا ہے ہم کو چندری رنگادو کہ ہم اس رنگ رلیوں میں زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہوسکیں ——

بدلتے ہوئے موسم کے سنگھم پر گلی گلی میں بسنت اور چیت کے نغمے کوئل اور پپیہے کے مضراب سے ہم آہنگ ہو کر کیف و سرور برساتے ہیں۔

بہار کی بھوجپوری بولی کا گیت بھی سن لیجئے جن کے اتار چڑھاؤ زیر و بم اور اظہار میں کتنی نغمگی ہے۔

— ۱۶ —

"تعسک میں رُدا کے باٹے ہم تو بیٹی لی بکرا۔ بے کھودی بھکے بنُولا چھین کے منواں ہمار ہمکو کا معلوم تھا دل کے کے توں کرباؤ گا۔ ہم تو اتنا جانتی تو پیت نا کرتی تہار"

"اے میرے محبوب ہم تمہارے عشق میں بہت زیادہ بیقرار ہیں تم نے میرا دل چھین کر ہم کو بیخود بنا دیا ہے ہم کو کیا خبر تھی کہ تم میرا دل لیکر ہم سے اس طرح بیوفائی کروگے۔ اگر ہم کو یہ معلوم ہوتا تو ہم کبھی بھی تم سے محبت نہ کرتے"۔

---

[1] بہار میں آم کی کیری کو "ٹیکورا" کہتے ہیں۔ [2] محبوب

# آسٹریلیا کی مشین اور دنیا کی غذا کا مسئلہ

ایڈگر بی

جیسے فصل پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے زمین تیار کرلی جائے اسی طرح کاشتکار طبقہ کو امداد باہمی کے اصول پر مشترکہ مشینوں، کے ذریعہ کام کرنے پر بھی تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس اسکیم میں جو مفید امکانات پوشیدہ ہیں ان کی کوئی حد و انتہا نہیں۔"

نیو ساؤتھ ویلز کی فارم میکنائزیشن (مشین کے ذریعہ زراعت کرنے کی) اسکیم کے اکزیکٹو افسر مسٹر لیونرڈ جڈ نے اس تحریک کی ——— جو آسٹریلیا میں کافی ترقی کرچکی ہے اور جس میں ہندوستان کیلئے بھی کافی دلچسپی کا سامان ہے، دشواریوں کا خلاصہ اور اس کے مستقبل کے متعلق اپنا اندازہ مذکورہ بالا الفاظ میں پیش کیا ہے۔

مسٹر جڈ کی خوش امیدی بیجا نہیں ہے۔ نیو ساؤتھ ویلز کے بعض ساحلی ضلعوں کے ان علاقوں کی پیداوار جہاں کاشت ہوتی ہے اس اسکیم کے ذریعہ انفرادی کاشت کے مقابلہ میں تین سو فیصدی تک بڑھ گئی ہے اور یہ محض اسلئے ممکن ہو سکا کہ صحیح وقت پر مشینری فراہم کردی گئی تھی۔ دودھ اور اس سے تیار ہونے والی اشیاء میں جو کمی ہوئی تھی وہ بہت کچھ اسی اسکیم کی وجہ سے خطرناک صورت اختیار کرنے سے رک گئی۔ اور یہ کامیابی ایسے حالات میں ہوئی جب ملک کے ایک بڑے حصہ میں قحط کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ یہ وہی دو سالہ قحط تھا جو ابھی حال میں دور ہوا ہے۔

مسٹر جڈ کا خیال ہے کہ "آگے چلکر پورے ملک میں اس اسکیم کے ذریعہ کاشتکاری کے طریقوں اور کاموں میں اہم ترقی ہوگی جس سے معاشی پیداوار بڑھیگی اور اس طرح ہی صنعت و حرفت کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا۔"

مسٹر جڈ نیو ساؤتھ ویلز کے محکمۂ زراعت میں ایک بڑے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ انہیں سالہا سال کا عملی تجربہ ہے کیونکہ وہ گیہوں پیدا کرنے والے ضلعوں میں نیز ان ضلعوں میں جہاں دودھ اور اس سے تیار ہونے والی چیزوں کا کاروبار ہوتا ہے فیلڈ افسر رہے ہیں اور اس کے علاوہ ہاکنسبری ایگریکلچرل کالج اور ڈیمورا اکسپیرمنٹ فارم میں فارم منیجر بھی رہ چکے ہیں لہذا انہیں اس طرح کی چیزوں سے پوری واقفیت ہے۔

اس اسکیم کے لگ بھگ کوئی نہ کوئی چیز تو ہونی ہی تھی اسلئے کہ آسٹریلیا۔ جس کی کل آبادی ستر لاکھ ہے۔ جنگ کے زمانے میں علاقہ بحرالکاہل کے ایک کروڑ بیس لاکھ انسانوں کو غذا فراہم کرنے کی ذمہ داری لے چکا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ دیہاتوں میں سیکھے ہوئے اور تجربہ کار کام کرنے والوں کی بیحد کمی تھی کیونکہ لوگ لڑائی میں بھرتی ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ نئی مشینیں اور فالتو پرزے بھی نایاب ہو رہے تھے۔ اس سب کے باوجود یہ اسکیم کچھ ایسی کامیاب ہوئی کہ اب اس کا جاری رہنا لازمی ہے۔ ماہرین یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اگر آسٹریلیا کو سمندر پار کی منڈیوں میں تجارتی مقابلہ اور برابری کرنی ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ابتدائی اور اہم پیداوار کے سلسلہ میں بالکل مشینوں سے کام لینا شروع کردے۔ ورنہ آسٹریلیا کو مقابلہ بہرحال کرنا ہی پڑے گا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آسٹریلیا کی برآمد کا تقریباً بیاسی فیصدی۔ جسکی اوسط مالیت ڈیڑھ ارب روپیہ سالانہ آتی ہے۔ زرعی صنعتوں کی پیداوار ہے۔ آسٹریلیا کے فارموں کی کل پیداوار کا تقریباً چالیس فیصدی باہر بھیجدیا جاتا ہے۔

## امداد باہمی کا طریقہ

مسٹر جیمس مارس بادن (کوئنس لینڈ) صدر اسٹریلین امریکن اسوسی ایشن نے حال ہی میں اخبارات کو یہ اطلاع دی ہے کہ ان کے پاس محکمہ جنگ کے پندرہ سو آدمیوں کی فہرست ہے جو اپنے وطنی ضلع میں واپس آنا چاہتے ہیں مگر وہ چاہتے ہیں کہ انہیں نوآبادکاری کی کوئی اسکیم دی جائے اور وہ اپنے طور پر مشینی ذرائع استعمال کرکے اس کو عمل میں لائیں۔ وہ ہمارے "کدال، بیلچہ اور ہاتھ گاڑی" کے تصور سے بیزار ہیں۔

اگرچہ آسٹریلیا میں جہانتک وسیع پیمانہ کی کاشت کا تعلق ہے، خصوصاً گیہوں کی کاشت کا، وہ مشینی ذرائع سے ہوتی ہے تاہم "کدال، بیلچہ اور ہاتھ گاڑی" کا جو نام لیا گیا ہے وہ غلط نہیں ہے اسوجہ سے کہ جنگ شروع ہونے تک چھوٹی چھوٹی آراضیوں کی کاشت میں انہیں چیزوں کا استعمال رہا ہے بلکہ بعض بعض جگہ اب بھی یہی صورت قائم ہے۔ البتہ اتنا یقین کیسا تھ کہا جا سکتا ہے کہ نیو ساؤتھ ویلز کی میکنائزیشن اسکیم نے دلوں میں جگہ کرلی ہے۔ اس اسکیم نے نیز اس قسم کی دیگر اسکیموں مثلاً غذائی کنٹرول

وکٹوریں گورنمنٹ میکنائزیشن اسکیم وغیرہ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ آسٹریلیا کے کاشتکار اور وہاں کی حکومتیں یہ تہیہ کر چکی ہیں کہ امداد باہمی کے طریقوں پر چل کر وہ خوش حالی کی منزل تک پہونچیں۔

مشترکہ مشینری، کے نظام نے ترقی پسند کاشتکاروں پر پوری طرح یہ بات روشن کر دی ہے کہ کاشتکاری کے مختلف مرحلوں کو جتنی وقت کا مسئلہ کافی اہم ہوتا ہے، اگر جلد از جلد طے کیا جائے تو اس سے کتنا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کاشتکاری کے جن جدید آلات کو کاشتکار امداد باہمی کے اداروں سے کرایہ پر لیا کرتا تھا اب انہیں اوزاروں کو وہ چاہے گا کہ اس کی ذاتی ملکیت ہو جائیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر ان کی قیمتیں اس کی دسترس سے باہر ہوئیں تو وہ کرایہ ہی پر لیکر کام چلاتے رہنے پر مجبور ہو گا۔

مسٹر جڈ کہتے ہیں کہ حکومت کی تحریک پر امداد باہمی کے ذریعہ کاشتکاری کا یہ تجربہ ایک انوکھی چیز ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں اس سے ملتی جلتی اسکیمیں تو ضرور چل رہی ہیں مگر بعینہٖ اس قسم کی کوئی اسکیم نہیں ہے۔ اس طریقہ میں جو خوبیاں فائدے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس اسکیم کے ذریعہ غلہ پیدا کرنے والوں کو دیہی صنعت پر سو فیصدی اقتدار قائم ہونا آسان ہو جاتا ہے۔

اس قسم کا پہلا مرکز جون ۱۹۴۳ء میں نادرا میں قائم کیا گیا اور نومبر ۱۹۴۵ء تک نیوساؤتھ ویلز کے ۳۰۹۴۲۳ میل تک پھیلے ہوئے علاقہ کے مختلف مقامات میں امداد باہمی کے اصول پر مشترکہ مشینری کے ۱۷ مرکز قائم ہو چکے تھے اور بیس مرکز اور قائم ہو رہے تھے مینڈی جیسے دور دراز مقام پر بھی جو دریائے ڈارلنگ پر واقع ہے ترکاری کی کاشت کرنے والوں نے مشترک ہو کر کام شروع کر دیا تھا۔ ان مشترکہ مشینری کے مرکزوں میں سے تقریباً ۷۰ فیصدی شمالی اور وسطی ساحل پر ہیں۔ ۲۱ فیصدی اندرون ملک کے قلعوں میں ہیں۔ ۱۶ فیصدی جنوبی سطح مرتفع میں ہیں اور ۱۱ فیصدی شمالی سطح مرتفع میں یا اس کے قریب واقع ہیں۔

## سرکاری امداد

مختصر یہ کہ ملکی حکومت نے غیر سودی رقمیں دیکر کاشتکار طبقہ کو امداد باہمی کے اصول پر استعمال کرنے کے لئے مشترکہ مشینری فراہم کرنے میں کافی مدد دی ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ اگر عام کاشتکار ذاتی طور پر اپنی کاشتکاری کا کام بالکل مشین کے ذریعہ سے انجام دینا چاہے تو اس کی مالی حیثیت اسے برداشت نہیں کر سکتی۔

سطح مرتفع کے علاقوں میں عام طور پر دو قسم کے مرکز قائم ہیں، ایک وہ جن سے غلہ کی کاشت میں مدد ملتی ہے دوسرے وہ جن سے فصل کاٹنے میں مدد ملتی ہے۔

جہاں دودھ وغیرہ کا کاروبار ہے وہاں عموماً پہلی قسم کے مرکز قائم ہوئے ہیں۔ جانوروں کے چارہ اور پانی کے ذخیروں کے سلسلہ میں بھی مشترکہ مشینری کے مرکز قائم کرنے کے لئے لوگوں میں قومی رجحان پایا جاتا ہے۔

پہلی قسم کے مرکز میں جو مشینیں ہوتی ہیں وہ یہ ہیں — ٹریکٹر، ہل مشین اور تخم ریزی کے آلات سطح مرتفع کے علاقوں میں ان مشینوں کے علاوہ کھیت کاٹنے کی مشین، گٹھے باندھنے کی مشین اور آلو کھودنے کی مشین بھی ہوتی ہے۔ بعض مرکزوں میں پورے اوزار ہوتے ہیں مثلاً اناج کاٹنے گھاس کاٹنے، گٹھا باندھنے، سوکھی گھاس باندھنے، گھاس سمیٹنے وغیرہ کی مشینیں۔ ان میں سے بعض اوزار ایسے ہیں جنہیں باہر سے منگانا پڑتا ہے۔ جنگ سے پہلے آسٹریلیا میں اوزار بنانے کی صنعت تھی جو زراعتی اوزاروں کی جدت اور اوزاروں کی عمدگی کیوجہ سے ساری دنیا میں مشہور تھی لیکن موجودہ حالات میں جس قسم کے اوزار وہاں کاشتکاری میں کام آتے تھے ان کی بناء پر

## معذرت

فرید جاوید

دیکھ کے حسین چہروں پر
دل کہ سوزِ دروں سے ہے مانوس
تیرا پیغام سرخوشِ تسلیم
مسکرانا بھی ہے محال اے دوست
بارہا نامراد آنکھوں نے
جائزہ لے نہ لیوں محبت کا
ادھ کھلی ہی رہے تو اچھا ہے
مجھکو رنگین آبگینوں میں
تجھ سے لازم ہے اجتناب مجھے
شامِ غم اضطراب کم نہ ہوا

کس کو فرصت نگاہ کون اٹھائے؟
ماہ پاروں سے کون آنکھ لڑائے؟
شدتِ غم سے دل اگر بھر آئے!
کسطرح قہقہوں سے کھیلا جائے
سے الاذہ بھی انتخابِ خواب چھلکائے
دیکھ اخلاص پر نہ حرف آ جائے
پھول بنکر کلی عبث مرجھائے
تلخ تر گھونٹ زندگی نے پلائے
گل کدے پر ترے خزاں کیا چھائے
دھیمے دھیمے سُروں میں گیت بھی گائے

ایک بیدار دل جوان شاعر
تا کجے رنگ و بو سے دل بہلائے

یہاں تیار ہونے والے اوزاروں کی قسمیں جو محدود تھیں۔ لیکن لڑائی کے زمانہ میں اس سلسلہ میں کافی ترقی ہوئی۔ اسلئے اب جس جس قسم کی مشینوں کی ضرورت ہوگی وہ تقریباً سب کی سب یہاں بن سکیں گی۔

قرضہ اور پٹہ کی اسکیم کے ماتحت یہ صورت ہوگئی تھی کہ اگر کوئی مشینری آسٹریلیا میں بن سکتی ہے تو وہ ممالک متحدہ امریکہ سے نہیں آسکتی تھی۔ لہذا کامن ویلتھ فوڈ کنٹرول کے مشینری سکشن نے صنعتی سہولتوں اور پیداوار کی بدلتی ہوئی ضروریات کا جائزہ لینا شروع کیا اور ۱۹۴۵ء میں ایک ایسا پروگرام شروع کیا جس سے فرموں کو کامن ویلتھ گورنمنٹ سے معاملات طے کرکے نئے نئے اوزار اور مشینری بنانے کی ہمت افزائی ہو۔ کامن ویلتھ کی وزارت سامان جنگ نے احکام نافذ کئے جنکی رو سے فرموں کو ۱۹۴۵ء کے اختتام تک ساڑھے سات کروڑ روپیہ مالیت کی مشین تیار کرنیکے لئے خام اشیا و مزدور اور وسائل فراہم کرلینے کا حق مل گیا۔ اب ایسی پچیس قسم کی نئی مشینیں تیار ہو رہی ہیں جو کامن ویلتھ میں اس سے پہلے نہیں بنی تھیں۔ ان مشینوں میں آلو کھودنے کی وہ مشینیں بھی ہیں جو پاور سے چلتی ہیں اور بیج بکھیرنے کی مشین، ترکاری بونے کی مشین، چقندر نکالنے کی مشین، مسراون، پھلی توڑنے کی مشین وغیرہ بھی ہیں۔ آسٹریلیا میں مشینی کاروبار کی مسلسل ترقی کے لئے یہ ایک عمدہ بنیاد مل گئی ہے۔

ان مشینوں کے علاوہ باہر سے بھی مشینیں منگائی گئیں اور اب بھی منگائی جارہی ہیں۔ مثلاً لڑائی سے پہلے تقریباً ڈیڑھ ہزار ٹریکٹر سالانہ کی درآمد کا اوسط تھا۔ ۱۹۴۳ء میں دو ہزار سے زیادہ ایسے ٹریکٹر درآمد کئے گئے جو ممالک متحدہ امریکہ میں وسیع پیمانہ کی کاشت کیلئے موزوں ثابت ہوچکے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سی دیگر اقسام کی مشینیں منگائی گئیں۔ ۱۹۴۴ء میں چھ ہزار سے زیادہ ٹریکٹر درآمد ہوئے۔

### سوسائیٹیوں کی امداد

امداد باہمی کے مشترک مشینری والے اداروں کی ترقی امداد باہمی کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ گذشتہ چند سال سے آسٹریلیا کی زندگی میں امداد باہمی کی سرگرمیاں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ نیو ساؤتھ ویلز گورنمنٹ ابتک اکیس لاکھ چالیس ہزار روپیہ سے زیادہ کاشتکار طبقہ کو قرض دے چکی ہے اور مزید رقمیں بھی مقرر ہوچکی ہیں۔

افراد کو تیس ہزار روپیہ تک دیا جاسکتا ہے اور وہ بھی بلا سود۔ یہ البتہ ضروری ہے کہ سوسائٹی منظور شدہ ہو، کاشت کرنے اور فصل کاٹنے کے سلسلہ میں منظور شدہ مشینریاں لینے پر آمادہ ہو اور اس کے لئے تیار ہو کہ ان مشینوں کو کاشتکاران ضلع کے فائدہ کے لئے اپنی نگرانی میں استعمال کرائیگی۔

اس رقم میں جو حکومت کی طرف سے دی جاتی ہے اس میں کام کا ابتدائی خرچ، تین مہینہ کی تنخواہ، ایندھن، تیل، پرزے اور مرمت کے اخراجات بھی لازماً شامل ہونے چاہئیں۔ اور بشرط ضرورت مکان فراہم کرنے کی سہولتیں بھی ہونی چاہئیں۔ اس اسکیم میں موٹر لاری یا ایسی مشین جو ضلع کی عام ضروریات کے لئے کارآمد نہ ہو یا وہ اوزار جیسے اوسط درجہ کے کاشتکار کو خود خریدنا چاہئے شامل نہیں ہیں۔

سوسائٹی کی ضروریات کی تفصیل نیو ساؤتھ ویلز کے دیہی بنک کی مقامی شاخ کے ذریعہ بھیجی جاتی ہے۔ جو رقم دی جاتی ہے وہ اسی شاخ کے مشینری ٹرسٹ اکاونٹ میں جمع کردی جاتی ہیں۔ مشینری کی خرید اس کی نگہداشت اور چلانے کے لئے جو رقم بھی نکالی جاتی ہے وہ ٹرسٹ اکاونٹ سے نکالی جاتی ہے اور مشین کے کرایہ کی جو رقم جمع ہوتی ہے وہ بھی اسی اکاونٹ میں جمع کی جاتی ہے۔ تین مہینہ کی ابتدائی مدت کے بعد کاشتکاروں سے جو رقم جمع کیجاتی ہے اس میں سے سوسائٹی مشین کی نگہداشت اور اس کے چلانے کے اخراجات وصول کرتی ہے۔

سوسائٹی کے ممبروں میں سے پچھتر فی صدی کاشتکار ہونا ضروری ہے۔ سوسائٹی کے لئے لازمی ہے کہ وہ مستقل اور معقول تنخواہ دار سکرٹری رکھے جسکے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ پورا وقت دینے والا آدمی ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہوشیار اور لائق مشین چلانے والا یا چلانے والے رکھے۔ سوسائٹی کے ڈائرکٹر ایسے لوگ ہوں جنکی اس طبقہ میں وقعت ہو۔ سوسائٹی کے لئے لازمی ہے کہ وہ ان قرضہ جات کی ادائیگی کا ذمہ لے اور کوآپریٹو ایکٹ ۱۹۲۳-۲۵ء کے ماتحت رجسٹرڈ ہو۔ منافع اداشدہ سرمایہ کا چھ فیصدی سے زیادہ نہ مقرر کیا جائے اور کوئی رکن اس کے حصوں کی مجموعی تعداد کے ۱/۵ سے زیادہ حصہ نہ خریدے۔

امداد باہمی سوسائٹی کے ارکان کی تعداد کم از کم سات ہو اور ہر رکن کے پاس کم از کم پانچ حصے ہوں اور ایک حصہ کی قیمت عہ۱۱ ہو۔ ایک ہی قسم کی دو یا دو سے زیادہ سوسائیٹیاں اگر چاہیں تو باہمی

د کے پیش نظر متحد ہوکر ایک اسوسی ایشن بنالیں اور دو یا دو سے
ادہ اسوسی ایشن متحد ہوکر ایک یونین بنالیں۔ یقین کیا جاتا ہے کہ ان
توں سے امداد باہمی کے اصول پر فارموں کو مشینری کے ذریعہ
انے میں کافی اہم قسم کی مدد ملے گی۔

**شتکار کا نفع** اس اسکیم سے کاشتکاروں کے لیے منافع
کی حسب ذیل صورتیں ہونگی۔

(۱) زندگی کا بہتر طریقہ۔ خصوصاً دودھ اور اس سے تیار
نے والی چیزوں کا کاروبار کرنے والوں کو پبلک کاموں کیلئے
ملاً تفریحی اور تعلیمی مشاغل کیلئے زیادہ وقت ملیگا۔ خصوصاً پیداوار
مسائل پر تفصیل کیساتھ غور و خوض کرنے کا زیادہ وقت ملیگا۔
، پیداوار میں جلد اور موثر اضافہ ہوگا۔ (۳) اس وقت آدمیوں
محنت کی کمی بیشی پر پیداوار کا بہت زیادہ انحصار ہوتا ہے اس کے
دا اس حد تک یہ انحصار نہیں باقی رہیگا۔ (۴) ایک ایسے مکمل اور
دید ترین یونٹ کی خریداری کے لئے جو سوسائٹی کی ضروریات کے
اظ سے موزوں ہو مالی وسائل بہ اطمینان فراہم ہوسکیں گے اور
ن رقم کی جو غیر سودی قرض کے طور پہلے کی ادائیگی کی صورت
، سوسائٹی کی حیثیت کے مطابق مقرر ہوگی (۵) ڈیری فارم کے
مویشیوں کی بہتر نگہداشت ہوسکے گی اور ترقی کی نئی نئی صورتیں سوچنے
کا موقع زیادہ ملے گا (۶) فارم کا کام زیادہ بہتر اور سلجھے ہوئے
طریقہ پر ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے حوصلے بڑھے رہینگے۔ وہ
زیادہ دلچسپی اور جوش و خروش سے کام کرینگے، زیادہ بہتر کام
کرینگے۔ اور اس کا یہ اثر ہوگا کہ زراعت کا کام جدید ترین سائنٹفک
اور اقتصادی طریقوں پر ہونے لگیگا۔ (۷) ایک ایسی بنیاد مہیا ہوجائیگی
جس پر صحیح معنوں میں کاشتکاروں کے درمیان امداد باہمی اور پیدا
کرنے والوں کے اقتدار کی عمارت تعمیر ہوسکے گی۔ (۸) اس وقت کے
ذاتی فارموں میں جو ضرورت سے زیادہ سرمایہ دارانہ حیثیت پائی
جاتی ہے وہ ختم ہوجائے گی (۹) زراعتی کام وقت پر مکمل ہونگے۔
(۱۰) جدید طریقے جلد سے جلد پھیل جائینگے۔ (۱۱) غلامانہ مشقت کا
قصہ ختم ہوجائے گا۔ (السٹریٹیڈ ویکلی بمبئی سے ماخوذ)

**لکھنے والوں سے:۔** رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط
کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالہ میں شائع کر لیا جائے یا
اس رائے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے علمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ
رکھیں۔ (ادارہ)

# آشوب

افسانہ

رفیق علی

طاہرہ کے لئے رد بے تو وبال جان ہوکر رہ گئے تھے۔ جب اس کی بوڑھی ماما پیالی میں سفیدہ گھس کر لاتی تو اس کی روح کانپ اٹھتی، وہ ایک جھرجھری سی لیتی مگر اس کی تمام مدافعانہ کوششیں بے کار رہ جاتیں، وہ اس کے سر کو بری طرح دبوچتی، وہ حیران رہ جاتی آخر اس مریل بڑھیا میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی ہے، اور اس کی سخت سخت سی انگلیاں جیسے کسی نے پتھر کی سلائی پھیر دی ہو، وہ سر شام ہی مرغی کی طرح لحاف میں سکڑ کر دبک جاتی، وہ خر خر خراٹے بھی لینے لگتی، اس کا باپ کہتا "طاہرہ بڑی گہری نیند سو رہی ہے" اسے اپنے باپ کی سادہ لوحی پر بڑی ہنسی آتی، وہ دوپٹے کا پلو اپنے منہ میں ٹھونس لیتی، مگر ماما کے پیروں کی چاپ سن کر وہ یوں کلبلانے لگتی جیسے بین پر سانپ ناچ رہا ہو، اس کے لئے ماما عزیزن افسانوی جادوگرنی سے کم خونخوار نہ تھی، پوپلا منہ، سفید بال، جھریوں والی کھال، موٹی موٹی ابھری نسیں، مگر جب وہ پیار بھرے لہجہ میں کہتی "اٹھو بھی میری شہزادی"، تو اس کا تمام خوف دور ہوجاتا، اور وہ یوں سب باتیں مان لیتی جیسے سچ مچ وہ شہزادی ہے کیونکہ اس نے کہانیوں میں سنا تھا کہ شہزادی کبھی بری لڑکی نہیں ہوتی۔

وہ اگر بچوں کی طرح ٹھنکتی تو بڑھیا کی گرفت اور سخت ہوجاتی، وہ اسے جھنجوڑ ڈالتی "اے ہے بی بی اب تم بچہ تھوڑی ہو" اور وہ اس طرح دل کڑا کر لیتی جیسے اس نے ماما کے چیلنج کو منظور کر لیا ہو، مگر اس کی تسلی میں سچی ہمدردی کی چاشنی ہوتی "بی بی اس میں میرا کیا فائدہ، تمہاری ہی آنکھیں بھری بھری ہوجائیں گی، ایسی بڑی بڑی نکل آئیں گی کہ بس دیکھا کرو"، یہ سن کر وہ اطمینان کی ٹھنڈی سانس بھرتی، کیونکہ اسے احساس تھا کہ بغیر آنکھیں ہرا ہوئے اس کا شہزادہ اس کے پاس نہ آئے گا، وہی شہزادہ جس کے بارے میں وہ لاکھوں بار کہانیوں میں سن چکی تھی۔

وہ ایسی منزل پر کھڑی تھی جہاں بچپن اور جوانی گلے ملتے ہیں اسی لئے جب وہ اپنے بچپن کے بارے میں سوچتی تو اوروں کی طرح ہلکی سی ٹھنڈی آہ اس کے نمکین ہونٹوں کو مرتعش نہ کرتی، ماضی کی یاد گرد بن کر بدن میں تحلیل نہ ہوتی بلکہ اسے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کل کی بات ہو، ایک ایسی کہانی جو بوجھل پلکوں کی وجہ سے پوری نہ سن سکی ہو اور دوسرے دن پھر اسی کی فرمائش کرلے۔

ماں کی وفات طاہرہ کے لئے ایک جانسوز واقعہ تھی، یہیں اس کو زندگی کا تسلسل دم توڑتا محسوس ہوتا جیسے زندگی کی کچھ کڑیاں ایک دوسرے میں پردے جانے سے رہ گئی ہوں، وہ بھولی ہوئی تھی کہ اس کی ماں نہیں ہے، وہ تو یہی سمجھتی جیسے وہ پریوں کے ملک میں اس کے لئے شہزادہ ڈھونڈنے گئی ہے، اس کی ماں کی تمام چیزیں ویسی ہی رکھی تھیں، اس کا باپ ہر اس شے کو جو ہاجرہ کی زندگی سے متعلق تھی علیحدہ کرنے پر تیار نہ تھا۔ اس کی خالہ زاد بہن نے اس سے رازدارانہ طور پر کہا "اے ہے بہنو! خالو آبا بھی کیا سٹھ گئے ہیں، کوئی مُردوں کے کپڑے بھی یوں سینت سینت کے رکھتا ہے" اور تو اور خود دادی جان نے بھی کہا "اس سانحہ سے صمد کا دماغ ماؤف ہوگیا ہے" جتنے منہ اتنی باتیں سن کر وہ سراسیمہ ہوجاتی، وہ جائے نماز پر بیٹھ کر بہت گڑگڑا کر دعائیں مانگتی یا اللہ میاں میرے ابا اچھے رہیں" مگر جب اس کی ماما اسے سمجھاتی کہ بیٹی اس دنیا میں سچی محبت کرنے والے ہی تو دیوانے کہلاتے ہیں"، تو اس کا تحیر کچھ مٹ جاتا اور وہ اپنی لٹوں کو اوپر پھینک کر کہتی "مٹ جائیں میرے ابا کو پاگل کہنے والے!"

اسے پچھلی باتیں اچھی طرح یاد تھیں جیسے وہ بھی چھوٹی چھوٹی کہانیاں سی ہوں، اس نے اپنی آنکھوں کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہ کی تھی مگر اس نے اپنے ابا کو اکثر کہتے سنا تھا کہ ہاجرہ طاہرہ کی آنکھیں تم سے کتنی ملتی ہیں، اس کی ماں کی آنکھیں کتنی شربتی تھیں، کتنی نیلی گہری آبی۔ وہ بڑے اشتیاق سے سنا کرتی کہ اس کے پیدا ہونے پر اس کی آنکھوں پر کیسا کیسا تبصرہ ہوا، اوٹ پٹانگ باتیں جن کا سر نہ پیر، کسی نے کہا یہ تو صمد کی لڑکی ہی نہیں معلوم ہوتی اور ہاجرہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا، طاہرہ سانولی تھی اور ہاجرہ اور صمد دونوں گورے۔ مگر وہ بہت ملیح تھی، جیسے سپیدۂ سحر میں سے شبنمی رات کی تازگی جھلملاتی ہو، اس کی آنکھوں کے بارے میں سب کی ایک ہی رائے تھی، صمد جب یہ کہتا کہ "ہاجرہ اس کی آنکھیں تو تم سے بھی زیادہ کٹیلی ہیں" تو وہ اس طرح کھل اٹھتی جیسے اس کی تعریف میں آخری الفاظ کہہ دیے گئے ہوں، طاہرہ کی آنکھوں کے بارے میں عجیب عجیب تاویلیں پیش کی جاتیں، کچھ کا خیال تھا کہ ہاجرہ کلکتہ میں جو ایک سال رہی ہے یہی تاویل سب سے زیادہ سراہی جاتی، اسی لئے سب اسے پیار میں بھولی بنگالن کہتے، اس کی لانبی پلکوں پر عجیب سحر منڈلاتا رہتا اس کے بھولے چہرے میں دل میں گھر کرنے کی بے پناہ قوت تھی، طاہرہ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لی جاتی اور ہاجرہ کو گود میں لینا بہت کم نصیب ہوتا، جب وہ بہت کڑھتی تو صمد اسے تسلی دیدیتا "ہر خوبصورت شے کسی ایک کا اجارہ نہیں ہوتی، اب جو لوگ مڑ مڑ کر تمہیں دیکھتے ہیں تو میں برا تھوڑی ہی مانتا ہوں" اور ہاجرہ لجا کر سمٹ کر پلکوں کی عجیب جنبش

سے کہتی "آپ تو نرے شاعر ہیں!" جس میں کچھ طنز بھی ملی ہوتی کیونکہ صمد کا یہی رونا تھا کہ "ماجرہ تمہارے حسن میں کتنی شعریت ہے اور میں کتنا روکھا پھیکا آدمی ہوں کہ اس کی اچھی طرح تعریف بھی نہیں کر سکتا۔"

آج جب وہ اپنے گھر لوٹی تو اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں، جذبات کے کالے کالے بادل اسکے عضو عضو میں منڈلا رہے تھے، اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ خالہ کے گھر کبھی نہ جائے گی، کیونکہ ساجدہ، شہلا، فاخرہ، نے آج اسے دل کھول کر چندی ہی چندی کہا، وہ بھی صرف اس لئے کہ عابد کسی ایسی ویسی نظر سے نہ دیکھے، کتنی اترانی ہیں بیچاری اپنی صورتوں پر، وہ چندی ہے تو اپنے لئے ہے۔ یہ یاد کرکے اس کی آنکھیں بھر آئیں کہ چندی کہنے پر اس کی ماں کتنی برہم ہوا کرتی تھیں، وہ بہت وہمی تھیں زیادہ محبت کرنے والے وہمی بھی ہوتے ہیں، ان کا خیال تھا کہ نانی عشو کی نظر طاہرہ کی آنکھوں کو کھا گئی کیونکہ انہوں نے ان کی شادی میں بھانجی ماری تھی، اس لئے وہ اکثر مرچوں سے اس کی نظر اتروائیں وہ اپنی ماں کی سنگار میز کے پاس کھڑی ہو گئی، اس کی ماں کی ایک ساڑی الگنی پر ٹنگی ہوئی تھی جیسے چوہے کتر گئے تھے دھول میں اٹے ہوئے پرانے چپل پڑے ہوئے تھے، کٹوری میں میلا میلا سا ناریل کا تیل جما ہوا تھا، طاہرہ مبہوت سی کھڑی تھی جیسے کسی نے اس پر مسمریزم کر دیا ہو، اس کے دل و دماغ میں ایک تازگی سی دوڑ گئی، اس نے یونہی ماما کو پکارا جیسے وہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ چائے تیار رکھے۔ امی طارق میاں کے یہاں سے لوٹیں گی تو چائے مانگیں گی مگر اسے ایک دھچکا سا لگا جیسے وہ آسمان سے زمین پر آ رہی ہو، طلسم ٹوٹ چکا تھا، وہ اپنی ماں کی ساڑی کو گالوں سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر خوب روئی، وہ سوچتی اسکی تعلیم کی وجہ سے اکثر امی ننہیال جاتے وقت اسے چھوڑ جاتیں، وہ سوچتی جیسے وہ ان کو ایک لمبا چوڑا شکایتوں سے بھرا خط لکھے گی.... "امی تم ایسی گئیں کہ لوٹی ہی نہیں، ماما عزیزن کی انگلیاں لوہا ہوتی جا رہی ہیں۔ سب کام کاج میں کرتی ہوں، ابا کہتے ہیں وہ تمہاری غیر موجودگی کو بھول سے گئے ہیں...... میری اچھی امی اب کے آنا تو میرے لئے اچھی سی روہوں کی دوا لیتی آنا"...... وہ ڈبڈبائی آنکھوں، گرم گرم گالوں اور کچے کچے خیالوں میں بالکل گڑیا سی لگ رہی تھی!!

وہ جب کبھی بھی اپنی بہنوں کے ساتھ بازار جاتی تو بناؤ سنگھار نہ کرتی، بہت کیا تو ڈھنگ سے دوپٹہ لپیٹ لیا، وہ بازار کی دوکانوں اور چلتے پھرتے آدمیوں کو کم دیکھتی بلکہ زیادہ تر وہ حیرت سے ساجدہ اور شہلا کو دیکھا کرتی، کس طرح ان کی آنکھیں ناچا کرتی ہیں، وہ دونوں پسینہ میں شرابور ہوئی جاتیں، وہ اگر ان سے بازار میں خوش ہو کر لپٹنے کی کوشش کرتی تو وہ جھٹک دیتیں "طاہرہ یہ کیا بدتمیزی ہے اپنے سہارے چلو" اور وہ یوں چونک اٹھتی جیسے واقعی اسے سہارے کی ضرورت ہے، اس نے اکثر بازار سے لوٹ کر گھر اکھڑا کر ساجدہ کو کہتے سنا "نہ جانے کیا لوگوں کی بدتمیز عادت ہے جو گھور گھور کر دیکھتے ہیں" اور وہ یہ کہکر بیر بہوٹی سی ہو جاتی یہ سوچ کر اس کی آواز عابد نے ضرور سن لی ہوگی، مگر دل میں طاہرہ خوش ہوتی کہ وہ بہت خوش قسمت ہے لوگ اسے گھور کر نہیں دیکھتے، ورنہ اسکے ریشمین کپڑے بھی ساجدہ اور شہلا کی طرح پسینہ میں بھیگ جایا کریں!

اس کی آنکھیں اچھی ہو گئی تھیں پھر بھی وہ چندی تھی، اسی لئے اب وہ چڑچڑی سی ہو گئی تھی، وہ ساجدہ اور شہلا سے ایک عجیب قسم کا انتقام لینے کے منصوبے باندھا کرتی، وہ چاہتی کسی طرح عابد بھی اسے چندی کہے اور ادھر وہ ایک دو تھپڑ کس کے اس کے منہ پر مارے کہ پانچوں انگلیاں بن جائیں اس طرح وہ ساجدہ اور شہلا سے اپنی ہتک کا بدلہ لے لے مگر ایسا تو کوئی موقعہ ہی نہ آیا اور انتقام کی آگ اس کے دل و دماغ میں سلگتی رہی، ایک دن وہ کمرے میں بیٹھی چوٹی گوندھ رہی تھی، دالان میں سب بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، ان میں عابد بھی تھا، آنکھوں کی تعریفیں ہو رہی تھیں، ساجدہ کا کہنا تھا کہ شہلا کی غلافی آنکھیں اچھی ہیں، شہلا تعجب کر لوتی نہیں "آپا نجمہ کی ہرن جیسی بڑی تو خاندان میں کسی کی بھی نہیں" مگر عابد کے منہ سے یہ سن کر "نہیں بھئی طاہرہ کی سی کشش کسی میں نہیں جیسے کوئی دل کھینچ رہا ہو" وہ چونک پڑی اس نے غیر شعوری طور پر نرم نرم گالوں پر ہاتھ پھیرنے شروع کئے یہ محسوس کرنے کے لئے کہ عابد کی انگلیوں کے لال لال نشان تو نہیں بن گئے ہیں!

وہ جب ان دونوں کے ساتھ بازار سے لوٹی تو بہت خوش تھی، مگر ساجدہ اور شہلا یوں کچھ خاموش خاموش سی تھیں، وہ دونوں کچھ اس طرح ہانپ رہی تھیں جیسے کسی نے ان کو دوڑایا ہو، وہ دونوں طاہرہ سے بول بھی نہیں رہی تھیں، ان کی نظر میں آج طاہرہ نے وہ ناگفتہ بہ حرکتیں کی تھیں کہ اس کے ہاتھ جوڑنے پر بھی اس کو معاف نہ کیا گیا ان کو اتنا تعجب ضرور تھا کہ آخر یہ حرکتیں اس نے سیکھی کہاں سے، یہی کہ لیمو بنڈی کر ہنسکر دوکاندار سے بولی "کیا کیجئے گا پیسے لیکر" وہ دونوں ہانپتی جاتی تھیں، زیور اوتارتی جاتی تھیں اور فاخرہ کو سناتی جاتی تھیں "بہنو اس مردود نے جب پیسے پھینک دئے تو اس قطامہ نے اٹھا بھی لئے" اور طاہرہ یہ سب سن کر

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

# ہندوستان اور چین کے مابین تجارت

**شمشیر سنگھ**

دنیا کے کوئی سے دو ملک ایک دوسرے سے اسقدر مشابہ نہیں ہیں جتنے کہ چین اور ہندوستان ہیں۔ دونوں کے رقبے وسیع، آبادیاں گنجان، باشندے غریب اور ثقافتیں قدیم ہیں۔ دونوں اپنے اپنے ملک میں زراعت کو ترقی دینے، نت نئی صنعتوں کو اختیار کرنے اور عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ چین نے حال ہی میں صحیح معنوں میں آزادی حاصل کی ہے، ہندوستان اس آزادی کے دروازے پر ہے۔ قدیم زمانے میں ان دونوں کے مابین گہرے تعلقات قائم تھے۔ دونوں کا مستقبل بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہے کیونکہ دونوں ایشیا میں امن و عافیت کے خواہاں ہیں۔ ان کے پچھلے تعلقات اور اگلے ارادوں کے پیشِ نظر کہنا پڑتا ہے کہ ان کے مابین اتحادِ باہمی کا قائم ہونا لازمی ہے۔ اس پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے چین کے لئے ایک تجارتی وفد کا بھیجا جانا ثابت کرتا ہے کہ حکومت کا یہ اقدام بالکل مناسب اور برمحل ہے لہذا اقتصادی اعتبار سے چین اور ہندوستان کی راہ اتحاد پر یہ وفد ایک اہم سنگ میل نصب کرے گا۔

لڑائی سے پہلے چین و ہند کی تجارت کچھ زیادہ قابلِ ذکر نہیں تھی۔ ہندوستان سے جانے والے مال کی مجموعی قیمت دو کروڑ روپے کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ یہاں سے جانے والی چیزوں میں کچی روئی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ دوسری قابل ذکر چیزوں میں سن کا سامان، کپاس، تمباکو، گٹ پیس کا مال، کوئلہ، چٹائیاں، چمڑا، کھالیں، لوہا اور صندل کا تیل شامل تھا۔ اس کے برعکس چین سے آنے والے مال میں سوتی دھاگے، کچے ریشم، اور ریشم کے سامان کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ دوسرے ملکوں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چین کی غیر ملکی تجارت میں ہندوستان کا حصہ بہت ہی قلیل تھا۔ تاہم لڑائی نے صورتِ حالات کو بڑی تیزی کے ساتھ یکسر بدل ڈالا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۴۱ء میں چین جانے والے ہندوستانی مال کی قیمت آٹھ کروڑ نوے لاکھ کے قریب ہو گئی۔ لیکن جب امریکہ لڑائی میں شامل ہو گیا اور جاپانیوں نے چین کے بہت بڑے علاقے پر قبضہ جما لیا تو تجارت کو ایک زبردست دھکا لگا چنانچہ اب امن و عافیت کی فضا قائم ہو جانے پر حکومت ہند نے چین کے ساتھ اپنے ملک کی تجارت کو بحال کرنے کے لئے اپنی توجہ مبذول کی ہے یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان چین کو وہ سب سامان دے سکتا ہے جو لڑائی سے پہلے یہاں سے جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان مختلف صنعتوں کا مال بھی دیا جا سکتا ہے جنکو لڑائی کے دوران میں ترقی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ ہندوستان سے مال جانا شروع ہو یہ پتہ چلانا لازمی تھا کہ چین میں بازار کے حالات کیا ہیں اور وہاں کے لوگوں کو ٹھیک ٹھیک کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اسی لئے حکومت ہند نے ایک تجارتی وفد اس ملک میں بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ ضروری معلومات حاصل کر لائے۔

اس وفد کے اراکین میں کے کے چینئی، تلسی داس، کلہ چند، جی پی کوٹک، ایم ایس سی جسّا والا اور اے اے جاویری شامل تھے۔ یہ لوگ کلکتے سے ۲۰ فروری کو روانہ ہوئے اور تقریباً آٹھ ہزار میل کا ہوائی سفر کرنے کے بعد ۲۹ مارچ کو واپس آگئے۔ اس مختصر عرصے میں وفد نے ہانگ کانگ، شنگھائی، پائینگ، تین تسن اور چنکنگ کا دورہ لگایا۔ شنگھائی سب سے اہم بندرگاہ ہے۔ عام دنوں میں چین کی نصف غیر ملکی تجارت اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ پائینگ چین کا تاریخی شہر ہے اور اپنے شاندار محلوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ چنکنگ زمانہ جنگ کا صدر مقام اور ملکوں کے عزم راسخ اور آئندہ کی امیدوں کا مثالی نمونہ ہے۔ وفد مذکور نے ان تمام مقامات کے تجارتی حالات کا جائزہ لیا، اعداد و شمار جمع کئے، مشہور کاروباری لوگوں، سوداگروں اور ایوانِ تجارت کے ممبروں سے ملاقات کی، نیز جنرلسیمو چیانگ کائی شیک اور ڈاکٹر ٹی وی سونگ جیسے نامور چینی راہنماؤں سے تبادلہ خیالات کیا۔ ہر موقع و محل پر چینیوں اور ان ہندوستانیوں نے جو چین میں آباد ہیں اس وفد کے اراکین کا خیر مقدم کرتے ہوئے پرخلوص مہمان نوازی اور دلی اتحاد و تعاون کا اظہار کیا۔ وفد کی جمع کی ہوئی اطلاعات، ان بنیادوں پر نکالے ہوئے نتائج اور سفارشات ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہو گئی ہیں جس کا نام "چین جانے والے تجارتی وفد کی روداد" ہے۔ اس روداد میں چینی صنعت پارچہ بافی کی نوعیت، تمباکو کی پیداوار اور روپے پیسے کے مفصل حالات

شامل ہیں۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دونوں ملکوں کے مابین تجارتی امکانات کس حد تک قائم ہو سکتے ہیں۔

دنیا کے نئے ترقی یافتہ ملکوں میں صنعتِ پارچہ بافی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جاپان اپنی اسی صنعت کی بدولت دنیا کے صنعتی ملکوں کی صف اول میں آ گیا تھا۔ اب سے کچھ عرصے پہلے چین بھی اپنی اس صنعت کو ترقی دینے میں لگا رہا تھا۔ وفد کا بیان ہے کہ وہاں لڑائی کے ہاتھوں اس صنعت کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ لڑائی سے پہلے اس کے کارخانوں میں پچپن لاکھ تکلے موجود تھے جنکی تعداد اب چالیس لاکھ رہ گئی ہے۔ قیاس ہے کہ ان میں سے نصف تکلے اس سال کے آخر تک اور باقی ایک آدھ سال میں چلنے شروع ہو جائینگے۔ چین کے ارباب تجارت اس صنعت کو فروغ دینے کے لئے ایک پُرامید لائحہ عمل بنا چکے ہیں تاکہ ایک طرف اس نقصان کی تلافی ہو جائے جس سے لڑائی کے ہاتھوں دوچار ہونا پڑا ہے اور دوسری طرف جنوب مشرقی ایشیا میں ان منڈیوں پر قبضہ جما لیا جائے جنکو لڑائی سے پہلے جاپانیوں نے ہتھیا رکھا تھا۔ اگر وہ فالتو تکلے جنکی فراہمی کی فرمائش برطانیہ اور امریکہ سے کی گئی ہے، وقت مقررہ تک پہنچ گئے تو چین تین سال کے اندر اندر اپنے ملک میں تیار ہونے والے کپڑے کی مقدار کو دوگنا کر دے گا۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا چین اپنے کارخانوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کچی روئی کافی مقدار میں پیدا کر سکتا ہے؟ لڑائی سے پہلے روئی کی پیداوار کے سلسلے میں چین کا تیسرا نمبر تھا۔ اسکی کوشش تھی کہ وہ اپنا کفیل خود بن جائے چنانچہ ۱۹۳۶ء تک اسے اس کوشش میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن لڑائی اور پھر ۴۱-۱۹۴۰ء میں آنے والے طوفان نے اس کے لائحہ عمل کو درہم برہم کر دیا اور نتیجہ یہ کہ آج چین کو اپنے کارخانے چالو رکھنے کے لئے غیر ملکی کپاس پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ اب وہ اپنی اس حکمتِ عملی کو کہ اس سلسلے میں اپنا کفیل آپ ہو جائے، بروئے کار نہیں لا سکتا کیونکہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ پالنے کے لئے اسے لامحالا اشیائے خوراک کی پیداوار کو ترجیح دینی پڑے گی لیکن صنعت پارچہ بافی کو حسب ارادہ فروغ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ روئی کی مانگ بڑھ جائے گی۔ نیز جاپان کے قائم کئے ہوئے وہ کارخانے جو اب چین کے قبضے میں ہیں، بہتر طریقے پر چل سکتے ہیں بشرطیکہ درمیانی اور چھوٹی قسم کی ہندوستانی روئی استعمال کی جائے۔ ان حالات کے پیش نظر یقینی ہے کہ آئندہ کئی سال تک چین میں ہندوستانی روئی کی مانگ کا سلسلہ جاری رہیگا۔

روئی کے علاوہ چین کو ہندوستانی تمباکو کی بھی ضرورت پڑے گی۔ اس کی کاشت وہاں کے تقریباً سبھی صوبوں میں ہوتی ہے۔ کپاس کی طرح اس کی پیداوار میں بھی شنگھائی کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن اسوقت سگرٹوں میں استعمال ہونے والے تمباکو کی اس ملک کو سخت ضرورت ہے۔ کم سے کم پانچ کروڑ بیس لاکھ پونڈ درکار ہے۔ اس کمی کو امریکی اور ہندوستانی تمباکو کی درآمد سے پورا کرنا پڑے گا۔ سگرٹ بنانے کے واسطے معیاری مرکب کے لئے تیس فیصدی امریکی، دس فیصدی ہندوستانی اور ستر فیصدی چینی تمباکو ملانا پڑتا ہے۔ اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال چین کو ستر لاکھ سے ایک کروڑ پونڈ تک ہندوستانی تمباکو کی ضرورت ہو گی۔ اس وقت یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ آئندہ چین کی منڈیوں میں ہندوستانی تمباکو کے امکانات کس حد تک خوشگوار ہونگے۔ چین میں موجودہ رجحانات یہ ہیں کہ کسی طرح سگرٹوں والے تمباکو کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے تاکہ باہر کا مال کم منگانا پڑے۔ تاہم شمالی چین میں غیر معیّن صورتِ حالات، حمل و نقل کی سہولتوں میں کمی، اور اقتصادی زندگی میں ابتری ہونے کے باعث ابھی کچھ عرصے تک ہندوستانی تمباکو کے بغیر گذارہ کر لینا چین کے لئے ممکن نہیں ہو سکے گا۔

عام ضروریات کی چیزوں کے لئے بھی چین میں عمدہ تجارت کا موقع ہے۔ روزمرہ استعمال ہونے والی اشیاء کا دس سال تک کال پڑا رہا ہے اسلئے ان کی مانگ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ جنگ سے پہلے چین تقریباً چھ بیس لاکھ روپے کا مال جرمنی سے منگواتا تھا۔ اس مال میں بائسکلیں، صابن، چمڑا، چمڑے کا سامان، چینی کے ظروف، ٹین میز اور دفتر کا ضروری سامان شامل تھا۔ اب ان میں سے بعض چیزیں ہندوستان بھی بھیج سکتا ہے لیکن وہ اتنی ہی رقم کے عوض اور ان تمام اقسام کا سامان نہیں بھیج سکتا جو پہلے جرمنی سے آتا تھا کیونکہ اول تو دوسرے ملکوں کے تاجر مقابلے کے لئے موجود ہیں اور پھر خود ہندوستان بھی خوبی اور پائداری کے لحاظ سے اتنا اچھا سامان تیار نہیں کر سکتا جو جرمن کے مال کا مقابلہ کر سکے۔ تاہم اس کے لئے اس تجارت پر حاوی ہو جانے کا زرّین موقع ہے جسپر جاپان قبضہ کئے ہوئے تھا کیونکہ مغربی ممالک میں تیار ہونے والے عمدہ مال کے برعکس جاپانی مال کا مقابلہ کر لینا ہندوستانی مال کے لئے کہیں زیادہ ممکن ہے۔ لڑائی سے

پہلے چین کروڑوں روپے کا مال جاپان سے منگاتا تھا مثلاً سوتی کپڑے کے ٹکڑے، لوہے اور فولاد کی چیزیں، چینی کے ظروف، عمارتی سامان، ربڑ کی چیزیں اور دیا سلائی کے بکس وغیرہ۔ یہ چیزیں ہندوستان سے بھیجی جاسکتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تجارتی میدان میں دوسرے ملکوں سے سخت مقابلہ رہے گا خصوصاً امریکہ سے کیونکہ وہاں سے اس وقت بھی امداد باہمی اور رفاہِ مشترک کے طور پر کثیر مقدار میں ہر قسم کا سامان اس ملک میں بھیجا جارہا ہے۔ تاہم یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ قیمت کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی مال کے لئے مغربی سامان کا مقابلہ کرلینا ممکن ہے بشرطیکہ کافی عمدہ اور پائدار ہونے کے ساتھ ساتھ قیمت کے لحاظ سے بھی وہ اتنا ارزاں ہو کہ چینیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے۔ یہ سچ ہے کہ خود ہندوستان میں بھی عام ضروریات کے سامان کی کمی محسوس ہورہی ہے تاہم یہ حقیقت بالکل صاف اور واضح ہے کہ اگر اس زرّیں موقع پر ہندوستان نے اپنے مال کا کچھ حصہ وہاں نہ بھیجا تو آئندہ وہ اچھی صورت مشکل ہی سے ممکن ہوسکے گی جو لڑائی سے پہلے جرمنی اور جاپان کو تمام جنوب مشرقی ایشیا کی منڈیوں میں حاصل تھی۔ پھر یہی نہیں کہ ہندوستان کی تجارت کا یہ تعلق صرف چین سے وابستہ ہو کر رہ جائیگا۔ بلکہ جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ بھی تعلقات پیدا ہونے کی صورتیں نکل آئیں گی۔

روئی، تمباکو اور عام ضروریات کے سامان کے عوض چین اپنا ریشم، ٹنگ کا تیل، ہری پھلیاں، سویابین، سبز چائے، سؤر کے بال اور دھات وغیرہ ہندوستان بھیج سکتا ہے۔

ریشم کو قدیم ترین زمانے سے چین کی برآمدی تجارت میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ پہلے بھی ہندوستان چین سے کچا ریشم اور ریشم کا سامان منگایا کرتا تھا۔ آج بھی اسے ہر قسم کے ریشمی سامان کی ضرورت ہے۔ اگرچہ آجکل چین کے ریشمی مال کی قیمتیں لڑائی سے پہلے کے مقابلے میں تین گنی ہوگئی ہیں تاہم ہندوستان میں اب بھی اس کا سکہ آسانی سے چل سکتا ہے۔ بہترین قسم کا کچا ریشم کوانگ سو اور زچی کیانگ میں تیار ہوتا ہے۔ کچا زرد ریشم ذی شون میں اور ٹسا منچوریا اور شان تنگ میں بنتا ہے۔ چین میں ریشم کا موسم مئی میں شروع ہوکر اکتوبر میں ختم ہوتا ہے۔ ٹنگ کا تیل ٹنگ کے درختوں سے شنگھائی کوانگ سی، ہونان، شمالی ہوپی اور زچی کیانگ کے صوبوں میں نکالا جاتا ہے۔ یہ تیل مختلف چیزوں میں کام آتا ہے مثلاً وارنش، روغن، آئل کلاتھ اور چھاپے کی سیاہی وغیرہ بنانے میں۔ لڑائی کے دنوں میں ٹنگ کا تیل بڑے بڑے صنعتی اداروں میں ایندھن کے طور پر استعمال کیا گیا ہے چینی سوچ رہے ہیں کہ اس تیل کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ لڑائی سے پہلے چین سے ہندوستان آنے والے مال میں ہری پھلیوں کا اوسط بہت کافی ہوتا تھا۔ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ اس سال مال کی فراہمی کس حد تک ممکن ہوگی۔ ہندوستان میں سویابین کی کھپت کچھ زیادہ نہیں ہوئی تاہم اس کی غذائی ماہیت کا لحاظ رکھتے ہوئے غور کرنا پڑے گا کہ کیوں نہ اس کی کافی مقدار منگائی جایا کرے۔ ہندوستان میں سبز چائے کی سالانہ کھپت بیس لاکھ ٹن کے قریب ہے۔ چونکہ اس ملک میں چائے نوشی کی عادت برابر بڑھتی جارہی ہے اسلئے آئندہ کثیر مقدار میں اسکے خرچ کی توقع کی جاسکتی ہے۔ برش بنانے کی صنعت کے سلسلے میں ہندوستان چین سے سؤر کے بال بھی لے سکتا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں برش کے کارخانوں میں تقریباً ایک سو ساٹھ ٹن بال کام آئے تھے، غالباً آئندہ ایک سو ٹن کی مزید ضرورت لاحق ہوگی۔ ہندوستان کو چین کی بعض دھاتوں مثلاً سرمے، ٹنگسٹن، پارے اور چاندی کی ضرورت پڑسکتی ہے۔

ہندوستان اور چین کے مابین آزادی سے تجارت ہونے میں کئی رکاوٹیں حائل ہیں مثلاً دونوں ملکوں کے درمیان تبادلۂ زر کی آسانیاں مفقود ہیں دوسرے حمل ونقل کی دشواریاں موجود ہیں۔ تیسرے یہ کہ چین اور ہندوستان کے ان تاجروں کو جو تجارتی حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ملک میں آنا جانا چاہتے ہیں، آسانی سے پروانۂ راہداری نہیں ملتا ہے۔ پہلی رکاوٹ کا آسان علاج یہ ہے کہ حساب کتاب کے خاص انتظامات اختیار کرلئے جائیں۔ دوسری دشواری کا حل یہ ہے کہ ہندوستان اپنے بحری اور ہوائی جہاز تیار کرے اور تیسرے یہ کہ پروانۂ راہداری جلدی سے مل جایا کرے۔

وفد مذکور نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ ہندوستان کی طرف سے ایک ٹریڈ کمشنر شنگھائی اور ایک اسسٹنٹ ٹریڈ کمشنر ہانگ کانگ میں مقرر کیا جائے اور چین سے ہندوستان آنے والے مال کے سلسلے میں درآمد کا لائسنس جاری کرنے کی شرط اٹھا دی جائے۔ نیز یہ کہ اس ملک میں بیمے اور بنک کی ہندوستانی کمپنیاں قائم کی جائیں۔ اگر ان سفارشات کا خیال رکھتے ہوئے قدم اٹھایا گیا تو چین کے ساتھ ہندوستان کی تجارت نہ صرف اس حد تک آسکتی ہے جو لڑائی سے پہلے قائم تھی بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر بہتر صورت اختیار کرسکتی ہے۔

# روس کی روزمرّہ زندگی

## جان لورنس

روس میں زندگی کا صحیح نقشہ کیا ہے؟ لوگ کس طرح رہتے سہتے ہیں؟ یہ ہیں وہ سوالات جو روس سے واپس آنے کے بعد تقریباً روزانہ ہر شخص نے مجھ سے کئے۔ آج بھی آپ کو بتلانے کر نے جب میں ان مسائل پر غور کر رہا تھا میں نے تصور کی آنکھ سے ماسکو کے ایک خاص گھرانے کو دیکھنے کی کوشش کی، یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ اس وقت وہاں کیا ہو رہا ہوگا یقین مانئے۔ آپ کی طرح وہ بھی اتوار کے کھانے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے لیکن ایک بات ہے۔ وہاں ابھی لنچ کا وقت بھی نہیں ہوا ہوگا۔ روس میں کھانے کے مقررہ اوقات نہیں ہیں لیکن جس کھانے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ سہ پہر کے بعد تین اور چھ بجے کے درمیان کھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی کھانے ہلکے پھلکے اور غیر معین ہوتے ہیں۔ روس میں چائے ہم انگلستان والوں سے بھی زیادہ پیتے ہیں۔ لڑائی کے دنوں میں چائے سے زیادہ چینی کی کمی ان کے لئے تکلیف دہ تھی۔ روسی چائے میں دودھ ملا کر پیالیوں میں کبھی نہیں پیتے۔ وہ بغیر دودھ کی چائے گلاسوں میں پیتے ہیں مگر چینی ضرور ملائی جاتی ہے۔ وہ مٹھاس کے بغیر چائے کبھی نہیں پئیں گے۔ اگر اتفاق سے کبھی چینی نہ مل سکے تو مربہ ہی گھول دیں گے یا چائے پینے کے ساتھ چاکلیٹ چباتے رہیں گے۔ وہ چائے میں لیموں کا ٹکڑا ڈال دینا بھی پسند کرتے ہیں۔ آجکل روسی لوگ چائے عام طور پر چائے دانی میں بنا لیتے ہیں تاہم سماوار نا پید نہیں ہوئے۔ وہ اب بھی نظر آتے ہیں۔ سماوار کو قدیم زمانے کے انگریزی چائے دان سے مشابہ سمجھنا چاہیئے۔ بس اتنا فرق ہے کہ اس میں اسپرٹ کی بجائے لکڑی کا کوئلہ جلتا ہے۔ اس طرح دن میں ہر وقت تازی چائے مل سکتی ہے۔

انقلاب سے پہلے روسیوں نے محض تجربے کے طور پر پانچ دن کا ہفتہ منانا شروع کر دیا تھا تاکہ لوگوں کی چھٹی ہمیشہ اتوار ہی کے دن نہ ہوا کرے۔ لیکن اب یہ طریقہ متروک ہو چکا ہے چنانچہ آج وہ کسی باغیچے میں یا شہر سے دور کسی دیہاتی ماحول میں تفریح کے لئے گئے ہوئے ہوں گے۔ یا ہو سکتا ہے کہ وہ سب ماسکو سے باہر کسی جگہ اپنے اپنے وقتی کھیت میں کام کرنے کے لئے گئے ہوں۔

لڑائی کے دنوں میں انھوں نے شہروں کے نزدیک وقتی کھیتوں کی ایک اہم تحریک شروع کی تھی۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو بعض مصیبتوں سے نجات پانا ان کے لئے دشوار ہو جاتا۔ ہمارے ملک کے مقابلے میں روس میں یہ تحریک زیادہ جدید تھی۔ چنانچہ میں نے ان دنوں ماسکو سے شائع ہونے والے اپنے اخبار میں ایسے مضامین اور تصویریں شائع کیں جن سے روسی یہ اندازہ لگا سکے کہ ہم فتح حاصل کرنے کی جدوجہد میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ ان کھیتوں میں زیادہ تر آلو اور کرم کلے کی کاشت کی گئی۔ کیونکہ کرم کلہ روسیوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ شوربہ بنانے کے علاوہ وہ لوگ کرم کلہ بھر کر دلیے کی قسم کا ایک کھانا پکاتے ہیں جو انگلستان میں تیار ہونے والے کرم کلے کے کھانے سے کہیں زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ پہلے پہل مجھے خیال ہوا کہ وہ کرم کلے کی کوئی مختلف قسم ہوگی لیکن پھر معلوم ہوا کہ صرف پکانے کا طریقہ مختلف ہے۔ یہ طریقہ معلوم کر لینا بہت مفید ثابت ہوگا۔

روس میں زیادہ اہم خوراک ڈبل روٹی ہے۔ چنانچہ وہاں روٹی کا خرچ انگلستان سے زیادہ ہے۔ حالانکہ پانچ سال سے اس پر راشن ہے۔ یہ روٹی زیادہ تر سیاہ رائی کی ہوتی ہے پکنے کے بعد بھی وہ سیاہ رہتی ہے۔ اس کا ذائقہ ذرا تلخ ہوتا ہے۔ اس لئے نئے لوگوں کو پہلے پہل بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شراب کی طرح اس کا عادی ہو جانے پر وہ کیفیت برقرار نہیں رہتی۔ پھر اس روٹی میں غذائیت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ روسی مزدور روکھی روٹی کھا کر بھی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ روسی قد آور اور قوی ہوتے ہیں۔ ان کے دانت بھی اچھے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھیں قبض کی شکایت کبھی لاحق نہیں ہوتی۔ میرے ایک دوست نے جو ڈاکٹر تھا، مجھے بتایا کہ یہ سیاہ روٹی کی بدولت ہے۔

روٹی کے بعد دوسری اہم خوراک ایک قسم کا دلیہ ہے جسے "کاشا" کہتے ہیں۔ مختلف اناجوں سے کئی مختلف قسم کے "کاشا" بنائے جاتے ہیں۔ اگر آپ کبھی اٹلی گئے ہیں تو آپ کو "پولینتا" یاد ہوگا جو وہاں کے غریبوں کی خوراک ہے۔ آپ اسے مکئی سے بنا ہوا "کاشا" کہہ سکتے ہیں۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خوراک کی یہ یک رنگی اکتا دینے والی ہوگی لیکن کچھ کھانے اس کے علاوہ بھی ہیں۔ مثلاً موسم گرما میں "کِسل" یعنی پھلوں کا عرق جو میٹھا کرنے کے بعد آلو کا آٹا یا میدہ ملا کر پیا جاتا ہے۔ اگر وہ ٹھیک طرح تیار نہ ہو تو بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ اس کا ذائقہ نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ اور پھر ککڑیاں ہیں، فصل کے موقع پر تازہ بتازہ اور باقی دنوں میں نمک لگی ہوئی خشک۔ کھمبیوں کی چٹنی بھی مزا دیتی ہے۔

روسی اچار چٹنی کے بڑے شوقین ہوتے ہیں اور جب وہ اپنے ملک سے باہر جائیں تو وہاں کے تیز سرکے کا ذائقہ انھیں یاد آتا رہتا ہے۔ دوسرے ملکوں کی طرح دودھ مکھن اور گوشت وغیرہ بھی روزمرہ خوراک کا جزو ہیں۔ لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ آجکل ہر روسی کو یہ چیزیں کس مقدار میں نصیب ہو جاتی ہیں کیونکہ کوئی تمام معیاری قسم کا راشن رائج نہیں ہے۔ محفلوں میں مچھلی کے کباب کے ساتھ ووڈکا (شراب) کا دور بھی لگتا ہے۔ معمولی ووڈکا خالص جن کی طرح تیز ہوتی ہے۔ وہ

چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں پی جاتی ہے اور سارا گلاس ایک دم چڑھا لینا پڑتا ہے۔ اگر ووڈکا پینے کے بعد کوئی چیز کھائی نہ جائے تو اثر زیادہ دیر پا نہیں ہوتا اور اگر اسے روسی "زاکوسکا" کے ساتھ پیا جائے تو سارے دن اثر رہتا ہے اور دوسرے روز بھی طبیعت بحال رہتی ہے بشرطیکہ شراب عمدہ قسم کی ہو اور جسم میں جان بھی ہو۔ روسی لوگ محفلوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اگر آپ ایک بار کسی محفل میں شریک ہو جائیں تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔ ایک بار ایک روسی نے مجھے ڈیڑھ بجے کے قریب لنچ کے لئے مدعو کیا۔ ساڑھے پانچ بجے ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ میرا مطلب ہے کہ دوسرے روز صبح کے ساڑھے پانچ بجے۔ سہ پہر کی چائے، شام کا کھانا، رات کا اوپرا اور پھر ساری رات شراب و کباب۔ ابتدائی بارہ گھنٹوں میں گفتگو نہایت معقول رہی لیکن پھر مزا خراب ہوتا چلا گیا۔

آپ حیران ہوں گے کہ ایسی محفلوں کے لئے اتنی بڑی مقدار میں کھانا کہاں سے آجاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے راشن کے طریقے کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ سوویٹ یونین میں ہر چیز کا معاوضہ نتائج کے اعتبار سے ملتا ہے۔ اس لئے ہر شخص کے راشن کا انحصار اس کام پر ہے جو وہ انجام دیتا ہے۔ چنانچہ سخت کام کرنے والوں کو دفتر کے منشیوں سے زیادہ مقدار ملتی ہے۔ اگر کام زیادہ ذمہ داری کا ہو تب بھی اس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ بے روزگار لوگوں کو بہت ہی کم راشن ملتا ہے۔ ایسی صورت میں بوڑھے اور بیمار لوگوں کو زیادہ دقت رہتی ہے۔ بڑی بوڑھیاں اگر بیٹوں پوتوں کے ساتھ نہ رہیں تو گزارہ مشکل سے ہوتا ہے۔ وہ گھر کے کام کاج میں مدد دینے کے علاوہ راشن لانے میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ وہ ہر چیز کے لئے گھنٹوں قطار میں کھڑی رہتی ہیں۔ ماسکو میں بڑی لمبی لمبی قطاریں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لوگ اپنی مرضی کے مطابق کسی دوکان کو اپنے راشن کے لئے مخصوص نہیں کر سکتے بلکہ کام کاج کے ہر مرکز سے ملحق ایک علیحدہ دوکان ہوتی ہے اور اس مرکز کے لوگوں کو اسی جگہ سے چیزیں خریدنی ہوتی ہیں۔ ہر چیز کی قیمت سرکاری طور پر مقرر ہوتی ہے اور دوسرے ملکوں کے مقابلے میں وہاں گرانی کم ہے۔ لیکن ایک بات عام ہے۔ کوئی شخص سخت کام کرنے والا ہو، یا کسی ذمہ دار ادارے کا مالک و منتظم ہو، اسے صرف ضروریات زندگی ہی مل سکیں گی۔ اگر کوئی شخص زیادہ عیش کرنا چاہے تو اسے لازمی طور پر فالتو کام کرنا پڑے گا۔ بس یہی ایک طریقہ خاص طور پر دوسرے ملکوں کے راشنی نظام سے مختلف ہے۔ اپنے نام کا مقررہ راشن لے چکنے کے بعد ہر شخص اس بازار میں جا سکتا ہے جہاں چیزیں کھلے بندوں بکتی ہیں۔ ان تجارتی دوکانوں سے فالتو اشیا حسب ضرورت مل سکتی ہیں خواہ وہ راشن میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔

اب تک ان گھرانوں کے نظام حیات کی تصویر کھینچی گئی ہے جو بڑے شہروں میں آباد ہیں۔ لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بازار میں کھلے بندوں فالتو چیزیں کس طرح مل سکتی ہیں، یہ جاننا ضروری ہے کہ دیہات کے لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

روس کے زیادہ باشندے دیہاتوں میں رہتے ہیں اور بہت سے دیہات بڑے شہروں سے کافی فاصلے پر آباد ہیں۔ سڑکیں خراب ہیں اور اگر ریل کی پٹڑی یا نہر قریب نہ ہو تو بہت سے دیہاتوں کا عام سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن روس میں دیہاتی ہونا فائدے سے خالی نہیں ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مقامی طور تیار کی ہوا چیزوں پر کوئی راشن نہیں ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑائی کے زمانے میں دیہاتیوں کو کھانے پینے کی کوئی دقت نہیں ہوئی۔ البتہ دوسری چیزوں کی کمیابی یا نایابی نے ان کو مشکلات میں مبتلا کر رکھا۔ مثلاً جاڑے کی راتوں میں انھیں شدید تاریکی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ چراغوں میں جلانے کے لئے پیرافین بالکل نہ مل سکی۔ روس کے دیہات عموماً "مشترک کھیتوں" کی صورت میں منظم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گاؤں کے چاروں طرف کی ساری زمین ایک بڑے کھیت کی حیثیت رکھتی ہے جس میں سب لوگ مل کر کام کرتے ہیں۔ پیداوار میں سے ہر شخص کا حصہ اس کام کی نوعیت اور مقدار پر منحصر ہوتا ہے جو وہ انجام دیتا ہے۔ ہر "مشترک کھیت" کے لئے سرکاری ہدایت ہوتی ہے کہ وہ کونسا اناج بوئے۔ یہ صورت انگلستان کی "وار ایگریکلچرل کمیٹیوں" کے طریقہ کار سے ملتی جلتی ہے۔ کل پیداوار میں ہر چیز کی ایک مقررہ مقدار حکومت کے سپرد کر دی جاتی ہے تاکہ اسے شہروں میں لیجا کر لوگوں میں تقسیم کیا جا سکے۔ اس مقدار کے علاوہ جو کچھ ہو وہ دیہاتیوں کا حصہ ہے اور وہ اسے جس طرح چاہیں صرف کر سکتے ہیں۔ اگر کسی کھیت میں فالتو مقدار پیدا نہ ہو سکے، تو اسے بہت ہی ناقص سمجھا جا سکتا ہے۔ اس فالتو مقدار سے دیہاتی اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد باقی چیزیں مختلف طریقوں سے شہر والوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔

روس میں قطاروں میں بنے ہوئے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے مکانات مل کر ایک گاؤں بن جاتا ہے۔ ان مکانوں میں فاصلہ بھی کافی ہوتا ہے۔ ہر مکان کے چاروں طرف ایک آدھ ایکڑ زمین ہوتی ہے۔ یہ مشترک کھیت کے علاوہ ہوتی ہے۔ لوگ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق اس میں چیزیں بوتے اور کاٹتے ہیں۔ اس پیداوار میں سے بھی جو کچھ مقدار اپنی ضروریات کے بعد بچ رہتی ہے اسے بازار میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ گھرانے کے لوگ اپنی چیزیں خود لے کر بازار میں جاتے ہیں کسی معاوضے یا کمیشن پر یہ کام دوسروں سے کرانا قانون کے خلاف ہے۔ چنانچہ کسانوں کی ایسی منڈیاں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان منڈیوں میں کسانوں کی عورتیں سر سے پاؤں تک شال لپیٹے، مکھن کی ٹکیاں، انڈے اور مرغیاں بیچتی نظر آتی ہیں۔ اگر یہ چیزیں ان کی ذاتی ملکیت ہوں تو وہ مرضی کے مطابق قیمت بھی وصول کر سکتی ہیں۔

غرض یہ کہ سوویت یونین میں رہنے والوں کا طریقۂ زندگی یہی کچھ ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ راشنی نظام سے بہت جلد چھٹکارا

حاصل کرلینا چاہتے ہیں۔ انھیں امید ہے کہ اس سال ڈبل روٹی کا راشن ضرور ختم ہو جائیگا اور باقی چیزوں کی پابندی بھی اگلے سال تک اٹھ جائے گی۔ ایسا ہو جانے پر کوئی بناوٹ باقی نہیں رہے گی کیونکہ پچھلے دو سال میں وہاں تمام بڑے بڑے شہروں میں ایسی دوکانیں کھلی رہی ہیں جہاں کپڑے، ٹین بند اشیائے خوراک، شراب، گراموفون کے ریکارڈ، گرم پانی کی بوتلیں، کھلونے، اور تمام ضروریات کی وہ تمام چیزیں ملتی رہی ہیں جو انگلستان وغیرہ میں نایاب تھیں لیکن کنٹرول کا طریقہ رائج نہ ہونے کے باعث قیمتیں بے پناہ اور انگلستان کے عام معیار سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ دوکانیں حکومت نے خود چلائی تھیں تاکہ ان کا نفع جنگی مصارف پورا کرنے کے کام آسکے۔ لیکن یہی قیمتیں گھٹنی شروع ہو گئیں اور اب بھی کم ہوتی جا رہی ہیں۔

۱۹۴۲ء میں جب میں پہلے پہل سوویت یونین پہنچا تو صحیح معنوں میں ہر چیز خرید لینی ممکن تھی سوائے اس کے کہ نرخ ہوش اڑا دینے کی حد تک زیادہ تھا۔ یعنی آرام سے زندگی بسر کرنے کے لئے لکھ پتی ہونے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ لوگ روپے پیسے کے دلدادہ نہیں تھے۔ کسی شخص سے کوئی کام لیا جاتا تو وہ یہ نہ پوچھتا کہ کیا تنخواہ ملیگی؟ بلکہ دریافت کرتا کہ اس کے عوض مجھے کیا ملے گا؟ مطلب یہ کہ کتنا کھانا اور کتنا کپڑا دوگے؟ روسی جب بھی کسی کارخانے میں کام کرتے ہیں، وہ معاوضہ کے طور پر کپڑا لینے کی توقع ضرور رکھتے ہیں۔



# عشرتِ عید ═══ تابش دہلوی

آج ہر اک پہ ایزد باری — ہوگئی عید کی خوشی طاری
عیش و عشرت کی یہ فراوانی — متبسم ہوئی فضا ساری
بیش قیمت لباس ہے سب کا — لوگ دکھلا رہے ہیں زرداری
ہے معطر دماغ خوشبو سے — پائے تخیل عیش سے بھاری
خلد نظارہ ہے نگاہوں کو — حسن صورت کی آئنہ کاری
پردۂ گوش پر ہر اک آواز — آج کرتی ہے خوب گلکاری
کیوں نہ ہر ایک ہو سبک غم سے — سب کی دولت سے جیب ہے بھاری
لیکن ان کو خبر نہیں کچھ بھی — رنگ لائی خرد کی عیاری
دہر کی ہر خوشی ہے مصنوعی — عقل سے ہو گئے ہیں سب عاری
عیش غم کو بنا دیا تابش — زندگی بھی ہے ایک بیکاری

# سونے کیلئے ═══ اظہار ملیح آبادی

کیوں گھٹا اٹھتی ہے منہ اشکوں سے دھونے کے لئے
آج ہم بیٹھے ہیں دنیا کو ڈبونے کے لئے
کیا حقیقت بحر کی، ہاں ایک صورت ہے فقط
آپ خود آئیں مری کشتی ڈبونے کے لئے
صبح کے تارے چمکتے ہیں نگاہیں چرخ پر
کتنا موزوں وقت ہے جی بھر کے رونے کے لئے
گاہ بادہ نوش گاہے عابد شب زندہ دار
دہر میں کیا کیا ہوئے تھے ہم نہ ہونے کے لئے
قبر کی جانب سے یہ کہتی ہوئی گذری حیات
اتنا شور و شر کیا تھا ایک سونے کے لئے
خار سے اظہار کچھ امید ہو سکتی نہیں
پھول جب تیار ہے کانٹا چبھونے کے لئے

# نقد و نظر

ف۔ م۔ ح

## مطبوعات خاتون کتاب گھر۔ دہلی

یورپ کے بہت سے پبلشر اچھے مصنفوں کی کتابیں عمدگی اور نفاست
سا تھ پیش کرنے کے سلسلے میں مشہور ہیں۔ جب ان کی مطبوعات
ڈالی جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ انہوں نے طباعت و اشاعت کے کام کو بھی
قل فن لطیف کی حیثیت دے رکھی ہے۔ ہندوستان کے جن معدودے چند اداروں نے
صوصیت کو اپنایا ہے، ان میں "خاتون کتاب گھر" دہلی کو سب سے زیادہ نمایاں حیثیت دی
ا ہے۔ اس ادارے کو "اردو نشرگاہ۔ دہلی" کی پیش کردہ کتابیں چھاپنے کا فخر حاصل ہے جسکے
جل و عقد ہمیشہ عمیق زاویۂ نظر سے کام لیتے ہوئے صف اول کے بلند پایہ ادیبوں کے
ار شائع کرنے کی سفارش کرتے ہیں۔ پھر جس طرح میکے والے ہر دلعزیزی کے خیال سے
لو بنا سنوار کر سسرال بھیجتے ہیں، اسی طرح خاتون کتاب گھر کے مالک و منتظم (شاید
ن" کی لفظی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے) ہر کتاب کو جہیز کے تحفہ کی طرح، سقدر سلیقے
تھ شائع کرتے ہیں کہ اس کی عمدگی، نفاست اور پاکیزگی ہر صاحب ذوق کا دل موہ لیتی
س طرح باطنی خوبیاں ظاہری رعنائیوں کے ساتھ مل کر ایک اچھا حسن امتزاج پیش
ں۔ یہ ادارہ مصور غم علامہ راشد الخیری کی یادگار ہے اور ان سے مرحوم کے صاحبزادوں
م کیا ہے۔ انہوں نے ترقی اردو کی خاطر میدان ادب میں ایک مضبوط عمارت کی بنیاد رکھی تھی
و نت نئے ادبی ستونوں کا اضافہ کر کے اس عمارت کو وسعت دے رہا ہے۔ اس وقت
کتاب گھر کی سات کتابیں پیش نظر ہیں جن پر مختصراً اظہار خیال کرنا مقصود ہے۔

**مہ راشد الخیری** | یہ کتاب اردو کے مشہور نقاد پروفیسر وقار عظیم ایم اے نے (جنکی
اب ادارہ آجکل نے حاصل کرلی ہیں) مرتب کی ہے۔ اہل قلم میں مشہور ہستیاں شامل ہیں۔
ظم کرپوری نے علامہ راشد الخیری کی افسانہ نگاری، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے
ناول نگاری، میجر ڈاکٹر نصیر الدین نے ان کی ٹریجیڈی، مولوی نصیر الدین ہاشمی نے
سفرناموں، ڈاکٹر سعید احمد بریلوی نے ان کی شاعری، جناب حامد علی نے ان کی انشاپردازی
ر مرتب نے انکی ظرافت پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مولوی شاہد احمد دہلوی
اتی) نے انکے لٹریچر میں شاعرانہ عنصر اور ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردی نے ان کے ادب
شریت کے وجود کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے ان کو بحیثیت مصلح پیش کیا ہے
محمود مورخ نے انکے تاریخی ناولوں پر نظر ڈالی ہے غرض یہ کہ ہر پہلو پر دو سرا دے
لانا مرحوم کے ادبی کارناموں کی خصوصیت اور انکی افادیت پر لکھے ہوئے تنقیدی مقالا
جمع کر دیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا حضرات کے نام ہی کتاب کے معیاری ہونے کی ضمانت
۔ قیمت ڈھائی روپے۔

**لستی** | لیونڈ آندریف روس کا سب سے بڑا ناول نویس گذرا ہے۔ وہ گورکی
نصر اور اسی کی طرح حقیقت نگار تھا۔ فرق اتنا ہے کہ اول الذکر نے زندگی کو بحیثیت
ماجوں کا توں پیش کیا ہے اور آندریف نے غیر معمولی لوگوں کی غیر معمولی زندگی پر
الی ہے چیخوف کے ہاں جو چیز سنگین ظرافت کا رنگ اختیار کرتی ہے، وہ آندریف کے
ہم تلخ طنز بن جاتی ہے۔ اس کے ناولوں میں "سیون ہو ور ہینگڈ" کو ایک بلند درجہ حاصل ہے۔
اس کو ہمارے ملک کے مشہور صحافت نگار اور مترجم شاہد احمد دہلوی نے اردو کا
جامہ پہنایا ہے۔ یہ کتاب تجزیۂ نفس کے اعتبار سے بہت زیادہ وقیع ہے اس میں
سات مجرموں کے حالات زندگی بیان کرنے کے علاوہ بتایا گیا ہے کہ جب
عدالت کی طرف سے ان کو پھانسی کا حکم سنا یا گیا تو ان کے قلب و دماغ پر کیا
کیفیات گذریں اور جب انہیں معلوم ہو گیا کہ بہت جلد موت کے گھاٹ اترنا یقینی ہے تو
زندگی کے آخری لمحات انہوں نے کیونکر بسر کئے۔ وہ لمحات جن میں خوف و ہراس، بے چینی و
بے قراری اور اطمینان و سکون کی متضاد کیفیات ملی جلی موجود تھیں۔ وہ کبھی سہم کر اور کبھی ہر
خیال سے خالی الذہن ہو کر موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس دلکش کتاب کا ترجمہ بھی دلکش
ہے۔ کیونکہ شاہد صاحب صف اول کے مترجموں میں شامل ہیں اور موسیو میٹرلنک کی طرح
آندریف بھی ان کا مقبول مصنف ہے جس کے طرز بیان اور زاویۂ نظر کو انہوں نے
خوب سمجھا اور اچھی طرح پیش کیا ہے۔ قیمت دو روپے۔

**طغیان** | ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے قاضی نذر الاسلام کی نظموں کو اردو کا
جامہ پہنا کر بنگال کے اس باغی شاعر کو ہمارے ادب میں روشناس کرایا تھا۔ افسانوں کے ضمن
میں یہ گرانقدر خدمت جناب محمد یونس احمر نے انجام دی ہے۔ احمر خود بھی شاعر اور بنگال کے
رہنے والے ہیں، نذر الاسلام کے قریب اٹھے بیٹھے ہیں اسلئے انہوں نے اس شاعر کی روح، اسکے
انداز بیان اور زاویۂ نظر کو خوب سمجھا ہے اور چونکہ طبعزاد افسانے لکھنے میں وہ پہلے سے مشاق تھے
اسلئے اس کام میں انہیں کسی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ نذر الاسلام کی نثر میں بھی وہی لطافت
و شیرینی اور وہی حسن بیان اور رنگینی موجود ہے جو اس کی نظموں کے لئے طرۂ امتیاز ہے۔
یہاں بھی اسکے خیالات بلند آہنگ ہو کر سنائی دیتے ہیں۔ ان افسانوں میں بھی وہ ایک انقلابی
شاعر کی حیثیت سے رونما ہوا ہے۔ اس نے ہندوستانی سماج کو خصوصاً اسکی کمزوریوں کو گہری
نظر سے جانچا اور اچھی طرح پیش کیا ہے۔ یہ آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہمارے ادب میں بالکل نئی
چیز ہے۔ اس سے قبل بہت کم لوگ نذر الاسلام کو افسانہ نویس سمجھتے ہونگے۔ اس کی اشاعت
ان کی معلومات میں اضافہ کرے گی۔ صادق الخیری صاحب کا دیباچہ سیر حاصل اور ٹھوس بنیادوں
پر قائم ہے۔ قیمت ڈھائی روپے۔

**دھنک** | علامہ راشد الخیری مرحوم کے صاحبزادے جناب صادق الخیری ایم اے نے ادبی
ذوق ورثے میں پایا اور اسے اپنی خداداد ذہانت سے خوب نکھارا ہے۔ دھنک کے سات
رنگوں کی طرح سات طبعزاد افسانوں کا یہ مجموعہ نہایت دلکش، رنگین، رومان پرور اور
شعریت سے لبریز ہے۔ ہر افسانے میں زندگی اس طرح ترانے بل کھاتی اور جادو جگاتی نظر آتی
ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں ایک ہلچل پیدا کر کے اپنا ہم آہنگ کئے بغیر نہیں رہتی۔
ہر افسانے کا ہر جملہ محسوس کراتا ہے کہ اسمیں ہماری ہی زندگی کے کسی ایک پہلو کا عکس جلوہ گر ہے۔
صادق صاحب نے روسی افسانہ نگاروں سے خوب متاثر ہو کر اپنے لئے ایک اسلوب پیدا کیا اور اسے
بالکل مشرقی سانچے میں ڈھالا ہے جب طرب انگیز انداز کے ساتھ اس کے بیٹے کا نام زندہ ہے،
مولانا مرحوم کے ساتھ صادق کا نام زندہ رہیگا۔ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے قیمت دو روپے۔

**رنگ و نور** | جناب جلیل احمد قدوائی ہمارے جدید ادب میں سب سے زیادہ قدیم اور

اسی اعتبار سے نہایت اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ وہ بیک وقت اچھے شاعر اور کامیاب افسانہ نگار ہیں، اس لئے انکی تحریریں دونوں رنگ ملے جلے نظر آتے ہیں یعنی شعر میں افسانوی رنگ اور افسانوں میں شاعری ان کی وہ خصوصیت ہے جو اس عہد کے کم مصنفوں کو نصیب ہوئی ہے۔ "رنگ ولوز" ان کی نظموں، غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر شعر کیف پرور اور جادو اثر ہے۔ خصوصاً وہ نوحے جو مختلف حضرات کی وفات پر لکھے گئے ہیں، اپنے اندر اتنی تڑپ رکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اصل درد کی کسک دل میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ غزلیں پابند بحر و عروض ہونے کے باوجود جدت فکر کی حامل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر شعر ذاتی جذبات کے ماتحت لکھا ہے۔ تصنع اور بناوٹ کا رنگ کہیں جھلکنے نہیں پاتا۔ آجکل شائع ہونے والے کلام کے مجموعوں کی طرح اگر اشعار کو پھیلا پھیلا کر شائع کیا جاتا تو ضخامت چارگنی ہو جاتی۔ اس مجموعے میں ناشر نے طباعتی عیاشی سے احتراز کیا ہے۔ قیمت سوا روپے۔

**اصنام خیالی** | قدوائی صاحب کے اس مجموعے میں سات افسانے ترجمہ شدہ اور چھ طبعزاد ہیں۔ ترجموں میں ایک ترگنیف کا، ایک مولیاں کا اور پانچ چیخوف کے ہیں۔ روس کے ان بلند پایہ مصنفوں کو زندگی کی سچی تصویر کھینچنے میں عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ اور چونکہ قدوائی صاحب کا فطری میلان ایسے ہی افسانوں کی طرف تھا اسلئے انہوں نے ان مصنفوں کو نہ صرف پسند کیا بلکہ ان کے خیالات کی ترجمانی نہایت کامیابی کے ساتھ کی۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے روسی افسانے پہلے پہل اردو میں پیش کئے۔ اسلئے بھی موصوف کو ہمارے ادب میں ایک خاص درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ان کا ہر افسانہ ایک علیحدہ ہستی کے نام معنون ہے۔ بعض انتساب معنی خیز ہیں۔ مثلاً "تین ملاقاتیں" ایک خاتون کے نام جنہیں ان کے دل نے بھلا دیا۔ "بلی کے بچے" چچیرے بھائی بہن کے نام اور "بھالو" ملا رموزی کے نام۔ جلدساز کی ستم ظریفی سے اس کتاب میں بیچ کے ۳۲ صفحے شامل ہونے رہ گئے۔ اسلئے مطالعہ شروع سے آخر تک نہ ہو سکا۔ قیمت ڈھائی روپے۔

**بے غیرت** | البجیم کے نامور ڈرامہ نگار مورس میٹرلنک کو جنکو ان کی ادبی تخلیقات کے سلسلے میں نوبل پرائز ملا تھا۔ ایسے کئی ڈرامے لکھے ہیں جن میں ڈرامائی کشمکش کم اور مسائل حیات کی ترجمانی زیادہ ہے۔ لیکن "مونا وانا" ایسا ڈرامہ ہے جو فنی اور مادرشی دونوں اعتبار سے بلند ہے۔ "بے غیرت" اسی کا کامیاب ترجمہ ہے جسے جلیل قدوائی صاحب نے اردو کے سانچے میں ڈھالا اور خاتون کتاب گھر نے دوسری بار پیش کیا ہے۔ اس میں عصمت و عفت کی نفسیات پر روشنی ڈالتے ہوئے سماج کے مروجہ اصولوں کے خلاف ایک آواز بلند کی گئی ہے۔ عورت کی حریت کے لئے ایک نیا پہلو پیدا کیا ہے۔ ترجمہ نہایت کامیاب اور دلکش زبان میں کیا گیا ہے۔ قیمت پونے دو روپے۔

---

## آشوب

بقیہ صفحہ ۵۱

اس طرح ہنس رہی تھی جیسے یہ سب کچھ مذاق ہو، اس کی نظر میں آج زندگی بھی ایک بہت لطیف مذاق ہو کر رہ گئی تھی، مگر وہ دونوں تو سوچ سوچ کر شرم سے گڑی جا رہی تھیں، آج کس طرح اس کی آنکھیں پھرکی کی طرح گھومتی رہیں اور طرح طرح کی آنکھیں ان کو گھورتی رہیں، ساجدہ کے بدن میں تو ابتک سوئیاں سی چبھ رہی تھیں، اس نے کچھ جل کر کہا "آخر طاہرہ تم میں اور بازاری عورت میں فرق کیا رہا" مگر طاہرہ تو یہی سوچ رہی تھی کہ وہ اس کی پیاری پیاری آنکھوں سے جل کر دل کا بخار نکال رہی ہے! مگر آپا فاخرہ کا ایک لفظ اسے کاٹے کھا رہا تھا۔ وہ بے شرم تو نہیں تھی، اس کے جذبات کی ساری فصیلیں ٹوٹ گئیں، وہ اس قدر روئی کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، وہ اسقدر بےبس تھی جیسے بھوکی شیرنی کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے، وہ سمجھتی تھی کہ سارے فساد کی جڑ عابد ہے، عابد کو آتا دیکھکر اس نے اپنا دوپٹہ سنبھال لیا، وہ سوچنے لگی کہ آج پہلی مرتبہ وہ اپنے دل کا راز اس سے کہے گی، وہ ضرور اس کے رونے کا سبب پوچھے گا تو وہ صاف صاف کہدے گی کہ ساجدہ شہلا اس سے اسی لئے حسد کرتی ہیں کیونکہ اس نے اس کی آنکھوں کی تعریف کی ہے۔ "ارے طاہرہ کیا پھر تمہاری آنکھیں دکھنے کو آ گئیں"۔

وہ لاپروائی سے کہتا نکل گیا اور طاہرہ نے ہتھیلی سے اپنے ہونٹ دبا لئے کہ کہیں سسکی نہ نکل جائے!

---

## آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

# ہماری نئی مطبوعات

## لندن سے آداب عرض

آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا "لندن سے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

دوسرا ایڈیشن قیمت عمر

## لندن سے باہر

آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیمت ۱۲/

## گلستان

حضرت مولانا فیضی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کر کے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے

تیسرا ایڈیشن قیمت عمر

## وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

بہترین ڈراموں کا مجموعہ مرتبہ اختر شیرانی اس مجموعہ میں مرتب نے ملک کے بہترین ڈراموں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے یہ ڈرامے آپ کی ذہنی خوراک ہیں آج ہی آرڈر دیجئے نام سے ہی اندازہ کیجئے کہ ایک ڈرامہ سے دوسرا کیسا لاجواب ہوگا۔ قیمت تین روپے

## بہار شریعت

مصنفہ حضرت مولانا مفتی حکیم امجد علی صاحب اسلامی عقائد اور قرآنی احکام کے لئے بہترین تصنیف تمام مسائل کو تقریباً دراستدلال مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی کتب میں بے نظیر تصنیف کا اضافہ کیا گیا ہے اگر آپ اپنے عقائد و اعمال نماز، روزہ و دیگر عبادات و معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہر وقت بہار شریعت کو زیر مطالعہ رکھیں یہ آپ کو عالم و مفتی سے بے نیاز کرے گی۔ مفتیان کرام کے لئے نوٹ بک کا کام دیتی ہے کامل، اچھے بلا جلد پچیس روپے مجلد اکتیس روپے

## معاشیات قومی

مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی یہ کتاب مزید رش لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی مرہون منت ہے جسے ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ دماغ نے اردو کا لباس پہنایا ہے یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز تاریخی روداد ہے اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

## مقالات شیرانی

از حافظ محمود شیرانی حافظ محمود شیرانی کا گوہر بار قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کر چکا ہے مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ گرانمایہ تصنیف ہر اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہونی چاہیئے۔ آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ کریں۔ قیمت تین روپے۔

## تاریخ انقلاب روس

مصنفہ شیر جنگ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی، اخلاقی اور مجلسی رد و بدل کی روح فرسا تاریخ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو اختصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ شیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو خوش اسلوبی سے مرتب کر کے ایک لاجواب تصنیف بنا دیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔

> ہمارے ہاں اسلامی، ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل پنجسورے اور سپارے شائع ہوتے ہیں۔
> فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

## اوراق پارینہ

از شیر جنگ ایک انقلابی قیدی جو کبھی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات غریب مزدور۔ کسان کی تکالیف معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ یہ کتاب انقلابی ذہنوں کے لئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین استعارے محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ قیمت عمر

## اردو زبان اور ہندو

مصنفہ ناظر سید بادری اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع عمل و دخل میں ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سر انجام دی ہیں۔ یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرے گی۔ تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے (عمر)

## قرآنی اخلاق دو حصے

انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہو قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ قیمت ایک روپیہ۔

## کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شیر جنگ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں مددوں سے بحث و تحقیق کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے۔ تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے۔

قیمت مجلد چھ روپے

**ملنے کا پتہ:۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور**

# آجکل

اردو کا پندرہ روزہ تصویری رسالہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۲ | فہرست | ۱۵ نومبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے





مدیر اعلیٰ

**سید وقار عظیم**

ایم۔ اے

نائب مدیران

**فضل حق قریشی**

دہلوی

**بھگت سروپ**

ایم۔ اے

# رفتارِ زمانہ

## عہدوں کی نئی تقسیم

کئی ہفتے کی مسلسل گفت و شنید اور خط و کتابت کے بعد آخرکار یہ صورت پیدا ہوئی کہ ہندوستان کی دو بڑی جماعتیں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ ایک مرکز پر آکر عبوری حکومت میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہوگئیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے نمائندوں کو مناسب عہدے دینے کی خاطر تفویض شدہ عہدوں کو نئے سرے سے تقسیم کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں وائسرائے ہاؤس سے حسب ذیل اعلان شائع ہوا ہے:-

مسلم لیگ کے ان نمائندوں کو جو حال ہی میں عبوری حکومت کے ارکین مقرر ہوئے ہیں، ہز ایکسلینسی گورنر جنرل نے حسب ذیل عہدے تفویض کئے ہیں:-

۱- مسٹر لیاقت علی خاں ........ مالیات ..........
۲- مسٹر آئی، آئی چندریگر ........ تجارت ..........
۳- مسٹر عبدالرب نشتر ........ مواصلات (ڈاک خانہ اور فضا)
۴- مسٹر غضنفر علی خاں ........ حفظانِ صحت ..........
۵- مسٹر جوگندر ناتھ منڈل ........ قانون سازی ..........

اس طرح دوسرے عہدوں میں جو تبدیلیاں ہوئیں، وہ حسب ذیل ہیں:-

۶- مسٹر جان متھائی ........ صنعت و حرفت اور فراہمی ..........
۷- مسٹر راجگوپال آچاریہ ........ تعلیم و فنون ..........
۸- مسٹر بھابھا ........ امورِ عامہ، معادن و قوت ..........

باقی عہدے جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی حسب ذیل ہیں:-

۹- پنڈت جواہر لال نہرو ........ امورِ خارجہ اور تعلقاتِ دولتِ مشترکہ
۱۰- سردار ولبھ بھائی پٹیل ........ امورِ داخلہ اور اطلاعات و نشریات۔
۱۱- ڈاکٹر راجندر پرشاد ........ خوراک و زراعت ..........
۱۲- مسٹر آصف علی ........ حمل و نقل اور ریلوے ..........
۱۳- سردار بلدیو سنگھ ........ دفاع ..........
۱۴- مسٹر جگجیون رام ........ لیبر ..........

دوسرے دن صبح کے ساڑھے دس بجے کابینہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں نئے ارکین نے حلفِ وفاداری اٹھایا۔

## چین میں قحط کے امکانات

غیر سرکاری طور پر اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس سال موسم سرما میں چین کے تقریباً پانچ کروڑ باشندوں کو قحط کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صورتِ حالات اسوقت بھی نازک ہے۔ چنانچہ شمالی کوانگسی کے اضلاع میں اوسطاً سو آدمی ہر مہینے بھوک سے مر جاتے ہیں۔ صوبہ ہونان کے قرب و جوار میں شرحِ اموات اس سے بھی دس گنی زیادہ ہے۔ میڈم چیانگ کائی شیک نے اپنی قوم کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ چین کے نوّے فیصدی باشندے دیہاتوں میں آباد ہیں۔ اس وقت انکی خوراک کا خاطر خواہ انتظام ملک کے سامنے ایک دشوار مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وزارتِ اغذیہ پورے وثوق کے ساتھ یہ اعلان کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ اس لڑائی میں جو قحط روکنے کے لئے جاری کر رکھی ہے، کامیابی نصیب ہو سکیگی یا نہیں۔

وزیر اغذیہ مسٹر ہاوکان نے کہا "گذشتہ چند ماہ کے دوران میں قحط پر قابو پانے کے سلسلے میں ہماری کوششیں پوری طرح اطمینان بخش ثابت نہیں ہوئیں کیونکہ لڑائی کے ہاتھوں حمل و نقل کی سہولتیں بالکل مسدود ہوگئی ہیں یا ناقابلِ اطمینان ہیں۔ آجکل چاول سے بھری ہوئی کشتی کو ہونان سے زیخوان تک جانے میں پورے دو مہینے لگ جاتے ہیں۔ خشکی کے راستے جانے میں دشواریاں اور بھی زیادہ ہیں۔ غیر ملکی اناج کے مقابلے میں خود چین کے بعض صوبوں کا مال قحط زدہ علاقوں میں زیادہ دیر سے پہنچتا ہے"۔ چین میں چاول بکثرت پیدا ہوتا ہے لیکن اسوقت گیہوں کے علاوہ اسے چاول کے لئے بھی دوسرے ملکوں کا دست نگر ہونا پڑ رہا ہے۔ چنانچہ وزارتِ اغذیہ کو یقین ہے کہ بہت جلد آسٹریلیا، کنیڈا اور امریکہ سے گیہوں اور ہند چینی، سیام اور فارموسا سے چاول ان کے ملک میں پہنچ جائیگا۔

## لندن کا ایک اخبار

لندن کے ایک ہفتہ وار اخبار "نیوز آف دی ورلڈ" نے حال ہی میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ہے۔ چار ہفتے کی کل فروخت کا اوسط نکالتے ہوئے حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر اشاعت کے چوہتر لاکھ بارہ ہزار تین سو تراسی

پرچے فروخت ہو گئے ہیں۔ اشاعت میں غیر معمولی اضافہ اخباری پابندیاں دور ہونے کے بعد ظہور میں آیا ہے۔ اس اخبار میں زیادہ تر جرم و سزا سے متعلق کہانیاں اور کھیل کود کے واقعات درج ہوتے ہیں۔ اس کا دعویٰ اگر صحیح ہے تو اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا تعداد حیرت انگیز ہے۔ ہندوستان جیسے ملک کا کوئی ہفتہ وار اخبار اپنی سال بھر کی مجموعی اشاعتوں کی کل تعداد سے بھی اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

## لاہور سے چھ نئے اخبارات

لاہور کی موجودہ آبادی تقریباً آٹھ لاکھ ہے اسوقت اس شہر سے اٹھارہ روزانہ اخبارات شائع ہوتے ہیں، جن کے باعث شمالی ہند کے میدانِ صحافت میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن اب جبکہ تین انگریزی اور تین اردو اخبارات کی اشاعت عمل میں آرہی ہے، وہ کلکتہ اور بمبئی کو بھی دور بٹھائیگا اور اس طرح سارے ملک میں اولیت کا سہرا اسی کے سر رہیگا۔ بعض صحافتی حلقوں کا خیال ہے کہ ابھی اس تعداد میں اور اضافہ ہوگا کیونکہ عوام میں اخبار بینی کا شوق برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ ان چھ میں سے پہلا اخبار "پاکستان ٹائمز" کے نام سے نکلیگا مسلم لیگ کے چند مشہور ارکین جن میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر خان افتخار حسین دالٹی ممدوٹ بھی شامل ہیں، اس کی مالی مدد کرینگے یہ اخبار مسلم لیگ کے خاص نصب العین (پاکستان) کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ لیگ کی اہم کارگزاریوں سے عوام کو آگاہ کرے گا۔ ایک اور اخبار "نیو انڈیا" کے سرپرستوں میں دو نام قابلِ ذکر ہیں۔ پنجاب نیشنل بنک کے مینیجنگ ڈائرکٹر مسٹر یودھ راج اور وزیر مالیات مسٹر بھیم سین سچر سیٹھ سدرشن ایم ایل اے انگریزی اخبار "بھارت" نکالیں گے جس میں کانگریس کے نصب العین کا پرچار کانگریس کے ایما پر ہوگا۔ اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے سیکرٹری مسٹر درمیندر اردو میں "جے ہند" نکالیں گے۔ یہ بھی کانگریس کی حکمت عملی اور اس کے لائحہ عمل کی ترجمانی کریگا۔ لالہ لاجپت رائے آنجہانی کے "مرحوم" اخبار "بندے ماترم" کو کانگریس کے چند نوجوان حیاتِ نو بخشینگے۔ فارورڈ بلاک کے نئے اخبار کا نام "رنجیت" ہوگا۔ سبھاش چندر بوس کے سالار اعلیٰ سردار سردول سنگھ کولیشر اس کی مالی مدد کریں گے۔

## اوسط پیداوار کا تناسب

کھیتی باڑی کے قدیم ترین طریقوں کو ابھی تک مدنظر رکھنے کے باعث ہندوستان زراعت کے میدانِ عمل میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اسکا صحیح اندازہ آسانی کے ساتھ زمین کی اوسط پیداوار سے لگایا جاسکتا ہے یعنی یہ دیکھا جائے کہ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی ایک ایکڑ زمین میں ایک خاص پیداوار کا اوسط وزن کسقدر ہوتا ہے، تو حیرت انگیز اعداد و شمار علم میں آتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل نقشے سے چند اشیائے خوراک کی اوسط پیداوار کا باہمی تناسب ظاہر ہوتا ہے:—

| ملکوں کے نام | گیہوں | چاول | روئی | گٹ |
|---|---|---|---|---|
| | پونڈ فی ایکڑ | پونڈ فی ایکڑ | پونڈ فی ایکڑ | من فی ایکڑ |
| ہندوستان | ۶۳۶ | ۸۵۱ | ۸۹ | ۳۸۸ |
| ارجنٹائن | ۷۸۰ | —— | ۱۵۱ | —— |
| ریاستہائے متحدہ امریکہ | ۸۴۶ | ۱۳۳۳ | ۲۶۴ | —— |
| کینیڈا | ۹۷۲ | - | —— | —— |
| اٹلی | —— | ۲۷۹۷ | —— | —— |
| مصر | —— | ۱۸۴۵ | ۵۳۱ | —— |
| جاپان | —— | ۲۱۲۴ | —— | —— |
| جاوا | —— | —— | —— | ۴۶۴۴ |
| پیرو | —— | —— | —— | ۱۱۶۰ |

## سبھاش چندر بوس

گذشتہ ایک سال کے دوران میں ہندوستان کی قومی فوج کے سالار مسٹر سبھاش چندر بوس کی زندگی اور موت کے سلسلے میں مختلف قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ وہ جس پُر اسرار طریقے پر لڑائی کے دوران میں ہندوستان سے غائب ہوئے تھے، اس سے کہیں زیادہ پُر اسرار صورت لڑائی ختم ہونے کے بعد پیدا ہوگئی۔ تاہم ملایائی یونین کے محکمہ تعلقات عامہ کی طرف سے جو اعلان حال ہی میں شائع ہوا ہے، اسے پڑھنے کے بعد اب شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ موصوف ۱۹۴۵ء میں یقیناً سورگباش ہوگئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے اعلیٰ اتحادی کمانڈر کی درخواست پر ٹوکیو میں عمیق تحقیقات ہوئیں اور اس نتیجہ پر پہنچا گیا کہ اب وہ اس دنیا میں زندہ موجود نہیں ہیں۔ امریکی محققین کا بیان ہے کہ ۱۸ اگست ۱۹۴۵ء کو ہوائی جہاز کے ایک حادثے سے زخمی ہوکر وہ تائی ہوکو اسپتال میں داخل ہوئے اور جانبر نہ ہوسکے۔ اس سلسلے میں چھ مختلف اشخاص سے مختلف اوقات میں جرح کی گئی اور سب کا بیان یکساں پایا گیا۔ انھوں نے یک زبان ہوکر ان کی وفات کی تصدیق کی۔ اس ضمن میں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ان لوگوں سے من مانی باتیں کہلوانے میں پہلے سے کوئی سازش کرلی گئی ہوگی کیونکہ جن لوگوں کو طلب کیا گیا ان سب کو وقت کے وقت اطلاع دی گئی اور فیصلہ بھی بیک وقت کیا گیا تھا۔

## فلسطین میں نئے آثارِ قدیمہ

فلسطین میں لڈ نامی ہوائی اڈے کے شمال میں راس العین کے مقام پر دوسری یا تیسری صدی قبل مسیح کی چند عظیم الشان یونانی

عمارتوں کے آثار برآمد ہوئے ہیں۔ انکی پوری تفصیل ابھی شائع نہیں ہوئی ہے حکومت فلسطین کے محکمۂ اثریات نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ان عمارتوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ راس العین سانسی کے ابتدائی عہد یعنی دو ہزار قبل مسیح میں آباد اور حکومت کنعان کا صدر مقام تھا۔ عہد عتیق میں وہ ایفک کہلاتا تھا۔ آسمانی صحائف میں بار بار اسکا ذکر آیا ہے۔ حضرت سیموئل کی پہلی کتاب کے چوتھے باب کی پہلی آیت میں ایک لڑائی کا ذکر ہے جو ایفک کے مقام پر ہوئی اور جس میں اہل فلسطین نے اسرائیلیوں کو بری طرح شکست دی تھی۔ یونانیوں کے عہد میں اس شہر کا نام پیگائے یعنی چشمہ تھا لیکن ہیرود اعظم نے شہر کی تعمیر نئے سرے سے کی اور اپنے باپ اینٹی پیٹر کے نام پر اسکا نام اینٹی پیٹرس رکھا۔ ان انکشافات سے ظاہر ہے کہ تاریخ کے بہت سے گمشدہ اوراق تاریکی سے روشنی میں آجائیں گے۔

## ہندوستان کیلئے اناج

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں نے جن اناجوں سے ہندوستان کی مدد کی، ان کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:۔

| اقسام اناج | ۱۷ اکتوبر کو ختم ہونیوالے ہفتہ میں | یکم جنوری سے ۱۷ اکتوبر تک کل تعداد |
|---|---|---|
| گیہوں | ۸،۷۰۰ ٹن | ۱۰،۷۷،۰۰۰ ٹن |
| چاول | ۴،۵۰۰ ٹن | ۲،۲۰،۰۰۰ ٹن |
| مکئی | ۹،۶۰۰ ٹن | ۱،۶۶،۴۰۰ ٹن |
| جو | ۲،۰۰۰ ٹن | ۱۲،۸۰۰۰ ٹن |
| جوار، باجرہ وغیرہ | ۸،۵۰۰ ٹن | ۱۷،۵۰۰ ٹن |

## چھتیس سال میں تیس میل

۱۰ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو لندن سے ایک خط مسز آرجولنس کے نام روانہ کیا گیا تھا۔ لفافہ پر نصف پینی والا سبز رنگ کا ٹکٹ چسپاں تھا جس پر شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تصویر بنی ہوئی تھی کیونکہ اس وقت انہی کی حکومت تھی۔ یہ خط حال ہی میں مسز جولنس کے پتہ پر مالٹنگ کوٹیج، ایبونام چیمسفورڈ پہنچا ہے۔ حالانکہ ان لوگوں کو مکان چھوڑے کافی عرصہ ہو گیا اور دونکاسٹر کے مقام پر ان کے انتقال کو بھی چند ہفتے گذر چکے ہیں۔ لندن سے چیمسفورڈ کا فاصلہ تقریباً تیس میل ہے جسے مذکورہ بالا خط نے چھتیس سال میں طے کیا۔ انگلستان کے محکمۂ ڈاک کی جلد بازی اور عجلت پسندی ضرب المثل سمجھی جاتی ہے۔ شاید یہ اس خصوصیت کی ایک زندہ مثال ہے جس طرح فوج کے بہت سے بہادر نوجوانوں کو اعزازی تمغے انکے مرنے کے بعد عطا کئے جاتے ہیں تاکہ ان کی بجائے انکی روح مسرت و شادمانی محسوس کرے۔ اسی طرح یہ خط مرحومہ کے مکان پر ان کی وفات کے بعد پہنچایا گیا۔

## یوپی کے دیہاتوں میں شاہی سکے

یو۔پی کی مجلس مسکوکات کی رپورٹ بابت ۴۶-۱۹۴۵ء کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ الہ آباد کے قریب ایک گاؤں میں کھدائی ہو رہی تھی کہ اچانک نو عدد ہسپانوی سکے برآمد ہوگئے۔ ان سکوں پر شاہ فرڈیننڈ ہفتم کی تصویر ہے جو ۱۸۰۸ء سے ۱۸۳۳ء تک ہسپانیہ کا بادشاہ تھا۔ اس تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ہسپانیہ اور ہندوستان کے مابین اس زمانے میں تجارتی تعلقات قائم ہونگے۔ مغل بادشاہوں کے چند سکے فتحپور نامی گاؤں سے بھی نکلے ہیں جن میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی دو طلائی مہریں بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ایک مہر احمد نگر کی ٹکسال سے اور دوسری اورنگ آباد کی ٹکسال سے جاری ہوئی تھی۔ اسی طرح دہلی کے بادشاہ علاؤالدین محمد شاہ ثانی خلجی کے جاری کئے ہوئے چند ایسے سکے برآمد ہوئے ہیں جن پر فارسی اور ناگری رسم الخط میں حروف کندہ ہیں۔ یہ سکے ۶۹۷ھ سے ۷۱۱ھ تک مختلف اوقات میں بنے تھے۔

## جامعہ ملیہ کا جشن سیمیں

آج سے پچیس سال پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد علی گڑھ میں رکھا گیا تھا۔ اس کے پہلے امیر مولانا محمد علی مرحوم تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ درسگاہ وہاں سے منتقل ہو کر قرول باغ دہلی میں آگئی اور اب چند سال سے مستقل طور پر اوکھلے کے قریب جامعہ نگر میں قائم ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت اور تعلیمی سرگرمیوں پر ایک مفصل مقالہ آپ پچھلے شمارے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یہاں اس کے جشن سیمیں کا ذکر کرنا مقصود ہے جو ۱۵ نومبر سے ۱۸ نومبر تک منایا جا رہا ہے۔ اس کے پروگرام پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی تقریب کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور کامیاب بنانے کے لئے جامعہ کے ارباب حل و عقد، خصوصاً ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (شیخ الجامعہ) نے صحیح ذوق نظر کا ثبوت دیا ہے۔ اس دوران میں جامعہ کی مسجد اور مدرسۂ ابتدائی کی عمارتوں کے سنگ بنیاد رکھے جائینگے۔ نمائش کا افتتاح ہوگا، خواتین، طلبائے قدیم، تقسیم اسناد اور جوبلی کے عام جلسے ہونگے، تیراکی اور دوسرے کھیلوں کے مقابلے، ڈرامہ، مشاعرہ، اسکاؤٹ ریلی، کیمپ فائر اور علمائے کرام کی تقریریں اسکی گوناگوں دلچسپیوں میں اضافہ کرینگی۔ امیر جامعہ کی طرف سے عصرانہ کی دعوت بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں ہے۔ اس طرح دماغی لطف و نشاط کے ساتھ ساتھ کام و دہن کی یہ لذت بھی اس تقریب کی ہمیشہ یاد دلاتی رہیگی۔

خواتین کے جلسے کی روح رواں محترمہ صالحہ عابد حسین ہیں۔ ان کے ایک پیغام سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ میں جلد سے جلد لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بھی ایک مدرسہ قائم کرنے کی تجویز زیر غور ہے +

# غزل

آرزو لکھنوی

تقدیر پہ شاکر رہ کر بھی، یہ کون کہے تدبیر نہ کر
وا باب اجابت ہو کہ نہ ہو زنجیر ہلا تاخیر نہ کر

غم بڑھنے دے اور ذرا اے دل جانچ آہ کی بے تاخیر نہ کر
ہے خواب ادھورا آپ ابھی، لے سمجھے غلط تعبیر نہ کر

جب ظلم کا بدلہ ظلم ہوا مظلوم کا حق کچھ بھی نہ رہا
دے درد ہی میں لذت یارب نالے کو عطا تاثیر نہ کر

ہو لاکھ کمان کڑی قاتل، کچھ جذب نشانے میں بھی ہے
بازو کے بل پہ نظر کر کے، اندازۂ زخم تیر نہ کر

پیمانِ محبت ختم ہوا، اب ذکر سے اسکے فائدہ کیا
بکھری کڑیوں کے منہ نہ ہلا، تیار نئی زنجیر نہ کر

الفت کے عہدِ محکم میں، بودے کاغذ کی ضمانت کیا
یہ دل سے دل کی باتیں ہیں، رکھ یاد فقط تحریر نہ کر

ہر دل ہے حیات کا سرمایا، اور دل میں جوش محبت کا
تو آرزو اور کہے گا بس رہنے بھی دے تقریر نہ کر

# ادیب الملک اکبر حیدری مرحوم

جہانِ حسن میں موجِ ترنم ہے وفا میری ٭ میں نغمہ ہوں محبت کا محبت ہے صدا میری
دلِ مضطر کو جس پر اعتمادِ کامرانی تھا ٭ مرے احساس خودداری میں ہے وہ التجا میری
مشیت کی نگاہوں میں جو معیارِ پرستش تھی ٭ ہوئی ہے جذبِ اشکِ خونفشاں میں وہ دعا میری
اک آنسو اور وہ بھی دل کی رنگینی سے بیگانہ ٭ نہ دیکھی جائیگی دنیا سے تصویرِ وفا میری

نیاز و ناز کا افسانہ سمجھنے کے لئے اکبر
سنی ہے کاتبِ قدرت نے بروں التجا میری

یہ تھے وہ اشعار جو دہلی کی "بزم اردو" کے ایک اجلاس میں گونجے، سننے والوں نے داد کا غلغلہ بلند کیا۔ شاعر کی مترنم آواز نے ایک مخصوص تحت اللفظ کے انداز میں یہ اشعار پڑھے۔ مجمع میں دہلی اور بیرون دہلی کے مخصوص شعراء موجود تھے۔ داد کا شور کم ہوا تو حضرت سائل مرحوم کی بلند آواز گونجتی ہوئی سنائی دی۔ جو اس جلسہ کی صدارت فرما رہے تھے۔ "حیدری صاحب۔ نیا رنگ اختیار کیا ہے آپ نے۔ ماشاء اللہ، بہت خوب۔ نادر انداز ہے۔" یہ تھے ادیب الملک اکبر حیدری جن کی وفات کو اب چھ برس گذر چکے ہیں۔ مگر ان کے احباب کو اب تک یقین نہیں آتا کہ ایسا صحت مند، زندہ دل، آزاد مرد دیکھتے ہی دیکھتے بزم احباب کو اس طرح دغا دے سکتا ہے۔

مخصوص احباب میں ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اکبر نے شاعرانہ دل و دماغ مگر شکل پہلوانوں کی پائی ہے۔ متوسط قد، تنومند، گول چہرہ، خندہ پیشانی، مسکراتی ہوئی شربتی آنکھیں جن میں ہر وقت پائپ کے تمباکو کا دھواں ناچ ناچ کر ایک ہلکا خمار قائم رکھتا تھا۔ نہایت خوش پوش اور اتنا ہی خوش باش اور خوش مزاج مرنجان مرنج طبیعت کا انسان۔ اپنے مخصوص اصولوں کا سختی سے پابند۔ مذہب اسلام کا سچا شیدائی۔ دن بھر انگریزوں کو اردو ہندی پڑھاتا اور خود پنج وقتہ نماز پڑھتا۔ انہیں انگریزی اردو کے علاوہ ہندی اور پشتو اور فارسی میں معقول مہارت تھی۔ بذلہ سنجی اکبر کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ بات بات میں لطیفے کہتے۔ دکھ درد میں بھی ہنستے رہتے لیکن دوسرے کے درد کے ہمدردی سے شریک بنتے۔ اور دوستوں کا دکھ اپنا دکھ سمجھتے۔ صاف باطن اور صاف گو حد درجہ تھے۔ وضع اور اصول کی پابندی ان کا ایمان تھا۔

ذیل کے قطعہ میں تصنع اور پرفریب زندگی سے کس دیدہ دلیری سے طنزیہ گریز کیا ہے ؎

تصنع ہے تکلف ہے، تعلق ہے تماشا ہے ٭ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ میری زندگی کیا ہے
خداوندا مری گمراہیوں سے درگذر فرما ٭ میں اس ماحول میں رہتا ہوں جسکا نام دنیا ہے

اکبر کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان کی بذلہ سنجی بہت جلد لوگوں کو ان سے بے تکلف بنا لیتی تھی۔ لیکن مخلص دوستوں میں صرف چند ہی تھے جن میں حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ، سید ذوالفقار علی بخاری (اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو)، بھیا احسان الحق عشقی۔ ملا محمد الواحدی۔ ڈاکٹر سعید احمد بریلوی۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، قاری عباس حسین (آف قوم دہلی)، ریش بند ہو گیا (آف "سچ" دہلی) اور مرحوم نقی نور دہلوی۔ ایک نظم میں دہلی کی بزم ادب کا تذکرہ اکبر مرحوم نے اس طرح کیا تھا ؎

خوبیٔ قسمت سے ہیں اہلِ نظر اربابِ ہوش ٭ معنوی فرزند تیرے تیری بزم ناز میں
تیری خدمت پر کمربستہ بصد جوش و خروش ٭ ہیں ترے نورِ نظر لیکن نئے انداز میں

ہیں بخاری، عشرت و محمود و تاباں و حزیں
تیری بزم علم و فن میں آج تخییل آفریں

بارگاہِ علم ہے نیرنگ کی بزم ادب ٭ خادمانِ بزم اردو ہیں یہاں مصروف کار
اکبر و وحشی، سعید و برق و نقاری سبھی سب ٭ تیری محفل کیلئے ہیں باعث عز و وقار

اے جہان آباد کی خفتہ زمیں بیدار ہو
یعنی اب گل آفرینی کے لئے تیار ہو

اکبر مرحوم راقم الحروف اور متذکرہ بالا احباب مشاعروں، نجی صحبتوں اور ادبی جلسوں میں اکثر ساتھ رہے۔ ان دلچسپ علمی ادبی محفلوں کی رنگینیاں اب "نقش و نگار طاق نسیاں" ہو چکی ہیں۔ فانی دنیا کے نقوش کسقدر بے ثبات ہیں۔ چند سال گذرے ہیں۔ کیا کیا صحبتیں برہم ہوئیں۔ زیادہ مدت بھی نہیں گذری لیکن معلوم ہوتا ہے ؏

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

دہلی کی بزم ادب سالہا سال قائم رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے اجڑ گئی۔ اکبر مرحوم اس بزم کے سکریٹری تھے۔ اچھے اچھے مشاعرے اور مفید معرکتہ آلآرا جلسے منعقد ہوئے۔ اب صرف اکبر اور بزم اکبر کی یاد باقی رہ گئی۔ بقول اکبر ؎

ایک دم کے ساتھ تھا ہنگامۂ سوز و گداز ٭ اب وہ پروانے کہاں جب شمع محفل اٹھ گئی

اکبر کی زندگی میں انکی صحت قابلِ رشک تھی لیکن اس سے زیادہ رشک کے قابل شاید موت بھی ہوئی یعنی نہایت مختصر اور بے اعتبار سی علالت میں ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء کو بھرے گھر کو الوداع کہا اور چل بسے۔ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ محترمہ بیگم اکبر حیدری جو اکبر مرحوم کے احباب میں اپنی مہمان نوازی اور انکی تصانیف میں خانم کے نام سے

عشرت رحمانی

یاد کی جاتی تھیں یعنی جنہیں اکبر نے کبھی تحریر و تقریر میں بھی اپنے سے جدا نہیں کیا یہ سانحہ کیونکر گوارا کر سکیں ۔ اولاد کا تو کہنا ہی کیا ہے اور احباب کیلئے بقول ؎
حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

اکبر حیدری کی شاعری ان کے ماحول اور اس کے اثرات سے قطعاً دور نہ تھی اور اس صاف گو، صاف باطن انسان کے دل میں جو کچھ تھا وہی زبان پر۔ یہی ان کی شاعری کا صحیح اور سچا پرداز ہے ۔ غزل، مسلسل نظم، رباعی، قطعہ، مثلث، مسدس، تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں یکساں قادر الکلامی کے جوہر دکھلائے ۔ کیونکہ انھیں حکیم سید الطاف احمد صاحب آزاد سہارنپوری مرحوم تلمیذ مولانا حالی مرحوم سے تلمذ حاصل تھا اور بجا طور پر اپنے استاد کا اثر اور رنگ قبول کیا ۔ اسلئے کلامِ اکبر، غالب اور حالی کے قدیم و جدید اثرات و شعور سے بھرپور نظر آتا ہے ۔ غالب کی معنی آفرینی، علوِ تخیل اور فلسفۂ جذبات، خواجہ حالی کا براعتِ اسلوب، تسلسلِ بیان اور روانی، اور آزاد انصاری کا ترنم اور سہلِ ممتنع ۔ یہ سب خوبیاں جمع ہو کر جو دلکش مرکب تیار ہو سکتا ہے وہی اکبر حیدری کا کلام اور یہی ان کی شاعری کی خصوصیتِ خاصہ سمجھنا چاہیئے ۔

انکی غزل تمام حسن سادگی کے ساتھ ارفع داخلی جذبات و احساسات سے مرصع ہوتی ۔ عامیانہ انداز سے ہٹ کر انہوں نے جو مخصوص راستہ اپنی منزل کیلئے اختیار کیا ان کا ایک شعر اس حقیقت کا آئینہ دار ہے ؎

ہر قدم پر اک نئی راہگذر ایجاد کی ؛ یاد رکھے گی قیامت تک مری منزل مجھے

سیدھے سادے انداز میں فلسفہ کے عمیق مسائل کو غزل کے اشعار میں بے تکلف ادا کر دینا اکبر کا عام رنگ ہے ۔ جبر و اختیار کے مسئلہ کو کس احتیاط سے بے تکلف ادا کر دیا ہے ۔ کہتے ہیں ؎

خود پرستی خدا نہ بن جائے ؛ احتیاطاً گناہ کرتا ہوں

یا ذیل کے اشعار میں کیفیاتِ جمیل ؎

درسِ عبرت عمر کی روداد ہے ؛ بڑھ گیا تو یہ فسانہ کم ہوا
حوادث میں فنا ہو کر بقا کے راز سمجھا ہوں ؛ مری جمعیتِ خاطر ہوئی میری پریشانی
اب دیکھئے کہ کون ٹھہرتا ہے دیر تک ؛ بزمِ شباب بھی ہے جہاں حباب بھی
کس چمن کی خاک میں پھولوں کا مستقبل نہیں ؛ دوربیں نظروں میں رنگ و بوئے بے گل نہیں
مری انجام بیں نظریں مجھے مغموم کرتی ہیں ؛ لرز جاتا ہے میرا دل عروجِ ماہِ تاباں سے
مستقل لے نامرادی مستقل انجام تک ؛ دیکھ کتنی لغزشیں پنہاں ہیں لب سے جام تک
تذکرہ برقِ دشت کا جو سنا میں نے کبھی ؛ آہ بھر کر دلِ غمگیں نے کہا ہائے شباب

ہر شعر بجائے خود فلسفۂ حیات کی دلکش اور رنگین تصویر ہے ۔ اکبر نے فلسفۂ گناہ پر مختلف اشعار و قطعات میں مخصوص رنگ سے روشنی ڈالی ہے ۔

ہر جگہ ندرتِ تخیل نے ایک نئی دنیا پیش کر دی ہے ۔ کہتے ہیں ؎

فرشتے آدمی بنکر نہ رہ سکے اکبر ؛ وہ ایسی کونسی مشکل تھی آدمیت میں

"عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کی حقیقت کو تسلیم کرکے اکبر عذر کو بارگاہ کی معصیت تصور کرتے ہیں اور اظہارِ انفعال میں عفو کے قائل ہیں ۔ کیا خوب کہا ہے ؎

بھلا میں بھی تو دیکھوں جو ملے دامانِ عصیاں کے
ذرا سے ۔۔۔ دیکھنے دے ذوقِ پشیمانی

فطرت نے لے کے اشکِ ندامت کی سرخیاں ؛ عنوان لکھ دیا مری فردِ گناہ پر
آبروئے گناہگاری ہوں ؛ عرقِ انفعال کیا کہنا

جوانی کی غلط روی کی طرف نئے انداز میں تنبیہہ و اشارہ کرتے ہیں (قطعہ)

ضمیرِ پاک طینت آہ کتنا بے مروت ہے
مگر ہر مسرت کو گنہگاری بتاتا ہے
میں کس دل سے کروں طاعت کہ طاعت میں مسرت ہے
نکوکاری سے ڈرتا ہوں کہ مجھکو لطف آتا ہے
گناہوں میں یقیناً ایک احساسِ مسرت ہے
گناہوں کے لئے لیکن جوانی کی ضرورت ہے

جوانی میں گنہگاری بہت معصوم ہوتی ہے
یہی حکمِ جوانی ہے یہی آئینِ فطرت ہے

ریاکاری بدترین معصیت ہے ۔ اور خود الکاری عین خدا پرستی ہے ۔ ان حقائق کو اکبر نے کس کس انداز میں ادا کیا ہے ؎

دروغِ مصلحت آمیز ہے دل کی تسلی بھی
خدا کا واسطہ دیکر نہ پوچھو اہلِ ایماں سے

انسانی سرشت اور عام مسلک یہ ہے کہ ۔ غ

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

لیکن بے ریا عبدیت، اس سے کہیں بالاتر ہے ۔ عبد و معبود کا رشتہ حقیقی معنوں میں یہ ہے ؎

نہ الفاظِ حمد و ثنا جانتا ہوں ؛ نہ دلچسپ طرزِ ادا جانتا ہوں
مری بندگی ہے یہی میں کہ تجکو ؛ خدا مانتا ہوں، خدا جانتا ہوں

کسقدر بلند تخیل ہے ۔ سبحان اللہ اور پھر اسی کی مزید تصریح ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

شیت کی پرستاری ادا میں نداز ہی اکبر ؛ دعا لب پر نہیں آتی مگر آنسو نکلتے ہیں
ہے میری عبودیت الفاظ سے بالاتر ؛ اے اشکِ سر مژگاں آ اور دعا بن جا

ایک اچھوتا طرزِ بیان اور دیکھئے ؎

بے تکلف تجھے خدا کہنا ÷ میری سادہ دلی کا کیا کہنا
جانتا ہوں ضرورتیں اپنی ÷ مصلحت ہے تجھے خدا کہنا

ان حقائق سے قطع نظر اکبر کی شاعری جمالیاتی پس منظر سے صد درجہ رنگین ہے معاملات حسن و عشق کو مختلف انداز میں نازو دلکش اسلوب سے غزل اور نظم دونوں صنف میں خوب بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کس قدر حسین و جمیل کیفیات ہیں کہیں ایک بزم جمال آراستہ ہے کہیں عشق کی خودداریاں آشکار ہوتی جا رہی ہیں۔ فریاد و جفا کی بے پناہ کشمکش نازک مرحلوں سے گزر رہی ہے شب ہائے فراق کی کانگذاریاں ہیں کہیں امید و بیم کے دوراہے پر عجب عالم حیرت برپا نظر آتا ہے کبھی آرزوؤں کی دلداری ہے تو کبھی حسن معصوم کی طرفداری، کہیں وصل کی تدبیریں ہیں اور کہیں جمال جہاں افروز کے افسانے اور فراق و وصال کے ترانے اپنے اپنے رنگ میں کیف بار ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ہر ہر شعر کی دل کھول کر تشریح کی جائے مگر خوف ہے کہ لطف نہ کھو جائے اس لئے ناظرین خود ہی پڑھیں اور اپنے اپنے ذوق کی رعایت سے اکتساب کیف کریں۔ ؎

شمع میں اک سوز تھا اک ساز پروانے میں تھا
حسن گویا عشق کے خاموش افسانے میں تھا

اے درد محبت مجھے گمراہ نہ کرنا ÷ دل اشک میں بہ جائے مگر آہ نہ کرنا
دور اندیشیاں محبت کی ÷ بے وفاؤں کو باوفا کہنا
جو ہی رہا تبسم، جو ہی رہا ترنم ÷ میں سنا چکا فسانہ شب غم کی کاوشوں کا
سرگذشت دل مرحوم کا عنواں دیکھا ÷ ایک موہوم سا آنسو سر داماں دیکھا
تنگ تھا ادھر ادھر عمر کبیر ÷ تھی جوانی کی رہگذر دلچسپ

ایک ہم ہیں دوستی پر بھی ہمیں دشمن خطاب
ایک تم ہو دشمنی پر بھی تمہارا نام دوست

دیکھا ہوس و حسن کو باہم جو بغلگیر ÷ ناکام محبت نے کہا ہائے محبت
سنگلاخ زمینوں میں بھی اکبر کی رنگیں نوائیاں کتنی عروج پر ہیں:-
آنکھ کھل جائے گی امید وار کی ÷ دیکھ اے چشم نیم خواب نہ چھیڑ
سہل ممتنع کی سحرکاری ملاحظہ ہو ؎
یوں نہ فتنے اٹھا خرام ناز ÷ میرا ایمان ہے قیامت ہے
ڈالدی بنیاد کعبہ جس جگہ ÷ یاد رکھے گا صنم خانہ مجھے
وہ اٹھیں در دیدہ نظریں وہ اٹھیں ÷ جھوم اٹھے کیف متانہ مجھے
پرسش غم اگر تکلف تھی ÷ اس تکلف کو دریا کرتے

اک تبسم ہے ان کے ہونٹوں پر
یا مری گم شدہ جوانی ہے

تڑپ کر کر دیں پیہم دل ناکام لیتا ہے
لرز جاتا ہوں جب کوئی وفا کا نام لیتا ہے

حسرت بھی ہے امید بھی ہے آرزو بھی ہے
سب کچھ مرے نصیب میں ہے ایک تو نہیں

طوفان برق و باد کی ذرہ نوازیو!
میں خانماں خراب کے آشیاں کہوں

جدھر کروٹ بدلتا ہوں ادھر دنیا بدلتی ہے
نہ پوچھو کونسی لذت ہے آخر درد پنہاں میں

ابھی تو ناخدا کے بعد میرے اک خدا بھی ہے
حوادث کیوں تڑپ کر رہ گئے آغوش طوفاں میں

تکمیل درد ہوتی ہے جب ہر دوا کے بعد
حسرت سے دیکھتا ہے مرا چارہ گر مجھے

بے کسی کا لطف بھی جاتا رہا ÷ شام غربت بھی سحر نے چھین لی

اکبر حیدری کی طبع خداداد بڑی حد تک غالب کے تتبع پر مائل تھی ع
داماں غزل تنگ و گل حسن تو بسیار

چنانچہ انہوں نے غزل میں تو ایک لطیف انداز قائم کیا ہی تھا لیکن نظم کے میدان میں اس سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر نظر آتے ہیں بلکہ ابتدا کی دور میں غزل گوئی کی طرف کسیقدر متوجہ تھے بھی مگر رفتہ رفتہ ان کا میلان طبع نظم کی طرف زیادہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ ۱۹۳۲ء سے آخری دم تک معدودے چند غزلیات کہی ہونگی ورنہ اس عرصہ میں ان کے کلام کا تمام تر سرمایہ "نظم گوئی" پر مشتمل ہے۔ اکبر نظم میں قدیم روایات کی پابندی اور بحور و قوافی کی قید کے ساتھ ساتھ ایک حد تک طرز جدید کے موجد سمجھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ردیف و قافیہ کی ایک آزاد پابندی اس انداز میں شروع کی جس سے ایک خوشگوار ترنم عام بحور میں پیدا ہونے لگا۔ یعنی مسدس اور مخمس کا عام رنگ لیکر انہیں میں ردیف و قافیہ میں اسطرح ترمیم کی کہ یہ انداز ان کا اپنا ہو گیا۔ یہ ایک دلکش اور مستحکم جدت تھی جو صرف اکبر کی نظموں ہی میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً نظم "محبت اور پرستش" کا ایک بند ہے ؎

مجھے اب تم نے سمجھایا کہ میری بیخودی کیا تھی ÷ میں اب سمجھا حقیقت میں محبت کسکو کہتے ہیں
مجھے معلوم ہے میری پرستش میں کمی کیا تھی ÷ میں اب سمجھا کہ وہ پرشوق دل کیوں اداس رہتے ہیں
نظام زندگی برلا مری دنیائے راحت میں
ذرا سا فرق تھا لیکن پرستش اور محبت میں

تخیل و جذبات کے لحاظ سے مسلسل نظموں میں تغزل کا رنگ اور

لطف جس بے تکلفی سے پیدا کیا ہے اس کے لئے انکی نظمیں "مجھے تم سے محبت ہے" "کیوں یاد آتے ہو" "انگارہ" "سحر موسیقی" "پھول والی" "نور و ظلمت" "جرأت پرواز" "مصور کی موت" "خواب ناز" "کیوپڈ" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

"تصورات" کے چند بند ملاحظہ ہوں۔ الفاظ کا دروبست، جذبات کی دلکشی اور انداز بیان میں موسیقیت کا کمال معراج پر نظر آتا ہے

جب آدھی رات کو بزم جہاں خاموش ہوتی ہے
حیات عالم ایجاد جب بیہوش ہوتی ہے
دل مہجور جب کہتا ہے افسانہ محبت کا
فلک پر بزم انجم جب سراپا گوش ہوتی ہے
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

پپیہا "پی کہاں ہے" "پی کہاں ہے" کہکے رُوتا ہے
کوئی سا فر ادا بھونرا کلی کے دل میں سوتا ہے
تصور میں نظر آتی ہے اک دنیا محبت کی
گل و بلبل میں جب راز و نیاز عشق ہوتا ہے
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

بساط آب و گل پر ہوتے ہیں جب رنگ و بو پیدا
کیا کرتے ہیں جب گلہائے تر جوش نمو پیدا
مری نظریں جب اُنسے اکتساب کیف کرتی ہیں
مرے دل میں ہوا کرتی ہے جب اک آرزو پیدا
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

تخیل کے لحاظ سے اکبر کو قدامت کے پردہ میں ترقی پسند، شاعر کہنا بیجا نہیں۔ انکی شاعری میں بھوک، ہڑتال، کسان، طوائف، مزدور، گھناؤنے اور گندے در و دیوار۔ بھیانک راتوں کی تاریکیاں نہیں آتیں۔ مگر وہ سب کچھ پایا جاتا ہے جو شعر و ادب کی ترقی اور معراج کے لئے ضروری ہے۔ انکی نظموں میں جگہ جگہ وہ نظریاتی پہلو موجود ہیں، اور تخیل میں وہ لاشعوری کیفیات ہیں جس سے صاف طور پر پرانی لکیر سے جائز طور پر ہٹتے اور وجدانی تصورات کے سہارے پورے شعور کے ساتھ منزل ترقی کی ایک نئی راہ گذر کی طرف خطوط و نقوش بناتے چلے جاتے ہیں۔ اور صحیح معنوں میں ادبیات کا ترقی پسند انداز یہی سمجھا جا سکتا ہے۔ جذبات حسن و عشق کے اظہار میں تنوع۔ اشعار میں موسیقیاتی ترنم، معنوی و تخیلی رنگین نوائیاں اور کیف و اثر کی ترقیاں دیکھتا ہوں تو اکبر کی نظموں میں خصوصاً "تخلیق حسن و عشق" "جمال آتشیں" "شہید آرائش" "نوروز" "رندان بادہ خوار"

"زاہد و بیدار" "دنیا اور شاعری" "بچہ اور ہلال" "نوجوان شاعر سے" "رہبران خود غرض سے" "شاعر کا پیغام" "عنوان" "نور و ظلمت" "سکون دل اور تجربہ" وغیرہ قابل مطالعہ ہیں۔

## "سکون دل"

یہ انساں کم نظر انساں زر و سیم و جواہر پر
نہیں معلوم آخر کیا سمجھ کر جان دیتا ہے
یہ دُر بے بہا یہ بیش قیمت آتشیں گوہر
یہ وہ چیزیں ہیں جن پر آدمی ایمان دیتا ہے
مگر اے کاش اس ظالم کو یہ معلوم ہو جاتا
سکون دل کبھی ایسے میسر ہی نہیں آتا

## "تجربہ"

محبت۔ دوستی۔ اخلاص۔ ہمدردی۔ وفاداری
یہ دولت لے کے آیا تھا میں انسانوں کی بستی میں
سمجھتا تھا کہ یہ چیزیں ہیں دنیا کو بہت پیاری
بہت کچھ ان کی قدر و منزلت ہے بزم ہستی میں
یہاں حق دوستی کے سینکڑوں ارمان رہتے ہیں
یہ انسانوں کی دنیا ہے یہاں انسان رہتے ہیں
مگر افسوس میرا تجربہ کچھ اور ہی نکلا ؛ غلط فہمی پہ اپنی کسقدر اب میں پشیماں ہوں
میں کیا سمجھا تھا اس دنیا کو کیا نکلی مگر یہ دنیا ؛ میں اس دنیا کے جلوے دیکھتا ہوں اور حیراں ہوں
نکوکاری کے پردوں میں گنہگاری کے جلوے ہیں
مقدس بارگاہوں میں ریاکاری کے جلوے ہیں

اکبر نے اصلاحی اور قومی نظمیں بھی لکھیں۔ جنکا پایہ ہمہ گیر اثرات کے لحاظ سے کافی بلند ہے۔ اصلاحی نظموں میں وہ نام نہاد مصلحین کے خلاف بغاوت کی ترغیب دیتے سنے جاتے ہیں اور قوم کی پستی، بداخلاقی، اور بے راہ روی پر آنسو بہاتے اور نعرۂ انقلاب بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ مذہبی اور اصلاحی نظموں میں "مسلم اور ہلال" کے چند بند سنئے :-

## مسلم

اے ہلال عید اے عنوان روداد نشاط
اے ہلال عید اے پیغام لطف و انبساط
میرے غم خانے میں درد انگیز اک آواز ہے
احتیاط اے شادمانی کے پیمبر احتیاط

یاد آتا ہے مجھے عہد گذشتہ کا عروج ؛ خون رلاتا ہے مجھے اسلام خستہ کا عروج
پرچم توحید پر وہ تیرے تصویر حسین ؛ جس سے وابستہ کبھی تھا بخت رفتہ کا عروج
ہاں تجھے بھی یاد ہو وہ سرگذشت اولیں ؛ ہم صفیر و ہمنوا تیرا ابھی تھا میں حزیں
بدنصیبی ہے مری وہ ہوگئے خواب و خیال ؛ جو فسانے سن چکی ہیں مجھ سے افلاک و زمیں
آج جب بدلا ہوا ہے بزم دنیا کا نظام ؛ آج کیوں آیا ہے تو لیکر مسرت کا پیام

آج کسکے دل سے نکلیں تجھکو سکتی آنکھ سے ٭ کیا کروں آخر بڑی نازک سی تیری اہتمام
ہاں مگر آ! ہمدمِ دیرینہ و دمساز آ!
چند آہیں ہیں ابھی تک مائلِ پرواز آ!

### ہلال

"ذرا ہوش میں آ ہوش میں او مسلمِ بے خانماں
کیوں مسلماں آپ کو کہتا ہے ننگِ دوجہاں
صاحبِ توحید ہوتا تو زمانے میں اگر
یوں نہ دنیا سے کبھی مٹتا تیرا نام و نشاں
اپنی غفلت کا مجھے الزام کیوں دیتا ہے تو ٭ اپنی بربادی کے حیلے ڈھونڈتا ہے حیلہ جو
میں تو آمادہ ہوں تیری ہمسفری کیلئے ٭ تجھ میں باقی ہے اگر اب بھی کوئی شانِ نمو
دیکھ آنکھیں کھول کر اسلاف کا طرزِ عمل ٭ ہے اگر ہمت تو آ اس جادۂ مشکل پہ چل
چھوڑ دے باطل پرستی توڑ دے بندِ کفر ٭ بتکدے میں پھر بنا کعبہ ذرا کروٹ بدل
از سرِ نو ملّتِ برباد کی تنظیم کر ٭ مائلِ تبلیغ ہو قرآن کی تعظیم کر
اہلِ دنیا کو سنا حکمِ خدا حکمِ رسولؐ ٭ نعرۂ تکبیر کی عظمت کو پھر تسلیم کر
پھر تری ہی نغمہ ہو تیرا پھر وہی سازِ حیات
پھر وہی میں ہوں وہی تو ہو وہی رازِ حیات

### "آزادی کے نام"

مستقل سرمایہ داری اور بزمِ بے ثبات
اس سے بڑھکر ہو گی اب کیا اور توہینِ حیات
بزمِ ہستی میں نہ تھا جب زر پرستی کا جنوں
زندگی آزاد تھی آزاد تھی کل کائنات

### "شہیدِ وطن" کے چند بند

اک گلِ افسردہ فرشِ خاک پر تھا محوِ خواب
جب مری نظریں پڑیں اس منظرِ غمناک پر
کانپ اٹھا میرے پہلو میں دلِ پُر اضطراب
اُف گلِ سرسبز اور صحنِ چمن کی خاک پر
خاک کے ذروں میں خوابیدہ تھی اک برقِ جمال
آہ یہ انجام رعنائی یہ ہستی کا مآل!

یہی پھول شاعر کے استفسار پر اپنی سرگزشت اسطرح سناتا ہے ؎

میں امانت دارِ حق تھا حق پرستی کیلئے ٭ منتظر تھی بزمِ گلشن مجھ سے ہر ایثار کی
میں نے دنیا کو دکھائے رنگ و بو کے معجزے ٭ میں نے اپنے خون سے نشو و نمائے خار کی
میری نکہت سے معطر ہو گئی بزمِ نسیم
میں نے صحنِ باغ میں ہر سمت پھیلا دی شمیم

اور پھر یہی "شہیدِ وطن" پھول انسانیت کو حبِ الوطنی اور جانبازی کا پیغام سناتا ہے ؎

میری ہستی وقف تھی صحنِ چمن کے واسطے ٭ میں فنا ہو کر سماؤں گا چمن کی خاک میں
جان دی میں نے مگر اپنے وطن کیواسطے ٭ زندگی پیدا کروں گا میں وطن کی خاک میں
آب و گِل میں جذب ہو کر گل کھلاؤں گا ابھی
ذرّے ذرّے میں مرے پنہاں ہے روحِ زندگی

یہ امر غالباً واقفینِ ادب سے پوشیدہ نہیں کہ اکبر حیدری محض شاعر نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ نثر میں بھی ان کا اندازِ مخصوص شعر گوئی کی طرح مرغوب و دل پسند تھا۔ نظم و نثر دونوں میں مزاحیہ رنگ بھی انکے صنفِ ادب کا ایک جزو خاص تھا۔ غمّاز کے پردے میں انھوں نے متعدد مزاحیہ اور اصلاحی انقلابی نظمیں مضامین اور افسانے لکھے ملک کے بلند پایہ اخبارات و رسائل انکے اس مخصوص رنگ کے شاہد ہیں۔ دہلی کے اخبار "قوم" رسالہ "نیرنگ" اور دیگر بے شمار جرائد میں حضرت غمّاز کے "ملفوظات"، "بھاری بھرکم کی ڈائری"، "شرارستان" وغیرہ مستقل عنوانات اربابِ ذوق کو اب تک یاد ہیں۔ غمّازی انداز ملاحظہ ہو ؎

اربابِ عقل و ہوش کہاں اہلِ فن کہاں ٭ بزمِ سخن ہے آج وہ بزمِ سخن کہاں
تبدیل ہو چکی ہے بیانِ معاشرت! ٭ ندرت دکھائے شاعرِ شیریں سخن کہاں
اتوار آئے پھرتی ہیں ایرو بیبن کو ٭ اب فرشِ مخملی پہ کوئی گلبدن کہاں
کاکل تراش کرتے ہیں اب موشگافیاں ٭ اب وہ عروجِ زلفِ شکن در شکن کہاں
اب میکدے کے نام پہ لائسنس لگ گیا ٭ اب وہ شراب ریز بہارِ چمن کہاں
اب آگرے میں اور ہے لاہور میں مقام ٭ اب عاشقوں کے حصے میں دیوانہ پن کہاں
آتا ہے دو دو ٹین میں بندھ کے ریل پر ٭ اس بیسویں صدی میں کوئی کوہکن کہاں
جنگل تمام چلتے ہیں ٹھیکے پہ آجکل ٭ جولانیاں دکھائے کوئی خستہ تن کہاں
موٹر بھی۔ ریل بھی ہے ہوائی جہاز بھی!
اب بے وطن کے دل میں ہے یادِ وطن کہاں

اکبر کی مستقل تصانیف جو شائع ہو چکیں ان میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں "روحِ جذبات (کلام کا انتخاب)" "عبرت کدہ" "رقاصہ" (ناول) "سیرِ خرابات" (ناول) "عیاش کی ڈائری"، "ارتقاءِ تمدن" اور "مجنوں کی ڈائری"۔ ان کے علاوہ انگریزوں کے لئے اردو ہندی کی درسی کتابیں لکھیں جن میں "منشی" سب سے زیادہ مخصوص اور مقبول ہے جو مختلف فوجی درسگاہوں میں انگریز افسروں کے کورس میں شامل ہے اور اس کے آٹھ نو اڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

مختصر یہ کہ ہر جہت سے تاریخ کیفی نے خوب فرمایا ہے ؎

اکبرِ حیدری وہ اہلِ قلم ٭ جسکے شعروں سے سب تھے مسرور
آہ وہ یارِ باصفا و خلوص ٭ آہ وہ شاعرِ فصیح و غیور
چھوڑ کر چل دیے ہیں بے وقت ٭ کیوں احباب کا دل نہ ہو رنجور
بے سر و پا نشاطِ بزم ہے آج
کہہ دے کیفی کہ "اکبر" مغفور (۱۳۶۵ھ)

# ہندوستان کی مشترک تہذیب

عابد حسین

"تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے، جسے وہ اپنے اجتماعی ادارات میں ایک معروضی شکل دیتی ہے، جسے اس کے افراد اپنے جذبات و رجحانات، اپنے سبھاؤ اور برتاؤ میں اور با قدر مادی اشیا کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں"۔ (۱)

اس کے معنی یہ ہیں کہ دراصل تہذیب کی روح ہے اِقدار کا شعور اور وہ ترتیب جو ان میں اہمیت کے لحاظ سے قائم کی جائے۔ یہ روح اپنے آپ کو تین طرح سے ظاہر کرتی ہے (۱) اجتماعی ادارات مثلاً مذہب، ریاست، قانون وغیرہ کی صورت میں۔ (۲) لوگوں کے عام مزاج، طرز عمل، طرز معاشرت کی صورتوں میں (۳) ان مادی اشیا کی صورتوں میں جو کسی معاشی، جمالی یا ذہنی قدر کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً غذا، لباس، مکان وغیرہ

یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ ہندویت اور اسلام میں مکمل اور مثالی تہذیب کے امکانات کیا ہیں، اور ان میں کیا کیا چیز مشترک ہے۔ بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت یعنی بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاں تہذیب کے مختلف اجزا کی، جنکا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے واقعی شکلیں کیا ہیں اور ان میں کس حد تک اشتراک ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تہذیبی جائزہ کس طرح لیا جائے، جہاں تک محسوس مظاہر تہذیب کا تعلق ہے ہر شخص اگر ذرا توجہ سے کام لے تو ان کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔ لیکن تہذیب کی غیر محسوس روح اور اس کے نفسی اور ذہنی عناصر کا ادراک نہایت ہی مشکل کام ہے، خصوصاً اس زمانے میں جب ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب دونوں کشمکش اور تغیر کے دور سے گذر رہی ہیں۔ اس کام کو جیسا چاہیئے وہی شخص کرسکتا ہے جسکا قلب اپنے زمانے کا آئینہ ہو جسکی آنکھ اپنی قوم کی آنکھ جسکی زبان اپنے ملک کی زبان —— یہ شاعر کا کام ہے، اس شاعر کا جو پہلے اپنے ماحول کو اپنے اندر جذب کرلے اور پھر خود اپنے ماحول پر چھا جائے، اور اس کی رگ و پے میں اتر جائے۔ خوش قسمتی سے ہمارے زمانے میں ایسے دو شاعر ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ٹیگور ہندوؤں میں اور اقبال مسلمانوں میں۔ دونوں کی رگوں میں وہ خون تھا جو دو ہزار سال سے ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پا رہا تھا۔ دونوں مشرق کی قدیم حکمت کے حامل، مغرب کی جدید حکمت سے واقف اور اس کی خوبیوں کے قدردان تھے۔ دونوں کے وسیع قلب میں نہ صرف ہندوستان کی بلکہ دنیا کی محبت سمائی ہوئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ایک حقیقت کا عکس رخ اسلام کے پیالے میں دیکھتا تھا، دوسرا ہندویت کے ساغر میں۔ انھوں نے اپنے وجدان صحیح کی مدد سے اپنی تہذیب کی حقیقی روح کو پالیا اور اپنی حرارت قلب سے اسکی افسردگی اور جمود کو دور کرکے اس میں تازگی اور گرمی پیدا کردی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے نئے رجحانات کو ان سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا اس لئے کہ یہ رجحانات بڑی حد تک انھیں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے لئے بہترین تدبیر یہ ہے کہ تہذیبی جائزے کی کٹھن منزل میں جہاں ایسے مقام آجائیں کہ راستہ نہ سوجھتا ہو وہاں ٹیگور اور اقبال کو دلیل راہ بنائیں۔

---

کثرت میں وحدت کا ادراک اور مشاہدہ ہندوستانی روح کی بنیادی خصوصیت مانی گئی ہے۔ چونکہ مذہب اسی مخصوص شعور کا نام ہے کہ کثرت مظاہر ایک نقطۂ وحدت پر لاتی ہے جو اسے حقیقت اور زندگی بخشتا ہے اور اس میں نظم و ضبط پیدا کرتا ہے۔ اس لئے ہم اس بنیادی خصوصیت کو مذہبیت کے نام سے تعبیر کرسکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے محور اقدار میں مذہبی قدر ایک مشترک مرکزی حیثیت رکھتی ہے جس کے گرد دوسری قدریں چھوٹے بڑے دائرے بناتی ہیں۔ آج بھی باوجود اسکے کہ قدامت پسند طبقہ کا مذہبی احساس زنگ آلود ہوچکا ہے اور جدت پسند طبقہ مغربی تہذیب کی بدولت مذہب کی طرف سے بے حس ہوگیا ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل کی گہرائی میں مذہب کا اتنا اثر باقی ہے کہ وہ زندگی اور کائنات کا کوئی تصور قائم ہی نہیں کرسکتے جس کی بنا پر مذہب پر نہ ہو۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، قدامت پسند تو ظاہر ہے کہ وہ مذہب کو بہت تنگ معنی میں لیتے ہیں اُسے وہ زندگی کا چشم و چراغ سمجھتے ہیں لیکن جدت پسندوں میں بھی کوئی ایسا نہیں جو مذہب کے ایک وسیع تصور کو تہذیب کی بنیاد نہ قرار دیتا ہو۔ اس خیال کے سچے نمائندے اقبال ہیں۔ اقبال اصل میں کوئی مذہبی آدمی نہ تھے۔ انھوں نے ٹیگور سے بھی زیادہ آزاد خیالی سے کام لے کر مذہب کی راہ میں فلسفی شاعر کی حیثیت سے قدم رکھا اور شاعرانہ وجدان کے ساتھ ساتھ عقلی نظر اور تنقیدی فکر کو اپنا رہنما بنایا لیکن وہ اسی نتیجے پر پہنچے کہ مذہب زندگی کے کسی ایک شعبہ کا نام نہیں وہ نہ محض فکر ہے، نہ محض احساس، نہ محض عمل۔ اس سے انسان کی پوری شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ فلسفہ کو مذہب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے وقت اسکی مرکزی حیثیت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے اسکے سوا کوئی

چارہ نہیں کہ مذہب کو ترکیب فکر کے عمل میں مرکز کے طور پر جگہ دے۔

بہت بعد بیسویں صدی کی ساری تحریک میں مذہبی روح سمائی ہوئی ہے اور وہ سب لوگ جن کے ہاتھ میں ہندوؤں کی ذہنی قیادت ہے، مذہب کا مقام اخلاقی اقدار کے نظام میں وہی سمجھتے ہیں جو سورج کا نظام شمسی میں۔ ان میں سب سے زیادہ آزاد خیال اور قدامت پسندی کے سب سے بڑے حریف ٹیگور تھے۔ انھوں نے اپنے دل کا دروازہ عصر جدید کی نئی روشنی کے لئے کھول دیا تھا جسکی مدد سے انسان کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے، عالم طبیعی کی قوتوں کا اور ان کے قوانین عمل کا جائزہ لیتا ہے اور ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس سے انکی تسکین نہیں ہوئی۔ اس نے انکو حقیقت کائنات سے زندہ رشتہ قائم کرنے کا جس کے لئے انکی ہندوستانی روح بے چین تھی کوئی راستہ نہیں دکھایا اور آخر انھیں اس پرانی روشنی سے مدد لینی پڑی جو اپنشدوں نے ڈھائی ہزار سال سے دنیا میں پھیلا رکھی ہے۔ ٹیگور اسی تعلق کا ذکر کرتے ہوئے جو فنکار کائنات اور حقیقت کائنات سے رکھتا ہے کہتے ہیں: "دنیا انسان کے وجود باطنی سے پوچھتی ہے "اے دوست کیا تم نے سچ مجھے دیکھا ہے؟ کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو —— اس حیثیت سے نہیں کہ میں وہ ہوں جو تمہیں غذائیں اور پھل دیتی ہوں، جس کے قوانین تم نے دریافت کئے ہیں، بلکہ میری شخصی اور ذاتی حیثیت سے"؛ فنکار یہ جواب دیتا ہے، "ہاں میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے، میں تمہیں جانتا ہوں اور تم سے محبت کرتا ہوں —— اس لئے نہیں کہ میں نے تم کو مسخر کرکے تمہارے قوانین کو اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے استعمال کیا ہے۔ میں ان قوتوں سے واقف ہوں جو کارفرما ہیں اور انسان کو منصب اقتدار پر پہنچاتی ہیں۔ مگر مجھے ان سے بحث نہیں۔ میں نے تو تمہیں اس رنگ میں دیکھا ہے جس میں تم وہ ہو، جو میں ہوں"۔ یہی حقیقت مطلق کی معرفت جو من و تو کے فرق کو مٹا دیتی ہے ہندو مذہب میں مرکزی حقیقت رکھتی ہے، اور یہی انسانی زندگی کی سب سے برتر قدر سمجھی جاتی ہے۔

مذہب کی حقیقت اقبال کے نزدیک بھی وہ رشتہ ہے جو وہ وجود مطلق سے رکھتا ہے۔ بقول ان کے قرآن کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان کے دل میں ان گوناگوں علاقوں کا برتر شعور پیدا کردے، جو اسے خدا اور کائنات سے وابستہ کرتے ہیں۔

غرض ہندویت اور اسلام دونوں کی تہذیبی روح جہاں تک وہ ٹیگور اور اقبال کے کلام میں جھلکتی ہے، مذہب کو قدر اعلیٰ قرار دیتی ہے۔ وجود مطلق کی معرفت کو مذہب کا نچوڑ سمجھتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا حقیقت کا بنیادی تجزیہ جو تحلیل اور امتیاز سے بری ہے ابتک ایک ہے —— بالکل اسی طرح جیسے عہد وسطیٰ میں ہندو بھگتوں اور مسلمان صوفیوں کے ہاں تھا۔ اور یہ ایک ایسی قدر مشترک ہے جو انھیں دنیا کی اور سب قوموں کے مقابلے میں ایک دوسرے سے قریب تر کردیتی ہے اور اس بات پر ہندو مسلم اتحاد کے بعض پرجوش اور مخلص حامی بہت زور دیتے ہیں، اور اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تہذیب محض ایک مجرد اور مبہم واردات کا نام نہیں بلکہ اس واردات کو واضح تصورات میں تحویل کرنے اور انھیں حقیقت کا جامہ پہنانے کا نام ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا حقیقت مطلق کا تجزیہ ایک ہی، لیکن جب اس تجزیہ کی تحلیل کی نوبت آتی ہے یعنی یہ سوال پیدا ہوتے ہیں کہ وجود مطلق کیا ہے، اس کی معرفت کس طریقے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسکا تعلق کائنات اور ان دونوں کا تعلق انسانی زندگی سے کیا ہے تو ہندو ذہن اور مسلم ذہن میں فکر و عمل کے راستے الگ ہوتے ہوئے اور سفر حیات کی مختلف منزلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہندو مسلمانوں کے تصور حقیقت میں جو فرق ہے اور اسکا جو اثر ان کے تصور تہذیب پر پڑتا ہے اسکا اندازہ بھی ٹیگور اور اقبال کی بنیادی افکار کے مقابلے سے ہوسکتا ہے۔ ٹیگور بھگتی مارگ کے دوسرے سالکوں، رامانج، مادھو آچاریہ، رامانند، کبیر، چیتن وغیرہ کی طرح سرچشمہ حقیقت کا تصور بحیثیت ایک "ذات" کے کرتے ہیں، جو انسان سے جدا ہے اور اس کی محبت اور عقیدت کی سزاوار ہے لیکن وہ بھی ہندو ذہن کے اس جدید ترین رجحان سے متاثر ہیں کہ بھگتی کے شخصی خدا اور ویدانت کے وجود مطلق کو ایک ہی حقیقت کے دو رخ سمجھا جائے۔ ان کے کلام میں جہاں خدا کا ذکر ایک محبوب ذات کی حیثیت سے ہے، جسکی محبت میں روح انسانی تڑپ رہی ہے وہاں اسکو "فہم و ادراک سے باہر، نام و صورت سے بری" بھی کہا گیا ہے۔ ایک اور جگہ ٹیگور کہتے ہیں "لیکن وہاں جہاں روح کی پرواز کے لئے آسمان کی نامحدود فضا پھیلی ہوئی ہے، ایک بے داغ، بے رنگ تجلی کا دور دورہ ہے وہاں نہ دن ہے نہ رات، نہ صورت ہے نہ رنگ اور نہ کوئی لفظ"۔ اسی طرح انسان اور خدا کے تعلق کے بھی دو رخ ہیں۔ کبھی خدا کے مقابلے میں انسانی روح کو اپنے تصور کا احساس ہوتا ہے اور وجود مطلق کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بالکل معدوم سمجھتی ہے۔ اس بات کو ٹیگور یوں بیان کرتے ہیں "محبت میں ایک سرے پر خودی ہے اور دوسرے سرے پر بے خودی۔ ایک طرف تعلّی ہوئی ہے "میں موجود ہوں" دوسری طرف شدید انکار "میرا کوئی وجود نہیں"۔ اس انا میں محبت کا کیا لطف؟ اور اگر یہی انا ہے تو محبت کا کیا امکان؟

اس دوئی کو ٹیگور کے ہاں خدا کے تصور اور خدا اور انسان کے تعلق کے

تصوف میں پائی جاتی ہے ٹگور کے مفسر اود ھاکرشنن جو ہندو ذہن کے جدید ترین رجحان کے نمائندے ہیں اس طرح دور کرتے ہیں کہ جب انسان اپنی محدود قوت ذہنی سے خدا کا ادراک کرنا چاہتا ہے تو وہ شخصی خدا کے تصور تک پہنچکر رہ جاتا ہے، جسے وہ اپنے سے جدا ہستی سمجھتا ہے. لیکن جب وہ ذہنی سطح سے بلند ہوکر مذہبی وجدان کی سطح پر آتا ہے تو اسے وحدت کامل کا شعور ہوتا ہے، جس میں خدا، کائنات اور انسان ایک وجود مطلق میں گھل مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔

اقبال کا تصور حقیقت نتیجہ ہے دو چشمہ ہائے فکر کے ملنے کا، جن کے سرچشمے بظاہر ایک دوسرے سے بہت دور نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک ان مسلمان صوفیوں کے خیالات کا سلسلہ ہے جنھوں نے حتی الامکان بیرونی اثرات سے آزاد رہ کر اپنا نظریۂ حقیقت خالص قرآنی تعلیمات سے اخذ کیا۔ وحدت شہود اور انسان کامل کے تصورات جو مسلمانوں کو نظریہ وجودیت اور نظریۂ فنا کے مہلک اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے قائم کئے گئے تھے۔ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ دوسرا جدید یورپ کے فلسفۂ ارادیت اور حیاتیت کا سلسلۂ فکر ہے۔ اقبال نے ان دونوں کو سمو کر نظریۂ حقیقت کا ایک خاکہ بنایا ہے جو عہد جدید کے مسلمانوں کے رجحانِ طبع کا آئینہ دار ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں اسپر اسقدر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں جو اسے اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ ہم صرف اتنا کرسکتے ہیں کہ اس کے اہم ترین نکتوں کو اختصار سے بیان کردیں۔

اقبال حقیقت کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے موضوع یعنی نفس انسانی کی طرف سے چلتے ہیں۔ ان کے نزدیک نفس انسانی کے دو پہلو ہیں۔ ایک نفس فاعلہ اور دوسرے نفس عارفہ۔ نفس فعلہ کا رُخ عالم خارجی کی طرف ہے۔ جہاں وہ اشیا کا ادراک مکان کے اندر کرنے پر مجبور ہے چونکہ مکان تقسیم پذیر ہے اور نقطوں سے مل کر بنا ہے اس لئے نفس فاعلہ کو زمانے کا شعور الگ الگ لمحوں کے سلسلے کے طور پر اور خود اپنا شعور الگ الگ کیفیتوں کے سلسلے کے طور پر ہوتا ہے۔ بخلاف اسکے نفس عارفہ، جو انسان کا حقیقی نفس ہے اور جسکا شعور ہمیں صرف اسوقت ہوتا ہے۔ جب ہم عالم خارجی سے قطع نظر کرکے اپنے اندر ڈوب جائیں، تصور مکان سے آزاد ہے۔ چنانچہ اسکا شعور زمانی مکان کے رنگ میں ڈوبا ہوا نہیں ہوتا بلکہ زمانہ اس کے لئے دورانِ محض ہے، یعنی ایک واحد لمحہ حالیہ جو نا قابلِ تقسیم ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نفس عارفہ میں لمحات زمانہ کی کثرت کا شعور نہیں ہوتا تو نفسی کیفیات بھی گھل مل کر ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن جاتی ہیں۔ نفس عارفہ کی شعور ذات کی خصوصیات یہ ہیں:۔ (۱) اس کے اندر زمانہ دورانِ محض ہے۔ (۲) اس میں نفسی کیفیات کی کثرت ایک وحدانا میں حل کی ہوئی ہے۔ اقبال کے نزدیک حقیقت مطلق کے شعور میں بھی جو نفس عارفہ حاصل کرتا ہے یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ "وہ دورانِ محض ہے جس میں خیال، زندگی اور مقصد ایک دوسرے میں نفوذ کرکے ایک وحدت نامیہ بناتے ہیں۔ ہمارے لئے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ اس وحدت کا تصور وحدت ذات کی حیثیت سے کریں۔ ایک محیط اور منفرد ذات کی حیثیت سے، جو کل افراد کی زندگی اور فکر کا سرچشمہ ہے"۔ "یہ ذات مطلق اپنی حقیقی ماہیت کا اظہار تخلیق مسلسل کی شکل میں کرتی ہے"۔ مگر ذات مطلق کا قیاس نفس انفرادی پر نہیں کرنا چاہیے۔ اقبال کا تصور تجسیم اور تشبیہ سے بری ہے۔ "حقیقت مطلق ایک تخلیقی زندگی ہے جسے بعض نے ذات کہا ہے۔ اس زندگی کو ذات سے تعبیر کرنے کے معنی یہ نہیں کہ خدا کو انسان کی شبیہ بنا دیا جائے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ زندگی کوئی بے شکل سیال نہیں بلکہ ایک تنظیمی اصول وحدت ہے، ایک عمل ترکیب ہے، جو ہیئت نامیہ کے منتشر رجحانات میں ربط قائم رکھتا ہے اور انھیں ایک مرکز پر لے آتا ہے"۔

اس سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ٹگور اور اقبال کے ہاں بنیادی مذہبی شعور کی تفسیر میں کیا فرق ہے۔ ٹگور کا خدا در حقیقت ویدانت کا برہمہ ہے شخصی خدا کا تصور جو ان کی شاعری میں جان ڈالتا ہے حقیقت کا ایک ادنیٰ تصور ہے جو انسان کے محدود ذہن کو عموماً اختیار کرنا پڑتا ہے۔ بخلاف اسکے اقبال کے نزدیک خدا کا سچا تصور جو تجربہ حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے وحدت ذات کے سوا اور کسی حیثیت سے نہیں کیا جاسکتا۔ وحدت وجود کو جس کے اکثر مسلمان صوفی قائل رہے ہیں اور بہت سے اب تک ہیں وہ حضرت مجدد الف ثانی کی طرح بعض "مقام قلب" یعنی خالص موضوعی احساس قرار دیتے ہیں جو راہ معرفت کا ایک ابتدائی مقام ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ شعور حقیقت کی جو تعبیر ٹگور کے اور سب پیروانِ وحدت کے نزدیک آخری اور مکمل ہے وہ اقبال کے نزدیک عارضی اور نامکمل ہے اور جو تعبیر اقبال کے خیال میں حقیقی ہے وہ ٹگور کے خیال میں اعتباری ہے۔

اس فرق کی بنیاد در اصل اس اختلاف پر ہے جو ٹگور اور اقبال میں عرفان حقیقت کے بارے میں ہے۔ ٹگور کے نزدیک وجدانی بصیرت جس کے ذریعہ ہم خدا کو دیکھ سکتے ہیں عقل و فہم سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ وہ ایک سیدھا سادہ معصوم بچوں کا سا غیر تنقیدی، غیر عقلی مشاہدہ ہے۔ "ذات برتر کی رویت ہماری روح کے اندر ایک براہ راست بلا واسطہ مشاہدہ ہے جسکی بنا کسی دلیل و برہان پر نہیں"۔ اسی لئے ٹگور نے ویدانت کے شعور حقیقت کو جو فہم و ادراک سے بالاتر اور وجدانِ محض پر مبنی ہے اعلیٰ اور مکمل مانا ہے۔ اقبال بھی واردات حقیقت کو بلا واسطہ اور وجدانی کہتے ہیں لیکن ان کے خیال میں جس طرح ہماری حسیات عالم خارجی کا علم بننے کے لئے عقل و فہم کی تعبیر کی محتاج ہیں اسی طرح واردات حقیقت بھی ذاتِ الٰہی کا عرفان بننے کے لئے ذہنی تعبیر کی محتاج ہے۔ وہ اسلام کی خصوصیت ہی یہ قرار دیتے ہیں کہ اس نے ذہن انسان کے بلوغ کو تسلیم کرکے

اس کو یہ سکھایا کہ آئندہ باطنی واردات کے معاملہ میں کسی شخصی سند کو نہ ماننے بلکہ اس واردات کو عقلی تنقید کی کسوٹی پر جانچے۔ اصل میں اقبال وجدان اور عقلی فکر کے تضاد ہی کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ فکر اور وجدان لازماً ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ دونوں ایک ہی جڑ سے نکلے ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اول الذکر حقیقت کے اجزا کا الگ الگ ادراک کرتی ہے آخرالذکر اسکا من حیث الکل ادراک کرتا ہے"۔ اس لئے اقبال وحدت وجود کے تصور کو جو محض وجدان پر مبنی ہے ناکافی سمجھتے ہیں اور وحدت ذات کے تصور کو جو اُن کے نزدیک وجدان اور عقل نے مل کر قائم کیا ہے حقیقت کی سچی اور مکمل تعبیر سمجھتے ہیں۔

نفس انسانی کے تصور اور اس تعلق کے تصور کے بارے میں جو انسان خدا سے رکھتا ہے دونوں میں اختلاف ہے۔ ٹیگور کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ نفس انفرادی کو محدود انسانی نقطہ نظر سے حقیقی مگر حق مطلق کے نقطہ نظر سے غیر حقیقی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک محدود میں جو کچھ حقیقت ہوتی ہے نامحدود کی نسبت سے ہوتی ہے۔ محدود انفرادی نفس کا نصب العین یہ ہے کہ نامحدود میں مل جائے۔ جوں جوں وہ نامحدود سے قریب ہوتا جاتا ہے اسکی حقیقت بڑھتی جاتی ہے اور انفرادیت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہی تسلیم خودی عین سعادت ہے۔ "انسان کی ابدی راحت کچھ پانے میں نہیں بلکہ اس میں ہے کہ اپنے آپ کو اسکے حوالے کر دے جو اُس سے بڑا ہے"۔ برخلاف اسکے اقبال کے نزدیک محدود نفس انفرادی اسی طرح حقیقی ہے جس طرح لامحدود نفس مطلق یا خدا۔ اور نامحدود سے قریب تر ہونے سے اس کی انفرادیت گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی جاتی ہے۔ جو مشکل یہاں پیدا ہوتی ہے کہ محدود انا کی محدودیت نامحدود کے حضور میں کیونکر باقی رہ سکتی ہے اُسے وہ اسطرح حل کرتے ہیں" اس مشکل کی بنیاد نامحدود کا غلط مفہوم سمجھنے پر ہے۔ در اصل نامحدودیت کے معنی نامحدود وسعت کے نہیں، جسکا تصور اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں جتنی وسعتیں موجود ہیں سب اسکے اندر سمیٹ لی جائیں۔ نامحدود کی ماہیت وسعت کمی نہیں بلکہ شدت کیفی ہے۔ جیسے ہی ہم شدت کے مفہوم پر غور کرتے ہیں یہ بات سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ محدود انا نامحدود سے جدا نہیں مگر اس سے مختلف ضرور ہے۔

کائنات کا تصور ٹیگور کے ہاں بجنسہ ویدانت سے لیا گیا ہے۔ عالم طبیعی بھی حقیقت مطلق کا ایک مظہر ہونے کی حیثیت سے محض اعتباری وجود رکھتا ہے محدود ذہن اس کو اسی طرح ایک مستقل حقیقت سمجھتا ہے جیسے اپنے آپ کو۔ مگر یہ فریب نظر یا "مایا" ہے اور عالم طبیعی حقیقت انا اور غیر انا انسان مطلق کے دو پہلو ہیں ——— ایک فاعلی، دوسرا انفعالی۔ غیر انا یا عالم طبیعی ایک ذریعہ ہے انا کی روحانی قوت کے اظہار کا۔ لیکن یہ قوت اپنے آپ کو عالم طبیعی کے ساتھ کشمکش میں ظاہر نہیں کرتی بلکہ اس کے ساتھ یگانگی کا رشتہ قائم

کرنے میں" جب تک انسان کو کائنات کے ساتھ رشتۂ اتحاد کا عرفان ہو، وہ ایک قید خانہ میں رہتا ہے جسکی دیواریں اس کے لئے غیر مانوس ہیں۔ جب وہ سب اشیاء میں روح ابدی کو پاتا ہے تو اس کو رہائی حاصل ہوتی ہے، اس لئے کہ اس وقت وہ اس دنیا کی پوری معنویت کو سمجھتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو کامل حقیقت کے اندر دیکھتا ہے اور وہ وجود کل کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے"۔ اقبال کا تصور کائنات اُن کے تصور الوہیت کی طرح جدید امرادیت کے فلسفہ کو تعلیم قرآنی کے ساتھ سمونے سے پیدا ہوا ہے۔ اقبال کے نزدیک عالم طبیعی حقیقت رکھتا ہے لیکن خدا کے بالمقابل کے طور پر نہیں بلکہ خطرۃ اللہ کے طور پر ——— وہ "کوئی کمیت مادی نہیں جو خلا کو پُر کر رہی ہو بلکہ واقعات کی ایک ترتیب ہے، ایک منظم طرز عمل ہے جو ذات مطلق سے نامیاتی علاقہ رکھتا ہے۔ عالم طبیعی کو ذات الٰہی سے وہی نسبت ہے جو سیرت انسانی کو ذات انسانی سے ہے"۔ انسان کا محدود ذہن البتہ عالم طبیعی کو ایک مدمقابل سمجھتا ہے اور اسے اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسکا علم کائنات انفعالی نہیں بلکہ فاعلی ہے۔ وہ ایک قسم کی بصیرت ہے جو سلسلۂ حیات کے ماورا ہے"۔ اس بصیرت سے مراد ہے اشیا کے زمانی مکانی اور علّی علاقوں کا بصیرانہ ادراک جو انا کرتا ہے ——— یعنی معلومات کے پیچیدہ مجموعے میں سے بعض کا انتخاب اُس مقصد کے لحاظ سے جو انا نے سر دست اپنے سامنے رکھا ہو۔ یہی کوشش کا احساس جو بالقصد عمل کے تجربے میں ہوتا ہے اور وہ کامیابی جو مجھے اپنے مقاصد میں حاصل ہوتی ہے، مجھے ایک علّت ذاتی کی حیثیت سے اپنی مثالیت کا یقین دلاتی ہے"۔ اسی وجہ سے اقبال انسان کے ادراک کائنات کو "تسخیر" کے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں کہ تسخیر کائنات کے ذریعے انسان کی خودی زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ خدا، کائنات، انسان اور ان تینوں کے باہمی علاقوں کے بارے میں جو خیالات ٹیگور اور اقبال کے ہیں ان کے اندر ان دونوں کے فلسفہ ہائے حیات کا عکس نظر آتا ہے جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں ٹیگور کے ذہن میں حیات انسانی کے مقصد کا تصور وہی ہے جو اپنشدوں کے زمانے سے ہندو ذہن پر چھایا ہوا ہے یعنی اس جہل کے پردے کو اٹھا کر جس کی وجہ سے افراد انسانی اور عالم طبیعی جداگانہ حقیقتیں نظر آتی ہیں۔ اس حقیقت عظمیٰ کی معرفت حاصل کرنا کہ وجود صرف ایک ہے اور وہ ہستی مطلق کا ہے"۔ ہندوستان کی مخصوص فکر کا عقیدہ ہے کہ انسان کی اصلی نجات جہل سے چھٹکارا پانے میں ہے۔ اس کی نجات اس میں نہیں کہ کسی حقیقی اور مثبت چیز کو مٹائے، اس لئے کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا بلکہ مٹانا اس چیز کو ہے جو منفی ہے اور ہمارے مشاہدۂ حق میں حائل ہوتی ہے۔ جب یہ رکاوٹ، جسکا نام جہل ہے دور ہو جاتی ہے۔ تب جاکر آنکھ کا پردہ اٹھتا

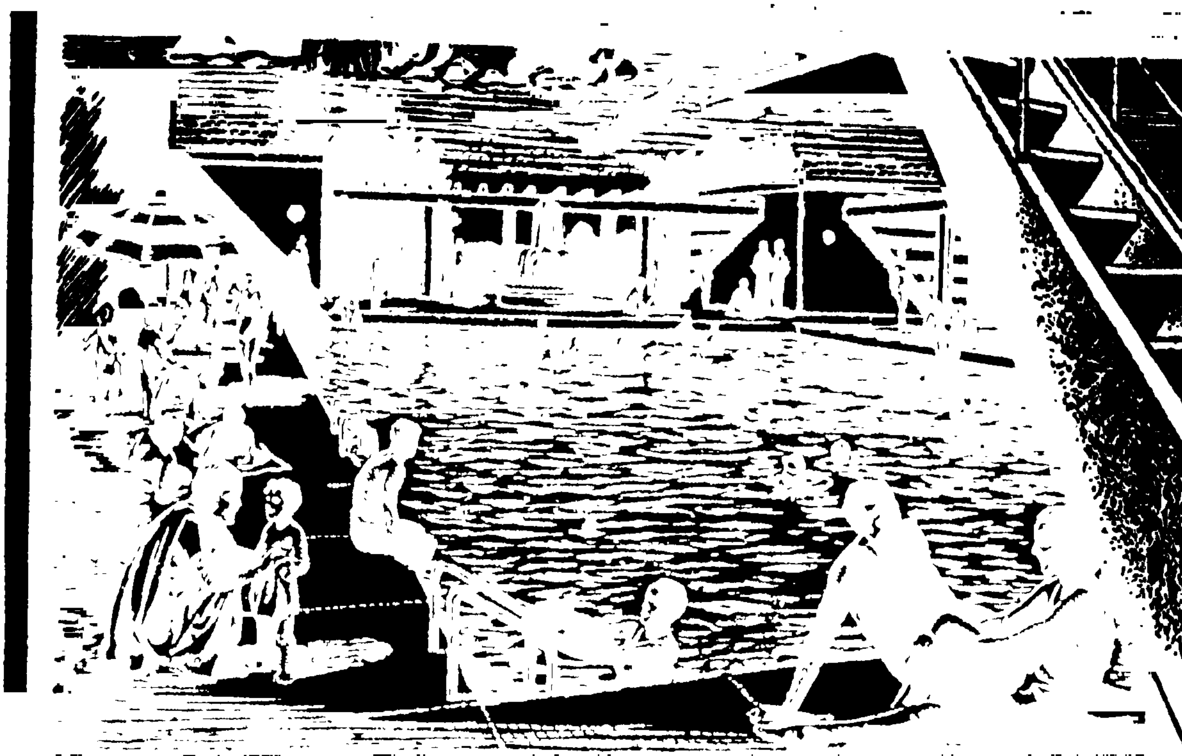
اس طرح اُٹھتا ہے کہ اُسکو نقصان نہ پہنچے"۔ اسوقت انسان کو حق کا جلوہ نظر آتا ہے"۔ اس وقت وہ اس دنیا کی پوری معنویت کو سمجھتا ہے جس کے اندر وہ پیدا ہوا ہے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو کامل حقیقت کے اندر دیکھتا ہے اور وجودِ کلی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے"۔ یہ اعلیٰ مقصد انسان کو حواس اور عقل کی مدد سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس لاعقلی قوت کی مدد سے جسے وجدان کہتے ہیں۔ اسلئے تربیتِ نفس میں قوائے ذہنی کو دبانے اور شعورِ باطنی کو ریاضت کے ذریعہ اُبھارنے کی ضرورت ہے۔ انسانی زندگی کا اخلاقی مقصد بھی اسی مذہبی مقصد سے متعین ہوتا ہے۔ وحدتِ وجود کے شعور سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ سب انسان ایک ہی حقیقت کے مظاہر ہیں۔ اس لئے ہم دوسروں کو اپنے آپ سے متحد سمجھتے ہیں۔ ان کے فائدے کو اپنا فائدہ جانتے ہیں اور خود کو ان کی محبت اور خدمت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ یہی سب سے بڑی نیکی اور سب نیکیوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح بدی کی جڑ انسانوں کے وجود میں تفریق کرنا، اپنی ذات کو دوسروں سے جدا سمجھنا اور اپنی ذاتی خواہشات رکھنا ہے"۔ یہی ہماری خواہشات ہماری معرفتِ نفس کی حدود کو تنگ کر دیتی ہیں، ہمارے شعور کی توسیع میں رکاوٹ ڈالتی ہیں اور گناہ کو وجود میں لاتی ہیں۔ یہ ایک اندرونی پردہ ہے جو ہمیں ہمارے خدا سے جُدا رکھتا ہے۔ تفریق و انتشار اور علیحدگی کا غرور پیدا کرتا ہے۔ گناہ کوئی ایک فعل نہیں بلکہ ایک طرزِ زندگی ہے جو اس مفروضے پر مبنی ہے کہ ہمارا مقصد محدود ہے خود ہمارا نفس آخری حقیقت ہے۔ ہم اصلاً ایک نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کی انفرادی زندگی الگ الگ ہے"۔ شاعری کا کام یہی ہے کہ انسان کو خواہشِ نفس کے شکنجے سے چھڑائے "ہم (شعرا) انسانوں کو ان کی خواہشات سے نجات دیتے ہیں"۔ خواہش سے نجات اسی وقت ممکن ہے جب فنکار احساسِ خودی کو دل سے دور کر دے۔ خود اور غیر خود کے فرق کو مٹا دے، جب وہ کائنات سے مخاطب ہو کر یہ کہہ سکے "میں تو تجھے اس رنگ میں دیکھتا ہوں جس میں تو وہ ہے جو میں ہوں"۔ یہی مشاہدۂ حقیقت کی پاکیزہ مسرت، فنونِ لطیفہ کی اور شعر و ادب کی جان ہے"۔ قدیم ہند کے ماہرینِ بلاغت کو یہ کہنے میں کوئی تامل نہ تھا کہ لطف و مسرت ادب کی جان ہے --- وہ لطف و مسرت جو بے غرض ہو"۔

اب اس تصورِ زندگی کی طرف رخ کیجئے جو اقبال کے مابعد الطبیعی نظریات میں جھلکتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم عالمِ وجود سے عالمِ وقوع میں، عالمِ سکون سے عالمِ سعی میں آ پہنچ گئے ہیں۔ یوں تو ٹیگور نے بھی ہندوستانی ذہن کے جدید رجحان کے مطابق عمل پر بہت زور دیا ہے، جسکا ذکر ہم آگے چل کر کرینگے، لیکن یہ ایک خارجی عنصر ہے جو ان کے بنیادی فلسفے سے نامیاتی تعلق نہیں رکھتا۔ اقبال کے فلسفۂ حیات میں تغیر اور حرکت، سعی و عمل کو رگِ جان کی حیثیت حاصل ہے۔ انکے ہاں حیاتِ انسانی کا انتہائی مقصد خود کو غیر خود میں فنا کرنا نہیں بلکہ اثباتِ خودی

ہے۔ خدا کا تصور وہ بہ حیثیت ذاتِ مطلق کے کرتے ہیں جو خودی کی کامل مثال ہے۔ انسان کو تخلقو باخلاق اللہ کے حکم کے مطابق بہ قدرِ استطاعت اس مثال کی تقلید یعنی اپنی خودی کی توسیع اور استحکام کی کوشش کرنی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کائنات کا جسے وہ اپنے گرد دیکھتا ہے تخلیقی عرفان حاصل کرے یعنی اس کی قوتوں کو اور ان کے قوانینِ عمل کو دریافت کرکے ان سے اپنے مقصد کے لئے کام لینے کی کوشش کرے"۔ انسان کے نصیب میں یہی ہے کہ اپنے گرد و پیش کی کائنات کے گہرے مقاصد میں شریک ہو، اپنی اور اس کی تقدیر کی تشکیل کرے، اس طور پر کہ اپنے آپ کو اس کی قوتوں کے مطابق کرے اور کبھی اپنا پورا زور لگا کر اس کی قوتوں کو اپنے مقاصد کے سانچے میں ڈھال لے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے میں جو جد و جہد کرنی پڑتی ہے وہ صوفیوں کی ریاضت سے کہیں زیادہ معرفتِ حقیقت میں مدد دیتی ہے۔ اقبال اس اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے جو تسخیرِ کائنات انسان کے روحانی ارتقا کے لئے رکھتی ہے کہتے ہیں "اس راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی ذہنی کوشش ہماری زندگی میں وسعت اور رنگینی پیدا کرنے کے علاوہ ہماری بصیرت کو تیز کرتی ہے اور اس طرح ہم میں یہ صلاحیت پیدا کرتی ہے کہ انسانی تجربے کے دقیق تر پہلوؤں پر زیادہ وثوق کے ساتھ نظر ڈال سکیں"۔ کائنات کا یہ گہرا علم محض ذہنی اہمیت نہیں بلکہ انتہائی روحانی قدر رکھتا ہے"۔ مشاہدۂ فطرت ایک طرح سے ذاتِ مطلق کا محرم بننے کی کوشش ہے اور یہ عبادت ہی کی ایک دوسری شکل ہے"۔ مگر اقبال انسانی خودی کو نیٹشے کی طرح اخلاقی اقدار سے بالاتر، عالمگیر قوانین سے آزاد "اپنے لئے آپ قانون" نہیں سمجھتے۔ خودی کی صحیح نشو و نما صرف ناموسِ الٰہی کی پابندی کے ذریعہ ایسے منظم معاشرے کے اندر ہو سکتی ہے جو آزادی، اخوت اور مساوات کی بنیاد پر تعمیر ہوا ہو۔ وحدتِ انسانی کے احساس کو اقبال بھی ٹیگور کی طرح، اخلاقی زندگی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں لیکن ان کے ہاں یہ احساس وحدتِ مطلق کے تصور سے ماخوذ نہیں بلکہ وحدتِ تخلیق کے تصور سے۔ سب انسان ایک ہیں" اس لئے نہیں کہ وہ سب بحرِ وجودِ مطلق کے قطرے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان سب کا ایک خالق ہے جس نے ان کو ایک ہی نغمۂ حیات سے پیدا کیا ہے، یکساں فطرت اور طبیعت عطا کی ہے، اور یکساں قانونِ زندگی کا پابند بنایا ہے۔ اس قانون کی حدود کے اندر، اجتماعی زندگی کی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے، شخصیت کو نشو و نما دیکر اس بلند درجے پر پہنچانا جہاں انسان حقیقت کا محرم، کائنات پر متصرف اور حیاتِ ابدی میں حصہ دار بن جاتا ہے، خلیفۃ اللہ فی الارض کے لقب کا مستحق ہوتا ہے یہی خلاق کا نصب العین ہے اور یہی آرٹ کا۔

اقبال بھی، ٹیگور کی طرح، جمالی ہیئت یعنی حقیقت کو فنونِ لطیفہ کا

(باقی صفحہ [illegible] پر)



# جدید تیرنے کے تالابوں کی تعمیر

تیرنے کے تالاب ہر طبقے کے لوگوں کی زندگی کی دلچسپی اور تندرستی میں زبردست اضافہ کرتے ہیں۔

یہ خواہ عوام یا خواص کیلئے تعمیر کیا جائے مگر ایک شہر میں کم از کم ایک ایسا تالاب ضرور ہونا چاہیئے تاکہ بوڑھے اور جوان سب ہی اس تندرستی میں اضافہ کرنیوالی ورزش سے لطف اندوز ہوسکیں تیرنے کے تالابوں کی مکمل تعمیر اور ان سے متعلقہ عمارتوں کی تعمیر کے لئے سیمنٹ کانکریٹ سے زیادہ کوئی دوسرا مسالہ موزوں نہیں ہے۔ یہ نہایت صاف اور محفوظ ہے اور اسکی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دیکھنے میں جاذب نظر اور دل خوش کن ہے اور بالکفایت ہونے کے علاوہ دیرپا بھی ہے۔

کانکریٹ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ مفید تعمیرات کیلئے دی کانکریٹ ایسوسی ایشن آف انڈیا (، کوئنس وے نئی دہلی) کے فنی ادارے کی اعانت حاصل کی جاسکتی ہے۔

ڈاک خرچ وغیرہ کیلئے تین آنے کے ٹکٹ مندرجہ بالا پتہ پر ارسال کرکے تیرنے کے تالابوں کے متعلق کتابچہ منگوالیجئے

## دی سیمنٹ مارکیٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ

CM. 104 A—

# بھائی بہن

افسانہ

ستیہ وتی ملک

"ماں جی! ......... ہائے! ماں جی! ..... ہائے!"

ایک بار، دوبار، لیکن تیسری بار" ہائے ہائے" کی دردناک پکار ساوتری برداشت نہ کر سکی۔ کاربن پیپر اور ڈیزائن کی کاپی وہیں کرسی پر پٹک جلدی سے اس نے غسل خانے کے دروازے کے باہر کھڑے کمل کو گود میں اٹھا لیا اور پچکارتے ہوئے کہا "بچے سویرے سویرے نہیں روتے۔"

"تو نرملا میرا گانا کیوں گاتی ہے۔ اور اس نے میری ساری قمیص کیوں چھینٹے ڈال کر گیلی کر دی ہے؟"

غسل خانے کے اندر ابھی تک پتلی سی آواز میں نرملا گنگنا رہی تھی" ایک ...... لڑکا ..... تھا ...... وہ روتا ........ رہتا ......."

"بڑی نٹ کھٹ لڑکی ہے۔ تہا کر باہر نکلے تو سہی، ایسا پیٹوں کہ وہ بھی جانے" ماں سے یوں دلاسا پاکر کمل کپڑے بدلنے چلا گیا۔

نجانے کتنی نیک آرزوؤں، ارمانوں اور دعاؤں کو لے کر ساوتری نے اپنے بھائی کے جنم دن پر تحفہ بھیجنے کے لئے ایک سپید ریشمی کپڑے پر تتلی کا خوبصورت ڈیزائن کھینچا ہے۔ ہلکے نیلے، سنہرے اور گہرے لال رنگ کے ریشم کے تاروں کے ساتھ ہی ساتھ جانے کتنی ہی میٹھی یادیں بھی اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھ اٹھ کر بندھی سی جا رہی ہیں۔ اور کئی بن پربتوں، ندی نالوں اور میدانوں کے پار دور سے ایک چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے آکر اس کے روئیں روئیں کو سرشار کر رہا ہے۔ کبھی ایسا بھی لگنے لگتا جیسے سامنے دیوار پر لٹکتی ہوئی نریندر کی تصویر ہنس کر بول اٹھے گی۔ ساوتری کی آنکھوں میں محبت کے آنسو چھلک آئے۔ تتلی کا ایک پنکھ کاڑھا جا چکا ہے لیکن دوسرا شروع کرنے سے پہلے ہی کمل کی سسکیوں اور آنسوؤں نے ساوتری کو وہاں سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

سکول کی چیزوں کو بیگ میں ڈالتی ہوئی نرملا کے پاس کھڑے ہو کر ساوتری نے کڑک کر کہا" نرمل، تجھے شرم نہیں آتی کیا؟ اتنی بڑی ہو گئی ہے! کمل تجھ سے پورے چار سال چھوٹا ہے۔ کسی چیز کو اسے چھونے تک نہیں دیتی۔ ہر گھڑی وہ بیچارہ روتا رہتا ہے۔ اگر اس نے تیرے پنسل کو دیکھ لیا تو کیا ہوا؟"

نرملا سر نیچا کئے مسکرا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر ساوتری کا پارہ اور بھی زیادہ چڑھ گیا۔ اس نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔" رانی جی، بڑے ہونے پر پتہ چلے گا، جب انہی نایاب صورتوں کو دیکھنے کیلئے بھی ترسو گی۔ بھائی بہن سدا ساتھ ساتھ نہیں رہتے۔"

ماں کی جھڑکیوں نے لڑکی کے ننھے ذہن کو ایک الجھن میں ڈال دیا — حیرت زدہ ہو کر وہ ماں کے غضبناک چہرے کی طرف صرف ایک ساکت، گہری، متعجب نگاہ ڈال کر رہ گئی۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد ذرا اداس سا منہ لئے نرملا جب کمل کو ساتھ لے کر سکول چلی گئی تب ساوتری کو اپنی ساری بیکچر بازی بے معنی سی معلوم ہونے لگی۔ دفعتاً اسے یاد آنے لگی کچھ سال پہلے کی ایک بات۔ تب وہ نریندر سے کیوں روٹھ گئی تھی؟ چھی! ایک معمولی سی بات پر..... لیکن آج جو بات معمولی سی جان پڑتی ہے۔ ان دنوں اسی معمولی، حقیر، ذرا سی بات نے اتنی بھیانک شکل کیوں اختیار کر لی تھی، جس کی وجہ سے بھائی بہن نے آپس میں پورے ایک مہینے تک ایک بات بھی نہ کی تھی۔ ایکا ایک ساوتری کے چہرے پر ہنسی کھل اٹھی، جب اسے یاد آیا نریندر کا دن رات نئے نئے ریکارڈ لا کر گراموفون پر بجانا اور ایک دوست سے دوربین مانگ کر بہن کے کمرے کی طرف جھانکنا کہ کسی طرح ان دونوں چیزوں کا اثر ساوتری پر پڑ رہا ہے یا نہیں۔ اسے یہ بھی یاد کر کے خوب ہنسی آئی کہ کیسے وہ ہونٹوں پر مہر سکوت لگائے مٹھائی کی طشتری نریندر کے کمرے میں رکھ آتی تھی۔ میز پوش پھر ہاتھ میں لے کر کاڑھتے ہوئے ساوتری نے من ہی من میں عہد کیا کہ اب سے وہ بچوں کو بالکل ڈانٹ پھٹکار نہیں بتائیگی لیکن ادھر بارہ بجے کی آدھی چھٹی میں کھانے کے وقت پھر کئی شکائتیں کمل کی طرف سے موجود تھیں۔ "نرملا مجھے اپنے ساتھ ساتھ نہیں چلنے دیتی، پیچھے چھوڑ آتی ہے۔" "مندا کنیر پورن دھارائے" کے بدلے "کمل کنیر پورن دھارائے" گانا گاتی ہے اور گدھا کہتی ہے"۔

معاملہ کچھ اتنا سنگین نہ تھا۔ اور دن ہوتا تو شاید نرملا کی ان شرارتوں کو ساوتری ہنسی سمجھ کر ٹال دیتی، لیکن یہ سرکش لڑکی سویرے ہی اس کے عزیز ترین اور ضروری کام میں بار بار رکاوٹ ڈال رہی ہے! ایک ہلکی سی چپت نرملا کے لگاتے ہوئے ماں نے ڈانٹ کر کہا " بس اکل ہی سکول سے تیرا نام کٹوا دیا جائے گا۔ یہ سب انگریزی سکول کی تعلیم کا ہی نتیجہ ہے۔ ذرا سی لڑکی نے گھر بھر میں آفت مچا رکھی ہے۔ ابھی بھائی بہنوں کی شکل صورت نہیں بھاتی۔ بڑی ہونے پر نہ جانے کیا کیا کرے گی۔"

پھر تھالی میں پوری ترکاری ڈال کر بچوں کے آگے رکھتے ہوئے ذرا دھیمی آواز میں کہا " دیکھو نرمل، جب میں تمہارے برابر کی تھی تو اپنے بھائی بہنوں کو کبھی تنگ نہیں کرتی تھی۔ کبھی اپنے ماتا پتا کو دکھ نہیں دیتی تھی" مگر یہ بات کہتے ہوئے اندر ہی اندر ساوتری نے کچھ جھجھک سی محسوس کی۔

---

"ہم دونو سینتا کے گھر سے جلوس دیکھیں گے ماں؟ اچھا"۔ کمل نے عاجزانہ لہجے میں اجازت مانگی۔

"نہیں جی، کیا اپنے گھر سے دکھائی نہیں دیتا؟" دروازے کی اوٹ میں نرملا کھڑی تھی۔ "کیسی چالاک لڑکی ہے۔ اسی غریب کو آگے کرتی ہے، جب خود کچھ کہنا ہوتا ہے۔" "جاؤ، جانا ہے تو" ساوتری نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

پانچ بجے محرم کا جلوس نکلنے والا تھا۔ پل بھر میں چوراہے پر سینکڑوں مرد عورتوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ ساوتری کا دھیان کبھی کالے ہرے رنگ برنگے کپڑے پہنے مجمع کی طرف اور کبھی جلوس کی وجہ سے رکی ہوئی موٹر گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف خود بخود کھنچ رہا تھا اور ادھر ننھی نرملا کے ہوش و حواس یکایک گم سے ہوگئے جب اسے گھر میں کمل کا سایہ تک نظر نہ آیا۔ بیکل سی ہوکر وہ ایک کمرے سے دوسرے میں اور پھر برآمدے میں بے پر پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی دوڑنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ اسے سب کچھ سنسان سا معلوم ہونے لگا۔ وہ ماں سے کئی بار چھوٹے بچوں کے بھیڑ بھاڑ میں کھو جانے کا حال سن چکی ہے۔ آہ ..... اس کا بھیا کمل ..... وہ کیا کرے؟

نیچے سڑک پر بھانت بھانت کے رنگ برنگے کھلونے، نئی نئی شکل کے غبارے، کاغذ کے پنکھے، پتنگ اور طرح طرح کے سُر نکالتے ہوئے باجے لاکر بیچنے والوں نے بچوں کے لئے پر سحر جال سا بچھا رکھا ہے، کچھ دور سے۔ جیسے کہ سٹیج کے پیچھے سے، ڈھما ڈھم ڈھما ڈھم ڈھول باجوں کی آواز بڑھتی آرہی ہے۔ نرملا ان سب دلکش چیزوں کو بنا دیکھے سنے بھیڑ کو چیرتی ہوئی سیتا کے گھر بھی ہو آئی۔ لیکن کمل تو وہاں بھی نہیں ہے۔ روتے روتے نرملا کی آنکھیں سوج آئیں۔ چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا۔ آخر وہ ہچکیاں لیتے ہوئے رندھے گلے سے ماں کے پاس جاکر بولی "کمل ... کمل تو سیتا کے گھر بھی نہیں ہے"۔

ساوتری کا تن بدن معاً ایک بار کانپ اٹھا۔ لمحہ بھر میں بھیڑ، موٹر، اور گاڑیوں کے خوف سے بلائے ناگہانی کے کئی تصورات اس کی آنکھوں کے آگے گھوم سے گئے۔ لیکن وہ ڈرپوک لڑکے کی نس نس سے واقف تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ کمل ضرور ہی کہیں نہ کہیں کسی دوکان پر کھڑا ہوکر یا کسی نوکر کے ساتھ جلوس دیکھ رہا ہوگا۔ پھر بھی اس نے پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی نرملا کو چھاتی سے نہیں لگایا اور نہ اسے ڈھارس ہی بندھائی بلکہ متحیر سی ہو، تسلی و تشفی کا ایک لفظ کہے بغیر گویا وہ اپنی لڑکی کے آنسوؤں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رہ رہ کر ایک تذبذب سا اس کے دل میں اٹھنے لگا۔ "مجھ سے بھی زیادہ ——— بھیا ماں کے دل سے بھی زیادہ۔ کسی اور کو درد اتنا ہوسکتا ہے؟ اور یہ نرملا تو دن رات کمل کو ستایا کرتی ہے!"

جلوس ختم ہوگیا۔ دھیرے دھیرے تماشائیوں کے جھنڈ بھی منتشر ہونے لگے۔ موٹر کاروں کا پہلے کی طرح دھڑا دھڑ آنا جانا پھر جاری ہوگیا۔ اور سامنے ہی فٹ پاتھ پر سفید نکر اور سفید قمیص پہنے پڑوسی ڈاکٹر صاحب کے نوکر کے ہاتھ میں ہاتھ لٹکائے کمل کشور گھر آتا ہوا دکھائی دیا۔

---

سیڑھیوں سے پھر سسکنے کی آواز سن کر ساوتری نے دیکھا تو مبہوت سی رہ گئی۔ نرملا کمل کو اپنی باہوں میں کس کر باندھے، دگنی شدت سے رو رہی ہے۔ اس کے کومل گلابی گال موٹے موٹے آنسوؤں سے بھیگے جارہے ہیں اور وہ بار بار کمل کا منہ چوم چوم کر کہہ رہی ہے، "پگلے! تو کہاں چلا گیا تھا؟ گدھے! تو کیوں چلا گیا تھا؟"

ساوتری کا دل بھر آیا۔ پاک محبت کے اس منظر کو دیکھ کر مسرت کی ایک دھارسی اس کے دل کی گہرائیوں میں بہنے لگی، جھڑتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس نے کمل کی جگہ نرملا کو چھاتی سے لگا کر اس کا منہ چوم لیا اور کہا "بیٹا، بہن کو پیار کرو۔ دیکھو، وہ تمہاری خاطر کتنا روئی ہے۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟" نرملا کا انداز روتے دیکھ کر کمل بول اٹھا "تو کیا میں وہاں نہیں رو رہا تھا؟" "تم کیوں رو رہے تھے جی؟" ماں نے حیران ہوکر پوچھا۔ "مجھے غبارہ لینا تھا۔ پیسہ نہیں تھا۔" نرملا نے دوڑ کر اپنی جمع کی ہوئی چونی کے پیسوں سے دو غبارے اور دو کاغذ کے کھلونے کمل کو لا کر دیئے اور ایک بار پھر اسے باہوں میں جکڑ کر کہا "گدھے! تو چلا کیوں گیا تھا؟"

---

## ہندوستان کی مشترک تہذیب: ——— بقیہ صفحہ ۱۷

مقصد سمجھتے ہیں، لیکن چونکہ ان کے نقطۂ نظر سے مشاہدۂ حقیقت محض انفعالی نہیں، بلکہ فاعلی، محض ادراکی نہیں بلکہ تخلیقی ہے، اس لئے درحقیقت اُن کا آرٹ اور اس کے مقصد کا تصور ٹیگور سے بہت مختلف ہے۔ اقبال کے نزدیک آرٹ کا مقصد خود اور غیر خود کے فرق کو مٹانا نہیں بلکہ اس پر اور زیادہ زور دینا یعنی انسانی خودی کو محکم اور مکمل کرکے حیات ابدی بخشنا۔ اس کا کام سکون، رقت، سپردگی کی کیفیت پیدا کرنا نہیں بلکہ تخلیقی بے چینی، ایک حرکی ولولے اور مجاہدانہ جوش کا ابھارنا۔"

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے ÷ یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا ÷ اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو ÷ جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں ÷ جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

# نادر شاہ کا آخری غیور سپاہی

ڈرامہ (۱)

یہ ڈراما جدید فارسی زبان میں آقائے سعید نفیسی تبریزی نے لکھا ہے جس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ دوسری موثر تدابیر کے ایرانیوں میں جوش وطن پرستی پیدا کیا جائے اور اُن کے اسلاف کی شاندار روایات کو یاد دلا کے شجاعت قومی کی دبی ہوئی چنگاریوں کو دوبارہ مشتعل کیا جائے۔

اس کی تشکیل کے سلسلے میں مصنف نے آخری جنگ روس و ایران کا حوالہ دیا ہے جو میدان قفقاز میں ہوئی تھی۔ پلاٹ نہایت سادہ ہے جس میں ایرانیوں کے تمدن و معاشرت کے تمام خصوصیات موجود ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس غم انجام واردات کو نہایت خوش اسلوبی سے حوالۂ قلم کیا گیا ہے؛ اشہر

## اشخاص

(۱) اللہ یار بیگ۔ نادر شاہ کی فوج کا ایک عمر رسیدہ افسر (اکیانوے سال عمر)
(۲) اردشیر بیگ۔ اوس کا فرزند (پچاس سال کا)
(۳) فلک ناز۔ اردشیر کی لڑکی (بیس سال کی)
(۴) میرزا مسیح طبیب (قراچہ داغی) (ساٹھ سال کا)

شہر تبریز میں ایک مکان ہے جس کے ایک وسیع کمرے کے دو دروازے مشرق و مغرب کی طرف اور تیسرا شمال کی سمت۔ مشرقی دروازے کے سامنے ایک توشک بچھی ہے جس پر صاف چادر ہے اور ایک بڑا گاؤ تکیہ لگا ہے۔ کمرے کے مغربی جانب دو اور موٹی قالینیں ہیں۔ اس کے علاوہ تمام کمرے کا فرش بھی قالین ہی کا ہے۔ اور شمال کی جانب پہلو میں ایک بڑا لکڑی کا صندوق رکھا ہوا ہے۔

## پردہ اول

(اللہ یار بیگ اور فلک ناز بیٹھے ہیں۔ بعد کو اردشیر بیگ بھی آجاتا ہے)

کمرے کے سیدھے رُخ توشک پر اللہ یار بیگ شکستہ سا بیٹھا ہوا ہے اور فلک ناز اس کے بائیں جانب خاموش بیٹھی ہے۔

**اللہ یار بیگ:۔** فلک ناز! بیٹی تیرا باپ کہاں ہے؟ آدھ گھنٹے سے میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ ابھی تک نہیں آیا۔ کھانے کے وقت بھی موجود نہ تھا۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں اس وقت نہ آئے کہ پھر کچھ نہ ہو سکے۔

**فلک ناز:۔** دادا جان۔ مایوس نہ ہوجئے۔ بابا کہیں ہوں مگر یہی وقت اُن کے آنے کا ہے۔ آپ خود جانتے ہیں کہ روزانہ ٹھیک بارہ بجے گھر آتے ہیں۔ آج نہار کے وقت بھی نہیں آئے۔ بہت ممکن ہے کہ گرفتار ہوگئے ہوں۔ مگر دادا جان از برائے خدا یہ تو بتلائیے کہ آپکا مزاج کیسا ہے۔ آج صبح سے اب تک میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کچھ بجھے سے بیٹھے ہیں! آپ تو برابر باتیں کیا کرتے تھے۔ اپنے دور و دراز سفروں کے دلچسپ قصے۔ نادری لڑائیوں کا حال برابر بیان کیا کرتے تھے جن کی وجہ سے مجھے تنہائی بالکل نہیں کھلتی تھی۔ آج کیا ہے کہ آپ سخت متفکر معلوم ہوتے ہیں۔ خدا کے لئے بتلائیے تو کیا معاملہ ہے؟ مجھے بھی تو معلوم ہو۔ اب مجھ میں اتنی طاقت و صبر نہیں کہ آپ کو زیادہ رنجیدہ دیکھ سکوں۔

**اللہ یار بیگ:۔** جان پدر بس تم دونوں (باپ بیٹی) میری دکھ بھری زندگی کا سکھ ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ نہ تو میرے پاس کوئی اندوختہ ہے جسے دیکھ کر خوش ہوں۔ نہ میرا کوئی جاہ و وقار باقی ہے کہ اس میں مست رہوں۔ بیٹی چالیس سال سے (کچھ توقف کے بعد) ہاں چالیس سال سے میں نے تبریز میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ ابتداً تو میرے لئے کافی دلچسپی کا سامان تھا۔ یہ بھی سوچا کرتا تھا کہ ممکن ہے زمانہ پھر مجھے موقع دے کہ میں کسی قومی جنگ میں دوبارہ ان بازوؤں سے کام لوں۔ ان پنجوں کو جو اس قدر کمزور ہوگئے ہیں) دشمنوں کے خون سے رنگین کرلوں!......

اشہر لکھنوی

اس کے علاوہ۔ بیٹی!... تمہاری دادی اور ماں زندہ تھیں۔

ایسے لوگوں کے لئے جنھوں نے اپنی طاقتور جوانی نادر شاہ ایسے جرّار بادشاہ کے ساتھ لڑائیوں میں گذاری ہو ضروری ہے کہ بڑھاپے کے دم چند روز گوشۂ عافیت میں بسر کریں۔ اپنے گرد تم ایسی معصوم ہستیوں کو دیکھیں اور انکی تفریح کیلئے دلچسپ باتیں کریں۔

پانچ برس ہوئے کہ موت کے بے رحم ہاتھ نے میری اس مسرت کے دائرے کو تنگ کر دیا۔ اور تمہاری بوڑھی دادی اور جوان ماں کو ہم سب سے جدا کر دیا۔ اب میری خوشی اور دل کا چین۔ بیٹی! تم سے اور تمہارے باپ کی ذات سے وابستہ ہے۔ تم دو تو میری دھندلی آنکھوں کی روشنی اور مرجھائے ہوئے دل کی ٹھنڈک ہو اگر تم کبھی مجھے رنجیدہ پاؤ تو یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ اس کا باعث تم یا تمہارا باپ ہے۔ بھلا دنیا میں کون ایسا ہے جو اپنے مطیع اور فرمانبردار بچوں سے ناراض ہو۔

نہیں۔ بیٹی! نہیں۔ تم دو تو میری آخری امید ہو۔ شاید آج یا کل میں اپنی آخری سانس تیری گود میں۔ نہیں ... تنہائی میں .... تیرے سینے پر سر رکھ کر ختم کروں! اور اس جاتی ہوئی دنیا کا آخری نقش جو میری بند ہوتی ہوئی آنکھوں میں رہ جائے وہ تیرا نورانی اور محبوب چہرہ ہو۔

لیکن نہیں ... نہیں ... میں اتنے جلد مرنا نہیں چاہتا۔ اگر دو تین روز قبل موت آتی تو شاید نہایت خوشی سے منظور کر لیتا۔ مگر اس وقت محسوس ہو رہا ہے کہ ممکن ہے چند روز اور زندہ رہوں کہ اس جنگ کو بھی دیکھ لوں اور اس آخری فتح کی مسرت کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں۔

**فلک ناز:**۔ دادا جان کیسی دہشت انگیز باتیں آپ کر رہے ہیں! لڑائی؟ کیا پھر لڑائی ہو رہی ہے! ہم ایرانیوں میں اب اس بدقسمتی کے برداشت کرنے کی طاقت بالکل نہیں رہی۔ دادا جان! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اس وقت تک اطمینان سے پانی کا گھونٹ حلق سے نہیں اترا۔ برابر زحمت و پریشانی سے سابقہ رہا۔ آج گرجستان سے لڑائی ہے تو کل کردوں سے۔ پرسوں اور کسی سے۔ روز ایک تازہ مصیبت نازل ہوتی ہے۔ آج پھر آپ جنگ کی خبر بد سنا رہے ہیں .... خدا کا واسطہ۔ دادا جان۔ جلد بتائیے کہ کیا خبر ہے۔ میرا تو کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے۔

**اللہ یار بیگ:**۔ نا بیٹی۔ پریشان نہ ہو۔ کوئی ہماری طرف رخ نہیں کر سکتا۔ ایرانی فوج طاقتور اور تجربہ کار ہے۔ ہم اپنے دشمنوں کے باپ کو پچھاڑ دیں گے اور انھیں پیوند زمین کر دیں گے! ابھی ایرانی نادر شاہ کو نہیں بھولے ہیں .... جنگ خراسان و بغداد .... و گرجستان انھیں یاد ہے (جوش بڑھتا ہے) اور خود میں کسی سے کم ہوں .... جب تک یہ ہاتھ میرے جسم میں ہیں۔

مجھ سے برداشت نہ ہوگا کہ دشمنوں کے منحوس پاؤں سے ایران کی مقدس زمین ناپاک ہو ...... فلک ناز! .... بیٹی اطمینان رکھو! یقین رکھ! (اس درمیان میں اردشیر بیگ کے پاؤں کی آہٹ بائیں جانب سے آتی ہے۔)

ہا! تیرا باپ آگیا! بیٹی ذرا خاموش رہ۔ میں اردشیر سے کچھ باتیں کر لوں۔

**اردشیر بیگ:**۔ پدر جان۔ السلام علیکم۔ اب تک آپ میرے منتظر ہونگے۔ اگر مجھے کچھ دیر ہوگئی ہو تو معاف فرمائیے۔ میں صبح کو مسجد گیا تھا۔ وہاں سب احباب جمع تھے۔ سلطنت روس نے دو ہفتہ قبل سلطنت ایران سے اعلان جنگ کیا ہے اسی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ چونکہ یہ ایک اہم معاملہ تھا اس وجہ سے دیر تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ میں نے بارہا صحبت سے اٹھنے کا ارادہ کیا مگر دل نے نہ مانا۔

**اللہ یار بیگ:**۔ جان پدر! یہ انتظار معمولی نہیں تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ذرا جلدی چلے آتے کہ اس معاملے میں میرے تمہارے درمیان کچھ گفتگو ہو جاتی۔ اب یہی وقت ہے۔ اس کے متعلق ہم مفصل گفتگو کر سکتے ہیں ..... ہاں تو مسجد میں کیا گفتگو ہو رہی تھی۔ اور تازہ خبر کے متعلق لوگ کیا کہہ رہے تھے؟

**اردشیر بیگ:**۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ دو ہفتے ہوگئے کہ سلطنت روس کا اعلان جنگ پایہ تخت طہران میں پہونچ گیا ہے۔ شاہ نے بڑی کوشش کی کہ روس اعلان جنگ واپس لے مگر کوئی نتیجہ نہ ہوا روسی جنگ کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ شاہ عجم کلاہ بھی مجبور ہے کہ تمام قبائل کو جنگ کے لئے تیار کرے۔ لہذا تمام اطراف ایران سے شاہی فوج کو طلب کیا گیا ہے تاکہ قفقاز کی طرف کوچ کرے۔ ...... کل شہر میں علماء کی طرف سے اعلان جہاد بھی ہو گیا ہے۔ اور ایک جم غفیر جنگ میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہے۔ وزیر جنگ کبھی کل اپنی فوج کے ساتھ کوچ کر دیں گے۔ روسی فوج کے متعلق سنا گیا ہے کہ ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور ماسکو سے چل پڑی ہے۔ مزید براں ان میں کی کچھ تعداد گرجستان پہونچ بھی چکی ہے۔ آج وزیر جنگ نے تمام قبائل آذربائجان کو طلب کر کے حکم دیدیا ہے کہ اپنے اپنے سوار رسالوں کو ساحل ارس پر جمع کر دیں ..... تبریز میں یہ عالم ہے کہ جو شخص ہاتھ میں تلوار پکڑ سکتا ہے لڑائی پر جانے کے لئے تیار ہے اور شاہراہوں پر تو ایک عجیب ہمہمہ ہے۔ جوانان جنگ جو اپنے دوستوں سے

رخصت ہو رہے ہیں۔ کاٹھیاں۔ زین۔ اور جنگی سامان بنانے والوں کی دوکانوں پر بڑی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے عمائدین نے اپنے خاص گھوڑے شاہی رسالوں کو پیش کر دئے ہیں۔ نیز چوپایہ فروشوں کے پاس جتنے گھوڑے۔ خچر۔ اونٹ وغیرہ تھے سب مخلصانہ جنگ کی نذر کر دئے۔ میرے احباب میں سے اسوقت تک تقریباً انتیس جوان فوج میں بھرتی ہو چکے ہیں بابا جان! جن میں سے آٹھ آدمیوں کو تو آپ بھی جانتے ہیں۔ محمود بیگ۔ ارسلان بیگ وغیرہم۔ اور کل یہ سب وزیر جنگ کے ساتھ کوچ کر دیں گے احباب مجھ سے بھی شرکت جنگ کے لئے مصر ہیں۔ . . . . مگر میں . . . . .

**اللہ یار بیگ:** — جان پدر! کیا تمہارا جانے کا ارادہ نہیں؟

**اردشیر بیگ:** — نہیں تو۔

**اللہ یار بیگ:** — بیٹا! کیوں نہیں جاتے۔ کونسی شے مانع ہے؟

**اردشیر بیگ:** — بابا جان! آخر میری ذمہ داریوں کو تو ملاحظہ کیجئے۔

**اللہ یار بیگ:** — ان سب سے بڑھ کر تم پر ایک اور ذمہ داری ہے۔

**اردشیر بیگ:** — میں آپ کو اور فلک ناز کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔

**اللہ یار بیگ:** — اردشیر! شرم کر . . . . . شرم۔ تو میرے لئے اور اپنی لڑکی کی محبت میں اس ایران کو نظر انداز کر رہا ہے جس کے لئے میرا اور تیرا دونوں کا خون بہ جائے تو اچھا۔ کیا اسی کے لئے مادر وطن نے ہمیں پرورش کیا تھا۔

**اردشیر بیگ:** — بابا جان! آپ کمزور بھی ہیں اور بیمار بھی۔ آپ کے لئے ایک تیماردار کی ضرورت ہے۔ فلک ناز کمسن ہے۔ اس کے سر پر اور کوئی بزرگ نہیں۔ اگر خدا نخواستہ آپ کے دشمن نہ رہے تو . . . . . میری پیاری۔ باعصمت فلک ناز! اس دیار غربت میں تنہا کیا کرے گی۔ جہاں جنگی دور دورہ ہوگا۔ تباہی ہوگی۔ قحط ہوگا! —

**اللہ یار بیگ:** — اردشیر! کیا تو بھول گیا کہ تو اللہ یار بیگ کا فرزند ہے۔ کیا تو بھول گیا کہ تو اس کا فرزند ہے جس نے نادر شاہ . . . . . ہاں . . . . . نادر شاہ۔ کے ہمراہ رکاب خونی لڑائیاں لڑی ہیں! . . . . . . . شیر مادر تجھ پر حرام! اردشیر! سن! میں پندرہ سال چین سے نہیں بیٹھا۔ کرمان و خراسان۔ اصفہان و شیراز۔ خوارزم و بغداد۔ گرجستان و ہندوستان۔ ہر میدان جنگ میں موجود تھا . . . نہ برف و بارش کی پروا کی۔ نہ خستگی و مرض کی۔ نہ زخم و تکلیف کی۔ نہ شکست و فرار کی۔ غرض یہ ہے کہ کسی بلا سے بھی نہیں ڈرا . . . . . . . . اردشیر! ذرا اس بڈھے کا دل گردہ دیکھ! اس مدت میں کسی رات آرام کی نیند نصیب نہیں ہوئی۔ اطمینان کا ایک گھونٹ پانی حلق کے نیچے نہیں اترا۔ نہ تو کسی عورت کی صورت دیکھنے کو ملی کہ اس کے نازک ہاتھوں سے ایک جام شربت پیتا۔ نہ جاڑے میں گرم بستر ملا جس پر پاؤں پھیلا کے آرام کی نیند سوتا . . . . . . . ہم شیر درندہ کی طرح اس صحرا سے اس صحرا . . . اور اس شہر سے اس شہر۔ دشمن کا تعاقب کرتے رہے! . . . . . . ہم نے بلخ سے لیکے بغداد تک سلیمانیہ سے لے کے محمود آباد تک بادشاہوں اور امیروں کے عالیشان محلوں کی دیواروں پر (نوک خنجر سے) جلی حرفوں میں اپنا نام کندہ کر دیا! وائے ہو تجھ پر۔ اے انقلاب زمانہ! اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم ایسے بہادروں کے لڑکے۔ محبت پدر و دختر کا بہانہ ڈھونڈ کے چاہتے ہیں کہ ایسے نازک موقع پر مادر وطن کی خدمت سے منہ موڑ لیں جبکہ وہ ان کی مدد کی محتاج ہے۔ عورتوں کی طرح اوڑھنی اوڑھ کے گھر میں بیٹھ رہیں اور دور سے تماشا دیکھیں کہ حمایت وطن میں برادران وطن کا خون زمین پر بہ رہا ہے۔ اردشیر! اگر تو جنگ میں کام آئے گا تو مجھے بھی ختم سمجھ۔ تیری دختر عزیز فلک ناز کا۔ فلاں روسی افسر کی کنیز ہو جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم اس گھر میں جان چرائے بیٹھے رہیں! — اور کل یا پرسوں ان سفید چمڑے والے روسیوں کے سامنے۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ۔ جھک کے سلام کریں۔ اردشیر! شرم کر! شرم کر! بس خاموش رہ!

آج نادر شاہ نہ ہوا جو تیرا سر تن سے اڑا دیتا! لیکن اگر وہ نہیں ہے . . . تو میں جو اس کے دروازے کے کتے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ خدا کا شکر ہے کہ زندہ ہوں۔ میرے بازوؤں میں ابھی اتنی سکت ہے کہ تیرا نجس خون اس پاک سرزمین پر بہا دوں!!!

**فلک ناز:** — (بیتاب ہو کے۔ اور اللہ یار بیگ کے قدموں پر سر رکھ کے) دادا جان! آپ تو کبھی ایسے سخت دل نہیں تھے۔ ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ ہم لوگوں سے پیش آتے تھے۔ اور محبت آمیز باتیں کیا کرتے تھے۔ آج آپ کو کیا ہو گیا۔ کہ یک لخت آپ نے اس اچھے برتاؤ کو بھلا دیا؟ دادا جان! اپنی ضعیفی پر

اور میری معصوم بیکسی پر ترس کھائے۔ خیر، میری طرف نہ دیکھئے تو نہ سہی۔ ۔ ۔ مگر اپنے بڑھاپے پر۔ للہ اپنے بڑھاپے پر رحم کیجئے!

**اللہ یار بیگ:** بیٹی! تو چپ رہ۔ یہ معاملہ ایسا معمولی نہیں جس میں عورتیں دخل دیں۔ تو ابھی بچہ ہے۔ تجھے ماں بننے کا موقع نہیں ملا ہے۔ تو کیا سمجھ سکتی ہے کہ مادر وطن کے لئے فرزندان وطن کی کیا روش ہونی چاہیئے؟ جان پدر! میں وہی مہربان اور نازک دل مرد ضعیف ہوں۔ جیسا پہلے تھا۔ لیکن اسوقت ایران کی نازک حالت دیکھ کے میرا دل سخت اور مزاج تند ہوگیا ہے۔ ہبی تو اپنے امور متعلقہ کو سہولت اور دلجمعی سے انجام دے اور مجھے اپنے ذاتی خرخشوں میں چھوڑ دے تاکہ میں تیرے بے سمجھ باپ کو ان برے خیالات سے باز رکھوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو جانتی ہے کہ ہمارے خاندان کی شرافت صرف اسی وجہ سے ہے کہ میں نے اپنے زمانۂ شباب کے پندرہ برس نہایت سخت مصیبتوں اور ناگوار زحمتوں میں گذارے ہیں۔ ایک ایسے صاحب جلال بادشاہ کے ہمراہ رکاب جنگ کی ہے جس کے خوف سے رود جیحوں سے لے کے دریائے جمنا تک لوگوں کو رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ بیٹی! تجھے کیا معلوم کہ میں نے یہ تمام فخر و شرف اپنے قوت بازو سے اور دشمنوں کے خون سے پیدا کیا ہے!

آج زمانے نے پھر ایک موقع دیا ہے کہ مجھ ایسے سپاہی کا اکلوتا لڑکا جو دنیا میں میرا قائم مقام ہوگا۔ میرے فخر و شرف کی تکمیل کرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے۔ ۔ ۔ ۔ بس اب مجھے اپنے باپ سے دو ٹوک بات کر لینے دے!

(اردشیر کی طرف متوجہ ہوکر) اردشیر! یاد رکھ۔ تیرے ضعیف باپ نے جو شاید دو ایک روز کا اس دنیا میں اور مہمان ہے۔ ایک سو بیس برس میں صرف دو چیزیں اپنے لئے مہیا کی ہیں اور وہ بھی صرف آج کے دن کے لئے!

اے بے رحم فرزند! تو یہ چاہتا ہے کہ سب میرا کیا کرایا خاک میں مل جائے۔ پہلی چیز میری شرافت ذاتی ہے جو پندرہ سال تلواروں کے سایئے میں۔ ۔ ۔ موت کے منہ میں رہ کے حاصل کی ہے۔ اور وہ بھی سنا درشاہ افشار۔ ۔ ۔ ۔ ہاں۔ ۔ نادرشاہ افشار کے فتحمند پرچم کے نیچے! اردشیر! فقط تو نے نادرشاہ کا نام ہی سنا ہے۔ تیرے تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ یہ شجاع مرد۔ اور مرد میدان فرد کیا تھا۔ اور کون تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے عزیز فرزند! نادر نام کا بادشاہ نہیں تھا۔ وہ ایسا صاحب جبروت تھا کہ اب ایران میں اس کا ثانی پیدا ہونا دشوار ہے۔ ۔ ۔ نادرشاہ وہ تھا کہ صرف جس کے خیال سے مجھ ایسے ایک سو بیس سال کے بڈھے میں جوش جوانی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اس جلیل القدر انسان کی بدولت میں نے یہ ذاتی شرف حاصل کیا ہے! اردشیر جان پدر! تیری ذات تجھے سو درجہ عزیز ہو سکتی ہے لیکن میں تجھے اس شرف و عزت پر نثار کرنے کو تیار ہوں!

دوسری چیز۔ اردشیر! تیری عزیز ذات میرا اندوختہ۔ تو ہی میرا میوۂ زندگی ہے۔ تیری ہی ذات ہے جسے میں نے زمانۂ شباب سے اسوقت تک ذخیرہ کیا ہے۔ اردشیر! آج جبکہ میں اس شرافت دیرینہ کی حفاظت کرنے سے مجبور ہوں تجھے امید ہے کہ تیرے قوی بازو اس کی حفاظت کریں گے۔

اے بے رحم سخت دل۔ اردشیر! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میرا تمام ثمرۂ زندگانی تباہ و برباد ہو جائے؟ نہیں۔ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

---

میں نہیں مان سکتا! یا تو میرے یہ ہاتھ تیرے خون سے رنگین ہونگے جنھوں نے تجھے پرورش کیا ہے۔ یا تو دشمنوں کے ہاتھ سے قتل ہوگا!!! اور کوئی تیسری صورت نظر نہیں آتی۔ اردشیر! تیری زندگی جسکو تو اسقدر عزیز سمجھتا ہے۔ تیری نہیں۔ بلکہ میری ملکیت ہے میں نے تجھے بخشی ہے۔ مجھے حق ہے کہ میں خود اسے واپس لوں۔ یا میرے دشمن اسے ختم کر دیں۔ اب جیسی تیری مرضی! بول تجھے ان دونو صورتوں میں کونسی صورت پسند ہے؟

**اردشیر:** — پدر جان! میری دلی خواہش ہے کہ حیات کی دولت پانے کے بعد آپ ہی کے پاک ہاتھوں سے مجھے موت کی نعمت بھی نصیب ہو!

**اللہ یار بیگ:** — اردشیر! مجھے ایک بات اور کہنا ہے۔ شاید یہ آخری فقرے ہوں جنہیں تو اپنے بوڑھے باپ سے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں! شریف خیال باپ سے۔ ۔ ۔ سنے گا! - اردشیر! غور سے سن میرے لئے دنیا کی کوئی شے اس سے زیادہ باعث ننگ و عار نہیں کہ اس موقع پر جبکہ مملکت ایران خطرے میں ہے اور ہزاروں ہمارے برادران وطن جو ظاہری حیثیت سے مجھ سے اور تجھ سے بہت کم ہیں حفاظت ایران کے لئے کمربستہ نظر آتے ہیں۔

تبریزی جوان . . . نہیں . . . بلکہ تمام ایرانی رود جیحون سے لیکے دریائے فرات تک جاں نثاران وطن نظر آرہے ہیں۔ ہم دونوں پر ان کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں تاکہ دیکھیں کہ آتش نادری کے یہ آخری شعلے جنھوں نے پندرہ سال تک دنیا میں آگ لگا رکھی تھی۔ وطن کے لئے کیا کارنمایاں کر کے دکھلاتے ہیں ؟ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ کل تبریز سے انیس نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے ہیں جن میں سے ایک بھی فوج نادری کے سپاہیوں کی اولاد سے نہ تھا اب لوگوں کو کہنے کا موقع ہے کہ سب گئے لیکن اللہ یار بیگ۔ نادرشاہ کی خاص پلٹن کے افسر کا لڑکا۔ اردشیر بیگ نہ گیا۔ ادر گھر میں اپنے بڈھے باپ اور نوجوان لڑکی کے ساتھ گھسا بیٹھا رہا . . . یا اللہ . . . آج میرے لئے موت کا سامنا ہے ! اردشیر ! تیری اس کوتاہی خدمت وطن سے جبکہ نادرشاہ قبر میں تڑپ اٹھا ہوگا . . . میں . . . کل روز قیامت کس منہ سے اس کے سامنے جاؤنگا !!! ۔ اچھا ۔ اچھا ! تو اس طویل داستان کے بعد۔ اردشیر تیرا کیا ارادہ ہے ؟ میدان جنگ میں جانا ہے یا نہیں ؟

**اردشیر :**۔ پدر جان ! کیا عرض کروں !

**اللہ یار بیگ :**۔ کیا تو نہیں جائیگا ! نہیں جائیگا ! (اپنا ہاتھ غصے میں اردشیر کے گریبان کی طرف بڑھاتا ہے۔ مگر کچھ سوچ کر رک جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے ) میں تیری طرح بے رحم نہیں ہوں . . بیغیرت ۔ نہیں ہوں ۔ اردشیر ! گھر میں عورتوں کی طرح چادر اوڑھ کے بیٹھ . . . تیری طرف سے میں خدمت وطن انجام دونگا ۔ اللہ یار ابھی زندہ ہے ! اس کی رگوں میں خون جاری ہے !

(غصے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور دروازے کی جانب دو تین قدم تیزی سے بڑھاتا ہے۔ لیکن چوتھی بار اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں اور زمین پر گر کر بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ جیسے فالج گر پڑا ہو۔ کمرے میں خاموشی پھیل جاتی ہے ۔ اردشیر او فلک ناز دونوں اس کے پاؤں پہ سر رکھ دیتے ہیں ۔ )

**فلک ناز :**۔ (آنکھوں میں آنسو بھرکے ) پدر جان ! آپ کو کیا ہوگیا ؟

**اردشیر بیگ :**۔ پدر جان ! مجھ سے سخت غلطی ہوئی۔ معاف کیجئے۔ برائے خدا اتنا غصہ نہ کیجئے۔ آپ کا جو حکم ہو میں اسے بجالانے کیلئے تیار ہوں

**فلک ناز :**۔ (اللہ یار بیگ کی پیشانی پر ہاتھ پھیرکے ) پدر جان ! اپنی ضعیفی پر رحم کیجئے۔ اس قدر جوش اچھا نہیں (رونے لگتی ہے )

. . . . . . . . . . . . . . (باقی دارد)

# رخصت

احمد ندیم قاسمی

ترے کہنے پہ کی ہے کوششِ ضبطِ فغاں میں نے
مگر اُٹھتا ہوا دیکھا ہے اب دل سے دھواں میں نے

تجھے ماضی کے فردوسِ حسیں میں گھوم لینے دے
تجھے پایا تھا اکثر جس میں اپنا ہم عناں میں نے

وہ تیرے التفاتِ جانفزا کی مختصر گھڑیاں
چکھا تھا اُن دنوں کیفِ حیاتِ جاوداں میں نے

وہ دن جب تیری دھن میں اک سفر تھی زندگی اپنی
پلوں میں چھان ڈالی وسعتِ کون و مکاں میں نے

وہ لمحے، جب سجا کر پتیوں سے اپنے ہونٹوں کو
تری بندہ نوازی کا لیا تھا امتحاں میں نے

وہ پل، خوف و خطر سے کھیلتا تھا جب شباب اپنا
بنائے تھے شکستہ ڈالیوں پر آشیاں میں نے

ہدف بننے کی خاطر کہکشاں دامن بڑھاتی تھی
کچھ اس شدت سے کھینچی تھی محبت کی کماں میں نے

ترے ہونٹوں سے جو گیتوں کی صورت میں ٹپکتا تھا
پیا تھا ایک مدت تک وہ خونِ ارغواں میں نے

وہ جس کو دیکھ کر جی چھوٹ جائیں ناخداؤں کے
کیا تھا اس سمندر میں سفینے کو رواں میں نے

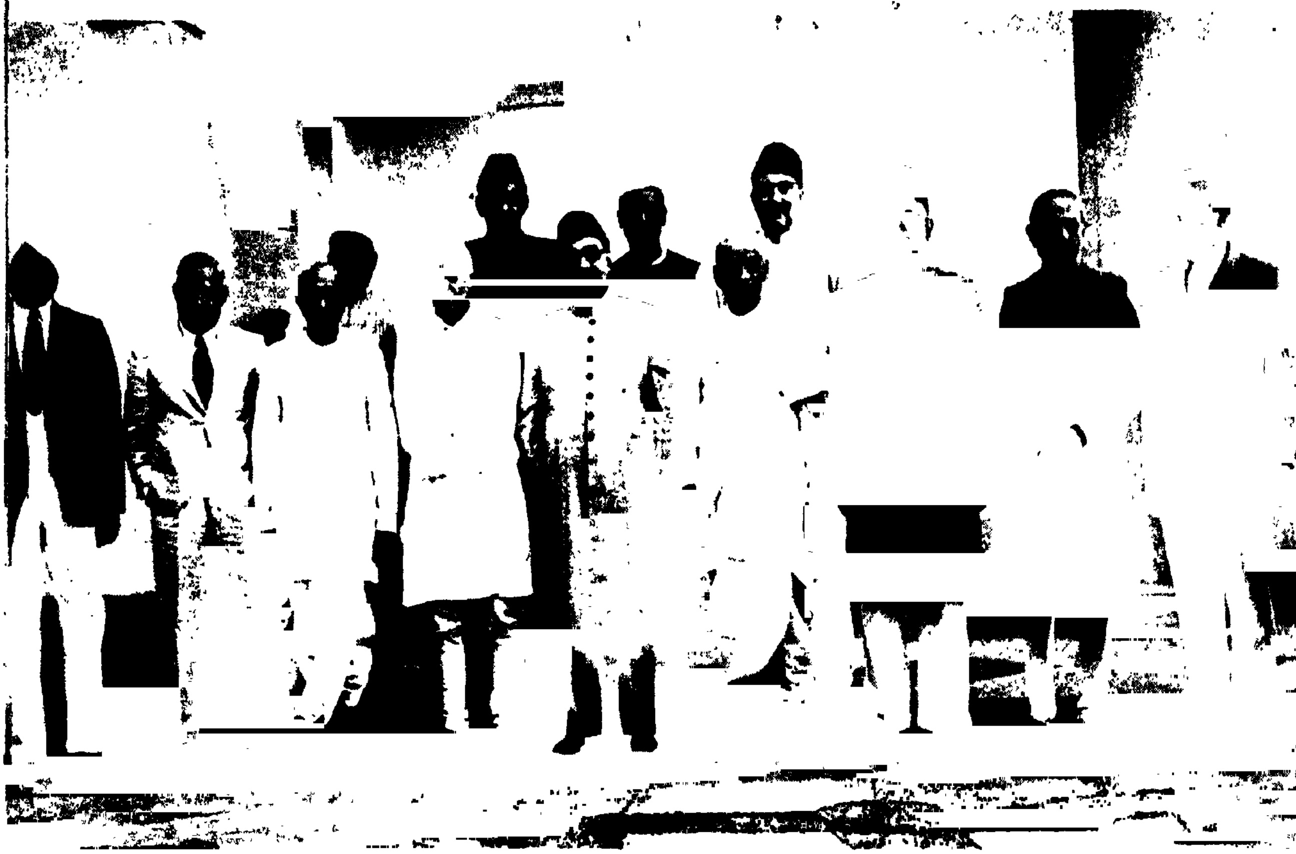
یہ سب کچھ خواب تھا، اور خواب بھی ساون کی راتوں کا
بہاروں پر نہ دیکھا سایۂ دورِ خزاں میں نے

بچھڑ کر تجھ سے آخر روح کی تسکین کی خاطر
کیا ہر ذی نفس پر اپنا دردِ دل عیاں میں نے

حسینوں میں پھرا، باغوں میں گھوما، دشت میں بھٹکا
کہیں پایا نہیں لیکن مسرت کا نشاں میں نے

اگر تو اذن دے تو یہ جہاں تج کر چلا جاؤں
ذرا اس آسماں کی چار دیواری میں گھوم آؤں

# نئی مرکزی حکومت کے اراکین



(اگلی صف میں بائیں طرف سے) سردار بلدیو سنگھ۔ ڈاکٹر جان متھائی۔ مسٹر سی راجگوپال اچاریہ۔ پنڈت جواہرلال نہرو مسٹر لیاقت علی خاں۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ مسٹر آصف علی اور مسٹر سی ایچ بھابھا۔ (پچھلی صف میں بائیں طرف سے مسٹر جگ جیون رام۔ مسٹر غضنفر علیخاں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور سردار عبدالرب نشتر۔

کئی ہفتے کی مسلسل گفت و شنید اور خط و کتابت کے بعد انجام کار ہندوستان کی دو بڑی جماعتیں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ ایک مرکز پر آکر عبوری حکومت میں حصہ لینے کیلئے آمادہ ہوگئیں۔ مسلم لیگ کے نمائندوں کو مناسب عہدے دینے کی خاطر تفویض شدہ عہدوں کو نئے سرے سے تقسیم کرنا پڑا۔ انکی تفصیل اسی شمارے کے "رفتار زمانہ" میں ملاحظہ فرمائیں۔

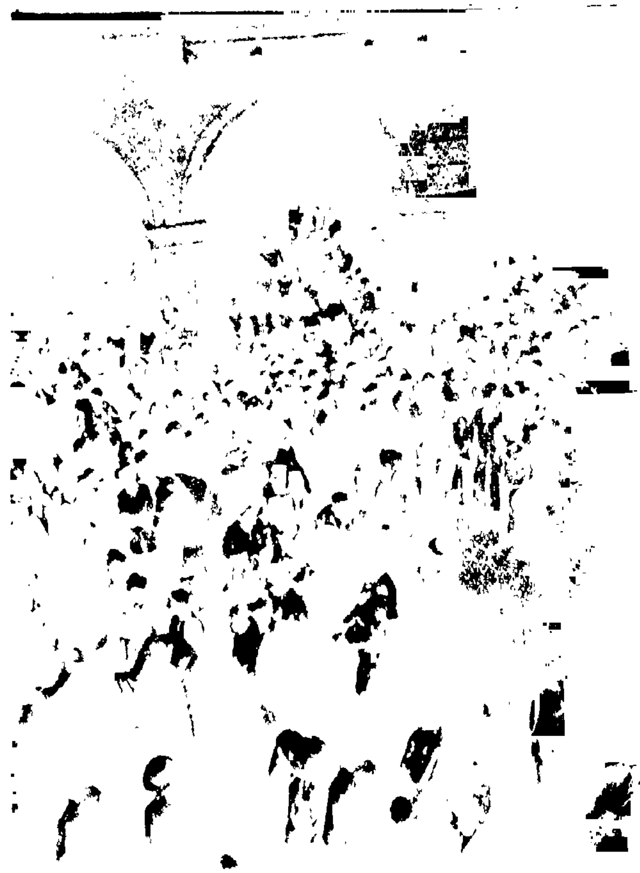
۲۶ اکتوبر کی صبح کو مسلم لیگ کے چار اراکین نے حلف وفاداری اٹھایا۔ اسکی طرف سے نامزد کئے ہوئے پانچویں رکن مسٹر جوگندر ناتھ منڈل' جو اچھوت ذات کے نمائندے ہیں' اس وقت دہلی میں موجود نہیں تھے۔ اسلئے انہوں نے اپنے عہدے کا چارج تار کے ذریعہ لے لیا لیکن حلف وفاداری بعد میں اٹھایا۔



مسٹر جوگندر ناتھ منڈل

# مصر کے میلے

مصر کے شہر طنطا میں جو نیل کے دھانے پر واقع ہے' ہر سال سید احمد البدوی کے یوم پیدائش پر ایک عظیم الشان میلہ لگتا ہے۔ یہ مصری ولی اٹھارویں صدی میں مراقش کے شہر فاس میں پیدا ہوئے تھے۔ حج اور بیت اللہ کی زیارت کے بعد انکے زھد وتقوی کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اس میلے کا زور خاص طور پر آخری رات میں ہوتا ہے۔ جو عموماً جمعہ کی شب ہوتی ہے۔ جمعہ کے روز آخری جلوس نکلتا ہے جسکا تماشا دیکھنے کیلئے لوگ صبح ہی سے بازاروں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ جلوس میں ایسی بڑی بڑی گاڑیاں بھی شامل ہوتی ہیں جن پر مختلف جھنڈے اور کتبے لگے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر تماشوں اور تفریحوں کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔



اس میلے کا جلوس سب سے زیادہ قابل ذکر ہوتا ہے۔ اس تصویر کے عین بیچ میں احمدالبدوی کے جانشین نظر آرہے ہیں۔ یہ انہی کے خاندان کے رکن ہیں۔



میلے کے دوران میں اس ہنڈولے کی آواز ہر وقت سنائی دیتی ہے۔ بچے اس میں بیٹھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔



اسی جلوس کا ایک اور منظر۔ اگلے حصے میں گاڑیاں دکھائی دے رہی ہیں۔



بلوچی (جنوبی ترکمانستان)



قرقز (قرقزستان)



بلقرانی (قفقاز)

# سوویٹ ایشیا کے لوگ



تاجک (تاجکستان)

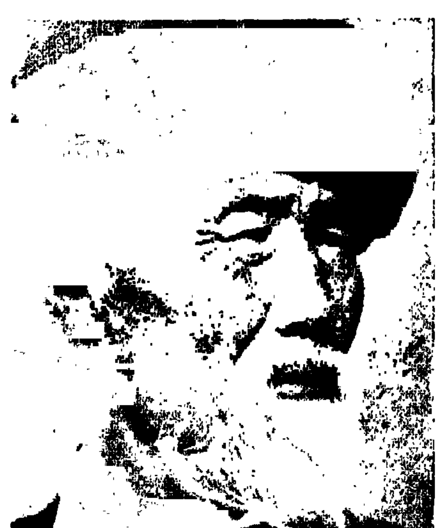
ہندوستان میں سینکڑوں ملی جلی نسلوں کے لوگ آباد ہیں لیکن اسکی مغربی سرحد سے چند میل کے فاصلے پر ملک روس کے باشندے اور بھی زیادہ مخلوط النسل ہیں۔ اگرچہ کل آبادی کے اسی فیصدی لوگ روسی یا سلافی ہیں، تاہم یونین میں پورے دوسو مختلف قومیتوں کے لوگ شامل ہیں۔ جو ڈیڑھ سو کے قریب زبانیں اور بولیاں بولتے ہیں۔



کالمک (شمالی قفقاز)



ازبک (ازبکستان)



قازق (قازقستان)



بریات منگول (سائبریا)

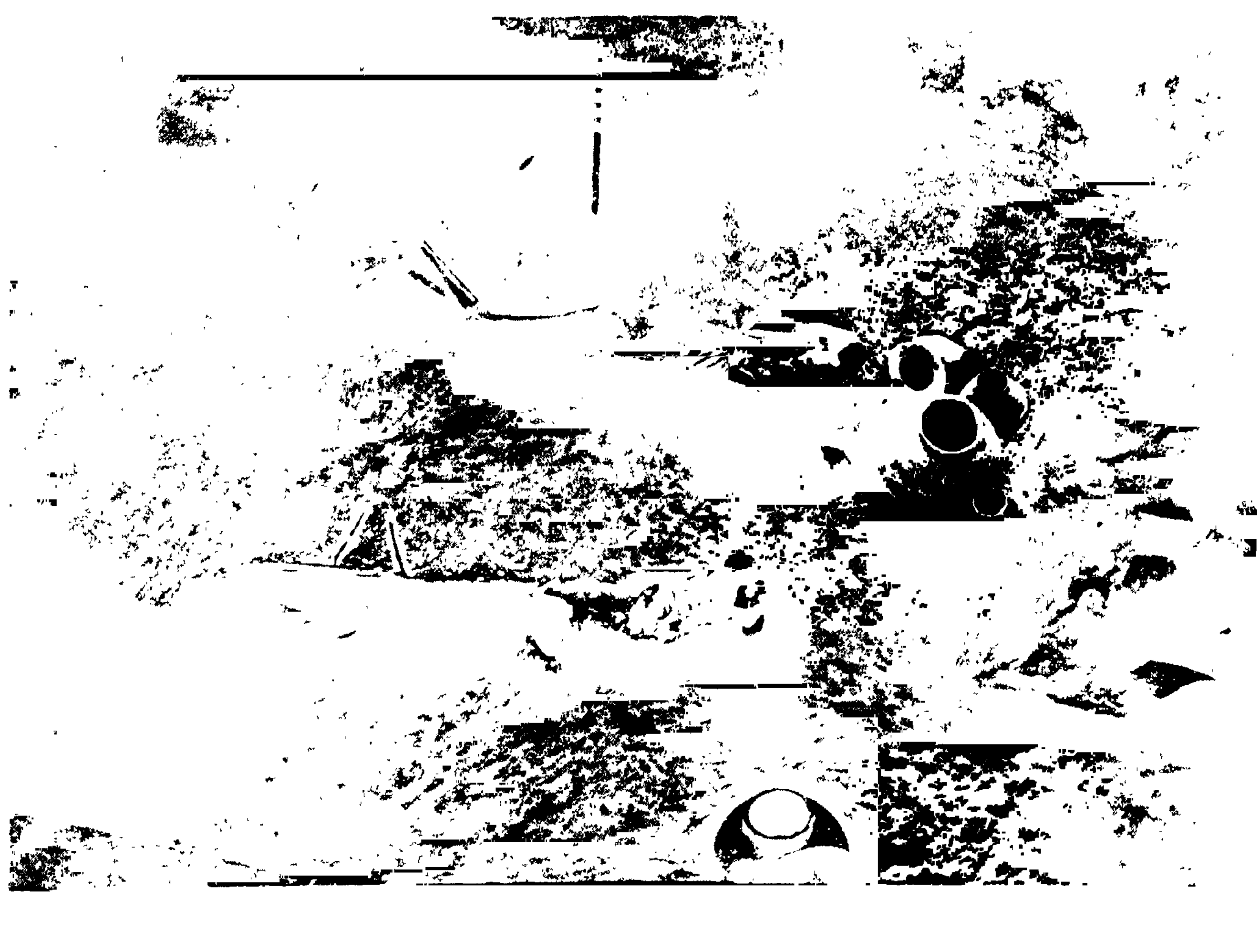
# ہڑپا کے نئے انکشافات

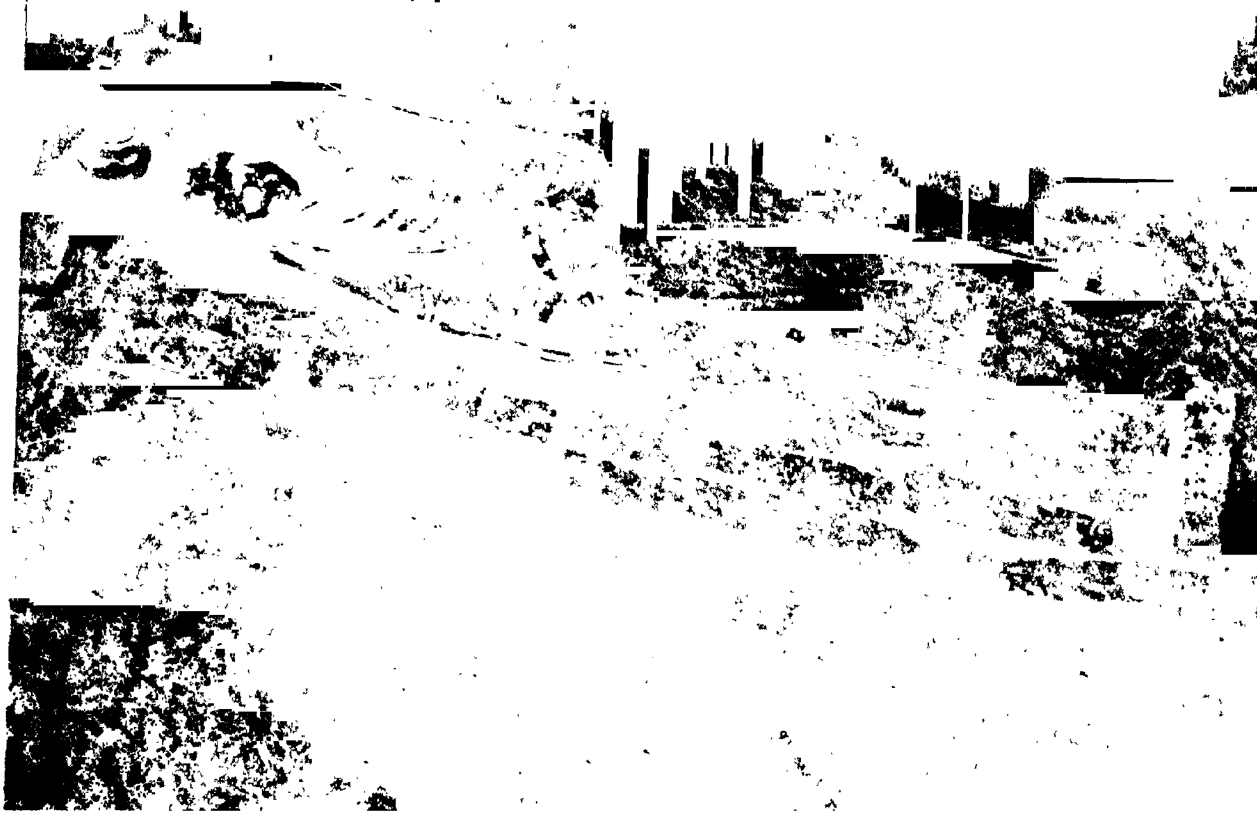
ہندوستان کے ماہرین آثار قدیمہ نے ہڑپا (پنجاب) کے کھنڈروں کی کھدائی کے بعد ایسے اہم ثبوت فراہم کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وادئی سندھ اور عراق کی قدیم تہذیبیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔ نئی تحقیقات میں زیادہ اہمیت دفن کرنے کی رسم کو دی جاسکتی ہے۔ یہ ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی چیز ہے۔ مردے کو لکڑی کے صندوق میں سرکنڈوں سے ڈھک کر رکھا جاتا تھا مردے کے قریب برتن وغیرہ رکھنے کا دستور تھا۔ تیسری صدی قبل مسیح کے عراق میں بھی یہ رسم رائج تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اینٹوں کی ۴۰ فٹ اونچی اور ۴۰ فٹ چوڑی دیوار بناکر شہر کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ اندازہ ہے کہ اس تہذیب کی داغ بیل ڈھائی ہزار قبل مسیح میں پڑی تھی۔ اور سیلاب کے ہاتھوں ڈیڑھ ہزار قبل مسیح میں اسکا خاتمہ ہوگیا۔



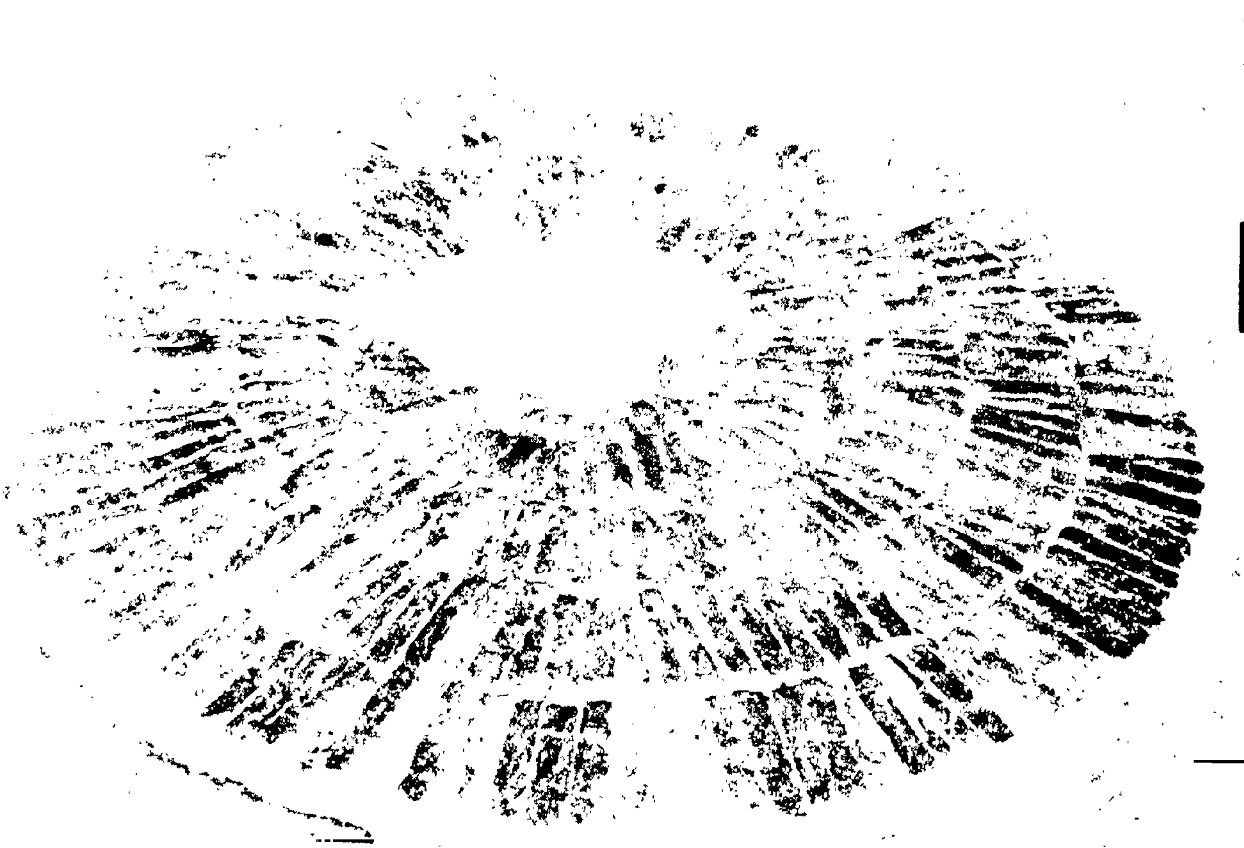
کا ایک اونچا ٹیلا۔ کھدائی سے پہلے مٹی کی اینٹوں کی ایک دیوار نے اسے بچا رکھا تھا۔

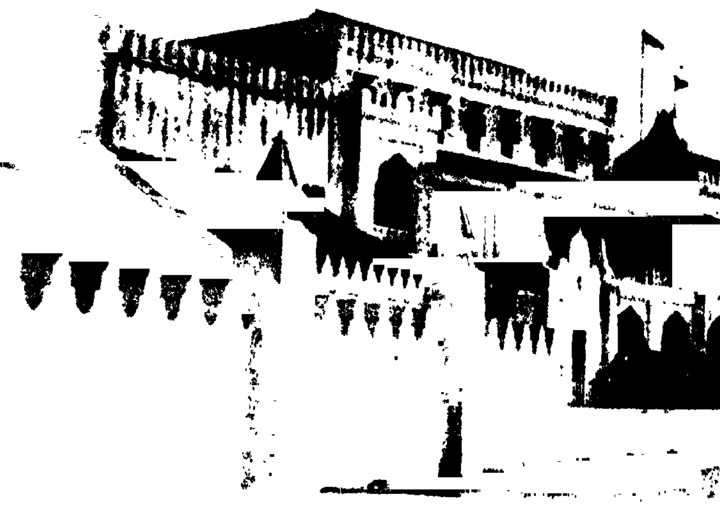
ہڑپا میں دفن کرنے کا ایک اور نظارہ۔ تھالیاں وغیرہ غالباً روایتی عقیدے کے ماتحت رکھی گئی ہونگی۔





ہڑپا کا قبرستان۔ چاروں طرف لگی ہوئی مٹی کی اینٹیں لاش کی حفاظت کرتی ہیں۔ (نیچے) اوکھلی کی وضع کا ایک پختہ کرّہ جس میں اناج کٹتا تھا۔ چاروں طرف لگی ہوئی بہت سی اینٹیں کثرت استعمال سے گھس گئی ہیں۔





ار کا عالیشان محل۔ اسکے قرب و جوار میں قحط کبھی اپنا رنگ نہیں جماتا۔



اعلیحضرت سلطان زنجبار

# زنجبار

جزیرہ زنجبار افریقہ کے مشرقی ساحل سے چند میل کے
واقع ہے۔ اسکا رقبہ ۶۴۰ مربع میل اور آبادی
۱۴ ہے ہزھائی نس سید سر خلیفہ بن حارب بن نوبنی
زنجبار کی حکومت آس پاس کے چھوٹے چھوٹے جزیروں
ہے وہ نہایت ملنسار، خوش خلق، عالم باعمل اور ترقی
حکمراں ہیں۔ کسی زمانے میں یہ جگہ غلاموں کی تجارت
مشہور تھی لیکن اب لونگوں نے انکی جگہ لے لی ہے۔
یہاں کسی زمانے میں غلاموں کو زنجبار سے غیر ملکوں
نے کیلئے لے جاتی تھیں۔ لیکن اب جزیرے کی سب سے
بڑی پیداوار یعنی لونگیں لادکر لے جاتی ہیں۔



تنگ اور سانپ کی طرح بل کھانے والی گلیوں میں
مکانات ایک دوسرے کے بالکل قریب بنائے جاتے ہیں۔



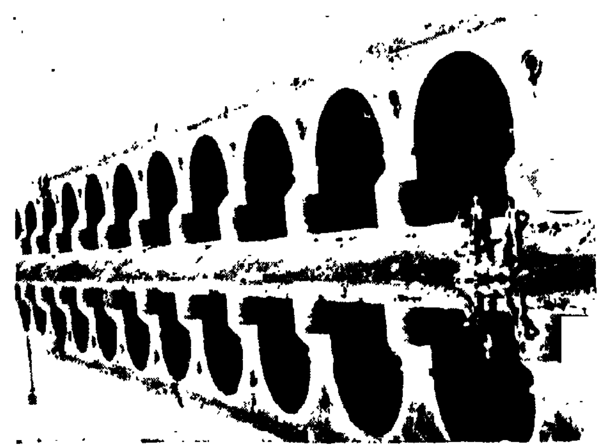
# وصل

اق کا ایک
ہور شہر۔



شہر موصل کا ایک عام نظارہ ۔

وصل کا ایک
پرانا پل جو
بتک قائم
ہے۔ ↓



موصل عراق کا تیسرا اہم شہر ہے۔ یہ دریائے دجلہ کے کنارے ۔تاریخی شہر نینوا کے بالمقابل واقع ہے۔ باشندوں میں عربوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شامل ہیں۔ شمالی علاقہ ایک اہم تجارتی مرکز ہے۔ چمڑے اور دھات کی بنی ہوئی چیزوں کا تبادلہ غیر ملکی اشیا سے کیا جاتا ہے۔ جنوبی علاقہ پٹرول کی وجہ سے اہم اور مشہور ہے۔ آثار قدیمہ کے لحاظ سے بھی یہ مقام قابل دید ہے۔ تعمیرات و آرائش میں نئے پرانے دونوں رنگ ملے جلے نظر آتے ہیں۔

# حاجیوں کا ہوائی جہاز




۱۲ اکتوبر کی صبح کو پہلا ہوائی جہاز حاجیوں کو لیکر نئی دھلی سے جدہ روانہ ہوا ن حاجیوں کی پیٹھ کے پیچھے ان کا جہاز روانگی کیلئے تیار کھڑا ہے۔



مس ثریا -- ایک فلمی ستارہ۔

# کیا معنی

عرشؔ ملسیانی

جس غم سے دل کو راحت ہو اس غم کا مداوا کیا معنی
جب فطرت طوفانی ٹھہری ساحل کی تمنا کیا معنی

راحت میں رنج کی آمیزش عشرت میں الم کی آلائش
جب دُنیا ایسی دنیا ہے پھر دُنیا دُنیا کیا معنی

خود شیخ و برہمن مجرم ہیں اک جام سے دونوں پی نہ سکے
ساقی کی بخل پسندی پر ساقی کا شکوا کیا معنی

اخلاص و وفا کے سجدوں کی جس در پر داد نہیں ملتی
اے غیرتِ دل اے عزمِ خودی اس در پہ سجدا کیا معنی

اے صاحبِ نقد و نظر مانا انساں کا نظام نہیں اچھا
اس کی اصلاح کے پردے میں اللہ سے جھگڑا کیا معنی

جلووں کا تو یہ دستور نہیں پردوں سے کبھی باہر آئیں
اے دیدۂ بے توفیق ترا یہ ذوقِ تماشا کیا معنی

میخانے میں تو اے واعظ تلقین کے کچھ اسلوب بدل
اللہ کا بندہ بننے کو جنت کا سہارا کیا معنی

ہر لحظہ فزوں ہو جوشِ عمل تسلیم و رضا کی راہ پہ چل
تقدیر کا رونا کیا مطلب تدبیر کا شکوا کیا معنی

اظہارِ وفا لازم ہی سہی اے عرشؔ مگر فریادیں کیوں
وہ بات جو سب پر ظاہر ہے اس بات کا چرچا کیا معنی

# سوگند

قمر فاروقی

نگار خانۂ فطرت کی آب و تاب تمام
سرور و کیف کی ہے ایک داستان تمام
رواں [illegible] ہے بدن میں شرابِ انگوری
ادا ادا سے نمایاں جھلک قیامت کی
نگاہ، مدسے ہے بوجھل چمن چمن ہے عذار
وہ کیف و رنگِ شفق، وہ سپیدۂ سحری
وہ ٹھنڈ چاند ستاروں کی وہ گلوں کی نمی
سما گئی ہے رگ و پے میں تیری روح رچ کر
ادائیں، جوشِ جوانی کی کیف میں ڈوبی
قدم قدم پہ ہویدا شرارتوں کے شرار
فضا ہے راگ سے لب ریز تیری آہٹ سے
کلی جو تجھ کو کہیں دیکھ لے، کھِل جائے
بہارِ عیش کا پالا ہے انگ انگ ترا
محال ہے کہ مرا دل ترا بدل پائے
یہ سادگی ہے تری جس کا شور برپا ہے
ترا جمال ہے مشاطگی سے بے پروا
نہ جانے کتنے حسیں نقش دیکھتا ہوں میں
سیاہ رات میں کرتا ہوں جب دھیان ترا
یہ تیرے قامتِ رعنا کی دلکشی، محبوب
کشاں کشاں لئے جاتی ہے مجھ سے ہوش مرا
حیا کے بوجھ کی سوگند تجھ کو دیتا ہوں،
کہ تھوڑی رات گئی ہے ابھی نہ سو جانا

# جھولے سے اُتر آنے کے بعد

(ایک چینی نظم)

باغ میں پھر بہار آئی ہے،
اور جھولے کی دو سنہری ریشمی رسیاں،
اُونچی ہوتی ہوئی،
بید کی ٹہنیوں اور پتوں میں جا کر چھپی ہیں۔
سامنے کے مکاں سے نکل کر وہ لڑکی
جھولے میں بیٹھ جاتی ہے اور جھولتی ہے
بن کے پر اڑنے لگتا ہے ملبوسِ رنگیں
بار بار اڑتی ہے آسماں کی طرف وہ
چاہتی ہے وہ شاید کہ جنت میں جا کر
کوئی تیتری بن کے اڑنے لگے
تھوڑی دیر اڑنے کے بعد وہ
چھوڑ دیتی ہے جھولا
اور سبزے پہ استادہ ہوتی ہے یوں
کر کے نیچی نگاہیں
جیسے جنت کی وہ حور ہو کوئی جس کو
وہاں سے نکالا گیا ہو
اور وہ شرم سے
اپنی نظریں جھکائے کھڑی ہو۔

(مینگ چوفان)

راجہ مہدی علی خاں

# برطانیہ کا نظامِ تعلیم

ایس، بی، آرگک

برطانوی مجلس قانون ساز کے اکثر موضوعات کی تاریخ بہت پرانی ہے اور بلا شبہ انگریزی نظام تعلیم پر یہ بات بالکل صادق آتی ہے کیونکہ قرون وسطیٰ اور عہد نشاۃ الثانیہ کے تعلیمی طریقوں پر اس نظام کی بنیادیں قائم ہیں بعض انگریزی مدرسے جو اس وقت پوری شان دکھا رہے ہیں، اس زمانے کے راہنمایانِ مذہب نے قائم کئے تھے جب مغربی یورپ میں رومن کیتھولک کا مدمقابل کوئی نہیں تھا۔ کچھ مدرسے ان امیر مردوں اور عورتوں نے قائم کئے تھے جن کا عقیدہ تھا کہ فیاضی اور خیرات کا مناسب بدلہ آخرت میں ضرور مل جاتا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ مدرسے ایسے بھی تھے جو لندن کے تجارتی اداروں کی طرف سے قائم ہوئے تھے۔ عہد نشاۃ الثانیہ میں انگلستان پر ٹیوڈر خاندان کی حکومت تھی جس نے زبان دانی کے مدرسے قائم کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی تاکہ متوسط طبقوں کے بچوں کو یونانی اور لاطینی کی تعلیم دی جا سکے۔ ٹیوڈر خاندان کے لوگ متوسط طبقے کے افراد کو اس لئے ابھارنے کے شائق تھے کہ وہ کسی طرح ان امراء کے ہم پلہ ہو جائیں جن کو سیاسی اقتدار حاصل تھا۔ غرض یہ کہ سنہ ۱۸۷۰ء تک انگلستان کے عام لوگوں کی تعلیم ان خاص طریقوں پر مبنی تھی۔

بعض مذہبی فرقوں کے لوگ قدرتی طور پر اس بات کے آرزومند تھے کہ ان کے مقلدین کے بچے صرف اس ماحول میں پرورش پائیں جسے وہ اپنے عقیدے کے مطابق صحیح اور سچا سمجھتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے ہم مسلک امیروں اور دولتمندوں کو ایسے مدرسے قائم کرنے کے لئے ابھارا جہاں غریب بچوں کی تعلیم کا انتظام ہو سکے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں ان مدرسوں کے پہلو بہ پہلو کچھ ایسے مدرسے بھی قائم ہوتے چلے گئے جو لوگوں نے ذاتی منفعت کے خیال سے قائم کئے اور اس میں شک نہیں کہ ان مدرسوں میں ایک خاص رقم کے عوض اچھی تعلیم مل جاتی تھی۔ مشہور ناول نویس چارلس ڈکنس نے اپنے ایک ناول میں ایک فرضی مدرسے کے نام سے ان اداروں کے نکمے پن اور وہاں کے ظلم و ستم پر اظہار خیال کیا ہے جو ذاتی منفعت کے لئے قائم کئے گئے تھے۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ اس قسم کے بعض مدرسوں میں استاد کم پڑھے لکھے تھے اور انھیں تنخواہیں بھی کم ملتی تھیں۔ نیز طلبا اتنی زدہ حالت میں زندگی بسر کرتے تھے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ سمجھ لینا بالکل غلط ہوگا کہ اٹھارویں اور انیسوں صدیوں کے سبھی پرائیویٹ مدرسے اس قسم کے تھے جس کا ذکر ڈکنس نے اپنے ناول میں کیا ہے۔ بہرحال اب ایسے مدرسے انگلستان میں نہیں ہیں درانحالیکہ کم سن بچوں کے بہت سے مدرسے ایسے ہیں جو کسی وقف کے بغیر قائم ہیں اور بالکل ذاتی مفاد کے اصول پر چل رہے ہیں۔ یہ مدرسے تیرہ سال کی عمر تک بچوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح مقصد پورا کرتے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ ثانوی جماعتوں کے مدارس میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح یونیورسٹی تک ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

انیسویں صدی کے دوسرے چوتھائی حصے میں انگلستان کی آبادی بڑی سرعت کے ساتھ بڑھ رہی تھی اس لئے حکومت نے ملک بھر میں ذرائع تعلیم کو وسیع کرنے کے مسائل پر زیادہ سے زیادہ غور کرنا شروع کیا تاکہ ایک صنعتی ملک کی صحیح ضرورتوں کو اچھی طرح پورا کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں پہلا قدم ۱۸۳۹ء میں اٹھایا گیا جبکہ پریوی کونسل کی ایک کمیٹی تعلیمی نظم و نسق کے لئے بنا دی گئی۔ اس طرح سب سے پہلے ادارہ تعلیم کی داغ بیل پڑی اور پھر موجودہ وزارتِ تعلیم کا قیام عمل میں آیا۔

تعلیم سے متعلق پریوی کونسل کی کمیٹی کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ تعلیم کو ترقی دینے اور اس سلسلے میں لوگوں کی ہمت بڑھانے کے لئے سرمایۂ عوام میں سے مدارس کو امدادی رقمیں عطا کرے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت حصول مقصد کے لئے ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔ ۱۸۳۹ء کے تھوڑے ہی عرصہ بعد پارلیمان نے لگاتار کئی قانون نافذ کئے جن کی رو سے بہت سے پرانے تعلیمی اوقاف کی نئے سرے تنظیم کی گئی۔ ان قوانین کی رو سے بعض قدیم ترین مدرسوں کے وقف نامے شروع سے آخر تک دوبارہ لکھے گئے اور بعض مدرسوں اور وظیفوں کو کسی پابندی کے بغیر ہر شخص کے لئے عام کر دیا۔

نتیجہ یہ کہ سنہ ۱۸۷۰ء میں تمام بچوں کے لئے جبریہ تعلیم کا قانون نافذ کرنا پارلیمان کے لئے ممکن ہو گیا۔ چنانچہ اس سال منظور ہونے والے اہم تعلیمی قانون نے ان تمام کم سن لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مدرسے میں جبریہ حاضری لازمی قرار دے دی جن کو کسی اور طریقے سے قابل اطمینان تعلیم و تربیت نہیں دی جا رہی تھی۔ اس زمانے کے تعلیمی نصب العین کی جھلک ۱۸۷۶ء کے ایک واحد قانون میں بھی دکھائی دیتی ہے جس کی رو سے تمام والدین پر پابندی عائد ہو گئی کہ وہ اپنے بچوں کو لازمی طور پر مناسب تعلیم و تربیت دلوائیں۔

اس میں شک نہیں کہ غریب لوگوں کے بچوں کی جبریہ تعلیم و تربیت کے لئے کوئی قانونی زبردستی نافذ کر دینا بالکل بے معنی اور ناقابل عمل ہے تاوقتیکہ وہ تعلیم مفت اور بلا معاوضہ نہ ہو۔ اسی لئے ۱۸۸۰ء میں ان تمام

ضلعوں میں درسی ادارے قائم کر دئے گئے جہاں ابتدائی تعلیم کی مروّجہ صورتیں اور امکانات ناقص یا ناکافی تھے۔ مذکورہ بالا قانون نے ان اداروں پر یہ فرض عائد کیا کہ وہ حسب ضرورت ابتدائی تعلیم کے مدارس قائم کیا کریں۔

ان درسی اداروں کی طرف سے قائم کئے ہوئے مدرسے "بورڈ کے مدرسے" کہلانے لگے اور اس طرح انگلستان میں اس نظامِ تعلیم کی داغ بیل پڑ گئی جو "دوعملی نظام" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک طرف غریب بچوں کی ابتدائی تعلیم کے ایسے بھی مدرسے قائم تھے جن کو خیراتی سرمائے سے چلایا جاتا تھا۔ ایسے مدرسوں کے نصاب میں مذہبی تعلیم کو خاص اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ دوسری طرف بورڈ کے مدرسے تھے۔ مذہبی تعلیم ان میں بھی دی جاتی تھی لیکن کسی خاص مسلک یا فرقے کے مطمح نظر کا پرچار قانوناً ممنوع تھا بلکہ وہاں عیسائیت کے عام ارکان ذہن نشین کرائے جاتے تھے۔ حکومت قومی سرمائے کی مد میں سے ان دونوں قسم کے مدرسوں کو مالی امداد دیتی تھی۔ لیکن وہ رقمیں اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھیں کہ مدرسوں کے تمام اخراجات کی پوری طرح کفالت کر سکیں اور اس کے علاوہ نجی مدرسوں کو پبلک فنڈ سے بھی کوئی رقم نہیں مل سکتی تھی۔ البتہ بورڈ کے مدرسوں کے لئے یہ دقتیں نہیں تھیں کیونکہ قومی سرمائے کی مد سے ملی ہوئی امداد کے علاوہ تھوڑی بہت فیس بھی بچوں کے والدین سے وصول کر لی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ باقی خرچ مقامی ٹیکسوں کی رقم سے پورا کیا جاتا تھا۔

نجی مدارس کی دقتوں کو ۱۹۰۲ء کے تعلیمی قانون نے ایک حد تک کم کر دیا۔ اس وقت انگلستان بھر میں مقامی حکام کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا یعنی ایسی منتخبہ جماعتوں کا جن کے ذمے بہت سے مختلف کام ہوتے تھے اور جن کو ٹیکسوں کے ذریعہ مالیانے میں اضافہ کر لینے کا اختیار بھی حاصل ہوتا تھا۔ ۱۹۰۲ء کے قانون کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے ہر حصے میں ان منتخبہ جماعتوں کا ایک ایک رکن ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں مقامی طور پر مختار سمجھا جائے اور اس پر یہ فرض عائد ہو کہ وہ اپنے علاقے میں تعلیم عامّہ کے ابتدائی مدرسوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی اور فروغ دے۔

نجی مدارس کے منتظمین جو اصل بانی کے دینی مقاصد کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے، سب سے زیادہ اس امر کے ذمہ دار ٹھیرائے جاتے کہ وہ مدرسے کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو قائم رکھیں۔ لیکن روزمرّہ کے اخراجات جن میں استادوں کی فیس بھی شامل ہوتی تھی، تعلیم کے مقامی حکام کو برداشت کرنے پڑتے تھے۔ اس کے برعکس استادوں کی تقرری کا اختیار پھر بھی منتظمین ہی کو حاصل تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ۱۹۰۲ء کے قانون نے مقامی حکام کو یہ اختیار دیدیا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا خود انتظام کریں یا اس سلسلے میں امداد دیں۔

لیکن ۱۹۰۲ء کا قانون نافذ کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ان بڑی عمر کے بچوں کے لئے ثانوی تعلیم کے اچھے ذرائع پیدا کئے جائیں جو اپنی ابتدائی تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے ہوں۔ مقامی حکام نے اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں اپنے فرائض اس طرح پورے کئے کہ انھوں نے زیادہ تر ان قدیم مدرسوں کو مالی امداد دی جو اپنے افتتاح کے زمانے سے اس وقت تک بدستور لاطینی اور یونانی تعلیم دیتے چلے آئے تھے۔ اسی اثناء میں زیادہ وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے ثانوی مدارس کے نصابِ تعلیم کو زیادہ وسیع کیا جانے لگا اور سائنسی موضوعات نے بھی اپنے قدم جمانے شروع کر دئے۔

تاہم بعض صورتوں میں مقامی حکام بالکل نئے ثانوی مدارس قائم کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ خصوصیت کے ساتھ مقامی حکام نے تعلیمِ نسواں کی ترقی کے لئے ایسی صورتیں پیدا کیں جن کی طرف اس وقت تک عملی طور پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ محض تدریجی طور پر ہم انیسویں صدی کے اس انوکھے خیال سے اپنا دامن بچا سکے ہیں کہ لڑکیوں کے لئے زیادہ تعلیم حاصل کر لینا خلافِ نسائیت ہے۔

۱۹۰۲ء کا قانون نافذ ہونے کے بعد سے تعلیم کے مقامی حکام جن مختلف مفید کارروائیوں میں لگے رہے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایسے وظائف کا انتظام کیا جن کو حاصل کرنے کے بعد غریب طبقوں کے لڑکے اور لڑکیاں یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لئے داخل ہو سکیں۔

ان کے علاوہ ۱۹۴۴ء سے پہلے ہمارے نظامِ تعلیم میں کچھ اور ترقیاں بھی ہوئی ہیں جن کا ذکر مجھے اس مختصر سے مقالے میں کرنا ہے۔

اس صدی کے شروع میں مقامی حکام کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ ان بچوں کی خوراک کا انتظام بھی کریں جو ابتدائی مدارس میں داخل ہوں۔ تقریباً اسی زمانے میں پارلیمان نے ان مقامی حکام پر یہ فرض بھی عائد کر دیا کہ وہ ان مدارس کے طلبا کی طبی دیکھ بھال اور علاج معالجے کا خیال رکھیں جو ان کے دائرۂ انتظام میں شامل ہوں۔

اور اب ۱۹۱۸ء میں جبریہ تعلیم کے ضمن میں عمر کی آخری حد چودہ سال مقرر کر دی گئی ہے۔ اور پھر چودہ سال سے زیادہ عمر کے بچوں کے لئے بھی یہ قاعدہ بنا دیا گیا کہ اگر وہ مدرسہ چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ گئے ہوں تب بھی اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ کچھ دیر کے لئے تھوڑی بہت تعلیم ضرور حاصل کیا کریں۔

غرض یہ تھا وہ نظامِ تعلیم جس میں ۱۹۴۴ء کے قانون نے مناسب ترمیمات کیں۔ اس نظامِ تعلیم سے کسی قدر الگ ہٹ کر لیکن اس کی افادیت کو صحیح معنوں میں ملحوظ رکھتے ہوئے سوچا جائے تو ان مدرسوں کی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑیگا جو کچھ تو اپنے وقف کی آمدنی کی بدولت اور کچھ فیسوں کے ذریعہ جمع ہو جانے والی رقم کے باعث اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکے۔ کچھ اور ایسے مدرسے بھی تھے جن کو وقف اور فیسوں کی آمدنی کے باوجود بھی محکمۂ تعلیم سے براہِ راست کچھ نہ کچھ مدد لینی پڑی۔

# حیوان سے انسان تک

عبدالمجید

آج سے لاکھوں برس پیشتر کا ذکر ہے کہ اس کرۂ ارض پر زندگی کا نام و نشاں تک نہ تھا زمین اس قدر گرم تھی کہ اس کوئی جاندار زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ زمین سے حرارت کا انتشار ہوتا گیا اور اس کا درجہ حرارت کم ہو گیا جس سے کہ اس کی سطح سرد ہو کر سکڑنے لگی۔ اس لئے اس میں جا بجا شگاف اور دراڑیں پڑ گئیں۔ کچھ مدت کے بعد ہوا کے بخارات نے پانی کی شکل اختیار کر کے ان گڑھوں اور نشیبی جگہوں کو پر کر دیا۔ اب زمین اس قابل ہو گئی کہ اس پر زندگی کے وجود کا اظہار ہو سکے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ زندگی پانی کے اندر وجود میں آئی۔ ماہرین علم ارتقا کا خیال ہے کہ مادہ حیات بے جان مادہ میں کیمیائی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔

ابتدا میں جاندار صرف ایک خانہ (Cell) پر مشتمل تھے۔ انکی شکل و شباہت مکڑی یا جرثومہ کی طرح تھی یعنی ایک خانے والے جراثیم جن کی زندگی ہوا، پانی اور پانی میں حل شدہ نمک پر منحصر تھی اپنی ادنیٰ اور ابتدائی حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ اور ترقی یافتہ قسم کو معرض وجود میں لانے کا باعث ہوئے۔ پھر ان میں سبز مادہ یا (Ghlorophyll) پیدا ہوا۔ یہی سبز مادہ ہے جس کی وجہ سے درختوں کے پتے ہرے رنگ کے دکھائی دیتے ہیں۔ مادہ حیات کے کیمیائی عمل سے یہ سبز مادہ ہوا کی کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی میں حل شدہ معدنی اشیاء سے پودوں کی غذا تیار کرتا ہے۔ اس قسم کے ادنےٰ جراثیم سے عالم نباتات وجود میں آیا۔ لیکن ایک خانہ والے جراثیم کی قسم کے جاندار جن میں سبز مادہ پیدا نہ ہوا۔ اور جس کے بغیر وہ اپنی خوراک تیار کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے ان سبز مادہ نہ رکھنے والے جراثیم کی قسم کے جانداروں سے عالم حیوانات ظہور پذیر ہوا۔

مسلسل تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ مادہ حیات کے عناصر کی ترکیب کیچڑ میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ عالم حیوانی میں سب سے پہلی ابتدائی اور سادہ ترین مخلوق جس کو امیبا (Amoeba) کہا جاتا ہے جو سڑوں کے کیچڑ یا ساکن پانی کے ذخیروں کی تہوں میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں نشو و نما پاتا ہے۔ البتہ امیبا یا اسی قسم کے بعض دوسرے جاندار اپنی حالت پر قائم رہے۔ رفتہ رفتہ بعض اپنے ماحول کی تبدیلیوں کے باعث بدلنے لگے۔ پس ان کے اندر کئی قسم کے جسمانی تغیرات رونما ہو گئے۔ چنانچہ طویل مدت کے بعد ایک خانہ والے جانداروں سے ایسی مخلوق معرض وجود میں آئی جن کا جسم متعدد خانوں سے بنا ہوا تھا۔ امیبا کو اگر "یک خانہ" جاندار کہا جائے تو یہ "کثیر خانہ" جاندار تھے۔ کثیر خانہ جاندار ایک دوسرے کے ساتھ مل کر جماعتیں بنا کر رہنے لگے تاکہ بیرونی خطرات سے محفوظ رہیں اور زیادہ آسانی سے ترقی کے مدارج طے کر سکیں۔

یہ ابتدائی زندگی سالہا سال نئے نئے تغیرات اور نئی نئی تبدیلیوں کی منزلیں طے کرتی رہی۔ اس میں طرح طرح کی رنگینیاں اور گوناگوں قسمیں پیدا ہوتی گئیں۔ ایک خانہ والے امیبا سے بہت سے خانہ والے جاندار، حلقہ دار کیچوے، اسفنج، مونگے، کیڑے مکوڑے، پھر ریڑھ کی ہڈی والے سادہ سے اعلیٰ حیوانات پیدا ہوئے اور اپنے اپنے مخصوص ماحول میں زندگی گذارنے لگے۔ ماہرین علم حیات نے یہ متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ امیبا ہی مختلف مدارج ارتقا طے کرتا ہوا، انسان کی ساخت اختیار کر لیتا ہے گویا پیچیدہ ترین ساخت کا جاندار "انسان" سادہ ترین جاندار "امیبا" کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

غور کیا جائے تو سب جانور اپنی اندرونی ساخت کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہیں:۔

۱۔ صلبی یا ریڑھ کی ہڈی والے جانور
۲۔ غیر صلبی یا ریڑھ کی ہڈی کے بغیر جانور

"صلبی" وہ جانور ہیں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہے جو پسلیوں کے ڈھانچہ کا مرکزی سہارا اور مجموعہ ہوتی ہے۔

"غیر صلبی" وہ جانور ہیں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کا ڈھانچہ نہ ہو۔

علم حیاتیات کے سرسری مطالعہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ وہ جاندار جن کے جسم ریڑھ کی ہڈی اور ڈھانچہ کے بغیر ہیں اور جنہوں نے صفحۂ ہستی پر ابتدائی ایام میں فروغ پایا نہایت ہی حقیر اور بے وقعت تھے۔ ان میں سے اکثر تو مٹ گئے کیونکہ وہ نئے ماحول کے مطابق اپنی زندگی کو نہ ڈھال سکے۔ کچھ ایسے سخت جان اور ڈھیٹ مزاج بھی ہیں جو اب تک اپنی ابتدائی صورت میں پائے جاتے ہیں بعض نے اپنی شکل اور ساخت بدل لی تاکہ وہ نئے ماحول میں زندہ رہ سکیں۔ ان جانوروں میں سے بتدریج ریڑھ کی ہڈی والے جانور پیدا ہوئے۔ یہ اپنی بناوٹ اور قوائے جسمانی کے لحاظ سے غیر صلبی جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ریڑھ ان کی ترقی کی ایک نمایاں اور مستقل نشانی ہے۔ پس اسی ایک اعتبار سے ترقی یافتہ حیوانات کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ صرف پانی کے اندر رہنے والے جانور مثلاً مچھلیاں۔
۲۔ خشکی پر اور پانی کے اندر رہنے والے جانور یا جل تھلیئے مثلاً مینڈک۔
۳۔ خشکی پر رینگنے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانور مثلاً چھپکلیاں، سانپ۔

۴۔ ہوا میں اڑنے والے جانور یا پرندے مثلاً کوا۔ فاختہ۔

۵۔ دودھ پلانے والے جانور یا شیرخوار مثلاً گائے بندر، انسان۔

ریڑھ کی ہڈی والے یا صلبی جانوروں میں سب سے پہلے مچھلی ظہور میں آئی۔ یہ جانور صرف پانی کے اندر ہی رہے اور یہاں ہی سے زندگی بسر کرنے کا سامان پیدا کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ ایک زمانہ ایسا آیا کہ خشکی (زمین) پر نباتات کی بہتات ہونے لگی تو بعض مچھلیاں پانی سے نکل کر کنارے پر آگئیں۔ جب زمین سے ان کا تعلق ہوا تو ان کے اعضا میں تغیر و تبدل ہونے لگا اور وہ جانور عالم ظہور میں آئے جو خشکی اور پانی دونوں میں رہتے ہیں اور جن کو ہم جل تھلیے کہتے ہیں۔ مینڈک ان کی واضح مثال ہے۔

جل تھلیے جانوروں کے بعد رینگنے والے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانوروں کا وجود ہوا۔ ان جانوروں کے ہاتھ اور پاؤں اس قدر کمزور اور مختصر ہوتے ہیں کہ ان کی رفتار سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیٹ کے بل رینگ رہے ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے۔ مثلاً سانپ اور وہ حقیقتاً اپنے پیٹ پر رینگ کر چلتے پھرتے ہیں۔

اب عالم حیوانی کے ارتقائی دور میں ایک طویل مدت ایسی آتی ہے جب کہ رینگنے والے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانور بکثرت ظہور پذیر ہوئے۔ یہ حیوانات دیکھنے میں بیحد خوفناک، جسمانی لحاظ سے لحیم و شحیم اور عادات کے مطابق بڑے ہی خونخوار اور پیٹو تھے۔ اکثر دریاؤں کے قرب و جوار میں اگی ہوئی سبزی چٹ کر جاتے یا سمندروں کے ساحلوں پر شکار کی گھات میں پڑے لیٹے رہتے۔ (Brontosaurus) اس وقت کے رینگنے والے حیوانات کا سردار تھا۔ اور اپنے جسم کی لمبائی کے لحاظ سے جو ستر فٹ سے زیادہ تھی آج تک سب سے طویل قامت حیوان مانا گیا ہے۔ اس کے پتھرائے ہوئے ڈھانچہ (Fossil) کو دیکھ کر عقل مبہوت رہ جاتی ہے۔ یہ حیوان اور اس کے بھائی بند اس قدر عظیم الجثہ تھے کہ موجودہ زمانہ کا سب سے زیادہ جسیم حیوان ہاتھی بھی ان کے سامنے ایک چڑیا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ظلم و استبداد کی بے پناہ قوت کے باعث انہوں نے زمین پر ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ادنےٰ، چھوٹے، اور عاجز جانور ہراسان اور پریشان ہو کر رہ گئے۔ مگر قدرت کا قانون زور اور زبردستی پر مبنی نہیں۔ یہ عظیم الشان جانور اپنی ناقابل برداشت جسامت کے باعث تنازع للبقا میں کامیاب نہ ہو سکے اس لئے معدوم ہو گئے۔ ان کے مقابل میں وہی کمزور و ناتوان رینگنے والے جانور مثلاً کچھوے، گرگٹ اور ننھی ننھی چھپکلیاں جنہوں نے زمانہ کے ساتھ مطابقت کی آج بھی روئے زمین پر آرام و عیش کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

زمین اپنے ارتقائی دور میں اس وقت گرم اور مرطوب تھی۔ رینگنے والے جانوروں نے اپنے ماحول میں تغیرات پائے تو ان میں بھی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ وہ عظیم الجثہ چھپکلیاں بھی (Liuosaurus) جو اب تک زمین پر اپنی حکمرانی کا سکہ جمائے بیٹھی تھیں آہستہ آہستہ مفقود ہونے لگیں۔ مگر چھپکلیوں کی وہ اقسام جن کی جسامت، وزن اور قد سب سے کم تھی زندہ بچ رہیں۔ انہوں نے گڑھوں اور بلوں میں چھپ کر گذارنے کا طریقہ اختیار کیا۔ ان میں سے بعض کے پر نکلنے لگے۔ چونکہ ان کے جسم ہلکے پھلکے اور کم وزن واقع ہوئے تھے اس لئے ان میں طاقت پرواز جلد آ گئی۔ ابتدائی پرندوں کی جسمانی ساخت میں رینگنے والے جانوروں کی بہت سی خصوصیتیں موجود تھیں۔ چونچ ندارد، دم گرگٹ کی طرح، انگلیاں ناخن دار، چمگادڑ کی طرح کا جھلی دار آلہ پرواز اور جبڑوں میں بڑے بڑے نوکیلے دانت تھے۔ اس قسم کے جانوروں نے ترقی کی اور وہ پرندے کہلائے۔

زمین پر کشمکش حیات پوری سرگرمی سے کارفرما تھی۔ اس عہد میں نباتات کی نوعیت عہد حاضر کی نباتات سے بہت قریب ہو گئی۔ پانی کم ہو گیا، خشکی کا رقبہ بڑھ گیا۔ رطوبت پسند نباتات (Moisture-Loving Flora) ناپید ہونے لگی۔ اس کی جگہ میلوں تک پھیلی ہوئی ہری بھری چراگاہیں منظر عام پر آگئیں۔ انہی سرسبز وادیوں اور میدانوں میں چھپکلیوں، کیڑے مکوڑوں اور پرندوں کی بستیاں آباد ہو گئیں۔ ماحول کی تبدیلیوں نے بعض رینگنے والے جانوروں میں حیرت انگیز تغیرات پیدا کر دیئے۔ اب ان کی ساخت ایسے حیوانات میں منتقل ہونے لگی جو انڈوں کی بجائے بچے جنتے تھے اور انہیں اپنی چھاتیوں سے دودھ پلاتے تھے یہ حیوانات دودھ پلانے والے یا شیرخوار جانور کہلاتے تھے۔ دودھ پلانے والے جانور عالم حیوانی کے سرتاج ہیں۔ یہ حیوانات اپنی جسمانی، دماغی اور قوتی کی خوبیوں میں سب سے اعلیٰ ہیں۔ ویل مچھلی، کنگرو، دریائی گھوڑا، سم دار مویشی کترنے والے چوہے، گوشت خور درندے، کرم خور خارپشت، چمگادڑ، گینڈے اور بندر نما حیوانات مثلاً لنگور، گبن، اورنگ اوٹان اور چمپانزی ان ترقی یافتہ حیوانات میں شامل ہیں۔

ان ہی دودھ پلانے والے جانوروں نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے انسانی شکل اختیار کر لی۔ عرصہ دراز تک انسان غیر متمدن رہا۔ اس کی زندگی ان وحشی جانوروں سے کچھ بہتر نہ تھی جن کا یہ شکار کیا کرتا۔ لاکھوں برس تک وہ وحشی جانوروں کی غاروں میں زندگی بسر کرتا رہا۔ ان ہی کی طرح لڑتا، جھگڑتا اور چیختا چلاتا پھرتا رہا۔ غالباً آج سے ایک لاکھ سال قبل انسان میں گفتگو کی قوت پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں نہ صرف منصوبے بنانے

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

# یونیسکو اور اس کے کام

جولین ہکسلے

یونیسکو (UNESCO) یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل سائنٹفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن کا مخفف ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جو چند خاص مقاصد کے لئے کھولا گیا ہے۔

اسی قسم کے چند بین الاقوامی ادارے اور بھی ہیں مثلاً ایف۔ اے۔ او یعنی فوڈ اینڈ ایگریکلچرل آرگنائزیشن اور سائی، ایل او یعنی انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن یا وہ ہیلتھ آرگنائزیشن جو ابھی حال میں بنا ہے اور پروویژنل انٹرنیشنل سول ایوی ایشن آرگنائزیشن۔ ان میں سے ہر ایک ادارہ کا اپنا الگ الگ مقصد ہے۔

دماغی کاموں میں بین الاقوامی شرکت کی ابتدا پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں لیگ آف نیشنز کے ماتحت پیرس میں "انسٹی ٹیوٹ آف انٹلیک چوئل کوآپریشن" قائم ہوا لیکن یہ انسٹی ٹیوٹ آج کے "یونیسکو" سے بہت مختلف تھا۔ اس زمانہ میں انسٹی ٹیوٹ کے پاس روپیہ بہت ہی کم تھا، اسے تعلیم کے مسائل سے کوئی واسطہ نہ تھا کیونکہ اس وقت عام خیال یہ تھا کہ تعلیم ہر ملک کا خاص اندرونی معاملہ ہے جس میں دوسرے ملکوں کو دخل نہیں دینا چاہیے اسی طرح انسٹی ٹیوٹ کو ریڈیو جیسی چیز سے جو ساری دنیا میں گھر گھر موجود ہے کوئی تعلق نہ تھا۔ اب آج کے "یونیسکو" کو دیکھیے۔ اس کا پندرہ سال کا بجٹ تقریباً ساڑھے سات ملین ڈالر ہے۔ لفظ ایجوکیشنل یعنی لفظ تعلیم خود ادارے کے نام میں شامل ہے۔ لاسلکی کے متعلق ادارے کے دستور میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ یہ آلہ اور اسی قسم کی تمام وہ چیزیں جن سے ہم اپنے خیالات عوام تک پہنچا سکتے ہیں مثلاً پریس اور فلمیں قوموں کے درمیان آپس کا اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جائیں گی۔

"یونیسکو" کے دستور میں اس ادارے کے جیسے مختلف اغراض اور مقاصد بیان کئے گئے ہیں ویسے شاید ہی کبھی کسی بین الاقوامی معاہدے میں بیان کئے گئے ہوں۔ اس دستور کا پیش لفظ مسٹر اٹلی کے ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے کہ "چونکہ لڑائی کا تخیل انسانوں کے دماغوں میں پرورش پاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ امن کے تحفظ کے لئے جو قلعے بنائے جائیں وہ بھی انسانوں کے دماغوں ہی میں ہیں، آگے چل کر دستور میں جتایا گیا ہے کہ تمام قوموں کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ انسانیت کے رتبہ کو پہچانیں، انسانوں میں تہذیب پھیلائیں اور ان کو انصاف، آزادی اور امن کی تعلیم دیں۔۔۔۔۔۔ وہ امن جس کی بنیاد حکومتوں نے اپنی سیاسی اور معاشی مصلحتوں پر رکھی ہو دنیا کی قوموں میں مقبول نہیں ہو سکتا اور نہ اسے پائیداری حاصل ہو سکتی ہے، صرف وہی امن دنیا میں قائم رہ سکتا ہے جس کی بنیاد نوع انسان کے ذہنی اور اخلاقی اتحاد پر ہو"

اس دستور میں شامل ہونے والی تمام ریاستوں نے اس عقیدے کو ماننے کا اقرار کیا ہے کہ "تعلیم کے لئے سب کو پورے پورے اور برابر کے موقعے حاصل ہونے چاہئیں، سچائی جہاں بھی ہو تلاش کی جائے اور دنیا کی قومیں آپس میں ایک دوسرے کے خیالات اور علم سے بے روک ٹوک فائدہ اٹھائیں"

ابھی حال میں کوپن ہیگن میں سر جان اور نے کہا کہ ایف اے او کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے نئے ورلڈ فوڈ بورڈ کے ذریعہ ساری دنیا میں بھوک اور افلاس کا مقابلہ کرے، ہم "یونیسکو" کے کام کو بھی مختصر لفظوں میں ذرا سی ترمیم کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں کہ یہ دنیا میں روحانی بھوک اور ذہنی افلاس کا مقابلہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے اپنی چند مہینوں کی زندگی میں متعدد عملی تجاویز پر کام شروع کر دیا ہے۔ مثلاً "انرا" (UNRRA) کو اختیار نہ تھا کہ وہ تعلیمی، تہذیبی اور سائنٹفک میدانوں میں کچھ کام کر سکے اس لئے اب ہم ان مقاصد کے لئے روپیہ فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور جنگ نے جن ملکوں کو اجاڑ دیا ہے ان میں اس قسم کی تنظیم شروع کر رہے ہیں۔ ہماری یہ تنظیم یورپ میں بھی ہوگی اور مشرق بعید میں بھی۔

اپنے اس کام کے سلسلہ میں ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ دنیا کے بعض ملکوں کو تو ہر قسم کے سائنٹفک آلات میسر ہیں اور بعض کو بالکل میسر نہیں۔ اس کمی کی وجہ سے تعلیم کو خاصہ نقصان پہنچ رہا ہے اس لئے ہم ایسی سفارشات تیار کر رہے ہیں جن سے یہ خرابی دور ہو سکے۔

ہمارا دوسرا کام ان پڑھ لوگوں کو تعلیم دینا ہے، ایک ایسی دنیا میں جہاں کے بسنے والوں میں آدھے سے زیادہ لوگ ان پڑھ ہوں۔ یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ "یونیسکو" کو اپنے مقاصد میں پوری کامیابی حاصل ہو سکے گی، اسی لئے ہم تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ

ہوئے ہیں۔ ہم نے مختلف ملکوں مثلاً میکسیکو، چین، روس، ترکی، برطانوی، فرانسیسی اور دوسری نوآبادیات کے ان مختلف طریقوں کا جائزہ لیا ہے جو ان ملکوں نے اپنے یہاں سے جہالت دور کرنے کیلئے اختیار کئے ہیں ہر قوم کا اپنا جدا طریقہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ تمام قوموں کو ایک دوسرے کے طریقہ میں کوئی نہ کوئی مفید بات ضرور ملے گی۔

یونیسکو نے اس طرف بھی قدم اٹھایا ہے کہ کاپی رائیٹ یعنی حقِ تصنیف و تالیف کے متعلق ایک نیا قانون تیار کرے اور اس قانون کی تیاری کے لئے ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ کاپی رائٹ کا مسئلہ نہایت اہم ہے اور اس اہمیت کی دو وجوہ ہیں، اول یہ کہ دنیا کو دو سب سے بڑی طاقتوں یعنی امریکہ اور روس میں سے کسی ایک نے بھی کاپی رائیٹ کے متعلق برن کنونشن کی پیروی نہ کی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ریڈیو میں فلموں میں اور آرٹ کے تمام کاموں میں کاپی رائیٹ کی حیثیت نہایت مبہم اور لغو ہے۔

ہم درسی کتابوں کا مطالعہ بھی شروع کر رہے ہیں۔ تاریخ، جغرافیہ اور عمرانیات کی کتابوں پر ہم خاص کر نظر ڈالیں گے، پھر ہم یہ سوچیں گے کہ بین الاقوامی نفرت اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے ہم ان درسی کتابوں میں کیا کیا تبدیلیاں کریں

یورپ میں تعلیمی براڈکاسٹ کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ہم ایک کانفرنس منعقد کرنے والے ہیں۔ ہم اس مسئلہ پر بھی غور کرنا چاہتے ہیں کہ عام تعلیم میں آرٹ سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ——— آرٹ سے فائدہ اٹھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم پیشہ ور آرٹسٹ یا گویئے تیار کریں گے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ آرٹ کی مدد سے ہم بچہ کی شخصیت اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ترقی دیں گے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ زبان ان بڑی رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ ہے جس کی وجہ سے دنیا کے ایک ملک کے بسنے والے دوسرے ملک والوں کے خیالات سمجھنے

سے مجبور رہتے ہیں۔ اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ کتابوں کے ترجمے فراہم کرنے کا ہم کوئی معقول انتظام کریں۔ اس کے لئے ہم نے دو تدبیریں سوچی ہیں ایک تو یہ کہ ان تمام نئی اور پرانی کتابوں کی فہرستیں تیار کر دی جائیں جن کے ترجمے ضروری ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کے ترجمہ کرنے والوں کی ایک ایسی جماعت مقرر کر دی جائے جو مختلف زبانوں میں ان کتابوں کے ترجمے کر سکے۔

اصل میں یونیسکو قائم کرنے کا خیال اس تعلیمی کانفرنس میں پیدا ہوا جسکے اجلاس جنگ کے پرآشوب زمانہ بھر لندن میں ہوتے رہے اور جن میں اتحادیوں کے تعلیمی وزیر شریک ہوتے تھے۔ ان سب نے مختلف تجاویز تیار کیں جو ۱۹۴۵ء کی گرمیوں میں سین فرانسسکو، کے مقام پر اپنی آخری شکل میں مرتب کرلی گئیں۔ اسی جگہ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ایک ایسا یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن قائم کیا جائے جو تعلیم اور تہذیب کے معاملات کو طے کرے اور جس کا صدر مقام پیرس ہو۔ اس کے بعد گذشتہ نومبر میں لندن میں ایک بڑی کانفرنس کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ اس قائم ہونے والے ادارہ کا خاکہ تیار کیا جائے اور اس کے لئے دستور بنایا جائے۔ اس کانفرنس میں جہاں اور بہت سی باتیں طے ہوئیں وہاں ایک یہ بھی تھی کہ اس کے نام میں حرف "ایس" اور بڑھا دیا گیا جو سائنٹفک کا مخفف ہے۔ اس کانفرنس نے ایک ابتدائی کمیشن بھی مقرر کر دیا۔ تمام کاموں کا مفصل پروگرام تیار کرے گا اور ایک عارضی بجٹ تیار کرکے "یونیسکو" اس سی او کی پہلی کانفرنس میں پیش کرے گا۔ یہ کانفرنس اس سال نومبر میں پیرس میں منعقد ہوگی۔ ایک انگریز ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ یونیسکو نے لندن میں جنم لیا اس لندن میں جو لڑائی کے کل زمانہ بھر دنیا کا تہذیبی مرکز بنا رہا حالانکہ ہم نے اس کے لئے کبھی کوئی کوشش نہیں کی بعض اوقات تو ہمیں اس کا پتہ بھی

## غزل ——— کرامت فاطمہ بیگم

دنیا ہے سرِ محفل کیوں جان کا نذرانہ
کم بخت کے ہاتھوں ہے دشوار تجھے جینا
یہ جام ہی بس پی کر تو یہ تجھے کرنی ہے
اپنوں میں جو اپنا بیت باقی نہ ہے کچھ بھی
کیا کیجئے گا سنکر کچھ لطف نہ آئے گا
آزاد یقیں سے ہو جائیں اگر نظریں

کیوں شمع کو کرتا ہے بدنام یہ پروانہ
تعزیر کے قابل ہے میرا دل دیوانہ
قربان ترے ساقی بھر دے مرا پیمانہ
یکساں ہیں ہمیں دونوں اپنا ہو کہ بیگانہ
دردو غم و حسرت ہے پُر نے مرا افسانہ
ہر جگہ وہ ملتا ہے کعبہ ہو کہ بت خانہ

کیا ہوں میں حقیقت میں معلوم نہیں بیگم
دیوانہ سمجھ لیجئے یا جانئے فرزانہ

نہیں چلا کہ لندن کی یہ مرکزیت کس طرح بڑھ رہی تھی لندن کا باشندہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ میں دنیا کا باشندہ بھی ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ "یونیسکو" لندن سے منتقل ہوکر پیرس کے شہر میں جا رہا ہے جو دنیا کے ان شہروں میں ہے جہاں علم، ادب اور سائنس ہمیشہ پھلے پھولے ہیں۔

ابتدائی کمیشن کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ اس ادارہ کا ایک مفصل پروگرام تیار کرکے نومبر میں کانفرنس کی منظوری کے لئے پیش کرے۔ کمیشن کی یہ رپورٹ تقریباً ستر اسی ہزار الفاظ پر مشتمل ہوگی، الفاظ کی اتنی بڑی تعداد کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ "یونیسکو" کی کاروائی تعلیم کے ہر پہلو سے متعلق ہوگی، اس کے پروگرام میں تمام قسم کے طبعی، سماجی، نظری، اور عملی علوم شامل ہوں گے، تخلیقی آرٹ مثلاً مصوری، موسیقی اور ادب بھی اس کے پروگرام کا ایک حصہ ہیں، پھر ریاضی اور عمرانیات کے علوم ہیں، میوزیم ہیں کتب خانے ہیں اور علوم کی نشر و اشاعت کا انتظام ہے اور آخر میں رسل و رسائل کے وہ تمام طریقے ہیں جن کے ذریعہ سے عوام تک ہم اپنے خیالات پہنچائے جا سکتے ہیں، ان طریقوں میں پریس ہے، ریڈیو ہے، فلم ہیں اور ٹیلی وژن ہے ان تمام کاموں کے پروگرام تیار کرتے وقت ہمارے سامنے چند عام اصول رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ "یونیسکو" ہمیشہ اپنا کام ان اداروں کے ذریعے انجام دے گا جو پہلے سے موجود ہیں، پھر "یونیسکو" کی ہمیشہ یہ کوشش رہے گی کہ قوموں کے درمیان ہر قسم کے تبادلے عمل میں آئیں، مثلاً ایک ملک کے طالب علم دوسرے ملک میں جائیں، مدرسین اور علمی تحقیقات کا کام کرنے والے بھی اسی طرح بدلہ میں ایک ملک سے دوسرے ملک کو بھیجے جائیں۔ کتابوں، فلموں، موسیقی، اور آرٹ کے کاموں کے تبادلے ہوں، عام معلومات اور سائنٹفک تحقیقات کے نتائج آپس میں ایک قوم دوسری قوم سے سیکھے۔ اگر ہم نے ایسا کر لیا تو امید ہے کہ ہمارے درمیان سے وہ تمام پردے ہٹ جائیں گے جنہوں نے قوموں کو ایک دوسرے سے دور کر رکھا ہے۔

"یونیسکو" ان تمام تبادلوں کے متعلق ایک ایسا انتظام تیار کرے گا جس کے ذریعہ سے تعلیم تہذیب اور سائنٹفک علوم سے فائدہ حاصل کرنے میں دنیا کے تمام ملک برابر کے حصہ دار ہیں۔ ہم دنیا سے جہالت کو مٹانا چاہتے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ پس ماندہ ملکوں کو تعلیم کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچائے جائیں، ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں اب تک جتنی سائنٹفک تحقیقات ہوئی ہے اسے دنیا کے ملکوں کی ملکیت بنا دیا جائے "یونیسکو" کے سامنے ایک دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ وہ ہر ملک کے مخصوص مسائل کا جائزہ لے اور ان کا گہری نظر سے یا تو خود مطالعہ کرے یا ان لوگوں کی مدد کرے جو اس قسم کے کام میں مصروف ہیں۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے میں دو ایک مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ سائنس نے اب تک اس تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے کہ خود اس کی یہ ترقی اس کے راستے میں ایک خطرہ بن گئی ہے، سائنٹفک اشاعتوں میں انتشار نظر آتا ہے سائنٹفک تحقیقات کے جو خلاصے اور اس پر جو ریویو عوام کے سامنے آئے ہیں وہ نہایت ناقص ہوتے ہیں۔ "یونیسکو" کے سامنے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ وہ اس مسئلہ کی طرف توجہ کرے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں بہت سے ایسے ملک ہیں جو خود اب تک صنعتی نہیں ہوتے ہیں لیکن صنعتی تہذیب وہاں پہنچ چکی ہے؛ اس تہذیب نے اس ملک کے قدیم فن اور دستکاریوں کو بالکل ختم کر دیا یا اتنا دبا رکھا ہے کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گیا ہے۔ ان حالات نے ہمارے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ان ملکوں کی دستکاریوں کو برباد ہونے سے کس طرح بچائیں ہمیں علم ہے کہ دو ایک موقعوں پر مثلاً امریکا میں "نواہو انڈینز" کے معاملہ میں اس قسم کی کوشش خاصی کامیاب رہی،

اسی قسم کا ایک اور مسئلہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ لڑائی کے زمانہ میں بڑی عمر کے ان پڑھ لوگوں کو تعلیم کے لئے جماعتی بحث کا طریقہ "ڈسکشن گروپ سسٹم" ایجاد کیا گیا تھا، یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا لیکن دنیا میں بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں اس طریقہ پر تعلیم نہیں دی جاتی، مثلاً چین، افریقہ اور ہندوستان ہم چاہتے ہیں ان ملکوں میں بھی اس طریقہ کو رائج کر دیا جائے۔

بہت سے لوگوں کی یہ تجویز ہے کہ ایک بین الاقوامی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا معلوم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یونیسکو اس مسئلہ پر پوری طرح غور کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرے گا۔ اخیر میں مجھے یہ بتانا ہے کہ ان منصوبوں کے علاوہ اور بھی متعدد منصوبے ہیں جن کو یا تو یونیسکو خود چلائے گا یا ان لوگوں کی مدد کرے گا جو ان کو چلا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ یونیسکو کے پاس جو رقم ہے وہ محدود ہے اور اسی میں اسے یہ تمام کام کرنے ہیں۔ اس لئے بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ نمونے کے منصوبے چلا دے تاکہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہر کام کے سلسلہ میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہماری ایک تجویز ہے کہ ایک انٹرنیشنل یوتھ کیمپ (بین الاقوامی نوجوانوں کی جماعت) تیار کریں جو تعمیری کاموں کی ذمہ داری لے۔ ہمارا یہ بھی ارادہ ہے کہ اس سلسلہ کی تمام مشکلوں کا

جائزہ لینے کے بعد ہم ایک "انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہوم اینڈ کمیونٹی پلاننگ" قائم کریں جس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ دنیا کے مختلف جغرافی علاقوں کے حالات کا اندازہ کرکے وہاں شہروں قصبوں اور گاؤں کے تعمیری نقشے تیار کرنے کے اصول مقرر کرے۔ اسی طرح ہمارا ارادہ ایک "انٹرنیشنل تھیٹر انسٹی ٹیوٹ" قائم کرنے کا بھی ہے۔ ہمارا یہ بھی ارادہ ہے کہ ہم "یونیسکو" کا ایک "انسٹی ٹیوٹ آف اپلائیڈ میتھمیٹکس" قائم کریں یہ انسٹی ٹیوٹ غالباً ہندوستان میں بنے گا۔ اور اس میں موجودہ زمانہ کی تمام وہ مشینیں مہیا کی جائیں گی جو اعداد و شمار کرتی ہیں، اور جن کا کام ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ آخیر میں میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جرمنی جرنیلوں کی داشت اور ان کی مہاجرت کا جو اسٹیشن ہیلی گولینڈ میں ہے اسے ہم خریدنا چاہتے ہیں مستقبل کی کامیابی کی امیدوں سے ہمارا دل لبریز ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میری یہ باتیں سن کر بہت سے لوگ یہ کہیں گے کہ "ایٹم بم" ایک نئی جنگ کے خطرے تو سامنے کھڑے ہیں، پھر یونیسکو جیسی چیز بنانے سے فائدہ کیا؟ ان لوگوں کو میں یہ جواب دوں گا کہ جنگ تو صرف ایک امکانی چیز ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے رہ گیا ایٹم بم، تو اس کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ اس کی تباہ کاریوں نے انسان کو ایسا خوف زدہ کر دیا ہے کہ وہ جنگ کو روکنے کا کبھی اتنا خواہشمند نہ تھا جتنا آج ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔ یونیسکو، اگر ایسے مواقع بہم پہنچا سکا جن سے دنیا کی قوموں کو ایک دوسرے کے صحیح حالات آزادانہ طریقہ پر معلوم ہو سکے اور دنیا میں تعلیم، سائنس اور فنون کے بین الاقوامی ادارے قائم ہو سکے تو یہ کام خود ایسا ہوگا جس سے جنگ کے امکانات کم ہو جائیں گے۔ پھر اخیر میں میں یہ بھی کہوں گا کہ اگر خدانخواستہ وہ بری گھڑی آہی گئی اور دنیا کو ایک نئی جنگ کا سامنا کرنا پڑا تب بھی مجھے یقین ہے کہ یونیسکو کا کام بیکار نہ جائیگا اور اس جنگ کے بعد بھی جاری رہے گا۔ ہمارے سامنے ایسی ایک مثال پہلے سے موجود ہے اور وہ انٹرنیشنل لیبر آفس کی ہے، باوجود اس کے کہ لیگ آف نیشنز کبھی کی ختم ہو چکی تھی اور دوسری جنگ عظیم بھی پانچ سال تک لڑی گئی انٹرنیشنل لیبر آفس آج تک زندہ ہے اور اپنے اس کام کو جو اس نے پچیس سال پہلے شروع کیا تھا نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیتا رہا ہے۔ (لسنر سے)

**اعلان**

دفتر رسالہ "آجکل" میں مضامین نثر و نظم کافی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبہ کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں ——— (ادارہ)



٥

# آپ ہمیشہ تندرست رہیں

دنیا میں کامیابی کا راز دو لفظوں میں یہ ہے کہ محنت کیجئے اور خوب محنت کیجئے محنت سے دولت پیدا ہوگی اور دولت سے عیش و آرام مگر اس کیلئے تندرستی کی ضرورت ہے اگر یہ نہیں ہے اور آپ بیمار ہیں تو محنت، دولت، آرام، صرف خواب و خیال ساری عمر تکلیف و مصیبت میں گزارنا ہوگی کبھی بھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

**بیماری** "خدا دشمن کو بھی نہ دے"۔ پیسہ کا خرچ، روزگار بند، مصیبت پر مصیبت، علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہایا مگر فائدہ نہیں "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ یہ مرض کیوں بڑھ رہا ہے فائدہ کیوں نہیں ہوتا! اس کا جواب ہے کہ مرض کی تشخیص نہ ہو سکی، دوا خالص اور عمدہ نہیں ملتی سڑی گلی دواؤں نا تجربہ کار طبیب سے فائدہ کی کیا امید ہو سکتی ہے

اگر آپ کے دوستوں میں سے کوئی صاحب کسی پیچیدہ اور پرانے مرض میں گرفتار ہیں تو ان کے حالات ناظم شعبہ تشخیص مجلس اطبا پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دھلی کو فوراً لکھ کر روانہ کیجئے!

یہاں مرض کے حالات تجربہ کار کہنہ مشق طبیبوں کی مجلس میں پیش ہوتے ہیں اس مجلس کے صدر دہلی کے مشہور طبیب و فقیر حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی سینیر ہاؤس فزیشن و اسسٹنٹ پرنسپل جامعہ طبیہ، ایڈیٹر رسالہ مسیح الملک ہیں

مجلس اطبا میں مرض کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے، بحث ہوتی ہے، ہر طبیب اپنے اپنے تجربہ کی بنا پر رائے ظاہر کرتا ہے اور بالآخر متفقہ رائے سے مرض کی صحیح تشخیص عمل میں آتی ہے دوا تجویز ہوتی ہے، مریض کو اطلاع دی جاتی ہے اور اس طرح روزانہ صدہا پیچیدہ مسئلے حل ہوتے ہیں تشخیص و تجویز کا یہ طریقہ اس قدر صحیح اور بہتر ثابت ہوا ہے کہ اب صرف ملک کے ہر گوشے کے مریض بلکہ بہت سے طبابت پیشہ اصحاب ڈاکٹر، حکیم اور وید بھی اپنے زیر علاج مریضوں کے پیچیدہ امراض کی بابت مجلس اطباء کا مشورہ طلب کرتے ہیں اس طرح ہزاروں مایوس مریض اس مجلس کی صحیح تشخیص کی بدولت نئی زندگی حاصل کر چکے ہیں۔ اگر آپ کسی پیچیدہ یا پرانے مرض میں گرفتار ہیں اور آپکا وقت خراب ہو چکا ہے اور دولت برباد ہو چکی ہے، تو ایک بار ہمیں حالات لکھکر یا اجملی شفاخانہ باڑہ ہندو راؤ میں تشریف لاکر مشورہ کیجئے۔ جواب طلب امور کیلئے لکھ یا لفافہ آنا ضروری ہے، رسالہ مسیح الملک بطور نمونہ طلب فرمائیے، اوقات مشورہ:- صبح ۸ سے ۱۲ بجے تک شام ۶ سے ۹ بجے شب تک

## عہد حاضر کا مایۂ ناز طبی شاہکار

## مسیح الملک کا علاج

### رعایتی قیمت پر

جو ماہنامہ مسیح الملک کی جانب سے اپریل ۱۹۴۲ء میں خاص نمبر کی صورت میں نہایت شاندار طریقہ پر شائع کیا گیا ہے۔ اس میں سر سے پاؤں تک کے وہ تمام پیچیدہ اور پرانے امراض نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں جن کے علاج میں اکثر طبیبوں اور معالجوں کو ناکامی ہوتی رہتی ہے اور ساتھ ہی ہر ایک مرض کے ذیل میں اجمل اعظم مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے خاص نسخے بھی موزوں کئے ہیں۔ طریقہ علاج اور بیش قیمت مجربات پیش کئے گئے ہیں جن کی تلاش میں دنیا بھر میں ضخامت تین سو صفحات سے زائد کتابت و طباعت نہایت نفیس اور قیمت ان سب خوبیوں کے باوجود صرف ۵

**خاص رعایت** لیکن جو لوگ تین روپیہ سالانہ چندہ بھیجکر ماہنامہ مسیح الملک کے مستقل خریدار بنیں گے ان سے دو روپے کے بجائے اسکی قیمت صرف ایک روپیہ لی جائیگی، اور اس طرح وہ پانچ کے بجائے چار روپے میں حاصل کر سکیں گے۔ لہذا آپ بھی آج ہی مبلغ چار روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجدیجئے ایک سال تک مسیح الملک بھی پڑھیئے اور بیش قیمت تجربات کا ذخیرہ بھی رعایت کے ساتھ حاصل کیجئے منی آرڈر بھیجنے والوں کیلئے محصول ڈاک معاف بطور نمونہ مفت طلب کیجئے

دفتر:- مسیح الملک پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی

## مینیجر مجلس اطبا پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دھلی

# تیسری ملاقات

افسانہ

اختر انصاری

ایک خواب کی روداد سُناتا ہوں۔ اور اگر شروع ہی سے یہ کہہ دوں کہ یہ ایک غیر معمولی خواب تھا تو اس سے میرا مقصد نہ تو یہ ہوگا کہ پڑھنے والوں کے شوق مطالعہ کو زبردستی بھڑکایا جائے اور نہ یہ کہ خواہ مخواہ رعب گانٹھ کر اپنی یا افسانے کی اہمیت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ یہ محض حقیقت کا اظہار ہوگا۔ اس اظہار حقیقت میں مجھے یوں اور بھی کوئی تامّل محسوس نہیں ہوتا کہ اس سے میرے افسانے کی فنّیت کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔

خواب کی روداد شروع کرنے سے پہلے ایک بات اور بتا دینی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ گو میرا خواب غیر معمولی ہے، مگر میں خود ایک بالکل معمولی، یعنی نارمل انسان ہوں۔ یونان کے بوڑھے فلسفی سقراط یا فرانس کی ان پڑھ دیہاتی دوشیزہ جون آف آرک کی طرح میں نے کبھی کوئی غیبی آواز نہیں سنی۔ میں نے کبھی رات کو نیند کے عالم میں بستر سے اٹھ کر نہ شیو کیا، نہ سڑک پر چہل قدمی کی، نہ چھت پر سے کودنے کا خطرناک اقدام کیا۔ اور نہ ہارڈی کے ایک ناول کے ہیرو کی طرح اپنی محبوبہ کو بازوؤں میں لے کر گھر سے باہر کی سیر کی۔ میں کبھی کسی دماغی بیماری یا کسی اعصابی عدم اعتدال یا کسی قسم کی عارضی یا مستقل دیوانگی ـــــ مثلاً غش یا مالیخولیا یا ہسٹیریا ـــــ کا شکار نہیں ہوا۔ میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی انوکھی یا ان ہونی بات کے ہونے کی خواہش کی ہو اور وہ خواہش ایک معجزانہ انداز میں پوری ہوگئی ہو۔ میں بارہا مصیبتوں میں گھر گیا ہوں۔ مگر کبھی یہ نہیں ہوا کہ خلاف عادت امور کے ذریعہ مجھے مصیبتوں سے چھٹکارا ملا ہو۔ میں نے اکثر ہوائی محل تعمیر کئے ہیں اور بیداری کے خواب دیکھے ہیں، مگر ان خوابوں اور محلوں نے کبھی مادّی شکل اختیار نہیں کی۔ بھُتنے بھوتوں اور آسیبوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ نہ میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے کسی جن یا چڑیل پری کو دیکھا۔ میں بچپن میں بالکل ایک معمولی بچہ تھا، اور طالب علمی کے زمانے میں ایک بالکل معمولی طالب علم۔ اپنی زندگی کے کسی دور میں میں نے کسی حیرت انگیز ذہانت یا نابغیّت کا ثبوت نہیں دیا۔ غرضیکہ ہر طرح سے ایک نارمل انسان ہوں اور رہا ہوں۔ سوتے میں جو خواب اکثر دیکھتا ہوں وہ بھی بالکل معمولی آدمیوں کے سے خواب ہوتے ہیں۔ سوا اس ایک بات کے (اور ضروری نہیں کہ یہ بات بھی کوئی غیر معمولی چیز ہو اور دوسروں کو اس کا تجربہ نہ ہوا ہو) کہ میں کبھی کبھی "خواب درخواب" دیکھتا ہوں۔ یعنی خواب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میں ابھی سو رہا تھا اور خواب دیکھ رہا تھا اور اب جاگ گیا ہوں۔ اور پھر خواب ہی میں اپنے "خواب درخواب" پر غور کرتا ہوں، اور اپنے آپ سے کہتا ہوں "اُف میں نے کیسا بھیانک خواب دیکھا! کیسا عجیب خواب دیکھا! مگر خیر اب تو میں جاگ گیا ہوں۔ اب کوئی اندیشے کی بات نہیں آخر وہ محض ایک خواب ہی تو تھا: ایک بے حقیقت خواب . . . . ." یہ ایک قدرے غیر معمولی کیفیت تو ضرور ہے جو میں نے اپنے خوابوں میں پائی ہے، ورنہ کیا سوتے میں اور کیا جاگتے میں میرا ذہن بالکل ایک نارمل انسان کے ذہن کی طرح کام کرتا ہے۔

اور اب سنئے میری زندگی کے تنہا غیر معمولی خواب کی روداد!

روز کی طرح اس دن بھی میں نے دوپہر کا زیادہ وقت سونے میں گذارا، اور رات کو ڈیڑھ دو بجے تک اپنے مطالعے کے کمرے میں رہا، جو مکان کے بڑے دروازے کے پہلو میں ہے اور جس کے دروازے اور کھڑکیاں گلی کی جانب ہیں۔ حسب معمول کبھی ایک کرسی پر بیٹھتا، کبھی دوسری پر اور کبھی کمر سیدھی کرنے کو جی چاہتا تو صوفے پر دراز ہو جاتا۔ اس دوران میں میں نے پڑھا بھی لکھا بھی، سوچا بھی اور خالی الذہن بھی رہا۔ اور عادت کے مطابق تقریباً مسلسل سگار پیتا رہا، یہاں تک کہ کمرے کی نصف درجن راکھ دانیاں سگار کی راکھ سے اٹ کر رہ گئیں۔ ڈیڑھ اور دو بجے کے درمیان کمرہ بند کر کے گھر کے اندر چلا گیا جہاں برآمدے میں ایک طرف ملازم سو رہا تھا اور دوسری طرف میرا پلنگ بچھا تھا۔ بستر پر پہنچ کر سونے سے پہلے میں نے اس دن کا آخری سگار سلگایا۔ رات اندھیری تھی۔ آسمان ستاروں سے بھرا تھا، مگر ستارے دھندلائے ہوئے سے تھے اور ان کی روشنی میں ابھی وہ جگمگاہٹ اور براقیت پیدا نہیں ہوئی تھی جو عام طور پر رات کے آخری حصے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ برآمدے میں قدرتی طور پر صحن سے زیادہ اندھیرا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے سگار پینے میں کچھ زیادہ لطف نہ آیا۔ سگار کا دھواں جو بجلی کی روشنی میں ایک خاص حسن اور رومانی کیفیت کا حامل نظر آتا ہے، تاریک کثافت کی ایک لہر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سگار بجھا دیا۔ کلی کی اور سونے کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ عادت کے مطابق فوراً نیند آگئی اور میں خوابوں کی اس دنیا میں پہنچ گیا جس میں ہر شخص اپنی زندگی کا آدھا نہیں تو ایک تہائی حصہ تو ضرور بسر کرتا ہے۔

اس دنیا میں منتقل ہو کر میں نے دیکھا کہ میرے سامنے صحن کے اس پار جو دیوار ہے اس کی منڈیر پر ایک شخص اکڑوں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ کبھی مکان کے مختلف حصّوں کی طرف نظر دوڑاتا ہے۔ کبھی پیچھے مڑ کر

دبی آواز میں اور ہاتھ کے اشاروں کے ساتھ کسی سے باتیں کرتا ہے۔ اور کبھی آگے کی طرف جھک کر صحن کی زمین کی طرف نظر ڈالتا ہے۔ گویا کود کر نیچے آنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ میں اس خوفناک شخص کو دیکھتا ہوں اور اس کے خوفناک ترارادوں کو بھانپ کر سر سے پاؤں تک لرز جاتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ بستر سے اٹھوں اور بچاؤ کی کوئی تدبیر کروں، مگر محسوس کرتا ہوں کہ میرے بدن میں ہاتھ پاؤں ہلانے تک کی بھی سکت باقی نہیں ہے۔ میں آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں اور کانوں سے سن سکتا ہوں مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ملازم کو جگانے کے لئے آواز دینا چاہتا ہوں لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ پھر مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ چنانچہ بار بار پلکیں جھپکاتا ہوں اور متعدد مرتبہ آنکھوں کو بند کر کر کے کھولتا ہوں۔ اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں، بلکہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور میں حقیقت سے دوچار ہوں۔ اس کے علاوہ میں یہ سوچتا ہوں کہ خواب میں انسان جو کچھ دیکھتا ہے اس میں اتنی صفائی اور ٹھیٹھ واقعیت کبھی نہیں ہوتی۔ خواب میں ہر چیز دھندلی، الجھی ہوئی، بے ربط، غیر یقینی اور غیر مستقل ہوتی ہے۔ خواب میں تو اکثر یوں ہوتا ہے کہ ابھی آپ اپنے مکان کے اندر کسی پُر تکلف کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں، اور ابھی کسی درخت کی ٹہنی پر پہونچ گئے ہیں، یا یہ کہ جس شخص سے آپ الجھ رہے ہیں وہ ابھی آپ کا بھائی ہے اور ابھی ذرا دیر میں آپ کے کسی دوست یا دشمن کا روپ دھار لیتا ہے۔ مگر یہاں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے جو منظر ہے وہ بالکل ٹھوس ہے اور واقعیت اور اصلیت سے بھرپور ہے۔ اس منظر کی جزئیات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ میں برآمدے میں اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں۔ داہنی جانب سرہانے کے پاس چھوٹی میز ہے اور اس پر سگار کیس اور دیا سلائی کا بکس اور پانی سے بھرا ہوا شیشے کا گلاس۔ اسی جانب ذرا آگے بڑھ کر کھانے کی میز اور کرسیاں ہیں، اور ان کے برابر ایک کھلا ہوا شیلف ہے جس میں برتن بھرے ہیں اور جو سائڈ بورڈ یا ڈیگن کا کام دیتا ہے۔ بائیں طرف دیوار سے لگا ہوا ایک لوہے کا ٹرنک ہے جو معمولی سائز کے آٹھ نو ٹرنکوں کے برابر ہے اور برآمدے میں اس لئے رکھا ہوا ہے کہ کمرے میں پوری ایک بڑی میز کی جگہ گھیر لیتا ہے۔ ٹرنک کے برابر دو تین کرسیاں پڑی ہیں اور کرسیوں کے اس طرف ملازم اپنی چارپائی پر بے خبر سو رہا ہے۔ برآمدے کے بعد صحن ہے جس کے چپے چپے سے کیا، ذرّے ذرّے سے مجھے گہری واقفیت ہے، کیونکہ میں اس مکان میں آٹھ دس سال سے رہتا ہوں۔ صحن کے خاتمے پر دس

گیارہ فٹ اونچی دیوار ہے جس کی بلندی میں مزید اضافے کے لئے میں ہمیشہ مالک مکان پر ایک بے نتیجہ اور بے سود تقاضہ کرتا رہا ہوں۔ اسی دیوار کے ایک حصے پر کھپریل کا وہ سائبان ٹکا ہوا ہے جو باورچی خانے کو دھوپ اور بارش کے حملوں سے بچاتا ہے اور کھپریل کے برابر دیوار کی منڈیر پر یہ شخص، یہ بن بلایا مہمان، اکڑوں بیٹھا ہے۔ اور خطرناک ارادوں سے لبریز نظر آتا ہے۔ نہ اس کے حلیے میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے، نہ وہ خود بندر کی شکل میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس کا وجود یقینی ہے۔ اس کی ہر حرکت بالکل واضح ہے اور پورے طور پر سمجھ میں آتی ہے۔ میں یقیناً خواب نہیں دیکھ رہا ہوں بلکہ بیدار ہوں ——— سوتے سوتے جاگ گیا ہوں اور اس ناخوشگوار صورت حال سے دوچار ہوں۔

اپنی بیداری کا یقین کر لینے کے بعد میں اپنی پھٹی ہوئی آنکھیں منڈیر اور منڈیر پر بیٹھے ہوئے شخص پر جما دیتا ہوں۔ اس کے جسم پر ایک کسے ہوئے لنگوٹ اور ایک چست شلوکے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہاتھ اور ٹانگیں بالکل ننگی ہیں۔ سر پر ایک مٹیالے رنگ کا صافہ بندھا ہے، اور شاید اسی کا کچھ حصہ ہے جو اس کے گالوں اور ٹھوڑی کو بھی ڈھانپے ہوئے ہے۔ تاہم اسکا چہرہ، یعنی آنکھیں، ناک، اور منہ صاف نظر آ رہا ہے۔ میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں تو میری حیرت زدگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ ایک آنکھ سے بھینگا ہے، اس کا ایک نتھنا بیچ میں سے کٹا ہوا ہے۔ اور پھولے ہوئے ہونٹ دو موٹے موٹے چوہوں کی مانند ہیں۔ میرے ذہن میں ایک بجلی سی کوند جاتی ہے، اور میرا حافظہ چیخ کر کہتا ہے "بدو!"

اس مقام پر میں اپنے پڑھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لئے خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس لانا چاہتا ہوں۔

میری ساری عمر بڑے بڑے تجارتی اور صنعتی شہروں میں گزری ہے، اور کسی گاؤں یا قصبے میں چند دن گزار دینے کو میں تعطیلات کا بہترین مصرف خیال کرتا ہوں۔ لوگ ایام فرصت میں کلکتہ اور بمبئی یا مسوری اور کشمیر جانے کے پروگرام بناتے ہیں۔ میں اس کے برعکس کسی اداس گاؤں یا ویران قصبے کی طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ میرے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے ایک ہم پیشہ و ہم مشرب دوست مظہر نے گزشتہ سال کرسمس کی چھٹیوں میں مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ یوں میں نے چند روز ایک چھوٹے سے پرسکون قصبے میں بسر کئے۔ مظہر کا مکان جو کچھ خام ہے اور کچھ پختہ، قصبہ کے ایک سرے پر واقع ہے۔ مکان کے ایک طرف ایک پکی سڑک ہے جس پر صبح سے شام تک اونگھتی ہوئی بیل گاڑیاں، بے ضرورت شور کرنے والے یکے، مویشی اور انسان گزرا کرتے ہیں، اور جو اس سارے ہنگامے کے باوجود

بے رونق ہی رہتی ہے۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا برساتی تالاب اور اس سے آگے کھیتوں کا لا متناہی سلسلہ ہے۔ مکان کی پشت پر ایک سایہ دار املی کا درخت ہے۔ اسی درخت اور اس کی بہاروں اور اس کے سائے میں برپا ہونے والی صحبتوں کو مظہر نے اپنے قصبے کی سب سے بڑی کشش بتایا تھا۔ شاید اس نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ آس پاس کے ہر مرتبے اور ہر قماش کے لوگ اپنی فرصت کے اوقات میں یہاں جمع رہتے ہیں اور ہر وقت اور ہر موسم میں ایک جلسے کا سا سماں بندھا رہتا ہے۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہ تھا کہ برسات کے زمانے میں اس درخت کے نیچے بیٹھنا کس قدر لطف و مسرت کا موجب ہوتا ہوگا۔

اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں میں ایک دن جو صبح کو سو کر اٹھا تو دیکھا کہ آسمان پر ابر چھایا ہوا ہے اور ٹھنڈی ہوا غیر معمولی تیزی کے ساتھ چل رہی ہے۔ لیکن اس پر بھی مظہر اور اس کے چند دوست یا محلے دار درخت کے نیچے حسب معمول جمع تھے۔ کوئی گرم کوٹ پہنے تھا، کوئی کمبل لپیٹے ہوئے تھا اور کوئی لحاف سمیت ہی آنکلا تھا۔ مگر ایسا کوئی نہیں تھا جو سی سی نہ کر رہا ہو اور سردی کے مارے ٹھٹھرا نہ جاتا ہو۔ سب اس حال میں کھڑے تھے کہ مظہر نے ایک شخص کو جو ادھر سے گزر رہا تھا بدو کہہ کر پکارا۔ وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے بدن پر ایک پھٹی ہوئی گھٹنوں تک اونچی دھوتی اور کھدر کے ایک کثیف نیم آستین شلوکے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس برہنگی سے زیادہ جاذب توجہ اس کی صورت تھی۔ وہ حد سے زیادہ کریہہ المنظر تھا۔ اس کا سر گنجا تھا، ایک آنکھ بھینگی تھی، ایک نتھنا بیچ میں سے کٹا ہوا تھا، اور ہونٹ دو موٹے موٹے چوہوں کی طرح پھولے ہوئے تھے!

"میاں بدو! ایسی سردی میں آج صبح ہی صبح کہاں چل دئے؟" کسی نے اس سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں میاں!" اس نے جواب دیا، "مجھ بدبخت کو تو موت بھی نہیں۔ سچ جانیو، آدھی رات سے جب سے کہ ہوا تیز چلی ہے اور بادل ہوئے ہیں صبح تک دونوں میاں بیوی بچی کو بغل میں دبائے، گھٹنوں میں سر دئے بیٹھے رہے ہیں۔"

"پھر اب اتنے سویرے سردی میں کیوں نکل کھڑے ہوئے؟ اس وقت کہاں کا ارادہ ہے؟"

"میاں اور سویر کی کیا بات ہے۔ یہاں تو ہر وقت سردی ہی ہے۔ رات جس طرح کاٹی ہے بس اپنا ہی دل جانتا ہے۔ اب تمہیں بتاؤ میاں! ایک کھدر کی چادر اس کڑاکڑاتے جاڑے میں کیا کام آسکتی ہے؟ اور وہ بھی تین آدمیوں کے بیچ میں!"

"ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ مگر اس وقت جا کہاں رہے ہو؟"

"میاں! جاتا کہاں۔ مزدوری کی فکر ہے۔ آنے دو آنے کی پیداوار کر کے پیٹ کو لگاؤں گا۔"

"اچھا اچھا، جاؤ،" سب نے مل کر کہا۔ اور وہ رخصت ہوگیا۔

یہ میری اور بدو کی پہلی ملاقات تھی۔

اس سال ستمبر کے پہلے ہفتے میں مظہر کے کنبے میں ایک شادی تھی اور مجھے ایک مرتبہ پھر اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ کنوار کا مہینہ تھا اور برسات کا آخری زمانہ۔ سب جانتے ہیں کہ اس موسم میں کیسی چلچلاتی دھوپیں پڑتی ہیں صحیح یا غلط مشہور ہے کہ انھیں دھوپوں میں ہرن کالا ہوتا ہے۔ ایک دن یہ اور غضب ہوا کہ ہوا بالکل بند ہوگئی۔ قیامت کی دھوپ اور اس پر حبس! گھروں کے اندر ٹھہرنا ناممکن ہوگیا۔ اگر کہیں کچھ امن تھا تو املی کے درخت کے سائے میں ہی تھا۔ چنانچہ دوپہر کے وقت میں اور مظہر اور کچھ اور لوگ درخت کے نیچے اپنے ہاتھوں میں پنکھے لئے بیٹھے تھے کہ چند مزدور گھاس کے گٹھے سروں پر رکھے آتے ہوئے دکھائی دئے۔ سب کے چہرے گھاس کے گٹھوں میں چھپے ہوئے تھے۔ درخت کے نیچے پہونچ کر سب نے اپنے اپنے سر کا بوجھ زمین پر لڑھکا دیا، اور بیٹھ کر جانوروں کی طرح ہانپنے لگے۔

"کہو بھئی بدو! کیا حال چال ہیں؟"

مظہر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں نے اپنے حافظے میں ایک ہلکی سی جنبش محسوس کی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا اور بیک نظر اس گنجے سر اور بھینگی آنکھ کے ٹوٹے نتھنے اور پھولے ہوئے ہونٹوں والے شخص کو پہچان لیا جس سے پچھلے جاڑوں میں پہلی دفعہ واقفیت حاصل کی تھی۔

"اچھا ہوں میاں!" بدو نے کہا۔ "اب کے تو میاں تم بہت دنوں میں گھر کو آئے۔"

"ہاں بھئی، کیا بتائیں چھٹی نہیں ملتی۔ کہو اب تمہاری کیسی گزر رہی ہے؟ جاڑوں میں تو تم بڑی تکلیف اٹھا رہے تھے۔"

"میاں! غریب کے لئے جاڑا گرمی سب برابر ہے۔ جاڑوں میں سردی کے مارے اکڑے جاتے تھے اور اب گرمی میں یہ دھوپ جلائے ڈالتی ہے۔ لو دیکھو۔"

یہ کہہ کر بدو نے اپنی پشت ہماری طرف کی۔ اور ہم نے دیکھا کہ اس کی پشت پر چونی کی گولائی کے برابر بیسیوں آبلے پڑے ہوئے ہیں۔

"یہ آبلے کیسے؟" مظہر نے پوچھا۔ "کیا کہیں جل گئے؟"

"میاں! جل نہیں گئے،" بدو بولا۔ "کپاس کے کھیت میں بیٹھے گھاس صاف کر رہے تھے۔ اپنے پاس کوئی کپڑا تھا نہیں جو پیٹھ پر ڈال لیتے۔

دھوپ کی تیزی سے آبلے پڑ گئے ہیں۔"

مظہر اور اس کے ساتھی "ارے" کہہ کر خاموش ہو گئے اور آسمان کی طرف منہ کر کے بارش کی دعائیں مانگنے لگے۔

یہ میری اور بدّو کی دوسری ملاقات تھی!

اور تیسری ملاقات خواب کی دنیا میں ہوئی جس کی روداد کا ایک حصہ میں سنا چکا ہوں اور باقی حصے کی طرف اب متوجہ ہوتا ہوں۔

میں منڈیر پر بیٹھے ہوئے شخص کو پہچان لیتا ہوں، اور زور سے چیخ کر کہنا چاہتا ہوں، "بدّو! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟" مگر آواز حلق میں سے نہیں نکلتی، اور میں بے دست و پائی کے عالم میں اس کو دیکھتے رہنے پر مجبور ہوں۔ اتنے میں ایک اور شخص کا سر منڈیر سے اونچا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ایک لمحے میں وہ بھی بدّو کے برابر آن بیٹھتا ہے۔ میں صورت حال کو اس ارتقائی تبدیلی میں پوری طرح غور بھی نہیں کر پاتا ہوں کہ اسی طرح ایک تیسرا شخص دیوار کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہے اور منڈیر پر آ کر اپنے ساتھیوں کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دیوار کے اس طرف زمین شق ہو گئی ہے اور کسی غلیظ اور ملعون دنیا کے بسنے والے اپنے ناپاک مسکنوں سے نکل نکل کر میرے مکان پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ میں اپنی نظریں یہ دیکھنے کے لئے منڈیر پر جما دیتا ہوں کہ ان تین حملہ آوروں میں اور کتنے حملہ آوروں کا اضافہ ہونے والا ہے۔ بارے یہ اضافہ تو نہیں ہوتا، مگر یہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ تینوں شخص کھپریل کے سائبان کا سہارا لیتے ہوئے یکے بعد دیگرے نیچے صحن میں اتر آتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر چیخنے کی کوشش کرتا ہوں، اور پلنگ سے اٹھنے کے لئے اپنے جسم کی انتہائی قوت کو کام میں لاتا ہوں۔ مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ میری آواز میرے دماغ میں گونج کر رہ جاتی ہے اور میرے جسم کی قوت تحلیل ہو کر مجھے پہلے سے زیادہ مفلوج بنا دیتی ہے۔ وہ تینوں شخص آگے پیچھے ایک قطار سی باندھے ہوئے، مکان کے بڑے دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز مجھے سنائی دیتی ہے۔ وہ دروازے کو چوپٹ کھول دیتے ہیں، گویا فرار کے راستہ کا انتظام سب سے پہلے کرتے ہیں، اس انتظام سے فارغ ہو کر تینوں دوبارہ صحن میں آ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر ساکت رہتے ہیں اور آپس میں اشاروں سے باتیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد برآمدے کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ میں برق زدہ ہو کر رہ گیا ہوں میری حالت بیہوشی کی حالت سے کہیں بدتر ہے، کیونکہ بیہوشی میں انسان شعوری احساس سے بہرحال عاری ہوتا ہے۔ برآمدے میں لوہے کا ضخیم ٹرنک سب سے پہلے ان کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ وہ کچھ دیر تک جھک جھک کر اس کے قفل کو دیکھتے ہیں۔ شاید کوئی کام بنتا نظر نہیں آتا اس لئے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس دروازے میں بھی ایک قفل پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ ادھر سے بھی پسپا ہوتے ہیں، اور تینوں برآمدے سے نکل کر صحن میں چلے جاتے ہیں۔ تقریباً دو منٹ تک کھپریل کے سائبان کے نیچے کھڑے رہتے ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں اور آپس میں مشورہ کرتے ہیں اس کے بعد دوبارہ برآمدے کی طرف بڑھتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر چیخنے کی اور پلنگ سے اٹھنے کی زبردست کوشش کرتا ہوں، مگر آواز میرے حلق میں مر چکی ہے اور بستر میرے لئے قبر بن کر رہ گیا ہے۔ ایک شخص ملازم کی چارپائی کی طرف بڑھتا ہے اور اس کے قریب جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ دوسرا برآمدے کے بیچ میں ٹھہر جاتا ہے۔ اور تیسرا یعنی بدّو میرے پلنگ کی طرف اپنے قدم بڑھاتا ہے۔ وہ میرے سرہانے کے پاس پہونچ کر چند لمحوں تک بےحس و حرکت کھڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد آگے کو جھکتا ہے اور میرے چہرے کو بغور دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں چیخنے کی ایک آخری اور بے پناہ کوشش کرتا ہوں اور کامیاب ہوتا ہوں۔

ایک بھیانک چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں خواب کی دنیا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خواب کے تاریک غار سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ جاتا ہوں۔

اور یہ تھا وہ خواب جو میں نے دیکھا۔

"لیکن" آپ کہیں گے! "یہ تو بالکل معمولی خواب تھا"

ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو، مگر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص میرے سرہانے کھڑا ہے اور جھک کر میرے چہرے کو بغور دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ ایک آنکھ سے بھینگا تھا۔ اسکا ایک نتھنا بیچ میں سے کٹا ہوا تھا۔ اور اس کے پھولے ہوئے ہونٹ دو موٹے موٹے جوہوں کی مانند تھے۔ وہ بدّو تھا!

---

## حیوان سے انسان تک

بقیہ صفحہ ۳۹

اور تدبیریں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوئی بلکہ یہ بھی کہ وہ اپنے ساتھیوں سے تبادلہ خیالات کر سکے اور اپنا مافی الضمیر ان کو بتا سکے۔ ان خصوصیات کی بدولت اس کو دنیا کے سب جانوروں پر غیر معمولی فوقیت اور سرفرازی حاصل ہو گئی۔ اس کی فطرت نے اب اسے مجبور کر دیا کہ وہ صحیح معاشرتی زندگی اختیار کرے جس سے کہ اس کے ذہنی اور دماغی قویٰ میں حیرت انگیز ترقی ہوئی اور بالآخر موجودہ دور کے مہذب اور ترقی یافتہ انسان کی خلقت کی تکمیل عمل میں آئی۔

# سوویٹ ایشیا کے لوگ

جان لورنس

جس طرح برطانیہ عظمیٰ یعنی صرف انگلستان [illegible] نہیں [illegible] اسی طرح سوویٹ یونین [illegible] روس [illegible] نام نہیں [illegible] طرح کے لوگ رہتے ہیں مگر سوویٹ یونین میں انھیں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اب میں آپ کو سوویٹ ایشیا کے متعلق کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جغرافیائی نقطۂ نظر سے "سائبیریا" ایشیا کا ایک حصہ ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو سائبیریا یورپی ندیں ہی کا پھیلاؤ ہے۔ اس میں ویسے ہی لوگ بستے ہیں اور اس کی آب و ہوا بھی ویسی ہی ہے۔ اصلی ایشیا تو آپ کو درحقیقت قازقستان اور سوویٹ ترکستان ہی میں نظر آئے گا۔ یہیں زرخیز وادیاں اور سمرقند و بخارا جیسے مشہور عالم شہر ہیں اور یہیں وہ صحرا ہیں جو وادیوں کو ایک دوسری سے جدا کرتے ہیں۔ یہ دراصل اس قسم کا ملک ہے جس کا ذکر الف لیلہ میں آیا ہے۔ یہاں اونٹ ہیں اور اسی طرح کی چیزیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں جاڑوں میں خاصی سردی ہوتی ہے۔ اور جب برف پڑتی ہے تو برف گاڑیاں اونٹ ہی کھینچتے ہیں البتہ انھیں گرم رکھنے کے لئے [illegible] اوڑھا دیتے ہیں۔ مرد لمبے لمبے سلکی چغے اور منقش ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ اور عورتیں اپنی لمبی کالی زلفیں پشت پر لٹکاتی ہیں۔ ان [illegible] بال کالے ہوتے ہیں۔ روسی زندگی کا یہ دلکش پہلو مجھے بہت پسند ہے۔ مگر "الف لیلہ" میں نظر فریبی بہت کم ہے اور نہیں یاد رکھنا چاہئے کہ اسکے پس منظر میں خوفناک غربت چھائی ہوئی ہے۔

سوویٹ ایشیا ہمیشہ غریب رہا ہے۔ روس کے مقابلے میں اسکی مفلسی کہیں زیادہ ہے۔ یہاں مسلمان آباد ہیں۔ تمام سوویٹ یونین میں کوئی دو کروڑ مسلمان ہوں گے۔ وہ عموماً روسی میں نہیں بلکہ اپنی مادری زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ البتہ جو لوگ مدرسوں میں روسی سیکھتے ہیں وہ کبھی کبھی روسی بول لیتے ہیں۔ لیکن ان دونوں زبانوں میں کچھ زیادہ اختلاف بھی نہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ تھوڑی سی مشق سے مختلف قبیلوں کے لوگ ایک دوسرے کی بات بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں۔ روسیوں کے مقابلے میں یہ لوگ بہت پیچھے تھے پچیس سال قبل ان میں صرف دو تین فیصدی لوگ پڑھنا جانتے تھے وہ بھی اپنی زبان میں نہیں بلکہ زیادہ تر عربی اور فارسی میں اس لئے کہ ان زبانوں کو ان کے نزدیک فوقیت حاصل تھی۔ چھپی ہوئی کتابوں کی تعداد نفی کے برابر تھی۔ ملک بھر میں معدودے چند ڈاکٹر تھے۔ ایک پورے ضلع میں جہاں کی آبادی کوئی اڑھائی لاکھ تھی صرف ایک ڈاکٹر تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بیمار کو مرض کے ایام میں موت سے کھیلنا ہوتا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے لوگوں کو شہری آزادی حاصل نہ تھی اور ان کا دارومدار محض حکام کے رحم و کرم پر تھا۔ یہ حاکم بعض صورتوں میں روسی افسر ہوتے اور کبھی ان کے اپنے "امیر" اور "قان"۔ قصہ مختصر یہ لوگ قرون وسطیٰ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض وجوہ سے قرون وسطیٰ کی تہذیب کا معیار بہت بلند تھا اور وسط ایشیا کے یہ لوگ وسطی بلند تہذیب کے وارث ہیں۔ چونکہ وسط ایشیا زیادہ تر صحرا ہے اس لئے ان لوگوں کی زندگی کا مدار پانی پر ہے۔ البتہ اگر وہاں بند بنا لئے جائیں اور نہریں کھود لی جائیں تو زمین کی آبپاشی ہو سکتی ہے اور یہی بنجر زمین زرخیز بنائی جا سکتی ہے۔ بند سے بجلی حاصل ہو سکتی ہے اور پھر یہی پانی کیمیائی مشینوں کے ذریعے کھاد کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے یا پھر زمانۂ جنگ میں اس سے بارود وغیرہ تیار کر سکتے ہیں جب کبھی وسطی ایشیا میں کسی اچھی حکومت کا دور دورہ ہوا تو اس نے بند بنائے اور نہریں کھدوائیں۔ اس لحاظ سے سوویٹ حکومت ان لوگوں کے لئے رحمت ثابت ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ بند بندھوانے اور نہریں کھدوانے کے لئے مزدوروں کی بہت بڑی تعداد درکار ہوتی ہے۔ یہاں کھدائی کے کام کے لئے زیادہ تر مقامی لوگ لگائے گئے ہیں اور حقیقت میں یہ انکے اپنے فائدے کی چیز ہے۔ جب کبھی اس قسم کی مہم درپیش ہوتی ہے تو پوری آبادی دل و جان سے اس میں لگ جاتی ہے۔ اور یہ ان کی زندگی کا دلچسپ پہلو ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی دور رہ کر حکومت ان لوگوں کا اعتماد کیسے حاصل کرتی ہے جب کہ یہ لوگ دیگر پس ماندہ اقوام کی طرح بڑے شکی واقع ہوئے ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ سوویٹ حکومت نے ان لوگوں کے معاملے میں کئی غلطیاں کھائیں، اور اول اول حکومت کی سخت مخالفت ہوئی اور لوگ مسلح بغاوت پر اتر آئے لیکن رفتہ رفتہ معاملات سلجھ گئے۔ سوویٹ یونین ایک طرح کا وفاقی نظام حکومت ہے گو ویسا نہیں جیسا ریاستہائے متحدہ یا سوئٹزرلینڈ یا آسٹریلیا کی جمہوری حکومتوں میں ہے۔ قانون یہاں جلد حرکت میں آجاتا ہے اور تمام احکام ماسکو سے صادر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے وزرا میں سے ایک نے مجھ سے کہا کہ "ماسکو ہی سب کا آقا ہے"۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مقامی کاموں کے لئے سوویٹ یونین کیطرف سے مقامی لوگ ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ لوگ مقدور بھر کوشش کرتے ہیں کہ عوام ان اپنے کاموں میں حصّہ لینے کو فخر سمجھیں۔ پچھلے بیس سال میں انھوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ان دور دراز علاقوں میں سوویٹ نظام کو قائم ہوئے ابھی بیس برس سے کچھ ہی اوپر گزرے ہیں۔ آج کل سب بچے اسکول جاتے ہیں۔ یہ ہر چیز مادری زبان میں سیکھتے ہیں۔ بہت سے طالب علم (جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں) ثانوی درجوں بلکہ یونیورسٹی تک پہونچ جاتے ہیں۔ میں نے تاشقند اور سمرقند کی دونوں یونیورسٹیاں دیکھیں ان میں سینئر پروفیسر ابھی تک زیادہ تر روسی ہیں لیکن اب اُزبک نوجوانوں کی کافی تعداد معلمی کے لئے تیار ہو رہی ہے۔ اس زمانے میں چونکہ اکثر لوگ پڑھنا سیکھ گئے ہیں اس لئے اب ہر علاقے میں مقامی ادب سے دلچسپی لی جا رہی ہے۔ ان لوگوں نے اپنے قدیم ادب کو پہلی مرتبہ بہت بڑی تعداد میں چھپوا کر محفوظ کر لیا ہے۔ مجھے ایک ناٹک دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ایک قدیم نظم سے تیار کیا گیا تھا۔ میں الفاظ سمجھنے سے تو قاصر رہا لیکن اداکاری ایسی واضح تھی کہ پورے کا پورا منظر آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میرے خیال میں آج سے پچیس سال پہلے کسی مقامی زبان میں کوئی کھیل نہیں کھیلا گیا۔ لیکن اب وہاں ایسے تھیئٹر قائم ہو چکے ہیں جو ماسکو کے بہترین تھیئٹروں سے کسی طرح کم نہیں۔

مگر ناٹک اور تھیئٹر تو محض ضمنی چیزیں ہیں کسی متمدن معیار زندگی کے لئے اصل چیز مناسب طور پر کاشت کردہ کھیت اور جدید کارخانے ہیں جہاں تک مجھے معلوم ہے وسط ایشیا میں کوئلے کی کانیں نہیں ہیں اور غالباً اسی وجہ سے وہاں عام طور پر صنعت و حرفت کو کچھ زیادہ فروغ حاصل نہیں۔ البتہ پارچہ بافی کی صنعت وہاں بڑے زوروں پر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وسط ایشیا میں کپاس بکثرت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے تاشقند میں کپڑے کا ایک بہت بڑا کارخانہ دیکھا۔ لنکاشائر کے کارخانوں سے اس کا مقابلہ تو کوئی ماہر فن ہی کر سکتا ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کارخانے کو سرسری نظر سے دیکھنے کے لئے بھی کئی گھنٹے وقت درکار ہے۔ میں نے دھنکنے سے کپڑے کی چھپائی تک کے سارے عمل دیکھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مستقبل قریب میں ان لوگوں کو پہننے کے لئے بہت عمدہ کپڑا مہیا ہو جائے گا گو انھیں مغربی یورپ کی صف میں کھڑا کرنے کے لئے بہت عرصہ درکار ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کپڑے کے اور بھی کارخانے ہیں۔

آبادی وہاں کی بڑھ رہی ہے لیکن اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں کہ زمین اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ناکافی ہوگی کیوں کہ زمین کو آبپاشی کے ذریعے کارآمد بنایا جا سکتا ہے حکومت برطانیہ میں بھی آب پاشی کی بعض بڑی بڑی اسکیمیں عمل میں آ چکی ہیں اور شاید یہ خیال کرنا درست نہ ہو کہ روس ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں اس قسم کی بڑی بڑی اسکیموں پر عمل ہو سکتا ہے۔ ہاں ان کے متعلق یہ بات بالکل صحیح ہے کہ جب یہ لوگ کسی کام کو کرنے کا تہیہ کر لیتے ہیں تو اس میں سر توڑ کوششوں سے تیزیٔ رفتار پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وادیٔ فرغانہ کو لے لیجئے۔ قدیم زمانے میں یہ زرخیز ترین علاقوں میں سے تھی لیکن آب پاشی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے یہ پھر سے بنجر ہو گئی۔ نہر فرغانہ کھدگئی تو اس علاقے کی زرخیزی بحال ہو گئی۔ مجھے اس کے متعلق جو قصّے بتلائے گئے اوّل اوّل میں نے انھیں باور نہیں کیا لیکن اب میں اسے بچشم خود دیکھ چکا ہوں۔ اس کا صرف ایک حصّہ کئی سو میل لمبا ہے۔ جن لوگوں کو اس نئے پانی سے فیض یاب ہونا تھا ان کو اس کے فوائد اچھی طرح سمجھا دئے گئے۔ انجنیروں نے اس نہر کی حدود زمین پر قائم کر دیں اور پلوں وغیرہ کے نشانات بھی لگا دئے۔ گویا کھدائی کے سوا ہر چیز تیار ہو گئی۔

اب دیکھئے کہ کھدائی کس طرح عمل میں آئی۔ اس علاقے میں کپاس

## غزل

**شفق جوالاپوری**

ہو گیا نقش دل پہ تیرا نام ؛ بس محبت کا مل گیا انعام
حسن ہر چند بے نیاز سہی ؛ عشق کو لیکن اپنے کام سے کام
ہم کو مرنا تھا عشق کے ہاتھوں ؛ حسن نے مفت لے لیا الزام
رنگ اب اور ہے زمانے کا ؛ کب تلک! یہ حدیث یا وہ جام
اب نہ منزل نہ راہ منزل ہے ؛ عشق میں پیش آ گیا وہ مقام
لاکھ طوفاں ہیں اور سفینۂ زیست ؛ ایک دل اور صد ہزار آلام
جس میں کیف و سرور و سوز نہیں ؛ وہ مئے شوق مطلقاً ہے حرام
نظروں نظروں میں کہہ گئے سب کچھ ؛ آنکھوں آنکھوں میں دے گئے پیغام
کسی رنگیں ادا کا صدقہ ہے ؛ ہم کہاں! اور کہاں یہ رنگ کلام
زلف مشکیں گھٹائیں ساون کی ؛ چشم مخمور یعنی۔ بادہ بجام

تم چھپاتے تو ہو شفق۔ لیکن
صاف غمّاز ہے یہ طرز کلام

خوب پیدا ہوتی ہے۔ سال بھر میں قریب قریب ایک مہینا ایسا ہوتا ہے کہ کھیتوں پر کوئی کام نہیں ہوتا۔ ایک بار ایسے ہی موقع پر مجوزہ نہر کے کنارے کنارے سب لوگوں نے پھیل کر ڈیرے ڈال لئے۔ ان کی تعداد ایک لاکھ ترلیسٹھ ہزار تھی۔ ان کو اچھا کھانا دیا جاتا اور ان سے دن بھر کام لیا جاتا تھا۔ شام کو انھیں سوویٹ یونین کے بہترین نغمائی کھیل دکھائے جاتے تھے۔ دن بھر تقریریں کرنے والے ایک گروہ سے دوسرے گروہ کے پاس جاتے اور انھیں ایک دوسرے کی مستعدی کا حال بتا کر گرماتے۔ اس طرح انمیں جذبۂ مسابقت پیدا ہو جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا کام تین ہفتے میں ختم ہو گیا یعنی سو میل لمبی نہر تیار ہو گئی جس نے اتنے بڑے بنجر علاقے کو زرخیز بنا دیا۔ بعد میں اس نہر میں اضافہ کیا۔ اسی طرح کئی بند اور نہریں اسی قومی اشتراک کی بدولت معرض وجود میں آئیں۔

جو لوگ ان کھیتوں میں کام کرتے ہیں عام طور پر ان کی کشتواری تنظیم ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہر گاؤں کے گرد جو زمین ہوتی ہے اسے ایک بڑا قطعۂ اراضی مان کر مشترک طور پر کاشت کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ اپنے منتظم کا انتخاب خود کرتے ہیں۔ ہر خاندان کو کچھ مویشی وغیرہ پالنے کی اجازت ہوتی ہے اور تھوڑی سی جداگانہ نجی زمین کاشت کرنے کا بھی حق ہوتا ہے۔ مجھے ایک گاؤں دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں ان کا اپنا ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشن (بجلی گھر) تھا۔ اس کی بدولت ہر گھر میں بجلی موجود تھی۔ اُزبکستان میں ترانوے گاؤں ایسے تھے جن کی بجلی اپنی تھی۔ لیکن اس چیز کو عام کرنے کے لئے بڑی مدت درکار ہے۔

مکانات وہاں گارے کے ہوتے ہیں اور گارا اس قسم کی آب و ہوا کے لئے کوئی بُری تعمیری چیز نہیں۔ مجھے چند مکانات کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ نہایت چھوٹے اور تاریک تھے لیکن میں نے وہاں جدید مکانات بھی دیکھے جن میں باقاعدہ صحن، پھل دار درخت اور ہوادار کمرے تھے۔ ان کے رخ عموماً شمال کی طرف تھے۔ اس سے انھیں دھوپ سے بچاؤ رہتا تھا۔ مکان کے ایک حصے میں مردانہ کمرے تھے اور دوسرے میں زنانہ۔ آجکل لڑکیاں بھی اسکول جاتی ہیں اور انھیں ایک گونہ آزادانہ زندگی بسر کرنے کا موقع مل رہا ہے لیکن ابھی تک کسی غیر مرد کو زنانہ کمروں میں جانے کی اجازت نہیں۔ آج سے چند سال پہلے تک عورتیں پردوں میں رہتی تھیں۔ یہ پردہ کیا تھا۔ ایک عجیب وضع کا کالا بدنما برقع جسے لکڑی کے ایک تکونے فریم کے ذریعہ سر سے چہرے پر لٹکایا جاتا تھا۔ سوویٹ حکومت نے کبھی پردے کی ممانعت نہیں کی حالانکہ ترکستان اور ایران میں ایسا ہو چکا ہے البتہ "اشتمالی جماعت" (کمیونسٹ پارٹی) پردے کے خلاف تبلیغ کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ ایک جوان عورت نے مجھے بتایا کہ "میں سب سے پہلی عورت ہوں جسے پردہ ترک کرنے کا فخر حاصل ہے"۔ اس نے اس سلسلے میں مجھے کئی دردناک باتیں بتائیں۔ ایک یہ تھی کہ پرانے خیال کے لوگ اس حرکت سے سخت برہم ہوتے اور بعض اوقات چہرہ ننگا کرنے والی لڑکی کو خفیہ طور پر ختم کر دیا جاتا۔

سوویٹ ایشیا بلاشبہ ترقی کر رہا ہے لیکن یہ لوگ ابھی تک بہت مفلس ہیں اور انھیں مغربی یورپ کے معیار تک پہنچانے کے لئے ابھی بہت عرصہ درکار ہے۔ لیکن روس میں ان پسماندہ لوگوں کی امانت داری کے فرائض انجام دینے کے لئے حالات سازگار ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان دو کروڑ نفوس کی دیکھ بھال کے لئے روسیوں اور دیگر متمدن لوگوں کی تعداد کوئی ستر کروڑ ہے جن میں سے اکثر برطانوی نوآبادیات کے لوگوں کے مقابلے میں بھی کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ سوویٹ یونین کے لئے افریقہ کے منطقۂ حارہ کی سی مشکلات نہیں ہیں۔ ان کے لوگوں میں سب سے زیادہ پسماندہ انتہائی شمال کے "اسکیمو" ہیں لیکن ان کی تعداد کچھ اتنی زیادہ نہیں۔ روس میں اس قسم کے لوگوں کی کثیر تعداد موجود ہے جو دور دراز علاقوں میں صنعتی کام اپنے ہاتھ میں لے کر زیادہ پسماندہ لوگوں کو اپنی حفاظت آپ کرنے کے طریقے سکھا سکتے ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ تمام سوویٹ یونین کا علاقہ زمین کا ایک ہی بڑا قطعہ ہے چنانچہ ہم ریل کے ذریعے ماسکو سے تاشقند چند روز میں پہونچ سکتے ہیں۔ اس سے ملک کو متحد کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ پھر وہاں نسلی بکھیڑے بھی نہیں ہیں کیونکہ پوری سوویٹ یونین میں صرف دو نسلیں ہیں یعنی یورپی اور منگولی۔ اگر کوئی انگریز جادو کے زور سے یکایک ماسکو پہنچ کر روسی لباس پہن لے تو اس کے چہرے کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ یہ روسی نہیں ہے۔ دوسری قوم ہو بہو چینیوں کی سی ہے لیکن وہاں کسی معاملے میں نسلی امتیاز کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ روسیوں کو ہر خوددار قوم کی طرح اپنے آپ پر ناز ہے لیکن ان میں جرمنوں جیسی "خودنمائی" کا رجحان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بنیادی طور پر صلح جو واقع ہوئے ہیں۔

## لکھنے والوں سے

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ اُن کو اسی رسالہ میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ قلمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کریں۔
(ادارہ)

# ہندوستانی فلموں میں ڈرامانگاری

بدر العظیم

ابھی کل کی بات ہے کہ ہندوستان میں پہلی بولتی فلم "عالم آرا" بنائی گئی۔ عالم آرا میں بس خوبی یہ تھی کہ فلم تھی اور بولتی ہوئی۔ لیکن اس وقت کے شائقین اس سے زیادہ کچھ چاہتے بھی نہ تھے۔ اور یہ فلم ہر طرح مقبولِ خاص و عام ہوئی۔ یہ فلم دیکھنے والوں کے لئے ایک نیا ذریعہ دلچسپی بنا اور بنانے والوں کے لئے ایک نیا ذریعۂ آمدنی۔ اور فلمی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے آج کیا ایک زمانہ گذرنے کے بعد بھی کچھ کم دلچسپ نہ ہوگی۔

شروع ہونے کی دیر تھی کہ فلموں کا تانتا بندھ گیا۔ فلم دیکھنے والوں نے فلم بنانے والوں کے دل بڑھائے اور فلم بنانے والوں نے فلم دیکھنے والوں کے۔ سینماؤں میں طوطی بولنے لگا اور تھیٹروں میں اُلّو۔ راستہ میں کئی کئی تھیٹر چھوڑ کر لوگ سینما کی طرف بڑھنا شروع ہوئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ ان دنوں نہ صرف بمبئی۔ پونا۔ حیدرآباد۔ دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ کلکتہ وغیرہ میں بے شمار تھیٹر کمپنیاں قائم ہوگئی تھیں بلکہ ہندوستان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی تھیٹر عام ہوگیا تھا۔ اور دوسری طرف سینما بھی تھیٹر سے کچھ کم دلچسپ جگہ نہ تھی۔ سینما کے دروازوں پر لوگوں کے استقبال کے لئے مستقل مسخرے رکھے جاتے تھے۔ اور چونکہ مشین ایک ہی ہوتی تھی اس لئے ایک ریل ختم ہونے کے بعد دوسری ریل چڑھانے میں وقت لگتا تھا۔ اس لئے سامعین کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے ہر ریل کے خاتمہ پر اسٹیج پر ناچ وغیرہ کا باقاعدہ انتظام رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ فرسٹ کلاس اسکرین سے نیچے ہی ملا ہوا ہوتا تھا۔ اور اوپر گیلری میں وہ لوگ بیٹھتے تھے جو "کم خرچ اور بالانشیں" کے قائل تھے۔ یہاں بھی سامعین کے حقوق کا کافی خیال رکھا جاتا تھا۔ اور ان کے اصرار پر ناچ وغیرہ ہر بار مکرر سہ کرر دھرانے میں تکلف نہ کیا جاتا تھا۔ فلم تو یوں کچھ ایسی لمبی نہ ہوتی تھی مگر اس طرح دیگر لوازمات سے وقت تھیٹر کی نسبت کچھ کم نہ لگایا جاتا تھا۔

زمانے کا مذاق بدلنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ وقت خواہ مخواہ زیادہ ضائع ہونے کا خیال آنے لگا ادھر لوازمات میں کمی آنی شروع ہوئی۔ اُدھر فلم میں دلچسپی کی زیادتی۔ مسخرے بجائے باہر کے فلم میں آنے لگے اور ناچ بجائے اسٹیج کے اسکرین پر پہنچ گیا۔ اگلی کرسیاں پیچھے اور پچھلی کرسیاں آگے کی گئیں۔ بجائے بار بار وقفہ دے کر تسلسل قائم نہ رکھنے کے فلم لگاتار دکھانے کا انتظام کیا گیا بس ایک بار وقفہ دیا جانے لگا۔ وہ بھی کسی مجبوری سے نہیں بلکہ سامعین کے اکتا نہ جانے کے خیال سے۔

اس کے بعد فلم کمپنیاں کھلنے کی باری آئی اور انھوں نے بھی رفتار دکھائی۔ لیکن دِقت ڈراموں کی کمیابی تھی۔ جو کچھ قدیم ڈرامے موجود تھے وہ اسٹیجوں پر بار بار کھیلے جا رہے تھے۔ اور وہ ڈرامے جو کمپنیوں کے منتظم خود لکھتے تھے کامیاب نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ اول اول تو کھیلے ہوئے ڈرامے ہی پھر فلم میں دھرائے گئے لیکن یہ کب تک ممکن تھا۔ اس لئے ڈرامے لکھنے کے لئے اس زمانے کے پڑھے لکھے لوگوں کو ملازم رکھنا شروع کیا۔ پرانے ڈرامے پھر لکھے گئے اور ان میں کہیں کہیں تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ بنگالی ڈراموں کا اردو ہندی میں ترجمہ کیا جانے لگا۔ لیکن ایسے ترجموں کی زبان بس برائے نام ہی ان کی اصلی زبان سے بدلی ہوئی ہوتی تھی مکالموں میں بھی ویسی ہی تک بندی کا خیال رکھا جاتا تھا جیسے کہ اسٹیج پر بولے جاتے تھے "مقفیٰ" - باوزن اور تلے ہوئے مکالمے ڈرامے کی جان سمجھے جاتے تھے۔ فلم کمپنیوں کو علاوہ ازیں چارہ نہ تھا کہ شُدبُد زبان جاننے والوں کے جیسے بھی برے بھلے ڈرامے ملیں انھیں فلمائیں۔ اور دیکھنے والے بھی اس کی زحمت نہ کرتے تھے کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ سب سے بڑا معیار دلچسپی تھا اور اس کے ساتھ گانے سونے پر سہاگے کا کام کرتے تھے۔

ہر فن کی ترقی اس کی ضرورت پر مبنی ہوتی ہے۔ زمانے نے کروٹ بدلنی شروع کی۔ رفتہ رفتہ سمجھدار ڈائرکٹر میدان میں اترنے لگے اور ڈرامانگاری بھی اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں نے شروع کی۔ لیکن یہاں آکر ڈرامانگار اور ڈائرکٹر دونوں یک زبان ہو کر ایک ہی اسٹیج پر کامیابی کے ساتھ نہ آسکے۔ اگر ڈائرکٹر پرانی روش سے ہٹ کر نئے راستہ کی جستجو کرتے تو ڈرامانگار قدیمی خوبیوں کو ڈرامے کی جان سمجھتے۔ اور اگر ڈرامانگار ہمت کر کے ڈرامے کو نیا رنگ دینے کی کوشش کرتے تو ڈائرکٹر اس کے کامیاب ہونے میں شک کرتے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ بیچارے ڈرامانگار نہ تو ڈرامانگاری کے فن سے واقف تھے اور نہ زبان و بیان کی خوبیاں سمجھتے تھے۔ چنانچہ نہ تو وہ خود اپنے نئے ڈرامے لکھ سکتے تھے اور نہ غیر زبانوں کے عمدہ ڈراموں کے اپنی زبان میں اچھے ترجمے کر سکتے تھے۔ دوسری طرف ڈائرکٹر بھی ظاہری دلچسپی پیدا کر دینے کو فنی خوبی سمجھتے تھے۔ اور پرانی روش کو بدل کر نئی چیز پیش کرنے میں مالی نقصان ہو جانے کا خیال بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ فلمی کہانی اس وقت تک صحیح معنوں میں ڈرامہ کہلانے کی مستحق نہ تھی۔

وقت بدلتے دیر نہیں لگتی - اب اور تعلیم یافتہ - فن کو سمجھنے والے - باہمت ڈائرکٹروں نے قدم بڑھایا اور آن کی آن میں فلمی دنیا کی صورت بدل گئی - قابل ڈائرکٹروں نے اندازہ کرلیا کہ فلم صرف ہنسی مذاق یا جسمانی کودپھاند کے کرتب دکھانے کا ذریعہ نہیں بلکہ اس میں ادبی اور فنی خوبیاں جھلک رہی ہیں - فلم علاوہ ظاہری دلچسپی کے جذبات لطیفہ کے لئے بھی باعث لطف بن سکتا ہے - یہ بھی خیال کیا جانے لگا کہ ہر فن کی ترقی کی صورت یہی ہے کہ ترقی یافتہ اقوام کی نقل کی کوشش کی جائے - اور علاوہ ازیں چارہ نہیں کہ اول اول غیر زبانوں کے اچھے ڈراموں کے اچھے ترجمے کئے جائیں چنانچہ فن کو سمجھنے والے زباں داں ادیبوں کی تلاش ہوئی جو کم ازکم غیر زبانوں کے ڈراموں کو بجنسہ تمام خوبیوں کے ساتھ اپنی زبان میں بدل سکیں - ڈرامانگاروں نے ڈائرکٹروں کو سہارا دیا اور ڈائرکٹروں نے ڈرامانگاروں کو اور دونوں دست بدست ترقی کے زینہ پر چڑھنے لگے - دونوں نے فن کو اپنانا شروع کیا - ادھر ہیملٹ بنا اُدھر کپال کنڈلا - ادھر باغبان تیار ہوا اُدھر باغی سپاہی اور فلمی دنیا کی فضا ہی بالکل بدل گئی -

ڈرامانگاروں اور ڈائرکٹروں کا باہم اتفاق اور کامیابی نہ محض ان کے ہم مشرب اشخاص کے لئے باعث ترغیب ہوا بلکہ اس نے ایک حد تک سامعین کا مذاق بدل دیا - ان کو بتادیا کہ فلم صرف دفع الوقتی کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ بھی ایک صنف ادب ہے - ان میں باریکیوں اور خوبیوں کو سمجھنے کی صلاحیت کی بنیاد ڈال دی - چنانچہ اب وہ ذی علم اشخاص جو اب تک ڈرامانگاری کو مذاق یا بیرون ادب خیال کرتے تھے اس طرف راغب ہوئے اور ان اشخاص نے بھی جو اس میں ناکامیاب ہوکر بیٹھ رہے تھے پھر قلم اٹھایا - اور اصولی خوبیوں پر توجہ دینی شروع کی اور اس راستہ پر چلنا شروع کیا جس نے دوسری اقوام کو ترقی کی راہ دکھائی - چنانچہ ہر چند کہ یہ درست ہے کہ ہماری فلمی دنیا ابھی عالم طفلی سے گذر رہی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کل کی بنی ہوئی فلموں چترلیکھا اور پکار نے اپنی عہد کی خود منوالی اور آنے والی دنیا بھی جب دیکھے گی تعریف لکھے بغیر نہیں رہ سکے گی - ہر عمدہ اور شاندار کامیابی آہستہ آہستہ ہوا کرتی ہے اس لئے اگر ہماری فلم سازی نے اپنی فنی حیثیت منوانے میں وقت لیا تو اسے لینا چاہئے تھا لیکن اس کامیابی کا سہرا ڈرامانگار اور ڈائرکٹر دونوں کے سر ساتھ ساتھ بندھا -

آج ہمارے ڈرامانگاروں اور ڈائرکٹروں کو خوش ضرور ہونا چاہئے مگر خاموش ہوکر نہیں بیٹھ جانا چاہئے - دونوں کو اپنی اپنی قابلیت اور محنت سے ترقی کی رفتار گھٹنے نہیں دینی چاہئے - ان کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے کہ جلد از جلد ہماری فلمیں ڈرامائی اصولوں کو اپنالیں اور تماشہ کی صف سے نکل کر حقیقت نمائی کا ادبی درجہ حاصل کرلیں - اور ہماری کل آنے والی فلمیں موضوع اور پلاٹ کی دلچسپی - کردار اور سیرت نگاری - اور برمحل و پرزور مکالموں کی خوبیوں سے پر ہوں -

ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ اب ہمارے موجودہ ڈائرکٹر و فلم کمپنیوں کے منتظم فلموں کا معاوضہ بڑھانے میں پوری کاوشوں سے کام لے رہے ہیں - قابل ادیبوں سے ترجموں میں مدد لی جارہی ہے اور عمدہ ڈراموں کو فلمانے کی کوشش ہو رہی ہے لیکن ذرا سی دیر کو بھی اس خیال سے نہ ہٹنا چاہئے کہ اچھے ڈائرکٹر اچھے ڈرامانگاروں کے بغیر یا اچھے ڈرامانگار اچھے ڈائرکٹروں کے بغیر ساتھ دئے کامیاب ہوسکتے ہیں - دونوں یک رائے ہوکر محنت کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری فلم سازی بہت جلد دوسری ترقی یافتہ اقوام کے ہم پلہ نہ ہوجائے - ضرورت اس کی ہے کہ فلم کمپنیوں کے منتظم - قابل ڈائرکٹروں - ادیبوں - آرٹسٹوں اور فوٹوگرافروں کو دوسرے ممالک میں بھیجیں تاکہ وہ کہنہ مشق کمپنیوں کا معائنہ کریں اور فلم سازی کی فنی حیثیت کا مطالعہ کریں - اور واپس آکر اپنی قابلیت کا اسکرین پر مظاہرہ کریں اور پھر اپنی کامیابی سے ان کی کامیابی کا مقابلہ کریں - یہ مانا کہ ہمیں وہ کامیابی فوراً حاصل نہیں ہوسکتی لیکن کوشش کی جائے تو آج نہیں کل ہماری محنتیں ضرور پھل لائیں گی -

ہر دور میں ہر فن کی کامیابی ایک حد تک اس دور کے رؤسا کی قدرپرشناسی کی وجہ سے ہوا کرتی ہے - ہمارے ملک کا کونہ کونہ ذی عزت اور بامذاق اشخاص سے بھرا ہوا ہے - اگر وہ فلمی دنیا میں دلچسپی لینا شروع کریں جیسا کہ اور ملکوں میں رواج ہے تو ہماری فلم سازی کا معیار دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے - اگر سالانہ مقابلہ ہوا کرے اور ادبی و فنی لحاظ سے جو فلمیں اول اور دوم آیا کریں ان میں محنت کرنے والوں کو انعام وغیرہ دیا جانے لگے تو یہ نہ محض ایک دلچسپ مشغلہ بن جائے بلکہ ہمارا ملک اس فن کی ترقی میں چند ہی دنوں میں اور ممالک سے پیچھے نہ رہے گا -

اگرچہ ہمارے معیاری فلمی رسالے فلم کے مختلف پہلوؤں پر برابر مضامین شائع کررہے ہیں لیکن انھیں یہ بھی چاہئے کہ وہ سامعین کو ہر اچھی فلم پر بے دھڑک تنقید لکھنے کی ترغیب دیں اور ان کے تنقیدی مضامین اپنے رسالوں میں چھاپنے کا مستقل انتظام کریں - تاکہ دیکھنے والوں میں بھی فنی خوبیوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو - ہمارے ادبی رسالے بھی اگر ڈرامانگاری پر اچھے مضامین شائع کریں تو ایک طرف تو ادب کی خدمت ہوگی اور دوسری طرف عوام میں ڈرامے کی باریکیاں سمجھنے کا مادہ پیدا ہوگا - اس طرح اگر ادبی اور فلمی رسالے دست بدست کوشش کریں تو بہت جلد ہمارے ملک میں اچھے ڈرامانگار پیدا ہوسکتے ہیں اور یہ صنف ادب بھی جو اب تک تاریکی میں رہی ہے اور زیادہ دن تاریکی میں نہ رہ سکے گی

# بازی گر

فیچر

## افراد

(۱) بازی گر (۲) رمضانی - ایک تماش بین -

(ڈگڈگی کی آواز سے شروع کیا جائے)

**بازی گر:** حضرات! اب میں آپ کو تاش کے دو چار دلچسپ کھیل دکھاتا ہوں جن سے آپ کی عقل دنگ رہ جائیگی۔ آپ نے شعبدے تو بہت دیکھے ہونگے۔ لیکن ہاتھ کی جو صفائی میں پیش کرتا ہوں۔ اس کی مثال مشکل ہے۔ (ڈگڈگی کی آواز) اچھا۔ آپ حضرات ایک ایک قدم پیچھے ہٹ جائیں۔ (مختلف قدموں کی آواز) ہے کوئی نوجوان جو میرے ساتھ کھیل میں حصے۔ تم آجاؤ میاں۔ کالی ٹوپی والے! بھلا کیا نام ہے تمہارا؟

**رمضانی:** رمضانی۔

**بازی گر:** بہت خوب! — کیا کام کرتے ہو میاں رمضانی؟

**رمضانی:** کام کاج کیسا۔ ابھی تو چوتھی جماعت میں پڑھتے ہیں۔ ملا ہے کی ہوا کھاتے ہیں۔

**بازی گر:** کیا کہنے۔ بہت ہونہار معلوم ہوتے ہو۔ اتنی زیادہ عمر اور چوتھی جماعت۔ خیر۔ ذرا دیکھو تو میرے ہاتھ میں کیا ہے؟

**رمضانی:** تاش کی گڈی ہے۔

**بازی گر:** تاش کے پتے پہچانتے ہو؟

**رمضانی:** اچھی طرح۔

**بازی گر:** چڑی تن کا غلام دیکھا ہے۔

**رمضانی:** جی ہاں آپ کھڑے تو ہیں میرے سامنے۔

(ناظرین کا قہقہہ)

**بازی گر:** نہایت مردمعقول ہو۔ (تاش پھینٹنے کی آواز) اچھا اب اس گڈی میں سے ایک پتا لے لو۔

**رمضانی:** معاف کیجئے۔ میرے پاس اپنی بہت سی گڈیاں موجود ہیں مجھے کسی اور پتے کی ضرورت نہیں ہے۔

**بازی گر:** اوہو۔ میرا مطلب ہے کہ ایک پتا نکال کر دیکھو اور گڈی میں رکھ دو۔ (تاش پھینٹنے کی آواز)

**رمضانی:** آخر اس سے فائدہ۔ یہ بھی کوئی کمال کی بات ہے۔

**بازی گر:** کیوں نہیں۔ تم ایسا کرو تو سہی۔ میں فوراً بتا دونگا کہ تم نے کون سا پتا نکالا تھا۔

**رمضانی:** اچھا تمہاری مرضی۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ کس رنگ کا پتا نکالوں۔

**بازی گر:** (ڈگڈگی بجا کر) جو تمہاری مرضی ہو — کسی رنگ کا کوئی پتا۔

**رمضانی:** پان کی بیبیا نکال لوں۔ یا اینٹ کا بادشاہ؟

**بازی گر:** جو تمہیں پسند ہو۔ مجھ سے مت پوچھو۔

**رمضانی:** اچھا تو یہ تاش کی گڈی ذرا مجھکو دیدو۔ مجھے حکم کا یکہ بہت پسند ہے۔ تین پتی میں سب سے پہلی چال اسی کی ہوتی ہے۔

**بازی گر:** پھر وہی غلطی۔ (تاش پھینٹنے کی آواز) میرا مطلب ہے کہ پتا چھپا کر اس طرح نکالو۔ کہ میں اسے نہ دیکھ سکوں۔

**رمضانی:** اچھا تو تم آنکھیں بند کر لو۔ میں ایک پتا نکال کر پھر گڈی میں رکھدوں گا۔

**بازی گر:** ہاں یہ ٹھیک ہے۔ (تاش پھینٹتے ہوئے) لو صرف ایک پتا نکالنا۔

**رمضانی:** جی نکال لیا۔ اور یہ لو — رکھ بھی دیا۔

**بازی گر:** اچھا میاں رمضانی۔ ذرا دائیں ہتھیلی منہ کے سامنے تو پھیلاؤ۔ اور زور سے کہو "میرے پتے آجا"

**رمضانی:** یہ بعد میں کہوں گا۔ پہلے سب پتوں کو پھینٹ لو کیونکہ پھینٹے بغیر بتانا آسان ہے۔ میرا پتا سب سے اوپر رکھا ہوا ہے۔

**بازی گر:** ارے رے رے۔ غضب کرتے ہو یار۔ میں نے کہا تھا۔ کہ گڈی کے بیچ میں کہیں رکھدو۔

**رمضانی:** اچھا پھر سہی۔ (چند قدموں کی ایسی آواز گویا لوگ چلا جانا چاہتے ہیں)

**بازی گر:** اجی صاحب! ذرا ٹھہریئے۔ اس چھوکرے نے تو میرے کھیل کا ستیاناس کر دیا۔ واللہ ایسے ایسے کمالات دکھاؤنگا۔ کہ آپ حیران رہ جائینگے۔ (ڈگڈگی بجا کر تاش پھینٹتا ہے) لو میاں رمضانی! دیر نہ کرو۔ جلدی سے ایک پتا نکال لو۔

**رمضانی:** آنکھیں بند کرو — ہاں ٹھیک — ایک۔ دو۔ تین — کھول لو اپنی آنکھیں۔

**بازی گر:** بس اب ہاتھ پھیلاؤ۔ اور زور سے اپنے پتے کو آواز دو۔

**رمضانی:** آجاؤ میری اینٹ کی نہی — آجا۔

(لوگوں کا قہقہہ)

**بازی گر:** لاحول ولا۔ نرے کاٹھ کے الو ہو۔ پتے کا نام لیا۔

**رمضانی:** تم ہی نے تو کہا تھا کہ اپنے پتے کو آواز دو۔ بھلا نام لئے بغیر کس طرح آواز دی جا سکتی تھی۔

**بازی گر:** تم یوں کہتے کہ میرے پتے آجا۔ (لوگوں کے قدموں کی آواز) اجی قبلہ! ذرا ٹھہریئے۔

**رمضانی:** اچھا۔ تم کہتے ہو تو اسی طرح آواز دے ...

**بازی گر:** لو جلدی سے نکالو پتا۔ اور اب کوئی غلطی نہ کر بیٹھنا۔ خدا کی قسم! عجیب ہی احمق انسان سے پالا پڑا۔

**رمضانی:** اس میں کیا شک ہے لیکن پھر بھی تم سے کم احمق ہو۔

(لوگوں کا قہقہہ)

**بازی گر:** اچھا اب باتیں نہ بناؤ۔ جلدی سے پتہ نکا...

**رمضانی:** بہت خوب آنکھیں بند کرو۔ دیکھنا مت۔ ایک۔ دو — تین — بس کھول لو آنکھیں۔

**بازی گر:** (ڈگڈگی بجا کر) غور کیجئے۔ مہربان میری آنکھیں بند تھیں۔ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ کون سا پتا نکالا۔ اور گڈی میں کس جگہ رکھا گیا لیکن پھر بھی .........

**رمضانی:** اوہوں۔ معاف کرنا بھائی۔ ہائے جلدی جلدی میں اسقدر گھبرایا کہ اس دفعہ پتا رکھنا بھول گیا۔ یہ دیکھو وہ میرے ہاتھ میں موجود ہے۔

**بازی گر:** ہت تمہاری ایسی تیسی۔ لاؤ۔ اب جلدی سے رکھو (وقفہ پھر تاش پھینٹنے کی آواز) خبردار۔ اب کوئی حماقت نہ کرنا۔ جب تک میں نہ کہوں پتے کا نام نہ بتانا۔

**رمضانی:** پتے کا نام غضب خدا کا۔ وہ تو میں نے جوں کا توں رکھدیا اسے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں۔ بتاؤنگا کیا خاک۔

(لوگ چلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ قدموں کی چاپ)

**بازی گر:** بھائیوں۔ ذرا ٹھہرو۔ ایک منٹ اور ٹھیر جاؤ۔ (لوگ ساتھ) نہیں ٹھیرتے۔ اچھا تمہاری مرضی چلے جاؤ۔ اندر تو بھی بھاگ تو اب کیوں کھڑا ہے۔ ورنہ سو میری نظروں کے سامنے سے اچھا خاصہ مجمع تھا۔ وصلی پاؤلا ضرور جمع ہو جاتا۔ کم بخت تو نے میری روزی خاک میں ملا دی۔ اب کیا تیری بوٹیاں چبا کر اپنا پیٹ بھروں گا۔

**رمضانی:** بھیا! قصور خود تمہارا ہے تاش کا کھیل کس طرح دلچسپ ہو سکتا ہے۔ میری بات مانو۔ تو بندر بنا لو۔ بہت کچھ کما کھاؤ گے۔ یہ کام میں نے بہت عرصہ کیا ہے۔ مجھے بنا لو۔ تم کچھ ساتھ دو تو پیٹ بھریں۔ مانگ کھائیں ہم۔ تم ڈگڈگی بجاؤ تو بندر نچائیں ہم (ڈگڈگی آ...

فضل حق قریشی

# جرمن قوم کی حالت

میں حال ہی میں جرمنی سے واپس آیا ہوں۔ وہاں میں نے قریباً دو ہفتے انگریزی اور برلن حلقوں میں گذارے۔ سب سے پہلا اور اہم ترین نقش جو میرے دل پر جما شہروں کی بربادی اور تباہی کا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس خوبی اور حسن اسلوبی سے رائل ایرفورس اور امریکن ایرفورس نے اپنے کام کو سرانجام دیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قریباً تمام بڑے بڑے شہروں کی کم و بیش دو تہائی عمارتیں یا تو بالکل برباد کر دی گئیں یا ان کو اس قدر نقصان پہنچایا گیا کہ وہ بالکل قابل رہائش نہیں رہیں۔ باقیماندہ ایک تہائی عمارتوں میں سے بہت سی خراب ہو چکی ہیں جن کی کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی ہیں اور جن کی چھتوں پر سے پانی ٹپکتا ہے۔

شہروں کی اس تباہی نے (اور انگریزی علاقہ تو زیادہ تر شہری ہے) ایک خوفناک رہائشی مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر کہیں رہائشی مکان ہیں بھی تو وہاں یہ حالت ہے کہ جس مکان میں پہلے ایک کنبہ رہتا تھا اب وہاں تین کنبے رہتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو تو عام طور پر بڑے بڑے شہروں میں کوئی جائے رہائش ملتی نہیں۔ ایک ایک کمرہ میں یا ایک ایک چھپر کے نیچے دس دس آدمی رہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض ان ہوائی حملوں سے بچانے والے ان حجروں میں مقیم ہیں جو ہمارے ہوائی حملوں سے محفوظ رہ گئیں زمین دوز گڑھوں میں رہنا گویا ایک قسم کا قبر میں رہنا ہے۔ جس میں نہ تو روشنی داخل ہو سکتی ہے اور جس میں نہ ہی سوائے دیواری "تختے" کے اور کوئی آراستگی کا سامان ہوتا ہے۔ اور جس میں نہ ہی کھانے پکانے کی کوئی سہولیت مہیا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود آج کئی مہینوں سے لوگ اس طریقہ سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کو ایسی حالت میں نہ جانے کب تک رہنا ہوگا۔

**پریم چند کھنہ**

اس خوفناک رہائشی مسئلہ کے ساتھ ساتھ زندگی کی دوسری ضروریات، مثلاً خوراک، کوئلہ اور کپڑا، کی بھی کمی ہے وقتی طور پر خوراک کی ہر ایک چیز کا راشن ہو چکا ہے۔ اس راشنبندی کی بدولت خوراک اس مقدار سے جو ہم برطانیہ میں صحت کے لئے لازمی خیال کرتے ہیں نصف بھی نہیں ملتی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ چربی، گوشت، چینی اور پنیر کا راشن جو برطانیہ میں ایک ہفتہ کے لئے کم سمجھا جاتا ہے۔ ایک مہینہ کے لئے اکتفا کرے۔ حالات میں بہتری ہونے کی امید تو ہے لیکن جس کو ہم کافی اور تسلی بخش بہتری کہہ سکیں وہ ابھی بہت دور ہے۔

پچھلے جاڑے میں گھریلو استعمال کے لئے کوئلہ کا راشن نہ تھا اور موجودہ تجاویز کی بنا پر نہ ہی اگلے جاڑے میں راشن ہوگا۔ جرمنی ایک سرد ملک ہے۔ اور شہروں میں ایسے مکانات ہیں جن میں لوگ رہتے ہیں کافی عرصہ تک شیشہ نہ لگ سکے گا۔ عملی طور پر نہ صرف نئے کپڑے نہیں بن رہے بلکہ پرانے کپڑے پھٹے جاتے ہیں۔ اگلے جاڑے میں یا تو بہت سے بچوں کو ننگے پاؤں برف میں سے گذر کر اسکول جانا ہوگا یا اسکول چھوڑنا ہوگا۔ باقی ہر ایک چیز مثلاً صابن اور دوا دارو کی چیزیں نہایت کم مقدار میں میسّر ہوتی ہیں۔

بے شک کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو صرف راشن شدہ خوراک پر گذارہ نہیں کرتے اور وہ کر بھی کس طرح سکتے ہیں۔ انگریزی علاقہ میں تو قریب قریب ہر ایک چیز کی کمی ہے۔ گرد و نواح کے دیہاتوں میں قدرتی طور پر خوراک آسانی سے اور زیادہ مقدار میں ملتی ہے۔ شہروں سے کارکنوں کی غیر حاضری کا باعث ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہفتہ میں دو تین روز خوراک کی تلاش میں دیہات میں پھرتے ہیں لیکن ہر ایک شخص کے لئے یہ غیر ممکن ہے۔ بعض شخص خاصکر تن تنہا ضعیف آدمی شہروں میں بھوکے مرتے ہیں۔ دیہاتوں میں جہاں خوراک زیادہ ملتی ہے وہاں رہائشی مکان بھی تباہ نہیں ہوئے۔ لیکن ایک دیگر سبب کی بنا پر وہاں بھی مکانوں کی قلت ہے۔ انگریزی علاقہ کی معمولی آبادی پناہ گزین اور دوسرے ممالک سے منتقل شدہ اشخاص کی درآمد کی وجہ سے پہلے کی نسبت دوگنی ہو گئی ہے۔ پناہ گزین سے مراد وہ جرمن لوگ ہیں جو جرمنی کے دیگر حصوں سے یا جرمنی کے پڑوسی ممالک مثلاً پولینڈ اور چیکوسلاواکیہ سے یا تو بھاگ کر آئے ہوئے ہیں یا وہاں سے نکالے گئے ہیں۔ منتقل شدہ سے ایسے لوگ مراد ہیں جو جرمن قوم سے تعلق نہیں رکھتے لیکن کسی وجہ سے اپنے گھروں کو لوٹ نہیں سکتے۔ ایسے پناہ گزین اشخاص لاکھوں کی تعداد میں اپنے گھروں سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور انھوں نے جرمنی کی اپنی حالت کو اور بھی پیچیدہ کر دیا ہے۔

اگر آج کوئی جرمنی کو جا کر دیکھے تو اسے سخت صدمہ ہوگا۔ آج جرمنی میں ہر طرف مصیبت ہی مصیبت نظر آتی ہے۔ کیا جسمانی ضروریات کی کمی، کیا بھوک اور سردی اور کیا رہائشی مکانوں کی قلت۔ ایسی بیچارگی کی حالت چھائی ہوئی ہے کہ کیا بچے اور کیا بوڑھے سب عاجز ہیں۔

بیکاری عام ہے۔ سائنسدان اور فنکار یا تو اپنے وطن کو واپس جا نہیں سکتے یا جانے سے ڈرتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہونہار نوجوان بھی ہیں جن کے لئے یونیورسٹی کے دروازے بند ہو گئے ہیں کیونکہ وہ لڑکپن میں نازیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے ہی جانکاہ نظارے اور بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کنبے ایسے ہیں جن کے افراد ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں۔ لاکھوں ایسے ہیں جن کی عورتیں اور مائیں جنگی قیدی ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں ایسے خاوند اور بیویاں ہیں جو جرمنی، پولینڈ، یوگوسلویا اور بالٹک ریاستوں سے تعلق رکھتی ہیں اور جنہوں نے سالوں سے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں اور نہ ہی وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کے ساتھی زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

مجھے اس بات کا کامل احساس ہوا کہ اپنا کام کرنے سے کس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے جب میری ملاقات لفٹوائی کیمپ میں خوش اور خرم لوگوں سے ہوئی۔ دو ڈاکٹر اور ایک نرس اپنے ساتھیوں کی صحت کے نگراں تھے۔ وہ ایک نوزادہ بچہ کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ بچہ ایک چادر میں جو ہاتھ سے کاڑھی ہوئی تھی لپٹا ہوا تھا۔ خانگی محبت سے جو خوشی پیدا ہوتی ہے مجھے اس کا احساس تب ہوا جب میں دو ہمبرگ کوٹھریوں سے جن میں اکیلی اکیلی عورتیں نہایت بری حالت میں رہتی تھیں۔ ایک تیسری کوٹھری میں گیا جہاں خاوند اور بیوی اکٹھے رہ رہے تھے۔ وہاں ہم نے ایک نئی یعنی انسانی فضا پائی میں نے ایک منکوحہ جوڑے سے گفتگو کی جن کے گھر کی جسامت صرف ۱۸ مکعب فٹ تھی اور جس میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی سامان۔ وہ رات کا چوکیدار تو دیواری تختے پر آرام کر رہا تھا اور اس کی بیوی اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ پوچھنے پر دونوں کہنے لگے کہ ہم گذارہ کر رہے ہیں۔

اگرچہ جرمنی کی سیر ان دنوں ایک جانکاہ تجربہ ہے تاہم ملک (جرمنی) کی حالت بالکل مایوس کن نہیں ہے۔ حالات اس بات کے شاہد ہیں کہ انسانی فطرت کس قدر حیرت ناک تحمل اور برداشت کی طاقت رکھتی ہے۔ ایک انگریز میڈیکل افیسر نے مجھے بتلایا کہ اگرچہ تپ دق کے پھیل جانے سے خطرہ کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں، لیکن جرمنوں کی صحت اچھی ہے، گو یہ بات بظاہر غیر معقول سی نظر آتی ہے، وہ غیر معمولی طور پر صاف ستھری اور باقاعدگی پسند قوم ہے، تمام یونیورسٹیوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور وہ طالب علموں سے بھرپور ہیں۔ کتابوں کی مانگ ویسی ہی شدید ہے جیسی خوراک کی۔ میں نے سامعین کے ہجوم دیکھے جو میری معاشرتی سلامتی اور مستقل روزگار کے عنوان پر تقریر سننے کے بیحد شائق تھے۔ میرے سے انھوں نے بہت سے معقول سوال کئے۔

ان موجودہ جانکاہ حالات کے پس پردہ ہٹلر کی بارہ سالہ حکومت کو جس میں سے وہ بچ نکلے منظر ہے۔ اگر آپ کسی تجارتی یونین کے لیڈر سے بات کریں تو وہ آپ کو بتلائے گا کہ اگرچہ ظاہر طور پر تندرست نظر آتا ہے در اصل اس کی صحت اس قدر بگڑ گئی ہے کہ سدھر نہیں سکتی۔ کیونکہ سیاسی قیدخانے میں لوگوں نے اس کے جسم کو خوب کچلا تھا۔ اکثر کیمپ میں عورت بھی دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایک کمرہ میں چار چار کنبے رہتے ہیں دو دو پردے پر ان کے نام لکھے ہوئے ہیں، اس سے پوچھا کہ تمہارا خاوند کہاں ہے تو جواب ملا کہ اب تو میرے پاس ہے۔ لیکن تین سال تک ایک ممنوع اخبار کو گھر میں رکھنے کی وجہ سے ہٹلر نے اس کو تین سال کی سزائے قید دی۔ ایک کیمپ میں ایک عورت بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس سے پوچھا کہ یہ بچے تمہارے ہیں تو اس نے جواب دیا۔ نہیں۔ میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔ میرا خاوند ایک انجینیر تھا جس نے نازی پارٹی میں ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہماری شادی کے بعد ہی وہ اس کو سیاسی قید خانے میں لے گئے۔ اور تین مہینے کے بعد مجھے بذریعہ ایک خط کے اس کی موت کی خبر ملی۔ کیا نازیوں کے ستائے ہوئے کیا دوسرے، سب اسی قسم کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔

انگریزی علاقہ کی حالت بہت تشویشناک ہے۔ یہ اس لئے کہ اگرچہ آج لڑائی کو ختم ہوئے پندرہ ماہ ہو چکے ہیں لیکن بہتری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس حالت کو بہتر بنانے کے لئے میں یہاں کوئی تفصیلی تجویز قلمبند نہیں کر سکتا جس سے زیادہ مقدار میں کوئلہ، خوراک اور دیگر روزمرہ کے استعمال کا سامان مل سکے، رہائش کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے، دنیا کے باقی حصوں کے ساتھ ذرائع آمد و رفت مہیا ہو سکیں اور مصیبت زدہ لوگ باقاعدہ زندگی بسر کر سکیں۔ لیکن اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں چند اخلاقی نتائج پیش کرنا چاہتا ہوں پہلا اخلاقی نتیجہ شہروں کی مکمل تباہی سے پیدا ہوتا ہے۔ گھر بار، دوکانیں، اسکول، گرجہ گھر، ہسپتال، لائبریریاں، تاریخی اونچی عمارتیں جو ایک زیادہ مہذب زمانہ کی یادگار ہیں سب ٹوٹی پھوٹی مٹی کا ڈھیر بنی پڑی ہیں۔ یہ اچھا ہوا کہ جرمنوں نے جنہوں نے دوسرے ممالک کو اپنی وحشیانہ جنگ کا شکار بنایا خود اپنے ہی ملک میں موجودہ زمانے کی جنگ کے نتائج کا مشاہدہ کیا۔ چند مجرمی لیڈروں کے ماسوا تمام جرمنوں کو اسے انصاف کی رو سے کافی سزا سمجھنی چاہئے۔ ہمارا فرض ہے کہ اب ہم سزا کا خیال چھوڑ کر ان کی بہتری کے متعلق سوچیں۔

دوسرا اخلاقی نتیجہ، ہم اسے پسند کریں یا ناپسند یہ ہے کہ ہم کو چاہیئے کہ جرمنی کے انگریزی علاقہ کو بلحاظ اقتصادی زندگی کے کامیاب بنایا جائے۔ ہم اس علاقہ سے ہٹ نہیں سکتے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ عمدہ نتائج جس کے لئے ہم نے لڑائی لڑی بحال رہیں تو ہمیں وہاں ٹھہرنا ہوگا۔ اور یقیناً ایسا بندوبست کرنا ہوگا جس سے کہ اہل جرمنی دوبارہ لڑائی کا جھنڈا بلند نہ کرسکیں، اور جب تک کہ وہ، اور باقی قومیں بھی لڑائی کا خیال ہی نہ چھوڑ دیں ہم جرمنی میں اپنے موجودہ پروگرام پر جس کا مدعا جرمنی کو مفلس کر دینے کا ہے، بغیر کافی خرچ کرنے کے قائم نہیں رہ سکتے۔ اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ دو کروڑ جرمن ہمارے پنشن خوار بنے رہیں، بھوکے مریں اور ہم سے نفرت کرتے رہیں تو ہمیں چاہیئے کہ جرمنی کے برطانوی علاقے کی درآمدی پیداوار بڑھانے کی اتنی ہی کوشش کریں جتنی خود برطانیہ کی۔

تیسرا اخلاقی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے علاقہ کو نفسیاتی طور پر کامیاب بنائیں، وہاں کی آبادی کو امن چین کی زندگی بسر کرنے کا موقع دیں اور ان کو دوست بنانے کی کوشش کریں۔ جولائی ۱۹۴۵ء میں پوٹسڈم کے مقام پر خفگی اور گھبراہٹ کی وجہ سے ۱۹۴۱ء کے ایٹلانٹک چارٹر کو خیرباد کہا گیا۔ اس چارٹر میں ہمارے نصب العین یہ قرار دیئے گئے تھے: ہر ایک قوم کے اندر مزدوروں کے حالات بہتر بنائے جائیں، اقتصادی ترقی اور معاشرتی سلامتی کے حالات پیدا کئے جائیں، تمام ملک، فاتح، مفتوح دونوں تجارتی لحاظ سے یکساں خیال کئے جاویں۔ ہر ایک قوم کو اس کی اقتصادی بہبودی کی خاطر ان اشیا کی ضرورت ہے، مساوی پیمانہ پر مہیا کی جائے۔ اس کے برخلاف پاٹسڈم میں ہم نے جرمنی کے زندگی کے معیار کو کم، اس کی صنعت کو تباہ کرنے اور اس کی تجارت کو چھین لینے کا تہیہ کیا۔ جب سے جرمنی نے ہتھیار ڈالے ہیں، اتحادیوں کے عمل نے ایٹلانٹک چارٹر کو ریاکاری کا نمونہ بنا دیا ہے۔

جرمن لوگوں نے اس بات کا ثبوت دے دیا ہے کہ ان میں کچھ خوفناک صفات ہیں۔ لیکن ان میں صنعت و حرفت، حسن انتظام اور خانگی محبت کی اعلیٰ صفات بھی موجود ہیں۔ علم موسیقی اور سائنس میں وہ لاثانی ہیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کی خوفناک صفات کو نظرانداز کریں۔ ہمیں نازیوں کے ہاتھوں ستم رسیدہ لوگوں کو نہ بھولنا چاہیئے اور دوبارہ ان کو اپنی وحشیانہ ظلم اور فریب کو عمل میں لانے کا موقع نہ دینا چاہیئے۔

انجام کار برائی کو دور کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کی بجائے نیکی کی جائے، انسانی مروت سے ظلم کی آگ کو بجھایا جائے، مطلق العنانی کے بجائے جمہوریت قائم کی جائے اور ریاکاری کو دور کرنے کے لئے خودداری اور عزت کا مادہ پیدا کیا جائے۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ بچوں کو بھوکا رکھنے اور بوڑھوں کو سردی میں مارنے سے انسانیت کا سبق نہیں سکھایا جا سکتا، نہ ہی سختی سے جمہوریت کا ریاکاری کے طریقوں کو عمل میں لاکر ت کے اصول سکھانا ممکن ہے۔

آؤ ہم تمام اتحادیوں کو ایک دفعہ پھر اس بات پر آمادہ کریں کہ پاٹسڈم کے معاہدہ کو خیرباد کریں اور ایٹلانٹک چارٹر کے اصولوں کو جرمنی سے سلوک کرتے وقت استعمال کریں۔ اگر اس کوشش میں کامیابی نہ ہو تو ہمیں چاہیئے کہ کم از کم جرمنی کے انگریزی علاقہ کو ایٹلانٹک چارٹر اور جمہوریت، رواداری، انصاف اور کفایت کے برطانوی نظریوں کے مطابق منظم کرنے کا فیصلہ کریں۔

## غزل

### خمار دہلوی

میں خود بھی سراپا جلوہ ہوں جلوؤں کو فقط دیکھا ہی نہیں
جو بھونکدے میری ہستی کو ایسا تو کوئی جلوا ہی... نہیں

احساس نظر کے ساتھ مجھے احساس دل بھی حاصل ہے
ہر جلوہ ہے حسن ذات ترا مستور بھی ہے پیدا ہی نہیں

ان مدبھری آنکھوں سے دل کا انجام تصادم اے توبہ
اس طرح لٹی دل کی بستی جیسے کہ کبھی کچھ تھا ہی نہیں

حیرانی چشم شوق بھی شاید حسن میں تیرے شامل ہے
ہر جلوہ ہے مثل آئینہ حیراں تو نے مجھے دیکھا ہی نہیں

ہر چند نگاہیں حیراں ہیں وہ حسن تجلی عام تو ہے
اس دل کی بدولت ذوق نظر مشہور بھی ہے رسوا ہی نہیں

احساس طلب کا ہوش کسے، کہنے کو طلب تو باقی ہے
کیا خاک ملے گا تیرا پتہ، اپنا تو پتہ ملتا ہی نہیں

اس دور سے پہلے بے کیفی بھی کتنی سرور آگیں ہے خمار
وہ درد نہ جانے کیا ہوگا جو درد ابھی پیدا ہی نہیں

# نقد و نظر

## دکھیا سنسار

مصنف:- جناب عشرت رحمانی۔ ناشر:- الہ آباد پبلشنگ ہاؤس۔ الہ آباد۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۱۶ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈھائی روپے۔ عشرت صاحب آل انڈیا ریڈیو میں عرصہ دراز سے ڈرامہ انچارج ہیں اور چونکہ اس محکمہ میں آنے سے پہلے بھی ایک اچھے ادیب تھے، اس لئے ریڈیو ڈرامے کے ضمن میں ان کی تخلیقات کا ادبی اور فنی معیار اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ بلند ہے۔ پیش نظر مجموعے میں ان کے چھ ڈرامے شامل ہیں جو حزنیہ ہیں اور مزاحیہ بھی۔ زبان اور عمل کے لحاظ سے فطری عنصر سب میں نمایاں ہے یعنی افراد تمثیل کے اقوال و افعال ان کے صحیح ماحول اور کردار کی ترجمانی کرتے ہیں "دکھیا سنسار" اور "پریم دان" ٹیگور کے ڈراموں سے ماخوذ ہیں لیکن ان میں بھی ان کا انفرادی رنگ اپنی جھلک دکھا رہا ہے "منکہ ایک مصنف" پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ عشرت صاحب کی آپ بیتی ہی نہ ہو۔ اسے ختم کر لینے کے بعد بھی بیوی کا یہ مسلسل مطالبہ کہ گھر کے خرچ کے لئے ستر روپے دلواؤ، دماغ کے پردے پر گھومتا رہتا ہے۔ زبان و بیان میں اردو ہندی کے مناسب امتزاج نے بڑی حلاوت پیدا کر دی ہے کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ امید ہے کہ ناشران کتب اگلے ایڈیشن میں اس کا لحاظ رکھیں گے۔

## دیس سے باہر

مصنف: جناب آغا محمد اشرف۔ ناشر: شیخ غلام علی اینڈ سنز کتاب منزل لاہور۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۳۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈھائی روپے۔ "لندن سے آداب عرض" "انڈرچیوں کا لندن" پیش کر چکنے کے بعد اب آغا صاحب نے یہ تیسرا مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اسے موصوف کی یادداشت یا ایک قسم کی ڈائری کہا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی سمندر پار ملکوں کے کوائف جمع ہیں۔ آٹھ نو سال ہندوستان سے باہر رہ کر انھوں نے سیر و سیاحت کا لطف خود ہی نہیں اٹھایا بلکہ اپنے تاثرات کو قلمبند کر کے دوسروں کو بھی استفادہ کا موقع دیا ہے۔ انگلستان والے حصے کو پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دیس سے باہر اردو زبان کس قدر رائج اور مقبول ہے اور انگلستان کے مستشرقین نے اس کی ترقی کے لیے کیسی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں "لندن کی ادبی زندگی" کا جائزہ، نیز جان گلکرسٹ اور جارج گریرسن پر تحقیقی مقالے بہت قابل قدر ہیں۔ چند مضامین میں زمانۂ جنگ کے بعض ایسے حالات شامل ہیں جن کا مطالعہ کسی دوسری جگہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب بڑی مفید ہے۔ ایران والے حصے میں کئی مضمون تاریخی اور سیاسی اعتبار سے دلچسپ اور مفید ہیں۔ ایک مقالے میں حافظ کے مزار پر شراب لنڈھانے کا واقعہ بہت ہی پر لطف ہے "کچھ بھولی بسری باتیں"، موضوع کے اعتبار سے اس میں نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

## BENGAL LAMENTING

مصنفہ:- محترمہ فریڈا بیدی۔ ناشر:- لائن پریس۔ ہسپتال روڈ لاہور۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۸۰ اصفحات۔ مجلد۔ انگریزی زبان۔ قیمت تین روپے۔ اس کتاب میں اس قحط عظیم کے تفصیلی حالات اور کچھ اعداد و شمار درج ہیں جو ۱۹۴۳ء کے آخر میں بلائے ناگہانی کی صورت میں سارے مشرقی ہندوستان پر نازل ہوا تھا۔ محترمہ بیدی نے بنگال کے دیہاتوں میں جا کر صورت حالات کا جائزہ لیا اور جو باتیں اپنے مشاہدے میں نہ آسکتی تھیں وہ دوسروں سے پوچھ پوچھ کر یادداشت میں محفوظ کر لیں۔ اس دوران میں ان کے مضامین مختلف اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ یہ کتاب انھیں مقالات و تصاویر کا مجموعہ ہے۔ اس میں عام حالات بیان کرنے کے ساتھ کہیں کہیں قحط کے اسباب و علل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر چند وہ مصیبت باشندگان بنگال کے سروں سے ٹل چکی ہے لیکن اس کی یاد اب بھی دردناک ہے اور دردناک رہے گی۔ اگر اس کتاب کا مقصد جیسا کہ بیان بھی کیا گیا ہے، یہ ہے کہ لوگ متاثر ہو کر اتحاد عمل کی صورت پیدا کریں تاکہ ایسے حادثات کی بازگشت ممکن نہ ہو تو کہنا پڑتا ہے کہ اس کی قیمت باعتبار لاگت بکروڑ سے زیادہ نہ ہونی چاہئے تھی۔ اس کے برعکس ۸۰ اصفحات کے تین روپے وصول کرنا ظاہر کرتا ہے کہ سماجی فلاح و بہبود کی بجائے ذاتی مفاد پیش نظر ہے۔ گویا بنگال کا قحط مصنفہ اور ناشر دونوں کے لئے نفع بخش ثابت ہوا۔ وہی مثل ہوئی کہ کسی کا گھر جلے اور کوئی ہاتھ تاپے۔

## روح تبسم

مصنف ظریف الملک حضرت ظریف دہلوی ملنے کا پتہ: ساقی بکڈپو کھاری باولی دہلی۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۸۴ صفحات۔ مجلد۔ قیمت درج نہیں۔ اس دور رنج و محن میں جبکہ بہت سے روح فرسا سیاسی اور معاشی حالات کے ماتحت زندگی اجیرن اور وبال جان ہو گئی ہے، لطف و مزاح کی باتیں دل بہلانے کے لئے بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ پھر اگر وہ باتیں کلام موزوں کی صورت میں جلوہ گر ہوں تو کیا کہنے۔ لہذا ظریف صاحب کے مزاحیہ کلام کا یہ مجموعہ برمحل ہونے کے باعث ایک ادبی اور روحانی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ ان غزلوں نظموں اور رباعیوں وغیرہ میں بعض اشعار اتنے قہقہہ انگیز ہیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ انسان بھی ہنسی ضبط کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عہد جدید کے خاص موضوعات مثلاً جنگ اور راشننگ وغیرہ پر ان کا کلام اور بھی زیادہ مزا دیتا ہے۔ یوں تو ہر چیز اپنی جگہ خوب ہے لیکن صنعت الکن (ہکلے پن) کے ماتحت جو غزلیں لکھی ہیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ تحت اللفظ یا ہکلا کر دونوں طرح پڑھنے پر مصرعے وزن اور بحر میں رہتے ہیں یہ خصوصیت کسی کو بھی نصیب نہ ہو سکی۔ چند سلام اور نعت جو بالکل سنجیدہ ہیں اس مجموعے میں شامل نہ کئے جاتے تو اچھا ہوتا۔ شاید "منہ کا مزا بدلنے کے لئے" یہ التزام کیا گیا ہے بحیثیت مجموعی یہ کتاب خوب ہے ـــــ اسے پڑھ کر بہتوں کو ہنسی آئے گی۔

## فرح

## تانیں

مصنف جناب منصور تبریز: ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ علم و ادب۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۴۸ صفحات۔ مجلد۔ قیمت پونے دو روپے۔ شاعری جذبات قلب کا آئینہ سمجھی جاتی ہے لیکن یہ قول سب سے زیادہ گیتوں پر صادق آتا ہے کیونکہ تصنع اور بناوٹ سے اس کا دامن بالکل پاک ہوتا ہے۔ پھر جس طرح ڈرامے اسٹیج پر کھیلے جاتے ہیں، اسی طرح گیت گائے جانے کے لئے ہوتے ہیں۔ ترنم کی

فراوانی ان کو اور چار چاند لگا دیتی ہے منجر صاحب کے یہ گیت پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فن موسیقی سے پوری طرح واقف ہیں کیونکہ اس کے بغیر وہ ایسے اچھے گیت لکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کے گیتوں کا معیار عام فلمی گیتوں کے معیار سے لاکھ درجہ بلند ہے۔ کاش وہ لوگ جو فلمی دنیا کے اس شعبے میں دخل رکھتے ہیں، تانیں پڑھ کر اثر لیں اور اندازہ لگائیں کہ وہ کچے راستہ کی کس منزل میں اب تک خاک اڑاتے رہے ہیں۔ اور آئندہ اس سطح سے ابھر کر آگے بڑھنا ان کے لئے کیونکر ممکن ہے۔ تانیں۔ بچوں کے گیتوں کا مجموعہ ہے جن میں زبردست ترنم کے علاوہ زبان کا لوچ بدرجہ اتم موجود ہے۔

## گھریلو صنعتیں

مصنف:- جناب افتخار علی ملک ایم اے، بی جے ڈی۔
ملنے کا پتہ:- اردو بک سٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔ ۲۰۰ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

ہندوستان کے تقریباً اسی فیصدی باشندے دیہاتوں میں رہتے ہیں اور ان کا سب سے بڑا مشغلہ کھیتی باڑی ہے لیکن انھیں سال میں کئی مہینے مسلسل اور کبھی بیچ میں بیکار رہنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ کنبے کے افراد جب بڑھ جائیں اور کاشت کی زمین محدود ہو تب بھی کچھ لوگ فالتو ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے لئے زراعت سے الگ کوئی اور کام ضروری ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ایسی ہی صنعتوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ کام بتائے ہیں جن کو گھریلو طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اچار۔ مربے چٹنیاں اور شربت بنانے کے علاوہ مرغیوں اور شہد کی مکھیوں کی پرورش اور تجارتی اعتبار سے ان کے رکھ رکھاؤ کے طریقے سمجھائے ہیں۔ دیہاتیوں کے علاوہ شہر والے بھی ان صنعتوں کو تجارتی یا ذاتی طور پر اختیار کریں تو یہ کتاب فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔

## مست قلندر کا آپ بیتی نمبر

اس خاص نمبر میں بعض حضرات نے اپنی ہی اور بعض نے دوسروں کی آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ صرف اول الذکر صورت کا اہتمام کیا جاتا تو کہیں زیادہ مناسب ہوتا۔ کیونکہ دوسروں کی آپ بیتیاں تو ویسے بھی عام اشاعتوں میں شامل ہوتی رہتی ہیں۔ علی عباس صاحب حسینی، جناب ماہر القادری، جناب میرزا ادیب، کوثر صاحب چاندپوری اور ڈاکٹر کاہن سنگھ کے مضامین دلکش ہیں (اکثر حضرات نے دوسروں کی آپ بیتی میں مبالغے سے کام لیا ہے۔) رئیس صاحب امروہوی کا اسم گرامی بھی لائق ذکر ہے۔ جو نصف درجن مضامین نظم و نثر کے ساتھ اس رسالہ کے اجارہ دار بن کر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ایکٹرسوں کی گھسی گھسائی تصویروں اور مختلف اشتہاروں نے بھی اس خاص نمبر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

دفتر رسالہ مست قلندر۔ لاہور سے طلب کیجئے



## آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱:- تبرکات ........ حضرت آسی لکھنوی (مرحوم) ....
۲:- آسی لکھنوی .......... جناب سید اظہار حیدر
۳:- ہندوستان کی مشترک تہذیب (۲) ڈاکٹر سید عابد حسین ......
۴:- چنگی کا صدر (روسی افسانہ) ...... جناب بشیر الدین ..........
۵:- نادر شاہ کا آخری غیور سپاہی پروفیسر آغا اشہر لکھنوی...
........ (ڈرامہ) (۲) ..................
۶:- ایک نہ بھولنے والی رات ...... ادیب الملک خواجہ محمد شفیع...
........ (افسانہ) ....................
۷:- اردو اور سائنس ........ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ......
۸:- برطانیہ اور نئے شہروں کی تعمیر .. جناب فتح چند کپور ........
۹:- ہنسی (افسانہ) .......... محترمہ زہرا افضل باش ......
۱۰:- جاپان اتحادی تسلط کے ایک سال بعد جناب جھر لال گپتا ........
۱۱:- دو غزلیں .......... جناب اختر شیرانی ......
۱۲:- سوڈان .......... سردار امانت سنگھ ......


مرد
برائے صحتِ جلد
رکسونا
استعمال کرتے ہیں
Rexona
اب
جھاگ سے لبریز
خوشبوئے معطر
ایسی رائے جلدی قائم نہ کیجئے کہ رکسونا صرف مستورات ہی کی خوبصورتی کیلئے ہے۔ یہ ٹائلیٹ صابن ہر اس فرد و بشر کیلئے نہایت مفید ہے جو کہ صحتِ جلد کا خواہشمند ہے۔ یہ ایک نہایت عمدہ قسم کا صابن ہے جو کہ جسم کو قوت، تر و تازگی اور راحت بخشتا ہے اس کے استعمال کا لطف خاصکر مرد ہی اٹھاتے ہیں
سب سے بڑا فائدہ اس عمدہ سبز اور زود جھاگ پیدا کرنیوالے صابن کا یہ ہے کہ اس میں حفظانِ صحت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مضر جراثیم کو نیست و نابود کر دینے والی، بدن کو فرحت دینے والی کیڈائل نام دوائی آمیزش کی گئی ہے جسے رکسونا کی بہت جلدی اور بہت پیدا ہونیوالی جھاگ جلد کے ہر مسام تک پہنچاتی ہے
آپ اس سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر آسانی اور بہت جلدی رکسونا کے باقاعدہ استعمال سے جلد کی صحت درست کی جا سکتی ہے اور اُسے ہر طرح سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے ایسے سبز اور زود جھاگ دینے والے ادویات سے مرکب صابن کو آج ہی سے فوراً عمل میں لائیں اور اس کے استعمال کو جاری رکھیں۔
نوٹ:۔ یہ ایک نقطہ خاص قابلِ ذکر ہے کہ جلد کی صحت پر ہی خوبصورتی کا انحصار ہے اور ہر مرد کو اپنے بدن کی جلد کو صاف اور محفوظ رکھنے کا اتنا ہی فخر حاصل ہے جو کہ ایک عورت کو۔
رکسونا بچے کیلئے:۔ یہی رکسونا جو کہ باپ استعمال کرے بچہ بھی کرے۔ اس کی جھاگ بدن کو مضر جراثیم سے محفوظ رکھتی ہے۔ ننھے بچوں کو غسل کرانے وقت رکسونا کو استعمال فرمائیں تا کہ وہ بچے کے نازک جلد کو ٹھنڈک پہونچائے اور اسے ہر طرح کی کھجلی و خارش وغیرہ سے بچائے رکھے۔
رکسونا مرہم کا استعمال کیجئے:۔ دردوں، سوزش، پھوڑے، داد، ناسور، مہاسے، پھنسے اور دوسری تمام جلدی امراض کیلئے۔ ہر جگہ تاجروں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔
RP. 28-23 UD
REXONA PROPRIETARY LIMITED

# ہماری نئی مطبوعات

## لندن سے آداب عرض

آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو ریڈیو کے ذریعہ نشر کیا
لندن سے آداب عرض انہی نشریات کا مجموعہ ہے بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہو گا۔
دوسرا ایڈیشن قیمت عہ

## دیس سے باہر

آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی و جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیمت ۲؎

## ادبستان

حضرت مولانا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کر کے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔
تیسرا ایڈیشن قیمت ۲؎

## وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

بہترین ڈراموں کا مجموعہ مرتبہ اختر شیرانی اس مجموعہ میں مرتب نے ملک کے بہترین ڈراموں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے یہ ڈرامے آپکی ذہنی خوراک ہیں آج ہی آڈر دیجئے۔ نام سے ہی اندازہ کیجئے کہ ایک ڈرامہ سے دوسرا کیسا لاجواب ہوگا۔ قیمت تین روپے

## بہار شریعت

مصنفہ حضرت مولانا مفتی حکیم امجد علی صاحب - اسلامی عقائد اور قرآنی احکام کے لئے بہترین تصنیف تمام مسائل کو تشریحاً اور استدلالاً مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی کتب میں بے نظیر تصنیف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ اپنے عقائد و اعمال، نماز، روزہ و دیگر عبادات و معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہر وقت بہار شریعت کو زیر مطالعہ رکھیں یہ آپ کو عالم و مفتی سے بے نیاز کرے گی مفتیان کرام کے لئے نوٹ بک کا کام دیتی ہے کامل ۱۷ حصے بلا جلد پچیس روپے مجلد اکتیس روپے۔

## معاشیات قومی

مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی۔ یہ کتاب فریڈرش لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی رہین منت ہے جسے ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ دماغ نے اردو کا لباس پہنایا ہے یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز اور تاریخی روداد ہے اردو زبان کے ہر ہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف۔
قیمت مجلد آٹھ روپے

## مقالات شیرانی

از حافظ محمود شیرانی
حافظ محمود شیرانی کا گوہر بار قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کر چکا ہے مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ گراں مایہ تصنیف ہر اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہونی چاہیئے۔ آج ہی طلب فرمائیں یا خط کریں۔ قیمت تین روپے۔

## تاریخ انقلاب روس

مصنفہ شیر جنگ: روس کے اقتصادی انقلاب کا ہمہ جہتی تاریخی، معاشی اخلاقی اور مجلسی رد و بدل کی روح فرسا تاریخ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو اختصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ شیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو کس خوش اسلوبی سے مرتب کر کے ایک لاجواب تصنیف بنا دیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے

ہمارے ہاں اسلامی، ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل پنجسورے اور سپارے بھی شائع ہوتے ہیں۔ فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

## اوراق پارینہ

از شیر جنگ ایک انقلابی تمہیدی وہ بھی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات۔ غریب مزدور۔ کسان کی تکالیف معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے یہ کتاب انقلابی ذہنوں کے لئے ایک پروگرام اور ادباء کے لئے بہترین استعارے محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ قیمت عہ

## اردو زبان اور ہندو

مصنفہ ناظم سید بارہوی۔ اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع عمل و دخل میں ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سرانجام دی ہیں یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرے گی۔ تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔
قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے (عہ)

## قرآنی اخلاق دو حصے

انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حق دار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہو۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جواہرات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ قیمت ایک روپیہ

## کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شیر جنگ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ وہ بیسیوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے۔
تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے۔
قیمت مجلد چھ روپے

ملنے کا پتہ:۔ **شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار لاہور**

# آج کل

اردو کا پندرہ روزہ
چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۳ | فہرست | یکم دسمبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے



مدیران

مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم
ایم۔ اے

نائب مدیر
فضل حق قریشی
دہلوی

بھگت سروپ
ایم۔ اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۲۶ دہلی

# رفتارِ زمانہ

## ادارۂ اقوام متحدہ اور تجاویزِ الحاق

پچھلے دنوں ادارۂ اقوام متحدہ کے مختلف اجلاسوں میں اس مسئلے پر کہ اور کن کن ملکوں کو ادارے کا رکن بنایا جائے بڑی گرما گرم بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت ہندوستانی وفد کے ارکین کو حاصل رہی۔ مسٹر مہاراج سنگھ نے جو کئی سال جنوبی افریقہ میں رہنے کے باعث وہاں کے سیاسی اور سماجی حالات کا مطالعہ کرتے رہے ہیں سختی سے اس امر پر زور دیا کہ جنوبی افریقہ کو ادارۂ مذکور میں ہرگز شامل نہ کیا جائے کیونکہ گزشتہ نصف صدی سے وہاں کی یونین کا رویہ نسلی امتیازات کے ماتحت افریقیوں اور ہندوستانیوں کے خلاف اتنا قابل اعتراض رہا ہے کہ آئندہ اس پر کسی قسم کا اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور چونکہ اس کے طرزِ عمل سے ساری دنیا میں فضائے امن و عافیت مکدر ہونے کا احتمال ہے اس لئے منشور کی طے شدہ شرائط کے ماتحت اسے حق رکنیت نہیں دیا جا سکتا۔ بالکل اسی رنگ میں مسز وجے لکشمی پنڈت نے پرتگال کی درخواست رکنیت کی مخالفت کی ساتھوں نے گوا کی مثال پیش کرتے ہوئے بتایا کہ نوآبادیات کے سلسلے میں حکومت پرتگال کا طرزِ عمل بہت برا بلکہ انسانیت سوز رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ اصل باشندگانِ ملک کو ان کے جائز حقوق سلب کرتے ہوئے ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا ہے۔ مسز پنڈت نے یہ بھی کہا کہ پرتگال کے برعکس آئرلینڈ رکنیت کا بہت زیادہ مستحق ہے۔ شروع میں امن پسند ملکوں کی تعریف اس پر عائد نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس وقت امن پسند ملک صرف اسی کو سمجھا جاتا تھا جو اتحادیوں کے ساتھ مل کر اعلانِ جنگ کر دے۔ اب زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کا مفہوم بھی بدل گیا ہے اور آئرلینڈ کو اس کی امن پسند پالیسی کے ماتحت ادارے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مشرقِ وسطیٰ کے ملک شرق اردن کو بھی جس نے حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے مستحق رکنیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی وفد کے ارکین کی رائے ہے کہ البانیہ کی شمولیت کے مسئلہ پر نظرثانی کی جائے کیونکہ اس ملک نے دوسری جنگِ عظیم میں فاشیت و نازیت کا قلع قمع کرنے میں بڑی قربانیاں پیش کی ہیں۔ افغانستان، آئس لینڈ اور سوئڈن کے الحاق کا مسئلہ بھی جنرل اسمبلی میں پیش ہوا اور تمام ملکوں کے نمائندوں نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے تجاویز کی تائید کی۔

## روس میں نئے صنعتی ادارے

سوویت روس کے ماہرینِ صنعت و اقتصادیات اپنے ملک میں صنعت و حرفت کے پانچ ہزار نوسو ادارے قائم کرنے کے خاکے تیار کر رہے ہیں۔ یہ ادارے ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۰ء والے پنج سالہ خاکے کے ماتحت قائم ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ماہ ایک سو یا ہر آٹھ گھنٹے کے بعد ایک بڑا کارخانہ کھل جائے گا۔ اس سلسلے میں کوہ یورال کی وادیوں میں بحیرۂ بالٹک کے ساحل کے ساتھ ساتھ لینن گراڈ میں میگنٹوگورسک کے مقام پر اور شرق بعید میں کوئلے اور مختلف دھاتوں کے نئے مرکز بننے شروع ہو گئے ہیں۔ یوکرین کے بعض علاقوں میں لوہے اور فولاد کے ان پرانے کارخانوں کو جو جنگ میں تباہ ہو گئے تھے نئے سرے سے تعمیر کیا جا رہا ہے کیونکہ موقع و محل کے لحاظ سے وہ مقامات بہت مناسب و موزوں ہیں۔ اسی پنج سالہ خاکہ کے تحت اکیڈیمی اوف سائنٹسٹس کے شعبۂ طبعیات و ریاضی کے ارکین سائنسی تحقیقات کا کام بھی شروع کرنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سے مادوں کی نئی خاصیتیں اور ماہیتیں معلوم کرنے کے بعد کوشش کی جائے گی کہ ان سے نت نئی چیزیں تیار کی جا سکیں۔ زمین کی بناوٹ اور اس کے طبقات کی نوعیت پر بھی چھان بین ہوگی تاکہ زیادہ تحقیقات کی مدد سے صنعت و حرفت کے مجوزہ اداروں کو خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے۔

## ایشیائی طلبا کی کانفرنس

کل ہند طلبا کی کانگریس نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ کرسمس کے موقع پر لاہور میں ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس میں تمام ایشیا اور نوآبادیات کے طلبا شریک ہوں۔ یہ اجلاس تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا اجلاس ہوگا۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ تمام ایشیائی اقوام کے مابین پہلے کی طرح دوستی اور اخوت کا رشتہ قائم ہو جائے اور وہ نوجوان جو سارے ایشیا کو آزاد اور نئی منزل کی طرف گامزن دیکھنا چاہتے ہیں ایک مشترک نظام کے ماتحت آ جائیں۔ اس سلسلے میں ایک مجلس عاملہ مرتب کر لی گئی ہے جس میں ہندوستان اور انڈونیشیا کے طلبا شامل ہیں۔

## جاپان کے مجرمین جنگ

مشرق بعید میں لڑائی ختم ہو جانے کے بعد جب اتحادیوں نے جاپان پر تسلط حاصل کر لیا تو ان لوگوں کی گرفتاری شروع ہوئی جنہوں نے آگ کے شعلے بھڑکائے تھے یا جو اس سلسلے میں ممد و معاون تھے۔ اس وقت سے ابتک ۸۰۵ مجرمین جنگ پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان میں سے ۶۳ رہا کر دئے گئے کیونکہ ان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا یا ان کے جرم کو زیادہ سنگین نہیں سمجھا گیا۔ ۶۰۰ کو مختلف میعاد کی سزائے قید دی گئی جو اسوقت تاریک کوٹھڑیوں میں اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ باقی ۱۴۸ کو سزائے موت دی گئی۔ ان میں سے ۱۰۹ اب تک دار پر چڑھ چکے ہیں اور ۷۶ اپنے آخری وقت کے لئے ایک ایک لمحہ گن رہے ہیں۔ ۱۶ اشخاص نے مقدمات کی صعوبتوں اور اس کے ہولناک انجام سے بچنے کے لئے خود کشی کر لی کیونکہ جاپانی روایات کے مطابق خود کشی کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ آج کل ۱۷ مجرموں پر مقدمہ چل رہا ہے۔ ساری دنیا ان کے نتائج کی منتظر ہے۔ ۶۹ مزید مجرموں کی فہرست بن چکی ہے۔ موقع ملتے ہی ان پر بھی مقدمہ شروع کر دیا جائے گا۔

## ہندوستان اور امریکہ کے درمیان نیا معاہدہ

۱۴ نومبر کی صبح کو حکومت ہند اور حکومت امریکہ کے مابین فضائی حمل و نقل کے سلسلے میں ایک نیا معاہدہ عمل میں آیا ہے۔ حکومت ہند کی جانب سے پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار عبدالرب نشتر نے اور حکومت امریکہ کی جانب سے جارج میریل اور جارج اے براؤنل نے دستخط کئے۔ معاہدہ تیرہ دفعات پر مشتمل ہے اور اس میں وہ شرائط بیان کی گئی ہیں جن کے مطابق دونوں ملکوں کے درمیان خاص خاص حصّوں میں فضائی حمل و نقل کا سلسلہ قائم ہوگا۔ یہ معاہدہ دراصل اس "برمودہ" نامی معاہدے سے مشابہ بلکہ اس کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے جو فروری ۱۹۴۶ء میں برطانیہ اور امریکہ کے مابین عمل میں آیا تھا۔ اس میں ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ہوائی جہازوں کے ذریعے لائی اور لیجائی جاسکیں گی۔ نرخنامے کی وضاحت کی گئی ہے جس کے مطابق دونوں ملکوں کے درمیان محصول وغیرہ وصول ہوا کریں گے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پروویژنل انٹرنیشنل سول ایوی ایشن آرگنائزیشن اور انٹرنیشنل ایر ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشن کے جہاز کن اصول و شرائط کے ماتحت کام میں لائے جاسکیں گے۔ ضمیمے میں ان ہوائی راستوں کا ذکر ہے جو اس سلسلے میں دونوں ملکوں کے جہازوں کو اختیار کرنے پڑا کریں گے۔ عبوری حکومت ہند کی تشکیل بلکہ دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد یہ پہلا اہم معاہدہ ہے جو ہندوستان نے بین الاقوامی تجارتی اصولوں پر کسی دوسرے ملک سے کیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ آئندہ اس عبوری حکومت کی پالیسی ممالک خارجہ کے ساتھ کیا رہا کرے گی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معاہدہ ہندوستانی تجارت کے لئے حد درجہ مفید اور ایک خوشگوار مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ خصوصاً آجکل جبکہ دنیا کا ہر ملک دوسرے ملک کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کی تدبیریں سوچ رہا ہے، یہ موقع ہندوستان کے لئے جسے ابتک بین الاقوامی سیاست میں کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی، بہت ہی غنیمت ہے۔ اصولاً ہندوستان کو فضائی حمل و نقل کا سلسلہ سب سے پہلے مشرق وسطیٰ، ملایا اور چین اور پھر ممالک یورپ کے ساتھ شروع کرنا تھا امریکہ کی باری بعد میں آتی۔ لیکن یہ غیر متوقع صورت زیادہ امید افزا ثابت ہوگی۔ طے شدہ شرائط کے مطابق یہ معاہدہ ایک سال کے نوٹس پر کسی بھی ملک کی طرف سے کالعدم کیا جا سکتا ہے لیکن معمول کے مطابق یہ گنجائش رکھی گئی ہے۔ اسکی نوبت شاید کبھی نہ آئے۔ اگرچہ اس رستے میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں تاہم یہ سلسلہ ایک دو ماہ کے اندر اندر عمل میں آ جائے گا۔

## بانس سے نقلی ریشم

میسور کے جنگلاتی تحقیقات کے ادارے نے بڑی چھان بین کے بعد معلوم کیا ہے کہ بانس کے ریشوں سے بہترین قسم کا نقلی ریشم تیار کیا جا سکتا ہے۔ ریاست میسور کے جنگل بانسوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس لئے حکومت میسور نے فیصلہ کیا ہے کہ اس قدرتی پیداوار سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے اور آئندہ بانس دوسرے کم اہم کاموں میں صرف نہ کئے جائیں۔ چنانچہ میسور سے سولہ میل کے فاصلے پر کرشنا بھدری کے مقام پر نقلی ریشم بنانے کا ایک بہت بڑا مل قائم کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔ یہ ہندوستان میں اپنی قسم کا پہلا کارخانہ ہوگا۔ نیز ریاست نے اب تک جو بڑے بڑے منصوبے مرتب کئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہمیت اسی مجوزہ کارخانے کو دی جائیگی۔ میسور کا کپڑا اور بہت سی دوسری مصنوعات پہلے سے مشہور ہیں۔ یہ کارخانہ ریاست کی ترقی کی راہ میں ایک اور سنگ میل ثابت ہوگا اور دنیا یہ بھی جان لے گی کہ ہندوستان کے تحقیقاتی ادارے دنیا کے دوسرے ملکوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہیں۔

## کولمبس سے پہلے

ابتک یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ پرتگال کا مشہور سیاح کرسٹوفر کولمبس پہلے پہل امریکہ پہنچا اور وہی اس نئی دنیا کا محقق ہے۔ لیکن حال ہی میں امریکہ کے ایک ماہر آثار قدیمہ مسٹر ایم میلیری نے اس کی تردید کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ کولمبس سے کئی پچھتر سال پہلے ناروے کے لوگ امریکہ گئے اور انہوں نے نیوفاؤنڈلینڈ میں خلیج سینٹ لیٹ کے قریب ایک بستی بسائی۔ وہ اس مقام پر قدیم وائکنگ تہذیب کا کھوج لگا رہے ہیں۔ وہ شمال بعید میں خلیج ابیض سے خلیج سینٹ لیٹ کی طرف روانہ ہوئے اور زمین کا سینہ چیر کر وائکنگ تہذیب کے بہت سے نوادر برآمد کرتے رہے۔ ایک جگہ انہیں نورس تہذیب کے کھنڈر ملے، اور دوسری جگہ ریلے کے قریب پتھر کی انگیٹھی جو نورس قوم کے لوگ استعمال

کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ دسویں صدی میں لیف ایرکسن نامی شخص نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ خلیج لیپٹولیٹ کے قریب اپنا ڈیرا جمایا تھا۔ اور ان کے بعد ناروے کے بہت سے باشندے وہاں جاکر آباد ہوگئے تھے۔ کولمبس پندرھویں صدی میں یعنی اس واقعہ کے پانچسو سال بعد وہاں پہنچا تھا۔

## آسٹریا کا گاندھی

آسٹریا کے شہر گراز میں ایک بالکل ننگ دھڑنگ شخص پاگلوں کی طرح چیختا چلاتا اور نعرے لگاتا ٹاؤن ہال کے سامنے آیا اور بآنگ دہل کہنے لگا کہ "میں گاندھی ہوں، میں نے آسٹریا کو آزاد کرانے کا بیڑا اٹھایا ہے"۔ چونکہ اسکی مجنونانہ حرکتوں اور اس قسم کے نعروں سے نقضِ امن کا اندیشہ تھا، اسلئے پولیس نے فوراً اسے گرفتار کر لیا۔

## امریکہ میں ایٹم بموں کا ذخیرہ

امریکہ میں جو ایٹم بم بڑی تیزی سے تیار ہو رہے ہیں، ان کی ساخت اور تعداد کے متعلق چند دلچسپ حالات اور اعداد و شمار معلوم ہوئے ہیں۔ سوا سال سے زیادہ عرصہ گذرا سب سے پہلا ایٹم بم ناگاساکی میں پھٹا تھا۔ اس کے بعد امریکی کارخانے اوسطاً چھ بم ہر ماہ بناتے رہے۔ اس دوران میں دو بم بکینی کے تجربات میں استعمال ہوگئے۔ ان کو نکال کر اسوقت امریکہ کے پاس ۹۷ بموں کا ذخیرہ ہونا چاہیئے جنکا وزن کم و بیش نو ہزار پونڈ ہوگا۔ ہر بم کا طول پچیس فٹ ہوتا ہے۔ اب جو بم تیار ہو رہے ہیں ان میں پلوٹونیم نامی مادہ استعمال ہو رہا ہے جو بھڑک کر پھٹنے میں یورینیم سے بھی زیادہ تیز ہوتا ہے۔ ہر بم کا وزن ۱۱۲ من کے قریب اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی ساخت میں بندوق کی طرح دو وسیع نالیاں اور بہت سے پرزے فولاد کے ہوتے ہیں۔ سیسے کے دو دبیز خول ان کے علاوہ ہیں۔ یہ خول اس لئے ہوتے ہیں کہ آتش گیر مادے کی تابکاری بم پھینکنے والے جہازوں میں بیٹھنے والے لوگوں پر اثر انداز نہ ہوسکے۔ ان سمیت بم کی گولائی کا قطر دو فٹ سے کسیقدر کم ہوتا ہے۔ یورینیم والا وہ بم جس نے ہیروشیما کے اسّی ہزار انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، سطح زمین سے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر پھٹا تھا۔ یہ بلندی زیادہ تباہ کاری کے لئے ضروری تھی۔ چنانچہ دوسرا بم جس میں یورینیم کی بجائے پلوٹونیم تھا اور جو ناگاساکی پر پھینکا گیا، چھتری ٹوٹ جانے کے باعث زیادہ تیزی سے زمین کی طرف گرا اور عین زمین پر یا اس سے کچھ اوپر پھٹا جس کے باعث کچھ زیادہ تباہکاری نہ پھیل سکی۔ اگر وہ بھی ایک ہزار فٹ کی بلندی پر پھٹتا تو ہیروشیما سے زیادہ وہاں نقصان ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ سطح زمین سے کچھ بلندی پر پھٹنے کی صورت میں آتشگیر مادے کا دھماکا اور دھچکا بہت ہی شدید ہوتا ہے۔ زمین پر آکر یہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔

## بچۂ غزال

گذشتہ موسم سرما میں صحرائے شام سے ایک طفل انسان پکڑا گیا جسے اس اعتبار سے "بچۂ غزال" کہا جاسکتا ہے کہ اس کی پرورش صحرا کے ہرنوں کے جھرمٹ میں ہوئی تھی۔ ایک عورت نے اسے اچھی طرح پہچان لینے کے بعد کہا کہ وہ میرا بچہ ہے۔ اس نے بیان کیا کہ ایک بار میں دمشق اور بغداد کے درمیان صحرا کو اونٹ کے ذریعہ عبور کر رہی تھی کہ بچہ گم ہوگیا۔ میں نے اس کی تلاش میں کوئی کسر باقی نہ رکھی لیکن ناکام رہی۔ بچہ ہسپتال میں مشہور معالجوں کے سپرد ہے۔ وہ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح اس کی بربریت ختم ہو اور وہ انسانوں میں رہ کر انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا سیکھ جائے مگر ابھی تک کوششیں بارآور نہیں ہوسکی ہیں وہ اب بھی گھاس خوش ہوکر کھاتا اور ہرنوں کی طرح حرکتیں کرتا اور انہی کی طرح بولتا ہے: تاہم کچھ نہ ملنے پر بادل ناخواستہ کچا گوشت یا دوسری سبزیاں کھالیتا ہے۔ پکی ہوئی کسی چیز پر منہ نہیں ڈالتا۔ کبھی کبھی دیگر لوگوں کی طرح بولنے کی کوشش بھی کرتا ہے مگر زبان صحیح لب و لہجہ پیدا نہیں کرسکتی۔ گرفتاری کے بعد سے یہ بچہ زیادہ موٹا ہونے لگا ہے اور وزن بھی بقدر ستر پونڈ بڑھ گیا ہے۔ تین بار وہ ہسپتال سے نکل بھاگا اور بمشکل ہاتھ آسکا۔ ایک بار دو موٹر گاڑیوں نے اس کا تعاقب کیا۔ اس کی رفتار تیس میل فی گھنٹہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چالیس میل فی گھنٹے بھی زیادہ دوڑ سکتا ہے۔ بہرحال کوشش کی جارہی ہے کہ اس کو کسی طرح انسان بنالیا جائے۔

## سانحات ارتحال

**صاحبزادہ محمد عمر** ادبی حلقوں میں خصوصاً ڈراما اور تھیٹر سے ذوق رکھنے والوں پر یہ سنکر سخت رنج و غم کی کیفیت طاری ہوجائے گی کہ صاحبزادہ محمد عمر کچھ عرصے جدا رہنے کے بعد اپنے جگری دوست اور ادبی ہمنوا یعنی نور الٰہی مرحوم کے ساتھ عالم بقا میں جا ملے۔ ان دونوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ "ناٹک ساگر" اردو ادب میں ایک غیر فانی تصنیف ہے۔ صاحبزادے صاحب نے اپنے ساتھی کے بعد بہت سے ڈرامے اور ادبی مضمون بھی لکھے ہیں۔ انکی بلند پایہ شخصیت اور انکی ادبی خدمات کے سلسلے میں ایک مفصل مضمون انکی تصویر کے ساتھ کسی آئندہ شمارے میں شائع کیا جائیگا۔ ادارۂ آجکل کو اس حسرتناک وفات پر سخت افسوس اور مرحوم کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔

**پنڈت مالویہ جی** نہایت افسوس کیساتھ یہ خبر سننے میں آئی کہ بروز منگل بتاریخ ۱۲ نومبر ۱۹۴۶ء بوقت شام چار بجکر تیرہ منٹ پر پنڈت مدن موہن مالویہ جی کا انتقال ہوگیا اسوقت بنارس کی ہندو یونیورسٹی کے علاقے میں وہ اپنی قیامگاہ پر زیر علاج تھے انکی بلند پایہ شخصیت اور انکی تعلیمی خدمات کے سلسلے میں ایک مفصل مضمون ان کی تصویر کے ساتھ کسی آئندہ شمارے میں شائع کیا جائیگا۔ ادارۂ آجکل کو اس حسرتناک وفات پر سخت افسوس اور آنجہانی کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔

# تبرکات ——— آسی لکھنوی

جذبۂ بے اختیارِ شوق کام آہی گیا　　آتے آتے مجھکو ان کا پورا نام آہی گیا
زدمیں مستقبل کے ماضی کا نظام آہی گیا　　صبحِ ناکامی پہ غالب رنگ شام آہی گیا
پھر بھی میرے دیدۂ دیدار جو کا کیا علاج　　فرض کر لیجیے کہ ان کا اک سلام آہی گیا
اب محبت ہی محبت ہے نہ ہم ہیں اور نہ تم　　جسکے آگے کچھ نہیں ہے وہ مقام آہی گیا
کروٹیں لینے لگی بزمِ مسرت کی زمیں　　اُٹھیئے جلد اُٹھیئے کہ ہنگامِ قیام آہی گیا
کیا وہ ہو سکتا ہے میرے شوقِ پیہم کا بدل　　میں نے یہ مانا کہ ان کا اک سلام آہی گیا
ضبط کرتا ہوں مگر دیوانگی دیوانگی
کیا کروں گا پھر جو لب پر انکا نام آہی گیا

(ناتمام)

ازل کے دن سے ہیں اہلِ محبت نوحہ خواں ابتک　　مگر اپنی جگہ پر ہیں زمین و آسماں اب تک
ہے معمورِ انقلابوں سے فضائے گلستاں اب تک　　کچھ اُجڑے کچھ جلے کچھ بن رہے ہیں آشیاں اب تک
کبھی اک شمع امیدِ وفا میں نے جلائی تھی　　اسی رخ پر چلی آتی ہیں لاکھوں آندھیاں اب تک
زمینِ کوچۂ قاتل سے لے حشر اُٹھ کے آیا ہوں　　میری آنکھوں میں ہے کیفیتِ خوابِ گراں اب تک
سحر کو ناز سے کس نے درِ دل پر قدم رکھا　　فضائیں گونجتے ہیں نغمۂ قدوسیاں اب تک
سحر کو ڈھونڈتا ہوں ہستیاں دورِ شبانہ کی　　کہیں ساقی نہ کہہ بیٹھے کہ غائب تھے کہاں اب تک
نہ شمعیں ہیں نہ محفل ہے نہ کوئی سننے والا ہے　　مگر ہم ہیں کہ بیٹھے کہہ رہے ہیں داستاں اب تک
ادھر امیدِ مستقبل کا دل میں موجزن طوفاں　　ادھر لاکھوں سوالوں پر نہیں اٹھتی زباں اب تک
نہیں یہ غم کہ چھینے اس نے جذباتِ شباب آسی
بڑا افسوس تو یہ ہے کہ دنیا ہے جواں اب تک

# آسی لکھنوی

**سید اظہار حیدر**

ہر ادب کی تاریخ میں ایک ایسا بھی زمانہ آتا ہے جب عوام کا مذاق انتہائی پستی کی طرف مائل ہوتا ہے چنانچہ اردو ادب کی تاریخ میں غالباً یہ زمانہ غدر اور انیسویں صدی کے اواخر تک کا ہے۔ درحقیقت اس زمانہ میں عوام کا مذاق آتنا سوقیانہ اور بازاری تھا کہ شرفاء نے غزل کو دور سے سلام کر لیا تھا۔ دماغوں میں زہر لبا تھا۔ کان زہر عشق اور دیوان جان صاحب کے نغموں سے گونج رہے تھے مختصر یہ کہ شعریت کی فضا مسموم تھی۔ لیکن انیسویں صدی کی آخری چوتھائی صدی میں کچھ حساس افراد عوام کے مذاق کو سدھارنے کے لیے اٹھے جنھوں نے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ ان افراد کا ذکر ادب کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے ہر عہد کا ادبی مبصر ان حضرات کے ادبی کارناموں پر نذر عقیدت پیش کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان حضرات کی حیثیت سنگ راہ کی سی ہے۔ آج اس گروہ کے چند افراد ہم میں باقی رہ گئے ہیں اور زیادہ تر افراد ایک ایک کرکے داغ مفارقت دیتے جا رہے ہیں۔ کچھ افراد آج بھی ہم میں موجود ہیں لیکن ان کی موت اور زندگی میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اب ان میں زمانہ کے ساتھ چلنے کی طاقت اور صلاحیت ہی نہیں باقی رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی آواز شکست خوردہ ذہنیت کی غمازی کر رہی ہے۔ لیکن افسوس ان ہستیوں کے اٹھ جانے کا ہے جن میں ابھی زمانہ کے ساتھ چلنے کی صلاحیت موجود تھی اور جن کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ہمارے درمیان سے اٹھا لیا۔ مولانا آسی مرحوم کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے جن میں زمانہ کے ساتھ چلنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔

مولانا عبدالباری آسی موضع الدین تحصیل ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرقی تہذیب و تمدن کی روشنی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ اور مغربیت اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر بھی شرفاء کے گھرانوں میں غدر سے قبل کا اچھا خاصہ ماحول دیکھنے میں آ جاتا تھا۔ آسی اسی ماحول کے پروردہ اور پرداختہ تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں آسی نے رائج الوقت فارسی اور عربی نصاب ختم کرکے حدیث و فقہ کی کتابوں کا استفادہ شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد طب اور حکمت کا مطالعہ شروع کیا۔ اسی زمانہ میں حکیم نواب جان کی فنی علمیت کا چرچا ہر خاص و عام کی زبان پہ تھا۔ مولانا آسی نے اسی فاضل استاد کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔

لائق شاگرد کی ذکاوت اور بڑھتی ہوئی قابلیت نے شفیق استاد کے دل میں گھر کیا چنانچہ آسی تھوڑے ہی عرصے کے بعد نسخہ نویسی کے اعزازی عہدہ پر مامور ہوئے۔ آسی کی ذہنیت کی تشکیل کچھ اسی طرح ہوئی تھی کہ دیکھنے والا کچھ دیر کے لیے کشمکش و حیص بیص میں ضرور پڑ جاتا ہے یکرنگی اور یکسانیت کا نام تک نہیں ملتا۔ آخر کار تلون مزاجی کے پیہم تقاضوں کو تنگ آکر ۱۹۱۰ء میں شاہجہاں پور کے انگریزی اسکول میں فارسی ٹیچر ہو گئے۔ اسکول کی زندگی کچھ دنوں کے لئے قابل توجہ تو ضرور رہی لیکن یہاں بھی وہ ذہنی آسودگی جس کی تلاش تھی نہ نصیب ہو سکی۔ لہٰذا کچھ عرصے کے بعد اسکول کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر جہان آباد کا رخ کیا۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد علی دلّی سے "ہمدرد" نکال رہے تھے۔ مولانا آسی ہمدرد کے ادارہ میں شامل ہو کر مشہور صحافت نگار جالب دہلوی کے ساتھ کام کرنے لگے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہندوستان کی سیاسی حالات نے کروٹ لی اور ہمدرد کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء میں اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ آخر کار دلّی سے دل برداشتہ ہو کر آسی نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ شام اودھ کی اجڑی ہوئی بہار اس نووارد کی نظر میں ایسی سمائی کہ نہ صرف مرتے دم تک اسکا دم بھرتا رہا بلکہ مرنے کے بعد بھی اسیں کا پیوند خاک ہوا ——— ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی تنوطیت اور رجائیت کا حسین امتزاج ہو اس کی شاعری کسی ترغیب یا تشویش کی کیسے ممنون ہو گی۔ غالباً ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے کہ آسی کہیں جا رہے تھے کہ اثناء راہ میں یہ شعر موزوں ہو گیا۔ ؎

ارے تم نے زخمی کیا دل ہمارا ٭ بڑا تیر مارا بڑا تیر مارا

اس کے بعد سلسلہ مشق جاری رہا۔

آسی نے آنکھ کھولی تو داغ، امیر اور جلال کو قریب پایا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شاگرد داغ کے تھے لیکن تعلیم اور انتخابیت نے ان کو امیر سے زیادہ نزدیک کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ناسخ کے رنگ میں طبع آزمائی کی۔ کبھی حالی کے طرز پر اشعار موزوں کئے اور اسی طرح کبھی کبھی داغ کے رنگ میں رنگین اور روزمرہ میں ڈوبے ہوئے اشعار کہے۔ کہیں کہیں پر غالب کی پیروی میں فارسی تراکیب کو اپنے اشعار میں قصداً جگہ دی۔ آسی نے اگر کبھی اپنی شاعری کو ابہام سے زینت بخشی تو صنائع لفظی کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفہ اور تصوف کو ثانوی سے زیادہ اہمیت نہ دے سکے۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی رنگ کی غمازی کر رہے ہیں۔ ؎

عہد وفائے دوست سچا لیکن اے ندیم
کیونکر کہوں کہ بھول گیا آسماں مجھے

ہمیں ناواقف رسم چمن تھے اے قفس والو!
فلک سے ٹھہر لیتے تو فکر آشیاں کرتے

دشتِ عدم سے وحشت لائی ہے سوئے ہستی
دونوں جہاں ہمارے روندے ہوئے پڑے ہیں

چھوڑا ہی کیا ہے لوٹنے والوں نے تیرے پاس
اک زندگی ہے سو وہ کوئی دن کی اور ہے

سمجھ تو لی ہے دنیا کی حقیقت ٭ مگر اب اپنا دل بہلا رہا ہوں

آسی کے نزدیک شعر خواہ کسی کے طرز پر ہو مگر ندرت بیان اور جوشِ کلام اس میں پایا جانا لازمی ہے۔ شعریت کے متعلق اتنا قابلِ تعریف نظریہ رکھنے کے باوجود بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسی خود اس نظریہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ چنانچہ کچھ غزلوں میں وہ سپردگی اور خود رفتگی نہیں ہے جو تغزل کی اصلی جان ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک ٹھہری اور سنبھلی ہوئی دردمندی انکے اشعار میں ملتی ہے جس سے ہر صاحبِ ذوق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے اشعار میں نہ کہیں سستے قسم کی جذبات نگاری ملتی ہے نہ چھچھورے انداز کی معاملہ بندی۔ الفاظ کا صحیح اور برمحل استعمال۔ محاوروں اور فقروں کی برجستگی اور بے ساختگی۔ تخیل کی بلندی اور لب و لہجہ کی متانت ہے۔ ان کی شاعری میں رنگینی اور دلکشی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آسی کے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں جو رستے ہوئے ذوقِ جمال کا پتہ نہ دیتی ہو۔ آسی کی شاعری جملہ خصوصیات کی حامل تو ضرور ہے لیکن ایک بات قاری کے ذہن میں رہ رہ کر کھٹکتی ہے یعنی ان کی شاعری میں اس محویت کا مطلق احساس نہیں ہوتا جو دوسروں کو بھی محو کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کا کم و بیش دل پر وہی اثر ہوتا ہے جو گزرے ہوئے زمانہ کی دھندلی یادوں سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آسی کا ایک شعر جس میں انتہائے بیخودی کی تصویر کشی کی ہے پیش کرتا ہوں یہ شعر ان کی مشاقی اور آرٹ کا اچھا نمونہ ہے!!! ؎

اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھکو
میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشاں ہوں میں

یا دوسری جگہ محویت کا نقشہ فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے ؎

ایسا بھی اتفاق مجھے بارہا ہوا ٭ اُن سے ملا ہوں انکا پتہ پوچھتا ہوا

اسی ضمن میں چند اشعار اور پیش کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

اس سال فصلِ گل میں اجڑا تھا بختِ نجد ٭ رہتا تو آشیاں کو اب ایک سال ہوتا
متاعِ زندگی کے دینے والے یہ تو سمجھائے ٭ کہ اتنا بوجھ سر پر رکھ کے لیجا بالکہاں ہوگا
شوخیاں موجۂ ہستی کی حد سے بڑھ چلیں ٭ پھینک دیں دو چار ذرّے اپنے ویرانے سے کیا
کیسی سی ڈھونڈھ کے لائے ہیں ہم اسے گل تر ٭ وہ زندگی جو گزر جائے مسکرانے میں

آسی کی شخصیت ان کی شاعری میں نمایاں طور سے جھلکتی ہے۔ انھوں نے غمِ دوراں اور غمِ جاناں کو غزل میں اس طرح سمویا کہ ان کے بعد مستقل طور سے دوسرے شاعروں نے بھی اسکا اظہار بڑے شد و مد کے ساتھ کیا۔ آسی کا آرٹ اس مقام پر انتہائی کمال پر پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ؎

دیکھکر اہلِ جہاں کی بے رُخی تیرے بغیر ٭ ہنس رہا ہوں آج میں اپنی ہنسی تیرے بغیر
آزردہ سے افسردہ سے حیراں سے رہے ہم ٭ تم مل بھی گئے پھر بھی پریشاں سے رہے ہم
مرادِ دلِ گزشتہ بھی یونہی گذرا ہے اے ہمدم ٭ بنا رکھی تھی اک مورِ خوشی کی شادماں کیا تھا

آسی کی زندگی فانی کی طرح غم و الم کا مجموعہ تو نہ تھی لیکن اتنا ضرور ہے کہ آسی کو بھی قدرت نے ایک دُکھا ہوا دل عطا کیا تھا۔ فانی کی شاعری میں عیشِ غم بھی ہے نو عرفانِ غم بھی۔ آسی میں زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اگر یہ صلاحیت ان سے چھین لی جاتی تو ان کی شاعری میں عوام کا دُکھ درد نہ ملتا بلکہ شخصی اور ذاتی غم کا عنصر غالب ہوتا۔ آسی نے بالکل غیر شعوری طور پر عوام کے دکھ درد کے احساس کا غزل میں تجزیہ کیا۔ چنانچہ بعض مقامات پر آسی کے لہجے میں متانت کم اور تلخی کے ساتھ ساتھ جھلاہٹ بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کہنا ہی پڑتا ہے کہ ایک ہلکی افسردگی ایک میٹھا درد اور ایک خاموش الم ملتا ہے۔ آسی زندگی کے حوادث سے کھیلتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ حالانکہ اس کی زندگی میں کئی بار خونی ڈرامے کھیلے جا چکے ہیں لیکن وہ زندگی سے ہراساں یا مغرور نہ ہوا۔ چنانچہ اسی ذہنیت کا عکس آئینۂ تغزل میں ملاحظہ ہو:-

رہا برقِ تپاں سے سابقہ تقدیر میں اتنا ٭ کہ اب اپنا نشیمن ہم بناتے ہیں شراروں میں
جا سکون زندگانی میری قسمت میں ڈھونڈھ ٭ ٹھوکریں کھائیں یہاں میں نے عمر بھر تیرے لئے
نمودِ غم کہ پھٹے پڑتے ہیں ایامِ جوانی میں ٭ اضافے ہو رہے ہیں واقعاتِ زندگانی میں
دکا رنگینیٔ ذوقِ تپش کی قدر کرتی ہے ٭ وہ پھولوں میں کہاں جو بات پاتا ہوں شراروں میں

آسی حریمِ حسن میں بھی اپنی خودداری پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس کی نگاہیں حسن و عشق کی قدر و منزلت سے بخوبی آشنا معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ محبوب کی نگاہِ التفات اس کی پریشان حالی کو دور کرنے کے بجائے رگِ احساس پر نشتر کا کام کرتی ہیں۔ آسی نے شاید نقاد کی نگاہ سے حسن و عشق کی واردات کا جائزہ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محبوب کا پیامِ شوق دیدہ دیدار جو کی تسکین کا ساماں فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح اس کے شوقِ پیہم کا بدل محبوب کا ایک سلام کسی حالت میں ادا نہیں ہو سکتا۔ ؎

پھر بھی میرے دیدۂ دیدار جو کا کیا علاج ٭ فرض کر لیجے کہ اُن کا اک سلام آ ہی گیا
کیا وہ ہو سکتا ہے میرے شوقِ پیہم کا بدل ٭ میں نے یہ مانا کہ انکا اک سلام آ ہی گیا

اب ہم آسی کے اس کلام کی طرف متوجہ ہونا چاہتے ہیں جس پر متقدمین خصوصاً میر درد کا نرم اور پُرگداز تغزل چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ آسی کے ان

اشعار کو پڑھنے کے بعد جن میں میر کا تتبع کیا ہے۔ قاری کا ذہن نامعلوم راہوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسی خود انھیں لوگوں میں ہل مل گئے ہیں۔ آسی کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ شاعر کا کام قدیم رسوم و روایات کو اپنے اندر جذب کر کے محفوظ رکھنا ہے بشرطیکہ ان روایات و رسوم میں جذب ہونے کی صلاحیت ہو۔ شاعر کا فرض یہ ہے کہ ادب اور زندگی کے روایات میں سے ان عناصر کو لے جو زمانی اور مکانی حیثیت سے محدود نہ ہوں یعنی جن کی ہمہ گیری مسلم ہے۔ شاعر اور نقاد دونوں کی نظر ادب کے ان اجزاء پر ہونا چاہیئے جن میں بقاء ارتقاء کی صلاحیت موجود ہو۔ آسی نے یہی کیا ہے۔ انھوں نے پرانے اسالیب صور کو اختیار کر کے نہ صرف زندہ رکھا بلکہ ان کو از سرِ نو ترتیب دیکر ان کے اندر نئے امکانات پیدا کئے۔ آسی کی زبان اگرچہ میر سوز و سودا کے مقابلہ میں زیادہ سلجھی ہوئی اور شستہ ہے لیکن اس میں دردمندی۔ دل برشتگی اور سوز و گداز کافی حد تک ویسا ہی عاشقانہ انفعال اور خود گداشتگی ہے جو غزل کی اصل جان ہے اور جو میر۔ درد کا مخصوص انداز ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ہے

کچھ ان کو ہمارا پاس نہیں جو چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں
ہم سنتے ہیں سر دھنتے ہیں منہ تکتے ہیں رہ جاتے ہیں

بیتاب سا پھرتا ہے کئی روز سے آسی ❊ بیچارے نے پھر تم کو کہیں دیکھ لیا ہے
کھل گیا دنیا پہ رازِ حسن و عشق ❊ وہ ہنسے مجھکو پسینہ آگیا

میر اور درد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اکثر چھوٹی چھوٹی سادہ اور شگفتہ بحریں اختیار کرتے ہیں جن میں بجائے خود وہ گداز اور بے ساختہ پن ہوتا ہے جسکا دوسرا نام تغزل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آسی کو بھی انھیں اکابرین متغزلین کی طرح چھوٹی اور دلآویز بحروں کے ساتھ خاص اُنس ہے جس میں انھوں نے بھی بڑے پُر تاثیر اشعار کہے ہیں۔ آسی کی اگر ایسی غزلوں کو پڑھا جائے تو بالکل متقدمین کے رنگ کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ کچھ اشعار سنئے ہ

مرا حال پوچھا مری بات مانی ❊ توجہ، عنایت، کرم، مہربانی
نظر بھی عرق آیا ہوا سا ❊ ملا بھی وہ تو شرمایا ہوا سا
بہار آتی ہے اور میں ڈر رہا ہوں ❊ کہ اکثر مجھکو راس آتی نہیں ہے
حالِ دل اور ایک لمبی سانس ❊ ایسا حال اتنا مختصر، توبہ!!!

---

آسی ایک زبردست قوت آخذہ کے مالک تھے اور جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان کی سب سے بڑی انفرادی خصوصیت تقلید اور انتخابیت ہے یعنی دوسروں کے اثرات کو اخذ اور قبول کرنے کا خاص ملکہ تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل میں ہر رنگ کے اشعار ہونے سے کسی طرز خاص کی خصوصیت نہیں۔ آسی انتخاب اور تقلید کی طرف فطرتاً مائل نظر آتے ہیں۔ اس سے ان کو فائدہ بھی پہنچا اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ پہنچا کہ متقدمین کے رنگ کو اپنے کلام میں اسقدر جذب کر لیا ہے کہ وہ گویا ان کا اپنا رنگ ہے مگر آسی نے صرف اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنے وقت کی خصوصیات اور میلانات پر بھی نظر رکھی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری کی دنیا میں ان کا مرتبہ دوسرے معاصرین سے بہت بلند رہا لیکن تقلید بجائے خود کوئی قابلِ تعریف چیز نہیں۔ اسی تقلید نے اردو شاعری کے مزاج کو خراب کیا تھا۔ اسی تقلید سے آسی کو بھی نقصان پہنچا یعنی زمانہ سازی کی غرض سے بعض اوقات انھوں نے اپنی قوت ضائع کی۔ بعض اوقات ایسا رنگ بھی اختیار کرنا پڑا جس کی ان کو کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔ مثلاً جہاں آسی نے میر۔ سوز۔ درد وغیرہ کے رنگ کی تقلید کی ہے وہیں سودا کی بھی تقلید کچھ کم نہیں کی ہے اور اکثر سنگلاخ زمینوں میں مرکب اور طویل ردیفوں کے ساتھ غزلیں لکھی ہیں۔ جس میں صرف تکلف اور تصنع برتا جاسکتا ہے اور تغزل کو کسی صورت سے نباہا بھی نہیں جاسکتا ہ

اُف وہ آغازِ محبت کی نگاہِ مدہوش ❊ ہمہ آفت ہمہ غارت ہمہ طوفاں ہمہ جوش
اس طرف وہ نگہ ہوشربا بادہ فروش ❊ اس طرف ذوق و فا مستا یہاں بردوش
وعدۂ دوست ہے تاریکیٔ مستقبل میں ❊ اور مرے عالمِ حیرت میں نہ فردا ہے نہ دوش

یہ آسی کی قادر الکلامی تھی جس نے ایسی سنگلاخ زمین پر تغزل کے سوتے بہادئے۔ آسی کے دیوان میں ایسی غزلیں بھی کافی تعداد میں ہیں جن کے لطف کا دارو مدار ردیفوں پر ہے اور جو اپنے اندر پوری غزلیت رکھتی ہیں۔

آسی کی شاعری میں دہلوی اور لکھنوی دونوں دبستانوں کی خصوصیات شاعری باہم دست و گریباں نظر آتی ہیں اور وہ بیچارے کفر و ایمان کی کشاکش میں بری طرح مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی شخصیت اور اپنی حیثیت کے لحاظ سے شعراء اردو میں آسی بالکل اکیلے ہیں۔ وہ بیک وقت ماضی کی یاد گار۔ حال کی کشاکش میں مبتلا اور مستقبل کے میلانات کا اشاریہ ہیں۔ متقدمین کے گائے ہوئے راگ نہ صرف ان کے کانوں میں بلکہ ان کی ہستی کی ایک ایک تہ میں گونج رہے ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ خود ان کے زمانہ میں دوسرے راگوں کی بانگ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک لطیف اور پُرکیف قسم کی انتخابیت یا ہم آہنگی تھی جو آسی کے دم سے شروع ہوئی اور انہیں پر ختم ہوگئی۔ آج کا نقاد یہ ماننے پر مجبور ہے کہ آسی ہی نے غزلوں میں اپنے لطیف اور نازک احساسات۔ اپنے شاعرانہ خلوص۔ اپنے شیریں تغزل۔ اپنے سبک ترنم اور اپنی مدھم مگر دلنشیں آواز کی ترجمانی کی ہے ❊

# ہندوستان کی مشترک تہذیب

۲

عابد حسین

یہ ہے آجکل کے روشن خیال ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی مذہبی تصورات کا عکس جو ٹیگور اور اقبال کے خیالات کے آئینے میں نظر آتا ہے۔ ان تصورات میں جو فرق ہے وہ دونوں فرقوں کے مذہبی ادارات، رسوم و عبادات اور مذہبی قوانین کے اختلاف میں اور بھی زیادہ نمایاں ہے۔ جہاں تک ریاست کا تعلق ہے آجکل تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی ریاستیں موجود نہیں ہیں جن میں مقابلہ کیا جا سکے۔ لیکن تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جو ریاستیں عہد قدیم میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مذہب کی بنا پر تعمیر کی تھیں وہ بہت مختلف تھیں اور آج بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی ریاست کے تصورات ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔

غرض جذبات اور مصلحتوں کو چھوڑ کر محض علمی نظر سے دیکھا جائے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے دھارے جہاں وہ مذہب کے سرچشموں سے نکلتے ہیں ایک دوسرے سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ خود ان مذہبوں کے سوتے ایک عظیم الشان خزانے سے نکلے ہیں، جو سطح کے نیچے ایک بحرِ بے کنار کی صورت میں موج زن ہے۔ لیکن اس وحدت کا احساس صرف ایک صوفی کو مراقبے کی گہرائیوں میں ہو سکتا ہے اور وہ بھی ایک کیفیت کے طور پر، جو چھلاوے کی طرح دل میں جھلک کر چھپ جاتی ہے اور ذہن اس کو پکڑنا چاہے تو ہاتھ نہیں آتی۔ البتہ جب ان دھاروں کو زمانے کی ہوائیں اس طرح بہاتی ہیں کہ وہ ہندوستان کی سرزمین پر ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں تو تاریخ اور جغرافیے کی متحدہ قوتیں ان کو ملا کر ایک عظیم الشان دریا بنانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ اب ہم کو دیکھنا ہے کہ اس کوشش کا نتیجہ اسوقت تک کیا نکلا ہے۔

---

ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے ذہنی عناصر سے قطع نظر کر کے دنیاوی عناصر پر نظر ڈالی جائے تو یہ دکھائی دیگا کہ جو اشتراک عہد مغلیہ کی ہندوستانی تہذیب نے ان میں پیدا کیا تھا وہ ناسازگار حالات کے باوجود بہت جگہ اب تک باقی ہے اور اس کے علاوہ جدیدیت کے اثرات نے جو مغرب سے آئے ہیں اشتراک کی نئی صورتیں نکالی ہیں۔ مثلاً اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے نظام اخلاق کا مذہبی اساس مختلف ہے لیکن زمان و مکان کے حالات نے اسکے مقرون مظاہر یعنی دونوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ مجموعی طور پر دونوں ایک سی اخلاقی خوبیاں اور خامیاں رکھتے ہیں۔ اسکے لئے دو مثالیں کافی ہوں گی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ہاں خدا کی محبت اور عبادات کے بعد سب سے بڑی قدر خلق خدا کی محبت سمجھی جاتی ہے۔ ایثار، خدمت، خیرات، صلۂ رحم، مہمان نوازی۔ غرض وہ سب صفات جن سے انسانی محبت ظاہر ہوتی ہے، دونوں کے ضابطۂ اخلاق میں بڑا اونچا درجہ رکھتی ہیں اور یہ دونوں کے ہاں زمانۂ انحطاط میں یہ چیزیں عموماً اپنے صحیح مصرف سے ہٹ کر غلط طریقے پر استعمال ہونے لگی ہیں۔ ایثار، خدمت اور مہمان نوازی استحصال کا تختۂ مشق ہو کر رہ گئی ہے۔ خیرات پیشہ ور گداگروں کو پیدا کرنے کا بہانہ بن گئی ہے۔ صلۂ رحم نے عزیز نوازی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہاں تک کہ مروّت یعنی ہمدردی کی ایک مستقل اور عام کیفیت جو ہندوستانیوں کی عام صفت سمجھی جاتی تھی ایک مہلک اخلاقی کمزوری بن گئی ہے جو انسان کی اخلاقی جرأت کو فنا کر دیتی ہے اور اسے موم کی ناک بنا دیتی ہے، جس کو ہر شخص جدھر چاہتا ہے موڑ لیتا ہے۔ اسی طرح عفت اور پاکبازی، خصوصاً جنسی ضبط نفس کو بھی ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے ہندوستانیوں کی نظر میں یکساں اہمیت حاصل ہے۔ ان کے اور اہل یورپ کے اخلاقی ضابطہ میں ایک صریحی فرق یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستانی عموماً جنسی جرائم کو ان جرائم سے، جو ملکیت کے خلاف ہوں، کہیں زیادہ سنگین سمجھتے ہیں۔ دراں حالیکہ اہل یورپ جنسی لغزشوں کو قابلِ درگذر اور چوری، خیانت وغیرہ کو ناقابل معافی جانتے ہیں مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی روح نے اپنے آپ کو ضابطہ اجتماعی ادارات میں دکھایا ہے، ان میں بہت اختلاف ہے۔ لیکن جہاں اس نے اپنے آپ کو زندگی کی واقعی قوتوں سے متعلق کر کے، طرز عمل اور طرز معاشرت یا مادی اشیا کی شکل میں ظاہر کیا ہے وہاں بڑی حد تک اشتراک نظر آتا ہے عملی اخلاق کا یہ اشتراک دونوں کی معاشرتی زندگی، خصوصاً خاندانی زندگی کی یکسانی میں اور بھی زیادہ نمایاں ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ہندو ذات پات کے نظام کے معتقد ہیں اور مسلمان معاشرتی مساوات کے قائل ہیں اس لئے دونوں کی معاشرتی زندگی کی ساخت مختلف ہونی چاہیئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ صدیوں تک ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں نے بھی اصولاً نہ سہی مگر عملاً نسل اور پیشے کی بنا پر جتھے بندی اختیار کر لی ہے اور جہاں تک قبائلی روح کا تعلق ہے دونوں میں فرق نوعیت کا نہیں بلکہ صرف درجے کا ہے۔ سچے مسلمان کسی طبقے اور کسی درجے کے ہوں ساتھ کھانے پینے میں پرہیز نہیں کرتے۔ لیکن شادی بیاہ میں ان کے ہاں بھی ذات اور برادری کا خیال ہندوؤں سے کم نہیں۔ جہاں تک

سیاسی اور معاشی زندگی کا تعلق ہے روشن خیال مسلمانوں کے اوپری طبقے کو چھوڑ کر عام مسلمانوں میں ذات برادری کی عصبیت ہندوؤں سے کم نہیں ہے، جس کا اظہار میونسپل کمیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور ایک حد تک صوبائی اور مرکزی کونسلوں کے انتخابات میں ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ غرض ہندو سماج اور مسلمان سماج دونوں بحر حیات کے اندر چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بٹی ہوئی ہیں۔ البتہ مسلمان جزیروں میں فاصلے مقابلتہً کم ہیں، ان کے درمیان نقل و حمل کا انتظام کچھ بہتر ہے اور انہیں پل باندھ کر ایک دوسرے سے ملا دینا زیادہ آسان ہے۔ دراصل ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرتی روح اپنے آپ کو خاندانی زندگی میں ظاہر کرتی ہے۔ خاندان ان کے ہاں، میاں بیوی اور بچوں کی چھوٹی سی اکائی نہیں، جیسی اہل یورپ کے ہاں ہوتی ہے، بلکہ ایک بہت بڑا حلقہ ہے جس میں بہت دور تک کے رشتہ دار شامل ہیں۔ ہندوؤں کے دھرم شاستر نے خاندانی ملکیت کو مشترک قرار دیا ہے اور شرع اسلام کے مطابق ہر شخص کی املاک اس کے بیٹوں اور بیٹیوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ لیکن عملاً ہندو اور مسلمان خاندانوں کی آمدنی اور خرچ کا بجٹ عام طور پر مجموعی ہوا کرتا ہے بلکہ اکثر صرف ایک شخص کمانے والا ہوتا ہے اور اسپر سارے خاندان کے خرچ کا بوجھ پڑ جاتا ہے۔ خاندان کے لوگ نہ صرف ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتے ہیں بلکہ ہر شخص اپنے آپ کو دوسروں کی خانگی اور عمومی زندگی کے ہر معاملے میں دخل دینے کا حقدار سمجھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خاندان کے ارکان خصوصاً عورتیں ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتی رہتی ہیں۔ مگر جب سارے خاندان کے مفاد یا آبرو کا معاملہ ہو تو عموماً سب ایک ہو جاتے ہیں۔ بزرگوں کی خصوصاً ماں باپ کی عزت اور اطاعت ہر شخص کا مقدس فرض سمجھا جاتا ہے اور جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، شوہر کی تابعداری اور خدمت پر حد سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ عورتوں کی حیثیت، ہندو اور مسلمان خاندان میں ایک سی ہے۔ اگرچہ اسلام نے عورتوں کو ہندو دھرم کے مقابلے میں بہت زیادہ حقوق دیئے ہیں لیکن آج دونوں معاشروں میں ان کا درجہ تقریباً یکساں ہے۔ مسلمان عورتوں میں مقابلتہً پردے کی سختیاں زیادہ اور تعلیم کم ہے اور وہ ان حقوق سے جو انکے مذہب نے ان کو دیئے ہیں بالکل فائدہ نہیں اٹھا سکتیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو چھوڑ کر، ہندو مسلمان، دونوں کی نظر میں عورت کسی مستقل شخصیت کی مالک نہیں، بلکہ مرد کا ضمیمہ ہے اور اسے احساس و خیال اور عمل میں مرد کے تابع ہونا چاہیئے۔

دونوں فرقوں کا رہنا سہنا، کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا، جزوی اختلافات کے ساتھ یکساں ہے۔ ایک خطے کے ہندو مسلمانوں میں، ان چیزوں کے لحاظ سے جو تھوڑا بہت فرق ہے وہ اس سے کم ہے جو ایک خطے اور دوسرے خطے کے ہندوؤں میں آپس میں موجود ہے۔ جہاں کہیں ہندوستانی تہذیب کا اثر اب تک باقی ہے، خصوصاً شمالی ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں، شادی بیاہ، پیدائش اور موت کی رسموں میں عام طور پر زندگی کے آداب و رسوم میں بہت کچھ اشتراک پایا جاتا ہے۔

ہم لوگ تو تنگ نظری کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو حد سے زیادہ اہمیت دینے کے عادی ہو گئے ہیں، لیکن غیر ملک کے لوگ جو ہندوستان میں مدتوں رہ چکے ہیں، مختلف صوبوں کے باشندوں میں تو آسانی سے تمیز کر لیتے ہیں لیکن ہندو مسلمان میں تمیز کرنا ان کے لئے نہایت ہی مشکل ہے۔ اور یہ تجربہ تو ہم میں اکثر کو ہوا ہوگا کہ ایک ہی صوبے کے لوگ اگر انگریزی لباس، یا ہندوستانی تہذیب کا عام لباس یعنی کرتا پاجامہ وغیرہ، یا اپنے صوبہ کا مخصوص لباس پہنے ہوں اور انگریزی میں یا صوبے کی زبان میں گفتگو کرتے ہوں تو بغیر گہری واقفیت کے مدتوں تک پتہ نہیں چلتا کہ یہ ہندو ہیں یا مسلمان۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے، جسے اہلِ نظر مشترک تہذیب کے اہم ترین عناصر میں شمار کرتے ہیں، ابتک صورتِ حال تقریباً وہی ہے جو عام طرز زندگی میں ہے یعنی ہر صوبے کے ہندو مسلمان اپنی صوبائی زبان بولتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ سب صوبوں میں (زیادہ تر شہروں میں) کچھ لوگ انگریزی اور بہت سے لوگ ہندوستانی زبان بھی بول سکتے ہیں، جو ملک کی قومی زبان بننے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے لیکن بدقسمتی سے خود ہندوستانی زبان کے گھر یعنی صوبہ متحدہ میں یہ جھگڑا چھڑ گیا ہے کہ اردو قومی زبان بن سکتی ہے اور بننی چاہیئے یا ہندی۔ قومی زبان کا پیچیدہ مسئلہ تفصیلی بحث چاہتا ہے۔ لیکن یہاں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ زبان کے میدان میں اب تک یہ امکانات موجود ہیں کہ ہندو مسلمانوں میں اتنا تہذیبی اتحاد ہو جائے جو سیاسی اتحاد کیلئے ضروری ہے۔ مگر جس طرح ان امکانات کو اتحاد کے مخالف بالارادہ اور اتحاد کے حامی بلاارادہ مٹا رہے ہیں اس سے زیادہ مشترک تہذیب اور مشترک قومیت کیلئے کوئی چیز خطرناک نہیں ہو سکتی۔

سب سے بڑی وحدت آفریں قوت، عہدِ مغلیہ کی طرح آج بھی فنونِ لطیفہ کی ہے۔ باوجود اسکے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے نزدیک آرٹ کا ذہنی تصور الگ الگ ہے (جیسا کہ ٹیگور اور اقبال نے ہمیں بتایا ہے) جب دونوں تصورات آرٹ کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے دل کی گہرائیوں سے وجدان اور احساس کی وحدت اس زور و شور سے ابلتی ہے کہ سارے ذہنی اختلافات کو بہا لے جاتی ہے۔ آرٹ کی دنیا میں پہنچ کر ہندو مسلمان اور مادرِ ہند کے دوسرے فرزند یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ سب کے اندر زندگی کا ایک ہی دھارا بہتا ہے، اس کی لہریں ایک ہی تال سے اٹھتی اور گرتی ہیں، طوفان ایک ہی طرح کے آتے ہیں۔ سکون ایک ہی انداز کا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف خطوں اور مختلف فرقوں کے اہل ذوق ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں ایک دوسرے کے دل کی زبان جو رنگوں اور سروں سے کام لیتی ہیں، اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یوں تو تہذیب کے اور

شعبوں کی طرح ہمارے ہاں آرٹ میں بھی عہد قدیم، عہد وسطیٰ اور عہد جدید کے اثرات پہلو بہ پہلو موجود ہیں، اجنتا کی نقاشی راجپوت قلم اور یورپ کے مختلف طرز مصوری، کلاسیکی ہندو موسیقی، مسلمانوں کے عہد میں ایجاد کئے ہوئے طرز اور یورپی موسیقی کی سستی نقلیں جو تھیٹر اور فلم میں مقبول ہیں، اور ان سب کے پیروؤں کے الگ الگ حلقے ہیں لیکن ان کی تقسیم مذہب و ملت کی بنا پر نہیں، بلکہ ذوقِ فن کے مدارج کے ارتقا کی بنا پر ہے۔ ہر طبقے کے فن کاروں اور مبصروں میں ہندو مسلمان بلاتفریق پائے جاتے ہیں اور ان میں یک جہتی اور برادری کی وہ روح نظر آتی ہے جو قومی اتحاد کے حامیوں کے دلوں میں امید کا چراغ روشن رکھتی ہے۔

یہ تو اس مشترک زندگی کے چند پہلو ہیں جو عہد وسطیٰ سے خصوصاً مغلوں کے زمانے سے ورثے میں ملی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ تاریخ کے عہد جدید نے انگریزی حکومت اور مغربی تہذیب کے سابقے کے ذریعے سے اشتراک کے کون کون سے نئے عناصر پیدا کر دئے ہیں۔ ہمارے ملک کے قوم پرور حلقوں میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندو مسلمانوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ انگریزی حکومت نے پیدا کئے ہیں۔ یہ بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت حاصل کرنے اور اسے قائم رکھنے میں ہمارے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھایا اور اپنی سیاسی اور تعلیمی پالسی کے ذریعے ان کو بڑھانے کی کوشش کی مگر یہ صحیح نہیں کہ ان کے پیدا کرنے کی ذمہ داری انگریزی حکومت پر ہے۔ اختلافات ایک حد تک ابتدا سے موجود تھے۔ سلطنت مغلیہ کی وحدت آفریں قوت نے ایک حد تک انہیں دبائے رکھا، لیکن اس کے زوال کے ساتھ پھر ابھرنے لگے۔ یہاں تک کہ انگریزی حکومت اور مغربی تہذیب کے خلاف ردِ عمل نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذہن کو صدیوں کے پیچھے ان کی تہذیبوں کے سرچشموں تک پہنچا کر ان کے باہمی فرق کو عارضی طور پر اور بھی بڑھا دیا۔ لیکن یہ انگریزی حکومت اور مغربی تہذیب کا بالواسطہ اثر تھا۔ ان کے بلا واسطہ اثرات تو مجموعی طور پر ہندوستانیوں کی زندگیوں میں وحدت اور ربط پیدا کرنے کا باعث ہوئے، جس کے دو پہلو تھے، منفی اور مثبت۔ منفی پہلو تو مخالفت کی وہ مشترک روح ہے جو غیر ملکی تسلط کے خلاف سارے ملک میں سلگ رہی تھی جس کے شعلے غدر کے زمانے میں بھڑک کر رہ گئے اور جس کی چنگاریاں راکھ میں دبی ہوئی اب تک موجود ہیں۔ یوں تو لوگوں کے دل میں بدیسی حکومت کی طرف سے میل ہوا ہی کرتا ہے لیکن انگریزوں کی حکومت میں بعض ایسی خصوصیات تھیں جنہوں نے اہلِ ہند کے احساسِ محکومی کو تیز کر کے سوہانِ روح بنا دیا اور اس کی مخالفت کو عداوت کے درجے تک پہنچا دیا۔ اول یہ کہ یہ شخص یا ایک خاندان کی حکومت نہ تھی بلکہ ایک پوری قوم کی، جسے ہندوستانی یہ سمجھ کر کہ معمولی سے معمولی انگریز کو ان کا حکمران بنا دیا گیا ہے، اور زیادہ باعث ذلت خیال کرتے تھے۔ ان کے اس خیال کو انگریزوں کی معاشرتی علیحدگی، اور نسلی غرور سے جو انیسویں صدی کی سامراجی ذہنیت نے ان میں پیدا کر دیا تھا اور تقویت پہنچی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ہندوستانیوں کے دل میں مخالفت کی روح کو اکسانے کی زیادہ ذمہ داری خود ان کے عقدۂ کمتری پر ہے یا انگریزوں کے عقدۂ برتری پر۔ بہر حال یہ مخالفت حقیقی ہے، شدید ہے اور عام ہے اور ہندوستانیوں میں ایک منفی رابطے کا کام دیتی ہے۔ دوسرے، انگریزی حکومت نے جس طرح سیاسی اقتدار کو معاشی استحصال کا ذریعہ بنایا اس کے تباہ کن اثرات سے ہندو مسلمان سبھی متاثر ہوئے اور اس چھوٹے سے طبقے کے سوا جو استحصال کے آلۂ کار کی حیثیت سے انگریزوں کے ساتھ شریک تھا، ہندوستانیوں کے دلوں میں ایک ہی ظالم قوت کے ظلم کا شکار ہونے کی وجہ سے ہم جنسی اور ہمدردی کی ایک اندرونی قوت پیدا ہو گئی۔

مثبت پہلو اس وحدت کا جو انگریزی حکومت نے ہندوستان کے اندر پیدا کی، قومیت کی سیاسی تحریک اور جدیدیت کی ذہنی تحریک کے اندر نظر آتا ہے۔ سارے ہندوستان کو ایک ہی قانون کی پرامن حکومت کے اندر لا کر مختلف خطوں میں باہم آمد و رفت کی سہولتیں پیدا کر کے، انگریزی زبان کے ذریعے ملک کے اونچے اور متوسط طبقوں کو تبادلۂ خیالات کا موقع دے کر، مغربی طرز معاشرت کے ذریعے ان میں ایک ظاہری ہم رنگی پیدا کر کے، انگریزوں نے ہندوستانیوں کے دبے ہوئے احساسِ وحدت کو ابھارا اور اسے ایک زندہ شعور بنا دیا بلکہ انگریز قوم کے بعض افراد نے اس عام شعور کو ایک منظم قومی تحریک کی شکل میں لانے میں بھی مدد دی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی انگریزی حکومت قومی تحریک کو، جب سے کہ اس نے تحریک آزادی کا رنگ اختیار کیا برابر کچلنے کی کوشش کرتی رہی اور بعض حق پرست انگریز ہندوستان کی تحریک آزادی کی تائید میں اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ جب کبھی ہندوستان کے لوگ ان مخالفانہ جذبات سے آزاد ہو کر، جو اس وقت قدرتی طور پر ان کے دلوں پر مسلط ہیں، پچھلے سو سال کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو انہیں ماننا پڑے گا کہ ہندوستان میں سیاسی وحدت پیدا کرنے میں انگریزی حکومت اور انگریزی قوم کا حصہ کچھ کم نہیں۔

اب رہی وہ مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم جو انگریزی حکومت کے ساتھ ہندوستان میں آئی تو اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں اس کے اثرات زیادہ مضر ثابت ہوئے۔ لیکن جب رفتہ رفتہ ہندوستانی ذہن مغربی تہذیب کی سطح کے نیچے گہرائی میں اترا اور ان مقامی عناصر سے قطع نظر کر کے جو یورپ اور امریکا کے مخصوص حالات اور روایات کی پیداوار ہیں، جدیدیت کی عالمگیر روح کو جذب کرنے لگا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے اندر نہ صرف ہندوستانیوں کے ذہنی

جمود میں حرکت پیدا کرنے کا بلکہ ان کی تہذیب کے منتشر اجزا کو ایک رشتے میں مربوط کرنے کا سامان موجود ہے۔ اپنی اس فطری خصوصیت کی وجہ سے کہ وہ ہر قسم کے تغیر و تبدل کی منزلیں بجائے انقلابی رفتار کے ارتقائی رفتار سے طے کرتا ہے، ہندوستانی ذہن نے ابھی تک جدیدیت کی راہ میں بہت تھوڑی ترقی کی ہے مگر اس محدود ترقی کے نتائج بھی امید افزا ہیں۔ اس کی بدولت مختلف فرقوں کے روشن خیال افراد زندگی کے بہت سے مسائل کو ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور ایک ہی معیار پر جانچنے لگے ہیں۔

جدیدیت کے جن عناصر کو تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے جذب کرنا شروع کیا ہے ان میں سے دو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک علمی طرزِ فکر اور دوسرے جمہوری تصورِ زندگی۔ جمہوریت کا اشتراکی نقطۂ نظر جس نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے یورپ میں بڑی مقبولیت حاصل کر لی ہے ابھی نیا نیا ہندوستانیوں کے سامنے آیا ہے۔ لیکن جتنی توجہ اسکی طرف ہو رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد ہندوستانی ذہن میں ایک اہم جگہ حاصل کر لے گا۔ جمہوریت اور اس کے لوازم یعنی آزادیٔ فکر، مذہبی اور تہذیبی رواداری، اجتماعی زندگی کی بنیاد جبر و تشدد پر نہیں بلکہ افہام و تفہیم پر رکھنے کا اصول قومی اتحاد کی بڑی زبردست قوتیں ہیں۔ اسلئے ہر فرقے کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں جمہوریت کے ایک قومی رجحان کا موجود ہونا متحدہ قومیت کے نشوونما کے لئے ایک مفید صورتِ حال ہے۔

جہاں تک علمی طرزِ خیال کا تعلق ہے، اس کا اصل تصور یعنی علم کی بنیاد مشاہدے اور تجربے پر رکھنا، ہندوؤں اور مسلمانوں کی ذہنی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہ تھی۔ ہندوؤں کے ہاں نیائے اور ویشیشک کے فلسفیانہ نظام اسی طرزِ فکر پر مبنی تھے۔ اور مسلمانوں کی ساری ذہنی زندگی میں صدیوں تک علمی روح جاری و ساری رہ چکی تھی۔ لیکن یہ پرانی باتیں ہیں۔ دو ہزار سال سے ہندوستان میں ہندوؤں کی اور ساڑھے سات سو سال سے مسلمانوں کی علمی زندگی میں مشاہدے اور تجربے کو نظرانداز کر کے تجرد و خیال آرائی پر زور دیا جا رہا ہے۔ ان میں علمی فکر کی تجدید جسکے آثار آج نظر آ رہے ہیں سراسر مغربی تہذیب کی روحِ جدیدیت کی منت پذیر ہے اور یہ جدید علمی طرزِ خیال جس نے ہندوستانی ذہن میں جڑ پکڑنی شروع کی ہے صرف یہیں تک محدود نہیں کہ مشاہدے اور تجربے کو علم کا ماخذ اور اسکی صحت کا معیار قرار دیا جائے بلکہ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ علم سے ایک طرف فطرت کی قوتوں کی تسخیر اور انسان کے بقا و راحت کے اسباب میں اضافہ کرنے کا اور دوسری طرف انفرادی اور اجتماعی زندگی کی معقول تنظیم کا کام لیا جائے۔ ہندوستانی ذہن نے اس طرزِ خیال کو جوں کا توں اختیار نہیں کیا بلکہ اس کو خالص مادیت اور واقعیت کی سطح سے بلند کر کے مادی اور روحانی، واقعی اور عینی اقدار میں امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جیسا کہ آپ کو ٹیگور، اقبال اور رادھاکرشنن کے ہاں نظر آتا ہے۔ پھر بھی جدیدیت کا یہ بنیادی اصول تسلیم کر لیا گیا ہے کہ روحانی فکر اور عینی تصورات کو عملی زندگی میں برتنے سے پہلے انہیں مفیدیت کی کسوٹی پر کسنا، یعنی اس معیار پر جانچنا چاہئے کہ وہ ہماری واقعی دنیا کی متفرق اور محسوس ضرورتوں کو کس حد تک پورا کرتے ہیں۔ یہ مشترک اور متحد تہذیب کی ایک نئی بنیاد ہے جس کی اہمیت کو ہم نے ابھی پوری طرح نہیں سمجھا ہے۔

---

اس سرسری جائزے سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہبی شعور جو ان کی تہذیبوں کا سرچشمہ ہے، یکساں ہے لیکن اس باطنی شعور کی ذہنی تعبیر میں فرق ہے اور یہ فرق مذہبی اور نیم مذہبی تصورات و ادارات کے اختلاف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ زبانوں کا اختلاف دراصل فرقہ واری نہیں بلکہ صوبہ واری ہے لیکن فرقہ واری بن گیا ہے۔ تاہم چونکہ دونوں تقریباً ہزار سال سے ایک ہی طبیعی اور عمرانی ماحول میں رہتے آئے ہیں، فطرت اور تاریخ کے یکساں سانچے میں ڈھلتے رہے ہیں، اس لئے ذہنی اختلافات کے باوجود ان کی مادی زندگی میں بلکہ ان کے عام مزاج اور مذاق میں ان کے اخلاق اور معاشرت میں بڑی حد تک یکسانی پائی جاتی ہے۔ اشتراک کا ایک نیا میدان جدیدیت نے پیدا کیا ہے۔ جو مغربی تہذیب کے ساتھ آئی ہے۔ اس میں غیر ملکی تسلط کی مخالفت، قومی آزادی کا ولولہ، جمہوریت پسندی اور (سب سے بڑھ کر) علمی طرزِ خیال۔ یہ عناصر وحدت آفریں قوتوں کا کام کر رہے ہیں۔

ان حقیقتوں کو پیش نظر رکھ کر قومی تہذیب کے مسئلے پر غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک مشترک قومی تہذیب کی تعمیر کے لئے کافی مسالہ ہے، لیکن بنی بنائی عمارت موجود نہیں۔ اس کے بنانے کیلئے شعوری کوشش کی، ایک معقول نقشے کی اور ایک مضبوط بنیاد کی ضرورت ہے، مگر یہ بدقسمتی سے اب تک قومی اتحاد کے حامی عام طور پر اس دھوکے میں رہے ہیں کہ قومی تہذیب کی عمارت صرف بالقوۃ ہی نہیں بلکہ بالفعل وجود رکھتی ہے، اس لئے انہوں نے اس کے لئے نقشہ بنانے کی یا بنیاد تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ جن چند اشخاص کو حقیقی صورتِ حال کا احساس ہوا انہوں نے ہندوستانی تہذیب کیلئے یورپ کی وحدانی قومی تہذیبوں کا نقشہ اور مذہبی اتحاد کی بنیاد تجویز کی۔ انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں نسلی اور لسانی اختلاف کی وجہ سے زمانۂ قدیم کے ان عہدوں میں بھی جب مذہبی اتحاد موجود تھا جدید مغربی

ملکوں کی سی وحدانی تہذیب نہ بن سکی تو ہمارے زمانے میں جب مختلف صوبہ واد تہذیبوں کے علاوہ جداگانہ فرقہ وار تہذیبیں بھی موجود ہیں، ان سب کو مٹا کر ایک واحد ہمہ گیر تہذیب کیونکر بنائی جا سکتی ہے؟ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ مذہب کو قومی تہذیب کی بنیاد قرار دے کر ان حالات میں جو مغربی ملکوں کے حالات کے مقابلے میں قومی وحدت کے لئے کم سازگار ہیں، وہ مغربی قومیت سے بھی زیادہ مکمل وحدت کا خواب دیکھ رہے ہیں، جو خواب کی حیثیت سے اچھا ہو، لیکن عملی پالیسی کی حیثیت سے ناقابلِ عمل اور مضر ہے۔

ناقابل عمل ہونا تو خیر ظاہری ہے مگر مضر ہم اس پالیسی کو اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس کا نام لیتے ہی ایک طرف تو صوبائی تہذیبوں کے حامی بھڑک گئے اور یہ سمجھ کر کہ مشترک تہذیب کی تحریک ان کی زبانوں کو اور دوسری تہذیبی خصوصیات کو مٹا دے گی، اس تحریک کی مخالفت کرنے لگے اور دوسری طرف ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب میں شدید رقابت پیدا ہو گئی۔ اور چونکہ ہندو نشاۃ ثانیہ کی تحریک اپنے آپ کو ہندوستان کی قومی تحریک کہتی ہے اور لوں بھی ہندو قومی اور ہندوستانی کا لفظ بے تکلف اپنی فرقہ وارانہ مذہبی تحریکوں اور اداروں کے لئے استعمال کرتے ہیں اسلئے مسلمانوں کے دل میں یہ اندیشہ اٹھ کھڑا ہوا کہ قومی تہذیب کے نام سے ہندو تہذیب ان پر مسلط کر دی جائے گی۔ اس اندیشہ کی وجہ زیادہ تر قومی زبان کی تحریک تھی۔

اس کے علاوہ جو کوششیں بعض قوم پروروں نے نہایت نیک نیتی سے اس امر میں کیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی اتحاد پیدا کریں، ان کا رجحان عام طور پر یہ تھا کہ دونوں مذاہب میں صرف اس کے شعور باطنی کو لے لیں جو دونوں میں مشترک ہے اور ان ذہنی نظریات اور اجتماعی اداروں کو جو انہوں نے اس شعور کی مختلف تعبیروں کی بنا پر تعمیر کئے ہیں، یعنی مذہب کے پورے نظاموں کو رد کر دیں۔ اس رجحان کو عام طور پر ہندوؤں نے بھی پسند نہیں کیا اور مسلمانوں نے تو اسے اپنی مذہبی زندگی کیلئے مہلک سمجھا، اس لئے کہ ان کے نزدیک باطنی شعور بجائے خود محض ایک داخلی اور عارضی کیفیت ہے اور اس میں سچی مذہبی شان اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ پیمبرانہ شعور کی رہنمائی میں تصورات اور ادارات کی معین اور مستقل شکل اختیار کر لے۔ اس لئے وہ نظام مذہب کو اصل مذہب سمجھتے ہیں اور اس کو کسی طرح قربان کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ خود یہ چیز کہ مذہبی وحدت کی بنا سیاسی مصالح پر رکھی جائے، ہندوستانی طبیعت کے خلاف ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی اتحاد کی جو کوششیں سیاسی یا دوسرے غیر مذہبی محرکات کی بنا پر کی گئیں مثلاً اکبر کی توحید الٰہی کا حلقہ بنانے کی کوشش، انہیں ہندوستانی ذہن نے نفرت کے ساتھ رد کر دیا۔ البتہ کبیر، نانک اور دوسرے صوفی بزرگوں کی مذہبی تحریکیں جو حقیقی اور خالص دینی محرک سے پیدا ہوئیں عام طور پر قدر اور عزت کی نظر سے دیکھی گئیں اور اگرچہ وہ مذہبی اتحاد پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئیں لیکن ان سے مصالحت اور رواداری کی ایک عام فضا کے پیدا ہونے میں بہت مدد ملی۔

غرض ہندوستان کی تاریخ بھی ہمیں یہ سبق دیتی ہے اور موجودہ حالات بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہمیں وحدانی "تہذیب بنانے اور اس کی بنا مذہب پر رکھنے کا خیال ترک کر دینا چاہیئے۔ بلکہ عہدِ مغلیہ کے نمونے کو سامنے رکھتے ہوئے ایک "وفاقی" تہذیب کا نقشہ بنانا چاہیے جس میں صوبوں اور فرقوں کی جداگانہ تہذیبیں برقرار رہیں لیکن ان کی تہ میں ایک مشترک ہندوستانی تہذیب بھی ہو، جو سارے ملک کو ایک رشتۂ اتحاد میں مربوط کر دے۔ اس نئی تہذیب کی تعمیر میں ہمیں اس سارے مسالے سے کام لینا ہے جو ہمیں عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تہذیب سے ورثے میں ملا ہے یعنی ایک مشترک زبان جو قریب قریب سارے ملک میں سمجھی جاتی ہے اور جس میں اخلاقی، معاشرتی، جمالی تہذیب اور مادی تمدن کے بے شمار مشترک عناصر ہیں۔ لیکن ان سب چیزوں کو ہم اپنی نئی تہذیب میں بجنسہ داخل نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان میں سے بعض بوسیدہ اور فرسودہ اجزا کو چھانٹنا پڑے گا اور بعض میں اتنی ترمیم کرنی پڑے گی کہ وہ اس روحِ جدیدیت کے ساتھ کھپ جائیں جسے ہم نہ صرف تاریخی بلکہ حیاتی ضرورت کے تقاضے سے اختیار کر رہے ہیں۔ یہ روحِ جدیدیت جس کی اہم ترین خصوصیات علمی طرز اور جمہوری تصورِ زندگی ہیں ہماری مشترک تہذیبی میراث میں سرایت کر کے ایک طرف اس میں ایک نئی قوتِ حیات اور نئی معنویت پیدا کر رہی ہے اور دوسری طرف ہندوستان کے فرقوں میں ذہنی اتحاد کی ایک نئی اور مستحکم بنیاد قائم کر رہی ہے، جو عہدِ مغلیہ کی ہندوستانی تہذیب میں موجود نہیں تھی۔ نئی ہندوستانی تہذیب کی تعمیر میں علاوہ ان مشترک عناصر کے جو جغرافی، معاشی اور تاریخی قوتوں کی بدولت پہلے سے موجود ہیں فرقہ واری یا صوبہ واری تہذیبوں کے ایسے عناصر سے کام لیا جا سکتا ہے جن کے متعلق عام طور پر مان لیا جائے کہ جدیدیت کے علمی اور جمہوری معیاروں پر پورے اترتے ہیں یعنی بجائے خود معقول اور مناسب ہیں اور کسی ایک فرقے یا صوبے کے لئے نہیں بلکہ سارے ملک کیلئے مفید ہیں۔

## غزل —— شاعر لکھنوی

ہر اشک آئینہ ہے مرے اضطراب کا
ہر سانس دے رہی ہے پتہ انقلاب کا

ہستی یہ ہے گھمنڈ تجھے ناسمجھ تو دیکھ
اٹھ اٹھ کے سطح آب پہ مٹنا حباب کا

اے ضبط المدد نہ مرے ہاتھوں سے بری بات
ساغر چھلکنے پائے نہ چشم پر آب کا

ظالم نہ پوچھ مجھ سے مری بیقراریاں
رکھ دل پہ ہاتھ دیکھ لے حال اضطراب کا

شاعر رہے گا یاد تجھے تا بہ زندگی
وہ بے خودی کسی کی وہ عالم شباب کا

# چنگی کا صدر

مصنفہ
آنتون چیخوف

مترجمہ
بشیر الدین

روسی افسانہ

یورال کی پہاڑیوں کے دوسری طرف بسے ہوئے ایک شہر میں ایک دن یہ خبر گرم ہوئی کہ راحت حلم نامی ایک معزز ایرانی افسر شہر میں آیا ہے اور ہوٹل "جاپان" میں مقیم ہے۔ عام شہریوں پر اس خبر کا کوئی اثر نہ تھا، ایرانی آیا ہے، آیا ہوگا۔ لیکن شہر کی چنگی کے صدر استیپان الوانچ کوتسین کو دفتر کے منشی سے جب یہ خبر معلوم ہوئی تو ان پر بڑا اثر پڑا وہ سوچ میں پڑ گئے اور پوچھنے لگے

"کہاں کا قصد ہے ان کا"

"پیرس یا لندن کا"

"تو بڑی آسامی ہے"

"خدا بہتر جانتا ہے"

دفتر سے گھر لوٹ کر صدر چنگی نے کھانا کھایا اور پھر سوچ میں پڑ گیا۔ یہاں تک کہ شام اسی غور و فکر میں گذر گئی، معزز ایرانی افسر کی تشریف آوری سے انھیں گہری دلچسپی پیدا ہوگئی، ان کو ایسا معلوم ہوا گویا ان کی تقدیر ہی راحت حلم کو یہاں کھینچ کر لائی ہے اور گویا وہ مبارک گھڑی آن پہنچی جس کا انھیں شدت سے انتظار تھا، جس کا وہ مدتوں سے خواب دیکھ رہے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ کوتسین دو تمغوں کے مالک تھے، ان میں سے ایک تمغہ تیسرے درجہ کا سرخ صلیب کا تھا اور دوسرا ڈوبتوں کو بچانے والی انجمن کا، علاوہ ان دو تمغوں کے کوتسین نے ایک چھوٹی سی بندوق بھی صلیب کی شکل کی بنا رکھی تھی جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ اس کھلونے کو بھی وہ ایک تمغہ تصور کرتے تھے اور اس کو ایک زنجیر میں باندھ کر اپنی وردی پر لٹکائے رہتے تھے۔ اس خیال سے کہ آدمی کے پاس جتنے زیادہ تمغے ہوں اتنی ہی زیادہ اس کی عزت ہوتی ہے اسی لئے صدر چنگی کے دل میں یہ حسرت تھی کہ وہ کسی طرح "شیر اور سورج" کا ایرانی تمغہ بھی حاصل کرے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اس تمغے کو حاصل کرنے کے لئے نہ اس کو لام پر جانے کی ضرورت تھی نہ عطیہ دینے کی اور نہ چناؤ میں حصہ لینے کی۔ معزز ایرانی افسر کی تشریف آوری کو اس نے اپنے مقصد کے حاصل کرنے کا ایک زریں موقع سمجھا۔

اگلے دن دوپہر کو کوتسین سج کر ہوٹل "جاپان" کی طرف روانہ ہوا۔ قسمت نے اس کا ساتھ دیا، جب وہ ایرانی کے کمرہ میں داخل ہوا تو اس کو تنہا پایا۔ راحت حلم ایک لحیم شحیم ایشائی تھا، اس کی ناک طوطے کی ناک کی طرح نوکیلی تھی اور آنکھیں باہر کو نکل پڑ رہی تھیں۔ ترکی ٹوپی پہنے وہ فرش پر بیٹھا ایک بکس میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔

"حضور کی مصروفیت میں مخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں"

کوتسین نے مسکراتے ہوئے کہا "حقیر استیپان الوانچ کوتسین۔۔ خاندانی، ذی اقتدار شہری، مقامی چنگی کا سردار حضور کی سرکار میں باریابی کا شرف حاصل کرنے کی اجازت چاہتا ہے، خادم اپنا فرض سمجھتا ہے کہ دوستانہ اور ہمسایہ طاقت کے نمائندے کی خدمت میں اپنی کورنش پیش کرے۔"

ایرانی مڑا اور بگڑی ہوئی فرانسیسی زبان میں اور ایسی آواز میں جو تختہ پر ہتھوڑا مارنے سے پیدا ہوتی ہے، بڑبڑایا۔

کوتسین نے جس نے خیر مقدم کے لئے کچھ الفاظ پہلے ہی سے تیار کر رکھے تھے، کہنا شروع کیا۔ "ایران کی سرحد ہمارے وسیع ملک کی حدود سے ملتی ہے۔ لہٰذا باہمی ہمدردی کا یہ تقاضا ہے کہ میں ان دو بڑے ملکوں کے درمیان استحکام کے جذبات کا اظہار کروں"

ایرانی اٹھا اور بھدی آواز میں کچھ بڑبڑایا۔ کوتسین نے جو کہ زبانوں سے ناواقف تھا، سر کی حرکت سے اشارہ کیا کہ وہ کچھ نہیں سمجھ سکا۔

"پھر میں اس سے بات چیت کیسے کروں" وہ سوچنے لگا، "مجھے چاہئے کہ میں کسی مترجم سے مدد لوں، مگر معاملہ ٹیڑھا ہے، مطلب کی بات دوسروں کے سامنے میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ مترجم تو فوراً سارے شہر میں ہماری باتوں کا ڈھنڈورا پیٹ دے گا"

اب کوتسین نے وہ چند اجنبی الفاظ یاد کرنے شروع کئے جنھیں وہ برابر اخباروں میں دیکھا کرتا تھا۔

"میں شہر کی چنگی کا صدر ہوں" وہ بڑبڑایا "یعنی لارڈ میر میونسپلٹی۔ ہاں۔ سمجھ میں آیا آپ کے"

کوتسین نے چاہا کہ الفاظ کے ذریعہ یا نقالی سے اپنی سماجی حیثیت کو ایرانی پر ظاہر کردے۔ پر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا طریقہ اختیار کرے۔ دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک تصویر نے جس کے نیچے بڑے حروف میں "شہر وینس"

---

؎ اس افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ترجمہ روسی زبان سے براہ راست اردو میں کیا گیا ہے۔

لکھا تھا، اس کی مدد کی۔ اس نے انگلیوں سے لفظ شہر کی طرف اشارہ کیا اور پھر اپنے سر کی طرف، گویا اپنے خیال میں اس نے اس طریقہ سے "شہر کا میر" (یعنی سردار) ترتیب دے دیا۔ ایرانی کچھ نہ کچھ سمجھ سکا۔ فقط مسکراتے ہوئے کہا "کیا خوب، کیا خوب" اس قصہ میں آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ اس کے بعد کوتستین نے ایرانی کے زانو اور کندھے کو چھو کر کہا۔

"سمجھ میں آیا آپ کے۔ جی ہاں بحیثیت لارڈ میئر میونسپلٹی کے میں حضور سے درخواست کرتا ہوں کہ حضور ایک مختصر سی سیر کو تشریف لے چلیں۔ سمجھے حضور سیر کو"

کوتستین نے تصویر میں شہر ونیس پر ایک انگلی رکھی اور دو انگلیوں کو ہلا کر ٹہلنے کی نقل اتاری، راحت حلم، جو کوتستین کے تمغوں پر نظر جمائے ہوئے تھا، یہ سمجھا کہ کوتستین شہر کا سب سے زیادہ معزز شخص ہے۔ لفظ سیر اس کی سمجھ میں آگیا اور وہ مسکرایا۔ دونوں نے اپنے اپنے اوورکوٹ پہنے اور کمرے سے نکل کھڑے ہوئے۔ نیچے اتر کر رسٹورانٹ کے دروازہ پر کوتستین رک گیا اور سوچنے لگا، ایرانی کو کھانے کی دعوت دی جائے تو کوئی ہرج نہ ہوگا۔

روسی رواج کے مطابق بے جا نہ ہوگا اگر حضور کچھ خورد نوش۔ شمپین۔ وغیرہ۔ سمجھے حضور۔ معزز ایرانی اشارہ کو فوراً سمجھ گیا دونوں رسٹورانٹ کی بہترین میز پر بیٹھ گئے اور شمپین کے ساتھ کھانے کا لطف اٹھانے لگے۔

"ایران کی خوش اقبالی کا جام صحت" کوتستین نے کہا "ہم روسیوں کو ایرانی بیحد پسند ہیں۔ گو ہم دونوں قومیں مختلف مذاہب کی پابند ہیں لیکن مشترک مفادہ باہمی مفاد، ایشا کا بازار صلح آمیز فتوحات گویا کہ"

معزز ایرانی نے جی کھول کر کھانا کھایا اور خوب شراب پی، اس نے کانٹے کو مچھلی کے ٹکڑے پر لگا کر لطف اندوزی کے ساتھ سر کو ہلایا اور کہا۔

"خوب بہت خوب"

"آپ کو یہ مچھلی پسند ہے" کوتستین نے خوش ہو کر کہا "بہت بہتر، اچھی بات" اور نوکر کی طرف مڑ کر "دیکھو ایسی دو بہترین مچھلیاں فلاں کمرے میں پہنچا دو"

اس کے بعد جنگی کے صدر اور معزز ایرانی چڑیا گھر کی سیر کو نکلے۔ شہر کے لوگوں نے دیکھا کہ ان کا استیپان ایوانچ جس کی رنگت شراب سے بھی زیادہ سرخ ہو رہی تھی اور جو بیحد خوش معلوم ہو رہا تھا، ایرانی کو ساتھ لئے ہوئے شہر کی مشہور گلیوں، کوچوں کے نظارے دکھاتا ہوا رہا تھا کوتستین ایرانی کو دیدبان پر لے گیا۔ دونوں دیدبان کے پتھر کے بنے ہوئے پھاٹک پر رکے، پھاٹک پر شیروں کے بت بنے ہوئے تھے، وہاں

اس نے پہلے شیروں کی طرف اشارہ کیا، پھر سورج کی طرف اور پھر اپنے سینہ کی طرف، دوبارہ شیروں کی طرف، پھر سورج کی طرف اور اپنے سینہ کی طرف۔ ایرانی نے سر کو جنبش دی۔ گویا کہ اس کو ان اشاروں سے اتفاق ہے اور اپنے سفید دانت نکال دئے۔ شام کو دونوں نے ہوٹل "جاپان" میں بیٹھ کر موسیقی سنی اور جب رات ہوئی ۔ ۔ ۔ رخ کیا۔

اگلے روز کوتستین دفتر پہنچا، دفتر کے ملازمین اس کے انداز کو دیکھ کر بھانپ گئے کہ ضرور کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے۔ ان کے منشی نے مسکراتے ہوئے طنز آمیز لہجے میں کہا۔

"ایرانیوں میں ایک رسم ہے کہ جب کبھی کوئی معزز مہمان کسی کے یہاں آئے تو اس کی شان میں میزبان ایک بکرا اپنے ہاتھوں سے ذبح کرتا ہے"

تھوڑی دیر بعد کوتستین کو ایک لفافہ ملا۔ لفافہ کو چاک کیا تو دیکھا کہ کاغذ پر ایک خاکہ کھنچا ہے، اس خاکہ میں ایرانی کی تصویر تھی، ایرانی کے سامنے کوتستین ہاتھ پھیلائے دو زانو بیٹھا تھا۔

یہ خاکہ دیکھ کر کوتستین کو کچھ تشویش ہوئی لیکن اس کا یہ جذبہ دیرپا نہ تھا۔ دوپہر کو پھر وہ معزز ایرانی کے یہاں پہنچا، پھر اس کی خاطر تواضع کی اور پھر شہر کا نظارہ دکھاتے ہوئے پتھر کے پھاٹک کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے شیروں کی طرف پھر سورج کی طرف اور پھر اپنے سینہ کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں سے چل کر ہوٹل "جاپان" میں رات کا کھانا کھایا اور چیروٹ منہ میں دبائے شراب میں مست دیدبان پہنچے۔ وہاں کوتستین نے ایرانی کو ایک خاص تماشہ دکھانا چاہا۔ چوکیدار کو آواز دی کہ وہ خطرہ کا الارم بجائے لیکن اس وقت آگ بجھانے والا عملہ چھٹی پر تھا۔

وہاں سے چل کر ہوٹل "لندن" میں چائے پی، وہاں ایرانی ان سے رخصت ہونے لگا۔ اس کو خیرباد کہتے ہوئے استیپان ایوانچ نے اس کو تین بار پیار کیا اور روسی رسم کے مطابق آنسو بہائے۔ جب گاڑی چلنے لگی تو کوتستین نے بآواز بلند کہا "ایرانیوں کو میری طرف سے پیغام محبت پہنچا دیجئے"

اس واقعہ کو گذرے ہوئے ایک سال چار مہینے ہوئے۔ دھواں دھار پالا پڑ رہا تھا، بلا کی سردی تھی، ہوا اس قدر ٹھنڈی اور تیز چل رہی تھی کہ انسان کے جسم میں سے آر پار ہو جائے۔ استیپان ایوانچ کوٹ کے بٹن کھولے ہوئے سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ راہگیروں میں کوئی بھی اس کی طرف مڑ کر اس کے تمغے "شیر اور سورج" کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی طرح ساری شام بڑی دیر تک ٹہلتا رہا سرد میں سینہ کھولے ہوئے۔ رات اس نے بستر پر کروٹیں لیکر کاٹی لیکن نیند کسی طرح نہ آتی تھی نہ آئی۔ اسے سانس بھی تکلیف سے آ رہی تھی۔ سینہ میں ایک سی جلن تھی اور دل میں دھڑکن۔ لیکن اس وقت اس کے دل میں سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اسکو سربیا کا تمغہ حاصل ہو جائے۔

# اردو اور سائنس

رضی الدین صدیقی

یہ[1] حقیقت ہے کہ اردو زبان میں ہر قسم کے سائنسی اور علمی خیالات کو بیان کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، اب کسی تعلیم یافتہ ہندوستانی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے اب اس کا قطعی ثبوت پیش کر دیا ہے اور پچیس سال کے ذاتی تجربے کے بعد میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک علوم و فنون کو ظاہر کرنے کی "صلاحیت" کا تعلق ہے اردو زبان دنیا کی کسی قدیم یا جدید زبان سے پیچھے نہیں ہے۔ میں نے یہاں لفظ "صلاحیت" کا عمداً استعمال کیا ہے۔ کسی چیز کی صلاحیت یا اس کا امکان اور واقعتاً اس کا وجود دو مختلف چیزیں ہیں، اس میں شک نہیں کہ علمی اور سائنسی تحریروں اور کتابوں کی اردو زبان میں ابھی بہت کمی ہے اور اس لحاظ سے ہماری زبان دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو کے لکھنے والوں کی زیادہ تر توجہ ادب لطیف، انشاء، افسانہ نگاری اور شاعری کی طرف مبذول رہی ہے اور جامعہ عثمانیہ کے سوا ملک کی تمام تر تعلیم انگریزی میں ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کی کتابوں کو اردو میں لکھنے یا پڑھنے کا خیال کسی کے ذہن میں اب تک بہت کم آیا ہے۔ چونکہ ملک کے ایک بڑے حصے میں اردو مادری زبان کے طور پر بولی جاتی ہے اور ویسے بھی سارے ملک میں عام مشترک زبان کا درجہ رکھتی ہے اس لئے اب اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے کہ علوم و فنون کو اردو زبان میں پیش کیا جائے تاکہ اہل ملک تعلیم سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کام میں رہنمائی کے لئے ظاہر ہے کہ سارے ملک کی نظریں جامعہ عثمانیہ پر لگی ہوئی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ملک کے ہر گوشہ سے جامعہ کے اساتذہ اور دوسرے حضرات کے پاس مختلف علوم و فنون کی کتابیں اور مضامین لکھنے کی فرمائش آیا کرتی ہے۔

تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ انفرادی کوششوں کے علاوہ جس طرح آج اردو زبان کی سب سے زیادہ منظم اور سب سے زیادہ قابل لحاظ علمی خدمت کرنے کا شرف حیدرآباد کو حاصل ہے اسی طرح ابتدائی زمانے میں بھی اس کام کو سرانجام دینے کا بیڑا حیدرآباد نے اٹھایا تھا۔ حیدرآباد میں یہ کام شمس الامراء خاندان کی سرپرستی میں انجام پاتا تھا، شمس الامرائے ثانی اور ثالث دونوں نے اس کی باضابطہ کوشش کی کہ حکمت، ہندسہ، ریاضی وغیرہ کی کتابیں اردو میں لکھیں اور دوسروں سے لکھوائیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کے ترجموں پر مشتمل تھیں ان میں سے بعض کتابیں اب بھی پائیگاہ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔

مختلف سائنسوں اور علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنے کی دوسری منظم کوشش آخری شاہانِ اودھ کی سرپرستی میں لکھنؤ میں کی گئی۔ ان بادشاہوں کو طبیعی علوم خصوصاً علم ہئیت سے بہت دلچسپی تھی اور ان کے حکم سے بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

اس کے بعد تیسری منظم کوشش دہلی میں کی گئی اور ۱۸۴۳ء میں دہلی کالج میں اس کام کے لئے ایک باضابطہ سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ چونکہ دہلی کالج میں ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور سوائے انگریزی کے باقی تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے اس لئے لازمی تھا کہ درسی کتابیں اردو میں تیار کی جائیں۔ دہلی سوسائٹی نے اردو کتابوں کی تیاری کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کے اخراجات کی پابجائی کے لئے حیدرآباد اور لکھنؤ کے امراء نے گراں قدر عطیے دیئے۔ جدید علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرتے وقت سب سے بڑی دقت اصطلاحات کی پیش آتی ہے۔ دہلی سوسائٹی والوں نے اصطلاحات کے متعلق یہ اصول مرتب کئے۔

۱۔ اگر سائنس کے کسی لفظ کا مترادف اردو میں نہ ملے تو ایسے لفظ کو اردو میں بجنسہ لے لینے میں کوئی قباحت نہیں مثلاً سوڈیم کلورین وغیرہ۔

۲۔ اگر سائنس کے کسی لفظ کا مترادف اردو میں موجود ہے تو اردو لفظ کو استعمال کرنا چاہیئے مثلاً لوہا، گندھک وغیرہ۔

۳۔ کیمیائی مرکبوں کے نام انگریزی ہی برقرار رکھے جائیں جیسے سوڈیم آکسائڈ وغیرہ۔

۴۔ یہ ضروری نہیں کہ جو انگریزی لفظ اردو میں لئے جائیں ان کو بجنسہ لکھا جائے۔ بلکہ ان کو اردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

ایک سو سال پہلے کے یہ اصول وہی ہیں جو آجکل بھی عام طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحوں میں ان اصولوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

اگر ۱۸۵۷ء کے واقعہ کے بعد دہلی کالج کو برخاست نہ کر دیا گیا ہوتا تو یقیناً اس وقت سارے ہندوستان میں تعلیم کی نوعیت تقریباً وہی ہوتی جو جامعہ عثمانیہ میں ہے اور اردو زبان میں علوم و فنون کے ایسے خزانے موجود ہوتے کہ وہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں

[1] بہ اجازت رسالہ "نوا" حیدرآباد۔

کے ہم پلہ ہوتی۔ لیکن بقول مولوی عبدالحق صاحب "اس کالج کو بلا وجہ اور بغیر کسی الزام کے ملکی اور سیاسی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا" اور اس طرح ملک کی ترقی کا شاید سب سے زیادہ اہم ذریعہ مسدود ہو گیا۔

دہلی کالج کی مسدودی کے چند سال بعد سرسید نے اس کام کا از سر نو بیڑا اٹھایا اور ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تاکہ اس کے ذریعہ سے اردو میں جدید علوم و فنون کی اشاعت ہو سکے۔ جب ایک سال بعد سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تو یہ سوسائٹی بھی اپنے جملہ ساز و سامان کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہو گئی۔ اور اب تک سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

اس سوسائٹی کے زیر اہتمام ہر مہینہ متعدد علمی جلسے منعقد ہوتے تھے جن میں جدید موضوعوں پر تقریریں ہوتی تھیں اور ایک رسالہ بھی نکلتا تھا جس کا نام "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" تھا۔ اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا۔ ان کتابوں کی زبان عام فہم اور سلیس ہونے کے علاوہ آج کل کی زبان سے بہت کافی مشابہت رکھتی ہے۔

سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سے رسالہ "تہذیب الاخلاق" بھی جاری کیا جس کی ایک بڑی اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مسلمانوں کے سائنسی اور علمی کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا جاتا تھا۔ ان مضمونوں کے ذریعہ سے بہت سی قدیم علمی اور سائنسی اصطلاحیں معلوم ہو گئیں جن میں سے اکثر اپنی موزونیت کی وجہ سے جدید اردو کتابوں میں رائج ہو گئیں۔

اس کے بعد منشی محمد ذکاء اللہ نے انیسویں صدی کے اواخر میں جدید علوم و فنون کی اردو کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا۔ یہ کتابیں حال تک بھی بہت مقبول تھیں اور درسی کتابوں کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں۔ سچ پوچھئے تو ان کی ان گراں بہا خدمات کی وجہ سے منشی ذکاء اللہ کو سائنسی اردو کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے۔

زبان اردو کی ترقی کے لحاظ سے بیسویں صدی کا اہم ترین کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جس کی تاسیس میں دہلی کالج کی طرح یہی بنیادی تخیل کارفرما تھا کہ تمام علوم و فنون کی تعلیم اردو میں دی جائے۔ اس مقصد کو بطریق احسن انجام دینے کے لئے ایک دارالترجمہ کی بنا ڈالی گئی اور طبیعی، حیاتی، عمرانی تمام علوم و فنون کی جدید ترین معلومات کو اردو میں منتقل کرانے کے لئے بے دریغ روپیہ خرچ کیا گیا چنانچہ اب تک دارالترجمہ سے مختلف علوم و فنون کی تقریباً ڈھائی سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور ایک سو زیر طبع ہیں۔ اس ٹھوس کام کے علاوہ دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ نے ایک بڑا انقلابی کام یہ کیا کہ ہندوستانی زبان میں اعلیٰ ترین اور جدید ترین تعلیم کے امکان کو ثابت کر دیا۔ ورنہ جامعہ عثمانیہ سے قبل مختلف وجوہات کی بنا پر اہل ملک کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگریزی زبان کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ پہلے پہلے تو سارے ہندوستان نے جامعہ عثمانیہ کے تجربہ کو شک اور شبہ کی نظروں سے دیکھا لیکن آخر میں سب کو ماننا پڑا کہ اردو زبان میں تمام علوم و فنون کو بیان کرنے کی کامل صلاحیت موجود ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے کارناموں سے چونکہ اکثر سامعین واقف ہیں اس لئے میں تفصیلات کو نظر انداز کرتا ہوں اور صرف اس امر کے اظہار پر اکتفا کرتا ہوں کہ جامعہ میں اب اعلیٰ ترین مدارج یعنی ایم ایس سی، پی ایچ ڈی وغیرہ تک جدید ترین نظری، عملی اور ٹکنیکل علوم و فنون کی تعلیم اور تحقیق کی جاتی ہے اور اس میں کوئی غیر معمولی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

جب جامعہ عثمانیہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے لگی تو ہندوستان کے دوسرے مقامات پر بھی لوگوں کو اپنی زبانوں کی ترقی کا خیال آیا اور انہوں نے کوشش شروع کی کہ اگر اعلیٰ مدارج تک نہیں تو کم از کم میٹرک یا ایف اے تک تعلیم مقامی زبانوں کے ذریعہ دی جائے۔ خصوصاً ہندی بھی اردو کی حریف بن گئی۔ اور پھر ہندی، ہندوستانی اردو کا

## حدیثِ دلؔ

عاصی کرنالوی

تیرِ نظر سے چھیڑ کئے جا رہا ہوں میں
زخموں کو بار بار سیئے جا رہا ہوں میں

ہمدم تحملِ دلِ حسرت زدہ نہ پوچھ
ساغر میں تلخیوں کے پیئے جا رہا ہوں میں

افشا نہ ہونے پائے کہیں رازِ زندگی
آنکھوں میں آنسوؤں کو پیئے جا رہا ہوں میں

ہوں دینے والا برق کو پھر دعوتِ عمل
پھر تنکا تنکا جمع کئے جا رہا ہوں میں

دل کو سکھا رہا ہوں میں آدابِ بندگی
احسانِ ستمگری کے لئے جا رہا ہوں میں

نظریں وہ جن میں سینکڑوں پنہاں ہیں بجلیاں
قلبِ حزیں پہ جذب کئے جا رہا ہوں میں

بگڑے نہ عاصی بات کہیں آج دیکھئے
دفترِ شکایتوں کا لئے جا رہا ہوں میں

قضیہ زور شور سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمیں اس مضمون میں ان تمام جھگڑوں سے کوئی سروکار نہ ہونا لیکن بات یہ ہوئی کہ ان جھگڑوں کی وجہ سے علمی اردو بھی لپیٹ میں آگئی اور اصطلاحات اور علمی زبان کے بارے میں اختلافات رونما ہوگئے۔ ایک جماعت کا یہ خیال کہ علمی اصطلاحیں خالص عربی یا فارسی ہونی چاہئیں، ان کے مقابل ایک دوسری انتہاپسند جماعت ہے جو اصطلاحوں کو خالص سنسکرت شکل میں لینا ضروری سمجھتی ہے، ان دونوں فریقوں کے درمیان مختلف مکاتیب خیال کے لوگ موجود ہیں جو ایک طرف یا دوسری طرف زیادہ رجحان رکھتے ہیں اور بعض ان دونوں کے بالکل درمیان ہیں۔

ایک عرصہ تک یہ بحث مختلف افراد اور پبلک انجمنوں کی حد تک محدود رہی۔ آخر اس مسئلہ کو سلجھانے کے لئے صوبہ جاتی اور مرکزی حکومتوں نے خود عملی اقدام شروع کیا۔ چنانچہ صوبہ بہار کی کانگریسی حکومت نے ایک "ہندوستانی کمیٹی" قائم کی، اس کمیٹی میں مولوی عبدالحق صاحب بھی شریک ہیں۔ لیکن زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو سنسکرت کی طرف زیادہ رجحان رکھتے ہیں اور رجوان الفاظ کو بھی لینا نہیں چاہتے جو ایک عرصہ دراز سے ٹکسالی اردو بن گئے ہیں۔ اس کمیٹی کی بنائی ہوئی اصطلاحات میرے پاس بھی رائے کے لئے آئی تھیں۔ میں نے تفصیلی طور پر ان کا تجزیہ کرکے بتایا تھا کہ نہ صرف زبان کے لحاظ سے بلکہ علمی لحاظ سے بھی یہ اصطلاحات نہایت ناموزوں ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ اصطلاحیں منظور نہیں ہوئیں۔ ورنہ سائنسی اردو کا خاتمہ ہی ہوگیا ہوتا۔

حال ہی میں حکومت ہند نے تعلیمات کے لئے ایک مرکزی مشاورتی کمیٹی قائم کی ہے جو سائنٹفک اور ٹیکنیکل اصطلاحوں کے مسئلہ پر بھی غور و فکر کر رہی ہے اس کے اجلاسوں میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا ہے اس کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ ہندوستان کی کسی زبان میں علمی اصطلاحیں تین اجزا پر مشتمل ہونی چاہئیں۔

(۱) ایک تو بین الاقوامی جزو۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی لفظ تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں میں اسی شکل میں رائج ہو تو اس کو بجنسہ لے لینا چاہیئے۔ اور ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں مثلاً موٹر ٹیلی فون وغیرہ۔

(۲) دوسرے اس خاص زبان کا جزو مثلاً لوہا، گندھک وغیرہ۔

(۳) مقامی زبانوں مثلاً بنگالی، گجراتی کے لئے عام ہندوستانی جزو مثلاً اگر کوئی لفظ پورے ہندوستان میں رائج ہو تو بنگال والے اس ہندوستانی لفظ کو لے لیں اور بنگال میں علیحدہ اصطلاح نہ بنائیں۔

آپ ملاحظہ کریں گے کہ پہلے دو اصول وہی ہیں جو اردو میں زمانہ قدیم سے رائج ہیں اور جن کو جامعہ عثمانیہ میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحوں میں عربیت اور فارسیت زیادہ تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے علوم کی عربی اور فارسی کتابیں موجود تھیں اور لوگ ان سے واقف تھے۔ نئی اصطلاحیں بنانے کی بجائے یہ مناسب سمجھا گیا کہ انہی قدیم اصطلاحوں کو باقی رکھا جائے لیکن رفتہ رفتہ ان اصطلاحوں کو تجربہ کی روشنی میں سادہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ "ذوالعنۃ المسطوح" کی بجائے اب "چار سطحی" کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اس کام کے لئے یعنے اصطلاحوں پر نظرثانی کرنے اور ان کو سادہ بنانے کے لئے جامعہ میں کوششیں برابر جاری ہیں۔

میں خود اس امر کا قائل ہوں کہ علمی اصطلاحیں اور علمی کتابوں کی زبان حتی الامکان سادہ اور مانوس ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ زبان بالکل بازار کی یا دیوان خانہ کی زبان ہو۔ جو لوگ اردو کی موجودہ اصطلاحوں پر اعتراض کرتے ہیں انہیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اکثر اصطلاحوں سے عام لوگوں کو کبھی سابقہ نہیں پڑتا اور اس لئے علمی زبان کا دارومدار عوام کی بول چال پر رکھنا کسی طرح ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ سائنس میں مفہوم کے خفیف سے ٹکنیکل فرق کے لئے دو مختلف لفظوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کا عام بول چال میں کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ مثلاً لفظ "متناہی" کو لیجئے۔ آپ کہیں گے کہ یہ ایک ثقیل لفظ ہے اور اس کی بجائے لفظ "محدود" پہلے ہی ایک دوسرے مفہوم کے لئے اختیار کرلیا گیا ہے۔ اور اس لئے "محدود" کے علاوہ ایک اور لفظ کی بھی ضرورت ہے (باقی آئندہ)

# نادر شاہ کا آخری غیور سپاہی

اشہر لکھنوی

## ۲

## پردۂ دوم

(وہی کمرہ ہے۔ اللہ یار بیگ توشک پر سیدھی طرف کروٹ لئے سو رہا ہے۔ سر پر پشمینے کا کنٹوپ ہے۔ اور ایک موٹا لحاف اوڑھے ہوئے ہے۔ پہلو میں ایک چھوٹی تپائی پر چمچہ۔ پیالی۔ اور دوا کی پڑیاں رکھی ہوئی ہیں۔ جس وقت کمرے کا دروازہ اٹھتا۔ اللہ یار بیگ گہری نیند میں ہے۔ بائیں ہاتھ کے دروازے سے فلک ناز۔ چادر نمازی اوڑھے ہوئے اندر داخل ہوتی ہے)

فلک ناز:- (آہستہ سے) حکیم صاحب تشریف لائیے۔

میرزا مسیح:- (طبیب۔ دبے پاؤں اندر داخل ہوتے ہوئے آہستہ سے) تکلیف نہ دو۔ اچھا ہے۔ سونے دو۔ میں تھوڑی دیر یہاں ہوں۔ اگر اس عرصے میں مریض بیدار ہوا تو دیکھ لوں گا۔ (دونوں داخلی کمرے میں چلے آتے ہیں۔ فلک ناز کچھ دور گردن جھکائے کھڑی ہے)

میرزا مسیح:- کس وقت سے یہ کسالت پیدا ہو گئی ہے؟

فلک ناز:- میرے والد کے جانے کے چار روز بعد سے۔ اس حالت کو ایک ماہ سے کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔

میرزا مسیح:- اوّل ہی سے اتنی شدت تھی۔ یا رفتہ رفتہ یہ کمزوری پیدا ہوئی۔

فلک ناز:- پہلے دو تین روز تو ذرا کم اثر تھا۔ مگر اس کے بعد سے تقریباً ایک ماہ ہوا کہ صاحب فراش ہو گئے ہیں۔

میرزا مسیح:- اس فوری کمزوری کا سبب کیا ہے؟

فلک ناز:- ٹھیک ٹھیک تو میں نہیں بتا سکتی لیکن ہاں اتنا جانتی ہوں کہ جس روز میرے والد شریک جنگ ہونے جا رہے تھے۔ ان کو کچھ غیر معمولی غیظ و غضب آگیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد دو تین روز کچھ فکرمند سے رہے۔ چاروں طرف عجب مایوسانہ نظروں سے دیکھتے تھے اور بعض کو آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے تھے۔ اس کے بعد کچھ دیر سکوت اختیار کر لیتے تھے۔ اور اس طرح بے حس و حرکت ہو جاتے تھے۔ چار یا پانچ روز کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں سست ہو گئے۔ کوئی چیز اگر پکڑ لیتے تو ہاتھ کانپ جاتے تھے۔ اور کھڑے ہوتے تو پاؤں لڑکھڑانے لگتے تھے۔ ایک روز نہ معلوم کوئی ترش چیز کھالی یا کیا؟ بلغمی کھانسی ہو گئی —— ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کھڑے سے گر پڑے۔ ہاتھ پاؤں تو بیکار ہیں ہی۔ اس وقت سے ابتک جسم کا سیدھی طرف کا حصہ بیکار ہو گیا ہے۔ ایک آنکھ مستقلاً بند ہے اور زبان بھی گفتگو کے وقت کچھ موٹی معلوم ہوتی ہے۔۔ سوتے میں زیادہ تر اول فول بکا کرتے ہیں۔

(اس وقت اللہ یار بیگ کے بستر سے یہ آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں)

اردشیر! جان پدر! اس ہاتھ کے قربان... بزن... بزن... مردود جانے نہ پائے (خاموش ہو کے کچھ وقفے کے بعد) افسوس! میں نہ ہوا جو تیرے مردانہ بازوؤں کو چوم لیتا... بزن... میرے رشید فرزند... بزن... یہ حرام الدہر ہرگز رحم کے قابل نہیں... اس وار کے صدقے... بزن... نادر شاہ اس کے صلے میں کل تجھے سپاہیانہ خلعت عطا کرے گا۔ میں خود شال دورمال تیری گردن میں لپیٹوں گا (خاموش ہو جاتا ہے)

میرزا مسیح:- کیا بیدار ہوئے؟

فلک ناز:- ہذیان بک رہے ہیں۔ زیادہ تر یہی حالت رہتی ہے اور ایسے ہی الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ بزن۔ بکش۔ قربان دست و بازوے تو۔

میرزا مسیح:- اس مدت میں سوائے اس روز کے کہ تمہارے والد پر غصہ ہوئے تھے۔ کیا اور کسی روز بھی کسی موقع پر غصے کا اظہار کیا تھا؟ یا نہیں؟

فلک ناز:- نہیں۔ اس روز سے برابر ان کی طبیعت سست ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو بھی آتا ہے اس سے نہایت روکھے ملتے ہیں۔ آپ نے ملاحظہ کیا برابر روسیوں کو سخت سست کہتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات فضا میں خواہ مخواہ گھونسے چلانے لگتے ہیں اور کہتے ہیں "حرامیو! مرتے چلے جاؤ۔ افسوس میں نہ ہوا۔ ایک ایک کے باپ کو چن چن کر تہس نہس کر دیتا!" ایک روز خلاف معمول اضطراب کا اظہار کیا تھا۔ ہاں! ٹھیک! یاد آیا.... چار روز قبل حسن علی بیگ مزاج پرسی کے لئے آئے تھے۔ نہ معلوم کیا ہوا کہ دادا جان کا حال بے

بدتر ہوگیا۔ حسن علی بیگ سے میں نے لاکھ لاکھ پوچھا کہ کیا بات ہوئی لیکن انھوں نے کہا کہ صرف میں نے یہ کہا تھا "روسیوں نے جنگ نخجوان میں فتح حاصل کرلی ہے۔"

میرزا مسیح۔ (فکر میں غرق ہوجاتا ہے اور اس درمیان میں اس کی انگلیاں ڈاڑھی کے بالوں کے لئے شانہ بنی ہوئی ہیں تھوڑے سے عرصے کے بعد) خانم اس معاملہ کو سرسری نظر سے نہ دیکھنا چاہئے ۔ مرض بہت خطرناک ہے ۔ یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہئے کہ بالکل نا امیدی ہے۔ اگر اچھی تیمارداری ہوگئی تو کوئی خطرہ نہیں۔ صرف ہر لحظہ دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ اگرچہ فالج گر پڑا ہے مگر زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ کوئی ایسی وجہ نہ ہونی چاہئے جس سے ان کے جذبات بھڑک اٹھیں۔ اور سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ جنگ سے متعلق کوئی خبر بد ان کے کانوں تک نہ پہونچنی چاہئے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اگر خدا نخواستہ یہ معلوم ہو کہ نابکار روسی اس جنگ میں کامیاب ہوگئے اور ولیعہد کی فوج نے شکست کھائی تو یہ خبر ان تک نہ پہونچنی چاہئے۔ بلکہ اس کے خلاف لشکر ایران کی فتح و ظفر کی خبریں ان کو دی جائیں۔ اور متواتر دی جائیں تو زیادہ مناسب ہے ——— اس طرح اگر مریض کی خبرگیری کی گئی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ ماشاءاللہ تمہارے دادا کا بڑا اچھا ہے ممکن ہے چند سال اور زندہ رہیں لیکن شرط یہی ہے کہ کوئی خبر بد ان تک نہ پہونچے ورنہ خدا ہی حافظ ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ جسم کا دوسرا حصہ بھی مفلوج ہوجائے یا اسی میں ترقی ہوجائے۔

فلک ناز:۔ بہت خوب۔ لیکن حکیم صاحب خبر بد ان تک نہ پہونچنے کا بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے کیونکہ ہماری فوج کی شکست کے اخبار برابر شہر میں مشہور ہو رہے ہیں۔ یہ خبریں کہاں تک ان سے پوشیدہ رکھی جائیں گی۔

میرزا مسیح:۔ خانم! اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میرا فرض او نیچ نیچ سمجھا دینے کا تھا سو سمجھا دیا۔ جہاں تک ہوسکے مریض کی دیکھ بھال میں کوتاہی نہ ہو۔

(اس درمیان میں اللہ یار بدقت کروٹ لے کے بیدار ہوتا ہے)

اللہ یار بیگ:۔ (لکنت آمیز لہجے میں) بیٹی فلک ناز!

فلک ناز:۔ پدر جان!

اللہ یار بیگ:۔ تھوڑا . . . پانی . . . پلا دو۔ (فلک ناز آبخورے میں پانی لاتی ہے اور میرزا مسیح خم ہو کے حالت مریض کا اندازہ کرتا ہے)

فلک ناز:۔ (پانی دیتے ہوئے) پدر جان! حکیم صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں۔ بہت دیر سے منتظر تھے کہ آپ بیدار ہوں۔)

میرزا مسیح:۔ (بستر کے پاس بیٹھ کے) ماشاءاللہ آپ کا حال بہتر ہے۔

اللہ یار بیگ:۔ الحمدللہ۔ مگر میرے دل کی عجیب حالت ہے۔ برابر وحشتناک خواب دیکھتا رہتا ہوں۔

میرزا مسیح:۔ کچھ نہیں۔ بہت جلد یہ حالت رفع ہوجائے گی . . . لیکن کامل آرام درکار ہے۔ حرکت کرنا آپ کے لئے سخت مضر ہے۔ یوں ہی لیٹے رہئے۔ کوئی بات ایسی نہ کیجئے کہ جس سے مزاج پر ناگوار اثر پڑے ذرا ہاتھ تو دیجئے (غور سے نبض دیکھ کے) آپ کی نبض کی رفتار بہت اچھی ہے کوئی غیر طبیعی حرکت نہیں پائی جاتی۔ ذرا زبان تو دکھلایئے گا۔ زبان بھی موٹی نہیں ہے۔ (میرزا مسیح قلم دوات لے کے نسخہ لکھنے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد فلک ناز سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔)

خانم! یہ دوا پاؤ بھر پانی میں جوش دیجئے اور یہ سفوف ڈال کے گنگنی گنگنی تھوڑی ہی دیر میں دن بھر پلائی جائے تین روز تک یہی نسخہ جاری رہے گا۔ تیسرے روز میں خود آجاؤں گا۔ بلوانے کی ضرورت نہیں غذا میں سوائے نیم برشت انڈا۔ دودھ اور ہلکے شوربے کے اور کچھ نہ دیا جائے۔ سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ ہر تدبیر بسہولت و آسانی سے انجام پائے۔ ایسا نہ ہو کہ مریض کو غصہ آجائے اور خون جوش کھا جائے۔ (جاتے وقت ان الفاظ کا اعادہ کرتا ہے) انشاءاللہ بہت جلد طبیعت سنبھل جائے گی۔ ذرا بھی بددل نہ ہونا چاہئے۔

## پردۂ سوم

(اسی کمرے میں اللہ یار بیگ مصروف خواب ہے فلک ناز ایک طرف کھڑی دل سے باتیں کر رہی ہے۔)

فلک ناز:۔ یا اللہ! عجب ناگوار زندگی گذر رہی ہے مسلسل پانچ ماہ سے دادا جان صاحب فراش ہیں۔ اس مدت میں ایک لمحہ کے لئے مجھے آرام میسر نہ ہوا۔ تکالیف کے اعتبار سے یہ گھر میرے لئے جہنم سا بن گیا ہے۔ کیا فائدہ اگر اتنی تکالیف برداشت کرنے کے بعد بھی دادا جان اچھے نہ ہوئے۔ سب سے زیادہ مایوس کن یہ بات ہے کہ مرض کا مداوا طبیب نے یہ تجویز کیا ہے کہ انھیں دل تنگی نہ ہو۔ کوئی خبر ایسی نہ پہونچ جائے جس سے انھیں رنج ہو بھلا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ بڑی مشکل کی بات ہے ——— کل صبح سے روسی فوج نے شہر کا محاصرہ کرلیا ہے اور غالباً آج دو ایک گھنٹے بعد شہر میں داخل بھی ہوجائیں گے

حکیم صاحب نے عجب کشمکش میں مجھے ڈال دیا ہے۔ پانچ ماہ سے برابر دادا جان کو لڑائی کی خبریں اپنی طرف سے بنا بنا کر سناتی رہتی ہوں کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ان سے یہ جھوٹ نہ بولوں کہ آج ایرانی فوج فتحمند ہوئی۔ دن بھر اسی دروغ بافی میں گذرتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ انھیں یقین بھی آجائے۔ آخر جھوٹ کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ اب تو معاملہ بڑی خطرناک حد تک پہونچ چکا ہے۔ روسی فوج تو تبریز کا محاصرہ کئے ہی ہوئے ہے۔ مگر میں ان سے کہتی رہتی ہوں کہ ایرانی فوج نے روس کے پایۂ تخت ماسکو کا محاصرہ کرلیا ہے جنگ قریب ختم ہے ایرانی فوج مظفر و فتحمند واپس آنے والی ہے۔ آج عصر کے وقت حسن علی خاں اور جعفر قلی بیگ مزاج پرسی کے لئے آئے تھے۔ وہ تو کہہ گئے کہ روسی فوج شہر میں داخل ہونے والی ہے۔ مگر بے چارے دادا جان کو میں نے اس خوبصورتی سے فوج ایران کی فتحمندی کی خبریں سنائی ہیں کہ انھیں یقین ہے کہ بجائے روسی فوج کے ایرانی فوج فتحمند واپس ہو رہی ہے۔ (آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے رونے لگتی ہے)

میرے بدنصیب دادا! تمہیں نہیں معلوم کہ کیا کیا مصیبتیں ہم پر نازل ہونے والی ہیں۔ تمہیں خبر نہیں کہ تم پر کیا سخت گھڑی گذرنے والی ہے۔۔ ہائے میرے ضعیف۔ عاشق وطن دادا جان! تم کیسے جانبر ہو سکو گے؟ مجھے تو یقین ہے کہ بابا جان بھی آخر وقت تمہاری بالیں پر موجود نہ ہوں گے۔ (رونے لگتی ہے) اس قیامت خیز موقع پر جب کہ شہر کے ہر شخص کو نفسی نفسی کی پڑی ہوگی۔ میں عورت ذات بے یار و مددگار!۔۔۔۔۔۔ اے لاوارثوں کے والی وارث میری مدد کر! از برائے رسول میری مدد کر! (پھر رونے لگتی ہے)

ہائے میرے ضعیف و ناتوان دادا۔ اگر تم اپنی فطرتی موت مرتے تو چنداں قلق نہ ہوتا۔ کیونکہ اتنی طویل عمر ہو چکی ہے۔ لیکن آہ۔ آہ۔ اس تکلیف سے خدا محفوظ رکھے جو تھوڑی دیر کے بعد تمہاری روح قبض کرلے گی۔

ہائے بلاشبہ صورت حال کو وہ خود جان جائیں گے۔ اگرچہ اللہ نے مجھے اتنی ہوشمندی عنایت کی ہے کہ دو تین روز تک اونبرشکست کو حیلے حوالے کرکے ان سے پوشیدہ رکھوں۔ لیکن۔ آہ۔ آہ۔ جب فوج روس شہر میں داخل ہوجائے گی تو میں اسے کس طرح چھپا سکوں گی۔ میرزا مسیح تو کہہ گئے ہیں کہ خبر بد مریض کے لئے خطرناک ہے۔ اس سے بدتر اور کونسی خبر ہوگی۔ یا الٰہا رحم کر! رحم! (رونے لگتی ہے اور چند منٹ بعد سر اٹھا کے چاروں طرف دیکھنے لگتی ہے۔)

صبح ہوگئی! اُفوہ بے خوابی سے میرا سر پھٹا جاتا ہے۔ یا اللہ کیا کروں؟ ایک طرف تو میرا جی نہیں مانتا کہ مریض کو چھوڑ کے چلی جاؤں ممکن ہے کہ اس پر کوئی بلا نازل ہوجائے۔ دوسری طرف اگر ذرا دیر سوتی ہوں تو یہ خوف ہے کہ تیمارداری میں فرق آیا جاتا ہے ایسا نہ ہو کہ مریض ختم ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔ دنیاوی مصیبت آ۔۔۔۔۔۔ اور میرے سر پر چھا جا! (یہ کہہ کے سر جھکا دیتی ہے۔) پھر ذرا طبیعت سنبھال کے کہتی ہے۔ سب کا مالک خدا ہے۔ بندے کو اسی پر بھروسہ چاہئے! اچھا۔ دادا جان جب تک مصروف خواب ہیں۔ میں بھی جاکے تکیہ پر تھوڑی دیر سر رکھ لوں اور پھر فوراً ان کی خبرگیری کے لئے موجود ہو جاؤں۔ خدا سے امید ہے کہ جب تک میں واپس نہ آجاؤں وہ بیدار نہ ہوں گے۔ (نہایت سست رفتار سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔)

تلک ناز کے چلے جانے کے بعد اللہ یار بیگ بستر پر کچھ کسمسانے لگتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اس کے جسم میں زیادہ حرکت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ بابایاں ہاتھ ٹیک کر بڑی مشکل سے بستر پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی آنکھیں ملنے لگتا ہے۔ پہلے تو زبان سے کچھ ادھورے الفاظ نکلتے ہیں لیکن کچھ دیر بعد زبان سلیس ہو جاتی ہے

غ۔۔۔۔خ۔ دایا۔ ع۔۔۔۔ع۔ جب۔ خواب بد تھا۔ آہ۔۔۔ میں کیا دیکھ رہا تھا! خدایا رحم کر۔ بدبخت روسی اس خاک پاک پر قدم رکھیں گے۔ مگر ایسا ممکن نہیں۔۔ ہائے یہ پاک زمین اور نجس روسیوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں۔ نہیں۔۔ نہیں۔۔۔ غیر ممکن۔۔۔ مجھے یقین نہیں آتا!۔۔۔۔ جب تک اللہ یار زندہ ہے۔۔ جب تک اس کے فرزند اردشیر کے دم میں دم ہے۔۔۔ جب تک ایرانی نسل باقی ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ (کچھ ٹھہر کے) بہترین دلیل اس کی یہ ہے کہ فوج نادری کے مقابلے میں ایک لاکھ روسی فوج کچھ نہ کرسکی۔ نابکار رسوائے خلق ہوئے۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ فوج ایران سے مقابلہ کوئی بازیچہ نہیں۔ اور نہ سرزمین ایران ایسی جگہ ہے کہ جس کا جب جی چاہے اسمیں داخل ہو جائے (اپنی طرف دیکھ کے کچھ سوچتا ہے اور مسکرا دیتا ہے)

ہاں! ایران کی غیرت مندی ابھی باقی ہے ——— میں باوجود ضعیفی و بے طاقتی اپنے میں اتنی جرأت پاتا ہوں کہ سو روسیوں کے سرتن سے اڑا دوں (اپنے بازوؤں کی طرف دیکھ کے) ہاں انہی بازوؤں سے جنہوں نے تمام عالم کے پہلوانوں کے منہ

سی دئے ـــــ انھیں بازوؤں سے جنگی نادر ایسے بہادر سپاہی نے تعریف کی!

روسیو! اپنی خودسری کا مزہ چکھو اور ایران پہ حملہ کرکے اپنے کئے کی سزا پاؤ!

(خاموش ہوکے اپنے چہرے اور سر پہ ہاتھ پھیرنے لگتا ہے)

اس بیمارستان ـ طبیب احمق کو تو دیکھو کہ میرے حال پر افسوس کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرا خون اس قدر جلد سرد پڑ جائے گا۔ اسے گمان ہے کہ ایک ایرانی اتنی آسانی سے دم توڑ دے گا ایرانی بڑا سخت جان ہے! ہاں! ہدایت کر گیا ہے کہ مجھے خبر بد نہ پہونچنے پائے؟ اسے خبر نہیں کہ ایران جب کسی سے برسرپیکار ہوتا ہے تو خبر بد نصیب دشمناں ہوا کرتی ہے۔ (غصہ آجاتا ہے) یہ احمق طبیب کیا کہہ گیا۔ کہ میں بڈھا اور کمزور ہوں۔ کیا یہ سمجھا کہ میرے ان بازوؤں میں طاقت نہیں رہی (جوش میں آکے) نہایت دقت سے اپنا بازو سر کے قریب لاتا ہے پھر اسے تکان دے کے آسمان کی طرف بلند کرتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اسے دبانے لگتا ہے)۔ یہ ہے وہ بازو جسے بیکار کہا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ وہ بازو جس نے نادر کے ساتھ شمشیرزنی کی ہو آسانی سے بیکار ہو جائے۔ ممکن ہے کہ وہ چند روز کیوا سطے بے حس ہو جائے لیکن وہ اس شیر کے مانند ہے جو اپنے شکار کی گھات میں خاموش ہو جاتا ہے۔ مگر جب موقع آجاتا ہے تو بجلی کی طرح ڈنکارتا ہوا کمین گاہ سے نکل پڑتا ہے اور اپنے فولادی پنجے دشمن کے سینے میں پیوست کر دیتا ہے۔ (بازو کو تیزی سے حرکت دیتے ہوئے) مجھے ان بازوؤں سے ابھی کام لینا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ یکبارگی بیکار ہو جائیں ـــــ چاہئے تو یہ ہے کہ آج شمشیر نادری اس ہاتھ میں ہو۔ اور جب فوج ایران پرچم فتح لہراتی ہوئی شہر میں داخل ہو تو اسی شمشیر سے فوجی سلام دیا جائے۔

یہ احمق طبیب کہہ گیا ہے کہ میرا سیدھا پاؤں بے حس ہو گیا ہے (جس طرح پہلے ہاتھ کو حرکت دی تھی اسی طرح پاؤں کو بھی حرکت دیتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے . . . . . . اے احمق طبیب! آ دیکھ لے کہ ایک ایرانی سپاہی کا پاؤں مرتے دم تک دشمن کا تعاقب کرنے اور فاتح فوج ایران کا استقبال کرنے کے لئے تیار ہے۔ آج یہ پاؤں وزیر ایران کے استقبال کے لئے اور اس کے بعد اپنے فرزند رشید . . . اردشیر بیگ کو گلے سے لگانے کے لئے آگے بڑھے گا ـــــ آج اس پاؤں کا یہ کام ہوگا کہ نادر شاہ کے نمائندے کو اس فتح و ظفر کے موقع پر حاضر کرے (کچھ سوچ کے) درست ہے کہ آج فوج ایران فاتح واپس ہو رہی ہے ـــــ اچھا مجھے اپنا فوجی لباس زیب جسم کر لینا چاہئے پیٹی کس لینی چاہئے اور ڈاب میں تلوار رکھ لینی چاہئے۔ (صندوق کی طرف بڑھتا ہے اور اسے کھول کے فوج نادری کی وردی نکال لیتا ہے۔ اور یکے بعد دیگرے پہننے لگتا ہے اور کہتا ہے) اس لباس کو خدا نے اسی روز کے لئے بنایا ہے! آج نادر شاہ موجود نہیں جو اپنی مبارک زبان سے فتحمند فرزندان ایران کی تحسین و آفرین کرے۔ لہٰذا اللہ یار بیگ اس کے ایک سردار کو گھر میں آرام سے نہ بیٹھنا چاہئے بلکہ استقبال کے لئے میدان میں جانا چاہئے (کاٹھی سے تلوار کھینچ کے) مجھے لازم ہے کہ اس تلوار سے جس طرح نادر شاہ اعظم کو میدان جنگ میں سلامی دیا کرتا تھا اسی طرح غیرتمند و فتح نصیب فرزندان ایران کو آج سلامی دوں . . . (تلوار کو چوم کے) اے شمشیر عزیز! اے اے یادگار نادر شاہ بزرگ! برسوں سے تو اس صندوق سے باہر نہیں نکلی تھی۔ لیکن آج موقع آ ہی گیا کہ تو اپنے چمکتے ہوئے پھل کو آفتاب کی طرح اس شہر میں چمکا کے دکھا دے (تلوار کی دھار الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہے) ہا! یہ تیغہ دشمنان ایران کے خون سے صیقل ہوا ہے۔ اس میں زنگ کی مجال کہاں ویسا ہی چمکتا رہے گا . . . . . . یہی وہ تلوار ہے جو نادر شاہ نے محاصرہ دہلی کے وقت مجھے اپنے ہاتھ سے عنایت فرمائی تھی۔ اللہ یار بیگ! اس تلوار کے قبضے پر اپنا مضبوط پنجہ جما دے . . . . . اور یاد رکھ کہ جب تک جسم میں ہاتھ لگا رہے اس کی روانی نہ رکے! . . . . . .

اے میری پیاری تلوار . . . ابھی میرے جسم میں ہاتھ ہیں ـ یہ وہی ہاتھ ہے۔ یہ وہی بازو ہے جس نے نادر شاہ کے ہاتھ سے تجھے لیا تھا۔ آج تجھ سے یہ کام لینا باقی تھا کہ ایران کے فرزندان غیور کی سلامی کے لئے بلند ہو ـــــ ٹھیک ویسے ہی جیسے قتل عام کے بعد دہلی میں تجھے بلند کر کے نادر کو سلامی دی گئی تھی۔ (جسم سمیٹ کے اور تلوار کھینچ کے سلامی دیتا ہے) اے پیاری تلوار! آ تجھے پھر ایک مرتبہ زیب کمر کر لوں (تلوار کمر سے باندھ لیتا ہے) ـــ ہا! صحرائے مغاں میں بھی میں یہی لباس پہنے تھا اور یہی تلوار میرے ہاتھ میں تھی ـــــ آج تبریز کے میدان میں بھی اسی لباس اور اسی تلوار کے ساتھ لوگ فوج نادری کے ایک سردار کو دیکھیں گے۔

(چاروں طرف دیکھ کے کہتا ہے ـــــ صبح ہو گئی ـ دیکھوں شہر میں

کیا خبر ہے۔ بالاخانے پر آکے کھڑکی کھولتا ہے۔ باہر نظر ڈال کے مجنونانہ انداز سے کہتا ہے! . . . . خدایا — میں کیا دیکھ رہا ہوں ہر طرف خاموشی! کیا روز عزا ہے . . . . عجب بے حمیت اور بے غیرت لوگ ہیں! آخر۔ نابکار د۔ یہ خوشی کا روز ہے۔ تمہارے برادران وطن فاتح واپس آ رہے ہیں۔ آخر عورتوں کی طرح کیوں گھر میں گھسے بیٹھے ہو۔ آج تو لباس عید پہننا چاہیئے۔ اپنے سروں کو فوج ایران کا فرش راہ بنانا چاہیئے . . . . لو۔ وہ دور سے غبار اٹھا — وہ آ رہے ہیں۔ اب وزیر جنگ فاتح فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے — بے شبہ میرا فرزند عزیز اردشیر بھی انکے عقب میں آ رہا ہے۔ وہ آئے۔ وہ آپہنچے! اور آگے بڑھو تاکہ اللہ یار بیگ تمہارے بازوں کے قربان ہو جائے!!

(عجب حیرت سے دیکھتا ہے اور اپنی آنکھیں ملنے لگتا ہے)

خدایا! . . . . میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ خواب ہے یا بیداری! خدا نہ کرے کہ درست ہو . . . ہائے۔ کیا دیکھ رہا ہوں۔ ہائے . . . . . ہائے . . . . . یہ کیسا دلخراش منظر ہے! سفید ٹوپی! سرخ قزاقانہ لباس! یا اللہ ان ملعونوں سے اور اس مقدس سرزمین سے کیا واسطہ! کیا غیور ایرانی مر گئے؟ آہ . . . . . ان بدبختوں کو اس دردمن میں کیوں گھسنے دیا! (جسم میں شدید لرزہ پیدا ہو جاتا ہے) یہ پدرسوختہ مجھے دھوکہ دے رہے ہیں! یا خدا۔ یہ کیسا عذاب ہے جس میں تو نے اپنے اس ناچیز بندے کو آخر عمر میں مبتلا کیا؟ (تلوار نیام سے کھینچ کے) ہا! تم شہر ریز میں داخل ہو گئے! دشمنو! تمہیں یہ نہیں معلوم کہ اللہ یار بیگ ابھی زندہ ہے؟ تمہاری کیا مجال کہ اب ایک قدم آگے بڑھ سکو! خدایا اس وقت نادر کہاں ہے! کہاں ہے نادر!! (زمین پر گر کر بیہوش ہو جاتا ہے)

---

# غزل

ذابر محمد قاسم

مسکراہٹ سے یہ ہوا ظاہر — دلبری میں ہے تو بڑا ماہر
تیرے ماتھے پہ جگمگاتے ہیں — میرے آنسو برنگ آب خضر
کیوں بلاتی ہے موجۂ دریا! — ڈوبنے میں ہوں میں ہی کیا ماہر؟
ساتھ میرا نہ دے سکے تارے — چار جھونکوں میں سو گئے آخر
اپنی سنگین گود پھیلا دے
موت نہ آتا ہے اس طرف ذابر

---

# دکن کی برسات

ماہر القادری

ہوائیں مسکراتی جا رہی ہیں — گھٹائیں لڑکھڑاتی جا رہی ہیں
بعنوانِ تراوش نرم بوندیں — پکھاوج سی بجاتی جا رہی ہیں
دلِ پُر درد کی دیرینہ چوٹیں
ابھر کر کام آتی جا رہی ہیں
چمن کا پتہ پتہ دھل رہا ہے — اندھیرے میں اُجالا گھل رہا ہے
کسی بدمست دوشیزہ گھٹا کا — ہر کسیار جوڑا کھل رہا ہے
خوشی ماحول پر چھائی ہوئی ہے
کہ جھولوں میں زمانہ تل رہا ہے
پپیہا اک قیامت ڈھا رہا ہے — بڑے اونچے سُروں میں گا رہا ہے
ارے! یہ گرمی کیف و مسرت — گھٹاؤں کو پسینہ آ رہا ہے
بہت ہلکی پھواریں پڑ رہی ہیں — کہ جیسے عطر چھڑکا جا رہا ہے
میں خود ہوں اپنے تیروں کا نشانہ
کوئی میری غزل کو گا رہا ہے
جگر میں درد پایا جا رہا ہے — مجھے شاید بلایا جا رہا ہے
نقابِ رخ اٹھایا جا رہا ہے — وہ نکلی دھوپ یہ جا رہا ہے
ستارے سسکیاں سی لے رہے ہیں — کسی کا دل دکھایا جا رہا ہے
وہ حالِ دل سے بچ کر چل رہے ہیں — ابھی تک آزمایا جا رہا ہے
رواں اس غم نہیں ہیں شبنم کے آنسو — کلی کو کیوں ہنسایا جا رہا ہے
مریضِ غم کو آکر دیکھ جاؤ — کہ تم پر حرف آیا جا رہا ہے
سناتے ہو کسے روداد ماہر
وہاں تو مسکرایا جا رہا ہے
گلی کے موڑ پر چھٹکے[1] کھڑے ہیں — بہت ہی تیز موٹر چل رہے ہیں
کہیں پردہ حیرباں ہیں دکنانی — کہیں پر فضا ہیں ہندوستانی
وہ آئی سامنے سے آم والی — لبوں پر پان کے بیڑے کی لالی
بہت ہی چاق چوبند اور چنگی — زباں اردو مگر لہجہ تلنگی
پھلوں کا ٹوکرا سر پر دھرا ہے
گھٹا کا جس پہ سایہ پڑ رہا ہے
بہت پُرکیف رم جھم ہو رہی ہے — گھٹا جیسے فضا کو دھو رہی ہے
فضائیں تیرتے ہیں ابر پارے — نم آلودہ ہواؤں کے سہارے
مسرت کا رواں در کارواں ہے
دکن برسات میں جنت نشاں ہے

[1] یکہ کی قسم کی ایک سواری [2] ... کی ایک قسم [3] اہل دکن یوپی کو ہندوستان کہتے ہیں

# دو غزلیں

اختر شیرانی

نو بہاروں کا سماں دکھلا چلے
جب بھی آئے پھول سے برسا چلے

رات دن کب تک ستائے جائیگا
بس کر اے غم، اب تو ہم گھبرا چلے

کب تک آئینگے، وہ اے صبح فراق!
اب تو سارے پھول بھی کملا چلے!

پہلے ساتھی تھا نہ اب ساتھی کوئی
آئے تھے تنہا یہاں، تنہا چلے!

وہ نہ آئے لے کے پیغام بہار
آرزوؤں کے چمن مرجھا چلے

تیرے پائے نازنیں پر گر سکیں
ساقیا اک دور تو ایسا چلے

آہ، اختر وہ نگاہِ فتنہ گر
دل کے ارماں سب کے سب مرجھا چلے

## نذرِ حافظؒ

پلائے جا پیئے جا خوب ساقی!
کہ ہستی ہے سراسر اتفاقی!

جہاں کی لذتوں سے تھک چکے ہیں
نہیں کوئی تمنا دل میں باقی

ٹھہر اے سارباں محملِ نازا
"الی رکبانکم طال اشتیاقی"

کسی صورت بہلتا ہی نہیں دل
"سلیمیٰ منذ حلّت بالعراقِ"

وہ جانِ آرزو ہے دور جب سے
"اُلاقی فی ہوا ہا ما اُلاقی"

غموں کا سایہ کب تک زندگی پر؟
گنوا دے میکدے میں عمر باقی!

چھلک جائے نہ مینا سے دو عالم
ہمارا ہات ہے اور زلفِ ساقی!

بتانِ ہند سے جی بھر چکا ہے
کدھر ہیں نازنینانِ عراقی؟

نہیں ہے عشق اگر اختر تو کیوں ہیں
یہ راتیں اور غزلہائے فراقی!

' یونیسکو ' میں ہندوستانی نمائندے

' یونیسکو ' کی جنرل کانفرنس کے پہلے اجلا
میں ہندوستانی نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ ا
میں سے چند پہلے سے وہاں موجود تھے
صرف تین نمائندے ۱۲ نومبر کو نئی دہلی سے
روانہ ہوئے جو اس تصویر میں موجود ہیں
(بائیں طرف سے) مسٹر آغا محمد اشرف (حکومت
ہند کے شعبۂ تعلیم کے ایک افسر) محترم
راجکماری امرت کور اور مسٹر غلام السیدین
(ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے) سر رادھا
کرشنن اس وفد کی قیادت فرمائینگے۔





۱۴ نومبر کو حکومت ہند اور حکومت امریکہ کے مابین
ہوائی حمل و نقل کے سلسلے میں ایک نیا معاہدہ عمل میں
آیا ہے۔ حکومت ہند کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو
اور سردار عبدالرب نشتر دستخط فرما رہے ہیں۔ تفصیل
کیلئے ' رفتار زمانہ ' صفحہ نمبر ۵ ملاحظہ ہو۔



# شاہ فیصل والئی عراق

عراق کے بادشاہ اعلیحضرت شاہ فیصل عر
زبان کا مشہور ماہانہ رسالہ ' النفیر ' بڑ
شوق سے مطالعہ فرما رہے ہیں جو ادا
متحدہ دہلی سے شائع ہوتا ہے۔



فلسطین اور سینا میں لڑنے والی آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ
کی فوجوں کی یادگار قائم کرنے کیلئے جورج لیمبرٹ
نے کانسے کے یہ خوبصورت مجسمے تیار کئے تھے۔



...طین کے شہر مقدبہ میں ترکوں سے نیل کے کنوئیں چھیننے میں
...ٹریلیا کی لائٹ ہورس بٹالین نے بڑی بہادری دکھائی تھی۔ اس موڈل
میں اسی سوار فوج کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

# پہلی جنگ عظیم میں مرنے والوں کی یادگار آسٹریلیا میں

ٹھیک انہیں دنوں جبکہ آسمان مغرب پر پہلی جنگ عظیم کے تاریک بادل چھائے ہوئے تھے آسٹریلیا کے ایک جنگی نامہ نگار نے جو خبریں بھیجنے کے
فرانس میں مقیم تھا۔ اپنے ہم وطن سپاہیوں کی یادگار قائم کرنے کے خیالی خاکے بنانے شروع کردئیے۔ اس خواب کی تعبیر ۲۴ سال بعد دوسری جنگ
...م کے دوران میں نکلی۔ یعنی ۱۹۴۱ ع میں قومی جنگی یادگار تعمیر کرائی گئی۔ جس پر ڈھائی لاکھ پونڈ خرچ ہوئے۔ لیکن وہ نوادر جو اسکے اندر
...وظ ہیں بہت بیش قیمت ہیں۔ اس میں خشکی تری اور ہوائی لڑائیوں کی ایسی ہزاروں تصویریں جمع ہیں جنکا ثانی ڈھونڈے نہیں مل سکتا۔ وہ سولہ
...ار جلدوں میں ہیں اوران کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ جنگی روز نامچے، رپورٹیں، تاریخی نقشے وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ مورخ اور طالب علم
...سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آسٹریلیا کے فوجی سپاہیوں اور افسروں نے اس تاریخی یادگار کو ہر لحاظ سے مکمل کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔ ڈاکٹر بین
...کاری طور پر جنگی مورخ قرار
...اور اپنے کارنامے کے سلسلے میں
...ٹر اوف لٹریچر ہوئے۔ اب دوسری
...ے عظیم کے سلسلے میں مسٹر
...ن لونگ آسٹریلیا کے جنگی مورخ
...ر ہوئے ہیں۔ وہ بھی قابل یادگار
...یں جمع کرنے میں مصروف ہیں۔



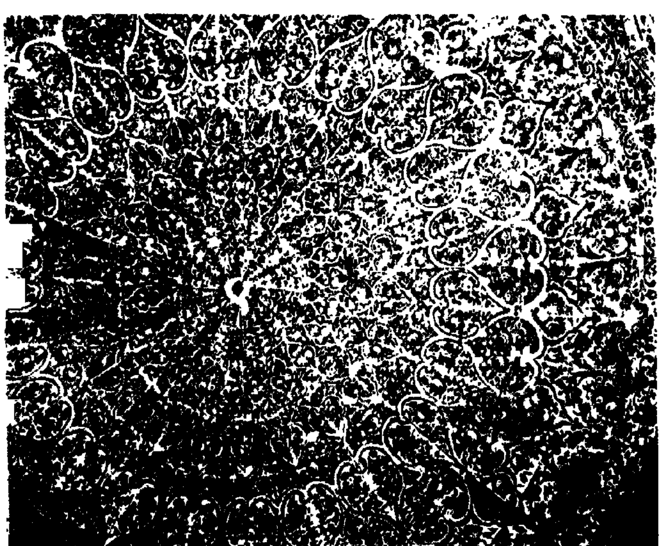
...ٹریلیا میں یادگار جنگ کی یہ
...رت ۳۹۰ فٹ لمبی اور ۱۹۶
چوڑی ہے۔ گنبد ۱۱۷ فٹ
...چا ہے۔ وسطی صحن میں ایک
حوض ہے جس کے پانی پر
...ب کے مناظر کا عکس پڑتا ہے۔
...ز کی صحنچیوں میں کانسی
ایسی تختیاں نصب ہیں جن
آسٹریلیا کے ان بہادر
...میوں کے نام کندہ ہیں جو
جنگ عظیم کے ... ہو گئے۔

# سقف و بام کی آرائشیں



شہر یزد کی مسجد "وقت الساعت" کا ایک خوشنما حصہ۔ محرابوں کی نقاشی اور گلکاری قابل دید ہے۔

ایران کی سر زمین پر جس شخص نے ایک بار قدم رکھ لیا یا جس نے وہاں کی مصنوعات کو قریب سے ایک نظر دیکھ لیا بس وہ دل و جان سے اسکا والہ و شیدا ہوگیا۔ مشہور استادان فن کی مصوری اور نقاشی کے شاہکار ابتک پوری آب و تاب کے ساتھ برقرار ہیں اور صحیح ذوق رکھنے والوں کی روحوں کو لطف و نشاط بخشتے ہیں۔ لوگوں کے فطری ذوق کے ساتھ وہاں کی خوشگوار آب و ہوا اور قدرتی مناظر کی دلچسپ کیفیات مل کر فنون لطیفہ کی ترقی کا باعث ہوتی ہیں۔ بادشاہوں کے محل تو ایک طرف مسجدوں اور مدرسوں کی دیواریں، چھتیں، محراب و منبر اور مینار بھی نقاشی، مصوری اور کاشیکاری کے وہ دیدہ زیب نمونے پیش کرتی ہیں کہ عقل انسانی انہیں دیکھکر دنگ رہ جاتی ہے۔ خراسان و آذربائیجان، ہمدان و شیراز اور یزد و اصفحان ایسے شاہکاروں کے مرکز رہے ہیں۔ اس صفحے کی تصاویر ان کمالات کے چند عکس پیش کرتی ہیں۔



"مدرسۂ خان" کی چھت کا ایک اور منظر۔ یہ خاندان زندیہ کے عہد کی یادگار ہے۔



شیراز میں "مدرسۂ خان" کی چھت کا ایک حصہ جسکی زینت و زیبائش درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔

# دیال باغ۔ آگرہ۔

رادھا سوامی فرقے کے پانچویں گرو نے ۱۹۱۵ء میں آگرہ کے قریب "دیال باغ کے نام سے ایک بستی قائم کی تھی جو اسوقت تین ہزار ایک سو ایکڑ کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس پر ستر لاکھ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ وہاں چھ ہزار سے زیادہ لوگ آباد ہیں جن میں سے ایک ہزار کے قریب صرف طالب علم ہیں؟ ان میں ہندوستان کے ہر حصے اور ہر فرقے کے لوگ شامل ہیں. بستی بالکل نئی وضع کی ہے۔ رہنے سہنے کے انتظام میں آرام کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔



دیال باغ کے مدرسے میں لڑکے مٹی کے گلدانوں اور دوسرے برتنوں پر ہاتھ سے نقش و نگار بنانے سیکھ رہے ہیں۔



قابل استاد . : اسکول کے طلبا کو علم الحیوانات پر سبق دے رہا ہے۔ (نیچے) اس بستی میں خاص وضع کے ایسے مکانات بنائے گئے ہیں جو خوبصورت بھی ہیں اور آرام دہ بھی۔





دیال باغ کے ایک کارخانے میں مشین سے بنیان بنے جارہے ہیں۔ یہاں ہوزری کا





لڑکیوں کے کالج کا نام 'بریم ودیالیہ' ہے۔ لڑکیاں فرسٹ ایڈ کا کام سیکھ رہی ہیں۔ (بائیں طرف) کالج کی ایک لڑکی جلترنگ سیکھنے کی مشق کر رہی ہے۔ یہاں موسیقی کے سب ساز بجانے سکھائے جاتے ہیں۔

---

اسمیں ہر قسم کی تعلیم و تربیت کے مدرسے اور ہر صنعت و حرفت کے کارخانے قائم ہیں۔ اس فرقہ کے چھٹے اور موجودہ گرو سری مہتاجی مہاراج خود اسی بستی میں رہتے ہیں اور دینی اور دنیاوی معاملات میں اپنے پیروؤں کی رہبری کرتے ہیں۔



جدید صنعتوں کے سلسلے میں بھی ہر قسم کی تربیت دی جاتی ہے۔ تکنیکل کالج کے طلبا گاڑی کے موٹر پر تار لپیٹنا سیکھ رہے ہیں (نیچے) بجلی والے کارخانے میں بجلی کے پنکھے بنائے جا رہے ہیں۔



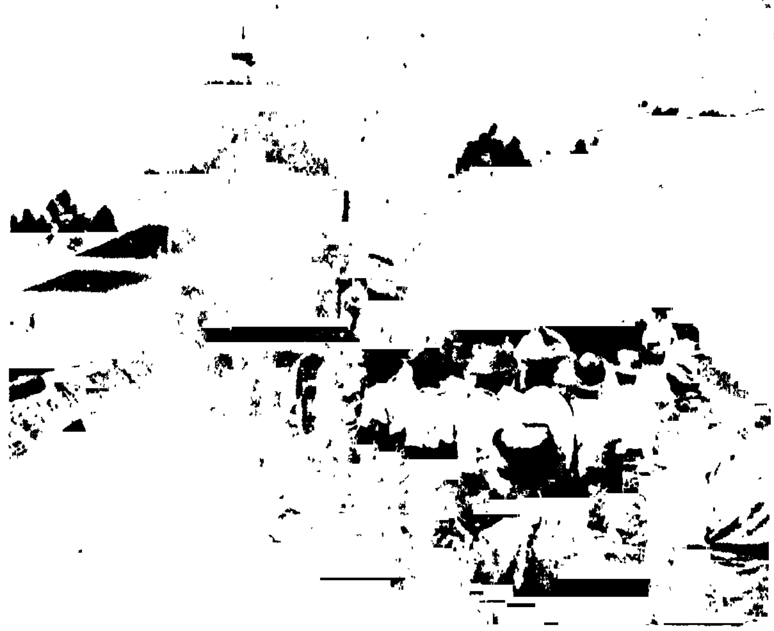
ڈیری میں بجلی سے چلنے والی مشین مکھن تیار کر رہی ہے۔



# برما کا نیا دور



ابراودی ڈیلٹے کا ایک برمی کاشتکار - چوڑے چھجے کا ٹوپ چہرے کے علاوہ پائپ کی بھی حفاظت کرتا ہے۔



کاشتکار ایک اجلاس میں شریک ہونے کیلئے جارہے ہیں۔

برما کی سرزمین ساڑھے تین سال تک لڑائی کی تباہکاریوں کے زیر اثر رہی ہے - لیکن وہاں کی موجودہ سیاسی بیداری نے زندگی کا ایک نیا دور قائم کردیا ہے - اکتوبر ۱۹۴۵ء میں وہاں شہری حکومت کا قیام عمل میں آگیا تھا - دارالعوام کے تازہ بل کے مطابق نئے انتخابات اپریل ۱۹۴۷ء میں ہوجائینگے - برما کے دیہاتوں میں مسلح ڈاکوؤں کے جتھے ہمیشہ شورش بپا کئے رکھتے ہیں - چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ڈاکو برما کا سب سے بڑا دشمن ہے - اسلئے برما کے امن پسند لوگ یعنی کاشتکار اور مزدور نئی اقتصادی تنظیم کے ساتھ ساتھ امن وعافیت بھی چاہتے ہیں - امید ہے کہ پچھلے سال کی به نسبت اس سال بیس لاکھ ایکڑ زیادہ زمین جوتی اور بوئی جائیگی اور اسطرح وہاں بیس لاکھ ٹن چاول بچ رہیگا - برما کے معاملات میں ہندوستانیوں نے ہمیشہ گہری دلچسپی لی ہے - یہ سلسلہ آئندہ بھی قائم رہیگا -



شہر ہنزادہ میں ڈسٹرکٹ کونسل افسران کی عمارت۔

# سوڈان

شمالی افریقہ کے مشہور و معروف ملک
سوڈان کی تصاویر اس صفحے پر شائع
کی جارہی ہیں۔ مفصل مضمون آپ اس
شمارے کے صفحہ نمبر ۵۵ سے ملاحظہ
فرماسکتے ہیں۔



خرطوم میں کچنر اسکول اوف
میڈیسنز کی عمارت۔

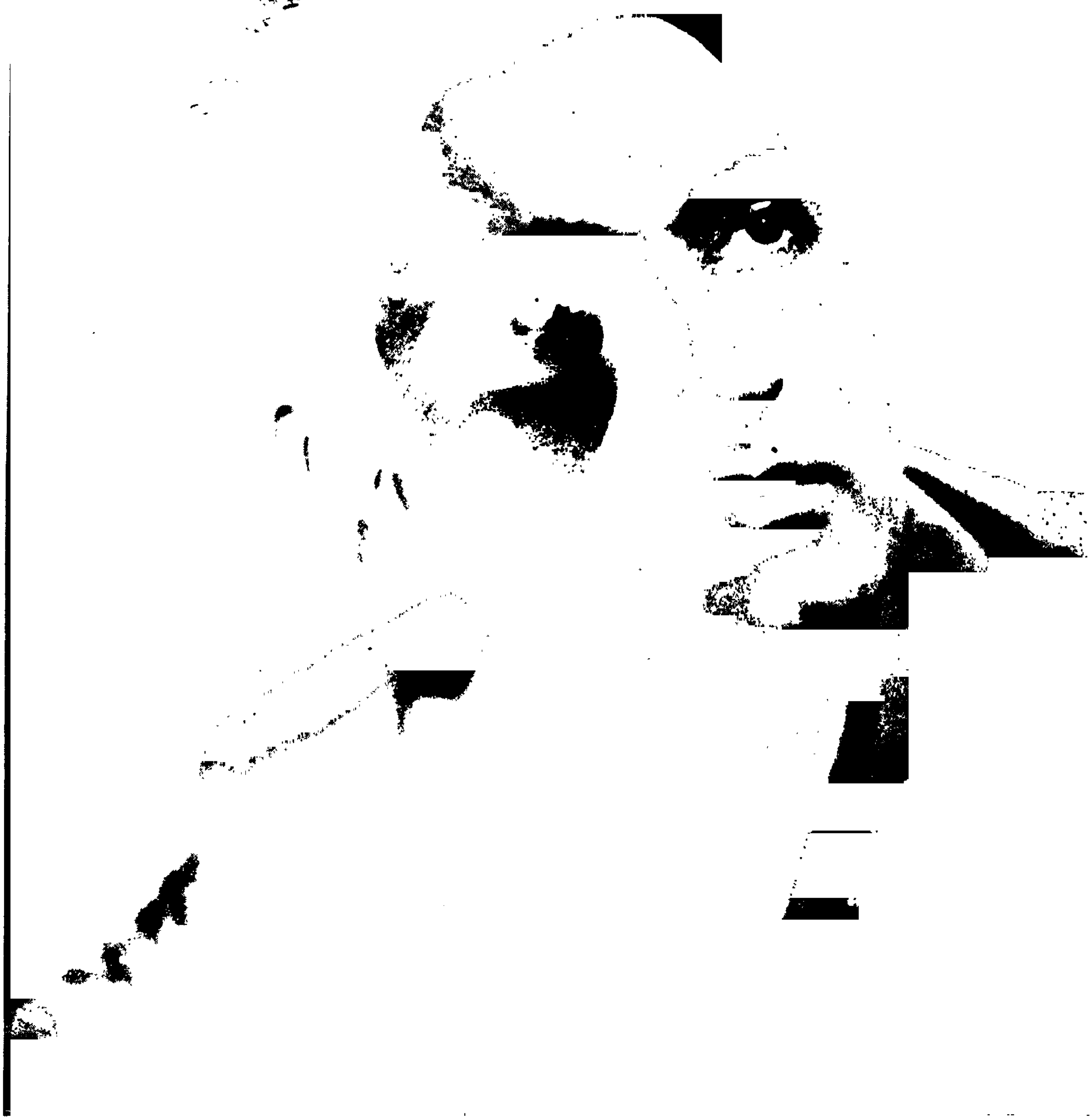


سوڈان میں برطانوی حکومت کو قائم ہونے چالیس سال ہوگئے ہیں۔ اس دوران میں وہاں کے طبی اداروں نے ترقی کرکے اعلی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ خرطوم کا "کچنر سکول اوف میڈیسنز" سب سے اہم ادارہ ہے۔ جہاں ڈاکٹروں، حفظان صحت کے انسپکٹروں، نرسوں اور دائیوں وغیرہ کی تربیت ہوتی ہے۔ اس میں سوڈانی بڑی دلچسپی اور ذمہ داری کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ حفظان صحت کے امور عامہ کے علاوہ سوڈان کا طبی محکمہ اور بھی خدمات انجام دیتا ہے مثلاً ایسی وبائی بیماریوں کے سلسلے میں تحقیق و تفتیش جو گرم ملکوں میں عام ہوتی ہیں۔ اس محکمے نے ادویات کی فراہمی کے علاوہ ایسا طبی عملہ بھی تیار کیا جسنے محاذ جنگ پر بڑے کارہائے نمایاں پیش کئے۔

ڈاکٹری سیکھنے والے ہونہار طلبہ
اپنے مدرسے کی جماعت میں



حفظان صحت کا کام سیکھنے والے
خوردبینوں کے ذریعہ بیماری پھیلانے
والے کیڑوں کی حقیقت سمجھ رہے ہیں ←



سربندر -- ایک فلمی اداکار۔

# میخانے

روش صدیقی

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے — نگاہِ یار سلامت، ہزار میخانے
یہ کیا ہوا؟ اے دلِ ناداں کہ ابھی محفل تک — پہونچ گئے تری خاموشیوں کے افسانے
چراغِ دیر و حرم کا تو اک بہانہ ہے — خود اپنی آگ میں جلتے ہیں تیرے پروانے
شریکِ خلوتِ محبوب ہے یہ تنہائی — فروغِ انجمنِ ناز ہیں یہ ویرانے
مری شراب میں زہرِ خود آگہی تو نہ تھا — بدل دئے ہیں کسی خوش نظر نے پیمانے
کنارِ درد میں نیند آ گئی محبت کو — ہوئے تمام فریبِ سکوں کے افسانے
تری خبر ہے نہ اپنی خبر ہے کچھ، پھر بھی — الجھ رہے ہیں غمِ آگہی سے دیوانے
یہاں بھی رحمتِ پیرِ مغاں سے ہو محروم — وہاں کی بات بھی اے واعظو! خدا جانے
نہ پوچھ گردشِ چشمِ سیاہ کا عالم — اتر رہے ہیں فلک سے زمیں پہ میخانے
کمال ہے مرے ذوقِ صنم پرستی کا — طوافِ ارضِ حرم کر رہے ہیں بتخانے

گناہِ پاکئ داماں ہوا معاف روش!
کیا ہے یاد کسی غیرتِ زلیخا نے

## غزل — نجم آفندی

نہ اب اہلِ دل ہیں نہ اب درد والے — محبت کے مالک محبت اٹھا لے
اب اسیری ہی ہے غیرتِ عشق راضی — ہمارا نہ بن ہم کو اپنا بنا لے
بدلنا نہیں ہے مزاجِ محبت — جفا آزما لے، وفا آزما لے
شناسا ہی تم سے نہیں ملتے ہیں — بڑے بے جگر ہیں ستم کرنیوالے
کوئی جان لے کر بھی اب دل نہ دیگا — کہاں دل کے بدلے ہیں دل دینے والے
محبت میں ہے یہ نزاکت کا پہلو — ہمیں کر گئے ہیں ہمارے حوالے
کسی کی بڑی کاوشوں کے ثمر ہیں — یہ گر ہیں دلوں کی زبانوں کے چھالے
وطن میں غریب الوطن ہو رہے ہیں — کسی پر خدا یہ مصیبت نہ ڈالے
یہاں دل ہی دل میں دل افسردگی ہے — کہیں ایک دل ہو تو سو دل سنبھالے

جہنم میں جاؤں تو اے نجم رضواں
اٹھا کر جہنم کو جنت میں ڈالے

## غزل — شرقی خالدی

رہوں جو بلائے اسرارِ بقا کیا — فنائے ہوش میں ہوش فنا کیا
عدم ہے زندگی سے آشنا کیا — نہ ہونے پر نظر آتا ہے کیا کیا
پشیمانی مآلِ نازشِ دل — ترا لطفِ تلون آشنا کیا
نہیں اٹھتی یہ تہمت زندگی کی — سرِ سودا نے دردِ دل دوا کیا
جزاک اللہ خوئے سرد مہری — سپاس ہمتِ اہلِ وفا کیا
زمانہ نقشِ پائے اولیں ہے — جنوں کی شورشوں کا پوچھنا کیا
ہمیں خود مر مٹے ہیں زندگی پہ — نگاہِ نازِ قاتل کا گلا کیا
ترے ہوتے بھی دل بے چین سا ہے — جنوں ہے مصلحت سے آشنا کیا
تمہیں ہر دل عزیزی سے تعلق — ہمارے غم سے تم کو واسطہ کیا

نظر ملتے ہی شرقی فیصلہ ہے
زباں کے واسطے سے التجا کیا

# ایک نہ بھولنے والی رات

خواجہ محمد شفیع

شباب کا زمانہ تھا، مسیں بھیگ رہی تھیں، رخساروں پہ سرخی تھی، دل میں امنگ، جسم پر روپ، رانوں پہ قیامت کا گداز، کمر میں چیتے کی سی لچک، سینہ بھرا ہوا، بازو بنے ہوئے، رفتار میں مستی تھی، گفتار میں شوخی۔

گرمی کا زمانہ آیا۔ جون، جولائی کی لوؤں سے بچنے حسب دستور مسوری جا پہنچا —— کون جوان بول روم ڈانسنگ کا دلدادہ نہ ہوگا۔ از انجملہ ہم بھی تھے۔ سیکھا بھی اس شوق سے کہ سارے سارے دن کمرہ بند کر کے نئے سے نئے سٹیپس کی مشق کرتے رات بھر بول روم کے تختے ہمارے زیر پا رہتے۔ ایک روز لنچ کے بعد میں اپنی رقص کی استانی کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ ایک چاند کی سی کرن دروازہ میں داخل ہوئی۔ میں نے اپنی عمر میں بہت سی حسین عورتیں دیکھی ہیں لیکن اس کے چہرہ کی گرما گرمی ہی کچھ اور تھی۔ شعلہ جوالہ ہماری جانب آتا نظر آتا تھا۔ سرو چراغاں نے کبک خرامی سیکھ لی تھی۔ بقۂ نور شمع کافور صرف رقص۔ اس آتش خرمن سوز نے بیک نگاہ بسمل ہائل میرا صبر و شکیب پھونک دیا۔ عجیب شکر بار حسن تھا —— اس سراپا حسن کا سراپا کیا بیان کروں۔ اس جمال لامحدود کو الفاظ کی آغوش میں لایا نہیں جاتا۔ اس آتشیں کا ذکر کرتے ہوئے نکتہ سپند وار ہر حرف جلے جاتے ہیں۔ دو ابرموئے آتش دیدہ ہیں تو کشش امن گلخن رسیدہ۔

صنوبر قامت، لالہ رُخ، سرو جوبار حسن۔ آنکھوں میں سیاہی اور سفیدی کے ساتھ ہلکی سی سرخی کی جھلک ایسی نظر آتی تھی جیسے سیپی میں در سیاہ ہو اور اس پر شفق اپنا ہلکا سا سایہ ڈالے —— پھر اس پر سیاہ پلکیں قیامت پر قیامت تھیں۔ محشر میں ایک اور حشر۔ بعینہ ایسا نظر آتا تھا جیسے کوثر و تسنیم پر بوقت شام سنبل کا سایہ پڑ رہا ہو۔ چاند سے ماتھے پہ بھنویں جیسے سینۂ شیریں پر تیشۂ فرہاد کی پرچھائیں۔ اس پہ سیاہ بال زنجیر بنا رہے، پہ شام اودھ منڈلاتی ہوئی —— سرخ و سفید سڈول گردن، بلوریں صراحی میں پگھلا ہوا یاقوت۔ رخساروں کی سرخی قلب مانی میں خیال۔ مئے احمر یا سمنی کی پتی پر شفق یا ہیرے کی تختی پر لعل یمانی کا پرتو۔ سینہ کا ابھار جیسے قلب زاہد میں سیب بہشتی کا خیال یا سنگ مرمر پہ پولی برف کی نازک ڈھیریاں —— بلوریں شکم چاندنی کی آبشار جیاں نہ ہو دور ار بہ جائے یا چاندی کی بنی ہوئی نرم و نازک چادر جس پر عابد شب زندہ دار سونا چاہتا ہے۔

کمر میں بید مجنوں کی لچک۔ شاخ صنوبر کا لوچ —— سرین کا گداز جیسے دودھ کے جھاگ، رانیں موتیوں کے مخروطی ستون، پنڈلیاں زہد مجسم کو پا برجا نہ رہنے دیں۔ پیر لیکخت خا۔ یہ حسن مجسم پیکر شباب۔ خوابوں کی دیوی۔ ملکۂ جمال روپ رانی اٹھلاتی ہوئی ہمارے قریب آئی۔ میں لڑکھڑاتا ہوا کرسی کا سہارا لے کر تعظیماً اٹھا۔ وہ وجد آفریں و نغمہ بار عجب نقرئی آواز میں بولی۔ میں مس ڈورس سے ملنا چاہتی ہوں'۔ یہ ڈانسنگ انسٹرکٹرس کا نام تھا۔ میں نے تعارف کراتے ہوئے ایک کرسی آگے کو سرکاتے ہوئے تشریف فرما ہونے کی التجا کی۔

وہ کچھ اس انداز سے بیٹھی جیسے کوئی نازک ہاتھ گلدان میں پھول رکھے۔ پھر مس ڈورس سے مخاطب ہوئی۔ ... سبا ناچ سیکھنا چاہتی تھیں۔

ٹرمز بتلانے کے بعد مس ڈورس نے سبق دینا شروع کر دیا۔ عورت رقص آشنا تھی فوراً یہ نئے قدم سیکھ گئی۔ بعدہٗ اس کمترین کے ساتھ استانی کی تجویز پر پریکٹس شروع ہوئی۔ جب میں نے اس فردوس منظر حسینہ کو اپنی آغوش میں لیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں جنت در بغل ہوں۔

کوئی ایک گھنٹہ ہم ساتھ ناچتے رہے۔ میں عجیب کیف و خمار کی دنیا میں تھا۔ ہر عضو بدن سرور محسوس کرتا اور میں میکدہ در کنار۔

خاصی مشق کرا دینے کے بعد میں نے شام کو انہیں ہوٹل میں مدعو کیا۔ ان محترمہ کا نام مس رعنا یوسف تھا۔ میں چار بجے سے ہی منتظر دیدہ و دل فرش راہ ہو بیٹھا۔ بوائے سے تین بار کرسی بدلوائی۔ گلدان کے پھولوں کو درست کیا۔ ٹیبل کلوتھ کی خیالی سلوٹیں نکالیں۔ ہر چاپ پہ نگاہ دروازہ پہ جاتی کہ آخر کار وہ جان انتظار آ ہی گئیں۔ میں پیشوائی کو گیا دل نے قدم چومے۔ آنکھوں نے بلائیں لیں۔

پہلے چائے کا دور رہا اس میکدہ بدوش سرور مجسم کے ہاتھ سے چائے میں بھی کیف مے تھا۔ شراب میں بھی اچھوتی سرخوشی کا عالم۔

بینڈ بج رہا تھا۔ دور چل رہا تھا۔ ساغر سے ساغر کھنک رہے تھے۔ بوتلیں اپنا راز درون گلاسز میں الٹ رہی تھیں۔ گلاس چھلکے پڑتے تھے۔ قلب آدم جھوم رہا تھا۔ ابن آدم لغزیدہ پا۔ حوا کی بیٹیاں مائل بہ گناہ تھیں۔ آدم کے بیٹے آمادہ بہ معصیت۔ سرمستی کی گھٹائیں چھائیں تھیں۔ عیش و عشرت کے مینہ برس رہے تھے۔ عشق کو نیاز تھا حسن مست ناز۔ عجب مستی و سرمستی و بدمستی کا دور تھا۔ ساری رات اسی عالم نشاط میں کٹی —— صبح ہوتے

شبنم کے موتی روندتے ہم باہر نکلے۔

ایک ہفتہ تک صحبتیں رچتی رہیں۔ محفلیں جمتی رہیں۔ اوراق بہار عشق گردانے گئے۔ زندگی واسوخت امانت بنی رہی۔ چاندنی راتوں میں سیریں رہیں۔ اندھیری راتوں میں خلوت۔

ایک روز میرا عزیز ترین دوست اشرف میرے بلاوے پر مسوری آیا شام کو نووارد کو ہمراہ لے میں حسب دستور ہیک میں جا پہنچا۔ وہاں اشرف کا رعنا سے تعارف کرایا۔ اس حسنِ مردافگن نے اشرف پر بجلی سی گرائی۔ آنکھوں سے حال دل ظاہر۔ ہاتھوں کا ارتعاش روح کی تڑپ کا آئینہ دار تھا۔ واپسی پر اشرف نے کہا ظالم میں مرگیا۔ اس ایک لفظ میں پوری داستان قلب پوشیدہ تھی —— دوسرے روز شام کا انتظار وہ کچھ ایسی بیتابی سے کرتا رہا کہ اضطراب پروانہ کا شبہ ہوتا۔

بہرنوع ہر صبح کے بعد شام ہے۔ اپنے وقت مقررہ پر مسوری کی شام آئی۔ زلف محبوب کی مستیاں و تاریکیاں لئے ہوئے۔ کسی سیہ مست کی لغزشوں کی حامل۔ ضمیر کی روشنی پر گناہوں کے کالے پردے ڈالتی۔ عصمت و عفت پرستاروں بھرے خندۂ دنداں نما کی بجلیاں گراتی آئی ولعبدنا نہ آئی۔

ہیک مین میں رنگ رہا۔ ساغر شراب بھی چھلکا مینائے شباب بھی اس دور ثانی و ملاقات دیگر نے اشرف کو کہیں کا نہ رکھا —— اس ساحرہ پر طبیعت میری بھی آئی تھی۔ دل کو میرے بھی یہ موہنی صورت بھائی تھی۔ لیکن اشرف کا حال ہی کچھ اور تھا۔ ہر دم اسی کی دھن تھی اسی کا خیال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پروانے کو قرب شمع کا حق سمجھنا ب سوختن ہے۔ میں صرف فانوس سے کھیل رہا تھا وہ لو پر سینہ رکھنے کو آمادہ۔ پھر دوست کا معاملہ آخر ہمیں میدان چھوڑنا پڑا۔

اکثر ہم تینوں پروگرام ساتھ بناتے۔ اکثر میں کچھ دیر بعد ہوٹل جاتا۔ گاہ بگاہ رعنا و کیتی بھی لیکس میں دو میں تنیسرا آنکھوں پہ ٹھیکرا بنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک روز صبح سے اشرف نے تیاریاں شروع کیں۔ معلوم ہوا کہ دلدار نے کامٹی فول پر ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ تخلیہ کی ملاقات ہوگی۔ تنہائی کی مدارات۔ لنچ عاشق و معشوق ساتھ کھائیں گے۔ سارا دن وہیں بتائینگے۔ اشرف نے ہوٹل سے نت نئے کھانے ٹفن باسکٹ میں بھروائے۔ رنگارنگ شرابیں ساتھ لیں —— ساتھ جانا پروگرام میں نہ تھا۔ وہاں گیارہ بجے کا وعدہ تھا۔ بریک فسٹ کے بعد ہی سے اس نے کپڑے پہننے شروع کئے۔ کبھی اسپورٹنگ کٹ پہنتا تو گاہ خاص ڈرائنگ روم سوٹ۔ ٹائیوں پر ٹائیاں بدل رہا تھا —— ہوٹل کے مالی کو حکم تھا کہ سب قسم کے بٹن ہول بنا کر رکھے —— عطروں میں اپنے کو کچھ ایسا بسایا کہ گلاب گندھی کی دکان کی مہک آتی تھی۔ غرضیکہ ابھی دس نہیں بجے تھے کہ جوبہ بن سنور کے روانہ ہوئے۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا ایک ناول سے دل بہلا رہا وقت گذار رہا تھا کہ دروازہ پر کسی نے آہستہ سے دستک دی میں نے اندر آنے کو کہا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو رعنا سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں نے تعظیم دی۔ دل میں یہ سوچ کر متعجب ہوا کہ ان بیگم کو تو اس وقت کامٹی فول پر ہونا چاہئے تھا۔ پھر خیال آیا کہ کہیں اشرف کو ڈھونڈتی ہوئی تو یہاں نہیں چلی آئی ہیں۔ بہرنوع میں نے پوچھا کہ آپ ابھی کامٹی فول نہیں گئیں۔ اشرف تو بڑے بڑے احترامات کے ساتھ یہاں سے گیا ہے۔ رعنا کے رخ ماہتاب پر ایک لکۂ ابر سا آیا اور گذر گیا۔ بولی مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی تھیں اس وجہ سے آئی ہوں۔ اب مجھے خیال آیا کہ شاید یہی سبب اشرف کو ٹالنے کا تھا۔ چونکہ میں اور وہ ہمہ وقت ساتھ رہتے تھے اور رعنا کو مجھ سے بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

رعنا مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے اور تنہائی میں۔ اس کا میلان طبع میری طرف ہے اور دل میرا متلاشی اس کی نظروں کے مبہم پیام آج منت کش معنی ہو رہے ہیں اس تخیل کے آتے ہی فضائے قلب پر ایک چاندنی سی چھٹک گئی۔ روح متبسم محسوس ہوئی لیکن فوراً ہی کسی نے گوش قلب سے کہا۔ یہ اشرف کے ساتھ غداری ہوگی۔

اس خیال کے آتے ہی میرے دل نے دست گناہ کو ایک عفیفہ کی طرح جھٹکا اور ستون عزم و دوست داری کی آڑ لی —— یہ لغزش و استقامت سب چند سکنڈز میں ہوگئی۔ رعنا نے اپنی ساڑی کے پلو سے کھیلتے ہوئے میرے دامانِ دل پر ہاتھ ڈالا۔ میں اس اندازِ درازدستی کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے سے دائرے میں کھیلتا رہا بچتا رہا جب تک بات اشاروں کنایوں میں رہی میں ٹالے بالے دیتا رہا۔ آخر نوبت بایں جا رسید کہ بیگم نے صاف کہہ دیا کہ مجھے محبت تم سے ہے اشرف بلاوجہ میرے گلے پڑ رہا ہے —— میں نے اس وقت تک قطعاً کوئی ہمت افزائی نہیں کی وہ تو کچھ پہلے ہی روز سے دیوانہ ہوگئے ہیں۔ مدعا یہ کہ اشرف کو والہ و شیدا کرلینے کے بعد اب یہ مرد شکار مجھے مسخر کرنا چاہتی تھی۔

حسن گلوسوز بھی تھا۔ نگہہ سینہ دوز بھی۔ گاہ گاہ میری جانب دیکھ کر تنفس کی تیزی سے سینہ کا مد و جزر سفینۂ جبات تہ و بالا کر رہا تھا۔ پھر لب لعل پر دردنداں باندازِ تاسف آتے قلب آدم نشتر الماس کی

برش محسوس کرتا ——— غرضیکہ میں عجیب کش مکش میں تھا۔ وہ ایمان دشمن اپنے حسین سنان و تیر لئے آمادہ بجہاد تلی تھی۔ ادھر قلب و دست دار پابرجائی پہ کمر بستہ۔ در دے و سخت دردے کا ہوے و سخت کا رے۔

میں نے اشرف کی بے قراری اور اس وعدہ خلاف سے ملاقات کی تیاری اور شوق بے پایاں کا تصور ذہن میں مستحضر کیا پھر اس حیلہ جو کی عیاری پر نگاہ ڈالی ——— کیا فن دیکھئے۔ اشرف کو وعدہ ملاقات پر ٹالا اور پھر میدان خالی کرا میرے پاس آن پہنچی۔ ایک کو شکار کر چکی تھی، دوسرے کو تیر اک سے باندھنا چاہتی تھی ——— تخیلات کے اس ہجوم نے رعنا کے چہرہ کی حسین نقاب تار تار کر دی۔ اس جذبات حق آشنا کی شمع نے پیشانی حسین تنزدیر کار پر کذب و ریا کی تحریریں اجاگر کر دیں ——— مجھے اپنے سامنے ایک اور رعنا نظر آنے لگی ——— گل رخسار وہی تھی لیکن پتیاں کچھ متنفر کن زاویوں میں جڑی ہوئی تھیں ——— ہونٹ اب بھی گلابی ریشم کے ڈورے تھے لیکن ناگ کے سے بل کھائے ہوئے۔ آنکھیں اب بھی کنول کے سے پھول نظر آتیں لیکن نوک مژگاں نیش عقرب دکھا رہی تھیں ——— ماتھا بے شک مہ ہفت روز تھا لیکن خرد سوز دیوانہ کن تابانیاں لئے ہوئے ——— سیاہ بال بلاشبہ انگور کے خوشے نظر آتے تھے لیکن اب ان میں کیف سم تھا سرور سے نہیں۔

غرضیکہ یہ آغوش نورد حسینہ میرے پاس سے محروم و ناکام۔ مایوس نامراد ہوئی ——— تیسرے پہر اشرف آیا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں تکان انتظار سے مضمحل ——— ایک طرف کرسی پر بیٹھا میں ظاہرہ کتاب میں منہمک رہا۔ تھوڑی دیر بعد بولا رعنا تو ادھر نہیں آئی۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ بولا وہ آئی نہیں میں انتظار دیکھتا رہا۔

شام کو ہیک مین میں ملاقات ہوئی حسن حیلہ جو نے بیک نگہ شرمسار
عشق اعتبار جو کے سارے گلے شکوے ختم کر دیے ؎
جہاں پہ جھک گئیں وہ نظریں منفعل ہو کر
وہیں پہ ختم فسانہ عشق کا فسانہ تھا

آج ہیک مین کی ایک میز پر ایک سرحدی خان تشریف فرما تھے۔ اس شہر کوتاہ آستینان میں تعارف کے لئے زیادہ ہاتھ بڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ رندان ازل و مخمور چشمان رند نواز دیکھتے دیکھتے لمحوں میں آشنا ہو جاتے ہیں۔

ہمارا بھی تعارف ان خان صاحب سے ہو گیا ——— خوش رو جوان متواضع انسان چہرہ سے سرداری آشکارا دادا کے سرداری میں ہلکا سا انکسار ——— باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ یہ جس علاقہ پر امو ہیں وہاں لال کافروں کی آبادی ہے۔ یہ سنتے ہی رعنا کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوئی اور فوراً چند فقرہ ایک اجنبی زبان میں بولے۔ خان نے اسی زبان میں جواب دیا۔ پھر یہ عقدہ کھلا کہ یہ بت ایمان سوز ایک کافرہ کے بطن سے تھی ——— رعنا کا حسن پرست باپ ایک لال کافر لڑکی کو لے آیا تھا اسے تہذیب و تمدن سے مزین کیا ——— رعنا اسی نہال کو ہی کا غنچہ ہے۔

خان نے ہم سب کو اپنے علاقہ میں آنے کی دعوت دی۔ رعنا نے بھی اصرار کیا اور کہا ایک بار اپنا مادری وطن دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ اشرف اور میں راضی ہو گئے۔

غرضیکہ کچھ روز بعد یہ قافلہ مسوری سے سوئے کافرستان روانہ ہوا۔ راہ کے حسین مناظر دیکھئے۔ قدرت کی کرشمہ کاریوں پر عش عش کرتے منزل بمنزل پہونچ گئے اور رخت سفر جائے قیام پر جا کھولا۔

پٹھان تواضع۔ برفانی اور کوہستانی مناظر۔ لب جو دامان کوہ۔ نغمۂ ہزار۔ ہوا عطر بیز چشم ساقی بادہ ریز۔ فطرت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ پیش نظر تھی اور رعنا اپنی خمار بار و مست کن اداؤں کے ساتھ شکر فگن۔

اس کافرہ کا حسن ایمان دشمن اس فضائے تقوی شکن و کفر پرور میں کچھ ایسا نکھرا کہ چشم خرد خیرہ ہوئی جاتی تھی۔ دل پروانہ کی طرح اس شمع رخسار کے قدموں پر گرتا نظر بلائیں لیتی۔

ایک روز خان نے کہا آئیے آج آپ لوگوں کو لال کافروں کی ایک خاص رسم دکھائیں۔ ہم سب اپنے میزبان کے ہمراہ درون کے اندر گئے۔ چاند نکلا تھا۔ فضائے بسیط پر سیم سیال بہ رہی تھی۔ ایک جانب سے عجیب مسنکن سازوں کی آواز اٹھی۔ فضا شراب برسا رہی تھی۔ سرسوتی دیوی خم لنڈھا رہی تھی۔ اہرمن نے جذبات گناہ بے لگام کر دیئے تھے۔ کافروں کی وحشیانہ چیخیں معبد قلب میں معصیت کے دیوتا جگا رہی تھی۔ لعل و الماس کی تراشیدہ کوہستانی حسین دوشیزائیں محو رقص تھیں۔ شراب شباب نے ان برف و گلاب کی دیویوں کو دیوانہ کر دیا تھا۔

اس ہنگامۂ حسن و سرور میں ایک جوان مجسمۂ شباب بھونرے کی طرح ہر گل نورس کا رس چوس رہا تھا۔ اس سراپا شباب و جذبات پر کام دیوتا کا شبہ ہوتا تھا۔ اس غول حسن میں اس طرح اینڈتا پھر رہا تھا جیسے کالا ہرنیوں میں، طاؤس مورنیوں میں۔

خان نے ہم کو بتایا کہ یہ شخص بٹالک کہلاتا ہے۔ ان کافروں کا یہ دستور ہے کہ حسین اور قوی نسل قائم رکھنے کے لئے ایک مرد سانڈ کی

حیثیت سے پالتے ہیں اور اسے بڑالک کہتے ہیں۔ سال بھر تک اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ سا گرہ اسے حق ہے جس حسینہ سے چاہے نسل کشی کرے۔ موسیقی کی گونج پہاڑوں کے سینے چیرے ڈال رہی تھی۔ شراب خام کی روانی سر جھکا رہی تھی۔ بڑالک کی ہر چیخ پر جذبات خفتہ جاگ جاگ اٹھتے۔ پہاڑی دوشیزاؤں کی تمناؤں بھری نیم نگاہیاں دل چیرے ڈالتی تھیں۔ تمام فضا پر اہرمن کا تسلط تھا۔ کام دیوتا کی حکمرانی۔ ہوا لڑکھڑا رہی تھی۔ تمام کائنات لغزیدہ پا نظر آ رہی تھی ـــــ رعنا ہاتھ میں ہاتھ دئے ہوئے سرو و چنار کی مانند جھوم رہی تھی۔ سات کو ایک بجے کے قریب ہم سب وہاں سے مست و مخمور لوٹے۔

ابھی دو کا عمل ہوگا۔ چاند وسط سما سے گذر چکا تھا کہ میں نے اپنے دروازہ کے سامنے سے ایک سایہ سا گذرتے ہوئے دیکھا۔ ابھی کوئی پندرہ منٹ نہیں گذرے تھے کہ ایک اور سایہ گذرا۔ اب میں نے باہر نکل کر دیکھا تو اشرف ایک سوتے میں چلنے والے کی طرح منہ اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ میں بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔

ابھی تھوڑی دور گئے تھے کہ دور سے وہی موسیقی کی آواز گونجی۔ اور بڑالک کی چیخ سنائی دی۔ ہم گھاٹی کے ایک موڑ سے مڑے ہی تھے کہ رعنا اور بڑالک ہم آغوش نظر آئے۔

ابھی میرا دماغ اس منظر کو پوری طرح سمجھا نہ تھا کہ بندوق سر ہوئی بڑالک اور رعنا ایک تیر تھا کہ جس میں دونوں چھید کے پڑے تھے۔ ایک جگہ سے برف تڑخی ہوئی تھی اس نے ان دونوں کی سپردگی کی۔

## جھلملیاں ـــــ اقبال فاروقی

سوزش درد میں اگر لذت بیخودی نہیں ÷ عشق میں زندگی نہیں حسن میں دلکشی نہیں
دل نہیں گر شریک غم، غم نہیں گر شریک دل ÷ پھر تو حیات عشق میں کوئی خوشی خوشی نہیں
کاش یارب وہ دن بھی آجائے ÷ جبکہ انسان خود کو پا جائے
وہی ہوتا ہے بہرہ یاب حیات ÷ اپنی ہستی کو جو مٹا جائے
دل میں اگر تلاطم جذبۂ اضطراب ہو ÷ حسن بھی کامیاب ہو عشق بھی کامیاب ہے
مجھ کو نہیں ہے کوئی غم آپ کی شست ناز کا ÷ لاکھ ہجوم غم سہی پھر بھی ظفریاب ہے
خود کو دنیا میں کھو رہا ہوں میں ÷ ہاتھ عقبیٰ سے دھو رہا ہوں میں
اب تو یہ بھی خبر نہیں اقبال ÷ ہنس رہا ہوں کہ رو رہا ہوں میں
دل کو نثار حسن کر، حاصل عاشقی نہ دیکھ ÷ محو غم فراق رہ۔ فرق غم و خوشی نہ دیکھ
یہ میری شان بیخودی، تیری نظر کا فیض ہے ÷ اپنی نظر کو آزما۔ تو میری بیخودی نہ دیکھ

## غزل ـــــ جاں نثار اختر

کبھی آہوں کبھی نغموں کا طوفاں
یونہی گونجے گا کب تک ساز دوراں
ترا حسن نظر اور میرے ارماں
کرن میں جس طرح ذرے پر افشاں
ہر اک ذرہ کے سینے میں ہیں پنہاں
نہیں معلوم کتنے ماہ تاباں
ارے مطرب کوئی رنگین نغمہ
کہ غم ہے زخمۂ ساز رگ جاں
نگاہیں جھک گئیں اہل جنوں کی
یہ کس نے چاک کر ڈالا گریباں
محبت کی بدولت زندگی سہل
محبت کی بدولت موت آساں
وفائیں کیں تو اپنے واسطے کیں
وفاؤں کا مری کیا تجھ پہ احساں
سمندر کو یقیں آئے گا کس دن
کہ ساحل سے بھی اٹھ سکتے ہیں طوفاں
نوائے ساز و بوئے گل پہ کیا ہے
بہت کچھ ہے ابھی نظروں سے پنہاں
یہ عالم ہے ابھی تمہید عالم
یہ انساں ہے ابھی امید انساں
یہ گل بھی زخم یہ شبنم بھی آنسو
مجھے دھوکا نہ دے فصل بہاراں
مزاج عشق کی افتاد اختر
محبت ہے شکست دل پہ نازاں

سلہ: باوامی وہ تیز و تند ہوا جو برفانی چوٹیوں پر چلتی ہے اور ہر شے کو اپنے ساتھ اکھاڑ کر لے جاتی ہے۔

# برطانیہ اور نئے شہروں کی تعمیر

فتح چند کپور

یوں تو آج برطانیہ میں ایسی بہت سی باتیں ظہور میں آ رہی ہیں جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں لیکن کم سے کم اس شخص کے لئے جسے شہروں کی ترقی کے ساتھ دلچسپی ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں انگلستان آج ایک ایسی تبدیلی سے دوچار ہو رہا ہے جو صنعتی انقلاب سے لے کر آج تک کبھی وجود میں نہیں آئی۔ اور وہ تبدیلی یہ ہے کہ اپنے ملک میں نئے شہر تعمیر کرنے کا جو تصور آج ہمارے سامنے ہے وہ ان تیرہ و تار شہروں کے تصور سے بالکل مختلف ہے جو انیسویں صدی کی صنعت کے دور میں بنے اور تعجب تو یہ ہے کہ یہ شہر جس دور میں بنے وہ دور لطافت کا دور سمجھا جاتا تھا۔

آج ہمارے سامنے جس قسم کے شہروں کے خاکے تیار کرنے کے منصوبے ہیں وہ ایسے شہر ہیں جن میں سبزہ زاروں کی کثرت ہو گی اور جن کے مکان ان تمام ضروریات کو پورا کر سکیں گے جو انسانی زندگی کے موجودہ ترقی یافتہ معیار نے پیدا کی ہیں۔

جو لوگ مدت سے اس قسم کے مکانوں کے حامی تھے ان کے لئے شہروں کی تعمیر کا نیا قانون ایک ایسے معجزے سے کم نہ تھا جو اچانک وجود میں آ جائے لیکن یہ معجزہ ایک حقیقت نکلا اور اس نے ثابت کر دیا کہ مدت سے فضا میں بہتر قسم کی زندگی کے جراثیم موجود تھے، محض موقع کی دیر تھی کہ یہ کسی جگہ اکٹھا ہو جائیں اور جڑ پکڑ لیں۔ یہ موقع انگلستان پر جرمنی کے ہوائی حملوں نے بہم پہنچا دیا۔

لڑائی سے پہلے بھی انگلستان مکانوں کے نقشے اور شہروں کی تعمیر کے خاکے بنانے کے سلسلہ میں عملی طور پر دنیا میں پیش پیش تھا۔ ایبا نیزر ہاورڈ جنہوں نے اب سے پچاس سال پہلے شہروں کی تعمیر کا وہ نیا تخیل پیش کیا جس میں ہر شہر کو باغوں سے پر کر دینے کی تجویز تھی اور جس نے شہروں کی تعمیر کے فن کو ایک نئی زندگی بخشی، انگلستان ہی کے رہنے والے تھے۔ اس قسم کے دو شہر لیچ ورتھ اور ویلوین بھی انگلستان ہی میں بطور نمونے کے تیار ہوئے۔ اس کی تجدید کرنے والوں میں دوسرے مشہور شخص سر ریمانڈ آنوین ہیں۔ یہ بھی انگلستان ہی کے رہنے والے تھے۔ پھر یہ خصوصیت بھی انگلستان ہی کے حصہ میں آئی کہ جنگ سے کچھ عرصہ پہلے بارلو رپورٹ نے اس قومی پروگرام کا خاکہ پیش کیا جس میں جدید قسم کے شہروں کو ملک میں عام کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ شہروں کی تعمیر کے سلسلہ میں ہماری جو موجودہ پالیسی ہے وہ دراصل انھیں کوششوں کی انتہا ہے۔ اس پالیسی کو پارٹی بندی سے اونچا رہنا چاہئے اور اگر اب تک یہ اونچی نہ رہ سکی تو یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ نئی پالیسی قوم کے لئے اتنی دلکش کیوں ہے؟ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انگریز، خواہ وہ شہری زندگی کا کتنا ہی عادی ہو چکا ہو، دیہات کے ساتھ ایک قلبی تعلق رکھتا ہے اور وہ ان تیرہ و تار شہروں میں اپنے آپ کو اجنبی سمجھتا ہے۔ دیہات کے ساتھ اس کی یہ وابستگی اس وجہ سے ہے کہ گزشتہ دو سو برس میں، تنہا انگلستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں صنعتیت کا زور رہا اور نفع کمانے کی خواہش ترقی پر رہی۔ اس وجہ سے نہ شہری زندگی کو درست کرنے کی طرف توجہ کی گئی اور نہ اس مصیبت کا بدل سوچنے کی کوشش کی گئی۔

انگلستان کے قدیم شہروں میں جو بہترین شہر ہیں ان کے وسطی حصوں میں آج بھی جو پرانے پارک اور کھلے میدان نظر آتے ہیں مثلاً کرائسٹ چرچ میڈو، ان کا مقصد یہی تھا کہ شہر کے بیچ میں دیہاتی منظر پیدا کر دیا جائے۔ ہمارے نئے قصبوں میں بھی اسی قسم کے سبزہ زار اور سبزہ سے ڈھکی ہوئی روشیں تیار کی جائیں گی۔ اس طرح ان نئے شہروں کے رہنے والوں کو چھٹیاں گزارنے کے لئے جس دیہات کی فضا کی تلاش ہوتی تھی وہ ان کو گھر بیٹھے مل جائے گی اور وہ تمام دلچسپیاں اور تفریحیں جن کی تلاش میں ان کو لمبے سفر کرنے پڑتے تھے گھر کے دروازے پر میسر آ جائیں گی۔

اس وقت شہروں میں مکانوں کی جو کمی ہے اس کے پیش نظر آپ ضرور یہ خیال کریں گے کہ سب سے پہلے بمبئی شہری علاقوں میں نئے مکان تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ واقعی نئے مکانوں کی ہمیں سخت ضرورت ہے لیکن اگر ہم نے صرف مکانوں کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی تو ہم اسی غلطی کو دہرائیں گے جو ہم نے اس سے پیشتر کی اور جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہے ہیں ہم نے اپنے قصبوں کی بے فکری، تو سیع کی، جہاں چاہا صنعتی علاقے بنا دیئے، لاپروائی کے ساتھ تجارتی [illegible] نو تعمیر کئے دیا، سڑکوں اور راستوں پر گھمسان کی آمد و رفت ہو گئی۔ آبادی کے علاقے ایک دوسرے سے

دور ہو گئے۔ ان چیزوں نے ہماری زندگی کو بالکل بے لطف بنا دیا۔

آج انگلستان کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ محض مکان نہیں ہیں بلکہ ایسا ماحول ہے جس میں نفاست کے ساتھ زندگی گزاری جا سکے اور جہاں بہتر قسم کی گھریلو زندگی بن سکے۔

بچوں کی ضروریات برطانیہ کی سب سے اہم ضروریات ہیں

آج برطانیہ کی شرح پیدائش پر نظر کی جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری آبادی گھٹ رہی ہے اور صدی کے ختم تک اس میں زیادہ عمر والوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ اس لئے اپنے بقا کی خاطر ہمیں "خاندان اور گھر" کو وہی اہمیت دینی پڑے گی جو آج سے سو برس پہلے ہم نے مشینوں کو دی تھی۔ یہ سچ ہے کہ محض اچھے قصبوں کی تعمیر نوجوانوں کو ماں باپ بننے کی ترغیب نہیں دے سکتی پھر بھی اگر ہم خاندان کی ضروریات سامنے رکھ کر نئے قصبے تعمیر کر دیں اور پرانے قصبوں کو بدل دیں تو اس معاملہ میں ترقی کے راستہ پر ہم کئی قدم آگے بڑھ جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ میں آج کل کے قصبوں کے نقشہ بنانے والوں اور میونسپل افسروں سے ہر موقع پر یہ کہتا ہوں کہ قصبوں کا وہ تصور چھوڑ دو جس میں پہلے تو موٹر کی سڑکوں اور عام شاہراہوں کا جال بچھایا جاتا ہے، پھر کارخانے پھیلائے جاتے ہیں، اس کے بعد جو جگہ بچتی ہے اس میں مکان، اسکول، دار الاقامے اور سینما ہاؤس بنائے جاتے ہیں۔ بلکہ اب قصبوں کے جو خاکے تیار کئے جائیں ان میں سب سے پہلے اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ماں کے لئے قصبہ میں ایسا راستہ ضرور ہو کہ جب وہ سودا سلف خریدنے کے لئے بازار جائے تو بچہ کو بچہ گاڑی میں بٹھا کر ساتھ لے جا سکے۔ یہ راستہ مختصر ہو، محفوظ ہو، خوش نما ہو۔ اسی طرح شہر کے باغوں کو آپ خواہ کم جگہ دیں یا زیادہ اس بات کا خیال ضرور رکھئے کہ شہر میں ماؤں کے لئے ایک ایسا ہال بن جائے جہاں وہ جمع ہو کر آپس میں تفریح کر سکیں اور ساتھ ہی بچوں کی دیکھ بھال بھی کر سکیں۔ پھر کھلے میدانوں میں بھی ایسا انتظام ہونا چاہئے جہاں بیٹھ کر

مائیں گپ شپ کر سکیں اور ان کے بچے سامنے کھیلتے کودتے پھریں۔ عورت کو موقع ملنا چاہئے کہ شوہر اور بچے کے مشاغل کے علاوہ اپنے پڑوس میں اس کے تفریحی مشاغل بھی جاری رہیں تاکہ وہ یہ محسوس کرے کہ ماں یا بیوی بننا کوئی مصیبت کی بات نہیں ہے۔ اور کارخانہ یا دفتر کی ان انتہائی غیر دلچسپ ملازمتوں سے کہیں بہتر ہے جن کی طرف ہماری عورت آج مائل نظر آتی ہے۔ اگر ہمارے نئے قصبوں کے نقشے بنانے والے موقع سے فائدہ اٹھائیں اور ہم بھی اپنے مشوروں سے ان کی قدر کریں تو امید ہے کہ ہمارے نئے قصبے بچوں کے لئے اتنے ہی مفید ثابت ہوں گے جتنے ویلچ ورتھ اور ویلوین ہیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ان سے بھی زیادہ مفید بن سکیں۔ اور یہ ہمارا بڑا کارنامہ ہوگا۔

متوازن آبادی

کی اہم قومی ضرورت کے بعد ایک سماجی ضرورت بھی ہماری توجہ کی مستحق ہے اور وہ ضرورت بھی وقت کی اہم ضروریات میں سے ہے۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے شہروں کی اس طرح پر تنظیم کریں کہ ان کے باشندوں کو پڑوسی کے ساتھ رواداری برتنے اور عمدہ شہری بننے کی ترغیب ہو اور طبقوں، جماعتوں اور فرقوں کے درمیان نفاق کی جو خلیجیں حائل ہیں وہ دور ہو جائیں۔ خلیجیں اتنی زیادہ ہو چکی ہیں کہ وہ لوگ بھی جن کی مالی اور سماجی حیثیت ذرا بھی اونچی ہے اپنے سے نیچی حیثیت والوں سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ اسی نفاق کی وجہ سے یہ لوگ اتفاق اور اشتراک کے ساتھ ان بڑے مشاغل کو بھی انجام نہیں دے سکتے جن پر آج نوع انسانی کی قسمت کا دار و مدار ہے جب تک ان چھوٹی جماعتوں میں جن کا ہر شخص کم و بیش مساوی حیثیت رکھتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔

جمہوریت کے اصول پر عمل نہیں کیا جائے گا یہ بہت مشکل ہے کہ بڑی جماعتوں میں ذمہ دار خود اختیاری حکومتیں قائم کی جا سکیں جو اپنی بناوٹ کے اعتبار سے پیچیدہ ہیں۔ اگر ہم اپنے شہروں کی تعمیر اس طریقہ پر نہ کریں گے کہ ان میں صحیح قسم کے شہری تیار ہو سکیں تو ہماری ساری سماج ایک بے جان مشین ہو کر رہ جائے گی جن میں صرف دو جماعتیں

## "یاد"

خامشی — ہولناک تاریکی
سرد بستر — اداس تنہائی

چار سُو رات کا فسوں طاری
جاگ اٹھا درد لے کے انگڑائی

سن رہا ہوں کھڑا دریچے میں
دور سے — بجتی حسین شہنائی

چھا گیا کون پھر تصور میں
جانے کیوں میری آنکھ بھر آئی

**پرویز لدھیانوی**

ہوں گی، ایک حاکم اور دوسرے محکوم یا زیادہ نفسیاتی طریقہ پر یوں کہئے کہ ایک زبردست اور دوسرے زیردست۔

اس طرح نئے قصبوں کا خاکہ تیار کرنے میں اگر ہمارے خاکہ بنانے والے انسانی معیار کو سامنے رکھیں گے تو اس کا بہت موقع ہے کہ ہمارے نئے قصبے اور شہر بھی ملک میں عمدہ قسم کی سیاسی زندگی پیدا کرنے میں مدد ثابت ہوں۔ چنانچہ میرے خیال میں اس سلسلہ کی سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ شہر کے ہر حصہ میں ایسے ہال ہوں جہاں لوگ جلسے کر سکیں اور براہ راست مباحثوں میں حصہ لے سکیں۔ میں نے مانچسٹر کے پچل ہوم میں ایک ایسا ہال دیکھا ہے۔ یہ بڑی عمر کے لوگوں کے لئے تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح کے ہال صرف بوڑھوں کے لئے کیوں ہوں جوان کی ضرورت سے قریب قریب بے نیاز ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے میری تجویز یہ ہے کہ شہر کے ایک حصہ میں وہاں کے لوگوں کا اپنا ہال ہو، اتنا بڑا کہ جس میں سیاسی جلسے ہو سکیں، اتنا خوبصورت جس میں شادیاں رچائی جا سکیں اور اتنا باوقعت کہ وہاں میت کی تجہیز و تکفین ہو سکے۔ یہ وہ آسانیاں ہیں جو ہر جگہ عوام کو حاصل ہونی چاہئیں اور ان کی طرف اگر ہم نے معمولی سی بھی توجہ کر لی تو اس سے وہ بڑی تلخی ذرا کم ہو جائے گی جو جنگ نے پیدا کی ہے اور جس کا ابھی مدتوں تک دنیا کو سامنا کرنا ہے۔ آپ کو غالبًا یاد ہوگا کہ قدیم زمانہ میں انگلستان فوج کا یہ شیوہ تھا کہ ان کا ہر فرد ادنیٰ سے ادنیٰ فوجی معاملہ میں تو جزرسی سے کام لیتا تھا لیکن جہاں رفاہ عام کے کام ہوتے تھے وہاں اس کی فیاضی اور دریا دلی کی کوئی حد نہ رہتی تھی۔

یہ ہیں وہ حالات جن کو سامنے رکھ کر آپ کو نئے قصبے اور شہر بنانے ہیں اس وقت اپنے اس کام میں اگر آپ نے جلدی کی تو دو خطرے ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ نئے قصبے بنانے کے لئے شاید آپ کوئی ایک مقررہ اصول بنا لیں اور دوسرا یہ کہ جو کچھ کرنا ہے وہ سب ایک ہی دفعہ میں ختم کر دیں۔ آنے والی نسلوں کے سامنے آپ کا آرٹ اس طرح آئے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ان کے لئے آپ نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔

اب پہلا خطرہ لے لیجئے یعنی کسی ایک مقررہ اصول پر تعمیر کی بنیاد رکھنے سے کیا نقصان واقع ہوتا ہے۔ اول تو یہ کہ بہتر سے بہتر اصول بھی اپنے اندر کوئی نہ کوئی خامی ضرور رکھتا ہے مثلاً آپ کا ایک پرانا اصول ہے کہ ایک ایکڑ زمین میں بارہ سے چودہ تک مکان بنائے جائیں۔ ابتدا میں تو یہ اصول ٹھیک تھا کیونکہ اس زمانہ میں مکان بہت گنجان بنائے جاتے تھے اور آپ کا اصول اس مروجہ طریقہ کے خلاف ردّ عمل تھا لیکن ہم بعد میں بھی اسی اصول کی پیروی کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بسا اوقات بالکل غیر ضروری طور پر اس اصول کو برتا گیا اور اس کی وجہ سے آپ کے بہت سے اعلیٰ درجہ کے مکانوں میں یکسانیت کا عیب پیدا ہو گیا۔ ورنہ یہ وہ مکان تھے جو اپنی تمام دوسری خوبیوں کی وجہ سے دنیا کے معیاری مکان کہلائے جانے کے مستحق تھے اس قسم کے معاملات میں حکومت کو تفصیلات کے متعلق فیصلہ کام کرنے والوں ہی کے ہاتھوں میں چھوڑنا چاہئے کیونکہ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ غیر ذمہ دار کام کرنے والا قانون کی آڑ لے کر کام کو نامکمل چھوڑ دیتا ہے۔

اب رہا دوسرا خطرہ یعنی قصبوں کو مکمل چھوڑنا۔ میرا خیال یہ ہے اس کو مختلف طریقوں پر بچایا جا سکتا ہے۔ اور ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ خاکے میں اس کا ایک حصہ ایسا ضرور چھوڑ دیا جائے جہاں کچھ نہ بنایا گیا ہو گیا اور جو بعد کو استعمال میں لایا جائے۔ اس تجویز کا ذکر وتھن شا پلان میں بھی ہے۔ دوسرا مفید طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر تعمیری حصے کے بعد کچھ حصہ خالی چھوڑ دیا جائے اس طرح پورا شہر تقریبًا پچیس سال میں مکمل ہوگا لیکن اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ابتدا میں جو غلطیاں ہوئی ہوں گی ان کی اصلاح ہو سکے گی، ان نئی ضروریات کو جن کا پہلے خیال نہ تھا تعمیر میں شامل کیا جا سکے گا اور اس وقت کے شہریوں کو موقع ملے گا کہ وہ اپنے شہر کی ترقی میں خود حصہ لیں۔

اخیر میں میں یہ عرض کروں گا اپنے نئے قصبے بنانے میں ہمیں عجلت اور لاپروائی سے کام نہیں لینا چاہئے کیونکہ ایسا کرنے میں ہمارے ہاتھ سے ایک نہایت فائدہ مند موقع کے نکل جانے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً میں نے دیکھا کہ بمباری کی وجہ سے تباہ ہونے والے شہروں میں سے ایک شہر کی دوبارہ تعمیر کا نقشہ انجینیر نے بنایا اور اس میں بازار کو ایک نہایت گنجان آمد و رفت والی سڑک کے انتشار اور پراگندگی سے دور کر دیا۔ تاجروں نے تعمیر کے وقت نقشے کی مطلق پروا نہ کی اور بازار کو اسی سڑک کے کنارے بنایا، بعد میں کاروبار جو کچھ بڑھا اس کو سڑک کی بھیڑ بھاڑ پر محمول کیا حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کاروبار کو بڑھانے والی چیز سڑک نہ تھی بلکہ بسوں اور موٹروں کے وہ اڈے تھے جہاں سے اتر کر مسافر کافی بڑی تعداد میں ان دوکانوں تک آتے تھے۔ اس قسم کی ترمیمیں جیسی اس بازار کے تاجروں نے کیں ہمارے مقصد کے لئے مفید نہیں ہو سکتیں۔ ہماری نئی تعمیروں کو ایسا ہونا چاہئے جو ہمارے شہروں کو نہ صرف مفید بلکہ ہمارے لئے دلکش اور دلفریب بنا دیں۔ (باقی صفحہ ۴۶ پر)

# ہنسی

افسانہ

فہمیدہ زہرا قس البابش

"لیکن سنئے تو" — اس نے اپنی تمام قوتوں کو جمع کرکے کہا "میں کچھ سننا وننا نہیں چاہتا" سن رسیدہ پروفیسر درشتی سے بولا جس کی آنکھوں میں سنگدلی جھانک رہی تھی۔

نوجوان کے چہرے پر زردی چھاگئی لیکن اس نے پھر ایک بار جرأت کی۔

"میری مفلسی پر نظر کیجئے اور میرے نوجوان ارمانوں پر بھی"۔ مجھے اقرار ہے کہ میں کالج کا قرضدار ہوں۔ لیکن میں ہمیشہ شرمندۂ احسان رہونگا جلد ہی ادا کردوں گا ——— سوچئے تو اتنا روپیہ میں یکلخت کیسے ادا کرسکتا ہوں لیکن بہت جلد ——— میں وعدہ کرتا ہوں"۔

پروفیسر نے اطمینان سے دوسرا سگریٹ سلگایا اور یہودیوں کی طرح کاروباری انداز میں کہنے لگا۔ "جب تک آپ ایک ایک پائی ادا نہیں کردیں گے آپ کو ایم اے میں داخلہ نہیں مل سکتا"۔

پھر وہ جھک کر بکھرے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا۔

"میں غریب ہوں" اس نے لرزیدہ تمنا سے کہا۔

"میں کیا کروں" پروفیسر نے جھانیت سے جواب دیا۔

"آپ بہت کچھ کرسکتے ہیں"

"تم میرا وقت ضائع کررہے ہو"

"پروفیسر صاحب!"

"میرا فیصلہ اٹل ہے"

"آہ میں کیا کروں" لڑکے کے منہ سے غیرارادی طور پر نکل گیا۔

"جان دے دیجئے" پروفیسر لاپرواہی سے ہنسا ——— حقارت کی ہنسی نوجوان کو محسوس ہوا کہ اس کی تمام رگوں کا خون منجمد ہوگیا۔

"آپ جاسکتے ہیں"۔ پروفیسر بے نیازی سے بولا۔

نوجوان نے دیوانی نظروں سے اس کے مطمئن چہرے پر نظر ڈالی۔ اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

---

وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا ——— ہنسی: — — وہ لاپرواہ ہنسی! اس کے دل میں دھڑکتی رہی اس کے دماغ پر ہتھوڑے چلاتی رہی۔

جب صبح ہوئی؛ اس کی ہیبت ناک بے چینی خاموش ہوچلی تھی — وہ پرسکون طریقے سے مسکرا رہا تھا۔

"یہ صبح میری زندگی کی حسین ترین صبح ہے"! وہ زیرلب بڑبڑایا۔

کھلے ہوئے دریچہ میں سے اس نے پھولوں کے رقص کی محویت کو دیکھا۔

"آج ان کے انداز میں کتنا کیف ہے۔ اس کی نظر ایک حسین پھول پر جم کر رہ گئی - ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ حسین پھول گر کر بکھر گیا اور ہوا اس کی پتیوں کو اڑا لے گئی۔

وہ سوچنے لگا شاید دنیا کا یہی دستور ہے۔

"اوہ! چائے! شبراتی آج تو تم نے انڈے نہایت اچھے تلے ہیں"۔ اس نے ایک روپیہ اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

اور شبراتی سوچنے لگا آج میاں کو ہو کیا گیا ہے - یہ جلے ہوئے انڈوں پر ——— لیکن سمجھے کیا — ان کا دماغ روز ہی ایسا ہو جایا کرے۔ میری بخار میں جلتی ہوئی لڑکی کے دودھ کا سامان تو ہو ہی گیا۔ وہ جلدی سے چلا گیا کہ کہیں سلیم میاں کا دماغ پھر ٹھیک نہ ہو جائے۔

سلیم دس روپیہ بجا بجا کر گننے لگا جو اس نے کچھ دن ہوئے برج میں جیتے تھے۔ انڈے ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ایک سیاہ بلی انہیں جلدی جلدی کھا رہی تھی۔

اس کی ابھری ہوئی ہڈیاں! وہ مسکرایا! بلی سہم کر ہٹی: ——— "ہیں ہیں، پیاری بلی اطمینان سے کھاؤ اگر اس سے پیٹ نہ بھرے تو یہ لو" — اس نے دو بسکٹ اس کی طرف پھینک دیئے۔ ——— "ننھی سی جان! اگر اب بھی بھوکی ہو تو جلدی بوٹیاں تو چ نوچ کر کھا جاؤ"

وہ ہنس پڑا — مایوس ہنسی۔ اسے دل کی دھڑکن گھڑی کی ٹک ٹک سے زیادہ نمایاں محسوس ہوئی۔ آٹھ بج گئے — وہ چونکا لیکن جلدی کیا ہے، اس نے اطمینان سے کہا ——— —

آہستہ سے الماری کھولی اور اپنے کپڑوں کا نہایت اطمینان سے جائزہ لینا شروع کیا ——— آہ یہ کپڑے ——— یہ نیلی دھاری کی ٹائی مجھے کس قدر محبوب ہے یہ ایک دو خوبصورت شیروانیاں ..... اور یہ ایک سوٹ۔ وہ بھی برج کی آمدنی تھی تعلیم کے یہ سال کیسے مشکل سال تھے۔ اور اب یہ روپیہ — مجھے کون قرض دے گا۔ "جان دے دیجئے" اس کے دل میں یہ الفاظ طوفانی جھکڑ بن کر چلنے لگے۔ ہوں۔ وہ پھر اپنی اچکنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس نے تین تین مرتبہ اپنے اکلوتے سوٹ کو پہنا ———

اور یہ سینٹ کی شیشی ——— جب لڑکیاں مشاعرہ میں آتی تھیں تو ایک دفعہ میں ساری انڈیل لیتا تھا اور پھر سارے ہینڈسم ٹائیں ٹائیں فش۔

"ایف اے میں بھی ٹوپ کیا اور بی اے میں بھی بازی لے گیا۔ اب ایم اے میں بھی ——— "ہماری باری تو آچکی تقریباً کے کمرے میں اس کا حریف کہہ رہا تھا۔ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا اور مسکرانے لگا — ایک پھیکی مسکراہٹ۔

نہیں میرے دوست ——— تمہاری قسمت کا ستارہ عروج پر ہے۔ میرا ملمہ

تو ٹوٹ چکا۔

ہندوستان کو ذہین آدمیوں کی ضرورت نہیں!"

یہ کہکر اس نے اطمینان کی سانس لی —— وہ غسل خانہ میں گھس گیا دیر تک نہاتا رہا —— جیسے اس کے جسم پر برسوں کی غلاظت پٹی تھی۔

یہ پانی کی لطیف ٹھنڈک —— اے ہیں —— میری جان کو بھی سرد کردے لیکن آہ میری روح جھلس رہی ہے —— ہیں ہیں —— میں کتنا خوش ہوں۔

وہ باہر نکل آیا۔ شیو کرتے وقت اس کی کھال کئی جگہ سے کٹ گئی اور وہ اطمینان سے اپنے بہتے ہوئے خون کو دیکھا کیا —— اپنے جسم کے خون کو نہانے کے بعد شیو —— یہ زندگی میں پہلا اتفاق تھا —— وہ دیر تک استرا پھیرا کیا اور اپنا پسندیدہ گانا گنگناتا رہا

کیسے چھپوگی ۔۔۔۔۔۔۔

دھوپ میں تمازت پیدا ہو گئی اور چڑیوں کا چہچہانا تو مدت ہوئی بند ہو چکا تھا لیکن اس کی حرکات میں جلدی نام کو بھی نہ تھی۔

ایسا اطمینان —— اس قدر مطمئن وہ کبھی نہ تھا۔ جب اس نے اپنی محبوب شیروانی پہنی تو وہ بے اختیار آئینہ کے سامنے چلا گیا۔ کریم کی شیشی کھلی پڑی تھی تمہیں بھی کیوں محروم رکھوں۔ یہ کہہ کر اس نے بہت سی کریم اپنے چہرہ پر مل لی۔ کیا میں بہت حسین لگ رہا ہوں۔

دریں چہ شک —— آئینہ نے جواب دیا —— اس کے چہرہ پر ناگواری چھا گئی۔ جان بہت سستی ہے کیا حقارت کی ہنسی اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ وہ بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑا —— کریہہ قہقہہ —— نو بج گئے —— بھئی بہت جلدی۔

وہ خراماں خراماں کالج چلا گیا ۔۔۔۔۔۔۔ زیادہ چہل پہل نہ تھی —— ابھی کھلے ہوئے دو ہی روز تو ہوئے تھے۔

بھئی اب کل کے لئے کچھ باتیں اٹھا رکھو اس کے دوست نے ہنستے ہوئے کہا

"کل کے لئے"، وہ مسکرایا

آج تو تم غضب کے حاضر جواب نظر آرہے ہو۔

حاضر جوابی سر بھی تو قلم کرا دیتی ہے۔

"اب ایسے سنگدل کہاں" وہ پروفیسر کہتا ہوا چلا گیا۔

دنیا کبھی کنگال رہی ہے۔ سلیم نے سوچا وہ اپنے کمرہ میں آگیا جب اس کی نظر گرد آلود ستار پر پڑی تو اس نے بڑی محبت سے اسے اٹھا لیا اور بہت دیر تک صاف کرتا رہا۔ پھر اس کا دل بے اختیار ہو گیا اور اس کی انگلیاں تھرکنے لگیں۔

اس کو —— سنبھلنے دے ذرا اے ناامیدی کیا قیامت ہے

اس کو وہ زمانہ یاد آتا رہا۔ جب لڑکیوں نے مکرر اور سہ کرر اس سے یہی مصرعہ گانے کی فرمائش کی تھی۔

اس کا سر جھکا نے لگا اور اس کو نیند آگئی

جب آنکھ کھلی —— تو دھوپ ڈھل چکی تھی —— اور شام پرکیف تھی۔ اس نے جلدی جلدی منہ دھویا اور سوٹ پہن لیا۔

اس کو محسوس ہوا کہ اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا ہے اور اس کی پیشانی پسینہ کے قطروں سے نم ہے —— اس نے شاہدہ کی تصویر کو صرف ایک لمحہ کے لئے دیکھا اور گھبرا کر البم بند کر دیا —— "خدا حافظ" اس نے اپنے کمرے پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ اور باہر نکل گیا۔

"بڑی سج دھج سے نکلے ہو یار" کسی دوست نے مسکرا کر کہا۔

"اس شان سے تم نے کسی کو نہ دیکھا ہوگا"

"سچ بتا —— آج تیری آنکھوں میں ایسی انوکھی چمک کیوں ہے" —— ؟

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

جب وہ راستہ طے کر رہا تھا تو چند دوست پکار اٹھے۔

"ارے کہاں ذرا دو تین ہاتھ بیڈمنٹن" —— "ضرور"

"آج تو بڑے پینترے دکھا رہا ہے میرے یار"

"پارک چلتے ہو" —— ایک نے تجویز پیش کی —— "آج تو لڑکیاں بھی زیادہ ہوں گی" دوسرے نے اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے کہا

"نہیں اسٹیشن چلو"

"ارے بھئی یہ احتراز کیسا؟ ہم تو سمجھے تھے کہ آج یہ بانکپن اسی لئے اختیار کیا ہے"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ ان سب کو کیفے میں لے گیا —— سورج دم توڑ رہا تھا۔

بیرا —— توس انڈے ۔۔۔۔۔۔ بریانی ۔۔۔۔۔ کباب ۔۔۔۔ مونگچیاں۔

اور بیرا سوچنے لگا کیا اس سے پہلے کبھی یہ کیفے میں آئے ہیں۔

"یہ کیا خبط ہے سلیم"

"خوب کھاؤ میرے یار —— جتنا کھا سکو کھائے چلے جاؤ"

"ہاں ہنس لو خوب ہنس لو"

وہ سب اس کا منہ تکنے لگے۔

پھر وہ سب پلیٹ فارم پر نکل آئے —— وہ بے انتہا خاموش تھا۔ سیٹی گونجی —— اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے انجن دندناتا ہوا آیا

اور وہ آناً فاناً میں کود گیا۔

ذہین کھوپڑی دور جا پڑی —— ایسا کیوں ہوا —— دوست متحیر رہ گئے —— وہ ہاسٹل دوڑ گئے —— اور جوش و سراسیمگی کی حالت میں اس کی میز پر پڑا ہوا لفافہ کھول ڈالا۔ لکھا تھا:۔

پروفیسر صاحب تسلیم

نسخہ تو آپ نے بہت لاجواب بنایا لیکن اس کے بعد
شاید آپ کو کسی کی بیچارگی پر ہنسنے کی ضرورت نہ پڑے۔

سلیم

لڑکوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی —— انہوں نے کھوپڑی کا جلوس نکالا اور پروفیسر کے پاس لے گئے۔

اس کے ہاتھ سے سگار چھوٹ پڑا۔

نہیں ایکبار —— اور ہنس لیجئے —— مجمع چلایا ...... پروفیسر کی مٹھیاں بھنچ گئیں —— وہ کانپ رہا تھا

---

اور اب وہ اکثر باتیں کرتے کرتے خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کی مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں۔ اس کی مضطرب آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی غیر معمولی اذیت میں مبتلا ہے۔ اکثر وہ بالکل خبطی معلوم ہوتا ہے۔

وہ محفل رقص و سرود میں کبھی نہیں بیٹھ سکتا ...... رقاصہ ہمیشہ کھوپڑی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

جب کسی مسرور موقعہ پر محفل ہنستی ہے تو وہ بھی ہنستا ہے —— ہمیشہ

—— ایک مجروح ہنسی! ——

---

**برطانیہ اور نئے شہروں کی تعمیر** —— بقیہ صفحہ ۴۳

جس طرح ہم برطانیہ کے رہنے والے آج سے دوسو برس پہلے میکانیکی ایجادوں میں دنیا میں پیش پیش رہے ہیں ہمیں امید ہے کہ نئے شہروں کی تعمیر کے ذریعہ معاشرتی زندگی کو ترقی دینے میں بھی ہم دوسروں پر سبقت لے جائیں گے۔ کیا اپنے نئے شہروں کی تعمیر میں آپ اس خوش تدبیری، اشتراک عمل اور ہمت کی مثال پیش نہ کریں گے جو آپ نے زندگی کے ہر شعبے میں اس وقت پیش کی تھی جب کہ جرمنی کے حملہ کا ہر وقت خوف تھا اور آپ کے گھروں پر بم برس رہے تھے۔ اگر آپ اس وقت بھی ایسا کر سکے تو یقین رکھیئے کہ برطانیہ نہ صرف مکانوں کی تعمیر کے معاملہ میں دنیا میں آگے آگے ہوگا بلکہ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی کوششوں میں یہ دنیا کی رہنمائی کرے گا۔ (لسنر" سے ماخوذ)

---

# انہیں کے دم سے

اُف وہ تخئیل جو افکار پریشاں میں نہیں
اُف وہ تصویر جو تجانۂ ایماں میں نہیں
اُف وہ جلوے جو ترے دیدۂ حیراں میں نہیں
ہے نفس تیغ شرر بار انہیں کے دم سے

ولولے دل کے جو اندازۂ طوفاں میں نہیں
حوصلے دل کے جو ارباب گلستاں میں نہیں
فیصلے دل کے جو امید گریزاں میں نہیں
ہے طلب بر سر پیکار انہیں کے دم سے

نشۂ تند جو اے دوست کسی مے میں نہیں
نغمۂ سوز جو اے دوست کسی نے میں نہیں
مطمحٔ فکر جو اے دوست کسی شئے میں نہیں
روح خوابیدہ ہے بیدار انہیں کے دم سے

وہ نگینے جو صد فہائے سلیماں میں نہیں
وہ سفینے جو ابھی حلقۂ طوفاں میں نہیں
وہ جبینیں جو ابھی دامن یزداں میں نہیں
زندہ ہے روح طلبگار انہیں کے دم سے

وہ تسلی جو تری چشم پشیماں میں نہیں
وہ تجلی جو ترے حسن فراواں میں نہیں
وہ تعلی جو ترے دعدۂ ذیشاں میں نہیں
مشتعل ہے دل بیدار انہیں کے دم سے

شعلۂ طور جو اب جلوۂ برہم میں نہیں
درد مہجور جو اب زادۂ مریم میں نہیں
جذب منصور جو اب ہمت آدم میں نہیں
سیکڑوں ہیں رسن و دار انہیں کے دم سے

رو بہ اصلاح کبھی ہوگی یہ تقدیر جمیل
کیا بگڑتی ہی چلی جائے گی تدبیر جمیل
مضمحل کیوں نظر آتی ہے یہ تصویر جمیل
پیچ در پیچ ہیں اسرار انہیں کے دم سے

جمیل ایوبی

# جاپان-اتحادی تسلّط کے ایک سال بعد

ذرا فرض کیجئے کہ ایک روز صبح کے وقت آپ بیدار ہونے پر اپنے باغیچے میں ایک مردہ وعیل مچھلی کو پڑا دیکھتے ہیں۔ اسے دیکھ کر کچھ دیر حیرت و استعجاب میں غرق رہنے کے بعد آپ یہ سوچنا شروع کرتے ہیں کہ اس لاش کو ٹھکانے کس طرح لگایا جائے۔ لیکن جلدی ہی آپ محسوس کر لیتے ہیں کہ اس سلسلے میں دماغ سوزی بے سود ہے۔ کیونکہ آپ موجودہ حالات کے پیش نظر اس سے کسیطرح بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے اور اس لئے آپ مایوس ہو کر ارادہ ترک کر دیتے ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہی آرزو کر سکتے ہیں کہ وہی معجزہ جو اسے وہاں لانے کا باعث ہوا تھا، ایک بار پھر اپنا رنگ دکھائے اور اسے واپس لیجائے بس سمجھ لیجئے کہ اسوقت جاپان کی بالکل یہی حالت ہے۔

جب تک آپ تباہی اور بربادی کا اصل نقشہ بچشم خود نہ دیکھ لیں آپ اس مایوسی۔ حرماں نصیبی اور مردہ دلی کا ذرا بھی اندازہ نہیں لگا سکتے جو اسوقت ایک زہرناک بلائے ناگہانی کی طرح جاپانیوں پر نازل ہے۔ وہ ایک تباہی ہے جس کا تصور بھی یورپ میں نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو یقین کرنا چاہئے کہ اکثر جاپانی شہر نئی وضع کی مضبوط عمارتوں سے پٹے پڑے ہیں۔ لیکن نوے فیصدی مکانات اور کارخانے تک لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔ بیشتر قصبات میں خالی ڈھانچ باقی ہیں۔ وہ شکستہ حالت میں ہیں تاہم استعمال ہو سکتے ہیں — باقی ہر چیز قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ آپ کو میلوں دور تک راکھ کا ایک وسیع صحرا نظر آئے گا۔ وہاں نہ اینٹ پتھر کے انبار ہوں گے نہ دیواروں کے سرے بس راکھ ہی راکھ ہو گی۔

مثلاً ٹوکیو کی مثال لیجئے۔ وہاں بم زدہ علاقے کی مرمت کا سوال اٹھایا ہی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ سارا شہر نئے سرے سے تعمیر ہونا ہے۔ اسوقت صرف سڑکوں کے نشانات باقی ہیں یا ان غیر ہموار راستوں پر گذرتی ہوئی ڈھچر گاڑیاں نظر آ جاتی ہیں۔ اسوقت ٹوکیو ایک ایسے جسم انسانی سے مشابہ ہے جس کا صرف ڈھانچ اور شریانی نظام باقی رہ گیا ہو اور باقی گوشت وغیرہ گل سڑ کر گر چکا ہو۔ کچھ بھی ہو اسے ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑا کرنا ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ یہ کام کیسے کیا جائیگا۔ مثلاً شہروں کی مکر ر تعمیر کے لئے جاپان میں لکڑی بکثرت حاصل ہو سکتی ہے لیکن وقت یہ ہے کہ اسے ڈھو کر جنگل سے کس طرح لایا جائے کیونکہ ریلوں کا نظام ابھی تک بگڑا پڑا ہے۔

اس کے علاوہ ایک بھی جاپانی ایسا نہیں ملیگا جو برضا و رغبت اور صحیح ذوق و شوق کے ساتھ عمدہ مکان تعمیر کرنے کے لئے تیار ہو جائے جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ فوراً اس پر ان دشمنوں کا قبضہ اور نفاذ حکم ہونے لگے گا جو ملک پر تسلط قائم کئے ہوئے ہیں۔

لڑائی سے پہلے ٹوکیو کی آبادی ستر لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اب کم ہو کر تیس لاکھ رہ گئی ہے۔ اس آبادی کا بھی بہت تھوڑا حصہ خاص شہر میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔ زیادہ تر لوگ مضافات شہر میں جا بسے ہیں اور وہاں بھی ایک مختصر سے مکان میں جو دو آدمیوں کے لئے کافی ہو سکتا تھا، چار چار پانچ پانچ گھرانے بیک وقت آباد ہیں۔ لیکن خیر انگلستان کے بالمقابل جاپان میں یہ صورت پھر بھی کم تکلیف دہ ہے۔ کیونکہ جاپانی گھروں میں لوگ زمین پر بستر بچھا کر سو جانے کے عادی ہیں اور اس کے علاوہ خلوت و تنہائی کا احساس بھی ان لوگوں میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات تو کسی جاپانی کو بھی گوارا نہیں ہو سکتی کہ آٹھ دس قریبی رشتہ دار ایک مدت نامعلوم کے لئے آپس میں مل جل کر ایک ہی خوابگاہ میں گذارہ کرتے رہیں۔

روزانہ شہر آنے اور وہاں سے واپس جانے میں چھ سات گھنٹے ضائع ہو جاتے ہیں اور پھر گاڑیوں میں ٹھس کر سفر کرنے والے ان لوگوں کو ٹین بند مچھلیوں سے تشبیہ دی جائے تب بھی حقیقت کی پوری ترجمانی نہیں ہو سکتی کیونکہ مچھلیاں بہرحال ٹھونس کر ڈبوں میں نہیں بھری جاتیں۔ تمام گاڑیوں میں سے بیٹھنے کے تختے نکال دئے گئے ہیں، اور مسافروں کو ڈبوں میں اسطرح زبردستی دھکیلا جاتا ہے جیسے انجن میں کوئلہ جھونکتے وقت فائرمین کا بیلچہ کام کرتا ہے۔ ان لوگوں میں ایسے بوڑھے بھی شامل ہوتے ہیں جن کو دوسرے ملکوں میں اس طرح کبھی نہ بھیجا جا سکتا۔ اسی ٹھونسا ٹھانسی کے باعث اکثر حادثات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ قابض فوجوں کے اراکین اسپیشل ٹرینوں میں سفر کرتے ہیں اور وہ بھی اس ٹھاٹ کے ساتھ کہ سونے اور کھانے کے ڈبے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

مہر لال گپتا

ٹوکیو اور بہت سے دوسرے شہروں میں بھی قابض فوجوں کے افراد ان علاقوں میں آباد ہیں جو لڑائی کی تباہ کاریوں سے بچے رہے اور جن پر مغربیت کا رنگ غالب ہے اور اس طرح وہ مغربی دنیا کا ایک حصہ

معلوم ہوتے ہیں۔ وہاں اکا دکا جاپانی بھی نظر آجاتا ہے لیکن اس طرح جیسے وہ غلطی سے اس طرف آنکلا ہو۔ فوجیوں میں سب سے بڑا موضوع گفتگو "مراجعت وطن" اور اس کی تاریخ کا تعین ہے۔ اس کا نتیجہ لازمی طور پر برا نکل رہا ہے۔ کیونکہ یقینی طور پر جاپانیوں کو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ امریکی ان کے ملک میں رہنا نہیں چاہتے لہٰذا اسی لئے بہت سے قابل اور مفید جاپانی اپنے آپ کو عام سماجی زندگی سے الگ تھلگ رکھ رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ قلیل عرصۂ قیام کی صورت میں کوئی تلافیٔ مافات ممکن نہیں ہے۔ اس کا ثبوت ان جنگی مقدمات کی شہادتوں سے مل سکتا ہے جو ٹوکیو میں چل رہے ہیں۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ان واقعات کی پوری تفصیل ہمیں معلوم ہونے نہیں پائی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ استغاثہ کا گواہ کچھ نہ کچھ عرصہ بعد مدافعت کا گواہ بن گیا۔ حالانکہ ان مقدمات کی پیروی میں بڑی تلاش کے بعد ایسے شاہد جمع کئے گئے تھے جن کو اصل حالات کا صحیح علم تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان گواہوں کو پورے وثوق کے ساتھ یہ معلوم نہیں ہے کہ پرانا نظام یکسر بدل چکا ہے۔ میری رائے میں اتحادیوں کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ مدت قیام کے سلسلے میں اپنا صحیح بیان شائع کردیں۔ اس کے بغیر جاپان میں کوئی اصلاحی کام ممکن نہیں ہوسکے گا اور اس کا برا نتیجہ آئندہ نسلوں پر پڑے گا۔

جاپان میں مادی نفرالفری کی موجودہ صورت کے ماتحت یہ امر کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے کہ ان کے اخلاق کا شیرازہ بھی بڑی حد تک بکھر چکا ہے۔ میرا مقصد جنسی اختلاط سے نہیں ہے حالانکہ اس کی مثالیں بھی بکثرت موجود ہیں بلکہ میرا مطلب اس بداخلاقی سے ہے جس کا اثر شہر کی پرسکون زندگی پر پڑتا ہے۔ یعنی رشوت ستانی، جعلسازی اور بدمعاملگی۔ نیز نیک و بد میں کوئی امتیاز قائم نہ رہنا۔ مجھے بہت سے جاپانیوں کے ساتھ گفتگو کرنے کا اتفاق پڑا۔ لیکن ایسا ایک شخص بھی نظر نہیں آیا جسے جنگ کے مجرمانہ پہلوؤں کا ذرا بھی احساس ہو۔ حتیٰ کہ عام بازاری لوگ بھی ان باتوں کی ذمہ داری نہیں لیتے جو جنگ کے ارباب حل و عقد کر گزرتے ہیں بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جنرل ٹوجو کو ساری دنیا نے قربانی کا بکرا بنا ڈالا ہے۔ وہی پرانے خبیث اب بھی دفتروں میں کام کر رہے ہیں اور اگر آپ کسی سرکاری اہلکار سے ملیں تو وہ یہی کہے گا کہ میں ذاتی طور پر لڑنے والوں کی حکمت عملی سے متفق نہیں تھا اور یہ کہ میں نے اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کی۔ حتی الامکان ہر شخص اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

اب تک میں نے شہروں اور قصبوں کی زندگی پر اظہار خیال کیا ہے دیہاتوں میں حالات زندگی تقریباً وہی ہیں جو لڑائی سے پہلے تھے۔ اب جبکہ شہروں میں خوراک کا مسئلہ بڑی حد تک ناقابل برداشت ہوگیا ہے دیہاتوں میں کھانے پینے کی چیزیں بڑی افراط سے موجود ہیں۔ ایسی صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی تقسیم ٹھیک طور پر کیوں نہیں کی جاسکتی؟ اس کے کئی سبب ہیں۔ سب سے اہم درجہ یہ ہے کہ جاپان میں ریلوں کا نظام عام طور پر بالکل بگڑ چکا ہے۔ اس سے قطع نظر لوگوں کو پوری طرح یقین نہیں ہوتا کہ حکومت کس قسم کے قانون جاری کرنے والی ہے۔ فطرتاً یہ ناممکن ہے کہ اشیائے خوراک پیدا کرنے والے اپنی کل پیداوار حکومت کے سپرد کردیں۔ جبکہ انھیں معلوم ہے کہ شہر سے آنے والے عام لوگوں کے ہاتھ وہ اپنا مال چور بازار کے ذریعہ زیادہ قیمت پر فروخت کرسکتے ہیں۔

اب رہا قبضہ و تسلط کے اصل پہلو پر غور کرنا۔ یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ جاپان میں صورت حالات جرمنی سے بالکل مختلف ہے۔ جرمنی میں اسوقت بھی کوئی نظام حکومت قائم نہیں ہے۔ اس کے برعکس جاپان میں لڑائی ختم ہونے کے بعد بھی حکومت موجود تھی اور اتحادیوں کی حکمت عملی یہ رہی کہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اتحادیوں کے صدر مقام سے حکومت جاپان کے نام ہدایات جاری ہوتی ہیں اور وہ انکو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے۔ اتحادی حکام عوام سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتے اور یہ صورت جرمنی سے بالکل مختلف ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپان میں بہت سے ایسے اہلکار جن کے وجود کو کسی طرح بھی گوارہ نہیں کیا جاسکتا۔ اب بھی ملک میں خصوصاً دیہاتی اضلاع میں اپنے عہدے سنبھالے بیٹھے ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جن کو لڑائی سے پہلے بھی اقتدار حاصل تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انکو برطرف کردینا ضروری تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ انکی جگہ کام کرنے کے لئے دوسرے لوگ نایاب ہیں۔ جاپان میں جنگ سے پہلے شہری ملازمتوں میں حتیٰ کہ شعبۂ تعلیم میں بھی زیادہ تر ایسے لوگ شامل تھے جن کے خیالات جنگجویانہ تھے۔ دراصل انہی لوگوں کو عام معاملات کا شعور اور تجربہ تھا۔ ایسی صورت میں یہ امر نہ تو ممکن العمل ہے اور نہ قرین مصلحت کہ ان کو فوراً الگ کردیا جائے تاوقتیکہ ان کی جگہ کام کرنے کے لئے نئے اصولوں پر تربیت دئے ہوئے دوسرے لوگ میسر نہ آجائیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ قبضہ و تسلط کے بعد جو دشواریاں پیدا ہوئی ہیں ان کا لب لباب یہی ہے۔ تسلط کا سب سے پہلا مقصد یہ تھا کہ جاپان میں فوج شکنی کی صورت پیدا ہوجائے اور اس میں شک نہیں کہ یہ مقصد حاصل ہوگیا۔ ہزاروں میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے تباہ شدہ کارخانے اس امر کا کافی ثبوت ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ تمام بحرالکاہل میں لڑائی کے نہایت اہم اڈوں پر اتحادیوں کا قبضہ ہوجانا یقین دلاتا ہے کہ اب ہمارے لئے جاپان سے باہر رہ کر

جاپان میں نظم و نسق قائم کرنا ممکن ہوگیا ہے لیکن اس مسئلہ پر اس طرح غور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کم نظر فوجی زاویۂ فکر سے کام لیا جا رہا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ کوئی ظالمانہ لڑائی شروع کرنے کے لئے جاپان میں کبھی بھی اتنی صلاحیت پیدا نہ ہو سکے گی بلکہ عزم و ارادہ بھی ممکن نہ ہو سکے گا۔ اس امر کو پورے یقین کے ساتھ تسلیم کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اس ملک پر اتحادیوں کا تسلط زیادہ مدت تک قائم رہے تاکہ آئندہ کم سے کم دونوں نسلوں کی تعلیم کا انتظام جمہوری بنیادوں پر کیا جا سکے۔ پھر یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ مقصد پوری طرح پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے یا نہیں مسلط فوج کو بھی زیادہ عرصہ وہاں قبضہ جمائے رکھنا چاہیئے۔ تاکہ جب یہ دونوں نسلیں امور عامہ میں عملی حصہ لینے کے لائق ہو جائیں تو وہ ان کو کسی قسم کے رونما ہونے والے ردِ عمل سے باز رکھ سکیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ صورت پندرہ بیس سال میں ظہور پذیر ہو سکے گی فی الحال مجھے کچھ معلوم نہیں کہ موجودہ تسلط کا سلسلہ کتنی مدت تک جاری رہے گا تاہم صورت واقعات اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ غالباً وہ اتنی مدت تک جاری نہیں رہے گا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جب تک ہم طویل مدت کا اصول پیش نظر رکھنے کے لئے تیار نہ ہوں جاپانیوں کو صحیح معنوں میں جمہوریت پسند بنانے کا ذرا بھی موقع پیدا نہ ہو سکے گا۔

سرکاری اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل لحاظ ترقی حاصل ہو رہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے غلط فہمیوں میں مبتلا کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہاں نافذ کئے ہوئے احکامات اور ان کے عملی پہلوؤں میں کوئی فرق واقعیا ذ پیدا نہیں کیا جا رہا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اس وقت بہت سے جاپانی جمہوریت نوازی کا ثبوت دے رہے ہیں اور انھیں اس امر کا پورا احساس بھی نہیں ہے کہ وہ نئے زاویۂ فکر پر غور کرنے کی بجائے نئی راہ عمل پر گامزن ہیں۔

اب رہا تعلیم کا میدان عمل۔ سو اس سلسلہ میں بہت کم تنظیمی کام کیا گیا ہے اور جو کچھ ہوا ہے وہ بالکل منفی حیثیت رکھتا ہے۔ تسلط قائم رکھنے والے حکام نے چند خاص موضوعات مثلاً جغرافیہ، تاریخ اور اخلاقیات کی تعلیم کو اس وقت تک کے لئے ممنوع قرار دیدیا ہے جب تک کہ قومی تعصبات سے الگ ہٹ کر کوئی نیا نصاب تیار نہ کر لیا جائے۔ اس وقت یہ بات بھی زیر غور ہے کہ جاپان کے مدرسوں اور کالجوں میں پڑھانے والے موجودہ استادوں کی جن کی تعداد تقریباً چار لاکھ چودہ ہزار ہے خوب اچھی طرح جانچ پڑتال کی جائے اور پھر فیصلہ کیا جائے کہ انھیں اس خدمت پر مامور رکھنا چاہیئے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نتیجے پر پہونچنے میں بڑی دیر لگے گی۔ پھر اس دو تذبذب کی حالت میں یہ امر کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے کہ اس وقت نہ تو استاد تعلیم و تربیت کی پابندی کرتے ہیں اور نہ طلباء کو اس کی پرواہ ہے۔ بہر حال یہ تجاویز نصف مرحلوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ طلباء جاپان کے غلط انداز نظام تعلیم سے بچے رہیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ مشورہ نہیں دیا جاتا کہ اس ملک کے لئے نئے اور مختلف قسم کے استاد کہاں سے لائے جائیں۔ دشواری یہ ہے کہ اس مسئلہ کا فوراً کوئی حل بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ اصل حل کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم طویل مدت کے اصول پر کاربند ہوں ٭

## غزل

مسرور منکر

کسی پر اس طرح آیا شباب آہستہ آہستہ
کلی جیسے بنے کھل کر گلاب آہستہ آہستہ

وہ اٹھی روئے روشن سے نقاب آہستہ آہستہ
محبت ہو رہی ہے کامیاب آہستہ آہستہ!

الٰہی خیر جب مجھ سے نگاہیں چار ہوتی ہیں!
حیا آتی ہے آتا ہے حجاب آہستہ آہستہ

یہ مطلب ہے کہ ہم گھبرا نہ جائیں ظلم سہنے سے
اسی باعث تو ہوتا ہے عتاب آہستہ آہستہ

سکون دل، سکونِ روح، اب تیرا خدا حافظ
کہ بڑھتا جا رہا ہے اضطراب آہستہ آہستہ

مجھے تشنہ لبی کا لطف بھی لینے دے اے ساقی
بڑھا میری طرف جام شراب آہستہ آہستہ

کسی کے غم میں اے مسرور اب یہ دل کا عالم ہے
کہ جیسے ڈھل رہا ہو آفتاب آہستہ آہستہ

**لکھنے والوں سے**

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالہ میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے قلمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کریں۔

ریویو کیلئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے ورنہ ان پر کسی قسم کی رائے قلمبند نہیں کی جائیگی

(ادارہ)

# ہندوستانی موسیقی کے ساز

شاہد احمد دہلوی

ہندوستانی موسیقی میں سینکڑوں ساز ہیں۔ ان میں سے بعض ہزاروں سال پہلے کی ایجاد ہیں۔ بعض ایجاد ہوئے اور اپنی پیچیدگی اور دشواری کی وجہ سے رواج نہ پا سکے اور گمنامی کے پردے میں چھپ گئے۔ بعض نے اتنی اہمیت حاصل کرلی کہ ان کی ایک مستقل ضرورت اور جگہ ہوگئی اور اس کے بغیر گانا نامکمل یا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بعض ساز ایسے ہیں جنہوں نے وقتی ضروریات کو پورا کیا اور بعد میں ان کا رواج نہیں رہا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ہمارے سنگیت میں تبدیلیاں ہوتی گئیں ہمارے سازوں میں بھی حسب ضرورت ایجادیں، اختراعیں اور ردوبدل ہوتا گیا۔ ویدک زمانے کے کچھ اور ساز تھے۔ ہندو حکمرانوں کے زمانے میں ان میں تبدیلیاں اور اضافے ہوئے۔ اسکے بعد جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو اپنے ساتھ عرب، ایران اور توران کے ساز بھی لائے۔ ان میں سے کئی اتبک برتے جاتے ہیں۔ کئی یہاں کی موسیقی سے میل نہ کھا سکے اور روپوش ہوگئے۔ ان کے علاوہ یہاں کے بعض گنیوں نے چند ساز بنائے جنہیں یہاں کی فضا ایسی راس آئی کہ جگ بیت جانے پر بھی ان کی ضرورت اور دلکشی میں کمی نہیں آئی بلکہ آنے والی نسلوں کے فنکاروں نے انہیں اور بھی مکمل کردیا نئی زندگی بخشی۔ جب فرنگیوں نے یہاں چھاؤنی چھائی تو ان کے بعض آلاتِ موسیقی نے بھی ہمارے سنگیت میں جگہ پائی۔ اس طرح ہماری موجودہ موسیقی میں بھانت بھانت کے ساز جمع ہوگئے ہیں۔

ہندوستانی موسیقی کے سازوں کی تعداد ہزاروں پر ہے۔ لیکن بعض زمانے کا ساتھ نہ دے سکے اور محفلوں کی بجائے عجائب گھروں میں انہیں جگہ ملی۔ بعض صرف مقامی ضروریات پوری کرسکے اور ایک محدود حلقے میں گھٹ کر رہ گئے۔ اسلئے ہزاروں پر نہیں تو سینکڑوں پر اب بھی ان کی نوبت ہے، ہم صرف ان سازوں کا ذکر کرینگے جو مشہور ہیں اور آجکل بجائے جاتے ہیں۔

ساز دو قسم کے ہوتے ہیں:۔ (۱) سُر کے ساز اور (۲) تال کے ساز:۔

اس تقسیم کے بعد سازوں کو چار اور قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) پہلی قسم کے ساز وہ ہیں جو مضراب یا چوبے سے بجائے جاتے ہیں جیسے بین، سرود اور ستار۔

(۲) دوسری قسم کے ساز وہ ہیں جو گز یا کمانی سے بجائے جاتے ہیں جیسے سارنگی، دلربا اور وائلن۔

(۳) تیسری قسم کے ساز وہ ہیں جو ہاتھ یا چوب کی ضرب سے بجائے جاتے ہیں۔ جیسے طبلہ نقارہ اور جلترنگ۔

(۴) چوتھی قسم کے ساز وہ ہیں جو پھونک یا ہوا سے بجائے جاتے ہیں۔ جیسے بانسری، شہنائی اور ہارمونیم۔

یوں تو سارے ہی ساز گانے کی نقل کرتے ہیں اور جو سُر گلے سے پیدا ہوتے ہیں وہی سُر تار یا تانت سے پیدا کئے جاتے ہیں لیکن ان سازوں میں سے بعض ایسے ہیں جو صرف گانے ہی کے ساتھ بجائے جاتے ہیں جیسے تانپورہ۔ بعض ایسے ہیں جو علیحدہ بجائے جاتے ہیں، جیسے بین اور سنکھ۔ اور بعض ایسے ہیں جو سنگت میں بھی بجتے ہیں اور علیحدہ بھی، جیسے سارنگی، دلربا اور طبلہ۔

اب ان سب سازوں کا مختصر حال پیش کیا جاتا ہے۔

**تانپورہ** | مروجہ سازوں میں سب سے زیادہ برتا جانے والا ساز ہے اسے طنبورہ بھی کہتے ہیں۔ یہ قدیم ترین سازوں میں سے ہے۔ چار ہزار سال پہلے کی مصری نقاشی میں یہ ساز موجود ہے۔ اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ قدیم مصریوں کی ایجاد ہے۔ تانپورہ میں چار تار ہوتے ہیں۔ بیچ کے دو تار گانے والے کے بنیادی سر میں ملائے جاتے ہیں اور انہیں جوڑا کہتے ہیں۔ چوتھا تار بھی سُر میں ملایا جاتا ہے اور کھرج کہلاتا ہے۔ پہلا تار راگ کی مناسبت سے مدھم، پنچم یا نکھاد میں ملایا جاتا ہے۔ یہ صرف آس کا ساز ہے اور اسکے چاروں تار باری باری سے چھیڑے جاتے ہیں۔ اس میں بجانے کا کوئی کام نہیں ہے۔ صرف سُر قائم رکھنے کیلئے تانپورہ چھیڑا جاتا ہے۔

**بین** | ہندوستان کے قدیم ترین سازوں میں سے ہے۔ روایت ہے کہ مہادیو نے پاربتی جی سے متاثر ہوکر اسے بنایا۔ اس کی کئی شکلیں تھوڑے تھوڑے سے فرق کے ساتھ بنائی گئی ہیں، جنہیں سے مشہور چار ہیں۔ (۱) رودر بین (۲) نارد بین (۳) سرسوتی بین اور (۴) وچتر بین۔ دو تونبوں پر ایک ڈانڈ لگا کر بین بنائی گئی ہے کسی میں پردے ہوتے ہیں اور کسی میں نہیں ہوتے۔ کندھے کے سہارے لگا کر یا فرش پر دونوں تونبے ٹکا کر بجائی جاتی ہے۔ تنت کار وک کا کہنا ہے کہ بین دسوں انگلیوں سے بجتی ہے، سیدھے ہاتھ کی چاروں انگلیوں میں مچھلی کے چھلکے کے ناخن جیسے حلقے پہنے جاتے ہیں بین میں آٹھ تار اور انیس پردے ہوتے ہیں

سازوں میں بین سے زیادہ مشکل ساز اور کوئی نہیں ہے۔ وچتر بین لعانہ خاں کی ایجاد ہے اس میں پردے نہیں ہوتے۔ اور بائیں ہاتھ میں بٹا لیکر بجائی جاتی ہے۔ اسی لئے اسے بٹہ بین بھی کہتے ہیں۔ یہ پٹیالہ والے عبدالعزیز خاں کی ایجاد ہے۔

**ستار** بین کی آسان شکل ہے۔ یہ حضرت امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ اسمیں پہلے تین تار ہوتے تھے اسی لئے اس کا نام سہ تار رکھا گیا تھا۔ اس میں صرف ایک تونبہ ہوتا ہے اور تانت سے بندھے ہوئے پردے ہوتے ہیں جو راگ کے سُروں کے مطابق کھسکائے جاتے ہیں۔

**سُربہار** ستار کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کی ڈانڈ نسبتاً چوڑی ہوتی ہے اور باج کے تاروں کے نیچے طربین آس دینے کے لئے لگائی جاتی ہیں۔ الاپ کے لئے سُربہار اور گت بجانے کے لئے ستار موزوں ہے۔

**رباب** ارسطو کی ایجاد ہے نیچے کا حصہ بیضوی ہوتا ہے اور یہ اسپر کھال منڈھی ہوتی ہے۔ اس میں چار تار اور سات طربین ہوتی ہیں۔

**سرود** رباب کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ قد وقامت میں رباب سے ڈیوڑھا ہوتا ہے۔ چٹکی میں زخمہ یا جَوا پکڑکر سیدھے ہاتھ سے ضرب لگائی جاتی ہے اور بائیں ہاتھ سے تاروں کو دبایا اور کھینچا جاتا ہے۔

**سُرسنگھار** سرود کی ایک اور شکل ہے جو پیار خاں لکھنوی کی ایجاد ہے۔ نیچے ایک لمبوترا تونبہ ہوتا ہے اور بین کی طرح اوپر ایک چھوٹا تونبہ ہوتا ہے۔ رباب، سرود اور سُرسنگھار میں پردے نہیں ہوتے۔

**سارنگی** بقراط کی ایجاد ہے۔ سُروں کی تمام خوبیاں اس ساز میں ادا کی جا سکتی ہیں۔ اسلئے اسے سَورنگی کہا گیا۔ گلے کا ساتھ سارنگی سے بہتر اور کسی ساز پر نہیں ہو سکتا۔ اس میں باج کے تین تار ہوتے ہیں اور طربوں کے دو سٹ ہوتے ہیں۔ بائیں ہاتھ کی انگلیاں باج کے تار کے پہلو میں تار سے ملا کر رکھی جاتی ہیں اور دائیں ہاتھ میں گز ہوتا ہے۔ گلے کی پوری نقل اتارنے کے علاوہ اس ساز میں دوسرے سازوں کا باج پیش کرنے کی بھی صلاحیت ہے چنانچہ بین، رباب، دلربا، طبلہ وغیرہ کے نقشے بھی سارنگی میں استاد بندو خاں دہلوی نے پیش کرکے اس دعوے کا ثبوت دیا ہے۔

**سُرساگر** سارنگی ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اسمیں بھی باج کے تین تار ہوتے ہیں اور نیچے باریک پچیس ادا کی جاتی ہیں اسکے علاوہ گلی اور تار ہوتے ہیں۔ جن پر بائیں ہاتھ سے جھالے بجائے جاتے ہیں۔ سُرساگر قد وقامت میں سارنگی سے ڈیوڑھا ہوتا ہے۔ یہ محسن خاں دہلوی کی اختراع ہے۔

**طاؤس** اسم بامسمّٰی ساز ہے۔ اس کی شکل مور کی ہوتی ہے۔ اور رنگ بھی وہی ہوتا ہے۔ مور کی دم ڈانڈ کا کام دیتی ہے۔ اس میں ستار کی طرح پردے لگے ہوتے ہیں جو حسب ضرورت کھسکائے جا سکتے ہیں۔ یہ ساز مضراب سے نہیں گز سے بجایا جاتا ہے۔

**کمانچہ** سارا لکڑی کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ نچلے حصے پر سارنگی کی طرح کھال منڈھی ہوتی ہے اور ڈانڈ پر ستار کی طرح پردے ہوتے ہیں۔ اسے ستار اور سارنگی کا آمیزہ سمجھنا چاہیئے۔ گز سے بجایا جاتا ہے اور طاؤس کی طرح بائیں ہاتھ کی انگلیاں باج کے تار پر ٹکائی جاتی ہیں۔ پنجاب کا عام ساز ہے۔

**دلربا یا اسراج** اس کا اصول وہی ہے جو طاؤس اور کمانچہ کا۔ صرف شکل میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔

**موسیقار** اس ساز کو اس روایتی موہوم پرندہ کی شکل دی گئی ہے جو موسیقی کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ یہ پرندہ ایک ہزار سال تک زندہ رہتا ہے۔ اس کی چونچ میں سات سوراخ ہوتے ہیں جن سے ساتوں سُر پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ مرنے لگتا ہے تو تنکے اور خشک ٹہنیاں وغیرہ جمع کرکے ایک ڈھیر لگاتا ہے اور اس پر بیٹھ کر دیپک راگ الاپتا ہے۔ اس کی تاثیر سے خشک ڈھیر میں آگ لگ جاتی ہے اور موسیقار جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی خاک سے ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ پھر ایک موسیقار بن جاتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ اس روایتی پرندہ کی تصویری شکل پر یہ ساز بنایا گیا ہے اور اس کی پشت اور دم پر سارنگی کے اصول پر تار لگائے گئے ہیں اور اسکے بجانے کا بھی وہی طریقہ ہے جو سارنگی کا۔ یہ ساز بندو خاں صاحب دہلوی کی اختراع ہے۔

**سارندہ** ایک مختصر سا ساز ہے جو نہایت خوش آواز ہے۔ سارنگی کی طرح بجایا جاتا ہے۔ گرو امرداس بانی امرتسر کی ایجاد ہے۔

**وایولن** فڈل یا بیلا یورپ کا ساز ہے جو ہمارے سنگیت میں شامل ہو گیا ہے۔ اس میں چار تار ہوتے ہیں اور کمانی سے بجایا جاتا ہے۔ اصول کے اعتبار سے اسے یورپ کی سارنگی سمجھنا چاہیئے۔

**چیلو** قد وقامت میں وایولن سے تین گنا ہوتا ہے۔ بجانے کا اصول وہی ہے جو بیلے کا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وایولن الٹا رکھ کر بجایا جاتا ہے اور چیلو بھاری ہونے کی وجہ سے فرش پر سیدھا ٹکایا جاتا ہے۔ اس کی آواز بہت بھاری اور گمبھیر ہوتی ہے۔ یہ بھی یورپی موسیقی کا ساز ہے۔

**ڈبل بین** یہ ساز بھی یورپ سے آیا ہے اور چیلو کی شکل اور قد وقامت میں اس سے بڑا ہوتا ہے۔ اس میں بھی چار تار ہوتے ہیں اور چٹکی سے بجایا جاتا ہے۔ اس کی آواز دھنئے کی تانت سے مشابہ

ہوتی ہے اور ہلکے پھلکے کانوں میں اس کی سنگت بڑا لطف دیتی ہے۔

**کوٹشی کوٹو** جاپانی ساز ہے۔ اس میں کئی تار ہوتے ہیں اور چابیاں لگی ہوتی ہیں۔ تار جوے سے چھیڑے جاتے ہیں۔

**بربط** عربی موسیقی کا پرانا ساز ہے۔ یہ فیثاغورث کی ایجاد ہے۔ اس میں ایک تختے پر چالیس تار اس طرح لگائے گئے ہیں کہ ان کی لمبائی کم ہوتی جاتی ہے۔ تیلی تیلی چوبوں سے بجایا جاتا ہے۔

**قانون** بربط ہی کی دوسری شکل ہے۔ یہ ابونصر فارابی کی اختراع ہے۔ بربط میں تار سیدھے چڑھے ہوتے ہیں اور قانون میں آڑے۔ اسے سُرمنڈل بھی کہتے ہیں۔ ایک ایک سُر کے دو دو تار یکجا چڑھائے جاتے ہیں اور یہ بھی سبک اور آبنوسی چوبوں سے بجایا جاتا ہے۔

**بانسری** پھونک سے بجائے جانے والے سازوں میں سب سے عام بانسری ہے۔ اسے کنہیا جی کی ایجاد بتایا جاتا ہے۔ اس میں چھ سوراخ ہوتے ہیں جن پر دونوں ہاتھوں کی تین تین انگلیاں رکھی جاتی ہیں۔ مختلف سوراخوں کے کھولنے سے مختلف سُر پیدا ہوتے ہیں۔

**نے** لوہے کی بڑی بانسری ہوتی ہے۔ یہ عمرو عیار کی ایجاد ہے۔

**الغوزہ** یہ بھی ایک قسم کی بانسری ہی ہے۔ عام طور سے دیہاتوں میں اس کا جوڑا بجایا جاتا ہے۔

**شہنائی** اصل میں سینائی ہے جو بو علی سینا کی ایجاد ہے۔ اس میں ایک پتی لگائی جاتی ہے جس سے سُر پیدا ہوتا ہے۔

**نفیری** شہنائی ہی کی دوسری شکل ہے۔ اسکے بجانے کے وہی تمام اصول ہیں جو شہنائی کے۔

**سنکھ** ہندوؤں کا مقدس گھونگا ہوتا ہے۔ یہی ناقوس بھی کہلاتا ہے۔ مندر میں پجاریوں کو جمع کرنے کے لئے یا عبادت کے وقت بجایا جاتا ہے۔ سنکھ ترنگ اسی کی ایک اور شکل ہے۔

**نرسنگھا** یہ سینگ ہوتا ہے اور لوگوں کو جمع کرنے کیلئے بجایا جاتا ہے۔

**پونگی** ایک گول چھوٹی تونبی میں اوپر ایک سوراخ کر کے ایک نلی لگائی جاتی ہے اور نیچے ایک سوراخ کر کے دو نلیاں ملی ہوئی لگی ہوتی ہیں۔ ان میں سوراخ ہوتے ہیں جن پر انگلیاں رکھی جاتی ہیں۔ یہ سپیروں کا مخصوص ساز ہے اور اس کی آواز ایک خاص اثر رکھتی ہے جس پر سانپ جھومنے لگتا ہے۔

**کلارنٹ** بانسری کی بہت ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہ ساز یورپ سے آیا ہے۔ اس میں بانسری کی طرح سوراخوں کے علاوہ چابیاں بھی لگی ہوتی ہیں۔ اس کی آواز بہت گمبھیر ہوتی ہے۔

**کارنٹ** یہ بھی یورپی ساز ہے۔ یہ بگل کی شکل کا ہوتا ہے۔ چھوٹا سا پیتل کا باجہ ہے جس میں صرف تین چابیاں ہوتی ہیں۔ انہی سے سارے سُر ادا ہو جاتے ہیں۔

**پیانو** اسے ارغنوں بھی کہا جاتا ہے۔ یورپ کا ساز ہے مگر اب ہمارے آلاتِ موسیقی میں شامل ہے۔ ہلکے کانوں اور آرکسٹرا میں بجایا جاتا ہے۔

**ہارمونیم** ہوا سے بجنے والے سازوں میں یہ ساز سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ کم قیمت اور آسان ہونے کی وجہ سے گھر گھر اس کا چرچہ ہوا۔ اس کی شکل پیانو سے ملتی جلتی ہے لیکن پیانو ضرب لگانے سے بجتا ہے اور ہارمونیم ہوا دینے سے۔ دوسرے سازوں کی طرح اس میں سُر ملانے کی دشواری نہیں ہے۔ ہر سُر کی ایک چابی ہے اور بارہ بارہ سُروں کی اس میں تین سپتکیں ہوتی ہیں۔ تھوڑی سی مشق سے یہ باجہ بجایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں عیب یہ ہے کہ ہمارے سنگیت کی باریکیوں اور نزاکتوں کو ادا نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے اسے ایک نامکمل اور ناموزوں ساز قرار دیا گیا ہے۔

**پکھاوج** گنیش جی کی ایجاد ہے۔ ایک طرف سیاہی ہوتی ہے اور دوسری طرف آٹا لگایا جاتا ہے۔ اس کی آواز ایسی ہوتی ہے جیسے سہانی توپیں چھوٹ رہی ہوں۔ کبھی بادل کی سی گرج سنائی دیتی ہے اور کبھی کڑکتی بجلیوں کے تڑاخے ہونے لگتے ہیں اور جب اس پر کوئی پرن سنائی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ چڑیوں کا ایک غول چہچہا رہا ہے۔

**طبلہ** پکھاوج کے دو ٹکڑے کر کے امیر خسرو نے ایجاد کیا ہے۔ اسکے بول پکھاوج سے الگ مقرر ہیں اور باج کا طریقہ بھی علیحدہ ہے۔ پکھاوج میں پورے ہاتھ سے ضرب لگائی جاتی ہے اور طبلہ میں انگلیوں کے پوروں سے۔

**ڈھولک** یہ بھی امیر خسرو کی ایجاد ہے اور قوالوں کا ساز ہے۔ اس کی آواز اور باج پکھاوج اور طبلہ دونوں سے الگ ہے۔

**کھول** پکھاوج کی شکل کا ساز ہے۔ اس کی دائیں بڑی بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ بنگال کا خاص ساز ہے۔

**کھڑتال** بھجن گانے والوں کے ساتھ بجائی جاتی ہے۔ یہ لکڑی کے ٹکڑے ہوتے ہیں جن میں پیتل کی چھوٹی چھوٹی تھالیاں لگی ہوتی ہیں۔

**مجیرے** پیتل کی دو کٹوریاں سی ہوتی ہیں۔ طوائفوں کے ساتھ بجائی جاتی ہیں۔

**نوبت** اصل میں نو باج ہے۔ اس میں دو شہنائی والے، دو نقارچی ایک جھانجھ والا، ایک قرنا والا، ایک دمامہ (ڈھول والا) ایک جمعدار (بینڈ ماسٹر) اور ایک باری دار یعنی خدمت گذار۔ یہ نو آدمی ہوتے تھے۔ نوبت شان و شکوت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ ہر پہر پر نوبت بجا کرتی تھی یعنی ہر تین گھنٹے کے بعد۔

**نقارہ** اس کی جوڑی ہوتی ہے۔ ایک بڑا جو بائیں ہاتھ کو رکھا جاتا ہے اور ایک چھوٹا جو دائیں ہاتھ کو رکھا جاتا ہے۔ نقارہ چوبوں سے بجایا جاتا ہے۔ اس کے بول پکھاوج، طبلہ وغیرہ سے الگ ہوتے ہیں۔

**ڈھول** بڑے پیٹ کا دو رُخہ ہوتا ہے۔ دایاں رُخ چوب سے اور بایاں ہاتھ سے بجایا جاتا ہے۔ منادی کرنے یا لوگوں کو جمع کرنے کے لئے بجایا جاتا ہے یا شادیوں کے جلوسوں میں بجتا ہے۔ اسے ڈہل یا طبق بھی کہتے ہیں۔

**تاسہ اور مرفہ** پھیلے ہوئے طبلے کی شکل کے ساز ہیں اور چوبوں سے بجتے ہیں۔ ان کی آواز بہت اونچی ہوتی ہے۔ بیاہ براتوں میں اس کے بجائے جانے کا عام رواج ہے۔ تاسہ دو چوبوں سے اور مرفہ ایک چوب سے بجایا جاتا ہے۔

**دھونس اور چانپ** تاسہ کی شکل کے چھوٹے مٹی کے پیالے ہوتے ہیں جن پر کھال منڈھی ہوتی ہے۔ انہیں گلے میں لٹکا کر بجایا جاتا ہے۔ نفیری کے ساتھ اب بھی بجتے ہیں۔

**جھانجھ** کمان کی شکل کا ہوتا ہے۔ اس میں پیتل کے گول گول ٹکڑے لگے ہوتے ہیں جنہیں ہلانے سے جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے۔

**دف** افلاطون کی ایجاد ہے۔ لکڑی کے ایک گول پیپے پر کھال منڈھی ہوتی ہے۔

**دائرہ** دف کی شکل کا ہوتا ہے مگر اس سے چھوٹا۔

**کھنجری** دف سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس میں پیتل کی چھوٹی چھوٹی تھالیاں بھی لگا دی جاتی ہیں تاچنے والیاں اسے ناچنے میں بجاتی جاتی ہیں

**ڈیرو اور ڈمرو** مہادیوں کی ایجادیں ہیں۔ ڈیرو ایک رخہ ہوتا ہے اور ڈمرو دو رخہ۔

**جلترنگ** چینی کے سولہ پیالے ہوتے ہیں جو بتدریج چھوٹے ہوتے جاتے ہیں۔ ان پیالوں میں حسب ضرورت پانی ڈالا جاتا ہے تاکہ سُر قائم ہو سکیں۔ سب پیالے نصف دائرے کی شکل میں رکھے جاتے ہیں اور دونوں ہاتھوں میں ایک ایک چوب لیکر بجایا جاتا ہے۔ طبلہ ترنگ، نلکی ترنگ، گھنٹی ترنگ، بوتل ترنگ اور لکڑ ترنگ وغیرہ بھی اسی اصول پر بنائے گئے ہیں۔

یہ ہمارے وہ ساز ہیں جو آجکل کے سنگیت میں برتے جاتے ہیں ورنہ صرف تال ہی کے تین سو سے اوپر ساز ہیں جو وجود میں آچکے ہیں۔

**نوٹ**:۔ ریویو کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے ورنہ ان پر کسی قسم کی رائے قلمبند نہیں کی جائے گی۔ —— ادارہ

# سوڈان

سوڈان شمالی افریقہ کا ایک مشہور ملک ہے۔ اسکے جنوب میں افریقہ کے مغربی ساحل والے وہ بحری ملک واقع ہیں جو دریائے کونگو کی وادی میں پھیلے پڑے ہیں شمال میں صحرائے اعظم اور مصر کا کچھ علاقہ ہے۔ مغرب میں بحر اوقیانوس ہے تو مشرق میں بحیرۂ احمر۔ اس کی لمبائی تقریباً چار ہزار میل اور کل رقبہ بیس لاکھ مربع میل کے لگ بھگ ہے۔ پچھلی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی چار کروڑ ہے۔

سوڈان خاصی اونچی جگہ ہے۔ اسکا زیادہ حصہ کھلے میدانوں کی صورت میں ہے جن کو دریائے سینیگل اور دریائے نائجر سیراب کرتے ہیں۔ یہ منطقۂ حارّہ میں واقع ہے اور بلندی سطح سمندر سے صرف ڈیڑھ دو ہزار فٹ ہے اس لئے آب و ہوا گرم ہے۔ دریاؤں کی وادیاں صحت کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ صحرائے اعظم کے باعث شمالی افریقہ سے الگ ہوگیا ہے اس لئے وہاں کے باشندوں نے جو حبشی نسل کے ہیں، شروع ہی میں مشرقی علاقے کا تمدن اختیار کرلیا تھا۔

مغربی سوڈان میں عربوں کے اثرات اور مذہب اسلام کے عقائد نویں صدی کے شروع میں پھیلنے لگے اور گیارہویں صدی تک انہوں نے خوب جڑ پکڑلی۔ البتہ مشرقی سوڈان میں نوبیہ کی دیسی عیسائی ریاستوں کے ہاتھوں اسلام کو فروغ حاصل نہ ہوسکا۔ انیسویں صدی کے بالکل آخر میں اقوام یورپ کو اس ملک پر حکمرانی نصیب ہوئی۔ اسوقت بھی سوڈان بہت سی ریاستوں میں منقسم ہے جو سب کی سب یورپی طاقتوں کے ماتحت ہیں وہ ریاستیں جو دریائے نائجر کے مغرب میں ہیں، فرانسیسی نظام میں شامل ہیں، وہ ریاستیں جو دریائے نائجر اور جھیل چیڈ کے درمیان ہیں، کلیتہً برطانوی تحفظ میں ہیں اور وہ ریاستیں جو جھیل چیڈ اور دریائے نیل کی وادی کے درمیان ہیں، فرانسیسی استوائی افریقہ میں شامل ہیں۔ باقی علاقہ جو نیل کی بالائی وادی میں ہے، مشترکہ طور پر برطانیہ اور مصر کے ماتحت ہے۔

۱۸۹۶-۹۸ء کی برطانوی مصری مہمات نے مصری سوڈان کو دوبارہ فتح کرلیا تھا۔ اسوقت سے وہ علاقہ برطانیہ اور مصر کی مشترکہ شہنشاہیت میں ہے سچ پوچھو تو اب سوڈان صرف اسی علاقہ کا نام ہے جو برطانیہ اور مصر کی حفاظت میں ہے۔

شمالی سوڈان کو درحقیقت جنوب مشرقی صحرائے اعظم کا ایک حصہ ہی کہا جاسکتا ہے اسکا جنوبی حصہ زرخیز ہے کیونکہ اس علاقے میں پانی کی بڑی افراط ہے۔ بیشتر حصہ گھنے جنگلوں میں پٹا پڑا ہے جنوب سے شمال کی جانب بہنے والا دریائے نیل اور اس کے تمام بڑے بڑے معاون اسی کی حدود میں واقع ہیں نیل کے جانب غرب وسیع میدان ہیں جن میں کہیں کہیں دو ہزار فٹ بلند پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں مشرقی ساحل جو بحیرۂ احمر کے ساتھ ساتھ ہے تقریباً چار سو میل لمبا ہے۔ اس حصہ میں سب سے زیادہ اہمیت راس رواپا کو حاصل ہے جسکا شمالی ساحل خلیج ڈودکلانا کی جانب ہے۔ اس طرف پورٹ سوڈان اور سواکن مشہور بندرگاہ ہیں۔

چونکہ ملک منطقۂ حارّہ میں واقع ہے اور بیشتر حصہ سمندر سے دور ہے۔ اس لئے آب و ہوا شدید گرم ہے۔ حرارت وسطی طبقات میں سب سے زیادہ اور صحرائی علاقے میں سب سے کم ہے۔ خرطوم کے شمال میں موسا کے ٹھنڈے کہیں کہیں صحرا میں نظر آتے ہیں۔ البتہ ان اضلاع میں جو زیادہ خشک نہیں ہیں کچھ جڑی بوٹیاں بھی دکھائی دی جاتی ہیں۔ نیلے نیل کے دونوں ساحلوں میں بابونہ کے درخت ہیں جس کی عمارتی لکڑی افریقہ بھر میں مشہور ہے اس کے علاوہ حنا ب اور تالحہ کے درخت بھی بہت مشہور ہیں جن سے گوند بڑی مقدار میں حاصل ہوتا ہے۔

جنگلی جانور اور پرندے بے شمار ہیں۔ بحر الغزال اور بحر الجبل کے جنگلوں میں ہاتھیوں کی کثرت ہے نیلے نیل کی وادیوں میں یہ اکا دکا نظر آتے ہیں۔ دلدلی علاقوں میں دریائے گھوڑوں اور مگرمچھوں کی افراط ہے۔ ان میں مرغابیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ شیر، چیتے، زراف اور کئی قسم کے تیندوے وسیع میدانوں اور چھدرے جنگلوں میں ملتے ہیں بعض جنگلوں کے شوخ رنگ پروں کے بے شمار پرندے اور کئی قسم کے بندر ہوتے ہیں۔ سانپوں کی بھی کثرت ہے۔ جو زیادہ تر زہریلے ہوتے ہیں۔ کوہ دوفان، دارفور اور صحرائے نوبیہ کے ڈھلوان علاقوں میں شتر مرغ بے شمار ہوتا ہے۔ حشرات الارض میں سے موسمی بخار کے مچھروں اور بھونرے کے برابر بھوری مکھیوں کو جو مویشیوں پر حملہ کرتی ہیں، سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

---

امانت سنگھ

عام اور سام نسل کے قبیلے، جن کے افراد زیادہ تر خانہ بدوش ہیں، شمالی سوڈان میں آباد ہیں۔ ان کو عربوں کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے خرطوم کے جانب شمال دریائے نیل کی وادی میں رہنے والے نوبیہ کے باشندے مخلوط النسل ہیں۔

نوبیہ کے صحرا میں بڑے قبیلے ابابدا اور بشارن ہیں حبشی قبیلوں میں سے چار اقسام خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے نام شلوک، ڈنکا، نوبہ اور بونگو ہیں۔ مصریوں کے برعکس سوڈانی قبیلوں کے لوگ جن میں عرب اور حبشی دونوں شامل ہیں بہت زیادہ کاہل اور مجہول ہیں۔ جہاں ضروریات زندگی مختصر اور سادی ہوں، جہاں مکانات تعمیر کرنے کی حاجت نہ ہو۔ جہاں سردی سے بچنے کے لئے کپڑا پہننا نہ پڑے وہاں ظاہر ہے کہ محنت اور جانفشانی کے کام کو جی نہیں چاہتا۔ بہت سے غریب

چیتھڑے پہنے نظر آتے ہیں۔ مکان کی بجائے صرف ایک چٹائی ان کے پاس ہوتی ہے وہ صحرا کے آزاد منش لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا ریوڑ خواہ کتنا ہی بڑا ہو، وہ اس بے سرو سامانی کے ساتھ رہتے ہیں۔ برطانوی نظام قائم ہونے کے بعد لوگوں کو زبردستی غلام بنانا یا انکی تجارت کرنا بالکل ممنوع ہو گیا۔ عربی بولنے والے باشندوں میں اب تعلیم حاصل کرنے کی آرزو بیدار ہو چلی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اخلاقی ترقی آہستہ لیکن نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔ تجارت کے کاموں میں ڈونگولی ملک بھر میں سب سے زیادہ چالاک ہیں۔ حبشی قبیلوں میں زیادہ تر بت پرست ہیں لیکن وہ جو شمالی علاقوں میں رہتے ہیں اسلام قبول کر چکے ہیں۔

سوڈان مدیریوں (صوبوں) میں اور پھر ہر مدیریہ معموروں (ضلعوں) میں منقسم ہے۔ شمال میں حیفہ، بحیرۂ احمر، ڈونگولا اور بربر، وسطی علاقے میں خرطوم، نیلا نیل اور سفید نیل، مشرق میں کسالا اور فنڈ، مغرب میں دارفور، کردوفان اور نوبہ اور جنوب میں بحر الغزال، بالائی نیل اور مونگالا مشہور صوبے ہیں رقبے کے لحاظ سے یہ چھوٹے بڑے ہیں۔

ملک کا صدر مقام خرطوم سفید اور نیلے نیلوں کے سنگم پر واقع ہے خرطوم کے بالمقابل سفید نیل کے مغربی کنارے پر شہر بربر، ابو حمید، میرادی، ڈونگولا اور وادی حلفہ آباد ہیں۔ بحیرۂ احمر کے کنارے دو بندرگاہیں پورٹ سوڈان اور سواکن ہیں۔ دریائے گاش کے کنارے ایک شہر کسالا ہے۔ انکے علاوہ کاملن، سینار، واد میدانی بھی مشہور شہر ہیں۔

خرطوم کے شمال میں رسل و رسائل کا سب سے بڑا ذریعہ ریل ہے۔ جنوب میں دخانی کشتیاں چلتی ہیں۔ دو طرفہ ریل سوڈان کو مصر سے ملاتی ہے۔ اسکی رسائی بحیرۂ احمر تک ہے۔ ریلیں حکومت کی ملکیت اور اسی کے اہتمام میں چلتی ہیں۔ دریائے نیل پر کریما اور کریما کے درمیان دخانی کشتیاں چلتی ہیں۔ اور خرطوم سے آگے جانب جنوب گو ندوکو رژنک حکومت نے دخانی کشتیوں کا باقاعدہ سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ بالائی نیل اور بحر الغزال میں رسل و رسائل کے سلسلے کو کھلا رکھنے کے لئے آبی خس و خاشاک چھانٹنے کی مشینیں استعمال کی جاتی ہیں۔ قافلوں کے قدیم راستوں کو روکو، ابو حمید اور بربر۔ سواکن پر ریلیں بچھا دی گئی ہیں تاہم شہروں اور دریا کے درمیان بڑے بڑے راستوں پر کنوؤں اور آرام گاہوں کی دیکھ بھال اب بھی کی جاتی ہے۔ تلغراف کا نظام اچھی طرح پھیلا ہوا ہے خشکی کے ذریعہ خرطوم کے ڈانڈے مصر اور اگنڈا سے ملے ہوئے ہیں۔ اس طرح اسکندریہ اور ممباسا کے درمیان براہ راست تار برقی کا سلسلہ قائم ہے بعض مقامات پر تلغراف کے تار ساڑھے سولہ فٹ اونچے ہیں تاکہ زرافوں سے محفوظ رہیں۔

---

ہرموں، مندروں، گرجاؤں اور دوسری یادگار عمارتوں کے کھنڈر دریائے

نیل کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ وادی حلفہ کے جنوب کی طرف سفر کیا جائے تو سیاح کو ان کے آثار نظر آتے ہیں جو بارہویں خاندان کی حکومت کے دوران میں قائم ہوا تھا۔ اٹھارویں خاندان کے بنائے ہوئے ایک عمدہ مندر کے کھنڈر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اسی سمت میں تینتالیس میل اور آگے کمنا اور سمنا نامی قلعوں کے کھنڈر موجود ہیں۔ تل العمارہ میں ایسے مندروں کے کھنڈر ہیں جن پر ہیرو غلیفی کتبے اب تک برقرار ہیں۔ جانک کے قریب ایک طویل و عریض ناتمام بت رکھا ہے دریا کے مشرقی کنارے پر کرما کے قریب ایک مصری شہر کے آثار ہیں۔ ذرا آگے بڑھکر جزیرہ آرگو خانقاہوں، گرجاؤں اور قلعوں کے کھنڈرات سے بٹا پڑا ہے۔ مردو نالی موجودہ گاؤں سے ایک دو میل پرے بہت سے اہرام اور منادر پائے جاتے ہیں۔ یہ اہرام ۵۰ سے ۶۰ فٹ تک بلند ہیں۔ ان سے قدیم حبش کے مذہبی صدر مقام نپاٹا کا سراغ ملتا ہے۔ یہاں سے رب عموں کی پوجا شروع ہوتی تھی۔ شہر شندی سے تیس میل جانب شمال میرو کے اہرام باقی ہیں۔ انہی میں کے ایک ہرم سے ملکہ کاندیس کا خزانہ برآمد ہوا جو برلن کے عجائب گھر میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

سوڈان میں اثریاتی تحقیقات سے اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں حال ہی میں مندروں اور آثار قدیمہ کے تحفظ کے لئے حکومت نے ایک کثیر رقم منظور کر دی تھی۔ خالص مصریاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو سوڈان کی ان یادگاروں سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ پرانے کتبات سے ثابت ہوتا ہے کہ بہت قدیم زمانے ہی میں مصریوں نے اس ملک میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا۔ ایکبرار یا اس سے زیادہ مدت تک مصری تسلط قائم رہنے کی بہت سی قابل ذکر یادگاریں موجود ہیں۔ سرکاری وفد نے آسوان اور کوردسکو کے درمیان ابتدائی زمانہ سے نصرانی عہد تک تمام اہم ادوار کی یادگاریں کھیں۔ حاصل شدہ نمونے قاہرہ کے عجائب گھر میں ایک الگ کمرے کے اندر رکھدیئے گئے ہیں۔ یہ ذخیرہ بڑا قیمتی سمجھا جاتا ہے۔

ہین سلوس ہیم کے کارناموں نے افریقی قوموں کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول کر رکھدیا۔ زیریں نوبیہ کے نصف جنوبی علاقے کے انکشافات ایک ایسی خود مختار تہذیب کا پتہ دیتا ہے جو بعد مسیح کی ابتدائی چھ صدیوں میں پروان چڑھی تھی۔ وہ ایک ایسی قوم کی پیداوار تھی جو سلطنت روما کی سرحدوں پر آباد تھی۔ اور جس نے اور فنوں کے ضمن میں یونانی روایات کو ورثے میں پایا تھا لیکن اپنی خداداد قابلیت سے کام لیکر انہیں اس طرح مخلوط کیا تھا کہ ہر فن طبعزاد معلوم ہونے لگا تھا۔ نئے انکشافات کی سب سے بڑی قدر و قیمت اس حقیقت سے واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے زمانۂ قدیم کی تاریخ سے متعلق نئے معدقہ مواد کی بنیاد رکھدی۔

---

دریائے نیل کے دونوں جانب تنگ قطعات اراضی زراعت کے لئے مخصوص ہیں۔ ان کے علاوہ خرطوم کے شمال میں صحرائے لیبیا کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ایسے ہیں جن پر کھیتی باڑی کرلی جاتی ہے نیلے دریائے نیل اور اتبارا کے درمیان مزروعہ زمین کے وسیع قطعات کو آبپاشی کے ذریعہ اتنا زرخیز کرلیا ہے کہ ان پر کپاس کی کاشت ہوتی ہے۔ اسی کی پیداوار پر ملک کی خوشحالی کا انحصار ہے۔ اناج کی سب سے بڑی فصل دُرا ہے جو سوڈانیوں کی بنیادی خوراک کا کام دیتی ہے کئی اضلاع میں ہر سال دو فصلیں تیار ہوتی ہیں۔ دریاؤں سے ملحقہ زمینوں پر دُرا سیلاب ختم ہونے کے بعد اور موسم برسات کے شروع میں بویا جاتا ہے گیہوں اور جو بھی بڑی مقدار میں بوئے جاتے ہیں۔ دوسری اشیائے خوراک میں سورج سیم، پیاز اور خربوزے شامل ہیں۔ خرطوم سے نیچے ہٹ کر وادیٔ نیل کے ساتھ، خصوصاً ڈونگولا مدیریہ کے مغربی کنارے پر اور اس کے آس پاس کے شاداب حصوں میں کھجور کی کاشت کی جاتی ہے۔ کھجور بھی دارفور اور کوردوفان میں خاص پیداوار کی حیثیت رکھتی ہے یہیں کی خاطر تل اور مونگ پھلیاں بھی بڑی مقدار میں بوئی جاتی ہیں۔ سوڈان مصری کپاس کا ابتدائی گھر تھا اور جو روئی اب اُگتی ہے وہ دہانے کے قریب کی پیداوار کے برابر ہوتی ہے۔

ساحلوں کے پاس کی زمین پر ساقیاؤں (رہٹوں) کے ذریعہ آبپاشی ہوتی ہے۔ انھیں بیلوں کی جوڑی چلاتی ہے۔ غزیرہ میں آبپاشی کے لئے نہروں کا ایک خاکہ ۱۹۲۵ء میں مکمل ہوا تھا۔

خاص جنگلی پیداواروں میں گوند اور ربڑ قابل ذکر ہیں۔ گوند مشرقی کوردوفان اور بالائی نیلے نیل کے جنگلوں میں پیدا ہوتا ہے۔

سونا بنی شانگل میں ملتا ہے جو سینار کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ ڈونگولا کے علاقوں سے نمک اور دارفور اور جنوبی کوردوفان سے کچا لوہا برآمد ہوتا ہے۔

برآمدی اشیا میں روئی باقی تمام چیزوں کی مجموعی مقدار سے بھی زیادہ بھیجی جاتی ہے۔ اس کے بعد گوند، بنولے، تل، کھال اور چمڑے کے نمبر آتے ہیں۔ مویشی، کھجور، ہاتھی دانت اور سونا بھی باہر بھیجا جاتا ہے، بحیرۂ احمر کی بندرگاہیں زیادہ تر ملک عرب سے تجارت کرتی ہیں۔ ان بندرگاہوں پر سیپیاں نکالنے کا کاروبار بھی قائم ہے۔ درآمدی اشیاء میں سوتی پارچہ جات، اشیائے خوراک (آٹا، چینی، چائے اور قہوہ) عمارتی لکڑی، تمباکو، کوئلہ، ریل کا سامان، لوہے اور مشینوں کو خاص اہمیت حاصل ہے ۱۹۲۸ء میں جو مال سوڈان سے بھیجا گیا اس کی قیمت پچاس لاکھ پونڈ تھی۔ اس میں سے نصف حصہ روئی کا تھا۔ اسی سال اٹھاون لاکھ پچپن ہزار پونڈ کا مال درآمد ہوا۔ برآمدی اشیاء کا بیشتر حصہ برطانیہ جاتا ہے اور درآمدی میں اس کے بھیجے ہوئے مال کی مقدار تہائی سے زیادہ ہوتی ہے۔

---

تربیت عامہ کا محکمہ تعلیم کا ذمہ دار ہے۔ ابتدائی تعلیم جو عربی زبان میں ہوتی ہے دیہاتی مدرسوں میں دی جاتی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں ایسے ابتدائی مدرسے بھی ہیں جن میں انگریزی عربی اور ریاضی کا انتظام ہے۔ سرکار کی طرف سے کچھ صنعتی کارخانے ہیں اور کچھ زنانہ مدارس بھی۔ خرطوم کے گورڈن کالج میں بہت سے حرفوں کی مناسب تعلیم دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ استادوں اور اسلامی عدالتوں کے منصفوں کی تربیت کا بھی انتظام ہے۔ اس کالج میں سائنسی تحقیقات کے لئے عمدہ سازوسامان سے لیس تجربہ گاہیں بھی ہیں۔

سوڈان میں برطانوی حکومت کو قائم ہوئے چالیس سال ہو گئے ہیں اس دوران میں وہاں کے طبی ادارے نے ترقی کرکے اعلیٰ حیثیت حاصل کرلی ہے۔ خرطوم کا کچنر اسکول اوف میڈیسنز سب سے اہم ادارہ ہے جہاں ڈاکٹروں، طبی نائبوں حفظان صحت کے انسپکٹروں، نرسوں اور دائیوں وغیرہ کی تربیت ہوتی ہے۔ اس میں سوڈانی بڑی ذمہ داری کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔

حفظان صحت کے امور عامہ کے علاوہ سوڈان کا طبی محکمہ اور بھی خدمات انجام دیتا ہے۔ مثلاً ایسے وبائی امراض کے سلسلے میں تحقیق و تفتیش جو گرم ملکوں میں عام ہوتے ہیں، حفظان صحت کا خیال اور کیڑوں سے بچنے کی تدابیر، دیہاتی علاقوں میں طبی خدمات نیز ٹیکوں کے لئے ویکسینوں اور سیرموں کی تیاری۔ اس محکمے نے ادویات کی فراہمی کے علاوہ ایک طبی عملہ بھی تیار کیا جس نے محاذ جنگ پر بڑے کارہائے نمایاں پیش کئے۔

---

سوڈان کو نئے سرے سے فتح کرنیکا سب سے بڑا اور اہم سبب یہ تھا کہ بالائی حصۂ نیل پر اثر و اقتدار حاصل کرنے کی سخت ضرورت تھی کیونکہ مصر کی تمامتر خوشحالی نیل کے آبی ذخیروں پر منحصر ہے۔ سوڈان کو جب برطانیہ اور مصر کی فوجی اور مالی مشترک کوششوں سے دوبارہ فتح کرلیا گیا تو حکومت برطانیہ نے مطالبہ کیا کہ اس ملک کے انتظامی اور قانونی اختیارات میں اسے "حق فتح" ملنا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں برطانیہ اور مصر کے مابین ایک معاہدہ عمل میں آیا جسکی رو سے دونوں حکومتوں کو سارے ملک سوڈان پر مشترک شہنشاہیت کا حق حاصل ہوگیا۔ ملک کی تنظیم نو اس طرح پر شروع ہوئی کہ سوڈان کا گورنر جنرل حکومت برطانیہ کی سفارش پر رکھا جانے لگا۔ چنانچہ اسکا پہلا گورنر جنرل لارڈ کچنر ہوا۔ نئی حکومت کا اولین فرض یہ تھا کہ وہ عوام میں امن و عافیت کی فضا قائم کرے ۱۹۰۲-۰۳ء میں سوڈان اور حبش کے درمیان نئے سرے سے حدبندی ہوئی اور اس طرح اس شورش پسند علاقے میں کچھ صلح و آشتی کا رنگ جم سکا نتیجہ یہ کہ آبادی بڑھنے لگی۔ اس صورت حالات کو دیکھتے ہوئے حکومت سوڈان نے اپنی توجہ زراعت و تجارت کی تجدید کی طرف مبذول کی، باشندگان ملک کی تعلیم کی داغ بیل رکھی اور مناسب عدالتی نظام قائم کردیا۔ جہانتک ممکن ہوسکا اس سلسلے میں سوڈان کا ملکی قانون اور وہاں کے رسم و رواج کو مدنظر رکھا گیا۔ یہ کوشش نہیں ہوئی کہ سوڈانیوں کو مصری یا انگریزی رنگ میں رنگ دیا جائے۔

عربی بولنے والے مسلمانوں نے محسوس کیا کہ انکی مذہبی اور لسانی روایات کا احترام ہو رہا ہے۔ اس لئے انہوں نے نئے نظام سے خاطرخواہ فائدہ اٹھانا چاہا۔ بت پرست علاقوں میں حکومت سوڈان نے تبلیغی جماعتوں کی ہمت افزائی کی۔

۱۹۲۵ء میں سر جیوفری آرچر ملک کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اس نے مرکزی نظام قائم کرنے کے اصول کو پوری تقویت دی۔ اس نے بیشتر نظم و نسق مقامی حکام کے سپرد کردیا۔ ۱۹۲۶ء میں سینار بند کی تعمیر نے گزیرہ کے بہت بڑے حصے میں آبپاشی کی صورت پیدا کردی۔ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء سوڈان کے لئے بالکل خشک سال تھے لیکن آبپاشی کی بدولت مادی ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔ حکومت نے فوراً بیج کا مرکزی ذخیرہ قائم کرکے قیمت پر کنٹرول کردیا۔

مارچ ۱۹۲۸ء میں برطانیہ اور مصر کے مابین ایک نیا معاہدہ ہونا تھا۔ جسے مصری کابینہ نے مسترد کردیا۔ اسپر حکومت برطانیہ نے مصر کو یاد دلایا کہ ۱۸۹۹ء کے معاہدہ کی رو سے برطانیہ سوڈان پر اپنا نظام قائم رکھیگا۔ تاہم ۱۹۲۹ء میں جہاں تک نیل سے آبپاشی کی اسکیم کا تعلق تھا، دونوں جماعتوں کے مابین پورے اطمینان کے ساتھ معاہدہ عمل میں آگیا۔ اس معاہدے کی رو سے مصری حکام کو فوراً اجازت مل گئی کہ وہ سفید نیل پر جبل اولیا کے قریب ایک بند تعمیر کریں۔ یہ جگہ خرطوم سے تیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

---

اس وقت ان مسائل میں سے جو حل طلب ہیں، سب سے زیادہ مشکل مسئلہ سوڈان کے مستقبل سے متعلق ہے۔ سوڈان کا موجودہ مسئلہ پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ قومی جذبات کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مصر کی آرزو جس کا اظہار وفد نے اپنے بیانات میں کیا ہے لیکن جو تمام جماعتوں کے دل کی پکار ہے، صرف یہ ہے کہ وادیٔ نیل میں پوری طرح اتحاد ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ سوڈان میں جو برطانوی مصری نظام قائم ہے، اُسے ختم کرکے خالص مصری (یا بالفاظ دیگر مصری سوڈانی) نظام قائم کرلیا جائے۔

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ سوڈانیوں نے برطانوی مدد سے اتنی زیادہ ترقی کرلی ہے کہ وہ صرف مصری اعانت سے ممکن نہیں تھا۔ لیکن مصری اسے تسلیم نہیں کرتے۔ قابل اطمینان سیاسی مفاہمت کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے پانی کی افراط۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ نیل میں پانی کی روانی ہمیشہ بڑھتی رہے تو ظاہر ہے کہ قلت آب کا اندیشہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ اور اس طرح جو اندیشے لگے رہتے ہیں ہمیشہ کے لئے مٹ سکتے ہیں۔ فراہمی کو دو طریقوں سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ جھیل ٹینک کے دہانے کے پاس نیلے نیل سے آگے بڑھ کر ایک اور بند تعمیر کیا جائے۔ اس صورت میں حکومت حبش سے بھی معاہدہ کرنا پڑے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سفید نیل سے براہ راست ایک نہر نکالی جائے جو وسیع دلدلی علاقوں یا بحر الغزال میں سے ہوکر نکلے۔ یہ دونوں صورتیں بہت مہنگی ہیں۔ خصوصاً بحر الغزال کے علاقے سے نہر نکالنا دشوار بھی ہے۔

## آنسو

**جوش ملیح آبادی**

تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو اے دوست!
سبزۂ نرم پہ پھیلی ہوئی شبنم تو نہیں؟
چاند تاروں کا حسیں جلوۂ برہم تو نہیں؟
حُسن کے نور سے بکھرا ہوا عالم تو نہیں؟

تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو اے دوست!
گنبدِ عرش سے ٹوٹے ہوئے تارے تو نہیں؟
کسی مغموم کے آزردہ سہارے تو نہیں؟
سنگِ مرمر کے تراشے ہوئے پارے تو نہیں؟

تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو اے دوست!
طاقِ مفلس میں یہ مغموم دیئے ہیں روشن؟
یا دہکتے ہوئے پُرسوگ شراروں کا چمن؟
تیز ہوتی ہی چلی جاتی ہے دل کی دھڑکن

تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو اے دوست!
چشمِ بے رنگ ہی کیوں آج چمک سے محروم؟
نور سے دھوئے ہوئے گال دمک سے محروم؟
کیوں یہ ٹوٹے ہوئے تارے ہیں فلک سے محروم؟

تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو اے دوست!
مانتا ہوں کہ مرے "فرض" کا ہے تجھکو خیال
روکتا ہے مجھے لیکن ترے اشکوں کا یہ جال
پونچھ بھی ڈال انھیں ہنس کے مری روحِ جمال

تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو اے دوست!

لہٰذا ملک کے لئے سب سے بہتر صورت یہی ہے کہ برطانوی مصری نظام کو کم سے کم ایک نسل تک کیلئے بدستور قائم رہنے دیا جائے۔ اس ضمن میں مصر کو وہ اختیارات مزید دیدیئے جائیں جو ۱۹۳۶ء میں اس سے لئے گئے تھے۔ نیز سوڈانیوں میں خود اختیاری حکومت کو ترقی دیا جائے جسکی عملی تشکیل تھوڑی بہت کامیابی کے ساتھ رونما ہو چلی ہے۔ اس اثناء میں آبپاشی کے دشوار مسئلے کو بھی حل کرلیا جائے جسپر ملک کی خوشحالی منحصر ہے۔

# نقد و نظر

## شیطان

مترجم:- حکیم حبیب احمد خاں صاحب اشعر دہلوی۔ ملنے کا پتہ:- ملک ایجوکیشنل بک ڈپو۔ اردو بازار دہلی۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۴۴ صفحات۔ مجلد قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ یہ جبران خلیل جبران کے دس افسانوں کا مجموعہ ہے جنکا ترجمہ اشعر صاحب نے براہ راست عربی سے کیا ہے۔ ان افسانوں میں بھی مصنف کی رنگین بیانی پورے کمالات کے ساتھ اپنا نقش جماتی نظر آتی ہے۔ ہر افسانہ کی حلاوت اور جادو اثری پڑھنے والے کا دل موہ لیتی ہے اور ہر جملہ قلب و روح کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے جی چاہتا ہے کہ قند مکرر کا مزا لینے کیلئے اس کا مطالعہ بار بار اور مسلسل کیا جائے۔ تیسرا افسانہ "شیطان" جس کی نسبت سے کتاب کا نام رکھا گیا ہے، اس مجموعے میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں طنز کی تلخی اتنی شدید ہے کہ شاید جبران کے کسی دوسرے افسانے میں نہ مل سکے۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ زیادہ شیطنت اس شیطان میں ہے جسے راندۂ درگاہ کیا گیا ہے یا اس انسان میں جسے اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ ترجمہ کی خوبیوں پر اظہار خیال کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ اشعر صاحب کو اس سلسلے میں پورا کمال حاصل ہے اور اسپر ہم اپنی رائے پہلے بھی پیش کر چکے ہیں۔ موصوف نے جناب قیسی رامپوری کی انسانیت سے متاثر ہو کر "شیطان" کو ان کے نام سے منسوب کیا ہے۔ یہ نسبت خاص توجہ کی مستحق ہے ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

## شیطان

مصنف:- حضرت قیسی رامپوری۔ ملنے کا پتہ: نگارستان ایجنسی اردو بازار۔ دہلی۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۳۶ صفحات۔ مجلد قیمت تین روپے۔

یہ دوسرا "شیطان" ہے لیکن استعارے کے انداز میں۔ ایک ایسا شخص ہے جو اپنی فطری خباثتوں کے باعث شیطان کہلائے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ وہ اس ناول کا ہیرو نہیں ہے لیکن اسکے افعال کی ہمہ گیری اسکی اہمیت کا باعث بن سکتی ہے قیسی صاحب کے دوسرے ناولوں کی طرح اس کا تعلق بھی ہماری سماجی زندگی اور اس کی کمزوریوں سے ہے۔ اسمیں بھی جا بجا طنز و ظرافت کی تلخیاں اور لطافتیں ملی جلی نظر آتی ہیں۔ چونکہ ہیرو ایک کامیاب مصور ہے، اسلئے انداز بیان میں رنگینی قدرتی طور پر جھلک دکھانے لگی ہے مگر کہیں کہیں عبارت کی بے ربطی یا پلاٹ کی الجھن ایسا نقص پیدا کر دیتی ہے جو طبیعت پر گراں گذرنے لگتا ہے۔ مثلاً یہ جملہ "رات کو دیر تک شبنم گیلی جھاڑی اور خنکی میں بیٹھ سے باوجود مضبوط جسم کی مالک ہونے کے ندیمہ کی صبح طبیعت خراب ہو گئی" بندش کے اعتبار سے بہت ہی ناقص ہے۔ یا دو مختلف کرداروں کا ایک ہی نام (رضیہ) رکھ دینا جبکہ اس یکسانیت سے پلاٹ میں کوئی خصوصیت پیدا نہیں ہوتی، بالکل بے معنی کہا جا سکتا ہے۔ غالباً ادبی خدمت کے تحت قیسی صاحب کا ضرورت سے زیادہ بڑھا ہوا جوش جس کے زیر اثر وہ ہر مہینے ایک ناول لکھ ڈالتے ہیں، ان خرابیوں کا ذمہ دار ہے۔ لیکن اس کے باوجود ناول نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔ عین مناسب ہوتا اگر قیسی صاحب اپنے اس "شیطان" کو اشعر صاحب کے نام منسوب کر دیتے۔ شاید وہ ابھی تک ان کی انسانیت کے اسیر نہیں ہوئے ہیں۔

ف۔ ح

## آیات وجدانی (جدید)

مصنف:- امام الغزل حضرت میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی۔ ملنے کا پتہ: میرزا حیدر بیگ چنگیزی سلطان بہادر روڈ لکھنؤ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۰۰ صفحات۔ مجلد قیمت پانچ روپے۔ غالب کی طرح میرزا صاحب کے بھی دو تخلص ہیں، یاس اور یگانہ۔ لیکن جس طرح غالب کا پہلا تخلص زبان زدِ خلائق نہیں ہے اسی طرح یاس کو جاننے والے کم اور یگانہ سے واقف بے شمار ہیں لیکن خیر تخلص سے کیا غرض۔ اصل چیز کلام ہے۔ میرزا صاحب نے اپنی جادو بیانیوں سے دوست اور دشمن سب پر اثر جما رکھا ہے۔ ہر شخص انکے محاسن کلام کا قائل ہے۔ وہ غزل اور رباعی دونوں اصناف سخن پر پوری طرح حاوی ہیں۔ جدت خیال اور ندرت بیان ان کے ہر شعر میں موجود ہے۔ وہ ہر لمحے زندگی کے حقائق بیان کرتے اور نفسیاتی اعتبار سے اس کے ہر پہلو کا تجزیہ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ انکے ہاں یاس اور افسردگی کی بجائے جوش اور امنگ کی فراوانی ملتی ہے لیکن جب غالب، جوش یا کسی اور شاعر کی مذمت میں قلم اٹھاتے ہیں تو لب و لہجے کا انداز معیار سنجیدگی سے گر جاتا ہے۔ چنانچہ پیش نظر کتاب کا آخری حصہ اسی رنگ کا حامل ہے۔ ابتدائی صفحات کے مطالعہ سے میرزا صاحب کے محاسن کلام کو اچھی طرح سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس حصہ کو کلام یگانہ کی شرح کہنا چاہیئے جس میں عمیق ترین خیالات کی وضاحت نہایت سادہ لفظوں میں کی گئی ہے۔ اپنی فلسفیانہ موشگافیوں کے باعث یہ کتاب مقبول ہوئی اور اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔

## رباب ہفتہ وار کا نیا سال نمبر

مدیران:- محمد عثمان صاحب (علیگ) اور حسینی شاہد صاحب بی اے (عثمانیہ) ملنے کا پتہ:- دفتر رباب ہفتہ وار، چارکمان، حیدر آباد۔ سالانہ چندہ دس روپے قیمت سالنامہ ۱۲؍ "رباب" کے عام ہفتہ وار شمارے بھی اس شان کے نکلتے ہیں کہ ان کو ماہانہ رسائل کی صف میں رکھا جاتا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ خاص نمبر کن خوبیوں کا حامل ہوگا۔ اس میں اردو کے بہترین ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے علاوہ چند نئے لکھنے والے بھی نظر آتے ہیں۔ ادبی مضامین میں مخدوم محی الدین، سبط حسن، حسینی شاہد اور عطا محمد کے رشحات قلم توجہ کے مستحق ہیں۔ عطا محمد صاحب نے "نئے زاویئے" پر اچھی تنقید لکھی ہے۔ اشفاق حسین صاحب نے "اردو شاعری کے مرقع" نیچر کے انداز میں دکھائے ہیں۔ "تیس روپے" اور "کافی ہاؤس میں" اچھے افسانے ہیں۔ منظومات میں جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر، ساغر نظامی، مسلم ضیائی، سلام مچھلی شہری، مجاز لکھنوی اور کیفی اعظمی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ فضل الرحمن صاحب نے اردو فلموں پر گہری نظر ڈالی ہے۔ یہ سال نامہ ہر لحاظ سے معیاری اور قابل مطالعہ ہے۔

## الطاف کے نغمے

مصنف جناب الطاف مشہدی۔ ملنے کا پتہ:- منیجر دار البلاغ، محمد نگر، بیور روڈ۔ لاہور۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۴۴ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ اردو شاعری میں

ہئیت کے تجربے کرنے والوں میں الطاف صاحب کا نام بھی قابل ذکر ہے اور اس لحاظ سے زیادہ بلند ہے کہ انہوں نے بحر و عروض اور ردیف و قافیہ کی پابندیوں کے ساتھ اپنے تجربات کی نئی بنیادیں رکھیں۔ انہوں نے طرح نو ڈالی لیکن روایتی حدود میں رہ کر۔ غلط طریقے سے مغربی تقلید نہیں کی چنانچہ ان کی غزلیں نظمیں، گیت، دوگانے اور ماہیے اس حقیقت کے ترجمان ہیں اور ان سب کے نمونے اس کتاب میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ ان کے گیتوں ہی میں ترنم نہیں ہے بلکہ ان کی غزلیں حتیٰ کہ نظمیں بھی گائی اور ساز کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہیں۔ رفعتِ خیال کے لحاظ سے بھی بعض اشعار اتنے وزنی ہیں کہ ان کو اس زمانے کے مشہور ترین شعراء کے کلام کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو ؎

مقام پرستش اک آ بنے گا ایسا — جبیں کو ترس جائیں گے آستانے
مرے ڈوبنے کا سبب بس یہی ہے — سہارا دیا تھا مجھے ناخدا نے

**روزگار کا شادی نمبر** | ماہنامہ "روزگار" رامپور نے ہز ہائنس نواب رامپور کے صاحبزادے کرنل محمد مرتضیٰ خاں بہادر کی تقریب شادی کے سلسلے میں یہ خاص نمبر شائع کیا ہے۔ لہذا ۶۴ صفحات کا بیشتر حصہ اسی موضوع کے مضامین نثر و نظم پر حاوی ہے۔ اگر غیر متعلقہ مضامین اور افسانے وغیرہ شامل نہ ہوتے تو اسے "شادی نمبر" کہنا زیادہ صحیح ہوتا۔ بصورتِ موجودہ یہ نام "محض تبرکاً" کہا جا سکتا ہے۔ ایک روپے میں دفتر روزگار، رامپور سے طلب کیجئے۔

## آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ تخمیس حسرت بر غزل حافظ ..... رئیس المتغزلین حضرت حسرت موہانی
۲۔ یارم کی یاد میں (مع تصویر) ..... پروفیسر رشید احمد صدیقی .....
۳۔ آواز (پولستانی افسانہ) ..... نواب جعفر علیخاں اثر لکھنوی .....
۴۔ دار العلوم ندوۃ العلما ..... جناب نگر ندوی .....
۵۔ اردو اور سائنس (۲) ..... ڈاکٹر رضی الدین صدیقی .....
۶۔ کچھ غزل کے بارے میں (۱) ..... حضرت مخمور اکبرآبادی .....
۷۔ کرگسوں کا سماج (افسانہ) ..... جناب اصغر علی .....
۸۔ یورپ نے اسلامی تمدن سے کیا استفادہ کیا؟ ..... ڈاکٹر حفیظ سید .....
۹۔ امجد حیدرآبادی کی نثر نگاری ..... جناب نصیر الدین ہاشمی .....
۱۰۔ آپ کیا چاہتے ہیں ..... محترمہ بلدیپ کور .....
۱۱۔ چین میں شادی کی رسمیں ..... فضل حق قریشی دہلوی .....
۱۲۔ کیمبرج یونیورسٹی کا دار التجربہ ..... جناب مادھو رام .....
۱۳۔ ترکی ادب کے بنیادی عناصر ..... جناب ایس کے چودھری .....

Zamiruddeen Ahmad



# آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۴ | ۱۵ دسمبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

## فہرست



مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم
ایم۔ اے

ناشر
فضل حق قریشی
دہلوی

مدیران
بھگت سروپ کھلر
ایم۔ اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

# رفتار زمانہ

## لاہور کی بادشاہی مسجد

لاہور میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی تعمیر کی ہوئی بادشاہی مسجد امتداد زمانہ کے ہاتھوں بوسیدہ اور بے رونق ہو چلی تھی کہ لوگوں کی توجہ اسطرف مبذول ہوئی اور وہ اس کی تجدید و مکرر تعمیر کے لئے کمر بستہ ہو گئے۔ مغل شہنشاہ کو اسکی تعمیر پر چھ لاکھ روپے خرچ کرنے پڑے تھے لیکن تب زمانے کا رنگ اور تھا اور ہر چیز سستی ملتی تھی۔ اب اس کی محض مرمت اور زیبائش پر تیرہ لاکھ خرچ ہو چکے ہیں اور دس لاکھ خرچ ہونے باقی ہیں۔ اس سلسلے میں پنجاب کے کسی بھی طبقے نے چندہ دینے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ سب سے زیادہ فیاضی مسلمان کاشتکاروں نے دکھائی۔ انھوں نے ایک انجمن بناکر ہر شخص کی سالانہ آمدنی پر ایک اوسط رقم مقرر کی اور دل کھول کر اس کار خیر میں حصہ لیا۔ اس انفرادی امداد کے علاوہ مرکزی حکومت، حکومت پنجاب اور حکومت نظام نے بھی مالی مدد کے علاوہ ماہرین فن کے مشوروں سے مستفیض فرمایا۔ تینوں حکومت کے چیف انجینئر یکجا جمع ہو کر اس کے بناؤ سنگھار پر غور کرتے رہے۔ بنیادی اعتبار سے کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی بلکہ اس امر کا خیال رکھا کہ اورنگ زیب کے زمانے میں جو مسالۂ تعمیر استعمال ہوا تھا، حتی الامکان وہی فراہم کیا جائے۔ چنانچہ دھولپور سے سنگ سرخ، مکرانہ سے سنگ مرمر اور شمال مغربی سرحد کے قبائلی علاقے سے ابرقی تعمیر کی سلیں منگائی گئیں۔ ۲۰۰ ۵ فٹ مربع وسیع صحن کی اینٹیں گھس گھسا کر ختم ہو چلی تھیں۔ انکی جگہ سلیں بچھا دی گئیں جس سے مسجد کی ظاہری رونق کو چار چاند لگ گئے۔ اورنگ زیب کے انجینئروں نے کنکریلے چونے کو پسوا کر چنائی کا گارا تیار کیا تھا۔ اب سیمنٹ نے اسکی جگہ لے لی۔ اسی طرح پتھروں کے جوڑ ملانے کے لئے لوہے کی بجائے تانبے کی پتیاں استعمال کی ہیں۔ اسطرح زیبائش کے ساتھ ساتھ اس کی استقامت بھی بڑھ گئی ہے۔ وسیع صحن کے چاروں کونوں پہ پہریدار سپاہیوں کی طرح کھڑی ہوئی مینار بھی کچھ تھکن ظاہر کر رہی تھیں۔ خصوصاً شمال مغربی اور جنوب مشرقی گوشے کی دو مینار بہت ہی خستہ حالت میں تھیں۔ ان سب کو نئی زندگی بخشی گئی ہے۔ یہ مینار جنکا بیرونی محیط ۲۰ فٹ اور بلندی ۱۷۶ فٹ ہے، ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے بگلے کی طرح زمانے کے بہت سے نشیب فراز دیکھ چکی ہیں۔ ان کے تھوڑے تھوڑے حصے مسمار کر کے نئے سرے سے بنائے گئے اور برجیاں بھی دوسری ہی چڑھائیں کیونکہ زلزلے سے ان کو سخت نقصان پہنچ چکا تھا۔ شاندار صدر دروازے اور اس کے باہر کی مدور سیڑھیوں کی مرمت ہونی باقی ہے۔ اس لئے فی الحال اس میں اور باقی مسجدیں وہی لطف و حسن موجود ہے جو مور کے خوبصورت پروں اور اس کے پیروں میں پایا جاتا ہے۔ وہ کوٹھریاں بھی جن میں کبھی مسجد کے طالب علم رہتے تھے آجکل زیر مرمت ہیں۔

## سر مانک جی دادا بھائی

مسلسل چودہ سال تک کونسل اوف اسٹیٹ کے صدر رہنے کے بعد ۲۰ ۔ نومبر کو سر مانک جی دادا بھائی اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو گئے۔ ایسا بڑا اعزاز اور اتنی طویل مدت کے لئے ذرا مشکل ہی سے نصیب ہوا کرتا ہے۔ وہ گذشتہ اڑتیس سال تک ہندوستان کی مجلس قانون ساز کے رکن رہے ہیں۔ ان کے ہمعصروں میں سے مسٹر سرینواس شاستری، سر شیواسوامی آئر، مسٹر جی کے گوکھلے، سر سریندر ناتھ بنرجی، اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ کونسل کو خیرباد کہتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ گذشتہ چند سال دونوں ایوانوں کے طریقۂ کار اور عملی پہلوؤں میں یکجہتی اور یگانگت مفقود رہی ہے۔ تاہم اب یقین ہے کہ نئی حکومت کے ماتحت یہ فضا سازگار ہو جائے اور باہمی اعتماد و تعاون پر کام چلنے لگے بشرطیکہ اقلیت کے مسئلے کو جسے ہندوستانی سیاست میں بڑی اہمیت حاصل ہے، کسی بہتر طریقے سے سلجھا لیا جائے۔ اگر ایسا ممکن ہو سکے تو اسمیں شک نہیں کہ مرکزی حکومت کو ان سے بے دریغ مدد مل سکتی ہے۔ ان کی یہ بھی رائے ہے کہ موجودہ صورت حالات کے ماتحت زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہندوستان سلطنت برطانیہ میں شامل رہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کو اسٹرلنگ بیلنس حاصل کرنے کے لئے انتہائی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ صنعت کو فروغ دینے کے علاوہ اناج کی کمیابی کا مداوا بھی صرف اسی طرح ممکن ہے۔ ہندوستان کو ترقی کی مہنگی اسکیموں کو نیچ کر کفایت شعاری سے بھی کام لینا ہوگا۔

## سائنس کانگریس کا اجلاس

انڈین سائنس کانگریس ایسوسی ایشن کا چونتیسواں سالانہ اجلاس ۲ سے ۸ جنوری ۱۹۴۷ء تک دہلی یونیورسٹی کی عمارات میں منعقد ہوگا جس کی صدارت پنڈت جواہرلال نہرو فرمائیں گے۔ رسم افتتاح ہز ایکسیلنسی وائسرائے ہند کے ہاتھوں ادا ہوگی۔ یہ اجلاس غیر معمولی طور پر نہایت شاندار رہے گا کیونکہ ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ نے تعمیر قومی کے پیش نظر ایک خاص جلسے کا انتظام کیا ہے جس میں بڑے بڑے سائنسداں اور ماہرین علم حصہ لیں گے۔ برطانیہ، امریکہ، روس، فرانس، بلجیم، چین، مصر، ڈنمارک، سوئستان اور دوسرے ملکوں کے مشہور اور نامور سائنسدانوں کو دعوت نامے بھیجے جا چکے ہیں معلوم ہوا ہے کہ سر ہنری ڈیل، سر رابرٹ روبنسن، پروفیسر ترا ارڈ، ڈارون، بلیکٹ اور گرے نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ پروفیسر ہکسلے کے آنے کی امید ہے۔ نیشنل اکیڈیمی اوف سائنسز واشنگٹن، رائل سوسائٹی اوف لندن اور رائل سوسائٹی اوف کینیڈا کے صدروں نے اپنے اپنے نمائندے بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ حکومت ہند کے شعبۂ تعلیمات نے ایسوسی ایشن کو پچھتر ہزار روپے کی رقم عطا کی ہے۔ امید ہے کہ غیر ملکی نمائندے سارے ملک کا دورہ کرینگے اور مختلف مقامات پر اپنے خیالات کا اظہار بھی فرمائیں گے۔

## ایٹم بم اور مدافعت

پروفیسر البرٹ آئن سٹائن اور ان کے رفیق کار سائنسدانوں کی ایک جماعت نے عوام سے دس لاکھ ڈالر چندہ کا اپیل کیا ہے۔ یہ کثیر رقم، اگر جمع ہوگئی تو ملک کے نوجوانوں کو ایٹمی قوت کی سماجی پیچیدگیاں سمجھانے اور اگر ضرورت ہوئی تو تہذیب و تمدن کو تباہی سے روکنے کے سلسلے میں صرف کی جائیگی۔ موصوف نے بتایا کہ مندرجہ ذیل حقائق کو سب سائنسداں تسلیم کرتے ہیں:—

(۱) اب ایٹم بم کم قیمت پر اور زیادہ تعداد میں تیار کئے جا سکتے ہیں وہ زیادہ تباہ کن بھی ثابت ہو سکیں گے۔

(۲) ایٹم بم سے بچنے کے لئے کوئی فوجی قوت موجود نہیں ہے اور نہ اسکی توقع کی جا سکتی ہے۔

(۳) دوسری قومیں ذاتی کوششوں سے ہمارے خفیہ طریقوں کو نئے سرے سے تحقیق کر سکتی ہیں۔

(۴) ایٹمی طریقۂ جنگ کے برعکس کسی قسم کی تیاری کرنا محض حماقت ہے اور اگر ایسی کوشش ہوئی تو ہمارے سماجی نظام کا شیرازہ بکھرے بغیر نہ رہ سکیگا۔

(۵) اگر لڑائی چھڑ گئی تو ایٹم بم لازمی طور پر استعمال ہونگے اور اس میں شک نہیں کہ وہ ہمارے تمدن کو تباہ کر دینگے۔

(۶) ان مشکلات کا حل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایٹمی قوت کے استعمال پر بین الاقوامی احتساب لگائی جائے اور اس طرح جنگ کے امکانات کا یکسر قلع قمع ہو۔

## جرمنوں کو وسیع تر اختیارات

جرمنی کے برطانوی علاقے میں جو فوجی حکومت قائم ہے، اس نے فیصلہ کیا ہے کہ یکم جنوری ۱۹۴۷ء سے تین صوبوں میں باشندگان ملک کو مقامی طور پر خود مختار حکومت کے اختیارات دیدیئے جائیں۔ خصوصاً تقسیم خوراک کے سلسلے میں بیشتر ذمہ داری خود انہی پر عائد کر دی جائے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا ہے کہ خوراک اور دوسرے شعبوں کی صوبجاتی وزارت جرمنوں کو تفویض کر دی جائے اور برطانوی فوجی حکومت کے افسران محض مشیران خاص کی حیثیت سے کام کریں۔ ہمبرگ سے اطلاع ملی ہے کہ پانچ سو ٹن اناج سے بھرا ہوا جہاز روس سے جرمنی کی بندرگاہ روٹردام پہنچ گیا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ کنٹرول کمیشن کا اعلان ہے کہ صوبہ رور کے لئے جہاں اسوقت سب سے زیادہ قحط پڑ رہا ہے، فوری تقسیم کے واسطے امریکہ نے ایک ہزار ٹن گیہوں بھیجا ہے۔ علاوہ ازیں برطانوی فوج کے پاس بیس ہزار ٹن بسکٹ فالتو تھے، وہ بھی اہل جرمنی کو دیدیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ بیس ہزار جرمنوں کو ملازمت دیکر انہیں فکر معاش سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ دوپہر کا کھانا انہیں سرکاری طور پر دیا جاتا ہے۔ برطانوی سپاہی اپنے راشن میں کمی کر کے کرسمس کے تحفے جرمن بچوں کو بھیج رہے ہیں۔

## انڈونیشیا کا مستقبل

بٹاویا سے اعلان ہوا ہے کہ ولندیزی اور انڈونیشیائی حکومتوں کے مابین ایک سیاسی معاہدہ عمل میں آیا ہے جسکی رو سے تمام ولندیزی جزائر شرق الہند کو وفاقی بنیادوں پر ایک حکمراں سلطنت کی حیثیت دیدی گئی ہے۔ انڈونیشیا کی اس جمہوری حکومت کو جاوا، مدورا اور سماٹرا پر پورا اقتدار حاصل ہوگا۔ معاہدے کے مسودہ کا مطالعہ کرنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ تمام علاقے بھی جو فی الحال اتحادیوں یا ولندیزیوں کے زیر تسلط ہیں باہمی مفاہمت کے اصول پر بتدریج آزاد ہو کر اس جمہوریت میں شامل ہو جائیں گے۔ اقرارنامے میں بیان کیا گیا ہے کہ "مفاد مشترک" پر دونوں حکومتوں کو اختیار حاصل ہوگا۔ اس "مفاد مشترک" کے ضمن میں امور خارجہ، دفاع اور حسب ضرورت مالیات نیز اقتصادی اور ثقافتی قسم کے موضوعات

### نئے سال کا تحفہ

ادارۂ آجکل سال بھر تک اپنے قارئین کو ادبی تحفے پیش کرتا رہا ہے تاہم نئے سال کے موقع پر وہ کیلنڈر کی صورت میں فن مصوری کا ایک ایسا شاہکار ہدیۂ قارئین کرنا چاہتا ہے جو ہر گھر اور ایوان کی زینت خاص بن سکتا ہے۔ لہٰذا التماس ہے کہ یکم جنوری کا آجکل خریدتے یا ڈاکیے سے وصول کرتے وقت یہ ضرور معلوم کر لیا جائے کہ کیلنڈر اس شمارے میں جڑا ہے یا نہیں۔

شامل میں پچھلے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ انڈونیشیا کیلئے یہ صورت بہرنوع زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔

## قوتِ برداشت کی اعلیٰ مثال

لندن کے ایک شخص سی برٹ کوزنیس نے جس کی عمر ۴۲ سال ہے تین ہزار میل کا طویل فاصلہ پیدل چل کر صرف ۴۸ دن میں طے کر دیا جس سے ساری دنیا محوِ حیرت ہو گئی۔ قوتِ برداشت کی یہ سب سے بڑی مثال ہے۔ کیونکہ اس اثنا میں اس نے صرف ۳۶ گھنٹے آرام کیا اور ۹۰ گیلن چائے پی۔ آرام کی مدت منہا کی جائے تو گویا اس نے روزانہ ۶۵ میل کا پیدل سفر کیا۔ اتنی قلیل مدت میں کثرتِ استعمال سے بوٹوں کے ۶ جوڑے خستہ حال ہو گئے۔ اس سلسلے میں اسے کسی خاص حصۂ ملک کا سفر اختیار کرنا نہیں پڑا بلکہ رومفورڈ نامی میدان میں مسلسل چکر لگاتے گئے۔ تاہم اب اس کا ارادہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایسی ہی قلیل مدت میں عبور کرے۔ اس سے ۱۳۷ سال پہلے قوتِ برداشت کی مثال کپتان جے بارلی نامی ایک اور برطانوی باشندے نے قائم کی تھی۔

## مشینی دماغ

لندن میں ریڈیو انجینیرز کی برٹش انسٹیٹیوٹ میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن نے فرمایا کہ برطانوی سائنسدانوں نے ایک ایسی مشین بنائی ہے جو انسان کی طرح واقعات کو یاد رکھ سکتی اور دماغ سے سوچ کر جواب دے سکتی ہے۔ اسے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کا حل پیش کرنے میں صرف چار سیکنڈ صرف کرنے پڑتے ہیں۔ جن کا جواب ماہرین ریاضی سے دس دن میں بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ ابتک جو مشینیں استعمال ہو رہی ہیں وہ ریاضی سے زیادہ متعلق ہیں لیکن عنقریب ایسی صورت بھی پیدا ہو جائے گی کہ وہ اپنے فیصلے اور اپنی ذاتی پسند کا اظہار کر سکیں گی۔

## ہوائی موٹر

امریکہ کے ایک مکینیکل انجینیر نے اعلان کیا ہے کہ اس نے حقیقی معنوں میں اڑنے والی موٹر ایجاد کر لی ہے یعنی ایک ایسی گاڑی جو بظاہر موٹر کار معلوم ہوتی ہے لیکن اسے ہوائی جہاز بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ پنکھوں اور بازوؤں کی تبدیلی کے بعد زمین پر اور ہوا میں برابر کام دے سکتی ہے۔ پنکھوں اور بازوؤں کو لگانے یا الگ کرنے میں صرف پانچ منٹ لگتے ہیں۔ اس میں ڈیڑھ سو گھوڑوں کی قوت والا چھ سلنڈر کا انجن لگایا گیا ہے۔ ہوا میں اس کی رفتار ۱۲۰ میل اور زمین پر ۵۰ میل فی گھنٹہ ہے۔ زمین پر ۲۵ میل اور ہوا میں ۱۳ میل فی گیلن کے حساب سے پٹرول خرچ ہوتا ہے۔ موجد کے دل میں اس کا خیال اس وقت پیدا ہوا جبکہ وہ دورانِ جنگ میں پرواز کا ساز و سامان ساتھ لیکر ہوائی جہاز پر سوار ہو رہا تھا۔ لڑائی ختم ہوتے ہی اس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا۔

## مچھلی کے پیٹ میں

پچھلے مہینے کے آخر میں ایک زبردست طوفان باد و باراں آیا جس نے بمبئی کے قرب و جوار میں بہت سی بستیوں کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ جھونپڑے اڑ گئے، عمارتیں بیٹھ گئیں اور کچھ انسان بھی سیلاب کی نذر ہو گئے۔ جب یہ بلائے ناگہانی ختم ہوئی تو لوگوں کے مشاغل نئے سرے سے شروع ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے بھی مچھلیاں پکڑنے کے لئے سمندر میں جال ڈالدئے۔ چنانچہ بمبئی سے کوئی تیس میل کے فاصلے پر بارہ فٹ لمبی ایک ایسی شارک مچھلی پکڑی گئی جس کا وزن سات سو پونڈ تھا۔ جب اس کا پیٹ چاک کیا گیا تو اس میں سے ایک آدمی کا پورا ڈھانچ اور لباس نکلا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ شخص اسی سیلاب کی نذر ہو کر سمندر میں پہنچا ہوگا اور وہیں مچھلی نے اسے نگل لیا ہوگا۔ غالباً اس نے صرف غرقِ دریا ہونے کی آرزو کی تھی تاکہ جنازہ اٹھنے کی صورت میں جو رسوائی ہوتی اس سے بچ جاتے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ غرقاب ہونے کے بعد انسان کو مچھلی نگل بھی لیتی ہے اور اس کا پیٹ چاک ہونے پر جب جنازہ ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں برآمد ہوتا ہے تو وہ زیادہ رسوائی کی صورت ہوتی ہے۔ خدا بچائے ایسی موت سے۔

## ہندوستان کیلئے اناج

امریکہ نے حسبِ وعدہ ہندوستان کیلئے مزید اناج بھیجنا شروع کر دیا ہے چنانچہ اسکی پہلی قسط کے طور پر نو ہزار ٹن گیہوں کراچی پہنچا اور اس میں سے آٹھ ہزار ٹن دہلی بھیج دیا گیا کیونکہ دہلی میں غلے کی کمی نے نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ امریکہ سے آٹھ ہزار ٹن گیہوں اور آنے والا ہے۔ اس کے علاوہ ترکی سے آٹھ ہزار ٹن گیہوں اور آٹھ ہزار ٹن جو اور عراق سے آٹھ ہزار چھ سو ٹن جو بہت جلد آنے کی امید ہے۔ اس مقدار میں سے بیشتر حصہ دہلی، یو پی، صوبہ سرحد، بلوچستان اور راجپوتانہ کے لئے وقف ہے۔

## سانحۂ ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ سنا گیا کہ ۲۲ نومبر کو لکھنؤ کے مشہور غزلگو شاعر حضرت مرزا ثاقب لکھنوی دنیائے شعر و ادب سے منہ موڑ کر خلد آشیاں ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی تصویر کے ساتھ آپ کی شاعری پر پروفیسر آغا اشہر لکھنوی کا لکھا ہوا ایک مفصل مضمون یکم مئی ۱۹۴۶ء کے آجکل میں شائع ہوا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ وہ اس سال کے آخر میں ہم سب کو داغِ مفارقت دے جائیں گے۔ دعا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو توفیقِ صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

مرحوم اکبرآباد میں پیدا ہوئے لیکن تمام عمر لکھنؤ میں رہنے کے باعث لکھنوی کہلانے لگے تھے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو؂

گلشن میں کہیں بوئے دمِ ساز نہیں آتی — اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

# تخمیس حسرتؔ بر غزل حافظ

رئیس المتغزلین حضرت حسرتؔ موہانی

مرے حق میں کیا نہ ہو گا کبھی رحم کا اشارا — نہ کبھی خطاب پنہاں نہ عتاب آشکارا؟

کہ یہ ہو تو بیکسی کا مجھے غم بھی ہے گوارا — بہ ملازمانِ سلطاں کہ رساند ایں دعا را

کہ بشکر پادشاہی ز نظر مراں گدا را

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے غم کی بے پناہی — ہے بیاں کی حد سے باہر مرے حال کی تباہی

یہ کچھ اور دے رہی ہے مری آرزو گواہی — ہمہ شب امید دارم کہ نسیمِ صبح گاہی

بہ پیامِ آشنائی بنوازد آشنا را

یہی التجا ہے کہ "بہ زہد نخوت انگیز" — یہ جو تھا بصد تکلف مجھے شغلِ مے سے پرہیز

اُسے کر دے ختم ساقی "بہ عطائے رافت آمیز" — بخدا کہ جرعۂ دہ تو بہ حافظِ سحر خیز

کہ دُعائے صبحگاہی اثرے کند شما را

# یلدرم کی یاد میں

**رشید احمد صدیقی**

اپنے رفقاء اور طلباء سے مجھے اکثر اس مسئلہ پر بحثنے کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی نامعقول شاعر نہیں ہو سکتا۔ جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں۔ اس میں فنون شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں۔ مرحوم اصغر گونڈوی اور سید سجاد حیدر میرے پیش نظر ہیں۔ ان کی دل فروز شاعری اور انشاء پردازی تمام تر انکی دلآویز شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ میرے سامنے ایسے اشخاص بھی ہیں جو شاعر اور انشاء پرداز کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ لیکن ان کی شاعری اور انشاء پردازی میں خامی بھی اسی حد تک ملتی ہے جس حد تک حیثیت انسان یہ گھٹیا واقع ہوئے ہیں۔

میرے نزدیک فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں۔ ایسا کوئی فن نہیں ہے جو انسان سے اونچا یا اس سے علیحدہ ہو۔

یلدرم مرحوم علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے اور علی گڑھ کے اس زمانہ کے طالب علم تھے جب زندگی خوش باشی نہ تھی تو کچھ نہ تھی نہ اب جب زندگی سوا خوش باشی سب کچھ ہے۔ میں نے ان کی طالب علمی نہ دیکھی لیکن علی گڑھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب ع

بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گذری تھی بہت

جب سے اب تک زمانہ کے رویّہ اور روانی میں بہت کچھ فرق آگیا ہے کیا کچھ فرق۔ جن قدروں پر جب "مرنے والے لاکھوں تھے" اب ان پر "رونے والا کوئی نہیں"، لیکن سجاد حیدر کی حیثیت جداگانہ تھی۔ ان میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی اور یہ ان کی سیرت و شخصیت کا بہت اہم اور بہتم بالشان پہلو ہے۔

انھوں نے روزگار کی بہت سی کروٹیں دیکھیں اور سہیں، ایسی کروٹیں جو معمولی اشخاص کو یکسر زیر و زبر کر سکتی تھیں۔ لیکن یلدرم میں فن کا ایسا اعتماد و امید آفرینی تھی کہ اُن کو بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ سیاسی فرائض بھی ان کے سپرد ہوئے انتظامی اور ادبی بھی لیکن وہ شروع سے آخر تک اور سرکے پاؤں تک شریف شاعر و ادیب رہے۔

مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی عہد میں سجاد حیدر اس کے رجسٹرار رہے انھوں نے مہاراجہ صاحب محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب، نواب سر مزمل اللہ خاں، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سب کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا وطیرہ جداگانہ تھا اور ان سب سے جدا سجاد حیدر کا تھا۔ انھوں نے کام سب کے ساتھ کیا۔ سازش کسی سے نہ کی میرے نزدیک یہی ایک بات یلدرم کی شرافت نفس اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم دلیل ہے۔

سجاد حیدر کو ڈپٹی کلکٹری راس آئی نہ رجسٹراری، وہ یونیورسٹی میں بھی رہے اور کالا پانی میں بھی لیکن روزگار کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ وہ کالا پانی تو گئے لیکن کسی کردہ یا ناکردہ گناہ کی پاداش میں نہیں جسکے بغیر کالا پانی کے تصور میں نہ گرمی آتی ہے نہ روشنی، اور یونیورسٹی آئے تو ایسے منصب پر جیسے دنیا بھر کی سرگرمیوں سے سروکار ہو سکتا ہے الا شعر و ادب سے۔

اس یونیورسٹی میں شعر و ادب کے دیوانے میں نے دو ہی پائے۔ دونوں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکے ہیں۔ ایک مولینا احسن مارہروی دوسرے سید سجاد حیدر یلدرم۔ ترکی، ترک اور ترکی ادب سے سجاد حیدر کو عشق تھا ان کا نام آتے ہی ان پر عجیب وارفتگی طاری ہوتی تھی۔ میں ترکی سے واقف نہیں ہوں لیکن ترکی ادب سے آشنا مختلف اصحاب کے ترکی کے اردو تراجم دیکھے ہیں۔ سجاد حیدر اور دوسروں کے ترجموں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ میں نے ایک بار سید صاحب سے پوچھا کہ ترکی ادب ہی جاننے والے پاس ہیں آپ کی شائستہ خوبی تحریر کا بھی کچھ دخل ہے؟ ایک دفعہ جھوم ہی تو گئے۔ آنکھوں میں روشنی پیدا ہو گئی، اور چہرہ جگمگا اٹھا۔ کہنے لگے۔ جناب (سید صاحب جوش میں آتے تو جناب کا لفظ ضرور استعمال کرتے اور اس پر مخصوص انداز سے زور دیتے) ترکی زبان جانتے ہیں کس کی زبان ہے، ہماری آپکی نہیں ہے میں نے بات کاٹ کر کہا یہی تو میں کہہ رہا تھا کہ میری تو یقیناً نہیں ہے۔ آپ کی تو کہیں نہیں ہے۔ مسکرائے اور بولے ترکی ترکوں ہی کی زبان ہے اور انھیں کی ہو سکتی ہے یہ ان لوگوں کی زبان ہے جو نہ کبھی غلام رہے نہ کسی کو غلام رکھا۔ معرکہ آراؤں کی زبان ہے جس میں ترکتازی ہے۔ سید صاحب پر اب کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ چنانچہ اب وہ اپنے بس کے تھے نہ میرے۔ نامق کمال کا مشہور ڈرامہ جلال الدین خوارزم شاہ میری ہی درخواست پر سید صاحب نے اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا جسکا بیشتر حصہ سہیل میں شائع ہوا۔ سید صاحب قلم کاغذ لے کر خود ترجمہ نہیں کرتے تھے بلکہ کسی کو مامور کر دیا جاتا۔ سید صاحب ترجمہ بولتے جاتے وہ لکھتا جاتا۔ شاذ و نادر کہیں ترمیم کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ترجمہ پڑھتے جا رہے ہیں۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مترادفات کیسے ہوتے لیکن جہاں تک اردو الفاظ فقروں اور ترکیبوں کا تعلق ہے میں سید صاحب کے اس کمال کا معترف ہوں کہ وہ بڑے اچھوتے بڑے جاندار اور بڑے گوارا اردو الفاظ استعمال کرتے تھے۔ الفاظ کے انتخاب اور ترکیبوں کی اختراع کا ترجمے میں بڑا دخل ہوتا ہے اور یہ بات صرف کسی غیر معمولی مترجم کے حصہ میں آتی ہے یہاں مجھے مولوی عنایت اللہ مرحوم دہلوی یاد آتے ہیں جن کا سا باکمال ترجمہ کرنے والا اردو ادب میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اردو اور انگریزی

دونوں زبانوں کو سیکھنے کی استعداد عنایت اللہ مرحوم میں خرق عادت کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ یہ بات انہیں کے حصہ میں آ بھی سکتی تھی۔ وہ اردو کے گہوارہ میں نہیں پلے تھے بلکہ اردو ان کے گہوارہ میں پلی تھی۔ وہ اہل زبان ہی نہ تھے اہل تمدن بھی تھے۔

یلدرم نے ترکی سے تراجم زیادہ کئے ہیں۔ اردو مضامین نسبتاً کم لکھے ہیں۔ ترکی انشا پردازی کا انداز ان میں کچھ ایسا رچ گیا تھا کہ اردو لکھنے میں ان کا قلم ترکی تال و سم قبول کر لیتا تھا۔ سید صاحب کے اس رنگ و آہنگ پر بعض لوگوں میں چہ میگوئیاں بھی ہوئی ہیں۔ میں بذات خود اردو میں اس انداز ترکانہ کو بڑا اچھا اضافہ سمجھتا ہوں۔

سید کے اسالیب انشاء اور ان کی موضوعات سید کی شخصیت کی بڑی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ اردو میں انشاء لطیف کی ابتدا شرر، ریاض اور یلدرم کی تحریروں سے ہوئی۔ انشاء لطیف کا رشتہ کھینچ تان کر ملا وجہی کی سب رس سے بھی ملایا جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک سب رس کا انداز متغزلانہ تصوف کا ہے جو انشاء لطیف سے جوڑ نہیں کھاتا۔ انشاء لطیف نے آگے چل کر ٹیگوریت کا رنگ اختیار کر لیا اور ٹیگوریت نے اردو میں سستے ادبی ترجمہ کی تحریروں کو اس درجہ عام اور مقبول بنایا کہ ثقات ادب کو سختی سے احتساب کرنا پڑا اور یہ انداز بلندی نظروں سے گر گیا یہاں تک کہ جو اصحاب اس کے سب سے بڑے حامی تھے وہ سب سے پہلے تائب ہوئے۔ اردو میں ٹیگوریت کی جس طرح ابتدا ہوئی اور جیسا اس کا انجام ہوا، مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے شعر و ادب کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے جس کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔

شرر اور ریاض کے عاشقانہ مضامین اور یلدرم کی انشاء لطیف میں فرق ہے۔ شرر کا اسلوب انشاء اور ان کا عشق دونوں کتابی ہیں۔ بندشیں کے ڈھیلے ڈھالے شخصی تاثرات کی ترجمانی نہیں۔ شاعرانہ زبان و بیان کی نمائش ملتی ہے۔ ریاض میں زبان و بیان کا مظاہرہ شرر سے زیادہ غیر معتدل ہے۔ ریاض کی شاعری میں جو پر لطف لیکن سطحی شوخی ملتی ہے وہ ان کی نثر میں پہنچ کر سستی اور عامیانہ بن گئی ہے۔ شاعری میں جو انداز بیان شاعری کا حسن ہے وہ نثر میں پہنچ کر مصنوعی اور مہمل ہو جاتا ہے۔ موضوع اور مطمح نظر کے یکساں ہونے کے باوجود نثر اور نظم کی مقتضیات میں فرق ہے۔ ریاض اور ناصر علی دہلوی نے اس امتیاز کو اپنی اپنی نثر میں نظر انداز کر دیا ہے۔

یلدرم کے ہاں بھی حسن و محبت کا کاروبار ہے لیکن یلدرم میں مجاز کی طرفگی و تازگی ہے۔ شرر اور ریاض کی پیداوار کتابی ہے۔ [illegible] سجاد انصاری کو بھی انشاء لطیف کا پیرو قرار دیا جاتا ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ سجاد انصاری کے یہاں فلسفیانہ تخیل ملتی ہے جس کو انشائے لطیف سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ انشاء لطیف اور غزل سرائی کا سرچشمہ ایک ہے [illegible]۔

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے

لیکن جس طرح غزلوں میں آرٹ اور اقدار کے اختلافات ملتے ہیں، ادب لطیف میں بھی یہ امتیازات نظر آتے ہیں۔ یلدرم اور ادب لطیف کے بعض دوسرے علم برداروں میں یہ فرق واضح ہے۔ سجاد حیدر کے ہاں شوخی بھی ہے شرارت بھی لیکن شہدپن نام کو نہیں۔ یلدرم کے ہاں عورت کو بڑا دخل ہے لیکن ان کے ہاں خیالات کی رعنائی ملتی ہے۔ [illegible] صاحب کا تشخص نہیں مہدی افادی کے ہاں خیالات کی رعنائی اتنی نہیں ہے جتنی جذبات کی رنگینی۔ مہدی کے اعصاب پر اگر عورت سوار نہیں ہے تو کچھ پیدل بھی نہیں ہے۔ [illegible] شوق کی [illegible] ان دونوں کی تحریروں میں جہاں تک عورت کا تعلق ہے مراتب جنسی کا اتنا ہی فرق ہے جتنا [illegible] کی [illegible]۔ اگر ان دونوں کو [illegible] میں منتقل کرنا ممکن ہوتا تو مہدی شوق بن جاتے اور شوق مہدی۔

سجاد حیدر کی تحریروں میں ایک بات نہایت واضح طور پر ملتی ہے یعنی وہ جذبات کی رو اور روانی میں بھی اپنے وقار اور وقار کو نہیں جانے دیتے۔ سجاد صاحب کے جذبات کچھ زیادہ تیز اور تند تھے جس کے ہاں خیالات کی [illegible] کے ہاں جذبات کا ہیجان و غلیان بہت کم ہوتا ہے۔ پھر بھی جہاں کہیں ایسے مواقع آ گئے ہیں سجاد صاحب نے ایک ہلکی جنبش قلم سے ان کو معتدل کر دیا ہے اور اس طور پر معتدل کیا ہے کہ اظہار مطلب میں کوئی فرق نہ آیا اور شرم و شرافت کا دامن بھی داغدار نہ ہوا۔

میرے نزدیک انشائے لطیف میں بیان کی رنگینی اور نزاکت کے ساتھ جذبات کی [illegible] جس طرح یلدرم نے [illegible] نہیں رکھا ہے۔ سجاد حیدر کی تحریروں میں جذبات سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی ہے۔ قاضی عبد الغفار اس بارے میں یلدرم سے ملتے جلتے ہیں لیکن [illegible] کی پرواز فکر میں [illegible] ہے [illegible] تحریریں [illegible] تیزی [illegible] رہتی ہے۔ اس [illegible] غلط نہ ہوگا کہ جہاں تک سجاد حیدر کے [illegible] سجاد انصاری سے زیادہ قریب ہیں [illegible] چاہیے کہ انشائے لطیف کے تین بڑے [illegible] ہیں جو [illegible] کے [illegible] انداز بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ سجاد حیدر، سجاد انصاری اور قاضی عبد الغفار۔

بعض اعتبار سے سجاد حیدر آخر عمر تک نوجوان رہے۔ وہ اس زمانہ میں بھی جوان تھے جب جسم و جان کے اعتبار سے ضعیف و نزار ہو چکے تھے۔ تعلیم نسواں، اردو [illegible] جب شاعری میں نئے تجربات [illegible] کی اور [illegible] میں اوائل سے سجاد حیدر ترقی پذیر واقع ہوئے تھے [illegible] کو مقبول بنانے میں تمام عمر کوشاں رہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کی نئی شاعری کے بڑے مداح تھے اور ان کی ایک [illegible] نظم [illegible] بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک فارسی مجلہ "ایرانشہر" نامی برلن سے ٹائپ میں شائع ہوتا تھا اسکا پہلا نسخہ سجاد صاحب کو موصول ہوا۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ سجاد صاحب اپنی کوٹھی سے دفتر آ رہے تھے۔ سر مبہر بہت سارے لفافے، کاغذات کے کچھ منتشر اجزا، ایک آدھ اخبار و رسالے بغل میں دبائے ایک رسالہ پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ میں ان سے کوئی بیس بائیس قدم پیچھے آ رہا تھا۔ اس کی خبر سجاد صاحب کو نہ تھی۔ سید صاحب کے چلنے کا خاص انداز تھا۔ خود ہلکے پھلکے تھے۔ رفتار اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی، ہموار۔ کسی قدر تیز، چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے تھے۔ نگاہ نیچی تقریباً عمودی۔ دس بارہ قدم چل کر اک ذرا کی ذرا رک سے جاتے اور ٹھیک سامنے ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پھر گرم رفتار ہو جاتے۔ اس پر ان کے ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ چست کیا تھا کہ سجاد تم چلنے میں سانپ کو شرماتے ہو وہ بھی چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا ہے اور پھر چل دیتا ہے۔ اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے۔ سانپوں میں رہ کر صرف سانپوں کی چال آئی اس کی تعریف نہ کروگے! اسی انداز سے چلے جا رہے تھے کہ یکایک ایک لفافہ سرک کر زمین پر آ رہا۔ سجاد صاحب کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ میں نے اٹھا لیا۔ کچھ ہی دور آگے بڑھے تھے کہ دوسرا لفافہ گرا، وہ بھی میں نے اٹھا لیا۔ باب العلم کے قریب پہنچے کہ تیسرے لفافہ نے مفارقت کی وہ بھی میں نے قبضہ میں کیا۔ سجاد صاحب برابر رسالہ کے مطالعہ میں منہمک رہے۔ سید صاحب کے پیچھے میں بھی یونیورسٹی آفس پہونچا۔ آفس پہنچکر موصوف نے بچے ہوئے لفافے متعلقہ لوگوں کے حوالے کئے۔ معلوم ہوا تین لفافے گم ہیں، چونک پڑے اور تھوڑی دیر تک سخت متفکر رہے میں نے تینوں لفافے کچھ وقفے سے واپس کئے۔ سید صاحب فرمانے لگے کہ آپ بھی کمال کرتے ہیں فوراً کیوں نہ دے دیئے۔ اس وقت مجھ پر کیا گزر گئی۔ میں نے کہا آپ مطالعہ میں منہمک تھے میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ سب کچھ بھول گئے۔ فرمایا خوب یاد دلایا یہ ملاحظہ فرمائیے "ایرانشہر" ہے۔ ٹائپ میں کتنا ستھرا چھپا ہے اور کیسے اچھے اور جاندار مضامین نظمیں ہیں۔ ایرانی وطن پرستوں نے برلن سے اسے شائع کیا ہے۔ کاش اردو میں ایسا پاکیزہ اور دیدہ زیب ٹائپ رواج پا جائے۔ اور جناب بات تو یہ ہے کہ جب تک آپ "بت سنگی" (لیتھو کی چھپائی) سے رشتہ نہ توڑیں گے اُردو کی اشاعت مسدود رہے گی۔ میں نے کہا۔ سید صاحب "بت سنگی" کا تو ہمارے شعر و ادب میں ایک درجہ بھی ہے۔ بت آہنی میں کیا رکھا ہے۔ بقول شخصے ؎

"حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا"

کسی قدر تیز ہو کر فرمایا یہی تو ستم ہے، آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ اچھی بھلی باتوں میں بھس ملا دیتے ہیں۔ اکبر نے ٹائپ کی خواہ مخواہ مٹی پلید کردی۔ میں نے عرض کیا سید صاحب اکبر نے کہیں بھس نہیں ملائی صرف بھس میں چنگاری لگائی ہے۔ ہنسے پھر فرمایا اور جناب بھی تو کچھ دور نہیں کھڑے ہیں۔

سید صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ بلدرم کوئی غیر معمولی شاعر نہ تھے۔ ان کی سب سے پہلی نظم مرزا پھویا بتائی جاتی ہے۔ اس میں شاعرانہ خوبیاں کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن گزشتہ علی گڑھ کی زندگی کے بعض دل کش پہلو لطیف انداز سے بیان کئے گئے ہیں۔ ہلکی پھلکی تفریحی نظموں میں اس کو اچھا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ سید صاحب کی نقاشی نازک خطوط اور ہلکے رنگوں کی ہے۔ ان کا مزاج رومانی تھا، وہ رومان جو ان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے پستی کی طرف ہرگز نہیں۔ موجودہ عہد میں رومان کی حیثیت مسخ کردی گئی ہے۔ اس کو مزاج و خیال کی رنگینی کی بجائے مطالبات جنسی قرار دیا گیا ہے، وہ بھی اس طور پر کہ جو چیز صحت کی دلیل تھی وہ مستقل (اور لاعلاج) مرض قرار پائی۔

سجاد صاحب کی ایک نظم جوان کی رنگینی، رسائی طبع، سیرت کی پاکیزگی اور ان کے نقطۂ نظر کی دل آویزی کی ترجمان ہے۔ شملہ کالکا لائن پر ایک نظارہ کے عنوان سے سب سے پہلے تہذیب میں شائع ہوئی۔ سید صاحب کی یاد کے ساتھ نظم ہمیشہ وابستہ رہے گی ؎

ماتھے پہ بندی — آنکھ میں جادو
ہونٹوں کی بجلی — گرتی تھی ہر سُو
چال لچکتی — بات لہکتی
جیسے کسی نے — پی ہو دارُو
انکھڑیاں ایسی — جن میں تھے رقصاں
لمحہ میں رادھا — لمحہ میں راہُو
ایسی پھڑک تھی — خلق تھی حیراں
ریل پر آیا — کہاں سے آہُو!

سجاد صاحب کو جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ترکی، ترکی ادب اور ترکوں سے والہانہ شغف تھا، ان میں سے کسی کا نام آ جاتا تو سید صاحب وجد میں آ جاتے۔ جس زمانہ میں وہ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے ایک بار اُن کو ٹرکی جانے کا موقعہ مل گیا! میں کیا بتاؤں اُن پر کیا نشاط طاری تھا۔ صحت اچھی نہ تھی۔ میں نے کہا سید صاحب سفر طویل ہے تکلیف دہ بھی کیسی گزرے گی؟ فرمایا ٹرکی کے خیال میں طبیعت مگن ہے۔ یہ شگون اچھا ہے اور ہر اعتبار سے اچھا یا یہ خاک وہاں کی خاک میں مل جائے گی یا پھر دیکھئے گا کیا رقصاں و شاداں واپس آتا ہوں چند ماہ بعد واپس آئے۔ سید صاحب یوں بھی سبک رفتار تھے۔ واپسی پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پاؤں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہیں، جسم میں توانائی، چہرہ پر بشاشت اور سُرخی آ گئی تھی۔ میں نے پوچھا ٹرکی میں کوئی تبدیلی پائی؟ فرمایا شروع سے آخر تک تبدیلی ہی تبدیلی نظر آئی، لیکن مجھے تو

ترکی سے الفت ہے بدلنے نہ بدلنے سے کیا سرکار۔

ترکی ادیبہ خالدہ خانم اور ان کی ابتدائی تحریروں کے بڑے دلدادہ تھے۔ موصوفہ علی گڑھ تشریف لائیں تو یونین میں سجاد صاحب نے اُن کا خیر مقدم کیا اور ضمناً موصوفہ کے ابتدائی مضامین اور انشاء پردازی کو بڑے لطف سے سراہا۔ خالدہ خانم نے فرمایا کہ اب وہ اپنے اگلے اسلوب انشاء سے تائب ہو گئی ہیں اور اسے صرف ایام جہالت کی یادگار سمجھتی ہیں۔ سجاد صاحب خاموش ہو گئے بعد میں ایک صحبت میں اس واقعہ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے خالدہ خانم کو کیا معلوم ان کی ایام جہالت کی باتوں نے کیا شگوفے کھلائے۔ پھر خلط بحث سے کیا حاصل سوال یہ نہیں ہے کہ خالدہ خانم کو کیا پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ میں کیا پسند کرتا ہوں۔

سجاد حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے۔ ان کو توڑ جوڑ بالکل نہ آتا تھا۔ وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ ایک سچے آرٹسٹ اور ادیب کی طرح وہ اہل مناصب سے کبھی مرعوب نہ ہوئے لیکن فن کے کمال کی داد دینے میں بڑے سخی تھے۔ سید صاحب کو میں نے شاید کبھی "تم" کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سنا ہو۔ انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو ذاتی رفعت اور منفعت کا کبھی وسیلہ نہیں بنایا۔ ان کو میں نے برہمی میں آپے سے باہر نہ پایا اور ہنسی دل لگی میں ان کے منہ سے کبھی ایسے الفاظ نہ سنے جو مذاق سلیم پر بار ہوں۔ یلدرم جیسے رچے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں وہ تمام آداب ان میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان و جواز ہیں۔ ان آداب کو وہ اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہو یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے بغیر کسی ارادے یا تکلف کے۔ یلدرم میں رسمی تکلف بالکل نہ تھا۔ انکی بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی۔ وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقہ کا اقتضا ہوتا تھا اور بے تکلف بھی اسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسن معاشرت کا جزو لاینفک سمجھی جاتی ہے، وہ ان لوگوں میں تھے جو اونچی اور بڑی سے بڑی صحبتوں میں ہماری اور خود اپنی نمائندگی کر سکتے تھے۔ شعر و ادب کا انکا ذوق محض فطری نہ تھا بلکہ وہ شعر و ادب کے رنگ و رفتار پر حکیمانہ نظر بھی رکھتے تھے۔ وہ اچھی اور بے تکلف انگریزی لکھتے تھے جو بات انکے عہد کے ہندوستانیوں میں بہت کم ملتی ہے انکی قدر کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوع تھا۔ شعر و شرافت کے جو لوگ قائل یا قدرداں تھے وہ تمام کے تمام خواہ ہندوستان کے کسی گوشہ میں ہوں یلدرم سے واقف اور انکی خوبیوں کے معترف تھے۔

سید سجاد حیدر ان لکھنے والوں میں تھے جنکا قائل نہ ہونا کم سواد ہونے کی دلیل ہے کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جنکی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ تک یک رنگی اور توازن ہو۔ وہ ہم سے جدا ہو گئے لیکن ہم اور ہمارے بعد آنے والے اُن سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے فردوس میں اُن کو وہ رنگینیاں اور نزہتیں بھرپور نصیب ہوں گی جن کی صرف جھلکیاں ان کی تحریروں میں ہم کو نصیب ہیں ✦

# "اُب یاد نہیں" === نکہت نسیم

تاروں سے سونا برسا تھا چشموں سے چاندی بہتی تھی
پھولوں پہ موتی بکھرے تھے ذروں کی قسمت چمکی تھی
کلیوں کے لب پر نغمے تھے شاخوں پہ وجد سا طاری تھا
خوشبو کے خزانے لٹتے تھے اور دنیا بہکی بہکی تھی

اے دوست تجھے شاید وہ دن اب یاد نہیں اب یاد نہیں

سورج کی نرم شعاعوں سے کلیوں کے روپ نکھرتے تھے
سرسوں کی نازک شاخوں پر سونے کے پھول چمکتے تھے
جب اودے اودے بادل سے امرت کی دھاریں بہتی تھیں
اور ہلکی ہلکی خنکی میں دل دھیمے دھیمے تپتے تھے

اے دوست تجھے شاید وہ دن اب یاد نہیں اب یاد نہیں

پھولوں کے ساغر اپنے تھے شبنم کی صہبا اپنی تھی
ذروں کے ہیرے اپنے تھے تاروں کی مالا اپنی تھی
دریا کی لہریں اپنی تھیں لہروں کا ترنم اپنا تھا
ذروں سے لے کر تاروں تک یہ ساری دنیا اپنی تھی

اے دوست تجھے شاید وہ دن اب یاد نہیں اب یاد نہیں

ہم دونوں ایک حقیقت تھے ہم دونوں ایک فسانہ تھے
ہم آپ ہی اپنی دنیا تھے ہم دنیا سے بیگانہ تھے
ہم اپنے راگ پہ ہنستے تھے ہم اپنی آگ میں جلتے تھے
ہم اپنے ہی عیش کا نغمہ تھے ہم اپنے ہی غم کا گانا تھے

اے دوست تجھے شاید وہ دن اب یاد نہیں اب یاد نہیں

یہ ساز کے پردے یہ مطرب سب اپنا ترنم کھو بیٹھے
یہ پھول یہ کلیاں یہ تارے سب اپنا تبسم کھو بیٹھے
یہ نرم ہوائیں یہ بادل سب بھول گئے شاید ہم کو
خاموش مناظر فطرت کے سب اپنا تکلم کھو بیٹھے

اے دوست تجھے بھی وہ لمحے اب یاد نہیں اب یاد نہیں

مصنفہ — مترجمہ

# آواز

جوزف ویسن ہاف — اثر لکھنوی

پولستانی افسانہ

پولینڈ کے دیہات میں موسم گرما کا دن ختم ہونے کے وقت ایک ایسا لمحہ آتا ہے جب کھیتوں کی پکی فصل کا فرستادہ ہوا کا ایک جھونکا دیہاتیوں کے ہموطنوں کے تن بدن میں سنسنی ڈال دیتا ہے اور گراں بار خوشبوؤں کو آزاد کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ گرم ہوا کے لمس میں آدمیوں کی آوازیں۔ جانوروں کی پکاریں، خواہشات نفس کے بہت سے مناسر شامل ہو جاتے ہیں جو اپنی تسکین کی توقع میں ہر طرف سے بکھرتے ہیں۔ یہی اسباب درختوں کی غیب موسیقی میں بھی کار فرما ہوتے ہیں نیز اس دھندلی اور پر اسرار روشنی میں جو تمام ایسے گوشوں میں حلول ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ صوف جنگلی فاختائیں بدرجہ کمال خوش و خرم نظر آتی ہیں جب سب اپنے بچھڑے جوڑے سے ملنے کا اعلان سب سے اونچے مقام سے کر کے وہیں لی جگہ سے گذرتی ہیں ایسے آسمان کے نیچے جو شدت انتظار سے زرد ہو گیا ہے۔

اگر الزبتھ کا مزاج ایسی نیچر کے اثرات کا اظہار کرنے لگا تو اس طرح کرتی۔ وہ ایک نیچے کوچ پر اپنے آرام کمرے میں لیٹی ہوئی تھی اور کھلی کھڑکی سے باغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی اس کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر جس کے نقوش نازک اور متناسب تھے سرخی کی تیز جھلک گورے گورے گالوں پر گلاب کے پھولوں کی مصوری کر رہی تھی۔ باریک بلاؤس کے نیچے اس کے سینے کا طوفانی اتار چڑھاؤ انتہائی نمایاں تھا اور چھوٹے چھوٹے پاؤں بے چینی سے ہل رہے تھے۔ لیکن اس کی سیاہ آنکھیں جو سفید پر تنجی ناخنوں پر جمی ہوئی تھیں ایک خوابناک محویت کے عالم میں آسمان کی پہنائیوں میں گم ہو گئی تھیں۔

یکایک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟ کیا اینٹنی تم ہو؟" الزبتھ نے اپنا منہ پھیرے بغیر پوچھا۔

"جی ہاں بیگم صاحبہ میں ہی ہوں" یہ کہتا ہوا پرانی وضع کا ایک دراز قامت ملازم جس کے بال سفید تھے داخل ہوا۔ اس کی وردی خوشنما اور فیشن کے مطابق تھی۔ "آپ کے مہمانوں نے مجھے یہ عرض کرنے کو بھیجا ہے کہ آپ کے بغیر وہ سخت اداس ہیں۔"

"اوہ، ان سے کہہ دو کہ میں ان کی صورت سے بیزار ہوں اور اسی وجہ سے چلی آئی" یہ کہکر وہ کھڑکی کے قریب جا کر جھانکنے لگی تاکہ اینٹنی کو یقین ہو جائے کہ وہ اپنے مہمانوں سے کتنی بے پرواہ ہے۔ لیکن اس ادا میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ بڈھے ملازم نے حکم کی تعمیل میں جلدی نہیں کی۔ ذرا دیر بعد جب اس نے اینٹنی کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں، البتہ اینٹنی سے ناراضگی کا اظہار نہیں ہوتا تھا اور اس نے پہلے حکم میں اتنا اضافہ کیا: "ان سے کہہ دو کہ..... نہیں ٹھہرو..... ان سے کہو کہ میں ان کے لئے کھانا پکا رہی ہوں۔ ہاں ان سے کہہ دو کہ میں بہت مصروف ہوں"۔ کہنے کو تو کہہ دیا مگر اپنے بہانہ کے ناقابل قبول ہونے پر خود ہی قہقہہ لگایا کیونکہ ہر شخص آگاہ تھا کہ الزبتھ ایسی مالکہ نہیں جو گھر بار کے دھندوں میں الجھی رہے۔ محل کے انتظام میں جو کچھ سلیقہ یا سگھڑاپا نمودار تھا وہ دراصل اینٹنی اور دارو غہ کی توجہ اور محنت کا منت پذیر تھا۔

اینٹنی جو دیگر ملازموں اور مہمانوں کی طرح اپنی مالکہ کی پرستش کرتا تھا یہ باتیں روا داری سے مسکراتا ہوا سنتا رہا اور پھر کمرے سے چلا گیا۔

الزبتھ کا عمل ست بیگم نہ مزاج اس کے خاندان والوں میں اکثر زیر بحث رہتا تھا کیونکہ اس کی ولادت کے حالات، زندگی میں اس کی منفرد جگہ، نیز قسمت کے داؤں اس کے متقاضی تھے کہ وہ سراپا عمل ہو۔ وہ خاندان کڈناسکی سے تھی۔ اس کے دو وین دراز سوتیلے بھائی، ایک سوتیلی بہن اور ایک پورا دھاڑا خالاؤں کا تھا جن کے پاس تاریخی شجرہ، ورموس نام و نمود کے علاوہ کچھ نہ تھا یا پھر روپے پیسے کا ہوگا۔ بیس برس پیشتر قدرت نے ان کی تنگدستی دور کرنے کا وسیلہ الزبتھ کی شکل میں بھیجا۔ ایک ننھی منی قبول صورت لڑکی کا ورود خاص افلاطونی تسلی کا باعث ہو سکتا ہے مگر قابل ہاتھوں میں یہ بظاہر ناچیز مخلوق کل قبیلہ کڈناسکی کے لئے ایک بیش بہا خزانہ اور ان کا واحد سہارا ثابت ہونے والی تھی۔ الزبتھ بڑھتی اور بڑھنے کے ساتھ نکھرتی گئی۔ والدین کی وفات کے بعد اس کے اعزہ نے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ ان کے سرگرم کار تخیل نے اسے ابھی سے کسی پریوں کے شہزادے سے منسوب دیکھا۔ لیکن آجکل پریوں کے شہزادے اکا دکا ہی نہیں بلکہ دور اندیش بھی ہیں اور ایسی بیوی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جو دنیسروں جہیز لائے۔ دوسرے بڑے آدمی مثلاً لوہے یا روئی یا کافی کے "بادشاہ" شاذ ہی ملتے ہیں اور بالعموم دور دراز مقامات مثلاً امریکہ میں براجتے ہیں۔ معاملے کی اہمیت اور نزاکت بڑھتی گئی کیونکہ قبیلہ کڈناسکی کے افراد اس پر تلے ہوئے تھے کہ ان کا عروج، ان کی شہرت انہیں کے حین حیات میں ہو اور یہ شرف ان کے بعد کی آنے والی نسلوں کے لئے نہ اٹھا رہے۔ اس تمام بلند حوصلگی اور حب جاہ کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ سترہ برس کی الزبتھ مائکلاف ہیومسکی سے بیاہ دی گئی، وہ کروڑپتی تھا مگر ایک ایسے خاندان سے جس نے حال ہی میں دولت کمائی تھی اور دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

مائکلاف ابھی جوان تھا۔ اس نے مال و زر، زمین اور کارخانے اپنے باپ سے ترکہ میں پائے تھے۔ اسی شخص سے خاندانی خوش حالی کا آغاز ہوا تھا اور جو

---

سلہ آئندہ سے ہم اس کو اختصار کے لئے الزبتھ کہیں گے۔

حال ہی میں سونا کمانے اور سٹے بازی کی جنگ میں موت کے گھاٹ اترا تھا۔ مانگسلاف بہت خوش رو تھا اور اس بنا پر ایک روایت قائم ہوگئی تھی کہ وہ ہنومنکی کا لڑکا نہ تھا بلکہ کسی شہزادے کے صلب سے تھا کیونکہ ہنومنکی کی شکل و شباہت کچھ یوں ہی سی تھی۔ غالباً یہی سبب ہے کہ اسے گھوڑدوڑ کا شوق اور ذی رتبہ اشخاص کی صحبت میں وقت گزاری کا چسکا تھا۔ خاندانی امرا و رؤسا بھی اس سے بہت جلد گھل مل جاتے تھے اور بے تکلف ہو کر پیارے کے نام سے پکارتے تھے اور یہ لطف بعض اوقات مٹھی گرم ہونیکا دست نگر نہ ہوتا تھا۔ لیکن دوسری طرف مانگسلاف کی کاروباری ذہانت اور کسب زر کی ہوس باآواز بلند اعلان کرتی تھی کہ نہیں صاحب ہم اپنے ہی باپ کے بیٹے ہیں۔ قصہ مختصر مانگسلاف الزبتھ کے لئے موزوں بر تھا۔

دو برس ادھر شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور ملک کے اخباروں نے اس کی طمطراق کا دیس اور بدیس میں خوب ڈھنڈورا پیٹا۔

افواہیں ضرور پھیلیں کہ الزبتھ نے اپنی اس خالہ کے گھر سے بھاگ جانا چاہا جہاں سے اس کی شادی ہو رہی تھی اور جب گرجے میں پادری نے پوچھا کہ وہ مناکحت بخوشی و بلاجبر و اکراہ قبول کرتی ہے تو اس کا جواب نفی میں تھا۔ لیکن آپ جانئے لڑکیاں بعض وقت حماقت کر بیٹھتی ہیں چاہے یتیم ہی کیوں نہ ہوں۔ حقیقت جو کچھ ہو شادی ہوگئی اور ہنومنکی سے رشتہ قائم ہونے سے خاندان کڈ ناسکی کی خوش حالی میں بین اضافہ ہوگیا۔

ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ الزبتھ اپنی حاصل کردہ حیثیت کی اہل ثابت نہ ہوئی۔ پیارے مانگسلاف کے مال و زر سے کھچا کھچ بھرے ہوئے صندوقوں پر قبیلہ کڈ ناسکی کے مطالبات کثیر اور متواتر ہوتے تھے مگر اسی فراخدلی سے پورے نہ ہوتے تھے کیونکہ ان مطالبات کو ماننے اور مضبوط بنانے میں سفارش کیسی الزبتھ نے کبھی زبان نہ ہلائی۔

اس طرف مانگسلاف جز بز تھا کہ ایک خوبصورت بیوی کا مالک ہونے کے باوجود اس کی ذات سے حسب توقع مالی منفعت اور رسوخ حاصل نہیں ہو رہے تھے۔ وہ اس جنس خوب و گراں بہا کی نمائش کرتا مگر نتیجہ ہمیشہ ناقابل اطمینان نکلتا، حالانکہ ایسا نہ ہونا چاہئے تھا۔ الزبتھ کے ذریعہ سے گھوڑدوڑ کے میدان یا سرکاری حلقوں میں پالا مارنا یا کسی ذی اثر متنفس کو قابو میں لانا ایک خواب تھا جو کبھی شرمندۂ

## بھول گئے

سردار جلیل

طوفانِ محبت میں دل کی کشتی کا بچانا بھول گئے
بس ایک ہی جلوے میں ان کے ہم ہوش میں آنا بھول گئے

پہلے تو اٹھایا کرتے تھے طوفان ہم اپنی آنکھوں سے
اب اشک بہانے کے دن ہیں اور اشک بہانا بھول گئے

اللہ رے شوئی قسمت جب پرسشِ غم کو وہ آئے
غیروں کے فسانے یاد رہے اپنا ہی فسانہ بھول گئے

انجامِ محبت تک ہمدم کیا جانئے کیا کیا ہو جائے
آغازِ محبت ہی سے جب ہم ہنسنا ہنسانا بھول گئے

جب سے کہ پلائی ہے ہمکو اک شوخ نے آنکھوں آنکھوں میں
اس وقت سے ہم دختِ رز کو ہونٹوں سے لگانا بھول گئے

بتلاؤ جلیل آخر کچھ تو ہر آن تبسم کیا معنی؟
چھپ چھپ کے بہاتے تھے آنسو کیا اب وہ زمانہ بھول گئے

تعبیر نہ ہوا۔ ایسی تمہید اٹھائی نہیں کہ الزبتھ کی طرف سے ضدی پن بلکہ قریب قریب وحشیانہ مخالفت کا مظاہرہ شروع ہوا۔ ہنومنکی کو کاروباری مہمات پیش آتے رہتے تھے اور یہ بالکل فطری تقاضا تھا کہ اپنی بیوی سے وقت پر مدد کی امید رکھے۔

اس کے علاوہ بھی الزبتھ میں متعدد معائب تھے جن کی وجہ سے خاندان والے نالاں رہتے تھے۔ مثلاً اس کی نظر میں روپے پیسے کی وہ "مذہبی" توقیر نہ تھی جو زیبر کی اور اونچے گھرانوں کی شان امتیاز ہے۔ تیاض شوہر سے جتنا روپیہ ملتا "بے معنی" کتابوں یا صناعت کے شاہکاروں کی بہم رسانی میں اڑا دیتی۔ ایک عادت تو ایسی خراب، ایسی خراب تھی کہ اغماض ناممکن تھا۔ وہ کیا؟ جو کچھ روپیہ پیسہ موجود ہوتا بلا کسی تفریق کے آوارہ گردوں، فقیروں اور محتاج کسانوں میں تقسیم کر دیتی یا ایسے لوگوں کو بخش دیتی جو چلتے ہوئے فقرے گھڑ لاتے کہ ہم کام کرنا اور اپنی زندگی سدھارنا چاہتے ہیں۔ ان میں ایک سے زیادہ "اصلاح یافتہ" حضرات پیشہ ور چور بن چکے تھے!

حاصل کلام دو خاندانوں کی اس شادی کو جو سراسر مصلحت اور دوراندیشی پر مبنی تھی اور اس سے وابستہ منصوبوں کو من موجی الزبتھ کا تلون ملیامیٹ کر رہا تھا۔ وہ ایک طرف تو ناقابل اصلاح "بہن" اور ایک طرف سرکش "بیوی" تھی۔

ابھی ابھی عزائم میں ایک شدید تصادم ہوا تھا۔ کس قدر حماقت! کیا یہ امر فطری نہیں کہ اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ اپنے خاندانی افراد و اثر کو حصول مقصد کے لئے استعمال کریں؟ جب ایسے مواقع حاصل ہیں تو ان سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

قدرے مزید وضاحت کی ضرورت ہے:۔

ایک کارخانے مسمی از ڈور، وڈن اینڈ کمپنی کو فکر تھی کہ اسکے بنائے ہوئے گیس کے چولہے روسی ریلوں میں رواج پائیں۔ اس کا دارومدار ایک بڑے عہدہ دار پر تھا جو "اکسلنسی" تھا اور پیٹرسبرگ میں رہتا تھا۔ وہ مانگسلاف سے بخوبی واقف تھا اور اس سے زیادہ کاؤنٹ وٹیولڈ سے جو اسی غرض سے ہنومنکی سے اس کی دیہی فرودگاہ میں ملنے آیا تھا۔ حال ہی میں "ہز اکسلنسی" اور الزبتھ سے ایک دعوت میں تعارف ہوا تھا۔ "ہز اکسلنسی"

ابھی جوان تھے، بہت جلد ترقی کی تھی اور مستقبل میں مزید ترقی کی توقع بے جا نہ تھی انہوں نے کھلم کھلا پری جمال الزبتھ کو پسند کیا تھا اور اعلان فرمایا تھا کہ اس کے ہر حکم کی بسر و چشم تعمیل کریں گے۔ اب موقع آیا تھا۔ مائکسلاف اور کاؤنٹ ڈیولڈ الزبتھ کو لے کر پیٹرسبرگ جانے کے عازم تھے تاکہ ہزاکسلنسی سے گیس کے چولہوں کا سوال طے ہو جائے اور مائکسلاف اور کاؤنٹ ڈیولڈ دونوں کی جیبیں اعزازی "حق الخدمت" سے گرم ہوں۔ یہ ذکر ہی بیکار ہے کہ اس طرح وہ اپنے ملک کا بھی حق خدمت ادا کرتے۔ لیکن الزبتھ کے ہاتھ بنائے بیل کا منڈھے چڑھنا مشکل تھا کیونکہ ہزاکسلنسی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ رضامندی کی سند الزبتھ کے نرم و نازک ہاتھوں میں شرف قبول پائے گی۔ لیکن الزبتھ کا دو ٹوک جواب تھا کہ مجھے اس جھگڑے سے کوئی سروکار نہیں، بھاڑ میں جائیں گیس کے چولہے اور جب اس سے ان ہانا دانستہ یہ کہا گیا کہ فابرگ کے بنے ہوئے زیورات زیب و زینت ہوتے ہیں تو اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بھلا بتائیے کیا حرج تھا اگر وہ پیٹرسبرگ تک چلی جاتی جہاں کئی سربرآوردہ اشخاص سے ملاقات ہوتی اور گیا تے ہیں فابرگ کے بنائے ہوئے زیور بھی دیکھنے میں آتے لیکن ان ضدی عورتوں کو بات حسن و جمال کا صحیح مصرف آتا ہی نہیں۔

وہ کوچ پر لیٹی ہوئی تھی اور آنکھوں کی کھڑکیوں سے کبھی محبت جھانکتی تھی اور کبھی نفرت ——— نفرت اس وقت جب دروازے کی طرف گھورتی کہ مریں سوسائٹی کا کوئی نمونہ داخل نہ ہو، محبت اس وقت جب بائیں باغ کی طرف تکتی جہاں شام کے سائے پھیل پھیل کر خنکی میں اضافہ کر رہے تھے اور شفاف نیلگوں آسمان کی گہرائیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ فطرت کا یہ سب اور مقدس سکون دعوت نظر دے رہا تھا اور اس کے علی الرغم زرپرست دنیا داروں کے سرد و بے مہر ذہن سے تازہ تصادم کی وجہ سے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا، اور اس کا ضمیر احتجاج پر آمادہ تھا۔

دوبارہ کسی نے دستک دی، اور انیٹنی نے داخل ہو کر بادل ناخواستہ کہا کہ ایک کسان حاضری کا سائل ہے۔ کسان کبھی دھتکارے نہیں گئے اگر انہوں نے الزبتھ سے اپنا دکھ درد کہنا چاہا۔

وہ کوچ سے اٹھ بیٹھی اور کہا کہ بلاؤ۔ انیٹنی نے ادب مگر استقلال سے عذر کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کوئی اجنبی ہے اور تنہائی میں ملنا چاہتا ہے، میں نے سمجھایا بھی کہ یہ ممکن نہیں کیونکہ آپ کے یہاں مہمان ٹکے ہوئے ہیں لیکن وہ نہیں مانتا۔۔۔ ۔۔۔ ایسے وحشی کے ساتھ آپ کو ہرگز تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"کیوں وہ میرا کیا بگاڑے گا؟"

"کچھ بگاڑے کہ نہ بگاڑے، اس کی صورت ایسی خونخوار ہے کہ ڈاکو معلوم ہوتا ہے۔ مناسب ہو گا کہ جب وہ آئے تو میں موجود ہوں تاکہ گستاخی پر آمادہ ہو تو فوراً حواس ٹھکانے کر دوں"۔ انیٹنی نے کہا۔ اس کا انداز بدستور موّدبانہ تھا مگر ہاتھ کی جنبش ایسی تھی گویا کسی کی گردن مروڑ رہا ہے۔

"انیٹنی اسکو بلا لاؤ اور پھر تم چلے جاؤ گے، کیوں نا؟ میرا دل بولتا ہے کہ اس آدمی کو بہت ضرور کچھ نہ کچھ کہنا ہے۔ میرے انیٹنی، میرے اچھے انیٹنی مجھے اس سے اکیلے ہی میں باتیں کرنے دو"۔ یہ کہکر الزبتھ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا جسکو بوڑھے انیٹنی نے پرجوش بوسہ دیا اور چلا گیا۔

جلدی بھدّے بھدّے قدموں کی دھمک سنائی دی اور دروازے تک آ کر ایک کسان رک گیا۔ اس کی وضع در حقیقت اطمینان میں خلل ڈالنے والی تھی۔ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں رسمی سلام بجا لایا اور تعظیماً کمر خم کی۔ چپ چاپ کھڑا تھا، نظر اس خوبصورت قالین پر جمی ہوئی تھی جس پر الزبتھ کھڑی تھی۔

وہ دراز قد اور صنوبر کے درخت کی طرح کشیدہ قامت تھا۔ خوشنما سیاہی مائل نغیر کا لرکا "سکمانہ"[1] پہنے تھا جس پر نیلے فیتوں کا کام تھا۔ بالوں کی لٹیں چھالے کی طرح پیشانی پر لٹک رہی تھیں جو دریائے بگ کے اس پار کی ترکیب ہے۔ وہ بظاہر رقیبین تھا۔ اچھا جوان تھا، مگر چہرہ ستا ہوا، رنگ بجھا بجھا جس سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے، آنکھیں وحشتناک اور خوفزدہ تھیں، ترشی ہوئی مونچھیں اور کلّے اس طرح ہلتے تھے گویا ان جملوں کو چبا رہا ہے جن کا زبان سے ادا ہونا مشکل ہے۔ ہاتھ پہلوؤں سے ملے ہوئے یوں لٹک رہے تھے جیسے درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سزائے موت ملی ہے اور پھانسی کے تختے پر چڑھنے کو ہے۔

جب وہ اس طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا الزبتھ نے اپنی آواز میں ہمدردی کا عنصر کا گلا گھونٹ رہا تھا پوچھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"جا۔ جنگل سے ۔۔۔۔۔" یہ کہکر وہ زور زور سے سانس لینے لگا[2] معلوم ہوتا تھا کہ صنوبر کے درختوں میں ہوا سرسرا رہی ہے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"یان کلوڈا"

اس اطلاع سے وہ وحشت دور نہیں ہوئی جو اس جنگلی آدمی کے ساتھ کمرے میں گھس آئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے وحشت اور صید کی صیاد سے دیدگی برستی تھی، وہ دیوار کا سہارا لئے ہوئے تھا اور الزبتھ اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوئی اس "مرقع الم" کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ اس کے دل میں کوئی فاسد خیال نہیں ہے بلکہ مبتلائے کرب و اضطراب ہے، تاہم اس کی آواز کی قدرتی موسیقیت اور ہمت آفرینی جواب دے گئی۔ دونوں خاموش کھڑے تھے۔ آخرکار کسان نے

[1] خلیا کوٹ۔ سکمانا کے صحیح معنی مجھکو معلوم نہیں۔ اثر
[2] بے اختیار دل چاہا کہ "زور زور سے" کی جگہ "زورے زورے" لکھوں مگر محاسبین کے خوف سے باز رہا۔ (اثر)

وس کیا کہ گفتگو کا سلسلہ اسے شروع کرنا چاہیئے۔

"مہربان خاتون، میں جنگل سے آیا ہوں......"

"بلاشبہ ڈاکو ہے" الزتبھ دل ہی دل میں سوچی، "لیکن چونکہ یہاں علانیہ رانکسارانہ طور سے آیا ہے غالباً اس کا مطلب یہ التجا کرنا ہے کہ اس کو چھپاکر ن کے پیچھا کرنے والوں سے پناہ دوں، مجھے سنبھل جانا چاہیئے، کئی منٹ رچکے ہیں اور یہ اللہ کا بندہ ہکلا ہکلا کر اپنا نام دہرانے اور جنگل سے آیا ہوں ڑبڑانے کے سوا کچھ نہیں پھوٹتا؟"

"تم جنگل سے بھاگ آئے ہو؟" اس نے پوچھا، کس سے بھاگے ہو؟

"بھاگ آیا ہوں!" اس دیو پیکر نے گھبرا کے کہا اور پہلی مرتبہ آنکھ اٹھاکر لزتبھ کی طرف دیکھا۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ کھلے، سفید دانتوں کی چمک پھیلی، سامنے ایک مجسمۂ حسن دیکھکر چہرے کا تناؤ ڈھیلا پڑا اور خشونت نرمی میں بدل گئی۔

اب اس نے جلد جلد بولنا شروع کیا۔

"میں جنگل سے نہیں بھاگا بلکہ جنگل میں بھاگا جب میرے اندر کی آواز نے پکارا۔ تین برس سے میری زبان بند ہے لیکن مہربان خاتون اب میں آپ کے پاس آیا ہوں کیونکہ لوگ کہتے ہیں آپ دیوی ہیں......"

الزتبھ کا نپ گئی کہ یہ تو کوئی باؤلا ہے۔

"یہاں ایک آواز ہے....." کسان نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا اور اپنے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ اس کی آواز میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔

"کیسی آواز؟" الزتبھ نے پوچھا۔

کسان نے منہ پھیرلیا اور اپنے آگے کی طرف پھیلے ہوئے اور ایک دوسرے سے گتھے ہاتھوں کو یوں مرڑوڑا کہ گوشت سے خالی انگلیاں کڑکنے لگیں، پھر ایک عجیب لہراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مہربان خاتون جنگل پھر جنگل ہے۔ وہاں خدا کی آواز درختوں کی چوٹیوں سے سرگوشی کرتی ہے مگر نیچے زمین پر ایک ناپاک روح رنگینی اور پھنکارتی اور اکثر انسان کے جسم میں اتر جاتی ہے جب وہ آس پاس ہوتا ہے گویا آدمی جانتا ہے کہ اسے کس آواز پر دھیان دینا چاہیئے کیونکہ یہاں خود اس کی آواز موجود ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے دوبارہ اپنے سینے پر گھونسا مارا۔ الزتبھ کو اب بھی گمان تھا کہ اس کے دماغ میں کچھ نہ کچھ خلل ضرور ہے، لیکن خوف دور ہوچکا تھا اور کسان کی باتیں زیادہ تندہی سے سن رہی تھی۔

"تم جنگل سے اچھی طرح واقف ہو؟" اس نے پوچھا

"جی ہاں، جنگل کے ملازم کے لئے جنگل کا جاننا ضروری ہے" جواب ملا۔

"تو تم ہمارے ہاں کے جنگلوں میں نوکر ہو؟"

"مہربان خاتون! اس سال تک نوکر تھا جب یہ افتاد پڑی"

"کیا افتاد پڑی؟"

کسان نے آنکھیں پھیرلیں اور پھر اپنی انگلیاں توڑنے مروڑنے لگا۔

الزتبھ نے بھانپ لیا کہ اس کی بے چینی بڑھ گئی ہے کیونکہ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں جمع ہو رہی تھیں۔

"مہربان خاتون میں آپ کے سامنے سارا کچا چٹھا بیان کر دوں گا، لوگوں کا کہنا سچ ہے کہ آپ دیوی ہیں۔ جنگل میں کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے عام لوگ ناواقف رہتے ہیں لیکن جنگل کے ملازم کو جاننا چاہیئے، یہ تو اسکا اٹل فرض ہے۔ رات کے وقت جنگل ہمیشہ چوکس رہتا ہے اور آپ جھیل کے کنارے کھڑی ہوجائیں تو کوسوں ادھر کی آواز سن لیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میرا یہ فرض تھا کہ اور بیچ بیچ پڑے تو فوراً اس کی اطلاع دوں......"

الزتبھ بے صبر ہوتی جا رہی تھی کہ اس تمام ہذیان کا مطلب کیا ہے، لہذا ہمت دلانے کو مسکرا کر کہا۔ "اسے بھی صاف صاف کہدو نا کہ کیا ہوا۔ ڈرو مت"

"میں جانتا ہوں..... میں غریب ہوں اور تنخواہ سے کبھی کچھ بچا نہ سکا۔ گناہوں کا اقرار کرنے اور بچوں کو بپتسمہ دلانے گیلسیا لے جایا کرتا تھا اس میں بہت پیسا اٹھتا تھا کیونکہ گنتی کے پادری ہیں اور بہت دور رہتے ہیں۔ تین برس سے کسی گرجے کے اندر پاؤں نہیں رکھا اور روحیں مذہب کی برکتیں حاصل کئے بغیر پڑے ہوئے ہیں حالانکہ یہ روبل (روسی سکہ) میرے پاس ہیں اور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں......"

یہاں تک پہنچ کر اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے جیب سے ایک چکٹی ہوئی تھیلی اور تھیلی سے کچھ میلے نوٹ نکالے۔

"تم نے..... تم نے کسی کا روپیہ لے لیا؟" الزتبھ نے پوچھا

"کیا آپ کا مطلب ہے کہ میں نے چرا لیا؟ جی نہیں انہوں نے خود دیدیا"

"کھل کے کہو! شاید ریاست کی لکڑی بیچ ڈالی؟"

---

[1] زار کے عہد حکمرانی میں یونانی کیتھلک گرجا جسے یونیئٹ بھی کہتے ہیں تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ ایسے گرجوں میں عبادت کی ممانعت تھی اور خلاف ورزی پر سزا دی جاتی تھی، اس وجہ سے پولینڈ اور ورلفینیا کے کاشتکار جو اس عقیدے کے پیرو تھے اور آسٹروی پولینڈ کی سرحد کے قریب رہتے تھے جہاں یہ پابندیاں عائد نہیں تھیں کوشاں رہتے تھے کہ وہاں چوری چھپے جائیں، بچوں کو بپتسمہ دلائیں اور دیگر مذہبی رسوم ادا کریں۔ یہ کسان مذہب سے بہت شغف رکھتے تھے اور عبادت سے محروم ہو جانے کو بڑی مصیبت سمجھتے تھے۔ یہ لوگ اپنے عقائد پر سختی سے قائم رہے گو حکومت کی طرف سے برابر کوشش ہوتی اور جبر و تشدد کیا گیا کہ روسی آرتھوڈاکس مذہب قبول کریں۔ انہوں نے جان دینا گوارا کیا مگر اپنے عقائد سے جو ان کو محبوب تھے منحرف نہ ہوئے۔ کاشتکاروں کی متعدد آنے والی نسلیں ان لوگوں کو شہید کا مرتبہ دیتی رہیں۔

"جی نہیں"

"تو پھر کیا کیا؟ کسی کو قتل کر ڈالا؟"

"مہربان خاتون! اس سے بھی بری بات!"

الزبتھ نے اسکے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں، وہ آنکھیں جن سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور جن کی تاب لانا دشوار تھا۔ اس نے تحکمانہ طریقہ سے ہاتھ بلند کر کے کہا۔

"ہاں کہو! کہو!"

کسان نے سر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتے ہی چہرے پر مردنی چھا گئی، اسے خبر ہو گئی کہ اعترافِ جرم کا لمحہ آ گیا۔

"میں ...... میں نے عدالت کے سامنے جھوٹا حلف اٹھایا اور ایسا کرنے کے لئے انہوں نے مجھے دس روبل دیئے ...."

"کہے جاؤ۔ پورا حال بیان کرو۔" یہ کہکر الزبتھ اس سے اور تھوڑی قریب ہو گئی۔

"میں نے انہیں دیکھا ...... درخت کاٹتے سنا ..... دبے پاؤں ان تک پہنچا اور ان کو دیکھا ...... انہوں نے بھی مجکو دیکھا ...... جب مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو وہ میرے پاس آئے اور مجھے دس روبل دیئے کہ ان کے خلاف گواہی نہ دوں ...... میں بہت غریب تھا ..... میری بیوی بیمار تھی ..... میں نے روپیہ لے لیا ...... اور جھوٹی قسم کھائی ...."

الزبتھ برابر اس کی طرف تک رہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پوری روح کھنچ کر اس کی آنکھوں میں آ گئی ہے، اس قدر سرگرمی سے ہمدردی کا اظہار ہو رہا تھا کہ مجرم کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ آزادی سے گفتگو کر سکتا تھا: دل کا بوجھ ہلکا ہو چلا تھا۔

"لیکن میں نے روبلوں کو خرچ نہیں کیا ...... اس تھیلی میں وہی روبل ہیں ...... مہربان خاتون آپ لے لیجئے ...... تیس سال سے مصیبت بھگت رہا ہوں، لڑکوں کو تنبیہ نہیں دلایا، بیوی کے علاج کو ڈاکٹر نہیں بلایا ... ان روبلوں کو نہیں چھوا ...... کیا آپ کا مطلب ہے کہ اعترافِ گناہ کے بعد میں خود کسی پادری کو دے دوں؟ لیکن اسے ڈھونڈنے کہاں جاؤں اور میں نئے روسی پادریوں کے سامنے اپنے کو ذلیل بھی نہیں کر سکتا ...... اسی الجھن میں جنگل کے لگاتار پھیرے لگاتا رہا تاکہ اپنے اندر کی آواز سے پوچھوں کہ کیا یہ جھوٹے حلف کا روپیہ گلیسیا میں بچوں کے بپتسمہ پر لگا سکتا ہوں لیکن آواز نے منع کیا۔ اگلی سال موسم بہار میں آواز نے مجھ سے کہا کہ محل کی مہربان خاتون کے پاس جا کیونکہ وہ دیوی ہے۔ یہ روبل اس کے حوالے کر کے رحم کی التجا کر۔ میں کئی دفعہ باغیچہ میں آیا، باورچی خانے کے گرد بھی چکر کاٹے لیکن درخواست کی ہمت نہ پڑی ...... آج آواز نے حکم دیا کہ فوراً جا ...... مہربان خاتون یہ روبل لے لیجئے اور میری روح کا بوجھ ہلکا کیجئے!"

تیسری مرتبہ اس نے وہی میلے کچیلے نوٹ الزبتھ کی طرف بڑھائے

وہ اس کے قریب گئی اور نفرت زدہ نوٹ اس کے ہاتھ سے لیکر اپنے پس پشت پھینک دیئے۔

کسان اس کے قدموں میں گر پڑا اور اس کے گھٹنوں سے لپٹ کر چلا یا۔

"مقدس خاتون کیا خدا مجھے معاف کر دے گا؟"

الزبتھ نے جھکے ہوئے دیو کا سر اپنے دونوں ننھے ننھے ہاتھوں میں لیا اور گردن قدرے خم کر کے اس کے الجھے ہوئے اور جنگل کی خوشبو سے بسے ہوئے بالوں کو چوم لیا نیز اس چہرے کو جو خود آزاری کے پسینے اور ندامت کے آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ پھر گرفتہ آواز میں کہا:-

"تمہاری خطا ...... تمہارا گناہ سنگین ہے۔ لیکن تم نے اپنے اندر کی آواز سنی اور اس کے حکم کی تعمیل کی۔ خدا تم کو معاف کرتا رہے گا۔"

کسان ابتک جھکا ہوا تھا۔ ہاتھ جوڑے ہوئے اور آنکھیں بند کئے، گویا دعا میں محو ہے۔ عالم رویا نیز اس مرئی خواب سے جو پیش نگاہ تھا طمانیت کی ایسی کرنیں پھوٹیں جنکی جوت نے اسکے چہرے کو بھی منور کر دیا۔ اس کا چپت آنند سے بھر گیا، اب وہ تھا اور از خود رفتگی۔ جب آنکھیں کھولیں اور اس معجز نما مجسمہ کو دیکھا اور اپنی نجات کا مژدہ ان لبریز ترحم آنکھوں میں پڑھا تو اس نے متانت سے کہا "بوجھ دور ہو گیا ....."

وہ دوبارہ جھکا اور دوبارہ الزبتھ کے گھٹنوں سے لپٹ کر آنسو بہاتا رہا۔

بعد ازاں وہ ایستادہ ہوا تو عظیم پر شکوہ تھا لیکن اس رحم سے چوندھیایا ہوا جس کا سزاوار ٹھہرا تھا۔ اس نے ادب سے سر تسلیم خم کیا اور چلتا ہوا۔ وہ بشاش تھا کیونکہ اس عذاب سے مخلصی پا چکا تھا جو سوہانِ روح تھا۔

دیر تک الزبتھ جہاں کھڑی تھی کھڑی رہ گئی، چہرہ دمک رہا تھا اور آنکھوں میں چمک تھی وہ خیالات جو محل سے جنگل اور جنگل سے محل آ جا رہے تھے لفظوں میں باآواز بلند اس طرح ادا ہوئے "کم سے کم جنگل کے بسنے والوں میں ابتک روح باقی ہے ......"

اس شام کو وہ کچھ ایسی کھوئی ہوئی اور اپنی ہٹ پر اڑی ہوئی تھی کہ اسکے شوہر یا کاؤنٹ وٹیونڈلے گیس کے چولہوں کا تذکرہ بالکل فضول سمجھا۔ انہوں نے گفتگو کے مختلف موضوع کرید کرید کر نکالے مگر الزبتھ کی طرف سے بے پروائی کا اظہار ہوتا رہا، البتہ کبھی کبھی یہ عجیب و غریب فقرہ دہراتی تھی جو ان خیالات سے یک لخت غیر متعلق تھا جو اعلیٰ سوسائٹی کی کسی فرد کے ذہن میں آ سکتے ہیں۔

"ہاں اب بھی روحیں موجود ہیں ...... جنگل کے ان لوگوں میں"

اس ناقابل فہم فقرہ نے بعض لوگوں کو کھوج لگانے پر ابھارا۔ یقیناً محل کا کوئی ملازم جھانک رہا تھا جب یان کلوڈرا اور الزبتھ کا واقعہ رونما ہوا کیونکہ بہت جلد یہ افواہ پھیل گئی کہ بیگم الزبتھ کسانوں کا منہ چومنے کی خوگر ہے!

# کیمبرج یونیورسٹی کا دار التجربہ

مادھو رام

ٹھیک سو سال پہلے کی بات ہے۔ ۱۸۴۶ء کی گرمیوں کا آغاز تھا کہ اسکاٹ لینڈ کے مشہور سائنس داں ولیم ٹامسن نے جو بعد میں لارڈ کیلون کے نام سے مشہور ہوئے۔ گلاسگو یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کے شراب خانہ پر قبضہ کیا۔ خالی پیپوں کو باہر پھینکوایا۔ نالیاں بنوائیں، نل لگوائے، اور اس طرح برطانوی یونیورسٹیوں کے سب سے پہلے معمل کی بنیاد ڈالی۔

آج ہمیں یہ ساری باتیں بالکل معمولی اور غیر اہم نظر آتی ہیں۔ لیکن بات یوں ہے کہ ابھی انگلستان میں بھی دوسرے ملکوں کی طرح سائنس کا باقاعدہ مطالعہ کے خیال نے عوام کے دلوں میں جڑ نہیں پکڑی تھی۔ پھر بھی سائنس یہ ابتدائی معمل کیمبرج یونیورسٹی کی موجودہ مشہور معمل کیونڈس لبوٹری کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس لیبارٹری کو سلطنت برطانیہ کا بہترین دار التجربہ کہا گیا ہے۔ اور ساری دنیا اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ جتنے بڑے بڑے اہم تجربات اس مرکزی لیبارٹری میں ہوئے ہیں دنیا کی کسی اور لیبارٹری میں نہیں ہوئے۔

گلاسگو یونیورسٹی کی بنیاد کے چند سال بعد کیمبرج کے چند ماہرین سائنس نے اپنی ایک لیبارٹری قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر خرچ کا اندازہ چھ ہزار پونڈ سے زائد کیا گیا۔ اس زمانہ کے معیار کے مطابق اتنی بڑی رقم کسی کالج میں سائنس کی لیبارٹری کے لئے بہت غیر معمولی تھی۔ اس لئے اگر ڈیون شائر کے ڈیوک خاندان کیونڈش کی فیاضی اور دور بینی سہارا نہ دیتی تو اس مشہور عمارت کے بننے میں ابھی نہ جانے کتنا عرصہ لگتا۔ انہیں کی دی ہوئی رقم سے یہ دار التجربہ تیار ہوا۔

ان دنوں یونیورسٹی کے چانسلر ڈیون شائر کے ڈیوک ہی تھے۔ جو ہنری کیونڈش سائنسداں کے رشتہ دار تھے۔ ان کی مربیانہ عنایات کے سایہ میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جیمز کلارک میکسویل جنہوں نے گرمی، روشنی اور مقناطیسی قوت کے متعلق بہت سا کام کر رکھا تھا۔ اس نئے کام کی صدارت کے لئے منتخب ہوئے۔ اور ۱۸۷۳ء تک اس لیبارٹری کا کچھ حصہ بن کر تیار ہو گیا۔ اگلے سال ۱۶ جون کو ڈیوک اوف ڈیون شائر نے یونیورسٹی کے چانسلر ہونے کی حیثیت میں اس کا افتتاح کیا۔ موجودہ صدی کا ماہر سائنس اس لیبارٹری کے ساز و سامان کی فہرست کو پڑھ کر بہت حیران ہوگا۔ پروفیسر میکسویل نے جو فہرست تیار کی تھی اسے دیکھ کر بے حد حیرت ہوتی ہے۔

کیونڈش لیبارٹری میں جو اولین تجربات کئے گئے ان کا دائرہ عمل بے حد وسیع تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہر سچے طالب علم کو کیونڈش لیبارٹری استعمال کرنے کی پوری پوری اجازت تھی۔ ان کے نصاب تعلیم سے ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کا ہر ایک ممبر جو تجرباتی طریقہ جات یا طبیعاتی تحقیقات کو سمجھنے کی خواہش رکھتا ہو۔ اس لیبارٹری میں آزادی سے کام کر سکتا ہے۔

کیونڈش لیبارٹری نے اپنی اوائل عمر میں ہی وہ عزت اور ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی جو اس کو آج حاصل ہے یعنی یہ کہ وہ پوسٹ گریجویٹ تحقیقات کا مرکز بنی اور وہ بے شک و شبہ سب جگہ سلطنت متحدہ کے مشہور ترین ماہران سائنس کا کارخانہ بن گئی۔ میکسویل کے بعد اس شعبہ کے صدر ایک دوسرے شہرۂ آفاق سائنسداں لارڈ ریلے ہوئے جنہوں نے کیونڈش لیبارٹری میں برقی مزاحمت کی اکائی کے شبہات کو نہایت خفیف لمبائی، چوڑائی، گہرائی کی صورت میں ظاہر کیا۔ نچلی منزل پر آخری کمرہ کے اینٹ کے ستون پر ایک پیتل کے تختہ پر کندہ ہے کہ سپننگ کائل ( Spinning Coil. ) کو جس کی بدولت لارڈ ریلے نے کامیابی حاصل کی اسی جگہ نصب کیا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ کے ہر حصہ سے کامیابی کی بو آتی ہے۔ مثلاً اسی جگہ پروفیسر جے ٹامسن نے برقیہ ( Electro ) کی حقیقت کو ثابت کیا۔ یہیں کچھ عرصہ کے بعد ایک اور کیمبرج یونیورسٹی کے سائنسداں لارڈ ردر فورڈ ایٹم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے یعنی بناوٹی تجزیہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اور یہ کام ایٹم کی زبردست قوت کو اپنے قبضہ میں لانے کی سب سے پہلی منزل تھی۔ حقیقت میں اس قدر ضروری اور اہم تجربات و انکشافات کیونڈش لیبارٹری میں کئے گئے ہیں کہ اگر ان کی اہمیت بتلانے کے لئے بھی انسان کو بے حد ماہر سائنس داں ہونا چاہئے۔

بہر حال ہمیں ایک یا دو تجربات پر جن کی اہمیت مسلمہ ہو چکی ہے توجہ دینی چاہئے۔ مثلاً ۱۹۳۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے دو سائنسدانوں کاک کرافٹ اور والٹن نے ایٹم کے محرکوں کے ذریعے جن کو ایک بندوق سے چلایا گیا تھا۔ ایٹم کے مرکزی حصے کے ٹکڑے ٹکڑے کئے۔ اس سے کچھ عرصہ پیشتر سر جیمز چیڈوک نے جو کیمبرج کے ایک اور مشہور سائنسداں ہوئے ہیں۔ نیوٹرون ( newtron ) کے انکشاف کا اعلان کیا۔ دو اور اشخاص ولیم بریگ اور اس کا بیٹا لارنس (جو ۱۹۳۸ء میں کیونڈش پروفیسر کے عہدہ پر ممتاز ہوا) کیونڈش لیبارٹری سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں نائٹ ( ) کا خطاب ملا اور ۱۹۱۵ء میں دونوں کی تحقیقات کی اہمیت کو تسلیم کر کے نوبل پرائز ( Prize ) دیا گیا۔ آج کیونڈش لیبارٹری کو اس کے بانی ڈیون شائر کے ڈیوک ہفتم آکر دیکھے تو پہچان نہ سکیں گے۔ یہ اس قدر ترقی پا گئی ہے کہ اگر اس کو دنیا کی عظیم ترین تجربہ گاہ کہا جائے تو غیر موزوں نہ ہوگا۔ انڈر گریجویٹ عورتیں مردوں کے ساتھ آزادانہ طور پر اس کو استعمال کر سکتی ہیں۔ اس کا سازو سامان کس قدر فراخدلی سے مہیا کیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہو جائے گا کہ لارڈ آسٹن مرحوم نے اس لیبارٹری کی ایک نئی شاخ کی تعمیر کے لئے جو ابتدائی تجربوں کے لئے بنائی گئی تھی ڈھائی لاکھ پونڈ دئے تھے۔ اس جنگ عظیم میں جو ابھی ختم ہوئی ہے کیونڈش لیبارٹری کا بہت سا سامان گورنمنٹ نے لے لیا تھا۔ اور وہ وقت شاید دور نہیں جب دنیا کو یہ معلوم ہوگا کہ کیونڈش لیبارٹری میں کام کرنے والے ماہران سائنس نے جرمنی اور جاپان کے خلاف لڑائی جیتنے میں کس قدر نمایاں حصہ لیا۔

# دارالعلوم ندوۃ العلماء

گذشتہ صدی کے اواخر اور اس صدی کے اوائل میں مسلمانوں کے "امراض تنزل" کے لئے جو بے شمار نسخے لکھے گئے تھے منجملہ ان کے ایک نسخہ "ندوۃ العلماء" کی تحریک بھی تھا۔

قوموں اور ملکوں کے عروج وزوال کے ہر ایسے موسم میں کچھ لوگ قبل از وقت سے پہلے بیدار ہوجاتے ہیں۔ جبکہ تمام ملک خواب غفلت میں سرشار ہوتا ہے۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس وقت بھی بعض ذکی الحس اور صاحب فکر طبائع وقت کے اثرات سے متاثر ہوئیں۔ اور اپنی حالت پر مغرب کے اقتدار اور عروج کے مقابلے میں غور کرنے لگیں ——— اس طرح تغیر واصلاح کی تحریکوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا ——— جس کا محرک اصلی تو مغربی تمدن کے اقتدار کا انفعالی اثر تھا ——— لیکن اس اثر نے مایوسی کی جگہ سعی وکوشش کے جذبات پیدا کردئے۔ مطالعہ ومشاہدہ تنزل کے اسباب پر غور کرنے کا ذریعہ بن گیا ——— اور اصلاح ودرستگی کی تدابیر پر غور کیا جانے لگا۔

ہندوستان کے ارباب علم وفضل بھی ان حالات سے بیخبر نہ تھے۔ اور اب وہ بھی یہ سمجھ چکے تھے کہ آج مسلمانوں کی سرفرازی وسربلندی کا راز محض دین ودنیا کے اجتماع" میں مضمر ہے۔ چنانچہ وہ اسی جد وجہد میں انتہائی انہماک سے مصروف ہوگئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے مصلحین بلاد اسلامیہ کے مقابلے میں ذرا دیر سے بیدار ہوئے۔ لیکن انھیں اس اثنا میں کافی غور وفکر کا موقع مل گیا۔ اور بہت سے مشاہدات وتجربات حاصل ہوگئے جو ان کے لئے شمع راہ ثابت ہوئے۔

## ندوۃ العلماء کا قیام

۱۸۹۲ء میں کانپور کے مشہور مدرسہ فیض عام کا جلسہ تھا۔ دور دور سے علماء وقت شرکت کے لئے آئے۔ دوران گفتگو میں یہ مسئلہ بھی آیا۔ گفتگو نے عمل کا قالب اختیار کیا اور "ندوۃ العلماء" کے نام سے ایک انجمن کی تشکیل ہوگئی ——— اس انجمن کے اہم مقاصد یہ تھے:

(۱) ایسے علماء تیار کرائے جائیں۔ جو علوم مذہبی قرآن وحدیث وفقہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے ہوں اور خصوصاً علم کلام میں۔ تاکہ غیر مذہب والوں کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت وصداقت ثابت کرسکیں۔

(۲) قوم میں ایسے علماء کی بھی ایک جماعت موجود ہونی چاہئے جو علوم وفنون مثلاً صرف ونحو، ادب وانشاء منطق وفلسفہ وغیرہ میں مہارت تامہ رکھتی ہو۔ دوسری قوموں کے سامنے جب اسلام کی علمی عظمت کا تذکرہ آتا ہے۔ تو خواہ مخواہ خلیل سیبویہ۔ عبدالقاہر جرجانی۔ سکاکی۔ فارابی۔ ابن سینا کا نام لینا پڑتا ہے۔

(۳) ایسے علماء بھی پیدا کئے جائیں جو دنیا کے حالات اور واقعات سے باخبر ہوں۔ اور ان کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ بستے ہیں اس کے اصول سلطنت کیا ہیں اور اس وقت مسلمانوں کی دنیاوی ضرورتیں کیا ہیں سلطنت کے انتظام میں جو تبدیلیاں پیش آتی رہتی ہیں ان سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑے گا۔ المختصر واقفیت، انتظام تدبر، حزم اور مصلحت اندیشی میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہو۔

جب یہ طے ہوگیا کہ مذکورہ جماعت کے بغیر اسلام اور اسلامی علوم کی ترقی واستحکام ممکن نہیں تو پھر یہ غور کیا گیا کہ وہ کن ذرائع اور اسباب سے پیدا ہوسکتی ہے۔ بڑے غور وفکر اور مشورۂ واستصواب کے بعد جو رائے اس معاملے میں قائم ہوئی وہ یہ کہ جب تک طلباء کو ابتدائی زمانۂ تعلیم سے اواخر تعلیم تک ایک خاص قسم کی تربیت وتعلیم نہ دیجائے اس قسم کے علماء پیدا نہیں ہوسکتے۔ اس لئے یہ قرار پایا کہ چند مخصوص اصولوں پر ایک عظیم الشان درسگاہ قائم کی جائے۔

کچھ دنوں کی ابتدائی جد وجہد کے بعد اس نقطۂ نظر کے تحت لکھنؤ کے مقام پر جو کسی زمانے میں اسلامی علوم ومعارف کا مرکز رہ چکا ہے ایک درسگاہ "دارالعلوم ندوۃ العلماء" کے نام سے قائم کی گئی جو کہ روز اوّل سے آجتک انتہائی کامیابی سے چل رہی ہے۔

فکر ندوی

درسگاہ کی شاندار دو منزلہ عمارت شہر سے باہر ایک پرفضا اور پرسکون مقام پر واقع ہے جس میں بیس بڑے بڑے کمرے تعمیر کئے گئے ہیں اور ہر ایک کمرہ ایک خاص فن کیلئے مخصوص ہے اور اس فن سے متعلق انتہائی سہولتیں بھی اسی کمرہ میں بہم پہنچادی گئی ہیں۔

حال ہی میں چند ایسی عمارتیں بھی تعمیر ہوئی ہیں جن کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی تھی۔ مثلاً دارالاقامہ جس میں بیرونی طلبا کے لئے خوش فضا کمرے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ایک شاندار اور خوبصورت مسجد جو دارالعلوم کی عمارتوں کے درمیان دور سے ایسی نظر آتی ہے گویا انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہو۔

## نظامِ عمل

دارالعلوم کا پورا انتظام ایک مجلس کے سپرد ہے جو بیس ارکان پر مشتمل ہے۔ ان ارکان میں جہاں علمار اور مشائخ وقت ہیں وہیں جدید تعلیم یافتہ اصحاب فکر و نظر بھی موجود ہیں تاکہ قدیم و جدید تہذیب کے امتزاج سے جو جماعت تیار ہو وہ بہت سی خصوصیات کی حامل ہو۔

روزمرّہ کے انتظامی معاملات کی سربراہی اور انجام دہی کے لئے معتمد مالیات کے عہدے قائم ہیں۔ دارالعلوم کا اندرونی انتظام ایک پرنسپل کے سپرد ہے جو اپنے عہدے کے لحاظ سے مہتمم اور ناظر کہلاتا ہے۔ ناظر دارالعلوم کے تمام تعلیمی اور انتظامی معاملات کا بھی ذمہ دار ہے۔ اس کی وہی ذمہ داریاں ہیں جو ایک کالج کے پرنسپل کی ہوتی ہیں اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی۔

دارالعلوم کے مہتمم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ تبحرِ علمی حسنِ انتظام، وسعتِ نظر اور زہد و تقویٰ کی صفات کا بخوبی حامل ہو۔

ناظر دارالعلوم کی امداد و اعانت اور عام دفتری امور کی دیکھ بھال کے لئے "منصرم" کا عہدہ قائم ہے۔ اس کی ذمہ داریاں وہی ہوتی ہیں جو ایک یونیورسٹی کے رجسٹرار کی ہو سکتی ہیں۔

درس و تدریس کے لئے لائق ترین اساتذہ کی جماعت ہے جو بڑے انہماک و توجہ اور پوری دلچسپی کے ساتھ تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اساتذہ کے انتخاب میں دارالعلوم کا روزِ اوّل سے یہ مطمحِ نظر رہا ہے کہ ہر فن کے معلم علیحدہ علیحدہ ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ اہتمام کے ساتھ وہ اپنے خاص فن میں درس دے سکیں اور طلبار میں علم کا ذوق اور فنی تعلیم حاصل کرنے کا زیادہ سے زیادہ سلیقہ پیدا کر سکیں۔

## خصوصیات

دارالعلوم ندوۃ کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا نصابِ تعلیم ہے۔ دارالعلوم کے نصابِ تعلیم میں قدیم و جدید علوم کے امتزاج کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی لازمی ہے۔ دارالعلوم نے زبان انگریزی کے سلسلے میں ایسا نصاب مرتب کیا ہے جس کی مدد سے جلد سے جلد طالب علم میں انگریزی کے رسائل و اخبارات پڑھنے کا سلیقہ آجاتا ہے اور حسبِ ضرورت دوسری کتابوں سے استفادہ حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

انگریزی کے ساتھ جغرافیہ، حساب، جومیٹری اور تاریخ کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں تاکہ اگر کوئی متعلم میٹرک کا امتحان دینا چاہے تو بلا کسی مزید تیاری کے دیدے۔

ان ابتدائی علوم کے علاوہ علوم جدیدہ معاشیات و سیاسیات سے بھی طلبار کو روشناس کرایا جاتا ہے۔ معاشیات و سیاسیات کی تعلیم میں اصول و نظریات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے معاشی و سیاسی حالات بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ موجودہ معاشی مسائل کے حل میں اسلامی اصول سے بھی کام لیا جاتا ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام طلبار کے سامنے آجائے۔

سیاسیات کی تعلیم میں نظریات کی تشریح کے بعد سب سے پہلے ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے بحث کی جاتی ہے۔ واسکوڈی گاما کی آمد سے برطانوی قبضہ تک کی ساری سرگذشت سنا دی جاتی ہے۔ پھر منٹو مارلے اصلاحات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگست ۱۹۱۷ء کے تاریخی اعلان کا ذکر آتا ہے اور مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات پر گفتگو ہوتی ہے۔ اور اس سلسلے میں ملک کے ترقی پسند عناصر کا ذکر بھی آتا ہے اور ساتھ ہی قومی مطالبات کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ آخر میں موجودہ اصلاحات پر گفتگو ہوتی ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر بحث کیجاتی ہے اور اختصار کے ساتھ تمام ضروری باتیں بتائی جاتی ہیں تاکہ طلبار موجودہ مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے مطالعہ کے بعد بصیرت اور سنجیدگی سے کوئی رائے قائم کر سکیں۔ اس سلسلے میں اسلام کا نقطۂ نظر بھی واضح کیا جاتا ہے اور اسلامی نظامِ حکومت کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کشاکشِ حیات میں شمعِ راہ بن سکے۔ سیاسی مسائل کو زیادہ ذہن نشین کرانے کی غرض سے ایک نقلی پارلیمنٹ بھی قائم ہے تاکہ نظری بحثوں کی عملی مشق ہو جائے۔

دارالعلوم کے نصابِ تعلیم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عربی زبان کی تعلیم ایک زندہ زبان کی طرح ہوتی ہے۔ طلبار کو محض کتاب فہمی کا عادی نہیں بنایا جاتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ لکھنے اور بولنے کی مشق بھی کرائی جاتی ہے اس سلسلہ میں دارالعلوم ندوہ کا طریقِ تعلیم تمام عربی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بالکل مختلف ہے۔

سب سے پہلے طلبار کو روزمرّہ کے مفردات ایک خاص ترتیب سے یاد کرائے جاتے ہیں اس کے ساتھ قواعد کے طرز پر آسان اور دلچسپ طریقہ سے جملوں کی مشق کرائی جاتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب صرف و نحو کے ضروری قواعد آجاتے ہیں تو "حکایات اطفال" کا پہلا حصہ شروع کرا دیا جاتا ہے۔ بالعموم یہ منزل ایک مہینہ میں ختم ہو جاتی ہے۔ جب اس طرح ایک حصہ ختم ہو جاتا ہے تو اسی انداز میں استاد چھوٹے چھوٹے قصے لڑکوں کو سناتا ہے اور پھر ان سے وہی قصے بار بار زبانی کہلواتا ہے چند مشقوں کے بعد "القراۃ الرشیدہ" کا سلسلہ شروع کرا دیا جاتا ہے۔ اس طرح تین چار ماہ میں متعلم میں اتنی استعداد اور صلاحیت پیدا کرا دی جاتی ہے کہ وہ سادہ زبان میں چھوٹی چھوٹی حکایتیں لکھ سکے اور روزمرّہ کی ضروری بات چیت کر سکے۔ ایک عرصہ دراز کے تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دو سال میں متعلم لکھنے بولنے اور سمجھنے میں کافی مشاق ہو جاتا ہے اور آسانی سے ہر قسم کے خیالات عربی زبان میں ظاہر کر سکتا ہے

آگے چل کر مصر کے ابتدائی ثانوی مدارس کے دو منتخب مجموعے پڑھائے جاتے ہیں۔ جو اسی غرض سے "وزارت معارف" نے مرتب کرائے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں ایک میوزیم بھی قائم ہے جس میں تمام چیزوں کے نمونے جمع ہیں تاکہ ترجمہ کے بغیر چیزوں کا تصور قائم ہو سکے۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً لڑکوں کو مشاہدۂ اشیاء کی غرض سے باہر بھی لے جایا جاتا ہے۔

دارالعلوم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عربی ادب کی جانب خصوصیت سے توجہ کی۔ اس لئے کہ ادب ہماری تعلیم کی حقیقی روح ہے۔ قرآن و حدیث کے بیشتر خزائن و علوم اس کے اندر مدفون ہیں۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ ہندوستان میں اسی فن کی جانب نسبتاً کم توجہ کی گئی۔ چنانچہ دارالعلوم نے فن ادب پر خاص زور دیا تاکہ طلباء فصاحت و بلاغت کے ساتھ صحیح عربی لکھ پڑھ سکیں۔ دارالعلوم کا یہ طریق تعلیم قدیم عربی مدارس کے ارباب حل و عقد کے لئے ایک عجوبہ روزگار بن گیا اور اس وقت ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دارالعلوم ندوہ کے طلباء کو عام جلسوں میں عربی زبان میں فی البدیہہ تقریر کرتے اور برجستگی سے گفتگو کرتے دیکھا۔ اس سے عام لوگ بہت متاثر ہوئے اور خصوصیت سے ندوہ کی جانب متوجہ ہوئے۔

دارالعلوم ندوہ میں عربی ادبیات کے ساتھ تاریخ ادب بھی پڑھائی جاتی ہے تاکہ ادب کے متعلم کے سامنے عہد جاہلیت سے آجتک کے تمام ادبی تغیرات آجائیں۔

دارالعلوم کی ایک خاص چیز یہ ہے کہ اس نے اپنے نصاب تعلیم میں دینیات کی تعلیم پر خصوصیت سے زور دیا ہے۔ علوم اسلامیہ کی درس و تدریس کا اصل مقصد قرآن پاک تھا لیکن عام طور پر معقولات اور فلسفہ مطمح نظر بنکر رہ گئے۔ قرآن اور علوم قرآن بالکل نظر انداز کر دئے گئے۔ اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے دارالعلوم نے عربی ادبیات کے بعد قرآن پاک کی جانب خاص طور پر توجہ کی اور معانی و مطالب اور تفسیر و ترجمہ کے لحاظ سے اسے مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا اور ایسی کتابیں خصوصیت سے داخل درس کی گئیں جن میں علوم قرآن سے بحث کی گئی ہے اور بالخصوص وہ جن سے قرآن پاک کا اعجاز ثابت ہو جیسے "اعجاز القرآن باقلانی" وغیرہ۔

دارالعلوم نے اپنا طریقہ تعلیم بہت حد تک فطری رکھا ہے اور ہر فن کو تین ادوار میں تقسیم کر دیا ہے۔ سب سے پہلے وہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جنمیں سلیس زبان میں نفس مسائل مذکور ہوں۔ دوسرا دور ان کتابوں کا ہے جن میں مسائل کے ساتھ ان کے دلائل بھی واضح طور پر بیان کئے گئے ہوں۔ اور تیسرا دور ان کتابوں کا آتا ہے جن کی عبارت دقیق اور پیچیدہ ہو تاکہ متعلم میں دقت نظر اور مشکل عبارتوں کے سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ قرآن پاک کی تعلیم بھی اسی ترتیب سے دی جاتی ہے۔

سب سے پہلے قرآن مجید کا تشریحی ترجمہ پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد علمی انداز میں تعلیمی مسائل پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے اور پھر اس کے بعد مفسرین کی کاوشیں اور ان کی تحقیقات انہی کے الفاظ میں بتائی جاتی ہے۔ بالکل یہی ترتیب حدیث کی تعلیم میں بھی رکھی گئی ہے۔ اس سلسلے میں خاص کوشش یہ کی جاتی ہے کہ متعلم میں ذاتی تحقیق و جستجو کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے۔ اسی کے ساتھ اسلامی تاریخ پر خصوصیت سے زور دیا جاتا ہے اور طلباء کو اسلامی عہد سے تعلق سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تمدنی مسائل سے آگاہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان پر غور کر سکیں اور اس عہد نو کی تشکیل میں ماضی کے ان تجربوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔

## "یونین الاصلاح"

طلباء کو ذہنی و فکری تربیت کے لئے علمی و ادبی مجلس "الاصلاح" قائم ہے جس کے تحت تمام علمی، ادبی اور تفریحی مشاغل انجام پاتے ہیں۔ اس انجمن کا تمام انتظام طلباء کے ہاتھ میں ہے اور انہی کے نمائندے انتظام کرتے ہیں۔ ہر سال نئے انتخابات ہوتے ہیں اور ایک نئی مجلس انتظامیہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ "ناظم" اس انجمن کا سب سے بڑا عہدہ ہے اور اس کی امداد و اعانت کی غرض سے متعدد عہدے دار ہوتے ہیں۔ انجمن کے پاس اپنا ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں اردو کی تقریباً تمام اہم مطبوعات موجود ہیں۔ کتابوں کے ساتھ پرانے اخبارات و رسائل کے فائل بھی موجود ہیں۔ اس کتب خانہ کے علاوہ ایک "ریڈنگ روم" بھی قائم ہے جس میں اردو، انگریزی، عربی اور فارسی کے تمام موقر جرائد و مجلات آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی ممالک کی سیاسیات سے واقفیت کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

مصر کے مشہور روزنامہ "البلاغ" کے علاوہ (جو سارے عالم اسلامی کی کیفیات اور واقعات کا حامل ہوتا ہے) افغانستان، عراق، شام، حجاز، الجزائر اور ٹیونس وغیرہ کے اخبارات بھی آتے ہیں تاکہ براہ راست ان ممالک کی سیاسیات پر گہری نظر رہ سکے۔ طلباء اپنی مشق کے لئے خود بھی قلمی رسائل و اخبارات نکالتے ہیں۔ عربی اردو کی تقریروں کے لئے ہفتہ وار جلسے بھی ہوتے ہیں جن میں مختلف عنوانات پر تقریریں کی جاتی ہیں۔ ان جلسوں میں اکثر اساتذہ بھی شرکت کرتے ہیں اور بعض اوقات خود بھی حصہ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں باہر کے مشاہیر اور ماہرین فن کو بھی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے خیالات سے طلباء کو مستفید کر سکیں۔

دارالعلوم ندوہ نے تکمیل فن خاص (ایم۔ اے) کی کلاس بھی قائم کی ہے تاکہ طلباء اپنی طبعی مناسبت کو دیکھ کر دو سال کے عرصہ میں کسی ایک فن میں مہارت تامہ حاصل کر سکیں جس سے انھیں طبعی مناسبت ہے۔

## دارالاقامہ

دارالعلوم ندوہ نے طلباء کے قیام کے لئے ایک عالیشان دارالاقامہ تعمیر کرایا ہے۔ یہ دارالاقامہ

"شبلی ہوسٹل" کے نام سے موسوم ہے۔ ہوسٹل کے اندرونی انتظامات کے لئے نگراں مقرر ہیں جو طلباء کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ ہوسٹل میں لڑکوں کی تقسیم عمروں کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ بڑے چھوٹے اور متوسط عمر کے طلباء کو علیحدہ علیحدہ کمروں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ متعدد استاد مقرر ہیں جو شب و روز ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ اور پورے انہماک و توجہ کے ساتھ طلباء کی ذہنی صلاحیتوں کو ترقی دینے کی فکر میں مصروف رہتے ہیں۔ شبلی ہوسٹل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں رہنے والے طلباء کے باہمی تعلقات دوستی کی حد سے گذر کر یگانگت کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور یگانگت کا یہ رشتہ تعلیمی زندگی ہی میں نہیں بلکہ عمر بھر قائم رہتا ہے۔ ایک "ندوی" خواہ دنیا کے کسی حصہ میں کیوں نہ ہو دوسرے "ندوی" کے لئے اپنی آغوش ہمیشہ وا رکھتا ہے۔

ندوہ کے اس نظامِ تعلیم سے گزشتہ تیس چالیس برس کے عرصہ میں جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں ان کے متعلق کچھ کہنا غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے میں ندوہ کے تربیت یافتہ "فرزند" موجود ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں مفید خدمات انجام دے رہے ہیں ؛

# رموز و اسرار

دنیا کی فضا سے مسکراتا ہوا جا
جینے والوں کے دل بڑھاتا ہوا جا
وہ ترکِ وطن تھا اور یہ عزمِ وطن
روتا ہوا آیا تھا تو گاتا ہوا جا

*

نعمت ایک یاد آ سکتی ہے
دل میں امید مسکرا سکتی ہے
احسان شناس ہے تو سو غم تیرے
اک صبح کی تازگی بھلا سکتی ہے

*

انسان کی زندگی کو شرماتے ہیں
خوش خوش آتے ہیں خوش چلے جاتے ہیں
پھولوں میں نہ جھگڑا ہے کوئی اور نہ فساد
کھلتے ہیں مہک دیتے ہیں مرجھاتے ہیں

*

کیا کیجئے نگاہ عارفانہ لیکر
چلتا ہے مجھے ساتھ زمانہ لیکر
دم بھر جو تردد میں قدم رکتا ہے
قسمت بڑھتی ہے تازیانہ لیکر

*

چڑھتی ہوئی دھوپ دم میں ڈھل جاتی ہے
گردوں کی طرح نظر بدل جاتی ہے
تیری ہی زمیں ہے جیسے اسطرح نہ چل
یہ پاؤں سے بھی کبھی نکل جاتی ہے

**نجم آفندی**

# دارالعلوم ندوۃ العلماء

دارالعلوم ندوہ اے مرکزِ ترقی
گہوارۂ علومِ دینی و فکرِ عصری
اے مہدِ علم و حکمت۔ سرچشمۂ ہدایت
اے گلشنِ ذہانت اے محفلِ فطانت

تونے ہمیں سکھایا دانش فروز ہونا
تونے ہمیں بتایا۔ ہنگامہ سوز ہونا
اسلاف کے علوم و حکمت کا رازداں ہے
تو اس جہاں میں گویا اک باغِ بے خزاں ہے

ماضی کی نکتہ سنجی۔ ماضی کی نکتہ دانی
افکارِ اہلِ مغرب۔ با صد ضیا فشانی
اسلام کی نظر سے تونے دکھائے ہم کو
اسرارِ علم و دانش تونے بتائے ہم کو

رازی کا رازِ پنہاں۔ فخری کا فخرِ حکمت
یعقوب کا تخیل۔ فارابی کی فطانت
بغداد و قرطبہ کے پُرنور کارنامے
ہم نے تری بدولت عصرِ رواں میں دیکھے

ہندوستاں میں جتنے اربابِ علم و فن ہیں
وابستہ ہیں وہ تجھ سے یا تیرے ہم سخن ہیں
شبلی کی روحِ علمی رگ رگ میں تیری جاری
اے مرکزِ سلیماں۔ ہر چیز تجھ پہ واری

ہندِ جدید میں ہے از ہر کا ہم نوا تو
امت کا راہبر تو۔ ملت کا رہنما تو
بخشی ہے تونے ہم کو فکر و نظر سلف کی
پائی ہے ہم نے تجھ سے گویا خبر سلف کی

ندوہ کا نام روشن ہو بزمِ زندگی میں
پنہاں ہے اپنا رازِ علم و عمل اسی میں
اربابِ علم و دانش تابندہ باد یا رب
دارالعلوم ندوہ۔ پائندہ باد یا رب

علم و عمل کی رو سے یہ گھر ہے ہمارا
ندوہ ہر اک طرح سے ازہر ہے ہمارا

**محمود الحسن قریشی**

# اردو اور سائنس

## ۲

**رضی الدین صدیقی**

اصطلاح بناتے وقت اس امر کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ اس لفظ کے مرکبات اور مشتقات آسانی سے حاصل ہو سکیں۔ مثلاً فرض کیجئے کہ لفظ (Axiom.) کے لئے آپ نے بہار کمیٹی کی سفارش پر اصطلاح "آپ سچ" اختیار کر لی۔ اب بتائیے کہ اس کی جمع کیسے بنائی جائے گی (Axiomatic Method.) اور (Axiomatisation) کے لئے کیا الفاظ ہوں گے۔ غرض وضع اصطلاحات کے موقع پر ایسے ہی باریک نکتوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔

اس کے باوجود اگر اردو اصطلاحوں پر مشکل اور غیر مانوس ہونے کا الزام برقرار رکھا جائے تو پھر میں عرض کروں گا کہ یہ الزام دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں پر بھی اسی طرح عائد ہوتا ہے۔ مثلاً انگریزی میں ایک اصطلاح (Transversal.) ہے اگر ایک لکیر کسی دائرے کو کاٹے تو اس لکیر کو دائرے کی (Transversal.) کہتے ہیں حالانکہ انگریز سائنس داں اس کو (Cas...r) بھی کہہ سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی زبان ہو یا جرمن اور فرنچ صرف معدودے چند اصطلاحیں ایسی ہیں جو شاید عام طور پر استعمال ہونے والے الفاظ سے مطابقت رکھتی ہیں ورنہ بے شمار اصطلاحیں عام زبان سے بالکل مختلف ہیں اور سائنسی ادب میں یہ عمل بالکل ناگزیر ہے۔

غرض عربی اور فارسی سے علمی اردو میں استفادہ نہ کرنے کا جو رجحان آج کل عام طور پر پیدا ہو گیا ہے، وہ اردو کی فطری ترقی اور تقاضوں کے حق میں سراسر ناانصافی ہے۔ ماہرین لسانیات اس پر متفق ہیں کہ ہندی، فارسی اور عربی، اردو کے اہم اور بنیادی ترکیبی عناصر ہیں اس لئے اصطلاحوں کے بناتے وقت سب سے پہلے انہی زبانوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

ہندی زبان سے شروع سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ اردو کی قدیم ترین سائنسی کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی الفاظ کو اصطلاحات کے سلسلے میں مناسب حد تک شروع ہی سے استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہی طریقہ دہلی کالج اور علی گڑھ سوسائٹی کے علاوہ آج کل جامعہ عثمانیہ اور انجمن ترقی اردو میں بھی رائج ہے۔

بقول میر حسن صاحب "اگر اردو زبان اپنی علمی اور سائنسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں ہندی سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی زبان کا سرمایہ زیادہ تر عشق و عاشقی کے مجرد مضامین، مناظر فطرت کی عکاسی، ہندو تصوف و فلسفہ اور روزمرہ کی عام باتوں تک محدود ہے اور ہندی میں علمی اور سائنسی ضرورتوں کو پورا کرنے والے لفظوں کی بہت کمی ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے کہ انگریزی زبان ابتدا میں ترجمہ کے دور سے گزر رہی تھی تو اس نے سائنسی اور علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دیسی زبان یعنی اینگلو سیکسن کے بجائے زیادہ لاطینی اور یونانی زبان سے استفادہ کیا۔ اینگلو سیکسن زبان سے زیادہ استفادہ اس لئے نہیں کیا گیا کہ اس زبان کا سرمایہ تخیلی اور رومانی ادب، شعر و شاعری اور روزمرہ تک محدود تھا۔

غرض میری رائے میں سائنسی اور علمی اردو کی تشکیل اور ترقی کے لئے عربی اور فارسی سے مناسب استفادہ ناگزیر ہے۔ اور اگر مصنوعی طور پر ان کے استعمال کو ممنوع قرار دیا جائے تو ہماری علمی زبان خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکے گی اور ملک کو ہمیشہ انگریزی یا دوسری غیر زبانوں کا محتاج رہنا پڑے گا۔

ایک اور اعتراض اردو اصطلاحوں پر یہ کیا جاتا ہے کہ ہندی الفاظ کے ساتھ عربی یا فارسی کے لاحقے اور سابقے لگائے گئے ہیں اور یہ طریقہ غلط ہے اور اس قسم کے بہت سے لفظ جیسے پان دان اگال دان وغیرہ موجود ہیں۔ اگر نئی اصطلاحیں بھی اسی قدیم اصول پر بنائی جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر زبان میں وسعت اسی طرح پیدا کی جاتی ہے کہ مختلف زبانوں سے ضروری لفظ لے لئے جائیں۔ چنانچہ جدید کوانٹم نظریے میں انگریزی سائنسدانوں نے جرمن اصطلاح (Eigenwert) کا ترجمہ اپنی زبان میں (Engenvalve) کر لیا یعنی جرمن لفظ (Eiger.) کو انگریزی لفظ (Value.) سے ملا کر ایک لفظ بنا لیا۔

غرض علمی زبان کی تشکیل میں اردو ٹیکنیکل اصطلاحوں کے بناتے وقت نہ صرف مختلف علوم و فنون کی واقفیت بھی ضروری ہے اور جامعہ عثمانیہ کے علاوہ انجمن ترقی اردو، ادارۂ ادبیات اردو، جامعہ ملیہ وغیرہ میں انہی اصولوں پر کام ہو رہا ہے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں یہ زبان لوگوں کو قدرتی طور پر نامانوس سی معلوم ہوئی لیکن اب یہی اصطلاحات اخبارات رسالوں اور کتابوں کے علاوہ ریڈیو میں بھی استعمال ہونے لگی ہیں اور جب انگریزی زبان کی مرعوبیت دور ہو جائے گی اور اردو ہندی کے تعصبات سے نجات ملے گی تو اس وقت جامعہ عثمانیہ کی زبان سارے ملک میں تعلیمی زبان کی حیثیت سے عام ہو جائے گی۔ ہندوستان میں آئے دن اردو کی جو کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بہت کم کسی علمی معیار

کو پورا کرتی ہیں ان کی حیثیت سراغ رسانی کے ان افسانوں کی سی ہوتی ہے جن کو لوگ ریل کے سفر میں یا چھٹی کے دن محض وقت کاٹنے اور دل بہلانے کی خاطر پڑھتے ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ اس قسم کی کتابوں کی قطعی ضرورت نہیں، لیکن ان کا تناسب ہمارے ادب کی مجموعی پیداوار میں اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے جتنا کہ ایک سنجیدہ انسان کی زندگی میں تفریح کے اوقات کا ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے اخباروں اور رسالوں کا ہے۔ یوں تو اردو کے سیکڑوں نئے اخبار اور رسالے نکلتے رہتے ہیں لیکن دو چار کے سوا ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو کسی ترقی یافتہ قوم کے رسالوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ بعض اس قسم کی کتابوں اور رسالوں کی بنا پر ہماری زبان اور ہمارے ادب میں ترقی نہیں ہو سکتی۔

کسی شخص کی عمر نوحؑ کی طرح اتنی طویل تو نہیں ہوتی کہ وہ طبع ہونے والے تمام رطب و یابس کو پڑھ سکے۔ اس مختصر زندگی میں کوئی انسان صرف چند منتخب کتابیں ہی پڑھ سکتا ہے اور اس لئے اعلیٰ معیار کی چند کتابوں کا شائع کرنا ناقص معیار کی بہت سی کتابوں کے شائع کرنے سے بہتر ہے۔ مصنفین کے علاوہ ناشرین کو بھی چاہئے کہ جب تک کوئی تصنیف یا تالیف نہایت اعلیٰ معیار پر پوری نہ اترے اس کو شائع نہ کیا جائے۔ پرانی اور فرسودہ باتوں کو دہرانا اپنے اوقات ضائع کرنے کے علاوہ سننے اور پڑھنے والوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اچھا مصنف بننے کے لئے زبان پر مہارت کے علاوہ تین چیزیں نہایت ضروری ہیں

(۱) مشاہدہ (۲) مطالعہ (۳) غور و فکر بدقسمتی سے ان تینوں اجزا کی ہم میں بہت کمی ہے اور اس کمی کی وجہ سے ہماری تقریریں اور تحریریں ایک لایعنی طومار ہو کر رہ جاتی ہیں جن میں چند خیالات کی تکرار اور بار بار تکرار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ ادب اور شاعری میں بڑا عنصر غیبی الہام اور القا کا ہوتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ شاعر اور ادیب تو کجا پیغمبروں پر بھی الہام اسی وقت ہوتا ہے جب وہ پہاڑ کے غاروں میں اپنی عمر کا بڑا حصہ سوچ بچار میں صرف کر دیتے ہیں۔

بہر حال جس طرح محض افراد کی تعداد سے کوئی قوم بلندی کے مدارج طے نہیں کر سکتی اسی طرح محض کتابوں کی تعداد میں اضافہ سے کوئی زبان اور ادب ترقی نہیں کر سکتا۔ پھر اس کے لئے محض افسانوں یا نظموں کی کتابیں کافی نہیں بلکہ شدید ضرورت ہے کہ ہماری زبان میں ہر قسم کی علمی، فنی اور سائنسی کتابیں اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کی اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں شائع ہوں۔ کسی ترقی یافتہ قوم کی زبان مثلاً جرمن، فرنچ یا انگریزی ہی کو لیجئے۔ اس زبان میں بھی معمولی افسانوی اور نظموں کی کتابیں کافی تعداد میں چھپتی ہیں لیکن کیا کوئی سمجھدار شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس زبان کی اس قدر عالمگیر اہمیت محض ان افسانوں اور نظموں کی وجہ سے ہے۔ دنیا کے ہر خطہ میں رہنے والوں کی ایک کثیر تعداد جو اس زبان کو سیکھتی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس زبان میں تاریخ، معاشیات، فلسفہ، عمرانیات، ریاضی، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، انجینیری، طب، قانون، فن تعلیم وغیرہ تمام علوم و فنون کی بیش بہا اور بلند پایہ کتابیں زیادہ شائع ہوتی ہیں۔ اگر ہم اردو زبان کے معیار کو بلند کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ اردو میں اعلیٰ درجہ کی علمی اور فنی کتابیں کثیر تعداد میں شائع کریں جن میں سے بعض ماہرین اور محققین کے لئے ہوں اور بعض عام دلچسپی رکھنے والوں کے لئے۔

اگر پورے ہندوستان کے باشندے نہیں تو کم از کم دس بارہ کروڑ ہندوستانی تو ضرور اردو لکھ پڑھ سکتے ہیں اور بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ جرمن اور فرانسیسی بولنے والوں کی تعداد ابھی اس قدر نہیں لیکن اس کے باوجود یہ زبانیں جیسی کچھ ترقی یافتہ ہیں اس سے کم و بیش سب لوگ واقف ہیں۔ اگر ہمارے ملک کی معاشی اور تعلیمی حالت اچھی ہو تو ہماری زبان کو بھی اس کے ہم پلہ بننے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگے گی لیکن ملک سے جہالت اور پستی کو دور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے کہ علم کی روشنی کو عام کیا جائے اور علوم و فنون کی مختلف کتابوں کا جال سارے ملک میں بچھا دیا جائے۔ اگر یہ کتابیں مسلمہ ماہرین کی لکھی ہوئی ہوں اور اچھے پیرایہ میں لکھی جائیں تو لوگ ان کو ایسی دلچسپی سے پڑھیں گے جیسے آج کل افسانوں کو پڑھتے ہیں۔ یہ ہمارا چشم دید واقعہ ہے کہ انگلستان میں سر جیمس جینز اور سر آرتھر ایڈنگٹن کی کتابیں افسانوں کی کتابوں سے زیادہ مقبول ہوئی ہیں، حالانکہ ان مصنفوں نے جدید ترین سائنسی انکشافات کو بیان کیا ہے۔

اسی طرح ہمارے جلسوں اور کانفرنسوں میں علمی مضامین کو بیش بیش جگہ دینے سے دوگونے فائدے حاصل ہوں گے۔ اول تو یہ کہ اردو زبان میں ہر قسم کے جدید ترین علمی خیالات کے اظہار کی صلاحیت پیدا ہو گی، دوسرے یہ کہ اس سے خود اہل ملک کی ذہنیت میں بڑا انقلاب ہوگا یعنی آج کل نظموں اور افسانوں کو پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے جو غلبہ جذبات کا ان کے دل و دماغ پر ہو گیا ہے اس کی بجائے وہ زیادہ معقولیت پسند ہو جائیں گے۔ اور اس طبیعی کائنات کی حقیقت سے بھی انہیں واقفیت ہو جائے گی۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سائنسی ذہنیت کی ہم میں بہت کمی ہے اور اسی وجہ سے ہمارے اکثر افراد جو تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتے ہیں شاعری اور لفاظی میں گم ہو جاتے ہیں۔ علوم و فنون سے ہماری ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ معمولی سے معمولی ایجاد یا انکشافات بھی ہمارے نزدیک ایک خطرہ سے کچھ کم حیرت انگیز اور ناقابل فہم نہیں۔

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

# کچھ غزل کے بارے میں

(۱)

**محمود اکبر آبادی**

غزل کے بنیادی عناصر کی تلاش کے لئے، پہلے لفظِ غزل کے لغوی معنی اور پھر صنفِ شعر کی حیثیت سے، غزل کے تاریخی ارتقا پر نظر ڈالنی پڑے گی۔

غزل کے لفظی معنی، راز گفتن بمعشوق ہیں۔ غزلیہ شاعری فی الجملہ جذباتی شاعری ہے اور جذبات کے دائرے میں ذاتی تجربے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے غزل کا موضوع بہت وسیع ہے۔ وہ سارے رموز و تاثرات، وہ تمام مسائل و مباحث، جن سے کوئی فردِ واحد دوچار ہوسکتا ہے اور جن پر وہ اپنے ذہنی ماحول اور علمی ساز و برگ کے حدود کے اندر، اپنی محبوبہ سے گفتگو کرنا چاہے، غزل کا موضوع بن سکتے ہیں۔

حقیقی تغزل، اصل میں ہلکی پھلکی، پیاری پیار، لطیف اور نازک باتوں کا نام ہے جو دل سے نکل کر بالراست دل تک پہنچتی ہیں اور پہنچتی ہوئی محسوس بھی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ، بہت سے محسوسات، بہت تجربات کا جی پر بوجھ سا ہوتا ہے۔ ان کی موجودگی سے جیون بھاری بھاری محسوس ہوتا ہے۔ ان کے کہہ ڈالنے سے جی ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے، بھڑاس سی نکل جاتی ہے، دل کی تھکن سی اتر جاتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ خود اپنے نفس میں ان کے کہہ ڈالنے کی شدید خواہش بیتاب معلوم ہوتی ہے اور ان کے کہہ ڈالنے سے خود بہ خود مزہ بھی آنے لگتا ہے۔ اس بوجھ کے اتار دینے کا ایک ادبی نام ( Self-Realisation ) بھی ہے اور یہی تغزل کا مترادف ہے لیکن تغزل کا اقتضا یہیں تک محدود نہیں، بسا اوقات، یہ عظمت و وقار، دقت و عمق، تفکر و تصور کا مطالبہ بھی کرتا ہے، اور ان تمام منازل و کوائف میں رومانیت کی ایک لہر، جمال پرستی کا ایک خفیف شائبہ ضرور شامل ہوتا ہے۔ ان سب سے بالاتر سچی واقعیت ہے۔ رومانیت قلب پر یکسر چھا جاتی ہے، لیکن سچی واقعیت کو رومانیت پر یہ فوقیت ہے کہ وہ قلبِ انسان کو اس مقام پر کھینچ لاتی ہے جہاں دل سجدہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں، سچی رومانیت، خود بیرنگ واقعیت کا دوسرا نام ہے۔ بہرحال، اگر ہلکا پھلکا تغزل، جوہی اور چنبیلی کی بھینی بھینی بو کے پروں پر سوار کر کے، فضا میں لے اڑتا ہے تو گہرا تغزل، جو میر اور غالب کے بیشتر اشعار میں میسر آتا ہے، یونانی حزنیہ کی طرح، تصفیۂ باطن کا موجب بن جاتا ہے۔

اب رہا، غزل کا تاریخی ارتقا، تو اس موضوع پر دو حیثیتوں سے بحث ہوسکتی ہے۔ ایک غزل کی ظاہری اور دوسری اس کی باطنی صورت۔ شعر کی ظاہری صورت کے لئے، میں ہمیشہ پیکر کا لفظ استعمال کرتا ہوں۔ اس مقالے میں بھی یہ لفظ یعنی پیکر انگریزی لفظ ( Form ) کے مترادف کے طور پر بار بار استعمال ہوا ہے۔ ( Form. ) کے لئے ہیئت کا استعمال، میرے خیال میں غلط ہے۔ اس کی ایک پیش پا افتادہ وجہ یہ ہے کہ "ہیئت" ایک علم کا نام ہے اور مدت مدید سے علمی اصطلاح کے طور پر رائج ہے۔ اس لئے ہیئت کے استعمال سے ذہن میں وہ تصور بیدار نہیں ہوتا جو انگریزی شعری اصطلاح ( Form ) کے اندر مرکوز ہے اور جو اس کے ذریعے سے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بیان اپنے مرکز سے ہٹ گیا۔ بہرحال، یہاں غزل کے تاریخی ارتقا سے بحث ہے۔ اس سلسلے میں پہلے غزل کے پیکر کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

غزل کا پیکر، مدت ہوئی عربوں نے وضع کیا تھا جو ایران کے واسطے سے ہندوستان تک پہنچا۔ رسمی بحریں تعداد کے لحاظ سے انیس ہیں اور زحافات کی مدد سے زیادہ ہو جاتی ہیں اور غزل چند بحروں کے علاوہ جو صرف عربوں کے لئے مخصوص ہیں، سب ہی بحروں میں کہی جا سکتی ہے۔ استادوں کے کلام میں کم و بیش سب ہی بحروں کے پیکر میسر آجاتے ہیں۔ بہر عنوان سترہویں صدی کی ابتدا سے، بیسویں کے وسط تک غزل کے پیکر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ولی نے اپنا غزلیہ کلام جس پیکر میں پیش کیا تھا، عہدِ حاضر کا متغزل غزل گو بھی اپنا کلام اسی پیکر میں پیش کر رہا ہے۔

غزل کے پیکر میں تغیر نہ ہونے کا خاص سبب ہے جو اردو فنِ شعر کے اصولوں سے وابستہ ہے۔ اردو شعر کے بعض اصناف، بعض بحروں سے تو ضرور وابستہ ہیں، مثلاً یہ کہ مثنوی اور رباعی کے لئے بحریں مخصوص ہیں لیکن کوئی موضوع کسی خاص پیکر سے مربوط نہیں۔ کہانی اور مرثیہ مثنوی اور مسدس سے بظاہر مربوط نظر آتے ہیں لیکن یہ رابطہ لاینفک بالازمی نہیں ہے۔ تاریخ اس لزوم کا ابطال کرتی ہے۔ نظیر نے کہانیاں مثنوی کے پیکر کے علاوہ، دوسرے پیکروں میں بھی پیش کی ہیں۔ بیسویں صدی کے پہلے ربع میں، چکبست نے راماین کا ایک سین، مسدس کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ سودا کے مرثیے مربع یعنی چو مصرعے ہیں اور حالی نے، غالب کی نوحہ خوانی کے لئے ترجیع بند کا پیکر تجویز کیا ہے۔

غزلیہ صنفِ سخن، بیشک، ایک خاص پیکر میں پیش ہوتی رہی ہے لیکن وہ محسوسات و تاثرات، وہ انفرادی تجربے اور مشاہدے، وہ حقائق و معارف، جن کا نام تغزل ہے، غزل کے روایتی اور مروجہ پیکر کے علاوہ، مثلث، مربع، مخمس اور بعض دوسرے پیکروں میں

بھی بیان ہوئے ہیں۔ بعض استادوں نے مثنوی اور قصیدے کے متن میں غزل پیش کی ہے۔ تضمین جس نوع بیان کا نام ہے وہ بھی کوئی مختلف پیکر اختیار کر سکتی ہے اور تضمین عموماً غزل ہی کی ہوتی ہے۔

ایک پہلو تو یہ ہوا، دوسرا رُخ یہ ہے کہ غزل کا روایتی پیکر، تغزل کے علاوہ اور اصنافِ سخن کا بھی حامل ہے۔ مثلاً یہ کہ سہرا عموماً غزل کے پیکر میں کہا جاتا ہے۔ ہجو، واسوخت اور شہر آشوب جیسے موضوعات کے لئے غزل کا پیکر اکثر استعمال ہوا ہے۔ قصیدہ خود، غزل کے پیکر کی ایک طولانی صورت ہے۔

تو جب غزل کا پیکر، تغزل سے اور تغزل کسی خاص پیکر سے ناقابلِ انفراق رشتے وابستہ نہیں تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو زبان میں نفسِ شعر کو پیکر سے اتفاقی علاقہ ہے، لازمی علاقہ نہیں۔

چنانچہ ظاہر ہے کہ اردو غزل کے پیکر میں تین صدیوں کی مدت میں بھی کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ ارتقا فطرت کا مطالبہ ہے۔ ہر ذی حیات شئے کو، جہد للبقا میں، ماحول سے مطابقت کرنی پڑتی ہے ورنہ وہ فنا ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ اصول اس ماحول میں نافذ ہے جہاں، فرد یا جنس، کی فطرت ارتقا کا جواز پیدا کر دیتی ہے۔ اگر بطون شئے خود مطابقت کا مطالبہ نہ کرے تو ارتقا کے منازل و مراحل پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ غزل کے پیکر میں، اس کی اتفاقی حیثیت کے باعث، کسی تغیر کی ضرورت ہی نہ تھی، اس لئے زمانے کا امتداد اس میں کوئی تغیر پیدا نہ کر سکا۔

انیسویں صدی کے شعری سماج میں بات بات پر سند کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں شاعروں کی اس خُو نے علالت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ رام پور کے دبستان میں یہ مرض، اپنی انتہائی شدت کے ساتھ خیال کی آزادی پر چھایا نظر آتا ہے۔ بیسویں صدی کے دوسرے ربع میں ہم نے ذہنی غلامی کے بہت سے بت توڑ ڈالے ہیں، پابندیوں کی بہت سی بیڑیاں کاٹ دی ہیں، لیکن بعض مشرقی بیڑیاں پاؤں سے نکل، ہاتھوں کی مغربی ہتکڑیاں بن گئی ہیں۔ آج، مرعوب کرنے کے لئے مغربی ادیبوں اور مغربی نقادی کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے۔ اس نوع کے حوالے اعتدال اور دیانت کے ساتھ بالکل جائز اور قابلِ قبول ہے لیکن جہاں ان کا بے جا اثر، مشرقی شاعری کو مشرقی انفرادیت اور مشرقی کیف و رنگ سے محروم کرتا نظر آئے، اس کا ٹھکرا دینا ضروری ہے۔ تنقید، وہ تنقید ہے جو فطری اور داخلی ہو اور جو ادب و شعر کے بطون سے پیدا ہو کر توازن کا اہتمام برقرار رکھے۔

چنانچہ غزل کو مغربی نقادی کے اصولوں سے پرکھنا، غزل کے مزاج کی سچی تشخیص نہیں ہے۔ غزل، خالص مشرقی صنف ہے۔ اور بحیثیت مغربی نقادی کے کانٹے پر نہیں تولی جا سکتی۔ جس طرح بعض مغربی دوائیں ہندستانی مرض کی خو پر کارگر نہیں ہوتیں اور بعض مغربی لذائذ اور مشروبات مثلاً سارڈن اور بیئر، ہندی ذوق و طبیعت سے فی الفور مطابقت نہیں کرتے اور ان کا مذاق کوشش سے پیدا کرنا پڑتا ہے اسی طرح نقادی کے وہ اصول، جو مغرب کے ادب کے نفس سے پیدا ہوئے ہیں، غزل کا پورا پکا جائزہ نہیں لے سکتے۔

حُریتِ خیال کا جو اصول ہم نے مغربی نقادی سے سیکھا ہے، اسی کا مطالبہ ہے کہ، ہم خود اپنے طور پر، جانچیں کہ آیا پیکر کی وہ بحث جو خالص مغربی ادب سے متعلق ہے، مشرقی شاعری پر صادق آتی ہے یا نہیں اور غزل کے پیکر کی لطافت و نزاکت اس بحث کا بارِ گراں برداشت کر سکتی ہے یا نہیں۔ انگریزی ادب میں، پیکر کا بیان سے خاص علاقہ ہے انگریزی فورم (پیکر) لفظوں کی ترتیب اور بیان کے اسلوب کو متاثر کرتا ہے۔ پیکر، بیان کو اور بیان موضوع کو متاثر کرتا ہے۔ ہر موضوع ہر بیان سے اور ہر بیان، ہر پیکر سے مطابقت نہیں کرتا۔ اس لئے ہر موضوع ہر پیکر میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ فن کی روایت بھی، اس نوع کے تداخل میں حائل ہے۔ لیکن اردو شعر کی دنیا میں، بیان، پیکر سے اس حد تک متاثر نہیں ہوتا اور پیکر اور موضوع کے درمیان اتنے موانع حائل نہیں جتنے انگریزی ادب میں ہیں۔ اس لئے پیکر اور موضوع کا راستہ بھی اتنا شدید نہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ اردو کی غزلیہ شاعری کے باب میں، ارتقا کا اصول، حقیقت میں پیکر پر نہیں بلکہ موضوع پر نافذ ہے۔ ہمارا معاشری اور سیاسی ماحول، نفسِ غزل سے اب تغیر کا مطالبہ کرتا ہے اور ارتقا کی قہری قوت، غزل کے موضوع کو برابر متاثر کر رہی ہے۔ پیکر میں تغیر، تناقض کا مترادف ہے۔ جبریہ تغیر ایک نیا پیکر ضرور خلق کر سکتا ہے جو غزل کا پیکر نہ ہوگا اور خود غزل کے پیکر کی موت کا باعث ہوگا۔ اس نوع کی تباہ کاری جسے اصطلاح میں (                ) کہا جاتا ہے، صناعت یا آرٹ کی تاریخ میں کبھی جائز نہیں سمجھی گئی۔

پیکر کے ذکر کے بعد اب میں اردو غزل کے موضوع کا ذکر چھیڑتا ہوں۔ موضوع سے، میرا وہی مفہوم ہے جو عموماً لفظ "مضمون" کے استعمال سے ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں غزل کی لفظی صورت کے لئے "پیکر" اور معنوی کے لئے موضوع استعمال کرتا ہوں۔ غزل کا موضوع وسیع ہے، بہت وسیع ہے اور اتنا وسیع کہ حیات، کائنات اور ماورائے حیات و کائنات، اس کے ظرفِ امکان میں سما سکتے ہیں۔ اس کا بلند، ملاءِ اعلیٰ کو چومتا ہے اور اس کا پست، حضیض زمین کی گہرائی میں لوٹتا نظر آتا ہے۔ شاعری کا وہ عنصر جس کو جدید نقادی آفاقیت کے نام سے موسوم کرتی ہے، غزل کی فطرت سے ہم آہنگ ہے اور بہ آسانی غزل کے قالب میں سمویا جا سکتا ہے۔

اس کا موضوع نہ صرف عالمگیر و ہمہ گیر کو محیط ہے، نہ صرف ان رموز کا مترادف ہے جن کی صداقت ازلی و ابدی ہے بلکہ ایسا دریا ہے جو کوزے میں بھی بند کیا جا سکتا ہے۔ پھیلاؤ کو مختصر اور اشاراتی بنانا، آرٹ کا منتہائے کمال ہے اور غزل کے موضوع، آرٹ کی اس قدرت سے پورا استفید ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ اردو زبان کا سرمایہ شعر و سخن، اتنا حقیر و فرومایہ نہیں، جتنا بعض حلقوں میں سمجھا یا بعض دائروں کی طرف سے بتایا جاتا ہے۔ یہ ذہنیت، کمتری کا شدید احساس ہے اور ذاتی لاعلمی اور بے اعتنائی کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہمارے بہت سے تعلیم یافتہ حضرات کو اردو ادب کا اگر علم ہے تو سطحی ہے اور عرفان تو بالکل نہیں۔ اس کے علاوہ ہم میں سے بعض کو، ٹین کے ڈبے کی مچھلی تازے جہانگیر سے زیادہ لذیذ معلوم ہونے لگی ہے۔ ہم اپنے اخلاق کے محاسن کو اغیار کی کسوٹی پر کس کر کھوٹے کھرے کا فرق سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری محرومی ہے اور سیاسی غلامی سے بدتر لعنت ہے۔ غزل کے باب میں بھی ہمارے بہت سے فیصلے، مغربی نقادی کے بے محل انطباق کی پیداوار ہے۔ غزل کے موضوع کے اجزا، اپنی لطافت اور پاکیزگی کے لحاظ الہامی دو ہی ہیں اور ان شعری قدروں کے حامل ہیں جو انسانی مشاہدہ اور تجربے کے ذخیرے میں منفرد کہی جا سکتی ہیں۔ ان میں عمومیت بھی ہے اور خصوصیت بھی ہے، وہ اجتماعی قلب اور واحد قلب دونوں کی روئداد ہیں اور اپنی اپنی جگہ، دونوں پر صادق آتے ہیں۔ غزل کے موضوع میں شاعرانہ اور فلسفیانہ قدروں کے علاوہ انسانی قدریں بھی معتدبہ مقدار میں شامل ہیں۔

جس وقت اردو زبان کے یہ اشعار زمین پڑھے جاتے ہیں:۔

کہتے ہو کہ غیر کو نہ چاہا ہو — معلوم ہوا کہ تم خدا ہو
میں تری یاد میں ہوں اور کافر — مسجدوں میں نماز ہوتی ہے
دامن دوست کا خیال شام الم جنون کے — اشک غم آؤ پونچھ لیں، اپنی ہی آستین سہی

تو فرشتے عرش پر ساز بجاتے ہیں اور حوریں رقص کرتی ہیں۔

آخری شعر میں جذباتی شاعری کا پورا کیف و اثر، ذاتی تجربے کے عناصر کے ساتھ سمو دیا گیا ہے اور ان سب سے بالاتر حسن بیان کی پوری قوت موجود ہے۔

غزل میں تسلسل کا سوال، پیکر اور موضوع دونوں سے متعلق ہے لیکن بیشتر موضوع سے علاقہ رکھتا ہے۔ اول تو یہ الزام غلط ہے کہ اردو شاعری میں مسلسل غزلیں، بڑی تعداد میں میسر آتی ہیں۔ اقبال اور جوش نے اس خصوص میں نظیر کا اتباع کیا ہے۔ دوسرے غزل میں تسلسل کا فقدان عیب نہیں، ایک حسن ہے جو غزل کی فطرت سے پیدا ہے اور اس کی نوعی خصوصیت ہے۔ ہمیں غزل کو اس کی حدود و تعینات اور اس کی جلب و قبول کی قوت کے دائرے کے اندر جانچنا چاہئے۔ تسلسل، نہ صرف غزل کے فن سے انحراف کا نام ہے بلکہ غزل کی صناعانہ نفاست اور اس کے پیکر کے ہلکے پھلکے پن کے بھی منافی ہے۔ غزل کا ہر شعر فی نفسہ ایک واحدہ (   ) ہے، ایک عالم اصغر ہے، آرٹسٹ کی پیدا کی ہوئی ایک چھوٹی سی دنیا ہے، جس کی صنعتی وحدت زائل دینے سے، اس کی یکتائی، اس کا اچھوتا پن، اس کا جمال، زائل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے علاوہ، فن کے اعتبار سے بھی، ہمیں اس تحریف و تصرف کا حق حاصل نہیں، غزل کا ہر فرد، ایک مکمل نفسیاتی تجربہ ہے، ایک بسیط مطالعہ ہے، ایک وسیع مشاہدے کے نتائج کا حامل ہوتا ہے اور غور و فکر کے لئے غذا بہم کرتا ہے۔ وہ ایک نوع کا صنعتی اشارہ، ایک قسم کی نفیس علامت ہے جو ذہن کو بیدار و ہشیار کر دیتی ہے اور جس کی مدد سے مجرد حقائق کے وسیع میدانوں کی سیر ممکن ہے۔ وہ ایک لوح ہے جس کے نقوش کی رہنمائی سے قلب کائنات کے رموز و حکم کا انکشاف ممکن ہے، وہ ایک شمع ہدایت ہے جس کی روشنی سے زندگی کے غیر محدود و بے پایاں مگر تاریک اور اندھیرے صحراؤں کی وسعت و پہنائی میں راہ مل سکتی ہے۔ جس طرح ماء اللحم کا ایک جرعہ بہت سے مفید و حیات پرور لطیف نشاط آور اجزا کی روح ہوتا ہے، اسی طرح، غزل کا ہر شعر، اپنے پس منظر کا پورے عالم کو محیط ہوتا ہے:۔

زندگی اپنی جب اس طرح سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب کا یہ مقطع، ایک پوری زندگی کے تلخ تجربے کا نچوڑ ہے۔ جن حضرات کو، ہارڈی کی مشہور ہیروئن (   ) کی زندگی کے پے در پے ناکامیوں، اور اندھی، گونگی، بہری فطرت کی بے ہنگام اور پر ستم ظرافت کا علم ہے، وہ جانتے ہیں کہ غالب نے ایک پوری داستان، ان دو مصرعوں میں سمو دی ہے۔ شالامار کی نئی تصویر، امن کی جیت میں، جو ٹیس (   ) کی کہانی سے، بنائی گئی ہے، (   ) یا آرسی کی زبان سے، جوش کا یہ گیت "دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی" غالب کے محرک خیال کا پرتو اور اسی کے انداز بیان کا سچا انعکاس ہے۔ جب ایک پوری واردات محبت، ایک پوری روئداد حیات، ایک شعر میں، اس قدرت سے بیان ہو سکتی ہے تو تسلسل کی اتنی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ محض اس کے فقدان پر غزل کے آرٹ کو ناکمل اور تشنہ ٹھہرا دیا جائے۔

اس کے بعد، اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ غزل کی صنف، اپنے پیکر کی اہلیت اور موضوع کی پہنائی کے اعتبار سے مستقل اور مکمل ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ (باقی آئندہ)

## اردو اور سائنس

بقیہ صفحہ ۲۲

مختصر یہ کہ ملک کی فضا حد درجہ غیر سائنسی ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ سرکاری اور خانگی طور پر علمی اور فنی تحریروں اور تقریروں کی ایسی قدر افزائی نہیں کی جاتی جس کی وہ مستحق ہیں۔ اگر ہماری زبان اور ادب کے معیار کو بلند کرنا ہے تو پھر ان تمام اقدار کو بھی بدلنا پڑے گا اور علوم و فنون کو شعر و سخن کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دینی ہوگی۔

# غزل

شفیق کوٹی

تمہارے درد کو ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
تمہارے عشق کو یہ وردگارِ دل سمجھتے ہیں

محبت کو مرادِ کاروانِ دل سمجھتے ہیں
وفا کو ہم فقط گردِ رہِ منزل سمجھتے ہیں

نہیں زیبا ہمارا شکوہ سنج بے رخی ہونا
یہ کیا کم ہے وہ ہم کو جور کے قابل سمجھتے ہیں

یہ سوچا تھا کہ دل ہی دل میں شکوہ حسن کا کرلیں
مگر مشکل تو یہ ہے وہ زبانِ دل سمجھتے ہیں

وہ کیا جانیں وہ کیا سمجھیں کسی پر کیا گزرتی ہے
جو بسمل ہیں وہی دردِ دلِ بسمل سمجھتے ہیں

بنا ڈالا سراپا دردِ آلام محبت نے
جہاں پڑتیں اٹھتی ہے اسی کو دل سمجھتے ہیں

حرم ہو دیر ہو یا ہو کلیسا یا ہو بت خانہ
جہاں دروشن تمہارے ہوں وہیں منزل سمجھتے ہیں

حوادث سے جہاں بھی کشتیٔ عمرِ رواں ڈوبے
اسی ہنگامۂ طوفاں کو ہم ساحل سمجھتے ہیں

انھیں کی روشنی میں ڈھونڈلیں گے وہ تمہیں اکدن
جو دیوانے مآلِ داغ ہائے دل سمجھتے ہیں

انھیں جب توڑتا ہے کوئی تو دل ٹوٹ جاتا ہے
شفیق ان بتدکلیوں کو ہم اپنا دل سمجھتے ہیں

## اداؤں نے مارا

بڑی خیریت ہوگئی زندگی کی بڑھاپے نے بخشا کچھ آکر سہارا
رہا وقفِ الفت جوانی کا عالم نگاہوں سے تاکا اداؤں نے مارا

بہت کوششیں کیں بہت ہم نے چاہا بہت پاؤں پیٹے بہت ورمارا
ہے سطح پر ہم نہ ڈوبے نہ اچھلے نہ حاصل ہوا بحرِ غم سے کنارا

کلیجے نے بھی چوٹ پر چوٹ کھائی جگر چھن گیا دل ہوا پارا پارا
ستم کی نظر نے تو ناوک بھی پھینکے کرم کی نگاہوں نے کیا تیر مارا

اسی کے سبب ہیں مرے ہوش قائم اسی کا ہے صدقہ جو میں جی رہا ہوں
تری یاد کو دل سے کیونکر نکالوں کہ ہے یہ مری زندگی کا سہارا

مریضِ محبت کا عالم جو دیکھا تو اٹھے یہ کہہ کر مسیح و اطبا
نہیں اس کے بچنے کا اب کوئی نقشا نہیں کوئی جز موت اب اسکا چارا

نہ رکھو قیامت پر انکو اٹھا کر نہ جانے قیامت میں ہو کیا قیامت
یہ دنیا کے جھگڑے ہیں دنیا میں طے ہوں یہیں فیصلہ ہو ہمارا تمہارا

یہ کیا مجھ کو سوجھا یہ کیا ان کو سوجھی جو بیٹھے بساطِ محبت بچھا کر
برابر کی بازی لڑی بھی برابر نہ وہ مجھ سے جیتے نہ میں انسے ہارا

نہ کچھ اور روداد غم ان کو لکھیں جو لکھیں تو خط میں یہ ہم انکو لکھیں
ستم تو جو ہونے تھے وہ ہو چکے سب کرم اب تو کچھ ہم پہ کیجے خدارا

یہ مانا نئے تم ہو دنیا نئی ہے مگر بات کچھ اہلِ ماضی کی بھی ہے
آزل رنگِ بازارِ الفت یہی ہے یہاں نفع و بیشتر ہے خسارا

آزل شاہجہانپوری

## غزل

جو ہے مری نگاہ میں حسن کا وہ جہاں ہے اور
دسترسِ نظر سے دور وہ کوئی آسماں ہے اور

تیرا خیال ہے غلط بات ہی رازداں ہے اور
تیرا گمان کچھ بھی ہو میرا گمان ہے اور

میں تو قفس نصیب ہوں۔ تجھ کو خبر ہے ہم صفیر
جس پہ گری ہیں بجلیاں کیا کوئی آشیاں ہے اور

جس کی بہار ہو خزاں۔ داغ ہی جس کے پھول ہوں
دل کے سوا جہان میں کیا کوئی گلستاں ہے اور

بڑھتی ہیں اور الجھنیں دل کو نہ کشمکش میں رکھ
صاف بتا پیامبر! مجھ سے وہ بدگماں ہے اور

اس میں وہ دل کشی کہاں اس میں یہ بے لسبی کہاں
قصۂ عشق اور ہے حسن کی داستاں ہے اور

دیر و حرم کا امتیاز مٹنے نہ پائے عشق میں
سجدۂ شوق ہے روا جس پہ وہ آستاں ہے اور

لے تو چلا ہے ساتھ ساتھ جذبۂ بے خودی مجھے
راستہ میرا اور ہے جادۂ کارواں ہے اور

درد کی جستجو نہیں۔ سوز کی آرزو نہیں
آج تو دل کا حال ہی رمزیؔ ناتواں ہے اور

رمزی بھوپالی

# ھندوستان میں ہوائی جہاز



ہوائی جہازوں سے متعلق ایک ہندوستانی کارخانے میں ایک چیف انسٹرکٹر «کیٹیلینا» نامی اڑن کشتی کے انجن پر کھڑوں بیٹھا دو مبتدیوں کو ہوائی انجن کی ساخت اور کل پرزوں کا طریقۂ عمل سمجھا رہا ہے۔

ہندوستان میں ہوائی جہازوں کی صنعت نے دوران جنگ میں جنم لیا اور بڑی تیزی سے فروغ پانا شروع کر دیا۔ سرکار اور نجی کارخانے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں کھل گئے۔ پہلا جہاز بھی ۱۹۴۱ء میں بنایا گیا۔ ان تمام کارخانوں نے اتحادیوں کی بڑی مدد کی، خصوصاً ان ہوائی فوجوں کی جنھوں نے اپنے مورچے ہندوستان میں لگا رکھے تھے۔ کارخانے مرمت، جڑائی اور دیکھ بھال کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اگرچہ ماہرفن کاریگروں کی بڑی کمی تھی اور صحیح اوزار نایاب تھے تاہم ان کارخانوں نے بہت سے فالتو پرزے وغیرہ بنا ڈالے جن میں وہ خاص قسم کی ٹنکیاں بھی ہیں جن کو دیسی سامان سے تیار کیا گیا ہے۔ اب لڑائی ختم ہوچکی ہے لیکن



ایک کاریگر جہاز کے اندرونی حصے میں ایک پیچ کس رہا ہے۔

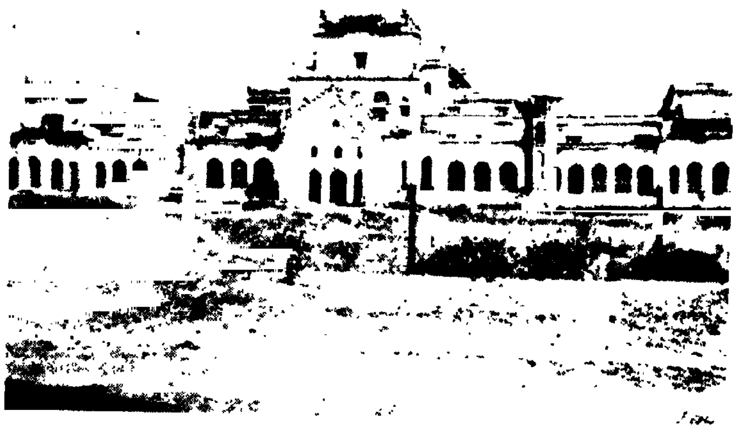
کارخانوں کو بند کرنے کی بجائے زیادہ وسعت دینے کے خاکے مرتب کئے جارہے ہیں تاکہ ضروریات عامہ کو پورا کرنے کے لئے فضائی محکمہ اچھی طرح ترقی پاسکے۔



ایک اڈا کا ہوائی جہاز میں اسلحے اور گیر لگائے جا رہے ہیں۔

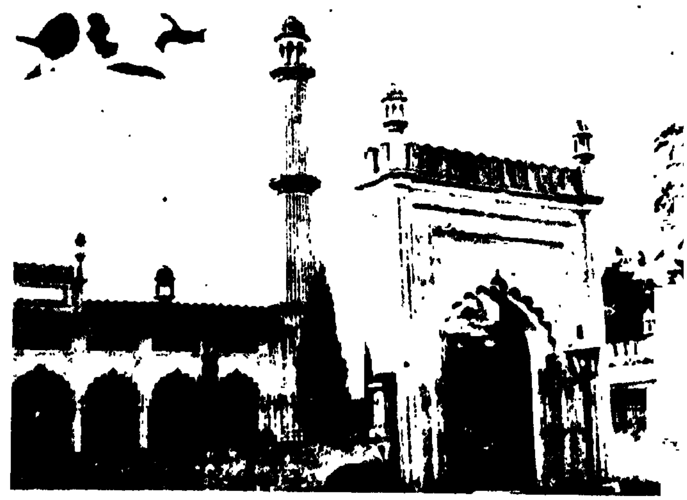
# دارالعلوم ندوۃ العلما

۱۸۹۲ ع میں کانپور کے مشہور مدرسے "فیض عام" کا جلسہ ہو رہا تھا اور بہت سے علما جمع تھے۔ اس وقت سب نے اس زبردست کمی کو محسوس کیا کہ ہمارے ملک میں دنیا کے دوسرے اسلامی ممالک کی طرح کوئی ایسی بڑی درسگاہ نہیں ہے جسے مذہبی تعلیم و تنظیم کا مرکز قرار دیا جاسکے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ حاملان مذہب و ملت اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کیلئے کمربستہ ہوگئے اور لکھنؤ شہر سے باہر ایک پر فضا اور پرسکون مقام پر "ندوۃ العلما" کے نام سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھدی اس میں تمام مذہبی موضوعات پر اعلی تعلیم شروع ہوگئی۔ اب اس ادارہ کا انتظام ایک مجلس کے سپرد ہے جو بچھتر ارکان پر مشتمل ہے۔ درسگاہ کے دارالاقامہ میں تقریباً ہر حصۂ ملک کے طلبا رہتے اور فیض علمی حاصل کرتے ہیں۔ مفصل مضمون اسی شمارے کے صفحہ ۱۷ سے ملاحظہ کیجئے۔ صفحہ ۲۰ پر ندوہ سے متعلق ایک نظم بھی شریک اشاعت ہے۔



درسگاہ کی شاندار دومنزلہ عمارت

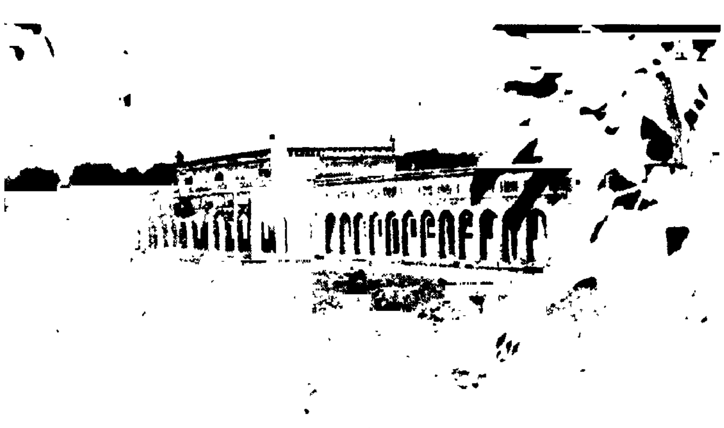
✡



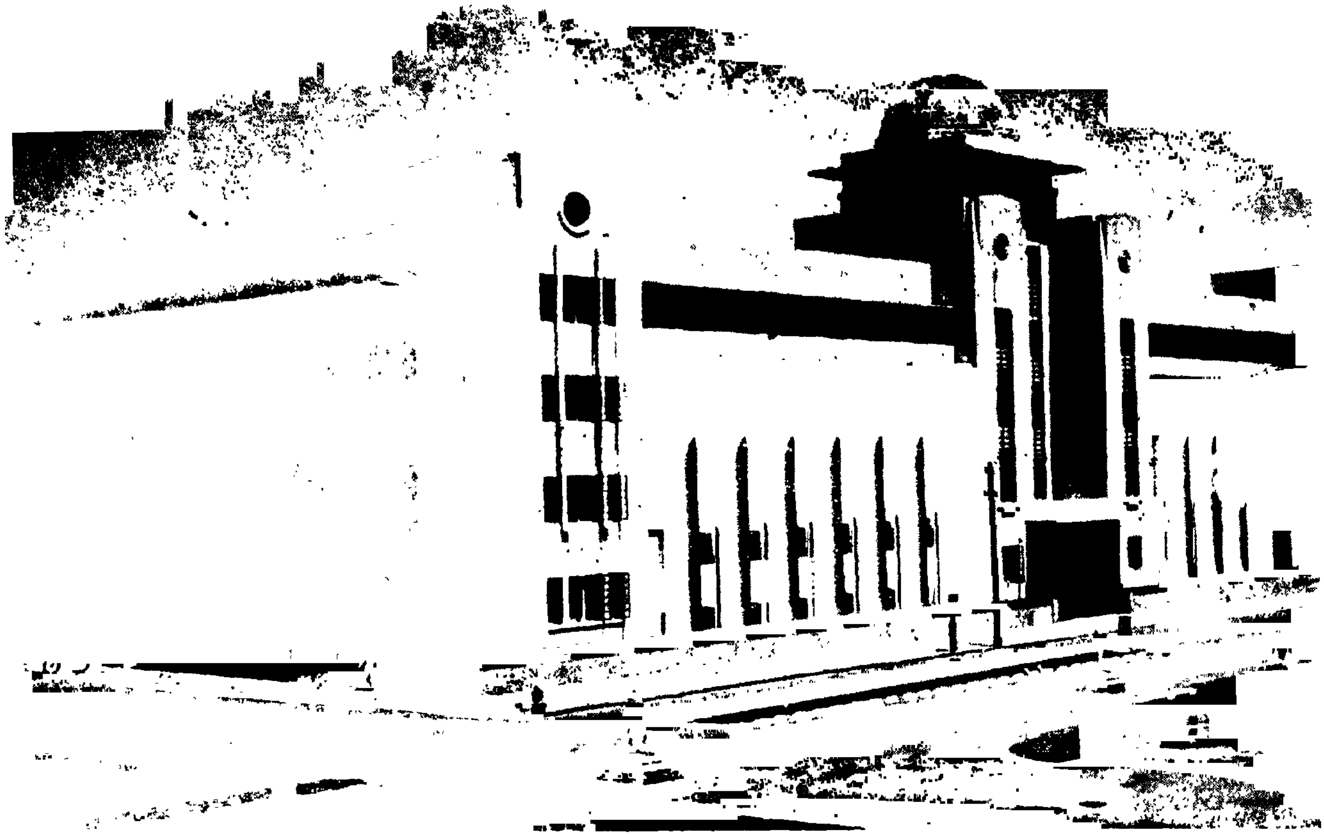
شاہی مسجدوں کے نمونے پر بنی ہوئی مسجد جو دارالعلوم کی عمارتوں کے درمیان واقع ہے۔

✡

✡



عمارت کا ایک اور خوشنما منظر۔ ←



میونسپل کمیٹی کی شاندار عمارت۔

# سندھ کا صدر مقام ۔ کراچی

ہندوستان کے مغربی ساحل پر کراچی صوبہ سندھ کا صدر مقام اور مشہور تجارتی بندرگاہ ہے۔ تجارت کے سلسے میں یہاں مختلف قوموں کے لوگ حتی کہ عرب اور ایرانی بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ عہد قدیم میں بھی شرق وسطی کے تمام ممالک کے ساتھ ہندوستان کی تجارت اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ موتیوں کے تاجروں سے لیکر گھوڑوں کے سوداگر تک ہر قسم کے کاروباری آدمی یہاں نظر آتے ہیں۔ یہاں بہت بڑا فضائی اڈا پہلے سے قائم ہے۔ اب ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی تجویز بھی زیر غور ہے۔ شمالی

—:o:—

ہند کیلئے جتنا بھی غلہ بیرونی ممالک سے آتا ہے اسی بندرگاہ پر اترتا ہے۔ یہاں روئی کی بہت بڑی منڈی ہے۔ اس شہر کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے۔

—:o:—



اس عمارت کے اندر روئی کی زبردست منڈی ہے۔

عرب
نیویورک کے
ھیں جن میں
سے دنیا کے ب
ھی میں فریا
صفحے کی تص
بالائی حصے
ھے۔ یہ جوا
علاقے میں ھ
آتے جاتے ھیر
اقتدار حاصل
ان کا احترام
زیب و زینت



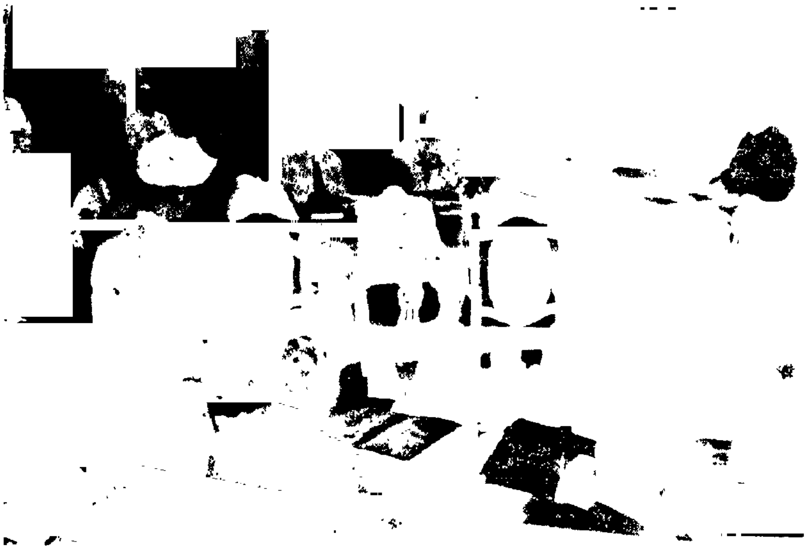
اٹھلواں ٹوکریوں میں اناج پھٹکتے وقت کسان عورتیں بڑے بڑے ھیٹ اوڑھ لیتی ھیں تاکہ چہرے تیز دھوپ سے بچے رھیں۔

خشک صحرا میں ایک شاداب مرغزار۔ بند ک



حضرموت میں نیویورک جیسے اسکائی اسکریپر۔

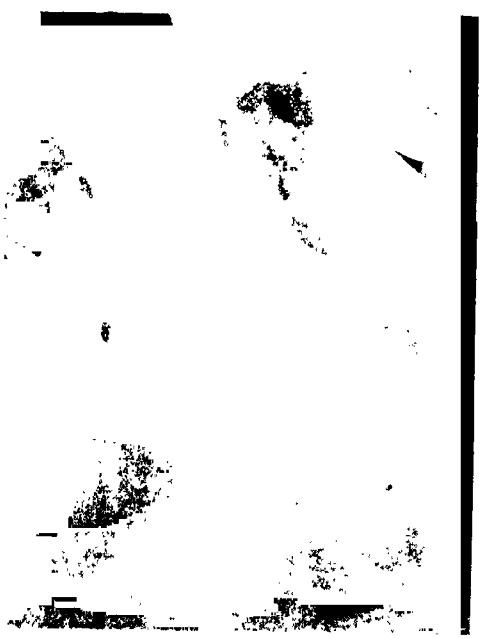




جلسے میں سر ایس۔ رادھا کرشنن تقریر کر رہے ہیں۔

# ماہرین اثریات

: ستمبر کو نئی دہلی میں محکمہ اثریات کی مرکزی
ہلس مشاورت کا ایک جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس
ں محکمے کے ڈائرکٹر جنرل مورٹیرو ہیلر نے
ی تقریر میں ہڑپا اور موہنجودارو کے آثار
یمہ کا حوالہ دیتے ہوئے ثابت کیا کہ عہد قدیم
ں وادیٔ سندھ اور عراق کے رہنے والوں میں
دست ثقافتی تعلقات قائم تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں
۔ یہ بھی بتایا کہ دونوں جگہ کے باشندے اپنے
دوں کو یکساں طریقے سے دفن کرتے اور اپنے
ہروں کے گرد پختہ اینٹوں کی دیواریں بناتے تھے۔



## امن کانفرنس کے نمایندے

پیرس والی امن کانفرنس کے ہندوستانی نمائندوں کے اعزاز میں سرسیموئل رنگا نادھن نے ایک پرتکلف دعوت دی ۔ یہ تصویریں اسی موقعہ پر لی گئی تھیں۔



برطانیہ کے ناظم خارجہ مسٹر ارنسٹ بیون سرراگھون پلائی اور سر سیموئل رنگانادھن کے درمیان تشریف فرما ہیں۔

رطانوی بحریہ کے پہلے لارڈ مسٹر اے وی الیگزنڈر
عوت ختم ہونے کے بعد ہندوستانی نمائندوں سے
گفتگو کر رہے ہیں۔

# ثقافتی جلسہ



حال ہی میں حیدرآباد کی عرب
کچرل ایسوسی ایشن کا ایک عام
جلسہ ہوا جس میں ریاست کے علم
دوست حضرات نے بھی شرکت کی۔
جلسے کی صدارت حیدرآباد کے
مفتیٔ اعظم مولانا عبدالقادر بدایونی
نے فرمائی جو تصویر کے بیچ میں
رونق افروز ہیں۔



طاق بستان کا ایک حصہ۔ یہ ایران کی قدیم عظمت کا ایک روشن نمونہ ہے۔ یہ مضبوط عمارت کرمان شاہان کے قریب واقع ہے۔

# ایران میں نقاشی کا ایک قدیم شاہکار

طاق بستان کے باہر محراب کے اوپر یہ دلکش نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ دو فرشتے تاج کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ پچھلی دیوار دو حصوں میں منقسم ہے۔ نیچے کے حصے میں ایک زرہ پوش سوار ہے جس کے ہاتھ میں نیزہ ہے۔ اس دیوار پر نقاشی کا کام بہت اعلی اور نفیس ہے۔ اوپر کے حصے میں تین آدمی نظر آرہے ہیں جن کے بیچ میں بادشاہ ہے۔ اس کا ایک ہاتھ تلوار کے قبضے پر ہے۔ دونوں طرف شکار کے دو میدان ہیں۔ مغربی دیوار میں ایک بادشاہ کی تصویر ہے جو کشتی میں بیٹھا ہے اور ایک سؤر کو مار رہا ہے۔ ہاتھی شکار کا پیچھا کر رہے ہیں۔ رقاصائیں ساز بجا رہی ہیں۔ ایک طرف کچھ آدمی شکار کئے ہوئے جانوروں کی کھال اتار رہے ہیں۔ دائیں طرف کی تصویر نامکمل ہے۔

وہ ہرنوں کی شکار گاہ کا منظر پیش کرتی ہے۔ بادشاہ گھوڑے پر سوار ہے۔ عورتیں دائیں طرف تخت پر بیٹھی ہیں۔ چھوٹے دالان کی تصویریں اہمیت کے لحاظ سے بڑے دالان کی تصویروں کے برابر نہیں ہیں۔ کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام بن شاپور بن نرسی کے عہد میں یہ عمارت تعمیر ہوئی تھی۔ اس دالان کے داھنی طرف کی دیوار کے نقش میں دکھایا گیا ہے کہ بادشاہ کسی قیدی کے سینے پر پیر رکھے کھڑا ہے۔ اس کے قریب کے میدانوں میں ساسانی زمانے کے ستونوں کے بالائی حصے ملا ہے۔ اثریات کے ماہرین نے ان میدانوں میں باقاعدہ کھدائی نہیں کی ہے لیکن بارہا ہل چلانے اور زمین کھودنے کے دوران میں کسانوں کو ساسانی سکے مل جاتے ہیں۔

# برطانیہ میں مسلمان



کارڈف کی نئی مسجد کے افتتاح سے پہلے ساؤتھ ویلز کے مسلمان اپنے قائد شیخ حسام اسمعیل کے ساتھ مسجد میں داخل ہو رہے ہیں۔

مغربی دنیا کے مسلمانوں میں کارڈف کے رہنے والے مسلمان وسیع اور خوشحال گھرانوں کے رکن ہیں۔ ان میں عدن اور عربستان کے باشندے شامل ہیں۔ ۴۱-۱۹۴۰ء میں جب اہل جرمن نے کارڈف پر حملہ کیا تو نازی بموں سے مقامی مسجد بالکل فنا ہوگئی۔ تاہم مختلف ذرائع سے روپیہ جمع کرکے مسجد کو دوبارہ تعمیر کرلیا گیا اور ساتھ ہی ایک اسلامی ثقافتی مرکز قائم کیا گیا۔ دونوں کا افتتاح بڑے شاندار طریقے پر ہوا۔ یہ جشن تین دن تک منایا گیا۔ ویلز کے مسلمانوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شریک ہوئے۔ مسجد کے باہر کارڈف کے لارڈ میئر نے گذشتہ ہفتہ ایک جلسے کی صدارت کی۔



کارڈف میں ایک مسلمان بچہ اذان کی آواز سنکر اسکی طرف متوجہ ہے۔ یہ ان خاندانوں میں سے ایک خاندان کا رکن ہے جو عرب سے ساؤتھ ویلز آکر آباد ہوگئے۔



کارڈف میں مسلمان بچوں کو قرآن شریف کی تعلیم قائدشف دیتے ہیں اس سے پہلے یہ جہازران تھے۔ لیکن ناروے کے محاصرہ میں جب انکے جہاز کو تارپیڈو کے ذریعہ اڑادیا گیا اور یہ جسمانی طور پر معذور ہوگئے تو انہوں نے خلوت نشینی اختیار کرلی۔



ممتاز شانتی ـ آسمان فلم کا ایک مسکراتا ستارہ۔

# حضرموت

، جنوب میں حضرموت ایک مشہور مقام ہے۔
کے اس حصے میں بھی اونچے اونچے اسکائی اسکر یپر
ربی طرز تعمیر کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس وادی
سیاح گذرے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کا انکشاف حال
کی تصویروں اور تحریروں سے ہوا ہے۔ اس
، کی ایک کتاب سے لی گئی ہیں۔ حضرموت کے
زمانے کا ایک شاداب شہر صیبون اب بھی موجود
نوں اور کھجور کے باغوں سے بٹا پڑا ہے۔ اس
، و عافیت کی فضا قائم رہتی ہے۔ لوگ اطمینان سے
کہ یہاں کے حکمراں سلطان علی کو پوری طرح
، صرف غلام فرمانبردار ہیں بلکہ بدو لوگ بھی
ں۔ شاہی محل میں ایک عالیشان ایوان ہے جسکی
ستونوں اور نرم غالیچوں نے دوبالا کر رکھی ہے۔



ایک خوبصورت بچی اپنے بہترین لباس میں۔

کو کھجور کے درختوں نے گھیر رکھا ہے۔



جوار کے کھیتوں میں کسان عورتیں بڑے بڑے نکیلے ہیٹ سر پر اوڑھے اور ڈھیلے ڈھالے نیلے لباس زیب تن کئے نظر آتی ہیں۔ سرراہ کھجوروں کے زیر سایہ پانی کے ایسے بہت سے حوض نظر آتے ہیں جن پر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گنبد پاس سے گذرنے والے پیاسوں کو فوراً دعوت کام ودہن دینے لگتے ہیں۔ عورتیں چھوٹی چھوٹی صراحیاں سروں پر اٹھائے ڈھیلے ڈھالے نیلے لباس پھڑکاتی ہوئی ایک قطار میں آتی اور پانی بھر بھر کر لے جاتی ہیں۔ دلہنیں اپنی روایتی شان کے مطابق اونٹوں پر بیٹھ کر سسرال جاتی ہیں لیکن دولہا نئی وضع کی موٹرکار کو ترجیح دیتے ہیں۔

# لکڑی کے کھلونے

ہندوستان میں کھلونے بنانے کا فن گھریلو صنعت کے طور پر قدیم ترین زمانے سے برابر فروغ پاتا رہا ہے۔ آجکل بھی بنارس' لکھنو اور میسور کے بنے ہوئے کھلونے ہر شہر کے بازاروں میں خوب بکتے اور پسند کئے جاتے ہیں۔ چونکہ بچے مٹی اور ٹین کے مقابلہ میں لکڑی کے کھلونے زیادہ پسند کرتے ہیں اسلئے اس صنعت کو وسیع پیمانے پر اختیار کرنے کیلئے بہت سے کارخانے کھل گئے ہیں جہاں سینکڑوں کاریگر صبح سے شام تک نت نئی وضع کے ایسے کھلونے بناتے رہتے ہیں جو ملک کے لاکھوں بچوں کی خوشی اور دلچسپی کا باعث بن سکیں۔ عام طور پر لکڑی کے کھلونوں پر لاکھی رنگ چڑھاتے ہیں لیکن بعض کی سطح اتنی چکنی اور دیدہ زیب بنادی جاتی ہے کہ کسی قسم کے رنگ و روغن کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔



لکڑی کی ان گھوڑا گاڑیوں پر روغن چڑھایا جارہا ہے۔ سب سے پہلے سفید رنگ کی تہ چڑھائی جاتی ہے۔



رنگ و روغن ختم ہونے کے بعد کیلیں' پیچ اور تار وغیرہ لگائے اور باندھے جاتے ہیں۔



اس تصویر میں ایسے کھلونے دکھائے گئے ہیں جو تک سے سک تیار ہوچکے ہیں۔

# قفقاز

قفقاز ایشیائے کوچک کا ایک مشہور یخی ملک ہے۔ پریوں کی اس زمین میں جو سیاح بھی ایک بار نچ گیا وہاں ہر چیز پر مائل ہوکر گیا۔ سر سبز و شاداب پہاڑ‘ تیزی ے بہتے ہوئے صاف و شفاف دریا ر کھلے میدانوں کے قدرتی مناظر شخص کا دل موہ لیتے ہیں۔ کسی مانے میں یہاں کے راستے مشکل اور



پسانور کے مقام پر سڑک کے بالکل قریب چند دیہاتی عورتیں اور لڑکیاں دم لینے کے لئے رک گئی ہیں۔

✡

دشوار گذار تھے لیکن اب وسیع اور ہموار سڑکیں بن گئی ہی جن کے ذریعہ پڑوسی ملکوں کے ساتھ اسکا سلسلہ قائم ہوگیا ہے باشندے زیادہ تر کاشتکار ہیں لیکن وہ زراعت کی جدید ترین مشینوں سے کام لیتے ہیں‘ حتی کہ بیج کے طور پر چاول ہو؛ جہازوں کے ذریعہ بویا جاتا ہے۔

✡



پہاڑی علاقے کا رہنے والا ایک دیہاتی اپنی بیوی سمیت طماں آکر سرراہ لگی ہوئی دوکان سے کچھ چیزیں خرید رہا ہے۔



قفقاز کے پہاڑوں کا ایک دلکش نظارہ۔ ←



نینا – ایک فلمی ستارہ۔

## عزائم

حرماں خیرآبادی

مٹا دیں آپ کو گو لاکھ ہم الفت کی راہوں میں
مگر فطرت کو ملتا ہے مزہ کچھ رزم گاہوں میں

بس از خلد بریں انجام آدم اور کیا ہوتا؟
بڑی مشکل سے پائی عافیت، وہ بھی گناہوں میں!

بہت در پردۂ ارض و سما ان کو نہاں پایا،
تجسس ہے بلا، رہنے لگے آخر نگاہوں میں!

دل عاجز نہ ہو ممنون کیوں کر اس کی قدرت کا
مجھے بخشی گئی، جو تمکنت ہوتی ہے شاہوں میں!

ہمیں ناقص سمجھنے والے رضواں پر یہ واضح ہو
کہ وہ انسان گم ہے فکر کی دشوار راہوں میں

پہونچتی تو نظر کیوں کر پہونچتی حسن بستاں تک
یہاں تو ذوق دل ٹھہرا خزاں کی خیرخواہوں میں

زمانے کو بہ لطف یک نظر جنت بنا دیتا
بشر ہی تھا، الجھ کر رہ گیا کلفت کی راہوں میں

مسرت کے تمنا دار یوں تو غم بری شے ہے
چھلک جاتے ہیں اکثر شکر کے جذبات آہوں میں

گذر آہستہ اے تاراج گر! آثار ہستی سے
یہ کشتے سو رہے ہیں دامن دل کی پناہوں میں!

عروس زر کی عالم میں ہوئی بے پردگی ایسی
کہ آخر میکدے کھلنے لگے پھر خانقاہوں میں

یہ نجم و مہر و مہ سب صدقۂ نوع بشر ہوں گے
ابھی تو چند ہیرے جگمگاتے ہیں کلاہوں میں

عزائم بھی گذر جائیں گے برسے کی طرح حرماں
موانع گو پہاڑوں کی طرح حائل ہیں راہوں میں

## غزل

اقبال عظیم

مجھے خبر نہ تھی، احساس زندگی کی قسم
کہ روٹھ جاؤ گے تم اپنی بے بسی کی قسم

میں اپنے غم سے بھی ہوں مطمئن، خدا شاہد
جو مجھ سے روٹھ چکی ہے اسی خوشی کی قسم

جو تیری یاد میں ٹپکا وہ اشک حاصل غم
جواب نہ آئے کی ہونٹوں پہ اس ہنسی کی قسم

فریب دیدہ و دانستہ کھا رہا ہوں میں
تری نگاہ کی معصوم سادگی کی قسم

تری تلاش میں کھو کر، میں پا گیا سب کچھ
جو مجھ کو راس نہ آئی اس آگہی کی قسم

مری نگاہ کو اب بھی ہے تاب نظارہ
نقاب اٹھا تجھے دل کی شکستگی کی قسم

یہ تو نے کیوں مجھے بیٹھے بٹھائے چھیڑ دیا
میں اپنے حال میں خوش تھا تری خوشی کی قسم

کسی کے کام نہ آ کے کسی کے ہو نہ سکے
کچھ ایسے کھو گئے اقبال بے خودی کی قسم

## غزل

تسکین قریشی

ابھی تک ہے یہ راز سینہ بہ سینہ
محبت میں مرنا ہے مشکل کہ جینا

نہ ہو جب تک آہوں سے آباد سینہ
محبت کی ہر آرزو بے قرینہ!

وہی عظمت زندگی سے ہیں واقف
کہ طوفاں سے گذرا ہے جن کا سفینہ

غم عشق سے زندگی، زندگی ہے
جو مرنا نہ جانے وہ کیا جانے جینا

نہ احساس طوفاں، نہ امید ساحل
نہ جانے کہاں جا رہا ہے سفینہ

تری آرزوئے محبت کے صدقے
مجھے آگیا زندگی کا قرینہ

کچھ ایسے بھی ساحل ہیں اپنی نظر میں
کہ آ کر جہاں ڈوبتا ہے سفینہ

ترے لطف سے دن گذرتے ہیں تسکیں
کہ اب دل کا ہر زخم ہے تا بہ سینہ

# آخری دیدار

فضل النقوی لکھنوی

ستارے دھیرے دھیرے چمک رہے ہیں۔ چاند چپکے چپکے نکل رہا ہے۔ اداسیاں جنگل کی گود میں پھیل رہی ہیں، فوجوں کے خیموں میں جلتے ہوئے چراغوں کا عکس دریا میں تیر رہا ہے۔ سورج کی گرمی جذب کئے ہوئے ذرات دہک رہے ہیں، زبانیں چپ ہیں لیکن رن بول رہا ہے۔ بار گھٹنے کو سیاہ پردہ اٹھ جانے کے بعد وہ خونی سین پیش ہونے والا ہے جس کے لئے تاریخ کے سادے اوراق کروٹیں بدل رہے ہیں۔ اگر لڑائی ملک گیری اور جاہ طلبی کے لئے ہوتی تو شاید اتنی جاذبیت اور روحانیت پیدا نہیں ہوسکتی تھی کہ بیویاں اپنے شوہروں کے، بہنیں اپنے بھائیوں کے، اور مائیں اپنے بیٹوں کے دلوں میں جنگ کرنے اور بات پر مر جانے کا طوفان پیدا کرتیں جینے کی نہیں بلکہ مرجانے کی تمنائیں کرتیں۔

جوان بیٹا! اٹھارواں سال، ستارے سے زیادہ پیارا۔ چاند سے زیادہ خوبصورت، بڑی آنکھیں، اونچی پیشانی، چوڑا سینہ، بھرے بازو، سرخ و سفید رنگ۔ جب انگڑائی لیتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ :-

"کہکشاں ٹوٹ کے ہاتھوں پہ اتر آئی ہے"

جب سفید رنگ کے عربی گھوڑے پر بیٹھ کر نیزے کو ہوا میں گردش دیتا ہوا ماں کی نگاہوں کے سامنے سے گذر جاتا ہے تو یہ نظر آتا ہے کہ چاند کے چہرے پر ہالا گھوم رہا ہے۔

تیرہ سو سال پہلے آپ کے تصورات ایسے میدان جنگ کو دیکھ رہے ہیں جو اپنے بعض خصوصیات کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک جانب دولت ثروت، سلطنت، اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار فوج کا موجیں مارتا ہوا سمندر، میلوں تک آلاتِ حرب کی جگمگاہٹ، زرق برق لباسوں چمکتی ہوئی سنہری روپہلی زرہوں اور دور تک پھیلے ہوئے خیموں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ دوسری طرف، بہتّر انسان۔ جن میں چھ ماہ سے لے کر بارہ سال تک کے بچے اور اسّی نوّے برس کے بوڑھے بھی شامل ہیں۔ اور جنگ صرف حق و صداقت پر ہونے والی ہے!۔

اگر کسی سلطنت کا بادشاہ ذاتی عیش و عشرت میں پڑ جائے، غریبوں کی زندگی کو کڑوا بنا کر روحانیت کو مادیت سے دبا دے، مندروں مسجدوں، اور گرجاؤں کو مسمار کر دے۔ ساقیوں کی نگاہوں میں عقیدت گھوم رہی ہو اور شراب کے جام میں مذہب چکر کھا رہا ہو جھوٹ بولنا ہنر، زناکاریاں عام اور ظلم و تشدد واجب ہو۔ اس کے خلاف اگر چند آوازیں بھی بلند ہو جائیں تو بہت ہوتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آوازوں کو کسی مذہب کے کانوں سے سنا یا کسی قوم کی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ کیونکہ جو جنگ انسانیت کے تحفظ۔ اور حق کی بقا کے لئے ہوتی ہے اس کی حمایت ہر انسان پر لازم ہوتی ہے۔ خواہ اس کا تعلق کسی ملت، کسی جماعت اور کسی مذہب سے کیوں نہ ہو۔

"مادر گرامی مجھے کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے"

جوان بیٹے نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں بیٹا۔ دن بھر تو گھوڑے کی زین پر کٹ گیا۔ آ میرے اندھیرے گھر کے چراغ میری آنکھوں میں سو جا" ماں نے جواب دیا۔ بیٹے نے کمر کھولی، خود۔ زرہ اور دستانے اتارے۔ نیزے کو خیمے کے ایک کونے پر رکھ کر اس پر ڈھال رکھی اور چاہنے والی ماں کے زانو پر سر رکھ لیٹ گیا۔

تھوڑا پانی تو نہ ہوگا؟ — بیٹے نے ماں کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

ماں۔ نہیں بیٹا — بھلا، پانی کہاں۔ آج تیسری رات ہے کہ تمہارا چھوٹا بھائی اور تمہاری چھوٹی بہن پیاس سے تڑپ رہی ہے۔

بیٹا۔ (تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد) نیند نہیں آتی ماں۔ جب سوتا ہوں حلق کی خشکی میں سانس الجھتی ہے اور پھر آنکھ کھل جاتی ہے۔

ماں۔ کیا کروں بیٹا۔ تین دن سے مشکیزوں نے پانی کی صورت نہیں دیکھی۔ ورنہ سوچی تھی کہ اگر کوئی گیلی مشک ہوتی تو وہی تیرے پھنکتے ہوئے سینے پر رکھ دیتی۔

بیٹا۔ ایک تو گرمی دوسرے پانی کی نایابی۔ یہ معلوم ہو رہا ہے کہ میرا سینہ میدان جنگ کی طرح دہک رہا ہے۔

ماں۔ سو جا بیٹا۔ ممکن ہے نیند آنے سے پیاس میں کمی ہو جائے۔

بیٹا سویا تو کیا۔ بیٹھتے ہوئے دل نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر دیں۔ یا دوسرے الفاظ میں غش آگیا۔

رات کے لمحے بڑھ رہے ہیں، ماں کی امیدیں گھٹ رہی ہیں، نوجوان بیٹا آرام کر رہا ہے، خیمے کی فضا میں سکون ہے، ماں آنکھوں میں آنسو بھرے، ٹکٹکی باندھے، نگاہیں جھکائے، ہاتھ میں شمع لئے اس چراغ کی ضو پر نظر جمائے ہے جس کو دنیا کی دوسری شام دیکھنا نصیب نہ ہوگی۔ بیٹے کی زلفیں سلجھ رہی ہیں اور ماں کی قسمت الجھ رہی ہے۔ دل دھڑک رہا ہے، آنسو برس رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ماں اپنے وارث سے اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہے کہ "جس طرح ممکن ہو میرے بچے کو چمکتی ہوئی تلواروں، اور لو دیتی ہوئی برچھیوں کی زد پر نہ بھیجو" کیونکہ ماں کی فطرت صرف یہی چاہتی ہے۔

مگر نہیں، بیٹے کی محبت جہاں نہیں دیکھی جاتی وہ "فرض انسانی" کی منزل ہوتی ہے۔ یعنی اگر "انسان کامل" یہ دیکھے گا کہ کسی جابر حکومت کے ہاتھوں میں "انسانیت" کا گلا گھٹ رہا ہے تو اس وقت!۔ نہ وہ اپنی اولاد کی فکر کرے گا، نہ گھر کو بچانے کا خیال۔ نہ اپنی جان کی پروا۔ اس کا پہلا اور آخری فرض یہ ہوگا کہ تشدد کی مٹھی سے انسانیت کا گلا چھڑا کر اپنی گردن پیش کر دے۔

ستاروں کی آڑ۔ اور چاند کی اوٹ ہیں نا امید ماں کا چراغ کب تک جلے گا؟۔ صبح کا ستارا قضا کا پیام نے کر جگمگا رہا ہے۔ موت کی ہوا سنک رہی ہے۔ تصورات خون کی چادر میں لپٹ رہے ہیں۔ تلواروں کی ہلکی جھنکاریں فضاؤں میں پھیل رہی ہیں، ماں کی سانسیں رک رہی ہیں، دم الجھ رہا ہے۔ اب دیکھئے کیا ہو۔؟۔ میرے پیدا کرنے والے میرے نوجوان بیٹے کی خیر!۔۔۔ دل کہتا ہے شاید بچ جائے۔ دماغ کہتا ہے کہیں لاکھوں پر بہتر بھی فتح پاتے ہیں۔؟۔ دل کہتا ہے ہو سکتا ہے ۷۲ کی بات رہ جائے۔ دماغ جواب دیتا ہے ہاں بہتر کی بات تو رہ سکتی ہے لیکن بہتر کی جانیں نہیں رہ سکتیں اور انھیں ۷۲ میں میرا نوجوان بھی ہے۔

صبح کا آفتاب، سنہری نہیں بلکہ خونیں شعاعیں پھینکتا ہوا نکلا۔ لاکھوں کے مقابلہ میں بہتر انسان، چھوٹی سی صف میں بڑے حوصلوں اور اونچے ارادوں کے ساتھ ایستادہ ہوگئے۔ دوپہر سے لڑائی چھڑ گئی، تیروں کی سنسناہٹ نے فضاؤں کو چونکا دیا۔ نیزوں کی چمک سے نگاہیں تلملا گئیں، تلواروں کی چھائیوں نے میدان جنگ کو آئینہ خانہ بنا دیا۔ لاکھوں اور بہتر؟۔ ایک ایک کو ہزاروں نے گھیر لیا۔ نیزوں کی نوکوں پر پشت ٹیک کر پیچھے نہ ہٹنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ گھمسان کا رن پڑا کہ ہزاروں لاشیں تتر بتر ہوگئیں مگر زوال آفتاب کے ساتھ ۷۲ کا چھوٹا سا لشکر بھی پراگندہ ہوگیا۔ اب تو صرف اتنے باقی رہ گئے جتنی ہاتھوں کی انگلیاں ہیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے اور ماں کا نوجوان بیٹا بھی۔

خیمے کا پردا لہرایا۔ ماں کے دل پر جھٹکا لگا۔ نگاہوں کے ساتھ خود بھی اٹھ بیٹھی۔

ماں۔ کون۔ میرا بچہ علی اکبر؟

علی اکبر۔ جی ہاں مادر گرامی۔

ماں۔ اتنی دیر میں کیوں پلٹے؟

علی اکبر۔ لڑائی چھڑ گئی تھی ماں۔ میرے بہت سے عزیز، بہت سے دوست، اور بہت سے اصحاب قتل ہوگئے۔

ماں۔ (گھبرا کر) اور تمہارے چچا عباس علمدار۔

علی اکبر۔ دریا کے کنارے آرام کر رہے ہیں۔

ماں۔ کیا وہ بھی شہید ہوگئے؟

علی اکبر۔ جی ہاں۔ اب تو میں ہوں اور پدر بزرگوار۔ اچھا مجھے بھی اجازت دیجئے۔

ماں۔ اجازت کیسی بیٹا؟۔

علی اکبر۔ نصرت کی اجازت، جنگ کرنے کی اجازت اور آخر میں جان دینے کی اجازت!

ماں۔ نہیں نہیں۔ میرے بچے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی تمناؤں، آرزوؤں، اور امیدوں کو ہمیشہ کے لئے کربلا کی جلتی ہوئی خاک میں دفن کر دوں۔

علی اکبر۔ مادر گرامی غور تو کیجئے۔ جب حق پر آنچ آ رہی ہو، جب صداقت پامال ہو رہی ہو، جب انسانیت حیوانیت کے پنجوں میں دم توڑ رہی ہو۔ اس وقت صرف یہی ہو سکتا ہے کہ حقیقت کی قربانی پیش کر کے حقیقت کو بچا لیا جائے۔

ماں۔ مگر میرے بچے میں نے تجھے کبھی دھوپ میں نہیں نکالا، تیری کوئی ضد نہیں ٹالی، اٹھارہ سال آنکھوں میں رکھا۔ بھلا کس دل سے مرنے کی اجازت دوں؟

علی اکبر۔ مادر گرامی میں خوب جانتا ہوں کہ میرے سوا آپ کے دل کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے۔ مگر انسانیت اور صداقت کو بچانے والا بھی میرے سوا دوسرا نظر نہیں آتا۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟۔ مجھ کو یا مخلوق خدا کے آرام اور زندگی کو؟

ماں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تیری جان بھی بچ جائے اور مخلوق خدا بھی ظلم و استبداد سے نجات پا جائے؟۔

علی اکبر۔ نہیں مادر گرامی۔ یہ متضاد خیالات ہیں۔ جب تک خون درخت کے تھالے میں نہیں ڈالا جاتا۔ پتوں، ڈالیوں اور پھلوں پر تازگی نہیں آتی۔

ماں۔ (گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے)۔ مگر نہیں میرے بچے دل سے مجبور ہوں۔ فطرت سے معذور ہوں۔ دنیا کی کوئی ماں اپنے بچے کو خوشی سے مرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

علی اکبر۔ آپ بالکل سچ فرماتی ہیں۔ مگر خدا اپنی مخلوق کا بچاؤ صرف اپنے برگزیدہ بندوں ہی کے ذریعے کرتا ہے۔ آج میری نوجوانی کو خاک میں مل جانے دیجئے۔ پھر دیکھئے گا دنیا کے کروڑوں نوجوان بوڑھے ہوں گے اور مر جائیں گے۔ لیکن آپ کے بیٹے کی جوانی قیامت تک نکھرتی رہے گی۔ میں ہمیشہ جوان رہوں گا۔

ماں۔ مگر میں تیرے بعد کیونکر زندہ رہوں گی؟۔

علی اکبر۔ دیر ہو رہی ہے ماں۔ دیکھئے دیکھئے میرا باپ ہزاروں میں اکیلا ہے، سنئے سنئے میرا فرض مجھے پکار رہا ہے۔ خدا حافظ۔

ماں۔ میرے بچے۔ آخری دیدار تو دیکھ لوں؟۔

خیمہ کا پردا اٹھا کر علی اکبر نکلے۔ یا ماں کا سینہ شق ہو کر کلیجا نکلا۔ ادھر بیٹے نے کھنچی ہوئی انگڑائی لے کر گھوڑے کی باگیں سنبھالیں۔ ادھر ماں کی دل کی رگیں کھنچ کر ٹوٹ گئیں۔ خیمے کا پردہ ماں کے دل کی طرح ہلتا رہا۔ اور چودھویں کا چاند فوجوں کی گھٹا میں غروب ہوگیا۔

محرم اور واقعہ کربلا کو دنیا کا ہر شخص جانتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ نے تیرہ سو چار سال قبل بروز عاشور حق و صداقت کو یزیدی فوجوں سے مقابلہ کر کے بچاؤ کیا تھا۔ اس دفاعی جنگ میں حضرت امام حسین نے اپنا گھر بار لٹا دیا تھا۔

حضرت علی اکبر، حضرت امام حسین کے نوجوان صاحبزادے تھے اور حضرت ام لیلیٰؓ ان کی والدۂ معظمہ تھیں جنھوں نے حق کی بھلائی اور مخلوق خدا کی اچھائی کے لئے اپنی ممتا کا خیال نہیں فرمایا اور حضرت علی اکبر شہید ہوگئے۔

# گرگسوں کا سماج

افسانہ

اصغر علی

یہ تو اچھی طرح یاد نہیں کہ میں پہلی مرتبہ اس سے کہاں ملا مگر یہ واقعہ ہے کہ میری اور اس کی واقفیت کوئی اتفاقیہ یا ہنگامی واقعہ نہیں تھی، کم از کم میں اسے چار سال سے جانتا تھا، اور ان چار سالوں میں تقریبًا ہر روز ہی وہ مجھ سے ملتی رہی کیونکہ جب سے میں تبدیل ہو کر اس قصبے کے اسکول میں آیا تھا، اور اس محلّے میں رہائش اختیار کی تھی ہفتہ میں تین چار مرتبہ میں ضرور سبزی پکاتا تھا، اور اس سے زیادہ تازہ اور سستی سبزی اور کوئی فروخت نہیں کرتا تھا۔

یہ ایک معمولی قسم کا قصبہ تھا، بہت قلیل سی آبادی تھی جو زیادہ تر کاشتکاروں پر مشتمل تھی، کچے مکانات، گندی اور اداس گلیاں، چاروں طرف پھیلے ہوئے وسیع کھیت، کہیں کہیں ریت کے ابھرتے ہوئے ٹیلے اور ان ٹیلوں پر اگی ہوئی ببول اور بیر کی جھاڑیاں، جوہڑوں کے کناروں پر تناور پیپل اور نیم کے درخت اور درختوں پر بیٹھے ہوئے اونگھتے ہوئے گرگس، یہ تھا اس قصبے کا غیر شاعرانہ اور افسردہ ماحول! درحقیقت یہ ہے کہ اگر اس جگہ مڈل اسکول، تھانہ اور ایک چھوٹا سا شفا خانہ نہ ہوتا تو یہ قصبہ بالکل ایک گاؤں تھا،

جس محلہ میں میں رہتا تھا وہ کاشتکاروں کا محلہ تھا، یوں تو اس محلہ میں کوئی ایسی دلکشی نہ تھی، جس سے متاثر ہو کر میں اس جگہ رہائش اختیار کرتا، لیکن چونکہ اسکول یہاں سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا، اتنا قریب کہ میں اسکول سے غیر حاضر ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود تصور کیا جاتا تھا، میں نے یہاں رہنا پسند کیا، اس کے علاوہ جاہل گنوار کاشتکاروں کی اس بستی میں مجھ ایسے معمولی پڑھے لکھے انسان کو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل تھی، میں ان کی نظر میں نہ صرف اسکول کا منشی تھا بلکہ ضرورت کے وقت وکیل، پٹواری اور پنچ کے فرائض بھی ادا کرنے کا اہل سمجھا جاتا تھا، اس محلے کی کوئی تقریب ایسی نہ تھی جس میں مجھے خاص طور پر مدعو نہ کیا جاتا ہو، اور ان تمام باتوں نے ایک شدید احساس برتری مجھ میں پیدا کر دیا تھا،

محلے والے مجھے ایک نیک اور برگزیدہ انسان سمجھتے تھے، کیونکہ پٹواری کے لڑکے کی طرح انھوں نے کبھی مجھے کوئیں پر پانی بھرنے والیوں کے گرد گھومتے یا کسی نوجوان لڑکی کو دیکھ کر خواہ مخواہ گنگناتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، میں عام معنوں میں ایک شریف اور نیک آدمی تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام شرافت بالارادہ یا بلا ارادہ میں نے اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے اختیار کر لی تھی،

وہ سبزی کا ٹوکرا سر پر رکھے بے جھجک میرے مکان میں داخل ہو جاتی تھی، حالانکہ وہ جانتی تھی کہ میں اس مکان میں تنہا رہتا ہوں، اس کی عمر زیادہ نہ تھی، مگر پھر بھی وہ جوان نظر نہ آتی تھی اس کے رخساروں میں تازگی ضرور تھی، مگر اس تازگی میں دوشیزگی کی رعنائی نہ تھی۔ اس کا جسم کچھ زیادہ موزوں نہ تھا، اعضا بھرے بھرے تھے، لیکن شباب کی جذبات انگیز کیفیت پیدا نہ کر سکتے تھے، اسے دیکھ کر شاید ہی کسی دل میں ہیجانی تاثر پیدا ہوتا ہو، اس کی آنکھوں میں زندگی کی ایک مبہم سی چمک تھی، جسے ایک نمایاں افسردگی نے اپنے دامن میں لپیٹ لیا تھا، ممکن ہے جنسی بھوک کسی نوجوان کی نظروں میں کچھ دیر کے لئے اسے حسین بنا دیتی ہو، لیکن اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی پژمردگی نے اس کے خد و خال کی تمام ملاحت کو پس منظر میں ڈال دیا تھا، جب وہ گلی میں آکر آواز لگاتی تو میں فیصلہ کر لیتا کہ آج کونسی سبزی پکانی ہے، وہ اندر آجاتی، اور میں سبزی کا نام بتاتا، مقدار وہ خود ہی جانتی تھی، وہ سبزی تولتی، چارپائی پر ڈالتی اور چلی جاتی قیمت میں اکثر تنخواہ ملنے پر ادا کیا کرتا تھا، یہ تمام معاملہ صرف چند منٹ میں ختم ہو جاتا، اور ابتدا میں اسے میری زندگی میں صرف اتنا ہی دخل تھا،

لیکن اس کا پژمردہ چہرہ اور افسردہ آنکھیں رفتہ رفتہ میرے خیالات پر چھانے لگے، اور میرے تحت الشعور میں چند الجھنیں ابھر آئیں، جب وہ سبزی دے کر چلی جاتی، تو میں بعض اوقات اس کے متعلق سوچنے لگتا، بالکل غیر ارادی طور پر، یہ سوچ اکثر خواب کی غنودگی کی طرح ہوتی تھی، غیر مسلسل اور مبہم خیالات کی چند بے ربط لہریں ذہن میں اٹھتیں، اور مٹ جاتیں، اور جیسے خواب کے بے نظام تصورات سے کوئی خاص مفہوم مرتب نہیں کیا جا سکتا، میری سوچ بھی اکثر بے معنیٰ ہوتی تھی، بعض اوقات سوچتے سوچتے میرے جسم میں ایک پھریری سی آتی اور ایک جنسی خواہش دل کے کسی کونے سے اپنا سر ابھارتی مگر فورًا ہی مٹ جاتی، اور کوئی دوسرا تخیلی سلسلہ شروع ہو جاتا، اور ذہن میں چند بھاری بھاری خیالات رینگنے لگتے۔

سوچ بڑھتی رہی اور اس کی ملاقاتیں طویل ہوتی گئیں اب وہ سبزی رکھ کر چلی جاتی، بلکہ بیٹھ کر قصبے کے مختلف معاملات پر تبصرہ شروع کر دیتی، "اس سال بارش نہیں ہوئی، سبزی کم پیدا ہوگی، جیت رام کا بیل مر گیا، ہماری بھینس کا دودھ سوکھتا جا رہا ہے"، اور اسی قسم کی دوسری

باتیں اس کی گفتگو کا موضوع بن جاتیں، مجھے ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی، کیونکہ فتح سنگھ نمبردار سے لے کر چھو ٹو حیا تک مجھے سب صبح و شام اسی قسم کی باتیں سنایا کرتے تھے، مجھے اس کے چہرے کے مایوس خد و خال اور اس کے یاس میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں دلکشی محسوس ہوتی تھی، وہ ایک مشین کی طرح اپنی بے ربط و بے معنیٰ باتیں کرتی چلی جاتی، اور میں اس کے چہرے کو گھورتا رہتا۔

اور پھر رفتہ رفتہ یگانگت بڑھتی گئی، وہ بغیر سبزی کے بھی میرے پاس آکر بیٹھ جاتی اور گھنٹوں بیٹھی رہتی، اس کی باتوں میں گہرائی پیدا ہونے لگی، اور میں اس کی روح کے قریب تر ہوتا گیا، اس کے دل کے چھپے ہوئے چور باہر نکلنے لگے تھے، وہ غیر محسوس طور سے مجھے اپنی زندگی میں داخل کرتی جا رہی تھی، میں اس کی روح کو ٹٹولتا رہا، اور اس کی عمر کی گزری ہوئی کہانیاں میرے حافظے میں ابھرنے لگیں، وہ دور کسی گاؤں کی رہنے والی تھی، اس نے مجھے بتایا تھا، اس کا باپ ایک بڑا زمیندار تھا، ان باتوں کو برسوں بیت گئے تھے، اور وہ چاندنی رات اسے اب تک یاد تھی جب وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ایک بیل گاڑی میں بیٹھ کر ہردوار چلی تھی، تمام رات میٹھے رسیلے گیت گاتے گزر گئی تھی، اور جب وہ کئی دن کے سفر کے بعد میلے میں پہنچے تھے، تو وہ بھونچکا ہو کر رہ گئی تھی، کیونکہ اتنی رونق، اتنی دھوم دھام اور اتنی گہما گہمی اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھی تھی، اور اسے وہ المناک حادثہ بھی یاد تھا، جب وہ اس گہما گہمی میں یکایک اپنے رشتہ داروں سے بچھڑ گئی تھی، اور پھر کئی دن رونے دھونے کے باوجود بھی وہ اپنے رشتہ داروں کو نہ ڈھونڈ سکی تھی، جگلال اسے ان رشتہ داروں سے ملا دینے کا وعدہ دے کر اس قصبے میں لے آیا تھا، اور اسے وہ خوفناک رات بھی یاد تھی جب مایوس ہو کر اس نے جگلال کے پاس سے بھاگنے کی کوشش کی تھی، اور جگلال نے قتل کی دھمکی دے کے اسے اپنی بیوی بننے پر مجبور کر دیا تھا، اور وہ اپنے ماں باپ سے کوسوں دور اپنی خواہشات کے خلاف ایک اجنبی کی گھرستن بن کر رہ گئی تھی، اور پھر اس کو جوانی کے وہ رس بھرے سپنے بھی یاد تھے، جو جگلال کی گرم گرم آغوش میں اس نے دیکھے تھے، اور جن کے سحر انگیز اثر سے وہ ایک خوابناک رومان میں گھل مل گئی تھی، یہ تمام کہانیاں اسے یاد تھیں، اور اب وہ انہیں میرے حافظے میں سموتی جا رہی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا میں ان کہانیوں میں جاذب ہوتا جا رہا ہوں،

دو روحوں کا تعلق شدید ہوتا گیا، اور میں اب اس کے بغیر کچھ اداس اور بے چین سا رہنے لگا، جس روز وہ نہ آتی، مجھے اپنے مشاغل میں ایک خلا سا محسوس ہوتا، اس لئے نہیں کہ اس کی متواتر قرابت نے میری جسمانی ضرورتوں کو بیدار کر دیا تھا اور میرے جنسی جذبات میں تندی پیدا ہو گئی تھی، بلکہ واقعہ یہ تھا کہ اس کی گزشتہ زندگی کی المناک داستان سے متاثر ہو کر میرے ذہن نے ایک عجیب جذباتی تار و پود اس کی شخصیت کے گرد بن لیا تھا، رحم کے وہ احساسات جو اس کی کہانیوں نے میرے دل میں تخلیق کر دئے تھے، مجھے اس کے بہت قریب لے آئے تھے، میں اس کے لئے کڑھتا تھا، معلوم نہیں کیوں!

پھر یکایک ایک روز مجھے محسوس ہوا کہ محلہ کی فضا میں کچھ تناؤ سا پیدا ہو گیا ہے، کاشتکاروں کی آمد و رفت میرے پاس رفتہ رفتہ کم ہونے لگی، میرا وقار اور میری اہمیت روز بروز گھٹتی جا رہی تھی، اور میں وکیل اور پٹواری تو کیا، شاید منشی بھی نہیں رہا تھا، محلے والوں کی پیشانی کے بل گہرے ہوتے جا رہے تھے، اور وہ لوگ جو ملتے ہی مجھے اس طرح آداب عرض کہا کرتے تھے، گویا کوئی قرض ادا کر رہے ہوں، اب نظریں بچا کر نکلنے لگے، اور جگلال تو جب مجھے دیکھتا، ناک بھوں چڑھا لیتا تھا، آخر یہ نفسیاتی جنگ کب تک جاری رہتی، ایک دن فتح سنگھ نے مجھ سے آکر کہہ ہی دیا، کہ رام دئی ایک بدچلن عورت ہے، وہ جگلال کے ساتھ بھاگ کر آئی تھی، تمام قصبہ میں بدنام ہے، اس کا بار بار میرے پاس آنا ٹھیک نہیں محلے والے اسے اچھا نہیں سمجھتے، اور ان تمام باتوں کا یقین دلانے کے لئے فتح سنگھ نے رام دئی کے متعلق کئی گھناؤنی کہانیاں مجھے سنائی تھیں،

اس روز میں تمام رات جاگتا رہا، رام دئی کی زندگی کا یہ پہلو اس کے بالوں سے بھی زیادہ سیاہ تھا، اس کی بے بسی اور بے چارگی نے ہمدردی کے جو بت میرے دل میں تراش کر رکھ دئے تھے، منہدم ہونے لگے، اور میرے ذہن پر نفرت اور پچھتاوے کے تاریک سائے چھا گئے، آج مجھے یکایک محسوس ہوا، کہ کسی نے ستاروں کی معصوم بستی سے گھسیٹ کر مجھے تلخ حقیقتوں سے بھری دنیا میں پٹک دیا ہے، مجھے رام دئی کے وجود سے ڈر لگنے لگا، کتنی خوفناک تھی وہ، میرے کئی سال کے قائم کئے ہوئے وقار کے تار و پود کو توڑنے کے لئے کتنی خطرناک سازش کی تھی اس نے، میرا دل غصہ سے ابل رہا تھا،

دوسرے دن صبح کو جب وہ سبزی لے کر آئی، تو میں نے اسے اپنے مکان میں داخل ہونے سے روک دیا، وہ کافی دیر تک بت بنی کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں کی افسردہ لکیریں بہت گہری ہو گئی تھیں، اور ان سے رحم کی التجا ٹپک رہی تھی، دو گرم گرم آنسو ڈھلک کر اس کے رخساروں پر آ گئے، یکایک میری نفرت کا ابال کچھ دھیما پڑ گیا، اور مجھے ایسا محسوس ہوا، گویا وہ آنسو

کہہ رہے ہوں "بابوجی! یہ بالکل بے گناہ ہے محلے والوں نے تمہیں بہکا دیا ہے"، مگر اشکوں کا یہ تریاق میرے دل کے ابلتے ہوئے زہر کو دور نہیں کرسکتا تھا، ہمدردی کے ٹوٹے ہوئے بت اب میرے دل میں زندہ نہیں ہو سکتے تھے، وہ ایک بدچلن عورت تھی، فتح سنگھ نے نفرت کا جو انجکشن میرے ذہن میں لگایا تھا، اس کا اثر میرے ریشے ریشے میں پھیل چکا تھا، میں نے دھکا دے کر اسے اپنے دروازے سے ہٹا دیا، اور وہ گردن جھکا کر چلی گئی، اور محلے والے جو اس حادثے کو دیکھ کر جمع ہو گئے تھے، دیر تک کھڑے دانت نکالتے رہے۔

میں پھر منشی، وکیل، پٹواری اور پنچ بن گیا تھا، اور محلے والے میرے گرد جمع ہونے لگے تھے، مگر جگلال کی پیشانی کے بل بدستور گہرے تھے، رام دئی اب بھی کبھی ملتی تھی، اس کی آنکھوں کی افسردہ لکیریں اب بہت زیادہ گہری اور تاریک ہو گئی تھیں، محلے والوں کے طعنوں کے نشتر تیز تر ہوتے جا رہے تھے، اور جگلال کی بربریت اور غصے کی شدت خوفناک حد تک بڑھ گئی تھی، اور ایک روز اس نے رام دئی کو اتنا مارا تھا، کہ بیچاری کا دایاں بازو ٹوٹ گیا تھا، وہ کئی دن سے سبزی بیچنے باہر نہیں آئی تھی، مگر محلے والوں نے پھر بھی اس کی بدچلنی کے متعلق دو چار اور نئی کہانیاں تراش لی تھیں، اور جگلال کی بربریت اور زیادہ تند و تیز ہو گئی تھی،

اگرچہ اب رام دئی کو میری زندگی پر کوئی دخل نہ تھا، اور میں اس کے وجود کو اپنے وقار کے لئے اب بھی ایک خطرہ تصور کرتا تھا، مگر فتح سنگھ کے انجکشن کا اثر کچھ کم ہو گیا تھا۔ اور رام دئی کی زندگی کی گزشتہ کہانیاں پھر میرے ذہن کے پس منظر میں تلملانے لگی تھیں،

ایک دن صبح جب مکان سے اسکول جانے کے لئے باہر نکلا، تو کچھ لوگ ایک چارپائی کندھوں پر اٹھائے آ رہے تھے، جگلال گردن جھکائے ان کے ساتھ تھا، اس کی پیشانی کے بل گہرے ہوتے ہوتے ایک دوسرے سے الجھ گئے تھے۔ اور آج ان سے رنج و غصہ کی بجائے تفکر اور حسرت کے آثار نمایاں تھے، "رام دئی کوئیں میں ڈوب کر مر گئی"۔ کوئی میرے قریب سے بولا، اور میرے دل کو ایک دھکا سا لگا، رام دئی کی سنائی ہوئی تمام کہانیاں یکایک میرے ذہن کی سطح پر ابھر آئیں، میں سوچ رہا تھا، وہ ایک دور دیس کی رہنے والی جگلال کے جھوٹے وعدوں میں پھنس کر اس قصبے میں آ گئی تھی، جگلال نے قتل کی دھمکی دے کر اس کو اپنی بیوی بننے پر مجبور کر دیا تھا، اور اس نے اپنے دور دیس کے سپنوں کو بھلا کر اس محلہ میں گھل مل جانے کی کوشش کی تھی، اور پھر فتح سنگھ نے جیسے میرے کان میں کہہ دیا ہو، وہ بدچلن ہے، محلے والے اسے بدچلن سمجھنے لگے تھے، بدچلن، بدچلن، بدچلن، اور ان نشتروں نے جگلال کے رگ و پے میں بربریت اور غصے کے شرارے بکھیر دئے تھے، اور خون کے اس خوفناک ابال سے تنگ آ کر اس نے ایک روز رام دئی کا ایک ہاتھ توڑ دیا تھا، اور وہ اس غیر فطری زندگی سے جنگ کرتے کرتے تھک گئی تھی، اور آج بالآخر وہ تنگ آ کر اس قصبے سے کہیں دور بھاگ گئی تھی، دور بہت دور ایک ایسے دیس میں جہاں وہ محلے والے نہیں تھے، جہاں جگلال نہیں تھا،

لوگ چارپائی اٹھائے جگلال کے مکان کی طرف بڑھ گئے، سامنے نیم کے درخت پر چند گرگس بیٹھے اونگھ رہے تھے، اور نیچے کسی جانور کی ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔

---

# حقیقت و مجاز

زندگی موت سے بدتر ہی سہی، ہے تو سہی
یہ فضا آہ مکدّر ہی سہی، ہے تو سہی

عیش رفتہ کے نشاں دیکھ کے خوش ہوتا ہوں
دل مرا اجڑا ہوا گھر ہی سہی، ہے تو سہی

شورش عشق بھی کیا چیز ہے اللہ اللہ!
اُن کی نظروں میں یہ کمتر ہی سہی، ہے تو سہی

تم شب ماہ میں آؤ تو چھپانے کے لئے
چاندنی رات کی۔ چادر ہی سہی، ہے تو سہی

شیخ پیاسا ہے اسے پینے دو اک جام کہ یہ
تشنۂ بادہ کوثر ہی سہی، ہے تو سہی

بیر ہے مجھ سے زمانے کو مگر ساتھ مرے
ایک برگشتہ مقدر ہی سہی، ہے تو سہی

کہئے کافر نہ برہمن کو کہ اس کا بھی خدا
بت ہے، بت اصل میں پتھر ہی سہی، ہے تو سہی

ہم بھی نازاں ہیں کہ ہے دوست ہمارا کوئی
اس کا غم کیا وہ ستمگر ہی سہی، ہے تو سہی

سنئے سائل کے بھی اشعار سر بزم کہ وہ
ایک گمنام سخنور ہی سہی، ہے تو سہی

سائل انبہٹوی

# یورپ نے اسلامی تمدن سے کیا استفادہ کیا؟

حفیظ سیّد

اس عہد میں بھی جبکہ یوروپ ابھی اسلام کی طرف معاندانہ طور پر رجوع نہیں ہوا تھا اس کی نظریں اسلامی کمالات اور عجائبات سے خیرہ ہو چکی تھیں اور اس نے زیادہ تر عرب ہی کی آرائشی اور تعمیری فطانت سے اپنا چراغ روشن کیا۔ گہری تحقیقی نظر ڈالنے پر یہ بات جلد ہی ثابت ہو جاتی ہے کہ روم و یونان کی قدیم صنعتوں سے زیادہ وہ اس باب میں اسلام کا رہین منت ہے۔ لیکن اس بحث کا چھیڑنا یہاں مناسب نہیں ہے۔ ہم اپنے موضوع سے دور ہٹ جائیں گے۔ تاہم اس عجیب حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا خالی از لطف نہ ہوگا کہ پیرسی کلیسا ناتردام Parisian. Cathedral of Notre Dame. کی تعمیر کے لئے عرب معمار مقرر کئے گئے تھے۔

سائنس اور علوم کے میدان میں مسلمانوں کا اثر کس حد تک وسیع ہے۔ اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔

"سب سے پہلے یہ اعتراف ضروری ہے کہ تجربات اور مشاہدات جو علوم اور سائنس کی بنیاد ہیں ہم نے تمام تر عربوں سے سیکھے۔" عام طور سے یہ امر بیکن ( Bacon. ) سے منسوب کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

مشہور و معروف سائنسدان ہمبولٹ Humboldt. اس بات کا تعین پہلے کرتے ہوئے کہ سائنس کا سب سے اہم منصب یہ ہے کہ وہ شخصی مظاہرات کو ارادی طور پر بلند کرتی رہے لکھتے ہیں کہ عرب اس بلندی پر پہنچ گئے تھے جس سے سائنسدان ناواقف تھے۔

ریاضی سے عربوں کو بڑا شغف تھا۔ جبر و مقابل ALGEBRA میں تو یہاں تک تکمیلی ترقی دکھائی کہ اس کی کایا ہی پلٹ دی۔ چنانچہ اس کی ایجاد انھیں سے منسوب کر دی گئی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے جبر و مقابل کو اقلیدس پر چسپاں کیا اور مماس Tangent کو علم مثلث میں شامل کیا۔

بغداد، شام، سمرقند، قاہرہ فنر، ٹولڈو، کارڈیوو وغیرہ میں علم ہیئت کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے ہوتا رہا۔ ان کی تحقیقات اور انکشافات حسب ذیل ہیں:۔

علم ہیئت کے حساب میں علم مثلث کا شمول۔

ستاروں کی حرکت کے جدول بنانا۔

ان خطوط کی کجی کا تعین جس سے سورج گذرتا ہے Obliquity of the eclimptic. اور پھر اس کی بتدریج تقلیل۔

اعتدالین ( Equinoxes ) سے سورج کے گذرنے کا قطعی انداز اور امتداد سال کا پہلا صحیح تعین۔

عرض البلد ماہتاب کی بے ضابطگی کی تحقیق اور محوری حرکت سے قمر کا ایک تیسرا انحراف جس کو آج کل Variation کہتے ہیں انھیں کی منت کش ہے۔

جغرافیہ کے ضمن میں ان بہادر سیاحوں کے کارنامے سائنس کے نقطۂ نظر سے بے انتہا اہم ہیں انھوں نے ان قطعی ہیئتی تعینات Astronomical Determinations. ) کی تشکیل کر دی جو اولیں نقشہ کشی کی بنیاد ہیں اور ان کثیر التعداد غلطیوں کی تصحیح بھی کر دی جو مقامات کے تعین کے سلسلے میں یونانیوں سے سرزد ہوئی تھیں۔

سیاحت کے نقطۂ نظر سے انھوں نے بہت سے سفرنامے شائع کئے جن کی وجہ سے دنیا کے وہ مختلف حصے جن کا وہم و گمان بھی نہیں تھا اور جہاں کسی یوروپین نے قدم بھی نہیں رکھا تھا نظر کے سامنے آ گئے۔

ال ادریسی ( Alldrisi نے ۱۱۶۰ء میں دریائے نیل کے منبعے جو بڑی بڑی خط استوائی جھیلوں سے پھوٹتے ہیں اسی طرح اپنے نقشے میں صحت کے ساتھ دکھائے ہیں جو اہل مغرب نے اب انیسویں صدی کے نصف میں دریافت کئے۔

علم طبیعیات میں ان کی جستجو اور انکشافات اور بھی زیادہ قابل غور اور قابل قدر ہیں۔ ذیل کے بیانات سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے:

تجرباتی اور نظریاتی طبیعیات Practical and Theoretical Physics میں وسیع معلومات بالخصوص بصریات میں بے مثل قیمتی آلات کا وضع کرنا۔

علم کیمیا کے سب سے بنیادی اجزاء اور مقدار کی دریافت مثلاً الکحل Alcohol شورہ کا تیزاب Nitric Acid گندھک کا تیزاب Sulphuric Acid. اور تقطیر کا اہم ترین عمل۔

علم کیمیا کا دوا سازی اور تجارت میں شامل کرنا۔ خاص طور سے دھاتوں کا علیحدہ کرنا۔ چیتھڑوں سے کاغذ بنانا جو چرمی کاغذ پیپرس Papyrus

اور چینی کے ریشمی کاغذوں کی جگہ کام میں لائے جاتے تھے۔

جہاز رانی میں غالباً سب سے پہلے پرکار ( Compass. ) کا استعمال انھیں نے کیا اور اتنا تو یقینی ہے کہ یوروپ کو اس ضروری ایجاد سے روشناس انھیں نے کرایا۔

اختتام پر ہم اتنا اور کہہ دینا چاہتے ہیں کہ توپ و بندوق کی ایجاد بھی مسلمان سائنسدانوں نے کی ہے۔ یعقوب نے محاصرہ مہدیہ میں توپ خانہ کا استعمال کیا تھا۔

۱۲۷۳ء میں سلطان ابو یوسف نے محاصرہ سجلماسہ ( Sijilmasa ) میں توپوں سے کام لیا تھا۔ ۱۳۴۲ء میں لارڈ ڈربی ( Lordderby ) اور لارڈ سیلسبری ( Salisbury ) نامی دو انگریز الجیسیرس ( Algeciras. ) کے محاصرہ میں موجود تھے جس میں عربوں نے اسی طرح حفاظت کی تھی۔ ان سیاحوں نے بارود کے اثرات دیکھے اور اس ایجاد کو اپنے ملک میں پھیلایا۔ یہ انھیں کا ذریعہ تھا جس کی وجہ سے چار سال کے بعد کریسی ( Cressy ) میں انگریزوں نے بارود کا استعمال کیا تھا۔

علوم طبی کے سلسلے میں مسلمانوں نے یونانی مصنفوں کی پیروی کی اور بعد میں کامیاب ترقی کی۔ طب کی تقریباً جتنی بھی معلومات ہیں یوروپ نے نشاۃ ثانیہ کے دور میں انھیں سے حاصل کیں طب کے جن مشہور شعبوں میں انھوں نے ترقی کی ان میں سے چند یہ ہیں۔ جراحی، بیماریوں کی تفصیل اور علامات، مخزن الادویات اور دوا سازی۔

انھوں نے معالجہ کے مختلف طریقے نکالے تھے، مثلاً میعادی بخار میں ٹھنڈے پانی کا استعمال، جن میں سے بعض صدیوں کے بھلائے جانے کے بعد آج دور جدید میں پھر نمایاں ہوئے ہیں۔

دواؤں کے اجزا میں سے بہت سی چیزیں انھیں لوگوں کی دی ہوئی ہیں۔ جیسے تیزپات ( Cassia. )، ریوند چینی ( Rhubark )، تمر ہندی ( Tamarind. )، کافور، الکحل، امونیا ( Ammonia. ) وغیرہ وغیرہ۔ صحیح معنوں میں دوا سازی کے خالق وہی تھے۔

بہت سے مرکبات جو آج مستعمل ہیں انھیں کی بدولت ہم تک پہنچے ہیں مثلاً شربت، عرقیات، روغنیات، مرہم اور کشید کیا ہوا پانی۔

جراحی کی بھی اساسی ترقی کی بنیاد عربوں کے ہاتھ پڑی ہے۔ ان کی تصنیفات ابھی تھوڑے دنوں پہلے شعبۂ طب کے درس میں مبادیات کے طور پر شامل تھیں۔

گیارھویں صدی میں وہ موتیابند کا علاج جانتے تھے۔

سیلان خون کا علاج بذریعہ آب سرد کرنا جانتے تھے۔

سوزش ناک دواؤں ( Caustics. ) اور زخم کشا ( Setons. ) کا استعمال اور آگ سے داغنے کے طریقوں سے واقف تھے۔

بے ہوشی اور بے حسی کی دوا جو موجودہ دور کی ایجاد سمجھی جاتی ہے حقیقتاً انھیں کی دریافت کی ہوئی تھی۔ عمل جراحی سے قبل وہ بے ہوشی اور بے حس کرنے کی دوا سے واقف تھے۔ تاکہ مریض اعصابی اذیت سے محفوظ رہے۔

اسی طرح انھیں حفظان صحت، طبی معالجہ اور نقاہت کے ذرائع پر بڑا اعتبار اور بھروسہ تھا موجودہ طب جو اس زمانہ کی سائنس میں صرف آخری حکم رکھتی ہے بالکل اسی راستہ پر گامزن ہے۔

خیالات اور فکر کے میدان میں بھی مسلمان بہت سے اہم علمی اور عملی نظریوں کے حامل ہیں۔ حضرت عیسیٰ نے مساوات اور اخوت کی تعلیم دی تھی۔ مگر حضرت محمدؐ کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں کے زمانہ میں ان کے ماننے والوں نے دونوں کے نمونے پیش کر دیئے۔ یہ ماننا البتہ حماقت ہے کہ انقلاب فرانس کی ذمہ دار ان کی ذات ہے جس پر ان کے مستقل اور ہموار عمل کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا تاہم یہ ماننا پڑے گا، اور اس کے کافی ثبوت ہیں، کہ خیالات اور جدید ہیئت اجتماعی کے حق رائے دہی کا نیا معیار حضرت محمدؐ ہی کی تعلیم کا منطقی نتیجہ ہے۔ یوروپ کو اس آزاد خیالی سے جس کو دہریت سے کوئی سروکار نہیں روشناس کرنے کا سہرا ابن رشد ( Averroes. ) کے سر ہے جو ۱۱۲۶ء سے لے کر ۱۱۹۸ء تک اسپین میں موجود تھا۔

ابن رشد نے اسلام کی خالص واحدانیت کو عیسائیت کے منہیاتی وحدت الوجود اور تشبیہی مذہب کے مقابل پیش کیا۔ ارسطو پر اس کی تنقیدوں نے، گو ان میں اسلامی خیالات کی صاف طور پر رنگ آمیزی تھی، قرون وسطی کے یوروپ میں تمام آزاد دماغوں کو بے انتہا متاثر کیا۔ رشدیت ( Averroism. ) جو اسی ذوق و شوق کے ماتحت پیدا ہوئی تھی صحیح معنوں میں نہ صرف تحریک اصلاح ( Reformation. ) کی پیشرو بلکہ جدید عقلیت کی خالق بھی سمجھی جا سکتی ہے۔

اسلامی طرز معاشرت کا اثر صالح بھی یوروپ پر کافی پڑا ہے عربوں نے بڑی فراخدلی اور حوصلہ مندی کے ساتھ انتہائی مذہبی رواداری برتی تھی۔ یہ ہسپانیہ کے عرب تھے جن میں مجاہدانہ جذبہ موجزن تھا جس کے مالک بعد میں مشرقی جنگجو بن بیٹھے۔ مشہور ہسپانوی مصنف بلاسکو ابنیز ( Biascoibanez. ) اپنے ناول "کلیسا کے سایہ میں" ( Shadowof. The Cathedral-Dans I, dubre de la cathedal. ) میں لکھتا ہے۔ "گویا یہ وصف الیسا تھا جو عیسائی قوم میں پہلے ہی سے موجود تھا اس سلسلے میں ہم ڈاکٹر لیبان کا اقتباس پیش کر سکتے ہیں۔" عیسائی

شجاعت کی طرح جو بعد میں نمودار ہوئی عربی شجاعت اپنا مخصوص تیور اور اصول رکھتی تھی۔ اس وقت تک کوئی آدمی شجاع نہیں کہلایا جاسکتا تھا جب تک ان اوصاف کا حامل نہ ہو۔ رحم، قوت، اولوالعزمی، سخن سنجی، فصاحت، شہسواری، نیزہ بازی، سیف زنی، تیراندازی۔

۱۱۳۹ء میں قرطبہ (Cardova.) کے والی نے طلیطلہ (Taledo) کا محاصرہ کیا جو عیسائیوں کے قبضہ میں تھا اور جس کی ملکہ (Berengaria) نے شہر پناہ میں اپنے کو بند کرلیا تھا۔ اس نے ایک مخبر سے اس کے پاس کہلوایا کہ یہ جوانمردی، اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کے خلاف ہے کہ ایک عورت پر حملہ کیا جائے۔ عربی سپہ سالار اس مہم سے دست کش ہوگیا اور اس نے ملکہ سے اس بات کی اجازت بھی چاہی کہ اپنا ہدیہ تبریک بھی اس کے حضور میں پیش کرسکے۔

ہسپانیہ کے عربی روزنامچے اس قسم کے ہزاروں واقعات سے بھرے ہوئے ہیں جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ مردانہ اوصاف کس قدر پھیلے ہوئے تھے۔

ایک بہت مذہبی آدمی ( St. Hilaire. ) اس بات کا پوری وفاداری کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ مغربی رسم و رواج عربوں سے کس قدر اثر پذیر ہوئے ہیں۔ قرآن پر جو کتاب اس نے لکھی ہے اس میں رقمطراز ہے "عربوں کے ربط و ضبط، گفتگو، اور ان کی تقلید سے قرون وسطیٰ کے اجڈ امراء کے ناشائستہ حرکات سدھر گئے۔ اور بہادروں (Knights.) میں بغیر اپنی شجاعت کو کم ہوئے نرمی، لطافت، انسانیت اور شرافت کے اوصاف پیدا ہوگئے۔ یہ امر مشکوک ہے کہ عیسائیت اپنے حلم اور بردباری کے باوجود یہ جذبات پیدا کرسکتی تھی یا نہیں۔

ممکن ہے قارئین یہ پوچھ بیٹھیں کہ پھر کیا وجہ ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے زمانے کے اہل قلم حضرات جو اپنے فضل و کمال کی بنا پر مذہبی تعصبات سے بلند معلوم ہوتے ہیں عربی تمدن کے اثرات سے روگرداں ہیں؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزاد خیالی ظاہری زیادہ ہے اور حقیقی کم اور ہم نے اسلام اور اس کے پیرؤں کے بارے میں جو رائے صدیوں سے قائم کر رکھی ہے اور اس کا اظہار کرتے رہے ہیں وہ ہماری ذہنیت میں رس بس گئی ہے۔

اگر ہم تمام تعصبات کے ساتھ ساتھ نسلی اور موروثی تعصبات کو بھی ملالیں جو ہماری ہر نسل میں قابل نفرت کلاسکی تعلیمات کے ساتھ افزوں ہوتے گئے۔ یعنی یہ کہ زمانہ گذشتہ کے تمام علوم و ادب محض یونانیوں اور رومیوں نے پیدا کئے ہیں تو ہماری سمجھ میں بآسانی آجائے گا کہ کس طرح مغربی تمدن کی تاریخ میں عربی تمدن کے یہ عظیم اثرات نظرانداز کردئے جاتے ہیں بعض حضرات کو یہ بات ہمیشہ مضحکہ خیز معلوم ہوگی کہ یہ مسلمانوں ہی کا فیض ہے جو کبھی یورپ جہالت سے دور نظر آتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ اسلام اس قدر جلد گر گیا؟ جس نے آٹھ صدیوں تک ہسپانیہ پر حکمرانی کرکے اسے نہ صرف مغربی تمدن و تہذیب سے برتر کردیا بلکہ اپنی چمک دمک سے کیا دلی، کیا بخارا، کیا قسطنطنیہ، کیا فز ( ) تمام میں روشنی پہنچادی۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ یہ لوگ ان اصول دین سے غفلت برتتے جاتے ہیں جن کی پابندی لازم ہے اور جن کے قائم کرنے کے لئے رسول مقبولؐ نے عمر بھر جانفشانی کی اور جو ان کی اور خلفائے راشدین کی کامیابی کے ضامن رہے۔

ایک مثال پیش کردینی کافی ہے کہ کس سختی سے ان اصول پر شروع میں عمل کیا جاتا تھا۔ ایک امیر اور طاقتور جبالہ نامی بادشاہ نے جو نیا نیا مسلمان ہوا تھا ایک غریب بدوی کے منہ پر جس سے خانہ کعبہ کے طواف کے وقت ذرا سا دھکا لگ گیا تھا، کئی طمانچے زور سے رسید کردیئے۔ بغیر اس کے جاہ و حشم اور ایک مشہور ہستی کی ناراضگی کا خیال کئے ہوئے خلیفہ عمرؓ نے اس غریب بدوی کے ہاتھ سے بادشاہ جبالہ کو وہی سزا دلوائی جو اس نے غریب کو دی تھی۔ کیونکہ اسلام کی آئندہ عزت کے لئے قانون اور انصاف کی نظروں میں ہر ایک کا برابر ہونا جملہ پس و پیش پر فوقیت رکھتا تھا۔

بغیر اتنے سخت اصولوں کے کوئی شخص سوائے ذاتی خوبیوں کے اور کسی چیز پر فخر نہیں کرسکتا۔ کسی شخص کا انتخاب سرداری کے لئے اس وقت تک نہیں ہوتا تھا جب تک وہ اس کا اہل نہ ہو اور ایک مرتبہ منتخب ہوجانے کے بعد اس کا فیصلہ آنکھ بند کرکے مانا جاتا تھا کیونکہ دراصل مخلصانہ طور پر اس کی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔

رسول مقبولؐ نے جو اپنی پیاری بیٹی فاطمہ زہراؓ سے کہا تھا کہ کام سے غافل نہ رہنا اور اس پر نہ بھولنا کہ تم رسولؐ کی بیٹی ہو وہ دیگر لوگوں پر بے کار ثابت ہوا۔ بہت سے غیر معروف اشخاص کے بیٹوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو بڑی چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنا پر حقارت سے دیکھنا شروع کیا اور یہ خیال کیا کہ ان کی سماجی حیثیت ان کی ترقی کی کوششوں میں مانع ہے۔ علاوہ اس کے ان اشخاص کی وجہ سے جو اپنے ذاتی کارناموں سے زیادہ اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر کیا کرتے تھے ایسی ہی شدید اور بے رحم جنگیں چھڑ گئیں جیسے پہلے ہوا کرتی تھیں۔

چنانچہ پھر وہی بدمزاجی اور بدانتظامی پھیل گئی جس نے قبل اسلام عربوں کو مفلوج کر دیا تھا۔

سارا علمی مذاق کھو کر، خانہ جنگی سے منتشر ہو کر اور تھک کر مسلمان عیسائیوں کی تاب نہ لاسکے جو انتقام کا خواب دیکھ رہے تھے اور ان اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اپنے کو منظم کر کے حملہ آور ہوئے تھے۔

عہد ماضی (اور آج بھی) اسلام اپنی بہت سی بدنصیبیوں سے بچ سکتا تھا بشرطیکہ مسلمانوں نے رسول صلعم کی آخری سماجت اور تنبیہ کو یاد رکھا ہوتا جو انھوں نے اپنے خطبہ کے موقع پر دی تھی "کبھی مت بھولنا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا سچا بھائی ہونا چاہئے"

اسلام کے تنزل کا دوسرا سبب خود اس کی ایک اساسی خصوصیت سے نکلتا ہے۔ اسلامی عقائد جو مافوق الفطری عنصر سے تقریباً مبرا تھے باآسانی عقلی دلائل پر پورے اترتے تھے۔ شروع میں یہ بہت مفید ثابت ہوا کیونکہ علوم توہمات کی رکاوٹوں سے آزاد رہے۔ یہی اسلام کے فوری عروج کا کافی سبب ہے۔ مگر رفتہ رفتہ مسلم دماغوں پر غنودگی طاری ہو گئی۔ وہ ان عظیم الشان نتائج سے جو پہلی صدی ہجری کے جوش و خروش میں نمودار ہوئے تھے کافی سے زیادہ مطمئن ہو کر غافل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نئے مفتوح ممالک میں اسلام بہیمانہ جذبات اور اشیا پرستی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ فقرار اور شافعین ( Intercessors. ) اولیا اور مرابطوں نے جو عیسائیت کے ذریعہ پیدا ہو گئے تھے اور جن کی قرآن میں سخت مخالفت ہے، علم اور عقل کی جگہ لی اور اپنے صریح توہمات سے تمام ترقیوں کو مسدود کر دیا۔ حکما، مثلاً ابن رشد نے اس کے خلاف جہاد کیا مگر بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ معصیت عوام میں اچھی طرح جڑ پکڑ چکی تھی۔ وہ ان روشن دماغ حضرات کو ملحد کہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ مردود قرار دے دئے جائیں۔



# ضروری

رسالہ آجکل میں مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کی اسی رسالے میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔

(ادارہ)

# امجد حیدر آبادی کی نثر نگاری

نصیر الدین ہاشمی

ایک گزشتہ مضمون میں حضرت امجد حیدر آبادی کی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آج ہم آپ کی نثر نگاری اور انشا پردازی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تاریخ نثر اردو پر نظر ڈالی جائے تو یہ امر بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ جس طرح اردو شاعری کے ارتقا میں دکن کا نمایاں حصہ ہے اسی طرح اردو نثر کو فروغ اور ترقی دینے میں دکن نے بڑا کام کیا ہے۔ یہاں زمانۂ دراز سے نہ صرف ادبی اور مذہبی کتابیں اردو نثر میں مرتب ہوتی رہیں بلکہ سائنٹفک کتابوں کی تدوین اور اشاعت کا کام بھی انجام پاتا رہا۔ اگر کلکتہ میں کمپنی کی جانب سے ڈاکٹر گلکرائسٹ کی زیر نگرانی قصے اور کہانیوں کی کتابوں کا ترجمہ ہوتا تھا تو یہاں علوم سائنس، ریاضی، کیمیا، اور طبیعیات کے ترجمے ہوتے تھے۔ جس زمانہ میں شمال میں ہنوز مقفی اور مسجع تحریرات کا دستور تھا تو دکن میں صاف اور سادہ اسلوب بیان کو اہمیت دی جاتی رہی۔ بہرحال جس طرح زمانہ گزشتہ میں دکن نے اردو زبان کی خدمت گزاری کی ہے اسی طرح اب بھی اردو کی ترقی میں نمایاں حصہ لے رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں نہ صرف اردو زبان میں علوم سائنس کی تعلیم ہوتی ہے بلکہ سائنٹفک اردو کتابوں کی اشاعت میں بھی جامعہ کا خاص حصہ ہے۔ دوسری طرف شعرا ادیب نثار اور سائنسداں اردو کی خدمت گزاری میں مصروف اور منہمک ہیں۔ حیدرآباد کے شعرا میں حضرت امجد کو جس طرح خاص اہمیت حاصل ہے اسی طرح آپ ایک نثار کی حیثیت سے اپنا مقام رکھتے ہیں۔ یہاں ہم کسی قدر صراحت کے ساتھ آپ نثر کا تعارف کراتے ہیں۔

حضرت امجد کی نثر کی پانچ کتابیں اب تک شائع ہوئی ہیں۔ یعنی جمال امجد، حج امجد، حکایات امجد، گلستان امجد اور میاں بی بی کی کہانی۔

"جمال امجد" کے آٹھ نوشتے یا آٹھ باب ہیں۔ ابتدائی ابواب میں اپنی زندگی کے حالات درج کئے ہیں اور آخری نوشتہ جو کتاب کے بڑے حصہ پر مشتمل ہے، تصوف کے اسرار اور سلوک کی باتیں عام فہم اور سادہ الفاظ میں درج ہیں۔ دراصل یہ آپ کی اہلیہ خانہ مرحومہ جمال النسا بیگم کے ملفوظات ہیں جو سلوک اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر یہ تصوف کی ایسی باتیں نہیں ہیں جو خاص صوفیا اور اہل باطن کی کارآمد ہوں بلکہ وہ زندگی کی سدھار اور اخلاق حمیدہ کے لئے ایک بہترین دستور العمل ہو گئے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نوشتہ اپنی طرز میں دلکش اور دل آویز ہے۔ اس کی عبارت عبرت انگیز اور معنی خیز ہے۔ اس سے ایمان کی تازگی اور روح کو مسرت ہوتی اور سکون ملتا ہے۔

"حج امجد" آپ کا سفرنامہ حج ہے جو دلچسپ حالات کا حامل اور ایک طالب صادق اور عاشق حبیب کی زیارت کا حال نہایت سوز و گداز کے انداز میں قلمبند کیا ہے۔ یہ ایک تجلی ہے جو کوندتی نظر آتی ہے۔ عام سفرناموں سے اس کا انداز بالکل جداگانہ ہے۔ حج کے حالات حجاز کی کیفیت وہاں کے رہنے والوں کی معاشرت وہاں کے مناظر وغیرہ کے حالات اس خوبی سے بیان کئے گئے ہیں کہ پڑھنے والوں کو خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔

"حکایات امجد" مختلف مضامین کا مجموعہ ہے ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خود امجد صاحب کی زندگی سے متعلق ہیں اخلاق اور تصوف کی بیش بہا معلومات کے ساتھ ہی ساتھ دلچسپ مکالمے پر لطف محفلوں کی تصویر جس انداز میں پیش کی گئی ہے وہ دیدۂ بصیرت کے لئے سبق آموز اور نتیجہ خیز ہے۔

"گلستان امجد" دراصل سعدی شیرازی کی گلستان کا ایک بہترین ترجمہ ہے۔ سعدی کی نظم و نثر دونوں کا ترجمہ امجد صاحب نے اپنی دلچسپ نثر میں کیا ہے۔ اور جا بجا اپنی رباعیات اور قطعات پیش کرتے گئے ہیں اس طرح گویا یہ گلستان سعدی گلستان امجد بن گئی ہے۔ اس کا مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے۔ مولانا کے خیالات کا مختصر اقتباس ملاحظہ کے قابل ہے۔

"دونوں (سعدی شیرازی اور امجد حیدر آبادی) میں عجیب مماثلت ہے۔ وہ بھی صوفی یہ بھی صوفی۔ وہ شاعر یہ بھی شاعر۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے فقروں والی نثر کی پیالیوں میں قند و نبات گھولنے والے اور یہ بھی۔ اخلاق اور نصیحت کی تلخی کو شہد و شکر میں ملا کر وہ بھی پلاتے تھے اور یہ بھی پلاتے ہیں۔ مجاز و حقیقت کا پردہ وہ بدلتے تھے اور یہ بھی بناتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، مختصر جملے، ٹھیٹ محاورے، دلکش ترکیبیں، موٹے موٹے لفظوں سے پرہیز اس کتاب کی خاص خصوصیتیں ہیں۔"

"میاں بی بی کی کہانی" میں بصورت افسانہ میاں بی بی کے تعلقات کا تذکرہ ہے۔ عورت کی مظلومی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مگر اس کو بھی۔ طلاق اور

سلہ ملاحظہ ہو آجکل بابت ۱۵ جولائی ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۰۔

تصوف کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ امجد صاحب کی نثر کے بعض خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

آپ کی نظم کی طرح نثر بھی بالکل صاف۔ سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ اس میں فارسی اور عربی کے لغات اور ثقیل الفاظ نہیں ہوتے۔ اس کے سمجھنے میں کسی کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔

آپ کی نثر چھوٹے چھوٹے جملوں سے مرکب ہوتی ہے۔ اس کے جملوں میں مبتدا اور خبر میں زیادہ فصل نہیں ہوتا۔

آپ کی نثر میں کبھی کبھی شوخی اور ظرافت کے گرم گرم فقرے آجاتے ہیں جن سے ہر پڑھنے والے کو ایک خاص لطف ملتا ہے۔ اور کبھی ہندی کے الفاظ اور جملے بھی آپ کی نثر میں آجاتے ہیں جس سے ایک شیرینی پیدا ہو جاتی ہے۔

اخلاق اور نصیحت کی کڑوی کسیلی باتوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کی تلخی شیرینی سے بدل جاتی ہے اور پڑھنے والوں کو گراں نہیں گزرتا بلکہ دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

نظم کی طرح نثر میں بھی حکمت معرفت، سلوک اور باطن کے بیش بہا مضامین اس طرح صاف اور واضح طور پر ادا ہوتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو گراں نہیں گزرتے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وعظ اور نصیحت کے بڑے بڑے مضمون یا طولانی تقریر سے وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی جو آپ کی ایک مختصر حکایت یا فقرے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

آپ نظم ہو یا نثر دونوں میں کسی شخص خاص کے اسلوب بیان کی پیروی نہیں کرتے بلکہ آپ کا طرز بیان سب سے بالکل جداگانہ اور نرالا ہے۔ اس کے آپ ہی موجد ہیں۔

ادبی حیثیت سے آپ کی نثر بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے لطف زبان اسلوب بیان کی جدت طرز ادا کی دلکشی قابل داد ہوتی ہے۔

یہاں مختصر طور پر آپ کی نثر کے بعض اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔

"ایک دفعہ مجنوں سے ملنے کو کہنے لگیں۔ رات میں نے عجیب تماشا دیکھا وہ یہ کہ لیلیٰ محمل میں سوار ہے اس کے ناقے کی مہار قیس کے ہاتھ میں ہے کیونکہ ناقہ لیلیٰ کا حامل قیس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے قیس انتہائے مسرت میں کودتا پھاندتا ناچتا اچھلتا مہار تھامے ہوئے چلا جا رہا ہے۔ قیس کی طرح ناقہ تو مجنوں نہیں تھا وہ اپنی معمولی رفتار سے۔ تھمے میاں جیسا ایک ایک قدم رکھتا ہوا چل رہا ہے۔ مہار ہے۔ کہ خود بخود لمبی ہوتی چلی جا رہی ہے" (جمال امجد)

"بڑھاپے میں جوانی کا رنگ کس طرح آسکتا ہے بہا ہوا پانی پھر ندی میں واپس نہیں ہو سکتا۔ سوکھا ہوا کھیت سبزۂ نو کی طرح کہاں لہلہا سکتا ہے۔

افسوس جوانی جاتی رہی۔ ہائے جوانی، جوانی کے ساتھ ہی اصل زندگی رخصت ہوگئی۔ اب تو مردوں کی طرح ایک جگہ پڑا ہوا ہوں۔ ایک بڑھیا نے خضاب لگا کر اپنے سپید بال کالے کر لئے تھے۔ میں نے کہا نانی اماں بالوں کو تو تم نے خضاب سے کالا کر لیا۔ مگر اس کبڑی پیٹھ کا کیا علاج کرو گی" (گلستان امجد)

عائشہ شادی کے پہلے کس قدر ہنس مکھ۔ ملنسار۔ بامروت لڑکی تھی عزیز تو عزیز اڑوس پڑوس والیاں بھی اس پر جان دیا کرتی تھیں۔ اس سے ایک دفعہ مل لینا ہمیشہ کے لئے طوق بندگی گردن میں ڈال لینا تھا۔ نوکر اس کے شیدا۔ سہیلیاں اس کی دیوانی۔ گھر میں ہر آنے والا پہلا قدم رکھتے ہی پوچھتا عائشہ ماں کہاں ہیں۔ صورت میں ماہتاب۔ سیرت میں لاجواب۔ گھر بھر کی جان تھی۔ آخر بدر کامل بغیر ہالے اور پیکر ناز بغیر آغوش محبت کے کب تک رہ سکتا ہے۔ عائشہ کی شادی ہوگئی" (حکایات امجد)

امجد صاحب ناول یا افسانہ نگار نہیں ہیں اور نہ آپ نے کوئی ڈرامہ لکھا ہے بلکہ تصوف اور اخلاق ہی آپ کا موضوع ہے۔ مگر اس کی خوبی یہ ہے کہ آپ تصوف اور اخلاق کو ایسے پیرایہ میں اور ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان سے ناول اور افسانہ کا مزہ ملتا ہے۔ اور ایسے مکالمے لکھتے ہیں جس سے ڈرامہ کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ یہ آپ کی وہ خصوصیت ہے جو کسی اور نثار یا ادیب میں نہیں پائی جاتی۔

افسانہ نویس کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے سدھار کے لئے افسانہ کی صورت میں سبق آموز واقعات پیش کئے جائیں۔ پڑھنے والوں کو یہ نہ معلوم ہو کہ افسانہ کا مقصد عبرت انگیزی یا آموزی ہے بلکہ بظاہر تفریح طبع اور دلچسپی ہوتی ہے لیکن ان کا حاصل مقصد سبق آموزی ہوتا ہے۔ امجد صاحب افسانہ نویس نہیں ہیں۔ مگر ان کا مقصد یا پیام انسانی زندگی کا سدھار ہے۔ وہ "محبت" "نیک زندگی" اچھی عادت برائی سے پرہیز کے لئے اپنے کلام نظم و نثر سے سامان ضیافت کرتے ہیں۔ نصیحت کی کڑوی کسیلی باتوں کو شیرینی لپیٹ کر پیش کرتے ہیں غرض آپ کا انداز بالکل فارسی کے ادیب سعدی کا سا ہے۔ اسی لئے مولانا سید سلیمان ندوی نے آپ کو حیدرآباد کے سعدی کا لقب دیا ہے جو بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ فقط۔

# آپ کیا چاہتے ہیں

افسانہ

بلدیپ کور

آج طبیعت کچھ عجیب الجھی ہوئی سی تھی دل بہلانے کے خیال سے بازار کی طرف نکل گیا۔ چلتے چلتے سینما تک پہنچ گیا۔ فلمی ریکارڈ بج رہے تھے۔ لوگ انہیں سننے کے لئے اکٹھا ہو گئے تھے اور خوب غور سے سن رہے تھے۔ بھلا وہ لوگ جنہیں کچھ کام نہ ہو اور جائیں بھی کہاں؟—— میٹھے میٹھے ترانے فضا میں گونج رہے تھے۔ ان کی مٹھاس کانوں کی راہ سے میرے احساس میں گھلتی چلی گئی۔ میں نے سوچا کہ آج سینما ہی کیوں نہ دیکھا جائے؟ طبیعت بھی بہل جائے گی اور وقت بھی آسانی سے کٹ جائے گا۔

سینما گھر کے بکنگ آفس کے پاس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ٹکٹ بابو کی کرسی پر ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے اور وہ ہر ٹکٹ لینے والے کو دیکھ کر مسکرا دیتی ہے اب سمجھ میں آیا کہ یہاں اتنی زیادہ بھیڑ کیوں ہوتی ہے!

اس دوشیزہ کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عیسائی ہے، عمر بیس کے لگ بھگ سمجھئے —— فلم شروع ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں نے کئی بار کھڑکی کے اندر سے اسے جھانک کر دیکھا اور اس کی مسکراہٹ سے لطف اندوز ہوا۔ اس نے مجھے اپنا منہ تکتے دیکھکر اس طرح مسکراتے ہوئے پوچھا: "آپ کیا چاہتے ہیں؟" میں اس سوال کا جواب نہ دے سکا اور کھڑکی سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اب فلم شروع ہونے والی تھی۔ بھیڑ دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ کھڑکی خالی دیکھ کر میں پھر کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اب وہ بالکل سنجیدہ سی بیٹھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ مسکراتے مسکراتے اس کے ہونٹ تھک گئے ہیں یا پھر کسی کی یاد اسے ستا رہی ہے اور اس میں وہ کھو گئی ہے۔ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی پھر اسی انداز سے مسکراتے ہوئے اس نے سوال کیا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

میں نے کچھ کہے بغیر ٹکٹ کے پیسے بڑھا دیئے وہ مجھے جونہی ٹکٹ دینے لگی میں نے جان بوجھ کر اس کی انگلیوں کو پکڑ لیا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔ میرا دل دھڑکنے لگا—— اور اس نے مسکراتے ہوئے پھر وہی سوال کیا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں ..... میں" الفاظ میرے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔

"اچھا آپ سینما دیکھ آئیے۔ میں آپ کا انتظار کروں گی" وہ مجھ سے بہت نرم لہجہ میں بولی۔

میں ٹکٹ لیکر بغیر کچھ کہے ہال کی طرف بڑھا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ فلم شروع ہوئی اور ختم ہو گئی مگر مجھے خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں ختم ہو گئی۔ میرے حواس میں عجیب قسم کا جمود پیدا ہو گیا تھا۔ بس وہی الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ "آپ کیا چاہتے ہیں"

ساڑھے بارہ ہو چکے تھے۔ سینما سے لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ سینما کی دوکانیں بند ہو گئیں اور آخرکار سینما کے سامنے والی بڑی بتی بھی بجھا دی گئی۔ میں ایک کونے میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں کہ اتنے میں وہی عورت میرے پاس آ کر بولی۔ "کیا آپ میرے ساتھ چلنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟"

پہلے تو میں نے سوچا نہ جانے یہ مجھے کہاں لے جائے؟ اس وقت جانا ٹھیک نہیں! مگر پھر آپ ہی آپ میرے منہ سے نکل گیا۔ "چلئے چلتا ہوں" اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنی چھتری کھول لی اور مجھے بھی چھتری میں لے لیا۔

ہم دونوں خاموش چلے جا رہے تھے —— میری سانس کی تیزی وہ ضرور محسوس کر رہی ہوگی —— میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا آخر چلتے چلتے وہ ایک گلی میں مڑ گئی۔ یہ گلی بہت تنگ تھی —— چلتے چلتے وہ ایک مکان کے سامنے کھڑی ہو گئی اور چابی نکال کر دروازہ کا تالا کھولا —— میں دل میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ اسی مکان میں رہتی ہے؟ گھر دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کسی بہت ہی غریب آدمی کا مکان ہو جو بمشکل تمام اپنا پیٹ پالتا ہو اور بری طرح اپنے زندگی کے دن پورے کر رہا ہو۔ ایک معمولی سی چارپائی، کچھ کام چلاؤ برتن۔ کچھ ٹوٹے ہوئے صندوق ایک مٹی کا چراغ —— اور ایک طرف وہ مسکراتا ہوا چہرہ جو سینما کے منچلوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا مجھے اس کے رہنے سہنے کا یہ سادہ انداز دیکھ کر اس پر ترس آ رہا تھا —— کتنی معمولی زندگی گذار رہی تھی وہ! دکھ سے بھری ہوئی زندگی، مجھے وہ لوگ یاد آ گئے جو اسے سینما میں غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یہ کیا خبر تھی کہ اس کی مری ہوئی مسکراہٹ کے نیچے دکھ اور درد کی کتنی سولی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ تبسم کے ان شعلوں میں غم کا کتنا دھواں ہے؟ کاش وہ دیکھ سکتے کہ اس مسکراہٹ کے پردہ میں کتنی تلخیاں، زہریلا وسیلیں ہیں، اس کے دل میں کتنے زخم ہیں جنہیں چھپانے کے لئے وہ ہنس رہی ہے، مسکرا رہی ہے، مگر عورت کو صرف عورت سمجھ کر دیکھنے والوں میں اتنی حس کہاں کہ ذرا سی دیر کے لئے وہ جذبات کی آگ کو بجھا کر، انسانی سطح پر آ کر دیکھیں کہ ایک مسکراتی ہوئی عورت کی چھاتی میں کتنی چنگاریاں بھری ہوئی ہیں——!

میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ وہ چراغ اٹھا لائی اور اسی طرح مسکرا کر بولی۔

"آیئے میری جھونپڑی تو دیکھ لیجیے"۔ میں سوچنے لگا کہ اب کونسی اچھی یا بری چیز رہ گئی ہے جو یہ مجھے دکھانا چاہتی ہے؟ پھر بھی میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہولیا۔ پہلے وہ مجھے رسوئی گھر میں لے گئی پھر صحن سے گذر کر ایک کمرہ میں داخل ہوئی۔ اس میں ایک الماری تھی جس میں دواؤں کی چند شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پلنگ پر سفید چادر اوڑھے کوئی لیٹا تھا، چادر سانس کی حرکت سے نیچے اوپر ہو رہی تھی پاس ہی ایک صراحی رکھی تھی، اس سے لگا ہوا ایک گلاس رکھا تھا ——— ایک چراغ پہلے سے وہاں ٹمٹما رہا تھا دوسرا آجانے سے روشنی میں کچھ اضافہ ہوا۔ وہ بڑی ہوشیاری اور نرمی سے چادر کو سرہانے سے اٹھا کر بولی "یہ میرے پتی ہیں"۔ تین سال پہلے ریلوے میں ٹرافک انسپکٹر تھے، ہماری زندگی آرام سے گذر رہی تھی مگر قسمت نے پلٹا کھایا اور یہ بیمار پڑ گئے اور پھر ان کی حالت روز بروز بگڑتی ہی چلی گئی" ——— اس کے گال پچکے ہوتے تھے، آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، ہونٹ جیسے زندگی کے رس سے خالی ہوتے جا رہے تھے ——— میرے سینہ میں ایک گھونسا سا لگا، میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے حیرت اور تعجب سے دیکھ رہا تھا اور وہ کہتی چلی جا رہی تھی "جو کچھ پونجی تھی دھیرے دھیرے کرکے ختم ہونے لگی اور آخر ایک دن سب کچھ ختم ہوگیا مگر یہ اچھے نہ ہوئے پھر بھی جب تک سانس تب تک آس، میں ان کا علاج کیئے جا رہی ہوں اور ان کی صحت کی آس پر جی رہی ہوں ——— نوکری کرنے کے بعد اپنے فرائض کا احساس بھی کرنا پڑتا ہے یہی احساس ہے جو سینما کی کھڑکی پر بیٹھنے کے بعد مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر دوڑنے لگتا ہے۔ دل روتا رہتا ہے۔ آنسو سیلتی رہتی ہے۔ مگر میں مسکرائے جاتی ہوں، اس لئے کہ مسکرانا میرے فرائض میں داخل ہے، رونا دھونا تنہائی کی باتیں ہیں نوکری پر تو مسکرانا ہی پڑتا ہے، اسی کی مجھے تنخواہ ملتی ہے، میں مسکراتی رہتی ہوں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ میری اس مسکراہٹ میں مٹھاس ہے' ——— اتنے میں مریض کراہتے ہوئے اپنی بیوی سے بولا۔

"آج اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

"تم نے دوا پی لی؟" عورت بات کاٹ کر بولی

"نہیں!" اس نے کہا "آج اٹھنے کی سکت ہی نہ تھی مجھ میں' دوا تک میرا ہاتھ نہ پہنچ سکا لیٹے لیٹے"

عورت نے جلدی سے گلاس میں بھر کر دوا پلا دی۔ اس کے بعد ہم لوگ وہاں سے ہٹ کر ذرا دور کھڑے ہو گئے ——— کچھ دیر چپ رہ کر وہ پھر بولی۔

"اس طرح میں مسکراہٹ کے پردہ میں، اپنے دکھوں کو چھپا کر دو زندگی کماتی ہوں جو ان کی دوا پر خرچ ہو جاتے ہیں انہیں پیسوں سے اپنے دوزخ کو کسی نہ کسی طرح ——— ورنہ؟"

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ مجھے مسکرانے کی مہلت کہاں؟ ——— جب میں مسکراتی ہوں میرے دل کی آگ اور بھڑک جاتی ہے، ہونٹوں کی وہ مصنوعی حرکت جسے آپ تبسم کہتے ہیں میرے زخموں کو اور کھرچے ڈالتی ہے پھر بھی میں مسکراتی ہوں ——— زندگی اسی کا نام ہے آگ اور پانی کے اسی ملاپ کو زندگی کہتے ہیں"

# ساجن سے

آؤ ساجن آؤ نا!

دیکھو چاند گگن میں سویا ——— جگ ہے اپنی نیند میں کھویا

میں دکھیاری تم بن تڑپوں

آؤ دھیر بندھاؤ نا! ——— آؤ ساجن آؤ نا!

پل پل آئے یاد تمہاری! ——— ساجن تم جیتے میں ہاری

درشن کو انکھیاں ترسا ہیں

آؤ۔ اب نہ ترساؤ نا! ——— آؤ ساجن آؤ نا!

کون تمہیں جا کر سمجھاوے ——— برہ کی اگنی کون بجھاوے

ڈول رہی ہے من کی نیا

آؤ پار لگاؤ نا! ——— آؤ ساجن آؤ نا!

قاسم علی

میرا سر چکرانے لگا، میں اپنے کیئے پر پچھتا رہا تھا۔ مجھ میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ اس سے نگاہیں ملا سکوں ——— بغیر کچھ کہے میں دروازہ کی طرف بڑھا ——— نہ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی۔

آہ عورت! ——— مجبور اور وفادار عورت!! میرے سینہ میں انگارے دہکنے لگے، احساس میں ایک دم بہت سی چنگاریاں سلگ اٹھیں، مجھے دنیا اور دنیا والوں سے ایک شدید نفرت محسوس ہونے لگی ———

اب میں ایک چوڑی سڑک پر چل رہا تھا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بجلی کے کھمبے کھڑے تھے، روشنی سڑک پر پھیل رہی تھی، ایک کھمبے کے نیچے سے گذرتے وقت بہت سے پتنگے میرے منہ سے چمٹ گئے ——— وہ روشنی کے گرد اکٹھے ہوگئے تھے ——— میں نے سوچا روشنی میں بڑی کشش ہے، وہ ہزاروں لاکھوں پروانوں کو گھسیٹ لاتی ہے اور پروانے یہ سمجھے بغیر کہ اس روشنی کے پیچھے کیا ہے؟ اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ——— مجھے سینما کی وہ بھیڑ یاد آگئی جو محض ایک تلخ مسکراہٹ کے لئے وہاں اکٹھی ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا وہ لوگ بھی ——— جو ایک ستائی ہوئی عورت کے گرد تبسم کے لئے سینما کی کھڑکی پر جمع ہو جاتے ہیں ان پروانوں ——— بے حس اور بے شعور پروانوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اسی وقت گھبرا کر میں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار دیا اور دو تین کیڑے میرے ہاتھ کے نیچے کچل کر رہ گئے!

# حسینؑ اور انسانیت

آج دنیا کے ہر گوشہ میں ایک غمناک واقعہ کی یاد لوگوں کو آرہی ہے جسے ہوئے ۱۳۰۰ برس سے اوپر گذر گئے۔ کیا یہ کسی خاص عصبیت کو قائم رکھنے کی خواہ مخواہ کوشش ہے؟

انسانی تاریخ کا دامن کیا المناک حوادث سے اتنا خالی ہے۔ اور رنج والم اور درد و کرب کیا انسانی زندگی میں ایسے نادر تجربے ہیں کہ بس بعض المناک حوادث کو چن چن کر یاد رکھا جائے؟ میں سمجھتا ہوں کہ بات اس سے زیادہ گہری اور انسانیت کے لئے زیادہ اہم ہے۔ مجھے تو اس واقعہ میں انسانی ارتقاء کے اصل اصول کا راز چھپا نظر آتا ہے۔ اسے یاد کیجئے اسے یاد رکھ کر انسانیت جو بھولتی بھی ہے بھٹکتی بھی ہے سیدھی شاہراہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر ہر رنگ ڈنڈیوں پر پڑی پھرا بھی کرتی ہے۔ اور آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹتی رہتی ہے۔ وہ انسانیت اس واقعہ کو یاد کرکے، سچ یہ ہے کہ اپنی صحیح راہ کو یاد کرتی ہے۔ اور ایک دفعہ پھر منازل ارتقائی کو طے کرنے کا قصد کرتی ہی چاہے یہ یاد دھندلی سی یاد ہو۔ چاہے یہ قصد بہت ہی کمزور سا ارادہ ہو۔

تاریخ کا ہر واقعہ کسی خاص سیاسی اور تمدنی ماحول میں ہوتا ہے۔ اور بہت سے دوسرے واقعات سے مربوط ہوتا ہے۔ رابطہ کا یہ حلقہ اکثر بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اور تاریخ انسانی کی وسعت میں یہ مربوط وحدت زیادہ عرصہ تک موثر وحدت کی حیثیت نہیں رکھ سکتی۔ اور تاریخ اسے ہوتے ہوتے بھلا دیتی ہے۔ لیکن بعض واقعات با وجود اپنی تاریخی، مکانی و زمانی پابندیوں کے حیاتِ انسانی کسی ایسے اہم اصول کے ترجمان ہوتے ہیں۔ کہ جب تک وہ اصول کارفرما ہے۔ ان کا بھلانا ذہن انسانی کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ وہ ایک منفرد واقعہ نہیں ہوتا۔ سارے واقعات کی روح ہوتا ہے۔ ان واقعات کا فہم حوادث تاریخی کے بے ربط و بے ترتیب سے انبار میں ربط و ترتیب پیدا کر دیتا ہے۔ ان سے تاریخ کی تاریکیوں کو روشنی نصیب ہوتی ہے۔ اور اس کا بظاہر بے معنی سا سلسلہ واقعات بامعنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ شہادت حسینؑ کا واقعہ اسی قسم کے واقعات میں سے ہے۔ یہ ایک مخصوص تاریخی چوکھٹے میں دراصل زندگی کے عالمگیر اصل اصول کو انسانیت کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

ذاکر حسین خاں

قدرت نے انسان کے علاوہ ہر بے جان اور جاندار مخلوق کو اپنے وجود کا توازن پانے کے لئے اندرونی کشاکش سے بچایا ہے۔ کہیں مادی خواص کو۔ کہیں فطری جبلتوں کو اس توازن کا ضامن بنا دیا ہے۔ داخلی تضاد کی کٹھن منزل جو انسان کے لئے انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں مقدر ہے۔ اس سے اور ساری مخلوق محفوظ ہے۔ پتھر بھی اس سے مامون ہیں، اجالو بھی فرشتے بھی۔ ایک انسان ہی ہے جس کے نصیب میں متضاد عناصر کی کشاکش سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہے یہ اپنا توازن کھو بھی سکتا ہے پا بھی سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انسان شاید ایک بیانی عبوری مخلوق ہے۔ اس کے وجود کی سرحدیں ایک طرف حیوانی علاقہ سے ملتی ہیں۔ ایک طرف الٰہی سے۔ اس کے سینے کو متضاد قوتوں اور میلانوں کا جولانگاہ بنا کر۔ کفر و شرک کی کشاکش میں اسے ڈال کر، روحِ انسانی کو یہ سعادت ارزانی کی گئی ہے۔ کہ وہ اسی شکل میں ایک ہم آہنگ و متوازن حیاتِ طیبہ کی تعمیر کر سکتی ہے۔ مادی اشیا کی دل فریب کشش سے بھی اسے واسطہ ہے۔ اور مادیت سے دامن چھڑا لینے کا شدید ولولہ بھی اس میں کارفرما ہے۔ یہ خود غرضی خود بینی کا مرکز بھی ہے۔ یہ محبت کی بے غرضی و بے نفسی سے بھی اسی کا سینہ معمور ہے، یہ تاکہ تاخت و تاراج کے بے خیال اور یہ خود غلط جنون کا شکار بھی ہو سکتا ہے اور بے تھکن کٹھن سے کٹھن جماعتی تعمیر کے لئے اپنی قوت کا ایک ایک شمہ بھی وقف کر سکتا ہے، یہ تمرد اور نخوت و غرور کے نشہ میں معصوم گردنوں سے خون کے دریا بہانے سے نہیں جھجکتا، اور تسلیم و رضا کا کشتہ بننا بھی اسی کو آتا ہے۔ یہی حریصوں کی طرح ٹوٹتا ہے یہی بہار کی طرح لٹاتا ہے۔ یہی اوروں سے چھینتا ہے۔ اور یہی اپنا سب کچھ اوروں پر نثار کر دیتا ہے۔ یہی پائی پائی جوڑتا ہے، یہی گنجے ڈھونڈتا ہے۔ یہی ہر تغیر سے ڈرتا ہے اور سارے تغیر اسی کے رہینِ منتِ احسان ہیں۔ یہی احتیاط کے مارے پھونک پھونک کر قدم اٹھانے سے بھی ڈرتا ہے اور پھر یہی مردانہ وار دہکتی آگ میں کود پڑتا ہے۔ یہی زمین سے نگہ نہیں ہٹا سکتا۔ یہی ستاروں سے باتیں کرتا ہے۔ یہی غفلت میں عقبیٰ سے منہ موڑ کر ادنیٰ کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ یہی ہوشیار ہو کر ادنیٰ کی آلودگیوں سے دامن جھٹک کر اعلیٰ کی طرف بے تابانہ بڑھتا ہے۔ یہی زندگی پر جان دیتا ہے اور حیاتِ بے شرف پر راضی ہو جاتا ہے۔ یہی جان دے کر زندگی کا چراغ روشن کرنا بھی جانتا ہے، اور مرگِ باشرف کو اصل حیات اور ضامنِ حیات مانتا ہے۔ یہی سرکشی کرتا ہے، یہی سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ یہی کافر ہے یہی مومن، یہی فرعون ہے یہی موسیٰ، یہی شرارِ بولہبی ہے یہی چراغِ مصطفویؐ، یہی یزید یہی شبیرؑ۔

اور اس کے ارتقا کا سارا راز، بہائم پر اس کی فضیلت کی اصل، اس کی انسانیت کا سرا شرف اس میں ہے کہ یہ ادنیٰ پر اعلیٰ کو ترجیح دینے کے لئے اپنے ضمیر کی پکار، اپنے قلب کے حقیقی میلان، اپنی عقلِ سلیم کے سچے رجحان کی وجہ سے مجبور رہے۔ یہ اس پکار کو ٹالتا ہے۔ اس میلان کو دباتا ہے۔ اس رجحان کو توڑتا مروڑتا ہے لیکن ان سے خالی نہیں ہو سکتا یہ برائیاں کرتا ہے مگر بھلائی سے ہمیشہ کے لئے روگردانی نہیں کر سکتا، ظلم کرتا ہے مگر عدل کے مطالبے

اسے بے چین رکھتے ہیں۔ باطل کی حمایت کرتا ہے مگر حق سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔ بدنمائیوں پر قانع نظر آتا ہے مگر حسن کے جادو سے پوری طرح محفوظ کبھی نہیں ہوتا۔ اسفل کی گھاٹیوں میں رہتے ہوئے بھی ایک گوشۂ چشم سے اعلیٰ کی چوٹیوں کو تکتا رہتا ہے جب برائیوں کا غلبہ ہوتا ہے۔ جماعتی زندگی مفاسد سے پُر ہوتی ہے اور ضمیر کی انفرادی زندگی اس مسموم ہوا میں دم توڑتی ہوتی ہے اس وقت کا اس کا کوئی نہ کوئی فرد اس کے حقیقی ضمیر کا ترجمان، اس کی اعلیٰ قدروں کا محافظ اور معلم بن کر اسے جھنجھوڑتا ہے، بیدار کرتا ہے، اور اپنے کو خطرہ میں ڈال کر اسے اپنی حقیقی تقدیر کے لئے فراموش کرنے یعنی روحانی خودکشی سے باز رکھتا ہے۔ کربلا میں شہادتِ حسینؑ کا واقعہ ارتقاء انسانی کے اس عمل کا ایک مہتم بالشان غیر فانی، تاریخی مظاہرہ تھا۔ یہ باطل کے مقابلہ میں حق کا۔ جماعتی مفاسد کے مقابلہ میں افرادِ صالحہ کے ذریعہ انقلاب کا، حکومت کے ظلم کے مقابلہ میں شہری کے مطالبہ عدل کا، بے دینی کے مقابلہ میں دین کا سینہ سپر ہونا تھا کہ کہیں مصلحت اندیشی، خوف، تن آسانی انسان کو اقدارِ مطلقہ کے مطالبوں سے بیگانہ نہ کر دیں۔

وہ قوتِ ارتقائی ہی جس کے حاملِ حسینؑ اس تاریخی واقعہ میں تھے۔ انسان کی حیاتِ طیبہ کی ضامن ہے۔ یہی اسے بہیمیت کے اسفل السافلین میں لوٹ جانے سے روکتی ہے اور اس کا طریق کار بس یہی ہے کہ اس کے حامل اسکے تقاضوں کو اپنی زندگی میں پورا کریں کہ اس کے تقاضے، اس کے مطالبے، دلیلوں سے منوائے نہیں جا سکتے نہ خالص عقلی منقولوں میں ثابت کئے جا سکتے ہیں۔ ان کو اپنی زندگی میں برت کر دکھانا ہوتا ہے ان کے لئے آرام و آسائش کو تجنا ہوتا ہے۔ اپنے پرائے کا برا بننا ہوتا ہے۔ محبت کے پھول برسا کر پتھر کھانے ہوتے ہیں۔ دعاؤں کے جواب میں گالیاں کھانی ہوتی ہیں۔ مخلصانہ خدمتوں کے عوض میں بدگمانیاں اور بے اعتمادیاں ملتی ہیں۔ اور ان سب کو مسکرا کر سہنا ہوتا ہے۔ اور ان کی خاطر جیے جانا ہوتا ہے۔ مگر سب سے زیادہ وضاحت سے اور اپنی غیر مشروط مطلق شکل میں اسوقت سامنے آتے ہیں جب ان کے لئے ناکامیابیوں کو کامیابیوں پر اور محرومیوں کو کامرانیوں پر ترجیح دی جاتی ہے اور اپنی پوری شان اور رنگینی میں اسوقت جب ان کے لئے جان کی بازی لگانی ہوتی ہے۔ کربلا کے میدان میں اقدار مطلقہ کی یہ حمایت اپنی اسی صاف اور واضح اور بے میل شکل میں دنیا کے سامنے آئی اور ایک "داستان سادہ رنگین" سے تاریخ انسانی کو ہمیشہ کے لئے مالا مال کر گئی۔

کس سادگی سے فرمایا اس شہید انسانیت نے حق پر اپنی آخری شہادت سے ایک شب پہلے "لوگو! دنیا نے رنگ کیسا بدل لیا ہے؟ نیکی سے خالی ہو گئی ہے! افسوس دیکھتے نہیں کہ حق کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اور باطل پر اعلانیہ عمل کیا جا رہا ہے، اور کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑے۔ اسے سہارا دے! بس اب وقت ہے کہ مومن حق کی راہ میں بقاء الٰہی کی خواہش کرے۔ میں شہادت کی موت چاہتا ہوں، ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود جرم ہے"۔ یہ شہید حق تاج و تخت لینے نہیں نکلا ہے۔ تاج و تخت لینے والے بقائے الٰہی کی خواہش نہیں کیا کرتے! تاج و تخت چاہنے والے یکسوئی سے شہادت کا قصد کر کے نہیں نکلا کرتے۔ تاج و تخت کے طالب مٹھی بھر آدمیوں سے لشکر جرار کا مقابلہ نہیں کرتے۔ یہ شہید حق اس "سستی کامیابی" کے لئے نہ نکلا تھا۔ جو انسان کو اکثر سچائی اور اچھائی سے بے تعلق و بیگانہ کر دیتی ہے۔ "کامیابی" چاہنے والے اپنے گنے چنے ساتھیوں کو معرکہ سے پہلے ساتھ چھوڑ سکنے کی رخصت نہیں دیا کرتے۔ وہ مقابلے کی پہلی کی شب میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ "کل میدان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ میری رائے ہے کہ تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ میں خوشی سے تمہیں رخصت کرتا ہوں"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہید اپنی شہادت کو انسانیت کے لئے اتنا صاف اور واضح بنانا چاہتا ہے۔ کہ کسی کو سمجھنے میں ذرا دشواری نہ ہو۔ پھر جب وفادار ساتھی ساتھ نہیں چھوڑتے تو قربانگاہ تسلیم و رضا پر اپنی آنکھوں کے سامنے سب کی قربانی پیش فرماتے ہیں۔ ایک ایک کر کے وفادار ساتھی قربان کئے جاتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کو بے وارث ہوتے دیکھا جاتا ہے۔ جوان بیٹے کو اپنے آگے راہیٔ ملکِ بقا کیا جاتا ہے۔ شیر خوار پیاسے بلکتے بچے کو اپنے ہاتھوں میں دم توڑتے دیکھا جاتا ہے اور پھر اپنی جان کا ہدیہ جان آفریں کی بارگاہ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ گویا حق کے لئے قربانی کا سبق دینے والا قربانی کی ہر دشوار سے دشوار اور دل شگاف سے دل شگاف شکل کی مثال بیک وقت پیش کر دینا چاہتا ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس راہ میں کوئی قربانی بھی ایسی ہے جو نہ کی جائے۔ قدرت کو بھی شاید اس سبق کی وضاحت منظور ہے اُدھر سے قوت و جبروت بھی اپنی سب عادتوں کا پورا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان بظاہر ناکام مخالفوں کے سر کاٹے جاتے ہیں۔ ان کی لاشیں روندی جاتی ہیں۔ انکی عورتوں کے سروں سے چادریں اتاری جاتی ہیں۔ ان کے خیمے جلائے جاتے ہیں، رسیوں سے باندھا جاتا ہے۔ طوق پہنائے جاتے ہیں۔ ناکامی کی ہر ممکن شکل کا ظہور ہوتا ہے۔ تاکہ حق پرستی کا سب سے مؤثر سبق انسانیت کے ذہن نشین ہو جائے۔ حق کا ساتھ دینا جب کامیابی سستی وقتی کامیابی، اس کے جلو میں ہو کچھ بہت دشوار نہیں۔ اس کی راہ میں ناکامیوں کو سینہ سے لگانا اور اس کی آخری فتح پر ایمان رکھنا حق کی حقیقی قوت کو آشکار کرتا ہے۔ یہی ارتقاء انسانیت کی ضمانت ہے یہی شہادت حسینؑ کا ماحصل، اسی حسینؑ انسانیت کے محسنین اعظم میں ہیں۔ اور ان کی شہادت کی داستان تاریخ انسانیت کا ایک نہایت قیمتی رنگین ورق۔

(آواز سے منقول)

# ترکی ادب کے بنیادی عنصر

ایس کے چودھری

ترکی انقلاب پر ترکی ادب کا اثر بے حد نمایاں ہے۔ اس بات کو خرمی طاہر نے ایک جگہ یوں بیان کیا ہے "ترکی کے موجودہ حیرت انگیز انقلاب کے پیچھے جن قوتوں کا اثر نظر آتا ہے ان میں سے ایک قوت اس کے ادیبوں کی ہے۔ کسی قوم کے بہت بڑے حصہ میں اگر اس حد تک بنیادی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں جتنی پچھلے چند برسوں میں ترکی میں ہوئی ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ خیالات بہت بڑی حد تک اس کے ادب میں کافی عرصہ سے موجود ہیں۔ سرسری نظر سے دیکھنے والوں کو تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ ترکی انقلاب بغیر کسی تیاری کے جیسے یکایک کہیں سے پیدا ہو گیا۔ حالانکہ ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ ترکی عوام میں خیالات کی جو نئی رو دوڑ چکی ہے اس کی جڑیں کئی طرف کو پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ اور ان میں سب سے اہم شاید ترکی ادیبوں کی قیادت ہے"۔

پہلا شخص جس نے مغرب کی طرف اپنا منہ موڑا اور انقلاب فرانس کے عجیب و غریب نئے تصورات ترکوں تک پہنچائے شناسی آفندی (۱۸۲۶ء-۱۸۷۱ء) تھا۔ اس کام میں اس کے دوسرے شریک ضیا پاشا (۱۸۲۹ء-۱۸۸۰ء) اور نامق کمال (۱۸۴۰ء-۱۸۸۸ء) تھے۔ شناسی آفندی کے اخبار "تصویر افکار" اس نئی تحریک کو لوگوں تک پہنچانے میں سب سے بڑا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ نامق کمال کے اخبار "حریت" نے بھی یہ خدمت انجام دی۔

عبدالحمید کے عہد میں نامق کمال کو بڑی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ یہاں تک کہ اس کی موت بھی جلاوطنی میں ہوئی۔ اس عہد میں قومیت کی تحریک کے سلسلہ میں سب سے نمایاں نام ضیا گیوک آلپ (وفات ۱۹۲۵ء) کا ہے۔ اس نے نہ صرف قومیت کے تصور کو اپنا مسلک بنایا بلکہ ایک اہم خدمت یہ بھی کی کہ فرانس کے مشہور ماہر عمرانیات درخیم کو ترکی میں روشناس کیا اور اس کا مادی عمرانی نظریہ ترکی حلقوں میں عام ہوا۔ ضیا گیوک آلپ نے ترکی قومیت کی بنیادی کتاب "ترکچولک اساسلری" (ترکیت کا اساس) کا مصنف بھی ہے۔ یعقوب قادری بھی ترکی کے انقلابی دور کا بڑا جوشیلا اور تلخ مصنف ہے اس نے بھی ترکی کے انقلابی جذبہ اور عمل پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس کی کتاب "سوڈوم ویگومورے" (جس کا ترجمہ فرانسیسی میں بھی ہوا) ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ کے بعد قسطنطنیہ پر برطانیہ، فرانس اور امریکا کے فوجی مشنوں کے قبضہ کی بھیانک تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس کتاب میں اس نے ان متوسط طبقہ کے ترکوں کا تذکرہ کیا ہے جو "بیودرے" اور "سقوطری" کے عیش کوش علاقوں میں آباد تھے۔ ان سارے مصنفوں نے کمالی انقلاب اور کمالی نشاۃ ثانیہ میں نمایاں عملی حصہ لیا۔ اس بات کو خرمی طاہر نے ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے "ترکی میں ادیبوں کی حیثیت بے حد موثر علمی جماعت کی سی ہے جس کسی نے کمالی انقلاب سے پہلے کے واقعات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کو محسوس کر سکتا ہے کہ یہ ادیب حقیقت میں انقلابی تھے اور یہی شاعر اور ناولسٹ تھے جن کے پیش کئے ہوئے آدرشوں کو سیاسی لیڈروں نے عملی جامہ پہنایا"۔

ضیا گیوک آلپ کے ناول "قزل المہ" (سرخ سیب) کو پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں ترکی قومی نشاۃ ثانیہ کی خواہش کس درجہ تیز تھی۔ کہانی بالکل ایک پیمبرانہ شان میں لکھی گئی ہے اور مصنف کے سارے تصورات آتاترک کی قیادت میں عملی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کہانی کا ہیرو ترغوت نامی ایک شخص ہے۔ وہ ترکی کے زوال سے مایوس ہو کر کسی "پاک سرزمین" کی جستجو میں نکلتا ہے۔ آذربائیجان کے قریب آئی قانم نامی ایک پری سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ دونوں میں بات چیت ہوتی ہے اور آخری ترغوت سے کہتی ہے "صدیوں تک ترکوں نے اپنی دلیرانہ فتوحات سے اپنی عظمت و شان کو بڑھایا ہے۔ انھوں نے زمین کے دور افتادہ حصوں میں اپنے خیمے نصب کئے ہیں، لیکن انھیں "موعودہ سرزمین" کبھی نہ مل سکی۔ انھوں نے اپنے آپ ہندوستان، چین، عرب، فارس، روم اور یورپ ہر ایک کے رنگ میں رنگا۔ لیکن جب وہ اپنی فتوحات سے دوسروں کی عظمت و بزرگی کو بڑھانے کا خیال چھوڑ کر وہ اپنے وطن لوٹ آئیں گے، صرف جب ہی وہ "موعودہ سرزمین" انھیں مل سکے گی۔ ترکوں کی صرف ایک تاریخ نہیں بلکہ "تاریخیں" ہیں۔ یعنی اس کی تاریخوں میں دوسروں کے لئے ادب اور تاریخ کے بڑے بڑے دفتر پوشیدہ ہیں۔ اس لئے انھیں چاہئے کہ وہ پھر اپنی تاریخ کی طرف لوٹیں۔ اپنی تاریخ کی طرف، اپنی زبان کی طرف اور اس کے ابجد کی طرف۔ اور اس طرح وہ موعودہ سرزمین کے بالکل قریب پہنچ جائیں گے"۔ اسی کے لفظوں میں "ترک قوم دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ جب کبھی اسے کسی ہیرو کی سرداری مل جاتی ہے تو وہ شعلہ کی طرح چمک جاتی ہے۔ سیاست میں بھی، جنگ میں بھی اور کلچر میں بھی۔ یہ ہیرو، یہ لیڈر نہ ہو تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی قیادت کے لئے ہمیشہ کسی نہ کسی ہیرو کی موجودگی ضروری ہے"۔

یہ پر جوش تمنا آگے چل کر اتاترک کی شکل میں پوری ہوئی۔

دور تنظیمات (۱۸۳۹ء-۱۸۷۶ء) کے دوسرے مصنفوں میں سے ایک کا نام عبدالحق حمید ہے۔ عبدالحق حمید ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور ریاست داں بھی تھے اور پچھلی صدی کے آخری حصہ میں بمبئی میں قونسل جنرل کی حیثیت سے رہ بھی چکے تھے۔ اور انھوں نے ہندوستانی زندگی کے متعلق ایک ناول بھی لکھا ہے۔ اسی دور کا ایک دوسرا مصنف احمد وفیق پاشا (۱۸۲۳ء-۱۸۹۱ء) ہے۔ ترکی زبان میں اس کی نظمیں اپنے قومی اور وطنی

جذبات کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اسی دور میں وامبری، رادلو، تھامسن اور بنیلی جیسے مشہور یورپین ماہروں نے قدیم ترکی تاریخ کے متعلق اپنی تحقیقات کیں اور رادلو اور تھامسن نے خاص کر آٹھویں صدی کی ان ترکی یادگاروں پر بہت کام کیا اور ترکوں نے سائبیریا میں قائم کی تھیں۔ ان یورپین محققوں کی تحقیقات اور ان کے انکشافات سے ضیا گوک الپ (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) بہت متاثر ہوا۔

کمالی انقلاب سے ذرا پہلے عمر سیف الدین (وفات سنہ ۱۹۲۰ء) اور احمد حکمت (وفات سنہ ۱۹۲۷ء) نے ایسے ناول لکھے تھے جنہیں ترکی ادب میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے لیکن وہ حقیقت میں صحیح قومی جذبات سے بہت دور ہیں۔ ترکی ادب میں وطنیت اور قومیت کو ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے داخل کرنے کا کام خالدہ ادیب خانم پیدائش قسطنطنیہ سنہ ۱۸۸۳ء) اور یعقوب قادری قرا عثمان اوغلو نے انجام دیا۔ ان دونوں لکھنے والوں نے ترکی قومی آزادی کی جنگ کا پرشورش زمانہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور عظیم المرتبت اتاترک کے آہنی پنجوں کو ترکی کی نئی تشکیل کرتے بھی دیکھا تھا۔

تاریخی کتابیں لکھنے والوں میں محمد فواد کوپرولو نے اپنی مشہور کتاب اناطولی اسلامیت (اناطولیہ میں اسلام) لکھ کر تنقیدی تحقیق کو ایک نئی راہ دکھائی۔ حکومت عثمانیہ کے آغاز کے متعلق اس کی کتاب تاریخی تحقیق کا ایک بے بہا سرمایہ ہے جس میں قدیم اور جدید، مغربی اور مشرقی ہر طرح کے ممکن ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔ محمد فواد کوپرولو نے تاریخ اور زبان کی تحقیقات سے ترکی میں منظم تحقیقات کا ایک نیا راستہ کھول دیا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پہلا ترک محقق ہے جس نے بین الاقوامی شہرت پائی۔

کمالی عہد کے مصنفوں میں ہم اوناسیدن (جو ایک زمانہ میں لندن میں سفیر تھا) اسعد ہاشم، محمد عاکف، احمد رفیق اور جلال نوری کا نام لے سکتے ہیں۔ یہ سارے مصنف، احمد رفیق اور جلال نوری کو چھوڑ کر شاعر بھی ہیں اور ناول نگار بھی۔ احمد رفیق مورخ تھا اور جلال نوری ماہر عمرانیات۔ ترکی کے یہ سب عظیم المرتبہ مصنف سنہ ۱۹۳۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۷ء تک ایک ایک کر کے موت کی نذر ہو گئے۔

موجودہ نسل کا نوجوان لکھنے والوں میں صدری ادہم (پیدائش سنہ ۱۸۹۸ء) ناولسٹ اور یا شار نبی (پیدائش سنہ ۱۹۰۸ء) مدحت جمال، حبیب فاضل، کمال حسد جمی اور آکا گوندوز زیادہ مشہور ہیں۔

ترکی کے موجودہ ادب کے عام جذبات گہرے قسم کی وطنیت اور قومیت سے مملو ہیں۔ اور ان کے علاوہ شخص، مقام اور واقعہ کی تحلیلی نادبی اور انسانی ذہن پر وقت اور مقام کے اثرات جیسی چیزوں کو بھی ادب میں اہمیت حاصل ہے۔ ترکی ادب تاریخ میں اور موجودہ سماج میں انسان کی شخصیت کا مطالعہ منفرد حیثیت سے نہیں کرتا بلکہ اسے پیچیدہ نظام کا ایک جزو سمجھ کر۔ اس سے بھی زیادہ اس کا موضوع یہ ہے کہ تاریخ میں اور ہمارے موجودہ پیچیدہ اور نہ سمجھنے میں آنے والے ماحول میں شخصیت کا مقام کیا ہے۔

# چین میں شادی کی رسمیں

فضل حق قریشی دہلوی

چین میں شادی کی رسمیں دلچسپ اور توجہ کی مستحق ہیں۔ زندگی کی منزل ثانی میں داخل کرنے سے پہلے والدین اپنی لڑکیوں کی اعلیٰ تربیت کا خاص اہتمام کرتے ہیں وہ انہیں سلیقہ مند اور گھر بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن اس تمام سعی و کاوش کی تہ میں عورت کی اپنی ذات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ والدین کے پیش نظر یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ان کی بیٹی اپنی ذہانت و لیاقت سے پرائے گھر جا کر راج کرے بلکہ اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کی لڑکی کی وجہ سے سسرال والوں کے نظام حیات پر کوئی ناگوار اثر نہ پڑے۔ چنانچہ زیادہ توجہ اس امر پر مرکوز کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ساس سسر اور جیٹھ دیور کی اطاعت و فرمانبرداری اور خدمت گذاری کے ڈھنگ سیکھ لے۔ خاوند کی خدمت گذاری کا مسئلہ زیادہ قابل غور نہیں ہوتا کیونکہ بیوی براہ راست اس کے آرام کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔ خود اس کے گھر والے اس کی آسائشوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ بیوی کو اتنی اجازت بھی نہیں ہوتی کہ وہ سب کے سامنے اپنے خاوند سے بات چیت کرے یا کسی بھی حالت میں اس کے ساتھ ایک ہی چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھالے۔

جہاں تک گھریلو معاملات کا تعلق ہے شادی انفرادی کی بجائے اجتماعی حیثیت رکھتی ہے۔ کسی فرد واحد کی بجائے پورے گھرانے کے احترام کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ وہاں کسی مرد کے پیش نظر شادی کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس رسم کی ادائیگی صرف ذاتی فائدے کی غرض سے کر رہا ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ بیوی اس کے گھر والوں کی خدمت کرے، بچے جن کر افراد خاندان میں اضافہ کرے جس سے خاندان کا نام روشن ہو اور اس طرح آبائی پرستش کا سلسلہ ابد تک قائم رہے۔ یہ بات اس درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں کہتا کہ میں نے اپنی لڑکی فلاں مرد سے منسوب کر دی بلکہ اسے خاندان کا نام ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ نسبت قرار پا جانے کے بعد اگر شادی کی رسم ادا ہونے سے پہلے مرد کا انتقال ہو جائے تو عورت اپنے کنبے والوں کو خیرباد کہہ کر اس منگیتر کے گھر رہنا شروع کر دیتی ہے جس کی صورت سے بھی وہ ناآشنا ہوتی ہے اور اس طرح اپنی ساری عمر سسرال والوں کی خدمت میں بسر کر دیتی ہے۔

شوہر کا انتخاب کرنے کے سلسلے میں ہندوستان کی طرح چین میں بھی لڑکے اور لڑکی کی مرضی یا ان کی پسند کا مطلق لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ وہ شب عروسی سے قبل ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ بعض دفعہ ان کی تخلیق کی ساعتوں سے قبل ہی ان کے دامنوں میں شادی کی گرہ لگ جاتی ہے۔ یعنی دو گھرانوں کے شادی شدہ مردوں میں یہ بات طے پا جاتی ہے کہ اگر ان میں سے ایک کے ہاں لڑکا اور دوسرے کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا جائیگا۔ کوئی شادی آپس کے رشتہ داروں میں بھی طے نہیں پاتی خواہ وہ رشتہ قریب کا ہو یا دور کا۔ ہمیشہ کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ناواقف لوگوں میں یہ سلسلہ چلے تاکہ اس طرح نئے نئے میل جول پیدا ہوں اور بے گانگی شناسائی میں بدلتی چلی جائے۔ چنانچہ ہر مشاطہ کا فرض ہے کہ وہ اپنا قدم درمیان لاتے ہی سب سے پہلے یہ معلوم کرے کہ دونوں فریق پہلے سے ایک دوسرے کے رشتہ دار یا دیرینہ واقف کار تو نہیں ہیں۔

ضلعوں اور صوبوں کے لحاظ سے شادی کی ضمنی رسمیں مختلف ہیں۔ لیکن جہاں تک بنیادی اصولوں کا تعلق ہے وہ سارے ملک میں یکساں ہیں۔ کوئی منگنی کسی مشاطہ کے بغیر دائرہ عمل میں نہیں آتی۔ مشاطائیں عموماً زیادہ عمر کی عورتیں ہوتی ہیں اور وہ اس کام کو پیشے کے طور پر اختیار کرتی ہیں۔ البتہ کہیں کہیں گھر کی مامائیں بھی یہ خدمت انجام دینے لگتی ہیں۔ ہر مشاطہ کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ ایسے گھرانے میں جہاں شادی کے قابل لڑکا یا لڑکی موجود ہو بے روک ٹوک جائیں اور بیاہ شادی کے مسئلہ پر گفتگو کرنے لگیں۔

بعض دفعہ لڑکے یا لڑکی کے والدین کی مرضی اور ایما پر یہ کام شروع کیا جاتا ہے لیکن عموماً مشاطہ اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے یہ سوال اٹھا بیٹھتی ہے۔ اس طرح شروع سے آخر تک اس کا قدم درمیان رہتا ہے اور وہ ہر معاملہ کی اونچ نیچ کا خیال رکھتی ہے۔

سب سے پہلی رسم یہ ہے کہ لڑکے کے والدین کسی مشاطہ کو لڑکی والوں میں بھیجتے ہیں تاکہ وہ لڑکی کا نام اور اس کا وقت پیدائش دریافت کرائے۔ یہ دونوں باتیں کسی نجومی یا پنڈت کو بتا کر معلوم کرایا جاتا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی جنم پتریوں کے مطابق ستاروں کا میل ممکن ہے یا نہیں۔ اگر نجومی کا فیصلہ خاطر خواہ ہو اور وہ یقین دلائے کہ دونوں میں نباہ ہو سکتا ہے تو دوسری رسم ادا کی جاتی ہے ورنہ نہیں۔ دوسری رسم یہ ہے کہ پھر مشاطہ کو شادی کا پیغام دے کر لڑکی والوں میں بھیجا جاتا ہے۔ اگر لڑکی والے اس رشتہ کو قبول کریں تو ان سے تحریری وعدہ لیا جاتا ہے اور یہ شادی کی تیسری رسم ہے۔ پھر چوتھی رسم کے طور پر لڑکی کے والدین کو چند تحفے بھیجے جاتے ہیں۔ منگنی کے تحفے "چاء لی" کہلاتے ہیں۔ ان میں چائے[1] کے بنڈل، مٹھائیاں، سپاری اور کچھ نقد روپے شامل ہوتے ہیں۔ مشاطہ ان تحفوں کو لکڑی کے چپٹے بکسوں میں سجا کر لے جاتی یا زیادہ ہونے کی صورت میں مزدوروں کے ساتھ لڑکی کے مکان تک جاتی ہے۔ لڑکی والے جواب میں ایک جملہ لکھ بھیجتے ہیں یعنی "شیہ ین چاء لی" (ہم نے رسمی تحفے قبول کئے اور رکھ لئے) اس طرح منگنی کی رسم

[1] "چائے" ابتدائی طور پر چینی زبان کا لفظ ہے اور اردو کی طرح یورپ کی بھی بہت سی زبانوں میں رائج ہے۔

پکی ہو جاتی ہے۔ اگر تحفے نہ بھیجے جائیں تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ منگنی کی رسم ادا نہیں کرنی اور جو سلسلہ اب تک چلا تھا وہ کالعدم ہو گیا۔ منگنی ایک بار طے ہو جانے کے بعد لڑکی والوں کی طرف سے توڑی نہیں جا سکتی۔ البتہ لڑکے والے نقدی کی صورت میں کفارہ ادا کر کے اپنا دامن بچا سکتے ہیں۔ تحفے قبول ہونے کے بعد مشاطہ لڑکی والوں سے جا کر کہتی ہے کہ شادی کے لئے کوئی مبارک گھڑی مقرر کر لی جائے۔ یہ پانچویں رسم ہے۔

لڑکی کی زندگی یوں بھی کچھ زیادہ پر لطف نہیں ہوتی لیکن نسبت قرار پانے کے بعد ساری دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں جس طرح یہاں شادی سے پہلے لڑکی کو مایوں بٹھا دیا جاتا ہے، وہاں بھی نسبت قرار پاتے ہی لڑکی گوشہ نشین ہو جاتی ہے لیکن اتنی شدید پابندی کے ساتھ کہ وہ اس حالت میں نظر اٹھا کر اپنے گھر والوں کو دیکھ بھی نہیں سکتی۔ ان سے گفتگو کرنی تو بڑی بات ہے۔ البتہ اس دوران میں مامائیں یا مشاطائیں اور گھر کی بڑی بوڑھیاں اسے گھیرے رکھتی ہیں اور وہ اس دوران میں شادی کے بعد کی زندگی سے متعلق بہت سی باتیں سیکھ لیتی ہے۔ کیونکہ اس سے قبل اسے ایسا موقعہ کبھی نہیں ملتا۔

ان ابتدائی رسموں کے علاوہ جو ہر صوبہ اور ضلعے میں مختلف ہو سکتی ہیں شادی کے لئے تین اہم بنیادی رسمیں لازمی ہیں جن کے بغیر شادی مکمل ہو نہیں پاتی۔ ان کی ادائیگی مذہبی اعتبار سے بھی ضروری ہے۔ وہ شرطیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) شادی کا تحریری اقرار نامہ جس پر دولہا دلہن کے والدین یا سرپرستوں کے دستخط ہوتے ہیں۔

(۲) شادی کی رقم کی وصولی۔

(۳) دلہن کی رسید یعنی لڑکے والوں کی طرف سے اقرار نامہ کہ دلہن ان کے خاندان میں پہنچ گئی۔

شادی کی رقم دلہن کے والدین یا سرپرستوں کو پیشگی دے دی جاتی ہے۔ اس کا تعین حسب حیثیت ہوا کرتا ہے۔ منافلاؤں کے وسیلے سے جب پہلی دو شرطیں پوری ہو جاتی ہیں تو آخری شرط کی تکمیل ذرا تفصیل کے ساتھ عمل میں آتی ہے۔

دلہن کو بہترین قسم کا لباس پہنا کر سرخ رنگ کی ایک شاندار پالکی یا کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے جو وضع قطع کے لحاظ سے صرف شادیوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ دلہن کے علاوہ کوئی اور اس میں سوار نہیں ہوتا۔ ہر چینی عورت زندگی بھر میں صرف ایک ہی بار اس پر بیٹھ سکتی ہے۔ کیونکہ پھر یہ موقع نصیب ہی نہیں ہو سکتا۔ کرسی لکڑی کی بنی ہوئی نہایت دلفریب ہوتی ہے۔ باہر کے رخ چاروں طرف بہت ہی دیدہ زیب نقش و نگار ہوتے ہیں جن میں مراسم شادی کے مختلف مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے کناروں وغیرہ پر ہدہد کے پر لگا کر زینت میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ ہدہد کو بہت بھاگوان سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر اس پرندے کا سایہ کسی پر پڑ جائے تو ازدواجی زندگی لازمی طور پر عیش و آرام میں بسر ہوتی ہے۔

اس پالکی میں داخل ہونے کا راستہ کسی قدر تنگ ہوتا ہے اور اسے بھی بند کر کے اس کے سامنے دبیز پردے لٹکا دئے جاتے ہیں، تاکہ جلوس کے آدمیوں یا راہگیروں میں سے کسی کی نظر دلہن پر نہ پڑ سکے۔ روشنی اور ہوا کا گذر نہ ہونے کے باعث یہ خلوت عموماً وبال جان ہونے لگتی ہے، خصوصاً گرمی کے موسم میں دم گھٹنے سے بعض عورتیں بے ہوش اور کبھی کبھی فوت بھی ہو جاتی ہیں۔ اسے چار کہاروں سے اور زیادہ شان دکھانی ہو تو آٹھ کہاروں سے اٹھوایا جاتا ہے۔ بعض گھرانوں میں پالکی کی بجائے موٹر کار کا رواج ترقی پا گیا ہے لیکن دبیز پردے اس پر بھی ڈالے جاتے ہیں۔ تاہم اس میں دم نہیں گھٹتا۔

دریا کے پار جانے کی صورت میں پالکی کشتی کے اوپر رکھ دی جاتی ہے لیکن ہمیشہ یہ خطرہ دامنگیر رہتا ہے کہ اس کے زیادہ وزن سے کشتی بیٹھ نہ جائے۔ تاہم کشتی کے ہچکولے دلہن کو ادھموا ضرور کر دیتے ہیں۔ اگر ابتدائی دو شرطیں پوری ہو چکنے کے بعد دلہن اتفاقاً مر جائے تو دولہا اس کے جنازے کو ساتھ لے کر آخری شرط پوری کرتا ہے تاکہ شادی کی رسم ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے۔ مرد ایسی صورت میں دوسری شادی کر لیتا ہے لیکن صورت اگر متضاد ہو تو دلہن باقی عمر کے لئے بیوہ سمجھی جاتی ہے۔

سرخ لباس پہنے ہوئے مزدور اور مزدورنیاں جہیز کی مختلف چیزیں اپنے سروں پر اٹھائے پالکی کے آگے چلتی ہیں۔ امیر لڑکیوں کی شادی کے موقعوں پر یہ جلوس غیر معمولی طور پر کافی طویل ہو جاتے ہیں۔ پالکی سب سے آخر میں روانہ ہوتی ہے۔ مٹھائیوں کے خوان، رنگ برنگ کی کاغذی قندیلیں اور دوسری نمائشی چیزیں پالکی کے ساتھ رہتی ہیں۔ باجہ بھی بجتا جاتا ہے۔ جلوس کے منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے دولہا کے دوست دولہا کا خط لا کر دلہن کے حوالہ کرتے ہیں جو سرخ کاغذ پر سنہرے حروف میں لکھا ہوتا ہے۔ اس میں دولہا کی طرف سے تاکید ہوتی ہے کہ بہت جلد میرے گھر پہنچنے کی کوشش کرو۔ خط کا مضمون ہمیشہ تیا تلا اور ہر صورت میں یکساں ہوتا ہے اس لئے دلہن اگر پڑھنا جانتی بھی ہو تو پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتی۔ وہ جانتی ہے کہ اس میں کیا لکھا ہوگا۔ تاہم وہ اسے مرتے دم تک اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے۔

دولہا کے گھر میں پالکی کاندھوں سے اتار کر صحن میں رکھ دی جاتی ہے اور اگر مکان وسیع وضع کا ہو تو اسے ملاقات کے کمرے میں لے جا کر رکھتے ہیں۔ دولہا ہاتھ میں پنکھا لے کر پالکی کے قریب آتا اور اس کی ڈنڈی سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ دلہن پر سرپر سنہرا سرخ ریشمی نقاب ڈالے باہر نکل آتی ہے۔ فوراً گھر کی ایک ملازمہ آگے بڑھ کر

اسے اپنی پیٹھ پر بٹھا لیتی اور کوئلوں کی آگ پر سے لے کر گزرتی ہے۔ عین اس وقت ایک دوسری ملازمہ دلہن کے سر پر ایک سینی اٹھائے رکھتی ہے جس میں چاول، چاول کھانے کی تیلیاں اور سپاری کی چند ڈلیاں رکھی ہوتی ہیں۔ اس رسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی بلا دلہن کے سر پہ سوار ہو تو فوراً دور ہو جائے۔

اس اثنا میں دولھا ایک اونچی تپائی پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور وہیں سے اپنی دلہن کا استقبال کرتا ہے جو قریب پہنچکر سربسجود ہو جاتی ہے اور اس وقت تک پڑی رہتی ہے جب تک کہ دولھا تپائی سے اتر کر اسے اٹھا نہ لے۔ ساتھ ہی وہ اس کے چہرے سے نقاب ہٹا دیتا ہے اور پہلی بار اس کی جھلک دیکھتا ہے۔ حالانکہ منہ اب بھی موتیوں کی جھالر سے جو نقاب کے نیچے ہوتی ہے، قریب قریب ڈھکا رہتا ہے۔

اس کے بعد وہ دونوں اس بڑے کمرے میں جاتے ہیں جہاں دولھا کے آبا و اجداد کے ناموں کی تختیاں، زمین و آسمان اور مکان کے صدر دروازے کی نگرانی کرنے والے دیوتاؤں کی مورتوں کے ساتھ قربان گاہ والے بڑے طاق پر رکھی ہوتی ہیں۔ دونوں مل کر ان کی پوجا کرتے ہیں۔ اس پوجا کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس کے بعد ہی دلہن صحیح معنوں میں اپنے دولھا کی بیوی کہلائے جانے کی مستحق ہو سکتی ہے۔ پوجا کے بعد دلہن چند مشروبات بھی بھینٹ چڑھاتی ہے۔

اس سے فارغ ہو کر وہ دونوں حجلۂ عروسی میں قدم رکھتے ہیں۔ وہاں نارنگی کا ایک چھوٹا سا پودا گملے میں رکھا ہوتا ہے۔ یہ خاص قسم کی نارنگی کا پودا محض نمائشی ہوتا ہے۔ اس کا پھل انتہائی ترشی کے باعث کھایا نہیں جاتا لیکن سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بہت چھوٹا پودا ہی بڑی طرح پھلوں سے لدا رہتا ہے۔ اس کی ڈالیوں میں چند سکے بھی بندھے ہوتے ہیں۔ یہ گویا افراطِ اولاد اور فراوانیٔ دولت کی علامات ہیں۔

دلہن کی سیج پر چھتری سے بندھی ہوئی سرخ کاغذ کی تین لمبی پٹیاں لٹکتی ہوتی ہیں جن پر کچھ دعائیں لکھی ہوتی ہیں۔ مثلاً "بھگوان کرے تمہیں سو بیٹے اور ہزار پوتے نصیب ہوں"۔

دولھا اپنی دلہن کو سلام کر کے اس کے قریب چائے پینے بیٹھ جاتا ہے۔ چائے کے ساتھ مٹھائیاں اور پھل بھی ہوتے ہیں۔ بیٹھتے وقت دلہن چاہتی ہے کہ دولھا کے لباس کا ایک دامن اپنے زانو کے نیچے دبا لے۔ دولھا بھی یہی کوشش کرتا ہے اور عموماً کامیاب رہتا ہے کیونکہ دلہن جان بوجھ کر اسے موقع دیدیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آئندہ کون کس پر حاوی رہے گا۔ چونکہ ہمیشہ سے مرد کا سکہ عورت پر چلتا آیا ہے، اس لئے دلہن پرانے دستور کو نہ توڑنے کے خیال سے خود ہی اعتراف کمتری کر لیتی ہے۔ لیکن اس زمانہ کی بعض روشن خیال لڑکیاں برابری اور ہمسری کی دعویدار ہوتے ہوئے بالا جیت لینے کی کوشش کرتی ہیں۔

چائے نوشی کے وقت دولھا کی بہنیں دلہن کے چہرے پر سے موتیوں کی جھالر ہٹا دیتی ہیں تاکہ اس کا منہ صاف طور پر نظر آ سکے۔ دلہن کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ وہ عروسی لباس پہننے اور بناؤ سنگار کرنے کے وقت تزئین جمال کے لئے چہرے پر غازہ یا پوڈر بالکل نہ لگائے تاکہ رونمائی کے وقت خدوخال کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ اگر کوئی لڑکی اس اصول کا خیال نہ رکھتے ہوئے مصنوعات استعمال کر لے تو اس پر نام دھرے جاتے ہیں۔

دولھا دلہن چائے پینے میں مشغول ہو جاتے ہیں لیکن پاس کھڑی ہوئی عورتیں دلہن کے نقش و نگار اور حسن و جمال کی بابت اپنے خیالات طنزیہ انداز میں ظاہر کرتی ہیں۔ بعض دفعہ ان کی رائے زنی اتنی سخت اور دلسوز ہو جاتی ہے کہ غریب دلہن دل ہی دل میں کڑھتی اور کبھی رو پڑتی ہے۔

شام کو تقریباً سات بجے دولھا کے والدین کے اعزاز میں ایک پرتکلف ضیافت کا انتظام کیا جاتا ہے جس میں اصولاً دلہن پیش پیش رہ کر ہر کام میں حصہ لیتی ہے حتیٰ کہ کھانا کھانے کے وقت وہ دسترخوان پر اپنے ہاتھ سے سب چیزیں چنتی اور بالکل "بیرے" کی طرح ہر فرمائش پوری کرتی ہے۔ خسر کا پیالہ شراب سے لبریز کر کے وہ خود گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے ہاتھوں سے پیش کرتی اور اسی طرح جھکی رہتی ہے جب تک کہ وہ تمام شراب ختم نہ کر لے۔ پیالہ واپس لینے سے پہلے وہ دو سجدے کرتی ہے۔ کچھ دیر بعد عام دعوت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں دولھا دلہن بھی حصہ لیتے ہیں۔

حجلۂ عروسی میں دوبارہ پہنچانے سے پہلے دولھا کی رشتہ دار عورتیں دلہن سے

## غزل
**زبیر افضل**

تمہیں خوف مآل آتا تو ہوگا — جوانی کا خیال آتا تو ہوگا
کبھی منزل کے دو بچھڑے ہوؤں میں — مقام اتصال آتا تو ہوگا
تمہیں معلوم ہے دل کی حقیقت — کہ اس شیشے میں بال آتا تو ہوگا
نقاب رخ کبھی اٹھتی تو ہوگی — حیا میں اعتدال آتا تو ہوگا
یہ میرا اور تمہارا ربط باہم — کہیں اس کا سوال آتا تو ہوگا
فسانے میں تمہارے ذکر میرا — تمہیں اکثر ملال آتا تو ہوگا
کبھی معراج دل ہوتی تو ہوگی — کبھی وہ ماہ وصال آتا تو ہوگا

تصور میں کسی کے اب بھی افضل
کوئی افسردہ حال آتا تو ہوگا

بہت سی پہیلیاں پوچھتی اور کوشش کرتی ہیں کہ ساری رات اسی طرح گنوا دیں لیکن دولہا جو عموماً اس وقت تک نشۂ شراب سے چور ہو چکتا ہے آکر مزاحم ہوتا اور دلہن کو زبردستی اپنی سیج پر لے جاتا ہے۔

تیسرے دن دوبارہ دولہا کے آباو اجداد کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس سے فارغ ہو کر دلہن اپنے میکے جاتی ہے۔ دولہا بھی ساتھ جاتا ہے۔ ان کے پہنچنے کے دوسرے دن دلہن والے بڑے پیمانے پر دعوت دیتے ہیں جس میں تمام عزیز و اقارب اور دوست احباب شامل ہوتے ہیں۔

دو سال تک دلہن کو دلہن سمجھا جاتا ہے اور گھر کے کام کاج میں اس سے کوئی مدد نہیں لی جاتی۔

یہ ہے مختصر سا خاکہ ان رسموں کا جو صوبہ کینٹن میں عام طور پر قدیم کنفیوشی مت کے پیرووں میں رائج ہیں۔ بعض صوبوں میں ان کی ادائیگی میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ نیز بودھیوں اور مسلمانوں کے طریقے بھی جدا جدا ہیں۔

---

صوبہ سواتو میں پالکی کرسی کے لئے لازمی نہیں ہے کہ وہ سرخ رنگ کی ہو اور لکڑی ہی کی بنائی جائے۔ اس کے دروازے کو دبیز پردوں سے بند بھی نہیں کیا جاتا۔ اس میں کافی گنجائش ہوتی ہے تاکہ اگر دلہن چاہے تو ٹانگیں پھیلا کر آرام سے بیٹھ جائے۔ دولہا کے مکان میں صدر دروازے کی چوکھٹ پہ سوٴر کے کچے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا لٹکایا جاتا ہے۔ دلہن کو اس کے نیچے سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ کوئلوں کی آگ کی بجائے جلتی ہوئی سوکھی گھاس پہ اسے خود پاؤں رکھ کر چلنا ہوتا ہے۔ وہ ملازمہ کی پیٹھ پہ سوار نہیں ہوتی۔ تیسرے دن میکے واپس جانے کی بجائے وہ مسلسل چار ماہ تک سسرال میں رہتی ہے۔ البتہ اس دوران میں اس کے چھوٹے بھائی بہن اس کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ تین سال تک ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو اسے دولہا کے آبا و اجداد کی پوجا کرنی پڑتی ہے۔ اسے تین سال تک دلہن سمجھا جاتا ہے۔

صوبہ ہنان میں "گھر داماد" رکھنے کا رواج بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی رسمیں شادی کی عام رسموں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس صورت میں ابتدائی بات چیت طے ہونے کے بعد دولہا بذات خود دلہن کے گھر جاتا ہے جہاں تمام رشتہ دار اور دوست احباب پہلے سے جمع ہوتے ہیں۔ اسے مکان کا صدر دروازہ بند ملتا ہے۔ کواڑوں پر دو بار دستک سن کر دلہن اس کا نام، پتہ، حسب و نسب اور وہاں آنے کا مقصد پوچھتی ہے۔ وہ سب حالات بتا کر اپنا مقصد بیان کرتے ہوئے اقرار کرتا ہے کہ میں اس گھر میں تمہارا شریک حیات بن کر ہمیشہ رہنا چاہتا ہوں۔ تب وہ دروازہ کھول کر اسے اندر بلا لیتی ہے اور باقی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ اس صورت میں لڑکی کے آبا و اجداد کی پوجا دولہا کو کرنی پڑتی ہے۔ زندگی بھر یا جب تک وہ اس بیوی کے ساتھ رہے دولہا کو کوئی کام کاج کرنا نہیں پڑتا۔

اس کے تمام اخراجات دلہن والے برداشت کرتے ہیں۔ یہ طریقہ زیادہ تر ان گھرانوں میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں لڑکی اکلوتی ہو اور والدین بہت امیر ہوں۔ ایسی صورت میں پیدا ہونے والے بچوں کے ناموں کے ساتھ لڑکی ہی کے نام کا جزو ملایا جاتا ہے اور وہ اسی کی ملکیت تصور کئے جاتے ہیں۔

اگر کوئی شخص بہ سلسلۂ ملازمت یا کسی اور ضروری کام کے باعث اپنے گھر سے دور دراز مقام پر ہو اور اس کی واپسی جلدی ممکن نہ ہو سکتی ہو لیکن شادی کرنی ضروری ہو تو اس کی بجائے ایک سرخ مرغ کو دولہا بنا کر تمام رسمیں ادا کر دی جاتی ہیں اور جب وہ شخص واپس آتا ہے تو دوبارہ کسی رسم کی ادائیگی کے بغیر دلہن کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اگر کوئی لڑکا جوان ہونے اور شادی کرنے سے پہلے ہی مر جائے تو اس کے والدین فوراً مشاطہ کو بلا کر اس کا رشتہ ڈھونڈنے کے لئے ہدایت کرتے ہیں۔ وہ کسی قدر تلاش و تجسس کے بعد ایسا گھر معلوم کر لیتی ہے جہاں کوئی کنواری لڑکی تقریباً انہی دنوں میں فوت ہوئی ہو۔ پتہ چلتے ہی رشتہ فوراً قائم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ لڑکی والے بھی منتظر ہوتے ہیں کہ کوئی مشاطہ کہیں سے ایسا پیغام لے آئے! اور ان کی لڑکی دوسری دنیا میں شوہر کے بغیر نہ رہے۔ ایسی صورت میں دولہا دلہن کی بجائے ان کے ناموں کی تختیاں تیار کر کے شادی کی تمام رسمیں ادا کر دی جاتی ہیں اور اس طرح دو مختلف خاندان ایک دوسرے کے سمدھیانے بن جاتے ہیں۔

# نقد و نظر

## افادی ادب

مصنفہ اختر انصاری، ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ضخامت ۱۰۴، قیمت ۲؎

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا اور اب پانچ برس بعد دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ اب سے پانچ برس پہلے بھی اس کی افادی اہمیت اتنی ہی تھی جتنی آج ہے۔ بلکہ آج خاصے آگے بڑھ جانے کے بعد بھی ہم ادبی زندگی کے ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جب اس کتاب کا موضوع اور اس کا انداز، بھٹکے ہوئے تخیل اور تھکے ہارے قلم کو سیدھی راہ پر چلنے کی طرف مائل کر سکتا ہے۔

کتاب میں مصنف نے چند ایسے مسائل پر بحث کی ہے جو یوں تو ہر زمانہ کے ادب کیلئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب زندگی کی قدریں ایک نئی شکل اختیار کر رہی ہیں اور اس لئے ادب بھی اپنے لئے نئے سانچوں کی تجویز کر رہا ہو یہ بنیادی مسائل اور بھی اہم بن جاتے ہیں۔ انہیں زیادہ وضاحت اور صفائی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب اسی خدمت کو بوجوہ احسن انجام دیتی ہے۔ اس میں ادب کے اہم بنیادی مسئلوں کو اختصار کے ساتھ اعتماد کے لہجہ میں اور ادبی جوش اور توانائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور اسلئے بہت کم موقعے ایسے آتے ہیں جہاں کتاب پڑھنے والا اپنے آپ کو لکھنے والے کا ہم خیال نہ محسوس کرتا ہو۔ یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی عذر نہیں ہوتا کہ ادب حیات انسانی کی تفسیر ہی نہیں بلکہ تنقید بھی ہے۔ وہ زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور اس پر اثر انداز بھی۔ اور ادب میں دو خصوصیتیں لازمی ہیں پہلی یہ کہ اسے اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق ہو اور دوسری یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت ہو۔ اور اس لئے کسی ادبی کارنامے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے یہی دو چیزیں سامنے رکھنی چاہئیں۔ اس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے مصنف نے شروع سے استدلال کا ایک منطقی طریقہ اختیار کیا ہے اور اس منطق کے مختلف مقدموں میں کہیں الجھن نہیں۔ اور اس لئے اگر کہیں کسی کو مصنف کی رائے سے اختلاف بھی ہو تو وہ کم از کم اس کے منطقی قیاس سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔

افادی ادب، کی کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ سرورق بھی رنگین اور دیدہ زیب ہے۔ لیکن کتابت میں شروع سے آخر تک جو حد سے زیادہ خوش مذاقی برتنے کی کوشش کی گئی ہے اس سے کتاب کا حجم بلا ضرورت بڑھ گیا۔ کتاب اصل میں اتنے صفحہ کی ہونی چاہئے تھی۔ اس طرح اس کی قیمت بھی ذرا اور کم ہو جاتی۔

## (۱) آنسو اور پسینہ۔ ۲۲۸ صفحے قیمت ۲؎
## (۲) جھگڑے۔ ۲۸۴ صفحے قیمت ۲؎

مصنف اور ناشر ڈاکٹر رام پرتاب بہادر۔ ملنے کا پتہ:- ہریش چندر ۳۳، کچہری روڈ الہ آباد۔

آنسو اور پسینہ ڈاکٹر بہادر کی دس چیزوں کا مجموعہ ہے۔ چیزوں اس لئے کہ اس میں پانچ افسانے ہیں، تین ریڈیو کی تقریریں، ایک اور چیز جو نشر ہو جاتی تو تقریر ہوتی، ایک مضمون جس کے متعلق شاید نگار صاحب بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ وہ مزاحیہ ہے یا سنجیدہ اور پڑھنے والے کیلئے بھی کسی نتیجہ پر پہنچنا دشوار ہے۔ افسانوں اور مضمونوں کے شروع میں مصنف نے کتاب کے بارے میں، (اور خود اپنے بارے میں) بہت سی باتیں کہی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی کے بجائے وہ ادب برائے پیسہ کے قائل ہیں۔ آجکل کے اکثر لکھنے والوں کی ذہنی کیفیت یہی ہے لیکن ادب اور فن کی بلندیوں سے اتر کر یہ بات کی اتنی سچی بات کی ہمت کسی میں بھی نہیں۔ یہ ہمت میں نے ڈاکٹر رام پرتاب بہادر میں دیکھی۔ یہ ہمت کہ مصلحت اور مروت کے پردے ڈالے بغیر اور بلا دلی اور شاعرانہ اشاروں کا سہارا لئے بغیر، بات کو جس طرح محسوس کیا جائے اسی طرح بیان بھی کر دیا جائے۔ اور دوسری طرف اس صفائی، سچائی اور اس سے تلخی کو مزاح اور طنز کی ملی جلی چاشنی میں ڈبو کر سامنے لانے کی عادت۔ یہ ہمت اور یہ عادت ڈاکٹر بہادر کے طرز کی دو اہم خصوصیتیں ہیں۔ وہی ان کے افسانوں میں بھی ہیں، وہی ان کی ریڈیو کی تقریروں اور ان سنجیدہ مضامین میں بھی جن کا مجموعہ "جھگڑے" ہے۔

جھگڑے، کوئی جھگڑے کی چیز نہیں بلکہ بدنصیب ہندوستان کے ان جھگڑوں کا کوئی حل تلاش کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔ ہندو مسلمانوں کے جھگڑے جنہوں نے درندوں اور وحشیوں سے بازی لگائی ہے، ہندی، اردو، ہندوستانی کے جھگڑے جنہوں نے اس معصوم اور بے ضرر چیز کو الھاڑا بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان جھگڑوں کے ہر پہلو کو ایک عامی کے نقطۂ نظر سے سوچا ہے اور جس جگہ جس کا قصور دکھائی دیا ہے جی کھول کر کھری کھری سنائی ہیں۔ ان کھری کھری باتوں، بلکہ حد سے زیادہ تند، تیز اور تلخ باتوں کا نشانہ ایک طرف جوش اور سمترانندن پنت ہیں اور دوسری طرف جناح اور گاندھی، اور ان کے علاوہ اور ہزاروں اس طرح کے آدمی جو مصنف کے نزدیک ان جھگڑوں کی آگ کو ہوا دیتے ہیں۔ ان ساری باتوں میں ہر جگہ ایمانداری ہے، ہر جگہ انہیں دور کرنے کی ایک بے چین خواہش ہے، ہر جگہ ایک بہتر زندگی کا ایک سہانا سپنا ہے لیکن اس ساری ایمانداری، اور بے چین خواہش کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ان مضمونوں کو پڑھکر نہ ہندو خوش ہو سکتے ہیں نہ مسلمان۔ نہ کانگریسی، نہ لیگی اور نہ اردو والے نہ ہندی والے ——— پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں سب کی خوشنودی کا سامان ہے۔ مصنف کے ترکش کے تیر جب کسی پر برستے ہیں تو ایک کا کلیجہ چھلنی ہوتا ہے اور دوسرے کو یہی منظر جاں فزا معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ یہ مشورہ طلب کیا ہے کہ وہ افسانے لکھیں یا مضامین ——— اس لئے شاید مشورہ بے محل نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ وہ افسانے بھی لکھیں اور مضامین بھی۔ لیکن ایک بات کو ذہن میں رکھ کر اور وہ یہ کہ ادب برائے پیسہ بھی اگر ادب کی روایتوں کی پاسبانی سے محروم ہو جائے تو وہ ادب نہیں رہتا۔ زبان و بیان میں نئی ادبی روایتوں کی مستحکم عمارت بھی صرف پرانی روایتوں کی بنیاد پر بنائی جا سکتی ہے۔ یہ مجموعہ اظہار خیال کی ہمت اور فکر کے خلوص کی ایک ایسی مثال پیش کرتا ہے جس کی ہمارے ادب میں انتہائی کمی ہے۔

ف - ع

# ہماری نئی مطبوعات

## لندن سے آداب عرض

آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا لندن سے آداب عرض انہی نشریات کا مجموعہ ہے بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ دوسرا ایڈیشن قیمت عہ

## دیس سے باہر

آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی و جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیمت دو روپے عہ

## ادبستان

حضرت مولانا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کر کے بے نظیر تصنیف بنادیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

تیسرا ایڈیشن قیمت دو روپے آٹھ آنے ؎

## وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

بہترین ڈراموں کا مجموعہ مرتبہ اختر شیرانی۔ اس مجموعہ میں مرتب نے ملک کے بہترین ڈراموں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے یہ ڈرامے آپ کی ذہنی خوراک ہیں آج ہی آرڈر دیجئے نام سے ہی اندازہ کیجئے کہ ایک ڈرامے سے دوسرا کیسا لاجواب ہوگا قیمت تین روپے

## بہار شریعت

مصنفہ حضرت مولانا مفتی حکیم امجد علی صاحب اسلامی عقائد اور قرآنی احکام کیلئے بہترین تصنیف تمام مسائل کو تقریباً اور استدلالاً مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی کتب میں بینظیر تصنیف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ اپنے عقائد و اعمال نماز روزہ و دیگر عبادات و معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہر وقت بہار شریعت کو زیر مطالعہ رکھیں یہ آپ کو عالم و مفتی سے بے نیاز کرے گی۔ مفتیان کرام کے لئے نوٹ بک کا کام دیتی ہے۔ کامل ۱۷ حصے بلا جلد پچیس روپے مجلد اکیس روپے۔

## معاشیات قومی

ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی، یہ کتاب مزید رش لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی مرہون منت ہے۔ جسے ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ دماغ نے اردو کا لباس پہنایا ہے یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز داستان تاریخی روداد ہے اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف قیمت مجلد آٹھ روپے۔

## مقالات شیرانی

از حافظ محمود شیرانی۔ حافظ محمود شیرانی کا گوہر بار قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کر چکا ہے مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ گرانمایہ تصنیف ہر اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہونی چاہیئے۔ آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ کریں۔ قیمت تین روپے۔

## تاریخ انقلاب روس

مصنفہ شبیر جنگ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی اخلاقی اور مجلسی رد و بدل کی روح فرسا تاریخ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو اختصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ شبیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو خوش اسلوبی سے مرتب کر کے ایک لاجواب تصنیف بنادیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے

ہمارے ہاں اسلامی، ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل پنجسورے اور سپارے شائع ہوتے ہیں۔ فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

## اوراق پارینہ

از شبیر جنگ ایک انقلابی تہذیبی و ملی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات غریب مزدور۔ کسان کی تکالیف معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے یہ کتاب انقلابی ذہنوں کیلئے ایک پروگرام اور ادبا کیلئے بہترین استعارے محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ؏

## اردو زبان اور ہندو

مصنفہ ناظم سید ماروی اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع عمل و دخل میں ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرے گی تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے ؏

## قرآنی اخلاقی دو حصے

انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانیکا حق دار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہو۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ قیمت ایک روپیہ۔

## کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شبیر جنگ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شبیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ سیلوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے تعلیمات کیساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے

**ملنے کا پتہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب۔ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور**

# اردو کے چند ابتدائی اخبار

**حامد اللہ افسر**

اس میں شبہ نہیں کہ اخبار(۱) اپنی موجودہ صورت میں ہمارے یہاں انگریزوں کے وسیلے سے نمودار ہوا، لیکن انگریزوں سے پہلے بھی ہمارے ملک میں قلمی اخباروں کا رواج تھا، شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں "وقائع" کے نام سے اخبار شائع ہوتے تھے یہ قلمی اخبار تھے اور حکومت ان کو شائع کرتی تھی "وقائع نویس" اس مقصد کے لئے ایک مستقل عہدیدار ہوتا تھا جس کی نگرانی میں بہت سے "وقائع نگار" ملک کے مختلف حصوں میں متعین رہتے تھے جن کا فرض تھا کہ بادشاہ کی حضوری میں پیش کرنے کے لئے اہم واقعات کی اطلاع دارالسلطنت کو بھیجتے رہیں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہ "وقائع" کسی خاص مقام پر کھڑے ہو کر کوئی رکن حکومت پبلک کو بھی سنا دیتا تھا۔ چنانچہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر "وقائع" کے سنانے کا ذکر بعض تاریخوں میں موجود ہے۔

ان قلمی اخباروں کا سلسلہ انگریزوں کے تسلط کے بعد تک قائم رہا، سرکاری "وقائع" کے علاوہ بعض اور لوگ بھی قلمی اخبار نکالتے تھے۔ یہ لوگ اخبار نویس کہلاتے تھے، غنی خاں نے اپنی کتاب منتخب اللغات میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب کی فوجوں میں اخبار تقسیم کئے جاتے تھے، کرنل جیمس ٹاڈ نے ۱۸۲۳ء میں کئی سو قلمی اخبار رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی نذر کئے تھے۔ یہ سب اخبار سلاطین مغلیہ کے زمانے کے تھے، مکالے نے ۱۸۳۶ء میں لکھا تھا کہ دیسی لوگوں میں قلمی اخباروں کا بہت رواج ہے، صرف دہلی سے ایک سو بیس قلمی اخبار مختلف مقامات کو بھیجے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں مطبوعہ اخبارات کا سلسلہ ۱۷۸۰ء سے شروع ہوا، سب سے پہلا ہندوستانی اخبار انگریزی زبان میں "بنگال گزٹ" کلکتہ سے ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو جیمس آگسٹس ہکی نے شائع کیا لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد ابتدا ہی سے اخباروں سے گھبرا اٹھے، لارڈ ولسلی نے ۱۷۹۹ء میں ایک حکم جاری کیا کہ ہر اخبار اشاعت سے پہلے گورنمنٹ کے سکریٹری کو دکھا لینا ضروری ہے۔ سیکریٹری کو اختیار حاصل تھا کہ جس عبارت کو وہ قابل اعتراض سمجھے قلم زد کر دے۔ سنسر کا یہ سلسلہ لارڈ میٹکاف کے زمانے تک جاری رہا جنھوں نے ۱۸۳۵ء میں اخباروں کے اوپر سے پابندیاں ہٹا لیں اور ایک حد تک ان کو اظہار رائے کے لئے آزاد کر دیا۔

بنگال گزٹ کے بعد نومبر ۱۷۸۰ء میں "انڈین گزٹ" شائع ہوا، پھر ۱۷۸۴ء میں "کلکتہ گزٹ" نکلا اور ۱۷۸۵ء میں "بنگال جرنل" شائع ہوا۔

ملکی زبانوں میں سب سے پہلا اخبار بنگالی زبان میں جاری ہوا، یہ اخبار سیرام پور کے عیسائی مشنریوں نے نکالا تھا، اس کا نام "دگ درشن" تھا یہ ایک ماہوار رسالہ تھا جو اپریل ۱۸۱۸ء میں شائع ہوا، دو نمبر نکلنے کے بعد جب اس کے منتظمین کو اطمینان ہو گیا کہ باوجود سیاسی خبروں کے حکومت نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، تو انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار "سماچار درپن" بنگالی زبان میں شائع کیا۔ یہ اخبار جب لارڈ ہیسٹنگس کی نظر سے گزرا تو انھوں نے سیرام پور کے مشنریوں کی بہت ہمت افزائی کی اور ان سے درخواست کی کہ اس اخبار کا ایک فارسی اڈیشن بھی شائع کیا جائے۔

۲۸ مارچ ۱۸۲۲ء کو "جام جہاں نما" کا پہلا نمبر شائع ہوا، یہی گویا سماچار درپن کا فارسی اڈیشن تھا، اس کے اڈیٹر منشی سدا سکھ تھے اور پرنٹر مسٹر ولیم ہاپکنس پیرسن، اس اخبار کا آدھا حصہ فارسی میں تھا اور آدھا اردو میں، یہی اردو کا سب سے پہلا اخبار تھا، اس سے ظاہر ہے کہ "اردو اخبار" جو مولوی محمد باقر صاحب نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے شائع کیا اردو کا پہلا اخبار نہ تھا جیسا کہ ان کے لائق فرزند مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بیان کیا ہے۔ بلکہ "جام جہاں نما" اردو کا پہلا اخبار تھا جو اردو اخبار سے چودہ برس پہلے نکلنا شروع ہوا تھا، جام جہاں نما کے بہت سے پرچے امپیریل رکارڈ ڈپارٹمنٹ میں اب تک موجود ہیں۔

اس کے بعد ۴ مئی ۱۸۲۳ء کو ماتھر موہن متر نے "شمس الاخبار" جاری کیا، یہ اخبار بھی فارسی اور ہندوستانی (اردو) میں تھا، یہ اردو کا دوسرا اخبار تھا۔

اس تحقیق سے ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ اردو کا سب سے پہلا اخبار ایک ہندو بزرگ کی ادارت میں شائع ہوا اور اس کے بعد دوسرا اخبار بھی ایک ہندو بزرگ ہی نے نکالا، گویا اردو اخبار کی بنا اصل میں ہندو اصحاب نے ڈالی۔

۱۸۲۱ء میں راجہ رام موہن رائے نے فارسی زبان کا ایک اخبار "مرآۃ الاخبار" کے نام سے جاری کیا، راجہ صاحب نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ ہم "مرآۃ الاخبار" کا ایک حصہ ہندوستانی کے لئے مخصوص کرنے کا انتظام کر رہے ہیں لیکن یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ انھوں نے یہ انتظام کیا یا نہیں۔

۹ فروری ۱۸۲۶ء کو "ہندی" کا سب سے پہلا اخبار "اودنت مارتنڈ" جاری ہوا یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور اس کے پبلشر جگل کشور صاحب تھے اور منو ٹھاکر پرنٹر تھے۔ یہ اخبار دیوناگری رسم خط میں تھا لیکن چل نہ سکا ایک سال جاری رہ کر بند ہو گیا۔

۱۸۳۶ء میں مولوی محمد باقر صاحب نے "اردو اخبار" جاری کیا، اس اخبار میں زیادہ تر قلعۂ معلی کی خبریں شائع ہوتی تھیں، مولوی محمد باقر اپنے علم و فضل کے لئے دہلی میں بہت ممتاز تھے اور دہلی اور مضافات دہلی میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ انکا اخبار بہت مقبول تھا۔ اس اخبار میں واقعات حاضرہ پر بے لاگ رائے کا اظہار کیا جاتا تھا، مثلاً شرک کی حرمت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:-

"دل شکستوں کی عمارت دل کی تعمیر نہیں ہوتی اور شکستہ راستوں کی تدبیر ہوتی ہے۔"
(اردو اخبار مورخہ ۴ جون ۱۸۳۷ء)

تعزیرات ہند کی ترتیب کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا گیا۔

---

(۱) لفظ اخبار گو خبر کی جمع ہے لیکن اردو میں بطور اصطلاح کے واحد ہے اور ان مطبوعات کیلئے مستعمل ہے جو روزانہ یا ہفتہ وار یا ہفتہ میں دو بار شائع ہوں اور جن میں واقعات و سانحات حاضرہ شائع کئے جائیں اور ان پر اظہار رائے ہو۔

"مسکاف صاحب نے ۲۷ جون ۱۸۳۶ء سے ۳۰ نومبر ۱۸۴۶ء تک یعنی تین برس پانچ مہینے چودہ دن کے واسطے بطور تنخواہ کے تین لاکھ چالیس ہزار پانسو پچیس روپیہ پائے اور کل ۹۲ قانون بنائے جو قانون چھاپے جاویں تو قریب ۲۰ کالم اس اخبار (اردو اخبار) کے ہوں، علاوہ ان صاحب کے کہ یہ بھی ممبر مجلس قوانین کے تھے اور کئی صاحب اور علاوہ تنخواہ پاتے تھے۔"

(منقول از اردو اخبار ۲۴ جنوری ۱۸۳۷ء)

اس کے بعد تو گویا اردو اخباروں کا باقاعدہ دور شروع ہو گیا۔ ۱۸۴۶ء میں "خیر خواہ ہند" مرزا پور سے نکلا۔ ۱۸۴۹ء میں "دار الاسلام" دہلی سے ۱۸۴۹ء میں "گلزار ہمیشہ بہار" بنارس سے اور "مالوہ اخبار" اندور سے شائع ہوا۔ یہ سب اخبار ہفتہ وار تھے اور ان کا چندہ پندرہ روپیہ سے پچیس روپیہ سالانہ تک تھا۔

۱۸۵۰ء میں منشی رائے ہرسکھ رائے صاحب نے "کوہ نور" کے نام سے ایک اخبار لاہور سے جاری کیا۔ یہ اخبار ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران میں یہ اخبار روزانہ کر دیا گیا، میری تحقیق کے مطابق یہ اردو کا سب سے پہلا روزنامہ تھا۔ "کوہ نور" ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ نول کشور پریس لکھنؤ کے بانی اور مالک منشی نول کشور صاحب کوہ نور پریس لاہور میں اس وقت کلرک تھے۔

---

# آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین





مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۶۶ سے شائع کیا

# آجکل

اردو کا پندرہ روزہ ترجمان

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۵ | فہرست | یکم جنوری ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے



مدیرِ اعلیٰ: سیّد وقار عظیم ایم اے

ناشر: فضلِ حق قریشی دہلوی

مدیران: بھگت سروپ کھلر ایم اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

# رفتار زمانہ

## آئین ساز اسمبلی

ملک معظم کی حکومت نے لندن سے ایک بیان جاری کیا جو ذیل میں درج ہے:۔

"ملک معظم کی حکومت نے پنڈت نہرو، مسٹر جناح، مسٹر لیاقت علی خاں اور سردار بلدیو سنگھ [illegible] پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ کل صبح ہندوستان واپس جا رہے ہیں۔

ان ملاقاتوں کی غرض یہ تھی کہ آئین ساز اسمبلی میں تمام پارٹیوں کی شمولیت اور ان سب کا تعاون حاصل کیا جائے۔ یہ توقع نہیں تھی کہ کوئی آخری فیصلہ کیا جا سکتا کیونکہ آخری فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے ہندوستانی نمائندوں کو اپنے رفقاء سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔

سب سے بڑی دقت وزارتی وفد کے ۱۶ مئی کے بیان کے پیراگراف نمبر ۱۹ (۵) اور (۸) کے مفہوم کے بارے میں پیدا ہوئی جس کا تعلق سکشنوں کے اجلاسوں سے ہے۔

وزارتی وفد برابر اس نظریہ پر قائم رہا ہے کہ اگر کوئی مخالفت نہ ہو تو سکشنوں کے فیصلے سکشنوں میں شامل نمائندوں کے ووٹ کی محض کثرت سے ہونے چاہئیں۔ اس نقطہ نظر کو مسلم لیگ نے قبول کر لیا لیکن کانگریس نے ایک مختلف نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اگر بیان کو مجموعی طور پر پڑھا جائے تو اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ صوبوں کو گروپ بندی اور آئین سازی دونوں کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

ملک معظم کی حکومت نے قانونی مشورہ لیا ہے جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ۱۶ مئی کے بیان کا وہی مطلب ہے جسے وزارتی وفد نے ہمیشہ بیان کیا ہے کہ اس کی یہی نیت تھی۔ لہٰذا بیان کے اس حصے کو جس کا یہ مفہوم لیا گیا ہے ۱۶ مئی کی اس اسکیم کا ایک ضروری حصہ سمجھنا چاہئے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے اس قابل ہو جائیں کہ ایک نیا دستور اساسی مرتب کر لیں جسے ملک معظم کی حکومت پارلیمنٹ کے روبرو پیش کرنے کے لئے تیار ہوگی۔ لہٰذا آئین ساز اسمبلی کی تمام پارٹیوں کو اس تشریح کو قبول کر لینا چاہئے۔

یہ بات واضح ہو کہ ۱۶ مئی کے بیان کے مفہوم کے متعلق دوسرے سوالات پیدا ہو سکتے ہیں اور ملک معظم کی حکومت کو امید ہے کہ اگر مسلم لیگ کی کونسل آئین ساز اسمبلی میں شرکت پر تیار ہو جائے تو وہ بھی کانگریس کی طرح اس بات پر رضامند ہو جائے گی کہ فیڈرل کورٹ سے مفہوم سے متعلق معاملات کا فیصلہ کرنے کے لئے کہا جائے جنہیں کوئی ایک فریق فیڈرل کورٹ کے سامنے لائے اور مسلم لیگ کی کونسل ایسا فیصلہ منظور کرے گی تاوقتیکہ آئین ساز اسمبلی نیز سکشنوں میں جو طریق کار اختیار کیا جائے وہ وزارتی وفد کی اسکیم کے مطابق ہو۔ جو معاملہ اس وقت متنازعہ فیہ ہے اس کے متعلق ملک معظم کی حکومت کانگریس پر زور دیتی ہے کہ وہ وزارتی وفد کے نقطۂ نظر کو مان لے تاکہ مسلم لیگ کے لئے اپنے رویہ پر نظر ثانی کرنے کا راستہ صاف ہو جائے۔ اگر وزارتی وفد کی نیت کی اس تصدیق کے باوجود آئین ساز اسمبلی یہ چاہتی ہے کہ اس بنیادی مسئلہ کو فیڈرل کورٹ کے سامنے فیصلہ کی غرض سے پیش کیا جائے تو ایسا بہت جلد کرنا چاہئے۔ اس صورت میں مناسب یہ ہوگا کہ آئین ساز اسمبلی کے سکشنوں کے اجلاس فیڈرل کورٹ کا فیصلہ معلوم ہونے تک ملتوی کر دیئے جائیں۔

متفقہ طریق کار کو [illegible] بنائے بغیر آئین ساز اسمبلی کی کامیابی کا ہرگز کوئی امکان نہیں۔ اگر ایسی آئین ساز اسمبلی جس میں ہندوستان کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو نمائندگی حاصل نہ ہو کوئی آئین وضع کرے تو ملک معظم کی حکومت قطعاً یہ ارادہ نہیں رکھتی ——— جیسا کہ کانگریس نے کہا ہے کہ وہ یہ ارادہ نہیں کرے گی ——— کہ وہ ملک کے ناراضا مند علاقوں پر ایسا آئین زبردستی ٹھونس دے۔"

## سمندر کی تہ میں

سوئٹزرلینڈ کے مشہور سائنسدان پروفیسر آگسٹ پیکارڈ نے جن کی عمر اس وقت باسٹھ سال ہے ۱۹۳۱ء میں غبارے کے ذریعہ فضائے آسمانی میں دس میل بلند پرواز کی تھی۔ اب وہ سمندر کی تہ میں تیرہ ہزار فٹ کی گہرائی تک جانے کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے ایسی آہنی کشتی تیار کرائی ہے جو نہ صرف پانی کے بے پناہ دباؤ کا مقابلہ کر سکے گی بلکہ اس کے اندر بیٹھ کر قعر البحری کائنات کا دقیق مطالعہ بہتر طریقہ پر ممکن ہو سکے گا۔ انکی یہ مہم [illegible] تحقیقات کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوگی۔

## سندھ میں نئے انتخابات

پچھلے سال جولائی کے مہینے میں سندھ کے گورنر نے سندھ اسمبلی کو معطل کر دیا تھا کیونکہ دونوں مخالف جماعتوں کے درمیان اتنی منافرت و کشیدگی پیدا ہو چکی تھی کہ دامن امن و عافیت چاک ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔ عبوری دور میں مسلم لیگی وزارت کے چند اراکین اہم ذمہ داریوں کو انجام دیتے رہے اور ساتھ ہی نئے انتخابات کی تیاریاں ہوتی رہیں جنکو عملی جامہ گذشتہ ماہ کے دوسرے ہفتہ میں پہنایا گیا۔ چونکہ فرقہ وارانہ تصادم کے امکانات بہت زیادہ تھے اس لئے پولیس کا معقول انتظام کیا گیا، اور خدا کا شکر ہے کہ کوئی ناگوار صورت پیدا نہیں ہوئی۔ مسلم لیگ کی تیس نشستوں کے لئے ستر امیدواروں اور ہندوؤں کی سات نشستوں کے لئے بیس امیدواروں کی درخواستیں منظور ہوئیں۔ باقی امیدوار بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔ مسلم نشستوں کے لئے انتخابات کی سرگرمیاں زیادہ جاذب نظر رہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے ہی روز چار ہزار مسلم خواتین نے مسلم لیگی امیدواروں کو رائے دی۔ تین روز تک یہ دلچسپ ہنگامہ برپا رہا۔

مسٹر جی۔ ایم سید جو معطل شدہ اسمبلی میں مخالف جماعت کے قائد تھے ۱۲۰۰ ووٹ سے ہار گئے اور ان کی جگہ قاضی محمد اکبر منتخب ہوئے۔ انتخابات کے نتائج حسب ذیل ہیں :—

| | |
|---|---|
| مسلم لیگی اراکین | ۳۵ |
| کانگریس | ۲۰ |
| یورپین | ۳ |
| قوم پرست مسلم | ۲ |
| کل تعداد | ٦۰ |

مسلم لیگ کو ایک نشست کے حلقے میں سولہ ووٹ سے شکست ہوئی۔

## دس ہزار ایٹم بم

امریکہ نے صرف دو ایٹم بموں کے ذریعہ ہیروشیما اور ناگاساکی کو تباہ و برباد کر دیا۔ سقوط جاپان کا اصل سبب بھی یہی دو حادثے تھے۔ اس وقت سے آج تک اس منحوس ایجاد کا چرچہ کسی نہ کسی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ ہر ملک اس کوشش میں ہے کہ اس راز عظیم کو معلوم کر کے اپنی حفاظت و مدافعت کا سامان پیدا کرے تاہم امریکہ میں اس کی تیاری بہت تیزی کے ساتھ عمل میں آ رہی ہے۔ شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر سی۔ ایچ۔ یورے نے ایک تقریر میں فرمایا کہ امریکہ بیس لاکھ ڈالر صرف کر کے دس ہزار بم خود تیار کر سکتی ہے۔ کیونکہ اسکے پاس بم بنانے والے کارخانوں کے ساتھ ساتھ اس مقصد کے لئے اتنا سرمایہ موجود ہے۔ یہ خبر امریکہ کے لئے کتنی ہی دل خوش کن ہو، ان غریب ملکوں کے لئے جن کے پاس اپنے بچاؤ کی کوئی صورت ممکن نہ ہو، بہت ہوشربا اور پریشان کن ہے۔ دنیا جاپان کی تباہی کی داستان کو ابھی بھولی نہیں ہے۔

## ہندوستان کیلئے اناج

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد سمندر پار ملکوں نے جن اناجوں سے ہندوستان کی مدد کی، ان کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں :—

| اقسام اناج۔ | ۲۸۔ نومبر کو ختم ہونے والے ہفتہ میں | یکم جنوری سے ۲۸ نومبر تک کل مقدار |
|---|---|---|
| گیہوں اور آٹا۔ | ۴۱,۷۰۰ ٹن | ۱۲,۴۹,۷۰۰ ٹن |
| چاول | ۱۸,۵۰۰ " | ۲,۷۳,۲۰۰۰ " |
| مکئی | ۲,۱۰۰ " | ۲,۷۳,٦۰۰ " |
| جوار باجرہ وغیرہ | ۱,۲۰۰ " | ۵۳,۸۰۰ " |
| جو | ۱۹,۷۰۰ " | ۷۷,۰۰۰ " |

## امریکہ میں ہندوستانی سفیر

بادشاہ سلامت کی حکومت نے مسٹر آصف علی کو ہندوستان کی طرف سے امریکہ کا سفیر مقرر کرنا بخوشی منظور فرما لیا ہے۔ یہ نیک خبر اہل دہلی کے لئے بہت ہی زیادہ باعث مسرت ہے۔ اس وقت مسٹر آصف علی کی عمر اٹھاون سال ہے۔ انھوں نے دہلی کے اینگلو عربک ہائی اسکول اور سینٹ اسٹیفن کالج میں تعلیم پائی اور لندن "لنکنز ان" نامی ادارے سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ بار ایٹ لا ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے مس ارونا گنگولی سے شادی کی جن کے چچا ڈاکٹر این گنگولی سی آئی ای، ان دنوں رائل اگریکلچرل کمیشن کے رکن تھے۔ نئی مرکزی حکومت نے یہ پہلا سفارتی تقرر کیا ہے جس کو بڑی اہمیت دی جا سکتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ جنوری کے شروع میں مسٹر آصف علی امریکہ تشریف لے جائیں گے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بیگم آصف علی جو ان دنوں ضرورت سے زیادہ مصروف ہیں، اپنے شوہر کے ساتھ واشنگٹن جا سکیں گی یا نہیں۔ مسٹر آصف علی کی روانگی سے قبل سر گرجا شنکر باجپائی امریکہ سے واپس ہندوستان آ جائیں گے۔

## پیرس کے بھوکے چوہے

جنگ اور متعلقات جنگ میں مصروف ہو کر دنیا بھر کے لوگ کھیتی باڑی کے کاموں کو چھوڑ بیٹھے۔ نیز فوجی دستوں اور مسلح گاڑیوں نے مزروعہ زمینوں اور کھیتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ اناج کی زبردست کمی محسوس کی جانے لگی اور قحط نے اپنا رنگ جما لیا۔ بہت سے لوگ بھوک کے مارے مر گئے اور کچھ ناقص غذا کے باعث کمزور ہو کر اپنی صحت و تندرستی کو کھو بیٹھے۔ لیکن پیرس سے آنے والی اس عجیب خبر نے ہر شخص کو حیران کر دیا ہے کہ وہاں کے بھوکے چوہے موقع پا کر انسان کے چھوٹے بچوں پر حملہ کرتے اور ان کے جسم کا کوئی حصہ کتر کر کھا جاتے ہیں۔ پہلے طاعون اور موسمی امراض کی روک تھام کے لئے چوہوں کو مارنے کی مہمیں سر کی جاتی تھیں لیکن اب اس نئی مصیبت سے بچنے کے لئے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے جو ایک مقررہ وقت پر شہر کے گرد گشت

سے چوہوں کے بلوں پر حملہ ہوئے گا اور ہر ممکن طریقے سے ان کی نسل کو نیست و نابود کر دینے کی کوشش کرے گا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مہم کس حد تک کامیاب ہوگی۔ پیرس کی مجلس بلدیہ نے عوام سے استدعا کی ہے کہ وہ اس سلسلے میں سرکاری اہلکاروں کی پوری پوری مدد کریں۔ چوہے دان لگا کر زہریلی گولیاں پھیلا کر یا کسی اور طریقے سے چوہوں کو فنا کریں تاکہ خود ان کے معصوم بچے امن و عافیت کی فضا میں سانس لے سکیں۔

## کالی مرچوں کی برآمد

حکومت ہند نے شروع جنوری سے آخر ستمبر ۱۹۴۶ء تک کالی مرچیں ہندوستان سے باہر بھیجنے کے سلسلے میں حسب ذیل ملکوں کیلئے اجازت دی ہے۔ مقدار کا تعین بھی کر دیا گیا ہے جو ہر ملک کے سامنے درج ہے:۔

امریکہ ۔ ۲۵۰۰ ٹن ۔ برطانیہ ۔ ۱۹۰۰ ٹن ۔ آئرلینڈ ۵۰ ٹن ۔ آسٹریلیا ۲۰۰ ٹن ۔ نیوزی لینڈ ۔ ۵۵ ٹن ۔ لنکا ۵۰ ٹن ۔ افریقہ کی برطانوی نوآبادیات ۔ ۱۰ ٹن ۔ بلجیم ۔ ۱۲۵ ٹن ۔ لیشیبی ممالک ۔ ۱۲۵ ٹن ۔ ناروے ۔ ۵۰ ٹن ۔ ڈنمارک ۱۰۰ ٹن ۔ سوئٹزرلینڈ ۲۰۰ ٹن ۔ ہسپانیہ اور ہسپانوی مراکش ۔ ۱۰۰ ٹن ۔ ترکی ۔ ۱۰۰ ٹن ۔ روس ۔ ۱۰۰ ٹن ۔ کینیڈا ۔ ۳۰۰ ٹن ۔ پرتگال ۔ ۱۰۰ ٹن ۔ اٹلی ۔ ۱۰۰۰ ٹن ۔ زیکوسلویکیہ [illegible] ۱۰۰ ٹن ۔ برطانوی جزائر غرب الہند ۔ ۱۰۰ ٹن ۔ مغربی طبقات کے دوسرے ممالک [illegible] ۵۰ ٹن ۔ مشرق وسطیٰ، افریقہ اور خلیج فارس کے ملک ۔ ۲۰۰ ٹن ۔

## بین الاقوامی ادارۂ حفظان صحت

پچھلے سال جولائی کے مہینے میں جب ادارۂ اقوام متحدہ کی اقتصادی اور سماجی مجلس کے زیر اہتمام بین الاقوامی مجلس حفظان صحت کا اجلاس ہوا تو اکسٹھ ملکوں کے نمائندوں نے جن میں ہندوستان کے نمائندے بھی شامل تھے، اس ضرورت کو محسوس کیا کہ ساری دنیا میں صحت و تندرستی کا عام معیار بلند کرنے کے لئے ایک عالمگیر ادارے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اب یہ تجویز عملی شکل اختیار کر رہی ہے۔ ہر ملک اپنی حکومت کی منظوری سے اس ادارے میں شامل ہو سکیگا۔ یہ ادارہ طب اور ادویات کے تمام [illegible] پر حاوی ہوگا۔ تشخیص امراض، طریقہ، علاج اور پرہیز وغیرہ کے سلسلے میں مشورہ و امداد کی سہولتیں پیدا کی جائیں گی۔ یہ لازمی نہیں ہوگا کہ اس کی ہر ہدایت کو دائرہ عمل میں لایا جائے لیکن ہر ملک کے لئے بہتری اسی میں ہوگی کہ [illegible] پر عمل کرے۔ یہ ادارہ بہتر غذا، رہائش، صحت و صفائی، وضع حمل، پرورش اطفال، تیاری و ترکیب ادویات اور طبی تعلیم کے ضمن میں بھی مفید خدمات انجام دیگا۔

## چین کی خانہ جنگی

دنیا میں دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے پہلے بھی چین کی سرزمین [illegible] اور قتل و غارت کا مرکز بنی ہوئی تھی کیونکہ جاپان نے اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کے لئے اس غریب ملک کو تختۂ مشق بنا رکھا تھا لیکن اب بھی جبکہ ساری دنیا پر فضائے امن و عافیت طاری ہو گئی ہے اور امریکہ کے ایٹم بم [illegible] جاپان کے عزم و ارادے کچل کر رکھدئے ہیں، چین میں بدستور آگ اور خون کی ہولی کھیلی جاری ہے لیکن یہ ہولی کسی بیرونی اثرات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خانہ جنگی کی فضا نے سمیم اہل ملک کے لئے عرصۂ حیات کو تنگ سے تنگ تر کئے جا رہی ہے۔ چین کی سرکاری حکومت اور اشتراکیوں میں کسی عنوان سمجھوتے کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ خبر آتی ہے کہ مفاہمت کے آثار رونما ہو رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف حصوں میں قتل و غارت کا بازار بدستور گرم ہے۔ دونوں مخالف جماعتیں ایک ہی ملک کی رہنے والی، ایک ہی مذہب کی حامی اور یکساں سماجی پابندیوں میں گھری ہوئی ہیں، پھر بھی دو ایک مرکز پر نہیں آتیں۔ امریکہ نے ایک مصالحتی وفد بھیجکر انتہائی کوشش کی کہ ان دونوں کے مابین صلح و صفائی کی صورت نکل آئے لیکن اب تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا ہے۔ اس خانہ جنگی سے ان کے تمام نظام حیات پر اتنا برا اثر پڑ رہا ہے کہ امن و عافیت کی فضا قائم ہو جانے کے بعد بھی عرصۂ دراز تک اس ملک کے لئے پنپنا اور ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ممکن نہیں ہو سکیگا۔

## سانحات ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ سنا گیا کہ سر جوگندر سنگھ جو وائسرائے ہند کی پچھلی مجلس عاملہ میں تعلیم، حفظان صحت اور اراضیات کے رکن تھے ۲۶ دسمبر کی شام کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ موصوف مئی ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے اور نجی طور پر اعلیٰ تعلیم پا کر ایک لائق سیاستداں اور بلند پایہ ادیب ہو گئے تھے۔ ملک کے انتظامی معاملات میں مفید مشورے دینے کے علاوہ صحافت کے میدان میں انکی بڑھی ہوئی دلچسپیاں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں۔ سکھ مذہب پر عمدہ اور مفید کتابیں لکھنے کے علاوہ انہوں نے کئی تذکرے اور ناول بھی قلمبند کئے۔ وائسرائے کی مجلس عاملہ میں آنے سے پہلے وہ ریاست پٹیالہ کے وزیر اعظم تھے۔

اسی ہفتے یہ افسوسناک خبر بھی سننے میں آئی کہ ریاست کپورتھلہ کی مہارانی تارا دیوی دہلی کی قطب مینار سے گر کر موت کے آغوش میں پہنچ گئیں۔ ان کا اصلی نام یوسپ تھا اور وہ زیکوسلوکیہ کی رہنے والی تھیں۔ وہ لڑائی سے پہلے ہندوستان آئیں اور اب سے چند سال پہلے مہاراجہ سے انکی شادی ہوگئی تھی۔ بعد کی اطلاعات سے معلوم ہوا کہ مہاراجہ سے ان کے تعلقات کشیدہ تھے اور اسی لئے وہ ان سے الگ رہتی تھیں۔ نیز اب وہ امریکہ جانے کے لئے پوری طرح عزم سفر بھی کر چکی تھیں۔ اسوقت ان کی عمر صرف ۲۷ سال تھی۔ اس بے وقت موت پر جتنا بھی افسوس کیا جائے، کم ہے +

# غزل

اثر لکھنوی

اک فقط میں ہی نہیں وہ بھی پشیماں ہوگا
بیکسی میں جو مرے حال کا پُرساں ہوگا

کچھ ترے جور ہی سے جور کا درماں ہوگا
کہ پشیماں جو نہ ہوگا تو پشیماں ہوگا

گرمیٔ شوق یہی ہے جو دمِ جلوہ گری
خود نظارہ صفتِ شعلہ پرافشاں ہوگا

اک ذرا اور جو چالاک ہوا دستِ جنوں
تو پھر اک سلسلۂ چاکِ گریباں ہوگا

بزم کی بزم سُلگ اُٹھے گی یہ یاد رہے
بے گناہوں کے لہو سے جو چراغاں ہوگا

ایک مرکز پہ سمٹ آئے نظامِ عالم
بے محبت کے ہوا ہے نہ یہ ساماں ہوگا

زندگی سے جسے تعبیر کیا جاتا ہے
ایسے جینے سے تو مرنا کہیں آساں ہوگا

جو ترے حسن کے جوہر بھی نمایاں کر دے
آئینہ تو وہ نہ ہوگا دلِ حیراں ہوگا

رنگ چہرے کا ذرا دیکھیے آئینے میں
جانیے آپ سے کیا درد کا درماں ہوگا

جو تری یاد کو سینے سے لگا کر سویا
شورِ محشر اُسے اک خوابِ پریشاں ہوگا

پھیر لے پھیر لے دم بھر کو نگاہیں ورنہ
نالہ بھی میری طرح بسملِ مژگاں ہوگا

دیکھیں کیا کہتے ہیں اب تک جو کہا کرتے تھے
طرزِ مومن میں اثرؔ خاک غزلخواں ہوگا

# جامعہ ملیہ اسلامیہ

حفیظ جالندھری


أَدِرْ كَاسًا وَّنَاوِلْهَا أَلَا يَا أَيُّهَا السَّاقِيْ
ابھی اک اور زندہ معجزے کا ذکر ہے باقی

رسالت کے بقیہ معجزوں میں جامعہ بھی ہے
مدینے ہی سے وابستہ یہ گورِ لامعہ بھی ہے

قیامِ جامعہ ان ظلمتوں میں ان فضاؤں میں
چراغِ راہ ایسی تند زہریلی ہواؤں میں

مقابل ساحرانِ مغربی کے اک یدِ بیضا
خدائی استنے فرعونوں کی۔ تنہا جرأتِ موسیٰ

یہ ملت جب کبھی اپنی زیاں کاری کو جانے گی
وجود اس جامعہ کا معجزے سے کم نہ مانے گی

---

سُنا ہے میں نے یہ قصہ بزرگوں کی زبانوں سے
اندھیری رات میں اک نور اترا آسمانوں سے

زمینِ ہند پہ طاری تھا خوابِ خود فراموشی
مسلسل ایک سناٹا۔ مسلسل ایک خاموشی

مسلماں سو چکے تھے دامنِ ادبار و ذلت میں
بجز عبرت کوئی پرسانِ ملت تھا نہ ملت میں

یہ عبرت ایک غیرت مند مومن کی بصیرت تھی
اسیرِ مالٹا کی حریت آموز سیرت تھی

یہ بندہ تک رہا تھا دور سے گردش ستاروں کی
نگہبانی اسے مطلوب تھی قسمت کے ماروں کی

سکوتِ مرگ کی اس وادئ خاموش میں گویا
اسی کے چشم و دل تھے آسمانی نور کے جویا

یہی آباد گھر دیکھا۔ یہی اک در کھلا پایا
ملا آنکھوں کا زینہ نور سینے میں اتر آیا

یہ شیخ الہند محمود الحسن کا باصفا سینہ
وہ نور اک چاند تھا انوارِ اسلامی کا آئینہ

یہ خورشیدِ رسالت کی طرف سے اک امانت تھی
اسے امت کی آنکھوں میں بسا دینا دیانت تھی

یہ اک تازہ بشارت تھی یہ اک پیغامِ نوری تھا
اسے سینہ بسینہ منتقل ہونا ضروری تھا

---

جنابِ شیخ نے اس کام کا آغاز فرمایا
جگایا اہلِ دل کو محرمانِ راز فرمایا

امینِ راز تھے بحرِ وفا کے بے بہا گوہر
یہ دو آنکھیں تھیں اک دل۔ اجمل و انصاری و جوہر

سفارش سوزِ کامل کی تقاضا دردِ بے حد کا
انھیں عہدہ ملا تبلیغِ ارشادِ محمد کا

اسی دل نے انھیں آنکھوں نے مل کر طرح ڈالی
یہی تینوں تھے کشتِ جامعہ کے اولیں مالی

تمنّا تھی کہ چمکے اس طرح کچھ جوہرِ خاکی ۔۔۔ کہ جس کی دید کا مشتاق ہو خود نورِ افلاکی
وہ گرمی جس سے داغِ عشق کا شعلہ ہویدا ہو ۔۔۔ مسلمانانِ ہند کی نگاہوں سے بھی پیدا ہو
تھی خدمت اسکے ذمے ظلمتِ شب کو مٹانے کی ۔۔۔ انھیں ترکیب سوجھی چاند سے سورج اگانے کی

---

نگاہِ ظلمتِ مغرب نے بھی یہ ماجرا دیکھا ۔۔۔ طلسمِ غفلتِ مشرق کا جادو ٹوٹتے دیکھا
اٹھی اندھیر گردی ہر طرف دینے کے تعزیریں ۔۔۔ سزائیں ۔ ابتلائیں ۔ تازیانے اور زنجیریں
تجلّی طورِ سینا کی بسی ہو جن نگاہوں میں ۔۔۔ غضب کے امتحاں رکھے گئے ہیں انکی راہوں میں
نہ بچھونے تربتوں میں اب وہ زیرِ خاک سوتے ہیں ۔۔۔ کبھی سوتے نہیں جو بیج بیداری کا بوتے ہیں
شہیدانِ مقاصد کو کہاں آرام ملتا ہے ۔۔۔ بحالِ قید و آزادی ، برابر کام ملتا ہے
ابھی جاری ہے اُن روحوں کا فیض کارفرمائی ۔۔۔ طلوعِ جامعہ سے ہے عیاں اُن کی مسیحائی
پسِ مردن ملا ہوگا انھیں اتنا ہی چین اب تک ۔۔۔ کہ وقفِ جامعہ ہے خدمتِ ذاکر حسین اب تک
جوانمردوں نے جھیلی تھی جفا پیرانہ سالی میں ۔۔۔ وفا کے بیج آخر بو گئے انکا بِرعالی میں
وہ عالی فکر جن کو جامعہ کا باغباں کہئے ۔۔۔ دمِ جاری و ساری مانئے روحِ رواں کہئے
یہی سادہ سے ذاکر یا رفیق کار ہیں اُن کے ۔۔۔ انہی سے پوچھئے پوشیدہ کیا اسرار ہیں ان کے
کبھی انکی نظر پڑتی نہیں اسبابِ زینت پر ۔۔۔ خدا رحمت کرے ان عاشقانِ پاک طینت پر
اسی اک دائرے میں کاٹ کر مدت اسیری کی ۔۔۔ بساتے جا رہے ہیں بستیاں روشن ضمیری کی
زمینِ شور پر ہل چل رہا ہے خشک سالی میں ۔۔۔ کمی کرتا نہیں خونِ جگر دریا نوالی میں
یہی ذاکر جو پیکر تھا کبھی حسن و جوانی کا ۔۔۔ ذرا پوچھو تو باعث کیا ہے اس کی ناتوانی کا
لہو کا قطرہ قطرہ وقفِ گلشن کر دیا اس نے ۔۔۔ جمالِ ذات سے پھولوں کا دامن بھر دیا اس نے

---

یہ چہرے نونہالوں کے یہ بازو نوجوانوں کے ۔۔۔ جنھیں اک روز ہونا ہے مقابل قہرمانوں کے
انہی چہروں سے دنیا میں اجالا ہونے والا ہے ۔۔۔ یہی بازو ہیں جن کا بول بالا ہونے والا ہے

ظہورِ معجزہ سے کم نہ پاؤ گے ظہور اِن کا
جگر کے خون سے سینچا گیا ہے باغِ نوران کا

# خطبۂ صدارت — اعلیٰحضرت فرمانروائے بھوپال

امیرِ جامعہ، خواتین اور حضرات!

میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارکنوں، اس کے طلبا اور اس کے ہمدردوں کو جن میں کل ہندوستان کے شائقین علم و تعلیم شامل ہیں تہہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ جامعہ نے اپنی عمر کے پچیس سال پورے کرلئے اور اس چوتھائی صدی میں قومی زندگی کا ایک جزو صالح بن کر صدیوں تک زندہ رہنے کا سامان کرلیا۔ کاش آج جامعہ کے نامور بانی حضرت شیخ الہند، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری مرحومین بقید حیات ہوتے اور اس باغ کو جو انھوں نے بڑے شوق سے لگایا تھا سرسبز و شاداب دیکھ کر خوش ہوتے۔ تاہم ہمارے دل انکی خدمت میں بعالم ارواح خراج تہنیت پیش کرتے ہیں۔

جامعہ ملیہ کی ربع صدی کی کارگزاری کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں اس فریضہ ملی کی نوعیت اور اہمیت کو سمجھ لینا چاہیئے جو جامعہ نے اپنے ذمے لیا ہے۔ خدمت عامہ کے کام جو قومی زندگی کی تعمیر کے لئے انجام دیئے جاتے ہیں دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اصلاح و تہذیب یعنی افراد قوم میں سچی اور پاکیزہ اخلاقی روح پھونکنا ان کے دلوں میں اقدار اعلیٰ کی محبت پیدا کرنا، اور ان کی سیرت اور عمل کو ان اقدار کے سانچے میں ڈھالنا۔ دوسرے تنظیم و تربیت یعنی افراد کی بکھری ہوئی قوتوں سے ایک منظم اور منضبط اجتماعی قوت پیدا کرنا جس کے ذریعہ سے قومی مقاصد حاصل کئے جاسکیں۔ پہلا کام عالم اور مصلح کا اور ان سے بھی زیادہ معلم کا ہے جو ان دونوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ دوسرا کام سیاست داں اور مدبر کا ہے جو علم کے تیار کئے ہوئے مسالے سے قوم اور ریاست کی پائدار عمارت بناتا ہے۔ یہ دونوں کام اپنی اپنی جگہ نہایت اہم ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے پہلا کام مقدم اور بنیادی ہے۔ اور دوسرا تمامتر اسی پر منحصر ہے۔ اگر معلم اپنا وظیفہ اصلاح و تہذیب بوجہ احسن ادا نہ کرے تو مدبر ترتیب و تنظیم سے یکسر قاصر رہیگا۔ اس لئے کہ بحیس بے روح اور بے اصول افراد سے تو کوئی قوم یا ریاست وجود میں ہی نہیں آسکتی۔ اسی طرح اگر معلم اپنا کام غلط طریقے پر کرے تو مدبر کے لئے اپنا فرض صحیح طریقے پر انجام دینا دشوار بلکہ محال ہے۔ ناقص مسالے کو کتنی ہی کاریگری اور چابک دستی سے استعمال کیا جائے اس سے جو عمارت بنے گی وہ کمزور اور ناپائیدار ہوگی۔ پست ہمت اور دنی الطبع افراد کو منظم کرنے میں کتنی ہی دانشمندی اور تدبر سے کام لیا جائے ایک صالح، تندرست اور قومی جماعت کا وجود میں آنا قطعاً ناممکن ہے۔

اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ معلم کا کام قومی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کام جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ معلم عالم اور مصلح کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر اس کے اور ان دونوں کے مابین ایک بڑا فرق ہے۔ معلم اپنے جذبۂ تخلیق اور اپنے جذبۂ اصلاح و تہذیب کو نہایت ضبط اور احتیاط سے اس طرح کام میں لاتا ہے کہ وہ دوسروں پر کوئی چیز اپنی طرف سے عائد نہ کرے بلکہ اس جوہر کو جو خود ان کے اندر موجود ہے ابھرنے اور نشو و نما پانے کا موقع دے۔ ایک شخص کا اپنی ذات میں عالمانہ فضل و کمال اور مصلحانہ جوش و خروش کی صفات کا جمع کرنا اور پھر نمود ات سے باز رہنا اتنی بڑی ریاضت اور اتنا بڑا ایثار ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس اہم اور مشکل کام کا بوجھ جامعہ ملیہ کے باہمت کارکنوں نے اٹھایا اور سخت دقتوں اور مصیبتوں کے باوجود اسے بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ انھوں نے سب سے پہلا اصول یہ رکھا کہ جامعہ کی تعلیم حکومت یا دوسری بیرونی قوتوں کی مداخلت سے آزاد رہے گی اور کوئی ایسی امداد قبول نہیں کی جائے گی جس سے جامعہ کی آزادی میں خلل پڑے۔ یہ اصول اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ناگزیر تھا جس نے شیخ الہند مرحوم اور دوسرے بزرگانِ قوم کو اس ادارے کی تاسیس پر آمادہ کیا تھا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم عصر جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی روایات کے مطابق اور قومی ضروریات کے مناسب ہو۔ ایسی تعلیم جو حقیقی معنی میں تخلیقی ہو جس سے ذہن میں بیداری، روح میں بالیدگی اور سیرت میں پختگی پیدا ہو کسی بیرونی قوت کے عاید کئے ہوئے نظام کے اندر نہیں پنپ سکتی، بلکہ آزادی کی کھلی ہوا چاہتی ہے۔ لہٰذا اپنی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے جامعہ کو حکومت کی امداد سے محروم رہنا پڑا جس کے بغیر ہمارے ملک میں کوئی تعلیمی ادارہ اچھی طرح نہیں چل سکتا۔ اس کے کارکنوں کو انتہائی عسرت کی زندگی بسر کرنی پڑی اور اس کے طلبا پر معاش کے اکثر دروازے بند ہوگئے مگر اس نے اس راہ سے جسے وہ سیدھی راہ سمجھتی تھی قدم نہیں ہٹایا اور آہستہ آہستہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتی رہی۔ اس بے سرو سامانی کی حالت میں اس نے نئے تعلیمی تجربے کئے اور تعلیم و تربیت کے ایسے طریقے نکالے جن سے بچوں میں بھی دینداری اور حقیقی انسانیت جسمانی اور ذہنی قابلیت، خود شناسی، خودداری اور خود اعتمادی، آزادانہ فکر اور رضا کارانہ ضبط کی صفات پیدا ہوں۔ اس نے جامعہ عثمانیہ کی طرح اردو زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دیکر اس ذہنی بے حسی اور بے بسی کو دور کرنے کی راہ نکالی جو غیر زبان میں تعلیم پانے سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں پیدا ہوگئی ہے۔ اس نے معلموں کی تیاری کے لئے نئے طرز کی تربیت گاہ قائم کی، علم و تعلیم کی روشنی کو مدرسے کی حدود سے باہر پہنچانے کی غرض سے حلقۂ تعلیم و ترقی، تصنیف و تالیف کے لئے اردو اکاڈمی اور بیت الحکمت کی بنیاد ڈالی اور نشر و اشاعت علوم کے لئے

مکتبہ جامعہ قائم کیا۔ اسکی تعلیمی وعلمی خدمات کو نہ صرف ہندوستان کے بلکہ دوسرے ملکوں کے ارباب دانش بھی قدر و عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور آئندہ کے لئے اس سے بڑی بڑی امیدیں رکھتے ہیں۔

ارباب جامعہ نے اپنے محدود وسائل کے باوجود موجودہ اداروں کی تکمیل و استحکام اور نئے نئے اداروں کے قیام کی جو تجویزیں مرتب کی ہیں ان سے نہ صرف ان کی حوصلہ مندی اور اولوالعزمی کا بلکہ ان کی مصلحت بینی اور وقت شناسی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ ضروری عمارتوں کی تعمیر اور اردو اکاڈمی اور بیت الحکمت کی توسیع کے علاوہ وہ ایک جدید ترین طرز کا صنعتی ادارہ، لڑکیوں کی تعلیم کا اقامتی مدرسہ، چھوٹے بچوں کی تربیت کے لئے کنڈرگارٹن اور انکی صحت کی درستی کے لئے ایک ایسا شفاخانہ کھولنا چاہتے ہیں جس میں مدرسوں کی حفظان صحت اور علاج اطفال کے مخصوص ماہرین موجود ہوں۔ یہ سب تجویزیں ملک کے حامیان تعلیم کی دلی ہمدردی اور توجہ کی مستحق ہیں۔ اور مجھے امید ہے۔ سب علم دوست اور مخیر حضرات ان منصوبوں کے پورا کرنے میں جامعہ ملیہ کو مدد دینگے۔

اس علمی و تعلیمی خدمت کے علاوہ جو جامعہ ملیہ نے انجام دی ہے اس کی خاموش ملکی خدمت ایسی ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جشن سیمیں کے معزز مہمانوں کے سامنے جامعہ ملیہ کے موجودہ اور آئندہ کاموں کا ایک سرسری خاکہ پیش کرنے کے بعد اب میں جامعہ کے ارکان سے چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں:۔

حاضرین جامعہ! آپ نے ایثار و خدمت کی جو راہ اختیار کی ہے وہ بڑی دشوار گذار اور سنگلاخ ہے اور کامیابی کی جس منزل تک آپ پہنچنا چاہتے ہیں وہ دور دراز اور دیر طلب ہے۔ مگر اہل ہمت کے لئے یہی راہ چلنے کے لائق اور یہی منزل پہنچنے کے قابل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ ماحول آپ کی جد و جہد کے لئے ناساز گار ہے۔ ذہنی تبدیلیوں کے دور میں قدرتی طور پر ہمارے دل و دماغ پر سیاست چھائی ہوئی ہے اور یوں بھی ان حالات کی وجہ سے جو جنگ عظیم کے بعد رونما ہوئے ہیں دیگر ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی سیاسی اور معاشی مسائل نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی۔ ایسے زمانہ میں لوگ آپ کے تعمیری اور تعلیمی کام کی طرف اتنی توجہ نہیں کرینگے جسکا وہ مستحق ہے لیکن آپکو اس سے بددل نہیں ہونا چاہیئے۔ وقت کے دھارے کیخلاف تیرنے والوں کو خصوصاً طوفان کے زمانہ میں موجوں کے تھپیڑے کھانے ہی پڑتے ہیں لیکن اگر انکے دلوں میں عزم، سینوں میں نور اور بازوؤں میں قوت ہے تو وہ دریا کو چیرتے ہوئے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہانتک کہ طوفان گذر جاتا ہے، ہوا بدل جاتی ہے، دھارا پلٹ جاتا ہے۔ اور منا مر تیرنے والے کے سد راہ نہیں ہوتے بلکہ اسکے رفیق راہ بنجاتے ہیں۔ خدا کے فضل سے آپ اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہونگے۔

مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ پر ہمارے مفکرین ایک مدت سے غور کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اسکے حل میں ان کو قابل اطمینان کامیابی نہیں ہوئی ہے ان کا نصب العین یہ ہے کہ ہمارے طلباء کے واسطے کوئی ایسا نظام تعلیم تجویز کیا جائے کہ جس میں علاوہ علوم جدیدہ کے انکی خصوصیات ملی پر بھی پوری توجہ کی جائے۔ تاریخ اسلام میں بغداد، قرطبہ، غرناطہ میں جو علمی ترقی ہوئی اور جسکی روشنی ابتک یورپ میں پھیلی ہوئی ہے، اس کی بنیاد تعلیم قرآن اور ارکان اسلام پر تھی اور اس لئے وہ تباہ کاری جو اسوقت مغربی دنیا میں مجرد سائنس کی تعلیم سے پیدا ہوئی ہے۔ اسلامی دنیا میں کبھی رونما نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں مغربی اثرات کے تحت جو نظام تعلیم جاری ہوا اس میں تہذیب اخلاق کا کوئی عنصر شامل نہیں تھا اسلئے اسکے مضر نتائج اظہر من الشمس ہیں۔

جامعہ ملیہ میں ان نقائص کے دور کرنے کیلئے قدم اٹھایا گیا ہے اور اگر یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا تو یہ درسگاہ ہمارے کل تعلیمی اداروں کے واسطے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

جامعہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسکے مدرسین نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں نہایت ایثار سے کام لیا ہے اور اپنی زندگی قومی خدمت کے واسطے قربان کی ہے۔ یہ مثال اخلاق کی کتابوں سے کہیں زیادہ موثر ہے۔ اور جو طلباء یہاں سے انگریزی پڑھکر نکلیں گے وہ ہمیشہ قوم کی خدمت کو اپنے ذاتی اغراض پر مقدم رکھیں گے۔

ایک بڑی خدمت اس ادارے کی یہ بھی ہے کہ اس نے قوم میں علم کو علم کی غرض سے حاصل کرنیکا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور طلبا کو یونیورسٹی کی ڈگریوں سے جو کہ صرف فکر معاش کے واسطے حاصل کی جاتی ہیں مستغنی کر دیا ہے۔

جامعہ ملیہ کی امتیازی کامرانی کا سہرا میرے دوست اور زمانہ طالبعلمی کے رفیق ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ کے سر ہے اور یہ ایک ایسی فروگذاشت ہوگی جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس قابل قدر اور مایۂ ناز ہستی کے متعلق میں اپنے دلی جذبات تشکر کا اظہار نہ کروں جنکی بے مثل قربانیوں اور پیہم کوششوں سے اس عظیم الشان ادارہ کی عملی تعمیر وجود میں آئی ہے۔ اس درسگاہ کے اساتذہ اور متعلمین کیلئے اس محترم ہستی کی شاندار نظیر سے بہتر کوئی چیز قابل تقلید نہیں ہو سکتی جسکا نام نامی ہمت، استقلال اور ایثار کا مترادف ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فی زمانہ ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ ہیں اور جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ میرے خیال میں کسی محب وطن اور محبوب ملت کی مساعی جمیلہ کی قدر و قیمت کا تعین کرنا ایک قسم کی جسارت ہے۔ تاہم میرے لئے اس امر واقعہ کا اظہار موجب فخر ہے کہ جملہ ابنائے وطن و قوم ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے مخلص اور بے نفس رفقائے کار کی عظیم القدر خدمات کیلئے ہمیشہ تہ دل سے سپاس گذار رہیں گے۔

خداوند کریم ان سب کی متفقہ کوششوں میں برکت دے اور جامعہ ملیہ کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین!

# جامعہ کے پچیس سال

اعلیٰحضرت، محترم امیر جامعہ، خواتین اور حضرات۔

آج مجھے آپ کی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پچیس سالہ روئداد کا خلاصہ پیش کرنا ہے، پچیس سال اور کیسے پچیس سال۔ یہ کام جب شروع ہوا تھا تو کتنے تھے جن کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اس پر پچیس سال بھی گذر جائیں گے۔ خاصی طویل مدت ہوتی ہے پچیس سال کی، اور پھر قوموں کی زندگی میں یہی پچیس سال ایک لمحہ سے بھی کم ہوتے ہیں، لیکن باوجود اپنی طوالت کے یہ زمانہ بے رنگ مرور کا مرادف ہوتا ہے، اور حیات قومی کا یہی ایک لمحہ ایک تخلیقی لمحہ ہونے کی وجہ سے صدیوں پر بھاری ہو سکتا ہے۔ ان گذرے ہوئے پچیس سال کی روئداد کس اسلوب سے پیش کروں۔ اس مدت میں عزائم اور فسخ عزائم، ولولوں اور پژمردگیوں، مشقتوں اور سہل انگاریوں، دل بستگیوں اور دل شکستگیوں، شبہوں اور اعتمادوں، امیدوں، مایوسیوں، تھپکیوں اور گھرکیوں، حوصلہ مندیوں اور درماندگیوں کی کیسی کیسی مثالیں سامنے آئی ہیں۔ اور یہ سب لفظ جو میں نے بولے یہ صرف برائے گفتن نہیں۔ ان میں سے سب کی مثالیں اس وقت میرے ذہن میں موجود ہیں۔ اس روئداد میں ان کا ذکر کروں تو داستان بہت طویل ہو جائے گی۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اگر خدمت قومی کا کوئی کام نیک نیتی سے خدا کا کام سمجھ کر کیا جائے تو ہر چند کہ دشواریوں اور آزمائشوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن جس کا کام ہوتا ہے وہ دستگیری فرماتا ہے۔ متزلزل قدموں کو ثبات عطا ہوتا ہے۔ دل ٹوٹا بھی جاتا ہے مگر پھر جوڑا بھی جاتا ہے

دلِ شکستہ درآں کوئے می کنند درست
چناں کہ خود نہ شناسی کہ از کجا بشکست

ان مع العسر یسراً، ان مع العسر یسرا، شرط یہ ہے کہ عسر کو اس کی رضاجوئی میں جھیلا جائے اور یسر کو اس کی راہ میں مشقت ہی کے لئے سہولت اور مرحمت جانا جائے۔

اس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کروں۔ آپ سب کو یاد ہوگا اس لئے کہ باوجود حافظہ کی معروف ناپائداری کے وہ آسانی سے بھلا سکنے کی بات نہیں کہ کوئی دس سال کی انتہائی ہیجانی تعلیمی بے چینی کے بعد سنہ ء میں مسلمانان ہند کی ایک عمومی حرکت نے تحریک خلافت کی شکل اختیار کی۔ ساری دنیا میں ملت اسلامیہ پر جو گذر رہی تھی اس سے ہندوستان کے مسلمان بے خبر اور غیر متاثر نہ تھے۔ اپنی جماعتی حالت کی زبونی سے باوجود ہمہ غفلت بھی آنکھیں بند نہ کر سکتے تھے۔ مایوسی بھی تھی، غصہ بھی تھا، اور بے ہاتھ پاؤں مارے اپنے خاتمہ کو خیر مقدم کرنے کو بھی یہ تیار نہ تھے کہ جسم جماعتی میں کہیں زندگی کی رمق باقی تھی اور جس طرح کسی شدید مرض کے حملے میں جسم اپنی ساری قوتوں کو سمیٹ کر ایک بار دفع مرض کی جان توڑ کوشش کرتا ہے اسی طرح ملت اسلامیہ ہند یہ نے اپنی ساری ناتوان توانائیوں کو مجتمع کر کے صورت حال کے مقابلے کا تہیہ کیا تھا۔ جس طرح جسم کے سارے نظام ہائے اعضا اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اس کی اس مصیبت میں آخری معرکہ کے لئے کمربستہ ہو کر کتابوں اور حکیموں کے اندازوں سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ اپنا عمل کرتے ہیں اسی طرح جسم اجتماعی کا حال ہوتا ہے۔ اس تلاطم کے زمانے میں مسلمانان ہند نے اسی قسم کی ایک کوشش کی تھی۔ تعلیمی نظام عضا کے فعل کا نتیجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ تعلیم کے کام کا پرسکون دھیما پن اور ایک انقلاب انگیز سعی ملی کی ہنگامہ آرائی کا یہ تعلق بادی النظر میں کچھ انوکھا سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس دور انقلاب میں جامعہ کے نام سے ان تمام نیم شعوری اور تحت شعور تعلیمی منصوبوں نے ایک شکل اختیار کی، جو ایک عرصہ سے مسلمانوں کے اہل فکر و عمل کو ایک صحیح قومی تعلیمی نظم کے ترتیب دینے پر اکسا رہے تھے۔ اس میں محمد قاسم کی تمناؤں، سید احمد خاں کی آرزوؤں، سید محمود کی تجویزوں، وقار الملک کے ارادوں، اعلیٰحضرت کی سلطانیہ کالج جیسی اسکیموں، غرض خدمت اور احیائے ملت کی بہت سی چھوٹی بڑی کوششوں کا پرتو ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قوم اپنے وجود کے وظیفۂ بنیادی سے غافل نہیں ہے اور جب بھی اپنی زندگی کے باقی رکھنے اور ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اسے تعلیم صحیح تعلیم ہی کی راہ پر گامزن ہونے کا خیال ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہماری قومی زندگی کا شیرازہ، جو خود ہمارے ہاتھوں بہت بوسیدہ ہو چکا تھا، بکھرا تو ہم نے دیوبند اور علی گڑھ میں اسے پھر سے جوڑنے کی سعی شروع کی۔ اس صدی کے ربع اول میں مسلمان جس عالمگیر ابتلا میں رہے اور اس میں انہوں نے جامعہ ملیہ قائم کی۔ یہ قوم میں صحیح زندگی کے ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن بس رمق زندگی کا۔ یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جب صحت کا کچھ شائبہ بھی جسم جماعتی میں ہو تو وہ اپنے ہیجانات کا اظہار ہسٹریا جیسے تشنجی ہنگاموں ہی میں نہیں کرتی بلکہ اس بحرانی قوت کو دھیمے دھیمے مگر منزل مقصود کی طرف یقینی طور پر چلنے والے ارادوں کا خزینۂ توانائی بنا دیتی ہے۔ یہ سبق ہے ہماری قوم کو کہ وہ اپنے جوش و خروش کو گھنٹوں اور دنوں کے اندر خالی نعروں اور جلوسوں میں منتشر نہ کر دے بلکہ صبر طلب صبر آزما تعمیری مساعی میں اسے برسوں، قرنوں بلکہ صدیوں پر پھیلا سکے۔ میں نے کہا کہ یہ جامعہ ثبوت ہے اور سبق۔ البتہ بہت ہی کمزور سا ثبوت اور بہت ہی روکھا پھیکا سبق۔ کیا عجب ہے کہ تائید ایزدی ہو تو کام کرنے والوں کی استقامت اور قوم کی پذیرائی اس ثبوت کو بہت قوی اور اس سبق کو بہت دلنشین بنا دے۔

ہاں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ اس جامعہ میں احیاء ملی کی بہت سی تعلیمی تجویزوں کا سنگم ہے۔ اس حقیقت کا اظہار تھا ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کو دیوبند کے سردار شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم و مغفور کے ہاتھوں سید احمد خاں کے دارالعلوم کی مسجد جامع میں اس کام کا افتتاح۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

مجسب زمانہ تھا وہ جب ولولۂ شر جوانی کے سرمست نوجوانوں پر پہلی بار وہ مخلصانہ دینی کیفیت طاری تھی جس کا ایک لمحہ کبھی کبھی ساری زندگی کا رنگ بدل دیتا ہے۔ یہ جوانوں کے ڈر سے نمازیں پڑھنے والے، راتوں کو روتے اور گڑگڑاتے سنائی دیتے تھے۔ خود غرضیوں کی ہر وقت جکڑے رہنے والی زنجیریں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈھیلی ہو رہی ہیں، ٹوٹ رہی ہیں۔ ملازمتوں کے تلاش، سفارشوں کے لئے سرگرداں اپنے پیٹ کے علاوہ اور سب حقیقتوں سے ناآشنا نوجوان بیتاب تھے کہ اپنے وجود کو وجود ملی میں گم کر دیں اور اپنی ساری قوتوں کو اسکی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ لیکن عمر بھر خود غرضی کی تکرار سے با غرض کاموں کی مشق تو نہیں ہوتی۔ اس سے بے غرضی کا رخ بھی جاذب توجہ ہنگاموں کی طرف، محلوں میں جھولیاں ڈال کر نکل کھڑے ہونے کی طرف، تقریروں کی طرف نئی نئی وضع کے لباسوں کی طرف ہی جاتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ چند نوجوانوں کے اصرار پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے اس وقت اس جوش اور اس خلوص کو ایک پائدار کام میں لگانے کا فیصلہ کیا اور مجھے وہ وقت یاد ہے اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں ایک وجود مقدس قید و جلاوطنی، علالت اور تفکرات ملی نے جس کی ہڈیاں گھلا دی تھیں، جسکے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا ہے لیکن جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کر رہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مدد خداوندی سے بہت کچھ بن سکتا ہے، یہ وجود مقدس دیوار کا سہارا لئے بیٹھا ہے۔ ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کر سکتا اور اسکا پیام اس کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سناتے ہیں۔ صاحبو یاد رہے کہ وہ جس دیوار کا سہارا لئے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی وہ اس ایوان محکم اور اس ایمان کا نتیجہ یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی اور وہ نہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب فرما رہے تھے جو ان کے سامنے تھے۔ ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا کسی عمارت کا افتتاح نہ ہو سکتا تھا، چندوں کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ قافلہ سروسامان کو چھوڑ کر بے سروسامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا، یہ وقتی فائدوں کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا، اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرہ زیادہ عزیز تھی۔ وہ محنت اور مشقت کا عزم لے کر تعمیر نو کے لئے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا، یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کو شروع ہوا تھا۔

اس کام کے ساتھ مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے وابستہ رہے حکیم اجمل خاں مرحوم اس کے پہلے امیر جامعہ مقرر ہوئے، اور مولانا محمد علی مرحوم پہلے شیخ الجامعہ۔ حکیم صاحب مرحوم نے ہم نوجوانوں کو متانت، رواداری خاموش خدمت کا سبق دیا۔ حکیم صاحب کی ذہنی جڑیں مسلمانوں کے علمی اور فنی ماضی میں بہت گہری پیوست تھیں۔ اور ان کی نظر حال کی ترقیوں اور مستقبل کے امکانات کو اس طرح صاف دیکھتی تھی جیسے شاید ہی کوئی نام نہاد جدید تعلیم یافتہ دیکھ سکتا ہو۔ ہم نے ان سے قدیم اور جدید کے ہم آہنگ بنانے اور سمونے کا سبق سیکھا۔ حکیم صاحب اپنے دلی کرب کو اپنے دلفریب تبسم کے پردے میں یوں چھپانا جانتے تھے جیسے صرف ایک ہم آہنگ شخصیت جانتی ہے۔ تکلیف میں مسکراتے رہنے کی عادت ہم نے ان سے سیکھی۔

پھر مولانا محمد علی اس عہد کی اُن غیر معمولی شخصیتوں میں تھے جنھیں قدرت نے ذہنی قوتوں کے ساتھ قلب و روح کی بیتابی بھی ارزانی فرمائی ہے۔ ان کا ذہن انھیں فرزانوں کا فرزانہ اور ان کا دل انھیں دیوانوں کا دیوانہ بنا دیتا ہے۔ جامعہ کے ابتدائی کام کرنے والوں کو اس دیوانے فرزانے کی شاگردی اور ہمرکابی کا شرف بھی حاصل ہوا جس نے ہماری قومی زندگی کے بہت سے اجارے توڑے اور بہت سے شیشہ گروں کی دکانیں درہم برہم کر دیں۔ جامعہ والوں کو ان سے وہ گرمی قلب ملی جو مایوسیوں میں امیدوار، اور تہی دستی میں غنی رکھ سکتی ہے، اور اگرچہ بے وسیلگی میں ہمارے منصوبوں کی شکست پر کبھی اوقات نیک دل ہمدردوں نے ہم پر ترس کھایا اور زبان حال سے فرمایا کہ ؎

بہ سادگی تو رحم آیدم دریں بازار
کہ تنگ دستی و امیدوار می گذری

لیکن محمد علی کی تربیت نے ہمیں دل شکستہ و ویران کی قدر کرنا سکھا دیا تھا، اور ہم بھی عرفی ہی کے الفاظ میں اپنے نیک دل ہمدردوں سے کہہ دیتے تھے کہ ؎

عرفی دل آباد بہ یک جو نہ خرد عشق
من ہم دل ویراں بہ دو عالم نہ فروشم

لیکن مولانا محمد علی زیادہ دن جامعہ میں نہ رہ سکے تھے کہ سیاست نے انھیں پھر طلب کیا، اور ہمارے ملک میں تو سیاست کا انعام اکثر قید و بند اور دار و رسن کی شکل میں ملتا رہا ہے۔ کراچی کے مشہور مقدمہ کے بعد مولانا قید کر دئے گئے اور ہمارے کام کی باگ عبدالمجید خواجہ صاحب نے سنبھالی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ خواجہ صاحب امیر جامعہ کی حیثیت سے آج ہم میں موجود ہیں، اور میں جامعہ کے تمام کارکنوں کی طرف سے ان کی خدمت میں مبارکباد کے ساتھ ساتھ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ ان کی رہنمائی نے جامعہ کو اس ڈھنگ پر چلا دیا جس پر وہ آج تک چلتی رہی ہے۔ خواجہ صاحب نے جامعہ کے خالص تعلیمی مشن کو سب سیاسی کام کرنے والوں سے منوایا اور جامعہ نے تہیہ کیا کہ وہ تعلیمی کام کو تعلیمی کام کی حیثیت سے کرے گی اور اس میں تعلیمی آزادی کو بطور اصول بنیادی کے ہمیشہ پیش نظر رکھے گی۔ اس دور کی سب سے اہم بات یہی ہے کہ جامعہ نے جو پہلے دن سے سرکاری اثر سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکی تھی یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کی تابع بھی نہیں ہے۔ مذہبی کام کی آزادی اور خود مختاری کا اصول سیاست کی

دھوپ چھاؤں سے بے تعلق آنی اور وقتی منصوبوں اور پائدار اور دیر طلب کاموں میں موخرالذکر کی اہمیت کا اقرار ہمیشہ کے لئے جامعہ کی زندگی میں راسخ ہوگئے۔ اور اگرچہ بسا اوقات اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں لیکن یکسوئی سے اسپر قائم رہ کر ہم نے نکتہ چینوں کو بھی ان کی نکتہ چینی کا فیتی حق چھینے بغیر مطمئن کردیا کہ سیاست سے ہماری یہ دامن کشی نہ بزدلی ہے نہ بے ایمانی بلکہ ایک صبر طلب تعمیری کام کے تقریباً منطقی تقاضوں میں سے ہے۔ سیاست خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالہ ہے، آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اتر جاتا ہے تعلیمی کام ایک دھیرے دھیرے بہنے والا میدانی دریا ہے، جو برسات ہی میں نہیں بہتا گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف بستے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان کرتا ہے۔ سیاست استوکام وجود قومی کی تمنا ہے۔ فطرتاً بیتاب ہے تعلیم اقدار مطلقہ کی عاشق ہے: لازماً صبر طلب۔ تعلیم ان اعلیٰ اقدار کو تازہ اور شاداب رکھتی اور پیدا کرتی ہے۔ سیاست ان کی تنظیم کرتی ہے اور حفاظت، اس لئے وہ مخدوم ہے اور یہ خادم سیاست شدت چاہتی ہے تعلیم مدت۔ سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے ہیں تعلیم کا پہلا منصوبہ ہی اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل آپ ہی سے لے رہنیں ہے۔ راہرو کا رخ متعین کرتی ہے ؎

ملال عالمیان دم بدم دگرگوں است

منم کہ مدت عمرم بیک ملال گذشت

بہرحال جامعہ نے اپنی اب تک کی زندگی میں تعلیم کو تمام غیرتعلیمی خارجی اثرات سے جو تعلیمی آزادی میں حائل ہوں محفوظ رکھنے کو اپنا اصول جانا ہے اور امید ہے کہ آنے والے دور میں کہ شاید تنگدستی کی جگہ وسائل کی فراوانی کا دور ہو۔ اور رک رک کر آگے بڑھنے کی جگہ جلد جلد قدم اٹھانے کا موقع ملے، جامعہ کے کارکن اس اصول کو ہاتھ سے نہ دینگے۔

غرض قومی زندگی میں تعلیم کی مرکزی حیثیت اور اس اہم وظیفہ کو کما حقہ ادا کرنے کے لئے آزادی کی ضرورت ہم پر آغاز کار ہی میں روشن ہوگئی تھی۔ اس وظیفہ کو ادا کرنے اور اس آزادی کو خالی منفی آزادی نہیں بلکہ عمل کی مثبت آزادی میں منتقل کرنے کا کام بڑا دشوار تھا۔ اس دشواری میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ جب بعض مجبوریوں کے باعث خواجہ صاحب شیخ الجامعہ کے عہدہ سے سبکدوش ہوگئے اور پھر کچھ عرصہ بعد حکیم اجمل خاں صاحب کا سایہ ہمارے سر سے ہٹ گیا۔ اس جگہ جامعہ کی زندگی کے ایک خاص واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا۔ اس سے جامعہ کے کام کی روح اور اس کے اصول کار پر روشنی پڑتی ہے۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری ہمارے امیر مقرر ہوئے۔ ان کی محبت اور شفقت، انکی فراخدلی اور انسانی ہمدردی، ان کی برائی سے بیزاری اور نیکی کی ہر رنگ اعانت کا جذبہ ہم کارکنوں کی تربیت میں اپنا اثر چھوڑ گیا ہے اور ہم شکرگذاری کے ساتھ ہمیشہ اسے یاد رکھیں گے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے امارت جامعہ کا کام جب سنبھالا تو ہماری مالی حالت بہت سقیم تھی۔ شروع شروع میں جامعہ کے تمام مصارف کا بار جمعیتہ خلافت اٹھاتی تھی لیکن سیاسی دریا کے اتار نے اس صورت کو ممکن نہ رکھا۔ حکیم صاحب تنہا اپنی ذاتی کوشش سے جامعہ کے کام کے لئے وسائل فراہم کرتے تھے۔ آخری زمانہ میں مسلسل علالت اور غیرمعمولی مصروفیت کے باعث ماہ بماہ فراہمی زر کے کام میں خلل پڑتا رہا۔ اور جب حکیم صاحب سدھارے تو جامعہ پر خاصا قرض تھا۔ ہم کارکنوں کو حتی کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم تک کو یہ علم نہ تھا کہ حکیم صاحب کہاں سے ہمارے لئے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ جب وہ رخصت ہوگئے تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے خود ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مشورے سے ان کی خدمت میں ایک مراسلہ بھیجا کہ جامعہ کے کام کو جاری رکھنے کا قصد ہو تو فراہمی زر کی طرف امنائے جامعہ توجہ فرمائیں یا اسکے بند کرنے کا فیصلہ کریں۔ نیز مجھے اس فیصلے کے اعلان سے کچھ پہلے آگاہ فرمادیں تاکہ اگر اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی مدد سے میں اس ادارے کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی قائم رکھ سکوں تو اس کی کوشش کروں۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا یہ مراسلہ امناء کی خدمت میں بھیجا اور انہیں فیصلے کی فوری ضرورت کی طرف متوجہ فرمایا۔ زمانہ بہت برا تھا، سیاسی ردعمل نے ساری امنگیں دبادی تھیں، ایک عام انتشاری حالت تھی۔ تعلیم کے ایک ایسے کام کے لئے جسے حکومت وقت بھی تسلیم نہ کرتی ہو جو اپنی بے سروسامانی کے باعث خود بھی ظاہر بین نظروں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے، کون روپیہ دیتا، نظر آتا۔ چنانچہ ہمارے امناء کی بہت بڑی اکثریت نے بلکہ پانچ چھ کو چھوڑ کر سب نے جواب دیا کہ جامعہ کو بند کردینا چاہیئے۔ روپیہ فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ اور بہت سوں نے کہ شخصی طور پر میرے اور میرے ساتھیوں کے ہمدرد اور خیرخواہ تھے یہ مشورہ دیا کہ اس کے کسی حصہ کو زندہ رکھنے کا سوال قابل تعریف تو ہے لیکن قابل عمل نہیں۔ اس خیال کو چھوڑ دو اور کوئی مفید کام کرو۔ اس فیصلے اور اس مشورے میں تجربہ، زمانہ شناسی، مصلحت اور احتیاط کتنی بھی ہو یقین اور جرات کی کمی ضرور تھی۔ لیکن یہ چیزیں الحمدللہ کہ قوم کے نوجوانوں میں موجود تھیں۔ میں نے اس خط کے ساتھ جسکا ذکر کیا، ایک خط اپنے ساتھیوں کو بھی لکھا تھا جو جامعہ میں کام کرتے تھے۔ انہیں بتایا تھا کہ غالباً امناء کا فیصلہ یہی ہوگا کہ جامعہ کو بند کردو، کیا آپ ہم مل کر اس کے کسی حصے کو بچائیں؟ روپیہ نہیں ہے مقروض ہے، جلد روپیہ ملنے کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہے، مکان کرائے کے ہیں، بچوں کو بلا کر کم سے کم سال تعلیمی کے ختم سے پہلے واپس کرنا بہت بے جا ہوگا۔ کہئے کیا رائے ہے؟ ان کا جواب آیا——سب کا بلا استثنا سب کا۔ کہ کام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، روپیہ نہ ہوگا، بلا معاوضہ کام کرینگے، ایک دوسرے کو سہارا دیں گے، لیکن ایک بار کوشش کرکے ضرور دیکھیں گے۔ اس باہمت جواب کے بعد بے یقینی کا جو درجہ کام کو بند کرنے کے لئے ضروری تھا وہ میں نے اپنے اندر نہیں پایا۔ لہٰذا کام جاری رہا۔ ان ساتھیوں کی ہمت کا امتحان خوب ہوا مہینوں کسی کو ایک پیسہ معاوضہ کا نہ دیا جاسکا۔ لیکن ہم نے جامعہ کے انتظام میں

ایک بنیادی تبدیلی کرلی۔ سب وہ جن کا تعلق رسمی تھا اس سے الگ ہوگئے۔ سب وہ جن کے دل کو لگی تھی اس کام کے ذمہ دار بن گئے۔ ایک انجمن، انجمن تعلیم ملی کے نام سے قائم کی گئی جس میں چند بنیادی اصولوں کے علاوہ جو ہمارے شریک رہنے پر آمادہ تھے گیارہ ساتھیوں نے حیاتی رکن بننا قبول کیا اس شرط پر کہ وہ ۲۰ سال تک یا تا حیات اگر زندگی ۲۰ سال سے پہلے ختم ہو جائے جامعہ کی خدمت کرینگے اور اپنی خدمت کا صلہ کبھی ۱۵۰ روپے ماہوار سے زائد طلب نہ کرینگے حالات نے آج تک کسی حیاتی رکن کو یہ معاوضہ بھی نہیں لینے دیا ہے۔ اب اس انجمن میں ۲۴ ارکین ہیں اور ہمارے دوسرے ساتھی جو ابھی رکن نہیں ہیں وہ بھی ارکین ہی کی پابندیوں کے ساتھ جامعہ کے کام کو ایک اچھا عبادت کا کام سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے محترم مولانا ابوالکلام آزاد نے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ہمراہ مدراس کا دورہ فرمایا اور ان کے اثر اور سیٹھ جمال محمد کی فیاضی سے وہ سخت وقت گذر گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس انجمن کا قیام ہماری تعلیمی تاریخ میں ایک قابلِ توجہ واقعہ ہے، اس نے اس زرپرستی کے زمانے میں تعلیمی، تہذیبی، دینی کام کو نیک کام کی حیثیت سے کرنے کی طرح ڈالی ہے اور اسے ایک کام بنانا چاہا ہے جسکا اصلی انعام خود کام ہی ہوتا ہے۔ ہمارے ماضی کی ساری شاندار روایات اسی طرزِ عمل کی رہین منت ہیں، ہمارے مستقبل کے لیے اس نئے طرز خدمت کا رواج ایک فال نیک ہے۔

دوسرے اس انجمن کے قیام سے غیر سرکاری تعلیمی کام کے لئے ایک نئی راہ نکلی ہے۔ تعلیمی آزادی کا وہ خیال جو پہلے دن سے جامعہ کی جان ہے اس انجمن کے قیام سے اور واضح ہو گیا ہے یعنی یہی نہیں کہ وہ تعلیم حکومت کے اثر سے آزاد ہو، سیاسی جماعتوں کے اثر سے آزاد ہو بلکہ ناواقف شخصیتوں اور غیر تعلیمی رجحانات رکھنے والی ٹولیوں کے اثر سے بھی پاک ہو، غیر سرکاری مدارس کی انتظامی جماعتوں اور ان کے ملازموں یعنی واقعی تعلیمی کام کرنے والوں کی روز کی کشاکش، وکیلوں اور تاجروں اور عہدہ داروں کے اعمل، بے جوڑ منصبوں کو جو استادوں کو خریدتے ہیں اور زرخرید چیز کی طرح برتتے ہیں اور ان استادوں کو جو اپنے کو جنس بازاری کی طرح بیچتے ہیں، تعلیم گاہوں میں یکجا کرکے صحیح تہذیبی تعلیمی مرکز کیسے بن سکتے ہیں۔ تعلیم کا کام صرف انہیں کرنا چاہیئے جو اسے اپنا حقیقی کام سمجھتے ہوں، جو اسکے بغیر بے چین رہیں، جو اس کی انجام دہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھیں اور جو اس کام کی اہمیت اور اپنی اس کے ساتھ وابستگی کے باعث خود اپنا احترام کرتے ہوں، اور آزاد ہوں کہ اپنے کام کو اپنی بصیرت کے مطابق بہترین طریق پر انجام دیں، میرا خیال ہے کہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں میں اس قسم کی پہلی انجمن ہے، اور میری دعا ہے کہ ایسی متعدد انجمنیں جلد وجود میں آئیں اور ہماری تعلیم کا کام کرانے کے کام کی جگہ عبادت کی ایک شکل بن جائے۔

آزادی اور خود مختاری کی یہ تدریجی نشوونما بے حقیقت ہوتی اگر مالی وسائل کی فراہمی میں جامعہ اس کے مناسب حال طریقہ نہ اختیار کرتی۔

چنانچہ جامعہ نے یہ کیا۔ ہماری جدید تعلیم گاہیں عموماً سرکاری گرانٹ اور امراء کی امداد سے چلتی ہیں اور اس طرح کہ ان کا وجود انھیں پر منحصر ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر کوئی تعلیمی جماعت اپنے کام کے شرف کا احساس رکھکر آزادی کی خواہش بھی رکھتی ہو تو وہ آزادی خالی دکھاوے کی آزادی ہوسکتی ہے۔ جامعہ کا کام جب سے اس کے واقعی کام کرنے والوں نے، انجمن جامعہ ملیہ کی شکل میں اپنے ہاتھ میں لیا تو انھوں نے مالی وسائل کی فراہمی کا بھی ایک نیا ڈھنگ ڈالا سرکاری امداد کا تو سوال ہی نہ تھا۔ متمول طبقہ کی مدد کمیاب تھی، اہل ثروت سرکار سے اعتنائی، بلکہ مخالفت کی صورت میں ایک تعلیم گاہ کو جس کے کام نے کبھی ابھی اپنی ساکھ پیدا نہیں کی تھی کیسے اپناتے؟ اور ہم کہ اپنی آزادی کی قدر شروع سے کرنا چاہ رہے تھے اپنے وجود اور اپنے طرزِ کار کو کیسے اس قسم کی مدد پر منحصر کرنے پر راضی ہو جاتے۔ ہم نے چند خواص کی جگہ جمہور ملت کو اپنا مددگار بنانا چاہا۔ اور ۱۹۳۲ء میں ہمدردانِ جامعہ کے نام سے ایک حلقے کی تنظیم شروع کی جس میں ہوتے ہوتے دس ہزار ہمدرد ہوگئے ہیں، جو ہمیں ماہانہ یا سالانہ چھوٹی چھوٹی رقمیں مرحمت فرماتے ہیں، لیکن ایک بار نہیں بلکہ برابر مرحمت فرماتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے کام سے ناخوش ہوتے ہیں تو اپنی مدد بند کردیتے ہیں، خوش ہوتے ہیں تو اور دوستوں کو بھی اس حلقہ میں شامل کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق دو چار صاحبانِ ثروت سے نہیں، بلکہ ہزاروں ہمدردوں سے بندھا رہتا ہے اور ہمیں یہ ڈر نہیں ہوتا کہ کسی ایک آدمی کے ناخوش ہونے سے ہمارا کام رک جائیگا بلکہ ہماری مدد صرف اسوقت بند ہوگی جب ہم اتنے برے ہوں کہ جمہور امت ہم سے متفقہ طور پر ناخوش ہو جائیں، اسوقت بے شک یہ مدد بند ہو بھی جانی چاہیئے اور ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہم کیوں اپنے ہمدردوں کی ہمدردی قائم نہ رکھ سکے۔

سنہ ۳۲ء میں اس حلقے سے پانچ ہزار روپے جمع ہوئے تھے، سنہ ۴۰ء میں اس نے ۲۴ ہزار فراہم کئے۔ سنہ ۴۲ء میں ۲۲ ہزار، سنہ ۴۵ء میں ۴۱ ہزار اور سنہ ۴۶ء میں جوبلی کے خاص چندے کے علاوہ جو اسی حلقے کی معرفت جمع کیا گیا ہے، اور جس میں اس نے دو لاکھ ۳۰ ہزار روپیہ فراہم کیا ہے، اپنے معمول کے طور پر ۴۸ ہزار روپے جمع کئے، اس عمومی امداد سے ہمیں پتہ ملتا رہتا ہے کہ ہماری قوم ہمارے کام کے متعلق کیا سمجھتی ہے؟ پچھلے تیرہ سال کا اندازہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس حلقے نے دو ہزار سے بڑھ کر ہماری گرانٹ ۴۸ ہزار کردی ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ زمانہ کیسے ہیجان کا زمانہ رہا ہے۔ اس میں لوگ ہم سے ناخوش بھی ہوئے ہیں، ہم پر نکتہ چینی بھی ہوئی ہے، ہم نے صحیح تنقید سے سبق لیا ہے، غلط کو صبر سے سنا اور سہا ہے، اور قوم نے ہمیں اس سال میں ۴۸ ہزار روپے چھوٹے چھوٹے چندوں کی شکل میں عطا فرمائے ہیں۔

پھر قوم کے عوام کے ساتھ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں اہلِ ثروت کا اعتماد بھی حاصل ہوا۔ اعلیٰحضرت حضور نظام نے، اعلیٰحضرت فرمانروائے بھوپال نے، اعلیٰحضرت نواب صاحب رامپور نے، ریاست کشمیر نے، پھر دہلی میونسپلٹی نے، ہمارے

کام کے لیئے مستقل امدادیں عطا فرمائیں، اور وہ کام جو رک رک کر ہوتا، مگر ہوتا، ذرا آسانی سے انجام پاسکا۔

قوم کی مدد سے، اس کے متوسطین، امرا، دونوں کی مدد سے یہ کام رفتہ رفتہ بڑھا، جامعہ کے پاس جس نے پچیس سال پہلے بغیر ایک چپہ زمین کے، اور بغیر عمارت کی ایک اینٹ کے، اور بغیر سرمایہ کے ایک پیسے کے، کام شروع کیا تھا۔ آج اوسط قیمتوں کے لحاظ سے ۱۵ لاکھ سے اوپر کا اثاثہ ہے۔ موجودہ قیمتوں میں تقریباً ۳۰-۲۵ لاکھ کا، اس کے کام کو تعلیمی حلقوں میں، اس ملک میں اور اس ملک کے باہر بھی کچھ نہ کچھ پسند کیا گیا ہے۔ اس کی مثال نے اور اس کے کام کرنے والوں کے اثر نے قوم میں تعلیمی کام کے اصولوں کو کم سے کم فکری طور پر ضرور متاثر کیا ہے اسکی مقبولیت بڑھی ہے۔ اس سال اس کے مدرسہ ابتدائی میں ایکہزار سے اوپر داخلے کی درخواستوں میں سے صرف چالیس بچوں کی درخواستیں منظور کی جاسکی ہیں۔

جو ہم پر شبہ کرتے تھے، اور ہمارے تعلیمی کام کو اور کاموں کے لئے بس ایک آڑ سمجھتے تھے وہ بھی مطمئن ہوگئے۔ حکومت ہند نے دو سال ہوئے ایک بڑی مستند کمیٹی سے ہمارا کام دکھوایا اور اس کمیٹی نے ہمارے تمام امتحانوں کے سرکاری طور پر تسلیم کئے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ ہمارا جامعہ جونیئر کا امتحان سرکاری طور پر مسلمہ میٹرک یا اسکول فائنل کے مساوی تسلیم کرلیا گیا۔ اور ہمارے استادوں کے مدرسے کے صداقت نامہ کو بنیادی مدرسوں کی معلمی کے لئے مستند مانا گیا۔ حکومت ہند نے اپنے ساٹھ منتخبہ اساتذہ کو ہمارے استادوں کے مدرسے میں تربیت کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

آج جامعہ ایک چھوٹا سا اقامتی کالج چلا رہی ہے جس کے متعدد فارغ جامعہ کے کام میں اپنی ساری قوتیں وقف کر رہے ہیں، اور ملک کے مختلف گوشوں میں علمی، تعلیمی، صحافتی، تجارتی، سیاسی کاموں میں نیک نامی کے ساتھ مصروف ہیں۔ اس نے ایک چھوٹا سا کوئی پچیس ہزار مجلدات پر مشتمل کتب خانہ جمع کرلیا ہے۔ ایک اقامتی مدرسہ ثانوی، ایک اقامتی مدرسہ ابتدائی چلا رہی ہے جن میں جدید طریق ہائے تعلیم پر تجربے کئے جارہے ہیں اور انھیں اپنی قومی ضرورتوں کے لئے مفید بنانے کی کوشش جاری ہے۔ ایک ادارہ تعلیمی مرکز کے نام سے شہر دہلی میں چل رہا ہے۔ جو ایک مڈل اسکول، ایک عمومی دارالمطالعہ، عام اجتماعیات کے لئے ایک ہال، پڑوس کے شہریوں کے لئے ایک مطب پر مشتمل ہے، اور اپنا کام بڑی خوبی سے انجام دے رہا ہے تعلیم بالغان کے طریقوں پر تجربہ حاصل کرنے کے لئے ادارہ تعلیم و ترقی کے زیر اہتمام ایک تجربی مرکز قائم ہے، اور دوسرے کام کرنے والوں کے لئے طریقہ کار سے متعلق لٹریچر شائع کرنے کے علاوہ اس نے بالغ مبتدیوں کے لئے ڈیڑھ سو سے اوپر رسالے شائع کئے ہیں۔ ایک استادوں کا مدرسہ ہے جس میں بنیادی مدرسوں کے استادوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے، اردو میں اشاعت کا کام وسیع پیمانہ پر مکتبہ جامعہ انجام دے رہا ہے اور آج اردو کے خادموں کی صف اول میں اپنے لئے ایک اچھی جگہ پیدا کرچکا ہے۔ ایک چھوٹا سا شعبہ مصنوعات جامعہ کے مدرسہ ثانوی کے معمل سائنس سے متعلق ہے، اور روزمرہ کے استعمال کی بہت سی چیزیں تیار کرتا ہے۔ ان مختلف اداروں کے کام کا کچھ اندازہ آپ کو جوبلی کی نمائش کے ملاحظہ سے ہوسکیگا۔

غرض خاصا پھیلا ہوا کام ہے اور اس پر ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں، لیکن سب چھوٹا چھوٹا کام ہے۔ ابتدائی حالت میں ہے، ہر پہلو سے اصلاح و ترقی کا پیاسا ہے۔ اور بالکل بے جا انکسار کے نہایت خلوص کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ان کاموں کی تفصیل بیان کرنے میں فخر کا شائبہ بھی نہیں کہ شرم کہ آنکھیں اٹھانے کا یارا بھی نہیں۔ پچیس سال کی قومی سعی اور اتنا حقیر سا نتیجہ؟ پچیس سال کی کدو کاوش اور یہ ہوئے کم! آپ جانتا ہوں کہ تعلیمی، تربیتی کام میں ہتیلی پہ سرسوں نہیں جمتی، جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پل مارنے میں پھیل جائے اور سارے ماحول کو خاکستر بنا دے، چمن بندی ہے، مادی وسائل کی لہروں سے مدت تک اسے سینچا ہوتا ہے۔ دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک بار نہیں روز اس میں ملانا ہوتا ہے، اور یہاں خون جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر یہ آرزو بے چین کرے کہ وسائل کی نہر کچھ کشادہ ہوتی، پسینہ بہانے کی آمادگی بھی ذرا زیادہ لوگوں میں پائی جاتی اور خون جگر کا بھی کال نہ ہوتا تو کیا یہ بے صبری اور ناشکری ہے؟ اگر یہ تمنا ستاتی ہے کہ قومی سعی کے تعمیری نتائج قومی شان کے شایان ہوتے تو کیا یہ جلد بازی ہے؟ اگر عمر کے اس تھوڑے سے دنوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں اٹھے، جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں، دیکھکر سیکھ سکیں اور برت کر اپنا سکیں، اور سنوار سکیں، جہاں ان گنت بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑسکے، جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا جواب دے سکیں، جہاں شخصیت کی نشوونما کا سامان ہو، جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل دین اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پرورش پائے اور رحمۃ اللعالمین کے چمن کے نونہال بار آور اور سایہ دار درخت نہیں، یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا ماحول مستفیض ہو، وہ ہر جگہ سے حکمت کو لیں کہ ان کا کھویا ہوا مال ہے اور ہر طرف اپنی تحقیق اور اپنی اچھی زندگی کے موتی بکھیریں کہ یہ دولت لٹانے ہی سے بڑھتی ہے۔ اعلحضرت، اکابر قوم اور بلند ہمت دوستو! اور عزیزو! اگر یہ ارادہ ہم ناچیز ارکان جامعہ کے دل میں پیدا ہو تو کیا وہ ایک خواب ہوگا جس کی تعبیر نہ ہوسکے گی؟ اس سوال کا ایک جواب ہم کارکن دیں گے اور وہ یہ ہے کہ اللہ چاہے گا تو یہ ارادہ پورا ہو کر رہے گا۔ لیکن اس کا ایک جواب آپ سب کے ذمہ بھی ہے۔

جیسا کہ آپ صاحبان اعلحضرت کی زبان مبارک سے ابھی سن چکے ہیں،

اس منصوبہ کو ایک قدم اور آگے بڑھانے کے لئے ہم نے اگلے چند سال میں بعض کام شروع کرنے کا قصد تو کر ہی لیا ہے - طالب علموں اور استادوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ہوسٹل اور مکان فوراً بنوانے ہیں، چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک اچھا کنڈرگارٹن بنانا ہے، ثانوی تعلیم میں ضروری تنوع پیدا کرنے کے لئے ایک صنعتی اور تجارتی مدرسہ قائم کرنا ہے، لڑکیوں کی تعلیم اور تربیت کے لئے اقامتی درسگاہ قائم کرنی ہے، علمی تحقیق کے ادارے قائم کرنے ہیں جن میں سب سے پہلے اسلامی علوم کے تحقیقاتی ادارہ بیت الحکمتہ کو صحیح اور مضبوط بنیادوں میں قائم کرنا ہے۔ اپنے مرحوم امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی یادگار کے طور پر ایک شفاخانہ بنانا ہے، کتب خانہ کے لئے عمارت بنانی ہے اور اس میں خصوصاً اسلام اور ہندوستان سے متعلق کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ فراہم کرنا ہے اور اس نو آبادی کے مرکز میں اس کے قلب کی حیثیت سے ایک مسجد تعمیر کرانی ہے - ان کاموں کے لئے میں نے اپنی ناتجربہ کاری میں دس لاکھ کا اندازہ کیا تھا، اس امید پر کہ جنگ کے بعد قیمتیں کچھ تو اپنی سابقہ حالت کے قریب آئیں گی۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا اور اب اس کام کے لئے تقریباً ۳۰ لاکھ کا اندازہ کیا جا رہا ہے۔ ہم نے قوم سے جوبلی کے موقع پر دس لاکھ روپیہ مانگا۔ دس لاکھ سے زیادہ تقریباً بارہ لاکھ روپیہ فراہم کرنے کا انتظام قوم نے کر دیا ہے۔ لیکن اب ان اٹھارہ لاکھ کا انتظام بھی تو اسی کو کرنا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ انتظام بھی ہو ہی جائے گا۔ لیکن جلد ہو یا دیر میں، ہم نے کام شروع کرنے وقت کب پہلے روپیہ جمع ہونے کا انتظار کیا تھا کہ اب اس کے منتظر رہیں گے - یہ کام خدا نے چاہا تو ہو گا ہی، اگر یہ اچھا کام ہے تو خدا آپ سب کو اس کی تکمیل کی سعادت میں شرکت کی توفیق عطا فرمائے -

میں نے جامعہ کی پچھلی روئداد اور اس کے اگلے منصوبوں کا ایک مختصر سا ذرا منتشر سا خاکہ پیش کر دیا ہے۔ اپنے سچے جذبات تشکر کا اظہار باقی ہے - سب سے پہلے اعلیٰحضرت کا، اس عزت افزائی اور ہمت افزائی پر شکریہ جو حضور نے یہاں تشریف فرما ہو کر، اور اس جلسہ کی صدارت فرما کر ہم کارکنان جامعہ کی کی ہے۔ حضور یہ عزت افزائی اس لئے بھی ہے کہ خدا نے آپ کو اپنی زمین کے ایک حصہ اور اپنی مخلوق کی ایک معتدبہ آبادی کی پاسبانی سپرد فرمائی ہے - آپ کو دولت و اقتدار عطا فرمایا ہے۔ آپ نے، کہ بادشاہوں کی محفل کے لئے زینت ہیں، ہم فقیروں کی مجلس میں تشریف لانا قبول فرمایا۔ لیکن اعلیٰحضرت سے زیادہ کس پر روشن ہوگا، اس لئے کہ آپ دونوں کے محرم ہیں، کہ اچھی دنیا میں مادی اقتدار کو ذہنی اقتدار کے سامنے، اور دولت کو فقر کے سامنے جھکنا چاہیئے - مادی اقتدار اور دولت کے لئے یہ بڑی سعادت ہے کہ ذہنی اقتدار اور فقر اسے اپنی خدمت میں قبول فرمالیں، حضور کی تشریف آوری سے ہماری حقیقی عزت افزائی اور ہمت افزائی، آپ کے دولت و اقتدار ہی کے باعث نہیں ہے بلکہ اس فقر کی وجہ سے ہے جس کا اس لباس خسروی میں نباہ لے جانا ظاہری فقیروں کے فقر سے کہیں مشکل تر اور اسلئے بہت زیادہ واجب الاحترام ہے - ہم فقیروں کی عزت افزائی اس درویش خسروی، اس شاہ فقر شعار اس امانت دار دولت و اقتدار کی تشریف آوری سے ہے جن کے لئے سروری خدمت گری ہے اور بادشاہت ایدین کی ذمہ داریوں کو کما حقہٗ انجام دینے کا موقع - اعلیٰحضرت ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں -

پھر قائد اعظم محمد علی جناح اور حضرت محترم مولانا ابوالکلام آزاد کا دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس جشن میں شرکت فرما کر ہمیں معزز فرمایا۔ آپ کی قوم کے چند بوڑھوں اور نوجوانوں نے خاموش تعلیمی کام کا ایک نمونہ اس جامعہ میں پیش کرنا چاہا ہے - آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ قومی وجود اور قومی تہذیب کا تحفظ صرف بگڑانے سے بچا کر نہیں ہو سکتا بلکہ اسے بناتے رہنے کا طالب ہوتا ہے - آزادی ہو یا ہو پذیر حیات تمدنی، یا اقدار عالی مطلقہ، یہ بس ایک بار حاصل کرنے اور سونپ کر رکھ دینے کی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ انہیں کو ملتی ہیں، اور انہیں کے پاس رہ سکتی ہیں جو ہر دم اتنے از سر نو حصول اور ہر دم از سر نو تخلیق کی دشواریاں انگیز کرنے پر آمادہ ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن ہم ہندوستانی مسلمانوں میں اسی تخلیقی عمل کے نمائندے بننا چاہتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ آپ ہمارے کام کو پسند فرمائیں گے آپ کی پسند ہماری محنتوں کا بڑا انعام ہوگی۔ پھر پنڈت جواہرلال نہرو اور دیگر وزرائے حکومت ہند کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے ہماری اس تقریب میں شرکت کے لئے وقت نکالا۔

آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں آپ کے لئے جگہ ہے۔ آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں - آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے - یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے دور دورہ میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے نئے خدمت گذار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ لفظ کچھ شاید سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لئے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے - ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گذرتی ہے

جب ہم سنتے ہیں کہ مصیبت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا، کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا لیکن ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو گیا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھئے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی۔ آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے، یہ مسئلہ اس قوم اور اُس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے۔ مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے۔ خدا کے لئے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھودنے نہ دیجئے۔

پھر ان سب بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہمارے جشن میں شرکت فرما کر اس کی رونق بڑھائی اور ہماری خوشی میں شریک ہو کر ہمارا دل بڑھایا۔ اس بدامنی کے زمانے میں سفر کی صعوبتیں برداشت فرمائیں، ہم شرمندہ ہیں کہ ان کے آرام و آسائش کا پورا انتظام نہ کر سکے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری ان فروگذاشتوں کو معاف فرما دیں گے۔ ان کارکنوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، خصوصاً عہدہ داران ریاست رام پور کا جن کی مدد کے بغیر ہم اپنے مہمانوں کو اتنا آرام بھی نہ پہنچا سکتے۔ ان دوستوں نے ہمارے ساتھ اس طرح کام کیا کہ گویا ان کا ہی کام تھا، اور سچ یہ ہے کہ ان کا کام اسی قدر تھا جتنا کہ ہمارا، ہم ان کی اس عنایت کو کبھی نہ بھولیں گے۔

اعلیٰحضرت! میں چند لمحوں کیلئے اپنے کو جامعہ کے کارکنوں کی صف سے الگ کر کے اپنی قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کا۔ حضور والا نے اپنے ارشادات صدارت میں مجھ ناچیز کے متعلق جو فرمایا ہے اس کا شکریہ کیسے ادا کروں، کاش میں ان کا مستحق ہوتا۔ حضور جامعہ میں اگر کوئی تعریف کا مستحق ہے تو وہ میں بالکل نہیں ہوں، میرے وہ ساتھی ہیں جو اپنا نام کسی کو نہیں بتاتے اور دن رات اس ادارہ کی خدمت میں اپنی جان کھپاتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے کسی اور ادارے کو نصیب ہوں گے۔ انہوں نے اس ۲۵ سال میں بہت کچھ سختیاں اٹھائی ہیں، اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔ یہ قوم کے بچوں کیلئے اپنی جانیں کھپاتے رہے ہیں اور خود ان کے بچے اچھی غذا اور اچھے لباس کیلئے ترسے ہیں، یہ قوم کی ذہنی زندگی کیلئے اپنا سب کچھ تج چکے ہیں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا ٹھیک انتظام نہیں ہو سکتا، یہ کتابوں کو ترستے ہیں، تحقیقی رسائل کو ترستے ہیں، انہیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے اور پھر کہیں سے روپیہ آ جاتا ہے تو یہ پہلے جامعہ کیلئے زمین خرید وا دیتے ہیں، اور اپنے مطالبے کو موخر کر دیتے ہیں یہ ہماری قوم کے مستقبل کیلئے ایک فال نیک ہیں، انہوں نے بہت تکلیفیں اٹھا کر قومی ترقی کے راستے کو صاف کر دیا ہے

آغشتہ اند بہ سر خار بخون دل — قانون باغبانی صحرا نوشتہ اند

میں قوم کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

# دو غزلیں

نقش مٹتی ہوئی کرنوں کا ابھارا کس نے؟
بامِ انجم سے کیا مجھ کو اشارا کس نے؟

جانے بھٹکے ہوئے راہی پہ کسے رحم آیا
رات کے اونگھتے سایوں میں پکارا کس نے؟

تیری بھیگی ہوئی پلکوں پہ، محبت کے سوا
جھلملاتے ہوئے تاروں کو اتارا کس نے؟

کشتیٔ زیست کنارے سے لگی ہے شاید
عین طوفاں میں دیا ورنہ سہارا کس نے؟

کلیاں روتی ہیں کہ بھونروں نے انہیں کیوں نوچا
بھونرے حیران ہیں، کلیوں کو نکھارا کس نے؟

یہ دھنک ہے تو عناصر کے جبینوں پہ نثار
ورنہ تھاما ترے آنچل کا کنارا کس نے؟

کوندے لپکے ہیں امیدوں کی خلاؤں میں ندیمؔ
پھر بھرا روح کی وسعت میں طرارا کس نے؟

---

مجھے اگرچہ ترے حسن میں کلام نہیں
مگر یہ خواب ہے اور خواب کو دوام نہیں

بھلا یہ کونسی منزل ہے بے نیازی کی
کہ آجکل مرے ہونٹوں پہ تیرا نام نہیں

تری خوشی ہے تو لے پوچھتا ہوں تیرا پتا
کہ اس سے اور کوئی پست تر مقام نہیں

نہ چلمنوں کی نقابیں، نہ خلوتوں کے سرور
تری بہشت سے ہم دل جلوں کو کام نہیں

چمن میں کس نے گرہ کھول دی مرے دل کی
اگر کلی کی چٹک میں ترا پیام نہیں

قدم قدم پہ نیا رنگ ہے زمانے کا
یہ گردشیں ہیں فلک کی، ترا خرام نہیں

ندیمؔ خاک کا ذرہ ہے دو جہاں بکنار
مری نگاہ میں اب جلوہ ہائے بام نہیں

احمد ندیم قاسمی

# بندی

افسانہ

سلمہ ستارے کی ٹکلی ہو یا سونے کی چمکتی ہوئی بندی یا سیندور کا ایک چھوٹا سا ٹیکہ — سہاگنیں بڑے پیار سے اسے اپنے ماتھے پر لگاتی ہیں۔

بندی لگانا۔ بندی دیکھ دیکھ کر خوش ہونا۔ بندی چھوٹ جانا۔ ان باتوں کے گرد ہماری صدیوں کی پرانی اور رومانی ادائیں ناچتی ہیں۔ چنری، مہندی اور سرخ چوڑیوں کے ساتھ بندی کو بھی بھارتی سنگار میں بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔

گاؤں کی اس ننھی نویلی دلہن کو دیکھئے۔ سہاگ کے گیت، ڈھولکوں کے شور میں کھوئے جا رہے ہیں سکھیوں کی چھیڑ چھاڑ ہنسنا، بلکہ قہقہے لگا دینا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کی یہ عورتیں دکھ کا نام ہی نہیں جانتیں اور پھر ایسے میں جب ہماری گرام سندری دلہن بنائی جا رہی ہو۔

رواج کے مطابق گاؤں کی دھوبن آئی اور دلہن کے ماتھے پر سیندور کی ایک چھوٹی سی بندی لگا کر جانے لگی — منہ بولی سہیلیوں کے گیت پھر نا جانے لگے:—

دلہن ماتھے سیندر کی بندیا لاگے ٭ دلہن ماتھے سیندور کی بندیا لاگے
باج رہی پائل۔ جھنک رہے کنگنا ٭ ڈول رہے آنچل۔ چمک رہے ملناں
ملنوں میں پھولوں کی سیجیا لاگے ٭ دلہن ماتھے سیندور کی بندیا لاگے
چندر گگن سوہے۔ چمکے ستارا ٭ ماتھے سے پھوٹ رہا جیون اجیارا
چمکے ہے بندیا — بولے پائلیا — سوچے دلہنیا
چندن دوارے ڈولیا لاگے
دلہن ماتھے سیندور کی بندیا لاگے —!!!

شام سے رات ہوئی اور سہاگ کے گیت گونجتے ہی رہے۔ سہاگ کی رات ڈھلنے لگی اور اوشا جھلملانے لگی۔ سندری آئینے میں اپنے آپ کچھ باتیں کر رہی ہے۔ شاید اس نے ابھی ابھی اپنے ماتھے پر بندی لگائی ہے!!

آج موری سونے کی بندیا چمکے ٭ آج موری سونے کی بندیا —!
ٹھنڈی ہوائیں ہیں، اوشا سہانی ٭ سوئے رہے راجہ، نجے مہارانی
جھوم لہرائے ——— بالی اترائے
ماتھے پہ چھوٹا سا تارا دمکے ٭ آج موری سونے کی بندیا چمکے —!
جوہی کی ایک کلی سمٹی سمٹائی ٭ بگیا سے بھولی مالن توڑ لائی
سونر وانے ڈھال دیا بندی بناکر ٭ ماتھے پر بندی ہے۔ کانوں میں بالی
بالی میں جوہی چمیلی سگمکے ٭ آج موری سونے کی بندیا چمکے —!!

دلہن آئینے میں بار بار اپنی سونے کی بندی دیکھ رہی ہے پیار بھرے بھاؤ تاؤں میں اتنا ڈوب جاتی ہے کہ اسے بندی ایک کومل سی جوہی کی کلی نظر آنے لگتی ہے پھر وہ اپنی بالیوں سے کھیلنے لگتی ہے۔ اتنے میں پیروں کی چاپ سنائی پڑتی ہے۔ اسکا دل ہولنے لگتا ہے سمجھتی ہے ساجن آگئے مگر نکلتی ہے نند — کتنی چنچل ہے دلہن کی یہ ننھی سہیلی مگر اسوقت تو وہ اپنی بھابی کو چھیڑنے پر تلی ہوئی ہے۔

نند۔ بھابی کی بندیا جگمگ جگمگ۔
دلہن۔ جانے کاہے ہوئے جیا ڈگمگ ڈگمگ۔
نند۔ بالکا بلم درد جوا تھارے
دلہن چنچل بندیا جھوٹ موٹ تارے
نند۔ سونے کی بندیا چنگی کھائے۔
دلہن۔ چھیڑ چھیڑ کاہے نند شرمائے
نند۔ بھابی کی بندیا جگمگ جگمگ
دلہن۔ جانے کاہے ہوئے جیا ڈگمگ

"بالکا بلم درد جوا تھارے ———" دلہن نے تو پہلے ہی تاڑ لیا تھا مگر نند چھیڑنے پر جو تلی تھی تو جانے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ چپکے سے ہنستی ہوئی بھاگ گئی ورنہ نہ جانے کتنی دیر بے چاری، انتظار کی ماری دلہن کو پریشان ہونا پڑتا۔ اس گھبراہٹ میں شاید ماتھے کی بندیا کہیں کھو گئی۔

کہاں گری رے مورے ماتھے کی بندیا

بندی گر جانے کا شگون کچھ اور ہی تھا شاید۔ کسے معلوم تھا کہ ساجن اتنی جلد پردیس چلے جائیں گے۔ ابھی کل کی تو بات ہے ابھی سونے کی بندی دیکھکر وہ پھولے نہیں سماتے تھے۔ دلہن ہاتھوں میں پھولوں کی تھالی لئے دیوی کے مندر کی طرف جا رہی ہے۔

مندر پہنچکر مورتی کے ماتھے پر ٹیکہ لگایا۔ پھول چڑھائے اور اب چاول چھڑک رہی ہے۔ سنئے وہ کچھ گا بھی رہی ہے ——— سہاگن کی پوجا!!

گوری میا بندیا کی رکھیو لاج ——— گوری میا
موری بندیا کی رکھیو لاج ———!!
جیون تمھرے ماتھے پہ ٹیکہ چمکے
ویسے ہی موری بھی بندیا دمکے
لائی ہوں پھولوں کا ہار
پاردیوی! آجائے من کی بہار
چاند اور تاروں کی تھالی چڑھاؤں

سلام مچھلی شہری

## بندیا کی رکھیو لاج ـــــ گوری میتا

موری بندیا کی رکھیو لاج ـــــ!

گوری میتا! پھولوں کی ڈالی چڑھوئے ـــــ!!

سہاگن پوجا سے واپس آئی۔ رات گئے تک مسکراتے ہوئے دئے سے باتیں کرتی رہی۔ کچھ ایسی اداس تھی کہ چنچل نند بھی اسے خوش نہ کر سکی ـــ گلابی جاڑوں کی رات اور ساجن پردیس۔ سوچتے سوچتے آخر آنکھ لگ ہی گئی۔ صبح ہوئی آئینے کے پاس گئی۔ جی دھڑ سے ہو کے رہ گیا۔ ماتھے کی بندیا سونے میں چھوٹ گئی تھی۔ جلدی سے بستر تک گئی "ارے یہ تو یہاں چمک رہی ہے" ہولے سے اٹھایا اور ماتھے پر لگا لیا ـــ پھر بھی نازک سے دل کو کیا کرے۔ دھڑکنے سے باز ہی نہیں آتا تھا۔

لگ گئی رے موری ماتھے کی بندیا

بندی اسی طرح چمک رہی ہے۔ کتنا کومل ہوتا ہے سہاگنوں کا من۔ ذرا ذرا سی بات پر بدگمانی! ساجن اب آتے ہی ہوں گے اور پھر یہ بندی اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ چمکے گی ـــــ چاند ستاروں کو ماند کرے گی۔

(دور سے ساجن کے گانے کی آواز قریب آکر دیگانہ سے بدل جاتی ہے)

مرد (ذرا دور سے)

میں آئے گیو ہو رانی! کھیتوا کنارے ـــــ

مرد — من میں جھنک رہی توری پائلیا
نینوں میں چمک رہی سونے کی بندیا

کاہے کھڑی راہ تکو گھونگھٹ لکارے
میں آئے گیو ہورانی! کھیتوا کنارے

عورت۔ (دور سے) آئے گیو بالم ہمارے
مرد۔ کوئل سمان موسے کون پکارے
عورت:۔ آئے گیو۔ آئے گیو بالم ہمارے

پھولوں میں جان آئی
آج مورے آنگن میں ایک نئی شان آئی

دیکھو اتر آئے ہیں چاند تارے
آئے گیو! آئے گیو بالم ہمارے

مرد:۔ پریم بھکاری کھڑا ہے دوارے

پائل سے کہدو "چھم چھم" بولے
بندیا سے کہدو جگ مگ چمکے

کہدو سہیلی سے تم کا سنوارے
پریم بھکاری کھڑا ہے دوارے

عورت۔ سجن مورے آئے۔

## غزل ـــ عزیز متھراوی

جب بیخودی میں کچھ نہ رہی آگہی مجھے
پھر دل کے عشق نے آواز دی ـ مجھے

جب کھو کے زندگی نہ مری پا سکی مجھے
پھر اُن کی جستجو بھی کہاں ڈھونڈتی مجھے

مہلت بقدرِ ذوقِ نظر کب ملی مجھے
بجلی سی ایک چیز دکھا دی گئی مجھے

ہنس ہنس کے تیرے ساتھ گزاری ہے زندگی
اے یاس! تو بھی یاد کرے گی کبھی مجھے

پہونچا ہوا ہوں سرحد کون و مکاں سے دور
دل کی تڑپ کہاں سے کہاں لے گئی مجھے

تیرے بغیر عشق تھا بیگانۂ طلب
محسوس ہو رہی تھی وہاں بھی کمی مجھے

پہلے تو بے سبب غمِ دنیا سے کھو دیا
اب ڈھونڈنے چلا ہے غمِ زندگی مجھے

بربادیوں میں بھی مرے دل کو سکوں رہا
یوں بھی تو کم نہیں ترے غم کی خوشی مجھے

اپنی تلاش میں بھی تری جستجو کہاں
میری نگاہ ڈھونڈھ رہی ہے ابھی مجھے

بے ہوش تھا تو اُن کی طرف دیکھتا رہا
جب ہوش آ گیا تو ہوئی بیخودی مجھے

اب تک میں رو رہا ہوں جو اے گردشِ فلک
آئی تھی اپنے حال پہ کس دن ہنسی مجھے

"اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی"
آئی عزیز راس مری شاعری مجھے

سونے کی بندیا ہلکی نہ پڑ جائے
آجا گگن کے سندر ستارے ۔۔۔ آئے گیو! ۔۔۔۔۔۔۔

مرد۔ پریم بھکاری کھڑا ہے دوارے
عورت۔ آئے گیو! آئے گیو بالم ہمارے
مرد۔ پریم بھکاری ـــــــ !!!

# کچھ غزل کے بارے میں

## ۲

محمود اکبرآبادی

غزل کا ارتقا، وسیع موضوع ہے اور ایک مکمل تصنیف کا محتاج ہے۔ میری نظر میں اردو غزل چند منزلوں سے گزر چکی ہے۔ منزل سے مراد یہ ہے کہ ایک دور میں ایک موضوع کا عام رواج رہا ہے۔ استاد سے لے کر نوآموز تک، اسی پر خیال آرائی اور خامہ فرسائی کرتا رہا ہے۔ غزل کی تاریخ میں اس نوع کے بہت سے دور ہیں۔ ولی نے تصوف کی بنا ڈالی اور میر درد نے اس پر جلا کی۔ میر نے قنوطیت کی بنیاد ڈالی اور زندگی کو یاس و نومیدی کے تیر و نشتر سے فگار پایا۔ جرأت، انشا، رنگین نے جنسی محبت کی لگاوٹ، چوچلے، نوک جھونک سے واسطہ رکھا اور معاملہ بندی کو سراہا، نظیر نے حیات و معاشرت کے جلوے بے نقاب کئے۔ مومن نے جذبات کو ابھارا، غالب نے حقائق و معارف کا جائزہ لیا، داغ نے امیروں اور دولتمندوں کے لئے ذہنی عیاشی کا سامان بہم کیا، حالی نے وطنیت کا راگ گایا، اقبال نے احیائے اسلام و اسلامیان کے امکانات کی تلقین کی اور فانی نے لفظوں کی روح سے موسیقی پیدا کی۔ جوش، فراق اور دوسرے اشتراکیین، موقت زندگی، معاشرت اور سیاست کے پیچیدہ مسائل پر روشنی ڈالتے اور بحث کرتے ہیں۔ ان دوروں کے استادوں نے اپنے اپنے رنگ اور اپنی اپنی فطنت کی قوت کے مطابق جو کچھ خلق کیا، وہ سب زندہ رہنے والا ہے۔

ردیف و قافیے کی پابندی کے ذکر سے، بہ ظاہر غزل کا رسمی پیکر مراد ہے اور اس سوال سے یہ پوچھنا مقصود ہے کہ مروجہ پیکر کی پابندی، تغزل پر کس طرح موثر ہوئی۔ غزل کا انحطاط مسلم ہے لیکن سوال کی نوعیت سے مجھے بنیادی اختلاف ہے۔ کسی صنفِ سخن کی ترقی یا تنزل کا انحصار، اس واسطے پر ہیں، جو اس کے موضوع کو اس کے پیکر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر کوئی صنفِ سخن، مائل بہ تنزل ہے تو ہرگز اس کے پیکر کا قصور نہیں۔ غزل کا تنزل بھی پیکر کا آوردہ نہیں ہے۔ انسان کا پیکر پرانا پڑتا جاتا ہے مگر فنونِ لطیفہ کا پیکر اس لعنت سے مبرا ہے۔ پیکر کی کہنگی کی شکایت فنونِ لطیفہ کی فطرت سے ناآگہی کی بنا پر ہوسکتی ہے۔ یونان کی مشہور شاعرہ سیفو نے مسیح کی ولادت سے مدت قبل، (Lyrical) شاعری کی بنیاد ڈالی اور (Ode) کا پیکر اختیار کیا۔ اس کی شاعری میں جذبات کی تازگی، محسوسات کی شدت اور بیان کا وقار، سادگی، ان سارے شعری محاسن کے تمثیلی نمونے ہیں۔ سیفو کے کم و بیش دو ہزار سال بعد، شیلی اور کیٹس نے (Ode) ہی کے پیکر کی روح سے ایسے (Lyrical) نغمے، ایسا حقیقی تغزل خلق کیا جو آج تک انگریزی دانوں کے کان میں رس ٹپکا رہا ہے۔

آرٹ میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ کیا پیش کیا ہے، یہ پوچھا جاتا ہے کہ کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ لفظی تصویر، خواہ حالہ دلیوی کی ہو یا گل بکاؤلی کی، اگر مکمل ہے تو آرٹ کا شہ پارہ ہے۔ جس نقص کو پیکر کی فرسودگی بتایا جاتا ہے، وہ اصل میں نام نہاد شاعروں کی فطنت کا نقص ہے۔ ان خوان لگا کر شہ پارہ میں داخل ہونے والوں کا قصور ہے۔ جو پیکر کے صحیح استعمال کی قوت سے محروم ہیں۔ اس بے بہرگی، اس صناعت کوری، اس سست نظمی کا قصور ہے جو ملاءِ اعلیٰ کی فضا میں اڑان نہیں بھر سکتی۔ اس ناشناسی کا قصور ہے جو صلاحیت اور غیبتِ صلاحیت میں امتیاز نہیں کر سکتی۔ اس کھوکھلے پن، اس رسم پرستی، اس ضد، اس غفلت، اس جلد بازی کا قصور ہے، جو تغزل کی روح سے نقاب نہیں اٹھا سکتی۔

ساتھ ہی ساتھ غزل کے موضوع کے بہت سے اجزا، مقدار میں اتنے زیادہ، نوعیت میں اتنے یکساں اور بیان میں اتنے یک لہجہ ہوگئے ہیں کہ اب طبائع پہ بار ہونے لگے ہیں۔ سماج کی سست رفتاری اور طبائع کی رسم پرستی نے جدت اور تنوع کی راہیں بند کر دی ہیں۔ عورت، جنسی محبت، غم و نشاط، ہجر و فراق، رسمی کرب و الم کا ذکر، غزل میں اس کثرت و بہتات سے ہے کہ اجیرن ہوکر رہ گیا ہے۔ تصورات کا سرقہ اس زیادتی سے ہے کہ موجد و نقال کا امتیاز باقی نہیں رہا۔ اندازِ بیان کا اعادہ اس کثرت سے ہے کہ انفرادیت کا یقین محال ہے۔ پسندیدہ الفاظ، چلتے ہوئے جملوں اور بنی بنائی ترکیبوں کا لوٹ پھیر عام طور پر روا ہے اور اس کے احتساب کا سماج کی طرف سے کوئی اہتمام نہیں۔ تغزل لفظی شعبدہ بازی، رسمی جملہ طرازی اور بے دھڑک چوری کا دوسرا نام ہوگیا ہے لیکن تغزل، رسم و روایت کی خانہ پوری، بلاغت کی موشگافی یا معنی و بیان کے میدان میں تگ و دو کا نام نہیں۔ جس طرح ہماری کلاسیکل موسیقی، آواز کے حسین و نغمہ ریز زیر و بم کی بجائے، ایک قسم کا غوغا بن کر رہ گیا ہے، اسی طرح ہماری غزلیہ شاعری مقصد کو ذریعے سے مخلوط کر دیتی ہے۔ اس بدنظمی نے غزل کی پسندیدگی کو نفرت یا کم سے کم بے اعتنائی سے بدل دیا ہے۔ داغ، مضطر، حسرت، سرور کی زمینوں میں اس کثرت سے مشق و طبع آزمائی کی گئی ہے کہ اصل شہ پاروں کی قدر و قیمت، پوشیدہ ہوکر، اولیت کی اہمیت گھٹ کر رہ گئی ہے۔ لیکن یہ انحطاط و ابتذال، پیکر کا آوردہ نہیں، پیکر کا منہ چڑانے والوں کا آوردہ ہے یہ موضوع کی خامی نہیں، موضوع کی اہمیت سے بے اعتنائی اور سہل انگاری کا قصور ہے۔

غزل کے ادبی و نفسیاتی مفاد سے، بہرہ اندوز ہونے کے لئے شرح و وضاحت کے آرٹ سے واقفیت لازمی ہے۔ غزل سمجھنا، غزل کہنے سے بہ مراتب دشوار اور امر شناس ذہن کا کام ہے۔ فانی نے، اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا:۔

کیوں، اہل حشر ہے کوئی نقاد سوز دل — لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

تغزل، قلبی واردات، ذاتی تجربے، عینی مشاہدے، انفرادی فکر،

الفاظ کی موسیقی کے لوچ، بیان کے حسن و وقار اور جزئیات کی لطافت و نزاکت سے جنم لیتا ہے۔ یہ اجزا بعض وقت الگ الگ اور بعض وقت متحدہ طور پر کارفرما ہوتے ہیں۔ تغزل کے کیف و اثر کے بھی دو پہلو ہیں۔ تغزل جس کا نام ہے، کہنے والے اور سننے والے دونوں کے لطیف نفس کے مشترک واسطے کا نام ہے۔ یعنی یہ کہ غزل سے لذت اندوز ہونے کے بعد شاعر کی آپ بیتی سننے والے تک بالراست اور تمام و کمال پہنچ جانی چاہئے۔ اس لئے شاعر میں قوت اور سمجھنے والے میں صلاحیت، دونوں چیزیں درکار ہیں۔ اس لئے شرح و وضاحت کے فن کی آبیاری کی بھی ضرورت ہے۔ شعر کے مفاہیم سمجھ کر، تصور و تخیل کی مدد سے، ہم شاعر کے اسی نفسیاتی ماحول میں پہنچ سکتے ہیں، جس کی گہرائی میں ڈوب کر اس نے اپنا کمال پارہ خلق کیا ہے۔

میں غالب کا ایک شعر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

آپ اگر اس شعر کے لفظوں کا مطلب سمجھ کر، غالب کے نفسیاتی ماحول میں در آنا چاہیں تو مشکل نہیں ہے۔ اولاً انیسویں صدی کے ہندوستان کا مذہبی پس منظر آپ کے سامنے آئے گا۔ اس کے بعد غالب کی فکر آپ کو کشمکش میں گرفتار نظر آئے گی، اس کے بعد اس کی سلجھی ہوئی طبیعت کی فلسفیت و بلند نظری، آپ کو انگلی پکڑ کر ایسی وسعت و بے پایانی تک پہنچا دے گی جہاں حدود و تعینات اصنام و معابد، صرف اشارے اور کنائے نظر آنے لگیں گے۔ اس کے بعد وحدت الوجود کے حامی کو اس شعر میں وحدت کا جلوہ، اور صنم پرست کو مورتی پوجن کا جواز نظر آنے لگے گا۔ بالکل اسی طرح، آپ کو، اس شعر میں:

جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

بے نقابی، بے پردگی، اور جمال کو نظارہ سوز بنانے کی حمایت نظر آئے گی۔ یہ سارے اجزا عصرِ حاضر کے تمدن کے ہم رنگ اور ضمیر کے ہم آہنگ ہیں۔ غالب کو آپ مستقبل طراز نہ مانیں، پھر بھی اس شعر میں، انفرادی تجربے اور شخصی مشاہدے کے اجزا موجود ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ غزل میں، بیکی شارپ، میدام بوویری یا اینا کرنینان جیسے شوخ و شنگ، ذی ہوش، جلوہ فروش اور حیات نما، (Life-like) کردار سامنے آتے ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ ان میں فاؤسٹ، یا ہملٹ کی سی تحلیلِ نفس یا جزئیات نگاری ملتی ہے، میں نہیں کہتا کہ ان میں حیات کے پیچیدہ مسائل پر اسی تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے، جس طرح، لیڈی چیٹرلیز لَوَر میں لورنس یا یولیسیس میں جوئس نے ڈالی ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ غزل کے اشعار میں وسیع پیمانے پر حیات کے مسائل کا حل نظر آتا ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ حیات، پیکر مرقع کے مقابل، ننھے منے مرقعے (Miniature) کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ آرٹ کا نقاد، دونوں کو حرزِ جان اور سعادتِ ایمان سمجھتا ہے۔ شاہجہاں اگر تختِ طاؤس پر مباہات کر سکتا تھا تو میں بھی اپنی انگوٹھی کے پکھراج پر ناز کر سکتا ہوں، بشرطیکہ میرا پکھراج الماس تراش ہو، اور اس کی پہل سازی میں بھی آرٹ نے اپنی نازک خیالی اور ژرف نگاہی صرف کی ہو۔ داغ کا یہ مطلع:

دل ہی تو ہے نہ آئے کیوں، دم ہی تو ہے نہ جائے کیوں
ہم کو خدا جو صبر دے، تجھ سا حسیں بنائے کیوں

وہ جذباتی (Miniature) ہے جو، سینکڑوں حیات پیکر مجسموں، ہزاروں حیات پیکر مرقعوں پر بھاری ہے۔

بیکی شارپ، میدام بوویری، اینا کرنینان، ہم نئے پڑھنے والوں کے لئے نئی ہوں مگر دنیا کے لئے نئی نہیں ہیں۔ ان کا وجود، کسی نہ کسی عنوان سے، ہر سماج میں پایا گیا ہے اور پایا جائے گا۔ یہ کردار، ہندوستان کے سماج میں آج بھی موجود ہیں۔ ان سے غزل کے (Miniature) کے لئے بہت سا مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمارے انیسویں صدی کے استاد، ان کو ٹھیکرے، فلوبیر اور ٹالسٹائے کی نگاہ سے نہ دیکھ سکے۔ ان کے پاس ہمارا سا شعور، ہمارا سا نقطۂ نگاہ، ہمارا سا ماحول نہ تھا۔ وہ دوسرے تماشوں، دوسرے مناظر کے گرویدہ تھے۔ لیکن ہمارا عہدِ حاضر کا نوجوان شاعر، اتنا کاہل، اتنا ذہن آوارہ، اتنا بے جان کیوں ہے کہ بیکی شارپ، میدام بوویری اور اینا کرنینا ہی سے ملاقات کی ہمت و جرأت نہیں رکھتا۔

میں یہاں پھر، یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ غزل کا موضوع رازِ بہ گفتن بہ معشوق ہے اور عہدِ حاضر کا غزل گو، پہلے غزل گویوں کے مقابلے میں، اپنی محبوبہ سے بیش از بیش مسائل پر گفتگو کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عہدِ، دنیا کے ذراتی عہد کی ابتدا ہے اور اس میں حیات کے لاتعداد مسائل پیشِ نظر ہیں۔ چنانچہ فرسودہ مباحث کی جگہ، فکر بیدار اور تصور خلق کرنے والے موضوعات پر بھی کھول کر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ ہاتھوں میں مہندی لگانے اور ہونٹوں پر لاکھا جمانے والی محبوبہ، بات کا جواب دیتے بیحد شرماتی تھی، لیکن عہدِ حاضر کی جان لیوا محبوبہ ترکی بہ ترکی جواب دینے کو تیار ہے۔ اس طرح غزل کے عاشقانہ رخ کے ساتھ معشوقانہ پہلو میں بھی جان پڑ سکتی ہے۔ خلاف بیان کی رہنمائی کے لئے، برج بھاشا شاعری کا وہ عنصر جو پریم رس اور نائکا بھید کے نام سے موسوم ہے، سامنے موجود ہے۔ غزل گو اگر استادانہ البیت کا مالک اور امتیازی فطانت کا حامل ہے تو جنسی مسائل و عوائد کی گتھیاں بھی سلجھا سکتا ہے۔ تحلیل نفسی (۲) کا موضوع، دریائے ناپیدا کنار ہے اور اس کے اجزا رفتہ رفتہ غزل کے پیکر میں سموئے جا سکتے ہیں۔ بہر عنوان راز کہنے والا اپنے رموز کے بیان میں جتنی صناعت پیدا کر سکے گا، اسی اعتبار سے، اس کے کلام کی قدر بینائی تولی جائیگی اور لیں۔

میں رجعت پسند یا آرٹ برائے آرٹ کے نظریے کا حامی نہیں ہوں۔ پرانی شعری قدروں کا اندھا پرستار بھی نہیں ہوں۔ مجھے ادب برائے زندگی کا نظریہ بھی تسلیم ہے اور اس سے بھی تمام و کمال اتفاق ہے کہ آرٹ زندگی کے مفاد کے لئے پھولنا پھلنا چاہئے۔ لیکن اپنی زبان کے تمدنی ورثے کا پرستار ہوں اور شعر کو عام فہم اور عام پسند بنانے سے پہلے شعری قدروں سے لبریز دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں شعری قدروں کو ارزاں بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں غزل ایک ترقی یافتہ،

آرٹ ہے جس کے رموز وحکم کا مذاق، ہر ظرف میں نہیں سما سکتا۔ غزل کہنا اور سمجھنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ نومشق اس سے شروع ضرور کر سکتا ہے لیکن نومشقی اور محض عاشقانہ صاجزادگی، اس کو انجام تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس آرٹ کا صحیح استعمال صرف استادی ہی سے ممکن ہے۔ شعر کے فن نے، سرقے کو عیب قرار دے کر، جس اصول کا اثباتی پہلو ابھارنا چاہا ہے، وہی اصول مغربی نقادی نے "انفرادی تجربے" کے نام سے پیش کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوسرے کا چبایا ہوا نوالہ نہ چبایا جائے۔ دوسرے کا تجربہ، اپنا بنا کر، دوسرے لفظوں میں ڈھالنے کی کوشش نہ کی جائے۔

سماج کے مذاق میں اصابت اور معیاریت اور کہنے والوں کے مدارج میں بھی فرق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ غزل، مراتب کی نوعیت کے لحاظ سے دو ہی قسم کی ہو سکتی ہے اور تیسری کی گنجائش نہیں۔ ایک وہ جو موضوع، زبان اور بیان کے اعتبار سے اتنی سہل ہو کہ اس سے سہل تر نا ممکن ہو۔ دوسری ایسی جس کے موضوعی عناصر، پردۂ خفا میں مستور ہوں۔ جس کے حجابات، ذاتی مطالعے، ذاتی غور وفکر کے بغیر نہ اٹھ سکیں۔ جو محض سن کر، پہلی کوشش اور نظر میں سمجھ میں نہ آئے۔ سہل ممتنع تک رسائی، اب بھی دشوار ہے، دوسری نوع بھی، اتنی دشوار ہونی چاہئے کہ خالص صناع کے علاوہ، دوسرے کی دسترس سے باہر رہے۔

غزل محض گرمیٔ محفل کا آلہ یا یاران طریقت کی باہمی ملاعبت کا کھلونا نہیں ہے۔ غزل ایک مکمل اور ذی وقار آرٹ ہے، جس کے مقاصد، خالص تفریح سے بلند تر ہیں۔ غزل اور غنائیہ میں فرق ہے اور مشاعرہ اور اوپیرا، اظہار کے دو مختلف ذرائع ہیں۔ اوپیرا، عامۃ الناس کی تفریح گاہ اور مشاعرہ، سنجیدہ قسم کی ادبی صحبت ہے جو مخصوصین اور اہل ذوق کے لئے برپا کی جاتی ہے۔ بہر عنوان، غزل، غنا، کی پیش خدمت یا لونڈی باندی نہیں ہے۔ غزل، اگر سچی غزل ہے تو اس کو کسی اعانت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بسر مشاعرہ، موسیقی کی مدد سے، غزل کے محاسن کو ابھارنا اور معائب کو دبانا، ذاتی فطنت کی کمزوری کا احساس اور غزل کے محاسن پر اعتماد کی کمی کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ، اس نوع کی خارجی اعانت کا شوق، اعتدال ودیانت کے بھی خلاف ہے۔ لحن، تال، سر کے ساتھ پڑھے جانے سے، سننے والے کو جو مزہ آتا ہے وہ شعر کا مزہ نہیں ہوتا، موسیقی کا مزہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ، پردہ پوشی اور سامعین کی قوت فیصلہ کو مجروح ومرعوب کر دینے کی کوشش وقتی وآنی ہے اور مستقل اثر نہیں چھوڑتی۔ موسیقی کا کیف دور ہونے کے بعد، جب مفاہیم کا صحیح تصور پیدا ہوتا ہے تو ردعمل شدید تر ہو جاتا ہے۔

میرے خیال میں مشاعروں کی لحن طرازی نے غزل کی شاعرانہ قدروں اور غزل کے آرٹ کی شرافت کو معتد بہ صدمہ پہنچایا ہے۔ غزل وہ ہے جو کسی خارجی اعانت کی آڑ نہ پکڑے۔ غزل وہ ہے، صفحۂ کاغذ پر جس کا منہ فق نہ ہو جائے۔ غزل وہ ہے جو ہر نوع کی تنقید کا ہمت وجرأت سے مقابلہ کر سکے۔

عامۃ الناس کی تفریح کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ تصویر سازی کی کمپنیوں نے، گیتوں کا نہایت معقول ذخیرہ ہماری زبان میں جمع کر لیا ہے اور یہ سعی روز بار ور ہو رہی ہے۔ اس لئے اب وہ وقت آگیا ہے کہ غزل اور گیت کے فرق وامتیاز پر زور دیا جائے۔ انگریزی ادب میں بھی، (Ode, Elegy, Sonnet) وغیرہ وغیرہ، (Song) سے علیحدہ اصناف ہیں اور ایک کو دوسرے کے محل پر استعمال نہیں کیا جاتا۔

غزل اور اس کا پیکر تباہ کرنے کی کوشش نہ صرف بیدردانہ تباہ کاری ہے، بلکہ ارتقا کی فطری قوت کا بھی بطلان ہے۔ وجود میں آنے سے پیشتر، مستقبل کے منازل ومراحل پر رائے زنی کیونکر ممکن ہے۔ مائیکل اینجلو نے، مسیح کا نقش، اپنے ذہن سے خلق کیا اور دنیائے عیسائیت سے منوا دیا۔ بمبئی آرٹ اسکول کے مصور کے لئے آج اگر یہ کمال محال ہو تو ہو، لیکن کسے معلوم ہے کہ ایک ایسا مصور زمانے کے بطون سے پیدا ہونے والا نہیں ہے جو خدا یا صداقت مجردہ کا پیکر بنا کر ساری دنیا سے منوا دے گا۔

غزل کا پیکر، بے شک آج صلاحیت کھو کے نظر آتا ہے لیکن میں پھر عرض کرتا ہوں کہ صلاحیت پیکر کے وجود میں نہیں ہوتی صناع کے بطون میں پنہاں ہوتی ہے۔ فطنت کا لازمہ ہے۔ وہ وقت پھر آسکتا ہے کہ غزل کے اشعار، رسفا کلیز کے حزنیہ سے برابر کا مقابلہ کرتے نظر آئیں، تغزل، فطرت پرستی کے ازلی وابدی دین کا نام ہے، جب تک انسان کے قلب میں دھڑکن موجود ہے، غزل کا موضوع زندہ ہے اور اس اچھوتے دین کی پرستش بھی زندہ ہے۔

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں (اقبال)

# ڈانٹے کا رومان

افسانہ

رشیدہ لطیف

شہر فلورنس جو آج حسن و خوبصورتی کا گہوارہ اور فیشن و جدت کا مرکز ہے، آج سے سات آٹھ سو سال پیشتر بھی شعر و نغمہ اور موسیقی و نقاشی کا گھر تھا۔ یہ رومان اسی عہد سے وابستہ ہے۔

فلورنس میں موسم بہار کا آغاز ہے۔ آج مئی ڈے یعنی مئی کا نوروز ہے۔ بہار کی دیوی اپنی پوری لطافتوں، نزاکتوں اور رنگینیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ مسکراتی ہوئی صبح اپنا سلام ساری دنیا کو پہنچا چکی ہے۔ سورج کی شفاف کرنیں مسکرا مسکرا کر دنیا والوں کو عام طور پر اور اہل فلورنس کو خاص طور پر ہنسنے اور ہنسانے پر آمادہ کر رہی ہیں۔ باغوں میں نسیم سحر اپنی متوالی چال اور اٹھلاتی اداؤں کے ساتھ غنچوں کو چھیڑ چھیڑ کر ہنس پڑنے اور خوشی سے کھل جانے پر مجبور کر رہی ہے۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو مست اور فرحت و تازگی پہنچاتی ہے۔ اور مرغان چمن اپنی خوش الحانیوں سے وہ محفل شعر و نغمہ بپا کر رہے ہیں، جس کا لطف کچھ سننے والے ہی خوب اٹھا سکتے ہیں۔

شہر کے وسط میں ارنو ندی اس سہانی صبح کی تمام دلچسپیوں اور رونقوں اور موسم بہار کی ساری لطافتوں اور نزاکتوں کو گود میں لئے اٹھلاتی، اتراتی اور ناز و انداز دکھلاتی ہوئی بہہ رہی ہے۔ ایسے سہانے وقت اور دلربا موسم میں اس خدائے بزرگ و برتر کا شکر بھی واجب ہے۔ جس نے ہمیں یہ سب نعمتیں عطا فرمائیں۔ لہٰذا وہ دیکھئے پادریوں کا ایک جلوس حمد کے گیت گاتا اور خوشی کے نغمے الاپتا نوروزی شکرانہ ادا کرنے کے لئے گرجے میں داخل ہوا۔ اور دیکھیو کے پل پر سناٹا سا چھا گیا۔

ایسا دلربا اور دلکش سماں ہو تو اداس اور غمگین رہنا بھی کفران نعمت ہے۔ کون غمگین رہ سکتا ہے! میرا خیال تھا اس وقت شہر کا بچہ بچہ خوشی و مسرت کے گہوارے میں جھول رہا ہوگا۔ آج رنج و غم کے مہیب دیو نے کہیں اپنا ٹھکانا نہ دیکھ کر شاید پردۂ ہستی سے اپنا منہ چھپا لیا ہوگا۔ لیکن نہیں، یہ کیا! وہ دیکھئے پل پر کوئی نوجوان یکہ و تنہا چلا آ رہا ہے۔ چہرے سے اداسی اور غمگینی ظاہر ہے۔ کچھ کھویا ہوا سا نظر آتا ہے۔ نوجوان چلتے چلتے پل کی منڈیر پر بیٹھ گیا اور پانی کے بہاؤ اور پھلوں کو دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔

جلوس عبادت سے فارغ ہو کر گرجے سے باہر نکلا۔ ایک پادری نے پل پر بیٹھے ہوئے نوجوان کو بغور دیکھا اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ "جیا تو! وہ دیکھو پل پر کوئی بیچارا تنہا بیٹھا ہے۔ آج کے دن کسی کو اداس رہنا اور تنہا و بےکس نظر آنا بھی حرام ہے۔ چلو دیکھیں، یہ بلند قامت نوجوان کون ہے؟ تنہا اور اداس کیوں بیٹھا ہے۔" دوسرے ساتھی سے "چلو جان تکا، تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔"

تینوں ساتھی جب ذرا قریب پہنچے۔ تو جان تکا حیرت اور تعجب سے چلائی۔ "ارے جیا تو، یہ تو ہمارا مقبول و معروف شاعر ڈانٹے ہے!.... مگر نوروز کا دن ....اور ڈانٹے غمگین نظر آئے!! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا ماجرا ہے۔"

**جیا تو:**۔ "ہاں ہے تو وہی! مجھے خود تعجب ہو رہا ہے۔ اچھا آؤ پیچھے کی طرف سے چپ چاپ چلیں۔ اور قریب پہنچ کر دیکھیں ماجرا کیا ہے! ایسے پرکیف وقت میں یہ اتنا غمگین کیوں ہے؟"

تینوں دوست آہستہ آہستہ ڈانٹے کے قریب پہنچے۔ لیکن وہ اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ اسے پاؤں کی آہٹ تک محسوس نہ ہوئی۔ وہ بدستور اپنے تصورات میں غرق ندی کی لہروں کے چکر میں کھویا رہا۔ تینوں ساتھی حیرت و تعجب سے اس کو تک رہے تھے۔ لیکن اسے ذرہ برابر بھی احساس نہ تھا۔ یکایک جان تکا نے ایک بے تکلم سی آواز سے اسے چونکا دیا۔ ڈانٹے نے ہوش کی دنیا میں آتے ہوئے مڑ کر دیکھا تو جان تکا، جیا تو اور کیولکانتی تینوں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ڈانٹے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "اچھا آپ لوگ ہیں۔ دوست آج تو تم نے مجھے ندی میں دھکیل ہی دیا تھا۔ نوروز مبارک! اور سینیورینا جان تکا کو خاص طور پر اور بہت زیادہ مبارک؟"

**جان تکا:**۔ "اور آپ کو بھی یوم بہار مبارک! مگر یہ تو بتائیے۔ ایسے مبارک دن آپ کا یہاں بیٹھنا اور موجوں کی گنتی گننا کیا معنے رکھتا ہے؟ اٹھئے ہمارے ساتھ چلئے۔"

**جیا تو:**۔ "ہاں ڈانٹے، اٹھو! آج تو کسی شخص کو بھی اور خصوصاً شاعر کو تو اداس رہنے کا حق نہیں۔"

**ڈانٹے:**۔ "نہیں جیا تو، آج میری طبیعت بہت اداس ہے۔ میں کہیں نہیں جا سکتا۔ تم لوگ جاؤ۔"

**جان تکا:**۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے! سینیور ڈانٹے آپ کو ضرور چلنا پڑے گا۔"

**کیولکانتی:**۔ "اٹھو ڈانٹے، ایسے حسین اصرار کو تم رد نہیں کر سکتے۔"

**ڈانٹے:**۔ "کیولکانتی، یہ میں جانتا ہوں کہ حسن کا فرمان اٹل ہے۔ لیکن تم جانتے ہو کہ ایک افسردہ دل پوری محفل کو افسردہ کر دیتا ہے۔ اور مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں۔"

**جان تکا:**۔ "میں سمجھ گئی جیا تو، میں سینیور ڈانٹے کی افسردہ نگاہوں اور مرجھائے ہوئے چہرے سے اندازہ لگا کر وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ سینیور کو کسی سے محبت ہو گئی ہے۔ کیوں شاعر ہے نا پتہ کی بات؟"

**ڈانٹے:**۔ (کچھ ہچکچاتے ہوئے) "کیسے کہوں کہ سینیورینا کا قیاس غلط ہے۔"

**جان تکا:**۔ "سچ مچ! تو پھر میری دلی مبارکباد قبول کیجئے! لیکن یہ تو بتائیے، وہ پری جمال، خوش خصال اور خوش نصیب ہے کون؟"

**ڈانٹے:**۔ "جان تکا، کہیں راز کی بات بتائی جا سکتی ہے!"

**کیولکانتی:**۔ "نہیں ڈانٹے، نام تو بتانا ہی پڑے گا۔"

**ڈانٹے:**۔ "کیولکانتی مجھے مجبور نہ کرو، میں نام ظاہر نہیں کر سکتا۔"

**جیا تو:۔** ڈانٹے، یہ تم بھی جانتے ہو کہ محبت کرنا کوئی جرم نہیں، کوئی گناہ نہیں، محبت کرنا عیب نہیں، پھر اس کا چھپانا کیا معنی!"

**جان تکا:۔** (ڈانٹے کو بہلانے کے انداز میں) "جیا تو، تم مشہور نقاش اور مانے ہوئے آرٹسٹ سہی لیکن تمہارا اور ڈانٹے کا مطمحِ نظر ایک ہونا بھی ضروری نہیں۔ اچھا سینور ڈانٹے آپ میرے کان میں کہدیجئے!

**ڈانٹے:۔** سینوریتا! مجھے مجبور نہ کرو۔ یہ میرا راز ہے۔ اس کا راز رہنا ہی بہتر ہے!"

**جان تکا:۔** "لیکن ڈانٹے۔ اگر آپ شاعر ہیں تو میں عورت، اور آپ عورت کی متجسس فطرت سے بخوبی واقف ہیں جسے ہمیشہ راز پا لینے ہی کی جستجو رہتی ہے۔ جب تک آپ نہ بتائیں گے۔ مجھے الجھن رہے گی۔"

**ڈانٹے:۔** (جان تکا کے اصرار سے مجبور ہو کر) "اچھا اگر تم نہیں جانتیں تو سنو۔ نام تو میں نہیں بتاتا۔ بس اتنا سن لو کہ تم سے بہت مشابہ ہے۔"

**جیا تو:۔** "آہا۔ میں سمجھ گیا، جان گیا، پہچان گیا! جان تکا، مبارک ہو! انہیں تم ہی سے الفت ہوئی ہے۔ لاؤ، کھلاؤ مٹھائی۔"

**کیولکانتی:۔** اچھا ڈانٹے، بھئی اب چلو بہت دیر ہو گئی۔"

**ڈانٹے:۔** "نہیں دوست، زیادہ بہتر ہوگا کہ مجھے اس وقت تنہا ہی چھوڑ دو۔"

**جیا تو:۔** "نہیں مانتے تو مجبوری، اچھا خدا حافظ۔"

تینوں دوست چلے جاتے ہیں۔ ڈانٹے پھر اپنے خیالات میں غرق ہو جاتا ہے۔ تصورات کی دنیا میں پہنچ کر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ندی کی شوخ و شریر لہروں میں کھو جاتا ہے۔ دلدادگانِ بہار اور وارفتگانِ نوروز کی ٹولیاں کی ٹولیاں گاتی بجاتی آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ لیکن ڈانٹے کو عام محویت میں ذرا احساس نہیں ہوتا۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی دلکش راگ گاتی ہوئی قریب سے گذرتی ہے۔

"پھر بہار آئی ہوا سے بوئے یار آنے لگی۔
سامنے پھر بلبلِ نقش و نگار آنے لگی"۔

افسردہ دل اور دنیا سے بے تعلق ڈانٹے گیت کے ان بولوں کو خود بھی آہستہ آہستہ گنگنانے لگتا ہے۔ جلوس آتا ہے اور گذر جاتا ہے۔ پل پر پھر سناٹا چھا جاتا ہے۔ لیکن گیت کے بول ڈانٹے کے احساسات میں ہل چل مچا دیتے ہیں۔ اس کے سوئے ہوئے جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ جلوس کے محشر انگیز گیت نے ڈانٹے کی رگِ جان کو چھیڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ وہ خود بخود پھر وہی گیت دوہرانے لگتا ہے۔

پھر بہار آئی، ہوا سے بوئے یار آنے لگی

اسی حالت میں ڈانٹے دور سے دو لڑکیوں کو آتے دیکھتا ہے محبت کی تیکھی حس اسے بے چین و بے آرام کر جاتی ہے۔ اسے اختلاج سا ہونے لگتا ہے۔ جوں جوں لڑکیاں قریب پہنچتی جاتی ہیں۔ ڈانٹے کا خیال یا آرزو یقین میں تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ دونوں اس کے پاس سے گذر جاتی ہیں تو ڈانٹے پھر کسی خیال میں غرق ہو کر ندی کے بہاؤ کو دیکھنے لگتا ہے۔ لڑکیاں کچھ دور آگے بڑھ جاتی ہیں۔ تو ان میں سے ایک جس کا نام بیٹرس ہے پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے۔

**بیٹرس:۔** "او ہو، سینور ڈانٹے ہیں، تسلیم!"

**ڈانٹے:۔** "جی، جی (گھبرا کر) تسلیم سینوریتا بیٹرس!"

**بیٹرس:۔** نصیب دشمنان، مزاج کیسے ہیں؟"

**ڈانٹے:۔** (پریشانی کے عالم میں) ایں، ہاں، ہاں، بہت اچھا ہوں" سینوریتا۔ شکریہ!"

**بیٹرس:۔** "سینور ڈانٹے! کیا آپ کو ندی کے شفاف آئینے میں دیکھنے کے بعد بھی اپنی حالت کا اندازہ نہیں ہوا؟ آپ کا چہرہ بالکل سفید پڑ رہا ہے۔ ہائیں، اور کیا آپ رو بھی رہے تھے؟"

**ڈانٹے:۔** (اور زیادہ گھبرا کر) "نہیں، سینوریتا — نہیں تو!"

**بیٹرس:۔** "تو کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتی ہوں کہ شاعر ڈانٹے اتنا بدحواس کیوں ہے جو مجھے مبارکباد دینا بھی بھول گیا۔"

**ڈانٹے:۔** (بدحواسی کے لہجہ میں) اوہو، معاف کیجئے گا۔ میں بھول گیا تھا۔ نوروز مبارک ہو! سینوریتا بیٹرس کو۔"

**ساتھ والی:۔** اور شاعر ڈانٹے، مجھے کچھ بھی نہیں!"

**ڈانٹے:۔** "اوہ میں بھول گیا تھا۔ آپ کو بھی نوروز مبارک ہو!"

دونوں ڈانٹے کی بدحواسی پر ہنستی ہیں۔

**بیٹرس:۔** سینور، آج شام کو میری سالگرہ کی پارٹی میں آنا نہ بھولئے گا۔ میں منتظر رہوں گی۔

**ڈانٹے:۔** "آہا، میں بھول ہی گیا تھا۔ سینوریتا، میں ضرور شریک ہوں گا۔ شکریہ!"

**ساتھ والی:۔** "لیکن سینور بیٹرس کے تحفہ کے ساتھ میرا تحفہ نہ بھول جائیے گا۔"

**بیٹرس:۔** "سینور، اس کی باتوں پر نہ جائیے یہ تو مذاق کر رہی ہے۔ تحفے وحفے کی ضرورت نہیں۔"

**ڈانٹے:۔** "جی، جی۔"

**ساتھ والی:۔** "سینور، آپ گھبرائے ہوئے کیوں ہیں! کیجئے تحفہ نہیں تو بہ، تحفے ضرور لاؤں گا۔"

**ڈانٹے:۔** "جی، درست، ہاں، کیوں نہیں!"

**بیٹرس:۔** "سینور، درحقیقت آپ تو بہت ہی گھبرائے ہوئے ہیں۔ شاید آپ اس اتفاقی ملاقات سے خوش نہیں ہوئے۔"

**ڈانٹے:۔** (گھبرا کر) ۔ جی، نہیں،

**ساتھ والی:۔** "یا وحشت، یعنی آپ واقعی خوش نہیں ہوئے؟"

ڈانٹے کوئی جواب نہیں دیتا۔ دونوں لڑکیاں چلی جاتی ہیں۔ اور ڈانٹے پھر اپنے خیالات میں غرق ہو کر ندی کے بہتے ہوئے پانی کو بغور تکنے لگتا ہے۔

# حقائق و معارف

## افقر موہانی وارثی

وہ نہیں ہیں پھر بھی تازہ دل میں انکی یاد ہے
یہ وہ دنیا ہے جو ویراں ہو کے بھی آباد ہے

...جب حسن کی افتاد ہے
تم کو اس سے کیا کوئی ناشاد ہے یا شاد ہے

...کوہکن کی کس قدر ... ہے
گردن فرہاد پر خون سر فرہاد ہے

حسن با عمل نام کی دنیا جب آباد ہے
ذرہ ذرہ اس زمیں کا جنت شداد ہے

میری وحشت سرخرو، میرا جنوں ...
وہ بھی مجھکو کہہ رہے ہیں خانماں برباد ہے

ایسے بھی جلوے ہیں کچھ حسن کرشمہ ساز کے
گم جہاں پر ارژنگ مانی و بہزاد ہے

چاہتی ہے ہر جفا خود داد ...
شعر میں دیکھئے کس مظلوم کی روداد ہے

کیا کریں صیاد ہم جاکر قفس سے آشیاں
سب کہیں گے دیکھکر یہ آشیاں برباد ہے

... کر سکتا نہیں صیاد ... کا خیال
یہ وہ طائر ہے اسیری میں بھی جو آزاد ہے

...آزادی کے دکھلا ...
لے کے اسیران قفس صیاد ...

... ستم ... پوچھ
دل سراپا آرزو ... ہے

قصہ گو سے سن کے قصہ قیس کا کہتے ہیں وہ
یہ تو بیتی داستان افقر ناشاد ہے

## غزل — سحاب قزلباش

ہزار باتیں ہیں دل میں ابھی سنانے کو
مگر زباں نہیں ملتی ہمیں جتانے کو

ہم اہل ظرف، ابھی تک ہیں ایک جنس لطیف
دبیں گے ... دنیا نے آزمانے کو

وہ آنسو ہیں آج سنارہے ترا شتی دیکھیں
جنہوں نے رنگ تبسم دیا زمانے کو

ہمارے پھول، ہمارا چمن، ہماری بہار
ہمیں سے جانے ملتی ہے آشیانے کو

لرز کے رکھدیا ... باگ گردشوں نے
وہ ہم کو ... یا تم نے آزمانے کو

سحاب اتنے تغیر نواز ہیں ہم بھی
کہ اپنے نغموں نے چونکا دیا زمانے کو

## واردات — عارف ملتانی

آغاز محبت میں ہمدم، کیا جانئے یہ کیا ہوتا ہے؟
سر تا بہ قدم اک آگ سی لگی ہے، رگ رگ میں سوز سموتا ہے!

یہ ہلکی ہلکی سی ٹیسیں، سینے سے کون اٹھاتا ہے؟
یہ میٹھے میٹھے سے نشتر، پہلو میں کون چبھوتا ہے؟

جب پھانس تو چبھے، اور درد اٹھے، تو آنکھ نہ ہو کیوں چھل چھل؟
وہ عشق تو موتی رولتا ہے، جو اشک کے دانے بوتا ہے

کچھ حسن میں قوت باقی ہے یا عشق میں لذت ہے ورنہ!
یوں زیست کی شندرئی، منجدھار میں کون ڈبوتا ہے؟

تاروں کی سہانی جگمگ سے، اک چوٹ سی دل پر لگتی ہے
میں پہروں اٹھ اٹھ روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے!

شبنم میں بھیگی راتوں میں فرقت کے ترانے گاتا ہوں
لب دھیرے دھیرے ہلتے ہیں، دل چپکے چپکے روتا ہے!!



عراقی فوج کے افسر چاند ماری کرنے والوں کے کمالات دیکھ رہے ہیں۔

# عراقی فوج کے افسر ہندوستان میں



کچھ عرصہ ہوا عراقی فوج کے چند افسر بریگیڈیر حسین مکی کی قیادت میں ہندوستان تشریف لائے۔ انہوں نے سارے ملک میں گھوم پھر کر یہاں کے فوجی نظم و نسق کا مطالعہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ "آرمڈ فورسز ہیڈکوارٹر" پر بھی تشریف لیگئے جہاں محکمۂ دفاع کے سکریٹری مسٹر جی۔ ایس۔ بھالجہ نے انکا استقبال کیا اور ہندوستان کے ایڈ جوٹنٹ جنرل لفٹننٹ جنرل آر۔اے سیووری سے ملاقات کرائی۔ یہ فوجی وفد دہلی چھاؤنی کے راجپوتانہ رائفلز سنٹر کا معائنہ

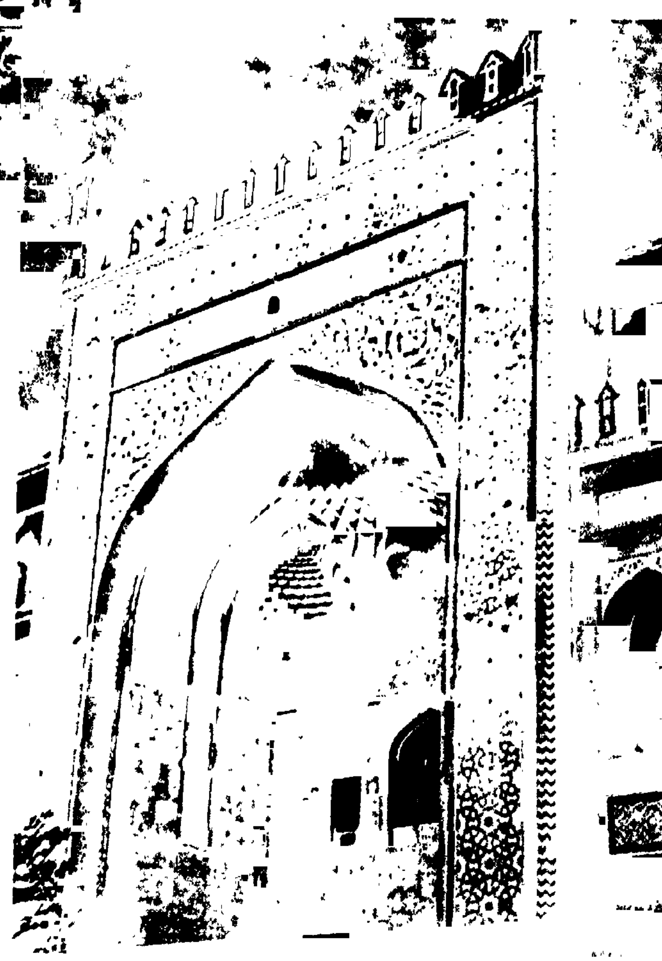


مشہور مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی زیب النساء کے ساتھ بہت سے تاریخی اور غیرتاریخی واقعات منسوب کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر واقعات ایسے ہیں جن کے متعلق اب تک مستند شہادتیں نہیں مل سکیں۔ انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زیب النساء سکندرہ میں دفن ہے۔ لیکن بہر حال ایک بات ایسی ہے کہ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ اور وہ یہ کہ زیب النساء ایک خوش گو شاعرہ تھی۔

جہاں ملتان سے لاہور جانے والی خاک آلود سڑک شروع ہوتی ہے۔ اسی کے قریب ایک چار مینار کی عمارت ہے جسے 'چوبرجی' کہتے ہیں۔ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء نے ایک باغ اپنے ایک وفادار خادم کو بخش دیا تھا۔ یہ اسی باغ کا دروازہ تھا۔ باغ تو اجڑ گیا۔ اب صرف اس کا دروازہ باقی ہے۔

٭

یہ سکندرہ میں آگرے کے قریب اکبر کے مقبرے کا دروازہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زیب النساء کو یہیں ← اس کے جد اعلیٰ کے پاس دفن کیا گیا تھا۔



# زرتشتی درسگاہ کا سالانہ جشن

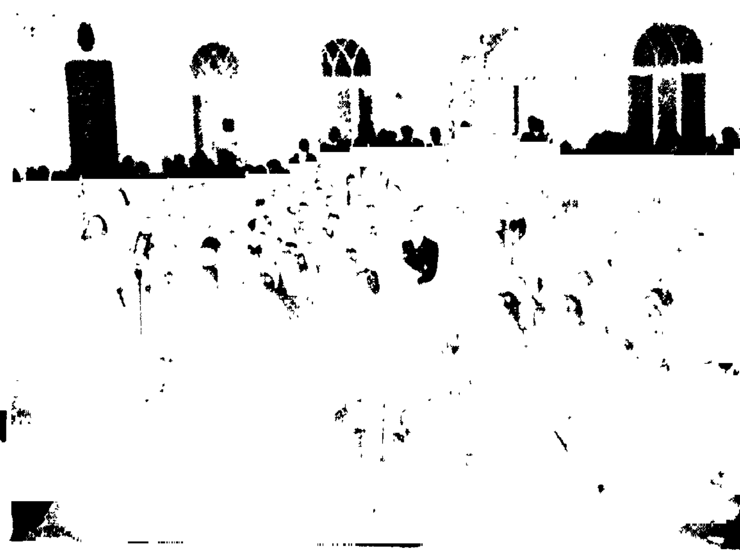
۲۶- مہر ماہ ۱۳۲۵ کی صبح زرتشتی درسگاہ کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ انجمن زرتشیان کی دعوت پر بہت سے اہل علم حضرات جن میں انگریز بھی شامل تھے جلسہ میں شریک ہوئے۔ انجمن زرتشیان کے صدر آقائ ارباب رستم گیو نے اس موقعہ پر ایک تقریر



پروفیسر پور داؤد ایک خاتون کو سند عطا کر رہے ہیں



آقائی ارباب رستم گیو جلسے میں اپنی سالانہ رپور
کر سنا رہے ہیں۔



جلسۂ تقسیم اسناد کا ایک منظر

✡

کی اور طلبا نے ترانے گائے جن سے سارا جلسہ
اٹھا آقائے ارباب رستم گیو نے اس جلسہ کی اہ
ذکر کرتے ہوئے اس میں شریک ہونے و
شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ کسطرح اور کن حالا
اب سے دس سال پہلے انجمن قائم کی گئی تھی

✡

انوشیروان دادگر اسکول کی ایک لڑکی
← آنسہ پوری امیر تیمور تقریر کر رہی ہے۔



# جامعہ کا جشن سیمیں







اس موقعہ پر اسکاؤٹ ریلی کا ایک منظر۔

اسکاؤٹ جامعہ کی عمارت

جشن سیمیں کے پنڈال اور اسکے مہمانوں کا ایک منظر



جشن سیمین میں داخل ہ





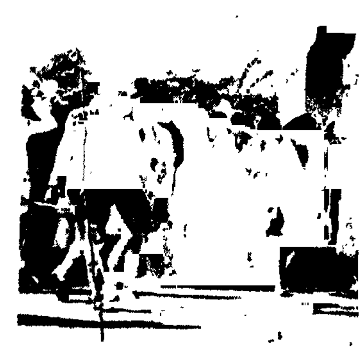
ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ



ایک حصے کے سامنے سے گذر رہے ہیں۔

، کا دروازہ۔

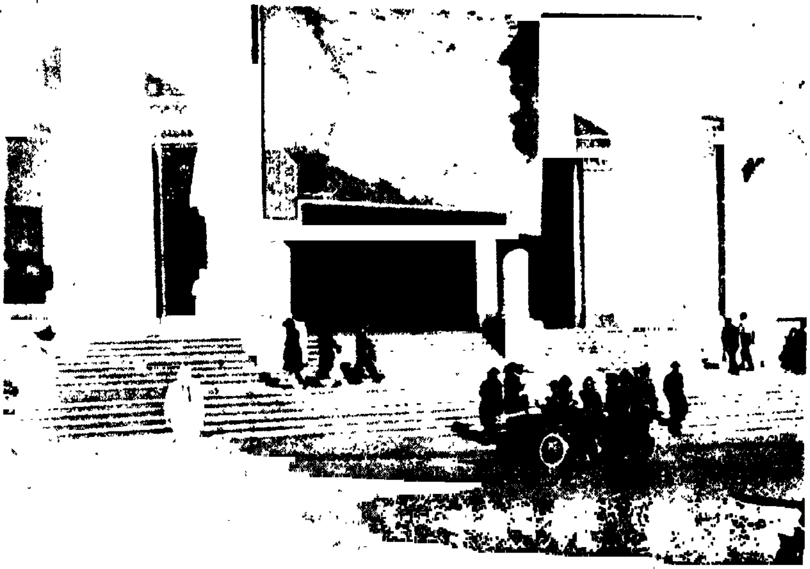




اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ہندوستان میں ایک نئے تعلیمی تجربہ کی بنیاد پڑی۔ اس تجربہ کے شروع کرنے اور چلانے والوں نے ۱۹۲۰ء سے آج تک سخت سے سخت آزمائشوں سے گذر کر اسے اس منزل تک پہنچایا ہے کہ اب وہ دنیا کے بڑے بڑے تعلیمی مفکروں سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ اس تعلیمی تجربہ کی عملی شکل جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ ۱۵۔ نومبر سے ۱۸۔ نومبر تک جامعہ نے اپنا جشن سیمیں منایا۔ جس میں ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے ماہرین تعلیم' علماء' ادبا اور سیاسی مفکر شریک ہوئے۔ ۱۸ نومبر کو جشن سیمیں کے خاص جلسہ میں اعلی حضرت فرماں روائے بھوپال کا خطبۂ صدارت ہوا اور اسکے بعد جامعہ کے شیخ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے اپنی رپورٹ پڑھی۔ یہ رپورٹ ہمارے ادبی اور تعلیمی سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس شمارہ میں آپ نواب صاحب بھوپال کے خطبہ اور ذاکر صاحب کی رپورٹ کے علاوہ حضرت حفیظ جالندھری کی نظم بھی ملاحظہ فرمائینگے۔ جو اس خاص جلسہ میں پڑھی گئی تھی۔



نگہبان فوجی دستے کا ایک سپاہی گرمائی محل کی حفاظت کیلئے ڈٹا کھڑا ہے۔



جنرل پوسٹ آفس کی سیڑھیاں۔ لڑائی کے دنوں میں یہاں فوجیوں اور انکے ملنے والوں کا جھمگوٹ رہتا تھا۔ اب صرف شہری چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

# الجدریا

رومیون کے عہد حکومت میں الجیریا ایک معمولی شہر تھا لیکن اب ترقی کرکے یورپ کے مشہور شہروں کے ہم پلہ ہوگیا ہے۔ یہ شہر صنعت و حرفت کا مرکز ہونے کے علاوہ ظاہری آرائش و زیبائش کے لحاظ سے بھی قابل دید ہے۔

۱۹۴۲ء میں جب فرانس نے جرمنوں کی تباہ کاریوں سے تنگ آکر ہتیار ڈالدئے تو انکی عارضی حکومت اسی جگہ قائم ہوئی تھی۔ حکومت نے ایک زنانہ مدرسہ لے لیا جو شہر سے باہر ایک



سینٹ جارج ہوٹل میں جانے کا دروازہ۔ لڑائی کے دنوں میں ہوائی فوج کے چیف مارشل جنرل ایزن ہور اور امیر البحر کننگھم کے صدر مقام اسکے اندر تھے۔

پہاڑی پر واقع تھا۔ اسکے مختلف کمروں میں حکومت کے مختلف محکمے قائم ہوگئے اور فرانس سے دور رہ کر اس امر پر غور کیا جانے لگا کہ اپنے ملک کو دشمنوں سے کسطرح واپس لیا جائے۔ جب افسران کی تعداد بڑھ جانے سے مدرسے کی عمارت میں گنجائش نہ رہی تو گورنر کا گرمائی محل بھی جلسوں وغیرہ کیلئے حاصل کرلیا گیا۔

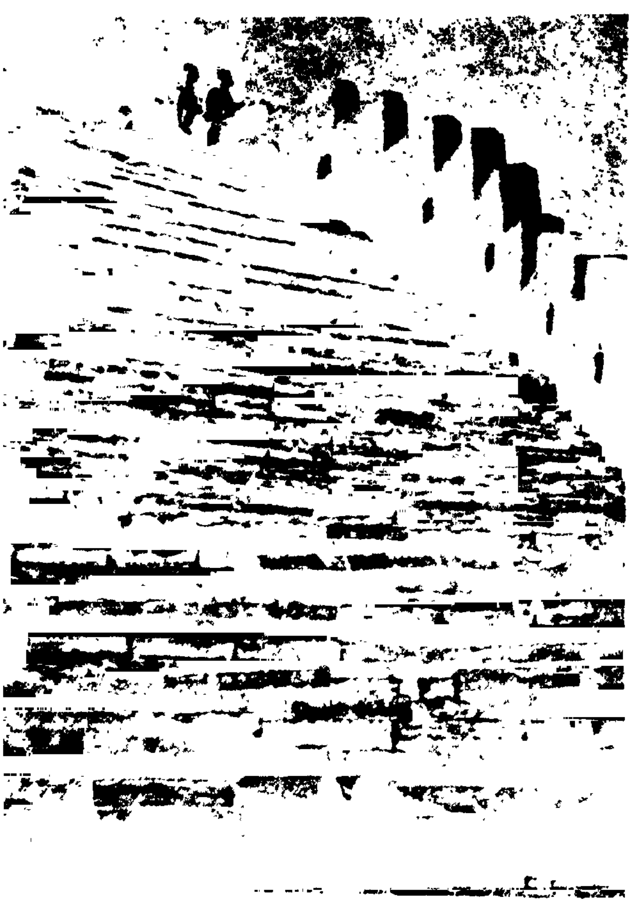


ایک زنانہ مدرسے کا کمرہ جسے ۱۹۴۲ء میں سقوط فرانس کے بعد فرانس کی عارضی حکومت نے لے لیا تھا۔ اب

# دیوار چین

چین کی دیوار اعظم ولادت مسیح سے ۳۱۴ سال پہلے شیہ هوانگ تی نے بنوانی شروع کی جو اسکے مرنے کے بہت عرصے بعد تک بنتی رهی وہ ڈیڑھ هزار میل لمبی هے۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ شمال اور شمال مغرب کی طرف سے منگول اور تاتار ارض چین پر حملہ نہ کر سکیں۔ دو هزار سال سے زیادہ مدت گذر جانے کے باوجود اب بھی اسکا بہت حصہ برقرار هے۔ مفصل مضمون صفحہ نمبر ۵۰ پر ملاحظہ کیجئے۔

بہت زیادہ ڈھلوان هونے کے باعث دیوار کی بالائی سطح هموار کے بجائے سیڑھیوں کی صورت میں تعمیر کی گئی هے۔





چین کی دیوار اعظم کا ایک دلفریب منظر۔ یہ حصہ پہاڑی علاقے کے صوبۂ جیہول کی سرحد کے سامنے هے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنی هوئی کئی پناہ گاهیں نظر آرهی هیں



دیوار رینگتے هوئے سانپ کی طرح پہاڑ پر چڑھتی




رتن مالا — ایک فلمی ستارہ

## نارسائی — وشوامتر عادل

کس نے آغاز کبھی دیکھا ہے ؟
کس نے انجام کبھی پایا ہے ؟
حسن کا کوئی بھی آغاز نہیں
حسن کا کوئی بھی انجام نہیں

چند بے جان طیور
چند سوکھے ہوئے پھل
چند مسلے ہوئے پھول
وقت کے ہانپتے خاموش کناروں کے ساتھ
دم بدم پیچھے پھسلتے ہی چلے جاتے ہیں
حسن چپ چاپ بہے جاتا ہے
حسن چپ چاپ گذر جائے گا۔

دور فضا کے افق پر بھی ہیں کتنے سپنے
چند اڑتے ہوئے بگلوں کی قطار
چند ڈھلتے ہوئے سست درخت
چند سرسبز پہاڑوں کا سکوت
یہ مگر پاس تو آتے ہی نہیں
حسن چپ چاپ بہے جاتا ہے
حسن چپ چاپ گذر جائے گا

ہاں مگر چند چٹانیں بھی ہیں
کہر میں لپٹی ہوئی
جن پہ لہروں کا اثر کوئی نہیں
جن کے سینے میں سحر کوئی نہیں
جن پہ تاریکی شب بار کے سو جاتی ہے

آج پھر تیز خیال آیا ہے
اور چپ چاپ گذر جائے گا۔

## ظلم — مضطر اکبرآبادی

تکلیفِ ضبطِ آہ نہ کرتے تو ظلم تھا
غم سے اگر نباہ نہ کرتے تو ظلم تھا
یہ موسمِ حسیں یہ جوانی یہ چاند رات
اب بھی اگر گناہ نہ کرتے تو ظلم تھا
تیری رضا پہ تیرے اشارے پہ اے ندیم
ہم زندگی تباہ نہ کرتے تو ظلم تھا
دنیا سے رسم و راہ پہ آمادہ یوں ہوئے
دنیا سے رسم و راہ نہ کرتے تو ظلم تھا
اے رحمتِ تمام ترے اعتماد پر
جی بھر کے ہم گناہ نہ کرتے تو ظلم تھا
تھی دل کو احتیاج تمہاری نگاہ کی
تم زحمتِ نگاہ نہ کرتے تو ظلم تھا
مضطر خلوص و صدق و وفا کے جواب میں
وہ ظلمِ بے پناہ نہ کرتے تو ظلم تھا

## کیفِ نظر — آباد لکھنوی

ہر شام کے پردے میں سحر دیکھ رہا ہوں
جو کچھ بھی دکھاتی ہے نظر دیکھ رہا ہوں
ظاہر ہے کہ تو دیکھ رہا ہے مرا عالم
میں بھی تجھے اے شعبدہ گر دیکھ رہا ہوں
مستی سے بہت دور ہوں اے بیخودیٔ شوق
میخانہ میں ساقی کی نظر دیکھ رہا ہوں
بخشا ہے عجب کیف مجھے میری نظر نے
تم ہی نظر آتے ہو جدھر دیکھ رہا ہوں
اک وہ کہ دکھاتے ہیں تجلی پہ تجلی
اک میں ہوں کہ گھبرا کے اُدھر دیکھ رہا ہوں
اب وہ نظر آتے نہیں بے پردہ کہیں بھی
اب ان کو بہ اندازِ دگر دیکھ رہا ہوں
آباد عجب حال میں پاتا ہوں جہاں کو
ہر شخص کو بیتابِ نظر دیکھ رہا ہوں

# کیمیا داں لوازئے

پی این پنڈت

انقلاب فرانس کے اس خبط جنون کے دور دورے میں جبکہ فرانس کا بادشاہ اور ملکہ آزادی قوم کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں سولی کی نظر ہو چکے ہیں۔ اور شاہی محل میں قطار در قطار زن و مرد موت کا حکم سننے کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک کیمیاں داں بڑی خاموشی اور اطمینان سے اپنی پیرس کی تجربہ گاہ میں مشغول کار نظر آتا ہے۔ یہ سائنس داں ایک مشہور و معروف آدمی ہے۔ جو اپنی طاقت ثروت اور وقت کا بہت سا حصہ فرانس کی خدمت میں صرف کر چکا ہے۔ لیکن زمانۂ انقلاب میں نفرت اور حقارت کا جذبہ روز افزوں تھا۔ اور اس سائنس داں کے ان گنت دشمن تھے۔ عین اس وقت جبکہ شہر پیرس کے کوچہ و بازار بے چینی سے کھول رہے تھے۔ اور اس کے دشمن اسکی تباہی اور بربادی کے منصوبے پکے کر رہے تھے۔ یہ کیمیا داں اپنے رفیق سیگوین کے پاس کھڑا اپنی نوجوان بیوی کو تجربوں کی یادداشتیں لکھوا رہا تھا۔ جو غذائیات کے علم میں اضافہ کرنے کی غرض سے کئے جا رہے تھے لیکن قسمت کو ابھی ان تجربوں کی تکمیل منظور نہیں تھی۔ تجربہ گاہ کا دروازہ تیزی سے کھلا سپاہی اندر آئے اور اس سائنس داں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس سائنس داں کا نام لوازئے تھا۔

جین انتاشنے اور جینے لوازئے کا اکلوتا بیٹا انتائنے لارنٹ لوازئے ۲۶ اگست ۱۷۴۳ء کو پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے وقت سیموئل جانسن مشہور انگریز ادیب ۳۴ برس کا تھا۔ والیٹر کی عمر پچاس سال تھی اور انقلاب فرانس کا پیغامبر روسو اپنی عمر کے تیس سال پورے کر چکا تھا۔

لوازئے ابھی دو ہی سال کا تھا کہ اس کی ماں کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اس کے باپ نے مکان بیچ کر اپنی ساس کے گھر رہائش اختیار کر لی۔ خوبیٔ قسمت سے اس کی ناکتخدا خالہ کانسٹن بھی وہیں رہتی تھی۔ اسے شیر خوار یتیم بچے سے محبت ہو گئی اور بھانجے کی پرورش اور دیکھ بھال اس نے ایسے اچھے طریق سے کی۔ گویا انتائنے کو پالنا ہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں انتائنے کو کارڈینل مزارن کی درسگاہ میں داخل کر دیا گیا۔ اس درسگاہ میں سائنس کی تعلیم کا بہترین انتظام تھا۔ بڑے بڑے مانے ہوئے سائنس داں اس کے سٹاف پر تھے۔ ان میں ایک ایبے لاسیلے (Abbela Caille) جس نے نصف النہار کی ایک قوس کی ٹھیک ٹھیک پیمائش کی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نے دس ہزار نئے ستارے دریافت کئے اور چودہ نئے تارا منڈلوں (Constellation) کا پتہ لگا کر ان کے نام رکھے۔ مزارن سکول کی ایک رصدگاہ ایبے کے سپرد تھی۔ لوازئے بھی اپنا بہت سا وقت وہیں گذارا کرتا تھا۔ ایک اور استاد جس کا لوازئے کی آنے والی زندگی پر بڑا اثر پڑا۔ کیمیا داں روئے (Rouelle) تھا۔ تیز مزاج بھی تھا اور سنکی سا بھی لیکن اپنی دھن کا پکا اور بہت اچھا استاد تھا۔ کہتے ہیں لیکچر دیتے وقت اس کے جسم میں اتنی حرارت پیدا ہو جاتی کہ وہ پہلے اپنی بال دار ٹوپی اتار دیتا۔ پھر گلوبند اور واسکٹ یہاں تک کہ کوٹ تک بدن سے اتار دیتا۔ غرض ایسے ایسے فنا فی الفن استادوں کی صحبت میں رہ کر نوخیز لوازئے بچپن ہی میں شہرت اور کامیابی کے مسرت آمیز خواب دیکھنے لگا تھا۔ لوازئے نے ایک ڈرامہ بھی لکھا لیکن اس کی طبیعت کا فطری جھکاؤ سائنس کی طرف تھا۔ اسے تو صرف ایک ہی لگن تھی اور وہ تھی سائنسی تحقیق و تفتیش۔

لوازئے کی سائنسی تحقیق کی ابتدا بیس برس کی عمر سے ہوتی ہے جب اس نے ہر روز باقاعدگی سے تین چار بار بادپیما پڑھنا شروع کیا۔ اس کا یہ مشغلہ خبط کی حد کو پہنچا ہوا تھا۔ کاروبار پر جانا ہوتا تو ایک بادپیما ساتھ رہتا اور گھر میں خالہ کو تاکید رہتی کہ کسی وقت اسکا دیکھنا ناغہ نہ ہو۔ لوازئے کی غرض یہ تھی کہ ایسے قابل اعتبار قانون دریافت ہو جائیں جن کی مدد سے موسم کے متعلق پیشین گوئی کی جا سکے۔ لیکن بڑی محنت سے جمع کی ہوئی یادداشتوں سے نتیجہ نکالنے سے پہلے ہی موت نے اسے آ دبایا۔ اور یہ کوششیں تکمیل تک نہ پہنچ سکیں۔

براعظم یورپ کی سیاحت کو اس زمانہ میں ہر طالب علم کی تکمیل تعلیم کا ضروری جز سمجھا جاتا تھا۔ ۱۷۶۷ء میں لوازئے بھی مشہور ماہر علم الارض گوتار (Guettard) کے ساتھ براعظم کی سیاحت کو روانہ ہو گیا۔

اس زمانہ میں پیرس کے رہنے والوں کے دماغ میں سمایا ہوا تھا کہ تہذیب کی حد پیرس کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن لوازئے اس سفر پر گیا اور وہاں سے گھر والوں کو اس نے جو خط لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ذہین اور رچان بین کے متوالے نوجوان کے لئے یہ سفری زندگی از حد مسرت ہے اور سائنس کا پرستان اس پر نت نئے دل پذیر منظر کھول رہا ہے۔

لوازئے اور اس کے ساتھی جس جس شہر میں جاتے وہاں کی دلچسپ چیزوں کا مطالعہ کرتے۔ زراعتی زمین کی ماہیت اور مقامی نباتات اور صنعتوں کی یادداشتیں لیتے۔ ہر مقام کا درجہ حرارت ناپتے۔ جھیلوں اور دریاؤں کے پانی کا وزن مخصوص نکالتے۔ اس نوجوان سائنس داں کے لئے یہ شب و روز دلچسپیوں سے لبریز تھے۔ آخر کار اکتوبر کے مہینے میں آدھی رات کے وقت دو لوٹھکے ماندے مسافر سفر کے میلے کچیلے کپڑے پہنے گھر آن پہنچے۔ گھر پہنچتے ہی خالہ سے گرمجوشی سے ملکر نوجوان لوازئے اچھلتا کودتا بادپیما کی پڑھائی کے لئے بھاگ کر چلا گیا۔

سفر سے واپسی پر لوازئے تیل جلانے والوں لیمپ اور موم بتیوں کی تحقیقات میں مصروف ہو گیا۔ مصنوعی روشنی سے اسے بہت دلچسپی تھی۔ پندرہ برس بعد اس نے سوانگ گھر اور تھیٹر روشن کرنے پر ایک تفصیلی مضمون لکھا اور ایک بیضوی شکل کا عاکسہ (Reflect: : )

ایجاد کیا۔ جو عام استعمال کی چیز بن گئی۔ اگلے دو برس میں پانی پر ایک مقالہ لکھا گیا اس میں پانی کے ۱۲۸ نمونوں کی تشریح پر جو دوران سیاحت میں جمع ہوئے بحث کی گئی۔ اس سائنسی خدمات کے بدلے اسے ۱۷۶۸ء میں اکیڈمی کی ابتدائی رکنیت مل گئی۔ اسوقت لوازیئے مشکل سے ۲۳ سال کا تھا۔ اس نوعمری میں جبکہ اسکے ساتھی ابھی کھیل کود میں مشغول ہوں گے ایسا مرتبہ حاصل کر لینا جو پچاس سال کی عمر میں بھی مشکل سے ملتا ہے۔ بڑی تعریف کی بات ہے۔ اس کے چند ہی ہفتے بعد لوازیئے نے فارمرز جنرل کی دولت مند اور بارسوخ کمپنی میں ایک عہدہ قبول کر لیا۔ یہ کمپنی شاہ فرانس کے لئے ٹیکس وصول کیا کرتی تھی۔ کمپنی کے ہر عہدہ دار کی ذاتی آمدنی کا اندازہ دو لاکھ لورے (LIVRE) یعنی قریب قریب ۲ لاکھ روپیہ سالانہ لگایا جاتا ہے — اس طرح لوازیئے کیلئے معقول آمدنی کی صورت پیدا ہو گئی۔

اس نیم سرکاری کمپنی کے کارندوں کو بڑے وسیع اختیارات حاصل تھے۔ اور یہ لوگ اپنی دراز دستیوں اور ظالمانہ کاروائیوں کے لئے بھی مشہور تھے۔ اور فرانس بھر میں حقارت سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ کاروباری کمپنی اپنے کارکنوں کی بدعنوانیوں اور بعض ظالمانہ کارروائیوں کی وجہ سے بہت ناکام تھی۔ اس بدنام اور مشتبہ کمپنی کے تعلق سے اس پر جو بعض برے اثرات ڈالے ان سے قطع نظر ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ اس کا تعارف اپنی آئندہ بیوی سے ہو گیا۔ فارمرز جنرل کے کارکنوں میں ایک شخص جیکس پالزے (Jacques Paulze) بھی تھا پالزے بڑا ذہین۔ پڑھا لکھا۔ صاحب مذاق۔ کروڑپتی امیر تھا۔ فرانس کی کئی بڑی بڑی کمپنیوں سے اس کا تعلق تھا۔ ماری۔ پالزے کی صاحب جمال لڑکی تھی۔ جب لوازیئے فارمرز کا ممبر بنا ماری ایک کانونٹ (Convent) میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ امیر طبقے کے کئی نوجوان ماری سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے۔ لیکن ماری کو تو دنیائے سائنس میں شہرت حاصل کرنا تھی شاید اسی لئے پالزے کی نظر انتخاب لوازیئے پر ہی پڑی۔ ماری کی عمر اسوقت ۱۴ برس تھی۔ اور لوازیئے ۲۸ برس کا تھا۔ ماری کی نیلی آنکھیں۔ اس کے بھورے بال اسکے نکھرے ہوئے رنگ میں ایک کشش تھی اتنا نیئے بھی خوش شکل جوان تھا۔ یہ شادی عشق و محبت کی ابتدا کے بغیر ہوئی لیکن ایسے جوڑ قسمت سے ملتے ہیں۔ مصور ڈیوڈ نے (David) ان دونوں کی جو تصویر بنائی ہے اور جو اب راک فیلر انسٹی ٹیوٹ نیویارک کی لائبریری میں آویزاں ہے۔ ایک قابل دید چیز ہے۔ لوازیئے کی شادی دسمبر ۱۷۷۱ء میں ہوئی۔ فرانس کے امراء وزراء اور دنیائے دولت اور سائنس کے بڑے بڑے رکن اس میں شریک ہوئے۔ لوازیئے کی دلہن حسن، قابلیت اور دولت سبھی کچھ جہیز میں لائی۔ شادی کے وقت ماری بہت نوعمر تھی اس کی تعلیم کی

ابھی ابتدا ہی ہوئی تھی لیکن اس نے اپنی خداداد قابلیت کا رخ ایسا پلٹ دیا کہ اپنے خاوند کی سائنسی تحقیقات میں مدد کے قابل ہوئی۔ اس نے لاطینی اور انگریزی جلد جلد سیکھ لی کہ ان زبانوں کے سائنسی رسالوں کا ترجمہ کر سکے۔ وہ ڈرائنگ اور نقاشی جانتی تھی۔ اور ضروری نقشے اور خاکے وہی بنایا کرتی تھی۔ علم کیمیا میں بھی شدبد حاصل کر لی۔ جب تجربہ گاہ میں تجربے جاری ہوتے تو میاں بیوی باری باری نتائج خوانی کرتے۔ اور جب مسلسل تجربے ہوتے تو ماری رت جگے کرتی۔ غرض ماری ہر لحاظ سے ایک قابل تعریف بیوی ثابت ہوئی وہ زندگی بھر خاوند کے پاس سے الگ نہیں ہوئی اس کی کامیابی کی حصہ دار اور اس کے دشمنوں کی دشمن تھی۔ سائنس بھی ماری کی گرویدہ احسان ہے کیونکہ ایسی وفا شعار بیوی کے بغیر لوازیئے کو بھی وہ کامیابیاں نصیب نہ ہوتیں جن کی وجہ سے اس کے نام کو شہرت حاصل ہے۔

۱۷۷۵ء میں لوازیئے بارود خانے کا افسر مقرر ہوا۔ یہ بڑا معزز عہدہ تھا۔ اس حیثیت سے اسے اپنی رہائش اسلح خانے کے احاطے میں رکھنی پڑی۔ جہاں اس لئے بیش قیمت آلات سے آراستہ تجربہ خانہ بنا دیا گیا تھا۔ فارم کی ممبری سے پہلے دس سال زیادہ تر کاروباری سفر میں گذرے۔ لیکن اس کے بعد لوازیئے پیرس میں مستقل طور پر رہنے لگا۔ وہ بے حد مشقت پسند تھا۔ ہر روز صبح چھ بجے سے ایک بجے تک اور شام کو سات سے دس تک تجربہ گاہ میں مصروف تحقیقات رہتا۔ اس کے علاوہ وہ ہفتہ میں پورا ایک دن تجربہ خانہ میں گذارتا۔ دوست اور شاگرد وہیں جمع رہتے بلکہ اکثر کھانا بھی وہیں کھاتے۔ اور ہر وقت سائنسی نظریوں پر بحث رہتی۔ اسی ماحول میں وہ نظریے قائم ہوئے اور وہ دریافتیں ہوئیں جن پر لوازیئے کی شہرت کا دارومدار ہے۔ شادی سے بعد کے بیس برس لوازیئے کے لئے بڑا مبارک زمانہ تھا۔ فرانس کی اکیڈمی کی سرکاری حیثیت لندن کی رائل سوسائٹی سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ نئے ممبروں کو شاہ فرانس کے حضور شرف باریابی حاصل ہوتا تھا۔ پرانے ممبر تنخواہ دار تھے اور کم و بیش سرکاری ملازمت کا درجہ رکھتے تھے۔ اکیڈمی کا رکن ہونے کی حیثیت سے لوازیئے کو کئی معمے حل کرنے پڑتے تھے۔ اور کئی الجھنیں سلجھانی پڑتی تھیں۔ مثلاً پیرس کی آب رسانی کو بہتر بنانے کی تجویز۔ کمزوروں اور بچوں کے لئے آرام کرسیوں کے ڈھانچے۔ ہسپتالوں اور جیل خانوں کی عمارتوں کا سدھار۔ جہازوں کے لئے سریش کا شوربہ بنانے کا طریقہ وغیرہ۔ میسمرزم یعنی مقناطیس حیوانی پر سائنسی نگاہ سے تحقیقات بھی کرنی ہوتی تھی بعض اوقات فضول اور بے تکی نو ایجاد کلیں منظوری اور تصدیق کیلئے اکیڈمی کو بھیج دی جاتیں۔ ساعت مشین۔ جہازوں کے مرمت کرنے کی گودیاں آگ بجھانے کے آلے۔ دائمی حرکت کی مشین۔ لوازیئے کو ان پر رائے زنی کرنی ہوتی۔ ان

الجھنوں اور پراگندگیوں کے باوجود لوازیے کو دماغ کی یکسوئی میں خلل نہیں آیا اور تحقیقات کے سلسلے میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔

ان مصروفیتوں کے باوجود اس نے بعض بہت اہم تجربے کئے۔ مثلاً کاربن ڈائی آکسائڈ کی کیمیائی ترکیب۔ نامیاتی کیمیا کی تحقیقات اور کیمیائی اصطلاحات اور کیمیائی مساوات کا نیا نظام ایسی دریافتیں ہیں جنہوں نے کیمیائی ریسرچ کی نئی راہیں کھول دیں۔ ۱۷۸۷ء میں ڈی مارو و (de Morveau) در فارکرائے (Fourcroy) کی مدد سے کیمیائی اصطلاحات کا نیا نظام مرتب ہوا۔ اس سے پہلے کیمیائی ناموں اور اصطلاحات میں بڑی گڑبڑ تھی یہاں تک کہ کیمیا دانوں کے لئے ایک دوسرے کی زبان سمجھنا بھی مشکل تھا۔ آجکل درسی کتابوں اور ریسرچ کے رسالوں جو سائنسی زبان استعمال ہوتی ہیں۔ اسی نئے نظام کو اس کا منبع سمجھنا چاہیئے۔ لوازیے کا کہنا ہے کہ "سائنس اور اس کی زبان ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک کی بہتری میں دوسرے کی بہتری ہے۔ اگر اصطلاحیں قائم نہ ہوں تو سائنسی حقیقتیں ایک سائنس داں دوسرے سائنس داں پر یا عوام پر واضح نہیں کرسکتا۔ نئی اصطلاحیں شروع شروع میں غیر مانوس۔ انوکھی اور بے ہنگم سی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن الفاظ اگر کسی عقلی نظام میں پرو دئے ہوئے ہوں تو کان جلد ہی ان الفاظ سے خوگر ہوجاتے ہیں اور ذہن ان کا مطلب سمجھنے لگ جاتا ہے"۔ اس وقت جب کہ سائنسی رسالوں اور کتابوں کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں میں ہو رہا ہے۔ اور ایک نئی سائنسی زبان زیر تعمیر ہے۔ لوازیے کے یہ الفاظ بہت معنی خیز معلوم ہوتے ہیں۔

اس نئے نظام کو فروغ دینے کی غرض سے ۱۷۸۹ء میں لوازیے نے کیمیا پر ایک ابتدائی کتاب (Traite Elementaire de Chimie) تصنیف کی جس میں اصطلاحات کو اس نئے نظام پر بحث کی گئی اور نئی اصطلاحات کا استعمال ہوا۔

اس کتاب میں مفرد اشیا کے احتراق پر بحث کی گئی ہے۔ گیسوں کے بنانے کے طریقے اور ان کی کیمیائی تشریح کا بیان ہے۔ ترشوں (Acids) اور قلیوں (Alkalis) اور ان کے کیمیائی عمل سے بننے والے نمکوں کا تذکرہ ہے۔ کیمیائی آلات کی تفصیل ہے اور پہلی بار ۳۳ کیمیائی عناصر کی فہرست دی گئی ہے۔ سائنائڈ۔ سلفٹ۔ فاسفیٹ۔ نائٹریٹ۔ ایسی ٹیٹ (Acetate) وغیرہ اصطلاحیں پہلی بار اس کتاب میں استعمال کی گئی ہیں۔ خالص کوئلہ کا نام کاربن ہے۔ کیمیائی عمل کے قاعدے صاف صاف لفظوں میں بیان ہوئے ہیں۔ پوٹاش اور سوڈا کا بھی پہلی بار نام لیا گیا ہے۔ غرض کہ ان تمام عملوں اور حالتوں کا تذکرہ ملتا ہے جن کا تعلق لوازیے کے نئے نظام سے ہے۔ لوازیے کے نظام اصطلاحات پر کچھ نقطہ چینی ضرور ہوئی لیکن کیمیائی ٹکسال میں اس کا سکہ چل گیا۔ اور اس تصنیف نے اس کو کیمیا دانوں کی پہلی صف میں لا بٹھایا۔ اسی لحاظ سے اسے کیمیائے جدید کا بنانے والا کہتے ہیں۔

اس چھوٹے سے مضمون میں لوازیے کے کارناموں کا ذرا بھی تفصیل سے ذکر کرنا ممکن نہیں۔ لیکن کیمیائی تحقیقات کی ایک خاص شاخ ہمارے لئے خاص طور پر دلچسپ ہے۔ اس لئے اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اس نے تنفس (Respiration) حیوانی حرارت اور غذا میں رشتہ دریافت کرنے کی ابتدا کی۔ اور علم غذائیات کی بنیاد رکھی۔ ہمارا جسم ایک کل کی حیثیت رکھتا ہے جو غذاؤں کے جلنے سے توانائی حاصل کرتا ہے۔ آجکل یہ کوئی نیا خیال نہیں سمجھا جائے گا لیکن ۱۷۸۰ء میں یہ اتنا صریحی امر نہیں تھا۔ غذا ہمارے جسم کو تقویت دیتی ہے اور تر و تازہ کرتی ہے۔ لیکن کیسے؟ تنفس حیات کے لئے لازمی ہے۔ مگر کیوں؟ ۱۷۸۶ء سے پہلے سائنس والوں کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس سے پیشتر ارسطو۔ رابرٹ ہک (R. Hook) سٹاہل (Stahl) اور اس کے شاگردوں بلکہ لوازیے کے ہمعصر پریسٹلے (Priestely) نے ان سوالوں کو حل کرنے کی ناکام کوششیں کی۔ لیکن لوازیے نے اپنے تاریخی تجربات سے بلاخوف تردید ثابت کر دیا کہ احتراق اور تنفس کے عملوں میں حیاتینی ہوا (Vital Air) یعنی آکسیجن جذب ہو کر ثابت ہوا (Fixed Air) یعنی کاربن ڈائی آکسائڈ بنتی ہے۔ ثابت ہوا پہلے پہل سکاٹ لینڈ کے باشندہ کیمیا داں بلیک (Blake) نے دریافت کی۔ لیکن لوازیے نے اس کی کیمیائی تشریح سے ثابت کر دیا کہ یہ گیس کاربن اور آکسیجن سے مرکب ہے۔ اس دریافت نے کیمیا اور فزیالوجی (عضویات) میں گہرا رشتہ پیدا کر دیا۔

لاپلیس (Laplace) مشہور فرانسیسی ریاضی داں ان تجربوں میں لوازیے کے ساتھ ساتھ کام کرتا رہا۔ غالباً کیمیائی مساوات کے حل اور حساب کی پیچیدگیوں میں اس سے بہت مدد ملی ہوگی۔ ایک خاص قسم کا حرارہ پیما (Calorimeter) بھی جو ان تجربوں میں استعمال ہوا۔ لاپلیس کی ایجاد ہے۔ تجربات پہلے پہل امریکی چوہوں (Guinea Pigs) پر کئے گئے۔ بعد ازاں جب انسانوں پر تجربہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو خطرہ جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک سائنس داں سیگوں (Siguin) نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ ان تحقیقات کا مفصل حال ۱۷۸۹ء کے پیرس اکیڈمی کے تذکروں (Memoirs) میں چھاپ دیا گیا۔ میڈم لوازیے کے بنائے ہوئے دو زوردار مرقعے ابھی تک موجود ہیں۔ جن میں تجربہ خانہ اور وہ تصویریں بنائی گئی ہیں جب یہ تجربات جاری تھے۔ پنسل کا

کا ایک نقاب بھی جو ان تجربات میں استعمال ہوا۔ ابھی تک میڈم لوازئے کے خاندان کے لوگوں کے قبضے میں ہے۔ یہ تحقیقات سائنس کو لوازئے کا آخری ہدیہ تھی۔ آنے والے سال بڑی کشمکش میں صرف ہوئے۔ تجربہ گاہ کی پرامن خاموشی اور سکون قلب اسے پھر نصیب نہیں ہوا۔ انقلاب فرانس کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا جس کے لیڈروں کا بقول کافن ہال (Coffinhal) سائنس والوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

۱۷۹۱ء کے درمیانی مہینوں میں اپنے طبقے کے دوسرے فرانسیسی شہریوں کی طرح اسے اپنا راستہ مشکلوں اور خطروں سے بھرا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نے تمام سرکاری تنخواہ والی ملازمتوں سے پیچھا چھڑا لیا۔ دارالخلافہ کی گڑبڑ اور ریشہ دوانیوں سے دور امن کی زندگی بسر کرنے کی غرض سے وہ اپنی زمینداری پر چلا گیا۔ ۱۷۹۲ء کا موسم سرما اور خزاں میاں بیوی نے وہیں بسر کئے۔ ۲۷ جولائی ۱۷۹۲ء کے دن انقلابی گیت گاتے ہوئے پیرس میں داخل ہوگئے۔ بادشاہ اور اس کے خاندان کے لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ بندوبست کے لئے ایک منتخب مجلس قائم کردی گئی۔ لوازئے کا پرانا رقیب کیمیا داں مرات (Marat) تھی جو اس پر کئی الزام لگا چکا تھا۔ اور اس کی سائنسی تحقیقات کا سخت نکتہ چیں تھا۔ اس انقلابی حکومت کا ایک سرکردہ رکن تھا۔ ملک میں جمہوری حکومت کا اعلان کردیا گیا۔ تمام سرکاری ادارے اور ایسے ادارے جن کا تعلق امراء سے تھا توڑ دئے گئے، یہاں تک کہ اکیڈمی آف سائنس بھی اس طوفان سے نہ بچ سکی۔ اور اس کی جگہ "ترقیٔ سائنس کی آزاد مجلس" قائم کردی گئی۔ پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ لوازئے فارمرز جنرل کا ایک سرکردہ رکن تھا۔ ٹیکس دینے والی عام پبلک کی نظروں میں یہ کمپنی کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ کمپنی کے حساب کی جانچ پڑتال کے لئے ایک کمیشن بنا دیا گیا۔ اور ممبروں کی گرفتاری کا حکم جاری کردیا گیا۔ لوازئے کو جلد ہی ان واقعات کی خبر مل گئی۔ دو روز تک وہ بڑے اضطراب کی حالت میں لوورے (Louvre) کے گرد سے اٹے ہوئے کمروں میں اس حکم کی تنسیخ کے لئے ہاتھ پیر مارتا رہا۔ اور اپنی قسمت کے فیصلہ کا بیقراری سے انتظار کرتا رہا۔ ان کمروں میں مدت سے اسکے متروک اور گرد آلود آلات پڑے ہوئے تھے۔ اور یہی وہ کمرے تھے جہاں ملک کے مانے ہوئے سائنس والوں کے سرگروہ کی حیثیت سے اسے اپنی پے در پے کامیابیوں پر خوش ہونے کا موقعہ ملا تھا۔ یقیناً یہ اس کی زندگی کے تلخ ترین لمحات ہونگے۔ تنسیخ حکم کی تمام درخواستیں نامنظور ہوگئیں اور ۲۸ نومبر کو اسے گرفتار کرکے پورٹ لبرے کے جیل خانے میں بند کردیا گیا۔ میڈم لوازئے کے باپ جیکس پالزے اور ۲۷ دوسرے فارمرز کو بھی اسی وقت حراست میں لے لیا گیا تھا۔ میڈم لوازئے اپنے خاوند کی رہائی کے لئے دوڑ دھوپ کرتی رہی۔ کبھی سرکاری افسروں سے ملتی کبھی جیل میں ملاقات کیلئے پہنچتی۔ اور کبھی اپنے غمزدہ اور گرفتار خاوند کو دلاسے کے خط لکھ کر اس کا حوصلہ بڑھاتی۔ گرفتاری کے چند ہی روز بعد یہ پریشان کرنے والی خبر مشہور ہوگئی کہ فارمرز کے حساب میں کروڑوں روپے کا غبن نکلا ہے۔ اس خبر سے قیدیوں کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ ۸ مئی کے دن ملزموں کو انقلابی عدالت کے سامنے پیش کردیا گیا۔ لوازئے نے اس بنا پر بہت پندرہ دن کی مانگی کہ وہ بنفس خود ایسے تجربات میں مشغول ہے جن سے بنی نوع انسان کو بہت فائدہ پہنچنے کی امید ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے اس کے جواب میں کافن ہال نے جو انقلابی عدالت کا صدر تھا ارشاد کیا کہ جمہوری فرانس کو عالموں کی کوئی ضرورت نہیں اور محض رسمی کارروائی کے بعد لوازئے اور اس کے ساتھیوں کو ملک کے خلاف سازش کے الزام میں سزائے موت دیدی گئی۔ اور گلوٹین سے ان کا سر کاٹ دیا گیا۔ اس وقت لوازئے صرف اکیاون برس آٹھ مہینے کا تھا۔ اگلے ہی دن لے گرانج نے کہا۔ لوازئے کا سر کاٹنے میں تو شاید ایک منٹ بھی نہ لگا ہوگا۔ لیکن سینکڑوں سال میں بھی اسکے برابر انسان پیدا ہونا مشکل ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

# بیجو سائیں

افسانہ

دیا شنکر نسیم

وہ تونبی بجاتا نکلتا تھا۔ اس کے کندھے پر بہنگی لٹکی ہوتی جس کے دونوں سروں سے گیروے رنگ کی رسی سے بندھی بانس کی دو پرانی پٹاریاں لٹکتی رہتیں، پٹاریاں پرانی ہو گئی تھیں اور اس بات کا صاف پتہ دیتی تھیں کہ ان کے اندر کی زیادہ چیزیں عمر میں ان پٹاریوں سے کم نہ ہوں گی۔ تھی بھی یہی بات: جب کچہری کے چوراہے کے قریب موٹے تنے والے نیم کے پیڑ کے نیچے وہ کندھے سے بہنگی اتار کر رکھتا اور آگے والی پٹاری کے اندر سے مٹی کی بھدی بھدی دو ہنڈیاں باہر نکالتا اور ان کے اوپر کا بندھا ہوا کپڑا تونبی بجا بجا کر کھولتا، تو ان میں سے نکلتے پھن پھیلائے ہوئے کالے بھیانک پرانے سانپ۔ تونبی کی آواز تیز ہونے لگتی اور کالے اپنا اپنا پھن اتنا پھیلا دیتے کہ ان پر جو کنچی کا نشان بنا ہوتا صاف دکھائی دینے لگتا۔ اتنا ہی نہیں، کبھی وہ ان کو گلے میں ڈال لیتا، کبھی بانہوں سے لپیٹ لیتا اور ان سے نہ جانے کیسے کیسے اشارے کرتا۔ تماشہ ختم کرتے کرتے سب سے پرانے کالے ناگ کو چمکار کر کہتا "لچھمن راج، بھیا، جاؤ، مالک لوگ، مائی لوگ، بابا لوگ سے انعام لے لو۔" اپنی مزدوری کے حقوق پیش کرنے کا یہ بظاہر بہت ہی سیدھا اور رائج طریقہ تھا، مگر اصلی مطلب یہ تھا کہ لچھمن راج تم نے اور تمہارے چند قیدی بھائیوں نے محنت کی ہے۔ ناچے ہو، اور اپنی عریانی کی نمائش کر کے اہلِ تماشہ کے لئے تفریح کا ذریعہ بنے ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ تم اس کی اُجرت و محنت نہ وصول کرو، اور اگر یہ بات ہے کہ تم تو ایک کیڑے ہو، تمہاری کیا اُجرت۔ تو میری تو ہے میرے دامن سے خالی مجھ نہیں بلکہ ایک اور ہستی بھی وابستہ ہے۔ اور اس وقت وہ خیال کرتا کہ کیا وہ ناگن جو اس کے پیچھے کی پٹاری کے اندر کی رنگین والی ہنڈیا میں بھربھری مٹی کی تہ پر سوئی ہے چوراہے کے اس پار ٹھنڈی سڑک کے کنارے رہنے والی حسین کنواریوں سے کسی حالت میں کم خوبصورت ہے۔ ناگن کا ملگجا رنگ، پھن کے پاس نیلی نیلی بوٹے دار دھاریاں۔ جیسے ندی کے کنارے نقشہ کھوا ہو۔ وہ یہ سوچ کر فخر سے گردن بلند کر لیتا اور تڑپ کر کہتا "دیر ہو رہی ہے۔ مالک لوگ، مائی لوگ، بابا لوگ، جو دینا ہو جلدی دو۔ دودھ لینا ہے، پلانا ہے، ناگن بھوک سے تلملا رہی ہے۔"

اور تب جلدی جلدی اس کے گرد انگوچھے پر گرنے لگتے، پائیاں، پیسے، ادھنے۔ اس طرح کچھ نہ کچھ ہر ایک دے ہی گذرتا۔ کوئی اس کی تونبی کا خیال کر کے، کوئی اس کے غضبناک سنجیدہ چہرہ کا، کوئی اس کی گھنی سیاہ ڈاڑھی کا، جو کہ اس کی صحیح عمر کا تخمینہ نہیں لگانے دیتی تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا، پیسہ دیتے وقت چند یار باش موقع تاڑتے رہتے اور یار لوگ کہہ بیٹھتے "بھائی، بیجو سائیں! کھڑے کھڑے تو گھٹنے درد کرنے لگے، محنت وصول ہو جائے اور پیسہ بھی۔" ان کے نزدیک گویا بیجو سائیں نے ابھی پورا حق نہیں ادا کیا۔ بیجو تھا کہ اتنا سنتے ہی جیسے تلملا سا اٹھتا۔ آنکھیں پھاڑ کر تونبی پٹاری کے پاس سے اٹھاتا اور ایسی پھونک پھونکتا ـــــــ خدا کی پناہ! قہر ہو جاتا، چہرہ پر خون دوڑ جاتا، مگر تونبی کی دھن تھی کہ سامعین کی رگ رگ میں پیوست ہوتی جاتی تھی، لوگ مبہوت، ساکت، بادلوں کی طرح کھڑے نظر آتے۔ بیجو دو چار سُر بیٹھے بیٹھے بجا کر کھڑا ہو جاتا۔ پھر کیا کہنا، یہ عالم عجیب ہوتا۔ تونبی کی آواز بہ درد ہوتی، سامعین کی پلکیں نم آلود ہو جاتیں۔ شاید ہر ایک کو اپنے بیتے ہوئے دنوں کے تلخ تجربے یاد آ جاتے!

تھے بیجو سائیں۔ کوئی بھی سائیں قرب و جوار میں اتنی محبت سے تماشہ نہ کرتا تھا۔ ظاہر ہے اس انداز سے بیجو سائیں کا دن بھر میں صرف ایک تماشہ، صرف ایک بیٹھک ہوتی اور پھر وہ اپنی کمائی بٹور کر سیاہ رنگ کے ایک بٹوہ میں رکھ کر بہنگی اٹھا کر چلتا۔ کچھ ہمدرد لوگ اس کے چلتے چلتے کہہ اٹھتے، "ارے بیجو سائیں، کافی تو پا گئے ہو، دو چار پیسے کا کچھ لے کر پانی پی لو۔ ٹھیک دوپہریا میں آئے ہو، گھر پر تو کچھ پکا نہ رہا ہوگا، انتڑیاں سوکھ گئی ہوں گی۔" بیجو یہ سن کر نہایت سخت بننے کی کوشش کرتا اور بظاہر اسی تکلیف کا اظہار کرتا جیسے کوئی اس کے ذاتی معاملہ میں دخل دے رہا ہو، اور منہ بنا کر کہتا، "اوہو، یہ نہ ہوئی بابا۔ جس کی رقم ہے، اس کے ہاتھ میں جائے گی۔ متر بتیا ایک ایک کپا پیسہ گنتی ہے"!

متر بتیا بیجو سائیں کی بیوی تھی، اس کے کوئی اولاد نہیں تھی، متر بتیا کا نام لیتے ہی بیجو کے ڈھلے ہوئے بدن میں پھریری سی آ جاتی اور وہ مصمم ارادہ سے قدم اٹھا کر آگے بڑھتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ لڑکے کھیل دیکھ لیتے پیسہ پاس نہ ہوتا، گھر جاتے، ماؤں، بہنوں سے ضد کرتے۔ حجت کرتے، پیسہ ملنے میں دیر ہو جاتی۔ جلدی جلدی دوڑ کر راستہ میں بیجو کے پاس سے گذر کر کہتے، "بیجو بابا یہ لو"۔ بیجو اپنا قدم نہ روکتا اور چلتے چلتے کہہ دیتا، "راجہ لوگ، یہ مجھ سے نہ ہو وے گی۔ میں خیرات نہیں لیتا، جب تماشہ تمہارا تب تھا، اس وقت جو دے دیتے لے لیتا اب پھر کبھی تماشہ دیکھ لینا دے دینا۔ لے لوں گا"!

اس وقت بیجو کے منہ سے ایمانداری کا سبق سن کر لڑکے سوچ میں پڑ جاتے۔

## (۲)

شہر سے ہٹ کر جہاں آبادی ختم ہوتی تھی، ڈھاک، ببول اور روس کا جنگل شروع ہوتا تھا۔ سڑک پر سے نگاہ ڈالنے سے چند سرکی کے سائبان تنے ہوئے پیڑوں کے بیچ میں سے دکھائی دیتے تھے۔ یہ تھی نقیروں، سائیوں، خانہ بدوشوں کی چلتی پھرتی بستی۔ ان لوگوں میں سے کوئی سل

کوٹتا، چکی کا پاٹ بناتا، کوئی ریچھ اور بندر کا ناچ دکھاتا، کوئی جڑی بوٹیاں کھود کر نکالتا اور بیچتا، کوئی پرانے مینڈکوں کے گلے سے زہر مہرہ نکالتا، کوئی کان کی بیماریاں اچھی کرتا، کوئی سینگی لگاتا۔ غرضیکہ ان خانہ بدوشوں کے ہر فرد کا ایک الگ پیشہ تھا۔ دن بھر یہ بستیاں اجاڑ رہتیں اور شام کو یکایک ان میں زندگی پھوٹ پڑتی۔ چولہے جل جاتے اور جنگلی لکڑیوں کے کوئلے کی آنچ میں موٹی موٹی روٹیاں سینکی جانے لگتیں۔ خاص خاص تیوہاروں کے دن بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو بھی ان عارضی آبادیوں سے اٹھ کر ہوا میں پھیل جاتی۔ یہاں دس بارہ ایسے خانہ بدوش لوگوں کا خاندان آباد تھا جس میں سے بیجو سائیں کہنے کے لئے ان سب میں پرانے تھے۔ سب سے پہلے بیجو یہاں آکر مقیم ہوا تھا کیونکہ شربتیا، بیجو کی بیوی کو یہ مقام کچھ پسند آگیا تھا اور بیجو جب کبھی دوسرے خطے، نگر بستی کی طرف نکل چلنے کے لئے کہتا تو شربتیا جھنجھلا کر کہتی "جنم بھر ادھر ادھر گھومو گے کہ کہیں ٹھہر کر دم بھی لوگے" بیجو یہ سن کر چپ ہو جاتا اور اس جنگل کو اپنی میراث سمجھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ بیجو نے یہاں کے پانچ چھ مہینے کے متواتر قیام میں جنگل کی ایک ایک بیل دیکھ ڈالی تھی اور یہاں کی اگنے والی ایک ایک جڑی بوٹی سے اپنے کو واقف کر لیا تھا۔ بیجو کے پاس سانپ کے کاٹے کی متعدد جڑی بوٹیاں تھیں۔ اور شربتیا کا کیا کہنا، وہ اپنے کو اس بن کی رانی سمجھتی تھی، اس جنگل کے تنومند ساکھو کے پیڑوں کی چھاؤں میں اس کے شانے دن بدن سڈول ہو رہے تھے جنگل کی مدماتی ہوائیں اس کے روپ اور جوانی میں نشہ بھر رہی تھیں۔ اس کا افلاس خانہ بدوشی اور غربت کی منزلوں کو طے کر کے فارغ البالی کی سنہری وادیوں میں قدم رکھ رہا تھا۔ اب اس کا مزاج آرام طلب ہونے لگا تھا۔

(۳)

اب بیجو کو قصے کہانیاں بھی سوجھنے لگی تھیں۔ دن بھر کا تھکا ماندہ جب کھانے پر بیٹھتا تو شربتیا کو راستے کی سنی ہوئی خبریں سناتا۔ جوئے میں کون کون لوگ پکڑے گئے، شہر کے کوتوال کمشنر بہادر کے یہاں کھانا کھانے گئے تھے۔ ناکہ کے سامنے خون۔ بھرے بازار میں ایک گوالن عورت پتھر والی حویلی کے کنوئیں میں گر پڑی۔ شربتیا اس پر تعجب کے ساتھ پوچھتی، کیا وہ اندھی تھی؟ اٹھایا ہوا نوالہ بیجو کے ہاتھ میں رہ جاتا اور کہتا "وہ تو نہیں اندھی تھی، پریم اندھا تھا" یہ کہہ کر بیجو نوالہ حلق کے نیچے اتار کر شربتیا کی شربتی آنکھیں دیکھنے لگتا، کچھ سوچتا اور من ہی من میں دہراتا "پریم اندھا ہوتا ہے"۔ اسی درمیان میں اس کی انگلیاں سینی میں جنگلی آموں کی چٹنی پر پڑ جاتیں۔ چٹنی زبان سے لگتی اور بیجو شربتیا کی شخصیت کا دل ہی دل میں جائزہ لیتا کہ یہ عورت اتنی تیز چٹنی بنا سکتی ہے جو تھکے تھکائے جسم میں دوا والی سوئی کا کام کرتی ہے۔ بیجو چٹنی چاٹتے ہوئے جلدی جلدی کھانے لگتا۔ اتنے میں شربتیا الھڑ طریقہ سے بھوں سکوڑ کر کہتی "پریم اندھا ہوتا ہے، ہاں مجھ سے کوئی کہے کہ میں کنوئیں میں کود پڑوں۔ ارے ہی ایسی۔

کہنے والے کے سینہ پر ایسا پتھر رکھ دوں کہ سانس نہ آئے۔ بڑے چلے ہیں" بیجو اتنی دیر میں کھا چکتا اور شربتیا کی باتیں سن کر پانی سے بھرا لوٹا منہ سے لگا لیتا۔ شربتیا یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگتی اور موضوع بدلنے کے لئے کہتی "آج تم بڑا بول کر رہے ہو، کتنے دن سے رٹ رہی ہوں کہ کنول کا پھول نہیں ہوتی تھی۔ جیسے آنا کبھی ہو، تماشہ لگا کے بازار سے بھوت کی طرح بھاگ گئے ہو۔ بیٹھتے ہو پٹوں میں تمہیں پانی والے کو ابھی دلہن رجیا کے نئے وسترے آنا ہے۔ تو بھی تو نہ باقی رہی اب آنکھوں کی روشنی بڑھ جائے گی۔ نہ کبھی پڑھی اور جیا کی آنکھوں پر یہ منہ سے چلے گا۔" بیجو کو اس وقت یہ یاد آئی ہوئی اس جنگلی جوان لڑکی کا چہرہ یاد آجاتا جو اس کے تماشہ کو کل بڑے شوق سے دیکھ رہی تھی۔ کیسی اچھی لڑکی تھی وہ۔ اس نے بیجو کو ایک دو نئی کہانی کی کڑی تھی۔ بیجو سا ما نگتا۔ اس کو اچھا بر ہے۔

(۴)

شربتیا کبھی کبھی دل بہلانے کے لئے جنگلی جھرمٹ سے نکل کر پاس والی سڑک پر جو کہ فوجی لاریوں کے چلنے کے لئے نئی نئی نکالی گئی تھی، آجاتی۔ موٹروں کی قطاریں کی قطاریں اس سڑک سے گزرتیں۔ وطن سے انجان جگہ چمکتے ہوئے، لڑائی زدہ فوجیوں کی طرف دور۔ سے شربتیا کے کنار جسم پر پڑتیں اور دھواں دھار غبار میں سب سے پیچھے والی لاری کی رفتار کم ہو جاتی۔ جب سنگھ ذرا گھور کر کہتا، گوری کو دیکھیں اکٹھا ہوا تھا۔ والی سنگھ کہتا "یہ جنگل کی ہرنی معلوم ہوتی ہے"، دیکھو نہ اس کی نشیلی آنکھیں! "فقیر سنگھ کہتا البتہ مجھے سب تجربہ ہے، انہیں رقم دو تو کچھ نہیں، ورنہ ان کی کمر میں تیز چاقو تیار رہتا ہے۔ کسی سے چھیڑ نہیں کہ انھوں نے وار کیا۔ اور یہ فوراً ہی شور مچاتی بھاگتی ہیں، ارے لالا، ارے لالا۔ جان کی جان لیتی ہیں اور ایک جھٹ الگ کھڑی کر دیتی ہیں۔ آج تک مجھے بیاکوٹ کا واقعہ بھولا نہیں"۔ کومل سنگھ، بگڑ کر کہتا "بہت دیکھا ہے ہم نے، ارے کو ذرا دو دو بات تو کر لیں۔ پیاس بھی تو لگی ہے"۔ موٹر رک جاتی، کومل سنگھ اترتے اور ایسا منہ بناتے کہ گویا کئی دنوں کے پیاسے ہیں۔ شربتیا کے قریب گزر کر پوچھتے "اری، کہیں کوئی کنواں بھی ہے، چلتے چلتے تو یہ حال ہو گیا ہے"۔ شربتیا جیسے سنی ان سنی کر دیتی۔ کومل سنگھ تب آواز بھاری بنا کر پوچھتے، کہاں ہے کنواں، پیاس کے مارے دم نکل رہا ہے، تھیلی کا پانی تو ابل رہا ہے"۔ شربتیا مسکرا کر کہتی "سڑک تو بنوا دیتی ہے تمہاری سرکار، کنوئیں کا انتظام نہیں کرتی! آئے ہیں ٹھنڈا پانی پینے۔ جس کے لئے جان دیتے ہو مانگو نہ اس سے ٹھنڈا پانی"۔ یہ کہتے کہتے اس کی نگاہ فقیر سنگھ کی بندوق پر پڑتی اور وہ سنبھل سی جاتی "سپاہی ہو۔ آؤ۔ آؤ پانی پی لو۔ بڑی گرمی ہے سچ مچ!" اور جنگل کی پگڈنڈیوں کی طرف اشارہ کر کے بڑھتی۔ کومل سنگھ ساتھیوں سے درخواست کرتے، "بھائی جان، واقعی بہت پیاس لگی ہے ورنہ کیا اس کے پیچھے دوڑتے۔ لاؤ تھیلی، تمہارے لئے بھی ٹھنڈا پانی بھر کر لیتا آؤں"۔ فقیر سنگھ کہتا "جلدی"۔ کومل سنگھ پیچھے مڑ کر جواب دیتا "ارے، ابھی ابھی"۔

(۵)

ایک دن بیجو کو شہر سے آنے میں دیر ہوئی۔ اس دن کچہری میں کسانوں کی بھیڑ لگی تھی۔ پانی بہت برس گیا تھا، ان کی دھان کی فصل سڑ گئی تھی۔ کسان دھان کی پٹریاں لے کر ڈپٹی کمشنر صاحب کو دکھلانے آئے تھے کہ شاید اس سے لگان میں کچھ معافی ہو جائے۔ کسان لوگ کچہری سے لوٹ رہے تھے کہ بیجو کی نوبنی کی دلکش آواز کانوں میں آئی، مجمع کا مجمع ادھر رجوع ہو گیا۔ منسکھ چودھری نے کہا "بھیا، کھیتی تو ناس ہو گئی، جو ہونا تھا ہو چکا۔ گھڑے گھڑے سائیں کا بھی تماشہ دیکھ لیں۔" اور اس طرح آج بیجو کو پانچ چھ روپے کے پیسے مل گئے، دل مالا مال تھا، سوچ رہے تھے کہ شرتیبا کی تقدیر سے ملے۔ چلو، بازار ہوتے چلیں۔ بازار میں جا کر شرتیبا کے لئے کنول کی پھول والی ٹکلی لی۔ پھر تھوڑا سا اونی رنگ کا سیندور۔ شرتیبا کی کالی کالی لٹوں کا خیال کر کے ایک چوٹی بھی لی۔ چوٹی لیتے وقت جنگل کے سبزہ زاروں کی فضا دماغ کے سامنے ناچ گئی، چوٹی سبز رنگ کی لی۔ یہ لے کر گذر رہے تھے کہ بکر قصاب کی دوکان سامنے ملی، تازہ گوشت ہوا تھا ایک کلیجی لی اور پھر دو تین سیاہ رنگ کی ہنڈیاں۔ آج بیجو واقعی بہت خوش تھا۔ حلوائی کی دوکان سے گذرے تو پاؤ بھر دودھ خریدا۔ آج ناگن کو دودھ ضرور دینا ہوگا۔ پٹاری میں وہی لکشمی تو ساتھ تھی جس کی بدولت آج بیجو اتنے دھن کے مالک ہوئے، ورنہ ہیں تو اور بھی سائیں گلی گلی بھیک مانگتے ہیں۔ بیجو آج اپنے کو ایک بھاری وکیل سمجھ رہا تھا۔ اس نے بچپن میں سنا تھا کہ بھاری وکیل دن بھر میں صرف ایک مقدمہ کرتا ہے اور اسی میں اپنا سارا ہنر خرچ کر کے جیبیں بھر لیتا ہے۔ چراغ جل گئے تھے، بیجو تیزی سے قدم رکھتا ہوا سوچتا چلا جاتا تھا کہ آج شرتیبا کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ کچھ پوچھے گی تو بولوں گا نہیں۔ بہت طعنہ دیتی تھی کہ شمشیر بندریا والے اپنی دلہن کے لئے سرمہ لائے، سرمہ لگائے رجیا بڑھیا۔ شرتیبا باندھے گی چوٹی۔ چوٹی دھانی رنگ کی، پرماوالی بنگالی لڑکی کی طرح۔ اب بیجو شہر کے اونچے اونچے دو طرفہ مکانوں کو چھوڑ کر صاف سڑک پہ آ گیا تھا۔ چاندپوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پہ چمک رہا تھا۔ بیجو کو سڑک دور پہ دودھ کی نہر کی طرح بہتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اب وہ بہنگی رکھے ہوئے متوازن قدم رکھتا جا رہا تھا۔ جنگل کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کو لگ رہی تھی اور پگڈنڈی قریب آ گئی تھی۔ راستہ کا ہر موڑ دور سے چمک رہا تھا۔ دوسرے موڑ پر کنوئیں کی جگت کے پاس دو پرچھائیاں بیجو کو نظر آئیں۔ یہ بیجو کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس جنگل کے ہر منظر سے وہ روشناس ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا ضرور بالضرور ان دو پرچھائیوں میں سے ایک رجیا کی ہے۔ آنکھوں میں سرمہ تو انہیں راتوں کے لئے لگاتی ہے! اب بیجو کنوئیں کی جگت کے پاس سے گذر رہا تھا، پرچھائیاں ہٹ کر قریب جھاڑی کے جھرمٹ میں جا چکی تھیں۔ بیجو سوچ رہا تھا کہ جھاڑیوں کے پاس سے کترا کے گذر جائے گا مگر دماغ نے کہا نہیں، آج رجیا کی آنکھوں میں سرمہ کی بہار دیکھ لے۔ بیجو سے رہا نہ گیا، یکبارگی نگاہ سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ شرتیبا کی باہیں کومل سنگھ کے گلے میں تھیں اور کومل سنگھ کہہ رہا تھا۔ "تیری ہستی اس جنگل میں بند ہے"۔ بیجو کو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ گویا اس نے ٹکلی اور سیندور کے دام تو دے دئے ہیں مگر وہ ان چیزوں کو دوکان ہی پر بھول آیا ہے۔ اب وہ الٹے پاؤں جا رہا تھا۔ ایک نامعلوم منزل کی طرف۔ چلتے چلتے یکایک خیال آیا، ناگن بہت دیر سے بھوکی ہے۔ بہنگی زمین پہ اتار کر بیجو بیٹھ گیا۔ ہنڈیا میں سے دودھ نکال کر پیالہ میں ڈالا۔ پھر پیچھے کی پٹاری سے ناگن والی ہنڈیا کھولی۔ ہنڈیا کھولتے ہی بیجو کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی ہے۔ ناگن غائب تھی اور اس ہنڈیا میں صرف ایک کیچلی پڑی تھی۔ دودھ کا پیالہ بیجو کے ہاتھ میں ویسا کا ویسا ہی رہ گیا۔

## "بیوہ" — رعنا اکبرآبادی

ادھ کھلا اک پھول مرجھایا ہوا — چودھویں کا چاند گہنایا ہوا
آرزوؤں پر بلا آئی ہوئی — زندگی پر مردنی چھائی ہوئی
منہ چھپائے غم کے دامن میں شباب — چہرۂ روشن پہ حسرت کا نقاب
ضبط کی صورت گریٔ کردار میں — درد کی واماندگی رفتار میں
سرنگوں بیدردیٔ تقدیر سے — رنگ سا اڑتا ہوا تصویر سے
شوق کے تیور پہ بل آئے ہوئے — ولولے دنیا سے شرمائے ہوئے
قوتیں ناز و ادا کی راز میں — دل کی دھڑکن ماتمی انداز میں
ہر لطافت زیست کی سوئی ہوئی — فتنہ پرور آنکھ پر روئی ہوئی
ہر قدم پہ اک سماجی اشتباہ — آہ سے ملتی ہوئی اک اک نگاہ
عشرت آسودہ حالی کی حریف — بارِ غم سے مضمحل صنفِ لطیف

"چلتی پھرتی لاش اک انسان کی"
"یعنی بیوہ ارضِ ہندوستان کی"

نوٹ: رسالہ "آجکل" میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ علمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کریں۔
ریویو کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے ورنہ ان پر کسی قسم کی رائے قلم بند نہیں کی جائے گی۔ ——— (ادارہ)

# گجراتی میں نئے ادبی رجحانات

اکرام حسین خاں

شکست خوردگی، روحانیت، قنوطیت، واقعیت، رجائیت، ان سب مراحل سے ادب اور آرٹ گذرا ہے اور اس وقت بھی گذر رہا ہے۔ ان کانٹوں سے، صرف اردو ادب اور آرٹ کا ہی شکار نہیں کھیلا گیا ہے۔ بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی انھیں کانٹوں سے ادبی مچھلیوں کا شکار کھیلا جا رہا ہے اور کھیلا جا چکا ہے۔ آجکل ملک کے ہر گوشہ اور ہندوستانی زبان کے ہر شعبہ میں ترقی پسندی اور رجعت پسندی کی نئی آویزش، اور نیا تصور کارفرما ہے۔ گجراتی میں بھی یہ نیا تصور اپنا رنگ لا رہا ہے۔

ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور چونکہ زندگی کا ہر لمحہ گریزپا، ہر لمحہ انقلاب انگیز ہے۔ اس لئے کوئی ادب کو منجمد، ساکن یا ٹھہرا ہوا نہیں مان سکتا۔ ادب زندگی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اور اس بھاگتی ہوئی زندگی کا ہر وہ نقش جو ابھر کر نمایاں ہوتا ہے۔ ادب کا وسیع دامن اسے اپنا کر اور بھی واضح کر دیتا ہے۔ اور یہی وہ "ربطِ خاص" ہے جو ادب اور زندگی دونوں میں نت نئی تازگی و توانائی سمو دیتا ہے۔ انھیں وجوہات کی بنا پر میتھیو آرنلڈ کے نزدیک ادب "تنقید حیات" ہے۔ اور جدید گجراتی ادب میں اس کی کارفرمائیاں ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن ادب کا یہ تصور گجراتی شاعری اور افسانوی ادب پر زیادہ اثر انداز ہوا ہے۔ ناول اور ادبی تنقیدات نے بھی اس ضمن میں ترقی کی، لیکن نئی زندگی کے نئے تقاضوں کو جس خوش اسلوبی سے شاعری اور افسانوی ادب نے انجام دیا، ناول اور تنقید اس کی متحمل نہ ہو سکی۔

جدید گجراتی ادب نے ستائے ہوئے عوام، سلگتے شوق، پگھلتے دلوں، جلتی امنگوں، رستے اور دکھتے ہوئے سرمایہ دارانہ ماحول کی پیدا کردہ "برکتوں" سے جنم لیا ہے۔ اس انقلاب کی دبی دبی سی چنگاریاں سنہ ۱۷ء کے گجراتی شاعر آکھا کے یہاں بھی معمولی سی کوشش سے کرید کرید کر نکالی جا سکتی ہیں۔

لیکن اب سنہ ۱۷ء کے فلسفی شاعر کی روحانی دنیا، "تصور" سرحد ادراک سے پرے ہو کر دھندلا اور مبہم ہو چکا ہے۔ اور اس کی جگہ مادی "مسجود" اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ جلوہ فگن ہے، دیا رام کی دین دارانہ موسیقی بھی سرد پڑ چکی۔ اب تو انیسویں صدی کے شاعر نرماد کی ترنم ریزیوں سے عوام کے دلوں کے تار نئی زندگی، نئے کشف اور نئی فکر سے بھرپور جھنجھنا رہے ہیں۔

اس نئے سیلاب کو روکنے کے لئے گجرات میں ایک نیا ادبی گروہ پیدا ہوا۔ اس گروہ نے مغربی تہذیب و تمدن کے زیر اثر بڑھتے ہوئے خیالات و تصورات کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ لیکن جیسا اردو اور ہندی میں ہوا ہے بالکل ویسا ہی گجراتی ادب اور آرٹ میں ہوا۔ نئے گجرات کے نئے ادیبوں نے ان کے پرانے بتوں کو ذرا بھی عقیدت کی نظر سے نہ دیکھا، یہی نہیں، بلکہ ان پرانے بتوں کو توڑ پھوڑ کر نئے "دیوتا" تراشے۔ جن کے خد و خال مغربی بے راہ روی کے ترشے تراشے مظہر ثابت ہوئے۔ نئی قدروں اور نئے زاویوں کی تلاش میں انھوں نے پرانی قدروں میں "جھلکتے ہوئے حسین و دلآویز خطوط" کو بھی مٹا دیا۔ انگریزی تعلیم اس قدر قوت اور زور کے ساتھ آگے بڑھی کہ اس نے گجرات کی تمام قدیم اور مقامی روایات کو ادب اور زندگی کے دائرے سے نکال دیا۔ سماجی رسم و رواج کا مضحکہ اڑایا گیا۔ اور گجرات کو "مغرب کا پیرایہ پوش" بنانے کی بلیغ کوشش کی گئی۔ بہرکیف یہ ادبی زندگی کا بحرانی دور تھا اور ہر جگہ بحرانی دور میں اسی قسم کی کمزور اور ناپائیدار تحریکیں ظہور میں آئیں اور فنا ہو گئیں۔ گجرات میں بھی کم و بیش ایسا ہی ہوا۔

اس تحریک کا گجراتی ادب اور آرٹ پر صرف اتنا اثر ہوا کہ انگریزی کے اتصال نے گجراتی شاعری، ڈراما اور افسانوں کو فطری اور نیچرل مضامین سے روشناس کرا دیا۔ جس نے آئندہ چل کر کافی ترقی کی اور گجراتی کے فطری شاعروں میں ورڈز ورتھ کا فطری تمتع اور شیلی اور کیٹس کی نظر پیدا کی۔ گجراتی ادب کا یہ دور حالی، آزاد اور سر سید کے دور سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ اور جس طرح ان کی ادبی کاوشیں اور کاہشیں سطحی، کمزور اور سرسری تھیں۔ اسی طرح، اس دور کے گجراتی ادیب بھی زیادہ تر کمزور اور سطحی ثابت ہوئے۔ اور ان ادیبوں کا گجراتی ادب اور آرٹ پر صرف اتنا ہی اثر ہوا کہ انھوں نے گجراتی ادب اور آنے والے گجراتی ادیب کے فکری رجحان کو بدل دیا اور بہت جلد اس نام نہاد انقلابی دور کی جگہ اعتدال پسندوں نے لے لی۔ ان ادیبوں نے گجرات کی بے پناہ وسعتوں سے ملکی اور مقامی عناصر کو سمیٹ سمیٹ کر مغربی نظریات کے ساتھ اس طرح سمویا کہ ان کے ادبی کارناموں میں ہندوستانی جگنوؤں کی چمک پیدا ہو گئی۔ ان ادیبوں کے مسائل خالص ہندوستانی مسائل تھے۔ مثلاً "بیوہ کی زبوں حالی"، "عقد بکر"، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان ادیبوں نے ان ہندوستانی مسائل کو نئے زاویوں اور نئی کسوٹی پر پرکھا۔ اور ایک نئے اور انوکھے انداز میں پیش کیا۔ ان کے ادب اور شاعری نے گجرات کے "حسین کھیت"۔ حسین کھیتوں کو حسین و جوان کنواریوں سے سجا دیا۔ یہی نہیں، بلکہ ان کنواریوں کی مخصوص نفسیات کو اپنے مخصوص نفسیاتی رنگ میں تحلیل بھی کیا۔ اور ان کے جوان سینوں میں سوئے ہوئے مگر بیدار جذبات محبت کو افلاطونی رنگ میں پیش کیا۔ (بالکل یہی، ہندی میں پنت اور بچن نے بھی اپنی ابتدائی شاعری میں کیا۔) مگر بہت جلد اس کی جگہ محبت کے جنسی نظریات نے لے لی۔ اور محبت کو فرائڈ، ہیولوک ایلس

موپاسان، فلابیر، ڈی۔ ایچ۔ لارنس، جیمس جوئس کے فکر کی روشنی میں دیکھا جانے لگا۔

ماضی کے اس احساس لطیف نے ان اعتدال پسندوں سے "کھانڈ کاؤیہ" بیانیہ اور گیتوں کے رنگ میں نہایت عتیق کی عظمتوں پر نظمیں لکھوالیں۔ ان نظموں میں رامائن، مہابھارت، کرشن اور رادھا، رام اور سیتا کے علاوہ ہندوستانی اولوالعزم حکمرانوں کی سطوت و شوکت، دلیری اور بہادری، حب الوطنی اور رعایا پروری کی داستانیں بھی موجود ہیں۔ "سرستوتی چندر" اسی زمانے کی کتاب، قابل قدر ادبی کارنامہ ہے۔ اس میں قدیم آریائی اور جدید مغربی تمدن کو اس طرح سمویا ہے کہ یہ پرانی حکایت نئے دور اور نئی روشنی کے پڑھنے والوں کے لئے ایک نئی سی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ اور نئے دور کے پڑھنے والے کو اس کی موضوعاتی ثقالت کا مطلق احساس نہیں ہوتا۔

اس زمانے کی ادبی تحریرات میں مذہبی عقیدت کیشی کا رچاؤ نمایاں امتیازی خصوصیت ہے۔ اور پنڈت کا دور، اسی لئے بھگتی دور سے موسوم کیا جاتا ہے۔ "گوورد ھا نوم" کا دور گجرات کی قدیم تہذیب و تمدن کو محفوظ و برقرار رکھنے کے لئے مشہور اور نیک نام ہے۔ ان خیالات و احساسات کی روشنی میں، ہم گجراتی ادب کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:-

(۱) ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۲ء تک۔

(۲) ۱۸۷۲ء سے ۱۹۱۵ء تک۔

(۳) ۱۹۱۵ء سے موجودہ زمانے تک۔

اس سی سالہ زندگی میں گجراتی ادب اور آرٹ نے جو اہم منزلیں طے کی ہیں۔ ان کا پس منظر یا عقبی فضا سمجھنے کے لئے، گجرات کی سی سالہ چلتی پھرتی زندگی نت نئے بدلتے ہوئے سیاسی، شعوری، فکری، معاشی، سماجی اور اقتصادی تحریکات کا سمجھنا از بس ضروری ہے۔ گاندھی واد کی ابتدا اور بورژوا جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ۔ پھر اجتماعیت، اشتراکیت، طبقاتی شعور، گرے ہوئے فلاکت زدہ، بے چارہ و مجبور عوام کے ساتھ خلوص اور ہمدردی کا اظہار، اس زمانے کی ادبیات کے خاص عنصر ہیں۔ "گوورد ھا نوم" دور کے ادیب اپنی سنسکرت اور انگریزی استطاعت کی اپنی ادبیات میں نمائش کرتے تھے۔ برخلاف اس کے، اس دور کے ادیب بلند خیالات اور وقیع جذبات کو بھی سادگی اور صفائی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اس زمانے کے ادیب سادگی و پرکاری کے قائل ہیں۔ وہ سادگی و پرکاری جو ہمیں انگریزی میں سیسل ڈی لیوس ڈبلیو ڈبلیو گبسن، اردو میں اختر انصاری، عسکری اور عصمت، ہندی میں نرین درشرما، اور نرنکار دیو سیوک، بنگالی میں بدھ دیو کے یہاں ملتی ہے۔

ہر شاعر، فلسفی اور ادیب اپنے ماحول سے جنم لیتا ہے۔ باکلوتیش بھی اپنے ماحول کا زائیدہ تھا۔ اس نے اپنے ذہن و فہم کی پوری صلاحیتوں کے ساتھ اپنے ماحول کی تلخی کا جائزہ لیا۔ اور بہت جلد اس نے دیکھ لیا کہ وہ جس زندگی اور جس زمانہ میں سانس لے رہا ہے وہ یاس و ناامیدی، قنوطیت اور شکست خوردگی کے گہرے دھندلکوں سے گدلی ہو رہی ہے۔ اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس نے ان دھندلکوں کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ اور اپنی مسلسل تلخ نوائی سے قنوطیت، یاس اور شکست خوردگی کے اس گہرے دھندلکے کے دامن کو چاک کر کے ایک نئے دور بیداری کے آغاز کا اعلان کیا۔ اس نے بوسیدہ نظام کی چیرہ دستیوں سے الجھ کر اس نئے ذہنی انقلاب کو اور زیادہ قوی بنا دیا۔

واقعیت پسند باکلوتیش کے بعد کنھیا لال مانک لال منشی کو ناول اور ڈرامے کے میدان میں ایک ادبی فن کار کی حیثیت سے بہت وقیع درجہ حاصل ہے۔ شاعری کے میدان میں نانالال دلپت رام کا کوئی مد مقابل نہیں۔ نانا نے حتی المقدور، اس دور کے نوجوان ادیبوں کے برخلاف، اس زمانے کی کسی نئی چیز کو قبول نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی اسلوب کے تیور کی وجہ سے ہم اسے جدید شاعری کا علمبردار مانتے ہیں۔ حالانکہ وہ نئی زندگی اور اس کی بدلتی ہوئی قدروں میں بحران و ہیجان سے مطلق آگاہ نہیں۔ اسی وجہ اس میں رجعت اور فرار کی کیفیات زیادہ موجود ہیں۔

نوجوان ادیب موجودہ ہندوستان، خصوصاً گجرات، اس کے تمدن، اس کی تہذیب، اس کی تبدیلیوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ بھوک سے بلکتے ہوئے بچے، پھٹے اور پرانے ملبوس میں لپٹی ہوئی زندہ لاشیں، فٹ پاتھ پر سسکتے ہوئے ناداروں، سرمایہ و محنت کی کشمکش، استبداد، رنگ و خون، تمیز بندہ و آقا، جگمگاتی ہوئی سڑکوں پر مصروف خرام دیویاں، ان کے مہین و باریک جھلکتے ہوئے ملبوس، دیکھ کر اس میں جمالیاتی اور انقلابی احساس کا ایک نیا تصور پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہی جمالیاتی اور انقلابی احساس اور نیا تصور انھیں فرار اور رجائیت سے بچائے ہوئے ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کو نئے رنگ میں دیکھتے ہیں۔ بحران کے نزدیک تھکے ہوئے دل کے لئے سامان نشاط ہی نہیں، اس میں تباہ کن اور مہلک اثرات بھی پوشیدہ ہیں۔ وہ ایسے خدا کے خلاف نہیں جو عوام کی تکالیف کا کوئی اثر نہیں لیتا۔ اس کا وہ یوں اظہار کرتے ہیں:-

"مندر کی حسین چہار دیواری میں، پتھر کے سجے سجائے دیوتا پر
نغموں کی بارش ہو رہی ہے۔
اسی مندر کی چہار دیواری کے پیچھے ایک بڑھیا دم توڑ رہی ہے!
کیا یہ مرمر کا دیوتا،
اس بکھرتی ہوئی نغموں کی شیرینی میں،
اس کی درد بھری آواز سن رہا ہے۔؟
نہیں —"

(باقی صفحہ ۹۲ پر)

# مرد

افسانہ

مصنفہ
محمود کامل

مترجمہ
صلاح الدین قریشی

آپ کیا بھوت پریت کے قائل ہیں؟
عباس بک ادہم جب حسب معمول اپنے پرانے دوست مصطفیٰ پاشا عبداللہ سے ملنے گئے تو پہلی بات ان کے منہ سے یہی نکلی۔
مصطفیٰ پاشا اس عجیب غیر متوقع سوال سے بوکھلا اٹھے اور کہنے لگے:
آخر آپ مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟
بات یہ ہے کہ مجھے آج راستے میں ایک ایسے شخص کی روح نظر آئی ہو جسے میں خوب جانتا ہوں اور آپ مجھ سے بھی زیادہ اس سے واقف ہیں۔ اس شخص کو مرے ہوئے پورا ایک سال گزر چکا ہے۔ جب میں موٹر میں شارع عماد الدین سے چلا آرہا تھا اس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ٹریفک کے سپاہی نے مجھے چوراہے پر روک رکھا تھا اچانک میرے سامنے سے سبز رنگ کی ایک بڑی سی موٹر گزری۔ یہ اسی انگریزی کمپنی کی بس تھی جس نے حال میں نئی گاڑیاں جاری کی ہیں۔ اسے وہی شخص چلا رہا تھا جسے ہم ایک سال سے مرا ہوا سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ وہ گہرے زرد رنگ کی وردی پہنے ہوئے تھا لیکن پھر بھی مجھے پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میری چیخ نکلنے والی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اتر کر اس سے ملوں، لیکن وہ بس بجلی کی سی سرعت سے مع تمام مسافروں کے میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ آپ سمجھے یہ شخص کون تھا؟
نہیں! میری سمجھ میں نہیں آیا۔
یہ آپ کا لڑکا منیب تھا!
اپنے دوست کا جواب سنتے ہی مصطفیٰ پاشا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ تعجب سے وہ بڑبڑانے لگے:
میرا لڑکا؟ ... منیب، میرا بیٹا؟
عباس بک اور قریب آگئے اور ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر سر ہلاتے ہوئے ذرا طعنہ آمیز لہجے میں کہنے لگے:
جی ہاں! آپ کا لڑکا منیب، مصطفیٰ پاشا! وہی لڑکا جس کے متعلق سوڈان سے کوئی اطلاع نہ ملنے کے بعد آپ سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ مر چکا ہے۔ وہی لڑکا جس کی آپ نے بڑی چھان بین کر کے مجھے یقین دلایا تھا کہ واقعی وہ مر چکا ہے اور مجھے اجازت دے دی تھی کہ میں اپنی لڑکی قاسمہ کی شادی جہاں چاہوں کر دوں اس لئے کہ اب اس کا منگیتر اس دنیا میں نہیں ہے!
لیکن آپ کو یہ یقین کیسے ہوا کہ وہ منیب ہی تھا؟
میں اسی وقت کمپنی کے دفتر گیا اور وہاں دریافت کیا کہ ان کے ہاں کوئی منیب مصطفیٰ نامی شخص ملازم ہے؟ رجسٹر وغیرہ دیکھ کر مجھے بتایا گیا کہ اس نام کا ایک شخص ابھی حال میں ڈرائیور کی پوسٹ پر رکھا گیا ہے اور اسے پندرہ گنی ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ انھوں نے مجھے اس کا پتہ بھی دیا ہے ....
یہ سن کر مصطفیٰ پاشا نے سر اٹھایا۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے دوست کے قریب آئے اور پوچھنے لگے:
آپ نے آخر پتہ کیوں حاصل کیا؟
آپ کو دینے کے لئے۔
میں اس کا کیا بناؤں گا؟
آپ اس سے ملنے کے لئے جائیں گے .... اپنے لڑکے سے ملاقات کرنے کیلئے۔
وہ میرا لڑکا نہیں ہے اور نہ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ گزشتہ سال مر چکا اور میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ مجھے اس لعنت سے نجات مل گئی۔ اب میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ وہ دوبارہ زندہ ہو کر میری زندگی حرام کر دے .... جو تکلیفیں اب تک مجھے اس سے پہنچ چکی ہیں بہت کافی ہیں۔"
آخر اس نے کیا بگاڑا ہے آپ کا جو آپ ایسا خوفناک انتقام لے رہے ہیں، جس میں باپ کی محبت کا شائبہ تک نہیں ہے؟
آپ خوب جانتے ہیں اس کے کرتوتوں کو .... آپ کو خوب معلوم ہے میں نے اس کی تعلیم و تربیت پر پانی کی طرح روپیہ بہایا لیکن اس نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ اس کے لئے میں نے گھر پر استاد کا انتظام کیا اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ وہ برابر ہر امتحان میں فیل ہوتا رہا۔ آخر ایک دن مجھے اس کا راز معلوم ہوا۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ آوارہ زندگی گذارتا ہے۔ راتیں شہر کے گندے اور ذلیل ترین بازاروں میں کاٹا کرتا ہے۔ شراب کا رسیا ہے اور اس کا نشہ کبھی نہیں اترتا۔ میں نے مایوس ہو کر تعلیم کا سلسلہ ختم کیا اور اسے گاؤں روانہ کر دیا تاکہ زمینداری کا کام سنبھال لے۔ خیال تھا کہ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں وہ میرا ہاتھ بٹائے گا اور میری جگہ کام کرے گا۔ میں نے جو اس پر بھروسہ کیا تھا اس نے اس کی بھی کچھ پروا نہیں کی اور کاشتکاروں سے جو رقم ملتی رہی اسے اڑاتا رہا۔ یہی نہیں وہ ہمیشہ قاہرہ سے پیشہ ور عورتوں کو وہیں گاؤں میں بلا لیتا تھا اور خوب گلچھرے اڑاتا تھا۔ یہاں اسی طرح شراب پی کر اور عیاشی کر کے ساری ساری رات گذار دیتا تھا۔ آخر ایک دن وہ حادثہ رونما ہوا جس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا اور میری عزت دو کوڑی کی کر دی۔
ہاں! ہاں! وہ گولی چلنے کا حادثہ؟
جی ہاں! .... کیا آپ اسے معمولی حادثہ سمجھتے ہیں عباس بک! کیا آپ کو نہیں معلوم کہ میں نے اس نالائق لڑکے کو بچانے کے خیال سے اپنی عزت نیلام کر دی؟ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ وہ دن کو تین بجے گاؤں سے موٹر میں روانہ ہوا۔ اس وقت اس نے شراب پی رکھی تھی۔ دو گھنٹے بعد وہ قاہرہ پہنچا۔ راستے میں بھی وہ شراب پیتا رہا، چونکہ شراب کی خالی بوتلیں موٹر میں موجود تھیں۔ اس کے بعد وہ نشے میں جھومتا اڈے کی طرف چلا۔ اپنی محبوبہ کو بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ دیکھ کر اس نے پستول سے

فائر کیا اور گولی اس کی کلائی پر لگی .... یہ تمام باتیں رپورٹ میں میرے نام کے ساتھ درج کی گئیں۔ آخر میں نے اپنی جان پر کھیل کر اسے جیل خانے سے بچایا، اور اس نے بڑی موٹی موٹی قسمیں کھا کر مجھے یقین دلایا کہ آئندہ کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا.... لیکن یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا.... اس نے پھر شراب شروع کر دی..... اُف! مجھے اب بھی جب اس رات کا خیال آتا ہے کانپ اٹھتا ہوں"

عباس بک کے دوست کے سینے میں جو طوفان امنڈ رہا تھا وہ خود بھی اسے محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مصطفیٰ پاشا کی کمر کو تھپکتے ہو کہا:

"ہاں! ہاں!! مجھے بھی خوب یاد ہے۔ اس دن میں قاسمہ کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ میرے سامنے ہی وہ لڑکھڑاتا ہوا گھر میں آیا تھا اور اس کے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی۔ مجھے اس کا شرمناک جواب بھی یاد ہے جو اس نے آپ کو دیا تھا اس نے کہا تھا: "آپ کون ہیں؟ مجھے اختیار ہے جو میرا جی چاہے کروں!" لیکن آپ نے بھی اسے نہیں بخشا۔ اسے دھکے دے کر نکال دیا اور پورے طور پر اسے عاق کر دیا کہ آئندہ وہ ہرگز گھر میں نہ آئے اور نہ کبھی آپ کو اپنی صورت دکھائے.. اس کے بعد اس نے بار ہا ملنے کی کوشش کی، لیکن آپ نے اسے ہمیشہ دھتکار دیا۔ آخر وہ بیچارہ کچھ کام کرنے کے خیال سے سوڈان چلا گیا"

تو کیا آپ کے خیال میں مجھے اس کے علاوہ اور کچھ کرنا چاہئے تھا؟

"..... نہیں، بالکل نہیں.... لیکن کیا خبر اب اس کی وہ حالت نہ رہی ہو۔

یعنی؟

میرا مطلب یہ ہے کہ اب آپ کو اس کے پاس جانا چاہئے ملنے کے لئے!

مصطفیٰ پاشا نے بات کاٹی:

"پیارے دوست! یہ ناممکن ہے... میں تو اب یہی سمجھتا ہوں کہ وہ مر چکا ہے.... اب میرا کوئی لڑکا نہیں ہے"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے اسے آج ہی دیکھا ہے۔ وہ زندہ سلامت موجود ہے اور یہ آپ کو بھی معلوم ہے۔ اصل میں یہ آپ کی خود پسندی اور فوجی سنگدلی ہے جو آپ کو ایسی بے رحمی کے ساتھ اسے مردہ تصور کرنے پر مجبور کر رہی ہے"

نہیں، نہیں، اس میں بے رحمی کی کوئی بات نہیں ہے عباس بک! میرا دل کبھی اس نافرمان لڑکے کی طرف سے صاف نہیں ہو سکتا جس نے میری زندگی حرام کر دی اور اس بڑھاپے میں میری عزت دو کوڑی کی کر دی"

پہلے میں آپ کی یہ بات مان سکتا تھا لیکن اب اس کے حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں..... اب وہ ایک اور ہی انسان ہے۔ وہ اب صحیح معنوں میں مرد ہے، جو اپنی ذات پر بھروسہ کرتا ہے اور خون پسینہ ایک کر کے اپنی روزی کماتا ہے۔ کون سمجھ سکتا تھا کہ ایسے لاڈ چونچلوں میں پلا ہوا منیب ایک دن مجبور ہو گا کہ قاہرہ کی سڑکوں پر کرایہ کی موٹریں چلاتا پھرے گا۔ یقیناً اب اس کی حالت بدل چکی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

مصطفیٰ پاشا کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور انھوں نے عجیب دکھ کے ساتھ کچھ سوچتے ہوئے سر ہلا لیا۔ پھر کہنے لگے:

ہاں! ہاں، ہو سکتا ہے!

اگر آپ کو کچھ شک ہے تو اس کی خود تحقیق کرنی چاہئے۔ یہ لیجئے! یہ اس کا پتہ ہے جو مجھے کمپنی سے ملا ہے۔

انھوں نے عباس بک کے ہاتھ سے پرچہ لے لیا اور پڑھنے لگے۔

اچانک ان کے چہرے پر محبت کے جذبات جھلک اٹھے اور پوچھنے لگے:

منیب! کیا سچ مچ وہ یہیں رہتا ہے؟

عباس بک نے بھانپ لیا کہ بوڑھا باپ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کہنے لگے:

مصطفیٰ پاشا! میں بھی آپ کی طرح اولاد رکھتا ہوں۔ اس طرح سنگدل بن کر جذبات کو گھونٹنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ نے فوج میں پورے تیس سال گذارے اور آج اس درجے پر پہنچ چکے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اس حد تک سخت اور بے رحم بن جائیں۔ اب آپ کو کسی نہ کسی طرح اس سے ضرور ملنے جانا چاہئے۔

بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ اس نے اپنی کمزوری چھپانے کے خیال سے پہلے تو پرچے کو انگلیوں میں مسلنا شروع کیا اور پھر اپنے دوست کی طرف سے پیٹھ موڑ کر کھڑکی کی طرف چلا۔ اس وقت وہ بڑبڑا رہا تھا:

میرا بیٹا... کون ہے میرا بیٹا؟

عباس بک نے کمرے سے نکلتے ہوئے جواب دیا:

آپ کا لڑکا منیب! اگر اس کے لئے نہیں تو کم از کم اس قاسمہ کے خیال سے ملنے کی کوشش کیجئے جس سے آپ اپنی لڑکی کی طرح محبت کرتے ہیں کسی طرح اس کے ہونے والے شوہر کو لوٹا لائیے جس کو وہ آج بھی یاد کرتی ہے اور ہمیشہ کے لئے جس کے پاس زندگی گذارنی چاہتی ہے!

دوسرے دن شام کو مصطفیٰ پاشا عبداللہ شایع بولاق پر اپنے لڑکے کا مکان تلاش کر رہے تھے۔ آخر مکان مل گیا۔ یہ انہی پرانی تنگ و تاریک گلیوں کا ایک مکان تھا جن کی کوئی اصلاح نہیں ہوئی تھی۔ اب تک ان گلیوں میں بڑے بڑے بے ہنگم پتھروں کا فرش تھا۔ برابر برابر بھنچے بھنچے مکانوں کے دروازے تھے اور ان دروازوں کے آگے عورتیں بیٹھی باتیں کرتی جا رہی تھیں اور آس پاس پھرتی ہوئی مرغیوں اور بطخوں کو دیکھتی جا رہی تھیں۔ ان کا آپس میں کسی لڑکے لڑکی کی لڑائی کے بارے میں جھگڑا ہو رہا تھا۔

مصطفیٰ پاشا دور تک چلے گئے۔ آگے جا کر وہ ایک گلی میں مڑے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس گلی میں صرف ایک مکان ہے۔ یہ دو منزلہ مکان تھا لیکن بہت چھوٹا تھا ایک موٹی سی عورت سامنے ہی زمین پر بیٹھی تھی۔ انھوں نے اپنے لڑکے کا نام لے کر اس سے پتہ دریافت کیا۔ عورت نے بتایا کہ مکان اسی کا ہے اور اس نام کا شخص دوسری منزل پر اس کے کرائے میں رہتا ہے۔

مصطفیٰ پاشا سیدھے اوپر گئے اور دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ اندر سے

بیس پچیس سال کی ایک جوان لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اس لڑکی کا رنگ گندمی اور قد لمبا تھا۔ وہ کالے کپڑے پہنے ہوئے تھی اور عام عورتوں کی طرح کسی قسم کا بناؤ سنگھار نہیں کر رکھا تھا۔ انھوں نے پوچھا:

منیب مصطفیٰ کا مکان یہی ہے کیا؟

لڑکی نے آگے کو جھک کر مسکراتے ہوئے جواب دیا:

جی ہاں! جی ہاں!! تشریف لائیے، چچا جان!

مصطفیٰ پاشا نے جو اس طرح مخاطب کرتے ہوئے دیکھا تو ذرا ٹھٹک گئے۔ لیکن ان کی یہ حیرت کچھ زیادہ دیر قائم نہیں رہی۔ لڑکی نے انہیں کھانے کے کمرے میں لا بٹھایا جو بیک وقت ملاقات کیلئے بھی استعمال ہوتا تھا اور اٹھنے بیٹھنے کے لئے بھی۔ وہ کہنے لگی:

"میں آپ کو پہچان گئی۔ آپ ان کے والد معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی صورت ان سے بہت ملتی جلتی ہے۔ میں ان کی بیوی ہوں!"

یہ سنتے ہی مصطفیٰ پاشا کو سناٹا آگیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ان پر بجلی گر پڑی ہے۔ انھوں نے جلدی جلدی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خوفزدہ آواز میں کہا:

بیوی؟

"ہاں، ہاں، میں ان کی بیوی ہوں۔ ہماری شادی کو آٹھ مہینے گذر چکے ہیں۔ انھوں نے مجھے سب کچھ بتادیا ہے۔ اپنے خاندان کے متعلق اور آپ کے متعلق۔ جی ہاں! وہ مجھے سب حالات بتا چکے ہیں۔"

مصطفیٰ پاشا نے طعنہ آمیز انداز میں زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا:

"اور شاید اس نے یہ سب کچھ شادی کرنے سے پہلے ہی بتادیا ہوگا، ورنہ تم اس سے ہرگز شادی نہ کرتیں.... شاید تم نے سوچا ہوگا کہ اس طرح میری بہو بن کر تمہیں میری دولت میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملے گا، لیکن....."

وہ ابھی اپنی بات پوری بھی کرنے نہ پائے تھے کہ لڑکی کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو کر رہ گیا اور اس نے نفرت بھرے انداز میں بات کاٹتے ہوئے کہا:

ہرگز نہیں جناب! جس دن سے میں نے ان سے شادی کی ہے کبھی بھول کر بھی مجھے اس بات کا خیال نہیں آیا... شادی سے پہلے میں لڑکیوں کے پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھی اور مجھے پچاس گنی ماہوار تنخواہ ملتی تھی جو میرے لئے بہت کافی تھی۔ ایک دن منیب نے آکر برابر والا مکان کرائے پر لیا۔ اس کے کپڑے تار تار تھے، ٹوٹی ہوئی جوتی میں سے انگلیاں جھانک رہی تھیں اور صورت شکل سے دکھ اور پریشانی ٹپکے پڑتی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھا لیکن اس پر بھی مجھے یقین تھا کہ اس میں ضرور کوئی راز ہے۔ مجھے شروع ہی سے ان کے ساتھ ہمدردی ہوگئی تھی۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ راتوں کو بہت دیر سے شراب کے نشے میں جھومتے جھامتے آتے ہیں۔ بعض اوقات گھنٹہ گھنٹہ بھر تک دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا تھا جب کہیں دروازہ کھلتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بیکار ہیں اور کہیں ملازمت نہیں ملتی۔ ایک دن میں نے سوچا اگر اس شخص کو دیکھ بھال کرنے اور اپنا بنانے والی کوئی بیوی مل جائے تو اس کی حالت بدل سکتی ہے اور دوسروں کی طرح یہ بھی انسان بن سکتا ہے۔ اصل میں یوں میرے دل میں شادی کا خیال پیدا ہوا۔

مصطفیٰ پاشا ذرا قریب آگئے اور اس کو گھورنے لگے پھر وہ اسی تیکھے انداز میں بولے:

لیکن جب تمہیں اس کے خاندان کا حال اور میرا نام معلوم ہوا تو اس سے شادی کرنے پر کیسے تیار ہوئیں؟

لڑکی نے سر اٹھایا اور کہنے لگی:

میں نے اس بارے میں خوب سوچ لیا تھا۔ شادی کے بارے میں جو ہماری باتیں ہوئیں اگر آپ کو معلوم ہوجائیں تو یقیناً آپ تسلیم کرلیں کہ میں نے ان کو بچانے کے خیال سے شادی کی ہے، نہ کہ اور جال میں پھنسانے کی غرض سے۔ یہ ایک رات کا واقعہ ہے اس دن وہ خلاف عادت ذرا جلدی آگئے تھے۔ انھوں نے کمرے کا کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ گھر کی مالکہ نے بڑا سخت تقاضہ کیا اور ان کو بہت کچھ برا بھلا کہا۔ اس پر وہ کمرے میں چلے گئے اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ اتفاق سے میں اس وقت باہر ہی تھی۔ کمرے میں سے ان کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز آرہی تھی... تھوڑی دیر بعد وہ کمرے سے نکلے اور میرے قریب سے گذرے۔ اس وقت ان کے چہرے پر کسی خوفناک ارادے کے آثار جھلک رہے تھے۔ خواہ مخواہ کسی نامعلوم جذبے نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان کا پیچھا کروں۔ میں نے ان کو دیکھا کہ دریائے نیل کی طرف چلے جارہے ہیں۔ شاید یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ دریائے نیل یہاں بالکل قریب ہی بہتا ہے۔ یہاں پل کے قریب وہ کھڑے ہوگئے اور پانی کو تکنے لگے۔ رات کے اندھیرے میں دریا عجیب خوفناک انداز میں بہہ رہا تھا... اب مجھے یقین ہوگیا کہ خودکشی کا ارادہ ہے۔ وہ شاید دریا میں چھلانگ مارنے ہی والے تھے کہ میں آگے بڑھی، سلام کیا اور کچھ باتیں پوچھنے لگی۔ تھوڑی بعد میں ان کو لے کر گھر واپس آئی اور ان کی طرف جو کرایہ باقی تھا ادا کردیا۔ اسی رات ہم نے شادی کے متعلق باتیں کیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت نہ آپ کی دولت ان کو بچا سکتی تھی اور نہ عزت! میں نے ہی اس دن انھیں موت کے منہ سے بچایا... میں نے تن تنہا!

وہ ہانپتی جارہی تھی اور باتیں کرتی جارہی تھی۔ پسینے کے قطرے پیشانی سے برابر ٹپک رہے تھے مصطفیٰ پاشا اس کی رام کہانی سن کر ذرا نرم پڑ گئے۔ محبت سے اس کے ذرا اور قریب آگئے اور کہنے لگے:

لیکن بیٹی! شادی کے بغیر بھی تم اس کی بہت کچھ مدد کرسکتی تھیں۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ تمہیں معلوم تھا کہ اس کا کس خاندان سے تعلق ہے۔

یہ میں مانتی ہوں کہ ہر اعتبار سے میں آپ سے کم حیثیت رکھتی ہوں... لیکن منیب نے جب مجھ سے شادی کو کہا اور بار بار اصرار کیا تو مجھے اچھی طرح یقین دلادیا تھا کہ ان کا اب آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ وہ اب کبھی آپ سے ملیں گے۔ وہ کہتے تھے کہ اس زندگی کو وہ اس دولت پر ہر طرح ترجیح دیں گے جو انہیں آپ کی وجہ سے مل سکتی ہے۔

مصطفےٰ پاشا نے لڑکی کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور کہنے لگی:
کیا تم نے اس کی باتوں کا یقین کر لیا تھا؟ کیا تم سمجھ سکتی ہو کہ منیب جیسا نوجوان اس دکھ بھری بیکسی کی زندگی کو دنیا سے دور اس گندے حقیر گھر میں گذارنا پسند کرے گا؟ اور وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے ساتھ جو اگرچہ اپنی جگہ شریف ہے لیکن کسی طرح بھی خاندانی اعتبار سے اس کے لائق نہیں ہے۔ اور ہاں! اس نے قانتمہ کے متعلق بھی تمہیں کچھ بتایا جس سے بچپن میں ہی اس کی نسبت ہو چکی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کے باپ عباس بک کی موٹر بھی اس محلے سے کبھی نہیں گذرے گی جس میں یہ اندھیری گلی واقع ہے!

لڑکی نے یہ ڈسنے والے فقرے سنے اور گردن جھکا لی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی، آخر دبی آواز میں کہنے لگی:
جو کچھ آپ نے فرمایا بالکل ٹھیک ہے... لیکن اب جو زندگی وہ گذار رہے ہیں وہ اس مصیبت کی زندگی کے مقابلے پر جنت سے کم نہیں! آپ نے انھیں دھتکار دیا تھا، ہمیشہ کے لئے اپنا دروازہ بند کر لیا تھا اور اپنی محبت سے محروم کر دیا تھا... اس پر وہ بری طرح شراب پینے لگے اور کبھی ہوش میں نہیں آتے تھے۔ جب سوڈان سے آئے تھے تو بہت کچھ نوکری کی تلاش کرتے رہے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ زندگی ان کے لئے مصیبت بن گئی اور وہ موت کو ترجیح دینے لگے... لیکن میں... ہاں! مجھ غریب اور کمزور لڑکی نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کوشش کر کے اس کمپنی میں نوکری دلائی... ایک معمولی ڈرائیوری کی جگہ! یہ کونسی اتنی بڑی بات تھی؟ پھر یہ ہوا کہ انھوں نے شراب ترک کر دی اور روپے کی قدر کرنے لگے۔ اب انھیں سوائے اپنے کام اور گھر کے کسی چیز کا خیال نہیں تھا۔
یہ ٹھیک ہے اور میں... میں اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔
لیکن میں اگر اسے اپنے ساتھ لے جاؤں تو تمہارا کیا خیال ہے؟
آپ کو اختیار ہے، میں روکنے والی کون ہوں؟
ہاں! بیٹی میں چاہتا ہوں کہ اب تم اس سے زیادہ میرے راستے میں حائل نہ ہو۔ میرے لڑکے کے ساتھ تمہارا تعلق بس اسی درجہ پر ختم ہو جانا چاہئے تاکہ وہ اپنی اور خاندان کی شان کے مطابق آئندہ زندگی گذار سکے۔ میں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ تمہارا جو کچھ خرچ ہوا ہے پیسہ پیسہ ادا کر دوں۔
ہرگز نہیں! میں نے کبھی اس قسم کے معاوضے کی توقع نہیں کی۔ میں اب بھی پہلے کی طرح زندگی گذار سکتی ہوں اور کسی کی محتاج نہیں ہوں۔
لیکن ایسی صورت میں جبکہ تم اسے دل سے چاہتی ہو تو تمہیں اس کی بھلائی کے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہئے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ میں موجودہ حالت میں اس سے ملنا پسند کروں۔ شاید تمہیں بھی میری اس رائے سے اتفاق ہوگا کہ اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ میرے پاس واپس آ جائے اور میری دولت سے آرام اٹھائے اور اس طرح اس ملازمت کی مصیبت سے نجات حاصل کرے جو کسی اعتبار سے اس کے لائق نہیں ہے... کسی نہ کسی طرح اس شرمناک زندگی سے جان چھڑائے جو اب تک اس نے گذاری ہے۔

لڑکی نے کمرے میں نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اچانک اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی اور بے اختیار ہو کر اس نے اپنی دونوں کلائیوں سے آنکھیں چھپا کر رونا شروع کر دیا۔ بوڑھا اس کے اور قریب آ گیا رونے کی آواز سن کر اس کا دل پگھلنے لگا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور چیختی ہوئی وہاں سے چلدی۔
آپ کو اختیار ہے! اگر وہ مجھے چھوڑ کر آپ کے پاس چلے آنے میں اپنی بہتری سمجھتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔
یہ کہتی ہوئی وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔
مصطفےٰ پاشا عبداللہ اس تنگ و تاریک کمرے میں اکیلے رہ گئے۔
کمرے کا سامان اندھیرے میں لاشوں کی طرح بکھرا پڑا تھا۔ جسے دیکھ دیکھ کر ان کا دل لرز رہا تھا۔ وہ اپنے لڑکے کے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے اور ساتھ ہی اس لڑکی کے متعلق سوچتے جا رہے تھے جس نے خود اپنی زندگی بنائی، اپنے حالات پر قابو پایا اور پھر ان کے لڑکے منیب کو اپنے بس میں کر کے موت کے منہ سے بچا لیا!۔
تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور اندھیرے میں کوئی دیا سلائی کی روشنی میں راستہ ٹٹولتا ہوا اندر آیا۔ مصطفےٰ پاشا زور سے کھانسے ان کا لڑکا منیب سامنے سے آ رہا تھا۔ لڑکا اس وقت سب کچھ بھول چکا تھا۔ محبت کے جذبات سے متاثر ہو کر وہ اپنے باپ سے لپٹ گیا... دیر تک باپ بیٹے کی باتیں ہوتی رہیں۔
انھوں نے ایک دوسرے کو نئے پرانے سارے قصے سنا ڈالے۔ آخر مصطفےٰ پاشا نے اس لڑکی کے متعلق پوچھا جس کے ساتھ وہ زندگی گذار رہا تھا، وہ بولا:
آپ نے اسے دیکھا؟
ہاں! بلکہ اس سے کچھ باتیں بھی کی ہیں۔
میں نے اس سے شادی کر لی ہے۔
یہ کیسے ممکن ہے؟
یہی نہیں بلکہ وہ میرے لئے بیوی سے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ میرے لئے ماں، بہن، باپ اور بھائی سب کچھ ہے!
میرا خیال ہے پہلے جب تمہیں معمولی سے معمولی آدمی کی محبت اور ہمدردی کی ضرورت تھی اور تم گھر والوں کی محبت کے بھوکے تھے اس وقت شاید تمہارا یہ کہنا درست تھا، لیکن اب تمہیں بہت جلد اپنے شاندار گھرانے میں واپس جانا ہوگا۔
ہاں! منیب! اب تم ہمارے ساتھ پہلے کی طرح زندگی گذارو گے۔
جو کچھ بھی ہوا ابا جان! لیکن اس کے بغیر میرے لئے سب کچھ ہیچ ہے۔ اگر وہ مجھے نہ بچاتی، اپنے بس میں نہ کرتی، سہارا نہ دیتی، رستہ نہ دکھاتی تو شاید آپ مجھے کبھی اپنے گھر میں گھسنے نہ دیتے۔ میں شرابی تھا، بدکار تھا، آرام پسند، ناکارہ اور بدمعاش تھا۔ اسی وجہ سے آپ نے مجھے اپنے دروازے سے دھکا دیدیا تھا۔ جب اس سے میری ملاقات ہوئی تو میری حالت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔

لیکن کیا تم یہ بھول گئے کہ وہ... وہ خاندانی اعتبار سے بہت کم حیثیت ہے
لیکن جب ہماری ملاقات ہوئی ہے میں اس سے بھی زیادہ ذلیل تھا...
میری حالت یہ تھی کہ خود میرے گھروالوں اور خاندان کے لوگوں نے مجھے دھتکار دیا تھا۔

شاید تم یہ بھول گئے ہو منیب! تم کون ہو!... تمہیں شاید یہ بھی یاد نہیں رہا کہ بچپن میں تمہاری ایک لڑکی سے نسبت ہو چکی ہے۔ وہ تمہارے انتظار میں گھل رہی ہے اور تمہاری تمام غلطیوں سے درگزر کرنے کو تیار ہے... کیا سچ مچ تم اپنی چچا زاد بہن قاسمہ کو بھلا چکے ہو؟

منیب نے گردن جھکا دی۔ تھوڑی دیر کے لئے سیاہ بادل کا ٹکڑا چاند کے چہرے سے ہٹ گیا اور کمرہ روشنی سے چمک اٹھا۔ منیب نے جو ڈرائیور کی وردی پہن رکھی تھی بوڑھے باپ کی نگاہوں کے سامنے ابھر آئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور ذرا سخت لہجے میں کہنے لگا:

جی ہاں! میں نے سب کچھ بھلا دیا ہے!

بوڑھے نے سر ہلایا اور ایک لمبا سانس لیکر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہنے لگا:

اچھا! تم کو یہ بھی خیال نہیں کہ میری تمام دولت صرف تمہارے حصے میں آنے والی تھی اور اب وہ میرے چچیرے بھائیوں میں تقسیم ہو جائے گی..... وہ بھائی بہن جن سے میں ہمیشہ نفرت کرتا رہا۔ خیر! ہونے دو..... تمہارا جو جی چاہے کرو۔ انہی تنگ و تاریک گلیوں میں پڑے سڑتے رہو۔ اسی قبر میں ایڑیاں رگڑتے رہو جہاں تم کیڑوں کی طرح رینگ رہے ہو..... تمہیں اختیار ہے.... لو میں اب جاتا ہوں۔

یہ کہہ کر بوڑھا آگے بڑھا اور سیڑھیوں کا رخ کر کے چند قدم چلا۔ منیب کھڑا ہوا اپنے باپ کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے تک رہا تھا۔ مصطفےٰ پاشا اچانک مڑے اور اپنے اکلوتے لڑکے کو روتے ہوئے دیکھا۔ تھوڑی دیر کے لئے یہ پرتاثیر منظر یونہی قائم رہا۔ آخر بوڑھا باپ اپنے لڑکے کی طرف بڑھا، کندھے پر ہاتھ رکھا اور لڑکھڑاتی ہوئی سی آواز میں کہنے لگا:

سنو، منیب! اس وقت جو میں تمہیں خواہ مخواہ اپنی بیوی سے بے وفائی کرنے پر مجبور کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح تم اس بے خطا لڑکی کو چھوڑ دو، اس کشمکش میں خود مجھے اپنی طبیعت پر بہت جبر کرنا پڑ رہا تھا۔ میرے پیارے بچے! میں اتنا کمینہ نہیں ہوں!.... تمہیں اس کا احسان ماننا چاہیئے..... اگر تم میری بات مان لیتے اور اس غریب کو چھوڑ دیتے تو میرے نزدیک تم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ذلیل نہ ہوتا... واقعی تم اب "مرد" ہو!

آخر دونوں باپ بیٹوں نے فیصلہ کر لیا کہ منیب اپنی بیوی کو لے کر شارع عباسیہ پر اپنے باپ کے شاندار مکان میں چلا آئے۔ ایک دن اسے اس لئے دھتکار گیا تھا کہ وہ ایک بھٹکا ہوا لڑکا تھا ——— لیکن آج وہ اپنی بیوی کے طفیل "مرد" بن چکا تھا واقعی سچا مرد!

## گجراتی میں نئے ادبی رجحانات ——— بقیہ صفحہ ۴۴

کیونکہ وہ پتھر سے تراش کر بنایا گیا ہے!!"

وہ ایسی عبادت اور ایسے خدا کا ساتھ نہیں دیتے۔ آزادی، خواہ وہ زندگی کے کسی شعبہ میں ہو، ان کے نغموں کی جان ہے۔ ایسے نغمے جو "قلب کو تڑپادیں" اور "روح کو گرمادیں"۔

اردو کی طرح گجراتی میں بھی بحر، وزن اور اسلوب کے نئے قالب کے سلسلے میں مختلف تجربات کئے گئے ہیں۔ اور آزاد نظم انھیں تجربات کا نتیجہ ہے۔ موضوع شاعری کے اعتبار سے بھی یہ دور خصوصیت رکھتا ہے پرانے شاعروں کے برخلاف اس دور کے شعرا معمولی سے معمولی چیز کو بھی موضوع شاعری تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کو ہے "چی کیل" پر بھی ایک خوبصورت نظم لکھی جا سکتی ہے۔

ان نئے نظریات کی بعض لوگوں نے بڑی شدت سے مخالفت کی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس بے راہ روی میں ادب اور آرٹ کی حقیقی اور صحیح قدریں نظر انداز ہو رہی ہیں۔ بہرکیف اردو کی طرح، گجراتی میں بھی "یہ چھیڑ" چلی جا رہی ہے۔

جہاں تک گجراتی افسانوی ادب کا تعلق ہے وہ ہر اعتبار اور ہر نوعیت سے موجودہ زندگی کی عکاسی کر رہا ہے۔ فرضی اور محض بیکار رومان آپ کو نام کو نہ ملے گا۔ نہ ہر کہانی (FREUDAL COMPLEX) کے کسی خاص جذبہ کا نشانہ بنتی نظر آئے گی۔ زبان و بیان کہیں بھی غلق یا کتابی نہیں ہوتا۔ بلکہ موجودہ ادیب واقعات کو اس پیرایہ میں ادا کرتا ہے۔ جس کے وہ متحمل ہو سکتے ہیں خطیبانہ انداز سے گریز کرتے۔ وہ واقعات کو حقیقت، خلوص، اور سچائی کے ساتھ من و عن اس طرح بیان کر دیتا ہے کہ پڑھنے والا افسانے کے پس منظر میں محفوظ ماحول کو از خود سمجھ جاتا ہے۔ یہ اشاریت اور ابہام ڈی، ایچ لارنس کی ذاتی اور شخصی خصوصیت ہے۔ اس زمانے کے افسانہ نگاروں میں ادب کا افادی پہلو کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں کا موضوع صرف وہی زندگی نہیں جو فلک بوس محلوں میں سانس لیتی ہے۔ بلکہ وہ کسانوں، مزدوروں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے قلیوں کی انتڑیوں کی مسوس کو بھی چھو سکتے ہیں۔ وہ نشے میں چور شرابی اور سماج کی دھتکاری ہوئی طوائف یا ایک معمولی سی کسبی کی روزمرہ تھکی تھکی کراہتی ہوئی زندگی کو بھی ادب اور آرٹ کی لطیف قدروں کو اثر انداز کرتا دیکھتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی نفسیاتی تحلیل ان کے ادبیات میں زندہ و تابندہ موجود ہے۔ گجراتی ادیب دھوم کیتو کہتا ہے "کوئی فن کار ابھی اپنے ماحول کی پستی یا بلندی سے دور رہ کر کسی ایسی چیز کا خالق نہیں جو ادبیات میں وقیع درجہ حاصل کر سکے"۔

**اعلان**

دفتر رسالہ "آجکل" میں مضامین نثر و نظم کافی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے اشحات قلم روانہ نہ فرمائیں ——— (ادارہ)

# دیوار چین

فضل حق قریشی

مشرقی دنیا میں حضرت انسان نے اپنی محنت و جانفشانی اور عزم و ارادے کی پختگی کے جو عظیم الشان کارنامے صفحۂ روزگار پر چھوڑے ہیں، وہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ایک طرف مصر کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں آسمان سے باتیں کرنے والے ہیبتناک اہرام تعمیر کر ڈالے تو دوسری طرف چین میں سردی سے ٹھٹھرے ہوئے میدانوں اور پہاڑی علاقوں میں غصے سے بل کھاتے ہوئے اژدہے کی طرح ملک کی حفاظت و مدافعت کے لئے ایسی لمبی لپکاری دیوار کھڑی کر دی کہ اُسے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عبور کرتے وقت انسان کا تخیل بھی تھک کر بیٹھ جاتا ہے۔

آج سے دو ہزار ایک سو ساٹھ سال پہلے یعنی اس وقت جبکہ حضرت مسیح کی ولادت میں بھی دو سو چودہ سال کا عرصہ باقی تھا، منگولوں اور تاتاریوں کے مسلسل اور بے پناہ حملوں سے تنگ آکر چین کے بادشاہ شیہ ہوانگ تی نے جو چن خاندان کا ایک اولوالعزم حکمران تھا، فیصلہ کیا کہ ملک کے بچاؤ کے لئے کوئی ایسی مستقل صورت نکالنی چاہئے جس کے بعد کسی منگول یا تاتاری کو اس سرزمین پر قدم رکھنے کا موقع بھی نہ مل سکے۔ بہت سی تجاویز پر غور و خوض کیا گیا اور انجام کار یہ طے پایا کہ چین کی شمالی اور شمال مغربی سرحدوں پہ ساحل سمندر سے تبت تک مسلسل ایک مستحکم اور مضبوط دیوار تعمیر کر دی جائے۔ نیز اس رکاوٹ کے علاوہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پہریدار سپاہیوں کی چوکیاں بٹھائی جائیں تاکہ وہ تیر و سناں کی بوچھاڑ سے حملہ آوروں کو دور بھگاتے رہا کریں۔

اس بادشاہ کو حکومت کرتے صرف سات سال گذرے تھے مگر اس کا رعب و داب اتنا زبردست تھا کہ رعیت کا ہر فرد تعمیل حکم کے لئے فوراً جھک جاتا تھا۔ چنانچہ فرمان صادر ہوتے ہی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

یہ کوئی ایسا معمولی کام نہیں تھا کہ سو ڈیڑھ سو معمار اور مزدور لگا کر اسے ماہ دو ماہ میں ختم کر لیا جاتا۔ سب جانتے تھے کہ اسے پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے لئے لاکھوں آدمیوں کو برسوں بڑی محنت و جانفشانی سے کام کرنا ہوگا۔ چنانچہ ملک بھر میں اعلان کرا دیا گیا کہ ساری آبادی میں سے بھلے چنگے اور تندرست و توانا آدمیوں کی تہائی تعداد درکار ہے۔ لوگ برضا و رغبت آمادگی ظاہر کرتے ہوئے شریک عمل ہو جائیں، ورنہ یہ کام ان سے زبردستی لیا جائے گا۔

کچھ تو افلاس کے مارے تلاش روزگار میں سرگرداں تھے اور کچھ خوف و دہشت سے مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ہر شہر قصبے اور دیہات کے باشندے مقررہ اوسط کے مطابق ترک وطن کر کے اس کار عظیم میں شامل ہونے لگے۔ اس تہائی آبادی کے علاوہ تمام اسیران جنگ اور مجرمین ملک بھی جیلوں اور قید خانوں سے نکال کر اس کام پر لگا دئے گئے اور اس طرح دو سو چودہ قبل مسیح میں یہ سلسلۂ تعمیر شروع ہو گیا۔

فوراً پہاڑوں کی بلندیاں کٹ کٹ کر وادی کی بستیوں میں گرنے لگیں۔

مزدور تمام دن اینٹیں تھاپتے، پتھر تراشتے اور چنائی کا کام جاری رکھتے اور رات آنے پر جب اندھیرا چھا جاتا تو وہیں جنگل بیابان میں پڑ رہتے۔ اس قید و بند کی حالت میں ان کی مجبور زندگی گذرتی اور دیوار آگے بڑھتی رہی۔

کہا جاتا ہے کہ تعمیر کے کام کو سلسلہ وار قائم رکھنے کی بجائے مختلف مقامات پر شروع کیا گیا تاکہ سرے آپس میں مل مل کر خود بخود ربط و تسلسل پیدا ہوتا رہے۔ حد سے زیادہ تیزی اور عجلت دکھانے کے باوجود اس کی تکمیل شیہ ہوانگ تی کی زندگی ہی میں نہیں اُس کے خاندان کے عہد حکومت میں بھی ممکن نہ ہو سکی۔ کیونکہ پانچ سال کے بعد (۲۰۹ ق م) اس کا انتقال ہو گیا اور دوسرے بادشاہ کام جاری رکھنے کے باوجود اس جیسی سرگرمی نہ دکھا سکے حالانکہ وہ اس اہم ضرورت کے حامی تھے

بارہ سو پچاس میل کے بعد یہ سلسلہ بالکل رک گیا اور اس لئے آخری ڈھائی سو میل کا ٹکڑا منگ خاندان کے ایک بادشاہ کو تعمیر کرانا پڑا جس کی حکومت حضرت مسیح سے پہلے نہیں بلکہ ان کی ولادت کے پندرہ سو ستر سال بعد شروع ہوئی تھی۔ اس طرح اس دیوار کی کل لمبائی ڈیڑھ ہزار میل ہو گئی۔ یہ مشرقی ساحل سمندر پہ آباد ہونے والے شہرستان مائی کوائی سے ضلع کانسو کے ایک قصبے منچو تک پھیلی ہوئی ہے۔ مختلف مقامات پر اس کی بلندی پندرہ سے تیس فٹ تک ہے اور بنیاد کے قریب عرض پچیس فٹ ہے جو بتدریج گھٹتے گھٹتے چوٹی کے قریب پندرہ فٹ رہ جاتا ہے۔ تقریباً ہر دو سو گز کے فاصلے پر اور بعض خطرناک مقامات پر ہر ایک سو گز کے فاصلے پر مضبوط پناہ گاہیں ہیں جن کی بلندی چالیس سے پچاس فٹ تک ہے۔ ایسی پناہ گاہوں کی کل تعداد چالیس ہزار سے زیادہ ہے۔

دوران تعمیر ہی میں ان پر سپاہیوں کی چوکیاں بٹھا دی گئیں تاکہ اندیشے کے موقعہ پر وہ برابر کی چوکیوں یا ملحقہ شہر کے دستوں سے مدد لے کر حملہ آوروں کو پسپا کر دیں لیکن تاتار اور منگول پھر بھی باز نہ آئے۔ ان کا جنگجویانہ جوش و خروش اس سد عظیم سے ٹھنڈا نہ پڑ سکا کیونکہ پندرہ بیس فٹ کی بلندی پر چڑھ جانا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ان کی غارت گری اور لوٹ مار بدستور جاری رہی اور یہی نہیں بلکہ ۱۲۷۷ء سے ۱۳۶۷ء تک یعنی نوے سال چین کے ایک بہت بڑے حصے پر منگولوں کا خاندان حکمران رہا۔

بعض مقامات پر جہاں حملہ آوروں کا زیادہ خوف ہوتا یا جہاں خاک کے مسلسل طوفانوں کے باعث یہ قیاس قائم کیا جاتا کہ قدرتی طور پر دیوار سے ساتھ ریت کے انبار لگ لگ کر اس پر چڑھنے اور اترنے کی صورت ممکن کر دیں گے، اصل دیوار کے آگے کئی کئی فالتو دیواریں تعمیر کر دی جاتیں چنانچہ وادی تان کو کے قریب ایک نہ دو ایسی پانچ دیواریں آگے پیچھے بنانی پڑیں کیونکہ وہ حصہ ریگستانی ہونے کے علاوہ رہزنوں کی خاص گذرگاہ تھا۔

یہ قیاس لگانا بہت مشکل ہے کہ اس دیوار کبیر کی تعمیر میں پتھر کی کتنی سلیں اور دھوپ میں خشک کی ہوئی کتنی اینٹیں کام آئیں۔ تاہم یہ اندازہ ضرور لگایا گیا ہے کہ برطانیہ عظمیٰ کی تمام عمارتوں سے زیادہ مسالہ تعمیر اس میں صرف ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا جبکہ اس زمانے کے نقشہ نویسوں کی طرح وہ لوگ سمت اور حدود کا صحیح لحاظ رکھنا نہیں جانتے تھے۔ اگر انھیں جغرافیائی اعتبار سے پوری واقفیت حاصل ہوتی تو شاید دیوار کا طول اتنا زیادہ نہ ہوتا۔ کیونکہ جب درمیان میں فلک بوس پہاڑوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس کی بلند چوٹیوں سے ہراساں نہیں ہوئے بلکہ دیوار کو مسلسل اس پر چڑھاتے اور اتارتے رہے گئے۔ چنانچہ بعض جگہ وہ کئی ہزار فٹ بلند ہوگئی اور اسی وجہ سے ایسے مقامات پر ہموار سطح کی بجائے مسلسل سیڑھیاں تعمیر کرنی پڑیں۔ اگر وہ لوگ کوہ پیمائی کے صحیح اصولوں سے واقف ہوتے تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے اترنے کی بجائے اس کے دامنوں ہی میں قریب کا راستہ معلوم کرتے اور جان لیوا دشواریوں سے بچ جاتے۔ کیونکہ بعض مقامات پر ڈھلان اتنی پھسلواں اور عمودی حالت میں ہے کہ سیڑھیوں سے بھی کام نہیں چلتا اور انسان کو پتھروں کے کنارے پکڑ کر یا رسی کے سرے ہاتھ میں لے کر انھیں طے کرنا پڑتا ہے۔ تعجب ہے کہ ان حصوں کو بالکل نظر انداز کیوں نہیں کر دیا گیا جبکہ یہ اندازہ لگا لینا آسان تھا کہ کوئی بھی حملہ آور وہاں سے آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ ان حصوں کی تعمیر میں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا جبکہ اس کا تصور ہی ہولناک ہے۔

اس سدِ عظیم کو دنیا سب سے بڑی دیوار کے علاوہ دنیا کا سب سے طویل قبرستان بھی سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس تعمیر کے دوران میں مزدوروں اور کارکنوں پر بڑی سختیاں روا رکھی جاتی تھیں۔ جہاں کسی نے غفلت برتی اور منتظمین نے اس کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسانے شروع کر دئے۔ اس طرح مرجانے والوں کو اور انھیں جو کام سے انحراف یا سرکشی کرتے زندہ حالت میں دیوار کے ساتھ چن دیا جاتا تھا۔ صحیح اندازہ لگانا دشوار ہے تاہم ایسے مظلوموں کی تعداد ایک ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ اس دیوار کی تعمیر ہوانگ تی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے لیکن اس کے علاوہ اس نے عظیم الشان محلات، عوام کے لئے وسیع آرام گاہیں، نہریں اور سڑکیں بھی بنوائیں جو اس کا نام روشن رکھنے کے لئے کافی تھیں۔ اس نے ایک محل اتنا طویل و عریض تعمیر کیا کہ صرف اس کے صحن میں دس ہزار آدمی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے۔ اس نے بڑے بڑے شہروں کے درمیان طویل سڑکوں کا جال اس لئے بچھوایا کہ اگر ضرورت ہو تو بیرونی حملے کے وقت دوسری جگہ سے مدد لینے یا فرار ہونے میں آسانی رہے۔ چنانچہ اس کی بنائی ہوئی بعض سڑکیں مقامی اعتبار سے اب تک قائم ہیں۔

ان قابل تعریف کارناموں کے ساتھ ساتھ ہوانگ تی نے ایک ایسی قبیح حرکت بھی کی کہ آج تک چین کے علم دوست حضرات اس کا ذکر نفرت و حقارت سے کرتے ہیں۔ چونکہ اسے ذاتی طور پر علم و ادب کے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ ایسی تحریروں کو، خصوصاً تاریخی کتابوں کو دفتر بے معنی سمجھتا تھا، اس لئے اس نے تخت پر بیٹھتے ہی چین کے تمام کتب خانوں کو نذر آتش کرا دیا۔ اس زمانے میں تمام تحریریں بانس کے پتوں یا اسی کے ریشوں سے بنی ہوئی پٹیوں پر محفوظ کی جاتی تھیں۔ ان کتابوں اور نوشتوں کی تعداد کئی لاکھ تھی۔ اس نے ایک حکم عام نافذ کر کے ان سب کو راکھ کی صورت میں بدل دیا اور وہ راکھ بھی آہنی دیوار کے درمیانی حصوں میں بھر دی گئی۔ صرف علاج معالجہ، کھیتی باڑی اور مویشیوں کی پرورش سے متعلق تحریروں کو مستثنےٰ رکھا گیا۔ اس تباہی کے ساتھ ساتھ اس نے ہزاروں عالموں کو بھی ہلاک کرا دیا تاکہ وہ اپنی دماغی صلاحیتوں سے کام لے کر ان نوشتوں کو دوبارہ زندگی نہ بخش سکیں۔ دراصل اس کی آرزو یہ تھی کہ اس کے عہد حکومت سے پہلے کی تمام تاریخ اس طرح تلف ہو جائے کہ ساری دنیا صرف اسی کو چین کا اولین شہنشاہ سمجھنے لگے۔ لیکن اس قتل و غارت کے باوجود چند عالم بچ رہے اور بعض علم دوست لوگوں نے کچھ کتابیں زمین میں دفن کر کے محفوظ کر لیں اور جب دو سو نو قبل مسیح میں اس کا انتقال ہوا ہو گیا تو چھپے ہوئے خزانے زمین کی تہوں اور انسان کے سینوں سے دوبارہ باہر آنے لگے اور اس طرح چین کی پرانی تاریخ مرتب ہو گئی۔

# اولتی کی لَے بندیوں میں

افسانہ

شاہدہ خاتون

نہ جانے کیوں وہ آج تمام دن یادِ ماضی میں گم رہی؟ ماضی — آج وہ تمام دن ماضی ہی کے تصورات میں ڈوبتی ابھرتی رہی — تمام دن —

اُف تمام دن — ! اور اس کا ذہن ہر طرف سے گھوم پھر کر ایک ہی مرکز پہ آجاتا — ماضی — ماضی — اور ماضی! اسے خود تعجب ہو رہا تھا، دن کی ہنگامہ آرائیاں اور خیالات کا سکوت! اور یکایک وہ اپنی روح کو بہت ہی مضطرب محسوس کرتی، واقعی بے چین! وجہ؟ اور وجہ کو سوچتے ہوئے اس کے پردۂ ذہن پر ایک بڑا سا سوالیہ نشان بن جاتا، سوالیہ نشان —؟"

پورا دن گذر گیا — اور جب افق پر گلابی گل بوٹے کھلنے لگے تو آسمان کی بیکراں وسعتوں میں، ہوا کے دوش پر بہت سے بادلوں کے ٹکڑے پھیل گئے، ہواؤں میں خنکی آگئی — بادل گہرے ہوتے گئے — تاریکی کا غیر مرئی پرندہ اپنے پر پھیلا کر اپنے وجود کا اعلان کرنے لگا — تاریکی، سیاہی — اس نے سوچا — کتنی تاریکی ہے — سرمایہ دار کے قلب جیسی تاریکی اور پھر آسمان سے پانی کی لڑیوں کے تار بندھ گئے — مسلسل — متواتر — مگر اس کے تصورات اب بھی ایک ہی مرکز پہ تھے، وہی ایک مرکز — ماضی — !! اور وہ جھنجھلا گئی۔ کمرہ سے نکل کر دالان میں پڑے ہوئے پلنگ پر تکیوں کے سہارے بیٹھ گئی۔ اب بارش دھیمی ہو گئی تھی اور اولتی سے پانی کے قطرات ٹپک رہے تھے — جن سے زمین میں چھوٹے چھوٹے ایک سیدھ میں بہت سے گڑھے ہو گئے تھے .......... اور اب وہ اولتی سے ٹپکتے ہوئے قطرات کو بغور دیکھ رہی تھی — ٹپ — ٹپ — ٹپ — بیشمار قطرات ٹپک رہے تھے — ٹپ — ٹپ — ٹاپ — اور اسے معلوم ہوا قطرات کے ٹپکنے کی لے ہم آہنگ ہو کر ایک عجیب موسیقی بکھیر رہی ہے — جیسے اولتی کی لے بندیاں کچھ کہہ رہی ہیں۔ ایک بڑا سا قطرہ اولتی کے جمع شدہ پانی میں گرا — بلبلہ اٹھا — اٹھی اس کی نگاہیں بلبلے پر تنی ہی ہوئی تھیں کہ دوسرا قطرہ — بلبلہ پر گرا — بلبلہ ٹوٹ گیا — اس نے سوچا — بلبلا؟ پانی سے بنا اور پانی ہی کے قطرہ نے اسے فنا کر دیا — اس نے آہستہ سے زیر لب گنگنایا سہ

ٹوٹ گئے شبنم کے موتی — بکھر گئے فطرت کے راز

اور وہ پھر اولتی کی لے بندیوں میں کھو گئی — جیسے وہ اس کی زبان سمجھتی ہو — اس کا جی چاہا یہ اولتی یوں ہی ٹپکتی رہے ...... برابر ...... اور وہ سنتی رہے —

......... اولتی کی لے بندیوں میں کھوتی کھوتی — ماضی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی —

اسے کتنی مسرت ہوتی تھی یہ سنکر کہ نئے انسپکٹر صاحب کی لڑکی اس کی ہم عمر ہے۔ وہ اپنی امی کی ہزار خوشامدیں کر کے انسپکٹر صاحب کے ہاں گئی۔ واپسی پر اس نے محسوس کیا، انسپکٹر صاحب کے گھر والے بڑے ملنسار ہیں اور خصوصیت کر اس کی ہم عمر سہیلی کے نام کو زیر لب دہرایا — "شہناز" کتنا پیارا نام ہے؟

...... پھر اس کے تعلقات انسپکٹر صاحب کے یہاں سے بہت زیادہ بڑھے۔ وہ انسپکٹر صاحب کو چچا اور اپنی سہیلی کی امی کو چچی کہا کرتی اور واقعی اسے وہ لوگ پیار بھی بہت کرتے۔ اس نے اپنی سہیلی سے پھول[1] لگایا۔ یوں تو دونوں ملنے کیلئے ہر وقت بے قرار رہتیں مگر راچی ضلع؟ سال کے آٹھ ماہ تو بارش ہی ہوتی ہے اور بیشتر اوقات مسلسل — ! ایک رات آسمان صاف تھا تو وہ اپنی پھول سے ملنے گئی — ان کا کوارٹر کوئی زیادہ دور تو تھا نہیں اس لئے وہ کبھی تنہا بھی جاتی۔ وہ کوارٹر میں داخل ہوئی .......... اور ایک نوجوان کو دیکھکر ٹھٹک گئی ..

..... لمحہ بھر میں اس نے غیر شعوری طور پر اس کا مختصر سا جائزہ لیا ........ گندمی رنگ، چوڑی پیشانی، گھنگھر والے بال، کشادہ سینہ اور ...... اور ......

...... اب اس نوجوان کی نگاہیں ادھر اٹھ چکی تھیں — تصادم — نگاہوں کا تصادم — اس کی آنکھیں جھک گئیں اور نوجوان؟ وہ بھی شرم سے باہر بھاگ گیا — مگر وہ ٹھٹک کر وہیں کی وہیں رہی ........ بالکل سنگ مرمر کی مورت بنی ہوئی — کسی ماہر فن آرٹسٹ کا شاہکار — جس میں اس نے نہایت ہی فنکارانہ مشاقی سے زندگی کے بھرتے ہوئے آہنوں کو سمو دیا تھا۔ گویا وہ معصومیت کے آسمان پر جگمگ جگمگ کرتا ہوا ایک درخشاں ستارہ تھی ...... جس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تھرکتا ہوا — تیرتا ہوا احساس شباب کا شرمایا ہوا خمار — اور اس خمار کے آس پاس کناروں پر جمی ہوئی مندی مندی سی سیاہی —

"تم وہاں پر کھڑی کیا سوچ رہی ہو پھول؟ ارے — آؤ نا —" اس کی پھول کمرہ سے نکلتے ہوئے بولی۔

وہ پھول کی آواز سے چونک پڑی اور اس کی پھول نے بڑھ کر اسے کمرے میں مسہری پر بٹھا دیا۔

"کیا سوچ رہی تھیں تم؟" اس کی پھول نے پھر استفسار کیا۔

"کچھ نہیں!" اور وہ سوچنے لگی کیا بتائے بھلا؟ وہ کیا دیکھ رہی تھی —؟

---

[1] بہار میں یہ ایک رسم ہے۔ جب دوستی بہت زیادہ پرخلوص ہو جاتی ہے تو سہیلی کا نام لینا آئین دوستی کے منافی سمجھا جاتا ہے اور سہیلی کا ایک خاص نام رکھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً پھول، دوگانہ، گوئیاں، سکھیا وغیرہ وغیرہ۔ یہ رشتہ محبت قائم کرنے کے لئے طرفین کی جانب سے باقاعدہ دعوتیں ہوتی ہیں۔

آسمان کی لامحدود وسعتوں میں تاروں کی جھلمل پریاں رقص کرتی ہوتی — ہر طرف رنگ......موسیقی......مسلسل......متواتر......اس دن وہ اپنی پھوپھی سے زیادہ گفتگو نہ کر سکی۔ اس کی پھوپھی نے بتایا کہ اس کے بھائی جان کلکتہ سے آئے ہوئے ہیں۔

پھر اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ — حیدری — ہیں، وہی جن کے افسانے وہ بڑے شوق سے پڑھتی ہے — اس کا تخیل تھا کچھ عجیب، مائل تھا اس کے متعلق —! افسانوں کے سہارے اس نے حیدری کی تصویر کچھ عجیب سی بنائی تھی — پختہ سن وسال — اپنے افسانوں کی طرح خشک — مگر — وہ کتنے افسانے ان کے پڑھ چکی تھی — وہی ایک محور — نہایت ہی تلخ — سماج کے پھوڑوں کی نشتر زنی۔ اور کچھ عجیب سے نظریات! وہ اکثر اس کے افسانہ کی عجیب "سطریں — جو بار بار پڑھنے سے زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ دل ہی دل میں دہرانے لگتی —

"آپ کا اشارہ یقیناً عورت کے رقص کی طرف ہے اس لئے کہ آپ رقص کو محض عورت سے متعلق سمجھتے ہیں، اور میں رقص کو محض اس لئے ناپسند کرتا ہوں کہ میں رقص کو عورت سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتا بلکہ میں عورت کو "حالت رقص" میں دیکھنے لگوں گا — اس کے نمود شباب کو۔ کمر کی نزاکتِ ناز آفریں کو"

اور وہ سوچتی واقعی انسان ایک ہی شے کی دو صفتوں کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا، اس کی نگاہیں اتنی دقیق نہیں کہ وہ فن اور فنکار کو علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھ سکیں۔

وہ اپنے افسانے اسی عجیب افسانہ نگار کو دکھانے لگی — اس نے دیکھا کہ وہ رومانی افسانے پسند نہیں کرتا۔ اس کے افسانوں میں تلخی پیدا ہونے لگی۔ اور حیدری نہایت تندہی سے اصلاح و ترمیم کا کٹھن فرض انجام دیتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے افسانے ملک میں حد درجہ مقبول و مشہور ہونے لگے — ایڈیٹروں کے تقاضے روز بڑھتے ہی جاتے اور اس کی افسانہ نگاری کی رفتار بھی —: اس کا فن اب ایک منفرد راہ پر گامزن ہو گیا اور اس کی شخصیت ایک انفرادی حیثیت سے مقبول ہو گئی

آخر کار اس کے استاد نے لکھ بھیجا کہ اب اصلاح کی ضرورت نہیں۔ مگر وہ اپنے افسانے اسے دکھلائے بغیر کہیں بھی نہ بھیجتی۔ اس کا دل ہی نہ بھرتا جب تک وہ افسانہ دیکھ نہ لیتا۔ اسے تسکین ہی نہ ہوتی جب تک وہ افسانے کو بہتر نہ کر دیتا — وہ محسوس کرتی جیسے افسانے میں کوئی کمی رہ گئی ہے اور وہ کمی اس کے دیکھ لینے کے بعد دور ہو جاتی۔

پھر......اور پھر...... وہ جانے کلکتہ سے کہاں چلا گیا بغیر اطلاع —! وہ روز اس کے خط کا انتظار دیکھتی مگر فضول! نتیجہ انتظار؟ مایوسی، محرومی —! اس دوران میں انسپکٹر صاحب کا تبادلہ ہو چکا تھا، اس نے اپنی پھوپھی سے اس کا پتہ دریافت کیا مگر اس کی پھوپھی نے بھی لاعلمی ظاہر کی —

## غزل — آغا علی خاں

رنگیں نوائیوں میں بھی وارفتگی نہیں
اب تک کلی کی آنکھ چمن میں کھلی نہیں

آنکھوں سے گر رہی ہے دل کے لہو کی بوند
ان کے حریم ناز میں جانا ہنسی نہیں

اللہ رے ان کے جلووں کی معجز نمائیاں
دل دیکھتا ہے آنکھ مگر دیکھتی نہیں

کر بند اب تو نالۂ شبگیر غم نصیب
پھیلا ہے — آنکھ کسی کی لگی نہیں

طے کرتے ہیں جادۂ الفت کی منزلیں
لیکن کسی میں پہلی سی دیوانگی نہیں

آنکھوں کے سرخ ڈوروں نے غماز کر دیا
اے شیخ تیرے سر کی قسم میں نے پی نہیں

کیا پوچھتے ہو حال مری زندگی کا تم
کہنے کو زندگی ہے مگر زندگی نہیں

محمود درد عشق ہوا جزو زندگی
غم خانۂ حیات میں میرے خوشی نہیں

یکایک اسے محسوس ہوا — اس کی رومانی تعمیر — منہدم ہو گئی۔ رعنائیوں رنگینیوں اور نکہتوں کے رنگ برنگے بلبلے ٹوٹ کر خلا میں غائب ہو گئے — اس کے افسانوں کی روح مر گئی —

ایڈیٹروں کے بیسیوں خطوط آئے — تقاضے کہ اپنا افسانہ بھیجئے — خطوط میں روزانہ اضافہ ہوتا جاتا — حتیٰ کہ اس کی چھوٹی اٹیچی خطوط سے بھر گئی۔ مگر جیسے اب اس کے قلم میں طاقت نہ رہی ہو۔ قوت تحریر مفلوج ہو گئی ہو، اس کا بلند پرواز طائر خیال آسمان سے زمین پر آ رہا —۔ اس کا دماغ اپنی ساری جدت طرازیاں زائل کر چکا —

پھر......؟ اور اس نے زیادہ سوچنے سے انکار کر دیا۔ اپنے سر کو زور سے کئی بار جھٹکا — جیسے ماضی کے تصورات کی کڑیوں کو توڑ دینا چاہتی ہو اور پھر اولتی کی لے بندیوں میں کھو گئی اسے ایسا معلوم ہوا کہ اولتی کی لے بندیاں ایک المیہ راگ میں تبدیل ہو گئی ہیں جیسے اس راگ میں سینکڑوں یتیموں کی حرماں نصیبی، ہزاروں بیواؤں کی ٹھنڈی آہیں، لاکھوں مصیبت زدوں کی کراہیں اور کروڑوں ناکام زندگیوں کی سسکیاں شامل ہیں —!

# حضرت اصغر کے ساتھ چند گھنٹے

حامد بلگرامی

میرے نزدیک جس طرح شاعر بعض وقت کسی خاص جذبے کے تحت شعر کہنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے، کچھ اسی طرح کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی کا کلام پڑھ کر اس کے متعلق اظہار خیال کے لئے اپنے کو مجبور پاتا ہے، جسے عرف عام میں تنقید و تبصرے کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان چند سطور کو ایک ایسے ہی جذبۂ بے اختیار کا نتیجہ سمجھئے۔

خمریہ کو میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں دیکھا تھا اور اکثر فرصت کے لمحے ان کی صحبت میں گذر رہے تھے، سرودِ زندگی اسی زمانے میں شائع ہوئی تھی۔ میں حضرت اصغر سے ملنے گیا۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز سے پوچھا "کہو یہ مجموعہ پہلے دونوں مجموعوں کے مقابلہ میں کیسا پایا!"

ان کے انداز گفتگو میں سنجیدگی کے ساتھ ایک مخصوص بشاشت ہمیشہ نمایاں رہتی، جس کو تبسم سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا لیکن سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ بشاشت تبسم ہی کا ایک لطیف پہلو ضرور تھی۔ ظاہر ہے کہ میرا جواب سوائے کلماتِ تحسین کے اور کیا ہو سکتا تھا، میں اس زمانہ میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا اور حضرت اصغر ہندوستانی اکیڈمی میں کام کرتے تھے مجھے یقین ہے کہ میں نے اس وقت بھی اس مجموعہ کے متعلق اپنی رائے دیانت داری ہی سے دی ہوگی لیکن آج اس اعتراف میں مجھے ہرگز تامل نہیں کہ آج قریب تیرہ چودہ سال بعد جب سرودِ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو ان اشعار میں ایک اور ہی نغمہ پاتا ہوں مجھے ان لطیف اور مبہم اشارات، سکون بخش کیفیات اور جگنو کی طرح رہ رہ کر چمک رکھنے والی کنایات کا احساس شاید اس وقت نہ ہوا تھا۔ زمانے کی رفتار نظروں کے سامنے سے خود بھی کچھ نہ کچھ حجابات اٹھاتی رہتی ہے ہوتا کچھ یوں ہے کہ وابستۂ حیات امیدوں کے ٹوٹنے پر شیرازۂ ہستی ایک بار منتشر ہونے لگتا ہے۔ اس وقت انسان کے سامنے بالعموم دو ہی راستے رہ جاتے ہیں ایک یہ کہ واقعات اور حوادث عالم کو اسباب کا لازمی نتیجہ سمجھ کر کامیابی حیات کے لئے از سر نو بہتر سے بہتر اسباب کی جستجو میں لگ جائے یا پھر اس ذات کی مشیت کا قائل ہو کر جو کل اسباب کا سببِ اول ہے راضی بہ رضا ہو کر بیٹھ رہے۔ ایک کا نتیجہ دنیاداری یا عروج دنیوی ہوتا ہے اور دوسرے کا قدیم تصورِ قناعت، ترک دنیا اور ترک ترک۔ لیکن ان سمجھدار ہستیوں کے سامنے جنہیں انسان کی یک گونہ فطری آزادی پر بھروسہ رہا ہے اور ساتھ ساتھ ایک قادر مطلق کی شان جمالی سے ان کے قلوب منور رہے ہیں ان کے سامنے زندگی کی ایک راہ یہ رہی ہے کہ وہ اپنے حصول مقصد کے لئے ہر ممکن کوشش تو کرتے رہتے ہیں اور کر ڈالتے ہیں لیکن نتائج کو مشیت کی رضا پر چھوڑ کر ناامیدی اور مایوسی کے ہمت شکن ہچکولوں سے بچ جاتے ہیں۔ ایک بار اس راہ پر آ جانے کے بعد زندگی کا نہ صرف نصب العین ہی بدل جاتا ہے بلکہ مسرت کے مفہوم میں کچھ عجیب وسعتوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ عمل پیہم کی لذت خود اپنا حاصل بن جاتی ہے اور نتائج کی کامیابی ایک ایسی ذات کا اذن اور رضا ساتھ لئے ہوئے آتی ہے کہ حال اور مستقبل دونوں جگمگا اٹھتے ہیں۔ سرود زندگی کے نغمے بھی کچھ یہی ترنم لئے ہوئے ہیں۔

ہر چند حضرت نے اس زمانے میں آنکھیں کھولی تھیں کہ دنیا مادیت کے شاید آخری منازل کی طرف تیزی سے گامزن تھی، جوں جوں زمانہ بڑھ رہا تھا زندگی کے گوشہ گوشہ میں انقلابات کی لہر دوڑتی جاتی تھی۔ پرانے تصورات خواہ وہ مذہبی ہوں یا تمدنی ایک تقویم پارینہ سمجھ کر پس پشت ڈالے جا رہے تھے۔ اشتراکیت کے شعلوں نے بہت سے کرم خوردہ روایات کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا تھا۔ جمہوریت کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ آزاد خیالی اور آزاد روی ادب کی روح بن چکی تھی۔ دنیائے شاعری میں غزل باوجود اپنی داخلی لذتوں اور دوامی رنگینیوں کے ترک کی جا رہی تھی۔ نظم اور نظم آزاد اس کی جگہ لے رہی تھی۔ اس وقت جس نغمہ نے غزل کی رفعتوں کو پاکیزگی کے ساتھ بلند کیا، اور لوگوں کو پھر اس کی لذتوں سے آشنا کرنے کے لئے قدیم روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں زندگی اور بیداری کی روح پھونک دی وہ ذات اصغر ہی کی تھی، جن نغموں کی انہیں تمنا تھی وہ نغمے خود انہیں کی رنگین نوائیوں نے فضا میں منتشر کر دیئے ؎

وہ نغمہ بلبل رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

باوجود غزل کی محدود دنیا میں ادبی زندگی بسر کرنے کے اصغر نے کبھی ذوق نظر اور بلندی نظر کو محدود نہ ہونے دیا۔ شاعری کی دراصل مجموعی حیثیت سے دو ہی قسمیں ہیں ایک بلند شاعری اور ایک اچھی شاعری یا دلچسپ شاعری۔ اصغر کا منتہائے نظر ہمیشہ بلند شاعری رہا اور اس کے لئے انہوں نے ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا تھا جہاں اندازِ بیان لطیف اشاروں اور تصور آفرین کنایوں میں کچھ ایسا سمویا ہوتا ہے کہ ان کے شاعرانہ تحیر سے محظوظ تو ہوا جا سکتا ہے اور ان کے ملکوتی مبہم اشاروں سے لطف بھی اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ان کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نظریں اکثر زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتی ہیں، وہ نہ صرف اس عالم رنگ و بو کی کیفیات دلپذیر انداز میں بیان کر جاتے ہیں بلکہ ان تجلیات کو جنہوں نے کائنات کی ہر شے کو بے خود و وارفتہ کر دیا ہے حسن و عشق ہی کی زبان میں ادا کرتے ہیں اور اس طرح ادا کرتے

ہیں کہ بھولی ہوئی حقیقتیں پھر یاد آجاتی ہیں۔ یہ تجلیات ہماری نظروں سے اوجھل ہیں لیکن اصغر کی نظروں سے پنہاں نہیں۔ ؎

ازل میں اک تجلی سے ہوئی تھی بیخودی طاری
تمہیں تو میں نے دیکھا تھا، کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

ہماری شاعری میں تصوف نے کچھ ایسا روایتی انداز اختیار کر لیا ہے کہ غزل کو تصوف کے سچے اور پاکیزہ جذبات سے بہرہ ور کرنا کوئی آسان کام نہیں رہا۔ اردو کا ہر شاعر جہاں بادہ و ساغر کی مجازی کیفیات پیش کرنے سے نہیں جھجکتا، خواہ اس کی لذتوں سے ہمیشہ ناآشنا ہی رہا ہو بلکہ جس قدر ناآشنا ہوتا ہے اسی قدر مزے لے کر اس کے ذکر سے لذت کام و دہن کی سیری کرتا ہے کچھ اس طرح شاعری کے لوازمات میں کچھ یہ بھی داخل ہو گیا ہے کہ شاعر کبھی طور پر بجلیاں گراتے ہوئے کو بیہوش کرے، خود جلوہ دیکھے، کبھی ذروں میں آفتاب کی چمک پیدا کر کے نگاہوں کو خیرہ کرے اور کبھی قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کل کے مناظر دکھا کر عرفان نگاری کا دعویدار بن بیٹھے۔ ہماری شاعری میں بیشتر تصوف نگار شعراء کے ہاتھوں صرف ایک روایتی شاعری باقی رہ گئی۔ خداوند کریم اقبال مرحوم کی روح کو مدارج اعلیٰ عطا فرمائے کہ امام غزالی کے بعد اس امام العصر نے تصوف کے صحیح مقام سے بھٹکوں کو راہ دکھائی۔ یا جہاں حقیقت کے رخ سے حضرت اصغر نے نقاب اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

جہاں شعرائے نے صرف روایتی طور پر تصوف کو شاعری میں جگہ دی ہے وہاں شعر میں دلکشی تو پیدا ہو گئی ہے لیکن اس سے نہ تو رنگ تصوف کی بلندیاں ظاہر ہوتی ہیں اور نہ ان کے حقائق کی گرہ کشائی ہوتی ہے جو ایک صاحب دل شاعر کر جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر کی روح عالم وجدان سے گذر کر ایک ایسے مقام پر پہنچتی ہے جہاں صبح و شام کے تصورات باقی نہیں رہتے جہاں صرف ایک نورانی فضا نظروں کے سامنے رہ جاتی ہے۔ یہاں اگر دعائے نیم شبی کی نظر قبول ہو گئی تو فیضان الٰہی کبھی در مقصود عطا کر دیتا ہے جن کے لئے نہ راتوں کا جاگنا کافی ہے اور نہ صرف غور و فکر سے وہاں تک رسائی ہو سکتی ہے اس راز کو علامہ مرحوم حضرت اقبال سے بہتر کون جانتا تھا۔ ایک بار حضرت اصغر اور علامہ مرحوم کا سامنا ہوا۔ حضرت اقبال نے فرمائش کی کہ "کچھ کہا ہو تو سناؤ" اصغر نے اپنی اس غزل کے چند شعر سنائے جس کا مصرع تھا کہ:

کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

علامہ مرحوم پر ایک کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ جب حضرت اصغر اس شعر پر پہونچے:- ؎

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

تو علامہ مرحوم آبدیدہ ہو گئے۔ شعر کو بار بار پڑھواتے اور ان پر عجیب اضطراب کی کیفیت طاری ہوتی جاتی۔ بے ساختہ بولے "اصغر یہ شعر تو ہے، انہیں ادھر کو ذہن ہے" کچھ اس شان کریمی کے موتیوں کو تو اقبال نے بھی منتشر رکھا تھا۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے (اقبالؒ)

لیکن یہاں ایک اور ہی لطف تھا جس کا احساس علامہ مرحوم کا دل کر رہا تھا دنیائے تصوف میں شاعر کی رسائی اس عالم تصور تک ہو پاتی ہے۔ یہاں پہونچنے کے لئے تو ایک پاکیزگی فطرت کی ضرورت ہے۔ علامہ اس درگاہ تک اکثر پہونچے اور یہی وجہ ہے کہ آخر عمر میں ان کا قلب اس درجہ گرم ہو گیا تھا کہ رحمتِ الٰہی کا ہر تصور ان کی آنکھوں کو شبنم آلود کر دیتا تھا۔

زندگی بلا کسی مقصد کے بسر نہیں کی جا سکتی اور اس مقصد کی بلندیاں زندگی کی ذہنی اور روحانی رفعتوں کا دار و مدار ہے۔ آنکھیں بند کر کے اللہ کا نعرہ لگا دینا اور عالم جذب میں آنکھوں سے سرخ ڈورے دکھا کر لوگوں کو متاثر کر لینا کوئی مشکل کام نہیں اس کے لئے نہ کسی کسب کمال کی ضرورت ہے نہ صدق و صفا کی۔ لیکن جہاں کسی کے حریم ناز تک پہونچ کر تجلیاتِ نورانی سے قلب کو اس درجہ معمور کرنا منظور ہو کہ حسن و عشق ہی مٹ جائے اس کے لئے پیہم غور و فکر کے تجارب میں زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ تفکر کی رسائی رفتہ رفتہ عالم وجدان تک ہوتی ہے۔ بقول علامہ اقبال کے وجدان درحقیقت خود ذہنی و عقلی کی ایک دوسری منزل کا نام ہے جہاں پہونچ کر کچھ دیر کے لئے ایک بیخودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اگر غور و فکر نے ذہن میں کسی سرمایہ کی فراہمی کر دی ہے تو وہ منظم صورت میں شکل پا کر شاعری میں جلوہ گر ہوتا ہے ورنہ اس عالم بیخودی میں پہونچنے کے بعد بھی شاعر کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

غزل کی دنیا میں بارگاہِ حسن تک رسائی مقصد حیات ہے اس حسن کی معیاری بلندی یا پستی پر غزل کے عروج و زوال کی داستان منحصر ہے۔ خواہ ایک مشرب ہوشربا کو مقصدِ زیست بنا کر ہوس کاریوں کے لئے ذہنی تسکین کا سرمایہ بہم پہونچی ہو یا ایک نور مجسم کے ساتھ سوز و گداز کے وہ تصورات وابستہ کرا جن میں رنگینی ہے لیکن پاکیزگی کے ساتھ۔ حسن ہے لیکن صداقت کے پہلو لئے ہوئے ——— عشق کو بھی ایسی بارگاہ حسن میں یک دامن ہو کر آنا پڑتا ہے اور لطف نظارہ کے لئے یہاں حسن و حسن نظر کا فرق بھی مٹ جاتا ہے۔ اصغر کے سامنے کسی ایسے ہی حسن کا تصور تھا۔

لیکن یہ یاد رہے کہ جب تغزل مذہبیت کے ظاہری رنگ میں رنگا جاتا ہے تو اس کا اثر جاتا رہتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر کلیات میں حمد و نعت کے رسمی ابتدائی اوراق جذب و اثر سے خالی ہیں۔ شاعری کو جہاں زہد خشک سے نفرت ہے وہیں رسمی تبلیغ سے بھی۔ شاعری میں جہاں اس قسم کی رسمی مذہبیت جلوہ گر ہوئی وہیں شاعری کی رنگینیاں دامن بچا کر الگ جا کھڑی ہوتیں۔ پیکرِ حسن و صداقت کو پیکرِ فطرت کی رنگینیوں میں ظاہر کرنا اور اس کی صداؤں سے

قلوب پر دائمی سرور کے اثرات مرتب کرنا وہ کڑی منزل ہے جس سے شاعر کے لئے کامیابی سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہوتا۔ اسی لئے بلند مقاصد کی پیش نظر رکھ کر شعر کہنے والے کامیاب نہیں ہوتے بلکہ کامیابی اور کامرانی انہیں نصیب نہیں ہوتی ہے جو تلاش حسن میں رفتہ رفتہ خود آستانۂ حسن تک پہونچتے ہیں۔ فطرت اپنا آغوش ان کے لئے کھول دیتی ہے۔ اور ان کی نظریں جی بھر کے سرشار ہوتی ہیں ایک بار اس بارگاہ حسن تک پہونچنے کے بعد جو کیفیت طاری ہوتی ہے تغزل کی زبان میں اسے بیخودی کہتے ہیں۔ شاعر کی خواہش اس عالم بیخودی سے واپس ہونے کی ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ اس راز کو اصغر نے کچھ یوں ظاہر کیا ہے۔ ؎

پہلے ہستی کی جستجو ہے ضرور ۔۔ پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کر

آیئے اصغر کے ساتھ ساتھ ہم بھی ان کے بارگاہ حسن تک چلیں لیکن اپنے رہبر کی نصیحتوں پر عمل کرتے ہوئے شاید ہماری نظریں بھی کچھ وہ تجلیات دیکھ لیں جنہوں نے اصغر کو بیخود و وارفتہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے محبوب کا مبہم سا تصور کچھ یوں پیش کرتے ہیں:۔ ؎

یوں مسکرا کے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیئے

شعر کے معنی نہیں کہنا چاہتا لیکن یہ ضرور عرض کر دوں کہ اندازِ بیان کی اس بلاغت پر غور کرتے چلیئے جس کی طرف اشارتاً بھی کچھ کہنے کی جرأت کرنا اس کے لطف کو پامال کرنا ہے، یہ وہ نازک مقام ہے کہ ذرا سا بھی قدم ڈگمگا جائے تو شاعری کی حیثیت سے انسان کو باہر پھینک دیا جاتا ہے

اسی حقیقت حسن کی پردہ کشائی ایک مقام پر یوں بھی کی ہے:۔

تکلم ہے ترا یا شعلۂ وادیٔ ایمن ہے
تبسم زیر لب ہے یا کلی کھلتی ہے جنت کی

شاعر نے ایک اشارہ سے ہم کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ پاکیزگیٔ خیال کا ساتھ ہے اور ایک ولادتی نور۔

اصغر سے اگر پوچھیئے کہ کیا عشق کی آخری منزل یہی ہے۔ ان کا جواب ہوگا کہ جس کو تم کہتے ہو وہ تو ہوس کا پہلو لئے ہوئے ہے، خواہشات کا نہ بجھنے والا دبا اپنے دامن میں چھپائے ہے جہاں آئے ہو یہ عشق کو خاک کرنے کے بعد ایک دوسری منزل ہے۔ جسے منزل عرفان کہتے ہیں۔ تم کو اگر اس منزلِ عرفان کی سیر کرنا ہے اور حسن کے پرتو سے تجلیات کا حاصل کرنا ہے تو آؤ نیاز و سجدہ کو اور شائستہ اور مکمل کر لو۔ یہ عالم تحیر ہے جسے علم کی پہلی منزل کہتے ہیں۔ یہی تحیر حاصل نظارہ ہے دیکھو خیرگیٔ نظر سے ہوشیار رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کہتے واپس آؤ:۔ ؎

خیرگیٔ نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں
اور بھی دور ہو گئے آ کے ترے حضور میں

یاد رکھو بارگاہِ حسن میں چلتے تو ہو لیکن کہیں تقاضائے دید نہ کر دینا۔

وہ بارگاہِ حسن ادب کا مقام ہے ۔۔ خبردار وہ اشتیاق تقاضا نہ چاہیئے

ان کے ساتھ ساتھ ہم ایسے مقام پر پہونچ جاتے ہیں جہاں ذوقِ دید جلوۂ حسن میں خود محو ہو کر رہ جاتا ہے اور نظر نور شعاع نور بن جاتی ہے ؎

محو ہے ذوقِ دید بھی جلوۂ حسنِ یار میں
ایک شعاعِ نور ہے اب یہ نظر نظر نہیں

یہاں دنیا کی صبح و شام نہیں ہوتی عروج و زوال کی داستانیں ختم ہو جاتی ہیں ابتدا اور انتہا کا فرق مٹ جاتا ہے اور دلِ حیرت آشنا پر اس عجیب راز کا انکشاف ہوتا ہے ؎

خبر دلِ حیرت آشنا اور کو یہ خبر نہیں
ایک مقام ہے جہاں شام نہیں سحر نہیں

اس بارگاہ حسن تک پہونچ کر شاعر کا یہ حال ہو جاتا ہے ؎

اب نہ کہیں نگاہ ہے اور نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں

ترا جمال ہے، تیرا خیال ہے، تو ہے۔
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں "کہ کیا ہوں میں"

یہیں اصغر کو اس متاعِ عشق کی قدر ہوتی ہے جس کو زندگی میں بارہا دار و رسن کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ "داغ عشق" نہیں "گل تر" تھا جس نے روح میں بیداری پیدا کر دی تھی اور حیات کو بامعنی بنا دیا تھا۔ یہاں پہونچکر نہ چمن کے لٹنے کا افسوس رہ جاتا ہے۔ نہ ماضی کی دلخراش تکلیفیں تکلیفیں رہ جاتی ہیں ؎

دل پہ لیا ہے داغِ عشق کھو کے بہار زندگی
اک گلِ تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا۔

کاش اس گلِ تر کو وہ ہستیاں سمجھ سکتیں جن کی نظریں اب تک خاروں سے الجھی ہوئی ہیں۔ تو پھر کوئی غم غم نہ رہتا۔ کسی نے کیا خوب کہا تھا ؎

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

نامناسب نہ ہوگا اگر اصغر کے تصورِ عشق پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اصغر بھی کچھ اسی نظریے تک پہونچے ہیں جہاں مولانا رومؒ اور علامہ اقبال مرحوم پہونچے تھے۔ ان کے نزدیک بھی دنیا کا نظام۔ ذروں کا رقص، شورشِ کائنات، ہنگامہ ارض و سما، غوغائے عشق کے سوا کچھ نہیں۔ ؎

نظامِ دہر کیا ہے؟ بیتابیوں کے کچھ مظاہر ہیں
گدازِ عشق گویا روح ہے اجزائے عالم کی

نشۂ عشق میں ہر چیز اڑی جاتی ہے
کون ذرہ ہے جو سرشار محبت میں نہیں

؎ کچھ آگ دی ہوس کو تو تعمیرِ عشق کی ۔۔ جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

(اصغر)

علامہ اقبال نے فلسفی کا دماغ اور شاعر کا دل پایا تھا۔ انہوں نے عقل و عشق کی ان کیفیات کو جو بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں ایک ہی زنجیر ارتقا میں منسلک کر دیا تھا۔ اقبال کے نزدیک عقل اگر راز ہستی سمجھتی ہے تو عشق آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ علم اگر خدا جو ہے تو عشق خدا نما۔ عقل اگر کشمکش کا دور سے تماشا دیکھتی ہے تو عشق بے تامل کارزار عمل میں کود پڑتا ہے"۔ لیکن بقول ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے ان دونوں میں بھی اقبال نے حقیقی فرق باقی نہیں رکھا" بلکہ دونوں میں صرف مدارج ارتقا کا فرق ہے ان میں مابہ الامتیاز آرزوئے معرفت کی وہ خاص کیفیت ہے جسے شاعر نے سوز کہا ہے اگر عقل میں یہ سوز پیدا ہو جائے تو وہ عشق بن جاتی ہے"

اصغر کے نزدیک عشق ہی تمام کائنات پر حاوی ہے۔ انہوں نے عقل و عشق کی بحث سے اپنے کو الگ رکھا ہے۔ وہ فلسفی نہ تھے صرف شاعر تھے اور داغ عشق اٹھائے ہوئے اس لئے ان کی نظریں عشق کی اس بلندی پر یا یا ارتقا کی منزلیں طے کئے ہوئے خود بخود پہونچ گئیں۔ ان کی خرد بے چارگیوں کا احساس ایک نرگس خمار آلود ہی نے کرا دیا ؎

کہاں خرد ہے، کہاں ہے نظامِ کار اس کا
یہ پوچھتی ہے تری نرگس خمار آلود

اصغر نے اپنے ابتدائی دور میں اسی عشق کو حاصل منزل سمجھا تھا۔ ؎

عشق ہی سعی مری عشق ہی حاصل میرا
یہی منزل ہے یہی جادۂ منزل میرا (نشاط روح)

لیکن بہت جلد یہ احساس ہو گیا کہ جس آفتاب کی درخشانی سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں وہ جادۂ لقا کے لئے راہ ہدایت تو ہو سکتا ہے لیکن شان معبودیت کا حقدار نہیں بن سکتا۔ یہاں پہونچ کر انہیں حسن و عشق کے تعلق کا احساس ہوتا ہے۔ انہیں ان دونوں میں سے ایک ایسا تعلق نظر آتا ہے جسے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ تکمیل عشق دراصل خود پر تو حسن کا رہین منت نظر آتا ہے ؎

شعاع مہر خود بیتاب ہے جذب محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پرواز شبنم کی

لیکن یاد رہے کہ جہاں ان دونوں حقیقتوں میں ناگزیر تعلق ہے وہاں یہ دونوں اس عالم رنگ و بو میں ایک ہو کر نظر نہیں آسکتیں اس راز کا انکشاف اصغر نے یوں کیا ہے ؎

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

اصغر جادۂ ہستی میں اسی عشق کو اپنا رہبر بنا کر کبھی رسوم و قیود سے دست و گریباں نظر آتے ہیں اور کبھی منازل کے راہ و رسم کے عمومی تصور کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ؎

نیاز عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظ ناداں
ہزاروں بن گئے سجدے جبیں ہم نے جہاں رکھدی

---

بہت سمجھے ہوئے ہے شیخ راہ و رسم منزل کو
یہاں منزل کو بھی ہم جادۂ منزل سمجھتے ہیں

---

کوئی سرگشتۂ راہ طریقت اس کو کیا جانے
یہاں افتادگی کو حاصل منزل سمجھتے ہیں

اسی عشق نے سود و زیاں کے تصور کو ننگ عاشقی قرار دیا اور خالق کی جستجو میں فطرت کی رنگینیوں میں الجھ کر رہ جانا نا مناسب ؎

یہ ننگ عاشقی ہے سود و حاصل دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے
جنون عشق میں ہستی عالم پر نظر کیسی
رخ لیلیٰ کو کیا دیکھینگے محمل دیکھنے والے

غرض اسی عشق نے زندگی میں ان کی کچھ اس طرح رہبری کی کہ

شہود غیب ہوا اور غیب ہو گیا ہے شہود

حسن و عشق کے اس تصور کے بعد جب کائنات عالم پر نظر پڑتی ہے اور دوسرا ہی عالم نظر آتا ہے ؎ ؎

ترا جلوہ، ترا انداز، ترا ذوق نمود ...... اب یہ دنیا نظر آتی نہیں دنیا مجھ کو
کائنات دہر ہے سرشار اسرار حیات ...... ایک مست آگہی کو بیخبر سمجھا تھا میں

اب اس دنیا کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور اسکا صحیح مصرف سمجھ میں آتا ہے۔ ؎

دہر میں نے غنچہ پکھولی راہ ہے پایان عشق
راہبر کو اک فریب رہگزر سمجھا تھا میں
مست و بیخود ہیں، مہ و انجم، زمین و آسماں
یہ تری محفل تھی جس کو رہگزر سمجھا تھا میں

وہی عشق ہے جو ابھی کعبہ و بتخانہ ڈھانے پر تیار تھا بیخود و مدہوش ہو جاتا ہے جسے مخالفت کی تاب نہ تھی۔ ہمدردی کا پہلو لئے نظر آتا ہے اک سکوت و خاموشی کا عالم چھا جاتا ہے، آلام روزگار آسان ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت ہستی کھل جانے کے بعد لطف خواب احساس خواب سے فنا ہو جاتا ہے۔ ایک بیخودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے یہی وہ بیخودی ہے جہاں خودی کی تکمیل ہوتی ہے اور لطف آگہی کا صحیح احساس اس عالم میں کیا جاتا ہے ؎

پھر ڈھونڈھ رہا ہوں بیخودی میں ۔:۔ کھویا ہوا لطف آگہی کا

بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی ۔ شاعر کے ساتھ ہم بھی اس کے عالم لاہوتی میں جا پہونچے ۔ لیکن یہ ضرور محسوس ہو رہا ہے کہ یہ کسی زاہد خشک کی شاعری نہیں بلکہ کسی دلکش عالم کی دلکش ترجمانی ہے ۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اصغر نے غزل کی محدود دنیا میں زندگی بسر کی لیکن اپنے ذوقِ نظر کو محدود نہ ہونے دیا رنگ تغزل کو ایک انوکھے انداز سے سنوارا ، اس طرح نہیں کہ غزل نفسیاتی ہیجان کا مرکز بن جائے انگڑائیاں توبہ شکن ہو جائیں بلکہ اس طرح کہ اس کے حسنِ دل آویز کے سامنے دل کو ہوس کاریوں کا ہوش ہی نہ رہے ۔ جہاں تمکنتِ حسن میں جوابِ عشق تو موجود ہو لیکن خاموشیوں کا وقار لئے ہوئے ۔ اصغر نے سب کچھ کہا ، فنا و بقا ، حیات و ممات ، حسن و عشق ، صبر و رضا ، جبر و اختیار ، لیکن غزل کے حدود میں رہ کر اس کی شوخی اور حیا دونوں قائم رکھتے ہوئے ایک بار سرودِ زندگی کی اس نظر سے بھی ورق گردانی کر لیجئے ۔

کیا گذرتی ہے شبِ غم تم اسی سے پوچھ لو ۔:۔ ایک پیاری سی شکل میری محرم و ہمراز ہے

---

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچۂ و گل کو ۔:۔ مگر موجِ صبا کی پاکدامانی نہیں جاتی

---

الٰہی خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے ۔:۔ ذرا بتوں کو بھی بندہ نواز رہنے دے
حیاتِ تازہ کی رنگینیاں نہ مٹ جائیں ۔:۔ ابھی یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے

---

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری ۔:۔ جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

---

تڑپنا ہے نہ جلنا ہے نہ جل کر خاک ہونا ہے ۔:۔ یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

---

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے ۔:۔ کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے
سحر لائی گی کیا پیغامِ بیداری شبستاں میں ۔:۔ نقابِ رخ الٹ دو خود سحر بیدار ہو جائے
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے ۔:۔ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

---

ہاں اصغر نے سچ کہا تھا ؎

غبار از دامن خود بارہا افشاندہ ام اصغر
بہ ہنگامِ جنوں صد مہر و ماہ کردہ ام پیدا

# نقد و نظر

## سیاسی نظریے

مترجمہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
ناشر، حالی پبلشنگ ہاؤس
صفحات ۹۳، قیمت ایک روپیہ عہ ر

یہ چھوٹی سی کتاب ہیرنشا کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ اصل کتاب میں سات باب ہیں (۱) خطۂ یونان و روما (۲) عیسائیت (۳) ازمنۂ وسطیٰ (۴) نشاۃ الثانیہ (۵) زمانۂ عقلیہ (۶) انیسویں صدی اور (۷) بیسویں صدی، ایک باب مترجم صاحب نے موجودہ زمانہ کے نام سے خود بڑھایا ہے۔ کتاب کے سات باب ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے سیاسی عالم کے لکھے ہوئے ہیں اور اسلئے ان میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جو کسی ایسے اہلِ قلم کی لکھی ہوئی چیزوں میں ہونی چاہئیں، جو اس مخصوص موضوع کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کا تبصرہ کرتا ہے۔ بظاہر یہ کتاب ایک بہت طویل مدت کے سیاسی افکار کا سرسری جائزہ ہے لیکن حقیقت میں مصنف کی قدرت اور مہارت نے اس مختصری کتاب میں اتنا مواد جمع کر دیا ہے کہ یورپ کے سیاسی افکار کی ایک صاف شفاف تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہم نے مدتوں کے مطالعہ اور فکر کے بعد جمع کیا ہے۔ ترجمہ بھی نور الحسن صاحب نے اچھا کیا ہے۔ لیکن ان سات بابوں کے بعد اگر آٹھواں باب نہ ہوتا تو بہتر تھا اس لئے کہ اس کا انداز مفکرانہ ہونے کے بجائے محض صحافتی سا ہے، اور اصل کتاب کے پس منظر میں یہ بات اور بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ایسی کتابیں ہر اردو جاننے والے کو پڑھنی چاہئیں اس لئے کہ تھوڑے سے وقت میں بہت سی مفید مستند اور اہم باتوں کا ایسا بیش بہا ذخیرہ صرف بہت اچھی کتابوں کے ترجمے ہی پڑھ کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کی لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ سرورق بھی دیدہ زیب ہے۔

و۔ع

## شخصیت اور کردار

مصنفہ، جناب شبیر محمد اختر۔
ناشر، ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد دکن۔
صفحات ۱۸۵، قیمت دو روپے عہ ر

پچھلے چند سال سے اردو ادب کی ہر صنف میں لکھنے والوں کا رجحان رفتہ رفتہ نفسیاتی ہوتا رہا ہے۔ افسانہ اور نظم کے علاوہ خود تنقید بھی اس نفسیاتی رجحان سے متاثر ہوئی ہے۔ اور ہماری مختلف طرح کی تحریروں میں اس کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ یہ اثر کچھ تو مغرب کے نئے ادبی اور فکری رجحانات کا پیدا کیا ہوا ہے اور کچھ خود ہمارے اپنے حالات کا۔ ہمارے حالات نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم اب چیزوں کی ظاہری ماہیت کے مطالعہ سے آگے بڑھ کر ان کی اندرونی کیفیتوں کے ہمراز بنیں اور اس طرح اپنی ان ذہنی بیماریوں کا مداوا کر سکیں جو خارجی حالات کی پیداوار ہونے کے باوجود اپنی الگ حیثیت بنا لیتی ہیں اور ان سے انسانی شخصیت اور اس کے کردار کے گرد طرح طرح کے جال بنتے چلے جاتے ہیں۔ نفسیات اور تحلیل نفسی میں انسانی شخصیت اور اس کے کردار کا مطالعہ ہی سب سے اہم چیز ہے۔ اردو والے برابر اپنی بساط کے مطابق ان چیزوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ موضوع ایسا ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی الجھن رہ جائے یا وضاحت کی کمی ہو تو سمجھنے والا بالکل غلط نتیجوں پر پہنچ جاتا ہے۔ شبیر محمد اختر صاحب کی یہ کتاب اسی الجھن کو دور کرنے کی ایک کوشش ہے۔

مصنف نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ شخصیت سے متعلق ہے۔ دوسرا کردار سے۔ پہلے حصہ کو مصنف نے ۹ بابوں میں تقسیم کیا ہے (۱) شخصیت کیا ہے (۲) شخصیت کی خصوصیات (۳) بالغ نظری (۴) جدت پسندی (۵) شخصیت کے منفی پہلو (۶) شخصیت کی خامیاں (۷) موقع شناسی (۸) چند رکاوٹیں (۹) حرف آخر۔ حرف آخر، ہیں گویا کتاب کے پہلے حصہ کا نچوڑ ہے لیکن مجھے یہ محسوس ہوا کہ اس باب میں مصنف کا ناصحانہ تخاطب اس حد سے ذرا زیادہ بڑھ گیا ہے جس پر آکر خالص علمی کتابیں لکھنے والوں کو ٹھیرنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو علمی موضوع کی متانت اور عظمت میں کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہی چیز یہاں بھی کھٹکتی ہے پھر ایک بات اور بھی ہے۔ کتاب کے طرزِ بیان میں میں نے جا بجا یہ محسوس کیا کہ مصنف صاحب اپنی بات کو آسان سے آسان زبان میں، ایک دلنشیں بے تکلفی کے انداز میں کہنا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کہیں کہیں اس میں کہانی کی لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کہانی کی لذت جہاں تک میرا تجربہ ہے ٹھوس علمی مباحث میں لذت نہیں دیتی۔

کتاب کے دوسرے حصہ کردار کے ۱۰ حصے ہیں (۱) مختلف اجزا (۲) سکون (۳) دکھ (۴) تقدیر (۵) کمزور جذبات (۶) خوف (۷) غصہ اور جوش (۸) خوشی (۹) کاروبار اور (۱۰) روزمرہ زندگی۔ اس حصہ میں بھی اختر صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی روانی اور بے تکلفی سے کیا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ موضوع پر غور و فکر کر کے سب کچھ لکھا ہے۔

اس کتاب کی جو علمی اور تعلیمی حیثیت اور افادیت ہے، وہ میرے خیال میں اور بڑھ جاتی اگر شبیر محمد اختر صاحب زبان و بیان کے معاملہ میں اتنی سادگی (اور کہیں کہیں رنگینی) کو اپنے اوپر لازم نہ کر لیتے۔

کتاب دیدہ زیب ہے۔ لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے اور سرورق بھی۔

## سیتا رام

مصنفہ طالب الہ آبادی، ناشر جعفری برادرس الہ آباد۔
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے عہ، سرورق رنگین اور مصور۔

رامائن، مہابھارت اور بھگوت گیتا تین ایسی کتابیں ہیں جو ہندوستان کی ادبی، معاشرتی، تمدنی اور فکری روایات کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ ان تینوں کتابوں کے ترجمے دنیا کی اکثر مشہور زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اردو میں بھی ترجمے ہوئے اور ان میں سے کئی ترجمے منظوم ہیں۔ سیتا رام جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سیتا اور رام کی منظوم کہانی ہے۔ طالب

طالب صاحب نے رنجیت سنگھ جی کی پیدائش سے لے کر ان کے راج تک کے سارے اہم واقعات کو نظم کا لباس پہنایا ہے۔ ان کی زندگی کے ہر دور یا زندگی کے ہر اہم واقعہ پر ایک نظم لکھی ہے۔ لیکن یہ نظمیں سب کی سب الگ الگ ٹکڑوں میں ہیں۔ اور اس لئے پوری کتاب میں وہ لطف نہیں جو تسلسل سے پیدا ہوتا ہے۔ ہاں یہ فائدہ ضرور ہے کہ ہر نظم بجائے خود مکمل ہے اور اسے دوسری نظموں سے الگ کر کے پڑھا جا سکتا ہے۔ کتاب بچوں کے لئے بے حد دلچسپ ہے۔

## ہندوستانی جنتری سنہ ۱۹۴۷ء

مرتبہ جناب محمد فرقان علی صاحب بلندی

ناشر بک اسٹال بک ڈپو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ قیمت چھ آنے

جنتری ہماری زندگی کے لئے بڑی ضروری چیز ہے۔ انسان کا ہر کام زمان و مکان کا پابند ہے۔ اگر انسانی زندگی سے پابندی کسی طرح اٹھ جائے تو اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس میں کیا افراتفری، کیا ہیجان پیدا ہو جائے۔ اسی اہم ضرورت کے پیش نظر ہر نئے سال سے پہلے طرح طرح کی جنتریاں شائع ہوتی ہیں۔ یہ جنتری بھی ایسی ہی بہت سی جنتریوں میں سے ایک ہے۔ کتاب میں سنہ ۱۹۴۷ء کی جنتری کے علاوہ، اسلامی اور ہندی مہینے اور تاریخیں بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ ایک صفحہ پر پچھلے تین سال اور اگلے ایک سال کی جنتری بھی درج ہے۔ پھر ملک کی بے شمار مفید معلومات ہیں۔ ڈاک اور تار وغیرہ کے قاعدے لکھے ہوئے ہیں۔ جا بجا مذہبی اور تاریخی موضوع پر دلچسپ مضمون بھی ہیں۔ اور اس طرح یہ جنتری خاصی مفید معلومات کا مجموعہ ہے۔ اشتہار بھی کتاب میں کثرت سے ہیں۔ لیکن اگر دواؤں کے بعض اشتہار نہیں نہ ہوتے تو یہ جنتری ہر چھوٹے بڑے کے ہاتھ میں جا سکتی تھی۔

## مقاصد قرآن

مصنفہ مولانا صبغت اللہ بختیاری۔

ناشر مکتبہ نشاۃ ثانیہ، مچھلی کوڑہ، حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲ر

رسالہ ترجمان القرآن میں ایک مسلسل مضمون کوئی دو سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ اسی مسلسل مضمون کو اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

اس رسالہ کی بنیاد اس خیال پر رکھی گئی ہے کہ "ایمان بالرسالت" کا عقیدہ صحیح ہے یا نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب مختلف علما نے مختلف طریقوں سے دیا ہے۔ اس رسالہ کے مولف نے قرآنی آیات اور احادیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "واسطۂ رسالت توحید کے مرتبۂ اعتقادی اور اس کی صحت کے لئے اور عمل صالح عملی زندگی کے لئے بطور نمونہ کے کس قدر ضروری ہے"۔

بحث ہر جگہ منطقی اور مدلل ہے لیکن کہیں کہیں یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ مولف کا لہجہ ذرا تیز اور سخت ہو گیا ہے۔ یہ انداز اس طرح کے رسالوں میں کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس طرح مختلف الخیال لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا بھی ممکن نہیں۔



## آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

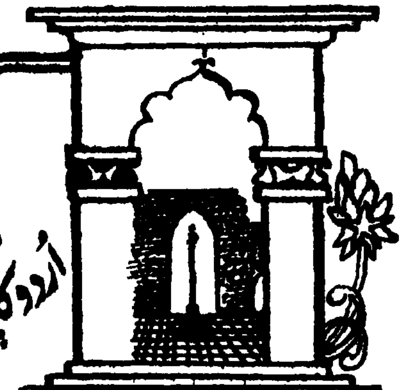


مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۲۶ سے شائع کیا



# آجکل

اردو کا پندرہ روزہ



سالانہ چندہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۶ | ۱۵ جنوری ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست



مدیر اعلیٰ: سید وقار عظیم ایم۔ اے

ناشر: فضل حق قریشی دہلوی

مدیران: بھگت سروپ کھلر ایم۔ اے = سید فاق حسین آفاق بی۔ اے

ادارۂ مطبوعاتِ متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

# رفتار زمانہ

## ۲۱ اور ۲۵ دسمبر

جمہوریۂ روس کے صدر جنرلیسمو جوزف اسٹالن ۲۱ر دسمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ پچھلے مہینے کی اکیس تاریخ کو سوویت روس کے گوشے گوشے میں ان کی سترھویں سالگرہ کے جشن منائے گئے۔ دنیا کے ہر حصے سے تہنیت و مبارکباد کے پیغام آئے اور ہر جگہ انکی درازیٔ عمر کی دعا مانگی گئی۔ مسلمانانِ ہند کے قائد اعظم محمد علی جناح ۲۵ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ پچھلے مہینے کی پچیس تاریخ کو اس ملک کے گوشے گوشے میں انکی سترویں سالگرہ کے جشن منائے گئے۔ دنیا کے ہر حصے سے تہنیت و مبارکباد کے پیغام آئے اور ہر جگہ ان کی درازیٔ عمر کی دعا مانگی گئی۔ صفحاتِ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں دن بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ۲۵ر دسمبر کو حضرت عیسیٰ کی تاریخ پیدائش تصور کر کے تمام نصرانی دنیا خوشیاں مناتی ہے۔ کرسمس کا تہوار اس کی یادگار ہے لیکن ولادتِ مسیح سے بہت پہلے بھی یہ یوم سعید دنیا والوں اور خصوصاً یورپ کے بہت بڑے حصے کے باشندوں کے لئے مسرت و شادمانی کا دن رہا ہے جس طرح چاند ہر قمری مہینے کی آخری تاریخوں میں چند دن کے لئے بالکل غائب ہو جاتا اور پھر پہلی تاریخ کو طلوع ہوتا ہے، اسی طرح سورج بھی یورپ کے بہت سے ملکوں میں ۲۱ اور ۲۵ر تاریخوں کے درمیان نظر نہیں آتا۔ قدیم باشندے جو نظام شمسی کی حقیقتوں میں سے گردشِ زمین کی نوعیت کو بالکل نہ سمجھتے تھے، ان دونوں دنوں کو بڑی اہمیت دینے لگے۔ انہوں نے قیاس کیا کہ سورج ۲۱ر دسمبر کو مر کر ۲۵ر دسمبر کو دوبارہ زندہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ چار دن تک سوگ مناتے اور ۲۵ سے ایک جشنِ عام برپا کرتے تھے کیونکہ اس روز طلوعِ آفتاب کو آفتاب کی حیاتِ نو تصور کرتے تھے۔ چنانچہ صدیاں گذرنے کے بعد آج بھی عیسائیوں کے علاوہ بہت سے دوسرے مذاہب کے پیرو ۲۵ر دسمبر کو مقدس اور بھاگوان سمجھتے ہیں۔ اس قدیم عقیدے کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر جناح کے جنم دن پر جو حضرت عیسیٰ کا بھی جنم دن ہے، سورج کو حیاتِ نو نصیب ہوتی ہے۔

## تبتی رسالہ

جدید تہذیب و تمدن سے دور ہمالیہ کے دامن میں بسنے والے ملک تبت کے متعلق یہ پڑھ کر کسقدر تعجب ہوا کہ وہاں سے ایک اعلیٰ معیاری رسالہ شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے کی اشاعت لاماؤں کی پُر اسرار سرزمین اور تجارتی شہر کالمپانگ سے عمل میں آتی ہے! اسکا نام "یُول چوگ سو سوئی سارگیور میلونگ" ہے جسکا لفظی ترجمہ "آئینۂ تبت" کیا جا سکتا ہے۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۵ء کو اسکا پہلا شمارہ "رونیو" کے ذریعہ شائع ہوا تھا۔ اس کے خریدار صرف چودہ تھے۔ عرصہ تک یہی تعداد رہی حتیٰ کہ اب اکیس سال بعد جبکہ وہ لیتھو پریس کے ذریعہ شائع ہوتا ہے، خریداروں کی تعداد تلو ہے۔ وہ پانچسو کاپیاں خریدتے ہیں۔ اس کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر مسٹر جی تھارچن ہیں جو تبت کے ایک اعلیٰ ماہر علم اور ادیب سمجھے جاتے ہیں انہیں بہت سے غیر ملکیوں کو اپنے وطن کی زبان سکھانے کا فخر بھی حاصل ہے۔ اس رسالے میں صرف مقامی کوائف ہی درج نہیں کئے جاتے بلکہ واقعاتِ عالم سے تمام باشندگانِ ملک کو آگاہ کیا جاتا ہے۔ اس کے تازہ ترین شماروں میں ایک مسلسل مضمون یعنی مسٹر اے ٹی اسٹیل کا سفرنامۂ تبت شائع ہو رہا ہے۔ نیز انگریزی زبان کے ذریعہ سے تبتی صرف و نحو پر سبق دئے جا رہے ہیں تاکہ جو لوگ سیکھنا چاہیں انکی مدد سے تبتی سیکھ لیں۔

## فنونِ لطیفہ کی نمائش

نئی دہلی کے ایوانِ نمائش میں جو پارلیمنٹ اسٹریٹ پر واقع ہے ۱۰ر فروری ۱۹۴۸ء کو فنونِ لطیفہ کی نمائش کا افتتاح ہوگا جسے آل انڈیا فائن آرٹس اینڈ کرافٹس سوسائٹی کی جانب سے انٹیلیجنس بیورو کے ایک افسر مسٹر ایل بی گی ترتیب دے رہے ہیں۔ اس نمائش کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حکومتِ ہند کے صرف سرکاری ملازمین اپنے اپنے شاہکارِ فن پیش کر سکیں گے۔ چنانچہ موصوف نے تمام محکموں کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنے ماتحت عملے کے ان لوگوں کو جو فنونِ لطیفہ سے شغف اور دلچسپی رکھتے ہیں، اس نمائش کو کامیاب بنانے کے لئے آمادہ کریں۔ اس نمائش کا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ سرکاری ملازمین میں، جن میں اعلیٰ افسران سے لے کر ماتحت اہلکار تک سبھی شامل ہونگے، اچھے ہنرمند اور فنکار موجود ہیں۔ نمائشی اشیاء میں سب سے بڑا حصہ ان تصاویر کا ہوگا جو امپیریل ایگریکلچرل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے افسر ڈاکٹر بی پال اور پوسا آرٹ کلب کے اراکین پیش کرینگے۔

## مولانا ابوالکلام آزاد

یہ امر موجبِ مسرت ہوا تھا کہ مسٹر آصف علی کو سفیر بنا کر امریکہ بھیجدیا گیا۔ اب مزید خوشی

اس خبر کے سننے سے حاصل ہوئی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد انکی جگہ عارضی حکومت میں شامل ہوگئے ہیں۔ مولانا کی ابتدائی زندگی یکسر علمی اور ادبی خدمات میں گذری ہے، اور اب بھی اگرچہ پورے انہاک کے ساتھ نہیں، تاہم کبھی کبھی ادبی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا زیادہ وقت سیاسی معاملات کو سمجھنے اور سمجھانے میں بسر ہوتا ہے۔ وہ ۱۹۱۲ء میں کانگریس میں شامل ہوئے اور اسوقت سے ابتک اس کے ایک سرگرم رکن ہیں۔ تین بار انہیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔ آخری بار یہ انتخاب ۱۹۴۰ء میں ہوا اور وہ مسلسل پانچسال تک اس عہدے پر فائز رہ کر اس سیاسی جماعت کی اعلیٰ خدمات انجام دیتے رہے۔

## سڑکوں اور ریلوں کی توسیع

امریکہ روانہ ہونے سے قبل مسٹر آصف علی نے ملک کے ذرائع حمل و نقل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان میں سڑکوں اور ریلوں کو توسیع دینے کی سخت ضرورت ہے۔ ریلیں، ہوائی جہاز اور ساحل کے آبی جہاز براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت ہیں اور سڑکوں کا نظام صوبائی حکومت کے سپرد ہے لیکن باہمی مفاہمت کے ساتھ انکو بھی کل ہند پیمانے پر بنایا جاسکتا ہے۔ صرف اندرونِ ملک ہی میں سڑکوں اور ریلوں کو توسیع دینے کی ضرورت لاحق نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی سیاست کے ماتحت انکو پڑوسی ملکوں تک طول دینا ضروری ہوگیا ہے۔ چنانچہ پشاور ریڈیو اسٹیشن سے تقریر کرتے ہوئے شمال مغربی سرحدی صوبے کے وزیر اعظم ڈاکٹر خان صاحب نے فرمایا کہ کاغان وادی سے گذرنے والی سڑک کو براہ راست چین اور روس تک بڑھانے کی اسکیم زیرِ غور ہے اور اسے بہت جلد عملی جامہ پہنانا شروع کردیا جائیگا۔ اس سلسلے میں اخراجات کا زیادہ حصہ مرکزی حکومت کو برداشت کرنا پڑے گا لیکن کام صوبائی حکومت کے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے ذریعہ ہوگا۔ اس منصوبہ کے علاوہ ایک اور اہم تجویز بھی زیرِ غور ہے۔ یعنی شمال مغربی سرحدی صوبے کو ریل کے ذریعہ کابل سے ملا دیا جائے گا۔ حکومتِ افغانستان بھی ایک ایسی ہی اسکیم پر غور کر رہی ہے۔ دونوں ملکوں کے مابین تجارتی اور ثقافتی تعلقات تو اب بھی موجود ہیں لیکن اس طرح وہ زیادہ استوار ہوجائیں گے۔

## جاپان میں زلزلہ

کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ عذابِ آلٰہی مختلف صورتوں میں نازل ہوا کرتا ہے۔ اربابِ سیاست کے غلط اندازوں اور کوتاہ اندیشیوں سے جاپان میں جان و مال کو جو نقصانِ عظیم پہنچا، اس کی تلافی بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ زلزلے کے شدید جھٹکوں نے اہلِ ملک کے لئے عرصۂ حیات تنگ کردیا۔ ہزاروں مرگئے، ہزاروں زخمی اور لاپتہ ہوئے اور لاکھوں بے خانماں برباد ہوگئے۔ ہیروشیما میں جو کچھ ایٹم بم کی تباہی سے بچا رہ گیا تھا، اس زلزلے کی نذر ہوگیا۔ امدادِ باہمی اور فلاحِ مشترک کی وہ انجمنیں جو برابر مصیبت زدگانِ جنگ کی مدد کر رہی تھیں اب اپنا دستِ تعاون اس ضمن میں بھی بڑھا رہی ہیں۔ اشیائے خورد و نوش کے علاوہ پارچہ جات اور دوا کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ بعض علاقوں میں جہاں لڑائی کے باعث حمل و نقل کے ذرائع مسدود ہوگئے تھے یہ امداد ہوائی جہازوں کے ذریعہ ممکن ہوئی ہے۔

## سندھ میں تین بجلی گھر

حکومتِ سندھ نے اپنے صوبے کی ترقی اور بہتری کے لئے برق آبی بنانے والے کارخانوں کے تین اہم خاکے مرتب کئے ہیں جن کو بہت جلد عمل میں لانے کے لئے تقریباً پانچ کروڑ روپے صرف کرنے پڑینگے۔ پہلا بجلی گھر دریائے روہڑی کے کنارے سکھر کے قریب تعمیر ہوگا جو دس ہزار کلوواٹ کی بجلی تیار کرسکیگا۔ جب نہر کے پانی میں کمی واقع ہوگی یا کسی اور وجہ سے خاص ضرورت لاحق ہوگی تو یہ کارخانہ بہت ہی مفید ثابت ہوگا۔ اس اسکیم کے دائرے میں سکھر کے علاوہ روہڑی، شکارپور، جیکب آباد، لاڑکانہ، خیرپور، رانودیرو، کمبر، گڑھی یاسین، شاہ دادکوٹ، ٹھوکری، بدہ، نصیرآباد، شکارپور، رستم، پیروگوٹھ، سیہون، لاکھی، آرین روڈ، جاک، ہاگرجی، جہان خان اور ہمایوں شامل ہیں۔ راستے میں جو دیہات آئیں گے، ان کا خیال بعد میں رکھا جائے گا۔ جب تک یہ اسکیم عمل میں آئے گی تیل سے چلنے والا انجن اس کی جگہ کام کرے گا۔ دوسرا بجلی گھر ٹنڈو ریلوے اسٹیشن کے پاس بنے گا۔ اور پانچ ہزار کلوواٹ کی بجلی تیار کرے گا۔ اس سے حیدرآباد کے علاوہ نواب شاہ، ٹنڈو محمد خاں، ٹنڈو اللہ یار خاں وغیرہ کو فائدہ پہنچیگا۔ تیسرا بجلی گھر مشرقی نہر نارہ کے کنارے بنے گا اور ساڑھے سات ہزار کلوواٹ کی بجلی تیار کرے گا۔ لیکن اس کی تعمیر اسوقت عمل میں آئے گی جب روہڑی نہر کی اسکیم تکمیل ہوجائیگی۔

## جرمنی کے جنگی مجرم

جرمنی کے برطانوی علاقے میں ہزاروں جرمن نظر بند ہیں۔ ان میں سے ستائیس ہزار اشخاص پر جنوری کے آخری ہفتے میں مقدمات کی کارروائیاں شروع ہونگی۔ زیادہ لوگ ان سیاسی اداروں سے تعلق رکھتے ہیں جن کو نورمبرگ کی جنگی عدالت عالیہ نے "مجرم" قرار دیا تھا۔ یہ مقدمے جرمنی کی عام عدالتوں میں ہونگے۔ ان اداروں سے تعلق رکھنے والے اور ہزاروں مجرم ابھی نظر بند ہی رہیں گے اور اپنی باری آنے پر اپنی صفائی پیش کرسکیں گے۔ برطانوی علاقے کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بھی ایسے قیدیوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ جلدی یا دیر میں بہرصورت ان پر مقدمے چلائے جائیں گے اور ان کو بھی اپنے کئے کی سزا انہیں بھگتنی پڑیگی۔

## چینی اشتراکیوں کی حکومت

پی کنگ کے مرکزی خبر رساں ادارے نے اطلاع دی ہے کہ چینی اشتراکیوں کا ایک جلسہ ان کے صدر مقام ین نان میں ہوا جس میں جماعت کے تمام بڑے اراکین کے علاوہ ماؤ تسی تنگ، چوتیہ اور جنرل چو این لائی بھی شامل ہوئے۔ انہوں نے باتفاقِ رائے فیصلہ کیا کہ نانکنگ کی مرکزی حکومت کے مقابلے پر انہیں بھی اپنی حکومت قائم کرلینی چاہیئے تاکہ صحیح نظام قائم ہوسکے۔ انہوں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اپنی ہوائی طاقت کو زیادہ استوار اور اقتصادی حالت کو بحال کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ اپنی قومی کارگزاریوں کا ساری دنیا میں پرچار کرنے

سکے لیئے انہوں نے ایک خاکہ بنایا ہے جس کے مطابق جینی اشتراکیوں کے ادارے برطانیہ، امریکہ اور فرانس میں کھولے جائیں گے۔ صدر مقام سے ایسے احکام بھی صادر ہوئے ہیں جن کی رو سے ان ضلعوں اور دیہاتوں میں جہاں اشتراکیوں کا تسلط ہے، تیاریٔ جنگ کی کمیٹیاں قائم کی جائیں گی تاکہ وقت ضرورت وہ فوراً لڑائی میں حصہ لے سکیں۔

## ہندوستان اور آبپاشی

حال ہی میں آبپاشی کے مرکزی ادارے نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس کے مطالعے سے چند نہایت دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ آبپاشی کے ضمن میں دنیا کا کوئی ملک ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس ملک کی تقریباً سات کروڑ ایکڑ اراضی میں ہر سال آبپاشی ہوتی ہے اور یہ رقبہ اتنا زیادہ ہے کہ امریکہ، روس، میکسیکو، جاپان، مصر، ہسپانیہ، اطالیہ، فرانس، چلی اور جاوا کے زیر کاشت علاقے مجموعی طور پر اس کی برابری نہیں کر سکتے۔ اگر ملک کے کل رقبے کو مدنظر رکھتے ہوئے آبپاشی کے علاقے کا تناسب نکالا جائے تب بھی اس ملک کا اوسط دنیا کے دوسرے تمام ملکوں سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں آبپاشی کے کام پر کم و بیش ایک ارب چھپن کروڑ روپے سالانہ صرف ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ نہریں اور اعلیٰ قسم کے بند بھی اس ملک میں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان کی تمام نہروں کو ایک سلسلے میں رکھا جائے تو کرۂ ارض کے گرد تین چکر لگ جائینگے۔ ہندوستان کے ریتیلے علاقوں میں برق آبی کے ایسے کارخانے قائم کئے گئے ہیں کہ ان کی مثال دنیا بھر میں کہیں نہیں مل سکتی بلکہ ان کا لحاظ رکھتے ہوئے دوسرے ملکوں نے استفادہ کیا ہے۔ آبپاشی کی نہروں میں ہمیشہ روانی قائم رکھنے کے لئے جو طریقے یہاں قائم کئے گئے ہیں وہ دنیا کے کسی ملک کو ابتک معلوم نہیں تھے۔ ان حقائق کو مدنظر رکھکر کہا جا سکتا ہے کہ آبپاشی کے معاملے میں ہندوستان ساری دنیا کا راہنما ہے۔

## کہر بارش کی صورت میں

گلاسگو کے ایک مشہور کیمیاں داں مسٹر میکنزی نے جن کی عمر اس وقت بہتر سال ہے، مسلسل تجربات کرتے رہنے کے بعد دعویٰ کیا ہے کہ میں ایک ایسا کیمیاوی مرکب تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جو کہر کو بارش کی صورت میں تبدیل کر لیا کرے گا۔ یہ مرکب "فیدو" سے بھی زیادہ موثر اور کم خرچ ثابت ہو گا۔ انہوں نے مرکب کے ساتھ ساتھ ایک مشین بھی بنائی ہے جو اس خاص مرکب کو کہر آلود فضا میں پھیلا دیگی۔ اس دوا کے اثر سے کہر کی بیرونی سطح کا دباؤ کم ہو جائیگا اور رطوبت جو گیسوں کی حالت میں ملی جلی ہوگی، سیال ہو کر سطح زمین پر برس پڑے گی۔ اس طرح ایک طرف ان نقصانات سے بچنا ممکن ہو جائیگا جن سے کہر کے زیر اثر سامنا کرنا پڑتا ہے اور دوسری طرف بارش میدانوں اور کھیتوں کے لئے مفید ثابت ہو سکے گی۔

## برطانیہ میں فلمی سرگرمیاں

جنگی تخریبات کے باعث ہر قسم کے تعمیری کاموں میں زبردست رخنے پیدا ہو گئے تھے اور ۱۹۳۹ء کے بعد سے ابتک بہت سے ادارے پورے جوش و خروش اور سرگرمیٔ عمل کے ساتھ اپنی کارگذاریاں پیش کرنے سے قاصر رہے تھے۔ تاہم اب برطانیہ میں فلمی پروڈیوسروں کی انجمن نے دو سال کا جو لائحۂ عمل پیش کیا ہے، وہ ایک حد تک حیرت انگیز ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد وہاں کے اس ادارے نے بڑی ترقی کی کیونکہ ۱۹۴۵ء میں باون اور ۱۹۴۶ء میں ساٹھ فلم بنا ڈالے۔ لیکن اس سال اس نے چوہتر فلم بنانے کا تہیہ کیا ہے جن پر بے قیاس رقم خرچ کی جائے گی۔ اگر اوسطاً ان میں سے ہر ایک فلم پر دو لاکھ پونڈ خرچ ہوئے تو کل فلموں پر ڈیڑھ کروڑ پونڈ صرف کرنے پڑینگے۔ پھر بعض ایسے فلم بھی تیار ہونگے جو دس لاکھ پونڈ سے کم میں نہیں بن سکتے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ صنعتی ادارہ مستقبل قریب میں بہت ترقی کرے گا۔ انجمن کے ڈائرکٹر جنرل سر ہنری فرنچ نے ان امور کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ فلموں میں افادی عنصر کا زیادہ لحاظ رکھا جائے گا۔

## محکمۂ ریلوے کے نئے منصوبے

دسمبر کے آخری ہفتے میں ریلوے کی اسٹینڈنگ فائنس کمیٹی کا جلسہ نئی دہلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت مسٹر آصف علی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں لائحۂ عمل منظور ہوا ہے، جسپر پچاس کروڑ لاگت آئے گی۔ کمیٹی مذکور نے طے کیا ہے کہ ساڑھے گیارہ کروڑ روپے کے خرچ سے کنچرا پارہ کے مقام پر ایک عظیم الشان کارخانہ قائم کیا جائے جہاں ہر سال ایک سو بیس انجن اور پچاس بوائلر بنا کریں۔ کام اس طرح شروع کیا جائے گا کہ دسمبر ۱۹۵۰ء تک پہلا انجن تیار ہو سکے گا۔ اس سلسلے میں ۱۹۴۷-۴۸ء کے دوران میں ساڑھے پانچ کروڑ صرف کئے جائینگے۔ بی بی اینڈ سی آئی ریلوے کی لائنوں پر بنے ہوئے بہت سے پلوں کی مکرر تعمیر یا مرمت ہوگی اور بعض پلوں کے صرف پائے درست کئے جائینگے۔ دو ایک ریلوے اسٹیشنوں کو جدید وضع پر دوبارہ تعمیر کیا جائے گا۔

پچھلے سال یکم اپریل سے ۳۰ نومبر تک کل آمدنی ایک ارب بیس کروڑ اٹھانوے لاکھ ہوئی جو اس سے ایک سال پہلے کے اسی عرصے کی آمدنی کے مقابلے بقدر چودہ کروڑ ستاون لاکھ کم ہے۔ یکم اپریل سے ۳۱ اکتوبر تک کل خرچ اناسی کروڑ چار لاکھ رہا جو ایک سال پہلے کے اسی عرصے کے خرچ کے مقابلے میں بقدر نو کروڑ تین لاکھ زیادہ ہے۔

# غزل

**صفی لکھنوی**

پہونچا کہاں پہ لے کے مرا رہنما مجھے
آیا نظر جہاں نہ کوئی نقشِ پا مجھے

پیغام زندگی نے دیا موت کا مجھے
مرنے کے انتظار میں جینا پڑا مجھے

ہنگامِ دفن دی یہ لبِ گور نے صدا
جو کچھ دیا تھا میں نے وہ سب مل گیا مجھے

گھر سے چلا تھا کوچۂ جاناں کے قصد سے
یادش بخیر بھول گیا راستہ مجھے

اس انقلاب کی بھی کوئی حد ہے دوستو!
ناآشنا سمجھتے ہیں اب آشنا مجھے

انسانیت یہ کہہ کے یہاں سے چلی گئی
راس آئے گی نہ ہند کی آب و ہوا مجھے

کشتی پہنچ سکیگی یہ تا ساحلِ مراد؟
دھوکا نہ دے خدا کیلئے ناخدا مجھے

ایذا رساں وہ شوخ تو ایذا پسند میں
ملتا ہے ہر جفا میں وفا کا مزا مجھے

نافہم پارسا تو سمجھتے ہیں مجھکو رند
فہمیدہ رند جانتے ہیں پارسا مجھے

انصاف کی تلاش میں اس کی خبر نہ تھی
سہنا پڑینگے یوں ستمِ ناروا مجھے

پروردگار تو ہی بڑا کارساز ہے
تیرے سوا کسی کا نہیں آسرا مجھے

وہ طولِ عمر جسمیں نہو لطفِ زندگی
مل جائے مثلِ خضر تو کیا فائدہ مجھے

دوں تیرا ساتھ عمرِ رواں کس طریق سے
آنکھیں دکھا رہے ہیں ترے نقشِ پا مجھے

ہر داغِ دل ہے مشہدِ صد خیلِ آرزو
کعبے میں آ رہی ہے نظر کربلا مجھے

تخلیقِ کائنات کو سوچا کیا، مگر
کچھ ابتدا ملی، نہ صفیؔ انتہا مجھے

# سر عبدالقادر

ڈاکٹر محمد باقر

"سر عبدالقادر سے ملنے چلوگے؟" محمود نے پوچھا۔

"چلینگے" میں نے جواب دیا۔

"تو کل ناشتے کے بعد فوراً میرے پاس پہنچ جانا۔ میں ان سے وقت طے کر رکھوں گا۔ ویسے اس کی خاص ضرورت نہیں"۔

"خاص ضرورت نہیں! کیوں؟"

"تم دیکھ ہی لوگے" محمود نے اپنی فیلٹ ڈاکوتوؤں کے انداز میں ترچھی کرکے سر پر رکھی اور مسکراتا ہوا شب بخیر کرکے چلا گیا۔

دوسرے دن ناشتے سے کچھ ہی دیر بعد ہم ایک نہایت ہی خاموش ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوکر دروازے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ معاً دروازہ کھلا اور فرنگی خادمہ نے لندن کی دسمبر کی سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے کواڑ کھولتے ہوئے ہم سے پوچھا۔

آپ سر عبدل سے ملنے آئے ہونگے؟

میں نے تبسم زیرلب سے خادمہ کی قیافہ شناسی کی داد دیتے ہوئے کہا ہاں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ہماری اطلاع دے دیجئے؛

ملازمہ نے دروازہ کھول دیا۔ "اطلاع کی ضرورت نہیں۔ آپ میرے پیچھے پیچھے چلے آئیے"۔

میں نے سوچا محمود درست کہتا تھا۔ سر عبدالقادر کے دروازے ہر ایک ملاقاتی کے لئے کھلے تھے۔ ہم زینے کے قالین (لندن میں تمام زینوں پر قالین بچھے ہوئے ہوتے ہیں) کی صفائی اور خوبصورتی کی داد دیتے ہوئے خادمہ کے پیچھے پیچھے چلتے گئے اور زینہ ختم ہونے پر جب ایک دروازے کے سامنے رک کر دروازہ پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی "آئیے"۔ خادمہ نے دروازہ کھولا اور کہا "سر عبدل آپ سے دو نوجوان ملنے آئے ہیں"۔ اتنے میں ہم بھی دروازے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔

سر عبدالقادر نے کھڑے ہوکر ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور بڑے تپاک سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ محمود نے میرا تعارف کرایا اور میرے لندن آنے کی وجہ بھی بیان کی۔ آپ نے اردو ادب سے میری دلچسپی کا حال سنکر پوچھا۔

"آپ سے لاہور میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی؟"

میں نے عرض کیا "آپ سے غائبانہ عقیدت تو ایک عرصے سے ہے لیکن آپ سے ذاتی ملاقات کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی۔ البتہ آج سے دس سال پہلے صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں ۱۹۲۷ء میں آپ کی ایک تقریر سننے کا فخر حاصل ہوا تھا جب آپ حکومت ہند کے نمائندے کی حیثیت سے بین الاقوامی لیگ میں شامل ہوکر جنیوا سے لوٹ کر آئے تھے اور آپ نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ ایک یورپین نے وہاں دنیا کے تمام مذاہب کے پیروؤں کی کانفرنس بھی کی تھی"۔

کہنے لگے "ہاں خوب یاد آیا۔ میں حال ہی میں اس آدمی سے پیرس میں ملا ہوں" اور اس کے بعد آپ نے اس وقت یعنی ۱۹۳۷ء میں وہ تمام خیالات دہرا دیئے جو آپ نے دس سال قبل ہمارے سامنے ۱۹۲۷ء میں بیان کئے تھے اور جو مجھے دھندلے طور پر بھی یاد نہ تھے لیکن میری ڈائری (جو اس وقت بھی لندن میں میرے ساتھ تھی) ان کی تصدیق کرتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ سر عبدالقادر کا حافظہ غیر معمولی ہونا چاہئیے۔ بعد میں اس خیال کی تصدیق بارہا عملی طور پر ہوئی۔ آپ نے کسی آدمی کو سر عبدالقادر سے اگرچہ چند منٹوں کے لئے بھی ملایا اور برسوں کے بعد جب دوسری دفعہ آپ سے ملا تو آپ نے اسے اس کے نام سے مخاطب کیا اور اچھی طرح پہچانا۔ رفتہ رفتہ مجھے یہ یقین ہوگیا ہے کہ اس قدر کثیر مشاغل اور اس قدر لوگوں سے ملنے والے آدمیوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جس کو اپنے حافظہ پر اس قدر قدرت حاصل ہو بلکہ سچ پوچھئے تو میں نے اپنی عمر میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں دیکھا۔

ہم کچھ دیر سر عبدالقادر کے پاس بیٹھے رہے وہ اپنے تازہ سفر کے حالات بیان کرتے رہے۔ آپ ابھی ابھی ہندوستان سے رخصت ختم کرکے واپس آئے تھے گفتگو کے دوران میں آپ نے یہ بھی بتایا کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری بھی ہندوستان سے ان کے ساتھ آئے ہیں۔ کہنے لگے "ہندوستان سپیکنگ یونین" میں آئیے۔ لطف رہے گا۔ حفیظ بھی آئینگے۔ سر عبدالقادر اس مجلس کے صدر اور روح رواں تھے اور دیوان شرر سکرٹری۔ اور اس مجلس کے رکن وہی ہوسکتے تھے جو اس مجلس کے جلسوں میں اردو میں گفتگو کریں۔ یونین کے جلسے نہایت باقاعدگی سے ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے کمرہ میں ہوتے تھے اور اس میں کثرت سے ہندوستانی اور اردو علم وادب سے دلچسپی رکھنے والے فرنگی بھی شامل ہوتے تھے۔ گویا لندن میں اردو کا مجلسی ہنگامہ سر عبدالقادر کی وجہ سے اس مجلس کے زیر اہتمام قائم رہتا تھا۔ جب حفیظ وہاں پہنچے تو اس مجلس کی مقبولیت اور بھی بڑھ گئی اور ہر جلسے میں لندن کے علاوہ آکسفرڈ، کیمبرج، گلاسگو اور برسٹل سے لوگ آنے لگے۔ نجانے سر عبدالقادر کے لندن سے چلے آنے کے بعد اس مجلس کا کیا حشر ہوا!

جن آدمیوں کو سر عبدالقادر سے مجلس میں ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی تصدیق کرینگے کہ مجلسی حیثیت سے آپ کا رتبہ بہت بلند ہے بلکہ یہ کہنا چاہئیے۔ کہ آپ ایک ایسے مجلسی فنکار ہیں جن کا ہم پلہ شاید ہی

کوئی دوسرا ہو۔ آپ گھنٹوں ان کی باتیں سنتے رہیں تو سیری نہ ہوگی۔ بلکہ یہی جی چاہے گا کہ زندگی فرصت دے تو کچھ لمحے اور آپ کے پاس بیٹھے رہیں۔ آپ نے بہت سیاحت کی ہے اور دنیا کے مختلف ممالک کی اہم شخصیتوں سے مل چکے ہیں لہذا آپ ان سے کسی موضوع پر کسی ملک کا ذکر کریں تو وہ اپنے ذاتی تجربوں کی مدد سے ایسی لذیذ باتیں سنائیں گے کہ آپ سنتے سنتے کبھی نہیں اکتائینگے۔ طرزِ بیان میں اس قسم کا خلوص اور سادگی ہے کہ آپ فوراً ان سے مانوس ہو جائینگے۔ اور سننے والے کو بھی یہ محسوس نہیں ہونے دینگے کہ رتبے یا عزت یا وجاہت میں وہ سامعین سے کس قدر بلند یا ارفع ہیں۔

۱۹۳۰ء کا ذکر ہے کہ آپ نے اردو سے متعلق میرے ایک لکچر کی صدارت قبول فرمائی۔ لکچر لندن کی گوورسٹریٹ انڈین سٹوڈنٹس یونین کے ہال میں ہوا۔ لکچر سے فراغت ہوئی تو کہنے لگے "بھائی۔ یہاں کی کافی بہت مشہور ہے آپ آپ کو کافی پلوائیں"۔ ہم نے بہتیرا کہا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ لیکن آپ بضد ہو کر میزبان بن ہی گئے۔ اس وقت ہم چار پانچ آدمی آپ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک دارالعلی تھے جو بیرسٹر ہو جانے کے باوجود لندن میں صرف دماغی عیاشی کرتے تھے اور ان کی جسمانی نقاہت اور مالی انحطاط میں کوئی زیادہ تفاوت نہیں تھا۔ دارا صاحب نے بیٹھتے ہی آپ سے پوچھا "شیخ صاحب غالب کا وہ شعر سنا دیجئے جو اگلے دن آپ نے مجھے سنایا تھا"۔ سر عبدالقادر نے کہا "پہلے میں آپ کو اس شعر کا استعمال سناتا ہوں اور پھر شعر"۔ ہم سب بیتابی سے ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے۔ آپ نے کہا "میں جب اس دفعہ لندن میں وزیر ہند کا مشیر ہو کر آ رہا تھا۔ تو نجی ضرورتوں کے پیش نظر میں نے اپنی زمین کا ایک ٹکڑا فروخت کر دیا۔ لاہور کے سٹیشن پر لندن کو روانگی کے وقت جب احباب الوداع کہنے آئے تو ہمارے ایک بہت پرانے جاننے والے مبارک اور سلامت روی کی دعا دینے کی بجائے سرگوشی میں کہنے لگے۔ شیخ صاحب ایک معزز عہدے پر جا رہے ہیں لیکن ہمیں یہ بات پسند نہیں آئی کہ آپ اپنی زمین کا ایک ٹکڑا فروخت کر کے جا رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا آپ نے غالب کا وہ شعر نہیں سنا۔ ؎

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف، بہم فروخت
پرسد چرا کہ نرخ مئے لالہ فام چیست۔

انگلستان کا سفر درپیش ہے تو یہ بھی کرنا ہی ہوگا"۔

لندن میں ایک عید کے موقعے پر ایک دعوتی رقعہ پر یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ ناچ کا انتظام مفت ہوگا۔ جس وقت آپ کو دعوت ملی میں پاس بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے دعوت دینے والوں سے کہا کہ آپ ناچتے گاتے رہتے لیکن عید کے موقعہ پر اس کا تذکرہ کیا ضرور تھا۔ یہ گفتگو کرتے کرتے جدید تہذیب و تمدن پر تبصرہ ہونے لگا۔ اور میں نے شکایت کی کہ مسلمان رفتہ رفتہ اپنے تمدن سے بہت دور ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک اپنی زبان سے بھی نامانوس ہو رہے ہیں۔ کہنے لگے "ایک بات بتاتا ہوں لیکن خدا کے لئے اسے ہمایوں میں نہ لکھ دینا۔ ان دنوں میرے مضامین ہمایوں میں شائع ہو رہے تھے) میرے اصرار پر آپ نے بتایا کہ آپ........ صاحب سے اگلے دن ملے تھے (سر عبدالقادر کے ارشادات کا لحاظ رکھتے ہوئے نام عرض نہیں کرونگا) آپ کو معلوم ہے کہ یہ ہندوستان کے ایک نہایت معزز سید خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور ان کے والد کتنے بلند پایہ عالم تھے۔ میرے ان کے والد سے بھی تعلقات تھے۔ میں نے ان سے ان کی والدہ کی خیر صحت پوچھی تو کہنے لگے "چشم بدور، بنت شب حرام۔ ماشاءاللہ اچھی ہیں"۔ شاید یہ الفاظ انہیں سے "ن رکھے تھے جن کو انہوں نے جمع کر دیا۔

وزیر ہند کے مشیر کے عہدے سے سبکدوش ہو کر لندن سے لوٹ کر آئے اور میں لاہور میں ان سے ملنے گیا۔ تو سبکدوش خاموش سے تھے لیکن غمگین نہیں تھے۔ میں نے وجہ پوچھی کہنے لگے میں نے اپنی عمر میں اس پاک مقولے کو اپنی زندگی کے تجربوں سے صحیح پایا ہے کہ عرفت ربی بفسخ العزائم (میں نے خدا کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا ہے) اور کافی عرصہ تک اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان سناتے رہے۔ ان واقعات کو لکھوں تو اس شمارہ کے سب صفحات بھر جائیں۔ آخر میں ایک بات سنائی کہ لندن میں آپ کو اطلاع ملی کہ آپ کے بیٹے کیپٹن احسان قادر جنگ شروع ہو جانے کی وجہ سے عن قریب محاذِ جنگ پر جانے والے ہیں (یہ ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے) چونکہ آپ اپنے اس بیٹے سے ایک عرصے سے نہیں ملے تھے اس لئے آپ اپنے عہدے سے فارغ ہو کر جلدی جلدی ہندوستان پہنچے اور سیدھے حیدرآباد چلے گئے جہاں کہ ان کا لڑکا مقیم تھا لیکن جس دن آپ حیدرآباد پہنچے اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے ان کے صاحبزادے وہاں سے چل دیئے تھے اور آپ کو ان سے ملنے کی حسرت ہی رہ گئی۔

سر عبدالقادر کو اولاد سے محبت نہیں بلکہ عشق ہے۔ آپ کے سب صاحبزادے اس وقت ماشاءاللہ بڑے ہو چکے ہیں اور ایک کے سوا سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن میں نے آپ کو بارہا ان کے متعلق متفکر دیکھا ہے۔ اور اکثر ان کی بہتری کے وسائل سوچتے پایا ہے۔ لیکن اولاد سے اسقدر شفقت کے باوجود آپنے اولاد (آپ کے زندہ بچے صرف لڑکے ہیں) کے متعلق اس انداز میں بھی گفتگو نہیں کی جس سے اولاد کی شکایت یا ان سے کسی قسم کی دنیاوی مدد کی خواہش کا اظہار ہو۔ بلکہ کہا کرتے ہیں۔ "میں خود چلتا پھرتا اور کام کرتا ہی مروں گا"۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی طبیعت میں صبر اور تحمل کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ لاہور میں (آپ کا مکان ٹمپل روڈ پر ہے) ایک دفعہ میں آپ سے ملنے گیا۔ تو دیکھا لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو مسکرا کر کہنے لگے "بھئی کئی دن سے بغل میں ایک پھوڑا ہے۔ جس میں بے حد درد

اور تکلیف ہے۔ لیکن کیا کروں یہ حال جب تک یہ اچھا نہ ہوا سے برداشت کرنا ہی ہوگا"۔ میں نے دیکھا کہ تکلیف اس قدر زیادہ تھی کہ بستر پر پہلو بھی آسانی سے نہیں بدل سکتے تھے۔ عمر اس وقت ساٹھ سال سے (یہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے) تجاوز کر چکی تھی لیکن استقلال کا یہ حال کہ اس قدر شدید تکلیف کے باوجود مسکرا رہے تھے۔

آپ مرنجاں مرنج انسان ہیں۔ چند سال ہوئے کہ لاہور کے مشہور اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے پنجاب کی اہم شخصیتوں کا ایک جائزہ لیا اور انکے سوانح حیات پر ایک مختصر سا تبصرہ کیا۔ شیخ سر عبدالقادر کے سیاسی عقاید کے متعلق سوانح نگار نے لکھا کہ آپ ملک کی تمام قومی تحریکوں کو اچھا سمجھتے ہیں اور ہر قسم کے لیڈروں کے مفید کاموں کی تعریف کرتے ہیں لیکن آپ کبھی کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں رہتے۔ میں نے یہ تبصرہ پڑھا تو آپ سے ملنے گیا اور میں نے عرض کیا کہ بظاہر یہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر قسم کی سیاسی تحریک کو پسند کرتے ہوں۔ لیکن کم از کم اخبار نے تو یہی لکھا ہے۔ کیا آپ اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا "ہاں" میں نے توجیہ چاہی تو آپ نے کہا "میاں بات یہ ہے کہ میں ہر اس تحریک کو اچھا سمجھتا ہوں جو ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لئے جاری کی جائے۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ ہر ایک تحریک کو جاری کرنے والوں کی نیت یہی ہوتی ہے۔ پھر ہر ایک تحریک میں چند ایسے اچھے آدمی بھی ہوتے ہیں جو نیک نیتی سے ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں ایسے لیڈروں کو بھی اچھا سمجھتا ہوں صرف میرا اختلاف سیاسی لوگوں اور سیاسی تحریکوں سے اس وقت شروع ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ان لوگوں میں سے چند لیڈر خودغرضی کے راستے پر چل رہے ہیں اور تحریک حد اعتدال سے تجاوز کر رہی ہے"۔ اعتدال کا تذکرہ چھڑا تو میں نے کہا مسلمان تو عام طور پر اتنی دنیا داری نہیں جانتے کہ ہمیشہ اعتدال سے کام لیں۔ اس پر آپ نے زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے "میں لائلپور میں وکالت کرتا تھا۔ ایک ہندو موکل تشریف لائے اور میں نے مقدمہ کی فیس دوسو روپے طلب کی۔ موکل نے کہا صاحب موت بھی مانگنے سے نہیں ملتی اگر آپ پونے دوسو لے لیں تو پیش کیا جائے۔ میں نے دوسو روپے پر اصرار کیا تو موکل ایک اور معزز وکیل کے پاس چلا گیا جس نے پونے دوسو پر مقدمہ کی وکالت کرنا منظور کر لیا اور موکل نے اس واقعہ کی اطلاع آ کر مجھے دی اور کہا آپ مسلمان ہیں نا، دنیا داری نہیں جانتے پچیس روپے کی بات ہی کیا تھی آپ نے پونے دوسو روپیہ بھی ضائع کر دیا۔ یہ واقعہ سننے کے بعد مجھے لندن کا ایک واقعہ یاد آیا جو میں نے آپ کو بھی یاد دلایا میں لندن یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تحریر کرنے میں مصروف تھا۔ ایک دن اپنے مرحوم پروفیسر ڈاکٹر بیلی سے کچھ اختلاف ہوا تو میں نے اپنے دعوی پر اصرار کیا اور اس کے ثبوت میں کئی مستند حوالے پیش کئے۔ لیکن اس دن ڈاکٹر بیلی کسی طرح قائل نہ ہوئے وہ اس پر مصر تھے کہ میں وہ حصہ مقالہ سے حذف کر دوں۔ میں یونیورسٹی سے بہت آزردہ اور پریشان ہو کر سیدھا سر عبدالقادر کے پاس انڈیا آفس میں پہنچا جہاں آپ کام کیا کرتے تھے۔ میں نے سارا واقعہ سنایا اور بڑے جوش سے اپنے دعوی کی حمایت میں ثبوت پیش کئے۔ آپ نے سارا ماجرا سن کر کہا "مجھے بھی تم سے اتفاق ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اگر تمہارے اصرار کی وجہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری نہ ملی اور یہاں سے فیل ہو کر گئے تو یہ قصہ کس کس کو سناتے پھرو گے۔ تمہیں آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے۔ ڈاکٹر بیلی جس طرح کہتے ہیں ویسے ہی کر دو۔ اور ڈگری لے کر گھر کو سدھارو"۔ میں مطمئن ہو کر واپس چلا آیا۔

آپ کی ذاتی شرافت، کسر نفسی اور رواداری کا ذکر میں نے کچھ اس طرح کیا ہے کہ شاید یہ گمان پیدا ہو جائے کہ آپ اصول کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن میں نے ہمیشہ آپ کو شدت سے اپنے اصولوں کی پابندی کرتے دیکھا ہے۔ میرے ایک بزرگ نے ایک دفعہ با اصرار مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا کہ میں ذاتی اثر سے کام لے کر اور سفارش کر کے آپ سے ایک ایسا کام کرنے کو کہوں جو اصول کے خلاف تھا۔ آپ اس وقت بہاولپور میں چیف جسٹس تھے۔ میں نے پہنچنے سے پہلے تار دے دیا تھا۔ آپ نے اسٹیشن پر موٹر بھیج دی۔ اپنے پاس ایک نہایت مکلف کمرے میں ٹھہرایا۔ فرصت میں میں نے عرضداشت کی تو نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا "بھئی یہ بات میرے اصول کے خلاف ہے۔ تمہاری دلیلیں درست لیکن مجھ سے ایسا نہ ہوگا"۔ میں اپنا سا منہ لے کر چلا آیا۔

سر عبدالقادر کی سیرت نگاری صرف ذاتی تجربات کی بنا پر ہی کرنے لگوں تو اس قلیل فرصت میں کم نہ ہوگی ادھر ایڈیٹر صاحب کا اصرار ہے کہ اختصار سے کام لیا جائے اور سوانح نگاری بھی کی جائے۔ اس لئے آپکے کچھ سوانح حیات بھی عرض کرتا ہوں۔ خان بہادر شیخ عبدالقادر لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں آپ نے فورمن کرسچین کالج لاہور سے بی۔ اے پاس کیا۔ اور پنجاب آبزرور کے ایڈیٹر ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء میں انگلستان بیرسٹری کے لئے گئے اور بلاد اسلامیہ کی سیر کرتے ہوئے واپس آئے۔ دلی، لائلپور اور لاہور وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج ہوئے مختلف اوقات میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن، ڈپٹی پریزیڈنٹ، پریزیڈنٹ، وزیر تعلیمات، وائسرائے کے ایگزیکٹو کونسل، وزیر ہند کے مشیر، بیرون ممالک حکومت ہند کے

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

# تعلیم اور تہذیب نفس

سر عبدالقادر

تقسیم اسناد کی تقریب پر یہ رسم ہے کہ خطیب وقت طلبہ کو کچھ نصیحت آمیز باتیں کہتا ہے۔ میرے ذمے بھی یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ میں ان طلبہ کے سامنے کچھ نصائح پیش کروں جو اس علمی ماحول سے باہر جانے اور عمل کی دنیا میں قدم رکھنے کو ہیں۔ مگر کوئی مشورہ دینے سے قبل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ناصح بننا زیادہ پسند نہیں کرتا ؎

مرکے ناصح برائے دیگراں     ناصح خود یافتم کم در جہاں

میں خود اپنی عمر کے ستر سے زیادہ برس بسر کرنے کے باوجود ابھی محتاج نصیحت ہوں تو میں نوجوانوں کو کیا نصیحت دوں۔ جوانی کا عموماً یہ تقاضا ہوتا ہے کہ ہر چیز کو آزمانے اور غلطیاں کرنے کے بعد تجربہ کے راستے سے صحیح نظریے قائم کرنا چاہتی ہے اور دوسروں کے تجربوں پر انحصار کرنا نہیں چاہتی۔ میں چند ایسے اصولی امور کی طرف توجہ دلاتا ہوں جن کو آپ دلیل راہ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

پہلا اصول جو زندگی میں داخل ہوتے ہی اختیار کرنا چاہئے، وہ رواداری ہے۔ یعنی کسی دوسرے شخص یا کسی دوسری جماعت کی رائے یا عقیدے کو صرف اس بنا پر غلط یا ناقابل قبول نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ آپ کی رائے یا عقیدے سے مختلف ہے۔ بلکہ ہر رائے کے سننے اور اس پر غور کرنے کے بعد اس کے موافق اور مخالف دلائل سن کر فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس عادت کی کمی اور عدم رواداری ہمارے ملک میں طرح طرح کی تکالیف کا باعث ہے۔ اور بہت سے جھگڑے اور فساد رواداری نہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان پڑھ لوگ اور کم پڑھے ہوئے زیادہ تر تنگ خیال ہوتے ہیں اور اختلاف رائے کو برداشت نہیں کر سکتے اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو اصحاب اعلیٰ تعلیم سے مستفید ہو چکے ہیں انہیں روشن خیالی سیکھنی چاہئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی اپنی رائے نہ ہو۔ یا ہوا کا ہر جھونکا ان کی رائے کو بدلتا رہے۔ اگر دوسروں کی رائیں سننے کے بعد وہ اپنی یا اپنی جماعت کی رائے کو قابل ترجیح سمجھیں تو اس پر ضرور قائم رہیں۔ اور دوسروں کو دلائل کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ نامناسب ہے کہ اختلاف رائے کی وجہ سے دوسروں کو بدظنی کی نگاہ سے دیکھیں۔ یا ان کی نیتوں پر حملے کریں۔ یا ان سے میل جول منقطع کر دیں۔

دوسروں پر بدظنی بڑھتے بڑھتے باہمی نفرت کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کسی ملک کے باشندوں کے لئے باہمی مخاصمت یا نفرت سے زیادہ کوئی بیماری نہیں ہو سکتی ہم آج کل ہندوستان کی تاریخ کے جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں بدقسمتی سے یہ بیماری زوروں پر ہے اور ملک کے اطراف و جوانب سے فرقہ وارانہ فساد اور کشت و خون کی خبریں آ رہی ہیں اور کلکتہ اور بمبئی جیسے بڑے شہروں میں اس وقت تک ہزاروں جانیں تلف ہو چکی ہیں اور اس سے بھی زیادہ لوگ زخمی ہو کر ہسپتالوں میں چلے گئے ہیں اور بعض پر اور بھی مذموم قسم کے حملے ہوئے ہیں۔ ان بیچاروں لوگوں کی نقل و حرکت پر پابندیاں لگ رہی ہیں۔ کہیں تقریروں اور جلسوں کی ممانعت ہے کہیں پانچ سے زیادہ آدمی مل کر نہیں نکل سکتے۔ کہیں شام کے بعد گھر سے نہیں نکل سکتے۔ از راہ انصاف کہئے۔ کہ یہ بھی کوئی زیست کا طور ہے۔ ہم چلے تھے مزید آزادی کو بڑھانے اور رہی سہی کو بھی کھو کر بیٹھ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آزادی کی ایک ضروری شرط کو بھول گئے ہیں اور وہ یہ کہ آزادی جب حاصل ہوتی ہے کہ انسان اپنے ہاتھ سے اس کو محدود رکھنا سیکھ جائے۔ اور کسی معاملے میں حد سے نہ گزرے۔ نہ دوسروں کو برا بھلا کہہ کر انہیں مشتعل کرے اور نہ اشتعال سے دست درازیوں کا حوصلہ بڑھائے۔ اس جلتی آگ پر پانی ڈالنا آپ لوگوں کا کام ہے۔ اگر اس جامعہ سے سند پانے والے نوجوان اور اسی طرح کے اور تعلیم یافتہ نوجوان یہ عزم کر لیں کہ وہ اپنی تقریر اور تحریر سے اور اپنے مجموعی اثر سے باہمی صلح کی کوشش کریں گے اور لڑائی جھگڑے کو مٹانے میں ساعی ہوں گے تو ملک کی زہریلی اور مکدر فضا صاف ہو سکتی ہے۔

اس کوشش میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا وہ طبقہ جو اخبارات سے تعلق رکھتا ہے یا تعلق پیدا کرنے کو ہے خاص طور پر مفید خدمت انجام دے سکتا ہے۔ اخبارات اس زمانہ میں عوام کی رائے پر بے حد اثر ڈال سکتے ہیں اور ڈالتے رہتے ہیں اور اس اعتبار سے ہر اخبار کا ایڈیٹر اور اس کے نائبین اور اس کے خبر رساں رپورٹر اور نامہ نگار ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی ایک رپورٹر کی غلط یا مشتبہ خبر جو کافی چھان بین یا تحقیقات کے بغیر شائع کر دی گئی ہو بعض اوقات ملک بھر میں آگ لگا سکتی ہے اور مختلف جماعتوں کو آپس میں لڑا سکتی ہے جن ناگوار حالات کا ابھی ذکر کیا گیا ہے اور جو آگ ان سے لگی ہوئی ہے۔ وہ اخبارات کے بجھانے سے بجھ سکتی ہے۔ اگر وہ اس کے بجھانے میں کوشاں ہوں۔ اغلب ہے کہ آپ میں سے کئی فن اخبار نویسی کو جو ایک معزز اور آزاد مگر غریبانہ پیشہ ہے اختیار کریں گے۔ ان سے میں یہی کہوں گا کہ اگر اخبار نویس کی غریبانہ زندگی کو دوسرے زیادہ کمائی والے پیشوں پر اس کی آزادی کے لحاظ سے ترجیح دی ہے تو کسی لالچ یا طمع کو اپنے منصفانہ

اور آزادانہ طرزِ عمل کے راستے میں حائل نہ ہونے دیں۔ اور یہ نہ پروا کریں کہ آپ کے اخبار کے ایڈیٹر کو کس قسم کی رپورٹ پسند ہوگی بلکہ یہ دیکھیں کہ صداقت کا کیا تقاضا ہے۔ آپ اپنے آپ کو صداقت کا مزدور سمجھیں۔ نہ کہ زید عمر کا ملازم۔ اس سلسلہ میں یہ جتا دینا بے جا نہ ہوگا کہ اخباری زندگی میں ناحال مسلمانوں کا حصہ بننا ہونا چاہئے۔ اس سے بہت کم ہے۔ اور اس میں زیادہ نوجوانوں کی شمولیت کی ضرورت ہے جتنی مفید تحریکیں ملک یا ملت کی ترقی کے لئے درکار ہوں۔ وہ اخبارات اور ان کے خبر رساں کارندوں کے بغیر نہیں پنپ سکتیں۔ اور جو لوگ اخباروں کو صحیح واقعات کی اطلاع دیتے رہتے ہیں وہ ایک بھاری خدمت کر رہے ہیں خواہ اس خدمت کا معاوضہ نسبتاً قلیل ہو۔

اخبارات اور ان کے نامہ نگار اگر رواداری اور صلح پسندی کی راہ اختیار کریں تو وہ اپنے وطن عزیز کے ایک بڑے مسئلے یعنی ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے کے حل میں معتدبہ امداد دے سکتے ہیں یہ مسئلہ ہمیشہ اہمیت رکھتا تھا اور ملک کی قسمت کا فیصلہ اس کے منصفانہ حل پر موقوف ہے۔ مگر اس بیسویں صدی میں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان میں یوں تو بہت سی قومیں آباد ہیں مگر یہ دو تعداد میں زیادہ ہیں اور اپنی اپنی تاریخی اور تمدنی روایات کی مالک ہیں ان میں اگر اتفاق ہو تو ہندوستان بڑی سے بڑی دول میں شمار ہو سکتا ہے اور ان میں اگر اندرونی مخاصمت اور نفاق رہے تو ہندوستان باوجود اپنی جغرافیائی بڑائی اور اپنی زمین کی خداداد زرخیزی کے کمزور ملک ہوگا۔ اس لئے قوم و ملت کے بہی خواہوں کی یہ کوشش ہونی چاہئے۔ کہ باہمی اتفاق اور محبت کی تلقین کریں۔ تاکہ ہر کہ و مہ یہ سمجھ جائے کہ سیاسی نظرئے اگر مختلف بھی ہوں تو بھی باہمی میل جول پر ان کا اثر نہیں پڑنے دینا چاہئے۔ کیونکہ آخر ہندو مسلمان دونو اسی سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں انہیں ایک دوسرے سے دیوار بہ دیوار رہنا ہے اور یہیں پیوندِ زمین ہوجانا ہے۔ نہ ہندوؤں میں سے وہ لوگ جو پہلے وسط ایشیا یا غرب ایشیا سے یہاں آئے تھے پھر وہاں جاکر آباد ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں کے وہ حصے جو عرب یا ایران یا افغانستان یا بخارا اور سمرقند سے آئے تھے پھر وہاں جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نسل اور خون کے لحاظ سے بھی یہیں کی پیداوار ہے۔ اس لئے حق ہمسائیگی کا یہ تقاضا ہے کہ ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں اور ایک دوسرے کی شادی غمی میں شریک ہوں۔ اور ایک دوسرے کی دل آزاری اور توہین اور تضحیک سے گریز کریں۔

اخباروں کے عارضی مضامین کے سوا پائدار علمی خدمات بھی آپ میں سے اکثر کو مرغوب ہوں گی۔ اگر آپ یہ چاہیں کہ تصنیف و تالیف کے ذریعہ ملک کی خدمت کریں اور عزت کی روزی کمائیں تو یہ بھی بہت اچھا راستہ ہے۔ بشرطیکہ یہ کام اس عزم کے ساتھ اختیار کیا جائے کہ جو کتابیں تصنیف کی جائیں یا شائع ہوں۔ اُن سے ملک کے تمدنی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی حالات بہتر ہوسکیں اور جو میلان بعض حلقوں میں اخلاقی پستی پیدا کرنے والی تحریروں کی طرف اندنوں ہو رہا ہے، اس کا ساتھ نہ دیا جائے اس میں شک نہیں کہ بازار میں اس دوسرے قسم کے مال کی گاہکی ضرور ہے، مگر اعلیٰ تعلیم والوں کو نہ چاہیئے کہ کسی عارضی نفع کے لئے خود بھی بداخلاقی کے بڑھانے کی ذلت گوارا کریں، اور جو ان کی کتابوں کو پڑھیں انھیں بھی رسوائی کا راستہ دکھائیں۔ کتابوں میں تراجم کی طرف جامعہ ملیہ کی مکتبہ نے بھی توجہ کی ہے اور عجب نہیں کہ آپ میں سے کئی نوجوان اس طرف مائل ہوں کہ دوسری زبانوں سے اردو میں کتابوں کے ترجمہ کریں یہ بہت ضروری کام ہے اور کتابوں کے پڑھنے اور خریدنے کا شوق ملک میں بڑھ رہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ شغل آمد کے لحاظ سے بھی اچھا ہوگا مگر اس سے ملک کو فائدہ اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ جو کتابیں ترجمے کے لئے چنی جائیں ان کا انتخاب صحیح ہو۔ بعض کتابیں ایسی ترجمے کے ذریعے ملک میں پھیل رہی ہیں۔ کہ ان سے فائدہ کی جگہ نقصان کا احتمال ہے۔ اس ضمن میں مجھے ایک نصیحت یاد آتی ہے۔ جو ایک معمر خاتون نے مجھے دی تھی جب میں پہلے پہل طالب علمانہ حیثیت سے انگلستان گیا تھا۔ میں اس سے پہلے کئی سال مسلمانوں کے ایک انگریزی اخبار موسومہ پنجاب آبزرور کی ایڈیٹری میں صرف کرچکا تھا اور اردو میں رسالہ مخزن بھی شائع کر رہا تھا۔ جب اس لیڈی نے یہ سنا تو مجھ سے دریافت کیا تم انگلستان سے بھی کچھ مضامین لکھ کر اپنے ملک کو بھیجا کروگے۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ وہ کہنے لگی کہ یہاں اچھی چیزیں بھی ہیں اور بُری بھی۔ تم وہ چیزیں یہاں سے بھیجنا جو تمہارے اہل وطن کے لئے مفید ہوں اور ان کا ذکر نہ کرنا جو بری نظر آئیں۔ کیونکہ برائی کا حصہ ہر ملک میں کافی ہوتا ہے۔ باہر سے اور لے جانے کی کیا ضرورت ــــ میرے دل پر اس خاتون کے اس مشورہ کا بہت اثر ہوا اور میں نے حتی الوسع اس مشورے پر کاربند ہونے کی کوشش کی۔

علمی اور قلمی پیشوں کے سوا بھی بہت سے ذرائع جائز معاش کی تلاش کے ہیں اور اسی لئے اس درسگاہ میں پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ دستکاری اور ہنر پر زور دیا گیا ہے۔ آپ میں سے کئی اپنے اپنے سیکھے ہوئے ہنر سے کام لیں گے۔ اس جامعہ نے دستکاری کے درجے کو پہلے سے بلند کر دیا ہے۔ اور اگر اس ارادے کی تکمیل میں کامیابی ہوئی کہ موجودہ دستکاری کی جماعتوں کی توسیع کرکے اپنے صنعتی شعبے کو ایک پالی ٹیکنک بنا دے، جس کی ہمیں بہت ضرورت ہے تو دستکاری کا رتبہ اور بھی بڑھ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جامعہ میں پڑھے ہوئے طالب علم نہ صرف خود اپنے اپنے ہنر کو ذریعہ معاش بنائیں۔ بلکہ اس اصول کی تبلیغ کریں اور وہ جھجک جو اب تک بعض دلوں میں ہے کہ وہ

پیشۂ قلم کو نسبتاً بہتر اور ہاتھ سے کام کرنے کو کم معزز سمجھتے ہیں، لوگوں کی طبائع سے نکل جائے۔ کسی ملک کے عوام میں وہ خودداری جو آزادی کی بنیاد ہو پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اہل حرفت و صنعت کو نظرِ حقارت سے دیکھنے کا رواج ہو۔ انگریزوں نے ڈیڑھ دو سو برس ہمارے ملک میں اتنی دور سے آکر حکومت کی ہے۔ ان کی کامیابی کا ایک راز یہی تھا کہ وہ حرفت و صنعت اور تجارت کو باعزت کام سمجھتے تھے جس شخص نے دخانی انجن ایجاد کر کے قوموں کی قسمت اور نظام کو دفعتاً پلٹا دے دیا وہ صناع ہی تھا۔ ان کے ملک میں بہت سے گھرانوں کے نام ان کے پیشوں سے متعلق ہیں۔ سمتھ بہت مشہور نام ہے۔ اس کے معنی لوہار کے ہیں۔ مختلف پیشوں کے لوگوں نے انگلستان میں اور دیگر حصص یورپ میں اپنے گلڈ یعنی انجمنیں قائم کیں۔ ان انجمنوں نے اپنی برادری کی مجالس شوریٰ کے لئے بڑے عالی شان ایوان قائم کئے ہیں جن میں بہت سے اب تک موجود ہیں۔ اور ان کے جلسوں میں جب اس ہنر کے پیشہ ور شامل ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کا اعزاز اسی طرح کرتے ہیں جیسے سیاسی پارلیمنٹ کے رکن کرتے ہیں۔ ہر رکن دوسرے کو آنریبل کہہ کر خطاب کرتا ہے اور قابل عزت سمجھتا ہے۔ ان میں سے بعض انجمنیں زمانہ بھر کی دولت جمع کر کے ایسی مالا مال ہو گئی ہیں۔ کہ ان کے ہاں دعوتوں کے موقع پر چاندی سونے کے برتنوں کا مجموعہ دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں ہر مزدور راج معمار اور ترکھان کا یہ حال ہے کہ وہ جب کسی کے ہاں مزدوری کرنے آتا ہے تو گھر والوں سے تن کر بات کرتا ہے اور ذرا سی اونچی آواز یا جھڑک برداشت نہیں کرتا۔ گویا وہ مساوات کی بنیاد پر کام کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو کسی سے کم نہیں سمجھتا۔ صرف اس لئے کہ دوسروں کا کام اچھے کپڑے پہن کر کرنے کا ہے اور اس کے کپڑے اس وقت میلے ہیں۔ یہی میلان میں نے اپنے سفر استانبول کے زمانے میں ترکوں میں پایا۔ ان کے ہاں لفظ آفندی معزز لوگوں کے لئے مخصوص ہے۔ میں نے دیکھا کہ دکاندار کو اس کی دوکان کا گاہک آفندم کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور وہ گاہک کو آفندم کہہ کر جواب دیتا ہے مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ دکانداروں اور اہل صنعت میں سے بیشتر لوگ اس لئے بھی آفندی کہہ کر بلائے جاتے ہیں کہ وہ کچھ عرصہ فوجی تربیت پا چکے ہیں۔ اور وہ ایسے سپاہی ہوتے ہیں کہ جب ضرورت ہو وہ فوجی خدمت میں حصہ لے سکیں۔ استانبول میں مسلمانوں کی بہت سی دکانوں پر چوکھٹوں میں لگے ہوئے قطعات آویزاں تھے جن پر الکاسب حبیب اللہ لکھا ہوتا تھا یعنی کسب حلال کرنے والا خدا کا دوست ہے۔ اس وقت دنیا کی بڑی سے بڑی دول کی بڑائی ان کی مصنوعات کی بڑائی پر موقوف ہے۔ اور ان کی دولت کا راز ان کی تجارت ہے۔ اپنی مصنوعات باہر بھیجتے ہیں اور دوسرے ممالک سے کھانے پینے کی چیزیں اور کچا مال اپنے ہاں منگواتے ہیں۔

تجارت کو سب ترقی یافتہ قومیں سلطنت سے بڑھ کر سمجھتی ہیں۔ اور موجودہ صدی کی دونوں عالمگیر لڑائیاں دراصل تجارتی اور اقتصادی اسباب سے ہوئی ہیں۔ کیونکہ یہ اصول تو گزشتہ جنگ عظیم کے وقت طے ہو گیا تھا کہ کسی فاتح ملک کو مفتوح ممالک پر مستقل قبضہ رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی اور شکست پانے والی قومیں بھی اپنے ملک کی زمینوں سے محروم نہ کی جائیں گی۔ اس لئے ان کا اصلی جھگڑا یہ تھا کہ تجارتی منڈیوں پر کسی ایک قوم کی ٹھیکیداری نہ رہے۔ اس وقت حکومت برطانیہ نے ہمیں کچھ ملکی اور سیاسی اختیارات دینے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا سیاسی اقتدار اٹھا لینے کے بعد اپنا تجارتی تعلق ہندوستان سے قائم رکھنا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ہندوستان والوں سے اور خاص کر یہاں کے تجارت پیشہ لوگوں سے ان کے تعلقات دوستانہ رہیں گے۔ تو جو مالی نفع ہندوستان سے انگلستان کو حاصل ہوتا رہا ہے اس کا بیشتر حصہ جاری رہ سکے گا۔ وہ پہلے یہاں تجارت پیشہ بن کر ہی آئے تھے۔ پھر انھوں نے سپاہ گری اور فوجداری اختیار کر لی اور مہاجن بن گئے۔ ہمارے لوگ اپنی پہلی تجارت کھو بیٹھے اور اکثر مصنوعات میں ان کے دست نگر ہونے پر قانع ہو گئے اب ہندوستان میں صنعت کے از سر نو زندہ کرنے اور تجارت کو فروغ دینے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ آپ لوگ بھی حتی قدر استطاعت زندگی کی اس دوڑ میں شریک ہوں۔ محنت اور سرمایہ تو ہر میدان میں درکار ہے۔ مگر صنعت اور تجارت کی ترقی کے لئے اور کاموں سے زیادہ انہماک ضروری ہے۔ مسلمانوں کو اپنی حکومت کے زمانے میں اپنی سپاہ گری پر اس قدر ناز تھا کہ وہ تجارت سے بہت حد تک غافل رہے۔ برعکس اس کے ہندوؤں کو تجارت سے گہرا تعلق تھا۔ انھوں نے اس زمانہ میں اس صیغے میں بہت کچھ ترقی کی ہے گو ابھی انہیں بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں دونوں مل کر کام کریں تو بہت زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ کہیں کہیں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں بعض محدود کمپنیوں میں ہندو اور مسلمان مل کر کام کرتے ہیں۔ لیکن عام طور پر میلان یہی ہے کہ ہندو ہندو کمپنیاں اور مسلمان مسلمان کمپنیاں قائم کرتے ہیں۔ اس سے بظاہر تو اشتراک عمل میں سہولت ہوتی ہے۔ مگر انجام کار یہ میلان ایک دوسرے سے علیحدگی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور جس مغائرت کی شکایت کی جاتی ہے وہ بڑھتی رہتی ہے۔ حالانکہ یہی وہ میدان ہے جس میں مل کر کام کرنے کی زیادہ گنجائش ہے۔ اس میں تنگ دلی خواہ ایک جانب سے ہو یا دوسری۔ سے دور ہو جانی چاہئے۔ اور اسے دور کرنے کی کوشش میں اس جامعہ کے طلبہ کو خاص طور پر حصہ لینا چاہئے۔ کیونکہ ان کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار ایسے اشخاص رہے ہیں جو ہندو مسلم اتحاد کے موافق رہے ہیں اور جنہوں نے اپنے ہندو ہم وطنوں کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

تجارتی کاروبار سے جن لوگوں کو واقفیت ہے انھیں معلوم ہے کہ آج کل کی تجارت اپنے سرمایہ کے لئے بنکوں کی محتاج ہے۔ اور جس تجارتی کارخانہ کے پس پشت بہ وقت ضرورت آسان شرائط پر کسی بنک سے روپیہ حاصل کرنے کا سہارا نہ ہو وہ کارخانہ مشکل سے چلتا ہے۔ جہازوں کے ذریعے جو مال باہر سے آتا ہے اس کی قیمت کی ادائیگی اور اس کے مال کا حصول بنکوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ جو مال اس ملک سے باہر بھیجا جاتا ہے اس کی قیمت کی وصولی وہاں کے بنکوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس لئے کسی قوم کی تجارتی ترقی بنکوں کے نظام اور عمل سے واقفیت اور بنکوں کے وجود کے بغیر نہیں ہوسکتی اور ملت اسلامیہ بنکوں کی اہمیت سے بے بہرہ ہے اور نہ بیمہ کمپنیوں میں ان کا کوئی مناسب حصہ ہے۔ جامعہ ملیہ نے اپنے طلبہ کو اس مضمون سے آشنا کرنے کے لئے اپنے مدرسوں میں سیونگ بنک اور باہمی تعاون کی سوسائٹیاں قائم کی ہیں اور طلبہ کو خود ان کا انتظام کرنے کا موقع دیا ہے۔ مگر اس مضمون کی وسعت کے لحاظ سے یہ ابجد خوانی اور کنڈر گارٹن کی تعلیم کا درجہ سمجھا جانا چاہئے۔ اب یہ کام فارغ التحصیل طلبہ کا ہوگا کہ وہ اس خشک مضمون کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں اور اس راستہ میں اپنے ہم عمروں اور دوستوں کی رہنمائی کریں۔ بنکوں میں حساب کتاب کی مہارت درکار ہے اور کئی مسلمان طالب علم اس کو روکھا پھیکا کام سمجھتے ہیں لیکن یہی روکھا پھیکا کام جب کسی کو آجاتا ہے اور وہ اس کے ذریعے سے اپنے کاروبار کو بڑھاکر خوشحالی پیدا کرتا ہے تو اس مضمون میں خود بخود دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔ ہر مضمون کا یہ قاعدہ ہے کہ اس کی ابتدائی منزلیں محنت طلب اور دشوار ہوتی ہیں مگر اوپر جاکر دلچسپ ہوجاتی ہیں۔

میں نہیں چاہتا کہ میرا یہ مختصر خطبہ اتنا طویل ہوجائے کہ آپ اکتا جائیں۔ اس لئے ایک اور ضروری مضمون کا ذکر کرکے آپ سے رخصت ہوں گا۔ وہ مضمون سائنس ہے۔ آپ کی جامعہ میں جو پہلا خطبہ تقسیم اسناد پڑھا گیا، وہ ملک کے ایک نامور سائنس داں پی سی رائے کا عالمانہ خطبہ تھا جو انگریزی زبان میں دیا گیا تھا۔ اس میں سائنس کی تعلیم پر زور دیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ سائنس کی ترقی سے دنیا میں کیا کیا نتائج پیدا ہوئے ہیں اور ابھی کتنے بڑے امکانات باقی ہیں۔ انھوں نے آپ کو مسلمانوں کی تاریخ سے بہت سے حوالے دے کر یہ بھی بتایا تھا کہ ایک وقت میں مسلمان علوم فلسفہ اور سائنس کی مشعل لے کر گھر سے نکلے تھے اور انھوں نے اس وقت یورپ کی جہالت اور تاریکی کو علم کی روشنی سے منور کر دیا تھا۔ پھر زمانہ بدلا اور شاگرد عالم فاضل بن گئے اور استادوں کی اولاد جاہل بن گئی۔ اب زمانہ نے پھر کروٹ لی ہے اور آپ لوگوں میں جو طلبہ سائنس پڑھتے رہے ہیں انھیں اس کی قدر وقیمت کا کافی احساس ہوگیا ہے۔ اب ان کا کام ہے جستجو اور تلاش کی لالٹین لے کر اس مضمون کی گہرائیوں تک پہنچیں اور اس میں نئی نئی دریافتیں اور ایجادیں کریں۔ بعض لوگ ان تباہیوں کے مناظر دیکھ کر اور سن کر جو سائنس کی بعض ایجادات کی بدولت گزشتہ ہولناک جنگ کے دوران میں دیکھے گئے ہیں، کہتے ہیں کہ اس سے تو بہتر تھا کہ سائنس اتنی ترقی نہ کرتی اور دنیا اس مہلک خونریزی سے بچی رہتی جس سے لاکھوں جوان ہلاک ہوئے اور ان سے زیادہ زخمی، اور بوڑھے اور بچے اور بیمار بھی آسمان سے برسنے والے گولوں کی زد سے نہ بچ سکے۔ یہ سچ ہے کہ ایسے برے نتائج پہلی نظر میں انسان کو سائنس سے بیزار کر دیتے ہیں۔ مگر اس سے نفس علم میں کوئی برائی پیدا نہیں ہوتی۔ علم کے صحیح اور غلط استعمال میں بہت فرق ہے۔ یہ برے نتائج اس کے غلط استعمال کے ہیں۔ ورنہ وہی علم بہتر نتائج پیدا کرسکتا ہے۔ ہوا میں جہاز اڑنے لگے تو آپ مہینوں کی مسافت دنوں میں اور دنوں کی مسافت گھڑیوں میں طے کر لیتے ہیں۔ ذہن کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور نئی دنیا اور پرانے زمانے کی پاتال اب آپ کے لئے دوسرے ملک نہیں دوسرے محلے بن گئے ہیں۔ اسی طرح یہ ایٹم بم جس سے آج کل ساری مہذب دنیا گھبرائی ہوئی ہے اور یہ خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ جیسے جاپان کے دو شہروں کو دو بموں نے خاک کا ڈھیر بنا دیا اور کانت الجبال کالعہن المنفوش کا عینی مشاہدہ کرا دیا اگر اسی طرح کے دو چار اور کسی دوسری جنگ میں پھینکے گئے تو دنیا اور اس کے تمدن و تہذیب کا خاتمہ ہوجائے گا۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ ایٹم بم کو محض نگاہ خوف سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ بالکل ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنا رعب دوسروں پر جمانے کے لئے یا اپنا عقدہ جلد حل کرنے کے لئے اس قوت کا بے جا استعمال کرے لیکن اس کے ساتھ اس کے دل میں یہ ڈر بھی رہے گا کہ اگر کسی دوسری قوم نے بھی اس کا راز پالیا ہے اور اس کے بنانے کی ترکیب سمجھ لی ہے اور وہ جواب میں بم پھینکے گی تو کیا حشر ہوگا اور اس ڈر کی وجہ سے وہ بم پھینکنے سے رکی رہے گی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت ردوکد کے بعد اقوام عالم اس شرط کو قبول کرنے پر مجبور ہوں گی کہ ایٹم بم سے جنگ میں ایک قوم دوسری قوم کو ہلاک کرنے کا کام نہ لے بلکہ اس میں جو امکانات انسان کے نفع کے لئے استعمال ہونے کے ہیں ان سے کام لے کر تہذیب کے لئے آسانیاں پیدا کرے۔ اس لحاظ سے شاید وہ دن بہت دور نہیں جب ایٹم بم کا مہیب دیو انسان ضعیف کی عقل مندی اور سائنس دانی کی بدولت اس کے سامنے جکڑا ہوا لایا جائے اور ہاتھ باندھ کر اس کی خدمت کا وعدہ کرے اور جس طرح بجلی سی زبردست قوت انسان کی زرخرید لونڈی بنی ہوئی ہے اور اس کے لئے چکی پیستی ہے اور اسے گرمی میں پنکھا کرتی ہے اور شب تار میں روشنی دیتی ہے۔ اسی طرح میاں ایٹم بم، انسان کا خادم بن جائے۔ عزیزو۔ آپ خوش قسمتی سے ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے ہیں

جس میں انسان کی قوت کے امکانات بے حد وسیع ہو گئے ہیں۔ بہت سے پوشیدہ حقائق آپ کے گرد و پیش موجود ہیں اور ان کے خزانوں کی کلید سائنس کے ہاتھ میں ہے اور سائنس کی کتابیں اور تجربے آپ کے سامنے ہیں۔ قفل کھولئے اور خزائن سے دنیا کو مالا مال کر دیجئے۔

اس طولانی تمہید کا اختصار یہ ہے کہ آپ نے جو علوم یہاں حاصل کئے ہیں اب ان کے استعمال اور صحیح استعمال کا وقت آیا ہے۔ بلند ارادے اور حوصلے لے کر درسگاہ سے باہر قدم رکھئے اور یاد رکھئے کہ آپ کا اصلی فرض یہ ہے کہ جو کام کریں اور جو فن پسند کریں اس میں صرف نیت کے ساتھ یہ مدنظر ہے کہ ملک و ملت کی خدمت آپ کے ذمے ہے ملک و ملت کے لئے سچی محبت آپکے دل میں ہو اور ان کی فلاح کے لئے ہر قربانی اور ہر ایثار کے لئے آپ تیار ہوں۔ بہت مدت ہوئی ایک سیاح جونس کی کے علاوہ فارسی عربی خوب جانتے تھے لاہور میں وارد ہوئے۔ میں شاید اس وقت سکول کے کسی درجے میں پڑھتا تھا۔ میں ان کی تعریف سن کر انھیں دیکھنے گیا اور میں نے ان سے کہا کہ کوئی ہدایت مجھے دیتے جائیں۔ انھوں نے ایک شعر پڑھا۔ جو میں آپکی خدمت میں تحفتاً پیش کرتا ہوں ؎

من نمے گویم سمندر باش یا پروانہ باش
گر بہ فکر سوختن باشی بروم دانہ باش



# اندازے

زیادہ سے زیادہ فطرتِ آدم کا اندازہ
یہ آئینہ کا اندازہ، یہ جامِ جسم کا اندازہ
یہ گردش ہائے ساغر گردشِ پیہم کا اندازہ!
ستارے بھی نہیں تخئیل کے عالم کا اندازہ
متاعِ زندگی لیکن ہے کم سے کم کا اندازہ!!
جسے سمجھا ہے بے ہوشی وہ بے ہوشی نہیں ساقی!
کسی کی یاد شامل ہو تو خاموشی نہیں ساقی!
فریبِ خودکشی کا نام مے نوشی نہیں ساقی!
شکستِ جام میری خود فراموشی نہیں ساقی!
ز فیضِ عیشِ سرمستی کیا ہے غم کا اندازہ!!
یہ کب چاہا تمنّا کو بہارِ احمریں ملتی —
فروغِ ماہتاب و کہکشاں سے آفریں ملتی؟
وطن ہی جس کو کہہ سکتا کہیں ایسی زمیں ملتی
کوئی منزل کبھی بھولے سے سرِ راہے نہیں ملتی!!
سفر کیا ہے؟ فقط راہوں کے پیچ و خم کا اندازہ!!!

**کمال صدیقی**

# کلوپیٹرا

**شریف عنایت اللہ**

بہت دن گذر گئے ـــ بہت راتیں گذر گئیں۔

میری اس سے پہلی مرتبہ راکسی سینما میں ملاقات ہوئی۔ نام تو بہت سن چکا تھا۔ محلہ کا بچہ بچہ اسے جانتا تھا ہمارے فلیٹ سے قریب ہی رہتی تھی۔ وہ اور گوپال، اس کا بوڑھا نوکر ـــ میں اکثر اسے بیلکونی میں مطالعہ کرتے دیکھتا۔ وہ بے حد حسین تھی مجسم شعریت۔ شباب کا جیتا جاگتا مجسمہ۔ یہی کوئی ۲۵، ۲۶ برس کا سن تھا۔ شروع شروع میں تو میں نے اسے کسی شریف گھرانے کی لڑکی سمجھا اور ایک دن میں نے جب اس سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو شمیم مجھ پر برس ہی تو پڑا ـــ "ارے میاں ابھی تم بچے ہو تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔ جانتے ہو وہ کون ہے؟ ـــ ارونا دیوی!" ـــ اب بھی نہیں پہچانا ـــ؟ ـــ ہندوستان کی سب سے بدنام افسانہ نگار تو وہ ہے ہی لیکن ہم اسے شہر کی سب سے بدنام ہستی کے نام سے بھی جانتے ہیں ـــ کلوپیٹرا ہے کلوپیٹرا ـــ اب بھی ملو گے اس سے؟" ـــ میں خاموش بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا اور کر بھی کیا سکتا تھا مجبوراً مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

پھر ایک رات ـــ سینما شروع ہو جانے کے کافی دیر بعد میں ہال میں داخل ہوا اندھیرے میں گائڈ نے ٹارچ سے میری جگہ بتائی اور میں "معاف کیجئے گا ـــ معاف کیجئے گا" کا وظیفہ پڑھتا لوگوں کے پیروں کو روندتا بڑی مشکل سے اپنی جگہ پہنچا کرسی پر بیٹھ جانے کے بعد پتہ چلا کہ پاس ہی کی سیٹ پر کوئی محترمہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ صنف نازک کی نزدیکی نے دل میں ایک عجیب رومانی کیفیت پیدا کر دی۔ پردہ پر اُلہاس گا رہا تھا۔ اس کمبخت اداکار سے مجھے سخت نفرت ہے لیکن آج وہ دنیا کا سب سے حسین نوجوان معلوم ہو رہا تھا۔ پاس ہی ایک بنگالی محترمہ بیٹھیں اپنے شوہر کو فلم کی کہانی کا خلاصہ سنا رہی تھیں۔ آج نہ جانے کیوں ان کی سرگوشیوں سے مجھے غصہ کے بجائے خوشی سی حاصل ہونے لگی۔ میرے مقابل ایک سیٹھ جی بیٹھے بیڑی کا دھواں بڑی محبت و عقیدت سے میری طرف بھیج رہے تھے۔ ان کے اس رویہ سے مجھے تسکین سی حاصل ہوئی۔ ارادہ ہوا کہ انھیں مخاطب کر کے کہوں ـــ خدارا اسی طرح پکچر کے نہ ختم ہونے تک بیڑی سے لطف اندوز ہوتے رہو۔ تمہاری بیڑی کی یہ بھینی بھینی خوشبو فضا میں آج ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی ہے ـــ میں نے ٹائی ٹھیک کی۔ کوٹ کی آستین پر سے گرد صاف کیا اور پھر سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے کے بعد نظریں چرا کر پاس بیٹھی محترمہ کو دیکھا ـــ "ارونا!" ـــ دل چیخ اٹھا۔ اس کے بعد اگرچہ میری آنکھیں اسکرین پر تھیں مگر کچھ دیکھ نہیں رہی تھیں۔ ذہن کی تمام قوتوں کو محض ایک ہی احساس تھا اور وہ یہ کہ ارونا میری بائیں جانب بیٹھی ہے میں نے اس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کتنی حسین تھی وہ ـــ خیام کا خواب اور دانتے کی زندگی کی تفسیر ـــ اس دھندلی روشنی میں وہ ایک شعلہ معلوم ہو رہی تھی۔

ـــ اور پھر ہم شو کے بعد پہلی مرتبہ ملے۔ اس واقعہ کے بعد ہماری اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ لیکن میں نے اپنے محلہ میں اس سے باتیں کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ دنیا اور دنیا والوں کی بے لگام زبان سے ڈر جو لگتا تھا۔ رات کی تنہائی میں روشنی گل کر دینے کے بعد جب میں بستر پر لیٹ جاتا تو نگاہیں خود بخود ارونا کے فلیٹ کی طرف اٹھ جاتیں۔ وہاں اکثر میں بارہ، ایک بجے تک روشنی دیکھتا۔ اپنے خیالوں کے دوران میں شمیم کی تنبیہ یاد آ جاتی اور میں اپنے ضمیر کے ہنگامہ خیز سوالوں سے بچنے کے لئے آنکھیں بند کئے نیند کی آمد کا انتظار کرنے لگتا۔ رات کی خاموشی میں ارونا کے ستار کے تاروں کی جھنکار سنائی دیتی۔ ستار کی سسکیاں چاندنی راتوں کی نشیلی فضا میں تیرتی رہتیں جیسے کوئی دل شکستہ آہیں بھر رہا ہو اور میں اس کی مدھر تانوں پر کان لگائے خوابوں کی دنیا میں کھو جاتا ـــ

ایک دلفریب شام جب شفق کی رنگینیوں میں رومانیت مستیاں لٹا رہی تھیں۔ میری اس سے ایک پارک میں ملاقات ہوئی۔ اور ہم دونوں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگے ـــ "آج چلو گے پکچر؟" ـــ اس نے یکایک پوچھا اور پھر میری کشمکش کو دیکھتے ہوئے اس نے خود ہی کہا ـــ "کیوں! میرے ساتھ پکچر جانے کی ہمت نہیں تم میں؟ ـــ دنیا کیا کہے گی ـــ یہی نا یہی خیال ہے" ـــ اور اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ میں نے پشیمانی سے سر جھکا لیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا ـــ "دنیا سے اتنا ڈرتے ہو، نور؟ ـــ یہ خوف تمہیں کہیں کا نہ رکھے گا۔ میری طرف دیکھو دنیا والوں کی مجھے رتی بھر بھی پرواہ نہیں۔ تمہارے سماج کو مجھ سے نفرت ہے۔ مجھے لوگ عجیب عجیب ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی سوسائٹی میں میرا گذر ناممکن ہے۔ لوگ میرے سایہ سے بھی گھبراتے ہیں اور تو اور، تم جیسے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی میرے ساتھ سیر و تفریح منظور نہیں۔ کیوں ـــ؟ صرف اس لئے نا کہ میں نے مروجہ تہذیب اور تمہارے سماج کے ذلیل اصولوں کے خلاف بغاوت کی ٹھانی۔ اس کے قدموں پر جھکنے کے بجائے دنیا کو اپنے پیروں پر لا گرانے کی کوشش کی۔ میں پوچھتی ہوں آخر کیا میں نے برا کیا؟ کیا حق کے لئے جہاد کرنا جرم ہے؟ کیا ایسی تہذیب کو جو انسان کو انسان بنانے کے بجائے خود غرض درندہ بنا دیتی ہے۔ جڑ سے اکھیڑ پھینکنے کی کوشش

اخلاقی گناہ ہے؟ بولو انور! ـ ـ ـ بولتے کیوں نہیں؟ ــ" میں کیا جواب دیتا۔ اس کے تخیلات میرے دل کی گہرائیوں میں گم ہو کر رہ گئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں بھی اسی کی طرح ایک باغی ہوں۔ جیسے یہ پارک باغی ہے۔ جیسے یہ ساری کائنات باغی ہے۔ دل میں ایسے ہی تو خیالات تھے میرے لیکن آج تک میں انکی گہرائیوں تک نہ پہنچ سکا تھا۔ آج میری خوابیدہ روح انگڑائیاں لیتی جاگ اٹھی تھی۔ دل نے چیخنا شروع کیا ــــ جگاؤ اَرونا ـــ مجھے سوتے سے جگاؤ میری غفلت تمہاری نزدیکی سے دور ہو رہی ہے زندگی جہنم نظر آتی ہے جہاں نہ خوشی ہے نہ شانتی ہے نہ اخانی ہے جہاں کچھ بھی نہیں ہے یہ لق ودق صحرا ہے۔ ہماری طرح آگ کا ایک بہت بڑا شعلہ ہے جس میں میں جل رہا ہوں تم خود ایک شعلہ ہو ــ مجھے بھی شعلہ بنا دو۔ میں آگ بن کر ساری دنیا کو جلا کر خاک کر دینا چاہتا ہوں ساری کائنات کو میں آگ کی لپیٹ میں تڑپتا دیکھنا چاہتا ہوں ــ بولو اَرونا! ــ تم بولتی کیوں نہیں ـــ لیکن دل کی یہ آواز دل کے پردوں ہی میں سمٹ کر رہ گئی۔ مجھے خاموش دیکھکر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میری باتیں بری لگیں انور؟" ــ میں نے عقیدت مندانہ نگاہوں سے اُسے دیکھا "نہیں اَرونا ـ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔ بخدا دل چاہتا ہے تم یونہی بولے جاؤ اور میں یونہی سنتا رہوں۔ میرے دل میں بھی ایسے ہی خیالات ابھرتے اور میں انکی تہہ تک نہ پہنچکر تڑپ جاتا۔ اپنے بس پاس سسکتی انسانیت کو دیکھتا تو اپنی دنیا اپنے تمدن اور خود اپنے سے مجھے نفرت سی ہونے لگتی۔ آج تمہاری باتیں سن کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری خوابیدہ روح جاگ اٹھی ہے ــــ تم مسکرا رہی ہو؟" میں رکا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کے بجائے مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ــ "برا نہ مانو انور ــ مجھے ہنسی تو آ رہی تھی لیکن تمہارے تخیلات پر نہیں بلکہ تمہاری باتوں پر ــ تو اب واپس چلو اندھیرا ہو رہا ہے۔" اور ہم واپس لوٹے۔

## قطعات ــــ ارشد صدیقی

جب کسی کا خیال آتا ہے
دل کو اس طرح گدگداتا ہے
جس طرح نیند میں کوئی بچہ
دیکھ کر خواب مسکراتا ہے

٭

آپ جب مجھکو یاد آتے ہیں
اشک پلکوں پہ تھرتھراتے ہیں
جیسے شبنم کے نقرئی قطرے
گر کے پھولوں پہ تلملاتے ہیں

٭

ابتدا انتہا میں کھو جائے
جلوہ یوں چشم وا میں کھو جائے
جسطرح آسمان سے تارہ
ٹوٹتے ہی فضا میں کھو جائے

اپنے فلیٹ کے دروازہ پر اس نے بیگ سے چابی نکالی، دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے: "تمہارے قدم ڈگمگائے نہیں انور؟ ــ آج تم کلوپیٹرا کے کمرے میں ہو" اس نے مسکرا کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ــ اور پشیمانی سے میرا سر جھک گیا۔

وہ بھی میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔ آسمان پر چاند نکل آیا تھا چاند کی سنہری کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ اَرونا نے چاند کو دیکھا اور پھر روشنی گل کر دی ــ "گھبراؤ نہیں انور! میں نے تمہاری بہتری کے لئے روشنی گل کی ہے۔ وہ دیکھو سامنے تمہارے پڑوسی مولانا حسین علی بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے ہیں۔ جانتے ہو وہ کس کے منتظر ہیں؟ اُس کرسچن لونڈیا میری طامسن کو تو جانتے ہی ہو نا ــــ"

"خدارا چپ رہو اَرونا! تم ایک ولی صفت ہستی کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہی ہو" مجھ سے نہ رہا گیا۔ اس نے دوبارہ ایک قہقہہ لگایا "میں نے پارک میں کہا تھا نا انور! تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے یقین نہیں آتا تمہیں میری باتوں کا؟ ــ اچھا پنڈت برجموہن شاستری کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ بھی ولی صفت ہیں نا ــ اُن سے ملاقات ہو تو پوچھ دیکھنا کہ رام کماری کے بچے کا کیا ہوا۔ رام کماری اُن کے یہاں جھوٹے برتن صاف کیا کرتی تھی۔ اس نے اسی کمرے میں تڑپ تڑپ کر جان دی تھی۔ کیسے بھولوں میں وہ بھیانک رات انور! اب وہ باتیں یاد آتی ہیں تو میں کانپ اٹھتی ہوں۔ میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ دل چاہتا ہے ایسے ظالم ــــ اُف بھگوان!" ــ جوش میں اس کی آواز کانپنے لگی اور اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنا دل تھام لیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور سانس زور زور سے چلنے لگا اُسکی حالت سے گھبرا کر میں نے پانی کے چھینٹے دیئے۔ کچھ دیر بعد اُسکی طبیعت سنبھلی اور اس نے آنکھیں کھولیں ــ "اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر تھیں۔ صرف ایک لمحہ کے لئے

میں نے اُن آنکھوں میں حزن و ملال کی جھلک دیکھی اور پھر اس نے کہا —— "شکریہ انور! گھبراؤ نہیں تم۔ یہ بہت پرانی بیماری ہے۔ اکثر مجھ پر ایسے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ اب تو میں انکی عادی سی ہوگئی ہوں" انھیں اٹھتا دیکھکر میں نے اپنے بازو کا سہارا دیا۔ سامنے آئینہ تھا۔ اس میں اپنا عکس دیکھا تو کچھ شرم سی محسوس ہوئی اور میرا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "کیوں انور! مجھے اپنے بازو کے سہارے بیٹھے دیکھکر شرم محسوس ہوتی ہے۔ نہیں؟ —— کیا ماں، بیٹے کے بازوؤں کا سہارا بھی نہیں لے سکتی؟ ——" اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ماں —— !!!" میرے منہ سے بیساختہ نکلا۔ وہ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا "ہاں انور! میں تمہاری ماں ہی کی طرح تو ہوں۔ ۳۸ برس کی عورت ایک نوجوان کی ماں ہی تو ہوتی ہے۔"

"۳۸ برس کی عمر ہے تمہاری؟" مجھے یقین نہ آتا تھا۔

"کیوں یقین نہیں آتا تمہیں؟ ——" اس نے مینٹل پیس پر سے فوٹو البم اٹھا لیا —— "یہ دیکھو انور —— تم نے اس نوجوان کو دیکھا ہے کبھی؟"

میں نے دیکھا کیبنیٹ سائز کی ایک تصویر تھی۔ چہرہ کچھ پہچانا سا معلوم ہونے لگا۔ "کون ہیں یہ؟ —— شاید میں نے انھیں کہیں دیکھا ہے۔" وہ مسکرائیں اور پھر بغیر کچھ جواب دئے میرے ہاتھ سے البم لے لیا۔ آنکھوں میں ایک پُراسرار چمک لئے وہ اس فوٹو کو دیکھتی رہیں —— "غلط خیال ہے تمہارا۔ تم نے اسے کبھی نہیں دیکھا، ہاں اس کی ماں کو ضرور دیکھا ہے" وہ اب بھی مسکرا رہی تھیں —— "یعنی —— تمہارا بیٹا ...؟!" میرے منہ سے بیساختہ نکلا۔ اس میں ارونا کے علاوہ میری بھی بہت شباہت تھی —— "ہاں انور! یہ رتن ہے میرا بیٹا۔ آجکل بمبئی میں بی اے کی تیاری کر رہا ہے۔ دیکھا نا تم نے اس کی شکل تم سے کتنی ملتی ہے جس دن میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا میں نے محسوس کیا جیسے میرا رتن بمبئی سے یہاں آگیا ہے —— اپنی ماں کے قریب —— ویسے ہی خدوخال —— ویسی ہی چال —— صورت شکل بھی ویسی ہی۔ تمہیں دیکھکر مجھے میرا بچہ یاد آجاتا۔ میرے سینے میں ماں کی ممتا اور بیٹے کا پیار جاگ اٹھتا لیکن دوسرے لمحے میں اپنی بے بسی پر تڑپ کر رہ جاتی" —— وہ رکیں —— "ایک بات پوچھوں انور! تم اپنی ماں سے دور ہو کیا تمہارا دل ماں کی محبت بھری گفتگو کے لئے نہیں تڑپا کرتا؟ چوڑیوں کی جھنکار کے لئے تمہارے کان بیقرار نہیں ہوتے؟ کیا بیٹے ایسے ہی سخت دل ہوا کرتے ہیں؟ میں تو اپنے بچے کے لئے اکثر تڑپتی رہتی ہوں —— وہ تو اپنی ماں کو مردہ سمجھ کر بمبئی میں آرام کی زندگی گذار رہا ہے ——" میں خاموش بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے خاموش دیکھکر انھوں نے خود ہی کہنا شروع کیا ——

"آجکل تمہارا کالج بند ہو رہا ہے۔ دو مہینے کے لئے تم شہر سے باہر جا رہے ہو۔ نہ جانے پھر کبھی ملاقات ہو یا نہیں۔ میرے یہ دورے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ بھگوان جانے کب دل ٹھہر جائے۔ آؤ آج میں تمہیں ایک کہانی سناؤں ——" اور انھوں نے کہنا شروع کیا۔ —— مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں تخیل کے پردوں پر اترا جا رہا ہوں —— عورت کی بے بسی —— دنیا کے مظالم —— دس گز کی زبان رکھنے والے شریف انسان —— جھوٹی افواہیں پھیلانے والے خود غرض درندے —— مولانا حسین علی —— پنڈت برجموہن —— ہماری دنیا کے ازلی پنڈت اور ہمارے ازلی مولانا —— ہندوستانی عورت تو وفا کی نھی دیوی ہوتی ہے۔ یہاں کی تمام نعمتیں ان کے قدموں پر رکھدی جاتی ہیں لیکن جب زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ آتا ہے تو ان کی بساط ایک بے جان مرمریں بت سے زیادہ نہیں۔ اگر کسی نے یہاں سر اٹھانے کی کوشش کی تو اس کی امنگوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ شاید یہی یہاں کا انصاف ہے یہی ازلی قانون۔ یہی رواج۔ شاید یہاں ازل سے ایسا ہی ہوتا آیا ہو —— لیکن یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ یہاں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہاں کمزور انسان کی بساط ایک مات کھائے ہوئے مہرے سے زیادہ کیوں نہیں؟ تباہی و بربادی کا یہ لامتناہی سلسلہ کہاں شروع ہوا تھا۔ کب شروع ہوا تھا کیوں شروع ہوا تھا۔ کب ختم ہوگا؟ —— اُف میرے معبود! میں پاگل ہوا جا رہا ہوں —— میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ حقیقت کے احساس نے مجھے خود فراموشی کے عالم سے بیدار کردیا۔ میری پیشانی پر پسینے کے قطرے چھلک اٹھے۔

میں نے دیکھا —— باغی ماں کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے آنسوؤں کے وہ قطرے ان کی چمکتی ہوئی چوڑیوں پر گرے اور پھسل کر سفید سفید جلد میں جذب ہوگئے۔ بہت دن گذر گئے —— بہت راتیں گذر گئیں۔

سورج نکلتا ہے۔ چاند طلوع ہوتا ہے۔ بہار آتی ہے پھر خزاں۔ لیکن فلیٹ نمبر ۱۵ میں ارونا دیوی کا پتہ نہیں۔ ہر رات روشنی گل کردینے کے بعد کان ستار کے مدھر تان سننے کے لئے بیقرار ہو اٹھتے ہیں۔ ستار کے تار آخری بار جھنجھنا کر ہمیشہ کے لئے بکھر گئے۔ باغی ماں دنیا کے انقلابوں سے دور ایک درخت کے سایہ تلے آرام کررہی ہے۔ بیٹا آئی سی ایس ہوگیا ہے۔ اور بیٹے کا ہمشکل فلیٹ نمبر ۲ میں بیٹھا دن اور رات باغی ماں کا منتظر ہے۔ رات کا خواب ڈھلنا شروع ہوتا ہے۔ صبح شب نے پریشان گیسوؤں کو سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔ سورج کی آمد آمد ہے مگر پھر بھی فلیٹ نمبر ۱۵ کا اندھیرا دور نہیں ہوتا —— نہ جانے کیوں —— !!

بہت دن گذر گئے .... بہت راتیں گذر گئیں۔

# نغمۂ شب تاب

فراق گورکھپوری

رات ہنس پڑتی ہے با دیدۂ پُرنم ساقی    بتیاں خونِ رگِ تاک کی جب جلتی ہیں
کچھ چمک جاتی ہے تاریکیٔ عالم ساقی    جب پیالوں میں چراغوں کی لَویں ڈھلتی ہیں

*

تھاپ پر تھاپ پڑی سازِ طرب پر ساقی    تا بہ دم گنبدِ افلاک گمک جاتی ہے
چنگ سے اُٹھتی ہے جھنکار برابر ساقی    خامشی رات کی رہ رہ کے کھنک جاتی ہے

*

آتی ہیں مدبھرے سنگیت کی لپٹیں ساقی    آگ آکاش کے سینے میں وہ دہکاتی ہوئی
اُنگلیاں ساز کے پردوں پہ رواں ہیں ساقی    اس جواں رات کے دل کی کسک اُکساتی ہوئی

*

پھول پڑتے ہیں سرِ فرش برابر ساقی    سازِ لرزاں پہ ہے رقصندہ شراروں کا گماں
گرمیٔ رقص سے دہکے ہوئے پیکر ساقی    عرق چہرہ میں چھٹکے ہوئے تاروں کا سماں

*

رقص میں پیکرِ رنگیں کا لچکنا ساقی    انگ کے لوچ میں کُل راگنیاں جھومتی ہیں
یہ مدھر بول، یہ کوندوں کا لپکنا ساقی    لالہ گوں ہونٹوں کو نغموں کی لویں چومتی ہیں

*

رس میں ڈوبی ہوئی آواز کی سرگم ساقی    سات رنگوں کی سجل قوسِ قزح باہوں کی دھنک
یہ کھنکتی ہوئی پائل کی چھما چھم ساقی    رُخِ گلرنگ پہ سنگیت کی یہ تیز دمک

*

موہنی آنکھوں کی یہ روپ کا جلوا ساقی    کنول ان نازنیں ہاتھوں کے لٹاتے ہوئے جب
جیسے دو چاندوں سے امرت کی ہو برکھا ساقی    ناچتے وقت چھلک جاتا ہے یوں جوبن رس

*

شعلے جب رات کے سنگیت کے لَو دیتے ہیں    جگمگا اُٹھتی ہے پیشانیٔ دوراں ساقی
نغمے جب زیرِ فلک کانپ کے دم لیتے ہیں    جھلملا اُٹھتا ہے تاروں کا چراغاں ساقی

*

رَین سنگیت کے اب بھیگ چلے ہیں شعلے    سرنگوں ساز، گلے نور کے خم ہیں ساقی
انگلیاں تیرگی چٹکاتی ہے گیسو کھولے    برقِ آواز کی پلکیں بھی تو نم ہیں ساقی

*

رات لیتی ہے جماہی پہ جماہی ساقی    ہر نگہ جاگے ہوئے تاروں کی السائی ہوئی
چور کتنی ہے تری نیم نگاہی ساقی    پچھلی شب! مدبھرے سنگیت کو نیند آئی ہوئی

---

لہ پھول پڑنا محاورہ ہے یعنی چنگاریاں برسنا۔ ۲ہ:- سنکرت شاعری میں ہاتھ، پاؤں، آنکھ اور چہرے کو کنول سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کرکمل، پدکمل، نین کمل، مکھ کمل۔ ۳ہ:- اس قافیہ کو میں نے یہاں روا رکھا ہے۔

# طوفانِ نوح

عبدالرشید خاں

۱۹۳۳ء میں برطانیہ کے بڑے عجائب خانہ میں بیسویں صدی کی موصلات اثری کی نمائش ہوئی تھی۔ ان اثریات میں علم وفن کے ماہروں اور عالموں کی نظروں میں جو سب سے زیادہ عجیب تحفے تھے وہ عراق میں نینوا اور بصرہ کے درمیانی علاقہ کی وادیوں میں کے اثریات تھے اس کے بعد ماہرین ان کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ دنیا میں کلدانی قوم شاید سب سے پہلی ترقی یافتہ اور متمدن قوم تھی۔

ان اثریات میں کلدانیہ کے دارالسلطنت ار ( [illegible] ) کے شاہی برجوں کی تصویریں۔ ان کے محلوں کے نقشے اور ان کی زینت وآرائشیں دیکھنے میں آئی تھیں۔ تحریری نقوش سے چنگی اور مالگذاری کے قاعدے اور دستور دیکھنے میں آئے۔ نصاب تعلیم اور علوم کی انتہا کا اندازہ ہوا۔ ان کے لباس کی کتر بیونت برتنوں کے نمونے اور مدرسوں کے خاکے سمجھنے میں آئے اور ان تمام چیزوں سے مجموعی طور پر ۴۰۰۰ قبل مسیح کی ایک ایسی شاندار تہذیب کے حالات۔ خیالات اور افعال پر اتنی تفصیل کے ساتھ روشنی پڑی ہے کہ انھوں نے تاریخ میں ایک ناپید باب کو قائم کر دیا ہے۔ ان آثار سے ہی یہ دریافت ہوا ہے کہ اگرچہ کلدانیہ کی معاشرت میں بت پرستی، بادشاہ پرستی داخل تھی مگر عقیدۂ توحید کی تعلیم کا بھی مدرسہ موجود تھا جس سے علمائے حق نمودار ہو کر بت پرستی کے خلاف جہاد کرتے رہے تھے۔

لیکن شاہ پرستی کو اس زمانہ کے بادشاہوں کا سہارا رہتا تھا اس لئے سرمایہ داری ہمیشہ دینداری اور توحید کی فضا پر غالب آتی رہی۔ اس زمانہ میں ار دنیا کی طرح دینی مذکروں کا بھی مرکز تھا۔ ان اثریات پر ماہرین کے قیاس نے اس کا بھی فیصلہ کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے زمانہ کی طوفانی بارش اور سیلاب سے نجات پانے کے بعد اس ارض نجات میں بطور شکرانہ ایک مدرسہ الہیات قائم کیا تھا اور گذشتہ تجربوں اور مشاہدوں سے فائدہ اٹھا کر یہاں کا تعلیمی نصاب بھی خود ہی مرتب کیا تھا۔

اُر کی اس تعمیر کی پہلی اینٹ رکھنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام یعنی جب ان کے اور بادشاہ وقت کے درمیان مناظرے اور مباحلے ہوئے کم ازکم ایک ہزار سال کی مدت گذری ہوگی یہ وقت دولت کلدانیہ کے عروج کا تھا۔ اس طویل مدت میں زمانہ کی رفتار اور تبدیلیوں نے توحید کے ابتدائی عقیدوں کو ضرور ناقص کر دیا ہوگا۔ دین کے پیشواؤں کے خیالوں کو اور دلچسپیوں کو بدل دیا ہوگا۔ دین توحید کی گرفت ڈھیلی ہوگئی ہوگی اور دوسری طرف بادشاہی کے طویل سلسلہ سے سرمایہ داری۔ دولت کی محبت اور ان کے ساتھ آنے والی خرابیوں نے ترقی اتنی کر لی ہوگی کہ لوگوں کے خیال اور سماج ان سے اچھی طرح رنگین ہوگئے ہوں گے۔ نفس پرستیوں کو روا رکھنے کے لئے اوہام پرستی شگون فال اور بت پرستیاں عام طور سے قائم ہوگئی ہوں گی اور توحید پرستی کی بے رنگی کے مٹانے یا اس سے بے پروائی کی ہوا عام ہوگی۔ بستیوں سے باہر کسانوں کی کثیر تعداد سرمایہ داروں، زمینداروں اور اہل کاروں کے ظلم وستم سے پسنے لگی ہوگی۔ غرضیکہ اصولاً وہ سب کچھ ہو رہا ہوگا جو سرمایہ داری کے عروج میں آج تک ہوا اور ہوتا رہے گا۔

کسی فلسفی کا قول ہے کہ "دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے" اس مقولہ کی روشنی میں اثریات مذکور نے حضرت نوح کے زمانہ کی تہذیب ومعاشرت کی تصویر جس حد تک کھینچی ہے اس پر ماہرین نے اصول ودستور کے مطابق قیاس سے کام لے کر اس طوفانِ عظیم کی وسعت اور ہیبت کا بھی بڑی حد تک صحیح اندازہ کر لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سیلاب عظیم اگرچہ ہیبتناک تھا مگر اس قدر محیط نہ تھا کہ اس کو عالمگیر کہدیں جیسا کہ توریت نویسوں نے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہم ان مصنفوں کو ان کی روایت میں اسی شرط پر صحیح سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سمجھ لیں کہ ان کی دنیا کا جغرافیہ اسی قدر تھا۔ ورنہ یہ واقعہ ہے کہ ایسے محیط اور مہیب طوفان تو دنیا کے ملکوں اور گوشوں میں اس حادثہ سے پہلے اور بعد میں بارہا آئے اور شاید اس سے بھی بڑے آئے اور رہتی دنیا تک آتے رہیں گے۔

۱۹۱۴-۱۸ء کی عالمگیر جنگ میں اس طوفان کے اندازے کی ایک اتفاقی حادثہ سے تصدیق ہوگئی تھی۔ یعنی جب قط العمارہ ترکوں کے قبضے سے نکل کر انگریزی قبضہ میں آیا تو برسات کے موسم میں بارش اتنی کثرت سے ہوئی کہ بڑا بھاری سیلاب آگیا۔ اس وقت انگریزی لشکر میں آثار قدیمہ کے مشہور انجینیر سر ولیم ولکاکس SIRWILLLAMWILCOKS بھی موجود تھے۔ انجینیر موصوف لڑائی سے پہلے دراز عرصہ عراق کے اطراف میں کام کر چکے تھے اور یہاں کے چپہ چپہ سے واقف تھے جب سیلاب انتہا کو پہنچنے لگا تو انجینیر موصوف نے چند افسروں کو ساتھ لیا اور ایک دخانی کشتی پر سوار ہو کر علاقہ میں سفر کیا پھر بیرحار کے بیچ میں ٹھیر کر دوربینوں سے صورت حال کا مشاہدہ کیا، اس وقت پانی ہی نظر آتا تھا جس میں کہیں کہیں کھجور کے اونچے پیڑوں کی ہری چوٹیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ کئی دن تک یہ حالت رہی۔ خلیج فارس کی وزنی ہوائیں بحر عرب کے گہرے بادلوں سے ٹکرا کر عراق کی طرف ہی لوٹتی تھیں اور اس کی وجہ سے سمندر کی طرف دریاؤں کا رخ یا سیلاب کا بہاؤ رکا کھڑا تھا۔ پھر جب اناطولیہ کی طرف سے ہوا چلی اور بحری موجیں لوٹیں تب پانی کا راستہ کھلا اور پانی اترنا شروع ہوا۔

ان اثریات میں جن تختیوں اور سلوں سے طوفان کے واقعہ کا حال معلوم ہوتا ہے ان کے مطالعہ کے بعد ماہرین فن سب سے پہلے عراق کی سطح ارض کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ توریت نویسوں سے اتفاق رائے نہ کر سکے اور اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہوئے کہ اگرچہ سیلاب اور بارش نے کسی قدر یہاں کی بستیوں کو اجاڑ دیا تھا پھر بھی یہ طوفان مقامی تھا۔ پرانے علما میں جن لوگوں نے

اسے عالمگیر بتایا ہے ان کی معلومات جغرافیہ اور دنیا کی نسبت بہت کم تھی بلکہ اس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ اپنے وطن کو ہی دنیا سمجھتے تھے۔ ان اثریات کا مطالعہ توریت کے ساتھ ساتھ کرنے کے بعد طوفان سے پہلے کی بستیوں کی نسبت حالات اس طرح مدون کئے گئے ہیں کہ لوگ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور گاؤوں میں پھیل کر رہتے تھے۔ بستیوں کے گرد دور دور تک اراضی کاشت پھیلی ہوتی تھی۔ لوگ زراعت پیشہ اور زراعت سے ملحق دستکار تھے۔ دستور نظام کے لحاظ سے یہ آبادیاں خود مختار تھیں۔ دریاؤں میں سال کے سال طغیانیوں کی وجہ سے جو نقصان پہنچ جایا کرتے تھے ان سے بچاؤ کرنے کے لئے کسی اجتماعی کوشش کے ذریعہ جس کو مرکزی طاقت یا حکومت کہنا چاہئے ان دریاؤں کے کناروں پر پختہ بند بھی بنا دیئے گئے تھے۔ پھر جب تک مرکزی انتظام میں طاقت رہی اس وقت تک ان آبادیوں کی حفاظت اور قیام کے اسباب باقی رہے۔ مگر صدیوں کی مدت میں جب یہ مرکزی طاقت کمزور ہو گئی تو بند اور پشتوں کی مرمت اور تعمیر جیسی پہلے ہوتی رہی تھی نہ ہو سکی اور یہ بند ٹوٹتے چلے گئے۔ یہاں کے دستور حکومت میں ڈھیل اور کمزوری کے ساتھ لوگوں کی اخلاقی حالت میں بھی آوارگی اور بدبختی بڑھ رہی تھی اس زمانہ میں بابل سے قریب تین سو میل کے فاصلہ پر بحر حمارہ (جھیل) کے شمال میں حضرت نوحؑ ایک تعلقدار یا رئیس کی حیثیت میں رہتے تھے۔ چونکہ وہ نبی بھی تھے اس لئے انھیں قدرتی وسائل سے پیش آنے والے حوادث کی خبر ہو گئی ہوگی لہٰذا انھوں نے اپنی بصیرت اور ہدایت سے بڑی سے بڑی کشتی کسی درخت کے (غالباً گوپھر) کے تختوں سے بنائی تھی تاکہ اس پر اپنے متعلقین، گھر کا سامان، مویشیوں کو اور ان کے لئے اتنی خوراک رکھ لیں جو چار چھ مہینوں کے لئے کافی ہو جائے۔ دجلہ اور فرات میں قدیم زمانہ سے جہاز رانی ہوتی چلی آئی ہے۔ یہ جہاز آجکل کے جہازوں کے مقابلہ میں کشتیاں ہوتی تھیں ان کو پرانے زمانہ سے ہی بلم کہتے چلے آئے ہیں ان کی وضع اور شکل کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے آجکل کے اسپتانی جہازوں کی ہے۔ قیاس بتلاتا ہے کہ عراق کی ان کشتیوں کا نمونہ حضرت نوحؑ کی کشتی کی قسم کا ہے بعید نہیں ہے کہ یہ کشتی اسی طرح کی ہو۔

پھر جب طوفان آیا۔ بارش ہونے لگی۔ دریاؤں میں پانی چڑھنے لگا تو کنار دریا کے کھنڈر ٹوٹنے اور بہنے لگے۔ بارش ہوتی رہی اور سیلاب کا حجم بڑھتا رہا۔ عذاب میں زیادتی کے واسطے اس سیلاب میں یہ ہوا کہ بحر حمارہ (جھیل) میں تہ آب بھی سوتے پھٹ گئے ان میں سے پانی ابل ابل کر طغیانی میں اضافہ کرتا رہا۔ مگر سب سے زیادہ غضب یہ ہوا کہ بحر عرب کی موسمی ہوائیں (یا بادل) جو شرق رو رہتے ہیں اور ہندوستان کے ساحلوں پر برسا کرتے ہیں رخ بدل کر خلیج فارس کی طرف ہو گئی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیلاب کا بہاؤ خلیج کی طرف ہونے کے بدلے اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ عذاب کے پورا کر دینے میں یہ بھی ہوا کہ بحر عرب اور خلیج فارس کی لہروں کا رخ بھی الٹ گیا اور یہ اندرون ملک دور تک پہنچنے لگیں۔ کتاب پیدائش (پرانا عہد نامہ) میں اسی کیفیت کی نسبت لکھا ہے کہ "آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں اور زمین کے سوتے پھٹ گئے"۔ غرضکہ چالیس دن تک چوبیس گھنٹے متواتر پانی برستا رہا سوتوں سے پانی ابلتا رہا سمندر سے لہریں امنڈتی اور الٹتی رہیں، جس سے سیلاب ٹھہرا رہا اور عذاب سے غضب ہوتا رہا۔ عراق کی برسات میں جب بارشیں کثرت سے ہوتی ہیں تو طغیانی کا سا عالم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایسی ہیبتناک طغیانی شاذونادر آتی ہے لیکن جیسی طغیانیاں وہاں آتی رہتی ہیں دیکھنے میں آیا ہے کہ خلیج کے بادلوں سے اور موجوں سے سیلاب کا پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔

بروایت کتاب پیدائش پندرہ ہاتھ اونچا پانی زمین پر تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ بائیس فٹ پانی چڑھ گیا تھا اور پہاڑوں پر بھی پانی چڑھ گیا تھا۔ عربی میں اگرچہ جبل کے معنی پہاڑ کے ہیں مگر جبل کا اطلاق سدب یا پلیٹو پر بھی ہوتا ہے۔ طوفان کے زمانہ میں یہ عالی آراضیاں آباد تھیں۔ اس ملک میں جیسی طغیانیاں سال کے سال آتی رہیں وہ اب معمولی سمجھی جانے لگی ہیں اور ان کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔ ان سیلابوں میں پانی بارہ فٹ کی اونچائی تک پہنچتا رہا ہے۔ اس لئے اس ہولناک طوفان میں اتنی ہی زیادتی تھی کہ خشکی پر پانی کا حجم اور دس فٹ زیادہ تھا یعنی مجموعی طور سے بائیس فٹ اونچا پانی تھا جس سے پہاڑ بھی ڈھک گئے تھے۔ بارش چالیس دن تک ہوتی رہی اور پانی اونچی چوٹیوں پر بھی دس بارہ فٹ کے حجم میں ایک ڈیڑھ مہینہ

## "اے دوست"

زیست سب جس پہ جان دیتے ہیں — نقش بر موجِ آب ہے اے دوست
نازہم جس خوشی پہ کرتے ہیں — اک فریبِ سراب ہے اے دوست
مال و زر و شادمانی و راحت — اک طلسمِ حباب ہے اے دوست
حسن اور بے حجاب ناممکن — حسن تو خود حجاب ہے اے دوست
تلخیٔ زیست پر تمنا کا — ایک رنگیں نقاب ہے اے دوست
غم کا احساس غم بڑھاتا ہے — ورنہ غم ایک خواب ہے اے دوست
ہو خزاں بھی بہار جس کے لئے — ہاں وہی کامیاب ہے اے دوست
درد جس داغدار دل میں ہے — روکش آفتاب ہے اے دوست
اک حیاتِ دوام ہے یہ موت — اس سے کیوں اجتناب ہے اے دوست

ایک اک شعر آج لطفی کا
آپ اپنا جواب ہے اے دوست

لطفی رضوانی

تک ٹھیرا رہا اس لئے اگر آجکل کے سے امدادی وسائل ان لوگوں کو میسر آجانے پر بھی کسی انسان یا مویشی کے بچنے کا امکان نہیں تھا۔

ایک خدا ترس انسان بلکہ نبی اور رئیس کے شایان حضرت نوحؑ نے بھی اپنے عزیزوں، رشتہ داروں، نوکروں اور مویشیوں کے بچانے کی فکر کی ہوگی۔ وہ مویشیوں کے بچانے میں تو کامیاب ہوگے مگر ان کے بیٹے کنعان کی طرح نوکروں کی نجات میں بھی مشیت الٰہی حائل ہوگئی تھی۔ پیدائش کی کتاب کی یہ روایت کہ حضرت نوحؑ نے چوپایوں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھا تھا صحیح نہیں معلوم ہوتی اور راجا کا پیوند ہے واضح رہے کہ یہ طوفان مقامی تھا چوپایوں کی تخلیق انسان سے پہلے ہو چکی تھی اور اس وقت تک ہر جنس اور قسم کی کثیر تعداد نسلیں بلکہ مناسب حال آب و ہوا اور ملکوں میں پھیل چکی تھیں اور موافق حال آب و ہوا کی کمی کہیں نہیں ہوسکتی تھی اس لئے تمام چوپایوں کی حفاظت کا مسئلہ یہاں نہ تھا۔ عراق میں عام نشیب بصرہ کی طرف ہے۔ اس سے سمجھنا چاہئے کہ پہلے کشتی سیلاب میں بہہ کر بصرہ کی طرف چلی تھی۔ یہ سفر کوئی منزل کا ہوگا اس سفر کو ختم کرتے کرتے ملک کی تمام آبادیاں غرق آب ہو چکی ہوں گی بصرہ [illegible] میں بحری بادلوں نے مزاحمت کی ہوگی اور کشتی کا رخ مشرق کی طرف پھیر دیا ہوگا [illegible] سے نیچے پانی میں سمندر کی طاقتور موجیں شمال کی جانب [illegible] رہی تھیں اس لئے یہاں سے کشتی نے شمال کا رخ کیا ہوگا حتی کہ بیرحمار کے [illegible] میں منزل کے قریب [illegible] تو بروایت کتاب پیدائش خدا نے ایک آندھی چلائی جو زمین پر سے ہوتی نکل گئی اور پانی کم ہوا اور تہہ آب چشمے بند ہو گئے۔

آندھی [illegible] عراق میں اب بھی مغرب سے موسمی چلتی ہیں اور شمال مغربی [illegible] پچھوا کہلاتی ہیں۔ پچھوا اناطولیہ اور شام کی طرف سے آتی ہیں اور خلیج تک ہوتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ ہوا تند و تیز آندھی کی شکل میں ہوتی ہے اور خلیج فارس کے بادلوں اور [illegible] کو دھکیلتی ہوئی دور سمندر تک لے جاتی ہے۔ چنانچہ اسی آندھی نے طوفان نوحؑ میں سیلاب کا راستہ کھولا تھا۔ بارش بند ہوئی زیر زمین سوتے بند ہوئے آندھی نے موجوں اور بادلوں کو دھکیلا تو سیلاب کو بڑھنے کا راستہ ملا اور پانی کم ہونے لگا بلند چوٹیوں پر سے پانی اترا اور کشتی زمین کو چھونے لگی تھی کہ ایک جگہ ٹھیر گئی کشتی کا یہ ٹھکانا [illegible] کی کا پہلا پایہ تخت بنا جس کا نام ارتھا بیرحمار کے مضافات سے زیادہ دور نہیں ہے۔ قدیم زمانہ میں دجلہ سے ایک شاخ پھوٹ کر اس کے قریب نکلتی ہوئی فرات میں گرتی تھی لیکن اب صدیوں سے یہ نہر خشک ہے۔ اسی خشک نہر کا نام شط الحئی ہے۔ ماہرین کا قیاس ہے کہ پرانے زمانے میں ارارت اسی جگہ کا نام ہوسکتا ہو جو بعد میں کوہ جودی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کوہ ارارات کو اناطولیہ کے ارارات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس میں مغالطہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اناطولیہ میں ارارات کا نام بعد میں اختیار کر لیا گیا۔

جہاد علمی اب بھی دوسرے گوشوں میں جاری ہے۔ اثریات کی دستیابی سے قدیم علوم میں جتنا اضافہ ہورہا ہے یہ اسی قدر ذوق تلاش و تجسس کو تیز کر رہا ہے، ان تحصیلات سے تاریخ کی گم شدہ کڑیاں جڑتی جارہی ہیں۔ پرانی روایتیں ٹوٹنے لگی ہیں۔ اور یہ توقع بیجا نہیں ہے کہ علم و سائنس کی ترقی اور فروغ سے عقائد اور روحانیات کی دنیا بھی کسی قدر سادہ و دلکش ہوسکے گی۔

# فرانسیسی افسانے اور فطرت نگاری

اثر لکھنوی

یوں تو کہا جا سکتا ہے کہ فطرت نگاری کا آغاز اسی دن سے ہوا جب انسان نے اوّل اوّل تحریر کو قلم اٹھایا کیونکہ مظاہر فطرت کی متابعت کا بھی سوال پیدا ہوا، لیکن تاریخ ادب کا مطالعہ کرنے میں دیگر امور کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا مثلاً قومی خصوصیات، واقعات، انسانی دل و دماغ کا اتار چڑھاؤ جن سے ادب متاثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہی اسباب ادبی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں اور بعض اوقات یہی اسباب ادب کی رفتار تیز کر دیتے ہیں۔ اگر بنی نوع انسان کو ایک فوج تصور کیا جائے جو زمانے کے وسیع میدان میں گامزن ہے اور برابر استقلال کے ساتھ راستی پر قابو پانے کو کمربستہ رہتی ہے تو زمانے کی سیہ بختی اور کسی دور کی خامیاں جو کچھ بھی ہوں یہ ناگزیر ہے کہ ادیبوں اور سائنسدانوں کو اس فوج کا ہراول تسلیم کیا جائے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں پہلی بار "طرز" معرض وجود میں آیا۔ اس سے پیشتر سائنسداں اور شاعر اپنے رجحان اور اپنی ذہانت و فطانت کی روشنی میں عمل پیرا تھے۔ بعض نے آن تیہ چند ذرّے حقیقت کے بھی ڈھونڈ نکالے تھے مگر ایسے ذرّے جو منتشر تھے اور جن میں فاحش اغلاط کا احتمال تھا۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ سائنسدانوں نے تہیہ کیا کہ قیاس کے بجائے تجربہ کو اپنا رہبر بنائینگے انہوں نے مفروضہ و مکسوبہ راستیوں کو ٹھکرا دیا اور اولین اسباب کی طرف رجوع کی ہوشیاری سے مشاہدہ و مطالعہ میں مصروف ہوئے اجماعی اصول کی جگہ تجزیہ پر تحقیق کی بنیاد قائم کی۔ قیاس اور پیشین گوئی سے انکشاف حقیقت کی امید ترک کر دی گئی، فطرت کا صبر و استقلال سے مطالعہ شروع ہوا، افراد سے گزر کر اجتماع تک اور اجتماع سے مجموعہ جز و کل تک رسائی ہوئی۔

یہ سائنس کا طرز کا رتھا۔

لیکن ایک مہذب جماعت کے تمام افراد و اشیا ایک دوسرے سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط و مسلسل ہوتے ہیں۔ جب انسانی تفکر کے ایک شعبے میں جولانیاں اور سرگرمیاں شروع ہوتی ہیں تو دوسرے شعبے بھی قدم بہ قدم رکھتے ہیں اور پھر سب مل کر منہمک ہوتے ہیں۔ ادب نے سائنس کی مثال سے استفادہ کیا اور وہ طرز طلوع ہوا جس کی بنیاد تجزیہ پر تھی۔ اٹھارویں صدی کی عظیم فلسفیانہ تحریک ایک زبردست سعی تھی، گو بسا اوقات اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کے چلنا ہوتا تھا تاہم اس کا مستقل مقصد مطالعہ اور حیات انسانی کے تمام عقدوں کا حل تھا۔ تاریخ اور تنقید میں قدیم منطقی استدلال کی جگہ واقعات و ماحول کی چھان بین نے لے لی، خالص ادبی کارناموں میں فطرت نے مداخلت کا اقدام کیا حتی کہ عین جینیکس روسو کی سرکردگی میں عنان حکومت اسی کے ہاتھ میں تھی۔ کوہ و صحرا و دریا میں گویا جان پڑ گئی اور کارگاہ عالم میں اپنی اپنی جگہ اپنے فرائض انجام دینے لگے۔ اب انسان ایک ذہنی مخلوق نہیں رہا بلکہ اپنے ماحول کا تابع تھا اور اسی کے تحت اس کی تکمیل ہوتی تھی۔

ڈائڈیرو مخصوص طور پر اٹھارویں صدی کی عظیم الشان ادبی شخصیت ہے۔ اس نے ہر قسم کی راستی کو دیکھا اور پہچانا، وہ اپنے معاصرین سے بہت آگے نکل گیا، رسم و رواج کی گھن لگی ہوئی بوسیدہ عمارتوں کو ڈھا تا چلا گیا، غیر معقول قواعد کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ اس عہد میں سرعت کے ساتھ شاندار ترقی ہوئی۔ شدید تھی وہ محنت و ریاضت جس سے کہ موجودہ سوسائٹی رونما ہوئی۔ یہ ایک دور جدید تھا جس نے آنے والی صدیوں کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا جس کو انسان طے کر رہا ہے۔ فطرت اس کی بنیاد ہے اور "طرز" اس کا آلۂ کار۔

اسی تدریجی ترقی کا نام "فطرت پرستی" ہے، سائنس اور ادب میں اسکا مطمح نظر فطرت و انسانیت کی طرف مراجعت ہے: ہر بات کو احتیاط و ہوشیاری سے جانچنا، صحیح تشریح کرنا اور ہر شے کی سچائی اور دیانتداری سے مصوری کرنا اس کا فرض ہے۔ مفروضہ شخصیتیں مفقود ہو گئیں، اختراعات کا ذبہ کا قلع قمع ہو گیا "مطلق اصول" باطل ہو گئے، ان کی جگہ زندہ اور اصلی نفوس کارفرما ہیں اور ان کے سچے حالات بیان ہوتے ہیں، روزانہ زندگی کے تعلقات من و عن دکھائے جاتے ہیں۔ اس امر کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ انسان اور اس کی زندگی کے تمام متعلقات کا مطالعہ کیا جائے تاکہ بلا افراط و تفریط اس کی حقیقت آئینہ ہو جائے اور صحیح نتائج نکالے جائیں، ان خیال پرستوں کے علی الرغم جو فرضی انسانوں کے نمونے گڑھتے ہیں مصنفوں کو ادبی عمارت بنیاد سے از سر نو اٹھانا پڑی اور ہر ایک نے اپنی استعداد کے موافق عملی طور پر اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔

انسانی تخیل میں ایسا زبردست ارتقا بغیر کسی تمدنی فشار کے ناممکن تھا۔ یہ انقلاب فرانس کی شکل میں ظاہر ہوا۔ کسی انقلاب کی تکمیل سنجیدگی اور فہمیدگی سے شاذ ہی ہوتی ہے۔ دماغ کے پیچ ڈھیلے ہو جاتے ہیں، قوت متخیلہ مرعوب و تیرہ ہو کر اوہام کا شکار ہو جاتی ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اختتام کے لگ بھگ انقلاب کے اس زبردست دھکے

کے بعد طبقۂ شعرائے دوسو کی نیک مگر مضطرب روحانیت سے متاثر ہوکر مبتلائے حزن و اضمحلال ہوگیا اور قسمت پرستی کو اپنا شعار بنالیا - وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی منزل مقصود کیا ہے، بعض نے تلخ نوائی اختیار کی بعض سوچ میں پڑ گئے یا خلاف فطرت افعال کو اپنی تخیل کا جولانگاہ بنایا - تاہم انقلاب کی روح ان میں حلول کرچکی تھی اور دوسروں کی طرح انھوں نے بھی علم بغاوت بلند کیا - ان کی سرکشی نے دنیائے رنگ و بو وجہانِ تخیلات و جذبات میں ہلچل مچادی - تمام معیّنہ اصول توڑ ڈالے گئے اور زبان نے بلند خیرہ کن اور موسیقیت سے لبریز الفاظ کا جامہ پہنا - اس حالت میں بھی صداقت کی جھلک نظر آجاتی تھی کیونکہ مردہ صدیوں کے خیالات کو دوبارہ زندگی بخشنے کی کوشش میں بھی مقامی رنگ جھلکنے لگتا تھا - اس طرح رومانوی سکول وجود میں آیا جسے فرانسیسی ادبی کلاسک کا حریف کہنا چاہیئے -

کسی میں اس (رومانی) تحریک کی تاب مقاومت نہ تھی اور سبھی نے اس کا اتباع کیا - مصوری، بت تراشی حتیٰ کہ موسیقی میں بھی رومانیت کا دور دورہ تھا - ایسے قوی اور ہمہ گیر مظاہرہ کی موجودگی میں خیال ہوتا ہے کہ ادب اور فن کے مستقل اصول ہمیشہ کے لئے منترتب ہوجائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا - فرانسیسی کلاسک اسکول تو دو صدیوں تک پھولا پھلا لیکن رومانوی اسکول میں صدی کے ایک چوتھائی حصے کے بعد ہی زوال کے آثار نمودار ہونے لگے - اس وقت لوگوں کو ہوش آیا اور اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ رومانوی تحریک محض ایک جھڑپ تھی نہ کہ وارے نیارے کی لڑائی بڑی بڑی قابلیتوں کے شاعروں اور ناول نگاروں کی ایک پوری نسل نے جن کے طبائع میں پرشکوہ جوش ودلیعت تھا حقیقت کے چہرے پر نقاب ڈال دی تھی اور حقیقت یہ تھی کہ ڈانڈیرد کے جائز وارث یعنی فطرت نگار اشخاص اس صدی کے واحد مالک ہیں - زنجیر کی گمشدہ کڑی آخرکار مل گئی اور فطرت نگاری بالزک کی سرکردگی میں لڑ بھڑ کر صف اولین میں پہنچ گئی -

اس میں شک نہیں کہ ایک قلیل عرصے تک دو ادبی ہستیاں ایک دوسرے کے مقابل رہیں، ایک طرف وکٹر ہیوگو تھا جو لکھنا تو چاہتا تھا نثر مگر لکھتا تھا نظم - پھر الکزانڈر ڈوما (بزرگ) تھا جس کے متعلق صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ زبردست افسانہ گو تھا، اُدھر جارج سینڈ تھی جو اپنی قوت اختراع کے دیکھے ہوئے خوابوں کو موزوں اور دلکش الفاظ میں دہراتی تھی - اس کے باوصف جدید فرانسیسی ناول کے سرچشمے بالزک اور اسٹینڈ ہال ہی میں ملیں گے، یہ دونوں مصنف رومانی جنون سے مصئون رہے، بالزک اپنی طبیعت کے خلاف اور اسٹینڈ ہال بالارادہ (بالزک سے بہتر دماغ رکھنے والے کے لئے یہی شایاں بھی تھا) جب کہ سرشار موسیقی اسکول کے متوالے اس کے فتوحات کا ہر جگہ چرچا کر رہے تھے جب کہ ہیوگو کے سر پر سلطان ادب کا تاج بڑی دھوم دھام اور طمطراق سے رکھا جا رہا تھا یہ دونوں یعنی بالزک اور اسٹینڈ ہال قریب قریب کس مپرسی کے عالم میں کام کر رہے تھے، ان کے مساعی نامشکور تھے اور ان کے ادبی کارناموں کو حقارت سے دیکھا جاتا تھا - لیکن یہ دونوں اپنی تصنیفات میں نیچرلسٹ اسکول کا دستور العمل منضبط کرگئے۔ ان کے بعد سینکڑوں کی تعداد میں ان کے جانشین ان کی خاک سے پیدا ہوئے، درانحالیکہ رومانوی اسکول خون کی کمی کی وجہ سے قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے تھا - اس کی یادگار صرف ایک شخص رہ گیا تھا کہ وہ وقار وکہن سال وکٹر ہیوگو، جس کا اس قدر احترام باقی رہ گیا تھا کہ اس کے منہ پر حقیقت کا اظہار نہیں کرتے تھے -

شاید ضروری نہیں کہ اس جگہ ان اصول کی صراحت کی جائے جو بالزک اور اسٹینڈ ہال کی دین ہیں - ناول نگاری میں انھوں نے وہی اصول برتے جو سائنس کی تحقیق میں دوسروں کے رہنما تھے - اشیا کے متعلق قیاس سے احتراز کیا، محض قصے کہنا چھوڑ دیا - اُن کا فرض یہ تھا کہ انسان کو لیں اور اس کے دل و دماغ پر عمل جراحی کریں - اسٹینڈ ہال زیادہ تر نفسیات پر قانع رہا - بالزک نے امزجہ کا مطالعہ کیا، ماحول کو از سر نو ترتیب دیا اور شہادت میں انسانی دستاویزیں ۱؎ "پیٹی کیٹ" "لا پیری گوریو" یا "کزان بٹی" کو ان سے پیشتر کے سترھویں اور اٹھارویں صدیوں کے ناولوں سے مقابلہ کرنے پر واضح ہوجائے گا کہ اس عظیم الشان نیچرلسٹ اسکول نے بالزک کے زمانے میں ہی ارتقا کے کیسے کیسے مدارج طے کر لئے تھے -

بالزک اور اسٹینڈ ہال کے ادبی فرزندوں میں سب سے ممتاز گسٹیو فلابیر کو ملنا چاہیئے - بالزک کو حد درجہ پریشان کرنے والا یہ احساس تھا کہ اس کے طرز انشا میں وکٹر ہیوگو کی سی گونج نہیں ہے - نکتہ چینوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ بہت کاواک لکھتا ہے، یہ سن کر بالزک بہت ملول و متاسف ہوتا تھا - کبھی کبھی وہ موسیقانہ لچک پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا مثلاً جب "لافیم ڈی ٹرنٹ" اور "لا لس ڈانس لا ویلی" لکھے لیکن اس مساعی ناکام رہے - یہ تحریریں اتنی بھی تو موثر نہ تھیں جیسی کہ وہ جن میں بالزک اپنا ہی بے زور مگر اکھڑا اکھڑا انداز بیان اختیار کرتا تھا گسٹیو کے ساتھ نیچرلسٹ اسکول کے قواعد ایک کامل الفن شخص کے ہاتھ میں پہنچ گئے جس نے ان کو مستحکم کیا اور مرمریں سطح کی طرح چمکا دیا -

فلابیر نے رومانوی فضا میں تربیت پائی تھی اور اس کی طبیعت کا میلان ۱۸۳۰ء کی تحریک کی طرف تھا - ابتداءً اس نے اپنی کتاب "میڈم بوواری" اس وقت کے فطرت نگاروں کے جواب میں لکھی تھی جو "شیمپ فلوری" کے متوالے تھے اور کاواک نگاری پر کھلے بندوں فخر کرتے تھے - فلابیر کا منشا یہ ثابت

۱؎ کیا رنگین نگاری اسی کا فیض نہ تھا؟ آثر

کرنا تھا کہ دیہات کے حقیر لوگوں کے حالات زندگی لکھنے میں بھی وہی وسعت خیال اور وہی قدرت زبان و بیان دکھائی جا سکتی ہے جو ہومر نے یونان کے سورماؤں کے تذکرہ میں صرف کی۔ خوش قسمتی ہے کہ فلابیر کی تصنیف سے ایک دوسرا نتیجہ بھی ظہور پذیر ہوا، اس کا منشا جو کچھ بھی ہو مگر حقیقت نگاری میں اب تک جو قوت کی کمی تھی اس کتاب نے پوری کر دی یعنی وہ بے مثل انداز بیان جو کسی کتاب کو لافانی بنانے میں معین ہوتا ہے۔ پھر کیا تھا، نئے آنے والوں کو صرف سچائی کے کشادہ راستے میں قدم رکھنے کی دیر تھی بشرطیکہ فن ان کا ساتھ دے۔

جو تنقید بالزاک نے شروع کی تھی پوری ہو گئی۔ انسان کا شاعرانہ مطالعہ اور ماحول کا اثر مقرراندا ز میں پایا گیا۔ یہیں سا تھ ہی ساتھ ناول نویس ماہر فن بھی ہو گئے، جدت ادا، ترتیب الفاظ و وضع تراکیب کے جوہر یا رہنے لگے اور اپنے اسلوب کی شیرینی اور لطافت سے راستی کے انکشافات میں تخلیق کی روح پھونک دی۔

فلابیر کی طرح اڈمنڈ اور جولس ڈی گانکور جو زندگی کے افراد بہت اور دلکشی کے متلاشی ہیں۔ یہ لوگ فلابیر کے برخلاف رومانیت کی پیداوار نہیں تھے نہ ان میں کوئی بات لاطینی یا کلاسکل تھی۔ ان کا فن خلقیہ فطرت تھا، وہ اپنی زبان کے آپ ہی موجد تھے اور انھوں نے جذبات کے اظہار کے لئے ایسا طرز ایجاد کیا جس میں حیرت انگیز عمق، متانت اور موزونیت ہے۔

سب سے پہلے اپنی کتاب "جرمنی لیسرٹو" میں پیرس کے باشندوں کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ مسافات شہر اور اس کے بے برگ و بار رعنائی کی مصوری کی، جو کچھ کہا آزادی سے اور اپنی زبان میں کہا۔ تحقیق اور ہر چیز اپنی اصلی حالت میں نظر آئی۔

دونوں گانکور نیچرلسٹ اسکول پر گہرا اثر ڈالا اور ان کا طریقہ فلابیر ہی کا اختیار کیا گیا جدید اسلوب اداسے لوگوں کی طبیعت میں ہیجان برپا کر دیا۔ جیسے اچھی موسیقی سے سنسنی پیدا ہوتی ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ محض تحریر نہیں تھی بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ نے جس رنگ بھر دیا لحن پیدا کر دیا اور عطر میں بسا دیا ہے۔

یہ ہیں جدید نیچرلسٹ اسکول کے بانی: بالزاک اور اسٹینڈہال اور ان کے بعد فلابیر اور برادران گانکور۔ موخر الذکر کے پہلو بہ پہلو اور لوگ بھی ہوئے۔ ان کے سلسلے میں دو نام فوراً سامنے آجاتے ہیں: الفانز ڈاوڈے اور گائی ڈی موپاساں۔

ڈاوڈے اُن خوش قسمت لوگوں میں تھا جنھیں قدرت اس جگہ لاکر بٹھا دیتی ہے جہاں شاعری اور حقیقت کے ڈانڈے ملتے ہیں۔ اس نے نیچرلسٹ اسکول کے شاندار ادبیات میں ایسی کتابوں کا اضافہ کیا جو حقیقت سے مطابق ہوتے ہوئے بھی ایسے شعلے سے منور ہیں جس کو خود ڈاوڈے نے فروزاں کیا جس شے کو اس نے چھوا اس میں نشوونما کی قوت پیدا کر دی، جان ڈال دی، رنگ بھر دیا، اور گہرائی بخش دی۔ نہ تو اس کا کلام اسٹینڈہال کی طرح سپاٹ تھا نہ بالزاک کی طرح کھردرا۔ اُس کی ذہنیت میں وہ دلکشی و رعنائی تھی جو عورتوں کا دل موہ لیتی تھی، اگرچہ وہ زندگی کے تاریک پہلو کے بجائے روشن پہلو کو اجاگر کرنا پسند کرتا تھا اور اس کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ اس کی تصنیفات پڑھنے والے رونے کے بجائے مسکرائیں تاہم اس نے کبھی دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی ادیبانہ راستی کامل تھی۔ ہم اس کو ان چار یا پانچ فرانسیسی ناول نویسوں میں شمار کر سکتے ہیں جن کے طرز تحریر میں ایک صحت مند دل دھڑکتا ہے اور سورج کی کرنیں بکھری ہوئی ہیں۔ وہ بلا شبہ نیچرلسٹ اسکول کا ایک رکن رکین تھا۔ اس کی تخیل میں چاہے کتنی بلند پروازی ہو لیکن زیادہ تر ان کی دلچسپی حقیقت سے ہے۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں کا نقشہ کھینچتا تھا جن سے ذاتی واقفیت تھی، وہ ایسے واقعات قلمبند کرتا تھا جو خود دیکھے تھے۔ اُن کے ناول اور افسانے مثلاً ...... کے حیرت انگیز کرشمے ہیں۔ ...... بجائے رونے کے بجائے ہنساتا تھا۔ یہ بات اس کے حزنیہ افسانوں مثلاً ...... میں بھی پائی جاتی ہے جس وہ اپنے ہیرو کی مصیبت پر افسوس تو کرتا ہے مگر اس کے تلون کو مضحکہ کے سپرد کر دیتا ہے۔

الفانزے ڈاوڈے میں دو نمایاں خوبیاں تھیں، ایک تو خنجر کی دھار کی طرح تیز طنز کا مادہ تھا، دوسرے تیکھا مذاق جو اس کے معاصرین میں کسی کو میسر نہ تھا۔ یہ ظرافت نہ تو ابیلے کی تھی نہ سوئفٹ کی بلکہ ایک بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی جس پر شاعری کا کوندا لپکتا اور ظرافت کو روشن کر دیتا تھا۔

یاد ہوگا کہ الفانزے ڈاوڈے نے اپنے اکثر معاصرین کی طرح زبان کی باریکیوں اور نزاکتوں کو نظم کے فن کے ذریعہ سے حاصل کیا تھا اور اوّل اوّل پبلک کے سامنے مختصر افسانہ نویس کی حیثیت سے آیا تھا۔ برسوں تذکرہ رہا کہ وہ اصلی نام لکھنے کا اہل نہیں لیکن بعد اس نے اس خیال کو فاتحانہ طریقے سے غلط ثابت کر دکھایا یہ بھی سب کو معلوم ہے، مگر گائی ڈی موپاساں مرتے دم تک مختصر افسانے ہی لکھتا رہا اور اس فن کو حد کمال تک پہنچا دیا۔ اس کی بعض طویل تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اگر صحت اور زندگی وفا کرتی تو کیا عجب ہے وہ کسی وزنی تصنیف کا مالک ہوتا لیکن جنون اور موت نے عین جوانی میں اس کی ادبی تحریکات کا خاتمہ کر دیا۔

کہنا چاہئے کہ موپاساں فلابیر کا بستر تبلیغ اور حصول کمال میں بڑی حد تک اس کا منت گزار ہے لیکن اس میں چند ذاتی صفات بھی تھے،

---

؎ خود ایمیل زولا اس برادری کا ایک معزز رکن ہے۔ آثر

اس کے مزاج میں "نارمن" توانائی تھی۔ وہ شہوانیت سے متنافر تو ہوتا تھا مگر اس میں تاثر بہیمیت کا عنصر نہ ہوتا تھا یہ صرف ایک فطری جذبہ تھا۔ ایسے شخص کا جس کو قدرت نے کثرت سے قوت تولید عطا کی ہو۔

طرز نگارش میں اس نے کمال بہم پہونچایا اور اسقدر مانجا کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ صفائی میں کاوش یا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس نے دیہاتی زندگی کے جو مرقع طیار کئے ہیں ان میں ایسی صناعت سے کام لیا ہے کہ سادگی میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ فلابیر کے واسطے سے موپاسان کا سلسلہ اسٹینڈہال تک پہنچتا ہے۔ موپاسان علم تشریح و نفسیات کا زبردست ماہر تھا۔ اسٹینڈہال کے پیرووں میں بال تورژے بھی تھا جس نے انسان کی غیر فطری شہوانی خواہشات کا مطالعہ کیا تھا اور ایسے امور کے تجربہ میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔

جن لوگوں کا اوپر ذکر ہوا نیچرلسٹ اسکول میں پیش پیش ہیں دوسرے بھی پیدا ہوئے ہیں اور اپنے پیشرووں کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان پر رائے زنی خلاف مصلحت ہے۔ جتنے ہیں اور محنت کرتے ہیں ممکن ہے کہ ان میں سے بعض نام و نمود پیدا کریں یا پیشینوں سے بھی گوئے سبقت لے جائیں لیکن اس کا انحصار ان کی خداداد قابلیت اور زمانے کے پختہ کرنے والے اثرات پر ہے۔

(باقی دارد)

---



## غزل

صدق جائسی

جذبۂ بے اختیاری ناوک قاتل میں ہے
تیر چٹکی سے نہیں چھوٹا کہ میرے دل میں ہے

ایک ہی ذکر ایک ہی چرچا، تری محفل میں ہے
مجھ کو یہ دھوکا، کہ دل کا راز میرے دل میں ہے

مجھ کو سوز دل نے بے مصرف جلایا عمر بھر
شمع جلتی ہے تو اک مصرف تری محفل میں ہے

وصل کے بعد اب خلش رہتی ہے یاد وصل کی
تیر سینے سے نکل آیا ہے، پیکاں دل میں ہے

درد دل کہنے کو کہتا ہوں مگر کیا فائدہ
جو زباں سے آپ کہئے گا وہ میرے دل میں ہے

کس خطا پر مجھ کو اٹھواتے ہو بزم ناز سے
یہ تو سوچو کس کی رسوائی بھری محفل میں ہے

حسن بے رونق ہے، جب پردے کے باہر آگیا
شہرۂ آفاق لیلیٰ، آج تک محمل میں ہے

قید بے میعاد کہئے، یا اسے قید حیات
عیش و غم اپنا، اسی زندان آب و گل میں ہے

دیکھ لے اے قیس دل میں عشق کامل ہے اگر
کون کہتا ہے کہ لیلیٰ، پردۂ محمل میں ہے

آپ کے دشمن مری جانکاہیوں کا غم کریں
یہ تو دنیا ہے، کوئی خوش ہے کوئی مشکل میں ہے

آبکاری میں بھی کیا اے صدق جلسہ ہے کہیں
آج قاضی[1] کی جگہ خالی مری محفل میں ہے

[1] قاضی سے اشارہ ایک عزیز دوست کیطرف ہے جو اس مرتبہ مشاعرے میں غیر حاضر تھے

## دوراہا ——— نکہت نسیم

میں کہاں جاؤں ——— یہ آواز کدھر سے آئی
جیسے ساغر کوئی کھنکے کوئی شیشہ ٹوٹے
جیسے شرمیلے مغنی کا ارادہ ٹوٹے
جیسے صحراؤں کی تنہائی میں نے کی آواز
جیسے لہروں پہ ہواؤں کی تھرکتا ہوا ساز
میں کہاں جاؤں ——— یہ آواز کدھر سے آئی
میں ہوں مغموم کہ یہ ساز بھی مغموم سے ہیں
یہ مرے اشک حقیقت ہیں کہ موہوم سے ہیں
جیسے تنہائی میں اک ساز بجاتا ہو کوئی
جیسے خاموش ستاروں کو رلاتا ہو کوئی
میں کہاں جاؤں ——— یہ آواز کدھر سے آئی
کون گم نام خلاؤں میں بلاتا ہے مجھے
کون مانوس سا اک راگ سناتا ہے مجھے
جیسے گزرے ہوئے لمحوں کو پکارے کوئی
جیسے ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارے کوئی
اور یہ آواز ——— یہ آواز کدھر سے آئی
صرف نغموں کے سہاروں پہ کوئی جی نہ سکا
ساغر اشک بھی تا زیست کوئی پی نہ سکا
زندگی عیش و محبت کے سوا بھی کچھ ہے
زندگی نغمۂ جنت کے سوا بھی کچھ ہے
میں کہاں جاؤں ——— یہ آواز کدھر سے آئی
"آ! کہ تلوار اٹھا ساز کے دن بیت گئے
یہ علم ہاتھ میں لے ناز کے دن بیت گئے
تلخیٔ زیست کو نغموں سے بھلانا کب تک
خوں بہانے کی جگہ اشک بہانا کب تک"
میں کہاں جاؤں ——— یہ آواز کدھر سے آئی
"آ! کہ تاروں کی قطاریں ہیں جلو میں تیرے
اٹھ! کہ جنت کی بہاریں ہیں جلو میں تیرے
چل! کہ ہر گام پہ سجدوں کی ضرورت ہی نہیں
سن! کہ اب تجھ سے غلامی کو محبت ہی نہیں"
اس دوراہے پہ ——— یہ آواز کدھر سے آئی

## عہدِ وفا ——— عبدالمجید بھٹی

گھنٹیاں کانوں میں بجتی ہیں کچھ افسانے لئے
ناچتی ہے زندگی گل رنگ پیمانے لئے
مست و لغزیدہ فضائیں ہیں ہوائیں مشکبار
آرزوئیں کارواں در کارواں ———
عشق و مستی کے جلو میں خواب لہراتے ہوئے
امتیاز ما و تو سے ماورا ———
دیدۂ و دل کے مقام
یک بیک جن پر بگولے چھا گئے
بجلیاں لہرا گئیں
جن میں کچھ ایوان ہیں گرتے ہوئے جلتے ہوئے
ارفت کے پیمانوں کے ساتھ
دل گرفتہ آرزوئیں
ٹوٹتی انگڑائیاں
گھنگھروؤں کی چھن چھنا چھن میں دبی
ڈوبتی جاتی ہیں دیپک راگ میں
جس کی تانیں اٹھ رہی ہیں دور سے
اور تانوں کی لپک سے جل رہی ہے کائنات
جل بجھا ہے انتظار
پھر دہک اٹھی ہیں کجلائی ہوئی چنگاریاں
پھر چمک اٹھی ہیں پتھرائی ہوئی آنکھیں مری
سرد آہیں گرم سانسوں میں ہوئی جاتی ہیں گم
بھر گیا نس نس میں زہر انتقام
جسم و جاں پر چھا رہا ہے التہاب
کاش جل جائے مرا عہدِ وفا

کاہشِ مرگِ دوام

## چیمبر او[ر] کومرس میں

پنڈت جواہرلال نہرو
کی تقریر



۱۶ دسمبر کو آنریبل پنڈت جواہرلال نہرو نے ایسوسی ایٹڈ چیمبرز آف کومرس میں جس میں ہندوستانی اور برطانوی تاجر موجود تھے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ گو کوئی ہندوستانی حکومت کسی خاص شخص یا ذات کیلئے کسی طرح کی حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی پالیسی کو ہرگز پسند نہیں کرے گی لیکن میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان دوسرے ملکوں کے ساتھ اب زیادہ قریبی تعلق رکھے گا۔

✿



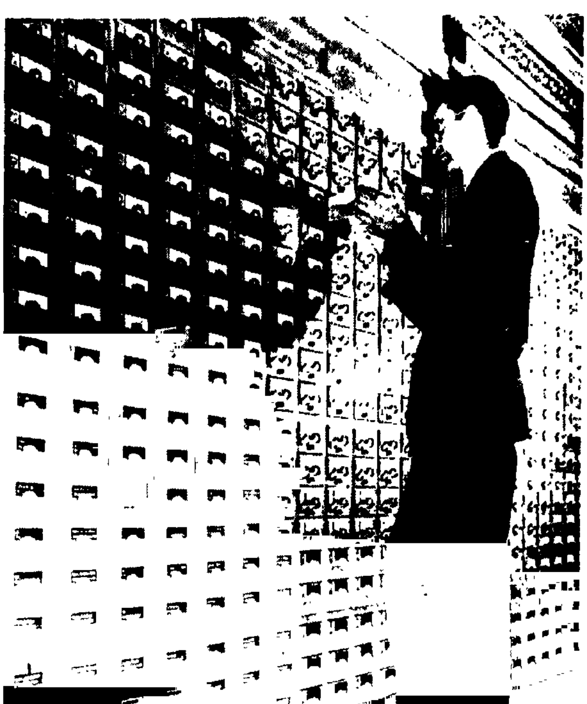
## کونسل اوف اسٹیٹ
## کے صدر

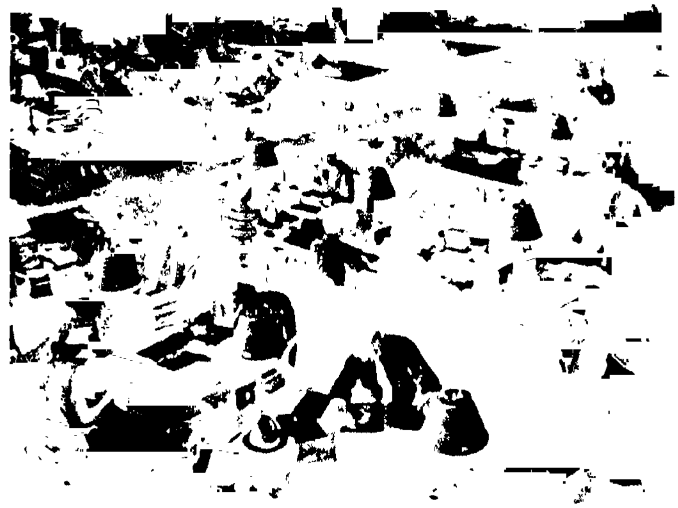
آنریبل سرمانک جی بی دادابھائی' کے سی ایس آئی' کے سی آئی ای' ایل ایل ڈی' بار ایٹ لاء۔

# نیویورک کی پبلک لائبریری

ریاست ہائے متحدہ میں چھ ہزار پانچسو کے قریب بڑی پبلک لائبریریاں ہیں جن میں سے ایک نیویارک کے مشہور حصے منہاٹن کے عین بیچوں بیچ واقع ہے۔ ۱۸۹۵ء میں تین اشخاص کی ذاتی کتابوں کے ذخیرے سے اسے قائم کیا گیا تھا۔ اب شہر بھر میں اسکی اکسٹھ شاخیں موجود ہیں۔ اس میں دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں کی پینسٹھ لاکھ کتابیں ہیں۔ صرف ہسپانوی حصہ سات ہزار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اگر سب کتابوں کی الماریوں کو ایک قطار میں رکھا جائے تو وہ سرسٹھ میل تک پہنچ سکتی ہیں۔ مطالعہ کیلئے ہر کتاب فوراً مل جاتی ہے۔ کتابوں نقشوں اور تصویروں وغیرہ کو نکالنے اور رکھنے کیلئے سات سو لائبریرین اور محرر ملازم ہیں۔ روزانہ دس ہزار سے زیادہ پڑھنے والے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عوام سے وصول ہونے والے ٹیکس کی کی ایک خاص رقم اسکا خرچ پورا کرتی ہے۔

ان خانوں میں ہر کتاب کے نام کے چھوٹے کارڈ رکھے ہیں۔ جن سے لائبریری کی تمام کتابوں کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ انکے بعد فہرست دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔





بڈنگ روم کا ایک حصہ۔ اس میں آٹھ سو آدمی بیک وقت مطالعہ یا تحقیقات کا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔



س حصے میں دس لاکھ سے زیادہ تصویریں موجود ہیں۔ فن کار اور مدیر ہمیشہ ان سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

ئبریری میں ایک کمرہ بچوں کیلئے الگ ہے۔ جہاں وہ تصویروں کی دلچسپ کتابوں سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔



# تبتی فنون لطیفہ کی نمائش

کچھ عرصہ ہوا لندن کی ڈیویز اسٹریٹ میں تبتی فنون لطیفہ کی ایک نمائش ہوئی جسمیں تبت اور اسکے ہمسایہ ملکوں کے تین سے زیادہ فن پارے پیش ہوئے۔ یہ زیادہ تر شوقین حضرات نے عاریتاً بھیجے تھے۔ ان میں کانسی کے بنے ہوئے گوتم بدھ کے دو ایسے مجسمے بھی تھے جو انکی تعلیم کی روح کو سب سے زیادہ مکمل طور پر واضح کرتے ہیں۔ انکو دیکھ کر اس باطنی سکون اور قوت ادراک کا اندازہ ہوتا ہے جو ایک سچے معلم اور عارف کامل کا حصہ ہوتی ہے۔ پہلا مجسمہ ساکیا فرقے کے ایک لاما کا ہے۔ اس کے بیٹھنے کے انداز سے پتا لگتا ہے کہ بسے خوفی بھی کتنی بڑی برکت ہے۔ دوسرے مجسمے پر تبتی زبان میں یہ الفاظ کندہ ہیں "یاں لاگ مکھیور کی خدمت میں"۔ یہ مجسمہ کمال فن کا بہترین مرقع ہے۔ تیسرا مجسمہ گیارہ سروں والی "اویلوکٹ" دیوی کا ہے۔ اسکے دوہرے ہاتھوں میں عام طور پر وہ ہتھیار ہوتے ہیں جن سے وہ پرستان کی حفاظت کرتی ہے۔ تبت میں مذہبی نقاشی اور صورت گری نے خاص طورپر مہاتما بدھ اور انکے چیلوں کی مورتوں کے سلسلے میں ایک مخصوص انداز اختیار کرلیا تھا اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی۔ مثلاً بدھ کی وہ تصویر جس میں اسے قبلائی خاں اور اسکی ملکہ کو اپدیش دیتا ہوا دکھایا گیا ہے ہمیشہ ایک ہی قسم کی ہوتی ہے۔ یعنی تصویر کے بیچ میں مہاتما بدھ کو بٹھایا جاتا ہے۔ ان کے بعد قبلائی خاں کو۔ ملکہ کو سب سے کم اہمیت دی جاتی ہے۔ بدھ مت کے بنیادی اصول جو ابتک لامائیت کی اکثر شاخوں میں پائے جاتے ہیں آگے چل کر تبتی آرٹ کے ہاتھوں "کثرت پرستی" کے بوجھ سے دب گئے۔ یہ اصول ساتویں صدی میں تنترائیت کی وجہ سے بھی مسخ ہوگئے۔ (تصویریں "اپالو میگزین" سے لی گئی ہیں۔)



کانسی اور کانسی کی بنی ہوئی لاما کی ایک قدیم مورتی



گیارہ سروں والی دیوی اویلوکٹ کی مورت جس میں ہیرے جڑے ہوئے

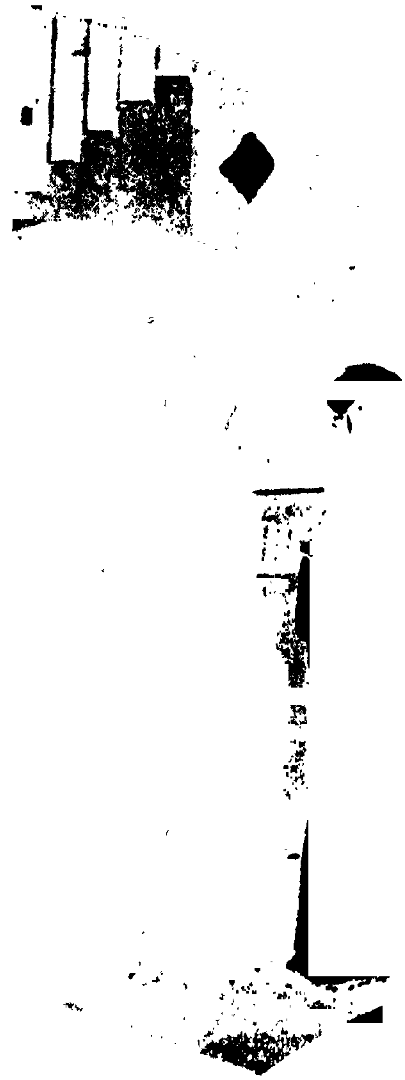


ساکیا فرقے کا ایک لاما قبلائی خان اور اسکی ملکہ کو بدھ مت کی تعلیم دے رہا ہے۔

# 'یونیسکو'

## ہندوستانی مصوری کی

'یونیسکو' یونائیٹڈ نیشنز ایجو
اینڈ کلچرل اورگنائزیشن' کا مخ
جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ادار
تعلیمی سائنسی اور ثقافتی معاملات
ہے۔ اس ادارہ میں شامل ہو
قوموں نے اس اصول کو تسلیم کی
کے لئے سب کو پورے پورے ا
موقعے حاصل ہونے چاہئیں۔ سچائ
ہو تلاش کی جائے اور دنیا کی قو
ایک دوسرے کے خیالات اور علم
ٹوک فائدہ اٹھائیں۔ اس ادارے کی
میں پڑی لیکن اسکا پہلا تاریخی
نومبر کے دوسرے ہفتے میں پیرس
اس میں تمام اتحادی ملکوں کے
شرکت کی۔ اس موقعہ پر فنون لطیف
اہتمام بھی کیا گیا جس میں تمام
شاہکار پیش ہوئے۔ ہندوستان کی
تصاویر کی نمائش ہوئی ان میں
اس صفحہ پر ہدیۂ قارئین کئے جارہے
پر مفصل مضمون آجکل کی اشاعت
میں شائع کیا جاچکا ہے

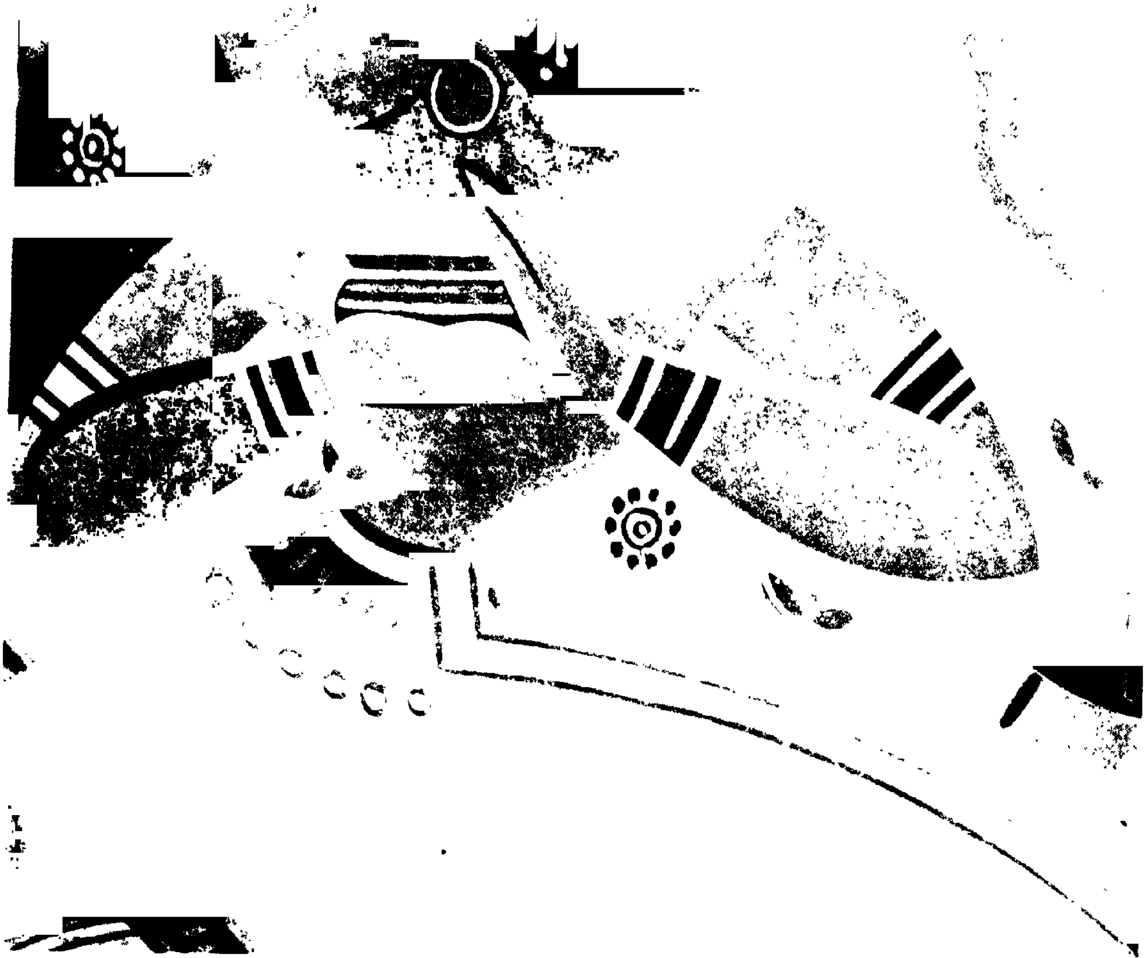




قات—(عمل گگنندر ناتھ ٹیگور)



حیات ذری چیتنیہ—
(عمل مولیا گوپال سین)



«گوپینی» – (عمل جمینی رائے) ↑

دیہات کا ایک منظر – (عمل کے ایچ آرا) ↓



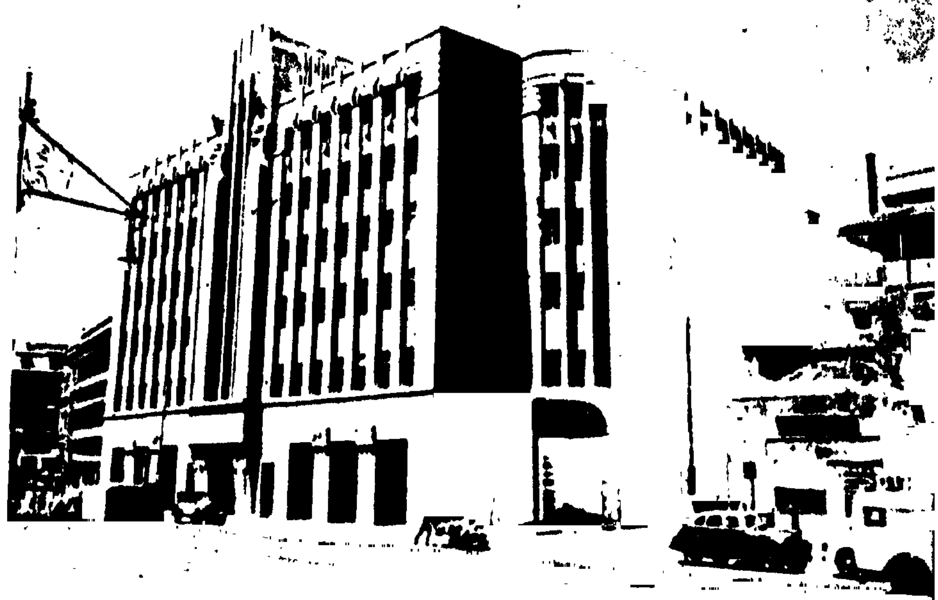
ں

مائش

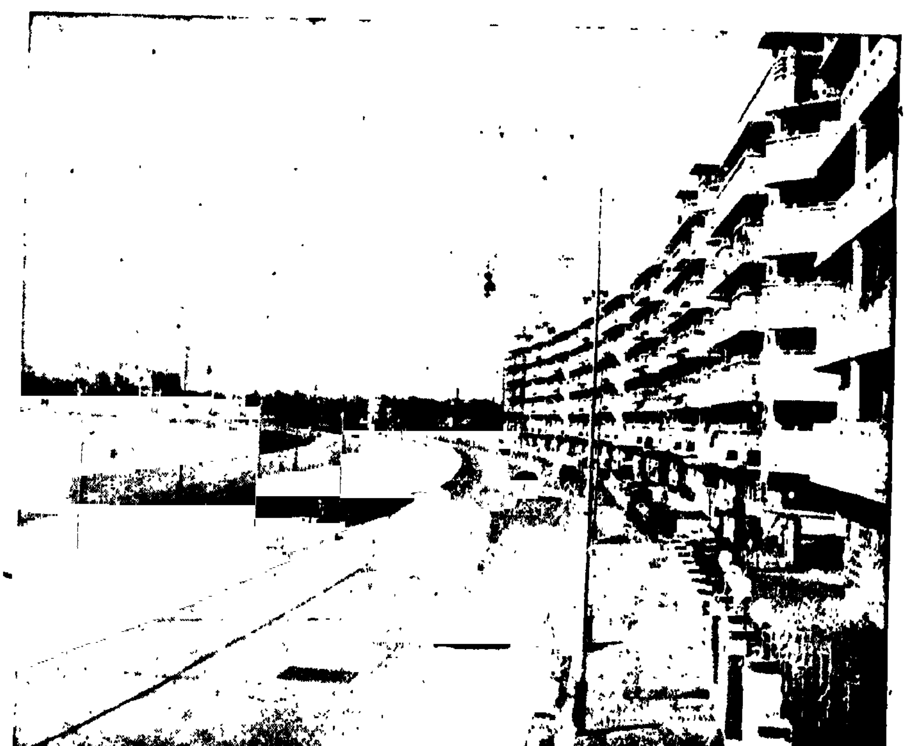
ں سائنٹفک
، ہے اور
یا بھر کے
ے تعلق رکھنا
والی تمام
ے کہ تعلیم
برابر کے
ہاں بھی
آپس میں
ے بے روک
غ بیل لندن
س گذشتہ
منعقد ہوا.
ائندوں نے
ی نمائش کا
وں کے
ے سے جن
ند فن بارے
.. یونیسکو
۱۵ نومبر

# بمبئی

زندگی کی یک رنگیوں سے گھبرا کر ہمیشہ بڑے شہروں کو جانے کو دل چاھتا ھے۔ شہر بمبئی اس اعتبار سے بڑی اھمیت رکھتا ھے۔ یہاں سینکڑوں سال سے زندگی گنگناتی، گاتی، ناچتی اور اپنا رنگ جماتی نظر آتی ھے۔ کلکتہ بمبئی سے بڑا ھے لیکن چہل پہل اور شان و شوکت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیویورک کی طرح بمبئی زیادہ گنجان آباد ھے اور ہر عمارت کی کئی کئی منزلیں



[...]وانڈیا لائف انشورانس کمپنی کی بالکل [...]ئی نئی وضع کی عمارت جو ایرکنڈیشنڈ [...]ے اور سیمنٹ کنکریٹ سے بنائی گئی ھے۔



ساحل سمندر کے قریب حال ھی میں پاٹی ھوئی زمین پر نئی وضع کے یہ شاندار فلیٹ تعمیر کئے گئے ھیں۔ یہاں سے شہر کا مشہور حصہ «میرین ڈرائیو» صاف نظر آتا ھے۔

ھیں۔ مشہور تجارتی بندرگاہ ھونے کے علاوہ یہ صنعت اور حرفت کا مرکز بھی ھے۔ فلموں کی صنعت نے خاص طور پر اسکو حد درجہ جاذب توجہ بنا دیا ھے اور اسی لئے وہ بہت سے فنون لطیفہ کا گہوارہ بھی ھے۔ مشرق و مغرب کا امتزاج بھی دکھائی دیتا ھے۔ یورپین آرکسٹرا سے لیکر دیہاتی سازوں تک ہر قسم کی تان فضا میں گونجتی سنائی دیتی ھے۔ ھندو، مسلمان، سکھ، عیسائی پارسی اور یہودی سب دوش بدوش چلتے پھرتے نظر آتے ھیں۔



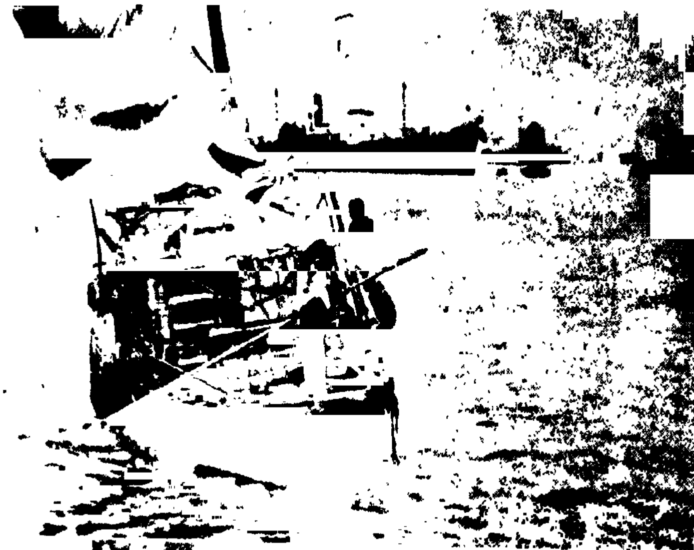
«ایروز سنیما» کی خوشنما [...]

# ہونگ کونگ

ہونگ کونگ میں اونچے بازار آڑے ترچھے اور اونچے نیچے ہوتے ہیں کہیں سطح ہموار ہوتی ہے اور کہیں سیڑھیاں۔



کاغذ سے لدی ہوئی ایک کشتی اس جہاز کی طرف جا رہی ہے جو ساحل ہونگ کونگ سے کچھ دور سمندر میں کھڑا ہے۔



❁

ہونگ کونگ جنوب مشرق ایشیا میں ایک دلکش مقام ہے ہوائی جہاز سے وہاں پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ فرانسیسی ہند چینی کے شہر سیگاؤن سے پہاڑی علاقوں کو چار پانچ گھنٹے میں طے کرکے یا سنگاپور سے بحیرہ چین کو آٹھ گھنٹے میں عبور کرکے۔ کوؤلون میں ہوا اور پانی کے جہازوں کے برطانوی مرکز ہیں اور وہاں سے دخانی کشتی میں بیٹھ کر اصل سرزمین پر جایا جاتا ہے۔ جب جہاز نیچے اترنے لگے تو پہاڑوں جزیروں اور سمندر کا ملا جلا منظر بہت نظر فریب معلوم ہوتا ہے۔ نیز چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جہاز چلانے والے کو مغالطے میں ڈالنے لگتی ہیں۔ دخانی کشتی کے ذریعہ ساحل کے سب سے پہلے شہر وکٹوریہ پہنچتے ہی لڑائی کی ہولناک تباہکاریوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ کاروبار کے بڑے بازار اگرچہ سلامت ہیں لیکن بہت سا حصہ تباہ ہوگیا ہے۔ پہاڑیوں پر چڑھنے کے بعد توجہ اس نہایت بدنما عمارت کی طرف مبذول ہوتی ہے جسے جاپانیوں نے اپنی فتح کی یادگار قائم کرنے کیلئے نہایت بے ڈھنگے پن کے ساتھ تعمیر کیا تھا۔ البتہ سمندر کی جانب کا نظارہ سکون بخش ہے اور مشکل سے یقین آتا ہے کہ اس بظاہر خاموش حصے میں بحری ڈاکو ہمیشہ ہلچل مچائے رکھتے ہیں۔ جنگ کی بربادیوں کے باوجود وہاں کی دکانیں اب بھی ہر قسم کے سامان سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اگرچہ قیمتیں بہت زیادہ ہیں تاہم ضرورت کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ ہوٹلوں میں مغربی اور مشرقی کھانے یکساں اہتمام کے ساتھ مل سکتے ہیں۔



چندر پربھا ــ ایک فلم ایکٹریس۔

# غزل

محمود سیتاپوری

مسیح بھی جو مرض کی مرے دوا کرتے
علاج دردِ محبت بتاؤ کیا کرتے ؟

وہ حسن سے جو نہ ہستی کو پُر فضا کرتے
کب اُن کی دید کا عشاق حوصلہ کرتے

اُنھیں کے ہاتھ نہ کیوں ساحلِ مراد آتا
جو بحرِ عشق میں اپنے کو خود فنا کرتے

خمارِ بادۂ الفت اُتر سکا نہ کبھی
تو کیوں تغافلِ ساقی کا ہم گلہ کرتے

وہ جانتے نہ اگر آہِ بے اثر کو مری
تو یہ محال تھا دل کھول کر جفا کرتے

نگاہِ لطف سے دل کی گرہ بھی کھل جاتی
اگر مجھے وہ تلطف سے آشنا کرتے

کبھی نہ گریۂ پیہم نے وہ اثر بخشا
کہ جس پہ دیدۂ پُرنم کچھ اکتفا کرتے

جنھیں کہ دل سے بھروسہ ہے ذات پر اُسکی
سوا خدا کے وہ کیوں ذکر ماسوا کرتے

پیام موت سے واقف ہے جب حیات اپنی
تو ایسی چیز کا کیا خاک آسرا کرتے

کسے امید تھی اس بات کی قیامت تک
کہ آپ وعدۂ فردا بھی وفا کرتے

جو حال اپنا نہ تھا التفات کے قابل
تو پھر بتاؤ کہ ہم کہہ کے تم سے کیا کرتے

چھلکتے جام فضا میں بھی مست ہو جاتیں
حرم کعبہ کو میکش جو میکدہ کرتے

بجز ہوائے جنوں خیز کے ترے وحشی
وہ کون تھا جسے صحرا میں ہمنوا کرتے

ڈبو دیا دل کے سفینے کو عشق نے محمود
یہ جانتے تو نہ ہم اسکو ناخدا کرتے

## محسوساتِ تصور — تصور کرتپوری

میں گرد و پیش اک وارفتگی محسوس کرتا ہوں
مزاجِ حسن میں کچھ برہمی محسوس کرتا ہوں

وہ لذت جو میسر ہے مجھے دردِ محبت میں
کبھی محسوس ہوتی ہے کبھی محسوس کرتا ہوں

فضائے بے نیازی میں بھی دل کھنچتا ہی جاتا ہے
غرورِ حسن میں بھی دلکشی محسوس کرتا ہوں

وہ کشتی خود جسے میں دے چکا طوفاں کے ہاتھوں میں
بسا اوقات ساحل سے لگی محسوس کرتا ہوں

سحر ہوتے چمن سے کون یہ رخصت ہوا یارب
گلِ رنگیں کے دامن پر نمی محسوس کرتا ہوں

مچل جاتے ہیں جب اُنکی جبینِ ناز پر تیور
میں اس کو بھی محبت کی ہنسی محسوس کرتا ہوں

شرارے حسنِ کافر کے ہیں شاید کعبۂ دل میں
تنفس میں تصور آگ سی محسوس کرتا ہوں

## عشرتِ ناتمام — احمد ریاض

وہ اس طرح پاس آکے بیٹھے وہ یوں سرِ راہ مسکرائے
بجھے ہوئے دل میں جان آئی دبی اُمنگوں نے سر اٹھائے

محبتوں کے خلاف یاں سازشیں اٹھائی ہیں نفرتوں نے
سیاہ خانے میں رہنے والا تمہارے ایواں میں کیسے آئے

فسردہ آنکھیں فسردہ چہرے ہر اک طرف منہ بسورتے ہیں
میں گم ہوں منزل کے پیچ و خم میں کہ راہ روکے کھڑے ہیں سائے

ابھی تو ابھریں گے وہ ستارے جو ٹوٹ کر بن چکے ہیں ذرّے
اُفق سے پھوٹیں نئی شعاعیں دیئے امیدوں کے جھلملائے

فراغتوں کی تلاش کی ہے مسرّتوں کیلئے پھرا ہوں
مگر یہ محنت گئی اکارت یہاں تو اپنے بھی ہیں پرائے

یہ میں ہی تھا جو کسی تصور کے آسرے پر جیا ہوں ورنہ
ان حادثاتِ جہاں کے ہاتھوں قدم کئی بار ڈگمگائے

ہزاروں ناکامیوں کی تہ میں مری اک امید دب گئی ہے
کہاں وہ لیجائے اپنی کشتی کہ جس کو ساحل نظر نہ آئے

# چین کا موجودہ مرض

ڈاکٹر حفیظ سیّد

چین والوں کو عرصۂ دراز سے خانہ جنگی کے مصائب برداشت کرنے پڑ رہے ہیں، اور تقریباً تیس سال تک غیر ملکیوں اور خود اہلِ چین کی لائی ہوئی جنگ سے ملک میں اتنے ہی زیادہ آدمی ہلاک ہوئے جتنے کسی بڑے قحط یا وبا سے۔ ابھی حال ہی میں جو اعصابی جنگ اور حملے جنرل چیانگ کائی شیک کی فوجوں اور اشتمالی لیڈر ماؤتسی تنگ کے رفیقوں کے درمیان شروع ہوئے ان کی نسبت امریکی جنرل جارج کیٹلٹ مارشل نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "انتہائی یاس انگیز ہیں"۔ انھوں نے یاس کا لفظ خاص غور سے استعمال کیا۔ ہر مرتبہ جب کسی غیر ملکی نے چین کے معاملات کا تصفیہ کرنا چاہا تو چینی پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ جھگڑنے لگے۔ اور فرانسیسیوں نے ازراہ ہمدردی اسے "چینی نلاکت زدہ ذہنیت" کے نام سے موسوم کیا۔

اگر کوئی غیر ملکی، چیانگ یا اشتمالیوں سے یہ دریافت کرے کہ ان میں اختلاف کیا ہے تو جواب ملے گا "کچھ نہیں" ظاہر ہے سچ ہے کیونکہ دونوں فریق سن یات سن اعظم کے قومی انقلاب کے ورثہ دار ہیں۔ دونوں کا سیاسی صحیفہ سن یات سین کے "سہ من چو" اصول یعنی استحکام قومیت، حقوق عوام اور معاش جمہور ہیں اور دونوں فریق اتحادِ چین کے لئے کوشاں ہیں۔ گذشتہ جنوری میں تصفیہ کی امید نظر آرہی تھی کیونکہ جاپان پر فتح حاصل کرنے کے بعد دونوں فریقوں نے فیاضانہ اخلاق کے ساتھ فوجی اور سیاسی سمجھوتہ کرلیا تھا اور سرکاری طور پر چیانگ کی یک جماعتی حکومت ختم کردی گئی تھی۔ ان کی فوجوں کے نوے ڈویژن اشتمالیوں کے اٹھارہ ڈویژنوں سے مدغم ہونے والے تھے۔ ایک پارلیامنٹ کا انتخاب ہونے کا بھی فیصلہ ہوا تھا۔ اور چین اتحاد اور جمہوریت کی شاہراہ پر گامزن ہوتا نظر آرہا تھا۔ لیکن رابطۂ اتحاد استوار ہونے سے قبل ہی خانہ جنگی کی آگ دوبارہ مشتعل ہوگئی۔

پرانے جنگی امیروں کے زمانہ میں جب کہ شخصی فوجیں چین کا گلا گھونٹ رہی تھیں۔ چیانگ طاقتور ترین شخصیت کی حیثیت سے نمودار ہوا اور دانشمندانہ طور سے ابتر حالات کا مقابلہ کیا۔ اور تفریق کو ذریعہ حکومت بنا کر وہ اپنی سپاہیانہ اہلیت سے چین کو ایک قوم بنانے میں قریب قریب کامیاب ہوگیا۔

جاپانی حملے سے قبل صرف اشتمالی اس کے حلقے سے باہر تھے ان پر قابو پانا بہت مشکل تھا اور ان کے استیصال کے لئے وقت درکار تھا۔ جدید ترین طریقے پر مسلح اور امریکی اسلحوں سے آراستہ فوجوں اور امریکی حکومت کی پشت پناہی کے ساتھ چیانگ، ایک زبردست حملے میں اشتمالیوں کو غارت کرسکتا تھا لیکن حالات میں تبدیلی پیدا ہوچکی تھی اب اس کی قیادت مسلّم تھی اور وہ ریاست کا حاکمِ اعلیٰ تھا اور اس میں فوجی اہلیت سے زیادہ حکمتِ عملی، صبر اور سیاست دانی کی خوبیاں درکار تھیں۔ خواہ وہ اشتمالیوں کے مقابلہ میں کتنا ہی برسرِ حق ہوتا لیکن رائے عالم اس کو ملامت کرتی اگر وہ اشتمالیوں سے اسی جارحانہ طریقہ پر پیش آتا جس کے وہ عادی ہوچکے تھے۔ اس لئے اشتمالیوں کی آتش خیز اشتعال دہی کے باوجود چیانگ نے ان کو تیغ و تفنگ کے بجائے نرم و ملائم اور میٹھے الفاظ سے روکے رکھنے کی کوشش کی۔

چیانگ کو اور دوسرے امور کا بھی لحاظ کرنا تھا کیونکہ اگر اسے ریاست ہائے متحدہ کی مدد نہ ملی ہوتی تو چین کب کا دیوالیہ ہوچکا ہوتا۔ مصنوعی ذریعہ سے ملک کی مالیات میں اضافہ کی تعداد کا یہ عالم تھا کہ وہ حدِ شمار میں نہیں لائی جاسکتی تھیں۔ ۱۹۱۲ء سے جبکہ چین میں جمہوریت قائم ہوئی۔ اخراجاتِ معاش میں پانچ گنا اضافہ ہوگیا تھا شنگھائی اس چور بازاری کا بدترین اڈہ تھا جس سے مشرق بعید کی دنیا کبھی واقف نہ تھی۔

حکومت نے چین کی مخصوص غذا چاول کی قیمت کو مزدور طبقہ کی مالی استطاعت کی سطح تک لانے کی کوشش کی۔ لیکن چیانگ کے نئے دارالسلطنت، نانکنگ میں سرکاری ملازمین ناداری کی وجہ سے شہر کے بازاروں میں خریداری نہیں کرسکتے تھے اس لئے حکومت نے ان کو ان کی اجرت کا ایک حصہ چاول کی شکل میں تقسیم کرنا منظور کیا۔ خود اہلِ چین اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ رشوت ستانی ملک کا رفتہ رفتہ گلا گھونٹ رہی ہے۔ کم تنخواہ پانے والے سرکاری افسران، اقوام کے مہیا کردہ سامانوں پر اقوامِ متحدہ کی امداد سے قبضہ کرکے چور بازاروں میں پہنچاتے جاتے تھے۔

اہلِ چین کا خیال تھا کہ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک چین میں دانشمند منتظم کافی تعداد میں پیدا نہ ہوجائیں۔ دوسرے ملکوں کا اصرار تھا کہ اگر نقل و حمل کے ذرائع لوگوں کو غذا پہنچانے۔ اور جنگ سے برباد شدہ علاقہ جات کی تعمیر کے حسبِ ضرورت ہوسکیں، تو یہ سب کچھ درست ہوجائے۔ لیکن شمالی صوبہ جات میں جیسوں ہی حکومت کے مزدوروں نے ریلوں کی مرمت ختم کی اشتمالی گروہوں نے انھیں برباد کردیا۔ گوکہ شان تنگ اور جیہول کے صوبوں میں چیانگ کی افواج نے منچوریا جانے والی ریلوے لائنوں کی چوبیس گھنٹہ نگہبانی کی تاہم وہ اشتمالیوں کو ہمیشہ برباد کرنے سے نہ روک سکیں۔

چیانگ نے صلح کی تجاویز کی ناکامی پر اشتمالیوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جو پہلے خوشی سے مشترکہ حکومت قائم کرنے پر راضی ہوگئے تھے۔ اور جیسے جیسے روسیوں نے منچوریا کو خالی کرنا شروع کیا اس پر قابض ہونے لگے۔ اور جاپانی اسلحوں کی مدد سے جو سرخ افواج نے انھیں حوالہ کردئے تھے، جنوب کی جانب پیش قدمی کرنے لگے۔ اور اپنے صوبوں سے جنگ کو آگے بڑھا دیا۔

ماؤتسی تنگ نے چیانگ کی حکومت پر مصالحت کی گفتگو کی شکست کا الزام لگایا کیونکہ مارچ کے مہینہ میں چیانگ کی کومنٹانگ جماعت کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس اشتمالیوں سے مدغم ہونے کی تجویز پر بحث کرنے کے لئے ہوچکا تھا۔ اشتمالی اخباروں نے یہ کہنا شروع کیا کہ تیرہویں صدی کے قدامت پسندوں سے

ملتے جلتے رجعت پسند چیانگ کی جماعت میں ایک جھٹ مؤثر صلح کی تجویز کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک "صلح کرنا خودکشی کا اقدام" تھا۔ چن برادران کی طاقتور ٹولی کی قیادت میں انھوں نے چیانگ سے خوب بحث کی اور حکومت کو اشتمالیوں کے ہاتھ فروخت کر دینے کا الزام لگایا۔ حکومت چنان کے خیال کے مطابق اس بغاوت کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ سمجھوتے کی تجویز واپس لے لی گئی اور اشتمالی فوج نے دوبارہ نقل و حرکت شروع کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شانشی اور منچوریا میں چنان کے سرخ پوشوں نے بہت کامیابی حاصل کی۔ چین میں ان کی عملداری بہترین نظم و نسق کی جگہ ہے۔ جمہوریت کے حامی ہیں اور بخط و رشوت ستانی کا نام تک نہیں ہے۔ انھوں نے لگان کو کافی حد تک گھٹا کر کسانوں کو مصائب سے آزاد کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا قول ہے کہ "چین کی اشتمالیت اور جگہوں کی اشتمالیت کی طرح نہیں"۔ اشتمالی جماعت کی تحریک کا منشا یہ نہیں ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں بلکہ وہ تمام چین پر اپنا حق جتاتی ہے اور اس کے حصول کے لئے پوری سرگرمی سے کوشاں ہے۔ اشتمالی رہنماؤں کا خیال ہے کہ فوجوں کی قلیل تعداد کے باوجود ہم کو چیانگ کے ذہنی تنگ نظر سیاسی ڈھانچے کے مقابلہ میں کافی مواقع حاصل ہیں۔

لیکن چیانگ کو سب سے بڑی فوقیت یہ حاصل ہے کہ امریکہ نے جاپان کی ہلاکت کے بعد جو اسلحہ اور جنگی سامان بھیجا وہ سب اسی کے قبضہ میں آیا ہے۔ اشتمالیوں کو صرف دلکش اور حسین الفاظ ہی حاصل ہوئے ہیں۔ گذشتہ ہفتہ تیس ہزار امریکی جہازیوں نے شمالی چین میں گشت کیا اور ذرائع رسل و رسائل کی نگہبانی کی۔ امریکیوں نے چیانگ کی بری و فضائی فوجوں کی تربیت کی ہے اور برطانوی ماہرین چینی بیڑے کی تربیت کر رہے ہیں۔

دولت اور اسلحہ کے ساتھ ساتھ حکومت ریاستہائے متحدہ نے نانکن میں چیانگ اور اشتمالیوں کے مابین صلح کرانے کے لئے درمیانی اشخاص بھی بھیجے ہیں۔ بحر الکاہل میں خاص طور سے ان سواحل پر جہاں آج روسی قابض ہیں، مادی طاقت بن جانے کے عزم کے ساتھ امریکہ کی نگاہ جنگ کے بعد کی تجارت کی طرف بھی ہے۔ چالیس کروڑ چینیوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش بھی ایک مفید کام ہے۔

چند دن ہوئے چیانگ نے ایک بار پھر ایک ایسی آئینی حکومت کے قیام کے لئے خواہش ظاہر کی ہے جس میں تمام جماعتوں کی نمائندگی ہو۔

**ضروری** رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالہ میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔

——— (ادارہ)

# تصنیفِ مقدّر

افسانہ

رضیہ نعمان

گھور کالی رات۔ گہری تاریکی نے زمین و آسمان کا فرق مٹا دیا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کاجل کی دھواں دھار برکھا ہو رہی ہو۔ کائنات ظلمت کدہ بنی ہوئی تھی، تاریکی ہی تاریکی جیسے نراشا کی دیوی نے ابھی ابھی جنم لیا ہو۔ ایک صرف ایک ننھا سا ستارہ بے بادبان نیّا کی طرح عرش کی تاریکیوں سے چھپ چھپ کر جھانکنے کی کوشش کرتا اور پھر گھٹاٹوپ اندھیرے میں سما جاتا جیسے ایک بالی دوشیزہ کسی کی طرف دھیمی دھیمی نگاہوں سے دیکھ کر خود ہی شرما جاتی ہے۔

میں تنگ آگئی یوں اس کے سرہانے بیٹھے بیٹھے۔ اور ہلکی سی روشنی والا ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ شیریں کا چہرہ اس بے معلوم سی روشنی میں اور بھی زرد معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے ننھے منے سنہری ریشم کے لچھوں سے گھنگھریالے بال اس کے ماتھے سے ہٹا دئے کیتنی مشابہ تھی آپا جان سے! ویسی ہی کشادہ پیشانی لمبی لمبی سیاہ پلکیں اور ہونٹ تو تھے ہی بالکل آپا کے پھیکا سا گلابی رنگ اور تھرتھراہٹ! بوقت مسرت شبنم آلود گل نو بہار کی مانند کھل جاتے اور جب کوئی بات ناگوار گزرتی آپا تو لب اتنی زور سے بھینچتے کہ محض ایک مہین سی پیازی لکیر ہو کر رہ جاتے۔ ارغوانی رنگ میں آپا بہت بھلی لگتیں۔ اسی لئے میں نے ضد کرکے ان کے نکاح کے وقت اسی رنگ کا جوڑا پہنایا تھا۔ اور میری پرنم آنکھوں میں اسی دن کا نقشہ پھر گیا۔ آپا سمٹی سمٹائی آدھا سا گھونگٹ نکالے سہیلیوں کے گروہ میں چمک رہی تھیں۔ جانے آج ان پر اتنا نکھار کہاں سے آگیا۔ ویسے تو مجھے آپا کی بنگالی سہیلی مادھوی کی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ لیکن آج آپا کی نیم وا جھکی ہوئی سی آنکھوں کے سامنے وہ بھی ماند پڑ گئیں۔ جب کلپنا اور مادھوی کوئی تان چھیڑتیں — اور اندرا ایک مخصوص انداز میں اپنی صراحی دار گردن ہلا کر ترچھی نظر سے دیکھتیں آپا جان کی طرف تو ان کی آنکھیں عجب سی شربتی جھلک مارتیں۔ حالانکہ ان کی آنکھیں با حیا مائل تھیں۔ لبوں پر مسرت آمیز کپکپاہٹ تھی۔ اور جب شاہدہ نے دولہا بھائی جان کے خیالی نقشے کو بیان کرنا شروع کیا۔ اور ان کے بازو میں چٹکی لی تو انھوں نے اپنا گول سا کھلا ہوا چہرہ بلوری حنا آلود ہاتھوں میں چھپا لیا۔ مجھے دولہا بھائی جان کا بے حد انتظار تھا۔ گو دیکھا کبھی نہیں تھا انھیں تاہم میں نے تخیل میں انکی مکمل تصویر بنا رکھی تھی۔ کچھ کچھ کرن دیوان جیسے ہوں گے۔ ہاں آواز اس سے بھاری ہوگی ہی۔ چال سے ایک خاص متوالاپن اور لاپرواہی ٹپکتی ہوگی۔ تیز تیز گہری شربتی آنکھیں اور باتوں میں شوخی و شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی، منجھلے بھائی کی طرح۔ شادیانوں کی آواز بلند ہوئی اور چاروں طرف سے مبارک ہو مبارک ہو کی صدا آنے لگی۔ میں نے جلدی سے عذرا باجی کے ننھے کو بڑی اماں کے پاس بٹھا دیا اور دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی کوٹھے پر چڑھ گئی۔ میری خواہش تھی کہ دولہا بھائی کو میں ہی سب سے پہلے دیکھوں اور یہی خواہش شاید بڑی آپا کی تھی۔ کیونکہ جب میں تیزی کا پاؤں کچلتی ہوئی آگے بڑھی تو بڑی آپا جھلائیں اور تنک کر بولیں چل ہٹ پیچھے ہٹالے میرے غرارے پر سے پیر ورنہ ...." "ورنہ کیا؟" میں تیز ہوگئی۔ "سر پر چڑھا رکھا ہے ابا جان نے اسے۔ لم ڈھینک کی لم ڈھینک ہوگئی ہے اور کہلاتی ابھی بچی ہی ہے۔" یہ کہتے کہتے انھوں نے مجھے کہنی سے پرے دھکیلنے کی ناکام کوشش کی۔ اتنے میں بارات دروازے پر لگ گئی۔ آگے آگے سفید پوش بینڈ والے پورے انہماک سے "ساون کے بادلو" کی لے بجا رہے تھے۔ میری بے قرار نگاہیں جھٹ گھوڑے پر پہنچیں۔ اسی وقت بینڈ والوں نے پورے جوش سے "تقدیر میں یہی تھا" کی سر نکالی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میری دونوں چٹیا کھینچ کر گال پر زور سے طمانچہ مار دیا ہے۔ براؤن سے گھوڑے پر ایک کالی داڑھی والا پست قد کا سانولا سا آدمی چپکا ہوا تھا۔ "تقدیر میں یہی تھا" تنہائی کی آواز آئی!!! جب میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو کمرے میں کوئی نہیں تھا کہیں سے سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ شاید بڑی آپا سامنے والے کمرے میں رو رہی ہوں گی۔ چار و ناچار آنکھیں پونچھ کر نیچے جانا ہی پڑا۔ ممانی جان اماں سے کہہ رہی تھیں "اے بہن! میرے خلیل میں کیا برائی تھی جو تم نے چاند سی بیٹی کا ہاتھ اس ادھیڑ عمر کے بھدے سے آدمی کے ہاتھ میں دے دیا۔ اماں جی رقت آمیز آواز میں بولیں۔ میری تو اس گھر میں داروغہ کی حیثیت ہے۔ بیٹی کے بارے میں چوں تک نہ کر سکی۔ انھوں نے تو اپنے بڑے بھائی کو خدا کا بھیجا رسول سمجھ رکھا ہے۔ ان کا کہنا چاہے راست ہو یا نہ ہو۔ یہاں تو قرآن شریف کی آیت سمجھا جاتا ہے۔ میری لاڈلی زاہدی۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں اماں جی سے لپٹ کر خوب روئی۔ منجھلے بھائی تو بالکل ہی اڑ گئے۔ بولے میں زاہدہ کا خون اپنے ہاتھوں نہیں کروں گا۔ اپنی بہن کو زندہ درگور نہیں کر سکتا۔ اپنے جیتے جی اسے اس گھناؤنے غار میں نہیں دھکیل سکتا۔ اور بھی بہت کچھ کہا انھوں نے لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے اور اگر کسی نے دھیان دیا بھی تو کہہ دیا کہ لڑکا جوشیلا ہے۔ چھوٹے چچا اور اشتیاق صاحب نے بھی صلاح کے طور پر کہا کہ آپ ایک دن کی بے عزتی کی خاطر زاہدہ بی بی کی زندگی کیوں تلخ کرتے ہیں۔ لیکن تایا ابا کی ایک ہی رٹ تھی کہ میں "قول دے چکا ہوں" کاش آج آقا بھائی یہاں ہوتے۔ لیکن وہ تو برما کے جنگلوں میں جاپانیوں کے پیچھے پھر رہے ہوں گے۔ اور میرا جی چاہا کہ میں بھی کسی ویسے ہی سنسان سے گھنے جنگل میں چلی جاؤں جہاں کوئی پرسان حال نہ ہو اور خوب چلا چلا کر روؤں۔

ظہر کے وقت میری آپا جان کا نکاح سید صادق علی سے ہوگیا۔ میں نے سمجھا ابھی آپا جان نے اسے دیکھا نہیں اسی لئے لجا رہی ہیں لیکن

منہ دکھائی کے بعد جب میں نے ان کے گھونگھٹ میں جھانکا تو نہ وہ رو رہی تھیں اور نہ وہ عام دیکھنے والوں کو ناامید معلوم ہوتی تھیں۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مسکرا رہی تھیں۔ واہ ری تایا ابا کی زبان پر بھینٹ چڑھنے والی آپا!! ہاں رنگ ذرا پھیکا پڑ گیا تھا اُن کا مگر یہ تو معمولی باتیں ہیں۔ اگر روزمرہ زندگی میں ایسی چھوٹی چھوٹی غیر اہم باتوں کو وقعت دی جائے تو زندگی بن ملاح کے ڈولے کی طرح ہچکولے کھاتی رہے۔ پھر بھی میرا جی چاہتا تھا کہ رخصتی کے وقت آپا اس ڈاروِن کے نظریے کو قائم رکھنے والے کے ساتھ جانے سے انکار کر دیں۔ یا کہانیوں کی ہیروئن کی طرح معصوم ہندوستانی لڑکی کی بے بسی بے کسی اور مظلومیت پر لمبا چوڑا لیکچر دیں۔ لیکن ڈولی اٹھ گئی اور کوئی ایسی بات ظہور پذیر نہ ہوئی۔ ہم سب خوب روئے۔ میں نے آج تک آپا جان کو روتے نہیں دیکھا تھا۔ اور منجھلے بھائی تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دئے۔ تایا ابا نے بھی اوورکوٹ کی [illegible] سے نشان تمام رومال نکالا اور لگے اسے آنکھوں کی طرف بڑھانے۔ "لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہیں!" انھوں نے [illegible] افسوس کے لہجے میں [illegible] ہیں ہیں کر کیا اب ہی تو ہو گئی۔ اور دل چاہا [illegible] آتے میں سب کی [illegible] تایا ابا [illegible] دوں [illegible] ان کی زنجیر دار گھڑی [illegible] ان کو [illegible] تھی [illegible] کر زنجیر پر [illegible] ماروں اور ان کے کان کے پاس جا کر اتنی زور سے چلاؤں کہ ان کے کانوں کے پردے [illegible] جائیں۔ اتنا تو میں نے کہہ ہی دیا تھا کہ آجکل کے لوگ لڑکیوں کو پرایا دھن نہیں بلکہ گھر کا کوڑا کرکٹ سمجھتے ہیں۔ جس کو جہاں پھینک دیں۔ میں اور بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن آپا جان کی گھنی بھنووں کے سکڑنے نے کچھ ایسا رعب ڈالا کہ میرے حلق میں کڑوا سا [illegible] ہو کر رہ گیا۔ سارے مجمع میں ایک شخص تھا جو آنسوؤں سے نہیں رویا۔ خلیل بھائی برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑے تھے انکے انداز سے بے نیازی جھلک رہی تھی۔ عجیب سی مسکراہٹ تھی ان کے ہونٹوں پر جیسے کہہ رہے ہوں "ہیں نا؟" اسی رات جب میں ضرورت سے باہر گئی تو کوئی برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ شاید دو بجے تھے رات کے اس وقت۔ تین دن کے بعد جب آپا جان گھر آئیں تو کافی خوش معلوم ہوتی تھیں۔ ویسے ان کی آنکھیں دو بجھے ہوئے کوئلوں جیسی لگ رہی تھیں۔ خیر!! پھر یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ نہ کبھی آپا جان نے شکایت کی اور نہ کوئی واقعہ پیش آیا۔ جب آغا بھائی واپس آئے تو انھوں نے بھی یہی کہا کہ صورت تو مٹی کی مورت ہے۔ لڑکی کے مقدر کا انحصار تو اس کے شوہر کی سیرت پر ہوتا ہے۔ مجھے بھی آغا بھائی کی بات پر یقین تو آ گیا۔ لیکن آپا کے لئے۔ اپنے لئے نہیں۔ اور میں دل ہی دل میں سوچتی کہ اگر میری شادی کسی بدصورت سے قرار پائے تو میں کبھی نہ مانوں اور صاف انکار کر دوں۔ اتنا ہی کہیں گے نا کہ منہ پھٹ ہے؟ پڑے کہیں۔ نہ بابا میں آپا جان کی طرح انکی زبان (ہوں زبان) پر قربان تو نہ ہو جاؤں۔ بڑے آئے قول دینے والے۔ انہیں

بارے میں دے کے دیکھیں قول مزا نہ چکھا دوں ان لوگوں کو تو میرا نام [illegible] نہیں۔ تایا ابا سوچتے ہوں گے کہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ لیکن جناب اب ہندوستانی لڑکی کو اپنی بے بسی و لاچاری کا احساس پکار پکار کر اپنے حقوق لینے پر آمادہ کر رہا ہے۔ وہ سماں آیا چاہتا ہے۔ جب زن و مرد دوش بدوش قوم و ملت کی بہبودی کے لئے جد و جہد کریں۔ اگر تعلیم کا اتنا بھی فائدہ نہ ہو تو ایسی تعلیم ہی بے سود ہے۔ بے کار ہے۔ شاید اسی لئے تایا ابا نہیں چاہتے تھے کہ میں کالج میں داخل ہو جاؤں۔ لیکن میں نے بھی اتنی ضد کی۔ اتنی بحث کی۔ اور میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب خاندان بھر کی مخالفت کے باوجود ابا میاں نے مجھے الہ آباد کالج میں داخل کرا دیا۔ اور میں نے پورے انہماک سے فلسفہ، تاریخ، فارسی، انگریزی پڑھنی شروع کر دی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے مجھ میں نئی روح پھونک دی گئی ہے۔ بلکہ [illegible] ایسا ہی نیا معلوم ہوتا تھا جیسے عمل نے دو [illegible] کر [illegible] رہا ہو۔

اسی سال آپا جان کو خدا نے ایک ننھی منی سی جیتی جاگتی گڑیا عطا فرمائی۔ میں پھولی نہ سمائی اور [illegible] ختم ہو [illegible] ہی ہیں اور اماں [illegible] بچی شکل و صورت میں بالکل [illegible] آپا جان کی طرح تھی [illegible] ملگجا سانولا رنگ [illegible] کا [illegible] معلوم [illegible] اس [illegible] ہوں [illegible] کھول لینے کی [illegible] تو وہ مخصوص انداز میں [illegible] کی کوشش کرتی۔

آپا کی ساس بہت [illegible] ثنا رکھا [illegible] ایسے اچھے خاصے نام کو بگاڑنے سے غضب؟ [illegible] ہم نے تھوڑا سا [illegible] اور [illegible] برداشت بھی کر لیتی۔ لیکن [illegible] ساتھ ان کی [illegible] ہونے کی تہمت لگا دی جاتی۔ اور آخری بات میں چھالیہ [illegible] کی [illegible] تو میں [illegible] پڑتی۔ ایک دن تو میں آپے سے باہر ہو گئی [illegible] کی بات ہو رہی تھی۔ دولہا بھائی کہنے لگے صنوبر رکھیں گے۔ "مجھے یہ نام پسند نہیں کیونکہ میری جماعت کی صنوبر بہت اترالی ہے۔" میں نے یونہی کہہ دیا "صنوبر کو بہن نہیں پسند" اس پر آپا کی ساس نے [illegible] اماں کی طرح [illegible] دینا شروع کر دیا "آئے ہائے بیٹی [illegible] صنوبر کو برا ہے کو ہونے لگا ہے وہ تو ایک پودا ہوتا ہے ہاں" مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ خاص کر آخری "ہاں" پر میں جل ہی تو اٹھی "لڑکی میری آپا کی ہے نا کہ آپ کی؟ جو آپ خواہ مخواہ بیچ میں [illegible]"۔ آپا جان نے میری چٹکی لی اور اماں نے بولی "گھور! [illegible] نہ تیری زبان گدی سے کھینچ دی تو کہنا"۔ پھر جو دولہا بھائی اور ان کی اماں نے آپا پر بوچھاڑ کی توبہ ہی بھلی۔ بعد میں مجھے بہت افسوس ہوا کہ اتنی سی بات کہہ کر میں نے یونہی فساد کی جڑ بنیاد کر دی۔ لیکن آپا کہنے لگیں کہ فساد کی جڑیں تو اول دن سے تھیں۔

اب تو درخت کی شاخیں نکل رہی ہیں۔ اماں نے بہت پوچھا کہ کیا بات ہوئی لیکن انھوں نے چپ ہی سادھ لی۔ نہ بولنا تھا نہ بولیں۔ ان باتوں کے باوجود منّی کا نام میں نے ہی رکھا۔ اگلی صبح ہم واپس آ رہے تھے۔ شاید آپا سے اتنی دور جانے کے خیال سے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور میں سوچتی رہی کہ دولھا بھائی جان آپا سے بات کیوں نہیں کرتے۔ اگر دن میں ایک آدھ دفعہ بولے بھی تو ڈانٹ ڈپٹ کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ اور آپا "جی" "جی ہاں" کے علاوہ کچھ نہ کہتیں۔ شاید ان کو اور کچھ کہنا آتا ہی نہ تھا! ساتھ والے کمرے میں منّی نے رونا شروع کر دیا۔ میں دولھا بھائی کی موجودگی کے خیال سے ڈر گئی۔ اس طرف اچانک نیچے کا دروازہ کھلا۔ میں چونک پڑی۔ یا اللہ رات کے دو بجے کون دولھا بھائی سے ملنے آیا ہے؟ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ دولھا بھائی خود اس کمرے میں سے آ رہے ہیں۔ لیکن یہ لڑکھڑا کیوں رہے ہیں؟ اور مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ بوتلوں کے بند پانی میں ڈوب چکے تھے۔ ان کے باقی اعمال تو آپا کی سہمی سہمی نظروں سے ظاہر تھے ہی۔ سیرت۔ ہوں!!

الہ آباد آ کر مجھے ان باتوں کا کبھی کبھی بڑی شدت سے احساس ہوتا۔ لیکن امتحان کے دنوں میں بوجہ مصروفیت یہ واقعات میرے ذہن سے مفقود ہو گئے۔ پھر نتیجے کا انتظار شروع ہوا۔ میں اور عذرا زیادہ تر اسی فکر میں ڈوبی رہتیں۔ پرچے تو میرے کافی اچھے ہو گئے تھے۔ اور پروفیسر ظہیر ہمدانی کا بھی خیال تھا کہ عذرا اور میں ضرور پاس ہو جائیں گے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے۔ کہ غالباً اوّل آئیں گی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں فیل ہونے کا ڈر خوفناک ترین بھوت کی صورت میں تخیل پر سوار رہتا۔ ظہیر صاحب کا کہنا درست نکلا۔ میں اپنے کالج میں اوّل اور یونیورسٹی میں چوتھی آئی۔ میری مسرت کی انتہا نہ رہی۔ گھر والے خاص کر آبا جان تو بہت ہی خوش ہوئے اور مجھے ایک پیاری سی رِسٹ واچ انعام میں دی۔ مبارک باد کے بہت سے خطوط آئے۔ زیادہ ہم جماعت لڑکیوں کے تھے۔ اور کچھ پروفیسروں کے۔ سب نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے کی تاکید کی تھی۔ اور ان خطوط سے آبا جان کافی متاثر ہوئے۔ پروفیسر ہمدانی پر مجھے رہ رہ کر غصہ آتا۔ اتنا نہیں کہ دو حرف شاباش کے ہی لکھ دیں۔ کالج میں تو تعریفوں کے پُل باندھا کرتے ہیں۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ لیکن چھوڑو ہمیں کیا؟ جیسے ان کے خط کے بغیر رہا نہیں جاتا۔ بڑے آئے اترانے والے۔ اور اترائیں کیوں نہ۔ لڑکیاں جوان کی صورت پہ دیوانی ہوئی جاتی ہیں۔ عذرا کو بھی تو ان کی آنکھیں بہت پسند ہیں۔ کہتی ہے یہی تو آنکھوں کی خوبصورتی ہے۔ آدھی آدھی بند کچھ کچھ کھلی نشیلی سی۔ اور پھر نیچے سے دیکھنا۔ پلکوں کو جھپکا کے۔ کیا فضول! اور ثریا نے تو حد ہی کر دی۔ ان کے بارے میں ایک طویل نظم لکھ ڈالی۔ جانے کیا شعر تھا وہ؟ کچھ سرو قدی اور شانہ ا...

جمال کے بارے میں کتنی بے وقوف ہیں یہ لڑکیاں؟ اگر کوئی اچھا ہے تو ہوا کرے۔ ہمیں کسی سے کیا غرض؟

ایک دن آپا جان نے مجھے بلایا۔ میرے علاوہ کوئی اور کمرے میں ... ٹانگے پر ... چڑھانے بیٹھا تھا۔ میں جھٹ واپس جانے کو ہوئی تو آبا جان بولے: "بیٹی ظہیر صاحب خود تمہیں مبارکباد دینے آئے ہیں۔" اور ادھر کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے بڑے پرجوش طریقے سے مبارکباد دی۔ جی میں آیا کہ کہوں "بڑی جلدی یاد آئی"۔ لیکن آپا کے خیال سے چپکی ہو رہی۔ ظہیر صاحب چھٹیاں گزارنے کے لئے ... کے پاس ایک گاؤں ... میں مقیم تھے۔ ... سے ان کی ... دوستی ہو گئی اور وہ اکثر ہمارے ہاں آنے لگے۔ بعض اوقات بالکل معمولی واقعات انسان کے ... زندگی کے ... کا ... بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور یہی حال ظہیر صاحب کے ... جانا آنے کا ... وہ ... ہمارے ہاں آتے اور ... میرا جی چاہتا کہ سارا دن ساری رات ... والے کمرے میں بیٹھ کر ... باتیں کرتے رہیں۔ اور میں ... رہوں ... ان سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ اور شام کی چائے ہم ... ظہیر صاحب ... بھائی اور میں ... پیتے۔ ایک شام ہم ... کر ... میرا ... دن یاد رہا ... ظہیر صاحب کی طرح تھا۔ ... جب وہ غور سے ... دیکھ ... تو ظہیر صاحب ہی معلوم ہوتا ... میں نے ... کہہ دیا "یہ تو بالکل آپ کی طرح ہے" اتنے میں سکرین پر ہیروئن کی تصویر آئی۔ ظہیر صاحب جھٹ ... اور ... کی طرح ... جھینپ گئی ... میں خوب روئی۔ گھر گئے تو ظہیر صاحب آہستہ سے بولے "بہت چھوٹا ... " ... میں نے گھبرا کر ... آنکھیں ... بیروئن کی طرح نہیں ... کان انگارہ ہو گئے۔ جب ... آتے تو میں کتنی کتنی دیر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے لباس کو دیکھا کرتی۔ دوپٹہ لینے کا طریقہ، قمیص کی تراش، غرارے کی ... و ... نہ جانے کیوں؟ اور ایک دن جب انھوں نے کہا کہ گول چہرہ بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے تو میں کتنی دیر سنگار میز کے پاس کھڑی دیکھتی رہی کہ میرا چہرہ کیسے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ پھر خود ہی مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ اور میں خوب خوب روئی۔ جب ظہیر صاحب کے جانے کے دن آئے تو میری طبیعت بڑی بڑی چڑچڑی سی ہو گئی۔ نہ کسی سے بات کرتی۔ نہ کوئی کام۔ نیند بھی تو نہیں آتی تھی رات کو۔ اور کبھی غلطی سے آ بھی جاتی تو خوابوں سے ... ظہیر صاحب کے !!

میں نے ایک غزل میں پڑھا تھا کہ اختر شماری و شب خوابی محبت کی علامتیں ہوتی ہیں۔ تو کیا مجھے ظہیر صاحب سے محبت ہے؟ میں اس قسم کی باتیں سوچا کرتی۔ اور دعا کرتی کہ اگر ہے تو دونوں طرف آتش فشانی ہو۔ ان دنوں میری دعائیں اکثر قبول ہو جایا کرتی تھیں۔ ظہیر صاحب کی سفارش

اور اپنے نمبروں کے بل بوتے پر مجھے بی۔ اے میں کالج میں داخل کر دیا گیا۔ سامان باندھتے وقت بڑی بھابی کہنے لگیں "ساتھ کون جا رہا ہے"؟ میں نے کہا "ظہیر" آنکھیں مٹکا کر بولیں "خالدی پھر سے کہنا ذرا"۔ "کیوں؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا "تمہارے منہ سے بہت بھلا معلوم ہوتا ہے یہ نام۔ اور دیکھو پھر تو تم نام لینا چھوڑ دوگی"۔ اماں جی بھی کہہ رہی تھیں کہ ظہیر بہت نیک طبیعت ہے، یہ کہہ کر بھابی کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ شریر بھابی۔ سارا راستہ مجھے بھابی کی صورت یاد آتی رہی۔ جی چاہا کہ لپٹ جاؤں ان سے۔

الہ آباد آئے مجھے تقریباً ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ آپا جان کی علالت کی خبر ملی۔ میں سخت گھبرائی اور آقا بھائی کو لکھا کہ اماں جی کو لے کر فوراً بمبئی چلے جائیں۔ وہاں تو کوئی بیچاری آپا جان کی تیمارداری بھی نہیں کرتا ہوگا۔ وہ لوگ پہلی گاڑی سے بمبئی روانہ ہوگئے۔ وہاں سے آقا بھائی کا ایک طویل خط موصول ہوا۔ لکھا تھا کہ آپا جان بہت سخت کمزور ہوگئی ہیں۔ بعض ڈاکٹر تپ دق کا شک کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹروں کی تو مرض کو بڑھا چڑھا کر بتانے کی عادت ہوتی ہے۔ آگے چل کر لڑکیوں کے نصیب کا رونا رویا تھا۔ کس طرح والدین نازوں پلی لاڈلیوں کو بخوشی و دانستہ طور پر سوٹڈ بوٹڈ حیوان خصلت درندہ سیرت جنوں کے غاروں میں دھکیل دیتے ہیں۔ اور یہ بے زبان فرض شناس ان پر مر مٹنا اپنا عین فرض سمجھتی ہیں۔ نبھاتی بھی خوب ہیں اس فرض کو"۔ دل بھر آیا میرا!

اس دن کالج میں فینسی ڈریس پارٹی تھی۔ میں نے خاص لکھنوی دلہن بننے کا وعدہ کیا تھا۔ جی تو قطعی نہ چاہتا تھا۔ لیکن عذرا وغیرہ کے کہنے پر پہننے ہی پڑے وہ کپڑے اور زیور۔ ہال کے دروازے پر ظہیر صاحب رہزنوں جیسا لباس زیب تن کئے کھڑے تھے۔ بولے "دیکھو خیالی (وہ مجھے اکیلے میں اکثر اسی نام سے پکارتے) میں نے تمہاری پسندیدہ نظم کے ہیرو کا۔ کہتے کہتے رک گئے۔ میں کچھ جھینپ سی گئی۔ وہ جو میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ اور دیکھے چلے جا رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے لئے مکمل سکوت طاری رہا۔ وہ جیسے خواب سے جاگ کر بولے "دیکھو خیالی دلہنیں یوں بے باکانہ انداز سے نہیں دیکھا کرتیں" میں شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔ ہاں یہ ٹرک بہتر ہے۔ انھوں نے تنقیدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا۔ "بالکل۔ اسے۔ بالکل اسی طرح دلہنیں بھی منہ چھپالیا کرتی ہیں۔ فرسٹ پرائز ملے گا" میں نمک مسالے لگانے میں کونسی کم تھی جھٹ کہہ اٹھی "آپ کو کتنی ایک دلہنوں کا تجربہ ہے؟" شاید مجھے اتنی بے باکی نہیں استعمال کرنی چاہئے تھی۔ کہنے لگے "صرف ایک" میں گھبرا گئی ادھر سے لڑکیاں آرہی تھیں۔ یکدم ظہیر صاحب نے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا "خالدہ آج تیسری اور آخری بار کہہ رہا ہوں۔ اگر آئندہ کام نہ کیا۔ تو پرنسپل صاحبہ کے پاس رپورٹ ہوگی۔ فینسی ڈریس سب سے پہلے پہن کر آگئی ہیں لیکن کام کے وقت غائب۔ میں بھونچکا سی ہوگئی۔ "بھولی جو آرہی ہیں تمہاری" دبی آواز میں انھوں نے کہا۔ اور میں سمجھ گئی۔ عذرا۔ رانی۔ ثروت۔ وغیرہ آگئیں اور میں ان کے ساتھ چلی گئی۔ جاتے جاتے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جب اندھیرے مستقبل میں معصوم ماضی کی یاد آئی تو ظہیر اسی طرح تخیل میں ابھر آئے۔ سیڑھی پر پاؤں رکھ کر تھوڑا سا جھکے ہوئے کمر پہ ہاتھ کشادہ پیشانی پر فاتحانہ چمک اور سیاہ لمبی پلکوں تلے محبت کا نشہ۔ مستقبل کا تصور اور کامیابی کی امید کامل کے ملے جلے جذبات جھلک رہے تھے۔ لبوں پر بے معلوم سا خفیف سا تبسم! پورے راہزن معلوم ہو رہے تھے۔

پہلا انعام رانی اور ثروت کو ملا۔ وہ لیلیٰ مجنوں بنی ہوئی تھیں۔ سانولی سلونی سی تیکھے نقش والی رانی بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے لیلیٰ نے دوبارہ جنم لیا ہو۔ دوسرا انعام ظہیر صاحب کا تھا۔ کس آن سے اٹھے۔ شان سے چلے۔ اور انعام لے کر جو سلام کیا میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ تیسرا انعام میرا تھا۔ چھوٹا سا فوٹو فریم۔ میرے ہاتھ سے وہ گر کر الگ الگ ہوگیا۔ ظہیر صاحب کہنے لگے "لاؤ میں جوڑ دوں!" لڑکیاں چلی گئیں۔ فریم ابھی نہیں جڑا تھا۔ اسی لئے میں کھڑی رہی۔ ظہیر صاحب آپا جان کا حال پوچھنے لگے۔ اسوقت سنبھلنے میری خودداری کہاں غائب ہوگئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ گھبرا گئے۔ میں نے سب حالات بیان کئے۔ جب میں ختم کر چکی تو وہ طوفان جذبات میں بہہ رہے تھے "خیالی" وہ زیر لب بولے۔ اف ان کی زبان سے خیالی کیسا بھلا معلوم ہوتا "خیا"، کو کچھ لمبا کر دیتے اور "لی" کہنے کے بعد اس طرح لب نکلتے گویا آئے بہت کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ لیکن کہنے سے قاصر اور پھر ہلکا ہلکا سا دبا دبا سانس لیتے نیم آہ بھرتے اور میری روح بہشت بریں میں ناچنے لگتی "خیالی" اس دفعہ ان کے لہجہ میں بے قراری تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔ وہ میرے ذرا قریب آگئے اور میرے دوپٹے سے کھیلنے لگے۔ اور سکوت کو انھوں نے کافی دیر کے بعد توڑا "ایک بیٹی کے تو بہت دکھ دیکھے ہیں سید صاحب نے دوسری بیٹی کی آرام میں زندگی گزرے گی!" آخری الفاظ انھوں نے رقت آمیز لہجہ میں کہے۔ انشاء اللہ کہتے کہتے وہ اٹک گئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہ فریم میرے ہاتھ میں دے کر چلے گئے۔ اس دن شاید رانی نے دیکھ لیا۔ اس شوخ چنچل لڑکی نے عارفہ کو بتایا اور یوں بات پھیلتے پھیلتے سب تک پہونچ گئی۔ اس دن رات کو لڑکیوں نے مجھے اتنا چھیڑا اتنا تنگ کیا کہ میں رونے والی ہوگئی۔ عارفہ بولی "بڑے بڑے ہاتھ مارے ہیں خالدی" اور رانی اپنی شرارہ سی آنکھیں مٹکا کر بولی "اب خالدی نہیں اب خالدہ ہمدانی کہو کیوں ٹھیک ہے نا بتو؟" اور سب نے اس چھیڑ خانی میں برابر حصہ لیا۔ ثروت اور موہنی بڑی شریر ہیں۔ نہ بابا میں یہ رہزن نہیں پسند یوں تو اتنا

بہت ساکام دے دیتا ہے اور پھر ہماری کالج بیوٹی پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔"
اور عذرا تو جب ایسی باتوں پر اتر آئے تو حد ہی کر دیتی ہے۔ آتے ہی بولی "لاؤ خالدی مٹھائی کھلاؤ یہ روکھا سوکھا کام ہمیں نہیں پسند" غرض اس دن جس کا جی چاہا اس نے کہا اور جتنا کہوان کے خیال میں کم کہا۔ اور میں تیوری چڑھانے کی ناکام کوشش کے بعد ہنسنے لگی۔

دن عید اور رات شب برات کی طرح گزر رہے تھے کہ یکدم آسمان پھٹا بجلی گری اور غم کی گھنگھور گھٹا چھا کر رہ گئی۔ ہائے میری آپا جان۔ انھوں نے آرام سے نجات پانے کی خاطر جسم فانی کو فنا کر دیا۔ اور روح کو ابدی زلیست بخشی۔ خون جگر بہانے مقدر کو کوسنے اور دنیا والوں کی بے پرواہی پر رونے کے علاوہ یہ لاغر و فانی بنی نوع انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔ اس وقت جی چاہتا ہے کہ خود بھی مرنے والے کے ساتھ مر جاؤ۔ دفن ہو جاؤ۔ لیکن بمرور وقت سے یہ اثر آہستہ آہستہ زایل ہوتا چلا جاتا ہے۔ صرف داغ فرقت رہ جاتا ہے باقی۔ یہی ہمارے ساتھ ہوا۔ ڈیڑھ سال گذر گیا۔ اس دوران میں میں نے بی۔ اے پاس کر لیا۔ ظہیر صاحب اکثر ہمارے یہاں آیا کرتے لیکن اب میں ان کے سامنے نہیں جاتی تھی۔ کچھ بھی ہو ہندوستانی لڑکیاں منگیتروں کے سامنے نہیں آتیں۔ میں سارے دن ننھی (جو آپا کی رحلت کے بعد ہمارے پاس تھی) کے ساتھ گزار دیتی۔ جب وہ "کالا جان کالا جان" کہتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے چلتی کیتی پیاری لگتی۔ اس وقت شیریں۔ اور کیوں نہ لگتی میری عزیز آپا جان مرحومہ کی اکلوتی نشانی جو تھی۔ یہ پیار مجھے کہاں لے جائے گا؟ میں نہیں جانتی تھی اس وقت!!!

دولھا بھائی کی دوسری شادی ہونے والی تھی۔ میرا خون کھول کر رہ جاتا ایک ہوک سی اٹھتی دل میں اور میں غسل خانے میں جا کر خوب روتی۔ مگر فائدہ؟ ایک دن دولھا بھائی کا خط آیا۔ ابا جان اور آقا بھائی نے مجھ سے چھپانے کی کوشش کی۔ جانے کیوں یہ لوگ مجھ سے ہر بات چھپانے کی کوشش کرتے ہیں؟ آخر میں بچہ تو ہوں نہیں۔ لیکن جب پوچھوں "کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ تو فیصلہ کن انداز میں حکم اکبری لگا دیتے ہیں "کچھ نہیں" چاہے میرے دل میں کتنی ہی کھلبلی مچی ہو پوچھنا بے سود ہوتا ہے اور میرا دل اینٹھ کر رہ جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر۔ خیر بات کا پتہ تو چل ہی جاتا ہے کسی نہ کسی بہانے۔ اسی رات کو جب میں آقا بھائی کے کمرے سے ایک کتاب لینے گئی تو وہ خط پڑا پایا۔ کہتے ہیں کہ اولاد کے لئے فرمانبرداری فرض اولین ہے لیکن آخر میں انسان ہی تو تھی اور وہ بھی کرید رکھنے والی طبیعت کی۔ جانے کس جذبہ کے ماتحت میں نے خط کھول لیا۔ اور پڑھتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ دولھا بھائی نے بڑے سخت الفاظ میں لکھا تھا۔ کہ "شیریں میری بیٹی ہے اور میں اس کا واحد حقدار ہوں۔ اگر آپ بھیجنے سے انکار کریں گے تو میں قانون کے ذریعے بآسانی لا سکتا ہوں۔ آپ کا یہ عذر تھا کہ بمبئی میں اس کی تربیت کرنے والا کوئی نہیں۔ سو میں نے اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔ اگلے چاند میرا نکاح

الہ آباد کے رئیس سید دلاور خاں صاحب کی بڑی صاحبزادی سے قرار پایا ہے۔ میں آگے کچھ نہ پڑھ سکی۔ میری آنکھوں کے سامنے عارفہ دلاور خاں کی بڑی بہن مشتری کی شکل پھر گئی۔ ننھی کی سوتیلی ماں۔ آہ!!! چھوٹی چھوٹی مکار آنکھوں والی۔ لڑاکا چالاک بدمزاج شیریں کی سوتیلی ماں۔ اُف!!

تمام رات میں نے کروٹیں لیتے لیتے گزار دی۔ درد و کرب نے مجھے بیتاب کر دیا۔ رنج والم نے بے قرار۔ تقدیر نے بے بس!!! ایک خیال میرے دل میں رہ رہ کر ابھرتا۔ قربانی۔ ایثار۔ ایثار۔ قربانی۔ ظہیر۔ مستقبل۔ محبت یہاں آکر میں ڈگمگائی۔ میری روح کانپی۔ میرا ارادہ لرزا۔ میرا دل ڈولا۔ لیکن نہیں میں اپنے نفس کی خاطر اپنے معیار سے نہیں گر سکتی۔ ظہیر میرے دل کی گہرائیوں سے چیخیں اٹھیں "چپ رہ" ضمیر نے گرجدار آواز سے کہا میرے خیالات میں ہیجان برپا تھا۔ طوفان اٹھ رہا تھا لیکن میں کائنات کو دکھا دینا چاہتی تھی کہ عورت صرف نفسی و جنسی محبت میں گرفتار ہو کر ہی قربانی نہیں کرتی۔ بلکہ اس کی محبت کنول کی پتی کی طرح پاکیزہ۔ حیات خضر کی طرح جاودانی فردوس بریں جیسی لافانی اور حق تعالیٰ کی ذات جیسی لاثانی ہے۔ محبت میں نفسی خواہشات کو اہمیت دینا حماقت ہی نہیں بلکہ محبت کی سراسر توہین ہے۔ محبت کا وجود بے شک دکھائی نہیں دیتا مگر ہر ذی روح کے سینے میں ضرور پنہاں ہوتا ہے ہم۔ صرف ہم ناقدرے بے پرواہ انسان اس کو روندتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں۔ لیکن میں ایسا نہ ہونے دوں گی۔ ہرگز نہیں۔ عزم وہ طاقت وہ قوت ہے جو گرتوں کو سہارا دیتا ہے۔ جو اپنے تئیں قربان گاہ پر چڑھا دینے کی ہمت بخشتا ہے۔ یہ بلند پایہ شے شکتی وہ چیز ہے جو مشکل سے مشکل کام کو آسان کر دکھاتی ہے۔ اسی خیال میں غلطاں و پیچاں میں بڑی بھابی کے پاس گئی اور ان کے سامنے پورا ماجرا بیان کیا۔ اور ساتھ ہی اپنا ارادہ بھی ظاہر کر دیا۔ وہ حیران رہ گئیں۔ بات گھر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ابا جان نے بہت سمجھایا۔ لیکن میرا فیصلہ اٹل تھا۔ ظہیر نے سنا اور آئے لیکن میں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ دل ہی تو تھا۔ انھوں نے ایک پرچے پر صرف اتنا لکھا تھا۔ کہ "میرا ہی قصور ہے نام ہی "خیالی" رکھا تھا تمہارا۔ پھر میری کوئی امید اصلیت کی صورت کیونکر اختیار کر سکتی تھی۔ آخری۔ ظہیر۔"

میں نے اس کا جواب لکھ بھیجا کہ "امید زندگی کے صحرا کا سراب ہے۔ ہمارے دل ستاروں کی طرح ہیں اور ستارے اکثر ٹوٹا کرتے ہیں۔" اسی دن شام کو وہ چلے گئے۔ میری زندگی سے بہت دور۔ بہت ہی دور۔

بقر عید کے چاند میں اور ننھی بمبئی چلے گئے۔ میرے احساسات بالکل سن ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے میری روح کو کوکین کا انجکشن لگا دیا ہو۔ جیسے مجھے افیم کھلا کر سلا دیا ہو۔ اور یہ زندگی کیا کوکین کے انجکشن سے کم اثر رکھتی تھی؟

آج ان واقعات کو تقریباً چھ برس گزر چکے ہیں (باقی صفحہ ۴۷ پر)

# اقبال کا شاہیں

**مغیث الدین فریدی**

اقبال کی جدّت طرازی نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کو اسالیب و موضوع کے علاوہ نئی نئی تمثیلات کی دولت بھی فراوانی کے ساتھ عطا کی ہے وہ شخص جو نظامِ قدرت میں بھی ندرت اور تنوع دیکھنا چاہے اور رات دن کی یکسانیت سے اکتا کر خدا سے کہدے ؎

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

وہ اردو فارسی کی پامال تمثیلات بلبل، کبک، طاؤس وغیرہ کا محتاج کیوں رہتا یہ اس کے زبردست جذبۂ تخلیق کا فیض ہے کہ اس نے اپنے پیغام کی وضاحت اور اپنے بلند مقاصد کی تشریح کے لئے شاہین، شاہباز اور عقاب کی تمثیلات سے کام لیا۔ یہ تینوں چیزیں بالکل اچھوتی نہیں ہیں۔ اردو فارسی میں اکثر جگہ ان کا ذکر آیا ہے۔ لیکن اقبال نے ان کے ذریعہ جس مقصد کی وضاحت کی ہے۔ اس مقصد کی اہمیت نے ان تمثیلات کی وقعت بڑھا دی ہے۔

اردو کے اساتذۂ قدیم کے کلام میں شاہین کا ذکر جس حیثیت سے کیا گیا ہے وہ کچھ ایسی مضحکہ خیز ہے کہ شاہین کے نام سے نفرت ہونے لگتی ہے ؎

مرغِ عصیاں اڑ کے صیدِ بازِ رحمت ہوگیا
رنگ شاہینِ تراز روئے ملالت ہوگیا

تیرے تیر سے کوئی طائر نہ چھوٹا دہر میں
رہ گیا تو ایک شاہینِ تراز و رہ گیا

چھپ رہا ہے قفسِ تن میں جو ہر طائرِ دل
آنکھ کھولے ہوئے شاہینِ نظر کس کا ہے

یا شاہباز کے لئے حضرتِ آتش فرماتے ہیں ؎

تو نے زلفوں کو الجھ پڑنے سے منڈوا یا جو یار
شاہبازِ حسن بے بازو نظر آیا مجھے

یہ اور اس قبیل کے متعدد اشعار اردو کے دواوین میں ملتے ہیں۔ فارسی میں خواجہ حافظ فرماتے ہیں ؎

شہپرِ زاغ و زغن شایانِ قید و بند نیست
ایں کرامت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

مگر اقبال کے کلام میں شاہین کا ایک خاص تصور ملتا ہے جو ان کے مخصوص تصورِ خودی کا نمائندہ ہے۔

"شاہین ایک بلند پرواز، تیز نظر، تنومند، جفاکش، غیور اور بلند نظرت پرندہ ہے" اقبال اس کی جملہ خصوصیات میں سے خونریزی کے عنصر کو حذف کرکے پیش کرتے ہیں اور یہی ان کے نزدیک صحیح مردِ مومن کا کردار ہے۔ بلند نظری اور ذوقِ عمل —— یہ تصور ان کے ہاں اسقدر تابناک ہے کہ جب وہ شاہین کی زبان سے اس کی سیرت بیان کرتے ہیں تو وہاں بھی خونریزی کا شائبہ تک نہیں آنے دیتے۔ شاہین کہتا ہے ؎

بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھکو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اقبال کے مسلک میں شباب تن آسانی اور تن پروری کا نام نہیں ہے، بلکہ سخت کوشی اور اپنے لہو کی آگ میں جلنا شباب کی صحیح تعریف ہے ؎

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

اقبال صوفیائے سلف کی تعلیم نفی خودی سے بیزار ہے وہ قوم کی پستی اور زوال کا سبب اسی غلط تعلیم کو قرار دیتا ہے "مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید" کا سبق دینے والے کو وہ "گوسفند از گوسفنداں قدیم" کے لقب سے یاد کرتا ہے اور اپنے زبردست جذبۂ تخلیق کی مدد سے خودی کو ایک نہایت ارفع و اعلیٰ درجہ عطا کرتا ہے۔ اس کی حکیمانہ بصیرت، فلسفیانہ استدلال اور شاعرانہ اندازِ بیان خودی کے لفظ سے غرور و خود پسندی کا مفہوم چھین کر اسے احساسِ نفس یا تعینِ ذات کے معنی پہنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک استحکامِ خودی اپنے طبعی ماحول سے جنگ کرنا اور فطرت کو اپنا مطیع بنانے کی کوشش کرنا ہے اور جب وہ قوم کے نوجوانوں میں خودی کا احساس نہیں پاتا تو خدا سے دعا کرتا ہے ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

جدید طریقۂ تعلیم سے اقبال سخت متنفر تھے۔ تہذیبِ جدید اور تقلیدِ فرنگ کے نیض سے وہ قوم کے نوجوانوں کو بے عمل، بزدل اور غلام دیکھکر ان اداروں اور تعلیم گاہوں کے ذمہ دار حضرات کو ان کے فرائض کا احساس دلاتے ہیں ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

بعض مغرب زدہ حضرات اقبال کی مقاصد آفرینی کے تصور کو برگسان کے جوشِ حیات اور ارتقائے تخلیق کا عکس بتاتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کے نقطۂ نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ برگسان نے نفسِ انسانی کی تخلیقی صلاحیت کو مادی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے لیکن اقبال کے نزدیک نفسِ انسانی کی تخلیق کا محرک روحانی جذبہ ہوتا ہے۔ اقبال کی مقاصد آفرینی خالص روحانی ہے اور اس تہذیبِ نفس کی مرہونِ منت ہے جو مذہب اخلاق کی بنیاد ہے۔ یہی تہذیبِ نفس جب اقبال کے سامنے مردِ مومن کا تصور پیش کرتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے ؎

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو ۔۔۔ فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں فرشتہ و حور ۔۔۔ کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

اقبال نطشے کا مداح اس وجہ سے ہے کہ وہاں بھی اُسے اپنے نقطۂ نظر کی تائید ملتی ہے۔ نطشے بھی استحکامِ خودی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اس کے لئے قلبِ او مومن و دماغش کافر است کہتا ہے وہ رومی کا اس لئے مداح ہے کہ رومی عقل سے زیادہ عشق پر ایمان رکھتا ہے اور یہی اقبال کا مسلک ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ۔۔۔ عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

مگر اسکا عشق اس سے مختلف ہے۔ وہ ایسا عشق چاہتا ہے جو جذبۂ تسخیر جذبۂ تخلیق اور جذبۂ ارتقا کے کامیاب امتزاج کا مجسمہ ہو۔

نہ دارد کار با دوں ہمتاں عشق ۔۔۔ تذرو مردہ را شاہیں نہ گیرد
عقاباں را بہائے کم نہد عشق ۔۔۔ تذرواں را بباز اں سر دہد عشق
نگہ دارد دلِ ما خویشتن را ۔۔۔ ولیکن از کمینش بر جہد عشق

اقبال کے نزدیک عشق زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیقی استعداد ہے۔ مگر اس کے لئے بیدار دل کی ضرورت ہے ؎

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے ۔۔۔ شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

اقبال کو جمود سے نفرت ہے وہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں حرکت اور عمل کا جذبہ بیدار کرنا چاہتا ہے اور جب ہندوستان کی غلامانہ ذہنیت سے مسلمان کو متاثر دیکھتا ہے تو کس انداز سے نشتر زنی کرتا ہے ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

خودی کی سعیٔ پیہم روح کو اندرونی اور وجدانی طور پر اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے تیار کرتی ہے اور یہ مقاصد کی روشنی مستقبل کی تصویر کو حال کے آئینے میں پیش کر سکتی ہے۔ مگر اس کے لئے جس ہمتِ بلند کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی تعلیم اقبال یوں دیتا ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں ۔۔۔ نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے ۔۔۔ امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر ۔۔۔ تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

قرآن پاک میں جگہ جگہ اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار خود ہے (لیس للانسان الا ما سعی یا لها ما کسبت و علیها ما اکتسبت) کی تفسیر اقبال بڑے دلچسپ پیرایہ میں یوں کرتا ہے جب ابوالعلا معرّی کو بھنا ہوا تیتر پیش کیا گیا تو اس نے تیتر سے یوں کہا ؎

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو ۔۔۔ دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارے
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ۔۔۔ ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اسلام نے انسان کے تصور اور ارادہ کو آزاد رکھا ہے تاکہ ہر شخص اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لا سکے۔ اقبال اسی تعلیم کو اپنے الفاظ میں یوں سناتا ہے ؎

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر ۔۔۔ چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ۔۔۔ ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسلام نے جو مردِ مومن کا معیار پیش کیا ہے اس پر جب مسلمان پورا نہیں اترتا تو اقبال اسے اس طرح غیرت دلاتا ہے ؎

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے ۔۔۔ تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری ۔۔۔ تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

اسی بیباکی اور بلند ہمتی کی تعلیم دیتے ہوئے اقبال قوم کے ہر فرد میں خود اعتمادی، غیرت اور بلند آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے ؎

جھپٹنے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ

علم و عقل سے زیادہ اقبال عشق کا پرستار ہے وہ خشک فلسفیانہ مسائل سے ہمیشہ بیزار رہا ہے۔ محض فلسفہ کو وہ زندگی سے دوری کہتا ہے ؎

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم سرِّ محبت سے بے نصیب رہا
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

---

## تصنیفِ مقدر :

بقیہ صفحہ ۳۴

میں نے حتی الوسع کوشش کی کہ ان کی شراب نوشی کی عادت چھوٹ جائے لیکن بے سود۔ پھر بھی میں خوش تھی کیونکہ میری ننھی شیریں میری امید کا ستارہ میری زندگی کا سہارا چمک رہا تھا۔ لیکن آج وہ بھی ٹمٹا رہا تھا۔ پندرہ دن سے بخار تھا۔ ڈاکٹر نے حالت نازک بتائی تھی۔ میں نے جھک کر شیریں کی پیشانی کو چھوا۔ سرد، برف کی طرح۔ سینے پہ ہاتھ رکھا۔ خاموش، بیابان کی طرح۔ ساکت، مردنی چھائی ہوئی۔ کمرے میں ایک سایہ پلنگ پر پڑے ہوئے بے جان جسم پر جھکا ہوا تھا۔ باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا۔ وہ ننھا ستارہ جو چھپ چھپ کر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اب تنگ آکر آکاش میں سما گیا تھا۔ دور تک کاجل کا صحرا دکھائی دیتا اور گھور کالی رات !!!۔

# چیخ

افسانہ

خاطر غزنوی

پڑاؤ پر آکر بس رک گئی — فوجی نے اپنا کٹ بیگ اور ایک بکس اتار کر اپنے گاؤں کی سڑک کے کنارے رکھ دیئے۔ بس پھر چل پڑی — اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر اس نے محسوس کیا کہ چھ سال کے عرصہ میں یہ پڑاؤ کسی قدر بدل چکا ہے — اب وہ کچی سڑک بھی پختہ ہو چکی تھی۔ مسافروں کے ٹھہرنے کی کچی کوٹھری بھی ایک پختہ عمارت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ساتھ کے کنویں پر چھپر ٹنگ چکا تھا۔ صرف چھپر ہی نہیں کنویں کے گرد سیمنٹ کا فرش بھی بن چکا تھا۔ لیکن اتنی تبدیلیوں کے باوجود اسے دور دور تک سبزے کا نام و نشان بھی نظر نہ آیا۔ اس نے سوچا شاید یہ علاقہ بھی قحط کی زد میں آچکا ہے — سڑک کے کنارے درخت یوں لنڈ منڈ کھڑے تھے — جیسے پارک شائر کی سن باتھ سوسائٹی کے ممبر دھوپ میں برہنہ ہو کر انگڑائیاں لے رہے ہوں۔

سورج خوب تیزی سے چمک رہا تھا۔

پڑاؤ پر صرف ایک ہی ٹانگہ کھڑا تھا۔ جس کی پچھلی نشست پر ایک نیا شادی شدہ جوڑا براجمان تھا۔ دلہن شادی کے زرین جوڑے میں ملبوس تھی۔ اور اس نے اپنا گھونگھٹ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بڑھا رکھا تھا۔

اپنی تازہ استری کی ہوئی وردی کو جھاڑتے ہوئے اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اور پالش کئے ہوئے بھاری بھرکم بوٹوں سے دھرتی کو کچلتا ہوا کوچوان کے پاس آیا۔ کالے رنگ کی کشتی نما فوجی ٹوپی کو اس نے سر پر کچھ ٹیڑھا کیا۔ اور ہاتھ میں ایک مختصر سی چھڑی کو گھماتے ہوئے کوچوان سے ٹانگہ کا کرایہ پوچھا — وہ قدرے رعب میں ہو گیا تھا — شاید کوچوان پر اپنے فوجی ہونے کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا — "ایک روپیہ" — ٹانگے والے نے بھی تن کر جواب دیا جیسے اسے اس کے فوجی ہونے کی کوئی پرواہ نہیں — اور فوجی بھی شاید اپنا رعب برقرار رکھنا چاہتا تھا — یا شاید کوئی اور وجہ ہو — کٹ بیگ اور ٹرنک رکھ کر وہ ٹانگے کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اب کسی اور لاری کے آنے کا وقت نہ تھا۔ کوچوان نے گھوڑے کو چابک دکھائی۔ اور فوجی اپنے گاؤں کے سہانے خوابوں میں کھو گیا۔ پورے چھ سال بعد وہ اس راستے سے گذر رہا تھا۔ راستہ وہی تھا۔ لیکن اس کی ہیئت بدل چکی تھی۔ بالکل اس کی اپنی طرح۔ وہ بھی پہلے پہل اس گاؤں سے بھرتی ہونے کے لئے گیا۔ تو کچھ اور ہی تھا — ایک اجڈ — اور غیر تعلیم یافتہ دیہاتی — جس کے دیہاتی کپڑوں سے گنوار پن کی بو آرہی تھی — اور اب چھ سال کے عرصہ میں وہ ایک سپاہی سے ترقی کرتا ہوا جمعدار بن گیا — دشمن کی قیدیں بھگت چکا۔ کئی ادھوری سی غیر ملکی زبانیں سیکھ گیا — یہاں تک کہ اب وہ اپنا دستخط بھی انگریزی میں کر سکتا تھا۔ اور ہر وقت اجلے اور استری کئے ہوئے کپڑے پہنے رہتا تھا۔

پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی دلہن کو کھانسی آئی — اس نے کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ عورت کا گھونگھٹ بڑھا ہوا تھا — اسے اپنی بیوی یاد آگئی — چھ سال کے عرصہ میں جانے وہ کیا سے کیا ہو گئی ہوگی — ایک سال تک تو وہ گھر والوں سے خط و کتابت کر سکا — لیکن معاً دشمن کے ہتھے چڑھ جانے پر سلسلہ بند ہو گیا — اور اسے قید و بند کی مصیبتیں یاد آگئیں — کتنی صعوبتیں جھیلیں تھیں اس نے — کتنی بیدردی کا سلوک کیا دشمنوں نے ان کے سپاہیوں سے۔ ان وحشیانہ مظالم کی یاد سے اس کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی — گرمی کی جھلسی ہوئی دوپہروں میں ان سے سخت مشقت کرائی جاتی — اتنی سخت کہ خون پسینہ ایک ہو جاتا — اور اس کے ماتھے پر پسینے کے چند موٹے موٹے قطرے نمودار ہو گئے۔ رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ شدت کی گرمی پڑ رہی ہے — اور معاً اسے یاد آیا کہ اس کی کلائی پر ایک گھڑی بھی بندھی ہوئی ہے — جس کا قطر ڈیڑھ انچ کے قریب ہے — جو فوجیوں کے لئے خاص طور پر مفید ثابت ہوتی ہیں — ہاتھ کو ہوا میں لہراتے ہوئے اس نے وقت دیکھا — ڈھائی بج رہے تھے — وہ سوچنے لگا کہ جب اس کی بیوی یہ گھڑی — یہ دیدہ زیب وردی — اپنے زرق برق کپڑے — اور امریکن سونے کے زیورات دیکھے گی تو کس قدر خوش ہوگی — کس قدر نازاں ہوگی۔ قسمت پر — اور اس نے پھر پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرف نظر کی — گھونگھٹ بدستور لٹک رہا تھا۔

ڈھائی بجے دوپہر کا وقت — شدت کی گرمی — یہ چٹیل میدان — اور یہ عورت ہے کہ گھونگھٹ ہی کئے بیٹھی ہے — ان دیہاتیوں سے تو شہر والے ہی اچھے ہیں گھونگھٹ وونگھٹ تو وہ جانتے ہی نہیں اور پھر اسے غیر ملکی شہر یاد آگئے — جہاں بالکل آزادی تھی — پردے کو کوئی جانتا ہی نہ تھا۔ اور اس عورت کو اس شدت کی گرمی کا بھی کچھ احساس نہیں — آخر ان لوگوں نے سمجھا ہی کیا ہے — جن کی رگ رگ میں غلامی سرچ گئی ہو۔

ٹانگہ اپنی ایک خاص رفتار سے یہ چٹیل میدان عبور کر رہا تھا۔ یہاں درخت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس نے لندن کے آباد بازاروں سے لے کر ہیروشیما کے کھنڈروں تک سبھی کچھ دیکھا تھا۔ اور یہ چٹیل میدان بھی ہیروشیما کے کھنڈروں سے کوئی کم نہ تھے — لیکن وہ ان چٹیل میدانوں پر مرا جا رہا تھا۔ ہزار برا سہی یہ علاقہ — لیکن یہ پھر اس کا وطن تھا۔ سنگ میل پر اس نے پڑھا۔ اس کا گاؤں صرف دو میل رہ گیا تھا۔ اور اس کے دل میں جیسے گدگدیاں سی ہونے لگیں — اسے پھر اپنی بیوی یاد آگئی۔ اس نے تصور کے پردوں پر کئی بار اپنی بیوی کی تصویر لانے کی کوشش کی۔ لیکن ایک دھندلا سا نقش بن کر مٹ جاتا — وہ شادی کے بعد صرف ایک مہینہ ہی تو اس کے ساتھ گذار سکا تھا۔ کیونکہ اسے ٹریننگ کے بعد چھٹی ہی ایک مہینہ کی ملی تھی — اور اس کی ماں نے اس ایک مہینہ کو نعمت غیر مترقبہ جانتے ہوئے اپنے بیٹے

کی شادی کردی اور پھر اس کے بعد چھ سال کا طویل عرصہ —— کچھ جرمنوں کے ساتھ جنگ میں اور کچھ ان کی قید میں۔ کچھ جاپانیوں کے ساتھ جنگ میں اور کچھ ان کی قید میں گذرا —— اور اب وہ آزاد ہو کر اپنے گاؤں آرہا تھا۔ اب وہ بالکل آزاد تھا اسے فوج کی نوکری سے چھٹی مل چکی تھی —— اور اب وہ اپنے گاؤں واپس آرہا تھا —— ٹانگہ اپنی مخصوص رفتار سے یہ چٹیل میدان عبور کر رہا تھا۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ گرمی شدت کی پڑ رہی ہے۔ پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت کا گھونگھٹ بدستور لٹک رہا تھا۔ اور اس کے ماتھے پہ پھر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے گھڑی کو بھی دیکھ لیا۔ تین بج چکے تھے۔ اکا ایکی اسے اپنی بوڑھی ماں کا خیال آیا۔ وہ اپنی ماں کو تو بھول ہی چکا تھا —— اور بیوی رہ رہ کر یاد آرہی تھی۔ وہ اپنی بیوی جو صرف ایک ماہ اس کے ساتھ رہی۔ اور عمر کے بائیس سال ساتھ رہنے والی ماں کو وہ بھول ہی چکا تھا —— لیکن ماں تو چیز ہی بھول جانے کی ہے —— اب تو اس کی جیون ساتھی اس کی بیوی تھی —— اس کے دکھ درد کی شریک —— اس کے راحت و آرام کی نگہبان اس کی ہر آسائش کی ذمہ دار —— اس کی بہترین مونس —— اور —— رفیق —— اور ماں —— وہ اس وقت ماں کے متعلق کچھ زیادہ سوچنا نہ چاہتا تھا۔

ٹانگہ اسی رفتار سے چٹیل میدانوں میں سے گذر رہا تھا۔ گھوڑا تپتی ہوئی پکی سڑک کو روندتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ بالکل اس کے دماغ کی رفتار کے ساتھ ساتھ —— اس طویل خاموشی سے وہ اکتا گیا تھا۔ اسے ایسا کوئی موضوع نہ سوجھتا تھا جس پر وہ کوچوان یا پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے نوجوان سے باتیں کرتا۔ اس نے گانا چاہا —— نغمہ اس کے ہونٹوں تک آکر رک گیا۔ اسے یاد آیا۔ کہ اس کے ملک کے رسم و رواج کے مطابق کسی عورت کی موجودگی میں گانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ وہ خاموش ہی رہا —— اور کچھ سوچنے لگا —— ٹانگے کی رفتار کچھ سست پڑ گئی۔ کوچوان نے گھوڑے کو بے نقط سنانی شروع کردیں —— شاید جانور ان موٹی موٹی گالیوں کا مطلب سمجھتا تھا —— اس کی رفتار میں تیزی آگئی —— لیکن وہ چاہتا تھا کہ گھوڑا اور بھی تیزی سے دوڑے۔ لیکن اس شعلہ بار دوپہر میں گھوڑے کی موجودہ رفتار بھی بہت زیادہ تھی۔

صاف میدان میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی سڑک یوں دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے کوئی سانپ دوڑا جا رہا ہو —— اسے حد نظر کے پاس کچھ آبادی کے نشانات نظر آئے یہ اس کا گاؤں تھا —— دور سے گاؤں کی ایک جھلک دیکھ کر اس کے دل میں پھر گدگدیاں سی ہونے لگیں —— وہ سوچنے لگا۔ کہ جونہی وہ اپنے گھر میں داخل ہوگا —— اس کی بیوی اور ماں اسے اجنبی سمجھ کر ایک لمحے کے لئے گھبرا جائیں گی —— لیکن جونہی اسے پہچانیں گی —— تو وہ گھونگھٹ نکال لے گی —— بالکل اس عورت کی طرح جو پچھلی سیٹ پر سمٹی سکڑی بیٹھی ہے —— اور اس کی ماں فرط مسرت سے اسے گلے لگائے گی —— اسے چومے گی —— اس کی بلائیں لے گی —— اور —— کوچوان نے پھر گھوڑے کو ایک دو موٹی موٹی گالیاں سنا دیں اور گھوڑا اپنا من بھاتا ملے سن کر تیز ہوگیا —— گاؤں قریب سے قریب تر آرہا تھا۔ اور فوجی کا دل بیٹھا جا رہا تھا —— خوشی اور جلدی کے ملے جلے جذبات اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے صاف معلوم ہو رہے تھے۔ سڑک کے کنارے اب سرسبز کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ لہلہاتے ہوئے کھیت —— اور ان لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے ایک میں سے ایک شخص نکلا —— اور سڑک پر گاؤں ہی کی جانب چلنے لگا —— فوجی کو ٹانگے میں بیٹھے دیکھ کر وہ ٹھٹھکا —— فوجی نے جیسے اسے پہچان لیا —— آخر پہچاننا ہی تو تھا۔ عمر کے بیس سال ایک ساتھ رہنے والے دوست رمضو کو وہ نہ پہچانتا —— یہ دوسری بات ہے کہ اسے پہچاننے میں کچھ دیر لگی —— فوجی نے بے صبری سے ہاتھ پھیلا دیئے —— اور اس کے منہ سے تیر کی طرح یہ لفظ نکل گیا —— "رمضو" —— اور اب رمضو نے بھی فوجی کو پہچان لیا —— "بخشو" کہتے ہوئے وہ ٹانگے کی طرف لپکا —— بخشو ٹانگے سے اتر گیا —— مدت کے بچھڑے ہوئے دوست بغلگیر ہوگئے —— ٹانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت کا گھونگھٹ اب اٹھ چکا تھا —— اور وہ حیرانی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ "بخشو کیا تم واقعی زندہ ہو" —— رمضو نے بے تابی سے پوچھا۔ "ہاں ہاں میں زندہ ہوں بالکل زندہ" —— بخشو خوشی سے چلایا اور گھونگھٹ والی عورت کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی۔

# فجی میں ہندوستانی

رام لال

جزائر فجی جنوبی بحرالکاہل میں واقع ہیں۔ جزائر کا رقبہ آراضی (۷۰۵۵) میل ہے اور (۹۵۰۰۰) میل تک یہ جزائر پھیلے ہوئے ہیں۔ بحرالکاہل کے برطانوی جزائر کا ⅓ حصہ اور اس رقبہ کی آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ فجی میں شامل ہے۔ ادر جنوبی بحرالکاہل کے گروپ میں جزائر فجی برطانیہ کا اہم مقبوضہ ہیں۔ اس کی فوجی اہمیت پاناما نہر کے نکلنے سے بہت بڑھ گئی ہے اور اب جبکہ برطانیہ امریکی دفاعی سکیم میں تعاون کرنے والی ہے ان جزائر کو اول درجہ کی فوجی چوکی میں تبدیل کر دیا جائے گا اور اس وقت اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جائیگی۔ یہ جزیرے آسٹریلیا اور شمالی امریکہ کو جانے والے سمندری راستہ میں پڑتے ہیں۔ اس لئے بحرالکاہل کو عبور کرنے والی تجارتی شاہراہوں کے نزدیک ہونے کی وجہ سے انہیں بہت اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ مغربی بحرالکاہل میں مقیم برطانوی ہائی کمشنر کا صدر مقام بھی چونکہ فجی ہی میں ہے اس لئے ان جزیروں کو سیاسی پوزیشنیں بھی حاصل ہوگئی ہے۔ جزائر فجی کا دارالحکومت سوا میں ہے۔ یہ بندرگاہ ہے اور جنوب غربی بحرالکاہل کے سمندری راستوں کا جنکشن ہے۔ برطانیہ۔ کنیڈا اور آسٹریلیا کے درمیان آنے جانے والے جہاز اور امریکہ کی میٹسن لائنز کے جہاز بھی یہاں ٹھہرتے ہیں۔ یہ جہاز چار ہفتہ کے بعد آتے جاتے ہیں اور بحرالکاہل کو شمال سے جنوب تک عبور کرتے ہیں۔ سوا میں ایک اہم لاسلکی سٹیشن اور ریڈیو گھر بھی ہے۔ جنوبی بحرالکاہل میں اس کی پوزیشن ایک اہم سمندری اڈہ کی بھی ہے جسکی وجہ سے اسے نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے دفاع کے لئے قدرتی طور پر موزوں سمجھا جاتا ہے۔

جزائر فجی کے گروپ میں کوئی ڈھائی سو ٹاپو ہیں۔ ان میں سے "ویٹی ووا" اور "وانوآ لیوو" ہی کے دو جزیروں میں خشکی کا ⅞ حصہ آجاتا ہے۔ اور تمام جزائر کی آبادی کا ¾ حصہ ان دونوں ٹاپوؤں میں آباد ہے۔ ۱۹۴۰ء میں فجی کی کل آبادی (۲۲۰۰۸۷) تھی جس میں سے خود فجی کے لوگ (۱۰۳۸۷۲) تھے۔ اور ہندوستانی ۹۸۱۱۳ تھے۔ (۵۰۰۷) آدمی یوریپن یا وہاں کی دیسی آبادی کی ملی جلی نسل کے تھے خالص یوریپن (۴۲۸۷) تھے اور (۸۵۰۰) آدمی پولنیشی، چینی اور تمانی وغیرہ تھے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۵ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار یہ تھے۔ ہندوستانی (۱۱۷۲۵۶) اور فجی کے لوگ (۱۱۷۴۸۸) کچھ لوگوں کو چھوڑ کر باقی اہل فجی میتھوڈسٹ فرقہ کے عیسائی ہیں۔ ہندوستانی آبادی میں ۱۹۳۶ء کی مردم شماری کے حساب سے (۸۵۰۰۲) آدمیوں میں سے (۷۰۹۸۶) ہندو تھے اور (۱۱۲۹۰) مسلمان۔ باقی میں سے (۱۰۶۰) سکھ اور (۱۶۶۵) عیسائی تھے۔ ان ہندوستانیوں میں بنگالی بھی ہیں اور بہاری بھی۔ نیز اڑیسہ کے لوگ۔ پنجابی۔ تامل۔ ملایالی۔ ٹیلگو۔ اور کنڑی بھی۔ اس کے علاوہ یو۔پی اور سی۔پی کے لوگ بھی ہیں۔ مذہبی دھڑے بندی یہاں نہیں ہے۔ اور یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو اپنی اپنی تقریبوں اور شادی بیاہ وغیرہ میں بلاتے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں (۱۶۰۰۰) ہندوستانی کاشتکاری کر رہے تھے اور (۸۵۰۰) لوگ مختلف پیشوں اور تجارتوں میں لگے ہوئے تھے۔ جہاں جہاں گنجان آبادی ہے وہاں زیادہ تر دوکانیں اور بیوپار ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس سلسلہ میں چینیوں سے مقابلہ ہے اور کامیاب۔ درزی خانے اور جوتے کی مرمت کا کام ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ سڑک پر سواریاں چلانے۔ زیور سازی۔ شکر کے کارخانوں میں چلنے والی ریلوں کی ڈرائیوری بڑی حد تک ہندوستانی ہی کرتے ہیں۔ کچھ ہندوستانی سرکاری دفتروں اور یوریپن فرموں میں بطور کلرک بھی ملازم ہیں۔

## ہندوستانیوں کی ہجرت کی تاریخ

۱۰۔ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو فجی کے پرانے حکمرانوں کے انگریزوں کا ایک معاہدہ ہوا اور اسکی رو سے جزائر فجی حکومت برطانیہ کے قبضہ میں آگئے۔ اور اسے ایک برطانوی نوآبادی بنا دیا گیا۔ نوآبادی بنتے ہی روئی کی کاشت کا بڑا غلغلہ ہوا جس کی وجہ سے یوریپنوں نے روئی کی کاشت دھڑا دھڑ شروع کر دی مگر فجی کے دیسی مزدوروں کی اہلیت بہت معمولی ثابت ہوئی اور اس وجہ سے جزائر سیرالیون اور جزائر نیو ہائی برائیڈز سے ۱۸۶۰ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیانی عرصہ میں کوئی (۵۰۰۰) مزدور منگوائے گئے۔ مگر مزدور منگوانے کا یہ سلسلہ بھی کچھ زیادہ اچھا ثابت نہیں ہوا اور ۱۸۷۰ء میں ایسے مزدوروں کی بڑی تعداد اپنے وطن واپس بھیجدی گئی۔ لیکن اس کے بعد گنے نے روئی کی جگہ لے لی اور اس بیوپار میں لوگوں کے خوب وارے نیارے ہوئے۔ شکر کے کام کو فروغ دینے کے لئے "کولونیل شوگر ریفائننگ کمپنی (سی۔ ایس۔ آر۔ سی)" نے خاص حصہ لیا اور اس کمپنی نے ہندوستان سے ہجرت کئے ہوئے مزدوروں کی مدد سے اس کام کو بہت پختہ بنیادوں پر قائم کر دیا۔

۱۸۷۸ء میں حکومت فجی کے "ایجنٹ جنرل مہاجرین" کو ہندوستان اس غرض سے بھیجا گیا کہ وہ یہاں "مزدوروں کی ایک مختصر مگر نہایت باقاعدہ

رہائش کا انتظام کرسکیں۔

اس افسر کی گفت و شنید سے جو نتیجہ پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ہر مزدور سے ایک "معاہدہ" (Indenture) کرایا جاتا تھا جس پر دونوں فریق آپس میں کچھ معاہدہ کرتے تھے۔ اس معاہدہ کی رو سے جانے والے مزدوروں کو ہندوستان سے جانے کی اجازت دی گئی مگر نہایت سخت نگرانی اور پابندی کے ساتھ معاہدہ کی رو سے اس بات کی ذمہ داری لی گئی تھی کہ ہر مزدور کو دس سال کے بعد خرچ دیکر واپس ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ حکومت فجی ایسے مزدوروں کو خود بھرتی کرتی تھی اور اپنی ہی نگرانی میں انہیں مختلف کارخانوں اور کمپنیوں پر جو سرکاری انتظام میں تھے پہنچا دیتی تھی۔

اس سسٹم کے ماتحت ۱۸۷۹ء اور ۱۹۱۶ء کے درمیان (۶۰۵۳۷) مہاجرین ہندوستان سے فجی پہنچے اور فجی سے پہلی واپسی ۱۸۸۹ء میں عمل میں آئی۔ مہاجرین کی آمد اور یہاں پیدا ہونے والے بچوں کی پیدائش کے بعد یہاں ہندوستانیوں کی آبادی جو ۱۸۸۱ء میں صرف (۵۸۸) تھی اور ۱۸۸۳ء میں (۲۳۰۰) تک پہنچ گئی۔ یہ تعداد ۱۸۸۸ء میں (۶۲۳۰) ہوگئی۔ ۱۸۹۱ء میں ہندوستانی (۷۴۶۸) ہوئے اور ۱۹۰۱ء میں یہ تعداد (۱۷۱۰۵) تک پہنچ گئی۔ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۱ء میں آنے والے مہاجرین کی تعداد اتنی بڑھی کہ (۲۰۸۴) آدمی فی سال کی اوسط ہونے لگی۔ سالانہ واپسی کا اوسط ۱۹۱۱ء میں (۸۴۳) شمار کیا گیا تھا۔ اور مجموعاً اس سال ان کی تعداد (۴۰۲۸۶) تھی۔ ہندوستان سے سستے تازہ دم مزدور نہایت آسانی سے اور بے تکلفی سے مل جاتے تھے اس لئے گنے پیدا کرنے والی املاک نے عام طور پر یہ وتیرہ اختیار کیا کہ معاہدہ کی رو کے جن مزدوروں کی مدت ملازمت ختم ہوگئی انہیں نکال دیا اور تازہ ہندوستانی بھرتی کرتے۔ اسپر ہندوستانیوں نے بھی یہ کیا کہ گنے کے کھیتوں کی مزدوری سے علیحدگی اختیار کرلی شروع کردی اور زمین لیکر ان پر کھیتی باڑی کا سلسلہ قائم کردیا۔ چنانچہ آزاد کاشتکاروں کی حیثیت سے انہوں نے چاول گندم وغیرہ دوسری چیزیں بھی کاشت کرنی شروع کردیں۔ ان سب چیزوں کی نکاسی کے لئے وہاں بہت اچھی میدان تھا اور روزگار کا نہایت معقول ذریعہ تھا ساتھ ہی ساتھ یہ ہوا کہ برٹش گنی، مالدیپ،

# غزل

**حافظ امرتسری**

دیکھ لینا کوئی برا تو نہیں
یہ کوئی جرم یا خطا تو نہیں

آپ ناحق بگڑ گئے مجھ سے
میں نے کچھ آپ سے کہا تو نہیں

دل کو ملتی ہے درد سے راحت
درد میں درد کی دوا تو نہیں

میں کہاں ہوں یہ کیا مقام آیا
یہی منزل کی انتہا تو نہیں

دل کے زخموں سے ملتے جلتے ہیں
غم سے تارے بھی آشنا تو نہیں

آپ کہتے رہیں برا لیکن
حافظ امرتسری برا تو نہیں

اور مری نداد کے تجربوں سے کچھ ہندوستانی فجی کی طرف آنے لگے اور یہاں آکر گنے کی بہت سی زمینوں پر قابض و متصرف ہوگئے۔

یورپین زمیندار یہ تو چاہتے تھے کہ ہندوستانی یہاں آئیں مگر صرف زرعی مزدوروں کی حیثیت سے۔ اس لئے وہ آزاد کاشتکار اور آزاد شہری کی حیثیت سے آباد ہونے والے ہندوستانیوں کو ایک آنکھ پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ آزاد ہندوستانی شہریوں سے ان کی آویزش رہنے لگی۔ علاوہ ازیں معاہدہ مزدوروں سے جن حالات میں کام لیا جاتا تھا وہ بہت ناگوار و ناگفتہ بہ حد تک پہنچ گیا تھا۔ ہندوستان سے جو مزدور ان جزائر میں جاتے تھے ان کے ساتھ عورتیں بہت کم ہوتی تھیں کیونکہ شادی شدہ لوگوں کے لئے "قلی لائینوں" میں رہنے میں بڑی دشواری تھی۔ عورتوں کی کمی کی وجہ سے "قلی لائینوں" کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی اور مزدور اخلاقی پستی کا شکار بننے پر مجبور ہوگئے۔

چنانچہ یہ "قلی لائنیں" بدکاری اور شرمناک بیماریوں کا گھر بن گئیں۔ خوفناک جرائم خودکشی اور اقتصادی پستی اس کے ساتھ ساتھ آئی۔ نیٹال کے لئے "معاہدہ مزدوروں" کی ہجرت کا قاعدہ اڑا دیا گیا۔ اس سے فجی کے زمینداروں کی بھی ذرا آنکھیں کھلیں اور انہوں نے کچھ رعایتیں دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں کئی نئی تبدیلیاں قواعد میں داخل کی گئیں۔ خاص طور پر یہ بات کہ مزدوروں کو ملازمت کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں فوجداری سپرد نہیں کیا جائیگا اور روزانہ ان سے جو کام لیا جاتا ہے اس میں بھی کمی کردی جائے گی۔ ۱۹۱۴ء میں ایک نیا۔ ٹیمن ٹال دفعہ مرتب ہوا۔ مگر اس کی رپورٹ سے بھی ہندوستانی پبلک کے مطالبات کی تشفی نہیں ہوئی۔ اور اہل ہند نے آنجہانی سی۔ ایف اینڈریوز اور ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ پیرسن کو ۱۹۱۵ء میں اس سلسلہ میں تحقیقات کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ ان لوگوں نے فجی میں مقیم ہندوستانیوں کی حالت کا بہت گہرا مطالعہ کیا اور بڑی چھان بین کے بعد قابل تردید ثبوت اس نوعیت کے بہم پہنچائے کہ ہندوستانی مزدوروں کی حالت نہایت افسوسناک ہے۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ لارڈ کے ہارڈنگ کو اس بات پر مجبور ہونا پڑا کہ معاہدہ

سسٹم کو بالکل ختم کر دیا جائے چنانچہ ۱۹۱۶ء میں قانون انفساخ سرخط پاس کیا گیا۔ اگرچہ سرخط لکھوا کر مزدور حاصل کر لینے کا طریقہ بالکل خلافِ قانون قرار دے دیا گیا تھا مگر سینکڑوں مزدور ابھی تک پرانے سرخط کے قواعد کی رو سے پھنسے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں اس سسٹم کی خرابیاں ۵۰ سال سے چلی آ رہی تھیں اور ان کے برے نتیجے بھی اپنی جگہ موجود تھے اس لئے اس قانون کے بننے کے باوجود ہندوستانیوں کی زندگی میں آشوب بدستور موجود رہا۔ پادری انڈریوز صاحب کو تازہ تحقیقات کے لئے پھر ۱۹۱۷ء میں بھیجا گیا۔ ان کی درخواست پر آسٹریلیا کی مس فلارنس گارنہم نے ۱۹۱۸ء میں اس سلسلہ میں خاص تحقیقات کیں۔ بالخصوص فجی میں آباد ہندوستانی عورتوں کی پس ماندہ حالت کی۔ اس سال کے ختم ہونے پر ان سب مزدوروں کے سرخط جو ۱۹۱۶ء تک آ چکے تھے حتمی طور پر منسوخ کر دئے گئے اور ۱۹۲۰ء میں سال شروع ہوتے ہی فجی کے ہر ہندوستانی نے اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا۔ ۱۹۲۱ء میں یہاں کے ہندوستانیوں کی تعداد (۶۰۶۹۱) شمار کی گئی تھی۔

## مزدور سے آزاد کاشتکار

"سی۔ ایس۔ آر۔ سی" کمپنی کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس کمپنی نے بہ آسانیاں بہم پہنچانی شروع کیں کہ ہندوستانی زمین لے لیں کہ اس میں گنا پیدا کریں یا تو ٹھیکیداری کے طریقہ پر یا خود کاشت مزارعین کی حیثیت سے۔ ان آسانیوں کی وجہ سے جزائر فجی میں ہندوستانیوں کی حالت کچھ بہتر ہو گئی خاص طور پر کمپنی کی اس سکیم سے یہ آسانی پیدا ہو گئی کہ اس نے ۱۹۱۴ء میں سے بنے بنائے کھیت ان ہندوستانیوں کی تحویل میں دے دئے جنکے معاہدہ کا آخری سال آ لگا تھا اور جب یہ مدت بھی ختم ہو گئی تو مستقلاً ان کھیتوں پر انہیں آباد کر دیا گیا۔ ۱۹۱۶ء میں جب سرخط سسٹم منسوخ ہوا تو اس کمپنی کے کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے لئے مزدور ملنے کی بڑی دشواری پیش آئی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں کمپنی نے سوسوا ایکڑ زمین کے پلاٹ ہندوستانیوں کی مختلف ٹکڑیوں کو پٹہ پر دینے شروع کئے۔ ۱۹۲۰ء میں ہندوستانیوں نے ہڑتال کر دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ آخرکار زمینوں کے پٹے سب کے سب ہندوستانیوں کے قبضہ میں آ گئے۔ جو کھیت جیسی پیداوار دیتا تھا اس کی مقدار و معیار کے مطابق کمپنی دام لگا کر مال اٹھا لیتی تھی۔ اس طرح فجی میں کمپنی شکر کی واحد اجارہ دار بن گئی اور خوب روپیہ رولا۔ اس وقت اس کے بزنس کا اندازہ (۴۰,۰۰۰) پونڈ لگایا گیا تھا۔

ان کے علاوہ ایسے بھی سینکڑوں ہندوستانی اس وقت موجود ہیں جنہوں نے یہاں کے دیسی مالکوں سے پٹہ پر براہ راست زمینیں لے رکھی ہیں۔ بعض لوگ برائے نام رقم دیتے ہیں مگر زمینوں پر مالکانہ تصرف حاصل ہے۔ مجموعی طور پر یہاں کے ہندوستانیوں کا بیشتر حصہ براہ راست یا بلاواسطہ طور پر شکر سازی کے کام سے اپنی روزی حاصل کر رہا ہے یہاں جتنا گنا پیدا ہوتا ہے اس کا ۲/۳ حصہ بھی ہندوستانی پیدا کرتے ہیں اور ۱۹۴۲ء کے حساب کی رو سے یہاں دس لاکھ ٹن گنا پیدا کیا گیا تھا جس کی قیمت (۳,۵۰۰,۰۰۰) پونڈ تھی۔

کمپنی سے جن ہندوستانیوں نے پٹہ پر زمینیں لی ہیں وہ دس دس ایکڑ کے وسطی قطعے ہیں اور جو زمینیں یہاں کے دیسی لوگوں سے لی گئی ہیں انکا اوسط ۱/۲ ۱۰ ایکڑ فی کمینت سے (۱۲) ایکڑ فی کمینت تک ہے۔ کمپنی کے پٹہ دار مجبور ہیں کہ زمین کو ڈھائی ڈھائی ایکڑ کے چار ٹکڑوں میں بانٹ دیں اور ہر قطع زمین پر کمپنی کی ہدایت کے مطابق یہ چیزیں بوئیں۔ ایک قطع پر گنا۔ دوسرے پر ایکھ۔ تیسرے پر مارشس کی مشرجہ کھاد کہ جسے کام میں لائی جاتی ہے اور چوتھے ٹکڑے پر گنے کی پود۔ ان کاشتکاروں کو اس کی بھی پابندی کرنی پڑتی ہے کہ کھیت میں کب پودے لگائے جائیں۔ کب ہل جوتا جائے اور گنے کب اکھاڑے جائیں۔ دیسی لوگوں سے جو زمینیں حاصل کی گئی ہیں وہاں یہ سب قیدیں نہیں ہیں۔ فجی کے دیسیوں سے پٹہ پر لی ہوئی زمینیں ان پابندیوں سے آزاد ہیں۔ لیکن کمپنی کی طرف سے اکثر یہ شرط لگائی جاتی تھی کہ ان کے بتائے ہوئے طریقوں کے خلاف جو گنا پیدا کیا جائیگا اس کو لینے سے کمپنی انکار کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایسا بہت دفعہ کیا گیا۔

۱۹۴۰ء میں جو زمینیں ہندوستانیوں کے پاس زیر کاشت تھیں اس کا اندازہ (۶۴۰۰) ایکڑ لگایا جاتا ہے۔ یہ زمینیں دیسی لوگوں سے پٹہ پر لی گئی تھیں لیکن سرکاری زمینیں (۲۵۰۰) ایکڑ رقبہ کی تھیں اس کے علاوہ (۲۰۰۰) سے (۳,۰۰۰) ایکڑ زمینیں ہندوستانیوں کے پاس مالکانہ حیثیت میں تھیں۔ (۳۳,۰۰۰) ایکڑ زمین ایسی بھی تھی جو سرکاری زمینیں تھیں مگر کمپنی کی نگرانی میں ٹھیکہ پر چلتی تھیں۔ (۵,۰۰۰) ایکڑ زمین آزاد مالکان آراضی سے کرایہ پر لے کر ہندوستانی کاشت کرتے تھے غرض مجموعی طور پر ہندوستانیوں کی تحویل میں (۱۰۷,۰۰۰) ایکڑ زمین تھی اور اس کا بڑا حصہ زیر کاشت تھا۔

فجی میں جو ہندوستانی آباد ہیں ان کے مستقبل کا مسئلہ زمین کے مسئلہ سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان جزیروں کی زمینوں کا (۸۰) فیصدی حصہ فجی کے لوگوں کا اپنا ہے اور اسے یہاں کی قبائلی املاک سمجھنا چاہیے۔ بقیہ (۲۰) فیصدی حصہ سرکاری زمین ہے یا سرکار کی طرف سے کمپنی کو دی ہوئی زمینیں ہیں۔ آئندہ کافی عرصہ تک (۸۰) فیصدی ہندوستانیوں کی اگر کوئی معاش یہاں ہو سکتی ہے تو وہ زمین کا ذریعہ ہے۔ ۱۹۰۹ء میں ایک قانون ایسا بنایا گیا کہ دیسی لوگ اپنی زمینیں صرف گورنمنٹ کے ہاتھ بیچ سکیں گے۔ ہندوستانیوں نے اس قانون کی وجہ سے مجبور ہو کر پھر جو بھی زمینیں حاصل کیں وہ سرکار سے حاصل کیں اور

وہ بھی زیادہ تر بٹہ پر جسے مستاجری طریقۂ زراعت کہنا چاہئے اس موقع پر دیسی مالکان آراضی کی مرضی ضرور حاصل کی جاتی تھی لیکن فی الحقیقت زمینوں کی مستاجری اور لگان کا تقرر ۱۹۳۳ء کے آرڈیننس کے نمبر ۷ اور نمبر ۴، کے ماتحت عمل میں آتا ہے۔ یہ آرڈیننس جب پاس کیے گئے تو ہندوستانیوں نے بہت سخت مخالفت کی۔ ان آرڈیننسوں کی وجہ سے فجی کے زمینداروں کو یہ شہ مل گئی کہ ہندوستانی آبارکاروں کو جب چاہیں بیدخل کر دیں۔ انہیں رہن کی زمین چھڑانے کی سہولتیں نہ دی گئیں اور عمل درآمد آرڈیننس کی تاریخ سے قبل تک حاوی کر دیا گیا۔ اور ان ترقیوں کا جو زمینوں پر یا ان کے گرد و پیش میں کی گئیں کوئی خیال نہ رکھا گیا۔ شرائط نہایت کڑی کر دی گئیں۔ آرڈیننس نمبر ۱۴ کے بننے سے فجی کے لوگوں کو یہ بھی ترغیب ہوئی کہ وہ اگر چاہیں تو ہندوستانیوں کے پٹے کی تجدید سے انکار کر دیں۔ "دیسی زمینوں کا آرڈیننس" اور "دیسی زمینوں کے دخل کا آرڈیننس" یہ دو آئین ایسے بنائے گئے جن کا مقصد محض کمپنی کے ساتھ ترجیحی سلوک کرنا تھا۔ گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل تھا کہ ہندوستانیوں اور فجی کے مالکان کے دعووں میں ثالثانہ فیصلہ کر دے مگر عملاً ہوتا یہ تھا کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں، کے فیصلوں کو ہی بحال رکھتا تھا۔ اور اس قاعدہ سے بھی ہندوستانیوں کو کچھ سہولت نہیں پہنچی۔ غرض ان تمام طریقوں سے ہندوستانیوں کو زمینوں کی مالکانہ حیثیت سے محروم کرنا مقصود تھا اور اس کے لئے مجبور کرنا تھا کہ وہ کمپنی کے صرف زرعی اجیر بنکر زندگی گذاریں۔ (۲۱) سال سے زیادہ کا پٹہ منظور نہیں کیا جاتا تھا اور فجی کے لوگوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ وہ بغیر گورنمنٹ کی مرضی کے کسی ہندوستانی کے ہاتھ زمین فروخت نہ کریں اور عملی طور پر کوشش یہ کی جاتی تھی کہ ہندوستانی زمین حاصل ہی نہ کر پائیں۔

فروری ۱۹۴۰ء میں "دیسی زمینوں کے ٹرسٹ کا آرڈیننس" جاری کیا گیا جس کی رو سے کل نوآبادی کی زمینیں گورنمنٹ کے کنٹرول میں آگئیں۔ زمینوں کا کچھ حصہ محض فجی کے لوگوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ اور باقی حصہ میں ساری دنیا کو اجازت دے دی گئی اور ان میں ہندوستانیوں کو بھی شریک کر لیا گیا۔ آرڈیننس میں پٹہ کے تمام قواعد و ضوابط درج کر دئے گئے تھے لیکن پٹوں کی تجدید میں ہمیشہ سخت دشواریاں حائل رہتی ہیں۔

جون ۱۹۴۳ء میں گنے کے کاشتکاروں نے جو زیادہ تر ہندوستانی ہیں یہ مطالبہ کیا کہ ہماری پیداوار کی قیمت زیادہ دی جائے کیونکہ لڑائی کی وجہ سے زندگی بہت مہنگی ہو گئی ہے مگر کمپنی نے یہ مطالبہ نامنظور کر دیا۔ مارچ ۱۹۴۴ء میں حکومت برطانیہ کے "دفتر نوآبادیات" نے ڈاکٹر سی۔ وائی شیپرڈ کو کاشتکاران کی شکایات کی تحقیق کے لئے بھیجا اور انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ انہوں نے سفارش کی کہ جو زمینیں "دیسی زمینوں کے ٹرسٹ بورڈ" کی طرف سے لی گئی ہیں ان کے پٹے ۱۲ سال کے لئے دئے جائیں اور ہر گیارہ سال کے بعد ان کی تجدید کی جائے اور کمپنی کو چاہئے کہ وہ بھی اپنے پٹے مزارعین کو اسی طرح دے۔ نفع کی کافی مقدار کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے یہ بھی سفارش کی کہ گنے کے دام لگانے کے وقت کمپنی کو چاہئے کہ وہ شیرہ کی رقم بھی کل مال کے ساتھ لگائے اور پولیس کو چاہئے کہ وہ کمپنی کی تولنے کی مشینوں کی پڑتال کرتی رہا کرے۔ ہر فصل کے گنے کی قیمت اگلی ۳۱ مارچ تک بیباق کر دینی چاہئے۔ قیمت کی ادائیگی کے سلسلہ میں کمی یا بیشی کا حساب آنے والے سال میں طرفین کے لئے قابل مجرا سمجھا جائے۔

کمپنی کی طرف سے اس کے کھیتوں میں سبزیاں یا دوسری خوراک کی چیزیں بونے کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی اور اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ صرف گنا ہی اگایا جائے۔ ۱۹۴۰ء میں کمپنی کی املاک آراضی کی صورت میں (۳۶،۰۰۰) ایکڑ شمار کی گئی تھی اور فجی کی برآمد کا ¾ حصہ صرف چینی پر مشتمل تھا۔ شکر کے بعد دوسرا نمبر چاول کا ہے جو ہندوستانی یہاں پیدا کرتے ہیں۔

چاول کی پیداوار کے لئے نکاسی کا میدان خود وہاں کے سارے ہندوستانی ہیں جن کا من بھاتا کھاجا صرف چاول ہے۔ اس کے علاوہ مکئی۔ روئی۔ "ینگونا"۔ کیلہ۔ تمباکو، وغیرہ بھی یہ لوگ پیدا کرتے ہیں۔ مختلف النوع زراعتوں میں چاول۔ گندم۔ مکئی۔ مرچ اور ساسن سبزی کے مختلف قسم کے مسالے بھی یہاں پیدا ہوتے ہیں اور یہ سب چیزیں زیادہ تر ایسی ہیں جو ان کی روزمرہ کی غذاؤں کا جزو ہیں۔ فجی میں زراعت کی پیشہ ورانہ تعلیم کی آسانیاں موجود ہیں مگر وہ صرف فجی کے لوگوں کو دی جاتی ہیں، ہندوستانیوں کو نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہندوستانی تو نسلاً بعد نسل کاشتکاری کرتے چلے آئے ہیں انہیں سکھانے کی ضرورت ہی کیا ہے! لیکن یہ بہت سخت غلطی ہے کیونکہ ایسا رویّہ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نوآبادی کی زرعی آبادی کا ایک بڑا حصہ زراعت کی ٹکنیکل تعلیم اور عملی ہنرمندی کے فائدہ سے بالکل محروم رہیگا اور زراعتی ترقی سن ہو کر رہ جائے گی۔

**لکھنے والوں سے**

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالہ میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ علمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔ (ادارہ)

# پودوں میں مقابلہ

اسلم فاروق فریدی

انسانوں کے برعکس پودوں میں اتحادِ حیات کا سراغ نہیں ملتا۔ ہر پودا اپنے ماحول اور توارثی خصوصیات سے اپنا جہاں الگ تعمیر کرتا ہے، اپنی بقا کے لئے خود جد وجہد کرتا ہے اور کسی دوسرے کا شرمندہ احسان ہونا اس کی غیور فطرت کے خلاف ہے، نہ وہ کسی سے مدد طلب کرتا ہے نہ کسی کو پہنچاتا ہے۔ اگر کسی کو مدد پہنچ بھی جائے تو وہ ارادۃً نہیں۔ اسلئے نہیں کہ وہ دوسرے کی مدد کرنا چاہتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اپنی بقا کیلئے جد وجہد کر رہا تھا کہ بالواسطہ غیر ارادی طور پر کسی دوسرے کی مدد ہوگئی اور اس کی خود غرضی میں ہی دوسروں کے لئے سامان بقا نکل آیا۔ آپ غالباً پودوں کے اس فعل کو گری ہوئی نظر سے دیکھتے ہونگے مگر اپنی بنائی ہوئی اخلاقی قدروں پر آپ کائنات کی ہر شئے کو نہیں جانچ سکتے۔ انسان افرادِ حیات کے لئے فطرتاً مجبور ہے۔ قدرت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ باوجود خود غرضی کے دوسروں سے واسطہ رکھے اور اسی میں اس کی بقا کا راز مضمر ہے۔ مگر پودے قوتِ ارادی سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ جہاں انہیں فطرت اگنے کے لئے حکم دیتی ہے وہ وفادار خادم کی طرح اس کے حکم کے تابع رہتے ہیں۔ ان کی دنیا ہماری دنیا کے مقابلہ میں محدود ہے۔ ہمارے ان کے احساس و فعل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ تقدیر کے پابند ہیں ہم آزاد۔ بقول اقبالؔ

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات     مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

اگر پودے اپنی بقا کے لئے جد وجہد نہ کریں تو خود فنا ہو جائیں۔ یہ مقابلہ ایک ہی نوع کے افراد میں ہوتا ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے انواع میں شروع ہو جاتا ہے۔ یہ جنگ اسقدر ہولناک ہوتی ہے کہ بیشتر پودے ابدی نیند سو جاتے ہیں۔ پودوں کی بالواسطہ اور غیر ارادی مدد کی ایک مثال یہ ہے کہ جب مسلسل کاشت سے کھیتوں میں غذائیت یعنی نائٹروجن وغیرہ کی کمی ہو جاتی ہے تو کسان مٹر یا دوسرے پھلیوں والے پودے بوتا ہے جن کی جڑوں میں جراثیم ہوتے ہیں۔ جو فضا سے نائٹروجن جذب کرکے زمین کو بخش دیتے ہیں جسکی وجہ سے آئندہ پھر دوسرے پودوں کی کاشت ہو سکے۔

پودے کے لئے غذا، جگہ، پانی، روشنی اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مقابلہ انہیں چیزوں کے حصول میں ہوگا۔ سب سے پہلے ہم غذا کے لئے مقابلہ کو لیتے ہیں۔

## غذا کیلئے مقابلہ

غذا کے مقابلہ کا سب سے زیادہ مظاہرہ گلی سڑی نامیاتی چیزوں پر اُگنے والے سماروغ Fungi (وہ پودے جو اپنی غذا خود نہیں بناتے) پھپھوندی اور جراثیم میں دیکھا جاتا ہے۔ اگر نامیاتی غذا کی کمی ہے تو وہ پودے جو غذا جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں حاصل کر لیتے ہیں فائدہ میں رہتے ہیں۔ اور باقی نقصان میں۔ اگر غذا ان سب پودوں کے لئے کافی ہے تو یہ مقابلہ جنگ نما اور تولد کی دوڑ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہر پودا چاہتا ہے کہ جلد سے جلد بڑھے اور جلد سے جلد اپنی نسل کی افزائش کا سامان کرلے۔ زرخیز مٹی میں ایک ایک تولہ کے اندر دس دس لاکھ جراثیم ہوسکتے ہیں اتنی بڑی تعداد کی وجہ سے ایک تعداد اور کیمیائی جنگ کا چھڑ جانا لازمی ہے۔ کوئی جرثومہ کوئی مادہ لیکر دوسرا خارج کرے گا۔ دوسری قسم کا جرثومہ دوسرے مادہ کو۔ غرض اس طرح سے انواع میں بالواسطہ جنگ شروع ہوتی ہے اور ان میں سے بیشتر فنا ہو جاتے ہیں۔ جہاں بہت سے پودے پرورش پا رہے ہوں وہاں آہستہ آہستہ پرورش پانے والے پودے کے حصے میں وہی غذا آتی ہے جو جلدی جلدی نشوونما پانے والے پودے چھوڑ جاتے ہیں اور اکثر تو فنا ہی حصہ میں آتا ہے۔ اعلیٰ پودوں میں غذا کا مقابلہ اتنا اہم نہیں رہتا جتنا پانی اور روشنی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی جڑیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ دور دور تک کی غذا کھینچ سکیں۔ ہم انسانوں کی طرح اس مقابلہ کا زیادہ شکار ادنیٰ اور غیر ترقی یافتہ پودے ہوتے ہیں۔

## جگہ کیلئے مقابلہ

اگر ایک ہی جگہ بہت سے پودے اُگ رہے ہوں تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جگہ کی قلت کی وجہ سے صحیح نشوونما حاصل کرنے میں ناکام ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ صعوبت پانی اور روشنی کی تنگی ہوتی ہے۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ پودوں کا قرب ان پر اثر انداز ہو۔ یہی حال ہوا کے مقابلہ کا ہے۔

## پانی کے لئے مقابلہ

یہ مقابلہ پھول دار اور دوسرے ترقی یافتہ پودوں میں یہ مقابلہ ادنیٰ کے زیادہ نمایاں ہے کیونکہ بڑے پودے اپنے حجم اور ضرورت کی وجہ سے پانی زیادہ چاہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوردبینی ادنیٰ اور غیر ترقی یافتہ پودوں کی تو ذرا سے پانی سے آبیاری ہو سکتی ہے اور تھوڑی سی شاعری کے ساتھ شبنم بھی ان کی پیاس بجھا سکتی ہے۔ ایسے پودے کاہی کی شکل میں اکثر آپ نے دیکھے ہونگے۔ پانی کی قلت کی وجہ سے کھیت میں بہت سے پودے سوکھ جاتے ہیں اس کا مشاہدہ عام ہے۔ اگر کسی تناور درخت کے نیچے چھوٹے چھوٹے پودے بڑی تعداد میں اگ آئیں تو ہوگا کہ تناور درخت جلدی جلدی تمام پانی ہضم کر جائے گا۔ یہ غریب حسرت سے اس کا منہ دیکھتے ہوئے دوسری دنیا کی امید میں اس عالمِ فانی سے نامراد کوچ کر جائینگے۔ مزید لطف یہ ہے کہ تناور درخت اپنے اندر ایسے اعضا بھی پیدا کر لیتے ہیں جنہیں غذا اور پانی محفوظ رکھ سکیں تاکہ ضرورت پڑنے پر انکا سرمایہ استعمال میں آسکے۔ ایسے اعضا آلو، پیاز، موٹے موٹے تنے والے

اور کانٹوں کی شکل میں آپ نے اکثر دیکھے ہونگے۔ غیر پودے جو اپنی بدقسمتی کا شکار ہوں اپنے بچاؤ کا سامان اکثر یوں کرلیتے ہیں کہ اپنی عمر کو مختصر سمجھکر جلدی سے بیج پیدا کرلیتے ہیں تاکہ اگر وہ فنا ہو جائیں تو ان کی اولاد تو باقی رہے۔ ایسے کم نصیب پودوں کو تین مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو سرمایہ دار بڑے درختوں کا دوسرے پانی کا بھاپ کی شکل میں اڑ جانا اور تیسرے بقیہ پانی کا زمین کے زیریں طبقات میں پہنچ جانا۔ یہ پودے اپنی جڑیں لمبی کرلیتے ہیں تاکہ تھوڑا بہت پانی تو حاصل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے پودوں کی جو خشکی یا درختوں کے نیچے اگتے ہوں جڑیں مقابلتاً بڑے درختوں سے کافی لمبی ہوتی ہیں۔ درختوں کا تنا اور ہوائی حصہ بڑا ہوتا ہے زیریں اکثر چھوٹا۔ مگر چھوٹے پودوں کا زیریں بڑا ہوتا ہے۔

## روشنی کے لئے مقابلہ

اصل میں سبز پودوں کی حیات کا انحصار کلیۃً روشنی پر ہے جب پودے فاصلہ پر ہوں تو ہر پودا چاروں طرف شاخیں بڑھا کر اپنی مرضی کے مطابق روشنی حاصل کرلیتا ہے۔ مگر جب پودے جھمگٹ میں ہوں تو ان کیلئے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ درخت تو اپنا تنا اور لمبا کر کے روشنی حاصل کر لیتے ہیں جیسا کہ جنگلات میں دیکھا گیا ہے مگر جھاڑیوں کی عمر فریاد کرتے ہی گزرتی ہے۔ فطرت نے اس چیز کو دیکھتے ہوئے پودوں کے فعلی نظام میں ایک اور اضافہ کیا اور وہ یہ کہ تاریکی میں پودے بہت لمبے ہو جاتے ہیں۔ آپنے اکثر اس گھاس کو دیکھا ہوگا جو کسی تاریک کونے میں یا تسلے کے نیچے اگ آتی ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ آلام کی ماری ہوئی زرد زرد گھاس روشنی کی تلاش میں اپنے تنے کو بہت ہی لمبا کرلیتی ہے۔ اور کم سے کم غذا میں گذارا کرنے کے لئے اپنی پتیوں کو مختصر اور چھوٹا کر دیتی ہے۔ عموماً تاریکی یا سایہ میں اگنے والے پودوں کے زیریں تنے پر شاخیں اور پتیاں نہیں ہوتیں۔ اس طرح سے وہ اقتصادیات سے کام لیکر اپنے تنوں کو لمبا کرلیتے ہیں۔ اگر کسی تاریک کمرے میں ایک طرف سوراخ سے روشنی آرہی ہو اور آپ اس کمرے میں ایک گملا رکھدیں تو پودا فوراً روشنی کی طرف مڑ جائے گا۔ اس سے روشنی کے لئے پودوں کی بے تابی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ سائے میں اگنے والے پودے اس قدر اقتصادیات میں کھو جاتے ہیں کہ اگر وہ روشنی میں اگ آئیں تو فطرت کی اس فیاضی کی تاب نہ لاکر خوشی کی موت مرجاتے ہیں یعنی نشوونما حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ جس طرح اگر کسی کنگال کو کہیں سے تاروں کا خزانہ ہاتھ آجائے تو وہ لمحہ جب اس کو خزانہ ملا اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہوگا۔ غالب نے اس لئے کہا ہے۔

"توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے"

چنانچہ اگر ہم پودوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ بہت سی انواع مقابلہ کی تاب نہ لاکر فنا ہو چکی ہیں۔ مقابلہ میں وہی بقا پاتا ہے جو زیادہ طاقتور ہو۔ جس میں زیادہ صلاحیتیں ہوں اور عقلمند ہو۔ بقول اقبال

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ ضعیف پودے جو عقلمند بھی ہوتے ہیں اپنی زندگی کا عنوان ہی بدل ڈالتے ہیں۔ اور دوسروں کے مزار کی اینٹوں سے اپنا محل تعمیر کرتے ہیں۔ یعنی وہ خونخوار اور طفیلی Parasite بن جاتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ خود غذا تیار کریں دوسرے پودوں اور حیوانوں پر اگ کر ان کی تیار کردہ خوراک چرا کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ آپ کے کان میں جب درد ہو تو سمجھ لیجئے کہ یہ ایک غذا چور پودا ہے جو آپ کو تکلیف دے کر خود مزے کر رہا ہے۔ اسی طرح اگر خدانخواستہ آپ کو نمونیہ ہو تو فوراً سمجھ لیجئے کہ ایک ڈاکو نے آپ کے پھیپھڑے پر حملہ کر دیا ہے۔ آپ نے آکاش بیل (امر بیل) کو دیکھا ہوگا کہ کس مزے سے غریب مہمان کا خون چوس چوس کر پرورش پاتی ہے اور اس طرح مہمان پر چھا جاتی ہے کہ غریب پنپ ہی نہیں سکتا۔ ایسے طفیلی پودوں کا علاج سوائے عزرائیل کے کسی کے ہاتھ میں نہیں جب تک یہ ختم نہ کر دیئے جائیں باز نہیں آتے۔ یا پھر ان کا مقابلہ ایسے پودوں (مہمانوں) سے پڑے جو تنے سخت جان اور کڑوے مزاج کے ہوں کہ ان کو اپنی چیرہ دستیوں کا موقع ہی نہ دیں۔ اگر یہ کوشش کریں تو ان کا وجود بھی باقی نہ رہے۔ آپ نے گیہوں کے پودوں پر سرخ

(بقیہ صفحہ ۵۹ پر)

## غزل

مکین احسن کلیم

اجل بھی جن سے پیچ و تاب کھا رہی تھیں بار بار رہ گئی ہے تھک کر
گذر گئے بے خطر انہیں سے یہ کشتگانِ حیات اکثر

نہ جانے یہ رات خود ہی اتنی بجھی بجھی اور فسردہ کیوں ہے
یہ آج خاموش و دم بخود سے ہیں کیوں شب افروز ماہ و اختر

سمجھ رہا تھا سکون جسکو وہ صرف اک دورِ بے حسی تھا
اب اور کیا رنگ لائے دیکھیں امید و ارماں کا حسن منظر

تری نظر کے بغیر شاید کبھی وہ جادہ بن نہ سکتا
وہ ایک لمحہ چمک رہا ہے جو آجتک وقت کی جبیں پر

پگھل چلے تیرگی کے آنسو فضا بھی اب کچھ نکھر گئی ہے
وہ پو پھٹی وہ کرن سی کانپی اداس ظلمت زدہ افق پر

کلیم اکثر یہ سوچتا ہوں کہ آرزو اسکی ہیں ذکیوں کی
یہ روز و شب تو گذر ہی جاتے سکون سے یا اداس رہ کر

# روس میں تیل کی صنعت

گزشتہ صدی کے دوسرے نصف حصہ میں تیل کی پیداوار میں روس دنیا کے تمام ملکوں سے آگے تھا بیسویں صدی کے شروع میں بھی دنیا میں تیل کی کل پیداوار میں روس کا حصہ پچاس اکیاون فی صدی سے کم نہ تھا۔ اس زمانہ میں امریکہ کی ریاستہائے متحدہ دنیا کی کل پیداوار کا صرف اکتالیس فیصدی تیل زمین سے نکال رہا تھا۔ اس وقت سے اب تک دنیا میں تیل کی پیداوار تو بہت زیادہ بڑھ گئی ہے لیکن اس معاملہ میں روس کی رفتار ذرا مدھم رہی ہے۔ اسی وجہ سے ۱۹۴۰ء میں روس امریکہ کی ریاستہائے متحدہ کی پیداوار کے صرف چھٹے حصہ کے برابر اور دنیا کی کل پیداوار کا مشکل سے دس فیصدی تیل نکال سکا۔

موجودہ صدی کے شروع میں روس میں ایک کروڑ ٹن سے زیادہ تیل نکالا گیا۔ اس میں سے زیادہ تر باکو کے اردگرد کے علاقہ سے اور تھوڑا سا شمالی کاکیشیا میں گروزنی کے علاقہ سے دستیاب ہوا۔ اگلے دس سال میں یہ پیداوار ذرا گھٹ گئی چنانچہ ۱۹۱۳ء کی پیداوار ۹۲۳۴۰۰۰ ٹن تھی۔ اسی طرح انقلاب روس کے شروع زمانے میں تو پیداوار بہت تیزی کے ساتھ گھٹی لیکن ۱۹۲۲ء میں آکر پھر بڑھی اور ۱۹۲۶ء تک تو پچھلی ایک کروڑ ٹن والی پیداوار سے بھی بڑھ گئی۔ ملک میں بڑے پیمانے پر صنعتیں جاری کرنے کی جو پالیسی روس نے اختیار کی اس کی وجہ سے تیل کی پیداوار میں نہایت تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی۔ پہلے پانچ سال والے منصوبہ (۱۹۲۸ء-۱۹۳۲ء) کے ماتحت یہ پیداوار دوگنی ہو گئی۔ چنانچہ قدرتی گیس کی پیداوار شامل کرکے ۱۹۳۲ء میں کل مقدار ۲۲،۳۰۰،۰۰۰ تھی۔

اس ترقی کی ایک وجہ یہ بھی کہ ان علاقوں میں جہاں سے تیل مل سکتا تھا تیل نکالنے کی پوری پوری کوشش کی گئی لیکن دوسرے پانچ سال والے منصوبہ کے زمانہ میں تیل کی صنعت نمایاں طور پر گھٹ گئی۔ دوسرے پانچ سال والے منصوبہ (۱۹۳۳ء-۱۹۳۷ء) میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ۱۹۳۲ء کی پیداوار ۲۲،۳۰۰،۰۰۰ ٹن تھی ۱۹۳۷ء میں ۴۶،۸۰۰،۰۰۰ ٹن تک پہنچایا جائے گا۔ گویا ۱۹۳۲ء کی پیداوار پر ایک سو دس فیصدی کا اضافہ مطلوب تھا لیکن ان پانچ سال میں پیداوار ہوئی صرف ۳۰،۴۰۰،۰۰۰ یعنی صرف ۳۶ فیصدی ترقی ہوئی۔ اس طرح منصوبہ میں جتنی مقدار کو مقصد قرار دیا گیا تھا اس کا صرف ۶۵ فی صدی ۱۹۳۷ء میں حاصل کیا جا سکا۔

تیسرے پانچ سال والے منصوبہ (۱۹۳۸ء-۱۹۴۲ء) کے ماتحت جو کوشش ہوئی اس کے نتائج اور بھی مایوس کن نکلے۔ تجویز کیا گیا تھا کہ تیل کی پیداوار ۳۰،۰۰۰،۰۰۰ ٹن سے ۵۴،۰۰۰،۰۰۰ ٹن کر دی جائے گی گویا ۷۰ فیصدی ترقی ہوگی اور گیس کی مقدار ۹،۰۰۰،۰۰۰ ٹن سے ۰۰۰،۵۰۰،۵ پہنچائی جائے گی یعنی ۱۰۰ فی صدی کا اضافہ ہوگا گویا تیل اور گیس دونوں کی مجموعی مقدار ۰۰۰،۰۰۰، ... تجویز کی گئی جس پر ۸۰ فیصدی اضافہ مطلوب تھا لیکن جس مقدار میں تیل حاصل ہوا ... تفصیل یہ ہے کہ گزشتہ میں یعنی تیسرے منصوبہ کے تیسرے سال تیل کی مقدار ۳۱،۴۰۰،۰۰۰ ٹن تک ہوئی گویا تین سال میں صرف ۷ فیصدی ترقی ہوئی اور قدرتی گیس کی پیداوار کو شامل کرکے کل مقدار ۳۴،۲۰۰،۰۰۰ ٹن ہوئی گویا ۱۲.۵ فیصدی ترقی ہوئی۔

چوتھے پانچ سال والے منصوبہ (۱۹۴۶-۱۹۵۰) میں جسے U.S.S.R. کی کونسل نے ابھی حال میں منظور کیا ہے۔ تجویز کیا گیا ہے کہ ۱۹۵۰ء میں تیل کی پیداوار ۳۵،۴۰۰،۰۰۰ ہو جائے اور قدرتی گیس کی مقدار کو اس وقت تک ۸.۴ بلین کیوبک میٹر یعنی ۴،۸۰۰،۰۰۰ ٹن تک پہنچا دیا جائے اس طرح دونوں چیزوں یعنی تیل اور گیس کی مجموعی مقدار ۴۰،۲۰۰،۰۰۰ ہو جائے گی۔ یہ مقدار صرف ۱۹۴۲ء والے منصوبہ کی مطلوبہ مقدار سے بہت کم ہے بلکہ ۱۹۳۷ء میں جو مطلوبہ مقدار تھی اس سے بھی کم ہے۔ یہ کمی واقعی ایسی ہے جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور قدرتی طور پر ہمارے سامنے یہ سوال آجاتا ہے کہ کیا یہ چیز روس کے تیل کے فاضل ذخیروں کے قریب ختم ہونے کی دلیل ہے۔

گوربچن سنگھ

## روسی تیل کے فاضل ذخیرے

روس کے ذخیروں کے متعلق رایوں میں بکثرت اختلاف ہے۔ ماسکو میں ۱۹۳۷ء میں جو بین الاقوامی جیولاجی کل کانگریس ہوئی تھی اس میں روسیوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ سوویٹ یونین میں ۸،۶۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ٹن تیل کے قدرتی ذخیرے زمین میں موجود ہیں اس کے برخلاف دنیا کے تمام دوسرے ملکوں میں تقریباً ۳۲ بلین ٹن ہیں اس تخمینے کی رو سے دنیا کے تیل کے ذخیروں میں سوویٹ یونین کا حصہ گویا ۵۵ فیصدی ہے لیکن دوسرے ملک کے ماہروں نے جو تخمینے کئے ہیں اور جو اعداد و شمار کی بنیاد پر کئے ہیں جو اسی کانگریس میں پیش ہوئے تھے ان کی رو سے سوویٹ یونین کے پاس صرف ۰۰۰،۰۰۰،۸۰۰،۱ ٹن تیل ہے گویا دنیا کے ان تمام ذخیروں کا جو اب تک معلوم کئے جا چکے ہیں ۲۲ فیصدی حصہ روس کے پاس ہے۔ ابھی حال ہی میں یعنی ستمبر ۱۹۴۵ء میں رسالہ ورلڈ پٹرولیم میں جو نقشہ چھپا ہے اس سے تو سوویٹ یونین کے تیل کے ذخیروں کو اور بھی کم

کردیا ہے، وہ کہتا ہے کہ دنیا میں کل محفوظ قدرتی ذخیرے ۳۰۰۷۷ ملین بیرل ہیں اور ان میں سے سوویٹ یونین کے پاس ۵۰۰۰۰ ملین بیرل ہیں۔ اس تخمینہ کی رو سے دنیا کے کل محفوظ قدرتی ذخیروں کا ۵۰ فیصدی تیل روس کے پاس ہے۔ یونائٹڈ اسٹیٹس بیورو آف مائنز United States Bureau of Mines کے مقرر کردہ دوران کی رو سے ۵۰۴۰۰ ملین بیرل ۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ٹن کے برابر ہوتے ہیں اور یہ مقدار ۱۹۳۶ء والی مطلوبہ مقدار سے ۱۱ فیصدی کم ہے۔ پھر اس معمہ کا حل کیا ہے؟

تیل کے بین الاقوامی اعداد و شمار میں قدرتی ذخیروں کی دو قسمیں کی گئی ہیں ایک تو وہ جو معلوم کئے جا چکے اور دوسرے وہ جن کے برآمد ہونے کا قوی امکان ہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں بین الاقوامی جیولاجیکل کانگریس میں ارضیات اور تیل کے مشہور روسی ماہر پروفیسر آئی وان ایم گب کن Ivon M Gubkin نے دنیا کے تیل کے ذخیروں پر جو اپنی رپورٹ پڑھی تھی اس میں اس بات پر زور دیا تھا کہ یہ تقسیم ان روسی ماہرین ارضیات کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے جو اپنے ملک کی تیل کی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی ضروریات کا تقاضا ہے کہ قدرتی محفوظ ذخیروں کی قسمیں دو سے زیادہ مقرر کی جائیں۔ روسی ماہرین ارضیات سب سے پہلے ذخیروں کو تین قسموں پر بانٹتے ہیں یعنی اول وہ ذخیرے جو دریافت ہو چکے، دوم وہ جو تیار کئے جا رہے ہیں اور سوم وہ جو نظر آتے ہیں۔ یہ تینوں قسمیں مجموعی طور پر "معینہ ذخیروں" کے نام سے پکاری جاتی ہیں اور یہ اس قسم کے ذخیروں میں شمار کی جاتی ہیں جو معلوم کئے جا چکے ہیں۔ روسی ماہرین ارضیات ان قسموں پر دو قسموں کا اور اضافہ کرتے ہیں اور ان کے اندر جو تیل موجود ہے اس کو بھی تخمینہ میں شامل کر لیتے ہیں۔ ان دو قسموں میں ایک تو وہ ذخیرے ہیں جن کے تیل کی مقدار معین کرنے میں تیل کے علاقوں کی ارضیاتی ساخت کو مدنظر رکھا گیا ہے اور دوسرے وہ خطے ہیں جہاں مختلف ارضیاتی اسباب

کے ماتحت تیل کا پایا جانا ممکن معلوم ہوتا ہے۔ روسیوں کی مقرر کی ہوئی ان قسموں کا تجزیہ کیا جائے تو پانچویں قسم تو کسی حالت سے یقینی ذخیروں میں شمار نہیں کی جا سکتی۔ البتہ چوتھی قسم کو دوسری بین الاقوامی قسم کے برابر سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی اس سے وہ علاقے مراد ہیں جہاں تیل کا پایا جانا ممکن ہے۔ کانگریس کے اجلاس میں پروفیسر گب کن کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کی مقرر کردہ چوتھی قسم وہ ہے جس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس سے کیا پٹرول نکالا جا سکتا ہے اغراض کے لئے کافی بڑی مقدار میں حاصل ہوگا۔ اس لئے اسے ان ذخیروں میں شامل کیا جائے جو یقینی قرار دئے گئے ہیں۔ کانگریس اس نظریہ سے متفق نہ ہوئی۔ البتہ گب کن کی پہلی تین قسموں کو اس نے تسلیم کر لیا اور ان کو یقینی علاقے قرار دے دیا۔

اس بحث سے یہ بات کھل گئی کہ گب کن کے تخمینے دوسرے ملکوں کے ان تخمینوں کے مقابلہ میں جو روسی تیل کے متعلق کئے گئے کیوں اس قدر مبالغہ آمیز ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں گب کن کا یہ تخمینہ کہ روس کے پاس دنیا کا ۵۰ فیصدی تیل ہے اپنی اسی مفروضہ تقسیم پر مبنی تھا، اسی سال دوسرے ملکوں نے جو روس کے تیل کا تخمینہ لگایا وہ صرف ۲۲ فیصدی نکلا۔ جس طرح گب کن کا تخمینہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اسی طرح اس دوسرے تخمینہ کی صحت میں بھی شبہ کی کافی گنجائش ہے۔ سوویٹ یونین کے یقینی ذخیرے ۱۹۳۷ء میں کم سے کم ۲۵ اور ۳۰ فیصدی کے درمیان تھے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ روسیوں کی چوتھی تقسیم کا کچھ حصہ بین الاقوامی پہلی تقسیم کے ماتحت آتا ہے اور یقینی ذخیروں میں شمار کیا جا سکتا ہے تو روس کے قدرتی ذخیروں کی مقدار یقیناً بہت بڑھ جائیگی۔

۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان روسی ماہرین ارضیات نے تیل کے علاقوں کی بہت چھان بین کی اور وہ اپنی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں کاکیشیا کے علاقہ میں زیادہ کم اور کاکیشیا سے باہر بہت زیادہ کوشش ہوئی کہ تیل کے ذخیرے برآمد کئے جائیں اور اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ ابھی حال میں تیل کی صنعت کے روسی منسٹر نکولائی بائے بے کو Nikolai Baibakov

## طالع افسردہ! — قاضی سلیم

جگنو کی سی لو دیتے ہیں لمحات گذشتہ
پر دل یہ افسردہ دمکتا ہی نہیں ہے
یوں قبر پہ حسرت کی تو ہوتا ہے چراغاں
پر شعلۂ امید بھڑکتا ہی نہیں ہے

---

کیا عیش شبانہ کی یہ پُر کیف کسک ہے
ہر چند دل زار دھڑکتا ہی نہیں ہے
بے خواب نگاہوں میں ستاروں کی جھلک ہے
پر نور سحر ان میں دمکتا ہی نہیں ہے

---

کیوں تیرے تصور کا حسیں آتشیں پیکر
اب دیدۂ نمناک سے ہٹتا ہی نہیں ہے
مستقبل موہوم پہ چھائے ہیں وہ بادل
بادل غم ہجراں کا یہ چھٹتا ہی نہیں ہے

---

جگنو کی سی لو دیتے ہیں لمحات گذشتہ

نے ایک موقع پر کہا کہ تیل کے قدرتی ذخیروں کے لحاظ سے سویٹ یونین دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ محض جنگ کے چار سال میں روس نے تیل اور گیس کے ۳۴ نئے علاقے دریافت کئے۔ اور جنگ سے پہلے کے میں سال میں ۸۳ علاقے دریافت کئے گئے تھے۔ جنگ کے زمانہ میں جو نئے ذخیرے دریافت ہوئے وہ مالولوف کے صوبہ میں پائے گئے ہیں اور داغستان (شمالی کاکیشیا) وسط ایشیا اور سکھالن وغیرہ میں برآمد ہوئے ہیں۔ ان نئے ذخیروں کی وجہ سے سویٹ یونین کے محفوظ تیل کی کل مقدار بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔"

اس طرح آج روس کے یقینی ذخیرے اُس تعداد سے کافی زیادہ ہیں۔ جو سترھویں بین الاقوامی جیولاجی کل کانگریس کے وقت تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا کے باقی حصے کے ذخیروں میں جو اضافہ ہوا ہے اس کے مقابلہ میں روس کا اضافہ اب بھی کم ہے۔ لیکن یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں کہ ان کی تعداد دنیا کے کل تعداد کا پندرہ یا بیس فی صدی ہے۔

یہاں ہمیں ایک چیز اور بھی سامنے رکھنی چاہئے۔ کسی ملک کی معدنی دولت محض وہ چیزیں نہیں ہوتی ہیں۔ جو زمین سے برآمد ہو چکیں بلکہ اس میں وہ چیزیں بھی شمار کی جا سکتی ہیں۔ جو زمین کے سینہ کے اندر محفوظ ہیں۔ اور آئندہ برآمد ہونگی۔ اس لحاظ سے سویٹ یونین کے پاس یقینی طور پر دنیا کے ہر ملک سے زیادہ تیل ہے۔

## روس کے تیل والے علاقے

روس کے سامنے تیل کا جو مسئلہ ہے۔ وہ یہ نہیں کہ ملک میں تیل کی کمی ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ قدرتی ذخیروں کو کس طرح صنعتی کام میں لایا جائے۔ اور یہ مسئلہ اصل میں جغرافیہ کا مسئلہ ہے۔ سویٹ یونین کا خاص تیل والا علاقہ ٹرانس کاکیشیا میں سویٹ یونین کی جنوبی سرحد کی جانب کیسپین کے کنارے باکو کے نزدیک واقع ہے۔ یہ علاقہ ملک کے خاص صنعتی شہروں سے ہزاروں کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ باکو اور خارکوف کے درمیان کا فاصلہ ۸۰۰،۱ کلومیٹر ہے۔ باکو اور ماسکو کا درمیانی فاصلہ ۲۵۵۰ کلومیٹر باکو اور لینن گراڈ کا ۲۰۱۰ کلومیٹر ہے۔ حالانکہ تیل کے ایسے علاقے جن میں کافی بڑی مقدار میں تیل محفوظ ہے۔ باکو کے علاقہ سے باہر دریافت کئے جا چکے ہیں۔ پھر بھی سویٹ روس کو باکو ہی سے تیل کی بنی ہوئی دوسری چیزیں منگانی پڑتی ہیں۔ باکو کا یہ علاقہ اصل میں ملک کے ایک ایسے حصہ کا جزو ہے۔ جہاں بے انتہا تیل کے چشمے پائے جاتے ہیں جنوب مشرق کی طرف یہ علاقہ بحر کیسپین کے نیچے ترکستان کے صحرا تک پھیلا ہوا ہے۔ اس تمام علاقے کے جغرافی حالات حد درجہ ناموافق ہیں۔ اور روسیوں کو تیل نکالنے کے لئے ان حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ترکستان سے مشرق کی طرف تاجیکستان اور جنوبی ازبکستان کے پہاڑی علاقہ تک تیل کے چشمے پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر تیل کے اعلیٰ درجہ کے چشمے اس تمام پہاڑی علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جو شمالی کاکیشیا میں باکو کے علاقہ کے شمال اور شمال مغرب میں واقع ہے۔ اور جہاں گروزنی اور میکاپ کے چشمے اور بحر کیسپین کے ساحل پر بکھاچ کلا کے ذخیرے ابھی جنگ کے زمانہ میں برآمد ہوئے ہیں۔

وہ تیل کے چشمے جو یورال کی جانب بحر کیسپین کے شمال اور شمال مشرق میں واقع ہیں۔ ایمبا کے علاقہ کے چشمے کہلاتے ہیں۔ یہ چشمے اور والگا کے نیچے کے حصہ پر جو گیس کے ذخیرے ہیں ارضیاتی نقطۂ نظر سے کاکیشیا کے ذخیروں کا سلسلہ ہیں۔ گذشتہ پندرہ سال میں یورال اور وسطی والگا کے علاقہ اور یورال کے پورے مغربی ڈھال پر نہایت کارآمد تیل کے چشمے برآمد ہوئے ہیں۔ اس نئی دریافت کے پیش نظر یورال اور وسطی والگا کے درمیان کے اس وسیع علاقہ کو جس میں جابجا تیل اور گیس کے چشمے ہیں۔ "دوسرا باکو کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں اس علاقے کے اندر تین مقامات پر نہایت کارآمد اور بڑے چشمے برآمد ہوئے ہیں۔ یہ چشمے والگا پر کیوبی شیو Kieubyshev کے نزدیک وسط یورال میں یوفا Ufa کے نزدیک اور شمالی یورال میں سیورو کے مسک Sevrokemsk کے نزدیک واقع ہیں۔ کیوبی شیو Kuibyshev اور بالخصوص ساراتوف Sarotov کے نزدیک گیس کے جو بڑے بڑے ذخیرے برآمد ہوئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں تیل کے بھی بڑے بڑے ذخیرے ضرور موجود ہوں گے۔ ساراتوف کے گیس کے ذخیرے ۱۹۴۲ء میں دریافت کئے گئے اور ۱۹۴۶ء کے موسم بہار میں ساراتوف سے ماسکو تک ۸۴۳ کلومیٹر لمبی گیس کی پائپ لائن بنائی گئی ہے تخمینہ یہ ہے کہ ساراتوف کا یہ گیس والا ذخیرہ ہر سال ۰۰۰،۰۰۰،۵۰۰ کیوبک میٹر قدرتی گیس پیدا کرے گا۔

ان ذخیروں کے علاوہ سویٹ یونین کے تیل کے چشمے بیشک خطے میں بھی ہیں۔ جو گم چیکا، سکھالین اور دوسرے مقامات پر واقع ہیں۔ بحر آرکٹک کے کنارے سائبریا کے ساحل پر بھی تیل کے چشمے برآمد ہونے کی امید کی جا رہی ہے۔ ملک میں مشینوں کی صنعت جاری کرنے اور بالخصوص زراعت کو مکانیکی بنانے کی کوشش نے سوویٹ یونین کے ہر حصہ میں تیل کی مانگ بڑھا دی ہے۔ پھر بھی وہی دور دراز علاقہ یعنی کاکیشیا تمام حصّوں کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ روس میں تیل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے میں پائپ لائن کو کچھ زیادہ دخل نہیں۔ تیل اور تیل کی مصنوعات ریل کے ذریعہ سے لے جائی جاتی ہیں۔ سیال پر ان چیزوں کی کمپائی کا اوسط خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے ۱۹۱۳ء

سے ۱۹۲۸ء تک یہ اوسط ۱۰۱، ۶ کلومیٹر سے ۲۸، ۷ تک تھا۔ لیکن ۱۹۳۷ء تک ترقی کرتے کرتے ۲۲۸، ۱۰ کلومیٹر تک پہنچا۔

روس کے اقتصادیات کے ماہر مدت سے یہ محسوس کررہے ہیں۔ کہ جغرافیائی حالات کو سامنے رکھ کر تیل کی صنعت کو ملک پر دوبارہ تقسیم کرنا نہایت ضروری ہے۔ دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کی رو سے جس میں ہر موقع پر اعتدال کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ کاکیشیا سے باہر کے علاقوں میں تیل کی پیداوار کو ۷،۱ فی صدی سے ۲، ۱۰ تک ترقی دینا تجویز کیا گیا تھا۔ پیشتر پنج سالہ منصوبہ میں اسے ۵، ۲۰ تک پہنچایا گیا۔ لیکن اس سب کے باوجود ۱۹۴۰ء میں جو تیل نکالا گیا اس کا نوے فی صدی کاکیشیا ہی کے علاقوں سے نکالا گیا تھا۔

روسی تیل پر جنگ کا بہت خراب اثر پڑا۔ شمالی کاکیشیا میں میکاپ اور گرونزی والے تیل کے علاقے جہاں سے ملک کی کل پیداوار کا ۱۵ فی صدی تیل حاصل ہوتا تھا۔ یا تو جرمنوں کے قبضہ میں چلے گئے یا بمباری کا نشانہ بنے دونوں علاقوں میں تیل کی صنعت بڑی حد تک برباد ہوگئی۔ اسی جنگ کے دوران میں ایک موقع ایسا بھی آیا کہ خیال تھا دشمن کا باکو پر قبضہ ہوجائے گا اور باکو ملک کے باقی حصے سے الگ ہوجائیگا۔ چنانچہ کنوئیں کھودنے کی اکثر مشین اور کھودنے والے عملہ کے لوگ ایسے علاقوں کو منتقل کردیئے گئے جہاں نسبتاً خطرہ کم تھا۔ باکو کے ان علاقوں کا جہاں تیل نکالنے کی تیاری ہورہی تھی۔ بڑا حصہ جنگ کے زمانہ میں برباد ہوگیا اور باکو کی تیل کی پیداوار بہت گھٹ گئی اگرچہ "دوسرے باکو" اور وسط ایشیا کے علاقوں میں تیل کی پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس سے اس نقصان کی تلافی نہ ہوسکی۔ جو کاکیشیا کے علاقہ میں ہوا تھا۔ اور گو جنگ کے ختم ہونے سے پہلے گرونزی اور میکاپ کے علاقوں کی صنعت روس کے پاس آگئی تھی پھر بھی جس وقت جنگ ختم ہوئی ہے تو روس کی تیل کی پیداوار بہت ہی کم تھی۔

۱۹۴۵ء کی پیداوار کی صحیح مقدار تو معلوم نہ ہوسکی البتہ چوتھے پانچ سال والے منصوبے میں ۱۹۵۰ء کے لئے جو مقدار تجویز کی گئی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ۱۹۴۵ء کی مقدار بہت کم ہے۔ اس نئے منصوبے کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ تیل کی صنعت کا جغرافیائی محل وقوع بدلا جائے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۶ء کو ازدیستیا میں جو اسکیم چھپی ہے۔ اس میں یو ایس ایس آر کے لئے مجموعی اعداد کے ساتھ ساتھ اس کو ہر جمہوریہ کے لئے الگ الگ اعداد دیئے گئے ہیں۔ چونکہ شمالی کاکیشیا کے علاقے روسی جمہوریہ (آر ایس ایف ایس آر) کا حصہ ہیں۔ اور اس حصہ کے لئے الگ اعداد نہیں شائع ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ بتانا ناممکن ہے۔ کہ سوویٹ یونین کی کل پیداوار میں کاکیشیا کے تیل والے علاقوں کا کیا حصہ ہوگا۔ سوویٹ پریس کی خبروں سے اتنا پتہ ضرور لگتا ہے کہ منصوبہ کی تجاویز کی رو سے شمالی کاکیشیا میں نہ صرف یہ کہ پیداوار کو جنگ سے پہلے والی مقدار تک پہنچانے کی کوشش کی جائیگی۔ بلکہ اس میں کچھ اضافہ بھی کیا جائیگا۔ آذربائیجان کی جمہوریہ کے باکو والے علاقے میں ۱۹۵۰ء کے لئے تیل کی جو مطلوبہ مقدار ہے وہ صرف ۰۰۰، ۰۰۰، ۱۷ ٹن ہے حالانکہ ۱۹۴۱ء میں اس علاقے نے ۰۰۰، ۰۰۰، ۲۴ ٹن تیل اور گیس پیدا کی جس میں ۰۰۰، ۰۰۰، ۲۲ اکیلا تیل تھا۔ سوویٹ یونین کی تیل کی کل پیداوار میں آذربائیجان کے ذخیروں کی پیداوار ۱۹۳۷ء میں ۲، ۷۴ فیصدی تھی۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے لئے اسے گھٹا کر ۹، ۴۷ کردیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے روسی (آر ایس ایف ایس آر) تیل کے علاقوں کی جن میں شمالی کاکیشیا بھی شامل ہے۔ مقدار ۹، ۱۹ فی صدی تک بڑھادی گئی ہے اور ترکمنستان کی جمہوریہ کی مقدار میں ۱، ۲ فی صدی اور ازبکستان کی جمہوریہ میں ۱ فیصدی کا اضافہ کیا گیا ہے۔

نئے کنوئیں کھودنے کی جو اسکیم ہے۔ اس کو دیکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام رجحان اسی طرف ہے کہ سوویٹ کی تیل کی صنعت ان علاقوں میں جاری کی جائے جو ایسے علاقوں سے نزدیک ہوں جہاں تیل کی مانگ ہے ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک جو نئے کنوئیں تیار کئے جائیں گے ان کی مجموعی تعداد ۲۷۰ دلا ہے اسکیم میں ان کوئنوں کو سات ان جمہوریوں میں پھیلا دیا گیا ہے۔ جہاں تیل پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے ۸۰۵، ۵ کنوئیں روسی جمہوریہ میں، ۲۴۰، ۲ وسط ایشیا کی تینوں جمہوریوں "ازبکستان، ترکمنستان اور کازاخ میں، ۶۶۰، ۲ آذربیجان میں ۲۴۰ جیارجیا میں اور ۲۵ یوکرین میں (اسکیم میں وسط ایشیا کی ان دو جمہوریوں کے لئے جہاں تیل پیدا ہوتا ہے۔ کوئی اعداد نہیں تجویز کئے گئے)

## سر عبد القادر —— بقیہ صفحہ ۵

نمائندے اور ایک دفعہ پھر ہائی کورٹ کے جج اور بہاولپور کے چیف جسٹس ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں آپ نے رسالہ مخزن جاری کیا جو اردو کی جریدہ نگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مخزن میں آپ نے ہندوستان کے ہر مذہب و ملت اور ہر قسم کے عقائد کے لوگوں کے مضامین شائع کئے۔ اردو ادب کے محسنوں میں آپ کا نام ہمیشہ نہایت عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔

لیکن یہ سب کچھ میں نے ایڈیٹر صاحب کے اصرار پر لکھ دیا ہے۔ میرے نزدیک اور میرے دل میں سر عبدالقادر کی شخصیت کا درجہ ایک مستقل ادارے کی حیثیت سے قایم ہے اور قائم رہیگا۔ اور یہ وہ ہمہ رنگ ادارہ ہے جس کا تعلق دنیا کی ہر قوم اور ہر نسل سے ہے۔ اپنے ملک میں اقبال جیسے لاثانی اور لافانی شاعر کو اپنے مقصد زندگی کی اہمیت سمجھنے میں مدد دی ہے۔ تفصیل عرض کروں تو بات کہاں کی کہاں پہنچے۔ اس لئے اجازت چاہتا ہوں۔

# نئی ادبی مطبوعات

**شیشہ وسنگ** ۔ مصنفہ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی۔ بارہ اصلاحی، معاشرتی اور اخلاقی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ لکھنوی زبان میں بہترین تصنیف۔ قیمت مجلد عہ

**لفافات** ۔ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی۔ یہ مرزا صاحب کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں رومانوی اور معاشرتی زندگی کے انقلابات کو بہترین پیرایہ اور پاکیزہ زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

**اردو زبان اور ہندو** ۔ مصنفہ اکرم سبزواری۔ اردو زبان کی ترقی و سربلندی میں ہندو اہل وطن نے جو بے بہا خدمات سرانجام دی ہیں، اس کتاب میں ان کی خدمات و حالات زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ عہ

**تاریخ انقلاب روس** ۔ مصنفہ شیر جنگ۔ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی، اخلاقی اور سیاسی رد و بدل کی روح فرسا تاریخ جو ایک سیاسی مصنف کی طویل جد و جہد اور ریسرچ کا بہترین مرقع ہے موجودہ تمام تاریخوں سے کامیاب و کامل کتاب ہے قیمت چار روپے آٹھ آنے للعہ

**کارل مارکس اور اس کی تعلیمات** ۔ مصنفہ شیر جنگ۔ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے اپنے نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا، ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے۔ تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت مجلد ہے

**اوراق پارینہ** ۔ از شیر جنگ۔ ایک انقلابی قیدی، وہ بھی ادیب۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات، غریب مزدور، کسان کی تکالیف، معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ یہ کتاب انقلابی ذہنیت کے لئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین استعارات، شاعرت اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ۔ قیمت عہ

**ادب لطیف** ۔ حضرت مولینا خلیفہ دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ۔ جن کو اختر شیرازی نے مرتب کر کے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ تیسرا ایڈیشن قیمت دو روپے آٹھ آنے ۸؍عہ

**دلیس سے باہر** ۔ آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی ادبی مضامین کا دوسرا مجموعہ۔ لندن سے آداب عرض کی مقبولیت اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ قیمت دو روپے۔ عہ

**لندن سے آداب عرض** ۔ آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر ہوائی حملوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے . . . . . . . . . ذریعہ نشر کیا "لندن سے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے۔ بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جسکے مطالعہ سے آپکی معلومات میں اضافہ ہوگا دوسرا ایڈیشن عہ

**قرآنی اخلاق** ۔ انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس نے اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا ہے۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان نکات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ قیمت عہ

**کمال اتاترک** ۔ مسیحائے ترکی مصطفےٰ کمال پاشا کے گہرے دوست محترم استاد محمود توفیق پاشا نے ترکی کے ڈکٹیٹر اور جلیل القدر رہنما کے سوانح حیات کمال تدبر اور محققانہ طرز بیان سے مزین فرمائے ہیں جس کی وجہ سے کمال اتاترک پر موجودہ تمام سوانح عمریوں سے مکمل و افضل ہے کتاب کی مقبولیت اس امر سے عیاں ہے کہ فاضل مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات کو اس خوبصورتی سے مرتب کیا ہے کہ اس کا پانچواں ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے ہے

## بہترین اخلاقی افسانے

سازِ فطرت۔ از حسن عزیز جاوید . . عہ
قسمت دنیاوی کشمکش کے دلچسپ پاکیزہ افسانے عہ
نیلوفر۔ دلچسپ اور نتیجہ خیز افسانوں کا مجموعہ عہ
صبر و ضبط معاشرتی و پاکیزہ افسانوں کا مجموعہ عہ

ہمارے ہاں اسلامی، ادبی، اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل پنجسورے اور سیپارے بھی شائع ہوتے ہیں۔

ملنے کا پتہ:- شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب۔ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

# آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

سالانہ چندہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۷ | فہرست | یکم فروری ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے





مدیر اعلیٰ: سید وقار عظیم ایم اے

ناشر: فضل حق قریشی دہلوی

مدیران: بھگت سروپ کھلر ایم اے = سید آفاق حسین آفاق بی اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۲ دہلی

# رفتارِ زمانہ

## سیاروں میں امکانِ حیات

دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام جو سائنس کانگریس جنوری کے پہلے ہفتے میں منعقد ہوئی، نہایت دلچسپ اور مفید ثابت ہوئی۔ اس میں دنیا کے بہت سے ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ سائنسی تقریروں کے علاوہ ایک نمائش بھی ہوئی جو ہندوستان کے لئے بالکل نئی اور تاریخ میں پہلی مثال تھی۔ اس کی ایک نشست میں برطانیہ کے شاہی منجم سر ہیرلڈ اسپنسر جونز کی تقریر جسکا موضوع "سیاروں میں امکانِ حیات" تھا، سب سے زیادہ جاذبِ توجہ رہی۔ ان کا خیال ہے کہ بہت سے سیاروں میں زندگی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ اگرچہ اسکا ثبوت فی الحال نہیں دیا جا سکتا کیونکہ تحقیقات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ تاہم یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ بعض سیاروں میں زندگی کے امکانات پیدا کرنے والے حالات موجود ہیں اور صرف اسی سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہاں اسکا وجود ممکن ہے۔ انہوں نے بتایا کہ فضا میں تقریباً دس کروڑ نظام ہائے شمسی قائم ہیں اور ان میں سے ہر نظام کے ماتحت اربوں سیارے گردش کرتے ہیں۔ دنیا والے زیادہ سے زیادہ اپنے نظامِ شمسی کے ستاروں اور سیاروں کی بابت کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں کیونکہ بڑی سے بڑی دوربین بھی اس حد سے آگے بڑھ کر ان چیزوں کو واضح طور پر نہیں دکھا سکتی جو فی الوقت دھندلی سی نظر آتی ہیں۔ اس اجلاس کی صدارت مسٹر لیاقت علی خاں (وزیر مالیات) فرما رہے تھے۔ انہوں نے سر جونز کی تقریر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا "اس تقریر سے ہم اس نتیجے پر ضرور پہنچتے ہیں کہ زندگی فضائی کیفیات پر منحصر ہے۔ اس لئے ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ وہ تمام بڑے بڑے سائنسداں جو اسوقت حسنِ اتفاق سے یہاں جمع ہوگئے ہیں ساری دنیا میں ایک ایسی خوشگوار فضا قائم کر دینگے جس میں وہ زندگی جو اسوقت کرۂ ارض پر موجود ہے کبھی نہ کسی صورت میں برقرار رہ سکے"۔ سامعین نے اس خیال کو بہت پسند کیا اور سارا ایوان نعرہائے تحسین سے گونج اٹھا۔ اس سائنس کانگریس کا مفصل حال تصویروں سمیت کسی آئندہ اشاعت میں ہدیۂ قارئین کیا جائے گا۔

## ہندوستانی صنعتوں کا مستقبل

۲ جنوری کی شام کو دہلی میں یونیورسٹی روڈ کے قریب صنعتی تحقیقات کے تجرباتی ادارے کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے حکومتِ ہند کے رکنِ صنعت و فراہمی ڈاکٹر جون متھائی نے فرمایا کہ اگر ایسے پرائیویٹ ادارے ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں قائم ہو جائیں تو ہماری صنعتی کارگذاریوں کا مستقبل نہایت شاندار صورت اختیار کر سکتا ہے۔ ادارۂ مذکور کے لئے حکومت نے دس ایکڑ قطعۂ زمین برائے نام کرائے پر عطا کیا ہے۔ عمارتوں کی تعمیر اور تجربہ گاہوں کے قیام پر جو رقم خرچ ہوگی، وہ لالہ شری رام جی ادا کرینگے۔ اس ادارے میں ہر قسم کے تحقیقاتی شعبوں کا اہتمام ہوگا۔ لالہ شری رام نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ایسے اداروں کا مقصد یہ ہے کہ صنعتی کارخانوں کے اربابِ حل و عقد لکیر کے فقیر نہ بنے رہیں بلکہ وہ نت نئی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے کاروبار کو ہمیشہ ترقی اور وسعت دیتے رہیں تاکہ آنے والے زمانے میں ہندوستان اس باب میں کسی دوسرے ملک سے پیچھے نہ رہنے پائے۔ اس ادارے کا سنگِ بنیاد حسنِ اتفاق سے ان دنوں رکھا گیا جبکہ دہلی یونیورسٹی میں سائنس کانگریس ہو رہی تھی اور اس میں ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے سائنسی نمائندے جمع تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی اس رسم میں شرکت کی اور اس طرح اسکی دھوم دھام میں غیرمعمولی اضافہ ہوگیا۔ فی الحال اس ادارے کے ماتحت پارچہ بافی اور ادویاتی تحقیقات کی تجربہ گاہیں کھولی جائینگی لیکن باقی شعبے بھی حسبِ ضرورت قائم ہوتے رہیں گے۔

## سائنسدانوں کو اعزازی ڈگریاں!

دہلی یونیورسٹی کے چانسلر ہز ایکسیلنسی وائسرائے ہند نے سائنس کانگریس کے موقعہ پر تقسیم اسناد کا ایک خاص اجلاس یونیورسٹی ہال میں منعقد کیا اور ان غیرملکی اشخاص میں سے جنہوں نے اس کانگریس میں شرکت کی تھی، ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔ ان کے نام یہ ہیں:-

سر چارلس ڈارون، سر ہیرلڈ اسپنسر جونز، سر جارج تھامسن اور پروفیسر پی ایم ایس بلیکٹ (انگلستان) ڈاکٹر ہارلو شیپلی اور ڈاکٹر اے ایف بلیکسلی (امریکہ) پروفیسر جیکس ہدامرد (فرانس)، پروفیسر ڈی پی دوگلن اور پروفیسر ای این پاولوسکی (روس)۔ اس جشن پر جب وائسرائے ہند نے روسی سائنسدانوں کو روسی زبان میں مخاطب کیا تو وہ اور دوسرے حاضرین حیران ہوگئے کیونکہ اس حقیقت کا بہت کم لوگوں کو علم تھا

کر دلکے اروسی زبان بھی جانتے ہیں۔ انہوں نے ہر شخص کو ڈگری دیتے وقت تاعدے کے مطابق کہا: "میں ان اختیارات خاص سے کام لیتے ہوئے جو مجھے اس یونیورسٹی کا چانسلر ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں، آپ کو ڈاکٹر اوف سائنس کی اعزازی ڈگری عطا کرتا ہوں۔"

## طوفانِ ژالہ باری

برق و رعد و باد و باراں اور برف باری کے طوفان ہر سال کرۂ ارض کے کسی نہ کسی حصے میں تباہی اور بربادی کے رنگ جماتے نظر آتے ہیں۔ اس سال اسی نوع کا ایک آسمانی نزلہ آسٹریلیا کی مشہور بندرگاہ سڈنی پر گرا مسلسل دس منٹ تک شدید قسم کی ژالہ باری ہوتی رہی۔ کہا جاتا ہے کہ جسامت میں ہر اولہ آدمی کی مٹھی کے برابر تھا۔ نتیجہ یہ کہ ہزاروں مکان مسمار ہوگئے۔ ہزاروں انسان، حیوان، جانور اور پرندے مر گئے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بے شمار ہے۔ چونکہ اولے بہت بڑے تھے اسلئے قدرتی طور پر زیادہ طمطراق سے گر رہے تھے اور زیادہ بلندی سے گرنے کے باعث ان کا اثر بھی زیادہ شدید تھا۔ اولے موٹروں کی چھتوں کو توڑ کر اسطرح اندر گھس گئے جیسے وہ کچی مٹی یا کاغذ کی بنی ہوئی تھیں۔ زیادہ پختہ مکانات اس بلائے ناگہانی سے بچے رہے لیکن ان کی کھڑکیاں اور دروازے پھر بھی محفوظ رہنے نہ پائے کیونکہ ہوا کے شدید جھونکوں کے باعث اولوں کی بوچھاڑ کسیقدر ترچھی تھی۔ فضا میں اڑنے والے پرندے مر کر اس طرح زمین پر آگرے گویا ان کو ہوائی بندوق کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ سڈنی کے کھیلوں کے میدان میں ایک بہت بڑی پناہ گاہ زمانۂ جنگ میں تعمیر کی گئی تھی، وہ زخمیوں سے بھر گئی کیونکہ باقی اسپتال بھی کھچا کھچ بھر چکے تھے، صرف عمارتی نقصانات کا اندازہ دو لاکھ پچاس ہزار آسٹریلوی پونڈ کے قریب لگایا گیا ہے۔

## جزیرے کی غرقابی

طوفانِ نوح کو ایک زمانہ گزر گیا اور اب اس واقعۂ عظیم کی حیثیت ایک افسانہ پارینہ کا درجہ حاصل کر گئی ہے یہاں تک کہ بعض لوگوں کو اس کی صداقت میں بھی تامل ہے لیکن وہ نہیں جانتے کہ دنیا میں قدرت کے زیر اثر یا بلائے ناگہانی کے طور پر یہ صورتیں اب بھی رونما ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ایک اطلاع ملی ہے کہ جزیرۂ پالمیرا بتدریج غرقاب ہو رہا ہے۔ یہ جزیرہ بحرالکاہل کے عین وسط میں جزیرۂ ہوائی کے جنوبی ساحل سے گیارہ سو میل کے فاصلے پر واقع ہے اور نہایت مختصر ہے یعنی اسکا طول صرف چھ میل اور عرض ڈھائی میل ہے۔ وسعت کے لحاظ سے آبادی بھی کم ہے یعنی صرف ۱۰۸ نفوس آباد ہیں۔ جب سمندر کے سیلاب عظیم نے جزیرے کو بتدریج پانی میں ڈبونا شروع کیا تو وہاں کے محکمۂ بحریہ کے چھوٹے سے ریڈیو اسٹیشن نے ایک پیغام نشر کیا جو سان فرانسسکو میں سنا جا سکا۔ اس پیغام میں اپنی مصیبت کا حال بیان کرنے کے بعد امداد و تعاون کی استدعا کی گئی تھی۔ فوری محافظت کے لئے کہا گیا کہ کسی نہ کسی طرح کوئی جہاز بھیجکر ہم ۱۰۸ آدمیوں کو بچا لیا جائے، ورنہ ہم اس جزیرے میں تنہا رہ کر سیلاب کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ طوفانِ نوح اسلئے آیا تھا کہ اس زمانہ کے لوگوں کا کفر و الحاد حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا تھا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سیلاب کا سبب صرف سمندر کا مد و جزر ہے یا کچھ اور۔ بعد کی اطلاعات سے معلوم ہوا کہ جزیرۂ مذکور کے تمام باشندوں کو ایک قریبی جزیرے "کوپر" میں منتقل کر دیا گیا۔ ان میں پانچ عورتیں اور تین بچے بھی شامل ہیں۔

## ہندوستان کیلئے اناج!

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد سمندر پار ملکوں نے جن اناجوں سے ہندوستان کی مدد کی، ان کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:—

| اقسام اناج | ۲۶ دسمبر کو ختم ہونیوالے ہفتے میں | یکم جنوری سے ۲۶ دسمبر تک کل مقدار |
| --- | --- | --- |
| گیہوں اور آٹا | ۵,۷۰۰ ٹن | ۱۳,۱۸,۷۰۰ ٹن |
| چاول | ۱۲,۵۰۰ " | ۳,۱۳,۲۰۰ " |
| مکئی | ۶,۳۰۰ " | ۲,۸۸,۱۰۰ " |
| جوار، باجرہ وغیرہ | ۴,۱۰۰ " | ۵۹,۶۰۰ " |
| میدہ | ۹,۴۰۰ " | ۳۸,۹۰۰ " |
| جو | ـــــــ | ۱,۳۱,۷۰۰ " |
| جئی | ـــــــ | ۲۴,۶۰۰ " |

## چاول کے حصے بخرے

بین الاقوامی ہنگامی مجلس اغذیہ نے اعلان کیا ہے کہ نئی تقسیم کے مطابق ہندوستان کو چار لاکھ دس ہزار ٹن چاول ملے گا۔ دوسرے ملکوں کا حصۂ رسد حسب ذیل ہے:—

لنکا ۲۰۰,۰۰۰ ٹن۔ ملایا ۲۲۵,۰۰۰ ٹن۔ ہانگ کانگ ۴۰,۰۰۰ ٹن، دوسرے برطانوی علاقے جن میں بحرالکاہل کے جزیرے شامل ہیں، مشرق وسطی اور جزائر غرب الہند ۸۰,۰۰۰ ٹن، چین ۲۴۵,۰۰۰ ٹن، ولندیزی جزائر شرق الہند ۱۰۰,۰۰۰ ٹن، فلپائن ۹۵,۰۰۰ ٹن، کوریا ۵۰,۰۰۰ ٹن اور جنوبی افریقہ ۷,۰۰۰ ٹن۔ اس طرح ان تمام حصوں کا کل وزن ۱,۴۸۲,۰۰۰ ٹن ہے۔ گویا اسکا چوتھائی حصہ صرف ہندوستان کے لئے ہے۔

## انتالیس سال کا بچہ

مانچسٹر کے قریب شہر بالفورڈ میں ۷۹ سال کی ایک بوڑھی بیوہ کا انتقال ہوگیا تو شہری فلاح و بہبود کے ایک افسر نے حفظانِ صحت کی مناسب تدابیر اختیار کرنے کیلئے اس کے گھر میں قدم رکھا اور یہ دیکھکر اسکی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس عورت کا ایک لڑکا جسکی عمر کا اندازہ ۳۹ سال لگایا گیا، باورچی خانے کے ایک کونے میں دبکا ہوا ہے۔ یہ شخص جسمانی اعتبار سے تندرست و توانا تھا لیکن اسکی ظاہری ہیئت اور بول چال بچوں جیسی تھی۔ اسکا نام ہنری کوپر تھا۔ حالات کی چھان بین کرنے پر معلوم ہوا کہ بڑھیا کو اپنے بچے سے اتنی شدید محبت تھی کہ

اس نے باہر کی فضا میں نکلنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اسطرح وہ اپنے گھر کے سوا دنیا کی ہر چیز سے لاعلم رہا حتیٰ کہ اس نے اپنی ماں کے سوا کسی متنفس کو نہیں دیکھا۔ اس کی ماں کو ڈر تھا کہ وہ دوسروں سے مل جل کر مجھے بھول جائے گا۔ اس میں بچپن کی عادتیں اس درجہ موجود تھیں کہ وہ خود کپڑے بدلنا یا اپنے ہاتھ سے کھانا کھانا بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کی تمام عمر چمچے سے کھانا کھاتے گذر گئی تھی۔ ضروری کام کاج کے لئے گھر سے باہر جاتے وقت ماں اسے کمرے میں بند کر دیتی تھی۔ اس زمانے میں اسکا راشن کارڈ بھی نہیں بنا، اسلئے بوڑھی ماں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اب حال ہی میں جب وہ خود بیمار ہوئی اور اپنا راشن بھی نہ لاسکی تو علالت کے علاوہ بھوک سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ غالباً انتالیس سال کے عرصے میں اسکا لڑکا کبھی بیمار نہیں ہوا۔ یا بصورت دیگر اس نے زبانی حال بیان کرکے اس کی دوا حاصل کی ہوگی۔ بھنورے میں پرورش پانا صرف سنا ہی تھا، لیکن یہ اس کی صحیح مثال کہی جاسکتی ہے۔ اپنی جیتی ماں سے جدا ہو جانے اور بالکل ہی غیر مانوس لوگوں میں رہنے کا ناگوار اثر اس شخص کے دل و دماغ پر اتنا شدید پڑا کہ وہ بھی نو ہفتے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ کچھ عرصے علیل رہکر اسپتال میں مرگیا۔

## ہندوستان کے شیر خوار بچے

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ دوران جنگ میں زچگی اور پرورش اطفال کا کام کس نوعیت کا رہا نیشنل بے بی ویلفیئر کونسل کے زیر اہتمام شیر خوار بچوں کی ایک نمائش منعقد کی گئی جس میں برطانیہ کے علاوہ برطانوی دولت مشترک اور دیگر مقبوضات کے بہت سے بچے شامل ہوئے صحت و تندرستی اور عام نشو و نما کا لحاظ رکھتے ہوئے جو فیصلہ کیا گیا وہ نہ صرف تعجب خیز بلکہ ہندوستان کے لئے ہمت افزا بھی ہے۔ اس مقابلہ میں دو اول انعامات ہندوستانی بچوں کو ملے۔ باقی میں سے ایک نیوزیلینڈ نے حاصل کیا اور ایک مالٹا نے۔ اس نتیجے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب ہندوستان میں بھی بچوں کی دیکھ بھال پر زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔

## بم کا نیا تجربہ

سوئزرلینڈ اور اطالیہ کی درمیانی سرحد کے قریب برق آبی تیار کرنے کے بہت سے کارخانے قائم ہیں لیکن جاڑے کے موسم میں جب کوہ آلپس پر برف جم جاتی ہے اور دریاؤں میں پانی کا زور گھٹ جاتا ہے تو یہ کارخانے کچھ عرصے کے لئے بیکار ہو جاتے ہیں اور اسطرح صنعت و حرفت کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے سائنسدانوں نے فیصلہ کیا ہے کہ پہاڑ کے برفانی ٹیلوں کو بموں کے ذریعہ توڑ کر پانی کی صورت میں منتقل کر دینے کا تجربہ کیا جائے۔ اگر یہ کوشش کامیاب رہی تو ظاہر ہے کہ ان دریاؤں میں بارہ مہینے برابر پانی کی افراط رہا کرے گی اور اسطرح کارخانے بدستور جاری رہا کریں گے۔ بم جو اب تک تباہی کا آلہ سمجھا جاتا ہے اس تجربے کی کامیابی کے بعد دنیا کے لئے مفید ثابت ہو سکیگا۔

## "گمشدہ دنیا" پر پہلی چڑھائی

آسٹریلیا کے جنوبی ساحل کے ٹھیک اس مقام سے جسے راس ولسن کہتے ہیں، چھ میل دور سمندر میں "رونڈونڈو" نامی ایک جزیرہ ہے جو عرف عام میں "گمشدہ دنیا" کہاتا ہے۔ شاید اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس دنیا والوں کے لئے اب تک اسکا وجود نہیں کے برابر تھا کیونکہ کوئی انسان اسپر قدم رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ یہ جزیرہ کیا ہے، ایک مخروطی وضع کا مینار ہے جسے قدرت کے ہاتھوں نے تعمیر کیا ہے۔ اس کا کل رقبہ جو نہایت ہی مختصر ہے صرف ایک پہاڑ کی صورت میں ہے جسکی چوٹی سطح سمندر سے ایک ہزار دو سو فٹ بلند ہے۔ اس کے دامن میں ہموار زمین اتنی لمبی نہیں ہے کہ چند نفوس کشتی سے اتر کر اطمینان سے اسپر کھڑے ہوسکیں، کیونکہ سمندر کی طوفانی لہروں کے فوراً ہی بعد نہایت ڈھلواں چڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ اسکے علاوہ کہر اور دھند کے طوفان اسے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں لیکن اس ترقی یافتہ زمانے کا انسان جو فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے اور پاتال کی گہرائی تک پہنچنے والے سمندروں کی تہ میں اترنے کی مہیں سر کرچکا ہے، بھلا اس "گمشدہ دنیا" کی تحقیق سے کسطرح باز رہتا۔ چنانچہ پچھلے مہینے چند منچلے نوجوان اسپر پہلا قدم رکھنے میں کامیاب ہوگئے کیونکہ اسوقت موسم کی کیفیات کسیقدر موافق تھیں جو دس ہی منٹ بعد مخالف ہوگئیں۔ ان لوگوں میں شہر وکٹوریہ کے گیلونگ کالج کا ایک سائنسدان بھی شامل ہے۔ اسکا خیال ہے کہ اس پہاڑ پر بعض ایسے درخت اور جانور ملیں گے جن سے انسان ابھی تک لاعلم ہے کیونکہ ماہرین طبقات الارض کا خیال ہے کہ یہ جزیرہ جو شاید بیس ہزار سال پہلے براعظم آسٹریلیا کا ایک جزو تھا، زمین کے اندرونی انتشارات کے زیر اثر الگ ہوگیا تھا اور اسی وقت سے اسکے تعلقات بھی منقطع ہوگئے تھے۔ اس مہم سے کچھ عرصے پہلے آسٹریلیا کی ہوائی اور بحری فوج نے بھی اس جزیرے پر پہنچنے کی کوشش کی تھی مگر ناکامیاب رہ گئے تھے۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ نوجوان زندہ سلامت لوٹنے پر وہاں سے کیا خبر لاتے ہیں۔

## جرمنی میں کڑاکے کی سردی

سنا گیا ہے کہ وسطی یورپ اور وسطی یورپ میں بھی جرمنی میں اتنی کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے کہ لوگوں کیلئے عرصہ حیات تنگ ہوگیا ہے ایسی صورت میں جبکہ ہر قسم کا ایندھن نہ صرف کمیاب بلکہ نایاب ہو ایسی بلائے ناگہانی یقیناً ہلاکت آفریں ثابت ہوسکتی ہے۔ دوسرے مقامات سے لکڑی اور کوئلہ لانے کی تدابیر اختیار کی گئیں لیکن ذرائع حمل و نقل نے ساتھ نہ دیا۔ بہت سے انجن ڈرائیور بیمار ہو جانے کے باعث اپنی خدمات انجام نہیں دے سکتے اور جب کوئلہ کشتیوں میں بھر کر دریاؤں کی راہ لانے کی کوشش کی گئی تو بہتے ہوئے دریاؤں کا پانی جم جانے سے کشتیاں جہاں تھیں وہیں رہ گئیں۔ قبرستانوں میں برف کی اتنی موٹی تہ جم گئی کہ ڈائنامیٹ سے اسکو اڑا کر قبریں کھودنے کا انتظام کرنا چاہا لیکن گورکن ناپید ہوگئے اور اسلئے بہت سے مردوں کو جلا ڈالنا پڑا ❖

# شبہائے رفتہ

اختر شیرانی

آہ وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے!

آہ، او سلمیٰ! وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے !
وہ ملاقاتیں، وہ باتیں یاد آتی ہیں مجھے !
حسن و الفت کی وہ گھاتیں یاد آتی ہیں مجھے !
آہ وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے !

جب تمہاری یاد میں دیوانہ سا رہتا تھا میں !
جب سکون و صبر سے بیگانہ سا رہتا تھا میں !
بے پیئے مدہوش سا مستانہ سا رہتا تھا میں !
آہ، وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے !

جب تمہاری جستجو بیتاب رکھتی تھی مجھے !
جب تمہاری آرزو بے خواب رکھتی تھی مجھے !
مثل موجِ شعلۂ بیماب رکھتی تھی مجھے !
آہ، وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے !

منتظر میری، جب اپنے باغ میں رہتی تھیں تم !
ہر کلی سے اپنے دل کی داستاں کہتی تھیں تم !
نازنیں ہو کر بھی نازِ عاشقی سہتی تھیں تم !
آہ وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے !

سردیوں کی چاندنی شبنم سے کملاتی تھی جب !
شبنم آ کر چار سو، موتی سے برساتی تھی جب !
باغ پر اک دھندلی دھندلی مستی چھا جاتی تھی جب !
آہ وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے !

جب تم آ جاتی تھیں با زلفِ پریشاں تا کمر !
عطر پیما تا بہ زانو، سنبلستاں تا کمر !
"مشک آگیں تا بدامن، عنبر افشاں تا کمر" !
آہ وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے !

# تبرّکات

## حافظ محمود شیرانی مرحوم

گر کروں شرحِ ستم گاریٔ تحریرِ جبیں
عرصۂ حشر بنے میرے قصیدے کی زمیں

ہائے وارونیٔ قسمت کہ نہ دولت ہے نہ صبر
وائے نیرنگیٔ تقدیر نہ دنیا ہے نہ دیں

کاوشِ خونِ جگر دل کو تسلی دیتی
دہر میں رسمِ وفا کا کوئی ہوتا آئیں

داغ بر سینہ ہوں اور خونِ تمنا در دل
فرہاد ہے مجھکو نہ ہوائے شیریں

اشک در دیدہ ہوں اور شکوۂ اختر بزباں
نہ دماغِ گل و گلشن نہ ہوائے نسریں

ہوں نظارہ کنِ عالم، بہ تحیّر لیکن
ساز و سامانِ گماں ہے، نہ سرِ برگِ یقیں

ماتمِ اہلِ وفا ہوں نہ نشاطِ طفلاں
سرِ ہوں ہیں بر دمِ شمشیر نہ دستِ گلچیں

عبرتِ اہلِ جہاں ہوں نہ تماشائے بہار
حسرتِ شمعِ فسردہ ہوں نہ خوابِ شیریں

پھرتا حیران ہوں مثلِ گلِ بازی ہر سُو
فخرِ آشفتہ مزاجی ہوں نہ نازِ تمکیں

کیوں ہیں سرگرم تسلی مرے ہمدم، یارب
کہیں مٹتی ہے مٹائے سے یہ تحریرِ جبیں

ہوشِ دیوانگی بہتر کہ نہ شر ہو نہ فساد
طورِ بیگانگی بہتر کہ نہ فتنہ ہو نہ کیں

ترکِ فرزانگی بہتر کہ نہ دل ہو نہ دماغ
طرزِ آوارگی بہتر کہ نہ دنیا ہو نہ دیں

ہمکو معلوم ہے یاروں کی حقیقت ساری
ہم نے دیکھا اثرِ ماتمِ دلہائے حزیں

میری اُمید ہے وہ جو ہے گلوگیرِ اجل
میرے ارمان ہیں وہ جو کہ مقدر میں نہیں

داعیِ مرگ جو آئے تو پڑھوں میں لبیک — ملک الموت جو آئے تو کہوں میں آمیں
نقش برآب ہیں قانونِ قضائے قدرت — خاک ہیں عیش و غمِ دہر و نقوشِ تکویں
اثرِ نقشِ قدم جوہرِ ہستیٔ مکاں — نفسِ سردِ وفا خونِ تمنائے مکیں
خاک ہوں اور مرا عرش پہ جاتا ہے دماغ — داغ ہوں لیکن ابھی ہے ہوسِ نقش و نگیں
موجِ یک قطرۂ دریا ہوں مگر طوفاں خیز — چشمِ حیرانِ تماشا ہوں مگر ہوں خودبیں
خاکساری پہ مری تم نہ بہانا آنسو — میں نے آنکھوں میں چھپا رکھا ہے بت خانۂ چیں
سادہ لوحی پہ مری کوئی نہ جانا ہرگز — میری صورت سے عیاں ہے مری شانِ تمکیں
سردِ آہوں سے مری زنگِ کدورت ہو عیاں — "جوہرِ آئینہ جز یک الف بیش" نہیں
شکوۂ بخت غلط، شوقِ تمنا ناخوب — دستِ بیداد سے رہتا ہوں میں فریادگزیں
رات دن جلوۂ احباب سے آنکھیں تھیں چمن — مردمِ چشم کہاں ہیں وہ ترے پیارے مکیں؟
میں تو میں، غیر بھی شرمندۂ احساں ہونگے — گر مرے خون سے ہو صحنِ گلستاں رنگیں
غیر سے کیوں ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — مجھکو احباب نے بھولے سے نہ دی تھی تسکیں
میری بیدردی سے پژمردہ ریاضِ رضواں — میری بے مہری سے افسردہ چراغِ بالیں
ہوشِ عاشق ہوں کہ ہو آمدِ محبوب سے گم — فکرِ دانا ہوں مگر سیلِ حوادث سے غمیں
کس پہ میں ناز کروں جبکہ نہ جوہر ہے نہ ذات — کس پہ اتراؤں یہاں تو نہ کمال ہے نہ مکیں

شدتِ رنج و غم و دردِ زمانِ غربت
کیا بیاں کیجیے کہ اب رخصتِ گفتار نہیں

# حافظ محمود شیرانی

**اویس احمد ادیب**

سید ہاشمی فرید آبادی نے حافظ محمود شیرانی کی وفات پر تاریخ لکھی تھی جو رسالہ "ہماری زبان" بابت یکم مارچ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی اس کا ایک شعر ہے ؎

بت جہل و ریا کے توڑ گیا ہاں نام وہ اپنا چھوڑ گیا
محمود کے گرز سے کیا کم تھی شیرانی کی شمشیر قلم

واقعہ یہی ہے کہ حافظ محمود شیرانی کا قلم اس شمشیر کی حیثیت رکھتا تھا جو ہمیشہ انصاف کے لئے اٹھی ہو اور جس نے ہمیشہ حق کا سر بلند کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شمشیر قلم کی کارفرمائیاں دنیائے ادب میں آجتک انتہائی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور شاید رہتی دنیا تک رہیں۔ دنیا میں اور دنیا کے ہر دور میں ہزاروں اور لاکھوں اہل قلم پیدا ہوتے ہیں مگر وہ سب کے سب زندہ رہنے کے لئے نہیں ہوتے۔ وقتی چہل پہل اور وقتی رجحان کے مطابق وہ زندگی کے حامل ہوتے ہیں اور "وقت کی موت" کے ساتھ ساتھ مر کے جاتے ہیں۔ مگر ان میں سے بعض اور چند ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ذات کو وقتی ہنگاموں سے متعلق نہیں کرتے اور اپنے قلم کو وقتی ہنگامہ خیزیوں کا ذریعہ نہیں بناتے۔ وہ اپنی دور رس نگاہوں سے زمانے اور وقت کی ضروریات سمجھنے کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں اور اپنی مسلسل کوششوں کے ذریعہ سے ایسے کارنامے پیش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں جو انہیں دنیائے ادب میں ایک خاص جگہ دلاتے ہیں۔ اس طرح ان کی ادبی زندگی "ابدی" زندگی ہو جاتی ہے۔ ان کی مادی موت بھی واقع ہو جاتی ہے مگر ان کی ادبی موت واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ جتنی ادب کی زندگی بڑھتی جاتی ہے اسیقدر وہ بھی زیادہ ابھرتے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے کارنامے انہیں فنا نہیں ہونے دیتے۔ ایسے ہی اہل قلم میں حافظ محمود شیرانی کا شمار ہے۔ ان کے کارنامے اردو زبان و ادب کے سرمایہ میں گرانقدر اضافے ہیں جو رہتی دنیا تک انہیں زندہ رکھیں گے۔

۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کی شب بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ اس رات کے نصف حصہ میں حافظ محمود شیرانی جیسی ادب نواز ہستی اردو زبان و ادب کے علمبرداروں کی تہ قدرت کو تشنہ چھوڑ کر عالم جاودانی کو کوچ کر گئی۔ حالانکہ ضعیفی کی وجہ سے ادبی خدمت میں وہ گرمی اور وہ تیزی باقی نہیں رہی تھی جو جوانی اور جوانی کے بعد کے زمانے میں تھی مگر دل میں جو لگن تھی اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اسوجہ سے آخر عمر تک کچھ نہ کچھ ادبی مشغلہ برابر جاری رہا اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ تشنۂ زبان ادب کی سیری کے لئے اپنے پختہ کار قلم سے ادبی جواہر پارے پیش کرتے رہتے۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جبکہ وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر ٹونک راج میں اپنی زندگی کے بقیہ دن گذارنے کے لئے چلے آئے تھے۔ انہیں چین اور سکون کی ضرورت تھی اسوجہ سے انہوں نے آخری ایام زندگی گذارنے کے لئے گکراج گھاٹ پسند کیا تھا جو ٹونک سے تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ وہیں کی زمین پر ایک باغ لگوایا۔ وہ اس کی دیکھ بھال کرتے اور خوش ہوتے۔ اس باغ کی ملکیت وہ کسی اور کے سپرد کرنا نہ چاہتے تھے اسوجہ سے یہ وصیت کی تھی کہ انتقال کے بعد ان کو اسی باغ میں سپرد خاک کیا جائے تاکہ مادی زندگی کے فنا ہونے کے بعد بھی اپنے لگائے ہوئے باغ سے کبھی علیحدہ نہ ہوں۔ چنانچہ آج وہ اسی باغ میں آرام فرما رہے ہیں۔ عرصہ سے مولانا کو ضیق النفس ہوگیا تھا۔ یہ موذی مرض روز بروز بڑھتا گیا اور آخرکار مہلک ثابت ہوا۔ جسوقت ان کا چراغ حیات گل ہوا اس وقت انکی عمر ۶۶ برس کی تھی۔

پروفیسر محمود شیرانی ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی زندگی اپنے وطن میں گذاری مگر تعلیمی سلسلہ میں اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ لاہور آنا پڑا۔ یہاں وہ اورنٹیل کالج کے طالب علم ہوئے۔ انتہائی محنت کے بعد ممتاز طور پر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا مگر اتنی تعلیم سے طبیعت کو سیری نہ ہوئی۔ انتہائی مدارج طے کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی اس وجہ سے غیر ممالک میں جانیکا خیال پیدا ہوا۔ خوش حال گھرانے کے فرد تھے، والد کا سایہ سر پر تھا، انگلستان روانہ ہوگئے۔ یہ ۱۹۰۴ء کا ذکر ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی اسوقت ان کے والد ماجد کے پاس رہے، وہ ہندوستان ہی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ابھی بیرسٹری کی ڈگری حاصل بھی نہ کرنے پائے تھے کہ ۱۹۰۶ء میں ان کے پدر بزرگوار کا انتقال ہوگیا۔ حیران و پریشان وارد ہندوستان ہوئے۔ یہاں وہ پھر زیادہ دن نہ رہ سکے کیونکہ ان کی تعلیم ابھی تشنۂ تکمیل تھی۔ اس سانحۂ عظیم کے بعد برادر خورد کی جدائی گوارا نہ تھی اس وجہ سے ان کو بھی اپنے ہمراہ انگلستان لے گئے جنکو وہاں کی ہوا ایسی راس آئی کہ انہوں نے دوبارہ ہندوستان کا رخ نہ کیا۔ اس سلسلہ میں یہ ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ حافظ محمود شیرانی پہلے ایسے ہندوستانی فرد تھے جو راجپوتانہ کی سرزمین سے نکل کر انگلستان گئے۔ ہندوستان کے دوسرے خطوں کی طرح وہاں کے باشندے بھی بڑے تنگ نظر اور قدامت پرست تھے۔ ایسے ماحول میں رہ کر یہ جرأت کرنا کہ فرنگیوں کے دیس میں جا کر تعلیم حاصل کی جائے یقیناً ہمت سے کام لیکر قدامت پرستی کی مضبوط زنجیر کو توڑنا تھا۔ اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ ہندوستان سے باہر قدم نکالتے ہی اس قدامت پرستی کو خیرباد کہا۔

انگلستان کی مشغول زندگی میں پہنچکر انہوں نے اپنے آپ کو بھی اسی سانچے میں ڈھالا۔ وہاں معمولی ہندوستانی کی طرح اپنی زندگی نہیں گذاری بلکہ اپنی زندگی کے مختلف شعبوں کو کامیاب بنانے کے لئے انتہائی انہماک سے کام کیا۔ اسلامک سوسائٹی کے وہ جوائنٹ سکریٹری بنے۔ لندن مسجد تعمیری فنڈ کے وہ سکریٹری رہے۔ ان کے ساتھیوں میں اسوقت سر محمد اقبال۔ سر عبدالقادر۔ مسٹر آصف علی اور رائے بہادر سورج نرائن وغیرہ تھے۔ یہ سب آپ کے ساتھ سرگرم عمل رہتے تھے۔

آٹھ برس انہوں نے اپنے وطن سے دور گذارے۔ یہ آٹھ سال آئندہ زندگی بنانے کے بنیادی کاموں میں صرف کئے۔ ۱۹۱۴ء میں وہ چند فوری ضرورتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے ہندوستان چلے آئے مگر ہندوستان میں قیام کی نیت سے نہ آئے تھے اور یہ ارادہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے پاس واپسی ٹکٹ تھا۔ جنگ عظیم کے چھڑ جانے کی وجہ سے مجبوراً انہیں ہندوستان میں قیام کرنا پڑا پھر چھ برس تک باہر جانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وطن سے دور رہ کر خاکِ وطن کی قدر معلوم ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ سمندری خطرات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ حکومت نے سواریوں کے جہازوں کی آمدورفت کے سلسلہ ہی کو بہت کم کردیا تھا۔ اگر کچھ جہاز آتے اور جاتے بھی تو وہ مسافروں کی جانی اور مالی ذمہ داری نہ لیتے صرف چیدہ چیدہ لوگوں کو پاسپورٹ ملتا۔ بقیہ ناکام رہتے۔ مولانا کی زندگی کا یہ وقفہ دو خاص مشغلوں میں گذرا۔ ایک سیر و شکار اور دوسرا تعلیم و تحقیق۔ یہ دونوں کام ایسے ہیں کہ جب ان کے شیدا ان میں لگ جاتے ہیں تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتے ہیں۔ یہی حال مولانا کا بھی تھا۔ سیر و شکار میں مصروف ہوئے تو ایسے کہ پھر گھر بار بھی یاد نہ آیا۔ اور اگر تحقیق میں لگے تو خود فراموشی کی حدود بھی طے کر گئے۔ اس طرح یہ چھ سال کا زمانہ ۱۹۲۰ء تک مذکورہ بالا دونوں مشغلوں میں گذارا۔ چاہتے تھے کہ اسی طرح اپنی زندگی کے بقیہ اور دن بھی گذار دیں مگر قدرت کو تو انہیں منظرِ عام پر لانا تھا اور عروسِ شہرت سے ہمکنار کرنا تھا وہ کس طرح اپنی زندگی خاموشی کے ساتھ گذار سکتے تھے۔

## تاریخ وفات پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی

نتیجۂ فکر حافظ مولوی عبیداللہ بصیر ٹونکی

برلبِ باناس[۱] در وادی اقامت گاہ کرد

۱۹۴۶ء

تا ببارد ابرِ رحمت بر مقامِ بے کسی!

۱۳۶۵ھ

[۱] گنگراج اور چاندماری کے درمیان دریائے باناس کا شہری کنارہ جہاں مرحوم نے اپنی حیات میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اور جہاں مرحوم وصیت کے مطابق دفن کئے گئے۔

۱۹۲۱ء میں پہلی بار انہوں نے ملازمت کی۔ اسلامیہ کالج لاہور میں وہ اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں انہوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت اس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دی کہ پنجاب میں یہ تصور کیا جانے لگا کہ محمود شیرانی کے مقابلہ پر کوئی دوسرا اہلِ قلم نہیں آسکتا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۲۷ء میں پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور پھر ۱۹۴۰ء تک فائز رہے۔ اس تیرہ سال کے زمانے میں انہیں اردو زبان و ادب کی خدمت کا خوب موقع ملا۔ ان کی زیادہ تر تصانیف اسی زمانے کی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے اس عہدے سے سبکدوش ہوکر انجمن ترقی اردو میں شامل ہوگئے تھے مگر ضعیفی نے شدید محنت کی اجازت نہ دی۔ ضیق النفس کے مرض نے اور مجبور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس علمی، قومی، ملکی اور لسانی کام سے بھی علیحدگی اختیار کرکے ٹونک واپس چلے گئے۔

مولانا کی زندگی ہمیشہ علمی رہی۔ انگلستان جانے کے وقت تک انہماک اتنا تو نہیں تھا جتنا کہ بعد میں ہوا مگر وہاں کے قیام نے اس انہماک کو زبردست قوت بخشی۔ ان کے اس زمانۂ حیات سے ایک دلچسپ واقعہ وابستہ ہے جس کا بیان یہاں غیر مناسب نہ ہوگا۔ قیامِ انگلستان کے زمانے میں انہیں ایک انگریز ڈاکٹر ہنری اسٹب کی ایک ایسی کتاب مل گئی تھی جو اسوقت تک شائع نہ ہوئی تھی اور نہ انگریزی پریس اس کو شائع کرنے کے لئے تیار تھا کیونکہ اس کی اشاعت سے عوام پر برے اثرات مرتب ہونیکا خیال تھا۔ وہ برے اثرات یہ تھے کہ لوگوں کو اسلام کے محاسن معلوم ہوجاتے اور عیسائیت کے عیوب ظاہر ہوجاتے۔ مولانا محمود شیرانی نے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ لگا کر اس کو شائع کرنا چاہا مگر اپنے آپ کو اس کے اخراجات کا کفیل نہ پاکر انہوں نے نہ صرف انگلستان میں چندہ کیا بلکہ مصر اور ترکی سے بھی چندہ کی اپیل کی۔ اسلامی ممالک نے بھی ان کی آواز پر سکوں کی بارش کردی۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی نہ صرف انگلستان میں بلکہ تمام انگریزی داں دنیا میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ہنگامہ بھی ایسا تھا کہ محمود شیرانی کو جھوٹا بنایا گیا۔ بعض اخباروں نے تو غیر ذمہ دارانہ طور پر یہ بھی لکھدیا تھا کہ ڈاکٹر

ہنری اسٹب کوئی شخص نہیں ہے یہ کتاب محمود شیرانی کی تالیف ہے اور انہوں نے یہ فرضی نام رکھ لیا ہے۔ مولانا اس لے دے سے پریشان نہ ہوئے بلکہ انگریزی پریس کی اس زہر افشانی کو اپنے لئے فال نیک سمجھے۔ اور اس کے بعد ہی ایک اور مختصر سی کتاب اس کتاب کے تعارف کے طور پر لکھی جس سے دنیا کو یہ اندازہ ہوگیا کہ محمود شیرانی دنیا کی کسی طاقت سے ڈرنے والے نہیں۔ یہی مولانا کا اولین کارنامہ تھا اور اس کی بدولت نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ تمام دنیا کے لوگوں نے حافظ محمود شیرانی کو جانا۔

مولانا کا ایک اور کارنامہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے ایک مضمون انتہائی تحقیق کے بعد "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" کے لئے بھی لکھا تھا جو بہت ہی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ "تاریخ ادب اردو" پر مختلف نظریوں سے کتنی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر ان میں خاص طور پر قابل ذکر "پنجاب میں اردو" ہے جو حافظ صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ مولانا مرحوم نے "خالق باری" اور "تنقید شعر العجم" مرتب کیں یوں تو انہوں نے درجنوں اور کوڑیوں مضامین لکھے مگر ان میں "چند بردائی کی پرتھی راج راسا" قابل توجہ ہے۔ فردوسی اور شاہنامے پر بھی ان کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات ہیں۔ ان کی علمی تحقیق اور ادبی ذوق کے بارے میں مدیر "ہماری زبان" کا خیال درج ذیل ہے جو "ہماری زبان" یکم مارچ سے ماخوذ ہے۔

"مرحوم کی زندگی خالص علمی زندگی تھی۔ ان کے علمی شغف کو دیکھکر حیرت ہوتی تھی۔ وہ عمر بھر ایک مستعد اور سچے طالب علم کی طرح علمی مطالعے اور تحقیق میں مصروف رہے ..........

علمی اور تحقیقی مقالات اردو ادب کا بے بہا سرمایہ ہیں اور شائقین علم اور طلبار کے لئے چراغ ہدایت۔ ایسے فاضل محقق کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں اور اس لئے ان کی موت فی الحقیقت قومی سانحہ ہے۔

مرحوم کی نظر بڑی غائر اور باریک بین تھی۔ اپنے خاص موضوعات میں انہیں کمال کا درجہ حاصل تھا۔ قدیم قلمی کتابوں اور تصویروں وغیرہ کی شناخت میں بھی بڑی اچھی نظر تھی۔ کاغذ روشنائی اور خط کو دیکھکر بتا دیتے تھے کہ یہ کتاب کس زمانے کی ہے۔

ان کی زندگی طالب علمانہ اور درویشانہ تھی جس کی مثال ہمیں صرف قدیم علمار میں ملتی ہے۔ وہ بہت با اخلاق، منکسر مزاج، مہمان نواز اور قانع شخص تھے ان کا ایک ہی شوق تھا اور اسے آخر عمر تک ایسا نبھایا کہ وہ ہمارے لئے ایک مثال اور نمونہ ہے ......"

مذکورہ بالا اقتباس سے نہ صرف ان کی علم دوستی اور ادب نوازی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ ان کی بالغ نظری کا بھی پتا چلتا ہے۔ مخطوطات کا یہ اندازہ لگانا کہ وہ کس عہد میں لکھے گئے۔ ہر شخص کا کام نہیں۔ کاغذ روشنائی اور لکھائی سے یہ اندازہ لگانا دشوار امر ہے۔ اکثر اس میں بڑے بڑے ذی فہم اور دراک دھوکا کھا جاتے ہیں مگر مولانا کو اس کام میں ایسا ملکہ حاصل تھا کہ انہیں کبھی دھوکا ہو ہی نہ سکتا تھا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ تھی اور وہ یہ کہ خود مولانا کے پاس "مخطوطات" کا ایک زبردست ذخیرہ موجود تھا۔ انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران میں اس پر کام بھی کیا مگر جب وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے لگے تو اپنے اس قیمتی اور بیش بہا ادبی ذخیرے کو پنجاب یونیورسٹی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ان کو صرف قدیم کتابوں ہی کا ملکہ نہ تھا بلکہ انہیں سکوں اور وہ بھی مختلف ملکوں اور زمانوں کے سکوں کے جمع کرنے کا شوق بھی تھا انہوں نے پرانے سکوں کو جمع کر کے ان کی قدامت کا اندازہ لگایا اور اس کو بھی پنجاب یونیورسٹی میں دے دیا۔ مولانا کا صرف ادبی مذاق ہی بلند نہ تھا بلکہ تاریخی دلچسپیاں انتہائی کمال پر تھیں۔

اس اقتباس میں حافظ شیرانی بحیثیت ایک انسان کے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ آدمی میں جو خوبیاں شرط انسانیت ہیں وہ ان کے اندر موجود تھیں۔ یہ تو اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں لکھا ہی جا چکا ہے کہ وہ قدامت پرستی کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک وہ تمام باتیں جو رسم و رواج کہلاتی ہیں، توہم پرستی کی حدود میں داخل تھیں۔ وہ کبھی کسی قسم کی مصیبت سے بھی گھبراتے نہ تھے بلکہ ہر مصیبت کو انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے۔ مہمان نوازی اور منکسر مزاجی اس بات کی دلیل ہیں کہ ان کا کیرکٹر بہت بلند تھا۔ دوسروں کو اپنے گھر پر جگہ دینا اور اس قدر شہرت کے مالک ہوتے ہوئے بھی غرور اور گھمنڈ نہ ہونا انسانیت کے اعلیٰ جوہر ہیں۔ انسان دنیا میں دراصل اپنے اخلاق سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کا ہر قدم اس کی اخلاقی بلندی کا مظہر ہوتا ہے۔ اخلاق کی یہ خوبی مولانا میں موجود تھی کہ وہ بڑے اور چھوٹے سب سے انتہائی انکسار کے ساتھ گفتگو کرتے۔ ہر ایک کو گوشۂ دل میں جگہ دیتے۔ اس کے علاوہ ان کے کردار کی ایک اور خوبی نمایاں کرنے کی ضرورت ہے اور وہ قناعت ہے۔ اس کا دنیا میں حاصل ہونا ایک دشوار امر ہے۔ مگر مولانا میں یہ صفت ابتدا ہی سے پیدا ہوگئی تھی۔

مولانا جن تصانیف سے زیادہ مشہور ہوئے وہ خاص طور پر دو ہیں۔ اول "پنجاب میں اردو" اور دوم "تنقید شعر العجم"۔ ان کتابوں نے مولانا کو علیحدہ علیحدہ مرتبے دیئے ہیں۔ "پنجاب میں اردو" نے ان کو ایک مورخ اور محقق ثابت کیا۔ اس کتاب میں مولانا نے یہ بتایا ہے کہ "اردو پنجاب سے نکلی" ہے کیونکہ پنجاب مسلمانوں کے زیر حکومت ایک عرصہ تک رہا اسو جہ سے یہاں پر سورسینی خاندان کی مختلف پراکرتوں کے میل جول سے ایک مخلوط زبان پیدا ہو چکی تھی جب مسلمان پنجاب سے دوسرے حصوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے آگے بڑھے تو وہ یہاں سے ایک مخلوط زبان لیکر گئے۔ اس طرح انہوں نے یہ بتایا کہ مسلمان جہاں گئے وہ پنجاب سے اردو زبان

بولتے ہوگئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کچھ داخلی شہادتیں بھی پیش کی ہیں مثلاً ملتانی اور اردو کی بہت سی مشترک حالتیں یوں بتائیں۔

(۱) دونوں میں اسما اور فعل کے آخر میں الف آتا ہے۔

(۲) دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے۔

(۳) دونوں زبانوں کے تذکیر و تانیث کے قواعد افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں اس طرح یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ مولانا لسانی تحقیق کے بھی ماہر تھے۔

ان کی دوسری کتاب "تنقید شعر العجم" ہے۔ یہ تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے۔ اس کو تحقیقی اس وجہ سے کہا گیا کہ اس میں ان تاریخی واقعات کو تحقیق کی روشنی میں صحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جنکو یا تو مولانا شبلی نے غلط لکھدیا تھا یا وہ ان کو صحیح طور پر معلوم نہ کر سکے تھے۔ انہوں نے ایسی غلطیوں کا بھی ازالہ کیا ہے جو مولانا شبلی نے سن سنا کر لکھدی تھیں۔ یہ کتاب چھ سو دس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو تاریخی اور تنقیدی حیثیتیں حاصل ہیں۔ یوں تو انہوں نے ہر شاعر کے متعلق صحت کے ساتھ اس کے حالات زندگی، واقعات اور دوسر مسائل پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر خاص طور پر رودکی، فردوسی، عمر خیام، انوری، نظامی گنجوی اور شیخ فریدالدین عطار کے متعلق غلط بیانیوں کی تصحیح اور تردید کی ہے۔ ان کے علاوہ ان کے کلام پر جگہ جگہ مختصر تبصرہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں مولانا خود فرماتے ہیں۔

"تنقید ہذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلت علمی کی منقصت نہیں ہے۔ بلکہ محض احتجاج ہے اس مروجہ روش کے خلاف جس میں ہمارے مصنفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں۔ ہم تاریخی واقعات اور سوانح لکھتے وقت اسقدر تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اس کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور ان کی صحت اور درستی کے متعلق اپنا اطمینان کر لیں۔ میں ان بزرگوں کے ساتھ بھی اتفاق نہیں کرتا جو شعر العجم کو حسن و عشق کا صحیفہ کہکر اس کے تاریخی پہلو کی اہمیت کو گھٹانا چاہتے ہیں اور نہ تنقید کی ضرورت کو اس سے مٹانا چاہتے ہیں۔"

ان کتابوں کو پڑھ کر اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا تنقید کے اصولوں سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ وہ تاریخی اور تحقیقی میدان میں اتر کر پہلے اپنا اطمینان کر لیتے ہیں تب کسی پر تنقید لکھتے ہیں یہ ایک نقاد کا اولین فرض ہے۔ اسے ضعیف روایتوں کو نظر انداز کرنا چاہیئے اگر کسی واقعہ کی صحت میں ذرا بھی شبہ ہو تو تاریخی شہادتوں سے اس کی حقیقت معلوم کرنی چاہیے۔ یہ خوبیاں حافظ محمود شیرانی میں تھیں۔ ان کا خیال ہے کہ مولانا شبلی نے ان خصوصیات کو مد نظر نہیں رکھا۔ ان کا انداز بیان اور طرز تحریر سادہ ضرور ہے مگر وہ کہیں کہیں فارسی کا سہارا لیتے ہیں پھر بھی تنقید دیانتداری سے کرتے ہیں یعنی مبالغہ نہیں ہوتا۔ صرف بڑے بڑے اور بھاری بھرکم الفاظ بے معنی نہیں ہوتے، بلکہ زیر تنقید شے کا فنی تجزیہ کرتے ہیں اور اس کی صداقت اور حقیقت کو آخری منزل تک پہنچاتے ہیں۔ مختصر جملوں میں اپنے مطلب کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں مگر نفس مضمون کبھی ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔

مولانا کی دیانتداری ضرب المثل بن چکی تھی۔ تاریخ، تحقیق اور تنقید میں کبھی وہ اس کو نہ چھوڑ سکے یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ ان کی تنقید کسی قدر تیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس دیانتداری سے ایک دلچسپ واقعہ وابستہ ہے جو نیا یک دہلی، بابت ۸ مارچ ۱۹۴۶ء سے نقل کیا جاتا ہے۔

"دیانت کا یہ عالم تھا کہ امتحان کے جو پرچے جانچ کے لئے آتے تھے انہیں دو تالوں میں مقفل رکھتے تھے کہ کہیں ان کے صاحبزادے (اختر شیرانی) اپنے کسی دوست کے پرچہ کے لئے کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں۔ ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ وہ منشی فاضل کے نظم کے پرچہ کے ممتحن تھے۔ ان کے صاحبزادے امتحان میں شریک تھے اور شاعر ہونے کی حیثیت سے اسی پرچہ میں ان کو سو فیصدی نمبروں کی امید تھی۔ بایں ہمہ مرحوم نے صرف ۶۴ نمبر دئے اور پرچہ مولوی محمد شفیع ایم۔ اے وائس پرنسپل اورینٹل کالج کے پاس بھیجدیا۔ غالباً یہ پرچہ سر عبدالقادر کو بھی دکھایا گیا تھا جس پر موصوف نے یہ فرمایا کہ آپ نے اس پر ظلم کیا ہے۔"

مولانا خود بھی شاعر تھے مگر دنیا نے آپ کو شاعر کی حیثیت سے نہ جانا۔ "ٹیپو سلطان" ان کی ایک زبردست نظم ہے جو قدر دانان شعر و سخن سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے مگر ان کی شہرت کا سنگ بنیاد ان کی نثری کتابوں نے رکھا۔ آج وہی کتابیں مرحوم کی یادگار ہیں جو ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جائیں گی۔

## شکوک

اضطراب بندگی پر شک نہ کر — دیکھ اب میری خودی پر شک نہ کر
جوش وحشت کی کمی پر شک نہ کر — دیکھ میری خامشی پر شک نہ کر
ساقیا دے اور جام زندگی — میری اس تشنہ لبی پر شک نہ کر
راز ہستی فاش ہو سکتا نہیں — زندگی میں زندگی پر شک نہ کر
چاک کرتا ہوں نقاب کائنات — اب مری دیوانگی پر شک نہ کر
آگ سینہ میں ابھی تک ہے دبی — سوزش دل کی کمی پر شک نہ کر

سن لے اے پرواز روداد حیات
وقت کی فتنہ گری پر شک نہ کر

پرواز جعفری

# چھینک

افسانہ

بشیر الدین

شام کا سہانا وقت تھا۔ نفاست پسند افسر ایوان دمتیری چریاکوف دوسری صف میں بیٹھے ہوئے دوربین لگائے کارنوال کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ تماشہ کی دلکشی نے اس پر ایک کیف کا عالم طاری کر دیا تھا اور وہ اپنے آپ کو ہفت آسمان تصور کرتا تھا۔ اچانک ... قصے کہانیوں میں "اچانک" کا لفظ اکثر آتا ہے۔ مصنفین کی رائے صحیح ہے کہ زندگی درحقیقت تعبیر ہے ایک عالم تذبذب سے۔

اچانک افسر کے چہرہ پر تیوریاں پڑ گئیں، آنکھیں باہر کو نکل پڑیں۔ سانس رک گیا۔ اس نے کمر کو خم کیا جھکا اور ... آخ چھیں، وہ چھینکا۔ چھینکنا کوئی جرم نہیں ہے ہر شخص کو چھینک آتی ہے۔ موسیقار چھینکتے ہیں خفیہ کا چھینکتے ہیں پولیس کے افسر اعلیٰ چھینکتے ہیں۔ چنانچہ چریاکو کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس نے رومال سے منہ پوچھا اور ایک مہذب انسان کی طرح دائیں بائیں نگاہ ڈالی کہ اس کے چھینکنے سے کسی کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ پہلی صف میں ایک معمر شخص نہایت اطمینان کے ساتھ جیب سے رومال نکال کر منہ اور گردن پونچھ رہا ہے اور کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ یہ شخص محکمہ ... کا افسر جنرل برزرالو تھا۔

"میں نے اس کو سان دیا" چریاکو سوچنے لگا۔ "خیریت ہوئی کہ یہ میرا افسر اعلیٰ نہ ہوا۔ یہ تو ایک اجنبی ہے۔ تاہم مجھ سے ایک نازیبا حرکت ہوئی ہے۔ مجھے معافی مانگنی چاہئے۔"

چریاکو کھانسا اور دبی آواز سے افسر کے کان میں کہا "معاف فرمائیے گا جناب والا۔ میں نے چھینک کر آپ کو سان دیا۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔"

"خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ آپ یقین فرمائیے میں نے جان کر ایسا نہیں کیا۔"

"اوہو۔ تشریف رکھئے مہربانی فرما کر اور مجھے تماشہ دیکھنے دیجئے۔"

چریاکو پر پریشانی غالب تھی۔ وہ احمقانہ طور پر مسکرایا اور اسٹیج کی طرف دیکھنے لگا۔ پر وہ اب ہفت آسمان پر نہ تھا۔ وہ ایک شدید بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ وقفہ ہوتے ہی وہ برزرالو کے پاس پہنچا اور اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پا کر کہنے لگا۔

"میں نے جناب کو سان دیا۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ میرا یہ فعل غیر شعوری تھا۔"

"ارے صاحب بس کیجئے۔ میں تو اس بات کو بھول چکا تھا۔ آپ دوبارہ یاد دلا رہے ہیں۔" جنرل نے کہا اور بے صبری کی علامت کے طور پر نچلا ہونٹ ہلایا۔

"بھول گیا؟ لیکن آنکھوں سے تو مکاری ظاہر ہے" یہ سوچ کر چریاکو نے جنرل کو شبہ کی نظر سے دیکھا۔ "صاف کہنا نہیں چاہتا لہٰذا مجھے چاہئے کہ میں اس سے کہہ دوں کہ چھینکنا ایک فطری عمل ہے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ میں نے اس پر تھوکا۔ ممکن ہے اس وقت نہ سوچ رہا ہو اور بعد کو سوچنے لگے۔"

چریاکو نے گھر پہنچ کر بیوی سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا لیکن اُسے ایسا محسوس ہوا کہ بیوی نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ یہ واقعہ سن کر کچھ گھبرائی تو ضرور پر جب یہ سنا کہ برزرالو ایک اجنبی ہے تو وہ مطمئن ہو گئی اور اس نے کہا "بہتر ہے تم اس کے گھر جا کر معافی مانگ لو۔ ممکن ہے اس کو خیال ہو کہ تم سب کے سامنے وہ کچھ نہ کہہ سکے جو تم دراصل کہنا چاہتے ہو۔"

"یہی تو بات ہے۔ معافی تو میں نے مانگی۔ لیکن وہ عجیب انسان معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔"

اگلے دن چریاکو نے بال بنوائے۔ نئی وردی پہنی اور برزرالو کے گھر پہنچا۔ جنرل دالان میں بیٹھا عرضیاں سن رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے چریاکو کو دیکھا۔ نگاہ ملتے ہی چریاکو بول اٹھا "جناب کو یاد ہوگا کل شام ارکادی کے تماشہ گھر میں مجھے چھینک آئی تھی اور میں نے نادانستہ جناب کو سان دیا تھا۔ اب معافی کا ..." چریاکو اتنا کہہ پایا تھا کہ جنرل نے چلّا کر کہا "کیا فضول بات ہے۔ نہ معلوم تم چاہتے کیا ہو۔" یہ کہہ کر جنرل پھر عرضی داروں کی طرف مخاطب ہو گیا۔

چریاکو سوچنے لگا "یہ شخص میری بات سننا نہیں چاہتا ہے۔ خفا ہے۔ بہرحال میں صفائی پیش کئے بغیر یہاں سے نہیں ٹلوں گا۔"

جنرل عرضیاں سن کر اٹھا اور اندر کی طرف بڑھا۔ چریاکو فوراً لپکا اور کہنے لگا "جناب والا مجھ سے گستاخی سرزد ہوئی ہے۔"

جنرل تنگ آ گیا اور اس کے چہرہ پر بے بسی کے آثار نمودار ہوئے۔ انکاراً ہاتھ ہلاتے ہوئے اس نے کہا "آپ معلوم ہوتا ہے مذاق کر رہے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی آڑ لی۔

"اس میں مذاق کی کونسی بات ہے۔" چریاکو سوچنے لگا "میرا ارادہ مذاق کرنے کا ہرگز نہیں۔ دراصل جنرل بات سمجھنے سے قاصر ہے۔ لعنت ہو اس پر۔ میں اس بددماغ سے معافی نہیں مانگوں گا۔ گھر جا کر اسے ایک خط لکھوں گا۔ اب اس کی شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔"

گھر پہنچ کر چریاکو نے اس مسئلہ پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ خط لکھنا مناسب نہیں۔ جنرل کے گھر جا کر ہی معافی مانگنا چاہئے۔ چنانچہ وہ پھر جنرل کے گھر پہنچا۔ جنرل اس کو دیکھ کر سوال کرنا ہی چاہتا تھا کہ چریاکو نے کہنا شروع کر دیا۔

"کل جناب کے حضور میں مجھ سے گستاخی سرزد ہوئی تھی۔ میں معافی

(باقی صفحہ ... پر)

# میر شیر علی افسوس

میر شیر علی افسوس کے مختصر حالات بعض فہرستوں میں ملتے ہیں، مگر ذیل کے حالات زیادہ تر انہی کی ایک تصنیف "آرائش محفل" سے لئے گئے ہیں، جس کا قلمی نسخہ ۱۲۳۳ھ میں یعنی مؤلف کی وفات کے کل دس سال بعد تحریر ہوا۔ حسب نسب کے اعتبار سے یہ سید تھے خاندان کا سلسلہ حضرت جعفر صادق چھٹے امام تک پہنچتا ہے والد کا نام سید مظفر علیخاں تھا، غالباً الہ آباد کے رہنے والے تھے، یا کم از کم اوائل عمر کا زمانہ وہیں بسر ہوا، کیونکہ اس شہر کے ایک بزرگ باکمال شاہ محمد اجمل صاحب کے حال میں لکھتے ہیں "مؤلف کو اس سراپا امتیاز کی خدمت میں ایام طفلی سے نیاز ذاتی اور رسوخ قلبی ہے" جوانی کے زمانے میں کچھ دن بنارس میں بھی رہے لکھنؤ کا ذکر کسی قدر جوش کے ساتھ کرتے ہیں، اس کی وجہ غالباً مذہبی عقیدہ ہے۔ اسکی صراحت ذیل کی ابیات سے ہوتی ہے جو بظاہر انہی کی طبع زاد ہیں اور آرائش محفل کے دیباچہ میں حضرت علیؓ کی شان میں لکھی گئی ہیں:

وہی دین و دنیا کا ہے بادشاہ — کرے گا بخوبی ہمیں رانباہ
خدا سے اسے دمبدم وصل ہے — نبی کا خلیفہ بلا فصل ہے

مزید شہادت علمائے لکھنؤ کے حال میں ذیل کے الفاظ میں ملتی ہے:

"اور فرقہ ناجیہ امامیہ میں مولانا سید دلدار علی سلمہ اللہ تعالے وحید عصر ہے تبحر اس بزرگ کا اس کی تحریر سے ہویدا ہے اور خوش بیانی اس کی تقریر سے پیدا، سینکڑوں اشخاص اس کی بدولت گمراہی سے نکلے اور منزل ہدایت کو پہنچے، مذہب امامیہ کو ترقی کامل اس نے بخشی اور ہندوستان میں نماز جماعت و نماز جمعہ اس نے کی"

گو افسوس نے خود لکھنؤ کے تعلقات یا وہاں توطن اختیار کرنے کی کوئی تصریح نہیں کی تاہم نواب آصف الدولہ کے دولت خانے کے ذکر اور اس کی تاریخ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ سے انھیں گونہ دل بستگی نہیں بلکہ محبت تھی، نواب آصف الدولہ کے محل کو وہ خیر المکانات اور خود نواب کو صفتی لکھتے ہیں یہ تاریخ اس کی بنا کی "دولت خانۂ عالی" مؤلف کے نتائج طبع سے ہے، لیکن خیر العمارات امام باڑہ ہے"

یہ الفاظ مزید وضاحت اور افسوس کے میلان طبع کو ظاہر کرتے ہیں کیا عجب کہ افسوس اس زمانہ میں لکھنؤ ہی میں موجود ہوں مگر دستورالفصاحت کے

ان کے والد کے لکھنؤ کے تعلقات اور وہاں کے قیام سے اصلیت روشن ہو جاتی ہے۔ مرزا فخر الدین احمد خاں بہادر المشہور بہ مرزا جعفر سے نواب سرفراز الدولہ مرحوم کی بہن منسوب تھیں، اور یہ نائب وزیر یعنی نواب آصف الدولہ تھے، انہی کی سفارش و امانت سے "در سرکار فیض مدار کمپنی بہادر بصیغۂ شاعری وارد و دانی نوکر شدہ مدتے درکلکتہ ماندہ، آخر ہمانجا باجل طبیعی درگزشت"

احد علی یکتا، دستور الفصاحت کے مولف نے افسوس کی وفات پر ذیل کے اشعار میں اظہار غم کیا اور تاریخ بھی منظوم کی ہے۔

از جہاں رفت میر شیر علی — کرد ہر پیر و ہر جوان افسوس
بعد افسوس چوں تخلص او — ہمہ کردند شاعران افسوس
گفتم از روے درد خاموشے — رفت افسوس زیں جہان افسوس

حقیقت یہ ہے کہ یکتا اور افسوس دونوں ہم سبق تھے "زبدۂ علمائے ہندوستان، مجتہد زمان، محدث یگانہ، مسیحی نے وقت، مخدومی و استاذی جناب حکیم آغا محمد باقر صاحب قبلہ غفر اللہ ذنوبہ" یکتا کے قول کے مطابق علم طب میں دونوں کے استاد تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی مولوی صاحبان کورے ملا نہ تھے بلکہ کسی نہ کسی دوسرے علم یا فن میں بھی اتنی دستگاہ رکھتے تھے کہ دوسروں کو اپنے فیض علم سے مستفید فرماتے، آج کل کی سی حالت نہ تھی کہ خالی وعظ سے سامعین کے ذہنوں کو پیہ کرتے تھے۔

افسوس کی استعداد علمی اور دستگاہ کا پتہ ان کے ایک دوست مولوی محمد اسلم کی ایک تاریخ سے بھی چلتا ہے یہ تاریخ محمد اسلم صاحب نے آرائش محفل، ان کی ایک تصنیف کے حصہ اول کی تکمیل کے وقت ہی کہی تھی چنانچہ ملاحظہ ہو۔

گزیں آل خیر خلق و نسل ضیغم یزداں — کہ آمد از سما شیر علی خوش ہم آں افضل
چہ او صاف فش بیاں سازم کہ ہست او جامع ہر فن
بہ نظم و نثر و طب و حکمت و فقہ و کلام اکمل
تخلص میکند افسوس؛ دارد لہجۂ اردو
زہم فرحان خود دارد؛ زہر فن بہرہ اکمل

**سید اظہر علی**

(۱) دستورالفصاحت ۲۱ - ۱۲۰ - (۲) روے درد یعنی د کے عدد (۴) رفت افسوس زیں جہاں افسوس کے عدد (۱۲۲۰) میں شامل ہوں گے۔ دستور الفصاحت کے مصحح جناب امتیاز علی صاحب عرشی نے بیل، قاموس اور دوسرے ماخذ کی غلطی اس ضمن میں ظاہر کی ہے تحشی صفحہ ۱۰۲ -

۱- افسوس تخلص میر شیر علی نام خلف میر مظفر علی نواب عالی جاہ کے توپخانے کے داروغہ تھے ان کا اصلی وطن نارنول ہے ان دنوں میر حیدر علی حیران اور میر حسن کی صحبت سے مشق سخن اس درجہ بڑھائی ہے کہ نکتہ سنج بھی اعتبار کرتے ہیں، دستور الفصاحت طبع رامپور ۱۰۲ حاشیہ تحشی -

یکتا نے تو طب اور شاعری کا ذکر کیا ہے، مگر محمد اسلم صاحب نثر، حکمت، فقہ اور کلام کا مزید اضافہ کرتے ہیں۔ "دار و لہجۂ اردو" خصوصاً قابل توجہ ہے اوّل تو یہ کہ کلکتہ میں اس لب و لہجہ کے آدمی تھے کتنے، ان سے چند سال پیشتر میر قمر الدین منت ملک الشعرا وہاں بے شک پہنچے تھے، مگر وہ فارسی میں ایسے محو تھے کہ اردو کی طرف انھوں نے کم توجہ کی، دوسرے ابتدا میں یہ میر سوز کے شاگرد تھے، سوز کا فیض تربیت، ان کی ذاتی استعداد دونوں نے طبیعت کو جلا دی صاحب دیوان ہوئے، لکھنؤ میں میر حیدر علی حیراں سے رجوع کیا مشق کلام کو پختہ کیا پھر احمد علی یکتا کے ساتھ دوستی او یکجہتی بھی رہی، لہجۂ اردو، پیدا ہو جانا کونسی بڑی بات تھی، بنگال والوں کو ان کا لہجہ یقیناً انوکھا اور پیارا لگتا ہوگا ورنہ اسلم صاحب اس کا ذکر کیوں کرتے۔

اس ضمن میں افسوس نے لکھنؤ کے شعرا کا ذکر کرتے ہوئے ایک پرلطف نکتہ حوالۂ قلم کیا ہے مگر اس میں ایک طرح کی چوٹ بھی ہے، لہٰذا ہم اسے معذرت کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

"شعرا بھی جتنے اس شہر (لکھنؤ) میں ہیں کیا فارسی گو کیا ریختہ گو کہیں نہیں ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد برہم ہونے شاہ جہاں آباد کے اکثر غریب امیر مرزایان ہندوستان سے نواب صفدر جنگ و شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں آکر اس شہر میں بسکونت دائمی ساکن ہوئے پس شہر تو عبارت اشخاص سے بھی دلی ہوگیا، اور باشندے اس کے بسبب کثرت صحبت و تتبع زبان تلفظ صحیح کرنے لگے، یہاں تک کہ جن کی طبع موزوں تھی شاعر ہو گئے، باوجود اسکے بھی لہجے میں تفاوت بہت رہ گیا لیکن محاورہ میں کم کہ زباندان ہی اس کو سمجھے اور اس کی طبیعت اس پر لگے"

احمد علی یکتا کا قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ افسوس صاحب دیوان تھے، جو ان کی طبیعت کے لگاؤ اور ذاتی ذوق شاعری کی واضح دلیل ہے دستور الفصاحت میں یکتا نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے مربی کے خلف اکبر مرزا قمر الدین احمد خاں بہادر صولت جنگ، قمر تخلص کے ہاں مشاعرے ہوا کرتے تھے، جن میں شاہ نصیر دہلوی نے بھی ایک زمانہ میں شرکت کی، ان مشاعروں میں شاعروں کی جو تربیت ہوتی تھی وہ محتاج بیان نہیں، ان معلومات کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ میر شیر علی افسوس ادبی ذوق لے کر آئے تھے اور خوبی قسمت کہیے یا زمانہ کی ناسازی خدمت بھی انھیں ایسی ہی ملی جس میں انھیں زور قلم دکھانے کا موقع ملا، بلکہ یوں کہیے کہ جہاں میر امن دہلوی نے موجودہ اردو زبان کی داغ بیل میں صاحبان کمپنی کا ہاتھ بٹایا وہاں میر شیر علی افسوس نے بھی اس عمارت کو اٹھانے اور اس کی تکمیل میں کافی امداد دی۔ اب رہی یہ بات جو عام طور پہ کہی جاتی ہے کہ صاحبان کمپنی نے محض یہاں کے علوم کو زندہ کرنے اور انہیں رواج دینے کے لئے یہ نئی تحریک پیدا کی، اس کے حق میں اور اس کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، میرے فاضل دوست ڈاکٹر اے، جے، آربری نائب مدیر انڈیا آفس لائبریری نے حال ہی میں ان صاحبان کی ادبی خدمات پر کافی روشنی ڈالی ہے اس لئے میں اس موضوع پر مفصل بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔

اب دیکھئے کہ میر شیر علی افسوس اپنے مربی کو کن الفاظ میں روشناس کرتے ہیں، میں خود انہی کے الفاظ نقل کرتا ہوں کیونکہ اوّل تو آپ اسطرح اب سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے کی زبان سے ملاقی ہوتے ہیں دوسرے تصنیف را مصنف نیکو کند بیان، یعنی مربی کو مربا ہی بھجوائے۔

میر صاحب لکھتے ہیں: "اور شکر گزاری افتخار مرزایان ہندوستان دولت خواہ صاحبان عالی شان، فخر خاندان، فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر ابن محسن الزماں خاں کی شب و روز کرنی ضروری ہے کیونکہ سرکار دولتمدار میں سبب اپنی رسائی کا وہی ہوا۔ والا امیروں تلک پہنچ فقیروں کی کہاں ۔۔۔۔۔ غرض مرزا صاحب کی جوہر شناسی و آشنا پرستی اور صاحبان عالی شان کی قدردانی اور مہربانی ۔۔۔۔۔ اشارۃً اس کا باغ اردو کے دیباچہ میں ہو گیا ہے ۔۔۔۔"

اب ان کی ادبی خدمات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اس زنجیر کی پہلی کڑی باغ اردو ہے، افسوس جب اس کتاب کی تحریر سے فارغ ہوئے تو "مدرس ہندی مسٹر جان گلکرسٹ بہادر دام الطافہ نے اس کا چھاپا شروع کر دیا، چنانچہ پانسو کتاب چھپی اور دور دور تلک پہنچی بعد اس کے فرمایا تو اس فن میں دستگاہ کامل رکھتا ہے تیرے کلام کی طرز سے ہم بہت محظوظ ہوئے اب جتنی کتابیں کہ لوگوں کی تالیف ہیں یا ترجمے تو انھیں اصلاح دے، زنہار اس امر میں کسی کی خاطر نہ کرنا، ان کی صحت و غلطی کی پرسش تجھی سے ہو گی، مولفوں مترجموں سے کچھ علاقہ نہیں ۔۔۔۔۔ چنانچہ چار کتابیں تو بالکل درست کیں، تفصیل ان کی دیباچہ رقمی میں لکھ چکا ہوں اور ایک آدھ کے جملے ہی مربوط کر دئے، ۔۔۔۔۔ بعد اس کے چندے اوقات شیر بیشۂ شہنشہ شعرا مرزا رفیع الدین سودا کے کلیات کی صحت میں کاٹی، از بسکہ وہ کاتبوں کے قلم جہل سے غلط ہو گیا تھا جیسا چاہیئے ویسا صحیح نہ ہو سکا اور نسخہ بھی دوسرا کہ مرتبہ صحیح ہو، ہم نہ پہنچا بسبب اس کے کہیں کہیں غلط رہ گیا"

ان کی آخری تصنیف آرائش محفل ہے، یہ تالیف زیادہ تر سجان رائے بھنڈاری کی فارسی تاریخ خلاصۃ التواریخ پر مبنی ہے جس کا تعلق اورنگ زیب کے عہد اور اس سے ماقبل کی تاریخ سے ہے۔ مگر ضمناً اس میں دوسرے مصنفوں اور ان کی تالیفات سے بھی امداد لی گئی ہے۔ مثلاً اس میں سیر المتاخرین خلاصۃ الہند اور ایک دو اور کتابوں کا نام بھی آگیا ہے۔ یہ مصنف کی نیک نیتی اور دیانت کی دلیل ہے، برخلاف اس کے دوسروں کی روش اور طبیعت کو دیکھئے اور خود ان کی زبانی سنئے: "بعض مولفین و مترجمین (یہ ان کے شریک کار تھے) نے چھاپے کے وقت جو درخواست کی کہ نام کتب مسطورہ کے اگر دیباچے میں رہیں گے تو ہماری کسر شان ہوگی، ناگزیر ان کے پاس خاطر

(بقیہ صفحہ ۴۰ پر)

# فرانسیسی افسانے اور فطرت نگاری

## ۲

اب نیچرلسٹ اسکول کے متعلق ایسی چار باتیں درج کی جاتی ہیں جو لکھنے والوں، پڑھنے والوں اور نقادوں کے لئے یکساں دلچسپ ہیں۔

(۱) طرزِ ادا کی انفرادیت۔
(۲) عموماً کس حد تک قوت اختراع سے کام لینا چاہئے۔
(۳) بیانیہ حصوں کی نسبتی اہمیت۔
(۴) ادب میں اخلاق کا سوال جو بہت معرضِ بحث میں ہے۔

### (۱) طرزِ ادا کی انفرادیت

اس قدرت کے بغیر کوئی ناولسٹ نمود حاصل کرنے کی توقع نہیں کر سکتا۔ بہت سے مصنف جن میں باقی صفات موجود ہیں اس لئے صفِ اول میں جگہ نہیں پاتے کہ دوسروں کی طرح لکھتے ہیں، ان کی صرف و نحو قطعاً درست، تحریر میں سب منشا روانی، جملوں کی تراش خراش میں خوبی اور رنگ آمیزی بھی ہوتی ہے مگر کوئی ذاتی امتیازی شان نہیں پائی جاتی۔ ایک ظریف نقاد نے خوب کہا کہ ایسے ناول نویسوں کا طرز "بھاڑے کا ٹٹو ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ مروّجہ اندازِ بیان کے دلدادہ ہوتے ہیں اور جو فقرے اور جملے ہوا میں مکھیوں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں ان پر اوقات بسر ہوتی ہے۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ انکی گرہ کا کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ جیسے کوئی شخص پس پشت کھڑا ہوا بتاتا جاتا ہے اور یہ لکھتے جاتے ہیں تاہم ان لوگوں کو شہرت حاصل نہ ہونے سے استعجاب ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ امر بدیہی ہے کہ اب صرف اسی ناول نویس کی قدر ہوتی ہے جو حقیقت کا معقول احساس رکھتے ہوئے فطرت کی ترجمانی میں جدت سے کام لے اور اس ناول میں اپنی ذات کا بھڑکتا ہوا شعلہ نہاں کر دے۔

بلاشبہ سب سے افضل مثال انفرادی طرزِ ادا کی فرانسیسی ادب میں سینٹ سائمن ہے جو اپنی تصانیف میں اپنا خونِ جگر اور پوری طاقت صرف کر دیتا تھا۔ اس نے ایسے صفحات چھوڑے ہیں جن میں عمق اور نبض کی لپک ہے۔ بہت سے مقتدر مصنفین ہیں جن میں طلاقت اور خوبی ترتیب پائی جاتی ہے سینٹ سائمن کے خود نوشتہ حالات میں ان کا فقدان ہے مگر ہر جملے میں موجِ حیات جوش زن ہے، اس کی تصنیف انسان کی فریاد ہے، طویل گفتگو ہے ایک شخص کی اپنی ذات سے اور ایسے شخص کی جو اپنے وجود سے محفل آراستہ کرتا ہے۔

انفرادی شان سے مطلب نمائش کی بوالعجبی نہیں ہے جس کا مآل صرف سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہو، طرزِ ادا محض طرزِ ادا کی خاطر کامیابی کی سند نہیں ہو سکتا۔ مصنف کو چاہیئے کہ اپنی تصنیف میں لہو پانی ایک کر دے اور اپنی دماغی قوتیں صفحات میں بکھیر دے۔

موسیو لنوں کلاڈل ایسا مصنف تھا جسے اپنے دیگر مماثل کی طرح یقین تھا کہ کسی تصنیف کے لئے سب سے ضروری بات جو اس کی بقا کی ضامن ہو صاف ستھری بے عیب زبان ہے۔ خلعت بقا حاصل کرنے کی دھن میں اس نے کوشش کی کہ اس کی تصانیف کا ہر جملہ ایک ڈال ہو۔ اس خیال میں ایسا محو ہوا کہ اس کی تخلیقات علمی سے قوت فنا ہو گئی۔ وہ ایسے جواہر چھوڑ گیا جنہیں رنگ ہے، سنگ ہے مگر آب و تاب نہیں، جو حیرت میں تو ڈالتے ہیں مگر انبساط کی لہر نہیں دوڑاتے۔

نیچرلسٹ اسکول کے سربر آوردہ مصنفین کی کتابیں پڑھئے ان میں صرف اندازِ بیان کی چمک دمک صرف الفاظ کی ترتیب میں ہی صناعی نہ ہوگی بلکہ وہ انفرادی شان پائی جائے گی جو کسی تصنیف سے روح سلب کرنے کے بجائے زندگی بخشتی ہے۔ بالزک کو اس کی تصانیف کے مجموعے سے جانچنا چاہئے، اس کی تصنیف "کانٹ دروولاٹسک" میں اندازِ بیان کے نگینے اپنی تابندگی دکھاتے ہیں البتہ ناولوں کی عبارت میں بہت کچھ حشو و زوائد اور رنگلانی ہے۔ اس کے بخلاف اسٹینڈ ہال میں انفرادیت کا مادہ بیشتر تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بے لاگ پر مغز اور دل میں جگہ کرنے والے جملے اس کی قوت تجزیہ سے دوش بدوش ہیں۔ یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ وہ طرزِ ادا کو دلکش بنانے کی کوشش کرتا ہے، اس کا انداز اس کی قابلیت کے لئے موزوں تھا، ایسا انداز جو اپنے اغلاط اور ظاہری بے پروائی میں ایسا انوکھا ہے کہ فرانسیسی ادب میں ضرب المثل ہو گیا ہے۔ فلابیر جیسا کہا جا چکا صناع تھا۔ وہ اپنے جملوں کی جلا کرتا تھا تاہم شخصیت اور شگفتگی قائم رہتی تھی۔ گانکور، ڈاؤڈے اور زولا کے صفحات میں بھی شخصیت کی جھلک موجود ہے اور شعاعیں مچل رہی ہیں، مگر سب کے انداز میں انفرادی شان ہے اور یہی شان ان کے اکثر معاصرین سے ان کو ممتاز کرتی ہے۔ یہ اندازِ بیان کا انوکھا پن محض اندازِ بیان کی غرض سے نہیں ہے بلکہ مصنف کی ذہانت کا جلوہ ہے ان جذبات کی اس دہکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہے جو ان کے سینے میں فروزاں تھی اور جس نے صفحات کاغذ پر منتقل ہونے کے بعد ان کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

اختر لکھنوی

### (۲) قوت اختراع

اگلے زمانے میں کسی ناول نویس کی اعلیٰ تعریف یہ تھی کہ قوت متخیلہ زبردست ہے۔ لیکن اگر آجکل ان الفاظ میں کسی کی تعریف کی جائے تو غالباً خردہ گیری متصور ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ناول نویسی کا چولا بدل گیا ہے۔ اب قوت متخیلہ سب سے اہم صفت شمار نہیں ہوتی۔ ڈوما اور ستوما میں اعلیٰ درجہ کی قوت متخیلہ تھی

ٹائرڈیم ڈی پیرس" میں ہیوگو نے ایسے اشخاص اور واقعات وضع کئے ہیں جو بے حد دلچسپ ہیں۔ موپسیٹ کے مصنوعی عاشقوں سے جارج سینڈ نے پورے ایک قرن تک دلوں کو مسحور رکھا مگر کسی نقاد یا ناظر نے آج تک یہ جرأت نہیں کی کہ بالزک یا اسٹینڈ ہال کو قوت اختراع سے متصف کرے۔ فقط اس بات کی تعریف ہوتی ہے کہ ان کا مشاہدہ اور تجزیہ زبردست ہے۔ ان کی عظمت اس میں ہے کہ اپنے عہد کی مصوری کی نہ کہ اس میں کرشمے گڑھے۔ ان کے جانشین فلابیر گانکور اور ڈاؤڈے کی شہرت اور کامیابی کا راز ان کے تخلیقی کارناموں میں نہیں ہے بلکہ وہ طباعی ہے جس نے فطرت کو اصل کے مطابق کر دکھایا۔

سچ ہے کہ ناول نویس کو کچھ نہ کچھ گڑھنا بھی پڑتا ہے، پلاٹ تیار کرنا ہوتا ہے جس کا انجام خوشی ہو یا غم لیکن یہ چیزیں بآسانی مل جاتی ہیں۔ گرد وپیش کے روزانہ واقعاتِ زندگی پر نظر دوڑانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ بریں وہی واقعات ضبط تحریر میں لائے جاتے ہیں جو اشخاص ناول کے ساتھ ساتھ منتقل ہوتے جاتے ہیں۔ صرف اتنا ہے کہ انسانی ڈراما میں ان کو فطرت کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔ ناول نویس کو دھیان رکھنا چاہیئے کہ اس کی تصنیف کا خیالی حسن حقیقت میں مضمر ہے۔ افراد اور ماحول کے انتخاب میں دقت نظر اور مطالعہ کی ضرورت ہے، لہذا سب سے اہم صفت جو ناول نویس میں ہونا چاہیئے قوت اختراع نہیں ہے بلکہ حقیقت کا صحیح اندازہ ہے یعنی ایسی قابلیت جس سے فطرت اپنی اصلی حالت میں آنکھوں کے سامنے آجائے۔ بدقسمتی سے بہت کم لوگوں کو اس سے بہرہ ہے۔ کتنے ہی رنگ کے اندھے ہیں اور چیزوں کو دیکھا نہیں دیکھتے جیسی ہیں۔ کتنے ہی ہیں جو دیکھتے ہی نہیں۔ بعض ناقدین اس حقیقت پژوہی سے آگاہ ہو کر کہنے لگے کہ نیچرلزم محض فوٹوگرافی یا فطرت کی عکاسی ہے، لہذا منکر ہوگئے کہ اس کو فن کا رتبہ حاصل ہے۔ لیکن یہ غلطی ہے نیچرلسٹ اسکول حقیقت وراستی کے وفادارانہ اتباع پر ناز کرتا ہے مگر اسی کے ساتھ اپنی تخلیق کو حیات بخشنے کا بھی دعویدار ہے۔ یہ کیفیت اسی انفرادی طرز ادا سے پیدا ہوتی ہے جسکا حوالہ دیا جاچکا۔ گو نیچرلسٹ تخیلہ کو اس اعتبار سے رد کردیتے ہیں کہ اصلی چیزوں میں مصنوعی کا اشتمال کیوں ہو تاہم وہ اپنی تمام کوشش اس مقصد کی تکمیل میں صرف کردیتے ہیں کہ راستی ایک ذی روح شی بن جائے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں جسکا ثبوت یہ ہے کہ نسبتاً بہت کم ناول نویس کامیاب ہوتے ہیں۔

## (۳) "بیانیہ حصوں کی نسبتی اہمیت"

ناول کا پلاٹ یا موضوع اور اس کے کیریکٹر ہی سب کچھ نہیں ہیں۔ بیان، اور اشخاص کے لئے مخصوص فضا پیدا کرنا بھی اہم ہے۔ یہاں قوت بیان کام آتی ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہم نے تاحال ایسے اجزا کو جو محض بیانیہ میں حسب مقتضائے فن محدود نہیں کیا؛ مطلق اصول کے برخلاف ہماری تصانیف میں نیچر کی بھرمار ہے اور ہم بیں کہ کچھ ایسے ہی رامیل زولا نے آپ کو بھی مستثنیٰ نہیں کرتا۔ (اگر) جو فطرت کی محبت میں از خود رفتہ ہوجاتے ہیں۔ مناظر کی رعنائی، روشنی کی شعاعوں اور تازہ ہوا کے جھونکوں سے ان پر نشہ سا چھا جاتا ہے۔ خود ہر دو گانکور بسا اوقات مناظر کو اشخاص کا ماتحت بنانے میں کامیاب نہیں ہوتے تھے، لیکن ان کے بیانیہ اجزا کے متعلق کم سے کم اتنا تو کہا جاسکتا ہے کہ کسی خاص موضوع پر محض لفاظی نہیں ہے بلکہ اس احساسات کا مذاکرہ ہے جو کسی منظر کو دیکھنے سے ابھرتے ہیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ظاہر ہوا اور اپنے ماحول میں مدغم ہو کر اپنے جذبات کی اعصابی لرزش ماحول میں منتقل کر دی۔ ماننا پڑے گا کہ گانکور کی بیانیہ عبارتیں حد اعتدال سے متجاوز ہوگئی ہیں لیکن ان میں انسانی دلچسپی کا سامان اور زندگی کا ارتعاش ضرور موجود ہے۔

خوبیٔ بیان کے کرشمے دیکھنے ہوں تو گسیٹو فلابیر کی تصنیفات دیکھئے ہر کیریکٹر کی تصور نگری اور تکمیل میں ماحول کا عنصر ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ فلابیر اشخاص کو ماحول میں دفن نہیں کر دیتا بلکہ ماحول سے شخصیت کو نمایاں کرنے میں مدد لیتا ہے۔ اسی سبب سے اس کی تصنیف میڈم بوواری اور لاڈوکیشن سنٹیمنٹل میں اس قدر زور ہے۔ نیلام کنندہ کی فہرست اشیا کی طرح طویل بیانات سے بالزک اپنی اکثر تصنیفات میں شروع کے چند اوراق سیاہ کرکے ذوقِ سلیم کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ فلابیر نے ایسے بیانات کو اتنا مختصر کردیا کہ ضرورت بھر رہ گئے۔ وہ الفاظ میں کفایت سے کام لیتا اور صرف ضروری رنگ بھرتا تھا، صرف ضروری خط لگاتا اور ضروری نقش ونگار نمایاں کرتا تھا۔ یہی فنکاری ان تمام چیزوں کی یادگار ہوتی تھی جنہیں حذف کردیا گیا۔ باوجود اس قدر جزرسی کے اس کی تصویریں ایسی ہیں جو بھول نہیں سکتیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو اصولاً کہوں گا کہ وہ مصنف مجرم ہے جو ماحول کی نقاشی کو اس سے زیادہ دخل دیتا ہے جتنی کہ اشخاص ناول کے کردار کو مکمل اور نمایاں کرنے کو درکار ہوتی ہے (زولا نے آپ کو بھی اس الزام سے بری نہیں سمجھتا ۔ مترجم)

## (۴) ادبیات اور اخلاق

یہ مسئلہ کہ ادبیات میں اخلاق کو کس حد تک دخل ہے اختصار کے ساتھ بیان کیا جائیگا کیونکہ میرے خیالات کا سب کو علم ہے۔ نیچرلسٹ اسکول کا ناول انسانی جذبات وخواہشات کی تشریح ہوتا ہے اور ان کے اثرات مابعد کا مرقع۔ سائنسدان کو اپنے دوران مطالعہ میں کتنی ہی گھنونی چیزوں کو چھونا پڑتا ہے، یہی حال ناول نویس کا ہے۔ نیچرلسٹ کو کسی شخصیت سے سروکار نہیں ہوتا، یوں سمجھ لیجئے کہ پبلک ایک عدالت ہے اور ناولسٹ اس کا محرر۔ اس کا یہ فرض نہیں کہ نتائج اخذ کرے اور فیصلہ سنائے۔ وہ صرف مسل مرتب کرتا ہے۔ سائنسدان کا بھی یہی فرض ہے کہ واقعات کا مطالعہ کرے اور تشریح کو اس کے متعلقہ نتیجے تک پہنچا دے بغیر اس کے کہ ترتیب وتدوین

کی سرزمین پر قدم رکھے۔ واقعات موجود ہیں، تجربہ یا تجزیہ فلاں فلاں شرائط کے ماتحت عمل میں لایا گیا اور یہ نتائج حاصل ہوئے، بس یہاں سائنس کا فرض ختم ہو گیا، اگر مصدقہ واقعات سے آگے قدم بڑھایا تو قیاس کی سرحد میں داخل ہوا اور سائنس کو خیرباد کہہ کے خیالی گھوڑے دوڑانے لگا۔ یہ سائنس تو نہ ہوا۔ اسی طرح نیچرلسٹ ناول نویس واقعات کا دیانتداری سے مطالعہ کرتا اور حیطۂ تحریر میں لاتا ہے، اگر اس سے تجاوز کیا تو غلط اور دھوکا دینے والے راستوں میں پڑ کر گمراہ ہوا۔ وہ خود اپنے افسانے سے غائب ہو جاتا ہے، صرف ایسے واقعات سپرد قلم کرتا ہے جو دیکھے ہیں، حقیقت یہ ہے، پڑھنے والا کانپے یا مسکرائے اور جو نتیجہ چاہے نکالے۔ جو فرض مصنف نے اپنے ذمے لیا تھا صرف اس قدر تھا کہ اصلی دنیا و چیزیں یعنی صحیح واقعات بلا رو و رعایت اور بے کم و کاست بیان کر دے۔ جو ناول نویس اپنی شخصیت کے بل بوتے پر بدی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے یا نیکی کو سراہتے ہیں اپنی دنیا و چیزوں کی قیمت گرا دیتے ہیں، ان کی مداخلت بے سود ہونے کے علاوہ رکاوٹ پیدا کرتی ہے، تصنیف کا زور بھی گھٹ جاتا ہے۔ تصنیف سنگ مرمر کی ایسی چٹان نہیں رہتی جو پہاڑ سے تراش لی گئی بلکہ ایسی شے معلوم ہوتی ہے جو مختلف اجزا سے ترکیب دی گئی ہے جس کو مصنف کے جذبات نے اپنے رجحان کے خراد پر چڑھایا ہے۔ یاد رہے کہ جذبات میں ہمیشہ تعصب کا لگاؤ اور لغزش کا احتمال رہتا ہے۔ جو تصنیف حقیقت پر مبنی ہے لافانی ہے بخلاف اس تصنیف کے جس کو مصنف کے ذاتی جذبات کے اظہار نے بدنما کر دیا ہے، ایسی کتاب صرف ایک خاص وقت یا عہد کے لوگوں کو متاثر کر سکتی ہے۔

نیچرلسٹ ناول نویسوں پر درشتی کے ساتھ پست اخلاقی کا الزام لگایا جاتا ہے اور محض اس وجہ سے کہ نیکوکار اور بدکار کو اسٹیج پر بلا تمیز پیش کر دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بدمعاشوں کے پریڈ کی اجازت ہے بشرطیکہ خاتمۂ کتاب پر ان کو سزا دی جائے یا مصنف کے غصہ اور نفرت کا بار ان کو پیس کے رکھ دے۔ رہے ایماندار اشخاص، نقاد کہتے ہیں کہ بہت نہیں تو چند ہی سطروں میں ان کی بھلائیوں کی تعریف کر دی جائے تاکہ ہمت بڑھی رہے۔ گویا سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے کام کرنے کی بدولت جو تجزیہ کے لئے لازم ہیں ہم مجرم ٹھہرائے جاتے ہیں۔ بے وقوفوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہم جھوٹے ہیں جب کہ ہم دراصل حرف بحرف سچ بول رہے تھے، وہ کہتے ہیں، "کیا خوب! جب دیکھو بدمعاشوں کے افسانے، کبھی کوئی ایسا کیریکٹر نہیں دکھایا جاتا جس سے ہمدردی ہو۔ ایسے کیریکٹر بھی ضرور رہ سکتے ہیں خواہ فطرت کے کاموں میں تھوڑی تلبیس کو دخل دیا جائے۔ ہمارا یہی فرض نہیں ہے کہ نیکی کو ترجیح دیں بلکہ حسب ضرورت لیپ پوت بھی کر دیں تاکہ دیکھنے والے کہیں واہ کیا چوکھا رنگ ہے"۔

ہمیں یہ بھی نصیحت کی گئی کہ کسی شخص کی خوبیاں جی کھول کے بیان کرو مگر برائیوں پر خاک ڈال دو۔ خلاصہ یہ کہ ہم اس لئے مجرم ہیں کہ فطرت کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور سختی سے راستی کے پابند ہیں۔

دنیا میں کامل صحت کی طرح کامل نیکی یا ایمانداری ناپید ہے۔ انسان میں بہیمیت کی جھلک موجود ہے جس طرح توانا سے توانا انسان میں امراض کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ عام اشخاص میں تو اچھا خاصا حیوانی مادّہ ہوتا ہے۔ وہ عجیب و غریب دوشیزہ لڑکیاں عصمت و عفت کی پتلیاں، وہ بات کے دھنی جری اور وفادار نوجوان جو ناولوں کی زینت ہوتے ہیں اس دنیا کے تو ہیں نہیں۔ ان میں زندگی سے مشابہت پیدا کرنے کو بہت سی ایسی باتیں اضافہ کرنا ہونگی جو مصنف نے اپنے دل ہی میں رکھیں۔ نیچرلسٹ مصنفین نے اپنا نصب العین یہ قرار دیا ہے کہ سارا کچا چٹھا کھول دیں گے، ہم انتخاب نہیں کرتے نہ حقیقت کو فسانہ بناتے ہیں۔ اور صرف اس بنا پر کہ ایسا کرنے سے انکار کرتے ہیں ہمکو مطعون کیا جاتا ہے کہ غلیظ میں لوٹنا پسند کرتے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو ناول میں اخلاق کا سوال ان دو نظریوں میں محصور ہے، وہم پرست کہتے ہیں کہ اخلاق سدھارنے کے لئے جھوٹ بولنا ضروری ہے، نیچرلسٹ جواب دیتے ہیں کہ راستی سے انحراف کے بعد اخلاق کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ کوئی چیز اتنی خطرناک نہیں جتنی خیال پرستی ہے۔ بعض کتابیں اس دنیا کو جھوٹے رنگوں میں دکھا کر لوگوں کے دماغ میں فتور پیدا کر دیتی اور ان کو بہت ہی ہولناک و پُرخطر راستوں پر لگا دیتی ہیں۔ میں اس فیلسوفی سے بحث نہیں کرتا جسکو تہذیب کا خطاب دیا جاتا ہے نہ ان گھنونی باتوں کا جنکو دلفریب بنانے کے لئے پھولوں سے ڈھانکا جاتا ہے۔ نیچرلسٹ کسی برائی کو آراستہ نہیں کرتے، بلکہ زندگی کے تلخ سائنس سے تنبیہ کرتے ہیں، لوگوں کو حقیقت و راستی کی درسگاہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ مجھے کسی دوسرے اسکول کا علم نہیں جس نے نیچرلسٹ اسکول کی طرح اس قدر اخلاق اور یکرنگی کا ثبوت دیا ہو۔ یقیناً ہم دودھ پیتے یا تتلا تتلا کے باتیں کرنے والے بچوں کے لئے نہیں لکھتے بلکہ تمام دنیا کے واسطے لکھتے ہیں، اس دنیا کے واسطے جو گناہ و بدی و جرم و مکر و دغا سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ ہم کسی کو بری نہیں کرتے تو کسی سے عداوت بھی نہیں رکھتے، انسان کو جیسا پاتے ہیں ویسا ہی نقشہ کھینچ دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ سب دیکھ لیں تاکہ سب شفا پائیں۔ یہاں ہمارا فرض ختم ہو جاتا ہے۔ آگے عنان اختیار قوموں کے پیشواؤں اور محافظوں کے ہاتھ میں ہے۔

**لکھنے والوں سے**

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالہ میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ علمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔ (ادارہ)

# یونسکو کانفرنس

ہوائی جہاز نے پیرس کے ہوائی میدان کے گرد تین چکر لگائے اور جب اُسے نیچے اترنے کی اجازت مل گئی تو ہوا باز نے جھپٹتے ہوئے شہباز کی طرح اسکا رُخ ہوائی میدان کی طرف پھیر دیا۔ گویا ہم پورے ایک گھنٹہ اور چار منٹ میں لندن سے پیرس آن پہنچے۔ شام کے چھ بجے تھے مگر سردی کے موسم میں یہاں چار بجے سے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ہوائی میدان کی عمارتیں روشنی سے جگمگا رہی تھیں۔ ملازموں نے ہوائی جہاز کے برابر لاکر زینہ لگایا اور ہم سب مسافر ایک ایک کرکے نیچے اُترنے لگے۔

مجھے فرانسیسی زبان کا ایک لفظ نہیں آتا۔ مگر ہوائی میدان والوں نے جس شیرینی اور ملائمت سے ہمارا استقبال کیا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ فرانسیسی آداب اور قاعدے مشرقی خلوص اور رسوم سے کچھ ایسے زیادہ دور نہیں ہیں۔ آدھے گھنٹے کے اندر کسٹم والوں نے ہمارے سامان کو اور پولیس نے ہمارے پاسپورٹ کو دیکھ لیا۔ اب ہم ہوائی جہاز والی کمپنی کی ایک موٹر لاری میں بیٹھے پیرس شہر کی طرف جارہے تھے۔ ہوائی میدان خاص پیرس شہر سے کوئی دس بارہ میل پر ہوگا۔ مگر ہوائی میدان سے لے کر ہوائی اسٹیشن تک برابر پُررونق آبادی کے آثار ملے۔ بازاروں میں قہوہ خانے گاہکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ جنھیں شیشے کی دیواروں کے پیچھے بیٹھے ہم موٹر میں سے دیکھ سکتے تھے کہیں کہیں کسی ریستوراں میں رقص بھی ہو رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہ پیرس ہے جو آج سے چند مہینے پہلے جنگ کا مرکز تھا جس پر پانچ سال تک دشمن کا قبضہ رہا جس کے رہنے والوں نے لڑائی کی کٹھن منزلیں طے کیں۔ مگر پیرس کی روایتی شادمانی اور پرانی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ہوائی اسٹیشن سے ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل جا اترے۔ رات کو ذرا سی دیر کے لئے پاس ہی سڑک پر گھومنے کے لئے نکل گئے۔ مگر سفر کی تکان نہ جانے کیوں غالب آگئی تھی اس لئے جلد ہی سو گئے۔

پروفیسر سیدین میرے رفیق سفر ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں گویا آج سے ۲۵ سال پہلے انہوں نے پیرس کی سیر کی تھی اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ جس طرح لندن میں انکی رہبری میں کرتا تھا۔ پیرس میں میری رہنمائی سیدین صاحب کریں گے۔ اسکی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ سیدین صاحب فرانسیسی زبان میں اپنا مطلب خوب ادا کرلیتے ہیں اور مجھے اس میدان میں ان جیسے رہبر کی ضرورت ہے۔

دوسرے دن ۹ نومبر سے یونسکو کانفرنس کا جلسہ شروع ہو رہا تھا اسلئے صبح سے اس کی تیاری میں لگ گئے۔ تیسرے پہر پیرس کی سوبورن یونیورسٹی میں کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ سوبورن یونیورسٹی پیرس کے لاطینی حصے میں قائم ہے جہاں کی فضا پیرس کے دوسرے علاقوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس علاقے کے ریستوراں طالب علموں اور مصوروں سے بھرے رہتے ہیں۔ یہاں بازاروں میں غازے اور حسن کی نمائش کے سامان کی نسبت کتابوں کی دکانیں زیادہ نظر آتی ہیں مگر قہوہ خانوں کی اسقدر کثرت ہے کہ بلا مبالغہ اس علاقے کا سب سے بڑا کاروبار قہوہ خانوں کی نگہداشت ہی سمجھا جاتا ہے۔

آج یونسکو کانفرنس کا اجلاس دیکھنے کے لئے طالب علموں کا ہجوم کئی گھنٹے پہلے سے یونیورسٹی کے سامنے کھڑا تھا۔ مہمانوں کے خیر مقدم کے لئے سیاہ اور سرخ چغے پہنے ہوئے پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر جلدی جلدی اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ مہمانوں میں عرب کے عبا اور قبا پہنے ہوئے شیخ بھی تھے جو سعودی عرب اور مراقش سے کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔ یونان۔ چین۔ ترکی۔ ہالینڈ۔ بلجیم۔ ایران۔ مصر۔ امریکہ، برطانیہ اور پولینڈ کے نمائندے تھے جو اپنے ملک کی طرف سے کانفرنس میں بھیجے گئے تھے۔ انہی نمائندوں میں ہندوستان کے ڈیلی گیٹ بھی شامل تھے ہندوستانی نمائندوں میں راجکماری امرت کور کی خوبصورت سیاہ بنارسی ساری پر سب کی نظریں بار بار پڑتی تھیں اور سیاہ شیروانی پہنے جب ہمارے لیڈر سر رادھا کرشنن ہال میں داخل ہوئے تو ادب سے سب انکی طرف دیکھنے لگے۔

کانفرنس کے بڑے کمرے میں پلیٹ فارم پر اتحادی قوموں کے جھنڈے اور نشان اس خوبصورتی سے آراستہ کئے گئے تھے۔ کہ ان کے پھریروں کی ایک قطار سی بن گئی تھی۔ ان جھنڈوں کے نیچے پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر۔ فرانس کے وزیر اور مدبر اور یونسکو کانفرنس کے اعلیٰ عہدے دار بیٹھے تھے۔ پلیٹ فارم کے نیچے دس فرانسیسی نقیب سرخ بانات کی درباری پوشاک پہنے بُت بنے کھڑے تھے۔ ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی گیلری تماشائیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ پورے چار بجے ایک عصا بردار نے پلیٹ فارم کی پشت پر ایک دروازہ کھولا۔ نقیبوں نے نیام سے تلواریں نکال کر سلامی دی اور سب حاضرین ادب سے کھڑے ہوگئے۔ اب ہمارے سامنے فرانس کے وزیر اعظم موسیو بیدو کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ان کے آتے ہی آرکسٹرا نے فرانس کا قومی ترانہ بجایا اور فرانسیسی طالب علموں نے اسے ایسے جوش سے گایا کہ سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اس کے بعد تقریریں شروع ہوئیں۔ پیرس یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے تقریر کی۔ فرانس کے وزیر تعلیم بولے۔ برطانی وفد کے لیڈر نے کچھ کہا۔ اور سب سے آخر میں فرانس کے وزیر اعظم نے کانفرنس میں شریک ہونے والوں کا استقبال کیا۔ تقریروں کے درمیان میں فرانسیسی آرکسٹرا کے نغمے بھی سننے میں آرہے تھے۔ اس سے دماغ پر تقریروں کا زیادہ زور نہیں پڑتا تھا۔

پانچ بجے کے بعد جلسہ ختم ہوا اور

آغا محمد اشرف

ہم سب اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔

دوسرے روز ۲۰ نومبر سے کانفرنس کی کارروائی کھلے اجلاس میں شروع ہوئی۔ سب سے پہلے تمام نمائندوں نے مل کر فرانس کے مشہور سیاسی لیڈر موسیو بلوم کو کانفرنس کا صدر چنا۔ اس کے بعد یونسکو کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر ہکسلے نے اپنی رپورٹ سنائی۔ اور پھر اس رپورٹ پر بحث شروع ہوئی۔ اس بحث میں سب سے پہلی تقریر ہندوستانی ڈیلیگیشن کے لیڈر سر رادھا کرشنن نے کی۔ سر رادھا کرشنن کی فصاحت کا سکہ تمام کانفرنس پر ایسا بیٹھا کہ ہر شخص نے ان کی تقریر کی تعریف کی اور حق تو یہ ہے کہ مشرقی ملکوں کی طرف سے انہوں نے تمام دنیا کو ایسی صاف صاف باتیں سنائیں کہ شاید ان سے پہلے کسی بین الاقوامی کانفرنس میں کسی نے بلا تکلف اور اتنی جرأت سے پیش نہیں کیا تھا۔ سر رادھا کرشنن کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) جنگ کے دوران میں اتحادی ملکوں نے سب سے بڑے بڑے وعدے کئے تھے اور انسانیت اور تہذیب کو بچانے کے لئے لاکھوں لوگوں نے انہی وعدوں پر جان دی تھی۔ اب جنگ ختم ہونے کے بعد ان وعدوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔

(۲) امریکہ اور روس کے دو مختلف نظریئے ہیں۔ امریکہ شخصی آزادی کا طرفدار ہے اور روس کمیونزم کا۔ مگر روس اور امریکہ دونوں نے اتحادی قوموں کے چارٹر پر دستخط کئے ہیں جس کی رو سے ہر شخص کو کچھ حقوق ملتے ہیں۔ اسی چارٹر نے تمام قوموں کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ چھوٹی اور بڑی قومیں نئی دنیا بنانے میں برابر کی شریک ہیں۔ اس نئی دنیا کی تعمیر میں رنگ اور نسل کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔

(۳) یونسکو کے پروگرام میں ان ملکوں اور قوموں کی بھلائی اور بہبودی بھی شامل ہے جنہیں جنگ سے نقصان پہنچا ہے۔ مشرقی ملک بھی اس پروگرام میں شریک ہونے چاہئیں۔ کیونکہ ان علاقوں میں جنگ کے بغیر بھی جہالت، دق کی بیماری اور غربت کی مصیبتیں چھائی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ جنگ نے مشرقی ممالک کو اور بھی نقصان پہنچایا ہے۔

(۴) بڑی قوموں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں صرف یورپ اور امریکہ کے ملک ہی نہیں بستے بلکہ دنیا میں ہندوستان اور چین جیسے بڑے بڑے ملک بھی موجود ہیں۔ جب یونسکو کا کام کرنے کے لئے افسر مقرر کئے جائیں تو اس وقت ہندوستان کو بھی برابر کا حصہ ملنا چاہیئے کیونکہ ہمارے ملک والوں میں بھی کام کرنے کی صلاحیت ہے۔

سر رادھا کرشنن کے علاوہ اس جلسے میں پروفیسر سیدین نے بھی تقریر کی اور ان کی تقریر کو بھی سب نے بہت پسند کیا۔ پروفیسر سیدین نے اس بات پر زور دیا کہ دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے بڑی بڑی رسدگاہوں سے زیادہ امن اور صلح کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ راجکماری امرت کور نے اپنی تقریر میں یہ تجویز پیش کی کہ یونسکو میں ہاری ہوئی قوموں کو بھی شرکت کی دعوت دی جانی چاہیئے۔

پروفیسر بھابھا کو یونسکو کی سائنس کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا، اور ان کی تجویز سے یہ بات منظور ہو گئی کہ ہندوستان میں غذا کی چھان بین کرنے کے لئے ایک مرکز قائم کیا جائے تاکہ ان تجربوں سے قحط کی بلا دور کرنے میں مدد ملے۔

یونسکو کانفرنس کے موقعہ پر ہندوستان کی طرف سے بہت سی آرٹ کی تصویریں بھی نمائش میں بھیجی گئی تھیں جنہیں سب نے بہت پسند کیا۔ ہندوستانی مختصر فلم بھی اس دوران میں پیرس میں دکھلائے گئے اور پیرس یونیورسٹی کی انجمن ہند نے ہندوستانی ڈیلیگیٹوں کی دعوت کی۔ اس دعوت میں بہت سے فرانسیسی مستشرق شریک ہوئے اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پیرس یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانیں پڑھانے کا انتظام بہت اچھا ہے۔ ۹ دسمبر کی شام کو پیرس میں پروفیسر سیدین نے اقبال پر ایک لکچر بھی دیا جسے سننے کے لئے بہت سے لوگ آئے تھے۔

غرض یونسکو کانفرنس ہندوستان کے نقطۂ نظر سے بے حد کامیاب رہی اور اس میں ہندوستان کے نمائندوں کا حصہ ہر لحاظ سے قابل اطمینان تھا۔ انگلستان کے مشہور ادیب مسٹر پریسٹلے نے لندن کے اخبار ڈیلی ہیرلڈ میں یونسکو پر ایک مضمون لکھا تھا اس میں مسٹر پریسٹلے لکھتے ہیں:-

"دماغی اور جسمانی اعتبار سے اگر یونسکو میں شریک ہونے والے نمائندوں کے لئے کوئی انعام مقرر ہوتا تو اس قسم کا اول انعام میں ہندوستانی نمائندوں کو دیتا"

یونسکو کانفرنس ابتدائی اجلاس کے بعد مختلف کمیٹیوں میں بٹ گئی تھی اور اس کی ہر کمیٹی میں ہندوستانی ڈیلیگیٹوں کا حصہ بہت نمایاں تھا۔ پیرس یونیورسٹی نے اس موقعے پر دنیا کے بڑے بڑے مفکروں اور عالموں کو لکچر دینے کے لئے بلوایا تھا۔ ان مقرروں میں ہندوستان کے نمائندے سر رادھا کرشنن بھی شامل تھے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ سر رادھا کرشنن کی تقریر ہندوستانی تہذیب کے موضوع پر اپنی قسم کی بہترین تقریر تھی۔ اپنی تقریر میں انہوں نے ہندوستان کی تہذیب کا قرون وسطیٰ سے لے کر موجودہ دور تک کا نقشہ ایسی خوبی سے کھینچا تھا کہ ہندوستان کے بارے میں جو غلط فہمیاں عام طور سے غیر ملکوں میں رائج ہیں ان کا خاتمہ ہو گیا۔

یونسکو کانفرنس کے جلسوں میں انگریزی یا فرانسیسی زبانوں میں تقریر کی جاتی تھی اور پھر تقریر کا فوراً دوسری زبان میں ترجمہ سنا دیا جاتا تھا۔ مجھے مترجموں کی مہارت اور ان کا کمال دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ پہلے یہ تقریر کو شارٹ ہینڈ میں لکھ لیتے تھے اور پھر بے تکلف اس کا انگریزی سے فرانسیسی میں یا فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ کر کے سنا دیتے تھے۔ چنانچہ جب ریڈیو کے موضوع پر میں نے تقریر کی تو اس کا بھی ترجمہ فرانسیسی زبان میں سنایا گیا اور بعد میں میں نے فرانسیسی ترجمہ اصل سے ملا کر دیکھا تو رتی برابر اس میں فرق نہیں تھا۔

یونسکو کا ہیڈ کوارٹر پیرس کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں ہے اور اسے اب یونسکو ہاؤس کہا جاتا ہے۔ اس میں کئی سو کمرے ہیں اور اسکا بندوبست ایسا عمدہ ہے کہ یہ ہوٹل خود ایک مختصر سا شہر بن گیا ہے۔ کھانے پینے کے لئے ریستوران، خط اور تار بھیجنے کے لئے ڈاک خانہ۔ تصویریں لینے کے لئے فوٹوگرافر، کتابیں اور اخبار بیچنے کے لئے کتابوں کی دکان۔ بنک۔ تھیٹر سینما کے ٹکٹ خریدنے کی جگہ۔ ہوائی جہاز اور ریل کے سفر کا بندوبست کرنے کے لئے دفتر، ہسپتال راشن کی دکان۔ غرض دنیا کا ہر کام یونسکو ہاؤس میں ہو سکتا ہے۔ اس چھوٹی سی بستی میں ۴۸ قوموں کے نمائندے جمع ہیں۔ مگر سب کی آنکھیں اس انجمن میں بار بار روسی نمائندوں کو تلاش کرتی ہیں۔ کیونکہ ابھی تک روس یونسکو میں شامل نہیں ہوا۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے لئے یونسکو نے ساڑھے سات ملین ڈالر کا بجٹ منظور کیا ہے۔ یہ رقم تمام قومیں مل کر ادا کرینگی اور یونسکو کے پروگرام کو دیکھا جائے تو ۷½ ملین ڈالر کی رقم کچھ ایسی زیادہ بھی نہیں ہے۔ جب ہمارے سامنے ایک ایسی نئی دنیا بنانے کا سوال ہو کہ جس میں شہریوں کو امن و امان اور صلح صفائی سے رہنے کے طریقے بتلائے جائیں گے۔ دنیا کی قوموں میں آپس میں رنجشیں دور کر کے انہیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقعہ دیا جائے گا۔ دنیا بھر کے ملکوں میں جہالت دور کرنے کی کوشش ہوگی اور سائنس کو انسانی ترقی کے لئے استعمال کیا جائیگا تو پھر ان فائدوں کے سامنے یہ رقم کوئی ایسی زیادہ معلوم نہیں دیتی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یونسکو سنہ ۱۹۴۷ء میں اپنا پروگرام کس حد تک پورا کرتی ہے۔

سب سے آخر میں مجھے فرانس کی گورنمنٹ کا ذکر کرنا ہے۔ کیونکہ کانفرنس کے دوران میں فرانسیسی حکومت نے جس فراخدلی اور خلوص سے اتحادی قوموں کی خاطر مدارات کی اسکا ہم سب پر بہت اثر ہوا۔ فرانس ابھی تک جنگ کی مشکلوں میں سے گذر رہا ہے، ملک میں بے حد گرانی ہے۔ جنگ کی وجہ سے فرانس کو جو نقصان پہنچا ہے اور اس کی روح جس طرح گھائل ہے ان زخموں کے بھرنے میں بہت عرصہ لگے گا مگر ان مشکلوں کے باوجود فرانس کی حکومت نے کانفرنس کے نمائندوں کے آرام کا بندوبست بہت اچھا کیا۔ ہر وقت سواری کے لئے موٹریں موجود تھیں۔ ہر روز فرانسیسی حکومت کی طرف سے دعوتیں ہوتی تھیں اور فرانس کے مشہور تھیٹر کانفرنس کے نمائندوں کی دلچسپی کے لئے اپنے آرٹ کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اگرچہ بعض لوگوں کو اس بات پر اعتراض ہے کہ یونسکو کا صدر مقام پیرس کو کیوں بنایا گیا۔ مگر چونکہ یونسکو اتحادی قوموں کے کلچر تعلیم اور سائنس کی سب سے بڑی انجمن ہے اس لئے اسکا صدر مقام بھی پیرس جیسا شہر ہی ہونا چاہیئے تھا جو کئی سو سال سے آرٹ۔ تہذیب، فنونِ لطیفہ اور علم و ہنر کا مرکز رہا ہے ✦

## ایک رنگین یاد ——— وجدی بنگلوری

یاد آتے ہیں مجھے وہ مے گساری کے مزے
وہ نگاہِ کیف زا کی کیف باری کے مزے

انتظارِ دوست میں وہ شب گذاری کے مزے
آہ و زاری کے مزے اختر شماری کے مزے

وہ کسی کی کم نگاہی بے رخی چینِ جبیں
وہ مرے جوشِ وفا وہ جاں نثاری کے مزے

وہ رباب و چنگ وہ دلکش جوانی کی بہار
وہ شکستِ توبہ اور وہ بادہ خواری کے مزے

وہ جمالِ جانستاں کا جلوۂ مستی فروش
وہ نگاہِ شوق کی بے اختیاری کے مزے

اللہ اللہ وہ ہماری باہمی سرگوشیاں
چاندنی راتوں میں پھر دل رازداری کے مزے

وہ جبینِ شوق میں بے تابیٔ شوقِ سجود
جبہ سائی کے مزے پھر اشکباری کے مزے

عشق کی فریاد پر وہ حسن کی بے مہریاں
وہ شکستِ آرزو پر شرمساری کے مزے

دن کی وہ بیتابیاں راتوں کی وہ بے خوابیاں
وہ ہماری اشکباری بے قراری کے مزے

ہجر کی بے کیف راتیں وصل کی وہ حسرتیں
جانِ مضطر کی تڑپ شب زنده داری کے مزے

عشق کی بیتابیوں پر مسکرانا دیر تک
پھر نگاہِ حسن کی وہ غمگساری کے مزے

داستانِ بے کسی رو رو کے وہ کہنا مرا
وہ نگاہِ شرمگیں کی شرمساری کے مزے

مجکو آدابِ محبت کا وہ ہر لحظہ خیال
اور وہ ان کی وفا کی پاسداری کے مزے

ہائے وہ آزادیاں ہر روز حسن و عشق کی
آہ وہ ہر وقت کی بے اختیاری کے مزے

اب نہ وہ ساقی ہے اے وجدی نہ وہ دورِ نشاط
بارغِ عشرت کی زمانے نے اُلٹ دی ہے بساط

# سچی کہانی

افسانہ

صادق قریشی

نوراں، تم کہتی ہو کہ کوئی سچی کہانی سناؤں۔ بادشاہوں اور شہزادیوں کے قصوں سے شاید تم اکتا گئی ہو۔ میں کل سے سوچ رہی تھی کہ تمہیں کونسی سچی کہانی سناؤں۔ آخر بچپن کی راز دار سہیلی کی بھولی بسری داستان یاد آئی ہے۔

بڑھیا نے یہ کہہ کر ایک انگڑائی لی۔ اور آنکھوں کو اچھی طرح ملا۔ اس کی پوتی نوراں ٹھوڑی پر ہاتھ دھرے اس کے جھریوں والے چہرے کی طرف تک رہی تھی۔ چاند کی چاندنی کیکر کی ٹہنیوں میں سے چھن چھن کر ان کی چارپائی پر پڑ رہی تھی۔

نوراں نے اٹھ کر دیوار کے پار جھانکا اور ادھر ادھر دور تک نگاہیں دوڑائیں۔

"چراغ بیلوں کو باندھ گیا ہے؟" بڑھیا نے نوراں کے چارپائی پر واپس آنے کے بعد پوچھا۔

"یہی میں دیکھنے گئی تھی۔ بیل بندھے ہیں۔ چھوڑ گیا ہوگا۔ اچھا تو اماں۔ اب شروع کرو نا وہ داستان!"

"نوراں، یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہ کیکر کا درخت چھوٹا بچہ سا تھا۔ آٹا پیسنے کی مشینوں۔ موٹروں اور ریل گاڑیوں کا کسی نے نام بھی نہ سنا تھا۔ آج تو تم جا کر گھڑی بھر میں من دو من آٹا پسوا لاتی ہو۔ اس وقت گھر گھر سے صبح سویرے چکی کی گھوکر اٹھتی تھی۔ یہ قصہ ریشمے نامی ایک جوان لڑکی کا ہے۔ وہ بھی چکی خوب پیسا کرتی تھی۔ بھرا گھر تھا۔ کھانے پینے کو عام تھا۔ ڈھور ڈنگر۔ نوکر چاکر دو تین سو بیگھے زمین بہت بڑی حویلی اور عیش و آرام کی سب چیزیں موجود تھیں۔"

"جیسے چوہدری الہ داد کے پاس ہیں" نوراں نے کہا۔

"ہاں بالکل ایسے ہی۔ ریشمے کا باپ بھی چوہدری تھا۔ ریشمے جوان تھی۔ سڈول بھرا ہوا جسم۔ لال انگاروں جیسے گال۔ گورا چہرا۔ سیاہ آنکھیں..."

"اماں۔ تمہارا رنگ بھی تو گورا ہے۔ جوانی میں تم بھی بہت خوبصورت ہوگی"۔

"دیکھو کہانی میں ادھر ادھر کی باتیں نہ کرو، میں کہاں کی گوری ہوں۔ ریشمے تو شہری عورتوں کی طرح سرخ و سفید تھی۔ جب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ باہر نکلتی تو گاؤں کے نوجوان کسی نہ کسی بہانے اسے دیکھنے کے لئے اس کے پاس سے گذرتے۔ ان نوجوانوں میں ایک کریم بھی تھا۔ جوان کا مزارع تھا۔ کریم ان کے گھر بھی اکثر آیا جایا تھا۔ کبھی بیلوں کو باندھنے جاتا۔ کبھی چارہ کاٹنے، کبھی کسی کام، کبھی کسی۔ ہر بار وہ نظر بچا کر ریشمے کو ضرور دیکھ لیا کرتا تھا۔"

"اور ریشمے بھی اسے دیکھا کرتی تھی؟" نوراں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں ہاں، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ریشمے کے دل میں بھی اس کی چاہ پیدا ہوگئی"۔

"اماں کیا یہ سچ ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے؟" نوراں نے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے"۔

"یہ تو بات سے بات نکلتی ہے۔ تم نے جو ایسی بات شروع کر رکھی ہے"۔ نوراں نے شرما کر کہا۔

"اچھا۔ میں یہ بات ہی نہیں سناتی۔ کوئی اور ذکر کرتی ہوں"۔

"نہیں نہیں اماں۔ اب میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔ یہی کہانی سناؤ۔ میں اور کچھ نہیں سنوں گی"۔

"اچھا تو پھر کریم اور ریشمے میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ گھر والوں کی آنکھ بچا وہ کہیں نہ کہیں کھڑے ہو کر دو ایک باتیں کر لیتے۔ کبھی وہ کنوئیں پر ملتے۔ کبھی کھیتوں کے کنارے"۔

"بھلا کیا باتیں ہوں گی وہ؟" نوراں پھر پوچھ بیٹھی۔

"بس محبت پیار کی باتیں۔ کریم کہتا — ریشمے تمہیں نہ دیکھوں تو مجھے چین نہیں آتا —"

اس وقت نوراں نے دیکھا کہ بڑھیا کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوگئی ہے۔

"ریشمے جواب دیتی! کریم میرا دل ہر وقت تمہارے ساتھ رہتا ہے۔ ایک چاندنی رات کو وہ دونوں کھیتوں کے کنارے ملے۔ کریم نے کہا — ریشمے میں بڑی دیر سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ دل ڈرتا ہے کہ پوچھوں یا نہ پوچھوں۔ آج میں نے ٹھان لی ہے کہ پوچھ ہی لوں گا۔ بات یہ ہے کہ میں تم سے بیاہ...... اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور آواز بھرا گئی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک معمولی مزارع ہے۔ اور ریشمے زمیندار کی بیٹی ہے۔ عین اس وقت دور کسی کے قہقہہ لگانے کی آواز آئی۔ وہ دونوں ڈر گئے۔ کریم کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا مذاق اڑایا ہے۔ کھیتوں میں فصلوں کی سائیں سائیں بھی پراسرار معلوم ہونے لگی۔ یہی فصلیں اور کھیت ان دونوں کی زندگی کی راہوں میں حائل تھے۔ چند لمحوں کے لئے دونوں خاموش رہے۔ کریم پھر آہستہ سے بولا — "ریشمے مجھے معاف کر دو۔ میں نے بہت بڑی بات منہ سے نکالی ہے۔ یہ میری دیوانگی ہے۔ کہاں گاؤں کے بڑے زمیندار کی چاند سی بیٹی اور کہاں ان کے کھیتوں میں کام کرنے والا ایک مفلس اور قلاش مزارع۔ جس کا نہ گھر ہے نہ گھاٹ۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔ چچا کے روکھے سوکھے ٹکڑوں پر پلتا رہا ہے —— اس کی آواز پھر بھرا گئی۔

ریشمے نے بات کاٹ کر کہا — بس بس کریم، میری نظروں میں تم سب کچھ ہو۔ میرا بس ہو تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ تیرے ساتھ چل دوں۔ حویلیوں

اور پکے مکانوں کو پھوس کی ایک جھونپڑی پر قربان کر دوں۔ ریشمی کپڑوں کو پھونک دوں اور گھر کے کتے ہوئے کھدر کو ریشم سے بڑھ کر سمجھوں......"

نوراں نے اس موقع پر پھر دخل دیتے ہوئے کہا۔ "اماں کیا سچ مچ کسی کی خاطر سب کچھ قربان ہو سکتا ہے؟ امیر آدمی غریبوں کے لئے اپنا دولت عیش آرام چھوڑ سکتے ہیں؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ رانجھا ہیر کی خاطر اپنی ساری زمینداری چھوڑ چھاڑ ہیر کا چاک بن گیا تھا۔ سسی پنوں کے لئے تھل میں......"

"چھوڑو چھوڑو اماں ان باتوں کو۔ مجھے جلدی بتاؤ ریشمے نے کیا کیا؟" نوراں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

"کرنا کیا تھا۔ وہ مجبور تھی۔ اس کے ماں باپ اس کی شادی کے سلسلے میں دوسرے گاؤں کے کسی چوہدری سے بات چیت کر رہے تھے۔ اس نے کریم کو یہ سب حال کہہ سنایا۔ اور اپنی بے بسی اور مجبوری کا ذکر کیا۔"

کریم نے کہا۔ "اگر تو مجبور ہے تو پھر دیکھ۔ خدا کی اس پاک خشک مٹی پر بیٹھے ہوئے میں اقرار کرتا ہوں کہ اگر تجھ سے شادی نہ ہوئی تو...." ریشمے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا کے لئے کچھ نہ کہو۔ خدا کے لئے کچھ نہ کہو" مگر وہ ہاتھ چھڑا کر کھڑا ہو گیا اور بولا "اے چاند تو میرا گواہ ہے میں تیرے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ اگر میرا بیاہ ریشمے سے نہ ہوا تو ساری عمر کنوارا رہوں گا"

اب پھر اسی قہقہے کی آواز آئی۔ دونوں کا دل دہل گیا۔ ریشمے نے کہا۔ اب ہمیں گھر جانا چاہئے۔ دونوں چپ چاپ گھر کو واپس آ گئے۔

"اماں یہ قہقہہ کون مارتا تھا؟" نوراں نے پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں۔ درختوں میں الو بولتا تھا اور اس کی آواز قہقہے سے ملتی جلتی تھی۔ پھر تو بیٹی پھر یہ ہوا کہ ریشمے کی شادی جلد ہی پڑوس کے گاؤں میں ایک زمیندار کے بیٹے سے کر دی گئی۔ باپ نے بیٹی کو زیور سے لاد دیا۔ اور شادی پر اتنا دل کھول کر روپیہ خرچ کیا کہ دور دور تک واہ واہ مچ گئی۔ کیوں نہ ہوتا۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔"

"اور کریم کا کیا بنا؟" نوراں نے غمگین سی صورت بنا کر پوچھا۔

"کریم اس شادی سے ایک دن پہلے گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ ریشمے سے کہہ گیا۔ ریشمے، دنیا میں غریب آدمی کی کوئی قدر نہیں۔ خدا ترا سہاگ قائم رکھے۔ جس لڑکے کے ساتھ تیری شادی ہوئی ہے وہ مریض ہے۔ بدصورت ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آوارہ ہے۔ میرا بس چلے تو اپنے چاند کو یہ گہن نہ لگنے دوں۔ مگر اس کے پاس سب عیبوں کو ڈھانپ لینے والی سونے چاندی کے تاروں سے بنی ہوئی چادر ہے۔ یہ چادر جس کے پاس ہو اس کے سب عیب خوبیاں بن جاتے ہیں۔ اور جس کے پاس نہ ہو اس کی خوبیاں بھی عیب نظر آتی ہیں۔ اچھا ریشمے خدا تمہیں خوش رکھے۔ آباد رکھے۔ اپنے غریب چاہنے والے کو بھول نہ جانا۔"

"اماں! میں پھر ایک بات پوچھوں؟ کیا کریم نے ریشمے کے ماں باپ سے شادی کا ذکر نہیں کیا تھا؟" نوراں نے پریشان سی صورت بنا کر پوچھا۔

"او ہو یہ تو میں بتانا ہی بھول گئی۔ ریشمے نے ایک دن اپنی ماں سے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔ ڈرتے ڈرتے اور سہم سہم کر۔ ماں نے کہا۔ بیٹی ہوش کی دوا کر۔ یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ خیر وار، جو پھر اس کا ذکر بھی تو نے کیا۔ تیرے باپ کے کان میں اس بات کی بھنک پڑ گئی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بیٹیاں ایسی باتیں نہیں کیا کرتیں۔ کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیوں کو کنگالوں کے ساتھ کیونکر باندھا جا سکتا ہے۔ چوہدری کی اینٹ کو دوری ہے، کون لگاتا ہے؟ ریشمے نے یہ سب کچھ سنا۔ اور اپنے دل پر پتھر رکھ کر چپ ہو گئی"

"اور پھر سسرال میں جا کر خوش خوش رہنے لگی؟" نوراں نے ناک چڑھا کر طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"تو اور کیا کرتی۔ عورت کی شادی جس مرد سے کر دی جائے وہ اسے پسند ہو یا ناپسند۔ اس کی خدمت کرنا اس کا فرض ہو جاتا ہے۔ ریشمے نے بھی سچے دل سے اپنے خاوند کی خدمت میں وقت گزارنا شروع کیا۔ وہ آدمی ویسا ہی تھا جیسا کریم نے کہا تھا۔ شراب پینا اور بدمعاشوں کے ساتھ دن رات باہر پھرتے رہنا اس کا کام تھا۔ کئی مرتبہ ریشمے بیچاری ساری ساری رات اس کے انتظار میں گزار دیتی۔"

"اسے کریم یاد نہیں آتا تھا؟" نوراں نے پوچھا۔

"آتا کیوں نہیں تھا۔ اس کے گاؤں سے جو بھی آتا اس سے کسی نہ کسی بہانے کریم کی بابت ضرور پوچھتی۔ مگر اسے ایک ہی جواب ملتا — کریم

## غزل

مسعود حسین

جاں بھی پرسوز ہوا انجام تمنا کیا ہے
کوئی مبتلائے رہ جینے کا بہانہ کیا ہے

میری آنکھوں میں نمی بھی ہو تو واشگاف کیا ہے
جس کو کوئی بھی نہ دیکھے وہ تماشا کیا ہے

وہ نہ چاہیں تو مزہ چاہ میں بھی خاک ملے
ہم انھیں چاہیں بھی بغرض تو تولیا ہے

جی سلگتا ہے سلگتا رہے جلتا ہے جلے
ایسی باتوں سے بھلا عشق میں بنتا کیا ہے

ایک ہی بات کہ چاہت میں سمجھتے نہ تھی
وہ کبھی شوق بھی بڑھتا ہی تو گھٹتا کیا ہے

عقل سمجھائے گی بہلائے گی پھسلائے گی
دل کی چھلنی سے یہ پیمانہ چھنتا کیا ہے

ہم سے منسوب ہیں امید و تمنا و خیال
کوئی دیکھے تو ذرا آپ کا نقشا کیا ہے

تو جب سے گیا ہے پھر واپس گاؤں میں نہیں آیا۔ اسی طرح دن اور مہینے گذرتے گئے۔ رشیمے کبھی میکے جاتی کبھی سسرال۔ اس کے شوہر کا حال بد سے بدتر ہوگیا۔ ادھر اس کے باپ کی قسمت کا ستارہ بھی گردش میں آنے لگا۔ بیٹی کی شادی پر جو جمع تھی سب خرچ ہوگئی۔ اگلے سال فصلیں اچھی نہ ہوئیں اور اسے اپنے بڑھتے ہوئے خرچ کو پورا کرنے کے لئے قرض لینا پڑا۔ پھر یہ حالت رہنے لگی کہ کبھی دو پیسے ہاتھ میں اور کبھی سر پر۔

"اور کریم کا پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں چلا گیا؟" نوراں نے پوچھا۔

"کریم کچھ دور ایک گاؤں میں چلا گیا تھا۔ اور وہاں کے بڑے زمیندار کے کھیتوں میں اس نے کام شروع کر دیا تھا۔ محنتی اور جفاکش تو تھا ہی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے اپنا سا مکان بنا لیا۔ وہ آرام سے زندگی کے دن کاٹنے لگا۔"

"اب رشیمے کی سنو۔ اس کے میاں دو سال بعد کچھ دن بیمار رہ کر چل بسے۔ شراب نوشی کی لت نے اس کی صحت تباہ کر رکھی تھی۔ آخر مر ہی گئے۔ بیچاری کی قسمت کو ٹھوکر ہی چھوڑ گئے ... کے بعد اس کا باپ اسے اپنے گاؤں واپس لے آیا۔ کریم بھی اپنے ماں باپ سے ملنے کے لئے آیا۔"

"اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی؟" نوراں قدرے خوش ہو کر بولی۔

"نہیں، اس کا تعلق رشیمہ سے ... تھا۔ کچھ عرصہ بعد رشیمے کے ماں باپ نے کریم کو بلایا ... اس سے رشتہ کی خواہش ظاہر کی۔"

"یہ بھی بہت اچھا ہوا کہ کریم کی دوسری جگہ پہلے کی درخواست کا علم رشیمے کے باپ کو نہیں ہوا تھا۔ ورنہ مردوں کی غیرت رشیمے اور کریم کے رستے میں آڑے آتی۔" نوراں نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

"شاید ایسا ہی ہوتا۔ بہر حال کریم اور رشیمے کی شادی ہوگئی۔ اور رشیمے کریم کے گاؤں میں جا کر آرام کی زندگی بسر کرنے لگی۔"

"آخر بچھڑے دلوں کو خدا نے ملا دیا۔ کیا اب بھی دونوں میں ... ویسی ہی محبت تھی؟" نوراں نے سوال کیا۔

"ہاں، وہ بدستور ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور عمر بھر چاہتے رہے۔"

"اب کیا وہ مر چکے ہیں؟" نوراں نے پھر پوچھا۔

"کریم۔ خدا اسے مغفرت کرے۔ خدا کو پیارا ہو چکا ہے۔ رشیمہ ابھی زندگی کے آخری دن کاٹ رہی ہے۔"

"کہاں رہتی ہے وہ بڑھیا۔ میں اسے ملنا چاہتی ہوں؟" نوراں نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹی کسی کو بتانا نہیں۔ رشیمے میں ہی ہوں۔ تمہاری دادی۔"

نوراں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "سچ کہتی ہو اماں؟ سچ؟ — مگر تمہارا نام رشیمے تو نہیں۔"

"نہیں یہ رشیمے کریم ہم دونوں نے اپنے فرضی نام رکھے تھے۔ یہ ہمارے گاؤں کے تین چار چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیوں کے نام تھے۔ شادی سے پہلے وہ مجھے رشیمے کہا کرتا تھا اور میں اسے کریم کے نام سے بلاتی تھی۔

اچھا بیٹی اب جاؤ سو رہو۔ اپنی بڈ بیتی تمہیں سنا چکی ہوں۔ صرف تمہارے اصرار پر کہ کوئی نئی کہانی سناؤں۔ کسی اور کو نہ سنانا پھرنا۔"

بڑی اماں سونے کے لئے چارپائی پر دراز ہوگئیں۔ نوراں اٹھی۔ اور اپنے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے نام یاد کرنے لگی۔ جمیداں، شریف یہ دونوں نام اسے پسند آئے۔

اگلے دن وہ کھانا لے کر کھیت کو جا رہی تھی تو چودھری الہ داد کا بیٹا شریف اسے حسب معمول رستے میں ملا۔

نوراں آج پہلے سے زیادہ خوش نظر آتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

"نورا! آج تم نے بہت دیر کر دی۔"

"آج سے آپ کا اور میرا نام شریف اور جمیداں رہے گا۔" نوراں نے آہستہ سے کہا۔

"تاکہ اگر ہم ایک دوسرے کا نام لیں تو کسی کو شک نہ گذرے۔"

"میں حیران ہوں نورا نہ نہ جمیداں یہ تم نے اتنی عقل کہاں سے سیکھی ہے؟"

## سہانا خواب

شمع کی مانند، جلتا ہوں مگر خاموش ہوں
چشم تر سے اشک حسرت ہیں رواں
جانتا ہوں میں کہ تم نزدیک ہو کر دور ہو
اور حائل ہیں ہمارے درمیاں وہ مشکلات
جن کا حل شاید کسی تدبیر سے ممکن نہیں
آہ اپنی بے بسی کو دیکھ کر
غرق ہو جاتا ہوں بحرِ یاس میں
پھر بھی، — جیسے گھُپ اندھیری رات میں
برق کا شعلہ چمک جائے ذرا سی دیر کو
اور تھوڑی دور سطحِ آب پر آئے نظر
ایک منظرِ دلفریب

ناؤ میں بیٹھی ہوئی اک نازنیں
جانے کہاں جاتی ہوئی
چار سو پانی میں ہوں بکھرے ہوئے پرکیف پھول
دیدہ زیب و دلفریب!
اور یہ نظارۂ رنگیں چھُپے
دفعتاً پھر رات کے ظلمات میں ——

اے دلربا!
جب کبھی تم سے ملاتا ہوں نگاہ
ایک جلوہ دیکھتا ہوں اس سہانے خواب کا
جس کی رنگینی ہے رشکِ نزہتِ باغِ جناں
آہ! پھر؟
غرق ہو جاتا ہوں بحرِ یاس میں

سیفی سوپوری

## ایک ملاقات

تعارف کرنے والے نے تو میری آن رکھلی تھی
مگر کچھ اس طرح اٹھی نگاہِ بے نیاز انہ
کہ خود میری ادائے شاعری کہنے لگی مجھ سے
تم! اور افسانوی خاتون سے اسطرح گھبرانا!

سنا ہے ان کو مجھ سے مل کے مایوسی ہوئی لیکن
خدا شاہد ہے، ان کو سوچ کر میں کانپ جاتا ہوں
نہ جانے کیوں غرورِ صنفِ نازک ہی کی شہ پاکر
میں ان کی زندگی کی تلخیوں کو بھانپ جاتا ہوں

بہر صورت، مجھے جینا ہے، جی لوں گا۔ یہ ظاہر ہے،
ہماری زندگی بھی ساحرِ ماحول کا فن ہے
مگر آہستہ چل، آہستہ چل، اے سرپھری دنیا!
کہ میرے کانپتے ہاتھوں میں اب تک تیرا دامن ہے!!

سلام مچھلی شہری

## پنچھی سے

اُڑ جا اس بستی سے پنچھی! —— اُڑ جا بھولے پنچھی!
یاں گھر گھر دکھیوں کا ڈیرا
جیون اپنا رین بسیرا
چھایا ہے گھنگھور اندھیرا
دور ابھی ہے سکھ کا سویرا
اُڑ جا اس بستی سے پنچھی! —— اُڑ جا بھولے پنچھی!
اس بستی کے رہنے والے
غربت کے غم سہنے والے
دکھ ساگر میں بہنے والے
اُڑ جا اس بستی سے پنچھی! —— اُڑ جا بھولے پنچھی!
پھوٹ رہے ہیں خون کے سوتے
حال ہوا یہ ہوتے ہوتے
کڑھتے کڑھتے روتے روتے
جیون گذرا روتے دھوتے
اُڑ جا اس بستی سے پنچھی! —— اُڑ جا بھولے پنچھی

کرشن موہن



چھوٹے کمرے کے ایک حصے پر یہ چند نقوش باقی رہ گئے ہیں۔

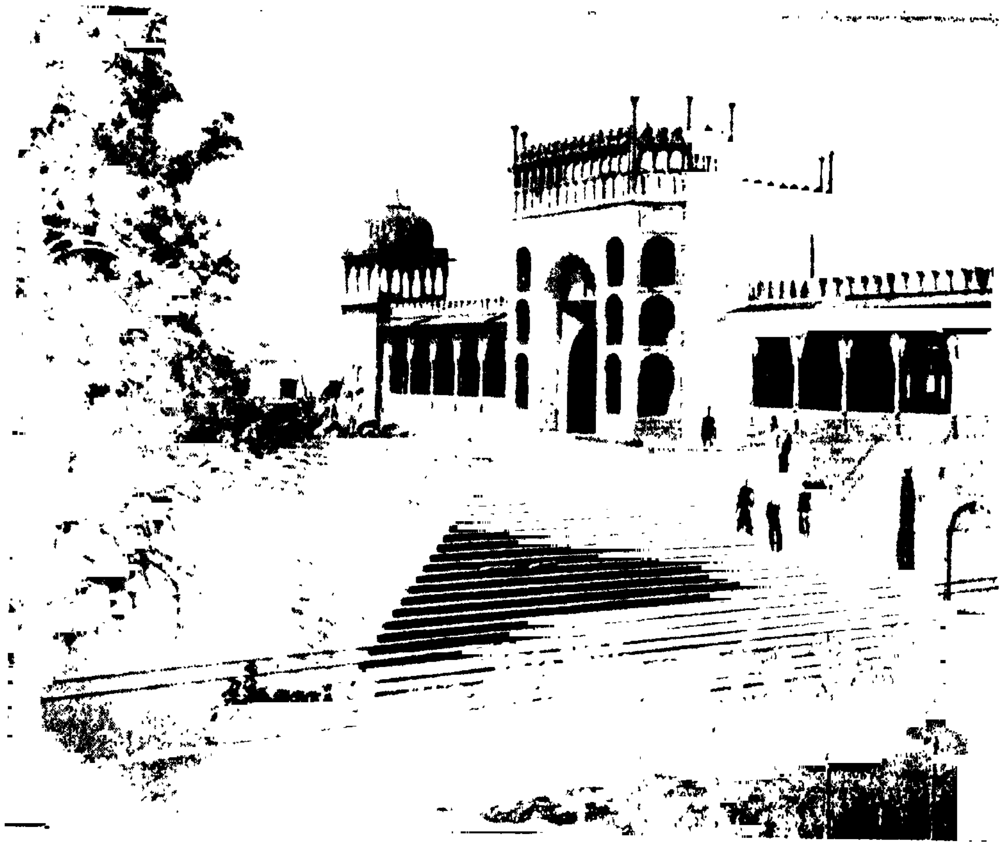
# نقوش طاق بستان (ایران)

ایران کے شہر کرمان شاہ کے قرب و جوار میں پرانے کتبے اور تاریخی عمارتیں بکثرت ملتی ہیں ان میں سے کچھ ساسانی عہد کی یادگار ہیں اور کچھ آل بویہ کے زمانے کی۔ یہ سب ایلورا اور اجنتا کی طرح پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہیں۔ ان میں «طاق بستان» کو خاص اہمیت حاصل ہے جو ساسانی زمانے کی یادگار ہے اور دو بڑے کمروں پر مشتمل ہے۔ بڑا کمرہ نسبتاً زیادہ خوبصورت اور سنگ تراشی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے چھوٹے کمرے میں پہلوی زبان کا ایک کتبہ خاص تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کمرے کسی بڑی عمارت کے حصے ہیں۔ ان کی بیرونی دیواروں پر پتھروں پر کھدے ہوئے مجسمے ہیں۔ کہیں دو فرشتے ایک تاج کو سنبھالے ہوئے ہیں تو کہیں کوئی نیزہ بردار سپاہی ڈٹا کھڑا ہے کہیں بادشاہ ہاتھ میں تلوار لئے اپنے مصاحبوں کے درمیان موجود ہے اور کہیں شکار کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ طاق بستان کی ایک خصوصیت پانی کا وہ چشمہ ہے جو اب تک جاری ہے۔



محراب دار طاق کے اندر پتھر پر کھدی ہوئی یہ مورتیں ابتک بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

# بھوپال کی شاہی مسجدیں



١٨٥٣ء میں نواب سکندر جہاں بیگم کے عہد حکومت میں بھوپال کی موتی مسجد سنگ سرخ اور سنگ مرمر سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس کے میناروں پر سونے کے پترے چڑھے ہوئے ہیں۔ اسکی بیرونی وضع قطع اور سیڑھیوں کا انداز بتاتا ہے کہ اسکی تعمیر کا نقشہ تیار کرتے وقت دہلی کی شاہی جامع مسجد کو ضرور مدّ نظر رکھا گیا تھا۔ اوپر کی تصویر میں اس مسجد کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے۔ بائیں طرف بھوپال کی نوے سال پرانی جامع مسجد کا ایک دالان دکھایا گیا ہے۔ جوہر لحاظ سے قابل دید ہے۔ اسکی تعمیر کا فخر نواب گوہر بیگم کو حاصل ہوا جو قدسیہ بیگم کے نام سے زیادہ مشہور تھیں۔ یہ مسجد پچیس سال میں بن کر تیار ہوئی اور اسپر ساڑھے پانچ لاکھ روپے صرف ہوئے۔ اسکے مینار اور گنبد جن پر سونے کے پترے چڑھے ہوئے ہیں میلوں پرے سے نظر آتے ہیں کیونکہ مسجد کی کرسی بہت اونچی



# لیبیا میں



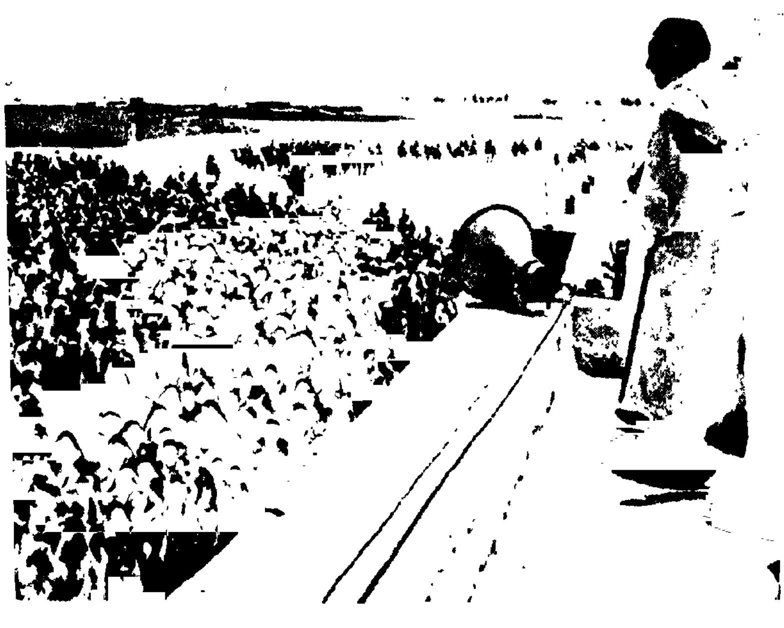
الجدابیہ کے مقام پر ہز ایکسیلنسی السید ادریس السینوسی کی آمد کے وقت عرب گارڈ کے رضاکار پرچم لہرا کر ان کا استقبال کر رہے ہیں۔ ایک جھنڈے پر عمر المختار لکھا ہے۔ یہ اس ۸۰ سالہ بوڑھے سردار کا نام ہے جسے ۱۹۳۱ء میں حفاظت وطن کے الزام میں اطالویوں نے نشانۂ اجل بنا دیا تھا

لیبیا میں سینوسی تحریک ۱۸۳۵ء کے لگ بھگ شروع ہوئی تھی۔ اسکا مفصل حال اسی شمارے کے صفحہ ۴۷ پر درج ہے۔ ہز ایکسیلنسی السید ادریس السینوسی اسی تحریک کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب اطالیہ میں فاشزم کا آغاز ہوا اور اسکے علمبرداروں نے لیبیا والوں پر ظلم و ستم کا سلسلہ شروع کیا تو سید صاحب ترک وطن کرکے یورپ چلے گئے اور وہیں سے اپنی تحریک کو برقرار رکھ کر اپنے ہموطنوں کو پنجۂ ظلم سے رہا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس دوسری جنگ عظیم سے اطالیہ کا دم خم ٹوٹ گیا تو لیبیا والوں کو اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا اور سید صاحب بھی بیس برس بعد اپنے وطن پہنچ گئے۔ اس صفحے کی تصویریں لیبیا میں ان کی واپسی پر کھینچی گئی تھیں۔



بیس سال کی جلاوطنی کے بعد ہز ایکسیلنسی السید ادریس السینوسی لیبیا میں واپس آئے تو ایک بوڑھے ہم وطن نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ قومی دستور کے مطابق ان سے معانقہ کیا۔ سید صاحب بظاہر بہت متاثر معلوم ہو رہے ہیں۔

—:o:—



لیبیا میں ہز ایکسیلنسی السید ادریس السینوسی ہم وطنوں کے ایک بڑے مجمع کے سامنے تقریر کر رہے ہیں۔ تمام اہم قبیلوں کے نمائندے جمع ہیں۔ ←

# انڈین سائنس



۶ جنوری ۱۹۴۷ء کی شام کو انڈین سائنس کانگریس کے اجلاس میں عارضی حکومت کے وزیر مالیات آنریبل مسٹر لیاقت علی خاں صدارتی تقریر کر رہے ہیں۔



دہلی یونیورسٹی کے میدان میں ان ـ
کانگریس کے چونتیسویں اجلاس میں
کوٹھاری جلوس



پروفیسر پی۔ ایم۔ ایس بلیکٹ۔ یہ بھی ان ۹ غیر ملکی نمائندوں میں شامل
تھے جنکو دہلی یونیورسٹی نے ڈی' ایس' سی کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

اجلاس سے پہلے انڈین سائنس کانگر
مشہور سائنسداں سر ڈی



# دریس (۱۹۴۷ء)



ں کا جلوس جنہوں نے انڈین سائنس
کی سرشانتی سروپ بھٹناگر اور ڈاکٹر
ت فرما رہے ہیں۔

صدر پنڈت جواہرلال نہرو برطانیہ کے
ہامسن سے مصافحہ کر رہے ہیں۔





سائنس کانگریس میں دو برطانوی نمائندے۔ سر ہیرالڈ اسپنس
جونز اور پروفیسر ڈاے اسٹامپ۔ اول الذکر کو شاہی منجم ہو
کا اعزاز حاصل ہے۔

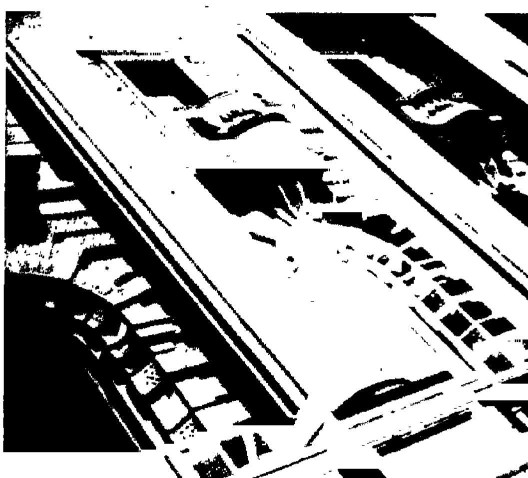


دائیں طرف بیٹھے ہوئے پروفیسر ڈی بی وولکن روسی سائنسدانوں
اس وفد کے لیڈر تھے جس نے سائنس کانگریس میں شرکت کی۔

# آسٹریلیا کی نئی عمارتیں

آسٹریلیا کی عمارتوں کی یہ تصاویر دیکھکر ندازہ ہوتا ہے کہ آجکل انہیں نت نئے نقشوں اور نمونوں پر تعمیر کیا جارہا ہے۔ یہ عمارتیں نہ صرف مستحکم اور پائیدار ہیں بلکہ دیدہ زیب اور جاذب نظر بھی ہیں۔ سرکاری دفتروں' تجارتی منڈیوں' عبادتگاہوں' تعلیمی اداروں اور مفاد عامہ کی دوسری عمارتوں میں یہی جدت کارفرما ہے۔ رہائشی مکانوں اور کوٹھیوں میں برطانوی اور امریکی نمونوں ہی کو مد نظر رکھا گیا ہے سوائے اسکے کہ موسم کا لحاظ رکھتے ہوئے برآمدے فرا وسیع کر دئیے گئے ہیں تاکہ گھروالوں کو اچھی طرح دھوپ کھانے کا موقع مل سکے۔ یہ تصاویر رسالہ «آسٹریلیا» سے لی گئی ہیں جو نیویورک سے شائع ہوتا ہے۔



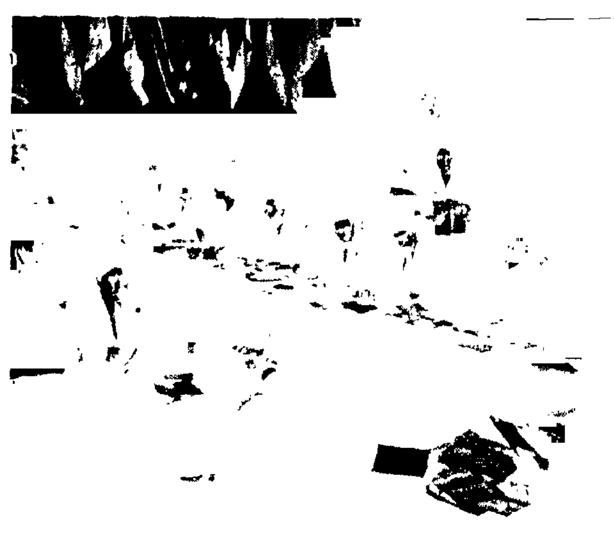


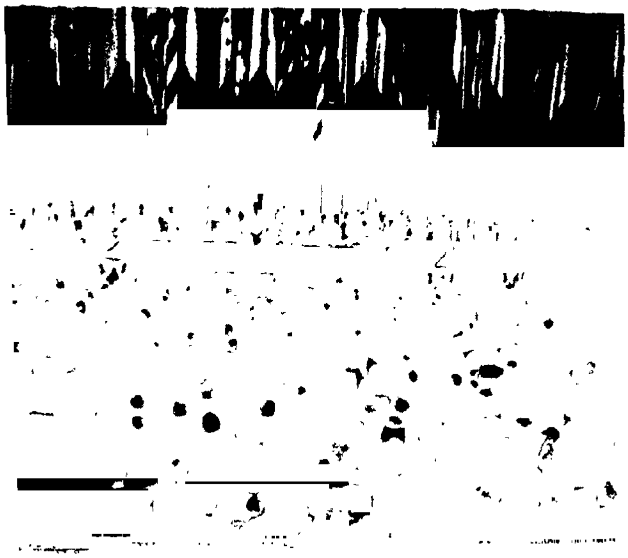




# برس میں
# ونیسکو
# کانفرنس

«یونیسکو» کا پہلا اجلاس ۱۹ نومبر ۱۹۴۶ء کو پیرس میں شروع ہوا تھا۔ یہ تصویریں اسی موقع پر لی گئی تھیں۔ اوپر کی تصویر ان ہندوستانی نمائندوں کی ہے جنہوں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ (بائیں طرف سے) پروفیسر بھابھا' سر رادھا کرشنن' خواجہ غلام السیدین' راجکماری امرت کور' سرجان سارجنٹ' مس بوس اور آغا محمد اشرف. نیچے دائیں طرف سائنس کا اجلاس ہو رہا ہے جس کے صدر پروفیسر بھابھا تھے۔ بائیں طرف کی تصویر میں دنیا بھر کے نمائندے جمع ہیں اور فرانس کے وزیر اعظم موسیو بیدو کانفرنس کا افتتاح کر رہے ہیں۔ یہ تصویریں ہمیں آغا محمد اشرف صاحب نے عنایت کی ہیں۔ اس شمارہ میں آغا محمد اشرف کا مضمون یونیسکو کانفرنس بھی شامل ہے۔ اگلے پرچے میں خواجہ غلام السیدین صاحب کی ایک اہم تقریر کا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے۔







ہندوستان کی ایک مشہور فلم ایکٹرس۔ وینا

# پنڈت سوریا کانت ترپاٹھی۔ نرالا

(کانتی چندر سونرکسا)

موجودہ ہندی ادب کے تین سب سے بڑے شاعروں میں سے ایک پنڈت سوریا کانت ترپاٹھی نرالا ہیں ۱۸۹۶ء میں بسنت پنچمی کے مہینہ میں نرالا جی بنگال کے ایک گاؤں میں ایک قدامت پسند برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دیہات کی آزاد فضا میں پروان چڑھ کر کشتی، سواری اور موسیقی کا یہ شوقین بچہ ایک لمبا چوڑا اور خوبصورت نوجوان بنا ــــ اور اس کے جسم کا یہی حسن اپنی قوت اس کی شاعری کے جوہر ہیں۔ یہاں تک کہ اب اس کا شمار ہندی کے بہترین فن کاروں میں ہے۔ نرالا کی تعلیم سنسکرت اور بنگالی سے شروع ہوئی اور پھر انھوں نے اردو، فارسی اور انگریزی میں دستگاہ حاصل کی ــــ لیکن سب سے زیادہ قدرت انھیں اپنی مادری زبان اودھی پر ہے۔

انقلاب، نرالا، کی زندگی کی سب سے اہم آواز ہے پھر بھی ان کا شمار ہندی کے بہترین کلاسیکی شاعروں میں ہوتا ہے۔ اپنی جوانی ہی میں نرالا جی رام کرشن مشن میں بنگالی رسالے سمن وایا، کے ایڈیٹر ہو گئے۔ وہاں انھوں نے یوگا اور ویدانت کا مطالعہ کیا۔ ۲۰ برس تک بنگال میں رہ کر وویکانند، ٹیگور، یورپین کلاسکی مصنفوں کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد لکھنؤ آئے۔ بنگال ہی میں انھوں نے اپنی آزاد نظموں کا پہلا مجموعہ شائع کیا۔

نرالا جی ہندی میں آزاد نظم کے بانی ہیں اور اب تک ان کی نظموں کے جو دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں وہ انھیں زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہیں۔ پریمل، گیت کا، انامکا، میں ان کی بہترین نغماتی شاعری ہے۔ تلسی داس، ان کا غیر فانی ایپک شاہکار ہے۔ بیلا اور نئے پتے میں ہیئت اور فکر کے بعض نئے تجربے ہیں۔ نرالا نے چھ ناول بھی لکھے ہیں اور ان کا شمار ہندی کے بہترین کلاسیکی اور رومانی ناول نگاروں میں ہے۔ وہ چھ سوانح عمریوں کے بھی مصنف ہیں اور ہندی میں اس لحاظ سے ان کی جدت پسندی آپ اپنی مثال ہے۔ فرانسیسی افسانوں کے بھی چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نقاد کی حیثیت سے بھی ہندی میں نرالا کا کوئی جواب نہیں ــــ علم و فضل، وقت نظر کے ساتھ ساتھ ایک ہمہ دانہ نظر رکھنے والا نقاد۔ ان کی تین تنقیدی کتابیں چھپ بھی چکی ہیں اور اب تک ان کی تصانیف کی تعداد ۴۵ ہے۔

نرالا موسیقی، رقص اور مصوری کا ایک نیرنگ مجموعہ ہے۔ اسے اس کا احساس بھی ہے اور اسی احساس نے آج تک کہیں اپنا سر نہیں جھکایا۔ لیکن اس کے سر نے غریبوں کے آگے جھکنا سیکھا ہے۔ وہ اپنا سب کچھ غریبوں کو دے سکتا ہے۔ اس کا تن من دھن سب انھیں کے لئے ہے۔ وہ ہندی کا سب سے نادار، لیکن سب سے زیادہ سخی شاعر ہے۔ اس کے سینے میں انسان کا دل ہے اور وہ ہندی کے لئے ایک بڑی دولت ہے۔

## بھر دیتے ہو

بھر دیتے ہو بار بار پریہ، کرونا کی کرنوں سے
کشبدھ ہردے کو پلکت کر دیتے ہو!
میرے انتر میں آتے ہو دیو نرنتر
کر جاتے ہو ویتھا بھار لگھو
بار بار کر کنج بڑھا کر!
اندھکار میں میرا رودن
سکت دھرا کے انچل کو
کرتا ہے مشنر سشنر
کسم کپولوں پر وے لال شنشر کنڑ
تم کرنوں سے اشرو پونچھ لیتے ہو
نو پربھات جیون میں بھر دیتے ہو

## بھر دیتے ہو

اے میرے محبوب! تم بار بار دردمندی کی کرنوں سے بھر دیتے ہو
میرے غم نصیب دل کو شادماں کر دیتے ہو
اے میرے دیوتا! تم سدا میری یاد میں آتے ہو
اور دکھ کے بوجھ کو ہلکا کر جاتے ہو
بار بار ہاتھ کا کنول بڑھا کر!
اندھیرے میں میرا رونا
زمین کے آنچل کو
ہر لمحہ ہر گھڑی نم کر دیتا ہے
کنول کے گلابی پر وہ لال، سردی کی شبنم
تم کرنوں سے آنسو پونچھ لیتے ہو
اور زندگی کو ایک نئی صبح سے بھر دیتے ہو

# جواری

افسانہ

غلام عباس

پولیس نے ایسی ہوشیاری سے چھاپہ مارا تھا کہ ان میں سے ایک بھی بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ اور بچ کر جاتا بھی تو کہاں۔ بیٹھک کا ایک ہی زینہ تھا جس پر پولیس کے سپاہیوں نے پہلے ہی قبضہ جما لیا تھا۔ رہی کھڑکی۔ اگر کوئی من چلا جان کی پروا نہ کرکے اس میں سے کود بھی پڑتا تو اول تو اس کے گھٹنے ہی سلامت نہ رہتے۔ اور بالفرض زیادہ چوٹ نہ آتی تو بھی اسے بھاگنے کا موقع نہ ملتا۔ کیونکہ پولیس کے نصف درجن سپاہی نیچے بازار میں بیٹھک کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے ——— اور یوں وہ سب کے سب جواری جن کی تعداد دس تھی پکڑ لیے گئے تھے۔

اتفاق سے اس دن جو جواری اس بیٹھک میں آئے تھے۔ ان میں دو ایک پیشہ وروں کو چھوڑ کر باقی سب کبھی کبھار کے شوقیہ کھیلنے والے تھے اور یوں بھی عزت دار اور آسودہ حال تھے۔ ایک ٹھیکہ دار تھا۔ ایک سرکاری دفتر کا عہدہ دار۔ ایک مہاجن کا بیٹا تھا۔ ایک لاری ڈرائیور تھا اور ایک شخص چیتھڑے کا کاروبار کرتا تھا۔

ان میں دو شخص ایسے بھی تھے جو بے گناہ پکڑ لیے گئے تھے۔ ان میں ایک تو من سکھ پٹواری تھا۔ ہر چند وہ کبھی کبھی کھیل بھی لیا کرتا تھا۔ مگر اس شام وہ قطعاً اس مقصد سے نہیں گیا تھا۔ وہ دکان پر ایک دوست کو بٹھا کر دس کے نوٹ کی ریزگاری لینے آیا تھا۔ ریزگاری لے چکا تو چلتے چلتے ایک کھلاڑی کے پتوں پر نظر پڑ گئی۔ پتے غیر معمولی طور پر اچھے تھے۔ یہ دیکھنے کو کہ وہ کھلاڑی کیا چال چلتا ہے۔ یہ ذرا کی ذرا رکا تھا کہ اتنے ہی میں پولیس آ گئی بس پھر کب نکل جا سکتا تھا۔

دوسرا شخص ایک عمر رسیدہ وثیقہ نویس تھا۔ جو ٹھیکہ دار کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا اس بیٹھک میں پہنچ گیا تھا۔ ٹھیکہ دار سے اس کی پرانی صاحب سلامت تھی اور وہ چاہتا تھا کہ ٹھیکہ دار اس کے بیٹے کو بھی چھوٹا موٹا ٹھیکہ کا کام دلا دیا کرے۔ یہ وثیقہ نویس کئی دن سے ٹھیکہ دار کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اور آخر ملا بھی تو کہاں جہاں نہ تو ٹھیکہ دار کو کھیل سے فرصت تھی اور نہ اسے اتنے آدمیوں کے سامنے مطلب کی بات کہنے کا یارا۔ ٹھیکہ دار کھیل میں منہمک تھا اور وثیقہ نویس اس سوچ میں کہ وہ کون سی ترکیب ہو سکتی ہے جس سے یہ کھیل گھڑی بھر کے لئے ختم ہو جائے اور وہ سب لوگ اٹھ کر باہر چلے جائیں مگر اس قسم کی کوئی صورت اسے نظر نہ آتی تھی۔ ادھر ٹھیکہ دار تھا کہ گھنٹوں سے برابر کھیلے چلا جا رہا تھا۔ آخر وثیقہ نویس مایوس ہو کر چلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے ہی میں پولیس آ گئی اور جواریوں کے ساتھ اسے بھی دھر لیا گیا۔

ان دونوں نے اپنی بے گناہی کے بہتیرے ثبوت پیش کئے مگر پولیس نے ایک نہ سنی۔ باقی کے لوگ پولیس کے اس اچانک دھاوے سے ایسے دم بخود رہ گئے تھے کہ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ سپاہیوں نے بڑی حفاظت کے ساتھ پہلے تو سب کو بیٹھک سے نیچے اتارا۔ پھر ان کے گرد گھیرا ڈال انہیں پیدل تھانے لے چلے۔

یہ بھی غنیمت ہی ہوا کہ جھٹپٹا وقت تھا۔ دھندلکے میں زیادہ لوگوں کی نظر نہ پڑی اور یہ لوگ کوٹ کے کالر یا پگڑی کے شملے میں منہ چھپائے، تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جلد ہی تھانے پہنچ گئے۔ جہاں تھانہ دار کے حکم سے ان سب کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

حوالات کی یکانت میں جب ان لوگوں کو تماشائیوں کی استہزا بھری نظروں اور سپاہیوں کے کڑے تیوروں اور کرخت لہجوں سے امان ملی اور جان پہچان کے لوگوں سے مڈبھیڑ کا خوف بھی نہ رہا۔ تو قدرتی طور پر سب سے پہلے ان کا دھیان بیٹھک کے مالک کی طرف گیا جو ان سب کے ساتھ ہی حوالات میں بند تھا۔ ہر شخص اسی کو اپنی بربادی کا باعث سمجھتا تھا چنانچہ سب کو اس پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اگر یہ شخص احتیاط کو کام میں لاتا، مکان کو سرائے نہ بنا لیتا کہ ہر ایرا غیرا منہ اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ بیٹھک کے باہر کسی مخبر کا انتظام کرتا۔ نیز پولیس والوں سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھتا تو ان لوگوں پر برا وقت کبھی نہ آتا۔

بیٹھک کے مالک کا نام تو خدا جانے کیا تھا مگر سب لوگ اسے بابو نکو کہا کرتے تھے۔ یہ شخص درمیانے قد اور چھریرے بدن کا تھا سنہری آنکھیں جن میں سرمے کے ڈورے سپید رنگت۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ چہرے پر چیچک کے مٹے مٹے سے داغ۔ دانت پانوں کے کثرت استعمال سے سیاہی مائل سرخ ہو گئے تھے گھنگھریالے بال جو ہر وقت آنولے کے تیل میں بسے رہتے۔ بائیں طرف سے مانگ نکلی ہوئی دائیں طرف کے بال ایک لہر کی صورت میں پیشانی پر پڑے ہوئے۔ ململ کا کرتا جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے۔ گلے میں چھوٹا سا سونے کا تعویذ سیاہ ڈورے میں بندھا ہوا۔ اس کا کرتا ہمیشہ اجلا ہوتا مگر دھوتی ہمیشہ میلی۔ سردیوں میں اس لباس پر ایک پرانا سرخ دوشالہ زری کے حاشیے والا اوڑھ لیا کرتا۔ اس کی حرکات میں بلا کی پھرتی تھی۔ جتنی دیر میں کوئی مشاق جواری ایک دفعہ تاش پھینٹے اور بانٹے یہ اتنی دیر میں کم سے کم دو دفعہ تاش پھینٹا اور بانٹ لیتا تھا۔

نکو پہلے ہی سے اس حملے کے لئے تیار تھا۔ پولیس کے چھاپہ مارنے سے لے کر اس وقت تک تو اس نے چپ سادھے رکھی تھی اور اس سارے قضیے میں اس کا رویہ ایک بیگانے کا سا رہا تھا۔ مگر اب جبکہ سب طرف سے اس پر تیز تیز نظروں کے حملے شروع ہوئے تو اس نے ایک جھرجھری لی اور اپنی مدافعت میں ایک لطیف مسکراہٹ جس میں خفیف سی ترشی بھی ملی ہوئی تھی، اپنے ہونٹوں پر طاری کی۔ یہ مسکراہٹ چند لمحے قائم رہی۔ پھر اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ سب پر ایک نظر ڈالی اور بڑی خود اعتمادی کے

لہجہ میں یوں کہا :—

" آپ لوگ بالکل بھی فکر نہ کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ میں سے کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ میرے ہاں پچھلے پانچ برس میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے تو کیا کہنا چاہیئے ، مذاق سمجھو مذاق !"

جواریوں نے نکو کی اس بات کو سُنا پر اس سے اُن کے غصے میں ذرا بھی کمی نہ ہوئی بعض نے گردن ہلائی بعض نے بازو جھٹک دیئے۔

"ہوں۔ مذاق سمجھیں۔ یہ اچھی رہی !" ٹھیکہ دار نے کہا۔

"لاحول ولاقوۃ" کپڑے کے سوداگر نے ذرا چاک کر کہا "عجب آدمی ہو یار۔ یہاں لاکھ کی عزت خاک میں مل رہی ہے اور تم اُسے مذاق بتا رہے ہو!"

"ناراض کیوں ہوتے ہو شیخ جی " نکو نے کہا " میں نے جو کہا آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ مونچھوں پہ تاؤ دیتے نکلیں گے مونچھوں پہ تاؤ دیتے !"

"چل ہٹ۔ بہاڑ یا کہیں کا " ٹھیکہ دار نے کہا۔

" بہاڑیا کون ؟ میں ؟" نکو نے تنک کر کہا " خیر جو جی میں آئے کہہ لو۔ مگر میں پھر کہتا ہوں کہ تم میں سے کسی پر بھی آنچ تک نہ آئے گی ؟"

وہ جواری جو کسی سرکاری دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا اُسے جوئے سے سخت نفرت تھی مگر جب کبھی اس کی بیوی، بچوں کو لیکر میکے جاتی تو اُسے اس جھک ہی کی سوجھتی۔ دفتر سے اُٹھ کر سیدھا وہیں کا رُخ کیا کرتا۔ ہر بار ہارتا اور اپنے کو کوستا عہد کرتا پھر کبھی نہ آؤں گا۔ مگر اگلے روز سب سے پہلے پہنچتا۔ اس شخص نے نکو کی یہ بات سنی ان سنی کر کے فریاد کے لہجہ میں کہنا شروع کیا :—

" ارے بھائی میں لٹ گیا۔ میں سرکاری آدمی۔ میری عزت دو کوڑی کی ہوگئی ہائے میرے بیوی بچے۔ نکو تو نے مجھے برباد کر دیا ہائے ——"

" سنئے تو سہی ملک صاحب ——"

"ارے کیا خاک سنوں ، ہائے وہ کونسا منحوس دن تھا جب میں نے تیری صورت دیکھی۔ ارے یار میں سرکاری ملازم۔ اگر میرے افسر والوں کے کان میں بھنک بھی پڑ جائے تو بدنامی —— ارے بدنامی کو تو گولی مارو۔ یہاں پندرہ برس کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ ہائے میرے بیوی بچے ——"

مہاجن کا بیٹا جس نے دولت کمانے کا یہ سہل اور دلچسپ طریقہ نیا نیا سیکھا تھا۔ اب تک تو بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا۔ مگر ملک کا یہ واویلا سن کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

" صبر کرو چھوٹے شاہ جی صبر کرو " نکو نے کہا " تم تو یار عورتوں کی طرح رونے لگے۔ مرد بنو۔ ارے بھائی یہ تو بات ہی کچھ نہیں ہے "

" میرے پتا جی کو پتہ چل گیا " مہاجن کے بیٹے نے سسکیاں لے لے کے کہا " تو وہ ایک دم مجھے گھر سے نکال دیں گے "

" ارے یار چھوڑو بھی۔ کوئی گھر سے نہ نکالے گا " نکو نے کہا۔

" نکو " ملک نے کہا " یہ سب تیرا کیا دھرا ہے "

" ملک صاحب " نکو نے پر زور لہجہ میں کہا " آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ آپ میری بات مانیں میں جو کہہ رہا ہوں کہ آپ پر ذرا آنچ نہ آئے گی۔ یوں نکال لاؤں گا جیسے مکھن میں سے بال نکالتے ہیں ؟"

" بس رہنے دے بھائی "۔ ملک نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا " اگر یہی دم خم تھا تو پولیس کو آنے ہی کیوں دیا ہوتا !"

" ملک صاحب آپ میری بات مانیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ بات اصل میں یوں ہے کہ تھانے دار اپنا ہی آدمی ہے۔ سمجھے آپ۔ وہ میرا بڑا مہربان ہے۔ وہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا میرے منہ پر تھوک دینا اگر کچھ کہے "

نکو کی یہ بات سن کر سب جواری پل بھر کو خاموش کچھ سوچتے رہے بعض تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس کی بات پر یقین کر لینا چاہتے تھے اور بعض کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کچھ فیصلہ نہیں کر سکے کہ انھیں نکو پر بھروسہ کرنا چاہیئے یا نہیں۔ البتہ یہ ظاہر تھا کہ رفتہ رفتہ ان کا غصہ اُترتا جا رہا تھا۔

" دیکھو نکو " کپڑے والے شیخ جی نے کہا " میں روپے پیسے کی پروا نہیں کرتا۔ مگر میری عزت بچ جائے۔ ویسے بات تو کچھ بھی نہیں ہے اور یوں خود میرا بہنوئی سب انسپکٹر پولیس ہے مگر توبہ تو۔ یہ کسی سے کہنے والی بات ہے !"

" شیخ جی۔ آپ ذرا بھی چنتا نہ کریں میں جو کہہ رہا ہوں اسے آپ مذاق ہی سمجھیں سمجھی بھول گئی کر لیا کرتے ہیں میرے —"

"کون ؟ " من سکھ جواری کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ وہ اتنے بڑے بڑے آدمیوں کو اس مصیبت میں اپنا سا ہی دیکھ کر اپنا دکھڑا بھول گیا تھا

" جی یہی آپ کے تھانے دار صاحب جو ابھی کہہ کر گئے ہیں بڑا "

وہ جواری جو ذری جلا تا تھا کپنے میں کھڑا کچھ دیر نکو کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا :—

" دیکھو نکو۔ مجھے صبح سویرے لاری میں سنگ میل بھر کے جانا ہے۔ سیٹھ وال میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اگر تیری واقعی یہاں کسی سے واقفیت ہے تو کوئی ایسی ترکیب کر کہ میں صبح سے پہلے پہلے یہاں سے خلاصی پا جاؤں "

وہ تو دھیرے دھیرے سبھی لوگ آخر کار نکو کی باتوں پر کان دھرنے لگے تھے مگر اس لاری ڈرائیور نے جس لہجہ میں نکو سے خطاب کیا۔ اس سے عام طور پر نکو کے ساتھیوں میں اسکا اعتماد اور بڑھ گیا۔ نکو نے بھی اسے محسوس کیا اور اپنی اس کامیابی پر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ البتہ لاری ڈرائیور نے جماعت سے علیحدہ ہو کر تنہا اپنی ذات کے لئے جو سفارش کی تھی اس کو سب نے ناپسند کیا اور اسے لاری ڈرائیور کی خود غرضی اور کمینگی پر محمول کیا گیا۔

نکو نے اس کے لہجہ میں اب اور بھی زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ لاری ڈرائیور سے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا :—

"مرزاجی میری جان۔ گھبراؤ نہیں۔ اس کا بھی انتظام ہو جائے گا"

انتظام دنتظام خاک نہیں ہوگا" اچانک وثیقہ نویس نے جھلاکر کہا۔

"مرزا تم بھی اس ڈینگیئے کی باتوں میں آگئے جو سر پر پڑی ہے اسے خود ہی بھگتو"

نکو نے وثیقہ نویس کے اس غیر متوقع حملے کو بڑی چابکدستی سے روکا۔

وہ کھل کھلاکر ہنس پڑا۔

"تو بڑے میاں کی بات سنو" اس نے کہا "ہوں انتظام نہیں ہوگا اور یہاں مال جو کھلا یا جاتا ہے ہر مہینے۔ بھائیو میں پھر کہتا ہوں کہ سے مذاق ہی سمجھو میں ہندو مسلمان والی قسم کھاکے کہتا ہوں کہ کسی کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ وہ یوں کہ تھانے دار ——— اب کیا بتاؤں تمہیں"۔ وہ ہنس پڑا۔ "کہہ جو دیا اپنا ہی آدمی ہے ——— اب تم کہلوا کے ہی رہوگے۔ پر ذکر و کرنہ کرنا بیٹا کسی سے، ورنہ پھنس جاؤگے۔ میرا دوش نہیں ہوگا وہ بات یوں ہے کہ تھانے دار ——— اب تم سے کیا چھپانا ——— بھئی میری اس کی رشتہ داری ہے۔ سن لیا! کیوں بڑے میاں اب تو ہوگئی تسلی۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو پچھلے پانچ برس سے اتنے بڑے شہر میں یہ دھندا بھلا کیسے چلتا رہتا"

نکو نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی۔ اقتدار کی عمارت پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم ہو چکی تھی۔

ان جواریوں میں ایک شخص تھا جس کے بشرے سے کوئی صدمہ یا رنج ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس سارے واقعہ کے دوران میں بالکل خاموش رہا تھا۔ ۲۰۔۲۲ برس کا ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ لباس اور وضع قطع کی طرف سے خاصا بے پروا معلوم ہوتا تھا۔ مدت ہوئی اس شخص نے ناتجربہ کاری کی وجہ سے ایک خاصی معقول رقم ہار دی تھی۔ بس اسی دن سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ جس روز ہاری ہوئی رقم کو واپس جیت لوں گا جوئے کا پھر کبھی نام نہ لوں گا۔ اس بیٹھک میں آنے سے گھنٹہ دو گھنٹے پہلے کسی باغ میں بیٹھ کر کھیل کا ایک پروگرام سا بنا لیا کرتا۔ چالیس تک سو ترح رکھتا۔ بے حد احتیاط سے کھیلتا۔ نہ تاؤ کھاتا نہ جوش میں آتا۔ مگر بد قسمتی سے ہاری ہوئی رقم روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا قرض بھی۔

اس شخص کو رسوائی یا قید اور جرمانے کا تو ذرا غم نہ تھا۔ البتہ اس بات کی فکر ضرور تھی کہ یہ سب کے سب ڈرپوک ہیں۔ بہک گئے جب بھی اور پھنس گئے جب بھی اس بیٹھک کا پھر کبھی رخ نہ کرینگے۔

ادھر نکو نے اب حالات پر پورا قابو پا لیا تھا۔ اگرچہ وہ رات رات بھر کسی کی مخلصی کا بھی انتظام نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اس نے کسی نہ کسی طرح ہر شخص کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ تھانے دار اگر اسکا قریب کا نہیں تو دور کا قرابت دار ضرور ہے اور صبح ہوتے ہی اسے رہا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سب لوگ زمین پر یہ پھٹے پرانے بدبو دار کمبل بچھا کر جو سپاہیوں نے لا دیئے تھے، بےنجنت سے ہوکر پڑ رہے۔

"اوہو غضب ہو گیا!" اچانک نکو نے کہا اور وہ لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیوں کیوں خیر تو ہے؟" اندھیرے میں کئی جواریوں نے پوچھا۔

"بھئی اگر پتہ ہوتا کہ یہاں رات کاٹنی پڑے گی تو تاش ساتھ لیتے آتے۔ اور مزے سے ساری رات کھیلتے۔ ..... کہو تو ابھی کسی سپاہی کو بھیجکر تاش اور موم بتی منگا لوں؟"

"نہ نہ بابا معاف کرو" سب نے یک زبان ہوکر کہا۔

"تم جانو" نکو نے بے پروائی سے کہا گویا ایسا نہ کرنے میں انہیں کا نقصان ہے۔ "اچھی خاصی دل لگی رہتی۔ صبح کو تھانے دار کو سناتے تو وہ بھی خوب ہنستا ......"

اگلے روز صبح کو کوئی نو بجے کے قریب ایک سپاہی حوالات کے سلاخ دار دروازے کے باہر آکر کھڑا ہوا اور بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا:۔

"او جواریو اٹھو۔ تمہاری داروغہ صاحب کے سامنے پیشی ہے"

جواری دیر سے اس حکم کے منتظر تھے۔ سب کی نظریں بے اختیار نکو کی طرف اٹھ گئیں نکو نظریں ترچھی کرکے ایک خاص ادا سے مسکرا دیا۔

پانچ منٹ کے بعد یہ دسوں آدمی تھانے کے چھوٹے سے میدان میں قطار باندھے کھڑے تھے۔ پانچ منٹ، دس منٹ۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا مگر تھانے دار کہیں پتہ نہ تھا۔ اس دوران میں نکو برابر اپنے لطیفوں، پھبتیوں اور ہنسی مذاق کی باتوں سے اپنے ساتھیوں کا جی بہلاتا رہا مگر جب ایک گھنٹہ گزر گیا اور تھانے دار نظر نہ آیا تب تو سب جواری بہت گھبرائے ہنسی ان کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی سب کے چہرے اتر گئے اور ایک بدگمانی کی لہر ان میں پھیل چلی وہ بار بار فکرمندی کے ساتھ نکو کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھتے اور نکو جواب میں ہر ایک کو ہاتھ سے صبر کا اشارہ کر دیتا۔ اس عرصے میں دو تین سپاہی ان جواریوں کے پاس سے گزرے اور نکو نے ہر ایک کو "خان صاحب جی" "خان صاحب جی" کہہ کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ مگر نہ تو انہوں نے نکو کی بات کا کوئی جواب دیا اور نہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

آخر جب انہیں کھڑے کھڑے پورے دو گھنٹے گزر گئے اور انکی ٹانگیں تھک کر چور ہو گئیں تو ایک سیاہ لاری تھانے کے اندر داخل ہوئی۔ اس میں سے تھانے دار اور کئی سپاہی نکلے۔ تھانے دار کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے اور سپاہیوں کے کندھوں پر بندوقیں۔ انہیں خالی ہاتھ لوٹتے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ جس مہم پر وہ صبح ہی صبح گئے تھے اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی اور یہ مہم ضرور کچھ بڑی ہی اہم مہم ہوگی۔ جبھی تو تھانے دار پریشان پریشان سا نظر آ رہا تھا۔

نکو دور ہی سے تھانے دار کو دیکھ کر اچھل پڑا۔

"وہ آگیا میرا موتیوں والا" اس نے کہا "بس اب گھبراؤ نہیں۔ دو تین ہی منٹ میں بیڑا پار ہوا چاہتا ہے"

یہ کہہ کر نکو نے دور ہی سے تھانے دار کو ایک فرشی سلام کیا۔ تھانے دار کی یا تو اس پر نظر نہیں پڑی یا پھر اس نے دانستہ نظریں پھیر لیں اور وہ سپاہیوں کی

بارکوں میں چلا گیا۔

"بکو" وثیقہ نویس نے طعن آمیز لہجہ میں کہا "میں جانوں تھانے دار کی تم پر نظر نہیں پڑی ورنہ وہ تمہارے سلام کا جواب تو ضرور دیتا۔"

"ابھی توبہ کرو" بکو نے کہا "تھانے دار میرے سلام کا جواب کبھی نہیں دیگا۔ بھائی وہ اس وقت رعب میں ہے رعب میں۔ کیا سمجھے! تھانے داری ہے کچھ مذاق تھوڑا ہی ہے۔ ہم سے بیہودے مذاق کرے تو سپاہیوں پر رعب کیسے جما رہے۔ کل کو یہی سپاہی اسے ناک چنے نہ چبوا دیں۔ اور سپاہی تو بلا مداری کے بندر کی طرح ہوتے ہیں کہ جب تک لاٹھی نظر آتی رہے۔ ڈگڈگی پر ناچتے رہتے ہیں، جہاں مداری نے ذرا ڈھیل دی بس لگے ہنسنے سر پر سوار ہونے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔؟"

پانچ منٹ کے بعد تھانے دار چند سپاہیوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا بارکوں میں سے نکلا اور ان جواریوں کے پاس سے گذرتا ہوا تھانے کے پھاٹک پر جا کھڑا ہوا اور وہاں کھڑے کھڑے بدستور سپاہیوں سے باتیں کرتا رہا۔

اتنے میں تھانے کے دفتر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ذرا سی دیر میں ایک سپاہی دوڑتا ہوا تھانے دار کے پاس پہنچا۔ جب تھانے دار تنہا واپس آ رہا تھا تو بکو نے ایک بار پھر اسے سلام کیا، تھانے دار نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دفتر میں چلا گیا۔

"کہا تھا نا" بکو نے فتحمندانہ لہجہ میں کہا "میرے سلام کا جواب نہیں دیگا۔ کیوں دیا جواب؟"

سب جواری خاموش رہے۔

"ایک دن" بکو نے پھر کہنا شروع کیا "تھانے میں بس وہ اور میں ہی تھے۔ کوئی سپاہی آس پاس نہیں تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ اتنی گدگدیاں کیں کہ ہنسا ہنسا کے برا حال کر دیا۔"

تھانے دار کوئی آدھ گھنٹے تک دفتر کے اندر ہی رہا۔ یہ لوگ پھر بے صبر ہو چلے تھے کہ اتنے میں وہی سپاہی جس نے صبح آ کر پیشی کی اطلاع دی تھی، دفتر سے نکلا اور سیدھا ان کے پاس آ کر کہنے لگا:—

"او جواریو! سنو۔ داروغہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ تم سب کے سب دھوتی پاجامہ کھول کے زمین پر ایک قطار میں اوندھے لیٹ جاؤ۔ پھر تم میں سے سرے والا آدمی ایک ایک کر کے اٹھے اور ہر ایک کے دس دس جوتے لگا کے خود دوسرے سرے پر اوندھا لیٹتا جائے۔ غرض اسی طرح سب کے سب باری باری ہر ایک کے دس دس جوتے لگائیں۔"

تھانے دار کا یہ حکم اتنا غیر متوقع تھا کہ سب جواری ہکا بکا رہ گئے، اور سراسیمہ ہو کر سپاہی کا منہ تکنے لگے۔

"تو الو کی طرح میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اگر حکم سمجھ میں نہ آیا ہو تو پھر سنا دوں؟" یہ کہہ جواب کا انتظار کئے بغیر سپاہی نے وہی الفاظ پھر دہرا دیئے۔

اس پر وثیقہ نویس اور من سکھ نواڑی بے اختیار آگے بڑھ کر سپاہی کے قدموں سے لپٹ گئے۔

"خانصاحب ہم بالکل بے قصور ہیں"۔ انہوں نے یک زبان ہو کر گڑگڑا کر کہا "یہ سب لوگ گواہی دینگے کہ ہم بالکل بے گناہ ہیں جس وقت پولیس آئی ہم نہ تو کھیل رہے تھے اور نہ اس ارادے سے وہاں گئے تھے۔ ہم بے گناہ ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ ہم بالکل بے قصور ہیں۔"

"میں کچھ نہیں کر سکتا" سپاہی نے کہا "داروغہ صاحب کا یہی حکم ہے۔"

"خان صاحب جی! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ ہماری طرف سے ہاتھ جوڑ کر حضور سے کہہ دیں کہ ہم دونوں بے گناہ پکڑے گئے ہیں۔ سب لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔"

"میں گواہی وواہی کچھ نہیں جانتا" سپاہی نے کہا "داروغہ صاحب نے سب کے لئے یہی حکم دیا ہے۔ ہاں اور سنو۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ راضی نہ ہوں تو ان سب کو پھر حوالات میں بند کر دیا جائے۔ دیکھو دیر نہ کرو۔ مجھے داروغہ صاحب کے ساتھ ابھی ابھی باہر جانا ہے۔ لاری تیار کھڑی ہے۔ تم نے دیر کی تو میں پھر سب کو حوالات میں بند کر دوں گا۔"

وثیقہ نویس اور من سکھ دونوں مایوس ہو کے پھر قطار میں آ کھڑے ہوئے۔ ان کا یہ انجام دیکھ کر کسی جواری کو لب ہلانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور وہ سخت پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ان کی نظریں بار بار بکو پر پڑتی تھیں۔ مگر وہ ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں تھانے کے دفتر کی دیواروں پر گڑی ہوئی تھیں جو گویا دیواروں کو چھیدتی ہوئی تھانے دار کو ڈھونڈھ نکالنا چاہتی تھیں۔

"دیکھو دیکھو" سپاہی نے کہا "تم لوگ دیر کر رہے ہو۔ مجھے مجبوراً تم سب کو حوالات ہی میں بند کر دینا پڑے گا۔"

اس پر بھی جواری ابھی لیت و لعل ہی کر رہے تھے کہ اچانک کسی کے دھڑام سے زمین پر گرنے کی آواز آئی۔

یہ بکو تھا جو دھوتی کھولے زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر من سکھ کی ہمت بندھی اور اس نے بھی بکو کی پیروی کر دی۔ اکاؤنٹنٹ ملک ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ سپاہی نے پیچھے سے آ، گدی سے پکڑ زبردستی نیچے بٹھا دیا۔ اور اس نے ناچار اپنے نیکر کے بٹن کھول دیئے۔

سپاہی کے اس سلوک کو دیکھ کر دوسرے جواری آپ ہی آپ زمین پر لیٹ گئے۔ صرف چمڑے والے شیخ جی کھڑے رہ گئے، ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور صورت سے انتہا درجہ کی مظلومی برس رہی تھی۔ ان کا ہاتھ بار بار کمر بند پر پڑتا تھا مگر وہیں رہ جاتا تھا۔

ایسے معزز اور شریف صورت آدمی کو ایسی پریشانی میں دیکھ کر سپاہی کا دل پسیج گیا اور وہ جان بوجھ کر وہاں سے ٹل گیا، "شیخ جی۔ تم دل کڑا کرو۔

پگڑی کے شملے سے آنسو پونچھے۔ گردن پھرا کر اپنے ارد گرد نظر ڈالی، اور پھر انتہائی مجبوری کے ساتھ بالآخر انہوں نے بھی تھانے دار کے حکم کی تعمیل کر دی۔

سرے پر لاری ڈرائیور تھا۔ سب سے پہلے جوتے لگانے کی اسی کی باری تھی۔ جس وقت وہ اٹھا تو بکو زور سے کھنکھارا۔ "مرزا جی سنبھل کے"۔ اس نے کہا "تم اپنے ہی آدمی ہیں ہاں۔ دیکھنے میں زور کا ہاتھ پڑے مگر..... سمجھ گئے نا....."

لاری ڈرائیور نے ابھی پانچ تک ہی گنتی کی تھی کہ وہی سپاہی تھانے کے دفتر سے نکلا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "داروغہ صاحب کہتے ہیں"۔ اس نے پاس آ کر کہا۔ "اگر تم لوگوں نے ٹھیک طرح سے جوتے نہ لگائے تو میں اپنے سپاہیوں سے جوتے لگواؤں گا"۔ یہ کہہ کر وہ پھر چلا گیا۔

جواریوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ خود ہی آپس میں زور زور کے جوتے لگوا لیں۔ چنانچہ کوئی بیس پچیس منٹ کے بعد، جب ہر ایک نے ہر ایک کے دس دس جوتے لگا لئے تو وہ اس کام سے نمٹ کر کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں وہی سپاہی پھر آیا اور کہنے لگا۔ "جاؤ۔ اب کے داروغہ صاحب نے تمہارا قصور معاف کر دیا ہے۔ پھر کبھی جوا نہ کھیلنا"۔

یہ لوگ تھانے میں سے یوں نکلے جیسے اپنے کسی بڑے ہی عزیز قریبی رشتہ دار کو دفن کر کے قبرستان سے نکلے ہوں۔ تھانے سے نکل کر کوئی سو گز تک تو وہ چپ چاپ گردنیں ڈالے چلا کئے۔ اس کے بعد بکو نے یکبارگی زور کا قہقہہ لگایا۔ اتنے زور کا کہ وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ "کیوں دیکھا"۔ اس نے کہا "نہ چالان، نہ مقدمہ۔ نہ قید۔ نہ جرمانہ! میں نہ کہتا تھا اسے مذاق ہی سمجھو!"

## میر شیر علی افسوس

بقیہ صفحہ ۱۶

راقم نے صفحۂ تحریر سے نکال ڈالے اور ترجمہ خلاصۃ التواریخ کا نہیں کیا۔ ہاں مضمون اس کا اس زبان میں لکھا ہے اور کمی اور زیادتی بھی جہاں موقع دیکھا ہے وہاں کی ہے"...... "اور بعض صوفیائے کرامت و خرق عادت اور ان کے درگاہوں کے احوال و تصرفات جو ثبت کئے فقط کتاب مذکور کی مطابقت کے لئے، بلکہ اس لحاظ سے ہنود کے فقرا اور معابد کے اوصاف و احوال کو..... لکھنے میں آئے نہ از راہِ اعتقاد کیونکہ اس خاکسار کا مذہب یہ ہے ؎

گر دو عالم پر از ولی باشد ۔ پیر ما مرتضےٰ علی باشد"

یا یہ کہئے کہ اس صاف بیانی سے اپنی بریت کا اثبات کر دیا بلکہ حق یہ ہے کہ کہیں اپنی چشم دید بات لکھی تو اس کی صراحت کر دی، یا کوئی سنی سنائی بات لکھی تو اس کے حوالہ یا راوی کا ذکر بھی کر دیا مثلاً ایک دو باتیں انہوں نے اپنے والد سے سنیں تو صاف لکھ دیا کہ میں نے اپنے والد صاحب سے اس طرح سنا، لکھنؤ کے متعلق بعض تفصیلات لکھیں تو وہ اپنے ذاتی مشاہدے یا علم کی بنا پر، مگر تعجب ہے کہ علم طب کے اپنے استاد کی نسبت ان کے قلم سے ایک حرف نہ نکلا۔ خدا جزائے خیر دے احمد علی یکتا کو کہ اس نے لطفاً کچھ لکھا تو سہی

# نوابِ سعد اللہ خاں

ماطفلِ کم سواد و سبق قصہ ہائے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

سنہ ۱۰۱۹ھ کے قریب چنیوٹ میں امیر بخش نامی ایک غریب الحال کسان رہتا تھا۔ وہ دن بھر اپنی زمین میں کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا۔ اس کی محنت اور دیانت داری علاقہ بھر میں مشہور تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ تنگ دست رہتا تھا۔ دوپہر کا کھانا اس کی بیوی کھیت میں پہنچاتی تھی۔ مگر اب چند دنوں سے اسے دوپہر کے وقت خود گھر آنا پڑتا تھا۔ کیونکہ اس کی بیوی کے وضع حمل کے ایام قریب تھے اس لئے وہ کھانا پہنچانے کے لئے کھیت میں نہیں آسکتی تھی۔ ایک دن جب وہ روٹی کھانے کے لئے گھر آیا تو بیوی نے

## انار لاؤ ورنہ مرتی ہوں

کمال عاجزی سے گڑگڑا کر کہا۔ کہ میرا جی انار کھانے کو چاہتا ہے۔ اگر تو نے لاکر نہ دیا تو میں مر جاؤں گی۔ امیر بخش نے ہنس کر کہا۔ بے وقوف! ہم غریبوں کا انار سے کیا کام! اگر شلغم مولی کہو تو لادوں!!

بیوی بولی تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر ایسی حالت میں جبکہ مجھے آٹھ ماہ کا حمل ہے۔ مجھے انار کے لئے نہ ترساؤ۔ اس نیک بخت نے کانوں کی بالیاں اتار کر حوالے کیں۔ اور کہا۔ یہ بالیاں لے جاؤ۔ اور جہاں سے بھی ممکن ہو انار خرید لاؤ۔

امیر بخش نے بالیاں جیب میں ڈالیں۔ اور شہر کو روانہ ہوا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ گھاٹ کے قریب ہی کابلی میوہ فروشوں کا قافلہ اترا ہے۔ اور وہ انار و انگور دہلی لئے جاتے ہیں۔

## ملک الیاس

امیر بخش بلا توقف لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا قافلے میں پہنچا۔ اتفاق سے سالار قافلہ ملک الیاس سامان کی دیکھ بھال کرتا پھرتا تھا۔ لوگوں نے اشارے سے بتایا ذرّ مقصود یہی ہے۔ اگر کچھ لینا ہے تو قدموں میں جھک جاؤ۔ ورنہ پھر کف افسوس ملنے سے کچھ نہ بنے گا۔ امیر بخش لپک کر آگے بڑھا۔ اور ملک الیاس کے آگے دوزانو جھک گیا۔ پاؤں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ خدا کے لئے ایک انار دے دو۔ ورنہ میری بیوی مر جائے گی۔

سوداگر نے ہاتھوں سے امیر بخش کو اٹھا کھڑا کیا۔ اور ملائمت سے بولا۔

"شریف آدمی! میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ پھر کہو۔"

امیر بخش کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دل گیر آواز میں بولا

"اے فرشتۂ رحمت! میری بیوی حاملہ ہے۔ اور وہ اناروں کے لئے دیوانی ہو رہی ہے۔ اگر انار لے کر نہ گیا۔ تو وہ جان دیدے گی۔ ایک حاملہ عورت کی زندگی اور موت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ خدا کے لئے مجھے مایوس نہ کیجئے۔ یہ بالیاں لے لیجئے اور ایک انار دے دیجئے۔" سوداگر دفعتہ خاموش ہو گیا اور سائل کے ماتھے کی سلوٹوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس کی تقدیر کے نوشتے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے بہت جلد معلوم کر لیا۔ کہ اس کی بیوی کے شکم میں یقیناً کوئی صاحب اقبال فرزند ہے۔ امیر بخش سے کہا۔ بڑے میاں یہ میوے جہانگیر اعظم شہنشاہ ہند کے لئے دہلی لئے جاتا ہوں۔ راستہ میں مجھے یہ میوے بیچنے یا کسی کو تحفہ کے طور پر دینے کی اجازت نہیں۔ لیکن اگر تم مجھے اس مائی کے پاس لے چلو۔ تو کچھ دانے انار بلکہ انگور بھی بلا قیمت پیش کر سکوں گا۔"

"بلا تکلف تشریف لے چلئے۔ اتنا بڑا سوداگر غریب خانہ قدم رنجہ کی تکلیف کرے۔ میرے لئے اس سے اور بڑا فخر کیا ہو سکتا ہے۔" امیر بخش نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

ملک الیاس نے چند انار اور انگوروں کے گچھے ٹوکری میں ترتیب سے رکھ کر نوکر کے حوالے کئے۔ اور امیر بخش کے ہمراہ اس کے گھر کو روانہ ہوا۔

## سند لکھ دو

امیر بخش کی بیوی بڑی بے تابی سے اناروں کا انتظار کر رہی تھی۔ خاوند کو خالی ہاتھ آتا دیکھ کر مایوس ہو گئی۔ امیر بخش نے کہا گھبراؤ نہیں۔ انار اور انگور لایا ہوں۔ مگر سوداگر تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔

"کیا کہے گا؟" بیوی نے گھبرا کر کہا۔

"کیا معلوم!" میاں نے متفکرانہ انداز میں جواب دیا۔

بیوی نے پردہ کر لیا۔ دروازے کے باہر چارپائی بچھوا دی۔ اور کہا۔ لے آئیے۔

سوداگر نے اندر آکر ادب سے سلام کیا۔ اور کہا۔ "مائی! میں یہ چند انار اور انگور ہدیہ کے طور پر لایا ہوں۔ تمہارے میاں نے قیمت دینی چاہی تھی۔ میں نے نہیں لی۔ میری شرط یہ ہے۔ کہ تو مجھے یہ سند لکھ دے۔ کہ اگر تیرا بیٹا صاحب اقبال ہو تو مجھ سے مروت سے پیش آئے۔"

مائی کے چہرے پر خوشی کی ایک جھلک دوڑ گئی۔ کہا۔ میرا لال ضرور صاحب اقبال ہوگا۔ تبھی تو انار مانگتا ہے۔ آپ جو لکھوانا چاہتے ہیں۔ لکھ لیں۔ میں نشان کر دینے کو تیار ہوں۔ سوداگر پہلے سے چند سطور لکھ کر لایا تھا۔ ان کے نیچے مائی کا نام لکھ کر نشان کرالیا۔

## دریتیم

۱۰ صفر ۱۰۱۹ھ کو جمعرات کے دن امیر بخش کے گھر میں ایک خوبصورت بچہ پیدا ہوا۔ اس نے خوب جی کھول کر خیرات کی مسجد کے

نور احمد خاں فریدی

مولوی صاحب سے مشورہ کر کے سعد اللہ نام رکھا۔ زچہ اتنی خوش تھی کہ اسے دردِ زہ کا احساس بھی نہ رہا تھا۔ خدا کی بے نیازی دیکھئے کہ عصر کے قریب اچانک امیر بخش کے پہلو میں درد اٹھا۔ اور گھڑی کے اندر اندر چل بسا۔ لوگوں میں بچے کے خلاف نفرت سی پیدا ہو گئی۔ کہ کیسا منحوس ہے۔ پیدا ہوتے ہی باپ کو کھایا۔ زچہ نے میاں کی بے وقت موت کی خبر سنی۔ تو شدتِ غم سے بیہوش ہو گئی۔ ہزاروں تدبیروں سے اسے ہوش میں لایا گیا۔ ماں بہنوں نے بہتیرا حوصلہ دلایا۔ مگر اس کا سہاگ الٹ چکا تھا۔ دنیا اندھیر نظر آئی لیکن مرتی کیا نہ کرتی۔ بچے کو چھاتی سے چمٹا اس کی پرورش شروع کی۔ مگر قدرت کو یہ سہارا ابھی پسند نہ آیا۔ سعد اللہ نے ابھی پانچ بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں۔ کہ سوداگر کی زبان سے بچے کے صاحبِ اقبال ہونے کی پیشنگوئی سننے والی ماں ہزاروں حسرتیں دل ہی میں لئے آخرت کو سدھار گئی۔ اور سعد اللہ ماں باپ دونوں کی طرف سے یتیم ہو کر رہ گیا۔

## جستجوئے علم میں لاہور اور سیالکوٹ کا سفر

یہ "درِ یتیم" دس برس کی عمر تک چنیوٹ کی مسجدوں میں دینیات کی ابتدائی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ جب ذرا سفر کے قابل ہوا۔ تو شوقِ علم کشاں کشاں دار السلطنت لاہور کو لے چلا۔ وہاں دہلی دروازے کے اندر ایک مسجد میں پڑے رہنے کی جگہ مل گئی۔ دن کو آفتاب کی روشنی میں اور رات کو مٹی کے چراغ میں سرسوں کا نہیں بلکہ آنکھوں کا تیل جلا کر علم کی تلاش بجھاتا تھا۔ کھانے کا بندوبست کہاں ہوتا۔ قریبی مسلمانوں کے گھروں سے ادراج کی روٹیاں لے کر پیٹ کے جہنم کو بھر لیتا۔ یہاں سے سیالکوٹ کو روانہ ہوا۔ اور علامہ کمال الدین[۵] کاشمیری سے حدیث و تفسیر، منطق و فلسفہ اور علم کلام کی سند حاصل کی حضرت سے اجازت لے کر پھر لاہور پہنچا۔ ان دنوں یہاں ملّا خواجہ بہت مشہور ہو رہے تھے۔

## وزیر بادشاہِ ہند را الطلبید!

بزرگ میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور ملّا شاہ بدخشی کے پیر بھائی تھے۔ خواجہ بختاور مرآۃ العالم میں لکھتا ہے کہ نواب سعد اللہ خاں اپنی افلاس اور پریشانی کے زمانہ میں ملّا صاحب کے پاس کسبِ علوم کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ ایک دن ملّا صاحب بول اٹھے۔

"وزیر بادشاہِ ہند را الطلبید"

یعنی شہنشاہِ ہندوستان کے وزیر کو طلب کرو۔ حاضرین متحیر ہوئے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ مگر کسی وزیر کو مجلس میں موجود نہ پایا۔ اور نہ ہی ان دنوں لاہور میں کسی وزیر کا ورود ہوا تھا۔ ایک بے تکلف عقیدتمند نے جرأت کر کے عرض کیا۔ کہ حضور کا خطاب کس سے ہے۔ فرمایا۔

۵ علامہ کمال الدین کاشمیری کے متعلق مشہور تھا۔ کہ جو ان سے تلمذ کا شرف حاصل لیتا ہے وہ ضرور صاحبِ کمال بن جاتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی بھی آپ کے ہی شاگرد تھے۔

"ملّا سعد اللہ را مے گویم"

سعد اللہ اٹھ کر حضور کا دست بوس ہوا۔ جتنے اصحاب اس وقت وہاں موجود تھے۔ سب اسے مبارک باد دینے لگے۔ اس واقعہ سے سعد اللہ کے دل میں دہلی دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ بشارت شاہ نامی ایک درویش دہلی کو جاتا تھا۔ اس کے ہمراہ ہو لیا۔ کرنال تک پہنچے ہی تھے کہ بشارت شاہ تھک کر بیٹھ گیا۔ کہ ...

## دہلی کی کشش

تو اس ویران اور بنجر علاقے میں سفر نہیں کر سکتا۔ لیکن سعد اللہ نے ہمت نہ ہاری اور سموم ہوا کے تند و تیز طوفان میں فقر و فاقہ کی مصیبتیں برداشت کرتا دہلی جا ہی پہنچا۔ چوراہی محلہ کی مسجد میں مولوی محمد صالح کے ہاں مسجد میں جھاڑو دینے اور وضو کی سبیل بھرنے پر دو نو وقت کی روٹی ملنے لگی۔ اتفاق سے نواب[۵] آصف خاں وزیرِ اعظم کا محل پاس ہی تھا۔ ان کے دو صاحبزادے مولوی صاحب کے ہاں پڑھنے آیا کرتے تھے۔

## عروج و اقبال کی منزلیں

ایک دن اتفاق ایسا ہوا۔ کہ نواب صاحب کے بچے ایسے وقت پڑھنے آئے۔ کہ مولوی صاحب مسجد میں موجود نہ تھے۔ سعد اللہ نے ان سے تختیاں لے کر اصلاح دے دی۔ رات کو جب نواب صاحب نے اصلاح شدہ عبارت دیکھی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ پوچھا کہ یہ کس کا خط ہے؟ لڑکوں نے عرض کیا مولوی صاحب تو تھے نہیں۔ مسجد کے ملازم سعد اللہ نے اصلاح دے دی۔ نواب صاحب نے نوکر بھیج کر سعد اللہ کو بلوایا۔ اور کہا۔ کہ آپ یہاں آ کر بچوں کو اصلاح دے جایا کیجئے۔ آپ کو دس روپے ماہوار ملا کریں گے۔ سعد اللہ نے انتہائی تنگدستی کے عالم میں اس وظیفہ کو غنیمت سمجھ کر قبول کر لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اور ایسا واقعہ ظہور میں آیا جس سے سعد اللہ کی کایا ہی پلٹ گئی۔ ایک دن نواب صاحب کے بچے ملّا محمد صالح سے مقاماتِ ابو الفضل پڑھ رہے تھے۔ اتفاقاً کوئی مشکل سی عبارت آ گئی۔ مولانا نے لاکھ کوشش کی مگر اس کے معنی و مطالب بچوں کی سمجھ میں نہ آ سکے۔ سعد اللہ نے موقعہ پا کر اس عبارت کی اس طرح وضاحت کی کہ تمام مطالب فوراً بچوں کے ذہن میں آ گئے۔ بچوں نے رات کو نواب صاحب سے دن کا واقعہ ذکر کیا۔ انھوں نے صبح کو بلا کر چالیس روپے ماہوار اور دو وقتہ خوراک پر بچوں کا مستقل اتالیق مقرر کر دیا۔

ان دنوں ہندوستان کی باگ ڈور شاہ جہاں بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ اور ان کی شاہ ایران سے خط و کتابت رہتی تھی۔ انہی ایام میں جبکہ ملّا سعد اللہ نواب آصف خاں کے صاحبزادوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ شاہ ایران کا ایلچی دربار میں حاضر ہوا۔ اور ایرانی تحائف کے ساتھ اپنے بادشاہ کا خط بھی پیش کیا۔ خط میں ملکی معاملات اور دوستانہ باتوں کے علاوہ ایک سطر خاص صنعت میں لکھی ہوئی تھی۔ بادشاہ کے تمام درباری امرا و فضلا کئی دنوں تک فکر آزمائی کرتے رہے لیکن اس عبارت

۵ نواب آصف خاں ملکہ عالیہ نور جہاں کا بھائی تھا۔ جہانگیر کے زمانہ میں وزارتِ عظمیٰ کے مرتبہ پر فائز ہوا۔ بادشاہ نے اپنے ولی عہد سلطنت شاہ جہاں کی شادی اس کی لڑکی ممتاز زمانی سے کر دی۔ شاہ جہاں کے زمانے میں اپنی اخیر عمر تک اس عہدے پر سر بلند رہا۔

کے مفہوم کو نہ پاسکے۔ بادشاہ اور وزیر اعظم سخت پریشان تھے۔ کہ اگر واپسی مکتوب میں اس عبارت کا جواب نہ گیا تو ہندوستان کے علما و فضلاء کی بڑی سبکی ہوگی۔

## ملا سعد اللہ کی نکتہ آفرینی

ایک دن نواب صاحب اس کو اپنے ہمراہ گھر پر لائے۔ رات کو شمعدان آگے رکھ کر دریائے فکر میں ایسا غوطہ مارا کہ صبح ہی کو سر ابھارا۔ مگر در مقصود پھر بھی ہاتھ نہ آیا۔ صبح کو بیگم صاحبہ نے پوچھا۔ کیوں صاحب! شب بیداری کا نتیجہ بھی نکلا۔ نواب نے کہا۔ کچھ نہیں۔ کم بخت نے ایسی صنعت میں لکھا ہے۔ کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔"

ملا صاحب کو بھی شاگردوں کی زبانی اس مکتوب کی حقیقت معلوم ہوگئی تھی۔ جب نواب صاحب محلسرائے سے دیوان خانے میں آئے۔ تو ملا صاحب نے وہ خط دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ نواب صاحب نے کہا۔ ملاجی بڑے بڑے عالم فاضل تھک کر ہار بیٹھے مگر کسی سے عقدہ کشائی نہ ہوسکی۔ تم دیکھ کر کیا کروگے۔

ملا صاحب نے دست بستہ التماس کی۔ حضور والا کا ارشاد بجا۔ مگر دکھانے میں کیا ہرج ہے۔ کبھی نادانوں سے بھی دانائی کی بات ہو جاتی ہے۔ نواب صاحب نے مسکرا کر خط بڑھا دیا۔ اور کہا۔ دو گھڑی کے بعد بھجوا دیجئے گا۔ کیونکہ قلعے میں ہمراہ لے جانا ہے۔

ملا صاحب خط کو لے کر اپنے کمرے میں جا گھسے۔ دو گھڑی کے بعد ہشاش بشاش باہر نکلے۔ خط نواب صاحب کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا۔ "جناب والا فدوی مطلب سمجھ گیا۔ ایک ظرافت کی بات ہے جب اس کا جواب لکھا جائے گا تو فدوی اس کے آخر میں اس سطر کا جواب لکھ دے گا۔"

نواب صاحب نے ہرچند دریافت کیا۔ کہ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔ کہ وہ ظرافت کی کونسی بات ہے "تاکہ میں جہاں پناہ کی خدمت میں عرض کر کے تمہیں انعام دلاؤں۔ ملا صاحب نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ حضور والا! غلام کو تبا دینے میں کچھ عذر نہیں۔ لیکن لطف جاتا رہے گا۔ اس کا لطف اس وقت آئے گا۔ جب شاہ ایران اس جواب کی نسبت کچھ لکھیں گے۔ پس جہاں پناہ سے حضور یہی عرض کر دیں۔"

نواب صاحب نے قلعے میں جا کر بادشاہ کی خدمت میں تمام امر واقعہ عرض کیا۔ اور جس وقت خط کا جواب تحریر ہونے لگا۔ ملاجی سے بھی جواب لکھوا دیا گیا۔

## ملاجی مرغی خانے کے داروغہ بنتے ہیں

ملا صاحب کے لئے جہاں پناہ نے حکم دیا کہ اگر کوئی خدمت خالی ہو تو ملاجی کو دی جائے۔" اتفاق سے مرغی خانے کے داروغہ کی آسامی خالی تھی۔ ملا صاحب اس خدمت پہ مامور ہوگئے۔ بھلا ایک عالم کو مرغی خانے سے کیا نسبت! لیکن قابلیت یہاں بھی کام کرگئی جہاں مرغی خانے پر ماہوار سینکڑوں روپے خرچ ہوتے تھے اس دفعہ وہاں ایک پائی بھی نہ لگی۔ فرد ملاحظہ کرنے پر بادشاہ نے تعجب فرمایا کہ کیا ہمارے مرغی خانے کا خاتمہ ہوگیا کہ ان کی خوراک کا خرچ فرد میں درج نہیں لیکن جب حضور نے تشریف لے جا کر دیکھا۔ تو مرغ پہلے سے زیادہ تیار نظر آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ شاہی باورچی خانے میں دیگوں کے منہ خام کرنے کا آٹا جو ضائع جاتا تھا۔ اسے چکنی دیگوں میں ملوا کر ملا صاحب مرغوں کو کھلاتے ہیں۔ بادشاہ کو ملا صاحب کی یہ سلیقہ شعاری بہت پسند آئی جب رخصت ہونے لگے تو ملا صاحب نے عرض کیا۔ جہاں پناہ نے جو خدمت غلام کے سپرد کی تھی۔ فدوی نے اس سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کی۔ مگر یہ کام بندہ کی طبع کے خلاف ہے۔ اگر مرغی خانے کی جگہ کتب خانہ کی دیکھ بھال اس غلام کے سپرد کی جائے۔ تو عین احسان ہوگا۔ بادشاہ نے منظور کرلیا۔ اور ملاجی اب

## شاہی کتب خانے کا نیا لائبریرین

لائبریرین بن گئے۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کو کتب خانے کے دیکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ تشریف لا کر دیکھا۔ کہ تمام کتابوں پر زربفت کی چولیاں اور کمخواب کے جزدان چڑھے ہیں اور تمام الماریاں رنگا رنگ کی چولیوں اور جزدانوں سے عجیب کیفیت دکھا رہی ہیں۔ فرمایا: "ملاجی۔ مرغی خانے کی کسر یہاں پوری کردی۔ مگر فرد ابھی تک ملاحظہ سے نہیں گذری۔" عرض کیا: "حضور والا اگر کچھ خرچ ہوتا۔ تو فرد بھی پیش ہوتی۔" فرمایا: "پھر یہ چولیاں کہاں سے آگئیں؟"

ملا صاحب نے عرض کیا: "حضور والا! دربار شہنشاہی میں مراسلے اور عرضیاں جن خریطوں میں آتی ہیں۔ وہ منشی خانے میں بیکار پڑے تھے۔ فدوی نے وہاں سے منگوا کر توشے خانے کے درزیوں سے ان کی چولیاں اور جزدان سلوائے۔"

بادشاہ اس جواب سے بہت مسرور ہوئے۔ اور سوچنے لگے ایسا شخص تو وزارت کے لائق ہے۔ انہی ایام میں ایران سے خط کا جواب بھی آگیا۔ لکھا تھا کہ "ہم کو یقین ہے کہ جس شخص نے ہمارے مراسلے کا جواب لکھا ہے۔ وہ آپ کا وزیر ہوگا۔ اگر یہ بات نہیں ہے۔ اور وہ ایران آنا منظور کرے۔ تو ہم نے اسے اسی تاریخ سے اپنا وزیر مقرر کیا۔ جس تاریخ سے وہ ہندوستان سے روانہ ہوگا۔"

بادشاہ نے ملا صاحب کو بلا کر کہا: "اب تو بتاؤ۔ وہ کیا معمہ تھا۔" سعد اللہ نے عرض کیا: "جہاں پناہ! شاہ ایران نے لکھا۔ کہ آپ تو صرف ہند کے بادشاہ ہیں۔ پھر آپ نے شاہ جہاں اپنا خطاب کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ غلام نے اس کے جواب میں یہ لکھ دیا۔ کہ ہند اور جہاں کے عدد ایک ہیں۔ ہم نے ہند کی بجائے جہاں اختیار کرلیا۔ تو اس میں ہرج کیا ہوگیا؟"

ملا کی تقریر سے بادشاہ اور اہل دربار پھڑک اٹھے۔ ہر طرف سے واہ واہ اور مرحبا کی صدا آنے لگی۔ جہاں پناہ تخت سے اٹھ کر نیچے تشریف لائے اور اپنے ہاتھوں اپنا قیمتی جبہ اتار کر ملا سعد اللہ کے کندھوں پر ڈال دیا اور وزارت کا قلمدان طلب کر کے مع خلعت وزارت کے ملا کو عطا فرمایا۔ اب ملا سعد اللہ

نواب سعد اللہ خاں کروزارت کے پردے میں ہندوستان پر راج کرنے لگے۔ یہ واقعہ ۱۰۵۵ھ کا ہے۔ وزارت کا چارج نواب اسلام خاں سے دلوایا گیا۔ اور منصب چار ہزاری ہزار سوار کا عطا ہوا۔ ماہ رجب ۱۰۵۵ھ میں وزارت عظمیٰ کا منصب، خلعت خاصہ از اصل و اضافہ منصب پنج ہزاری ذات و ڈیڑھ ہزار سوار کا عنایت ہوا۔ ۱۰۵۶ھ میں منصب شش ہزاری دو ہزار سوار مرحمت ہوا۔ ۱۰۵۸ھ میں سعد اللہ خاں منصب ہفت ہزاری ہزار سوار دو اسپہ وسہ اسپہ پر سربلند ہوا۔ ۱۰۵۹ھ میں چونکہ نواب سعد اللہ خاں امارت کے تمام مناصب حاصل کر چکے تھے۔ اور کوئی رتبہ باقی نہ رہا تھا۔ اس لئے دو کروڑ درم جس کی مقدار تیس لاکھ روپے کے برابر ہوتی تھی بطور انعام کے عطا ہوا۔

اس زمانے میں امیر بخش کے یتیم کا اثر و نفوذ اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ شہنشاہ کا ولیعہد سلطنت سلطان داراشکوہ بھی اس سے خم کھاتا تھا۔

## ہم دشمن کو پشاور پر روکیں گے

شاہ جہاں بادشاہ نے جب شہر شاہ جہاں آباد (دہلی) تعمیر کیا۔ تو لال قلعے کے سامنے ایک پہاڑی پر جامع مسجد کی تجویز ہوئی امرا نے دست بستہ عرض کیا کہ اگر خدانخواستہ دشمن شہر میں گھس آیا تو اس مسجد کو بطور دمدمہ کے استعمال کرے گا۔ اور توپیں چڑھا کر لال قلعہ کو سرمہ بنا کر رکھ دے گا۔ بادشاہ کے چہرے پر تردد کے آثار ظاہر ہوئے۔ نواب سعد اللہ خاں نے بڑھ کر عرض کیا: "جہاں پناہ ہم دشمن کو پشاور پر روکیں گے۔" وزیر کی بلند ہمتی نے بادشاہ کے فکر کو دور کر دیا۔ خوش ہو کر فرمایا: "تو پھر اس مسجد کی تعمیر کا کام تم ہی سنبھالو۔" وزیر اعظم کی تو خواہش ہی یہی تھی۔ کہ یہ کار ثواب اس کے ہاتھوں تکمیل پائے چنانچہ اس نے بڑے انہماک سے اس کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔

## سعد اللہ خاں کی قرآن فہمی

نواب سعد اللہ خاں کی ذات بہت سی خوبیوں کی حامل تھی۔ وہ بہترین سپاہی بھی تھے اور پختہ کار حساب دار بھی، وہ معاملہ فہم منصف بھی تھے اور پرہیزگار عالم دین بھی۔ اپنے اپنے موقعہ پر انھوں نے اپنی قابلیت کے خوب جوہر دکھائے۔ ایک دفعہ دربار میں کوئی پادری حاضر ہوا۔ بادشاہ سے دوران گفتگو میں عرض پرداز ہوا: حضور والا! قرآن میں جو یہ آیا ہے کہ رطب اور یابس سب اس میں موجود ہے۔ بھلا یہ تو فرمائیے "دنوں" کا قرآن کے اندر کہیں ذکر ہے۔ بادشاہ نے فرمایا: "ہاں وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ (چاند سے منزلوں کے انداز مقرر کر دیئے ہیں) سے دن ہی تو مراد ہیں۔" پادری نے کہا: حضور نے درست فرمایا مگر سال میں دن کتنے ہیں۔ یہ تو ظاہر نہیں ہوتا۔" بادشاہ نے وزیر اعظم کی طرف دیکھا۔ نواب صاحب نے بلا تامل عرض کیا: جہاں پناہ، قرآن مجید نے پادری صاحب کے سوال کا جواب اسی آیت میں ہی دے دیا ہے۔" پادری نے کہا۔ "وزیر صاحب ذرا واضح کر کے سمجھائیے۔" نواب صاحب نے بادشاہ کی طرف متوجہ ہو کر عرض کیا۔ "حضور والا۔ قَدَّرْنٰهُ کے اعداد ابجد کے لحاظ سے ۳۶۰ ہوتے ہیں۔ اس سے قرآن کی ہمہ گیری کا زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔" نواب صاحب کے اس جواب پر ہر طرف سے تحسین و آفرین کی آوازیں آنے لگیں۔ اور بادشاہ نے خوش ہو کر اسی وقت اپنی خلعت فاخرہ مرحمت فرمائی۔ اور اٹھ کر ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ادھر پادری صاحب کے لئے اعتراف کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔

## سنگ لرزاں کی مسجد

نواب سعد اللہ خاں کے اعمال خیر میں سے اس کی ایک بے نظیر مسجد چنیوٹ میں اب تک موجود ہے۔ جب خدا نے اسے ہندوستان کی وزارت عنایت فرمائی تو اس نے وطن مالوف کی اس مسجد کو جہاں اس نے پہلے پہل بسم اللہ شروع کی تھی وسیع کر کے اعلیٰ پیمانہ پر سنگ سرخ اور سنگ لرزاں سے تعمیر کیا۔ یہ بہت کشادہ مسجد ہے۔ اس کے ستون مشہور ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ شمار میں نہیں آتے۔ اوپر جو مینار ہیں۔ وہ سنگ لرزاں سے بنے ہیں۔ ان میں خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی ہاتھ لگائے تو وہ ہلنے لگ جاتے ہیں۔

## بشارت شاہ کی آمد

بشارت شاہ کرنال سے واپس ہو گیا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا ہم سفر سعد اللہ آجکل ہندوستان کا وزیر اعظم بنا ہوا ہے تو وہ دہلی میں حاضر ہوا اور نواب کے محل میں داخل ہونے لگا۔ دربانوں نے روکا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا چاندنی چوک میں بیٹھ گیا۔ جب وزیر کی سواری گذرنے لگی تو سامنے آ گیا اور جھلا کر بولا۔ "او بدمعاش حرام زادے! اب یہ دماغ ہے کہ دروازوں پہ دربان بٹھا رکھے ہیں؟"

نواب سعد اللہ خاں دانا آدمی تھا چپ ہو رہا۔ جب اندر گیا۔ تو خزانچی سے کہا۔ "دس ہزار اشرفیاں لے آؤ۔ اور دیوان خانے میں خلوت کرا دو۔" پھر حکم دیا۔ "باہر ایک مجذوب کھڑا ہے۔ اسے لے آؤ!"

خزانچی لپک کر بشارت شاہ کو اندر لے آیا۔ وہ اپنی قدیم عادت کے مطابق گالیاں دینے لگا۔ نواب صاحب نے اس کی بکواس پر توجہ نہ دی اور اسے اپنی یہ طبعزاد رباعی سنائی ؎

آدمی را بچشم حال نگر　　از خیال پریشاں بگذر
نافہ آہو خوں بود　　سنگ ہست ابتدائے لعل و گہر

دس ہزار اشرفیاں اپنے ہاتھ سے شاہ صاحب کی نذر کیں۔ اور چار سپاہیوں کو بلا کر حکم دیا کہ اسی وقت قبلہ شاہ صاحب کو لے کر لاہور روانہ ہو جائیں اور وہاں پہنچا کر واپس آئیں۔

## ملک الیاس کی باریابی

سوداگر پیشہ لوگوں کا دستور ہے کہ جب کسی شہر میں وارد ہوتے ہیں تو اس جگہ کے اکابر و معارف کا حال پوچھ لیتے ہیں۔ بخت کی یاوری کہ ملک الیاس کو جس نے سعد اللہ خاں کی والدہ کو انار اور انگور پیش کئے تھے

دہلی میں لے آئی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وزیر اعظم چنیوٹ کا باشندہ ہے اور اس کے والدین غریب آدمی تھے۔ تو اسے یقین ہوگیا کہ ہو نہ ہو وہی بچہ ہے جس کے متعلق میں نے پیشنگوئی تھی۔ کہ ایک دن نصرت و اقبال اس کے قدم چومیں گے۔ وہ اپنے قیافے کے صحیح ہونے پر بہت خوش ہوا۔ فوراً خریطے سے وہی سند نکالی اور وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کی والدہ کا دستخطی کاغذ پیش کیا۔ نواب صاحب کو ماں کی شکل بھی یاد نہ تھی۔ انگوٹھے کے نشان کو دیکھ کر فرط محبت سے ان کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ کاغذ کو سر آنکھوں سے لگایا۔ کہا: "اے عمّ مہربان! آپ نے میرے ماں باپ کو دیکھا ہے اور ایک وقت میں ان کی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس لئے آپ بمثل میرے ماں باپ کے ہیں۔ اس غریب خانہ کو اپنا گھر سمجھئے۔ اور جو خدمت میرے لائق ہو بلاتکلف ارشاد فرمائیے"

ملک الیاس نے وزیر اعظم کی اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا اور اپنے علائق خاندانی کا ذکر کرکے رہائش سے معافی چاہی۔ کہا کہ اگر میرے مال و اسباب پر سے محصول ہٹا دیا جائے۔ تو یہ میری بہت بڑی خدمت ہوگی۔ نواب صاحب نے اسی وقت معافی کا فرمان لکھ دیا۔ اور سوداگر شادکام رخصت ہوا۔

## نواب سعد اللہ خاں کا سفر آخرت

صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے۔ سعد اللہ خاں وزیر بعارضہ قولنج کہ از مدتے داشت و تقرب خاں علاج مے نمود بعمر ۷۴ سال بتاریخ ۲۲ رجمادی الثانی سنہ ۱۰۶۶ھ فوت شد۔

اب خافی خاں کا بیان سنئے۔ لکھتا ہے۔

"نواب سعد اللہ خاں عارضہ قولنج میں پانچ چار مہینے مبتلا رہا۔ اس کی عیادت کو بادشاہ کئی بار گیا۔ طبیبوں کو اس نے بار بار بدل کر علاج کے لئے مقرر کیا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اور آخری جمادی الاخریٰ سنہ ۱۰۶۶ھ کو اس سرائے فانی سے روضہ جاودانی کو اس نے انتقال کیا۔ بادشاہ کو ایسا ملال ہوا۔ کہ وہ اس کے لئے بے اختیار زار زار رویا"

برنی ار لکھتا ہے کہ داراشکوہ نے زہر دے کر اس جلیل القدر امیر کو شہید کرایا۔ لیکن فارسی تاریخوں سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اگر دارا کا اس کی وفات میں کچھ دخل ہوتا تو اورنگ زیب جو کہ بھائی کی معمولی سی لغزش کو بھی دامن عفو میں چھپانے کے لئے تیار نہ تھا اس کا ضرور ذکر کرتا یا اس کے طرفدار مورخ ضرور لکھتے۔

حکیم داؤد خاں مخاطب بہ تقرب خاں جو کہ بادشاہ کا معالج خاص تھا۔ اس کا علاج کرتا رہا اور خود بادشاہ کئی بار چل کر اس کی عیادت کو پہنچا۔ خافی خاں نے اگرچہ سعد اللہ خاں اور داراشکوہ کے باہمی حسد اور بے جا کاوشوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر وہ صاف تسلیم کرتا ہے کہ جملہ اختیارات رکھنے اور ولیعہدی کے امیدوار ہونے کے باوجود داراشکوہ مرتے دم تک سعد اللہ خان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ کیونکہ امرا اس پر جان دیتے تھے اور بادشاہ فدا تھا۔ برنی ار کی تاریخ کا قلعہ قیاس کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ہر جگہ افواہوں اور باہمی تعلقات سے بہت سے غلط نتائج مرتب کرلیتا ہے۔ چنانچہ الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ میں اس امر کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اگرچہ وہ اپنی تاریخ میں ہر جگہ برنی ار کے حوالے دیتا ہے۔

## آثار باقیہ

نواب سعد اللہ خاں کے انتقال کے وقت اس کے بڑے بیٹے لطف اللہ کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ اسے بادشاہ نے منصب صدی صد سوار کا منصب عطا فرمایا تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں صوبہ داری کے عہدہ تک ترقی کی۔ لاہور میں اس نے اپنے لئے سنگ سیاہ کا عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ قبر کا تعویذ، فرش۔ دیواریں سب سنگ سیاہ کی تھیں۔ مگر طوائف الملوکی کے زمانہ میں سیاہ پتھر اکھڑوا دیا گیا۔ اب خشتی قبر رہ گئی ہے۔ چونکہ ان کی اولاد نہ رہی تھی۔ اس لئے محکمہ نزول نے -/۲۲۵۰ روپے میں یہ مقبرہ اور ملحقہ باغ نواب علی رضا قزلباش کو دے دیا۔ نواب سعد اللہ خاں کی قبر کا حال معلوم نہ ہوسکا۔ اس نے دہلی، لاہور اور چنیوٹ میں کئی شاندار حویلیاں تعمیر کی تھیں۔ رنگ محل (لاہور) جہاں اب مشن اسکول ہے۔ یہ اسی کی حویلی کا کچھ حصہ ہے باقی حصہ اس کے جنوب میں تھا۔ موچی دروازہ میں حویلی پتھراں والی کے نام سے نواب مرحوم کی ایک اور حویلی بھی تھی۔

اس وقت چنیوٹ میں نواب سعد اللہ خاں کی اولاد سے کوئی شخص نہیں ہے۔ مگر اس کی بنائی ہوئی سنگ لرزاں کی عالیشان مسجد اور اس کے محلات کے کھنڈر اس کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں۔ ؎

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بہ عدل ✿ گرچہ بسے گزشت کہ نوشیرواں نماند
خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر ✿ زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

## چھینک ــــ بقیہ ــــ صفحہ ۴۷

چھینک ــــ بقیہ ــــ صفحہ ۴۷

مانگنے حاضر ہوا ہوں۔ میرا مطلب مذاق کرنا نہیں ہے جیسا کہ جناب کو گمان ہے۔ میں نے چھینک کر جناب کو ساں دیا تھا۔۔۔"

جنرل غصہ میں کانپنے لگا اور چیخ کر کہا "نکل جاؤ یہاں سے"

چریا کو خوف کے مارے سمجھ نہ سکا کہ جنرل نے کیا کہا۔ دبی آواز میں اس نے پوچھا "کیا فرمایا حضور نے"

جنرل نے زمین پر زور سے پاؤں مارا اور چلا کر کہا "نکل جاؤ یہاں سے"

جنرل کی پرغیظ ڈانٹ کا چریا کو پہ برا اثر پڑا۔ ڈر کے مارے اس کی گھگی بندھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا کانوں سے اس کو سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بمشکل تمام گھسٹتا ہوا مکان سے نکلا اور میکانے کی قوت سے چلتا ہوا گھر پہنچا۔ وردی اتارے بغیر بستر میں داخل ہوا۔ جنرل کی ڈانٹ کا اسے اتنا صدمہ ہوا کہ وہ پھر جاں بر نہ ہوسکا۔

# لیبیا کی قومی تحریک

لیبیا افریقہ کے شمالی ساحل پر بحیرۂ روم کے کنارے واقع ہے اس کے مشرق میں مصر ہے۔ اور مغرب میں ٹیونس اکل رقبہ ۴۰۶۵۰۰ مربع میل ہے۔ پورا ساحل دو صوبوں میں بٹا ہوا ہے۔ مشرقی صوبہ سائرینیکا کہلاتا ہے۔ اور مغربی صوبہ ٹری پولی ٹینا۔ ٹری پولی ٹینا کا پایۂ تخت ٹری پولی (طرابلس المغرب) ہے اور سائرینیکا کا صدر مقام بن غازی۔ دونوں صوبوں کی آبادی تقریباً نو لاکھ ہے۔ اور آبادی میں اکثریت عربوں اور بربریوں کی ہے۔

دونوں صوبوں کی شروع زمانہ کی تاریخ قریب قریب ایک سی ہے حضرت مسیح سے تقریباً ساڑھے چھ سو برس قبل فونیقی قوم نے ان دونوں صوبوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ فونیقیوں سے یہ دونوں صوبے یونانیوں کے پاس گئے یونانیوں سے رومیوں کو ملے اور پانچویں صدی عیسوی میں بازنطینی سلطنت میں شامل کئے گئے۔ پھر ساتویں صدی عیسوی میں پورا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔

ساتویں صدی سے سولہویں صدی تک لیبیا کی تاریخ میں کوئی اہم واقعہ نظر نہیں آتا۔ عربوں کی مرکزی طاقت کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے عرب سلطنت کے تمام ملک خود مختار ہو گئے تھے۔ چنانچہ لیبیا بھی خود مختار تھا۔ لیکن اس ملک میں اس تمام زمانہ میں خانہ جنگی اور طوائف الملوکی رہی۔ سیاسی انتشار کے اس دور میں ناممکن تھا کہ قوم متحد ہو کر اپنا کوئی نصب العین مقرر کرتی اور قومی زندگی کو کسی اونچے معیار پر لانے کی کوشش کی جاتی۔

ریگستانوں کے بسنے والوں قبائلی سرداروں کے ساتھ وفاداری کا جذبہ ہوتا ہے۔ قومی اتحاد کے اصول کو سمجھنا ان کے لئے آجتک مشکل ہے۔ پھر قرون وسطی میں تو اس کا ذکر ہی کیا؟ چنانچہ لیبیا میں صدیوں تک قبائلی اختلافات اور جنگیں جاری رہیں۔ اسی ابتری کی وجہ سے ملک پر پڑوس کی حکومتوں کی للچائی ہوئی نظریں پڑنے لگیں۔ چنانچہ اس دوران میں لیبیا ٹیونس کے قبضہ میں چلا گیا۔ سولھویں صدی عیسوی میں جب عربوں کی جگہ ترکوں کو اقتدار حاصل ہوا تو لیبیا بھی ۱۵۵۲ء میں ترکی سلطنت کی ایک ولایت بن گیا۔ اور یہاں ایک ترکی گورنر مقرر ہوا۔

اٹھارویں صدی تک لیبیا کو ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ ۱۷۱۱ء میں طرابلس کے کرمانلی خاندان کے ایک شخص احمد پاشا نے جو ینگ چری ترکوں کی نسل سے تھا۔ لیبیا میں خود مختار حکومت قائم کی لیکن اس نے اور اس کے خاندان نے ترکی خلیفہ کے قائم مقام کی حیثیت سے حکومت کی، یہ لوگ خلیفہ کو باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے۔ لیکن ایکصدی بعد اس خاندان پر زوال آیا اور ۱۸۳۵ء میں ملک میں پھر خانہ جنگی چھڑی ترکوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر دوبارہ لیبیا پر اپنا پورا اثر قائم کر لیا۔ اور یہ ملک پھر ترکی حکومت کی ایک ولایت بن گیا۔ ترکوں کے قبضہ میں آجانے کے بعد بھی لیبیا کے اندرونی اختلافات نہ مٹے۔ البتہ اسی زمانہ میں سائرینیکا قومی اتحاد کی ایک تحریک شروع ہوئی جسے سنوسی تحریک کہتے ہیں۔ اس تحریک نے سائرینیکا کے تمام قبائل کو اس طرح متحد کر دیا کہ وہ باقاعدہ ایک ملکی طاقت سمجھے جانے لگے۔

سنوسی تحریک کے بانی کا نام سید محمد بن علی بن السنوسی الخطابی الحسینی الادریسی المناجری تھا۔ ان کو عرف عام میں شیخ سنوسی کہا جاتا ہے۔ یہ فاطمی سید تھے۔ الجزائر کے شہر مستغنم میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش ۱۸۰۳ء ہے انہوں نے فیض کے شہر میں دین کی تعلیم حاصل کی ابتدا ہی سے مذہبی احساس رکھتے تھے۔ چنانچہ قوم اور مذہب کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا۔ انہوں نے قوم اصلاح کا ایک مکمل پروگرام تیار کیا جس کی بنیاد دین کی اصلاح پر رکھی۔ تیس سال کی عمر میں انہوں نے مراقش چھوڑ دیا۔ اور دینی اصلاح کی تبلیغ کے سلسلہ میں الجزائر کے صحرا میں دورہ شروع کیا۔ الجزائر سے ٹیونس پہنچے۔ اور وہاں سے طرابلس آئے اور ان ملکوں میں کافی مسلمان ان کی تبلیغی اور اصلاحی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اور ان کی تحریک ترقی کرنے لگی۔

شیخ سنوسی کی تعلیم اور تبلیغ کے اصول خالص اسلامی اصول تھے۔ انہوں نے قرآن اور حدیث کا نہایت غور سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ تیرہ سو برس میں مسلمانوں کی دینی زندگی کے اندر اس قدر خرافات شامل ہو گئی ہیں۔ کہ اسلام کی اصل تعلیم بالکل چھپ گئی۔ اور مسلمان اس تعلیم سے دور جا پڑے جس کا پیغمبر اسلام نے دنیا کو سبق دیا تھا۔ اس تعلیم کو دوبارہ اجاگر کرنے کا ان کے نزدیک صرف ایک طریقہ تھا۔ اور وہ یہ کہ پیغمبر اسلام نے جس سیدھے اور صاف انداز میں اسلام پیش کیا اور شروع زمانہ کے مسلمانوں نے جس طرح اسلام کو سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ وہی طریقہ امت کو اختیار کرنا چاہئے۔ وہ آزادی کو اسلام کی بنیادی تعلیم قرار دیتے تھے۔ اسی وجہ سے فکری اور سیاسی دونوں قسم کی آزادی کی تبلیغ کرتے تھے۔ فکری آزادی سے ان کی یہ مراد تھی۔ کہ مسلمان کا ذہن دوسروں کا غلام نہ بنے اسے چاہئے کہ خدا اور رسول کے احکام کی پیروی کرے، اس کے بعد کسی مذہبی پیشوا یا بزرگ کی تقلید اس پر فرض نہیں یہی وجہ ہے کہ گو شیخ سنوسی اپنے آپ کو مالکی، فقہ کا پیرو کہتے تھے لیکن اس کی پیروی اس سختی کے ساتھ نہ کرتے تھے جیسی اس فرقہ کے لوگ عام طور پر کرتے ہیں فقہ تو فقہ ہے وہ قرآن کو سمجھنے کے لئے مفسروں کی رائے کو ضروری نہ بتاتے تھے، ان کا خیال تھا کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے بس حدیث کافی

قاسم حسن

ہے۔ جب تک علماء کی تقلید کی جائے گی۔ قرآن کی حقیقت پڑھنے والے کے ذہن پر روشن نہ ہوگی۔ وہ ابتدائی دور کے اسلام کو عقائد اور عمل کا نمونہ قرار دیتے تھے۔ اور اپنے پیروؤں کو اسی نمونہ پر چلنے کی تبلیغ کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اسلام میں سیاست اور مذہب دو جُدا چیزیں نہیں اور اسلام کا ابتدائی دور اس کی مثال ہے۔ انہوں نے بھی اپنی تحریک میں اپنا مقصد یہی قرار دیا تھا کہ مسلمانوں کی تنظیم اس ڈھنگ پر کی جائے کہ ان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی بنیاد اسلام کی تعلیم پر ہو، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس ایک پورا پروگرام تھا۔ جسے وہ اسلامی ملکوں میں جاری کرنا چاہتے تھے۔ اسی پروگرام کے چلانے کیلئے انہوں نے درویشوں کا وہ سلسلہ قائم کیا تھا جسے سنوسی فرقہ کہتے ہیں۔

اب تک شیخ سنوسی کی تبلیغ الجزائر، ٹیونس اور طرابلس میں ہوئی تھی۔ اور ان تینوں ملکوں میں انہیں اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ لیکن جب وہ مصر میں قاہرہ پہنچے تو جامعہ ازہر کے علماء نے ان کو غیر مقلد قرار دیکر ان کی مخالفت کی جس کی وجہ سے شیخ قاہرہ سے مکہ چلے گئے۔ یہاں ۱۸۳۵ء میں انہوں نے ابو قبیس میں اپنی پہلی خانقاہ قائم کی۔ عرب کے قیام کے زمانہ میں شیخ سنوسی نے وہاں کے وہابی فرقہ کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کئے۔ اس فرقہ کے عقائد میں بھی ان کو وہی چیز نظر آتی تھی جس کی تلاش میں وہ خود تھے۔ وہابی فرقہ کے ساتھ شیخ کا ربط ضبط دیکھ کر مکہ کے علماء بھی ان کے خلاف ہوگئے۔ جب یہ مخالفت زیادہ ہوئی تو ۱۸۴۳ء میں شیخ نے مکہ چھوڑ دیا اور سائرینیکا میں آکر قیام کیا۔ یہاں درنا کے پہاڑوں میں انہوں نے اپنی مشہور خانقاہ "زاویہ بیضا" کے نام سے قائم کی لیبیا میں یہی خانقاہ ان کی تبلیغ کا مرکز بنی۔

سنوسیوں کا تبلیغی پروگرام یہ تھا کہ سب سے پہلے یہ اپنی تبلیغی کوششوں کے لئے ایک علاقہ منتخب کرتے تھے۔ اس علاقہ میں کسی ایک مقام کو اپنا مرکز قرار دیتے تھے۔ یہ مرکز "زاویہ" کہلاتا تھا۔ اور اسی "زاویہ" سے اس پورے علاقہ کی تنظیم کیلئے کوشش جاری ہوتی تھی۔ یہ تنظیم اسلام کے بالکل شروع زمانہ کی تنظیم کے اصول پر کی جاتی تھی۔ ہر زاویہ ایک شیخ کے ماتحت ہوتا تھا یہ شیخ اسلام کی تعلیم سے بخوبی واقف ہوتا تھا۔ اور اپنی تحریک کے مقاصد سے بھی پوری طرح باخبر ہوتا تھا۔ اپنے حلقہ میں مذہبی تعلیم دینے کے ساتھ ہی ساتھ وہ قبائلی اور انفرادی جھگڑوں کو بھی فیصل کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں سنوسی شیوخ کو وہ کامیابی اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ جو کبھی ترکوں کو میسر نہ آئی تھی۔ شیخ کے تمام پیروؤں پر فرض تھا کہ وہ تحریک کے چلانے کے لئے اپنے زاویہ کو مالی امداد دیں۔ اس طرح جو رقم وصول ہوتی تھی اس کا زیادہ حصہ زاویہ کی کوششوں کے سلسلہ میں صرف ہوتا تھا، جو باقی بچتا تھا وہ تحریک کے مرکزی سردار کے پاس بھیج دیا جاتا تھا۔ اس طرح شیخ محمد علی سنوسی کے زاویوں نے بہت جلد ترکوں کی سلطنت کے اندر ایک دوسری سلطنت کی سی حیثیت اختیار کر لی۔ سنوسیوں کو سب سے زیادہ اثر اور اقتدار سائرینیکا میں حاصل ہوا۔ کیونکہ یہاں ترکی اثر پہلے سے ہی کم تھا۔ اور اسی وجہ سے سنوسیوں نے سب سے پہلے اسی کو اپنے لئے عمل کا میدان بنایا۔

سنوسیوں کے ہر زاویہ کے زیر اثر جو علاقہ ہوتا تھا۔ اس کا انتظام کرنے میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا کہ مقامی رسموں اور رواجی قانون کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ بشرطیکہ یہ رسمیں اور رواجی قانون اسلام کے اصولوں کے خلاف نہ ہوں۔ ملک کے بسنے والے زیادہ تر گلہ بان تھے۔ اس قسم کی سیدھی سادی سماج میں لازمی تھا کہ سنوسیوں کا انتظامی اصول مقبول ہو۔

ترکوں کو سنوسیوں کی یہ ترقی پسند نہ آئی۔ اسی وجہ سے سنوسیوں کی برابر یہ کوشش رہی کہ ترکوں کے ساتھ ان کا تصادم نہ ہو۔ ۱۸۵۵ء میں جب ترکوں نے سنوسیوں کا مقابلہ کرنا چاہا۔ تو اس ٹکر کو بچانے ہی کی غرض سے سنوسیوں نے سائرینیکا کو چھوڑ دیا۔ اور پہلے تو جغبوب کے نخلستان کو اپنا مرکز بنایا۔ لیکن اب ان کی جماعت فوجی رنگ اختیار کرنے لگی۔ اس نئی خصوصیت نے جماعت میں اتحاد اور یہیں شیخ احمد سنوسی نے انتقال کیا اور شیخ نے دو لڑکے چھوڑے شیخ محمد شریف اور المہدی۔ دوسرے کو خلیفہ بنایا۔

شیخ مہدی سنوسی کو بھی اپنے تقدس اور سیاسی دور اندیشی کی وجہ سے قوم میں وہی مقبولیت حاصل ہوئی جو ان کے باپ کو حاصل تھی۔ انکے زمانہ میں سنوسی زاوے لیبیا سے باہر الجزائر، فلسطین، ترکی اور ہندوستان میں بھی قائم ہوئے۔ شمالی افریقہ میں مشرق کی طرف مصر کی مغربی سرحد سے سوڈان کے وسط تک اور مشرقی صحرا میں اور شمال میں ٹریپولی ٹینیا کے ساحلی علاقہ تک شیخ مہدی سنوسی کا اثر قائم ہوگیا۔ اور ان کو بادشاہی اختیارات حاصل ہوگئے۔

سنوسیوں نے لیبیا کے نخلستانوں پر قبضہ کرلیا۔ اور ان میں زراعت شروع کر دی۔ ساتھ ہی صحرانشیں بدوؤں کی تنظیم کی طرف قدم اٹھایا۔ اور لیبیا اور لیبیا سے باہر وسطی سوڈان تک ان کی تبلیغ پھیل گئی۔ اور عربوں کی ایک بڑی تعداد ان کی تحریک میں شامل ہوگئی۔ سنوسیوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت نے ترکوں کو پریشان کر دیا، اس زمانہ سلطان عبدالحمید دوئم ترکی کے خلیفہ تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ٹریپولی ٹینیا اور سائرینیکا کے اکثر حصوں میں ترکی گورنر سے کہیں زیادہ سنوسی شیوخ کی عزت اور ان کا اثر تھا ترکوں کی طرف سے سنوسیوں کے خلاف کاروائیاں شروع ہوگئیں۔ اور اسی مخالفت کی وجہ سے شیخ سنوسی نے ۱۸۸۹ء میں جغبوب کو چھوڑ کر بن غازی سے سات سو میل دور کفرہ کے ریگستان کو اپنا مرکز بنایا۔ یہاں آس پاس کی حبشی سلطنتوں کے ساتھ سنوسیوں کے دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے

جس سے سنوسی تحریک کو اور بھی امداد ملی اور تھوڑے ہی عرصہ میں سنوسی راد سے جھیل چھڈ کے ارد گرد تقریباً سو میل کے رقبہ میں پھیل گئے۔

اس علاقہ میں سنوسیوں کے لئے ایک نیا خطرہ پیدا ہو رہا تھا اور وہ فرانسیسیوں کا خطرہ تھا فرانسیسی کانگو کی طرف سے وسط سوڈان کی طرف بڑھ رہے تھے اور یہ سنوسی علاقہ تھا۔ سنوسیوں کو اپنے بچاؤ کے لئے فرانسیسیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۱ء تک فرانسیسیوں کے ساتھ ان کی جنگ ہوتی رہی لیکن آخیر میں سنوسیوں کو کفرہ سے پیچھے کا علاقہ فرانسیسیوں کو دینا پڑا اور جنگ ختم ہوگئی۔

فرانسیسیوں کے ساتھ سنوسیوں کی یہ جنگ اس وجہ سے خاص کر اہم ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ سنوسی جماعت نے ہتھیار سنبھالے لیکن اس دس سال میں لڑائی میں پہل کبھی سنوسیوں کی طرف سے نہیں ہوئی وہ ہمیشہ اپنے بچاؤ کے لئے لڑے لیکن بچاؤ کے سلسلہ میں ان کو جو تیاری کرنی پڑی اس نے ان کے دلوں میں فوجی جذبہ پیدا کر دیا اور ان کے آپس کے اتحاد کو بہت بڑھا دیا۔ اسی اتحاد کی بدولت ان کی تحریک اس قدر کامیاب ہوئی کہ بہت جلد پورے سائیرینیکا نے ان کی اطاعت قبول کر لی۔

فرانسیسیوں کے ساتھ سنوسیوں کی جنگ ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے لیبیا پر حملہ کر دیا۔ دنیا کی تاریخ میں ہر ملک کے بسنے والوں میں قومی جذبہ سب سے زیادہ اسی وقت ابھرا ہے جب کسی بیرونی طاقت نے ان پر حملہ کیا ہے۔ اپنے ملک کی آزادی کو بچانے کے لئے ملک والے ہمیشہ متحد ہوتے ہیں اور وطن اور قوم کی خدمت کے لئے تن من دھن سے تیار ہوگئے ہیں۔ چنانچہ لیبیا کے باشندوں میں بھی اٹلی کے حملہ نے قومیت کے احساس کو جگا دیا۔ ترکوں کو اٹلی کے حملہ کا پہلے سے اندازہ تھا چنانچہ پچھلے پندرہ سال کے عرصہ میں وہ لیبیا والوں کو خوش رکھنے کی برابر کوشش کرتے رہے تھے۔ انھوں نے لیبیا کے قصبوں میں مدرسے کھلوائے تھے، قبائلی معاملات کے ساتھ برابر ہمدردی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ حکومت کے انتظام میں لیبیا والوں کو شریک کرنے کی غرض سے اکثر ذمہ داری کے عہدوں پر ملکی لوگوں کو مقرر کر دیا گیا تھا، ان تمام کوششوں کے علاوہ ترکی سلطنت میں اتحاد قائم رکھنے اور اس سلطنت میں اتحاد قائم رکھنے اور اس سلطنت کے ملکوں کو یورپ والوں کی دست برد سے بچانے کے لئے ترکی نے ایک تحریک جاری کی تھی جسے "تحریک اتحاد اسلامی" یا "عالمگیر اسلامیت" کہا جاتا ہے اور جو انگریزی میں پان اسلامزم کہلاتی ہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں یہ تحریک اپنی پوری ترقی تک پہونچ چکی تھی۔ ترکی سلطنت کے تمام ممالک اس تحریک میں حصہ لے رہے تھے اور ان کے اندر غیر معمولی طریقے پر قومی جذبہ پیدا ہو گیا تھا، لیبیا پر بھی اس تحریک کا پورا اثر تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں جس وقت اٹلی نے لیبیا پر حملہ کیا ہے تو اس وقت اس ملک میں دو جماعتیں تھیں، طرابلسی عرب یعنی ٹری پولی ٹینا کے قبائل اور سنوسی فرقہ۔ یہ دونوں جماعتیں اب تک ترکوں سے برگشتہ تھیں لیکن اس وقت اٹلی سے مقابلہ میں نہایت خوشی کے ساتھ ترکوں کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہوگئیں۔ طرابلس کی جنگ میں اٹلی کا صرف ترکوں اور لیبیا کے باشندوں ہی سے مقابلہ نہ تھا بلکہ کل اسلامی دنیا کی مخالفت کا سامنا تھا۔

اگرچہ ٹری پولی ٹینا اب تک سائیرینیکا سنوسی تحریک سے الگ تھا لیکن دونوں صوبے اپنی اپنی آزادی کے لئے تقریباً بیس سال تک ترکوں کے ساتھ یورپی طاقتوں سے لڑتے رہے۔ ۱۹۱۹ء میں ترکوں کو جنگ عظیم میں شکست ہوئی ٹری پولی ٹینا اس وقت تک ترکوں کے ساتھ رہا لیکن ... سائیرینیکا، سرخیقہ نیفصان میں اپنی آزادی کے لئے کبھی تنہا اور کبھی ترکوں کے ساتھ اخیر تک اٹلی کا مقابلہ کرتے رہے لیکن ترکوں کی طاقت روز بروز کمزور ہوتی جاتی تھی اور اٹلی لیبیا پر قابو پاتا جاتا تھا لیبیا پر اٹلی کا شکنجہ جس قدر کسا جاتا تھا لیبیا والوں میں قومی جذبہ آزادی اور زیادہ ہوتا جاتا تھا اور آزادی کی خواہش اتنی ہی بڑھتی جاتی تھی۔

۲۵ر فروری ۱۹۱۲ء کو اٹلی نے لیبیا پر اپنے سیاسی اقتدار کا اعلان کیا۔ لیکن اس اعلان کو نہ ترکوں نے تسلیم کیا، نہ طرابلسی عربوں یعنی ٹری پولی ٹینا نے اور نہ سنوسیوں یعنی سائیرینیکا نے کیونکہ ابھی تک ملک پر اٹلی کا قبضہ بھی نہ ہوا تھا اس لئے ترکوں کو ایک موقع ہاتھ آگیا اور ترکی خلیفہ نے لیبیا کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان میں عربوں کے نقطۂ نظر سے جو دفعہ خاص طور پر لیبیا کے لئے مفید تھی اس کے الفاظ یہ تھے "تمہارے ملک میں امن اور خوشحالی قائم کرنے کے خیال سے میں بحیثیت اس ملک کے بادشاہ کے تمہیں مکمل آزادی بخشتا ہوں"

اسی زمانہ میں بلقان کی پہلی جنگ چھڑ گئی۔ ترک اپنی فوجی طاقت کو بلقان کے محاذ پر اکٹھی کرنا چاہتے تھے اس کی خاطر ان کو لیبیا چھوڑنا پڑا چنانچہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو اٹلی کے ساتھ انھوں نے صلح کر لی۔ یہ صلح وزان کے مقام پر ہوئی تھی اس لئے یہ صلح نامہ وزان کا صلح نامہ کہلاتا ہے۔ اس کی رو سے ترکوں نے لیبیا پر اٹلی کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کر لیا لیکن ترک اس سے پہلے عربوں کی آزادی کا اعلان کر چکے تھے اس لئے عربوں نے اس صلح نامہ کو تسلیم نہ کیا اور اٹلی کے سیاسی اقتدار کا مقابلہ کرنے لگے۔

لیبیا سے ترکوں کے چلے جانے کے بعد بھی اٹلی اس ملک کو فتح نہ کر سکا۔ ۱۹۱۵ء تک عربوں نے اٹلی والوں کو بہت سی شکستیں دیں اور اٹلی کا ٹری پولی ٹینا میں صرف دو شہروں یعنی طرابلس اور حمص پر قبضہ ہو سکا۔ اسی طرح سائیرینیکا میں سولم کے قریب سنوسی فوج سے اٹلی کا مقابلہ ہوا لیکن اٹلی والوں کو شکست ہوئی اور سائیرینیکا پر ان کا بس اتنا اثر نہ ہو سکا کہ ان کی چند فوجوں نے سرحد پر اڈے جما لئے۔

اس زمانہ میں سنوسی جماعت کے صدر نشین سید احمد شریف سنوسی تھے

جو تحریک کے بانی سید محمد بن علی کے پوتے تھے۔ یہ "تحریک اتحاد اسلامی" کے زبردست حامی تھے، چنانچہ "باب عالی" (ترکی خلافت) کی طرف سے ان کو شمالی افریقہ کا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ - ۱۹۱۸) کے دوران میں چونکہ سنوسی فرقہ ترکوں کے ساتھ تھا اس لئے ترکوں کی مدد کی خاطر شیخ احمد سنوسی نے اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ وسطی سوڈان، اینگلو مصری سوڈان اور جھیل چھڈ کے علاقہ میں اتحادی طاقتوں کے ساتھ سنوسیوں کی جنگ چھڑ گئی۔ ۱۹۱۵ء میں سنوسیوں نے مصر پر بھی حملہ کر دیا اور یہ لڑائی دو سال جاری رہی لیکن اخیر میں سنوسیوں کو شکست ہوئی اور شیخ احمد سنوسی کو سائیرینیکا سے جلا وطن ہونا پڑا۔ اٹلی والوں نے شیخ سید محمد ادریس سنوسی کو جو شیخ احمد شریف سنوسی کے چچا زاد بھائی تھے اور مدت سے مصر میں مقیم تھے بلا کر سنوسیوں کا سردار بنا دیا۔ اٹلی والوں نے ان کے ساتھ معاہدہ کر لیا کہ ان مقامات کو چھوڑ کر جو فوجوں کے قبضہ میں ہیں باقی کل سائیرینیکا شیخ ادریس کے قبضہ میں رہے گا۔ اور وہی یہاں کے حاکم ہوں گے۔

۱۹۱۸ء میں جب ترکی کو جنگ عظیم میں شکست ہوئی تو ٹری پولی ٹینیا والوں نے اپنے ملک میں جمہوریت کا اعلان کر دیا، اور گو قبائلی سرداروں میں آپس کے اختلاف تھے لیکن ۱۹۲۰ء میں غریان کے مقام پر سب نے متفق ہو کر یہ طے کر لیا کہ سائیرینیکا کے شیخ محمد ادریس کو جمہوریہ کا صدر بنایا جائے۔ شیخ ادریس کو یہ دعوت بھیجی گئی اور ۱۹۲۲ء میں انھوں نے اسے قبول کر لیا۔ ظاہر ہے یہ بات اٹلی والوں کو پسند نہیں آسکتی تھی، اتفاق سے اسی زمانہ میں اٹلی کی اندرونی حکومت میں انقلاب ہوا فسطائی جماعت برسر اقتدار آئی اور اٹلی میں آمریت (ڈکٹیٹر شپ) قائم ہو گئی۔ اٹلی کی نئی حکومت لیبیا کی آزادی کو کب گوارا کر سکتی تھی، اس نے عوام کی آزادی اور ان کے حقوق کو دبا کر بھیڑیا راج قائم کر دیا اور اٹلی کی طرف سے لیبیا میں اتنا دباؤ پڑا کہ اخیر میں شیخ ادریس سنوسی کو لیبیا چھوڑنا پڑا اور انھوں نے مصر میں پناہ لی۔ گو شیخ ادریس مصر کو جلا وطن ہو گئے لیکن لیبیا کی جنگ آزادی بدستور جاری رہی اور ٹری پولی ٹینا کے قبائلی سردار اور سنوسی شیخ اسی طرح لیبیا پر اٹلی کی حکومت کے مخالف رہے چنانچہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک اٹلی والوں کو مجبوراً لیبیا کے دونوں صوبوں میں ملک کے باشندوں کو انتظام حکومت میں کچھ اختیارات دینے پڑے، لیکن انتظام حکومت میں محض حصہ دار بنا لینے سے لیبیا والوں کی تسلی نہیں ہو سکتی تھی، اُن کا مطالبہ تھا مکمل آزادی اور اسی آزادی کی خاطر انھوں نے اٹلی کے خلاف جان کی بازی لگائی تھی، اٹلی کی طرف سے آزادی کی تحریک کو کچلنے کی جتنی زیادہ کوشش کی گئی تحریک اتنی ہی زیادہ بڑھی۔ یہاں تک کہ ملک میں ایک عام بغاوت پھیل گئی۔ اس بغاوت کو دور کرنے کے لئے اٹلی والوں کی طرف سے قتل و غارت شروع ہوا اور شہر کے شہر اجاڑ ڈالے گئے۔ اٹلی کی اس مہم کے ہیرو جنرل گرانزیانی تھے، انھوں نے باغیوں پر ان کی بستیوں کے کنوئیں بند کرا دئے۔ ہزارہا عرب پیاس کی تکلیف سے مر گئے۔ ہری بھری کھیتیاں سوکھ گئیں بن غازی کے شہر میں روزانہ ایک درجن عرب شارع عام پر پھانسی کے تختے پر لٹکائے جاتے تھے۔ عربوں کے سرداروں کو ہوائی جہازوں پر سے نیچے پھینک دیا جاتا تھا اور ان کی موت سے اشتہار کا کام لیا جاتا تھا۔ جس آدمی کے پاس کوئی ہتھیار نکلتا اسے سزائے موت دی جاتی تھی۔ کل عرب آبادی پر یا تو پولس کا سخت پہرہ رہتا تھا یا انھیں ساحل کے کنارے کے ریگستانوں میں قید کیا جاتا تھا، اٹلی کے یہ مظالم نو سال تک جاری رہے عرب نہایت بہادری سے ان کا مقابلہ کرتے رہے لیکن اخیر میں سنوسی جماعت کو اپنا مرکز سائیرینیکا اٹلی کی فوجوں کے حوالے کرنا پڑا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس جنگ میں سائرینیکا کی آبادی میں سے ایک تہائی مرد مارے گئے۔

دنیا میں قومیت کے جذبہ کو جس چیز نے سب سے زیادہ تقویت پہونچائی ہے وہ حاکموں کا محکوموں پر ظلم تھا، چنانچہ لیبیا کی قومیت کو بھی اٹلی کے ظلم نے انتہائی ترقی تک پہنچا دیا اور باوجودیکہ ملک پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا تحریک اسی زور شور کے ساتھ جاری رہی۔ سائیرینیکا کے عرب باشندے سنوسی حکومت ہی کو ملک کی اصلی حکومت قرار دیتے تھے اور گو شیخ محمد ادریس مصر میں جلا وطن تھے لیکن لیبیا میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور اٹلی کے خلاف جتنی کارروائیاں ہوتی تھیں وہ سب اس کے نام سے کیجاتی تھیں اٹلی والے شیخ ادریس کے خلاف ہر ممکن طریقہ پر پروپیگنڈا کر رہے تھے لیکن لیبیا کے لوگ شیخ کی طرف سے بدگمان نہیں ہوتے تھے۔ شیخ ادریس لیبیا والوں کے قومی ہیرو تھے اور ان کی قربانیوں کی وجہ سے انکی مقبولیت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ٹری پولی ٹینیا والے بھی لیبیا میں ایک انھیں کو ایسا شخص سمجھتے تھے جو پورے ملک پر حکومت کا مستحق تھا۔ اس چیز سے ملک کے اتحاد کو بڑی مدد ملی اور اس اتحاد ہی کی وجہ سے لیبیا کی آزادی کی تحریک زندہ رہ سکی۔

اٹلی کے قبضہ کے بعد بہت سے عرب لیڈر ایسے تھے جن کو لیبیا سے جلا وطن ہونا پڑا۔ ان سب نے مشرق وسطیٰ کے ممالک میں پناہ لی اور وہاں اپنا پروپیگنڈا جاری کیا۔ پروپیگنڈا کے لئے دمشق میں ٹری پولی ٹینیا سائیرینیکا ڈفینس کمیٹی کے نام کی ایک انجمن قائم کی۔ یہ انجمن لیبیا سے باہر رہ کر اٹلی کی مخالفت کر رہی تھی۔ اسلامی ملکوں کے اخبار انجمن کے حامی تھے۔ چنانچہ بہت جلد دوسرے عربی ممالک کو بھی لیبیا کے عربوں کے ساتھ ہمدردی ہو گئی اور اس ہمدردی نے لیبیا کی تحریک آزادی کو بہت تقویت پہنچائی۔

۱۹۳۹ء میں جس وقت یورپ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی ہے تو اس وقت لیبیا کے عربوں کی ایک بڑی تعداد جلا وطنی کی زندگی گزار

رہی تھی، ان میں زیادہ تر ایسے لیڈر رہتے جو اٹلی کے خلاف لڑ چکے تھے ۱۹۳۹ء میں ان سب نے مصر میں اسکندریہ کے مقام پر جمع ہو کر اپنی ایک کانفرنس کی جس میں ایک قرارداد کے ذریعہ یہ منظور کیا گیا کہ سائبریٰ نیکا اور ٹری پولی ٹینا دونوں سید ادریس سنوسی کو امیر تسلیم کرتے ہیں اور انھیں یہ حق دیتے ہیں کہ وہ لیبیا کے پورے ملک کی نمائندگی کریں۔ اس قرارداد کی ایک نقل مصر کے وزیر اعظم کو بھیجی گئی اور دوسری برطانوی سفیر مقیم مصر کو۔ اس کے بعد کانفرنس ہی کی تحریک پر سید ادریس سنوسی برطانوی فوجی افسروں سے ملے اور ان سے کہا کہ اگر یہ وعدہ کیا جائے کہ برطانیہ لیبیا کو آزاد کر دے گا اور سید ادریس سنوسی کو وہاں کا حکمران تسلیم کرے گا تو لیبیا کے باشندے انگریزوں کو اٹلی کے خلاف مدد دینے کو تیار رہیں۔ انگریز اس شرط کو ماننے پر آمادہ ہو گئے چنانچہ اگست ۱۹۴۰ء میں جوں ہی اٹلی اتحادیوں کے خلاف جنگ میں شامل ہوا ہے لیبیا کے سربرا وردہ لیڈروں نے انگریزوں کا ساتھ دینے کے لئے ایک ملکی فوج تیار کرنی شروع کر دی۔ اس فوج میں زیادہ تر وہ فوجی سردار رہتے جو اٹلی والوں کے خلاف اب تک لڑ رہے تھے۔ لیبیا کی اس فوج کا نام لیبین عرب فورس رکھا گیا ۱۹۴۲ء میں اس کی تعداد پانچ بٹالین یعنی تقریباً پانچ ہزار سپاہی تھے۔ اس فوج میں سب کے سب وہی لوگ تھے جو یا تو اٹلی کے ظلم کی وجہ سے لیبیا چھوڑ کر جلا وطن ہو گئے تھے یا اٹلی سے باغی ہو کر اٹلی کے خلاف لڑنے کے لئے بیچین تھے۔ ان سب میں اکثریت سائیرینیکا والوں کی تھی۔ نومبر ۱۹۴۲ء میں انگریزوں نے اٹلی کو شکست دے دی اور ۹ جنوری ۱۹۴۳ء کو برطانیہ کے ناظم امور خارجہ نے ایک اعلان کے ذریعہ سید ادریس سنوسی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ملک معظم کی حکومت کا ارادہ ہے کہ جنگ کے ختم ہونے پر کسی حال میں بھی سائیرینیکا میں اٹلی کا دوبارہ اقتدار قائم نہ ہونے دیا جائے گا۔

اس اعلان کے ساتھ ہی ساتھ لیبیا میں انگریزوں نے اپنا "عارضی تسلط" قائم کر لیا۔ ملک کا نظام حکومت انگریزی فوج کے ہاتھوں میں آ گیا۔ البتہ بعض وہ عہدے جو اب تک اٹلی والوں کے پاس تھے عربوں کو دے دئے گئے۔ وہ زراعتی فارم بھی جن کو اٹلی والے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے عربوں کو مل گئے۔ لیکن ان چیزوں سے عربوں کی تشفی نہیں ہو سکتی تھی، انھوں نے مطالبہ کیا کہ سید ادریس کو امیر لیبیا مقرر کیا جائے، اس کے جواب میں انگریزوں نے یہ کہا کہ ہیگ کے معاہدے کی رو سے ہم اس وقت تک دشمن سے چھینے ہوئے ملکوں کی آزادی کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے جب تک اتحادی قومیں متفقہ طور پر نئے نظام کے متعلق یہ طے نہ کر دیں کہ کون سا ملک کس کے پاس رہے گا۔

لیبیا میں اس وقت جو چیز قومی تحریک کو بہت زیادہ ترقی دے رہی ہے وہ ملک کی ڈانواڈول سیاست ہے۔ سیاسی حالت کے متعلق عربوں کو اب تک نہیں معلوم کہ ان کی آزادی کے متعلق آخری فیصلہ کیا ہوگا۔ سید ادریس کے ساتھ جو ان کو دلی شغف حاصل ہے وہ انھیں مجبور کر رہا ہے کہ شیخ کو جلد سے جلد لیبیا کا حکمران دیکھیں، اب تک دو بار لیبیا والے اپنے اس قومی ہیرو کو مصر سے مہمان کے طور پر لیبیا بلا چکے ہیں، ملک میں ان کا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور گوشہ گوشہ میں ان کے آنے پر خوشی منائی گئی، آزادی ملنے میں جتنی دیر ہو رہی ہے قومی تحریک اسی قدر مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔

ملک کی اقتصادی حالت سے بھی قومی جذبہ کو بہت تقویت پہنچ رہی ہے اٹلی والوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں لیبیا میں تعمیری کام تو کیا لیکن ترقی کی ساری اسکیمیں ان آبادکاروں کے لئے تھیں جو اٹلی سے آ کر لیبیا میں بس گئے تھے۔ عربوں کی زمینیں ان سے زبردستی چھین گئی تھیں اور زراعت کے لئے اٹلی کے آبادکاروں کو دی گئی تھیں۔ آج بھی یہ لوگ ان پر قابض ہیں۔ یہ خبر عربوں کے دل کے لئے بڑی تکلیف دہ ہے اور ان کو مشتعل کرنے اور ان کی قومی غیرت کو ابھارنے کے لئے کافی ہے۔

اس کے علاوہ ملک کی عام اقتصادی حالت بہت کمزور ہے، زراعت نہایت خراب حالت میں ہے۔ ملک کی معدنی پیداوار قدرتی طور پر نہ ہونے کے برابر ہے لگہ بانی پر عربوں کا دارومدار ہے سو اس کو ترقی دینے کی بھی کسی نے کبھی فکر نہ کی۔ اٹلی کی معاشی لوٹ کھسوٹ نے اور جنگ کی تباہ کاریوں نے ملک کی رہی سہی دولت بھی ختم کر دی۔ اٹلی کی حکومت کے زمانہ میں لیبیا کے میزانیہ میں ہمیشہ خسارہ رہا اور لیبیا اٹلی کا مقروض رہا۔ حالانکہ اٹلی کی حکومت قائم ہونے سے پہلے لیبیا کو کوئی مالی مشکل پیش نہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانہ کے مقابلہ میں آج شہری عربوں کی زندگی کا معیار اونچا ہو گیا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس معیار کو قائم رکھنے کے لئے جس قسم کے معاشی وسائل کی ضرورت ہے ملک کو ان سے بالکل محروم رکھا گیا۔ سامراجی طاقتوں نے جن پسماندہ ملکوں پر قبضہ کیا وہاں ان کا اصول یہی رہا اور اسی اصول کی بدولت ملک میں اقتصادی بدحالی پھیلی جو آگے چل کر اس ملک میں قومی بیداری کا باعث ہوئی۔ چنانچہ لیبیا والوں کو بھی اپنی تباہ حالی کا بہت احساس ہے اور وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اس کے وجوہ دو ہیں ایک تو غیر ملکی حکومت کا تسلط اور دوسرے خود ان کے اندرونی اختلافات اور نا اتفاقی۔ انھیں دو چیزوں پر آج ان کی قومی تحریک کی بنیاد ہے۔

# "بے بس"

افسانہ

فہمیدہ زہرا قزلباش

جب دولہا دولہن نے محفل کو پہلی بار سلام کیا —— دعائیں تو بعد میں نکلیں پہلے ان کی موزونیت پر تنقیدی نظریں دوڑ گئیں۔
زبیدہ مہتابی رنگ... اس کی شرمیلی مخمور آنکھیں... اس کے جسم کے دلربا پیچ و خم ان سب پر سے نظریں گذر کر اس کے چار فٹ آٹھ انچ کے غیر معمولی چھوٹے قد پر جم کر رہ گئیں بالکل جیسے چاند کا لامتناہی حسن ابر کے ایک ننھے سے ٹکڑے کے دامن میں چھپ جاتا ہے۔
"دولہا کس قدر بلند قد اور وجیہہ ہے"
"دولہن" —— ایک طنزیہ تبسم
"جیسے دراز بالوں میں کوئی ننھی سی جوں رینگ رہی ہو"
پرطعنوں میں ڈوبے ہوئے فقرے سچی بنی عورتوں کا محبوب مشغلہ ہیں۔
یہ سرگوشیاں دلہن تک پہنچ ہی گئیں۔ ممکن ہے دولہا نے نہ سنی ہوں کیونکہ ان کے بارے میں نہ تھیں۔ زبیدہ کے دل میں احساس کروٹیں بدلنے لگا۔
سورج کی آخری شعاعیں پھولوں کے الوداعی بوسے لے رہی تھیں اور پرندوں کی آوازوں میں نقاہت پیدا ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ دریچہ کھلا تھا۔
کتنی دلفریب شام ہے۔ شاہد نے شرماتے ہوئے غنچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ہوں، زبیدہ نے جواب دیا "لیکن آپ باہر نہیں جا سکتے"
بڑی خشک ہو تم بیب
آپ کے بخار کی ہوا ہی ایسی ہے
وہ مسکرا دیا
صبح آپ نے دوا کہاں رکھی تھی
نہایت بدمذاق ہو تم
تیماردار کو بدمذاق بننا ہی پڑتا ہے۔ اس کے چہرہ پر کچھ ناگوار سلوٹیں پڑ گئیں۔
کاش بیویاں نازک مزاج نہ ہوتیں۔ وہ مسکرا دیا۔
اچھا جائیے الماری پر سے اتار لائیے۔
وہ ہنس دی اور شاہد بولا ہم جانتے تھے ان سلوٹوں میں بھی قہقہے تھے۔
عورت کے خاموش تبسم مردوں کے احساس فرزانگی کا اکثر مذاق اڑاتے ہیں۔
وہ مسکرا دی —— ایک ناتخانہ مسکراہٹ۔ اور تیزی سے چل دی۔
جس قدر سرعت سے بڑھی تھی اتنی ہی بے بسی سے رک گئی۔ دو انچ اونچی ایڑی کا سینڈل پہننے کے باوجود اس کے ہاتھ دوا تک پہنچنے سے معذور رہے اس کے چہرہ پر بیچارگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انسان انتہائی کوشش کے باوجود کسی کمی کو پورا نہ کر سکے —— تو
کیا کرنے لگیں آپ۔ شاہد نے آواز دی۔
"آپ اتار لیجئے" باوجود کئی مرتبہ دل میں دہرا کے وہ اس مختصر سے فقرہ کو ادا نہیں کر سکی۔
شاہد اٹھ کر چلا آیا —— کیا بات ہے؟ —— ہم
جو لوگ ایک چیز کے مالک ہوتے ہیں وہ دوسرے کی محرومی کا احساس کر سکتے ہیں؟ اگر حقیقت یوں ہوتی —— کوئی غریب ہاتھ پھیلاتا نظر نہ آتا۔
جیسے آپ سمجھ نہیں سکتے۔ میرا ہاتھ نہیں پہنچا۔ وہ جھنجلا گئی۔
اوہ! شاہد نے کہا۔ اور سوچنے لگی جس بات کو میں اس قدر شدت سے محسوس کرتی وہ شاہد کیوں خود نہ سمجھ سکے۔
شاہد نے شیشی اتار دی شبنم نے اس کے بلند قد کو دیکھا۔ اور اسے محسوس ہوا "جیسے دراز بالوں میں کوئی ننھی سی جوں رینگ رہی ہو"۔
ایٹ ہوم —— بڑے پیمانہ پر تھا۔ زبیدہ خاص مہمان تھی۔ نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی آخر آئی۔ سی۔ ایس کی نئی دلہن تھی۔
زمانہ کی ذہنیت کے مطابق ایک آئی۔ سی۔ ایس کی بیوی کو بے پناہ ذہین، بے انتہا حسین اور مکمل طور پر موڈرن ہونا چاہئے —— اور حسن۔ بیشک حسن تو لازمی چیز ہے ورنہ خواب میں بھی نظر نہیں آ سکتے —— فش! یہ آئی۔ سی۔ ایس۔
زبیدہ جس وقت متعارف ہوئی اس کو سب مجسم نظر آئے۔ پہلی بات جو اس نے محسوس کی "یہ سب عورتیں کیسی دراز قد ہیں" ساتھ ہی "چار فٹ آٹھ انچ" اس کے کانوں میں چیخ اٹھا۔
وہ تمام وقت مسکراتی رہی ہنستی رہی —— بعض بعض دفعہ تو اس نے بہت طویل قہقہے لگائے۔
اس کی مسکراہٹ بھی —— ایک چبھن تھی۔
اس کی ہنسی بھی —— ایک خلش تھی۔ اور
اس کا قہقہہ —— ایک مسلسل اضطراب تھا۔
یہ بھی عجیب بات تھی کہ پرخلوص نگاہیں بھی نکتہ چیں نظر آئیں۔
باتیں سنانے کے لئے ہی کی جاتی ہیں "جب تک قد بلند نہ ہو شخصیت حقیر حقیر سی معلوم ہوتی ہے" کسی لڑکی ہی نے کہا ہوگا۔ جس سے یہ برداشت نہ ہو سکا ہوگا کہ ایسے بیہودہ قد کی لڑکی ایک آئی۔ سی۔ ایس کی بیوی ہو۔ "اس سے بہتر تو دبی تھی" - آہ ذہنیت! اور پستی خیال —— کیا وہ کانا اور کوڑھ مغز ہی کیوں نہ ہو۔
زبیدہ جزبز ہو کر رہ گئی۔ اس کا دل چاہا وہ اٹھ کر بھاگ جائے۔ اس خیال کی کھٹک کون مٹا سکتا ہے۔ خدا! اس کے ہاتھ کیوں نہیں لرجتے۔ وہ کہتا ہے "میں سب سے بڑا عادل ہوں" کیا خوب عدل ہے یہ۔
"کیا کفر بک رہی ہو" اس نے ایک نامعلوم سی آواز محسوس کی۔ وہ

باغیانہ خیالات کو دبانے کی کوشش کرنے لگی ——— لیکن وہ بھڑکتے ہی رہے۔

آسمان ابر آلود تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو"۔ شاہد نے باہر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا

"کچھ نہیں"۔ اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

کوئی گیت یاد ہے۔

بس سو جایئے۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ اس نے ریشمیں لحاف میں اپنا چہرہ چھپا لیا مسلسل آنسوؤں نے اسے رات بھر جگائے رکھا۔

انسان اپنی کمی کو بھلائے رکھتا ہے لیکن جب دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا جائے تو وہ کرب زندگی پر آسیب بن کر چھا جاتا ہے چھیڑنے والے چاہے اس کا احساس نہ کر سکیں۔

کیا پڑھ رہے ہیں آپ۔ اس نے اٹھلاتے ہوئے پوچھا۔

ایک کتاب۔

یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں ——— کوئی داستان عشق ہو گی۔

انارکلی۔

اس کا سرورق مجھے بے حد پسند ہے ——— کیوں نا۔

خوبصورت سرورق میں ایک غمگین داستان پنہاں ہے۔

ٹھیک کہتے ہیں آپ ——— وہ کچھ سوچنے لگی۔

قدیم لباس جلیل ہوتا تھا ——— سلیم شاہی۔

بہت پسند ہیں ——— وہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔

مجھے بھی عورتوں کے پاؤں میں بیحد اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے ورق الٹ دیا۔

زبیدہ ——— کسی نے بڑے پیار سے پکارا۔

اوہ آپ!

کیا آپ کو شک تھا۔

"بہت دیر کر دی آج"۔ اس نے ایک سرخ گلاب کا پھول کوٹ میں لگاتے ہوئے کہا خرید و فروخت میں دیر ہو گئی۔ بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے سلیم شاہی جوتے نکال کر رکھ دیئے۔

یہ تمہارے نازک سفید پاؤں میں بے حد جچیں گے۔

ہاں بہت خوبصورت ہیں۔ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

وہ حیران رہ گیا۔

زبیدہ کھل کیوں نہیں اٹھی ——— عورتیں شوہر کے تحفہ کو بہت عزیز رکھتی ہیں۔ کیا تم کو پسند نہیں آئیں۔

مجھے آپ کا تحفہ ناپسند کیسے ہو سکتا ہے لیکن ——— اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ شاید آنسو چھپانے کی کوشش کی ہو گی۔

لیکن ——— کیا۔ اس نے بے قراری سے پوچھا۔

یہ صرف دراز قد عورتوں کے لئے ہیں۔

ہاں ٹھیک تو ہے اس کا مجھے خیال ہی نہ رہا ——— اس کے چہرہ سے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے ایک عجیب قسم کی تکلیف ——— "کاش ایسا نہ ہوتا" ——— "ہاں ٹھیک تو ہے"۔ شاہدہ چونک اٹھی۔ شاہد بھی سوچتے ہیں۔ انھوں نے حقیقت کو حقیقت کیوں سمجھا۔ اگر مجھے بھی تو یوں کہنے کی کیا ضرورت تھی "ہاں ٹھیک تو ہے"۔ اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ ایسا کیوں ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ اس کا سر جھک گیا۔ میرے شریک حیات ہو کر بھی۔ وہ تسلی کے فقرے نہیں کہہ سکتے تھے۔

نہیں زبیدہ تم مجھے ایسی ہی پیاری لگتی ہو۔ حقیقت تو یہ ہے دراز عورتوں میں کچھ مردانہ حسن جھلکنے لگتا ہے۔ ہیں ادرول سے کیا مطلب۔ تم میرے لئے ہو۔ مجھے تم حسین لگو گی، ہر انداز میں حسین لگو گی زیب"۔ وہ جھنجلا گئی۔

وہ بچپن کا زمانہ بھی کیسا حسین دور تھا۔ بڑے ہونے پر بھی مجھے خیال نہیں ہوا۔ بس ایک دن چچا نورے پر غصہ آیا تھا جب انھوں نے بڑی آواز سے کہا تھا۔

"دو انچ ہی بڑھا لو بیٹی"۔

مجھے کس قدر طیش آیا تھا، اور اپنے وجود سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اب یاد آتا ہے یہ بڑھیاں کیسی کانا پھوسی کیا کرتی تھیں ——— اے ہے اس کا بیاہ کیسے ہو گا۔ ۔ ۔ اور اماں میرے چہرے کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کرتی تھیں۔

یہ لوگ بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ جیسے انسان کے ہاتھ میں ہے۔ کہنا ہے تو خدا سے جا کر کہو۔ لیکن جہاں طنز کا جواب نہ ملے وہاں سے یہ کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ کیا خدا کو اس کا احساس نہیں کہ یہ مجھ پر نہیں ——— خود اس کی صناعی پر پھبتی ہے۔ شاید اس میں طاقت ہے کہ وہ اتنے طنزیہ اور چبھتے جملے برداشت کر سکے۔

لیکن ——— انسان ایک کمزور انسان میں اتنی تاب کہاں۔

میں اس مہتابی رنگ اور ہرن جیسی آنکھوں کو کیا کروں۔

ہر دوا بیکار ——— ہر دعا ناکام ——— ہر آہ بے اثر۔

جب خدا کو رحم نہیں آیا ——— تو ان ظالم انسانوں کی حقارت اور طنز کا کیا گلہ کروں۔ آج وہ روئی نہیں۔ غصہ سے کانپ اٹھی۔

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"۔

کوئی شاہ صاحب ہیں ——— بڑے پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ خادمہ نے بڑی عقیدت سے کہا۔

کیا اس سے قبل بیدکیان صحت مند تھیں بر ہنہ پہنچے ہوؤں پر اعتقاد تھا۔ لیکن حسرت کی شدت دماغی توازن کو تتر بتر کر دیتی ہے۔ خدا مراد دے یا نہ دے لیکن امید کی کرن کو کبھی غروب نہیں ہونے دیتا۔

"میرے پاس نے آؤ"۔ خادمہ بہت خوش خوش گئی۔

شاہ صاحب نے آتے ہی غمزدہ سلونوں کو پہچان لیا۔

کوئی اس کا علاج بھی ہے؟

کوئی مرض لاعلاج بھی ہے بیٹی؟

زبیدہ کی آنکھیں چمکیں، اور سائیں جی کی لالچ دمک اٹھی۔

اس نے بہت آہستگی سے شیشی نکالی اور چپکے سے کہا بس رات کے بارہ بجے پی لو۔

ایک دم ـــ ایک شیشی۔

ہاں یہی ایک خوراک ہے۔

بس ایک خوراک!

اسی کو تو کرامات کہتے ہیں بیگم صاحب، خادمہ بڑے جوش سے بولی۔

آپ کو کیا دوں؟

ہم اللہ والے لوگ کچھ نہیں لیا کرتے۔ خدا کی راہ میں خیرات کریں یہی سو روپے ہوے تاکہ چند بکرے ... تیرے صدقے میں ذبح کردوں۔

زبیدہ ہچکچائی۔

دل ترا کر بیٹی۔ اگر ہم پر یقین نہیں تو شیشی لے اور ہم کو کچھ نہ دے۔ لیکن صدقہ اگر ہوگا تو ہمارے ہی ہاتھ سے...

زبیدہ نے سو روپے دیدیے اور شاہ صاحب اللہ ہو اللہ ہو کے نعرے لگاتے چلے گئے۔

زبیدہ نے دوا احتیاط سے رکھ دی۔ وہ شاہد کو ہمراز بنانا چاہتی تھی ـــ نوکرنی! اوں ہوں وہ موقوف کیا کہے گی۔ اسے غصہ تھا شدید غصہ۔ اس کے زخم کچھ سوتے سوتے سے تھے لیکن شاہد کے احساس سے ان میں سے پیپ رس رہی تھی۔ شاہد نے کیوں کہا ـــ آخر کیوں کہا ـــ کیا میں نے بھی کبھی کہا ـــ تمہارا رنگ ضرورت سے زیادہ سانولا ہے۔ مجھے تو اس میں بھی ایک حسن نظر آتا تھا۔

دنیا اس وقت کمتر سمجھتی ہے جب تم خود اپنے کو حقیر سمجھنے لگتے ہو۔

اس رات بہت ستارے ٹوٹ رہے تھے۔

ادھر آؤ زیب آج تو تم بڑی دلکش لگ رہی ہو۔

نہ وہ مسکرائی نہ وہ ہنستی۔

آج کچھ طبیعت عجب بے سکون ہے ـــ وہ ٹہلنے لگا۔ لیکن زبیدہ ٹس سے مس نہ ہوئی جیسے کوئی بات ہی نہیں ـــ تمہاری طبیعت بے سکون ہے تو کیا کروں... میری طبیعت تو خدا جانے کب سے بےچین ہے۔ اس کی نگاہیں گھڑی پر جمی ہوئی تھیں ـــ بارہ بجنے میں ایک منٹ...

ابھی آئی ـــ وہ تیزی سے اٹھی۔

کہاں جا رہی ہو

ذرا پانی پینے۔

یہیں آجائیے گا۔

ہیں ـــ اور وہ چلی گئی

اسے شاہد کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے اندھیرے ہی میں شیشی خالی کردی۔ شاہد نے بٹن دبایا اور زبیدہ کا دل ہل گیا ـــ دوا کی شیشی بھری تھی اور ٹنکچر آئیوڈین کی خالی ـــ

یہاں اندھیرے میں کیا کر رہی تھیں۔

وہ خاموش شیشیوں کو تک رہی تھی۔

پانی پی چکیں شاہد نے زور سے پوچھا

'ہاں' وہ سکتے میں بولی۔

"چلو پھر"

"چلو"

"یہاں بیٹھ جاؤ"

وہ بیٹھ گئی

آج طبیعت مضمحل ہے۔ غالب کی مخصوص غزل سناؤ۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں ٭ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس نے شعر گنگنایا ـــ وہ جلد سو گیا۔

وہ تڑپ تڑپ کر سوئی ـــ دونوں کی نیند میں بڑا فرق تھا۔

# آپ بیمار ہیں

دنیا میں کامیابی کا راز دو لفظوں میں ہے کہ محنت کیجئے محنت سے دولت پیدا ہوگی اور دولت سے عیش و آرام مگر اس کے لئے تندرستی کی ضرورت ہے اگر یہ نہیں اور آپ بیمار ہیں تو محنت، دولت، آرام صرف خواب و خیال، ساری عمر تکلیف و مصیبت میں گزارنا ہوگی کبھی بھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

## تپ دق کا آخری علاج

رجسٹرڈ

## کیلسو

"KELSO"

WONDERFUL FOR TUBERCULOSIS



جب ماتاجی میری زندگی سے مایوس ہوگئیں — اور — پتاجی کی آنکھوں سے ہر وقت آنسو نکلنے لگے اور تمام رشتہ داروں نے ڈاکٹروں حکیموں اور ویدوں کی رائے کے مطابق میرے مرجانے کا فیصلہ کرلیا تو ہمارے پتاجی کے ایک سچے اور مخلص دوست نے کیلسو کیمیکل ورکس کی تیار کردہ دوا کیلسو کے استعمال کرانے کا فوری مشورہ دیا۔ پتاجی نے فوراً روپے بذریعہ تار روانہ کرکے کیلسو کا مکمل کورس منگوایا، اس کے کھاتے ہی میرے جسم میں نئی روح پڑگئی ہر روز بخار، کھانسی، سینہ کا درد، خون تھوکنے، گلے کی خراش، بلغم اور دستوں میں کمی ہونے لگی، بھوک کھل گئی خون میں سرخی بڑھنے لگی اور چند دنوں میں چہرہ بارونق ہوگیا۔ پسلیوں اور سینہ کی جلن بالکل غائب ہوگئی، گھبراہٹ کا نام و نشان نہ رہا اور اب کوئی شخص مجھے دیکھ کر ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کبھی تپ دق کے پنجہ میں گرفتار ہوئی تھی



اس دوا کو کیلسو کیمیکل ورکس نے ریسرچ کی نئی تھیوری کے مطابق سونا اور سچے موتیوں جیسی قیمتی چیزوں سے تیار کیا ہے۔ تپ دق کے ماہر اور دہلی کے مشہور طبیب پروفیسر حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی وائس پرنسپل جامعہ طبیہ، صدر مجلس اطبا، وایڈیٹر رسالہ مسیح الملک تپ دق کے مریضوں کو کیلسو ہی کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں کیلسو جسم میں داخل ہوتے ہی جراثیم سل کو فوراً ہلاک کرکے کمزوری کو دور کردیتا ہے اسی وجہ سے دق کی ہر قسم میں پھیپھڑے کی ہو یا آنتوں کی گلٹیوں کی ہو یا ہڈیوں کی سل شدید ACUTE PHTHISIS ہو یا سل مزمن CHRONIC PHTHISIS کیلئے آخری دوا ہے جن مریضوں نے سنی ٹوریم میں رہ کر علاج کرایا تھا ان میں سے اکثر نے اپنی لاکھوں روپے کی جان کیلسو ہی کے استعمال سے بچائی ہے۔

سنی ٹوریم کے ایک مریض کی رائے

قیمت

چیف ایجنٹ کیلسو کیمیکل ورکس صدر بازار دہلی

KELSO CHEMICAL WORKS. SADAR BAZAR DELHI

## بیماری

خدا دشمن کو بھی نہ دے، جیب کا خرچ، روزگار بند، مصیبت پر مصیبت، علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہ رہا ہے مگر فائدہ نہیں "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" یہ مرض کیوں بڑھ رہا ہے فائدہ کیوں نہیں ہوتا اس کا جواب یہ ہے کہ مرض کی تشخیص نہ ہو سکی، دوا خالص اور عمدہ نہیں مل سکی، بازاری گلی دواؤں اور ناتجربہ کار طبیب سے فائدہ کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ اگر آپ کے دوستوں میں سے کوئی صاحب کسی پیچیدہ اور پرانے مرض میں گرفتار ہیں تو ان کے حالات ناظم شعبہ مجلس اطبا، پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی کو فوراً لکھ کر روانہ کیجئے!

یہاں مرض کے حالات تجربہ کار کہنہ مشق طبیبوں کی مجلس میں پیش ہوتے ہیں اس مجلس کے صدر دہلی کے مشہور طبیب پروفیسر حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی سینئر ہاؤس فزیشن و وائس پرنسپل جامعہ طبیہ، و ایڈیٹر رسالہ "مسیح الملک" ہیں مجلس اطبا میں مرض کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے، بحث ہوتی ہے، ہر طبیب اپنے تجربہ کی بنا پر رائے ظاہر کرتا ہے، اور بالآخر متفقہ رائے سے مرض کی صحیح تشخیص عمل میں آتی ہے۔ دوا تجویز ہوتی ہے، مریض کو اطلاع دی جاتی ہے اور اس طرح روزانہ صدہا پیچیدہ مسئلے حل ہوتے ہیں تشخیص و تجویز کا یہ طریقہ اس قدر صحیح اور بہتر ثابت ہوا ہے کہ اب نہ صرف ملک کے ہر گوشے کے مریض، بلکہ بہت سے طبابت پیشہ اصحاب ڈاکٹر، حکیم اور وید بھی اپنے زیر علاج مریضوں کے پیچیدہ امراض کی بابت مجلس اطبا کا مشورہ طلب کرتے ہیں اس طرح ہزاروں مایوس مریض اس مجلس کی صحیح تشخیص کی بدولت نئی زندگی حاصل کر چکے ہیں۔ اگر آپ کسی پیچیدہ یا پرانے مرض میں گرفتار ہیں اور آپکا وقت خراب ہو چکا ہے اور دولت برباد ہو چکی

**نیجر مجلس اطبا پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی**

# نقد و نظر

## ہمایوں جوبلی نمبر

۲۰۰ صفحات قیمت عہ

اردو کے مشہور اور مقتدر رسالہ ہمایوں نے اپنی پچیس سال کی خدمت کے اختتام پر سلور جوبلی منائی ہے، اسی کی یادگار یہ رسالہ ہے۔ رسالہ میں عموماً جس طرح کے مضامین اور جس طرح کی نظمیں اور غزلیں ہمیشہ چھپتی ہیں ویسی ہی (زیادہ تعداد میں) اس رسالہ میں بھی ہیں اور وہ ہمایوں کی روایات کے مطابق سب کی سب ایسی ہیں کہ ان سے ایک خاص نمبر مرتب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان مضامین اور نظموں اور غزلوں کے علاوہ مضامین کا ایک بے حد مفید سلسلہ بھی اس خاص نمبر میں شامل ہے۔ اراکین ہمایوں کی فرمائش پر ملک کے اچھے اچھے لکھنے والوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف نثر و نظم کا پچیس سالہ جائزہ لیا ہے۔ اور ہمیں بتایا ہے کہ اس پچیس سال میں مختصر افسانے تنقید اور غزل نے کیا کیا منزلیں طے کی ہیں۔ اس پچیس سال کے اردو ادب میں خواتین کا کیا حصہ رہا ہے اور نفسیات نے اسے کس حد تک متاثر کیا ہے۔ یہ سارے مضامین مل کر ہمایوں کے اس جوبلی نمبر کو ایک ایسی چیز بنا دیتے ہیں جسے ہر اردو داں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے اور دوسروں سے اس کے پڑھنے اور خریدنے کی سفارش کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ہمایوں کی اہمیت صرف اس خاص نمبر کی وجہ سے نہیں۔ ایک خاص نمبر تو اس کے تین چار پرچوں کے مضامین کو یکجا کر کے ہمیشہ ہی بنایا جا سکتا ہے۔ اصل میں اہمیت اس اہم خدمت کی اور اس خدمت کو انجام دینے کی اس روش خاص کی ہے جو اردو کے رسالوں میں میرے نزدیک ہمایوں سے زیادہ اور کسی کے حصہ میں نہیں آئی۔ اس خاصی طویل مدت میں ہمایوں نے کبھی ایسی چیزوں کی اشاعت نہیں کی جن سے ادب کی بلند قدروں کو ٹھیس لگے۔ اسکے باوجود وہ برابر ادب کی ہر منزل میں رہبر اور رہنما کے فرائض انجام دیتا رہا ہے۔ اردو کے کئی اچھے لکھنے والوں کو ہم نے صرف ہمایوں ہی کے وسیلہ سے پہچانا ہے۔ ہمایوں کو پڑھ کر ہمیں ادب اور زندگی کی رفتار کا ایک سنجیدہ اندازہ بھی ہوتا رہا ہے۔ اس طرح کے رسالوں کی اردو کو ہر زمانہ میں ضرورت رہی ہے۔ اور خاص کر آج جب کہ ادب کی بہت سی اصناف تجربہ کے عبوری دور سے گذر رہی ہیں ان کی قدر و قیمت اور بھی زیادہ ہے۔ وہ حال کو انتشار سے نکالنے میں مدد دیتے ہیں اور مستقبل میں منزل کی جستجو کرنے والوں کے لئے سنگِ میل کا کام دیتے ہیں۔ ہمایوں کے اس جوبلی نمبر کے نکلنے کی تقریب کے موقع پر اردو والوں کو ان سب کا ممنون ہونا چاہیئے جنہوں نے ہمایوں کو ادب کی صحیح اور سلیم راہوں پر چلنے میں مدد دی۔

## سویرا

ضخامت ۲۲۰ صفحات قیمت عہ

اس نام کا ایک پرچہ نیا ادارہ، لاہور نے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ پرچہ پر پہلی نظر پڑتے ہی اس پر قبضہ کر لینے کو جی چاہتا ہے۔ بے حد فن کارانہ چمکیلا لیکن سادہ سرورق آنکھوں میں کھب جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری منزل آتی ہے، مطالعہ کی۔ اور یہ منزل ختم ہونے کے بعد پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے دو روپے ایک اچھے کام میں صرف کئے۔ یا رسالہ مفت بھیجنے والوں نے مجھے واقعی ایک لطیف و جمیل تحفہ بھیجا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ رسالہ کے مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مقالات، منظومات، افسانے اور ڈرامے اور جائزے۔ اور ان حصوں میں سے کسی میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں جسے بھرتی کہا جا سکے۔ اچھی تو سب ہی ہیں، لیکن ان اچھی چیزوں میں کئی بہت اچھی بھی ہیں، اور یہ بات رسالہ کے چاروں حصوں میں ہے۔ مقالات، منظومات، افسانے اور ڈرامے اور جائزے لیکن رسالہ کی تین خصوصیتوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ پہلی یہ کہ مضامین اور جائزوں میں نہ صرف ادبی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا گیا ہے بلکہ زندگی کے زیادہ اہم معاشی اور فکری مسائل کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے۔ دوسری یہ کہ نظموں کا حصہ مجموعی حیثیت سے ایسا ہے جسے دیکھ کر اچھے خاصے انتخاب کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ معاشی، ادبی، اور فلمی جائزوں میں اس ایجاز و اختصار کو دخل نہیں دیا گیا جو ہمارے جائزوں اور تبصروں کی خصوصیت بن گئی ہے۔

سویرا کا پہلا پرچہ صحافت میں ایک صبح درخشندہ کا پیامی بن کر آیا ہے۔ اور اس میں شروع ہی سے نیم روز کی تابانیاں جھانکتی نظر آ رہی ہیں۔

و۔ ع

## نیا دور ۹

کتابی سائز کا یہ رسالہ کوئی ڈیڑھ سال سے بنگلور سے نکل رہا ہے۔ اس کے پہلے ہی پرچہ کو دیکھ کر کہنے والوں نے یہ کہا تھا کہ خدا کرے اسے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ اردو والوں کو خوش ہونا چاہیئے کہ اسے نظر نہیں لگی اور نیا دور برابر آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے تقریباً سارے نئے اچھے لکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور اس کے ہر پرچہ میں اچھے ادب کا خاصا مسالہ جمع ہو جاتا ہے۔ افسانوں اور نظموں کی طرف نیا دور نے شروع سے خاص طور پر توجہ کی ہے۔ تنقیدی حصہ کو بھی ہمیشہ متوازن رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح مجموعی حیثیت سے نیا دور کا ہر پرچہ متوازن بھی ہوتا ہے اور متنوع بھی۔ لیکن اس پرچہ کے متعلق ادارہ کا یہ دعویٰ کہ "یہ نمبر ہر طرح سے متوازن اور متنوع ہے" اور بھی صحیح ہے۔ اس کا اندازہ صرف مضمون نگاروں کے ناموں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس نمبر کی محفل میں رشید احمد صدیقی،

باقی صفحہ ۶۰ پر

# فجی میں ہندوستانی

رام لال

## سماجی اور اقتصادی حالت

عورتوں اور مردوں کی آبادی میں عہد نامہ کے مطابق شروع ہی سے جو تناسب تھا اس کے اثرات اب بھی نظر آتے ہیں۔ شروع شروع میں اس آبادی میں عورتوں کی تعداد صرف چھبیس فیصدی تھی۔ اور بعد میں بڑھ کر ۴۳ فیصدی ہوگئی۔ یہ تناسب رفتہ رفتہ بڑھتا رہا۔ ۱۹۳۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق فجی میں ہندوستانیوں کی پیدائش کا تناسب کچھ زیادہ تھا یعنی فجی میں ہندوستانیوں کی پیدائش کی تعداد ۱۹۵۲ اور دوسرے مقامات پر ۱۳۱۴ تھی۔ ۱۹۳۸ء میں چار عورتوں کے مقابلے پانچ مردوں کی نسبت تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نو آبادی قائم کرنے کا عمل گھرانوں کے آباد کرنے کے اصول پر ہونا چاہیئے۔ ۱۹۴۰ء تک ہندوستانی عورتوں کی تعداد مردوں کی تعداد سے تقریباً دس ہزار کم تھی۔ شادی کے موقع پر لڑکیوں کو بیچ دینے کی رسم اب بھی ہندوستانی معاشرتی زندگی کا ایک تاریک پہلو ہے۔ بے ضابطہ شادیوں کے مقابلے میں باضابطہ شادیاں بہتر سمجھی جانے لگی ہیں۔ اور ان میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی خواتین نے ہندوستانی عورتوں کی ایک جماعت بنائی ہے اور معاشرتی خرابیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔

ابھی چند سال پہلے تک ہندوستانی رسم و رواج کے مطابق جو شادیاں ہوتی تھیں انہیں فجی قانون کی رو سے جائز نہیں مانا جاتا تھا۔ اس لئے وہ شہری قانون کے لحاظ سے ناجائز رہتی تھیں۔ اس لئے ازدواجی رشتہ میں پختگی کی شدید کمی رہتی تھی۔ اور اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی تھیں۔ حال ہی میں شادی سے متعلق فرمان جاری ہوا ہے۔ اس میں شرط ہے کہ صرف ہندوستانی شادیوں کے افسر اور پادری بیاہ کو رجسٹر کریں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسرے اس طرح کے لوگوں کے لئے جو بے قاعدہ شادیوں کی رجسٹری کر دیتے ہیں کوئی سزا نہیں ہے۔ اس لئے پچھلی برائیوں میں سے اکثر اب بھی موجود ہیں۔

۱۹۱۷ء میں سی ایف انڈریوز نے کمپنی سے مطالبہ کیا تھا کہ ہندوستانی مزدوروں کی مزدوری ایک شلنگ یومیہ سے بڑھا کر ایک شلنگ تین پنس کر دی جائے۔ ۱۹۱۹ء میں حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا جس کی تجویز تھی کہ ہندوستانی مزدوروں کی کم سے کم اجرت تین شلنگ چار پنس ہونی چاہیئے۔ ایک سرکاری افسر نے اجرت کے مسئلہ پر خاص طور سے غور کیا اور تجویز پیش کی کہ اچھی بود و باش کیلئے کم از کم چار شلنگ اجرت ہونی چاہیئے۔ پھر بھی ۱۹۳۹ء میں اجرت دو شلنگ تین پنس یومیہ سے دو شلنگ چھ پنس یومیہ تک بڑھتی گھٹتی رہی۔ جو کہ ۱۹۱۹ء کے کمیشن کی تجویز کردہ اجرت سے بھی کم تھی۔

فجی میں ہمیشہ سے ہندوستانی مزدوروں کے مقروض ہونے کی بڑی وجہ ان کی اجرتوں کی کمی رہی ہے۔ ۱۹۳۵ء میں حکومت نے فجی کی مجلس آئین ساز میں ایک شہادت پیش کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ریلوا۔ نادی اور با کے علاقوں میں ہندوستانیوں کی جو زمینیں دوسروں کے ہاتھ گروی تھیں وہ ۱۹۲۵ء میں ۵۴۴۶ ایکڑ تھیں۔ ۱۹۳۰ء میں ۱۸۵۹۷ ایکڑ۔ اور ۱۹۳۶ء میں بڑھتے بڑھتے ۱۱۰۵۰۸ ایکڑ ہوگئیں۔ اسی طرح ہندوستانی مزدوروں کا قرضہ جو ۱۹۲۵ء میں ۱۹۹۶۹ پونڈ تھا بڑھتے بڑھتے ۱۹۳۵ء میں ۸۲۲۶ پونڈ اور ۱۹۳۶ء میں ۹۶۲۲۸ پونڈ ہوگیا۔ مجلس آئین ساز میں اندازاً یہ بھی بتایا گیا کہ نو آبادی کے تمام ضلعوں میں ہندوستانیوں کا کل قرضہ ۵۰۰،۰۰۰ پونڈ کے لگ بھگ تھا اور اس فرقہ کی کل زراعتی آمدنی ۱۹۳۷ء میں اندازاً ۶۰۰،۰۰۰ پونڈ تھی۔ جون و بزلی کولڑ اپنی کتاب "بحر الکاہل کا چھوٹا ہندوستان۔ فجی میں" (مطبوعہ ۱۹۴۱ء) لکھتا ہے "قرضداری کا ایک سبب یہ ہے کہ کمپنی اپنے ملازموں کو بہت کم اجرت دیتی ہے۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کمپنی کے ملازموں میں نوے فیصدی دیوالئے ہیں"۔ جو ہندوستانی حکومت اور فجی کے باشندوں سے زمینیں پٹہ پر لیکر گنے کی کاشت کرتے ہیں بہت زیادہ مقروض ہیں۔ کمپنی سے پٹہ پر زمین لینے والوں پر اتنا قرضہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول الذکر اپنی فصلوں کو ساہوکار کے ہاتھ گروی رکھ دیتے ہیں لیکن کمپنی سے پٹہ پر زمین لینے والے ایسا نہیں کر سکتے۔ قرضہ کی زیادتی کا ایک اور سبب وہ ہندوستانی پیشہ ور ساہوکار ہیں جو بہت زیادہ اور ناجائز سود وصول کرتے ہیں۔ ہندوستانی دکاندار ادھار پر ۲۰ فیصدی زیادہ قیمت وصول کرتے ہیں۔ روپیہ قرض دینے کی روک تھام کا قانون بالکل بیکار ثابت ہوا۔ فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت کی طرف سے ایک زراعتی بنک کھولا جائے جس کی شاخیں گنے کی کاشت کرنے والے تمام ضلعوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔

مزدوروں اور کسانوں سے متعلق کچھ قوانین بھی ہیں۔ ۱۹۴۱ء کے صنعتی ایسوسی ایشن سے متعلق اٹھارویں آرڈنینس کی شرط ہے کسانوں کی جو جماعتیں بنائی جائیں وہ باقاعدہ اور رجسٹرڈ ہوں قانون کی رو سے رجسٹری لازمی ہے۔ اس کی رو سے ان دیہاتی

کاشتکاروں کو بھی جو ملازم نہیں ہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی جماعتیں بنائیں ۱۹۴۱ء کے کسانوں کے جھگڑوں سے متعلق انیسواں فرمان جو پنچایت اور آپس کے میل جول کے بارے میں ہے اس کی رو سے کسانوں کے تمام جھگڑوں کی تفتیش اور ان کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔ اگر کسی ایسی انڈسٹری میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہو جہاں کوئی فیصلے کی تدبیر نہ ہو سکے تو گورنر کو اختیار ہے کہ وہ فریقین کا فیصلہ کر دے۔ لیکن اگر میل ملاپ کے یہ طریقے کارگر نہ ہوں یا اگر فریقین ایسی درخواست کریں تو گورنر فریقین سے کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے جھگڑے کو ایک جھگڑا چکانے والی عدالت میں پیش کریں جس کے فیصلے کی دونوں پر پابندی ہوگی۔ مزدوروں کی انجمنیں بنانے کی تحریک آہستہ آہستہ جڑ پکڑ رہی ہے۔ اور اس کا ثبوت کسانوں کی جماعت کسان سنگھ اور مزدوروں کی جماعت مزدور سنگھ کا وجود میں آنا ہے۔ ان کے مطالبوں میں اپنے ہر گروہ یا سردار کے انتخاب کرنے کا حق ہے۔ ۱۹۴۱ء کے مزدوروں کی خوشحالی سے متعلق بیسواں آرڈننس اس بات کا اختیار دیتا ہے کہ ایک لیبر کمشنر مقرر کیا جائے۔ جو اس نوآبادی کے مزدوروں کی عام خوشحالی کی نگہبانی ہی نہیں بلکہ اس کو ترقی بھی دے۔ اسے کچھ اندراج اور جانچ پڑتال کے اختیارات بھی دیئے گئے ہیں تاکہ وہ اپنے فرائض کو جو اس پر اس آرڈننس کی رو سے عائد ہوتے ہیں انجام دے سکے۔

۱۹۳۸ء کے نوآبادیات کے فرمان کی وہ شرائط جن کا تعلق ضمانتوں اور ان پابندیوں سے ہے جو اس خطۂ زمین پر ہندوستانیوں کے اترنے اور پہلے تین سال کے قیام پر لگائی گئی ہیں۔ ہندوستانیوں کو وہاں آباد ہونے سے کھلم کھلا باز رکھتی ہیں۔ نوآبادی کی حکومت کے آباد کرنے کی پالیسی کا ایک کھلا مقصد یہ ہے کہ فجی میں پیدا ہونے والے ہندوستانیوں کے مفاد کی خاطر غیر شادی شدہ مردوں کو آنے سے روکا جائے۔ ان شادی شدہ ہندوستانیوں کو جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہوں اور جنہیں کاشتکاری کی مستقل ملازمت کا یقین دلایا گیا ہو انہیں داخل ہونے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ ان ہندوستانیوں کو بھی جن کی تجارت فجی میں جڑ پکڑ گئی ہو۔ ان کو اپنی بیویاں اور چھوٹے بچوں کو ہندوستان سے لاکر اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ غیر شادی شدہ مردوں میں صرف ایسے لوگوں کو آنے کی اجازت ملتی ہے جن کی تجارت کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں ضرورت ہے۔ فجی میں پیدا شدہ ہندوستانی جو معاشرتی معاشی اور سیاسی معقولیت کی کشمکش میں پیش پیش ہیں۔ ہندوستانیوں کے وہاں آباد ہونے پر پوری پوری روک نہیں تو اس سے زیادہ سخت پابندی عائد کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ ایسے ہندوستانی ہیں جو شہروں میں بڑی بڑی اسامیاں چاہتے ہیں۔

۱۹۳۶ء کے آخر میں گورنر نے فجی حکومت کی ہندوستانی آبادی سے متعلق ایک کمیٹی مقرر کی تاکہ ہندوستانی نوآبادی سے متعلق تجاویز پیش کرے۔ اس کمیٹی میں تین ہندوستانی کونسل کے نامزد ہندوستانی ممبر تھے لیکن منتخب شدہ تین ممبروں میں کوئی ہندوستانی نہیں تھا۔ ہندوستانی امور کا ایک محکمہ بھی ہے جسے ہندوستانی مشاورتی کمیٹیاں مدد دیتی ہیں۔ لیکن یہ کمیٹیاں فائدہ مند ثابت نہیں ہوتیں۔ کیونکہ ضلعوں کے کمشنر اپنی ہی پسند کے لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہندوستانی افسروں کی ایک نئی جماعت بھی ہے اور دو ضلعوں کے کمشنروں کے نائب ہیں۔ یہ شخص ان ہندوستانیوں کی خاص حمایت کی وجہ سے بدنام ہو گئے ہیں جنہوں نے ہندوستانیوں کے آباد ہونے پر زیادہ پابندی عائد کرنے کی تائید کی۔

۱۹۱۶ء تک اس نوآبادی کی تعلیم عیسائیوں کی تبلیغی جماعت کے ہاتھ میں رہی۔ لیکن اس کے بعد سے حکومت نے بھی اپنے صوبائی حلقوں کے ذریعے تعلیم کی ذمہ داری میں ان کے ساتھ حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ آٹھ ممبروں کا ایک تعلیمی بورڈ ہے جس میں دو ہندوستانی ممبر ہیں۔ تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کے سلسلے میں ہندوستانیوں کے خلاف کافی نسلی امتیاز برتا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں یورپ والوں پر کل تعلیمی خرچہ ۲۹.۰۸ فیصدی تھا حالانکہ ان کی تعداد کل آبادی کا ۴۱.۰۲ فیصدی تھی اور ہندوستانیوں کی تعلیم پر خرچہ ۱۵.۰۵ فیصدی تھا حالانکہ ان کی تعداد آبادی کا ۴۲.۰۸ فیصدی تھی۔ اس سے زیادہ خراب بات یہ تھی کہ ہندوستانیوں سے ان کی تعلیم پر جو ۵۰ فیصدی حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ حالانکہ ان کا تعلق اس طبقے سے جو معاشی اعتبار سے سب سے زیادہ غریب تھے۔ یورپ والوں کی تعلیم کے لئے فجی کی تعلیمی بجٹ میں پہلے ہی ایک حصہ مقرر کر لیا جاتا تھا۔ اور فجی حکومت یورپ والوں کی تعلیم کا پچاس فیصدی خرچ خود برداشت کرتی ہے۔

۱۹۴۰ء میں سکول جانے کی عمر والوں میں سے کل ۴۰ فیصدی ہندوستانی لڑکے اور ۱۱ فیصدی لڑکیاں سکول میں پڑھتی تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے آخر میں رجسٹر شدہ ہندوستانیوں کے سکولوں کی تعداد ۸۸ تھی اور اس کے مقابلے میں فجی اور یورپ والوں کے رجسٹر شدہ سکولوں کی تعداد ۳۲۰ تھی۔ سکول۔ یونیورسٹی اور صنعتی تعلیم کی سہولتیں بھی کم ہیں۔ کیونکہ آبادی میں مختلف صوبوں کے اور مختلف زبانیں بولنے والے ہندوستانی ہیں۔ اس لئے سکولوں میں ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں بڑی دقت پڑتی ہے۔ لیکن ہندوؤں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے ان کی زبان زیادہ بولی جاتی تھی۔ اس لئے ہندوستانی ذریعۂ تعلیم قرار پائی۔ خاص خاص موقعہ پر ایک مزید ہندوستانی زبان کے تعلیم دینے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ اس طرح ہندوستانی کی تعلیم پہلی چار جماعتوں میں

ضروری تھی۔ اور انگریزی زبان کا پڑھنا اپنی مرضی پر تھا۔ تمام نوآبادی میں بہت سے ہندوستانی جوان انگریزی بولتے ہیں۔

## سیاسی حالت

فجی میں ایک مجلس عاملہ اور ایک مجلس آئین ساز ہے۔ جن کی شکل مشاورتی ہے۔ بڑے حکام کی ایک کونسل بھی ہے جو گورنر کو مشورے دیتی ہے ۱۹۲۴ء تک ۶۰،۰۰۰ ہندوستانیوں کی نمائندگی ایک نامزد ممبر کرتا تھا۔ لیکن ۱۹۲۴ء میں ان کی نمائندگی دو منتخب شدہ ممبر کرنے لگے۔ ۱۹۲۹ء میں انہیں تین فرقہ وارانہ نشستیں مل گئیں۔ ۵ نومبر ۱۹۲۹ء کو ایک منتخب شدہ ہندوستانی ممبر نے مجلس آئین ساز میں تجویز پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ جس طرح نوآبادی کی برطانوی آبادی کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے اسی طرح ہندوستانیوں کو بھی عام ووٹ دینے کا حق ملنا چاہئے۔ یورپ والے مشترکہ انتخاب کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ ہندوستانی ووٹ دینے والوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے۔ ہندوستانی کونسل سے مستعفی ہو گئے اور ۱۹۳۲ء تک عدم تعاون کی پالیسی پر چلتے رہے۔ ۱۹۳۲ء کے دستور العمل کے ماتحت مجلس آئین ساز میں سولہ سرکاری ممبر اور پندرہ غیر سرکاری ممبر ہوتے ہیں۔ غیر سرکاری ممبروں میں تین منتخب شدہ اور دو نامزدہ یورپی ممبر ہوتے ہیں۔ پانچ نامزدہ اصلی باشندوں کے ممبر اور باقی پانچ ہندوستانی ممبر جن میں تین منتخب شدہ ہیں اور دو نامزد۔ ۱۹۳۶ء کی مردم شماری کے مطابق فجی میں ۹۹۵۹۵ دیسی باشندے تھے۔ ۸۹۳۳۲ ہندوستانی اور ۴۲۳۸ یورپ والے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو پانچ پانچ نشستیں دی گئیں۔ اور اسے برابر کی نمائندگی کہا گیا۔ مجلس عاملہ میں ہندوستانیوں کا کوئی نمائندہ نہیں۔ سوا کونسل میں سات سرکاری اور چھ غیر سرکاری ممبر ہیں۔ چھ غیر سرکاری ممبروں میں دو ہندوستانی دو فجی کے اور دو یورپی ممبر ہیں۔

نوآبادی کا سرکاری ڈاکٹر ہندوستانی امور کے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ ہندوستانی اس انتظام سے بالکل ناخوش ہیں۔ ہندوستانیوں کا خیال ہے کہ بحیثیت سکریٹری اس کا یہ فرض ایک ضمنی چیز ہے۔ اور اس طرح ہندوستانی امور کو کافی توجہ نہیں ملتی۔ ہر ایک تسلیم کرتا ہے کہ نوآبادی کی معاشی ترقی میں ہندوستانیوں کا بڑا حصہ ہے۔ جب ہندوستانی دوسروں کے ساتھ مساوات کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ تو اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ فجی والوں کے سیاسی اقتدار کی برتری کا خیال نہیں کرتے۔ ان کا دعوےٰ ان کے کچل جانے کے خوف سے ہے۔ لیکن وہ دوسرے آباد ہونے والے فرقوں سے مثلاً یورپ والوں سے رتی برابر بھی مساوات کی کمی کو برداشت نہیں کر سکتے۔

## نقد و نظر ——— بقیہ صفحہ ۵۷

قاضی عبدالغفار، علی عباس حسینی اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ ابن انشاء، عزیز احمد، علی جواد زیدی، مخمور جالندھری، فکر تونسوی، یوسف ظفر، علی سردار جعفری ممتاز مفتی اور اختر الایمان بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ نسبتاً کم معروف لکھنے والوں کی چیزیں بھی ادبی حیثیت سے قابل تعریف ہیں۔

نیا دور کا ادارہ ہم سب کی مبارک باد کا مستحق ہے کہ وہ بنگلور جیسے دور افتادہ مقام سے ایک ایسا رسالہ نکال رہا ہے جو ہر طرح ہمارے موجودہ ادبی رجحانات کا عکاس ہے۔

**نسوانی دنیا** (لاہور) جنوری ۱۹۴۷ء۔ یہ پرچہ نسوانی دنیا کا کوئی خاص نمبر نہیں ہے۔ پھر بھی پہلی ہی نظر میں پڑھنے والوں کو اس کی انفرادیت اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اب تک اردو میں جتنے نسوانی رسالے نکل رہے ہیں ان کی نظر عورت کی زندگی کے صرف اس پہلو پر ہے جو اسے سیاست سے الگ رکھتا ہے۔ حالانکہ ہماری موجودہ زندگی کا انداز کچھ ایسا ہے کہ سیاست اور زندگی کو ایک دوسرے سے الگ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ "نسوانی دنیا" یہی احساس پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اور ہمارے نزدیک ایک مستحسن کوشش۔

## آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ چند غیر معروف تضمینیں ......... جناب وزیر الحسن ........
۲۔ تضمین .............. حضرت غالب (مرحوم) .......
۳۔ تضمین .............. حضرت مومن (مرحوم) .......
۴۔ غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط ...... حضرت اطہر ہاپوڑی .......
۵۔ غالب کی وفات پر آزاد کا قطعہ تاریخ ... پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ......
۶۔ غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک (مع تصاویر) ...... پروفیسر حمید احمد خان .......
۷۔ یونسکو کے بنیادی عقائد ...... خواجہ غلام السیدین .......
۸۔ اولاد (افسانہ) .......... پروفیسر رشید احمد صدیقی .......
۹۔ غزل .............. جناب قدیر لکھنوی .......
۱۰۔ ہم پریسیڈنٹ ہیں (افسانہ) ... آغا محمد یعقوب دواشی .......
۱۱۔ روس میں کتابوں کی اشاعت ... اے نزاروف .......
۱۲۔ بلبلا ............ جناب ناظم صدیقی .......
۱۳۔ دو غیر فانی شہزادیاں (افسانہ) .... تران وان ترنگ .......
۱۴۔ ۵۵۵ (افسانہ) ........... بیگم سلیم .......

مضامین دلی پرنٹنگ پریس دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۲۶ اسی شائع کیا

حسن و عشق، نغمہ و ساز، ادب اور آرٹ کا سنگم

فلم ساز و ہدایت کار مسٹر سبطین فضلی کی فنکارانہ تخلیق

# مہندی

فلمی راگنی آکاش بیگم پارہ کے کرن دیوان تارے

سلطان منظر — غوری — پرتما دیوی — ذکی — جانی بابو

الوری — بوبائی — اور مراد

نغمہ کار — مکالمے اور گانے — عکاسی — صدا بندی

غلام حیدر — ساغر نظامی — پرشوتم دیویچہ — بی اے نادر

جاری کردہ — فضلی فلمز — رتن ولا دادر بمبئی۔

دوسری جدوجہد
خاتون
گڑیا
اور آوارہ

تقسیم کنندگان

دی دکن فلم ایکسچینج حیدر آباد دکن جنوبی ہند۔ نگار پکچرز دہلی۔ ایونیو پکچرز پشاور

# آپ بیمار ہیں

## بیماری

خدا دشمن کو بھی نہ دے، بیسکا خرچ، روزگار بند، مصیبت پر مصیبت، علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہ رہا ہے، مگر فائدہ نہیں مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" یہ مرض کیوں بڑھ رہا ہے فائدہ کیوں نہیں ہوتا اس کا جواب یہ ہے کہ مرض کی تشخیص نہ ہوسکی، دوا خالص اور عمدہ نہیں مل سکی، سٹری گلی دواؤں اور ناتجربہ کار طبیب سے فائدہ کی کیا امید ہوسکتی ہے۔ اگر آپ کے دوستوں میں سے کوئی صاحب کسی پیچیدہ اور پرانے مرض میں گرفتار ہیں تو ان کے حالات ناظم شعبۂ تشخیص مجلس اطبا پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی کو فوراً لکھ کر روانہ کیجئے!

یہاں مرض کے حالات تجربہ کار کہنہ مشق طبیبوں کی مجلس میں پیش ہوتے ہیں اس مجلس کے صدر دہلی کے مشہور طبیب پروفیسر حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی سینیر ہاؤس فزیشن وائس پرنسپل جامعہ طبیہ، و ایڈیٹر رسالہ مسیح الملک ہیں۔ مجلس اطبا میں مرض کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے بحث ہوتی ہے، ہر طبیب اپنے تجربہ کی بنا پر رائے ظاہر کرتا ہے، اور بالآخر متفقہ رائے سے مرض کی صحیح تشخیص عمل میں آتی ہے دوا تجویز ہوتی ہے ہر مریض کو اطلاع دیجاتی ہے اور اس طرح روزانہ صدہا پیچیدہ مسئلے حل ہوتے ہیں تشخیص و تجویز کا یہ طریقہ اس قدر صحیح اور بہتر ثابت ہوا ہے کہ اب نہ صرف ملک کے ہر گوشے کے مریض بلکہ بہت سے طبابت پیشہ اصحاب ڈاکٹر، حکیم اور وید بھی اپنے زیر علاج مریضوں کے پیچیدہ امراض کی بابت مجلس اطبا کا مشورہ طلب کرتے ہیں اس طرح ہزاروں مایوس مریض اس مجلس کی صحیح تشخیص کی بدولت نئی زندگی حاصل کر چکے ہیں اگر آپ کسی پیچیدہ یا پرانے مرض میں گرفتار ہیں اور آپ کا وقت خراب ہوچکا ہے اور دولت برباد ہوچکی ہے تو ہمیں لکھیے۔

**منیجر مجلس اطبا۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی**

دنیا میں کامیابی کا راز دو لفظوں میں یہ ہے کہ محنت کیجئے محنت سے دولت پیدا ہوگی اور دولت سے عیش و آرام مگر اس کے لئے تندرستی کی ضرورت ہے اگر یہ نہیں اور آپ بیمار ہیں تو محنت، دولت، آرام صرف خواب و خیال ساری عمر تکلیف و مصیبت میں گزارنا ہوگی، کبھی بھی کامیابی نصیب نہیں ہوسکتی۔

## امتحان کی کامیابی کا راز

ذہنی ... دماغ اور حافظہ کمزور ہے تو




# کیمیا رحیات

صادق ... الملک
کا ... مفت طلب فرمائیے

استعمال کرکے اتنا طاقتور اور قوی بنالیجیے کہ کچھ نہ بھول سکیں اور کم از کم اٹھارہ گھنٹے مسلسل دماغی محنت کرسکیں

دماغی کام کرنے والوں کے لئے خاص طور پر کیمیا رحیات کی ایجاد پروفیسر حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی صدر مجلس اطبا و وائس پرنسپل جامعہ طبیہ نے تقریباً دس سال کے تجربہ اور ہزاروں روپیہ صائع کرنے کے بعد کی ہے، دماغی کام کرنے والوں کی کامیابی اور ترقی کیلئے کیمیا رحیات کا استعمال ضروری ہے کیمیا رحیات اس قسم کے کیمیاوی اجزا اور جواہرات سے سائنٹفک طریقہ پر تیار کیا جاتا ہے جو دماغ کیلئے قدرتی خوراک ہے اگر آپ دماغی کمزوری کے علاوہ کسی اور پیچیدہ بیماری میں مبتلا ہیں تو مفصل حالات لکھ کر ہم شعبۂ تشخیص مجلس اطبا کو بھیج دیں،

قیمت فی شیشی ... خوراک ... تین شیشیاں ... اعلیٰ فی شیشی چار روپے ... تین شیشیوں تک ۹



... ل اطبا پوسٹ بکس نمبر (۵۹) دہلی




سالانہ چندہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۸ | فہرست | ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے



مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم ایم۔اے

نائب مدیران
فضل حق قریشی دہلوی — بھگت سروپ کھلر ایم اے — سید آفاق حسین آفاق بی اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ — پوسٹ بکس ۱۲۶ دہلی

# رفتار زمانہ

## فلمی حصّوں پر پھر احتساب

کچھ عرصے سے محسوس کیا جا رہا تھا کہ بعض ہندوستانی فلموں میں عریاں یا مخرب اخلاق منظروں، گیتوں یا مکالموں کو روا رکھا جانے لگا ہے یا بصورت دیگر بعض فلموں میں مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچانے والے دانستہ شامل کرلئے جاتے ہیں۔ اس لئے ذوق سلیم رکھنے والے بہت سے حضرات جو فلم بینی کو برا بھی نہیں سمجھتے، ایسے فلموں سے اجتناب کرنے لگے تھے۔ حالانکہ یہ فلم پبلک میں پیش ہونے سے قبل محکمۂ احتساب کی سند حاصل کرلیتے تھے۔ بہت سے ادبی اور فلمی رسائل نے ارباب فلم کی اس غلط روش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی لیکن نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہ ہوسکا۔ تاہم یہ سن کر خوشی ہوئی کہ صوبہ بمبئی کے ہوم منسٹر مسٹر مورارجی ڈیسائی نے اس سلسلے میں پہلا نیک قدم اٹھایا اور چار ایسے پرانے فلموں کے قابل اعتراض حصے حذف کرنے کے احکامات صادر کردئے جن کی نمائش کافی عرصے ہوتی رہی ہے۔ ان میں بعض فلم تین تین چار چار سال پرانے ہیں۔ آئندہ کے لئے بھی انھوں نے محکمۂ احتساب کو ہدایت کردی ہے کہ نئے فلموں پر زیادہ گہری تنقیدی نظر ڈال کر جائزہ لیا جائے تاکہ وہ طوفان بدتمیزی جسے دبانے کی اب کوشش کی گئی ہے، بار دگر کسی پردۂ فلم پر اپنا رنگ نہ جما سکے۔ بمبئی کے ہوم منسٹر کی یہ کاوشیں ہر اعتبار سے قابل تحسین ہیں۔ قارئین کی معلومات کے لئے ان فلموں کے نام اور قابل اعتراض حصوں کی لمبائی وغیرہ نیچے درج کی جاتی ہے۔

۱۔ دس بجے ۔ پربھات کمپنی ۔ ایک گیت ۔ ۶۱ فٹ
۲۔ رتن ——— جمنا پروڈکشن ۔ چند مکالمے ۔ ۱۹۹ فٹ
۳۔ بچوں کا کھیل ۔ رمنیک پروڈکشن ۔ دو گیت ۔ ۴۰۴ فٹ
۴۔ مہارانا پرتاپ ۔ جینت ڈیسائی ۔ ایک گیت ۔ ۴۰۰ فٹ

ان کے علاوہ حسب ذیل اٹھارہ فلموں میں سے جو تیار ہوچکے ہیں یا زیر ترتیب ہیں، بہت سے حصے الگ کردئے گئے ہیں (۱) سالگرہ (۲)، قیمت (۳)، بیراگیت (۴)، شہر مصر یا فرعون (۵)، جگ بیتی (۶)، برہمن کنیا (۷)، قسمت کا دھنی (۸)، ابر میل (۹)، کانگو (۱۰)، شاہی خزانہ (۱۱)، بھیدی دشمن (۱۲)، طوفان کوئین (۱۳)، ہوائی کھٹولا (۱۴)، روپا (۱۵)، چمکتی بجلی (۱۶)، حور بغداد (۱۷)، انجولی اور (۱۸)، دوستی۔

حذف شدہ مکالموں یا گیتوں کی تفصیل ادارے کے پاس موجود ہے لیکن ان کی اشاعت سے اس لئے احتراز کیا جاتا ہے کہ ان کا اعادہ بجائے خود ایک فعل مذموم ہے۔ امید ہے کہ اس پھر احتساب سے اثر لیتے ہوئے فلم کمپنیاں آئندہ خود ہی اس امر کا خیال رکھا کریں گی کہ ان کی ادبی اور فنی خدمات ہر لحاظ سے اتنی قابل قبول ہوا کریں کہ ان میں کسی قسم کی کتربیونت کا امکان نہ رہے۔

## ایندھن کا مسئلہ

دنیائے شاعری میں تسلیم کیا جاتا ہے کہ محبوب اپنے حسن وجمال کی تابشوں سے جب چاہے عاشق نامراد پر بجلی گرا کے تڑپا دے اسی لئے ایسے محبوب کو برق وش، برق افگن، برق آسا اور برق آہنگ جیسے خطابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ اٹالیہ میں تیتی جیا گتی ایک ایسی لڑکی بھی موجود ہے جس کے جسم سے کپڑوں کی رگڑ برقی لہریں پیدا کردیتی ہے اور وہ لہریں معمولی نہیں، بہت قوی ہوتی ہیں۔ آجکل سارے ملک میں بلکہ تمام برّ اعظم یورپ میں اس کا چرچا ہو رہا ہے اور اسے اتنی اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے سائنسدانوں نے اسے دعوت دی ہے تاکہ وہ اس کے جسم کا معائنہ کرکے یہ معلوم کرسکیں کہ اس برق تابی کا اصل سبب کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض کپڑوں کی رگڑ اس کے جسم سے اتنی حرارت پیدا کردیتی ہے کہ اسے موسم سرما میں جبکہ انتہائی سردی کے باعث ہزاروں لوگ مرے جا رہے ہیں وہ اطمینان سے گرم رہتی ہے بلکہ فالتو حرارت سے وہ چائے یا کافی پکا لیتی ہے۔ اس طرح ایندھن کا مسئلہ جو یورپ بھر میں نہایت نازک صورت اختیار کرگیا ہے، کم سے کم اس کے لئے حل ہوجاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سائنسداں اسکے جسم کا معائنہ کرکے کیا بال کی کھال نکالتے ہیں۔ اس سے پہلے ایک اور لڑکی کے متعلق سنا گیا تھا کہ وہ بجلی کے مثبت و منفی دونوں تار پکڑ لیتی تھی اور اسے کوئی صدمہ نہیں پہنچتا تھا۔ بلکہ اس حالت میں اگر بجلی کا بلب اس کے جسم کے کسی حصے پر رکھ دیا جاتا تو وہ جل اٹھتا اور سارے گھر میں روشنی ہوجاتی تھی۔ افسوس ہے کہ اس لڑکی کی اس کیفیت کا سائنسی تجزیہ نہیں کیا جا سکا۔

## ایک یونانی جہاز کی تباہی

دوسری جنگ عظیم کو ختم ہوئے خاصہ عرصہ گذر چکا لیکن اس دوران میں پھیلائے ہوئے جال اب بھی کبھی کبھی تباہی کا رنگ جاتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ یونان کی وزارت بحریہ کے ایک بیان سے پتہ چلا ہے کہ حال ہی میں "ہمارہ" نامی ہزار ٹن وزنی جہاز سمندر میں پڑی ہوئی ایک نامعلوم سرنگ سے ٹکرا کر تباہ و برباد اور غرق ہو گیا۔ اس جہاز پر ۴۲۵ مسافر اور ملاح وغیرہ موجود تھے۔ ان میں سے ۳۴۲ ڈوب گئے اور ان کی لاشوں کا بھی کوئی پتہ نہ چل سکا۔ ۲۰۶ امدادی کشتیوں کے ذریعے بچا لئے گئے۔ ۲۰ اشخاص کے متعلق سنا گیا ہے کہ وہ جزیرہ یوبیا کی چند چھوٹی بندرگاہوں پر پہنچ گئے ہیں۔ مسافروں میں چالیس ایسے سیاسی قیدی بھی شامل تھے جو حکومت کے خلاف ہونے کے باعث مورد عتاب تھے۔ ان کو ایتھنیہ (ایتھنز) اس لئے لایا جا رہا تھا کہ عدالتی فیصلے کے بعد وہ جلاوطن کر دئے جائیں۔ دنیوی عدالت کی بجائے ان کی قسمت کا فیصلہ قانون قدرت کے ماتحت ہوا اور وہ وطن کی بجائے دنیا ہی سے رخصت کر دئے گئے۔

## لوہے کا پھیپھڑا

تقریباً دس سال گذرے، آسٹریلیا کے مشہور شہر سڈنی میں جون مکماہن نامی ایک بچے کے پھیپھڑے میں کوئی ایسی خرابی پیدا ہو گئی جس کے باعث اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ اس بچے کی عمر صرف نو سال تھی۔ ڈاکٹروں نے غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ اگر پھیپھڑا تبدیل کر دیا جائے تو زندگی ممکن ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی دوسرے انسان کا یہ عضو نہیں ملنا مشکل تھا، اس لئے مصنوعی طور پر لوہے کا پھیپھڑا تیار کر کے اس کے جسم میں رکھا اور سانس کی آمد و شد کو قوت برقی کے ذریعہ بدستور قائم کر دیا۔ صورت یہ تھی کہ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے سوتے جاگتے بجلی کا سوئچ لگا رہتا تھا اور اس طرح وہ شخص جس کی عمر اب انیس سال ہو گئی تھی، اس دنیا میں جیتا رہا۔ لیکن افسوس ہے کہ کسی غیر متوقع حادثے کے تحت بجلی گھر میں ایسی گڑبڑ ہوئی کہ بجلی کی رو کا سلسلہ منقطع ہوا اور اس شخص کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو گیا۔ کامل ایک گھنٹے تک بجلی گھر کے ارباب حل و عقد کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح بجلی تیار کرنے کی مشین ٹھیک ہو جائے مگر بے سود۔ آخر اس شخص نے جس کی زندگی کا ہر لمحہ بجلی کی ایک لہر پر منحصر تھا سانس گھٹنے کے باعث تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ سائنسدانوں اور ڈاکٹروں کا دماغ اب کسی اور طریقے سے اسے نہ بچا سکا۔ استعارے کے طور پر سنگدل انسان کا وجود تو بہت سننے میں آیا ہے لیکن یہ صحیح معنوں میں لوہے کے پھیپھڑے کا انسان تھا جو دس سال تک قانون قدرت کا مقابلہ کرتا رہا اور آخر ہار کر گوشہ قبر میں جا چھپا۔

## سمندر پار ملکوں سے

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں کے پاس جو کچھ اناج بچ رہتا ہے اس میں سے وہ ہندوستان کی مدد برابر کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

| قسم اناج | مقدار یکم سے ۱۶ر جنوری ۱۹۴۷ء تک | |
|---|---|---|
| گیہوں | ۱۳،۹۰۰ | ٹن |
| چاول | ۳،۷۰۰ | ٹن |
| جو | ۹،۰۰۰ | ٹن |
| کل مقدار | ۲۶،۶۰۰ | ٹن |

## بمبئی میں نئے تھیٹر

ہنگامۂ غدر ختم ہونے کے کئی سال بعد سب سے پہلے بمبئی میں ایک تھیٹریکل کمپنی قائم ہوئی اور پھر آئے دن نت نئی کمپنیاں کھلتی چلی گئیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس روایت قومی کو برقرار رکھتے ہوئے آج بھی جب کہ دوسرے شہروں نے اس طریقۂ لطف و نشاط کو بالکل ترک یا کم کر دیا ہے، وہاں چونسٹھ تھیٹر موجود ہیں اور تازہ ترین منصوبوں کے مطابق سولہ مزید تھیٹر کھلنے والے ہیں۔ ایک ایسے شہر میں جو فلمی دنیا کا مرکز بنا ہوا ہے یہ اقدامات تعجب خیز ہونے کے ساتھ ساتھ قابل تحسین بھی ہیں۔ ایسے دو فنی اداروں کو جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہوں، دوش بدوش قائم رکھنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ حکومت بمبئی کو تھیٹریکل کمپنیوں کے لائسنس وغیرہ سے کچھ زیادہ آمدنی نہیں ہوتی لیکن اگر اس میں اضافہ کر لیا جائے تو ان اداروں کو حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے کیونکہ فی الحال اس پہلو سے ان کا وجود قابل اعتراض حیثیت رکھتا ہے۔ بمبئی کی مثال کو سامنے رکھ کر اگر دوسرے شہروں میں بھی تھیٹروں کی بنیادیں رکھی جائیں تو ہمارے ملک میں ان کو نئے سرے سے دوبارہ زندگی نصیب ہو سکتی ہے۔

## روسی سائنسداں انجمن ترقی اردو کے دفتر میں

۸ر جنوری ۱۹۴۷ء کی شام کو روسی سائنسدانوں کا وفد جس نے انڈین سائنس کانگریس میں شرکت کی تھی انجمن ترقی اردو (ہند) کے دفتر میں تشریف لے گیا اور انجمن کی مطبوعات اور بعض نادر قلمی کتب کو دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔ اس وفد میں پروفیسر ایس۔ یو۔ عمراف بھی شامل تھے جو مسلمان ہیں اور فارسی زبان خوب جانتے اور بلا تکلف بولتے ہیں۔ انھوں نے فارسی مخطوطات کا معائنہ بڑے شوق سے کیا۔ پروفیسر بارنی کوف بوجہ علالت اس وفد کے ساتھ ہندوستان نہ آسکے۔ وہ ماسکو میں اردو زبان کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے روسی زبان میں صرف و نحو پر ایک اچھی کتاب لکھی ہے، اردو شاعروں کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے اور زبان سے متعلق کئی کتابیں اور مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے انھوں نے ہمیشہ اردو ہی میں خط و کتابت کی ہے۔ انجمن سے رخصت کے وقت "روسی ادب" مصنفہ

پروفیسر محمد مجیب ایم اے اور میگورکی کی آپ بیتی" مترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بی اے پی ایچ ڈی کا ایک ایک نسخہ تحفۃً پیش کیا گیا۔ وہ اس سوغات کو اپنے ساتھ روس لے گئے۔

## ترکی سے فالتو گیہوں

حکومتِ ہند کے اڈیشنل فوڈ کمشنر میجر جنرل اے سی آرنلڈ نے ایک بیان میں فرمایا کہ حکومت ترکیہ نے اپنے اناج کے فالتو ذخیرے میں سے باسٹھ ہزار ٹن گیہوں ہندوستان کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اگر حمل ونقل کی تمام سہولتیں میسر آگئیں تو یہ اناج فروری کے آخر تک ہندوستان کی بندرگاہ پر پہنچ جائے گا۔ انہوں نے بتایا کہ ترکی میں ٹاٹ کی بوریوں کی بہت کمی ہے۔ اگر یہ مشکل کسی طرح آسان ہوگئی تو اناج کی روانگی کا انتظام فوراً ممکن ہوجائیگا۔ اسی مقصد کے ماتحت موصوف جنوری کے تیسرے ہفتے میں ترکی چلے گئے ہیں تاکہ وہاں کی ذمہ دار ہستیوں سے مل ملاکر اس کارِ خیر کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ میجر جنرل آرنلڈ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک برطانوی سفارتخانے میں ایک سیاسی رکن کی حیثیت سے رہ چکے ہیں۔ اگر ان کی کوشش بہت جلد بار آور ہوگئیں اور اناج کا یہ بڑا ذخیرہ بخیر وخوبی ہندوستان آگیا تو موجودہ پریشانیوں میں کسی قدر کمی ہوجائے گی۔ ترکی کا بہت بڑا علاقہ نہایت زرخیز ہے اور مقامی ضروریات پوری کرنے کے بعد ہر سال اناج کا بہت سا حصہ فالتو رہ جاتا ہے۔ امید ہے کہ ترکی کی یہ وقتی پیش کش آئندہ کے تجارتی تعلقات کو خوشگوار بنانے میں ایک اچھی مثال بن سکے گی۔

## تین نئی ایجادیں

(۱) زندگی کی موجودہ ضروریات میں ٹائپ کی مشین کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی ہے سرکاری دفتروں سے لے کر تجارتی منڈیوں تک ہی نہیں بلکہ گھروں میں بھی اس کا استعمال عام ہوگیا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سہولت حاصل کرنے کے علاوہ اس وقت میں بھی بچت ممکن ہوسکتی ہے جو ہاتھ سے عبارت نقل کرنے میں ضائع ہوجاتا ہے۔ ہر زبان کی الگ الگ ٹائپ مشینیں موجود ہیں لیکن اب لندن کے ایک کارخانے نے ایسا انتظام کیا ہے کہ حروف کی تبدیلی سے جس میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی ہر زبان کی عبارت ایک ہی مشین پر ٹائپ کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ کاغذ کی چوڑائی کے مطابق جب چاہیں مشین کو چھوٹا بڑا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک مکمل مشین کے علاوہ پرزوں کی صورت میں فالتو اجزا خرید کر بہت سی مشینوں کا کام ایک ہی سے نکالا جاسکتا ہے۔

(۲) موٹروں، ہوائی جہازوں اور دوسری مشینوں کو حرکت میں رکھنے کے لئے پیٹرول کا خرچ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور یہ بھی اندیشہ دامنگیر ہے کہ کہیں اس کا ذخیرہ ختم نہ ہوجائے۔ چنانچہ اس میں کفایت کے خیال سے روز بروز نئی تدبیریں سوچی جارہی ہیں۔ حال ہی میں لندن کے ایک سرکس میں البرٹ بروک وے نے ایسی موٹر سائیکل کا مظاہرہ کیا جو پیٹرول کے چند قطروں میں ایک میل جاسکتی ہے یا یوں سمجھئے کہ وہ پیٹرول جو ایک معمولی سگرٹ لائٹر میں پڑتا ہے، اس موٹر سائیکل کو تقریباً نصف میل چلا سکتا ہے۔

(۳) نورویچ کے ایک ماہر نے ایسی سائیکل ایجاد کی ہے جس کا وزن مروجہ سائیکلوں سے نصف ہے حالانکہ ضرورت کی کوئی چیز کم ہونے نہیں پائی اور نہ اس کی مضبوطی میں کوئی فرق پیدا ہوا ہے۔ اس سائیکل کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ سے توڑ مروڑ کر اس طرح بند کیا جاسکتا ہے کہ وہ موٹر میں بیٹھتے وقت اپنے پاس رکھ لی جاتی ہے۔ اسے معمولی پارسل کی صورت میں لپیٹ کر بھیجنا بھی آسان ہے۔ اس سائیکل کے پرزے برطانیہ میں نہیں مل سکتے۔ بڑے پیمانہ پر ان کی تیاری آسٹریلیا میں عمل میں آرہی ہے۔

## وائی، ڈبلیو، سی، اے کا جشنِ زرّین

ہندوستان میں وائی، ڈبلیو، سی، اے (ینگ ویمنز کرسچین ایسوسی ایشن) کی داغ بیل بمبئی میں آج سے ستر سال پہلے چار معزز خواتین نے ڈالی تھی۔ ان میں سے ایک ہندوستانی، ایک اینگلو انڈین اور دو انگریز تھیں۔ انجمن کی شاخیں تمام ہندوستان کے علاوہ لنکا اور برما میں بھی قائم ہوگئیں اور پھر آج سے پچاس سال پہلے ان سب کو ایک نظام کے ماتحت کر کے اس کا نام قومی وائی ڈبلیو سی اے رکھا گیا۔ اس قسم کی انجمنیں ہندوستان ہی میں نہیں دنیا کے تمام متمدن ملکوں میں موجود ہیں اور طبقۂ نسواں کی فلاح وبہبود کے لئے نہایت مفید خدمات انجام دے رہی ہیں۔ کیونکہ ان کے لائحہ عمل میں ہر قسم کے علمی وفنی اور سماجی ومعاشرتی تعلیم وتربیت کے اہم مقاصد بھی شامل ہیں۔ اس سال یکم فروری کو اس قومی انجمن کا جشنِ زرین نئی دہلی میں منایا گیا جس میں ہمارے ہندوستان اور بیرونجات کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس موقع پر انجمن کی کارگذاریوں کو واضح کرتے ہوئے بتایا گیا کہ وہ اب تک ہندوستانی خواتین کے لئے کیسے کیسے مفید کام انجام دے چکی ہے۔

## سانحۂ ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر سننے میں آئی کہ دنیائے فلم کے مشہور اداکار کندن لال سہگل کچھ عرصہ بیمار رہ کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ موصوف نے نیو تھیٹرز کے "دیوداس" میں سب سے پہلے اپنی نظری اداکاری کے صحیح جوہر دکھائے اور ایسا نام پیدا کیا کہ ان کی شخصیت قابلِ رشک ہوگئی۔ انہوں نے گانے کا ایک ایسا خاص انداز بھی تخلیق کیا جو فنی اعتبار سے مکمل نہ سہی لیکن سامعین کو متاثر کرنے کے اعتبار سے لائق تقلید ہوگیا۔ انکی وفات سے دنیائے فلم کو یقیناً ایک صدمۂ عظیم پہنچا ہے۔

# اپنے ترکِ مے نوشی پر غالب کا قطعۂ تاریخ

سیّد وزیر الحسن

غالب نے ترکِ شراب کی کئی دفعہ کوشش کی مگر یہ توبہ ٹوٹتی رہی، کبھی روز ابر میں کبھی شب ماہتاب میں، کبھی ہوسِ طبیعی کے ہاتھوں، کبھی ہیجانِ توبۂ غضبی کی تسکین کی خاطر کبھی "اک گونہ بیخودی" کی غرض سے، کبھی "دوریٔ احباب" کا غم غلط کرنے کیلئے، کبھی غم گیتی کو گوارا بنانے کیلئے چنانچہ اس فسخِ عزائم کو اسکے حساس ضمیر نے خود بیان کیا ہے:۔

یک روز بہ ترک بادہ گوئی غالب ٭ رخ روزِ دگر بہ بادہ خوئی غالب

زین توبۂ بے بقا چہ جوئی غالب ٭ توبہ تب توبہ است گوئی غالب [1]

مگر سہ شنبہ ۲ نومبر ۱۸۶۸ء کی توبہ جسکو اس نے خود اتنی اہمیت دی کہ ایک ہفتے کے کامیاب پرہیز پر اس توبہ کی تاریخ کہی یقیناً تادمِ مرگ قائم رہی ہوگی۔ یہ اس کی آخری علالت کا زمانہ تھا اور اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا [2]

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے ٭ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

حکیم محمود خاں مرحوم اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم — یہ دونوں بزرگ [3] جن کی شخصیتیں طبابت اور نقاہت کے کمالات کی جامع تھیں اس توبہ کے محرک تھے اور اعزا کی سخت نگرانی جسکی طرف قطعۂ تاریخ میں اشارہ ہے۔ اس توبہ کی محافظ تھی۔ غالب کی رندانہ شوخی اس "انابت نامے" میں بھی قائم ہے جس نے پرہیز کو بے بسی اور بے زری کا عطیہ ظاہر کیا ہے اور توبہ کو امتناع کا رنگ دیا ہے۔ بہرحال اس توبہ یا امتناع کے امتحانی دور کو ابھی کچھ کم تین مہینے گزرے تھے کہ غم گیتی جاں گسل ثابت ہوا۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو یہ آزاد مرد، قیدِ حیات و بندِ غم سے رہا ہو گیا۔ خواجہ حالی مرحوم کا بیان ہے "مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہو جاتا تھا، پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت مسلسل پونے تین مہینے کے ترکِ شراب سے ہو گئی ہوگی۔ اب غالب کے سوانح نگار کا یہ مسئلہ شاید حل ہو سکے کہ "غالب اگرچہ ہمہ تن مجموعۂ امراض بن چکے تھے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ موت کا فوری سبب کونسا مرض بنا"

اب ہم وہ قطعۂ تاریخ درج کرتے ہیں جو غالب نے سہ شنبہ یکم شعبان ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۷ نومبر ۱۸۶۸ء) سے شراب ترک کرنے کی تقریب میں شب ہفتم شعبان ۱۲۸۵ھ مطابق شب بست و سوم نومبر ۱۸۶۸ء کو نظم کیا تھا۔ یہ منظومہ نہ صرف اس لئے اہم ہے کہ غالب کی زندگی کے ایک انقلابی نقطے کا پتہ دیتا ہے۔ بلکہ اس لئے بھی اہم ہے کہ نظم میں اس شاعرِ اعظم کی یہ آخری نگارش ہے۔ اس کے بعد کی کوئی نگارش ہمارے علم میں نہیں۔ اس قطعے کا ماخذ "سبد باغ دو در" ہے جو غالب کی فارسی نظم و نثر کے نایاب ذخیرے پر مشتمل ہے میرے پاس اس مجموعے کا اصل نسخہ ہے جس کی کتابت طباعت کی غرض سے مصنف کی زندگی میں ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء) میں شروع ہوئی تھی اور مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے بائیس دن بعد ۷ ربیع الآخر ۱۲۸۶ھ (مطابق ۱۷ جولائی ۱۸۶۹ء) کو ختم ہوئی۔ مگر اس مجموعے کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ سبد باغ دو در غالب کا رکھا ہوا تاریخی نام ہے جس سے آغازِ کتابت کا سال ۱۲۸۳ھ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ خاتمے کی عبارت میں درج ہے۔ کاتب نے یہ نسخہ غالب کے شاگرد منشی ہیرا سنگھ کھتری کی فرمائش پر لکھا تھا۔ یہ منشی ہیرا سنگھ حوض قاضی کے قریب گندی گلی میں رہتے تھے۔ اس نسخے میں بعض اشارات سے قیاس ہوتا ہے کہ اسکا بیشتر حصہ غالب کی نظر سے گزرا تھا ٭

## قطعہ

هر شب بقدح ریختمے بادۂ گلفام — آئے ز دو سی سال مرا قاعدہ این بود

شش روز شد اینک کہ نہ بتر حرمت است — شد غمزدہ تر دل کہ ازین بیش حزین بود

امشب چہ سرایم کہ شب اول گو راست — شش روز بہ بیتابی و تلواسہ چنین بود

ناگاہ در آں وقت کہ در نزع زہ عمر — از من دو قدم تا بدم باز پسین بود

یکرہ دو تن از شرب مرا منع نوشتند — وآں منع نہ از بغض بل از غیرت دین بود

هرچند بداں منع من از مے نگزشتم — اما دم گیرائی عزیزان بہمین بود

دانی کہ چہ شد چوں زر سوداگر صہبا — کشش داد دستد با من ویرانہ نشین بود (ق)

بگزشت ز اندازہ بالیت، بمن گفت — دیگر ندہم بادہ کہ معمول نہ این بود

با کاسۂ خالی چہ کند کیسۂ خالی — تا خواستہ در خواستہ دل صبر گزین بود

گر زر بہ بے از جائے دگر مے طلبیدم — کہ نقد در آں دست کہ پشتش بزمین بود

در غرۂ شعبان چو زمن بادہ گرفتند — خود غالب پژمردہ نشانے ز سنین بود

رو شش بدر آر از مہ شعبان کہ در ینجا — مقصود من از مخرجہ ابنہ ہمین بود

۱۲۷۵ھ = ۱۲۸۱ - ۶

[1] یہ غیر مطبوعہ رباعی میں نے غالب کے کلیات فارسی قلمی ۱۲۶۱ھ سے نقل کی ہے جو کتاب خانہ ریاست عالیہ رامپور میں محفوظ ہے۔ اسکے لئے میں ناظم کتاب خانہ مولانا عرشی صاحب کا ممنون ہوں موصوف نے یہ بھی بتایا کہ یہ رباعی غالب کے اپنے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ [2] قطعۂ تاریخ میں "دو تن" سے مراد شاید یہی دو بزرگ ہیں۔ نواب زین العابدین خاں عارف مرحوم کی نواسی محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ کے بیان سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

# دلّی کے ایک اہم نعتیہ مشاعرے کی تضمینیں

سید وزیر الحسن

سعدی کے نعتیہ قطعہ کی طرح شاہجہانی دربار کے ملک الشعرا قدسی کی نعتیہ غزل کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اسکا کچھ اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس غزل کی اب تک سینکڑوں تضمینیں ہو چکی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں ان تضمینوں کے صرف ایک مجموعے کا ذکر کرنا ہے جسے قاضی محمد عمر ساکن دہلی نے ۱۸۵۵ء کے اواخر میں 'حدیث قدسی' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ مگر اس کی طباعت ایک مدت بعد ہوئی۔ یہ مجموعہ دلّی کے ایک نعتیہ مشاعرے کا گلدستہ ہے جو ۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کا غالباً آخری نعتیہ مشاعرہ تھا۔

اس مجموعہ کی اہمیت اس سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ غالب کی بھی فارسی تضمین اس میں شامل ہے جو ان کے مطبوعہ کلام میں موجود نہیں نہ ان کے کلیات نظم کے معلومہ قلمی نسخوں میں ہے۔ البتہ سبد باغ دو در[۱] اور بیاض حسرت[۲] میں موجود ہے۔ اس طرح اس تضمین کے استناد کے بارے میں یہ دونوں قلمی نسخے 'حدیث قدسی' کی تصدیق کرتے ہیں اور 'حدیث قدسی' سے ان دونوں قلمی نسخوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان تینوں ماخذوں میں تضمین کا متن صرف دو تین جگہ مختلف ہے مگر یہ اختلاف سہو کاتب تک محدود ہے۔

'حدیث قدسی' کے تضمین نگاروں میں بہادر شاہ ظفر، غالب، مومن، مجروح، صہبائی، غلام امام شہید اکبر آبادی اور حکیم آغا جان عیش کے علاوہ میرزا محمد سلطان فتح الملک رمز (ولیعہد بہادر شاہ ظفر) صاحب عالم میرزا رحیم الدین حیا، صاحب عالم میرزا فخر الدین حشمت ابن میرزا اعظم بخت بہادر، میرزا محمد ظہیر الدین مغل، مرزا قادر بخش صابر، مرزا قادر شاہ شکوہ، نواب مرزا والا جاہ بہادر لکھنوی المتخلص بہ عاشق، مرزا عالیجاہ بہادر لکھنوی المتخلص شیدا محمد عبد اللہ علوی، احمد حسن وحشت، میر مرزا خورشید، مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی (مولف ساطع برہان) حزین شاگرد عارف، مولا بخش قلق میرٹھی، منشی عزت سنگھ عیش، ستر رلال شگفتہ لکھنوی اور بدر الدین مہر کن نقشی تخلص قابل ذکر ہیں یہ وہی بدر الدین ہیں جن سے غالب مہریں بنوایا کرتے تھے۔ مہر کنی کی مناسبت سے یہ نقشی تخلص کرتے تھے اور اپنی مہر کنی کا التزام انھیں اس درجہ ملحوظ تھا کہ انھوں نے اپنی تضمین اس مصرعے سے شروع کی ہے

ع اے نگین ختم اللہ تو ہے خستم نبی

'حدیث قدسی' کے مرتب قاضی محمد عمر نے ایک غزل میں جو اس مجموعے کے آخری صفحات میں درج ہے تضمین نگاروں کے تخلص نظم کئے ہیں۔ شروع کے چار شعر یہ ہیں:—

آج پھر بزم سعادت کی ہے ترتیب نئی
جمع ہوتے ہیں سبھی مدح سرایانِ نبیؐ

گوہر مملکت و سایۂ حق مہر علا
شاہِ ذیجاہ ظفر مظہر نورِ قدسی

خازنِ جوہرِ عرفانِ خدا حضرت رمز
جس کی پیشانی سے ظاہر تھے فیوضِ ابدی

منبع فضل و کرم معدنِ فیاضِ ازل
ساقیٔ میکدۂ علم و ہنر صہبائی

پانچویں شعر میں غالب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:—[۵]

شیر میدان سخن غالب یکتائے زمن ٭ فخر خوش فہمی و خوشگوئی و شیریں سخنی

مومن کا ذکر دسویں شعر میں یوں آتا ہے:—

مومن مضطر و مدہوش و حیات و حیدر ٭ بسمل و طائب و آشفتہ و دا سنحی و غنی

ظفر، مومن، مجروح، شہید و صہبائی کی تضمینیں ان کے اپنے اپنے مطبوعہ مجموعوں میں موجود ہیں اسلئے ہم صرف غالب کی تضمین پیش کر رہے ہیں۔

تضمین غالب کے ادبی آثار میں ایک نادر چیز ہے۔ انکے بعض ممتاز معاصرین نے انکے کلام پر تضمین کی مگر انکی فنی غیرت نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ وہ بھی کسی کے کلام پر تضمین کریں۔ معاصرین تو کجا انہوں نے متقدمین کے کلام پر بھی تضمین نہیں کی۔ بات یہ ہے کہ تضمین نگار ایک ادبی طفیلیہ ہوتا ہے اور ادبی طفیلیہ ہونا انکی اجتہادی شان کے خلاف تھا اور تو اور انکے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف نے انکی دو غزلوں کی تضمین کی مگر انھوں نے اخلاقاً بھی کبھی ایسا نہیں کیا کہ ان کی ایک آدھ غزل پر تضمین کر دیں۔ اور صرف فنی خودداری ہی کا سوال نہیں حقیقت یہ ہے کہ تضمین اور تخلیق میں بیر ہے۔ تضمین مستقل نظم کی حیثیت سے غالب کے فن سخن میں گویا صنف ممنوعہ ہے۔ انھوں نے صرف نعت گوئی کے لئے اپنا یہ اصول توڑا ہے قدسی کے کلام پر تضمین کرنا غالب کے لئے ایک نہایت تنگ میدان میں سخنوری کا کمال دکھانے کے مترادف تھا۔ مگر اس باکمال شاعر نے تضمین کہی ہے تو اسے بھی ایک ادبی تخلیق کی عظمت بخش دی ہے اور تضمین کی بندشوں کے باوجود اپنے فنی معیار کو قائم رکھا ہے۔

---

۱:۔ بحوالہ صفحہ ۰ ، ۲:۔ عہد غالب کی ایک قلمی بیاض جس میں غالب کا کلام ہے

۳:۔ مجموعے کی طباعت سے بہت پہلے ان کی وفات ہو چکی تھی۔

# غالبؔ کی تضمین قدسیؒ کی نعتیہ غزل پر

کیستم تا بخروش آورَدم بے ادبی  قدسیاں پیشِ تو در موقفِ حاجت طلبی
رفتہ از خویش بدیں زمزمۂ زیرلبی  مرحبا سیّد مکّی مدنی العربی
دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اے کہ روئے تو دہد روشنیٔ ایمانم  کافرم کافر اگر ہر منیہ شش خوانم
صورتِ خویش کشیداست مصور دانم  من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

اے گلِ تازہ کہ زیب چمنی آدم را  باعث رابطۂ جان و تنی آدم را
کردہ دریوزۂ فیضِ تو غنی آدم را  نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

اے لبت رابسوئے خلق ز خالق پیغام  روح را لطفِ کلامِ تو کند شیریں کام
ابرِ فیضی کہ بود از اثرِ رحمتِ عام  نخل بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بشیریں رطبی

خواست چوں ایزدِ دانا کہ بساطے از نور  گسترد در ہمہ آفاق چہ نزدیک چہ دور
حکم اِصدارِ تو در ارض و سما یافت صدور  ذاتِ پاکِ تو دریں ملک عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

وصفِ رخشِ تو اگر در دلِ ادراک گزشت  نہ ہمیں است کہ از دائرۂ خاک گزشت
ہمچو آں شعلہ کہ گرم از خس و خاشاک گزشت  شبِ معراج عروجِ تو ز افلاک گزشت
بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

چہ کنم چارہ کہ پیوند خجالت گسلم  من کہ جز چشمۂ حیواں نبود آب و گلم
من کہ چوں مہرِ درخشاں بدمد نورِ دلم  نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بسگِ کوئے تو شد بے ادبی

دل ز غم مردہ و غم بردہ ز ما صبر و ثبات  ساری کن و بنمائی بما راہِ نجات
داد سوزِ جگرِ ما کہ دہد نیل و فرات؟  ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات
رحم فرما کہ ز حد می گزرد تشنہ لبی

غالبِ غمزدہ رانیست دریں غمزدگی  جز بامیدِ دلائے تو تمنائے بہی
از تب و تابِ دل سوختہ غافل نشوی  سیّدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

# غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

اطہر ہاپوڑی

میرے پاس مرزا غالب کے قلم سے لکھی ہوئی ایک مستند نثر ہے جو مہاراجہ سردار سنگھ والئی بیکانیر کو بطور عرضداشت لکھی گئی ہے۔ اس کے آخر میں تحریر ہے۔

نیازمند اسداللہ خاں شاعر غالب تخلص نگاشتہ پنجم جنوری ۱۸۵۹ء

اس کے بعد مرزا صاحب کی اپنی مہر ہے جو اردوئے معلیٰ کے آخر میں اور رقعہ جانشینی نواب علاؤالدین خاں والئی لوہارو پر ثبت ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ سردار سنگھ والئی بیکانیر کو اپنی ریاست میں نیا سکہ جاری کرنا منظور ہے اور سکہ کے ایک جانب ملکہ وکٹوریہ کا نام اور ایک جانب ایک شعر اپنے نام کا لکھوانا چاہتے ہیں اور مسودہ عرضداشت فارسی زبان میں ملکہ معظمہ کے نام لکھنے کی فرمائش ہے۔ اسی غرض کے لئے مرزا غالب کے پاس مہاراجہ نے اپنے ایک معتمد منشی کشوری لال کو بھیجا ہے اور وہ دہلی آکر مرزا صاحب سے ملے ہیں اور سکے کے نقش کی اور شعر کی معہ عرضداشت فارسی فرمائش کی ہے۔ مرزا صاحب نے تین نقشے سکہ کے اور دو شعر کہہ کر عرضداشت بنام ملکہ معظمہ کا فارسی مسودہ تیار کر کے اس اردو عرضداشت کے ساتھ مہاراجہ کی خدمت میں منشی کشوری لال کے ہاتھ بھیجا ہے دونوں شعر یہ ہیں:-

بعہد دولت وکٹوریہ بہ بیکانیر ✤ نمود سکہ سردار سنگھ زر را زیر
نمود سکہ سردار سنگھ زر را زیر ✤ زروئے نام و نشاں در دیار بیکانیر

مرزا غالب نے سکہ کے لئے تین نقشے بھی تجویز کئے ہیں۔ ایک میں ملکہ زمان کوئن وکٹوریہ سریر آرائے ہند و انگلینڈ۔ دوسرے میں کوئن وکٹوریہ تخت نشین ہند و انگلینڈ۔ تیسرے میں کوئن وکٹوریہ اورنگ آرائے ہند و انگلینڈ لکھا ہوا ہے۔

ان تینوں نقشوں کی پیشانی پر یہ عبارت درج ہے

ان سب میں جون سا آپ کے نزدیک موزوں اور فصیح ہو اسپر صواد کر دیجئے۔

نمبر ۳ کے نقشہ پر صواد بنا ہوا ہے اور اس کے قریب حاشیہ پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

منشی شیو پرشاد نے یہ سکہ پسند کر کے صواد کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی کشوری لال کے سوا منشی شیو پرشاد ایک شخص اور ہیں جن کی پسندیدگی بھی کوئی وزن رکھتی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ منشی شیو پرشاد کون ہیں اور ان کے مہاراجہ سے کیا تعلقات ہیں۔

اب میں مرزا صاحب کی عرضداشت اردو نثر بنام مہاراجہ بیکانیر پیش کرتا ہوں۔ یہ نثر غیر مطبوعہ ہے اور اسکی مثل مہاراجہ بیکانیر کے دفتر میں موجود ہے۔ مثل میں یہ بھی درج ہے کہ مرزا صاحب کو ایک ہزار روپیہ بطور صلہ دیا گیا ہے۔

## نقل عرضداشت

بحضور والا فرلسرور جناب سری مہاراجہ صاحب والا مناقب عالیشان قلزم فیض و احسان

دام اقبالہٗ و زاد افضالہٗ۔ لوازم نیاز و تسلیم از روئے مودت و ارادت بجا لاکر آرزو۔ و مطالب و مقاصد را بزبان اردو عرضہ میدہد۔ یہ گوشہ نشین سرکار فیض آثار انگریزی بعوض جاگیر پنشن دار اور گورنمنٹ کے دربار میں سات پارچہ اور تین رقم خلعت پانے والا اور حضرت قدر قدرت ملکہ معظمہ دوران کا مداح اور بتقلم وزرائے شاہنشاہی سارٹی فکیٹ خوشنودی پائے ہوئے ہے۔ دریں ولا منشی کشوری لال صاحب نے کہ وہ میرے دوست اور حضور کے خیر خواہ ہیں مجھ پر مسودہ عرضداشت اور سکہ حضور کی فرمائش کی۔ میں حضور کی خدمت بجا لانے کو اپنا فخر و سعادت سمجھتا ہوں اور عرضداشت کا مسودہ اس نیازنامہ میں ملفوف بھیجکر عرض کرتا ہوں کہ اگر یہ مسودہ پسند نہ آئے تو یہ کاغذ مجھ کو واپس مل جائے اور اگر اس مسودہ کے موافق عرضداشت لکھنی منظور ہو تو میرا بھیجا ہوا یہ مسودہ کہ بہ مہر و دستخط میرے ہے دفتر میں رہے اور حرف بحرف مطابق اس کے عرضداشت لکھی جائے۔ میرے لکھے ہوئے لفظوں میں اور فقرے داخل نہ کئے جائیں اور کوئی لفظ بدلا نہ جائے۔ سکہ مبارک کے سکہ کے باب میں عرض یہ ہے کہ اگر سنہ اسکو قرار دیجئے کہ ہندوستان میں بادشاہی عملداری ہوئی تو یہ بات نامناسب ہے کیا وہ اس سے پہلے بادشاہ نہ تھیں اور اگر وہ سال منظور رکھئے کہ جس سال میں ولایت میں تخت پر بیٹھی ہیں تو یہ تکلف محض ہے۔ بہتر یہ ہے کہ دو سن لکھے جائیں ایک از روئے اطاعت ۱۸۵۹ء عیسوی اور ایک موافق رواج ملک و ملت۔ سنبت ۱۹۱۵۔ سکہ مبارک کے تین نقشے بھیجتا ہوں دو مع تصویر اور اس میں سکہ منظوم یعنی ایک شعر جیسا کہ سلاطین ماضی کا ہر ملک میں دستور رہا ہے اور ایک نثر۔ ان نقشوں میں سے جو نقشہ سری مہاراج کی پسند آئے وہ حضور کو مبارک ہو۔ اب نیازمند اس عنایت کا متوقع ہے کہ آئندہ میں راج کا متوسل اور سری مہاراج کا دولت خواہ اور دعاگو گنا جاؤں گا اور جو کام میرے لائق ہو بے تکلف اس کے سرانجام کا مجھکو حکم ہوا کرے۔ زیادہ حد ادب۔ بہار شان جاہ و جلال بیفزاید بہار دولت و اقبال جاوداں باد۔

نیازنامہ اسداللہ خاں شاعر غالب تخلص نگاشتہ پنجم جنوری ۱۸۵۹ء

خان بہادر نظام جنگ
نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ
۱۲۶۷ھ

[illegible]

لوازم نیاز و تسلیم از روی مودت و ارادت بجا می‌آورد [illegible] مطالب [illegible] به زبان آرزو و عرضه میدارد [illegible]

[illegible] آثار انگریزی [illegible] جاگیر [illegible]

حضرت [illegible]

منشی کشوری لال [illegible]

[illegible] خدمت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

# غالب کی وفات پر آزاد کا قطعۂ تاریخ

آج سے پورے اسی برس پہلے منشی بال گوبند ماتھر نے آگرہ سے ایک ماہوار اردو رسالہ ذخیرۂ بال گوبند کے نام سے جاری کیا۔ منشی مذکور دہلی گزٹ پریس میں کلرک اور آگرہ اردو اخبار پریس کے مالک، مہتمم، پرنٹر، پبلشر سب کچھ تھے۔ یہ دونوں مطبع آگرہ میں واقع تھے۔ ان کا یہ رسالہ انہیں کے مطبع میں بہت بڑی تقطیع کے ۴۸ صفحوں میں چھپتا تھا۔ اس کی قیمت سالانہ چھ روپے اور محصول ڈاک بارہ آنے تھا۔ اس رسالے کے تیئیس پرچے میرے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے پہلا پرچہ ماہ جون ۱۸۶۸ء کا اور آخری دسمبر ۱۸۷۰ء کا ہے۔ مرزا غالب دہلوی کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو واقع ہوئی۔ اس سانحے کے بعد ذخیرۂ بال گوبند کا جو پرچہ بابت مارچ ۱۸۶۹ء میں نکلا اس میں ایک مضمون غالب کے متعلق بھی شائع ہوا۔ وہ مضمون ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ مگر اس کا ایک ٹکڑا کسی قدر دلچسپ ہے۔ اس لئے یہاں نقل کیا جاتا ہے :–

"ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیور اسلام اتار کر حلیۂ فرنگستان سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اس کے احباب نے حال اس مذہب نو اختیار کا اور کیفیت فرنگستان ہونے کی دھوکا دے دے کر بھی دریافت کی پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو۔"

اس مضمون کے آخر میں ایک قطعۂ تاریخ بھی ہے جس کا عنوان یہ ہے :–

"قطعۂ تاریخ طبع زاد مولوی محمد حسین صاحب آزاد شاگرد رشید محمد ابراہیم خاں ذوق دہلوی" وہ قطعہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :–

بلبل باغ بیدلی : دریغ ✤ اسد اللہ غالب و نوشہ ✤ عنصری پیشش درست بے جوہر ✤ عسجدی بردہ بر درش سجدہ

فکر تش جاں نواز و جانش پاک ✤ نقش روشن و دانش آگہ ✤ بعروسی بکرہائے سخن ✤ فی المثل میرزا ہوے نوشہ

سخنش کان گوہر افکار ✤ نظم و نثرش تمام نقد سرہ ✤ رخت بربست چوں ز دارکہن ✤ نظم مضمون شاعت آوارہ

غالب آں شیر بیشۂ معنی ✤ صید مضمون شکار او چو برہ ✤ جگر بحر آب شد بہ غمش ✤ دل اقلیم گشتہ صد پارہ

بظہورش خفا ظہوری را ✤ اسدی در مقابلش روبہ ✤ از پے سال رحلتش آزاد ✤ ہاتف غیب گفت و زد نعرہ

شد و مغفور از خدائے غفور

کہ بود سال فوت "او غضرہ" ۱۲۸۵ھ

اس قطعہ میں کتابت کی کئی غلطیاں تھیں جو درست کر دی گئیں۔ مگر آٹھویں شعر کے دوسرے مصرع میں جو غلطی ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اسلئے وہ مصرعہ بجنسہ نقل کر دیا گیا۔

یہ قطعہ بتاتا ہے کہ آزاد مرحوم غالب کو فارسی کا بڑا شاعر مانتے تھے مگر ان کی اردو شاعری کے قائل نہ تھے۔ مندرجہ بالا مضمون کی ابتدائی سطریں جو ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت غالب کے متعلق لوگوں کی رائے بالعموم یہی تھی :–

"یہ شخص شہر دہلی میں ایک بڑا نامی گرامی شاعر فارسی کا تھا۔ اگرچہ اشعار اردو بھی اس کے بہت ہیں مگر زیادہ تر شہرت فارسی میں حاصل تھی۔"

دوسروں کا کیا ذکر غالب خود بھی اپنے متعلق یہی رائے رکھتے تھے جیسا کہ ان کے اس شعر سے صاف ظاہر ہے :–

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

**مسعود حسن رضوی**

# غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک

حمید احمد خاں

چاندنی چوک سے مڑکر بلی ماروں کے اندر کچھ دور تک چلے جائیے تو شمسی دواخانے کی عمارت اور حکیم محمد شریف خاں کی مسجد کے درمیان ایک کشادہ گلی نظر آتی ہے۔ کچھ نئی کچھ پرانی عمارتیں، کچھ سنورتے کچھ بگڑتے ہوئے مکان ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ گلی میں ذرا فاصلے پر داہنے ہاتھ کو کوڑے کا ڈھیر ایک خاک انداز کے پاس پڑا ہے اور ہمیشہ پڑا رہتا ہے۔ گلی کے دونوں طرف کی عمارتیں زیادہ تر چھوٹی اینٹ کی پرانی عمارتیں ہیں۔ لیکن جس خاص بات کو آپ ایک سرسری نظر میں محسوس کئے بغیر نہیں رہتے، وہ ان نیم منہدم عمارتوں میں اونچی اونچی محرابوں کی کثرت ہے۔ ان بلند محرابوں سے پتا چلتا ہے کہ اس گلی کے گزشتہ مکینوں کی زندگی عظمت وشان سے خالی نہ تھی۔ یہ گلی قاسم جان کی گلی کہلاتی ہے اور اٹھارھویں صدی کے دوسرے نصف سے لے کر آج کے دن تک اسی نام سے مشہور ہے۔ گلی کے اس نام کے پیچھے ایک کہانی ہے جو شاہ عالم بادشاہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔

اس زمانے کے قریب تین شریف زادے، جو آپس میں بھائی بھائی تھے قسمت آزمائی کے لئے سمرقند سے روانہ ہوئے اور منزل بمنزل اٹک اور پنجاب سے گزرتے ہوئے مٹتی ہوئی مغلیہ سلطنت کی راجدھانی میں پہنچے۔ شہر میں پہنچ کر وہ بالآخر اسی گلی میں آباد ہوئے جس کے نکڑ پر ہم آپ کھڑے اس وقت باتیں کر رہے ہیں۔ شہرت اور دولت ان تین بھائیوں میں سے کم از کم دو کے حصے میں ضرور آئی۔ پہلے قاسم جان کے اقبال کا ستارہ چمکا۔ خود گلی کا نام اس کا شاہد ہے کہ جاہ وثروت کے لحاظ سے قاسم جان اپنے بھائیوں کے سرتاج تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے شروع میں تقدیر ایک بار پھر مسکرائی اور اس مرتبہ عارف جان کا بیٹا نوہارو اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست پر متمکن نظر آیا۔ قاسم جان اور عارف جان کی اولاد اب بھی اس گلی کی حویلیوں اور محل سراؤں میں موجود ہے لیکن ہمارے یہاں کھڑے ہونے اور اس عام رہ گزر پر عقیدت کی آنکھوں کا فرش بچھانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پرانے شرفا کی اولاد یہاں آباد ہے یا بجائے خود اس گلی کی پرانی داستان سے ہمیں غیر معمولی دلچسپی ہے۔ ایک اور کشش ایسی ہے جو لوگوں کو دور دور سے کھینچ کر یہاں لاتی رہے گی۔ اس کشش کو چار حرفوں کا ایک لفظ بیان کر دیتا ہے، اور وہ لفظ ہے: **غالب**۔

گلی قاسم جان کے چپے چپے کے ساتھ غالب کی زندگی کو کسی نہ کسی پہلو سے کسی نہ کسی منزل میں تعلق رہا ہے۔ غالب کا اصل وطن آگرہ تھا۔ لیکن ابتدائے شباب ہی میں وہ آگرے کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے دلی میں آ رہے تھے۔ اس ترک وطن کے بعد وہ پچاس پچپن برس تک دلی میں رہے لیکن ذاتی مکان کبھی نصیب نہ ہوا۔ ہمیشہ کرایے کے مکانوں میں اور کبھی کبھی کسی مفت ملے ہوئے مکان میں رہے۔ اس تمام مدت کا بیشتر حصہ انھوں نے گلی قاسم جان ہی کے کسی نہ کسی مکان میں گزارا اور اگر کبھی تھوڑے عرصے کے لیے باہر نکلنا بھی پڑا تو اسی محور کے گرد چکر کھاتے رہے لیکن غالب کی ذات سے قطع نظر اس تعلق کا سلسلہ خود غالب کے خاندان تک پہنچتا ہے۔ اسی گلی میں، شاید غالب کی پیدائش سے بھی پہلے، غالب کے چچا کا عقد عارف جان کی بیٹی سے ہوا تھا۔ دس پندرہ برس بعد جب غالب خود بانکے دولہا بنے ہوئے عارف جان کی پوتی امراؤ بیگم کو بیاہنے آئے تو اپنی برات یہیں قاسم جان کی گلی میں لائے تھے۔ اور پھر تقریباً ساٹھ سال بعد جب بوڑھے شاعر کا جنازہ اٹھا تو اسی گلی کی ایک ڈیوڑھی سے دوست اور شاگرد اور عزیز میت کو کندھا دیتے ہوئے، جامع مسجد اور دلی دروازے کی راہ سے، درگاہ حضرت نظام الدین کو روانہ ہوئے۔ اس دن اسی گلی کے ایک مکان میں ستر برس کی ایک بڑھیا ماتم میں جھکے ہوئے سر پر ایک سفید دوپٹہ اوڑھے اپنی اس بیوگی کے غم میں آنسو بہا رہی تھی جس کی میعاد کو سال بھر بعد مرحوم شوہر کی برسی کے دن موت کے ہاتھوں ختم ہونا تھا۔

سامنے کے سرے پر، جہاں گلی ختم ہونے سے پہلے بائیں ہاتھ کو گھومتی ہے، ایک بڑی محراب نظر آ رہی ہے۔ اگر اس محراب سے گزر کر اندر چلے جائیں تو چند پرانی عمارتیں ملتی ہیں جن میں سے ایک عارف جان کے بیٹے نواب احمد بخش خاں والی لوہارو کی حویلی ہے۔ روایت کہتی ہے کہ یہی حویلی غالب کے خسر مرزا الہی بخش خاں معروف کا بھی مسکن تھی۔ اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غالب اٹھارہ بیس کی عمر میں جب ہمیشہ کے لئے دلی چلے آئے، تو پہلے پہل چند سال تک اسی مکان میں رہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ غالب کی زندگی کے آخری چند سال ایک ایسے مکان میں بسر ہوئے جو گلی کے اس دوسرے سرے پر ہے جدھر ہم مسجد اور دواخانے کے درمیان کھڑے ہیں۔ دلی میں ان کے پہلے مکان اور آخری مکان کی یہ باہمی نسبت معنی خیز ہے۔ گلی کے پرلے سرے سے چل کر اس سرے تک آئیے تو گویا آپ نے غالب کے شباب سے لے کر وفات تک کی تمام منزلیں طے کر لیں۔ دلی میں ان کی زندگی لوہارو والوں کی عظیم الشان حویلی

سے شروع ہوئی اور اس کھنڈر میں ختم ہوئی جس کی زیارت کے لئے ہم آپ گلی کے اس سرے پر کھڑے ہیں۔

گلی میں چند قدم چلئے تو مسجد کے پیچھے (بلکہ اس سے ملی ہوئی) ایک دواخانے کی نئی عمارت کو چھوڑ کر ہمیں ایک بڑی ڈیوڑھی نظر آتی ہے۔ اندر جاکر دیکھئے تو مختصر سا صحن گرتی ہوئی عمارت کے ملبے سے بھر بھر کر کچھ اور مختصر ہوگیا ہے۔ صحن کے مشرق کی طرف دو بوسیدہ سے کمرے ہیں جو غالبًا پشتِ مسجد کا سہارا لئے ہوئے ہیں ابھی تک اپنی سخت جانی کے اظہار کے لئے کھڑے ہیں۔ یہ ڈیوڑھی، یہ صحن اور یہی دو کمرے غالب کی آخری فرودگاہ کی یادگار ہیں۔ وہ بالا خانہ جو، خود ان کے بقول، ان کے "بیٹھنے اٹھنے، سونے جاگنے جینے مرنے کا محل" تھا اب باقی نہیں رہا۔ بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ اینٹوں کا یہ ڈھیر اب تک کھڑا کس طرح رہا۔ گلی کے دوسری طرف، غالب کے دیوان خانے کے تقریبًا سامنے ہندوستانی دواخانے سے متصل غالب کا زنان خانہ تھا۔ یہاں اب ہندوستانی دواخانے کا کارخانۂ دواسازی ہے لیکن اس کا حلیہ اب اتنا بدل چکا ہے کہ اگر بیگم غالب پھر کسی طرح یہاں پہنچ سکیں تو انھیں اپنے گھر کو پہچاننے میں خاصی دقت محسوس ہو۔

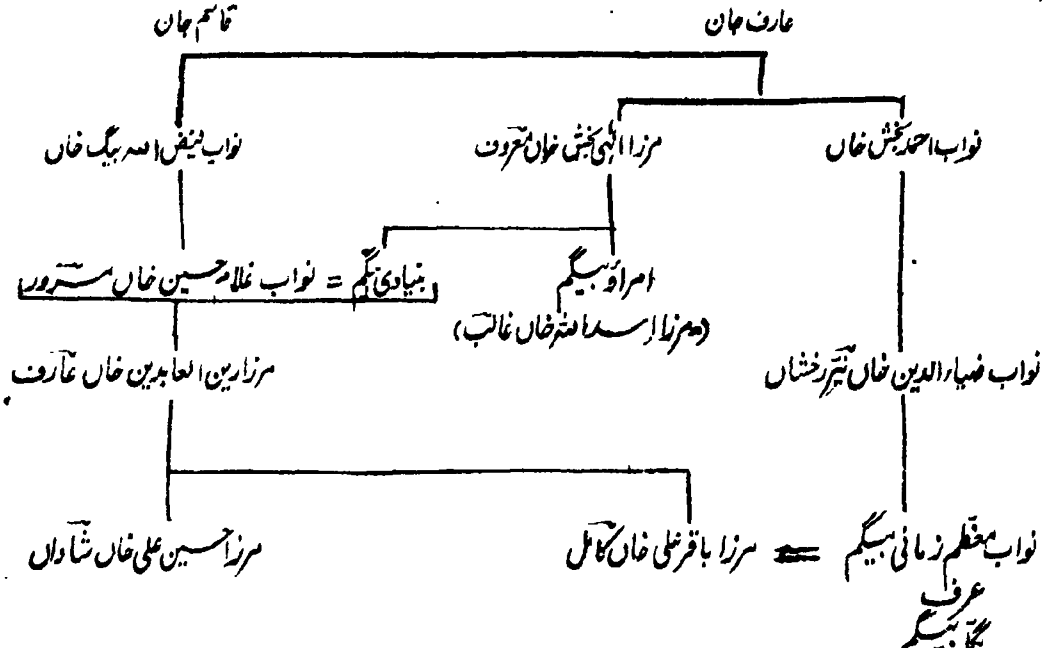
غالب دن کا بیشتر حصہ دیوان خانے میں گزارتے تھے۔ جب تک بڑھاپے کے ضعف اور امراض نے غلبہ نہ پالیا، ان کا معمول یہ تھا کہ صبح ناشتے کے بعد اپنے بالاخانے کے دالان میں دوستوں کو خط لکھنے بیٹھ جاتے۔ خط لکھ کر اوپر لفافہ رکھ دیتے اور داروغہ کلو بند کرکے ٹکٹ لگا دیتے تھے۔ دوپہر کو قصے کہانی کی کوئی کتاب لے لیتے یا چوسر اور شطرنج سے جی بہلاتے۔ کبھی عارف جان یا قاسم جان والوں میں سے کوئی لڑکا گلی میں سے آتا ہوا دکھائی دیتا تو اسے آواز دے کر اوپر بلا لیتے۔ تھوڑی دیر اسی سے ہنسی مذاق کی باتیں کرکے کچھ اپنا مگر زیادہ اس کا دل خوش کرتے۔ گرمیوں میں دوپہر کو بالعموم سو جاتے تھے۔ سہ پہر کو اٹھتے تو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ یہ ملاقاتیں زیادہ تر اس ڈیوڑھی میں ہوتیں جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔ اسی ڈیوڑھی میں مونڈھے پڑے رہتے تھے۔ غالب بالاخانے سے نیچے اتر آتے۔ دوست اور شاگرد اپنے اپنے وقت اور سہولت کے لحاظ سے جمع ہوتے اور یہیں بیٹھتے۔ غالب ایک بڑے چوڑے مونڈھے پر جو لال کھاروے سے منڈھا ہوا تھا ٹانگیں سمیٹے ہوئے بیٹھا کرتے۔ چپلیں آگے پڑی رہتیں۔ ذرا دائیں ہاتھ کی طرف حقہ ہوتا۔ غالب اس عمر میں اونچا سننے لگے تھے۔ جب کوئی شخص بات کرتا تو سننے کے لئے کان اس طرف کو جھکا دیا کرتے تھے۔ ملنے والے اگر کہیں قریب سے آتے تو پیدل چلے آتے تھے۔ فاصلے سے آنے والوں میں پابند وضع بزرگ پالکی میں تشریف لاتے۔ پالکی دروازے کے سامنے رکی، وہ بزرگ نیچے اترے۔ غالب نے ذرا دیکھا اور پھر اپنے خاص لہجے میں (لفظوں کو خوب پھیلاتے ہوئے) کہا: "آئیے، آئیے! آپ کا مزاج اچھا ہے؟"

یہ دیوان خانے کی زندگی کی تصویر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حرم سرا میں زندگی کا کیا نقشہ تھا جہاں غالب کی نصف صدی سے زائد کی رفیقۂ حیات کے دن گزرتے تھے؟ غالب کا ہر روز کا معمول تھا کہ ایک موٹی سی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے کم از کم ایک مرتبہ زنان خانے کو ضرور جاتے۔ یہاں وقت کس طرح گزرتا، کیا باتیں ہوتیں، کیا قصے قضیے طے ہوتے، ان تفصیلات پر بظاہر ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے پہلے اسی گلی قاسم جان کے اندر، لوہارو والوں کی اس حویلی میں جس کا ذکر ابھی آچکا ہے، ایک سن رسیدہ بی بی موجود تھیں جنھوں نے غالب کی زندگی کے آخری دور کا یہ پہلو اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ یہ بی بی عارف جان کی پڑپوتی، غالب کے دوست نواب ضیاء الدین خاں نیر رخشاں کی بیٹی اور مرزا زین العابدین خاں عارف کی بہو نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم تھیں۔ مجھے جولائی ۱۹۳۸ء میں اپنے کرم فرما اور محترم دوست حکیم محمد کامل خاں صاحب دہلوی کی معرفت بگا بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا۔ بگا بیگم صاحبہ اپنی حویلی کے ایک دالان میں پردے کے پیچھے تشریف لے آئیں۔ پردے کے دوسری طرف ایک تخت پر حکیم صاحب اور میں بیٹھ گئے۔ میں نے مرزا غالب اور ان کی بیگم صاحبہ کے متعلق کئی سوالات کئے جن کا جواب بگا بیگم صاحبہ مجھے تفصیل سے دیتی رہیں۔ ان کی عمر اس وقت نوے برس کے لگ بھگ تھی، مگر آواز میں بڑھاپے کی کمزوری کا کوئی خفیف سا اثر بھی میں نے محسوس نہیں کیا۔ برجستہ اور بے تکان بات کرتی تھیں گفتگو کی ہر منزل پر مجھے ان کے ذہن کی بیداری اور احساسِ ظرافت کی موجودگی کے ثبوت ملے ہیں ان کے ہر جواب کی یادداشتیں قلم بند کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بار بار میں نے محسوس کیا کہ میرا قلم ان کی شستہ تقریر کی روانی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

جو کچھ میں نے ان سے سنا، اس کی کیفیت یہاں لکھنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ غالب کی خانگی زندگی سے متعلق بگا بیگم صاحبہ کو کیا خصوصیت حاصل تھی جس کی بنا پر ان کی دی ہوئی معلومات ہمارے لئے قابل قدر ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالب کی اولاد میں سے کسی بچے نے کبھی برس سوا برس سے زیادہ کی عمر نہ پائی۔ ان کی بیگم صاحبہ نے اولاد سے مایوس ہوکر آخر اپنے بھانجے (اور قاسم جان کے پڑپوتے) زین العابدین خاں عارف کو منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ مرزا غالب بھی عارف سے حقیقی اولاد کی سی محبت کرتے تھے جس کا اظہار مرزا صاحب کے اردو اور فارسی کلام دونوں میں موجود ہے۔ جب عارف کا انتقال [1] ہوگیا تو غالب

[1] ۱۸۵۲ء میں

ان کے دونوں بیٹوں، باقر علی خاں اور حسین علی خاں، کو اپنے پاس لے آئے اور انھیں اسی لاڈ پیار سے رکھا جس سے اپنی اولاد کو رکھتے۔[۵]
بڑے لڑکے باقر علی خاں کی شادی غالب نے خود اپنی زندگی میں کی۔ اس طریقے سے جو بہو غالب کے گھر میں آئی، وہ یہی بگا بیگم صاحبہ ہیں۔
ان تمام رشتوں کی کیفیت ذیل کے شجرے سے بخوبی ذہن نشین ہو جائے گی:




اس میں شک نہیں کہ بگا بیگم صاحبہ نے غالب کا صرف آخری زمانہ دیکھا لیکن چونکہ وہ رات دن گھر میں رہتی تھیں اس لئے ان کے بیان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کہیں کہیں جہاں انھوں نے قیاس سے بات کی، ان کا بیان درست نہیں ہے (مثلاً غالب کی عمر کے متعلق)، مگر جو باتیں ان کی دیکھی ہوئی تھیں، ان کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مثلاً جب میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کے چلنے کا انداز کیا تھا تو فوراً بولیں: "سہج سہج چلتے تھے۔ بڈھے تھے۔ اسی برس کی عمر تھی۔" ظاہر ہے کہ اس قول کا صرف پہلا حصہ بالکل درست اور دوسرا تخمیناً درست ہے۔ لیکن ہم کتنے ہی صحت پسند ہوں ہمارا یہ تقاضا ضرورت سے زیادہ سخت ہوگا کہ بگا بیگم صاحبہ کے کسی تخمینے میں بھی کوئی فرق نہ نکلے۔

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ جیسی تربیت مرزا غالب طبیعت کے لحاظ سے آزاد رو تھے، اسی قدر ان کی بیگم صاحبہ اپنے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کی طرح پرہیزگار اور نماز

---

[۵] غالب کے اردو خطوں میں اس کی طرف جا بجا اشارے ملتے ہیں۔ اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط (بنام میر مہدی مجروح) میں لکھتے ہیں: "تو بھئی اب تم چاہو بیٹھے رہو، چاہو اپنے گھر جاؤ۔ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا پیلا بیٹا حسین علی خاں، یہ ہم روزہ خوار ہیں؛ وہی حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے: 'کھلونے منگا دو۔ میں بھی بجار جاؤں گا'۔"

بگا بیگم صاحبہ کے پھوپھی زاد بھائی خضر مرزا مرحوم مجھ سے بیان فرماتے تھے: میں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے کہ حسین علی خاں مرزا غالب سے شوخیاں کرتے اور کبھی ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی ان کی بہت ناز برداری ہوئی۔ مرزا صاحب نے کہا "ارے حسین علی، آکر پڑھ لے"! انھوں نے جواب دیا "دادا جان، آتا ہوں"۔ اور دوسری طرف نکل گئے۔ کھیل تماشے کا تو انھیں لپکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دیئے اور پھر مرزا صاحب کے پاس منہ بسورتے ہوئے آئے کہ دادا جان بیس روپے دلوا دیجئے۔ مرزا صاحب نے کلو کو بلا کر کہا "بھئی، انھوں نے ایک تھیٹر اور مارا۔ دیدے بیس روپے"۔

خضر مرزا مرحوم نے اپنے بچپن کے دنوں کا ایک اور واقعہ مجھے اس طرح سنایا: "ایک دن میں چلا جا رہا تھا۔ بھائی حسین علی خاں بھی گلی میں سے جا رہے تھے مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا اور آواز دی "ابے لنڈو! یہاں آؤ"۔ ہم پہنچے تو مرزا صاحب نے ہمارے لئے مٹھی بھر بادام طشتری میں ڈال دیئے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو مرزا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "ابے یہ کیا! منہ سے کھا، میرے مرغی کے بچے یوں ہی چگا کرتے ہیں!"

روزے کی پابند تھیں۔ اس وجہ سے میاں بیوی کے درمیان اکثر نوک جھونک ہوتی تھی[۵۱]۔ چنانچہ غالب بیوی کو "حضرت موسیٰ کی بہن" کہتے تھے اور اگر زیادہ بگڑتے تو یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ "میرا تو ناک میں دم کر دیا ہے!" مگر یہ جھگڑا محض رندی و زہد کے اختلاف تک محدود نہ تھا۔ جو کچھ میں نے سنا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اختلاف مزاج کو بھی گھر کی چپقلش میں نمایاں دخل تھا۔ چنانچہ خود بگا بیگم صاحبہ کی موجودگی میں میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔ امراؤ بیگم خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتیں۔ ان سے کہتی تھیں: "بیٹی تو تو بچہ ہے۔ بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر، بڈھا تو دیوانہ ہوگیا ہے!"

اسی قسم کا ایک واقعہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ (مرزا صاحب) پچھلے پہر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز عصر کے بعد واپس آئے۔ میں اور میری ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ دونوں (ہم) اسی تخت پر آکر بیٹھے۔ جب ہم نے سلام پھیرا تو کہنے لگے: "واہ وا! خوب! بہو کو بھی اپنا سا کر لیا۔ کمہاری بوٹنٹ کا لیڑا اپنے گھر لے جاتی ہے تو چالیس دن میں اسے بھی اپنا سا کر کے نکال دیتی ہے!"

ایک اور لطیفہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ برسات کے دن تھے۔ مینہ بہت برسنے لگا۔ پوتوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا۔ (مرزا صاحب) بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے۔ میں یوں بیٹھی تھی، گاؤ تکیے کے کونے سے لگی ہوئی۔ کہنے لگے: "ایک بیوی، دو میں، تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا! بہو، میں اور میری بیوی بیٹھے ہیں، تم کیوں بیٹھی ہو؟" اس پر میری ساس بولیں: "لے توبہ! بڈھا تو دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لئے کوئی چاہئے۔ اب بہو ہی مل گئی۔" میں اتنے میں اٹھ کر ایک کونے میں جا بیٹھی۔ اب انھیں یہ فکر کہ برسات کا موسم ہے اور کیڑے پتنگے کا عالم، مجھے ڈھونڈتے پھریں اور کہتے جائیں: "مجھے کیا خبر تھی بہو اس بات کو اتنا برا مانے گی!"

میں نے نوکروں اور بچوں کے متعلق پوچھا کہ غالب ان سے کس طرح پیش آتے تھے۔ حسین علی خاں کے متعلق بتایا کہ "چھوٹے پوتے کو دھمکایا کرتے تھے۔" نوکروں میں کلّو کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا: "کلّو داروغہ کو مرے ہوئے پندرہ برس ہو گئے۔ لوگ ان کی زیارت کو بہت آتے تھے۔ یہ چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب کے پاس آکر رہے۔ کلّو داروغہ کا یہ حال تھا کہ پاؤں کی آہٹ سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں، بہوئیں ہیں یا بوڑھیاں۔ ایک اور نوکر مدار خاں تھا۔ ان دونوں کا بیاہ انھوں نے خود کیا۔ یہ مجھ سے پہلے کا ذکر ہے۔ میں نے سنا ہے۔ مدار خاں کے لڑکے کا نام نیاز علی تھا۔ یہ مرزا صاحب نے لے لیا۔ مدار خاں کی بیٹی آبادی کو کلّو نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔"

"کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب تلے ہوئے، دال مربّہ، پسے ہوئے بادام اور حلوا سوہن[۵۲]۔ جب کھانا خراب ہوتا تو پکانے والے کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ پکانے والا کون تھا؟ ددا تھیں۔ مرزا صاحب پان نہیں کھاتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی کھاتے نہیں دیکھا۔ چنے کی دال بین کڑھی پھلکیاں بہت کھاتے تھے۔ چنے کی دال ہر سالن میں ایک ایک چمچہ ضرور پڑتی تھی۔ میرے بیاہ کے بعد کی بات ہے کہ چنے کی دال سالن میں پڑی ہوئی میرے سامنے بھی آئی۔ مجھے پسند نہیں تھی مغلانی نے میری ساس سے شکایت کی کہ بہو نہیں کھاتیں چنے کی دال۔ مرزا صاحب یہ بات سن رہے تھے۔ کہنے لگے: "ددا، یہاں تو آ" ددا گئیں تو ان سے کہا: "پیسے نہیں تھے تیرے پاس؟ بہو کی پسند کی چیز پکا لی ہوتی۔" ددا نے جواب دیا: "نہیں، بہو چنے نہیں کھاتی ہیں۔" بولے: "ارہو، خدا سے بھی بڑھ گئیں بہو؟ توبہ توبہ!" پھر میری ساس سے کہنے لگے: "بیوی سنو" وہ بولیں: "میں نہیں سنتی!" اس پر مجھ سے کہا: "بیٹی، برا نہ ماننا۔ ایک بات سناتا ہوں۔ خدا کے آگے چنا گیا اور فریاد کی کہ باری تعالیٰ یہ کیا بات ہے مجھ کو لوگ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ بھونتے ہیں، تلتے ہیں، ابالتے ہیں، پیستے ہیں۔ آخر میرا گناہ کیا ہے؟ خدا نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا، دور ہو۔ نہیں میں بھی تجھے کھا جاؤں گا!"

یہ بات سناتے ہوئے خود بھی ہنستی رہیں۔

میں نے پوچھا "مرزا صاحب کی یادگار کوئی چیز آپ کے پاس ہے؟" کہنے لگیں: "مجھے کیا خبر تھی کہ لوگ ان کی چیزوں کو اس طرح ڈھونڈیں گے؟ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں ہے۔ ہاں معظم میاں (نواب معظم علی خاں) کے پاس ان کا پیالہ اب تک ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ بھوپال لے گئے تھے۔"

جب میں نے غالب کے مذہب کے متعلق سوال کیا تو بولیں: "ان کے مذہب کا کیا ٹھکانا؟ جہاں بیٹھے اسی مذہب میں ہو گئے۔" میں نے یہ بھی پوچھا کہ مرزا صاحب کس زمانے میں اونچا سننے لگے تھے؟ جواب دیا: "میں نے تو انھیں بہرا ہی دیکھا۔ جب میرا بیاہ ہوا تو بہرے ہی تھے۔" غالب کے بھائی مرزا یوسف کی وفات کے متعلق دریافت کیا تو کہا: "سرس کی گلی میں مارے گئے تھے[۵۳]۔ مسجد تہور خاں میں دفن ہوئے۔" میں نے غالب کے متعلق بھی پوچھا کہ کس جگہ انتقال کیا تو جواب دیا: "دیوان خانے میں، جہاں مجید خاں نے اصطبل بنوایا ہے۔ اس وقت حکیم محمود خاں، حکیم غلام مرتضیٰ اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ سب وہیں تھے۔"

اس سوال کے جواب میں کہ مرزا صاحب نے کس مرض میں انتقال کیا، بگا بیگم صاحبہ نے کہا: "وہ کچھ بیمار تو ہوئے نہیں۔

---

۵۱ اس ضمن میں "یادگار غالب" کی متعلقہ عبارت بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

۵۲ بگا بیگم صاحبہ نے قدرتاً غالب کی شام کی شراب کا ذکر نہیں کیا لیکن عجب نہیں یہ حلوا سوہن ہی شراب کا قائم مقام ہو۔ ۵۳ فتح دہلی کے بعد ۱۸۵۷ء۔

بس مرہی گئے۔ ہوا یہ کہ کھانا کھانے آئے۔ جنابہ بیگم کو بہت چاہتے تھے۔ پوچھا جیون بیگ کہاں ہیں؟ بلاؤ، احمد بیگ ان کے خادم تھے، انھیں بھیجا۔ مرزا صاحب کہنے لگے "اچھا جب وہ آئیں گی تو کھانا کھاؤں گا" یہ کہہ کر لیٹ گئے۔ کروٹ لے کر لیٹے ہی تھے کہ بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں ان کا دم نکلا"۔

امراؤ بیگم کے متعلق بگا بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا: "جب میں بیاہی گئی تو وہ اچھو کی پھانک تھیں۔ جا نماز پہ بیٹھ کر کہا کرتیں: "اے اللہ! تو کب بلائے گا؟" ایک روز میں نے پوچھا: "پھپھی جان آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا؟" کہنے لگیں: "بیٹی، تھکا بیل سرا کو دیکھتا ہے"۔

یہ ہے ان معلومات کا بڑا حصہ جو مجھے بگا بیگم صاحبہ سے حاصل ہوئیں۔ یہیں اس تحریر کو ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن آخر میں مجھے ذاتی حیثیت کی ایک چھوٹی سی بات کا ذکر بھی کرنا ہے۔ جس دن مجھے بگا بیگم صاحبہ سے باتیں سننے کا موقع ملا، اسی شام میں نے اپنی والدہ مرحومہ کو (جو اس وقت زندہ تھیں) معمول کے مطابق ایک خط لکھا۔ یہ خط محفوظ ہے اور اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں مجھے یہ عبارت نظر آتی ہے:

> آج صبح ہوٹل سے نکل کر میں پھر حکیم صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے بگا بیگم صاحبہ (معظم زمانی بیگم) دختر نواب ضیاء الدین نیر رخشاں کے پاس لے گئے۔ یہ عارف کی بہو ہیں۔ نوے برس کی عمر ہے۔ گھر کی باتیں بتاتی رہیں۔ بہت مہربانی سے پیش آئیں۔ بار بار اصرار سے پان دینا چاہتی تھیں مگر حکیم صاحب (جنھیں علم تھا کہ میں پان نہیں کھاتا) روک دیتے تھے۔ انھیں بار بار یہی خیال ہوتا تھا کہ اتنی دور سے آئے ہیں تو ان کی تواضع ضرور ہونی چاہئے......

میں اب بھی پان نہیں کھاتا ہوں۔ لیکن جب اس عبارت کو پڑھتا ہوں تو یہ افسوس ضرور ہوتا ہے کہ میں اس دن ایک تبرک سے محروم رہا۔

---

سلہ بگا بیگم صاحبہ کی بڑی صاحبزادی کا عرف ہے جو اس وقت اپنی عمر کے چوتھے سال میں تھیں۔ مرزا غالب انھیں محبت سے "جیون بیگ" کہتے تھے۔ ان کی شادی نواب شجاع الدین خاں سے ہوئی۔

---

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

## جرأت رندانہ — عشرت جلالی

یہ میخانے کا تیرے آج کیسا رنگ ہے ساقی؟
ارے پینا تو پینا آہ! جینا تنگ ہے ساقی!
خودی و بیخودی میں اف یہ کیسی جنگ ہے ساقی!
خرد کا ذکر ہی کیا خود جنوں بھی دنگ ہے ساقی!
ارادے سرد، ہمت پست، دل پر زنگ ہے ساقی!
تو پھر کس کام کی صہبائے شعلہ رنگ ہے ساقی!

رستی، لڑکھڑاتی، کرب و غم میں ڈوبی ڈوبی سی!
یہ فریاد خودی ہے یا صدائے چنگ ہے ساقی
یہ نغمات طرب ہیں یا ہیں دیپک رنگ کی تانیں!
ترانہ آہ سے کیوں آج ہم آہنگ ہے ساقی؟
ذرا تو سوچ! کچھ تو غور کر! یہ تیرے شیشوں میں
غریبوں کا لہو ہے بادۂ گلرنگ ہے ساقی؟
ہزاروں پچلی پچلی حسرتوں کا خون ہوتا ہے!
کہیں تب جا کے بنتا بادۂ خوش رنگ ہے ساقی!
یہ رقص جام و مینا ہے کہ عقل و ہوش کا ماتم؟
کہ افلاس و امارت کی سیاسی جنگ ہے ساقی؟
یہ بہکا بہکا سا عالم! یہ ہر ہر گام پہ لغزش!
خطائے نامناسب ہے کہ عقلی لنگ ہے ساقی؟
ارے جینے بھی دے! جینے کی خاطر کون پیتا ہے!
تصنع ہے! یہ ڈھکوسلا ہے! یہ ڈھونگ ہے ساقی!

یہ پینا کوئی پینا ہے! یہ جینا کوئی جینا ہے!
خوشی مفقود ہے! دنیائے مستی تنگ ہے ساقی!
ہمیں اب جرأت رندانہ دنیا کو دکھانا ہے!!
سنبھلنے والے! سوال پاس نام و ننگ ہے ساقی!
یہ شیشے توڑ بھی دے اب! یہ ساغر پھینک بھی دے اب!
یہ دور تیغ ہے ساقی! یہ دور جنگ ہے ساقی!
بجائے جام کوئی پرچم خونیں اٹھا تو بھی!
کہ تیرے میکشوں پر آج جینا تنگ ہے ساقی!

# یونیسکو کے بنیادی عقائد

(پچھلے شمارہ میں ہم نے یونیسکو کانفرنس کے ہندوستانی وفد کے ایک رکن آغا محمد اشرف صاحب کا مضمون ہدیۂ ناظرین کیا تھا - موجودہ شمارہ کی کتابت تقریباً ختم ہو چکی تھی کہ اس وفد کے ایک دوسرے رکن خواجہ غلام السیدین صاحب نے ہمیں اس 'فی البدیہہ' تقریر کی رپورٹ مرحمت فرمائی جو موصوف نے کانفرنس کے آخری اجلاس میں کی تھی - یہ تقریر اس اجلاس کی بالکل آخری تقریر تھی اس لئے اس کے ابتدائی حصہ میں سیدین صاحب نے کانفرنس کے اراکین کو اس ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی جو کانفرنس کا کام ختم ہونے کے بعد ان سب پر عائد ہوتی ہے - اس کے بعد فرانس کی حکومت اور اہل پیرس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فاضل مقرر نے کچھ ایسی باتیں کہیں جو ہر امن پسند متمدن انسان کے لئے اہمیت رکھتی ہیں - ہم اس تقریر کے نصفِ آخر کا اقتباس سیدین صاحب موصوف کے شکریہ کے ساتھ ناظرینِ 'آجکل' کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں ——— ادارہ)

کانفرنس کے کام کا سرسری جائزہ لیتے وقت برابر میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا رہا: کس حد تک اس کانفرنس نے ہمیں ان قدرے مبہم اور غیر متعین مسائل کے تعین اور توضیح میں مدد دی ہے جن سے ہم نے اپنا کام شروع کیا تھا؟ میرا خیال ہے کہ ہم آسانی سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ سکرٹریٹ، پریپریٹری کمیشن اور خود ہماری کانفرنس اور اس کی کمیٹیوں نے جو کام کیا ہے اس کے بعد ہمیں اپنے آگے کی زمین زیادہ اچھی طرح نظر آنے لگی ہے اور اب ہم اپنے منصوبے زیادہ اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ بنا سکتے ہیں - میں ان اسکیموں اور منصوبوں کا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا - یہ کام ڈرافٹنگ کمیٹی زیادہ بہتر طریقہ سے انجام دے چکی ہے اور پچھلے دو دنوں میں مختلف مقرر بھی ان کا تذکرہ کر چکے ہیں - میں تو آپ کی توجہ اپنے مسلک کے دو عملی اور بے حد اہم بنیادی عقیدوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں — وہ عقیدے جو کانفرنس میں ہماری بحث تمحیص کے بعد برآمد ہوئے ہیں - ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارا اولین مقصد امن ہے — اسی امن کا ایوان ہمیں ساری دنیا کے عوام کے دلوں میں تعمیر کرنا ہے - کوئی منصوبہ وہ بجائے خود کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، امن کے منصوبوں سے برتر نہیں ہو سکتا - ہر منصوبہ کی پرکھ صرف اس اصول کی ترازو پر ہونی چاہئے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ امن کا پیامی ہے یا نہیں - شاید کبھی وہ وقت آجائے، اور خدا کرے کہ جلد آجائے، جب ہم سب یکسوئی کے ساتھ کلچرل زندگی اور اس کے لبے پایاں مظاہر کی جستجو میں سرگرم سفر رہ سکیں - لیکن وہ وقت ابھی آیا نہیں - اور موجودہ حالات کی شدت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان اسباب کی بیخ کنی کریں جو حقیقی کلچرل زندگی کو ناممکن بنا رہے ہیں — اور اسی چیز کے پیش نظر کانفرنس نے بین الاقوامی رضاجوئی اور رواداری پیدا کرنے کے لئے مختلف منصوبے تجویز کئے ہیں -

ہمارے مسلک کا دوسرا اہم عقیدہ یہ یقین ہے کہ ایک ایسی دنیا میں جسمیں نہ صرف سیاسی عناصر نے بلکہ معاشی، تمدنی اور تعلیمی مواقع کی کمی اور تفاوت نے ایک انتشار پیدا کر رکھا ہے نہ امن ممکن ہے نہ آزادی اور نہ کلچر - یہی تفاوت اور مساوات کی کمی ہے جو دنیا کی مختلف قوموں کے درمیان صحیح ذہنی ارتباط نہیں پیدا ہونے دیتی - یہی کمی ہے جس نے دنیا کے بعض حصوں کی ایک کثیر تعداد کو — بلکہ یوں کہئے کہ ساری کی ساری آبادی کو ایک ایسی زندگی کے دوزخ میں دھکیل دیا ہے، جس میں غربت ہے، ویرانی ہے اور تنگی - ہمیں کسی طرح بھی یہ بات برداشت نہیں کرنی چاہئے کہ ان "تنگ و تاریک خطوں" کے برابر برابر "روشن خطے" بھی قائم رہیں — یہ راستہ خطرہ کا راستہ ہے - اور اسی لئے یونیسکو نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کی آواز دور افتادہ خیالی ماضی کے لئے نہ ہو بلکہ حال کے لئے ہو، اسی وقت کے لئے - اس کا کام یہ ہو کہ ایسے ملکوں میں جو اب تک تعلیم، کلچر اور سائنس کی نعمتوں سے محروم رہے ہیں، تعلیم، کلچر اور سائنٹفک علم کا معیار بڑھائے اور اس طرح عام انسان کی زندگی کو بہتر بنا سکے - ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جنگیں صرف آمروں کی مجرمانہ حرکتوں سے، خطیبوں کی حماقتوں سے یا روپے سے کھیلنے والوں کی چالوں سے نہیں پیدا ہوتیں - بلکہ اس لئے بھی ہوتی ہیں کہ دنیا میں کروڑوں انسان اب بھی ناداری اور مایوسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور سکون و آرام کے ایک لمحہ اور کلچر کی بے شمار نعمتوں سے یکسر محروم ہیں - اور اس لئے وہ بڑی آسانی سے ہر اس شخص کی چرب زبانی کا شکار بن جاتے ہیں جو ان کی ساری بدنصیبیوں کا مداوا اپنے ایک معاشی یا سیاسی نسخے سے کرنا جانتا ہے -

اگر ہم دنیا کو اس خطرے سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں عام انسانوں کی زندگی کو بدنصیبی کی اس تاریکی سے نکالنا ہوگا، ہمیں اس کی زندگی کو بامعنی بنانا پڑے گا - انسان کو، قوموں کو جنگ کی تباہیوں سے بچانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم اسے یہ محسوس کرنے کے قابل بنائیں کہ زندگی واقعی زندہ رہنے کی چیز ہے اور اس لئے اسے ہر ناکام "اشتہار باز" گلی کوچہ میں خطابت کرنے والے ہر خطیب یا

خواجہ غلام السیدین

چالاک لفع باز کے اشارے پر قربان کر دینے میں نہ دانش مندی ہے نہ ذاتی مفاد۔ کانفرنس نے بنیادی تعلیم، تعلیم بالغان، عوام کے مفاد کے لئے سائنس کے وسائل کا استعمال، ریڈیو، فلم، تھیٹر اور اخباروں میں ایسے پروگراموں کا معیار بہتر بنانے کی کوشش جو عوام کے لئے مخصوص ہیں، جیسی چیزوں پر زور دیا ہے۔ اور ان ساری چیزوں کے پیچھے یہ خواہش کام کر رہی ہے کہ عوام کی زندگی کو کلچرل حیثیت سے زیادہ بامعنی بنایا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مقصد کے حصول کا لازمی پیش خیمہ یہ ہے کہ انکے معاشی معیار کو اونچا کیا جائے۔ لیکن اس وقت مجھے اس اہم مسئلہ کے متعلق کچھ نہیں کہنا۔

لیکن آپ کی اجازت سے سب نمائندوں کی خدمت میں صرف ایک آخری بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اب جب کہ کانفرنس ختم ہو چکی، آپ سب اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں گے جہاں اپنی ذاتی شخصیت یا سرکاری حیثیت کی وجہ سے آپ کا خاصا اثر اور اقتدار ہے۔ اب یہ آپ کا فریضہ ہے (اور میرے نزدیک اعزاز بھی) کہ آپ یونیسکو کے خیالات اپنے حلقۂ اثر میں پھیلائیں۔ ان خیالات کا بنیادی عنصر یہ احساس ہے کہ دنیا کے سارے حصے بنیادی طور پر متحد اور باہم ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ یہ احساس اپنے بچوں اور بالغوں کے دلوں میں ہر طریقے سے جاگزیں کیجئے یہاں تک کہ وہ ان کے فکر اور تخیل میں رچ بس جائے۔ وہ یہ سمجھنے اور محسوس کرنے لگیں کہ دنیا کی بہبودی ہر شخص کی ذمہ داری ہے۔ اس کی طرف سے غافل ہونا اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ نسلوں پہلے کسی نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ "کیا میں اپنے بھائی کا نگہبان ہوں؟" آپ نے اس سوال کے بہت سے جواب سنے ہوں گے۔ میں اس سوال کا جواب آپ کو ایک ایسے بچے کی زبان سے دوں گا جو اپنے سے چھوٹے ایک اور بچے کو اپنی پیٹھ پر لادے ہانپتا کانپتا پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ ایک راہگیر نے ہمدردی کے لہجہ میں اس سے کہا "صاحبزادے کیا تمہیں یہ بوجھ بھاری نہیں لگتا؟" لڑکا اس سوال پر چلتے چلتے رک گیا اور حیرت سے سوال کرنے والے کا منہ دیکھ کر بولا "بوجھ؟ لیکن یہ بوجھ نہیں ہے یہ تو میرا بھائی ہے!" جب ہم میں بھی اس بچہ کی سی دانش مندی، فیاضی اور نیکی پیدا ہو جائے گی تو ہمیں بھی ان اندھیرے جنگلوں میں روشنی کی کرن نظر آنے لگے گی، جن میں ہم راہ بھول کر بھٹکتے پھر رہے ہیں جب تک ایسا نہ ہو ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم قرآن پاک کی اس سخت تاکید کو یاد رکھیں جو اس نے ان لوگوں کو کی ہے جو عام بہبودی کیلئے، عام ذمہ داری کیطرف سے غافل ہیں اور صرف اپنے آشیانہ کیلئے تنکے اکٹھے کرنے یا اپنی کشتی کو سلامتی کے ساحل تک پہنچانے کے خیال میں مگن ہیں "وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً" کیا دنیا کی موجودہ صورت حال سے زیادہ کوئی اور چیز اس ابدی صداقت کی مظہر ہو سکتی ہے؟ ایک ایسی صورت حال جس سے دنیا کو نجات دلانے کیلئے یونیسکو کو بھی (دوسرے اداروں کی طرح) پوری کوشش کرنی چاہیے۔ مجھے بھروسہ ہے کہ ہم سب نے یہاں اسی نجات کلی کی طرف کچھ یقینی قدم اٹھائے ہیں۔

## کسی سے

مانا کہ فصلِ گل بھی ہے، ابر بھی کیف بار ہے!
آج چمن کی ہر روش نازشِ صد نگار ہے!
جاگ اٹھی ہیں مستیاں، زمزمۂ بہار ہے!
کیسے کہوں بہار میں سوگ بھی آشکار ہے!؟
فطرت کے دستِ ناز میں آج ہے جام بخودی
جھوم رہے ہیں برگ و بر، وجد میں ہے کلی کلی
سبزۂ نو دمیدہ پر کھیل رہی ہے چاندنی
میرا جہانِ آرزو آج بھی سوگوار ہے!!
میری مجال یہ کہاں، آپ کو حور کہہ سکوں!
آپ کو پھول کہہ سکوں، نغمہ و نور کہہ سکوں!
میری زباں کو تاب کب شعلۂ طور کہہ سکوں!
جرأت کہاں کہ یہ کہوں آپ پہ دل نثار ہے!!
آپ کی بزم ناز میں، میرا بھلا شمار کیا؟
لاکھوں ہوں مضطرب جہاں اک دلِ بیقرار کیا؟
اک دلِ بیقرار کیا، اشکوں کی جوئبار کیا؟
حسنِ جفا شعار پر کس کو کچھ اختیار ہے!!
ہے یہ کمالِ عاشقی نالوں میں کچھ اثر نہ ہو
میری جبیں جھکی رہے آپ کو کچھ خبر نہ ہو

شمس شمسی

## غزل

اللہ اللہ شباب کا عالم ایسے ہے جیسے خواب کا عالم
ہلکی ہلکی سی ہر ادا ان کی سر سے پا تک شراب کا عالم
زندگی جس کو کہتی ہے دنیا سر بسر ہے سراب کا عالم
کاش وہ دیکھتے کبھی آکر اپنے خانہ خراب کا عالم
حسن زیرِ نقاب اف توبہ صبحدم آفتاب کا عالم
ہر طرف وہ ہی جلوہ گر ہیں ندیم دیدۂ کامیاب کا عالم
کیسے اظہارِ مدعا ہو شمیم؟
کون دیکھے عتاب کا عالم؟

کشور شمیم

# ۵۵۵

افسانہ

نتھنوں کے کونوں سے لے کر ناک کی آخری حد تک جیسے گندہ نکوٹین کی تہہ جم گئی ہو۔ اس کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا ہر سانس گلوریا فورم کی ایک لپیٹ کے ساتھ اس کے شش سے لے کر دماغ کی بیں تیری نسوں تک جھنس جاتا ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ میز پر مسلوں کی ڈھیر میں مدفون کھوپڑی کو کتنی ہی بار اس نے اسی کثیف دھوئیں کی موجوں سے کھنگال کھنگال کر دھویا ہے اور کتنی ہی بار دھوئیں کی ان موجوں نے گرد آلود کھوپڑی کو آئینہ صاف کر دیا ہے کہ اب وقت اس کا ماضی کھوپڑی کی شفاف سطح پر اُبھر کر جھانکنے لگا ہے ــــ ایک کش اور گرد اُڑ گئی ــــ دوسرا کش اور نقوش اُبھر گئے ــــ تیسرا کش اور تصویر نمایاں ہو گئی ــــ اس کی گود سے لے کر عورت کی آغوش تک ــــ کتنی ہی زہریلی سانسیں اس نے اس طویل عرصے میں کھینچی ہیں۔ زندگی کے اس بے ڈھنگے پن میں اس کو صرف خلا ہی خلا نظر آیا ہے ــــ عورت کی آغوش سے لے کر زمین کی گود تک کتنی ہی ایسی اور زہریلی سانسیں اس کو کھینچنی ہیں ــــ اور یہ خلا شاید اس وقت تک پُر نہ ہو گا ــــ لیکن آج ایک ہی کش میں وہ زندگی کے اس طویل خلا کو پُر کر دینا چاہتا تھا۔ ایک ہی کش میں اپنی اس مفلسی سے انتقام لینا چاہتا تھا جو اس کے باپ سے لے کر اس کے بیٹے تک کی روح پر محیط تھی ــــ یہ سگریٹ کیوں اتنا پیتے ہو۔ اور مریل ہو جاؤ گے۔ قحط کے دن ہیں کہیں کے ــــ بڑے حکیم نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا تھا اور اس کے بیرنگ ہوئے دھوئیں کی چادر کفن بن کر اس کے اطراف پھیل گئی تھی ــــ لیکن آج ــ آج ایک ہی کش میں وہ ایسی کئی دھوئیں کی چادریں اس حکیم کے اطراف پھیلا دے گا۔

ــــ جیب میں چھپے ہوئے نوٹوں کا خیال آتے ہی اس کی چھاتی دھک دھک کرنے لگی ــــ لگا دوں ایک جست؟ پُر کر دوں یہ سارا خلا۔ نکوٹین تو اس میں بھی ہو گی لیکن خوشبو کے ساتھ ــــ زہر کی ڈلی پر شکر کی تہہ لپیٹ دی جائے تو زہر کہاں رہتا ہے۔ آدمی شکر کی تہہ لپیٹ کر تو ہی گولیاں ہڑپ کر جاتا ہے ــــ لیکن کوئی چھپے ہوئے زہر کو نہیں دیکھتا سب آنکھیں بند کر لیتے ہیں ــــ حکیم بکتا ہے۔ قحط کے دن سگریٹ چھوڑ دے۔ ڈاکٹر چندر کہتا ہے فرحت اور چستی کے لئے فلاں سگریٹ پیئے بڑا صاحب فلاں سگریٹ کے کش لگاتا اور موٹا ہوتا ہے۔ زہر سب دوائیں ہیں لیکن میں کڑوی گولی نگل لیتا ہوں اور وہ شکر کی تہہ چڑھا کر ــــ سطح کے نیچے جھانک کر آدمی کتنا پست ہو جاتا ہے ــــ ماں کی گود سے لے کر عورت کی آغوش تک میں نے ہمیشہ سطح کے نیچے ہی کچھ تلاش کیا ہے۔ بڑا صاحب صرف سطح کے اوپر دیکھتا ہے۔ رگ بھی اس کے اندر نہیں جھانک سکتے۔ نکوٹین اور ڈیٹیٹس کے بس کو چھید کر نکلتی ہیں آگے نکل جانے کی قوت ہی نہیں رکھتیں۔ اور دھجیوں اور چیتھڑوں سے ہٹ کر یہی نگاہیں میرے گوشت اور ہڈیوں تک کو چھید دیتی ہیں۔ اور آج؟ ــــ آج ایک ہی کش میں دھوئیں کے کئی کفن وہ ان نگاہوں کے اطراف پھیلا دے گا اور اس نے کچھ اور سوچے بغیر ایک جست لگا دی ــــ ۵۵۵ کا ایک حسین ٹن اس کی گرفت میں تھا۔ اس نے محسوس کیا دوکان والے کی تیز نگاہیں اس کے گوشت اور ہڈیوں کو اسی طرح چھید رہی ہیں۔ ٹن پر اس کے پنجے کی گرفت اور بڑھ گئی۔ اس نے چاہا کہ یکبارگی یہ تمام سگریٹ ڈھنک دے اور دھوئیں کی اس پھیلی ہوئی چادر میں دوکان والے، بڈھے حکیم، ڈاکٹر چندر اور بڑا صاحب سب کو کفنا دے ــــ اور ــــ یہ کفنائے ہوئے مردے اس کے ماضی کے گھٹا ٹوپ اندھیارے میں کہیں پھینک دیئے جائیں ــــ لمحہ بھر میں اس کے خشک ہونٹوں کے بیچ میں ایک حسین سگریٹ لپکیا رہا تھا۔ دوکان والے کی نگاہیں اور شدید ہو گئی تھیں۔ اس نے دھوئیں کا ایک ننھا سا چھلا دوکان کی طرف پھونک دیا اور شکر میں لپٹی ہوئی ایک چھوٹی سی گولی نگل لی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بڑا صاحب اس وقت کہیں سے آ دھمکے اور وہ بڑے صاحب کو اتنی شدت سے گھورے کہ اس کی نگاہیں فلالین اور ٹوئیڈ کو چھید کر اس کی ہڈیوں میں پیوست ہو جائیں اور بڑا صاحب پریشان ہو جائے۔ اور چھپ چھپ کر دبک دبک کر کہیں غائب ہو جائے۔ جیسے وہ خود بڑے صاحب کی ذلیل نگاہوں سے چھپ چھپ کر، دبک دبک کر ــــ اور اس نے ایک لمبا کش لگا لیا ــــ پاؤں خود بخود سڑک کی طرف اُٹھ گئے۔

یونیورسٹی سے ڈگری لینے کے بعد کوئی دو سال تک اس کے اطراف صرف ڈگری ہی ناچتی رہی تھی۔ خالی جیب کو مست مست کر جب وہ مزید تشفی کر لیتا اور بس، بس اسٹانڈ سے نکل جاتی یا رکشا والا دو سواریاں کمل کر کے روڈ پر تیرنے لگتا تو اس دوڑتی ہوئی بس اور کھسکتی ہوئی رکشا کی پشت پر اس کو بی اے کی ڈگریاں چپکی ہوئی نظر آتی ــــ اس دو سال کے طویل عرصہ میں اس نے اپنی ڈگری کو بیسیوں مقامات پر سایہ کی طرح چمٹے ہوئے دیکھا تھا ــــ پہلے پہل تو یہ ڈگری پی۔ ڈی۔ سی کے اطراف ہی ناچا کرتی تھی۔ لیکن اس کے بہت جلد بعد ہی کارپوریشن، تعمیرات، دیہا بکاری کے دفاتر سے لے کر اس کے تنگ و تاریک مکان تک ہزاروں ڈگریاں اس کے اطراف قہقہے لگاتی ہوئی ناچنے لگی تھیں ــــ اور اب ــــ اب دھوئیں کی کثیف موجوں میں بھی یہ ڈگری ہلکورے لیتی ہوئی کبھی کبھار اُبھر جاتی تو وہ ایک اور ریلا اس پر بہا کر اسے غرق کر دیتا۔

لیکن آج ــــ آج اسے پہلی تنخواہ ملی تھی۔ دس دس کے ایک نہیں دو نہیں تین نوٹ اس کے سینے سے چمٹے ہوئے تھے۔ دھوئیں کی موجوں میں بی اے کی ڈگری اُبھرتی تو آج وہ اسکو غرق

بیگم سلیم

کردینے کی کوشش نہ کرتا۔ آج ڈگری اس پر استہزا نہیں کر رہی تھی، وہ ڈگری پر مسکرا رہا تھا۔ بس اسٹانڈ پر کھڑی ہوئی بس، سواریوں کے لئے چیختا ہوا رکشا والا سب اس کو اپنے تابع نظر آرہے تھے۔ آج وہ اپنی مفلسی سے خوب انتقام لینا چاہتا تھا۔ ۵۵۵ کے ٹن کو کچھ ذرا آگے کی طرف کرکے وہ بس میں سوار ہوگیا۔ بس دوڑنے لگی۔ ٹن سے ایک سگریٹ نکال کر اس نے ہونٹوں کی بجائے باچھوں میں داب لیا۔ سگریٹ کے لکھے ہوئے حصے کو نمایاں کرتے ہوئے اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کو محسوس ہوا کہ آج یہ نگاہیں اس کے گوشت اور ہڈیوں کو نہ چھید سکیں گی بلکہ ۵۵۵ کے ٹن ہی پر جم کر رہ جائیں گی ——— کہاں جاؤ گے۔ اور اس نے آواز اور نگاہوں کی تیروں سے بچنے کے لئے ۵۵۵ کے ٹن کی ڈھال کو کچھ آگے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ——— جہاں تک تمہاری بس جائے۔

سگریٹ کے ٹن کو گھورتے ہوئے کنڈکٹر نے ایک ٹکٹ اسکے ہاتھ میں رکھ دیا۔

صرف سکندرآباد تک ———

——— پلازا ——— کون کھیل چل رہا ہے ؟ ———

(Bathing Beauty)

جناب ۔"جناب" اس نے محسوس کیا جیسے وہ بڑا صاحب ہوگیا ہے۔ یونیورسٹی کی باونڈری سے نکلتے وقت ہی اس نے جناب اور مسٹر کے سارے القاب وہیں چھوڑ دیئے تھے۔ اس کے بعد سے آج تک اس کو کسی نے جناب یا مسٹر نہیں کہا تھا لیکن آج ۔ آج کوئی ہاتھ جوڑے ہوئے اسے جناب کہہ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کم از کم اب تو اسکا بڑا صاحب یہاں آجائے ۔ یا ۔ یا وہ بڈھا حکیم یا وہ ڈاکٹر چندریا اور کوئی بھی نہیں تو وہ دکان والا ہی ———

بہت مزے دار کھیل ہے حضور (Esther Williams) کام کر رہی ہے مچھلی ہے مچھلی ——— وہ سوچنے لگا۔ کون جانے کون بلا ہے یہ اور نہ ہوگی کوئی بندر کی بچی۔ ڈاروین کی نامکمل تھیوری۔ لیکن اس نے اس طرح سر ہلایا جیسے وہ بارہا اس کو دیکھ چکا ہے۔ ایک سگریٹ پھر اس کی باچھوں میں لرزنے لگا ——— سینما ہال میں داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنے ملاقاتی کو کن انکھیوں سے دیکھا جو گیٹ پر کھڑا ہوا اس کو تاک رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا ۔ آج واقعی وہ بڑا صاحب ہے اور چند ملتجی نگاہیں اسکا بھی تعاقب کر سکتی ہیں۔ بریوں کی طرح اس کے گوشت اور ہڈیوں میں پیوست ہونے والی کتنی نگاہیں آج چاندی کے نرم نرم تار بن کر اس کے اطراف بکھر رہی تھیں۔ اور آج وہ ہر چاندی کے جال میں پھنس جانے کے لئے تیار تھا۔

——— پردے چھوٹ رہے تھے۔ ہال بالکل تاریک ہوگیا تھا۔ پچھلی دیوار سے پردے کو گھورتی ہوئی تیز شعاعیں اسکرین کو اس طرح روشن کر رہی تھیں جیسے اس کے ماضی کے گھٹا ٹوپ اندھیارے کو آج کا دن ——— اجالا چاروں طرف پھیل گیا۔ پردے اٹھ گئے۔ پنکھے رک گئے اور وہ ہر دن کو دماغ میں محفوظ کئے ہوئے باہر نکل آیا۔ حوض کے نیلے پانی میں پہیہ کی طرح گھومتے ہوئے پریوں کے گول حلقے کے بیچ سے تھرک تھرک کر تڑپ تڑپ کر ادھر ادھر نکلنے والی کچی چاندی سے بنی ہوئی (Esther Williams) اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔

پسند آیا سرکار ——— اس کا نیا ملاقاتی ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

بہت پسند آئی ——— آئی!!

——— ملاقاتی نے دبی زبان میں "آئی" کو دہرادیا۔

ہاں ہاں بہت پسند آئی ——— میں نے تو پھر دیکھنے ——— اور اس نے لجائے ہوئے بات کاٹ دی۔ ہوں، ہی ہی ہی ——— میں سمجھا یعنی جناب کو وہ ——— وہ پسند آگئی ۔ مگر یعنی ۔ یعنی کہ کیا حقیقت ہے اس کی صاحب ۔ پانی بھرے گی پانی۔

پانی بھرے گی ؟ ہاں ہاں پانی بھرے گی صاحب ڈبہ ہے ڈبہ ۔ ڈالڈا دناسپتی کا ڈبہ ہے فقط۔ ——— ہی ہی ہی ارے میاں کیا کہتے ہو آخر ——— جھوٹ نہیں کہتا مسٹر۔ اٹھارہ برس کی ہوگی بس ۔ اور کیا کہوں جیسے جیسے ——— جیسے سمجھ لیجئے کہ دودھ پیڑی ہو پنڈلیاں اور ۔ اور ۔ ہی ہی ۔

اوہ ! تو یہ بات ہے یوں کیوں نہ کہہ دیا۔

ہاں ہاں واقعی یوں کیوں نہ ——— یہی تو کہہ رہا تھا جناب ۔

——— سوچ رہے ہیں ؟ کچھ بھی نہیں ، کچھ بھی نہیں ، بہت کم دیجئے ، بس ایک نوٹ دس کا ۔ ہی ہی ہی ۔

کیا زیادہ ہے یہ ——— سو روپیہ بھی زیادہ نہیں اسکے لئے تو ۔ ہی ہی چینی کی

## غزل

دل پہ جو گزری کوئی کیا جانے
یہ تو ہم جانیں یا خدا جانے

خاک جھیلے گا وہ مصیبت عشق
ابتدا کو جو انتہا جانے

کیا کہوں اس سے اپنے دل کی لگی
جو لگا کر نہ پھر بجھا جانے

بادہ نوشوں کا حشر کیا ہوگا
مجھ بلا نوش کی بلا جانے

کیا کہے عرض مدعا وہ بشر
جو نہیں اپنا مدعا جانے

تو ہی اپنا مقام جانتا ہے
اک ظلوم و جہول کیا جانے

دل کو کل تک تو چین حاصل تھا
آج کیا ہوگیا خدا جانے

بات رندی کی مجھ کو آتی ہے
پارسائی کی پارسا جانے

ناتوانی پہ زندگی ہے گراں
مار ڈالا نفس کی آ۔ جا۔ نے

تجھ کو اپنی خبر نہیں اے جوش
تو خدائی کا راز کیا جانے

**جوش ملسیانی**

گرڈیا ہے خالص۔ ایک نظر بس ایک ذرا۔ ورنہ منہ پر تھوک دینے بچہ صاحب۔

دھڑکتے ہوئے سینے سے چھوٹی بڑی نوٹوں کو انگلیوں کی پوروں سے چھوتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ کیوں نہ ڈوب کر دیکھوں اس ڈالڈا وناسپتی کے ڈبے میں۔ کیوں نہ میری نگاہیں، میری انگلیاں بھی کسی کے گوشت اور ہڈیوں کو چھید کر نکل جائیں۔ جب یہ نوٹ۔ یہ کاغذ کے پرزے مجھ پر ہنس سکتے ہیں تو میں ان پر کیوں نہیں ہنس سکتا۔ ایسے چپٹائے ہوئے ہوں سینے سے جیسے ان کے بغیر جی ہی نہ سکوں گا —— بس اسٹانڈ سے لے کر سینما ہال تک، سینما ہال سے لے کر جمیس اسٹریٹ تک آج سوئیوں کی طرح جسم کو چھیدنے والی تمام نگاہیں چاندی کے تاروں کی طرح میرے قدموں پر بکھر رہی ہیں —— کاغذ کے پرزوں کو سینے سے چپٹائے رکھو۔ سوئیاں نرم تار بن کر راستے میں بچھ جائیں گی۔ کاغذ کے پرزوں کی تلاش میں بی۔ اے کی ڈگری کو کشکول بنائے رکھو۔ نرم تار سوئیاں بن کر ہڈیوں میں دھنس جائینگے۔ جیسے میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ جو کچھ ہیں یہ کاغذ کے پرزے ہی تو ہیں —— میری کوئی شخصیت ہی نہیں۔ انفرادیت ہی نہیں۔ وجود ہی نہیں ہستی ہی نہیں —— کچھ بھی نہیں ہوں میں —— نوٹ اس کے کلیجے کو ڈسنے لگے۔ اس نے محسوس کیا جیسے ۵۵۵ کا ٹن انگارے کی طرح اس کی ہتیلی کو جھلس رہا ہے —— باچھوں سے ہٹ کر ہونٹوں میں ایک سگرٹ کانپا۔ دھوئیں کی چادر ہوا میں پھیلی۔ اس نے محسوس کیا جیسے یہ کفن صرف اسی کے لئے ہے —— اور —— اور بڈھا حکیم۔ بڑا صاب دوکان دالا جیسے اسیر قہقہے مار رہے ہوں —— وہ جھنجلا اٹھا۔ ذلیل کہیں کا ہاتھ جوڑتا ہے —— "جناب" —— اور کل کہاں مرگیا تھا یہ جناب کا بچہ —— وہ چاہتا تھا کہ اس نئے ملاقاتی کے منہ پر ایک تھپیڑ رسید کردے —— بس اسٹانڈ سے لے کر جمیس اسٹریٹ تک چاندی کے تار بکھیرنے والی ہر آنکھ کو پاؤں تلے کچل دے —— بڑے صاب کے منہ پر تھپیڑ۔ نئے ملاقاتی کے منہ پر تھپیڑ۔ سماج کے منہ پر تھپیڑ۔ زندگی کے منہ پر تھپیڑ۔ اور —— اور ڈالڈا وناسپتی کے ڈبے کے منہ پر تھپیڑ —— اور وہ کہیں ڈوب مرے۔

کیا بک رہے ہو۔ چلے جاؤ یہاں سے نکل جاؤ —— دور ہو جاؤ میری نظروں سے —— ہی ہی ہی۔

اور اس نے محسوس کیا جیسے اسکا باپ ہنس رہا ہے۔ ماں ہنس رہی ہے۔ دُبلی پتلی مریل بہن ہنس رہی ہے —— منہ چڑا رہی ہے۔ ہی ہی ہی۔

۵۵۵ کا ٹن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ سگرٹ زمین پر بکھر گئے اور وہ پھر اپنے ماضی کے گھٹ ٹوپ اندھیارے میں جھانکنے لگا۔

**اعلان**

دفتر رسالہ آجکل میں مضامین نثر و نظم کافی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں۔ (ادارہ)

# اولاد

رشید احمد صدیقی

سب سے پہلی بات جو میں اپنے بارے میں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ والدین ہونا میری تقدیر ہے میری ذات نہیں۔ اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ اولاد کے بارے میں ایک صاحب اولاد کے اظہار خیال کو کس حد تک جانبدارانہ یا غیر جانبدارانہ قرار دیں گے اور اس میں نفسیات یا نفسانیت کے کون کون سے پہلو دریافت کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ میں ان دونوں میں سے کسی ایک کا ماہر نہیں ہوں۔ اور کیا عجب آپ میری اس کوتاہی سے فائدہ اٹھا کر میری باتوں کا کچھ ایسا مطلب نکالیں اور اس مطلب کی کچھ اس طرح تشہیر کریں کہ اولاد کی پوری قوم مجھ سے بدظن ہو جائے اور آپ تو جانتے ہیں لفظ قوم کے ساتھ بدظنی کچھ اس طرح پر مدغم ہے کہ قوم کی ڈیفینیشن یا تو اب صرف اتنی اور یہ رہ گئی ہے کہ وہ جو بدظن ہو۔ ضمناً لیکن حلفاً یہ بھی عرض کروں گا کہ بدظن میں اردو املے کی اصلاح میں نے مدنظر نہیں رکھی ہے۔

جن دو امور کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے یعنی نفسیات اور نفسانیت ان کا عجیب دستور ہے۔ ان کے پردے میں یا ان کے بہانے کسی بات سے کوئی مطلب نکالا جا سکتا ہے مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ اولاد نالائق ہوتی ہے تو آپ یہ نتیجہ نکالیں گے کہ میں خود اپنے والدین کی نالائق اولاد میں ہوں اور یہ کہوں کہ اولاد لائق ہوتی ہے اور والدین کو ہنساتی ہے تو آپ بڑے وثوق و خلوص سے کہہ دیں گے کہ میرے خاندان کی سترویں یا ایک سو سترویں پیڑھی میں کوئی مرد معقول بھی گذرا ہے جس کے جبڑے کی ہڈی فلاں عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ اور یہ کہوں کہ اولاد لائق ہوتی ہے اور نالائق بھی یعنی ہنساتی بھی ہے اور رلاتی بھی ہے تو آپ کہیں گے کہ یہی تو ہم بھی کہتے ہیں۔ اس کا جواب میرے پاس اس کے سوا کوئی نہیں کہ میں دل مسوس کر رہ جاؤں اور دبی زبان سے یہ کہہ دوں کہ آپ کس سے کم ہیں۔ آپ متعجب نہ ہوں مطلب نکالنے کا یہ طریقہ بہت عام ہے۔ اور ادھر کچھ عرصہ سے ادب میں بھی اسے بڑا فروغ ہو رہا ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہو اور یہ میں صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو یقیناً نہ معلوم ہوگا کہ ادبی اصطلاح میں اسے تنقید کہنے لگے ہیں۔ اس فن میں مہارت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ تنقید کرنے والا خود بھی کہاں تک ہنستا ہے اور دوسرے روتے ہیں یا خود روتا ہے اور دوسرے تالیاں بجاتے ہیں۔ اس بوالعجبی کو ایک مصرعہ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے۔

لیکن میرے ماہر نفسیات نہ ہونے سے آپ بددل نہ ہوں۔ اس اظہار واقعہ کو آپ میری خاکساری پر محمول نہ فرمانا چاہیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ جس موضوع پر مجھے آپ سے گفتگو کرنی ہے وہ ہے کچھ ایسا کہ اس میں فن کے لحاظ سے جو جتنا ماہر ہوتا ہے۔ ذاتی تجربے کے معاملہ میں اتنا ہی بے بس ثابت ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے اولاد کو خدا کی دین بھی کہتے ہیں اور ہنسنے اور رونے دو مواقع کو اس سے بہت متعلق کر رکھا ہے کہ اولاد پر ہنستے اور خوش ہوتے ہیں اور اس کے حال پر روتے رلاتے ہیں۔ اولاد کا خدا کی دین ہونا والدین کی سمجھ میں اس وقت ذرا زیادہ آنے لگتا ہے جب اولاد اس دین پر اپنی طرف سے دین کا تعلق بڑھا لیتی ہے۔ اور جب اس لین دین کا سلسلہ دور تک پہنچتا ہے تو البتہ والدین کے ذہن میں یہ بات بھی آنے لگتی ہے کہ اگر اولاد خدا کی دین ہے تو والدین خدا کے کون ہیں۔ سمجھ گئے ہیں اس موضوع سے کتراتا ہوں۔ اور براہ راست اولاد کے بارے میں گفتگو کرنے کے بجائے خیر و عافیت دونوں کی اسی میں سمجھتا ہوں کہ والدین ہی زیر بحث رہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہندوستانی تعریف کرنے کے لئے دوسری قوموں کو اور برا بھلا کہنے کے لئے اپنی قوم کو منتخب کرتا ہے۔ خاص طور سے ایسے نازک وقت میں جب کہ اولاد اور والدین دونوں اپنی اپنی الگ الگ قومیت منوانے پر مصر ہوں کیا ہوا جو سننے والی برادری میں اولاد اور والدین کا جو تناسب ہے وہ خطرہ میں پڑ گیا یا کچھ اور نہیں تو جوانوں کی سعادتمندی میری دانائی کو بھی کمزوری ہی سمجھ بیٹھی۔ یہ دونوں صورتیں خطرناک ہیں۔ اور جب انسان خطروں میں گھرا ہو تو محض خطرے کی گھنٹی بجانے سننے سے بہتر کیا تو یہی ہے کہ خطرہ کو خاطر میں لانے سے یکسر انکار کر دے یا خود خطرہ بن جائے۔ لیکن خطروں کا ذکر یا اعلان وہ بھی ریڈیو پر شاید آپ کو پسند نہ آئے۔ اور شاید یہی نہیں بلکہ یقیناً ریڈیو والے بھی اس کے متحمل نہ ہوں گے۔ اس لئے میں ایک محفوظ سی بات عرض کروں گا اور بات کے محفوظ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس بات کے لئے آپ کو حفاظت خود اختیاری کو کام میں نہ لانا پڑے۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ وہ بات آپ کی سمجھ میں آ جائے تو آپ کچھ نہ کریں اور سمجھ میں نہ آئے تو سب کچھ کر ڈالیں۔ وہ بات یہ ہے کہ دنیا میں سب سے انوکھی وہی قوم ہے جس کا ذکر کر چکا ہے اور جس کے افراد والدین کہلاتے ہیں۔ یہ قوم دنیا کے ہر حصہ میں ملتی ہے۔ ہر جگہ اس کی حیثیت یکساں ہے۔ وہی جو انسانوں میں خدا کی ہے۔ مصیبت پڑی تو اللہ اللہ ورنہ لاحول ولا۔ اس قوم کی اکثر خصوصیات عام طور پر مشترک ہیں مثلاً یہ کہ ان میں سے ہر ایک خواہ کتنا ہی افلاطون زمانہ کیوں نہ ہو لیکن اس میں ان کی بڑی آسانی سے بیوقوف بنائے جانے کی صلاحیت دیکھ لیتی ہے یا پیدا کر لیتی ہے۔ اور جہاں اس میں کامیاب نہیں ہوتی وہاں ان کو خبطی یا بوڑھا فاذد ([illegible]) کا لقب دے کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی قوم ہو جو فریب کھانے اور زیادہ سے زیادہ وقت تک فریب میں مبتلا رہنے پر اسی طرح اور اتنی خوشی سے آمادہ رہتی ہو جتنی کہ والدین کی قوم۔

یہی نہیں بلکہ لطف اس وقت آتا ہے جب اپنی اپنی اولاد کے فریب میں مبتلا والدین اس فریب کو اپنا اپنا کارنامہ بنا کر ایک دوسرے کے سامنے پیش کرتے ہیں اور بھید کو خاطر میں نہیں لاتے کہ اولاد اپنے والدین کا کارنامہ ہوں یا نہیں والدین اپنی اولاد کا کارنامہ ضرور ہوتے ہیں۔ اولاد پیدا کرنا والدین کا فعل طبعی ہوتا ہے اور والدین کو دوست رکھنا اولاد کا فعل اخلاقی۔ یہاں اخلاق سے مراد اکثر اولاد کا وہ اخلاق ہوتا ہے جو والدین کے اخلاق کی خبر لیتا رہتا ہے۔ میں مذہبی باتوں کا عالم نہیں ہوں لیکن مجھے مذہبی روایات سے بڑی دلچسپی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو نہ ان روایات سے بیر ہوگا نہ مجھ سے اس لئے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جو روایات میں آپ کو سناؤں گا ان کو آپ صحیح یا دلچسپ پائیں تو میری تعریف دوسروں سے کریں اور غلط اور غیر دلچسپ پائیں تو صرف مجھے آگاہ کر دیں اولاد یا والدین کا یہ شیوہ ہو یا نہیں شریفوں کا یہی شیوہ ہے۔ ایک روایت تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ اولاد کی کثرت والدین کے لئے باعث مغفرت ہے۔ جس کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ اولاد کی زیادہ تعداد مغفرت کی دعا کرے گی تو والدین کی بخشائش ہو جائے گی۔ اس کی توجیہہ بعض اعصابی مرض میں مبتلا والدین یہ بھی کرتے ہیں کہ یہ اولاد کی دعائے مغفرت نہیں ہے۔ بلکہ والدین کے ساتھ ان کا حسن سلوک ہے جو ان کی بخشائش کا موجب ہوتا ہے۔

دوسری روایت ہے اگر پچھلے جنم میں آپ نے کسی پر مظالم توڑے تھے اور وہ آپ سے بدلہ نہ لے سکا تھا تو کسی نہ کسی جنم میں عورت یا اولاد کی شکل میں نمودار ہوگا اور آپ سے ایسی کسر لے گا کہ وہ سب کچھ کرے گا آپ کچھ نہ کر سکیں گے۔ یہ دونوں روایتیں بظاہر مختلف معلوم ہوتی ہیں لیکن ان سے ایک بات ثابت ہے وہ یہ کہ آپ کی نجات اولاد ہی سے وابستہ ہے۔ رہا یہ کہ اولاد کی نجات کس سے وابستہ ہے وہ مجھے نہیں معلوم۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ بعض والدین کبھی اپنی اولاد کے لئے کچھ کم عذاب نہیں ہوتے۔

میں ظالم اور خود غرض والدین کو کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھتا جو اپنی اولاد کو رلاتے ہیں۔ میرے نزدیک اولاد کا والدین کو رلانا اتنا برا نہیں ہے جتنا والدین کا اپنی اولاد کو رلانا۔ اس لئے کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اولاد کو وجود میں لانے کی ذمہ داری والدین پر ہے۔ اس لئے والدین کا فرض ہے کہ وہ جس ہستی کو زندگی کے بھنور میں لا ڈالنے کے ذمہ دار ہیں۔ اس کے لئے سختیاں جھیلیں نہ یہ کہ اس کو مصیبتوں میں پھنسائیں یا پھنسنے دیں! بذات خود میں اولاد سے بالکل مساویانہ حیثیت سے نپٹنا پسند کرتا ہوں یعنی عاقل اور بالغ ہونے پر اولاد ایمانداری سے یہ فیصلہ کرے بحیثیت ایک فرد آزاد کے کون کسی کی خدمت خلوص سے بجا لاتا ہے خدمت اور خیر اندیشی ایسی چیزیں نہیں ہیں جو کسی کے سمجھ میں نہ آئیں یا جن کا مفہوم کہیں اور ہو اور کہیں اور۔ ان کا کوئی معاوضہ نہیں لیکن ان کا احترام نہ کرنا انسانیت سے گذر جانا ہے جو انسانوں میں سب سے گھٹیا بات سمجھی جاتی ہے۔

ہندوستان میں آپ ایسے بہت سے بزرگوں سے واقف ہوں گے (میرے اور آپ کے علاوہ) جن کی نہ خوشی اپنی نہ غم اپنا ان کے رنج و راحت کا انحصار ان بے شمار بچوں کے اوپر ہوتا ہے جن میں ہر عمر اور قد و قامت کے نمونے شامل ہوتے ہیں۔ جن کو یکے بعد دیگرے ایک قطار میں کھڑا کر دیا جائے تو اہرام مصر کے زینے نہ سہی ایک خاص قسم کی شاعری کے مصرع ضرور معلوم ہونے لگیں گے۔ اس ہجوم میں بزرگ محض ذو اضعاف اقل بنے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر والدین ہونے کا فخر یا فریب اس مرتبہ کی تلافی کر دیتا ہے۔ ان کو ان سب بچوں کے سلسلہ وار نام نہ بھی یاد ہوں لیکن ان کی تعداد از بر ہوگی۔ اس تعداد کا ذکر یہ حضرات کچھ یوں ہیں اس طرح کریں گے گویا یہ ان "زمینوں" کو آسمان سے توڑ کر لائے ہیں۔ جہاں اولاد آتنی اور ایسی ہو وہاں کے حادثات اور ہنگاموں کا پوچھنا کیا! اور یہ حضرت جیسا کہ ایک اور بہت بڑے حضرت کہہ گئے ہیں ان ہنگاموں ہی کو "گھر کی رونق" سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ملول ہے تو ان کو فکر ہے کہ دنیا کس آشوب میں مبتلا ہونے والی ہے۔ کوئی قہقہے مار رہا ہے تو یہ پریشان کہ ضرور اس نے ہمسائی کی مرغی چرائی ہوگی۔ کوئی انفلوئنزا یا ٹائیفائڈ کی تواضع میں لگا ہوا ہے تو اس کے لئے پھل دوائیں اور کھلونے فراہم کرنے کی فکر میں ہیں۔ کوئی گھر سے باہر پردیس میں علم کی پیاس بجھا رہا ہے تو گھر کی یاد میں اس کے حسرت بھرے خطوط چلے آ رہے ہیں جو کسی مشتبہ کارنامے سے شروع ہو کر کسی یقینی فرمائش پر ختم ہوتا ہے۔ کوئی زندگی اور زمانہ سے بیزار ہو کر دونوں کو خیر باد کہنے کے منصوبے باندھ رہا ہے تو کسی کو یہ شکایت کہ خدا کو انھیں پیدا کرنے پر اتنا اصرار ہی تھا تو والدین کے انتخاب میں خود ان کی رائے لے لی ہوتی مثلاً خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔ ؟ — نعروں، فرمائشوں، منصوبوں اور شکایتوں کے اس ناگہ میلا میں ایک طرف سے ہنستی کھیلتی دھوم مچاتی بچی نے آکر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں تو سارے غم ڈھل گئے اور کسی ٹوتھ پیسٹ یا پاؤڈر کا اشتہار نظر آنے لگے۔

اولاد کے ہنسانے یا رلانے کے عمل سے واقف ہونے کے لئے اس امر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اولاد یا والدین ہمارے معاشرہ کے کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں بالعموم یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جو والدین جتنے کھاتے پیتے اور ذی اقتدار ہوتے ہیں اتنی ہی ان کی اولاد نالائق یا نامعقول ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مفلوک الحال

والدین کی اولاد اکثر سعادتمند اور وفا شعار ہوتی ہے۔ دولت واقتدار کا بڑا خطرہ یہ ہے کہ احتیاج جو انسان کو انسان سے ربط دیتی ہے اور ایک دوسرے سے قریب اور متوازن رکھتی ہے وہ باقی نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولتمند اور ذی اقتدار کی اولاد۔ بیوی۔ دوست سب کے سب کسی نہ کسی حد تک اس سے مشتبہ رہتے ہیں اور ظاہر ہے کوئی شخص جو کسی سے مشتبہ ہو اس کو ہنسانے کی فکر نہ کرے گا۔ انتقاماً رلانے پر آمادہ ہو جائے تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔

دوسری طرف حاجتمند کی اولاد ہوتی ہے جو اپنے بے مایہ والدین سے محبت نہ بھی کرے تو بھی اس سے مشتبہ نہیں ہو سکتی۔ دونوں زندگی کو قائم رکھنے اور مبارک بنانے کے لئے ریاضت کرتے ہیں۔ یہ ریاضت ان کے جسم و جان سے برائی اور بدی کے فضلوں کو طرح طرح سے دور کرتی رہتی ہے اور اس طرح جسم و جان کو تازہ اور توانا رکھتی ہے اور اولاد و والدین دونوں کو ایک دوسرے کا انعام بنا دیتی ہے۔

میں جو کچھ ایسا سمجھتا ہوں کہ والدین کو اولاد کی طرف سے جو خوشی اولاد کے بچپن میں میسر آجاتی ہے وہ والدین کے لئے کافی ہوتی ہے سیانے ہونے پر اولاد کی توجہ بھی ہٹ جاتی ہے اور ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے۔ شاید والدین کے مطالبہ میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس نئے تعلقات اتنے خوشگوار یا ہموار نہیں رہتے جتنا کہ والدین چاہتے ہیں۔ مگر اولاد کی بچپن کی معصومانہ سرگرمیوں کا عمل ورد عمل والدین کی فخر و سر خوشی کا موجب ہوتا ہے وہ والدین کے لئے تمام عمر کو کافی ہوتا ہے۔ یہ والدین کی زیادتی ہے کہ وہ دم واپسین تک اولاد سے اسی قسم کی خوشی دیکھنا پانا چاہتے ہیں۔

اولاد کب ہنساتی ہے اور کب رلاتی ہے۔ عمر کے ان ڈھلتے ہوئے لمحوں کا راز ہے جب زندگی کے سائے گہرے ہو کر مستقبل کے نامعلوم و غیر واضح ورق پر امید و حسرت کے عجیب و غریب نقوش بکھیرنے لگتے ہیں۔ ایسے نقوش جن کے سانچے میں صدیاں نسلیں بن جاتی ہیں اور وقت کی کبھی اور کہیں نہ ختم ہونے والی پہنائی ان آنے والی نسلوں کو ایک ایسے تار کی طرح پروئی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس کا ایک سرا ہماری اپنی ذات ہوتی ہے اور دوسرا ابد سے ہمکنار۔ شباب کی منزل سے گذر کر کبھی نہ پورے ہونے والے حوصلوں کی جھلاتی شمع کے لئے اولاد کا یہ تصور ایک فانوس بن جاتا ہے جس سے مستقبل کا دھندلکا دیر تک تابناک اور پر امید نظر آتا ہے۔

(باجازت آل انڈیا ریڈیو)

**ضروری:**— ان حضرات سے جو اپنے اخبارات و رسائل میں "آجکل" کے مضامین حوالے اور اطلاع کے بغیر نقل کر لیتے ہیں درخواست ہے کہ مضمون نقل کرنے کے بعد وہ ہمیں مطلع فرما دیا کریں۔ — (ادارہ)

# غزل

متین مچھلی شہری

جلوۂ حسن یار پر میری پڑی نظر کہاں
بے خودیٔ نظارہ میں اس کی مجھے خبر کہاں

در خورِ بد جس ہے عشق شکستہ پر کہاں
دیکھنے کی طرف پڑی ان پہ مری نظر کہاں

رہ روِ راہِ عشق کو ہوتی ہے یہ خبر کہاں
رات کہاں گذر گئی اور ہوئی سحر کہاں

عالمِ بے خودی ہے اور محویتِ خیال ہے
ان کی خبر نہیں ہے جب اپنی مجھے خبر کہاں

سجدۂ نقشِ پا کا ہے شوق سرِ نیاز کو
کاش بتائے خضرِ شوق ہے تری رہگذر کہاں

دیکھئے جس طرف ادھر جلوۂ حسن آشکار
اپنے ہجوم میں اسے ڈھونڈ سکے نظر کہاں

عالمِ بیخودی مرا دونوں جہاں سے ہو جدا
ہائے گا کیا کوئی پتا اب ہے یہ بیخبر کہاں

دیکھی ہیں میں نے ہر طرف اسکی تجلیاں مگر
جلوۂ طورِ دل کہاں جلوۂ رہگذر کہاں

پرتے سے اد شوقِ دید اہلِ نظارہ کا بڑھا
پردہ سے بڑھ کے حسن کا ہے کوئی پردہ در کہاں

فیضِ تصورات سے پھول بھی ہیں چمن بھی ہے
کنجِ قفس قفس نہیں پھر غمِ بال و پر کہاں

بے خودِ عشق کی خودی طرفہ کرشمہ ساز ہے
ہوش جسے کچھ آگیا اپنی اسے خبر کہاں

کعبہ و دیر سے غرض تیرے نیاز مند کو
چھوڑ کے تیرا آستاں جائے ادھر ادھر کہاں

جس نے کیا ہے دل میں گھر آہ وہ شوخ اور ہے
قابلِ خلوتِ جمال جلوۂ رہگذر کہاں

میرا خیال تھا کہ ہے حسن مجاز کی طرف
چشم حقیقت آشنا جا کے پڑی مگر کہاں

در خورِ صبر تھا کہ ہے وسعتِ صحنِ بوستاں
کنجِ قفس کو چھوڑ کر جائے یہ مشت پر کہاں

یہ بھی مجھے نہیں امید صبح ہے اسکی صبح حشر
میری شبِ فراق کی ہوتی ہے اب سحر کہاں

## نئی کوشش ۔۔۔ موج علیگ

رات نے دہشتِ ظلمات کا اگلا ہے زہر
روشنی اپنا کفن اوڑھے ہوئے سوتی ہے
درد ہی درد میں ڈوبے ہوئے غم خانے میں
زندگی اپنی شکستوں پہ بہت روتی ہے

زخم گہرے ہی سہی، یاس میں رنج سہی
زیرِ افلاکِ ستم سہنے میں جینا ہے مجھے
اپنی تقدیر کے اکرام سے آنکھوں کا لہو
آج پیتا ہوں اور آئندہ بھی پینا ہے مجھے

مجھ کو اٹھنا ہے کئی بار ابھی پستی سے
نامرادی مرے جذبات کی قیمت تو نہیں
یہ نہیں راہ ہی جاتی ہیں امیدیں دل کی
عشق افسردہ سہی، عشق ہلاکت تو نہیں

قافلے بڑھنے لگے اپنی منازل کی طرف
میں بھی بیمار ارادوں کو توانا کر لوں
زندگی بہتی سے بہتی ہی رہے گی شاید
میں بھی رگ رگ میں وہی برق کی لہریں بھر لوں
زیرِ افلاک ستم سہنے میں جینا ہے مجھے

## غزل ۔۔۔ قدیر لکھنوی

عاشق کے دل سے درد کی لذّت نہ پوچھیے
کتنی لطیف شے ہے محبت نہ پوچھیے

جیسے حیات و موت کی مخلوط چاشنی
لمحاتِ انتظار کی لذّت نہ پوچھیے

کلمہ نفس نفس پہ ہے سجدہ قدم قدم
پابندیٔ نمازِ محبت نہ پوچھیے

بے اختیار پھر کوئی یاد آگیا مجھے
اب عالمِ خیال کی وسعت نہ پوچھیے

کچھ کہہ کے ہم خموش ہیں کچھ سن کے وہ خموش
تفصیلِ داستانِ محبت نہ پوچھیے

میری نظر سے آپ اگر مطمئن نہیں
خود آئینے سے اپنی حقیقت نہ پوچھیے!

وہ اشکِ خوں جو زینتِ دامانِ یار ہو
اس لعلِ شب چراغ کی قیمت نہ پوچھیے

غنچے نے ہنس کے چاک گریباں کیا ہے جب
شبنم کو جو ہوئی ہے ندامت نہ پوچھیے

چہرہ عرق عرق ہے نگاہیں جھکی جھکی
اندازِ اعترافِ محبت نہ پوچھیے

مرکز ہیں حسن و عشق کے دیر و حرم قدیر
کیا ہے مجاز کیا ہے حقیقت نہ پوچھیے

## غزل ۔۔۔ شاد عارفی

یہ جگمگاتے ہوئے ستارے۔ یہ پھول جو مسکرا رہے ہیں
اِدھر سے شرما کے جا رہے ہیں اُدھر سے اٹھلا کے آ رہے ہیں
یہاں کھڑے مسکرا رہے ہیں وہاں کھڑے مسکرا رہے ہیں
وہی نتیجہ کہ جس سے میں ابتدائے الفت میں کانپتا تھا
سحر کے چھپتے ہوئے اندھیرے پہ جو بھی تمثیل دل کو بھائے
غمِ جدائی نہ چھپ سکے گا رہی جو یہ مختلف بیانی
محبت اور ترکِ شرکتِ بزمِ حسن مہمل سا ادعا تھا
نقاب کی جنبشوں سے پیدا ہیں جلوہ ہائے "حجاب دشمن"
ہم ان کو کھو کر نہ پا سکے ہیں نہ کوئی پانے کا آسرا ہے
ترنمِ صبحِ گلستاں پر۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو
ہمیں جو اے شاد پیش آئے ہیں روزِ دنیائے آرزو میں

ابھی مصیبت نہیں پڑی ہے قریب آغاز کھا رہے ہیں
زہے تقاضائے دلربائی مجھے محبت سکھا رہے ہیں
یہ ہوش کس کو؟ لبھا رہے ہیں کہ دل پہ بجلی گرا رہے ہیں
یہ الجھنیں ہیں کہ آج وہ بھی اسی نتیجے پہ آ رہے ہیں
وہ اپنے چہرے سے رفتہ رفتہ سیاہ چادر اٹھا رہے ہیں
کسی کو میں کچھ بتا رہا ہوں، کسی کو وہ کچھ بتا رہے ہیں
یہ اس بھروسے نے بات رکھ لی کہ ہم "کسی کو" ستا رہے ہیں
شباب کے ولولوں میں ڈوبی ہوئی ادائیں لٹا رہے ہیں
مشاہدہ ہیں یہ آ رہا ہے جو کھو رہے ہیں وہ پا رہے ہیں
"وہ زیرِ رخسار ہاتھ رکھے مری غزل گنگنا رہے ہیں"
تمہیں بھی وہ واقعات پر لطف جستہ جستہ سنا رہے ہیں

## روسی سائنسد



۸ جنوری ۱۹۴۷ء کو انڈین
انگریس کی مجلس استقبالیہ نے
کانگریس کے اجلاس میں شرکت کرنے
غیر ملکی نمائندوں کو امپریل ہو
دہلی میں چائے کی دعوت پر مدع
جس میں لارڈ اور لیڈی ویول کے
عارضی حکومت کے اراکین نے بھی
کی۔ تصویر میں بائیں طرف سے آ
سردار عبدالرب نشتر' پروفیسر ای۔
پاولوفسکی (روسی سائنس اکیڈیمی
نمائندے) آنریبل پنڈت جواہرلال
اور مسز ہمفریز تشریف فرما ہیں۔

# ہزار سال پرانی قبر میں

امریکہ کے صوبۂ پیرو میں "ویرو" نامی وادی کے
قریب کولمبیا یونیورسٹی کے محققین نے ایک ایسی قبر
کا کھوج لگایا ہے جو تقریباً ایک ہزار سال پرانی ہے
قیاس لگایا گیا ہے کہ اسمیں ایک کاہن کی لاش دفن کی گئی تھی
جو اپنے آپکو "آئی پائس"
دیوتا کا اوتار بتاتا تھا۔
قبر میں لاش کے علاوہ اور
بھی بہت سی چیزیں رکھی
گئی تھیں۔ تصویر ملاحظہ
ہو۔ بائیں طرف تونبے کے
بنے ہوئے چند کشکول
پڑے ہیں۔ بیچ میں پروں
کی بنی ہوئی ٹوپی ہے اور
دائیں طرف شراب کی
صراحیاں جنکو کھوپری کی
وضع پر بنایا جاتا تھا۔ بیچ
میں دو "عصے" بھی پڑے
ہیں جنکے دستوں کی نقاشی
قابل تعریف ہے۔ ان میں سے ایک کی موٹھ پرا
شکل ہے اور دوسری پر انسان کی صورت۔ اس تص
سہرا ڈاکٹر ڈبلیو ڈی اسٹرونگ کے سر ہے اور یہ
"لندن نیوز" سے لی گئی ہے۔



# مستقبل ایران کے ماہرین تعمیرات



ٹکنیکل کالج کے طبیعات کے دارالتجربے میں روشنی کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک ادق آلے سے کام لیا جا رہا ہے۔



طلبا کیمیا کی لیبوریٹری میں خورد بین سے بعض نمونوں کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔

ایران کچھ سال سے برابر صنعتی ترقی کر رہا ہے۔ تمام ملک میں ٹکنیکل کالج اور سکول کھول دئے گئے ہیں۔ ان میں ٹکنیکل ٹریننگ کالج۔ فائن آرٹس ٹکنیکل کالج۔ زنانہ ٹکنیکل سکول کانوں کے سروے کرنے اور لوہے سے فولاد بنانے والے کارخانے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان اداروں کی بدولت ماہرین فن کا ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ٹکنیکل ٹریننگ کالج میں الیکٹریکل۔ مکنیکل۔ مائننگ اور کیمیکل انجینرنگ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ طہران انڈسٹریل انسٹی ٹیوٹ میں بڑھئی اور لوہار کا کام سکھاتے ہیں۔ فائن آرٹس انسٹی ٹیوٹ میں فائن آرٹ اور زنانہ ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں سینا پرونا اور ہیٹ بنانا سکھاتے ہیں۔



ایک استاد اپنے شاگردوں کا خاکہ کشی کا کام دیکھ رہا ہے

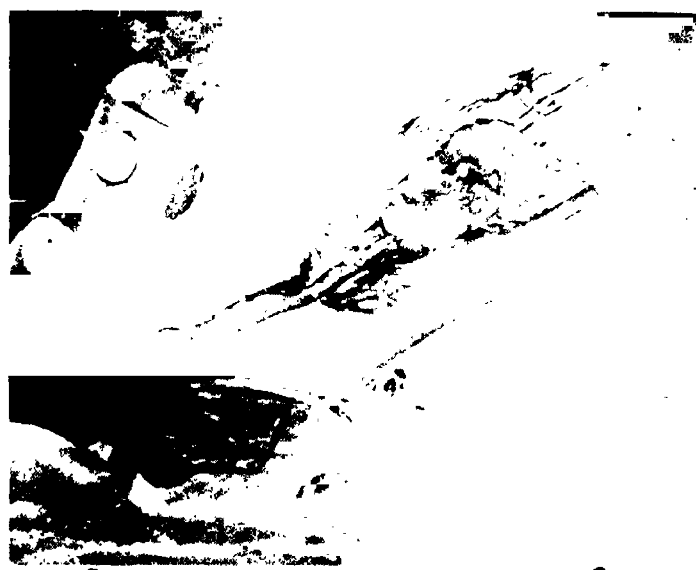
# مصنوعی سمندر کی تہ میں

شہر فلوریڈا کے "میرین اسٹوڈیو" نامی "مچھلی گھر" میں بہت سے آبی جانوروں کی پرورش کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے - اس "مچھلی گھر" کو دنیا کا سب سے بڑا مصنوعی سمندر کہا جاسکتا ہے - لڑائی کے دنوں میں اسے بند کردیا تھا لیکن اب پھر کام جاری ہوگیا ہے - بڑے بڑے ٹینکوں میں دیو پیکر شارکوں کے علاوہ ہر قسم کی چھوٹی بڑی مچھلیوں کے نمونے جمع ہیں جن کو موکھوں میں سے جھانک کر دیکھا جاسکتا ہے - بالکل سمندری نظام کی طرح ہر مچھلی اپنے



چارہ پلانے کے وقت کا ایک منظر - مچھلیوں ، کچھوؤں اور دوسرے جانوروں نے اپنے "ان داتا" کو گھیر رکھا ہے

وجود کو قایم رکھنے کے لئے جد و جہد کرتی ہے - اس "مچھلی گھر" کا اصل مقصد سائنسی تحقیقات تھا لیکن ہزاروں شوقین اسے دیکھنے کے لئے روزانہ آتے ہیں - حال ہی میں "ورے" نامی ایک بہت بڑی مچھلی اس میں اتاری گئی ہے جس کے لئے پچیس آدمیوں کی اور ایک جر ثقیل کی ضرورت پڑی تھی - اس سے قبل اتنے بڑے قد و قامت کی مچھلی کو قید میں کبھی نہیں رکھا گیا تھا - گرم خون، سانس لینے اور دودھ پلانے والی مچھلیوں کو "مچھلی گھر" کے ملازم دو ہفتے میں اسطرح سدھالیتے ہیں کہ وہ انکے ہاتھ سے چارہ کھانے لگتی ہیں - بعض مچھلیاں دل لگی کی عادی ہوجاتی ہیں - وہ ربڑ کی ان رنگین گیندوں و ... کو سطح پر ڈالا جاتا ہے منہ میں پکڑ کر ... میں لے جاتی اور وہاں سے چھوڑ کر ان سے کھیلنے لگتی ہیں - کبھی کبھی وہ ان ڈھانی من کے کچھوؤں کو ستانے لگتی ہیں جو مصنوعی چٹانوں کے پاس بوڑھے فلسفیوں کی طرح خاموش بیٹھے رہتے ہیں - (یہ تصویر "لنڈن نیوز" سے لی گئی ہیں)



غوطے خور ایک پانچسو پونڈ وزنی مچھلی کو چارہ کھلا رہا ہے - ... رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے

پانچ فٹ لمبی شارک مچھلی ایک غوطہ خور کے پاس سے گذر رہی ہے جسنے اپنی حفاظت کے لئے ایک خاص قسم کا لباس پہن رکھا ہے

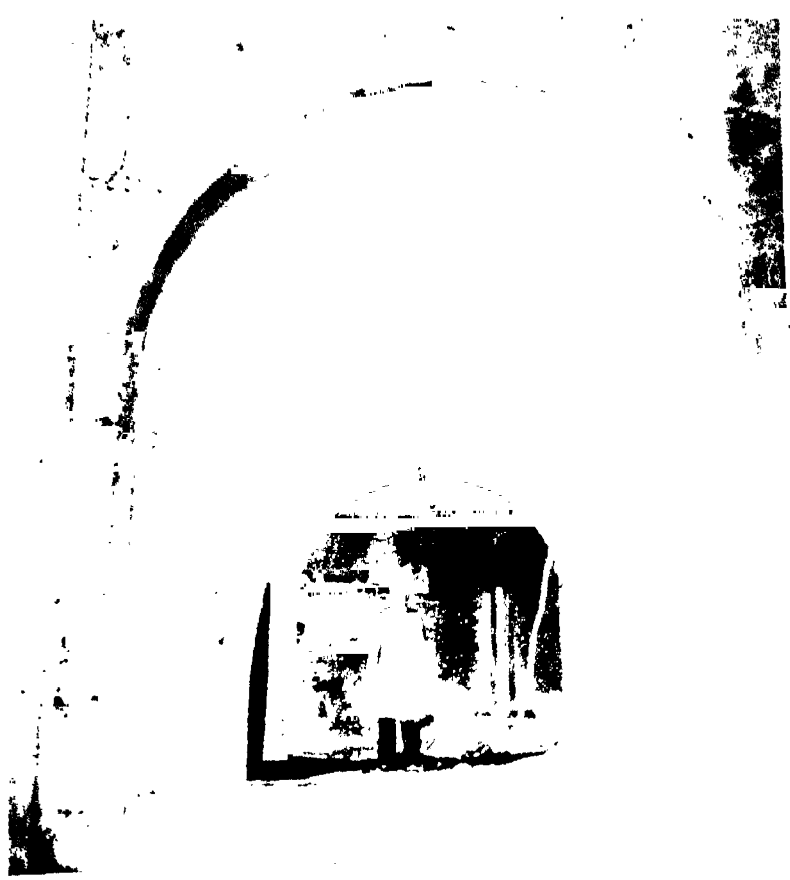
دنیا کے سب سے بڑے "مچھلی گھر" میں سطح سے گیارہ فٹ نیچے ایک عجیب و غریب گول مول مچھلی کو چھوٹی قسم کی مچھلیاں گھیرے چر رہی ہیں ↓



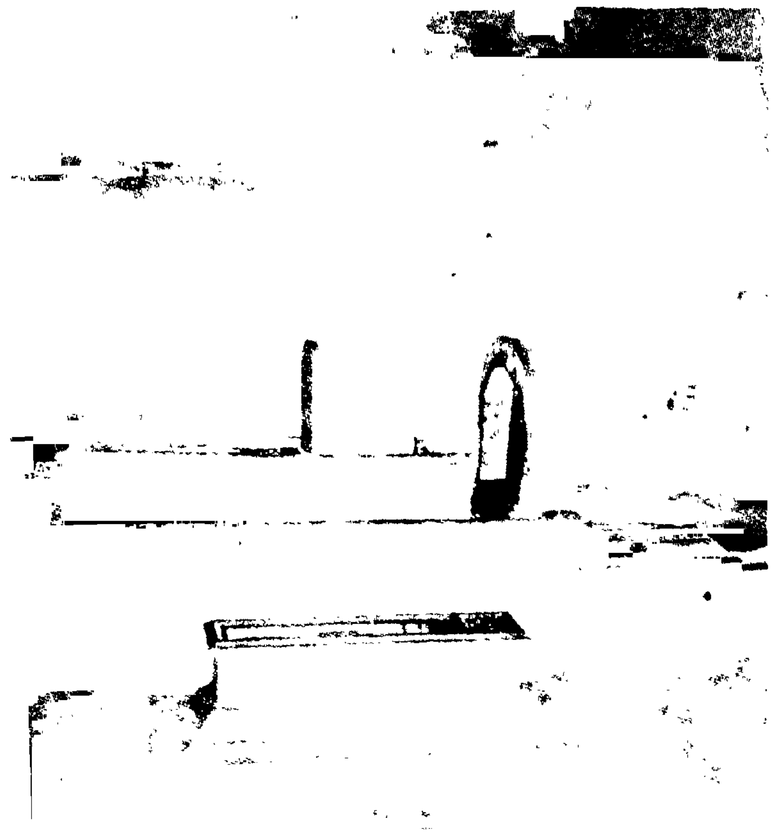




# غالب سے متعلق چند یادگاریں



اس صفحہ پر آپ کو پانچ تصویریں نظر آتی ہیں جن کا تعلق غالب کے سفر حیات کی کسی نہ کسی منزل سے ہے۔ جوں جوں زمانہ گذر رہا ہے وہ یادگاریں کم ہوتی جارہی ہیں جن سے غالب کا شخصی تعلق رہا ہے۔ اس لحاظ سے ان پانچوں تصویروں کی حیثیت ادبی تبرّکات کی سی ہے۔ داھنے صفحہ پر اوپر کی طرف گلی قاسم جاں کی تصویر ہے۔ اس گلی کا ذکر کسی قدر تفصیل سے صفحہ ۱۳ سے شروع ہونے والے مضمون میں آیا ہے۔ لوھارو والوں کی جس حویلی کا تذکرہ اس مضمون میں ہے اسکا پھاٹک گلی کے اس سرے پر ہے جدھر سے یہ تصویر لی گئی ہے۔ سامنے جہاں گلی تنگ ہوتی نظر آتی ہے وہاں داھنے ھاتھ کی طرف غالب کا مردانہ مکان اور اس کے تقریباً سامنے زنانخانہ تھا۔ غالب کے دیوانخانہ کا بیرونی پھاٹک اور ڈیوڑھی اب تک قائم ہے۔ گلی قاسم جان کی تصویر کے نیچے اسی پھاٹک او

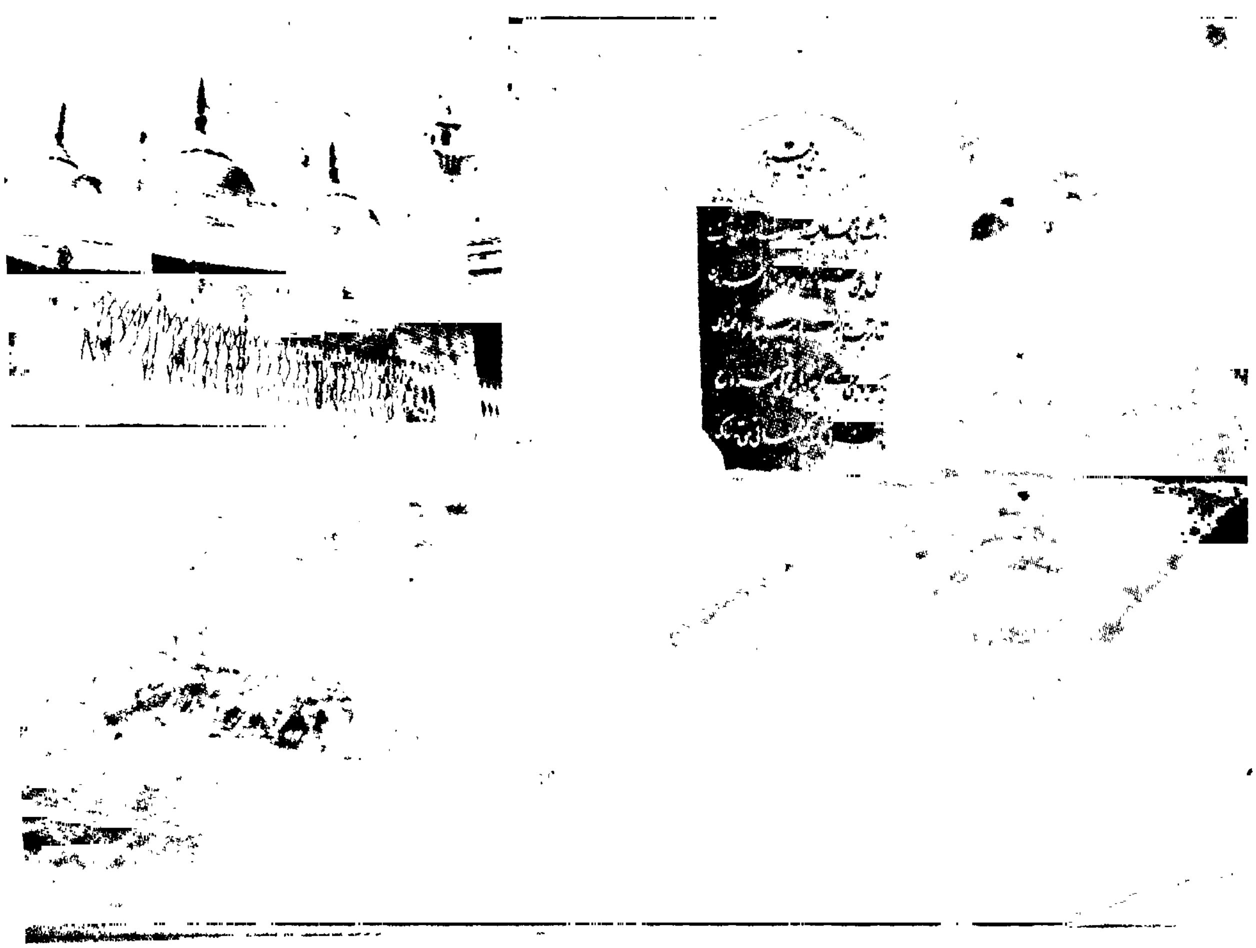


ڈیوڑھی کی تصویر ہے جس میں اندر کے
صحن کی جھلک بھی نظر آرہی ہے۔

غالب کے دیوانخانہ کی پشت پر حکیم محمد شریف خان مرحوم کی مسجد اچھی حالت میں اب بھی موجود ہے۔ اس مسجد کا ذکر غالب نے اپنے اس مشہور شعر میں کیا ہے۔

مسجد کے زیرسایہ اک گھر بنالیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

مسجد بالائی منزل پر ہے۔ اس کی تصویر بائیں صفحے کی بڑی تصویر کے ایک کونہ میں نظر آرہی ہے۔ یہ بڑی تصویر غالب کی قبر کی ہے۔ اسکی لوح پر میر مہدی مجروح کا کہا ہوا قطعہ ہے جس سے غالب کی وفات کی تاریخ نکلتی ہے۔ اس تصویر کے اوپر درگاہ حضرت نظام الدین اولیا سے ملحق قبروں کے اس احاطے کی تصویر ہے جس میں مرزا غالب دفن ہیں۔ غالب کی قبر وہ ہے جس کے سرہانے مدیر آجکل اور پروفیسر حمید احمد خاں کھڑے ہیں۔



# باربادوس





برج ٹاؤن کی بندرگاہ پر جزائر غرب الہند کے تمام حصوں کے جہاز آکر ٹھیرتے ہیں۔ وہاں کی ظاہری حالت انگلستان کی ہر چھوٹی سی بندرگاہ سے ملتی جلتی ہے۔

برج ٹاؤن میں براڈ اسٹریٹ کاروبار کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اس بازار میں ہمیشہ بڑی گہما گہمی رہتی ہے۔



مجمع جزائر غرب الہند میں بالکل مشرقی سرے پر باربادوس ایک ایسا جزیرہ ہے جس میں رہ کر برطانیہ والوں کے دلوں میں اپنے وطن کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ اس لئے اسے جزائر غرب الہند کا «چھوٹا انگلستان» کہتے ہیں۔ ان تصاویر پر سرسری نظر ڈالنے سے مناظر قدرت کے علاوہ جزیرہ کے عام محل وقوع کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ خصوصاً اسکا مشہور شہر برج ٹاؤن انگلستان کا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ کولمبس نے سب سے پہلے اسی جزیرے کو دریافت کیا تھا۔ اس کا رقبہ ۱۶۶ مربع میل ہے اور آبادی تقریباً ڈھائی لاکھ ہے۔

اس مختصر سے جزیرہ پر درختوں کے جھنڈ میں یہ دلفریب منظر انگلستان کے جنگلوں جیسا لطف پیدا کردیتا ہے۔

# 'بغالا' کشتی پہلی بار پانی میں

« بغل » کے لفظی معنی عربی میں مادۂ خچر کے ہیں۔ عربوں نے شروع شروع میں اپنی کشتیوں کو یہ نام دیا کہ ہزاروں برس پہلے سمندروں میں انہیں پر سفر اختیار کیا۔ اسطرح کی کشتیوں میں ۲۰۰ ٹن سے زیادہ وزن لادا جاسکتا ہے۔ خلیج فارس اور عرب کے تقریباً سارے خاص خاص بندرگاہوں میں یہ کشتیاں بنائی جاتی ہیں۔ جنگ کے زمانہ میں جب جہازوں کی بہت کمی تھی ان کشتیوں نے عدن اور جنوبی افریقہ کے درمیان سامان اور مسافر لانے لیجانے کا



بغالا کشتی کا سکان۔ موٹی رسیوں کو دیکھئے جو کشتی کو پانی میں اتارتے وقت سہارے رکھتی ہیں۔ شہر لوگ کشتی کو تنقیدی نظر سے دیکھ رہے ہیں

——:o:——

کام بڑی خوبی سے انجام دیا۔ یہ کشتیاں عرب میں ہوکر ہندوستان آتی ہیں اور یہاں چاول اور لکڑی لاد کر خلیج فارس اور عرب کے بندرگاہوں تک پہنچاتی ہیں۔





ایک نئی کشتی جسے جھنڈوں اور تاڑ کی شاخوں سے سجا رکھا ہے



کشتی کو سیدھا رکھنے کیلئے آڑ لگا رکھی ہے۔ جزر کے وقت یہ آڑ کشتی کو سنبھالے رکھتی ہے۔



# ہم پریشیڈنٹ ہیں

مصنفہ
ظہور بخش

مترجمہ
آغا محمد یعقوب دواشی

سیٹھ دھنا مل پڑھے لکھے تو واجبی ہی تھے پر تھے اندھوں میں کانے راجا۔ خوش قسمتی اور دولت نے زور مارا تو سینی ٹیشن کمیٹی کے ممبر ہی نہیں پریسیڈنٹ بن بیٹھے۔ پھر کیا تھا قصبے بھر میں ان کا طوطی بولنے لگے۔ وہ جہاں نکل جاتے بھونچال سا آجاتا۔ بچے کھیل کود بھول کر ادھر ادھر بھاگ جاتے۔ چلتی عورتیں گھونگھٹ میں سمٹ کر رفٹ ہاتھ میں دبک رہتیں اور لوگ سر جھکا جھکا کر سلامی داغنے لگتے۔ مگر سیٹھ جی ڈانٹ پھٹکار کرتے سوتے ہوئے بکتے جھکتے آگے قدم بڑھاتے جاتے۔ اس طرح گھر پہنچتے پہنچتے نہ جانے کتنے لوگوں پر خفا ہو کر دیتے: "تم نے ہمیں کیا سمجھا ہے۔ یاد رکھو ہم پریشیڈنٹ ہیں پریشیڈنٹ! نالائق کہیں کے!"

حکومت کی اس جھونک میں سیٹھ جی کبھی کبھی سینی ٹیشن کمیٹی کے سکریٹری پنڈت رام سکھ بچولی پر بری طرح برس پڑتے تھے: "آخر تم ہوس مرض کی دوا؟ اب تمہیں کتنی بار سمجھایا جاوے کہ ہم پریشیڈنٹ ہیں۔ قانون کی کس کتاب میں لکھا ہے کہ سکتر ہمیشہ پریشیڈنٹ کے حکم پر ٹال مٹول کیا کرے؟ ہم تو رحمدل آدمی ہیں یہ نہیں چاہتے کہ کسی کو نقصان پہنچے۔ اسی لئے غم کھا کر رہ جاتے ہیں۔ مگر تم ہو کہ اپنی حرکتوں سے باز ہی نہیں آتے۔ جانتے ہو کہ ہمارے قلم میں کتنی طاقت ہے؟ ہم پریشیڈنٹ ہیں کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں۔ جس دن بڑے صاحب کے پاس رپٹ لکھ کر بھیجیں گے اس دن آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔

بچولی جی اصل میں ہندی مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ تنخواہ تو بہت معمولی پاتے تھے مگر تھے بڑے زندہ دل اور خوش مزاج۔ دن بھر خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنسایا کرتے تھے۔ اس لئے قصبے کے سبھی فرقوں میں بڑی ریجھ بوجھ تھی۔ سکرٹری شپ تو ان کے لئے محض ندی ناؤ سنیوگ کی بات تھی۔ پھر بھی وہ سیٹھ جی کے ساتھ کسی طرح کی بحث میں نہیں پڑتے تھے ان کے رعب کو اپنی میٹھی ہنسی میں اڑا دیا کرتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی اتنا ضرور کہہ دیا کرتے تھے "آپ رعب گانٹھتے ہیں میں ڈر جاتا ہوں۔ اگر یہی حال رہا تو کسی دن سکرٹری شپ سے ہاتھ جوڑ لوں گا۔"

مگر سیٹھ جی یوں ماننے والے آدمی نہ تھے۔ انھوں نے دو چار بار بچولی جی کی عرض سننے کے بعد صاف صاف کہہ ڈالا: "سکتر جی یہ دھمکی کسی بیوقوف کو دیا کرو۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ ہمارے سامنے تمہارا یہ رنگ نہ چلے گا۔ سکتر جی کام کرتے ہو تو پانچ روپیہ مہینہ الاؤنس بھی پاتے ہو۔ آخر تمہیں تنخواہ ملتی کتنی ہے؟ پندرہ روپلی یا اور کچھ؟ سو ماسٹر جی پانچ روپے سے ہاتھ جوڑ لینا تمہارے بوتے کی بات نہیں۔ غرض ہو تو ہزار بار ہمارا رعب سہو ورنہ ماؤ استعفا پیش کرو۔ سب دن گنڈے سکڑ مل جائیں گے۔ یہ درجہ اور یہ الاؤنس پانے کے لئے تمہارے ہی نائب ماسٹر ہماری جوتیوں پر دس دس بار ناک رگڑیں گے۔ سمجھے؟"

"جی ہاں سمجھ گیا۔ میں تو غریب آدمی ہوں۔ خدمت میں عرضی پیش کرنا میرا کام ہے۔ اس پر غور کریں یا نہ کریں یہ آپ کی مرضی ہے۔" اتنا کہتے کہتے بچولی جی خاموش ہو گئے۔

"اب آئے ماسٹر جی تم راستے پر۔ ہم مالک ہیں تم نوکر۔ ہم رعب گانٹھیں تم ہنا کان پونچھ ہارے رعب سہو۔ بس یہی تو عہدے کی بات ہے۔ دیکھنا تو کچھ دنوں میں کیا ہوتا ہے۔ اگر تمام قصبے کو نکیل کر نہ رکھ دوں تو ہم سیٹھ دھنا مل نہیں۔ نہیں پریشیڈنٹ ہی کیسے؟" کہتے کہتے سیٹھ جی بڑے رعب کے ساتھ اپنی مونچھیں اینٹھنے لگے۔

ایک دن کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ تقریباً ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ حال ہی کی آئی ہوئی ڈاک میز پر پڑی تھی اور بچولی جی پوسٹ کارڈ لفافے، پیکٹ وغیرہ چھانٹ چھانٹ کر سلسلے سے رکھتے جاتے تھے اتنے میں سیٹھ جی بھی وہاں آ پہونچے اور لگے زوروں سے دن دنانے "کیا ہو رہا ہے ماسٹر جی؟ ارے تم تو ڈاک دیکھ رہے ہو۔ کچھ ہمارے نام پر بھی آیا ہے؟"

بچولی جی نے ایک میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی طرف کرسی بڑھاتے ہوئے کہا: "میں خود ہی آپ کو بلانے والا تھا۔ واقعی آپ بڑے اچھے موقعہ پر آئے۔ تشریف رکھئے۔"

"کیوں، بات کیا ہے؟" سیٹھ جی نے کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے سوال کیا۔

"بس یہی سمجھ لیجئے کہ پانچوں گھی میں ہیں اور سر کڑھائی میں۔ مگر پہلے منہ میٹھا کروا دیجئے۔" بچولی جی نے ہنستے ہنستے جواب دیا۔

"منہ میٹھا کروانا کون بڑی بات ہے مٹھائی سے پاٹ دیں گے ماسٹر جی۔ ذرا سناؤ تو سہی کیا ہمیں کہیں کا راج مل گیا ہے؟" مسکرا کر سیٹھ جی نے پوچھا۔

"یہ دیکھئے۔" کہتے ہوئے بچولی جی نے ایک لفافہ سیٹھ جی کی طرف بڑھا دیا۔

"ارے یہ تو انگریزی میں ہے۔ بھلا ہم انگریزی ونگریزی کیا جانیں۔

اگر معلوم ہو تو اس کا مطلب سمجھا دو۔" سیٹھ جی نے لفافہ کے اندر رکھا ہوا کاغذ نکالا اور اس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ بڑے صاحب کا پروانہ ہے۔ انہوں نے خوش ہو کر آپ کو کئی بڑے بڑے اختیارات دئے ہیں۔" پچولی جی نے ذرا خوشی کے لہجے میں بتلایا۔

"اچھا۔ بڑے صاحب نے ہمیں بڑے بڑے اختیارات دئے ہیں؟ ذرا اچھی طرح پڑھ کر سمجھاؤ، ماسٹر جی۔ یہ لو اپنا انعام" یہ کہتے کہتے سیٹھ جی کا چہرہ کھل اٹھا اور انہوں نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر پچولی جی کی طرف بڑھا دیا۔

"واہ اس کی کیا ضرورت ہے" کہہ کر پچولی جی نے نوٹ اپنی جیب میں ڈالا اور سیٹھ جی کے ہاتھ سے لفافہ لے کر پڑھنا شروع کیا۔

"مسٹر دھنا مل سیٹھ۔

آپ نے اب تک سینی ٹیشن کمیٹی کا کام بہت اچھی طرح چلایا ہے۔ اس لئے ہم نہایت خوش ہیں اور آپ کو نیچے لکھے اختیار دیتے ہیں۔

(۱) آپ اپنے قصبے کے کسی آدمی پر جرمانہ کر سکتے ہیں مگر جرمانے کی رقم دو سو روپے سے زیادہ نہ ہو۔

(۲) آپ اپنے قصبے کا کوئی بھی مکان بے دھڑک گروا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ بغیر آپ کی مرضی کے بنوایا گیا ہو۔

(۳) آپ اپنے قصبے کے کسی آدمی کو جیل بھیج سکتے ہیں مگر سزا کی میعاد چھ مہینے سے زیادہ نہ ہو۔

(۴) اور یہ لکھے ہوئے اختیار آپ جب چاہیں سینی ٹیشن کمیٹی کے سکریٹری کی صلاح سے عمل میں لا سکتے ہیں۔

(دستخط)

جی۔ ایم۔ بھر کھڑیا، ڈپٹی کمشنر

یہ سنتے ہی سیٹھ جی اچھل پڑے۔ پچولی جی بولے "آج کے [illegible] بڑھیا نمبر ہے۔ ایسے اختیارات آج تک شاید ہی کسی ہندوستانی کو ملے ہوں۔"

"دھن بھاگ، ہم تو تر گئے ماسٹر جی۔ بھگوان کرے بڑے صاحب جگ جگ جئیں۔ دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔ اگر ان کی ایسی ہی مہربانی بنی رہی تو کیوں ماسٹر جی کسی دن ہمیں پھانسی دینے کا اختیار بھی مل جائیگا؟"

"اگر آپ اسی طرح سینی ٹیشن کمیٹی کا کام چلاتے رہیں تو میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سال تین مہینے کے اندر پھانسی کی سزا کا اختیار بھی مل جائے گا۔ مگر ایک بات ہے۔ آئندہ قصبے میں جو سرکاری افسر آئیں ان کی خاطر تواضع دل کھول کر کیا کیجیے گا۔ آپ تو خود جانتے ہیں کہ روٹی کا ٹکڑا پانے سے کتا بھی خوش ہو جاتا ہے، پھر سرکاری افسر تو آدمی ٹھہرے۔ اگر آپ ان کی خاطر تواضع کریں گے تو وہ کیوں نہ خوش ہوں گے۔ جہاں انہوں نے ضلع صاحب سے آپ کی سفارش کی تہاں آپ پھانسی دینے کا اختیار ملا ہی سمجھئے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ آئندہ اس معاملے پر ہم خاص طور سے خیال رکھینگے۔ ہاں ماسٹر جی، کیا ضلع صاحب نے ہمیں مسٹر کا خطاب بھی دیا ہے؟"

"اور نہیں تو کیا؟ یہ دیکھئے۔ صاف تو لکھا ہے۔ ایم۔ آئی۔ ایس۔ ٹی۔ آر مسٹر۔ اب تو ہوا آپ کو بھروسہ؟"

"آہا! تب تو بڑے صاحب سچ مچ بھلے آدمی ہیں۔ اچھا دیکھو ماسٹر جی، اب ہمیں آئندہ مسٹر سیٹھ ہی کہا کرو۔ سمجھے؟ ہاں ایک بات اور بتلاؤ۔ اب ہم مسٹر ہو چکے ہیں، اتنے بڑے بڑے اختیار پا چکے ہیں۔ اس لئے کچھ جلسہ ولسہ بھی ہونا چاہیے۔ پرواہ نہیں ہزاروں ہی کھنک جائیں مگر دھوم دھام ایسی رہے کہ لوگ واہ واہ کر اٹھیں۔ بولو کیا کہنا ہے تمہیں؟"

"کہنا کیا ہے؟ کل سویرے ہی ڈھنڈورا پٹوا دیجئے۔ جس سے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آپ کو کونسا خطاب ملا ہے۔ کون کون سے اختیار ملے ہیں۔ اس کے بعد علاقے کے اور قصبے کے خاص خاص لوگوں کو ٹھٹے دار دعوتیں دیجئے۔ شہر سے چار پانچ طوائفیں بلوا لیجئے۔ روز شام کو آتشبازی چھڑوا دو اور بھی اچھا۔ پھر شام رات ناچ مجرے میں گذرے۔"

"کیوں نہ ہو! ماسٹر جی تو ٹھہرے۔ تم نے صلاح کیا دی ہمارے من کی بات کہہ دی۔ سچ مانو ہم ایسا ہی کریں گے۔ اچھا لاؤ یہ پروانہ ہمیں دیدو۔ اب چلیں طوائفیں بلوائیں اور آتشبازی منگانے کا کچھ انتظام کریں۔" یہ کہتے کہتے سیٹھ جی کھڑے ہو گئے۔

"پروانہ تو آپ کو نہیں مل سکتا۔ یہ سرکاری کاغذ ہے۔ دفتر کے فائل میں رہے گا۔ آپ اس پر دستخط کر دیجئے۔" پچولی جی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے" کہہ کر سیٹھ جی نے کاغذ پر دستخط کر دئے۔

اس کے بعد وہ باہر نکلے اور جھومتے جھامتے آگے بڑھے۔ مگر راستے میں جو ملتا اسی کو دیکھ کر رک جاتے اور کہنے لگتے: "بھیا ہماری تو بھیا سدھ ہو گئی۔ پریسیڈنٹ تو ہم تھے ہی، اب مسٹر بھی ہو گئے ہیں۔ چاہے جس پر جرمانہ ٹھوک دیں، چاہے جسے بڑے گھر کی ہوا کھانے بھیج دیں۔ چاہے جس کا گھر گروا دیں۔ آج ہی تو ضلع صاحب کا پروانہ آیا ہے۔ اب بچے بچے کا قصبے بھر میں ہمارا ڈنکا۔ آس پاس کے رہنے والوں کو بھی یہ خبر سنا دینا۔ سویرے تو ہم ڈھنڈورا پٹوا ہی دیں گے۔ جلسے بھی سات دن تک ہوں گے۔ آتشبازی ہوگی۔ رنڈیوں کا ناچ ہوگا۔ کھانا پینا ہوگا۔ تم بھی آنا۔ تماشا دیکھنا بھلا؟"

دھوم دھام سے فرصت ملی تو سیٹھ جی کا وہی حال ہوا کہ ایک تو کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ وہ اب سینی ٹیشن کمیٹی کے چپراسی کو ساتھ لیتے اور بلاناغہ صبح و شام قصبے کا چکر لگانے نکل پڑتے۔ جہاں چار آدمی بیٹھے پاتے

وہیں ٹھہر جاتے اور بڑبڑانے لگتے: "ایں! یہ پنچایت کس کے حکم سے ہو رہی ہے؟ ہم پریشیڈنٹ ہیں، منسٹر ہیں، چاہیں تو تم پر جرمانہ ٹھونک دیں، تمہیں جیل بھیجدیں، تمہارے گھر دھول میں ملوادیں۔ خبردار جواب ہم سے حکم لئے بغیر کسی طرح کا جاؤ کیا۔ بنا سینگ کے گدھے۔ بے وقوف۔ پاجی کہیں کے!"

جہاں کہیں چار بچے کھیلتے نظر آتے وہیں رک جاتے اور چپراسی کو حکم دیتے: "ابے الو کے پٹھے! ان بنا دم کے بندروں کو سمجھا کہ سرکاری سڑک پر اودھم مچانا قانون کے خلاف ہے۔ سو بھی منسٹر سیٹھ کی علداری میں۔ وہ پریشیڈنٹ ہیں، چاہیں تو تمہیں جیل بھجوادیں اور تمہارے گھر کھدوا کر پھینک دیں۔ کسی پر جرمانہ ٹھونک دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے...... ابے جا، انکو سمجھا جلدی کر۔ نہیں تو ہم تجھے ہی جیل بھیجتے ہیں۔"

اگر کسی غریب کے دروازے پر کوڑا کرکٹ پڑا دیکھتے، تو آپے سے باہر ہوجاتے اسے بلاکر خوب ڈانٹ پھٹکار دکھاتے: "تجھے معلوم ہے ہم کون ہیں، تو جانتا ہے ہمیں کتنے بڑے بڑے اختیار حاصل ہیں؟ سن ہم پریشیڈنٹ ہیں، منسٹر ہیں۔ چاہیں تو کسی کو بھی جرمانہ کردیں، کسی کو بھی جیل بھیجدیں اور کسی کا بھی گھر مٹی میں ملوا دیں۔ اگر کبھی کوڑا کچرا دکھائی دیا تو ہم ایکدم تیرا گھر ہی پھنکوادیں گے۔ سمجھا؟"

اس طرح سب لوگوں پر سیٹھ جی کا رعب غالب ہوگیا۔ وہ آپس میں ملتے جلتے اور گپ شپ کرتے بھی خوف کھاتے کہ کہیں سیٹھ جی نہ آپہنچیں۔ مگر سیٹھ جی کی حکومت کی پیاس اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس لئے بےچین رہتے اور بات بات میں چڑ اٹھتے تھے۔ نوکروں چاکروں اور بال بچوں پر بگڑ پڑتے یہاں تک کہ ہاتھ چلا بیٹھتے تھے۔ ایک دن انھوں نے پچولی جی سے کہا: "اختیار ملے پورا ایک ماہ ہونے کو آیا مگر ہم نے نہ کسی پر جرمانہ کیا، نہ کسی کو جیل بھیجا، نہ کسی کا گھر گروایا۔ بڑے صاحب کیا کہتے ہوں گے کہ ہم نے بھی کس نکھٹو کو اختیار دئے۔ تم تو کوئی صلاح مشورہ دیتے ہی نہیں۔"

"منسٹر سیٹھ، اختیار عمل میں لانا نہ لانا تو آپ کی مرضی پر ہے۔ میں تو آپ کے حکم کا تابعدار ہوں۔ صلاح مشورہ دینے سے میں نے کب انکار کیا ہے؟ کسی پر جرمانہ ٹھوکئے، کسی کو جیل بھیجئے، یہ کسی کا گھر ہی گروا دیجئے۔ اگر آپ یوں خاموش بیٹھے رہیں گے تو کسی دن بڑے صاحب تمام اختیار چھین لیں گے۔"

یہی تو ہم سوچتے ہیں۔ ہمارا منشا یہ ہے کہ پہلے کسی کو جیل بھیجنا چاہئے۔ پھر تو تمام قصبہ کانپ اٹھے گا اور بڑے بڑے افسروں کو معلوم ہو جائے گا کہ منسٹر سیٹھ نے بھی کسی کو سزا دی ہے۔ بولو کیا رائے ہے تمہاری؟"

"سوچا تو آپ نے اچھا ہے۔ ہے کوئی مجرم آپکی نظر میں؟"

"ہے کیوں نہیں، یہی ہیلتھ منسٹر کا یہ چپراسی۔ بدمعاش۔ کام چور۔ بےایمان جنگی۔ ہم پہلے اسی پر ہاتھ صاف کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیوں، جنگی نے کوئی قصور کیا ہے کیا؟"

"قصور؟ قصور تو اس نے بہت بڑا کیا ہے۔ کیا تم حکم عدولی کو کوئی معمولی قصور سمجھتے ہو۔ آج کی ہی بات سنو۔ دکان میں چیٹن نے پاخانہ پھیر دیا۔ جنگی سامنے بیٹھا تھا۔ ہم نے اسے حکم دیا: "یہ پاخانہ صاف کردو۔" اس پر اس نے پاخانہ تو صاف کیا نہیں الٹا گستاخانہ جواب دیا: "میں بھاکر ہوں پاخانہ صاف کرنا میرا کام نہیں۔" تب تو ماسٹر جی ہماری طبیعت جل کر خاک ہوگئی۔ ہم نے من میں کہا: "رہو بیٹا۔ اگر تمہیں جیل بھیجے بڑے گھر کی ہوا نہ کھلائی ہو تو ہمارا نام بھی منسٹر دھنا مل نہیں۔ آخر ہم پریشیڈنٹ ہیں کچھ مذاق نہیں۔"

"سچ ہے جب چیونٹوں کی شامت آتی ہے تو ان کے پنکھ نکلتے ہیں۔ سرکار قصور تو جنگی نے اتنا بڑا کیا ہے کہ اسے ایکدم پھانسی پر لٹکا دینا چاہئے۔ مگر افسوس ابھی آپ کو پھانسی دینے کا اختیار ملا ہی نہیں ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ چلئے کل سویرے اسے گرفتار کریں۔"

"مگر ہمارے پاس ہتھکڑیاں تو ہیں ہی نہیں۔"

"ہتھکڑیاں نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ ہم اسے رسی سے ہی بندھوائیں گے۔ آپ تیار رہئے۔ میں پو پھٹتے ہی حاضر ہو جاؤں گا۔ پھر دیکھیں گے کہ وہ کیسا جنگی ہے کتنے پانی میں ہے؟"

دوسرے دن سویرا ہوتے ہی دونوں آدمی جنگی کے دروازے پر جا پہنچے۔ پچولی جی نے آواز دی: "جنگی باہر نکلو۔"

یہ سنتے ہی جنگی باہر نکلا اور باہر نکلتے ہی ایک طرف کو بھاگا۔ پھر کیا تھا، دونوں نے اس کا پیچھا کیا۔ پچولی جی دبلے پتلے پست قد جوان تھے اسلئے جنگی کے پیچھے کچھ دوڑ بھی لیتے تھے مگر سیٹھ جی کا برا حال تھا۔ وہ بار بار

## غزل ـــ شہید بدایونی

فریب حسن میں انسان اکثر آ ہی جاتا ہے
سمجھتا ہے یہ سب کچھ پھر بھی دھوکا کھا ہی جاتا ہے

کبھی پوری بھی ہو جاتی ہیں امیدیں محبت میں
مگر اکثر نظام آرزو بدلا ہی جاتا ہے

نہ شکوہ لب پہ آتا ہے نہ آنکھیں نم ہی ہوتی ہیں
مگر چہرے پہ رنگ بےقراری آ ہی جاتا ہے

نہیں دکھتے ہیں بار غم سے شانے گو محبت میں
مگر اک وقت آتا ہے کہ دل گھبرا ہی جاتا ہے

یہ چپ رہنا کہیں وجہ غلط فہمی نہ بن جائے
خموشی کو زبان آرزو سمجھا ہی جاتا ہے

شہید اب عشق کے ہونٹوں میں وہ گرمی نہیں باقی
مگر چہرے پہ پھولوں کے پسینہ آ ہی جاتا ہے

اپنی توند اور ڈھیلی ڈھالی دھوتی سنبھالتے، ٹھمک ٹھمک چلتے اور آواز لگاتے جاتے تھے: "اے کھڑا رہ، او جنگی کے بچے! کھڑا رہ۔ ہم پریسیڈنٹ ہیں، مسٹر ہیں۔ ذرا ٹھہر تو، ابھی تجھے بڑے گھر کی ہوا کھانے بھیجتا ہوں۔"

یہ سن کر جنگی کبھی کبھی ٹھہر جاتا تھا مگر جوں ہی وہ دونوں پاس پہنچتے تھے بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔ یہ دوڑ گھنٹوں ہوتی رہی۔ جنگی نے پہلے تو انہیں قصبے کی سڑکوں اور گلیوں کے خوب چکر کٹوائے۔ پھر وہ ان کو قصبے کے باہر اونچی نیچی ناہموار زمین پر لے گیا۔ اب تو سیٹھ جی اور بھی آفت میں پڑے۔ جھاڑیوں نے ان کی دھوتی جگہ جگہ سے نوچ ڈالی اور وہ خود کئی بار ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچے۔ آخر بے چارے بے دم ہو کر ہانپنے لگے اور ایک چٹان پر بیٹھتے بیٹھتے بولے: "رہنے دو ماسٹر جی! بدمعاش نے بہت پریشان کیا۔ اب اور کوئی ترکیب سوچیں گے۔"

پھولی جی نے ان کے سامنے دوسری چٹان پر ڈیرہ ڈالتے ہوئے کہا: "سرکار یہ تو بڑی شرم کی بات ہوئی۔ پہلی ہی بار مجرم کو گرفتار نہ کر سکے۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

"خیر چنتا کی کوئی بات نہیں۔ ہم کل ہی اس کا گھر زمین دوز کرا دیں گے۔ پھر تو لوگ آپ ہی سمجھ جائیں گے کہ بدمعاش اور مجرم کسی طرح ہمارے چنگل سے بچ کر نکل نہیں سکتے۔"

"بڑی غلطی ہوئی۔ اگر آپ نے پہلے ہی یہ بات کہی ہوتی تو اتنی پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔ دوڑتے دوڑتے میری تو بری حالت ہو گئی۔"

"اور ہماری حالت؟ ذرا یہ دھوتی تو دیکھو کیسی چیتھڑے چیتھڑے ہو گئی ہے۔ مگر اس ہائے ہائے سے کیا فائدہ؟ آج چار پانچ مزدوروں سے کہہ دو کل سویرے سات بجے گینتی پھاوڑے لے کر ٹھکانے پر آ جائیں۔ پھر دیکھیں گے بیٹا جنگی کتنی اچھل کود مچاتے ہیں۔"

اگلے دن سات بجتے ہی جنگی کے گھر پر دھاوا بول دیا گیا۔ سیٹھ جی نے مزدوروں سے کہا: "ٹکر ٹکر کیا دیکھتے ہو، چلاؤ نا گینتی۔ اس گھر کو ابھی کھود کر مٹی میں ملا دو۔ سوچنے کی کیا ضرورت؟ ہم حکم تو دے رہے ہیں۔ چلاؤ چلاؤ گینتی۔ دیر مت کرو۔"

اتنے میں جنگی لٹھ لئے باہر آیا اور بولا: "جو مجور گینتی پھاوڑے لے کے ٹھاڑے؟"

سیٹھ جی نے جواب دیا: "کاہے ٹھاڑے ہیں؟ تیرا گھر گرا دے۔ اور تیں مان ہمارے حکم۔ ابھی مالوم پڑے جات۔ ہم پریسیڈنٹ آئیں۔"

یہ سنتے ہی جنگی نے لٹھ گھمانا شروع کیا اور مزدوروں سے گرج کر کہا: "جا سمجھ لو کہ تم نے گینتی چلائی اور ہم نے تمہاری مونڈی چور چور کریں۔ جات ہو اِتیں سیں کے نہیں؟ ان کھیں تو ہم آپن دیکھیں لیت۔ ہم سو ڈنڈ کھا کر آئیں۔"

اب تو پھولی جی وہاں سے چیختے چلاتے بھاگے۔ ان کے پیچھے پیچھے سیٹھ جی بھی گرتے پڑتے بھاگے ہوئے۔ دونوں ایک دم سکول میں پہنچ کر ہی رکے۔ پھولی جی کرسی پر گرتے گرتے بولے: "مسٹر سیٹھ اس معاملے میں تو ہم لوگوں کی بڑی کرکری ہوئی۔ اگر وہاں سے نہ بھاگتے تو جنگی ہم دونوں کو زندہ نہ چھوڑتا۔ ذرا اس کی ہمت تو دیکھئے۔ پاجی نے ایک دم لٹھ گھمانا ہی شروع کر دیا۔"

سیٹھ جی پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں گھبراہٹ تھی اور چھاتی دھونکنی سے ٹکر لینے لگی تھی۔ وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئے اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے کہ کہیں جنگی نہ آتا ہو۔ جب طبیعت کچھ ٹھکانے پر آئی تو انہوں نے کہا: "ہمارا خیال تھا کہ جنگی غریب ہے، دبو ہے۔ ہم اسے آن کی آن میں پکڑ کر جیل بھیج دیں گے۔ مگر وہ تو شیر نکلا ماسٹر جی، پورا شیر۔ جب اس نے لٹھ گھمایا تو ایسا جان پڑا جیسے ہماری جان ہی نکل گئی ہو۔ اب تمہیں کوئی اپائے نکالو۔ اگر وہ سزا نہ پا سکا تو لوگوں پر سے ہماری دھاک اٹھ جائے گی۔"

"دھاک اٹھ جائے گی؟ کیا سرکار نے دھاک اٹھانے کے لئے ہی اتنے اختیار سونپے ہیں؟ بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی۔ چوروں بدمعاشوں کی شیطانی سے کسی کی دھاک نہیں اٹھتی۔ آپ ٹھہرئے تو، میں اسے جیل بھجواؤں گا۔ ذرا دماغ ٹٹولنے دیجئے۔ دیکھوں کوئی اپائے سوجھتا ہے یا نہیں۔" یہ کہتے کہتے پھولی جی آنکھ بند کر کے گم سم ہو گئے۔

"ٹھیک ہے۔ ایک چھوڑ دو دماغ کام کریں گے تو کامیابی کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ اچھا ہم بھی سوچتے ہیں۔" کہتے ہوئے سیٹھ جی نے آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد پھولی جی نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا: "کیوں مسٹر سیٹھ، سوجھا کوئی اپائے؟"

سیٹھ جی نے آنکھیں کھول کر جواب دیا: "اپائے تو ایک بھی نہیں سوجھا ماسٹر جی۔ کیا اس معاملے میں ہمیں پولس سے کچھ سہاتیا نہیں مل سکتا؟"

پھولی جی اچھل پڑے اور بولے: "واہ کیا کہنا! اپائے تو آپ نے بہت بڑھیا سوچا۔ بس لکھئے تھانیدار صاحب کو ابھی ایک آرڈر۔ پھر تو وہ جنگی کو پکڑ کر جیل بھیج ہی دیں گے۔ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔"

سیٹھ جی نے تعجب سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پھولی جی کو دیکھتے ہوئے کہا: "کہتے کیا ہو ماسٹر جی۔ تھانیدار صاحب کو آرڈر لکھ دوں؟ وہ ناراض نہ ہوں گے؟"

"ناراض کیوں ہوں گے؟ وہ تنخواہ کس بات کی پاتے ہیں؟ چوروں بدمعاشوں کو پکڑ کر جیل بھیجنا تو ان کا کام ہی ہے۔ پھر آپ پریسیڈنٹ ہیں، مسٹر ہیں اور ہیں آنریری مجسٹریٹ۔"

"ارے تو کیا ہم آنریری مجسٹریٹ بھی ہیں؟"

"تعجب ہے ابھی آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں۔ بھلا جرمانہ کرنے، جیل بھیجنے اور مکان گروانے کے اختیار مجسٹریٹ کے سوا اور کسے ملتے ہیں۔ مجسٹریٹ حکم دیتا ہے اور پولس اس کی پابندی کرتی کراتی ہے۔ آپ نے

کچہری میں دیکھا ہوگا مجسٹریٹ نے سزا سنائی نہیں کہ پولس نے آگے بڑھ کر مجرم کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں بھر دیں۔ یہ تو میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ مجسٹریٹ خود ہی مجرم کو جیل بھیجنے جاتا ہو۔ آپ تھانیدار صاحب کو آڈر دیجئے تو سہی۔"

"واہ ماسٹر جی،" اتنی بڑی بات اور تم نے ہمیں اب تک نہ بتلائی۔ اچھا تو تمہیں لکھو مگر ذرا رگڑ رگڑ کر جس سے تھانیدار صاحب کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ ہم خالی پریسیڈنٹ اور منشڑ ہی نہیں ہیں انا ڑی مجسٹریٹ بھی ہیں۔"

نہیں حضور، میرا لکھنا غیر قانونی ہوگا۔ فیصلہ یا حکم تو مجسٹریٹ کو اپنے ہی ہاتھوں سے لکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے آپ خود لکھئے۔ مضمون میں بولے جاتا ہوں۔"

"تو لاؤ کاغذ قلم دوات، ہمیں لکھتے ہیں۔ جب تک جنگی جیل نہ جائیگا۔ ہمیں چین نہیں ملے گا۔"

کاغذ سامنے اور قلم ہاتھ میں آتے ہی سیٹھ جی لکھنے کے لئے بیٹھ گئے۔ بچولی جی نے مضمون بولنا شروع کیا:

"ستی شری پتشانتی وِرگ جہانشیو تھانے سروا پری براجمانے شری پانچ

تھانیدار صاحب کو منشڑ دھنا مل سیٹھ کا سلام پہونچے۔ بھگوان کی دیا سے یہاں کشل منگل ہے۔ آپ کا کشل منگل چاہئے۔ تو پیچھے سماچار یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم اس قصبے کے پریسیڈنٹ ہیں۔ انا ڑی مجسٹریٹ ہیں۔ سینی ٹیشن کمیٹی کا چپراسی جنگی ٹھاکر سولہ آنے تو کیا بیس آنے بدمعاش ہے۔ اس لئے ہم نے غصے میں آکر اسے پورے چھ ماہ کی کڑی سزا دی ہے۔ اب آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اسے فوراً سے پیشتر گرفتار کر کے جیل بھیج دیجئے۔ یہ یاد رکھئے کہ اگر آپ کسی طرح کی غفلت کریں گے تو اپنے کئے کا پھل پا دیں گے۔ تھوڑا لکھا بہت سمجھنا۔

(دستخط)

منشڑ دھنا مل سیٹھ

پریسیڈنٹ اور انا ڑی مجسٹر

جب قلم آرام کرنے کے لئے میز پر لیٹ رہا تو بچولی جی نے کاغذ اٹھا لئے اور کہا: "اب لگی جنگی کے گلے میں پھانسی۔ یہ حکم پڑھتے ہی تھانیدار صاحب کا پتا پانی ہو جائیگا۔ حضرت ابھی سپاہیوں کو ساتھ لے کر جنگی کے پیچھے پیچھے دوڑتے نظر آویں گے۔"

اس کے بعد انھوں نے یہ حکم ڈاک بہی پر چڑھا کر تھانیدار صاحب کے پاس بھیج دیا۔ تھانیدار صاحب خود موجی انسان تھے۔ اکثر بچولی جی کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے دل بہلایا کرتے تھے۔ یہ حکم پڑھتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے منشی جی سامنے بیٹھے ڈائری لکھ رہے تھے۔ تھانیدار صاحب کو اس طرح ہنستے دیکھکر دھیرے سے بولے: "کیوں، کیا بات ہے حضور؟"

تھانیدار صاحب نے وہ کاغذ منشی جی کے سامنے پھینک دیا اور کہا:

"اب تو یہ بنیا حکومت کے نشے میں پاگل ہو گیا ہے۔ بالکل پاگل۔"

منشی جی کاغذ پڑھتے ہوئے بولے: "اس کا یہ نشہ جتنی جلدی کافور ہو جائے اتنا ہی اچھا۔ لوگ باگ بہت پریشان ہیں۔ اگر کسی دن کوئی فساد کھڑا ہو گیا تو جواب بھی آپ کو کرنی پڑے گی۔ کل جنگی کو گرفتار کرنے کے لئے وہ بچولی جی کے ساتھ قصبے بھر میں دوڑتا پھرا تھا۔ آج سویرے سویرے مزدور لے کر اس کا گھر کھدوانے پہنچا تھا۔ میں تو یہ ناپسند کرتا ہوں۔ ذرا اس کی جرأت تو دیکھئے وہ آپ ہی کو حکم دینے لگا، دھمکی دینے لگا۔ نالائق کے دماغ میں گوبر بھرا ہے بالکل گوبر۔"

یہ کہتے کہتے انھوں نے کانسٹبل کو آواز دی: "بلا لاؤ دھنا مل کو۔"

کانسٹبل بات کی بات میں دھنا مل کو بلا لایا۔ ان کو دیکھتے ہی تھانیدار صاحب اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور بڑے ادب سے بولے:

"آئیے آئیے۔ تشریف رکھئے۔"

تھانیدار صاحب اتنے ادب سے پیش آئے تو سیٹھ جی پھول کر کُپّا ہو گئے۔ انھوں نے پہلے تو کرسی پر اڈّا جمایا پھر آواز کو بھاری بنا کر سوال کیا: "آپ نے جنگی کو جیل بھیج دیا؟"

"بھلا آپ حکم دیں اور میں اس کی تعمیل نہ کروں؟ ابھی دو سپاہی اسے ہتھکڑیاں ڈال کر تھانہ کی طرف لے گئے ہیں۔" تھانیدار صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔

"سچ مچ، تب تو آپ بہت ہوشیار ہیں۔ ہم ضلع صاحب سے آپکی سفارش کریں گے اور آپ کو ترقی دلوائیں گے۔ بہت نیر سے جنگی کی بڑا بدمعاش!" کہتے ہوئے سیٹھ جی اچھل پڑے اور خوشی ان کے چہرہ پر چمک اٹھی۔

"یہ آپ کی عین مہربانی ہے۔ مگر گستاخی معاف ہو میں جنگی کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ نے کل بچولی جی کے ساتھ اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"ہاں کی تو تھی۔"

"کیا آج سویرے آپ مزدور لے کر اس کا گھر گرانے گئے تھے؟"

"ہاں گیا تو تھا۔"

"کس کے حکم سے؟"

"ہا ہا ہا ہا۔ کس کے حکم سے؟ ہا ہا ہا ہا! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم پریسیڈنٹ ہیں منشڑ ہیں، انا ڑی مجسٹر ہیں؟ آپ اب تک رہے کہاں؟ ہا ہا ہا ہا!"

"یوں دانت دکھانے کی ضرورت نہیں، آپ پریسیڈنٹ ہیں مگر انا ڑی مجسٹریٹ ہرگز نہیں ہیں۔ آپ نے جنگی کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے وہ غیر قانونی ہے۔ اگر اس نے کوئی کارروائی کی تو آپ جانتے ہیں کیا ہوگا؟ پھر یہ ہا ہا ہی سب بھول جائیں گے۔ دن کو تارے دکھائی دینے لگیں گے۔ ہم نے

باقی صفحہ ۵۹ پر

# قید خانہ

احمد علی کے افسانوں کا مجموعہ

جلال الدین

اس مجموعے میں احمد علی کے چار افسانے شامل ہیں جو انہوں نے چند مہینوں کے وقفے سے یکے بعد دیگرے لکھے ہیں، اور جو ایک مخصوص ذہنی کیفیت کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ شروع میں پیش لفظ بھی ہے:-

"میرے افسانوں میں یہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔ نہ صرف افسانوی بلکہ فنی نقطۂ نظر سے"

"ہماری گلی" کے مصنف نے انگریزی کے علاوہ خود اردو میں اچھے فسانہ نگار کی حیثیت سے جو جگہ حاصل کرلی ہے وہ کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوسکی ہے۔ لیکن انتہائی رومانیت اور بے باکی کے باوجود "انگارے" کی کہانیوں یا خود "مارچ کی ایک رات" کا سا طرز بیان اس مجموعے میں نظر نہیں آتا، نہ وہ تیزی ہے، نہ وہ خودسری، یہاں حزن نہ سطحی ہے، نہ خارجی؛ نہ درشت اور نہ بیزار کن۔ اس میں انتہاء سپردگی اور ملائمت آگئی ہے، اور گہری داخلیت بھی! یہ نہیں کہ موضوع میں کوئی بڑا فرق آگیا ہو یا ان کے بنیادی محرکات مختلف ہوگئے ہیں۔ ایسا بالکل نہیں۔ ان کہانیوں میں ہمیں طنز بھی ملتا ہے، اور شرابیوں کا کھردرا مذاق بھی۔ جگہ جگہ زندگی کی محرومیوں کا ذکر آتا ہے اور فطرت کے اندھا دھند چکر کے علاوہ خود انسان پر انسان کی اس بیداد کا حوالہ بھی ملتا ہے جو اکثر بلاارادہ یا مجبوری کی بنا پر ہوتی ہے لیکن بیشتر زندگیوں کو، معصومانہ زندگیوں کو، کہیں کا نہیں رکھتی!

یہ سب کچھ ہے، لیکن اس کے باوجود یہاں احمد علی کا لہجہ اتنا مایوس کن نہیں، جتنا پرسکون اور پر وقار ہے۔ یہ یاسیت اندھی و بے حوصلہ نہیں، فلسفیانہ اور خیال انگیز ہے، پہلے کی طرح پگھلے ہوئے لوہے کے بجائے یہاں لفظ لفظ میں پارے کی تڑپ اور رقت ہے۔ اس کا اثر اچھا بھی پڑا ہے، اور برا بھی، برائی یہ کہ زندگی کی وہ تصویر جو ان افسانوں میں ملتی ہے ایک حد تک تشنہ اور یک رخی ہے ــ یعنی صرف وہ جو غیر ذمہ داری اور رومان کے آس پاس بھٹکتی رہتی ہے۔ اور اچھائی یہ کہ اسی کے طفیل اس میں وہ المیہ طمانیت یا طرب ناکی آگئی ہے جو کسی بھی فنی تخلیق میں تاثر اور دلکشی کی ضامن ہے!

یہ کہانیاں سرتاسر مغربی نہج کی ہیں۔ نہ صرف کردار بلکہ ماحول، طرز بیان، اور استعارے و تشبیہیں تک سب یورپی ادب کی یاد دلاتے ہیں۔ احمد علی نے یہ اقدام بڑی ہمت کا کیا ہے۔ ہمارے اکثر لکھنے والے کردار اور طرز تو مغربی رکھتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے کتابوں میں وہی اور اسی طرح پڑھا ہے لیکن ماحول ہندوستانی رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ ترقی پسندی کی رو میں بہنے والے اکثر ادبا کے مرقعے ہندوستانی معاشرت سے میل نہیں کھاتے۔ اس کے برعکس آزاد روی اور قلندری کی وہ ذہنیت جو "قید خانے" کے ان چاروں افسانوں میں مشترک ہے۔ مجموعی حیثیت سے ایک ایسی تہذیب پیش کرتی ہے جس میں نہ ذاتی روابط ملتے ہیں نہ روحانی، جو صرف مادی محبت یا زیادہ سے زیادہ دوستانہ تعلقات کو فلسفیانہ رنگ دے کر زندگی کے سپاٹ خاکے میں رنگ آمیزی کرتی رہتی ہے۔ وہ وسعت، اور وہ اطمینان و مسرت جو ایشیائی قناعت پسندی اور روحانیت کا مقدس سرمایہ ہے، ان افسانوں میں قطعاً مفقود ہے، اور بیکلی اور بے یقینی کا یہ جذبہ جگہ جگہ خود مغربی تہذیب پر ایک گہری طنز کی شکل میں پھوٹ بھی پڑتا ہے۔

اسی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ احمد علی دراصل انگریزی کے ادیب ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے لارنس اسٹرن کو فرانسیسی کا ادیب کہا جا سکتا ہے ــ! مغربی لکھنے والوں، خاص طور سے فرانسیسی ادبا کا ان پر بہت گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ "شعلے" کے اکثر افسانوں میں یہ تاثر ڈھکا ڈھکا سا ہے، لیکن "ہماری گلی" کی بہت سی کہانیوں کو پڑھتے وقت صاف ایمیل زولا کی فطرتیت (Naturalism) اور اس کی عریاں حقیقت نگاری یاد آتی ہے ــ اور اس مجموعے کے افسانوں میں تو یہ فرانسیسی رنگ اتنا نمایاں ہے کہ جگہ جگہ جذبات اور پس منظر کی ہم آہنگی بیک وقت مصوری اور غنائیت میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہے ــ!

ہمارے اردو لکھنے والوں میں یہ انداز کرشن چندر کے ساتھ کچھ مخصوص سا ہوگیا ہے ــ کرشن جن کے طرز بیان میں غزل کی سی گھلاوٹ اور نزاکت ہے، اور جنہیں پڑھتے وقت شدت تاثر سے تھوڑی دیر کے لئے واقعی دل میں میٹھا میٹھا سا درد معلوم ہونے لگتا ہے! تقریباً یہی جذبہ احمد علی کے افسانے "پریم کہانی" کو پڑھتے وقت طاری ہوجاتا ہے پلاٹ کی سادگی، اور کردار کی یکرنگی کے باوجود کوئی طاقت ہے جو یاسیت کی اس تاریکی میں ہمیں ایک موہوم سی امید دلا کر گھسیٹے لئے جاتی ہے۔ یہ امید کہ شاید انجام وہ نہ ہو جو کہانی کا ہر ہر لفظ کہتا ہے کہ ہونے والا ہے۔ یہ امید ظاہر ہے کہ ٹوٹ جاتی ہے، لیکن ٹوٹ کر بھی مایوس نہیں کرتی۔ زندگی اور فطرت کے اٹل اصولوں سے اس کا رشتہ

اس طرح ملا ہوا ہے کہ اس میں کسی پر الزام نہیں آتا، کسی کی غلطی نہیں معلوم ہوتی فراق نے ٹھیک ہی کہا ہے :- ؎

ہم بھی سچے، تم بھی سچے عشق میں سچ ہی کا رونا ہے

اس میں سچ کی سچ سے، خود داری کی خود داری سے، حجاب کی حجاب سے لڑائی ہے۔ اس لڑائی میں فتح یا شکست کچھ بھی نہیں ہوتی۔ بس یہ جنگ ہوتی رہتی ہے، اور پھر یہ جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ اور تخئیل کی بھول بھلیاں میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ غلط کون ہے اور صحیح کیا ہے؟ شاید اسی لئے پریم کہانی اس مجموعے کی سب سے زیادہ دلفریب کہانی ہے!

"پریم کہانی" میں نام کوئی نہیں، صرف "میں" اور "وہ"۔ اور جن کے نام آتے ہیں، انہیں کہانی سے کم سے کم یا بالکل بھی تعلق نہیں! یہ "میں" ہیرو ہے، جو، جیسا کہ پریم کہانیوں کا قاعدہ ہے جوانی کے طوفان سے گذر چکنے کے بعد بیتے ہوئے دنوں پر نظر ڈال رہا ہے۔ ن۔ م۔ راشد نے اپنی ایک نظم میں شباب کو "گناہ کی حلاوتوں" سے بھر لینے کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ خیال یا حوصلہ جیسا کچھ ہے، ظاہر ہے، لیکن احمد علی نے اس کا عجیب رُخ پیش کیا ہے۔ ہیرو ایک عورت سے بے انتہا محبت کرتا ہے، ایسی محبت جس کے والہانہ پن کو ہم کیٹس کے خطوں میں محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن اس شدید اور بے پناہ محبت کے باوجود وہ تخئیل پرست بھی ہے اور تمثالیت کا جویا بھی، چنانچہ محبت محبوب کی بت سازی اور اس کے تقدس کا جو غیر معمولی تصور قائم کر لیتی ہے۔ اس نے اسے مجبور کیا کہ محبت کے سخت ترین طوفان میں بھی نام نہاد "جسمانی قرب" سے دور رہے۔ اس کا نقشہ احمد علی نے یوں کھینچا ہے :-

دوبارہ پھر اس نے اپنا سر پیچھے جھکا لیا، اور اس قدر جھکی کہ سر زمین سے لگ گیا۔ اس کے کالے بال ہری ہری گھاس پر بکھر گئے، اور اس کی گلابی ساری نے سیاہ چاند کے گرد ہالہ بنا لیا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور ...... اس کی آنکھوں میں بوسے کی دعوت جھلک اٹھی ......

"یہ صرف میرا گمان ہے" میں نے کہا، "وہ تو آسمان کو دیکھ رہی ہے"

اور ایسی کتنی ہی دعوتوں کے بعد مایوس ہو کر

وہ اٹھ بیٹھی اور وہ مغرب کی بڑھتی ہوئی تاریکی کو گھورنے لگی۔ پھر تھکی ہوئی آواز سے بولی اب تو دیر ہو گئی ہمیں چلنا چاہئے ——"

پریم کہانی دل میں پیدا ہوتی ہے، لیکن جسم کی طاقت اسے وصال نہ ہونے سے شبنم کے قطروں کی طرح پتوں سے پھسل کر مٹی میں غائب ہو جاتی ہے۔ یہی انجام ہے اس "پریم کہانی" کا۔

اس کے بعد پھر اس سے ملاقات نہ ہوئی اور کچھ ہی عرصے میں وہ مر گئی۔ اس کی لاش ندی میں سے پائی گئی۔ وہ گلابی ساری اور وہ اپنی مٹر کا ہار پہنے ہوئے تھی لیکن نہ میرے دل میں پہلے کی طرح طوفان ہی پیدا ہوا، اور نہ اس کی یاد خواب بن کے آئی۔ وہ تو میرے دل میں بس چکی تھی — اس سنگ دل دنیا کی طرح میری روح کی گہرائیوں میں آہستہ آہستہ چل رہی تھی، جیسے وہ درختوں کو ایک لازوال محبت بھری لوری سنا رہی تھی ......

پریم کہانی کے اس انجام پر صدیاں گذر چکی ہیں، اور صدیاں یونہی گذر جائینگی لیکن اس انجام میں فرق نہ آئے گا۔ امید کی روح ہمیشہ انہیں بیلیوں میں پھڑپھڑاتی رہی ہے اور پھڑپھڑاتی رہے گی۔ لیکن یہاں نہ پریم کہانی کی اہمیت ہے، نہ اس انجام کی، صرف اس ازلی خلش کی کشمکش رہ جاتی ہے جسے عورت کی فطرت کہتے ہیں، جو ہاں ہو کر بھی نہیں ہو سکتی ہے اور نہیں ہو کر بھی ہاں۔ اس مجموعے کا ایک اور افسانہ ہے "گذرے دنوں کی یاد" ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ اس سرے پر ہیرو بیٹھا یاد کی مرتی ہوئی روشنی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے، دوسرے سرے پر فاصلے کی مجبوریوں کو عبور کرتی ہوئی، درخت اور دریا اور پہاڑوں کو کودتی پھاندتی، تیز روی اور ثابت قدمی کے ساتھ کسی کی نرم اور جذبے سے بھری ہوئی آواز آتی ہے "بتاؤ میں کون ہوں؟"

ہیرو اپنی تمام گذشتہ زندگی کو آنکھوں کے سامنے گذرتے دیکھ رہا ہے۔ یہ آواز جانی پہچانی ہے، لیکن جانی پہچانی آوازیں ایک سے زیادہ ہوتی ہیں، عیش کی ان تھکی ہاری، مٹتی ہوئی یادوں میں وہ نہیں جانتا کہ کون کون ہے ...... وہ ان سب عورتوں کے نام بتا رہا ہے — شیلا، سنتوش؟ مایا؟ — سب ہی تو اسے یاد ہیں سب ہی کی آوازیں اس کی جانی پہچانی ہیں، سب ہی سے اس نے پیمان وفا باندھے ہیں اور اس وقت زیست کے یہ سب تار رگ جاں کی طرح لرزنے جا رہے ہیں، لیکن وہ ناموں کے ان دھندلے نقوش کو الگ الگ ہیئت نہیں دے پاتا۔ ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور بھولی بسری یادیں جگمگ جگمگ کر کے نمایاں ہونے سے پہلے ہی ایک چھا جانے والی کیفیت کے اندھیرے میں کھو جاتی ہیں۔ لمحے، دن، وقت گذرتا جاتا ہے، اور ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجتی ہے — وہی آواز، وہی درد، وہی جذبہ۔

نہ تو میں شیلا ہوں، نہ سنتوش، اور نہ مایا۔
میں ماضی کی ایک آواز ہوں۔ میں کون ہوں، یہ نہ بتاؤ،
کیا میں ابھی تک تم کو یاد ہوں —؟

مگر ٹیلیفون محض کہی ہوئی بات کو ادھر سے ادھر پہنچا سکتا ہے۔ وہ محبت کی خوابیدہ یادوں کو کیسے جگادے، وہ جلی ہوئی راکھ سے چنگاری کیسے اڑائے، ماضی پھر ماضی ہے —— گذرے ہوئے شباب کا ماضی! آواز پہچانی نہیں جاتی، یاد کا سانپ لہرا گیا ہے لیکن تخئیل کو لکیر پیٹنے کا شوق ہے:-

زندگی ایک بند گنبد ہے، اس کونے میں ماضی ہے، اس میں حال، اس میں مستقبل۔ ماضی پر سے پردہ ہٹ چکا ہے، اور اس کی تصویر ایک سبزہ زار کی طرح پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے...... یہ لیلا ہے، یہ مایا، یہ سنتوش، یہ سلیمہ ہے، یہ انجیلا...... یہ وہ آنکھیں ہیں جو نرگس سے زیادہ نرم اور عشق سے زیادہ بیمار ہیں، ان کی تہ میں میرے دل کی قبر ہے، اور ان کی چمک میں میرے عشق کی آگ۔ یہ وہ بانہیں ہیں...... یہ وہ بال...... یہ وہ......

زندگی ایک غبار ہے۔ جب تک ہوا میں رہا، آندھی رہا، جب بیٹھ گیا تو ریت بن گیا۔ میں نے آندھی کی تمنا میں آنکھیں بھی کھوئیں اور نہ کچھ حاصل کیا اور نہ پایا۔ اب تو آندھی جم کے رہ گئی ہے۔ نہ آگے بڑھتی ہے اور نہ مطلع صاف ہوتا ہے۔ ایک مستقل ریت کی جھڑی ہے کہ دن رات برستی ہے نہ کھلتی ہے، اور نہ ہیجان ہی پیدا کرتی ہے......

یہ خود کلامی بہکتی ہے سنبھلتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ حسن ناپائدار سہی، یاد ناپائدار نہیں، اور عشق تو لازوال ہے۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ وقت ہر چیز پر خاک ڈالتا جاتا ہے۔ اور ماضی کے نقوش اتنے مدھم پڑ گئے ہیں؟ کیوں عشق کی آگ اتنی سرد ہو گئی ہے؟ جو لازوال تھا، اس نے کیوں ماضی کے پردے میں منہ چھپا لیا ہے؟ جو یاد پر سے زیادہ ہلکی تھی وہ کیوں پہاڑوں سے زیادہ بھاری ہو گئی ہے؟ اور ایک اور سوال، ان سب سے بڑا، جو "پریم کہانی" کا ہیرو "گذرے دنوں کی یاد" کے ہیرو سے بزبانِ حال پوچھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ "میں نے ٹھیک کیا یا تم نے؟ ہم میں سے کون فائدے میں رہا، کون گھاٹے میں؟" ان کا جواب نہیں ملتا، خود یہ سوال الگ الگ نہیں، ایک میں ایک ملے جاتے ہیں، گم ہوئے جاتے ہیں —— اور ٹیلیفون پر آخری آواز، پھیلتی، اٹھتی، مضطرب سی آتی ہے، "نہیں اب جانے دو، میں بند کرتی ہوں، اچھا خدا حافظ......" ٹیلیفون کٹ جاتا ہے اور یاد کی چنگاریاں جگنو بن کر تخئیل کی تاریکی کا منہ چڑانے لگتی ہیں:-

عورت کا دل کسی قدر سخت ہوتا ہے، اور ملائم بھی،
جب میں عشق کرتا تھا تو اس کا دل پتھر کا تھا، اور اب جب کہ وہ محبت میں مبتلا تھی تو اس کا دل موم تھا۔ لیکن یاد کے برفانی طوفان نے اس کو اور بھی جما دیا، اور موم بھی میرے لئے سنگ خارا بن گیا...... اس نے دیکھ لیا کہ وہ اکیلے میرے دل میں بستی تھی۔ ماضی کی اور بھی آوازیں اس میں بند تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ میرا دل اب ویرانہ ہے۔ اس کی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر ریت بن چکی ہیں، اور اب ماضی کی آوازیں بھی اس میں نہیں گونجتیں......

یاد ایک پر کی طرح ہلکی بھی ہوتی ہے، اور ایک پہاڑ کی طرح بھاری بھی۔ میں یادوں کے بار کو اپنے دل میں لئے پھرتا ہوں۔ ان کے قافلے میرے دماغ میں گشت کرتے ہیں لیکن مجھے بوجھ تک نہیں معلوم ہوتا......

لیکن نہ کسی عورت کو مجھ سے محبت تھی، نہ میں نے کبھی عشق کیا۔ یہ سب میرے تخئیل کی تصویریں تھیں جو پٹ بیجنوں کی طرح چمکیں اور غائب ہو گئیں، نہ میں تھا، نہ وہ تھیں، نہ محبت —— میرے ہونے نے ان کو مجھ سے چھین لیا......

—— زندگی بہت کٹھن، درد انگیز، اور سنگلاخ ہے۔

اس حزن آلود خود کلامی کے تار دیر تک جھنجھناتے رہتے ہیں اور انجام کا کوئی واضح تصور نہ ہونے کے باوجود اس میں اس المیہ طرب آفرینی کا احساس ملتا ہے جو بڑے سے بڑے غم کو نئی خلوص کی بھٹیوں میں پگھلا کر حسن اور طمانیت کے کندن میں تبدیل کر دیتا ہے۔

طرز بیان کی اس دلآویزی سے الگ ہٹ کر ہمیں پھر چند سوالوں پر غور کرنا ہوگا۔ یہ دلگیر حزن انفرادی ہے یا اجتماعی؟ زندگی کا یہ نظریہ کسی تخلیقی ارتقا اور رجائیت کی نمائندگی کرتا ہے یا فرار اور تشکیک کی؟ اور اگر یہ بے یقینی ہی زندگی کا آخری سہارا اور قناعت پسندی کی آخری حد ہے تو فن کا جواز یا اس کی ضرورت کیا ہے، اور وہ معیار کیا ہیں جو آج کو کل سے، لطیف کو کثیف سے اور خود امید آفرینی کو یاس انگیزی سے ممتاز کرتے ہیں؟ اس کیلئے ہمیں بقیہ دو افسانوں "قید خانہ" اور "قلعہ" کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی ہوگی۔ ان کا جواب تو وہاں بھی نہ ملے گا، لیکن وہ فضا ضرور مل جائے گی، جس کی وسعتوں میں کھو کر انسان "یہ یا وہ" قسم کے سوال پوچھ ہی نہیں سکتا، دن کی پھیلی ہوئی ہمہ گیر روشنی میں بجلی کے یہ قمقمے بجھ نہیں جاتے لیکن پھیکے، دھندلائے ہوئے، بے وقعت نظر آنے لگتے ہیں، بلکہ اکثر تو نظر ہی نہیں آتے۔ قدروں کا سوال اٹھانے میں سب سے زیادہ اہم اور ساتھ ہی دلچسپ پہلو یہی ہے کہ مذہب یا اخلاق یا کوئی اور احساس فرض،

یہ تمام چیزیں بڑی اہم اور قابل وقعت ہونے کے باوجود بعض حالتوں میں بے ضرورت اور اکثر بے معنی بھی معلوم ہونے لگتی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے کوئی اُمّی ہو کر بھی پیغمبر ہو سکتا ہے! ذمہ داری کا یہ احساس اور بنیادی قدروں سے وفاداری کا مطالبہ عام انسانوں سے ضرور کیا جانا چاہیئے، جیسے کسی اسپتال میں مریضوں کی ایک خاص طرح سے نگہداشت کی جاتی ہے ان کے لئے ایک مقررہ نظام الاوقات ہوتا ہے، ان کے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، سب پر مخصوص بندشیں رکھی جاتی ہیں لیکن معالج اور دوسرے تندرست و توانا لوگوں پر یہ پابندی عائد نہیں ہوتی اور نہ ہونی چاہیے۔ نہ ان کا ٹمپریچر چارٹ رکھنے کی ضرورت ہے نہ دوا پر دوا پلانے کی۔ مذہب یا اخلاق کی یہ "دوا شیانہ" حیثیت پیش نظر ہو تو فن اور فنکار کو اس کبھی نہ ختم ہونے والی، اور کبھی نہ مانی جانے والی جواب دہی سے نجات مل جائے جو اس کی تخلیقی قوتوں کا معتد بہ حصہ ان موروں پر بیکار ضائع کرتی رہتی ہے!

یہ تصور ان افسانوں میں اتنا صاف اور واضح تو نہیں ملتا مگر "قلعہ" اور "قید خانہ" دونوں میں اس کے لگ بھگ اشارے ضرور ملتے ہیں۔ "قلعے" کا بنیادی تصور گنجلک ہے، اس میں ایک نیم سیاسی زیریں دھارا بہتا ہے جو آخر تک پہنچتے پہنچتے تمثیلیت سے ہمکنار ہوتا معلوم ہوتا ہے اور اس میں پرومی تھی اس (Prometheus) کی کشمکش آزادی کا بھی ہلکا سا ذائقہ ہے، لیکن اس روحِ اضطراب کی سب سے زیادہ واضح اور پرخلوص کارفرمائی ہمیں "قید خانہ" میں ملتی ہے "قید خانہ" اس مجموعے کا خالصتاً فلسفیانہ افسانہ ہے۔

اسٹیشن، شراب خانہ، گھر — ان تین قید خانوں کی کھڑکیوں سے جھانک کر احمد علی نے دنیا کے اس وسیع قید خانے کی حدود پر نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے جسے ہم زیست کی پہنائی کہتے ہیں — مگر باہر برفباری ہو رہی ہے۔ کہر اور دھند، اور تاریکی ان سب نے مل جل کر زندگی کی کال کوٹھڑی میں تنگ دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ یہاں سانس لینے بھی الجھتا ہے۔ نگاہوں کے تار روشنی کی خبر لانے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور اس بند گنبد میں آواز کے پردے بس ایک مبہم سی گونج سے لرز کر رہ جاتے ہیں۔ یہ سب ہے، مگر تخئیل پھر بھی زندہ و تابندہ ہے، اور حسن کی آنکھوں میں زرکار خوابوں کے موتی جھلک رہے ہیں۔ اور فنی تسکین کی شاہراہ کہکشاں سے بھی پرے نکلتی چلی گئی ہے! اس پس منظر میں یہ اکھڑے اکھڑے فقرے اور الجھے سلجھے الفاظ عجیب و غریب طور پر وسیع اور گہرے مفہوم سے بھر جاتے ہیں:-

زندگی بہت وسیع ہے، اور خیالات کا سلسلہ اتھاہ ہے۔ ٹھکانہ میرا ہے نہ تیرا۔ زندگی کی پہنچ بہت دور تک ہے اور تخئیل کے لئے موت اور زیست یکساں ہے۔ مکان میرا گھر نہیں زندگی ہے، جس کی ہر سمت نرالی، اور ہر شئے نئی ہے مکان صرف رہائش کی جگہ نہیں بلکہ تخئیل ہے۔ اگر ادھر نگاہ اٹھائی تو پہاڑ ہیں، اور ادھر، تو لندن کی سڑکیں اور مقام۔ ایک کروٹ میں گرمی ہے تو دوسری میں سردی اور بارش۔ ایک ہی وقت میں ماضی، حال، اور مستقبل، زندگی اور موت دکھائی دیتے ہیں ..........

ان الفاظ کا لکھنے والا ایک قصہ گو ہو یا نہیں (احمد علی کی یہ حیثیت ہمیشہ مشتبہ رہی ہے، اور اس مجموعے میں تو خاص طور سے) لیکن وہ ایک حساس اور واقعیت پسند مفکر ضرور ہے۔ ان کے اس علامیت (Symbolism) کا "ہتھیار سنبھالنے" پر اعتراض کیا گیا ہے اور ایک حد تک یہ اعتراض درست بھی ہے، خاص طور سے اس وقت جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یوں احمد علی کو مابعد الطبیعات سے نہ ادبی دلچسپی ہے نہ اخلاقی ہمدردی اور بحیثیت ایک مخصوص، حقیقت پسند اور "حقیقت نگار" مصنف کے، ان سے اس دلچسپی و ہمدردی کی توقع کی جانی چاہیئے، نہ اس کا مطالبہ۔ لیکن ایسا نہیں۔ باطنی اور روحانی زندگی بھی ان کے لئے اتنی ہی واضح "حقیقت" ہے جتنی ظاہری اور جسمانی زندگی۔ اسی لئے ان کی تخلیق میں ایک تار فلسفیانہ تخئیل کا ضرور رہتا ہے، اس تار کو تصوف یا مابعد الطبیعات سے اتنا تعلق نہیں ہوتا جتنا ایک گہرے حزن سے، "حزن" جس کا اول و آخر وہی ہے جو حسن کا! اس کے یہ معنی نہیں کہ "المیہ" ہی سب کچھ ہے، یا زندگی کا یہی لسانی رجحان، فن کا ترجمان، اس کا محافظ، اور اس کی سب سے بڑی پہنچ یا فتح ہے اور خوش دلی اور سرفرازی کو خلوص، گہرائی اور سنجیدگی سے بیر ہے! ایسا بالکل نہیں، بلکہ اصولاً اس کا الٹ ہی زیادہ درست ہے — یعنی انسان کی "اچھائی" کے لئے مایوسی و اضطراب کی فضا ظاہر ہے اتنی سازگار نہیں ہو سکتی، جتنی خوشی اور اطمینان کی لیکن اس دنیا میں جہاں فرصت یک دو نفس حاصل عمر خضر ہے، اور جہاں ہر طرف خوشی کی شرابیں لنڈھائی جانے کے باوجود انفرادی زندگی کے پیمانے ہی کچھ شکستہ اور کمزور ہیں، یا ان کی تہ میں ازلی تشنگی کا تلچھٹ موجود ہے، یہ تسلیم کرنے میں کس کو باک ہوگا کہ زندگی کی ہر تخلیقی تعمیر و تشکیل میں اس بے پایاں غم کا لحاظ رکھنا ہوگا جو صدیوں اور نسلوں سے بے نیاز ہو کر ہر خوشی کی ابتدا، انتہا، اور اس کا مستقبل پس منظر بنا ہوا ہے، جس طرح اجتماعی زندگی میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ اوسط رفتار، "یاران تیز گام" سے نہیں بلکہ ان سست رووں

سے زیادہ قریب ہوتی ہے جو "محو نالۂ جرس کارواں" رہتے ہیں، یا جس طرح معاشی بہتری کے لئے مٹھی بھر امیروں سے زیادہ ان کروڑوں کے مسائل سامنے رکھنے اور انہیں حل کرنے کی ضرورت ہے جو "غریب" کہلاتے ہیں ـــــ اسی طرح فنکار کا اخلاقی ہی نہیں فنی فرض بھی ہے کہ وہ نابالغ انبالی اور بے فکری سے زیادہ، کہیں زیادہ، ان پھیلے ہوئے غم کی طرف اپنی توجہ مبذول کرے، اور ان کی ایسی تعبیر، تنقید، اصلاح کرے (جو کچھ اور جتنا کچھ بھی کر سکے) کہ اس ویرانے میں بھی مسرت، تسکین، اور خوش دلی کے پھول کھل سکیں!

ان افسانوں میں ہمیں کچھ ایسی ہی فنی تسکین کا احساس ہوتا ہے یہاں احمد علی نے حزن کو ڈرامائی انداز دینے کے بجائے اسے سیدھی سادی اور عام واقعیت سے اس قدر لبریز کر دیا ہے کہ زندگی کا یہ پیاسی رجحان نہ انفرادی رہ گیا ہے، نہ محض رومانی و مریضانہ۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ان مٹ نقش کی طرح بابل کے مینارون سے چیخ چیخ کر جوانی کی طرب انگیزیوں کی داستان ایک پُر تاثیر، دلدوز طنز کے ساتھ دہرا رہا ہے ـــ لیکن بابل افتراق کا مینار ہے۔ اتحاد کا نہیں ـــ اور اسی انتشار، اسی تجزیئے میں احمد علی کی سب سے بڑی کامیابی پوشیدہ ہے۔ کرشن چندر کا زندگی سے بھرپور ناول "شکست" ایک ہارے ہوئے ملک کی داستان ہے۔ اس لئے شیام کی شکست اور ونتی کا انجام دونوں ایک سیاسی نظریئے کی تائید کرتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں، مگر "قید خانہ" تو آزاد انسانوں کی کہانی ہے، "پریم کہانی" بھی، "قلعہ" بھی، اور ایک حد تک خود "گذرے دنوں کی یاد" بھی، لیکن حقیقت کی تلخی پھیلی ہوئی انسانیت کی ایک عام اور مشترک میراث ہے۔ اس میں ہندوستان اور انگلستان کی قید نہیں، نئے اور پرانے کی بھی نہیں!



## غزل

### احمد اورنگ آبادی

دل مرا گھبرا رہا ہے کیا کروں
یاد پھر وہ آ رہا ہے کیا کروں

یاد آئیں جب وفائیں بعدِ قتل
ہائے اب پچھتا رہا ہے کیا کروں

شوق دیدارِ جمالِ پاک کا
رات دن تڑپا رہا ہے کیا کروں

ہو رہے ہیں زخم سب اچھے مگر
کوئی بگڑا جا رہا ہے کیا کروں

آنکھ ملتے ہی نگاہِ مست سے
ہاتھ سے دل جا رہا ہے کیا کروں

ناتوانی سے ہلا جاتا نہیں
اور وہ بلوا رہا ہے کیا کروں

منہ کو آنچل سے چھپا کر سو گیا
وصل میں شرما رہا ہے کیا کروں

نذر کیا دوں - جان یا دل یا جگر
آج وہ یار آ رہا ہے کیا کروں

شعر میں احمد مرے اوستاد کا
کیوں نہیں رنگ آ رہا ہے کیا کروں

## غزل

### ابر احسنی گنوری

لبوں تک یوں مرے سینے سے آہ بیقرار آئی
کہ خود بڑھ کر نقابِ چہرہ جاناں اتار آئی

کسے منصور الفت اس جہاں میں ساز گار آئی
مری قسمت میں غم آیا ترے حصہ میں دار آئی

نگاہِ آرزو محفل سے اُن کی شرمسار آئی
سکوں کی بھیک لینے کو گئی تھی بے قرار آئی

بتا کیا شکل ہے ضبطِ جنوں کی پردہ رہنے کی
فدائے رنگ و بو سب لوگ کہتے ہیں بہار آئی

مصیبت پر مصیبت داغ پر داغ اور غم پر غم
مرے حصہ میں جو دولت بھی آئی بے شمار آئی

بچانے کے لئے توہین سے دم بھر کو آ جاؤ
ستارے مجھ پہ ہنستے ہیں کہ شامِ انتظار آئی

نظر کو یہ ملا ہے ابر پھل اپنے طوفوں کا
سکون و صبر کی بازی درِ جاناں پہ ہار آئی

# دو غیر فانی شہزادیاں

افسانہ

تران مان تنگ

تون کن کے چھوٹے سے گاؤں سؤن سٹے میں یہ دونوں لڑکیاں کنول یا چنبیلی کے دو پھولوں کی طرح بڑھتی رہیں۔ بڑی لڑکی کا نام ٹرنگ ٹریس اور چھوٹی لڑکی کا نام ٹرنگ نہی ۔

ٹرنگ ٹریس سحور کن حسن کی ملکہ تھی۔ اس کی آنکھیں جن میں جذبات شعلوں کی طرح روشن تھے ہر دل میں محبت کی آگ بھڑکاتی تھیں۔ اس کا تبسم جس میں مہکتے ہوئے گلاب کے پھولوں کی مٹھاس تھی۔ ہر روح میں تلاطم برپا کر دیتی. اور اس کی آواز سے جو نسیم سحری کی طرح ہلکی ہی تھرتھروں اور چٹانوں پر بھی ایک کیف طاری ہو جاتا۔ انسان تو انسان چرند و پرند بھی اس کے حلقہ بگوش تھے. تمام کرہ ارض اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا تھا۔ یہ پیاری شخصیت دنیا میں سب سے زیادہ اچھے اور سخی دل کی مالک تھی۔ اس کی پیاری فطرت میں عفت، عصمت، تقدس، سعادتمندی اور حب الوطنی اس طرح چمکتی تھی جیسے آسمان پہ جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے ستارے.

ٹرنگ نہی جب اپنی بہن کے ساتھ ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک گلاب کے پھول کے پاس دوسرا گلاب کا پھول کھلا ہوا ہے۔ یا جیسے دو ستارے برابر برابر چمک رہے ہیں۔ حسین پھولوں کی طرح، وہ حسن، مہک اور رنگینی میں ایک دوسرے کا جواب تھیں۔ دو پھولوں کی طرح انھوں نے اپنے وطن اور اپنے باپ کے گھر کو اپنی خوشبو سے بسا رکھا تھا۔ وہ دونوں وطن اور گھرانے کے چمن کی زینت تھیں۔

بوڑھا بادشاہ ہنگ وینگ جو غاصب و جابر چینی گورنر ٹو ڈنہ سے نفرت کرتا تھا اور اس کے خلاف طرح طرح کے منصوبے باندھا کرتا تھا جاری قربان گاہ پر جھکا۔ منتر پڑھ پڑھ کر اس نے اپنے اجداد کی روحوں کو بیدار کیا۔ پیشنگوئی کرنے والوں، رمالوں اور جادوگروں سے مشورہ کر کے اس نے اپنے اجداد کی ابدی آرام گاہوں کو بدلا۔

ایک رمال نے عرض کی۔ حضور۔ اب آپ کے بزرگوار کا مقبرہ ایک اژدہے کی پشت پر ہے۔ شہزادیاں آپ کا بدلہ لیں گی۔ وہ چینی جرگوں کا پیچھا کرتے کرتے انھیں ہماری مقدس سرزمین سے نکال دیں گی۔ اور اپنے حکمران ہونے کا اعلان کر دیں گی "۔

بادشاہ نے کہا۔ میں نے شاہی خاندان کی قسمت کا فیصلہ بدھ دیوتا کے طاقتور ہاتھوں میں دے دیا ہے "۔

حضور۔ یہ سب کچھ مقدس آسمانی کتاب میں یاقوتی حرفوں سے لکھا ہوا ہے۔ حضور۔ اگر دونوں شہزادیاں نام دائٹ کی حکمراں نہ بنیں تو میں اپنا سر اتروا دونگا۔ ان کی تلواریں بڑے سے بڑے جنگجو سے زیادہ ہیبتناک ہیں۔ یہ دونوں اہل چین پر فتح حاصل کریں گی۔

ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی نے بچپن ہی میں تلوار چلانا، نیزہ بازی اور گھوڑے کی سواری سیکھی تھی۔ فن سپہ گری سکھلانے کے لئے شاہ ہنگ وینگ نے ان دونوں کی تعلیم و تربیت اپنے وفادار جرنیلوں میں سے ایک جرنیل کے سپرد کی تھی۔

اس طرح دونوں شہزادیوں کے دلوں میں انتقام کا جذبہ پرورش پا رہا تھا جس دن سے ٹو ڈنہ نے شاہ ہنگ وینگ کو تخت سے اتار کر اس کی جگہ خود غصب کر لی تھی۔ ... سلطنت انام میں ... پھیلا ہوا تھا۔ ماندرین سلطنت ... نے ... سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ گاؤں کے گاؤں اور صوبے کے صوبے نذر آتش کر کے تخت و تاراج کر دئے گئے اور وہاں کے باشندے تیغ کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ انام کے بہادر اور امن پسند کسانوں پر اتنے زیادہ ٹیکس لگائے گئے کہ وہ ان کا بوجھ برداشت نہ کر سکے۔ انام حب الوطنوں کو سب سے زیادہ ہیبتناک تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ ... بھوتوں کی طرح قحط، زبوں حالی اور موت نے اس سرزمین پر اپنا تسلط جمایا۔ ... کے لوگ خاموش تھے۔ ان کے دلوں میں نفرت کا جذبہ برابر بڑھ رہا تھا۔ اور وہ بدلہ لینے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

اگرچہ ٹرنگ ٹریک فن سپہ گری میں کامل ہو گئی تھی پھر بھی وہ محبت کی زہر آلود برچھیوں کے وار نہ جھیل سکتی تھی۔ ہر حسین عورت کی طرح وہ بھی محبت کے سخت لیکن دلکش میدان میں مات کھا جاتی تھی۔

گاؤں سون سے میں اس روز ایک تہوار منایا جا رہا تھا۔ جھنڈے جن پہ اژدہوں اور دوسرے چینی نشانات کی زرکاری کی گئی تھی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی زنانی سنہری چھتریاں کھلی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے موسم خزاں میں کنول کے پھول کی پتیاں کھلی ہوئی ہیں۔ جس طرح دعائیں اور منتر آسمان کا رخ کرتے ہیں اسی طرح ڈھولوں کی آوازوں سے آسمان گونج رہا تھا۔ سب جوان لڑکے لڑکیاں اپنا اچھے سے اچھا لباس پہنے ہاتھوں میں چاول۔ بھنا ہوا گوشت۔ بھرے ہوئے چوزے۔ چھالیہ۔ منتی کاغذ۔ لوبان اور اگر کی بتیاں کشتیوں میں لئے مخروطی شکل کے مندر میں داخل ہوئے۔ ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی بھی اپنی کنیزوں کے ساتھ اپنی سنہری گاڑی میں سوار ہو کر وہاں پہنچیں۔ اپنے ہاتھوں کو سینے پر رکھے لوبان اور اگر کی بتیاں سنبھالے وہ بدھ دیوتا کے سامنے جھکیں، حفظ و امان کی دعا کی اور دیوتا سے مدد چاہی۔

وہ قربان گاہ پر چار بار جھکیں اور جب بدھ دیوتا کی عبادت سے مطمئن ہو گئیں تو وہ اٹھیں اور اپنی سنہری گاڑی میں سوار ہونے کیلئے آگے بڑھیں۔

تھائی ساچ ٹرنگ ٹریک کے سامنے جھکا اور کہا "شہزادی۔ اچھی شہزادی۔ اپنی غریب رعایا میں سے ایک فرد کو اجازت دیجئے کہ آپ کی خدمت میں یہ کنول کے پھول پیش کر کے شاہی خاندان سے وفاداری اور اس کی تحسین و بہی خواہی کا ثبوت دے"۔

وہ ذرا ٹھٹکی لیکن پھولوں کا گلدستہ لے لیا۔ پھر شرما کر بولی "جناب آپ کے کنول کے پھول بہت خوبصورت ہیں۔ میں پھولوں سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ ان کو بکھیرنے کی جرأت نہیں کر سکتی"۔

ٹرنگ ٹریک کے اس اچھے برتاؤ سے پُرحوصلہ ہو کر اس نوجوان ماندرین نے کہا "اچھی شہزادی۔ آپ کی نیک شخصیت تک رسائی، آپ کی آواز کا سننا اور آپ کے جسم کی مقدس خوشبو کا سونگھنا میرے لئے عزت کا باعث ہے۔ شہزادی، ایک سنہرے بادلوں کی طرح آپ کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ میری پیاسی روح آپ کی طرف اس طرح کھنچی جا رہی ہے جیسے کوئی ابابیل آسمان کی طرف اڑے۔ میرا دل آپ کی طرف ایک فاختہ کی طرح اڑ کر جاتا ہے۔ میرے خیالات نے آپ کے گرد اگرد ہزاروں مسحور کن خواب بُن دئے ہیں۔ شہزادی جب آپ سامنے ہوتی ہیں تو میں اتنا کھو لیا جاتا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ میں جاگ رہا ہوں یا سو رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ حقیقت ہیں یا ایک خواب۔ سچی زندگی اور خواب، اور وہم و یقین میں کتنا کم فرق ہے"۔

شہزادی بولی "جناب آپ کے الفاظ میری روح پر ایسا اثر کر رہے ہیں جیسے آسمان کی بارش کا نغمہ۔ آپ کی آواز میرے دل میں محبت کی طرح گھر کر رہی ہے۔ آپ کا ممتاز نام میرے گھر میں جس کی دیواروں پر دارچینی کے رنگ کی لکڑی لگی ہوئی ہے، گلاب کے پھولوں کی مہک کی طرح داخل ہو گیا ہے"۔

تھائی ساچ نے کہا "شہزادی۔ آپ کے الفاظ سے میرے ویران دل میں امید اور خوشی پھوٹ رہی ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو آپ کے محل اور اس یاقوت کی انگوٹھی کا جو آپ اپنی انگوٹھی میں پہنے ہوئے ہیں منتظم و محافظ بن جاؤں"۔

شہزادی بولی: "جناب۔ آپ کی ستائش سے مجھے شرم آتی ہے۔ لیکن ایک سنہرے ریشمی کپڑے کی طرح میرا ناپائدار مقدر والد بزرگوار کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ مجھے کسی پہاڑ پر چڑھنے کا حکم دیں تو میں اس پر چڑھ جاؤنگی۔ اگر وہ کہیں کہ میں سمندر میں جا پڑوں تو سمندر میں جا پڑوں گی۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ دیر ہو رہی ہے۔ میری بہن میرے انتظار میں ہے"۔

ٹرنگ ٹریک تھائی ساچ کے سامنے ایک خاص انداز سے جھکی اور اپنے دل میں ہزاروں جذبات لئے اپنی سنہری گاڑی میں بیٹھ کر ایک مسحور کن مسکراہٹ کے ساتھ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

تھائی ساچ اس کے حسن اور کشش سے مخمور اپنی خوابوں کی دنیا میں ایسا کھو گیا کہ بہت دیر تک وہ بت بنا کھڑا رہا جیسے اس جگہ اسے کیلوں سے گاڑ دیا گیا ہو۔ مخروطی شکل کے مندر میں تہوار ہوتا رہا۔

اس کے کئی ہفتے بعد تھائی ساچ ایک لمبے نیلے چغے میں ملبوس اپنے نوکروں اور رشتہ داروں کے ساتھ بادشاہ ہنگ ویونگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شادی کے تحفے پیتل کی بڑی بڑی منقش کشتیوں میں بادشاہ کے تخت کے سامنے رکھے گئے۔ تحائف میں جنتیانا شراب کی دو سو بوتلیں۔ بیس نوکیلے ہاتھی دانتوں کی جوڑیاں۔ چینی ریشم کے سو لپٹے ہوئے تھان۔ سونے کے ایک ہزار ڈھلے ہوئے ٹھوس گولے۔ دو مرصع کنگن ٹھوس سونے کا ہار۔ چھالیا رکھنے کے لئے سیپی کی سو ڈبیاں اور بہت سی نایاب اور قیمتی چیزیں شامل تھیں۔ تھائی سلچ کی شاہی خاندان سے وفاداری اور سپہ گری کی عظیم صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے بادشاہ ہنگ ویونگ نے اپنی پیاری اور خوبصورت بیٹی ٹرنگ ٹریک کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

شاہی خاندان کا سردار بن کر تھائی ساچ نے جس کی رگوں میں ہنگ آنزلا کا خون دوڑ رہا تھا۔ فیصلہ کر لیا کہ اہل چین کو اس سلطنت سے نکال کر تخت دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ اپنی بیوی اور اپنی سالی ٹرنگ نہی کے ساتھ مل کر اس نے آدمی بھرتی کرنے شروع کئے۔ فوج بنائی۔ ایک مہم کے منصوبے باندھے اور تخت نشینی کا اعلان تیار کیا۔ ادھر ٹوڈ ننھ کے جاسوس بھی غافل نہیں تھے۔ قلیوں، ڈاکٹروں، سوداگروں اور فقیروں کے بھیس میں تھائی سا

## رباعیات — صفیہ شمیم ملیح آبادی

گلشن کی ہر اک کلی چٹک جاتی ہے
جب ناز سے کچھ وہ مسکرا دیتے ہیں
پیشانیٔ آفاق دمک جاتی ہے
گلزار میں چاندنی چھٹک جاتی ہے

×

اب دل سے ہوا ہے بلغ عشرت لے جا
جاتا ہے جو تو یاد بھی لے جا اپنی
غم بخش دے ہر ایک مسرت لے جا
یعنی مرے دل سے کیفِ الفت لے جا

×

طوفان میں کشتی کو بڑھاؤں کیسے؟
یہ قہر حوادث یہ ہجوم آلام
آندھی میں چراغ دل جلاؤں کیسے؟
اللہ یہ بارِ غم اٹھاؤں کیسے؟

×

بیزارِ تصنع ہوں صداقت کی قسم
اب طالب ظلمت ہوں تجلی کیسی
وارفتۂ نفرت ہوں محبت کی قسم
سرشارِ غم ہوں مسرت کی قسم

کے ہر قدم پر اس کے ساتھ تھے اور اس کے ہر لفظ اور ہر عمل کو گہری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اس طرح جابر ٹوڈ تھ کو تھائی ساچ کے ہر لمحے کی خبر ملتی رہتی تھی۔ ان سب باتوں سے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے اس نے اپنے محل میں بہت بڑی دعوت کی جس میں ٹرنگ ٹریس کے شوہر کو بھی بلایا۔ ہر قسم کے شبہ کو دور کرنے کے لئے تھائی ساچ بالکل اکیلا اور نہتا دعوت میں گیا۔ ٹوڈ تھ نے مسکراتے ہوئے خوش خلقی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا پرجوش اور پر تپاک استقبال کیا۔ اس کی اتنی عزت کی جتنی ایک بڑے مہمان کی کرنی چاہئے۔

ٹوڈ تھ نے حکم دیا۔ "ہمیں کچھ شراب دو اور اتنی شراب دو کہ ہم ڈیوک تھائی ساچ کی صحت و سلامتی کے لئے جی بھر کر شراب پئیں۔"

مصاحب جو چاروں طرف کھڑے ہوئے تھے مسکرائے اور فرمانبرداری کے انداز میں تھائی ساچ کو شراب سے لبالب پیمانے دئے۔ اور تھائی ساچ یکے بعد دیگرے ان کو خالی کرتا رہا۔

ٹوڈ تھ نے حکم دیا۔ "ہمیں گانا سناؤ اور محترم مہمان کے لئے کوئی محبت کا گیت گاؤ۔" چھتاروں اور جھنکاروں کی آوازیں وطن کے نغمے گانے لگیں۔ خوش نوا مطربوں کے گلے میں ہار تھے اور چہروں پر غازہ۔ انھوں نے تھائی ساچ کے متحیر دل کو تاروں بھری راتوں کے گیت سنائے بمطرب تھائی ساچ کو اپنے نغموں سے مدہوش کر رہے تھے اور مصاحب اسے شراب کے جام پر جام دئے جا رہے تھے۔ اس طرح تھائی ساچ نے شراب کی تین بوتلیں پی۔

ٹوڈ تھ نے حکم دیا۔ "ہمیں کچھ رقص بھی دکھاؤ۔ ڈیوک تھائی ساچ کے اعزاز میں روپہلی اژدہے والا ناچ ناچو۔"

ڈھول اور جھانجھ کے سروں میں موزونیت ختم ہو جانے کے بعد ناچنے والوں نے اپنے سروں، اپنے ہاتھوں، بازوؤں اور ٹانگوں سے ایک ایسی تصویر کھینچ دی جیسے روپہلی اژدہا بادلوں میں اڑ رہا ہو۔ شراب، رقص اور سرود نے تھائی ساچ کو نروانا کے سایوں میں پہنچا دیا۔ بجھتی ہوئی آگ کی طرح اپنی بیوی، اپنی سالی، اپنے خاندان اور اپنے وطن کی یاد اس کے دماغ میں جھلملائی۔ ٹوڈ تھ خون کا پیاسا ٹوڈ تھ ہی صرف ایسا تھا جو اپنے ہوش میں تھا۔ ایک طوفان کی طرح غصہ اس کے دل میں اٹھا۔ ان خطرات کو بھول کر جن کا اندیشہ تھا تھائی ساچ کے منہ پر تھوکا۔ اس کو زخمی کیا اور بغاوت اور غداری کے الزام میں تھائی ساچ کو فوراً خوفناک موت کی سزا دے دی گئی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھوس کر اور اسے باندھ کر ایک خالی اچار کے مرتبان میں ڈال دیا گیا۔ ٹوڈ تھ کے احکام پر سر تا پا اس قیدی کے جسم پر کھولتا ہوا پانی ڈالا گیا۔ یہ تکلیف دو گھنٹے سے زیادہ تک جاری رہی۔ جب تھائی ساچ کا جسم ایک پھوڑے کی طرح پک گیا تو ٹوڈ تھ نے اسے اپنے محل کے بائیں جانب دفن کرا دیا۔

ٹرنگ ٹریک نے جب یہ خبر سنی تو وہ دل شکستہ اور خشم آلود پہاڑوں میں بھاگ گئی۔ اس نے لوگوں میں دل ہلا دینے والا اعلان کیا۔ انام کے سینکڑوں، ہزاروں محب الوطن پہاڑوں پر جمع ہوئے اور ٹرنگ ٹریک کی محکومی اختیار کر لی۔ اپنی بہن ٹرنگ نہی اور کئی وفادار جرنیلوں کی رائے سے اس نے جنگ کے لئے ایک فوج بنائی۔ ایک سال کی لگاتار محنت کے بعد دونوں شہزادیاں ایک ہزار ہتھیار بند اور جنگجو آدمیوں کی فوج بنانے میں کامیاب ہوئیں۔ انھوں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور ٹوڈ تھ پر ٹوٹ پڑیں۔ ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی دو سفید گھوڑوں پر سوار سنہری تلواریں لئے جنگی احکام جاری کر رہی تھیں۔ انام کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم جنگ دونوں شہزادیوں کی فوج اور چینی فوج کے درمیان ہوئی۔ اپنے بھالوں، تلواروں اور برچھوں سے دونوں شہزادیوں کی فوج نے ٹوڈ تھ کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔

دونوں رانیوں کی بہادری اور حب الوطنی کی گرمجوشی نے انام کے سپاہیوں میں اتنا جوش پیدا کیا کہ وہ شیروں کی طرح لڑے۔ ٹوڈ تھ کی فوج بھاگ گئی اور وہ قید کر لیا گیا۔ ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی نے ایک مہینے میں ساٹھ شہروں سے زیادہ فتح کئے۔

تھائی ساچ کا بدلہ لے کر انھوں نے قوم کی لاج رکھ لی اور نام وائٹ کی رانیاں ہونے کا اعلان کر دیا۔

فغفور چین قوانگ وو نے جب ان دونوں رانیوں کی طاقت اور مقبولیت کا ذکر سنا۔ تو تین سال تک انھیں گفت و شنید کے دھوکے میں رکھا۔ ہر سال اپنے سفیروں کے ہاتھوں قیمتی تحفے، عمدہ عمدہ اعلانات اور قصیدے بھیجتا رہا۔ ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی نے بھی فغفور چین کے یہاں اپنے سفیر بھیجے۔ جب یہ بات چیت چل رہی تھی تو چینی فوجوں نے ماوائن کی کمان میں نام وائٹ کی سرحد کو عبور کر لیا۔

ماوائن کے غصے یا حملے کے زور سے ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی مرعوب نہ ہوئیں۔ وہ اپنے سفید گھوڑوں پر سوار ہوئیں اور دشمن پر جا ٹوٹیں۔ دونوں فوجوں کے درمیان بڑا خونریز مقابلہ ہوا۔ تلواروں، بھالوں اور نیزوں کی زبردست جنگ چھڑ گئی۔ اپنی دونوں رانیوں کے فرمان کے مطابق انام کی فوجوں نے اپنے وطن کی چپہ چپہ زمین کے لئے سخت مقابلہ کیا۔ تیروں کی چھاؤں میں اور تلواروں اور بھالوں کے سایہ میں یہ دونوں رانیاں خاموشی اور فخر کے ساتھ بغیر کسی ضرر کے اپنے سپاہیوں کے ساتھ جنگ میں مصروف رہیں۔ ان کی تلواروں کے وار سے ہر طرف چینی سپاہیوں کے سر سوکھے پتوں کی طرح اڑ رہے تھے اور پکے ہوئے پھل کی طرح گر رہے تھے۔ ماوائن ان دونوں رانیوں کی بہادری اور دلیری کے سامنے بے بس تھا۔ ایک بگڑے ہوئے شیر کی طرح خشم آلود ہو کر اس نے اپنی چالوں کو بدل دیا۔ ہتھیاروں سے لڑنے کے بجائے اس نے صوبہ سون ٹے کو ان دو رانیوں سمیت جلا کر راکھ کر دینے کی ٹھان لی۔ اس نے شہر کے چاروں طرف گھاس پھونس اور لکڑیوں کے

ڈھیر جمع کئے اور انھیں تیل سے بھگویا۔ ایک رات جب ہوا بہت تیز چل رہی تھی اس نے اس گھاس پھونس میں آگ لگا دی۔ ہوا کے جھونکوں سے آگ شہر کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ آگ کے اس پھیلتے ہوئے دائرے اور جہنم میں دونوں رانیاں مع اپنی فوج کے جل کر خاک کا ڈھیر ہونے والی تھیں لیکن انام کی روحیں ان دونوں شہزادیوں کا مقدر دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے آگ پر خوب بارش کی۔ آگ کا حلقہ ٹوٹ گیا اور دونوں رانیوں کی فوج سانڈوں کے ریلے کی طرح دشمن پر جا ٹوٹی۔ چینی فوج پھر بھاگ گئی اور مقبوضہ علاقے کو خالی کر دیا۔ ماوائن کا غصہ جبر چین کی طرح تند و تیز ہو گیا۔ لاج کا خیال ایک اژدھی کی طرح اس کا گلا دبائے جا رہا تھا۔ دل میں کہتا۔ "ماوائن جو جنگ کا ماہر اور چین کا سب سے بڑا جرنیل ہے۔ دو کمزور عورتوں سے کبھی ہار نہ مانے گا۔ میں موت کو شکست پر ہزار درجہ ترجیح دیتا ہوں"۔ تین روز تک اس نے کچھ نہ کھایا تین راتوں تک وہ بالکل نہ سویا اور سوچتا رہا۔ تیسری رات کو ماقولی کے فیضان سے اس نے لڑائی کی ایک اور چال سوچی۔ وہ نام وانٹ کی رانیوں کی عفت و عصمت جانتا تھا۔ اس نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ گھڑیالوں، خطرے کی گھنٹیوں اور ڈھول ڈھنڈوں کی آواز پر جنگ روز بگڑ گئی۔ رانیوں کے جنگ آزماؤں نے ہاتھیوں پر سوار ہو کر مغلوب دشمن کا شدت کے ساتھ پیچھا کیا۔ فتح کا یقین اور اپنی فوج کی جنگی قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی اپنے سفید گھوڑوں پر سوار جنگی احکام دے رہی تھیں۔ ماوائن نے اپنی فوج کو پہاڑ کی سیدھی ڈھلوان پر جمع کیا اور سب سپاہیوں کو ننگا ہو جانے کا حکم دیا۔ اور کہا کہ جوان دونوں خوبصورت عورتوں کو زندہ قید کر لائے گا اس سے ان کی شادی کر دوں گا۔ یہ کہہ کر ان ننگا ری کتوں کو دونوں رانیوں کی طرف للکار دیا۔ بندروں جیسے بالوں والے بھوکے بھیڑیوں کی طرح خونخوار اور جنسی خواہش کے بھوکے اژدہے کی مانند ماوائن کی فوج فحش الفاظ بکتی دونوں رانیوں پر پل پڑی۔

اس خوفناک منظر اور حیا سے متاثر ہو کر ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی

## ساجن سے

تم لاکھ چھپو سو پردوں میں، یہ آنکھیں پتہ لگا لیں گی

پہچان بھلا کیسے بھولے — آنکھوں میں سندر چھبی جھولے

لاکھوں میں اپنے ساجن کو یہ آنکھیں ڈھونڈ نکالیں گی

پھولوں میں تم مسکاتے ہو — مدھ بھنوروں میں تم گاتے ہو

چھپ کر بھی تو تم چھپ نہ سکے، یہ آنکھیں درشن پالیں گی

کتنی گھنگھور گھٹائیں ہوں — اندھیاری دسوں دشائیں ہوں

پونو کا چاند نہ چھپ سکتا، کرنیں ہی پتہ بتا دیں گی

چترنجیت

نے اپنے چہرے جھنڈوں سے چھپا لئے اور بھاگ گئیں۔ دونوں کی سحر اندازی اور حسن سے متاثر ہو کر چینی فوج نے بھیڑیوں کے ریلے کی طرح ان کا پیچھا کیا۔ دونوں رانیوں نے اپنی تلواروں اور بھالوں کی مدد سے ان بالوں والے آدمیوں میں سے راستہ کاٹ کر نکال لیا۔ ہر طرف سینکڑوں سر گر رہے تھے۔ ننگے آدمیوں کی قطاریں ٹڈی دل کی طرح ان کا گھیرا کئے ہوئے تھیں۔ غصے اور جھلکن کی ماری ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی جن کا رنگ شرم کے مارے قرمزی ہو گیا بھاگ گئیں۔ ماوائن کو اس شیطانی تدبیر کی کامیابی نے دلیر بنا دیا۔ اس نے بھی اپنے کپڑے اتار لئے۔ پسینے سے شرابور اس کا بالوں والا جسم ایک طوفان زدہ مکئی کے کھیت سے مشابہ تھا۔ اس وقت اس سے زیادہ کریہہ منظر کوئی شخص نہ تھا۔ وہ بالکل ایک انسان نما بندر یا دیو معلوم ہوتا تھا۔ دونوں رانیوں کے تعاقب میں شامل ہونے کے لئے وہ اپنے چست گھوڑے پر سوار ہوا۔ ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی پیچھے مڑ کر کیسے دیکھتیں۔ سیدھی بھاگتی رہیں۔ اور ماوائن کی خونخوار فوج اشتعال دینے والے نعرے لگاتی ان کا پیچھا کرتی رہی۔ انام کی شکستہ دل فوج جس میں سخت ابتری پھیل گئی تھی مایوس ہو کر بھاگ گئی۔ ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی نے فوج کو جمع کر کے دفاعی حملہ کرنے کی آخری کوشش کی۔ لیکن افسوس وقت گزر چکا تھا۔ دونوں رانیاں اگرچہ گھری ہوئی اور ہر طرف سے حملے کی زد میں تھیں لیکن وہ دو شیرنیوں کی طرح مقابلہ کر رہی تھیں۔ ان کی تربیت کامل جرنیلوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ دونوں کی ٹانگیں زخمی ہو گئی تھیں پھر بھی انھوں نے ہزاروں چینیوں کے سر اڑا دئے اور لڑتی بھڑتی اپنا راستہ کاٹ پھر بھاگ نکلیں۔

جب دونوں دریائے ڈے پہنچیں تو ان کے جرنیل اور فوج کے سپاہی سب بھاگ چکے تھے۔ دونوں رانیاں دو اژدہوں کی طرح اپنے گھوڑوں سمیت تیز رو اور جھاگ دار پانی میں کود پڑیں۔

ٹرنگ ٹریک نے کہا۔ "ایک شاندار موت بے حیائی سے بہتر ہے"۔

ٹرنگ نہی نے جواب دیا۔ "بے شک ایک شاندار موت بے غرتی سے بہتر ہے"۔

دریائے ڈے کا بھرتا ہوا پانی دونوں کو بہا کر لے گیا۔ ماوائن اور اس کی فوج جب دریائے ڈے تک پہنچی تو کنارے کو ویران اور درختوں کو اداس پایا۔ چینی جرنیل نے جھاڑیوں میں شکاری کتوں کو چھوڑ دیا۔ کتوں نے ادھر ادھر سونگھا۔ زمین کو کھرچا اور بھونکنے لگے۔ انام کی خوبصورت رانیاں جھاڑیوں میں روپوش نہ ہوئی تھیں۔

ماوائن کے حکم سے ہزاروں بلیاں۔ کشتیاں اور چینی ڈونگے دریا میں ڈال دئے گئے۔ ماہر سے ماہر غوطہ خوروں نے دلیر سے دلیر مچھیروں اور دوسرے لوگوں نے پانی میں کود کر دونوں رانیوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ پورے دن کی مسلسل تلاش کے بعد یہ لوگ ان دونوں کی لاشیں نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ ماوائن نے اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنی فوج کو حکم دیا کہ ان دونوں کی لاشوں کو چیر ڈالو اور ان کے دل میرے سامنے پیش کرو۔ ڈھولوں کی آواز کے ساتھ ماوائن کے سنہری تخت کے سامنے ایسی رکابیوں میں جو سیپیوں سے منقش تھیں دونوں کے دل پیش کئے گئے۔ ان دلوں کو جنتیانا شراب سے بھرے ہوئے چینی کے دو گلدانوں میں ڈال کر ماوائن نے تحفہ کے طور پر فغفور چین کو بھیجدیا۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ان دونوں رانیوں کی لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کووں کے آگے ڈال دو۔

ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی کی یاد اور اعزاز میں سونگ ٹے کے سبز و شاداب کناروں پر ایک مندر بنا ہوا ہے جو خوبصورتی اور سجاوٹ میں انام کے کسی مندر سے کم نہیں۔ انام کے بادشاہ نے ان قوموں کے بہادروں کو "نام وائٹ کے رشی" کے خطاب دئے۔ اور ان کے مندر کو "تھان تھائی یعنی کامل عورتوں کے شہر" کے شہر سے موسوم کیا ہے۔

دونوں شہزادیاں مر گئیں، لیکن ان کی یاد غیر فانی ہے۔ وہ مر کر بھی زندہ جاوید ہیں۔

## ہم پریسیڈنٹ ہیں

بقیہ صفحہ ۳۹

کیا کہہ رہے تھے آپ؟"

"ہا ہا ہا ہا! آپ ہیں کس چکر میں؟ ضلع صاحب نے ہمیں بڑے بڑے اختیار دے رکھے ہیں۔ ہم چاہے جس پر جرمانہ کر دیں۔ چاہے جس کو جیل بھیجدیں۔ چاہے جس کا مکان دھول میں ملوا دیں۔ ہمیں بہت جلد ہی سزا دینے کا اختیار بھی ملنے والا ہے۔ سول میں بڑے صاحب کا پروانہ آیا تھا۔ ماسٹر جی نے اس پر ہمارے دستخط بھی لئے تھے۔ زیادہ سٹر پٹر کیجئے گا تو ہم آپکو بھی ...... کچھ آیا سمجھ میں یا نہیں؟"

"آپ نے پاگل خانے کی ہوا کھائی ہے؟"

"پاگل خانے کی ہوا کھائیں ہمارے دشمن۔"

"کچھ تو آپ کو بھی کھانی پڑے گی۔" یہ کہہ کر تھانیدار صاحب نے ایک کانسٹبل کو حکم دیا: "دیکھتے کیا ہو۔ ان کو حوالات میں بند کر دو۔ پاگل خانے بھجوا دیں گے۔"

یہ حکم پاتے ہی کانسٹبل نے سیٹھ جی کو حوالات کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔ اب تو سیٹھ جی کی عجب حالت ہوئی۔ وہ کبھی کانسٹبل سے کہتے تھے: "ارے جمعدار صاحب سنئے تو ہم پریسیڈنٹ ہیں منسٹر ہیں۔ ابے گردن اتنے زور سے تو نہ دبایئے۔ آنریری مجسٹریٹ ہوں۔ آپ کو مٹھائی کھلوا دیں گے" کبھی تھانیدار صاحب کو تاکتے تاکتے پکارنے لگتے تھے: "کچھ تو لحاظ کیجئے تھانیدار صاحب بھگوان قسم ہم پریسیڈنٹ ہیں، منسٹر ہیں۔ آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ کیا اندھیر ہے۔ آپ تو سنتے ہی نہیں۔ بھگوان قسم ہمارے سکتر کو بلوا لیجئے۔ اور بڑے صاحب کا وہ پروانہ ......"

تھانیدار صاحب قہقہہ لگا کر بولے: "دیکھئے، دیکھئے۔ وہ لپٹن کی چائے کا اشتہار ہے۔ سیٹھ جی ہمارے ہی پاس سے لے گئے تھے۔"

(ہندی آجکل سے ماخوذ)

# قطعات

### پروین مرادآبادی

### موجِ سراب

کارواں کا سفر سراب ہے دنیا
خواب ہے ایک خواب ہے دنیا
دلِ ناداں ابھی ہے آبِ حیات
پھر سوچ سراب ہے دنیا

### دولتِ دل

حسرتاں اُن کی بے نشانی ہے
کس زمانے کی اک کہانی ہے
دولتِ دل ہے جاوداں پیارا
اور ہر چیز یہاں فانی ہے

### شمعِ حقیقت

سحر کا وہ دل بیقراری ہے
زندگی ایک بے قراری ہے
نور عالم کے ذرے ذرے پر
روشنی جس کی آج طاری ہے

# روس میں کتابوں کی اشاعت

سوویٹ یونین میں کتابیں انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو بن گئی ہیں۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ ملک میں سیاسی زندگی کا ایک خاص انداز، حکومت اور سماج کے کاموں میں ہر طبقہ اور گروہ کے لوگوں کی دلچسپی، مدرسہ کی تعلیم کا بلند معیار اور کالج میں تعلیم کی سہولتیں، اور ملک میں عام طور پر ایک وسیع پیمانہ پر پھیلی ہوئی کلچرل سرگرمیاں — ان سب چیزوں کا اثر کتابوں کی اشاعت پر پڑتا ہے۔

سوویٹ عہد نے ملک میں ایک نئی طرح کے پڑھنے والے پیدا کر دئے ہیں — ایسے پڑھنے والے جن کے ذہن تحقیق اور تفتیش کے شیدائی اور حصول علم کے سچے جویا ہیں۔ ایسے لوگ بغیر کتابوں کے جی ہی نہیں سکتے۔ یہ بات پچھلی جنگ نے پوری طرح ثابت کر دی۔ سرخ فوج کا ہر سپاہی، اس کی زندگی خواہ کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو اپنے پاس ایک کتاب ضرور رکھتا تھا۔ بہت سی ایسی کتابیں پچھلے دنوں عجائب گھروں میں داخل کی گئی ہیں، جو یا تو جھلسی ہوئی تھیں یا ان پر خون کے دھبے تھے — یہ ایسے سپاہیوں کی کتابیں ہیں جنھوں نے میدان جنگ میں مرتے وقت بھی انھیں اپنے سے جدا نہیں کیا۔

انقلاب سے پہلے ساری کتابیں عموماً غیر سرکاری ناشر شائع کرتے تھے یہ کتابیں صرف ایک محدود طبقہ کے لوگوں کے لئے چھپتی تھیں — صرف ایسے لوگ جو کتابوں پر بہت سی رقم خرچ کر سکتے تھے۔ یہ کتابیں ملک کے اکثر لوگوں تک پہنچ سکتی تھیں — نہ صرف اس لئے کہ ان کی قیمتیں بہت زیادہ تھیں، بلکہ اس لئے بھی کہ اکثر لوگ پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔

۱۹۱۷ء کے بعد کتابوں کی اشاعت کا کام حکومت کے ہاتھ میں آگیا۔ اور پہلا کام یہ کیا گیا کہ اشاعت گھروں کی تعداد بڑھائی جائے اور ان کے دائرۂ عمل کو وسیع کیا جائے۔ ۱۹۳۰ء تک تقریباً ۱۷۰ سوویٹ اشاعت گھر ہو گئے اور ان کے علاوہ مختلف علمی اداروں اور وزارتوں کے مرکزوں پر پچاس ادارتی اور اشاعتی شعبہ اور قائم ہوئے۔ اس سال ادارتی اور اشاعتی کام کرنے والوں کی تعداد آٹھ ہزار سے بھی اونچی تھی۔ اس تعداد میں چھاپہ خانوں اور اشاعت گھروں کا انتظامی اور ٹکنکل اسٹاف شامل نہیں ہے۔

۱۹۳۷ء میں ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں دوگنی کتابیں شائع ہوئیں اور ان کی مجموعی تعداد ۱۹۱۳ء کے مقابلہ میں آٹھ گنی تھی۔ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۳۷ء میں طباعت کی نسبت ۳۳۰۰ اور ۱۸۰۰۰ تھی۔

انقلاب سے پہلے کے زمانہ میں اکثر کتابیں روسی زبان میں تھیں اور سینٹ پیٹرزبرگ اور ماسکو میں چھپتی تھیں ان میں کچھ کتابیں ایسی تھیں جو خاص خاص علاقوں کی مقامی زبانوں میں چھپتی تھیں لیکن ان کی تعداد کل تعداد کے دسویں حصہ سے بھی کچھ کم تھی۔ ۱۹۳۷ء میں مقامی زبانوں میں چھپنے والی کتابوں کی تعداد کل تعداد کے چوتھائی حصہ سے بھی کچھ زیادہ ہو گئی۔ علاوہ بریں ۱۹۱۳ء میں روسی علاقوں کی ۴۸ مختلف زبانوں میں کتابیں چھپتی تھیں اور آج ۱۱۵ مختلف زبانوں میں چھپتی ہیں۔ مختصر یہ کہ سوویٹ انقلاب کے بعد ۴۰ مختلف روسی قوموں کی زبانیں اس قابل ہو گئی ہیں کہ ان میں کتابیں چھپ سکتی ہیں۔

کتابوں کے موضوعوں میں بھی انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ انقلاب سے پہلے کی اشاعتوں میں سب سے نمایاں جگہ مذہبی ادب کو ملتی تھی اور تقریباً ساری کتابوں میں حاکم گروہ کے مفاد کی جھلک نمایاں تھی۔ اور آج کل سب سے اہم جگہ سائنس، سیاست اور افسانہ کی کتابوں کا حاصل ہے۔

سماجی اور معاشی مسائل کی کتابوں کا نمبر سب سے پہلا ہے۔ مارکسیت اور لیننیت پر جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان کی تعداد حیرت انگیز ہے ۱۹۳۷ء تک مارکس، انجلس، لینن اور اسٹالن کی لکھی ہوئی کتابیں سوویٹ کی ۸۵ زبانوں میں ۳۶۰,۰۰۰,۰۰۰ کی تعداد چھپ چکی تھیں۔ جنگ کے دوران میں صرف اسٹیٹ پولٹکل پبلشنگ ہاؤس نے اسٹالن کی کتابوں کے ۷۰,۰۰۰,۰۰۰ نسخے شائع کئے۔

زراعت، ریاضی، نیچرل ہسٹری، طب، زبان اور آرٹ کی کتابیں بھی افسانوی ادب کی طرح بڑی بڑی تعدادوں میں چھپتی ہیں ۱۹۱۳ء میں افسانوی ادب کے صرف ۱۶,۰۰۰,۰۰۰ نسخے چھپے تھے ۱۹۳۷ء تک یہ تعداد بڑھ کر ۱۱۸,۰۰۰,۰۰۰ ہو گئی۔ کسی ناول کی اوسط اشاعت ۱۹۱۳ء میں ۴۳۰۰ تھی، تو ۱۹۴۱ء میں ۳۰,۰۰۰ ہو گئی۔

ذیل میں کلاسیکی ادب کی اشاعت کا ایک تقابلی نقشہ درج کیا جاتا ہے

## روسی کلاسیکی ادب

| | ۱۸۹۷ — ۱۹۱۷ | ۱۹۱۷ — ۹۳۷ |
|---|---|---|
| گورکی | ۱۰۸۳,۰۰۰ | ۲۶,۹۲۳,۰۰۰ |
| پشکن | ۹۱۶۵,۰۰۰ | ۶,۴۲۶,۰۰۰ |
| لیوٹالسٹائی | ۸۹۹۱,۰۰۰ | ۵,۹۲۶,۰۰۰ |
| چیخوف | ۵۲۰,۰۰۰ | ۳,۰۲۹,۰۰۰ |
| نکراسوف | ۱۹۴,۰۰۰ | ۵,۸۶۰,۰۰۰ |
| سالتکوف شدرین | ۶۵,۰۰۰ | ۵,۲۶۱,۰۰۰ |

اے نزاروف

| | | |
|---|---|---|
| لرمانتف | ۲۴۹۶،۰۰۰ | ۳،۷۸۶،۰۰۰ |
| شوخنکو | ۶۲۹،۰۰۰ | ۲،۷۰۵،۰۰۰ |
| آستروفسکی | ۱۳۵،۰۰۰ | ۲،۶۹۳،۰۰۰ |

## مغربی کلاسیکی ادب

| | | |
|---|---|---|
| ماپساں | ۱،۲۰۷،۰۰۰ | ۲،۹۳۳،۰۰۰ |
| ہیوگو | ۳۹۷،۰۰۰ | ۲۰۴۷۸،۰۰۰ |
| زولا | ۸۴۸،۰۰۰ | ۱،۹۲۶،۰۰۰ |
| ڈکنس | ۷۴۷،۰۰۰ | ۱،۷۱۰،۰۰۰ |
| فرانس | ۵۲۳،۰۰۰ | ۱،۵۷۸،۰۰۰ |
| بالزک | ۱۰۰،۰۰۰ | ۱،۲۷۳،۰۰۰ |
| شیکسپیر | ۵۱۵،۰۰۰ | ۹۲۵،۰۰۰ |
| ہائنے | ۱۲۳،۰۰۰ | ۷۵۳،۰۰۰ |
| سروانٹیز | ۱۰۸،۰۰۰ | ۴۶۲،۰۰۰ |
| بائرن | ۱۴۷،۰۰۰ | ۲۷۸،۰۰۰ |

جہاں تک شیکسپیر کا تعلق ہے روس کے لوگ اس کے ڈرامے پڑھنے کے بجائے انھیں اسٹیج پر زیادہ دیکھتے ہیں۔ اور روسی اسٹیج پر شیکسپیر کے ڈرامے دنیا کے ہر حصہ سے زیادہ دکھائے جاتے ہیں۔

انقلاب کے بعد ہی سے یہ ممکن ہو سکا ہے کہ سوویٹ قوموں کے اکثر لوگ دوسرے ملکوں کا کلاسیکی ادب اپنی اپنی زبانوں میں پڑھ سکیں۔ جن مصنفوں کے نام یہاں لکھے گئے ہیں، ان کی اور ان کے علاوہ دوسرے ادیبوں کی کتابوں کے ترجمے تقریباً ساری اہم سوویٹ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

جنگ کے دوران میں چھاپے خانوں اور اشاعت گھروں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے چھاپہ خانوں پر نازیوں نے قبضہ کر کے انھیں تباہ و برباد کر دیا۔ لینن گراڈ روسی طباعت و اشاعت کا خاص مرکز ہے اور جرمنوں کے محاصرہ نے یہاں کے کام میں بڑا خلل ڈالا تھا۔ چھاپہ خانوں اور اشاعت گھروں کے اکثر کام کرنے والوں کو فوجوں میں بھرتی کر لیا گیا تھا۔ اور اس کے علاوہ کاغذ، گتے اور جلد سازی کے سامان کی بھی بے حد کمی تھی۔ ان ساری دقتوں کے باوجود ۱۹۴۳ء میں ۱۵،۰۰۰، ۱۹۴۴ء میں ۱۷،۰۰۰ اور ۱۹۴۵ء میں ۱۸،۰۰۰ جلدیں چھپیں۔ جنگ کے شروع شروع میں چھوٹے چھوٹے حجم کے رسالے شائع ہوتے رہے۔ لیکن آگے چل کر سیاسی، علمی اور افسانوی ادب کی ضخیم کتابیں بھی شائع ہونے لگیں۔

سوویٹ اشاعت گھر اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ جنگ کے بعد کے زمانہ میں اشاعتوں کی تعداد اتنی کثیر ہونی چاہیئے کہ جنگ سے پہلے کی تعداد اس کے مقابلہ میں بالکل حقیر بن جائے۔

# بلبلا

ناظم صدیقی

بلبلا جسقدر نازک اور حسین ہوتا ہے اسیقدر دلکش اور دلفریب بھی اس کی مدور شکل، اس کے شوخ اور ہر آن بدلتے ہوئے بے شمار رنگ، اس کی انتہائی نزاکت، معمولی صابن کے آبی محلول سے اس کی تخلیق، بادِ صبا کے دوش پر اس کی سبک روی، کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو ہمیشہ سے اس کو بچوں اور بڑوں کے لئے جاذبِ نظر بنائے ہوئے ہیں اس کی ذات سے اتنے عجیب استعارات اور ایسی لطیف تشبیہات متعلق ہیں کہ پروازِ تخیل اور ندرتِ خیال کی داد دئے بغیر چارہ نہیں۔ ملاحظہ ہو۔

چھوٹا سا ایک جسم آبی ہوں مست
یا گنبدِ فلک سے ہیں تختہ ہزولے
جام بلور ہے جو لبریز ہوں سے
کس مست بادہ خوار نے پھینکا نکال کے
کس نازنیں کی بزم کا یارب یہ جام ہے
سارے جہاں کی نازکی جس پر تمام ہے

(محروم)

لگا کے بحر میں غوطے حباب ابھر نکلے
صدف کے منہ کے چمکتے ہوئے گہر نکلے

(اوج)

کس نے دیکھا اس سوا بہتا ہوا
آب پر الٹا کٹورا نسیم کا

(نتلیو)

اس کی حیاتِ مختصر اگر نادر کا کوری کی نظروں کے آگے دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائیداری کی بے بضاعتی کا نقشہ کھینچ دیتی ہے کہ

ہے حباب بحر کے مانند انجام حیات
ایک غوطہ کھانے میں سر بہ سر بہ حیات

تو علامہ کو ہمت و جسارت کا سبق پڑھاتی ہے۔

از حباب آموز ہمت اے کہ با صد احتیاج
خالی از دریا برون آرد سبوئے خویش را

اور محروم کو اپنی آن بان میں، ایک مغرورانہ شان دکھاتی ہے۔

بیٹھا ہوا ہے کس نے کیا بلبلے میں ہے
نشہ کوئی یہ ہوا بلبلے میں ہے
اُف کسقدر غرور بھرا بلبلے میں ہے
فرعون کیا یہ آکے چھپا بلبلے میں ہے
کتنا ابھار کتنی اکڑ کیسی شان ہے
پانی کی ایک بوند میں کیا آن بان ہے

لیکن جس بلبلے نے ہمیشہ فکر و نظر کو دعوت دی، دنیا اس کی حقیقت سے زمانۂ قریب تک آشنا نہ ہو سکی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مشاہدہ اور تجربہ کی مدد سے طبیعی اور کیمیائی نظریے قائم ہو چکے تھے مگر سائنٹفک طریقوں سے جب تک ان کی تصدیق و توثیق نہ ہوئی بلبلے کی عجیب اور حیرت انگیز خصوصیات کی تشریح و توضیح تشفی بخش ثابت نہ ہو سکی لیکن ان طبعی اور کیمیائی نظریوں پر روشنی ڈالنے سے قبل بلبلے کا مطالعہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بلبلا دراصل ہوا کے دباؤ کی وجہ سے بنتا ہے یہ بالعموم منہ سے پھونکنے پر اور بعض اوقات مصنوعی پمپ کے ذریعہ ایسے ہی ابھر آتا ہے جیسے بچوں کے کھیلنے کا غبارہ یا فٹ بال کا بلیڈر ہوا بھرنے سے پھول جاتا ہے۔ ایک اور لائقِ توجہ چیز اس کے خوشنما رنگ ہیں۔ اس کے بعد بلبلے کی انتہائی لطافت یا سبک پن قابلِ غور ہے۔ صابن کے پانی کے قطرے سے اگر ایک ہی بلبلا بنایا جا سکتا تو وہ ایک ماسک خانہ کے برابر بڑا ہوتا۔

بلبلے کے ہوا پر اڑنے کا راز دراصل اس کے سبک پن میں پوشیدہ ہے۔ ان تمام امور کو سمجھنے اور بلبلے کے متعلق کچھ سائنسی معلومات حاصل کرنے کے لئے سطحی تناؤ سے واقف ہونا ضروری ہے۔

## سطحی تناؤ

کسی غبارہ یا بلیڈر میں جب دباؤ کے تحت ہوا بھری جائے تو وہ ربڑ کو پھاڑ کر نکل جانے کی متقاضی ہوتی ہے اگر ربڑ میں کوئی ایسی قوت موجود نہ ہو جو ہوا کے دباؤ کا مقابلہ کرے اور ربڑ کو پھٹنے سے روکے تو ہوا کا مقید رکھنا ممکن نہیں۔ لیکن ربڑ کی یہ قوت مزاحم محدود ہوتی ہے اگر پمپ کے ذریعہ برابر ہوا بھرتے رہیں تو ایک حد ایسی آجاتی ہے جب ربڑ کی قوتِ مزاحمت ہوا کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے مقابلہ میں کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور اس وقت غبارہ پھٹ جاتا ہے۔ یہی حال بلبلے کا بھی ہے۔ ہم اس میں آہستہ آہستہ منہ سے ہوا بھرتے رہتے ہیں۔ اور وہ بتدریج بڑھتا رہتا ہے۔ مگر بالآخر ٹوٹ جاتا ہے بلبلے کی وہ جھلی جس کے اندر ہوا بند ہو جاتی ہے، وہی کام کرتی ہے جو غبارہ میں ربڑ انجام دیتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بلبلا بظاہر ٹھوس نظر آتا ہے مگر درحقیقت مائع ہوتا ہے اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تناؤ یا سکڑنے اور پھیلنے کی خصوصیت بلبلے میں اسی طرح موجود ہوتی ہے جس طرح ہوا بھرے ہوئے غبارہ میں چونکہ یہ تناؤ کی قوت جھلی یا ربڑ سطح پر ہر جگہ مساوی عمل کرتی ہے اس کو سطحی تناؤ کہتے ہیں۔

یہ تناؤ کچھ بلبلوں تک محدود نہیں بلکہ تمام مائعات کی سطحوں پر موجود ہوتا ہے۔ مائعات کی سطح بالعموم چپٹی ہوتی ہے اور ایسی سمت سطحوں کا عمل ہوتا ہے گویا وہ ایک تنی ہوئی جلد سے ڈھکی ہوئی اور یہی وہ عجیب خصوصیت ہے جو بہت سے حیرت انگیز واقعہ کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً پٹرول کے چند قطرے پانی کی ایک کافی وسیع چادر پر ڈالے جائیں تو وہ بہت تیزی سے ہر طرف کو پھیلنے لگتے ہیں حتیٰ کہ پانی کی سطح پر پٹرول کی ایک بہت پتلی تہہ قائم ہو جاتی ہے اور قوسِ قزح کے وہ تمام رنگ جو ہم بلبلے میں دیکھتے ہیں اس میں آنے لگتے ہیں۔

پٹرول جب پانی پر ڈالا جاتا ہے تو وہ قطروں کی شکل

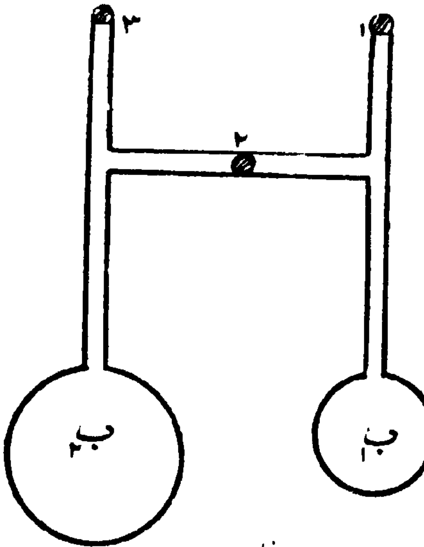
پانی پر کیوں نہیں تیرتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں پانی اور پٹرول کی سطحیں ملتی ہیں وہاں سطحی تناؤ گھٹ جاتا ہے۔ اندر اس کے اطراف کی سطح جہاں تناؤ زیادہ ہوتا ہے کمزور تناؤ کی جگہ پر اثر انداز ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سطح کا رقبہ جہاں پانی اور پٹرول ملتے ہیں تیزی کے ساتھ مسلسل بڑھتا رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر پٹرول ہر طرف کو سرعت سے پھیلنے لگتا ہے اس طرح کافور کا ایک ٹکڑا پانی کی سطح پر اضطراب کے سے عالم میں ادھر ادھر ناچتا پھرتا ہے گویا غیر مرئی قوتیں اس پر زور آزما ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کافور جس مقام پر پانی کی سطح سے مس کرتا ہے وہاں سطحی تناؤ کم ہو جاتا ہے اور اطراف کا بڑھا ہوا تناؤ کافور کو سطح آب پر متحرک کر دیتا ہے۔ پانی کے برتن میں اگر دونوں طرف سے کھلی ہوئی ایک باریک نلی کو عموداً کھڑا کیا جائے تو سطحی تناؤ کے باعث پانی نلی میں چڑھ جاتا ہے۔ ایسی پتلی نلی کو شعری نلی کہتے ہیں۔ اور یہ خاصیت شعریت یا شعری جذب و دفع کی طاقت کہلاتی ہے۔

اگر شکر کا ایک ڈلا چائے کی پیالی پر اس طرح رکھیں کہ اس کی سطح چائے سے مس کرتی رہے تو چائے اوپر چڑھنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ سارا ڈلا تر ہو جاتا ہے۔ شکر کا ڈلا ٹھوس نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ہوا کی باریک نالیاں موجود ہوتی ہیں جو بے شمار شعری نلیوں کی مانند عمل کرتی ہیں اسی کی وجہ سے چائے اوپر چڑھ جاتی ہے۔

## بعض دیگر خصوصیات

اب یہ دیکھنا ہے کہ بلبلا مدور کیوں ہوتا ہے؟ بیضوی یا مکعب شکل کا کیوں نہیں ہوتا؟ ہم یہ دیکھ چکے کہ بلبلے کی جھلی اندر کی ہوا پر دباؤ ڈالتی ہے جس کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ ہوا کو باہر نکال دے۔ جھلی میں سکڑنے کا میلان ہوتا ہے اور در حقیقت یہ سکڑ کر کم سے کم رقبہ اختیار کر لیتی ہے۔ کسی خاص حجم کی چیز کو رکھنے کے لئے کم سے کم سطحی رقبہ کا برتن اصولاً ایک کرہ ہی ہو سکتا ہے چنانچہ جب ایک ترمچی ترم بجاتا ہے تو جہاں تک اس کے چہرے کی ساخت اجازت دیتی ہے اس کے گلے کروی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

بلبلے کے اندرونی دباؤ کو اگر ایک دم آزاد کر دیا جائے تو ایک جلتی ہوئی شمع کو گل کرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ غالباً یہ بات بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں کہ ایک بڑے بلبلے کے مقابلے میں چھوٹے بلبلے کا اندرونی دباؤ زیادہ ہوتا ہے اس کو عملی طور پر بھی آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ شکل (۱) میں بنائے ہوئے آلے کے ذریعہ ایک چھوٹے اور ایک بڑے بلبلے میں ربط قائم کیا جائے تو چھوٹا بلبلا بڑے کو اور پھلا دیتا ہے۔ چھوٹا اور چھوٹا ہو جاتا ہے اور بڑا بڑھنے لگتا ہے۔ آلے میں مقامات ۱ و ۲ و ۳ پر ٹونٹیاں لگی رہتی ہیں۔ ب ۱ پر ایک




شکل (۱)

چھوٹا اور ب ۲ پر ایک بڑا بلبلا پھونکنے کے بعد تمام ٹونٹیاں بند کر دی جاتی ہیں جب ٹونٹی ۲ کو کھولتے ہیں تو بڑا بلبلا پھولنے لگتا ہے اور آخر ٹوٹ ہی جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب تک ب ۲ میں ہوا داخل نہ ہو اس کا پھولنا ممکن نہیں اور اس میں ہوا اسی وقت داخل ہو سکتی ہے جبکہ ب ۱ کے اندر کا دباؤ ب ۲ کے دباؤ سے زیادہ ہو۔

بلبلے یا جھاگ (کیونکہ جھاگ بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے بلبلوں کا مجموعہ ہے) پیدا کرنا مائعات کی کوئی مشترک خصوصیت نہیں ہے معمولی صاف پانی، سپرٹ ملی ہوئی سرخ شراب، وسکی اور برانڈی میں بلبلے یا جھاگ اڑانا امر محال ہے۔ سمندر کے پانی، مدوجزر دریا کے میلے پانی، بیر، شاوٹ اور ایسے تمام سیال مادوں میں جن کا تعلق حیوانی یا نباتاتی اجسام سے ہے۔ اور ان سب سے زیادہ صابن کے محلول میں جھاگ یا بلبلے پیدا کرنے کی خصوصیت بہت نمایاں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام سیال لعابدار ہوتے۔ ان میں چپچپاہٹ پائی جاتی ہے۔ مثلاً نشاستہ یا گوند کا محلول ان کے سالمات غیر معمولی بڑے ہوتے ہیں اور یہ معمولی سالمات کے باہم چمٹ جانے سے بنتے ہیں۔ ان غیر معمولی بڑے سالمات میں برقی بار بھی موجود ہوتا ہے۔ لعابی محلول اپنے اکثر خواص میں معمولی محلولوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ جھلی میں سے نہیں گزر سکتے۔

غرض جب ہم صابن کے محلول سے بلبلے بنتے ہوئے، یا بیر میں سے جھاگ اٹھتے ہوئے یا سمندر کے پانی سے کف پیدا ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمارے پیش نظر کوئی معمولی محلول نہیں بلکہ لعابی محلول

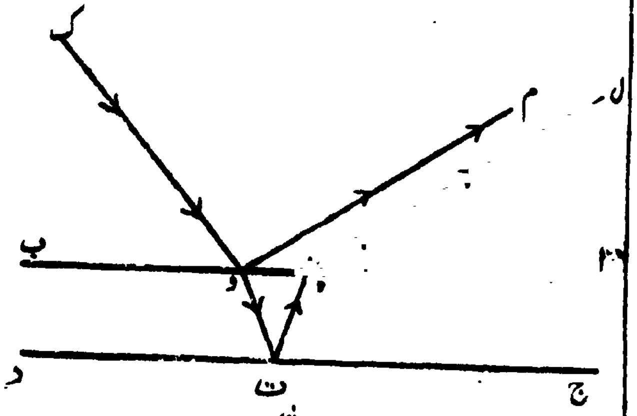
ہوتا ہے سمندر کا پانی معمولی نمک کا ایک ہلکا سا محلول ضرور ہے۔ لیکن اس میں لعابی مادے بھی موجود ہوتے ہیں۔ اور بالخصوص ساحل کے قریب جہاں پانی میں حیوانی اور نباتی مادے پڑے ہوئے سڑتے رہتے ہیں۔ ان تمام مادوں میں لعابدار اشیا کثرت سے موجود ہوتی ہیں۔

## بلبلے کے شوخ رنگ

کسی جوہڑ میں گدلے پانی کی سطح پر جو رنگ نظر آتے ہیں یا گیلی سڑک پر بکھرے ہوئے پٹرول میں۔ وجہ دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوتی ہے۔ البتہ رنگ نمودار ہونے کے لئے جھلی کا بہت باریک ہونا ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جھلی کتنی باریک ہو؟ اس کا جواب ایک انچ کی کسی کسر میں آسانی سے دیا جا سکتا ہے لیکن اس سے جھلی کی دبازت کا کوئی واضح تصور قائم نہیں ہو سکتا۔ البتہ زیادہ بہتر اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ایک پیسہ کو کوٹ پیٹ کر بلبلے کی جھلی کے برابر باریک ورق بنایا جائے تو وہ کھانے کے ایک بڑے کمرے کے رقبے کے مساوی ہوگا۔

تقریباً سو سال گذرے جب ٹھامس ینگ نے یہ بتایا تھا کہ صابن کے بلبلے کے رنگوں کی تشریح نظریہ امواج نور کے ایک ضمنی نتیجہ کے طور پر کی جا سکتی ہے۔

سمندر میں جب دو مختلف مقامات سے موجیں اٹھ کر کسی ایک جگہ ملتی ہیں تو کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ اوج اگر اوج سے ملے تو دگنی بلندی کی اوج پیدا ہوگی۔ اور حضیض حضیض سے ملے گی تو نتیجہ میں دگنی گہرائی کی حضیض قائم ہوگی۔ لیکن اوج اور حضیض آپس میں ملیں تو موج کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ رقمی جمع و خرچ کی طرح امواج کو جمع کرنے کا یہ اصول تعرض یا تداخل کہلاتا ہے۔ آواز اور نور کی موجوں میں بھی یہی صورتیں پیش آتی ہیں۔ ان کی موجوں کے دو جوڑ جب ایک دوسرے سے تعرض کرتے ہیں تو بلند آواز تیز روشنی یا خاموشی اور تاریکی پیدا ہوتی ہے۔ تعرض کے لئے موجوں کے دو جوڑ ہونے چاہئیں۔ بلبلے میں نور کی شعاعیں صابن کی جھلی کی بیرونی اور اندرونی سطح منعکس ہوتی ہیں تو موجوں کے دو جوڑ بن جاتے ہیں۔ جھلی چونکہ سیال مادے سے بنی ہوتی ہے اس کی موٹائی مختلف حصوں میں مختلف ہوتی ہے۔ کہیں یہ بہت باریک ہوتی ہے اور کہیں نسبتاً موٹی مگر مجموعی حیثیت سے اس کی دبازت نور کی موجوں کے طول کے قریب قریب مساوی رہتی ہے۔ جھلی کی بیرونی سطح سے نور کی شعاعیں منعکس ہوتی ہیں اور اندرونی سطح سے منعکس ہونے والی شعاعوں سے تعرض کرتی ہیں۔ اس تعرض کی نوعیت جھلی کی دبازت پر موقوف ہوتی ہے۔ شکل (۲) میں فرض کیجئے کہ ا ب ج د صابن کی جھلی کا ایک حصہ ہے جس میں خط اب جھلی کی بیرونی سطح کو اور ج د اندرونی سطح کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک شعاع واقع ک و جھلی کی بیرونی




شکل (۲)

سطح ا ب سے راستہ و م پر منعکس ہوتی ہے۔ اور دوسری شعاع اندرونی سطح سے منعکس ہو کر راستہ ہ ن، پر نکلتی ہے۔ و م، اور ہ ن، ایک دوسرے سے معترض ہوتی ہیں۔ ان کے ا، و، ج، ملیں گے یا حضیض۔ یہ فاصلہ و، ن، اور ن، ہ، یعنی جھلی کی دبازت پر منحصر ہوگا۔ اگر یہ دبازت سرخ روشنی کی شدت کو دگنا کر دینے کے لئے موزوں ہے تو نیلی روشنی کو مٹانے کے لئے اس کا کافی ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ مختلف رنگوں کی روشنیوں کی موجوں کے طول مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس مقام پر سرخ روشنی کا انعکاس زیادہ ہوگا۔ نیلی منعکس ہی نہ ہوگی اور باقی رنگوں کی روشنیاں ہلکی نظر آئینگی۔ غرض اس مقام پر سرخ رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہوگا کسی دوسرے مقام پر جہاں جھلی کی دبازت مختلف ہے نیلی روشنی غالب ہوگی۔ وعلیٰ ہذا طیف کے تمام رنگ نمایاں ہو جائینگے جھلی کی دبازت میں عام یکسانیت ہی مختلف رنگوں کی روشنیوں کی ترتیب سے قوس قزح کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ تار کے ایک حلقہ کو صابن کے محلول میں ڈبولنے سے اس کے اندر ایک جھلی قائم ہو جائے گی۔ اس کے بعد حلقہ کو عمودی سمت میں لٹکا دیا جائے تو صابن کا محلول نیچے کی طرف بہنے لگتا ہے جس کی وجہ سے اوپر سے نیچے کی جانب جھلی کی دبازت بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔ اور مختلف رنگوں کی اتنی پٹیاں ظاہر ہو کر ایک بڑا عجیب منظر پیش نظر کر دیتی ہیں۔

(رسالہ سائنس سے ماخوذ)

# بسنت

برق موسوی

پھر بسنت آئی، گئے جاڑے، ہوئی رُت خوش گوار
مسکراتی، ناچتی، گاتی ہوئی آئی بہار

چپہ چپہ بن گیا میرے وطن کا رنگ پاش
اللہ اللہ دید کے قابل ہے سرسوں کا نکھار

جاگتی ہے جس طرح نوخیز کوئی خواب سے
یوں اٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی صبحِ بہار

گل بداماں رُت، پھر آئی ناز کرتی اس طرح
مسکراتی جس طرح آئے کوئی جانِ بہار

بھینی بھینی موتیا کی بو ہوئی پھر عطر بیز
ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی ہیں پھر ہوائیں خوش گوار

کھلتے کھلتے یوں کھلی اس سرد موسم کی کلی
دھیرے دھیرے غنچہ وا ہوتی ہے جیسے چشمِ یار

عطر افشاں، نیم کے پھولوں کی خوشبو دن کو ہے
رات کی رانی کی نکہت رات کو ہے مشک بار

پھاگ اڑاتا آیا، پھاگن ماس پھر اس دھوم سے
ہر طرف گرنے لگے بھارت میں رنگیں آبشار

واہ کیا رنگینیاں ہیں ان دنوں صبح و مسا
واہ کیا دل چسپیاں ہیں آج کل لیل و نہار

گاؤں کے "بھولے بسنتی" کھیتوں میں نکلے سیر کو
جن پہ قرباں، شہر کے پرکار و فتنہ جو نگار

کیوں نہ موضوعِ سخن ہو، یہ بھی شاعر کے لئے!
کوئی دیکھے تو "بسنتی پوش پریوں" کا سنگار

رُخ پہ ہلدی، مانگ میں سیندور، ماتھے پر تلک
زرد کپڑے سب کے سب اور زرد ہی پھولوں کے ہار

رنگ رلیاں، اک طرف ہولی کی، آبادی میں ہیں
اک طرف جنگل میں منگل ہے، یہ سرسوں کی بہار

مختلف رنگین پوشاکیں پہن کر تتلیاں
کر رہی ہیں رقص کس انداز سے طاؤس وار

اڑ رہے ہیں بن پہ تلیر کارواں در کارواں
چر رہی ہیں کھیت میں بھیڑیں قطار اندر قطار

آم کی شاخوں میں نکلیں ننھی ننھی کیریاں
گر رہی ہے، جھوم کر باغوں پہ کیا توتوں کی ڈار

پتے پتے پر ہے رقصاں فصلِ گل کی تازگی
ڈالی ڈالی پر غزل خواں مطربانِ نوبہار

چاندنی کا لطف شب کو، صبح کو کھیتوں کی سیر
کس مزے سے کٹ رہے ہیں پھر مرے لیل و نہار

خلد کی رنگین وادی میں پہنچ جاتا ہوں میں
مست کوئل کوکتی ہے صبح کو جب بار بار

کیا بتاؤں، کس خوشی سے گنگنا اٹھتا ہوں میں
صبح جب بجتا ہے، سورج کی شعاعوں کا ستار

کروٹیں لیتی ہے کس کس رنگ سے دل میں اُمنگ
جھٹپٹے کو پھولتا ہے جب شفق کا لالہ زار

رات کو جب آسماں پر مسکراتا ہے قمر
دل کی پھلواری پہ پڑتی ہے مسرت کی پھوار

تو کہے، پورب میں یہ کوئی اڑاتی ہے گلال
آج کل اس رنگ سے ہوتی ہیں صبحیں آشکار

تو پکارے، ہو نہ ہو، پچھم میں یہ ہوتا ہے پھاگ
یوں شفق کے شام کو بن جاتے ہیں نقش و نگار

چہرۂ خوباں سے روشن تر ہے رخسارِ سحر
گیسوئے جاناں سے بڑھ کر زلفِ شب ہے مشک بار

یہ مرا دیوان ہے، یا صبح کی رنگیں جھلک
گلشنِ کشمیر ہے، یا شام کے نقش و نگار

صبح کو گیتی پہ بہتی ہیں سنہلی ندیاں
رات کو گردوں سے گرتے ہیں رو پہلے آبشار

کڑکڑاتی سردیوں کی گرم بازاری گئی،
اب نہ سردی ہے نہ گرمی، کیسی رُت ہے خوش گوار

اس طرح بدلا ہے موسم، جس طرح کوئی حسین
"سرد مہری" چھوڑ "گرم مہر" ہو یانِ کار

دیکھتے ہی دیکھتے، آجائیں گی اب گرمیاں
ہائے کیا جلدی چلا جاتا ہے یہ عہدِ بہار

روک لیتا، کوئی دن، اس جانے والی رت کو اور
کاش برقِ موسوی! ہوتا یہ میرا اختیار

# نقد و نظر

## ذاکر صاحب

مصنفہ رشید احمد صدیقی، ناشر کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

اس چھوٹی سی کتاب میں ذاکر صاحب کا ذکر ہے اور رشید صاحب کی زبان سے ہے۔ موضوع بھی محبوب اور بیان بھی۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کتاب شروع کیجئے تو اسے ایک ہی سانس میں ختم کئے بغیر جی نہیں مانتا۔ یہ سب کچھ اس لئے بھی ہے کہ رشید صاحب نے ہمیں ذاکر صاحب کے متعلق وہ باتیں بتانے کی کوشش نہیں کی جو ہم سب کم و بیش جانتے ہیں۔ ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے مفکر تعلیم کی حیثیت سے، اور ملک و قوم کو ایثار اور اخلاص کا درس دینے والی ایک محبوب ذات کی حیثیت سے اب ذاکر صاحب کو کسی عقیدتمند دوست کی مدح سرائی یا لغز بیانی کے سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ان کا نام تو اب دوسروں کا سہارا بنتا ہے لیکن ایک ایسے شخص کے متعلق ایسی باتیں سننے کی تمنا ہر ایک کے دل میں پیدا ہوتی ہے، جن کا تعلق خاص ذاتی سیرت اور اخلاق سے ہو۔ ذاکر صاحب اسی طرح کی کتاب ہے۔ رشید صاحب نے ذاکر صاحب کو ہر رنگ میں دیکھا ہے، اور اس کتاب میں ان سارے رنگوں کو ملا کر ایک بے حد حسین تصویر بنائی ہے۔ رنگوں کو اچھی طرح سمونے کی کوشش تو نہیں کی گئی (رشید صاحب کا فن شاید اس جاں سوزی کا قائل ہی نہیں) لیکن ان بکھرے ہوئے رنگوں میں بھی ایک کشش ہے۔

مضامین رشید والے رشید صاحب اب اردو کیلئے ایک بھولی بسری یاد ہو گئے ہیں لیکن ذاکر صاحب، کے بعض حصے اس بھولی بسری یاد کو تازہ کر دیتے ہیں۔ یہ غالباً ذکر مرشد کا فیض ہے۔

کتاب اپنی معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری محاسن سے بھی مزین ہے۔ آرٹ پیپر پر چھپی ہے، کتابت اور طباعت بھی بہت اچھی ہے (سوائے شروع کے چند صفحوں کے جن میں کتابت کی بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں اور طباعت میں بھی صفائی نہیں آئی)

کتاب پر تبصرہ کرتے وقت انسان کو سنجیدہ ہونا پڑتا ہے اور سنجیدگی کی بارگاہ میں شکوہ و شکایت کا عمل دخل نہیں۔ پھر بھی رشید صاحب سے یہ شکوہ ہے کہ یہ کتاب اتنی مختصر کیوں ہے۔

## سازِ ہستی

مصنفہ بیگم صالحہ عابد حسین، ناشر کتابی دنیا لمیٹڈ۔ صفحات ۳۰۶، قیمت تین روپے

بیگم صالحہ عابد حسین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ نقشِ اول کئی برس ہوئے شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ گویا نقشِ ثانی ہے اور مجموعی حیثیت سے ان ساری خصوصیات کا حامل ہے جو نقاش کے نقشِ ثانی کو اس کے نقشِ اول سے بہتر و برتر بناتی ہیں۔ مجموعہ میں نو افسانے ہیں سب کے سب زندگی کے سچے مرقعے ہیں اور سب میں زندگی کی سچائیوں کے باوجود افسانہ کی دلکشی ہے۔ موضوع کے انتخاب میں بھی اور زبان و بیان کی سادگی اور شیرینی میں بھی۔

اردو میں پچھلے چند برسوں میں کئی افسانہ نگار خواتین ایک نمایاں حیثیت سے ہماری افسانہ نگاری کے میدان میں آئی ہیں اور ان میں سے اکثر نے اپنے لئے فن کی کوئی نہ کوئی جدت مخصوص کر لی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اس جدت طرازی کی کوشش میں لغزشیں بھی ہوتی ہیں۔ بیگم صالحہ عابد حسین افسانہ نگار خواتین میں تنہا ایسی ہیں جنہوں نے اپنے مسلک کو بدلے بغیر بھی ترقی کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ انہیں کسی نئے سہارے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ زندگی کا صحیح مشاہدہ، اس پر ایک صالح تنقید اور ان دونوں چیزوں کو خوش گوار انداز میں پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دینا۔ ان کی افسانہ نگاری کا اساس ان تین چیزوں پر ہے۔ اور یہ سہارے بجائے خود اتنے مستحکم ہیں کہ لکھنے والے کو کسی اور سہارے کی ضرورت ہی نہیں۔

## بات چیت

مصنفہ بیگم صالحہ عابد حسین۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ کتابی دنیا، لمیٹڈ، دہلی۔

یہ کتاب ان تیرہ تقریروں کا مجموعہ ہے جو بیگم صالحہ عابد حسین نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ کی تھیں۔ تقریروں کو مناسب عنوان کے ماتحت تین مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے پہلے حصہ (اپنی باتیں) میں میں نے لکھنا کیسے شروع کیا، استانی جی، عورت کے فرائض، تیمار داری، ہماری عید، بد مزاج بیوی، میل جول اور ہمارا اخلاق جیسے عنوانوں پر تقریریں ہیں۔ دوسرے حصہ (اپنوں کی باتیں) میں یہ تقریریں ہیں: اسلام میں عورت کے حقوق، حالی کے خطوط اور حالی کا اصلاحی ادب تیسرے حصہ (اوروں کی باتیں) کی تقریروں کے عنوان ہیں — مصطفےٰ کمال نے عورتوں کے لئے کیا کیا، خالدہ ادیب خانم اور عورتیں اور آزادی جمہوری ملکوں میں۔ ان سب تقریروں کی ایک سب سے بڑی خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ بات چیت کے انداز میں لکھی گئی ہیں اور پیرایۂ بیان بے حد دلنشین ہے اور دوسری خصوصیت یہ کہ ہر تقریر میں فکر کا وہ عنصر بھی شامل ہے جس کے بغیر بات چیت پُر تاثیر نہیں بنتی۔ مجموعی حیثیت سے یہ تقریریں عورتوں کے ادب میں مفید اضافہ ہیں۔

## ظالم کسان

بچوں کی یہ چھوٹی سی کہانی شفیع الدین صاحب نیر نے لکھی ہے اور کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی نے شائع کی ہے

کہانی بچوں کے لئے دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ لیکن زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ کتاب آرٹ پیپر پر چھپی ہے۔ ہر صفحہ بلاک بنوا کر چھپوایا گیا ہے اور کہانی کے ۹ صفحوں کے ساتھ ساتھ پورے صفحے کی چار بے حد جاذب نظر رنگین تصویریں ہیں۔ اردو پڑھنے والے بچوں کے لئے کتاب ایک تحفہ ہے۔ کتاب کی قیمت گیارہ آنے بظاہر زیادہ ہے، لیکن کتاب پر جو کچھ خرچ کیا گیا ہوگا اسے دیکھتے ہوئے قیمت زیادہ نہیں۔

و۔ع

# چاند کی شہزادی

افسانہ

فضل حق قریشی

عرصۂ دراز کی بات ہے،[1] سنوگی نومیا کو نامی ایک بڈھا جاپان کے ایک دیہات میں رہتا تھا۔ وہ روزانہ جنگل سے بانس کاٹ کر شہر کے بازاروں میں بیچتا اور اس آمدنی پر گذارا کرتا تھا۔ ایک روز بانسوں کے جھنڈ میں اسے کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک حسین و جمیل چھوٹی سی لڑکی ہے۔ اس کا قد صرف چار انچ تھا۔ وہ اسے احتیاط سے اٹھا کر اپنے گھر بیوی کے پاس لے گیا۔ وہ لڑکی اس قدر نازک تھی کہ اسے ریشم کی ٹوکری میں لٹا کر پالنا پڑا۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی روز سے اس بنس کٹے کا روزگار چمکنے لگا۔ ہر دفعہ بانس کاٹنے پر اسے سونے چاندی کے ڈھیر ملنے لگے اور اس طرح وہ برابر دولت مند ہوتا چلا گیا۔

اس لڑکی کو ان سیدھے سادے لوگوں میں زندگی بسر کرتے مشکل سے تین مہینے گذرے ہوں گے کہ وہ ایک دم بڑھ کر جوان ہو گئی۔ اس کے سر کے بال بھی جو دونوں شانوں پر بکھرے رہتے تھے، خوب طویل ہو گئے اور اس لئے ضرورت ہوئی کہ جوڑا باندھ کر انھیں سر کی زینت بنا دیا جائے۔ بنس کٹے نے اس کا نام کاگویا ہیمے رکھ دیا جس کے لفظی معنی ہیں "میدان خزاں کا سدا بہار بانس"۔ اور یہ اس لئے کہ وہ بانسوں کے جھنڈ میں سے ملی تھی۔ نام رکھنے کی رسم ادا کرتے وقت شاندار دعوت بھی کی گئی۔

کاگویا آس پاس کی تمام عورتوں میں سب سے زیادہ حسین تھی، اس لئے دعوت کے دوران میں سب کی نظر اس پر پڑی اور جلدی ہی اس کا چرچا ہر طرف ہونے لگا۔ اس روز سے منچلے نوجوان اس کے گھر کے کاوے کاٹنے لگے اس آرزو میں کہ باغیچے کی باڑ سے جھانک کر اسے ایک نظر ہی دیکھ لیا کریں۔ لیکن ان کی یہ آرزو کبھی بر نہ آتی کیونکہ انھیں زیادہ نزدیک جانے کا موقع نہ ملتا اور غریب لوگ تو دور ہی سے دھتکار دئے جاتے تھے۔ تاہم پانچ مالدار عاشقوں نے ہمت نہ ہاری اور وہ مسلسل اپنی کوششوں میں سرگرداں رہے۔ یہ پانچوں شہزادے یعنی اشیزوکوری، کوراموچی، سدائجن، چی اناگون اور مورو تادا اس قرب و جوار میں رہتے تھے۔ وہ پورے ضبط و تحمل کے ساتھ زمانے کے سرد و گرم کو برداشت کرتے اپنے ارادے پر قائم رہے یہاں تک کہ ایک دفعہ وہ حرف مدعا زبان پر لائے اور بڈھے بنس کٹے سے کہا کہ اپنی لڑکی ہم میں سے کسی ایک کے ساتھ بیاہ دو۔ بڈھے نے صاف جواب دیا کہ وہ میری حقیقی بیٹی نہیں ہے اور اسی لئے اس کی شادی کے معاملے میں صرف میری رائے کوئی اہمیت نہیں رکھ سکتی۔ وہ مایوس ہو کر چلے گئے لیکن پھر بھی کوئی مناسب موقع دیکھ کر بڈھے کے سامنے ذکر چھیڑتے رہے۔ آخر اس نے مجبور ہو کر کاگویا کی توجہ اس موضوع کی طرف مبذول کرائی اور اس سے کہا کہ تم جیسی حسین لڑکی سے شادی کر لینا ان میں سے ہر شہزادے کے لئے باعث فخر ہے لیکن تمہیں اپنی پسند کے معاملے میں پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ اس پر وہ بولی کہ ان منچلے نوجوانوں پر بھروسہ کرنا مشکل ہے۔ پتہ نہیں کس روز ان کا من میری طرف سے پلٹ جائے اور میں مایوسی کے دامن میں منہ چھپا کر روتی رہ جاؤں۔ اس لئے جب تک ان کو اچھی طرح آزما نہ لیا جائے، شادی کے لئے حامی نہیں بھری جا سکتی۔ آخر طے پایا کہ وہ صرف اس نوجوان سے شادی کرے گی جو اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دے۔ یہ سن کر ان پانچوں کے مرجھائے ہوئے دل یکبارگی ہرے ہو گئے اور وہ سب کے سب خوب بن ٹھن کر خوشی کے شادیانے بجاتے اس کے گھر پہنچے تاکہ یہ معلوم کریں کہ آزمائش کی صورت کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔ اس ہنگامے کا علم ہوتے ہی کاگویا باہر نکل آئی اور انھیں مخاطب کر کے بولی:-

"شمالی ہندوستان کے شہر نخو کو میں پتھر کا بنا ہوا ایک کاسۂ گدائی موجود ہے جو کسی زمانے میں مہاتما بدھ کے پاس تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ شہزادہ اشیزوکوری فوراً جائیں اور اسے لا کر میری خدمت میں پیش کریں۔ اور کوہ ہورائی کی چوٹی پر جو مشرقی سمندر پر سایہ فگن رہتا ہے، ایک سرسبز و شاداب درخت ہے جس کی جڑیں چاندی کے تاروں کی، تنا خالص سونے کا اور پھل سفید کھوراج کے ہیں۔ میں حکم دیتی ہوں شہزادہ کوراموچی کو کہ وہ فوراً جائیں اور اس کی ایک شاخ توڑ کر میرے پاس لے آئیں۔ اسی طرح سرزمین موروکوشی کے لوگ ایسے چوہوں کے سمور سے پوشاک تیار کرتے ہیں جن پر آگ اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ شہزادہ سدائجن وہاں سے ایک پوشاک لا کر بھیج دیں۔ اور شہزادہ چی اناگون قوس قزح کے رنگ کا وہ ہیرا میرے حضور میں پیش کریں جس کی چمک دمک اب تک اژدھے کے سر میں چھپی ہوئی ہے۔ اب رہ گئے شہزادہ مورو تادا۔ وہ ان خوبصورت کوڑیوں کا ایک جوڑا لائیں جن کو ابابیلیں اپنی چونچوں میں اٹھا کر سمندر پار سے لاتی ہیں۔"

شہزادہ اشیزوکوری نے گھر جا کر غور و خوض کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک کاسۂ گدائی کی تلاش میں شمالی ہندوستان تک جانا محض حماقت اور ایک حد تک بے چارہ دری ہے۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ اس جیسا ایک جعلی کاسہ بنوا آنا یا کہیں سے حاصل کر لینا مناسب ہے۔ اس نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے ایسی صورت پیدا کی کہ کاگویا کو اس کے عزم سفر کا علم ہو گیا۔ در انحالیکہ وہ مکار شہر یاتو میں تین سال تک چھپا بیٹھا رہا اور اس اثنا میں شہر توچی کی پہاڑی خانقاہ سے قدیم زمانے کا ایک پیالہ مل گیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا اور زربفت کے ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر مصنوعی پھولوں کے دستے کے ساتھ اپنی محبوبہ کے پاس بھیج دیا۔ لیکن جب

---

[1] یہ افسانہ جس کو جاپان کے ضمیاتی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے آج سے ہزار سال پہلے قلمبند کیا گیا تھا۔ — مترجم

کاگویا نے اس میں نورِ سماوی کی کوئی جھلک نہ دیکھی تو اسے فوراً محسوس ہوگیا کہ وہ پیالہ مہاتما بدھ کا نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے اسی رائے کے ساتھ پیالہ واپس کردیا اور شہزادے کو مایوس ہوکر خاموش ہوجانا پڑا۔

شہزادہ کوراموچی بھی اتنا ہی مکار اور چالاک تھا۔ اس نے بھی لوگوں میں مشہور کرادیا کہ شہزادہ سیم و زر کے ایسے درخت کی تلاش میں سرزمین کوکوشی کی جانب عازمِ سفر ہے جس میں پکھراج کے پھل لگتے ہیں۔ لیکن دراصل اس نے خاندانِ اوجیارو کے چھ فنکار کی خدمات حاصل کیں اور اپنے ساتھ ان کی رہائش کا انتظام ایک ایسے دور افتادہ مکان میں کیا جہاں انسان کا گذر بڑی چیز ہے، پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ وہاں تنہائی میں رہ کر اس نے کاگویا کی بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق مصنوعی شاخ تیار کرانی شروع کی اور جب فنکاروں نے حسبِ منشا اسے بالکل مکمل کردیا تو وہ اسے اپنے ساتھ لے کر کاگویا کی خدمت میں جا پہنچا اور شاخ پیش کرتے ہوئے اپنے سفر کے فرضی حالات بھی بیان کرتا رہا۔ کاگویا سکوت و استعجاب کے عالم میں سب باتیں سنتی رہی۔ شہزادے نے کہا کہ میں نے خوفناک سمندروں کو طے کرتے وقت محیر العقول جانوروں کا مقابلہ کیا اور بھوک پیاس کے صدمے برداشت کئے۔ نیز سوہانِ روح بننے والی بیماریوں میں مبتلا رہا تب کہیں گوہرِ مقصود ہاتھ آسکا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب میں سمندر کے کنارے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو ایک ایسی سہ رنگ ندی کو بہتے دیکھا جس کی ایک لہر سنہری، ایک روپہلی اور ایک نیلگوں تھی اور عبور کرنے کے لئے سیپیوں کی پشت ہائے نگارین کے پل بنے ہوئے تھے۔ اسی ندی کے کنارے وہ درخت اگا ہوا تھا جس کی تفصیل آپ نے بیان کی تھی۔ میں نے فوراً ایک شاخ توڑ لی اور اب اسے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا فخر حاصل کررہا ہوں۔ یہ کہانی اس خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کی گئی تھی کہ کاگویا اسے سچ سمجھنے کے لئے مجبور ہوگئی اور ساتھ ہی اس کو شہزادے کے مصائب و آلام پر ترس بھی آنے لگا لیکن عین اس وقت جبکہ ان میں یہ گفتگو ہورہی تھی خاندان اوجیارو کے چھ فن کار درّانہ اندر گھس آئے اور شہزادے سے مصنوعی شاخ بنانے کی اجرت طلب کرنے لگے جو اس وقت تک ادا نہیں کی گئی تھی۔ اس انکشافِ حقیقت کو کاگویا نے غنیمت جانا اور فنکاروں کو اپنے پاس سے انعام دے کر رخصت کردیا۔ نیز وہ شاخ جو اصلی نہیں تھی، شہزادے کو واپس دے کر اسے بھی چلتا کردیا۔

سدائجن نے بھی ووکئی نامی ایک سوداگر کو جو اپنا سامانِ تجارت ساتھ لے کر موروکوشی کی جانب جا رہا تھا، تخلیے میں بلایا اور اس سے کہا کہ میری خاطر چوہوں کے سمور سے بنی ہوئی ایک ایسی پوشاک لیتے آنا جس پر آگ اثر انداز نہ ہوسکتی ہو۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد جب تجارتی جہاز واپس آیا تو شہزادے کو پوشاک مل گئی۔ اس لباس کا کیا کہنا۔ کپڑے کی زمین سمندر کے پانی کی طرح سبزی مائل نیلی تھی اور اس پر ابھرا ہوا سنہرا اسٹائل عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ اس کی نزاکت و رعنائی بھی لاجواب تھی۔ شہزادے کو اس سوداگر پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا، اس لئے اپنی کامیابی کا اسے پورا یقین ہوگیا اور اسی لئے وہ پوشاک کو کاگویا کی خدمت میں لے گیا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی لیکن ساتھ ہی اس کی آزمائش کو ضروری سمجھا۔ چنانچہ اس نے فوراً آگ جلوائی اور لباس اس میں ڈال دیا۔ ایک دم شعلوں نے تیزی پکڑی اور وہ قیمتی پوشاک نذرِ آتش ہوگئی۔ یہ نتیجہ شہزادے کے لئے موجبِ الم لیکن کاگویا کے لئے باعثِ مسرت تھا۔ کیونکہ اس طرح وہ تیسرے مکار کے پھندے سے بچ گئی۔

شہزادہ چی اناگون نے بھی اپنے ہوا خواہوں کو جمع کیا اور اژدہے کے سر میں چھپے ہوئے ہیرے کا ذکر کرکے اسے حاصل کرنے کی تدبیر معلوم کرنی چاہی۔ دوستوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور کہا کہ آپ کو اس مہم پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس کام کو بخوشی انجام دیں گے۔ چنانچہ شہزادہ انھیں رخصت کرکے اپنے محل کی آرائش و تزئین کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے تمام دیواروں پر نئے رنگ و روغن سے بیل بوٹے بنوائے، چھتوں اور محرابوں میں جھاڑ فانوس لٹکوائے، ستونوں پر سنہرے روپہلے کپڑے کی پٹیاں لپٹوا دیں اور فرش کو بھی رنگین ٹائلوں سے دیدہ زیب بنا دیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر اس نے لوگوں کی واپسی کا انتظار شروع کیا کہ کب وہ لوٹیں اور وصلِ محبوب کے مزے حاصل ہوں۔ انتظار کی یہ گھڑیاں اس کے لئے بہت ہی کٹھن تھیں۔ آخر جب صبر نہ ہوسکا تو وہ خود ناہوا کے ساحل تک گیا۔ ملاحوں سے یہ پوچھنے کے لئے کہ وہ لوگ جو اژدہے کی تلاش میں کشتیاں لے کر گئے تھے، واپس آگئے یا نہیں۔ لیکن یہ سن کر اسے تعجب ہوا کہ کسی شخص نے اس مقصد کے لئے ایک بھی کشتی کرائے پر نہیں لی۔ آخر وہ خود اس مہم پر روانہ ہوگیا۔ اس کی روانگی کے فوراً ہی بعد برق و رعد کے دیوتا کی ناراضگی زمین و آسمان کے درمیان تہلکہ مچانے لگی۔ چمک اور گڑگڑاہٹ کے علاوہ ہوا کی رفتار تیز ہوئی اور سمندر کی لہریں بری طرح سر اٹھانے لگیں۔ چند منٹ میں جب یہ طوفان بڑھنے لگا اور ڈوبنے کی نوبت آگئی تو کشتی کے ناخدا نے کہا کہ ہوا کا زور، موجوں کا شور، بادل کی گرج اور بجلی کی چمک صاف بتا رہی ہے کہ آسمان کے دیوتا اس لئے ناراض ہیں کہ ایک انسان نے سمندر کے اژدہے کو قتل کرنے کے لئے کمر کس رکھی ہے جبکہ وہ اژدہا بجائے خود ایک دیوتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم فوراً توبہ کرو اور اپنی سلامتی کی دعا مانگو۔ شہزادے نے اپنی غلطی تسلیم کی اور فوراً ہزار بار دعا مانگنے کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ ساتھ ہی قسم کھائی کہ آئندہ اس ارادے سے باز رہوں گا۔ اس کی دعائیں قبول ہوگئیں اور طوفان کا زور ختم ہوگیا لیکن ان ناگوار اثرات سے اس کا جسم زخمی اور روح مضمحل ہوگئی۔ تاہم غنیمت ہے کہ وہ اپنے وطن پہنچ گیا۔ تب اس کے دوست احباب بھی آئے اور ہیرے کی تلاش میں اپنی ناکامی کی داستا

سنانے لگے۔ شہزادے نے حرفِ شکایت زبان پر لانے کی بجائے ان کو یقین دلایا کہ بہتری اسی میں رہی ورنہ وہ بھی مریض جسم و جاں ہو کر لوٹتے۔ اس نے کہا کہ کاگویا کا دلی منشا ہماری تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس لئے آئندہ میں اس ظالم عورت کی طرف رخ بھی نہیں کروں گا۔ چنانچہ عشق کا بھوت اسکے سر سے اتر گیا اور وہ اس محل کی طرف سے لاپروا ہو گیا جسے بڑی محنت سے سجایا تھا حتیٰ کہ چڑیاں دیواروں پر ٹنگے ہوئے زر لفت کے پردوں کے سنہرے تار نکال کر اپنے گھونسلوں میں لے گئیں اور اس نے مطلق پروا نہیں کی۔

پانچویں شہزادے صاحب بھی اسی طرح ناکام رہے۔

---

اس کے بعد کاگویا کے حسن و جمال کی شہرت سینہ بہ سینہ ہو کر دربارِ شاہی تک پہنچ گئی اور شہنشاہ نے اسے ایک نظر دیکھ لینے کے لئے اپنے حرم کی ایک معتبر خاتون فوساگو کو روانہ کیا کہ وہ جا کر بنس کٹے کی لڑکی کو دیکھے اور صورتِ حالات سے مطلع کرے۔ لیکن جب وہ خاتون وہاں پہنچی تو کاگویا نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ لہذا وہ مایوس ہو کر واپس چلی گئی اور شہنشاہ سے اپنی ناکامی کا حال بیان کر دیا۔ وہ کاگویا کے اس روکھے پن پر ناراض نہیں ہوا بلکہ ایک بار اور قسمت آزمائی کے خیال سے بنس کٹے کو دربار میں بلا بھیجا اور یہ بھی کہلوا دیا کہ اپنی لڑکی کو ساتھ لیتے آنا تاکہ اگر ممکن ہو سکے تو تم کو شاہی خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا جا سکے۔ بنس کٹا اگرچہ شاہی انعامات کا خواہاں تھا اور انہیں حاصل کر لینا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا تھا تاہم وہ فطرتاً نیک مزاج تھا اور باپ ہونے کے لحاظ سے اپنے فرائض کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اسلئے اس نے اپنی متبنیٰ لڑکی پر کوئی ناجائز دباؤ ڈالنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ بادشاہ کا پیغام سنا کر اس سے مشورہ کر لینا کافی جانا۔ کاگویا نے جواب دیا کہ مجھے دربار میں حاضری دینے سے اس لئے تامل ہے کہ وہاں جاتے ہی میری موت یقینی ہے اور اگر تم اپنے انعامات کی خاطر مجھے قربان کر دینا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں وہاں چلی جاؤں گی۔ اس کے باپ کو اس بیان سے رنج ہوا لیکن اس نے یہی فیصلہ شہنشاہ کے گوش گزار کر دیا۔

شہنشاہ نے اس دوسری ناکامی پر بھی ہمت نہ ہاری اور فوراً شاہی شکار کے انتظامات شروع کرا دئے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس بہانے بنس کٹے کے مکان کی طرف سے گذرے اور لڑکی کو ایک نظر دیکھ لے۔ چنانچہ اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ جب اس نے کمرے میں قدم رکھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ایک آسمانی نور کی تابشوں سے جگمگا رہا ہے اور وہ نور صرف کاگویا کے جسم خصوصاً چہرے کا پرتو ہے۔ جب وہ قریب پہنچا تو لڑکی نے اپنے کمونو کی آستیں سے منہ چھپا لیا اور شہنشاہ کو اچھے خد و خال اچھی طرح دیکھنے نہ دئے۔

شہنشاہ نے جو ایک ہی جھلک دیکھ کر بے تاب ہو گیا تھا۔ فوراً شاہی پالکی منگائی تاکہ اسے بٹھا کر محل میں لے جائے لیکن پالکی کے آتے ہی کاگویا سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس غیر معمولی کرشمے پر بادشاہ نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ وہ مخلوقِ ارضی نہیں ہے بلکہ مخلوقِ سماوی سے تعلق رکھتی ہے۔ لہذا اس نے یہ سمجھ کر کہ وہ نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود وہیں کمرے میں کھڑی ہوئی ہے اسے مخاطب کر کے کہا۔ "اے بے مثل حسینہ! اگر تو میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہے تو نہ سہی لیکن تو اپنی اصلی حالت پر ضرور آجا تاکہ میں تیرے جمالِ بے نظیر کی ایک جھلک اور دیکھ لوں"۔ کاگویا دوبارہ انسانی صورت میں جلوہ گر ہو گئی لیکن بادشاہ کو بے نیل و مرام جانا پڑا۔

---

اس واقعہ کے تین سال بعد موسم بہار کے شروع ہوتے ہی کاگویا نے مستقل طور پر چاند کو نظر جما کر دیکھنا شروع کر دیا اور جب ساتویں مہینے کی چودھویں رات آئی تو اس کا دلی رنج و غم جو آتش فشاں کی مانند سینے کے نیچے چھپا ہوا تھا سیلاب اشک بن کر نمودار ہونے لگا۔ اس کی حالت اتنی قابلِ رحم ہو گئی کہ گھر کی کنیزیں بھی اسے دیکھ دیکھ کر رونے لگیں۔ بنس کٹے کے استفسار پر اس نے بتایا کہ مجھے چاند کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ دنیا کی تباہی کا اندازہ ہو رہا ہے اور اسی لئے میں آنسو بہا رہی ہوں۔

چاند کے آٹھویں مہینے کے شروع میں اس نے اپنے عزیزوں کو بتایا کہ میں آپ کی طرح ارضی نہیں ہوں بلکہ دنیائے قمر کی رہنے والی ہوں۔ میرا وطنِ مالوف ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ میں اس کرۂ ارض کو چھوڑ کر وہاں واپس چلی جاؤں۔ اس خبرِ وحشت اثر نے صرف کاگویا کے فرضی باپ ہی کو غمگین و ملول نہیں کیا بلکہ شہنشاہ بھی اس صدمہ کی تاب نہ لا کر سخت پریشان ہو گیا اور جب اسے بتایا گیا کہ اگلے مہینے کی چودھویں تاریخ کو ایک جماعت اسے واپس لے جانے کے لئے اس کرۂ نور و ضیاء سے اس ظلمت کدۂ دہر پر اترے گی تو اس نے اپنے محافظ دستے کے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ہتھیار بند ہو کر کاگویا کے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیں اور جب چاند کے رہنے والے نظر آئیں تو فوراً تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دیں تاکہ انہیں گھبرا کر بے نیل و مرام لوٹ جانا پڑے۔

یہ انتظامات دیکھ کر کاگویا نے بتایا کہ اس قسم کے محاصرے بالکل بے سود ہیں۔ باشندگانِ قمر کو تیروں کی بارش کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیگی بلکہ ان کے وارد ہوتے ہی ہر بند دروازہ خود بخود کھل جائے گا اور کسی بھی تیر انداز میں اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ اپنی کمان کا چلّہ چڑھا کر ان پر حملہ کر سکے۔ محافظ دستے کے سپاہی اس بیان سے ناراض ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ ہم ان بدتمیزوں کو آنِ واحد میں گھائل و مجروح کر کے رکھ دینگے۔

حتیٰ کہ اس مقررہ رات کی وہ گھڑی نزدیک آپہنچی جس کا سب کو انتظار تھا۔ محافظ دستے کے سپاہی جو مکان کے چاروں طرف دور دور تک پہرا لگائے بیٹھے تھے، فوراً ہوشیار اور چوکنے ہوگئے۔ انہوں نے دیکھا کہ چاند ستاروں کی ضیا بتدریج اتنی زیادہ ہوتی جارہی ہے کہ تمام دنیا بقعۂ نور بن گئی ہے اور ابھی اس ضیا افروزی کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ عجیب و غریب قسم کے بادل کا ایک بڑا ٹکڑا نمودار ہوا جس پر باشندگانِ قمر لوری نا بانیوں کے ساتھ رونق افروز تھے۔ انہیں دیکھتے ہی کسی سپاہی میں اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی اور ان کے دلوں نے جو کسی قدر رک رک کر حرکت کر رہے تھے گواہی دی کہ مقابلہ کی طاقت موجود نہیں ہے۔ بادل کی وسیع سطح پر ایک شاندار گاڑی کھڑی تھی جس پر ایک زرکار چھتر لگا ہوا تھا اور کھڑکیوں پر زربفت کے ایسے پردے آویزاں تھے جن کی مثال دنیا میں کہیں بھی نہ دیکھی گئی تھی۔ گاڑی کے اندر سے ایک کرخت آواز سنائی دی "ادھر آؤ، میاں کو مار دو!"

اور جب منس کٹا اس حکم کی تعمیل میں لرزتا کپکپاتا قریب پہنچا تو اس کو دوسرا حکم ملا کہ کاگویا کو بلانا ضروری اتنی کے لئے تیار کردو اور ساتھ ہی اسی آواز میں کاگویا کو مخاطب کرکے کہا گیا "اے ملکۂ قمر! آخر کب تک آپ اس دارالمحن میں اپنی زندگی خراب کرتی رہیں گی؟"

فوراً اندرونی اور بیرونی تمام دروازے کھل گئے اور کاگویا اپنی سہیلیوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں باہر نکل آئی۔ اس نے اپنے باپ کو مخاطب کرکے کہا "اگر میں نے اسی کرۂ ارض پر جنم لیا ہوتا تو میں آپ کو رنج و غم کے عالم میں چھوڑ کر کہیں بھی جانا پسند نہ کرتی۔ لیکن اب مجبوری ہے اور مجھے چاند میں واپس جانا ہی پڑے گا جہاں سے شہابِ ثاقب کی مثال اس دنیا میں آئی تھی۔ میں اپنا نقاب بطور یادگار چھوڑے جاتی ہوں تاکہ اسے دیکھ کر آپ اپنا دل ٹھنڈا کر لیا کریں۔"

پھر اس نے شہنشاہ کے نام ایک خط بھیجا جس کا مضمون یہ تھا۔

"عالیجاہ! آپ نے کوشش کی کہ کسی طرح باشندگانِ قمر کو گھائل کرکے میری روانگی میں رخنہ پیدا کردیں لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ میں عالیجاہ کی کوئی خدمت انجام نہ دے سکی۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اسی دنیا میں رہ جاتی۔ اب آسمانی نمائندے مجھے لینے کے لئے آگئے ہیں اور مجھے ان کے ساتھ جانا ہی پڑے گا۔ آپ بھول کر بھی یہ خیال دل میں نہ لائیں کہ میں جان بوجھ کر احکامِ شاہی کی خلاف ورزی کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ یہ الفاظ آپ کی بارگاہ میں پہنچ کر میری طرف سے صفائی پیش کرسکیں گے۔ میں انہیں قلمبند کرتے وقت دلی رنج محسوس کر رہی ہوں۔"

یہ خط بھیج کر اس نے وہ آبِ حیات پیا جسے باشندگانِ قمر اپنے ساتھ لائے تھے اسکے زیرِ اثر وہ دنیا کی تمام باتوں سے خالی الذہن اور ساتھ ہی غیر فانی ہوگئی۔ اس نے پروں کا بنا ہوا ایک حلۂ آسمانی بھی پہنا اور گاڑی میں جا بیٹھی۔ اس کے سوار ہوتے ہی بادل کے ٹکڑے میں حرکت ہوئی اور وہ آسمان کی طرف اٹھتا چلا گیا۔



## آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ میں نظم ـــــ پنڈت آنند نرائن ملا۔
۲۔ پنڈت آنند نرائن ملا (مع تصویر) ـــ پروفیسر سید احتشام حسین
۳۔ ماں (افسانہ) ـــــ جناب شبیہ انصاری
۴۔ غزل ـــــ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی
۵۔ ترکی کا آئین ـــــ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
۶۔ چینی موسیقی ـــــ جناب شاہد احمد دہلوی
۷۔ ایک پرانی صحبت ـــــ نواب خواجہ عبدالمجید
۸۔ سواد (افسانہ) ـــــ جناب مسلم جالندہری
۹۔ جنگِ عظیم سے پہلے کی کہانیاں ـــ محترمہ حمیدہ سلطان
۱۰۔ ان کی ذات (افسانہ) ـــــ محترمہ سیدہ ولی ملک
۱۱۔ نفسیاتی گتھیاں اور اردو شاعری۔ جناب مرزا عابد عباس
۱۲۔ صحرا میں پھول (افسانہ) ـــ جناب اکمل قاسمی
۱۳۔ شیر افگن کا قتل ـــــ جناب شبیر حسن
۱۴۔ عربوں کا ذوقِ علمی ـــــ جناب عبید محمد زبیر

مضامین دلی پرنٹنگ پریس میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعاتِ متحدہ نے پوسٹ آجکل سے شائع کیا

# نئی ادبی مطبوعات

**شیشہ وسنگ**:- مصنفہ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی۔ بارہ اصلاحی، معاشرتی اور اخلاقی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ لکھنوی زبان میں بہترین تصنیف۔ قیمت مجلد عہ

**اتفاقات**:- مرزا فدا علی خنجر لکھنوی۔ یہ مرزا صاحب کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں رومانوی اور معاشرتی زندگی کے اتفاقات کو بہترین پیرایہ اور پاکیزہ زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

**اردو زبان اور ہندو**:- مصنفہ ناظم سیوہاروی۔ اردو زبان کی ترقی و سربلندی میں ہندو اہل وطن نے جو بے بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس کتاب میں ان کی خدمات و حالات زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ ؎

**تاریخ انقلاب روس**:- مصنفہ شیر جنگ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر تاریخی، معاشی اخلاقی اور مجلسی رد و بدل کی وضع فرسا تاریخ جو ایک سیاسی مصنف کی طویل جد و جہد اور کد و کاوش کا بہترین مرقع ہے۔ موجودہ تمام تاریخوں سے کامیاب و کامل کتاب ہے۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے للعہ

**کارل مارکس اور اس کی تعلیمات**:- مصنفہ شیر جنگ:- کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے اپنے نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت مجلد سعہ

**اوراق پارینہ**:- از شیر جنگ۔ ایک انقلابی بیتہ ری وہ بھی ادیب۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات۔ غریب مزدور کسان کی تکالیف معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے یہ کتاب انقلابی ذہنوں کے لئے ایک پروگرام اور ادباء کے لئے بہترین استعارے محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ۔ قیمت عہ

**ادبستان**:- حضرت مولانا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کرکے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ تیسرا ایڈیشن قیمت دو روپے آٹھ آنے ؏

**دیس سے باہر**:- آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی ادبی، مضامین کا دوسرا مجموعہ۔ لندن سے آداب عرض کی مقبولیت اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ قیمت دو روپے۔ عہ

**لندن سے آداب عرض**:- آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا۔ "لندن سے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے۔ بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ دوسرا ایڈیشن۔ عہ

**قرآنی اخلاق**:- انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کو مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ قیمت عہ

**کمال اتاترک**:- مسیحائے ترکی مصطفےٰ کمال پاشا کے گہرے دوست محترم استاد محمد توفیق پاشا نے ترکی ڈکٹیٹر اور جلیل القدر رہنما کے سوانح حیات کمال تدبر اور محققانہ طرز بیان سے مزین فرمائے ہیں جس کی وجہ سے "کمال اتاترک" موجودہ تمام سوانح عمریوں سے مکمل و افضل ہے کتاب کی مقبولیت اس امر سے عیاں ہے کہ فاضل مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات کو اس خوبصورتی سے مرتب کیا ہے کہ اسکا پانچواں ایڈیشن چھپ رہا ہے قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے سعہ

## بہترین اخلاقی افسانے

سازِ فطرت:- از حسن عزیز جاوید ...... ؏
قسمت:- دنیاوی کشمکش کے دلچسپ پاکیزہ افسانے ... ؏
نیلوفر:- دلچسپ و نتیجہ خیز افسانوں کا مجموعہ ...... ؏
صبر و ضبط:- معاشرتی و پاکیزہ افسانوں کا مجموعہ ... ؏

ہمارے ہاں اسلامی ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف، حمائل پنجسورے اور سیپارے بھی شائع ہوتے ہیں۔

# آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

سالانہ چندہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۹ | فہرست | یکم مارچ ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے





مدیرِ اعلیٰ
سیّد وقار عظیم
ایم اے

نائب مدیران
فضل حق قریشی دہلوی — بھگت سروپ کھلر ایم اے — سید آفاق حسین آفاق بی اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۹۶ دہلی

# رفتارِ زمانہ

## ایشیائی تعلقات کی کانفرنس

تمام ایشیائی ملکوں کے مابین سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی تعلقات کو زیادہ استوار کرنے کے لئے نئی دہلی میں ایک کانفرنس ہونے والی ہے جس کے اجلاس ۲۳ ؍ مارچ سے ۲ ؍ اپریل تک منعقد ہوں گے۔ دعوت نامے جاری ہو چکے ہیں اور بیشتر ملکوں نے اپنی شرکت کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ اس کے صرف ابتدائی اور آخری جلسوں میں عوام کو جانے کی اجازت ہوگی ورنہ باقی تمام کارروائیوں میں صرف نمائندگان و سامعین ہی شریک ہو سکیں گے۔ افغانستان نے چھ نمائندے بھیجنے کا وعدہ کیا ہے جن میں ڈاکٹر محمد انس خاں ڈائرکٹر جنرل شعبۂ تعلیم، ڈاکٹر عبدالمجید خاں نائب امیر جامعہ کابل اور مسٹر عبدالحی خاں عزیز انڈر سکریٹری وزارت اقتصادیات کابل بھی شامل ہوں گے۔ ملایا سے نو نمائندے آئینگے جن میں ملایا کی قومی جماعت کے تین رکن شامل ہوں گے۔ برما میں ایک غیر سیاسی جماعت ہے جو ہندوستانی کونسل کی طرح برمی کونسل کہلاتی ہے۔ اس نے آٹھ نمائندے بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ لنکا کے وزیر حفظانِ صحت آنریبل جارج ای ڈی سلوا اپنی حکومت کی طرف سے بذاتِ خود نمائندگی کریں گے۔ چین کی تینوں مشہور جماعتیں یعنی سائنو انڈین ایسوسی ایشن، نیو ایشیا ایسوسی ایشن اور فورن پالیسی ایسوسی ایشن اپنے اپنے نمائندے بھیجیں گی۔ موتمر رابطۂ عرب کی ثقافتی مجلس نے بھی نمائندے بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ انڈونیشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر شہریار نے کانفرنس کی مجلس عاملہ کی صدر مسز سروجنی نائیڈو کو لکھا ہے کہ میرے ملک سے نمائندے اور سامعین پوری تعداد میں شرکت کریں گے۔ نیپال اور بھوٹان کی حکومتیں بھی چند سامعین بھیجیں گی۔ شام کی مجلس ادب کی جانب سے محمد خلیل بے مردم بے تشریف لائیں گے اور "تمدن عرب میں ہندوستانی عناصر" کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔ ترکی نے اپنے سفیر متعینہ ہندوستان کو نامزد کیا ہے کہ وہ اس کانفرنس میں سرکاری طور پر شرکت کریں۔ نیویارک کے ادارہ تعلقات ممالک بحر الکاہل نے مسٹر و مسز رچرڈ ڈایڈ ولف، مسٹر ایڈ گرسنو اور مسٹر تالبوت کو اپنی طرف سے نامزد کیا ہے۔ دنیا بھر کے نسوانی اداروں کو بھی اڑتیس دعوت نامے بھیجے گئے ہیں اور امید ہے کہ تمام ایشیا کی مقتدر خواتین ذوق و شوق کے ساتھ اس کانفرنس میں حصہ لیں گی۔

## فرانسیسی اعزاز سے اجتناب

فرانس کے محکمۂ امور خارجہ کے ایک اعلان سے معلوم ہوا ہے کہ حکومتِ فرانس نے ایک فوجی تمغہ جو فرانس کا سب سے بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے اور جس کی حیثیت برطانوی وکٹوریہ کراس کے برابر ہوتی ہے، روس کے قائد جنرلیسمو جوزف اسٹالین کی خدمت میں پیش کیا لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ فرانس نے اس سے قبل ایسے ہی اعزازی تمغہ جات مسٹر چرچل جنرل ڈی گال اور امریکہ کے صدر روزویلٹ کو پیش کئے تھے ان میں سے جنرل ڈی گال نے بھی اسے قبول نہیں کیا تھا اور صدر روزویلٹ کو چونکہ ان کی وفات کے بعد دیا گیا تھا، اس لئے قبول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ جنرلیسمو اسٹالین نے فرانس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ لینن کے بعد سے آج تک یہ امر ہماری روایات قومی کے منافی رہا ہے کہ سویٹ حکومت کا کوئی رکن کسی غیر ملکی اعزاز کو قبول کرے۔ اسی لئے میں بھی اس سے اجتناب کر رہا ہوں۔ جنرل ڈی گال نے اس بنا پر انکار کیا کہ وہ خود اپنے ملک کے رہنما کی حیثیت سے وہ تمغہ جات دوسروں کو عطا کرتے رہے تھے اور اس لئے اس اعزاز کو اپنے لئے غیر ضروری سمجھتے تھے۔

## خونخوار فرانسیسی

امریکہ کے ایک عظیم الجثہ پرندے خفاش کی بابت عام عقیدہ ہے کہ وہ رات کے وقت قبرستان سے نکل کر اکیلے دکیلے آدمیوں پر جھپٹتا اور قابو پا کر ان کا خون چوس لیتا ہے۔ لیکن اب ان خصوصیات کا حامل انسان فرانس کے ایک شہر روئیل میں گرفتار کیا گیا ہے جس نے متعدد عورتوں پر حملہ کر کے ان کا خون چوس لینے کی کوشش کی۔ اس کا نام فیلکس ہے۔ اس کی عمر چوبیس سال ہے پیشے کے لحاظ سے باغبان ہونے کے علاوہ وہ ایک اچھا ملہ باز بھی ہے۔ یکایک اس کے دماغ میں کچھ فتور پیدا ہوا اور اس نے عورتوں پر خونخوار حملے شروع کر دئے۔ آخر میں وہ اس وقت پکڑا گیا جبکہ ایلیلیڈ گردون نامی ایک اسٹینوگرافر لڑکی کو تختہ مشق بنا رہا تھا جیل خانے میں اور اس کے بعد عدالت کے کمرے میں بھی اسکی

حرکتیں مجنونانہ رہیں اور دو دن کے مسلسل استفسارات کے بعد اس نے اقبال جرم کیا۔ اب ماہرین طب و نفسیات اس کی دماغی کیفیات کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ عجیب تغیر اس کی فطرت میں کیوں پیدا ہوا۔

## سمندر پار ملکوں سے

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں کے پاس جو کچھ اناج بچ رہتا ہے اس میں سے وہ ہندوستان کی مدد برابر کر رہے ہیں مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

| قسم اناج | ۳۰ جنوری کو ختم ہونے والے ہفتے کے دوران میں | |
|---|---|---|
| گیہوں یا آٹا | ۱۷,۷۵۰ | ٹن |
| چاول | ۳۸,۰۰۰ | ٹن |
| مکئی | ۱۸,۰۰۰ | ٹن |
| جو | ۱,۷۵۰ | ٹن |
| میلو | ۹,۳۰۰ | ٹن |
| جوار وغیرہ | ۸,۲۰۰ | ٹن |
| کل مقدار | ۸۳,۵۰۰ | ٹن |

## ۸۵ ہزار ٹن گیہوں

ریجنل فوڈ کمشنر میجر جنرل اے سی آرنلڈ جو پچھلے ماہ فراہمی گندم کے سلسلے میں ترکی تشریف لے گئے تھے برطانیہ ہوتے ہوئے کراچی واپس آگئے ہیں۔ ان کا بیان بہت امید افزا ہے۔ شروع میں ترکی نے برطانیہ کو ۷۰ ہزار ٹن گیہوں دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن بعد میں صورت حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ حصہ ہندوستان کے لئے مخصوص کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس میں اضافہ کر کے کل مقدار ۸۵ ہزار ٹن کر دی ہے۔ اس سلسلے میں جو گفتگو لندن میں ہوئی اس کا نتیجہ بھی خوشگوار رہا۔ یعنی حمل و نقل کی سہولتیں نصیب ہو گئی ہیں۔ قوی امید ہے کہ فروری کے آخر تک تین جہاز کراچی پہنچ جائیں گے اور پانچ مارچ کے دوران میں آجائیں گے۔ چونکہ شمالی ہندوستان میں چاول پر گیہوں کو ترجیح دیجاتی ہے اس لئے اس اناج کا زیادہ حصہ وہیں روک کر باقی ان علاقوں میں بھیجدیا جائیگا جہاں اشیائے خوراک کی سب سے زیادہ کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ اس مصیبت کے وقت ترکی کی یہ پیشکش ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے۔

## ایندھن کا عالمگیر مسئلہ

دنیا بھر میں دوسری جنگ عظیم کے ہولناک نتائج ہر قسم کے قحط کی صورتیں پیدا کر رہے ہیں۔ نہ کھانے کو اناج ہے اور نہ پہننے کو کپڑا۔ اب ایندھن کی بے پناہ کمی نے نئی دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ اس کی کمیابی نے صرف صنعتی اداروں ہی پر ناگوار اثر نہیں ڈالا بلکہ روزمرہ زندگی میں بھی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یورپ میں زیادہ دقت اس لئے بھی محسوس ہو رہی ہے کہ وہاں اس سال کی شدید سردی نے لوگوں کے لئے صعوبات تنگ کر رکھا ہے۔ کوئلے کی کانوں سے لے کر ریلوے یارڈ تک ہر محکمے کے مزدور سردی سے بیمار پڑ جانے کے باعث کام کرنے سے معذور رہیں اور اس طرح کوئلہ کھودنے یا ان کو کانوں سے شہری منڈیوں تک منتقل کرنے کی صورتیں بھی مسدود ہو گئی ہیں۔ برطانیہ کی مشہور آسٹن موٹر کمپنی محض اسی لئے عارضی طور پر بند کر دی گئی اور اس طرح اس کے چودہ ہزار آٹھ سو ملازم بے روزگار ہو گئے یہی حال دوسرے اداروں کا ہے اور برطانیہ ہی میں نہیں امریکہ میں بھی یہی صورت رونما ہو رہی ہے۔ ان واقعات کی روشنی میں اگر ہم اپنے ملک کا جائزہ لیں تو یہاں کی دشواریاں نسبتاً بہت کم محسوس ہوں گی۔

## جوہری تحقیقات ممنوع

مشرق بعید کی گیارہ اقوام کی انجمن نے باہمی فیصلے کے بعد ایک حکم جاری کیا ہے جس کی رو سے تمام ملک جاپان میں نہ صرف جوہری قوت کے استعمال کو بلکہ اس سلسلہ میں ہر قسم کی تحقیقات کو ممنوع قرار دیدیا گیا ہے۔ اس انجمن کا اجلاس واشنگٹن میں ہوا تھا۔ اس نے اپنا فیصلہ مشرق بعید کے کمانڈر انچیف جنرل میک آرتھر کے پاس تعمیل کے لئے بھیجدیا ہے۔ آئندہ جاپان میں ریڈیائی عناصر کی برآمدگی یا ان کی تیاری کی کوئی اور صورت عمل میں نہیں آئے گی۔ تاوقتیکہ یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ اس کی ضرورت ادویاتی استعمال کے لئے لاحق ہوئی ہے۔ اس امر کا ثبوت اتحادی فوتوں کے اعلیٰ کمانڈر کی خدمت میں پیش ہوگا اور ہر کارروائی بھی انہی کی نگرانی میں ہوگی۔

## ڈوور کی سفید پہاڑیاں

لندن سے کچھ دور ڈوور کے مقام پر چاک کی سفید پہاڑیاں جغرافیائی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ ساحل سمندر کے بالکل قریب واقع ہیں۔ جہاز میں گذرنے والے اس کے دلکش نظارے سے خاص لطف اٹھاتے ہیں۔ حال ہی میں یہ سن کر تعجب ہوا کہ زمین کے کسی نشیبی انتشار کے باعث ان پہاڑیوں کا ایک بہت بڑا حصہ جس کے وزن کا اندازہ دو لاکھ پچاس ہزار ٹن لگایا گیا ہے پھسل کر سمندر میں اس طرح جا پڑا کہ پانی میں چار سو فٹ ایک جزیرہ نما سا بن گیا۔ اس طرح خلیج مارگریٹ کا وہ حصہ جو پہاڑیوں کے بالکل دامن میں تھا بالکل پٹ گیا ہے۔ وہاں پہنچنے کے لئے بعض بڑی بے ترتیب پہاڑیوں کا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ لڑائی کے دوران میں جرمن جہازوں نے اس جگہ بہت سے بم بھی برسائے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انکے دھماکوں سے بھی پہاڑیوں کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ اس کمزوری، زمین کے انتشار اور تیز ہواؤں کے دباؤ نے مل جل کر یہ حادثہ رونما کیا اور اس میں شک نہیں کہ موجودہ تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا حادثہ ہے۔

## ٹینس کے عالمگیر مقابلے میں

کچھ عرصے پہلے دنیا کے مختلف کھیلوں میں ہندوستانیوں کا

کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی لیکن اب یہاں کے کھلاڑیوں نے اپنی بے پناہ مہارت واستعداد کا لوہا منوانا شروع کر دیا ہے پچھلے سال کرکٹ کی ٹیم لندن گئی اور اس نے ہر لحاظ سے کھیل کا اتنا اچھا مظاہرہ کیا کہ وہاں کے جملہ اربابِ ذوق دنگ رہ گئے۔ اولمپک کھیلوں میں بھی ہاکی کے کھلاڑی داد لئے بغیر نہ رہ سکے۔ اب معلوم ہوا کہ ٹینس کے "ڈے وس کپ" کے لئے اس ملک کے چار بلند پایہ کھلاڑی جا رہے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ غوث محمد (کپتان)، سمنت مہرا، دلیپ بوس اور افتخار احمد۔ اس ٹیم کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لئے مسٹر یو ایس گپتا ہمراہ جائیں گے۔ یہ حضرات مارچ کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان سے روانہ ہو جائیں گے۔ کامل یقین ہے کہ اس مقابلے میں بھی ہمارے کھلاڑی ضرور نام پیدا کر کے آئیں گے۔

## شعاعِ آفتاب کی تصاویر

برطانیہ کے شاہی منجم سر ہیرلڈ اسپنسر جونز نے جو پچھلے دنوں انڈین سائنس کانگریس میں شرکت کرنے ہندوستان آئے تھے، ایک بیان میں فرمایا کہ حال ہی میں ایسے طیاروں کے ذریعہ جن کی پرواز ریڈیو کی لہروں سے منضبط کی جاتی ہے شعاعِ آفتاب کی تصاویر کھینچنے کی کوشش کی گئی اور نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ ان طیاروں کی بیرونی سطح پر ایسے کیمرے لگا دئے گئے تھے جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد خود بخود تصویریں کھینچتے ہیں۔ یہ طیارے سطح زمین سے ۱۱۲ میل دور جا کر واپس آ گئے۔ آئندہ شاید اس سے بھی زیادہ فاصلے طے کر سکیں گے۔ اس طرح ان دوسرے سیاروں کا بھی مزید حال معلوم ہو سکے گا جن میں آبادی کے امکانات کی بابت قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ سر جونز نے بتایا کہ اس قسم کے تجربات فلکیاتی تحقیقات میں بیش قیمت اضافہ کریں گے۔

## اسٹرلنگ قرضہ

اکتوبر ۱۹۴۱ء سے دسمبر ۱۹۴۶ء تک جو اسٹرلنگ قرضہ جات ہندوستان کے ذمے رہے انکی تفصیلات حسب ذیل ہیں:-

| | |
|---|---|
| ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۱ء تک | ۲،۱۶،۰۰،۰۰،۰۰۰ روپے |
| ۲۳- اکتوبر ۱۹۴۲ء تک | ۴،۱۳،۰۰،۰۰،۰۰۰ " |
| ۲۹- اکتوبر ۱۹۴۳ء تک | ۸،۱۵،۰۰،۰۰،۰۰۰ " |
| ۲۷- اکتوبر ۱۹۴۴ء تک | ۱۱،۶۹،۰۰،۰۰،۰۰۰ " |
| ۲۶- اکتوبر ۱۹۴۵ء تک | ۱۰،۸۲،۰۰،۰۰،۰۰۰ " |
| ۲۵- اکتوبر ۱۹۴۶ء تک | ۱۶،۳۱،۰۰،۰۰،۰۰۰ " |
| ۲۰- دسمبر ۱۹۴۶ء تک | ۱۶،۲۲،۰۰،۰۰،۰۰۰ " |

(تازہ ترین اعداد و شمار)

## مہابھارت کا روسی ترجمہ

ہندوستانی تہذیب و تمدن کی طرح ہندوستانی ادب بھی اقوام عالم کی توجہ کا ہمیشہ مرکز رہا ہے۔ گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو گوتم بدھ کی کہانیاں یورپ کے ہر ملک کے ادب میں کسی نہ کسی طرح موجود ہیں۔ اب سنا گیا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی اور مشہور رزمیہ نظم "مہابھارت" کا روسی ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ اس سے قبل بھی روس میں ہندوستان کی بہت سی قدیم کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ روسی زبان پر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی اس ملک کی زبانوں کے بہت سے الفاظ جوں کے توں یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ پائے جائیں گے۔

## صلح نامے کا طویل ترین سفر

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ، برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے مابین جو صلحنامہ عمل میں آیا اس کا مسودہ تیار ہو چکا ہے اور اب اس پر مختلف ملکوں کی ذمہ دار ہستیوں کے دستخط ثبت ہو رہے ہیں۔ یہ مسودہ امریکہ میں شائع ہوا اور سب سے پہلے مسٹر برنز نے اس پر دستخط کئے۔ اس کے بعد ہوائی ڈاک کے ذریعہ اسے ماسکو بھیجا گیا۔ وہاں سویت روس کی طرف سے موسیو مولوٹوف نے دستخط کئے اور اسے لندن بھیج دیا۔ مسٹر بیون کے دستخطوں کے بعد وہ پیرس پہنچا تاکہ ایم بڈال کے دستخط ہو جائیں۔ اس مرحلے کے بعد اٹلی، ہنگری، بلغاریہ، رومانیہ اور فن لینڈ کی باری آئے گی۔ اور اس طرح صلحنامہ کا مسودہ تقریباً سات ہزار میل لمبا سفر طے کرے گا۔ یہ تاریخ میں اپنی قسم کی پہلی مثال ہوگی۔

## ڈاکٹروں سے اپیل

۱۴ فروری کو اطبائے ہند کی کونسل کی رسم افتتاح ادا کرتے ہوئے پنڈت جواہرلال نہرو نے ملک کے تمام ڈاکٹروں سے اپیل کی کہ وہ تجارتی اغراض و مقاصد سے زیادہ خدمت عوام کا لحاظ رکھا کریں۔ انھوں نے فرمایا کہ ڈاکٹروں کی خود غرضانہ ذہنیت کے باعث طبی پیشہ بہت زیادہ بدنام ہو گیا ہے۔ ہندوستان ہی میں نہیں دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی اس کی حالت یکساں ہے چنانچہ جارج برنارڈ شا جیسی مشہور ہستی بھی تنگ آ کر اس کے خلاف سنگین الزام لگائے بغیر نہ رہ سکی۔ پنڈت نہرو نے اس امر پر زور دیا کہ اب حکومت کے لئے فرض ہو گیا ہے کہ وہ طبی پیشے کی غلط روشوں کو راہ راست سے ملانے اور اس پر مہر احتساب لگانے کے لئے خود قدم اٹھائے چنانچہ اطبائے ہند کی کونسل آئندہ یہی فرض انجام دے گی۔

اس کونسل کے صدر لفٹنٹ کرنل امیر چند تھے۔ انھوں نے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ آئندہ ڈاکٹری کی غیر ملکی سندوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی جائیگی بلکہ ہندوستان ہی میں ایسے امکانات پیدا کئے جائیں گے کہ طلبا یہیں رہ کر ڈاکٹری کے تمام شعبوں میں علمی و عملی تجربات پورے کمال کیساتھ حاصل کریں اور ملک و قوم کیلئے مفید ثابت ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ اب تک حکمراں قوتوں نے اس امر کی کوشش کی کہ صحیح صلاحیت و استعداد کی بجائے محض مغربی فضیلت کا سکہ جمانے کیلئے غیر ملکی سندوں کو ترجیح دی جائے ؏

# "میں"

آنند نرائن مُلّا

مجھے ممکن ہے دھوکا ہو کہ میں روئے حقیقت ہوں
مگر جو کچھ بھی ہوں اس دورِ باطل میں غنیمت ہوں

مجھے روشن نہیں کرتی کوئی سیلی سی چنگاری
فروزاں ہوں تو اس آتش فشانِ دل کی بدولت ہوں

مذاقِ بزم نے کیا کیا نہ زک دینے کی کوشش کی
ہواؤں سے جو لڑ لڑ کر بنی ہے وہ عمارت ہوں

میں، اپنے وقت کا، یہ تو زمانہ ہی بتائے گا
بہ قولِ خود اک آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

ازل سے آج تک گونجے ہیں جو دنیا کے کانوں میں
وہی آنکھوں کا نغمہ ہوں وہی دل کی حکایت ہوں

بنائے زندگی رکھتا ہوں فطرت کے تقاضوں پر
جو فخرِ آدم پہ کرتا ہے وہ جرمِ آدمیت ہوں

مری تقدیر ہے خود جل کے اوروں کو ضیا دینا
غم اپنے حق میں ہوں اوروں کا سامانِ مسرت ہوں

بھٹک کر آ گیا اس دور میں کیسے خدا جانے
خرد کی یخ زدہ صبحوں میں اک شامِ محبت ہوں

خزاں کے تند جھونکوں میں بھی خوابِ رنگ و بو دیکھا
جہنم میں بھی جس نے گل کھلائے ہیں وہ جنت ہوں

مجھی پر ایک دن ایمان لائیگا جہاں مُلّاؔ
اگر الفت خدائی ہے تو میں دل کی نبوت ہوں

# پنڈت آنند نرائن ملّا

**سید احتشام حسین**

پنڈت آنند نرائن ملّا کی شاعری کی عمر تقریباً بیس سال کی ہوگئی لیکن اتنی مدت میں انکو جو شہرت حاصل ہونا چاہئے تھی وہ حاصل نہیں ہوئی۔ اس بات کی بہت سی وجہیں ہوں گی لیکن سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ کہ انہوں نے خوش فکر اور نغز گو شاعر ہونے کے باوجود باقاعدہ شاعر بننے کی کوشش کبھی نہیں کی، غزلیں لکھیں تو دوستوں کے اصرار پر، نظمیں کہیں تو انھیں کبھی کاغذ پر نقل کرنے کی زحمت گوارا نہ کی، کاغذ پر نقل آگئی تو ان کی اشاعت کی جانب متوجہ نہ ہوئے پیشہ کی مصروفیتوں نے اِس طرح مشاعروں میں شریک ہونے کا موقع نہ دیا کہ مدّاحوں کا کوئی بڑا گروہ پیدا ہو سکتا۔ ملّا کے مزاج میں کسی قسم کا البالی پن نہیں ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ شاعری کے معاملہ میں اُس مستعدی کا اظہار نہیں کرتے جو مقدمات کی پیروی میں، علمی، ادبی اور سماجی جلسوں کی شرکت میں دوستوں سے ملنے جلنے اور زندگی کی دلچسپیوں میں حصہ لینے میں ظاہر ہوتی ہے۔ شاعری کے معاملے میں اس لاپروائی نے انھیں اچھا خاصا نقصان پہنچایا لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ انھوں نے کم کہا اور جو کچھ کہا وہ قابل غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

آنند نرائن ملّا کی عمر چھیالیس سال کی ہے، اُن کشمیری برہمن خاندانوں سے تعلق ہے جن میں علم و فن کا چرچا رہا کیا ہے۔ اور ابھی کچھ دن پہلے تک وہ لوگ نہ صرف اردو بلکہ فارسی میں بھی شعر گوئی کا کمال دکھایا کرتے تھے خود ملّا نے ابتدا میں فارسی کا گہرا مطالعہ کیا، لکھنؤ میں پلے اور بڑھے اور لکھنؤ کی حالت یہ تھی کہ یہاں گلی گلی مشاعرے ہوتے تھے، شاعری کے بڑے بڑے استاد تو گنتی کے تھے۔ لیکن مشاعرے میں غزلیں پڑھنے والوں کی تعداد بتانا محال تھا۔ گو جدید نظم نگاری کا رواج ہو چکا تھا۔ اور حالی سے لیکر چکبست تک بہت سے شاعر اُردو زبان کا دامن وسیع کر چکے تھے۔ لیکن لکھنؤ کے مشاعروں میں غزلوں ہی کا چرچا تھا انداز بیان سلاست، زبان کی صحت، محاورہ اور صنعتوں کے استعمال پر زور دیا جاتا تھا۔ یہ تھی لکھنؤ کی ادبی فضا جس میں ملّا کا شعور جوان ہو رہا تھا اور سیاسی حالات یہ تھے۔ کہ قومی زندگی استعماری بندشوں کو توڑتی پھوڑتی آگے بڑھتی چلی جارہی تھی، ہندی نوجوان انفرادی حیثیت سے ایک شاندار مستقبل کا خواب دیکھنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تقدیر کو بھی تابناک بنانے کی فکر میں تھے۔ تعلیمی اداروں میں علم کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی شعور بڑھ رہا تھا۔ ترک موالات اور خلافت کی تحریک نے آزادی کا سبق دیا تھا، آزادی کے جذبہ نے ایک ادبی رومانیت کو بھی جنم دیا تھا۔ جس نے غزل کے موضوعات کو نظم کے سانچے میں ڈھالنے کا فن سکھایا۔ سیاسی اور سماجی نظمیں لکھی گئیں۔ اور اقبال کے اثر سے مفکرانہ نظموں کی طرف بھی لوگ متوجہ ہوئے۔ جب ان باتوں کا تذکرہ کسی مخصوص شاعر کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ شاعر کی انفرادیت اور شخصیت انھیں بنے بنائے سانچوں میں ڈھال کر ڈھال دی جاتی ہے اور مکانکی طور پر ہر شاعر بنے بنائے راستوں پر چل کھڑا ہوتا ہے اس سے صرف ان باتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ شاعر کی ذہنی تربیت میں ایسے عناصر داخل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی انفرادیت اور شخصیت کا اظہار کرنے کے لئے انھیں عناصر میں سے واقعات اور خیالات منتخب کرتا ہے۔ مضبوط اور اعلیٰ شخصیت رکھنے والے کے یہاں اس انتخاب میں صرف جذبہ کی نہیں بلکہ عقل اور شعور کی کارفرمائی ہوتی ہے اس طرح وہ جس سماج کی پیداوار ہوتا ہے اس کا ناقد بھی ہوتا ہے۔ اور اسی کو اپنے خیالوں اور خوابوں کے فنی اظہار کے لئے بھی کام میں لاتا ہے یوں تو ایک سماجی شعور رکھنے والے شاعر کا تعلق زندگی کی پیچیدگیوں سے ہی ہوتا ہے۔

آنند نرائن ملّا ایسے ہی شاعروں میں سے ہیں۔ جو زندگی کا مطالعہ گہری نظر سے کرتے ہیں۔ جو مکانکی طور پر بنے بنائے راستہ پر نہیں چل کھڑے ہوتے بلکہ اپنے ہی احساسات، جذبات اور تجربات کو فن کے لوازم کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہر بات سمجھی اور سوچی ہوئی ہوتی ہے ہر خیال فکر کی کسی کسوٹی پر کسا ہوا ہوتا ہے۔ ہر تصوّر میں خلوص کی گرمی اور احساس کی سچائی شامل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فن کے مطالبات پر بھی ان کی نگاہ ہوتی ہے دونوں باتیں مل کر ملّا کی شاعری کو رنگین اور ٹھوس بناتی ہیں۔

ملّا نے غزل کے ایک شعر میں گویا اپنے فنی رجحان اور ذاتی نقطۂ نظر کی ترجمانی کر دی ہے ؎

اظہار درد دل کا تھا ایک نام شاعری
یاران بے خبر نے اسے فن بنا دیا

شاعری میں کتنا حصّہ "درد دل" کے وجود سے تعلق رکھتا ہے، کتنا اس کے "اظہار" سے، اور پھر یہ کہ اس درد دل کے اظہار کو ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے ✣ نالہ پابندِ نے نہیں ہے

کی مثال کو پیش نظر رکھنا چاہئے یا کچھ فنی قیود کا پابند ہونا چاہئے؟ اگر شاعری میں یہ مسئلہ حل ہو جائے اور اس تناسب کا کسی طرح علم ہو جائے جو مواد اور ہیئت کے امتزاج کے لئے ضروری ہے تو پھر شاعری کے جادو کا تجزیہ کرنے میں کوئی دشواری باقی نہ رہ جائے۔ لیکن یہ آسان نہیں ہے۔ کیونکہ

جب درد دل کا اظہار "فن" بن چکا تو پھر روایتی فنی اسالیب نہ سہی، کسی نہ کسی قسم کے فنی اسلوب پر اسے پورا اترنا چاہئے۔ اس لئے مُلّا نے بھی مواد پر زیادہ زور دینے کے باوجود فن کی نزاکتوں پر بھی نگاہ رکھی ہے۔ اور یہاں لکھنؤ کی "زبان پرستی" کا ماحول ان کے فنی اسلوب کو چمکانے میں معین ثابت ہوا۔

فن اور اسلوب پر قابو رکھنے اور خیالات کو حسن کارانہ طور پر ترتیب دینے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے مُلّا نظم اور غزل دونوں شکلوں میں اپنے جذبات ظاہر کرتے ہیں۔ وہ نہ تو غزل کے مخالف ہیں اور نہ غزل ہی کو ہر طرح کے خیالات کے اظہار کے لئے مناسب سمجھتے ہیں۔ ایک موقعہ پر مُلّا اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اگر کارزار ہستی میں آپ حصّہ لینا چاہتے ہیں تو آپ نظم کی تلوار اٹھائیے۔ لیکن اگر آپ انسانی دل کی عمیق گہرائیوں تک پہونچنا چاہتے ہیں۔ تو آپ کو شعر مفرد کے نشتر سے کام لینا پڑے گا۔ میرے نزدیک دونوں اپنی اپنی جگہ پر ضروری ہیں۔ اور ان میں سے کوئی دوسرے کی جگہ استعمال نہیں کیا جاسکتا" مُلّا کا یہ خیال ممکن ہے کسی شاعر کے کلام پر پورا اترتا ہو۔ لیکن عملاً یہ بات ممکن نہیں ہے۔ کہ انسان اپنے شعور کو اس طرح تقسیم کرے کہ ایک خاص قسم کے خیالات مفرد اشعار میں اور خاص قسم کے خیالات مربوط نظموں ہی میں ادا کرے۔ چنانچہ خود مُلّا کی شاعری میں حدِ فاصل قائم نہ رہ سکی اور ان کی غزلوں کا مطالعہ کرنے والے کو ایسے اشعار بے شمار ملتے ہیں جن سے کارزار ہستی میں مدد لی جاسکتی ہے۔ تاہم انھوں نے اس بات کی کوشش ضرور کی ہے۔ کہ غزلوں کا اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کے واضح بیان سے گراں بار نہ بنائیں۔ بلکہ انھیں نفسیاتی محرکات اور واردات کی غزلوں میں پیش کریں۔ جن سے انسانی دل کی گہرائیوں تک رسائی حاصل ہو سکے۔ محبت اور اس کے لوازم جن کی ہمہ گیری اور حقیقت کے وہ معترف ہیں شاعر کے انفرادی دکھ سکھ کے تصور کو اس طرح عوام انسانی دکھ سکھ کے تصور میں تبدیل کر دیتے ہیں کہ ان کا بیان بھی ایک پرگداز دل میں محبت کی کسک اور تڑپ کا بیان بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ مُلّا کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ جن میں محبت کے علاوہ زندگی کے دوسرے واقعات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ مگر بالعموم انھوں نے غزلوں کو بیانِ محبت ہی کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ہلکے اور گہرے نفسیاتی اشارے، تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے غیر مرئی جذبات کی مصوری، محبت کی دبی ہوئی چوٹوں کا ابھار، معمولی تمثیلوں سے زندگی کے زبردست انقلابات کی جانب اشارے۔ مُلّا کی غزلوں میں بے شمار پائے جاتے ہیں اور جو چیز ان میں اثر اور کیف پیدا کرتی ہے۔ وہ ان کے تجربہ اور مشاہدے کا خلوص ہے۔ جو حقیقت بنکر پھوٹے نکلتا ہے۔ غزلوں کے کچھ اشعار سنئے:۔

بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں تو یہاں رکی تھی تری چشم التفات کبھی

سمٹی زیست عشق سے دور نہ ہو سکی مگر
جہاں تو کچھ کھڈ و دشت دامن کو بہار ہیں

نہ رو مہوتے ہوئے ڈالیوں پہ پھولونگی
محو دیتا آنکھ سے دیکھا ہے خزاں تیا بلیں

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اٹھا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

مجھے دھوکا نہ دیتی ہوں کہیں تری ہوئی آنکھیں
تمہیں جو سامنے پاؤ وہی تصویر خواب آئی؟

عمر آنے کو آجائے مجھے حسرت دل پر
لیکن یہ تلاش غنا ہے جوانی تو نہیں ہے

جفاصیاد کی وقف خیال آشیاں کر دی
قفس کی زندگی وقف خیال آشیاں کر دی

اسیر آنکھیں کہاں سے سوئے گلشن کیلئے لائیں
نظر جتنی بھی تھی صرف تلاش آشیاں کر دی

میکشوں نے پی کے توڑے جام سے
ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے۔

پھر وہ ہے خاک کے ذرّے جو کرتے زرنگار
اونچی اونچی چوٹیوں پر نور برسانے سے کیا

گذری حیات وہ نہ ہوئے مہرباں کبھی
سنتے تھے ہم کہ عشق نہیں رائیگاں کبھی

آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار
گذرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہ لطف
پھر خون کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی

کھنچے آتی ہیں اس ساحل پہ خود دو اجنبی موجیں
محبت ایک جذب بے اماں معلوم ہوتی ہے

میرے ہر آنسو میں خوشبو میرے ہر نالہ میں راگ
اب تو ہر ہر سانس میں شامل تمہیں پاتا ہوں میں

اب تمنا بے صدا ہے اب نگاہیں بے پیام
زندگی اک فرض ہے جیتا چلا جاتا ہوں میں

کھڑا ہوں دیر سے گم زیست کے دوراہے پر
جو کارواں سے چھٹا تا ہے وہ مقام آیا

وہ عجب گھڑی تھی نظریں میری تجھ سے جب ملی تھیں
مگر ایک دم کو جیسے کہ ٹھہر گیا زمانا

کوئی کہہ رہا ہے جیسے میرے غم کی تیرگی میں تیری بجھ چکا ہوں جنگو وہ نہ پھر جلانا

چشمِ خوں بار میں باقی نہ رہا کوئی اشک
آج بیمارِ محبت کو ہنسی آئی ہے۔

شمع اک موم کے پیکر کے سوا کچھ بھی نہ تھی
آگ جب تن میں لگائی ہے تو جان آئی ہے

ملّا کی غزلوں کے یہ چند اشعار بغیر کسی خاص خیال کے پیش کر دیئے ہیں۔ ان میں روایتی غزل کی آن بان کے ساتھ ساتھ خود شاعری کی ذہنی کیفیت، ذاتی تجربات اور جدید نفسیات کی آمیزش نے ایسا نیاپن پیدا کر دیا ہے۔ جسے دورِ جدید ہی کی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔ ان اشعار میں محض صناعی کا جادو نہیں تخیل کی گرمی اور شدّت ہے۔ اور یہی چیز ہے۔ جو اچھی اور بُری، مخلصانہ، اور پُر تاثر اور بے اثر شاعری میں مابہ الامتیاز کی حیثیت رکھتی ہے۔ غزل کی شاعری خیال کی پختگی اور بیان کی ندرت ہی سے فرسودگی سے بچائی جا سکتی ہے۔ اور مُلّا ان دونوں خصوصیات کو یکجا کرنے میں اپنی غزلوں میں اکثر کامیاب ہوتے ہیں۔

ملّا ایک اچھے وکیل اور باخبر انسان ہیں ملک کے سماجی اور سیاسی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور ان کے متعلق خود رائے قائم کر سکتے ہیں۔ انسانی ہمدردی کے جذبہ سے ان کا دل لبریز ہے۔ اور وہ تغیرات جن سے عوام متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں بھی متاثر کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی نظمیں جہاں، ایک طرف رنگ و بو کے ترانے گاتی ہیں، محبت کی تصویریں کھینچتی ہیں۔ وہاں دوسری طرف ملک کے سیاسی مسائل کو بھی شاعرانہ وجدان کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ کچھ نظمیں وقتی اور ہنگامی موضوعات پر ہیں۔ کچھ مفکرانہ ہیں اور دماغ پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ چند عنوانات سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ "آثارِ وقت" "مسز حامد علی" "میری دنیا" "تجسیا" "فیروز" "لیگ سے" "جواہر لال نہرو" "اقبال سے" "گاندھی جی" "ڈویا تری" "دتیہ پورن کا مرثیہ" "ٹھنڈی کانی" "لال قلعہ" وغیرہ۔ ان نظموں کے مطالعہ کے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں بعض نظمیں تو واقعہ کا اثر قبول کرتے ہی لکھ دی گئیں ہیں کیونکہ ان میں اُبال زیادہ اور گہرائی کم ہوتی ہے۔ یہ کیفیت بالعموم اُن نظموں کی ہے۔ جن کو سیاسی کہا جا سکتا ہے۔ وہ نظمیں سوا اس کے کہ حبِّ وطن، قوم پرستی اور آزادی کا تذکرہ کریں۔ کوئی مخصوص نظامِ فکر نہیں پیش کرتیں یہ بحث بہت پرانی ہو چکی کہ شاعر کا کام صرف تاثرات کا بیان کر دینا ہے یا اپنے خیالات کی کوئی ایسی سمت بھی مُتعیّن کرنا ہے۔ جس پر یہ غور و فکر کی بنیاد رکھی جا سکے، ملّا کی شاعری کے مطالعہ کے وقت یہ بحث سامنے آتی ہے اور گو ملّا کے خیالات میں ابہام نہیں پایا جاتا۔ لیکن تشنگی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ نظمیں صرف ایک بیانِ واقعہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جن میں جذبات کی گونج ہوتی ہے۔ لیکن وہ انسانی عنصر نہیں ہوتا جس سے ان کی غزلیں روشن اور تابناک بنتی ہیں۔ ان کے سینہ میں بار بار امید کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ لیکن ان میں عوامی انقلاب کی لہریں اٹھتی دکھائی نہیں دیتیں چونکہ میں اُن کے خیالات سے واقف ہوں اس لئے مجھے اور زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ کہ جس جمہوریت پسندی اور انسان دوستی کا اظہار ان کے عام خیالات میں ہوتا ہے۔ جس صبحِ نو کی جھلک ان کی گفتگو میں دکھائی دیتی ہے۔ جس ترقی کے خواب وہ بحث مباحثہ میں دیکھتے ہیں۔ وہ ان کی نظموں میں ایک سہمی ہوئی کرن سے زیادہ طاقت سے نہیں پھوٹتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ "جہاں میں ہوں" جیسی نظمیں بہت کم ہیں۔ اس نظم کی گہرائی وسعت بلند نظری اور وفورِ تمنّا کا پتہ دوسری نظموں میں بہت کم چلتا ہے۔ اس کے چند شعر دیکھئے:۔

تمنا قیدِ ہمت پا بہ جولاں ہے جہاں میں ہوں
مجھے جکڑے ہوئے زنجیرِ امکاں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید یہ محفل بھی ستاروں سے چمک اُٹھے
ابھی تو اشکِ بیکس سے چراغاں ہے جہاں میں ہوں

کسی دن تپتے تپتے یہ بھی شاید گرم ہو جائے
ابھی برفاب کا سا خونِ دہقاں ہے جہاں میں ہوں

افق پر ہوں تو ہوں دھندلے سے کچھ جلوے مسرت کے
ابھی راحت فقط اک خوابِ ارماں ہے جہاں میں ہوں

نظر میں ہیں تصور کے وہی موہوم نظارے
ابھی انساں حقیقت سے گریزاں ہے جہاں میں ہوں

خدا وہ دن تو لائے سوز بھی اک ساز بن جائے
ابھی ہر ساز میں اک سوزِ پنہاں ہے جہاں میں ہوں

جن سیاسی نظموں میں فکر کا عنصر شامل ہو گیا ہے ان میں شعریت کے ساتھ وزن اور گہرائی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر نظم کو خود اس کے عناصرِ ترکیبی کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ اس فضا میں جانچنا چاہئے جس میں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ جس دنیا کی تصویر آپ نے ان اشعار میں دیکھی اس سے بھی واضح تصویر "میری دنیا" میں ملتی ہے:۔

اک بار دورِ گردوں ایسا نظام بھی ہو
جس میں ہر ایک میکش صہبا بہ جام بھی ہو

مظلوم کا کلیجہ تیرِ ستم نہ ڈھونڈے
ایوانِ شہاد مانی بنیادِ غم نہ ڈھونڈے

اک آرزوئے باطل فکرِ سکوں نہ ٹھہرے
الفت فقط مذاقِ اہلِ جنوں نہ ٹھہرے

انسان غاصبانہ راہوں سے ہٹ چکا ہو
پیشانیِ بشر کا تیور پلٹ چکا ہو!

انسانیت کا پودا پھٹے نہ جس ہوا میں!
دل کا بھی سانس لینا ممکن ہو جس فضا میں
ایسی زمین بھی کوئی کیا زیرِ آسماں ہے؟
میرے خیال بتلا دنیا مری کہاں ہے؟

جن نظموں میں زندگی کے ایسے تعمیری پہلوؤں کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان کی تعداد کم ہے۔ پھر بھی یہ بڑے اچھے آثار ہیں۔ کہ ملّا آزادی کی صبح قریب دیکھ رہے ہیں۔ قصر سرمایہ داری انھیں متزلزل نظر آرہا ہے کاروانِ نوعِ انسان کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے اور وہ مساواتِ انسانی کے سپاہی کو بڑھنے اور دنیا پہ شہر یاری کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ایسی نظموں میں "آثارِ وقت" "لال قلعہ" "جہاں میں ہوں" "میری دنیا" "کانسٹی ٹیوٹنٹ اسمبلی" "صبح آزادی" اور "کلکتہ" اعلیٰ درجہ کی نظمیں ہیں۔ جن میں سے بعض ہنگامی موضوعات سے تعلق رکھنے کے باوجود شاعر کے خلوص اور وجدان سے رنگین، کیف آمیز اور پُر اثر ہو گئی ہے۔

ملّا کی پہلی نظم "پرستارِ حسن" ہے۔ جو ۱۹۲۶ء میں لکھی گئی، پہلی ہی نظم سے ان کی حقیقت پسند طبیعت اور ذہنی رجحان کا پتہ چل جاتا ہے۔ انھوں نے کبھی شاعری کی رو میں حقیقت کے تصور کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ یہ اور بات ہے کہ ملّا کا حقیقت کا ادراک ہمارے ادراک سے مختلف ہو۔ وہ نظمیں جن میں انہوں نے معمولی اور غیر معمولی رومانی واقعات کو شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ حقیقت کا بیش بہا مرقع پیش کرتی ہیں۔ طویل اور مربوط نظموں میں سے اقتباس دینا مشکل ہے۔ ورنہ آپ دیکھتے کہ اصلیت کو ملّا کس قدر دلکش انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔ "تم مجھے بھول جاؤ گے" "سماج کا فنکار" "دوشیزہ کا راز" "منڈی کا نی" "آخری سلام" میں شعریت اور حقیقت کی ایسی آمیزش ہے کہ ان کے اثر کا تجزیہ مشکل ہو جاتا ہے۔ خوبصورت فنی کارناموں کی حیثیت سے ان نظموں کی بناوٹ اور سجاوٹ بھی قابلِ غور ہے۔

آخر زمانے میں ملّا نے گو کبھی کبھی بندوں کی ساخت میں جدّت سے کام لیا ہے۔ لیکن دو تین نظموں کے سوا آزاد نظم نگاری کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ ان نظموں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شعریت اُن کے مزاج میں اس طرح بسی ہوئی ہے کہ ترنم اور رنگینی کا احساس آزاد نظموں میں بھی کم نہیں ہونے پاتا۔ "صبح آزادی" اور "گل کردو قمر کو" دونوں آزاد نظمیں ہیں اور دونوں کامیاب ہیں۔ خاص طور سے آخر الذکر تو پڑھتے وقت پابند نظموں سے زیادہ مترنم اور کیف انگیز نظر آتی ہے۔

ایک مختصر سے مضمون میں ملّا کی نظموں کی واقعی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ہر نظم کی مکمل تشریح ہی اس کی معنوی اور لفظی خوبیوں کو ظاہر کر سکتی ہے۔ اور وہ اس مضمون میں ممکن نہیں۔ افسوس ہے کہ ملّا کو اب تک اپنی نظمیں مرتب کر کے شائع کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن وہ موقع جلد آنا چاہیے۔ ایک جگہ پر ملّا خود لکھتے ہیں:۔ "کبھی شعر کہنے کی نیت سے بیٹھ کر آج تک شعر نہیں کہا۔ جو کچھ کہا ہے وہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی لکھ کر کچھ نہیں کہا۔ بڑی سے بڑی نظمیں اولین مصرعہ سے لیکر دماغ ہی میں نظم ہوئیں۔ پہلے خاکہ سے لیکر آخری خاکہ تک یہیں ان کی اصلاح اور ترقی ہوتی رہی ہے۔ اور مکمل ہو جانے کے بعد بھی دماغ ہی میں محفوظ رہیں ............ پیشہ کی مصروفیت کی وجہ سے کوئی وقت فکر سخن کے لئے نہیں ملتا ............؟"

ان موانع کے باوجود ملّا کی شاعری بڑی جاندار اور پُر کیف ہے وہ کسی مخصوص فلسفۂ خیال کی اشاعت کے مدعی نہیں، وہ کسی خاص مکتب خیال سے رسمی یا روایتی طور پر وابستہ نہیں، وہ اپنے دردِ دل کا اظہار فنّی خصوصیات کو مدّنظر رکھ کر کرسکتے ہیں۔ اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو ایک فن کار کی سچائی کے ساتھ ایک شاعر کے خلوص کے ساتھ، انسانی ہمدردی کے جذبات کے ساتھ ایک نئی زندگی کی امید کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ یہی ایک اُن کے فن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

## قطعات

### مسرور منگر

جب بھی یاد آگئے ہیں [illegible]
[illegible]
دل میں [illegible]
[illegible]

تشنۂ بادہ و مجبور ہوں میں!
[illegible] ہوں میں
زندگی مجھ پہ بار ہے مسرور
ایک ناکام آرزو ہوں میں

سب بہاریں [illegible] خوشی کی ہیں!
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کھا گیا ہوں عشق میں مسرور
یعنی دل کو [illegible] چکا ہوں میں
یعنی ان سے جبین [illegible]
اپنی ہستی کو کھو چکا ہوں میں

# ماں

افسانہ

اصغر انصاری

دو[1] نازی سپاہیوں نے ایک عورت کو کیپٹن وارنر کے سامنے لا کھڑا کیا۔ وہ غریب معمولی درجے کی پوستین پہنے ہوئے تھی جو اس درجہ بوسیدہ ہو چکی تھی کہ اس کے میلے کچیلے کپڑے اندر سے صاف صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وارنر نے اس عورت پر شبہ کی نظر ڈالتے ہوئے تعجب سے سپاہیوں سے پوچھا "کیا یہی عورت ہے؟"

"جی ہاں حضور! یہی وہ عورت ہے" سپاہیوں نے جواب دیا۔

وہ غریب میز کے سامنے کچھ عجب بے ڈھنگے انداز سے کھڑی ہوئی تھی اس کے سر کے بالوں کی ایک لٹ جو سفید ہو چلی تھی اس کی شال سے باہر نکل آئی تھی اور اس کی عمر کی غمازی کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ معمولی درجے کا تھا، نہ اچھا نہ برا۔ ایک سیدھے سادے دیہاتی کا چہرہ! "کیا نام ہے تمہارا؟"

"اولینا کوستس یک"

وہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں پنسل گھماتا رہا۔ اور اس کی آنکھیں اس عورت کا جائزہ لیتی رہیں جو اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ دو ہی باتیں ہیں اس نے سوچا۔ یا تو سپاہیوں سے غلطی ہوئی ہے اور وہ کسی غلط عورت کو پکڑ لائے ہیں یا پھر شاید یہی وہ عورت ہو۔ اس لئے کہ اس کے خد و خال سے ایک خاص قسم کی ذہانت ٹپک رہی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس سے سوالات اور جرح کر کے کچھ معلوم کر لینا کوئی آسان بات نہیں ہے۔

"کیا تم چھاپہ مار فوج کے ساتھ تھیں؟"

وہ نہ تو گھبرائی اور نہ اس سوال پر حیران ہی ہوئی۔ اپنی آنکھیں اس درندے پر سے ہٹائے بغیر اس نے جواب دیا "ہاں! میں چھاپہ مار فوج کے ساتھ تھی!" اس غیر متوقع جواب نے وارنر کو بھونچکا کر دیا۔ وہ غیر شعوری طور پر اس کاغذ پر جو اس کے سامنے پڑا ہوا تھا عجیب سنگم پتوں اور پھولوں کا ہار بنانے لگا۔

"اور تم گاؤں کیوں واپس آگئیں؟ ان لوگوں نے تم کو واپس کیوں بھیج دیا۔"

"مجھے کسی نے نہیں بھیجا! میں آپ اپنی مرضی سے آئی ہوں۔"

"ہوں تو تم اپنی مرضی سے آئی ہو! مگر تم آئی کیوں ہو؟"

اس دفعہ عورت نے کوئی جواب نہیں دیا، اس کی سیاہ آنکھیں افسر کے مکروہ چہرہ پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی بے رنگ آنکھوں کو گھور رہی تھیں۔

"ہاں تو یہ بات ہے!" افسر نے کہا۔ عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، تم چھاپہ مار فوج کے ساتھ تھیں اور اچانک اپنے گھر آگئیں، اپنے گاؤں آگئیں، یہ کیا بات ہوئی؟ کیا تم لوگوں میں کوئی تنظیم نہیں ہے؟ مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ تم کو ان لوگوں نے کس لئے یہاں بھیجا ہے؟"

"میں اپنی مرضی سے خود آگئی، میں وہاں زیادہ نہیں رہ سکتی تھی۔"

"نہیں رہ سکتی تھیں؟ کیوں نہیں رہ سکتی تھیں؟" افسر کی دلچسپی بڑھنے لگی "کیا انتظام خراب ہو گیا تھا؟ تمہارا کمانڈر گزشتہ حملہ میں مارا گیا تھا؟ ہے نا یہی بات؟ تمہارے دستے میں گڑبڑ پھیل گئی تھی؟"

"مجھے اپنے دستے کے متعلق کچھ علم نہیں! میں بس گھر آگئی۔"

"لیکن کیوں؟ تم اچانک کیوں چلی آئیں؟"

اس کے ہونٹوں میں ارتعاش پیدا ہوا، لیکن ان سے کوئی آواز نہ نکلی۔

"کیا یہ بات تو نہ تھی کہ تم نے سوچا ہو کہ یہ سب بیہودگی ہے جرم ہے، غنڈہ گردی ہے، اور تم اس میں حصہ نہیں لے سکتیں؟"

اس کے سر کو جنبش ہوئی اور اس نے کہا، "نہیں! بس میں وہاں ٹھہر نہیں سکتی تھی، اس لئے واپس چلی آئی۔"

"لیکن کیوں نہیں ٹھہر سکتی تھیں؟"

اس دفعہ اس نے کوشش کی اور اس کی چندھی رطوبت دار آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا، "میں وضع حمل کے لئے آئی تھی۔" اس پر اس وحشی جرمن نے ایک ایسا شیطانی قہقہہ لگایا، ایسا مکروہ قہقہہ کہ اس غریب عورت کی ہڈیاں تک ٹھنڈی ہو گئیں۔

"تم کو سردی لگ رہی ہے کیا؟ یہ جگہ تو کافی گرم ہے، لیکن تم کچھ اس طرح سکڑی سکڑائی کھڑی ہو جیسے برف و باراں کے طوفان میں گھر گئی ہو۔ اپنی شال اتار دو۔"

اس نے اپنی بھاری بھدی اور موٹی شال خاموشی سے اتار کر قریب پڑی ہوئی تپائی پر رکھ دی۔

"کوٹ بھی اتار دو۔"

ایک لمحہ تو اس نے پس و پیش کیا اور اس کے بعد بٹن کھولے اور کوٹ اتار دیا۔ افسر نے اسے گھور کر دیکھا۔ ہاں یہ بات ٹھیک ہی ہے۔ آخری مہینہ معلوم ہوتا ہے۔ عورت کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ اس ظالم نے سمجھ لیا تھا کہ اس غریب کے لئے کھڑا رہنا بہت مشکل ہے اور اسی لئے اس نے گفتگو کو طویل کرنا شروع کر دیا۔ سوالات آہستہ آہستہ کرنا شروع کئے اور سوالات کے درمیان کا وقفہ بڑھانا شروع کر دیا۔ اور وہ غریب ہر سوال کا جواب جلدی جلدی دیتی رہی جو اس کی ذات سے متعلق تھا۔ ہاں اس کی شادی ہو چکی تھی، اس کا شوہر لڑائی میں مارا گیا تھا، اس

[1] اس افسانے کا پلاٹ واندا واسلیوسکا کے شہرۂ آفاق ناول "رین بو" سے ماخوذ ہے جس پر ۱۹۴۳ء میں اسٹالن کا پہلا انعام دیا گیا تھا۔

قبل یعنی انقلاب سے پہلے وہ ایک جاگیردار کے ہاں ملازم تھی۔ اس کے لئے غلہ پیدا کرتی تھی، اس کے مویشی چراتی تھی۔ انقلاب کے بعد وہ مشترکہ فارم پر کام کرنے لگی۔ اور پھر لڑائی شروع ہونے پر وہ چھاپہ مار دستہ بنتے ہی فوراً اس میں شامل ہوگئی۔ لیکن اپنی حالت اس نے پوشیدہ رکھی، مگر جب اس کے لئے چلنا پھرنا دوبھر ہوگیا اور وضع حمل کا وقت قریب آگیا تو وہ گاؤں چلی آئی۔ وہ اطمینان و سکون کے ساتھ بچہ جننا چاہتی تھی۔

"تو تم سکون و اطمینان سے وضع حمل چاہتی ہو؟ تم ہی تو تھیں جس نے گزشتہ ہفتے پل اڑا دیا تھا؟"

"جی ہاں!" "کس نے مدد کی تھی تمہاری؟" "کسی نے نہیں میں اکیلی تھی۔"

"اچھا اچھا! دیکھا جائیگا! بتاؤ چھاپہ مار فوج کہاں ہے؟"

وہ خاموش تھی، اس کی سیاہ آنکھیں خاموشی سے افسر کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں، افسر نے ایک لمبا سانس لیا۔ یہ بار بار دوہرائی ہوئی پرانی کہانی تھی، یعنی خاموشی اور طویل جرح اور افشائے راز کے لئے ہر امکانی کوشش اور نتیجہ کچھ نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ یا تو فوراً بات کرنا شروع کردیتے ہیں یا پھر کوئی انسانی طاقت ان کو بولنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ لیکن اس عورت کے شروع کے جوابات سے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس کے چہرہ کی ساخت کے متعلق اس کا خیال صحیح نکلا۔ اس کے ہونٹ اور ٹھوڑی اس کی قوت ارادی کا پتہ دے رہی تھی۔ ہاں، وہ اپنے متعلق بات کرے گی، اپنی ذات کے متعلق ہر سوال کا جواب دے دیگی لیکن دوسروں کے متعلق ایک دفعہ خاموشی اور ہزار دفعہ خاموشی۔

"اچھا تو تم گاؤں آنے سے پہلے کہاں تھیں؟"

خاموشی۔ وہ گھبراہٹ میں میز پر پنسل مارنے لگا اور اس عورت کی طرف سے جس سے وہ جرح کر رہا تھا نظر پھیر لی۔ اچانک اسے کوفت ہونے لگی اور وہ سوچنے لگا کہ کیوں نہ وہ یہ سب چھوڑ چھاڑ کے اپنی محبوبہ کے پاس چلا جائے اور اس جرح کا کام کسی دوسرے ماتحت افسر کے سپرد کردے۔ لیکن وہ خود کسی نہ کسی صورت سے چھاپہ مار فوج کے متعلق کچھ نہ کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ چھاپہ مار فوج جس نے اس کی زندگی اجیرن اور اس کی حکومت ناممکن کردی تھی، اس کے علاوہ اس کو اپنے ماتحتوں کی ذہانت پر بھروسہ بھی نہ تھا۔ پھر اس کے ماتحتوں کو ایک مترجم کی بھی ضرورت پڑتی جس کی زبان دانی پر پورا بھروسہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود یہ غیر ملکی زبان خوب بول سکتا تھا۔ آخرکار وہ محنت جو اس نے اس زبان کے سیکھنے پر صرف کی تھی ضائع نہیں گئی۔

"ہوں! تو تمہیں کیا کہنا ہے؟ "تمہارے کمانڈر کا نام کرل ہے نا؟ مگر یہ تو اس کی عرفیت ہے اس کا اصلی نام کیا ہے؟" خاموشی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ عورت ناقابل برداشت حد تک تھک گئی۔ اس کی کنپٹی پر اس کی

پیشانی پر اور اس کے ہونٹوں کے چاروں طرف پسینے کے موتی سے چمک رہے تھے۔ اس کے چہرہ کے نقوش زیادہ گہرے ہوگئے تھے اس کے ہاتھ جو اس کے پہلو میں مردہ ٹہنی کی طرح لٹکے ہوئے تھے بالکل بے جان ہوگئے تھے۔

"تم بولتی ہو یا نہیں؟"

اچانک اس نے خود محسوس کیا کہ وہ خود بالکل تھک گیا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سب کچھ پھینک پھانک کر بھاگ جائے ——— اور دینا موت کی تھکن محسوس کر رہی تھی۔ سیاہ دھبے اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے اور سیاہ لہر جو شاید پیٹ کے نیچے سے اٹھتی ہوئی آرہی تھیں اس کی بصارت کو ختم کئے دے رہی تھیں۔ موت نے پھول تمام راستوں سے جھپٹ کر اس کی سمت بڑھتے آرہے تھے اور اس کو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ گویا یہ افسر یہ میز اور یہ پیٹ میں چھپے ہوئے کا غذات اور یہ تھکن جو اس کی پشت پر تھی سب اس ہولناک اندھیرے میں تیر رہے ہیں۔ اس نے محسوس کیا گویا موت کا پسینہ اس کے چہرہ پر پھوٹ کر بہہ نکلا ہے۔ اس کے ہاتھ منوں کی طرح وزن دار ہوگئے تھے۔ اس کی ٹانگوں میں ناقابل برداشت درد ہو رہا تھا اور وہ سوچ بھی رہی تھی۔ وہ کتنی دیر سے کھڑی ہوئی تھی؟ ایک گھنٹہ دو گھنٹے تین گھنٹے ممکن ہے تمام دن، لیکن نہیں سورج ابھی چمک رہا تھا اور شاید اس کو اتنی دیر نہیں ہوئی تھی جتنا اس کا خیال تھا۔

اس کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیٹ کے اندر کوئی اس کی تمام رگوں کو کھینچ رہا ہے۔ اچانک وہ آواز "تم ماں ہو" اور دینا جو گرنے والی ہی تھی اس لفظ کے سہارے سنبھل گئی۔ یقیناً وہ ماں تھی۔ اس جرمن افسر کے دماغ میں یہ بات گھس ہی نہ سکتی تھی کہ اس نے اس لفظ کو ادا کرکے غریب اودینا کی مدد کردی اور وہ بھی ایسے وقت جب کہ دنیا اس کی نگاہوں میں اندھیری ہوگئی تھی اور زمین پیروں تلے سے نکلی جا رہی تھی۔ "تم ماں ہو۔۔۔" یہ کس نے کہا؟ میز کے سامنے بیٹھے ہوئے جرمن افسر نے یا اس کے چھاپہ مار دستے کے کمانڈر کرل نے؟ "تم ماں ہو۔۔۔" وہ اس وقت اس بچہ کے متعلق نہیں سوچ رہی تھی جو اس کے دل کے قریب آرام کر رہا تھا، جو اپنا سانس اس کے پھیپھڑوں سے لے رہا تھا اور جو اس کے سیدھا کھڑے ہونے میں مانع ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت ان چھاپہ ماروں کے متعلق سوچ رہی تھی جو قرب وجوار کے جنگلوں میں چھپے ہوئے تھے اور اسے "ماں" کہہ کر پکارتے تھے اس لئے کہ وہ عمر میں ان سب سے بڑی تھی۔ گو کہ اس نے لڑائی میں کافی حصہ لیا تھا، پل بھی اڑایا تھا لیکن وہ اس کو اپنا خاص کام نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے سپاہیوں کے کپڑے دھوئے تھے، کھانا پکایا تھا۔ ان لوگوں کی خبر گیری کی تھی جن کا کوئی نہ تھا۔ اس نے بیماروں کی تیمارداری کی تھی۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کی تھی۔ ان کے پھٹے ہوئے کپڑے سیئے تھے۔ اس نے وہ سب کچھ کیا تھا جو بالعموم ایک ماں اپنے

بچوں کے لئے کرتی ہے اور اسی لئے وہ اسے "ماں" کہہ کر پکارتے تھے "تم ماں ہو۔۔۔" یہ الفاظ اس کو جنگل کے نوجوانوں کی پکار معلوم ہوئے ان لوگوں کی پکار جن کی موت اور زندگی کا انحصار اس کے صرف ایک لفظ پر تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس لفظ نے اس کے مادرانہ فرائض یاد کرا دئے۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ لفظ ایک پیغام تہنیت لے کر آیا ہے، اُس کے ان بچوں کی طرف سے جو جنگل میں چھپے ہوئے تھے۔

وارنر کی گرج دار آواز سنائی دی "بولو چچا پہ مار دستہ کہاں چھپا ہوا ہے؟"

اس کے ذہن میں ہر راستہ ہر درخت ہر جھاڑی گھوم گئی۔ وہ سڑک جس کا پتہ بار بار پوچھا جا رہا تھا اس کے دماغ میں روز روشن کی طرح چمک رہی تھی۔ اسے ڈر معلوم ہوا کہ کہیں یہ چندھی رطوبت دار آنکھوں والا جرمن درندہ اس روشن سڑک کو جو اس کے دماغ میں جگمگا رہی تھی دیکھ نہ لے۔ جلد ہی اسے کچھ اور سوچنا چاہئے۔ اپنے گھر کے متعلق، دریا کے متعلق، اپنے پڑوسیوں کے متعلق، لیکن اس کے خیالات پر بھرپور بر دستی جنگل کا نقشہ، اپنے کمانڈر کرلی کا چہرہ، اپنے سولہ چچا پہ مار لڑکوں کا چہرہ چھا جاتا۔ ہاں واقعی جنگل میں اس کے سولہ بیٹے تھے۔ سولہ بہادر نڈر لڑکے۔۔۔

"میں چچا پہ مار دستے کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ وہ چلے گئے، لیکن کہاں گئے مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

وارنر کی مٹھیاں غصے سے بھنچ گئیں۔ چار گھنٹے کی متواتر جرح کے بعد وہ وہیں تھا جہاں سے اس نے شروع کیا تھا۔ غصے سے اپنے سامنے سے کاغذات ہٹاتے ہوئے اس نے سپاہی کو آواز دی۔ ایک سپاہی حاضر ہوا۔

"لے جاؤ اس کو یہاں سے اصطبل میں ـــــ تھوڑی دیر باہر ہوا میں بیٹھو۔ شاید تمہارے دماغ کی گرمی نکل جائے۔ جب تمہارے دماغ کی گرمی نکل جائے اور تم اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کر لو تو سپاہی سے بلا کر کہدینا وہ مجھے خبر کر دے گا۔"

جس وقت اولینا اصطبل لے جائی جا رہی تھی تمام گاؤں کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ ان کے چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی گویا اس بدقسمت عورت کے ساتھ برف پر دوڑ رہے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ برف پر گرتے تھے اٹھتے تھے سنگینوں کی چبھن محسوس کرتے تھے اور شیطانی قہقہے بھی سنتے تھے، اولینا خود محسوس کر رہی تھی کہ گاؤں بھر کی نگاہیں اس کے چہرہ پر بکھری ہوئی ہیں۔ یہ اس کا اپنا گاؤں تھا، جہاں وہ پل کر بڑی ہوئی تھی جہاں اس نے زندگی کا گرم و سرد دیکھا تھا۔ مگر اب اسی گاؤں میں دھاردار نکیلی برف سے اس کے پیر زخمی ہوگئے تھے، ان میں سے خون بہہ رہا تھا۔ جان لیوا درد اس کی قوت برداشت ختم کئے دے رہا تھا، اس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں، وہ لڑکھڑاتی تھی، گرتی تھی اور پھر اٹھ جاتی تھی۔ وہ اس لئے نہیں اٹھ جاتی تھی کہ وہ ظالم درندے اس کو بندوق سے مار رہے تھے بلکہ اس لئے اٹھ جاتی تھی کہ وہ کسی طرح جرمن سپاہیوں کی ٹھوکر کے سامنے پڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ ان نازی درندوں کو یہ اطمینان قلب نہیں بخش سکتی تھی کہ وہ یہ سمجھ کر خوش ہوں کہ وہ اس کو سزا دے رہے ہیں، اس پر ظلم برسا رہے ہیں اور نزع کی تکلیف پہنچا رہے ہیں، شکاری کتوں کی طرح اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ دراصل اس کو کوئی تکلیف ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی قوت احساس ختم ہوگئی تھی، اس کے تمام جسم سے خون بہہ رہا تھا، وہ گرتی تھی اٹھتی تھی، برف پر گھسٹتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اولینا گویا اس جسم سے کہیں باہر ہے۔ اس پر ایک غشی کی حالت طاری تھی، اور اس غشی کی حالت میں اس نے جنگل کی پر پیچ سڑک دیکھی، اپنے چچا پہ مار دیکھے۔ اس کے کان بج رہے تھے۔ کمانڈر کرلی پکارتا ہوا معلوم ہوا "ماں" بالآخر وہ گر پڑی اور کوشش کے باوجود نہیں اٹھ سکی۔ "اٹھو نہیں تو رسید کرتا ہوں ایک لات!" سپاہی کی مکروہ آواز سنائی دی۔ دوسرے سپاہی کی آواز آئی "پیٹ پر مارو، اس کے پیٹ پر" بال پکڑ کر ایک سپاہی نے اس کو اٹھایا اور اس کی مردہ چال پر طنز کرتے ہوئے کہا، "سیدھی طرح چلو، اپنے محبوب کے ساتھ ہوا خوری کو تو نکلی نہیں ہو۔"

اولینا گرتی تھی، اٹھتی تھی لیکن وہ چیخی نہیں، وہ چلائی نہیں، نہ اس نے کیپٹن وارنر ہی سے ملنے کی کوئی خواہش ظاہر کی۔ سپاہی اب خود اس دلچسپ نظارے سے اکتا گئے تھے۔ ایک جنگلی جانور کی طرح چیختے ہوئے چلاتے ہوئے مارتے ہوئے وہ اولینا کو اصطبل لے گئے اور اس کو اس طرح اس میں ڈال دیا جس طرح کوئی اپنے سر کا بوجھ اتار کر پھینک دیتا ہو۔ وہ غریب زمین پر منہ کے بل گر گئی، لیکن غیر شعوری طور پر اس کے ہاتھ اس کے پیٹ پر پہنچ گئے، جیسے وہاں کوئی دولت چھپی ہوئی ہو!

اس کی پیٹھ کے زخم جن کو اس نے ابھی تک محسوس نہیں کیا تھا اب بری طرح جلنے لگے تھے۔ بے اندازہ کوشش کے بعد اس نے اپنے آپ کو زمین پر سے اٹھایا اور اپنے شانوں کو اپنی ٹانگوں کو اور اپنے بازوؤں کو اپنی سوجی ہوئی انگلیوں سے بری طرح ملنے لگی۔ چاندنی کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ اصطبل کے ایک کونے میں کچھ گھاس پھوس کا ڈھیر لگا ہوا ہے، وہ گھسٹتی ہوئی وہاں تک پہنچی اور اپنے آپ کو اس پر گرا دیا۔

تند و تیز ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ آندھی اور طوفان اپنے پورے شباب پر تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ عناصر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ اولینا چیخ رہی تھی، اپنی پوری آواز اور پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔ اس کے جسم میں اب جان لیوا درد ہو رہا تھا، یہ صرف درد زہ ہی نہ تھا، بلکہ اس کی تمام چوٹیں ابھر آئی تھیں۔ بندوق کے کندے کی چوٹیں، برچھی کے گھاؤ اور سب سے زیادہ بھوک پیاس اور سردی کی تکلیف

ان تمام تکالیف نے مل کر اس پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح حملہ کر دیا تھا، اس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے گئے ہیں، جیسے خونخوار درندوں کے خون آلود دانت اس کے جسم میں پیوست ہو گئے ہیں، یا جیسے اس کے جسم کو زندہ آگ پر بھونا گیا ہے ——— اولینا چیخ رہی تھی۔ اب وہ چیخ سکتی تھی، وہ ایک بچہ کو جنم دے رہی تھی۔ اب وہ اپنی خاموشی کو توڑ سکتی تھی۔ وہ اس وقت سے خاموش تھی جس وقت سے جرمن سپاہیوں نے اس کو اس کے گھر سے گرفتار کیا تھا اور وہ اس وقت خاموش رہی جب تک کہ اس نے دیکھا کہ باوجود ان سب تکالیف کے وہ ایک بچہ کو جنم دے رہی ہے، ایسا بچہ جو باوجود بندوق کی چوٹوں کے، باوجود اس کے برف پر گرنے کے اور باوجود اس کے سڑک پر گھسٹنے کے زندہ تھا، صرف زندہ ہی نہ تھا بلکہ اس دنیا میں آنے پر مصر تھا، اندھیرے سے اجالے میں آنے کے لئے، اپنی ترکِ آپ بنانے کے لئے ——— اولینا چیخ رہی تھی، غیر انسانی آوازیں، جانوروں کی آوازوں سے مشابہ اس کے حلق سے نکل رہی تھیں۔ چیخنے سے اس کے درد میں کمی ہو جاتی تھی، چیخ میں درد ڈوب جاتا تھا۔ سردی کا اثر کم ہو جاتا تھا، اور ہواؤں کی تیزی بھی کم ہو جاتی تھی۔

اصطبل کے کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے اپنا سر بھی نہ گھمایا، اس کے درد لگ چکے تھے اور وہ اپنے زخمی جسم کی پکار کے جواب میں انتہائی زور سے چیخ رہی تھی۔ سپاہی دروازہ پر ہی رک گیا۔ وہ اس کو ڈانٹنے والا ہی تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ عورت تو بچہ جن رہی ہے۔ ایک لمحے بعد دوسرا سپاہی بھی آ گیا۔ دونوں بچہ پیدا ہوتا دیکھ کر بندروں کی طرح کھی کھی کرنے لگے اور بے ہودہ آوازے کسنے لگے۔ وہ مظلوم اس وقت اس دنیا سے دور تھی جہاں وہ یہ محسوس کر سکتی کہ وہ برہنہ گھاس کے ڈھیر پر پڑی ہوئی ہے، اور یہ کہ دو اجنبی آدمیوں کی مکروہ آنکھیں اس کو دیکھ رہی ہیں اور یہ کہ وہ اس کو اس حالت میں دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ وہ اس وقت ایک روسی بچے کو جنم دے رہی تھی اور اس خیال نے اس کو اس دنیا سے علیحدہ کر دیا تھا۔ جہاں جرمن درندوں کی حکومت تھی، اور اس تصور نے اس کے برہنہ جسم اور ان درندوں کی شرمناک نگاہوں کے درمیان پردہ حائل کر دیا تھا۔ وہ ایک بچہ کو جنم دے رہی تھی اور غالباً ان دو جنگلی سپاہیوں نے ان کی اجازت بھی دے دی تھی، اس لئے کہ وہ دروازہ ہی پر کھڑے رہے اور اندر نہ آئے۔

اس نے بچے کو جنم دے دیا، ایک روسی بچے کو، جو باوجود انتہائی مصیبتوں کے اس دنیا میں آ گیا، ایسے باپ کا بچہ جو اپنے ملک کی خاطر میدانِ جنگ میں مارا جا چکا تھا، ایسی ماں کا بچہ جو اس وقت تک کم از کم دس دفعہ مر چکی ہوتی ——— اس نے بچہ کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ چھوٹا سا سرخ سرخ بچہ۔ نہ تو وہاں کوئی دائی تھی اور نہ کوئی دوسری عورت جو اس کے ایسے وقت میں کام آتی۔ ایک کتیا کی طرح اس نے نال کو اپنے دانتوں سے کاٹ ڈالا اور پھر اس کو ایک چیتھڑے سے باندھ دیا۔ اس کے بعد وہ بچے کو اپنے برف لیے ٹھنڈے ہاتھوں سے ملنے لگی، اور سوچنے لگی کہ کاش اس کو ذرا سا پانی ہی مل جاتا، جس سے وہ اپنے بچہ کا منہ تو دھو سکتی۔ نوزائیدہ بچہ ایک تندرست بچے کی طرح چیخ کر رو دیا۔ اولینا کا خوشی کے مارے سانس رکنے لگا۔ اس نے ایک لڑکے کو جنم دیا تھا، اس کا پہلا لڑکا، اس کا پہلا بچہ، اس کے جسم کا پہلا پھل، ایسے جسم کا جو چالیس سال تک بے برگ و بار رہا تھا۔

اتنے میں جرمن سپاہی نے اس کے ٹھوکر ماری، اور وہ اپنے ہوش میں آ گئی۔ سپاہی نے اس کو اٹھنے کا حکم دیا، کمزوری کی وجہ سے وہ اٹھ نہ سکتی تھی، لیکن کوشش کر کے وہ کھڑی ہوئی، بندوق کے کندے سے دھکیلتے ہوئے سپاہی نے اس کو دروازے کی طرف چلنے کا حکم دیا، وہ خاموشی سے سپاہی کے سامنے چلنے لگی، ایک شرابی کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے، وہ سمجھ گئی کہ وہ وارنر کے پاس جرح کئے جانے کے لئے جا رہی ہے۔

وارنر نے اس کی طرف کراہت سے دیکھا۔ وہ واقعی خوفناک معلوم ہو رہی تھی، اس کا چہرہ بالکل غیر انسانی معلوم ہو رہا تھا۔ ایک پتلی سی خون کی لکیر اس کے ہونٹوں سے بہ کر اس کی ٹھوڑی پر خشک ہو گئی تھی، ایک کالا سا چوٹ کا نشان اس کی آنکھوں کے نیچے تھا اور ایک آنکھ کچھ ایک طرف کو پھر گئی تھی۔ اس کے بال بٹی ہوئی رسی کی طرح اس کے چہرہ کے دونوں طرف پڑے ہوئے تھے، اس کے ننگے اور سوجے ہوئے پیر کالے ہو رہے تھے۔ افسر نے سر کے اشارے سے سپاہی سے کہا کہ عورت کو بیٹھنے کے لئے کرسی دیدے۔ وہ حیران رہ گئی لیکن فوراً بغیر اجازت کے بیٹھ بھی گئی اور حیرت سے جرمن افسر کا منہ تکنے لگی۔

"لڑکا یا لڑکی؟ بچہ کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک افسر نے پوچھا۔

"لڑکا" عورت نے بھرائی ہوئی کمزور آواز میں جواب دیا۔ اس کے بعد افسر نے ایک گلاس پانی لانے کا حکم دیا۔ اولینا نے محسوس کیا کہ وہ خوشی کے مارے دیوانی ہوئی جا رہی ہے۔ اس نے پاگلوں کی طرح گلاس پکڑا اور غٹ غٹ پانی پینے لگی۔ اس کے ہونٹ نم ہو گئے، گلا تر ہو گیا اور سینہ کی آگ کچھ بجھ سی گئی۔ اتنے میں ہی وارنر نے گرجدار آواز میں کہا "بس"۔ اور سپاہی نے اس کے ہاتھ سے گلاس چھین لیا اور وہ تکتی رہ گئی۔ ایک گھونٹ پانی پینے کے بعد پیاس کی شدت اور بڑھ گئی۔

"ہوں! تو تمہارے لڑکا ہوا ہے! زندہ تندرست بچہ! اور امید ہے کہ اب تم زیادہ سمجھداری کا ثبوت دوگی۔ اب یہ صرف تمہارا ہی سوال نہیں ہے، بچے کی سلامتی یا تباہی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ہے نا یہ بات! زندگی یا موت؟" اس نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا

فطری طور پر اس نے اپنے بچے کو کلیجے سے چمٹا لیا۔ وآرنر اس کی حرکات کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا "اچھا بتاؤ اس وقت کرلی کہاں ہے؟" اولینا سرد پڑ گئی۔ تو یہ ڈرامہ پھر شروع ہو رہا تھا، اس نے اپنے بچّہ کا گرم جسم اپنی آغوش میں محسوس کیا اور اس گرمی سے اس کے دل میں کچھ تقویت آگئی۔ اب اس جرح میں وہ اکیلی نہ تھی۔ اب اس کا لڑکا، اس کے جگر کا ٹکڑا، اس کے پاس تھا، وہ لڑکا جو اتنی مصیبتوں میں پیدا ہوا تھا، وہ جو اصطبل میں پیدا ہوا تھا، وہ جو جرمن ریچھ کے اتنے دنوں بعد پیدا ہوا تھا۔ وہ لڑکا اس وقت اس کے پاس تھا اور اس کی آغوش میں اطمینان سے سو رہا تھا اور اس کا ننھا سا دل جیسے ایک چھوٹی سی چڑیا کا دل، آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے بچے کو دیکھ رہی تھی اور اس میں کھوئی ہوئی تھی کہ وآرنر کی آواز اسے سُنائی دی۔

"بتاؤ! اس وقت کرلی کہاں ہے؟" وہ چونک پڑی اور اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا، "مجھے نہیں معلوم"۔ "ہوں! تو تمہیں نہیں معلوم ... اچھا وہ اس وقت کہاں تھا جب تم گاؤں آئی تھیں؟" — "مجھے نہیں معلوم۔ جنگل میں"۔ — "کونسے جنگل میں؟" "بس جنگل میں"۔ "یہاں تو بہت سے جنگل ہیں، چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم کس طرف سے جنگل میں داخل ہوئی تھیں؟" — "مجھے یاد نہیں رہا، میں نہیں جانتی چاروں طرف کہرا چھایا ہوا تھا"۔

وآرنر کے تیور بدل گئے۔ "دیکھو یہ مت بھولو کہ تم ایک ماں ہو"۔

پھر وہی لفظ! لیکن اب یہ ہر طرح صحیح تھا، اس کی گود میں اب اس کا اپنا بچہ تھا، چھوٹا سا، ننھا سا، جو اصطبل کی زمین پر پیدا ہوا تھا اور جو اپنی ماں کی پھٹی ہوئی قمیص میں لپٹا ہوا تھا۔

"کیا تم یہ نہیں چاہتیں کہ تمہارا لڑکا زندہ رہے، بڑھے اور پھلے پھولے؟ میں تم کو ایک موقع اور دیتا ہوں، اس موقع سے فائدہ اٹھانا تمہارا کام ہے اور مجھے امید ہے کہ تم اب بے وقوفی نہ کروگی"۔

اولینا نے کوئی جواب نہیں دیا، اصل میں وہ سمجھی ہی نہیں کہ وآرنر کے دل میں کیا ہے، لیکن نہ معلوم کیوں اس کا دل گھبرانے لگا اور جی اندر سے بیٹھنے لگا۔ آخر وآرنر کا منشا کیا ہے؟ وہ کیوں نرمی اور آہستگی سے باتیں کر رہا ہے، اس طرح جیسے ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرتا ہے۔

وآرنر کی آواز پھر سنائی دی "تم یہ نہ سمجھنا کہ میں انسان نہیں ہوں اور کوئی جانور ہوں۔ میں اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہوں؟ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ میں اپنا فرض بحیثیت ایک سپاہی کے ادا کر رہا ہوں۔ مجھے تم پر اور تمہارے بچے پر افسوس ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ تم اپنے بچہ پر رحم کھاؤگی۔ تم نے اسے زندگی بخشی ہے لیکن اس زندگی کو واپس لینے کا تمہیں کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ تم جانتی ہو کہ میرا مطلب کیا ہے، تم اچھی طرح سمجھ لو کہ میرے سوالات کا جواب نہ دے کر تم گویا خود اپنے بچے کو موت کی سزا دے رہی ہو، تم اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو، میں تمہیں تھوڑا سا وقت دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اب تم تسلّی بخش جواب دوگی اور اس طرح اپنی اور اپنے بچہ کی جان بچاؤگی"۔

یہ کہہ کر وآرنر نے تھوڑا سا تمباکو لیا اور دراز سے کاغذ نکال کر آہستہ آہستہ سگرٹ بنانے لگا۔ اولینا اس کی موٹی موٹی انگلیوں کو دیکھتی رہی گرتے ہوئے تمباکو کو دیکھتی رہی، سفید سگرٹ کے کاغذ کی شکنیں دیکھتی رہی۔ دیاسلائی جلی، ایک شعلہ بلند ہوا، اور نیلے دھوئیں کے بادل کمرے میں چھا گئے۔

"ہوں! بولو! جواب دیتی ہو کہ نہیں؟" "نہیں!"

وآرنر کا چہرہ غصّے سے تمتما گیا۔ "اچھا ٹھیرو! میں اب تمہیں بتاتا ہوں! میں اب تک تم سے ایک انسان کی طرح برتاؤ کر رہا تھا، ادھر آؤ تم دونوں سپاہیو! اس کو پکڑے رہو، اور اس کے پلّے کو ادھر لاؤ"۔

ایک سپاہی نے اس کے بچّے کو اس کی گود سے چھین لیا پیشتر اس کے کہ وہ محسوس کرے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، وہ سپاہی کے پیچھے دوڑی لیکن فولادی ہاتھوں نے اس کو دونوں طرف سے جکڑ لیا۔ اولینا نے اپنی آنکھیں اپنے بچے پر سے نہ ہٹائیں، سپاہی بچّے کو بے ڈھنگے طریقے سے لیے ہوئے تھا اور وہ ڈر رہی تھی کہ وہ کہیں اسے گرا نہ دے۔

"اسے میز پر لٹا دو، وآرنر نے کہا"۔

اپنی ماں اور جرمن افسر کے درمیان وہ میز پر لیٹا ہوا تھا، اور ادھر سپاہی کے مضبوط پنجے اولینا کے شانے کے گوشت میں گھسے جا رہے تھے۔ تاکہ وہ جان لے کہ ان کی گرفت کس قدر مضبوط ہے اور وہ چھوٹ نہیں سکتی بچّہ مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا، اس کی چھوٹی پلکیں، چڑیا کے پروں کی طرح پھڑ پھڑائیں اور پھر وہ رونے لگا، اس آواز میں جس میں نوزائیدہ بچے روتے ہیں۔ اولینا کے کلیجے پر آرے چل گئے۔

اس نے اپنے بچے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی، لیکن فولادی ہاتھوں کے شکنجے میں اور بھی کس گئی۔ اس کی نگاہیں بچے پر جم کر رہ گئیں۔

وآرنر کی گرجدار آواز سنائی دی "بولو! تم بولتی ہو کہ نہیں، میں تم سے آخری بار پوچھتا ہوں"۔

اس نے اپنے بچے کی طرف سے منہ پھیر لیا، اور دھیمی مگر صاف آواز میں کہا، "نہیں مجھے کچھ نہیں کہنا!"

وآرنر نے اپنے ہاتھوں سے وہ چیتھڑا قمیص جس میں وہ لپٹا ہوا تھا نوچ کر پھینک دی۔ اس کا معصوم بچہ ننگا، مٹھیاں بھینچی ہوئی، ٹانگیں سکڑی ہوئی، میز پر پڑا چیخ رہا تھا۔ وآرنر نے اس کی گردن پکڑی اور اپنی دو انگلیوں میں اسے اس طرح اٹھا لیا جیسے کوئی کتّے کے پلّے کو اٹھاتا ہو۔

"ہوں! اچھا" یہ کہہ کر وآرنر نے آہستہ آہستہ اپنا ریوالور اٹھایا۔

اولینا پتھر کی طرح جامد و ساکت ہوگئی۔ اس کے بازو اور اس کی ٹانگیں برف کی طرح سرد ہوگئیں۔ کمرہ اس کی آنکھوں میں پھیلنا شروع ہوا، وارنر بھی بڑھنا شروع ہوا، اور ایک دیو کی طرح بڑھتا ہی گیا اور اس کا سر بادلوں سے چھونے لگا۔ اس مہیب خلا کے اندر اس زمین اور آسمان کے درمیان اس کا بچہ اس دیو کی انگلیوں میں لٹک رہا تھا۔ اب بچے نے رونا بھی بند کر دیا تھا، لیکن اس کی ٹانگیں سکڑ رہی تھیں، پھیل رہی تھیں، مٹھیاں بھنچ رہی تھیں اور کھل رہی تھیں، جیسے ہوا سے کوئی پنجہ لڑا رہا ہو۔

"اب مجھے دیکھنا ہے کہ تم بالشویک کتنی ہو کہ ماں ہو"

یہ آواز سن کر اولینا ہوش میں آگئی۔ کمرہ اپنی اصلی حالت میں آگیا اور وارنر بھی اب دیو نہیں معلوم ہو رہا تھا۔

"میں ماں ہوں" اولینا نے اپنا جنگل والا نام یاد کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب ٹھیک ہے، بتاؤ وہ جنگلی کہاں چھپے ہوئے ہیں"

اس نے اپنے بچے کو پھر نہ دیکھا اور وارنر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "ایک دفعہ نہیں اور ہزار دفعہ نہیں، میں کچھ نہیں بتاؤں گی"

ریوالور کی نال بچے کے منہ کے قریب ہوتی چلی گئی، یہ اولینا نے بغیر دیکھے ہوئے بھی دیکھ لیا۔

"یہ تمہارا اکلوتا بچہ ہے نا؟" وارنر نے پوچھا۔

"نہیں" اولینا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا؟ تمہارے اور اولاد ہے؟ لڑکے! لڑکیاں؟ یہاں گاؤں میں؟" وارنر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

اچانک ایک خفیف سی مسکراہٹ اولینا کے پھٹے ہوئے موٹے اور بھکرے ہونٹوں پر جھلکا اٹھی۔

"لڑکے ۔۔۔۔ صرف لڑکے ۔۔۔۔ بہت بہت سے لڑکے ۔۔۔۔ جنگل میں ۔۔۔۔ کرلی ۔۔۔۔ کرلی اپنے سیکڑوں ۔۔۔۔ ہزاروں ۔۔۔۔"

ایک گولی کے چلنے کی آواز آئی، چھوٹے سے منے سے منہ پر بارود اور دھوئیں کی بدبو چاروں طرف اڑنے لگی۔ جو سپاہی ۔۔ نا کو پکڑے ہوئے تھے وہ بھی کانپ گئے۔

"یہ لیجئے اماں صاحبہ!" وارنر نے بچہ کی لاش کو ٹانگ سے پکڑ کر ہوا میں ہلاتے ہوئے اولینا کی طرف پھینک کر کہا۔ "تم نے خود اپنے ہاتھوں اپنے بچے کو اس انجام پر پہنچایا ہے" لیکن اولینا اس وقت اس جگہ سے کہیں دور بہت دور اپنے بچوں کے ساتھ جنگل میں تھی۔

"لے جاؤ اس مردود کتیا کو میری نظروں کے سامنے سے لیکن ٹھیرو دیکھو میں تم سے آخری بار پوچھتا ہوں تم بولو گی یا نہیں؟"

اولینا نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ کچھ سن ہی نہیں رہی تھی، جواب کیا دیتی، سب کچھ اس کا سب کچھ ختم ہو چکا تھا، اس کا بیٹا ہی نہیں رہا تھا، وہ بیٹا جس کی خاطر اس نے بیس برس انتظار کیا تھا، اس کا دل خاموش ہوگیا تھا، اس کے اندر کچھ نہیں رہا تھا، نہ ڈر نہ ہراس نہ حرکت۔ اولینا نے خالی نظروں سے وارنر کی طرف دیکھا، ان نظروں سے جن سے بے جان چیزیں دیکھی جاتی ہیں جیسے پتھر جیسے لکڑی۔

"لے جاؤ اس کو یہاں سے اور پھانسی لگا دو لیکن یہاں گھر کے قریب نہیں، یہاں ویسے ہی لاشوں کی بدبو ہے۔ دریا کا کنارا اس کام کے لئے بہترین جگہ ہوگی"

وہ گردن جھکائے خاموشی سے چلنے لگی اس سمت جس سمت اس کو بندوق کے کندوں سے مار کر اشارہ کیا گیا۔ وہ چلتی رہی معلوم نہیں کس وقت دریا کے کنارے پہنچ گئی۔ جب وقت موت کی بجلی بھیجی گئی پسلیوں کو توڑتی ہوئی اس کے پھیپھڑوں میں گھسی اس وقت وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہو "میرے بچے! میرے لال! میں تم کو کیسے بچا سکتی تھی!!"

## غزل

**قمر جلالوی**

نہ رکتے ہیں آنسو نہ تھمتے ہیں نالے
کہو کوئی کیسے محبت چھپا لے

چمن والے بجلی سے لوٹے نہ جالے
غریبوں کے گھر بے خطا ہو نہ ڈالے

ہنسے ہنس کے دل مانگا گیسو سنبھالے
بڑے ناز سے کھینچے بڑے جال ڈالے

کرے کوئی کیا وہ جو آئیں یکایک
نگاہوں کو روکے کہ دل کو سنبھالے

یہ ترتیب محفل نہیں دیکھتا ہوں
ادھر سے اٹھائے ادھر کے نکالے

کروں ایسا سجدہ وہ گھبرا کے کہہ دیں
خدا کے لئے اب ادھر کو اٹھا لے

یہ دیوانے ہیں ان کو کیا پوچھتے ہو
یہ جینے والے بڑے اپنے والے

قیامت ہیں ظالم کی ترچھی نگاہیں
خدا جانے کیا ہو جو نظریں اٹھا لے

بس اتنی سی دوری ہے یہ میں ہوں منزل
کہاں آکے چھوٹے ہیں پاؤں کے چھالے

تمہیں بندہ پرور ہمیں جانتے ہیں
بڑے سیدھے سادے ترے بھولے بھالے

قمر میں ہوں مختار تنظیم شب کا
مرے بس میں ہیں یہ اندھیرے اجالے

# ترکی کا آئین

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

۱۹۱۹ء میں مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں ترکی میں جمہوری انقلاب کامیاب ہوا۔ اور سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا۔ نئے دور میں ترکی کو ایک نئے جمہوری آئین کی ضرورت تھی۔ جسے اسوقت ترکی کے لیڈر کمال اتاترک نے پورا کیا۔ کمال اتاترک نے برطانیہ، امریکہ اور فرانس کے آئین کا پوری طرح مطالعہ کرنے کے بعد ۱۹۲۴ء میں ایک نیا آئین ترکی کی اسمبلی میں پیش کیا۔ جسے اسمبلی نے منظور کر لیا۔ اس آئین میں برطانیہ، امریکہ اور فرانس کے آئین کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

یہی آئین معمولی ردّ و بدل کے ساتھ آج بھی ترکی میں رائج ہے۔ ۱۹۳۴ء میں ترکی کے آئین کی ترمیم کی گئی جس کی رو سے ہر بالغ عورت کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ نئے آئین کی رو سے ترکی کو جمہوری ملک قرار دیا گیا۔

امریکہ کے آئین کی طرح ترکی میں بھی ریاست کا ایک صدر ہے قانون بنانے اور انتظامی معاملات کے لئے ایک نمائندہ اسمبلی ہے جسے نیشنل اسمبلی کہتے ہیں۔ اور جسے چننے کے لئے ہر بالغ شہری کو ووٹ کا حق حاصل ہے۔ اس کے علاوہ یہ آئین ملک کی لوکل سیلف گورنمنٹ اور عدالتی نظام کا خاکہ بھی پیش کرتا ہے۔ شہریوں کے انفرادی حقوق کی تشریح بھی آئین میں ہی کی گئی ہے۔ آئین میں ترمیم کے لئے ⅔ اکثریت کی ضرورت ہے لیکن آئین کی پہلی دفعہ جس سے ملک میں جمہوری نظام قائم کیا گیا کسی صورت میں ترمیم نہیں ہو سکتی۔

ترکی کے صدر کا انتخاب نیشنل اسمبلی چار سال کے عرصے کے لئے کرتی ہے لیکن اس عرصے کے بعد وہی صدر کتنی ہی بار چنا جا سکتا ہے۔ خاص خاص موقعوں پر صدر نیشنل اسمبلی کی صدارت کرتا ہے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو کیبنٹ کی صدارت بھی اسے کرنی پڑتی ہے۔ ترکی کا صدر نیشنل اسمبلی کے ممبروں میں سے بڑے وزیر کا انتخاب کرتا ہے۔ اور جنگ کے دوران میں جنرل اسٹاف اور کیبنٹ کے مشورے سے فوجوں کا سپہ سالار نامزد کرتا ہے۔ آئین کی رو سے صدر پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دس دن کے اندر اندر اسمبلی سے پاس شدہ قانون کو نافذ کر دے لیکن اُسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ ایسے قانون کو دوبارہ غور کرنے کے لئے اسمبلی میں بھیجے۔ اگر اسمبلی پھر بھی اس قانون کو نہ بدلے تو صدر کو اُسے نافذ ہی کرنا پڑتا ہے۔

۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک مصطفیٰ کمال ترکی کے صدر رہے اور ان کی قیادت میں ترکوں کی تمدنی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ ۱۹۳۸ء میں مصطفیٰ کمال کی وفات کے بعد عصمت انونو صدر منتخب ہوئے۔

نیشنل اسمبلی کا چناؤ ہر چار سال کے بعد ہوتا ہے اور اسے چننے کے لئے ہر بالغ شہری کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ سب شہری پہلے (Electors) چنتے ہیں اور اس کے بعد شہریوں کے چنے ہوئے (Electors) اسمبلی کے ممبروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس اسمبلی کے ۴۵۵ ممبر ہیں۔ یہ اسمبلی اپنا صدر خود منتخب کرتی ہے۔ اور ترکی کے صدر کی غیر حاضری میں اسمبلی کا صدر اس کے فرائض سر انجام دیتا ہے۔

نیشنل اسمبلی کا اجلاس سال میں ایک دفعہ ہوتا ہے۔ اور یہ سیشن ۶ ماہ تک جاری رہتا ہے۔ ہر سیشن کے لئے ایک تاریخ مقرر کر دی جاتی ہے اور صدر کو یہ اختیارات حاصل نہیں کہ وہ اسمبلی کے اجلاس کو روک سکے۔ ہر سیشن کے شروع میں اسمبلی میں سالانہ بجٹ پیش کیا جاتا ہے۔ آئین کی رو سے اسمبلی کے فرائض یہ ہیں۔ قانون بنانا اور قانون کی ترمیم و تنسیخ کرنا۔ دوسرے ملکوں سے معاہدے کرنا۔ جنگ کا اعلان کرنا۔ سکے جاری کرنا وغیرہ۔ اس کے علاوہ عدالتوں سے ملی ہوئی سزاؤں کو کم یا معاف کرنا اور پھانسی کی سزا کا انتظام کرنا بھی اسمبلی کے فرائض میں شامل ہے۔

ملک کا صدر اسمبلی کے اراکین میں سے بڑے وزیر کا انتخاب کرتا ہے۔ اور اسمبلی کے ممبروں میں سے ہی بڑا وزیر کیبنٹ کے سولہ رکن چنتا ہے۔ یہی کیبنٹ پر ملک کی حکومت کا بار ہے۔ اسمبلی کا کوئی ممبر سرکاری نوکری نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی ممبر اسمبلی کے اجلاس سے دو ماہ تک بلا وجہ غیر حاضر رہے تو وہ اسمبلی کا رکن نہیں رہ سکتا۔

اسمبلی کا ہر رکن اپنی اہلیت کے مطابق ایک مستقل کمیشن کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ یہ کمیشن ہر قانون پر اسمبلی میں پیش ہونے سے پہلے پوری طرح بچار کرتا ہے۔ اسمبلی کے نمائندوں کا کہنا ہے کہ وہ اسمبلی کے کھلے اجلاس کی نسبت ایسے کمیشن میں زیادہ کام کرتے ہیں۔

اسمبلی کے رکن حکومت اور عوام کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لئے اپنے اپنے علاقوں کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ اور حکومت کے مختلف محکموں کے متعلق عوام کی رائے کا اظہار اسمبلی کے سیشن میں کرتے ہیں۔

ترکی میں برطانیہ، امریکہ اور دوسرے ملکوں کی طرح مختلف پارٹیاں نہیں ہیں۔ انتخابات میں اکثر پیپلز پارٹی یعنی کمال اتاترک کی پارٹی جسے انقلاب سے پہلے ینگ ٹرکش پارٹی کہا جاتا تھا کے نمائندے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں کمال اتاترک نے دوسرے ملکوں کے آئین کی مثال پر عمل کرتے ہوئے ترکی میں بھی ایک مخالف پارٹی قائم کرنے کی کوشش کی لیکن یہ "منظم مخالفت" کامیاب نہ ہو سکی۔ جنگ کے دوران میں آئینی طور پر پیپلز پارٹی کے علاوہ دوسری پارٹیوں پر انتخابات میں حصہ لینے کی

بندش کو اڑا دیا گیا۔ پیپلز ری پبلکن پارٹی کا جال سارے ملک میں بچھا ہوا ہے اس پارٹی کے ۱۳ لاکھ سے زیادہ ممبر ہیں۔ ہر گاؤں، شہر اور صوبے میں پارٹی کمیٹی موجود ہے۔ اور یہ کمیٹی حکومت کی باگ ڈور کا ایک ضروری جزو سمجھی جاتی ہے۔

تاہم ترکی میں بھی سوشلسٹ تحریک کی وجہ سے چند ایک نئی پارٹیاں وجود میں آئیں۔ مثلاً سوشلسٹ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی۔ لیکن ان پارٹیوں کے نمائندے نیشنل اسمبلی میں کسی خاص تعداد میں کامیاب نہ ہوسکے۔ ان پارٹیوں کی تنظیم میں ایک آئینی رکاوٹ بھی موجود ہے۔ ترکی کے آئین کے مطابق ملک میں کوئی ایسی پارٹی منظم نہیں کی جاسکتی جس سے جماعتی کشمکش پیدا ہو اور کمیونسٹ تحریک کا بنیادی پہلو جماعتی کشمکش ہے۔

ایک لمبے چوڑے ملک میں جہاں مرکزی حکومت کا اثر ملک کے ہر حصے میں براہ راست نہیں ہو سکتا لوکل سیلف گورنمنٹ کے مختلف شعبے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں جمہوری دور سے پہلے بھی دیہاتی پنچائیت کو ہی حکومت کا بنیادی ادارہ بنایا۔ لیکن اس ادارے کو ایک منظم جمہوری شکل دیدی۔ اور مرکزی حکومت کی نگرانی میں اس ادارے کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔

مرکزی حکومت میں لوکل سیلف گورنمنٹ کا صیغہ ہوم منسٹر کو سونپا گیا ہے۔ ترکی کو باسٹھ (۶۲) صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر صوبہ ضلعوں میں منقسم ہے اور ہر ضلع کمیونز میں۔ مختلف گاؤں یا شہروں کے وارڈ مل کر کمیون بنتے ہیں۔ ہر گاؤں یا شہر کے وارڈ کے لئے ایک کونسل اور ایک نمبردار چنا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر کمیون اور ضلع کے لئے ایک کونسل چنی جاتی ہے اور یہی کونسل علاقے کے انتظام کے لئے افسر مقرر کرتی ہے۔

ہر صوبے میں ایک گورنر تعینات کیا جاتا ہے اور گورنر کی مدد کے لئے دو کونسلیں ہوتی ہیں۔ ایک سرکاری ممبروں یعنی افسروں کی کونسل اور دوسری عوام کی چنی ہوئی۔ دوسری کونسل کو وہی لوگ منتخب کرتے ہیں جو نیشنل اسمبلی کو۔

گورنر کا کام نہایت ذمہ داری کا کام خیال کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس عہدے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور اسکا تقرر کافی سوچ بچار کے بعد ہوتا ہے۔ گورنر کے لئے یہ قانونی طور پر ضروری ہے کہ وہ سال میں کم از کم دو ماہ اپنے صوبے کا دورہ کرے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ساتھ میل ملاپ بڑھائے۔

گورنر کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ ضلع اور کمیون کے افسروں کے ذریعے مرکزی حکومت کے احکام اور ہدایات عوام تک پہنچائے۔ مثال کے طور پر اگر مرکزی حکومت یہ قانون پاس کرتی ہے کہ عام تعلیم کے لئے ہر گاؤں میں اسکول بننے چاہئیں۔ مدرس اور انکی تنخواہ مرکزی حکومت اپنے ذمے لیتی ہے لیکن سکول کی عمارت کی ذمہ داری گاؤں میں رہنے والوں پر ہے۔ ایسی صورت میں گورنر کا یہ فرض ہے کہ وہ مرکزی حکومت کی ان ہدایات کو عوام تک پہنچائے اور انھیں تعلیم کے فائدے بتا کر مجبور کرے کہ وہ اپنے گاؤں میں سکول کے لئے عمارت تعمیر کریں۔ لیکن گورنر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عوام کو ڈرا دھمکا کر انھیں عمارت تعمیر کرنے کے لئے مجبور کرے۔

تعلیم کے علاوہ یہ بھی گورنر کا فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے صوبے میں سڑکیں اور ہسپتال بنوائے صوبے کی پولیس بھی گورنر کے ماتحت ہوتی ہے۔

لوکل سیلف گورنمنٹ کے اخراجات کے لئے صوبوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ سڑکوں، عمارتوں اور اراضی پر ٹیکس لگائیں۔ اس کے علاوہ انھیں مرکزی حکومت سے بھی مالی مدد ملتی ہے۔

کمال اتاترک کی قیادت میں ترکی میں بہت سی مذہبی اور قانونی تبدیلیاں ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کے مدنظر ملک کے عدالتی نظام کو بھی بدلنا پڑا۔ شروع شروع میں نئے ججوں کی تقرری میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ

---

## قرب و دُور

تم مجھ سے کتنی دور ہو
جیسے کہ دھرتی سے گگن
تارا کہ اس سنسار تک
پہنچی نہ ہو جس کی کرن
جیسے سوادِ شام سے
ہو دور صبحِ ضوفگن
یا دسترس سے دور ہو
جیسے صبا کا پیرہن
جیسے فضاؤں سے پرے
اُڑتی ہوئی بوئے سمن
یا سرحدِ تخئیل پر
کوئی شگفتہ نسترن

میں تم سے کتنا پاس ہوں
جیسے کہ ربطِ جان و تن
چشمہ سے جیسے کوہ کے
گونجا ہوا ہو کوئی بن
جیسے کلی کے قلب میں
ہو پھول بننے کی لگن
فصلِ بہار و جوشِ گل
جیسے چمن اندر چمن
یا حسن میں جیسے ادا
یا خود ادا میں بانکپن
یلغے میں پنہاں کیف مے
یا فن میں مضمر روحِ فن

یہ قرب کیا ہے دور کیا
فطرت کا ہے دستور کیا

جاں نثار اختر

وہ ان تبدیلیوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور عام طور سے وہی لوگ جج مقرر کئے جاتے تھے جو کمال اتاترک کی پالیسی کے حق میں تھے۔

لیکن جب کمال اتاترک کی اصلاحات ملک میں اچھی طرح رائج ہو گئیں، تو عدالتوں کی غیر جانبداری کے لئے آئینی طور پر انتظام کیا گیا۔ ترکی کی عدالتیں اپنے فیصلے نیشنل اسمبلی کے نام پر کرتی ہیں۔ لیکن نیشنل اسمبلی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ ان عدالتوں کے فیصلوں کو رد کر سکیں۔ صرف ترکی کے صدر کو سزائیں کم کرنے یا معافی کے محدود اختیارات حاصل ہیں۔

ترکی کی عدالت عالیہ یعنی ہائی کورٹ ۲۱ ممبروں پر مشتمل ہے جن میں سے ۱۱ رکن اپیل کی عدالتوں کے جج ہوتے ہیں اور دس کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر۔ عدالت عالیہ کے فیصلے آخری سمجھے جاتے ہیں اور مسترد نہیں کئے جا سکتے۔

فرانس اور امریکہ کے آئین کی طرح ترکی کے آئین میں بھی عوام کے حقوق واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ قانون کے سامنے سب شہری برابر تسلیم کئے گئے ہیں۔ کسی ترک کو اس کی ذاتی جائیداد سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک قانون اس امر کی اجازت نہ دے۔ تحریر و تقریر کی آزادی ہر شہری کا حق سمجھا گیا ہے۔ لیکن ملک میں کوئی ایسی سیاسی پارٹی نہیں بنائی جا سکتی جس کا مقصد جماعتی کشمکش پیدا کرنا ہو۔ اس کے علاوہ اخبارات پر کچھ پابندیاں ہیں۔ مثلاً ہر نئے اخبار کے اجراء کے لئے ایک کافی بڑی رقم حکومت کے پاس جمع کرانی پڑتی ہے اور اس رقم کو حکومت ضبط کر سکتی ہے۔ اس پابندی کے مدنظر ملک کے اخبارات حکومت کے کاموں پر آزادانہ تنقید نہیں کر سکتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترکی کے آئین میں بہت سی پابندیاں ہیں لیکن پھر بھی اس آئین کو جرمنی کی طرح فاشسٹ یا مطلق العنان آئین نہیں کہا جا سکتا اس آئین کی بنیادیں جمہوری اصولوں پر قائم ہیں۔

صنعتی جمہوریت شاید اس آئین میں اس وجہ سے مفقود ہے کہ انقلاب ترکی دراصل تمدنی اور مذہبی انقلاب تھا۔ اور جب کمال اتاترک نے یہ آئین بنایا تو اس کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد مذہبی اور تمدنی اصلاحات تھیں ویسے بھی ۱۹۱۹ء میں ترکی میں صنعت کو زیادہ فروغ نہ تھا۔ جوں جوں ملک میں صنعت کو فروغ ہوا، مزدوروں اور کسانوں کی صنعتی جماعت بھی بڑھنے لگی صنعتی دور میں صنعتی مزدور ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ہر آئین میں ان کے حقوق کے تحفظ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے لیکن ترکی میں ایسا کوئی قانون نہیں۔ اسی طرح ترکی کی خارجی پالیسی پر عوام کو آئینی طور پر دسترس حاصل نہیں ہے۔ اور اخبارات پر پابندیاں ہونے کی وجہ سے حکومت پر کسی قسم کا آئینی دباؤ یا رکاوٹ نہیں ہے۔

لیکن ان پابندیوں کے باوجود پیپلز پارٹی خاص طور پر گھریلو معاملات میں عوام کی ترجمانی کرتی ہے۔ اور ان کے حقوق کا تحفظ کرتی ہے۔ ان حالات میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترکی کے آئین میں جمہوریت کے بنیادی اصول تو موجود ہیں لیکن وقتی تبدیلیوں کی وجہ سے آئین میں چند ضروری امور پر ترمیم کی ضرورت ہے۔

# غزل

**اثرؔ لکھنوی**

کیا وہی تم ہو کہ جب مجھکو پریشاں دیکھتے
سوچ میں پڑ جاتے اور چین جبیں کے داماں دیکھتے

اب تڑپ اٹھتا ہے دل یاس نگہ کے ساتھ ساتھ
جوش زن رگ رگ میں اک نغموں کا طوفاں دیکھتے

ہم فریب آسودۂ رنگ بہاراں ہی رہے
ورنہ ہر ذرّے کے دامن میں گلستاں دیکھتے

میں سمجھتا ہوں قیامت سے ہے تیری کیا مراد
عمر گزری ہے نگاہِ فتنہ ساماں دیکھتے

کچھ عجب اسلوب تھا اپنے جنوں کا ابکی سال
فصل گل آخر ہوئی سوئے گریباں دیکھتے

یاد ہے رنگیں خرامی اک سراپا نازکی
خود نظارے کو نگار گل بداماں دیکھتے

کس قدر نازک مگر بھرپور تھا زخمِ جگر
دیکھنے والے وہی برگشتہ مژگاں دیکھتے

جاگ اٹھتا تھا نظارہ کروٹیں لیتا ہوا
مسکرا کر وہ جو سوئے چشمِ حیراں دیکھتے

اب کہاں وہ شعلۂ حسن تصور کا فروغ
وہ نہ ہوتے اور گھر میں اُن کو مہماں دیکھتے

بے خودی ہوتی اگر ذوقِ تماشا میں شریک
کیا عیاں ہے اور کیا نظروں سے پنہاں دیکھتے

ذرہ ذرہ یک جہان رازِ مشتاقِ کشود
دیدنی تھا یوں جو رنگ بزمِ امکاں دیکھتے

تم حقیقت کو اگر مدِ نظر رکھتے اثرؔ
پاک نقشِ غیر سے آئینۂ جاں دیکھتے

# چینی موسیقی

شاہد احمد دہلوی

موسیقی کو بالعموم ایک بین الاقوامی زبان کہا جاتا ہے۔ جتنے بھی انسان ہیں سب کے جذبات و احساسات یکساں ہوتے ہیں، چاہے وہ کسی نسل اور قوم کے ہوں۔ ان کے خصائص فطری میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ احساساتِ انسانی کا ایک مظہر موسیقی بھی ہے۔ رسم و رواج اور طور طریق کے فرق کی وجہ سے کچھ اختلاف مذاق ضرور ہوتا ہے۔ جیسے ایک قوم کی زبان دوسری قوم کی زبان سے علیحدہ ہوتی ہے۔ ہر قوم کی موسیقی کا تعلق چونکہ براہ راست اس کی زبان سے ہوتا ہے اس لئے اس کا ایک مخصوص قومی مزاج بن جاتا ہے۔ مشرق کے تمام ممالک میں ہر قوم کی ایک علیحدہ موسیقی ہے اور ان کا باہمی فرق بہت نمایاں اور واضح ہے۔

چین میں موسیقی کا رواج نہایت قدیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چینی موسیقی کا موجد شہنشاہ فیوھسی تھا جس کا زمانہ حکومت ۲۸۵۲ء قبل مسیح ہے۔ چینیوں کا کہنا ہے کہ آسمان، زمین اور انسان کے درمیان جو ہم آہنگی ہے اس کا مظہر موسیقی ہے۔ چین کے قدیم بسنے والوں کی بھی اپنی ایک موسیقی ضرور رہی ہوگی۔ ہر ملک کے باشندوں کی ایک مخصوص موسیقی ہوتی ہے۔ بیرونی حملہ آوروں کے ساتھ ان کی تہذیب اور ان کے فنون بھی چین میں آئے اور یہاں کی موسیقی بھی ان سے متاثر ہوئی۔

چین کے مختلف شہنشاہوں نے مختلف طریقوں سے اپنے ملک کی موسیقی کو ترتیب دیا، اور اس نے کئی چولے بدلے لیکن اس کی مخصوص شکل روایتی شہنشاہ ہوانگ تی (۲۶۹۷ء قبل مسیح) کی مرہون منت ہے۔ نغموں اور [illegible] آوازوں کے نام رکھے گئے اور بنیادی سُر مقرر کیا گیا۔ نظریاتی اعتبار سے ایک اچھی حکومت کے قیام میں موسیقی کو بہت اہم درجہ حاصل ہے۔ یہ قدیم چینی موسیقی اسقدر غیر معمولی خصائص کی حامل تھی کہ شہنشاہ اعظم کی بنائی ہوئی ایک سولہ سو سال پہلے کی چیز سنکر کنفوشس نے تین سال تک گوشت کھانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ممکن ہے کہ چینیوں پر سُروں کی عجیب و غریب ترکیبیں کچھ اس طرح اثر انداز ہوتی ہوں کہ ہم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ افسوس ہے وہ قدیم موسیقی اب بالکل معدوم ہو چکی ہے اسلئے اس کی اثر آفرینی کا تجربہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان روایات کو سچ سمجھ لیا جائے تو پھر کسی کو یہ کہنے میں کسی قسم کا عذر نہیں ہو سکتا کہ اب ایسی موسیقی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بلکہ کسی کے اس مزاحیہ مقولے کو صحیح ماننا پڑتا ہے کہ چینی موسیقی وحشتناک حد تک دلکش ہوتی ہے۔ جیسے بیٹھے ہوئے گلے سے بلیاں کھرج بھر رہی ہوں چند ناقابلِ فہم نظریئے تو باقی ہیں لیکن اس سے زیادہ موسیقی قدیم کا کوئی وجود یا ثبوت نہیں پایا جاتا۔

کہتے ہیں کہ جب تباہی عظیم ہوئی تو موسیقی کی کتابیں اور آلاتِ موسیقی بھی اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس لئے ماضی کی نشان دہی کے لئے اب ہمارے پاس کچھ بھی باقی نہیں ہے۔

اس گمشدہ فن کا کھوج لگانے اور اسے دوبارہ رائج کرنے کی بڑی بڑی کوششیں کی گئیں۔ بعض کتابیں اور آلاتِ موسیقی پوشیدہ مقامات سے برآمد کئے گئے۔ مگر زمانہ کی ناسازگاری نے فنون لطیفہ کو پنپنے نہیں دیا۔ ابتلائے عظیم نے اتنا بڑا فصل ڈال دیا تھا کہ موسیقار اعظم جس کی پشتہا پشت سے موسیقی کی اجارہ داری بطور وراثت چلی آتی تھی، وہ بھی اپنی یادداشت سے اس فصل کو نہیں پاٹ سکا۔ نغمہ طرازوں نے اپنے اپنے نظریئے گھڑ لئے۔ ایک کی بات دوسرے نے نہیں مانی۔ نتیجہ یہ کہ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔ ایک شور بے ہنگام اور عجیب افراتفری مچ گئی۔ چنگ خاندان کے دو شہنشاہوں نے جنکے نام اینگ ہسی اور چین لونگ تھے، انتہائی کوششیں کیں کہ موسیقی اپنی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کرے لیکن کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔

چینی موسیقی کی ابتدائی تاریخ ہمیں فرانسیسی مشنری امیتو کی تحریر سے ملتی ہے۔ اس پادری نے اس موضوع پر معلومات حاصل کرنے کو اپنے فرائض میں داخل کر لیا تھا اور جبتک وہ پیکنگ میں رہا جتنی بھی کتابیں چینی موسیقی پر اسے مل سکیں اس نے ان سب کا مطالعہ کیا۔ ان سب کتابوں کی فہرست اس نے اپنے تذکرہ میں درج کر دی ہے۔ ان کتابوں سے معلوم ہوا ہے کہ قدیم چینیوں نے ایک سپتک کو برابر کے بارہ حصوں میں اسی طرح تقسیم کیا تھا جس طرح یورپ کی موسیقی میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ان میں سُر اور آدھے سُر دونوں شریک ہیں اور ان کا نام انہوں نے "[illegible]" رکھا۔ فرق صرف اس تقسیم میں یہ ہے کہ یورپی موسیقی میں ہوتے تو بارہ ہی سُر ہیں مگر ان کے درمیانی وقفوں میں چھوٹے بڑے کا فرق ہوتا ہے لیکن چینی موسیقی کے بارہ سُروں کے درمیانی وقفے سب برابر کے ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ انکے برتاوے میں صرف پانچ سُر ہوتے ہیں جنکے نام یہ ہیں۔

(۱) کونگ۔ (۲) چانگ۔ (۳) کیو۔ (۴) چے اور (۵) یو۔

ان کے ہم آہنگ یورپی موسیقی کے سُر یہ ہیں۔

(۱) الیف (۲) جی (۳) اے۔ (۴) سی اور (۵) ڈی۔

اور ہندوستانی سُر یہ ہونگے:۔

(۱) شدھ مدھم (۲) پنچم (۳) شدھ دھیوت (۴) کھرج اور (۵) شدھ رکھب۔

کونگ یا الیف یا شدھ مدھم کو چینیوں نے پہلا سُر مانا ہے جیسے ہندوستانی موسیقی میں کھرج کو پہلا سُر مانتے ہیں۔ مذکورہ بالا پانچ سُروں

کے علاوہ جو تیرہ سُر اور باقی رہ جاتے ہیں انکے وقفوں کے نام "پی این کوانگ" اور "پی این چی" ہیں۔ ان کے ہم آہنگ سُر ہماری موسیقی میں شدھ گندھار اور شدھ نکھاد ہیں۔ لیکن یہ دونوں چینی موسیقی میں شاذ و نادر ہی برتے جاتے ہیں۔

چین کے قدیم آلاتِ موسیقی میں بھی پانچ سُر ہوتے تھے۔ ہیتو بن ایک بیضوی شکل کا پھونک سے بجنے والا ساز ہے جس میں پانچ سوراخ ہوتے ہیں اور انہیں باری باری سے کھولنے سے ہی پانچ سُر پیدا ہوتے ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی شکل کا ایک ساز آجکل بھی بجایا جاتا ہے۔ ایک اور ساز کن ہے جس کا بہت احترام کیا جاتا ہے کیونکہ یہ کنفوشس کا محبوب ساز سمجھا جاتا ہے۔ اس میں سے بھی یہی پانچ سُر ادا ہوتے ہیں۔ ایک اور بہت پرانا ساز اُو ہے جس کی شکل دبکے ہوئے شیر کی سی ہوتی ہے۔ اس میں چھ سُر ہوتے ہیں۔ پانچ تو یہی سُر اور چھٹا سُر پہلے سُر کی ٹیپ ہوتا ہے۔

پرانے سازوں میں سے کئی ایسے ہیں جو آجکل کی موسیقی میں برتے نہیں جاتے یا اگر برتے بھی جاتے ہیں تو ان کی شکلیں بہت کچھ بدل چکی ہیں۔ اس زمانے میں بھی جو ساز چین میں بنائے جاتے ہیں ان میں یہی پانچ سُر رکھے جاتے ہیں۔ لندن کی ایک نمائش گاہ میں جو ساز رکھا گیا تھا وہ بھی پانچ سُروں ہی کا تھا۔ ڈاکٹر برنے نے پیرس کی اکادمی میں جو چینی ہارمونیکان دیکھا تھا وہ بھی اسی اصول پر بنایا گیا تھا۔

جدید موسیقی کا آغاز تانگ خاندان سے ہوا ہے ([illegible]) فان آست نے چینی موسیقی کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ پوجا پاٹ کی موسیقی یا مقدس موسیقی اور تفریح کی موسیقی یا عام موسیقی۔ جدید چینی اصولاً سات سُروں کو مانتے ہیں لیکن ان کے برتاوے میں صرف پانچ ہی سُر آتے ہیں۔ مقدس اور عام دونوں قسم کی موسیقی میں پانچ ہی سُر برتے جاتے ہیں۔ چینی موسیقی یورپی یا ہندوستانی سازوں پر مکمل صحت کے ساتھ پیش نہیں کی جا سکتی کیونکہ ان کے سُروں اور ہمارے سُروں کے درمیانی وقفوں میں فرق ہے۔

مقدس موسیقی عبادت کے وقت سننے میں آتی ہے۔ پوجا میں یا تو شہنشاہ خود شریک ہوتا تھا یا اس کا کوئی نائب۔ مثلاً آسمان، زمین، آباؤ اجداد، سورج، چاند اور کنفیوشس کی پوجا میں مقدس موسیقی پیش ہوتی تھی۔ باقی ساری موسیقی عام موسیقی میں شامل ہے۔ اور اس کے مواقع بے شمار ہیں۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا جلوس ایسا نہیں ہوتا جس کے ساتھ باجے نہ بجتے جاتے ہوں۔ پیچ و خم کھاتے بازاروں میں جہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہو جلوس بل کھاتا اور مڑتا مڑتا چلا جاتا ہے اور اس کے ساتھ باجے بجانے والے ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ ہوں تب تو خیر موسیقی کو خاص دخل ہے لیکن چین میں مُردے اور مُردوں کے ساتھ بھی باجا گاجا ہوتا ہے۔ غریب سے غریب میت کے ساتھ بھی ایک سازندہ تو ضرور ہی ہوتا ہے اور جو آسودہ حال ہوتے ہیں انکے ساتھ کئی کئی شہنائی نواز اور طبال ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ طرح طرح کے ساز بجانے والوں کی ٹولیاں بھی ہوتی ہیں۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں جمہوریت قائم ہونے سے پہلے دستور تھا کہ جب کوئی ذی مرتبت حاکم کہیں جاتا تھا تو ایک بہت بڑا گھنٹا بجایا جاتا تھا جس کی ضربوں کی تعداد سے اس حاکم کے مرتبے کا اعلان کیا جاتا تھا۔ اس مرتبے کے گھنٹے کے بجائے جانے کے اور بھی کئی مواقع ہیں۔ شام کی پوجا میں تنہا زمین کے ساتھ یہ گھنٹہ بجایا جاتا ہے۔

تھیٹر میں عوام کی بیشتر دلچسپی گانے بجانے کی وجہ سے ہے چینیوں کو اس میں بہت لطف آتا ہے لیکن غیر ملکیوں کے لئے یہ موسیقی سمع خراش اور دردِ سر کا باعث ہوتی ہے۔ اسٹیج پر جو گانا ہوتا ہے بالعموم نظم خوانی کے طریقے پر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساز اس طرح بجائے جاتے ہیں کہ کبھی تو لمبے لمبے سُر کھینچے جاتے ہیں اور کبھی ساز رک رک کر بجائے جاتے ہیں۔ اس میں بہت کچھ یورپی طریقۂ نظم خوانی کی جھلک پائی جاتی ہے

## غزل — کرشن دیال ستم

مری بربادیوں سے خانۂ الفت ہی ویراں ہے
نہ اب وہ دستِ وحشت ہے نہ وہ چاکِ گریباں ہے
نہ پوچھو حال میری تیرگیٔ بختِ خفتہ کا
مجھے صبحِ وطن بھی بدتر از شامِ غریباں ہے
قناعت پر ہوں قائل۔ شکر کرتا ہوں مصیبت پر
مجھے وجہِ سکونِ دل مرا حالِ پریشاں ہے
زباں رکھتی ہے سوسن۔ منہ سے لیکن کچھ نہیں کہتی
خموشیٔ معنیٔ دار دکا اس میں رازِ پنہاں ہے
تعلق ہے ازل کے دن سے پیدا حسن و الفت میں
اُدھر دستِ زلیخا ہے ادھر یوسف کا داماں ہے
کہیں لالے کی رنگینی کہیں سبزے کی شادابی
زہے جوشِ نمو۔ نکھرا ہوا رنگِ گلستاں ہے
ستم ان کا کرم ہے یا ستم۔ کچھ کہہ نہیں سکتا
مگر حال اپنا پہلے سے زیادہ ہی پریشاں ہے

پرانی منظوم کہانیاں اور روایتی گیت زیادہ گائے جاتے ہیں۔ اندھے ایک قسم کے کاستار بجاتے ہیں اور اندھی عورتیں انکے ساتھ ایک اور قسم کا ستار بجاتی ہیں۔ طوائفوں کو چینیوں کے نظریوں کے مطابق مخصوص موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ غریب سے غریب چینی خواہ وہ کسی عمر کا ہوگا تو کی کتابوں میں سے گیت پسند کرکے گاتا ہے اور خوب ہی بھرکے گاتا ہے۔ گھسیارے اور کھیتوں میں کام کرنے والے سوال جواب کے گانے گاکر وقت کاٹتے ہیں، وہ اس طرح کہ لڑکے اور مرد ایک گیت گاتے ہیں تو لڑکیاں اور عورتیں اس کا جواب گاتی ہیں۔ بدھی پجاری گا کر دعا خوانی کرتے ہیں اور تاؤ مت پجاری بھی اپنے ساز بجا کر اپنے مذہبی گیت گاتے ہیں۔

چین کے متعدد آلات موسیقی ہیں۔ ان میں سے بعض مقدس موسیقی کے لئے مخصوص ہیں اور بعض عوامی موسیقی کے لئے۔ ان میں سے ایک بہت قدیم ساز سنگ ہے۔ اس میں ایک سلسلہ پتھر کے ٹکڑوں کا ایک چوکھٹے میں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ جب ان پتھروں پر ضرب لگائی جاتی ہے تو بڑی سریلی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک ساز ایسا بھی ہوتا ہے جس میں صرف ایک پتھر ہوتا ہے اور بانسری کے ساتھ اسے بھی اسی طرح بجایا جاتا ہے جس طرح پجاری گھنٹے کو بجاتے ہیں۔ آلات موسیقی میں پتھروں کا استعمال چینیوں کے لئے مخصوص ہے۔ سنکھ بجانے کا رواج تو بدھیوں، چوکیداروں اور پانی فروشوں میں ہے۔ گھنٹیاں بڑی چھوٹی، گول، چوکور، ہر شکل اور ہر وزن کی بجائی جاتی ہیں۔ پچاس پچاس ٹن تک کی گھنٹیاں ہوتی ہیں۔ ہر مندر میں ایک بڑی گھنٹی اور ایک بڑا ڈھول ہوتا ہے۔ چین کے قدیم آلات موسیقی میں سے ایک ساز گھنٹی "ترنگ" ہے جسے ایک چوکھٹے میں ننھی ننھی گھنٹیاں لگاکر بنایا گیا ہے۔ اس کی ایک اور شکل اس طرح بنائی گئی ہے کہ دس بڑی گھنٹیاں ایک سلسلہ میں لگائی گئی ہیں اور بڑی سریلی آوازیں دیتی ہیں۔ اسی طرح "لکڑ ترنگ" بھی ہوتا ہے جو لکڑی کے ٹکڑوں سے بنایا جاتا ہے اور لکڑی کی موگریوں ہی سے بجایا جاتا ہے۔ ڈھول، نقارے اور دھونسے وغیرہ کہا جاتا ہے کہ ابتدا چین میں ہندوستان سے آئے۔

بعض تار کے ساز بھی قدامت سے چلے آتے ہیں۔ ان میں قانون اور ستار اور وائلن کی شکل کے ساز شامل ہیں۔ ان میں سے بعض مضراب سے اور بعض گز سے بجائے جاتے ہیں۔

پھونک سے بجنے والے سازوں میں بانسریاں، الغوزے اور شہنائیاں ہیں، چھوٹی بڑی سب قسم کی لکڑی کے کئی ساز ہیں جن میں "چوب ماہی" بہت عام ہے۔ اس کی شکل کھوپڑی کی سی ہوتی ہے۔ اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے اور اسے چوب سے بجایا جاتا ہے۔ پجاریوں کا یہ عام ساز ہے۔

تال کے ساز بے شمار اقسام کے ہیں۔ چند سازوں کا ذکر اس مضمون کے آخر میں کیا جائے گا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ چینیوں نے صدیوں پہلے سُروں کے تمام درجے نہایت مکمل طور پر دریافت کرلئے تھے۔ یورپ نے اس وقت ان باریکیوں کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ چینی موسیقی کا پہلا سُر پہلی سرتی کی بجائے چوتھی سرتی پر قائم کیا گیا ہے۔ اسلئے ان کی موسیقی کی سپتک دنیا بھر کی موسیقی سے علیحدہ ہوتی ہے۔ اس میں اگر کچھ مماثلت ہے تو ہندوستانی موسیقی سے۔ چونکہ یورپی موسیقی کے سُروں کے درمیانی فاصلے ساخت میں اور چینی سُروں کے مقررہ اس لئے ان میں بین فرق پڑ جاتا ہے اور جو کان جس موسیقی کے عادی ہو جاتے انہیں صرف وہی موسیقی سریلی معلوم ہے اور باقی سب بے سری۔ چینی موسیقی کو سننے میں اسکے بے سرے پن کا احساس ہوتا ہے لیکن نظریاتی طور پر چینیوں کے وضع کردہ سُر بالکل صحیح ہیں۔ البتہ تال کی الہ کی موسیقی میں بہت کمی ہے۔

جس طرح ہم چینی موسیقی سے لطف اندوز نہیں ہوتے اسی طرح چینی بھی کسی اور ملک کی موسیقی سے لطف نہیں اٹھا سکتے۔ ہانگ کانگ میں ایک انگریزی بینڈ بج رہا تھا۔ ایک چینی سے اسکے متعلق دریافت کیا گیا تو اس نے کہا "بے سرا ہے"۔ لیکن چینی اپنے ملک کی موسیقی کو خوب سمجھتے ہیں اور اسکی بڑی قدر کرتے ہیں۔ اگر کوئی چینی بینڈ بج رہا ہو تو ان کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں۔ ان کے ادب سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی موسیقی کو بہت وسیع سمجھتے ہیں۔ "چینی ادب کے جواہر" میں سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"ملائم، جیسے کوئی سرگوشی کر رہا ہو۔ اب اونچی اور ملائم، جیسے کسی مرمریں تھالی میں موتی برس رہے ہوں۔ بالکل یوں جیسے جھاڑی میں ایک خوش گلو پرندہ گا رہا ہو۔ اس طرح پھسل رہی ہے جیسے نشیب کی طرف چشمہ گنگناتا چلا جا رہا ہو۔ اور پھر جیسے پانی سے بہا جاتا ہوا چشمہ یک بیک جم کر رہ گیا ہو موسیقی ایک لمحہ کے لئے سو گئی، کچھ ایسے جذبے کے ساتھ جسے الفاظ میں ادا کرنا ممکن نہیں۔"

چینی موسیقی کے چند ساز یہ ہیں۔

**(۱) شنگ** چین کے آلات موسیقی میں سب سے زیادہ نمایاں اور مکمل ساز ہے۔ یہیں پر دوسرے ساز اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اسکی ساخت نازک اور آواز بڑی میٹھی ہوتی ہے۔ اصول اسکے تقریباً سب وہی ہیں جو یورپ کے ارغنوں کے۔ اکثر محققین کے قول کے مطابق شنگ کو دیکھنے ہی کے بعد اکارڈین اور ہارمونیم یورپ میں بنایا گیا ہے۔

**(۲) کوتو** اس کا دوسرا نام یاماٹو گوتو ہے۔ تیرہ تاروں کا ایک لمبا ساز ہوتا ہے جو مضراب سے بجایا جاتا ہے۔ یہ ساز ایک اندھے استاد کی ایجاد ہے اس لئے عرصہ دراز تک صرف اندھوں ہی کے بجانے کے لئے مخصوص رہا۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا کہ عورتوں کو

یہ ساز بجانا سکھایا گیا اور ان کی تعلیم کا ایک جزو بن گیا اور لڑکیوں کے جہیز میں اگر یہ ساز شامل نہ ہو تو جہیز نامکمل سمجھا جاتا تھا۔ اب مرد بھی بجاتے ہیں۔

**(۳) کاگوراہیو** — ایک قسم کی نے جس میں سُروں کے لئے چھ سوراخ ہوتے ہیں۔ قدیم مقدس موسیقی اور ناچ کے ساتھ بجایا جاتا ہے۔

**(۴) شو** — پھونک سے بجتا ہے۔ اس میں کئی نلکیاں لگی ہوتی ہیں۔

**(۵) پیپا** — چار تار کا ساز ہے۔ ناخن سے چھیڑ کر بجایا جاتا ہے۔

**(۶) سونوکوٹو** — پہلے چھوٹا اور چھ تار کا ساز تھا۔ لیکن اب اس کی لمبائی ساڑھے چھ فٹ ہوتی ہے اور اس پر تیرہ تار چڑھے ہوتے ہیں۔ مضراب سے بجایا جاتا ہے۔

**(۷) اوتیکی** — سات سوراخ کی بانسری۔

**(۸) تائیکو** — چوکھٹے میں آویزاں ایک قسم کی ڈفلی جسے دو چھوٹی چھوٹی موگریوں سے بجایا جاتا ہے۔

**(۹) شوکو** — دھات کا بنا ہوا ایک قسم کا گھنٹا۔

**(۱۰) گکو** — ڈبرو کی شکل کا ساز۔ اس کی ڈوریاں دبانے سے اس کی آواز بدلتی ہے۔

**(۱۱) شاکوہاچی** — تقریباً پونے دو فٹ لمبی بانسری جس میں صرف چار سوراخ ہوتے تھے۔ اب اس کی ترقی یافتہ کئی شکلیں بن گئی ہیں۔

**(۱۲) سامی سن** — تیرھویں صدی سے جین میں اس ساز کا رواج ہے۔ سب سے زیادہ مقبولِ عام ساز ہے۔ اس میں نیچے ایک طبلی ہوتی ہے جیسے ہمارے سازوں میں تو نبا ہوتا ہے۔ اس پر سانپ کی کھال منڈھ دی جاتی ہے۔ اب کتے بلی وغیرہ کی کھال چڑھائی جاتی ہے۔ اس کی طبلی میں ایک لمبی ڈانڈ لگی ہوتی ہے جس پر تین تار چڑھے ہوتے ہیں۔ ان تاروں کو انگلی کے بڑھے ہوئے ناخن یا مضراب سے اس طرح چھیڑا جاتا ہے کہ تار کھال سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتا ہے۔ اس آواز کو تاروں ہی کے ذریعہ سُروں میں ڈھالنا اس کے بجانے والے کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس ساز کی عجیب آواز نے چین کے علاوہ جاپان کی موسیقی میں بھی کافی انقلاب کیا ہے۔

چینی بالطبع نہایت قدامت پرست ہوتے ہیں لیکن کچھ عرصہ سے انہیں اپنی پستی کا احساس ہو گیا ہے۔ یورپ، امریکہ اور روس کی ترقی یافتہ قوموں سے جدید چین بہت متاثر ہوا ہے، چنانچہ ان قوموں کا کلچر تیزی سے چین میں رائج ہو رہا ہے اور یہاں کی موسیقی میں نت نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں بالخصوص سازوں میں۔ کئی یورپی ساز چین کی موسیقی میں شامل ہو چکے ہیں۔

# چاند گرہن

آغا صادق

میرے دوست سید آغا صادق صاحب ایم۔ اے کبھی کبھی اپنی تازہ نظمیں مجھے تحفتاً بھیجتے ہیں اور انہوں نے مجھے اجازت دے رکھی ہے کہ ان میں سے کوئی بعض رسائل میں بغرضِ اشاعت بھیج دوں۔ مجھے یہ نظم جو ذیل میں درج ہے بہت پسند آئی۔ امید ہے "آجکل" کے ناظرین بھی اسے پڑھ کر پسند کریں گے۔ (عبد القادر)

گہنا گیا ہے چاند ستارے اداس ہیں
سہمی ہوئی فضا کے نظارے اداس ہیں!
فطرت کے لب پہ موجِ ہوا آہِ سرد ہے
سینے میں کائنات کے ٹھنڈا سا درد ہے!
چہرے پہ ذرے ذرے کے غم کا غبار ہے
ماتم نشیں فلک ہے فضا سوگوار ہے!
کس کی نظر لگی ہے کہ سنولا گیا ہے یہ
اب چاند چاند ہی نہیں اک ٹھیکرا ہے یہ!
وہ حسن وہ ادا وہ فروغِ نظر نہیں
وہ آب و تاب و جلوۂ الفت اثر نہیں!
ہر لمحہ روزگار کا ظلمت بدوش ہے
پہنائے شش جہات میں ظلمت کا جوش ہے

منظر دکھا کے دل میں مرے درد بھر دیا
فطرت نے آج راز مرا فاش کر دیا!

خورشید کی طرح یہ حقیقت ہے بے نقاب
ہے ماہتاب روشنئ خور سے فیضیاب
خورشید کی نگاہ سے ماہِ تمام ہے
خم کی نوازشوں ہی سے یہ جام جام ہے!
گر چشمِ التفات نہ ہو آفتاب کی
ممکن نہیں کہ شمع جلے ماہتاب کی
ہوتی ہے مہر و ماہ میں حائل کبھی زمیں
بجھتی ہے کانپ کانپ کے یہ شمعِ عنبریں
میرے بھی دل کا حال یہی ہے ترے بغیر
سینہ تجلیوں سے تہی ہے ترے بغیر
آنکھیں چرا گیا ہے تو وقفِ ملال ہوں میں
چہرہ چھپا لیا ہے تو گہنا گیا ہوں میں
آنکھوں پہ ہیں فراق کے پردے پڑے ہوئے
تاریکیوں کے تیر ہیں دل میں گڑے ہوئے
ظلمت سرائے دہر میں گرمِ سفر ہوں میں
اے آفتابِ حسن گدائے نظر ہوں میں!

یہ زندگی بغیر ترے زندگی نہیں!
جب تو نہیں تو مجھ میں کوئی روشنی نہیں!

# حقائق و معارف

جانِ حزیں بدن میں رہے یا کہیں رہے
اس سنگِ آستاں پہ مگر یہ جبیں رہے
دنیائے حسن رنگ بدلتی رہی مدام
اپنے خیال پر مگر اہلِ یقیں رہے
توہین ہے کلیم یہ ذوقِ نگاہ کی
خود جلوہ گر کہیں رہے جلوہ کہیں رہے
تیرا خیال تیری تمنا ترا ملال
یہ ساتھ عمر بھر رہے گو ہم کہیں رہے
اب کامیابِ دید ہے اپنی نگاہِ شوق
بے پردہ کوئی آئے کہ پردہ نشیں رہے
کعبہ ہو بتکدہ ہو کلیسا ہو یا حرم
مطلب تو دیکھنے سے ہے کوئی کہیں رہے
اے ناشناسِ جنسِ وفا ہم خدا گواہ
تیرے نہیں رہے تو کہیں کے نہیں رہے
ذوقِ سجود کی مرے اللہ ری کاوشیں
اب آستانِ یار رہے یا جبیں رہے
زاہد بتائیں ہم تجھے آدابِ معرفت
کعبہ میں بھی خیالِ بتِ نازنیں رہے
افقر یہی ہے حاصلِ سرمایۂ حیات
آنکھوں میں جلوہ ان کا دمِ واپسیں رہے

افقر موہانی

# غزل

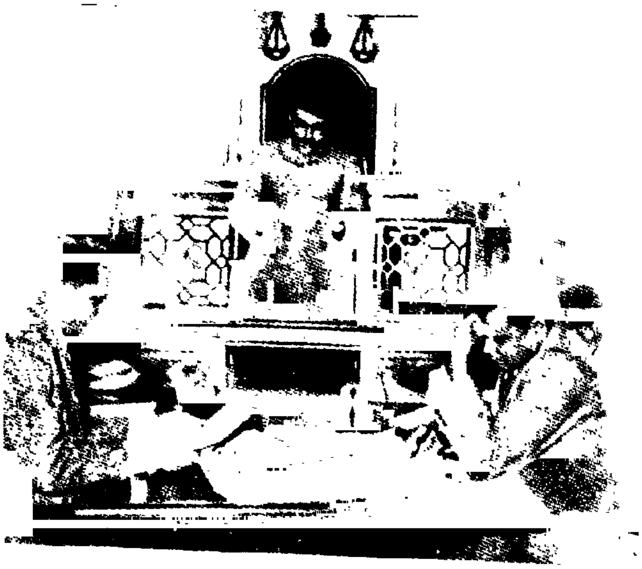
آصف بنارسی

چمن والوں پہ ہے فرض اعتبارِ باغباں کرنا
قفس میں نامناسب ہے خیالِ آشیاں کرنا
بنا لوں میں حریمِ ناز کو مرکز تصور کا
جبینِ شوق کو ہے بے نیازِ آستاں کرنا
سلوک اس کی نگاہوں کا ہے یکساں سارے عالم سے
لحاظِ دوستاں کرنا نہ پاسِ دشمناں کرنا
تلون نازکی ہے شان اثر کیوں لے نیاز اس کا
جبیں پیوست کر دینا ہمیں سجدہ جہاں کرنا
توجہ چاہیے تیری نگاہِ شوق پرور کی
ہمیں یک لمحہ عشرت کو ہے عیشِ جاوداں کرنا
ترے کہنے سے اے شیخِ حرم توبہ تو کرتا ہوں
نہ چھوٹے گا طوافِ کعبۂ پیرِ مغاں کرنا
نمایاں ہے مری تعمیر میں تخریب کا پہلو
مجھے قدرت کو تھا منظور شاید رائیگاں کرنا
ہوائے عافیت سرمایہ سوزِ عافیت نکلی
ہمیں محنت کے تنکوں سے تھا تعمیرِ آشیاں کرنا
پھنسایا ہے فریبِ جستجو میں ساری دنیا کو
نشاں اپنا بنا دینا ہے خود کو بے نشاں کرنا
کسی کا پوچھنا مقصد مرا مجھ سے سرِ محفل
خموشی کا مرتب درد آگیں داستاں کرنا
مصر میری اسیری پر ہوا کیوں باغباں آصف
چمن میں بھی مجھے آتا تھا نغمہ آشیاں کرنا!

# سفارتی نمائندون کے ساتھ



یکم فروری ۱۹۴۷ء کی شام کو عارضی حکومت کے نائ
صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے غیر ملکوں کے سفار
نمائندوں کو چائے کی دعوت دی. اس موقع کی اس تصو
میں مسز وجے لکشمی پنڈت اور سر ٹیرنس شون -
ہندوستان میں برطانیہ کے ھائی کمشنر ھیں' دعو
میں شریک نظر آرہے ھیں۔



# مجلس محکمہ فضائی

یکم فروری ۱۹۴۷ء کو نئی دھلی میں فضائی محکمے کی کانفرنس ھوئی جسکے صدر آنریبل سردار عبدالرب نشتر تھے. انھوں نے حاضرین جلسہ کو مخاطب کرتے ھوئے فرمایا کہ مشرق و مغرب کے مابین جب بھی کوئی فضائی سفر کیا جائے ھر جہاز کو ھندوستان سے ھوکر گذرنا پڑیگا۔ اس خاص سبب سے ھمارے ملک کو آئندہ بڑی اھمیت حاصل ھو جائیگی۔

۳ جنوری کو پریس کانفرس میں حکومت ھند کے وزیر تعلیم و فنون آ
مولانا ابوالکلام آزاد نے ان ھندوستانی طلبا کے انتخاب وغیرہ کے -
میں جو سرکاری وظیفے پر غیر ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے
آئندہ کے لائحۂ عمل کا انکشاف فرمایا۔

# وزیر تعلیم پریس کانفرنس میں



# برش کی تیاری

برش بنانے کے سلسلے میں ہر قسم کا کچاسامان ہندوستان میں بڑی افراط سے پایا جاتا ہے۔ اس صنعت کے لئے ایلوے، کھجور اور ناریل کے ریشوں نیز گلہری بھیو، بکری اور سور کے بالوں کی ضرورت پڑتی ہے ان میں سے سور کے بال سب سے زیادہ مناسب و موزوں ثابت ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے بالوں کو خوب اچھی طرح دھویا جاتا ہے تاکہ اندرونی میل وغیرہ دور ہوجائے پھر انہیں دھوپ میں سکھا لیا جاتا ہے۔ اسکے بعد لمبائی اور موٹائی کے لحاظ سے ان کی چھنٹائی ہوتی ہے۔ ایک قسم کے بال الگ الگ باندھ کر اس طرح کاٹ لئے جاتے ہیں کہ وہ ایک برش کیلئے کافی ہو سکیں۔ انکی کٹائی میں بڑی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔

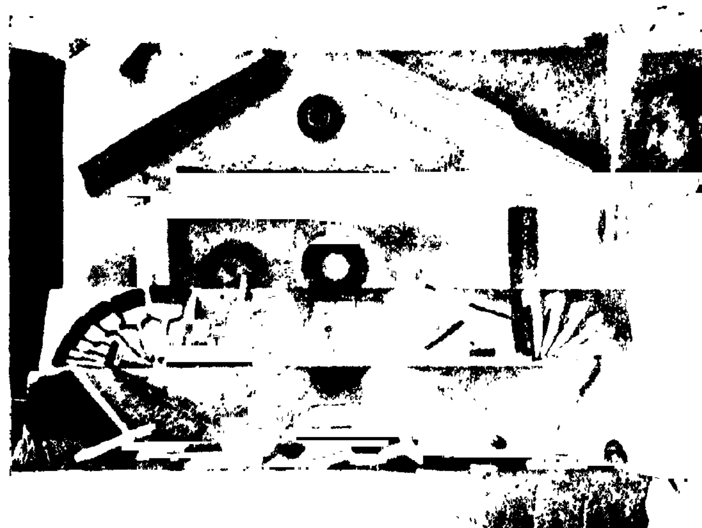
نئے طریقے کے مطابق برش بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ریشوں یا بالوں کو لکڑی کے تختے میں بنے ہوئے سوراخوں کے اندر ٹھونس کر گراہیں لگا دی جاتی ہیں۔ انہیں جمانے کیلئے سریش استعمال کیا جاتا ہے بالوں کو گرم کرکے سوراخوں میں ٹھونسا جاتا ہے تاکہ وہ ٹھنڈے ہوکر ان میں اچھی طرح پھنس جائیں۔ دوسری صورت میں سریش لگانے کی بجائے مہین تار استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ زیادہ جدید اور عام ہے۔ اس منزل سے گذرنے کے بعد لکڑی پر رنگ و روغن اور پالش کر باقی رہ جاتا ہے۔

برش کی تیاری میں یہ کچا سامان استعمال کیا جاتا ہے۔ اسمیں ایلوے، کھجور اور ناریل کے ریشے، گلہری، بھیو، بکری اور سور کے بال اور امریکہ کا کچا سن شامل ہے۔





مشین کے ذریعے بالوں یا ریشوں کے گچھے لکڑی کے پتروں میں ٹھونس دئے جاتے ہیں۔ اسے بھرائی کی مشین کہا جاتا ہے۔



رنگ ساز کی دوکان سے لیکر سنگھار میز تک ہر قسم کے بڑے چھوٹے برش تیار ہوتے ہیں۔ تقریباً سبھی وضع کے نمونے اوپر موجود ہیں۔

# ھاتھیوں کا دریائی بیڑا



سدھائے ہوئے ھاتھی برما کے
جنگلوں میں بڑے مفید کام
انجام دیتے ہیں۔ وہ شیشم کے
بڑے بڑے گدے اپنی پیٹھ پر
لاد کر لاتے اور آراکشی کے
کارخانوں میں ہر قسم کی
مشینوں کو چلاتے ہیں۔ لیکن
حال ہی میں کشتیاں پہنچنے



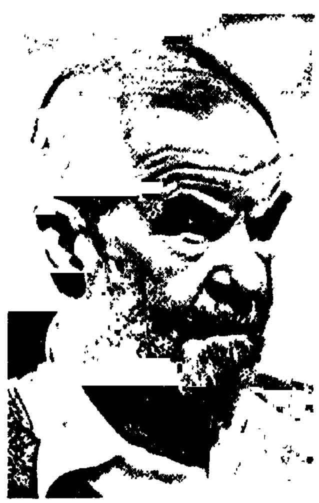
کے سلسلے میں ان سے ا[illegible]
کام لینا شروع کیا گیا ہے۔
کے تند دریا ایراودی کو
کرنے کیلئے یہ ھاتھی ز[illegible]
کے ذریعہ کشتیوں سے
دئے جاتے ہیں تاکہ ملاح
محنت و مشقت سے بچ [illegible]



اس صفحے کی تصاویر میں اس
نئی خدمت کے مختلف پہلو
دکھائے گئے ہیں۔ سب سے
پہلے ھاتھیوں کو دریا کے
کنارے لاکر جمع کیا جاتا ہے
پھر زنجیروں کے ذریعے انہیں
کشتیوں میں جوتا جاتا ہے
اور پھر اس کام سے فارغ ہوکر
دوسرے ساحل پر واپسی تک
[illegible] کیا جاتا ہے۔



مکہ معظمہ سے نو میل کے فاصلے پر کوہ عرفات اور اس کے دامن کا ایک منظر۔ یہاں حج کے دن حاجی دعائیں ما
اور ظہر و عصر کی نمازیں پڑھتے ہیں۔



مسٹر جان فلبی سی۔ائی۔ای۔ایف۔
آر۔جی۔ایس۔آئی۔سی۔ایس۔

اس مقدس رسم کی یادگار جسکی بنیاد حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے رکھی تھی صدیاں گذر جانے کے بعد آج بھی پورے ذوق و شوق کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک کے مسلمان سفر کی تمام سختیاں جھیلتے سرزمین عرب پر قدم رکھتے اور مکہ و مدینہ کی زیارت سے شرفیاب ہوتے ہیں۔ ظہور اسلام سے قبل بھی کفار مکہ ہرسال اس جگہ جمع ہوتے اور اپنے تین سو بینسٹھ دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ اسلام نے سنت ابراہیمی کا احترام کرتے ہوئے رسم حج کو برقرار رکھا اور اسطرح مکہ کو جملہ مسلمانان عالم کا ایک ایسا مقدس مرکز بنا دیا کہ آج بھی دنیا کے تقریباً تیس کروڑ مسلمانوں میں سے دو لاکھ سے زیادہ حاجی صرف سمندر پار کے ملکوں سے وہاں پہنچتے اور فریضۂ اسلام ادا کرتے ہیں۔ دوران جنگ میں سفر کی سہولتیں مسدود ہونے کے باعث اس تعداد میں کمی پیدا ہوگئی

مکہ شریف کے قریب جبل نور جہاں حضرت رسول مقبول صلعم پر سب سے پہلی بار وحی نازل ہوئی۔



تھی لیکن پچھلے سال جب حالات بہتر
کا مظاہرہ ہونے لگا۔ پانی کے جہازوں
اور بسوں کے ذریعہ حتی کہ پیدل بھی اسج
جہازوں کی افراط کے باعث بہت سے
مذہبی حیثیت کے علاوہ حج کا موقع سیا
حیثیت سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ
عقیدے کے لوگ وہاں جمع ہوتے آپس
اخوت اسلامی کی بنیادوں کو مضبو

# حج بیت اللہ



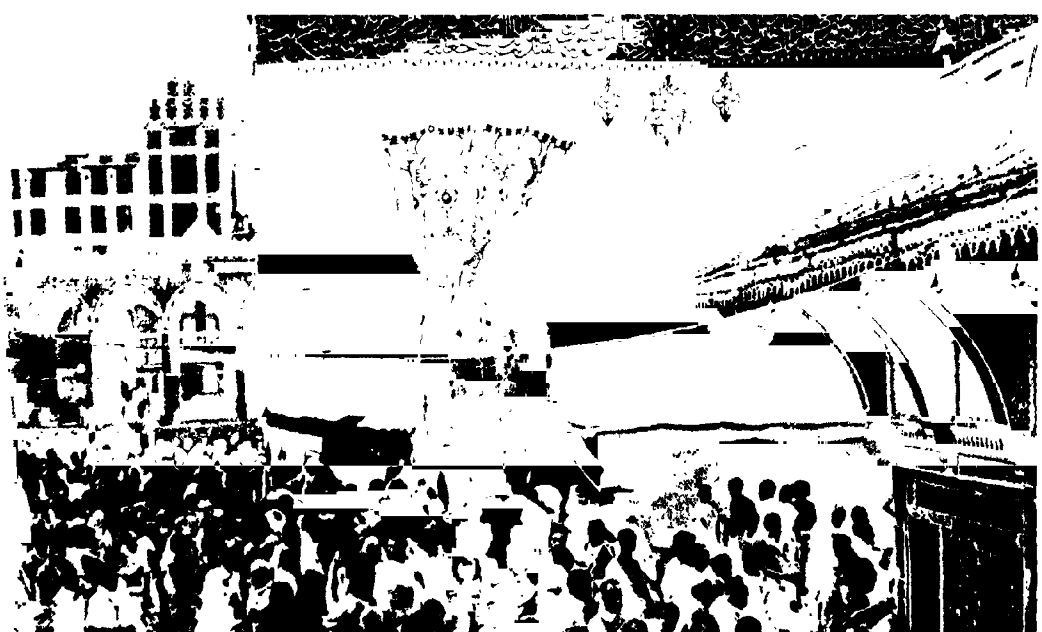
اس مقام مقدس کی یادگار جہاں حضرت ابراہیم اپنے لخت جگر حضرت اسمٰعیل کو خدا کی راہ میں قربان کردینے کیلئے لائے تھے۔

تصویریں «لندن نیوز» میں مسٹر جان فلبی کے ایک مبسوط مقالے کے ساتھ شائع ہوئی تھیں اور وہیں سے «آجکل» نے لی ہیں۔ مسٹر فلبی ہندوستان کی سول سروس میں آٹھ سال رہنے کے بعد ۱۹۱۵ء میں عراق گئے اور ستائیس سال تک عربستان اور اہل عرب کا عمیق مطالعہ کرتے رہے۔ وہ سلطان ابن سعود کے خاص دوستوں میں ہیں انہوں نے موضوعات عرب پر کئی کتابیں بھی لکھی ہیں وہ مذہب اسلام کا بڑا احترام کرتے اور ہر مسلمان سے پورے خلوص کے ساتھ ملتے ہیں۔



مدینہ منورہ کی مسجد نبوی میں مقبرۂ رسول مقبول صلعم کا مقدس گنبد خضرا۔ پانچ میں سے صرف دو مینار نظر آرہے ہیں۔

صحن کعبہ جسے رسم حج شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے بادشاہ، شاہی خاندان کے افراد اور وزرائے سلطنت بڑے احترام کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہی



پھر اسی ذوق و شوق
لوگ موٹروں لاریوں
ہیں۔ اس سال ہوائی
فضائی سفر بھی کیا۔
ی، تجارتی اور ثقافتی
ملک ہر قوم اور ہر
دلہ خیال کرتے اور
ہیں۔ اس صفحے کی

# شاہ عبداللہ
# ترکی میں



شاہ عبداللہ ترکی کے محکمۂ امور خارجہ کے ایک نمائندے سے مصافحہ کر رہے ہیں

کچھ عرصہ ہوا شرق اردن کے حکمراں ہ عبداللہ ترکی تشریف لے گئے تھے۔ اس شاہی ر کیلئے صدر جمہوریۂ ترکیہ نے اپنا خاص ہاز ''ساوارونہ'' بھیج دیا تھا جہاز کی سب سے ی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے بعض کمروں کا مان آرائش تاریخی اعتبار سے نادر و نایاب ہے۔ لاً ایوان نشست کی بعض و، کرسیاں اور میزیں غیرہ قابل ذکر ہیں جو فرانس کے شاہ لوئی ہاردھم کے دربار میں استعمال ہوتی تھیں۔ یہ ہاز دراصل امریکہ کی ایک کروڑ پتی خاتون یلئے بنایا گیا تھا ایان سو فیصدی محصول سے چنے کیلئے اسے صدر ترکی کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ سکی قیمت سامان آرائش سمیت ساڑھے بارہ لاکھ ونڈ ہے۔ شاہ عبداللہ کے خاص وزیر بھی انکے مراہ گئے تھے۔ یہ سفر محض دوستانہ تعلقات و زیادہ استوار کرنے کیلئے اختیار کیا گیا تھا۔



شاہ عبداللہ ''ساوارونہ'' جہاز سے نیچے اتر رہے ہیں۔



ساوارونہ' جہاز کا ایک دلکش منظر۔

# ایرانی آرٹ کے چند شاہکار

مسٹر آرتھر ہوپ نے جو ۱۹۳۰ء سے امریکن انسٹی ٹیوٹ میں شعبۂ ایرانی فنون و تعمیرات کے ڈائرکٹر ہیں ایک کتاب "ایرانی فنون کے شاہکار" لکھی ہے جس میں مفید اور معلوماتی مضامین کے علاوہ نادر و نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ موصوف کا دعوی ہے کہ سرزمین ایران قدیم تہذیب و تمدن اور فنون لطیفہ کا گہوارہ ہے۔ مختلف ملکوں میں جب بھی فنون لطیفہ کی کوئی نمائش منعقد ہوئی انہوں نے ایرانی شاہکار اپنے خاص اہتمام کے ساتھ پیش کئے اور ناقدین فن کو انکا دعوی تسلیم کرلینا پڑا۔ بعض نوادر ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح کے ہیں لیکن زیادہ حصہ سن عیسوی شروع ہونے کے بعد کا ہے۔ ان میں قالین قدیم نوشتے تصویریں کانسی کے مجسمے رنگین ٹائل اور سکے وغیرہ شامل ہیں۔ انہیں دیکھ کر یقیناً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قدیم ایرانی نجوم و ہندسہ کے علوم اور نقاشی و مصوری کے فنون کے علاوہ زراعت و تعمیرات کے بھی

زبردست ماہر تھے۔ اس صفـ
کی تینوں تصاویر مسٹر آر
کی کتاب سے "ماڈرن نیو
میں نقل کی گئی تھیں
وہیں "آجکل" میں
گئی ہیں۔

دو ہزار سال قبل مسیح کے بنـ
ہوئے کانسی کے جتنے نمونے
آذربائیجان سے دستیاب ہوئے
ہیں یہ ان میں سب سے زیاد
خوبصورت اور نفیس ہے۔ قیا
کہتا ہے کہ یہ کسی وزیر کے
کا نمونہ ہے۔



کانسی کا ڈھلا ہوا یہ بارہ سنگھا آذربائیجان سے دستیاب ہوا ہے اور دو ہزار قبل مسیح کا تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ قوت کا مظہر ہونے کے علاوہ اصلیت کا زبردست حامل ہے۔



نیلگوں فیروزی رنگ کی چمکدار چینی کا بنا ہوا یہ خوبصورت شیر جو دو فٹ نو انچ اونچا ہے' بارہویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا۔ ←



## رنگِ جنوں

لو پھر وہی ٹھنڈی سانسیں ہیں، لو پھر مرا جی گھبراتا ہے
لو پھر مری راتیں پھنکتی ہیں، لو پھر مجھے رونا آتا ہے
کیا جانے تصوّر ہے تیرا، یا تیری نظر یا غم کی خلش
سینے کی دکھن یہ کہتی ہے اک تیر سا پیرا جاتا ہے
خود فطرتِ دل بھی ملزم ہے سب آپ ہی پر الزام نہیں
کچھ آپ اسے تڑپاتے ہیں کچھ آپ یہ تڑپا جاتا ہے
کیوں فطرتِ رنگیں چھیڑ دیا تو نے یہ ترانہ الفت کا
پھر آگ سی بھڑکی سینے میں پھر منہ کو کلیجہ آتا ہے
یہ رنگِ جنوں ہے اے مخفیؔ انداز بُرے ہیں ہوش میں آ
رونے پہ ہنسی آجاتی ہے ہنس دینے پہ رونا آتا ہے

——— ح۔ ب۔ مخفیؔ

## رنگِ شوق

شوق کا رنگ اڑا جاتا ہے
خون آنکھوں سے بہا جاتا ہے
تو تصور میں جو آجاتا ہے
غم کا احساس چلا جاتا ہے
ان کی نظروں کو کوئی کیا جانے
درد بدنام ہوا جاتا ہے
میری مئے خواری کو کیا حاجتِ جام
کوئی آنکھوں سے پلا جاتا ہے
ان کے جلوؤں کا اثر کیا کہیئے
دل کی رگ رگ میں سما جاتا ہے
یہ مرا جوشِ طلب اے بلقیسؔ
ان کو ہر رنگ میں پا جاتا ہے

——— امِّ ناہید بلقیسؔ

## غزل ——— ذابرؔ فتحپوری

اس حسیں منظر کا کوئی نام ہے؟
آپ کے ہاتھوں میں رنگین جام ہے
قطرہ قطرہ ہو رہا ہے بحرِ غم
موت، اس آغاز کا انجام ہے
گردشِ ایّام کہتے ہیں کسے؟
بختِ خفتہ، گردشِ ایام ہے
ہے مزاجِ عشق ویرانی پسند
مفت میں کیوں حسن پھر بدنام ہے!
ہجر کی راتوں میں کیوں گھبرائے دل؟
نور میں ڈوبی ہوئی ہر شام ہے
پوچھتے ہیں نام وہ بیمار کا
اے اجل، کہہ دے کہ ذابرؔ نام ہے

## چاند ——— نیّرؔ ردولوی

چاند تیرے لئے پیغامِ مسرت ہے ندیم! ہاں ترے واسطے سرچشمۂ الفت ہے ندیم!
ہے مرے واسطے یخ بستہ سا اک نور ندیم!
چاندنی رات میں ہوتی ہے تجھے بیتابی ایک ہیجان سا جذبات میں درنجوابی
چاندنی رات میں ملتا ہے سکوں مجھکو ندیم!
سرد کرنوں سے تو بجھ جاتے ہیں جذبات مرے کھو بھی جاتے ہیں خلاؤں میں خیالات مرے
چاندنی رات میں ہوتا ہے جنوں تجھکو ندیم!
چاندنی پھیلی ہوئی ہے یونہی میدانوں میں جیسے پھیلا ہو کفن دہر کے ویرانوں میں
تو سمجھتا ہے کہ روشن ہے جہاں میرے ندیم!
عقل کو کام میں اے دوست نہیں لاتا تو اپنے جذبات پہ قابو ہی نہیں پاتا ہے تو
عقل کی شمعیں جلاتا ہی نہیں میرے ندیم!
کیا ہوا ہند کا وہ پھیلا دمکتا ہوا ماہ تیری تہذیب و تمدن کا چمکتا ہوا ماہ
مغربی بدلیوں میں ڈوب رہا ہے وہ ندیم!
اب خیالوں کے مزاروں کو محل تو نہ بھی دے مذہبی جھوٹ کے قصوں کو ذرا چھوڑ بھی دے
اختلافات کی بدلی سے نکل میرے ندیم!

# ایک پُرانی صحبت

خواجہ عبدالمجید

میخانہ کی خرابی دیکھی تو جی بھر آیا
کیسا بھرا پڑا تھا کل تک یہ گھر خدایا (خواجہ)

دلّی آباد تھی۔ غدر پڑا، اُجاڑ ہوگئی، پھر آباد ہونی شروع ہوئی۔ یہ اُس زمانہ کا مذکور ہے۔ نواب فضل اللہ خاں ایک دہلی کے شریف زادے۔ یہ تین بھائی۔ دیوان جی۔ بخشی جی۔ نواب صاحب۔ قسمت نے یاوری کی کسی حیلہ سے الور جا پہنچے۔ دیوان جی۔ دیوانی کے عہدہ پر سرفراز ہوئے، بخشی جی بخشیٔ افواج۔ نواب صاحب راجہ کے مصاحب۔ وہ اوج موج ہوئے کہ خدا دے اور بندہ لے۔ راجہ پٹے پر، ساری ریاست پر تصرف۔ یہ غدر سے پہلے کا واقعہ ہے۔ غدر کے چند سال بعد راجہ کے بھائی بھتیجے ان سے برافروختہ ہوگئے فساد برپا کیا۔ گھر پر چڑھ آئے۔ ہر ایک نے بھاگ کر چھپ کر جس طرح بن پڑا۔ اپنی جان بچائی۔ ایک نوعمر رشتہ دار قتل ہوا۔ راج کے پہرے چوکی میں شہر سے نکال دیئے گئے۔ سرکار ہند نے بنارس میں نظر بند کیا۔ چند سال بعد دلّی میں رہنے کی اجازت ہوگئی۔ یہاں آکر اپنے آبائی مکانات میں آباد ہوئے۔ راجہ اُن کا دوست۔ خفیہ خط و کتابت جاری۔ آئے دن ٹھاکر آ جا رہے ہیں۔ اشرفیوں کی تھیلیوں پر تھیلیاں وصول ہوتی ہیں۔ دن عید، رات شب برات۔ جس کی سفارش کر دی اسی کا کام بن گیا۔ کیا مجال راجہ ان کا کہنا ٹالے۔

جاڑے کے دن ہیں۔ جہاوٹ ابھی برس کر کھلی ہے۔ پورے سات دن کی جھڑی تھی۔ ہوا سینہ کے پار ہوئی جاتی ہے۔ خدا کا شکر ہے مینہ ایک دن پہلے کھل گیا۔ نہیں تو عید کی کرکری ہو جاتی۔ عید الفطر کا دن گذر رات آئی۔ آج دیوان جی کے ہاں عید کی محفل آراستہ ہوگی۔ شہر کے سارے رُوددار آدمیوں سے یاد اللہ۔ سب مدعو ہیں۔ کھانے کی دعوت نہیں۔ اسکا موقع نہیں۔ سارے دن خوب کھایا ہے رات کو کھا کر کیا کریں گے۔ ہاں نقل اور کشمیری چائے سے تواضع ہوگی۔ یہی موسم کا میوہ ہے رقص و سرود کی محفل ہے۔ گلاب دلّی شہر کی نامی نامدار رقاصہ کا مجرا ہے۔ آدھی رات تک جشن رہیگا۔ مکان ان کا آبائی ہے۔ دیوان خانہ بڑا تو بہت۔ مگر بھدا بھدا۔ یہ اس زمانہ کی عمارت ہے جب تک اس گھر میں لچھمی نے جنم نہیں لیا تھا۔ پھاٹک بھی شاندار نہیں نہ جلوہ خانہ۔ صبح سے اہتمام ہونا شروع ہوا۔ صحن میں تین سرو چراغاں کھڑے کئے گئے۔ دالان در دالان کے درّوں پر کھاروے کے پتی پردے پڑے ہیں۔ اندر قالینوں کا فرش۔ زربفت اور کمخواب کے گاؤ تکیہ چاروں طرف لگے ہوئے۔ بیدری، گنگا جمنی، نقرئی کلیاں سجی ہیں۔ پیچوان قرینہ سے رکھے ہوئے ہیں۔ سب میں لکھنؤ کا مہری خمیرہ بھرا ہوا ہے۔ چلمیں اور ان کے جنبر چہ رس کے منٹ منٹ پر رنگ بدلیں ایسے بھرے ہوئے کہ گھنٹہ بھر تک رنق دیں۔ عود سوزوں میں عنبر ہے۔ گھر سے باہر تک مہک رہا ہے جگہ جگہ کشتیاں رکھی ہیں۔ ان پر رنگ برنگ کے کارچوبی کشتی پوش پڑے ہیں۔ ان میں سلونے سینکے بادام۔ الائچی دانہ اور نقل بھرے ہوئے ہیں۔ جب مہمان جمع ہو جائیں گے تو چائے کا دور شروع ہوگا۔ کشمیری چائے کا کیا کہنا۔ یہ چائے کاہے کو ہوتی ہے ایک خوش مزا حریرا ہوتا ہے جس نے پی ہو بس وہی جانے۔

چھت پر جھاڑ ٹنگے ہوئے قلمیں ہنیاں سب بلوری جھل مل جھلمل کر رہی ہیں۔ دیواروں پر دیوارگریاں آویزاں۔ فرش پر چاندی کے شاخے سہ شاخے۔ جگہ جگہ مردنگیں رکھی ہوئی۔ تمام گھر جگمگا رہا ہے۔ روشنی کا عکس قدآدم آئینوں پر عجیب نظارہ فریب ہے۔ آنکھیں چندھیائی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے مرزا قربان بیگ سالک تشریف لائے۔ یہ رات دن کے ہمنشین ہیں۔ بالا قامت۔ سرخ و سفید رنگ۔ غالب کے شاگردوں میں دہلی میں بہت نام پایا۔ سینکڑوں شاگرد ہوئے۔ پھر پیٹ کی خاطر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ وہیں فوت ہوئے۔ دوسرے صاحب جٹا مل آ رہے ہیں۔ یہ بھی گھر ہی کے آدمی ہیں۔ سر پر مارواڑی پگڑی، بر میں جامہ۔ جامہ دار کی اونی چھینٹ کا۔ یہ ہمارے دیوان جی کے ساہوکار ہیں۔ روپیہ پیسہ انہی کے پاس رہتا ہے چٹھی پرچہ پر دیتے لیتے رہتے ہیں۔

اطلاع ہوئی مرزا غالب تشریف لا رہے ہیں فینس پر آتے ہیں۔ سن رسیدہ ہیں ترکمانی لباس زیب تن۔ سر پر کلاہ قبچاق۔ بدن پر انگرکھا۔ اُس پر پوستین کی الخالق۔ دیوان جی لب فرش تک تعظیم کو آئے۔ اپنے برابر لے جاکر بٹھایا۔ مزاج پرسی کی عید کی مبارکباد دی۔ اتنے میں اطلاع ہوئی کہ نواب ضیاء الدین خاں کی سواری آئی ہے۔ یہ ٹرٹ پر سوار ہیں۔ دو سوار آگے دو پیچھے۔ صاحب خانہ مشایعت کے لئے گئے اور ہاتھ پکڑ کر لائے۔ اُن کے سر پر پیا پیانہ بانکا انگوچھا بندھا ہوا ہے۔ پوستین کا چغہ زیب تن۔ پوستین شیر و شکر۔ صورت سے وقار برستا ہے۔ ہر قدم انداز سے رکھتے ہیں اتنے میں نواب شمس الدین خان تشریف لائے۔ نوجوان ہیں۔ بدن ایسا سڈول کہ بایدو شاید۔ دلّی میں ان کے حسن کی نظیر نہیں۔ چوگوشیہ ٹوپی سر پر۔ اس موسم میں جامدانی کا انگرکھا پہنے ہوئے ہیں۔ اس کے اوپر کمخواب کا سینہ بند ہے۔ ان کو سردی کیوں لگنے لگی تھی۔ جوان ہیں۔ رنگ میدہ اور شہاب۔ بولتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ بات بات پر مسکرائے دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا کی مسرت انہی کے حصہ میں آئی ہے۔

لیجئے حکیم محمود خاں آگئے۔ گھوڑے پر سوار آئے ہیں گھوڑا میانہ قد نقرہ

تامیس کو گھوڑا پکڑا امکان میں داخل ہوئے۔ ڈاڑھی چڑھی ہوئی۔ رنگ پر موتی کی آب ان گھٹا ہوا۔ جوانی میں خوب ورزش کی ہے۔ اب ادھیڑ ہیں۔ بشرہ اگر کھلے ہوئے ہیں حکیم صاحب ہیں کشتے کھا کھا کے ہو گئے۔ سردی مگے ان کے دشمنوں کو ہاں چار پانچ دوست لڑکی ایک۔ فرو اوڑھ رکھی ہے۔ شبنم جارے کی وضع ہوگئی مفتی صدرالدین صدر صدور دہلی بھی ان سے بڑے ہوئے۔ ان کا یہاں موقع۔ یہ محفل تو ان کے لائق نہیں ہے۔ پر سفید عمامہ۔ گلے میں گھٹنوں تک کا رتہ۔ اس پر پرملے کی مرزئی۔ کشمیری کام کا چغہ۔ دیوان جی نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ کیوں نہ ہو عالم وقت ہیں۔ جید مرزائی ہیں۔ علم دین میں فرد سمجھے جاتے ہیں۔ یہ سرود شروع ہونے سے پہلے رخصت ہو جائیں گے۔ ایسی محفل میں شرکت ان کے تقدس کے خلاف ہے۔ دیوان جی کے بلاوے پر ان کی خاطر آ گئے ہیں۔ ان سے کچھ بعید رشتہ داری بھی ہے۔ منشی محمد شفیع خاں عرف آغا جان میر منشی ایجنٹ راجپوتانہ اور ان کے بھائی مولوی محمد تقی خاں عرف میاں جان بھی مدعو ہیں۔ آنے سے انکار کر دیا۔ ایسی محافل میں ہم شریک نہیں ہو سکتے۔ بعد میں حاضر ہوں گے اگرچہ قرابت قریبہ ہے اور دیوان جی کے ان پر ایام غدر میں احسانات بھی ہیں۔ بخشی داس تشریف لا رہے ہیں خوش رو کیمرسن آدمی ہیں۔ صورت شکل سے شرافت کے آثار نمایاں ہیں۔ بدن بھی ورزشی۔ سرو قامت۔ گندمی رنگ۔ داڑھی منڈی ہوئی۔ مونچھیں بڑی بڑی۔ ان کو چیڑ رکھا ہے۔ لباس میں بہرحال جامہ دار کا پاجامہ وغیرہ۔ سر پر پگڑی خاص انداز کی ذرا بانکی رکھی ہے۔

اب رات خاصی آ گئی۔ مہمان بھی ایک ایک کرکے سب جمع ہو گئے۔ بی گلاب دئی بڑی دیر کی حاضر ہیں۔ نوازندے سب موجود۔ کمرہ میں ساز ملائے جا رہے ہیں۔ گانا شروع ہونے والا ہے۔ گلاب دئی نو عمر۔ یہی پندرہ یا کہ سولہ کا سن۔ پاتر ہیں۔ دلی کی ڈیرہ دار طوائفوں میں سے ہیں۔ کچھ دن سے یہاں آ گئی ہیں۔ بہت نام پایا ہے۔ کوئی محفل ان سے خالی نہیں۔ سچ تو یہ ہے

## غزل

**اقبال فاروقی**

آ اے دور جنوں تجھے سجود ... اے رونق محفل کر دوں گا
نظروں کی کشش سے محفل میں جلووں کو مقابل کر دوں گا

مانا کہ بہت ہے بیتابی ہیں اور ملال غم فرقت بھی
طوفان کو ذرا یاں آنے دو ہر موج کو ساحل کر دوں گا

وہ ناخدا ہیں بیزار کرم لیکن مجھے دعویٰ ہے ہمدم
جس چیز کی خواہش رکھتا ہوں اس چیز کو حاصل کر دوں گا

جب رخ سے وہ پردہ اٹھیں گے خود پردہ نظر بن جائیں گی
جس وقت تجلی چمکے گی میں عشق کو کامل کر دوں گا

کیا دیکھ رہے ہو نہیں رہبر کوئی کیا ہے جو نہیں کوئی منزل
کچھ فکر نہ کر اے ذوق سفر ہر گام کو منزل کر دوں گا

اے چشم تصور تو نے اگر لمحات جنوں میں ساتھ دیا
میں گوشہ خلوت میں رہ کر نظارہ محفل کر دوں گا

وہ تیر نظر سے کام تو لیں، وہ ذوق جنوں کی داد تو دیں
اقبال میں اپنے سینے کو ہر زخم کے قابل کر دوں گا

کہ صورت ایسی پائی ہے کہ پری ان کی ... بچپنے میں آئی ہیں۔ نقشہ ایسا کہ کسی مصور کی قلم سے اترا ہے۔ بدن سڈول۔ بوٹا سا قد۔ رنگ کی آب موتی کی آب کو شرمائے۔ لباس میں وہ تراش خراش کہ لال تعل ... کو بھی مات کیا۔ آسمانی دوپٹہ اس پر ... ستارے بھرے ہوئے۔ زرلفت کی تہ پوشی۔ دوپٹہ کے ہمرنگ پاجامہ۔ پاؤں میں ... جوتے۔ ٹھاٹ سے ہوئی محفل میں داخل ہوئیں۔ سب ... کے عاشق رہ گئے۔ ساری محفل پر چھا گئیں۔ آتے ہی جھک کر مجرا بجا لائی۔ دیوان جی نے مسکرا کر تو ہاتھ ... اور فرمایا بیٹھ جاؤ۔ یہ سکر ... کے ہیں ... ابھی سفردائی ... کی طلبی کا ... نہیں ہوا۔ نوکر ... آ گئے لگتا ہے ... خاصدان اور ... نقل کی کشتی رکھ دی۔ دیوان جی کے پان کوئی معمولی پان نہیں ہے۔ ... ہر ایک ... برابر کی ... ہوتی ... کلابتوں ... کی گولیاں چاندی کی ڈبیہ میں الگ رکھی ہیں۔ دیوان جی کی فرمائش پر ... کرانے میں زیادہ تیز نہیں۔ خوشبو الیسی کہ ... کرنے پر بھی منہ ... آ کارے ... نے بڑے انداز سے ایک گلوری اٹھائی۔ ... منہ کھول ہاتھ لچکا کر منہ میں رکھ لی ... کوئی کھانی ... دیوان جی ہوئے ... تیز نہیں۔ ... البتہ ... اور کچھ اس انداز سے ... ہوئے کو پیار آئے۔ حضور ... میں ... آ جائے گا۔ سبھے عادت نہیں۔ پھر ... نہیں لگے گا۔ تھوڑی دیر خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ جس نے چھیڑ چھاڑ بھی کی مگر حرفوں کی بنی ہوئی تھی۔ پی گئی اور بڑی متانت سے جواب دیتی رہی۔ یہ محفل اس قابل نہیں تھی کہ شوخی طبع آزمائی جائے۔ یوں تو غضب کی جگت ... اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دے۔ کچھ دیر بعد دیوان جی نے ایک کو اشارہ کیا۔ سفرداؤں کو بلا لیا جائے۔ سفردے آئے تو یہ اٹھ کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پشواز پہن کر گھونگرو باندھ آن بیٹھی۔ پھر گانا شروع ہو گیا۔ پہلے پکا گانا گایا۔ موسیقی دان ہر

گشتکاری پر لوٹے جاتے تھے۔ مگر جو بے رُکھے تھے۔ ان کو ناک لطف نہ آیا۔ غزل کی فرمائش ہوئی داد دے کے شعروں میں سر ہلاتے گئے۔ بی صاحبہ نے مرزا غالب کی طرف اشارہ کرکے یہ غزل شروع کی ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

سوسوز سے ایک ایک بول ادا کیا۔ ہر شعر پر مرزا صاحب کی طرف اشارہ ہوتا تھا۔ چاروں طرف سے تحسین اور آفرین کے نعرہ بلند تھے۔ سلام کرتے کرتے بی صاحبہ کے ہاتھ ٹوٹے جاتے تھے۔ بس یہی داد مشترک تھی۔ کچھ گانے کی اور کچھ شعر کی۔ غرض سماں بندھ گیا۔ اور غزلوں کی فرمائش ہوئی۔ کئی غزلیں گائی گئیں۔ مگر وہ بات کہاں۔ اب فارسی کی فرمائش ہوئی۔ عراقی کی یہ غزل شروع کی۔ ؎

بہ طواف کعبہ رفتم زحرم ندا برآمد
کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدہ ریائی

پھر پہلا ہی سا سماں بندھ گیا۔ بلکہ اس سے کچھ بڑھ چڑھ کر۔ سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اب ناچ کی باری آئی۔ یہ جو کھڑی ہوئیں تو اس طرح قدم اٹھاتی ہیں۔ سو سو گھونگرو ایک ایک پاؤں میں بندھے ہوئے ہیں۔ مگر ایک کی آواز نہیں۔ سبک رفتاری کا وہ عالم کہ تماشے بچھاوو تو نہ ٹوٹیں۔ اب ناچ شروع ہوا۔ دو حبشی مشعلیں روشن کر حاضر ہوئے۔ مشعل کی روپہلی ڈنڈی ہے۔ سر کے سرخ پٹکے میں اڑی ہوئی۔ ایک ہاتھ میں مشعل تھام رکھی ہے دوسرے میں کپتی ہے۔ اسپر بھی لمبی روپہلی شام چڑھی ہوئی۔ جدھر بی صاحبہ ناچتی ہوئی جاتی ہیں یہ دونوں منکر نکیر اس کے ساتھ ہیں۔ پیچھے دو سارنگیے۔ بیچ میں طبلچی۔ آزو بازو دو منجیرے والے نو عمر لڑکے۔ ناچ سبحان اللہ کسی اچھے کتھک کی بتائی ہوئی ہیں۔ اب آدھی رات آگئی۔ ناچ بند ہوا۔ بی صاحبہ مجرا کرکے رخصت ہوئیں۔ سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔

(ختم)

# کہانی

سکوتِ شام میں اکثر یہ سوچتا ہوں میں
کہ میری زیست کی تابندگی، درخشانی
تری نگاہ کے دامن میں چھپ گئی آخر!
بہت اداس تھا، اے کاش تجھ کو پا لیتا
شکست میری تمنا نے مجھ کو دی آخر!

※

میں جانتا تھا کہ تجھ کو نہ پا سکوں گا کبھی
اسی فریبِ تمنا سے جی رہا تھا میں
ترے خمار لبوں سے، نشیلی آنکھوں سے
شراب تیری جوانی کی پی رہا تھا میں
حیات و موت کی راہوں سے بھی جدا ہو کر
ترے شباب کی چلمن میں مسکراتا تھا
حسین رات کے بھیگے ہوئے دھندلکے میں
گھنیری زلف کے دامن میں مسکراتا تھا
سکوتِ شام میں جب پاس تو نہ ہوتی تھی
تو آسماں پہ ستارا بھی ڈوب جاتا تھا
حسین چاند افق کے سنہری آنچل میں
تجھے نہ پا کے مسرت سے جگمگاتا تھا
اداس رات ہے اب اور اداس تنہائی
مری نگاہ میں الفت کا اب پیام نہیں
کبھی مرے لئے فردوس تھی تری آغوش
مگر اب حسن میں رنگینیٔ خرام نہیں

میں جانتا تھا تمنا مری ہے بے بنیاد
اداس دل کے چمن کو سجا رہا تھا میں
سیاہ و سرد گھٹائیں تھیں میری دنیا پر
شبابِ حسن کا پرچم بنا رہا تھا میں
مری حیات خلاؤں کا بیکراں ہے اب
میں درد و آہ کے بربط پہ گنگناتا ہوں
یاد آتی ہیں جب وہ جھکی جھکی آنکھیں
کہ درد و یاس کی لہروں میں ڈوب جاتا ہوں
قفس کی آہنی دیوار یاس کا زنداں
یہ آہِ نیم شبی سے پگھل نہیں سکتا
تبسموں کی بہاریں، مسرتوں کا فسوں
شبابِ شعر کے سانچے میں ڈھل نہیں سکتا

※

مہیب سائے الم کے بڑھے ہی آتے ہیں
یہ زندگی ہے انا کی کہ ایک راہگذار
ہے ایک منزلِ موہوم، زیست کا ٹھہراؤ
نہیں ہے میرے نفس میں حیات کی پیکار
خیال خام تھی امید اس کو پانے کی
یہ چاہتا ہوں کہ غم سازِ میں بدل جائے
مری اداس محبت، جنوں کا گہوارہ
جمال اور تبسم کے نور میں ڈھل جائے
سکوتِ شام میں اکثر یہ سوچتا ہوں میں!

نعیم صبا

# مواد

(افسانہ)

مسلم جالندھری

مواد ہی تو نہ ملتا تھا۔ اسے رات دن اپنے نئے افسانے کے لئے مواد کی تلاش تھی۔ اٹھتے۔ بیٹھتے۔ ٹہلتے اور کام کرتے وقت وہ اسی کے متعلق سوچتا۔ دفتر میں قلم دیتے چلاتے دفعتًا اس کا خیال کسی دوسری ہی دنیا میں کھو جاتا اور وہ عارضی طور پر اپنے ماحول سے بےخبر ہو کر افسانے کے مواد کے متعلق سوچنے لگتا۔ اور یہ سوچنا بھی تو ایک مصیبت ہے۔ جب فرصت ہی نہ ہو تو کوئی سوچ کیسے سکے۔

دفتر میں میز پر جھکے جھکے جب اس کا دماغ سوچنے کی طرف مبذول ہو جاتا۔ اور اس کے ذہن سے خیالات دھوئیں کے بادل بناتے ہوئے اڑنے لگتے۔ تو وہ وقت اس کے لئے انتہائی کشمکش کا وقت ہوتا۔ وہ چاہتا کہ خیالات کے ان بادلوں سے حقیقت نگاری کی بارش برسائے جس سے سطح قرطاس پر رنگ برنگ کے بوٹے اگیں۔ لوگ اس کی خیابانِ تخیل سے پھول چنیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی نظر نیچے میز پر پڑے ہوئے کاغذوں کے پلندے پر جا پڑتی۔ اور کوئی تند آندھی خیالات کے ان بادلوں کو چشم زدن میں کہیں سے کہیں اڑا لے جاتی۔ وہ جھنجلا کر فائلوں کو اٹھا کر میز پر پٹک دیتا۔ "یہ کلرکی کمبخت کبھی فرصت ہی نہیں دیتی۔ اور فرصت نہ ہو تو کوئی سوچ کیسے سکے۔ اچھا بھلا سلجھا ہوا مواد اس کلرکی کی نذر ہو گیا"۔

اور کبھی وہ سوچتا۔ کیوں نہ کلرکی پر ہی اپنے خیالات کا اظہار کر دے۔ لوگوں کو اس کی حقیقت سے آشنا کر دے۔ تاکہ کوئی دوسرا انسان بے انسانی کے اس جھنجھٹ میں نہ پڑے۔ وہ اپنے ماحول پر نظر ڈالتا۔ بابو شام لعل جن کے بال جوانی ہی میں چاندی کے تار کی طرح سفید ہو رہے تھے۔ ٹائپ کی مشین پیٹتے نظر آتے۔ ناک پر ایک بھدی سی عینک جس میں ایک طرف کی کمانی ٹوٹ جانے کی وجہ سے سیاہ دھاگہ بندھا ہوا تھا کچھ اس انداز سے ٹکی ہوئی تھی۔ کہ معلوم ہوتا تھا داہنی آنکھ کا شیشہ بائیں طرف کی نسبت آدھ انچ نیچے ہے۔ سیاہ و سفید مونچھیں دانت صاف کرنے والے برش کی طرح اکڑی ہوئیں۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ تیرہ سال ہو گئے تھے انھیں ٹائپنگ مشین کے ساتھ منسلک ہوئے۔ اور اب تک اس رشتے کو مستقل مزاجی سے نبھائے جا رہے تھے۔ بس کلرکی کا زندہ مجسمہ تھے۔

ایک طرف ایک کالی کلوٹی لڑکی کاغذوں کا پلندہ سامنے رکھے الٹ پلٹ کرتی رہتی۔ اس کے موٹے موٹے رنگے ہوئے ہونٹ ہر وقت کھلے رہتے اور وہ ہر دیکھنے والے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی۔ کبھی کبھی وہ پتلی سی آواز میں مغربی طرز میں گنگنانے لگتی۔

"کاش میرے پاس کوئی محبت کرنے والا ہوتا" اس لڑکی سے اسے نہ معلوم کیا چڑ تھی۔ وہ فورًا ہی اپنا منہ ادھر سے موڑ لیتا اور وہ ہنس دیتی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ "یہ ہندوستانی لوگ تہذیب سے بالکل بے بہرہ ہیں"۔۔۔ گویا جیسے وہ اپنے آپ کو ہندوستانی ہی نہیں سمجھتی" اور وہ منہ چڑا کر سامنے پڑی ہوئی فائل کے ورق جلدی جلدی الٹنے شروع کر دیتا۔ اس کے خیالات پراگندہ ہو جاتے اور افسانے کا مواد جو سخت محنت اور جانفشانی کے بعد اسے مہیا ہوتا تھا۔ ذہن سے یکقلم مفقود ہو جاتا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کچھ لکھے۔ لیکن لکھ نہیں سکتا تھا۔ اور اسے نئے سرے سے مواد کی تلاش میں نکلنا پڑتا۔

وہ سامنے پڑی ہوئی الماری پر نظریں مرکوز کر کے سوچنا شروع کر دیتا۔ لیکن باوجود ہزار کوششوں کے وہ چیز اسے نہ ملتی۔ جو اس نے چند لمحے پہلے کھو دی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کالی کلوٹی لڑکی کی بڑی بڑی زرد آنکھیں اس پر گڑی ہوئی ہیں۔ اسے اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے معلوم ہوتے۔ اور وہ گھبرا کر نظریں الماری سے ہٹا لیتا۔ وہ اس زندگی سے۔ اس ماحول سے۔ اس کلرکی سے تنگ آ چکا تھا۔ اس نے اس کا دماغ چاٹ لیا تھا۔ وہ اپنا کوئی افسانہ کوئی تحریر مکمل نہ کر سکتا تھا۔ وہ اس زندگی سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن بھاگ کر بھی کہاں جائے۔ اسے ہر جگہ کلرکی ہی کرنی پڑے گی۔ وہ اتنا بڑا ادیب نہیں تھا کہ اپنے کمال سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لے اور اس طرح پیٹ کے دھندے سے نجات پائے۔ اسے شہرت بھی میسر نہ تھی۔ پھر سوائے کلرکی کے چارہ ہی کیا تھا۔ اور ایک احساس شکست اس کے دل پر چھا جاتا۔ اور وہ پژمردہ ہو کر فائلوں کے پلندے سے کچھ تلاش کرنا شروع کر دیتا۔ لیکن اس خیال سے کہ دفتر نہیں تو گھر جا کر وہ ضرور کچھ نہ کچھ لکھے گا۔ اس کی ڈھارس بندھ جاتی۔ اور وہ بڑی مستعدی سے اپنے کام میں منہمک ہو جاتا۔

گھر جاتے ہی اسے پھر مواد کی تلاش ہوتی "عشق و محبت کی دلفریب اور سنسنی خیز داستان۔ رقابت۔ مفارقت اور پھر وصال یا موت۔ لیکن نہیں۔ یہ تخیل تو اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ حقیقت نگاری کرے سرمایہ دار کی غریب پروری کا پردہ فاش کرے اور مزدور کے جوش اور غیرت کو ابھارے۔ اسے نیند سے جگائے۔ اپنے حقوق کا احساس دلائے۔ اور دنیا میں ذہنی انقلاب پیدا کر دے۔ ذہنی انقلاب کے بغیر کوئی سیاسی یا عملی انقلاب ممکن نہیں۔ وہ اپنے قلم کے بل بوتے پر کیا کچھ نہیں کر سکتا"۔ لیکن فورًا ہی اس کا کوئی دوست آ جاتا۔ اور قلم چھین کر پرے پھینکتے ہوئے ہمدردانہ انداز میں کہتا "یار تم سارا دن لکھتے تھک نہیں جاتے۔ مجھے تو تم پر ترس آتا ہے۔ دیکھو تمہاری صحت کس قدر گر رہی جا رہی ہے"۔ اور اس وقت اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ سب لوگ بدھو ہیں۔ عقل سے کورے۔ یہ ادب کے اہل ہی نہیں جنگلی کہیں کے۔ بالکل جانور ہیں جانور۔ اس کا دل چاہتا وہ ایسے دوست کا گلا گھونٹ دے۔ جس نے اس کے حسین اور قیمتی خیالات کی یوں ہنسی اڑائی ہے۔ لیکن وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتا جیسے مسکرا نہیں رہا۔ اس کی ذہنی بےحسی کا ماتم کر رہا ہے۔ پھر بھی کبھی کبھی خوشی کی کوئی لہر اس کے دل میں دوڑ جاتی۔ روزانہ بازار سے نمک۔ مرچ۔ لکڑی۔ دال اور ایسی

اور بہت سی بک بک ... اور بچے کھلانے سے تو اسے نجات حاصل تھی۔ نہ ہی اسے اپنے پڑوسی کی طرح سالے کا پیٹ بھرنا پڑتا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ دوست پرانے ہیں گے اور چلے جائیں گے۔ وہ بعد میں لکھنے لگا لیکن بیوی — بچے — ان کی چیخ پکار۔ ہر وقت کی تو تو میں میں تو ایک مستقل مصیبت ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن خوشی کی یہ لہر ہمیشہ عارضی ہوا کرتی۔ کوئی نہ کوئی دوست ہمیشہ اس کے پاس موجود رہتا۔ اور وہ دل ہی دل میں تلملا کر چپ ہو رہتا۔

آخر اسے ایک انوکھی تجویز سوجھی تھی۔ اس نے کمرے کو قفل لگایا اور باہر چل دیا۔ "اب کوئی اس کے خیالات میں مخل نہ ہو سکے گا" اس نے سوچا۔ اور اب افسانے کے مواد کی تلاش میں بھی دقت پیش نہ آئے گی۔ وہ جو دیکھے گا لکھ دے گا۔ وہ فطرت کی حقیقتوں میں ڈوب کر ان کو پائے گا۔ اور پھر اپنے قلم کی زبان سے دنیا والوں کو ان سے آگاہ کرے گا۔ تاکہ وہ بھی اس کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ نقاش فطرت بنے گا۔ اس کی نگاہ دوربین ہے۔ وہ ایک نظر میں کسی چیز کو یا اس کے ماحول کو دیکھ کر اندازہ لگا لے گا۔ اور پھر اپنے قلم کی مدد سے اسے عوام تک پہنچا دے گا۔

وہ اپنے ان خیالات میں مستغرق جا رہا تھا کہ ایک کرخت سی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "کیا ہے ننگ صاحب۔ سیر کا جاتا ہے۔" اس کا پڑوسی — ایک مدراسی کلرک — ننگ دھڑنگ صرف ایک لنگوٹی پہنے سڑک پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ جل بھن کر کباب ہی تو ہو گیا۔ "یہ کم بخت دیکھ نہیں رہا کہ میں کہیں تو جا رہا ہوں۔ سیر کو نہ سہی جہنم کو سہی۔" اور ذہن میں آئے ہوئے قیامت کے ناول آناً فاناً ہی کے ساتھ پھر غائب ہو گئے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس موٹے مشٹر کے توے جیسے مدراسی کو جو زرد دانت نکالے اس کی طرف تک رہا تھا، اٹھا کر زمین پر پٹک دے۔ "لیکن نہیں" اس نے سوچا "یہ بہتر نہیں۔ وہ ایک مہذب انسان ہے۔ اسے کبھی اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔" اور وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ "جی ہاں۔ میں سیر کو جا رہا ہوں۔"

سامنے سیمنٹ کے بہت سے چبوترے بنے ہوئے تھے۔ یہاں پہلے گودام بنے ہوتے تھے۔ اب یہ چبوترے خالی پڑے تھے۔ صرف ایک طرف پانچ چھ تنبو دکھائی دے رہے تھے۔ چبوتروں کے درمیان زمین خالی پڑی تھی۔ ایک طرف دھوبی گھاٹ تھا۔ پاس ہی دھوبیوں کے رہنے کا ایک بہت بڑا واڑہ تھا۔ چھوٹے بڑے لڑکے ٹینس کی گیند اور بلا لئے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ کچھ دور ایک موٹر یا انجن کے ٹوٹے ہوئے [illegible] ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ اس نے وہیں چبوتروں کے درمیان ٹہلنا شروع کر دیا اور پھر اپنے افسانے کے متعلق سوچنے لگا۔ دھوبی گھاٹ کے باشندے ایک نئی ہستی کو اپنی حدود میں پا کر گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ ایک بوڑھا دھوبی جس کی طرف سے ہوا شراب کی بو لا رہی تھی۔

اپنی بادامی سی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا اس کو غور سے دیکھتا ہوا پاس سے گزر گیا۔ جیسے پوچھ رہا ہو "تم یہاں کیوں آئے ہو۔ یہ ہماری زمین ہے۔ تم لوگوں کا یہاں کیا کام ہے۔ نکل جاؤ یہاں سے۔" لیکن وہ پھر بھی وہیں ٹہلتا رہا۔ "یہ لوگ مجھے کتنا ہی برا کہیں۔ میں ان کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کروں گا۔" وہ سوچنے لگا۔ ان گندے اور میلے پرانے چیتھڑوں میں زندگی کی جو جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ میں اس کا سبب تلاش کروں گا۔ ان کی ہر حرکت میں زندگی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی زندگی زندہ اور جاندار ہے۔ دفتروں میں کام کرنے والے بابوؤں اور شہری لالاؤں کی طرح مردہ نہیں۔ آخر یہ بوڑھوں کا نشے میں مست ہو کر خوش گپیاں اڑانا۔ نوجوانوں کے قہقہے۔ بچوں کی دھینگا مشتی۔ کنواریوں کی بے باکی۔ سہاگنوں کے گھونگھٹ۔ ان کے پاؤں کی جھنکاریں زندگی ہی کی نشانیاں تو ہیں۔ لیکن اس پر بھی یہ لوگوں کی میل دھونے والے اتنے گندے کیوں ہیں۔ ان کے بدن نصف برہنہ کیوں ہیں۔ یہ نو دس برس کی لڑکیوں کے پیٹ اتنے بڑے کیوں ہیں۔ یہ کرکٹ کھیلتے کھیلتے کیوں لڑ پڑتے ہیں۔ ان کی زبان اتنی فحش کیوں ہے۔ کیا کسی نے ان کے حال پر توجہ نہیں دی۔ کسی نے ان کی آواز کو بلند نہیں کیا۔ دوسروں کے کانوں تک نہیں پہنچایا۔ کیا ان کے لئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں۔

وہ خیالات سے پھر پور گھر کو لوٹا۔ اس نے اپنے مضمون کا بہت سا مواد اپنے سینے میں جمع کر لیا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے پہلو میں دل نہیں ایک پھوڑا ہے جس میں سے مواد نکل کر بہا ہی چاہتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس مواد کو الفاظ کی رکابیوں میں ڈھال کر صوفوں پر بیٹھنے والوں کے سامنے رکھ دے۔ ان کے منہ پر دے مارے۔ "کہ اے معطر اور مرغن غذائیں کھا کر بھی خرابی صحت کی شکایت کرنے والو۔ ذرا اس کا بھی مزا چکھو۔ یہ مواد انہی غریبوں کے پھوڑے پھنسیوں سے نکلا ہے۔ ان کا پانی کی طرح بہتا ہوا پسینہ اور خون دیکھ کر حاصل ہوا ہے۔ اس خون کو دیکھ کر جسے تم رات دن چوستے رہتے ہو۔ آؤ ذرا اس مواد کی خوشبو سے بھی لطف اٹھاؤ۔" اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ سارا مواد اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ قلم کی ہر ایک جنبش اس کو کاغذوں میں تحویل کرتی جاتی تھی۔ کہ اس کے ساتھی کی آواز آئی۔ "بتی بجھا دو نا یار۔ روشنی میں نیند نہیں آتی۔" اس نے [illegible] اور قلم میز پر پٹک دیا۔ اور خود چادر میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔

# جنگ عظیم سے پہلے کی کہانیاں

حمیدہ سلطان

اب سے پچیس تیس سال قبل کے لکھے ہوئے مضمون میں ہیں موجودہ دور کی بے چینی بے اطمینانی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی نہ کسی کہانی میں بھوک کا رونا ہے نہ جنسی خواہشات کا بیان۔ کہا جاتا ہے کہ ہر زمانہ کا ادب اس کی اخلاقی اور معاشی حالت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ہر ادیب اسی ماحول کی عکاسی کرتا ہے جس میں کہ وہ رہتا ہے۔

اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غدر کے بعد بھی جب دوسری حکومت کا ملک پر قبضہ ہو چکا تھا اور سارا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا تھا دلی اور لکھنؤ کی حکومتوں کا تختہ الٹ چکا تھا اور یہاں کے رہنے والے تباہ حال تھے پھر بھی جنگ عظیم سے پہلے اقتصادی حالت اتنی نہ بگڑی تھی کہ دانے دانے کو محتاج ہو جاتے بچی کچھی کھرچن ہر امیر و غریب کے گھر میں موجود تھی سستا سماں لوگ سیر چشم تھے اور ہر چیز کی فراوانی تھی۔

ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی لکھی ہوئی کہانیاں اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہیں ڈپٹی صاحب خود مسلمان متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے اپنی کہانیوں میں متوسط الحال مسلمان گھرانوں کی تصویر کھینچی ہے مرات العروس ڈپٹی صاحب کی مشہور تصنیف ہے اس میں قصے کی ہیروئن اصغری خانم کے والد پچاس روپے کے نوکر تھے اور اصغری خانم کے خسر جو کہیں باہر کسی ریاست میں ملازم تھے بیس روپے ماہانہ گھر کے خرچ کے لئے بھیجتے تھے اسی بیس روپے مہینے میں ہی یہ برکت تھی کہ ایک ماما کھانا پکانے پر نوکر تھی گھر بھی خاصا فراخ دو منزلہ تھا ماما کو ڈیڑھ روپے ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی لیکن وہ چور تھی اسلئے دوسری ماما دیانت کی ... روپے ماہوار پر رکھا گیا۔

اکبری خانم اصغری خانم کی بڑی بہن کے یہاں محمد عاقل دس روپے مہینے پر ملازم ہوئے اور بیوقوف بیوی کی ضد سے الگ دو روپے ماہوار پر گھر لیا تو چونکہ اکبری کو جسکو گھرداری کا سلیقہ نہ تھا اور کھانا پکانا نہ آتا تھا کچوریاں اور ربڑی منگا کر کئی روز تک اپنا پیٹ بھرا گویا دس روپے مہینے کے ملازم کی بیوی اسی زمانے میں کچوریوں اور ربڑی سے پیٹ بھر سکتی تھی اور اب تو شاید چنے بھی نہیں مل سکتے مرات العروس کے سب مرد کردار سنجیدہ مزاج غیور نیک طینت انسان ہیں اور عورتیں بھولی بھالی باحیا شریف زادیاں اکبری اصغری دو سگی بہنیں ہیں فرق صرف ان دونوں میں اتنا ہے کہ اکبری نانی کے بیجا لاڈ کی بدولت پھوہڑ زبان دراز بیوقوف اور خود غرض ہے اس نے اپنی حماقتوں سے ساس سے لڑ جھگڑ کر گھر الگ کیا جہیز کے کپڑے لاپروائی کی بدولت خراب ہو گئے برتن اور زیور چوری چلے گئے۔ سب کچھ کھو دینے کے بعد وہ سنبھلی اور

اور اصغری نے تیرہ برس کی عمر سے ہی اپنی معاملہ فہمی اور دوراندیشی کی بدولت سسرال کے الجھے ہوئے معاملات کو سلجھایا یہاں تو جواو باش دوستوں کی صحبت میں بہک چلا تھا ٹھیک کیا اور ایک مکتب بھی کھولا جس کی حیثیت بالکل ایک پرائیوٹ اسکول کی سی تھی جہاں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ معلومات عامہ اور حفظان صحت کے اصول کھیل کود لڑکیوں کے لئے تمام چیزوں کا خوش اسلوبی سے بندوبست کیا گیا تھا اسی مکتب کی بدولت حسن آرا جیسی شوخ الہڑ لڑکی اچھی بیٹی بن گئی "بنات النعش" "مرات العروس" کا دوسرا حصہ ہے یہ کتابیں آج بھی اتنی مقبول ہیں جتنی تیس چالیس سال قبل تھیں۔ "ابن الوقت" ڈپٹی صاحب کا لکھا ہوا تیسرا حصہ ہے اس میں غدر کے مفصل حالات اور اسی وقت کی بے چینی اور انتشار کا بیان ہے دہلی والوں کے لئے یہ قیامت کا وقت تھا ایک جانب بوڑھے بے بس تاجدار سے ان کو دلی ہمدردی تھی جن کے آباؤ اجداد کے احسانات ان کی پشتہا پشت پر تھے دوسری جانب نئی حکومت کے نظم و نسق سے وہ متاثر تھے۔ اور جانتے تھے مغل سلطنت کا اب خاتمہ قریب ہے اسلئے سمجھدار ہندو مسلمان وقت کا ساتھ دے رہے تھے ابن الوقت بھی جو بادشاہ کی منظور نظر بیگم نواب معشوق محل کی سرکار میں ملازم تھا ایک انگریز جلیل القدر افسر کی جس کو باغیوں نے گولی مار دی تھی تیمارداری کرتا ہے نوبل صاحب جو اسم بامسمیٰ تھا صاحب اقتدار ہو کر ابن الوقت کو بڑا عہدہ دیتا ہے اور یہاں ابن الوقت خبیث دارمن کر پورے صاحب بہادر بن جاتے ہیں یورپین طرز معاشرت اختیار کر لیتے ہیں لیکن نوبل صاحب کے حالات جاننے کے بعد ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر انگریز نوبل نہیں ہے اور وہ آخر کار انگریزوں کے متعصب انداز سے تنگ آکر استعفےٰ دیدیتا ہے اور اپنی پرانی وضع اختیار کرتا ہے یہ کتاب سبق ہے ان ہندوستانیوں کے لئے جو انگریزوں کی حرص کرتے اپنے ملکی وقار کو صدمہ پہنچاتے ہیں اور انگریزوں کی آنکھوں میں بھی اپنی رکیک حرکات سے ذلیل ہوتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی غلامانہ ذہنیت پر ڈپٹی صاحب نے جا بجا خوب طنز کی ہے میرا مقصد اس وقت ان کہانیوں پر تنقید کرنا نہیں بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ ملک کی معاشی اور اخلاقی حالت باوجود اندرونی بکھراؤ کے کسی قدر سنبھلی ہوئی تھی۔ ٹکے سیر عمدہ ترکاری ملتی تھی دو پیسے کے چھ یا سات کرارے بڑے پان آتے تھے دو روپے میں لوٹ کر کے ٹھیر کر تازی مٹھائی اور پیسے پیسے کے رنگ بہت سارے آجاتے تھے۔ دودھ چار پیسے سیر خالص ملتا تھا اور

دو پیسے کا دہی سیر بھر قیمے کے کبابوں کو خستہ کرنے کے لئے کافی ہوتا تھا مردوں پر جنسیات کے دورے کسی عورت کی جھلک دیکھکر نہیں پڑتے تھے محلے کی تمام بہو بیٹیاں ہر محلے والے کی نظر میں ان کی بہو بیٹیاں تھیں ایک شریف دوسرے شریف کے گھر میں تاک جھانک نہیں کرتا تھا لڑکیاں شرمیلی سجیلی حیا پرور ہوتی تھیں نہ ان کی چوڑیاں کسی بانکے نوجوان کو گذرتے دیکھ کر جھینکتی تھیں نہ رنگین دوپٹے کے آنچل لہراتے تھے۔

عورت و مرد کی نگاہیں حرص آلود گرسنگی سے پاک تھیں گو پرانے نظام کا ڈھانچہ بے جان ہوگیا تھا تاہم ابھی وہ صحیح سالم تھا ادب کی کیفیت اسلئے سنبھلی ہوئی تھی نذیر احمد کے بعد شرر کا نمبر آتا ہے لیکن شرر کی کہانیوں سے ملک کے حالات کا اندازہ لگایا نہیں جاسکتا، ہمیشہ تاریخی ناول لکھتے تھے اور وہ بھی محض عشقیہ ہمارے سماجی اخلاقی حالات سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اس لئے ان کا ذکر فضول ہے اسی سلسلے میں قابل ذکر مرزا رسوا کا ناول امراؤ جان ادا ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک طوائف کی کہانی ہے جو تھی تو بچاری درحقیقت ایک غریب شریف گھر کی لڑکی لیکن لڑکپن میں ڈاکوؤں کے ہاتھ پڑ کر ایک طوائف کے ہاتھ لگی اور تقدیر کے ہاتھوں خود بھی طوائف بن گئی میرے خیال میں مرزا رسوا کا یہ ناول اس درجے کا ہے کہ آجتک اس موضوع پر اور کسی نے نہیں لکھا عورت کی فطرت کا بیان خود اس کی ہی زبان سے ایک عالم نفسیات کی طرح مرزا رسوا نے کیا ہے خانم صاحب جنہوں نے امراؤ جان کو خریدا اور پالا تھا تھیں تو ایک طوائف لیکن بڑے ٹھسے دار اور آن بان کی اور پھر امراؤ جان کا مذاق شعر و ادب سنجیدہ و شستہ گفتگو حاضر جوابی بذلہ سنجی اسی زمانے کی طوائفوں کا کردار بھی ہماری نظروں میں بلند کر دیتی ہے اسی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان دنوں ہمارے ملک کی سوسائٹی کی اخلاقی حالت کس قدر اونچی تھی گویا طوائفوں کے بالا خانے پہلے شرفا کے لئے کلبوں کی حیثیت رکھتے تھے جہاں چند ہم خیال دوست جمع ہو کر تاش کھیلتے شراب کے جام لنڈھاتے اور رگانا سنتے تھے اور وہ وہاں محض عیاشی کے لئے نہیں ذہنی اور دماغی تفریح کیلئے جاتے تھے آج یہ سب چیزیں کلبوں میں موجود ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے جو کام طوائف سربازار و راشتہار عام دیکر دوکان سجا کر بے تکلفی سے کرتی تھی اب خانہ ساز عورتیں ذرا سلیقے اور تکلف سے نیم عریاں ہو کر رقص بھی کرتی ہیں جوا بھی کھیلتی ہیں شراب بھی پیتی ہیں اور غمزہ عشوہ طرازی سے دل لبھانے میں بھی کمال رکھتی ہیں۔

ہمارے ادیبوں پر جو ایک دم جنسیات کے دورے پڑنے لگے اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ ان میں سے جو مالی حالت کمزور ہونے کے باعث کلبوں میں نہیں جاسکتے اسی قسم کی تفریحات میں حصہ نہیں لے سکتے اس طرح ذہنی عیاشی کر کے اپنا دل خوش کر لیتے ہیں وہ لڑکیاں جو متوسط الحال گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں خاندانی رسم و رواج اور روپے کی کمی کے باعث ایسی سوسائٹی میں شامل نہیں ہوسکتیں لکھ لکھ کر ہی اپنا دل بہلاتی ہیں رسائل میں ایسے افسانے اور کہانیاں پڑھتے پڑھتے متلی ہونے لگتی ہے جہاں چودھواں سال شروع ہوتے ہی لڑکا اور لڑکی جنسی مسائل پر غور کرنے لگتے ہیں۔

جنسی مسائل پر سوچنا اور ان کو سمجھنے کی کوشش کرنے کو میں برا نہیں کہتی لیکن یہ خیال کہ ہر لڑکی اور لڑکا سن بلوغت میں قدم رکھتے ہی اسکو سمجھنے کی کوشش کرنے لگتا ہے خود لکھنے والوں اور لکھنے والیوں کی مریض ذہنیت کو واضح کرتا ہے صحت مندانہ نظریہ یہ تھا کہ خواہ مخواہ اسی قسم کی چیزیں لکھ کر قبل از وقت احساسات بیدار کر دیئے جائیں معاف کیجئے میں ماضی و حال کا موازنہ کرنے میں اپنے موضوع سے الگ ہٹ گئی۔ امراؤ جان ادا کو اتفاقات کا پنور کھینچ کر لیجاتے ہیں جو اس کا مولد تھا اور ایک روز وہ وہاں مجرے کے لئے جاتی ہے جہاں کبھی وہ ایک بھولی بھالی لڑکی کی حیثیت سے رہتی تھی اپنے والدین کے ساتھ وہی املی کا بڑا درخت ہے اور وہی میدان جو اس کے لڑکپن کے کھیلوں کا مامن و مسکن تھا پرانی یاد اس کو بے چین کر دیتی ہے اور وہ واپس آکر اپنے بچھڑے ہوئے والدین اور بہن بھائیوں کی یاد میں آنسو بہاتی رہتی ہے آخر کانپور چھوڑ دیتی ہے گویا طوائف بن کر بھی اتنے سال گناہ آلود زندگی گذارنے کے بعد اس کے دل کی معصومیت اور پاکیزگی قائم رہی تھی لیکن اب تو ہر ترقی پسند خاتون بہو بیٹی ہوتے ہوئے طوائف بن جانے کی آرزو دل میں لئے ہوئے ہے یہ ہیں مغربی تہذیب کے اثرات اور غیر ملکی نظام کی برکت۔

اگر اس سلسلے میں فسانہ آزاد کو شامل نہ کیا جائے تو یہ داستان مکمل نہ ہو سکے گی چنانچہ آزاد کا مصنف رتن ناتھ سرشار ادیب نہیں مصور ہے فسانہ آزاد میں سرشار نے ایک طبقے کی نہیں ہر طبقے کی تصویر کھینچی ہے کتاب کا ہیکو ہے رنگا رنگ تصاویر کا ایک دلکش مرقع ہے۔ ایک طرف افیمی افیم کی چسکی لگا کر بے تکی ہانک رہے ہیں دوسری جانب بھٹیاریوں کی لڑائی ہو رہی ہے تیسری طرف بزم مشاعرہ آراستہ ہے اور چوتھی جانب نواب نامدار کی سواری چلی آتی ہے جدھر جاؤ نیا رنگ ہے کہیں ساقنیں بناؤ چناؤ کئے ٹھٹھول بازی کر رہی ہیں اور کہیں شوخ و شنگ نو عمر نواب زادیاں چہل میں مصروف ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ سب ذکر ایسے دلنشیں پیرائے میں ہیں اور اس طرح ایک لڑی میں پروئے گئے ہیں کہ طبیعت پر بار نہیں گذرتا۔ قصے کے ہیرو میاں آزاد ایک بے فکرے خوش رو رنگین طبع سیلانی جیوڑے کے انسان ہیں آج یہاں تو کل وہاں رنگیلی طبیعت ضرور انہوں نے پائی ہے مگر بے لاگ ادھر ادھر پھرتے پھراتے

ان کو ایک حسین و جمیل نواب زادی حسن آرا بیگم سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ کمسن مگر باہمت اور سنجیدہ مزاج لڑکی ان سے کہتی ہے ترکوں کی مدد کرو اور فتح یاب ہو کر آؤ تو تم سے شادی کروں گی آزاد اپنی محبوب کے حکم پر خوشی خوشی روم سدھارتے ہیں حسن آرا کی چھوٹی بہن شہر آرا بیگم پر ایک عالیقدر شہزادے ہمایوں نامی کی نظر پڑتی ہے اور وہ اسی الہڑ چنچل لڑکی کو دل دے بیٹھتے ہیں کمسن اور بھولی شہر آرا پہلے شہزادے سے اغماض کرتی ہے آخر کار سچی محبت سے متاثر ہو کر وہ بھی محبت کرنے لگتی ہے۔ لیکن کبھی بے حجاب سامنے نہیں آتی ہمیشہ شرماتی لجاتی ہے گو محبت چاہتی ہے کہ باتیں کرے مگر وہ شریف حیا پرور لڑکی ہمیشہ اپنے حیا آمیز انداز سے شہزادے کے دل کو اور بھی نیم بسمل کر جاتی ہے۔

"فسانہ آزاد" پڑھ کر لکھنؤ کے بنے ہوئے وقت کی شان آنکھوں میں پھر جاتی ہے نازوں کے پالے ہوئے امیرزادے خوشامدی مصاحبوں میں گھرے ہوئے بٹیریں لڑانے اور بے پر کی اڑانے میں مصروف ہیں محلسراؤں میں بیگمیں بیرونی دنیا سے بے خبر اپنے مشاغل نازیں ہیں مہریاں مغلانیاں لونڈیاں باندیاں اللہ آمین پر سلامی کرنے کو موجود ہیں کسی بیگم کی سواری جاتی ہے تو اس شان سے کہ فینس پر زرکار پردہ پڑا ہے ایک مہری شوخ طرار جوان چست و چالاک بنی سنوری فینس پر ہاتھ رکھے ساتھ ساتھ ہے دونوں طرف دو چوبدار ساتھ دوڑتے جاتے ہیں۔

رنگین مزاج نواب شوخ جوان مہریوں سے مذاق ضرور کرتے ہیں مگر دل لگی کے طور پر اور وہ مہریاں بھی اسی مذاق کو اصلیت نہیں صرف خوش طبعی اور قدر ذاتی سمجھتی ہیں۔ کنواری لڑکیاں اتنی غیور اور باحیا ہیں کہ جب ہمایوں فر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عاشق النسا بیگم بن کر حسن آرا سپہر آرا سے گلے مل کر گئے اور شرمیلی حسن آرا پر یہ راز کھلا کہ عاشق النسا کے پردے میں ہمایوں فر تھے تو وہ زہر کھانے پر غیرت کے مارے طیار ہو گئی چھوٹی بہن نے بمشکل باز رکھا تنقید کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو فسانہ آزاد میں کمزوریاں کافی ہیں لیکن اتنی ضخیم چار جلدوں کی کتاب کو دیکھتے ہوئے پھر سرشار کی روانی انداز بیان کا خیال کرتے ہوئے ان کمزوریوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔

یہ تھا ایک سرسری جائزہ ان کہانیوں کا جو جنگ عظیم سے قبل لکھی گئیں میرا مقصد تو صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اس وقت ملک کی مالی و اخلاقی حالت ایسی نازک نہ تھی جیسی اب ہے ادیب غریب کیا کریں وہ تو سماجی حالت سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں جو کچھ بھی ان کا اثر ہوتا ہے یہ افسانے جو ہماری آپ کی نظروں سے رات دن گذرتے ہیں محض تفریحی نہیں ہیں بلکہ ان کو دیکھ کر اب غور کرنے کا وقت ہے دن بدن بھوک بے چینی اور جنسی انتشار افسانوی ادب میں بڑھتا ہی جاتا ہے اور یہ بکھراؤ اب رسوائی کی حد تک پہونچ گیا ہے اگر جلد ہی ان بے چینیوں کا سد باب نہیں کیا گیا جن کی وجہ سے ایسا ادب پیدا ہو رہا ہے تو وہ وقت دور نہیں کہ ہندوستان کی اخلاقی حالت مغربی ممالک سے بھی بدتر ہو جائے گی کچھ مغربی ادب کے اثر نے دماغوں کو مسموم کیا ہے اور زیادہ تر اقتصادی کمزوری نے یہاں کی اخلاقی حالت کو پست کر دیا ہے۔ اخلاق و تہذیب کی اقدار دن بدن گرتی جا رہی ہیں۔

ان حالات میں ادیبوں پر یہ طے کرنا کہ وہ ایسے افسانے کیوں لکھتے ہیں جن کو دیکھ کر صاحب غیرت کو شرم سے پسینہ آجاتا ہے درست نہیں ہر ادیب و شاعر اپنے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ جو کچھ اپنے ارد گرد وہ دیکھتا ہے محسوس کر کے لکھ دیتا ہے لکھنے والوں کو تنبیہ کرنے سے پیشتر چاہیئے کہ ملک کی اخلاقی معاشی حالت سدھارنے کا فکر کیا جائے ورنہ ہمارے ادب کا بھی اللہ ہی حافظ ہے پرانے نظام کی لاش اب سڑ گل چکی ہے اور اس کی ہی عفونت کبھی آپ کو منٹو کی بو میں ملتی ہے اور کبھی عصمت کے لحاف اٹھانے پر۔

## سوزِ دروں

کچھ ایسا بڑھتے بڑھتے بڑھ گیا سوزِ دروں میرا  
خموشی خود بیاں کرنے لگی حالِ زبوں میرا

یہ اعجازِ محبت ہے، یہی ہے معراجِ الفت کی  
لبِ نازک ترے اور قصۂ حالِ زبوں میرا

کسی کافر کے نقشِ پا کی قیمت کچھ نہیں ہوتی  
اگر مجبور ہو کر سجدہ نہ کرتی سر نگوں میرا

بنا دے گا تماشہ تجھ کو بھی یہ شوقِ تنہائی  
تری دیوانگی کا پیش خیمہ ہے جنوں میرا

مرے رونے پہ تیرا تبصرہ اللہ کی قدرت  
تری تقدیر کا عنواں ہے ہر اشکِ خوں میرا

وہ ٹیسیں ہیں کہ رگ رگ بن گئی ہے نشترِ عریاں  
نہیں معلوم کس رہزن نے لوٹا ہے سکوں میرا

کبھی تجھ کو بھی دردِ عشق تڑپائے گا اے ظالم  
کسی دن تیرے ہی سر چڑھ کے بولے گا فسوں میرا

میں دانستہ فریبِ عشق میں لایا گیا نجمی  
زبردستی کسی نے مجھ سے چھینا ہے سکوں میرا

(نجمی بلاسپوری)


لکس
ٹائلیٹ صابن کے ذریعہ
ستارہ اپنا سادہ
خوبصورتی کا راز تشریح کرتی
ہے
LUX
TOILET SOAP
میں لکس ٹائلیٹ
صابن کا بھرپور جھاگ
تیار کرتی ہوں اور اسے
جلد پر بملائمیت لگاتی ہوں
اسکے بعد میں صاف ستھرے اور
ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالتی ہوں
آخرش باہستگی اپنا
چہرہ نرم تولئے سے
خشک کرتی ہوں
فلمی
اسٹارس کا
حسن بخش صابن
حسین جلد ہی عورت کی ایک بہت بڑی جادو موہنی ہے ۔ آپ اپنے جلد کی لاپرواہی
نہ کیجئے۔ لکس ٹائلیٹ صابن کی ملائمیت کے ذریعہ اس کی حفاظت کریں ۔ فلمی ستاروں کے
بہتر اصول کی پیروی کیوں نہیں کرتے ۔ آپ اس کے ملائم صاف کرنیوالے انجام سے خوش
ہوں گے، اور آپکو اس خوشبودار سفید صابن کا بالائی دار جھاگ حاصل ہو گا جو آپکے قیمتی جلد کو تر و تازہ صاف
شفاف اور ریشم کے مانند ملائم بنائے۔ فلمی ستاروں کے خوبصورتی کے راز کی آزمائش کیجئے
LTS. 140-27 UD
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

# "ان کی ذات"

کہانی

کل شام کی بات ہے کافی ہنس کھیل کر ہم لوگ میدان سے اُٹھے تو شکنتلا نے مُڑ کر کہا۔ "دیکھو، پھر بہاری . . . . ."

شکنتلا کے پتی ذرا جھنجھلا اُٹھے۔ بولے "تو ہوا کیا؟ تم لوگ نہ جانے اتنی دیا کیوں دکھانے لگتی ہو۔ ان لوگوں کی ذات کتوں جیسی ہوتی ہے جہاں ٹکڑا ملا، وہیں کے ہو گئے۔ جب ہمیں اس کی ضرورت ہی نہیں تو کیا کریں؟ سو بار کہا ہے سامنے والے ڈاکٹر صاحب کے یہاں چلا جا۔ دفتر میں کام کرنے کو بھیجا۔ بدتمیز نہ کام کرے تو؟"

میرا ہاتھ پکڑے شکنتلا ایک کنارے ہو گئی۔ بولی "بھابی، تمہیں پتہ ہے نا؟ جب آیا تھا، تن پر کپڑے نہ تھے۔ بات تک کرنے کا شعور نہ تھا۔ اب موہنی بڑی ہو چلی ہے۔ میرے پاس دوسرا نوکر ہے لیکن یہ پھر بھی دس دن سے لگاتار پیچھے پیچھے چکر کاٹ رہا ہے۔ گھر میں بنا کہے کام کرنے چلا آتا ہے۔ کل تو انہوں نے کہہ بھی دیا تھا۔ پھر اگر سیڑھیوں پر قدم رکھا تو تمہاری خیر نہیں۔ پر ایسا ڈھیٹ ہے!

دراصل اس بارہ سال کے پہاڑی چھوکرے کی ایک ٹک آنکھوں سے ایسی ڈھٹائی سی پھوٹی پڑتی تھی جیسے کہ وہ خاموش ہی کہہ رہی ہوں "نہیں جاتا، میں نہیں جاتا"۔

کئی بار سنکر لگتا ہے جیسے کہ ٹھیک ایسا ہی ایک واقعہ پہلے بھی ہو چکا ہے اور سچ کہوں گھر لوٹتے لوٹتے لگ بھگ چار سال پہلے کی ایک ایسی ہی یاد مجھے آ گئی۔

چیتھڑوں کی گٹھڑی بغل میں لئے جس دن سویرے سویرے وہ نیپالی گھر میں داخل ہوا تھا ——— کہاں کے ہو؟ کیا تنخواہ لوگے؟ پہلے کہاں نوکری کی ہے؟ وغیرہ وغیرہ کچھ بھی پوچھنے کی مجھے گنجائش معلوم نہ ہوئی۔ جانے کیوں، کوئی کوئی شکل ایک ہی نظر میں خود بخود جگہ بنا لیتی ہے۔

"بھابی، اس کی گٹھڑی میں تیل ہے۔ صابن کی ٹکیہ اور ایک ٹوٹا کنگھا بھی!" کمل جان دنوں دہلی میرے پاس تھا، بار بار خبریں لاتا۔

اور جب کمل نے حیرت زدہ سا ہو کر کہا۔ "بھابی، وہ تو پڑھنا بھی جانتا ہے" تو ایکا ایک میرے من میں ایک بے بنیاد سا خوش کن تصور گھر آیا۔ اگر یہی میلا کچیلا، گردن جھکا کر چلنے والا نچلے طبقے کا انسان پڑھ لکھ کر، کوٹ پتلون پہن کر کسی جج کی کرسی پر جا بیٹھے تو!

یہی وجہ تھی کہ رسوئی گھر کے کام کے علاوہ بال رامائن، سپت سرج، پریم دوادشی وغیرہ وغیرہ کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں اسے سونپی گئیں۔

بجلی کیسے بنتی ہے، ہوائی جہاز کی ایجاد کس نے کی، ریڈیو کیا ہے ——— نئی دنیا کے ایسے کئی کرشمے گوپال کو کچھ نہیں معلوم۔ اسی لئے جاسوسی اور نئی ایجادوں کی کہانیاں سے کمل دن رات اس کے زرخیز دماغ میں بٹھانے کی کوشش کرتا۔

تمہارے گھر ہے؟ اس میں جنگل ہے؟ اچھا، اس میں شیشے ہیں؟ فرش ہے؟ ——— رسوئی گھر کی چوکھٹ پر بیٹھی ننھی وینا اس سے کئی سوال کرتی مگر گوپال سب سوالوں کے جواب میں صرف سر ہلا ہلا کر "ہاں۔ ہاں" کر دیتا۔

کبھی دوپہر کے سکوت کو اور بھی پُر سوز بناتا ہوا جب وہ زینے پر بیٹھا بنسی بجانے لگتا تو مجھے خود بھی ایسا جان پڑتا جیسے اس کی آنکھوں کے آگے دھان کے ہرے کھیت اور بیچ بیچ میں موتیوں سے جڑے پوست کے لہلہاتے کھیت، بھیڑ بکریوں کے جھنڈ، اونچے نیچے پہاڑی گاؤں اور عزیز و اقارب منقش ہو اٹھے ہوں۔ تھوڑے ہی عرصے میں گوپال بھی اسی اشتیاق اور مسرت سے کمل کے ساتھ روز شام کے وقت، اس کے بابا کے گھر لوٹنے پر نیچے دوڑ جاتا، اور گاڑی میں سے کاغذ پتر اور دوسری چیزیں اٹھا لاتا۔

میز اور پلنگ وغیرہ گھر کی ہر ایک چیز کو گوپال اپنی اپنی جگہ پر سلیقے سے رکھتا۔ صرف یہی نہیں، اس نے اپنے رسوئی گھر کو بھی طرح طرح کی تصویروں اور کیلنڈروں سے آراستہ کر لیا۔ دیوالی کے دن تو اسی نے اپنے خود اپنے جمع کئے ہوئے پیسوں سے کاغذ کی بیلیں، پنکھے اور فانوس لا کر سجایا۔

ڈاک والا جب خط لاتا تو وہ بڑے اشتیاق اور تجسس سے پوچھتا "لاہور والے جیجا جی کی چھٹی آئی ہے؟ دلی والی بہن جی آ رہی ہیں کیا؟" جیسے ہمارے سبھی بھائی بند اس کے رشتہ دار ہوں۔

کمل جب سامنے گھر کی اوپر والی منزل میں اپنے ساتھیوں کو تالی بجا بجا کر بلاتا اور وینا اپنی لمبی چیخوں سے سارے گھر کو سر پر اٹھا لیتی تب گوپال کا جی اچھل پڑتا۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں ہوتا کہ وہ کیسے ان کے ساتھ ناچنے اور تالی بجانے کی فطری خواہش کو روکے ہوئے ہے۔ وہ پتنگ پکڑ پکڑ کر کمل کو لا کر دیتا۔ رات کو پڑوسیوں کے نوکروں پر رعب گانٹھنے کے لئے جب وہ برآمدے میں چارپائی پر سفید چادر بچھا اور تکیہ لگا پاؤں پھیلا کر سوتا تو کمل مجھے کھینچ کر لے جاتا "دیکھو بھابی، گوپال کی شان"

لیکن محض ایک محبت بھری نظر پا کر ہی وہ کسی وقت اپنا اتنا حق سمجھنے لگے گا، اسکا مجھے خواب میں بھی خیال نہ تھا۔

ایک دن بارہ بجنے کو آئے۔ کمل اور اس کے بھائی کمپنی کرتا ہر کام پر چلے گئے۔ گھر کا کام دھندا میں نے آپ ہی کیا۔ گوپال اوندھے منہ چھت پر پڑا رہا۔ شاید رات کسی وجہ سے اسے ڈانٹ پڑی تھی اور انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ "فضول تم گدھے کو گھوڑا بنانا چاہ رہی ہو۔"

مجھے خود بھی اسکے روٹھنے کی پرواہ

ستیہ وتی ملک

نہیں تھی۔ لیکن جب دوپہر ڈھلنے کو آئی تو مجھ سے بھی کھایا پیا نہیں گیا۔ پڑوسیوں کے نوکر کو بھیج کر میں نے اسے بلوایا ــــ "کیوں رے، کس لئے اوندھا پڑا تھا؟ لاٹ صاحب کہیں کا! بچوں پر غصہ نہیں کرتے کیا؟ اس کمل کو ہی کئی بار تیرے سامنے ڈانٹ پڑی ہے، چل کھانا کھا لے۔"

گوپال کی لال لال سوجی آنکھوں میں لاڈلے بچوں کی سی ڈھٹائی ابھر آئی۔

"بابو جی مار لیتے، پیٹ لیتے، پر چلا جا یہاں سے چلا جا! ایسا کیوں کہا"؟

اتنا کہہ کر وہ زور سے رو اٹھا۔

"اوہ، یہ بات ہے!" مجھے حیرت بھری ہنسی آگئی۔

ایک دن دوپہر کو کمل کی تالیوں کے مارے سارا گھر گونج اٹھا۔ "منوہر آگیا منوہر آگیا!"

"ماں جی، اماں کی بیماری کی وجہ سے میں جلدی نہ آسکا۔ میرا قصور معاف کر دو۔" ایسا کہتے ہوئے پرانے نوکر منوہر نے گٹھڑی میں سے بھنے چنے اور کچھ گڑ نکالا۔ "اماں نے دئے ہیں۔"

"ماں جی، گھر میں گائیں بیائی تھیں۔ بتا کا کاج کرنا تھا اور آنے کے دن تو ماں ایسی روئیں۔۔۔۔۔۔"

مجھے یاد آیا جب وہ دیہاتی زبان میں لکھی ہوئی چٹھیاں لے کر مجھ سے پڑھوانے آیا کرتا تھا جن میں اکثر لکھا ہوتا تھا "تو چلا آ جنم بھر کمانے کو رکھا ہے۔ اماں اندھی ہوئی جا رہی ہے۔"

"ہاں تو یہ پھول دان نئے آئے ہیں؟ یہ برتن کیسے پھوٹ گیا؟" منوہر نے آتے ہی گھر بھر کی جانچ پڑتال شروع کر دی۔

ہم نے ایک بلی کا بچہ پالا تھا۔ دنیا اسے کتنا پیار کرتی تھی۔ وہ دم ہلا ہلا کر میرے پیچھے پیچھے بھاگتا تھا۔ لیکن جانے اس گوپال نے اسے کہاں پھینک دیا۔ یہ کرسی بھی تو اسی نے توڑی ہے۔ وہ شیشے کی خوبصورت صراحی بھی اسی کے ہاتھوں پھوٹ گئی۔" گوپال کی پچھلی سبھی غلطیاں کمل جی ہنس ہنس کر منوہر کو سنانے لگے دنیا دھم دھم کرتی بار بار منوہر کی گودی میں اچھل جاتی۔

ادھر اشد رسا، حواس باختہ سا گوپال آنکھوں میں انتہائی اضطراب کے آنسو بھرے میرے پلنگ کے سرہانے سر جھکا کر آ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ زور زور سے کانپ اٹھے اس کی پُر الم ہی سی شکل سے میں نے اسکا مدعا کچھ کچھ جان بھی لیا۔ لیکن پرانے نوکر منوہر کے آجانے سے مجھے گھر کے کام کاج سے کافی چھٹکارا مل رہا تھا اسی لئے میں نے کہا۔ "گوپال وہاں سامنے والے گھر میں جگہ خالی ہے۔ میں نے ان لوگوں سے کہہ بھی دیا ہے۔"

اس نے بھرائی ہوئی آواز سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کہہ نہیں سکا۔ ہمارے دھوئے ہوئے کپڑے اتار کر اس نے پھر سے وہی چیتھڑوں کی گٹھڑی اٹھائی اور اس جگہ کو جہاں پھولوں کو وہ پانی دیا کرتا تھا، رسوئی گھر کی ان دیواروں کو جنہیں اس نے تصویروں اور بیل بوٹوں سے سجا رکھا تھا، اس جگہ کو

## غزل ——— شکور احمد رعنا

تیری بدولت گردشِ قسمت کوئی گھڑی آرام نہیں
شام کی دنیا صبح نہیں اور صبح کی دنیا شام نہیں
حسن کا جلوہ چار طرف ہو عشق کا جذبہ عام نہیں
دل میں تمہاری یاد سلامت لب پہ تمہارا نام نہیں
اک وقت کچھ ایسی دنیا تھی جب مے کے مطابق جام نہ تھا
اسوقت کچھ ایسی دنیا ہے مے آج لبقیدِ جام نہیں
منزل کا تعین اب کیا اب راہروِ بے منزل ہوں
کیا پختہ مزاجی عشق کی ہے اب کوئی خیالِ خام نہیں
دیکھا بھی اس نے میری طرف بے معنی و مقصد دیکھ لیا
کیا کیجئے ایسی نظروں کو نظروں میں کوئی پیغام نہیں
عشق و وفا کے بندوں سے کچھ کام کی باتیں کرنی ہیں
دیوانوں کا پیغمبر ہوں میں اہلِ خرد سے کام نہیں
دنیا نے محبت سی شے کو کیوں درد کا الٹا نام دیا
اس دردِ محبت کے صدقے دل میں ہے خلش آرام نہیں
اللہ کہیں ایسا ہی کرے الزامِ محبت سچا ہو
یہ بات نہ آئے کہنے میں الزام بجز الزام نہیں
کیا حسن پہ اپنے نازاں ہو کچھ ویسی ہے درد دل ہی نہیں
ہنگامۂ ہستی بیجا ہے فطرت کا یہ انعام نہیں
کافر ہے اگر کافر ہی سہی کیا ترکِ محبت کر دونگے
کفر اسکا بجز کفر تو ہے اسلام یہاں اسلام نہیں
اس میکدۂ ہستی کے سب شیشہ و ساغر جھوٹے ہیں
تقدیر سے رعنا ملتی ہے وہ مے جو لبقیدِ جام نہیں

جس پر بیٹھ کر وہ کمل سے سبق پڑھا کرتا تھا حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا وہ آہستہ آہستہ چل دیا۔

---

کتنے آئے اور کتنے گئے! ٹھیک ہے، ان لوگوں کی ذات ہی ایسی ہے۔ لیکن وہ چوٹ کھائی سی چھلچھلاتی آنکھیں، وہ کانپتے ہاتھ اور وہ ایک ٹک نظر جس سے، چلے جانے کے بعد دوسرے دن بھی وہ سامنے کے گیٹ پا تھ سے میری طرف لگاتار دیکھتا رہا تھا، شکنتلا کے نوکر کی بات سنکر اپنے آپ ہی رہ رہ کر دل میں ابھر رہی ہے۔

# نفسیاتی گتھیاں اور شاعری

مرزا عابد عباس

شیکسپیر کے ہمعصر فرانسیسی ڈرامہ نگار مولیئر (Molier) کے ایک ہیرو کو انتہائی استعجاب ہوتا ہے جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمامی عمر نثر بولتا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح ہماری روزانہ کی زندگی میں خود ہمارے دماغ سائنٹفک اور نفسیاتی اصولوں کو نادانستہ طور پر سمجھتے بوجھتے رہتے ہیں اور ان پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ دوکاندار بالکل معمولی چیز کو اس ڈھنگ سے سجاتا ہے کہ خریدار کا دل بے اختیار ہوجاتا ہے۔ پان سیگرٹ والے کی دوکان پر خالی سیگرٹ کے پیکٹوں کے ہار، مٹھائی والے کی دکان پر مٹھائی کے بے رونق ڈلے اس طور پر ترتیب دیئے جاتے ہیں کہ نظر جم کر رہ جاتی ہے۔ پھر شب میں اگر ایک نے اپنی دکان کو سیلاب نور کا مصداق بنا دیا ہے تو دوسرے نے چند چھوٹے چھوٹے بلب لگا رکھے ہیں جو باری باری جلتے ہیں اور گذرنے والوں کی نظر کو متوجہ ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پھر خرید و فروخت کے مسائل اس نفسیاتی پیرایہ میں طے ہوتے ہیں کہ خریدار کو اپنی جان چھڑانی مشکل ہوجاتی ہے۔ ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ان لوگوں کو نفسیات کے ان شعبوں کا جن سے وہ تعلق ہوتے ہیں ماہر کہہ دیا جائے تو غالباً ان کو مولیئر کے ہیرو سے زیادہ استعجاب ہو۔

اس میں شک نہیں کہ گذشتہ صدی سے نفسیات نے اس قدر ترقی کی ہے کہ وہ تمام علوم پر حاوی ہونے کے علاوہ ہماری روزانہ کی زندگی کی شاہرہ پر پولیس مین کی حیثیت رکھتی ہے۔ نادانستہ واقفیت سے قطع نظر کر کے جب ہم حد شعور میں آتے ہیں تو علم کے ہر شعبہ کو نفسیات کا باجگذار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ صنعت و حرفت سے لے کر بچوں کی تربیت تک ہر گلی، ہر راستے، ہر چوراہے پر نفسیات کا پہرہ دار ہم کو نشان منزل دیتا رہتا ہے۔ علم طبیعات کے ساتھ ساتھ حرکت اور قوت کے توازن کو کس نے درست کیا۔ تھکن اور آرام کے مسائل کو کس نے حل کیا۔ آج کسی ٹرننگ کالج کے معلم یا متعلم سے پوچھئے کہ اس کے درس و تدریس کی روح کیا ہے کیا بچوں کے مزاج، ان کی عادتیں، ان کی ذہنی نشوونما، ان کی تدریجی ترقی، ان کی طبیعی اور ذہنی عمر کا ایک دوسرے سے تعلق، ان کا میلان طبع اور ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر ان کی تربیت کے صحیح اصول تحقیقات علم نفسیات کے محتاج نہیں۔ خود نفسیات کی تعریف کہ وہ فرد کے حرکات و سکنات کا ماحول کے تعلق سے مطالعہ کرتی ہے کیا اس بات کی دلیل نہیں کہ فرد کی ہر حرکت نفسیات کی سرحد میں آجاتی ہے اور اگر نفسیات اس کو نظر انداز کرے تو وہ ایک مکمل علم نہیں مگر نفسیات اس کو نظر انداز کرے ہی کیوں؟ اس نے تو قانون کا بھی مطالعہ کیا ہے اور مجرمانہ ذہنوں کا بھی پھنسی پھوڑوں کو جراح کے لیے چھوڑ کر ذہنی اور دماغی امراض کے نئے تجزیۃ النفس کے نسخے بھی تیار کئے ہیں۔ کیا آج کوئی اس دعوے سے منکر ہوسکتا ہے کہ مجرموں کی دماغی تشکیل عام انسان سے مختلف ہوتی ہے اور سینکڑوں جرائم صرف اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ مجرم ان کے کرنے کیلئے مجبور ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر نفسیات کی یہ پکار کہ مجرموں کو بجائے جیل کے دماغی ہسپتالوں میں بھرتی کرایا جائے قابل سماعت ہے یا سمع خراش۔

تعارف کی حد تو ختم ہوئی اب مجھے نفسیات کا قصیدہ پڑھنا نہیں کیونکہ قصیدہ کا زمانہ اب کہاں؟ یہاں مجھے صرف ان گتھیوں، ان الجھنوں، ان احساسات سے بحث ہے جو عالم طفلی میں ایک بچے کے ذہن میں پیدا ہوجاتے ہیں اور ان کی نشوونما خود بچے کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ یہی بچے جوان ہوکر جب عالم فاضل، سیاسی لیڈر، سماجی رہنما، اخلاقی مصلح، ادیب یا شاعر کی شکل میں عوام کے سامنے آتے ہیں تو ان کے قول و فعل، حرکات و سکنات، نشست و برخاست میں ان احساسات کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جن سے ہم کو انسان کے کیریکٹر کا مطالعہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ انسان خود اپنی زندگی کے صرف ایک جزو سے واقفیت رکھتا ہے۔ سینکڑوں احساسات اور خیالات دفینے کی حیثیت سے دماغ انسانی میں محفوظ رہتے ہیں۔ صفحۂ زندگی پر قائم ہوجانے والا کوئی بھی نقش بقائے حیات تک مدہم تو ہوسکتا ہے مگر مٹ نہیں سکتا۔ وقتی طور پر وہ دماغی کیفیات کے پس منظر میں چلا جاتا ہے اور وہاں سے برابر اپنے مظاہرے کے لئے راہیں ڈھونڈتا ہے۔ انھی نقوش کا دفینہ لاشعور کے نام سے موسوم ہے اس لاشعور میں انسانی زندگی کا نصف سے زیادہ حصہ چھپا ہوا ہے۔ اس میں وہ تمام چیزیں جو بیک وقت حد شعور میں نہیں رہ سکتیں اور وہ جذبات و احساسات و خواہشات جو کسی سبب سے فرو کر دیئے جاتے ہیں یا کچل دیئے جاتے ہیں۔ ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ زندگی کا ہر باب، ہر تشکیل و تعمیر یہاں تک کہ تخریب بھی لاشعور کی محتاج ہے۔ اگر یہ ایک طرف انسان کو اشرف المخلوقات بنا سکتی ہے تو دوسری طرف وحشی درندوں سے بھی پست کر دیتی ہے۔

لاشعور کے نقوش کا مظاہرہ یا ان کشتہ جذبات کا جو اس میں محفوظ ہیں کسی نہ کسی طرح راہ پانا از بس ضروری ہے اور اگر ان کو اور کوئی راہ فرار یا راہ تسکین نہیں ملتی تو یہ حالت نوم بذریعہ خواب اور جاگتے میں ہوائی قلعے تعمیر کرنے میں آسودگی پا جاتے ہیں لیکن ان کا مکمل مظاہرہ اشعار میں ہوتا ہے۔

شعر جذبات شاعر کا آئینہ دار ہوتا ہے وہ اس کی روحانی اولاد ہوتی ہے۔ اور یقیناً اس سے شاعر کے لاشعور کے چھپے ہوئے خزانے منصۂ شہود پہ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ شاعر ذکی الحس ہوتا ہے اور اپنے احساس کو الفاظ کا جامہ پہنانا جانتا ہے۔ اور لاشعور کا دریا جب روانی پہ آتا ہے تو ہر بندش کو توڑتا ہوا ان تمام سنگریزوں کو بھی بہا لیجاتا ہے جن کو اپنے مقام پہ ہی رکنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر عوام سے کچھ مختلف طبیعت رکھتا ہے اور اکثر پاگل اور ہم لوگوں کی زبان میں کریک ( Creek ) وغیرہ کا بھی لقب پاجاتا ہے۔ وہ اس بات کو کہتے ہوئے نہیں ڈرتا جس سے عوام کسی نہ کسی مجبوری سے احتراز کرتے ہیں۔ وہ آزادی سے اپنی رائے سیاست، معاشرت، اور اخلاقیات پہ صادر کرتا ہے اور اگر ان میں کوئی سقم پیدا ہوگئے ہیں تو کھلے بندوں ان پہ اعتراض کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کا کلام نہ صرف اس کے جذبات کا بلکہ اس کے زمانے کے احوال کا بھی آئینہ ہوتا ہے۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا (میرؔ)

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں (غالبؔ)

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں (انشاؔ)

دور حاضرہ کا شاعر جب سیاست کی گھاگھمی دیکھتا ہے اور تقسیم دولت سے غیر مطمئن ہے تو وہ کہتا ہے۔

بول اری او دھرتی بول — راج سنگھاسن ڈانواں ڈول (مجازؔ)

اور اس کو تشبیہیں بھی یہی ماحول مہیا کر دیتا ہے۔

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں (مجازؔ)

زندگی کی مصروفیات سے گھبرا کر جاں نثار اختر اپنے اوقات محبت میں سے وقت کاٹتے ہیں اور معذرت کرتے ہیں کہ "زندگی فرصت محبت ہی نہیں، انجم"

لاشعور میں ان دبی ہوئی جذبات کی چنگاریوں کے علاوہ ایک اور زبردست احساس ہوتا ہے وہ دماغ کی مدافعانہ ساخت ہوتی ہے۔ میرے خیال سے کوئی شخص بھی ایسا نہ ہوگا جس نے یہ نہ محسوس کیا ہو کہ بچے کو گندگی سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ مٹی میں کھیلنا تو جناب کا شغل خاص ہے۔ جہاں اس قابل ہوئے کہ گھٹنیوں چل سکیں بس پھر تو زمین ہے اور جناب ہیں جہاں گشت سے مقابلے کا دعویٰ۔ اور پھر یہیں تک نہیں۔ اسی مٹی اور اس میں ملی ہوئی غلاظتیں کوڑا کرکٹ وغیرہ کو غذا کی جگہ استعمال کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن تعلیم و تربیت اس خواہش کو اس طور پر دباتی ہے کہ یا تو اس کی ضد مزاج میں پیدا ہو جاتی ہے یا یہ ناپاک سے ناپاک چیزوں کی خواہش میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پہلی صورت میں دماغ میں مدافعانہ ساخت پیدا ہو جاتی ہے اور دوسری میں ارتفاعی۔ ہماری شاعری میں ان دونوں کی مثالیں جگہ جگہ موجود ہیں۔ اقبالؔ "ترانۂ خودی" میں ایک قطعہ انسان کی زبان سے خدا کے جواب میں کہلواتے ہیں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یگانہ چنگیزی بھی مدافعانہ رنگ میں ڈوب کر کہتے ہیں۔

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی — لے دعا کر چکے اب ترک دعا کرتے ہیں

اور جوشؔ کی تو بغاوت ظاہر ہے۔

ممنوع شجر سے لطف پیہم لینے — طوبیٰ کی گھنی چھاؤں میں کچھ دم لینے
آوارہ و جوشؔ کشمیر آپہنچا — اللہ سے انتقام ارم لینے

لیکن ہمارے شاعر پہ اکثر رنج و غم کی انتہا ہو کر ایک ایسا عالم ارتفاعی بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کو غالبؔ نے جگہ جگہ لکھا ہے۔

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج ؛ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں
عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ؛ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اسی سلسلے میں غالبؔ کا ایک اور شعر بھی قابل سماعت ہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے ؛ مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

لاشعور کے اندر ایک اور زبردست احساس ہوتا ہے جس کو تجزیۂ النفس کے پہلے اسکول نے بنیادی احساس مانا ہے۔ یہ لاشعور کی الجھنوں کی جڑ ہے اور باقی تمام گتھیاں اس کی شاخیں۔ اس احساس کا نام یونان کے تخیلی بادشاہ کے نام کے اوپر احساس اڈیپس ہے۔ اس کا مختصر افسانہ یہ ہے کہ اڈیپس کے باپ شاہ تھیبس نے اس کے پاؤں میں میخ ٹھونک دی تھی کیونکہ اس کے متعلق پیشین گوئی تھی کہ وہ اپنے باپ کو قتل کر کے اپنی ماں سے شادی کرے گا۔ لیکن ایک ہمسایہ ریاست کے بادشاہ نے اس کو بچا کر اپنا بیٹا بنا لیا۔ اڈیپس کی پرورش ہوتی رہی اور وہ اپنے حقیقی والدین سے لاعلم رہا۔ یہاں تک وہ پیشین گوئی اس کے کان تک پہنچی۔ اس خوف سے کہ کہیں ایسا کر نہ بیٹھے وہ بھاگ کھڑا ہوا اور اتفاقیہ جنگل میں اپنے حقیقی باپ سے ملا۔ اس سے جھگڑا کیا اور اسے قتل کر دیا۔ صحرا نوردی ہی کے عالم میں وہ تھیبس پہنچا اور ( Sshinx ) کا معمہ حل کر کے ریاست کو مصیبت سے چھٹکارا دلا کر وہاں کا بادشاہ چن لیا گیا۔ بیوہ ملکہ اس کی زوجیت میں دی گئی۔ جب اس معصوم گنہگار جوڑے کے چار بچے ہو چکے تو اڈیپس کو اصلیت سے آگاہی ہوئی تب اس نے اپنی آنکھیں نکال ڈالیں اور تمام عمر مصیبت میں بسر کی۔

اس اصول کی بنا پر کہ سخت سے سخت ممنوعات کی زبردست سے زبردست خواہش فطرتِ انسانی میں پائی جاتی ہے یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ماں سے شادی کی خواہش بچے کے اندر زبردست ہونا چاہئے۔ کیونکہ اصولِ اخلاق، مذہب اور سیاسی قانون سب ہی اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ اسی بنیادی اصول پر تجزیۃ النفس کے پہلے اسکول نے اس احساس کا نام اس کہانی کے تعلق سے احساسِ اڈیپس رکھا ہے ان کے نزدیک تمام دماغی گتھیاں اسی احساس سے پیدا ہوتی ہیں اور احساسِ کمتری (Inferiority Complex) تو گویا اس کا چھوٹا بھائی ہی سمجھنا چاہئے۔ یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ بچہ اپنی ماں سے بلا شرکتِ غیرے محبت کرنا چاہتا ہے۔ اور ہر وہ شخص جو اس کی محبت میں شریک ہونا چاہتا ہے اس کا دشمن ہے اور بچہ ہر ممکن کوشش سے اس کو دور کرنا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک خاص عمر میں اس کو اپنے باپ اور بہن بھائیوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ ان کو دور کرنے کے سلسلے میں ان کی موت تک کی خواہش کرتا ہے کیونکہ موت کا مفہوم اس کے ذہن میں اس قدر ہولناک نہیں جتنا کہ وہ دراصل ہے۔ لیکن بچے کو فوراً اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ لوگ اس کی نفرت کے باوجود اس کی محبت میں شریک ہیں۔ یہی چیز احساسِ کمتری بن کر اس کے لاشعور میں جذب ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے اس کے سن و سال میں ترقی ہوتی جاتی ہے وہ ہر چیز کو اصلیت کی روشنی میں دیکھتا جاتا ہے اور ماحول سے مناسبت پیدا کرتا جاتا ہے۔

تجزیۃ النفس کے اسکول کے احساسِ اڈیپس اور بچے کی خواہشِ جنسی اور خواہشِ نفسی کے دعوے اگرچہ حدِ اعتدال سے گذر گئے ہیں لیکن یہ مسلمہ امر ہے کہ بچے اپنی ماؤں کی گود میں دوسرا بچہ نہیں دیکھ سکتے اور خود دو یا تین برس کا بچہ اپنے ننھے منے بھائی یا بہن کے پیدا ہوتے ہی یہ پوچھتا ہے کہ یہ کب مرے گا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اگر ان ننھے منوں کو یہ حضرت اکیلا دیکھ پاتے ہیں تو فوراً آنکھ میں انگلی گھسا دیتے ہیں یا تھپڑ یا لکڑی سے مرمت بھی کر دیتے ہیں۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ تمام احساسات اور خواہشات کے ساتھ نفسانی اور جنسی خواہشات بھی نشو و نما پاتی رہتی ہیں اور یہی خصوصیت کے ساتھ ضبط اور دباؤ کی حدیں آتی ہیں جس قدر ضبط اور دباؤ راسخ ہوتا ہے اتنی ہی قوت کے ساتھ یہ راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے ؛ رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

باجوش سے باندازِ خاص یوں سنئے :۔

کیا کیا نہ کئے خدا نے جنت میں جتن ؛ آدم نے مگر گناہ کر کے چھوڑا

چونکہ نفسیات میں "محبت" نام کا کوئی لفظ نہیں بلکہ وہ اسی احساس کا مرادف ہے لہٰذا اس احساس کو لے کر شاعر جب صفحۂ قرطاس پر اپنے جذبات کے ٹکڑے پیش کرتا ہے تو عشق و محبت کی داستان سب سے آگے ہوتی ہے۔ کونسے ملک کی شاعری ایسی ہے جس کی روح یہ داستان نہیں، کہاں کے شعرا نے محبت کے دیوتا کے قدموں میں عقیدت کے پھول نہیں چڑھائے۔ کس دیارِ سخن نے اقلیمِ حسن کا باج ادا نہیں کیا۔ بالخصوص اردو شاعری کی تو یہ رگِ جان ہے۔ اردو شاعری کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ اور موجودہ دور تک ہر صنفِ سخن میں اسی کا اثر غالب رہا۔ حد یہ ہے کہ مرثیہ گو شعرا تک نے سب سے پہلے اسی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ دورِ حاضر کے شعرا جنھوں نے سیاست و معاشرت کو مرکزِ تخیل بنا لیا ہے خود اسی دیوتا کے پرستار رہ چکے ہیں۔ یہاں پر چند مثالیں صرف ان تحریکوں کی پیش کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اخلاقی اور معاشرتی پابندیوں کو پس پشت ڈال کر ان جذبات کے مظاہرے کے لئے راہیں ہموار کیں اور اونچے پلیٹ فارم پیدا کئے۔ اس میں سب سے زیادہ حصہ شعرائے لکھنؤ کا ہے اور غزل اس کا ذریعہ خاص ہے۔ شعرائے دہلی کا محبوب شعرائے فارس کے تتبع میں مرد ہی ہوتا تھا اور اکثر شعرا کے اشعار سے امرد پرستی کا دھوکہ ہی نہیں بلکہ یقین ہوتا ہے مگر یہ طے شدہ ہے کہ ان کا تخیلی محبوب خواہ کسی صنف کا ہو اشعار سے مرد ہی ظاہر ہوتا تھا کیونکہ رواج یہی تھا اور ان کو اصلیت کی طرف متوجہ ہونے سے سوسائٹی کی پابندیاں مانع ہوتی تھیں۔ مگر شعرائے لکھنؤ نے اگرچہ فعل تو مذکر ہی رکھا مگر لوازماتِ محبوب صاف صاف غمازی کرتے ہیں کہ اس پردۂ زنگاری میں محبوب وہی ہے جس کو ہونا چاہئے۔

انشا اور جرأت کی غزلیں بھی اسی سرحد سے ملی ہوئی ہیں۔ خیر ان کو بھی رند کہہ کر چھوٹ جائیے مگر آتش جیسے بزرگ مست کو کیا کہئے۔ میر حسن کی سحر البیان، نسیم کی گلزارِ نسیم اور سب سے زیادہ نواب مرزا شوق کی تمام مثنویاں کیا ان تمام بزرگوں کے شایانِ شان ہیں۔ مگر یہ رو ایسی ہے کہ اگر بہہ نکلے تو پھر اس کے نزدیک شاہ، اور شاہ صاحب سب ایک ہو جاتے ہیں۔ داغ پر تو بازاریت کا داغ ہے ہی، امیر مینائی تو بڑے صوفی تھے۔ ذرا ان کا دیوان اٹھا کر دیکھئے کہیں کہیں داغ بھی ہاتھ باندھے نظر آئیں گے۔

اب ذرا عصرِ حاضر کے ان نوجوان شعرا پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے چلئے جو ہر جگہ بغاوت کا بھوت اپنے سر پہ لئے پھرتے ہیں۔ سب سے اہم اور سب سے زبردست تحریک ان کی یہ ہے کہ شاعری بالکل فطرت کے مطابق ہونا چاہئے۔ اسی سلسلے میں غزل کی ہر دلعزیزی کم ہونا شروع ہو گئی۔ مغرب سے نظم کی (Technique) اردو میں رائج ہوئی۔ آزاد نظم کی ابتدا ہوئی اور فعل جو اب تک ہر عریانیت کے باوصف مذکر ہی تھا مؤنث کر دیا گیا۔ سلمیٰ۔ انجم۔ ثریا۔ نجمہ۔ رضیہ۔ نسیم غرضکہ ہر ممکن مسلم نام اپنی نظم میں لانا فیشن ہو گیا۔ اور اردو شاعری اینٹوڈیٹ ہو گئی۔

یہ تھا احساس الیکٹرا کمپلیکس اور جذبات جنسی و نفسانی کا مظاہرہ اور اس کی مختلف شکلیں۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ مختصر سا تذکرہ احساس کمتری کا بھی سن لیجئے۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ بچہ حد شعور میں آتے ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ہی دنیا میں ایک فرد نہیں بلکہ ہر کام میں ہر حیثیت سے دوسرے شریک ہیں اور یقیناً اس سے زیادہ قوت اور فہم رکھتے ہیں۔ وہ سینکڑوں میں سے ایک ہے اور وہ بھی بے حقیقت۔ یہی احساس قوی ہو کر اس کے اندر ڈر۔ خوف۔ شرمیلا پن وغیرہ کو لاشعور کے اندر پرورش کرتا رہتا ہے اور آپ کو تعجب ہوگا کہ دنیا کے وہ لوگ بھی جن کو ہم ان کی کامیابی کے اوپر مغرور خیال کرتے ہیں دراصل قریبی تجزیہ پر احساس کمتری کا شکار پائے جاتے ہیں۔ وہ اس احساس کو دور کرنے کے لئے زبردست کوشش کرتے ہیں جس طرح یونان کے مشہور مقرر ڈماستھنیز نے اپنی لکنت کو اس طرح دور کیا کہ وہ سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر کنکریاں منہ میں رکھ رکھ کر بولا کرتا تھا۔ اور آخر کار وہ دنیا کے خوش بیان مقرروں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح امریکہ کے سابق صدر روزویلٹ نے اسی احساس کو جو ان کے اندر جسمانی کمزوری کے باعث پیدا ہو گیا تھا شہسواری سے دور کرنے کی کوشش کی مگر نفسیاتی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کاوشوں سے اس احساس پر پردہ تو پڑ جاتا ہے مگر وہ احساس مٹتا نہیں۔

یہی احساس تمام شعرا اردو میں بھی موجود ہے۔ کیا محبوب کے در پر ناصیہ فرسائی کرنا۔ اس کے ہر ظلم کو برداشت کرنا۔ رقیبوں کے طعنے سننا حد یہ کہ دربان کی بھی جوتیاں کھانا کوئی قابل فخر بات ہے مگر وہ احساس دماغ کی گہرائی سے نکل کر شعر کی شکل میں کاغذ پر آتا چلا جاتا ہے۔

(غالب) گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر  جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
(امیر) وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں  میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں
(مومن) اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل  میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا
(غالب) گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی  اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

تقدیر پر شاکر رہنا بھی دراصل احساس کمتری کا مظاہرہ کرنا ہے اور اس نغمہ سے شعرائے اردو کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔

در پر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے  وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے (غالب)

یا۔  پیش آتا ہے وہی جو کچھ کہ پیشانی میں ہے

اکثر جگہ اس قسم کے بھی اشعار ملیں گے

(درد) تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو  دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
بھلا ہمت اور عزم جرأت الفت ارے توبہ  تمہیں نے ابتدا کی تھی حیا تک کا پڑا تھا ہی

ان شعروں سے دھوکہ کھا جانا ممکن ہے مگر جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یہ ایک پردہ پوشی ہے۔ جوش کے ایک قطعہ کے بعد کے دو مصرعے ہیں۔

جیسے کتنے بہادری کے کام  بزدلی کی مدد سے ہوتے ہیں

اسی طرح ہر شخص اپنے اس احساس کو غرور۔ تکبر۔ فخر و امتیاز کے پردے میں چھپا رکھنا چاہتا ہے۔

صرف یہی ایک راہ نہیں جس سے احساس کمتری کو تسکین ملتی ہو بلکہ شعرا کی آپس کی رقابت، خود کو دوسروں پر ترجیح دینا، سودا و میر، انشا و مصحفی، ناسخ و آتش، غالب و ذوق، داغ و امیر کی آپس کی چشمکوں نے بھی اسی جذبہ کو آسودگی بخشی ہے۔ اور دراصل مقطع میں سخن گسترانہ بات آ پڑتی نہیں بلکہ قصداً لائی جاتی ہے۔

دور حاضرہ کی انقلابی شاعری تمام کی تمام اسی ذیل میں آجاتی ہے۔ سرمایہ۔ سیاست۔ معاشرت وغیرہ کے خلاف بغاوتیں دراصل اپنے احساس کمتری پر قابو پانے کے ذریعے ہیں۔ مگر غیر شعوری۔ حد یہ کہ خدا کے خلاف جس قدر کفر بکا جاتا ہے وہ بھی شاعر کے اس احساس کا سب سے بڑا پردہ ہے۔

جوش جرعۂ غم سے مست ہو کر کہتے ہیں:۔

زمین کیسی فلک کو پست کر دوں  خودی کیسی خدا کو مست کر دوں

اگرچہ ان گتھیوں کی حد نہیں جو دماغ انسانی میں لاشعور کے زیر نگیں پرورش پاتی رہتی ہیں مگر چند جو خاص تھیں وہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیں۔ سب سے زبردست چیز یہ ہے کہ انسان چونکہ فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے اس وجہ سے ہر پابندی کو خواہ وہ سوسائٹی کی ہو یا مذہب کی، خواہ وہ اخلاق کی ہو یا سیاست کی کچل دینا چاہتا ہے۔ شاعر کا دماغ چونکہ بے انتہا ذکی الحس ہوتا ہے لہٰذا وہ آزادی کے ساتھ شیخ و برہمن کی ٹانگیں گھسیٹتا ہے اور ہر اس اصول کی مخالفت کرتا ہے جو آزادی کے منافی ہے۔ مگر چونکہ خود اس کا دماغ بھی ان نفسیاتی محرکات کا شکار ہوتا ہے لہٰذا وہ اقبال کی شکل میں ایک وقت ترانہ سناتا ہے تو دوسرے وقت ترانہ ملت۔ جوش کی شکل میں ایک وقت کہتا ہے کہ

اللہ کو تہلکہ بنانے والے۔ اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

تو دوسرے وقت کہتا ہے

فاقے کرتے ہیں شکار لاکھوں بندے  اللہ کی یہ وعدہ خلافی افسوس

بعض وقت اس کی سمجھ بھی نہیں آتا کہ کونسا جذبہ لاشعور سے شعور کی سرحد میں داخل ہونا چاہتا ہے۔

(جگر) یہ کیا مقام عشق ہے ظالم کہ ان دنوں  اکثر ترے بغیر بھی آرام آ گیا
(جوش) پہلو میں ہیں وہ پھر بھی ہے یہ بے چین  معلوم نہیں میری تمنا کیا ہے

اب اگر اردو شاعری کو کسی مقصد اور مفہوم سے وابستہ کرنا ہے تو شعرا کو تجزیۃ النفس کے ذریعہ اپنی دماغی گتھیوں کو سلجھانا پڑے گا پھر وہ کسی ایک مقصد پر قائم ہو سکتے ہیں اور یہ غالباً ایک شاعر کے لئے ناممکن ہے۔

حدیث دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد

---

خط و کتابت کرتے وقت حوالہ نمبر خریداری ضرور دیجئے تا کہ جواب دینے میں آسانی رہے۔ ورنہ شکایت معاف فرمائیں۔

# صحرا میں پھول

افسانہ

اکمل قاسمی

نخلستان کے چھوٹے چھوٹے بچے شور مچاتے ہوئے اس کی طرف دوڑ پڑے دیوانے! صحرا میں پھول دیوانے! صحرا میں پھول — اور وہ ایک کھجور کے بوسیدہ جڑ پر بیٹھ گیا۔ ایک خوبصورت جوان۔ جس کی آنکھوں میں نور بھرا ہوا تھا۔ تشنہ خمار۔ ایک ڈھیلی ڈھالی قمیص بدن پر لٹک رہی تھی۔ جو جا بجا سے پھٹی ہوئی تھی۔ الجھے الجھے خشک گرد آلود بال پیشانی پر لٹک رہے تھے۔ وہ مسکرا رہا تھا اور لڑکے اسکے گرد شور مچا رہے تھے۔

"دیوانے! صحرا میں پھول! صحرا میں پھول!!"

اس نے پیار سے دو تین بچوں کو گود میں دبا لیا۔ اور ان کے منہ چوم لئے۔ مچلتے ہوئے شوخ بچے اس کی گود سے چھوٹ کر چیختے ہوئے بھاگے۔

"دیوانے! صحرا میں پھول" ——— ؟

میرے نخلستان میں یوں تو دسیوں پاگل اور نیم پاگل وقتاً فوقتاً دیکھے گئے مگر اس جوان کی زندگی الجھے ہوئے بالوں، پھٹی ہوئی قمیص، تشنہ نگاہی اور آسودہ مسکراہٹ میں بڑی پر اسرار معلوم ہوتی تھی خصوصاً جب وہ نخلستان کے کھجوروں میں کہتا ہوا گذرتا "صحرا میں پھول" ——— ؟

تماشائی اک حسین سی ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتے بچوں نے اس کا نام ہی رکھ دیا تھا "صحرا میں پھول" جسے وہ بڑے غور سے سنتا اور جی ہی جی میں بہت خوش ہوتا۔

ہواؤں میں خنکی پیدا ہو چلی تھی مغربی افق میں شام کی سرخی کانپ رہی تھی۔ کھجوروں پر تاریک سایہ ناچ رہا تھا۔ آسمان پر تارے بیدار ہو رہے تھے۔ مشرقی افق سے چاند ہنستا ہوا ابھر رہا تھا۔ اور چاندنی کے ہلکے ہلکے عکس میں صحرا پر اسرار طریقہ پر مسکرا رہا تھا۔ سامنے نخلستان کے پست جھونپڑوں پر دھواں منڈلا رہا تھا۔ ایک بار بچوں کا شور دور سے سنائی دیا دیوانے! صحرا میں پھول" اور پھر ایک متحرک سایہ نخلستان سے نکلتا ہوا نظر آیا۔ جو تیزی سے صحرا کی طرف لپکا۔ چاندنی گہری ہو چکی تھی اور میں اونٹ پر سوار اپنے نخلستان کی طرف جا رہا تھا۔

"دیوانے صحرا میں پھول اور پھر ایک متحرک سایہ" میری جستجو میں طلب سی پیدا ہوئی اور میں نے اپنے اونٹ کو اسی متحرک سایہ کی طرف موڑ دیا جو اب نخلستان سے نکلکر صحرا کی رنگین خاموشی میں ٹھہر گیا تھا۔ چاندنی نے اس سایہ کے خد و خال نمایاں کر دئے تھے۔

میں قریب پہنچا۔ وہی نوجوان ایک ریت کے تودے پر یکہ و تنہا بیٹھا ہوا ملا۔ میں اونٹ سے اتر پڑا اونٹ کی نکیل ہاتھ میں پکڑ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ لیکن اسے میرے آنے کی مطلقاً خبر نہ ہوئی جیسے وہ کسی خواب کی سکر آمیز کیفیتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے ایک بار اسے غور سے دیکھا اسکے سراپا پر نظر ڈالی۔ وہ رو رہا تھا۔ آنسوؤں کے بہتے ہوئے تیز دھارے گرد آلود قمیص کے دبیز دامن پر تیر رہے تھے۔ میرے احساس میں سنسنی پھیل گئی۔ میں سوچنے لگا۔

دیوانگی اور آنسو ——؟؟ جیسے کسی آفت زدہ کا خاموش آنسو" جیسے اہل ہوش کا گریہ ——" دیوانگی، آنسو، اہل ہوش کا گریہ —— بیہوشی اور ہوشیاری۔ یعنی محبت!! ایں یہ کیا ہوا یعنی محبت۔ ؟ کیا اسے کسی سے محبت ہے ؟ کیا اس نے کسی سے محبت کی تھی ؟؟۔ میرا سر چکرانے لگا۔ عالم وارفتگی میں میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ وہ ایک بار چونکا اور مجھے خاموش نظروں سے دیکھنے لگا۔ میری نگاہوں کے ابھرے ہوئے نقوش پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا شاید اسے میری شناسا نگاہی ناگوار معلوم ہوئی۔ وہ میری نگاہوں میں کسی دور سے آئے ہوئے اجنبی مسافر کا تیور ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ پھر سر بہ خم بیٹھ کر جانے کیا سوچنے لگا۔

میرا شوق جستجو کچھ اور تیز ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر اپنے ماخوذ تاثرات جمع کئے۔ دیوانگی، آنسو یعنی ہوش —" اجنبی مسافر انتظار اور صحرا" کیا اسے کسی نئے کارواں کا انتظار ہے ؟ مگر صحرا میں پھول — میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ سامنے نخلستان کے کھجوروں کے جھنڈ میں جھونپڑوں کے نشانات دھندلے ہوتے جا رہے تھے۔ میں اونٹ پر سوار ہو کر نخلستان کی طرف چل پڑا۔ وہ اسی طرح روتا رہا۔

دوسرے دن وہ پھر میرے نخلستان میں آیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے اسے دیکھتے ہی شور مچانے لگے دیوانے! صحرا میں پھول" ———،

اس نے تین بچوں کو بازوؤں میں دبا لیا اور دیر تک انہیں پیار کرتا رہا۔ اسی طرح طویل دنوں تک۔ وہ میرے نخلستان میں آتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کی قمیص سینکڑوں جگہ سے پھٹ کر کاندھے سے جھولنے لگی۔ اس کا بدن عریاں ہو گیا۔ بدن کیا تھا ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ اب و ... پاگل ہو گیا تھا۔ اسی طرح کتنے مہینے گزر گئے۔

نخلستان کے بچے اداس اداس پھر رہے تھے۔ ایک دن وہ اپنے وقت پر نخلستان میں نہ آیا۔ لوگ کہہ رہے تھے وہ صحرا میں مر گیا۔ ریت کے اسی تودے پر جہاں وہ مجھے اس رات روتا ہوا ملا تھا۔

ایک بار پھر میں اپنے نخلستان کی طرف جا رہا تھا۔ مغربی افق میں شام کی سرخی کانپ رہی تھی۔ کھجوروں پر تاریک سایہ ناچ رہا تھا۔ آسمان پر تارے بیدار ہو رہے تھے۔ مشرقی افق سے چاند ہنستا ہوا ابھر رہا تھا۔ اور چاندنی کے ہلکے ہلکے عکس میں صحرا پر اسرار طریقہ پر مسکرا رہا تھا۔ اچانک اسی ریت

تودے کے قریب پہنچ کر میں نے اونٹ کی نکیل کھینچ لی اور اونٹ سے نیچے اتر گیا۔ وہ میری طرف بڑھی اور سہم کر کھڑی ہو گئی۔ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی!! جس کا سفید چہرہ سرخ جوڑوں میں اس طرح نکھرا ہوا تھا جیسے قلزم کی سرخ لہروں پر ناچتا ہوا کنول کا سفید پھول۔

میرے داہنی ہاتھ کی جانب کچھ فاصلے پر خیموں کا ایک سلسلہ چاندنی میں چمکتا ہوا نظر آیا جا بجا شعلے اپنی زبانیں ہلا رہے تھے اور ان پر دھواں ناچ رہا تھا خیمہ والے کھانا پکا رہے تھے۔ اس نے مجھے بتایا وہ اس نئے کارواں کے ساتھ آئی ہے۔ پہلے بھی وہ یہاں آ چکی ہے جب اس کا کارواں ادھر سے گذر رہا تھا۔ اس نے اپنا نام میرا بتایا۔ میری زبان سے اس نوجوان کے مرنے کی خبر سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا دل بھر آیا اور سامنے کھجوروں کے جھنڈ میں جھونپڑوں کے نشانات دھندلے ہو رہے تھے۔ اوپر چاند مسکرا رہا تھا۔ میں اونٹ پر سوار ہو کر اپنے نخلستان کی طرف لپکا ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"صحرا میں پھول" مرجھا رہا تھا اسی ریت کے تودہ پر؟

# "شیر افگن کا قتل"

**شبیر حسن**

مغل بادشاہوں کے متعلق جتنے بے سروپا افسانے مشہور ہیں ان میں غالباً سب سے زیادہ نمایاں حیثیت اس افسانہ کو حاصل ہے کہ جہانگیر نے نورجہاں کو حاصل کرنے کی غرض سے اس کے شوہر شیر افگن کو قتل کرایا۔ چونکہ افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے بعض سنجیدہ اور ذمہ دار مورخین نے بھی اپنی تاریخوں میں اس افسانہ کو ایک معتبر واقعہ کی طرح پیش کیا ہے۔

اسکولوں اور کالجوں کی عام تاریخی کتابوں میں یہ افسانہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جہانگیر نے اپنی نوجوانی کے زمانہ میں نورجہاں کو دیکھا اور اس پر عاشق ہو گیا۔ اور یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ اسی کے ساتھ شادی کرے گا لیکن اکبر نے شادی کی یہاں تک مخالفت کی کہ ۱۵۹۹ء میں نورجہاں کی شادی شیر افگن کے ساتھ کر دی۔ اس کے چند ہی ماہ بعد شیر افگن کو جہانگیر کا خاص ملازم مقرر کر کے دونوں کو میواڑ کی مہم پر بھیج دیا۔ لیکن جب اکبر اور جہانگیر کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی تو شیر افگن جہانگیر کو چھوڑ کر اکبر سے جا ملا۔ اور ۱۶۰۵ء میں اکبر کے انتقال پر جہانگیر نے شہنشاہ ہندوستان بن کر شیر افگن کو بردوان میں جاگیر دے کر وہاں بھیج دیا۔ لیکن دو برس بعد ۱۶۰۷ء میں اپنے دودھ شریک بھائی قطب الدین خاں کو بنگال کا گورنر محض اس غرض سے بنا کر بھیجا کہ وہ شیر افگن کو قتل کر دے۔ جھگڑے میں دونوں مارے گئے اور نورجہاں دہلی بھیج دی گئی جہاں وہ چار برس تک جہانگیر کی والدہ کے پاس رہی۔ اور ان چار برس کے بعد ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔

قتل کے اس افسانہ کو سچا ثابت کرنے کے لئے چونکہ یہ بھی لازم آتا تھا کہ کسی طرح یہ ثابت کیا جائے کہ شیر افگن کو قتل کرانے سے پہلے جہانگیر نورجہاں کو دیکھ چکا تھا اور دل و جان سے فریفتہ تھا لہٰذا ایک اور شاعرانہ قصہ تصنیف کیا گیا کہ جہانگیر نے اپنی جوانی کے زمانہ میں اپنے باغ میں نورجہاں کو دیکھ لیا تھا اور اس وقت نورجہاں نے بڑی شوخی و شرارت سے اس کے دو کبوتر اڑا دیئے تھے۔ اور غارتگری حسن سے جہانگیر کے پاس جو کچھ بچا کچا دل رہ گیا تھا وہ اس ادائے خاص نے چھین لیا تھا۔

اب ذرا تواریخ کی ورق گردانی کرنے سے پہلے خود اس افسانہ ہی کے جزئیات کو منطقی نظر سے پرکھئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ کس قدر بے سروپا افسانہ ہے:-

اگر بقول مخالفین جہانگیر واقعتاً نورجہاں پر فریفتہ تھا اور وہ اس سے شادی کرنے کا اس قدر خواہشمند تھا کہ اس نے آخر شیر افگن کو قتل کرا کے نورجہاں کو حاصل کر لیا۔ اور جہانگیر کو اکبر کی وجہ سے اپنی اس محبت میں انتہائی ناامیدی و ناکامی ہوئی تھی اور اکبر نے خود ہی شیر افگن کو جہانگیر کا رقیب بنا دیا تھا تب یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا میں کوئی غیر جانبدار شخص ایسے دو رقیبوں کو ایک منٹ کے لئے بھی ایک دوسرے کا حاکم و محکوم مقرر نہیں کر سکتا۔ پھر حاکم بھی کون جو محکوم رقیب کے مقابلہ میں ناکام و نامراد رہ چکا ہو۔ اور جو شہنشاہ زادہ ہو!! اگر جہانگیر نورجہاں سے محبت کرتا ہوتا اور اس کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش ہوتی تب یہ ناممکن ہے کہ اکبر شیر افگن جیسے حد سے زیادہ کمزور رقیب کو جہانگیر جیسے زبردست و طاقتور مگر ناکام رقیب کے قبضہ میں اس طرح دے دیتا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے!!

پھر غور فرمائیے کہ شیر افگن کے ساتھ نورجہاں کی شادی کر دینے کے بعد اکبر شیر افگن کو جہانگیر کا ملازم بھی کس موقعہ پر مقرر کرتا ہے جبکہ جہانگیر میواڑ کے خلاف جنگ پر جا رہا ہے۔ اور اس افسانہ کے مصنفین کے نزدیک رقابت و ناکامی کا گہرا زخم دل پر موجود ہے۔ اپنے ساتھ نورجہاں کی شادی نہ ہونے سے بے چین ہے شیر افگن جو کامیاب رقیب ہے وہ ہر وقت دست بستہ سامنے موجود ہے اور خار کی طرح آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ لڑائی کا ہنگامہ ہے شیر افگن کو بڑی ہی آسانی سے ہنگامہ کارزار میں اپنے ہی کسی آدمی سے اس طرح قتل کرا سکتا ہے کہ غنیم کا نام ہو لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اگر واقعتاً وہ نورجہاں سے محبت کرتا تھا تو کیوں ایسا نہیں کیا!!

پھر شیر افگن قطب الدین خاں کے آدمیوں کے ہاتھ سے قتل بھی ہوتا ہے تو جہانگیر کے شہنشاہ بننے کے کامل دو برس بعد!! اگر واقعتاً جہانگیر نورجہاں کو دیکھ کر اس سے محبت کرتا تھا اور اسی کے حکم سے شیر افگن قتل کیا گیا تھا تب سوال یہ ہے کہ بادشاہ بننے اور سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک ہونے کے بعد دو برس تک شیر افگن کو قتل کرانے سے وہ کیوں ڈرتا رہا؟ حالانکہ یہ وہی جہانگیر تھا جس نے ایسی حالت میں جبکہ اسے کوئی بادشاہی طاقت حاصل نہیں تھی اپنے باپ اکبر کے سب سے بڑے دوست اور وزیر اعظم ابوالفضل کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سیاسی اختلافات پر قتل کرا دیا تھا آخر عشق و محبت کا جذبہ تو اس سے بھی کہیں گہرا ہوتا ہے۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ اور آگے چلئے۔ شیر افگن اور نورجہاں کی شادی کے بعد جب شیر افگن اس کا ملازم ہے تو جہانگیر اپنے زمانۂ شہزادگی میں اس کے ساتھ مراعات خسروانہ کرتا ہے۔ اور شیر افگن کا خطاب دیتا ہے۔ آخر کیوں؟ اگر وہ واقعتاً رقیب تھا تو یہ عنایتیں اور مہربانیاں کیسی؟ شیر افگن ان عنایات کے باوجود جہانگیر کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور جب اکبر جہانگیر سے ناراض ہو گیا ہے تو اکبر سے جا ملتا ہے لیکن جب جہانگیر خود بادشاہ بنتا ہے تو شیر افگن کی تمام خطائیں معاف کر دیتا ہے۔ حالانکہ اگر جہانگیر کے دل میں کوئی شمہ برابر بھی رقابت کا جذبہ موجود ہوتا تو شیر افگن کو قتل کرا دینے کا بہترین موقعہ

تھا قتل کی دونوں صورتیں ممکن تھیں۔ اگر جہانگیر دوسروں کو یہ وجہ قتل نہ بھی بتلاتا کہ اس نے میرے ساتھ غداری کی اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بہکا کرلے گیا تب بھی لوگ یہی سمجھتے کہ اسی وجہ سے قتل کیا گیا (نہ کہ نورجہاں کو حاصل کرنے کے لئے)۔ لیکن اگر ساتھ ساتھ یہ ظاہر بھی کر دیتا تو وجہ قتل بھی معلوم ہو جاتی۔ لیکن غور فرمایئے کہ شیر افگن کو قتل کرانے کے بجائے جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد اسے جاگیر عطا فرمائی۔ اگر وہ رقیب ہوتا تو یہ جاگیر کیسی؟ پھر جاگیر بھی کہاں دیتا ہے۔ اپنے جائے قیام دارالسلطنت سے کالے کوسوں دور بردوان (بنگال) میں!! حالانکہ اگر وہ نورجہاں سے محبت کرتا ہوتا اور اس کو حاصل کرنے کا خواہشمند ہوتا تو تب یقیناً شیر افگن کو اپنے پاس رکھتا تاکہ ذرا سی غلطی پر قتل کرادے اور غلطی پکڑنے کی کوشش کرتا اور ایسی شخصی حکومت میں اس کے ہزاروں ذریعے ہو سکتے تھے۔

اب ذرا تاریخی شہادتوں کی طرف آیئے۔ وہاں ایک عجیب ہی کیفیت ہے۔ اس افسانہ کے مصنفین اور ماننے والے خود اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہندوستانی ہمعصر مورخین میں سے کسی نے بھی اس بات کا اشارۃً یا کنایۃً تذکرہ تک نہیں کیا ہے کہ شیر افگن جہانگیر کے ایما سے قتل ہوا تھا یا نورجہاں کو جہانگیر نے شیر افگن کے انتقال سے پہلے کبھی دیکھا تھا۔ مگر اس کے متعلق یہ کہدیا جاتا ہے کہ صاحب وہ شخصی حکومت تھی۔ کس کی مجال ہو سکتی تھی کہ بادشاہ کے خلاف لکھتا۔ حالانکہ یہ دلیل انتہائی لچر پوچ ہے چونکہ دور کیوں جایئے انھیں جہانگیر کے والد اکبر کے خلاف ملا بدایونی نے جو کچھ بہر انگلا وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ لیکن خیر اگر اس لچربات کو تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے تب اس بات کا آخر کیا جواب ہے کہ اس زمانہ کے یورپین سیاحوں نے بھی جنھیں بیچارے ہندوستانی مورخین کی طرح بقول شخصے "ہاتھی کے پیر کے نیچے کچلے جانے کا" کوئی ڈر نہ تھا اس افسانہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ شیر افگن جہانگیر کے ایما سے قتل کیا گیا حالانکہ ان یورپین سیاحوں کو برابر یہ تلاش رہتی تھی کہ شاہی خاندان کے متعلق کوئی گپ بھی سنیں تو اسے نمک مرچ لگا کر اپنے سفرنامہ میں درج کرلیں چنانچہ انھوں نے ایسے ایسے افسانے گھڑے ہیں کہ انھیں نورجہاں اور شاہجہاں کے درمیان نیز جہانگیر اور اس کی سوتیلی ماں کے درمیان ناجائز تعلقات تھے۔ لیکن بے پر کی اڑانے والے سیاح تک بھی اس افسانہ کا کہیں تذکرہ نہیں کرتے حالانکہ وہ نورجہاں کی نہ صرف اوائل زندگی اور ملکہ بننے کے بعد کے تمام حالات بیان کرتے ہیں بلکہ شیر افگن کی موت کا واقعہ بھی بیان کرتے ہیں مگر وہ بھی کہیں یہ نہیں کہتے کہ شیر افگن جہانگیر کے ایما سے قتل کیا گیا تھا۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس زمانہ میں صرف ایک دو سیاح ہی نہیں آئے بلکہ اس زمانہ کے سات آٹھ سیاحوں کے سفرنامے آج موجود ہیں۔ اگر ایک دو ہوتے تو یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ انھوں نے یہ واقعہ سنا نہ ہوگا لیکن یہ ناممکن ہے کہ اگر اس افسانہ کو سچا مانا جائے تب سات آٹھ میں کوئی بھی اس کا شبہ تک بھی ظاہر نہ کرے۔ خاص طور پر ایسی حالت میں جبکہ ان سیاحوں میں سے بعض اسی زمانہ میں جب یہ واقعہ پیش آیا ہے مستقل طور پر دربار میں رہتے تھے مثلاً ہاکنس وغیرہ۔

ہاکنس (۱۶۰۷ء تا ۱۶۱۲ء قیام در ہندوستان) شیر افگن کی موت کے چند ہی ماہ بعد مغل دربار میں آیا اور چونکہ وہ ترکی زبان خوب جانتا تھا لہٰذا وہ جہانگیر کے درباریوں میں آسانی سے شامل ہوگیا۔ امراء۔ رؤسا اور عام پبلک سے میل جول پیدا کیا اور جہانگیر کی نورجہاں سے شادی ہونے کے کامل آٹھ ماہ بعد تک ٹھیرا رہا۔ اس طرح نورجہاں کا یہ ڈرامہ تمام اس کے سامنے پیش آیا۔ (کیونکہ ۱۶۰۷ء میں شیر افگن کی موت واقع ہوئی ہے اور ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے نورجہاں سے شادی کی ہے) لیکن ہاکنس کہیں بھی اس کا تذکرہ نہیں کرتا کہ جہانگیر نے شیر افگن کو قتل کرایا تھا۔ اس کے دوران قیام میں نورجہاں جہانگیر کی والدہ کے پاس چار سال تک رہی۔ اگر جہانگیر نے شیر افگن کو قتل کرایا ہوتا تو ہاکنس لوگوں کو ضرور کہتے ہوئے سنتا کہ جناب یہ وہی مہرالنساء ہیں جن کے شوہر شیر افگن کو جہانگیر نے قتل کرایا تھا اور آج ان کو اپنی والدہ کے پاس رکھ چھوڑا ہے۔ لوگوں نے اس وقت یہ نہ کہا تھا تو شادی کے وقت تو ضرور یہی کہتے کہ آج جس مہرالنساء سے جہانگیر شادی کر رہا ہے وہی ہے جس کے شوہر شیر افگن کو قتل کرایا تھا اور وہ اسی لئے قتل کرایا تھا کہ اس سے شادی کرے (کم از کم اس قسم کی خیال آرائی ہی کرتے) عام لوگوں کی شادی کے موقع پر بھی یہی ہوتا ہے کہ دولہا دولہن کے متعلق تمام اگلے پچھلے واقعات کا لوگوں میں تذکرہ ہوتا ہے۔ بھلا جہانگیر تو بادشاہ تھا۔ رعایا میں سے ہر شخص کی زبان پر اسی شادی کا تذکرہ ہوگا۔ مگر ہاکنس لوگوں کو یہ شبہ تک بھی ظاہر کرتے ہوئے نہیں سنتا کہ شیر افگن جو محض قطب الدین خاں گورنر بنگال کو قتل کرنے کی وجہ سے فوراً ہی انبہ خاں کے ہاتھ سے مارا گیا تھا اس کے قتل کی وجہ قطب الدین خاں کو مار ڈالنا نہیں تھی بلکہ جہانگیر کی یہ خواہش تھی کہ اس کے قتل کے بعد میں نورجہاں سے شادی کرلوں!!

اور آگے بڑھئے۔ سر طامس رو (۱۶۱۵ء تا ۱۶۱۸ء) ہندوستان میں بلکہ خاص مغل دربار میں رہا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مہرالنساء نور محل سے نورجہاں بن چکی ہیں۔ سلطنت کے تمام سیاہ و سفید کی مالک ہیں۔ ہر جگہ انھیں کا حکم چلتا ہے مگر اس وقت بھی کسی کی زبان سے یہ نہیں سنا جاتا کہ یہ وہی نورجہاں ہیں جن کے شوہر کو جہانگیر کے ایما سے قتل کئے گئے تھے چنانچہ سر طامس رو بھی دیگر سیاحوں کی طرح اس کا کہیں ذکر نہیں کرتا۔

اور لیجئے۔ ایڈورڈ ٹیری بھی اسی زمانہ میں (۱۶۱۶ء تا ۱۶۱۹ء) ہندوستان میں رہا مگر اس کے کان بھی اس افسانہ سے ناآشنا ہیں۔

اور سنئے ایک سیاح کا بیان۔ پیٹرو ڈیلا ویل کہتا ہے کہ "نورجہاں ہندوستان میں پیدا ہوئی لیکن ایرانی النسل تھی یعنی ایک ایرانی کی لڑکی تھی جو مثل دوسرے لوگوں کے ہندوستان میں مغل بادشاہ کی ملازمت کرنے آیا تھا اور دربار میں

ایک مقتدر حیثیت رکھتا تھا۔ نورجہاں پہلے ایک اور ایرانی سردار کی بیوی تھی لیکن اس کے انتقال کے بعد نورجہاں کو ایک زرّیں موقعہ مل گیا جیسا کہ اکثر خوبصورت بیواؤں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ کس طرح شاہ سلیم (جہانگیر) نے اس کو دیکھ لیا۔ اور اس سے محبت کرنے لگا اور اس سے شادی کر لی"۔ اس بیان میں جوکہ دراصل اس نے یہیں کے لوگوں سے سن کر لکھا ہے وہ شیر افگن کی موت کے معاملہ میں کوئی شبہ تک بھی جہانگیر پر ظاہر نہیں کرتا۔ اور اپنے بیان سے وہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جہانگیر نے نورجہاں کو شیر افگن کی موت کے بعد دیکھا تھا۔ اسی بیان میں آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ "دراصل یہ خود نورجہاں تھی نہ کہ جہانگیر جس نے شادی کی خواہش کی اور اس کے لئے نہ صرف متعدد بار اپنے آپ کو دکھانے ہی کی کوشش کی بلکہ اس کے لئے جادو وغیرہ بھی کیا"۔ یہ تمام باتیں وہ ہیں جوکہ اس زمانہ کے لوگوں سے سن کر لکھی ہے!

اور ملاحظہ فرمائیے۔ سر ٹامس ہربرٹ جو جہانگیر کی وفات کے قریب ہندوستان میں آیا تھا اس افسانہ کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ اس کے علاوہ پیٹر منڈی (PETER MUNDIG) جو جہانگیر کی وفات کے فوراً بعد آیا ہے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا۔ حالانکہ سر ٹامس ہربرٹ اور پیٹر منڈی دونوں نے جہانگیر اور نورجہاں کے حالات لکھے ہیں لیکن وہ اس بات کا کہیں اشارہ تک بھی نہیں کرتے کہ شیر افگن کا قتل جہانگیر کے ایماء سے ہوا تھا۔

اور آگے بڑھئے۔ برنیئر (BERNIER) جو جہانگیر کے بعد ہندوستان میں آیا اور مغل دربار میں رہا اس نے بڑے بڑے درباریوں سے میل جول پیدا کیا۔ شاہجہاں۔ جہاں آرا۔ روشن آرا وغیرہ کے متعلق جتنی گپیں سنیں ان سب کو اس نے بڑھا چڑھا کر اپنے سفرنامہ میں درج کر لیا۔ اور تفصیل سے نورجہاں جہانگیر کے حالات بھی لکھے لیکن اس تمام دفتر میں اس افسانہ کا کہیں پتہ نہیں۔ برنیئر کی ان متذکرہ بالا گپوں سے جوکہ زیادہ تر یہیں کے لوگوں سے سن کر لکھی تھیں اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ رعایا کو شاہی خاندان کے متعلق جھوٹی اور بے سروپا خبریں اڑانے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ لہٰذا غور فرمائیے کہ شیر افگن کے اس من گھڑت افسانہ میں ایک فیصدی بھی حقیقت ہوتی تو اس کے متعلق باقاعدہ طور پر سو فیصدی گپ کھینچی جاتی۔ لیکن یہ کتنی عجیب غریب بات ہے کہ ان لوگوں کو تو اس کے متعلق کوئی شبہ تک بھی نہیں ہوا حالانکہ اس زمانہ کے حالات و واقعات خود ان کے سامنے پیش آ رہے تھے سب مرکھپ گئے تو محمد صادق تبریزی نے کامل اسّی برس کے بعد یہ بے پرکی اڑائی۔

اس ضمن میں ان واقعات کا ذکر بھی ضروری ہے جو شیر افگن کی موت کا باعث ہوئیں۔ یہ بات تمام تاریخ داں حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ بنگال ہمیشہ سے شورش پسند رہا۔ بختیار خلجی کے وقت سے اکبر تک تو تقریباً آزاد ہی رہا۔ مگر اکبر کے فتح کر لینے کے بعد بھی شورش برابر جاری رہی۔ چنانچہ اس واقعہ کے وقت بھی بنگال میں بغاوت کا بازار گرم تھا اور افغانی لوگ سرکشی کر رہے تھے جوکہ بالآخر ۱۶۱۱ء میں پھوٹ پڑی۔ شیر افگن اس وقت بنگال ہی میں تھا۔ پرچہ نویسوں کے ذریعہ جہانگیر کو معلوم ہوا کہ شیر افگن بھی باغیوں کے ساتھ ریشہ دوانیاں کر رہا ہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر جہانگیر کو شبہ ہوا۔ شبہ کرنا جرم نہیں ہے لیکن محض شبہ کے ماتحت اس کو قتل کرا دینا ظلم ہوتا۔ لہٰذا جب جہانگیر نے قطب الدین خاں کو ۱۶۰۶ء میں بنگال کا گورنر مقرر کیا تو بھیجتے وقت اس کو یہ ہدایت کی کہ:

"اگر شیر افگن راست کرداری پر قائم رہے تو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے ورنہ ہمارے پاس بھیج دیا جائے اور اگر آنے میں تساہل کرے تو سزا دیجائے"۔ (اقبالنامہ صفحہ)

لہٰذا قطب الدین خاں نے بنگال پہنچ کر شیر افگن کو بردوان سے بلایا مگر اس بات پر تمام مورخین متفق ہیں کہ شیر افگن نے آنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا قدرتی طور پر اس پر بغاوت کا شبہ یقین کو پہنچ گیا۔ اور قطب الدین خان نے اس کو بلانے اور اس کے انکار کر دینے کی اطلاع دربار میں بھیجدی۔ جہانگیر نے دوبارہ حکم بھیجا کہ "اس کو یہاں روانہ کر دیں اور اگر اس کے اطوار سے بداندیشی کا اندازہ کریں تو جس طرح رخصت ہوتے وقت ہدایت دی گئی تھی اس ناہنجار کو سزا دیں"۔ (اقبالنامہ صفحہ ۱۶)

لہٰذا قطب الدین خاں خود بردوان گیا۔ اور اس بات کا مخالفین اقرار کرتے ہیں کہ اس نے شیر افگن کو محض گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن شیر افگن نے اپنی گرفتاری کے خیال سے، انتہائی غصہ کی حالت میں قطب الدین خان کو قتل کر دیا۔ اس پر قطب الدین خاں کے ساتھیوں اور ملازموں نے شیر افگن کو مار ڈالا۔ اب بتائیے اس میں جہانگیر کا کیا قصور ہے؟۔ اپنے قتل کا شیر افگن خود ذمہ دار ہے کہ اول قطب الدین خاں اسے طلب کرتا ہے تو وہ آنے سے انکار کر دیتا ہے اور اس طرح اپنے خلاف بغاوت کے شبہ کو یقین تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر جب قطب الدین خاں اسے گرفتار کرنا چاہتا ہے تو اس کو قتل کر دیتا ہے جس پر فوراً ہی قطب الدین خاں کے ساتھی محض اس وجہ سے کہ اس نے ان کے سردار اور صوبہ کے گورنر کو قتل کیا اس کو بھی مار ڈالتے ہیں۔

ایسی حالت میں کوئی بھی غیر جانب دار انسان یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ شیر افگن کا قتل جہانگیر کے ایماء یا حکم سے ہوا تھا۔

# عربوں کا ذوق علمی

عبید اللہ محمد زبیر

عرب جب کسی ملک میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتے تھے تو مفتوحہ علاقوں کے علوم فنون کی نہایت مستعدی کے ساتھ تحقیقات کرتے تھے۔

خلفائے اسلام خصوصاً خلفائے عباسیہ نے ملک کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے مدارس قائم کئے اور مختلف تصانیف کو عربی زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے بڑے بڑے نامی علمار کو دربار میں رکھا تھا، جب عربوں کے علوم فنون کو یورپی اقوام نے اپنی زبان میں ترجمہ کیا تو ان سے بیش بہا فوائد حاصل کئے جن کی وجہ سے آج وہ بام ترقی پر نظر آرہے ہیں۔

ابتداءً عربوں کو شام اور ایران کی فتوحات میں یونانی علوم کا وہ ذخیرہ دستیاب ہوا جس سے اہل عرب میں تحصیل علم کا ذوق پیدا ہوگیا عربوں نے تحصیل علوم میں جو ترقی کی وہ فی الواقع حیرت انگیز و تعجب خیز ہے۔ عربوں کا یہ عام قاعدہ تھا، کہ جب وہ کسی ملک کو فتح کرتے تھے تو سب سے پہلے وہاں مساجد اور مدارس کی تعمیر ہوتی تھی۔ عام مدرسوں کے علاوہ دارالعلوم کا قیام بھی مختلف حصوں مثلاً بغداد۔ طلیطلہ۔ قرطبہ۔ میں تھا۔

الحکم ثانی خلیفہ اندلسیہ کے کتب خانہ میں مختلف علوم و فنون کی چھ لاکھ نایاب جلدیں تھیں صرف چوالیس جلدوں میں فہرست کتب مرتب تھی۔ اس کے برعکس شاہ فرانس چارلس کے شاہی کتب خانہ میں فقط نو سو جلد سے زیادہ نہ تھیں اور ان میں کتب مذہبی کی ایک المار ی بھی نہ تھی۔

عربوں نے چند صدیوں میں فلسفہ۔ ادب۔ ریاضی ہیئت جغرافیہ طبعیات حیاتیات۔ طب وغیرہ میں اس قدر ترقی کی کہ دنیا ششدر رہ گئی۔

جس وقت عرب تمدن کے میدان میں آئے تو ان کا فلسفہ علم روحانیات پر مشتمل تھا۔ ارسطو۔ سقراط۔ اپی کیورس اور کل فلاسفہ اسکندریہ کی تصانیف کو عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا تو اس زمانہ میں صرف دارالعلوم ہی میں کچھ فلسفیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن عوام میں فلسفہ کا ذوق ناپید تھا کیونکہ یہ لوگ فلسفہ کو مانع مذہب سمجھتے تھے یہی وجہ تھی کہ بعض وقت خلفائے اسلام فلسفیوں کو ملک سے باہر کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ امام غزالی اور ابن رشد فلسفہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ موخر الذکر کی تصانیف کا اثر خاص کر یورپ پر بہت گہرا پڑا۔

اہل عرب دوسری قوموں کی طرح شاعری میں فطری استعداد رکھتے تھے، چنانچہ زمانہ جاہلیت میں عرب عکاظ نامی ایک علاقہ میں ہر سال مشاعرہ کرتے تھے، جس میں اطراف و اکناف کے اہل سخن حصہ لیتے اور خراج تحسین حاصل کرتے تھے، مشاعرہ کا دلچسپ و معنی خیز کلام طلائی حروف میں لکھ کر خانہ کعبہ میں آویزاں کیا جاتا تھا اس کو معلقات کہتے تھے

اہل عرب کے شاعرانہ خیالات میں ان کے فطری جذبات کی مناسبت سے بہادری و عشقبازی بھی داخل تھی، چنانچہ ایرانی عاشق فرہاد سے کہیں بڑھ کر وامق کا نام دنیائے عاشقی میں درخشاں ہے۔ ان کے اشعار کے دس مجموعے قیاساً شمار کئے گئے ہیں۔

عربی اشعار میں عبرانی اشعار کے برعکس وزن اور قوافی موجود ہیں بلکہ بعض اوزان خود شعرائے عرب کی ایجاد ہیں۔ عربی زبان دوسری زبانوں سے شاعری کے لئے زیادہ موزوں اور وسیع ہے۔ اس کے علاوہ ان کا گذر ایسے پہاڑی اور صحرائی مقامات سے ہوتا تھا جہاں سے مناظر قدرت ان کی شاعری میں ایک ہیجان پیدا کر دیتے تھے۔ یہ لوگ مستقل مزاج بھی زیادہ ہیں اس لئے ان کے اشعار میں بہادری اور فراست دونوں ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ابتداً ان کے اشعار چھوٹے چھوٹے موزوں فقروں میں ہوتے تھے اور اس کے بعد ایک مثل کے دو حصے کر دئے گئے اور مسجع بنا دیا گیا۔ اور اس کے بعد بعضوں نے اسی طرح کے اور دو ایک مسجع اور مقفیٰ فقرے بنائے اور اس کے دو سے تین اور تین سے چار کر دئے یہ رجز کہلاتے تھے۔

اہل عرب قصیدہ بھی کہتے تھے اس کی ابتداء مہلہل اور امرأ القیس سے ہوئی۔ سب سے پہلا قصیدہ جو کہا گیا وہ مہلہل کا تھا۔ اس کے بعد امرأ القیس نے کئی قصائد کہے۔ عربوں نے بہت جلد ایک یا دو صدیوں میں اس قدر اشعار کا ذخیرہ جمع کیا کہ دنیا کی کوئی متمدن قوم بھی کئی صدیوں میں اس قدر جمع نہ کر سکی۔ چنانچہ حماسہ کو زمانہ جاہلیت میں چودہ ہزار نظمیں زبانی یاد تھیں۔ چونکہ عرب کے اکثر شعراء اسلامی لڑائیوں میں مارے گئے اس لئے وہ بہت کچھ اشعار کا حصہ اپنے ساتھ لے گئے۔ عرب شاعروں کی بہت زیادہ قدر کرتے تھے۔ چنانچہ جب کسی قبیلہ میں کوئی شاعر پیدا ہوتا تھا تو دوسرے قبائل کے لوگ آتے تھے اور مبارکباد دی جاتی تھی۔

عربوں کے زمانے میں علوم ریاضی کو نمایاں ترقی ہوئی اور جبر و مقابلہ کے موجد عرب ہی مانے جاتے ہیں عربوں میں جبر و مقابلہ کا شوق اس قدر پھیلا کہ مامون خلیفۂ عباسیہ نے نویں صدی کے اوائل میں اپنے دربار کے مہندس محمد موسیٰ کو اس علم میں ایک عام فہم کتاب لکھنے کا حکم دیا۔ عربوں نے علم مثلث میں مثلثات حل کرنے کے لئے چند ایسی شکلیں بنا دیں جس سے یہ علم بالکل بدل گیا۔ اور یہ اشکال بھی اس وقت تک مستعمل ہیں۔ علم مثلث میں مماسہ کا داخل کرنا ایک بہت بڑی ترقی ہے جس کا سہرہ عربوں کے سر رہا۔

علم ہیئت میں نہ صرف عرب بلکہ ان کے جانشینوں نے بھی بڑی

ترقی کی۔ اگرچہ بغداد میں تعلیم کا مرکز تھا لیکن دوسرے مقامات مثلاً دمشق۔ سمرقند۔ قاہرہ۔ طلیطلہ۔ قرطبہ وغیرہ میں ہیئت دانوں کی کثرت تھی۔ ہارون اور مامون کے زمانہ میں بغداد کے مدرسہ ہیئت نے بڑے بڑے کام انجام دئے۔ محمد بن جبر نے اپنے زمانہ کے کل مسائل ہیئت جمع کئے۔

مختصر یہ کہ علوم ریاضی و ہیئت میں حسابات میں مماسہ کا استعمال کرنا اجرام سماوی کے حرکات کی زریچوں کا مرتب کرنا۔ اعوجاج منطقۃ البروج اور اس زاویہ کے بتدریج کم ہونے کی نہایت درست تحقیقات کرنا چاند کے زیادہ سے زیادہ ارتفاع کا اختلاف دریافت کرنا، استعمال معدل النہار کا ٹھیک معلوم کرنا، سال کی درست مدت کا قرار دینا عربوں ہی کے ایجاد و اختراع ہیں۔

عرب دلیر جہازراں تھے۔ اور دور دراز ممالک کی سیاحت کر کے نئے راستے معلوم کئے۔ ان سیاحوں میں سلیمان۔ ابن حوقل۔ البیرونی۔ ابوالحسن اور ابن بطوطہ قابل ذکر ہیں۔ ابن بطوطہ شمالی افریقہ سے نکل کر مصر، فلسطین۔ عراق، عجم۔ شمالی عربستان مکہ تک اور قسطنطنیہ سے ہوتا ہوا بخارا۔ قندھار کے راستہ سے ہندوستان آیا۔ اس نے ان ممالک کے حالات میں ایک کتاب تصنیف کی جو تاریخ ابن بطوطہ کے نام سے مشہور ہے۔

اہل عرب نے علم طبعیات میں بھی کافی ترقی کی تھی۔ ابن ہیثم الحسن کی ایسی تصانیف ہیں جن میں آئینوں کے نقطہ اجتماع الضو اور ان میں تماثیل کے ظاہری مقامات۔ مسلہ انعطاف۔ شعاعی اور تماثیل ظاہری کا بڑا پن وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ جرثقیل بھی عربوں ہی کی ایجاد ہیں۔ طبعیات کی طرح عرب علم کیمیا میں بھی حیرت انگیز انکشافات اور ایجادات کئے ہیں۔ بڑے مرکبات جن سے یونانی بالکل نابلد تھے مثلاً الکوہل۔ گندھک کا تیزاب۔ شورے کا تیزاب۔ مارالملوک وغیرہ انہی عرب کی بدولت وجود میں آئے۔

عربوں کا سب سے قدیم اور مشہور کیمیا دان جابر بن حیان گذرا ہے۔ یہ خراسان کا باشندہ تھا۔ اس کی تصانیف علم کیمیا میں ایک ہزار سے زیادہ گنائے جاتے ہیں۔ اس کی تصانیف میں بعض ایسے مرکبات کا ذکر ہے جو اس کے قبل معلوم نہ تھے مثلاً شورے کا تیزاب، مارالملوک، نوشادر، چاندی کا شورا وغیرہ۔ اس کی تصانیف میں سب سے پہلے کیمیائی عملیات مثلاً عرق کشی، تصعید، پانی میں حل کرنے کے طریقے اور گلانے وغیرہ کا بیان ہے۔

جابر کی طرح رازی بھی مشہور کیمیا دان تھا اس کی مشہور تصانیف الحاوی الجامع۔ کتاب الاقطاب اور سقوریہ ہیں۔ اس نے اپنی تصانیف میں گندک کا تیزاب اور الکوہل کے متعلق دقیق معلومات پیش کئے ہیں۔

عرب نے علمی تحقیقات کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی ان علوم سے صنعت و حرفت میں بڑا کام لیا۔ اور علمی معلومات کی وجہ سے ان کی صنعت و حرفت میں ایک نمایاں عمدگی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ عرب گندگ، تانبے، پارے،

لوہے اور سونے کو معدن سے برآمد کرنا جانتے تھے۔ بارود کی تیاری بھی عربوں ہی کے دماغ کا نتیجہ ہے۔ قدیم ایشیائی اقوام مختلف قسم کے جلانے والے مرکبات لڑائیوں میں استعمال کرتے تھے۔ یونانیوں نے عربوں کے محاصرۂ قسطنطنیہ کے وقت ان آلات حرب سے نہایت کامیابی کے ساتھ کام لیا۔ اور اس کی تیاری کو ملکی راز کی طرح پوشیدہ رکھا۔ لیکن یہ راز زیادہ دنوں پوشیدہ نہ رہ سکا۔ عربوں نے بہت جلد یونان کا یہ نسخہ معلوم کر لیا اور اس کا استعمال ان میں اس درجہ بڑھ گیا کہ یہ حربی آلات کا ایک جزو اعظم بن گیا اور عرب اسے کئی طرح سے اور مختلف آلات کے ذریعہ دشمنوں پر پھینکتے تھے۔

بارود کی قوت نفوذیہ کا استعمال عربوں ہی نے پہلے معلوم کیا۔ یعنی توپ اور بندوق کو عربوں ہی نے ایجاد کیا۔ عموماً مورخین کا یہ خیال ہے کہ توپ کا استعمال ۱۳۴۶ء میں کریسی کی لڑائی میں ہوا۔ لیکن مورخین عرب کی تصانیف اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ توپ کا استعمال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ ایک مورخ لکھتا ہے "امیر یعقوب اپنے باغی سردار کے شہر مہیدار کو ۱۲۰۵ء میں محاصرہ کیا تھا اور دیواروں پر مختلف آلات اور گرجنے والی کلوں کے ذریعہ جن کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا حملہ کیا تھا۔ اور ان کلوں میں سو سو دھاریں نکل رہی تھیں اور شہر میں بڑے بڑے پتھر اور آگ کے گولے برس رہے تھے"۔ کاغذ بنانا اور قطب نما کی ایجاد بھی عربوں کی رہین منت ہے۔

دوسرے علوم کی طرح عرب علم حیاتیات میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے تھے۔ محققین عرب نے علم نباتات کی بھی تحقیق کی تھی۔ بالخصوص طبی نباتات کو باغیچوں میں لگایا جاتا تھا۔ دسویں صدی عیسوی میں ایک نہایت عمدہ باغ غرناطہ میں تھا۔ عبدالرحمن الداخلی کے زمانہ میں قرطبہ میں بھی ایک اسی نوعیت کا نباتاتی باغ تھا۔ اور اس نے محققین علم کو شام اور ایشیا کے دوسرے حصوں میں بھیج کر درخت منگوائے۔

مثل ہیئت۔ ریاضی اور کیمیا کے علوم طبیہ بھی منجملہ ان علوم کے ہیں جن کو عربوں نے تحقیق کیا۔ عرب اطبا میں ایک بہت مشہور شخص رازی ہے اس نے پچاس سال تک حکمت کی۔ اس کی تصانیف مختلف علوم میں ہیں اس کی کتاب علاج اطفال اس فن کی پہلی کتاب ہے جس میں کئی ادویہ اور نئے طریق علاج درج ہیں۔ رازی کی طرح علی عباس ایک لائق طبیب تھا اس نے جالینوس اور ربا اور دوسرے یونانی طبیبوں کی بہت سی غلطیاں نکالی ہیں۔

اطبائے عرب میں سب سے زیادہ مشہور بوعلی سینا تھا۔ اس کو ملک الاطبا کہتے ہیں۔ اس نے دنیائے طب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا باوجودیکہ بوعلی سینا نے کثرت عیاشی کی وجہ سے بہت کم عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کی تصانیف متعلق طب کثرت سے ہیں۔ اسی کے اصول پر آج تک بھی اطبا کا ایک بڑا گروہ عمل پیرا ہے۔ اس کی تصانیف اتنی مرغوب ہوئیں کہ کم و بیش دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں ترجمہ کی گئیں۔ (بقیہ صفحہ ۶۰ پر)

# نقد و نظر

## آخری رات

مصنف:۔ حضرت ایم اسلم۔ ناشر:۔ کتب خانہ دارالبلاغ نمبر ۱ محمد نگر، میور روڈ، لاہور۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۵۰۴ صفحات قیمت چار روپے۔ اسلم صاحب کی ہر تحریر میں مشرقی تمدن اور ان کی برتری اپنا رنگ جماتی نظر آتی ہے۔ وہ ان خیالات و عقائد کے سختی سے مخالف ہیں جو مغربی تہذیب و تمدن نے ہندوستانیوں میں پیدا کر دیئے ہیں۔ پردہ کا مسئلہ اگرچہ بہت پرانا ہے اور اس پر ہر پہلو سے ہر انداز میں بحث کی جا چکی ہے تاہم میاں صاحب نے اس کو ایک دلکش رومان کی صورت میں جس طرح جس رنگ میں پیش کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ قدیم و جدید خیالات و افکار کا حسن تضاد بڑے مفید اور موثر پہلو پیدا کرتا ہے موصوف کی یہ پرخلوص خدمات بحیثیت مجموعی تمام ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے کارآمد ہیں۔ اس ناول کا فنی معیار لائق تحسین ہے۔ اور موضوع کے اعتبار سے ہر شخص اچھا سبق حاصل کر سکتا ہے۔

## حیات محمد علی جناح

مصنف:۔ جناب انیس احمد جعفری۔ ناشر:۔ شیخ نذیر احمد صاحب مالک کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۴۸۶ صفحات قیمت ساڑھے سات روپے مسلم لیگ کے صدر اور مسلمانوں کے قائد اعظم محمد علی جناح کی سیرت و سیاست کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ بہترین کتاب ہے۔ کیونکہ اب تک کی تمام تحریروں سے استفادہ کرتے ہوئے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی ہر سیاسی جدوجہد کو پس منظر میں رکھتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ مسئلۂ پاکستان کے ہر پہلو کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسروں کے اقوالِ زریں بھی پیش کئے ہیں اور چونکہ ذاتی جذبات سے الگ ہو کر محض حقائق کی روشنی میں جملہ مسائل امروزہ کا مطالعہ کیا ہے، اس لئے یہ کتاب ہر قوم و ملت کے افراد کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ یہ تاریخ بھی ہے کیونکہ برطانوی کابینہ وفد کے فیصلے اور مدبرین سیاست کے خیالات تک اس میں شامل ہیں۔ جعفری صاحب نے اس کتاب سے پہلے مسٹر جناح کے ہمنام مولانا محمد علی مرحوم کی سیرت بھی اسی کاوش سے قلمبند کی تھی چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس طرز نگارش میں درجۂ کمال کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ضخامت و افادیت کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کتاب ساڑھے سات روپے میں بھی سستی ہے۔

## سالنامہ ساقی

مدیر:۔ شاہد احمد صاحب دہلوی بی اے آنرز۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ ساقی۔ دہلی۔ سالانہ چندہ چھ روپے قیمت سالنامہ ڈھائی روپے۔ حجم ۲۸۸ صفحات۔ کاغذ کی کمیابی بلکہ نایابی کے باعث جنوری اور فروری کا مشترک شمارہ سالنامے کی صورت میں شائع ہوا ہے اور وہ بھی خاصی تاخیر کے بعد جبکہ اس کی اشاعت کی طرف سے ایک حد تک مایوسی ہو چکی تھی۔ لیکن خیر اچھے مضامین نثر و نظم نے تمام شکایات کا مداوا کر دیا ہے۔ سرسری سی نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کی ترتیب میں بڑی کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی جیسے مستند ادیبوں کے رشحات قلم بھی شامل ہیں جنہوں نے اب میدان ادب میں قدم نہ رکھنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ کوے کی کہانی جو مسٹر فطرت کی زبانی سنائی گئی ہے، نہایت دلچسپ ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی آنکھ ذرا سویرے جو کھل گئی تو انہوں نے سب کے لئے ہنسنے ہنسانے کا سامان پیدا کر دیا۔ افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نویسوں میں میاں اسلم، ناکارہ حیدرآبادی، حجاب امتیاز علی، صادق الخیری، بلونت سنگھ، دیوندر ستیارتھی، شفیق الرحمٰن، مرلا دیوی، محمود ہاشمی، قرۃ العین حیدر، اشرف صبوحی، طاہرہ دیوی اور ابو سعید قریشی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ وقار صاحب نے نذیر احمد کے ناولوں کے پس منظر اور عزیز احمد صاحب نے قرۃ العین کی افسانہ نگاری کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔ پیران ہند حکیم اشہر دہلوی نے عرصہ دراز کے بعد دائرۂ رومان سے ذرا ہٹ کر اپنا کلام رنگین پیش کیا ہے۔ نہال سیوہاروی کی غزل اور نازش دہلوی کی نظم (ایک احساس) بہت بلند ہیں۔ جناب سلام مچھلی شہری نے بھی دو صفحات میں کچھ کہا ہے۔ معلوم نہیں کیا۔

## سالنامہ چمنستان

مدیر۔ جناب آغا سرخوش قزلباش۔ ملنے کا پتہ دفتر چمنستان، دہلی۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ قیمت سالنامہ عہ حجم ۱۴۴ صفحات۔ فہرست مضامین پر نظر ڈالتے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ مستند ادیبوں کے رشحات قلم حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن جلدی پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ قسم کے کئی مضامین وہ ہیں جن کے مسودات محکمۂ ریڈیو سے طلب کر کے یا دستِ غیب سے لیکر شامل اوراق کر لئے گئے ہیں۔ ریڈیو کے مضامین یقیناً مفید ہوتے ہیں لیکن ایک ہی پرچے میں ان کی بھرمار اور وہ بھی اس طرح کہ بعض کا حوالہ تک نہیں دیا گیا، قابل اعتراض ہے۔ مقالاتِ مدیری میں بعض ایسی ہستیوں کی ضرورت سے زیادہ تعریف کرنا جن کو ادب سے محض برائے نام تعلق ہے، اصول صحافت کے خلاف سمجھا جائیگا۔ باقی افسانوں وغیرہ میں مردوں سے زیادہ عورتوں نے حصہ لیا ہے۔ چند نام یقیناً قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ میرزا ادیب، ظفر قریشی اور شاہد احمد دہلوی کے افسانے خوب ہیں۔ اثر جلیلی صاحب نے فانی کی فنی عظمتوں کا اعتراف کرنے کے باوجود ان کی شاعری کی اصل روح کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ سرورق جاذب نظر ہے۔

## ہمارا قائد

مصنف:۔ محمد احمد خاں ایم اے۔ ناشر:۔ قائد ملت اکادمی، فیل خانہ قدیم۔ حیدرآباد دکن۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۰۷ صفحات قیمت دو روپے۔ جناب مولوی محمد بہادر خاں (مرحوم) جو بہادر یار جنگ کی حیثیت سے زیادہ مشہور تھے کل ہند ریاستی مسلم لیگ کے بانی تھے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے قائد اعظم محمد علی جناح سے مشورہ کرنے کے بعد اس لیگ کو قائم کیا تاکہ ریاستوں میں بھی برطانوی ہند کے مسلمانوں کا نصب العین پیش کیا جا سکے۔

ف۔ح

یہ کتاب موصوف کی سیرت اور سیاسی جدوجہد پر بغیر غائر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آخر وقت تک کتنے پرخلوص طریقے سے اپنے مشن کو کامیاب بناتے رہے۔ موصوف نہایت عالم اور خطیب تھے ان کی تقریر و تحریر دلوں میں اثر تھا۔ ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے یہ بہترین کتاب ہے۔ مصنف نے جو مرحوم سے قریبی تعلق رکھتے تھے، صحیح سوانح نگار کا فرض ادا کیا ہے۔ کیونکہ محض مدح سرائی کی بجائے انہوں نے حقائق سے بحث کی ہے۔

## عالمگیر کا خاص نمبر

مدیر :۔ جناب عبدالرحیم شبلی بی کام۔
ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ عالمگیر لاہور۔

ضخامت ۲۰۴ صفحات قیمت دو روپے۔ ستائیس نظموں اور غزلوں، آٹھ تنقیدی و تاریخی مقالوں اور بیس افسانوں اور ڈراموں کا یہ مجموعہ رسالہ عالمگیر کی روایتی خصوصیات کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ منظومات کے ضمن میں بلند پایہ اساتذہ کے ساتھ ساتھ نومشق شعرا کا کلام بھی زینت اوراق ہے۔ جناب شہاب مالیر کوٹلوی کا تاریخی مقالہ اور جناب حامد حسن قادری کی "حالی کی غزلگوئی" پر تنقید خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ شبلی صاحب نے ایچ ای بیٹس کے ایک افسانے کا ترجمہ بڑی محنت سے کیا ہے۔ ماہر القادری صاحب کے افسانے میں افسانویت سے زیادہ شاعری اپنا رنگ جما رہی ہے۔ باقی افسانے اور مضامین وغیرہ بھی اچھے ہیں اور خاص اہتمام سے جمع کئے گئے ہیں۔

## آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ تبرکات .......... حضرت آغا شاعر قزلباش (مرحوم)
۲۔ آغا شاعر قزلباش (معہ تصویر) .. وقار عظیم ایم اے ........
۳۔ دلاور شاہ داتا ........ جناب آفتاب قزلباش ......
۴۔ سراب (افسانہ) ........ حضرت سہیل عظیم آبادی ......
۵۔ تین ہفتے پیرس میں ........ جناب آغا محمد اشرف ........
۶۔ اقبال کی ہمہ گیری ........ محترمہ جہاں بانو نقوی ........
۷۔ "تھوا کہ یہ ..." (افسانہ) ..... محترمہ ضیاء القمر امام ........
۸۔ شہاب صغیرہ یا ٹوٹنے والے تارے ...... جناب محمد رشید فریدی ........
۹۔ ارض سیما (افسانہ) ...... جناب ادیب بریلوی ......
۱۰۔ عرب میں زندگی کا نیا دور ...... جناب انعام کبریا ......
۱۱۔ جاپانی شاعری ........ فضل حق قریشی دہلوی ......
۱۲۔ امریکہ کا تعلیمی نظام ...... جناب نرائن دت ........
۱۳۔ جذبات عشرت ........ جناب عشرت رحمانی ......
۱۴۔ بالم روٹھ گئے ........ جناب عبدالمجید بھٹی ........



غربوں کا ذوق علمی ——— بقیہ صفحہ ۵۸

سب سے بڑا جراح قاسم بن عباس اندلسی تھا اس نے بہت سے آلات جراحی ایجاد کئے۔ جراحی میں اسی نے پتھری نکالنے کا نشتر ایجاد کیا جو بالکل جدید سمجھا جاتا ہے۔

عربوں کی طبی ترقی زیادہ تر فن جراحی علامات اور ادویات میں انھوں نے بہت طریقے علاج کے معلوم کئے ہیں۔ اور ادویات میں کافی اضافہ کیا مثلاً کافور، تمر ہندی۔ سنا۔ الکوہل وغیرہ۔ ادویات مرکب کے عربی ہی موجد ہیں جن کے اکثر مرکبات فی زمانہ مستعمل ہیں۔ بہرحال دنیا کا کوئی ایسا علم نہیں ہے جس میں عربوں نے ترقی نہ کی ہو۔

مضامین دلی پرنٹنگ پریس میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۶۶ سے شائع کیا

۱۵ مارچ ۱۹۴۷ء


لکس ٹائلیٹ صابن
کے ذریعہ سورن لتا
کا باضابطہ اہتمام حسن
ہے۔
LUX
TOILET SOAP
فلمی اسٹارس کا
حسن بخش صابن
میں لکس ٹائلیٹ صابن کا بھرپور جھاگ تیار کرتی ہوں اور اسے اپنی جلد پر بملائمیت لگاتی ہوں۔
اس کے بعد میں صاف ستھرے اور ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالتی ہوں۔
آخر میں باہستگی اپنا چہرہ نرم تولئے سے خشک کرتی ہوں۔
سورن لتا جانتی ہے کہ اپنی حسین جلد کی احتیاط خاص طور سے کرنا لازمی ہے جس سے وہ جلد ملائم اور بے عیب رہتی ہے۔ کیا آپ بھی اپنے جلد کی باضابطہ اہتمام یہی کرتے ہیں؟ ایک ماہ کے لئے آپ خود اس آسان خوبصورتی کے درس کی مشق کیجئے گا۔ آپ کو اس نفیس، سفید صابن کی خنک، دھیمی، خوشبو بھاتی ہے گی اور اس کا کافی جھاگ آپ کی جلد کو جلوہ گر، صاف، شفاف اور تازہ روح کر دے گا۔ آپ اپنے جلد کی احتیاط کیجئے جو کہ اس کے لئے ضروری ہے۔ لکس ٹائلیٹ صابن کے ذریعہ اصلی حسن کی حفاظت کیجئے گا۔
LTS. 151-23 UD
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

جامعہ نگر (دہلی)
20 MAR 1947

# آجکل

مصور
اردو کا پندرہ روزہ
سالانہ چندہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۲۰ | فہرست | ۱۵ مارچ ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے



مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم
ایم۔ اے

نائب مدیران
فضل حق قریشی
دہلوی
بھگت سروپ کھلر
ایم اے
سید آفاق حسین آفاق
بی اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ
پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

# رفتار زمانہ

## آزادیٔ ہند کا مستقبل

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کی رات کو برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر اٹیلی نے دار العوام میں ملک معظم کی حکومت کے اس قطعی فیصلے کا اعلان کیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ جون ۱۹۴۸ء تک حکومت ہند کے تمام اختیارات ہندوستانیوں کو سونپ دینا چاہتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ملک معظم کی حکومت کو اس وقت سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ برطانوی ہند میں مرکزی حکومت کے اختیارات کسے اور کس صورت میں تفویض کئے جائیں۔ کیونکہ اگر اس وقت یہ محسوس کیا گیا کہ دستور العمل ایسی مجلس نے مرتب نہیں کیا ہے جس میں تمام فرقوں اور جماعتوں کے نمائندے پورے اشتراک عمل کے ساتھ موجود تھے تو انتقال اختیارات کی نوعیت مختلف ہوگی۔ یعنی اس وقت یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ بحیثیت مجموعی مرکزی حکومت ہی کو یا بعض صوبوں میں الگ الگ یہ اختیارات دئے جائیں یا ان دونوں صورتوں سے الگ کوئی تیسرا راستہ نکالا جائے جو تمام باشندگان ملک کے لئے مفید ثابت ہو۔ اس کارروائی کے لئے سوا سال سے زیادہ کی مدت باقی ہے تاہم ابتدائی تدابیر کو عملی جامہ پہنانا ابھی سے شروع کر دیا جائیگا۔ یہ اعلان تمام برطانوی ہندوستان کے لئے حد درجہ مسرت بخش ہے اور قوی امید ہے کہ اس روشن منزل کی طرف پہنچنے اور صلح و آشتی کیساتھ مل جل کر قدم بڑھایا جائیگا۔

## ہندوستان کے نئے وائسرائے

مذکورہ بالا اعلان کے ساتھ ساتھ مسٹر اٹیلی نے دار العوام میں ملک معظم کی حکومت کے اس فیصلے کا اعلان بھی کیا کہ ہندوستان کے موجودہ وائسرائے ہز ایکسیلنسی لارڈ ویول کی تقرری جو زمانۂ جنگ کے وائسرائے کی حیثیت سے کی گئی تھی، ختم کی جا رہی ہے اور ان کی جگہ وسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے ہند کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے جو مارچ کی ۲۲ تاریخ کو اپنے عہدے کا چارج لے لیں گے۔ لڑائی کے دوران میں وسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن جنوب مشرقی ایشیائی کمانڈ کے سپریم کمانڈر تھے اور پچھلے سال نومبر کے مہینے میں ان کو بحیرہ قلزم کے بحری بیڑے کی کمان میں ایک اعلیٰ عہدے پر نامزد کیا گیا تھا اور یہ تقرری اس سال اپریل میں عملی صورت اختیار کرنے والی تھی۔ ۶ جنوری کو موصوف نے پورٹسماؤتھ میں سینیئر آفیسر کا ٹکنیکل کورس بھی لیا تھا۔ انھیں ہندوستان کے معاملات سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اب ان کی وہ دلچسپی عملی طور پر ہندوستانیوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

## گرٹیا گاربو کے نام

ستر سال کے ایک بوڑھے نے جس کا نام ایڈگر ڈونے تھا اور جو اپنے وطن مالوف یعنی لندن کو خیرباد کہہ کر امریکہ کی ایک ریاست میچیگان میں خلوت نشین ہو گیا تھا گرٹیا گاربو کے نام پانچ ہزار پونڈ کی رقم چھوڑی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص گرٹیا گاربو کا نادیدہ عاشق تھا۔ شوق دیدار میں اس نے ایک بار ہالی وڈ کا سفر بھی اختیار کیا لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی امید بر آئی یا نہیں آئی۔ تاہم پردۂ سیمیں پر وہ اپنی محبوبہ کو برابر دیکھتا رہا۔ عین ممکن ہے کہ ریاست میچیگان کے حکام اس وصیت نامہ کو تسلیم نہ کریں کیونکہ آخر عمر میں مسٹر ڈونے کا دماغ کسی قدر خراب ہو چکا تھا۔ وصیت نامے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر گرٹیا گاربو میری بیوی بننا گوارا کر لے تو اس کو یہ رقم میری بیوی کی حیثیت سے دی جائے۔ مرنے کے بعد مسٹر ڈونے کی قیامگاہ سے اخباری تراشوں کا ایک پلندہ نکلا جس میں گاربو سے متعلق خبریں اور تصویریں شامل تھیں۔ ایک ایسا خط بھی موجود تھا جو مکتوب الیہ تک نہ پہنچنے کے باعث واپس آگیا تھا۔ اس شخص نے ۱۹۲۲ء میں ترک وطن کیا تھا اور وصیت آج سے گیارہ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ وہ ستر سال تک تجرد کی زندگی بسر کرتا رہا۔

## سیاسی وفدوں کے اخراجات

برطانیہ میں مصارف کے ترمیمی تخمینہ جات پیش ہونے پر چند حیرت انگیز اعداد و شمار کا انکشاف ہوا ہے۔ مثلاً اس برطانوی کابینہ وفد پر جو پچھلے سال کے شروع میں ملک کے سیاسی مستقبل پر گفتگو کرنے ہندوستان آیا تھا سوا اکتیس ہزار پونڈ خرچ ہوگئے۔ اسی طرح اس پارلیمانی وفد نے جو غیر سرکاری طور پر ہندوستان کے سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید کرنے یہاں آیا تھا چار ہزار آٹھ سو پونڈ کی

بھاری رقم خرچ کر ڈالی۔ نیز اب سے تین مہینے پہلے یہ محسوس کرنے کے بعد کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین سیاسی سمجھوتہ کسی عنوان ممکن نہیں ہے جب دونوں فریقین کے نمائندوں کو لندن میں مدعو کیا گیا، اس خیال سے کہ شاید نئی فضا میں مصالحت کی کوئی نئی صورت نکل آئے، اور یہاں سے قائد اعظم محمد علی جناح اور مسٹر لیاقت علی مسلم لیگ کی جانب سے اور پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ کانگریس کی جانب سے لندن تشریف لے گئے تو اس مختصر سے سفر پر نو ہزار ساٹھ پونڈ خرچ ہو گئے۔ اسی نوع کی اور رقمیں بھی جو دوسرے ممالک سے متعلق ہیں سننے والے کو ایک بار ورطۂ استعجاب میں ڈال دینے کے لئے کافی ہیں۔

## سمندر پار ملکوں سے

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں کے پاس جو کچھ اناج بچ رہتا ہے، اس سے وہ ہندوستان کی مدد برابر کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:—

| قسم اناج | مقدار جو ۱۳ / فروری کو ختم ہونے والے ہفتے میں آئی |
|---|---|
| گیہوں کا آٹا | ۴۵ ٹن |
| چاول | ۶،۲۰۰ 〃 |
| مکئی | ۴،۰۰۰ 〃 |
| جو | ۱۹،۴۰۰ 〃 |
| کل مقدار | ۲۹،۶۴۵ ٹن |

## مشرقی طلبا کے لئے

لندن میں رہنے والے ایک ہندوستانی ماہر امراض چشم ڈاکٹر آر یو ہنگورانی نے انگریزی عوائد رسمیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں ممنوعات کے طور پر دس ہدایات ان طلبا کے لئے درج ہیں جو بغرض تعلیم و تربیت ہندوستان اور مشرق بعید سے انگلستان جاتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ مشرقی طلبا مغرب میں جا کر کس قسم کی بدعنوانیاں کرتے ہیں۔ وہ ہدایات یہ ہیں:— گفتگو میں ایک بات کو مت دہراؤ، ایسے جملے یا محاورے مت بولو جو فرسودہ یا معنوی ہوں، بحث کے وقت اپنے آپے سے باہر مت ہو، اپنی تقریر میں ضرورت سے زیادہ تصنع اور بناوٹ کو روا نہ رکھو، گرہ بڑ نہ مچاؤ، بے موقع و محل پر مذاق یا بھید نہ بتاؤ بلکہ ماحول کے مطابق گفتگو کرو، شیخی نہ بگھارو، اپنی امارت یا قابلیت کا ناجائز اثر ڈال کر کسی انگریز لڑکی کو مرعوب نہ کرو، لوگوں کو فریب میں مبتلا نہ کرو اور ملنے جلنے والوں سے ان کی عمر، آمدنی یا گھریلو زندگی کی بابت کوئی سوال نہ کرو۔

## لکڑی کی ٹانگوں میں

قاعدے اور قانون کے خلاف اشیائے ممنوعہ کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جانے کے عجیب و غریب طریقے دنیا میں رائج ہیں لیکن حال ہی میں ایک سب سے زیادہ حیرت انگیز طریقہ معلوم ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ادھیڑ جرمن اپنے ملک کی سرحد طے کر کے آسٹریا میں جا رہا تھا جس کی دونوں ٹانگیں مصنوعی طور پر لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ عین اس وقت امریکی سرحد پر پہرہ دینے والے سپاہی کو شبہ ہوا اور اس نے اس شخص کو روک کر تلاشی لی۔ جب اس کی مصنوعی ٹانگیں اس کے دھڑ سے الگ کی گئیں تو ان کے اندر سے چار قیمتی گھڑیوں اور پانچ ہزار مارک کے نوٹوں کے علاوہ کھانے کا بہت سا سامان نکلا۔ یہ سب چیزیں خلاف قاعدہ جرمنی سے باہر لے جائی جا رہی تھیں۔

## برطانوی فوج کی واپسی

برطانیہ کے فوجی حکام اعلیٰ نے حکومت مصر کو یقین دلایا ہے کہ برطانوی فوج کا آخری دستہ اس سال ۳۱ / مارچ کو قاہرہ سے کوچ کر جائیگا۔ اس وقت تک قصر النیل والی بارکیں جو قاہرہ میں واقع ہیں بالکل خالی ہو جائیں گی۔ اسی طرح مارچ کے آخر تک باب الحدید کی وہ بارکیں جن میں فوجی پولیس رہتی تھی، مصر کے اسپتال نیز عباسیہ کے ہر قسم کے اسلحے اور ذخیرہ جات بالکل چھوڑ دئے جائیں گے۔ مصر کی ایک خبار کی اطلاع سے پتہ چلا ہے کہ حکومت مصر بڑے پیمانے پر بری بحری اور فضائی مدافعت کی اسکیم تیار کرنے پر غور و خوض کر رہی تھی جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تقریباً پانچ کروڑ روپے خرچ ہوتے۔ اس اسکیم کے ماتحت پانچ بڑے کارخانے کھول کر ہر قسم کے ہتھیار اور ہوائی جہاز تیار کرنے تھے۔

## گیہوں کی بین الاقوامی کانفرنس

انٹرنیشنل ویٹ کونسل کی سفارشات کو دائرہ عمل میں لاتے ہوئے حکومت امریکہ کے ایما پر حکومت برطانیہ نے ۱۸ / مارچ کو لندن میں گیہوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان کو بھی دعوت دی گئی ہے۔ اس اجلاس میں تقسیم گندم وغیرہ کی بابت ایک معاہدہ مرتب ہوگا جس پر تمام شریک ہونے والے نمائندوں کے دستخط ثبت ہوں گے۔ مجوزہ معاہدے کے چند اہم امور حسب ذیل ہیں:— (۱) دنیا بھر میں کم سے کم لاگت پر گیہوں کی پیداوار کو ترقی دینا (۲) ان ملکوں کے لئے جو باہر سے اناج خریدنے کے لئے مجبور ہیں مناسب نرخ پر گیہوں فراہم کرنا (۳) گیہوں کا ذخیرہ اس طرح قائم کرنا کہ وہ حسب ضرورت میسر آسکے (۴) ایسی صورت پیدا کرنا کہ کسی جگہ اناج کا فالتو ذخیرہ خواہ مخواہ ضائع نہ ہو (۵) اچھے کاشتکاروں کی اعانت کرنا اور (۶) غذائی لائحہ عمل کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے پیداوار و خرچ پر توجہ دینا۔ وہ تمام قومیں جو تجارت گندم میں کسی اعتبار سے حصہ لے سکتی ہوں

اس معاہدے پر دستخط کر سکتی ہیں۔ کوشش کی جائیگی کہ چار یا پانچ سال کی مدّت کے لئے اس معاہدے کا نفاذ یکم اگست ۱۹۴۷ء سے شروع ہو جائے۔

## صدر روزویلٹ کا فلم

مسٹر جیمز روزویلٹ نے جو امریکہ کے سابق صدر روزویلٹ کے صاحبزادے ہیں، حال ہی میں اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ امریکہ کی کئی فلم کمپنیاں آنجہانی کی سیاسی زندگی کے اہم پہلوؤں کو پردہ سیمیں پر پیش کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ اس ضمن میں عمیق مطالعہ اور تحقیق کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ کیونکہ اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ بالکل صحیح واقعات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ان بین الاقوامی شہرت کی بلند پایہ ہستیوں کا عملی تعاون بھی حاصل کیا جائے جو ان کی حین حیات میں ان کے ساتھ کسی نہ کسی حیثیت سے شریک کار رہے ہیں یا جن کا ذکر ان کی شخصیت پر روشنی ڈالنے کے لئے ضروری ہے۔ اس اعتبار سے انگلستان کے سابق وزیر اعظم مسٹر چرچل اور روس کے جنرلیسمو اسٹالین سے پورے تعاون کی توقع ہے۔

## چار ہزار سال پرانا مجسمہ

عراق کی سرزمین نوادر قدیم کا مدفن ہے۔ چنانچہ آئے دن ماہرین آثار قدیمہ کی دماغی کاوشیں اور مزدور کی کدالیں دھرتی کا سینہ چیر کر نت نئی چیزیں برآمد کرتی رہتی ہیں۔ حال ہی میں عراق کے ایک اثریاتی وفد نے جس کے روح رواں فواد سیفی تھے، عراق کے قدیم شہر اریدو کی کھدائی کے بعد چند مجسمے وغیرہ نکالے ہیں۔ ان میں سے سنگ اسود کا ایک مجسمہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ وہ سمیری عہد کی یادگار ہے جس کا اندازہ چار ہزار سال لگایا جاتا ہے۔ یہ مجسمہ شیر کا ہے۔ تاریخی اہمیت سے قطع نظر فنی لحاظ سے بھی اس کو بڑی وقعت دی جا سکتی ہے۔

## نئے سال کا بجٹ

نئی مرکزی حکومت کے رکن مالیات آنریبل مسٹر لیاقت علی خاں نے ۲۸ر فروری کو اسمبلی میں نئے سال کا بجٹ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآنی تعلیمات کی رو سے دولت صرف طبقۂ امرا ہی میں تقسیم نہیں ہونی چاہئے بلکہ غریبوں کے ساتھ بھی رواداری کا ثبوت دینا ضروری ہے۔ بجٹ کے اعداد و شمار نہایت دلچسپ ہیں۔ نمک کا ٹیکس بالکل ختم کر دیا گیا اور انکم ٹیکس دینے والوں کی آمدنی کی کم سے کم حد دو ہزار کی بجائے ڈھائی ہزار کر دی گئی ہے۔ پچھلے سال کے بجٹ میں آمدنی کی کل رقم تین ارب چھبیس کروڑ انیس لاکھ تھی لیکن اس سال دو ارب ننانوے کروڑ بیالیس لاکھ ہے۔ چنانچہ چھبیس کروڑ ستتر لاکھ کے فرق کو پورا کرنے کے لئے چند نئے ٹیکس لگائے جائیں گے۔ مثلاً تجارتی صنعت کے سلسلے میں ایک لاکھ سے زیادہ کی آمدنی پر پچیس فیصدی یعنی ایک روپیہ پر چار آنے ٹیکس وصول ہوگا جس کی رقم تیس کروڑ بنتی ہے۔ خالص نفع کی اس سے کم رقم پر ٹیکس کی شرح نسبتاً کم ہوگی۔ اس ضمن میں ساڑھے تین کروڑ روپے وصول ہوں گے۔ کارپوریشن ٹیکس ایک آنے سے دو آنے کر دیا ہے۔ اس کا میزانیہ چار کروڑ روپے ہوتا ہے۔ سپر ٹیکس موجودہ حدود کو ذرا گھٹا کر لگایا جائیگا۔ یہ رقم ڈھائی کروڑ ہوتی ہے۔ باہر سے آنے والی چائے پر محصول کی شرح دو آنے کی بجائے چار آنے فی پونڈ ہوگی۔ محکمہ دفاع کے اخراجات کی رقم ایک ارب اٹھاسی کروڑ اکہتر لاکھ ہے۔ ملک معظم اور ہندوستان کی حکومتوں کے مابین مالی سمجھوتے کی میعاد ۳۱ر مارچ ۱۹۴۷ء کو ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد سے ہندوستان کے دفاعی اخراجات براہ راست اس ملک سے متعلق رہیں گے۔ ۳۱ر جنوری کو اسٹرلنگ قرضہ کی کل رقم سولہ ارب پانچ کروڑ تھی۔ گویا اس سے پہلے کے دس ماہ میں ایک ارب اٹھائیس کروڑ کی کمی ہوگی جس کا سبب غلے کی بے پناہ درآمد ہے۔ ایک سو چھ منٹ کے بعد اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے موصوف نے دعا مانگی کہ خدا آئندہ سال کے تمام نازک موقعوں پر ہماری مدد کرے۔

## اخبارات کی صحافتی مہمان نوازی

گذشتہ اشاعت میں بتایا جا چکا ہے کہ پچھلے دنوں سردی کی بے پناہ شدت اور ایندھن کی غیر متوقع کمی کے باعث یورپ بھر میں بے شمار زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے کارخانے جن کا عارضی تعطل ہی لاکھوں روپے کے نقصان کے مترادف ہے ایک مدت نامعلوم کے لئے بند کر دینے پڑے۔ عوام کو مجبور کیا گیا کہ وہ معینہ اوقات میں قوت برقی کی مقررہ مقدار خرچ کیا کریں۔ برطانیہ میں یہ نزلہ تمام ہفتہ وار اخبارات پر بھی گرا اور ان کی اشاعت سرکاری احکام کے مطابق دو ہفتے کے لئے روک دی گئی۔ ان ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے والوں میں مشہور و معروف ہفتہ وار اخبارات "پنچ" اور "لندن نیوز" بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں علی الترتیب ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۲ء میں جاری ہوئے اور نہایت پابندی اور تسلسل کے ساتھ نکلتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ۱۹۲۶ء میں جب اخبارات نے ایک عام ہڑتال کی تب بھی ان کی اشاعت کسی عنوان رکنے نہ پائی۔ ہفتہ وار اخبار کی بے بسی کا لحاظ رکھتے ہوئے بعض روزانہ اخبارات نے صحافتی مہمان نوازی کا ثبوت دیا اور ان سے کہا کہ آپ اپنے ذاتی خیالات کا اظہار ہمارے صفحات میں کر سکتے ہیں۔ مثلاً مشہور روزانہ اخبار "ڈیلی میل" نے اپنے افتتاحیہ صفحے کے تمام کالم اسپکٹیٹر کے سپرد کر دئے اور "ایوننگ اسٹینڈرڈ" نے بیک وقت کئی اخبارات کو دعوت دی جو اشد ضرورت کے باعث قبول کی گئی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ دنیا ان صحافت نگاروں کے خیالات سے مستفید ہو سکی جن کی نگارشات کو موجودہ سیاسی انتشار کے زمانے میں بڑی اہمیت دی جا سکتی ہے۔

# شاعری فطرت

آغا شاعر قزلباش (مرحوم)

گوہر جو اُگلتا ہے یہ شاعر کی ہے فطرت — ایسی نہیں ہوتی ہر اک انسان میں قدرت
خود یہ جسد کو پیدا کرے اتنی نہیں طاقت — خلاقِ جہاں کرتا ہے اس شے کو ودیعت

حصہ نہیں جس کا اُسے دولت نہیں ملتی
نااہل کو مر کر بھی یہ نعمت نہیں ملتی

کچھ حرص و ہوا سے نہیں یہ رنگ چمکتا — جس پھول میں خوشبو نہ ہو وہ کب ہے مہکتا
بے موجِ ہوا بھی کوئی شعلہ ہے بھڑکتا؟ — دیکھا ہے کبھی طائرِ تصویر چہکتا

توبہ کرو یہ وصف زبانی نہیں ہوتا
کچھ نقل سے خلاقِ معانی نہیں ہوتا

بنتا ہے بنائے سے کہیں کوئی سخنور؟ — بے کار یہ کوشش ہے بہت ہو گئے بُک سر
الماس کا ہم رنگ ہوا ہے کوئی پتھر؟ — تلوار وہ ہے جس میں کہ ذاتی بھی ہوں جوہر

اسوار جہاں جاتے ہیں پیدل نہیں چلتے
انسان کے اس فن میں تو کس بل نہیں چلتے

وجدانِ حقیقی سے طبیعت کو شرف ہے — جو کچھ کہیں اس کیف کو وہ حق بہ طرف ہے
چھینٹے نہ ہوں نیساں کے تو بیکار صدف ہے — جوشش ہی کے دم سے لبِ ہر موج میں کف ہے

کوسوں بھی تو بہتا ہوا دھارا نہیں ملتا
چڑھ جائے یہ دریا تو کنارا نہیں ملتا

# آغا شاعر قزلباش

اب سے کوئی ۲۳-۲۴ برس پہلے کی بات ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ہم سب شام کا کھانا کھا کر بیٹھے تھے والدہ مرحومہ نے پاندان کھولا، سب چھوٹوں بڑوں کو پان دئے اور پاندان اندر چوکی پر رکھوا دیا۔ بچوں کے لئے اب کہانی سننے اور سو جانے کے سوا کوئی شغل باقی نہ رہا تھا کہ اتنے میں والد صاحب (مرحوم) بولے بھئی باجا کون کون سنے گا ــــــ ہم سب یک زبان ہو کر بولے "ہم"۔ نوکر کو آواز دی۔ وہ گراموفون اٹھا کر لایا۔ والد صاحب اسی دن کچھ نئے رکارڈ بازار سے لائے تھے۔ اس لئے باجا سننے کے شوق میں اور بھی تیزی پیدا ہو گئی اس دن جتنے نئے رکارڈ بجے ان میں سے ایک میں یہ غزل تھی جس کا مطلع ہے ؎

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی ہے میرے ماتم کی

یہ شعر مجھے کچھ ایسا بھلا لگا کہ زبانی یاد ہو گیا۔ غزل کے باقی شعر تو اب بھی ذہن میں نہیں ہیں لیکن یہ مطلع دل پر اسی طرح نقش ہے جیسے ۲۳-۲۴ برس پہلے تھا ــــــ اس کے دل پر نقش ہونے کی وجہ یقیناً اب وہ نہیں جو پہلے تھی پہلے مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ شعر کس کا ہے۔ اب جانتا ہوں کہ افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش کا ہے اور اس شعر کو پڑھ کر میرے ذہن پر جو نقش بنتا ہے اس میں ان ساری شاعرانہ رنگینیوں اور نفیس لطافتوں کا امتزاج ہے جو آغا شاعر کی غزلگوئی کی خصوصیات ہیں۔ آغا شاعر کی غزلگوئی محبت کے اس جذبہ کی ترجمانی کرتی ہے جس نے نہ الوہیت کے گہوارے میں پرورش پائی ہے اور نہ روحانیت کی گودوں میں پلا بڑھا ہے۔ اس محبت میں بقول شخصے افلاطونیت بھی نہیں۔ یہ محبت ہماری آپ کی دنیا میں رہنے والے ایک جذباتی انسان کی محبت ہے۔ اس کا محبوب دنیائے آب و گل سے دور، بہت دور کسی ایسی دنیا میں رہنے بسنے والا محبوب نہیں جہاں آہوں کے دھوئیں کے سوا اور کسی چیز کی رسائی نہ ہو اور نہ کوئی ایسا محبوب جو اس دنیا میں رہتے بستے ہوئے بھی ایسا ہو کہ جب وہ پاس آئے تو اسے ہاتھ لگائے نہ بنے اور جب وہ آئے (جس کی بے وفائیوں کے ہزاروں شکووں سے دل کے ساز کا ہر تار بکھر چکا ہو) تو زبان گنگ ہو جائے اور وہ یہ سمجھ کر واپس چلا جائے کہ بیمار کا حال تو اچھا ہے۔ آغا شاعر قزلباش کی غزلوں کا محبوب بھی (ان کے استاد کے محبوب کی طرح) ایسا محبوب ہے جس کی اداؤں پر پیار تو آتا ہے لیکن محض اس لئے کہ وہ محبوب ہے اسے الوہیت کی حدوں تک نہیں پہنچا دیا جاتا۔ اس کی دلداری کی جاتی ہے۔ آنکھیں اس کی راہ میں بچھائی جاتی ہیں لیکن اس سے کوئی شکایت ہوتی ہے تو اس سے شکوے بھی کئے جاتے ہیں اور ایسے انداز میں کئے جاتے ہیں جو سماوی نہیں ارضی ہے۔ شکوہ کا وہی 'ارضی' انداز اس مطلع کے دونوں مصرعوں میں موجود ہے۔ پہلے میں محبوب کی ارضیت کی تصویر ہے، اور دوسرے میں عاشق کی اس جذباتی اور ذہنی کیفیت کی ترجمانی جو انتہائی مایوسی اور شکستہ دلی سے پیدا ہوتی ہے۔ مایوسی اور شکستہ دلی دل کے زخموں کا مداوا طنز کے مرہم سے کرتی ہے۔ طنز آغا شاعر کی غزلگوئی کی ایک خصوصیت ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

بُرے حال سے یا بھلے حال سے ❊ تمہیں کیا ہماری بسر ہو گئی
سدھاریں بھلا آپ کیا دیکھتے ہیں ❊ جنازہ کسی کا، تماشہ کسی کا
سنبھالا نہ تم نے اجل نے جِلایا ❊ کہیں کام کرتا ہے داتا کسی کا
اٹھانے پڑے خاک سے دل کے ٹکڑے ❊ بڑا پیار تھا پیار دیکھا تمہارا
ملو تم، اگر کوئی مشکل نہیں ہے ❊ مگر کیا کروں پیار کا دل نہیں ہے

بات ذرا بے ربط سی ہے پھر بھی جی چاہتا ہے کہ وہ تین ایسے شعر سنا کر آگے بڑھوں جن میں طنز کا نشانہ بے نارحم، محبوب نہیں بلکہ ایک ایسی ذات ہے جو طنز و تشنیع سے بے نیاز اور ارضی، علائق سے بالاتر ہے۔ ؎

جو برق و باد پہ قادر وہ اس قدر مجبور ❊ کہ ایک سانس بڑھانے کا اختیار نہیں
ہم جلائے گئے ہیں مرنے کو ❊ اس کرم کی بہار کون کرے؟

حشر میں انصاف ہو گا بس یہی سنتے رہو
کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائے گا

تیسرے شعر میں طنز کی جو تلخی ہے اس کے پردے میں ایک شوخ کرن کی جھلک ہے۔ یہی شوخ کرن آغا شاعر کی غزلوں میں تغزل کا وہ مفہوم پیدا کرتی ہے جسے سب سے پہلے ہمارے غزلگو شاعروں میں جرات نے شروع کیا۔ مومن کے مخصوص انداز نے اس رنگ کو بدل کر شوخی میں متانت اور شکایت میں بلاغت اور معنی آفرینی کے جوہر شامل کر کے اسے جلا دی ــــ اور پھر کچھ آگے چل کر جرات اور مومن کے دو رنگوں کو ملا کر ایک سنہرے روپہلے طرز کی بنیاد داغ نے رکھی۔ داغ کے اس شوخ و شنگ رنگ کو امیر مینائی کے شاگردوں میں ریاض نے اور خود داغ کے شاگردوں میں آغا شاعر نے اس حسن و خوبی سے قائم رکھا کہ یہ بیسویں صدی کی غزل کی ایک نمایاں خصوصیت بن گیا۔ اس طرز کے کچھ پہلو یقیناً ایسے ہیں جن پر ثقہ سے ثقہ پڑھنے اور سننے والے بھی سر دھنتے ہیں۔ اس طرز کے لکھنے والوں نے زبان کی سادگی، بے تکلفی، روزمرہ اور ان ساری چیزوں سے پیدا ہونے والی

وقار عظیم

گھلاوٹ اور لگاوٹ سے جو کام لیا ہے۔ اس سے تغزل کے حسن میں ایک جذباتی کشش پیدا ہوتی ہے، اور گو ہم اپنی پردہ داری کے خیال سے اس کشش کو کشش نہ سمجھیں یا بظاہر اس حسن سے گنگناتی ہوئی بزموں کے رقص و نغمہ میں ڈوب کر اپنی برتری کے احساس کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں مصروف رہیں، لیکن یہ خواہش شاید ہر ایک کے دل میں گدگدی پیدا کرتی ہے کہ اس بزم کے حسن رنگین کی جھلک کسی نہ کسی طرح نظر آ جائے۔ اس لئے کہ اس رنگین جھلک میں بھی بہت کچھ ایسا ہے جو ہمارے دلوں سے قریب ہے۔ ہماری انسانی فطرت کا جزو لاینفک ہے۔ آغا شاعر کی غزلگوئی فطرت انسانی کے اسی پہلو کو بے تکلفی سے لیکن شاعرانہ انداز میں ہمارے سامنے لاتی ہے۔ یہاں احساس تو ایک معمولی انسان کا ہے لیکن بیان شاعر کا۔ اور جہاں یہ دونوں چیزیں مل جائیں شعر میں لذت کا پیدا ہو جانا یقینی ہے کچھ شعر سنئے ؎

پھر مرے سر کی قسم کھا کر چلے ✤ پھر مجھے سرکار نے دھوکا دیا
کوستے ہیں ستانے والے کو ✤ آپ سے تو کوئی خطاب نہیں
کہاں نصیب یہ شاہ وہ دردِ دل پوچھیں ✤ میں مسکرا کے کہوں ہاں حضور ہوتا ہے
دو اجازت تو کلیجے سے لگاؤں رخسار ✤ سینک لوں چوٹ جگر کی انہیں انگاروں پر
پھر تڑپنے لگا دلِ مضطر ✤ پھر لگا تھپکے ہم کو سینے سے

تم بھلا کون سے دل میں مرے آنے والے
دیکھنا جان نہ پہچان چلے آتے ہیں

مجھ سے پوچھے کوئی میں بات بتاؤں دل کی ✤ اس لئے روٹھ رہے ہیں کہ منائے کوئی

ان سارے شعروں میں عاشق اور محبوب کا رشتہ شروع سے آخر تک ارضی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں ہر جگہ باقی ہر چیز سے زیادہ تقاضائے بشری کا پرتو ہے۔ عاشق محبوب دلنواز کی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا — لفظوں کے حریری پردوں میں بھی انسانی فطرت کی شوخی اور بے باکی صاف جھانکتی دکھائی دیتی ہے — لیکن اس شوخی اور بے باکی میں بھی وہ حفظ مراتب موجود ہے جو عشق اور حسن کے رشتہ میں ایک کو نیاز دوسرے کو ناز، ایک کو خادم دوسرے کو مخدوم، اور ایک کو عاشق اور دوسرے کو محبوب بناتا ہے۔ پھر مجھے سرکار نے دھوکا دیا، آپ سے تو کوئی خطاب نہیں، میں مسکرا کے کہوں ہاں حضور ہوتا ہے — ان تینوں مصرعوں میں جہاں ایک طرف اس ارضی تعلق کی جھلک ہے جسے میں نے آغا شاعر کی غزلگوئی کی خصوصیت کہا ہے، وہاں دوسری طرف نیاز و ناز کے باہمی تعلق کا حفظ مراتب بھی ہے۔ اس کے بعد کا شعر ہے ؎

دو اجازت تو کلیجے سے لگاؤں رخسار
سینک لوں چوٹ جگر کی انہیں انگاروں سے

اس میں دو اجازت کے ٹکڑے کی بلاغت قابل داد ہے۔ اسی طرح اس سے اگلے شعر کا دوسرا مصرعہ "پھر لگا تھپکے ہم کو سینے سے" ایک گذری ہوئی طویل اور رنگین کہانی کا ایک معنی خیز ٹکڑا ہے۔ اس کے بعد کے دونوں شعروں میں شوخی یقیناً زیادہ ہے لیکن اس شوخی میں بھی کسی اور بات سے زیادہ یہ پہلو نمایاں ہے کہ حسن اور عشق کا باہمی رشتہ راز بنا کر رکھنے کی چیز نہیں۔

یہ آغا شاعر مرحوم کی غزلگوئی کے صرف دو رخ ہیں۔ انہیں دیکھ کر غزل میں بلند مطالب کی جستجو کرنے والوں کو شاید پوری تسکین نہ ہو۔ اس لئے ان کے تھوڑے سے شعر اور سن لیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شعر پڑھ کر آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جس نے عشق و محبت کی ترجمانی میں زندگی، بشریت اور ارضیت کو نہیں چھوڑا، دنیا کے دوسرے حقائق سے بے تعلق رہنا بھی اس کے بس کی بات نہیں — زندگی کے متعلق آغا شاعر کے دو شعر ہیں ؎

زندگی ہے مزار غم کا نام ✤ اس سمندر کو پار کون کرے؟
تنکے کی طرح سیل حوادث لئے پھرا ✤ طوفاں لے کے آئے تھے ہم زندگی کے ساتھ

یہ دو شعر محض خیال آرائی کا نتیجہ نہیں بلکہ شاعر نے زندگی کے طوفانوں اور سیل حوادث کے تھپیڑوں سے دوچار ہو کر اپنے تجربوں کو شعر کا لباس پہنایا ہے۔ یہی شاعر جب زندگی کے اس طوفان میں مناظر فطرت کی جھلک دیکھتا ہے تو پکار اٹھتا ہے ؎

کبھی ساون کی جھڑی ہو کبھی بھادوں برسے
ایسا برسے مرے اللہ کہ چھاجوں برسے

اف رے شبنم اسقدر ناقدریاں ✤ موتیوں کو گھاس پر بکھرا دیا

کہیں دریا، کہیں صحرا، کہیں پربت، کہیں کھیت
کہیں موتی سا پانی اس پہ آنچل سبز کائی کا

کچھ شعر یونہی بے ربط اور بے سلسلہ اور سن لیجئے۔ ان میں بھی زندگی کے طوفان اور سیل حوادث کی جھلکیاں ہیں اور اصل میں یہی جھلکیاں ہیں جو تصویر کو مکمل بناتی ہیں ؎

اے شمع ہم سے سوز محبت کے ضبط سیکھ
کمبخت ایک رات میں ساری پگھل گئی

تو ہم بتائیں غنچہ و گل میں ہے فرق کیا
اک بات ہے کہی ہوئی اک بے کہی ہوئی

اس واسطے تھم تھم کے ہے جاری نفس اپنا
آہوں سے کہیں ٹوٹ نہ جائے قفس اپنا

کہاں تک سختیاں جھیلے کوئی قید علائق کی
نکل جاؤں گا اک دن توڑ کر دیوار زنداں کو

برق خرمن سوز آب رکھنا ذرا چشم کرم
چار تنکے پھر جڑے ہیں آشیانے کے لئے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

# دلدار شاہ داتا

حسن نظامی

میرے دوست آغا شاعر صاحب مرحوم آج سے تیس سال پہلے ایک دفعہ میرے پاس آئے تو میں نے دیکھا تسبیح و اکر تارا گلے میں ہے۔ سر برہنہ قلندرانہ شان الا اللہ کے نعرے لگاتے ہوئے۔ میں نے یہ ہیئت دیکھتے ہی کہا آئیے دلدار شاہ داتا۔

وہ میرا فقرہ سن کر پھڑک گئے اور کہا اب اسی نام سے پکارا کیجئے۔ میں نے کہا نام سے کیا ہوتا ہے کچھ کام بھی کیجئے۔ میں مکان دیتا ہوں اس میں کچھ دن رہئے اور فقرا کی باطنی تعلیم حاصل کیجئے۔ کہا ہم تو اسی نیت سے آئے ہیں۔ بتلایئے کونسا مکان ہے۔

میں نے ایک مکان میں اپنے قریب ٹھہرایا۔ تصوف کے اذکار و اشغال بتائے۔ اور روزانہ شام کے وقت چند گھنٹے ان کے ساتھ گزرنے لگے۔

ایک چلّے کے بعد میں نے ان کو متھرا بھیجا۔ جہاں کئی مہینے ان کا قیام رہا۔ جہاں میں نے پہلے سے بندوبست کر دیا تھا۔ اس کے بعد جی اکتا یا اور وہ متھرا سے واپس چلے آئے پھر کبھی ان سے اس شوق کا ذکر نہیں سُنا۔

## دلدار شاہ کا حلیہ

آغا شاعر صاحب قزلباش کا قد میانہ تھا۔ جسم دوہرا گدازتھا۔ چہرہ گول۔ آنکھیں بڑی بڑی چمک دار اور رسیلی تھیں۔ آواز بڑی اور رپاٹ دار تھی۔ جب شعر پڑھتے تھے تو شعر کی شکل بن جاتے تھے اس خوبی سے ادا کرتے تھے۔

ایک دن میں نے کہا، مجھے سوائے حضرت اکبر الہ آبادی اور کسی کے اشعار یاد نہیں رہتے۔ بولے کیا میرا بھی کوئی شعر یاد نہیں رہتا؟ میں نے کہا جی ہاں آپ کا بھی کوئی شعر یاد نہیں ہے۔ البتہ آپ کی ایک کتاب کا ابتدائی حصّہ یاد ہے۔ جو نظم نہیں نثر ہے۔ تعجب سے پوچھا وہ کیا عبارت ہے میں نے وہ عبارت سنائی جو یہ تھی

"یہ میٹھی ٹکیاں۔ جو اماں نے بڑے چاؤ سے پکائی ہیں۔ کھا تو رہی ہوں۔ مگر رہ رہ کے تم یاد آ رہے ہو۔"

آغا دلدار شاہ یہ سن کر بہت خوش ہوے، اور اس کتاب کا بہت دیر تک ذکر کرتے رہے۔ جس کی عبارت یہ تھی۔

میں ان کو دہلی کی جان کہا کرتا تھا، افسوس وہ نہ رہے۔ اور دہلی کی زندگی بے جان ہوگئی۔

## آغا شاعر قزلباش:

(بقیہ صفحہ ۹)

گھٹا جاتا ہے دم ضبط فغاں سے ۞ بٹے جاتے ہیں نالے ہچکیاں سے

آغا شاعر قزلباش کو اردو والے ایک غزل گو کی حیثیت سے (ایک ایسے غزل گو کی حیثیت سے جس کی غزلیں رنگین محفلوں کو رنگین بناتی ہیں اور جس کے شعر پڑھ کر اب بھی لوگ سر دھنتے ہیں) جانتے ہیں، ان کی غزلوں کا دیوان، مخزن پریس نے "تیر و نشتر" کے نام سے عرصہ ہوا شائع کیا تھا۔ یہ شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آغا شاعر نے کلام پاک کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ رباعیوں میں کیا تھا اور وہ مجموعہ "خمکدۂ خیام" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اور یہ کہ انہوں نے نثر، نظم سے بھی زیادہ لکھی ہے۔ وہ مخزن کے مشہور لکھنے والوں میں سے تھے اور ان کے رنگین شاعرانہ اور پرکیف مضامین کا مجموعہ "خمارستان" شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ میں ۲۷ مضامین ہیں کچھ خالص ادبی اور تنقیدی، کچھ بیانیہ، کچھ تخیلی اور کچھ دہلی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق۔ ان سارے مضامین کا موضوع ایک سا نہیں۔ لیکن ایک چیز ہے جو ہر مضمون میں بے حد نمایاں ہے۔ اور وہ ہے آغا شاعر کی شاعرانہ فطرت۔ آغا شاعر نے ہر چیز کو شاعر کی نظر سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ مناظر فطرت، دہلی کی اُجڑی ہوئی بزموں کے دلدوز تصورات، حسن اخلاق کے دلنشیں سبق، ادب کی بیتی ہوئی صحبتوں کی یاد ۔۔۔ ان سب چیزوں کو پڑھ کر لکھنے والے کے احساس اور بیان کی شاعرانہ نزاکتیں، دل پر گہرا اثر کرتی ہیں۔ لکھنے والے نے مشاہدات اور محسوسات کو چھوٹے چھوٹے شاعرانہ فقروں میں بیان کیا ہے اور اس طرح اس کے دل کی بات دوسرے کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ آغا شاعر کی نثر کی یہ خصوصیت ان کے ان متعدد ڈراموں اور ناولوں میں بھی نمایاں ہے جن میں سے اکثر اب تک شائع نہیں ہوئے یا شائع ہوئے تو اب ان کا پتہ نہیں اور کوئی جانتا تک نہیں کہ آغا شاعر نے ڈرامے لکھ کر کبھی کبھی ان میں ہیرو کا پارٹ بھی خود کیا ہے۔

بعض ڈرامے اور ناول ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔ "دو دل، ارمان اور ناہید" ابھی حال میں شائع ہوئے ہیں۔ شیکسپیر کے بعض ڈراموں کے ترجمے اب تک غیر مطبوعہ ہیں اور یہ ساری باتیں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

اور یہ بات تو شائد بہت تھوڑے سے لوگوں کو معلوم ہے کہ افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش کبھی دلدار شاہ داتا بھی تھے ۔۔۔ ہماری یہ ساری بے نیازی اور بے خبری اس شاعر اور ادیب کی طرف سے ہے جسے اس دنیا سے سدھارے ابھی سات ہی سال ہوئے ہیں (وفات ۲ مارچ ۱۹۴۰ء) پھر دنیا کی کس چیز کا اعتبار ہو۔ کس پر بھروسہ ہو سوائے ایک ذات کے جو ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گی اور اسی کا نام سدا رہنے والا ہے۔ باقی سب کچھ فانی ہے۔

# دلدار شاہ داتا

آفتاب قزلباش

یہ علی گنج ہے چودھویں کا چاند اپنی پوری تابانی سے خنک نور کی بارش کر رہا ہے۔ نیم کے پھولوں کے گچھے ہوا میں لہرا کر فضاؤں کو بھینی بھینی خوشبو میں بسا رہے ہیں۔

رات بھیگ چکی ہے ہُو کا عالم ہے، آدم نہ آدم زاد دنیا کا تھکا ہارا شور نیند کی آغوش میں جا چکا ہے۔ چاندنی میں سفید سفید قبریں معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے آسمان سے آکر سر بسجود ہو گئے ہیں۔

دلدار شاہ داتا کی قبر بڑے بڑے سرخ، کچھ قرمزی، کچھ گہرے زرد گلاب کے پھولوں سے مہک رہی ہے۔ دلدار شاہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آرام کر رہے ہیں۔

دلدار شاہ کے متعلق مشہور ہے کہ بڑے نفیس مزاج، نرم و نازک حسین و جمیل بزرگ تھے۔ پاک صاف رہنا تو خیر ان کی سرشت میں ہی تھا لیکن سنا جاتا ہے کہ وہ شمامۃ العنبر اور نہ جانے کون کون سے عطر سے اپنے لباس کو بساتے تھے۔ آج ان کی قبر گلاب سے مہک رہی ہے اور وہ خود منوں خاک کے نیچے بڑے آرام سے سو رہے ہیں۔

میرے آنسو نکل پڑے اللہ اکبر! اتنا نازک مزاج آدمی جسے گرد و خاک تو کجا سگرٹ کے دھوئیں سے تکلیف ہوتی ہو، جسے طلوع و غروب کے حسین مناظر کی کھلے بندوں سیر کی ہو، جو ساری زندگی ہوا کی طرح آزاد اور پانی کی طرح رواں دواں رہا ہو آج قبر کی تنگ و تاریک کوٹھری میں آسودہ ہے۔

دلدار شاہ غزل کے بادشاہ تھے، معروف شاعر تھے۔ انہیں کا یہ شعر میں نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے پڑھا ؎

لحد میں ان کے جسم نازنین پر کیا گزرتی ہو
سحر تک جن کو بے چینی رہی ہو چین بستر کی

مارچ ۱۹۴۴ء کا بارھواں دن طلوع ہوا مطلع صاف تھا۔ نہ بہت زیادہ گرمی تھی نہ بارش کے کوئی آثار۔ عصر اور مغرب کے درمیان ایکا ایکی آندھی کے جھکڑ چلنے لگے، گرد و غبار سے آسمان تاریک ہو گیا۔ بڑے بڑے تناور درخت چرچرا کر بڑے دھماکوں سے زمین پر آ رہے رستے ویران ہو گئے ٹریفک رک گئے، بجلی کے تار ٹوٹ گئے۔ مکانوں سے ٹین کے سائبان اُڑ گئے۔ الامان و الحفیظ۔ طوفان کیسا تھا ہی باران رحمت کا نزول شروع ہوا۔ ادھر دلدار شاہ نے کلمہ پڑھا اور ہلکی مسکراہٹ چہرے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ گئی۔ بارش کہتی تھی کہ اب برس کے کھلنے کا نام نہ لوں گی۔ ایسی طوفانی شام کو دلدار شاہ کی طلبی کا حکم آیا۔ یہ راضی برضا مسکراتے ہوئے لبیک کہتے ہوئے دنیا سے سدھارے ہمیشہ رہے نام اللہ کا —— لوگوں میں ذکر ہوا کہ دلدار شاہ بڑے پہنچے ہوئے آدمی تھے دیکھا نہیں کیسا سخت طوفان اور کس غضب کی بارش تھی کوئی بزرگ جب دنیا سے اٹھتا ہے تو طوفانی عناصر کا اسی قسم کا مظاہرہ ہوتا ہے دوسری صبح ایک مقامی روزنامے نے لکھا۔

دلی کا زبان دان ہند و مسلم اتحاد کا سچا عاشق چل بسا۔ دوسرے اخبار نے لکھا ہے

مر گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

کسی نے کچھ لکھا کسی نے کچھ۔ حضرت شمس العلماء خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے منادی میں لکھا "یہ کم آدمیوں کو معلوم ہو گا کہ دلدار شاہ ایک زمانے میں سلطان جی آ کر رہے تھے۔ میں نے انہیں ایک کمرہ دیا تھا اور وہ کمرہ بند کر کے عبادت کیا کرتے تھے"۔ مجھے دلدار شاہ کے ملفوظات میں کچھ اور دلچسپ واقعات ملے۔

دلدار شاہ ایک صاف دل اور پاک باطن معصوم آدمی تھے۔ ایک زمانے میں گیروے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنا کرتے تھے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھوں سے نور کی شعاعیں نکلتی تھیں۔ سورت اور احمد آباد بھی کچھ دن قیام کیا تھا اور وہاں کے لوگ انہیں دلدار شاہ داتا کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ان کے ایک سورتی دوست نے بیان کیا کہ دلدار شاہ إِلَّا اللّٰہ کا ورد کیا کرتے تھے۔ ایک برگد کا درخت جس نے اپنے جیسوؤں میں اپنی داڑھیوں سے کھیپ میں بنا دی تھیں اس کے نیچے دلدار شاہ چند معتقدین کے ہمراہ بیٹھے ذکر و فکر کی باتیں کر رہے تھے۔ دلدار شاہ بتا رہے تھے کہ اللہ کے کلام میں بڑی قدرت ہے۔ یہ پہاڑوں کو بادل کی طرح اڑا سکتا ہے۔ درختوں کو پرکاہ کی طرح پھینک سکتا ہے۔ مگر اس کا ورد کرنا اور اس کی مشق کرنی ہے تو مشکل ہے۔ یہ کہہ کر آپ دو زانو ہو کر بیٹھے اور زور سے إِلَّا اللّٰہ کا نعرہ مارا۔ معاً برگد کا ایک بہت بڑا ٹہنا چر چر سے اپنی جگہ سے علیحدہ ہو کر دھم سے زمین پر آ رہا۔ اتنے بڑے تناور درخت کے ٹہنے کے گرتے ہی لوگ دیوانہ وار دلدار شاہ کے حضور میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ آپ کی یہ کرامت شہر بھر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ دلدار شاہ ایسی چیزوں سے گھبراتے تھے چنانچہ رات ہی کو سورت سے غائب ہو گئے۔

سلطان جی اور حضرت خواجہ اجمیری سے بڑی عقیدت تھی۔ اجمیر شریف میں دلدار شاہ بیمار ہو گئے جو نقد روپے پاس تھے وہ ایک رومال میں باندھے ہوئے تھے۔ گھبرا کر دلی کا قصد کیا۔ اسٹیشن پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ رومال کہیں گر گیا ہے۔ آپ وہاں سے درگاہ پہنچے۔ عرض کیا کہ مجھے دلی جانا ہے اور میرا رومال کہیں گر گیا میرے پاس اب زادِ راہ بھی نہیں ہے۔ باہر نکلے ہی تھے کہ نواب نوح الدین خان صاحب تاباں دہلوی رئیس لوہارو سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا آپ دلی کب جا رہے ہیں؟ دلدار شاہ نے کہا آج اور

ابھی۔ نواب صاحب نے کہا میری خاطر اتنی تکلیف گوارا کیجئے کہ یہ دو سو روپے میرے گھر دے دیجئے گا میں بھول آیا اور وہاں سخت ضرورت ہے۔ دلدار شاہ نے روپے لے لئے اور گاڑی میں سوار ہو گئے۔ گاڑی نے پوری رفتار شروع کی تھی کہ کھڑکی سے ایک ہاتھ بلند ہوا جس میں دلدار شاہ کا وہی رومال تھا جس میں ان کے روپے تھے آواز آئی یہ رومال گر گیا تھا لے لیجئے۔ دلدار شاہ نے رومال لے لیا اور کھڑکی سے جھانک کر رومال دینے والے کو دیکھا مگر وہاں پہاڑی پتھروں، درختوں کے اور کچھ نہ تھا۔ گاڑی پوری رفتار سے جا رہی تھی۔

دلی پہنچ کر دلدار شاہ نواب شجاع الدین صاحب کے دولت کدے پر تشریف لے گئے۔ اپنی آمد کی اطلاع کرائی تو نوکر نے آ کر کہا نواب صاحب ایک ہفتہ سے صاحبِ فراش ہیں۔ آپ کو اندر ہی بلایا ہے۔ دلدار شاہ اندر پہنچے تو نواب صاحب کو نہایت کرب میں پایا۔ کچھ پڑھتے اور دم کرتے رہے۔ چلتے ہوئے نواب صاحب کو اجمیر والا معاملہ سنایا۔ نواب صاحب نے کہا بھائی میں تو آج ایک ہفتے سے بستر سے اُٹھ بھی نہیں سکتا ہوں اجمیر جانا تو کجا۔

دلدار شاہ کی شاعری کی دھوم تھی، ان کی غزل خوانی بےنظیر تھی۔ تحت اللفظ پڑھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے لیکن یہ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ شاعر کیسے ہیں۔

دلدار شاہ صاحب سیف کے خاندان سے تھے۔ وہ نسلی طور پر تنزلباش تھے۔ ان کے گھرانے میں علم و فضل کی دستار اس وقت بندھتی تھی جب وہ اچھا خاصا سہرا پر تسلیم کر لیا جاتا تھا۔

دلدار شاہ کو بارہ سال کی عمر میں گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ بے ماں کا بے زبان بچہ دو دن مسلسل فاقے اور دربدری سے تنگ آ کر حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب جہان آبادی کے مزار پر آ بیٹھے۔

گرمی کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں شاہ کلیم اللہ صاحب کے مزار پر سوائے اس معصوم بچے کے کوئی اور نہ تھا۔

یہ بچہ ناز و نعم کا پالا ہوا تھا۔ دو دن کے فاقے اور خستگی سے چور ہو کر بچے نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ کھانوں کی دوکان کے پاس سے گذرتے ہوئے بچے نے بڑی حسرت سے کھانا کھاتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ مگر واہ ری غیرت کسی سے منہ سے نہ کہا کہ میں دو دن سے بھوکا ہوں۔

شاہ صاحب کے مزار پر لیٹے لیٹے بچے کو نیند آ گئی۔ تھوڑی دیر میں کھانے کی خوشبو سے آنکھ کھل گئی۔ اب جو اُٹھ کر دیکھا تو زردے کی بھری ہوئی چوٹی دار پلیٹ گرما گرم سامنے رکھی ہے۔ بچے نے اِدھر اُدھر دیکھا چلچلاتی ہوئی دھوپ میں کہیں دور دور آدمی کا پتہ نہیں تھا کسی کے آنے جانے کا کوئی سان گمان بھی نہیں تھا۔ بھوک سے بیتاب ہو کر وہ ساری پلیٹ زردے کی کھالی اور پانی پیا۔ دلدار شاہ کو کھانا کھاتے ہی ایک نشہ کا سرور پیدا ہوا اور وہ عالم طاری ہو گیا جس وقت آدمی کچھ کہتا ہے جو اس پر نازل ہو رہا ہو۔ دلدار شاہ مترنم ہوئے اور پہلا شعر اس وقت کہا جب ہرگز ہرگز سن تمیز و شعور نے انہیں چھوا تک نہیں تھا۔

دلدار شاہ بڑے نیک دل اور دوسروں کے کام آنے والے دانا تھے۔ چھپ کر اور چھپا کر وہ لوگوں کے ساتھ نیکی کرتے تھے اور حضرت علی کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے "کہ جب سائل کو کچھ دو تو اس کی جانب نہ دیکھو کیوں کہ اس کے چہرے کی کیفیات تم دیکھو گے تو وہ شرمندہ ہوگا۔ اس طرح دو کہ ایک کی دوسرے کو خبر نہ ہو"

ان کے ایک ہندو عقیدت مند جوڑے کے ہاں اولاد کئی سال سے نہ ہوئی تھی۔ دلدار شاہ کی تعویذ لکھنے کی بات اڑتی اڑتی ان لوگوں نے بھی سُن لی۔ ان ہندو دوست نے دلدار شاہ دانا سے عرض کیا۔ دلدار شاہ کچے سوت کے دھاگوں کو پڑھ کر دیا کرتے تھے اور کوئی تعویذ کبھی بازو پر باندھنے کو دیتے تھے۔ مگر لکھ کچھ پچھ جڑا نے بتے۔ عاجزی اور انکساری سے فالتو اور جب کوئی سر ہو جاتا اور اللہ کا حکم شامل حال ہو جاتا تو وہ تعویذ لکھ دیتے تھے اور خدا کی برکت سے لوگوں کی مراد پوری ہو جاتی تھی۔ چنانچہ دلدار شاہ تعویذ دے کر کوچ کر گئے۔ ان ہندو عقیدت مند کو بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن خدا کا کرنا انہوں نے خواب میں دلدار شاہ کو دیکھا۔ دلدار شاہ مسکرائے اور ایک بڑا سیب ان کو دیا اور کہا گھبراؤ نہیں اللہ میں بڑی قدرت ہے۔

آج بھی وہ صاحب دلدار شاہ کے عقیدتمند ہیں اور اپنا ہرا بھرا باغ دیکھ کر مسکرایا کرتے ہیں جس کو دلدار شاہ نے برکت دی تھی۔

وصال سے کچھ گھنٹے پہلے دلدار شاہ نے کہا تھا کہ ایک آدمی بڑا لمبا چوڑا میرے لئے سونے کی جگمگاتی ہوئی کرسی لایا ہے۔ مجھے کہتا ہے اسمیں بیٹھو میں سمندروں پہاڑوں اور دریاؤں سے اڑا کر لے جاؤں گا۔ میرا دل لرز رہا ہے۔ پھر فرمایا میرے اوپر سے ہوائی جہاز گذریں گے۔

اللہ اللہ۔ وہ سونے کی کرسی میں بیٹھ کر سمندروں دریاؤں اور پہاڑوں سے گذر کر کسی نا معلوم جگہ چلے گئے لیکن جہاں ان کا جسدِ خاکی مدفون ہے اس پر سے ہوائی جہاز اُڑ کر دن رات نہ جانے کتنی بار گذرتے ہیں۔ ابھی ابھی سبز و سرخ روشنی دکھاتا ایک امریکن جہاز گذرا ہے مجھے دلدار شاہ کی معصوم باتیں رُلا رہی ہیں۔

روز آسمان میں تارے رقص کرتے ہیں۔ روز ہوائیں سرسراتی ہیں۔ صبح طلوع ہوتی ہے۔ شبنم برستی ہے۔ دوپہر ہوتی ہے پھر شام ہو جاتی ہے لیکن اب دلدار شاہ کو کسی موسم سے تکلیف نہیں ہوتی اور وہ گہری نیند سو رہے ہیں ان کی قبر پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس میں ایک مصرعہ یہ بھی ہے۔

ع

آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

# سراب

افسانہ

سہیل عظیم آبادی

(سارے کردار فرضی ہیں)۔

"چوکری چائی بابو؟"

"کیا بولتا ہے؟"

"چوکری چاہتا ہے بابو؟ ہم دکھائے گا"

"جیپ رہوت"

"اچاوالا ساپ"

"بھاگو بدمعاش"

"بوت اچاوالا ساپ ۔۔۔ نیا نیا مندر والا"

"بھاگتا ہے یا نہیں سور کہیں کا"

"چل کے دیکھ لو ساب ۔ پھر اب والا ہوگا تو ...."

"سور کے بچے بھاگتا ہے یا مار کھائے گا"

"دل خوش ہو جائگا ساب۔ دیکھ لو ساب۔ دیپہ بھی کم ساب پانچ پیسہ۔"

"اب بھاگ جا۔ ورنہ ماروں گا تجھے"

انور برابر اسے ڈانٹتا اور تیزی کے ساتھ قدم بڑھاتا جا رہا تھا لڑکا برابر اس کا پیچھا کرتا جا رہا تھا۔ جب وہ گلی کے موڑ پر آگیا تو لڑکا ناامید ہو کر پیچھے رہ گیا۔ انور سوچ رہا تھا کہ اس نے غلطی کی جو اس راستے سے آیا۔ مگر اسے جلدی تھی اور یہ راستہ مختصر تھا۔ ورنہ وہ ہرگز اس راستے سے نہ آتا۔ کلکتہ میں وہ کئی برسوں سے تھا۔ لیکن اس راستے سے گزرنے کا دوسرا موقع تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس راستے میں کون لوگ رہتے ہیں۔ لیکن اسے ان لوگوں سے دلچسپی نہ تھی۔ اسے شوق تھا تو کھیلوں سے اور ورزش سے۔ مگر وہ اس محلے کو جانتا تھا۔ اس کے بہت سے دوست اپنا وقت گزارنے اس محلے میں آیا کرتے تھے۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ ایک جوان لڑکی کی قیمت اس محلے میں ایک بکری سے بھی کم ہے۔

موڑ پر پہنچ کر انور نے جیب سے رومال نکالا۔ اور چہرے سے پسینہ صاف کیا۔ ابھی نہ ٹرام کا پتہ تھا اور نہ بس کا۔ آج شہر کی دو بڑی ٹیموں کا میچ تھا۔ اور وہ جلد سے جلد کھیل کے میدان میں پہنچنا چاہتا تھا لیکن بس یا ٹرام کا پتہ نہ تھا۔ انور نے پلٹ کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ لڑکا اب بھی تھوڑی دور پر کھڑا تھا۔ اس کے بدن پر پھٹی ہوئی میلی دھوتی اور میلی بنیان تھی۔ سر کے بال میلے اور الجھے ہوئے تھے۔ اور وہ انور کو مایوس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

انور جلد سے جلد میدان پہنچنے کے لئے تیزی سے چل کر آیا تھا۔ اس لئے اس کا بدن پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ وہ رومال سے چہرہ اور ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ گلی میں سناٹا سا تھا۔ صرف حلوائیوں کی دو دکانوں پر کچھ لوگ تھے اور کام کر رہے تھے۔ اور یہاں پردہ کھڑا ہوا تھا۔ وہاں تک کوئی عورت نظر نہیں آتی تھی۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا میدان کی طرف جانے والی کوئی بس یا ٹرام نہیں آرہی تھی۔ ایک آدمی اس کے سامنے آیا اور بولا۔

"سلام ساب"

انور نے اسے پہچانا نہیں۔ لیکن اسے خیال آیا کہ اس آدمی کو اس نے کہیں دیکھا ضرور ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ آخر اسے کہاں دیکھا ہے۔ وہ آدمی کھڑا [illegible] اور بولا۔

"ساب ہم آپ کو ریاض بابو کے گھر دیکھا تھا"

انور کو یاد آگیا کہ ایک دن جب وہ ریاض کے [illegible] پہنچا تو [illegible] ریاض کو اس آدمی کے ساتھ کچھ [illegible] باتیں کرتے دیکھا تھا۔ اور اس کے پہنچ جانے پر دونوں چپ ہو گئے تھے۔ پھر ریاض نے [illegible] سے دوسرے [illegible] چلا آیا تھا۔ اور ریاض نے خود ہی [illegible] کہ یہ آدمی [illegible] ہے۔ اور کبھی کبھی اس سے ملنے آیا کرتا ہے۔ اس وقت [illegible] آدمی [illegible] کی طرح [illegible] تھی [illegible] سب ترتیب [illegible] آنکھوں میں [illegible] ایک حصہ بالوں کی بیک سے [illegible] ہو گیا تھا۔ انور نے یوں ہی اس سے سوال کر دیا۔

"تمہارا کیا نام ہے تم یہاں کیا کرتے ہو؟"

وہ آدمی مسکرایا اور [illegible] پیشتر کے بولا۔

"ساب میرا نام گھن ہے [illegible] لوگوں [illegible] اور کیا کام ...."

انور نے گھن کی آنکھوں میں شرارت [illegible] دیکھی اور اسے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ یہ بھی اس لڑکے [illegible] ریاض کے پاس بیٹھا تھا [illegible] وہ واقف تھا۔ انور جھنجھلا گیا۔ اور بولا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

گھن پھر مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت اور کمینہ پن کی [illegible] موجود تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی۔ اور وہ بولا۔

"کیا چاہے گا ساب۔ بس آپ کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ اور [illegible] آپ لوگ بڑا آدمی ہے ساری خوشی اسی میں ہے کہ آپ لوگ خوش رہے"

انور حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ گھن کے ایک دو اور ساتھی اسے عجیب انداز سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ خود کو عجیب کشمکش میں محسوس کرنے لگا۔ کچھ بول نہ سکا لیکن خود ہی کہنے لگا۔

"ساب ٹھیک کیا۔ او لڑکا سالا کا بات میں نہیں آیا۔ سالا جھوٹا ہے۔ اس کا پاس کوئی اچھا لڑکی نہیں۔ جاڑے عمر کا اور بیماری مارا ہے۔ آپ اچھا لڑکی

گوری اور سُندر میم جیسا۔ چلو ساب!"

انور کو غصہ آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ مگن کے گال پر زور سے ایک طمانچہ مارے۔ لیکن وہ ضبط کر گیا۔ اور گلی کے موڑ سے آگے بڑھ گیا۔ مگن نے پہلے لڑکے کی طرح اس کا پیچھا نہیں کیا۔ بلکہ پاس ہی پان کی ایک دکان پر چلا گیا۔

انور تیزی کے ساتھ میدان کی طرف قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا ایک بس گزری لیکن اس میں گھسنے تک کی گنجائش نہ تھی۔ لوگ لٹک کر جا رہے تھے۔ وہ چلتا گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا کہ شاید ٹرام یا کوئی خالی ٹیکسی ہی آ رہی ہو۔ لیکن سارا راستہ آدمیوں سے بھرا تھا دو تین گاڑیاں نظر آئیں۔ مگر وہ سب کی سب ذاتی گاڑیاں تھیں۔

انور اپنے آپ پر جھنجھلا اٹھا۔ آخر وہ ادھر سے آیا ہی کیوں؟ پہلے تو اسے مگن اور اس لڑکے کی وجہ الجھن ہوئی۔ ان سے بچ کر نکلا تو اب کہیں کسی سواری کا پتہ نہ تھا۔ اور کھیل کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔

انور آگے بڑھتا گیا۔ لیکن وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔ خود اپنے اوپر، لڑکے پر اور مگن پر۔ لیکن اس کے دماغ میں یہ سوال بار بار پیدا ہوتا تھا۔ آخر یہ لوگ اتنے ذلیل اور بے شرم کیوں ہیں؟ کیا یہ کوئی اور دوسرا کام کر کے پیٹ نہیں پال سکتے۔ ان میں اور کتوں میں کیا فرق ہے۔ بلکہ کتا بھی ان سے بہتر ہے۔ وہ کم سے کم مالک کی رکھوالی کرتا ہے۔ اور اس میں ایک صفت ہے۔ وفاداری، وہ اپنی اس صفت کو کسی حال میں بھی ضائع ہونے نہیں دیتا۔ لیکن ان لوگوں کی شکل تو انسان جیسی ہے۔ لیکن انسان ہیں نہیں محض چند پیسوں کے لئے اپنا اخلاق اور اپنی شرافت بیچ ڈالتے ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ خود انھیں سے سودا کرنے والے انھیں کیا سمجھتے ہوں گے۔

وہ انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ ایک جھنکار جیسی ہنسی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آس پاس میں کوئی نہ تھا۔ یکایک اس کی نظر سامنے کوٹھے پر چلی گئی۔ دو نوعمر لڑکیاں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے کھڑی بازار کی سیر دیکھ رہی تھیں۔ اور ہر راستہ چلنے والے پر کچھ پھبتی کہتی جاتی تھیں۔

وہ دونوں ایک راہ چلتے مارواڑی کو دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ دونوں قبول صورت تھیں۔ دونوں گوری چٹی ایک ذرا دبلی پتلی سرخ ساری میں لہراتے ہوئے شعلے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اور دوسری ذرا گول بدن کی سفید ساری میں کھلے ہوئے کنول کے پھول جیسی۔ انور نے دونوں کو دیکھا اور نظر ان کی طرف سے ہٹالی۔ لیکن چند قدم چلنے کے بعد پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکیوں نے بھی اسے دیکھ لیا اور دونوں ہنسنے لگیں۔ ایک دوسرے کو گدگدایا اور انور سے بولی۔

"اے۔ ایسے کیوں دیکھتے ہو، ہم مٹھائی ہیں کیا؟"

دوسری بولی۔

"لو یہ تو بالکل رس گلا ہے۔ آنا ہو تو آ جاؤ بھو کے کتوں کی طرح نہ دیکھو۔ ہم ہڈی نہیں ہیں۔ یہ ہے رس گلا۔"

پہلی لڑکی بولی۔

"دیکھو تو ہڈی نہیں۔ گوشت ہی گوشت ہے۔ کتنی موٹی ہو رہی کم بخت۔ بھینس ہے بھینس۔"

دوسری بولی۔

"اور پالی ہوئی گدھی ہے۔ گدھی۔"

پھر دونوں نے ایک دوسرے کو گدگدایا اور ہنسنے لگیں۔ انور کھسیانا سا ہو گیا۔ اور تیز تیز قدم بڑھانے لگا۔ لیکن اس کے ذہن میں یہ بات جم کر رہ گئی کہ دونوں لڑکیاں قبول صورت ہیں۔ پھر دونوں کی حد سے بڑھی ہوئی شوخی۔ انور نے اپنے دل کے اندر تھوڑی سی کشش محسوس کی۔ مگر کس کی طرف یہ فیصلہ کرنا اس کے لئے مشکل تھا۔

لیکن وہ تیز تیز قدم بڑھاتا گیا۔ اسے جلد ہی میدان پہنچنا تھا۔ وہاں آج بہت اچھا فٹ بال میچ ہونے والا تھا۔ شہر کی دو مشہور ترین ٹیموں کا مقابلہ تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ میچ دیکھنے گئے ہوں گے اور جا رہے تھے۔ وہ خود بھی کھلاڑی تھا۔ اور کھیل دیکھنے کا شوقین۔ دونوں لڑکیوں کا خیال اس کے دماغ سے نکل گیا۔ اسے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر بہت دیر کر کے پہنچا تو پھر اسے بیٹھنے کی بھی جگہ نہ مل سکے گی۔

وہ بار بار مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ کہ میدان کی طرف جانے والی بس یا ٹرام آ جائے۔ لیکن جو گاڑی ادھر جا رہی تھی وہ اتنی بھری ہوئی کہ چیونٹی کے سرکنے کی جگہ نہیں۔ اور اس کا داخل ہونا تو ممکن ہی نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بھیڑ صرف کھیل کی وجہ سے ہے۔ اور اسی سے وہ ڈرتا تھا۔ گاڑیوں کے دیکھنے کے بعد خواہ مخواہ اس کی نظر اس کوٹھے کی طرف چلی جاتی۔ اس نے سوچا کہ اب چلتا ہی جائے گا۔ اور مڑ کر نہ دیکھے گا۔ لیکن چند ہی قدم چلنے کے بعد پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لال ساری والی لڑکی نے اسے اپنی زبان نکال کر دکھا دی پھر دونوں ہنسنے لگیں۔ انور جھینپ گیا۔

انور پھر آگے بڑھتا گیا۔ تھوڑی دور آگے گیا تھا کہ اسے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ اور وہ اس میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی اپنی رفتار میں جا رہی تھی۔ اور سارا بازار تیزی کے ساتھ اس کی نظر کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے دماغ میں صرف کھیل کا میدان تھا۔ یا کبھی کبھی دونوں لڑکیاں آ جاتیں۔ اسے کچھ بھی خیال نہ رہا کہ اس کے سامنے سے کیا کیا چیزیں گزر گئیں۔ اس نے سوچا تھا کہ واپسی میں سینما دیکھے گا۔ لیکن راستے میں تین سینما ہاؤس ملنے پر بھی وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ کس سینما گھر کا کیا پروگرام ہے۔

آخر وہ کھیل کے میدان کے پاس پہنچ کر ٹیکسی سے اتر گیا۔ ابھی کھیل شروع

ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ جہاں وہ اترا وہاں پر ایک بڑا سا ہوٹل تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلے چل کر چائے پی لے۔ ورنہ کھیل شروع ہونے کے بعد پھر وقت نہیں رہے گا۔ وہ ہوٹل میں گھس گیا۔

سارا ہوٹل لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ جس جگہ وہ جا کر بیٹھا اس کے پاس والی میز کے گرد چار آدمی بیٹھے تھے۔ دو مرد اور دو عورتیں۔ دونوں عورتیں خوب صورت اور قیمتی کپڑے پہنے تھیں۔ اور ان کے سامنے کھانے کی بہت سی چیزیں رکھی تھیں۔ اور چائے کا سامان رکھا تھا۔ اور خوش گپی میں مصروف تھے۔ ایک مرد کی عمر پچاس اور دوسرے کی چالیس سے کم نہ تھی۔ اور دونوں لڑکیوں کی عمر اٹھارہ اور بیس سے زیادہ نہیں۔

ان لوگوں کو دیکھ کر اسے خیال ہوا کہ کوئی خاندان سیر کے لئے نکلا ہے۔ اور چائے پینے کے بعد چلا جائے گا۔ ابھی ہوٹل کا ملازم اس کے لئے چائے لایا بھی نہ تھا کہ اس کا ایک دوست ارشد آگیا۔ ارشد مشہور کھلاڑی تھا۔ اور وہ بھی چائے پینے کے لئے چلا آیا تھا۔ دونوں بیٹھ گئے اور کھیل کے متعلق باتیں ہونے لگیں لیکن ارشد پلٹ پلٹ کر ان دونوں لڑکیوں کو دیکھتا جاتا تھا۔

دونوں نے چائے پی اور ہوٹل سے باہر نکل گئے۔ راستے میں ارشد نے اسے بتایا کہ وہ چاروں کون تھے۔ زیادہ عمر والا شخص مسٹر سین تھا۔ ایک اسکول کا ماسٹر جو ادھر دو برسوں سے دولتمند آدمی بن گیا تھا۔ دوسرا شخص مسٹر مکرجی تھا۔ اور دولت مند تاجر۔ اور دونوں لڑکیاں مسٹر سین کی بیٹیاں تھیں۔ مسٹر سین کی یکایک ترقی اور دولت مندی کا راز یہی دونوں لڑکیاں تھیں۔ مکرجی دونوں بہنوں میں بری طرح الجھا ہوا ہے۔ اور مسٹر سین بری طرح مکرجی سے روپے وصول کر رہا ہے۔ ارشد نے اسے یہ بھی بتایا کہ مکرجی تنہا شکار نہیں۔ سین نے اپنی بیٹیوں کے جال میں بہتوں کو پھنسا رکھا ہے۔

انور کو یاد آگیا کہ اس نے پہلے بھی ان لوگوں کے قصے سنے ہیں۔ اس بے چارے آئی۔ سی۔ ایس آفیسر پر اسے ترس آیا جو چند ماہ پہلے ان دونوں بہنوں کے چکر میں پھنس کر بری طرح ذلیل ہوا تھا۔ اور پھر بہت سے قصے۔

کھیل ہوتا رہا۔ انور دیکھتا رہا۔ لیکن آج فٹ بال کے علاوہ اس کے دماغ میں وہ دبلا پتلا لڑکا، مگن، ریاض، دونوں لڑکیاں پھر مسٹر سین، مسٹر مکرجی اور مسٹر سین کی دونوں بیٹیاں چکر کاٹتی رہیں۔ آج کھیل میں اسے وہ دلچسپی نہ ہوئی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ وہ برابر سوچتا رہا کہ آخر انسان کیا ہے؟ عورت اس کی اتنی بڑی کمزوری کیوں ہے؟ پھر یہ لوگ کتنے ذلیل ہیں جو عورتوں کو بیچ کر روٹی حاصل کرتے ہیں۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا اور بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکر کاٹتے رہے۔

کھیل کا انجام غیر متوقع ہوا۔ جس ٹیم سے انور کو ہمدردی تھی وہ ہار گئی۔ اسے اس کا بالکل یقین نہ آتا تھا۔ آخر یہ ٹیم ہار کیسے گئی؟ اس ٹیم کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔ اس ٹیم کے ہارنے کا اثر انور پر بہت خراب ہوا۔ وہ خود اپنے کو تھکا اور ہارا محسوس کرنے لگا۔ اور جب کھیل کے میدان سے نکلا تو بالکل خالی ذہن تھا۔

وہ پھر اسی ہوٹل میں ارشد کے ساتھ واپس آگیا۔ ہوٹل زیادہ آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے بعد اسے ایک کونے کی میز خالی نظر آئی۔ دونوں جا کر بیٹھ گئے۔ ہوٹل کا ملازم آیا اور آرڈر لے کر چلا گیا۔ دونوں باتیں کرتے رہے۔ اور وہ بات ہر طرف سے گھوم پھر کر آج کے میچ پر ختم ہو جاتی تھی۔ انور پر بہت زیادہ اثر تھا۔ ارشد پر بھی اس ٹیم کے ہارنے کا اثر ضرور تھا لیکن اتنا نہیں۔

دونوں چائے پیتے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ انور کے ذہن میں سارا میدان اور کھیل کا نقشہ اب تک موجود تھا۔ وہ دل ہی دل میں غور کر رہا تھا کہ کس کھلاڑی نے نمایاں غلطی کی۔ یہ ہار کن کھلاڑیوں کی کمزوریوں کی وجہ سے ہوئی۔ یا پھر لڑکا، مگن، دونوں لڑکیاں، مسٹر مکرجی، مسٹر سین اور ان کی بیٹیاں اس کے دماغ میں گھوم جاتی تھیں۔

ارشد نے محسوس کیا کہ انور بہت زیادہ متاثر ہے۔ تو اس نے اس کا دماغ دوسری طرف متوجہ کرنے کے لئے پوچھا۔

"انور۔ تم نے یہ فلم دیکھا ہے؟"

"کون سا؟"

" SHE DEFENDS HER COUNTRY "

"نہیں دیکھا۔"

"پلازا میں یہ فلم چل رہی ہے جا کر دیکھ لو۔ کیا خوب فلم ہے۔ ایسی فلمیں ابھی ہمارے ملک میں بننے میں بہت دیر ہے۔"

"میں نے اس فلم کی اور بھی تعریف سنی ہے۔ چلو ساتھ چلیں۔"

"میں دوبارہ دیکھ آیا۔ یہی ایک فلم ایسی ہے جسے میں نے دو بار دیکھا ہے۔ ورنہ کبھی کوئی فلم دوبارہ نہیں دیکھی۔"

"اور ہندستانی فلم کون سی ہے؟"

"معلوم نہیں۔ میں ہندوستانی فلمیں نہیں دیکھتا۔ ان میں گانوں کے سوا اور ہوتا بھی کیا ہے؟"

"تم غلطی پر ہو۔ اب ہندوستانی فلموں کا معیار پانچ سال پہلے جیسا نہیں۔ اچھی اچھی فلمیں بننے لگی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب تک خامیاں موجود ہیں لیکن پھر بھی وہ بہت کچھ بدل چکی ہیں۔ اب تو بہت سے سماجی مسئلوں پر فلموں میں بحث نظر آتی ہے۔ تم نے ڈائرکٹر منظر کی تازہ فلم۔ نہیں دیکھی۔ میرے خیال میں تو یہ ایک تنہا فلم سو مولویوں کے وعظ سے زیادہ مفید اور با اثر ہے۔"

ڈائرکٹر منظر کا نام آتے ہی اسے ایک بات سوجھی اور اس کا دل بڑی حد تک ہلکا ہوگیا۔ ہندوستانی فلموں کی دنیا میں ڈائرکٹر منظر کا نام تیزی کے ساتھ مشہور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی فلمیں زیادہ مقبولیت حاصل کرتی جا رہی تھیں۔ وہ بہت پاکیزہ فلمیں بنایا کرتا تھا۔ وہ اپنی ہر فلم میں کوئی اخلاقی اور سماجی مسئلہ پیش کرتا تھا۔

چائے ختم ہوگئی اور دونوں باہر آئے۔ ارشد نے ہزار چاہا کہ انور کو سینما لے جائے لیکن اس کے دماغ میں ڈائرکٹر منظر تھا۔ اس سے دو چار بار کی ملاقات بھی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ منظر کے گھر جائے گا۔ اس سے باتیں کرے گا۔ اور اسے اس بات پر تیار کرے گا کہ ایسی فلمیں بنائے جو واقعی لوگوں کی حالت کو سدھار سکیں۔

ارشد اس سے الگ ہوگیا۔ اور وہ اس ٹرام پر بیٹھ گیا جو ڈائرکٹر منظر کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ وہ سوچتا گیا کہ آج کے واقعات منظر سے کہے گا۔ اور کہے گا کہ اس مسئلے کی طرف توجہ کرے۔ آخر یہ کیا ہے؟ عورت بکتی ہے۔ بیچی جاتی ہے۔ خریدی جاتی ہے —— گاجر مولی اور جانوروں کی طرح۔ یہ عورت کی توہین ہے۔ یہ مرد کا کمینہ پن ہے۔ وہ عورت کو بیچتا ہے۔ دوسروں کے شہوانی جذبات کو ابھار کر مالی فائدہ اٹھاتا ہے۔ کبھی عورت کو پیش کرکے کبھی اس کے حسن کا ذکر کرکے۔

آخر ٹرام وہاں پہنچ گئی جہاں اسے اترنا تھا۔ انور اتر گیا اور منظر کے گھر کی طرف چلنے لگا۔ اس نے دور ہی سے دیکھا کہ منظر کے فلیٹ پر روشنی نظر آرہی ہے۔ اسے بڑی خوشی ہوئی۔ اس سے ملاقات ہوگی۔ اور وہ ایک نئی تصویر کا خیال اسے دے گا۔

وہ منظر کے فلیٹ پر پہنچا۔ اندر سے کئی آدمیوں کی آواز آرہی تھی۔ اس نے بجلی کا بٹن دبایا۔ اندر گھنٹی بجی۔ ایک نوکر آیا۔ انور نے اپنا نام بتایا۔ ملازم چلا گیا پھر ایک لمحہ میں منظر خود اسے لینے آگیا۔

دونوں کمرے میں پہنچے۔ وہاں پانچ آدمی پہلے ہی سے بیٹھے چائے پی رہے تھے منظر نے انور کا ان سب سے تعارف کرایا۔ ان میں تین ایکٹریس تھیں ایک اس کی بیوی کا پبلسٹی آفیسر اور دوسرا اس کا اسسٹنٹ۔ منظر نے چائے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے ایک نئی فلم بنانی شروع کی ہے "روح کی پیاس" میں سچ کہتا ہوں۔ ہماری روح پیاسی ہے ... ہندوستان —— ہندوستان کیا، ساری دنیا مادی حیثیت سے جتنی ترقی کرتی جاتی ہے۔ اس کی روح اسی قدر پیاسی ہوتی جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ دنیا سراب کی طرف دوڑ رہی ہے۔ اور وہاں اسے پانی نہیں مل سکتا۔ وہاں پانی نہیں نظر کا فریب ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ایک دن یہ دنیا پیاس سے مرجائے گی۔ برباد ہوجائے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا رخ سراب کی طرف سے موڑ کر بہتے دریا کی طرف کردیا جائے۔ پھر اس کی پیاس بجھ جائے گی اور وہ اس طرح زندہ رہ سکتی ہے۔"

انور نے تائید کی اس نے محسوس کیا کہ جو کچھ منظر نے کہا۔ انور خود بھی نہ کہہ سکتا۔ اسے اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

منظر تیزی سے مڑا اور بولا۔

"دو منٹ —— میں اس فلم کا اشتہار لکھوا رہا ہوں۔ یہ میری کمزوری ہے ہر کام کو خود کرنا چاہتا ہوں۔ تم بھی سن لو۔ ذرا پڑھو تو ——"

پبلسٹی آفیسر نے پڑھنا شروع کیا۔

"روح پیاسی ہے، اسے پانی کی ضرورت ہے۔ لیکن آپ سراب کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

ڈائرکٹر منظر کا نیا شاہکار —— روح کی پیاس آپ کی صحیح رہنمائی کرے گا۔ اور آپ اپنی روح کی پیاس بجھا سکیں گے۔ یہ فلم ڈائرکٹر منظر کا بے نظیر کارنامہ ہوگا —— اور اس فلم میں اتنے حسین اور نئے چہرے نظر آئیں گے۔ جیسے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں گے —— نشیلی آنکھیں —— شوخ تبسم —— متوالی جوانی۔ حسن سراپا —— ایشیائی شاعر کا تخیل مجسم —— پری زادوں کا جھرمٹ۔"

انور حیرت سے کا منہ دیکھنے لگا۔ اسے اپنا سر گھومتا محسوس ہونے لگا۔ پھر اس کے دماغ میں سب کی شکلیں ناچنے لگیں۔ شہر کے بدنام محلے کی وہ گلی، الجھے بالوں والا لڑکا، گمن، لمبی سڑک، کوٹھے پر دونوں لڑکیاں بسٹر سیٹھ۔ ان کی دونوں بیٹیاں، ایکٹریسیں، پبلسٹی آفیسر، اور ڈائرکٹر منظر، سب مل کر ایک ساتھ ناچ رہے تھے۔

# تین ہفتے پیرس میں

آغا محمد اشرف

کسی نے سچ کہا ہے کہ پیرس ایک شہر نہیں ہے بلکہ اسے ایک دنیا سمجھنا چاہیئے اور واقعی پیرس کے دنیا ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی سیاح پیرس کے خوبصورت بازاروں تاریخی عمارتوں، عجائب گھروں، تماشا گاہوں، فنون لطیفہ اور آرٹ کے مرکزوں اور شاہی باغوں ہی کی سیر کرنے کے لئے نکلے تو ان تمام چیزوں کو صرف سرسری نگاہ سے دیکھنے کے لئے کئی ہفتے درکار ہونگے۔ عجائب گھروں کے اعتبار سے تو میں پیرس کو ایک جنت سمجھتا ہوں۔ ہر علم اور ہر فن پر پیرس میں عجائب گھر آپ کو ملیگا۔ حد یہ ہے کہ پرانے شاہی باغوں میں سیر کے لئے جایئے تو وہاں بھی آپ عمارت میں عجائب گھر ملحق ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ عجائب گھروں کو سجانے کا سلیقہ بھی پیرس والوں ہی کو آتا ہے۔ گھنٹوں عجائب گھر کے مختلف حصوں کو دیکھتے رہیئے۔ کیا مجال کہ یہ بے جان چیزیں آپ پر بار گذر جائیں۔ ہر چیز کو اس سلیقے اور ہنر سے سجایا گیا ہے کہ بے اختیار اسے ٹھہر کر دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔

چنانچہ ہر روز ہزاروں سیلانی سیر سپاٹے کی غرض سے پیرس کے ان عجائب گھروں کی سیر کو جاتے ہیں۔ مگر اس بہانے سے معلومات کا اتنا ذخیرہ اپنے دامن میں بھر لاتے ہیں کہ اگر کئی کئی سو صفحے کی کتابیں بھی پڑھتے تو شاید معلومات میں اتنی وسعت پیدا نہ ہوتی۔

پیرس کے عجائب گھروں کے پھیلاؤ اور ان کی ہمہ گیری کا اندازہ اس بات سے کر لیجئے کہ پیرس کے مشہور عجائب گھر لوور کے مختلف حصوں کو میں تین گھنٹے تک متواتر دیکھتا رہا مگر پھر بھی ایک تہائی سے زیادہ نہ دیکھ سکا۔ لندن میں عجائب خانے عام طور سے اتوار کے روز بند رہتے ہیں۔ مگر پیرس والے اس نکتے سے واقف ہیں کہ اتوار ہی کا دن فرصت کا دن ہوتا ہے۔ اس لئے تمام پیرس میں اتوار کو عجائب گھروں میں خوب رونق رہتی ہے ہر عجائب گھر کے اندر انکی عجائبات کے عکس اور تصویریں بھی مل سکتی ہیں۔ اور یہ استطاعت رکھتی ہیں کہ معمولی سی رقم خرچ کرنے کے بعد انسان اس عجائب گھر کا ہلکا سا چربہ بھی ساتھ لا سکتا ہے۔

یہی حال پیرس کی تاریخی عمارتوں۔ شاہی محلات اور قدیم گرجا گھروں کا ہے یہ بھی اتوار کے روز عوام کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ خصوصاً شاہی محلات اور قدیم باغات میں تو ایسی رونق ہوتی ہے کہ میلہ سا لگ جاتا ہے۔ ایک اتوار کا دن مجھے پیرس کے قریب وارسائی کے محلات میں گذارنے کا اتفاق ہوا۔ بلا مبالغہ ایک ہزار سے زیادہ موٹریں اس محل کے سامنے کھڑی تھیں اور سینکڑوں آدمی اس کے علاوہ موٹر بسوں اور ریل گاڑیوں میں آئے تھے۔ پیرس کے ان شاہی محلات اور باغوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرانسیسی شاہی خاندان کسقدر عیش و طرب کا دلدادہ تھا۔ محلات کے کمرے پر تکلف فرنیچر سے اب بھی آراستہ ہیں۔ ان کمروں میں فرانس کے بڑے بڑے مو قلم مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں لٹک رہی ہیں جو فرانس کے آرٹ کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔ باغوں کی روشوں پر سنگ مرمر کے خوبصورت مجسمے لگے ہوئے ہیں۔ تراشی ہوئی نہریں دریائی ... سے بہتی ہوئی آتی ہیں۔ یہ تمام خوشنما مناظر ... تصور ... ہیں کہ ... تہذیب کی معراج ذاتی آرام اور انفرادی عیش و طرب سمجھی جاتی تھی۔

خاص پیرس میں بھی تاریخی عمارتوں اور پرانے گرجا گھروں کی کمی نہیں۔ نوتردام کا مشہور گرجا گھر فرانسیسی فن عمارت کے کمال کا ایک بہت عمدہ نمونہ ہے۔ اس گرجا گھر کی خوبصورت چھت اور کھڑکیوں کے منقش شیشے نماز ... میں ... انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہی انسانی دماغ جو جنگ کے خوفناک کھیل کھیلتا ہے۔ انسان کی تباہی کے لئے بم بنا سکتا ہے۔ جب فنکاری اور آرٹ پر اپنا زور صرف کرنے پر آتا ہے تو اس کی کاریگری لامتناہی وسعتوں تک جا پہنچتی ہے۔

یہ قاعدہ ہے کہ انسان جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے اسکا اثر اس کی زندگی کے ہر شعبے پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیرس والوں کی زندگی پر آرٹ کا اس قدر اثر ہے کہ پیرس میں جدھر نظر اٹھایئے آرٹ ہی آرٹ نظر آئے گا۔ بازاروں میں دکانیں اس خوبی سے سجائی جاتی ہیں کہ بجائے خود یہ طلسمات کا مرکز ہیں۔ سڑک کے کنارے پھول بیچنے والی نے پھولوں کے گلدستے اس ترتیب سے آراستہ کئے ہیں کہ اس کی دکان کف گل فروش نہیں بلکہ ارم کا نمونہ بن گئی۔ کسی دکان سے کوئی چیز خریدیئے۔ دکان پر سودا بیچنے والی لڑکی اسے ایسی خوبصورتی سے باندھے گی کہ بعض اوقات سودے سے زیادہ اس کاغذ کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ جس میں اسے لپیٹا گیا تھا۔

قدرت نے اس آرٹ کے ساتھ ان کی زبان بھی بے حد شیریں بنائی ہے۔ دکان کے اندر جایئے تو خادمہ مسکراتی ہوئی آپکا استقبال کرے گی جتنی دیر تک چاہے بیٹھیں دیکھئے چیزیں پسند نہ آئیں تو انہیں ناپسند کرتے چلے جایئے۔ کیا مجال جو اس کی پیشانی پر بل آ جائے۔ جب آپ دکان سے رخصت ہونے لگیں گے تو یہ خادمہ نہایت ادب سے آپ کے لئے دکان کا دروازہ کھولے گی اور الوداعی سلام کرے گی۔ یہ کسی خاص دکان کا ذکر نہیں ہے بلکہ کم و بیش پیرس کی ہر دکان کا یہی دستور ہے جسکا اثر غیر ملک سے آنے والوں پر عجیب و غریب ہوتا ہے!!

پیرس کے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں ایک دلچسپ بات میں نے یہ دیکھی کہ بل ادا کرتے وقت بارہ فیصدی رقم آپ کو اور ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ رقم ویٹر یا خدمتگار کا معاوضہ ہے۔ کیونکہ عام طور سے ہوٹلوں میں ویٹروں کو تنخواہیں نہیں ملتیں۔ بلکہ ان کی آمدنی کا ذریعہ یہی بارہ فیصدی کا اضافہ ہے کہ جسے

گاہک ادا کرتے ہیں۔ گویا آپ کہیں جا کر ایک ہزار فرانک کا کھانا کھائیں تو کھانے کی قیمت کے ساتھ ۱۲۰ فرانک آپ ویٹر کو ادا کریں گے۔ مگر بعض دفعہ یہ دستور خاصی مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً آپ سینما کا ٹکٹ خریدیئے۔ جب آپ سینما میں داخل ہونگے تو ملازمہ آپ کو اپنی جگہ تک پہنچائے گی اور اس کے بعد اپنا حق خدمت وصول کرے گی۔

افسوس کہ جنگ کے بعد سے فرانس کی سیاسی زندگی ابھی تک استوار نہیں ہو سکی۔ مختلف پارٹیاں اب تک ایک دوسرے سے خفا ہیں اور اس وقت (دسمبر ۱۹۴۶ء میں) فرانس کے وزیر اعظم کی تلاش ہو رہی ہے مگر ابھی تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا کہ جس کی ذات پر تمام سیاسی جماعتوں کو اتفاق ہو۔ چنانچہ اس سیاسی کشمکش کا اثر فرانس کی روزانہ زندگی پر بھی نظر آتا ہے۔ بلیک مارکیٹ کا بازار اسقدر گرم ہے کہ کوئی قانون کی پرواہ نہیں کرتا۔ بہت سی چیزوں کی راشن بندی ہے۔ مگر دام ادا کرنے والے کو ہر چیز بلیک مارکیٹ میں مل سکتی ہے۔ مجھے یہ دیکھکر بہت لطف آیا کہ لباس فروخت کرنے والی دکان پر جب میں نے کپڑے کے کوپن پیش کرنے سے عاجزی ظاہر کی تو دکان کی مالکہ نے مسکرا کر کہا۔ موسیو ہم سے آپ کپڑے کے کوپن خرید سکتے ہیں۔ مگر ہر کوپن کی قیمت ۵ فرانک ہوگی۔ اور اسطرح بازار میں کھلے بکتا کوپن خریدنا کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا۔ غالباً فرانس کو جنگ کے ان تباہ کن اثرات سے نکلنے میں کافی عرصہ لگے گا۔ مگر یہ درمیانی عرصہ ناگزیر ہے کیونکہ ابھی تک جنگ کے زخم ہرے ہیں۔ بازاروں میں بہت سی عورتیں اپنے عزیزوں کے سوگ میں سیاہ کپڑے کے ٹکڑے کوٹوں پر لگائے نظر آتی ہیں۔ اور اکثر فرانسیسی اب بھی اس ہولناک زمانے کا ذکر درد بھرے لفظوں میں کرتے ہیں جبکہ پیرس کی تاریخی عمارتوں پر جرمنی کے جھنڈے نظر آتے تھے مگر اس کے باوجود پیرس کا حسن کسی سوگوار حسین کی طرح دلکش اور جاذب نظر ہے۔

پیرس شہر کے باہر کچھ فاصلے پر بہت خوبصورت جنگل ہیں کہ انہیں گورنمنٹ نے لوگوں کی تفریح کے لئے بالکل قدرتی حالت میں رکھا ہے۔ سردی کے زمانے میں جب درختوں کے پتے گر جاتے ہیں تو سوکھی شاخوں سے ان جنگلوں میں ایسا دلکش سماں پیدا ہوتا ہے کہ اسے صرف مصور کا قلم ہی کاغذ کے سینے پر منتقل کر سکتا ہے۔ ان باغوں کے پاس ہی قہوہ خانے اور ریسٹوران ہیں جہاں سیر کرنے کے بعد آپ جا کر چائے یا کافی پی سکتے ہیں۔

پیرس کو میں قہوہ خانوں کا شہر کہوں تو بے جا نہیں ہوگا۔ اس شہر میں اسقدر ریسٹوران اور قہوہ خانے ہیں کہ ان کی تعداد کاتب تقدیر بھی شاید اپنے حساب میں نہ لکھ سکے۔ پھر ان قہوہ خانوں کی رونق! صبح سے لیکر رات کے بارہ ایک بجے تک ہر قہوہ خانے میں ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ ریڈیو بج رہا ہے میزوں پر اخبار رکھے ہیں۔ آپ جا کر چائے کی ایک پیالی منگا لیجئے۔ اور جی چاہے تو صبح سے رات کے بارہ بجے تک قہوہ خانے میں بیٹھے رہیئے۔ مالک کو ہرگز اعتراض نہیں ہوگا۔ اکثر لوگ خط لکھنے یا کتاب پڑھنے کے لئے قہوہ خانے میں جا بیٹھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ مصور تصویریں بھی قہوہ خانے میں آکر بناتے ہیں۔

فرانس والے جذبات کے لحاظ سے ہم مشرقی لوگوں سے بہت کچھ ملتے ہیں۔ انگریز قوم اپنے دل کی بات چہرے یا لفظوں سے کبھی ادا نہیں ہونے دیتی۔ مگر فرانسیسی الفاظ کے ذریعے۔ ہاتھ کے اشاروں سے اور چہرے کے آثار چڑھاؤ سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان جذبات کا مظاہرہ بازاروں اور خاص طور سے قہوہ خانوں میں بہت دیکھنے میں آتا ہے۔ اظہار تعشق کے جو دلچسپ مظاہرے میں نے پیرس کے قہوہ خانوں میں دیکھے اس سے پہلے صرف سینما کے پردے پر یا کتابوں میں دیکھے تھے۔ مگر یہاں یہ عام بات ہے۔ زمین دوز ریلوں میں یا قہوہ خانوں میں اگر عورت کو اپنے دوست یا شوہر کی کوئی ادا بھا جائے تو وہیں بوسے سے کر اس کی داد دیتی ہے۔ البتہ اظہار غیض وغضب کا مظاہرہ ابھی تک دیکھنے کا مجھے موقعہ نہیں ملا۔

پانچ سال تک پیرس پر جرمنوں کا قبضہ رہا۔ مگر خوش قسمتی سے پیرس کی عمارتوں کو بموں سے کوئی نقصان نہیں پہنچا اور پیرس سے پسپا ہوتے وقت جرمنوں نے اس شہر کو تباہ بھی نہیں کیا۔ یہ پیرس کی خوش قسمتی تھی ورنہ لڑائی کی لپیٹ میں اگر یہ شہر آجاتا تو دنیا آرٹ اور تاریخی معلومات کے ذخیروں سے محروم ہو جاتی۔ البتہ لڑائی کا اثر پیرس والوں کی روح پر ضرور ہوا ہے۔ ان کے چہروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کے دل کچھ بجھ سے گئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہاں کی سیاسی کشمکش ہے۔ فرانس کی سیاسی پارٹیوں میں اب تک کھینچا تانی ہو رہی ہے اور جب تک ملک میں سیاسی امن قائم نہ ہو زندگی کا رخ سیدھے دھارے پر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ جنگ کی مصیبتوں کا اثر یہاں کی روزانہ زندگی پر اب تک باقی ہے۔ پیرس میں گرانی کا یہ عالم ہے کہ چائے کی ایک پیالی دس بارہ آنے کو ملتی ہے۔ ہوٹل میں اگر پیٹ بھر کر ایک وقت کھانا کھایئے تو بل کے دام بیس روپے تک پہنچتے ہیں۔ پیرس کی دکانوں میں مال بھرا ہوا ہے۔ مگر چیزوں کی قیمتیں دیکھکر دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہندوستان میں بھی گرانی نے عام چیزوں کے دام بڑھا دیئے ہیں مگر ہندوستان کی گرانی کا پیرس سے کیا مقابلہ۔ ایسی صورت میں خدا جانے پیرس میں غریب اور متوسط طبقے کے لوگ کیسے رہتے ہیں۔ جب سے جنگ ختم ہوئی ہے لوگوں نے تازہ دودھ کی شکل نہیں دیکھی۔ مگر آپ کے پاس سگرٹ کا ایک پیکیٹ ہے تو اس کے عوض بہت سی کام کی چیزیں آسانی سے مل سکتی ہیں۔ صابن دوا کے لئے بھی نہیں۔ مٹھائی کسی قیمت پر دستیاب نہیں ہوتی۔ مکھن صرف بڑے بڑے ہوٹلوں میں خاص خاص گاہکوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ ہفتے میں دو دن بجلی نہیں آتی اسلئے

دن بھر اندھیرا رہتا ہے اور یورپ میں جبکہ دن بھی رات کی طرح تاریک ہو تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس مصیبت کے کیا معنی ہیں۔ علاوہ ازیں کوئلے کی اسقدر کمی ہے کہ سردی میں کمرے گرم نہیں کئے جا سکتے۔ اور نہ نہانے کے لئے گرم پانی مل سکتا ہے۔ یہ میں نے صرف چند مشکلیں آپ کے سامنے رکھی ہیں۔ ایسی حالت میں کوئی قوم کیسے زندہ دل رہ سکتی ہے۔ مگر اس کے باوجود میں نے پیرس کی شاہراہوں پر کھڑے ہو کر ہنسنے چلنے والوں کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے لباس نہایت صاف ستھرے ہیں۔ عورتوں کے لباس کی تراش خراش اور فیشن کا مرکز آج بھی پیرس ہے کہ جسکی نقل تمام دنیا میں کی جاتی ہے۔ البتہ پیرس والوں کی روح مزدور مرجھا گئی ہے۔ مگر بظاہر یہ پیرس کی قدیم روایتوں کو نہیں بھولے۔ پیرس شہر کا قدیم نشان ایک جہاز ہے جسے چاروں طرف سے بڑی بڑی لہروں نے گھیر رکھا ہے۔ اس کے نیچے لکھا ہے: "یہ سفینہ موجوں کے سینے پر تیرتا رہتا ہے مگر کبھی ڈوبتا نہیں"۔ غالباً اس سے بہتر پیرس کے لئے کوئی اور موٹو نہیں چنا جا سکتا۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس شہر کے لوگوں کی خوش مذاقی اور اخلاق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہر شخص آپ سے ہنس کر بات کرے گا۔ میں فرانسیسی زبان بالکل نہیں جانتا۔ اس لئے راستہ پوچھنے میں بہت مشکل ہوتی ہے۔ تنگ آ کر جب میں انگریزی زبان میں کسی سے راستہ پوچھتا ہوں تو اگرچہ یہ میری بات نہیں سمجھتا مگر نہایت اخلاق سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے مجھے راستہ بتا دیتا ہے۔ شروع شروع میں ایک روز رات کو میں پیرس سے لندن براڈکاسٹ کرنا چاہتا تھا۔ پیرس میں بی بی سی کا چھوٹا سا دفتر ہے۔ وہاں تک میں موٹر میں پہنچ تو گیا مگر واپسی پر کوئی سواری نہیں ملی۔ میں پیرس کے راستوں سے بالکل ناواقف تھا اور زبان سے نابلد۔ ایک سمت منہ اٹھا کر چل دیا۔ اتفاقاً سڑک پر مجھے ایک اخبار بیچنے والا مل گیا۔ یہ انگریزی زبان خوب بولتا تھا۔ اس سے میں نے ایک اخبار خرید لیا اور اس نے مجھے اپنے ہوٹل کا راستہ بتا دیا کہ فلاں اسٹیشن سے زمین دوز ٹرین ملے گی اس میں بیٹھ جانا۔ مگر بدقسمتی سے مجھے دو جگہ گاڑی بدلنی تھی اور گاڑی بدلنا کوئی آسان کام نہیں۔ بہرحال پیرس والوں نے میری رہنمائی کی اور میں پوچھتا پوچھتا اپنے ہوٹل تک آن پہنچا۔

پیرس کی زمین دوز ریلوں کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ۲ فرینک (تقریباً ایک آنہ) کا ٹکٹ لے کر آپ سارے شہر میں گھوم سکتے ہیں۔ البتہ موٹر بسوں کا حساب کچھ اور ہے اور ان میں ایسی بھیڑ ہوتی ہے کہ اب تک مجھے کسی موٹر بس میں بیٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پیرس میں سڑکوں پر موٹریں اور مسافر بائیں طرف نہیں بلکہ سڑک کے دائیں طرف چلتے ہیں اسلئے دلی کے تانگے والوں کی زبان میں کہیں دایاں دبا کر چلنا پڑتا ہے اور اس سے اکثر میرے لئے مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ تمام عمر میں سڑک کے بائیں طرف چلنے کا عادی رہا ہوں۔ اب ڈر یہ ہے کہ اگر دائیں طرف چلنے کی عادت راسخ ہو گئی تو ہندوستان میں کیا حشر ہوگا!!

پیرس کا اصلی حسن رات کے وقت نکھرتا ہے۔ فرانسیسی زبان میں پیرس کو روشنی کا شہر کہا جاتا ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ پیرس کے بازاروں اور شاہراہوں کی روشنی اس خوبصورت شہر کے حسن میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ دریائے سین اٹھلاتا ہوا شہر کے بیچ میں سے گذرتا ہے۔ اس کے دونوں طرف بڑے بڑے راستے ہیں اور ان کی روشنی کے عکس سے دریا میں ایک اور شہر پیدا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دور کے فاصلے پر پیرس کے بازاروں میں بڑے بڑے چوراہے ہیں اور رات کو ان کی روشنی سے ایسا دلکش سماں پیدا ہوتا ہے کہ بار بار یہی جی چاہتا ہے کہ میں راستہ بھول جاؤں اور اس جگمگاتی بھول بھلیاں میں لگاتار پھرتا رہوں۔

ہندوستان میں صبح اٹھنا میری عادت ہے اور ہواخوری سے دلچسپی میری پرانی خوش وقتی ہے۔ یہ سحرخیزی کی عادت میری پیرس میں بھی قائم ہے اور اکثر سردی کے باوجود بھی صبح سورج نکلنے سے کئی گھنٹے پہلے پیرس کے بازاروں میں نکل جاتا ہوں۔ اسوقت سڑکوں پر یا تو وہ غریب مزدور ملتے ہیں جنہیں بہت سویرے کام کرنا پڑتا ہے۔ یا پیرس کے ایسے منچلوں سے سابقہ پڑتا ہے جو رات بھر پیرس کے روائتی عشرت کدوں میں بسر کر کے اب گھروں کو لوٹتے ہیں۔ پیرس کی حسین رقاصہ کو یا تو چراغ جلے دیکھئے جبکہ یہ اپنے حسن کی نمائش میں حریفوں سے بازی لے جانا چاہتی ہے یا اسکا دیدار صبح دم کیجئے جب کہ ایک ایسے سوداگر کی طرح جو اپنا سارا متاع لٹا چکا ہو۔ یہ ہاتھ جھاڑ کر اپنے گھر کا رخ کرتی ہے۔ مگر پیرس کی سڑکوں نے زندگی کے ایسے اتار چڑھاؤ بہت دیکھے ہیں۔ یہ ہزار سال پرانا شہر فاتح بادشاہوں کے قدم چوم چکا ہے۔ مفتوح فوجیں اس کی قدیم سڑکوں پر سے گذر چکی ہیں۔ مگر زمانے کی رفتار نے اس کے حسن میں کوئی فرق آنے نہیں دیا۔ پیرس کے عین بیچوں بیچ فتح کی بہت بڑی یادگار ایک دروازے کی صورت میں قائم ہے۔ اسکی محراب کے نیچے ایک نامعلوم فرانسیسی سپاہی کی قبر ہے۔ جس کے سینے پر ۲۴ گھنٹے آگ جلتی رہتی ہے۔ اور اس آگ کے شعلے پیرس والوں کو یاد دلاتے ہیں کہ پیرس روشنی کا شہر ہے اور فرانس کے بہادروں کی ہمت اس شمع کی محافظ ہے۔ گویا حوادث کی لہریں اس شہر سے آن آن کر ٹکراتی ہیں مگر پیرس کے حسن اور اس کی دلربائی کا سفینہ ہمیشہ تیرتا رہتا ہے۔ اسے کوئی طاقت فنا نہیں کر سکتی ✦ (از پیرس)

# اقبال کی ہمہ گیری

جہاں بانو

اقبال میرے لئے سب کچھ ہے۔ ایک شاعر سب سے پہلے۔ پھر ایک علامہ، ایک کلیم، ایک مصلح، ایک مفکر، ایک علوم مرتبت فلسفی، ایک ترجمان حقیقت، ایک قلندر بے نیاز، اور ایک عارف کامل۔ جب کسی کے متعلق بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس "سب کچھ" میں سے پہلے کیا کہیں۔ وہی حال میرا ہے۔ اس لئے اس مضمون میں کوئی ربط و تسلسل تلاش نہ کیجئے۔

مجھے تو اقبال بانگ درا میں ایسا لگا جیسے وہ کسی چیز کو ڈھونڈھ رہا ہو۔ بہت ہی بے چین بے چین۔ بلا کا مضطرب۔ مجھے ایک تڑپ اس میں ملی۔ ایک سوز اس میں میں نے پایا۔ ایک بے قراری سی میں نے اس میں محسوس کی۔ جانے وہ کیا ڈھونڈھ رہا تھا۔ پتہ نہیں اس کی مطلوبہ چیز اس کو مل گئی یا نہ مل سکی۔ "یہ کثرت میں وحدت" کا متلاشی شاعر۔ وفا کو "افلاس تخیل" سے معنون کرنے والا ہرجائی "حسن ازل" سے مضبوط پیمان وفا باندھنے کا ڈھنگ مچاتے ہوئے ایک "حسین تازہ" جس کے "ہر لحظہ مقصود" نظر بنا رہے۔ آخر میں جو حضور رسالتمآب میں یہ کہنے پر مجبور ہو جائے ؎

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

مجھے اس کی بانگ درا میں کیا کچھ نہیں ملا۔ اتنے اصول اس نے سکھائے لیکن وہ میری زندگی کی روائتی بے اصولی آج تک نہ گئی۔ کبھی تو میں نے اس کے "شکوہ" پر سر پھوڑنے کی تمنا کی، کبھی اس کے "عقل و دل" کے مکالمہ نے مجھے سوچ بچار کی وادیوں میں کھو دیا، کبھی اس کے "زہد و رندی" نے میرا ایمانی توازن بگاڑ دیا۔ اس کی نظم "صقلیہ" نے "صقلیہ" کی عظمت و شوکت کو محسوس کرنے میں بڑی مدد دی۔ اس کے "ترانہ ملی" نے وطنیت کے جذبہ میں طوفان مچا دیا۔ اس کی "موٹر" نے خموشی اور ضبط کی تعلیم دی۔ کیونکہ اس نے بتا دیا تھا ع

ہے جادۂ حیات میں سر تیز پا خموش!

اس کا "فلسفۂ غم" دل کی گہرائیوں تک پہونچکر تلاطم برپا کر گیا۔ اس سے پہلے ہی غالب نے بتایا تھا ع

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں

لیکن اقبال نے اپنی طرح سمجھانے کی کوشش کی۔ میں اس متبرک و مقدس جذبہ سے اچھی طرح روشناس ہو گئی۔ اس کی عزت میرے دل میں بہت زیادہ بڑھ گئی۔ مسرت موہوم سی ایک چیز، اور بے حقیقت و ناپائدار سی شے معلوم ہونے لگی۔ کبھی اس کے ساتھ فلک کی سیر کی۔ جبکہ وہ ستاروں سے آگے کے جہان کو پانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ کبھی اس نے رات اور شاعر میں رات سے چپکے چپکے جو باتیں کہہ دیں۔ ان کو سننے اور ان کو سمجھنے کی کوشش میں اپنی [illegible] یا سا گنتی رہی۔ اس سے چاند نے کسی کے اس شعر کی توضیح کر دی ؎

کچھ عقل کے میزان میں تولا نہ گیا
چپ ہو گئے اس طرح کہ بولا نہ گیا!

ایک حاجی سے مدینہ کے راستے میں، اس کے ساتھ میری بھی ملاقات ہو گئی۔ اور مجھ پر عشق کا عقدہ کھلا ع

عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے!

گورستان شاہی کی فلسفیانہ عظمت یہ بھولنے کی واردات نہیں۔ کبھی اس کی انکساری دیکھی ؎

تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
نہیں کوئی دیکھتا ہے مجھ میں، تو عیب ہے میرے عیب جو کا

اس کا "فراق" ابھی طفل شیر خوار ہی تھا۔ اقبال اس کی منزل سے ابھی دور تھا۔ اس اضطرابی جذبہ کو سمجھنے کی وہ کوشش کر رہا تھا۔ کہنے لگا ؎

یونہیں میں دل کو پیام شکیب دیتا ہوں
شب فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

پیام عشق میں یہ نصیحت بھی تو کی ہے ع

بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا!

"درد دل" کے حصول کی بڑی آسان سی ترکیب اس نے مجھے بتائی۔ اور چونکہ ع بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا۔ مجھے اس آسانی میں بھی مشکل کا سامنا ہوا ؎

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

اور پھر اپنی اسی نظم میں اس نے مجھ سے یہ بھی تو کہا تھا ؎

محبت کے لئے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

اس کے نقطۂ نظر سے اس جذبہ کا حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ "تصویر درد" بن کر اس نے جبر و اختیار کی وضاحت کر دی ؎

الہٰی پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیات جاوداں میری نہ مرگ ناگہاں میری

"طفل شیر خوار" غالب کے اس شعر کی کھلی تشریح ہے ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

وہ مجھ سے مخاطب ہوکر کہتا ہے ؎

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو
آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرارِ آرزو

فی الحقیقت اقبال فلسفی بننے سے پہلے عاشق بنا۔ جبھی تو عشق اور موت جیسی چیز اس سے لکھی گئی۔ اور نیٹشے سے وہ متاثر ہوا۔ اس نظم میں عشق کے مقابلہ پر اس نے موت کو ایک پامال سی کیفیت بتلانے کی کوشش کی ہے۔

اس کی نظم "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" دل پر پتھر رکھ کر اس کو پڑھی۔ اور نہ صرف پڑھی بلکہ پڑھانے پر بھی مجبور ہوگئی۔ کیسی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ جبکہ دل رونے کو چاہے اور کوئی نہ رو سکے۔

اس کے 'شکوہ' نے تو مجھے پچھاڑ کر رکھ دیا۔ اتنی مسحور و مخمور ہوئی کہ جب کبھی اس کو پڑھا تخیل جھومنے لگا۔ جیسے کسی نے بہت سی تیزاب پی لی ہو۔ اس میں اقبال نے اپنے خالق سے بہت سے نخرے کئے ہیں۔ جو سب کے سب حق بجانب ہیں۔

غالب نے کہہ دیا تھا صرف ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

لیکن اقبال نے "اسپ تازی کو مجروح ہوتے دیکھا اور 'طوق زریں' کو گردن خر میں دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ؎

یہ شکایت نہیں ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں؟

پھر خود ہی اس 'شکوہ' کا جواب دیکر اپنی فن کاری کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس تباہی داد بار کے محرک ہم ہی خود ہیں اور ہمارے اعمال۔ اور وہ عہد سلف کی یاد دلاکر ہم کو غیرت دلانا چاہتا ہے۔ دیکھا کہ اپنی زبان کا کچھ ان کندۂ ناتراش انسانوں پر اثر نہ ہوا۔ تو خدا کی زبان سے کہلوتا ہے ؎

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟
ہوگئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں!

اس طرزِ اغیانہ پر تو اس نے 'بالِ جبریل' میں دھوم مچا دی ہے۔

اور بتا دیا کہ ہم ویسے بھی جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانشِ فرہنگ!

قصہ مختصر مجھے اقبال بانگ درا میں بڑے ہی غیر مطمئن عالم میں ملا۔ مضطرب مضطرب سا ہو جیسے۔ کوئی چیز ڈھونڈے کوئی۔ اور وہ اس کو نہ ملے۔ کھویا کھویا سا یہ مایۂ ناز شاعر بال جبریل میں اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے۔ اور کتنا مطمئن ہوجاتا ہے وہ۔ جیسے سب ہی کچھ اس کو مل گیا ہو۔ اب جیسے وہ خود آگاہ بھی ہے اور خدا آگاہ بھی۔ ایک اطمینان سا جیسے سب ہی کچھ اس کو مل گیا ہو۔ اب جیسے وہ خود آگاہ بھی ہے اور خدا آگاہ بھی۔ ایک اطمینان سا جیسے اس کو نصیب ہوگیا ہو۔ مسلسل ٹھوکریں کھا کھا کر جیسے کوئی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ سوز و گداز سے معمور ہوکر۔ غم و الم سے چور چور ہوکر۔ لیکن اظہار پر جس کو اب بھی جیسے قدرت نہ ہو۔ اظہار بھی کرے تو جذبات کا گلا گھونٹتے ہوئے۔ زبان رکھتے ہوئے بھی گونگا ہو جیسے کوئی۔

بانگ درا میں اقبال مجھے کھلونے دے کر بہلا رہا تھا۔ ستارے، چاند، ندی، پہاڑ، پھول کا تحفہ، گلہری ——— کائنات کی ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی طرف رجوع کرتا ہوا وہ اب شاہین و شہباز کی معیت میں آسمانی بلندیوں پر مجھے لے جانے پر مصر ہے۔

یوں دیکھا جائے تو بال جبریل درحقیقت اس کے نظریوں کی تکمیل، اسکے معتقدات و خیالات کی معراج، اور اس کے مسلک کا صحیح عکس سمجھا جاتا ہے۔ اس میں اقبال بچہ نہیں رہا۔ اس نے اب ہوش سنبھالا ہے۔ اب وہ ایک سچے انسان کی طرح اتنا صاف گو اور منہ پھٹ ہوگیا ہے کہ اس کے کڑوے بول بھی کڑوے نہیں لگتے۔ اس کے طرز کلام کی بیباکی، اس کا قلندرانہ رد یہ اتنا دل نشین ہوتا ہے کہ دل کے در و دیوار ہل جاتے ہیں۔ اور پھر دل میں اس کی باتیں گھر بنا لیتی ہیں۔ اقبال دنوں، مہینوں، برسوں، یاد رکھنے کی ایک کیفیت کا نام ہے!

اپنی اس انوکھی بلند پایہ تصنیف میں اقبال کی عقل دشمنی اپنے حدود کو توڑ کر پرے نکل گئی ہے۔ عقل محبوب تک رسائی کی سد راہ ہے۔ وہ ان بندشوں کو توڑ کر اب آزاد ہوگیا ہے۔ اس لئے بھی اس کے کلام میں ایک مقناطیسی جاذبیت آگئی ہے۔ پہلے اس نے عقل کے بڑے چونچلے کئے۔ اس کے لئے تلے اور نازبرداریوں میں اپنی زندگی مٹا دی۔ عقل سے کچھ نہ ملا۔ بلکہ اقبال خود ہی گم ہوگیا۔ اب اس کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے دل کو جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ جو اس کے پہلو میں پڑا سو رہا تھا۔ اقبال اور اس کی عقل کے معرکے اس کو خواب میں دکھائی دے رہے تھے۔ ایکدم سے عقل کو شکست سی ہوئی۔ اور دل اس کا آنکھیں ملتے ہوئے انگڑائی لینے لگا۔ خواب ہستی کی تعبیر مل گئی اب اس دل ناداں کے توسط سے اسکو اپنے نفس کو پہچاننے میں کتنی مدد ملتی ہے۔ ذرا دیکھئے ——— اس دل کے ذریعہ اس نے اپنے نفس کو پہچانا۔ ضمیر جاگ اٹھا۔ پھر اس نے اپنے رب کو

پہچانا۔ پھر تو اب اس کو کسی دنیوی لذت کی ضرورت نہ رہی۔ وہ صحیح معنوں میں قلندر ہوگیا۔ خودی کے دروازے اس کے دل پر کھلتے گئے۔ اقبال معرفت کی راہ میں نکل گیا۔ "حدیث قدسی" کی اہمیت و عظمت اس نے مجھے سمجھائی یہ بڑی بڑی باتیں۔ میرا اضمحل دماغ۔

شمس تبریزیؒ فرماتے ہیں: "تصوف عشق و جمال کا مذہب ہے"
اس نظریہ کو کہ عشق ہی سب کچھ ہے۔ یہی زندگی کا زبردست ہنگامہ ہے۔ تم قسم سے شعراء نے اس پر سر دھنا ہے۔ حافظ کا یہ فیصلہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد زعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اور اقبال کی یہ تشریح ؎

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اس پر غالب کا یہ نظریہ ؎

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے۔ گر برق خرمن میں نہیں

جگر نے اس جذبہ کو یوں سمجھا ؎

حال بھی، ماورائے حال بھی ہے
عشق مشکل بھی ہے محال بھی ہے

اقبال کے نقطۂ نظر سے تو خدا نہ صوفی کو ملا نہ واعظ کو۔ کچھ تو ان کا غلط طریقہ اس کو ڈھونڈنے کا۔ کچھ ان کی انانیت۔ ان کا غرور۔ ان کا گھمنڈ بیزار ہوکر کہنے لگا ؎

چشم کرم ساقیا! دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو!

اقبال مشرق و مغرب دونوں سے خفا ہے۔ وہ حرم اور کلیسا میں یکساں ریاکاری کا بازار گرم دیکھتا ہے، اور پھر اپنے جنون کو ہی غنیمت سمجھتا ہے جس کی یہ دھوم ہے اس کے قلب مضطرب میں ؎

خاموش نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک!

اقبال مغربی تہذیب کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس میں غلامانہ ذہنیت کا نام نہیں۔ اس کا تصفیہ ہے کہ مغرب نے اپنی قوتوں کو عقل کا ماتحت بنا دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرتاپا عمل بن کر رہ گئے۔ اور مشرق نے اپنے ہر کام میں دل کی رہنمائی اختیار کی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ ان کی عملی قوتیں کمزور ہوگئیں۔ بلکہ سلب ہوگئیں۔ اب یہ نوبت ہے کہ یورپ کا آدمی ایک مشین یا ایک کل ہے۔ اور مشرق کا انسان مردہ۔ بے حس۔ بے جان۔ اقبال اب اس دھن میں لگ گیا ہے کہ مشرق کے انسان کو عملی بنائے۔ اس کی قوتوں کا اس کو احساس دلائے۔ اس کے چھپے ہوئے جوہر چمک اٹھیں۔ اس کی سوکھی رگوں میں خون دوڑے۔ وہی خون جس کے دوران کا غالب بھی اس وقت تک قائل نہیں تھا جب تک کہ وہ آنکھ سے آنسو بن کر نہ ٹپکے۔ مشرقی دل جیسے بات بات پر دھڑکتا ہے اقبال چاہتا ہے کہ اس کے اعضائے بدن بھی اسی طرح حرکت کریں۔ وہ اپنے لئے زندہ نہ رہے۔ بلکہ دوسروں کے لئے جئے۔ زندہ رہنا کوئی کمال نہیں۔ زندہ رکھنا کمال ہے۔

تو دوسری طرف وہ مغرب کے آدمی کو دل اور روحانی قوتوں سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ اہل مغرب کی عقل نے ان کے دل کو ان سے چھپا دیا ہے۔ جبھی تو نہ ان کی زندگی میں کوئی ایک بھی نوع جس زندگی عبارت ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دماغ روشن اور ان کے دل تیرہ و تار ہوگئے۔

اقبال اب نظر کے دھوکوں میں نہیں آتا۔ وہ صاحب نظر ہوگیا ہے۔ یہ دنیا اپنی مسحور کن قوتوں اور ان گنت رنگینیوں کے باوجود اس کے دل سے اتر گئی ہے وہ ظاہری حسن کو ملمع سمجھتا ہے۔ اس کی نظریں گہری اور وسیع ہوگئی ہیں۔ وہ اپنے اس شعر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ تقلید تخلیقی قوتوں کو مردہ کر دیتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ظاہری حسن پر مٹنے والوں کے لئے ایک سبق ہے ؎

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ!

سعدیؒ نے اپنے شعر کی مٹی پلید ہونے پر ایک مرتبہ جھنجلا کر کہا تھا ؎

"شعر مرا بمدرسہ کہ برد؟"

اقبال نے اس کیفیت کو اچھی طرح سمجھا دیا۔ سعدیؒ کا خیال گو نگا تھا پھر بھی وہ غصہ کی بات تھی۔ ذرا سمجھ میں نہ آسکی۔ اقبال نے یوں بتا دیا کہ دیکھو سعدیؒ یہ کہنا چاہتے تھے ؎

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے، کہہ نہ سکیں روبرو!

تمنا کا اظہار تمنا کی قدر و قیمت کو گرا دیتا ہے۔ اور شعر تشریح سے غارت ہوجاتا ہے۔

اقبال کا کلام خطروں میں زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ قوت اور عمل اس کی شاعری کے دو زبردست محرک ہیں۔ اس کی "بلبل بیزاری" کا ثبوت اس کی شاہین پسندی سے ملتا ہے۔ وہ اپنے محبوب فلسفی نیٹشے سے متاثر ہے۔ نیٹشے کی فلاسفی قوت کی پرستش سکھاتی ہے۔ اسکا شاہین خود دار اور غیرت مند ہے۔ وہ شکار مردہ بھوکا رہ کر بھی نہیں کھاتا ع وہ شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں۔ وہ شاہین د

شاہباز کی مثال دے کر فقر، درویشی، خود اعتمادی اور خلوت پسندی کی ترغیب دلاتا ہے۔ اس کا شاہین کسی سے ڈرتا ورتا نہیں ؎

یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

انسان بس یونہی صرف نام کا ہی اشرف المخلوقات میں سے ہے اس میں ان اعلیٰ جذبات اور پاکیزہ صفات کا فقدان ہے۔ اور صفات عالیہ کا حصول مشکل ترین امر ہے۔ ادنےٰ صفات بآسانی حاصل ہو جاتی ہیں اقبال کے نقطۂ نظر سے ماحول سے متاثر ہو کر انسان اپنی فطری صلاحیتوں اور نیچرل طاقتوں کو کھو دیتا ہے ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

اقبال کی شاعری کے دو زبردست مرکز "عشق" اور "خودی" ہیں — بانگ درا کے اس کے "پرندہ اور جگنو"، بال جبریل کے سوز و گداز سے معمور ہو کر "پروانہ اور جگنو" بن گئے ہیں۔ پروانہ کی زبان عشق سے جل گئی ہے۔ اور یہ جل جانا ہی اس کی زندگی کی عین معراج ہے۔ اس کی زبان پر عشق بول رہا ہے۔ جگنو کے خواب میں "خودی" نکھر گئی ہے ؎

پروانہ

پروانہ کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو!

جگنو

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں
دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں میں!

اقبال تصوف کا معلم ہے۔ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے اظہار خیال میں فرشتوں کی معصومیت و الوہیت کارفرما ہے۔ اس سالک راہ حقیقت کو ہم نے اب تک یہی سمجھا کہ وہ نرا ایک خشک فلسفی ہے عشق و محبت سے کوسوں دور۔ وہ زندگی میں تڑپ و بے قراری کو پسند کرتا ہے۔ عمل و حرکت اس کی شاعری کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ اس کا عشق تو ایک بہت ہی بلند و ارفع سی کیفیت ہے اور شعرا کے نام نہاد عشق سے بالکل مختلف و جداگانہ۔ وہ گل و بلبل کے قصوں، سوسن و نرگس کی بیلوں سے نہیں الجھتا۔ سرو صنوبر کا قامت پرست نہیں۔ اس کا عشق اپنے مبدا تک پہنچانے والا عشق ہے۔ اقبال کے یہاں عشق ایک پر عظمت کیفیت ایک بلند و ارفع جذبہ ہے۔ اقبال وصل سے گریزاں ہے۔ اسکو فراق سے دلبستگی ہے۔ وہ اپنے استاد داغ کی طرح "وصل" کو ماحصل زندگی نہیں سمجھتا۔ بلکہ جیسے ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ وہ داغ کی ضد ہے۔ اقبال کے نزدیک فراق زندگی کی جان اور اس کی روح رواں ہے

وصل عشق کی موت ہے ؎

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو! ہجر میں لذت طلب!

اور پھر ایک مثالی سبق ؎

گرمیٔ آرزو فراق! شورش ہاؤ ہو فراق!
موج کی جستجو فراق! قطروں کی آبرو فراق!

وصل کا متمنی بزدل ہوتا ہے۔ اس کا حوصلہ پست، اس کی ہمت نکمی۔ وہ جلد کسی نتیجہ پر پہونچ کر مطمئن و مسرور ہو جانے کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھے ہوئے ہے۔ اس کو درحقیقت عشق نہیں۔ وہ تو بوالہوس ہوا۔ ہوس تکمیل و انجام کی تمنائی ہے۔ وہ عشق میں مر مر کر جینے کی زندگی کا لطف کیا جانے۔ وہ اس لنظریہ سے بے خبر ہے کہ "اپنے موضوع محبت کو پا لینا ایک عظیم بدنصیبی ہے!" حسن ایک موضوع ہے محویت کا۔ جذبات کی دنیا تصورات کی دنیا سے الگ ہے۔ حسن ایک احساس ہے۔ احساس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو سوچا جائے۔ حسن ایک تصور ہے وصل اس کو بلندیوں سے قعر مذلت میں گرا دیتا ہے۔ اقبال تصور اور محویت میں رہنا چاہتا ہے۔ اب اس عالم میں ڈال دینے کے بعد کتنی ہی مصیبتیں کیوں نہ ہوں۔ وہ ان کیفیات کو "فراق" سے معنون کرتے ہوئے ان کے سہنے کو تیار ہے۔ عشق کی منزل اتنی کٹھن ہے کہ وہ فراق کے کٹھن ترین راستہ سے ہی اس منزل پر پہنچنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس کو تلاش منزل میں جو مزہ مل رہا ہے وہ منزل پر پہنچنے کے بعد شاید کھو دے۔ ویسے بھی تو ہے؟

مقام عقل سے آساں گذر گیا اقبال
مقام شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ!

اقبال غالباً کسی کی نگاہ کا مارا ہوا ہے۔ اس نے کلام میں جابجا اس کا اظہار کیا ہے۔ کبھی تو کہتا ہے ؎

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے!

تو کبھی کہنے لگا ؎

نہ بادہ ہے، نہ صراحی، نہ دور پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزم جانانہ!

کہیں یوں ماضی کی طرف لے جانے کی کوشش کی ہے ؎

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہ محبت! وہ نگہہ کا تازیانہ!

اب ہم کیسے سمجھیں کہ اقبال ایک خشک فلسفی ہے صرف؟

اقبال نئی تہذیب کی بے اصول راہروی سے بیزار ہے۔

وہ اس نئے بھی نسوانی تعلیم سے گریزاں ہے کہ اس سے نسائیت متاثر ہوتی ہے۔ نسائی حسن کی وہ صحیح معنوں میں پرستش کرتا ہے۔ تعلیم سے فطری حیا کا فقدان اور بیباکی دیکھ کر اس کا جی جل گیا ہے اکبر نے ایسے ہی موقع پر کہا تھا ؂

اسے اکبر ہمارے دل کو تڑپانا نہیں آتا
کہ جس کو علم تو آتا ہے شرمانا نہیں آتا

اور جب جوش کو ایسی ہی بیباک قسم کی عورت ملی جس سے غیر نسائی حرکات کا اظہار ہونے لگا تو یہ تو پھر جوش ٹھہرے۔ کہہ دیا ؂

آہ عورت! کہاں ہے گم عورت!
ہم کو لاکھوں میں ایک بھی نہ ملی!

اقبال اپنی نزاکت خیال کا یوں اظہار کرتا ہے ؂

بہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراش آذرانہ!

ایک اور مقام پر یہ بھی تو کہہ دیا ہے ؂

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک!

گویا یہ بھی ایک فارسی شعر کی تشریح ہے

چہ کنم کہ چارۂ نیرم کہ ز دشت شغ علم و دانش
نہ دمید ہیچ خارے کہ بہ دل نشانم اورا!

بال جبریل میں اقبال عاشق کم اور فلسفی زیادہ ہے۔ اس کے پیر و مرید کا مکالمہ ایک ذی وقار اخلاقی چیز ہے جس میں خود مرید ہندی بن کر اپنے مرشد سے سوال کرتا ہے اور اسی کے اشعار پیاس نے تضمین باندھی ہے۔

کہیں جبریل کو ابلیس سے ہم کلام کر کے دونوں کی بات چیت کا لطف اٹھاتا ہے۔ حالی نے تو بتایا تھا ؂

فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

لیکن اقبال نے ابلیس کے درجات بہت ہی بلند کر دئے ہیں ؂

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

محبت پر بھی ایک فلسفیانہ نظم ہے۔ ایک ایسا جذبہ جو صرف محسوس کرنے کے لئے بنا ہو جس کو سمجھانے میں انسان گونگا ہو جائے۔
"ساقی نامہ" میں وہ ہنگامہ بپا کرنا چاہتا ہے کہ ہانکے پکارے کہتا ہے ؂

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر!
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!

## آتشِ غم

سیدہ اختر

رہنے دے ناصحا ہمیں ان کے کرم سے دور دور
لاکھ وہ مہرباں سہی پھر بھی ہیں ہم سے دور دور

اُن کے در حبیب سے ہیں جن کو لطیف نسبتیں
رہتا ہے وہ سر نیاز ... دیر و حرم سے دور دور

زحمت ہجر کی قسم، لذت درد کی قسم
اہل فراق کب رہے آپ کے غم سے دور دور؟

ان سے بغیر کیا کہوں؟ دل کا عجیب حال ہے
بادہ ہے کیفیت نہیں جام ہے جم سے دور دور

اے دل مضطرب نہ ... حد سے نہ اپنی تو گذر
ان کے ستم کے پاس پاس اُن کے کرم سے دور دور

جس کو ملے گھڑی گھڑی قربت کوئے حبیب
کیوں نہ رہے وہ خوش نصیب باغ ارم سے دور دور

شکل قرب کیا کہیں شکوۂ بُعد کیا کریں؟
ہم ہیں ان کے پاس پاس وہ ہیں ہم سے دور دور

جن میں وہ سجدۂ ... ہو انہیں ... وہ نشتر ہو
وہ غم جاں "گر ..." ... سے دور دور

"نالۂ درد آرزو" شیوۂ اہل دل نہیں
اختر شعلہ آفریں آتش غم سے دور دور

غرض اس کے کسی شعر میں زندگی سوتی ہوئی نہ ملے گی بلکہ تخیل میں زندگی کا روپ بدلا ہوا ہے کہیں چمک ہے کہیں تڑپ ہے کہیں سوز و گداز کی معموری کہیں کسک کہیں ٹیس کہیں حوصلہ افزائیاں۔

اگرچہ غالب کی نزاکت خیال اور ان جیسی دلفریب موہنی ترکیبیں اقبال کے یہاں نہیں۔ غالب کا جیسا ان کا محبوب نہیں۔ غالب کی نازک بیزاری نہیں۔ غالب کا رشک نہیں۔ لیکن اقبال کی متانت کلام اس کی بلندی تخیل اس کے فلسفہ کی گہرائیاں اس کے بلند و ارفع جذبات، تصوف کی چاشنی ان سب کیفیات و درجات کا لحاظ کرتے ہیں اقبال کو غالب کا ایک حقیقی اور قابل عزت جانشین تصور کرنے پر مجبور ہیں۔

اقبال کی شاعری بیدار کن ہے۔ یہ کسی طرح لوری دینے والی، تھپک تھپک کر سلانے والی شاعری نہیں۔ میر کی طرح اقبال کو صرف اپنا ہی دکھ درد محض اپنا ہی احساس نہیں بلکہ اس کو تو ساری کائنات سے دلچسپی و ہمدردی ہے۔ ایک بین الاقوامی رنگ اس کی شاعری میں دوڑتا اور کھیلتا پھرتا اور جیتا نظر آتا ہے۔

# مکتوبِ گرامی

الہ آباد ———— ۱۰ فروری ۱۹۴۷ء

عزیزمن۔

۱۵ فروری کا "آج کل" دیکھا۔ اسے تو آپ نے اچھا خاصا ایک "غالب نامہ" بنا دیا ہے۔ بہت اچھے مضمون "غالب" کے متعلق جمع ہو گئے ہیں۔

"مہر جین" تو جامعۂ ملیہ کی توجہ سے کئی برس ہوئے شائع ہو گئی۔ اب سید وزیر الحسن صاحب نے "باغِ دو در" کے کواڑ ذرا سے کھولے ہیں۔ "غلام امام شہید اکبر آبادی" (ص ۸) آگرے کے تو نہ تھے۔ الہ آباد وطن تھا اور یہاں "دائرۂ غلام امام شہید" اب تک موجود۔ نویں صفحے پر "غمگساری کن و تنہائی ہماراہ نجات" ہیں "تنہائی" بے معنی "تنہائی" ہو تو مصرع درست اور بامعنی ہے۔ پیورس سال جناب "اطہر" نے بڑی مہربانی سے وہ اصل خط دکھایا تھا جس کا عکس اب آپ نے اڑا لیا۔ سید مسعود حسن صاحب رضوی کے بیش بہا ذخیرے سے اور کچھ نہیں تو "آزاد" کا قطعۂ تاریخ آپ کو مل گیا جو بہت اہم ہے۔ جیسا کہ سید صاحب نے فرمایا ہے۔ یہ مصرع سمجھ میں نہیں آتا: نظم مضمون شانت آوارہ۔ "شانت" ظاہرا کاتب کی غلطی ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ "شد است" (= شدہ است) اصل میں ہوگا؟ کاتب پڑھ نہ سکا اور اس تصحیف کی صورت پیدا ہو گئی "آوارہ" میں شبہہ نہیں ہوتا۔ "نظمِ مضمون شدہ ست آوارہ" مضمون کا نظم جاتا رہا، تباہ ہو گیا۔ اب مارا مارا پھرتا ہے۔ "آوارہ" کے یہ تینوں معنے ہیں۔

سولہویں صفحے پر بگّا بیگم صاحبہ فرماتی ہیں: "کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب تلے ہوئے، دال مربا، پسے ہوئے بادام، اور حلوا سوہن" اور چیزوں کا ذکر تو "غالب" نے اپنے خطوں میں خود ہی کیا ہے، مگر حلوا سوہن اُن کے خطوں میں اس سلسلے میں نہیں ملتا۔ جس زمانے میں بگّا بیگم نے انھیں دیکھا ہے اس سے بہت پہلے مرزا صاحب کے دانت جواب دے چکے تھے اور اسی سے داڑھی بھی چھوڑ دی تھی مسّی نچی "روزانہ حلوا سوہن" تو کیا ہی کھاتے ہوں گے۔ خطوں میں جہاں کھانے کی تفصیل لکھی ہے شراب کا بے تکلف نام لیا ہے۔ اسی سے حمید احمد خاں صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بگّا بیگم نے حلوا سوہن شاید شراب کی جگہ کہہ دیا۔ مسلمان گھرانوں کی بیویاں ایسے لفظوں کا منہ سے نکالنا معیوب جانتی ہیں (اور بیویوں کی خصوصیت نہیں مرد بھی ذرا جھجکتے ہیں یا یوں کہتے تھے) کبھی "کالا پانی" کہہ دیا، کبھی "دوا"۔ بگّا بیگم نے اگر ذرا گاڑھا پردہ ڈالا تو بجا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ صرف بگّا بیگم نے یہ اصطلاح بنائی تھی یا عام طور پر یوں بولتے تھے۔

فارسی میں ایک لفظ "سوہن" ہے مگر وہ مخفف ہے "سوہان" کا۔ "ریتی" کو کہتے ہیں یا سنگِ فسان کو۔ "ریتی" وہ ہتھیار جسے لوہار کسی سخت چیز پر رگڑتا ہے، کبھی اسے کاٹنے، کبھی صرف ہموار کرنے کی غرض سے۔ ظاہر ہے "ریتی" یا "فسان" کو نہ حلوے سے کوئی مناسبت نہ شراب سے۔ مگر "غالب" کے ایک فارسی شعر میں "سوہن" شراب کے لئے آیا ہے۔ قطعہ ہے (۲۲ بیت کا)

ساقی بزم آگہی روزے ÷ راوقے ریخت در پیالۂ من

پھر اس راوق نے جو اپنا اثر دکھایا اس کی کیفیت بیان کرتے ہیں

ہم زدستاں سرخوشی حریفانہ ÷ بے محابا گرفتش دامن

سوال یہ سوال کرتے ہیں۔ ساقی جواب دیتا ہے۔ تیرھواں شعر ہے:-

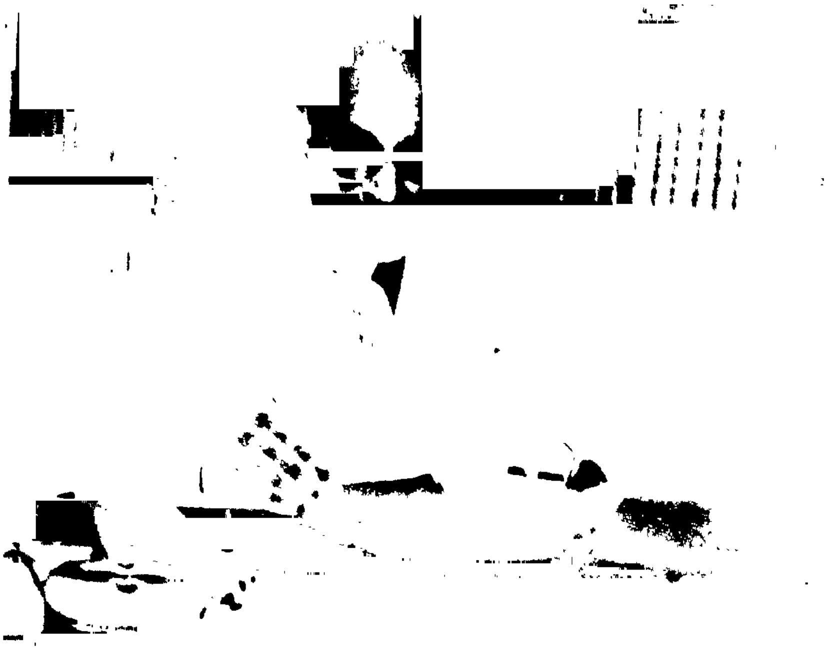
گفتمش سلسبیل نوش باشد؟ ÷ گفت خوشتر بباشد از سوہن

فارسی میں سوہن کے یہی ایک معنے ہیں جو یہاں چسپاں نہیں ہوتے۔ ہندی میں البتہ ایک لفظ "سوہن" ہے (جسے "سوہان" سے کچھ لگاؤ نہیں)۔ اس کے معنی ہیں جی کو بھانے (بھلا لگنے) والا، گوارا، خوشنما، خوب صورت، اسی لئے "سوہن" کا مترادف بھی ہے اور مٹھائی کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ "حلوا سوہن"۔ قرینہ یہی ہے کہ "غالب" نے "ناب گوارا" کے لئے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

اب لوگ "غالب" بیچارے کے شعر کو مدرسے میں ضرور لے جائیں گے۔ "صاحب۔ یہ تو غلط ہے۔ اور پھر عربی فارسی لفظوں کے ساتھ یہ ہندی قافیہ کتنا بھونڈا!"

"غالب" ایسے اعتراضوں کو کب گردانتے ہیں۔ یہ وہی "تجبر" اور "لنگن" والا مضمون ہے۔ بظاہر "سوہن" (شراب کے معنوں میں) دلی والوں کی اصطلاح تھی اور شاید اب بھی ہے۔ بگّا بیگم صاحبہ کا اسے بے تکلف استعمال کرنا خود ہی سند ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی



## بجٹ

مرکزی حکومت کے رکن مالیات آنریبل مسٹر
ت علی خان نے ۲۸ فروری کو اسمبلی میں
سال کا بجٹ پیش کیا۔ اس روز اسمبلی میں
ے سے پہلے وہ اپنے سکریٹریٹ والے کمرے
ں بیٹھے بجٹ سے متعلق تقریر کی نوک پلک
ست فرما رہے ہیں۔ بجٹ کا اجمالی ذکر اسی
شمارے کے صفحہ ۶ پر ملاحظہ ہو۔

## نگار خانے میں

ہندوستان کے عارضی حکومت کے نائب صدر آنریبل پنڈت جواہرلال نہرو میڈیم کلارا کوئین کے نگار خانے میں تشریف فرما ہیں اور وہ ان کا بسٹ (Bust) بنانے میں مصروف ہیں۔ میڈم کلارا وانڈر کی ایک مشہور بت ساز خاتون ہیں



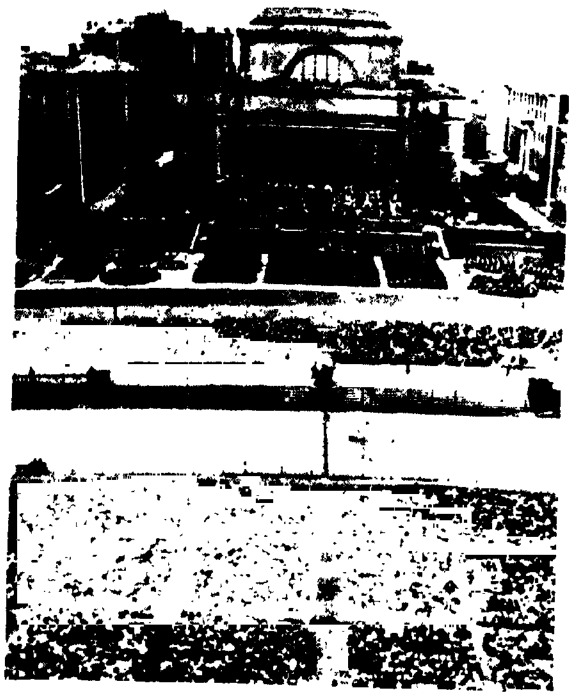


## ٹینس کا ڈے وس کپ

ٹینس کے عالمگیر مقابلے میں حصہ لینے والے ملکوں کے نام کی پرچیاں 'ڈے وس کپ' کے اندر سے نکال نکال کر امریکہ کے صدر ٹرومین یہ فیصلہ فرما رہے ہیں کہ شروع سے آخر تک مقابلوں کی ترتیب کیا رہے۔

# امریکہ کی یونیورسٹیاں

امریکہ کی تیرہ ریاستوں میں سے شمالی کیرولینا میں سب سے پہلے سرکاری طور پر تعلیمی ادارہ قائم ہوا جو آج تک موجود ہے۔ لیکن اس وقت غیر سرکاری درسگاہیں بھی موجود نہیں۔ امریکی انقلاب کے بعد سے وہاں کی یونیورسٹیوں کے نظام کار میں زبردست تغیر رونما ہوا اور وہ سب دنیا بھر کے لئے مثالی نمونہ بن گئیں۔ انمیں کتابی تعلیم سے زیادہ فنی تعلیم کا خیال رکھا جاتا ہے۔ زراعت سے صنعت تک تمام شعبوں میں اعلی ماہرین فن تعلیم کیلئے موجود ہیں۔ اس ضمن میں مساچوسیٹس کا ٹکنیکل ادارہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ زنانہ وسّار کالج میں اعلی تعلیم کے ساتھ خواتین کی گھریلو تربیت کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔



کولمبیا یونیورسٹی میں رسم تقسیم اسناد کے وقت طلبا کے عزیز و اقارب اور دوست احباب بھی جمع ہوتے ہیں۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔



وسّار نامی زنانہ کالج کی عظیم الشان عمارت۔



ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مغربی وسطی علاقہ میں زراعت کے ایووا اسٹیٹ کالج کی عمارت اور ملحقہ میدان۔

ٹکنیکل تعلیم دینے والے مساچوسیٹس نامی ادارے کی عمارت۔

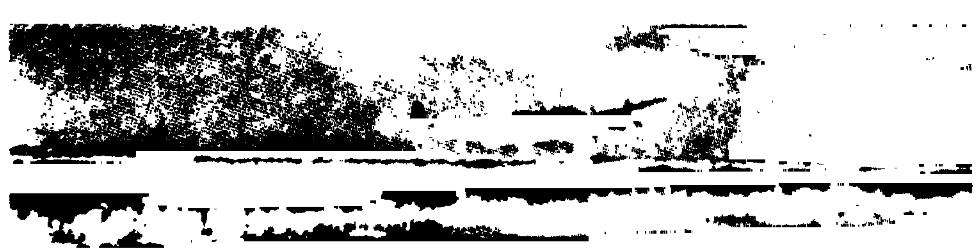


# آگ کا ناچ

۱۹۴۲ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل نے زور دیا کہ کہر دور کرنے کے تجربات فوراً عمل میں لائے جائیں کیونکہ اسکی موجودگی ہوائی جہازوں کی پرواز پر خاص کر برا اثر ڈالتی تھی۔ یہ تجربات کامیاب رہے اور شدید گرمی کے ذریعے فضا کو صاف کرنے کا طریقہ معلوم کرلیا گیا۔ یہ تجربہ ۱۹۴۳ء میں کیا گیا اور ۱۹۴۴ء میں اس سے بہت مفید کام لئے گئے۔ اس صفحے کی تصاویر امریکہ کی ہوائی تجربہ گاہ پر لی گئی تھیں۔

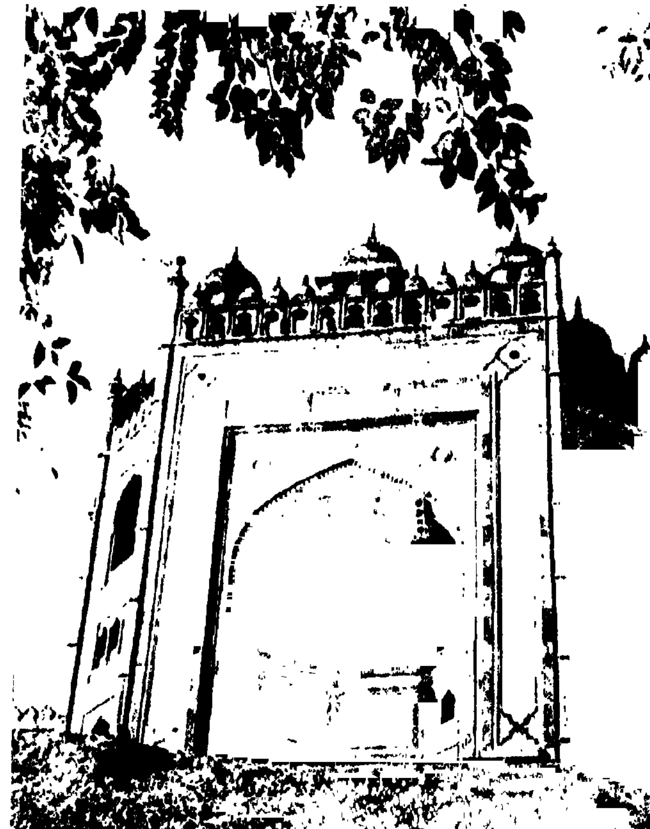


«فوگ انٹینسیو ڈسپرسل اوف» نے کہر دور کرنے کیلئے جو طریقہ اختیار کیا وہ اوپر کی تصویر سے ظاہر ہے۔ آگ کے ناچتے ہوئے شعلے کتنے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔



انہی شعلوں کے اوپر سے رائل ایرفورس کا لنکاسٹر نامی ہوائی جہاز اس صاف فضا میں سے گذر رہا ہے جسے شعلوں کی تپش نے کہر اور دھند سے پاک کردیا ہے۔

شہر آگرہ سے چند میل دور ایک مختصر سے گاؤں' سیکری کے قریب شیخ سلیم چشتی نامی ایک ولی اللہ رہتے تھے۔ انکی دعاؤں کی برکت سے خدا تعالی نے شہنشاہ اکبر کو بیٹا عنایت کیا اسنے خوش ہوکر اس ویران مقام پر اپنا پایۂ تخت بناڈالا اور اسکا نام فتحپور سیکری رکھا۔ یہاں کے شاہی محلات وغیرہ میں اسقدر سنگ سرخ استعمال ہوا ہے اور فنکاوں نے سنگتراشی کے کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں کہ اس جیسی مثال دوسری

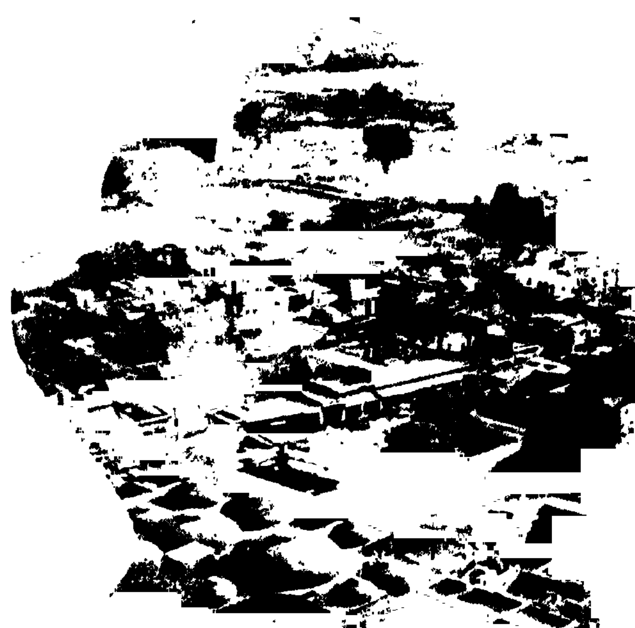


فتحپور سیکری میں ۱۷۶ فٹ اونچا « بلند دروازہ » جو ہندوستان میں سب سے اونچا دروازہ ہے ۔ شہنشاہ اکبر نے یہ دروازہ اس فتح کی یادگار میں بنوایا تھا جو اسنے سلطنت خاندیش پر حاصل کی تھی ۔ جامع مسجد میں داخل ہونے کا صدر دروازہ بھی وہی ہے ۔

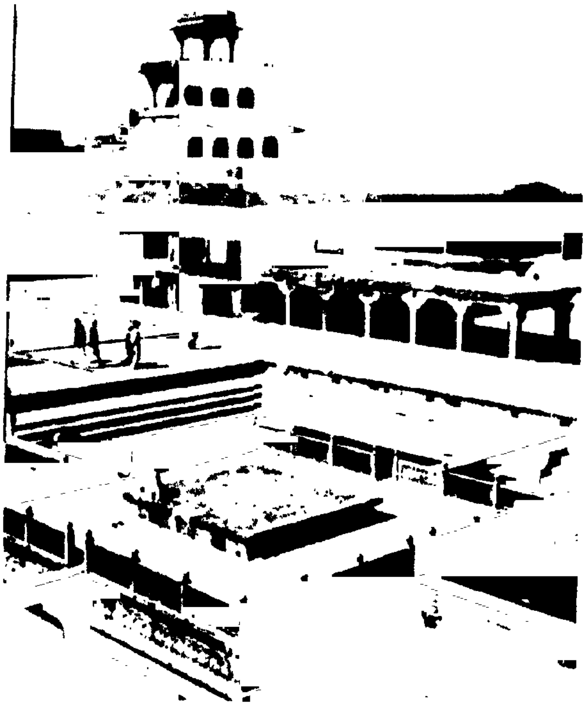


فتحپور سیکری کے جامع مسجد کا ایک اندرونی منظر۔ مختلف دالانو کی محرابیں آگے پیچھے نظر آرہی ہیں ۔

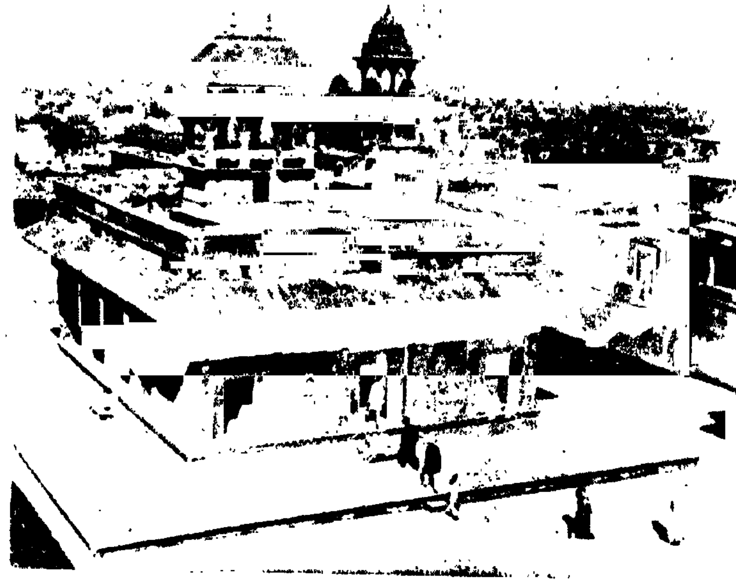
فتحپور سیکری کے گاؤں کا یہ دلکش منظر بلند دروازے کے اوپر سے دکھائی دیتا ہے ۔ اگلے حصہ میں حمام خانہ کے گنبد نظر آرہے ہیں ۔



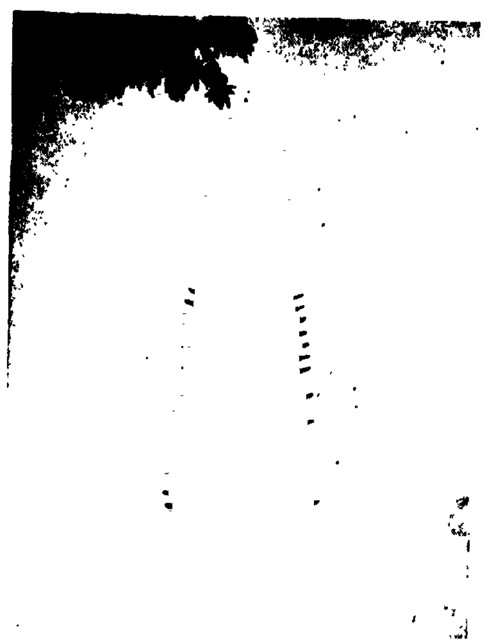
جگہ نہیں مل سکتی۔ مضبوط اور اونچی دیواروں سے گھرا ہوا یہ شہر چھ میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ ۱۵۷۴ء میں یہ پایۂ تکمیل کو پہنچا مگر گیارہ سال بعد ہی اسے خیرباد کہہ دینا پڑا۔ کیونکہ سیاسی مشکلات کے علاوہ بعض ضروریات زندگی کی فراہمی میں بھی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ تاہم تاریخی عمارتوں کے شائق اب بھی اس دور افتادہ [illegible]



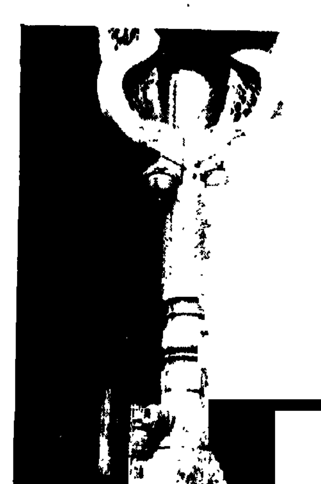
پانچ منزل کی یہ عمارت «پنج محل» کہلاتی ہے۔ اگلے حصے میں ماہی تالاب کا ایک رخ دکھائی دے رہا ہے۔



اکبر نے یہ محل اپنی راجپوت رانی جودھا بائی کیلئے بنوایا تھا۔



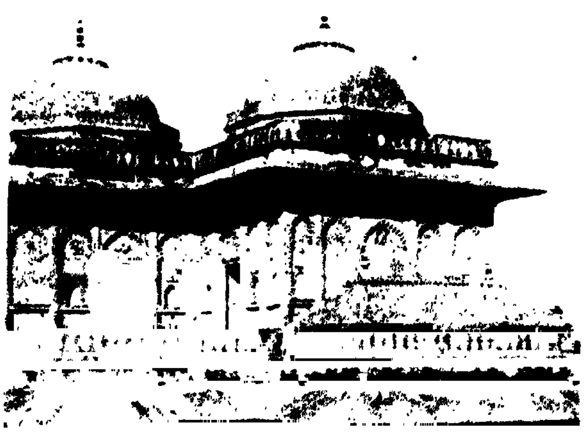
# کبر کے
# نوابوں
# ں دنیا



یہ عمارت «ہرن مینار» کہلاتی ہے۔ اسکے نیچے اکبر کے ایک چہیتے ہاتھی کی قبر بنائی جاتی ہے۔

---

شیخ سلیم چشتی رح کا مقبرہ زینت و زیبائش کے لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے۔ یہ اسی مقبرے کا ایک ستون ہے۔ ←

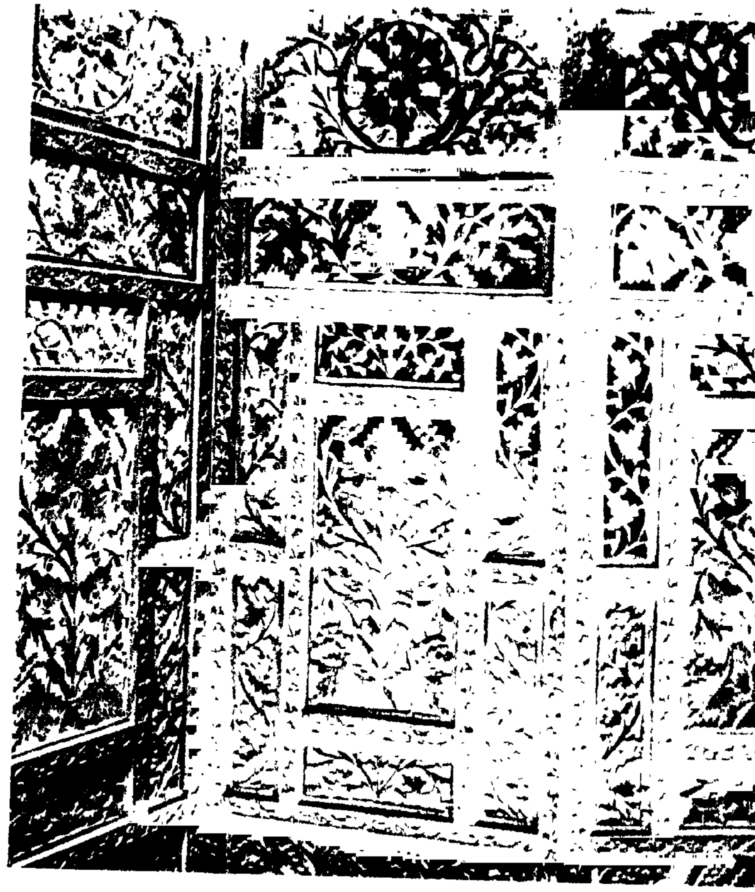




فتحپور سیکری میں بیربل کا مکان۔ یہ مکان [illegible] نے اپنی بیٹی کے لئے بنوایا تھا۔

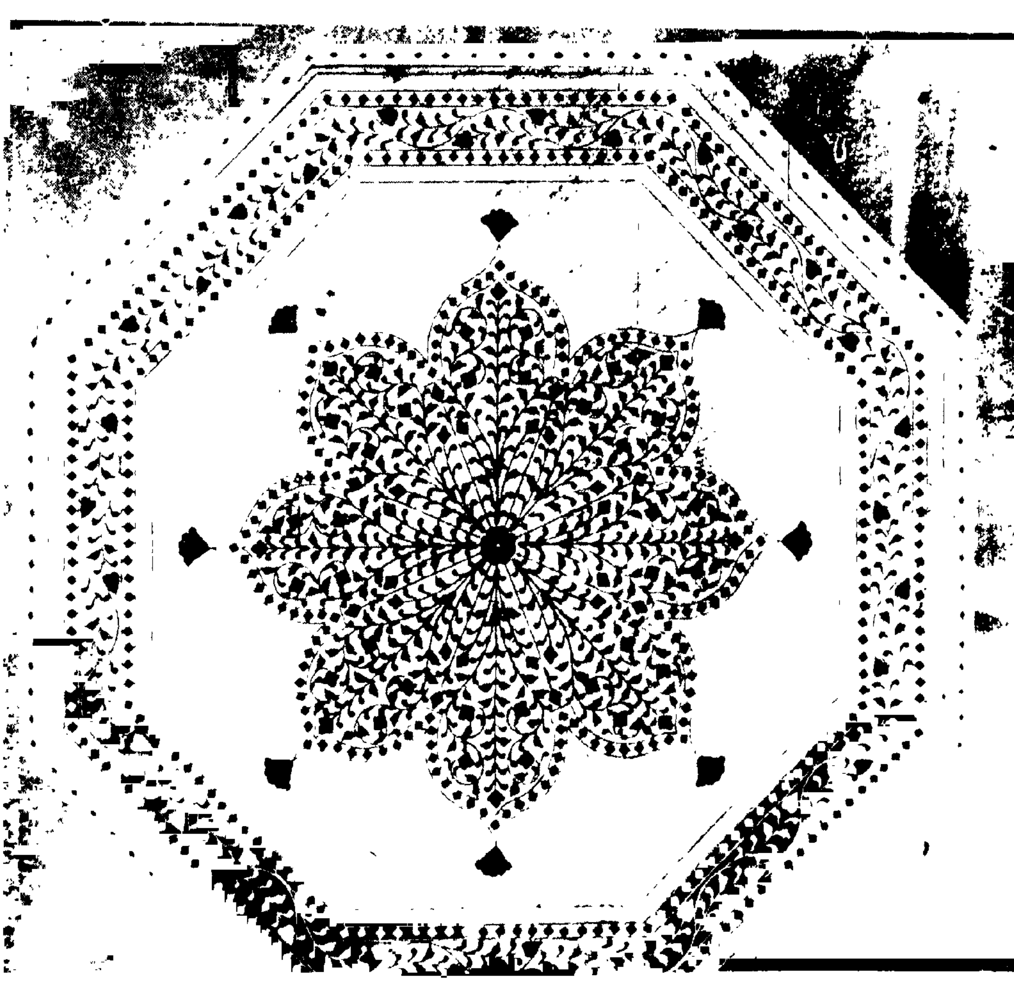
# کشمیر میں لکڑی کا کام

ارض کشمیر جہاں کے شال دوشالے اور قالین دنیا بھر میں مشہور ہیں، لکڑی کا اعلی کام پیش کرنے کے سلسلے میں بےحد ممتاز ہے۔ ہندوستان میں شاید اتنا اچھا کام دوسری جگہ نہ ہوتا ہو۔ لکڑی پر کھدائی یا جالی کی کٹائی کرتے وقت ماہرین فن زیادہ تر پھولوں سے لدے ہوئے پودوں بیلوں اور دوسرے مناظر قدرت کا خاص لحاظ رکھتے ہیں۔ لکڑی میں کھدائی کرکے ہاتھی دانت کے پترے جوڑنا بھی بہت عام ہے۔ سامان آرائش میں میز کرسیاں پلنگ کے کٹھہرے پردے کھڑکیوں کے کواڑ زیبائشی ظروف اور ایسی ہی دوسری چیزیں شامل ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے



اخروٹ کی لکڑی سے بنا ہوا ایک جالیدار پردہ۔ کٹائی کے کام میں انگور کی بیلوں کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔

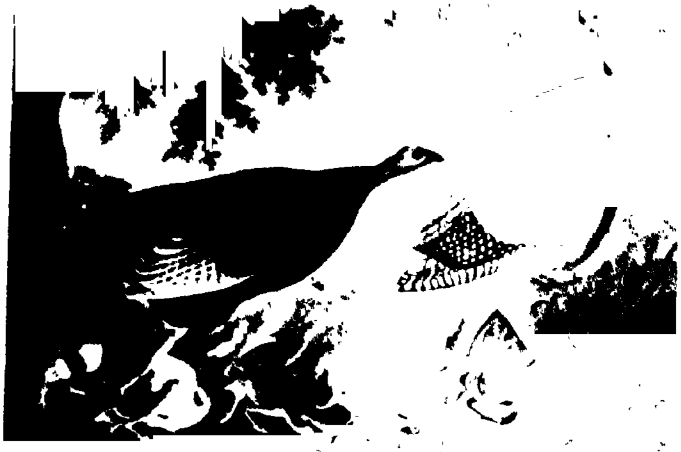
کہ نزاکت و رعنائی کے ساتھ وہ نہایت مضبوط اور پائدار بھی ہوتی ہیں۔ یہاں کی قدیم مصنوعات یورپ کے تمام عجائب خانوں میں موجود ہیں اور سوغات کے طور پر اب بھی باہر بھیجی جاتی ہیں۔



ایک میز کی بالائی سطح۔ لکڑی میں کھدائی کرکے ہاتھی دانت کے پترے نہایت خوبصورتی کے ساتھ جڑے گئے ہیں

# پیلو ممالک یورپ میں

پیلو جسے انگریزی زبان میں ٹرکی کہتے ہیں میکسیکو کا ایک خاص پرندہ ہے۔ وہ شمالی اور وسطی امریکہ کے بعض حصوں میں بھی ملتا ہے۔ جنگلی ہونے کے باوجود گھروں میں پالا جاسکتا ہے۔ جوان دا آسینائس کی ایک تصنیف «حیوانات امریکہ» کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۴۹۹ء میں پیڈرو نینو نامی سیاح وینزوئلا کے ساحل سے چند پیلو خرید کر ہسپانیہ لے گیا۔ لیکن یہ امر تحقیق طلب ہے کہ پیلو وینزوئلا میں کیسے پہنچے۔ ہسپانیہ میں اس پرندے کو عرصہ



یہ تصویر امریکہ کے مشہور مصور جون اوڈوبون نے بنائی تھی۔ ان کی تصنیف امریکہ کے پرندے میں مثل تصاویر ہی کے باعث بہت مقبول ہوئی تھی۔

✡

دراز تک ہندوستانی پرندہ سمجھا جاتا رہا۔ یہ غلط فہمی اس بنا پر تھی کہ خود کولمبس ساحل امریکہ کو ہندوستان کا ایک حصہ سمجھ چکا تھا۔ ہسپانیہ کے بعد یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی اس پرندے کو پالنے کا عام رواج ہوگیا۔ اسکے نام کی وجہ تسمیہ بھی دلچسپ ہے۔ کیونکہ اسے ملک ٹرکی سے کوئی تعلق نہیں ہے کہتے ہیں کہ یہ نام اسکی آواز کی بنا پر رکھا گیا ہے۔ جب وہ ڈرکر زور سے چیختا ہے تو «ٹرک ٹرک» کی آواز نکلتی ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں



امریکہ کے ایک شہر ورتھنگٹن میں «کنگ ٹرکی ڈے» کے موقع پر بے شمار پیلو نمائش کے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ یہ تہوار ہر سال منایا جاتا ہے۔

بحیرۂ قلزم اور بحر اوقیانوس کے ساحلی ملکوں میں تجارت کرنے والے لوگ ٹرک یعنی غیر ملکی کہلاتے تھے انکے سامان تجارت میں پیلو بھی شامل ہوتا تھا۔ شاید اسی لئے اسے ٹرکی یعنی غیر ملکی پرندہ کہتے ہیں۔



ورتھنگٹن کے بازاروں میں سے دوہزار پیلوؤں کا جلوس نکل رہا ہے۔ دونوں جانب کھڑے ہوئے لوگ انہیں دیکھکر خوش



مہندر ناتھ

## بالم روٹھ گئے

ماتھے پہ بندیا میں کیسے لگاؤں؟
کس بدھ مانگ بھروں؟
کیسے کروں میں سنگار
بالم روٹھ گئے

آن کے اب نہ بولوں بلاؤں
چپ بھی رہوں تو مروں
کیسے کروں میں سنگار
بالم روٹھ گئے

اے ری سکھی! کیسے ان کو مناؤں؟
کیا اب جتن کروں؟
کیسے کروں میں سنگار
بالم روٹھ گئے

عبدالمجید بھٹی

## "سرود رفتہ"

زندگی نام ہے فسانے کا

دل تھا سیماب کو ثروت نیم
آفتاب و قمر تھے میرے ندیم
حسن کے عرش تک رسائی تھی
میرے پاؤں تلے خدائی تھی
اب وہ دن ہیں نہ اب وہ راتیں ہیں
حسن و عشق اب پرانی باتیں ہیں
ساغروں میں شراب ختم ہوئی
داستان شباب ختم ہوئی
ساز الفت کے تار ٹوٹ گئے
ناز پروردہ جام پھوٹ گئے
اب وہ کیف تصورات کہاں
عشرت بزم کو ثبات کہاں

رنگ اب اور ہے زمانے کا

اصغر نثار قریشی

## شباب

علی اشرف حیدرآبادی

شباب وہ ہے جو زندگی کو ابھار کر آفتاب کر دے
شباب وہ ہے جو شورش دل کو محشر انقلاب کر دے
شباب وہ ہے کہ جس کی آنکھوں سے رنگ و بو کا شعور جاگے
شباب وہ ہے جو ظلمت دل کو مرکز آب و تاب کر دے
شباب وہ ہے جو اپنی نظروں سے ساری ہستی کے منظروں کو
حسین و رنگیں بنا بنا کر مقابل ماہتاب کر دے
شباب وہ نغمۂ فسوں ہے، شباب وہ زخمۂ جنوں ہے
کہ چھیڑ دے دھن میں ساز اپنا تو ہر نفس کو رباب کر دے
شباب ہے وہ شرار ہستی کہ سنگ و آہن کو موم کر دے
شباب ہے وہ بہار ہستی کہ خار و خس کو گلاب کر دے
شباب وہ داور محبت ہے عشق کا تاج سر پہ رکھکر
جب آئے اپنی شہنشہی پر اجل کی مٹی خراب کر دے
شباب وہ نقش آرزو ہے، شباب وہ دشمن سکوں ہے
کہ زندگی کے نفس نفس کو رہین صد اضطراب کر دے
شباب وہ دور بیخودی ہے شباب وہ عہد سرخوشی ہے
کہ موجۂ زہر غم کو نظروں سے اپنی صہبائے ناب کر دے
شباب طوفاں ہے زندگی کا، شباب مرکز ہے سرکشی کا
کبھی جو وہ اپنی ضد پہ آئے اجل کی مٹی خراب کر دے

شباب وہ ہے کہ جسکے دامن میں سینکڑوں بجلیاں بھری ہوں
شباب وہ ہے کہ جسکے شاداب رخ سے سوکھیتیاں ہری ہوں

# "ہوا یہ کہ ——"

افسانہ

ضیاء القمر امام

وہ تو جانے کب تک ویسی ہی کھلنڈری اور نادان سی بچی بنی رہتی۔ اور ڈیڈی بھی اسے ننھی ہی سمجھتے رہتے۔ اگر امی روز روز وہ عجیب سا تبصرہ کر کر اسے احساس نہ دلا دیتیں کہ وہ بڑی ہوگئی ہے۔ اللہ! بعض دفعہ امی کس قدر غیر دلچسپ باتیں کرنے لگتی ہیں۔

آسمان پر بارھویں یا تیرھویں کا چاند ستاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کر رہا تھا۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر بیٹھی ہوئی صبیحہ سوچ رہی تھی کہ آخر یہ امی اسے اس قدر جلدی گھر سے نکالنے پر کیوں تلی ہوئی ہیں حالانکہ وہ کچھ دقیانوسی خیالات کی ہیں۔ شادی بیاہ اور گھر گرہستی کے جھگڑوں کے علاوہ انہیں اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اور ڈیڈی بیچارے اپنے وقت کے "یاتی" قسم کے لوگوں میں سے —— ٹینس کے دلدادہ —— اپنی یونیورسٹی میں اچھے کھلاڑی گردانے جاتے تھے۔ ایک دفعہ چیمپئن شپ بھی جیت چکے ہیں۔ عورتوں کی آزادی کے حامی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ امی کی مرضی کے خلاف انھوں نے صبیحہ کو اتنی آزادی دے رکھی ہے۔ پھر بھلا اگر ان کی اور امی کی رائے اکثر باتوں میں اختلاف کرے تو کیا عجب ہے!

آجکل اور کچھ نہیں تو اس کی شادی ہی کو بہانہ مل گیا ہے۔ بحث کرنے کے لئے۔ —— ڈیڈی کہتے ہیں کہ ابھی صبیحہ کی عمر ہی کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے اتنی جلدی تعلیم ختم کر لی —— وہ ابھی دو تین سال ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ دراصل ان کا مقصد یہ ہے کہ صبیحہ کھیل کے میدان میں ان کی اور اپنے دونوں بھائیوں کی طرح ٹینس میں نام پیدا کر لے اور زیادہ نہیں تو کم از کم ایک چیمپئن شپ تو جیت ہی لے۔ صبیحہ کو بھی ان کی رائے سے اتفاق ہے مگر امی نہیں مانتیں۔ وہ ہمیشہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی ہیں۔

کل ہی کا ذکر ہے۔

شام کو چائے کے بعد صبیحہ اپنے کمرے میں آکر لیٹ رہی اور اپنے بھائیوں کے باہر سے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ ڈیڈی برابر والے کمرے میں بیٹھے امی کو شام کو ہونے والے میچ کے متعلق بتا رہے تھے جس میں صبیحہ اور سلیم جیمسفورڈ کلب کے عزیز احمد اور شانتی دیوی کے خلاف کھیلنے والے تھے۔ "اے کب تک اسے یہ لڑکوں کا سا کھیل کھلواتے رہو گے۔ کبھی لڑکی کی جون میں بھی آنے دو گے یا نہیں۔ اللہ جانے مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتا یہ موا گلی ڈنڈا ——" امی میچ کی باتیں سنتے سنتے بولیں۔

"ٹینس کہو جی"۔ ڈیڈی اپنے پسندیدہ کھیل کی توہین کب برداشت کر سکتے تھے۔

"خیر مجھے نام سے مطلب نہیں"۔ امی کی آواز آئی۔ "میں تو یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کبھی اس کی فکر بھی کرو گے یا نہیں۔ ماشاء اللہ اتنی بڑی ہوگئی ہے۔ مگر توبہ کرو! تمہیں تو ہر وقت ٹینس کی رٹ ہے۔ سوتے جاگتے بس یہی کلمہ ہے۔ پرائے گھر جا کر اللہ ماری ٹینس ہی ہر بات میں کام آئے گی نا؟ جن کے پلے پڑے گی وہ تمہیں ہی برا بھلا کہیں گے کہ بے ڈھنگے باوا نے ٹینس کے علاوہ اور کچھ بھی نہ سکھوایا۔"

"جب ہی تو میں کہتا ہوں اس قدر جلدی نہ کرو۔ میں اطمینان سے ایک اپنے ہی جیسا کھلنڈرا داماد ڈھونڈ لاؤں گا۔" ڈیڈی امی کو چڑانے کی فکر میں تھے۔

"اے تو! اب اس پر اترا ئیے۔ یہی بات ہے تو کہیں نظر دوڑاؤ نا۔ تمہارے کلب ہی میں اتنے کھلاڑی بھرے پڑے ہیں۔ کسی کو کر لو پسند۔ شعیب یا سلیم کے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟ ان کے گھر والوں نے تو میری دہلیز کی مٹی لے ڈالی ہے۔ اور سچ پوچھو تو یہ دونوں بہت پسند ہیں۔ اور شعیب کا باپ شہر کی ممتاز ترین ہستیوں میں سے ہے۔ سلیم اللہ رکھے خود کسی بڑے سے عہدے پر فائز ہے۔ کہو تو صبیحہ کی مرضی معلوم کر لوں؟" اور صبیحہ کو یقین ہوگیا کہ اب یہ کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں گے۔ مگر بات میں سے بات نکل کر ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں کہ وہ دونوں پھر نئے سرے سے الجھنے لگے۔ صبیحہ بیچاری کڑھ رہی تھی کہ اس کی خاطر بھلا یہ دونوں کیوں اپنی زندگی کو عذاب بنائے ڈال رہے ہیں۔ مارے اکتاہٹ کے وہ ضرور رو دیتی اگر اس کی نظر شعیب کی سرمئی اولڈز موبیل پر نہ پڑتی جو اسی وقت آہستہ سے گیٹ کے اندر پھسل آئی تھی۔ اس کے دونوں بھائی شعیب اور سلیم سمیت واپس آگئے تھے۔

"صوفی چلو بھئی۔ کافی دیر ہو چکی ہے"۔ چھوٹے بھیا نے کھڑکی میں سے اندر جھانک کر کہا۔ اور وہ جلدی سے جا کر کار میں بیٹھ گئی۔ راستے بھر بڑے بھیا اسے کھیلنے کے متعلق ضروری ہدایات دیتے رہے۔ مگر پھر بھی اسے ڈر محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ ہار گئی تو ——؟ اور چند منٹ بعد جب کلب میں پہنچی تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یونہی بے وجہ! ورنہ ویسے روز کیا وہ ٹینس کھیلتی نہ تھی۔

اندر داخل ہوتے ہی اسے کلب کے سکریٹری راؤ مل گئے۔ وہ اور کلب کے زیادہ تر ممبر صبیحہ کو بچپن سے جانتے تھے۔ کیونکہ ڈیڈی مدتوں سے اس کلب کے ممبر تھے۔

"گڈ ایوننگ انکل"۔ صبیحہ انھیں دیکھتے ہی بولی۔

"گڈ ایوننگ ڈیئر۔ تمہارے ابا جان ابھی تک نہیں آئے؟"

"جی نہیں۔ شائد کچھ دیر ٹھہر کر آئیں۔"

" صبیحہ۔ چلو میچ شروع ہونے میں تھوڑی سی دیر رہ گئی ہے" سلیم آکر بولا
" ابھی چلتی ہوں "

" ہاں بھئی ضرور جاؤ ـــ یہ لڑکے کسی وقت تم لوگوں کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے اور کبھی اگر ہم لوگوں کو تم سے بات چیت کرتے دیکھ لیں تو حسد ـــ نہیں بھئی ـــ خیر ـــ تو ایسے موقعوں پر میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی انھیں میں سے ایک ہوتا اور پھر کسی دوسرے کو تم سے بات تک کرنے کا موقعہ نہ دیتا" انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر آہستہ سے کہا۔

دیکھئے انکل آپ ہر وقت چھیڑتے رہتے ہیں مجھے" صبیحہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

" اچھا بھئی۔ اب نہیں چھیڑیں گے ہم اپنی بیٹی کو ـــ جاؤ کھیلنے کے لئے۔ بیچارہ سلیم دیر سے انتظار کر رہا ہے "

میچ شروع ہوا ـــ کلب کے ممبر کورٹ کے دونوں طرف بیٹھے۔ اشتیاق بھری نظروں سے صبیحہ اور سلیم کے کھیل کو دیکھ رہے ۔ شروع شروع میں تو صبیحہ کچھ خوفزدہ سی تھی۔ دہی ہارنے کا ڈر۔ اس کے مخالف اپنے کلب کے بہترین کھلاڑیوں میں سے تھے۔ لیکن سلیم بڑے اطمینان سے کھیل رہا تھا حقیقت میں وہ بہت عمدہ کھلاڑی تھا۔ اور اس کے بیک ہینڈ کا تو کلب بھر میں جواب نہ تھا۔ اسی کو دیکھ کر صبیحہ کو بھی ذرا ڈھارس بندھی اور اس نے جم کر کھیلنا شروع کیا ـــ مقابلہ کافی سخت رہا اور آخر میں وہ اور سلیم جیت گئے جس پر خوب تالیاں بجیں۔ وہ دونوں کورٹ سے واپس آرہے تھے تو لوگوں نے ان کی ڈھیروں تصویریں لے ڈالیں۔ انھیں خوب مبارکباد دی گئی۔ اور سب سے آخر میں جب سلیم نے اس سے کہا۔ صبیحہ آج تم بہت اچھا کھیلیں۔ اسی رفتار سے چلتی رہیں تو چیمپئن شپ ملی ہی سمجھو" اور پھر جب وہ ایک خاص انداز سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کے سارے جسم کا خون سمٹ کر اس کے چہرے کی طرف دوڑ رہا ہو۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا کس قدر احمق ہوں میں۔ بس اتنی سی بات پر جھینپ گئی۔ کیا کہے گا سلیم" اور وہ ہمت کر کے بولی ـ " اور تم بھی تو ـــ " مگر جونہی سلیم نے اس کی طرف دیکھا ـ وہ پھر گھبرا گئی اور اس کی آواز حلق ہی میں اٹک کر رہ گئی۔ خیریت ہوئی کہ سلیم کو اسی وقت اس کے دوستوں نے آگھیرا اور صبیحہ جلدی سے کلوک روم میں گھس گئی ـــ اگر سلیم اس سے کچھ اور مطلب نکال لے تو ؟ اور بے چارہ شوی یونہی رہ جائے ـــ کیسی حماقت ہوگئی مجھ سے۔ وہ سوچنے لگی۔ مگر اس کا بھی کیا قصور تھا۔ سلیم کی آنکھیں اتنا کچھ کہے ڈال رہی تھیں۔ کہ وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ ورنہ وہ خود تو یہ ہی چاہتی تھی کہ جب تک کچھ فیصلہ نہ ہو جائے سلیم اور شوی اس کے جذبات کا بالکل اندازہ نہ لگا سکیں۔ لیکن اگر اس کا چہرہ بات بات پر سرخ ہو جائے تو آخر وہ کیا کرے۔

سلیم شام پھر اس کے ساتھ پھرتا رہا اور رات کو بھی جب وہ سیاہ ساری پہنے اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ۔ جس [illegible] درمیان وہ اور بھی [illegible] معلوم ہوتی تھی۔ ڈانس کے لئے کلب پہنچی تو سلیم کلب کے باہر ہی انھیں مل گیا۔ اور وہ سب بال روم کے ایک کونے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شوی پہلے ہی سے وہاں کا انتظار کر رہا تھا

جب رقص شروع ہوا تو سلیم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ـ صبیحہ ؟ اور صبیحہ اس کا مطلب سمجھ کر بولی ـ " نہیں سلیم شوی سے پہلے سے وعدہ کر چکی ہوں "

شام پھر تو ٹینس کھیلی ہے صبیحہ نے ہمارے ساتھ۔ مگر اب رقص نہیں کر سکتیں۔ اسی موقعہ کے انتظار میں تو میں تمام [illegible] خاموش رہا۔ اور تم اب بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے [illegible] اچھا نہیں ہوتا [illegible] قریب ہی کھڑا ہوا شعیب ہنس کر بولا۔

سلیم تم کسی اور لڑکی کو کیوں نہیں کہتے رقص کرنے کے لئے ؟ صبیحہ نے پوچھا۔

مگر سلیم جواب دئے بغیر جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اور کسی نامعلوم شئے کو گھورنے لگا۔ اس کی خلا میں گھتی ہوئی نگاہیں [illegible] رہی تھیں۔ جو عمارت میں نے شام کو صبیحہ کے بغیر [illegible] تیار کی تھی اس کی بنیادیں کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتیں ـــ اور کہیں خبر شوی [illegible] ل کر اسے منہدم ہی کر دیں ـــ کیا خبر ؟

مگر چند لمحوں بعد شوی کے ساتھ رقص کرتی ہوئی صبیحہ سلیم اور اس کی نگاہوں کو کچھ عرصے کے لئے تقریباً بھلا چکی تھی۔ [illegible] خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ [illegible] شوی کس قدر عمدہ طریقہ سے قدم اٹھاتا ہے۔ رقص کرنے میں تو [illegible] کمال حاصل ہے۔ اور جب پولو کا [illegible] کس شروٹ یا دو [illegible] کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے [illegible] کا بھی استاد ہے ـــ اگر یہ ٹینس بھی عمدہ جانتا تو ـــ تو کیا ہوتا ؟

لیکن انسان ہر چیز میں ماہر تھوڑا ہی ہو سکتا ہے ـــ وہ ان ہی خیالات میں غرق تھی کہ پہلا رقص ختم ہو گیا۔ اور اس کے بعد کئی شروع اور ختم ہوئے ـــ آخر کلب کا آرکسٹرا "سینٹ لوئی بلوز" بجانے لگا ـــ یہ دھن صبیحہ کو سب سے زیادہ پسند تھی۔ آخری رقص شروع ہو گیا۔ اس وقت تک زیادہ تر جوڑے تھک کر بال روم کے چاروں طرف بچھی ہوئی میزوں کے گرد بیٹھ چکے تھے۔ محض چند نوجوان جوڑے ایسے تھے جو ابھی تک محو رقص تھے۔

دوران رقص میں جانے مسٹر راؤ کو کیا سوجھی کہ وہ بال روم میں لگے ہوئے لاؤڈ سپیکر کے قریب پہنچے۔ اور جب سینٹ لوئی بلوز کا بہترین حصہ بج رہا تھا تو ـــ مسٹر شعیب اور مس صبیحہ ـــ انھوں نے آہستہ سے کھنکار کر لاؤڈ سپیکر میں سرگوشی کی ـ اور بال روم کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے

لوگوں کی نظریں ان پر جم گئیں۔ بزرگ مسکرا مسکرا کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور نوجوانوں کی نگاہوں میں رشک تھا۔ حقیقت میں اس وقت وہ دونوں ایک دوسرے کے سہارے رقص کرتے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے — سلیم ایک کونے میں بیٹھا گہری نظروں سے انھیں تک رہا تھا —

صبیحہ جھنجھلا رہی تھی۔ "جانے یہ کیا عجیب عجیب مذاق سوجھتے ہیں انکل راؤ کو" اور شعیب بیچارہ اتنی بہت سی نظریں اپنی جانب اٹھی دیکھ کر واقعی گھبرا گیا۔ "صبیحہ یہ ساری تو بہت سج رہی ہے" وہ بوکھلا کر جلدی سے بولا۔ اور جب مسکرا کر اسے بوجھل لمبی لمبی پلکیں اس کی طرف اٹھیں، ننھے ننھے لپ سٹک لگے ہونٹ مسکرائے۔ اور صبیحہ نے کہا "شکریہ!" تو وہ اور زیادہ چکرا گیا۔ بیچارہ لڑکا! صبیحہ نے محسوس کیا کہ وہ مضبوط سا ہاتھ جو اس کے ننھے سے ہاتھ کو تھامے ہوئے تھا۔ بے طرح کانپ اٹھا تھا۔

کلب سے واپس آکر صبیحہ پوری رات نہ سو سکی۔ وہ سوچتی رہی کہ اگر یہ سب کچھ یونہی چلتا رہا تو شوی اور سلیم ضرور ایک دوسرے سے حسد شروع کر دیں گے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ دو اتنے اچھے دوستوں کے دلوں میں محض اس کی وجہ سے دشمنی کے جذبات پیدا ہوں — اس کے علاوہ امی اور ڈیڈی کے جھگڑے۔ جو روز بروز بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

دو روز بعد ریلیف فنڈ کے لئے کلب میں پھر رقص ہونے والا ہے۔ اس کی آفت آئے گی۔ بھئی اللہ! یہ شوی اور سلیم کسی اور کے ساتھ کیوں نہیں کرتے ڈانس۔ اتنی ڈھیروں لڑکیاں بھری پڑی ہیں کلب میں۔ پتہ نہیں کیوں اگر کرتے ہیں تو اسی کے ساتھ ورنہ نہیں۔ ہمیشہ سے یہی بدتمیزی کی عادت ہے ان میں۔ اور اسے بھی ان میں سے ایک سے وعدہ کرنا پڑے گا۔ اور سب سے بڑی الجھن کی بات یہ ہے کہ اگر وہ شوی سے وعدہ کرے تو سلیم پھر اسے ویسی ہی گہری گہری نظروں سے تکے گا۔ اور اگر سلیم کے ساتھ رقص کرے تو شوی اپنے مخصوص انداز میں بے بسی سے مسکرائے جائے گا۔ بھئی اللہ!...

صبح تک وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ ان دونوں میں سے اسی کے ساتھ رقص کرنے جائے گی جس کو وہ اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا ارادہ کرے گی۔ مگر مشکل یہ آن پڑی تھی کہ شوی اور سلیم میں سے کس کو منتخب کرے۔

ان دونوں کو صبیحہ اس وقت سے جانتی تھی جب اسے ڈھنگ سے ان کے نام بھی لینے نہ آئے تھے۔ وہ اس کے بھائیوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ پھر سکول اور کالج میں بھی وہ سب اکٹھے رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں بھی ان ہی کے خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے۔

صبیحہ بچپن ہی سے سوچا کرتی تھی کہ ان دونوں کی جو باتیں اس کو پسند تھیں وہ اگر ایک ہی انسان میں جمع کر دی جائیں تو وہ قدرت کا شاہکار بن جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے لئے ایسے ہی انسان کو پسند کرے گی جو ان دونوں کی اچھائیوں کا مجموعہ ہو۔ مگر ایسا انسان اس کی زندگی میں ابھی داخل ہی نہ ہوا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اپنے بھائیوں کے علاوہ جتنے بھی لڑکوں سے ملی تھی اس کے دل میں ان سب سے زیادہ اونچی جگہ شوی اور سلیم کے لئے تھی۔ مگر اس اونچائی کی بھی ایک حد تھی جسے آج تک ان دونوں میں سے کوئی بھی عبور نہ کر سکا تھا۔ مگر اب ان دونوں میں سے ایک کو یہ حد عبور کرنا تھی۔ وہ دونوں بھی یہی چاہتے تھے۔ امی اور ڈیڈی کی دلی خواہش بھی یہی تھی۔ اور بھائی بھی دبے چھپے الفاظ میں اس سے کہہ چکے تھے کہ وہ ان میں سے ایک کا انتخاب کرے۔ کلب کے ممبروں تک کو یقین تھا کہ اس کی شادی ان ہی دونوں میں سے ایک سے ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ کلب کا کوئی اور نوجوان ممبر اس سے ٹینس کھیلنے یا رقص کرنے کی درخواست کرتا تو بزرگ ممبر اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے۔ جیسے وہ شوی اور سلیم کا حق چرا رہا ہو — مطلب یہ کہ اسے ان دونوں میں سے ایک کے حق میں فیصلہ کرنا تھا۔ مگر ان دونوں میں بہتر ہے کون؟

سلیم مردانہ خوبصورتی کا مجسمہ۔ اس کی ہر بات سے مردانگی ٹپکتی تھی۔ مگر اس کے مزاج میں سنجیدگی بے حد تھی۔ اور اس کی وہ غرور کی حد تک پہنچی ہوئی خودداری — اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یکایک اس کی نظروں میں کسی کی کچھ بات جچتی ہی نہ تھی — ہونہہ! جانے کیا سمجھتا تھا خود کو — اور اس کی وہ گہری گہری نظریں جو کسی کے سامنے جھکنا جانتی ہی نہیں۔

اور وہ بیوقوفی کی حد تک بھولا اور خوبصورت سا شوی — بالکل بچہ سا! اس قدر باتونی اور دلچسپ — جیسے ہنسنا ہنسانا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہو — اس قدر عمدہ رقص جانتا تھا اور فرینک سناترا کے سارے گانے رٹے پڑے تھے اسے۔ مگر بھئی اس کے مزاج میں بچپن جو حد سے زیادہ ہے۔ ایسا بچہ سا شوہر جچتا نہیں کچھ — ہیم؟ مگر اس کا غرور — شوی؟ اور اس کا بچپن — اوہوں! پھر آخر کون؟ سلیم یا شوی؟ — شوی یا سلیم؟ — ہائے اللہ پھر وہ دونوں؟ اس کا دم رکنے لگا۔ مجھ سے تو خاک بھی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ پھر؟ — آخر امی کا استخارہ کس روز کام آئے گا —؟؟

# شہاب صغیرہ یا ٹوٹنے والے تارے

جب آسمان صاف ہوتا ہے تو رات کے وقت کبھی کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ روشنی کے نقطے یکایک کسی سمت سے نمودار ہو کر بڑی تیزی سے کچھ دور حرکت کر کے غائب ہو جاتے ہیں اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا ستارہ آسمان سے ٹوٹ کر گر پڑا۔ اسی لئے عوام اس منظرہ کو تارہ ٹوٹنے سے تعبیر کرتے ہیں انہیں کو فارسی میں شہاب ثاقب اور انگریزی میں "شوٹنگ اسٹار" کہتے ہیں۔ ان شہابوں سے کچھ تو اسقدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ روشنی کے نقطوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اسی لئے بہت معمولی روشنی کے ساتھ فضا میں مختصر سفر کر کے ایک ساعت میں غائب ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے دو چار چھوٹے شہاب ہر رات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کو شہاب صغیرہ کہتے ہیں۔

آسمان صاف ہونے کی حالت میں اوسط نگاہ والا آدمی غروب آفتاب سے لے کر طلوع تک ۵ یا ۶ ستارے ٹوٹتے ہوئے دیکھ سکتا ہے یہ چھوٹے شہاب بھیانک خاموشی کے ساتھ اپنی چمک دکھلا کر ایسی جلدی غائب ہو جاتے ہیں کہ ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ عموماً رات کے اول حصے میں نسبتاً کم اور آخری حصہ میں زیادہ شہاب نظر آتے ہیں۔ سال کی کچھ مخصوص تاریخوں پر (مثلاً وسط اپریل، اگست کا پہلا ہفتہ۔ وسط اور آخر نومبر) اور دنوں کے مقابلے میں شہابوں کی غیر معمولی کثرت ہوتی ہے اور انہیں خاص تاریخوں پر کچھ مقررہ وقفوں (مثلاً ۶ سال یا ۳۳ سال) کے بعد شہابوں کی بارش جیسی ہوتی ہے۔

زمانہ قدیم میں شہابوں کے متعلق عوام عجیب و غریب خیالات رکھتے تھے۔ قدیم فلاسفر ان کو کرۂ ہوائی میں کسی نامعلوم بے ترتیبی کا نتیجہ قرار دیتے تھے کچھ علماء یہ کہتے تھے کہ فضا میں کوئی مشتعل ہونے والا مادہ ایک لکیر کی شکل میں پھیل جاتا ہے۔ اس کے ایک سرے سے آگ لگ کر دوسرے سرے تک یہ مادہ جلتا چلا جاتا ہے۔ علمائے حال کی توجہ انکی طرف پچھلی صدی کی ابتدا سے ہوئی۔ ۱۷۹۹ء میں ایک جرمن عالم طبعیات ہمبولٹ کچھ طبعی اور نباتاتی مشاہدات کرنے کی غرض سے جنوبی امریکہ کے ملک وینی زویلا[1] گیا ہوا تھا ۱۲ نومبر کو وہ شہر کمانا[2] میں مقیم تھا۔ آخری رات میں اس نے وہاں شہاب صغیرہ کی ایسی بارش دیکھی کہ وہ متحیر رہ گیا اور اس نے اس عجیب و غریب منظرہ کا مفصل حال اپنے سفرنامہ میں لکھا۔ اس واقعہ کے ۳۴ سال بعد ۱۸۳۳ء میں ۱۲ و ۱۳ نومبر کی درمیانی شب میں شمالی امریکہ کے مشرقی ساحل پر دو امریکی علمائے سائنس[3] نے شہابوں کی پھر ایسی ہی بارش دیکھی جیسی ۱۷۹۹ء میں ہمبولٹ دیکھ چکا تھا۔ انہوں نے یہ بھی اندازہ کیا کہ وہ شہاب آسمان کے ایک خاص مقام سے اسطرح نکلتے نظر آتے ہیں جیسے وہاں کوئی آدمی کھڑا ہوا زمین کی طرف آتش بازی کے انار چھوڑ رہا ہو۔ جب علمائے سائنس کی توجہ اس طرف ہوئی تو اس زمانے کے مشہور فلکی اولبرز[4] کے سامنے شہابی بارش کی دو شہادتیں پیش ایک ۱۷۹۹ء کی اور دوسری ۳۴ سال بعد ۱۸۳۳ء کی اور دونوں مرتبہ ۱۲ و ۱۳ نومبر ہی کو یہ چیز پیش آئی تھی تاریخ اور سمت کی مطابقت ان دونوں شہابی بارشوں کے تعلق کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ چنانچہ اولبرز نے یہ پیشین گوئی کی کہ اس قسم کی شہابی بارش ۳۴ سال بعد یعنی ۱۸۶۷ء میں انہیں تاریخوں پر پھر ہوگی۔ جب وہ سال قریب آیا تو ایک امریکن فلکی نیوٹن[5] نے کتب تاریخ سے شہابی بارشوں کی بہت سی شہادتیں جمع کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ ۳۴ سال کے بجائے ۳۳ سال بعد یعنی ۱۸۶۶ء ۱۳ و ۱۴ نومبر کی درمیانی شب میں اس قسم کی شہابی بارش ہوگی۔ نیوٹن کی پیشین گوئی بالکل صحیح اترنے پر علمائے سائنس کو شہابوں سے پوری دلچسپی ہوگئی۔ ہر ملک میں شہابوں کے مشاہدات ہونے لگے یادداشتیں محفوظ کی جانے لگیں اور بڑے بڑے عالی دماغ مسئلہ شہاب کے حل میں منہمک ہوگئے۔

## شہاب اور کومٹ کا تعلق

شہابوں کے متعلق سب سے پہلا نظریہ پیش کرنے کا فخر اٹلی کے فلکی شیاپریلی[6] کو حاصل ہے۔ اس نے ۱۸۶۶ء کی شہابی بارش دیکھ کر غور و فکر جاری رکھا اور مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچے۔

"شہاب نظام شمسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اجزاء زمین کی مداری حرکت (۱۸ ½ میل فی سیکنڈ) سے بھی زیادہ رفتار کے ساتھ آفتاب کے گرد بہت زیادہ بیضوی مداروں پر سفر کرتے رہتے ہیں۔ جب زمین مداری حرکت کرتی ہوئی ان میں سے کسی شہابی مدار کے قریب سے گذرتی ہے تو معمول سے زیادہ شہاب نظر آتے ہیں۔"

اس کے ساتھ شیاپریلی نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ ماہ اگست کے شہاب بالکل اس شاندار کومٹ کے مدار پر سفر کرتے ہیں جس کو ایک امریکن فلکی نے ۱۸۶۲ء میں دیکھا تھا۔ ایک شہابی انبوہ کو اس نے ایک اور کومٹ کے مدار پر سفر کرتے پایا۔ یہ مشاہدات شیاپریلی کو ایک نئے نتیجے کے قریب لا رہے تھے اور اس نے اس شبہ کا بھی اظہار کیا تھا کہ شاید کومٹ اور شہاب میں کوئی قریبی تعلق ہے اگرچہ شیاپریلی کا قیاس حقیقت کے قریب لا رہے تھے اور اس نے اس شبہ کا بھی اظہار کیا تھا کہ شاید کومٹ اور شہاب میں کوئی قریبی تعلق ہے۔ اگرچہ شیاپریلی قیاس حقیقت کے قریب آگیا تھا

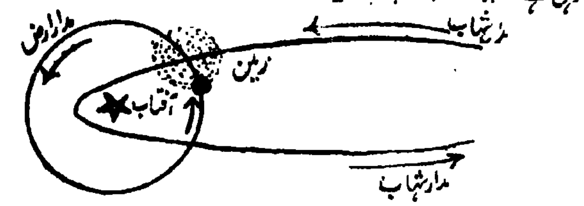
محمد رشید فریدی

1. Venezuela. 2. Cumana. 3. Olmstead and Twining. 4. Olbers.
5. Newton. 6. Shiaparelli.

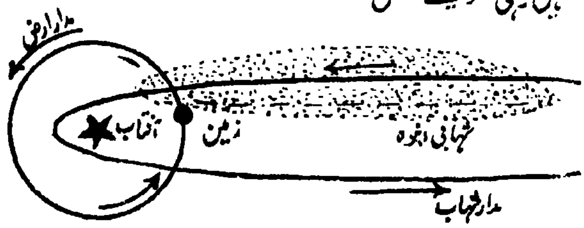
لیکن ابھی محتاج ثبوت تھا۔ خوش قسمتی سے اسی سال (سنہ ۱۸۶۶ء) ایک فلکی ٹیمپل نے ۱۴ اور ۱۵ نومبر کے شہابوں کے ساتھ ایک چھوٹا کومٹ سفر کرتے دیکھا۔ اس کے علاوہ شیاپریلی کے ایک فلکی نے یہ معلوم کیا کہ ۲۰ اپریل والے شہاب اس مدار پر سفر کرتے ہیں جس پر سنہ ۱۸۶۱ء کا کومٹ سفر کرتے دیکھا گیا تھا۔ یہ مشاہدات صاف طریقہ سے کومٹ اور شہاب کے قریبی تعلق کا پتہ دیتے تھے لیکن اب بھی فیصلہ کن ثبوت درکار تھا جو بالآخر سنہ ۱۸۷۲ء میں حاصل ہوگیا۔ بیلاؔ کا کومٹ ۶ سال ۸ ماہ کے عرصہ میں اپنے مدار کا دورہ ختم کرکے زمین کے قریب آتا تھا۔ سنہ ۱۸۳۲ء میں وہ اپنے مقررہ مدار پر سفر کرتا ہوا بخوبی نظر آیا تھا۔ کچھ عرصہ غائب رہنے کے بعد سنہ ۱۸۵۲ء میں وہ دو ٹکڑوں کی شکل میں نمودار ہوا۔ پھر تیسری بار گردش پر اسے سنہ ۱۸۶۶ء میں نظر آنا چاہئے تھا۔ لیکن باوجود سخت تلاش کے اب وہ دو ٹکڑے بھی دکھائی نہ دیے۔ اس کے بجائے مقررہ تاریخ پر شہابوں کی بارش جیسی ہوئی۔ اور یہ شہاب اس خاص سمت سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے جس مقام پر اس دن بیلا کومٹ ہوتا۔ بیلا کومٹ کی اس عجیب و غریب سرگذشت نے علما کے شبہ کو یقین میں تبدیل کردیا۔ چنانچہ جب سنہ ۱۸۶۶ء میں شیاپریلی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ شہاب وہ چھوٹے چھوٹے مادی ٹکڑے ہیں جو کومٹ کے پاش پاش ہوجانے سے وجود میں آتے ہیں تو دنیائے سائنس نے اس کو بلا کم و کاست قبول کرلیا۔

## شہابی انبوہ اور ان کا مبدا

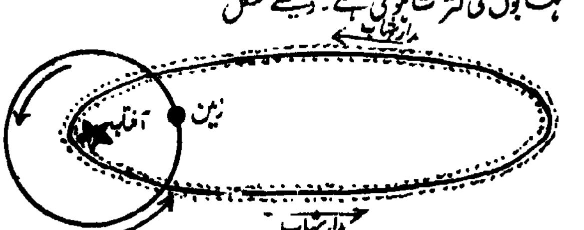
آفتاب یا کسی بڑے سیارے کی قوت کشش سے بعض اوقات وہ مادی اجزا جن کے اجتماع اور ایک مرکز پر ہجوم کرنے سے کومٹ وجود میں آتا ہے منتشر ہوجاتے ہیں۔ یہ اجزا ایک انبوہ کی شکل اختیار کرکے کومٹ کے اصل مدار پر اسی رفتار سے سفر کرتے رہتے ہیں۔ اجزا منتشر ہونے سے مرکزی کشش کا ثقل باقی نہیں رہتا۔ اس لئے ان سے کچھ اجزا دوران سفر میں اصل انبوہ سے جدا ہوکر مدار پر منتشر ہوتے رہتے ہیں۔ پھر بھی ان کے مدار یا رفتار میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ چنانچہ سال کی جن تاریخوں میں زمین ان شہابی مداروں کے قریب آتی ہے تو معمول سے زیادہ شہاب نظر آتے ہیں لیکن جب مقررہ مدت کے بعد ان کا انبوہ اپنے بیضوی مدار کا دورہ ختم کرکے زمین کے قریب پہنچتا ہے تو شہابوں کی بارش جیسی ہوتی ہے۔ ایک مدت کے بعد جب وہ اجزا منتشر ہوکر تمام مدار پر یکساں نیت کے ساتھ پھیل جاتے ہیں تو ہر سال مقررہ تاریخوں پر شہابوں کی کثرت ہوتی ہے۔ شہابی انبوہ کے متعلق ڈاکٹر جونسٹن کا یہ قیاس ہے کہ ان کی وسعت عموماً ایک لاکھ میل کے قریب ہوتی ہے اور اس فاصلے کو عموداً طے کرنے میں زمین کو قریب پانچ گھنٹے لگتے ہیں۔ بعض شہابی انبوہ کی ضخامت (چوڑائی) اتنی ہوتی ہے کہ ۲۴ یا ۴۸ گھنٹے مداری سفر کرنے کے بعد زمین اسکو عبور کرپاتی ہے اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلسل کئی کئی رات زمین پر غیر معمولی طور پر شہابوں کی کثرت رہتی ہے۔ انبوہ گذر جانے پر پھر ویسی کثرت نہیں رہتی۔ دیکھئے شکل




زمانہ گذرنے کے ساتھ شہابی انبوہ اپنے مدار کی لمبائی پر پھیلتا جاتا ہے۔ یہانتک کہ اس کی لمبائی اسقدر بڑھ جاتی ہے کہ زمین اس انبوہ کے اگلے حصے میں سے گذرنے کے بعد جب ایک سال کے عرصہ میں مکمل مداری گردش کرکے پھر اسی مقام پر پہونچتی ہے تو وہ انبوہ اس خاص مقام سے نہیں گذر چکا ہوتا اور پھر زمین کو اس میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس طرح بعض شہابیوں کی بارش اپنی مخصوص تاریخوں پر کئی کئی سال تک متواتر ہوتی رہتی ہے۔ انبوہ گذر جانے کے بعد پھر اس وقت تک کہ وہ اپنے بیضوی مدار کا گشت کرکے دوبارہ زمین کے قریب واپس نہ آئے شہابوں کی ویسی کثرت نہیں رہتی۔ دیکھئے شکل




مدت دراز کے بعد شہابی انبوہ پھیلتے پھیلتے تمام مدار پر یکساں نیت کے ساتھ پھیل جاتا ہے اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر سال مقررہ تاریخوں پر شہابوں کی کثرت ہوتی ہے۔ دیکھئے شکل




ان شہابوں میں سے ہزاروں لاکھوں ہر سال زمین کے قریب پہنچکر اپنی زندگی کا دور ختم کرتے رہتے ہیں اور اسطرح رفتہ رفتہ انکی مجموعی تعداد میں کمی ہوتی رہتی ہے۔

## شہابوں کی جسامت اور تعداد

اگر واقعی شہاب کومٹ کے ٹکڑے ہیں تو ایک کومٹ کے پاش پاش ہونے پر بے شمار شہاب وجود میں آتے ہونگے۔ ان میں سے کچھ تو تنظیم کے ساتھ مدار پر سفر کرتے رہتے ہیں اور کچھ تمام نظام شمسی کے اطراف و جوانب

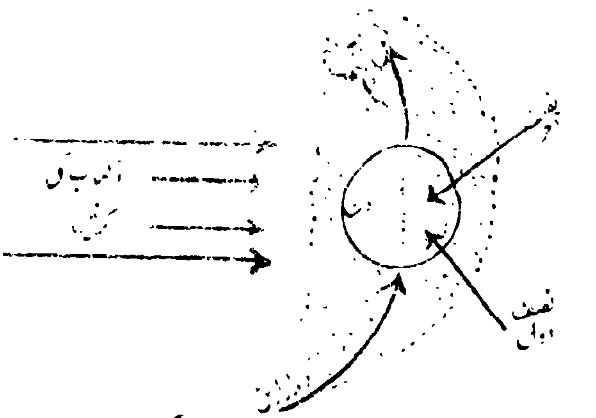
ہیں بے قاعدہ طریق پر منتشر ہو جاتے ہیں۔ ان تمام شہابی ٹکڑوں کی شمار سوائے خدا کے کوئی نہیں جان سکتا۔ ان میں سے تھوڑے زمین کے قریب پہنچ کر ہوا کی رگڑ سے جل بجھ کر راکھ بن جاتے ہیں۔ صرف ان کا شمار بطور اندازہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ خالی آنکھ سے ایک شب میں ۵ یا ۶ شہاب جلتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں دوربین میں شاید اتنے ہی عرصہ میں سیکڑوں دیکھے جا سکیں۔ اگر ان میں وہ شہاب بھی شامل کر لئے جائیں جو دن کے وقت آفتاب کی تیز روشنی کے باعث ہم کو جلتے ہوئے نظر نہیں آ سکتے تو یہ عدد اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ پھر اگر ان تمام شہابیوں کو شمار کیا جائے جو ایک دن (۲۴ گھنٹہ) میں کرۂ ارض کے قریب پہونچکر اپنے وجود کا خاتمہ کر لیتے ہیں تو یقیناً یہ تعداد کروڑوں تک پہنچ جائے گی۔ نیوٹن نے ان کا اندازہ قریب دو کروڑ کے کیا ہے۔ یہ شہاب عموماً جسامت میں مٹر کے دانے سے بڑے اور وزن میں بقول ڈاکٹر جونسٹن کے ایک یا دو اونس سے زیادہ نہیں ہوتے۔ پھر بھی اتنی بڑی تعداد روزانہ زمین پر گرنے سے یقیناً انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی محال ہو جاتی اگر زمین کو کرہ ہوائی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے نہ ہوتا جس کی وجہ سے وہ سطح ارض کو چھونے سے پیشتر ہی راکھ بن جاتے ہیں۔ شہابیوں کی اتنی بڑی تعداد زمین کے قریب پہنچکر ہر دن فنا ہوتی رہتی ہے کہ اگر نئے نئے کومٹ ٹوٹ پھوٹ کر شہابیوں میں تبدیل نہ ہوتے رہتے تو کم از کم مدار ارض کے آس پاس گھومنے پھرنے والے شہاب کبھی کے ختم ہو جاتے۔

## شہابیوں کی رفتار

جب تک شہاب زمین سے دور فضائے بسیط میں پھرتے رہتے ہیں نہ ہمیں ان کے وجود کا پتہ لگتا ہے نہ ہم ان کی رفتار معلوم کر سکتے ہیں۔ غیر منظم شہاب جو نظام شمسی کے اطراف و جوانب میں گھومتے رہتے ہیں زمین کے قریب پہونچنے پر اس کی کشش سے جذب ہو کر سطح ارض کی طرف دوڑتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی رفتار صرف زمین کی قوت جاذبہ پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی لئے ایسے شہابیوں کی رفتار کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ عموماً ۷ یا ۸ میل سے لے کر ۲۰ یا ۲۵ میل فی سیکنڈ کے اندر اندر رہتی ہے۔

منظم شہاب جو اپنے اپنے مداروں پر سفر کرتے ہیں کبھی اس طرح زمین سے ملتے ہیں جیسے دو آدمی مخالف سمت سے آتے ہوئے ایکدوسرے سے متصادم ہوتے ہیں اور کبھی اس طرح جیسے کوئی تیز رفتار کسی سست رو آدمی کو پیچھے سے جا پکڑے۔ شہاب کی ذاتی حرکت زیادہ سے زیادہ ۲۵ میل فی سیکنڈ ہو سکتی ہے اور زمین کی مداری حرکت قریب ۱۷ میل فی سیکنڈ ہے لہذا زمین سے دیکھنے پر پہلی حالت میں شہاب کی رفتار ۲۵+۱۷=۴۲ میل فی سیکنڈ اور دوسری حالت میں ۲۵-۱۷=۸ میل فی سیکنڈ نظر آئے گی۔

رات کے اول حصے میں بمقابلہ دوسرے نصف حصے کے عموماً شہاب کم نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ رات کے اول حصے میں سطح ارض پر صرف وہی شہاب پہنچتے ہیں جو پیچھے سے آ کر زمین کو پکڑتے ہیں۔ دیکھو شکل




زمین کے چاروں طرف شہاب پھیلے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ رات کے اول حصے میں صرف وہی شہاب زمین پر پہنچتے ہیں جو پیچھے سے آ کر زمین کو پکڑتے ہیں لیکن آخری نصف حصے میں زمین جس سمت حرکت کر رہی ہے اس رخ ہی میں ہزاروں شہاب پھیلے ہیں۔ اگر ان … کو زمین نہ حرکت کرے تب بھی مداری حرکت کے باعث … ہوگی۔

## شہابیوں کی روشنی اور انجام

وہ روشنی شہابی اجزا کے احتراق … سے پیدا ہوتی ہے … کے ماتحت کومٹ کے اجزا منتشر ہو جاتے ہیں یعنی شہابی شکل اختیار کر لینے کے بعد ٹھنڈے اور تاریک ہو جاتے ہیں … جب تک شہاب فضائے بسیط میں گھومتے پھرتے باقاعدہ سفر کرتے رہتے ہیں تو بالکل ٹھنڈے اور تاریک ہوتے ہیں اور رفتار بھی بہت تیز ہوتی ہے لیکن جب زمین کے قریب پہونچنے پر سطح ارض کی طرف مائل ہوتے ہیں تو کرہ ہوائی میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ ہوا کی رکاوٹ سے ان کی رفتار میں یکایک کمی واقع ہو کر قوت رفتار حرارت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور شہاب گرم ہو جاتے ہیں۔ سطح ارض کے قریب پہونچنے پر زیادہ کثیف ہوا کی رگڑ سے بہت گرم ہو کر مشتعل ہو جاتے ہیں اور ہم کو نظر آنے لگتے ہیں۔ اس حالت میں تھوڑی بہت دور سفر کرنے کے بعد وہ اپنی ہی گرمی سے جل بجھ کر راکھ بن جاتے ہیں۔ اسطرح وہ شہاب جو شاید ہزاروں سال سے فضائے بسیط میں خاموش نامعلوم زندگی بسر کر رہا تھا۔ زمین کے قریب پہنچکر آخری چمک دکھلا کر صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جاتا ہے۔

## چند بڑے اور مشہور شہابی انبوہ

(۱) شہاب بیلی یا مسلسلی:۔ یہ شہاب ۲۳ سے ۲۷ نومبر تک نظر آتے ہیں۔

چونکہ یہ مجمع النجوم مراۃ المسلسلہ سے نکلتے نظر آتے ہیں اس لئے ان کو شہاب مسلسلی کہا جاتا ہے۔ علمائے فلک کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ شہاب کومٹ بیلا کے ٹکڑے ہیں جو کسی نامعلوم آسمانی حادثہ کے باعث پاش پاش ہو گیا۔ کومٹ کے اجزا منتشر ہو کر شہابی انبوہ میں تبدیل ہو گئے۔ یہ شہابی انبوہ بیلا کے مدار پر اپنی اصل رفتار سے گھومنے لگا۔ اس گردش میں آہستہ آہستہ یہ شہاب مدار پر منتشر ہونے لگے۔ اسی لئے ۲۳ سے ۲۷ نومبر تک ہر سال اور دنوں کے مقابلہ میں زیادہ شہاب نظر آتے ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کا انبوہ باقی ہے۔ اسی لئے ۶ سال ۸ ماہ یا تریب ۷ سال بعد جب وہ انبوہ مدار ارض کے قریب آتا ہے تو شہابوں کی غیر معمولی کثرت ہوتی ہے۔

**(۲) شہاب اسدی** ہر سال ۱۲ یا ۱۳ نومبر کے قریب رات کے وقت معمول سے زیادہ شہاب نظر آتے ہیں۔ لیکن ۳۳ یا ۳۴ سال بعد جب ان کا شہابی انبوہ دورہ کرکے زمین کے قریب واپس آتا ہے تو شہابوں کی بارش جیسی ہوتی ہے۔ یہی وہ شہاب ہیں جن کو ہمبولٹ نے ۱۷۹۹ء میں اور آلبرز نے ۳۴ سال بعد ۱۸۳۳ء میں دیکھا تھا۔ اور انہیں کی اگلی بازگشت کے متعلق آلبرز نے پیشین گوئی کی تھی (دیکھئے اسی مضمون کا ابتدائی حصہ)۔ یہ شہابی انبوہ اسقدر وسیع ہے کہ کسی ایک نقطے سے گذرنے میں اسے کم و بیش تین سال لگ جاتے ہیں۔ اسی لئے جب قریب ۳۳ ½ سال کے بعد یہ انبوہ مدار ارض کے قریب پہنچتا ہے تو دو اور بعض اوقات تین سال تک متواتر انہیں خاص تاریخوں پر مقررہ سمت سے شہابی بارش ہوتی رہتی ہے۔ یہ شہاب مجمع النجوم اسد کی طرف سے نکلتے نظر آتے ہیں اس لئے ان کو شہاب اسدی کہا جاتا ہے۔

**(۳) شہاب شیلاقی** ہر سال ۹ سے ۱۲ اپریل تک یہ شہاب مجمع النجوم شیلاق سے نکلتے نظر آتے ہیں۔ اسی باعث انکو شہاب شیلاقی کہا جاتا ہے۔ ۲۰ اپریل ۱۸۰۳ء کو جب ان کی بارش ہوئی تو انکی سمت اور مدار کی تحقیق شروع ہوئی۔ اسوقت سے اس وقت تک انہیں خاص تاریخوں پر ہر سال شہابوں کی ایک جیسی بارش ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکو شہابی شکل میں تبدیل ہوئے بہت زمانہ گزر گیا اور اسی باعث منتشر ہوتے ہوتے اب اس کے اجزا تمام مدار پر یکسانیت کے ساتھ پھیل گئے۔ کچھ علما یہ خیال کرتے ہیں کہ ان شہابوں کا کومٹ ۴۱۵ سال میں اپنے مدار کا دورہ ختم کرتا تھا۔ اس لئے ان شہابوں کا انبوہ ۱۸۰۳ + ۴۱۵ = ۲۲۱۸ یعنی ۲۲۱۸ء زمین کے قریب پھر آئے گا۔ اس قیاس کی تصدیق اس سال کے گذر جانے کے بعد ہی ہوسکیگی۔

**(۴) شہاب غولی** ماہ اگست کے اول ہفتہ میں یہ شہاب نظر آتے ہیں۔ چونکہ یہ مجمع النجوم راس الغول کی طرف سے نکلتے نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کو شہاب غولی کہا جاتا ہے +

## ممتاز محل — جمال صابری

زمانہ اپنے مرکز سے اُٹھا انگڑائیاں لے کر
چلا انسان کی جانب عشق پھر تیر و کماں لے کر
ستاروں کو سنبھالے خود زمیں پر آسماں آیا
نیا اک چاند نکلا مشعلِ نورِ جہاں لے کر
شباب آگیں فضاؤں سے نئی رنگینیاں برسیں
نسیمِ زندگی آئی بہارِ جاوداں لے کر
محبت کا کھلا اک پھول صحنِ باغِ ہستی میں
خدائے حسن آیا حسن کی رعنائیاں لے کر
بکھیرے ساحلِ جمنا پہ موتی شوخ موجوں نے
بڑھا دستِ تمنا دولتِ ہندوستاں لے کر
تصورِ تاج کا قدرت کو اس درجہ پسند آیا
محبت خلد سے آئی دلِ شاہ جہاں لے کر
یہی دل بن گیا دلبر اسی کو ناز کہتے ہیں
یہ رشکِ ماہِ کامل ہے اسے ممتاز کہتے ہیں

## گیت — چاند پنڈت

میت جگت میں گیت ہے ایسا، جو سُر دے کر گایا جائے
من میں بسے تو من اُجالا ہو
گلے ملے تو تن اُجالا ہو
پنی گھٹا ہے وہ جیون کی، جب برسے امرت برسائے!

(۲)
پھول یہ جگ میں کم کھلتا ہے
کھلے کہیں تو کم ملتا ہے
ملے تو دھیرج بن کر دل کی، ہر دھڑکن میں آن سمائے!

(۳)
میت جسے مل جائے جگ میں
سینکڑوں تاج ہیں اسکے پگ میں
وہ زر دھن ہی سوگ کا راجہ۔ ساجن جسکے پران کہائے!
میت جگت میں گیت ہی ایسا جو سُر دیکر گایا جائے!

# ارضِ سیما

افسانہ

ادیب بلوی

ڈاکٹر جمالی نے ایک طویل سانس لے کر کہا " میں بہت تھک گیا ہوں میرے عزیز بچو" " واقعی" عروج نے ڈاکٹر کو کرسی پیش کرتے ہوئے کہا " آج ہم پھر بھی بہت ہیں"۔ ڈاکٹر کرسی پر بیٹھ گیا اور انجم نے لبادہ اتار کر کھونٹی پر ٹانک دیا۔ عروج معذرت کر کے اندر چلا گیا۔ نوکر نے چائے لا کر میز پر لگا دی۔ عروج بھی کپڑے بدل کر واپس آگیا۔ اتنی دیر ایک عجیب بے تکی خاموشی رہی۔ انجم نے چائے بناتے ہوئے سوال کیا " ڈاکٹر یہ تو بتلائیے کہ آپ نے اب کلکتہ کو کیسے پایا"۔ " اوہ انجم " ڈاکٹر نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔ " اب کلکتہ بہت بڑا شہر ہو گیا ہے۔ اب سے بیس سال پہلے کا کلکتہ تو خواب و خیال معلوم ہونے لگتا ہے"۔ "یہ بات ہے" عروج نے مسکرا کر کہا " تب تو تمہیں بڑا مزہ آیا ہوگا یہاں آکر" " ہاں " " تم کہہ سکتے ہو عروج " ڈاکٹر نے معنی خیز نظروں سے عروج کو دیکھتے ہوئے کہا۔ " یعنی " عروج چونکا۔ " یہی " ڈاکٹر بولا " میں نے دنیا کے بڑے بڑے شہر دیکھے ہیں اس لئے مجھے شہروں سے دلچسپی کم ہے۔ میں نے ایسی ایسی عجائبات دیکھے ہیں جو تم نے سنے بھی نہ ہوں گے"۔ " تو پھر سنائیے" انجم نے پرشوق انداز میں ڈاکٹر سے درخواست کی اور عروج نے ہاں میں ہاں ملائی۔

" تمہارے اصرار سے میں مجبور ہو جاتا ہوں میرے بچو ورنہ کم از کم اس واقعہ کو تو ہرگز تم لوگوں کو نہ سناتا " " کیوں " عروج اور انجم دونوں نے ایک دم سوال کیا۔ " اس لئے کہ " ڈاکٹر نے معنی خیز انداز سے دونوں کو دیکھ کر کہا " کہیں تم مجھے پاگل نہ سمجھ بیٹھو"۔ " ہرگز نہیں ڈاکٹر" عروج نے اپنے لہجہ میں یقین کا اظہار کرتے ہوئے کہا " ہم آپ پر پورا بھروسہ کرتے ہیں" " اور ڈاکٹر" انجم بولی۔ " آپ تو میری عادت جانتے ہیں۔ میں ہر اس بات پر جو آپ کے منہ سے نکلے یقین کر لیتی ہوں"۔ " بہر حال " ڈاکٹر نے وثوق سے کہا " یہ واقعہ میرے مکمل ہوش و حواس میں مجھ پر گذرا ہے اس لئے کوئی کتنا ہی مجھے کیوں نہ جھٹلائے میں اس کی صداقت پر اپنے آپ کو کبھی شک میں مبتلا نہ ہونے دوں گا۔ اب تم بھی اندازہ لگا لو کہ واقعہ کی نوعیت کیا ہوگی جب کہ میں خود اس پر اتنا زور دے رہا ہوں"۔ " یقیناً نہایت عجیب چیز ہوگی " انجم نے کہا۔ ڈاکٹر نے ایک انداز سے سگریٹ جلا کر کہا

" انجم یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ مجھے سیر عالم کا سودا تھا۔ میں دنیا کے ہر ملک میں پھر پھرا کر تھک چکا تھا۔ اب میرا ارادہ تھا کہ صحرائے اعظم کے پرہول دشت کی سیاحی کی جائے اور وہ خفیہ راز جو صرف افسانوں کی شکل میں ہم تک پہنچتے ہیں دنیا پر ظاہر کر دیئے جائیں۔ غرضیکہ انہیں خیالات کی بنا پر میں نے طے کر لیا تھا کہ صحرائے اعظم کی آندھیاں جونہی ختم ہوں گی میں ارضِ سیما کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ ارضِ سیما کی میں اس قدر حیرت انگیز داستانیں سن چکا تھا کہ جان کے خوف کے باوجود اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہاں جا کر کوئی واپس نہیں آیا میں نے وہاں جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ مجھے ہر شخص نے منع کیا پر میں نہ مانا۔ سرمیاں شروع ہوتے ہی میں شیخ نکاب کے گھر مہمان ہو گیا۔ اس نے بھی مجھے بہت سمجھایا

" آپ ارضِ سیما نہ جائیں سیکڑوں سیاحت کی آرزو میں گئے مگر وہ اس عجیب خطہ سے دنیا کو روشناس کرائیں گے کوئی نہ لوٹا۔ سب جا کر موت کے تاریک پردے میں چھپ گئے۔ تقریباً بارہ سال گذر گئے کسی سیاح نے ارضِ سیما کی طرف جانے کا ارادہ نہیں کیا۔ آپ کا بھی نہ جانا ہی بہتر ہے۔ ویسے آپ کی مرضی"۔ حالانکہ اس بیان سے ڈر کر مجھے اپنا ارادہ بدل دینا چاہیئے تھا لیکن اثر الٹا ہوا۔ میرے شوق کو تازیانہ لگا۔ میں نے شیخ کے تمام مشوروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے رخت سفر باندھ ہی لیا۔ سامان ہی کیا تھا ایک چمڑے کا بکس۔ رائفل۔ ٹارچ۔ گھڑی اور چند چھوٹی چھوٹی ضروری چیزیں۔ کارتوسوں کی بھی کافی مقدار میرے ساتھ تھی۔ غرضیکہ میں بالکل تیار ہو کر اونٹ پر سوار ہو گیا۔ دو اونٹ تھے ایک پر میں سوار تھا اور دوسرے پر رہبر سوار تھا جو مجھے دشتِ ممنوعہ تک پہنچا کر واپس چلا آنے والا تھا۔ تین رات اور دن کے مسلسل سفر کے بعد ہم ایک جگہ پہنچ کر رک گئے۔ آج صحرائی موسم بہت خوشگوار تھا۔ سینہ ریگ پر ٹوٹے پھوٹے پتھر پڑے تھے اور زبانِ بے زبانی سے بتلا رہے تھے کہ کبھی یہ جگہ بھی آباد تھی۔ غرضیکہ میرے راہبر نے کہا " یہاں سے دشتِ ممنوعہ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور اس جگہ سے پندرہ میل دور ارضِ سیما ہے"۔ میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور بہت لالچ بھی دیا۔ مگر وہ کسی بھی قیمت پر تیار ہوتا نظر نہ آیا۔ میں نے دونوں اونٹ اس کے حوالے کر دیے اور اس کے بتلائے ہوئے نشانات پر تن تنہا چل پڑا۔ صحرائے اعظم کی فضا اس وقت بہت خوشگوار تھی اور میں کاندھے پر رائفل رکھے خراماں خراماں اپنے راستہ پر گامزن تھا...

جوں جوں سورج بلند ہوتا گیا تمازت بڑھتی گئی۔ ہواؤں میں بھی تیزی پیدا ہو گئی۔ گرد کے طوفان اٹھنے لگے۔ مگر بحیثیت مجموعی دن اس قدر خوفناک نہ تھا جیسا کہ لوگوں کی زبانی سنا تھا۔ غرضیکہ دن کی طویل محنت اور سفر کی محنت شاقہ کے بعد میں راہبر کے بتلائے ہوئے نشان پر پہنچ گیا۔ سورج جھک چکا تھا۔ اور صحرائے اعظم کی ہیبت ناک رات قریب تھی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس وقت میرے دل میں کس قدر بھیانک خیالات آ رہے تھے۔ میرے شوقِ جستجو نے ان تمام واہموں کا مقابلہ کیا۔ میں دشتِ ممنوعہ کے اس علاقہ میں پہنچ چکا تھا جہاں سے ارضِ سیما کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ راہبر کی نشان دہی کے مطابق پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے پہاڑ اور ہیبت ناک عمیق غار دکھائی دینے لگے۔ صحرائے اعظم اور ریگ کے اس سمندر میں پتھریلی پہاڑیاں اور کثیر عمیق غاروں کا وجود یہ بتلا رہا تھا کہ ارضِ سیما ضرور کوئی جگہ آباد ہوگی۔ میں برابر چلتا رہا۔ رائفل میں نے مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی اور ہر حادثے کے لئے تیار تھا۔ راہبر کے دیے ہوئے نشانات کے مطابق ارضِ سیما یہاں سے زیادہ سے زیادہ دو تین میل ہوگا۔ سبزی کا میلوں تک کوئی نشان نہ تھا پہاڑیوں کی جانگسل چڑھائی سے میں تھک گیا اور مجبوراً دم لینے کے لئے

ایک چٹان پر جو ایک پہاڑی کے سائے میں تھی بیٹھ گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا میدانوں میں تیزی سے اندھیرا پھیلنا شروع ہوا۔ اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھیں چھوٹے غاروں کو دیکھ کر بدن میں ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر سستا کر سگریٹ نکالا اور کش لگانے لگا۔ پھر دن بھر کی طویل مسافت اور سخت تکان کو بھلا کر میں آنے والے حادثات کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔ پہاڑیاں تاریکی میں روپوش ہو چلی تھیں اور غار دہانِ اژدر نظر آنے لگے تھے۔ میں جس چٹان پر بیٹھا تھا اس کے نیچے ایک تنگ اور خوفناک وادی تھی میں نے جوں ہی نیچے نظر ڈالی مجھے کسی جاندار کے پیروں کی چاپ سنائی دی اور متحرک سائے نظر آئے۔ میں نے فوراً رائفل سنبھال کر ٹارچ سے اس طرف روشنی ڈالی اُف توبہ خدا۔ آج بھی اس واقعہ کو یاد کر کے میرے کل بدن میں لرزہ شروع ہو جاتا ہے۔ ٹارچ کی برقی روشنی میں میں نے چند بہت ہی حسین، نازک اندام برہنہ لڑکیوں کو پایا جن کی ستر پوشی کے لئے ایک چیتھڑا کپڑا تک نہ تھا گلے میں ہار اور چیتھڑوں کے شلوکے پہنے ہوئے تھیں۔ میری گھبراہٹ دور ہوئی اور آنکھوں میں ان کے حسن کو دیکھ کر چکا چوند پیدا ہو گئی مجھے گمان ہوا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ ان کو خوب اچھی طرح ہاتھوں سے مل کر کھولا۔ اف لڑکیاں اپنے ملکوتی حسن کے ساتھ اسی جگہ موجود تھیں اور مجسم جب میری نظریں لڑکیوں کے عقب پر پڑیں تو میرے ہوش حواس نے جواب دے دیا میرے اوسان خطا ہو گئے۔ لڑکیوں کے پیچھے سب بڑے بڑے خونخوار درندے کھڑے غرغرا رہے تھے اور وہ چھوٹی سی تنگ وادی ان بیشمار کئی نسل والے جانوروں سے بھری ہوئی تھی۔ میں اپنے اوپر قابو نہ پا سکا اور چیخ مار کر بیہوش ہو گیا......

جب میری آنکھ کھلی تو ایک عجیب حیات بخش خوشبو اور پرسکون ماحول کا احساس میرے اوپر طاری ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اتنا پرسکون ماحول مجھے پہلے کبھی میسر نہ آیا تھا۔ میں جس بستر پر لیٹا تھا وہ ریشم اور کمخواب کا تو یقیناً نہ تھا لیکن اس قدر آرام دہ تھا کہ میں اپنی ساری زندگی بھر ایسا بستر نہ دیکھ سکا۔ بستر جنگلی گھاس پھوس اور جانوروں کی کھال کا تھا اور اس طرح بنایا گیا تھا کہ انسان اس پر لیٹ کر زندگی کے ہر درد کو بھلا دے آنکھیں کھول کر تھوڑی دیر بالکل نہ سمجھ سکا کہ میں کہاں ہوں اور میرے اوپر کیا حادثات گذرے۔ مگر آہستہ آہستہ واقعات کا اعادہ ہونے لگا۔ گذرے ہوئے واقعات، شعوری طور پر میرے سامنے آنے لگے۔ میں شام کے اس پرہول حادثے سے یکایک کانپ اٹھا۔ اور پھر آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا کہ ایک ایسی ترنم آواز نے آنکھیں کھلی رکھنے پر مجبور کیا جس کا بیان میرے حدودِ الفاظ سے بہر حال باہر ہے۔ میں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ میرے سرہانے ایک دوشیزہ کھڑی تھی۔ بالکل ایسی ہی جیسی میں نے اپنی بیہوشی سے قبل دیکھی تھی میں نے گھبرا کر لڑکی کے عقب دیکھا کہ کہیں درندوں کی فوج تو نہیں ہے مگر مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہاں اور کوئی نہ تھا۔ وہ لڑکی تنہا تھی اس نے مجھے ہوش میں پا کر کچھ کہا مگر میں ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ ایک عجیب اور دلچسپ زبان بول رہی تھی۔ حالانکہ میں دوشیزہ کا بولا ہوا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا تھا لیکن مجھے اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ وہ میرے متعلق کچھ جاننا چاہتی ہے۔ میں بھی یہ سب کچھ جاننے کے لئے بے قرار تھا اور ممکن ہے میرے کئے ہوئے سوالات وہ بھی خاک نہ سمجھی ہو۔ اب اس نے میری طرف پانی کا ایک پیالہ بڑھایا جس کا مقصد یہ تھا کہ اس کو پیو۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میں بالکل نہ سمجھ سکا مگر اس کی آواز میں بلا کا ترنم اور گفتگو میں لوچ اور موسیقی تھی۔ بہر حال میں نے پانی پی لیا اور میری کچھ تکان دور ہوئی۔ میں نے محسوس کیا اس پانی میں کوئی غذائیت تھی جس نے میری نقاہت کو قدرے کم کر دیا اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک دوسری حسین دوشیزہ کمرے میں داخل ہوئی جو متمدن دنیا کے لئے تو ایک غیر متمدن مجسمہ ہی کہا جا سکتا ہے مگر جس طرح اس کی تعمیر ہوئی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انسانی فنِ تعمیر شاید مدت العمر تک ایسی نادرِ روزگار عمارت تیار نہ کر سکے گا۔ لڑکی قیدِ لباس سے قطعاً آزاد تھی حسین اور بلا کی حسین۔ متناسب اعضا میگوں آنکھیں۔ بڑے بڑے سیاہ بال۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے قریب آئی۔ اور پہلی دوشیزہ نے اپنی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ دونوں میں چند منٹ باتیں ہوئیں اور پہلی دوشیزہ باہر چلی گئی۔ نو وارد میرے قریب آئی اور کچھ کہا آواز میں وہی ترنم اور موسیقی کا امتزاج تھا۔ میں خاک نہ سمجھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے یا کیا چاہتی ہے اس کے ایک اشارے سے معلوم ہوا کہ وہ میرے برابر بیٹھنے کی خواہش رکھتی ہے۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور وہ بیٹھ گئی۔ عروج اس کے جسم کی نرمی اور عورت کی اس قدر نزدیکی نے میرے اوپر حیوانیت طاری کر دی۔ میں تمام حزنیہ حادثات کو بھلا کر محوِ حسرت تھا وہ بہت خوش نظر آتی تھی۔ میں نے اس کی طرف پرشوق ہاتھ بڑھائے اور وہ پر ارمان جذبات کے ساتھ میری گود میں گر پڑی۔ اب وہ میری گرفت میں تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے جب ہوش آیا بہت سی دوشیزگانِ ارم ہماری حالت پر کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ میری ہم آغوش لڑکی میری گود سے نکل کر ان ہی لڑکیوں میں جا ملی۔ مجھے ایکمرتبہ پھر پانی پلایا گیا اور میں غافل ہو گیا۔

صبح کے سہانے وقت پر میں بیدار ہوا۔ ارضِ سیما کی کنواریوں نے مجھے جگایا اور میرے جسم کو لباس سے آزاد کیا۔ میں بہت چلایا مگر بے سود۔ وہ مجھے باہر لائیں اور سب نے ایک آواز ہو کر کہا قصرِ ارم میں نے دیکھا سر بفلک عمارت میرے پیش نظر ہے۔ شاید یہی ارضِ سیما کا صدر مقام تھا میں لڑکیوں کے آگے بڑھا۔ قصرِ ارم جو اپنے عجائبات کی وجہ سے اہلِ دنیا کیلئے

ایک نہ سمجھنے والی چیز تھی۔ میں نے حیرت سے قصرِ ارم کو دیکھا نیرِ اعظم کی چمکیلی لیکن ٹھنڈی شعاعوں سے قصرِ ارم چمک رہا تھا۔ ہزاروں لڑکیاں محوِ گلگشت تھیں ہر طرف باغات اور سرسبز درختوں کے جھنڈ تھے۔ میں یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ صحرائے اعظم میں ہوں یا واقعی ارم میں۔ غرضیکہ میں ارم کے دروازہ پر لایا گیا لڑکیوں نے تعظیماً سر جھکائے۔ میں نے نقل کی۔ وہ آگے بڑھیں اور مجھے ایک تختِ زمردیں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ میں جھک گیا اور جب سر اٹھایا تو وہی لڑکی میرے پیشِ نظر تھی جو میری آغوشِ شوق میں ایک مرتبہ اسیر ہو چکی تھی۔ وہ مسکرائی اور اس کا برق پاش تبسم ...... اس کیا کہوں میرے پاس الفاظ نہیں۔ غرضیکہ اس نے کچھ احکامات صادر کئے اور پھر مجھے واپسی کا اشارہ کیا۔ میں اب آزاد تھا اور حسینانِ ارضِ سیما کے ساتھ گلگشت کرنے پر مجھے کوئی روکنے والا نہ تھا۔ اگر حیرت تھی تو یہ کہ صحرائے اعظم میں ایسا خطہ بھی موجود ہے اور پھر یہاں سوائے حسینانِ پریوش کے کسی مرد کا وجود کیوں نہیں پایا جاتا پھر ان حسین نوخیز لڑکیوں میں کوئی زیادہ عمر کی عورت بھی دکھائی نہیں دی۔ میں دنیا کی فکروں سے بالکل آزاد ہو گیا خوب بےفکری اور آزادی کے لطف اٹھائے اور چند دنوں کی کوشش میں مجھے وہاں کی زبان آ گئی۔ اب میں اس قدر خوش کہ کبھی بھول کر بھی میرا دل دنیا کی مکروہات کی طرف واپسی کے لئے رضامند نہ ہوتا تھا میں حال میں مست تھا اور مستقبل کی طرف سے بالکل بےنیاز۔ یہاں کے مفصل حالات سے میں نے اچھی طرح واقفیت حاصل کر لی تھی۔ یہاں تین قصر تھے۔ قصرِ ارم جس میں خود رہتا تھا قصرِ نشاط جہاں ملکہ ارم مقیم تھی اور قصرِ بہار جہاں ارضِ سیما کا سالانہ جشنِ عروسی منعقد ہوا کرتا تھا۔ یہاں ملکہ کے لئے عدیم المثال حسن کا مالک ہونا ضروری ہوتا اور پھر اس کی دو نائب ہوتیں جن میں سے ایک قصرِ ارم میں رہتی اور دوسری قصرِ بہار میں۔ اور ملکہ جشنِ عروسی کے موقعہ پر پہلے قصرِ ارم میں رونق افروز ہوتی اور پھر معہ شاہی حشم قدم رکھے عین جشن کے موقعہ پر جب کہ موسمِ بہار کا چاند چودھویں تاریخ پر پہنچتا ملکہ قصرِ بہار میں جلوہ فرما ہوتی۔ جشن کے اختتام پر سالانہ احکامات صادر ہوتے اور پھر ملکہ قصرِ نشاط کی طرف روانہ ہو جاتی۔ اس کی ایک نائب معہ چند نازنینانِ ارضِ سیما کے قصرِ بہار میں اور دوسری نائب معہ دوسری پارٹی کے قصرِ ارم چلی آتی۔ نائب ملکہ قصرِ ارم میرے حال پر خاص طور سے مہربان تھی۔ مجھے اجازت تھی کہ میں جس نازنین کو پسند کروں اس کے گلشنِ حسن و جمال سے بغیر کسی حجاب اور رکاوٹ کے لطف اندوز ہوں اور جب چاہوں ناظمہ قصرِ ارم کو اپنے تصرف میں لاؤں۔ ناظمہ قصرِ ارم مجھ پر اتنا سب کچھ نثار کر چکی تھی لیکن یہ بات عجیب تھی کہ وہاں نہ عورتوں میں ایک دوسرے کے خلاف جذبۂ حسد تھا اور نہ رقابت۔ میں جس لڑکی کو اپنے لئے پسند کرتا فوراً تیار ہو جاتی اور دوسری دوشیزگان میرے فیصلہ پر خندہ پیشانی سے اپنی اپنی رضامندی ظاہر کرتیں۔ پھر بھی میرے تعلقات خصوصی طرف ناظمۂ ارم ہی سے تھے۔ وہ مجھ سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرتی اور میں ... چاہنے لگا۔ یوں مجھ پر کوئی پابندی نہ تھی مگر ہنوز یہ راز ہی تھا کہ دوشیزگانِ ارضِ سیما کی پیدائش کیسے ہوئی اور پھر یہ جوان کیسے رہتی ہیں نہ کوئی مرتا ہے نہ کوئی بیمار ہوتا ہے نہ کسی کے بچہ پیدا ہوتا ہے پھر مرد کا وجود نہیں اور میری اس قدر خاطر مدارت کیوں ہوتی ہے۔

ایک پر بہار رات کو جب کہ ناظمۂ ارم میری آغوش میں تھی اور جشنِ عروسی کے ایام قریب آ چلے تھے ناظمۂ ارم کچھ غمگین سی ہو گئی۔ مجھے تعجب ہوا کہ آخر وہ متفکر کیوں ہے۔ میں نے جب وجہ پوچھی تو وہ رو پڑی میں گھبرایا اور آخر اس نے وہ راز بتلایا جس نے میری زندگی کے بے پناہ سکون میں اضطراب کا زہر ہلاہل گھول دیا۔ اس نے بتلایا کہ جشنِ عروسی کے موقعہ پر جب کہ ملکہ یہاں آئے گی تو تم قصرِ بہار بھیجے جاؤ گے اور چودھویں چاند رات کو تم کو خالقِ ارضِ سیما کی نذر کر دیا جائے گا۔ تم ارضِ سیما کی مقدس قربانی ہو اور اسی لئے تمہاری اس قدر خاطر مدارات ہوتی ہیں۔ اس مرتبہ بارہ سال گذر گئے ہمیں کوئی مرد نہیں ملا۔ اس لئے بارہ سال سے جشنِ عروسی بہت پھیکا ہوتا تھا۔ اب چونکہ تم پھنس گئے ہو اس لئے ہر طرف خاص تیاریاں ہو رہی ہیں۔ قصرِ نشاط دلہن بنایا گیا ہے اور ملکہ بلقیس تمہیں دیکھنے کی تمنائی ہے۔ آگے اور راز میری دسترس سے باہر ہیں کیونکہ یہ راز سوائے ملکۂ ارضِ سیما کے اور کوئی نہیں جانتا۔"

"تم جانتی ہو انجم اس نغمہ کو سن کر میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ بدن میں رعشہ طاری ہو گیا۔ موت کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی اور یہ معلوم کر کے کہ چند روز بعد میں موت کی آغوش میں ہوں گا۔ میری زندگی یکسر اضطراب بن گئی۔" میں ناظمۂ ارم کے قدموں پر گر پڑا اور اس سے رو رو کر التجا کی کہ مجھے کسی طرح بچاؤ۔ وہ خود بھی مضطرب تھی اور میری محبت میں گرفتار۔ کہنے لگی یہاں سے بچ کر چلا جانا میرے تخیل سے باہر ہے۔ آخر جاؤ گے کہاں۔ میں نے اسے بتلایا کہ کیا اتنی بڑی دنیا میں کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملے گی۔ مگر وہ تو دنیا کے وجود سے بے خبر تھی۔ غرضیکہ میں نے اسے سمجھایا اور وہ میرے ساتھ قصرِ ارم سے بھاگ چلنے پر رضامند ہو گئی۔ اس نے ارضِ سیما کو خیرباد کہہ دینے کا آخری فیصلہ کر لیا۔ طے شدہ پروگرام کے ماتحت ایک اندھیری رات میں ہم دونوں قصرِ ارم سے نکلے۔ میں نے اپنے وہ کپڑے جو بکس میں اب تک محفوظ تھے لے لئے۔ رائفل اور ٹارچ بھی ساتھ لئے بس یہ تھا ہمارا رختِ سفر۔ رات کی اس خوفناک تاریکی میں ہم دونوں اندھا دھند چل پڑے۔ میں نے راہ میں پوچھا اے ناظمۂ قصرِ ارم مجھے یہ تو بتلا کہ جب میں پہلے روز یہاں آیا اور گرفتارِ معصیت

ہوا اسی روز میں نے تمہارے عقب میں خوفناک درندے دیکھے تھے۔ کیا یہ میرا وہم تھا یا حقیقت۔ ناظمہ قصرارم نے میرا سہارا لے کر لرزتے ہوئے کہا نہیں تو بتان لیوا بات ہے۔ تمام صحرائی درندے ملکہ ارض سیما کے تابعدار ہیں۔ اگر کوئی فرد سر اٹھائے یا یہاں کا راز باہر نکالنا چاہے یا ملکہ کی خلاف ورزی کرے ملکہ فوراً ان درندوں کی مدد سے اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ ملکہ ارض سیما ملکہ موسیقی ہے جب وہ ایک خاص نغمہ بلند کرتی ہے تو درندے فوراً جمع ہوجاتے ہیں۔ اب اگر خالق ارض سیما کی مرضی ہوئی تو ہم نکل سکتے ہیں ورنہ ہم دونوں کا بچنا مشکل ہے۔ اب ہم دونوں نے بھاگنا شروع کیا۔ ہم اپنی پوری رفتار سے بھاگتے رہے جہاں تک اور جتنی دور ممکن ہو سکا۔ ناظمہ قصرارم تھک کر چور چور ہوچکی تھی اور مشرق کی طرف سے آفتاب طلوع ہونے لگا تھا۔ ناظمہ نے کہا اب ہم کو دن کی روشنی میں سفر بند کر دینا چاہیئے اور کوئی محفوظ جگہ تلاش کر کے دن گذارنا چاہیے۔ رات کو ہم پھر اپنا سفر جاری کریں گے ورنہ اگر کسی محافظ صحرائی درندے کی نظر ہم پر پڑ گئی تو یہاں سے چلے جانے کا تخیل ہی یکسر محال ہو جائے گا۔ غرضیکہ ہم نے ایک پوشیدہ سے غار میں جھاڑ جھنکار ہٹا کر جگہ بنالی۔ اور اپنی روپوشی کا دن گذارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے اور پھر ناظمہ میرے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ میں نے رائفل زمین پر رکھ دی۔ اب آفتاب طلوع ہونے والا تھا۔ سفیدۂ سحر پھیل چکا تھا۔ میں نے پوچھا کیوں ناظمہ ارم تمہاری ملکہ آخر ان نوجوانوں کو کیوں قتل کرتی ہے۔ ناظمہ نے اپنی خمار آلود آنکھیں اوپر اٹھا کر کہا۔ میرے محبوب یہ یہاں کا دستور ہے۔ جب مرد قتل ہوجاتا ہے تو ارض سیما کی تمام کنواریاں اپنے ماتھے پر خون کا ٹیکا لگاتی ہیں اور پھر یکسر نوجوان ہوجاتی ہیں۔ مجھے یہ سن کر سخت تعجب ہوا اور قتل انسانی کی وجہ جواز بھی معلوم ہوگئی۔ ناظمہ سو گئی۔ اور میں نے دیکھا کہ یہ پہاڑیاں تقریباً ویسی ہی ہیں جیسی دشت ممنوعہ کے اختتام پر تھیں مگر نظریں اٹھنے پر سرسبز باغات اور بہترین و پُرفضا مناظر تھے۔ دور میری پشت کی طرف ہیبت ناک پہاڑوں اور غاروں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ میں نے سوچا شاید سمت بدل گئی ہو۔ غرضیکہ انہیں خیالات میں رات بھر کی تھکان اور کسل کی وجہ سے مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی اور میں بھی تھوڑی دیر میں سو گیا۔ یکایک ایک کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ ناظمہ حیرانی سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی میں بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اف خدایا ہم چاروں طرف سے صحرائی درندوں سے گھرے ہوئے تھے اور ناز نیناں قصر بہار ناظمہ قصرارم کو حقارت سے دیکھ رہی تھیں۔ اب موت اور زندگی کی آخری کشمکش تھی —— (باقی آئندہ)



# دو غزلیں

گو یہ بے سرور ہے سجدۂ بے حضور ہے
ان کے حضور ناز سے تو ابھی دور دور ہے
عشق کی آگ ہو اگر دل کی نگاہ و فکر میں
ہر گل و لالۂ چمن شعلۂ شمع طور ہے
لو سے لپٹ لپٹ کے یوں نغمہ سرا ہے اب تلک
شمع مری نگاہ میں باب حریم نور ہے
جلوہ فگن ہے جس میں تو ہے وہی تیرا آئینہ
اور ہے تیرا جہاں وہی جس میں ترا ظہور ہے
اتنی حسین کائنات! زادۂ حادثات ہو!
پردۂ شش جہات میں ہے کوئی اور ضرور ہے
رشک صد امین کلیم خود تری وادیٔ حیات
یاد کسی کی شمع طور، طور ترا شعور ہے
نشہ ہو جانے کس قدر ان کی نگاہ مست میں!
جن کا خیال ہی امین میکدۂ سرور ہے

---

پوچھتے کیا ہو زندگی کیا ہے؟
دل کی تسکین کا تقاضا ہے
عشق خون سکوں برائے سکوں!
کتنا "رنگیں نمود" دھوکا ہے!
ایک ہی شاخ پر بہار و خزاں!
عندلیبو یہ ماجرا کیا ہے!
زندگی کا اک ایک ہنگامہ
شرح دل گرمیٔ تمنا ہے
مبتلائے جنون عشق و نشاط!
دل ہی بربط ہے دل ہی مینا ہے
اس میں قید مکاں نہ قید زماں
دل کی دنیا الگ ہی دنیا ہے
ذوق تکمیل ذات امین حزیں
ذرہ ذرہ میں کار فرما ہے

امین حزیں

# عرب میں زندگی کا نیا دور

انعام کبریا

دو ہزار برس پہلے جب سفر صرف قافلوں میں ہوتا تھا تو ہندوستان سے مغرب کی طرف کسی ملک میں جانے کے لئے عرب میں سے ہوکر گذرنا پڑتا تھا۔ اور اس طرح یہ قافلے جنوبی عرب کے لئے آمدنی کا ایک خاص ذریعہ تھے۔ لیکن جب رومیوں نے ہندوستان جانے کے لئے سمندری راستہ کا پتہ لگایا تو اس خشکی کے راستہ کی اہمیت بہت کم ہوگئی اور اب صرف ایسے ہی لوگوں کے قافلے اس راستے سے گذرتے تھے جو کعبہ کی زیارت کے لئے عرب جانا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب اور مغربی ملکوں کا تعلق کم ہوتا گیا اور مغربی ملکوں میں ان مصنوعات کی بھی مانگ کم ہوتی گئی جن میں عربوں کو امتیاز حاصل تھا مثلاً ایک زمانہ میں حضرموت لوبان باہر بھیجنے کے لئے بہت مشہور تھا۔

یوں تو یہ خوش نصیبی عرب ملک ہی کے حصہ میں تھی کہ اس سرزمین میں مذہب اسلام کے پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوا اور اس کے بعد سلطنت اسلامی کی فتوحات اور استحکام میں اس سرزمین کے فرزند اپنے تن من کی بازی لگائیں اور رہتی دنیا تک سارے جہان کے مسلمانوں کے لئے عرب کی سرزمین طواف اور حرمت کی جگہ رہے۔ لیکن مادی حیثیت سے عربوں کی خوشحالی کا دور بہت قائم نہیں رہا اور اس کا خاتمہ بھی جلد ہی ہوگیا۔ لیکن جو اقتصادی اور معاشی تبدیلیاں عربوں کی تاریخ میں حال ہی میں ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنزل کا دور اب ختم ہونے والا ہے اور خوشحالی اور بہبودی کے آثار کچھ اس درجہ اچانک اور پرزور انداز سے رونما ہو رہے ہیں کہ عجب نہیں کہ جو ملک صدیوں سے قدامت کی یکسانی سے ہم آہنگ رہا ہے بہت جلد حیرتناک تبدیلیوں کا مرکز بن جائے۔

عرب کی موجودہ اقتصادی ترقی اور نشوونما میں سب سے بڑا ہاتھ سلطان ابن سعود کی کوششوں کا ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں سلطان نے حکومت کی باگ سنبھالی اور سنہ ۱۹۳۲ء تک رفتہ رفتہ اپنی حکومت کو وسیع بنایا۔ اور عرب نے اس مدت میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں ترقی حاصل کرلی۔

ابتدائی برسوں میں سلطان کی آمدنی کا ذریعہ محض وہ زکوۃ تھی جو اسے مسلمانوں سے ملتی تھی۔ اور پہلی جنگ عظیم (سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء) تک برطانیہ سے بھی کچھ مالی امداد ملتی تھی۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود کو فرمانروائے حجاز تسلیم کیا گیا اور اس وقت سے سلطنت کی آمدنی میں بےشمار اضافہ ہوگیا۔ آمدنی کی سب سے بڑی مد وہ روپیہ ہے جو ہر سال لاکھوں حاجیوں سے وصول ہوتا ہے۔ عرب میں زرمتبادل سعودی ریال کی صورت میں ہوتا ہے۔ ریال ایک چاندی کا سکہ ہوتا ہے جس کا وزن ۱۱٫۶۶۴ گرام ہوتا ہے۔ ایک ریال کے بدلہ میں ایک شلنگ ۴ پینس ملتے ہیں۔ اب سے پہلے آمدنی کا اوسط ۱۸۰۰ر۰۰۰ ریال تھا۔ اس کے علاوہ محصول کی صورت میں ۲۰۰ر۰۰۰ ریال اور وصول ہوتے تھے۔ اس آمدنی سے حکومت کی مالی حالت سخت خطرہ میں رہتی تھی اس لئے کہ جو قرضہ حکومت نے مختلف ملکوں سے لیا تھا مثلاً ہندوستان سے اسلحہ جات کی صورت میں، کسی دوسرے ملک سے وائرلیس اور ٹیلیگراف کا سامان خریدنے میں، اور ہالینڈ سے قرضہ کی صورت میں اس کی ادائیگی بہت مشکل سے ہوسکتی تھی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۳۲ء تک سعودی حکومت پر ۲۱۹٫۰۰۰ پونڈ سونے کا قرضہ ہوگیا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر فرمانروائے حجاز اور محافظ حرم سلطان ابن سعود نے ایک بہت اہم فیصلہ کیا جو عرب تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مئی کے مہینہ میں سلطان نے عرب امریکن آئل کمپنی سے یہ معاہدہ کیا کہ ۶۰ سال کے لئے حکومت کے مشرقی علاقہ میں ۲۵۰٫۰۰۰ مربع میل زمین تیل نکالنے کے لئے کمپنی کو دیجاتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد شمال اور جنوب میں کچھ اور حصہ اس میں بڑھا دیا گیا۔ کمپنی ایک ٹن تیل کے اوپر ۴ شلنگ (سنہری) سعودی حکومت کو ادا کرتی ہے۔ تیل کی مقدار ۶۰۰۰ر۰۰۰ ٹن سالانہ کے قریب ہے۔ سب سے زیادہ تیل مشرقی ساحل کے قریب جزیرہ بحرین کے مقابل کی زمین سے حاصل ہوتا ہے۔ راس تنورا کے بندرگاہ سے ۵ میل کے فاصلہ پر تیل کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا ہے جس میں ۱۲۰٫۰۰۰ ٹن سالانہ کے حساب سے تیل صاف کیا جاتا ہے اور باقی تیل بحرین کو بھیج دیا جاتا ہے بحرین پٹرولیم کمپنی اسے صاف کرتی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ آئندہ اس سے دس گنا زیادہ تیل نکالا جاسکے گا۔

اس کمپنی کے قیام نے عربوں کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اس علاقہ میں جہاں کے باشندوں نے کبھی اپنی آنکھوں سے موٹر بھی نہ چلتی دیکھی تھی اب اپنے سر پر ہوائی جہازوں کو اڑتے ہوئے دیکھا۔ صحرا کے سوکھے ہوئے چشموں میں جہاں میلوں تک پانی نہ ملتا تھا اب وہاں نلوں سے پانی ملنے لگا۔ جو راستے ریت سے ڈھک گئے تھے اب وہ صاف ہوگئے اور آمد و رفت کے لئے سہولتیں مہیا ہوگئیں، اب صحرا کے بیچ میں بھی خیمے دکھائی دینے لگے ہیں۔ ان آدمیوں نے مشینوں پر کام کرنا شروع کردیا ہے جنہوں نے اب تک اونٹوں ہی سے مشین کا کام لیا تھا۔ یہ سب تبدیلیاں اچانک ظہور پذیر ہوئیں اور سیدھی سادی زندگیوں میں انقلاب رونما ہونے لگا۔ عرب بچوں نے اپنے لئے نئے سکول دیکھے۔ ڈاکٹری علاج کا رواج ہوا، نئی طرز کی عمارتیں تعمیر ہونے لگیں غرض طرز رہائش، طرز لباس، طریق زندگی

میں مغربی تہذیب کے جملہ لوازم نے جگہ پالی۔ زندگی کی نئی قدروں نے پرانی قدروں پر غلبہ پالیا۔ اس کا اثر کلچر پر بھی پڑا۔ زراعت تجارت صنعت وحرفت سب میں مغربی رنگ جھلکنے لگا۔ کمپنی کے نوجوان ملازموں کی صورت اور لباس میں یہ اثر نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ بدوؤں کی زندگی میں بھی اس انقلاب نے خاصی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔

وسط عرب کے باشندوں کا شمار ہمیشہ سے دنیا کے مستعد ترین انسانوں میں رہا ہے۔ وہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جنھوں نے تنازعہ للبقا میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ وہ ریگستان میں دوپہر کے تپتے ہوئے سورج سے جھلسے ہوئے راستوں پر ننگے پاؤں چلنے کے عادی تھے۔ ان کا زاد سفر محض ایک مٹھی کھجوریں اور مشکیزہ میں تھوڑا سا پانی ہوتا تھا۔ وہ ضرورت کے وقت ۹۰ میل تک لگاتار اونٹ کی پیٹھ پر سفر کر سکتے تھے۔ گرمی ہو یا سردی محض ایک عبا پہن کر گذار دیتے تھے۔ ایسے گرم دنوں میں رمضان کے مہینہ میں دن بھر نہ کچھ کھاتے تھے نہ پیتے تھے۔ ان کی اولاد اب بھی انھیں کی طرح جفاکش، مستعد، باہمت، عالی حوصلہ اور عقلمند ہے۔ مغربی طرز زندگی سے اثر لینے کے بعد شاید اس سرزمین میں وہ سپوت پیدا ہوں جو مغرب کے رنگ میں خود کو بھی تیز کر دیں۔

دسمبر ۱۹۳۴ء میں سلطان ابن سعود نے "سعودی عرب معدنیاتی کمپنی" کو ایک خاص علاقہ میں تیل کے علاوہ معدنیات نکالنے کی اجازت دیدی۔ اس کمپنی نے جدہ سے تقریباً ۲۰۵ میل شمال کی طرف مہد الذہب میں اپنا کام شروع کر دیا۔ یہاں سونے کے علاوہ چاندی، تانبہ، سیسہ، جست اور دوسری دھاتیں بھی برآمد ہوئیں۔ سعودی عرب میں شمالی، وسطی اور جنوبی مغربی علاقہ میں بہت سی قدیمی کانیں موجود ہیں۔

ان تبدیلیوں کے علاوہ اور بہت سی تبدیلیاں بھی عرب کی زندگی میں واقع ہوئیں۔ جدہ کے ہوائی اڈہ پر ہوائی جہاز مستقل طور پر ٹھیرتے ہیں اور وسطی عرب کے دار الخلافہ ریاض میں بھی ہوائی جہاز سے لوگ اترتے اور سوار ہوتے ہیں۔

۱۹۳۴ء میں سلطان نے محکمہ حفظان صحت قائم کیا، ایک مستقل فوج کا انتظام کیا۔ اسکول کھولنے شروع کئے اور عرب میں جدید چیزوں کو رواج دیا۔

۱۹۴۱ء میں پھر ملک کو سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۴۱ء کے بجٹ میں قرضہ ۱۵۰۰۰۰ پونڈ تک پہنچ گیا۔ حاجیوں کی آمد سے جو سالانہ آمدنی ہوتی تھی جنگ کی وجہ سے وہ بھی بہت کم ہو گئی۔ تیل اور سونے کے کاروبار سے بھی پہلے کی بہ نسبت کم روپیہ وصول ہوا۔ ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کا اثر عرب پر بھی بہت شدید پڑا۔ جنس، ریزگاری اور دوسری اشیا کا کال پڑ گیا۔ ان حالات کے پیش نظر ایک وفد ۱۹۴۶ء کے موسم گرما میں واشنگٹن گیا۔ عرب کے وزیر مالیات عبداللہ السلیمان اس کے صدر تھے۔

یہ وفد وہاں اس مقصد سے گیا تھا کہ وہاں کے بینک سے قرضہ لے۔ چنانچہ اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور عرب کو ۱۰۰۰۰۰۰۰ شلنگ قرضہ مل گیا۔ اس روپیہ سے عرب کے ذرائع آمدورفت اور زراعت کو توسیع دی جائے گی۔

۱۹۴۲ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ سے ایک وفد سعودی عرب میں زراعتی ترقی کے ذرائع دریافت کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں زراعت کی ترقی کے لئے بہت بڑا میدان ہے۔ نخلستان اور بہت سی وادیوں میں پیداوار بہت بڑھ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پہاڑی علاقوں سے بھی بہت سا مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ چراگاہوں اور آبپاشی کے کاموں میں توسیع کی بہت گنجائش ہے۔ یہ امید ظاہر کیجاتی ہے کہ گیہوں، چاول اور دوسری جنسوں کے معاملہ میں ملک خود اتنی پیداوار کر سکتا ہے کہ دوسروں کا محتاج نہ رہے۔ اشیائے برآمد میں پھلوں اور اون کی مقدار اور اونٹوں اور بھیڑوں کی تعداد میں بھی بہت اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ دس سال کے عرصہ میں زراعتی پیداوار دگنی ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس کے حصول کے لئے کنوئیں کھودے جائیں، پشتے باندھے جائیں، فصل کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کا سدباب کیا جائے، بہتر کھاد مہیا کیا جائے، شہد کی تجارت کو ترقی دی جائے، نل لگائے جائیں وغیرہ وغیرہ۔ عرب کے پانی میں مچھلیوں کے ذخیرے بہت زیادہ موجود ہیں اور اس سے ایک مستقل تجارت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ الحفا اور الحسا کے علاقوں میں زراعتی ترقی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ الخرج اور نجد میں چونا ملی ہوئی مٹی موجود ہے اور اس سے بہت کام لیا جا سکتا ہے۔ جنوبی مغربی صوبہ اسیر مقابلتاً زیادہ زرخیز ہے اور پھلوں کی کاشت کو یہاں کافی فروغ دیا جا سکتا ہے۔

---

سعودی عرب میں تبدیلیاں مستقبل قریب میں معاشی انقلاب کے آثار پیدا کر رہی ہیں، اس سے قبل عرب کی تاریخ میں جہاں لوگ مذہب، قدامت، آزادی اور دیانتداری کے خوگر رہے ہیں مغربی تہذیب کے تھپیڑے اس قدر زور سے کبھی نہیں پہنچے۔ عرب نے اس سے پہلے کبھی مغربی اثر لینے کے لئے اپنے دروازے نہیں کھولے مگر اب دروازے کھل چکے ہیں تھپیڑوں کا زور اور طوفان کی موجیں زیادہ تیز ہوتی جا رہی ہیں اور مغربی تہذیب سے وابستہ عرب سرزمین میں داخل ہو چکی ہے۔ ہمسایہ ملکوں میں اس سے پہلے انقلابات رونما ہو چکے ہیں۔ مصر کو موجودہ ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لوانت ہمیشہ سے یورپ کے اثر سے قریب رہا ہے۔ عراق اور ایران کی معاشی تبدیلیاں موجودہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے ہم آہنگ ہو چکی ہیں۔ ہندوستان بھی اب پہلے سے بہت آگے ہے۔ اور اب محض عرب ہی ایسا ملک باقی رہ گیا

تھا جو ساتویں صدی عیسوی سے اب تک ایک ہی انداز پر چل رہا تھا۔ مگر بیسویں صدی کا نیا پن، نئی قدریں، نئے سماجی، معاشی تقاضے اور تجارتی اور اقتصادی رجحانات عرب کے سامنے ہیں۔ ہر چیز بدل رہی ہے۔ نئی امنگیں ہیں، نئے ارادے ہیں، غرض زندگی کا فلسفہ ہی بالکل بدل گیا ہے۔ روح اور جسم، مادے اور روح کی کشمکش عروج پر ہے۔ زاویۂ نظر جلدی جلدی بدلتے جا رہے ہیں۔ اور زندگی کے ہر ایک شعبہ میں مغرب کا اثر صاف جھلک رہا ہے۔ تعلیم کا رواج اب بھی کم ہے اور ہر فن کے ماہرین کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔

سعودی عرب کے بہت کم نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان یا امریکہ گئے ہیں۔ ملک کی آبادی تقریباً ۵۰۰۰۰۰ ہے جس میں ۲۰۰۰۰۰ بدو شامل ہیں۔ معلموں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ تعلیم نسواں کا تو ابھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔

سعودی عرب کے تعلقات اپنے شمالی ہمسایوں سے دوستانہ ہیں۔ عراق اور عرب کے تعلقات ذرا کشیدہ ہیں۔ اور اس کی مثال رشید علی گیلانی کے واقعہ سے دی جا سکتی ہے۔ بغداد کی سنہ ۱۹۴۱ء کی بغاوت کے لیڈر کو عراق اور برطانیہ کی دشمنی کے باوجود سلطان ابن سعود نے اپنے وطن میں پناہ دی۔ شرق اردن کے لوگوں نے جنگِ عظیم کے موقعہ پر سلطان ابن سعود کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکائی تھی۔ کویت سے عرب تعلقات سنہ ۱۹۴۱ء کے تجارتی معاہدے کے بعد بہت بہتر ہو گئے۔ جنوبی مغربی سرحد کا جو یمن اور عرب کے درمیان واقع ہے سنہ ۱۹۳۴ء کے عہدنامہ سے فیصلہ ہو گیا تھا اور اب دونوں کے تعلقات تسلی بخش ہیں۔

سعودی عرب کے تعلقات امریکہ اور برطانیہ سے دوستانہ ہیں مگر فلسطین کے معاملہ میں اکثر ہر دو ملکوں سے عرب کا اختلاف رائے ہوتا رہتا ہے۔ نجد میں ریڈیو کا رواج ہونے سے اب روزانہ کے واقعات کا علم باشندوں کو براہ راست ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شرق اردن کے دستوں میں سعودی عرب کے سپاہی بھرتی ہیں اور فلسطین کے چشم دید حالات لوگوں کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت عرب کے سامنے جو معاشی تجاویز ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ موجودہ تہذیب میں مادیت کو بہت دخل ہے اور سعودی عرب میں روحانیت ابھی کسی قیمت پر مادیت سے شکست کھانے کے لئے تیار نہیں۔ دونوں میں زبردست کشمکش کی صورت میں اگر کوئی صلح کی صورت ہو جائے اور درمیانی راستہ نکل آئے تو اس سے بہتر کوئی صورت نہیں۔ اس لئے کہ مادیت بغیر روحانیت کے بے کار ہے اور عرب کے باشندوں میں فطرتاً روحانیت کے لئے جو جذبہ ہے وہ ان کے لئے بہت بڑے امتحان کا سوال پیدا کر رہا ہے دیکھنا یہ ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

## جذباتِ عشرت

عشرت رحمانی

سانس لینے میں بھی ہیں دشواریاں
اُف مریضِ عشق کی لاچاریاں

بن گئیں آسانیاں دشواریاں
اُف مرے احساس کی بیداریاں

حسن ہے خوابیدۂ آغوشِ کیف
عشق ہے اور روح کی بیداریاں

درگزر فرما نگاہِ دل فریب!
تا بکے آخر یہ دنیاداریاں!

کانپ جاتا ہے دلِ انجام بیں
دیکھ کر امید کی دلداریاں

اے جنونِ عشق یہ کیا ہو گیا
سرنگوں ہیں عقل کی ہشیاریاں

اک نئی تصویر ہر پردہ میں ہے
صاف کہتی ہیں یہ پردہ داریاں

ہر قدم پر ایک منزل بن گئی
کام آئیں راہ کی دشواریاں

سرفرازی سر کے جھکنے کا ہے نام
بے نیازِ دار ہیں سرداریاں

کانپتا ہوں آرزو کے نام سے
اُف مری ناکامیاں ناداریاں

اہلِ دل نے آنسوؤں میں دیکھ لیں
ضبط کی مجبوریاں ۔ ناچاریاں

حسن ہوتا کیوں محبت کا حریف
کیا ہوئیں عشرت مری خودداریاں

# نئی ادبی مطبوعات

**شیشہ و سنگ** ۔ مصنفہ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی ۔ بارہ اصلاحی معاشرتی اور اخلاقی افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ لکھنوی زبان میں بہترین تصنیف قیمت مجلد ؎

**اتفاقات** ۔ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی ۔ یہ مرزا صاحب کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں رومانی اور معاشرتی زندگی کے اتفاقات کو بہترین پیرایہ میں اور پاکیزہ زبان میں پیش کیا گیا ہے ۔ قیمت ؎

**اردو زبان اور ہندو** ۔ مصنفہ ناظم سیوہاروی ۔ اردو زبان کی ترقی و سربلندی میں ہندو اہل وطن نے جو بے بہا خدمات سرانجام دی ہیں اس کتاب میں ان کی خدمات و حالات زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے ۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے ؎

**تاریخ انقلاب روس** ۔ مصنفہ شیر جنگ ۔ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی، اخلاقی اور مجلسی ردوبدل کی روح فرسا تاریخ جو ایک سیاسی مصنف کی طویل جدوجہد اور کدوکاوش کا بہترین مرقع ہے ۔ موجودہ تمام تاریخوں سے کامیاب و کامل کتاب ہے ۔ قیمت ؎

**کارل مارکس اور اس کی تعلیمات** ۔ مصنفہ شیر جنگ :۔ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے اپنے نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا ۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا ۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے ۔ تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ۔

قیمت مجلد ؎

**اوراق پارینہ** ۔ از شیر جنگ ۔ ایک انقلابی قیدی ۔ وہ بھی ادیب ۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں ملکی حالات ۔ غریب مزدور ۔ کسان کی تکالیف ۔ معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے ۔ یہ کتاب انقلابی ذہنوں کے لئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین استعارے محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ ۔

قیمت ؎

**ادبستان** :۔ حضرت مولانا خلیق دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ ۔ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کر کے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے ۔ یہ مجموعہ بار بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے ۔ تیسرا ایڈیشن ۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے ؎

**دیس سے باہر** :۔ آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی ادبی مضامین کا دوسرا مجموعہ ۔ لندن سے آداب عرض کی مقبولیت اس امر کی ضامن ہے ۔ کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں ۔ آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے ۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے ؎

**لندن سے آداب عرض** ۔ آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا "لندن سے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے ۔ بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا ۔

دوسرا ایڈیشن قیمت ؎

**قرآنی اخلاق** :۔ انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہے ۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کو مکمل پروگرام پیش کرتا ہے فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی ۔ قیمت ؎

**کمال اتاترک** :۔ مسیحائے ترکی مصطفےٰ کمال پاشا کے گہرے دوست محترم استاد محمد توفیق پاشا نے ترکی کے ڈکٹیٹر اور جلیل القدر رہنما کے سوانح حیات کمال تدبر اور محققانہ طرز بیان سے مزین فرمائے ہیں جس کی وجہ سے "کمال اتاترک" موجودہ تمام سوانح عمریوں سے مکمل و افضل ہے ۔ کتاب کی مقبولیت اس امر سے عیاں ہے کہ فاضل مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات کو اس خوبصورتی سے مرتب کیا ہے کہ اس کا پانچواں ایڈیشن چھپ رہا ہے ۔

قیمت مجلد ؎

## بہترین اخلاقی افسانے

سازِ فطرت :۔ از حسن عزیز جاوید ۔ قیمت ؎
قسمت :۔ دنیاوی کشمکش کے دلچسپ پاکیزہ افسانے ؎
نیلوفر :۔ دلچسپ اور نتیجہ خیز افسانوں کا مجموعہ ؎
صبر و ضبط :۔ معاشرتی و پاکیزہ افسانوں کا مجموعہ ؎

ہمارے ہاں اسلامی، ادبی، اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل پنجسورے اور سیپارے بھی شائع ہوتے ہیں ۔

ملنے کا پتہ :۔ **شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب ۔ کتاب منزل ۔ کشمیری بازار لاہور**

# امریکہ کا تعلیمی نظام

نرائن دت

امریکہ نے قومی ترقی کے لئے بڑے بڑے منصوبے بنائے ہیں ان میں بچوں کی تعلیم بھی شامل ہے۔ سال کے نو مہینوں میں پیر سے لے کر جمعہ تک تقریباً ہر پانچ میں سے ایک امریکی اپنا دن کا وقت سکولوں یا یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے میں گزارتا ہے۔ دس لاکھ تربیت یافتہ استاد تقریباً ۳۰٫۰۰۰٫۰۰۰ طلبا کو مختلف قسم کے نصابوں کی تعلیم دیتے ہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تعلیمی اداروں کے چار بڑے حصے ہیں۔ جب بچہ پانچ یا چھ سال کے سن کو پہنچتا ہے تو اس کی باقاعدہ تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ اور اسے ایک ابتدائی مدرسے میں داخل کر دیا جاتا ہے جہاں کی پڑھائی آٹھ سال کی ہوتی ہے۔ ابتدائی تعلیم پوری کرنے کے بعد لڑکا ثانوی یا ہائی سکول میں چار سالہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل ہو سکتا ہے۔ اس تعلیم کو پورا کرنے کے بعد وہ کالج میں داخل ہو سکتا ہے جس میں چار سال کی پڑھائی ہوتی ہے۔ کالج سے بی اے کرنے کے بعد اگر کوئی طالب علم یہ چاہے کہ اپنی منتخب شدہ لائن میں اور کچھ مزید کام کرے تو وہ گریجویٹ یا صنعتی سکولوں میں داخلہ لے سکتا ہے۔ تعلیم کے ان بڑے بڑے مدارج کے علاوہ کم سن بچوں کے لئے نرسری سکول اور کنڈرگارٹن اور بڑے لوگوں کے لئے ٹریڈ سکول اور دوسری قسم کے تعلیمی ادارے کھلے ہوئے ہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کوئی واحد اور مرکزی نظام تعلیم نہیں ہے۔ ۴۸ ریاستوں میں ہر ایک کے تعلیمی آئین الگ الگ ہیں۔ اکثر فرقے نامزدہ یا منتخب شدہ تعلیمی بورڈوں کے تحت اپنے ابتدائی اور ثانوی مدرسے چلا رہے ہیں جو حکومت کے عام قوانین میں مقامی ضرورتوں کے مطابق تبدیلیاں کر لیتے ہیں۔ بعض اسکول تو پرائیویٹ ادارے چلاتے ہیں لیکن اکثر سکولوں کو مقامی حکومت کی ایجنسیاں چلاتی ہیں۔

سب ریاستوں میں جبری تعلیم کا قانون نافذ ہے اور جو والدین اپنے بچوں کو سکول نہیں بھیجتے ان پر جرمانہ ہوتا ہے۔ ہر ریاست میں پبلک کے لئے ایسے سکول جاری ہیں جہاں بچے اور بچیوں کو بلا کسی نسلی یا مذہبی امتیاز کے ابتدائی تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ ان سکولوں کا خرچہ مقامی ٹیکسوں اور حکومت کی مالی امداد سے پورا ہوتا ہے۔ بعض سکول ایسے بھی ہیں جن کا خرچ مرکزی حکومت بھی برداشت کرتی ہے۔ پرائیویٹ یا مذہبی اداروں کے جاری کردہ سکولوں یا ایسے پبلک سکولوں میں جہاں مفت تعلیم دی جاتی ہے اگر داخلہ حاصل کر لیا جائے تو تعلیم کی قانونی شرائط پوری ہو جاتی ہیں۔ امریکہ ابتدائی یا ثانوی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا میں ۹۰ فیصدی طلبا ایسے سکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جہاں مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ مذہبی اور پرائیویٹ اداروں کی تعداد امریکہ کے سکولوں کی تعداد کا تقریباً چھ فیصدی ہے۔ لیکن ان اداروں کو اپنا تعلیمی معیار مفت تعلیم دینے والے سکولوں کے معیار کے برابر رکھنا پڑتا ہے۔ سن ۱۸۵۰ء سے ہر ریاست کے ایسے سکولوں میں جن کا خرچہ ٹیکس سے پورا ہوتا ہے مختلف فرقوں کی مذہبی تعلیم قانونی طور پر ممنوع ہے۔

امریکہ میں ابتدائی اور ثانوی سکولوں کی تعداد تقریباً ۲۲۱٫۰۰۰ ہوگی لیکن ہر ریاست کے مقامی حکومت کے نظام میں اختلاف کے باعث ۵٫۰۰۰ مختلف تعلیمی کورس ہیں۔ اس کے باوجود قومی اور معاشرتی انداز تخیل کا بنیادی نتیجہ تقریباً وہی ہے جو ایک قومی نظام تعلیم کا ہوتا ہے۔ اس میں اس حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے کہ ایک طالب علم ایک ریاست کے سکول سے دوسری ریاست کے سکول میں جا سکتا ہے۔ ان دونوں کا درمیانی فاصلہ خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو لیکن طالب علم کے تعلیمی پروگرام میں بہت کم فرق پڑتا ہے۔ اکثر ابتدائی سکولوں میں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ البتہ فنی تربیت میں اختلاف ہوتا ہے۔ لڑکوں کو دستکاری اور لڑکیوں کو گھریلو کام کاج سکھائے جاتے ہیں۔

پبلک سکولوں میں طلبا یکے بعد دیگرے امتحان پاس کرنے کے بعد ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں ترقی پاتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی طالب علم کسی جماعت میں فیل ہو جائے تو اسے دوبارہ اسی کی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ایسے طلبا کی جو بار بار فیل ہوتے ہیں۔ الگ الگ جماعتیں بنا دی جاتی ہیں۔ اور ان کی تعلیم ایسے اساتذہ کے سپرد ہوتی ہے جو کند ذہن طلبا کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق تعلیم دینے میں ماہر ہوتے ہیں۔ ذہین طلبا کی الگ الگ جماعتیں بنائی جاتی ہیں تاکہ وہ اپنی رفتار کے ساتھ ترقی کرتے رہیں اور جماعت کی معمولی ترقی کے باعث ان کی ترقی نہ رک سکے۔

ابتدائی سکول کی تعلیم پوری کرنے کے بعد طلبا ہائی سکول میں داخل ہوتے ہیں۔ چند ہی سالوں میں ہائی سکول میں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ سن ۱۹۴۰ء تک چودہ سال سے سترہ سال تک کی عمر کے بچے ۷۳ فیصدی سیکنڈری سکولوں میں تعلیم پاتے تھے۔ ان اداروں میں مفت تعلیم دی جاتی ہے اور ان کا خرچہ قوم برداشت کرتی ہے۔ ثانوی سکول میں ہر طالب علم کی تعلیمی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ امریکہ کے ابتدائی سکولوں میں اکثر طلبا کو تمام دن ایک ہی استاد تعلیم دیتا ہے

البتہ جسمانی ورزش آرٹ اور موسیقی کی تعلیم الگ الگ استاد دیتے ہیں۔ ہائی سکول میں طالب علم کے جتنے مضامین ہوتے ہیں اتنی ہی اس کی جماعتیں اور استاد ہوتے ہیں۔ اور اسے مضامین کے انتخاب میں یہ پہلا موقعہ ملتا ہے۔

طالب علم اور اس کے والدین کو ہائی سکول کی علمی اور فنی تعلیم کے انتخاب میں کسی اصول سے کام لینا چاہئے۔ بڑے بڑے قصبوں اور شہروں میں تو دونوں قسم کی تعلیم کے سکول اکثر الگ الگ ہیں۔ لیکن دیہات کے علاقوں میں ایک ہی ہائی سکول کے تعلیمی پروگرام میں انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ علمی سکولوں میں تو انہی روایاتی مضامین پر زور دیا جاتا ہے مثلاً انگریزی زبان اور ادب، غیر ممالک کی زبانیں۔ ریاضی۔ تاریخ۔ کیمیا۔ علم الحیوانات۔ طبعیات۔ موسیقی اور آرٹ۔ اکثر علمی سکولوں میں خاص خاص فن مثلاً حساب کتاب، مختصر نویسی، زراعت اور غیر ملکی تجارت کی تعلیم کا انتظام ہے۔ فنی تعلیم دینے والے سکول روایاتی مضامین کی تعلیم پر کم زور دیتے ہیں۔ فنی تعلیم دینے والے خاص خاص سکولوں میں طلبا کو ہوائی جہاز سازی، کپڑے کی تجارت، طباعت اور اسی قسم کی اور تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں اتنی علمی تعلیم بھی دی جاتی ہے کہ وہ جمہوری سوسائٹی میں اپنی جگہ سنبھال سکیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے قصبے ہیں جو مالی مشکلات کے باعث اپنے ہائی سکولوں میں مختلف مضامین کی تعلیم کے لئے اچھے استاد، سائنس کی تجربہ گاہیں، فنون اور فنی تعلیم کے واسطے کارخانے، جسمانی ورزش کے سامان کا انتظام نہیں کر سکتے۔ ایسے علاقوں میں رہنے والوں کی تعلیم کے لئے ایک ادارہ قائم ہوا ہے جسے اجتماعی ہائی سکول کہتے ہیں۔ یہ سکول ایک ایسے علاقے کے بیچ میں واقع ہوتا ہے جہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے قصبے آباد ہوں۔ ایک طالب علم کے گھر اور مدرسے کا درمیانی فاصلہ چالیس کلومیٹر سے پچاس کلومیٹر تک ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایک بس سروس کا انتظام ہے جو طلبا کو سکول مفت لاتی اور لے جاتی ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یونیورسٹیوں کا نظام دوسرے ممالک کی یونیورسٹیوں کے نظام سے مختلف ہے۔ امریکن یونیورسٹی کی ایک امتیازی شان یہ ہے کہ یہ کئی کالجوں اور سکولوں پر منقسم ہوتی ہے۔ کالجوں میں آرٹ اور سائنس کے کالج اور سکولوں میں مختلف قسم کے علمی اور فنی تعلیم دینے والے سکول شامل ہیں۔ مثال کے طور پر نیو یارک کی کولمبیا یونیورسٹی کو لیجئے اس میں مردوں کے لئے آرٹس اور سائنس کا کولمبیا کالج ہے، عورتوں کے لئے برنارڈ کالج ہے۔ استادوں کی تربیت کے لئے ایک کالج ہے۔ ایک میڈیکل کالج ہے جس میں دندان سازی کا سکول بھی شامل ہے۔ ان کے علاوہ قانون، تجارت، انجینئرنگ، صحافت اور اطلاقی سائنس کے الگ الگ سکول ہیں۔ ایسے علمی سکول بھی ہیں جن میں فاضلانہ تعلیم دی جاتی ہے۔

امریکہ کی بہت سی یونیورسٹیاں قومی ادارے ہیں جن میں یا تو فیس ہی نہیں لی جاتی اور اگر لی بھی جاتی ہے تو بالکل برائے نام۔ بڑی بڑی قومی یونیورسٹیاں زیادہ تر مغربی، وسط مغربی اور جنوبی حصوں میں ہیں۔ ریاستہائے متحدہ کے نئے نئے آباد شدہ حصوں میں ایسی یونیورسٹیوں کے یکجا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۶۲ء میں مرکزی حکومت نے اپنی زمینیں ریاستوں کو اس شرط پر دی تھیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم دینے والے اداروں کی امداد میں کام میں لائی جائیں۔ حکومت کی یونیورسٹیوں کے علاوہ بڑے بڑے شہروں کی میونسپل کمیٹیوں نے اپنے شہریوں کے فائدے کی خاطر الگ کالج کھولے ہوئے ہیں۔ امریکہ میں اعلیٰ تعلیم دینے والے ۱۷۸۵ ادارے ہیں۔ ان کا دو تہائی حصہ جس میں بہت سے پرانے اور بہت مشہور ادارے شامل ہیں، خود پبلک کی املاک سے قائم ہوا۔ ان کا انتظام اوقاف کے بورڈ کرتے ہیں جن پر حکومت کا کوئی اختیار نہیں۔ انھیں کوئی مالی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان اداروں میں فیس اس لئے لگائی گئی ہے کہ اوقاف کی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہے۔ بہت اچھا تعلیمی ریکارڈ رکھنے والے طلبا کو وظیفے بھی دئے جاتے ہیں جن سے ان کی تعلیم کا کل خرچہ یا اس کا کچھ حصہ پورا ہو جاتا ہے۔ یہ بات عام طور پر رواج پا گئی ہے کہ کالج کے طلبا اپنے خالی وقت میں کچھ نہ کچھ کام ضرور کرتے رہیں۔ اس طرح غریب طلبا اپنی تعلیم کا خرچہ ہی نہیں بلکہ دوسرے اخراجات بھی نکال لیتے ہیں۔

پبلک یا پرائیویٹ کالجوں میں داخلہ کا انحصار کسی ہائی سکول کے منظور شدہ تعلیمی معیار کے درجے کو پاس کرنے پر ہے یا کسی ایسی شہادت پر جس کی رو سے اس طالب علم نے اس منظور شدہ معیار تک تعلیم حاصل کر لی ہو۔ بہت سے کالجوں میں ایک شرط یہ بھی ہوتی ہے کہ یا تو داخلہ کا امتحان پاس کریں یا یہ ثبوت دیں کہ سکول میں ان کی تعلیمی حالت غیر معمولی طور پر اچھی تھی۔ پرانے کالجوں میں سے اکثر یا تو جوان مردوں کو داخل کرتے ہیں یا جوان عورتوں کو۔ جنوبی یا مغربی حصوں میں جن اداروں کو حکومت چلا رہی ہے۔ ان میں عموماً مرد اور عورتیں ساتھ تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ کالج کے پہلے دو سالوں میں طالب علم مختلف قسم کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اس کے آخری دو سال ایک خاص علمی میدان میں صرف ہوتے ہیں جسے وہ خود انتخاب کرتا ہے اور جس میں اس نے کچھ قابلیت دکھائی ہوتی ہے۔ چار سالہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسے بی اے یا بی ایس سی کی ڈگری اسی صورت میں ملتی ہے کہ اس نے کسی خاص علمی میدان میں امتیازی شان حاصل کر لی ہو۔ بہت سے کالج تعلیم، انجینئرنگ، تجارتی انتظام اور

دیگر مضامین میں بھی سندیں دیتے ہیں۔

اس زمانے میں کالج کے نصابِ تعلیم میں برابر تجربات کئے جارہے ہیں۔ اس صدی عیسوی کے آغاز سے طلبا کا کالج میں اور مختلف مضامین پڑھنے کی طرف رجحان ہوتا جاتا ہے جن کا فنی تعلیم سے بہت کم لگاؤ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک تحریک یہ بھی ہے کہ ہر طالب علم کو اور زیادہ موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنی مضامین کو انتخاب کرے جن کا وہ مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں اس رجحان کا رخ بدل گیا ہے۔ عام قسم کے مطلوبہ مضامین پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تاکہ طالب علم اپنے مضمون میں ماہر اور فاضل ہونے کے علاوہ ایک امتیازی شان بھی پیدا کرے۔ شکاگو یونیورسٹی میں کالج کے طلبا اپنی تعلیم سوشل سائنسوں، جنرل سائنس اور افلاقیات کے مطالعہ سے شروع کرتے ہیں۔ یہاں وہ طلبا تاریخ، سیاسیات علم الانسان۔ ریاضیات۔ اور اپنے وطن اور دیگر ممالک، کے ادب کا مطالعہ کرکے انسانی علم اور تخیل کی تدریجی ترقی کا اندازہ لگاتے ہیں۔ میری لینڈ کے سینٹ جون کالج میں کالج کے نصاب پر تجربے ہو رہے ہیں۔ ان کی بنیاد بہت سے قدیم اور اعلیٰ قسم کے ادب پر ہے جس میں افلاطون، ڈانٹے، شیکسپیر۔ مارکس۔ ٹالسٹائے کے شاہکار شامل ہیں۔ اوہیو کے انٹیوچ کالج میں بھی کئی سال سے کالج کی تعلیم پر تجربہ ہو رہا ہے۔ یہاں طلبا اگر ایک مہینے فنی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو دوسرے مہینے ادبی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم ان مسائل سے وابستہ ہو جائے جنھیں آگے جاکر طالب علم کو سر کرنا پڑتا ہے۔

ہائی سکول کی تعلیم پوری کرنے کے بعد طلبا کی روز افزوں تعداد کالج میں داخل ہو رہی ہے۔ اور یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ میلان بڑھتا رہے گا۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں کانگریس نے ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے فوج سے ان نکالے ہوئے سپاہیوں کے لئے جو اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہیں روپیہ منظور کیا جائے۔ چنانچہ ایسے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔

گریجوئٹ سٹڈی کے یونیورسٹی سکولوں میں صرف وہی طلبا داخل ہو سکتے ہیں جنھوں نے کالج کا پورا اور باقاعدہ نصاب مکمل کر لیا ہو۔ اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد ایم اے یا ایم ایس سی کی ڈگریاں دے دی جاتی ہیں۔ مزید مطالعہ اور تحقیقی مقالے کی اشاعت پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دے دی جاتی ہے۔

فنی سکولوں میں داخلے کی شرائط کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتی رہتی ہیں۔ ان شرائط کا انحصار حکومت کی ان پابندیوں پر ہے جو اس فن کو پیشہ بنانے کے لائیسنس پر عائد ہیں۔ ریاستہائے متحدہ کے اکثر میڈیکل سکولوں میں داخلے کے لئے تین چار سال کی تربیت ضروری ہوتی ہے۔ اور اس میں بھی علم کیمیا اور علم حیات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ پھر ڈاکٹری پڑھنے والے طالب علم کو میڈیکل سکول کا چار سالہ نصاب پورا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹری کا لائسنس حاصل کرنے کے لئے اسے ایک اور سرکاری امتحان پاس کرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر ڈاکٹری کرنے سے پہلے اسے ایک دو سال کسی ہسپتال میں کام کرنا ہوتا ہے۔ کسی خاص مرض یا سرجری میں خصوصیت حاصل کرنے کے لئے مزید مطالعہ اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بعض قانون کے اسکول تو ایسے ہیں جو طلبا کو ہائی سکول کی تعلیم کے بعد ہی داخل کر لیتے ہیں۔ لیکن اکثر سکول ایسے ہیں جو طلبا کو اس وقت تک داخل نہیں کرتے جب تک وہ کالجوں میں کئی سال تک تعلیم حاصل نہ کرلیں۔ قانون کا نصاب بھی عموماً تین چار سال کا ہوتا ہے۔ اور ڈاکٹری کی طرح اس میں وکالت کرنے کا لائسنس حاصل کرنے کے لئے ایک سرکاری امتحان پاس کرنا ضروری ہے۔ استادوں۔ دندان سازوں۔ مستند اکاؤنٹنٹ وغیرہ کے لئے تعلیم و تربیت اور لائسنس حاصل کرنے پر اسی قسم کی پابندیاں عائد ہیں۔ لائسنس دیتے وقت صرف حکومت ہی اپنی تعلیمی معیار کا خیال نہیں رکھتی بلکہ پروفیشنل ایسوسی ایشنز بھی اس کا لحاظ رکھتی ہیں۔ ان اداروں کو اس پیشہ میں شریک ہونے والے پر نیم قانونی اختیار حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ڈاکٹر سرجری میں خصوصیت حاصل کرنی چاہے۔ تو عام طور پر وہ امریکن کالج آف سرجنز کے امتحان میں بیٹھتا ہے۔ یہ حکومت کی مانی ہوئی جماعت تو ہے۔ لیکن یہ امریکہ کے بڑے بڑے سرجنوں کی ایسی جماعت نہیں جس کی حکومت نے خود تنظیم کی ہو۔ قانون کے کسی طالب علم کو وکالت کرنے کی اجازت دینے سے پیشتر امریکن بار ایسوسی ایشن اور اس کی متعلقہ ایسوسی ایشنز سے مشورہ لے لیا جاتا ہے۔

امریکہ میں تعلیمی ترقی کا اس حقیقت سے پتہ چلتا ہے کہ آج ہر اوسط درجے کے شہری کی تعلیم صرف آٹھ سالہ ابتدائی سکول کی تعلیم تک محدود نہیں ہوتی بلکہ ثانوی سکول کی بھی تعلیم ہوتی ہے۔ ہر ذہین طالب علم کو خواہ اس کی مالی حالت کیسی ہی خراب ہو موقعہ دیا جاتا ہے کہ وہ کالج کی تعلیم حاصل کر سکے۔ تمام ملک اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ حکومت اپنے شہریوں کی تعلیم کی ذمہ دار ہے۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر شہری کا حق ہے کہ اس میں جتنی تعلیم حاصل کرنے کی اہلیت ہے حاصل کرے۔

**اعتراف**

یکم مارچ کے پرچہ میں آل انڈیا ریڈیو کے نشر شدہ دو مضامین شائع ہوئے تھے جن کا حوالہ دینا رہ گیا قائین تصحیح فرمالیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

ترکی کا آئین ——— ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ ایک بڑی صحت — خواجہ عبدالمجید دہلوی

# نقد و نظر

## …تبہ جدید لاہور کی مطبوعات

اچھی کتابیں لکھنا ایک اہم قومی …دمت ہے لیکن میرے نزدیک اس سے بھی بڑی خدمت …ی کتابوں کو اچھی صورت شکل دے کر شائع کرنا اور اس طرح …ڑھنے والوں کو گویا اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ کوئی دیدہ زیب کتاب کسی …ے ہاتھ میں یا بک اسٹال پر دیکھیں تو اسے اٹھا کر ایک نظر دیکھ ضرور لیں۔ اردو کی اشاعت اور ترقی کے لئے یہ ایک نیک فال ہے کہ ہمارے بہت سے ناشر اب کتابوں کی اشاعت کے اس پہلو کی صحیح اہمیت کا اندازہ کرنے لگے ہیں۔ مکتبہ جدید لاہور اسی طرح کے اشاعتی اداروں میں سے ایک ہے۔ وہ تھوڑے عرصے سے اردو میں ایسی کتابیں شائع کر رہا ہے جو نہ صرف ظاہری حیثیت سے نظر فریب ہیں بلکہ مواد اور موضوع کے لحاظ سے بھی دلچسپ اور مفید۔ اچھے ناول، اچھے افسانے، اچھے مضامین اور اچھی نظمیں — یہ ساری چیزیں جہاں ایک طرف ہمارے فرصت کے وقت کا ایک دلچسپ اور تفریحی مشغلہ ہیں، وہاں دوسری طرف اگر ان کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے تو ذہنی تعمیر کا ایک آلہ بھی بن سکتی ہیں۔

مکتبہ جدید نے حال ہی میں اس طرح کا ایک پروگرام مرتب کیا ہے وہ چند مشہور روسی ناولوں کے ترجمے اردو میں شائع کر رہا ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی میخائل شولوخوف کا مشہور عالم ناول (AND QUIET FLOWS THE DON) ہے۔

اسی ناول کا ترجمہ "اور ڈان بہتا رہا" کے نام سے شائع کیا گیا ہے کتاب بڑے سائز کے ۶۳۶ صفحوں میں چھپی ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ اور ان دونوں چیزوں سے زیادہ کتاب کی جلد اور گرد پوش کی خوبصورتی دیدہ زیب اور دلکش ہے۔

اصل کتاب دنیا کے مختلف ملکوں میں اتنی مقبول ہوئی ہے کہ اس کا تعارف غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی ہندوستان اور اردو کے نقطۂ نظر سے کتاب کی بعض باتیں ایسی ہیں جو جاذب توجہ ہیں۔ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے تو یہ کہ اس کہانی کا پس منظر روسی انقلاب کے گرد و پیش کی طوفانی زندگی ہے۔ اور اس طوفانی زندگی کے تھپیڑوں سے قدم ملا کر چلنے والے روسی مزدوروں اور کسانوں کی معاشی اور ذہنی کشمکشوں کی مفصل تصویر۔ اردو کے نقطۂ نظر سے یہ کہ اردو ادب میں عرصہ کے بعد اب ایک ایسا دور آیا ہے جب ہمارے ادیب باقی ساری اصناف کے مقابلہ میں ناول کی کمی کو شدت سے محسوس کر کے اسے اپنے فکر و تخیل کی آماجگاہ بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ایک ایسے دور میں اس طرح کے ناولوں کے ترجموں سے جن میں زندگی کی گہرائی اور فن کی بلندی کا حصہ برابر برابر ہے ادب کی اس نئی رو کو بڑا سہارا ملے گا۔

ناول کا ترجمہ محمود جالندھری اور سراج الدین احمد نظامی نے کیا ہے۔ ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اصل کی روح کو قائم رکھے اور ترجمہ ہو کر بھی ترجمہ نہ معلوم ہو۔ اس ترجمہ میں دونوں خوبیاں موجود ہیں۔

کتاب کی قیمت آٹھ روپے ہے۔ اس کی ضخامت اور ظاہری اور باطنی محاسن کو دیکھتے ہوئے قیمت زیادہ نہیں۔ اور اسی لئے ایسی کتابوں کو دیکھ کر یہ حسرت ضرور پیدا ہوتی ہے کہ ہم انہیں خریدنے کے قابل ہو سکیں۔

## تار و پود

مصنف بلونت سنگھ۔ ناشر: مکتبہ جدید لاہور ضخامت ۲۸۴ صفحات کتابت طباعت صاف۔ تصری خوبصورت گرد پوش قیمت تین روپے۔

بلونت سنگھ اردو کے ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کا پہلا ہی افسانہ پڑھ کر یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ افسانہ نگار آگے چل کر اردو ادب کا درخشندہ ستارہ بنے گا۔ یہ پیشین گوئی اگر سچی نہ ہو تو غلط ثابت بھی نہ ہوئی۔ دو ہی تین برس میں بلونت سنگھ نے پڑھنے والوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے اور نقادوں کو بھی اس لئے نہیں کہ انہوں نے کسی پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر یہ نعرے لگائے ہوں کہ لوگو دیکھو میری طرف دیکھو، میں افسانے لکھتا ہوں تمہیں میری طرف دیکھنا پڑے گا۔ بلکہ اس کے برخلاف وہ خاموشی سے افسانے لکھتے رہے اور ان کا ہر نیا افسانہ پڑھنے والوں کو ان کی طرف کھینچ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اب پڑھنے والے مجبور ہیں کہ جب وہ کسی افسانے کے ساتھ بلونت سنگھ لکھا دیکھیں تو اسے ضرور پڑھیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اس کا جواب افسانوں کا یہ مجموعہ ہے۔ مجموعہ میں چودہ افسانے ہیں۔ اور ان سارے افسانوں کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ لکھنے والے کے سچے مشاہدات اور پرخلوص محسوسات ہیں۔ اور اس لئے ان سب میں کوئی نہ کوئی کشش ہے۔ لیکن سب سے زیادہ کشش ان افسانوں میں ہے جو بلونت سنگھ نے پنجاب کے دیہاتوں کی ایک خاص طرح کی زندگی اور خاص طرح کے افراد سے متعلق لکھے ہیں۔ اس طرح کے افسانوں میں سے ایک گرنتھی ہے، زندگی سے بھرپور، ایسی زندگی جس میں جسم اور ذہن دونوں کی تصویریں نمایاں طور پر ہمارے ذہنوں پر قبضہ کرتی ہیں۔ اسی طرح کے افسانے ہیں۔ پنجاب کا البیلا اور تین باتیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعی زندگی میں ابھی کتنا کچھ ہے جسے ہم نے نہیں دیکھا اور افسانہ نگار صرف ایک افسانہ لکھ کر اسی ان دیکھی زندگی کو ہمارے لئے مانوس بنا دیتا ہے۔

تار و پود کے دوسرے افسانوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی مصوری ہے۔ لیکن ان میں بھی کہیں یہ شائبہ نہیں کہ اسے افسانہ نگار نے اچھی طرح دیکھے بغیر ہی دکھایا ہے۔

مکتبہ جدید نے اسی دوران میں دو کتابیں اور بھی شائع کی ہیں — خدیجہ مستور کے افسانوں کا مجموعہ بوچھار اور محمود جالندھری کی نظموں کا مجموعہ تلاطم۔ ان دونوں کتابوں پر ہم کسی آئندہ اشاعت میں تبصرہ کریں گے

و۔ ع

# آپ بیمار ہیں

نہ ہیں کامیابی کا راز دو لفظوں میں ہے محنت کیجئے اور خوب محنت کیجئے محنت سے دولت پیدا ہوگی اور دولت سے عیش و آرام مگر اس کیلئے تندرستی کی ضرورت ہے اگر یہ نہیں اور آپ بیمار ہیں تو محنت، دولت آرام صرف خواب و خیال۔ ساری عمر تکلیف و مصیبت میں گذارنا ہوگی کبھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی!

**بیماری** تندرستی کی دشمن کو بھی دے، پیسہ کا خرچ، ... مصیبت پر مصیبت علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہ رہا ہے مگر فائدہ نہیں مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی یہ مرض کیوں بڑھ رہا ہے

فائدہ کیوں نہیں ہوتا اس کا جواب یہ ہے کہ مرض کی تشخیص نہ ہو سکی دوا خالص اور عمدہ نہیں مل سکی سڑی گلی دواؤں اور ناتجربہ کار طبیب سے فائدہ کی کیا امید ہو سکتی ہے اگر آپ کے دوستوں میں سے کوئی صاحب کسی پیچیدہ اور پرانے مرض میں گرفتار ہیں تو ان کے حالات ناظم شعبہ تشخیص مجلس الاطباء پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی کو فوراً لکھ کر روانہ کیجئے یہاں مرض کے حالات تجربہ کار کہنہ مشق طبیبوں کی مجلس میں پیش ہوتے ہیں اس مجلس کے صدر دہلی کے مشہور طبیب پروفیسر حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی سینیر وائس پرنسپل جامعہ طبیہ و ایڈیٹر رسالہ مسیح الملک ہیں۔ مجلس الاطباء میں مرض کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے۔ بحث ہوتی ہے ہر طبیب اپنے اپنے تجربہ کی بنا پر رائے ظاہر کرتا ہے اور بالآخر متفقہ رائے سے مرض کی صحیح تشخیص عمل میں آتی ہے دوا تجویز ہوتی ہے۔ مریض کو اطلاع دی جاتی ہے اور اس طرح روزانہ بہت پیچیدہ مسئلے حل ہوتے ہیں تشخیص و تجویز کا یہ طریقہ اس قدر صحیح اور بہتر ثابت ہوا ہے کہ اب نہ صرف ملک کے بگڑتے کے مریض بلکہ بہت سے طبابت پیشہ اصحاب، ڈاکٹر، حکیم اور وید بھی اپنے زیر علاج مریضوں کے پیچیدہ امراض کی بابت مجلس الاطباء کا مشورہ طلب کرتے ہیں اس طرح ہزاروں مایوس مریض اس مجلس کی صحیح تشخیص کی بدولت نئی زندگی حاصل کر چکے ہیں اگر آپ کسی پیچیدہ یا پرانے مرض میں گرفتار ہیں اور آپ کا وقت خراب ہو چکا ہے اور دولت برباد ہو چکی ہے تو ایک بار اپنے حالات لکھ کر یا اجمل شفاخانہ باڑہ ہندو راؤ میں تشریف لا کر مشورہ کیجئے۔ جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔ رسالہ مسیح الملک بطور نمونہ طلب فرمائیے، اوقات مشورہ صبح ۱۰ بجے سے ۱۲ بجے شام تک۔ شام ۶ سے ۸ بجے شب تک

**منیجر مجلس اطباء پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی**

تپ دق کا آخری علاج

کیلسو

"KELSO"

WONDERFUL FOR TUBERCULOSIS



جب ماتاجی میری زندگی سے مایوس ہو گئیں — اور پتاجی کی آنکھوں سے ہر وقت آنسو نکلنے لگے اور تمام رشتہ داروں نے ڈاکٹروں حکیموں اور ویدوں کی رائے کے مطابق میرے مرجانے کا فیصلہ کر لیا تو ہمارے پتاجی کے ایک سچے اور مخلص دوست نے کیلسو کیمیکل ورکس کی تیار کردہ دوا کیلسو کے استعمال کرانے کا فوری مشورہ دیا، پتاجی نے فوراً روپے بذریعہ تار روانہ کر کے کیلسو کا مکمل کورس منگوایا، اس کے کھاتے ہی میرے جسم میں نئی روح پڑ گئی، روز بخار، کھانسی، سینہ کا درد، خون تھوکنے، گلے کی خراش، بلغم اور دستوں میں کمی ہونے لگی بھوک کھل گئی۔ خون میں سرخی بڑھنے لگی اور چند دنوں میں چہرہ بارونق ہو گیا، دبلاپن اور پسینہ کی علامت بالکل غائب ہو گئی۔ مرض کا نام و نشان نہ رہا اور اب کوئی شخص مجھے دیکھ کر ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ کبھی تپ دق کے پنجہ میں گرفتار ہوئی تھی



اس دوا کو کیلسو کیمیکل ورکس نے ریسرچ کی نئی تھیوری کے مطابق سونا اور سچے موتیوں جیسی قیمتی چیزوں سے تیار کیا ہے تپ دق کے ماہر اور دہلی کے مشہور طبیب پروفیسر حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی وائس پرنسپل جامعہ طبیہ، صدر مجلس اطباء، ایڈیٹر رسالہ مسیح الملک تپ دق کے مریضوں کو کیلسو ہی کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں کیلسو جسم میں داخل ہوتے ہی جراثیم سل، سل، پھیپھڑوں کو فوراً ہلاک کر کے کمزوری کو دور کر دیتا ہے اسی وجہ سے دق کی ہر قسم میں پھیپھڑوں کی ہو یا آنتوں کی، گلٹیوں کی ہو یا ہڈیوں کی سل شدید ACUTE PHTHISIS ہو یا سل پرانی CHRONIC PHTHISIS کیلئے آخری دوا ہے جن مریضوں نے سنی ٹوریم میں رہ کر علاج کرایا ہے ان میں سے اکثر نے اپنی لاکھوں روپے کی جان کیلسو ہی کے استعمال سے بچائی ہے۔

سی لو نیکا ایک مریض کی رائے

[illegible]

قیمت

بتہ: کیلسو کیمیکل ورکس صدر بازار دہلی

KELSO CHFMICAL WORKS. SADAR BAZAR DELHI

# جاپانی شاعری

**فضل حق قریشی**

قدیم جاپانیوں کا اصلی وطن چین ہے۔ وہ اپنے ملک کی شدید سردی سے تنگ آکر ترکِ وطن کے لئے مجبور ہو گئے تھے۔ حالانکہ خود جاپان میں بھی خنکی خاصی ہوتی ہے۔ مگر چین کے مقابلہ میں کسی قدر کم۔ اسی سرد آب و ہوا کے باعث ان کی طبیعت میں غصہ بہت کم ہوتا ہے۔ دوسروں کی باتیں جلد تسلیم کر لیتے ہیں کسی قدر قدامت پسند ہیں۔ نیز ان کے ملک کے زلزلے، پہاڑوں کی آتش فشانیاں، باد و باراں کے طوفان، سمندروں اور دریاؤں کی طغیانیاں اور حشرات الارض کی ایذا رسانیاں انہیں کبھی چین کی زندگی بسر کرنے نہیں دیتیں لیکن ان کی فطرت ان قدرتی مصائب و آلام کی صد درجہ عادی ہو گئی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ زندگی اسی انتشارِ مسلسل کا دوسرا نام ہے۔ اسی لئے اسکا شکوہ کرنا انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔ وہ سب کے سب رجائیت پسند ہیں۔ کائنات کے ہر ذرے میں انہیں مسرت و شادمانی کے دریا امنڈتے نظر آتے ہیں۔ ملک میں زلزلہ آتا ہے تو اس کے جھٹکوں کو وہ تبسم قدرت کے ارتعاشِ عظیم سے تعبیر کرتے ہیں۔ شق الجبال اور اس وقت کی آتش باریاں ان کے نزدیک عبارت ہوتی ہیں۔ زرخیزیٔ کوہ کے جوشِ نمو اور بہار کی دیوی کی ان گل فشانیوں سے جن کو وہ موسم خزاں ہی سے شروع کر دیتی ہے[1] اور اس طرح ان پہاڑوں سے نکلی ہوئی معدنیات گویا نعم البدل بن جاتی ہے۔ ان کی تباہی و بربادی کا۔ غرض یہ کہ وہ ان شاعرانہ خیالات سے اپنی ہر مصیبت کو راحت میں بدل لیتے ہیں، اور اس طرح انھیں آمدِ مرحیات کا بہت کم احساس ہوتا ہے۔

یہی تمام حوادث اور دیگر مظاہرِ قدرت ان کے لئے موضوعِ شعر ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کی وطنی شاعری جسکا سرچشمہ خود ان کا دل ہے، وقت اور جگہ کے تعینات سے قطعی آزاد ہے۔ ان کے اشعار طیور چمن کے جانفزا نغموں، تالاب کے کنارے ٹرانے والے مینڈکوں کی لذت فروز آوازوں اور رات کے وقت شور مچانے والے جھینگروں کے ترانوں سے ہمنوا ہوتے ہیں اور اپنی سحر سنجیوں سے حسن و جمال کی دیویوں اور عشق و محبت کے دیوتاؤں تک کو متاثر کر دیتے ہیں۔ وہ عورت و مرد کے باہمی تعلقات کو پُرخلوص اور لطیف بنا دیتے ہیں کیونکہ عموماً ان کی منکوحہ بیوی ہی، ان کی محبوبہ ہوتی ہے۔ اس کی عارضی جدائی سے وہ مغموم اور اس کے قرب سے مسرور ہوتے ہیں مثلاً

"اس رات جب میں اپنی پیاری بیوی کے ساتھ جو آج مجھ سے کوسوں دور ہے۔ موتی جڑے ہوئے تکئے بدل کر آسودۂ خواب تھا[2] تو میری آرزو تھی کہ مرغِ سحر کبھی بانگ نہ دے، خواہ دن کتنا ہی نکل آئے۔"

رات کو چمکنے والے جگنو ان کے نزدیک آسمان سے ٹوٹے ہوئے ستارے ہیں جو سماوی ماحول کی بےلطفیوں سے اُکتا کر اس دنیا میں تحقیقِ سکون کے لئے آگئے ہیں ؎

"اے حسین جگنو! اے آسمان کے درخشاں تارے!
تو نرم و نازک گھاس پر محوِ خواب ہے۔
یہاں شبنم کے لطیف آنسو پیغامِ سکون دیتے ہیں۔"

ان کا عقیدہ ہے کہ ہمنے شاعری ان دیویوں اور دیوتاؤں سے سیکھی ہے جو آسمان و زمین کے دائرۂ وجود میں آنے سے قبل بھی کسی دوسری دنیا میں گیت گاتے تھے۔ ان کی تاریخ ادب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے دورِ اولین میں شعر و شاعری کا اس قدر چرچا تھا کہ تمام ملک اس فنِ لطیف کو زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ سمجھتے تھے۔ ہر پیشے اور ہر صنعت و حرفت کے لوگ اس میں حصہ لیا کرتے تھے۔ جگہ جگہ مشاعرے کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور باکمال شعراء اس میں شرکت کرکے دادِ سخن لیتے تھے۔ اس ضمن میں جاپان کے زبردست ادیب اور شاعر سرا یوکی کے مندرجہ ذیل الفاظ خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں:-

عہدِ قدیم میں ہمارے ملک کے حکمراں اور دیگر اصحاب ثروت موسم بہار کے پُرلطف اور درخشاں ایام میں یا موسم خزاں کی خوشگوار چاندنی راتوں میں محافلِ مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ شاعر صنفِ نازک کے سینے کو کوہ فوجی کی چوٹیوں اور ان کے لبریز محبت دل کے شعلوں کو فوجی کے کبھی سکون نہ پانے والے شراروں سے تشبیہ دیتے تھے۔ بہار کے موسم میں رنگ برنگ کے پھول دیکھکر اور خزاں کی سہانی اور پرسکون راتوں میں پتوں کے گرنے کی آواز سنکر متاثر ہو جاتے تھے۔ ایک طرف ناشگفتہ کلیوں کی زود خیزگی اور نیم وا غنچوں کی معصومیت اور دوسری طرف بانس کے درختوں میں ہوا کے جھونکوں کی سرسراہٹ اور جھینگروں کا شور ان کے لئے الہام بن جاتا تھا۔ وہ گھاس کی پتیوں پر جڑے ہوئے شبنمی موتیوں اور سطحِ آب پر نمودار ہونے والے حبابوں سے زندگی کا سبق لیتے تھے۔

اس عہد میں چونکہ اپنے خیالات کو کاغذ یا کسی دوسری چیز پر منتقل کرنے کا فن موجود نہیں تھا، اس لئے وہ شعر کہتے۔ زیرِ لب گنگناتے رہتے اور صرف اپنے دل کو خوش کر لینے کے بعد بھول جاتے تھے۔ یا مشاعروں میں دادِ سخن لے کر سمجھتے کہ ہماری کاوشوں کا صلہ مل گیا ہے۔ اور اس نے ان کو موجِ قلب سے محو ہو جانے دیتے۔ تاہم اس زمانے کے بعض گیت جو مشہور ہو کر عوام کو یاد رہ گئے تھے، بعد میں قلمبند کر لئے گئے اور آج بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اس وقت ان کی شاعری ترجمانِ قدرت تھی اور ہر شعر دل کا وہ صحیح جذبہ ہوتا تھا جو انتہائے جوش میں انسان کے لبوں پر آکر الفاظ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اس لئے ان کا کلام بحر و عروض اور ردیف و قافیہ کی پابندیوں سے قطعی بےنیاز تھا۔ بعض اوقات وہ دل کی چوری ایک داستان ہوتی تھی۔ مثلاً ؎

---

[1] آتش فشاں پہاڑوں اور زلزلوں کے حادثات زیادہ تر اسی موسم میں رونما ہوتے ہیں کیونکہ ان دنوں زمین کا آتش گیر مادہ پورے جوش پر ہوتا ہے۔ [2] جاپان میں میاں بیوی جب خلوت میں مل کر سوتے ہیں تو ایک دوسرے کا تکیہ بدل لیتے ہیں۔ جسکا مقصد خلوص و محبت کا اظہار ہے۔

"میں تیرے فراق میں غم کے آنسو بہا رہی ہوں۔ اگر اسوقت کوئی راہ چلتا مسافر مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ میری آہ وزاری کی وجہ کیا ہے تو پھر تو ہی بتا کہ اسے کیا جواب دوں؟ کیا اس سے کہوں کہ اس چاند کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہی ہوں جو سامنے کی پہاڑی کے عقب سے ابھی ابھی طلوع ہونے والا ہے۔ ممکن ہے وہ باور کرلے اور چلا جائے، مگر میرا دل! کیا اسے بھی تسکین ہوجائے گی؟" سلہ

اور کبھی اتنی مختصر کہ مشکل سے ایک جملہ کہا جاسکے مثلاً

"آہ! برف کی سرد تہریاں اور پھولوں کی پژمردگی۔"

گویا ان کی وہ شاعری ایک قسم کی نثرپہ شاعری تھی لیکن بحر ونحو نہ ہونے کے باوجود اس میں اتنا ترنم ہوتا تھا کہ ہر سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

جیساکہ اوپر کہا جاچکا ہے عہد قدیم میں چونکہ خیالات کو ضبط تحریر میں لانے کا رواج نہیں تھا، اس لئے ان کا بیشتر کلام ضائع ہوگیا۔ تاہم چند نمونے کوجیکی اور نخونگی میں ملتے ہیں۔ بعدازاں جب شاعری کو باقاعدہ ایک فن لطیف کی حیثیت دی گئی تو سب سے پہلا مجموعہ ۷۵۶ء میں من یوشو سلہ کے نام سے شائع ہوا۔ جسکا بیشتر حصہ ساتویں صدی عیسوی کی شاعری پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں نے بھی اس فن لطیف میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ جاپانی عورت جس طرح زندگی کے ہر شعبے میں مرد کے دوش بدوش رہتی ہے، اسی طرح شاعری کی دنیا میں بھی وہ اس سے کم تر نہیں رہی اور جاپانیوں کے اس رواج کے مطابق کہ شادی سے قبل ہر لڑکی کے لئے الف با سیکھنا لازمی ہے، ایک جاپانی لڑکی کی تعلیم اسوقت تک نامکمل سمجھی جاتی ہے، اگر وہ خود سخن گوئی میں ماہر نہ ہو۔ چنانچہ اس عہد قدیم سے آج تک ہزاروں کی تعداد میں ایسی شاعرات گذری ہیں جن کے کلام کو عام مقبولیت حاصل ہوئی۔

ساتویں صدی عیسوی میں شہزادی نوکی باٹو کو غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی۔ اسکا کلام من یوشو میں موجود ہے ایک نمونہ ملاحظہ ہو:-

"تمہارے لئے کس طرح ممکن ہوگا
تن تنہا عبور کرنا
موسم خزاں کے پہاڑ کو
جس کو عبور کرنا کس قدر دشوار تھا
اس حالت میں بھی جبکہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تھے"

جاپانی شاعری کی یہ خصوصیت کہ اس میں ایمائی کیفیات صد درجہ پنہاں ہوتی ہیں، یہاں اپنا رنگ جما رہی ہے۔ اپنے عاشق سے یہ کہنے کی بجائے کہ تم تنہا نہ جاؤ بلکہ مجھے بھی ساتھ لے چلو! اپنے مقصد کو راستے کی دشواریوں کی شکل میں پیش کرتی ہے تاکہ وہ یہ سوچکر کہ پچھلی مرتبہ ایک شریک سفر کی موجودگی نے کسقدر سہولت پیدا کردی تھی، اس دفعہ بھی اسے اپنے ساتھ لے اور اسے فراق کے صدمے برداشت کرنے نہ پڑیں۔ حسن ادا کی یہ نادرالوجود ترکیب داد سے مستغنی ہے۔

آٹھویں صدی کے ربع اول میں سے حتونارد اور اکاحینو کے کلام کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اول الذکر کی شاعری کے دو نمونے حسب ذیل ہیں:

(۱) "اپنی بہن کی خاطر
اپنے ہاتھ سے توڑتے ہوئے
اونچی ٹہنی والے بیر کے شگوفے سلہ
میں بھیگ گیا"
شاخ بیر پر پڑی ہوئی شبنم سے۔

گویا بہن سے اتنی محبت ہے کہ اس کی خاطر شبنم کے قطروں سے بھیگ جانا گوارا کرلیا لیکن اونچی ٹہنی کا وہی پھول توڑا جو زیادہ خوشنما اور شگفتہ تھا۔ بیر کے پھول برف باری کے زمانہ میں کھلتے ہیں، جبکہ جاپان میں سخت ترین سردی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں شبنم کے قطروں سے بھیگ جانا اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔

(۲) "کاش! وہ لوگ جو پیدا ہوں
زندہ ... میرے زمانے کے بعد
کبھی ہرگز نہ گذریں۔
محبت کے اس راستے سے
جیساکہ میرا رہا ہے۔"

اپنی داستان غم کتنے اچھے پیرائے میں بیان کی ہے۔ اگر وہ خود زندہ رہتا تو شاید لوگوں کو محبت سے باز رہنے کی تلقین کرتا لیکن ایسی صورت میں جبکہ اسکا وجود نہیں ہوگا صرف یہ آرزو کرسکتا ہے کہ اگر وہ مبتلائے محبت بھی

---

سلہ:- بالکل یہی خیال رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی ایک نظم میں پیش کیا ہے اور دونوں میں یکساں درجہ یگانگت ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا ٹیگور کی نظم جاپانی نظم کا نقش ثانی ہے۔

سلہ:- یعنی دس ہزار پتیوں کا مجموعہ۔ غالباً ابتدائی ترتیب کے وقت اس میں دس ہزار نظمیں ہونگی۔

سلہ:- جاپان میں بیر کے پھولوں کو وہی درجہ قبولیت حاصل ہے جو بنگال میں کنول کو یا ایران میں گلاب کو ہے۔ کیونکہ بیر کے پھول میں نسوانی فطرت پنہاں سمجھی جاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح سخت سردی میں بھی بیر کا پھول کھلتا رہتا ہے جبکہ کسی دوسرے درخت پر پتا تک نظر نہیں آتا اسی طرح عورت بھی مصائب و آلام میں گھر جانیکے باوجود خندہ پیشانی رہتی ہے۔ وہ اپنے عزیز و اقارب اور خاص طور پر شوہر کی خاطر ہر قسم کی تکالیف جھیل لیتی ہے۔

ہوں تو مایوس تمنا نہ رہیں۔ ہندی کا یہ مشہور دوہا اس کے ساتھ ملاحظہ ہو:۔

"جو میں ایسا جانتی کہ پریت کرے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پریت کرے نہ کوئے"

اسی عہد کی شاعری میں سے خاتون سکالوئی کی دو نظموں نے میری توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ ایک نظم حسب ذیل ہے:۔

"لباس جو میرے بھائی نے زیب تن کر رکھا ہے، بہن ہے
اے ساؤ (کی سمت سے) چلنے والی (سرد) ہوا
زیادہ تیزی کے ساتھ مت چل
تا وقتیکہ وہ گھر نہ پہنچ جائے"

یہ مختصر الفاظ بہن کے سچے جذبات کا آئینہ ہیں۔ اگر بھائی گھر پر موجود ہوتا تو وہ اس کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے عملی طور پر صدہا تدابیر اختیار کر سکتی ہے لیکن ایسی صورت میں کہ وہ باہر ہے اس سے زیادہ کیا کر سکتی ہے کہ سرد ہوا سے التجا کرے کہ تھوڑی دیر کے لئے مت چل۔ اردو میں اسی رنگ کا یہ شعر توجہ طلب ہے۔

اے ابر بہار آج ذرا تھم کے برسنا ٭ آج آئے مرا یار تو پھر تھم کے برسنا

خاتون سکالوئی کی دوسری نظم جاپانی شاعری کی نادر تشبیہات کا ایک عکس لطیف پیش کرتی ہے (اس کے ساتھ ہی) اوتو نو یوشیکی کی بھی ایک نظم ملاحظہ ہو جو نویں صدی کا مشہور شاعر تھا:۔

"غائبانہ محبت ۔۔ ایسی تکلیف دہ شے ہے
جیسی کنول کی وہ دوشیزہ کلی
جو پیدا ہوتی ہے جھاڑیوں میں
موسم گرما کے کسی جنگل میں" (خاتون سکالوئی)

---

"میری محبت ۔۔ اس گھاس کی مانند ہے
جو پہاڑی گھاٹیوں میں پوشیدہ رہتی ہے
اگرچہ اس کی مقدار بڑھتی ہے۔
(لیکن) کوئی نہیں جو اس حقیقت کو جانے" (اوتونو یوشیکی)

دونوں کا موضوع یکساں اور تشبیہ بھی تقریباً ایک ہی قسم کی ہے۔ یوشیکی کی نظم سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسکا منشا غائبانہ اور خاموش محبت سے ہے مگر کسی لفظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اسے اچھا سمجھتا ہے یا برا۔ لیکن خاتون سکالوئی کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ محبوب کے سامنے اظہار محبت کرنا ضروری ہے ورنہ محبت بے کار ہے اسکا کوئی مقصد نہیں رہتا۔

اس وقت ایک جاپانی گیت یاد آ گیا جسکا موضوع بھی یہی ہے۔

"محبت کر کے مایوس تمنا رہنا
ایک افسردہ کن شے ہے، جس سے واسطہ پڑتا ہے
لیکن اس سے زیادہ افسوسناک اس کا پیدا ہونا اور مرنا ہے۔
جبکہ اس دوران میں کسی سے محبت نہ ہو سکے"

اس ضمن میں اردو ادب میں سے تین شاعروں کے اشعار پیش کرتا ہوں تاکہ باہمی تفاوت کا اندازہ ہو سکے۔

(۱) محبت درحقیقت ایک انداز پرستش ہے
محبت کا مزا جب ہے محبت غائبانہ ہو (جگر جدیدی)

(۲) حسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی گذر جانے میں ہے (جگر مرادآبادی)

(۳) خلل ہائے حسرت اسیر چہ باطل ہو وے
دل مگر زہرہ جبینوں پہ نہ مائل ہووے (آتش لکھنوی)

نویں صدی عیسوی میں دوسرا مجموعہ مرتب ہوا جسکا نام کوکن شو ہے یہ چند لوگوں کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ تھا جن میں سے ایک تسرایوکی تھا جو خود بھی اپنے زمانے کا بلند پایہ شاعر اور ادیب گذرا ہے۔ اس مجموعے میں سے اونو یوشیکی کے کلام کا نمونہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے ایک دوسرے شاعر اونو کوماچی کی ایک نظم ملاحظہ ہو:۔

"ایک چیز جو مرجھا جاتی ہے
کسی ظاہری علامت کے بغیر
وہ پھول ہے قلب انسان کا
اس دنیا میں"

"کوکن شو" کی طرح اور مجموعے بھی مرتب ہوئے جن کی کل تعداد اکیس ہے۔ ان سب کو مجموعی طور پر نیجو ہاچی دائی شو کہتے ہیں جن میں نہایت مبسوط طریقے پر شاعری کے اکیس مختلف ادوار کا کلام بھی کر دیا ہے۔

دسویں صدی عیسوی میں ایک اور مجموعہ شائع ہوا جس کا نام شوئی شو رکھا گیا۔ یہ کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ اس میں وہ کلام تھا جو اس وقت تک کسی دوسرے مجموعے میں شامل نہیں ہوا تھا۔

دسویں اور تیرھویں صدی کے درمیان خاتون ہوری کاوا اور خاتون سنوکی نے خاص شہرت حاصل کی۔ اول الذکر کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"کوئی شخص کس طرح یقین کر سکتا ہے
کہ سچی محبت ثابت قدم رہے گی ۔۔
میرے خیالات آج صبح
میرے بالوں کی مانند الجھے ہوئے ہیں"

سچی محبت کئے جانے کے باوجود یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہمیشہ قائم بھی رہے گی۔ اسی موضوع پر غور و فکر کرتے رہنے میں ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی اور جاگتے رہنے سے پیدا ہونے والی بے کلی نے کسی کروٹ چین لینے نہ دیا۔ نتیجہ یہ کہ مسلسل پہلو بدلتے رہنے سے سر کے بال بہت کچھ الجھ گئے

سورت میں کسقدر سنورے رہتے، بری طرح اُلجھ کر رہ گئے۔ ان خیالات کی طرح جو صبح کے وقت بھی دل و دماغ پر چھائے رہتے۔ کتنا اچھا خیال ہے اور کس خوبی سے پیش کیا ہے۔

خاتون سنوکی کے کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

"ایک بڑی چٹان کی مانند (جو) دور تک سمندر میں
خفیف ترین مد و جزر میں بھی غرقاب رہتا ہے
انسان کی (آنکھ سے) غیر مرئی، نامعلوم
میری آستین ایک لمحے کے لئے بھی خشک ہوتے نہیں پاتی۔"

کسقدر دلکش تشبیہ ہے۔ وہ چٹان جو سمندر کے پانی میں ڈوبی ہوتی ہے، لازمی طور پر ہمیشہ بھیگی رہے گی پھر اسی کی طرح آستین کا کبھی خشک نہ ہونا گویا یہ بتاتا ہے کہ محبوب کے فراق میں تمام وقت آنسو بہانے میں گذر جاتا ہے لیکن اس حقیقت کو صاف لفظوں میں بیان نہیں کیا کیونکہ یہ مسلک عشق میں روا نہیں ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں تیکاکیو (؟) شاعر نے ایک نیا مجموعہ "کوکن شو" کے نام سے مرتب کیا۔ اس میں بھی جاپانی شاعری کا اچھا انتخاب موجود ہے۔ اس بزم شعرا میں سے نوجی وارا نوتچی لو لوکی ایک نظم پیش کرتا ہوں جس میں کوئی نصیحت نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ دل بھی صبح مفارقت کے انتظار میں [illegible] ہے

"دن جلدی ہی رخصت ہو جائیگا
اور رات آ جائیگی، یہ میں جانتا ہوں
تاہم میں اس صبح کو ذرا سے کسقدر نفرت کرتا ہوں
جبکہ مجھ کو محبوب کے پہلو سے چلے جانے پر مجبور کرتی ہے"

یکو بوشی اور تاناباتا کی محبت سے متعلق ایک افسانہ جاپان کی روایات قدیم میں شامل ہے جس کے مطابق سال میں صرف ایک بار انکا ملاپ ہوتا ہے تو انکے بعض بند حضرت سلیمان کے نغمہ نغمات کے مشابہ ہیں۔ ان دونوں کے درمیان دریائے فلک ہے۔ اسی روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے اہل جاپان ساتویں مہینے کی سات تاریخ کو ایک تہوار بھی مناتے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ کیجئے:۔

"وہ آ رہا ہے، وہ میرا رفیق دیرینہ۔ جسکے دیکھنے کی تمنا میں عرصہ دراز سے میں کھڑی ہوں دریائے فلک کے کنارے۔ [illegible] اب پیکار ڈھیلا کرنے کا وقت قریب آگیا ہے [illegible] اور [illegible] کشتی میں سوار ہو کر میرا محبوب [illegible] پہنچنے کی کوشش کریگا۔" پھر تاناباتا کو [illegible] ہوئی کہتا ہے:۔

"اگرچہ وہ اسقدر قریب ہے [illegible] آستین کی لہر دکھائی اور لباس کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے لیکن موسم خزاں آنے سے قبل دریائے فلک کو عبور کرنا [illegible] سے ممکن نہیں ہے۔"

(باقی آئندہ)



## آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین



مضامین دلّی پرنٹنگ پریس میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۹۶۷ سے شائع کیا

ادب لطیف
سالنامہ ۱۹۴۷ء

اپنی
انفرادیت
کی
جوت
جگاتا
ہوا

اپریل میں شائع ہو رہا ہے

# عظمت اور اجتہاد اسکی فطرت ثانیہ ہیں

نقاد اس کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں
تاریخ اس کو سنگ میل قرار دیتی ہے
اہل ذوق اس کا ہر سال انتظار کرتے ہیں

**ادب لطیف** کھوکھلا دعوی نہیں کرتا، اٹل ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس کا ہر سالنامہ تازہ زندگی، تازہ جدّوجہد اور تازہ عزائم کیساتھ فن اور ادب کی فضاؤں میں پھیل جاتا ہے۔

## سالنامہ ۱۹۴۷ء

بھی اپنے مستند، ترقی پسند نقادوں، شاعروں اور ادیبوں کی لافانی نگارشات کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کیا جائے گا
سامراجی قوتوں کی ریشہ دوانیاں، تمدنی اور تہذیبی ہیجانات، سائنس اور سیاست کے جدید تر پلٹے، ادب اور زندگی کے نئے نئے تقاضے، اور عوامی رجحانات کے ارتقائی رخ۔
سالنامہ ۱۹۴۷ء کے ممتاز فنکار زندگی کے ان اہم اور ہمہ گیر مسائل پر اپنے صحت مند اور صالح افکار پیش کر رہے ہیں

## سالنامہ کے چند فنکار

قاضی عبدالغفار باری۔ احتشام حسین۔ عندلیب شادانی۔ فراق گورکھپوری۔ عبادت بریلوی۔ کرشن چندر۔ سعادت حسن منٹو۔ احمد ندیم قاسمی۔ ممتاز مفتی۔ شفیق الرحمن۔ اختر اورینوی۔ ہاجرہ مسرور۔ الوز۔ ن م۔ راشد۔ علی سردار جعفری۔ کنہیالال کپور۔ دیویندر ستیارتھی۔ بلونت سنگھ۔ ساحر لدھیانوی۔ فکر تونسوی۔ اثر لکھنوی۔ شاد عارفی۔ حفیظ ہوشیارپوری۔ ضیا جالندھری۔ قتیل شفائی۔ عبدالحمید عدم۔ گوپال متل۔ ان کے علاوہ سالنامہ میں آپکے تمام منفرد اور محبوب فنکار شمولیت فرمائیں گے۔ ۳/-/-

# اِنسان اور موسمِ بہار

## کیا انسان اِس موسم کی شوخی اور مستی کو برداشت نہیں کرسکتا؟

انسان نے جب پہلی مرتبہ دنیا میں آنے کے بعد اس دنیا کی بے رونقی کو دیکھا تو اس نے کہا، "اے مالک تو نے مجھے کیسی دنیا میں بھیج دیا ہے، جہاں نہ مستی ہے نہ شوخی ہے اور نہ زندگی ہے۔"

مالک نے پوچھا، "تو کیا چاہتا ہے؟"

انسان بولا، "میں ایک ایسی دنیا چاہتا ہوں جہاں حسن ہو، جوانی ہو، شباب ہو، جہاں کی فضا میں مستی ہو اور جہاں وہی کیف و سرور ہو جو تیری جنت میں ہے۔ میرے مالک اس دنیا کو بھی اسی جنت کی طرح بنا دے جہاں میں دنوں رہا ہوں اور جہاں کی فضا میں حسن بکھرا بکھرا رہتا ہے۔"

مالک نے کہا، "اب تو اس شوخی اور مستی کو برداشت نہیں کرسکے گا۔"

انسان نے گڑگڑا کر کہا، "میرے مالک کچھ بھی ہو میری دنیا کو جنت جیسا بنا دے۔"

مالک نے، جسے انسان کی دلداری منظور تھی، ایک اشارہ کیا، کائنات کا رنگ بدلنے لگا، مست فضائیں چلنے لگیں۔ زمین سے رنگ برنگ کے پھول اُمنڈ پڑے۔ درخت ہرے بھرے ہو گئے درختوں کی شاخیں میووں سے جھک گئیں۔ دریاؤں کا پانی شفاف موتی کی طرح چمکنے لگا، ہر طرف حسن تھا، شوخی تھی اور جوانی تھی۔ یہ تھا دنیا کا انقلاب اور اسی انقلاب کا نام ہے موسمِ بہار۔

اگرچہ دنیا بہت پرانی ہو چکی ہے لیکن پھر بھی اس انقلاب کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ہر سال بہار آتی ہے اور بہار کے آتے ہی پتہ پتہ میں نشو و نما کی قوت بڑھ جاتی ہے اور ہر طرف فضا میں ایک جوانی سی لہرانے لگتی ہے۔

### انسان اور موسمِ بہار

موسمِ بہار کی یہ انقلابی کیفیات صرف اس کائنات ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ آفرینشِ عالم سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ موسمِ بہار کے آتے ہی انسان بھی ایک انقلاب محسوس کرنے لگتا ہے چنانچہ انسانی قلب امنگوں سے لبریز ہو جاتا ہے۔ سرد خون گرمی پا کر رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ دماغ پر ایک مستی سی چھا جاتی ہے اور انسان ان کیفیات سے کچھ مدہوش سا ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے قدرت نے کہا تھا کہ "اے انسان اب تو اس شوخی اور مستی کو برداشت نہیں کرسکے گا۔"

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے لیے یہ مست کر دینے والا موسم ناقابلِ برداشت ہی بن جاتا ہے کیونکہ بہار کے آتے ہی نہ صرف انسان کے احساسات کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے بلکہ جسمانی کیفیات بھی اس کے لیے مصیبت بن جاتی ہیں۔

### موسمِ بہار میں اِنسانی جِسم کی بغاوت

موسمِ بہار کے آتے ہی انسان کے جسم میں ایک انقلاب رونما ہو جاتا ہے وہی خون جو ہمارے جسم کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے ہم کو پریشان کرنے لگتا ہے۔ خون گرمی پا کر رگوں میں پھیلنے لگتا ہے اس میں ایک جوش پیدا ہو جاتا ہے اور خون میں جوش پیدا ہونے کے ساتھ ہی وہ تمام خوفناک بیماریاں ابھر پڑتی ہیں جو زیادتی خون یا جوشِ خون سے تعلق رکھتی ہیں۔

موسمِ بہار کے آتے ہی پھوڑے، پھنسیاں، چیچک، خسرہ، چھپبر وغیرہ کی شکایتیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ صرف یہی نہیں ہوتا بلکہ وہ مواد جو جاڑے میں جسم کے کسی نامعلوم کونے میں پڑا ہوا تھا گرمی پا کر ابل پڑتا ہے اور کمزور اعضا پر گر کر ان کو ناکارہ کر دیتا ہے۔ غرضکہ موسمِ بہار کے آتے ہی انسان کے سارے جسم میں ایک ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید اسی لیے قدرت نے انسان سے کہا تھا کہ "تو موسمِ بہار کی شوخی اور مستی کو برداشت نہیں کرسکے گا۔"

### یہ جسمانی بیماریاں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟

شاعر اور ادیب کی نظر میں موسمِ بہار کی یہ بیماریاں موسمِ بہار کی پیدائش کی یادگار ہیں۔ لیکن اطبا کہتے ہیں کہ ان بیماریوں کو بہار جیسے معصوم اور پُرلطف موسم کی ہلاکت آفرینیوں کا سبب نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ بیماریاں اُن خرابیوں کا نتیجہ ہیں جو سردی کے موسم میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ سردی میں تو دبی پڑی رہتی ہیں لیکن جوں ہی موسمِ بہار کی لطیف گرمی ان کو چھیڑتی ہے یہ ابل پڑتی ہیں۔

اطبا کی رائے ہے کہ اگر جسم میں مدافعت کی طاقت ہو تو یہ زہریلا مادہ جو سردیوں میں جسم میں پڑا ہوا تھا خود ہی نکل جاتا ہے۔ لیکن اگر قوتِ مدافعت کمزور ہے تو یہ زہر جسم میں رہ جاتا ہے اور سینکڑوں خطرناک بیماریوں کا سبب بن جاتا ہے۔

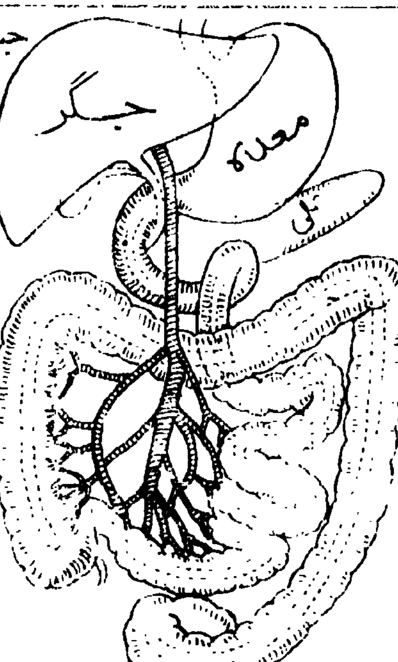
# موسم بہار ہمارے لیے مصیبت

قدرت نے سچ کہا تھا کہ اے انسان تو موسم بہار کو تو برداشت نہیں کرسکے گا" چنانچہ یہی ہو رہا ہے کیوں کہ ہماری تن درستیاں خراب ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارے جسم میں زہر خارج کرنے کی قوت باقی نہیں رہی۔ اس لیے موسم بہار جیسا خوش گوار موسم بھی ہمارے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔

موسم بہار ہمارے لیے کس قدر قاتل ثابت ہو رہا ہے، اس کا اندازہ اس خوفناک رپورٹ سے ہو سکتا ہے جو ہر سال ہندستان میں شائع ہوتی ہے۔ اس رپورٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موسم بہار ہی نوع انسان کی تباہی کا پیام لے کر آتا ہے اور لاکھوں انسانوں کی زندگی کو برباد کرکے چلا جاتا ہے۔

## ۲۷ لاکھ آدمی موسم بہار کے شکار

جسم کے نظام ہضم کے اعضاء




بتی فی صدی روگ ان ہی اعضاء کے کاموں میں گڑبڑ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ صافی کی یہ خاصیت ہے کہ ان اعضا کے فعل کو بالکل درست حالت میں رکھتی ہے اگر ان میں خراب مادے جمع ہوں تو ان کو باہر نکالنے کا فوراً بندوبست شروع کر دیتی ہے اس طرح یہاں کے خراب مادے جو خون میں پہنچ پہنچ کر خون کو خراب کرتے تھے وہاں نہیں پہنچتے۔ عام دست آور دواؤں کو دست لانے سے کام ہوتا ہے چاہے جسم کو دستوں کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ صافی کی عجیب تاثیر ہے کہ نظام ہضم کے اعضاء پر صحیح عمل کرتی ہے

اندازہ لگایا گیا ہے کہ موسم بہار میں خون میں زہر شامل ہونے کی وجہ سے جو خوفناک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں ان میں تقریباً ۲۷ لاکھ لوگ یا تو جان دے بیٹھتے ہیں یا تن درستی کھو بیٹھتے ہیں۔ ان ۲۷ لاکھ میں وہ کروڑوں لوگ شامل نہیں ہیں جو معمولی پھوڑے پھنسیوں کی تکلیف اٹھاکر تن درست ہو جاتے ہیں۔ یا چیچک وغیرہ میں اپنے جسم کی خوبصورتی کو زائل کرکے زندہ رہ جاتے ہیں۔

موسم بہار کا ہی یہ کرشمہ ہے کہ ہر سال بہت سے لوگ اس موسم میں جیسے جنون اور دیوانگی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ غرض کہ موسم بہار ہمارے لیے ایک مصیبت بن کر آتا ہے اور جب جاتا ہے تو لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کو برباد کرکے چلا جاتا ہے یہ موسم بظاہر تو خوش گوار ہے لیکن درحقیقت ہر موسم سے زیادہ خطرناک ہے

## موسم بہار کی ہلاکت آفرینیوں سے بچئے

موسم بہار ہندستان میں اپنی تباہ کاریاں برپا کرنے کے لیے ہر سال ۱۵ فروری کو آتا ہے اور آخر ماہ اپریل تک ایسا ہنگامہ برپا رکھتا ہے جس کی تلافی کبھی نہیں ہو سکتی۔

ہندستان کے ہر ہوشمند انسان کا فرض ہے کہ وہ اس خوش گوار مگر خطرناک موسم کی ہلاکت آفرینیوں سے اپنے آپ کو بچائے اور ایسی تدبیر اختیار کرے کہ اس موسم کا خطرہ بڑی حد تک ختم ہو جائے ——— اس موسم کے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا جائے کہ رات کو دیر تک نہ جاگا جائے ثقیل غذاؤں کو چھوڑ دیا جائے اور خون میں تیزی پیدا کرنے والی چیزوں کے استعمال سے پرہیز کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی کسی نہ کسی طرح اس زہریلے مادے کو خارج کر دیا جائے جو سردیوں سے جسم میں پڑا ہوا ہے اور اب وہ جسم میں زہر بن کر ایک قیامت برپا کرنے والا ہے۔

## قدیم زمانہ میں لوگ کیا کرتے تھے؟

قدیم زمانہ کے ہوشمند آدمی موسم بہار کو طاعون اور ہیضہ سے بھی زیادہ خطرناک خیال کرتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ موسم بہار کے آتے ہی کم از کم ایک ہفتہ کا جلاب لیا کرتے تھے تاکہ جسم کا تمام زہریلا مادہ خارج ہو جائے۔ جو لوگ زیادہ دولت مند تھے وہ اس سے بھی زیادہ مدت کا جلاب لیتے تھے۔ لیکن اب زمانہ ایسا آگیا ہے کہ لوگوں کے پاس نہ وقت ہے نہ روپیہ۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ہفتوں جلاب لے کر گھروں میں پڑے رہیں اور اس کے بعد فاقہ کشی کی مصیبت برداشت کریں۔

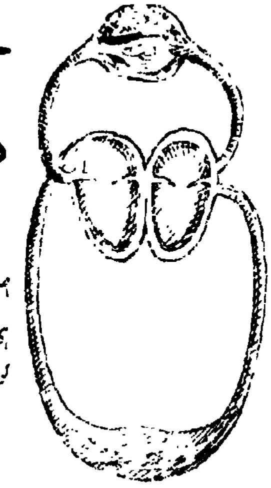
## اس زمانہ میں لوگ کیا کرتے ہیں

اس زمانہ میں جب کہ لوگوں کے پاس نہ وقت ہے اور نہ روپیہ، وہ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے صفی خون دوائیں استعمال کر لیتے ہیں لیکن چوں کہ اس وقت تک کوئی ایسی صفی دوا ایجاد نہیں ہوئی تھی جو خاص طور پر اس موسم کے مریضوں کے لیے مخصوص ہو، اس لیے لوگوں کو پورا فائدہ نہیں ہوتا تھا لیکن اب چونکہ یہ مشکل حل ہو گئی ہے کہ آفتاب ہمدرد دواخانہ دہلی نے خاص اس موسم کے لیے "صافی" جیسی موثر دوا تیار کر دی ہے تو پبلک اسی دوا کا استعمال کرتی ہے اور اس دوا کا یہ اثر ہوتا ہے کہ لوگ ان خطرناک امراض سے بچ جاتے ہیں جن کا پیدا ہونا اس موسم میں بالکل یقینی ہے۔

## صافی بیسویں صدی کی حیرت انگیز ایجاد ہے

صافی بیسویں صدی کی وہ حیرت انگیز ایجاد ہے جس کے استعمال سے

# جسم میں دورانِ خون



صافی نہ صرف خون کے اصل نقصوں کو دور کردیتی ہے بلکہ خون کی گردش کو بھی صحیح حالت میں رکھتی ہے

نہ پہلے جوڑے سے سہل پینے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کسی خاص احتیاط کی۔ بس صبح اٹھتے ہی نہار منھ پانی یا دودھ میں ملاکر صافی پی لیجیے چند روز کے استعمال کے بعد سارا جسم کندن بن جائے گا۔

**صافی**

اس وقت ہندوستان کی واحد دوا ہے جو خون کی تمام خرابیوں کے لیے اور موسم بہار میں پیدا ہونے والی بیماریوں کے لیے سب سے مفید ثابت ہو رہی ہے۔ یہ خون کے زہریلے اور ناقص مواد کو پیشاب پاخانہ یا پسینے کے ذریعہ خارج کردیتی ہے چنانچہ صافی کے استعمال کے بعد بعض لوگوں نے جو پیشاب اور پاخانہ کا امتحان کیا تو اس میں زہریلا مادہ کثرت سے پایا گیا۔ یہی زہریلا مادہ اگر جسم میں رہ جاتا تو سینکڑوں بیماریوں کا سبب بن سکتا تھا۔

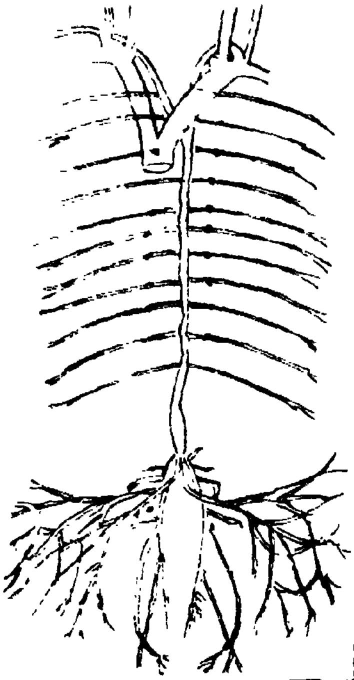
## صافی کے استعمال کا طریقہ

صافی کے استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ روزانہ صبح کو نہار منھ ایک تولہ صافی دودھ یا پانی میں ملاکر پی لیں۔ اس کے بعد ایک گھنٹے تک کچھ نہ کھائیں۔ اگر صافی کے دورانِ استعمال پسینہ کثرت سے خارج ہو یا پیشاب بار بار آنے لگے تو اس سے ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ صافی کا اثر شروع ہوگیا اور صافی خون کے ناقص اجزا کو پسینہ اور پیشاب کی راہ خارج کر رہی ہے۔ اگر صبح کے وقت فرصت نہ ہو تو صافی کی خوراک کو دوگنا کرکے اور اسے گرم پانی میں ملاکر پی جائیے۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ دن میں دست صاف ہوں گے اور طبیعت میں شگفتگی اور ہلکا پن محسوس ہونے لگے گا۔

ما تقدم اور صحت کی حفاظت کے لیے محض ایک مہینہ تک صافی کی روزانہ ایک خوراک پی لینا بالکل کافی ہے۔ بچوں کو صافی آدھے سے ۲ خوراک تک دی جاتی ہے۔ البتہ موسم بہار کی بیماریوں میں کچھ اضافوں کی ضرورت ہوگی جن کی تفصیل آگے چل کر بیان کی جائے گی۔ صافی کے دورانِ استعمال میں اس چیز کا خیال رکھنا چاہیے کہ غذا ہلکی اور زود ہضم ہو۔ بیمار کے لیے موسم کے پھل جتنے چاہیں کھائیں۔

## صافی کے کرشمے

یہ حقیقت ہے کہ موسم بہار کی کئی بیماریوں میں صافی کے کرشمے حیرت انگیز طریقہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ جسم میں پہنچتے ہی خون اور زہریلے مواد پر ایسا زبردست



جسم میں غدد جاذبہ اور عروق جاذبہ کا نظام

اس نظام پر صافی کے مقوی اثرات پڑتے ہیں ... صافی ... خون میں کوئی ... نہیں رہنے دیتی۔

قبضہ کرلیتی ہے کہ طبیعت کو وہ کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے اور طبیعت انہیں صافی کی امداد سے آسان راستوں سے جسم سے باہر نکال دیتی ہے۔ حقیقت میں صافی کے یہ فوائد اور اثرات اس کے عجیب و غریب نسخہ اور سائنٹفک طریقۂ تیاری کی بدولت حاصل ہوتے ہیں۔ صافی میں یہی دوائیں شامل کی گئی ہیں جو معدے میں ہضم ہوکر اور جگر کی نالیوں سے گزر کر رگوں میں پہنچ جاتی ہیں اور خون میں شامل ہوکر خون کی صفائی کے قدرتی خزانوں کو سرگرم عمل بنا دیتی ہیں۔ غدد جاذبہ کو آمادہ کردیتی ہیں کہ وہ جلد سے جلد خراب مواد کو کسی جگہ جمع نہ ہونے دیں۔ صافی کے ساتھ خارج ہونے کا راستہ مل جاتا ہے اور غدد جاذبہ و عروق جاذبہ کی رطوبت کو چھاننے کے لیے تیار اور تیز کردیتی ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ صافی خون کو متاثر کرتی ہے بلکہ اس میں عجیب و غریب خصوصیت یہ ہے کہ بدن میں جو خلط غالب ہوتی ہے اس کو اعتدال پر لے آتی ہے اور زائد مواد کو پیشاب، پاخانہ اور پسینے کی راہ سے باہر نکال دیتی ہے۔

## صافی کیا ہے؟

صافی کی ترکیب مفید جڑی بوٹیوں کو ملاکر ایک ایسا مرکب تیار کیا گیا ہے جس میں ایسے بے شمار منافع جمع ہوگئے ہیں۔ دراصل صافی چند نہایت معتبر مجرب اور نایاب بوٹیوں اور بہت سی بیش قیمت دواؤں کا ایک مرکب ہے جس کے فوائد میں محض ترکیب تیاری کی ندرت اور عمدگی سے طاقت اور قوت کے معجزے پیدا ہوگئے ہیں۔ ہمدرد دواخانے میں جس

سے چلنے والی متعدد مشینوں کی لاکھوں گردشوں اور ماہر دوا سازوں کی مسلسل محنت و کاوش سے جو مجلس تجربات اور اس کے صدر محترم عالی جناب حکیم حافظ محمد عبد المجید صاحب کی نگرانی و سرپرستی میں بروئے کار آتی ہیں صافی کو اعجاز دکھانے والی ایک مرکب صورت سیال کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ پہلے ایک سال تک نہایت خاموشی کے ساتھ مجلس تجربات میں صافی اصولی اور فنی تجربوں کی آغوش میں پلتی بڑھتی رہی اور فن کی باریک اور نہایت دقیق نگاہیں اس کے خط و خال پر تنقید کے ساتھ پڑتی رہیں۔ کبھی اس کے نسخے پر بحث کی گئی کبھی زمانہ اثر کو کم کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی کبھی اس کی طاقت عمل کو بڑھانے کی سفارش ہوئی۔ غرض ایک سال کے بعد کئی ہزار مرتبہ پر تجربہ کر کے مجلس تجربات کے تمام ممبروں نے بالاتفاق کہہ دیا کہ اب صافی مکمل ہو گئی اور اس میں خون صاف کرنے اور فساد خون کی بیماریوں کو دور کرنے کی حقیقی قوتیں پیدا ہو گئیں اس کے بعد صافی کو یورپ کی قیمتی دواؤں کے دوش بدوش بازار میں منظر عام پر رکھ دیا گیا۔

# صافی کس طرح اپنا عمل کرتی ہے؟

صافی جسے کافی تبدیلیوں کے بعد موجودہ دور کی خون صاف کرنے والی دواؤں کے مقابلے میں سب سے زیادہ موثر مکمل اور کارآمد بنا دیا گیا ہے جسم انسانی میں داخل ہو کر خاص طور پر یہ کام کرتی ہے کہ عروق جاذبہ (لمفیٹک ویسلز) کے اس عمل کو تیز کر دیتی ہے جو خراب مواد کو نکال لینے کے سلسلہ میں قدرتاً انھیں انجام دینا پڑتا ہے۔ اس طرح عروق جاذبہ اور خون کی رگیں (Blood Vessels) خراب مواد کو جلد ایسے مقامات پر پہنچا دیتی ہیں جہاں سے انھیں جسم سے باہر نکلنے کے لیے راستہ مل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ صافی کبھی پاخانہ کی صورت میں جسم کے خراب اور ناکارہ مواد کو نکالتی ہے کبھی اس کے استعمال سے پسینہ زیادہ آتا ہے۔

پسینے کے غدود کا خورد بینی منظر



صافی ان غدودوں کو صحیح کام پر آمادہ کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صافی کے استعمال سے بعض اوقات پسینہ بہت آتا ہے۔



گردہ جسم کا سب سے بڑا داروغہ صفائی

صافی گردوں کے فعل کو اگر قدرتی طور پر ضرورت ہوتی ہے بہت حد تک مدد پہنچاتی ہے اور پھر جسم کے سارے خراب مواد پیشاب کے راستے بہا دیتے ہیں۔

جوانوں اور عورتوں کو ہر موسم میں دی جا سکتی ہے۔

# صافی اور بہار کی بیماریاں

موسم بہار کی مختلف بیماریوں میں اگرچہ صافی کا استعمال بہترین شافی علاج ہے تاہم اس کا طریقہ استعمال مختلف ہوتا ہے اس لیے یہاں الگ الگ ہر مرض میں صافی استعمال کرنے کے آسان طریقے لکھے جاتے ہیں۔

**صافی اور خون کا بخار:** خون میں جوش آجانے سے ایک خاص قسم کا بخار پیدا ہو جاتا ہے جسے اطبا کی زبان میں سوءنخس کہتے ہیں۔ اس میں خون کا غلیہ اور اس کے گرم ہو جانے کی سب علامتیں پائی جاتی ہیں۔ اگر بخار آنے سے پہلے جب مریض کو انگڑائیاں آنی شروع ہوں، سر بھاری معلوم ہو اور آنکھوں میں غیر معمولی سرخی ظاہر ہو تو صافی ایک تولہ تھوڑے سے پانی میں ڈال کر دونوں وقت پلائیں اس سے خون اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے اس کی گرمی بجھ جاتی ہے اور بخار کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ اگر اس نوبت پر علاج نہیں کیا جا سکے اور بخار ہو جائے تو ایک تولہ صافی ایک چھٹانک پانی میں ڈال کر صبح کو پلائیں۔ شام کو بھی یہی دوا دیں۔ سات دن کے بعد آٹھویں دن صبح کو دو تولے صافی نیم گرم پانی یا نیم گرم دودھ میں ڈال کر پلائیں اس سے تین دست ہو جائیں گے۔ شام کو چار رتی خمیرہ مروارید۔ ماشے یا خمیرہ گاؤزبان عنبری ۶ ماشے کسی موسمی پھل کے رس کے ساتھ کھلائیں۔ نویں دن پھر ایک تولہ صافی پانی یا دودھ میں ملا کر دیں۔ شام کو بھی دوا کی دوسری خوراک دیں۔ دسویں دن پھر ڈبل خوراک سے مسہل دیں اسی طرح تین مسہل دیں اس سے بخار رفع ہو جائے گا اور خون اپنی کیفیت و طبیعت کے لحاظ سے اصل حالت پر آجائے گا۔ یہ ضروری نہیں کہ مسہل کے لیے آٹھویں دن ہی کا انتظار کیا جائے۔ اگر ضرورت ہو تو درمیان ہی میں مسہل دے دیں۔ بخار رفع ہو جانے کے ایک ہفتہ بعد تک دوا پیتے رہیں۔ نقاہت رفع کرنے کے لیے خمیرہ مروارید کھائیں۔ ... دودھ یا کسی پھل کے رس کے ساتھ استعمال کریں۔ غذا میں ... ... کی سبزیاں ... ... کافی مقدار میں ... ... کھلوں میں ... ... ...

**صافی اور خسرہ:** ... ... موسم بہار شروع ہوتے ہی روزانہ صبح و شام تین ماشے صافی ... ... ...

ٹکا لگ چکا ہو انھیں بھی صافی دینی چاہیے۔ اگر خسرہ نکل آئی ہو تو صافی ۳ ماشے عرق تیفو دو رسبز ڈ، دو تولے میں گھول کر دیں۔ اس سے خسرہ کے دانے اچھی طرح ظاہر ہو جائیں گے۔ جب خسرہ نکل چکے تو کمزوری دور کرنے کی غرض سے خمیرہ مروارید ۳ ماشے کھلا کر اوپر سے دودھ یا کسی موسمی پھل کا رس پلائیں اور چند روز تک مسلسل پلاتے رہیں خسرہ کے بعد جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آئیں یا کسی مقام پر ورم یا سرخ نشانات باقی رہ جائیں تو بھی صافی تین ماشے پانی میں حل کرکے کچھ دن تک پلاتے رہیں۔ بچہ بہت چھوٹی عمر کا ہو تو صرف ۲ ماشے صافی پلائیں۔ شام کو نونہال آدھا چمچہ چٹائیں خسرہ کے بعد دست آنے لگیں یا پیٹ پھولنے لگے اور بچہ دبلا ہو جائے۔ پیٹ غیر معمولی طور پر بڑھ جائے تو صبح کو صدوری آدھا چمچہ دودھ میں ڈال کر اور شام نونہال آدھا چمچہ چاٹ یا دودھ میں ملا کر دیں۔ کھانسی باقی رہ جائے تو سعالین کی آدھی ٹکیا دودھ یا پانی میں گھول کر دن میں چند بار دیں

**صافی اور چیچک**:- چیچک کے آثار نمایاں ہوتے ہی خمیرہ مروارید ۲ ماشے کھلا کر اوپر سے صافی ۳ ماشے ذرا سے پانی میں ملا کر پلائیں۔ چیچک ڈھل جانے تک برابر یہی دوا دیتے رہیں۔ دانے کم نکلیں اور خراب عوارض پیدا ہونے لگیں تو جب تیفودہ جرجڑ ایک دو عرق تیفو دو دو تولے میں گھس کر بار بار دیں۔ زخم باقی رہ جائیں تو انھیں نیم کے پانی سے دھو کر ہمدرد مرہم لگاتے رہیں اور صافی ۳ ماشے پانی میں ملا کر زخم بھرنے تک پلاتے رہیں

**صافی اور حلق کا درد**:- خزاں و موسم بہار میں اکثر حلق میں درد ہونے لگتا ہے کبھی بخار بھی ہو جاتا ہے اور اگر صرف حلق میں درد ہو بخار نہ ہو تو صافی ایک ایک تولہ ذرا سی چائے میں گھول کر صبح و شام پلائیں۔ اگر طبیعت بھاری بھاری ہو تو تیسرے دن صافی کی مقدار دوگنی کر دیا کریں۔ حلق کے اندر ہمدردی سے دوائے گلو دن میں دو بار لگائیں صبح کو نہار منہ دوائے غرغرہ دو تولے کو پانی میں جوش دے کر اور صاف کر کے غرارے کر لیا کریں۔ کھانسی بھی ہو تو سعالین کی ایک ٹکیہ منہ میں ڈال کر چوستے رہیں۔ بخار کی صورت میں صافی ایک تولہ ذرا سے پانی میں گھولیں اور خاکسی ۲ ماشے پھانک کر پئیں۔

**صافی اور خارش**:- کھجلی دو قسم کی ہوتی ہے خشک اور تر اگر خارش [illegible]
[illegible]
سے صافی ایک تولہ کسی رس میں ملا کر نوش کر لیں۔ ایک ہفتہ تک مسلسل یہی دوا پئیں آٹھویں دن صافی کی مقدار بڑھا کر مسہل میں دو تین دست آ کر مرض میں نمایاں تخفیف ہو جاتی ہے صندل کیونڈ دوائی ایک تولہ تیل میں ملا کر ملیں۔ خارش تر ہو اور پرانی نہ ہو تو صرف صافی سب سے بہتر استعمال کیجیے یعنی صافی ایک تولہ پانی ۵ تولے میں ملا کر پئیں۔ خارجی طور پر کیتو ا صفا دیسی ۵ تولے تیل میں ملا کر صبح کی دھوپ میں بیٹھ کر لگائیں دو گھنٹے کے بعد نیم کی بھوسی یا صابن سے غسل کریں۔ اسی طرح تین دن تک کریں غذا میں سبزی ترکاریاں کھائیں نمک مرچ اور مسالے کم کر دیں ترشی اور تیل سے پرہیز کریں۔

**صافی اور پھوڑے پھنسیاں**:- پھوڑے اور پھنسیاں خواہ کسی قسم کی ہوں صافی کا استعمال صبح و شام تین ماشے سے چھ ماشے تک دونوں وقت یہی دوا پی کر ساتھ دوسرے دن صبح کو صافی ایک تولہ ذرا سے پانی میں حل کر کے پئیں آسانی سے ممکن ہو تو اسی طرح ایک دن چھوڑ کر تین مسہل لیں۔ اگر کسی پھوڑے میں درد زیادہ ہو اور پیپ پڑنے کے آثار پائے جائیں تو اس پر نیم کے پتے دو تولے پانی میں پکا کر اس کا بھرتہ بنا کر باندھیں۔ اس کی ٹکیہ لگائیں۔ پیپ نکل جانے کے بعد ہمدرد مرہم لگا کر پٹی باندھ دیا کریں۔

**صافی اور ماشرا**:- ماشرا حقیقت میں چہرے کا سرخ باد ہے۔ اکثر موسم بہار میں چہرے پر ورم آ جاتا ہے۔ جدید تحقیق یہ ہے کہ سرخ باد ایک قسم کے کیڑے کی وجہ سے ہوتا ہے جسے سٹرپٹو کاکس پایو جے نس (Streptococcus pyogenes) کہتے ہیں اگرچہ سرخ باد کو خون اور سردی کا مرض سمجھا گیا ہے مگر چہرے کا ورم جسے ماشرا کہتے ہیں موسم بہار میں نہ ہوتا ہو۔ اگر چہرے پر سرخ دھبے نظر آئیں یا ورم معلوم ہو تو صافی کا باقاعدہ صبح و شام استعمال کرنا چاہیے تیسرے دن صافی ہی سے مسہل لیں پیپ کی ضرورت ہو تو صرف رسوت ایک تولہ مہندی کے پتے ۲ تولہ مرچ مکو کے پانی یا صرف تازے پانی میں پیس کر لگائیں۔ بخار ہو جائے تو کوئی خوف نہ کریں یہی دوا دیتے رہیں۔

**صافی اور گلسوئے**:- گلسوئے جن کو کن پیڑے بھی کہتے ہیں سخت متعدی مرض ہے جو خزاں یا بہار کے موسم میں ایک قسم کا کیڑا سرایت کر جانے سے وبا پھیل جاتا ہے اس مرض میں کان کی جڑ ورم جاتی ہے بخار بھی آ جاتا ہے بیماری بچوں اور جوانوں کو زیادہ ہوتی ہے اس مرض کے پھیلتے ہی تندرست بچوں اور نوجوانوں کو روزانہ صبح کے وقت ایک تولہ صافی پانی میں ملا کر پلائیں بچوں کو صافی ۶ ماشے کی مقدار میں دیں۔ مقامی طور پر ورم کی جگہ ہمدرد مرہم ملیں۔

**صافی اور خناق**:- خناق بھی چھوت کی بیماری ہے اور بچوں کو زیادہ ہوا کرتی ہے بہتر ہوتا ہے کہ گرمی بڑھنے سے پہلے ہی حفظ ماتقدم کی غرض سے صافی ایک تولہ پانی یا کسی مناسب عرق میں ملا کر پلائیں مرض لاحق ہو جانے پر صبح کو معجون عشبہ ۳ ماشے یا مرجل شا ستر ۳ ماشے کھلا کر اوپر سے صافی ۶ ماشے نیم گرم پانی یا چائے میں ملا کر پلائیں حلق میں دوائے غرغرہ کیف پانی میں جوش دے کر نیم گرم پانی سے غرغرے کرائیں۔ مقامی طور پر ہمدرد مرہم لگائیں جو بچے پانچ چھ دن صافی برابر پی لیں ان کو یہ مرض لاحق نہیں ہوگا اور ہو گیا ہو تو مرض گھٹ جائے گا۔

**صافی اور نکسیر**:- بہار اور گرمی کے موسم میں اکثر نکسیر پھوٹنے لگتی ہے نکسیر پھوٹتی ہو تو صافی ایک تولہ صبح و شام چند دن تک استعمال کرنی چاہیے سر پر تیل ملیں اور یہی نکسیر کا علاج ہے

**صافی اور مہاسے**:- مہاسوں سے چہرہ بدنما ہو جاتا ہے یہ مرض اکثر جوانی میں خون کی تیزی کو کالی دخل ہے صافی مہاسوں کے لیے نہایت مفید ہے یعنی روزانہ صبح ایک تولہ پانی یا دودھ میں ملا کر پی لینا کافی ہے کبھی کبھی صافی سے مسہل بھی لے لیا کریں عورتوں کو یہ خرابی ہو تو ایام کی خرابیوں کو دور کرنے کی غرض سے اوپر کے نسخے کے علاوہ رات کو سوتے وقت مستورین کا ایک چمچہ بھی دودھ میں گھول کر پی لیں چہرے پر غازہ حسن افزا ہمدرد رات کو سوتے وقت پانی میں گھول کر لگا لیا کریں۔

**صافی اور بچی**:- بچی میں صافی ایک تولہ پانی میں ملا کر صبح و شام چند دن تک پئیں بیرونی طور پر سرکہ ایک تولہ روغن گل ایک تولہ ملا کر ملتے رہیں۔

**صافی اور انہوریاں**:- انہوریوں کو دھوپ بھی کہتے ہیں یہ چھوٹے چھوٹے باریک دانے ہوتے ہیں جو جسم پر نکل آتے ہیں یہ بیماری پسینے کی گلٹیوں میں جلد کے لاکی طرح کے نیچے پسینہ رک جانے سے ہوا کرتی ہے صافی پسینے کی گلٹیوں میں تحریک پیدا کرکے ان کو سرگرم عمل بنا دیتی ہے اس لیے صافی کے استعمال سے بہت جلد انہوریاں مٹ جاتی ہیں

صافی ایک تولہ ذرا سے پانی میں گھول کر پلائیں۔ سم پروانے بہت زیادہ ہوں تو شام کو بھی صافی ایک تولہ کسی پھل کے رس میں ملا کر پلائیں۔

**صافی اور داد**:- داد ایک چھوت دار بیماری ہے۔ جدید تحقیقات سے اس کا سبب نباتی کیڑا ثابت ہوا ہے۔ داد میں صافی بہت سریع الاثر ہے۔ ایک تولہ صافی پانی میں ملا کر پلائیں۔ داد پر روغن گندم یا روغن قوبا یا ضماد داد لگائیں۔

**صافی اور چنبل**:- چنبل جسے انگریزی میں سورائیسس (Psoriasis) کہتے ہیں نہایت تکلیف دہ جلدی مرض ہے اس میں جلد پر چھوٹے چھوٹے گلابی رنگ کے متفرق ابھار پیدا ہو جاتے ہیں جن میں چھوٹے چھوٹے چھلکوں کی تہ ہوتی ہے جو نوچنے پر اتر جاتے ہیں یہ ابھار یا داغ رفتہ رفتہ بڑھتے رہتے ہیں اور ان میں خارش ہو کرتی ہے کبھی بہت سے داغ مل کر ایک جال سا بنا دیتے ہیں۔ صافی چنبل کے لیے بالکل شفا بخش دوا ہے۔ حب لیموں دو عدد یا قرص شاہترہ ۲ ملشے کھا کر صافی ایک تولہ پانی میں ملا کر پئیں۔ مقامی طور پر ضماد خارش جدید یا ہمدرد مرہم لگائیں۔

**صافی اور طاعون**:- اگرچہ ہندوستان میں طاعون کی بیماری مختلف موسموں میں پھیلا کرتی ہے لیکن صوبہ بمبئی اور دکن وغیرہ میں مارچ کے مہینے میں اس کے پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ غدودی طاعون میں بغل کنج ران وغیرہ کے غدود پھول جاتے ہیں۔ صافی طاعون غدودی اور طاعون فلغمونی میں بہت مفید ہوتی ہے۔ مرض کے حملے سے پہلے جب طاعون کسی مقام پر پھیل رہا ہو روزانہ صبح حب طاعون عنبری ۲ عدد کھا کر اوپر سے ایک تولہ صافی ذرا سے پانی میں ڈال کر پی لیا کریں۔ اگر مرض کا حملہ ہو جائے تو صبح کو حب طاعون عنبری ۲ عدد صافی ایک تولہ پانی میں ملا کر پئیں۔ شام کو خمیرہ صندل سادہ ۹ ماشے کھا کر اوپر سے صافی ایک تولہ پانی یا عرق بید مشک ۵ تولہ میں ملا کر پلائیں۔ ہذیان اور بخار کی زیادتی میں بار بار خمیرہ صندل ۳ ماشے عرق بید مشک کے ساتھ دیتے رہیں۔ بغل کنج ران یا کان کے پیچھے ورم ہو جانے پر ضماد طاعون جس کو نیم گرم لگائیں یا [illegible] ہمدرد مرہم لگاتے رہیں۔ [illegible] کی کمزوری میں [illegible] سادہ [illegible] ماشے [illegible] کے رس کے ساتھ دیتے رہیں۔

**گرمی دانے**:- جن بچوں یا بڑوں کو گرمی یا برسات کے موسموں میں گرمی دانے تکلیف دیتے ہوں انہیں بطور حفظ ماتقدم صافی کا استعمال ابتدائے موسم ہی سے کرنا چاہیے۔ معمولی حالت میں صافی ایک خوراک روزانہ صبح نہار منہ کافی ہوتا ہے [illegible] وقت بھی صافی استعمال کی جا سکتی ہے۔ برسات کے زمانہ میں گرمی دانوں کی تکلیف کی صورت میں صافی کا استعمال روزانہ صبح و شام [illegible] دن تک کرنا چاہیے۔ بچوں کو عمر کی مناسبت سے کم خوراک صافی دینی چاہیے۔ ہمدرد پوڈر [illegible] لیا جاتا ہے۔

**پیشاب کی جلن**:- جن عورتوں اور مردوں کو پیشاب [illegible] صافی ایک تولہ [illegible] دودھ کی لسی میں [illegible] بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اگر تکلیف [illegible] وقت صافی استعمال کرنا چاہیے۔

**دائمی قبض**:- دائمی قبض کے مریضوں کو صافی ایک تولہ رات کو سوتے وقت دودھ کے ساتھ پینا کافی ہے۔ اس مرض سے نجات حاصل کرنے کے لیے [illegible] استعمال کرنا چاہیے۔ ایک دن ناغہ دے کر استعمال کریں اس طرح آہستہ آہستہ خوراک کم کرتے جائیں [illegible] قبض کو دور کرنے کے لیے صافی بلا تکلف دینی چاہیے۔ [illegible] قبض کو [illegible] دور [illegible]

ہوتی ہے جو اس کی طبیعت کی بے چینی اور متلی کی شکایت کو بھی بڑی حد تک ختم کر دیتی ہے۔

**طبیعت گری گری رہنا**:- موسموں کے بدلنے کے دنوں میں جن اصحاب کی طبیعت گری گری رہتی ہو انہیں صافی کی ایک خوراک صبح نہار منہ دس بارہ دن تک استعمال کر لینی چاہیے اس سے ایک دو دن میں ہی طبیعت سنبھلنی شروع ہو جائے گی۔

**پہاڑوں پر جانے والے**:- میدانوں کے رہنے والے جب گرمی کا موسم گزارنے کیلیے سرد مقامات پر جاتے ہیں تو کبھی کبھی ان کو پھوڑے پھنسیوں اور کھجلی وغیرہ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ بچے خاص طور پر اس تبدیلی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان تکلیفوں سے بچنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ پہاڑوں پر جانے سے پہلے پندرہ بیس دن صافی کی ایک خوراک صبح نہار منہ دودھ میں ملا کر استعمال کر لی جائے۔ بچوں کو عمر کی مناسبت سے آدھی یا اس سے کم خوراک دی جاتی ہے۔ پہاڑوں پر جو اصحاب جلدی شکایتوں میں مبتلا ہوں انھیں صافی صبح شام استعمال کرنی چاہیے۔

## دواؤں کی قیمتیں

جن دواؤں کا ذکر اس مضمون میں ہوا ہے ان کی قیمتیں ناظرین کی سہولت کے لیے اس فہرست میں لکھی جاتی ہیں۔

| نام ادویہ | مقدار | قیمت | نام ادویہ | مقدار | قیمت | نام ادویہ | مقدار | قیمت |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| اطریفل شاہترہ | ۱ تولہ | ۱ر | رسوت | ۱ تولہ | ۵ر | ضماد بہاسہ | تولہ | ۱ر |
| حب تیفودیہ رجسٹرڈ | ۱ درجن | ۶ر | روغن قوبا | ۱ " | ۸ر | عرق بید مشک قسم اول | ۱ بوتل | [illegible] |
| حب طاعون عنبری | ۱ درجن | ۶ر | روغن تل | ۱ " | ۱۰ر | عرق تیفودیہ رجسٹرڈ | ۱ " | [illegible] |
| حب لیموں | [illegible] | ۱۰ر | روغن گندم | ۱ " | ۸ر | غازہ حسن انزا | ۱ ڈبیہ | ۱۲ر |
| خاکسی | ۶ ماشہ | [illegible] | روغن صندل | ۱ " | [illegible] | قرص ملین | ۱ درجن | ۶ر |
| خمیرہ ابریشم شیرہ عنابی | ۱ تولہ | ۸ | سعالین رجسٹرڈ | ۱ شیشی | ۱۲ر | قتلازم | ۱ شیشی | [illegible] |
| خمیرہ زمرد | ۱ تولہ | ۸ | سفوف جوہر دالا | ۱ تولہ | ۱ر | گلاب کا تیل | ۱ تولہ | ۱ر |
| خمیرہ صندل سادہ | ۱ تولہ | [illegible] | صافی رجسٹرڈ | ۱ شیشی | [illegible] | اندک سیال | " | [illegible] |
| خمیرہ تازہ بابا عنبری | ۱ " | [illegible] | صندری [illegible] | ۱ " | [illegible] | مستورین رجسٹرڈ | ۱ شیشی | [illegible] |
| [illegible] | " | [illegible] | ضماد [illegible] | ۱ تولہ | ۱ر | معجون مضعفی خاص | ۱ تولہ | ۴ر |
| دواء المسک سادہ | " | [illegible] | ضماد [illegible] | ۱ " | ۳ | نونہال رجسٹرڈ | ۱ شیشی | ۱۱ر |
| [illegible] مسک [illegible] | " | ۸ | [illegible] | ۱ تولہ | ۳ر | ہمدرد مرہم | ۱ ڈبیہ | ۱۲ر |
| [illegible] | " | [illegible] | [illegible] | ۱ تولہ | ۲ر | ہمدرد پاؤڈر | ۱ پیکٹ | ۴ر |
| دواء [illegible] | " | ۲ر | | | | | | |

# آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

سالانہ چندہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۲۱ | فہرست | یکم اپریل ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے





مدیر اعلیٰ: سید وقار عظیم ایم اے

ناشر: فضل حق قریشی دھلوی

مدیران: بھگت سروپ کھلر ایم اے — سید آفاق حسین آفاق بی اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ — پوسٹ بکس ۱۶۶ دھلی

# رفتار زمانہ

## برطانوی مال کی درآمد

غیر ملکی تجارت کے اعداد و شمار کا بہ غور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جنوری کے مہینے میں جو برطانوی مال ہندوستان آیا وہ پچھلے سال کے اسی مہینے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ چند خاص چیزوں کے اعداد و شمار نیچے درج کئے جاتے ہیں۔

| قسم مال | جنوری ۱۹۵۰ء میں | جنوری ۱۹۵۱ء میں |
|---|---|---|
| پارچہ بافی کی کلیں ۔۔۔۔ | ۔۔۔۔ ۵,۷۱,۴۱۰ | ۶,۲۷,۶۰۸ پونڈ |
| ریل گاڑیاں وغیرہ ۔۔۔۔ | ۔۔۔۔ ۵,۰۲,۱۶۰ | ۱۳,۴۲,۳۵۲ ” |
| موٹریں اور ٹیکسیاں ۔۔۔۔ | ۔۔۔۔ ۱۹,۶۴۵ | ۲,۳۸,۰۰۸ ” |
| ریل لائن والے انجن ۔۔۔۔ | ۔۔۔۔۔۔۔۔ | ۱,۱۱,۹۶۲ ” |
| لوہے اور فولاد کی چیزیں ۔۔۔۔ | ۔۔۔۔ ۳,۰۰,۰۸۴ | ۵,۳۵,۶۲۳ ” |
| لوہے کے بغیر دھاتوں کا سامان | ۔۔۔ ۳,۹۹,۵۳۴ | ۶,۳۳,۲۰۹ ” |
| بجلی کا سامان اور آلات ۔۔۔ | ۔۔۔۔ ۳,۲۳,۰۳۰ | ۵,۵۸,۳۹۸ ” |
| بنا ہوا سوتی سامان جملہ اقسام | ۔۔۔۔ ۵۱,۵۳۳ | ۹۱,۷۸۳ ” |
| اونی سامان وغیرہ ۔۔۔۔ | ۔۔۔۔ ۲۲۵,۶۹۴ | ۳,۰۰,۳۲۴ ” |
| ریشم اور مصنوعی ریشم کا سامان | ۔۔۔۔ ۷۹,۶۴۳ | ۱,۹۸,۰۳۶ |
| مرکب و مفرد ادویات ۔۔۔۔ | ۔۔۔۔ ۶,۲۸,۰۰۲ | ۷,۴۹,۲۲۴ ” |

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ چیزوں کی قیمتوں میں زبردست فرق رہا۔ مثلاً پچھلے سال پارچہ بافی کی جو کلیں آئیں ان کا وزن ۱۹۶۲ ٹن تھا جبکہ اس سال کا وزن صرف ۱۹۸۵ ٹن تھا۔ لیکن قیمت میں نمایاں فرق ہے پچھلے سال صرف ۹۲ موٹریں آئیں اور اس سال ۸۸۲۔ ۱۹۵۰ء میں جنوری سے دسمبر تک کل درآمدی سامان کی قیمت ۷,۹۷,۵۰,۰۴۷ پونڈ تھی جب کہ ۱۹۴۹ء میں کل قیمت ۰۹,۵۹,۰۷,۴۳,۱۳ پونڈ گویا نصف سے کچھ کم۔

## جہالت کا استیصال

ادارہ اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی شعبے کے صدر مقام نے اعلان کیا ہے کہ ماہ مئی کے دوران میں ایک خاص اجلاس چین کے صوبہ نانکنگ میں منعقد ہوگا جس میں مشرقی ایشیا کے ملکوں اور جنوب مغربی بحرالکاہل کے جزیروں کے وہ ماہرین تعلیم جو بنیادی تعلیم کے اصولوں پر مبصرانہ نظر رکھتے ہیں، شرکت کریں گے۔ یعنی ہندوستان، برما، سیام، ہند چینی، انڈونیشیا، ملایا، جزائر فلپائن، کوریا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ نے حصہ لینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اجلاس چین کی وزارت تعلیم کے زیر اہتمام عملی جامہ پہنے گا۔ جس میں یہ اہم موضوع زیر غور ہوگا کہ ایشیا سے جہالت کا استیصال کس طرح ممکن ہے۔ بحث و تمحیص کے بعد چین میں دو مختلف علاقے منتخب کئے جائیں گے جن میں سے ایک لازمی طور پر چینگنگ میں ہوگا۔ وہاں عوام کو تعلیم دینے کے طریقوں پر تجربے کئے جائیں گے۔ اور پھر رونما ہونے والے نتائج کو پیش نظر رکھتے ہوئے سارے ایشیا میں ایک تعلیمی نظام و نصاب قائم کیا جائے گا۔

## برطانیہ کے چاروں طرف

برٹ کورینر نامی ایک باشندۂ انگلستان نے شوقیہ طور پر برطانیہ کے گرد پیدل سفر کرکے ایک نادر مثال قائم کی ہے۔ باد و باراں کے طوفانوں ہی سے نہیں بلکہ برفباری کا مقابلہ کرتے ہوئے اس نے تقریباً تین ہزار میل کا چکر ایک ہزار ایک سو چھتیس گھنٹے میں لگایا۔ اسے وٹ بائی سے سکاربورو تک پہنچنے میں سب سے زیادہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ تیس میل کے فاصلے میں بے پناہ برف پڑی ہوئی تھی۔ اسے محض اٹھارہ انچ چوڑی ایک پگڈنڈی سے گذرنا پڑا جس کے دونوں طرف بیس فٹ اونچی برف کی دیواریں کھڑی تھیں۔ اور ہر لمحے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ کوئی حصہ گر کر اسے زندہ ہی دفن نہ کردے۔ ان مصائب و آلام کو برداشت کرتے رہنے کے باوجود اس کی ہمت نے جواب نہیں دیا۔ چنانچہ اب اس کا ارادہ ہے کہ لندن سے امریکہ جائے اور ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک پیدل سفر کرے۔ اسنے کہا کہ اس سفر سے میرا مطلب یہ ہے کہ اہل امریکہ جان لیں کہ برطانوی نوجوانوں کو اپنی مضبوط ٹانگوں پر کتنا بھروسہ ہے۔

## افغانستان کیلئے امریکی اساتذہ

حکومت افغانستان کی نئی حکمت عملی کے تحت یہ فیصلہ ہوا ہے کہ ملک بھر میں انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم و تدریس قرار دیتے ہوئے ایک جدید نصاب پیش کیا جائے۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حکومت افغانستان نے امریکی حکومت کے محکمۂ تعلیم سے فی الحال اکتیس ماہرین تعلیم

ملے ہیں تاکہ ان کو کابل کے تین بڑے کالجوں میں متعین کر کے کام فوراً شروع کر دیا جائے۔ ان اساتذہ کو تین سال کے معاہدے پر لیا جائیگا اور اخراجاتِ سفر کے ساتھ اچھی تنخواہیں ملینگی۔ ضرورت ہوئی تو معاہدے میں توسیع کر دی جائے گی۔ فارسی زبان کو چھوڑ کر انگریزی میں تعلیم شروع کرنے کا مقصد اسکے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود ان کی زبان میں اعلیٰ علوم و فنون کی کتابیں موجود نہیں ہیں اور نہ اب تک ضروری اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔

## کرۂ ارض سے چاند تک

بعض بین الاقوامی انجمنوں کی طرح برطانیہ میں ایک انجمن بین السیارگان بھی قائم ہے جس کے صدر مسٹر [illegible] اہم ہیں۔ انہوں نے انجمن کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں چاند اور دوسرے سیاروں تک پہنچنے کی صورت لازمی طور پر ممکن ہو جائے گی۔ یہ کام اس قسم کے برق رفتار ہوائی راکٹوں سے لیا جائیگا جو برطانیہ اور امریکہ کے درمیان ڈاک لانے اور لے جانے کے سلسلے میں تیار کئے گئے ہیں۔ ان راکٹوں کی رفتار ریڈار اور جوہری قوت کے ذریعہ منضبط کی جائے گی۔ [illegible] رفتار کئی ہزار میل فی گھنٹہ ہوگی۔ اس مہم میں بہت سے لوگ شروع میں [illegible] آتر جائیں گے لیکن کامیابی لازمی ہوگی۔ اس سلسلے میں [illegible] بھی بہت خرچ ہوگا۔ موصوف نے فرمایا کہ جتنی رقمیں [illegible] حرب کی تیاری پر خرچ کرتی ہیں اگر اس کار خیر میں لگا دیں تو [illegible] نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ اب بھی یہ کام حکومت کو اپنے سر لینا [illegible] اتنے کثیر اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسوقت چاند پر [illegible] موجود نہیں ہے۔ نباتات کے نشانات بھی نہیں ملتے، اس لئے وہاں سنگلاخ چٹانوں اور جمے ہوئے لاوے کے انباروں کے سوا کچھ نہیں ملیگا۔ چنانچہ وہاں سے بعض معدنیات کے نمونے لانے ممکن ہیں۔ [illegible] خیال ہے کہ وہاں مینگنیز ڈائے اوکسائڈ کی بڑی مقدار موجود ہوگی اور اس کے ذریعہ آکسیجن تیار کر کے یہاں سے جانے والے لوگ اپنی زندگی کا رشتہ قائم رکھ سکیں گے۔ لیکن ابتدا میں یہ سامان یہیں سے بھیجا پڑیگا۔ انکا اندازہ ہے کہ راکٹ کو مسلسل چار روز تک چلتے رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد وہ زمین کی کشش سے نکلکر باقی دو لاکھ چالیس ہزار میل کا فاصلہ خود طے کرے گا۔ کشش ثقل سے باہر ہو کر بعض مضحکہ خیز نتائج بھی برآمد ہونگے۔ ہو سکتا ہے کہ پانی کا گلاس اٹھانے کے بعد دوبارہ اسی جگہ نہ رکھا جا سکے یا انسان کا ایک قدم ایک لمبی چھلانگ کے برابر ثابت ہو۔ یہ خیالات اپنی نوعیت کے لحاظ سے نئے نہیں ہیں۔ البتہ سائنس کی موجودہ ترقیوں کے ساتھ ان میں کافی گہرائی ضرور پیدا ہو گئی ہے۔

## برطانیہ کو تحفے

[illegible] دوسری جنگ عظیم میں جس کے ہولناک اثرات ابھی تک لوگوں کے دل و دماغ پر طاری ہیں اور جن کے تباہکن نتائج کا خمیازہ بہت سی قوموں کو ہنوز بھگتنا پڑ رہا ہے، اتحادی ملکوں میں سے خاص طور پر برطانیہ نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی بڑی امداد کی تھی۔ برطانیہ نے نہ صرف ان ملکوں کی مدافعت کا بیڑا اٹھایا بلکہ سامانِ حرب و اغذیہ کی رسد جاری رکھ کر یہاں کے باشندوں کو ہر قسم کی اندرونی مصیبت سے بھی بچائے رکھا۔ ان خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے نیوزی لینڈ کے وزیر اعظم مسٹر فریزر نے برطانیہ کو ایک کروڑ پونڈ کا تحفہ دینے کا اعلان کیا ہے۔ آسٹریلیا کی جانب سے بھی سلسلے میں ڈھائی کروڑ پونڈ کا تحفہ پیش کیا جائے گا۔

## بلند ترین چھلانگ

اس دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ہوائی جہازوں سے [illegible] چھتریوں کے ذریعہ زمین پر اترنے یا ان میں سے سامان پھینکنے کے بہت سے تجربے کئے گئے اور ضرورتاً بھی اس [illegible] لیکن امن و عافیت کے دنوں میں کبھی کبھی یہ مشکل اور ہمت شکن کام [illegible] اختیار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ روس کے مشہور [illegible] تجربے کئی بار کر چکے ہیں۔ حال ہی میں ایک ہوائی جہاز کے ذریعہ [illegible] نکلکر اتنی بلندی پر پہنچ گئے جہاں [illegible] جیسی اہم چیز سے محروم ہونے کے باعث سانس [illegible] نہیں لی جا سکتی۔ یہ صورت سطح زمین سے تقریباً [illegible] میل کی اونچائی پر جانے کے بعد ممکن ہوتی ہے۔ وہاں سے وہ [illegible] حافظت زمین پر واپس آ گئے۔ یہ ان کی ڈیڑھ ہزارویں چھلانگ تھی لیکن [illegible] زیادہ بلندی سے کودنا پہلی دفعہ ممکن ہوا تھا۔

## سمندر پار ملکوں سے

[illegible] غذائی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے [illegible] ملکوں سے جو غلہ اناج آ رہا ہے اس سے [illegible] ہندوستان کی [illegible] برابر آ رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اسکا اندازہ [illegible] جا سکتا ہے۔

| قسم اناج | ہفتہ مختتمہ ۲۰ فروری | ہفتہ مختتمہ ۲۷ فروری |
|---|---|---|
| گیہوں اور آٹا | ۱۰٬۳۰۰ ٹن | ۲۰۰ ٹن |
| چاول | ........ | ۷٬۵۰۰ " |
| مکئی | ........ | ۳٬۳۵۰ " |
| جو | ........ | ۹٬۲۰۰ " |
| میلو | ۳۰۰ ٹن | ۱۳٬۲۵۰ " |

## ہندوستان کا تجارتی وفد

۹ مارچ کو ایک تجارتی وفد جس کی نیابت مسٹر ایم اے ایچ اصفہانی کر رہے ہیں ہندوستان [illegible] سے مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں کے دورے پر روانہ ہوا ہے۔ تقریباً نو ہفتے تک تجارتی معاملات کے تمام پہلوؤں پر گفت و شنید کرنے کے بعد یہ وفد ہندوستان واپس آ جائے گا۔ اس دوران میں اس کے تمام ارکان بصرہ، بغداد، طہران، دمشق، بیروت، فلسطین، شرق اردن، انقرہ، [illegible] اور اسکندریہ

ایک ساتھ رہیں گے۔ پھر دو حصوں میں ہو کر خرطوم اور حجاز جائیں گے۔ اس کے بعد مصر میں دوبارہ جمع ہو کر واپسی کا سفر اختیار کریں گے۔ قوی امید ہے کہ یہ دورہ ہندوستان اور مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک کے لئے سودمند ثابت ہوگا۔

## طبیہ کالج کا جشن سیمیں

۱۴، ۱۵ اور ۱۶ مارچ کو آیورویدک و یونانی طبی کالج دہلی نے نہایت وسیع پیمانے اور شاندار طریقے پر جشنِ سیمیں منایا جس میں ہندوستان بھر کے حکیموں، طبیبوں اور ویدوں کے علاوہ بہت سی ممتاز ہستیاں شامل ہوئیں۔ اس موقعہ پر طبی کانفرنس اور طبی نمائش کے علاوہ مشاعرہ، مباحثہ اور دوسرے مفید و دلچسپ امور لائحہ عمل میں شامل رہے۔ جلسے کا افتتاح سر شانتی سروپ بھٹناگر نے کیا اور پہلی نشست کی صدارت آنریبل جگ جیون رام نے فرمائی۔ آج سے اٹھاون سال پہلے یہ محسوس کرنے کے بعد کہ ہندوستان میں طبِ یونانی کو فروغ کی بجائے انحطاط نصیب ہو رہا ہے، دہلی کے معزز خاندانِ شریفی کی سب سے مقتدر ہستی اور مشہور قومی رہنما (مسیح الملک) حکیم اجمل خاں (مرحوم و مغفور) نے اس ادارہ کی بنیاد ایک طبیہ مدرسے کی صورت میں رکھی اور اپنی پرخلوص خدمات کے ساتھ اپنا قیمتی سرمایہ بھی اس کی نذر کر دیا۔ اس کے بعد پیدا ہونے والی مالی دشواریوں کو حل کرنے کے لئے سنہ ۱۹۰۳ء میں مشترکہ سرمایے سے "ہندوستانی دواخانہ" کھولا تاکہ اس کی خالص آمدنی سے ادارے کے اخراجات پورے کئے جا سکیں۔ یہ تدبیر بہت کامیاب رہی۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں اسی کے تحت ایک طبیہ زنانہ شفاخانہ قائم کیا تاکہ امراضِ زنانی کے سلسلے میں تحقیق و تجربے کے علاوہ خواتین کو طبی تعلیم دی جا سکے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں طبِ یونانی کے ساتھ ساتھ آیورویدک تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا اور دونوں علوم دوش بدوش فروغ پانے لگے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں طبیہ مدرسے کو کالج کی صورت میں ترقی دیکر گاندھی جی سے اسکا افتتاح کرایا اور تعلیم و تربیت زیادہ اعلیٰ پیمانہ پر شروع کر دی۔ اسی رسم کے پچیس سال بعد کالج کا مذکورہ بالا جشنِ سیمیں منایا گیا ہے۔ اس مبارک تقریب کو مرحوم کے صاحبزادے مسیح الملک حکیم جمیل احمد خاں نے عملی جامہ پہنایا ہے۔ اپنے والد مرحوم کی طرح موصوف کو بھی طبِ یونانی کی تحقیق اور طریقۂ علاج کے سلسلے میں زبردست شہرت حاصل ہے۔

## علوم و فنون کا قومی عجائب گھر

مرکزی اسمبلی میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حکومتِ ہند کے رکنِ تعلیم آنریبل مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ حکومت اصولی طور پر اس تجویز کو منظور کر چکی ہے کہ ہندوستان میں فنون، اثریات اور ارتقائے حیات کا ایک قومی عجائب گھر قائم کیا جائے۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ابتدائی طور پر ایک کروڑ روپے صرف ہونگے اور اسکی تکمیل پانچ سال میں ممکن ہو سکیگی۔ اسکے بعد تقریباً ساڑھے آٹھ لاکھ روپے سالانہ خرچ ہوا کریں گے۔

## محکمہ ریڈیو کی توسیع

محکمہ اطلاعات و نشریات کے رکنِ اعلیٰ آنریبل سردار پٹیل نے ایک پریس کانفرنس میں فرمایا کہ محکمہ ریڈیو کے توسیعی لائحہ عمل پر جو بڑی حد تک طے ہو چکا ہے، ابتدائی طور پر تین کروڑ ستاون لاکھ اور پھر چھیاسی لاکھ روپے سالانہ خرچ ہوں گے۔ مجوزہ خاکے کے مطابق دہلی، مدراس، بمبئی اور کلکتہ کے آلاتِ نشر میں اضافہ کرنے کے علاوہ الہ آباد، کراچی، ناگپور، بیزواڑہ، احمد آباد، کٹک، دھاڑوار، گوہاٹی اور کالی کٹ میں نئے مرکز قائم کئے جائیں گے۔ اس موقعہ پر انہوں نے کئی اور امور کی بھی وضاحت کی۔ مثلاً یہ کہ تجارتی اشتہارات کو ریڈیو سے نشر کرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ ٹیلی وژن کے لئے فی الحال کوئی خاکہ زیرِ غور نہیں ہے۔ نجی ادارے نشری مرکز قائم کرنے کے مجاز نہیں ہونگے۔ حکومتِ ہند آل انڈیا ریڈیو کو بی بی سی کی طرح پبلک کارپوریشن بنانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بی بی سی کی صرف خبریں دہلی سے نشر ہوتی رہینگی۔ اس سے زیادہ سمندر پار ملکوں کے نشریات کو ہندوستان سے ریلے کرنا ممکن نہیں ہو سکیگا۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ انتظامی سہولت اور مالی بچت کے خیال سے برطانوی ہند کو لسانی فنی اور دوسرے ثقافتی امور کا لحاظ رکھتے ہوئے پانچ بڑے علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے گا جن کے مرکز دہلی، کلکتہ، مدراس، بمبئی اور الہ آباد ہوں گے۔

## سالنامہ آجکل ۱۹۴۷ء

آج کل کا سالنامہ اس سال بھی حسبِ معمول یکم جون کو قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ 'آجکل' کی سب سے بڑی خصوصیت اسکا تنوع ہے۔ سالنامہ میں یہ تنوع جس تزک و احتشام سے رونما ہوگا، اسکا اندازہ صرف اُن اہلِ قلم حضرات و خواتین کے ناموں کی فہرست سے کیجئے جو سالنامہ میں شریک ہو رہے ہیں:

**شعراء:۔** صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی، ثاقب لکھنوی، آلِ رضا لکھنوی، قدیر لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، آنند نرائن ملا، بیتاب بریلوی، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، ساغر نظامی، روش صدیقی، جاں نثار اختر، اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی، اسد ملتانی، یوسف ظفر، فکر تونسوی، وشوامتر عادل، فراق گورکھپوری، اخترالایمان، قیصر زیدی، سلام مچھلی شہری، صفیہ شمیم، رخشت کلکتوی اور رابعہ پنہاں

**مضمون نگار:۔** حامد حسن قادری، مسعود حسن رضوی، آغا حیدر حسن دہلوی، مرزا محمد عسکری، مرزا جعفر علی خاں اثر، آلِ احمد سرور، احتشام حسین، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، آغا محمد اشرف، ڈاکٹر محمد باقر، محمد مجیب، پروفیسر محمد عاقل، مرزا محمود بیگ، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی، شوکت تھانوی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور عبادت بریلوی

**افسانہ نگار:۔** سہیل عظیم آبادی، سلطان حیدر جوش، غلام عباس، دیوندر ستیارتھی، محمد یونس احمر، شیر محمد اختر، بلونت سنگھ، شمشیر سنگھ نرولا، صالحہ عابد حسین، ناکارہ حیدرآبادی، حبیب اشعر، نریندر ناتھ سیٹھ اور ل احمد اکبرآبادی۔

مزید تفصیلات اگلے پرچہ میں ملاحظہ کیجئے۔

# برما کی یاد میں — ظفر علی خاں

برسات میں برما کی دلآویز فضا دیکھ
کشمیر کے بعد آ کے یہاں شانِ خدا دیکھ
سورج کا پتہ پوچھتی پھرتی ہے خدائی
بادل کو اِس انداز سے گردوں پہ گھرا دیکھ
آتی ہے دبے پاؤں صبا اُس کو جگانے
انگڑائیاں لیتے ہوئے سبزے کی ادا دیکھ
رنگون کی جھیلوں کے کناروں پہ چلا جا
اور نور کے سانچوں میں حسینوں کو ڈھلا دیکھ
جوڑے کی گل اندازگئ دھاوٹ پہ نظر ڈال
اور غازۂ رخسار پہ صندل کو ملا دیکھ
لب ہائے عقیقی پہ نہیں پان کی سُرخی
اس رنگ میں تو سُرخیِ خونِ شہدا دیکھ
سینہ جو برہنہ ہے۔ تو رانیں بھی ہیں عریاں
پھر کر نئی تہذیب کا اندازِ حیا دیکھ

# مولانا ظفر علی خاں

عبدالمجید سالک

مولانا ظفر علی خاں مالک جریدہ زمیندار لاہور کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں تقریباً نصف صدی سے آپ ملک میں ایک صاحب طرز انشا پرداز، شاعر اور صحافی کی حیثیت سے روشناس چلے آتے ہیں۔ آپ کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز بھی اہل ملک کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن موجودہ صحبت میں مجھے صرف ان کے کمالات ادب و شعر سے سروکار ہے۔ اس لئے ان کے حالات زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد میں اپنے موضوع کی طرف رجوع کروں گا۔

ظفر علی خاں کے والد محترم مولوی سراج الدین احمد مرحوم نے اگرچہ ڈاک خانہ کی ملازمت میں زندگی بسر کی۔ لیکن سبکدوش ہونے کے بعد آپ نے پنجاب کے زمینداروں کی خدمت و اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اور ایک ہفتہ وار اخبار "زمیندار" کے نام سے جاری کر دیا۔ جس کے پرانے پرچوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ نہایت سلیس اور سادہ اردو لکھتے تھے۔ اور غریب زمینداروں کے درد سے آپ کا سینہ لبریز رہتا تھا۔ زمینداروں کی جہالت، ان کی رسوم قبیحہ اور ان کے افلاس کے موضوع زیادہ تر ان کے پیش نظر رہتے تھے، اور زمیندار ان کی مخلصانہ سعی و جہد کو بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ مولوی صاحب مرحوم نے اپنے ہونہار اور لائق فرزند ظفر علی خاں کو علی گڑھ کالج میں تعلیم دلائی جو اس زمانے میں مسلمان نوجوان کی تعلیم و تربیت کی معراج سمجھی جاتی تھی۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد ظفر علی خاں حیدر آباد دکن چلے گئے جہاں مولوی عزیز مرزا مرحوم کی نگاہ جوہر شناس نے آپ کو منتخب کر لیا اور آپ ایک اچھے مشاہرے پر ملازم ہو گئے۔ کچھ دیر بعد آپ نے حیدر آباد دکن سے "دکن ریویو" ماہوار رسالہ جاری کیا جو چند سال تک ادب اردو کی قابل تعریف خدمت انجام دیتا رہا اور ادبی حلقوں میں مولوی ظفر علی خاں کی نظم و نثر کا چرچا اسی رسالہ کے مضامین و منظومات سے شروع ہوا۔ یہی رسالہ بعد میں لاہور سے "پنجاب ریویو" کے نام سے نکلتا رہا۔

۱۹۰۹ء میں مولوی سراج الدین احمد مرحوم کا انتقال ہو گیا اور مولوی ظفر علی خاں ملازمت سے قبل از وقت سبکدوشی حاصل کر کے وطن واپس آ گئے۔ یہاں آپ نے "زمیندار" کی عنان ادارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لیکن آپ کی بلند پرواز اور جفاکش طبیعت کو ہفتہ وار اخبار اور زمینداری مسائل کی محدود فضا نہایت تنگ نظر آئی۔ چنانچہ آپ "زمیندار" کو اپنے گاؤں کرم آباد (ضلع گوجرانوالہ) سے اٹھا کر لاہور لے آئے اور کچھ مدت بعد اس کو ہفتہ وار سے روزانہ کر دیا۔ ادبی ذوق اور لطف زبان کے وہ رسیا جن کو دوسرے اخباروں میں اپنے مذاق سخن کی تسکین کا سامان نہ ملتا تھا "زمیندار" کی نظم و نثر کے دلدادہ ہو گئے۔ اتنے ہی میں جب طرابلس و بلقان کے ہنگاموں نے مسلمانوں میں ہیجان پیدا کیا تو مولانا ظفر علی خاں کی جرأت و بیباکی نے زبان و قلم کے وہ جوہر دکھائے کہ ان کا نام ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونجنے لگا۔ دوسرے اخبارات اس میدان میں شکست کھا گئے اور ہر طرف "زمیندار" اور مولوی ظفر علی خاں کا طوطی بولنے لگا۔

۱۹۱۴ء میں جنگ یورپ کا آغاز ہوا یہ "زمیندار" اور مولانا ظفر علی خاں پر ابتلاؤں کا دور تھا۔ نظر بندی کے زمانے میں آپ کو غیر سیاسی اخبار نکالنے کی اجازت ملی تو "ستارۂ صبح" پہلے ہفتہ وار اور پھر روزانہ نکلنے لگا جس میں مولانا ظفر علی خاں نے ادب و انشا کے علاوہ رائج الوقت تصوف پر بے پناہ حملے کئے اور یہ بھی ایک اچھا خاصا ہنگامہ رہا۔ "ستارۂ صبح" کو بند کرنے کے بعد مولانا اعلیٰحضرت شہریار دکن کے ارشاد کی تعمیل میں پھر حیدر آباد پہنچ گئے اور وہاں دار الترجمہ کا کچھ کام آپ کے سپرد کیا گیا۔ لیکن جنگ یورپ کے ختم ہوتے ہی آپ پھر وہاں سے واپس تشریف لے آئے۔ اور ۱۹۲۰ء کے اوائل میں "زمیندار" کو دوبارہ جاری کر دیا۔ تحریک خلافت، ترک موالات، قید و بند، رہائی، اور مختلف انواع کے نشیب و فراز کے بعد مولانا ۱۹۳۷ء میں مرکزی اسمبلی کے ممبر ہو گئے اور ۱۹۴۵ء میں دوبارہ منتخب ہو گئے۔

غرض مولانا کی زندگی پینتیس سال سے ادب و سیاست کے گلستان و خارستان کی شیرازہ بندی ہے لیکن میں تو کانٹوں کو بچا کر صرف پھول چننا چاہتا ہوں۔ اور چونکہ مجھے چند سال تک مولانا کی ہم قلمی کا شرف حاصل رہا ہے۔ اسلئے میں ان کے اخلاق و اوصاف سے بخوبی واقف ہوں۔ وہ انسان کی حیثیت سے بے حد محبت پرور، شگفتہ مزاج، بذلہ سنج، لطیفہ گو، دوست نواز اور شفیق بزرگ واقع ہوئے ہیں۔ چائے اور حقے سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ اور جب یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں تو فراغ خاطر کے عالم میں ان کے منہ سے نظم و نثر کے پھول فی البدیہہ جھڑتے ہیں۔ بہت سے اوصاف و کمالات کے جامع ہیں۔ نہایت سلیس، شگفتہ اور بہار آفریں انداز میں نثر لکھتے ہیں۔ نظم میں ایک خاص اور بدیع طرز کے موجد ہیں۔ ان کی زبان دانی اہل زبان کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ وہ اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں بے تکان تحریر، تقریر اور نظم پر قادر ہیں۔ ترجمے کے فن میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ وہ مدح و ہجو، مزاح و استہزا کے بادشاہ ہیں۔ کسی ممدوح کو آسمان پر چڑھا دینا اور کسی شامت زدہ کو خاک میں ملا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

نثر میں مولانا ظفر علی خاں کی چند تالیفات موجود ہیں۔ ان میں زیادہ تر انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں مثلاً معرکۂ مذہب و سائنس، خیابان فارس۔

جس میں منگل، معاشرت، سنہر گھونگا، میری عینک وغیرہ۔ "لطائف الادب" چند دلچسپ مضامین کا مجموعہ ہے۔ "غلبہ روم" آیۂ غلبت الروم فی ادنی الارض کی تاریخی تفسیر ہے۔ غرض کتابوں کے معاملے میں مولانا کا کام بے حد غیر مرتب رہا ہے۔ ترجمے زیادہ تر بعض دوستوں کی فرمائش سے کئے۔ مضامین بیشتر اخباری ضرورت سے لکھے۔ شاید دو تین کتابیں ایسی بھی ہوں جو بالاہتمام اپنے شوق سے تصنیف کی ہوں۔ ورنہ آپ کی تالیفاتِ نثر اکثر اتفاقات کا نتیجہ ہیں۔ حالانکہ اگر آپ کسی پروگرام کے ماتحت تحریر کتب کا کام شروع کرتے تو علم و ادب کا بہت بڑا اور پائدار سرمایہ فراہم ہو جاتا۔ صحافی کی حیثیت سے آپ نے ہزاروں افتتاحیے اور شذرے لکھے ہوں گے۔ لیکن ان کی حیثیت بہرحال عارضی و ہنگامی ہے۔ میں اس مضمون میں مولانا ظفر علی خاں کی نثر کے نمونے پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا۔ کہ آپ کی نثر خواہ کتاب کی صورت میں ہو یا مقالے یا افسانے کی شکل میں ہو۔ اس کا کوئی حصہ دلچسپی اور شگفتگی سے خالی نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۵ء میں مولانا کے مجموعہ مضامین "لطائفِ الادب" کا یہ دیباچہ لکھتے ہوئے میں نے ذیل کی چند سطور لکھی تھیں۔ جو مفید مطلب ہونے کی وجہ سے، پیش کرتا ہوں:-

> ظفر علی خاں نے میدانِ صحافت میں قدم رکھتے ہی جہاں سیاسی خیالات و افکار میں وہ انقلاب عظیم پیدا کر دیا جسکے کرشمے آج ہمیں اپنے گرد و پیش نظر آ رہے ہیں۔ وہاں اپنے حسنِ تحریر اور قوت تحریر سے زبانِ اردو کی وہ خدمت انجام دی جسکے کامل استقصا کے لئے سالہا سال سے آج تک کے تمام جرائد و رسائل اور دیگر مطبوعات کا وقت نظر سے مطالعہ کرنا اور پھر ان منتشر جواہر ریزوں کو یکجا جمع کرنا سالہا سال کی محنت شاقہ چاہتا ہے، انگریزی زبان کے صدہا محاورات ہزارہا الفاظ اور بے شمار فقرات اس ہمہ گیر انشا پرداز کے کمال ترجمہ کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے اور عروس اردو کی جبین ناز کا زیور بن گئے۔ اندازِ تحریر کی دلاویزی، تشبیہ و استعارہ کا اچھوتا پن، ٹھیٹھ اردو محاورات اور فارسی تراکیب کا دلکش امتزاج، جا بجا ظرافت و تفنن کے چھینٹے، الفاظ کا شکوہ، فقرات کی بندش اور بیان کی روانی وہ محاسن ہیں جن کے شکر احساں سے زبان اردو کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔

اخبار نویس کی ایک بہت بڑی بدقسمتی یہ ہے۔ کہ اخبار نویسی اس کے تمام دوسرے اوصاف کو دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے۔ اور لوگ اس کے علم و فضل، اس کے ادب و شعر اور دوسرے کمالات کو فراموش کر کے اسکو محض اخبار نویس کی حیثیت سے جاننے لگتے ہیں۔ اب مولانا ظفر علی خاں ہی کو دیکھئے۔ ان کی بدیع المثال اور دلاویز شاعری عمی فن کی خاک میں اس طرح دب کر رہ گئی کہ بعض نقادوں کو شعرا کا تذکرہ مرتب کرتے وقت ظفر علی خاں کا خیال ہی نہیں آتا۔ حالانکہ وہ ان بڑے بڑے مشاقوں پر جو شعر الشعرا بنے پھرتے ہیں ہزار وجوہ فضیلت رکھتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی نظموں کے متعدد مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ حبسیات۔ بہارستان۔ نگارستان اور چمنستان کے نام کس نے نہیں سنے اور کون نہیں جانتا کہ ان مجموعوں میں نظموں کی تعداد دو ہزار سے کم نہ ہوگی میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان میں کثیر التعداد نظمیں ایسی ہیں جو اخباری روزمرہ کے ہنگامی واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئیں اور ان کی حیثیت عارضی ہے۔ لیکن ان کو اردو شاعری کے ذخیرے سے کون خارج کر سکتا ہے۔ سودا انشا کی ہجویں اور ان کے مستزاد اور دوسری ہنگامی نظمیں اب تک اردو کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ تو مولانا ظفر علی خاں کا یہ ہنگامی کلام کیونکر مستحق تغافل قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک زمانے میں میں نے مولانا کو مشورہ دیا تھا کہ آپ اپنی نظموں کو دو الگ الگ مجموعوں میں تقسیم کر دیجئے۔ ایک میں مستقل حیثیت کی منظومات ہوں اور دوسرے میں عارضی اور ہنگامی نظمیں یکجا کر دی جائیں تو یہ کتاب بڑے بڑے شعرا کے مجموعوں پر بھاری ہوگی۔ اسلامی مدارس میں ہمیشہ کیلئے بطور نصاب رائج کی جا سکے گی اور یونیورسٹی کے امتحاناتِ اردو کی کتابوں میں قابل قدر اضافے کا باعث ہوگی۔ لیکن خدا جانے میرا مشورہ کیوں قبول نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ بعض ہجوی، اختلافی، ہنگامی اور مبتذل نظموں کی وجہ سے مولانا کے مجموعوں سے تعلیم و تدریس وغیرہ میں استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ آئندہ ایڈیشنوں کی ترتیب کے وقت میرے مشورے کو ضرور مدنظر رکھا جائے گا۔

اب میں آجکل کے پڑھنے والوں کی خدمت میں مولانا ظفر علی خاں کے کلام سے کچھ اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بحر بیکراں کا انتخاب کیوں کر کروں۔ آپ کی شاعری کے موضوع اور اس کی خصوصیات سن لیجئے۔ حضور سرورِ کائنات کی ذاتِ مقدس سے والہانہ شیفتگی، اسلام سے بے پناہ محبت، وطن دوستی، تاریخ اسلام، حضور نظام سے اظہار عقیدت اور احرار۔ کانگرس۔ ہندو سبھا اور قادیانی فرقے کی مخالفت خصوصیات یہ ہیں زبان نہایت پاکیزہ، محاورات صحیح، شوخی، رنگینی منظر نگاری، "کیری کیچر" اور قافیہ نوازی

رسول اللہؐ کی شان میں بے شمار قصائد "بہارستان" میں موجود ہیں۔

ایک قصیدے کے چند اشعار سنئے۔ ؎

اے کہ ترا جمال ہے زینتِ محفلِ حیات — دونوں جہاں کی رونقیں ہیں ترے حسن کی زکات
بارگہِ الست سے بخش دیئے گئے تجھے — سب ملکی تصرفات سب فلکی تجلیات
چہرہ کشا کرم ترا قاف سے تا بہ قیرواں — لطف ترا کرشمہ سنج کعبہ سے تا بہ سومنات

دیکھتے ہی ترا جلال کفر کی صف الٹ گئی    جھک گئی گردن ہبل۔ ٹوٹ گیا طلسم لات
چون و چگونہ و چرا تا بجا وتا کجے    حل کئے ایک بات میں تو نے یہ سرمدی نکات
سر پہ اندھیری رات ہے گھر گئی ہے بھنور میں ناؤ    موج بلا ہے تاک میں دور ہے ساحل نجات
تھام کے پایۂ عرش کا کر بہ ادب یہ التجا    اے کہ ہے مبدء فیوض ایک فقط تری ہی ذات
مورد لطف خاص پر کس لئے آج یہ عتاب    ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشۂ چشم التفات

ایک اور نظم میں ارشاد ہوتا ہے ؎

اے کہ آرائش ہماری داستاں کی تجھ سے ہے    اے کہ افزائش ہماری عز و شاں کی تجھ سے ہے
ملت بیضا کی رونق تیرے دم سے برقرار    تمکنت اس بے تجمل کارواں کی تجھ سے ہے
ہے خمیر مایۂ حسن عرب تیرا جمال    دلربائی نجد کے بانکے جواں کی تجھ سے ہے
ساری دنیا بن گئی ہنگامہ زار کشت و خوں    کچھ اگر امید ہے امن و اماں کی تجھ سے ہے

اس ورق پر پرتو افگن ہے ترا سحر جلال
اور بہار اس خامۂ معجز بیاں کی تجھ سے ہے

۱۹۱۲ء کے اواخر میں مولانا انگلستان گئے۔ سمندر کے سفر سے ایک عجیب کیفیت دل و دماغ میں پیدا ہوئی۔ جس کے ماتحت آپ نے ایک طویل نظم لکھی "سمندر کی روانی اور تخیل کی جولانی"۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے محیط بیکراں اے بحر ناپیدا کنار    تیری یکتائی ہے نقش وحدت پروردگار
تیرے عارض پر جمال اسکا فروغ افشاں کبھی    اور جلال اس کا کبھی تیری جبیں پر جلوہ بار
ہیں تری پہنائیاں سنجاب دامان خیال    اور تری جولانیاں آغوش فطرت کا فشار
تیرا اک چین ابرو آفت جان حزیں    تیرا اک خندہ لب لطف عمر مستعار
حسن تیرا لازوال اور عمر تیری جاوداں    ہو نہیں سکتی خزاں سے [illegible] تیری بہار
نیلی نیلی ہیں تری موجیں پرا باندھے ہوئے    یا ہیں قدرت کی فوجیں ہیں قطار اندر قطار
تو سکوں میں ہے نشان رافت و لطف خدا    اور طوفاں میں دلیل قہر و خشم کردگار
میری عشرت گاہ بنتی جن دنوں تھی شوخ سیج    دست شوخ ماہتاب اور تیرے سینے کا ابھار
میں نے دیکھا ہے ترا ہیبت فزا جوش و خروش    ہو چکی تھی ظلمت شب جب محیط روزگار
بجھ چکی تھی آسماں پر مشعل ماہ منیر    مشتعل گردوں میں جھمک زن تھی انجم کے شرار

اتنے میں خیال آیا کہ اسی سمندر کی لہریں خاک عرب کو بوسے دے رہی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا ؎

میں نے دیکھا ہے تجھے خاک عرب کو چومتے    اے خدا تیرے اس آئین پر مری جانیں نثار
سجدہ کرتا رہا ہے جس [illegible]    لے تو لوٹا گا اس خاک اطہر کا غبار
عرش پر گر فرش طیاری ہے تیرا اس خاک پر    جس میں محو خواب ہے کون و مکاں کا تاجدار
وہ کہ جس کی کفش برداری نے بخشا عروج    جو گدا تھے ہو گئے آدھے جہاں کے شہریار

اس کے بعد سیاسیات کی طرف عنان توجہ پھر گئی ہے لیکن ندرت [illegible] منظر نگاری، جذبات، جوش و خروش اور قدرت کلام کا شاہکار ہے۔

اب ذرا شوخی و رنگینی کے کرشمے ملاحظہ ہوں۔ ایک طالوی حسینہ کی شان میں فرماتے ہیں۔ اور کیا خوب فرماتے ہیں ؎

اے کشور اطالیہ کے باغ کی بہار    لاہور کا دامن ہے تیرے فیض سے چمن
ہنگامہ جمال تری دلربا ادا    پروردگار عشق ترا چلبلا چلن
الجھے ہوئے ہیں دل تری زلف سیاہ میں    ہیں جس کے ایک تار سے وابستہ سو فتن
پروردۂ فسوں ہے تری آنکھ کا خمار    آوردۂ جنوں ہے تری بوئے پیرہن
پیمانۂ نشاط تری ساق صندلیں    میخانۂ سرور ترا مرمریں بدن
رونق ہے ہوٹلوں کی ترا حسن بے حجاب    جس پر فدا ہے شیخ تو لٹو ہے برہمن

مولانا سید اکبر حسین الہ آبادی نکتہ آفرینی اور قافیہ نوازی میں مثال نہ رکھتے تھے۔ ان کا ایک شعر مشہور ہے ؎

پکا لیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہمارا کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

اس پر مولانا ظفر علی خاں کی قافیہ نوازی بیدار ہو گئی۔ ملاحظہ فرمایئے۔ اس زمین میں کیسے کیسے گل کھلائے ہیں ؎

زمین سنگلاخ اکبر نے کیسی منتخب کی ہے    کہ مشکل ہو گیا اس میں قوافی کو بنولانا
صلاح الدین نے فصل صلیبی جس سے کاٹی تھی    درانتی اس ہلال نو کی ہنگام درو لانا
بہانی آ کے اس بت نے جفا کاری کی کچھ ایسی    اور اس پر مجھ سے کہتا ہے وفاداری کی تو لانا
حریم مصطفیٰ کے بام و در جس سے فروزاں تھے    مرے اجڑے شبستاں میں اسی مشعل کی ضو لانا
چڑھا انگریزی کا پادری تو اپنے منبر پہ    کدھر ہیں آپ مولانا جو تھے بالفضل اولانا

حقیقت یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کو قوافی بنانے میں خاص کمال حاصل ہے اور قدرت سخن کی وجہ سے وہ ہر قافیئے میں رونق پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک نظم میں التزام کیا ہے کہ گھر گھر۔ فر فر۔ صرصر کی طرح کے قافیے لائے جائیں۔ ملاحظہ ہو ؎

عرب کا اور عجم کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا    جہاں میں روشنی پھیلی چراغ کعبہ کی گھر گھر
جب اس کی تیل بتی کا نبی خود کر گئے ساماں    بجھا سکتی ہے پھر کب اس دیے کو کفر کی فر فر
یہاں الہام کی باتیں وہاں اوہام کی گھاتیں    ادھر اسلام کی تکبیر ادھر اصنام کی ہر ہر
رسول اللہ کی امت کی رنگا رنگیاں دیکھو    کہیں چینی کہیں ترکی۔ کہیں ہندی کہیں بربر
سلام اس پر کیا اس طرح ازبر جس نے قرآں کو    کہ جو کچھ سن لیا جبریل سے دہرا دیا فر فر
ترے دروازے کی چوکھٹ ہی یارب اور سر میرا    یہ سر جب ہو چکا تیرا تو پھر میں کیوں پھروں در در

مرا خس پوش کاشانہ کہیں اچھا ہے راحت میں
اس ایوان مشید سے جو ہے پروردۂ مرمر

ایک دفعہ لاہور میں ایک رقاصہ آئی جس کا نام تھا "اقبال تیلی"۔ اسکے رقص کا شہرہ اسقدر عام ہوا کہ وضیع و شریف سب ٹوٹ پڑے۔ مولانا نے پانچ اشعار لکھے۔ اور قافیہ تھا "تیلی" ؎

سر راہ اک اشتہار آج دیکھا    کہ ناچیں گی شب کو مس اقبال تیلی
رسن سازیوں کے دکھائینگی جوہر    بکے گی تھیٹر میں جادو کی سُتلی
قلم کا تو سنسر نے سر کاٹ ڈالا    زبان کاٹ کر آپ کر دیں گی تتلی

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

# لوک گیت

**دیوندر ستیارتھی**

اودھ کی ایک ضرب المثل میں دکھ نے بھگوان سے اہیر کی جیتی آزمائی گئی ہو [illegible] ملے تو ستو کھائے [illegible] ملے تو اہیر سے بچو [illegible] یعنی ان نہ ملے تو ستو کھانا چاہئے۔ اور جب کوئی انسان نہ ملے تو اہیر سے بات چیت شروع کر دے [illegible] ہے کہ [illegible] کچھ زیادہ سادہ دل واقع ہوا ہے۔ وہ دوسروں [illegible] زیادہ [illegible] ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر بگڑ کر لٹھ دے مارتا ہے [illegible] برتری کی دلیل ہو سکتی ہے وہ ہے اس [illegible] سے بڑے [illegible] وہ پہاڑوں کی پوری قوت سے گاتا ہے۔ اور ممکن ہے کچھ لوگ اس سے سنگیت کو گانے سے زیادہ چلانا [illegible] زیادہ ہو جائیں۔ اہیر کا برہا جو گھونٹ گونجتا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ [illegible] کے اونچے سروں سے اہیر کا اپنا دل [illegible] دوسروں کا۔ کیونکہ دوست [illegible] کے [illegible] زیادہ ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

نائی، دھوبی، کہار، اہیر سب کا اپنا سنگیت ہے۔ [illegible] گیت بھی گائے جاتے ہیں جو بہت بڑے [illegible] نہیں سمجھے جاتے [illegible] ہے کہ وہ دھوبیوں کی [illegible] نکال سکیں۔ اسی طرح کہار [illegible] کی دلیل [illegible] ہیں۔ لوک گیت کے سانچے میں ڈھل کر بات سخن [illegible] یہی ہوتا آیا ہے۔ گاؤں کی زندگی کا [illegible] کے ساتھ بے تکلفی محسوس کرتے۔ لوک گیت کی [illegible] چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں رہتی۔ ہر کسی کو اپنی راگنی پر ناز ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں کی راگنی بے رس ہے۔ بلکہ ایک دوسرے کا سنگیت اپنی اپنی سرحد پر کچھ اس طرح ڈھل گیا ہے کہ ایک نیا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ ایک خاص طرح کی آمیزش [illegible] آپ ہی آپ پیدا ہو جاتی ہے جو شروع سے لوک گیت کے [illegible] رہی ہے۔ مثلاً ایک ہندی لوک گیت ہی کو لیجئے جو پورب میں گایا جاتا ہے۔

بڑھوا کہنر واکے آئی بڑھیا تو [illegible] تلوا میں جال۔\
بڑھوا نہ پاوے جو ایک ایک مچھریا تو بہیانے گال۔\
بڑھوا مور جیا کے جر نیا [illegible] دیکھ جری جائے۔\
ہے بوی دائی تو کہے روٹھ چڑھوے جوای بڑھوا مری جائے۔

یعنی بوڑھے کہار پر بڑھاپا آیا تو تالاب میں جال پھینکنے لگا۔ بوڑھے کو ایک بھی مچھلی نہیں ملی تو کھسیانہ ہو کر بہو کا گال مسلتا ہے۔ یہ بوڑھا میرے جی کا جنجال ہے۔ میرے ماتھے کی [illegible] دیکھ کر جل اٹھتا ہے

[illegible] جو تمام جلے تو تجھے [illegible] چڑھوں [illegible]

بے [illegible] یہ حال ہے کہ اب [illegible] بال بھی گایا [illegible] ہے۔ یوں ہی ہوتا ہے [illegible] خوب [illegible] لیکن چند قطروں [illegible] مطلب نہیں [illegible] تھا [illegible] خوب [illegible] ہیں۔

[illegible] مخصوص راگ [illegible] قائم کرتی ہے [illegible] کا [illegible] ہے یہی [illegible] نہیں ہوتی۔ کیونکہ [illegible] کے [illegible] برابر [illegible] رہتے ہیں۔ بلکہ [illegible] سے [illegible] بول [illegible] سکتے ہیں۔ لوک گیت کا [illegible] بہت دور رہتا [illegible]

[illegible] جوت [illegible] سے [illegible] کی [illegible] کے بیٹوں کے [illegible] لوک گیت کا [illegible] لوک [illegible] میں [illegible] لوک گیت شہر تک آ پہنچے ہیں [illegible] ہے۔ راستے ہی میں ان کی [illegible] بہت حد تک کم ہو چکی ہوتی ہے۔

انسانی فطرت کی [illegible] اور [illegible] لوک گیت کی [illegible] کی دلیل ہے گانے والوں کا ہر طبقہ اپنی پسند کا خیال رکھتا ہے۔ روایتوں سے بے نیاز [illegible] کا سوال نہیں اٹھتا۔ ماحول کا دباؤ ایک فاضل قدر چیز ہے جو لوک گیت کو حقیقت نگاری سے بہت دور نہیں بھٹکنے دیتا۔ نئے گیت ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن صحیح اور صحت مند گیت وہی قرار دیئے جاتے ہیں جو زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار کا جائزہ لینے کا کام خوش اسلوبی سے [illegible] دیتے ہیں۔ سماجی اور اقتصادی احساس گانے والوں کو ہمیشہ [illegible] رہتا ہے۔ لیکن بنیادی احساسات جوں کے توں قائم رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک ملک کے لوک گیت اس کے تہذیبی سفر پر اچھی خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔ وہاں یہ بھی حق ہے کہ اس کے گیت دور دراز ملکوں کے لئے بھی روحانی تاثیر اور تخلیقی تحریک کے باعث ثابت ہوتے ہیں۔ اور یہ امر لوک گیت کی عالمگیر حیثیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

جیسے جوت سے جوت جگائی جاتی ہے۔ پرانے گیت نئے گیتوں کے جنم داتا بنتے ہیں۔ رنگ جھمک ستارے سے چمکتے ہیں اور بہت سے پرانے اور نئے گیت انہی ستاروں کے گرد گھومتے ہیں۔ رت رت کا جوار بھاٹا درختوں کے سائے، دھرتی کی سوندھی سوندھی سگندھ۔ انسان اور مویشیوں کا ملاپ، آزاد کھلی ہوائیں، ایسے بیسیوں مضامین لوک گیت کے معمولی سے معمولی خاکے میں رنگ بھر دیتے ہیں۔ ادھر ایک بھیڑ بکریاں چرانے والا کوئی چھوکرا اپنی گھنگھریلی اون والی چاہیتی بھیڑ کی تعریف شروع کر دیتا ہے۔ ادھر جنگلی خود رو پھول دھرتی کی مسکراہٹ کا مطالبہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ادھر کسان یہ کہتا سنائی دیتا ہے، میرے بیل مجھے زندہ رکھتے ہیں۔ کسان کی بیوی گھر بھر دنی ہے اور من ہی من میں اداس ہو رہی ہے، سوچتی ہے ابکے تو بیٹا آ جانا چاہیے، جبھی کہتی ہوں کہ کوکھ ہری ہوئی ہے، کہیں کوئی دلہن سونے کے کنگن پہنے کھڑی ہے اور نند کو للچا رہی ہے۔ . . چندن بن سوکھ گیا اور عورتیں اداس ہو گئیں۔ . . . . کہیں کوئی منچلا دلہن کو جگا کر کہتا ہے اٹھ سندری میں پردیس جا رہا ہوں، تم سپنے کی منت کیا کرو گی تا کہ میرا درشن نصیب ہو سکے، کہیں کوئی شکایت ہے میرا بالم تو بالک ہے اور میں سولہ برس کی ہوں، ہائے میں نے پچھلے جنم میں کونسا پاپ کیا تھا کہ جوانی کا یہ سراپ ملا، کہیں کوئی عورت کہہ اٹھتی ہے، ہے سورج بھگوان، میں نے بار بار پرارتھنا کی کہ مجھے عورت کا جنم مت دو، اگر عورت کا جنم دو تو مجھے سندر نا نہ دو، اگر سندر بنا دو تو مورکھ پتی نہ دو، اگر مورکھ پتی دو تو مجھے بانجھ مت رکھیو، اگر بانجھ رکھو تو سوت مت دو، ہے سورج دیوتا تم نے مجھے سوت دی، ہائے مجھ سے کونسا اپرادھ ہو گیا تھا، نہ بنجر دھرتی بھلی نہ بانجھ عورت، بیٹے کے لئے بار بار سورج کی منت مانی جاتی ہے۔ ایسے ایسے سکھ دکھ کے ان گنت گیت ہندوستان کے کونے کونے میں گائے جاتے ہیں، ایک کا سکھ دکھ سب کا سکھ دکھ، یہ لوک گیت کا بنیادی اصول ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ شاعری کا زوال شروع ہو جاتا ہے، یہ بات لوک گیت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے

## ساجن روپ پجاری نکلے

بھونروں نے بھی کہا تھا ایسا — پی کو جان نہ اپنے جیسا
لوگ جنہیں کہتے تھے یوگی — اکثر وہ سنساری نکلے
ساجن روپ پجاری نکلے

میں نے سمجھا پیار کریں گے — اور دل کا نہ دھیان دھریں گے
جلنے نین تھے بھولے بھالے — اتنے اتیاچاری نکلے
ساجن روپ پجاری نکلے

پریم پجاری کہنے والے — پریم نگر میں رہنے والے
دو دن اس دنیا میں آکر — جوبن کے بیوپاری نکلے
ساجن روپ پجاری نکلے

بسمل شیخوپوری

جو لوگ گاؤں سے نکل کر شہر میں مزدوری کرنے چلے آتے ہیں وہ گاؤں کے شعر و نغمے سے ناطہ توڑ بیٹھتے ہیں، ان کے بچے گھٹیا درجے کے فلمی گیت گنگنانے لگتے ہیں، مزدوروں کے ہاں گانا بجانا ضرور ہوتا ہے، لیکن ان محفلوں میں نسل در نسل چلا آنے والا سر تال اپنی شکست کی آواز نظر آنے لگتا ہے۔ پرانے اور نئے کی کچھ ایسی کھچڑی سی پکنے لگتی ہے جیسے جنتا کے فن کا زوال سمجھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ یہاں پرانے گیت گدی سے اتارے ہوئے راجہ کی طرح ایمان کا کڑوا کسیلا رس چکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جنتا سے اس کی صدیوں کی میراث چھن گئی۔ اپنے فن سے بیچارے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ دوسرے طبقوں کے فن کو یہ اپناتے بھی ہیں تو ہمیشہ نقل کا احساس ہوتا ہے۔

لیکن جب دور دراز بنگال میں پدما کے کنارے دھرتی کا کوئی لال گا اٹھتا ہے تو اس کی آواز جنتا کی شاعری کی نمائندہ ہوتی ہے۔

"بھو میں کیپنے کا پیچھے اٹھ لسے ماچھیر ڈِم!"

یعنی بھونچال اتنا زبردست ہے کہ اس کے کارن ندی کا جل ہل رہا ہے۔ یہیں تک بس نہیں جل کے اندر مچھلی کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ بھی کانپ اٹھتا ہے۔ حقیقت بعد تخیل کا یہ امتزاج جنتا کے فن کا خاص جوہر ہے۔

یا جب پورب کی کوئی کسان دولہن گاتی ہے تو ان گنت نسلوں کے شعری سرمایہ کا آسرا لیتی ہے۔

"اٹاریوں پہ گرا رے کبوتر آدھی رات!"

آدھی رات کا تصور متعدد گیتوں میں نمایاں ہے۔ بیلا پھولے آدھی رات، اسی مالا کا منکا ہے۔ آدھی رات کو اٹاری پر گرنے والا کبوتر ضرور کوئی نامہ بر ہوگا جو بالم کا پریم پتر لے کر اڑا چلا آیا ہوگا۔ اور بڑی مشکل سے آدھی رات تک پہنچا ہوگا۔ محبوب اور محبوبہ بے حد بیقرار ہوں گے ورنہ اٹاری پر کبوتر نہ گرتا۔ لوک گیت نے کبوتر کو امر کر دیا ہے۔ اور یہ بیلا جو آدھی رات کے وقت کھلتا ہے یہ بھی جنتا کے فن کا بے پناہ جوہر لئے ہوئے ہے۔ کوئی چاہے تو گھنٹوں بیٹھا اس کی تشریح کرتا رہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کر آیا ہوں، لوک گیت تو گانے کی چیز ہے اور

جنتا نے اسے زندہ رکھ چھوڑا ہے، تو محض ایک ہی نکتہ نگاہ سے کہ اس کا دل بہلتا ہے۔ اور جب گاؤں کی گوری گاتی ہے "پیا سونے دے موں کو جگی ساری رات"، تو پس منظر میں آدھی رات کا جادو جاگر ہو اٹھتا ہے۔

نئے زمانے کے گیتوں میں موٹر گاڑی گاؤں کے کچھ راستے پر دھول اڑاتی نظر آتی ہے۔ ایک بھوجپوری جھومری کو لیجئے۔

میں راجہ رانی کی بیٹی کہو تو جرمانہ کرا دو جی
کچی سڑک پر کنکر بچھا دو
انھیں پہ چلے موٹر گاڑی
دلی سے کھبریا منگا دو جی

یہ دور دراز گاؤں کی گوری دلی کی خبر کے لئے اتنی بیقرار کیوں ہے؟ شاید یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اب گاؤں شہر سے الگ تھلگ زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔

ایک دوسرا بھوجپوری جھومر سنئے۔

رسیا گاڑی چلت مورا بھوکھ لگت ہے، پیڑا ہے متھرا کو
رسیا گاڑی چلت مورا پیاس لگت ہے، گڑوا ہے گنگا کو
رسیا گاڑی چلت مورا دوڑ ٹکھت ہے، لکڑی ہے آگرے کو
رسیا گاڑی چلت مورا نیند لگت ہے، سیج ہے پٹنے کو

ظاہر ہے کہ یہ گاڑی معمولی بیل گاڑی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ بیل گاڑی جو پانچ ہزار برس پیشتر کے موہنجو دارو دور کی یاد دلائے۔ یہ گاڑی تو بہت تیز رفتار سے چلتی ہوگی ورنہ متھرا، آگرے اور پٹنہ کا تصور اتنی پھرتی سے قائم نہ کیا جا سکتا۔ یہاں ضرور ریل گاڑی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کے تیسرے درجے والے ڈبے میں بیٹھے بیٹھے گوری کو بھوک لگتی ہے تو اسٹیشن پر سے آواز آتی ہے متھرا کا پیڑا کھاؤ۔ اور اگلے ہی لمحے پیاس لگنے پر گنگا جل پینے کو مل جاتا ہے۔ اسی طرح پھر ہونٹ سوکھنے لگتے ہیں تو آگرے کی لکڑی مہیا ہو سکتی ہے اور آخر میں پٹنہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جہاں گوری کا بالم شاید مزدوری کرتا ہے۔ گوری بھی پٹنہ میں رہے گی، وہیں اس کی سیج لگے گی۔ تنگ سی کوٹھری میں۔

پنجاب کے ایک نئے گیت میں دوسری عالمگیر جنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کوئی عورت کہتی ہے۔

دن گنک گئے مہینے ٹل گئے
تے یدھ پارے نہیں مکیا!

یعنی دن بیت گئے لیکن یہ جنگ ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ اور اب جبکہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور سپاہی ضرور گوری سے ملاقات کرنے واپس آ چکا ہوگا۔ گوری کا گیت کروٹ بدلنے پر مجبور ہے۔

آخر میں صرف یہی عرض کرنا ہے کہ لوک گیت کے رسیوں کو چاہئے کہ جنتا کی زندگی اور اس کے فن کا صحیح تصور قائم کریں۔ اگر کوئی شہری ادارہ کسی راج نرتکی کو مخاطب کرکے یہ کہہ اٹھتا ہے کہ راج نرتکی آج سے میں تیرا جنتار کھتا ہوں تو گا کہ اس سے جنتا کے دل بہلا دے کا سماچار ملے۔ اور اگر یہ راج نرتکی سچ مچ لوک گیت گاتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ لوک گیت کی میراث بے پناہ قوت کے احساس سے سننے والوں کے دل و دماغ کو نہ گرما سکے لیکن جنتا کے دل بہلا دے کا صحیح احساس خود جنتا کی زبان سے اس کے پرانے اور نئے گیت سننے ہی سے ممکن ہے بشکریہ اجازت آل انڈیا ریڈیو

## غزل — شعری بھوپالی

ابھی نہیں روشِ غم پہ اختیار مجھے
ذرا سنبھال کے لے چل خیالِ یار مجھے

سمجھ کے اپنی محبت کا راز دار مجھے
کسی نے سونپ دیا دردِ آشکار مجھے

یہ کون ہے کہ پسِ پردۂ بہار مجھے
دکھا رہا ہے شبیہ جمالِ یار مجھے

نہ خود ہوں بس میں نہ دل پر ہی اختیار مجھے
یہی ہے وقت چرا لے نگاہِ یار مجھے

وہ ابتدائے محبت کا عالم پر کیف
بغیر وعدہ بھی رہتا تھا انتظار مجھے

تری عنایتِ صد جلوہ کی کیا کہنا
بجائے اپنے کیا تو نے آشکار مجھے

ادھر یہ رنگ کہ ہر وعدہ اک حسین فریب
ادھر یہ حال کہ پھر بھی ہے اعتبار مجھے

خیالِ یار کو میں بھول جاؤں نا ممکن،
بھلا سکے تو بھلا دے خیالِ یار مجھے

یہ طے کیا ہے کہ ان کو نہ اب مناؤں گا،
خدا کرے یہ ارادہ ہو سازگار مجھے

جہانِ عشق کی مجبوریاں ارے توبہ
نہ اختیار انھیں ہے نہ اختیار مجھے

ہمیشہ سینے سے اپنے لگائے رہتے ہیں
خیالِ یار کو میں اور خیالِ یار مجھے

جمالِ یار سے لے کر تجلیاں شعری
شکست کرنا ہے آئینۂ بہار مجھے

# ترقی پسند ادب

## معین احسن جذبی

ترقی پسند ادب کا نام پہلے پہل آج سے چھ سال قبل ہندوستان کی ادبی فضا میں گونجا۔ اور بہت جلد پڑھے لکھے لوگوں کی محفل میں بحث کا موضوع بنگیا۔ اب تک لوگ ادب کے نام سے تو واقف تھے۔ لیکن ترقی پسند کی صفت نے انہیں ہزار طرح کے شبہات میں مبتلا کر دیا۔ یہ ایک نئی تحریک تھی جو ادب کا دھارا کسی اور طرف موڑنا چاہتی تھی۔ ہر نئی چیز جہاں حیرت اور دلچسپی کا باعث ہوتی ہے وہاں بدگمانیاں بھی پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ بیسیوں مضامین اس کی مخالفت یا موافقت میں لکھے گئے اور اب تک لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن عموماً وہی ہزار بار دہرائی ہوئی باتیں ہیں ان اعتراضات یا اعتراضات کے جواب میں نظر آتی ہیں۔ ایک طرف اگر قدیم ادب کے معیار پر موجودہ ادب کو پرکھا جاتا ہے تو دوسری طرف ترقی پسند نظریہ کی کسوٹی پر قدیم ادب کو کسا جاتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ہم کسی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکتے کہ کس ادب کو اچھا اور کس ادب کو برا سمجھیں۔ آج بھی ہمارے سینکڑوں ادیب اسی کشمکش میں پڑے ہوئے ہیں۔

ترقی پسند ادب کیا ہے؟ اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟ ان مسئلوں سے ہم بعد میں بحث کریں گے۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ترقی پسند ادب کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمان سے ٹپک پڑی ہو۔ ہمارا ادب سینکڑوں سال سے ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا آج ترقی پسند ادب کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہم اس نئے ادب کو پرانے ادب سے الگ کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔

جدید ادب کو سمجھنے کے لئے ہمیں قدیم ادب کا ایک سرسری جائزہ لینا ہوگا۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ ادب اور سماج میں بہت ہی گہرا ناتا ہے۔ ادب سماج ہی کی پیداوار ہے۔ اس لئے سماج میں جو بھی انقلابات رونما ہونگے، خواہ وہ سیاسی ہوں خواہ اقتصادی، ادب ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر ہم اپنے قدیم ادب کو اس پس منظر میں دیکھیں تو ترقی پسند ادب کے وجود میں آنے کے اسباب خود بخود واضح ہو جائینگے۔ ہم یہاں بہت ہی مختصر طور پر یہ دکھلانے کی کوشش کرینگے کہ ہمارا ادب سیاسی تغیرات سے کس حد تک متاثر ہو رہا ہے۔

### قدیم ادب کا سماجی پس منظر

سلطنت مغلیہ کی ہیبت اور عظمت اورنگ زیب کے دم تک قائم رہی۔ لیکن ملک و قوم کی آسودگی و خوشحالی میں اسی زمانہ میں گھن لگ چکا تھا۔ اورنگ زیب کے جانشین قطعی ناکارہ نکلے۔ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں نے سلطنت کی رہی سہی طاقت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ بغاوتیں ہونے لگیں اور جگہ جگہ خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ساتھ ہی انگریز اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر شمالی ہندوستان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شاہ عالم اور شجاع الدولہ نے ان کو روکنے کی کوشش کی لیکن اب انگریزوں کی طاقت کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ مجبوراً صلح کرنی پڑی اور مغلوں کی حکومت دلی اور دلی کے گرد و نواح تک محدود ہو گئی۔ اب سلطنت کا شیرازہ قریب قریب منتشر ہو چکا تھا اور صدیوں کے پرانے جاگیرداری نظام کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ سماجی زندگی پر بھی اسکا اثر پڑنا لازمی تھا۔ امراء، زمیندار، اہل صنعت و حرفت، غرض سماج کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو افلاس و فلاکت میں مبتلا نہ ہو۔ ایک طرف عزت و آبرو کے لالے تھے تو دوسری طرف پیٹ کا سوال۔ معاش کی تلاش میں بڑے بڑے شرفا مارے مارے پھر رہے تھے۔ اور ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ایسے پرآشوب زمانہ میں ان لوگوں کی تو اور بھی دِقت تھی جنہوں نے علم و ادب ہی کو اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا تھا۔ شعرا تو پہلے سے تو بہت ہی پریشان حال تھے اور سرپرستوں اور مربیوں کی تلاش میں در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ اس انحطاطی دور میں جب ہم اپنے ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ صرف شاعری ہی تک محدود نظر آتا ہے۔ ہماری شاعری اس وقت تک اپنے بہت سے ابتدائی مدارج طے کر چکی تھی۔ شاعروں میں ہمیں میرؔ سوداؔ اور دردؔ جیسے صاحب کمال ہستیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی ایسا نہیں جو اس زمانہ کے انحطاط و انتشار سے متاثر نہ ہوا ہو۔ میرؔ کا سارا کلام ان کے آلام و مصیبت کی داستان ہے۔ ان کے یہاں ہمیں بعض جگہ سیاسی اور سماجی انتشار کے مرقعے بھی مل جاتے ہیں۔ زمانہ کی شکایتیں اور فلک کج رفتار کے شکوے ان کی بے بسی اور لاچاری کے احساس کا نتیجہ ہیں۔ ان کی حساس طبیعت اس دور کی تلخ حقیقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکی اور آخرکار وہ حزن و یاس میں پناہ گزین ہو گئے۔

سوداؔ ذرا زیادہ تیز طبیعت کے آدمی تھے۔ جتنے جوش و خروش کے ساتھ مدح کرتے اتنے ہی جوش و خروش کے ساتھ مذمت، لیکن وہ بھی اس دور کی ابتری کا رونا روتے ہیں۔ شہر آشوب اور تضحیک روزگار جیسی نظمیں اس زمانہ کی سیاسی بدامنی اور سماجی انتشار کی پوری پوری ترجمانی کرتی ہیں۔ اگرچہ وہ ہر طبقہ کی زبوں حالی کی تصویر بڑے مضحکہ خیز انداز میں پیش کرتے ہیں لیکن آخر میں ان کی آنکھ بھی نم نظر آتی ہے۔ دردؔ بھی سوداؔ اور میرؔ کے ہم عصر تھے لیکن ان کا تصوف کی بھول بھلیوں میں پناہ لینا ہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ اس زمانہ کے ہنگاموں کی تاب نہ لا سکے۔

---

۱ یہ مضمون ۱۹۴۲ء میں لکھا گیا تھا۔

نظیر میر و سودا کے بعد آتے ہیں۔ نظیر پہلا اردو شاعر ہے جسے ہم بجا طور پر عوام کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ عوام کی زندگی کے ہر رخ سے وہ انتہائی دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ عوام کن مشاغل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ کن باتوں سے خوش ہوتے ہیں اور کن باتوں سے ملول۔ اس کے حسن و عشق کی دنیا بھی اونچے طبقہ کی حسن و عشق کی دنیا نہیں۔ اس کا مشاہدہ تیز ہے۔ وہ عوام کی زندگی کے ہر پہلو پر بہت ہی گہری نظر ڈالتا ہے، جس طرح عوام سوچتے رہتے ہنستے ہیں وہ بھی ہمیں اسی طرح رہتا سہتا اور سوچتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ عوام کا ایک فرد ہے، عوام کے محسوسات اور جذبات اس کے محسوسات اور جذبات ہیں۔ نظیر پر اکثر ابتذال کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ابتذال تو ہمیں میر و سودا کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ نظیر کی شاعری پر صرف ایک اعتراض ہو سکتا ہے۔ اسکے یہاں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے اچھے اچھے مرقعے تو ہیں لیکن خود زندگی پر تنقید کہیں نہیں ملتی۔ پھر بھی نظیر کا کارنامہ اس زمانہ کی عام اور فرسودہ روش کو دیکھتے ہوئے بہت ہی حیرت انگیز ہے۔ نظیر کی شاعری ایک عرصہ تک پڑھے لکھے طبقوں میں مقبول نہ ہو سکی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ سماجی شعور کا فقدان تھا۔ لیکن جوں جوں سماجی اور سیاسی شعور بڑھتا گیا نظیر کی اہمیت بھی زیادہ ہوتی گئی۔ اور آج تو وہ پرولتاری (عوامی) شاعری کا باوا آدم مانا جاتا ہے۔ اپنے دور کی ترجمانی نظیر سے بہتر اب تک شاید ہی کسی شاعر نے کی ہو۔

غدر کا ہنگامہ ہماری سماجی زندگی میں ایک بہت ہی بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی جڑیں اچھی طرح مضبوط ہو گئیں۔ سرمایہ داری نظام نے جاگیرداری نظام کی جگہ لے لی صنعت و حرفت کی دنیا میں بھی انقلاب ہوا۔ دستکاروں اور ہنرمندوں کا کوئی پوچھنے والا نہ رہا مشینوں کا رواج ہوا۔ انگریزی تعلیم رائج ہوئی۔ عالموں اور مولویوں کا اقتدار پہلے سے کم ہو گیا۔ انگریزی تعلیم اور خیالات سے ہندوستانی تہذیب اور معاشرت بھی متاثر ہوئی۔ راجہ رام موہن رائے اور سر سید اپنی اپنی تحریکیں لیکر اٹھے۔ دونوں کا مقصد ایک ہی تھا یعنی کس طرح حکمراں طبقہ اور اپنی قوم کے درمیان جو خلیج حایل ہے اسے پاٹ دیں۔ سر سید تو خاص طور سے چاہتے تھے کہ مسلمان نہ تو صرف حکومت ہی سے تعاون کریں بلکہ حکمراں طبقہ کی تہذیب و معاشرت کو بھی اپنا لیں۔ سر سید ان کوششوں میں ابھی مصروف ہی تھے کہ اردو نثر ادب میں انقلاب ہوا۔ اور آزاد نے انگریزی ادبیات سے متاثر ہو کر نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ آزاد کو انگریزی ادب کے مقابلے میں اپنا ادب بہت ہی فرسودہ اور پست نظر آتا تھا۔ آزاد کی یہ ادبی تحریک ان کے ہاتھوں بار آور نہ ہو سکی۔ آزاد سب کچھ تھے مگر شاعر نہ تھے۔ یہ کام حالی نے

تھا۔ انہوں نے اس نیچرل شاعری کو واقعی نیچرل بنا دیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ شاعری کو شعوری طور پر کسی خاص مقصدی رنگ کا جامہ پہنایا گیا۔ شاعری اب تک امیروں اور رئیسوں کے تفنن طبع کا ایک ذریعہ تھی پیچیدہ استعاروں، دور از کار تشبیہوں، اور مبالغوں نے اس کی سادگی چھین لی تھی۔ حالی نے دوبارہ اسے سادگی کے پھولوں میں بسایا اور صرف یہی نہیں بلکہ اسے زندگی کا ترجمان بھی بنا دیا۔

حالی نے خود اپنی آنکھوں سے اسلامی حکومت کو مٹتے اور انگریزی حکومت کو قائم ہوتے دیکھا تھا۔ اسلامی حکومت کے مٹنے کا غم کس مسلمان کو نہ ہوگا لیکن حالی نے ان اسباب پر بھی غور کیا جس کی بدولت مسلمان حاکم سے محکوم ہو گئے۔ مسدس انہیں خیالات اور تاثرات کے ماتحت لکھی گئی۔ حالی نے اس میں مسلمانوں کی گذشتہ عظمت و سطوت کے پس منظر میں ان کی موجودہ ذہنی اور اخلاقی پستیوں کا نقشہ بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ حالی مسلمانوں سے بہت کچھ مایوس نظر آتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا نقطۂ نظر اصلاحی تھا اس لئے ہمیشہ انہوں نے امید کا چراغ جلائے رکھا، اور بیداری اور ذوق عمل کا درس دیتے رہے، بہت ہی میٹھے اور بہت ہی ہمدردانہ لہجہ میں۔ لیکن حالی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا مقدمہ شعر و شاعری ہے۔ جس میں انہوں نے شعر و ادب کے پرانے اصولوں کو جانچا اور نئے اصول مرتب کئے۔ حالی کے ان خیالات کا آنے والی نسلوں پر گہرا اثر ہوا۔

اسمٰعیل۔ اقبال۔ چکبست اور عظمت اللہ کی شاعری حالی کے اسی انقلابی نظریہ ادب کی ترجمان ہے۔

حالی کی طرح اکبر کو بھی مسلمانوں کی یہ زبوں حالی بے چین رکھتی تھی۔ وہ خالص اسلامی تہذیب و تمدن کے علمبردار نہیں تھے، وہ مشرقی تہذیب و تمدن کے فدائی تھے۔ مشرقیت ان کا مذہب تھی۔ وہ مشرقیت کے اسقدر دلدادہ تھے کہ مغربی تہذیب و معاشرت بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مغرب کی ہر چیز انہیں بری معلوم ہوتی تھی۔ سر سید کی مغربیت انہیں سخت ناگوار تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان انگریزی تعلیم و تہذیب کا اثر ذرہ برابر بھی قبول کریں۔ اس مقصد کو سامنے رکھکر انہوں نے سر سید اور مغربی تعلیم پر اعتراضات شروع کئے۔ مغربیت میں انہیں ایک زبردست خطرہ نظر آیا جس میں انہوں نے اپنا سب کچھ جاتا ہوا محسوس کیا۔ انہوں نے مغربیت کے فریب کو توڑنے کی بڑی کوشش کی اور طنز کے بڑے بڑے کاری وار کئے۔ مگر آخر میں انہیں یہ احساس ہونے لگا کہ "آئی بلا ٹلتی نہیں"۔

چکبست نے جب ہوش سنبھالا تو ہندوستان میں سیاسی شعور انگڑائی لے رہا تھا۔ وطنیت، قومیت اور آزادی کے نعرے ہر طرف بلند ہو رہے تھے۔ حکومت سے ہوم رول کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ انہ

سیاسی ہنگاموں نے چکبست میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا کیا۔ ان کی شاعری اس وطن پرستی کے جذبہ سے معمور ہے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کے دل میں بھی قوم اور ملک کے لئے وہی تڑپ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو خود ان کے دل کو بے چین رکھتی تھی۔ جو مقصد ان کی شاعری کا تھا وہی درا صل اس زمانہ کا تقاضہ بھی تھا۔ چکبست کی شاعری میں وقتی اثرات زیادہ ہیں۔ ان کی وطنیت اس زمانہ کے سیاسی شعور کے مطابق ہے۔ ماضی کی عظمت، حال کی اصلاح یہی ان کی شاعری کے عناصر ہیں۔

چکبست اور اقبال دونوں کا ماحول ایک ہی تھا۔ اقبال نے بھی شروع شروع میں، وطن کا راگ گایا لیکن ان کے حکیمانہ مزاج کا تقاضہ کچھ اور ہی تھا۔ حالی اور اکبر کی طرح وہ بھی اسلام کے شیدائی تھے اور مسلمانوں کو اسی عروج و بلندی پر دیکھنا چاہتے تھے جو ان کے اسلاف کو میسر تھی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلمانوں کو عمل و حرکت کا پیغام دیا، افراد کے ذہنی ارتقا کے اصول بتائے فرد و جماعت کے رشتہ پر روشنی ڈالی اور ایک مثالی اسلامی حکومت کا تصور پیش کیا۔ لیکن وہ زمانہ حال کی سیاست سے بے خبر نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دنیا کا کوئی ملک دوسرے ملکوں کے افکار و خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یورپ کی بڑھتی ہوئی مادیت ان کی نظر میں دنیا کے امن و امان اور تہذیب و معاشرت کے لئے ایک خطرہ تھی۔ انہوں نے دنیا کی ہر سیاسی تحریک کو گہری نظر سے دیکھا اور اس کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش کی۔ اقبال پہلے شاعر ہیں جنہوں نے سیاست کو شاعری سے ہم آہنگ کیا۔ نئے نئے خیالات کے لئے نئے اسالیب وضع کئے۔ ادب کے متعلق ان کا نظریہ بھی کافی اہم ہے۔ وہ ادب کو بیداری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس ادب سے بیزار ہیں جس میں موت کی نقش گری ہو۔ ان کا خطاب نوجوانوں سے ہے۔ ان میں وہ شاہینی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ پر اس شاہینی کا مقصد خوں ریزی نہیں۔ ان کے الفاظ میں لہو گرم رکھنے کا بہانہ ہے۔ ایک ایسے حلقہ کے لئے جو شیریں نغموں میں گم تھا، اقبال کی شاعری ایک دعوت جنگ ہے۔ وہ اپنے دور کی تمام ذہنی تحریکوں سے متاثر ہوئے ہیں اور ان کا ذکر جا بجا ان کے کلام میں ملتا ہے۔ آفاقی نظر، بلند آہنگ لہجہ، رعنا غزال تاتاری کی نرمی، جلال اور جمال دونوں، اقبال کے یہاں ملے جلے ہیں۔ اس زمانے میں اقبال کا اثر بہت عام ہے۔ اور موجودہ دور کے تمام شعرا اقبال سے کسی نہ کسی طور پر مستفید ہوئے ہیں۔

پریم چند بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اور اپنے گرد و پیش سے سب سے زیادہ باخبر۔ ان کا واحد مقصد سماج کی کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنا ہے۔ ان کو ہم بجا طور پر تمدنی نقاد کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بیشتر کہانیوں اور ناولوں میں معاشرت کی ان خرابیوں کو نمایاں کیا ہے جنکے ہوتے ہوئے ہم اطمینان و آسائش کی زندگی نہیں بسر کر سکتے۔ پریم چند فرسودہ اور غیر مفید رسم و رواج کے دشمن ہیں۔ انہیں شہری زندگی سے دیہاتی زندگی کہیں زیادہ دلآویز معلوم ہوتی ہے۔ دیہاتوں کی معاشرت ان کے آلام و افکار اور دکھ درد سے وہ پوری طرح واقف ہیں۔ وہ ہر طبقہ اور اس کے افراد کی نفسیات سمجھنے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ کردار نگاری میں ابتک کوئی ان کا حریف نظر نہیں آتا۔ لیکن کردار نگاری میں یا نفسیاتی تجزیہ کی دھن میں وہ اپنا اصلاحی مقصد نہیں بھولتے۔

ان پر قومی تحریکوں کا بھی بہت اثر ہوا ہے۔ غلامی کا احساس انہیں بھی چین نہ لینے دیتا تھا۔ فرقہ پرستی اور غلامانہ ذہنیت سے سخت متنفر تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۱ء کی عدم تعاون اور اس کے بعد کی تحریک میں انگریزی حکومت کا جبر و تشدد اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جلیانوالہ باغ کے سانحہ نے ان کے دل میں انگریزی حکومت کے خلاف سخت نفرت پیدا کر دی تھی۔ ان کے آخری دور کے ناولوں میں اسی وجہ سے قومیت اور اجتماعیت کی روح اس قدر بیدار نظر آتی ہے۔ پریم چند نے اپنے دور کی عکاسی بڑی سچائی اور خلوص سے کی ہے۔ اور عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں "ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ مورخ کا قلم جب آج سے سو پچاس برس بعد لکھے گا تو اس کے تیس پینتیس برس کی تاریخ سمجھنے کے لئے جہاں گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، محمد علی، انصاری اور ابوالکلام کی تقریریں اور تحریریں پڑھنی پڑیں گی۔ وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہوں گے۔" بلکہ شاید ان سیاست دانوں کی تقریریں اور تحریریں اتھلی اور سطحی معلوم ہوں اور پریم چند کے کرداروں کی دنیا زندہ اور روشن نظر آئے۔

پریم چند اپنے قصوں کی بنیاد ہمیشہ کسی تجربہ یا مشاہدہ پر رکھتے ہیں۔ وہ حقیقت نگاری کو افسانہ نگاری کا پہلا اور بنیادی اصول مانتے ہیں لیکن اکثر حقیقت کا دامن ان سے چھوٹ جاتا ہے اور وہ رومانیت اور جذبات اور جذباتیت میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ طالسطائی اور گاندھی جی کی طرح وہ محض ذہنی انقلاب کے حامی ہیں اور انسان کی شرافت نفس پر بہت زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ پریم چند چاہتے ہیں کہ زمینداروں اور سرمایہ داروں میں اتنی شرافت پیدا ہو جائے کہ وہ کسانوں اور مزدوروں کا دکھ درد سمجھنے اور ان سے نرمی کا برتاؤ کرنے لگیں۔ وہ ظالموں اور مظلوموں میں سمجھوتہ کرانا چاہتے ہیں اور ان کے خیال میں اس کے لئے پریم، محبت یا شرافت کافی ہے مگر جب محبت یا پریم سے علاج نہ ہو سکے تو وہ کھو جاتے ہیں۔ اسوقت ان کی دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے ان کے یہاں بعض کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ وہ اکثر ایسے واقعات بھی قصہ میں شامل کر دیتے ہیں

جو نہ قصہ کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں اور نہ کسی کردار کی تخلیق ہی ان سے ہوتی ہے۔ بعض اوقات قصہ کے مختلف اجزا کو بھی وہ اچھی طرح مربوط نہیں کر پاتے اور قصہ میں کچھ ڈھیلا پن سا پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کی کردار نگاری اور نفسیاتی تجزیہ ان کی تمام خامیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

پریم چند کے لکھنے کا طریقہ بہت ہی سادہ اور دلکش ہے اور زبان بہت ہی منجھی، عبارت آرائی انہیں نہیں آتی تکلف اور تصنع سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان کی سادگی ان کے افسانوں کو پر اثر اور حسین بنانے میں بہت ہی مدد دیتی ہے۔ خیالات اور جذبات جس طرح ان کے ذہن میں آتے ہیں اسی طرح کاغذ پر ٹپک پڑتے ہیں۔ انہوں نے بڑی خوبی سے ہندی الفاظ اردو زبان میں سموئے ہیں۔ اس طرح انہوں نے ہندی اور اردو کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بعض اوقات وہ فارسی کی موٹی موٹی ترکیبیں بھی استعمال کرنے لگتے ہیں جس سے عبارت میں ایک قسم کی ثقالت اور بھدا پن پیدا ہو جاتا ہے۔

افسانہ نگاری کی دنیا میں پریم چند کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس زمانہ کے تمام افسانہ نگاروں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اگر پریم چند نہ ہوتے تو ہمارے افسانے اور ناول شاید کبھی بھی حسن و عشق کی رومانیت سے نکلتے۔ پریم چند کے لئے زندگی ایک سنجیدہ چیز تھی اور اس کا مطالعہ انہوں نے بہت ہی سنجیدگی سے کیا۔ اقبال کی طرح وہ بھی آرٹ کو کسی مفید اور اعلیٰ مقصد تک پہونچنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

## انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک

جنگ عظیم کے بعد دنیا ایک نئی کروٹ لے چکی تھی۔ بہت سی پرانی قدریں مٹ چکی تھیں اور ان کی جگہ نئی قدروں نے لے لی تھی۔ یورپ مذہبیت اور روحانیت کو خیر باد کہہ کر قومیت اور مادیت کے سیلاب میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ ہندوستان ہنوز غلامی کی زنجیروں میں گرفتار تھا۔ حکومت بھول چکی تھی کہ اس نے ہندوستان کو جنگ عظیم کے بعد آزاد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس لڑائی میں ہندوستانیوں نے جس بنا پر زور و شور سے حصہ لیا تھا وہ یہی آزادی کی آس تھی۔ اور سنہ ۱۹۲۰ء کی عدم تعاون کی تحریک انگریزوں کی اس وعدہ خلافی کا نتیجہ تھی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک نے نوجوانوں میں انقلاب اور آزادی کی آگ اور بھی بھڑکا دی۔ ہمارے ادب میں بھی انقلابی رجحانات رونما ہونے لگے۔ نئے لکھنے والے پیدا ہوئے جو اقبال اور پریم چند کی روحانیت اور اصلاح پسندی سے کچھ زیادہ مطمئن نہ تھے۔ یہ بے اطمینانی سنہ ۱۹۳۳ء میں "انگارے" کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ یہ مجموعہ تھا سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانوں کا۔ یہ افسانے زیادہ تر انقلابی اور جنسیاتی رجحانات کے ماتحت لکھے گئے تھے۔ حکومت نے اسے بہت جلد ضبط کر لیا۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں دنیا کو اس معاشی بحران کا مقابلہ کرنا پڑا جس نے سرمایہ دارانہ نظام کی اصل حقیقت کو بے نقاب کر دیا۔ بڑے بڑے بینکوں کا دیوالہ نکل گیا۔ بیکاری اور بے روزگاری اتنی بڑھی کہ سرمایہ داری کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اشتراکی روس ہی ایک ایسا ملک تھا جہاں بیکاری اور بیروزگاری بڑھنے کے بجائے گھٹ رہی تھی۔ اس تقابل نے یورپ کے اکثر ذہین اور آزاد خیال لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور جوں جوں اشتراکیت کے بنیادی اصولوں سے واقف ہوتے گئے، سرمایہ دارانہ نظام سے ان کی نفرت بڑھتی گئی۔ ادھر جرمنی اور اٹلی میں فسطائیت زور پکڑ رہی تھی۔ ہٹلر اور مسولینی کے جبر و استبداد اور قتل و غارت کی داستانیں آئے دن سننے میں آتی تھیں۔ جمہوریت اور شخصی آزادی کا جو بھی نام لیتا موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ نہ جانے کتنے جمہوریت پسند ادیبوں اور سائنسدانوں کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ جو بچ کر بھاگ نکلے وہ جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ وہ واقعات تھے جو بجلی کی طرح یورپ کے ادیبوں اور شاعروں کو متاثر کر رہے تھے۔ ان کو یقین ہو چلا تھا کہ ادب اور کلچر کی ترقی جمہوریت کی آزاد فضاؤں ہی میں ہو سکتی ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ جب تک یہ طبقاتی امتیاز نہ مٹے گا اور پیداوار کے ذرائع اور تقسیم پر مزدوروں کا قبضہ نہ ہوگا صحیح قسم کی جمہوریت کا قیام ناممکن ہے۔

لیکن اس سیاسی انقلاب کے لئے پہلے نچلے طبقہ کی ذہنیتوں کا بدلنا ضروری تھا۔ سیاسی لیڈروں سے انہیں کوئی خاص توقع نہ تھی اور پھر کسی انقلاب کا انحصار محض سیاسی لیڈروں ہی پر نہیں ہوتا۔ روس کے انقلاب میں ادب نے عوام کی ذہنیتوں کو جس طرح منقلب کیا تھا اس کی مثال ان کے سامنے تھی۔ اس لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ وہ بھی اس حربہ سے کام لیں اور عوام کو ان کی قوت سے آگاہ کریں۔ ان کے دلوں میں ایک ولولہ اور ایک جوش پیدا کریں، ان کو بتائیں کہ وہ کن پستیوں میں پڑے ہوئے ہیں اور کن بلندیوں تک پہونچ سکتے ہیں۔ انگلستان میں نئے ادب کی بنیاد انہی سیاسی خیالات پر رکھی گئی۔ کچھ ہندوستانی نوجوان جو اس زمانہ میں وہیں تھے اور جو ہندوستان کی سیاسی جدوجہد سے بھی متاثر تھے ان پر بھی اس نئے ادب کی تحریک کا اثر پڑا۔ ان میں ملک راج آنند اور سجاد ظہیر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انہیں لوگوں نے مئی سنہ ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی بنیاد ڈالی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی ادب کو بھی ان نئے رجحانات کا حامل بنایا جائے جن کی نشو و نما انگریزی اور فرانسیسی ادب میں شروع ہو گئی تھی۔ اسی سال جولائی میں بین الاقوامی مصنفین کی کانگریس برائے تحفظ کلچر پیرس میں منعقد ہوئی۔ اس میں میکسم گورکی،

(World's Congress of Writers for the Defence of Culture)

...مین رولاں، آندرے مالرو، اور بہت سے شہرۂ آفاق مصنفین نے شرکت کی۔ اس کانگرس کے متعلق سجاد ظہیر جو اس میں صرف ایک ...ی کی حیثیت رکھتے تھے لکھتے ہیں: "یہ اجتماع جو پیرس کے ایک مشہور ... ہال میں ہوا دنیائے ادب میں بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب قریب قریب دنیا کی ہر مہذب قوم کے ادیب باہم صلاح مشورہ کے لئے ایک مقام پر جمع ہوئے تھے۔ انہوں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ تہذیب و تمدن کو رجعت پسندی اور تنزلی کی اٹھتی ہوئی لہر سے بچانے کے لئے ان کی انفرادیت کو خیرباد کہہ کر خود اپنی حالت کو منظم کرنا ضروری ہے۔ صرف یہی ایک موثر طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے وہ ترقی و فلاح کی قوتوں کی مدد کر سکتے ہیں، اپنی تخلیقی صلاحیت کو افزائش و نشو و نما کا پورا پورا موقع دے سکتے ہیں اور اس طرح جماعتی حیثیت سے اپنی ہستی کو ایک انقلاب انگیز عہد میں فنا ہونے سے بچا سکتے ہیں ....... ظاہر ہے کہ اتنی بڑی کانفرنس میں مختلف خیال اور عقیدے کے ادیب جمع تھے لیکن ایک چیز کے بارے میں وہ سب متفق تھے۔ وہ یہ تھی کہ ادیبوں کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ آزادیٔ خیال و رائے کے تحفظ کی کوشش کرنی چاہیے۔ فاشزم یا سامراجی قوتیں جہاں بھی ادیبوں پر جابرانہ پابندیاں عائد کریں یا ان کے خیالات کی بنا پر ان پر مظالم کریں، ان کے خلاف پرزور احتجاج کرنا چاہیے۔ دوسری چیز جو اس کانفرنس میں سب محسوس کرتے تھے یہ تھی کہ ادیب اپنے حقوق کا بہترین تحفظ اس حالت میں کر سکتے ہیں جب وہ عوام کی آزادی کے "متحدہ محاذ" کا جزو بن کر محنت کش طبقوں کی پشت پناہی حاصل کریں۔"

بہرحال ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی بنیاد تو انگلستان میں پڑ چکی تھی مگر اسے ہندوستان میں مقبول بنانے کا کام ابھی باقی تھا اور یہ کام کچھ آسان بھی نہ تھا۔ لوگ ابھی پرانی لکیر کے فقیر تھے۔ خوش قسمتی سے سجاد ظہیر، احمد رشید جہاں اور دوسرے ترقی پسند نوجوان ادیبوں کو پریم چند جیسی ہستی کی ہمدردیاں حاصل ہو گئیں جن کی ادیبانہ شخصیت کا لوہا ہر پڑھا لکھا آدمی مانتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ پریم چند نے صدارتی خطبہ پڑھا جسے ان کے ادب کے تصورات کا نچوڑ سمجھنا چاہیے۔ آخر میں کانفرنس نے اپنے اغراض و مقاصد کی توضیح ایک اعلان نامہ کی صورت میں پیش کی۔ وہ اعلان نامہ یہ تھا۔

"ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پستی و رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے۔ نت نئے روپ بدل کر یہ مہلک زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبہ میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔

اس لئے ہندوستانی مصنفین کا فرض ہے کہ ملک میں جو ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشو و نما میں پورا حصہ لیں۔

ہندوستانی ادب کی نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ وہ زندگی کی متین اور حقیقی حقیقتوں سے جی چرانا چاہتا ہے۔ حقیقت و واقعیت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عناصر و قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔ اسکا پتہ اس سے چلتا ہے کہ ہمارے ادب میں عقلیت کم سے کم پائی جاتی ہے۔

ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جد و جہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔

ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لئے زندگی کے جس شعبہ میں رجعت کے آثار پائے جائیں گے انہیں افشا کریں گے۔ ہم اس انجمن کے ذریعہ سے ہر ایسے جذبہ کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔

ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں، تعمیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ انجمن کے مقاصد یہ ہونگے (۱) تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشورتی جلسے منعقد کرکے اور لٹریچر شائع کرکے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا (۲) ترقی پذیر مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جد و جہد کرکے ملک کی آزادی کی کوشش کرنا (۳) ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا (۴) آزادیٔ رائے اور آزادیٔ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔"

اس کانفرنس کے بعد ترقی پسند مصنفین کی تحریک بڑی سرعت کے ساتھ سارے ملک میں پھیل گئی۔ ہر صوبہ میں اس کی ایک شاخ قائم ہوئی۔ نوجوان طبقہ نے خاص طور سے اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے انقلابی اور دہشت انگیز ادب کا وہ طوفان اٹھا کہ خدا کی پناہ!

انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس سنہ ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں ہوئی۔ ہندی، مرہٹی، گجراتی اور بنگالی ادیبوں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ ایک دوسرے کے ادب سے واقفیت حاصل کرنے اور اپنے ادبی نقطۂ نظر کو وسیع اور متحد کرنے کا یہ بڑا ہی اچھا موقع تھا اور اس سے کترا ادیبوں نے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا۔ (باقی آئندہ)

# تصور اور حقیقت

# پھول اور کانٹے

# زندگی کے تین عکس

دیوکی نندن ناصح

کالج کی زندگی بھی کیا آزادی کی زندگی تھی! فکر معاش سے آزاد مستقبل کے سنہری خوابوں سے بھرپور۔ انہی دنوں میرا ایک دوست کرشن چندر بھی تھا۔ ہم دونوں کی دوستی کالج بھر میں مشہور تھی۔ ہم اکٹھے ہی سیر کو جاتے، اکٹھے ہی پڑھتے اور اکٹھے ہی سنیما تھیٹر دیکھنے جایا کرتے تھے۔ جوانی میں سب سے دلچسپ موضوع گفتگو شادی ہوتا ہے اور ہم دونوں گھنٹوں اکثر اس بارے میں باتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہم دونوں کشتی میں بیٹھے دریا کی سیر کر رہے تھے۔ میں چپّو چلا رہا تھا اور کرشن چندر اپنی دلچسپ باتیں مزے لے لے کر سنا رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ فضا میں اڑ رہے تھے۔ چپّو چلانے سے پانی کے چھینٹے اڑ اڑ کر پیار و لطافت پھوار کی شکل میں گر رہے تھے۔ کرشن چندر نے افق پر نظر جماتے ہوئے کہا "میں اس دن کتنا خوش ہوں گا جس دن میرے نصیب کا ستارا کسی کی مرمریں انگلیوں میں محبت کے نغمے پیدا کر دیں گی کوئی حسینہ زندگی کے سفر میں میری ساتھی بن جائے گی پھر ہم دونوں مل کر سیر کریں گے آزاد پرندوں کی طرح اڑتے پھریں گے، چشموں، مرغزاروں، بادلوں اور آبشاروں کے حسین مناظر، افق کی شفق رنگینیاں، حسین خواب، مترنم فضا ....." "بس بھی کرو یہ شاعری" میں نے مذاقاً کہا۔

چھ سال بعد جب لاہور گیا تو اپنے قدیمی دوست کا خیال آیا۔ پوچھتے پوچھتے اس کا گھر ڈھونڈ ہی نکالا۔ کرشن چندر اب چھ برس پہلے والا آزاد اور بے فکرا نوجوان نہ تھا۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں اور مجبوریوں سے آشنا گھر والا تھا۔ نیم آستین کی گھٹیا سے کپڑے کی قمیص اور گاڑھے کی دھوتی پہنے وہ اپنے دو سالہ بچے کو کھلا رہا تھا۔ پاس ہی چارپائی پر اس کا بڑا بیٹا بیٹھا باسی روٹی دہی سے کھا رہا تھا۔ آنگن کے ایک طرف چھوٹی سی رسوئی تھی۔ میلی سی ساڑھی میں ملبوس اس کی بیوی سر دبائے بیٹھی چولھا سلگا رہی تھی۔ فرش پر کچھ جھوٹے برتن، کچھ کپڑے اور کھلونے بکھرے پڑے تھے۔ میں نے بغیر بازو والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "کہو بھئی کیسے ہو۔ تم نے تو کبھی خط بھی نہیں لکھا" اس کی پیشانی پر دنیا داری کی مشکلات اور گھریلو ذمہ داریاں جھریوں کی شکل میں نمودار ہو گئی تھیں۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے بولا:

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

آئینہ وہی تھا لیکن زندگی نے تین بار اس میں جھانکا اور تین مختلف چہرے دیکھے۔

(۱)

ننھی ستارہ نے اپا جان کی میز پر پڑے ہوئے قلمدان کو قالین پر ٹپک دیا۔ پھر لال اور نیلی سیاہی سے لت پت ہاتھوں سے اپنے چہرے پر بھی گلکاری کر دی۔ چھوٹی سنگار کی میز پر آئینہ پڑا تھا۔ ستارہ نے اس میں اپنی شکل جو دیکھی تو ڈر کر بھاگی۔ امی جان نے پوچھا "کیوں کیا ہوا بیٹی ستارہ؟ اتنی بدحواس کیوں ہو رہی ہو" ننھی ستارہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "امی جان آپ کے شیشے میں کوئی چڑیل چھپی بیٹھی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی ڈائن کاٹنے کو دوڑی" تب ستارہ معصومیت کے گہوارے میں سو رہی تھی اور بچپن اسے جھلا رہا تھا۔

(۲)

وہ ابھی دفتر سے نہیں آئے تھے۔ آج انہوں نے سنیما لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ باورچی خانہ میں بوڑھی رحیمن چائے تیار کر رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کے قد آدم آئینے کے سامنے ستارہ عرف مسز سلیم اختر کھڑی اپنے حسن کا جائزہ لے رہی تھی۔ لمبی لمبی پلکوں کی چھاؤں میں شراب جوانی سے چھلکتی ہوئی دو آنکھیں اب معصومیت کا گھر نہ تھیں۔ ان میں احساس خودی اور ناز حسن جھلک رہا تھا۔ سیاہ لمبے بال ساون کی گھٹا کی طرح سفید ریشمی بلاؤز پر پھیلے ہوئے تھے۔ رخساروں پر جوانی کی شفق بیدار ہو رہی تھی۔ ستارہ جھوم اٹھی "ایک فاتح کی طرح" یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب جوانی بیدار ہو رہی تھی اور زندگی کے چمن میں بہار کی معطر نسیم چل رہی تھی۔

(۳)

سردیوں کی ایک پھیکی شام تھی مطلع ابر آلود تھا۔ ایک بوڑھی خاتون کھڑکی کے پاس کھڑی آئینہ سامنے رکھے ان نقلی دانتوں کو منہ میں لگا رہی تھی جو آج ہی لندن کے ساز کی دکان سے بن کر آئے تھے۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔ دھنسی ہوئی آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک لگی ہوئی تھی۔ سڈول بازو سوکھے ہوئے انگوروں کی طرح مرجھا گئے تھے۔ جب بوڑھی خاتون دانت لگا چکی تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کے آئینہ میز پر رکھ دیا۔ جوانی کے سنہری سپنوں کی تعبیر کتنی بھیانک تھی۔ یہ بوڑھی خاتون بھی ستارہ تھی لیکن اب زندگی کے آخری پہر کا کانپتا ہوا ستارہ تھی پلکوں پر لرزتا ہوا آنسو!

# فانی اور اس کا عمومی احساس

## تابش دہلوی

غم اور خوشی کے احساس اور اس کے رد و قبول کے طریقے ہر شخص کے لئے مختلف ہیں اسی طرح (Self Consolation) یعنی ذاتی اطمینان کے بھی ہزاروں پہلو ہیں بعض لوگ زندگی کی عارضی اور مصنوعی مسرتوں سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کا عادی بنا لیتے ہیں کچھ لوگ اپنے داخلی احساسات کی لذتوں سے خوشی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں معلوم نہیں ان میں سے کونسا طریقہ بہتر ہے بہرحال قرار کی صورت دونوں میں سے نطشے کا (All Progress is the Spiritualism of Pain) یعنی درد کا روحانی بننا ترقی ہے، اس ترقی میں بھی شکست خوردگی کے قبول کا احساس پایا جاتا ہے اور ہمارے سامنے مظلوم انسانیت کی پوری داستان آجاتی ہے! انسان ازل سے ابدی سکون اور راحت کے حصول میں سرگرداں ہے اور خوشی ہو خواہ غم ہمیشہ آسودگی کی تلاش ہر طرح شکست خوردگی کی قبولیت کے احساس ہی کو وہ مسرت کا نام دیتا ہے۔ یا یہاں ترقی سے وہ تمام مسرتیں مراد ہیں جو زندگی کی انفعالی صورتیں ہیں۔ اور زندگی کی کشمکش میں ہمیشہ آدمی کو فریب دیتی رہتی ہیں

زمانے کا کوئی دور ایسا نظام زندگی نہ پیش کر سکا جو مظلوم انسانیت کے لئے آسودگی کا ذریعہ بنتا۔ زندگی اپنی تمام قوتوں اور رعنائیوں کے باوجود کبھی موت پر فتح نہ پا سکی! دنیا کی تمام راحتیں غم کی ٹھوس حقیقت کو کبھی نہ جھٹلا سکیں راحتوں کا تجزیہ کیجے تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی نے "غم گوارا" کو راحتوں کا نام دے رکھا ہے "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے لیکن "تو با زمانہ بساز" یا "تو با زمانہ ستیز" کا احساس ہی زمانے کی قوتوں کو مسلم کر دیتا ہے صلح اور جنگ کا خیال ہی اسوقت پیدا ہوتا ہے جب اپنی کمزوریوں کا پورا پورا یقین ہو جائے یا اپنی قوتوں کا اندازہ کرنا مقصود ہو۔ فانی کو اپنی شکست خوردگی کا احساس ہے لیکن وہ عام آدمیوں کی طرح اپنی مجبوریوں اور ناکامیوں پر ماتم نہیں کرتے بلکہ وہ اس احساس کو خوشی سے قبول کرتے ہیں، اور اس میں آسودگی اور طمانیت کے راستے تلاش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ زندگی کے تمام حواس اس سے متاثر ہوں، کیونکہ اس کے علاوہ انھیں کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آتا، رفتہ رفتہ یہ کوشش ہی ان کی زندگی بن جاتی ہے اور اس طرح وہ غم میں آسودگی اور خوشی کے راستے تلاش کر لیتے ہیں ایک جگہ خود اس اصول کی وضاحت کرتے ہیں ؎

ممکن نہیں ہے راحتِ دنیا کی آرزو
غم پر گمانِ راحتِ دنیا کئے بغیر

[illegible] معنے میں "راحت" [illegible] میں زندگی کی [illegible] قوتوں کا احساس [illegible] اور [illegible] حصول کی تڑپ بھی فانی کی [illegible] زندگی کا ایک [illegible] غم کبھی تو [illegible] خوشی کے حساس و اظہار کی طرح [illegible] فانی کی [illegible] خوشی کے حصول کی غمازی کرتے [illegible] ہیں۔

غم کے اس شدید احساس [illegible] میں انفرادیت اور انفرادیت [illegible] شدید [illegible] کے احساس [illegible] کہیں [illegible] بھی اپنے [illegible] انجام کی تمنا پائی جاتی [illegible] قابل [illegible] پورا ثبوت ہے [illegible] انفرادیت کے [illegible] موجود [illegible] نظر انفرادیت کے احساس [illegible] شکست خوردگی کے احساس میں بھی اپنی ذات کے [illegible] پہلو [illegible] ثبوت [illegible] مثالیں [illegible] ؎

[illegible] کہیں [illegible] سے حاصل ہوتی ہے
حیف ہے اس [illegible] عشق میں رسوا ہو نہ سکا
وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل [illegible]
[illegible] آداب [illegible] ہے [illegible] میرا
چھن گیا تیری محبت نے [illegible]
[illegible] دنیا [illegible]
اپنے [illegible] شوق پرستش کا دن ہے مخصوص
وعدہ [illegible] منتظر رہا

اپنی ذات کی [illegible] انفرادیت کا یہ احساس سپردگی اور [illegible] عشق [illegible] جذبہ کو زندگی اور غم دنیا میں دیکھئے ؎

زمانہ بر سر آزار تھا مگر [illegible]
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

بے ذوق نظر بزم تماشا نہ رہے گی
منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

اپنا نہ رہے گی جو گوارا نہ رہے گی
چھیڑا ہمیں دنیا نے تو دنیا نہ رہے گی

حشرِ امید سے مراد ہیں ہم    گلہ ہائے دراز ہیں ہم لوگ

عبودیت کے مدارج میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے ؎

دور لے جا ہٹا کے سجدۂ ناز    دل ہے آوارۂ حدودِ نیاز
تا عرشِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

بندگی اور انکسار کے مدارج میں وہ آستاں اور سر کی قید دل سے آزاد ہو کر اب قیدِ بندگی سے بھی آزاد ہونا چاہتے ہیں، لیکن اسطرح کہ احترامِ حسن میں کوئی فرق نہ آنے پائے اور "اک سجدہ چاہتا ہوں" کہہ کر بندگی کی معراج وہ ایک ہی جست میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

جبر و قدر کے مسائل میں بھی وہ اپنی ذات کو نہیں بھولتے، فرماتے ہیں ؎

رہے تقدیر ناکامی کہ تیری مصلحت ٹھیری
تری مرضی سے وابستہ ہوا اللہ رے غم میرا

یہ مثال بھی دلچسپی سے خالی نہیں ؎

تو تبسم بھی شریکِ نگہِ ناز ہوا
آج کچھ اور بڑھا دی گئی قیمت میری

یہاں بھی اپنی ہی قیمت کا احساس کارفرما ہے۔

تصوف کے مسئلوں میں بھی انھیں اپنا عرفان رہنما ہے اور ان مضامین کو انھوں نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے ؎

میری نظروں میں تو ہے واسطۂ دید ہے تو
ہیں بعنوانِ تجلی بھی تجھے یاد نہیں

ہم ہیں اس کے خیال کی تصویر
جس کی تصویر ہے خیال اپنا

نورِ برقِ معرفت بخشا دلِ آگاہ نے
ورنہ پہلے سوزِ غم اک شعلۂ بے ہوش تھا

ہو بھی چکے تھے دامِ محبت میں ہم اسیر
عالم ابھی بقیدِ زمان و مکاں نہ تھا

ان مثالوں سے یہ وضاحت کرنی مقصود تھی کہ فانی کی شاعری میں غم کے شدید احساس کے ساتھ اپنی ذات کی بقا اور اس کے وجود کی تمنا بھی شدت سے پائی جاتی ہے اور اب میں فانی کی شاعری سے غم کی کچھ نئی تعریفات پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ فانی نے غم کو کچھ نئی قدریں دے کر اردو شاعری میں متعارف کرایا ہے۔ کہیں غم سے ان کی مراد ذاتی زندگی کا عرفان و احساس نہیں بلکہ تمام آفاق کی زندگی کی وسعتوں اور قوتوں کا اندازہ ہے۔ مثلاً ؎

غم کو بنا کے محرمِ اسرارِ کائنات    ہر نقشِ غم کو پیکرِ انساں بنا دیا
زندگی کا کوئی پہلو ہی نہ تھا جو غم نہ تھا
ہوش کا سودا جنونِ عاشقی سے کم نہ تھا

ہر تبسم پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے
گل خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے

رفتہ پیمِ خزاں تھی اس چمن کی ہر بہار
خندۂ گل تھا مگر بے گریۂ شبنم نہ تھا

فانی نے کبھی غم کے نازک پہلوؤں سے تعریفاتِ حسن کا بھی کام لیا ہے، فرماتے ہیں ؎

غم راز ہے ان کی تجلی کا جو عالم بن کر عام ہوا
دل نام ہے ان کی تجلی کا جو راز رہی عالم نہ ہوئی

یا یہ شعر سنئے ؎

بہار رندرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھیری
خزاں شہیدِ تبسم ہوئی بہار ہوئی

اردو شاعری میں غزل کی پوری تاریخ میں غالباً غم کی یہ نئی قدریں نہیں ملیں گی۔ ایک اور غم کی نئی تعریف ملاحظہ کیجئے ؎

دیر میں یا حرم میں گذرے گی
عمر تیرے ہی غم میں گذرے گی

یہاں غم سے (محبوب) عبودیت کی وضاحت کس قدر اچھی طرح کی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے غم سے فانی نے اپنی ذات کے عرفان کا بھی کام لیا ہے اور "مگر منجملۂ آدابِ غمخواری ہے غم میرا" کا اظہار بار بار کیا ہے اس کے علاوہ جبر و قدر کے مسائل میں بھی بڑی بڑی نازک باتیں کہی ہیں۔ آدمی کو احساس کی دولت بخشی جاتی ہے اور اس کے ساتھ جو حواس دئے جاتے ہیں وہ نامکمل اور مکمل دونوں ہیں، کچھ قدرتیں عطا کر کے مجبورِ محض بنایا جاتا ہے یہ کشمکش موت اور زندگی کے درمیانی درجہ سے کم نہیں ؎

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

ازل سے آج تک انسان نے ابدیت حاصل کرنے کی بے شمار کوششیں کی ہیں اور کیوں نہ کرتا اس کائنات میں خدا کے بعد اولیت کا تاج ہمیشہ سے انسان کی پیشانی ہی پر سج رہا ہے۔ اپنی قوتوں سے خدا کے اختیارات میں دخل دینا چاہا ہے موت پر قدرت چاہی ہے لیکن یہ کوشش ہمیشہ نامشکور ہوئی۔ اس تمنا کو فانی کے یہاں دیکھئے ؎

ایسا بھی کوئی دن مری قسمت میں ہے فانی
جس دن مجھے مرنے کی تمنا نہ رہے گی

"مرنے کی تمنا نہ رہے گی" کا مطلب زندگی کو ختم کر دینا نہیں ہے بلکہ زندگی کو ابدی اور دائمی بنانا ہے یہاں تمنا کا لفظ اس کوشش کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ سے آدمی نے ابدی بننے کے سلسلہ میں کی ہے ممکن ہے آدمی کی یہ کوشش کبھی آدمی کو بھی خدا کی طرح دائمی بنا دے مگر ابھی تک یہ کوشش تمنا اور آرزو سے زیادہ نہیں ؎

آتی رہے گی جب اس زندگی کو موت
یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

موت کے بعد زندگی زندگی کے بعد موت یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ زندگی کا (Pendolum) شکن گشت اور بازگشت کی خدا معلوم کتنی حرکتوں سے اس حیات کو گذارتا ہے۔

بہر حال فانی کی ساری شاعری غم سے آسودگی حاصل کرنے کی ایک کوشش ہے۔ جو شخص غم سے خوشی حاصل کرنا ہو میں اسے قنوطی نہیں کہوں گا بلکہ شاید وہی مسرتیں زیادہ مستحکم ہوتی ہیں جن کے حصول کا ذریعہ غم ہو۔ فانی کی شاعری میں غم کا نتیجہ غم نہیں بلکہ غم ایک ذریعہ ہے خوشی کا۔ جو شخص "جان کیا دیں کہ بہت جان سے بیزار ہیں ہم" اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتا ہو زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا نظریہ جس شخص کا اصول حیات ہو اور جو "یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی"، کا نعرہ لگا کر زندگی تو زندگی موت کو بھی اپنی زندگی بنانا چاہتا ہو اسی قنوطی کہنا درست نہیں فانی کی شاعری کا عمومی احساس اور ان کے لہجے کی یکسانیت ڈوبتے چاند کی پھیکی چاندنی کی طرح دل و دماغ پر چھا جاتی ہے ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ منظر پسند نہ آئے ؞

## کلام ظریف

تم نے صورت جواب دکھائی ہے
سال میں یاں جیسے آئی ہے

ہے خطا میری تو فقط ذرا تم ڈرو
غلطی ان کی دوتہائی ہے

کہیں جچتی ہے اب تمہارے سے
آگ دشمن نے جو لگائی ہے

ہو گئے وہ کچھ ایک دم سے فرنٹ
ایسی پٹی انھیں پڑھائی ہے

اپنے بھائی کا جو گلا کاٹے
وہ برادر نہیں قصائی ہے

دیکھنا کھس میں ڈال کر چپکی
پی جما لو کی اب بن آئی ہے

میں اڑاتا ہوں ناصحا تو کون ؟
کیا ترے باپ کی کمائی ہے

الٹی آنتیں گلے میں آن پڑیں
ہم تو سمجھے تھے یہ بھلائی ہے

چٹکیوں میں اڑا دیا اس نے
کہہ کے اب بات بھی گنوائی ہے

دیکھو دیکھو سنبھل کے بات کرو
منہ سے نکلی تو پھر پرائی ہے

ہمارا ہی جھوٹ نکلتے رہے ہو ظریف
عمر ساری یونہی گنوائی ہے

ظریف دہلوی

## غزل

حیدر

حجاب ناز و غرور کیا ہے جنوں بڑھانے کا اک بہانہ
نقاب رنگیں ہے یا ہے شوق نگاہ کو کوئی تازیانہ

نظر ہر اک اس کی عارفانہ ہر اک ادا اس کی جادوانہ
نفس نفس میں سما کے کوئی سنا رہا ہے نیا ترانہ

نگار خانہ ہے یا کسی کا کہ ہے یہ کوئی خمار خانہ
کہیں کوئی محو خواب شیریں سنا رہا ہے کوئی فسانہ

کبھی امیری، کبھی فقیری، کبھی مسرت کبھی مصیبت
کسی کا یکساں خوشی و غم میں رہا نہ رہتا ہے یا زمانہ

یہ عشق و الفت یہ رنگ محفل یہ مستی و کیف کی بہاریں
شراب کوئی پلا رہا ہے نگاہ سے اپنی غائبانہ

شعور جن کو نہیں فلک پر وہ بن کے تارے چمک رہے ہیں
سروروں کا ہوا ہے دشمن نہ جانے کیوں اس قدر زمانہ

کسی کے دل میں کھٹک رہا ہوں کسی کی آنکھوں میں چبھ رہا ہوں
خروش الفت ہے کافرانہ جنون ہمت ہے باغیانہ

ذرا یہ سرگوشیاں تو دیکھو کہ عشق خاشاک کو شرر سے
تڑپ ادھر بجلیوں کی حیدر ادھر ہے تنکوں کا آشیانہ

# چاندنی رات

سلام مچھلی شہری

یہ موسم بہار کی ایک چاندنی رات کا ذکر ہے۔

جمیل بھائی نے آسمان کی طرف دیکھا اور فضا کی تعریف میں کوئی مصرع گنگنا کر رہ گئے۔ مایا بھابی اس چھوٹی سی خوبصورت کتاب کو جس کے مطالعے میں وہ دو روز سے مصروف تھیں پاس کی ہری میز پر رکھ کر چائے بنانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں اور میں کچھ سہما سہما جمیل بھائی کے بارے میں سوچنے لگا" کتنے اچھے آدمی ہیں۔ کتنی مٹھاس ہے ان کی بات چیت میں۔ کتنے معصوم ہیں، جیسے انھوں نے میرے اوپر کوئی احسان ہی نہیں کیا ہے" دور کھلی ہوئی فضا میں چاندنی ہمیں چیخ چیخ کر پکار رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بھابی اس کتاب کے اوراق الٹنے لگیں اور میں جمیل بھائی کے ساتھ رات کی تفریح کے لئے چل پڑا۔

وہی ہوا۔ فضا حسین تھی۔ مناظر دلکش تھے مگر ہماری گفتگو کا ایک موضوع بھی ایسا نہیں تھا جو کسی معنی میں بھی چاندنی رات کی دل افزائی کرنے پر تیار رہا ہو ــــــ ہم زیادہ تر سیاست اور ہندوستان کی سماجی زندگی پر باتیں کر رہے تھے، کبھی کبھی آرٹ اور ادب کا کوئی مسئلہ چھڑ جاتا مگر اس کی حیثیت ایک جملہ معترضہ سے زیادہ نہ ہوتی۔ پھر ہم جلدی سے کیبنٹ مشن اور کانگریس لیگ کی موجودہ پالیسی اور لیڈرشپ پر آجاتے۔ جمیل بھائی کی ہمہ گیر قابلیت ہر چیز کو آفاقی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتی لیکن میں اپنی تمام گفتگو کو ہندوستان ہی تک محدود رکھتا۔ اس پر کبھی کبھی مجھے بچہ سمجھ کر وہ ڈانٹ بھی دیتے۔

چاند کبھی چناراں کی چلمن سے جھانکتا، کبھی شاہی عمارتوں کی آڑ لے لیتا۔ چاندنی کبھی زمین پر تھرکتی، کبھی چھتوں پر ناچنے لگتی۔ کوئل بولتی اور بول کے رہ جاتی۔ شفاف چاندنی کو دن سمجھ کے بے وقوف ابابیلیں بڑے بڑے گنبدوں کے گرد چکر لگاتیں اور پھر پتھروں میں کوئی جان نہ پا کر چپ چاپ دبک جاتیں لیکن ہمیں ان مشاہدوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم دلچسپی لینا بھی نہیں چاہتے تھے۔

مغربی روش سے دو چاندا سے تھکے انگڑائی لے کر اٹھے۔ کوئی امریکن ہوگا جمیل بھائی نے سرسری طور پر کہا۔ پھر ہم جنگ اور جنگ کے بعد کے امکانات پر بات کرنے لگے ــــــ سامنے حضرت گنج کا بڑا گرجا گھر ہماری گفتگو کا مذاق اڑا رہا تھا اور ہمیں معلوم ہوا کہ ہم کافی تھک گئے ہیں۔ تفریح کے یہ معنی نہیں کہ رات کی خاموشی میں خواہ مخواہ اتنا بڑا چکر لگایا جائے اور نہ چاندنی رات نے ہم سے یہ کہا تھا کہ ہم اتنی بے جان اور کھردری بحثیں لے بیٹھیں۔

(۲)

اور ان دنوں بھی راتیں چاندنی اگلتی ہیں۔

سرما میرا محبوب ترین موسم ہے لیکن ان دنوں اگر رات تاریک ہوتی تو مجھے آسمانی دیوتاؤں پر بڑا غصہ آنے لگتا ہے۔ انھیں ہمیں اندھیرے میں رکھنے کا کیا حق ہے۔ وہ ہمارے لئے دوزخ کی شمعیں بھی اکثر کیوں بجھا دیتے ہیں؟!

لیکن ایک ہفتے سے رات تاریک نہیں ہے۔ پرسوں خلیل جبران کی کہانیوں سے گھبرا کر میں آموں کے جھنڈ کی طرف چل پڑا۔ کٹی ہوئی فصلوں اور تاڑ کے سایوں سے گزرتا ہوا میں شاید اپنے خاندانی قبرستان میں قدم رکھنے ہی والا تھا کہ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں جلدی سے لوٹ پڑا۔ کچھ سوچ کر اپنی کمزوری پر ہنسنے لگا اور قصبہ کی گنجان گلی کا راستہ پکڑ کر ہوتے ہوئے گھر آنے لگا ــــــ راہ میں حافظ عبدالرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوئی جو اپنی عبائیں سنبھالے ایک ہاتھ میں چھڑی ایک ہاتھ میں لالٹین لئے جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے جا رہے تھے۔ چاندنی رات میں لالٹین کی روشنی ان کی ڈاڑھی کی طرح بکھری ہوئی معلوم ہوتی تھی

"کہاں سے آرہے ہو؟"

"قبرستان کی طرف سے"

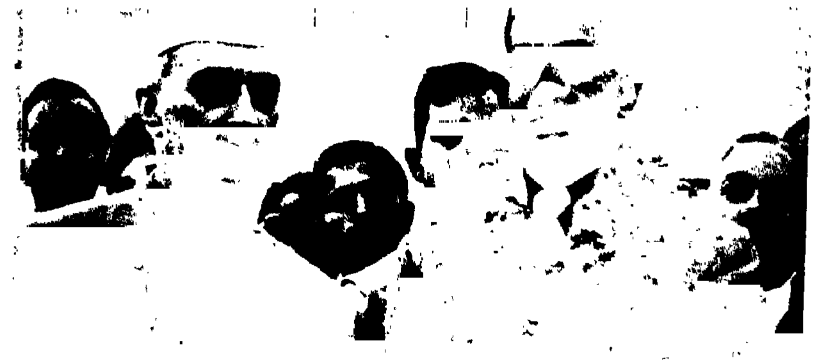
"آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں"

"قبرستان تک"

دور کہیں سے الو کی آواز آئی۔ حافظ صاحب کی عبائیں چاندنی میں پھیلتی گئیں اور ان کی لالٹین بالکل سرد پڑنے لگی ــــــ کسی نے کہا کہ پانڈے جی کا اکلوتا لڑکا . . . . . . . . میں سمجھ گیا۔ قصبے کے پوربی علاقوں میں طاعون کا بڑا زور تھا نہ جانے کیوں اتنی تھکاوٹ کے باوجود بھی میری آنکھ نہ لگ سکی۔ اب کی میں نے دو روز پہلے کے اخبار سے دل بہلانا چاہا۔

پچھلے موسم بہار کی وہ چاندنی رات جمیل بھائی اور مجھ سے کتنی طویل سیاسی اور سماجی گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے ہمیشہ پرانے رہنے والے اخبار کو چارپائی کے نیچے ڈال دیا ــــــ اوپر چاند سردی سے کانپ رہا تھا۔

خط کتابت کرتے وقت چیٹ نمبر کا حوالہ دینا نہایت ضروری ہے (ادارہ)



## مسٹر مینن

ممبر ہند کی حیثیت سے چین جانے وقت مسٹر کے۔ پی۔ ایس۔ مینن نئی دہلی کے ولنگڈن ہوائی اڈے پر عارضی حکومت کے نائب صدر پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ نظر آرہے ہیں۔



## کمانڈر انچیف

حال ہی میں اجمیر کے میو کالج میں تقسیم انعامات کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ تصویر میں ہندوستان کے کمانڈر انچیف سر کلاڈ آکنلک ایک طالب علم کو انعام دے رہے ہیں۔ ان کے بائیں طرف مہاراجہ جےپور تشریف فرما ہیں۔






## مسٹر چندریگر

حکومت ہند کے وزیر تجارت آنریبل مسٹر آئی۔ آئی۔ چندریگر نئی دہلی میں ایک تجارتی اور اقتصادی مجلس کے سامنے محصول بحری کے سلسلے کی وہ تجاویز سنارہے ہیں جو جینوا میں ہونے والی بین الاقوامی تجارتی کانفرنس میں پیش ہونگی۔

# استرے کی دھار پر

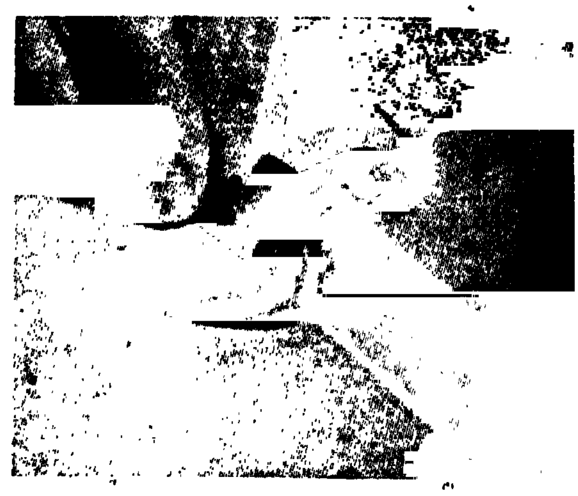
اس صفحے پر نظر آنے والا کیڑا ایک خاص قسم کے گھونگے میں سے نکلتا ھے - اسکے جسم کی بیرونی سطح ایک چپچپے مادے کی وجہ سے چکنی ھوتی ھے - اگر ھاتھ میں اٹھایا جائے تو وہ فوراً پھسل جاتا ھے - تجربے کے طور پر ایک تیز استرا اسکے سامنے رکھا گیا تو وہ اسے آسانی سے عبور کر گیا - دھار اسکے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی -



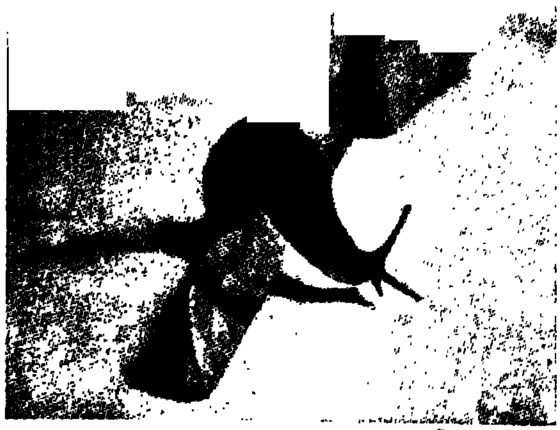
تجربہ کرنے سے پہلے استرے کی دھار تیز کی جا رھی ھے ۔



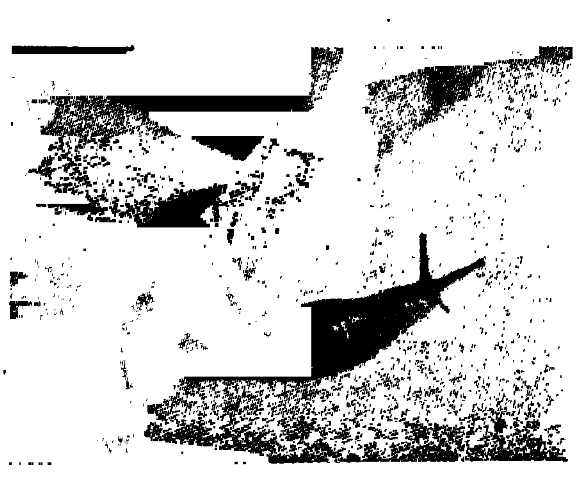
استرا گھونگے میں سے نکلے ھوئے کیڑے کے راستے میں رکھ دیا گیا ھے لیکن یہ رکاوٹ اسکے لئے کوئی ھچکچاھٹ پیدا نہیں کرتی



اب دیکھنا یہ ھے کہ دھار پر سے گذرتے وقت یہ کیڑا کٹ تو نہیں جاتا ۔

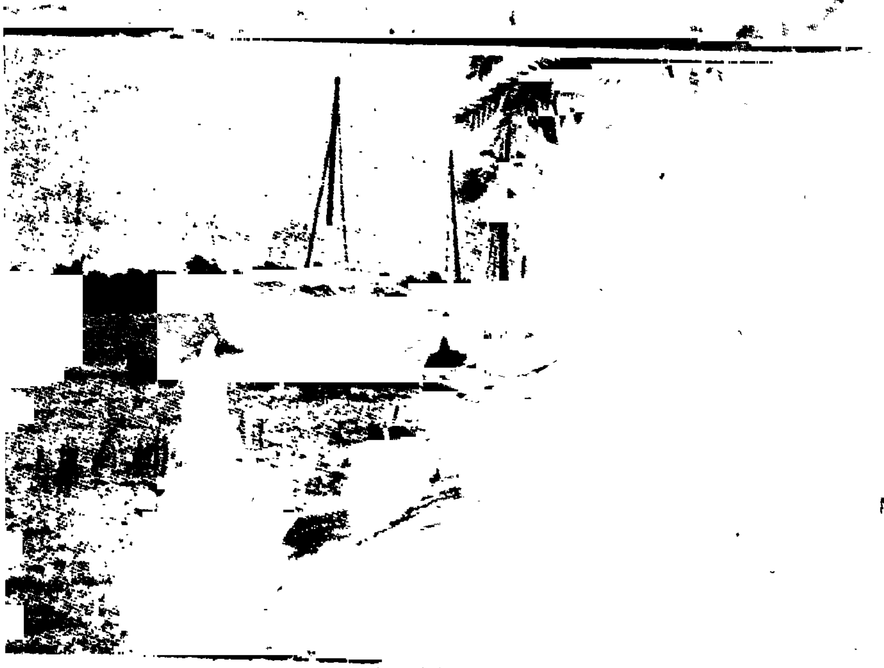


وہ بڑے اطمینان کے ساتھ تیز دھار پر سے گذرتا چلا جا رھا ھے ۔



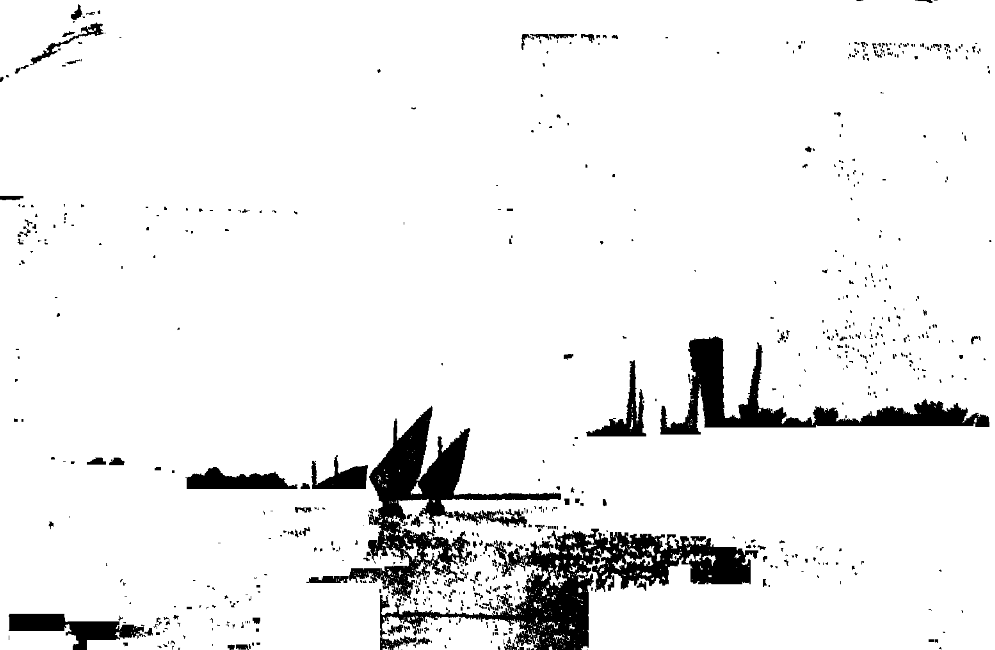
اسے جسم کے چپچپے مادے نے بچا لیا جس کا نشان استرے پر باقی رہ گیا ھے ۔



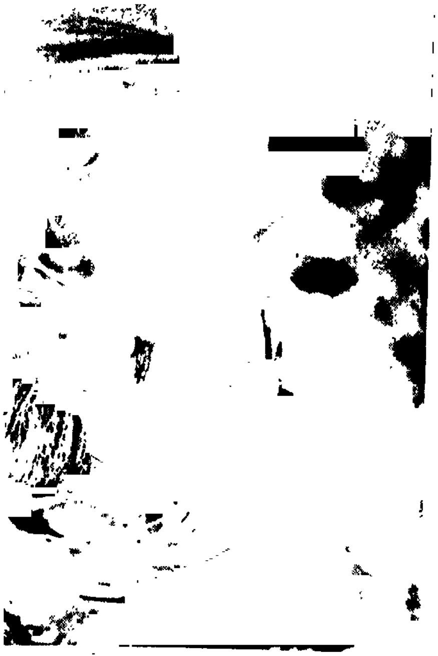


# دریائے دجلہ

سرزمین عراق کو سیراب کرنے والا دریائے دجلہ اپنے ہمسفر دریائے فرات کی طرح تمام مملکت عربستان میں مشہور ہے - اس نے بہت سی قوموں کے عروج و زوال کے ساتھ ساتھ تاریخ کے نہایت اہم پہلوؤں کو ایک تڑپتی بل کھاتی نظر سے دیکھا ہے - موصل کے بالمقابل دوسرے کنارے پر قدیم شہر نینوا کے آثار ابتک موجود ہیں - اس کے ابتدائی حصے میں جو سنگلاخ زمینوں سے گذرتا ہے کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی البتہ میدانی علاقے میں وہ ہمیشہ اپنی گذرگاہ بدلتا رہا ہے - چنانچہ ہزار سال قبل مسیح میں یہ دریا شطالحی کے قریب سے بہتا تھا شہر لگاش کے آثار اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ سمیری عہد میں اسکی گذرگاہ وہی تھی اس سرزمین پر بہنے والی بعض ندیاں ایسی ہیں جو کبھی دجلے سے ملتی ہیں اور کبھی فرات سے - گویا زمانے کا رنگ دیکھکر نت نئے تعلق پیدا کرتی ہیں- ساحلی علاقے بہت زرخیز ہیں لوگ کھیتی باڑی کرنے کے علاوہ بھیڑ بکریاں بھی پالتے ہیں - کھجور کی پیداوار بہت نفع بخش ہے - مغربی دجلے کے ساحل پر دیار بکر ایک مشہور شہر اور تجارتی منڈی ہے - قسم قسم کے جہاز اور سفینے سامان تجارت سے لدے ہوئے وہاں آتے جاتے ہیں - اس دریا میں

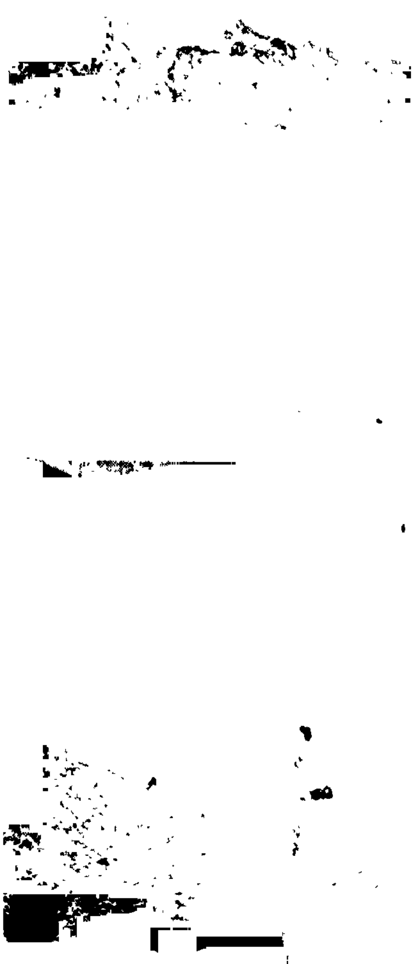


چلنے والی لکڑی کی کشتیاں جن پر بنی
نہال منڈھی ہوتی ہے - ۳۰ ٹن تک
سہار سکتی ہیں لیکن بڑے سفینے ۱۰۰ ٹ
وزن لیجاتے ہیں - عام دنوں میں در
چوڑائی زیادہ سے زیادہ باؤ میل اور گ
چھبیس فٹ ہے - برسات کے دنوں میں
طغیانیاں آتی ہیں باڑھ بڑھ جاتا اور سط
اونچی ہوجاتی ہے - اس صفحے کی
میں چند ساحلی مناظر دکھائے گئے ہی
سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہاں زند
ہنگاموں میں بسر ہوتی ہے -



# بلوچستان

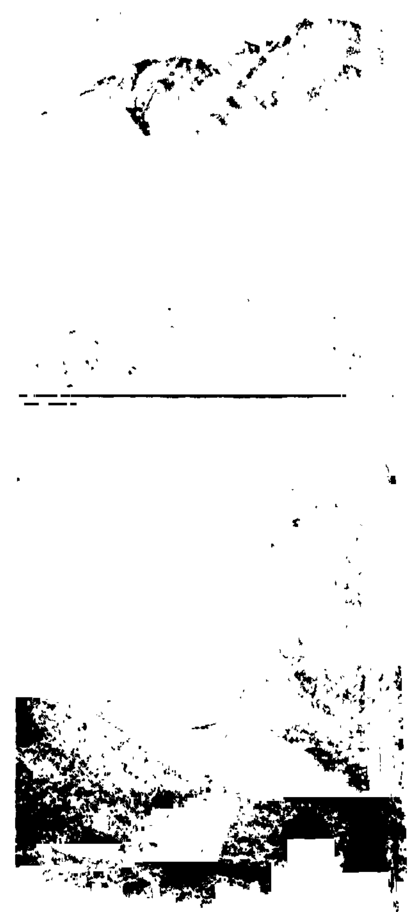
ستان برطانوی ہند کی مغربی سرحد پر ایک پہاڑی ملک ہے جس کا رقبہ تقریباً
۱۳۴ مربع میل ہے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں اسکی کل آبادی ۸۶۸۶۱۷ تھی،
زیادہ تر خانہ بدوش ہیں بھیڑ بکریاں پالتے ہیں۔ زرخیز علاقوں میں کاشت بھی
ہے۔ اناج کے علاوہ پھل بکثرت ہوتے ہیں۔ دریائے سندھ کے بالمقابل تین سو میل
سلسلۂ کوہ واقع ہے۔ برطانوی بلوچستان کے علاوہ باقی حصے پر خان قلات کی حکومت











ہے ۔ عام باشندوں میں دراوڑی ' عربی ' اور ایرانی ' اقوام کے خون کا میل پایا جاتا ہے ۔ بعض خالص عربی النسل ہیں لیکن بحیثیت مجموعی سب بلوچ کہلاتے ہیں ۔ سطح زمین کے تغیرات اور موسمی کیفیات کی تبدیلیاں ہمیشہ اپنا نقش جمانی نظر آتی ہیں ۔ بعض حصے جو کبھی صحرا تھے آج شاداب ہیں اور بعض پرانے مرغزاروں میں آج خاک اڑتی ہے صرف کوئٹہ تک ریل جاتی ہے باقی حصوں میں اونٹوں یا گدھوں پر سوار ہو کر جانا پڑتا ہے ۔ اس صفحے کی تصاویر میں ایک میوہ فروش اپنے بہترین پھلوں کی نمائش کر رہا ہے ۔ اوپر بیٹھے ہوئے بڑے میاں خاص نظروں سے تک رہے ہیں ان سے نیچے شمالی بلوچستان کے کوہ سلیمان کا ایک حصہ دعوت نظارہ دے رہا ہے ۔ اس آٹھ ہزار فٹ بلند پہاڑ کی چوٹیاں برف کی بجائے سفید چونے سے ڈھکی ہوئی ہیں جنکی تہہ پانچ ہزار فٹ تک موٹی ہے ۔ ایک اور تصویر میں کچھ لوگ دامن کوہ میں بیٹھے زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں بائیں طرف پہاڑی بکرے کو خریدنے سے پہلے اسکے گوشت اور بالوں کی جانچ پڑتال ہو رہی ہے ۔

# اسکیمو

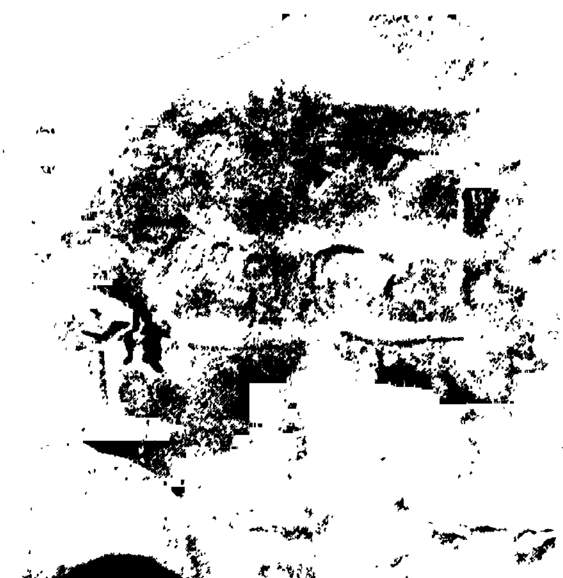
سرد ممالک کے ان باشندوں کو جو زیادہ تر شمالی امریکہ کی آخری سرحد گرین لینڈ لبراڈور اور کچھ سائبریا میں آباد ہیں اسکیمو کہا جاتا ہے - کچی غذا خصوصاً کچا گوشت کھانے کی وجہ سے انکا یہ نام پڑگیا ہے - ۱۹۲۸ء میں انکی کل آبادی صرف تیس ہزار تھی - انکے رسم و رواج بہت ہی عجیب و غریب ہیں - شادی کے سلسلے میں وحدانیت کے قائل ہیں لیکن ایک شخص کی کئی کئی بیویاں اور ایک عورت کے کئی کئی خاوند بھی ہوتے ہیں بعض قبیلوں میں سفید اقوام کے خون کی آمیزش ملتی ہے چنانچہ بہت سے لوگ انگریزی بھی بولتے ہیں ویسے انکی زبان نہایت مشکل ہے یہ لوگ بالکل جاہل ہیں - ہاتھ پاؤں کی انگلیوں پر بیس تک گن لینے والا بڑا قابل سمجھا جاتا ہے - مچھلی اور دوسرے جانوروں کے شکار پر گذارا کرتے ہیں - بعض حصے ایسے بھی ہیں جہاں کے رہنے والوں نے گوشت کبھی چکھا تک نہیں - وہ ہرقسم کی سبزی اور اناج کھاتے ہیں کسی خاص مذہب کے پیرو نہیں ہیں - انکے نزدیک کائنات کا ہر ذرہ ذی حیات اور لائق پرستش ہے -



ملاقات کے وقت مصافحہ کا طریقہ متمدن ممالک کے دستور سے بہت ملتا جلتا ہے -

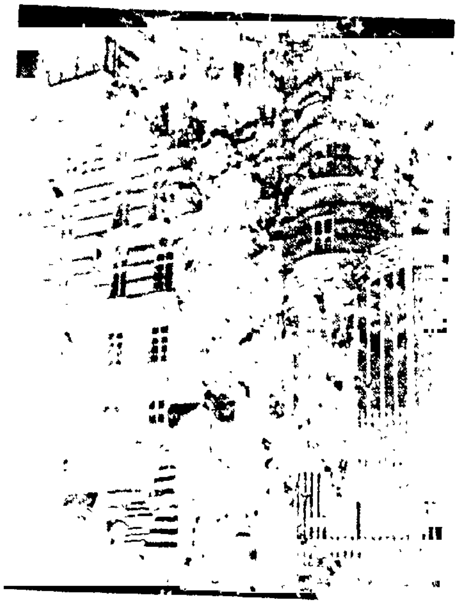
اس تیر اندازنے اپنی آنکھوں کو دھوپ سے بچانے کے لئے عینک خود ہی بنائی ہے -





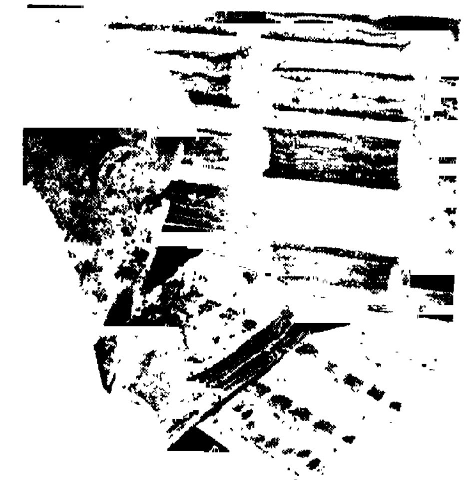
# اسکاٹ لینڈ یارڈ

سوسال سے زیادہ گذرے شاہان انگلستان کے ایک قدیم محل "وائٹ ہال" کا حصہ "اسکاٹ لینڈ یارڈ" کہلاتا تھا - ۱۸۴۲ء میں جب محکمۂ پولیس نے جاسوسی کا ایک الگ شعبہ قائم کیا تو وہی حصہ اسکا مرکز بن گیا - اسے اتنی شہرت ہوئی کہ عوام میں وہ شعبہ اسکاٹ لینڈ یارڈ ہی کے نام سے یاد کیا جانے لگا یہانتک کہ یہی اسکا سرکاری نام بن گیا اور جب ۱۸۹۰ء میں اسے ویسٹ منسٹر برج



اسکاٹ لینڈ یارڈ کی عمارت کا ایک حصہ .

کے قریب نئی کشادہ عمارت میں منتقل کیا گیا تو یہ نام بھی ساتھ ساتھ گیا . ۱۹۰۵ء اور ۱۹۴۰ء میں اس عمارت میں حسب ضرورت توسیع ہوتی رہی اسوقت اسے اتنی اہمیت حاصل ہے کہ لندن کے سات سو مربع میل رقبے میں کوئی ایسا اہم کام رونما نہیں ہوسکتا جسکی اطلاع پہلے سے اسکاٹ لینڈ یارڈ کو نہ مل چکی ہو - وہاں ہر قسم کی اطلاعات پہنچتی ہیں . انہی کی روشنی میں احکامات جاری ہوتے ہیں - امن کے دنوں میں پیغامات زیادہ تر ارتکابات جرائم حادثات اور آتشزدگی کے واقعات سے متعلق ہوتے تھے لیکن لڑائی چھڑنے کے بعد بہت سے نئے موضوعات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوگئی اور اسی محکمے کے ماتحت بحری فضائی اور بری شعبے الگ الگ قائم کردئیے گئے جو شہری مدافعت کے ادارے کے علاوہ ہے -



لائبریری کا ایک حصہ جس میں انگلیوں کے نشانات کا پورا ریکارڈ محفوظ رکھا جاتا ہے -





اس کمرے میں ہر قسم کے پیغامات آتے ہیں -



انگلیوں کے نشانات سے سراغ لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے -



نجمة.

# ساحلِ جمنا پر ایک شام

شمیم رائے بریلوی

وہ شام، حسیں شام، وہ جمنا کا کنارا
جاتے ہوئے خورشید کی وہ آخری کرنیں
کرنیں تھیں کہ خورشید کی دزدیدہ نگاہیں
پانی کا تھا اک فرشِ عجب سطحِ زمیں پہ
خوش رنگ اک اس فرش پہ گلدستہ دھرا تھا
دیتی تھی اسے ٹھنڈی ہوا لوریاں آ کر
سارس کا بصد ناز وہ آنا لبِ ساحل
وہ مچھلیوں کی تاک میں بگلوں کی قطاریں
بہتے ہوئے پانی میں تھی شورش نہ تلاطم
بل کھاتی تھیں اٹھلاتی تھیں لہراتی تھیں موجیں
اودی سی گھٹائیں تھیں شفق پھول رہی تھی
الٹا تھا پڑا چرخ کا جامِ مئے رنگیں
تھیں وجد میں آئی ہوئی پُرکیف ہوا میں
اف کتنا دلآویز تھا وہ عالمِ رنگیں
ہر چیز جو دلچسپ تھی منظر تھا سہانا
ٹوٹے ہوئے دل نے بہ صد عجز دعا کی
مچلے ہوئے جذبات کو کس طرح مناتے
وہ عالمِ دلکش نظر افروز نظارا
آتی ہوئی شب کا وہ خموشی میں اشارا
جو دیکھتے آتی تھیں چمکتی ہوئی موجیں
اس فرش پہ چلنے سے ہواؤں کی تھیں شکنیں
یعنی کہ تھل آغوش میں موجوں کی سمٹا تھا
دن بھر کی تپش سے جو وہ مرجھایا ہوا تھا
پانی کا وہ آئینہ دکھانا لبِ ساحل
نطقوں کا خوشی سے وہ نہانا لبِ ساحل
موجوں کا کنارے پہ وہ ہلکا سا ترنم
لیکن کبھی ساحل سے نہ ہوتا تھا تصادم
جس سے دلِ دریا میں بھی اک آگ لگی تھی
اک ہلکی سی سرخی میں فضا ڈوبی ہوئی تھی
گلہائے تر و تازہ سے مہکی تھیں فضا میں
نیلا تھا فلک سرخ شفق اودی گھٹائیں
یاد آ گیا بھولا ہوا ماضی کا فسانا
کچھ دیر کو پھر کاش وہ آ جائے زمانا
کس طرح شمیم آہ لگی دل کی بجھاتے

## آج کل

دل جلوہ تمام کا مسکن ہے آج کل
سینے میں نور وادیِ ایمن ہے آج کل
دل کس حسیں کی یاد سے روشن ہے آج کل
نادان اپنا آپ ہی دشمن ہے آج کل
وحشت جنوں نواز ہے دامن ہے آج کل
چشمِ الم نصیب میں ساون ہے آج کل
ہے شوق میں امان ہی آج کل
ہر چند دل فریب ہے شمعِ نظر فروز
دل کو تلاش ناوکِ مژگاں کا ارمان لوں
رقصاں ہے عمر کی ... سے عمر سیاں کا تار
دل کے نہال میں ہے جیسے کلی شاخِ نو
تابِ نظر شعاعِ جمال ہے
جس کے فرش نگاہ کا
دل میں خیال عارضِ تاباں سے آج کل
ظلمت نصیب زندگی روشن ہے آج کل
دفعتہ حسیں ... سے جو میں دار و گیر ہے ضیا

ضیا صدیقی

## غزل

ہم برق کی نظر ہے آشیانے کی
میں نقش ڈھونڈ رہا ہوں ابھی زمانے کی
نگاہ پیر ہو تو ... راز الفت کی
کرے گا زیرِ لب ادائیں آزمانے کی
مگر کرے گا اثر انداز بے رخی محبوب
کوئی تو بات ہے نگاہ میں تیری
زمانہ لعنتِ غم مانگتا ہے مجھ سے کیوں اب
نگاہ لطف سے بھی میرا نصیب کہاں
یہ دور کیسی ہم سے دوستی ہے تب کیسو
ہم اور حضرت واعظ بہار میں توبہ
مری نگاہ میں ہی گردش زمانے کی
وہ دور جام وہ ساون کی رات وہ ساقی
مرے خیال میں وہ شوخی نہیں رہی شمیم
اڑی اڑی سی کہ جام گم سے فسانے کی

شمیم رومانی

# لیو بیک لینڈ اور بیک لائٹ کی دریافت

پی۔ این پنڈت

سچائی کبھی کبھی افسانے سے بھی زیادہ دلچسپ ہوا کرتی ہے۔ آپ نے ایسی کئی کہانیاں سنی ہونگی جن میں دفتر کا ملازم چھوکرا مالک کی خوبصورت لڑکی سے شادی کرکے آخرکار اپنے آقا کے کاروبار کا مالک بن جاتا ہے۔ شاید کسی ناول لکھنے والے کو یہ نہیں سوجھی کہ اس کے ناول کا ہیرو تجربہ گاہ میں آلات دھونے والا ایک نوجوان لڑکا اپنے پروفیسر کی صاحبزادی سے بیاہ کرکے ویلاکس (Velox) یعنی فوٹو کی تصویر چھاپنے کے کاغذ اور بیک لائٹ کا موجد بن گیا۔ یہ ہے چند لفظوں میں لیو بیک لینڈ کی سرگذشت حیات۔ لیو بیک لینڈ ۱۴ نومبر ۱۸۶۳ء کے دن گھنٹ میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین غریب مگر دیانتدار تھے انہوں نے اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ بیک لینڈ شروع ہی سے ہونہار طالب علم تھا۔ اس نے سولہ سال کی عمر میں شہر کے پبلک ہائی سکول کا آخری امتحان اعلیٰ درجے میں پاس کرلیا۔ دو ہی برس بعد اس نے گھنٹ کی یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری حاصل کرلی۔ اور اسی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوگیا۔ اس عہدے کی تنخواہ بہت قلیل تھی۔ اسلئے وہ بروجیز کے سرکاری نارمل سکول میں اپنے فاضل وقت میں طبیعات اور کیمیا پڑھایا کرتا تھا۔ اس آمدنی سے اپنی مالی کمی پوری کرتا رہا۔ ۱۸۸۷ء میں اس کو بلجیم کی چاروں یونیورسٹیوں کا لاری ایٹ (Laureate) مقرر کردیا گیا۔ یہ ملک بھر کا بڑا تعلیمی اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ اس اعزاز حاصل کرنے والے کو ایک سنہری تمغہ اور دوسرے ملکوں کی یونیورسٹیوں میں دو سال تک تعلیم حاصل کرنے کا خرچ بھی دیا جاتا ہے۔ اس دوران میں بیک لینڈ کو اپنے استاد پروفیسر شوارز کی دختر نیک اختر سے محبت ہوگئی۔ اسکے سوانح حیات لکھنے والوں کا کہنا ہے کہ محبت کا یہ جذبہ اور ترقی کی خواہش عمر بھر بیک لینڈ کی رہنمائی کرتی رہی۔

بیک لینڈ بے پرواہ اور خوش باش سا نوجوان تھا۔ بیک لینڈ کا ایک ہم سبق ہے ایٹ (Hyatt) جو اس کے ساتھ ساتھ برلن کی مشہور دارالعلوم ٹیکنیشے ہوک شولے میں کام کرتا تھا۔ لکھتا ہے "ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیک لینڈ برلن میں حصول تعلیم کی غرض سے نہیں آیا۔ بلکہ جرمن دارالخلافہ میں رات کی آوارہ گردی اور سیر تماشے کی نیت سے آیا ہے۔" لیکن آگے چل کر اسی ہم سبق کو اپنی رائے واپس لینی پڑی۔ اور بیک لینڈ کی فنی مہارت اور علم کیمیا کی ہمہ گیری کا قائل ہونا پڑا۔ بات دراصل یہ ہے کہ بیک لینڈ کے اعلیٰ اعزاز اور اس کا کیمیائی علم اس پر کبھی بارگراں ثابت نہیں ہوئے۔ اور تجربہ گاہ کی تھکا دینے والی مصروفیتوں کا بوجھ اس نے بڑی آسانی سے اپنے کندھوں پر لے لیا ہوا تھا بیک لینڈ نے اپنے الفاظ میں زندگی کے اس زمانے کا یوں ذکر کیا ہے۔ "میری اصلی تعلیم اس وقت شروع ہوئی جب مجھے یونیورسٹی تعلیم کو خیرباد کرکر عملی زندگی کی ذمہ داریوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ تعلیم مجھے امریکہ میں حاصل ہوئی عملی زندگی ایک بڑی درسگاہ ہے جہاں نہ تو کوئی مقررہ تعلیمی نصاب ہے اور نہ ہی کوئی سند ملتی ہے۔ اور جہاں غلط اور بے بنیاد نظریے سچائی کی کڑی ٹھوکروں سے جلد سیدھے راستے پر آجاتے ہیں۔ میں مرتے دم تک اسی درسگاہ کا پوسٹ گریجوٹ طالب علم رہنا چاہتا ہوں"۔ اس تعلیمی دورے کے خاتمے پر بیک لینڈ گھنٹ واپس آگیا۔ سیلین شوارز سے شادی کرلی اور واپس امریکہ چلا گیا۔ یہ ملک اور اس کی ترقی پذیر فضا اسے اتنی مرغوب ہوئی کہ اس نے اسی ملک کی مستقل رہائش اختیار کرلی۔ مدت تک تلاش روزگار میں بیک لینڈ ادھر ادھر ہاتھ پیر مارتا رہا۔ لیکن کہیں جم کر کام نہ کرسکا۔ آخرکار یہ فیصلہ ہوا کہ ملازمت کا خیال ترک کرکے آزادانہ طریقے سے روزی کمائی جائے۔ اگر بیک لینڈ یہ فیصلہ نہ کرتا تو شاید دنیا ویلاکس فوٹو کی تصویر چھاپنے کے کاغذ اور بیک لائٹ جیسی مفید چیزوں سے محروم رہ جاتی۔ غرض نیویارک کے ایک غیر معروف علاقہ میں [illegible] ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے کر اس میں ایک حقیر سی تجربہ گاہ قائم کرلی گئی اور کمرے کے باہر "لیو بیک لینڈ۔ مشورہ دینے والا کیمیادان" کے نام کی تختی لٹکا دی گئی۔ بیک لینڈ کے پاس روپیہ پیسہ بالکل نہیں تھا اور دوکان پر گاہک بھی شاذ و نادر ہی آتے تھے لیکن اس کا دماغ کیمیائی منصوبوں سے چھلک رہا تھا۔ زندگی کے اس نازک حصے کا حال وہ اپنے لفظوں میں یوں بیان کرتا ہے "میں نے کئی نیم پختہ ایجادوں کی تکمیل کی کوشش کی جن میں ہر ایک پر لاکھوں روپے خرچ کئے جاسکتے تھے۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک لمبی بیماری سے چند مہینے بستر پر لیٹنا پڑا۔ اس بیماری نے مجھے مصیبت سے رہائی دلادی۔ میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ میری پونجی خرچ ہوچکی تھی

اور بڑھتے ہوئے قرض کا خطرہ میری جان کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ ان حالات میں مجھے اپنی آئندہ زندگی کے پروگرام پر سوچ بچار کرنے کا اچھا موقع مل گیا۔ غور و خوض کے بعد میں اس فیصلے پر پہنچا کہ بے معنی اور بے سر و پا کیمیائی ریسرچ پر فضول وقت ضائع کرنے کے بدلے مجھے کسی ایک کیمیائی معمے کو جس میں کم سے کم عرصہ میں مفید نتیجہ نکل سکے سلجھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اسی پر پوری توجہ سے کام کرنا چاہیئے۔ اس فیصلے نے بیک لینڈ کی زندگی کا رخ پلٹ دیا۔ یہ بیماری ایک نعمت ثابت ہوئی جس نے بیک لینڈ کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے بیک لینڈ کو فوٹو گرافی اور اس کے کیمیائی عملوں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس وقت فوٹو کی تصویر لینے والوں کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ فوٹو کے مروجہ چھاپنے کے کاغذ پر چھپائی کرنے کے لئے سورج کی روشنی ضروری تھی۔ گیس یا بجلی کی روشنی میں فوٹو کی تصویر نہیں چھپ سکتی تھی۔ بیک لینڈ نے تھوڑی ہی سی کوشش سے ایک ایسا کاغذ تیار کر لیا جو گیس کی روشنی میں فوٹو لے لیتا تھا اس کاغذ کا تجارتی نام ویلاکس رکھا گیا۔ اس دریافت کی خبر دھیرے دھیرے کوڈک کمپنی کے کروڑپتی مالک جارج ایسٹ مین تک جا پہنچی جو فوٹو گرافی کی دنیا میں ہر نئی ایجاد سے فائدہ اٹھانے پر تلا ہوا تھا۔ فوراً بیک لینڈ کو ان لفظوں میں بلاوا بھیجا گیا۔ اگر آپ ویلاکس کے حقوق بیچنا چاہتے ہیں تو راچسٹر چلے آیئے۔ مجھے یقین ہے ہم بات چیت کر کے سمجھوتا کر سکیں گے۔ بیک لینڈ اس پیغام پر پھولا نہ سمایا۔ اور نیویارک سے راچسٹر روانہ ہو گیا۔ دوران سفر میں اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات موجزن تھے۔ آخر اپنی ایجاد کی قیمت کیا مانگوں ایسا نہ ہو کہ ایک دم زیادہ مانگ سے سودا ہی بگڑ جائے۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ پچاس ہزار ڈالر مانگوں گا۔ لیکن پچیس ہزار ڈالر سے کم ہرگز منظور نہ کروں گا۔ وہ غریب نادار کیمیا داں کروڑپتی جارج ایسٹ مین کی فراخ دلی کا کیا اندازہ لگا سکتا تھا۔ راچسٹر پہنچتے ہی بیک لینڈ۔ ایسٹ مین کے پرائیوٹ دفتر میں جا دھمکا۔ ایسٹ مین نے بڑی بے تکلفی سے اس کا استقبال کیا اور کہا تشریف رکھیئے میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ آپ کی ایجاد بڑی عجیب و غریب ہے۔ اور امکانات سے لبریز ہے۔ میں آپ کے اس کارنامے کو بڑے احترام سے دیکھتا ہوں۔ کیا آپ ویلاکس کے حقوق کیلئے دس لاکھ ڈالر معاوضہ منظور فرمائینگے۔ سچ جانیئے کہ اس خلاف امید پیش کش پر اگر وہ کرسی پر بیٹھا ہوا نہ ہوتا تو چکر کھا کر زمین پر گر جاتا۔ اس کامیابی نے بیک لینڈ کا حوصلہ بہت بڑھا دیا اور وہ بڑی بڑی ایجادوں کے خواب دیکھنے لگا۔

کاؤنٹ دی شارڈونے نے ۱۸۹۲ء میں ریشم کے کیڑے کے مقابلہ پر مصنوعی ریشم تیار کیا۔ بیک لینڈ نے [illegible] ہندوستان کے ایک حقیر سے کیڑے کے حریف بن کر اس کی [illegible] مرتبت بنانے کا عہد کر لیا۔ ایک ننھا کیڑا پیپل اور [illegible] کے درختوں [illegible] تیار کرتا ہے۔ [illegible] لاکھ کیڑے [illegible] سیر لاکھ تیار کر سکتے ہیں۔ امریکہ میں ہر سال [illegible] کی لاکھ [illegible] دوسرے لفظوں میں بیک لینڈ نے ........ کیڑوں کا کاروبار بند کر کے رکھ دیتے ہم [illegible] بنانے والے رال کی تالیف کا [illegible] Fa[illegible] نے ہندوستان کی [illegible] اسی طرح بیک لینڈ کی دریافت سے ممکن تھا ہندوستان کے [illegible] بند ہو جاتے۔

بیک لینڈ مصنوعی رال بنانے کو [illegible] اندازہ لگا لیا کہ یہ ایک دشوار اور غلط کام ہے۔ [illegible] نیچ میل سا شیرہ جو نہ تو پگھلایا جا سکے۔ نہ کسی چیز میں حل ہو سکے۔ نہ ہی اس کی کیمیائی تشریح کی جا سکے بھلا [illegible] کام کی شے ہے۔ اگر یہ بھی معلوم ہو کہ ٹیسٹ ٹیوب میں کون سا مرکب تیار ہو رہا ہے۔ [illegible] ساخت کیا ہے تو صرف خدا پر بھروسہ کر کے [illegible] کام چلایا جا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں کیمیا داں کی حیثیت ایک ایسے جادوگر کی سی ہوتی ہے جو کوہ [illegible] سے کام کر رہا ہو۔ یہ طریقہ کار نہ تو سائنسی حیثیت رکھتا ہے اور نہ تسلی بخش ہی ہے۔ گذرے سو سال کا کیمیائی لٹریچر ایسی یادداشتوں سے بھرا پڑا ہے کہ فلاں فلاں کیمیائی عمل سے ایک [illegible] سے ملتا جلتا سیاہ مادہ بن گیا۔ جس کو بیکار سمجھ کر مزید چھان بین نہ کی گئی۔ کیمیا داں نے [illegible] اس معجون مرکب کو کوڑے کی بالٹی میں انڈیل دیا اور کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ۱۸۷۲ء میں مصنوعی رنگ کے موجد فان بئر نے اور اس کے شاگردوں نے پہلی بار فینول (Phenol) اور فارم لڈی ہائڈ Formal Dehyde کے مابین کیمیائی عمل کی چھان بین کی۔ اس کی اس عمل سے [illegible] نہیں ہوئی۔ کیونکہ پیچ کو لگا [illegible] کا ایک مرکب بن جانے سے ٹھنڈا ہو جانے پر رال کی شکل اختیار کر لی۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں ایک کیمیا داں [illegible] بھی اسی قسم کے تجربات کرتا رہا لیکن اس کے فلاسک اور بیکروں میں یہ مسالہ ایسا چپک گیا کہ انہیں نالیوں کی نذر کر دینا پڑا۔ بیک لینڈ نے پہلے تو ان متقدمین کی یادداشتوں کا بغور مطالعہ کیا۔ پھر ان تجربات کو دہرانے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ مصنوعی رال بنانے کا راز [illegible] اور فارم الڈی ہائڈ

کے اسی کیمیائی عمل میں چھپا ہوا ہے۔ یہ دونوں مسالے ارزاں تھے اور آسانی سے مل جاتے تھے۔ بیک لینڈ ایک نئی راہ پر چل پڑا۔ مہینوں اس کیمیائی عمل کی چھان بین جاری رہی یکے بعد دیگرے نوٹ بکیں یادداشتوں سے بھر گئیں۔ لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی انجام کار اسی معجون مرکب کا چپکنا غیر حل پذیر اور لعاب سا ڈل بن جاتا۔ بیک لینڈ ان ناکامیوں سے نراس نہیں ہوا بلکہ اس کے ذہن رسا کو ایک نئی بات سوجھی جس نے اس کی تحقیقات کا رخ ہی بدل دیا۔ یہ مسالے اسقدر بے قابو اور ڈھیٹھ سے واقع ہوئے ہیں۔ ان کی اسی صفت سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے مصنوعی لاکھ کی تلاش ترک کردی۔ اس کے عوض ایک ایسا مال بنانے کے درپے ہوگیا جو سانچے میں ڈھل کر سدا کے لئے غیر مبدل شکل اختیار کرلے۔ دنیا کو ایسے مسالے کی از حد ضرورت تھی اور تجارت میں اس کی بڑی مانگ ہوجانے کی امید تھی۔

بیک لینڈ کی چھان بین مہینوں جاری رہی۔ وہ اس میں ایسا غرق ہوا کہ راتیں بن سوئے گذر جاتیں۔ اس نے ہم وزن اجزا لے کر ایک خاص آلے (Anteclave) میں ان کو ۲۰۰° س تک گرم کیا۔ پرانے ہونا جیسے مادے کی بجائے ان حالات میں ایک سیال مگر شفاف شے حاصل ہوئی۔ یہ مادہ جلدی جم کر سخت ہوگیا۔ سانچے میں ڈھالنے کے لئے بہت اچھا مسالہ تھا۔ یہی بیک لائٹ کے تجارتی نام سے مشہور ہوا۔ بیک لینڈ نے بڑے اشتیاق سے دنیائے کیمیا کے اس نو وارد کی طبعی صفات کا مطالعہ کیا۔ عام شکل و شباہت میں بیک لائٹ کہربا سے ملتا جلتا مگر کہیں زیادہ سخت تھا۔

یہ کسی محلل میں گھلتا نہیں تھا۔ نمی جذب نہیں کرتا تھا۔ چاقو سے چھیل جاتا تھا اس لئے خرادا جا سکتا تھا۔ سانچے میں ڈھل جانے کے بعد نہ تو اس کی شکل و صورت میں کوئی تبدیلی ممکن تھی۔ اور نہ ہی اس کی کیمیائی ہیئت میں کوئی تبدیلی ہوسکتی تھی۔ آنیوالے دو سالوں میں اس نئے لاکھ نما مسالے پر بڑی محنت سے تجربات جاری رہے۔ اس کو ہر طرح سے آزمایا گیا۔ اس کی خوبیوں اور کمزوریوں سبھی صفات کی جانچ پڑتال کی گئی۔ اور کئی پیٹنٹ حاصل کئے گئے۔ اس دفعہ بیک لینڈ نے اپنے حقوق کسی سرمایہ دار کے ہاتھ نہیں بیچے، بلکہ اس آمدنی سے اس کی مالی حالت بہت بہتر ہوگئی۔ اس نے بیک لائٹ سے بلیرڈ کھیلنے کی گیندیں، گراموفون باجے کے ریکارڈ، ورزش کے ڈمبل، بجلی کے سوئچ، چلنے پھرنے کے پرزے پیالے اور کئی قسم کے لٹو بنائے۔ جب اسکا دوست ہرٹی اس کی تجربہ گاہ میں ملاقات کے لئے آیا تو بیک لائٹ کی خود ساختہ چیزیں بڑے اشتیاق سے اسے دکھائیں۔ بالکل جیسے کوئی ماں اپنے نوزائیدہ بچے کو بڑے فخر سے دکھاتی ہے کبھی وہ گیند بڑے زور سے زمین پر دے مارتا۔ کبھی گراموفون باجے کا ریکارڈ زمین پر پٹخ دیتا کبھی پاؤں میں ترختے یا تلے دبا کر دکھاتا۔ بیک لینڈ کا خیال تھا کہ یہ مضبوط اور غیر عامل نو دریافت بیک لائٹ کم سے کم چالیس صنعتوں میں استعمال ہوسکیگا۔ اس کے خواب میں بھی نہیں آیا ہوگا کہ پچیس برس بعد چائے کے پیالے سے لے کر ہوائی جہاز بنانے کی شاید ہی کوئی ایسی صنعت رہ جائے گی۔ جسکا کام بغیر بیک لائٹ کے چل سکے۔ نہ ہی اس کو ان ان گنت ملائموں کا اندازہ ہوسکتا تھا جو آنے والے سالوں میں دریافت ہونے والے تھے۔ اور جن کی دریافت بیسویں صدی کے عجوبوں میں سمجھی جانے کا حق رکھتی ہے۔ بیک لائٹ پہلے پہل بیک لینڈ کی تجربہ گاہ واقع یونکرس میں بنا۔ تجارتی پیمانے پر ساخت کے لئے جنرل بیک لائٹ کمپنی ۱۹۱۰ء میں قائم ہوئی۔ جو ۱۹۲۲ء میں بیک لائٹ کارپوریشن کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں بیک لینڈ کے پیٹنٹ کی میعاد ختم ہونے پر کئی اور کمپنیوں نے الگ الگ تجارتی ناموں سے بیک لائٹ بنانا شروع کردیا۔ ان میں دو یعنی ڈیوریز اور ریزی ناکس معروف ہیں۔ فینال کے بجائے اب فرفیورال استعمال ہوتا ہے۔ یہ ایک الکحل ہے جو جئی کے چھلکے کی کشید سے بنتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ لفظ پلاسٹک (ملائمہ) سے کیا مراد ہے۔ ہم نے ایک مبہم سا لفظ چن لیا ہے اور غیر جس کے معنی اس کے ساتھ منسلک کر دیئے ہیں۔ پلاسٹک (ملائمہ) سے ایسا مسالہ مراد لیا جاتا ہے جس میں ملائمت کی طبعی صفت ہو۔ یعنی جو میکانی زور دبانے، کھینچاؤ، یا مروڑنے سے پیوستگی چھوڑے بغیر نئی شکل اختیار کرلے۔ پلاسٹک (ملائمے) لچکیلے ہوتے ہیں۔ گر بغور دیکھا جائے تو یہ لفظ بیک لائٹ کی صفات کا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ محض امریکہ کے تجارتی اشتہار بازوں کی ایجاد ہے۔ بہرحال اب یہ ہر جگہ بولا اور سمجھا جاتا ہے۔

بیک لائٹ نے بجلی کی رفتار سے مقبولیت حاصل کرلی۔ ۸ فروری ۱۹۰۹ء کو جب بیک لائٹ نیویارک کے کیمیا دانوں کے کلب میں پیش کیا گیا تو بیک لائٹ سے بنے ہوئے بجلی کے سامان اور روزمرہ کے کام کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی نمائش بھی کردی گئی۔ بیک لائٹ کے سگرٹ ہولڈر اور تمباکو پینے کے پائپ پہلے پہل فروخت کے لئے دکانوں پر پہنچے۔ تجارتی پیمانے پر بجلی کا سامان بیک لائٹ سے بنا۔ بیک لائٹ چینی سے بھی زیادہ غیر موصل ہے۔ لکڑی کے برادے یا ایسبسطاس کی ملاوٹ سے ایسا سخت ہو جاتا ہے کہ ٹھیس لگنے سے نہیں ٹوٹتا اور بڑی صحت سے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ جنگ عظیم میں بیک لائٹ کا استعمال موٹر کار اور ہوائی جہاز کے کل پرزے بنانے میں بہت بڑھ گیا۔ ہوائی جہاز کا پنکھا لکڑی سے بنایا جاتا تھا۔ نہ تو یہ مضبوط ہوتا تھا اور نہ ہی قابل اعتبار اکثر عین ضرورت کے وقت ٹوٹ جایا کرتا۔ کپڑے کی تہیں دیکر بیک لائٹ کا

...پنکھا امتحان کی غرض سے تیار کیا گیا۔ پہلے اسے ڈھائی ہزار چکر فی منٹ کی رفتار سے گھمایا گیا اور ایک ایسی مصنوعی سرنگ میں سے گذارا گیا جس میں گرم جھکڑ چل رہا تھا۔

آخر کار مشین گنوں سے اس پر گولیاں چلائی گئیں۔ ان حالات میں لکڑی کا پنکھا پرزے پرزے ہو جاتا۔ لیکن بیک لائٹ سے بنا ہوا پنکھا اس کڑے امتحان میں پورا اترا۔ بلکہ اسے ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا۔ اس مظاہرے سے بیک لائٹ کو بہت اشتہار ملا۔ اور لوگوں پر ظاہر ہو گیا کہ اسے محض خوشنما سگرٹ ہولڈر بنانے کا مصالحہ ہی سمجھنا درست نہیں۔ یہ ہماری اور بھی بڑی بڑی خدمات سر انجام دے سکتا ہے۔

فینول یعنی کاربالک ترشہ اس نئے ملائمہ کا ضروری جز ہے [illegible] زمانۂ جنگ کی بھی ایک کارآمد چیز ہے۔ فینول سے پکرک ترشہ اور ٹی۔ این۔ ٹی جیسی دھماکو کیمیائی اشیا بھی بنتی ہیں۔ امریکہ کے کیمیائی کارخانوں نے جنگ عظیم ۱ کے دوران میں کاربالک ترشہ بنانے میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر امریکہ کے پاس چار کروڑ پونڈ کاربالک ترشہ فالتو پڑا ہوا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کیا کیا جائے۔ کیونکہ اس کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ کاربالک ترشہ کا استعمال پھیپھڑوں کو غسل دینے کے کام آتا ہے تاکہ اس کی پھپھڑیاں مر جائیں جراثیم کش دواؤں میں پڑتا ہے۔ ایسپرین اور سیلی سیلک ترشہ (Salicylic Acid) اور ایسی ایسی بیسیوں دوائیں اس سے بنتی ہیں۔ لیکن ان تمام [illegible] کی سالانہ کھپت [illegible] پونڈ کے لگ بھگ رہتی ہے۔ جب بیک لائٹ بنے لگے تو بیک لائٹ کی مانگ کے ساتھ ساتھ کاربالک ترشہ کی کھپت بھی بڑھ گئی اور یہ تجارتی مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔ ایک [illegible] سے کسی دوسری کیمیائی صنعت میں کتنی ترقی ہوتی ہے۔ اس کی بڑی اچھی مثال ہے۔ امریکہ میں ریڈیو سیٹوں کی ساخت پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں [illegible] سیٹ تھے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک لاکھ، سنہ ۱۹۲۳ء میں ۵ لاکھ اور [illegible] میں ان کی گنتی ایک کروڑ [illegible] تک ہو گئی۔ اس میں ۵۰ لاکھ موٹر کاروں کے [illegible] شامل نہیں۔ ادھر سنہ ۱۹۲۰ء میں امریکہ نے ۴ لاکھ پونڈ بیک لائٹ بنایا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں کل مصنوعی رالوں کی مقدار ۵ کروڑ پونڈ تھی جس میں [illegible] بیک لائٹ تھا۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ بیک لائٹ کی دریافت کے بعد پلاسٹک ملائموں کی تلاش ختم ہو چکی ہے۔ دراصل یہ تلاش برابر جاری ہے۔ ہر سال نت نئے ملائمے دریافت ہوتے رہتے ہیں بلکہ مکمل صفات والا ملائمہ ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ کسی میں کوئی خامی ہے کسی میں کوئی۔ پھر بھی یقینی امر ہے کہ آنے والے زمانے میں یہ مسالے لکڑی، دھات، سیمنٹ بلکہ کانچ تک کے زبردست

حریف ثابت ہوں گے۔ [illegible] چھوٹی چھوٹی چیزوں سے قطع نظر ڈھانچے بھی [illegible] ڈھالے سے بنائی جاتی [illegible] کھڑکیاں اور دروازوں کے [illegible] کاریوں اور ہوائی جہازوں کے ڈھانچے میز کرسیاں اور [illegible] انہی سے بنے گا۔ [illegible] دیواروں کی [illegible] چیزیں نہ صرف اتنی [illegible] ہوں گی [illegible] بھی ان پر کوئی [illegible] اور نہ ہی ان کو پالش یا وارنش کرنا پڑے گا۔ [illegible] سے بنی ہوئی اشیا کی [illegible] نمائش ہوئی [illegible] اشیا نمائش کے لئے پیش کی گئیں [illegible] چیزیں ہماری زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتی تھیں۔ [illegible] کی چھوٹی سی فہرست [illegible] مضمون میں دینا ممکن نہیں۔

اب بیک لائٹ کے بھائی بند پلاسٹک [illegible] نظر دوڑائیے۔ [illegible] میں تجارتی پیمانے پر بنانا شروع ہوا [illegible] نئے ملائموں کی بڑی [illegible] کے باوجود سیلولائیڈ کی لچک [illegible] کی وجہ سے بڑے کام کی چیز ہے [illegible] استعمال پذیری [illegible] لیکن جدید [illegible] سے یہ نقص بہت حد تک رفع [illegible] سینما کے فلم، چاقوؤں [illegible] کے دستے اور [illegible] بھی [illegible] سے بنتے ہیں۔

دودھ کے کیسین (Casein) یعنی پنیر [illegible] کے کیمیائی عمل سے ایک [illegible] ملائمہ بنتا ہے [illegible] پیمانے پر تیار ہو رہا ہے۔ اس سے طرح طرح کے [illegible] جاتے ہیں [illegible] ظاہری شکل [illegible] ملائموں سے بہتر [illegible] قیمت میں سستا ہے۔ اس کا تجارتی نام گیلے [illegible] (Galalith) یعنی مصنوعی ہاتھی دانت ہے۔ [illegible] بٹن سازی میں [illegible] استعمال ہوتا ہے [illegible] کے برازیل کے آئوری نٹ (Ivory Nut) [illegible] اس صنعت سے خارج ہو چکے ہیں۔ یوریا (Urea) [illegible] سے بننے والے ملائمے بیک لائٹ کے بڑے حریف [illegible] بہت سے شفاف ہوتے ہیں۔ سانچے میں آسانی سے ڈھالے جا سکتے ہیں [illegible] قوس و قزح (دھنک) کے سبھی رنگ [illegible] دئے جا سکتے [illegible] لاگت بھی کم آتی ہے۔ یعقوب [illegible] مفید ہے [illegible] پکنک کی ٹوکری میں سجے ہوئے خوش رنگ [illegible] طشتریوں [illegible] دیکھ کر یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ سب معدنی [illegible] بنے ہیں۔ لیکن حقیقت میں [illegible] نے پورا کی [illegible] ساخت سے [illegible] ایک ہنگامہ مچا دیا۔ کیمیائی تجربہ خانے کا [illegible]

امونیا گیس (Ammonia) اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیسوں کے باہمی کیمیائی عمل سے بن رہا ہے۔ فارم الڈی ہائیڈ، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی کا بنتا ہے، گو یہ خوشنما نہیں ہے۔ [illegible] پینے کے پیالے اور آپ کے ریڈیو سٹ کا ڈھکنا [illegible] دونوں کے دونوں لطیف مسالے سے بنے ہیں۔ پرس پکس (Perspex) ایک جدید ملائمہ حال ہی میں بنا ہے۔ یہ کانچ سا شفاف ہے لیکن [illegible] سے نہیں ٹوٹتا یہ کانچ کو کئی صنعتوں سے خارج کر دے گا۔ نائی لان (Nylon) ایک نیا مسالہ ہے جس کے ریشے ریشم کے تاروں سے کئی گنا مضبوط ہیں۔ یہ بہت بڑی مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ نائی لان سے بنے ہوئے موزوں کے تار نہیں ٹوٹتے۔ نائی لان کے دانت برش بڑے پائیدار ہوتے ہیں اور جلدی خراب نہیں ہوتے۔

ساٹھ سے زیادہ ایسی نئی نئی ترکیبیں تیار ہو چکی ہیں جن کو کیمیائی عملوں میں گھولنے سے روغن، وارنش اور ہوائی جہازوں کے مخصوص وارنش (Dopes) بنتے ہیں۔ ہر شے کے لئے خاص قسم کا روغن درکار ہوتا ہے۔ جنگی جہاز کے [illegible] دستے والے برجوں کو ایک مخصوص روغن کی ضرورت ہے۔ [illegible] روغن ایسا ہونا چاہئے جو زبان سے چاٹنے یا دانتوں سے کاٹنے سے نہ اترے۔ نیز دانتوں کی باہر کی اور اندرونی سطح کے روغن ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کو الگ الگ درجہ تپش اور مرطوبیت کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ بمبار ہوائی جہاز کی بیرونی سطح کے روغن کے لئے لازم ہے کہ چار سو میل فی گھنٹہ کی رفتار پر بھی سطح سے چپکا رہے۔ اس رفتار پر ہوائی رگڑ سے پیدا ہونے والی حرارت سے عام [illegible] اور السی کے تیل سے بنے ہوئے روغن جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ ناقص وارنش ہوائی جہاز کی رفتار کو [illegible] فیصدی تک کم کر دیتے ہیں۔ جنگ کرنے والے ہوا باز کے لئے ہر لمحہ بیش قیمت ہوتا ہے ایسے وقت میں ہوائی جہاز کی اڑان میں کمی سے ہوا باز کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ پلاسٹک رالوں کے وارنش بنانے میں باریک سے باریک تفصیل پر بھی دھیان رکھا جاتا ہے کوئی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس چھوٹے سے مضمون میں نئے ملائموں اور رالوں کا تفصیل سے ذکر کرنا ممکن نہیں۔ [illegible] مسٹر کارلٹن ایلس (Carlton Ellis) [illegible] مصنف نے پلاسٹک مسالوں کے تجارتی ناموں کی جو ردیف وار فہرست دی ہے اس سے باریک ٹائپ کے [illegible] صفحے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کتاب کی طباعت کے زمانہ میں اور اس کے بعد کتنے نئے بازار میں بک چکے ہوں گے۔ ملائموں کی صنعت پر نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم کسی سرکس کا تماشا دیکھ رہے ہیں جس کے خیموں میں الگ الگ تماشا دکھایا جا رہا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ [illegible] خیمے میں کونسا تماشا دکھایا جائے گا۔

## "شب تنہائی" — دل امرتسری

دست ناہید میں ہے ساز سرود رفتہ
رات کی محفل خاموش میں رقصاں ہیں نجوم
تیرے مسکن سے بہت دور شبستاں ہے مرا
میرے سینے میں ہے افسردہ امیدوں کا ہجوم

آسماں سے وہ پلٹتا ہوا تارا ٹوٹا
بجھ گئی ایک چمکتی ہوئی نورانی لکیر!
میں نے دیکھا ہے کہ افلاس کی تاریکی میں
یونہی کھو جاتے ہیں اکثر کئی شعلوں کے ضمیر

قافلے آتے ہیں سستا کے چلے جاتے ہیں
پائے گردوں میں مگر ایک بھی جنبش نہ ہوئی
میں تو اک بندۂ مجبور ہوں رو لیتا ہوں
جنگ اہرمن و یزداں کی کبھی مٹ نہ سکی

رات ڈھلنے لگی مہتاب جھکا جاتا ہے
کہکشاں کشتی سیمین فلک دور گئی
نذر گرداب سحر ہو گئے کتنے تارے
کون جانے کہ غلامی کی سزا کیا ہو گی

تو ثریا نے بھی ڈالا کے اتارا جھومر!
پائے زہرہ میں بھی پازیب کی جھنکار نہیں
جس میں ہیئت کو بدلنا ہو تمدن کیسا
زندگی وقت ہی وقت کی رفتار نہیں

ڈوب کر آگ میں سورج کی کرن نکلی ہے
ناوک گردش ایام چلا شعلہ بدوش
وقت کے خنجر براں پہ ہے رنگ شبخون
یا بغاوت کا سلگتا ہے پر اسرار خروش

# دس ہزار

ڈرامہ

ادے شنکر بھٹ

## ڈرامے کے کردار

۱۔ وِساکھارام ............ صوبہ سرحد کا ایک سیٹھ
۲۔ سُندر لال ............ وِساکھارام کا لڑکا
۳۔ راجو ............ وِساکھارام کی لڑکی
۴۔ راجو کی ماں ............ سیٹھ کی بیوی
۵۔ مُنیم

وقت ...... شام کے پانچ بجے

**منظر:**۔ (صوبہ سرحد کے ایک شہر میں ایک دو منزلہ مکان۔ اوپر کی منزل میں ایک بڑا سا کمرہ جس میں دو دروازے ہیں۔ ایک زینے کے پاس اور دوسرا مکان کے اندرونی حصے میں جاتا ہے۔ گلی کی طرف دو کھڑکیاں ہیں۔ کمرے کے اندر ایک چارپائی ہے جس پر میلا سا بستر بچھا ہے۔ مشرق کی طرف کونے میں ایک چوکی ہے۔ اس کے سامنے طاق میں ٹھاکر جی کا ایک سنگھاسن ہے اس میں کچھ پیتل کی مورتیاں ہیں جن پر گیندے کے پھولوں کی مالا چڑھی ہے۔ طاق کی کیل سے رُدراکش کی مالا لٹک رہی ہے۔ ہاتھ کی لکھی ہوئی دو چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی وہاں پڑی ہیں۔ کمرے میں کچھ تصویریں ہیں۔ ایک مہاراجہ رامچندر کی رسم تاجپوشی کی اور دوسری کالی دیوی کی۔ کمرے میں ایک موڑھا اور ایک ٹوٹی ہوئی کرسی رکھی ہے۔ کرسی کا بیت ٹوٹ چکا ہے۔ ایک چھوٹی سی میز ایک کونے میں رکھی ہے جس پر ایک لوٹا اور اس کے اوپر ایک گلاس رکھا ہے۔ دو کھونٹیوں میں سے ایک پر ایک پگڑی اور دوسری پر ایک دوپٹہ اور ایک میلا سا کوٹ ٹنگا ہوا ہے۔ چارپائی پر لالہ وِساکھارام پریشان حال لیٹے ہوئے ہیں۔ انکی آنکھوں میں بے چینی ہے۔ چہرہ پچکا ہوا، رنگ زرد، بال بکھرے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی تشویش میں ہیں۔ ہاتھ میں ایک خط ہے جسے بار بار اٹھا کر پڑھتے ہیں اور پھر سرہانے رکھ دیتے ہیں، پھر اٹھا لیتے ہیں، پڑھتے ہیں، اور پھر رکھ دیتے ہیں۔ اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں، اور چھت کی کڑیوں کی طرف تاکتے ہیں اور پھر دھم سے چارپائی پر لیٹ جاتے ہیں)

**وِساکھارام:**۔ ہائے کیا جانتا تھا، یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا۔ ہے رام جی! اے پربھو راج! بڑی مصیبت آپڑی ہے۔ کوئی اُپائے سوجھتے نہیں ہے (آنکھیں میچ کر ٹھاکر جی کو ہاتھ جوڑتا ہے اور پھر آنکھیں کھول کر وہ ہاتھ میں سے کر پڑھنے لگتا ہے) کیا کروں؟ راجو۔ راجو ری!

(اندر کے دروازے سے چودہ سال کی ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آتی ہے)

**راجو:** ہاں چاچا جی! کیا کہہ رہے ہو؟

**وِساکھارام:**۔ اری کیا ابھی مُنیم جی نہیں آئے؟ مرا جاؤں ہوں۔ بڑی مصیبت ہے۔

**راجو:**۔ بھائی جی کب آئیں گے بھلا؟ آپ ہم پاس آکر بلا لو ناجی کو۔ کچھ روپوں ہی کی تو بات ہے (اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں) بھگوان۔ بڑے نامراد ہیں یہ لوگ۔ یہ چاچا جی بھیج دو روپیہ لیکن دیکھو تو!

**وِساکھارام:**۔ اچھا چارپائی پر جھک کر، آنکھیں موند لیتا ہے) اپنی قسمت کو روؤں ہوں۔ روپیہ بھی کہیں دھرا ہے ابھی۔ مت بھی ماری گئی ہے۔ محمد بخش نے روپے کا سود دیکر دو ہزار مانگے آیا تھا۔ اس کو بھی تو دینا ہی ہے دس ہزار کے سرکاری بونڈ خریدنے ہیں۔ ایسا موقعہ کب ملیگا۔ اتنا سود کیا چھوڑا جا سکے ہے بیٹی! (اوہ) دس ہزار دینے پڑینگے (ایک دم چارپائی پر دھڑام سے لیٹ جاتا ہے)

**راجو:**۔ (ڈر کر) چاچا جی، کیا ہوا تمہیں؟ ماں جی! ارے ماں! دیکھو تو چاچا جی کو کیا ہوا ہے؟

(راجو کی ماں گھبرائی ہوئی آتی ہے)

**راجو کی ماں:**۔ کیا تو دو۔ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ دس ہزار روپے تو پھر بھی ملتے رہیں گے۔ لڑکا تو پھر ...... ہائے بھگوان کیا کہہ رہی ہوں، بے زہر (ہاتھ جوڑ کر طاق میں رکھے سنگھاسن کی طرف دیکھنے لگتی ہے) پاپ ہی کرے ہیں۔ دیا کرو بھگوان!

**وِساکھارام:**۔ منیم جی نہیں آئے؟ (آنکھیں بند کر لیتا ہے)

**راجو:**۔ آتے ہی ہونگے۔ تمہارا جی کیسا ہے؟

**راجو کی ماں:**۔ کہوں تو ہوں۔ فکر کیوں کرو ہو؟ ہے ایشور میرے لڑکے کو، وہ میرا سب کچھ لے لو۔ میرے پیارے بچے کو مجھے دیدو بھگوان (رونے لگتی ہے)

**راجو:**۔ (ماں کے گلے سے لپٹ کر) روئے کیوں ہے بھابی! چاچا سے کہہ کے بھائی کو بلا لے نا!

**راجو کی ماں:**۔ (آنسو پونچھتی ہوئی) کیسے بلاؤں بیٹی۔ تیرے چاچا کو تو روپے کی پڑی ہے۔ ایشور نے ایک ہی لڑکا دیا ہے ...... ہا بھگوان!

**وِساکھارام:**۔ (آنکھیں کھول کر) راجو منیم جی نہیں آئے، بیٹی؟

**راجو:**۔ ابھی تو نہیں آئے۔

**وِساکھارام:**۔ نہ جانے منیم جی نے کھانڈ کا سودا کیا یا نہیں۔ اسوقت تو کھانڈ خریدنا ضروری ہے۔ پھر مہنگی ہو جائے گی کیسی مصیبت ہے۔ نہ جانے ابراہیم سے روپے کا تقاضا کیا یا نہیں۔ آج چار سال ہونے آئے ابھی تک سود بھی نہیں دیا۔ مقدمہ

لڑنا پڑے گا۔ تب کہیں جاکر وہ بے ایمان روپیہ دیگا۔ (خط ہاتھ میں لے کر) پر اس کو کیا کروں؟

(راجو، راجو" نام لیکر منیم آواز لگاتا ہوا زینے میں کھٹ کھٹ چڑھتا آتا ہے)

**وساکھارام:** - لو منیم جی آگئے (ایکدم اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) آؤ منیم جی، آج بڑی دیر لگائی۔

(راجو اور اسکی ماں دوسرے دروازے سے گھر کے اندر چلی جاتی ہیں)

**منیم:** - جے رام جی کی سیٹھ جی! دیر ہوگئی۔ دن بھر کا حساب کتاب کرنا تھا۔ تیرہ آنے کے حساب سے کھانڈ کے نو بورے خرید لئے ہیں۔ محمد بخش کا آدمی آیا تھا، میں نے کہہ دیا سیٹھ جی کے آنے پر فیصلہ ہوگا۔ سنا ہے ابراہیم فرار ہوگیا ہے۔ روکڑ ملاتے اتنی دیر ہوگئی ہے۔ ہاں۔ پٹھانوں کا کوئی خط آیا کیا؟

**وساکھارام:** - کھانڈ تو بارہ آنے تھی نا۔ پھر تیرہ آنے کیوں خریدی؟ ابراہیم بھاگ گیا کیا؟ یہ تو بڑی بُری خبر ہے منیم جی! چار ہزار لقد ہیں۔ کیسے چھوٹے جا سکتے ہیں! چودھری سے نہیں کہلوایا؟ وہ تو ضامن ہے نا! سرکاری بانڈ کی کوئی چٹھی آئی؟ روپے تیار رکھنا۔ بونڈ تو خریدنے ہی ہونگے۔

**منیم:** - پٹھانوں کی طرف سے کوئی چٹھی آئی سیٹھ جی؟

**وساکھارام:** - روکڑ میں کتنا باقی ہے؟ چودھری کے پاس ابھی بھیجو اور تقاضا کرو۔ (چارپائی پر لیٹ کر) سب طرف مصیبت ہے۔ روپے لے کر دینے کا کوئی نام نہیں لیتا۔ (آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتا ہے) ہا بھگوان! ہے رام جی! کیسا بُرا سے ہے!

**منیم:** - پٹھانوں نے کچھ لکھا سیٹھ جی؟ سندر لال کا خیال کرنا ہی چاہیئے۔ نہ معلوم بیچارے کو کیسی تکلیف دے رہے ہونگے! (سیٹھ کی طرف دیکھتا ہے)

**وساکھارام:** - لو یہ پڑھو کیسا دُشٹ ہے لڑکا۔ ذرا بھی لڑائی نہیں کی۔ ڈولی میں نئی بہو کی طرح ان کے ساتھ چلا گیا میری چھاتی پر مونگ دلنے۔ کہاں سے لاؤں دس ہزار؟ دس ہزار (خط منیم کے ہاتھ میں دیکر) لو پڑھو۔ سب برباد کر دیا۔ بھلا باہر نکلا ہی کیوں؟

**منیم:** - سیٹھ جی! سندر لال کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر ابھی کوئی سے تمہیں نے تو بھیجا تھا۔

(خط ہاتھ میں لے کر پڑھنے لگتا ہے)

**وساکھارام:** - برباد ہوگیا میں تو منیم جی! ہاں، ذرا زور سے پڑھو۔

**منیم:** - (چونک کر) ہیں! یہ تو سندر لال کی لکھاوٹ ہے! لکھتا ہے "پتا جی. اگر میری زندگی چاہتے ہو تو کسی آدمی کے ہاتھ خیبر پھاٹک کے باہر آج ٹھیک شام کے آٹھ بجے دس ہزار روپیہ پہنچادو۔ پولیس کو یا کوئی آدمی لے کر آئے تو وہ، کہتا ہے مجھے مرا ہی سمجھو۔ ان لوگوں نے مجھے بڑی تکلیف دی ہے۔ شاید نرک کی کوئی بھی اذیت اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری رکشا کرینگے۔ آپکا پتر :- سندر لال"

(منیم خط کو رکھ کر وساکھارام کی طرف دیکھنے لگتا ہے)

**منیم:** - سیٹھ جی، دس ہزار کی کیا بات ہے۔ آج ہی تو بدھوا ہے۔ اگر کہیں تو محمد بخش کو نہ دیکر دس ہزار کا انتظام کروں۔ روپیہ تو ہے ہی۔

**وساکھارام:** - (اٹھ کر) آنے پیسے کا سود ہے منیم جی۔ دس ہزار یونہی جائینگے؟ ہے بھگوان، کنگال کر دیا!

(راجو اور اس کی ماں ایکدم کمرے میں آجاتی ہیں)

**راجو کی ماں:** - یوں ہی جائیں گے۔ سنا تم نے منیم جی! ان کی عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں۔ کچھ نہیں سوچتے۔ بس۔ روپیہ۔ روپیہ۔ روپیہ! میرا لڑکا لاؤ منیم جی! ہائے میرا سندر! ہائے میرا بچہ رے!

(گھونگھٹ کئے زمین پر بیٹھ جاتی ہے۔ راجو دوڑ کر باپ سے لپٹ جاتی ہے اور التجا کے ڈھنگ سے اسے دیکھنے لگتی ہے)

**وساکھارام:** - بھلا منیم جی۔ میں کیا کہتا ہوں کہ سندر نہ آئے؟ میں تو خود چاہتا ہوں کہ لڑکا کسی طرح گھر آجائے۔ میں کیا سندر کا باپ نہیں ہوں؟ تمہیں بتاؤ؟ لڑکے کے بنا تو گھر سونا سونا سا لگتا ہے۔

**منیم:** - (سر ہلا کر) ہاں یہ تو ہے ہی۔

**راجو کی ماں:** - آج سویرے سے میں ان کا روپ دیکھ رہی ہوں۔ کہتی ہوں روپے کے پیچھے لڑکے کو ہاتھ سے نہ کھودو۔ روپیہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ دس ہزار کیا بڑی بات ہے۔ پر انھیں تو نہ جانے کیا ہوگیا ہے۔ کھانڈ اور سود سے ان کا دھیان چھوٹے تو نا۔ منیم جی، میں تمہارے پیر پڑوں، میرا سندر لادو۔

**منیم:** - تاتاجی گھبراؤ مت۔ سندر کو گھر پر ہی سمجھو۔

**راجو کی ماں:** - گھر کیسے سمجھوں منیم جی! گھبراؤں کیوں نہیں۔ انکی (خاوند کی طرف اشارہ کر کے) حالت دیکھکر تو میرے جی میں ایسا ہو رہا ہے کہ میں لڑکا کھو بیٹھونگی۔ کہتے ہیں۔ جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ اور لڑکا۔۔۔۔ ہائے! نہ معلوم ان سے یہ کیسے ایسا کہا گیا۔ ہے بھگوان!

**راجو:** - منیم جی۔ میرے بھائی کو جلدی بلا دو۔ دیکھو، کئی راتوں سے ماں سوئی نہیں ہیں۔ ساری ساری رات روتی رہی۔ آنکھیں سوج گئی ہیں۔ میرے بھائی کو جلدی سے لے آؤ منیم جی!

(رونے لگتی ہے)

**راجو کی ماں:** - میں کہتی ہوں میرا گہنا لے کر بیچ دو اور میرے لڑکے کو بچا لو۔

**منیم:** - گھبرانے کی کیا بات ہے تاتاجی۔ سیٹھ جی کو بھی آپ سے کم فکر نہیں ہے۔

**وساکھارام:** - ہاں۔ تو ہے ہی۔ میں بھی کب سویا ہوں راتیں۔ دن رات چنتا لگی رہتی ہے۔ سندر میری آنکھوں کے سامنے جھومتا رہتا ہے۔ اس کے بچپن کی بات یاد آیا کرتی ہے۔ ادھر ابراہیم روپے دینے میں ہی نہیں آتا۔ کیا تم نے اس کے سود کا حساب لگایا منیم جی؟ کتنا بنے پر

اس کے اوپر وہ کھاتہ کہاں رکھوائی ہے؟ گودام میں نا؟ دیکھو، تالیاں اپنے پاس ہی رکھنا۔ نہ ہو تو مجھے دے جاؤ۔

**منیم**:- سیٹھ جی، سُندرلال کے لئے کیا حکم ہے۔ روپے کا انتظام کروں؟ بہت تھوڑا وقت ہے۔ (سیٹھ کی طرف دیکھتا ہے) پندرہ ہزار تجوری میں رکھکر آیا ہوں۔

**وساکھا رام**:- دس ہزار، نہ کم نہ تھوڑا۔ ارے اور کوئی انتظام نہیں ہو سکتا ہے۔ منیم جی! پولیس کو خبر کیوں نہ کر دو!

**منیم**:- پولیس بھی کیا کرے گی سیٹھ جی، پولیس بھی تو ڈرتی ہے۔ اور اسے کیا معلوم نہیں ہے پردہ کرے تب تو سیٹھ جی، میں تو آپ کو صلاح نہ دونگا کہ آپ اور کوئی انتظام کریں۔ نہیں تو آپ لڑکے سے ہاتھ دھو بیٹھینگے۔ نہ کریں ایشور!

**راجو کی ماں**:- تم کس دُبدا میں پڑے ہو منیم جی؟ لو میرا گہنا لے جاؤ (اتار کر سامنے رکھدیتی ہے) دیکھو لڑکے کو لا دو۔ چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلونگی۔

**وساکھا رام**:- کیا سب میرے پران کھائے جاؤ ہو۔ گہنا بھی کون گھر کا نہیں ہے۔

**منیم**:- سیٹھ جی، دیر ہو رہی ہے حکم دو۔

**راجو کی ماں**:- کہہ تو رہی ہوں۔ گہنا لے جاؤ۔ دے دینا۔

**وساکھا رام**:- کیا کروں میں پھر منیم جی، علی بکس اپنے گنتے جیتر الے گیا کیا؟

**منیم**:- دیر ہو رہی ہے سیٹھ جی۔ خبر بہانے تک پہونچنا ہے۔ کیا حکم ہے؟

**وساکھا رام**:- دس ہزار! ہائے (آہ بھر کر بے سُدھ سا ہو کر پھر لیٹ جاتا ہے)

**منیم**:- کیا حکم ہے سیٹھ جی۔ اس لئے جلدی کر رہا ہوں۔ دکان سے کچھ آدمی ساتھ لے لوں گا۔

**راجو کی ماں**:- ارے بول تو دو۔ ہاں بولو منیم جی! (اکڑ کر) لے جاؤ روپیہ۔ میں کیا گھر کی، دکان کی کوئی بھی نہیں ہوں؟ جاؤ دیر نہ کرو۔ ہے بھگوان!

**منیم**:- جو حکم۔ (چلا جاتا ہے)

راجو:- (ماں سے) اب بھائی آجائے گا ماں!

**راجو کی ماں**:- ہاں بیٹی۔ لینے گئے ہیں منیم جی۔ بھگوان کا نام لے۔ سندر راضی خوشی گھر آئے۔

**وساکھا رام**:- (ایک دم ہوش میں آ کر) منیم جی گئے۔

راجو:- ہاں گئے چاچا جی۔

**وساکھا رام**:- گھر برباد کر ڈالا! کیا سے کیا ہو گیا۔ لڑکا کپوت نکلا۔ ہائے! کیسے میں نے پیسہ کمایا۔ دس ہزار۔ ہائے رام! (پھر لیٹ جاتا ہے) اری راجو کی ماں، میں مرا۔

**راجو کی ماں**:- کہوں ہوں۔ کون بڑی رقم ہے۔ گھر بچہ آجائے تو اور ہو جائینگے روپے پرماتما نے سب کچھ تو ... ہے بھگوان دیا کرو۔ تم اتنی چنتا کیوں کرتے ہو؟

**وساکھا رام**:- چنتا نہ کروں؟ (بیٹھکر) خون کی کمائی ہے، خون کی۔ آج چالیس سال سے لگاتار دن رات ایک ایک کر کے روپیہ کمایا۔ (پھر لیٹ جاتا ہے)

**راجو کی ماں**:- کمایا ہے تو کیا فائدہ۔ نہ تیرتھ، نہ جپ تپ، نہ برت۔ کبھی ہردوار بھی نہ لے گئے۔ میں تو تمہارا پیسہ جانتی ہی نہیں۔ چار کوٹھیاں ہیں اور ہم اس گلی میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ آج تین چار لاکھ روپے کے مالک ہو۔ ایک پیسہ بھی کبھی دان نہ کیا۔ ایسا روپیہ کس کام کا؟

**وساکھا رام**:- (اٹھ کر) آگ لگا دے گھر میں مجھے کیا؟ منیم نے آج کی بکری کا کوئی حساب ہی نہیں دیا۔ بے ایمان ہو گیا ہے ہے رام جی! (لیٹ جاتا ہے) دس ہزار روپیہ اس نالائق کے... منیم کہاں گیا ہے راجو؟

**راجو کی ماں**:- اور روپیہ ہوتا ہی کس لئے ہے۔ اس میں سندر کا کیا قصور ہے بھلا؟

**وساکھا رام**:- منیم کہاں گیا؟ شاید اُگراہی کرنے گیا ہوگا۔ ہے رام جی، دیا کرو! (لیٹ جاتا ہے)

(سُندرلال اور منیم آتے ہیں۔ راجو کی ماں سندرلال کو دیکھکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ راجو بھائی سے لپٹ جاتی ہے۔ لڑکا پہلے وساکھا رام اور پھر اپنی ماں کے پاؤں چھوتا ہے۔)

**وساکھا رام**:- (لڑکے کو دیکھکر) آگیا رے! بڑی خوشی ہوئی۔

**راجو کی ماں**:- آج بیٹے کو دیکھکر چھاتی ٹھنڈی ہوئی۔ (اس سے لپٹ جاتی ہے) میری آنکھوں کے تارے!

**راجو**:- میرے بھیا! (اس کے گلے سے لپٹ جاتی ہے)

**راجو کی ماں**:- کیسا دُبلا ہو گیا اتنے ہی دن میں۔

**سُندرلال**:- ہاں ماں۔ بھگوان ان راکشسوں کے پنجے میں نہ ڈالے۔ دیکھ مار مار کر تمام دیہ سُجا دی ہے (جسم دکھا کر) بڑی بڑی دُکھ رہی ہے۔

**وساکھا رام**:- بڑا اچھا ہوا بیٹا۔ کیسے آئے؟ کیا ویسے ہی انہوں نے چھوڑ دیا؟ منیم جی، آج اُگراہی میں کیا ملا؟

**سُندرلال**:- (منیم جی کی طرف دیکھکر) دس ہزار روپے دئے تھے نا؟

**منیم**:- (گھبرا کر) ہاں سیٹھ جی نے حکم دیا تھا نا؟

**وساکھا رام**:- کیا پورے دس ہزار!

(ایک دم دھڑام سے تکئے پر گر پڑتا ہے۔ سُندرلال، منیم، راجو وساکھا رام کی طرف دیکھتے ہیں)

**راجو کی ماں**:- (سندر کو تھپتھپاتی ہوئی) نہیں نیند آگئی ہے بیٹا، آؤ چلیں۔

پردہ گرتا ہے

---

**لکھنے والوں سے**

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ قلمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔ (ادارہ)

# سالنامہ آجکل ۱۹۴۷ء

آجکل کا سالنامہ اپنی روائتی خصوصیات کے ساتھ اس سال بھی حسب معمول یکم جون کو قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائیگا نہایت اعلیٰ مضامین نثر و نظم جمع کرنے کیلئے ادارۂ آجکل نے بڑی کوشش کی ہے۔ جن حضرات کا چندہ ماہ مئی میں ختم ہو رہا ہے وہ فوراً اگلے سال کا چندہ بھیجنے یا وی پی منگانے کا انتظام کریں۔

ایجنٹ صاحبان بھی اپنی فرمائشات صحیح وقت پر ارسال کر دیں۔

کاروباری حضرات سالنامہ میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دے سکتے ہیں۔ اس سالنامے کی ہلکی سی جھلک اسی شمارے کے صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ کریں۔



# ہماری نئی مطبوعات

## لندن سے آداب عرض

از آغا اشرف ایم۔ اے صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں، اور لندن پر بمباری کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا۔ لندن سے آداب عرض انہی نشریات کا مجموعہ بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ دوسرا ایڈیشن قیمت ایک روپیہ بارہ آنے عہ

## وہیں سے باہر

آغا اشرف ایم اے صاحب کے تاریخی و ادبی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ آغا اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں ہماری زبان و معاشرت کے متعلق جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے قیمت دو روپے آٹھ آنے

## اوراق لبنان

حضرت خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و مضامین کا مجموعہ جنکو اختر شیرانی نے مرتب کیا ہے اردو ادب کی و شعری بے نظیر کتاب ہے یہ مجموعہ کئی بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے نیا ایڈیشن۔ قیمت عہ

## معاشیات قومی

مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی، یہ کتاب فریڈرش لسٹ کے حقیقت افروز کی مرہون منت ہے جسے ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ قلم نے اردو کا لباس پہنایا ہے۔ یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز اور تاریخی روداد ہے۔ اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

## اوراق پارینہ

شیر جنگ

ایک انقلابی قیدی وہ بھی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں ملکی حالات، غریب مزدور، کسان کی تکالیف، معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ یہ کتاب انقلابی ذہنوں کیلئے ایک پروگرام اور ادباء کیلئے بہترین استعارے، محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ ہے۔ قیمت ۸ر

## اردو زبان اور ہندو

ناظم سیوہاروی

اردو زبان کی ترقی اور اسکے وسیع عمل و دخل میں ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سرانجام دی ہیں یہ تصنیف آپکو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرائے گی تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔ قیمت مجلد عہ

## قرآنی اخلاق دو حصے

عبدالصمد صارم

انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم کیا گیا ہو۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جسکے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ قیمت ۸ر

## کتاب منزل کشمیری بازار ــ لاہور

# سلاطین مغلیہ کے چند قدیم سکے

## اکبر اعظم کے سکے

عہد اکبری میں ملک کی سب سے بڑی عمارت فتح پور سیکری میں بنائی گئی تھی جس کا افتتاح ۹۸۵ھ مطابق ۱۵۷۷ء میں ہوا تھا۔ یہ عمارت باہر سے ۳۲۰×۴۲۴ فٹ طول اور ۳۳۰ فٹ عرض کی ہے۔ چاروں طرف ۵۷×۵۷۵ فٹ کے دالان دردالان ہیں جن کے دو محراب دار اور چھت جدا جدا گنبدوں کی ہے۔

مشرق و مغرب میں چودہ چودہ اور شمال جنوب میں نیرہ تیرہ در ہیں۔ شروع شروع میں ٹکسال کا اہتمام چودھریوں کے سپرد تھا اور یہ پہرا بہتمم مقرر کئے گئے۔ چنانچہ آگرہ اور فتح پور سیکری کی ٹکسال کے دارغہ خواجہ عبدالصمد خاں شیرازی شیریں رقم مقرر ہوئے۔ چار یاری روپیہ سب سے پہلے اسی ٹکسال میں مسکوک ہوا تھا۔ اکبری سکے کئی قسم کے اور مختلف وزنوں کے تھے جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ روپیہ وزن ۱۱ ماشہ ۶ رتی۔

چہرہ۔ کلمہ طیبہ اور حاشیہ پر بصداق ابی بکر۔ بعدل عمر بحیا عثمان۔ بعلم علی۔

پشت:۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلداللہ ملکہ ضرب دارالسرور فتح پور ۹۸۹ھ

۲:۔ روپیہ وزن ۱۱ ماشہ چار رتی۔
جس کا حاشیہ کٹا ہوا اور اس پر ۹۹۲ھ درج تھی۔

۳:۔ پیسہ۔ وزن ایک تولہ ۸ ماشہ ۷ سرخ۔

چہرہ:۔ دارالضرب فتح پور اور ملک الشعرا فیضی کی رباعی درج تھی اور درمیان میں اللہ اکبر جل جلالہ کندہ تھا۔

پشت:۔ یہ بیت منقوش تھی ؂

ایں سکہ کہ پیرایۂ امید بود ‌‌ ‌ با نقش دوام نام جاوید بود
سیمائے سعادتش ہمیں بس کہ بدہر ‌ ‌ یک ذرہ نظر کردہ خورشید بود

سال الٰہی اور مہینہ اس کے بیچ میں تھا۔

۴:۔ ایک اور اکبری سکے پر یہ عبارت منقوش تھی۔

چہرہ:۔ "السلطان الاعظم الخاقان المعظم الخلیفۃ المتعالی خلداللہ ملکہ وسلطانہ وابدعدلہ واحسانہ"۔

پشت:۔ ملک الشعرا فیضی کی یہ رباعی درج تھی ؂

ایں نقد روان گنج شاہنشاہی ‌ ‌ با کوکب اقبال کند ہمراہی
خورشید بپرورش ازاں رو ننہد ‌ ‌ یابد شرف از سکۂ اکبر شاہی

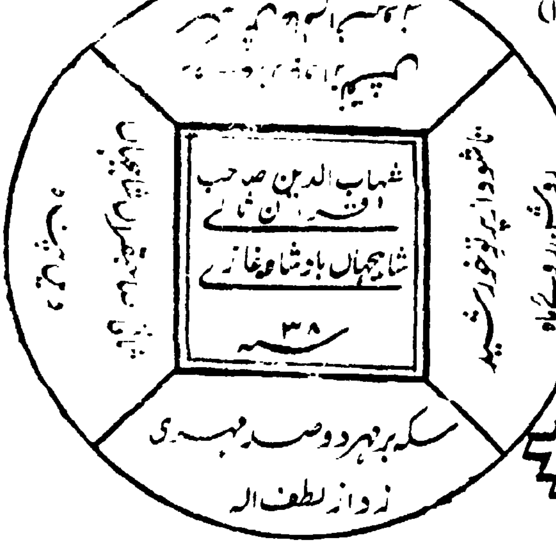
[illegible] ر [illegible] عدد وا اکبر سے
[illegible] ہوت سے سکوں پر
[illegible] ی کندہ تھی سہ
[illegible] دست بخت [illegible] پور باد
[illegible] ہفت [illegible] باد
[illegible] بیکہ [illegible] نام [illegible] کرباد

## شہنشاہ شاہجہاں کے سکے

[illegible] مروجہ سکوں کے علاوہ ایک عجیب [illegible] شرفی [illegible] [illegible] کی ایک [illegible] اشرفی جو ۱۰۶۲ھ ۱۶۳۰ء [illegible] میں [illegible] ہوئی تھی یہ بھی لندن کے عجائب خانہ میں [illegible] جو بیت درج ہیں معہ نقل کے مندرجہ ذیل ہیں۔

چہرہ:۔ سکہ بر مہر و وصد مہر زد [illegible] لطف الہ
ثانی صاحبقراں شاہجہاں [illegible]
روئے زر باد از نقش مد [illegible] عالم فروز
تا شود از پرتو خورشید روشن [illegible]

(۱)



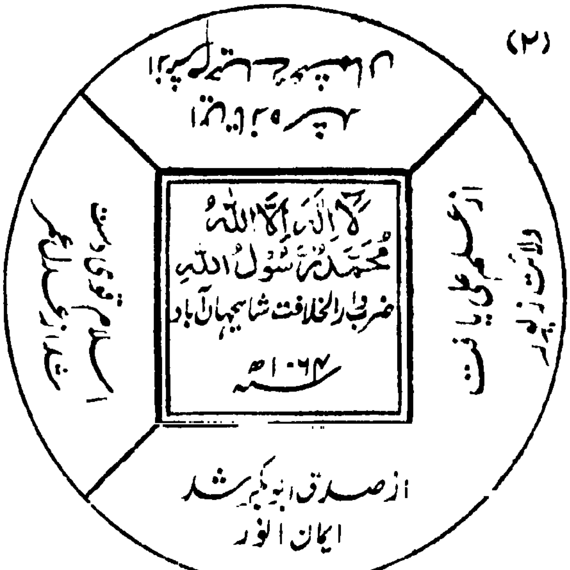

شفق سرحدی

پشت:۔
از صدق ابوبکر شد ایمان انور
اسلام قوی دست شد از عدل عمر
دین تازہ شد از شرم و حیائے عثمان
از علم علی یافت ولایت زیور

---

۱؎ سلاطین مغلیہ کے سکوں کے متعلق میرا ایک مضمون جو شہنشاہ جہانگیر کے سکوں کے متعلق تھا۔ آجکل بابت ۵ امئی ۱۹۴۲ء کی اشاعت میں "جہانگیری عہد کے چند سکے" کے عنوان سے شائع ہوچکا ہے۔ یہ مضمون اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ (شفق سرحدی)

(۲)




مندرجہ بالا اشرفی عوام کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ خاص طور پر امیروں اور منصب داروں کے انعام کے لئے مقرر تھی چنانچہ شاہجہان نامے سے اس بات کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ایک جگہ مرقوم ہے کہ

" در سال سی و یکم جلوسی بتاریخ سوم جمادی الثانی سنہ ۱۰۶۶ھ کے روز شرف آفتاب بود مبارز خان بعنایت خلعت و اسپ با زین نقرہ و فیل معزز گشتہ بہ پیچ شنبہ روانہ شد۔ ہمت خان بخلعت اضافہ یا نصدی بہ منصب دو ہزاری و ہزار سوار و اسپ و علم جاگیرداری دون سری نگر و سلطان نظر برادر سیف خاں بمنصب ہزاری شش صد سوار و بعنایت خلعت و اسپ با زین مطلا و انعام پانزدہ ہزار روپیہ و یک مہر صد تولگی و یک روپیہ ہیں و زن منتخر و مباہی گردیدہ رخصت یافت "

# اورنگ زیب عالمگیر کے سکے

عہد اورنگ زیب کے سکے کسی خاص شہرت کے مالک نہیں۔ عام اور عہد اکبری و عہد شاہجہانی کے سکوں کی نقل تھے صرف ایک سکہ اور مہر ہی مشہور ہیں۔ سکہ پر یہ بیت نقش تھی

سکہ زد در جہاں چوں بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اور اشرفی پر بجائے بدر منیر کے [illegible] لکھا جاتا تھا۔

# غزل

رنگِ جہاں برنگِ دگر دیکھتا ہوں میں
اک موجِ حسن ادھر سے ادھر دیکھتا ہوں میں

پاس خودی بھی ہے مجھے احساس ضبط بھی
مجبور ہو کے تجھکو مگر دیکھتا ہوں میں

دل میں ترا خیال نظر میں ترا جمال
اب تجھکو دیکھتا ہوں جدھر دیکھتا ہوں میں

پھر بن رہی ہے جلوہ گہ حسن کائنات
وابستہ پھر نظر سے نظر دیکھتا ہوں میں

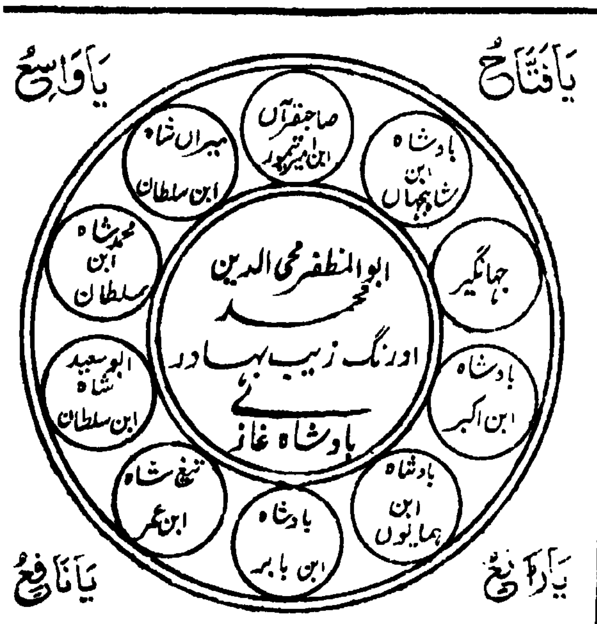
دنیا بھی دلفریب نظارے بھی دلنواز
لیکن بقدر حسن نظر دیکھتا ہوں میں

اب ذرہ ذرہ رونق حسن بہار ہے
یکساں مزاجِ قلب و نظر دیکھتا ہوں میں

احسن شباب سے ہے عبارت بہار زیست
اک سیلِ رنگ و بو ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

اصغر احسن جالندھری

مہر کا پہر مندرجہ ذیل شکل کا تھا۔



# ارضِ سیما

افسانہ (۲)

ادیب بریلوی

میں نے رائفل اٹھائی اور ناظمہ قصرِ ارم کے روکنے کے باوجود اندھا دھند فائر کرنا شروع کر دیے۔ گرجدار آوازوں کے ساتھ رائفل آگ اور دھواں اگلنے لگی۔ نازنینانِ قصرِ بہار سہم گئیں۔ بہت سے جانور زخمی ہوئے بہت سے تیورا کر زمین پر آ رہے۔ [illegible] میں نے رائفل کا رخ قصرِ بہار کی دوشیزاؤں کی طرف پھیرا لیکن ان کی ناظمہ نے فوراً ایک نعرہ بلند کیا۔ ناظمہ قصرِ ارم خوف سے بیہوش ہو گئی۔ صحرائی درندے بڑھے اور مجھے نقصان پہنچائے بغیر رائفل کے آگے سینہ سپر ہو گئے اور نازنینانِ قصرِ نشاط جمع ہو گئیں۔ میں برابر زندگی کی آخری جد و جہد کرتا رہا اور اس وقت تک گولی چلاتا رہا جب تک کہ میرے پاس آخری کارتوس بھی ختم نہ ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں رائفل پکڑ لی اور لاٹھی کی طرح اسے پکڑ کر درندوں پر چل پڑا۔ تا بکے تھک کر زمین پر گر پڑا۔ نازنینانِ قصرِ بہار نے آگے بڑھ کر مجھے محاصرے میں لے لیا۔ اور ایک خطرناک درندے کی پیٹھ پر مجھے بٹھا دیا۔ پیاس سے پریشان ہو کر میں نے پانی مانگا۔ جو خود ناظمہ قصرِ بہار نے مجھے دیا۔ پانی پیتے ہی میں غافل ہو گیا۔ آہ انجم جب آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو مقید پایا۔ نہ معلوم بیچاری ناظمہ قصرِ ارم کہاں تھی اور اس پر کیا گذری۔ اب میں زندگی سے بے مزا باقی ماندہ حیات کے دن گن گن کر گذار رہا تھا۔ مجھے اب بھی اجازت تھی کہ کسی بھی دوشیزہ سے لطفِ زندگی اٹھاؤں۔ سوائے ناظمہ قصرِ ارم کے ہر دوشیزہ میری ہر خدمت کے لئے حاضر تھی کیونکہ ناظمہ قصرِ ارم ملکہ کے حکم سے قتل کی جا چکی تھی۔ اس لئے کہ اس نے ایک انسان سے محبت کی تھی۔ اب ایک نئی لڑکی قصرِ ارم کی ناظمہ مقرر ہو چکی تھی۔ مجھے ہر طرح کا آرام پہنچایا جاتا تھا اور جشنِ عروسی کی تیاریاں زور و شور پر تھیں۔ سمجھ لو کہ زندگی کے دن تیزی سے کم ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ ملکۂ ارضِ سیما سے شرفِ باریابی حاصل کرنے کی درخواست کی مگر وہ رد کر دی گئی کیونکہ میں نے غداری کی تھی۔ اور غدار سے ملکہ نہیں ملا کرتی تھی اور نہ جشنِ عروسی سے پہلے اس کی شکل دیکھنا ممکن تھا۔

قصرِ نشاط اپنی تمام نشاط سامانیوں کے ساتھ سجایا جا رہا تھا۔ سامنے ملکۂ ارضِ سیما کا عظیم الشان محل تھا اور اس کے بالکل سامنے مشرقی جانب ناظمہ قصرِ نشاط کا محل تھا۔ جنوب کی طرف معبد خالقِ ارضِ سیما اور شمال کی سمت میرا محبس جو اگرچہ دنیا کے بڑے سے بڑے آراستہ محل سے اچھا تھا مگر میرے لئے عذاب۔ حالانکہ میں قید نہیں تھا لیکن نگرانی ضرور کی جاتی تھی۔

آخر کار بہار کا وہ منحوس مہینہ آ پہنچا جس کی چودھویں تاریخ کو یہ خونی ڈرامہ کھیلا جانے والا تھا۔ پہلی رات کو چاند کے نمودار ہوتے ہی مجھے وہاں کے رسم و دستور کے مطابق بہترین خوشبودار عرقیات سے غسل دیا گیا اور مجھے ہار پھولوں میں لاد دیا گیا۔ گویا کہ میں اب مکمل قربانی کا بکرا تھا۔ اف خدایا وہ ساعتیں یاد کر کے مجھے اب بھی اختلاج ہونے لگتا ہے۔ غرضیکہ دولہا بنانے کے بعد مجھے قصرِ نشاط سے قصرِ ارم لایا گیا۔ یہاں کی نئی ناظمہ نے میرا استقبال کیا۔ یہاں میں چاند کی تیسری رات تک مقیم رہا۔ چوتھی رات کو مجھے شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ قصرِ بہار کی طرف لے جایا گیا۔ اف موت مجھے مقتل کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی تھی۔ میں مجبور و بے دست و پا تھا۔ مجھے اپنی موت کا کامل یقین ہو چکا تھا۔ مگر موت کا انتظار ایک ایسی دردناک اذیت تھی جس کا ذکر حدودِ الفاظ سے باہر ہے۔ ہر چاندنی رات کو یہاں عیش و سرور کی مجالس برپا ہوتیں۔ ہر رات ارضِ سیما کی کنواریاں [illegible] جمع ہوتی جا رہی تھیں۔ جشنِ عروسی بہت قریب آ رہا تھا۔ قصرِ ارم۔ قصرِ نشاط اور تمام دوسرے قصروں کی دوشیزائیں جمع ہو چکی تھیں۔

غرضیکہ وہ دن آ پہنچا۔ آج چودھویں رات کا چاند پوری تابانی سے چمک کر میری زندگی کی شمع کو ہمیشہ کے لئے بجھا دینے والا تھا۔ میرے اوپر نہایت سخت پہرہ تھا۔ میں نے ملکۂ ارضِ سیما کے حسن کی اتنی داستانیں سنی تھیں اور اس قدر عجیب و غریب واقعات ارضِ سیما کی کنواریوں نے مجھے سنائے تھے کہ میں اتنی دردناک موت سے بے نیاز ہو کر ایک مرتبہ ملکہ کے حسن سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ آخر وہ وقت بھی آ ہی گیا۔ ملکۂ ارضِ سیما پورے شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ قصرِ نشاط سے روانہ ہوئی اور ایک ایک قدم کی خبریں قصرِ بہار میں آنے لگیں۔ جوں ہی ماہتاب جانبِ مشرق سے طلوع ہوا ملکہ کی سواری قصرِ بہار میں داخل ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ملکہ کے حسن کو دیکھ کر میں [illegible] دردناک موت کو بھول گیا اور محوِ حیرت رہ گیا۔ مجھے تعجب تھا کہ کیا واقعی دنیا میں ایسے حسن کا وجود بھی ممکن ہے۔ میں مبہوت دیکھتا رہا اور سواری میرے سامنے سے گذر گئی۔ مجھے پھر موت کی اذیت ناکی کا احساس ہوا۔ میں تڑپنے لگا۔ اپنی مجبوری پر آنسو بہانے۔ چلایا۔ چیخا۔ مگر یہاں کون تھا جو میری فریاد پر کان دھرتا یا مجھے سہارا دیتا۔ میں خدائے قدوس کی بارگاہ و نیاز میں جھک گیا اور التجا کی کہ بارِ الٰہا تو ہی ہے اور صرف تیرا ہی سہارا ہے۔ دعا سے میرے دل کو قدرے تسلی ہوئی۔ نازنینانِ ارم نے مجھے آخری مرتبہ غسل دیا اور دولہا بنایا۔ اب چاند پوری تابانی سے چمکنے لگا تھا۔ میں قدم قدم پر کانپتا اور لڑکھڑاتا دوشیزگانِ ارم اور قصرِ نشاط کے محاصرے میں قصرِ بہار کے سامنے لایا گیا۔ یہاں ملکۂ ارضِ سیما کا تختِ جلوہ لگا ہوا تھا۔ تمام دوشیزائیں صف بہ صف ایستادہ تھیں۔ اس میدان کا نام دشتِ شباب تھا کیونکہ خالقِ ارضِ سیما کو قربانی دینے کے بعد ارضِ سیما کی ہر دوشیزہ پھر سے جوانی اور شباب حاصل کرتی تھی۔ میرے پہنچتے ہی قصرِ بہار کی دوشیزائیں آگے بڑھیں اور انہوں نے مجھے قصرِ ارم اور قصرِ نشاط کی محافظ دوشیزاؤں سے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ میں اپنی موت کے دردناک منازل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میری موت پر یہاں ایک آنکھ بھی غمگین ہونے والی

[illegible] خوا [illegible] میری [illegible] اپنے شباب رقص [illegible]
جانور جبل سے میری موت [illegible] شادو [illegible]
[illegible] جانا بلند ہوا [illegible] دوشیزگان [illegible]
[illegible] جلوہ نما ہوں [illegible]
[illegible] ہیں [illegible]
[illegible] بالکل [illegible]
[illegible] مرکزی ہوئی [illegible]
[illegible] فریب [illegible] سے قریب آئی [illegible]
[illegible] ایک ایک الفاظ کو [illegible]
[illegible] ملک ارض سیما [illegible]
[illegible] شباب کی طرف [illegible]
[illegible] شباب آگے بڑھیں [illegible]
[illegible] میں لے لیا [illegible]
[illegible] میدان شباب کی [illegible]
[illegible] میدان شباب کی قربان [illegible]
[illegible] تعظیم کے لئے [illegible] مجھے [illegible]
[illegible] گیا اور تمام جلوس کی دوشیزائیں [illegible]
[illegible] تخت پر متمکن ہو چکی تھی۔ ناچ [illegible]
[illegible] دوشیزہ نے اپنا کمال فن دکھا [illegible]
[illegible] رقص عروسی شروع کیا۔ اف [illegible]
رقص [illegible] طریقہ سے فن رقص [illegible]
[illegible] مجھے معلوم تھا [illegible] رقص [illegible]
اختتام کے ساتھ میری زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ اسی لئے میں چاہتا تھا
کہ یہ رقص جتنی دیر ممکن ہو سکے جاری رہے۔ میں زندگی سے [illegible]
ہو چکا تھا اور اس کو چند ہی لمحوں کا مہمان سمجھ رہا تھا کہ ایک فضائے بسیط
میں خوفناک گڑگڑاہٹ کا شور بلند ہوا۔ رقص [illegible] ہو گیا اور نازنینان [illegible]
سہم گئیں۔

میری نظریں یکایک اوپر اٹھیں اور میں نے دیکھا کہ فضا میں سے
ایک مہیب جانور پر پھیلائے اترنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوشیزگان
پریشان ہو رہی تھیں لیکن ملکہ انہیں تسلی دے رہی تھی۔ [illegible] کا خیال تھا کہ

یہ کوئی عجیب [illegible] ہے۔ یہ شاید دھڑ دھڑاتا آیا ہے۔ ملکہ کو یقین
تھا کہ [illegible] نہیں ہو سکتا کیونکہ ملکہ نغمے کی مالک تھی۔ وہ دیوزاد
جانور [illegible] طرف بڑھی اور تمام دوشیزائیں بھی
[illegible] کی طرف بھاگا۔
[illegible] کا اندازہ لو کرو۔ وہ کوئی جانور نہیں
[illegible] کا باعث [illegible] تھا۔ ملکہ تو حیرت
[illegible] آگے بڑھ
[illegible] حسن [illegible] کو دیکھتے اور
[illegible] میں نے وہاں پہنچ کر اپنی زبان میں
[illegible] کا ایک پرزہ ڈھیلا
ہو گیا ہے [illegible] میں نے انہیں بتایا
[illegible] وہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں [illegible] بھی ان سے
[illegible] وہ مجھے لے چلنے کے لئے تیار تھے مگر جہاز کا
[illegible] ورنہ سب کی موت یقینی تھی۔ ملکہ نے [illegible] ایک
زبان میں [illegible] سمجھ لی کہ وہ جانور نہیں بلکہ میری ہم قوم کی
کوئی ایجاد ہے اور اس میں انسان بیٹھے ہیں۔ اگر ہم سب [illegible] تباہ نہ کر دیں
تو [illegible] بے نقاب ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر اس نے ایک مطرب [illegible]۔
[illegible] میری [illegible] گرفتاری کے [illegible]
[illegible] پائلٹ
[illegible] لگی۔ میں نے [illegible]
[illegible] کی فوج جمع ہو کر ہم سب کا خاتمہ
کر دے [illegible] شروع کی۔
[illegible] اندازہ لگایا کہ ہم بھاگ
[illegible] اس نے [illegible] سروں کو [illegible] کر دیا۔ چاند کی
[illegible] پر گرد و غبار کا طوفان [illegible] ایک [illegible]
طرح [illegible] جانوروں کی فوج موج طوفان کی طرح آگے بڑھتی نظر آئی۔
میں نے [illegible] موت ہمارے سروں کے گرد پہنچنے والی ہے
اس نے اضطراب کے عالم میں جلدی جلدی کام ختم کیا اور ہم سب بھاگ
کر جہاز پر بیٹھ گئے۔ پائیلٹ نے جہاز کا پنکھا گھمایا ہمارے چہرے مسرت
سے کھل [illegible] کیونکہ جہاز اسٹارٹ ہو گیا تھا۔ پائیلٹ [illegible]
پر سوار [illegible] جہاز زمین پر دوڑنے لگا ملکہ نے یہ دیکھ کر طوفانی
آوازمیں [illegible] کیا۔ صحرائی درندے آندھی کی طرح جہاز کی طرف
لپکے۔ [illegible] دل تذبذب کے عالم میں بری طرح دھڑک رہے تھے
کہ جہاز [illegible] سکے گا یا نہیں۔ درندے اب قریب آ چکے تھے۔ ملکہ کا نغمہ
اب [illegible] آوازمیں صور اسرافیل کی طرح فضاؤں میں گونج

رہا تھا۔ عین اسوقت جبکہ ایک بہت بڑے صحرائی شیر نے آگے بڑھکر چاہا کہ پنجہ مار کر جہاز کو روک لوں اور آگے نہ بڑھنے دوں ہمارے جہاز نے ودکیا ہمارے منہ سے مسرت کی چیخیں نکل گئیں۔ اور شیر اچھل کر رہ گیا۔ ملک کا نغمہ بند ہو چکا تھا۔ میدان سے شباب درندوں کی غرغراہٹ سے گونج رہا تھا اور ہمارا جہاز فضائے بسیط میں تیزی سے پرواز کرتا ہمارے دنیا کی طرف چلا جا رہا تھا۔ میں اس زبردست خوشی کی تاب نہ لا سکا اور انتہائی مسرت سے بیہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو قاہرہ کے ایک بہت بڑے ہسپتال میں ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اور نرسیں میرے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔ میری آنکھ کھلتے ہی ان کے چہرے مسرت سے کھل اٹھے۔ جب میں نے سوال کرنا چاہا تو ڈاکٹر نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ابھی تم بہت کمزور ہو جب طاقت بحال ہو گفتگو کرنا۔ مجھے ایک انجکشن دیا گیا اور میں پھر بیہوش ہو گیا۔ جب میں دوبارہ جاگا تو ڈاکٹر نے بتلایا کہ میں متواتر ۲۰ گھنٹے غافل رہا تھا جرمن ہوائی جہاز کا پائیلٹ جہاز کی خرابی کی وجہ سے صحرائے اعظم میں آ پہنچا تھا اور مجھے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتے ہوئے دیکھ کر ادھر اٹھا لایا۔ جرمن پائیلٹ کا خیال تھا کہ جہاں اس نے جہاز اتارا تھا وہ دشت ممنوعہ کا علاقہ کہلاتا ہے۔ ارض سیما کا نام سن کر اور وہاں کے واقعات یاد کر کے میرے تن بدن میں رعشہ طاری ہو گیا۔ ڈاکٹر نے میری حالت کا اندازہ کر کے پوچھا کیا وہاں تم پر کوئی عجیب واقعہ گذرا ہے۔ میں نے اسے بلا کم و کاست سارا واقعہ سنا یا اور ساتھ ہی کہا کہ تم میرے دشت ممنوعہ جانے کی تصدیق شیخ گلاب سے کر سکتے ہو۔ جب میں نے اسے اپنے جانے کی تاریخ بتلائی تو اسے اور تعجب ہوا کیونکہ آج اس تاریخ کو ۹ مہینے گذر گئے تھے۔ سوال یہ تھا کہ اگر میرا دماغ وہاں کے حادثات سے خراب ہو بھی گیا تھا تو میں ایسے ہولناک ریگستان میں بغیر کھائے پیئے اتنی مدت کیسے زندہ رہتا۔ اس لئے ممکن ہے جرمن پائیلٹ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔

بہرحال چندروز بعد میں قاہرہ کے ہسپتال سے نکلا۔ اور ارادہ کر لیا کہ آئندہ بھول کر بھی صحرائے اعظم جانیکا خیال دل میں نہ لاؤنگا۔ مزید تصدیق کے لئے میں شبنم گلاب کے گھر گیا اور اس سے اپنے جانے کی تاریخ معلوم کی۔ اس رہبر سے بھی ملا جو مجھے دشت ممنوعہ تک چھوڑنے گیا تھا ان تحقیقات کے بعد مجھے یقین آیا کہ جو کچھ میرے ساتھ گذرا وہ سچ ہے اور میرے دماغ کا واہمہ نہ تھا۔ واقعات اس کی تصدیق کر رہے تھے۔

ڈاکٹر یہ واقعہ سنا کر چپ ہو گیا اور عروج اور انجم حیرت سے ڈاکٹر کا منہ تکتے رہے۔

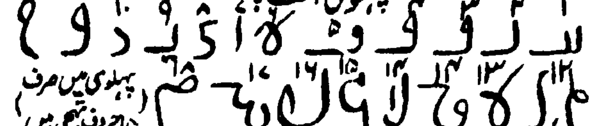
# پہلوی زبان اور اس کا ادب

بعض محققین لسانیات کا خیال ہے کہ لفظ پہلوی اصل میں پرتو تھا جو اشکانی قوم کا نام تھا، کثرتِ استعمال سے پہلو اور پہلوی بن گیا۔ سر جان مالکم مولف تاریخ ایران اور ایڈورڈ براؤن جیسے مستشرق کی تحقیق یہ ہے کہ لفظ پہلوی اصل میں پارتھوی تھا۔ بہر حال پہلوی سے مراد دور اشکانی کا وہ رسم الخط اور زبان ہے جو ساسانی عہد میں رائج تھی۔

خط پہلوی کی بناوٹ آرامی ہے جو سامی خطوط میں سے ایک خط تسلیم کیا گیا ہے اور دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا ہے۔ ساسانی عہد کے کتبے اور زردشتی کتب کے مطالعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ پہلوی خط دو طرح کا تھا ایک خطِ قدیم جسے خط کلدہ کہتے تھے اور کتبات کے سوا اس کا اب کہیں کوئی نشان موجود نہیں ہے اور دوسرا خط ساسانی یا پہلوی کتابی چنانچہ ساسانیوں کی تہذیب کے اکثر آثار خصوصاً ان کا ادب اسی طرزِ خط میں آج بھی موجود ہے۔

پہلوی رسم الخط کی خصوصیات میں سے ایک اہم اور قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس خط میں اکثر الفاظ سامی لغت کے لکھے جاتے ہیں اور فارسی حروف میں پڑھے جاتے ہیں چنانچہ جس طرح ایک ایرانی اس علامت "۱۰" کو جو عربی میں عدد دس کی مظہر ہے اپنی زبان میں "دہ" پڑھے گا اسی طرح پہلوی خط کا پڑھنے والا "ملکاں ملکا" کو "مل کاں مل کا" پڑھنے کی بجائے "شہنشاہ" پڑھے گا چنانچہ اس قسم کی عبارت کو جو سامی حروف میں لکھی ہو لیکن قدیم فارسی میں پڑھی جائے "ہزوارشن" کہتے ہیں۔

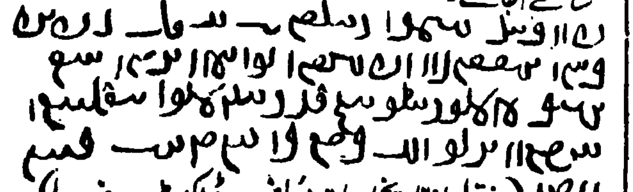
پہلوی الف با




حروف مذکورہ کا تلفظ

ا، آ، خ، ب، ق، ق، گ، ہ کی آواز آخر کلمات میں ادا کرنے کے لئے ن، و، ر، ل ز، ی، ہ، گ ج کنا غ ر، ل م س پ ج ج پ ف ش ت۔ حروف نمبر ۴، ۷، ۸، ۱۵، ۱۶ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ایک علامت یا پہلوی حرف مختلف الحروف صداؤں کا مظہر ہے اسی لئے پہلوی الف با کو ایک مشکل ترین الف با تسلیم کیا گیا ہے، اس دشواری کا حل سوائے سیاق و سباق کے اور کچھ نہیں ہے

ذیل میں اردشیر بابکاں کی کتاب "کارنامک" (کلیلہ و دمنہ) کی ایک عبارت جو خط پہلوی میں ہے نقل کی جاتی ہے تاکہ پہلوی الف با عبارت کی شکل میں سامنے آجائے۔



(منقول از تاریخ ادبیات مؤلفہ ڈاکٹر رضا)

فارسی میں تلفظ۔

یون کارنمک ی ارتخشیری پاپکاں اپتون نبشت تیکو پہت اگ آخر من مرگ ی الکساندر آروبیک ایران شتر ۲۰۰ و ۴۰ کو تک خوتا ے بہوت۔

عبارت متذکرہ بالا کو پہلوی خواں اس طرح پڑھے گا!!

بہ کارنامکے ارتخشیری پاپکاں اتیون بنشت استاذ کو پس ہیچ مرگ الکساندر راو بیک ایران شہر دویست و چہل کوتک خدائے بود۔

حالیہ فارسی میں اس کا ترجمہ یہ ہے۔ بکارنامہ اردشیر بابکاں چنیں نوشتہ است کہ پس از مرگ اسکندر رومی ایران شہر دویست و چہل کد خدائے بود (دویست و چہل در رقم نوشتہ است)

عہد ساسان کے آخری دور میں علمائے ایران نے پہلوی کے ناقص خط کا تکملہ کیا اور از سرِ نو پہلوی کی الف با کو مرتب کیا۔ پہلوی زبان قدیم فارسی زبان سے مشتق ہے یعنی قدیم فارسی زبان کے کلمات اور اس کی ترکیب میں مرورِ ایام کے باعث اس قدر تغیر واقع ہوا کہ وہ دوبارہ پہلوی زبان کی شکل میں زندہ ہوئی اور رفتہ رفتہ موجودہ فارسی میں تبدیل ہو گئی۔

## ادبیات پہلوی

پہلوی ادب کی بہترین تصانیف زردشت کی مذہبی کتابیں ہیں جن میں بعض اوستا کے متن ہیں اور بعض اوستا کی شرحیں اور بعض زردشتی فقہ پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ خالص ادبی تصانیف بھی ہیں جن میں ایک قابلِ ذکر "گجستک ابالیش" ہے، بعض قصص و حکایات پر مشتمل ہیں لیکن ایران پر غلبہ اسلام اور رسم الخط کی تبدیلی کے باعث اب ان کتابوں کا وجود نہیں ہے۔

پہلوی ادبیات میں بہت سی علمی اور فلسفیانہ تصانیف بھی تھیں جو دورِ ساسانی خصوصاً نوشیراں کے عہد میں یونانی اور سنسکرت زبان میں ترجمہ کی گئی تھیں۔

شمس بریلوی

شاہی فرامین اور معتبر روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایران کے مذہب پرست مصنفین نے قبل اسلام بہت سی کتابیں مذہبی موضوعات پر تصنیف کی تھیں اور ان میں سے اکثر کتب کو پہلوی سے فارسی میں نقل بھی کر لیا گیا تھا لیکن عربی زبان کے استیلا اور غلبہ سے اس قسم کے قلمی اور نادر نسخے آہستہ آہستہ نابود ہوتے چلے گئے اور اب فقط وہ مخطوطات باقی ہیں جو دین زردشت کے پیرو دوسری صدی ہجری میں یا اس کے بعد اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے تھے اور تلف کاری سے بچ گئے یا جن کی حفاظت خود ایران میں کی گئی۔

اَوِستائی کتابیں جو پہلوی زبان میں اس وقت موجود ہیں وہ اَوِستا کے پانچ حصے یا پانچ مختلف اجزا ہیں یعنی وندیداد، یسنا، ویشتاسپ یشت، اھورمزد یشت، خورشید یشت اور اس کے علاوہ مختلف اجزا میں ماہ یشت اور ماہ نیایش قابل ذکر ہیں۔

اَوِستا کے متن کے علاوہ زردشتیوں کی ایک اور معروف و مشہور دینی کتاب دینکرت (دینی اعمال) ہے، اس کتاب میں زرتشتی عقائد، آداب و مراسم اور اوامر و نواہی نیز قصص بیان کئے گئے ہیں ان کے علاوہ ایک دوسری قابل ذکر تصنیف بندھشن (آفرینش) ہے جس میں حمد الٰہی، شیطان کی نافرمانیاں، آفرینش خلق کا تذکرہ ہے۔ دین کرت کا مصنف آتورفرن بگ ہے جو دین زردشت کا مشہور مبلغ اور مناظر تھا اسی نے مامون الرشید کے دربار میں مردود ابالیش سے مناظرہ کیا تھا۔

غیر مذہبی کتابوں میں سب سے مشہور کتاب یا پہلوی ادب کا دوسرا شاہکار گجستک ابالیش کے بعد ... کارنامک اردشیر بابکان ہے جس کا ایک نمونہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ اس مختصر کتاب میں جو اصلاً ایک افسانہ ہے ایسے تاریخی پہلو بھی ملتے ہیں جن سے دور ساسانی کی کچھ نہ کچھ تاریخ مرتب ہو سکتی ہے اس کے علاوہ داستان خسرو گواتان با غلامش (خسرو پسر گباد یا قباد) اور یادگار زریران بھی خالص ادبی تصانیف میں شمار کی جاتی ہیں، خصوصاً یادگار زریران جسے شاہنامہ گشتاسپ بھی کہتے ہیں ایک قابل اعتنا رزمیہ داستان ہے اور اس جنگ کے تفصیلی وقائع پر مشتمل ہے جو دین زرتشت کے وفادار متبع شاہ گشتاسب اور اس مذہب کے سب سے بڑے دشمن ارجاسپ کے مابین واقع ہوئی تھی، ایران کے قومی مورخ فردوسی نے بھی شاہنامہ میں زریر و گشتاسپ کا تذکرہ کیا ہے۔

کتاب گجستک ابالیش سے ایک دو نمونے :-

(۱) ایندون گویند کو گجستک ابالیش زندے از ستخر بود

حالیہ فارسی :- چنین گویند کہ ملعون ابالیش زندے از استخر بود

اردو :- اس طرح کہتے ہیں کہ ملعون ابالیش استخر کا ایک اوباش شخص تھا۔

(۲) مردے وہ ربان دوست بود او روزے گرسنگ او تشنہ آتشگا ہے آمد کہ باژ گرم اوداو نوکس نبود

حالیہ فارسی :- مردے خوب رواں دوستے بود روزے گرسنہ و تشنہ بہ آتشگاہ آمد کہ باج گیرد و آں جا کس نبود

ترجمہ :- ایک شخص جو مہربان و مخلص تھا ایک دن بھوکا پیاسا اس خیال سے آتشکدہ میں آیا کہ وہاں سے فیض حاصل کرے۔

غرضکہ امثلہ بالا سے یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ پہلوی زبان میں بھی ادبیات کا کافی ذخیرہ موجود تھا اور تقریباً ہر موضوع پر تصانیف موجود تھیں لیکن ایرانیت کی شکست اور زرتشتیت کی بے سروسامانی نے وہ تمام نوادر ہم تک نہیں پہنچنے دیئے، اگر آج وہ ذخیرہ موجود ہوتا تو ساسانی ادب اور اس کی تاریخ پر بہت کچھ اس کی مدد سے روشنی ڈالی جا سکتی تھی! اور ساسانی عہد کی معاشرت اس کے کلچر اور تہذیب پر بہت کچھ تفصیل سے لکھا جا سکتا تھا۔ ان ادبی شواہد کے فقدان نے ایران میں فارسی شاعری کے آغاز کے مسئلہ کو بھی اس قدر دشوار بنا دیا کہ اب یہ تعین کرنا بھی دشوار ہو گیا ہے کہ ساسانی عہد میں نظم کا وجود بھی تھا یا نہیں۔

# برٹش میوزیم لائبریری

مسعود حسین

'برٹش میوزیم لائبریری' جس میں کہ پچاس لاکھ سے بھی زیادہ کتابیں ہیں، دنیا کے چار بڑے کتب خانوں میں شمار کیا جاتی ہے۔ 'برٹش میوزیم' قدیم قومی نوادر اور قومی کتب خانہ کے مجموعہ کا نام ہے۔ آج کل 'لائبریری' چار شعبوں میں منقسم ہے: طبع شدہ کتب، قلمی نسخے، مشرقی طبع شدہ کتب اور قلمی نسخے، اور فنون لطیفہ و نقش و نگار۔

عام طور سے طبع شدہ کتب ہی کو 'لائبریری' کہا جاتا ہے۔ گو یہ دنیا کے چار سب سے بڑے کتب خانوں میں سے ایک ہے لیکن مختلف زبانوں کی کتابوں کی کثرت اور کتب بیں اشخاص کے ساتھ وہاں کے ملازمین کے پرخلوص رویہ کی وجہ سے اس کی پرانی شہرت جس نے کہ اس کو اولین کا مرتبہ بخشا اور جس کی کہ وہ مستحق تھی، اب تک قائم ہے۔ بقیہ تین بڑے کتب خانہ یہ ہیں: پیرس کی ببلیوتھیک نیشنیل۔ واشنگٹن کی کانگرس لائبریری' اور ماسکو کی 'لینن لائبریری'۔

اگر کتابوں کی سب الماریوں کو ایک قطار میں رکھا جائے تو وہ اٹھاسی میل تک پہنچ سکتی ہیں لور حال کے زمانہ امن میں ان کا اضافہ ایک میل سالانہ تھا۔ کتابوں کی تعداد پچاس لاکھ سے بھی زیادہ ہے لیکن سب بلومسبری میں 'برٹش میوزیم' ہی کے اندر نہیں رکھی ہوئی ہیں کیونکہ ۱۹۰۶ء سے اخبارات لندن کی شمال مغربی سمت کے مضافات میں ہینڈن کے ہوائی مستقر سے متصل ایک علیحدہ عمارت میں رکھ دیے گئے ہیں۔

## کتابیں حاصل کرنے کا قانونی طریقہ

ان کتابوں کے وسیع ذخیرہ کا ایک بڑا حصہ گذشتہ صدی کے دوران میں حق تصنیف و تالیف کے قوانین کے ماتحت حاصل کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا قانون ۱۸۴۲ء میں نافذ کیا گیا تھا اور سب سے آخری علاوہ ایک یا دو تفصیلی ترمیمات کے ۱۹۱۱ء میں۔ پارلیمنٹ کے ان قوانین کی رو سے برطانیہ عظمیٰ کی ہر طبع شدہ کتاب کے ناشر کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس کی ایک جلد 'میوزیم' کو پیش کرے۔ ذاتی طور پر چھپوائی ہوئی کتابیں اس قانون سے مستثنیٰ ہیں اور وہ یا تو تحفہ کے طور پر یا خرید کر حاصل کی جاتی ہیں۔

بسا اوقات اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ غیر ضروری اور بے کار کتابوں کے انبار کو رکھنے سے ملازمین کے وقت اور روپوں کو برباد کرنا ہے لیکن اس بات کا فیصلہ کرنا کہ کون سی کتابیں غیر ضروری اور بے کار ہیں ناممکن ہے' اور یہ طے کرنا کہ ایک صدی کے بعد ان کتابوں کے متعلق کیا خیال ہوگا اور بھی ناممکن ہے۔ انتخاب کا کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے کتابوں کا اخراج ضروری ہے اور اس طرح سے بہت سی کتابوں کا وجود ختم ہو جائے گا جو اخلاف کے نزدیک نہایت اہم اور ناگزیر ہوں گی۔ کسی انتخاب کرنے والے نے بلیک رمباڈ، بوہیم اور بہت سے دیگر مصنفین کی تصنیفات کو منتخب کر کے حفاظت سے رکھا ہوگا؟ لیکن جو درحقیقت بے کار ہے وہ بھی مجموعی حیثیت سے اگلے مورخین کے لئے بہت زیادہ قابل قدر ہے کیونکہ اس سے اس زمانے کے عام خیالات اور مذاق کی رفتار پر روشنی پڑتی ہے۔ "آج کی مٹی کل کا سونا ہے"۔

## بیرونی ممالک کی کتابیں

بیرونی ممالک کی کتابیں اور حق تصنیف و تالیف کے قوانین سے پہلے کی برطانوی کتابیں ہمیشہ خرید کر یا تحفہ کے طور پر حاصل کی گئی ہیں اور کی جاتی ہیں۔ 'میوزیم' کا مستقل سرمایہ معمولی ہے اور منتظمین کو اپنے تمام اخراجات کے لئے پارلیمنٹ کی سالانہ امداد کا بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور اہم مواقع پر خاص امداد کا، جیسے کہ ۱۹۳۳ء میں انجیل مقدس کے دو سب سے قدیم قلمی نسخوں میں سے ایک کوڈکس سینے ٹیکس Codex Sinaiticus کی خریداری پر دی گئی تھی۔ لائبریری کی پوری تاریخ کے دوران میں نہ صرف اہمیت کے لحاظ سے ہر درجہ کی لاتعداد مختلف جلدیں ——— حقیقی قدر و قیمت سے لے کر وقتی قدر و قیمت تک کی ——— حاصل کی گئی ہیں بلکہ نادر ذخیرے بھی ہیں۔ جو معطیان کے ناموں کے ساتھ ایک ہی جگہ رکھے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر طبع شدہ کتب میں حسب ذیل ذخیرے شامل ہیں: دی کنگس (شاہ جارج سوئم کی کتابوں کا ذخیرہ جو ۱۸۲۳ء میں شاہ جارج چہارم نے عنایت کیا)، دی گرین ول (مسٹر ٹامس گرین دل کی کتابوں کا ذخیرہ جو ۱۸۴۷ء میں انکی وصیت کے مطابق حاصل ہوا)' اور دی ہینڈ (پچاس غیر معمولی طور پر نادر اور قیمتی جلدیں جو ۱۹۰۱ء میں مسٹر اے۔ ایچ۔ ہینتھ نے اپنی مرضی سے میوزیم کے لئے چھوڑیں)

'لائبریری' کے ذیلی شعبے 'نقشہ جات' اور 'تحریر نغمہ' کے ہیں۔ دوسرے شعبہ میں شاہ جارج پنجم کا عاریتاً دیا ہوا 'شاہی ذخیرہ' رکھا ہوا ہے۔ یہ ہینڈل کی ان قلمی تحریرات نغمہ کی وجہ سے بہت گراں بہا ہے جو اس نے شاہ جارج سوئم اور اس کی ملکہ کے لئے تصنیف کئے تھے۔ فن طباعت کے ابتدائی زمانہ کی کتابیں (۱۵۰۱ء سے پہلے کی چھپی ہوئی) جن کی تعداد قریباً دس ہزار ہے (یعنی میونخ کی اسٹیٹ لائبریری سے کچھ ہی کم اگر درحقیقت وہ نقصان سے بچ گئی ہے) رابرٹ پراکٹر کے بتلائے ہوئے اصولوں کے مطابق 'لائبریری' میں ان شہروں اور مطبوں کے ناموں کے ساتھ جہاں پر کہ وہ شائع ہوئی ہیں ایک ہی جگہ

رکھی ہوئی ہیں۔

'لائبریری' کے ابتدائی زمانہ میں طبع شدہ حصہ قلمی نسخوں کے مقابلہ میں بہت کم حیثیت کا خیال کیا جاتا تھا۔ ۱۸۲۳ء میں بادشاہ کا کتب خانہ ملنے سے لائبریری کی کتابوں کی تعداد میں پچاس فیصدی کا اضافہ ہوگیا اور اس کی حقیقی قدر و قیمت اس سے بھی کہیں زیادہ ہوگئی، کیونکہ شاہ جارج سوئم نے اپنے کتب خانہ کو قاعدہ میں ترتیب دی تھی اور اس کا مہتمم کتب خانہ ڈاکٹر جانسن سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں 'میوزیم' کا ذخیرہ نہایت بے ترتیبی کے ساتھ جمع کیا گیا تھا۔ چند سال بعد ایک اطالوی سیاسی پناہ گزین کے عملہ میں شامل ہونے سے 'میوزیم' کو اس سے بھی بڑا ایک اور ذخیرہ حاصل ہوا۔

**اینٹینیو پینزی** یہ اطالوی اینٹینیو پینزی تھا۔ یہ دور وہ تھا جب دور انسانیت نے اپنے خیمے گاڑ دیئے تھے اور ترقی کی جانب گامزن تھی۔ پینزی کی دور رس نگاہوں نے مستقبل کی دنیا کو دیکھ لیا تھا اور وہ اس پرانے خیالات کے ادارہ میں بھی ایک عظیم انقلاب پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ پوری طاقت کے ساتھ جمود پیدا کرنے والی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہوا اور جب وہ مہتمم اعلیٰ کے عہدے سے سبکدوش ہوا تو 'میوزیم' کو دنیا کے کتب خانوں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ بنا دیا تھا۔ اس نے ۱۸۳۶ء میں پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے اپنا نصب العین ان الفاظ میں بیان کیا تھا: "میں چاہتا ہوں کہ ایک غریب طالب علم کو اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لئے وہی ذرائع حاصل ہوں، اسی طرح اپنے ادبی مشاغل جاری رکھ سکے، اسی طرح مستند اسناد سے مدد لے سکے، اور دقیق نکات کو حل کر سکے جس طرح کہ ملک کا سب سے دولت مند آدمی کر سکتا ہے۔"

اس مقصد کی تکمیل کے لئے پینزی نے 'میوزیم' کی ضرورتوں پر غائر نظر ڈالنے کے بعد کتابوں کی خریداری کے لئے حکومت سے معقول امداد حاصل کی، لیکن اگر اس 'لائبریری' سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانا تھا تو ضرورت اس امر کی تھی کہ کتابوں کو مناسب جگہ پر رکھا جائے، معقول ترتیب دی جائے، اور ان کی فہرست تیار کی جائے۔ ضرورت اس بات کی بھی تھی کہ عمارت کو کشادہ کیا جائے تاکہ ایک ہی وقت میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ مطالعہ کر سکیں۔

پینزی پہلا شخص تھا جس نے کہ ان صریح حقائق کو دیکھا۔ اس نے کتب خانہ کی عمارت کا ایک نئی قسم کا نقشہ بنایا ——— ایک بڑا گنبد دار مطالعہ کا کمرہ جس کے اندر سب طرف لاکھوں کتابیں رکھنے کے لئے الماریاں لگی ہوں۔ یہ 'میوزیم' زیادہ سے زیادہ گنجائش نکالنے کے فن عمارت کے ان اصولوں پر بنایا گیا تھا جو اس زمانہ میں ۱۸۵۱ء کی 'عظیم الشان نمائش' کے لئے بنوائے ہوئے 'کرسٹل پیلس' کی وجہ سے بہت زیادہ مقبول ہو رہے تھے۔

دارالمطالعہ جس میں کہ ایک ہی وقت میں تقریباً ۵۰۰ آدمی بیٹھ سکتے ہیں، ۱۸۵۷ء میں کھولا گیا۔ یہ اب تک استعمال میں ہے اور یقیناً کہ مشہور ہے اتنا ہی مفید بھی ہے۔ نواردی لائبریری (جیسا کہ عام طور سے کتابوں کی الماریوں کو کہا جاتا ہے) کو بدل کر ایک نئی طرز پر اور زمانہ حال کے مطابق عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ پینزی نے یہ بھی محسوس کیا کہ کتابوں کے اس عظیم الشان ذخیرہ کی سائنٹیفک اصولوں پر ایک مناسب فہرست تیار کی جائے اور اس قسم کی پہلی فہرست اسی کی کوششوں کی رہین منت ہے۔

**عالموں کا اجتماع** یہ دارالمطالعہ جو ۱۹۳۹ء کی جنگ میں دشمن کے ہوائی حملے سے صدمہ پہونچنے کی وجہ سے مرمت کرنے کے بعد ۴ جون ۱۹۴۲ء کو دوبارہ کھولا گیا ہے دنیا کے بین الاقوامی مقامات اجتماع میں سے ہے جہاں ہر ملک کے عالم و فاضل نظر آتے ہیں۔ داخلہ کے اجازت نامہ (جس کی ہر چھ مہینے بعد تجدید کرانی پڑتی ہے) کے لئے اس کے علاوہ کسی شرط کی ضرورت نہیں ہے کہ عمر اکیس سال کی ہو، ایک قابل یقین وجہ کا اظہار کہ اس کو صرف اسی کتب خانہ کی ضرورت ہے نہ کہ دیگر کتب خانوں کی جن میں کہ بآسانی سے داخلہ مل سکتا ہے اور کسی معزز اور ذمہ دار شخص کا ایک خط جس میں درخواست کنندگان کے اچھے چال چلن کی تصدیق کی گئی ہو۔ ان شرائط سے صرف کتابوں کی حفاظت مدنظر ہے۔ دارالمطالعہ کو اس کی شہرت کی سزا یہ ملی ہے کہ بہت سے اشخاص بغیر کسی ضرورت اور اہلیت کے اس کو استعمال کرنے کے لئے درخواست کرتے ہیں۔ ناظم کتب خانہ ایسے لوگوں کو بہت مسرت کے ساتھ مناسب مشورہ دیتا ہے۔

اگر نقش و نگار اور فنون لطیفہ کے شعبوں میں ان کی پرانے زمانہ کی انگریزی آب رنگ تصاویر، سادی تصاویر، او نیم رنگ تصاویر کے عدیم المثال ذخیرہ اور فرانس، ہالینڈ، جرمنی، اٹلی اور دیگر بیرونی دبستانوں کے شاندار ذخائر کی خوبیوں اور دلچسپیوں کا مناسب تذکرہ کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ یہی حال مشرقی کتب خانہ کا ہے جس میں عہد عتیق کی عبرانی اور شامی نوشتے اور اس سے بھی زیادہ پرانی چینی اور وسطی ایشیائی تحریرات جو طن ہانگ میں سر آریل اسٹین کو ملے تھے، اور خوبصورت ایرانی اور عربی نقش و نگار موجود ہیں۔

**میوزیم کا مایہ فخر** مغربی قلمی نسخوں کا ذخیرہ مع یونانی نمونہ ہائے سنگتراشی 'میوزیم' کا مایہ فخر تصور کیا جاتا ہے یونانی نمونہ ہائے سنگتراشی کو چھوڑتے ہوئے 'لائبریری'، اور 'میوزیم' کی تخلیق کا اصلی سبب یہی مغربی نسخوں کا ذخیرہ ہے۔

انگلستان میں ۱۵۳۶ء سے ۱۵۴۰ء کے زمانے کی تحریک تجدید

مسیحیت کے دوران میں ضبط شدہ خانقاہوں کے کتب خانوں کو ختم کر دیا گیا تھا اور ان کی زیادہ تعداد بالکل برباد کر دی گئی تھی۔ صرف گنتی کے اشخاص نے جو کچھ کہ بچا تھا اس کی قدر و قیمت بحیثیت قوم اور مذہب کی یادگار کے محسوس کی اور جو کچھ ان کو مل سکا جمع کر لیا۔ ان میں سے ایک شخص سر رابرٹ کاٹن کا جمع کیا ہوا ذخیرہ ۱۷۰۰ء میں حکومت کو مل گیا۔ اس کو ۱۷۳۱ء میں آگ سے سخت نقصان پہنچا اور یہ ظاہر ہے کہ یہی قومی کتب خانہ کی بنا ثابت ہوا۔

۱۷۵۳ء میں ایک بہت زیادہ کتابیں جمع کرنے والے سر ہنس سلوان نے جس کو خصوصاً پچھلی دو صدی کے الکشافات سائنس میں بہت دلچسپی تھی اپنے ذخیرہ جس میں ایک عام بڑا کتب خانہ بھی شامل تھا بہت کم قیمت پر حکومت کو پیش کر دیا۔ تمام متعلقات پر قابو پا لیا گیا اور ایک سرمایہ فراہم کر کے مانٹیگ ہاؤس تعمیر کیا گیا۔

پارلیمنٹ کے فاؤنڈیشن ایکٹ کے ماتحت ابتدائی سرمایہ میں سے کاٹن اور سلون کے کتب خانوں میں ایک بڑے کتب خانہ کا جو کاٹن کے اصول پر آکسفورڈ کے پہلے ارل رابرٹ ہارلے نے جمع کیا تھا اضافہ کیا گیا۔ ان میں شاہ جارج دوم نے جو گوٹنجن یونیورسٹی اور اس کے مشہور کتب خانہ کا بانی تھا اپنے کتب خانہ کے عطیہ سے جو قرون وسطیٰ تک کے انگلستان کے فرمانرواؤں کے قلمی نسخوں کے لئے خاص طور پر مشہور تھا اور اضافہ کیا۔

---

مولانا ظفر علی خاں بقیہ صفحہ ۱۶

گرے اگر زمیں پر سواران تقوے — دھلائے کا جھل بل جو یہ خنگ ختلی

یہی مادیاں ہے تولا ہو روالو — تمہارے تقدس کی گاڑی بھی جت لی

یہ مولانا کے خرمن سخن کے چند دانے ہیں جو ہم نے آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے ہیں۔ چونکہ مولانا کا کلام زیادہ تر سیاسی اور اخلاقی ہے اس لئے اس کے اقتباسات ایک ادبی رسالے میں پیش کرنا نہایت نازک اور ذمہ داری کا کام ہے۔ لیکن مولانا کے مقام شعر کو سمجھنے کے لئے مندرجہ بالا اقتباسات ہی ارباب ذوق سلیم کے لئے کافی ہیں۔ مولانا ہماری زبان، ہمارے ادب اور ہماری شاعری کے نہایت عزیز او موجود رکن ہیں۔ خدا انہیں دیر گاہ سلامت رکھے۔

---

# جاپانی شاعری

## ۲

فضل حق قریشی دہلوی

جاپانی شاعری کی تاریخی اور تدریجی ترقیوں کا جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب بلحاظ اقسام اس پر اظہار خیال کیا جائے تاکہ فنی اعتبار سے بھی اس کی خصوصیات نگاہ کے سامنے آ جائیں۔

اس سے پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ ابتدا میں جاپانی شاعری قافیہ اور بحر و عروض سے مبرا ہونے کے باعث ایک قسم کی نثریہ شاعری تھی۔ لیکن جب شعرا نے محسوس کیا کہ ہمارے جن گیتوں میں اتفاقیہ طور پر علی الترتیب پانچ اور سات بول نظم ہوگئے ہیں وہ غیر معمولی طور پر بہت زیادہ سحر انگیز اور موثر ہیں۔ اسوقت انہوں نے مناسب سمجھا کہ شاعری کے لئے چند اصول مقرر کرکے اسے ایک فن کی حیثیت دیدی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ تحریک آٹھویں صدی عیسوی کے شروع ہی میں رونما ہوگئی تھی لیکن اسے زیادہ تقویت کچھ عرصے بعد نصیب ہوئی اور مستند شعرا کے فیصلے کے مطابق نئی شاعری کو چار مختلف اقسام کی بحروں کے تحت پابند کر دیا۔ آج تک انہی اصولوں کی پابندی کی جاتی ہے۔

اس نظم و انضباط سے کسی نوع کی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ وہ پابندیاں ایسی سخت نہیں ہیں کہ ان کا لحاظ رکھنے میں اظہار جذبات کی رو میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو۔ صرف اتنا ہوا کہ پہلی سی بے ساختگی کسیقدر کم ہوگئی۔ لیکن اس کے برعکس یہ فائدہ ضرور ہوا کہ نظم اور نثر میں امتیاز کرنا ممکن ہوگیا۔ ورنہ ادب کے ان دو شعبوں کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں تھی۔ وہ چاروں قسمیں فنی اعتبار سے الگ الگ ہونے کے علاوہ اپنے موضوعات کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں۔ یہاں ان کا سرسری جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ہر ایک کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ درمیانی تفاوت اچھی طرح ذہن نشین ہوسکے۔

**۱۔ ہوکو** اس نظم کے صرف تین مصرعے ہوتے ہیں اور تینوں مصرعوں کے بولوں کی کل تعداد سترہ مقرر ہے۔ یعنی اس طرح کہ پہلے میں پانچ، دوسرے میں سات اور تیسرے میں پھر پانچ بول ہوں۔ یہ طرز محاکات کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں ایسی لفظی تصویریں پیش کی جاتی ہیں کہ اسے سنکر کوئی دیکھی محسوس کی ہوئی شے نظر کے سامنے آجائے۔ یا کسی گذشتہ واقعہ کی یاد دل میں اسطرح تازہ ہو جائے کہ وہ ابھی وقوع پذیر ہوئے مثلاً

جھیل کے کنارے کی ایک بیل
تعجب کی بات ہے کہ ایک مینڈک کا
اس پر آ بیٹھنا

ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو

تیری ماں کے گھر میں ریشم کے کیڑے
اپنے خولوں میں تنہا — اور میں بھی ہوں
(اسی طرح) تیری یاد میں تنہا اور اداس

تشبیہ کتنی مکمل اور صداقت سے کس درجہ لبریز ہے کہ پورا اطمینان قلب نصیب نہ ہو تو دنیا بھر کی نعمتیں ہیچ ہیں۔ ریشمی کپڑوں میں ملبوس اور طلائی زیورات سے لدی ہوئی عورت اگر اپنے محبوب سے جدا ہو تو کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔ اس کی اداسی ریشم کے اس کیڑے کی طرح ہے جو تنہا اپنے کوئے میں پڑا رہتا ہے۔

اس طرز کا سب سے مشہور شاعر باشو تھا جو ۱۶۴۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ پچاس سال کے عرصہ حیات میں اس نے اپنی بے شمار موثر نظموں کے ذریعہ اپنی ہستی کو ناقابل فراموش بنا دیا۔ اس کا کلام نو دیوانوں کی صورت میں جمع ہے۔ وہ قلب کی لطیف و نازک کیفیات کو نہایت مختصر الفاظ میں بیان کر دینے کا ملکہ رکھتا تھا اور اسی لئے اس نے ہوکو شاعری کو اختیار کیا۔ اس نے اپنی ہر نظم میں ایک مختصر بات کہی اور سننے والوں کو بہت کچھ سوچنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔ جاپانی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت کہ اس میں اصل بیان سے کئی گنی زیادہ ایمائی کیفیت پنہاں ہوتی ہے۔ باشو کے کلام میں نہایت اعلیٰ طریقہ پر جلوہ گر ہے۔ اس کی مختصر نظمیں غالب کے پیچیدہ اشعار کی طرح ناقابل فہم اور ایک حد تک بے معنی معلوم ہونے لگتی ہیں اور اسوقت تک سمجھ میں نہیں آتیں جب تک کہ وہ بہت سی باتیں جو ان سے پہلے نہ سمجھ لیا جائے۔ حیات انسانی کے متعلق اس کی ایک نظم ہے :

جلد جلد منتشر ہونے والی شبنم
تو مجھے پاک کر لینے دے اپنے سے
یہ گناہ آلود زندگی

پانی ہر شے کو پاک و صاف کر دیتا ہے خواہ انسان کا جسم ہو یا اسکے پہننے کا لباس۔ لیکن دریا کا پانی جس میں ہزاروں شہروں کے

---

ؔ جاپانی زبان میں "ہشو" کیپسیلے کو بھی کہتے ہیں۔ ؔ یہ ایمائی کیفیت صرف شاعری ہی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ افسانوں حتی کہ عام بول چال میں بھی رنگ اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ معاشرتی زندگی میں الوداعی جملے کو لیجئے۔ وداع کرنے والا "سایونارا" کہتا ہے یعنی خدا حافظ" لیکن اس کے اصلی معنے ہیں "اگر یہی ہونا ہے تو۔ ۔ ۔" یعنی جملہ شرطیہ ہے مگر نا تمام۔ گویا وداع کے وقت اس قدر رنج طاری ہے کہ جملہ پورا کرنے کی بھی تاب نہیں اور رخصت ہونے والے کو یہ سوچنے کا موقع دیا جاتا ہے کہ قسمت میں جدائی لکھی ہے، اسلئے رخصت ہو رہے ہیں۔ اور اگر یہی ہونا ہے تو خدا نگہبان ہے۔

کے گندے نالے آکر ملتے ہیں حقیقی معنوں میں خود پاک نہیں ہوتا۔ یہی صورت چشمے کے پانی کے ساتھ ہے۔ زمین کے اندر چھپی ہوئی نامعلوم چیزیں اس میں مل جاتی ہیں اور ممکن ہے کہ ان میں کوئی ناپاک شے بھی ہو۔ کپڑا یا جسم ایسے پانی سے پاک ہو سکتا ہے لیکن زندگی یا روح کی پاکیزگی کے لئے جو بذاتِ خود بہت لطیف شے ہے، شبنم سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ پانی جب بخارات بن کر اڑتا ہے تو کوئی دوسری مادی شے اس میں کسی لحاظ سے آمیز نہیں ہوتی حتی کہ اس میں بو یا ذائقہ تک نہیں ہوتا نیز تمام مذاہب کے اعتقادات کے مطابق پانی جل کر پاک ہو جاتا ہے اور ان ہی بخارات سے مترشح ہونے والی شے کا نام شبنم ہے جو ہر طرح منزہ و مطہر ہے۔ زندگی کی آلودگیاں اس سے پاک ہو سکتی ہیں۔ باشو نے بارش کے قطروں کو بھی نہیں لیا کیونکہ قطرات شبنم کی مثال ہونے کے باوجود ان میں پھر بھی فرق ہے۔ باد و باراں میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور ممکن ہو سکتا ہے کہ آندھی کے غبار نے ان قطروں کو زمین تک پہنچنے سے قبل آلودہ کر دیا ہو۔

اسی شاعر کی ایک دوسری نظم ملاحظہ ہو۔ ؎

"اے جھینگر! تیرے مسرور راگ سے کوئی شخص
ہرگز (یہ) قیاس نہیں لگا سکتا
(کہ) تجھے اتنے جلدی مرجانا ہے"

جھینگر کی زندگی جتنی مختصر ہوتی ہے، اتنی ہی پرمسرت بھی۔ یہ قدرت کا فریب عمل ہے کیونکہ فضائے مسرت تو ممد حیات ہے اور جھینگر کو بہت عرصے زندہ رہنا چاہیئے۔ لیکن ہوتا ہے برعکس اس کے۔ نتیجہ نکلا کہ عمر کی کمی و بیشی کا انحصار کسی شخص کی ظاہری حالت پر نہیں ہوتا۔ دولت و ثروت جاہ و جلال یا آرام و آسائش زندگی کے لمحات میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ ورنہ تزک واحتشام اور مسرت و شادمانی کی زندگی بسر کرنے والے بادشاہوں کی عمر فقیروں سے زیادہ ہوا کرتی یا رنج و غم کی فضا میں مصیبت کے لمحے گذارنے والے بہت جلد مرجایا کرتے۔ جھینگر کو مخاطب کرکے باشو نے ہنگامۂ حیات کے اسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔

اس کی ایک اور نظم ملاحظہ ہو ؎

"پیاری چڑیا! مت کھا، میں منت کرتا ہوں
ان ننھی، بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کو جو کھیل رہی ہیں
میرے باغ کے پھولوں کے درمیان"

ہرچند جہد للبقا کے اصول کے مطابق ہر بڑی قوت چھوٹی قوت کو فنا کر دیتی ہے اور چڑیوں کا مکھیوں کو ہضم کر جانا عین اقتضائے فطرت ہے مگر باشو جو بدھ مت کا پیرو تھا، یہ گوارا نہیں کرتا کہ ذاتی مفاد یا لذتِ کام و دہن کے لئے کسی دوسرے جاندار کو ہلاک کر دیا جائے اور وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ مکھیاں پوری مسرت کے ساتھ پھولوں کے جانفزا آغوش میں کھیل رہی ہوں۔ یعنی اگر ان کی زندگی کا نہیں تو کم سے کم اس مسرت کن فضا کا لحاظ رکھتے ہوئے ہلاکت آفرینی سے احتراز کیا جائے۔ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو مکھیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے چڑیا کو اڑا دیتا لیکن شاعر جس کے احساسات کی دنیا عام سطح سے بلند ہوتی ہے، منت پذیری کا اظہار کرتے ہوئے التجا کرتا ہے تاکہ چڑیا نادم ہو کر اس وقت اڑ سے اور آئندہ بھی احتیاط رکھے۔ اب اس نظم کو اگر انسان کی زندگی پر منطبق کرکے سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ استعارہ ہے ہر بڑی اور چھوٹی قوت کی درمیانی جد و جہد کا۔ اور اس طرح شاعر کا پیام کس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔

ایک اور نظم پیش کی جاتی ہے جس میں ایمائی کیفیتیں اسقدر زیادہ ہیں کہ جتنا سوچا جائے، اتنی ہی باریکیاں نکلتی ہیں اور انسان کا ذہن کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ ؎

"قدیم میدانِ کارزار، دوبارہ بہار کے پھولوں سے شاداب
یہی جملہ کائنات ہے، اس خواب کی تعبیر
بیس ہزار جنگ جو سورما — جو ہلاک ہوئے"

یعنی اس میدان میں جہاں ہزاروں سپاہی ہلاک ہوئے تھے، موسم بہار کے آتے ہی گل فشانیاں ہونے لگیں حالانکہ قدرت کو چاہئے تھا کہ ان بہادروں کے سوگ میں دوسرے سال یہ موسم ہی نہ آتا یا کم سے کم اس جگہ یہ شادابی نہ ہوتی، لیکن قدرت کا یہ نظام کہ ایک کی فنا پر دوسرے کی بقا منحصر ہے بالکل اٹل ہے اور شادی کی محفل صفِ ماتم کے ساتھ ساتھ ہے۔ بقول شاعر ؎

دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

ان ہزاروں سپاہیوں میں جوان تھے اور بڈھے بھی اور خدا جانے کس کس شان کے تھے لیکن ان سب کو صرف بیس ہزار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ خواب کی سی باتیں ہیں کیونکہ وہاں اب نہ ان کے زخموں سے ٹپکا ہوا خون ہے اور نہ فضا میں ان کی صدائے دلخراش کی گونج۔ ان کے برعکس وہاں بلبل کے نغمے ہیں اور پھولوں کا تبسم۔ غالب کا یہ شعر بے ساختہ یاد آگیا ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں     خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

اس باکمال شاعر نے ۱۶۹۴ء میں دنیا کو خیرباد کہا۔

صنف نازک میں سے چی یو نامی ایک شاعرہ دورِ متوسط میں گذری ہے اس کی بھی بہت سی نظمیں اس طرز میں مشہور ہیں جو بلحاظ جذبات نگاری نہایت اعلیٰ ہیں۔ ان میں سے چند میری نظر سے گذریں۔ میں نے صرف ایک کو منتخب کیا اور سمجھتا ہوں کہ یہی ایک اس شاعرہ کے لئے سرمایۂ حیات ہے جو اس نے اپنے کمسن بچے کی موت سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ بطور یادگار اصل نظم بھی نقل کئے دیتا ہوں

"توم بو شوری رو
کیو وادوکو مادی
اِتا لُو را؟"

ترجمہ:- میں حیران ہوں - وہ کتنی دور بھٹکتا چلاگیا آج جگنوؤں کا تعاقب کرتا کرتا)

اس نوحۂ غم میں ایمائی کیفیت کس درجہ پنہاں ہے - عام دستور ہے کہ جب کسی چھوٹے بچے کی ماں کا انتقال ہوجاتا ہے تو عزیز و اقارب اسے تسکین دینے کے لئے یہ کہکر ٹال دینا چاہتے ہیں کہ وہ علاج کی غرض سے اسپتال یا تمہارے لئے کھلونے لینے بازار چلی گئی ہے - لیکن اگر عزیز بچے ہی کا انتقال ہوجائے تو ماں کو کس طرح تسکین دی جائے - ماں اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا بچہ مرگیا ہے مگر یہ فرض کرکے کہ وہ حسب معمول دوسرے بچوں کے ساتھ جگنو پکڑنے گیا تھا - وہ اظہار استعجاب کرتی ہے کہ آج ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا - شاید بھٹک کر کہیں دور چلاگیا ہے - خود فریبی سہی لیکن کس انداز میں تسکین خاطر ہورہی ہے - گویا اپنے لطیف شغل سے فرصت پانے کے بعد بچے کے واپس آنے کی امید ہے - جاپان میں جیسے گل ہائے گوناگوں اور حشرات الارض کا ملک بھی کہتے ہیں چھوٹے بچوں کی روحوں کو تصویروں میں پھولوں، تیتریوں اور جگنوؤں کے ساتھ کھیلتا دکھایا جاتا ہے کیونکہ یہ عام عقیدہ ہے کہ ان کی معصوم روحیں آسمان سے پرے کی دنیا میں انہی عناصر قدرت کے ساتھ کھیلتی رہتی ہیں -

اسی بحر میں ایک اور نظم میرے پیش نظر ہے جو کسی گمنام شاعر کے ذہن رسا کا نتیجہ ہے - مختصر ترین الفاظ کے ذریعے موسم بہار میں قوت نمو کے اعجاز اور پھولوں کی افراط کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے - کہتا ہے ؎

"موسم بہار اور قدرت کی فیاضیاں
کائنات کا ہر ذرہ پھول بن گیا!
اپنے گلدستے کے لئے کس کس کو منتخب کروں؟"

سندباد جہازی کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ ایسے جزیرے میں پہنچا جہاں ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگے ہوئے تھے تو اس کی عقل حیران رہ گئی اور وہ اپنے ساتھ کچھ بھی نہ لا سکا - کیونکہ جب ایک ہی نوع کی چیزیں مختلف اعتبارات سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نظر آتی ہیں تو انتخاب بہت مشکل ہوجاتا ہے - موسم بہار میں ہر طرف پھول ہی پھول نظر آرہے ہیں بعض رنگ کے لحاظ سے اچھے ہیں اور بعض خوشبو کے اعتبار سے قابل ترجیح - کسی کی رعنائی جاذب نظر ہے تو کسی کی نزاکت دل کو موہ رہی ہے - غرض یہ کہ ایک گلدستے کے لئے سب سے زیادہ مناسب و موزوں پھولوں کا چننا دشوار ہوگیا ہے - خیال کے علاوہ طرز بیان بھی لطیف ہے -

---

## دودو اِتسو

یہ دوسری مشہور قسم ہے - اسکے مصرعوں کی تعداد تین یا چار ہوتی ہے مگر بول صرف چھبیس مقرر ہیں - یہ طرز عشق و محبت کے بے پناہ جذبات کی ترجمانی کے لئے مخصوص ہے - حسن و جمال کی کرشمہ سازیوں کو بیان کرنے کے لئے اس مختصر بحر میں موسیقی کی جان میں اور دکھے ہوئے دلوں کی پرسوز فریاد کو اس ساز کے ذریعے سنایا جاتا ہے - اس بحر میں کسی دوسرے نغمے کی اجازت نہیں لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ یہی نغمہ کسی دوسرے سُر میں پیش کردیا جائے - مثلاً مندرجہ ذیل نظم بجائے دودو اِتسو کے ہوکوٹا میں ہے ؎

"بلبل کو کیونکر دیکھوں، مجھے خوف ہے
وہ سہم کر اڑ جائے گی
میرا دل امواج نغمات کے ساتھ بہ رہا ہے"

کتنا عمیق خیال ہے - محبوب کے سامنے اگر اظہار محبت کردیا جائے تو اس میں عشوہ طرازیوں کے ساتھ غرور و نخوت کا مادہ بھی پیدا ہوجاتا ہے جو عاشق کی جان پر بن جائے خود ایک ستم ہے - اسلئے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کبھی اظہار عشق نہ کیا جائے بلکہ اس آگ کو چپکے چپکے دل کے اندر سلگنے دیا جائے اور جذبہ محبت کو جو لافانی ہے ہمیشہ برقرار رکھا جائے - بلبل کو دیکھنے کیلئے جی چاہتا ہے مگر وہ اندیشہ ہے کہ میں ناہم اسکی آواز کانوں تک پہنچ رہی ہے اسی کیا معلوم اس نغمے کی لہروں میں دل بہا جارہا ہے یعنی اگر محبوب سے نہ ملنے کا تہیہ کیا جائے تب بھی اس کا تصور تھوڑا بہت تخیل جانے دیتا ہے - کس قدر عمیق طرز بیان ہے -

عشق کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ انسان محبوب کی خاطر اپنی عزیز جان کی بھی پروا نہ کرے اور اگر ضرورت ہو تو اسے محبوب کی خاطر قربان کردے -

ایک نظم ملاحظہ ہو ؎

"کیا میں تو نے یاد رکھا
کوسین گرکو تو رو کا؟
نہیں تو گوسین کو تو؟
کیا میں نے لیو!"

(ترجمہ: [illegible] تو نے [illegible] کام کروں یا پانچ ہزار دولوں؟
تنخواہ کی کیا ضرورت ہے مجھے اس کے پہلو میں رہنے دو)

یہ نظم ہوکوٹا کے ایک نہایت دلچسپ واقعہ کی تصویر ہے - پچھلے زمانے میں ایک شخص فوجی آیا تھا جو ایک نواب کے یہاں کا ملازم اور فوجی خدمت کے صلے میں ملی ہوئی جاگیر کا مالک تھا - اس کی آمدنی پانچ ہزار کوکو چاول تھی جو اس زمانے میں ایک معقول آمدنی سمجھی جاتی تھی - اس کو کوشی نامی ایک طوائف سے محبت ہوگئی جس کا نام اوگینیا تھا - جب نواب کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت برہم ہوا اور حکم دے دیا کہ اپنی آمدنی کو برقرار رکھو یا محبت کی راہ - ایک بازاری عورت سے محبت کرنے کی صورت میں جاگیر کو قائم رکھنا ممکن نہیں - مگر دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی انہوں نے سوچ کر یہ

---

۱؎ ایک ناپ کا ایک پیمانہ جو ۴.۹ بشل کے برابر ہوتا ہے -
۲؎ ٹوکیو کا ایک مشہور محلہ جہاں بازاری عورتیں رہتی ہیں -

محبت آئندہ بھی لوگوں کی نگاہ میں کھٹکیگی اس لئے ایک ساتھ دونوں نے خودکشی کرلی۔ انہی کی افسوسناک موت سے متعلق یہ نظم ہے اور آج تک لوگ اسے گاتے ہیں۔ پیرایۂ بیان کسقدر لطیف ہے۔ عاشق اپنے دل سے دریافت کرتا ہے کہ کونسی بات پسند کروں۔ ایک پہلو میں آرام یا دنیوی دولت؟ اور خود ہی جواب دیتا ہے کہ مجھے ان کی کیا ضرورت ہے۔ محبوب کا دائمی قرب چاہیئے۔

مندرجہ ذیل نظم ملاحظہ ہو۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایرانی شاعر کے خیال کا چربہ ہے ؎

او مانی سشن دارا
تیرا ہوا یا راکھو
یا سے تے کرتی شیتے
سا کے دی نومھتے

ترجمہ:۔ جانمن اگر تو مرمٹ جائے تو گوشۂ قبر کو تیرا قرب حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں تیرے جسم کی راکھ کو شراب میں ملا کر پی جاؤں گی۔

وصل بعد وصال کی اچھی ترکیب ہے۔

اس بحر کی نظمیں تعداد میں کم ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو موضوع اسکے لئے مخصوص ہے وہ دوسری بحروں میں نظم کیا جا سکتا ہے۔

**ہنر کا** اس بحر میں قدرتی شاعری پیش کی جاتی ہے۔ موسمی کیفیات، پرندوں کے چہچہے، بہار و خزاں کے مناظر سب اس میں شامل ہیں عموماً بلبل اور بیر کے درخت، چڑیا اور بانس کے درخت۔ جنگلی ڈک اور بید کے درخت، کونل اور چاند، مینڈک اور برسات یا ختری اور پھول کے ذکر ساتھ ساتھ کئے جاتے ہیں۔ پہلے [illegible] ترکیب امتزاجی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا لیکن اب اس کی زیادہ پابندی نہیں رہتی۔ اس قسم کی نظموں کے پانچ مصرعے ہوتے ہیں جن میں سے پہلے اور تیسرے میں پانچ پانچ بول اور باقی تین میں سات سات بول ہوتے ہیں۔ یعنی مجموعی طور پر سترہ بول ہوتے ہیں۔ باشو کے بعد اس بحر کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

" موئی جی مادو
کا نزی فی ماکا سانے
نی رو نزرونی نو
یا کا ناز نولو وا
ای نو چی مانی سکے ری "

ترجمہ [illegible] چھوٹے سے [illegible] شئے سے بنی ہوئی [illegible] کے ساتھ [illegible] زندگی کہتے ہیں۔

اگرچہ [illegible] زندگی کو سمجھنے [illegible] نازک خیالی سے کام لیا گیا ہے تاہم [illegible]

جاپانی شاعر بھی زندگی کو پانی کے بلبلے سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ افسردگی دل کے متعلق اسی قسم کی ایک مثال دورِ متوسط کے ایک مشہور شاعر کوماچی کے کلام میں بھی ملتی ہے جو ۸۳۴ء میں پیدا ہو کر ۸۸۰ء میں فوت ہوا تھا۔ اچھی تشبیہہ کے ساتھ ساتھ گہرا نفسیاتی رنگ بھی شامل ہے ؎

"ایک شے جو مژمردہ ہو جاتی ہے
کسی بیرونی علامت کے بغیر
ایک پھول ہے
انسان کے دل کا
اس فانی دنیا میں"

پھول کملاتا ہے تو پتوں پر سب سے پہلے مژمردگی کی علامات ظاہر ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد اس کا جگر خراب ہوتا ہے مگر انسان کا دل غم واندوہ سے گھلتا رہتا ہے اور کسی پر ظاہر نہیں ہوتا۔ حتی کہ زندگی کے دن ختم ہو جاتے ہیں۔

کوماچی سے پہلے کے یعنی ساتویں صدی عیسوی کے ایک شاعر یاکاموچی کی نظم پڑھی تو غالب کا یہ شعر فوراً یاد آ گیا ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری ۔۔۔ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

اب جاپانی شاعر یاکاموچی کی نظم ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے ؎

"محض بہانے کے طور پر
میں نے کہا۔ میں جاؤں گا
اور اس طرف دیکھوں گا
بانس کے جنگلے کی حالت
لیکن حقیقتاً تجھے دیکھنے کا مقصد تھا"

جو لوگ دام محبت میں گرفتار رہ چکے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محبوب سے ملنے کے لئے کیسے کیسے بہانے تراشے جاتے ہیں تاکہ اس پر یہ ظاہر نہ ہو کہ ہم اس سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ [illegible] رقیب کا بھی خوف ہوتا ہے کہ وہ نکتہ چینی نہ کر سکیں۔ اس لئے بانس کے جنگلے کی حالت دیکھنے کے لئے ادھر جا پہنچ گیا جہاں سے محبوب کا [illegible] جاپانی عشاق بھی اس رمز کو جانتے ہیں کہ محبوب کو تو [illegible] دیکھ کر [illegible] جانا چاہیئے تاکہ دور سے دیدار ہو سکے اور رقیب بھی [illegible]

اسی موضوع کی ایک اور نظم [illegible] بحر میں ہے [illegible] صوبہ ہنگو میں بہت مشہور ہے اور عموماً [illegible] میں گائی جاتی ہے۔ وہ نظم بحر طویل میں ہے [illegible] ایک بند [illegible] حسب ذیل ہے۔

"اے محبوب اگر تو مجھ سے ملنا چاہے، اس طرح کہ سب [illegible] تیرے سوا کوئی نہ ہو تو چپ چاپ آ [illegible] جنگل میں پا لینا اس وقت مطلع صاف ہو یا ابر آلود ہو، تو فکر نہ کر۔ اور اگر لوگ تجھ سے پوچھیں کہ تیرے آنے کا مقصد کیا ہے تو پیارے!

اپنے کہدے کہ میں صرف ایک تیتری پکڑنے آئی ہوں "

کوماچی کی ایک اور نظم ملاحظہ ہو سہ

"شام کے آتے ہی فوراً
میں کھول دوں گی پٹی اپنے دروازے کے
اور پھر منتظر رہوں گی پہلے سے
اس کے لئے جس نے آنے کا وعدہ کیا تھا
میرے خوابوں کی نگری میں مجھ سے ملنے "

کتنا اچھوتا خیال ہے کہ تعریف نہیں کی جاسکتی ۔ محبوب جب خواب میں نظر آتا ہے تو گویا وہ غیر مادی ہیولے میں نہیں بلکہ مکمل جسمانی وجود کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور اس مقصد کے لئے دروازے کو پہلے سے کھلا چھوڑ دیا گیا تاکہ اسے اندر داخل ہونے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ انتظار کی بے چینیوں کے ساتھ ایفائے عہد کی قوی امید دوگونہ لطافت پیدا کر رہی ہے۔ خواب کی نگری سے قطع نظر عالم حقیقی میں جب غائب محبوب کا دیدار چاہتا ہے تو اس در پر جانے کی شان کس درجہ بلند ہوتی ہے سہ

ہم پکاریں اور کھلے ، یوں کون جائے — یار کا دروازہ گر پائیں کھلا۔

اسی مضمون میں ایک گمنام شاعر کی نظم ہے جو بہت مبہم سی ہے ۔ غالباً ذو معنی ہے ۔ لفظ خواب (یومے) کا تعلق ابتدائی مصرعوں سے ہو سکتا ہے اور آخری سے بھی ۔ اور اس طرح دو مفہوم پیدا ہو سکتے ہیں ۔ دونوں اچھے ہیں اور شاعر کی نازک خیالی ظاہر کرتے ہیں ۔ لفظی ترجمہ پیش کرتا ہوں سہ

"ہمہ وقت اس امید میں
کہ ہم ملیں گے
اپنے خواب میں
میں نے تمام رات گذار دی
نیند کی کیفیت طاری ہوئے بغیر "

ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ خواب کی حالت میں ایک دوسرے سے ملاقات کا وعدہ تھا لیکن انتہائی خوشی کے باعث یہ کیفیت ہوئی کہ مطلق نیند نہ آئی اور تمام رات بیداری میں گذر گئی ۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی قوی امید تھی اسلئے خواب میں مجھے دکھائی دیا گویا میں بیداری کے عالم میں اس کا انتظار کر رہا ہوں حتی کے تمام رات گذر گئی ۔ دوسرا مفہوم بھی قرین قیاس ہے ۔ خواب کی حالت میں ہم جو کچھ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں وہ بیداری کی کیفیت ہوتی ہے ، خواہ حقیقت نہ ہو ۔ غالب کا یہ مصرع ملحوظ رہے جو ۔ "ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں "

ذو معنی مفہوم کی حامل ایک نہایت لطیف نظم پیش کی جاتی ہے جو نویں صدی کے ایک عالم اعلیٰ مچی ماسانے نے شہزادی مساکو کو لکھ کر بھیجی تھی سہ

" اگر ہم خلوت میں ایک ساتھ مل سکتے
جہاں کوئی دوسرا ہمیں دیکھ نہ سکتا
تو میں چپکے سے تیرے کان میں کہتا

بس یہ مختصر سے چند الفاظ
" او موئی ۔ تا نے تا موئی "

اس نظم میں آخری مصرعے کے دو معنے ہو سکتے ہیں ۔ یعنی "میری جان! میں تیری محبت میں دیوانہ ہو رہا ہوں" اور یہ بھی کہ "میں تجھے یکسر فراموش کر دوں گا " ۔ دونا یہ خصوصیت اسلئے پیدا کی گئی کہ اگر غلطی سے وہ پرچہ کسی اور کے ہاتھ لگ جائے تو اپنی برأت کا پہلو پیدا کیا جا سکے ۔

دسویں صدی کے ایک مشہور شاعر تسو کا تسا ہے آغاز موسم بہار کے متعلق اس کی مندرجہ ذیل نظم بہت لطیف ہے سہ

"گرے ہوئے تھے
بلبل رنگیں نوا کے
آنسو جس طرح اس کا ذرا کے لوگ
جہاں کی برف منوز منجمد ہے
جانتے کہ موسم بہار آگیا

ہماری شاعری میں بھی اس قسم کا تصور موجود ہے اور ان چیزوں کے درمیان علت و معلول کا رشتہ قائم ہے ۔ اس وقت حافظے کی لوح پر جگر مراد آبادی کا یہ شعر یک دم روشن ہو گیا سہ

کرے نہ کام جو بلبل کا نالہ سحریں — نہ غنچے نیند سے چونکیں نہ رنگ و بو آئے

**ناگا اتا** یہ قسم طویل نظموں کی ہوتی ہے اور تمام اصولوں سے بے نیاز ہے ۔ نہ مصرعوں کی تعداد معین ۔ نہ بولوں کی ترتیب مقرر ۔ عموماً تاریخی واقعات یا منظوم افسانے وغیرہ اسی بحر میں بیان کئے جاتے ہیں ۔ لیکن یہ بہت زیادہ مقبول نہیں ہے ۔ عہد قدیم کا بیشتر کلام جب اصول شاعری مرتب نہیں ہوئے تھے ، اس کے تحت میں آجاتا ہے ۔

عصر جدید میں توسن نامی ایک شاعر اس طرز کا بہت مشہور گذرا ہے ۔ وہ ایک معمولی درجے میں ... تھا ۔ ۱۸۹۵ء میں اس نے اپنی نظموں کا مجموعہ مرتب کیا جنمیں سے بعض نہایت طویل تھیں ۔ چونکہ عام رجحان سے مختلف تھیں ، اسلئے کوئی ناشر اس مجموعے کو طبع کرانے کیلئے کوشاں نہ ہوا ۔ بالآخر اس نے اپنا کل دیوان بہت قلیل رقم میں فروخت کر دیا ۔ مگر کتاب کا شائع ہونا تھا کہ تمام ملک میں اس کی شہرت ہوگئی اور اس شاعر نے غیر متوقع طور پر ناول ردیف ... کے کلام میں بلند تخیل اور خلوص جذبات کے ساتھ طرز بیان کی صفائی بھی درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہیں ۔ قدرت کی سحر کاریاں ، حسن و جمال کی دلفریبیاں اور عشق و محبت کا سوز و گداز ہر مصرعے میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے ۔ اس کے حسن بیان ... طلبا ان کے ... فریفتہ ہو گئے اور جلد ہی یہ شاعر جو کچھ عرصہ قبل گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا ... شاعری کا ایک درخشاں ستارہ بن گیا ۔ اس نے دو مجموعے بھی شائع کئے جن میں ... طرز کو فروغ دیا ۔ ... کے بہت سے ہمنوا بھی پیدا ہوئے ۔ معاصرین میں سب سے زیادہ شہرت بنکی کو ہوئی جس کا پہلا دیوان ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئے ۔ اس نے نثر میں بھی شاعرانہ حسن بیان پیدا کر دیا ۔ ۱۸۹۳ء میں باشو اور ۱۸۹۶ء میں بسن کے طرز بیان پر تبصرے شائع کیں ۔ وہ نظموں میں تخیل کی بلندی پرواز کے ساتھ مناظر قدرت کی لفظی تصویر پیش کرنے کا حامی تھا ۔ چنانچہ وہ اس عہد کا سب سے بڑا مصور فطرت سمجھا جاتا ہے ۔ اس کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی ، اسلئے بہت جلد ( ۱۹۰۲ء میں ) فوت ہو گیا ۔

اس بحر کی مثالیں طوالت کے خوف سے نظر انداز کی جاتی ہیں ۔

# نقد و نظر

## مکتبہ جامعہ اسلامیہ دہلی کی مطبوعات

مکتبہ جامعہ ایک ایسا ادارہ ہے جس نے اردو کی اشاعت کے سلسلہ میں ابتداہی سے ایک واضح نصب العین پر عمل کیا ہے۔ بچوں کے لئے مختلف طرح کی کتابیں شائع کرنا اس نصب العین کے اجزا میں سے ایک ضروری اور اہم جزو ہے۔ اردو میں اب سے چند برس پہلے تک اول تو بچوں کے لئے کسی خاص نظام کے ماتحت کتابیں شائع کرنے کی ضرورت کا احساس ہی نہیں تھا۔ . . . اور اگر کہیں کہیں یہ احساس تھا بھی تو صرف اس حد تک کہ کہانیوں کی چھوٹی چھوٹی سستی کتابیں شائع کر دی گئیں۔ یہی گویا قوم کی بہت بڑی خدمت تھی۔ لیکن حقیقت میں اس کام کو ایک اہم قومی خدمت سمجھ کر انجام دینے والے اداروں میں اگر مکتبہ جامعہ کی سب سے پہلی نہیں تو سب سے اونچی جگہ ضرور ہے۔ مکتبہ برابر ہر عمر کے بچوں کے لئے ان کی نفسیاتی اور ذہنی ضرورتوں کے مطابق صرف کہانیوں ہی کی نہیں بلکہ تاریخ، جغرافیہ، حساب، و نظموں کی کتابیں شائع کرتا ہے۔ پچھلے چند برسوں کے حوصلہ شکن حالات نے جہاں قومی زندگی کے دوسرے بڑے بڑے کاموں میں رخنے ڈالے وہاں کتابوں کی اشاعت کی رفتار بھی مایوس کن رہی۔ ہرچند کہ حالات ابھی ایسے کاموں کے لئے پوری طرح سازگار نہیں ہیں، مکتبہ نے تھوڑے ہی سے عرصہ میں اچھی اچھی کتابیں شائع کی ہیں۔ بڑوں کے لئے بھی اور چھوٹوں کے لئے بھی۔ اس وقت بچوں کی کوئی ۲۰-۲۱ کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں۔ ان میں کہانیاں بھی ہیں، ڈرامے بھی، نظمیں بھی اور تاریخ کی کتابیں بھی۔ اور یہ ساری کتابیں مختلف عمروں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

۔ بچوں کا قاعدہ ـــــ قیمت ۱۲ ار ۔ پہلی جماعت کا حساب۔ قیمت ۱۲ ار بچوں کو زبان اور حساب سکھانے کی ابتدائی منزلیں بڑی سخت ہوتی ہیں۔ ان منزلوں کو زمانہ برابر نئے ڈھنگوں سے طے کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اور برابر یہ احساس ذہن میں خلش پیدا کرتا رہا ہے کہ تجربہ نے ہر نئے ڈھنگ میں خسرانی کا کوئی نہ کوئی پہلو نمایاں کر دیا ہے۔ اور اس لئے ذہن انسانی ایک نیا طریقہ سوچتا ہے اور اس نئے طریقہ پر تجربہ کرتا ہے۔ یہ دونوں کتابیں بھی اسی طرح کے ایک نئے تجربے کی کوشش ہیں لیکن چونکہ کتاب کے مصنف بچوں کے ہر دلعزیز استاد عبدالغفار صاحب مدھولی ہیں اور اپنے ہر تجربہ کو جاں سوزی کی کسوٹی پر کس لینا ان کا معمول ہے اس لئے یقین ہے کہ یہ دونوں کتابیں زبان اور حساب سیکھنے اور سکھانے کے مشکل کام کو پہلے سے آسان کر دیں گی۔ دوسرا سٹ دس کہانیوں کا ہے۔ پہلے کہانیوں کے نام سن لیجئے۔ خرگوش کا ہونٹ، خربوزہ شہزادہ کا سر بن گیا، ایک کھوری تیل میں، راجہ جی جیل میں، چھوٹی ناگن، مزہ چکھا دیں گے، جنگل کا راجا، چوہوں کی کانفرنس، شہزادی کا غلام، جو نیبرد جو ہر خون نہ پیا ہو۔ شمتو کی عید۔ عنوانوں کو دیکھکر آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لکھنے والوں نے اپنے کام کی پہلی منزل کو بھی کتنی اہمیت دی ہے۔ یعنی عنوان میں کوئی نہ کوئی پہلو ایسا ہے جو چھوٹے پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے۔ ان دس کتابوں میں سے آخری تین ڈرامے ہیں اور باقی کتابوں میں سے ہر ایک میں یا ایک کہانی ہے یا دو تین۔ لیکن کہانیاں سب مزیدار ہیں، سبق آموز ہیں، بچوں کے ذہنی معیار کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ زبان بھی آسان، اور صاف ستھری ہے۔ کتابوں کا حجم کم سے کم چوبیس صفحے اور زیادہ سے زیادہ ۴۰-۵۰ صفحے اور قیمتیں ۵ ار اور آٹھ آنے کے درمیان ہیں۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے، سرورق رنگین اور سادگی کا مجموعہ ہیں اور بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہ کتابیں ۵-۶ برس کے بچوں سے لیکر ۹-۱۰ برس تک کے لئے بچوں کے لئے بہت اچھا تحفہ ہیں۔

تیسرا سٹ تاریخ کی کتابوں کا ہے۔ کتابوں کا نام ہے تاریخ ہند کی کہانیاں۔ پہلے حصہ کی کہانیاں ہندو عہد سے متعلق ہیں۔ دوسرے کی کہانیاں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لیکر اورنگ زیب کے عہد تک کی کہانیاں ہیں۔ تیسرے حصہ میں اورنگ زیب کے بعد سے ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک کی اور چوتھے میں ۱۹۴۲ء تک کی لڑائی کی داستانیں ہیں۔ یوں تو کتاب کے پہلے دونوں حصے بھی بہت اچھے ہیں اور چھوٹے بچوں کو بہت آسان زبان میں اور چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ذریعہ ہندوستان کی لمبی چوڑی تاریخ کے تسلسل اور اہمیت کا اندازہ دیا گیا ہے۔ لیکن تیسرا اور چوتھا حصہ اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس میں بچوں کی تاریخ کو ایک بلند قومی مقصد کے پیش نظر ایک بالکل نئے نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے اور تاریخ کو صرف سنوں، ناموں اور لڑائیوں کا ایک مجموعہ بنا دینے کے بجائے اسے ملک کی معاشی، ذہنی اور سیاسی حالت کا آئینہ بنا دیا گیا ہے۔ بچوں کے لئے تاریخ نگاری میں یہ کوشش اردو میں سب سے پہلی ہے اور اس نے مستحسن بھی کر اس نے طرح توڑ ڈالی ہے۔ پہلے حصہ کی قیمت ۸ ہے، تیسرے کی دس آنے اور چوتھے کی ۱۲ ار۔ دوسرے حصہ کی قیمت درج نہیں

و۔ ع

چار مجموعے نظموں کے ہیں:۔

(۱) کلیاں قیمت ۸ ار (۲) نئی نظمیں قیمت ۱۲ ار (۳) بچوں کے نغمے قیمت ۱۲ ار (۴) بچوں کے حالی قیمت ۸ ار۔ پہلا مجموعہ ایسی نظموں کا ہے جو خود بچوں کی لکھی ہوئی ہیں اور وقتاً فوقتاً پیام تعلیم میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس لئے نظموں کے موضوع سب کے سب بچوں کے من بھاتے ہیں۔ کچھ نظمیں کھیل کھلونوں پر ہیں، کچھ پرندوں سے متعلق کچھ مناظر فطرت سے اور کچھ زندگی کے عام مشاہدات پر۔ دوسرے مجموعے میں بچوں کے تین شاعروں یعنی سید یوسف ہمر، برکت علی فراق اور حسن عثمانی کی نظمیں ہیں۔ یہ چھوٹی بحروں میں لکھی ہوئی آسان اور رواں نظمیں ہیں تقریباً سب کی سب ایسے موضوعوں پر ہیں جن میں بچوں کو دلچسپی ہو۔

تیسری کتاب اردو کے مشہور ادیب اور بچوں کے مقبول شاعر حامد اللہ افسر

باقی صفحہ ۔۔۔ پر

## نقد و نظر

بقیہ صفحہ ٦٥

ایسی نظموں کا مجموعہ ہے جو خاص کر بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں اور بچوں کے اپنے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ مجموعہ میں کل ۴۰ نظمیں ہیں۔ ۱۸ سات برس تک کے بچوں کے لئے، باقی اس سے بڑے بچوں کے لئے۔ شروع میں ڈاکٹر نورالحسن (مرتب) کا ایک مختصر دیباچہ بھی شامل ہے۔ چوتھی کتاب سعید انصاری صاحب کی مرتب کی ہوئی ہے۔ مرتب صاحب نے حالی کے کلام کے ایسے حصے منتخب کرلئے ہیں جو بچوں کے کام کے ہیں یا خاص کر بچوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ نظموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مذہبی، اخلاقی، قومی اور فطری اور ان چاروں عنوانوں کے تحت حالی کی مثنویوں۔ قطعوں اور مسدس میں سے ایسے ٹکڑے نکال لئے گئے ہیں جو بجائے خود مکمل بھی ہیں اور ایک واضح مقصد اور تصویر بھی سامنے لے آتے ہیں۔ یہ انتخاب ذرا بڑے بچوں کے لئے ہے۔ اور اس لحاظ سے بے حد قابل قدر ہے کہ اردو کے اس عظیم المرتبت شاعر کے سات اہم حصوں تک بچوں کی رسائی ہو جاتی ہے۔

ان کہانیوں اور نظموں کے مجموعوں اور تاریخوں کے علاوہ مکتبہ نے حال ہی میں بچوں کے لئے ایک کتاب اور بھی شائع کی ہے۔ کتاب کا نام ہے آدمی کی کہانی۔ کتاب کے مصنف نے علم الانسان جیسے ٹھوس اور علمی موضوع کو بچوں کیلئے اس قدر آسان بنا کر لکھا ہے کہ ایک پیچ در پیچ اور الجھا ہوا موضوع بچوں کے لئے کہانی بن گیا ہے۔ کتاب میں جا بجا مناسب تصاویر بھی شامل ہیں۔ ان ساری خوبیوں کو دیکھتے ہوئے کتاب کی قیمت ایک روپیہ کم ہے۔

## آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

| | | |
|---|---|---|
| ۱- | تبرکات ........ | حضرت میر حسن دہلوی مرحوم ...... |
| ۲- | اقبال (معہ تصویر) ........ | جناب آغا حیدر حسن دہلوی ... |
| ۳- | اقبال اور انداز بیان ...... | نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی ... |
| ۴- | شہرت (روسی افسانہ) .... | جناب بشیر الدین ...... |
| ۵- | قطعات ........ | جناب سید رضا علی ...... |
| ۶- | غالب شفت پر آزاد کا قطعہ تاریخ .... | ڈاکٹر محمد باقر ...... |
| ۷- | چین کی کہانیاں ...... | جناب رتن لال کھنہ |
| ۸- | فرزانہ (ڈرامہ) (۱) ...... | جناب ادیس احمد ادیب ... |
| ۹- | دل تھا کہ نہیں (افسانہ) ... | جناب اشرف صبوحی دہلوی ... |
| ۱۰- | ترقی پسند ادب (۲) ...... | جناب معین احسن جذبی ..... |
| ۱۱- | منحوس ہیرا (خاکہ) ...... | اسٹینلے کلارک ...... |
| ۱۲- | غنی کاشمیری ...... | جناب پریم ناتھ پردیسی ..... |
| ۱۳- | دیوان حافظ کی فالیں .... | جناب ارجمند مسیح الزماں ادیب .. |
| ۱۴- | ۔۔۔کے اخبار ...... | محترمہ لیلا دتی ...... |
| ۱۵- | لذت خاموشی ...... | جناب اختر شیرانی ... |

مضامین دلی پرنٹنگ ورکس میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۲۶ سے شائع کیا

۱۵ / ۱ پریل ۱۹۴۷ء

# آجکل

اردو کا پندرہ روزہ باتصویر

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۲۲ | فہرست | ۱۵ اپریل ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے



مدیرِ اعلیٰ
سید وقار عظیم ایم اے

ناشر
فضلِ حق قریشی دہلوی

مدیران
بھگت سروپ کھلر ایم اے = سید آفاق حسین آفاق بی اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

# رفتارِ زمانہ

## ایشیائی تعلقات کی کانفرنس

آجکل کے ایک پچھلے شمارے میں ہم اس کانفرنس کی بابت مختصراً اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے۔ دہلی کے پرانے قلعہ میں جس کی شکستہ دیواریں اب بھی ہندو اور مسلمان شہنشاہوں کی عظمت و شان کی حامل ہیں، ۲۳ مارچ سے ۲ اپریل تک اس کے اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ دو ابتدائی اور ایک آخری یعنی کل تین دن عوام نے شرکت کی، ورنہ باقی دنوں میں صرف نمائندے اور سامعین شامل ہوئے۔ موضوعِ گفتگو کے اعتبار سے ان کے مختلف گروہ بنا دیئے گئے تھے۔ اس دوران میں تمام ایشیائی ملکوں کے ثقافتی اور تمدنی تعلقات پر ہر نمائندہ وفد اپنے خیالات ظاہر کرتا رہا۔ مولانا آزاد کے ایک بیان کے مطابق اس نوع کے اجلاس بودھی بھکشوؤں کے زیر اہتمام قدیم ہندوستان میں منعقد ہوا کرتے تھے لیکن عصرِ جدید میں یہ کانفرنس اپنی قسم کی پہلی مثال ہے۔ یہ کانفرنس "انڈین کونسل آف ورلڈ افیئرز" کے زیرِ ایوان عمل میں آئی ہے جو آج سے تین سال قبل قائم کی گئی تھی۔ شروع میں اس کے صرف ۱۶۴ رکن تھے۔ سر تیج بہادر سپرو نے سب سے پہلے صدر کے فرائض انجام دیئے۔ اب اس کے اراکین کی کل تعداد تقریباً ۵۰۰ ہے۔ یہ کانفرنس پہلا عملی قدم ہے جو کونسل نے اٹھایا ہے۔ اس موقعہ پر باہر سے آنے والے نمائندوں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:-

افغانستان:- ڈاکٹر عبدالمجید (قائدِ وفد) کابل یونیورسٹی میں سائنس اور حیاتیات کے پروفیسر ہیں۔ شعبۂ تعلیم میں بھی انہیں بڑا دخل رہا ہے۔ مسٹر سردو خاں گویا اعتمادی حکومت افغانستان کے محکمۂ مطبوعات کے مشیرِ خاص ہیں۔ مسٹر احمد علی کہزاد جو کچھ عرصے شاہ افغانستان کے پرائیویٹ سیکرٹری بھی رہ چکے ہیں، کابل کے عجائب گھر اور افغانستان کے محکمۂ آثاریات کے ڈائرکٹر ہیں۔ ڈاکٹر محمد انس خاں کابل کی وزارت تعلیم میں ڈائرکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہیں۔ مسٹر حکم چند افغان ٹریڈ ایجنسی کے ڈائرکٹر ہیں۔

ایران:- مسٹر علی اصغر حکمت (قائدِ وفد) شیراز کے رہنے والے اور فرانس کے تعلیم یافتہ ہیں۔ پانچ سال ایران کے وزیرِ تعلیم رہے پھر دو سال وزیرِ امورِ داخلہ اور ایک سال وزیرِ عدل رہے۔ اس وقت طہران یونیورسٹی میں تاریخ ادب کے پروفیسر ہیں۔ ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ شہزادی صفیہ فیروز ہوگکنگ میں پیدا ہوئیں اور یورپ میں ایک اطالوی خانقاہ میں تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے تمام دنیا، خصوصاً امریکہ اور یورپ کا سفر کیا ہے۔ ہندوستان بھی آئی ہیں۔ کئی علمی انجمنوں کی صدر رہیں۔ مسٹر غلام حسین صدیقی طہران یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ پہلے وزیرِ زراعت تھے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ جی رام وزارتِ مالیات کے ایک افسرِ اعلیٰ ہیں۔ مسٹر محمد تقی مقتدری بنک آف انڈسٹری کے قانونی مشیر اور "آئین" کے مالک و مہتمم ہیں۔ مسٹر مہدی بیانی طہران کے قومی کتب خانے کے ڈائرکٹر اور انڈو ایرانین سوسائٹی کے ناظم اعزازی ہیں۔

فلسطین:- ڈاکٹر ہیوگو برگمن (قائدِ وفد) پراگ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۰ء میں فلسطین پہنچے اور یروشلم کی یونیورسٹی لائبریری کے مہتمم ہو گئے۔ پھر عبرانی یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھانا شروع کیا۔ مسٹر بونے الفریڈ یروشلم کی یہودی ایجنسی میں اقتصادی تحقیقات کے ادارے کے ڈائرکٹر ہیں۔ اس موضوع پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر انا براج یا ہوروس میں پیدا ہوئیں، انگلستان میں طبی تعلیم پائی اور ۱۹۱۲ء میں فلسطین جا کر یہودی خواتین کی تحریک میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لینے لگیں۔ ڈاکٹر ایما نوئیل اولسوانگر پولینڈ میں پیدا ہوئے جرمنی میں تعلیم پائی۔ پھر فلسطین پہنچ گئے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ وہاں کی اسپرانٹو لیگ کے صدر ہیں۔ مسٹر بین زائن پان امریکہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں فلسطین آ گئے۔ اس وقت یہودی لیبر پارٹی کی نیشنل کونسل کے رکن ہیں۔ ڈاکٹر ڈیوڈ ہاسوہن ایک تجارتی ادارے کے ڈائرکٹر ہیں۔ حیفہ میونسپل کارپوریشن کے رکن بھی ہیں۔ مسٹر یعقوب شمونی برلن میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں فلسطین پہنچے۔ ایک سیاسی ادارے کے عملے میں شامل ہیں۔ مصری وفد کے قائد مسٹر مصطفیٰ مومن ہیں جو اعلیٰ ادبی قابلیت بھی رکھتے ہیں۔ انڈونیشیا کے کئی نمائندے بروقت آ گئے تھے مگر آخری نشست میں شرکت کرنے کیلئے ایک خاص ہوائی جہاز بھیج کر ڈاکٹر شہریار کو بھی مدعو کیا گیا اور وہ ۳۱ مارچ کو تشریف لے آئے۔

تمام نمائندوں نے دہلی کے تاریخی مقامات کی سیر کرنے کے علاوہ نمائندین شہر سے ملاقات کی اور مختلف اداروں میں جاکر ان کی عملی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جب محترمہ حیّا ادریسی جو مصر کی وفد کی ایک نمائندہ ہیں، ادارۂ "آجکل" میں تشریف لائیں اور انھیں "آجکل" کا تازہ شمارہ پیش کیا گیا تو یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ وہ اردو پڑھ سکتی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے "رفتارِ زمانہ" کا پہلا کالم پڑھ ڈالا۔

اس کانفرنس سے متعلق چند تصاویر اسی شمارے کے وسطی اوراق پر ملاحظہ کیجئے۔

## آنکھ کی پیشکش

حال ہی میں امریکہ کی ایک اندھی نوجوان لڑکی کو موسیقی کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں وظیفہ ملا ہے۔ اس لڑکی کی بابت جو ایک آنکھ سے نابینا ہے اور اس فنِ لطیف کا اچھا ذوق رکھتی ہے، قیاس لگایا گیا ہے کہ تھوڑے سے ریاض کے بعد وہ ایک بلند پایہ فنکار بن سکتی ہے۔ انہی دنوں امریکہ کی عدالت میں ایک بدمعاش کے خلاف کسی کی موٹر چرا لینے کے جرم میں مقدمہ چل رہا ہے۔ جب حراست میں رہنے والے اس چور نے اس لڑکی کا حال اور وظیفہ ملنے کی کیفیت اخبار میں پڑھی تو اس نے لڑکی کی ماں کو خط لکھا کہ اگر کوئی ڈاکٹر عملِ جراحی کے ذریعہ منتقل کر سکے تو میں اپنی ایک آنکھ تمہاری لڑکی کو پیش کر سکتا ہوں۔ اس جج نے جس کی عدالت میں چور پر مقدمہ چل رہا ہے اس عجیب و غریب پیشکش کو قابلِ قبول سمجھا ہے تاہم پورے وثوق کے ساتھ اپنی رائے دینے کے لئے وہ قانونی مطالعہ کرنے کی مدت تک اس معاملے کو ملتوی رکھنا چاہتا ہے۔ اسے شبہ ہے کہ ایک چور کی طرف سے ایسی پیشکش کہیں خلافِ قانون نہ ہو۔ ابتک شعر و شاعری کی دنیا میں محبوب کی خاطر آنکھوں کو فرشِ راہ بنتے تو سنا تھا لیکن عملی دنیا میں یہ اپنی قسم کی پہلی مثال ہے تاہم یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس قربانی کے پس منظر میں کوئی دلی جذبہ کارفرما ہے یا نہیں۔

## سمندر پار ملکوں سے

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں کے پاس جو کچھ اناج بچ رہتا ہے اس سے وہ ہندوستان کی مدد برابر کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اسکا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

| قسم اناج | ہفتہ مختتمہ ۷ مارچ | ہفتہ مختتمہ ۱۴ مارچ |
|---|---|---|
| گیہوں معہ آٹا | ۲۶,۸۰۰ ٹن | ۷,۰۰۰ ٹن |
| چاول | ——— | ۸,۳۰۰ " |
| مکئی | ۱,۰۰۰ " | ۳,۳۰۰ " |
| جوار باجرہ وغیرہ | ——— | ۳,۵۰۰ " |
| جَو | ۲,۴۰۰ " | ۴,۵۰۰ " |
| میلو | ۲۶,۸۰۰ " | ۸,۵۰۰ " |

## بالوں کی قیمت

۱۸۱۶ء میں فرانس کے فاتحِ اعظم نپولین بوناپارٹ نے اپنے ملک سے جلاوطن ہوکر جزیرہ سنت ہیلینا میں زندگی کے باقی دن گذارے تھے۔ انہی دنوں اس کے سر کے کٹے ہوئے بالوں کا ایک گچھا ایسے کاغذوں کے درمیان رکھا گیا جن پر خود نپولین کے ہاتھ کی ایک تحریر ثبت تھی۔ اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دنوں انگریزی ادب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ محض حسنِ اتفاق سے اب اس کاغذ میں رکھا ہوا بالوں کا گچھا ایک شخص کے ہاتھ لگ گیا جسے پیرس لاکر سرِ بازار نیلام کیا گیا تو آخری بولی سترہ ہزار فرانک تھی۔ اتنی گراں قیمت پر ایک معمولی چیز حاصل کرنے پر بھی خریدنے والا اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فرانس والے اپنے اس قومی ہیرو کی کتنی قدر و منزلت کرتے ہیں۔

## کشمیر میں "نئے آثارِ قدیمہ"

ریاست کشمیر کے شہر جموں سے چھیس میل کے فاصلے پر کوٹلی نام ایک گاؤں ہے جہاں ایک سادھو جی دھونی رمائے بیٹھے رہتے تھے۔ ایک روز ایک بندر نے ان کے سامنے درخت سے نیچے اتر کر زمین کے ایک حصے کو خاص انداز سے سونگھنا اور کریدنا شروع کر دیا۔ سادھو جی کو شبہ ہوا کہ یہاں ضرور کوئی چیز دفن ہے۔ اس لئے انہوں نے زمین کو دس فٹ کی گہرائی تک کھود ڈالا۔ اور ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی جب انہوں نے دیکھا کہ وہاں واقعی قدیم زمانے کا ایک سنگین فوارہ موجود ہے۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو خبر کی گئی اور انہوں نے اس جگہ باقاعدہ سائنٹفک تحقیقات شروع کر دیں۔ ان کا قیاس ہے کہ فوارہ حضرت مسیح سے قبل بنا کر اس جگہ رکھا گیا تھا۔ سادھو جی اسے بندر کی کرامات سمجھتے ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ فائدہ ضرور ہوا کہ نہایت پرانے زمانے کی ایک چیز سینۂ ارض سے برآمد ہو کر مورخین کے لئے موضوعِ فکر بن گئی۔

## چین کی خانہ جنگی

چین کی خانہ جنگی تک دونوں کے لئے جانی و مالی نقصانات روز بروز زیادہ نقصان دہ ہوتی جاری ہے۔ وہاں اس لڑائی کا سلسلہ گذشتہ تیرہ سال سے جاری ہے اور کسی طرح کم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اسی دوران میں چین کو جاپان سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا اور اسطرح اس کی طاقت دو مختلف محاذوں پر مختلف قسم کی لڑائیوں کے باعث گھٹتی رہی۔ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان یعنی دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے سے قبل جنرلیسمو چیانگ کائی شیک نے کمیونسٹوں کے استیصال کے لئے پے در پے پانچ دھاوے کئے جو انکی تدابیر کے مطابق انقطاعی ہو سکتے تھے لیکن نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہ ہو سکا تاہم اب چین کی قومی فوجوں کے ایک سالار جنرل چینگ چنگمن نے کومنتانگ کی مرکزی مجلس انتظامیہ کے روبرو تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ واقعات امید افزا ہو چلے ہیں۔ دوسری طرف کمیونسٹ پورے وثوق کے ساتھ دعویٰ کر رہے ہیں کہ جیت ہماری رہیگی اور اگر باہمی سمجھوتے کی کوئی صورت ممکن ہوئی تو وہ ہمارے حق میں زیادہ

مفید رہے گی۔ اسوقت ان کی جماعت چین کے چھ صوبوں پر چھائی ہوئی اور تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ حکومت چین کے اعلان سے معلوم ہوا ہے کہ اس سال کے جنگی مصارف مبلغ ۲،۸۱۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ چینی ڈالر رکھے گئے ہیں اور یہ رقم کل قومی بجٹ کے چالیس فیصدی حصے سے زیادہ ہے لیکن کمیونسٹوں کا کہنا ہے کہ یہ اعداد و شمار صرف کاغذی کارروائی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل خرچ اس سے کہیں زیادہ رہیگا۔ اس سے ان کے عزم و ارادے کا پتہ چلتا ہے۔ چین کے وزیر اطلاعات ڈاکٹر پینگ ہو سیہ چی نے چین کی کمیونسٹ جماعت کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے کہا کہ جب تک یہ لوگ ہتھیار نہ ڈالیں ان کی قانونی حیثیت تسلیم نہیں کی جائے گی۔

## انڈیا آفس لائبریری

جون ۱۹۴۸ء میں حکومت برطانیہ جب اپنے اختیارات ہندوستانیوں کو سونپ دیگی تو لندن میں انڈیا آفس بھی اصولاً بند کر دینا پڑے گا۔ ۱۸۰۱ء میں اس آفس کے ساتھ ساتھ ایک لائبریری بھی قائم کی گئی تھی جسکا مقصد یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی وساطت سے مشرقی علوم و فنون کے جو نوادر حاصل ہوں، وہ اس میں محفوظ کئے جا سکیں۔ لائبریری کا ایک حصہ عجائب گھر کی حیثیت رکھتا تھا۔ جسے ۱۸۵۸ء میں "ساؤتھ کنسنگٹن میوزیم" کے ساتھ ملا دیا گیا۔ لائبریری ہنوز موجود ہے اور اسوقت اس میں بیس ہزار قلمی نسخے اور دو لاکھ تیس ہزار کتابیں محفوظ ہیں۔ ہندوستانی بلکہ تمام مشرقی ثقافت کو بھی طرح سمجھنے کے لئے اس سے بہتر ذخیرہ کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آئندہ یہ لائبریری کس کی تحویل میں رہے گی۔ یعنی اسے بھی تفویض اختیارات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو دیدیا جائے گا یا نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر وہیں رکھا جائیگا۔ آنے والا زمانہ اس کے مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔

## بھوکوں کی بغاوت

جرمنی کے برطانوی علاقے سے ایک اخباری نامہ نگار نے اطلاع دی ہے کہ شہر ڈسلڈورف کے تقریباً تمام باشندوں نے جن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے، بھوک کی شدت سے تنگ آکر بغاوت شروع کر دی۔ گویا سقوط المانیہ کے بعد یہ پہلا زبردست ہنگامہ ہے جو سرزمین یورپ پر برپا ہوا۔ انہوں نے سب سے پہلے ایک فوجی موٹر کو جھیل میں دھکیلا، سرکاری عمارتوں پر پتھر برسائے اور پھر ایک باغ میں جمع ہو کر غم و غصہ کا اظہار کیا۔ اس موقعہ پر برطانوی سپاہیوں کو مجبوراً شہری نظام اپنے ہاتھوں میں لینا پڑا ورنہ اسوقت تک یہ کام خود اہل جرمنی کے سپرد تھا۔ ایک مبصر کا قیاس ہے کہ آئندہ وہاں اس سے بھی زیادہ ہنگامہ ممکن ہو سکتا ہے۔

## سردی، آندھی، بارش اور سیلاب

اس سال برطانیہ میں پے درپے کئی آسمانی بلائیں نازل ہوئیں۔ جیسا کہ ایک پچھلے شمارے میں کہا جا چکا ہے، وہاں سب سے پہلے اتنی شدید سردی پڑی کہ دریاؤں کا پانی بھی جم کر رہ گیا اور یہ مصیبت ایسے وقت میں آئی جبکہ حمل و نقل کی دشواری اور دوسرے اسباب کی بنا پر ایندھن نایاب ہو گیا تھا۔ چنانچہ محکمہ حفظان صحت کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ مارچ تک صرف پانچ ہفتے کے دوران میں گیارہ ہزار چار سو اکیاسی اشخاص سردی کے ہاتھوں مر گئے۔ صرف لندن میں مرنے والوں کی تعداد دو ہزار تین سو تھی۔ اسکے بعد شدید آندھی آئی اور بے پناہ بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہزاروں درخت جڑ سے اکھڑ گئے اور ان سے تین سو سڑکوں پر آمد و رفت ناممکن ہو گئی۔ کچھ بارش اور کچھ پگھلی ہوئی برف نے مل جل کر تیس چالیس علاقوں میں سیلاب عظیم برپا کر دیا۔ دریائے ٹیمز اور دوسرے دریاؤں میں پانی عام سطح سے سترہ اٹھارہ فٹ زیادہ اونچا ہو گیا۔ صرف ۱۹۲۸ء میں پانی کی سطح تیس فٹ اونچی ہوئی تھی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف دریائے ٹیمز سے روزانہ چودہ ارب گیلن پانی سمندر میں چلا جاتا تھا پھر بھی اس کی فراوانی اور روانی میں کئی دن تک کمی پیدا نہ ہو سکی۔ فوجی سپاہیوں کی بروقت مدد سے تقریباً تین ہزار گھرانوں کو لقمۂ اجل بننے سے بچایا گیا۔ پھر بھی بہت سے لوگ جن کی صحیح تعداد ابھی معلوم نہیں ہو سکی ہے، اسکی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ حیات انسانی کے اس نقصان عظیم کے ساتھ جسقدر مال و اسباب ضائع ہوا، اسکا صحیح اندازہ لگانا بھی مشکل ہے لیکن قیاس کہتا ہے کہ اس کے اعداد و شمار بھی کچھ کم ہولناک نہیں ہونگے۔

## سانحات ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ سنا گیا کہ ڈاکٹر عزیز الحق جو کچھ عرصے پہلے حکومت ہند کے وزیر تجارت تھے، ۲۲ مارچ کی شام کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم مشکل سے دو ہفتے بیمار رہے۔ ۱۹۴۳ء میں وہ ہندوستان کی طرف سے لندن میں ہائی کمشنر تھے اور اسکے بعد وائسرائے کی مجلس عاملہ میں شامل ہو گئے۔ لندن جانے سے قبل وہ بنگال میں وزیر تعلیم رہ چکے تھے۔ کچھ عرصے کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ ابھی پچھلے سال مسلم لیگ کے فیصلہ پر حکومت برطانیہ سے ملا ہوا "سر" کا خطاب بھی واپس کیا تھا۔

اور ایک ہفتہ بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ دوسری افسوسناک خبر ملی کہ محترمہ بیگم مولانا محمد علی جمعہ کی رات کو اس دار المحن سے رخصت ہو کر اپنے عزیز شوہر کی روح پاک سے جا ملیں۔ مرحومہ ان چند مسلم خواتین میں سے تھیں جن کی پرخلوص اور انتھک مساعی جمیل کو ملت اسلامیہ کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم کی زندگی میں وہ انکی دست راست تھیں اور انکی وفات کے بعد سے آخری لمحات تک جیسا کہ ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے وہ اپنے شوہر کے ہمنام اور ہم پلہ رہنما یعنی مسلمانان ہند کے قائد اعظم محمد علی جناح کی دست راست رہیں۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ ان دونوں بزرگ ہستیوں کو غریق رحمت کرے اور اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دے۔ آمین

ادارہ

# تبرکات

(غیر مطبوعہ) — میر حسن دہلوی (مرحوم)

جلوہ گر چہرہ ترا بالوں میں جو شب ہوگیا
مہ ترے مکھڑے کے آگے ماہِ نخشب ہوگیا

میں تو ساری رات کھٹکا پاؤں کا سنتا رہا
کیوں بہانا میرے سر رکھتا ہے تو کب ہوگیا؟

شعر لکھواتے تھے جب تک تب تلک آتے تھے وہ
اب بلا آوے انہوں کی اُن کا مطلب ہوگیا

عشق ہو تو ہو جوانی اور بڑھاپے میں نہو
اسپہ کیا موقوف ہے جب ہوگیا تب ہوگیا

آنکھ اُٹھا کر جس کو دیکھا اسکے دل کو لے لیا
لیتے لیتے دل کے لینے کا انھیں ڈھب ہوگیا

کیوں پریشاں اب رہوں زلفوں کے تیری دام میں
عشق کے فرمان سے جاگیر و منصب ہوگیا

شعر کہنا تو بہت مشکل ہے لیکن اے حسن
کہتے کہتے بات میں تیری مزا اب ہوگیا

مرسلہ عبد العلیم شیر کوٹی

# اقبال

آغا حیدر حسن مرزا

پہلے پہل میں نے چوتھی جماعت میں اقبال کی نظم "پرندے کی فریاد" پڑھی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ استادوں کے نام ہدایتیں آئی تھیں کہ نہ تو ان پڑھوائیں نہ لڑکوں کو مرغا بنائیں نہ اٹھک بیٹھک کرائیں اور نہ ان کی انگلیاں قلموں کے شکنجے میں کسی جائیں۔ نہ ان مروڑے جائیں نہ ہاتھوں پر بیتیں لگائی جائیں اور نہ آئے لئے باندھ کرائے ان پر انگوٹھوں کی مار پڑے۔ بلکہ بچوں کو کھیل کھلائے جائیں اور نظمیں حفظ کرا کر ان کو گوایا جائے۔ میری چھٹی میں آدھا پینیا سی تھی۔ میں نے پہلے پرندے کی فریاد حفظ کر کے اور گا کر سنائی۔ دوسری نظم بچے کی دعا تھی اور گائی۔ پہلی نظم کا میرے ننھے منے دل پر یہ اثر ہوا کہ لال چڑیاں بجے اور کبوتر پالنے کا خاندانی شوق تھا میں نے پنجروں کی کھڑکیاں کھول سب اڑا دئے۔ اور گملوں کی پتیاں اور پودے کھول ان کو بھی آزاد کیا اور ایسی اس فعل سے خوشی ہوئی کہ شاید کسی بادشاہ کو ایک آزاد کرنے سے نہ ہوئی۔ دوسری نظم جب میں نے نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر گا کے پڑھی تو میرے دل کی تمام مغلانیاں اور مامائیں جوق در جوق چٹ چٹ بلائیں لینے لگیں اور میری دادا سید نانا نے حبیث کا لاڈلا نہ مجھ پر سے اتارا۔ میں اپنے جی میں بڑا اترایا کہ آج بھی اس اترا ہٹ کا خیال آتا ہے تو دل کا کنول کھل جاتا ہے۔ ہاں یہ تو میں سے کہا ہی نہیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کس کی نظمیں ہیں۔ پہلی دفعہ مخزن میں انکا مرثیہ سسلی پڑھا اور معلوم ہوا کہ شیخ محمد اقبال کوئی پنجاب کے بیرسٹر ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے میرا گھرانہ زبان کے معاملے میں بڑا تنگ خیال اور کوتاہ نظر تھا۔ دلی میں لپٹے سے اچھی اردو کسی کی نہ سمجھتے اور دلی سے اچھی اردو کسی باہر والے کی نہ جانتے تھے مجھے اس مرثیہ کو پڑھکر شوق ہوا کہ بغداد کے بلبل شیراز کے ملنے سنوں اور یہاں آباد پر داغ کے خون میں آنسو بہیں۔ تلاش کرکے یہ چیزیں پڑھیں۔ اور اس طرح میری ادبی تحقیق کی ابتدا ہوئی۔ البتہ ان بدردوں سے جو خرابی ہوئی فریاد کی تھی۔ اس سے ابتک کان ناآشنا رہے آنکھیں محروم رہیں۔ نہ دل نے انہوں نے حضوروں کے لئے دعا مانگی تھی ویسی ہی قبولیت اس کو روزی ہوئی۔ زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری۔ ایسی گھڑی میں مانگی گئی کہ قبول ہوئی اور اب اسے شکر کے یوں گانے کو جی چاہتا ہے ؎

کہ مثال شمع گذری میری ساری زندگانی

ان کا کلام رسالوں میں شوق سے پڑھتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا۔ انگریزی پڑھے لکھوں کی ان کے کلام کے متعلق رائیں سنا کرتا۔ یہاں تک کہ علی گڈھ کی درسگاہ میں پہنچ گیا۔ وہاں خوش قسمتی سے لیے طالب علموں میں داخل ہوگیا جو علی گڈھ کے گرانڈیل سمجھے جاتے۔ ان میں ایک صاحب ملک غلام محمد تھے جو آجکل سر غلام محمد ہیں۔ ان کو اس زمانے میں سارے ہندوستان کے مشاہیر کے حالات از بر تھے۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح یہ رہنما تذکرے سیاسی، ادیب، شاعر، قومی شاعروں کی سوانح عمریاں موجود نہ تھیں۔ البتہ اخباروں اور رسالوں میں ان مشاہیر کے حالات لکھے جاتے۔ چونکہ یہ اخبار پابندی سے پڑھتے تھے۔ ان کو ان سب کے حالات خوب یاد تھے اور اپنی اس ہمہ دانی کا رعب ہم سب پر خوب جماتے۔ انہی حضرت کی بدولت اقبال بینی کے ذوق کی تربیت ہوئی۔ دلی میں اپنی تنگ خیالی کی وجہ سے الفاظ میں الجھ کر رہ جاتے۔ اب اقبال کے درخشاں تخیل کے راستے میں الفاظ اس طرح پس کر ذرہ ذرہ ہو جاتے کہ اپنی جگہ پر وہ بھی آفتاب بن کر چمکنے لگتے۔ پھر جب درسگاہ کی زندگی ختم ہوئی تو رات دن نواب مسعود جنگ مرحوم کے ساتھ رہنا ہوا انکو استادوں کے ہزاروں شعر یاد تھے۔ اقبال بھی ان کے دماغ میں محفوظ تھے۔ اور غریق رحمت کرے۔ جوش میں آکر خوب مزے سے سناتے تھے۔ ان کی وجہ سے شام کی نشست نواب سر حیدر نواز جنگ کے ہاں ہوگئی تھی وہاں اقبال مرحوم کا کلام مسعود مرحوم سنایا کرتے اور سب جھومتے۔ مسعود صاحب کمال کی قدردانی میں بہت فراخ حوصلہ تھے۔ انکی دلی خواہش تھی کہ سر محمد اقبال مرحوم کو عثمانیہ یونیورسٹی کی زینت بنائیں۔ مگر ان کا دانا پانی یہاں کا نہ تھا کیسے آتے۔ سر یمین السلطنت مرحوم سے خوب یاد اللہ تھی۔ لیکن یہاں کھینچا نہیں۔ سر اکبر حیدری نے مولوی عبدالحق صاحب کو سنا ہے بلانے کو بھیجا۔ وہ لاہور گئے۔ باتیں جانے کیا ہوئیں۔ یہاں کا پیام کس طرح دیا۔ اور وہاں کا جواب کن الفاظ میں لائے کہ اقبال تو یہاں نہ آئے۔ البتہ ہزار روپے ان کی پرورش کے خیال سے نواب صدر اعظم بہادر نے بھجوائے۔ روپے تو واپس آگئے لیکن سر اکبر حیدری مرحوم کا نام ارمغان حجاز کی بدولت شاعر کی غیر فانی دنیا میں غیر فانی ہوگیا۔ اسی ارمغان میں مسعود مرحوم کا بھی مرثیہ ہے۔ کلیجہ نکال کر رکھدیا ہے تو کیوں کہوں۔ محبت اور احسانمندی بھرے دماغ کو لفظوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ آپ میں سے بہت سے حضرات ایسے ہوں گے جنہوں نے حضرت اقبال کو دیکھا ہے اور دیکھنا کیا بعضے تو ایسے بھی ہوں گے جو مدتوں ان کے ساتھ رہے سہے ہوں گے۔ ان کے لئے میری باتیں ایسی ہی ہونگی کہ ننھی کے سامنے ننھیال کی باتیں کیونکہ رہنما سنانو کنجا یہاں ان کی صورت بھی نہ دیکھی۔ اکثر پڑھنے والوں کو مجھ سے توقع ہوگی کہ میں اپنی طرز کو سنبھالے، ان کا اصل نقشہ آپ کے سامنے لفظوں میں کھینچوں۔ اور لفظوں کے جادو سے زندہ کرکے آپ کے کانوں کی آنکھوں کے سامنے ان کو پیش کردوں۔ یہ مجھ سے ناممکن۔ ہاں سنیے۔ سنئے پہلی دفعہ ۱۹۱۳ء میں لاہور گیا۔ ایک دوست تھے۔ لاہور کے ہی رہنے والے حکیم احمد شجاع صاحب ان کو ملانا تھا۔ ایک منیجہ دو کالج

ہو جاتے۔ جو حضرت اقبالؒ سے بھی مل لیتا لیکن مجھے دوسروں کی بدولت اُن سے ملنا پسند نہ آیا۔ پھر سنہ ۱۹۳۰ء میں کشمیر جاتے ہوئے لاہور رستے میں پڑا۔ لاہور کی سیر اُترا کشمیر کے طفیل اور حضرت اقبال کی زیارت جی نے مکروہ جانا اور یہ ارادہ کیا کہ حیدرآباد سے دلّی تک ریل میں جاؤں۔ اور دلّی سے پیدل ہو کر زیارت کی نیت باندھ کر پاؤں پاؤں چلتا ہوا لاہور پہنچوں۔ ان کی چوکھٹ پر بیٹھ کر ذرا سانس کو قابو کروں۔ اندر ادب سے داخل ہوں، ان کے ہاتھ چوموں، اور اپنے ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہو جاؤں۔ پوچھیں کون ہے۔ عرض کروں۔ جاہل زائر۔ فرمائیں کیوں آیا۔ عرض کروں، زیارت کے لئے۔ وہ کہیں کیوں دیکھ لیا؟ اور میں الٹے قدموں واپس ہو کر دکھن چلا آؤں۔ زبان کو کوکولے لگ جائے۔ اور چپ لگ جائے۔ دل و دماغ باتیں کریں فیصلہ یہ ہو کہ ایک بار دیکھا۔ دوسری بار کی ہوس ہے۔ نہ دیکھا، نہ آرزو پوری ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں پھر کشمیر کی ٹھانی اور لاہور اُترنا ہوا۔ اب کی دفعہ جناب عبداللہ چغتائی صاحب سمجھا کر گھسیٹ کر ان کی گلی تک لے گئے۔ گلی کے دونوں طرف کچے کھنڈر تھے۔ سامنے چوپٹ پل پایوں کا پھاٹک کھلا تھا۔ بن چمن کی انگنائی۔ اس کے بعد ایک برآمدہ، اس میں ایک چارپائی بچھی۔ پاس ایک پنجابی حقہ رکھا۔ مونڈھوں، کرسیوں پر کچھ آدمی بیٹھے۔ ایک صاحب تکیوں کا ٹیکا لئے آدھے لیٹے۔ چار خانے کا چادرا پڑا۔ صورت دیکھی ہو تو اللہ وہاں دیدار نہ دکھائے۔ ایک دم اپنی بے ادبی کا احساس ہوا اور وہیں سے بندہ فوراً واپس۔ بہتیرا ساتھیوں نے روکا سمجھایا لیکن کشمیر کے طفیل اور حضرت اقبال کی آستان بوسی ایمان نے نہ مانا۔ اور چلا آیا۔ اس کے بعد وہ حیدرآباد تشریف لائے۔ بگر گھر کہوں یا ایوان مدینہ۔ آپ نے تو ٹون ہال سنا ہوگا۔ بس وہیں جلسہ ہوا۔ سر یمین السلطنت مرحوم کے ہاں مشاعرہ ہوا۔ گھر میں چھپا بیٹھا رہا۔ لیکن سُنا کہ سب کی بولیاں سُنا گئے۔ اور چپ بیٹھے رہے جن صاحب سے یہ روایت سُنی البتہ ان کے ایک شعر پر فرمایا۔ پھر پڑھئے۔ ان ہی صاحب کا بیان ہے کہ انداز ایسا پُر معنی تھا کہ وہ نہ سمجھ سکے کہ غلطی پر ٹوکے گئے ہیں یا تعریف ہے۔ میں نے اس دفعہ بھی کسی جلسے میں جانے کی کوشش نہ کی۔ پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس آ جائے تو سب کو اچنبھا ہو جائے اس لئے گھر ہی سے نہ نکلا۔ اس جذبے کو تقویت شریمتی پدمجا دیوی نے اور دی۔ کہا نہ تم صورت دیکھو نہ تم پڑھتے سنو۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے۔ یہاں جلہ شری تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ یہ رائے اور ہاتھ آئی۔ پھر دیکھنا اور سننا ہی نصیب نہ ہوا۔ آج دنیا کے ایسی شاعر کا دیکھا ہے اور آپ میرے تاثرات جو ان کے متعلق ہیں، ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں سن رہے ہیں۔ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اپنی عقل اور دوسرے کی دولت زیادہ سمجھتا ہے۔ الحمدللہ۔ اس کمزوری سے نجات ملی اور حضرت اقبال کی عقل نے محسوس کرا دیا کہ اپنے پلے کچھ نہیں۔ عاقل بننے کا شوق ہے۔ سات خزانے عقل

کے تین خزانے اسرار خودی۔ رموز بیخودی۔ پیام مشرق اور جاوید نامہ۔ انکی قفل کنجیاں ایرانی اور تین خزانے بانگ درا۔ بال جبریل۔ ضرب کلیم کی ہندوستانی۔ باقی رہا ایک خزانہ ارمغان حجاز۔ اسکا قفل ایسا جس کو دونوں کنجیاں کھول سکتی ہیں۔ جتنا جسکا بل بوتہ ہے۔ اتنا مال اپنی بساط کے موافق لے جائے۔ اقلیم خاموشاں دماغ کے خزانے ہی میں بند رکھی کہ رسا لسنا تو کیا ادھر کی سیر بھی نصیب نہ ہوئی۔ آدمی اپنی بُری بھلی صورتیں بھی ایسے پہلو نکال لیتا ہے کہ اچھے اچھے حسینوں کو جاننے کا منہ ہو جائے۔ اور ایسے بھی مائی کے لال ہوتے ہیں جو اپنے کو حسین اور طرحدار سمجھتے ہیں۔ میرے دل کی آنکھوں نے حضرت اقبال کا وہ حسن اور طرحداری دکھائی کہ رقابت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کو عام کر دوں۔ ان کی تراش خراش۔ وضع۔ قطع۔ خد و خال۔ بول چال اور لباس میرے دھیان میں ایسے بسے ہوئے ہیں جو مجھے پسند ہیں۔ چاہے وہ خود حضرت اقبال کو پسند نہ ہوں۔ اس لئے میں نے ان کی صورت کو راز رکھا اور آپ صاحبوں پر ظاہر نہ کیا۔ آپ نے تو کتابوں میں بھی پڑھا ہوگا۔ یا دوستوں سے سُنا ہوگا کہ وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ کشمیری اصل کے تھے۔ لاہور میں ایک کوٹھی بنالی تھی۔ اور اس اینٹ چونے کے مکان میں رہتے تھے تو یہ سمجھئے اور دوست سمجھئے کہ ایک عالیشان محل ساری شاعری کی بنا پر پھیلا ہوا ہے۔ حضرت شاہجہاںؒ نے جب لال حویلی تعمیر کرانی شروع کی تو اس کی تکمیل ہونے تک اپنے ٹھہرنے کے لئے مٹیا محل بنوا لیا تھا۔ اسی طرح حضرت اقبالؒ نے جب اپنا قصر شاعری تعمیر کرنا شروع کیا تو اپنے ٹھہرنے کے لئے پہلے ہمالیہ کی دیواریں اٹھائیں۔ سوامی رام تیرتھ، سری رامچندر جی اور گورو نانک صاحب کو پاس بٹھایا۔ سامنے ہندی بچے حضرت اقبال کی تعلیم کی ہوئی دعائیں مانگتے اور ننھی منی سی فوج بنا کر کھیلتے۔ تو حضرت اقبال ہی کا سکھایا ہوا ترانہ گاتے ہوئے فوجی کرتب دکھا کر جی خوش کرتے۔ ان کو مکڑی اور مکھی دکھا کر حزم و احتیاط کا سبق دیا۔ پہلے بادشاہوں کے زمانے میں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ یہاں اس کی ضرورت بھی کر گئے بکری سا تو چریں اور تبادلہ خیال کریں اور یہ رنڈرونا چھوڑ دیں۔ عبادت کے لئے نیا شوالہ تعمیر کر دیا۔ پھر اس محل نے وہ وسعت اختیار کی کہ دنیا کا چپہ چپہ اس کی رتن جڑاؤ چھت کے نیچے آ گیا اور جوں جوں چھتے ہٹے وہ محل کے بائیں باغ کا کام دینے لگے۔ اس محل میں مذہب، ملت، رنگ، روغن کی قید نہیں، یہاں خودی ہمہ ہی نہیں بلکہ خودداری اور مکمل انسانیت ہے۔ انقلاب گویا بازاری نہیں کہ کسی کو اچھی سواری میں دیکھا تو جل گئے۔ کسی کو اچھا پہنتے اور کھاتے پیتے دیکھا کہ بھن گئے کہ تو کون ہو کے نے چولھے میں جھونکو۔ آپ کا نرم ہوں تو بلا سے محلے والے تو اندھے ہو جائیں۔ ظالم خدا ترس ہو جائیں۔ انقلاب ایسا ہو کہ گندی کایا پلٹ جائے۔ بدخواہ بہی خواہ ہو جائیں۔ ظالم خدا ترس ہو جائیں

بے فیض، دولتمند با فیض ہو جائیں اور نکمے مفت خورے مفلس قلاش (قلاش) محنتی کماؤ اور زردار بن جائیں۔ ہر ایک کی اپنی برائی بدل کر اچھائی صحیح معنوں میں ہو جائے۔ اس محل میں بار عام ہے۔ ظالموں بدمست، عیش پرستوں اور کاہلوں کو بار نہیں۔ ان کے لئے بھی دروازے تو کھلے ہیں لیکن خود ان کے دل اندر آنے کو نہیں چلتے۔ کیونکہ اپنی ہی غفلت کاہلی اور پندار کے پردے پڑے ہیں۔ وہی حجاب حائل ہے اور اپنی کمزوریاں ہی حاجب ہیں۔ اس محل میں نہ سازشیں ہیں نہ جوڑ توڑ۔ نہ خون آشامی۔ نہ کمزوروں کو ملنا دلنا۔ جیو اور جینے دو۔ نیکی سے کام کئے جاؤ۔ دھوکا دو نہ دھوکا کھاؤ۔ کمانے کو لال منہ والا نہ کھائے اور نہ کلموہے کو زر دآزار ستائے۔ اللہ کے بندے۔ اللہ کی زمین۔ بولیں بسیں اسے یاد کریں۔ رام کی چڑیاں رام کا کھیت۔ آؤری چڑیوں کھاؤری کھیت کہ اگر زید نہ دیں تو غلہ مارکے اڑا کر بھی پاپ نہ لیں۔ بلونت کمزوروں کے منہ کا ٹکرا چھین کر جینا نہ بنے۔ طاقت پیدا کریں اور قوی ہو کر اپنا بچاؤ کریں۔ اصل قوت ملاپ ہی میں ہے۔ نفاق کا نام کمزوری ہے۔ کمزور بھلا عمل کے میدان میں کیوں اترنے چلا جسم کے ساتھ روح کی بھی ترقی ہو۔ قیمتی برتن اور لذیذ کھانا مٹی کے ڈھوبرے میں کندن ملیے کو کس کا جی چاہیگا۔ اور زمردین تھالی جڑاؤ کٹورے میں نمک پانی کوئی کیوں پیئے گا۔ ظرف مظروف کی شان ایک ہو تو لطف ہے۔ مزا ہے۔ جسم سکھا کر روح بڑھائی تو کیا پھل پایا۔ اور روح مردار کرکے جسم پالا تو دنیا ہی کو حلال کیا۔ یہاں دین دنیا دونوں کو ساتھ رکھ کر اور آنکھیں کھول کر کام کرنے کے آداب سکھائے گئے ہیں۔ جتنا جو بچا سکتا ہے اتنا ہی اس کو دیا گیا ہے۔ اگر اچھے اوتار ختم نہ ہوئے ہوتے تو لوگ اقبال کو اوتار مان لیتے اور ختم نبوت پر ایمان نہ ہوتا تو کون ابوجہل ہے جو ان کی آواز سنکر صدقنا نہ کہتا۔ ان کا ظرف ایسا کہ دوسروں کی خودی کو ابھارتے رہے اور راستے سیدھے اور سہل سہل ترکیبیں اس کے حصول کی بتایا کئے لیکن کبھی جھوٹے منہ بھی خدائی کا دعویٰ نہ کیا۔ بلکہ یہاں تک احتیاط برتی کہ جواب شکوہ میں بتا دیا کہ اللہ میاں جواب نہیں دے رہے۔ کیونکہ نہ تو وحی آئی اور جو آتی تو نبوت کا اعلان کر دیتے۔ لیکن ایمان سلامت تھا۔ نبوت ختم ہوئی۔ عقیدتمند خدا نہ بنا دیں۔ اس لئے شکوہ کے مقابلے میں جواب شکوہ کچھ یونہی سا رہا۔ شکوہ میں بھرے ہوئے انسان کی گلہ گزاری کا پورا حق ادا ہوگیا۔ اس زور شور اور جوش و خروش کا جواب تو اللہ میاں ہی دیتے تو دیتے۔ اگر اقبال وہی زور جواب میں دکھا دیتے تو شرک عائد آتا۔ اس لئے اجتناب کیا۔ جوں جوں انسان اقبال کی سیر کریں گے۔ ان پر روز نئے نئے اسرار آشکارا ہوتے جائینگے۔ اللہ حافظ اقبالمندوں کا ٭



نظم

# لذتِ خاموش

(سانیٹ)

شامِ گلشن پہ بہاروں کے سمے لہرائے!
نگہِ شوق نے شاداب نظارے دیکھے!
شفق و نور کے دریا کے کنارے دیکھے!
جگمگاتے ہوئے تاروں کے سمے لہرائے!

کون آیا مرے سینے میں یہ مخمورِ جمال؟
کس کی آواز سے سرشار ہے دنیائے شباب؟
کس کی آنکھوں میں چھلکتی ہے یہ صہبائے شباب؟
بزمِ کونین ہوئی جاتی ہے مسحورِ جمال!

چار سو رقص کناں زمزمہ زاروں کا سماں!
محفلِ دہر پہ عشرت کا سماں طاری ہے!
ذرے ذرے پہ کوئی حسنِ جواں طاری ہے!
دلِ آفاق پہ چھایا ہے بہاروں کا سماں!

ایسے عالم میں ہوں دنیا کا مجھے ہوش نہیں!
زندگی، لذتِ خاموش ہے، خاموش نہیں!

اختر شیرانی

# اقبال اور انداز بیان

اثر لکھنوی

ادبی اصطلاح میں اسٹائل، طرز، اسلوب یا انداز بیان زبان کے ان خصوصیات کا مطالعہ ہے جن کی جھلکیاں کسی تحریر میں نظر آتی ہیں۔ جب تک ادب میں یہ زاویہ نگاہ نہ ہو، اس کی نزاکتوں اور لطافتوں تک رسائی اور قدر و قیمت کا تعین دشوار ہے۔ اسٹائل کا مادہ یونانی لفظ (STILUS) ہے نہ کہ (STYLUS) جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے) یہ ایک نوکدار آلہ کسی دھات، لکڑی، یا ہاتھی دانت کا ہوتا تھا جس کے ذریعے قدیم یونان میں موم کی لوحوں پر حروف اور الفاظ کندہ کئے جاتے تھے[۵]۔ امتداد زمانہ سے وہ آلہ جس سے نقش بٹھایا جاتا تھا خود ان نقوش یعنی جملوں یا عبارت کا مفہوم ادا کرنے کو استعمال ہونے لگا اور ایک عمل جو ابتداءً میکانکی تھا رفتہ رفتہ ذہنی یا تصوراتی بن گیا۔ یہ نقوش یا تو اجاگر ہوتے ہیں، یا دھندلے اور ناہموار جنھیں بعد کو اسٹائلس کے دوسرے کند سرے سے سدھارا جاتا تھا۔ ادب میں یہی کانٹ چھانٹ، دماغ سوزی اور باریک بینی خود ادیب کی اپنی ذات کی پرکھ بن جاتی ہے۔ وہ اپنا جائزہ لیتا اور غور کرتا ہے کہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ سکا اور حقیقت کا جو نقش اس کے دل پر مرتسم تھا، تحریر میں بلا کم و کاست منتقل ہو گیا کہ نہیں۔ اسی دیدہ ریزی پر کسی پارۂ ادب کی خوبیوں اور نوک پلک سے درست ہونے کا دار و مدار ہوتا ہے۔ ایک ذی ہوش، خود نگر، حقیقت آشنا اور محتاط مصنف کی ذہنی صناعت کے نقوش نہ صرف صاف اور گہرے ہوتے ہیں بلکہ ان میں ایک انفرادیت اور انوکھاپن ہوتا ہے۔ وہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ اس کا تخلیقی کارنامہ کسی پہلو سے بھی ناقص یا نامکمل رہے۔ وہ اسے بار بار پڑھتا اور جانچتا ہے اور چین نہیں لیتا جب تک مرضی کے موافق خراد پر نہ چڑھ جائے۔ اس کے برعکس ایک سہل انگار مصنف کے نقوش بھدے، کھردرے اور غیر منظم ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو ان کو جلا دینے میں جان کھپاتا ہے نہ کھردراپن دور کرنے کی پروا کرتا ہے بقول شخصے "کانا اور دو رتی"۔ اسٹائل کا یہی اختلاف جو مصنفوں کے مزاج کا آئینہ ہوتا ہے ان کی شخصیت کو نمودار کرتا ہے۔ اور مستحق ستائش یا سزاوار نکوہش بنا دیتا ہے۔ اسی بات کو مجملاً یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسٹائل مصنف کے گھر کا بھیدی ہوتا ہے یا بوفان کے الفاظ میں (بادنیٰ تغیر) اسٹائل ہی مصنف ہے۔

ایک عربی حکایت ہے کہ ایک روز حضرت سلیمان نے ایک جن سے پوچھا کہ زبان (تقریر) کسے کہتے ہیں۔ یہ جن بڑا پڑھا جن تھا، اس نے جواب دیا "ہوا کا ایک گزرتا ہوا جھونکا"۔ حضرت سلیمان نے دوبارہ استفسار کیا کہ اس ہوا کے جھونکے کو کسی طرح قید بھی کر سکتے ہیں، عرض کی صرف ایک ہی مرکب ہے اور وہ فن تحریر ہے۔ شاید ہمارا محاورہ "پڑھا جن" اسی روایت سے نکلا ہے کہ جو شخص چالاک اور چلتا ہوا ہوتا ہے اور جس پر کوئی افسون کارگر نہیں ہوتا، اسے پڑھا جن کہتے ہیں۔ خیر یہ جملۂ معترضہ تھا۔

اچھے اسٹائل میں مصنف کا علاوہ ذہن ہمارے حواسوں کو متاثر کرتا اور اپنا پرتو ڈالتا ہے گویا اس کے جملے اس کا دھڑکتا دل یا اس کی روح کے خط و خال ہیں۔

اردو کے شاعروں میں سب سے پہلے میرؔ نے طرز کو اہمیت دی اور سختی سے کاربند رہا بعدازاں دوسروں نے تتبع کیا، ورنہ اس سے پیشتر ایہام گوئی کا رواج تھا۔

یہ سچ ہے کہ شاعری میں معنویت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ طرز یا اسٹائل ہی کی دلکشی اور حسن آفرینی ہے جو شاہد معنی کے رخسار کا غازہ اور عروس سخن کا زیور بنکر اس کی رعنائیوں کو دوبالا کر دیتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ اس تزئین کے لئے بڑا سلیقہ درکار ہے۔ اگر غازہ زیادہ تھوپ دیا یا زیورات نفیس اور نازک نہ ہوئے تو حسن معنی اپنا فروغ دکھلانے کے بدلے اور چھپ جائے گا یا دب جائے گا۔ اور اس نئی نویلی دلہن پر دھوکا ہوگا کہ "عجوزۂ ہزار داماد" ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ تخیل و معانی کا اتھلاپن یا افلاس ڈھانپنے کو لیپ پوت کی جاتی ہے مگر نظر باز فوراً تاڑ جاتے ہیں۔

اسٹائل کے مفہوم و مقصد پر روشنی ڈالنے کو شاید اتنا ہی لکھنا کافی ہوگا۔ آئیے اب اقبال کے نگار خانوں میں گلچینی جال کریں۔ لیکن یہ عرض کر دوں کہ اس کے لئے بہت وقت درکار ہے اور میں ان کثیر شاخوں میں سے بھی جن میں خیال کی بلندی اور اسلوب کا بانکپن بیک وقت اور دوش بدوش جلوہ گر ہیں صرف معدودے چند شاخوں پر اکتفا کروں گا، ورنہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے ہر شعر میں اس کی انفرادیت پسند طبیعت اور دقت نظر کا انعکاس ہے، دل کی دھڑکنیں مقید ہیں۔

غالباً میرا یہ قیاس غلط نہیں کہ پنجاب سے باہر اقبال کو جس شعر نے روشناس کرایا اور اعتراضوں کی بوچھار کے باوصف ان کی جلالت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھا کر ان کی شہرت کا دائرہ وسیع کر دیا یہ مشہور مطلع ہے ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اعتراضات کی تفصیل یا رد و قبول کا موقع نہیں مگر تاریخ اس کی شاہد ہے، کہ مذہبی ارتقا کی ہر منزل میں بلا کسی استثناء کے انسان کا جذبۂ عبودیت و پرستش خدا کو مادی یا مجازی لباس میں دیکھنے کا

---

[۵]۔ عربی لفظ طرز یا طراز بالکل اسی مفہوم کا حامل ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ طراز کے اصلی معنی کپڑے پر بیل بوٹے بنانے کے ہیں نقش کا تصور علیٰ حالہ قائم ہے۔

متمنی رہا ہے۔ اس جذبے کی شدت اور آفاقیت کا یہ حال ہے کہ تلقے کی بنجر زمین میں بھی ایک قلم لگا دی جسے (ANTHROPOMORPHISM) کہتے ہیں۔ یعنی خدا کی طرف انسانی صفات کا منسوب کرنا۔ حضرت موسیٰ کا سوال "ارنی" اسی دل کی پکار ہے۔ منصور کا نعرۂ "انا الحق" اسی کی گونج ہے قیس کا نعرہ "انا لیلیٰ" اسی کا ارتعاش ہے۔ یہی اقلیم تصوف میں مذہب کے باطن یعنی عشق کی سرکردگی میں مسئلہ ہمہ اوست یا ہمہ از دوست بن گیا جس کا عطر میر کے اس شعر میں ہے ؎

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر ⁂ میں ورنہ وہی خلوتیٔ رازِ نہاں ہوں

بعد ازاں تصوف کی راہ سے شاعری میں داخل ہو کر تو عجیب عجیب گل کھلائے اور انوپ روپ دکھائے۔ شاید ہی فارسی یا اردو کا کوئی شاعر ہو جس نے اس راگ کو کسی نہ کسی لے میں نہ الاپا ہو، آخر کا انداز تو ایسا والہانہ ہے کہ تصوف و معرفت کی خشک اصطلاحیں نغمۂ موزوں کے قالب میں ڈھل کر "بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست" کی مصداق ہو گئیں۔ حکایت لذیذ ہے مگر اس مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اقبال کا زیر بحث مطلع اپنی تخئیل کے لیے ملٹن کا دست نگر ہے۔ بالفرض ایسا ہو بھی تو اقبال کی منقصت نہیں ہوتی۔ اگر ترجمہ اتنا عمدہ ہے کہ مترجم کی زبان کا شاہکار بن جائے تو لائق آفرین ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر اعتراض کو تسلیم کرتے ہوئے بھی انداز بیان کی ندرت نے اس مطلع کو رشک آفتاب عالمتاب بنا دیا اور لافانیت کا تاج پہنا دیا ہے۔ اور یہ سب کرشمہ ہے پہلے مصرع میں "حقیقتِ منتظر" اور دوسرے میں "ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں" کا۔ اقبال کے بعد نہ معلوم کتنے شاعروں نے سجدوں کو ایک ایک جبیں میں تڑپایا۔ مگر بجز داغ ندامت کچھ حاصل نہ ہوا۔ رعنائی خیال کا الفاظ میں منتقل ہو جانا اور کچھ ہے۔ مگر بے جان الفاظ سے خیال کی صورتگری کی امید بانجھ ہواؤں سے گلباری کی توقع رکھنا ہے۔ اس مطلع کی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اسی طرح میں نہ معلوم کتنے مشاعرے ہو گئے اور نہ معلوم کتنے شاعروں نے مشاعروں سے الگ طبع آزمائی کی۔ اب اقبال کا یہ شعر لیجئے ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل ⁂ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اس میں خیال اور انداز بیان دونوں اچھوتے ہیں کیونکہ جہاں تک مجھے علم ہے۔ اقبال سے پیشتر اگر ایک فریق وجدان کو عقل کے علی الرغم سب کچھ سمجھتا تھا تو دوسرا عقل کو۔ اقبال نے دونوں کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے امتیاز کا معیار قائم کیا، دونوں کے مدارج مقرر کر دیئے۔ اگر ایک طرف عقل کے تجربات اور مشاہدات کو سراہا تو دوسری طرف ان کی صحت جانچنے کو وجدان کی رہبری بھی ضروری سمجھی۔ وجدان براہ راست اکتساب فیض کرتا ہے اس سے بھی کام لینا چاہیئے اور عقل و استدلال کا غلام بنانے کے بجائے کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دینا چاہیئے تاکہ وجدانی محرکات کی روشنی میں فرمودات عقل کی اصلاح ہوتی رہے۔ ایسے دو شیر پہلے ساتھ ہی ساتھ نہ تو عقل رہے نہ وجدان۔

دونوں قوتیں انسان میں ودیعت ہیں اور دونوں برسرکار ہیں کیونکہ کسی قوت کے تعطل کا دوسرا نام موت ہے۔ اور یہ توزع معانی جس کو میں نے مختصر اور ناتمام طور پر بیان کیا معجزہ ہے "عقل کو پاسباں" کہنے کا!

بانگ درا کی پوری نظم جس کا عنوان "محبت" ہے حسن کلام وجدت ادا کا خوش کار مرقع ہے، یہ نظم آپ حضرات نے بتکرار پڑھی ہو گی اور ممکن ہے کہ ازبر ہو لیکن اس میں وہ لذت اور کشش ہے جو تشنگی کی حالت میں بھی خمار سے آشنا نہیں ہوتا لہذا بغیر مزید معذرت کے حاضر ہے:-

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
قمر اپنے لباس نو میں بیگانہ سا لگتا تھا[1]
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئین مسلم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے
کمال نظم ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشم خاتم سے
سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیاگر تھا
صفا تھی جس کی خاک پا میں بڑھ کر ساغر جم سے
لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشم روح آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسم اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی بر آئی آخر سعیٔ پیہم سے
پھرایا فکر اجزا نے اسے میدان امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہ حق کے محرم سے
چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے مسیح ابن مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

---

[1] "کاش 'بیگانہ سا لگتا تھا' کی جگہ کچھ اور ہوتا۔ یہ ٹکڑا اشعار کی غدودیت؟ خون کئے دیتا ہے۔ کم سے کم میرا ذوق یہی کہتا ہے۔

ہوس نے یہ پائی ہستیٔ نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں، ذرّوں نے لطفِ خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اقبال کے کلام میں تخیّل و طرزِ ادا کا بے مثل امتزاج ہے۔ اگر تخیّل بلند ہے تو انداز بیان بھی منتہم بالشان ہے۔ اگر خیال سطحی اور ہلکا پھلکا ہے۔ مثلاً وہ نظمیں جو بچوں کے لئے کہی گئیں یا وہ غزل جو داغ کے رنگ میں ہے (نہ آتے ہمیں، اس میں تکرار کیا تھی) وہاں انداز بیان بھی سیدھا سادہ ہے اور یہ ان کے فلسفیانہ دماغ کی ہمہ گیر قوت کا جو حسب منشا سادہ یا رنگین و پرکار ہوسکتی تھی، بیّن ثبوت ہے۔

سوامی رام تیرتھ پر جو نظم ہے اسکا پہلا ہی شعر اس کی زندگی کے حالات اور ڈوبنے کے واقعات پر محیط ہے اور یہ صرف لفظ "ہم بغل" کی طرفہ کاری ہے سے

ہم بغل دریا سے ہو اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہرِ نایاب تو

یا ستارۂ صبح کو "جبینِ سحر کا زیور" کہنا حسن سے کسقدر لبریز ہے۔ تصریع میں طوالت ہے اور یہ طرزِ انتقاد آجکل پسند بھی نہیں کیا جاتا گو میں اسی کا خوگر بلکہ شیشہ بندی بول چال میں گڑیا ہوں میرے ذوق کی تسکین نہیں ہوتی جب تک اچھا شعر پڑھکر یا سن کر اس کی خوبیوں کا احصا نہیں کرلیتا، جب تک پری شیشے میں نہ اتاروں قرار نہیں آتا اور اگر مجھے اپنی عمر سے ناجائز فائدہ اٹھانے دیجئے تو عرض کروں کہ سخن فہمی کا ملکہ پیدا کرنے کی یہی واحد صورت ہے۔ مگر میں کہاں سے کہاں بہک گیا! اقبال کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے سے

جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل
چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول

بے اختیار دل چاہتا ہے کہ چاند کا آنچل نہیں تو ایک کرن چرا کر میں بھی کاہیدہ ہوتے ہوتے اس طلسمی منظر میں تحلیل ہو جاؤں۔ یہ ایسے اسالیب بیان ہیں جن پر اردو شاعری جسقدر ناز کرے بجا ہے، اور دوسری زبانوں کو چیلنج دے کہ "لاؤ اس کے مثل کوئی آیت" (میں نے عمداً ایک مختصر سورے کو اور مختصر کرکے آیت بنا دیا تاکہ قرآن مجید سے تقابل کا اشتباہ زائل ہو جائے)۔

یہ مصرعہ دیکھئے :- روحِ خورشید ہے، خونِ رگِ مہتاب ہے عشق

عشق کو روحِ خورشید کہہ کر اس کی تجلّی بڑھادینا اور مہتاب کے زرد چہرے کی تہ میں خون کی سرخی دوڑا دینا اور اس طرح عشق کو جلالی اور جمالی دونوں شانیں دکھادینا اقبال اور صرف اقبال کا حصہ ہے۔

جزیرۂ سسلی کو "تہذیبِ حجاز کا مزار" کہنا کیا اس تہذیب کی گزشتہ عظمت اور زوال مابعد کی مکمل اور حسرتناک داستان نہیں ہے؟ اور اسی نظم کا یہ مصرع :-

"جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں"

کیا مِلّ نضائے اسلام پر ازآغاز تا حال چھایا ہوا نہیں ہے؟ کیا "لفظ ہمگرد" منزل سے دوری، تکدر، انتشار اور درد وں کے زمرے اور تھکے ہوئے ہونے کی ترجمان نہیں ہے؟

میں نے اقبال کی متعدد تصانیف میں سے صرف بانگ درا کے چند صفحات الٹ پلٹ کر ایک خاکہ پیش کر دیا، مزید خامہ فرسائی کی نہ تو فرصت ہے اور نہ غالباً ضرورت ہے۔

اکثر حضرات مجھ سے متفق نہ ہوں گے مگر میں اسے بدقسمتی بلکہ خطرناک غلطی سمجھتا ہوں کہ کسی شاعر کے کلام کو اس کی افادیت جانچنے اور اپنے طریق کار کا ہادی و رہبر بنانے کی نیت سے پڑھا جائے۔ اس طرح اندازِ بیان کی رعنائیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں اور پڑھنے والا اس دماغی و روحانی اہتزاز سے محروم رہ جاتا ہے جو آرٹ کا منشاءِ اولین ہے۔ پہلے محض مکیف ہونے کو پڑھئے تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ وہ آرٹ ہے بھی یا اور کوئی بلا ہے۔ کم ازکم افادیت کو لذتیت پر مقدم نہ ٹھہرائیے۔ کسی بڑے شاعر کا کلام خطرناک کیونکر ہوسکتا ہے؟ اس کی ادنیٰ مثل یہ ہے کہ اقبال کا نظریۂ خودی کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے نے "ملت کو فرعون کی میراث بنا دیا"۔ نہ معلوم کتنے نوجوان گمراہ اور کتنے خود فریبی کا شکار ہوگئے اور بظاہر صرف اس وجہ سے کہ اقبال شاعر تک تو رسائی ہوتی نہیں بلکہ اس کے درجے میں اپنی خودی یا انانیت سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

یہ ضرور ہے کہ کسی شاعر کو اس طرح سمجھنے کے لئے کہ اس کے آرٹ کے جوہر نمایاں ہوں سب جلے معقود ہو جائیں اور انکار دستاویز بن جائیں وسیع اور گہرا مطالعہ درکار ہے۔ کاش ہمارا نوجوان طبقہ اپنی دوسری مصروفیتوں اور سرگرمیوں سے تھوڑا وقت اس دردِ سری کے لئے بھی نکال سکے۔ صلہ؟ ایسے شاداب پھول جو باغ جنت میں بھی نہیں۔ دعا ہے کہ اقبال کی یہ دعا بارگاہِ صمدیت میں شرف قبول پائے :- سے

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

---

**ضروری**

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کرلیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کرلیا جائے۔

"نقد و نظر" کے سلسلے میں ہر کتاب کی دو جلدیں دفتر آجکل میں وصول ہونی چاہئیں ورنہ ان پر کسی قسم کا اظہارِ خیال نہیں کیا جائے گا۔

(ادارہ)

# شہرت

روسی

## بشیر الدین

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔

میتیا کلدارو گھبرایا ہوا اور پریشان حال لیے والدین کے ہاں پہنچا اور ان کی خوابگاہ میں داخل ہو گیا۔ والدین لیٹ چکے تھے۔ بہن افسانہ کا آخری صفحہ ختم کر رہی تھی۔ چھوٹے بھائی بھی کے سو چکے تھے۔

"تم اتنی رات گئے کہاں! اور تمہارا حال کیا ہے"۔ والدین نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اُف۔ کچھ نہ پوچھئے۔ میں اس کا مستحق نہ تھا۔ مجھے کب امید ہو سکتی تھی۔ نہ یہ بات قابل یقین ہے"۔ میتیا نے کہا اور رُک رُک کر ہنسنے لگا۔ خوشی کے مارے اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ چنانچہ وہ بیٹھ گیا۔

"آپ کو تو اس بات کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ سچ ہے، اس کا یقین کرنا دشوار ہے۔ یقین تو در کنار، آپ کے تصور میں بھی یہ بات کبھی نہیں آ سکتی تھی"۔

بہن بستر سے اٹھی اور کمبل اوڑھے بھائی کے پاس جا بیٹھی۔ چھوٹے بھائی بھی جاگ گئے۔

"تمہیں ہو کیا گیا ہے اور تمہارا حال کیا ہے"؟ ماں نے سوال کیا۔

"یہ حال خوشی کا نتیجہ ہے اماں جان۔ خوشی کا۔ اب تو سارا روس مجھے جان گیا۔ سارا روس جی ہاں۔ آج تک تو بس آپ ہی لوگ میری ہستی سے واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ دمیتری کلدارو ایک غیر فوجی ملازم دنیا میں بستا ہے اور اب سارا روس مجھ سے واقف ہو گیا۔ جی ہاں۔ بخدا سارا روس"۔

میتیا ایک جست لگا کر اپنی نشست سے اٹھا اور کمرہ کا چکر لگا کر پھر بیٹھ گیا۔

"آخر بات کیا ہے۔ کچھ بتاؤ تو سہی؟" باپ نے پوچھا۔

"آپ لوگ تو وحشیوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اخبار آپ نہیں دیکھتے۔ کسی کی شہرت کی آپ کو خبر نہیں ہوتی۔ اخباروں میں ایسی ایسی قابل قدر باتیں نکلتی ہیں۔ جہاں کوئی واقعہ ہوا وہ اخبار میں چھپا۔ کوئی بات شائع ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ آج میری خوشی کی انتہا نہیں، ہاں اخباروں میں ذرا اس کالم کو ملاحظہ فرمائیے جہاں مشہور و معروف ہستیوں کا ذکر ہوتا ہے وہیں آپ کو میرا ذکر بھی ملے گا"۔

"کیا کہا؟ کہاں؟"

باپ کا چہرہ فق ہو گیا۔ ماں نے صلیب کی طرف نظر اٹھائی اور صلیب کا نشان بنایا۔ اس کے چھوٹے بھائی اچھل کر اس کے نزدیک جا بیٹھے۔

"جی ہاں وہیں میرا ذکر بھی شائع ہوا ہے۔ اب تو میں سارے روس میں مشہور ہو گیا۔ اماں جان تم اس اخبار کا تعویذ بنا کر اپنے پاس رکھو۔ کبھی کبھی نکال کر پڑھ لیا کرنا"۔

میتیا نے جیب میں سے ایک فرسودہ اخبار نکال کر والد کو دیا اور انگلی سے اس جگہ کی طرف اشارہ کیا جہاں سرخ پنسل کا نشان تھا اور کہا "اسے پڑھئے"۔

باپ نے عینک لگائی۔

"پڑھئے نا"۔

ماں نے صلیب کا نشان بنایا۔ باپ نے کھنکار کر پڑھنا شروع کیا۔

"۲۲ دسمبر رات کے گیارہ بجے دمیتری کلدارو نے مدہوشی کے عالم میں ......"

"دیکھا آپ نے کتنی تفصیل اور خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پڑھتے جائیے آگے پڑھئے۔ سنئے"۔

"ٹھوکر کھائی اور ایک گھوڑے سے، جو ایک دہقانی گاڑی کا تھا ٹکرایا اور گرا۔ خوف زدہ گھوڑا بدکا اور ساز سمیت کلدارو کے اوپر سے گزر گیا۔ کلدارو کو بے ہوشی کے عالم میں پولیس تھانہ لے گئی وہاں ڈاکٹر نے معائنہ کیا۔ چوٹ جو کلدارو کی گردن کے پچھلے حصہ میں آئی ......"

"چوٹ بم کی تھی اماں جان۔ ذرا اور آگے پڑھئے۔ چلئے"۔

"چوٹ جو کلدارو کی گردن کے پچھلے حصہ میں آئی تھی بہت معمولی تھی۔ اس واقعہ کی رپورٹ کا اندراج کر لیا گیا اور زخمی کی مرہم پٹی کر دی گئی"۔

"انسپکٹر نے کو ٹھنڈے پانی میں بھگو کر گردن پر رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ اس واقعہ کی اطلاع سارے روس میں ہو گئی"۔ یہ کہہ کر میتیا نے اخبار کو تہہ کر کے جیب میں رکھا۔

"یہاں سے میں سکارو (اس کا ایک دوست) کے یہاں جاؤں گا اور اس کو یہ خبر سناؤں گا وہاں سے نکل کر ایوانوف کے پاس جاؤں گا اور وہاں سے نتالی ایوانو کے پاس اور بیسرو کے۔ اچھا اب اجازت چاہتا ہوں۔ آداب عرض ہے"۔

یہ کہہ کر میتیا نے ٹوپی پہنی اور فاتحانہ انداز سے رخصت ہو گیا۔ (چیخوف)

---

نوٹ:۔ چیخوف کا یہ افسانہ اور وہ افسانے جو بشیر الدین صاحب نے اس سے قبل آجکل میں شائع کرائے ہیں؛ براہ راست روسی ترجمہ ہونے کے باعث اصل سے بہت زیادہ قریب ہوتے ہیں اور ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ (ادارہ)

# قطعات

سیّد رضا علی

## بخیل اور اس کی بی بی

بی بی بولی بخیل کی اکدن　　تم نظر آتے ہو اُداس اُداس
خیر ہی کھو گئی ہے کوئی چیز　　اور ملنے کی اس کے کچھ نہیں آس
یا کسی کو دیا ہے کچھ تم نے　　رو رہیں زندہ ہوتیں گر مری ساس
فکر کیا ہے جو تم ہو افسردہ　　اور کس بات کا ہے تمکو ہراس
بولا اس میں کسی کو کیا دیتا　　کیا خزانہ ہے کوئی میرے پاس
کھوے وہ جو کسی کو دے دھوکا　　مجھے ایمانداری آئی ہے راس
کیوں نہ ہوں میں ملول دیکھا ہے　　دیتے اک آدمی کو بے دسواس
اپنی گاڑھی کمائی کیوں کسی کو دے　　کفر ہے یہ نہیں خدا کی پاس

نہ سمجھنا بعید۔ اِس کو تم
ہو اگر جائے۔ دینے والے کا ناس

## کھوٹا بیٹا اور کھوٹا پیسا

وقت جب آدمی پہ پڑتا ہے　　اور دشمن جھگڑتا لڑتا ہے
کھوٹا بیٹا ہو کھوٹا پیسا ہو　　آہی جاتا ہے کام جیسا ہو

## تضمینیں

عاصی ہوں حرص پر نہیں مرا اب　　اے کریمے کہ از خزانۂ غیب
اس سے بڑھ کر نہیں مری خواہش　　گبر و ترسا وظیفہ خور داری
یار احباب میں نہیں کوئی سوم　　دوستاں را کجا کنی محروم

کہہ دے کب آئے گی مری باری
تو کہ با دشمناں نظر داری

*

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　گو ہو افسوس پر نہ چاہیے خشم
دن دہاڑے نظر نہ آئے جو راہ　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

*

رمضاں یہ نہیں ہے یہ ہے جب　　گر من آلودہ دامنم چہ عجب
مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں دوست　　ہمہ عالم گواہ عصمت اوست

*

حملہ ہٹلر نے روس پر جو کیا　　کاش وہ یاد اسقدر رکھتا
لقمہ وہ لے جسے چبا سکے مرد　　کار دنیا کسے تمام نہ کرد

## سالنامہ آجکل

آجکل کا سالنامہ حسب معمول اس سال بھی یکم جون ۱۹۴۷ء کو شائع ہو رہا ہے۔

سالنامہ کے مضامین کی جھلک اس شمارہ کے صفحہ ۶۰ پر ملاحظہ فرمائیے

(ادارہ)

# غالب کی وفات پر آزاد کا قطعہ تاریخ

(ڈاکٹر محمد باقر)

آجکل کی ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں مسعود حسن صاحب رضوی نے غالب کی وفات پر مولانا آزاد مرحوم کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ شائع کیا ہے جس میں آٹھواں شعر یوں درج ہے۔

رخت بربست چوں زدارِ کہن   نظمِ مضمون شانت آوارہ؟

ذیلی نوٹ میں رضوی صاحب نے تحریر فرمایا ہے "اس قطعہ میں کتابت کی کئی غلطیاں تھیں جو درست کر دی گئیں۔ مگر آٹھویں شعر کے دوسرے مصرع میں جو غلطی ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آئی اس لئے وہ مصرعہ بجنسہ نقل کر دیا گیا ہے" حقیقت یہ ہے کہ اس مصرعہ میں کتابت کی کوئی غلطی نہیں۔ صرف طرزِ تحریر نامانوس ہونے کی وجہ سے دوسرا مصرعہ پڑھا نہیں گیا۔ اور اگر اس مصرعہ پر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ مصرعہ یوں پڑھا جانا چاہیئے تھا۔

نظمِ مضمون شانست آوارہ

یعنی "اس کے مضمون کا نظم پریشان ہو گیا ہے"۔ قطعہ کے نویں اور دسویں شعر سے ظاہر ہے کہ ضمیر متصل کا جو التزام "مضمونِ شان" میں رکھا گیا ہے وہی ترتیب ان اشعار میں "کشمکش" اور "رحلتش" کی تراکیب میں دہرائی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو

جگر بجر آب شدہ کشمکش   دلِ تقطیع گشتہ صد پارہ

از پئے سالِ رحلتش آزاد   ہاتفِ غیب گفت وزد نعرہ

"شانت" کو "شدہ است" پڑھنے سے بھی ربطِ مضمون قایم رہے گا اور تقطیع میں فرق نہ آئے گا۔ ملاحظہ ہو۔

رخت بربست چوں زدارِ کہن
نظمِ مضموں شدہ است آوارہ

لیکن اصلی تحریر یعنی "شانت" کو پیشِ نظر رکھئے تو معلوم ہو گا کہ یہ قیاس درست نہیں۔ "شانت" کی کوئی شکل بھی "شدہ است" نہیں بنتی۔ لیکن "شانست" بن سکتی ہے۔ اس لئے صحیح صرف یہی ہے۔

# کشمکش

(فرحت شاہجہانپوری)

دلِ مجبور بہلتا نہیں بہلانے سے

لذتِ جلوۂ حیرت! میں کہاں سے لاؤں
چہرۂ حسن و لطافت! میں کہاں سے لاؤں
پیکرِ مستی و نکہت! میں کہاں سے لاؤں
دلِ مجبور بہلتا نہیں بہلانے سے

محفلِ ذہن میں آباد نظارے ہیں ابھی
نگہِ شوق میں پُرکیف سہارے ہیں ابھی
روح میں تیرتے پھرتے وہ اشارے ہیں ابھی
دلِ مجبور بہلتا نہیں بہلانے سے

اپنے ارمانوں کے لاشہ پہ بھی روتا ہے کبھی
جانِ عبرت کدۂ غم میں بھی کھوتا ہے کبھی
ہجر کے ہاتھوں بےچین سا ہوتا ہے کبھی
دلِ مجبور بہلتا نہیں بہلانے سے

کیا کروں! سوزشِ فرقت پہ فدا ہو جاؤں
منزلِ راہِ محبت میں فنا ہو جاؤں
اپنے اجڑے ہوئے گلشن کی فضا ہو جاؤں
دلِ مجبور بہلتا نہیں بہلانے سے

دمِ رخصت تری خاموش نگاہوں کی قسم!
زینتِ قلب و نگہ بھولی سی باتوں کی قسم!
ڈوبتی ڈوبتی مرے اشکوں بھری آنکھوں کی قسم!
دلِ مجبور بہلتا نہیں بہلانے سے

محفلِ حسن و محبت کو سجانے آجا
خلشِ دوری و نزدیک مٹانے آجا
دورِ ماضی کے کچھ افسانے سنانے آجا
دلِ مجبور بہلتا نہیں بہلانے سے

# چین کی کہاوتیں

رتن لال کھنہ

کسی ملک کی کہاوتیں عوام کی تہذیب و تمدن کا آئینہ ہوتی ہیں ان سے ہمیں عام لوگوں کے رواج، متداول روایات اور عقائد کا پتہ چلتا ہے۔ اس ملک کی قومی نفسیات، نسلی خصائل اور خصوصیات بھی کہاوتوں سے مظہر ہوتی ہیں۔ وان ڈی دالڈی کا قول ہے کہ بالآخر لوگ اپنی قدروں کا مجسمہ بن جاتے ہیں۔ ان کہاوتوں سے ہمیں عوام کی قدریں صریحاً معلوم ہو جاتی ہیں۔

چین کی کہاوتیں چینی عوام کی روحانی، ذہنی، باطنی اور تمدنی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ چینی عوام کی گوناگوں قدریں ان سے منعکس ہیں۔ عوام کی ظرافت بھی کہاوتوں سے ٹپکتی ہے۔ اور گیٹے کا مقولہ ہے کہ جن چیزوں پر لوگ ہنستے ہیں وہی ان کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ان کہاوتوں میں دنیا میں کامیابی سے زندگی بسر کرنے کے ڈھب، سماجی نیک اطوار، زندگی کا فلسفہ کوزے میں دریا کی طرح بند ہیں۔ ہم چینی عوام کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر ان کی کہاوتوں کے آئینہ میں نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

اکثر چینی کہاوتیں دنیاوی حکمت کے جواہر ہیں۔

مثلاً: "اگر اولتی نیچی ہے تو جھک جاؤ۔"

"ایک گھوڑے پر دو کاٹھیاں مت ڈالو"

"اپنی کامیابیوں کا ذکر ان لوگوں کے سامنے نہ کرو جو ناکام رہتے ہیں۔ کامیابی کے وقت اپنی ناکامیوں کو نہ بھولو"

بہت سی کہاوتیں سوشل چال چلن کا فلسفہ سکھاتی ہیں مشتے نمونہ از خروارے:

"مرہون منت کرو گے تو مرہون منت ہو گے"

"دوسروں کے عیب سے وہی سلوک روا رکھو جو اپنے عیوب سے رکھتے ہو"

"خوش خلقی سختی سے برتر ہے۔"

"اپنے عمل میں ثابت قدم رہو مگر مزاج میں نرم رہو"

"اپنے ساتھ کڑے رہو۔ مگر اپنے ساتھیوں سے ملائمت برتو"

چینی کہاوتوں میں ہمیں فلسفے کے بیش بہا موتی بھی ملتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

"غلطی کے بغیر سچائی کا نام تک نہ ہوتا"

"جو شخص شیر پر سوار ہوتا ہے وہ اتر نہیں سکتا"

"ایک کتا کسی چیز پر بھونکتا ہے اور باقی کتے اس پر بھونکتے ہیں"

"کوئی بت ساز بت پرست نہیں ہوتا وہ جانتا ہے کہ وہ کس مادہ سے بنے ہوئے ہیں"

اکثر چینی لوک کہاوتوں میں ہمیں عوام کی روحانی اور اخلاقی قدریں ملتی ہیں۔ مثلاً:

"انسان چھوٹے مرتبہ کا خدا ہے اور خدا بڑے مرتبہ پر انسان"

"گھر پر بیٹھو اور والدین کی پوجا کرو۔ دور دراز جاکر دیوتاؤں کی پرستش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اگر تم راست باز اور بے ریا ہو تو تمہیں کسی دیوتا سے عفو گناہ کے لئے دعا کرنے کی حاجت ہے؟"

"کامیابی پر مغرور ہونا اور ناکامی سے مایوس ہونا حالات کی غلامی ہے: ایسا آدمی کس طرح مختار خود کہلا سکتا ہے؟"

"زمین پر ایک نیک آدمی کا اضافہ بہشت میں ایک فرشتہ کے اضافہ سے بہتر ہے"

"جو برائی کرتا ہے اور اس کے افشا سے ڈرتا ہے اس کی بدی میں نیکی کا تخم ہے۔ جو نیکی کرتا ہے اور اسے شہرت دینے کا شائق ہے اس کی نیکی میں بدی کی جڑ ہے۔"

عورت بھی ایک معما ہے۔ اس کی نفسیات کے کئی پہلو ہیں۔ فلاسفروں اور شاعروں نے اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھئے چین کی کہاوتیں، عورت کی سیرت، خصائل اور نفسیات پر کیا کیا روشنی ڈالتی ہیں اور کیا کیا مخصوص نظریے پیش کرتی ہیں:

"جو مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو آسانی سے جان پہچان لیتے ہیں ان کا عشق ارزاں ہوتا ہے"

"وہ لڑکی جو اپنے حسن سے ناز و انداز کرتی ہے پاک دامن نہیں ہو سکتی۔ وہ عالم جو علم فروشی کرتا ہے مخلص نہیں ہو سکتا"

"بچے ریاکاری سے روتے ہیں کہ لوگ ان کی باتوں کا یقین کریں۔ عورتیں اس لئے روتی ہیں کہ لوگ ان پر ترس کھائیں"

"آدمی خیال کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے۔ عورت بہتر جانتی ہے"

اگلے وقتوں میں مذہب ہماری زندگی پر مسلط تھا، آجکل زر پرستی۔ عوام کا دولت کی طرف جو خیال تھا وہ چینی کہاوتوں سے ظاہر ہوتا ہے ملاحظہ ہو:

"دولت اندھے کو بھی سوجھ دے دیتی ہے"

"سونے کی پرکھ آگ سے ہوتی ہے۔ آدمی کی سونے سے"

"مالدار لوگوں کی باتوں پر سب دھیان دیتے ہیں"

"روپیہ سے تم دیوتاؤں کو بھی خوش کر سکتے ہو، بغیر روپیہ تم ایک آدمی کو بھی خوش نہیں کر سکتے"

چینی عوام کی ظرافت اور مزاح ان کی کہاوتوں سے ٹپکتی ہے چینی لوک ظرافت کی مخصوص لذت مندرجہ ذیل کہاوتوں میں ملتی ہے :

" ایک سورما دنیا ترک کرنے پر راضی ہو سکتا ہے مگر وہ اپنی محبوبہ اور اپنے گھوڑے کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوگا"

" ایک بوتل کی سی ناک والا آدمی تارک مسکرات ہو تو ہو۔ مگر کوئی بھی ایسا خیال نہ کریگا"

" بے وقوف لڑکے کسی خاندان کو برباد نہیں کرتے یہ کام ہوشیار لڑکوں کا ہے"

" دانا آدمی اکثر آنکھوں سے باتیں کرتا ہے سطحی آدمی اکثر کانوں سے نکل جاتا ہے "

چینی عوام کا زندگی اور ما فیہا کے متعلق انداز فکر ان کی کہاوتوں میں منعکس ہے۔ مندرجہ ذیل کہاوتیں اسی زاویۂ نگاہ سے ملاحظہ ہوں :

" جو شخص اپنے ذہن کو اپنے جسم کا غلام بناتا ہے وہ ایک ہمیشہ جتا رہنے والا گھوڑا یا ڈھور ہے جو اپنے جسم کو شہرت پر قربان کر دیتا ہے وہ ایسا ہے جیسے قفس میں تیتر یا جنگلی ہنس"

" زراندوز مادی طور پر دولت مند ہے اور روحانی طور پر غریب قناعت کرنے والا مادی طور پر غریب ہے اور روحانی طور پر متمول"

" دیکھو تو پھول کیسے کھلتے ہیں اور کس طرح مرجھا جاتے ہیں : نہ کہو کہ یہ شخص ٹھیک کہتا ہے اور وہ شخص غلط"

" امن میں کتا ہونا جنگ میں انسان ہونے سے بہتر ہے"

" جن لوگوں نے زندگی کی تلخیوں کی تلخ ترین تلخی نہیں چکھی وہ زندگی کی شیرینیوں کی شیریں ترین شیرینی کو کیا جانیں"

" جو کچھ بھی کرو اس طرح کرو کہ تمہارے دوستوں کو اس پر افسوس کرنے کا موقع نہ ملے اور تمہارے دشمنوں کو خوش ہونے کا"

" ہم دنیا کی صاف بادِ صبا اور چمکتے ہوئے چاند کو کہاں ٹھکانے لگائیں گے ؟ شراب کے پیالے اور شاعری کے تھیلے میں"

" اپنے دروازے کی سیڑھیوں سے برف صاف کرو"

" امیر کا وصف دینے کی صلاحیت ہے، غریب کا بھیک مانگنے سے انکار، عالی مرتبہ آدمی کا ہم جنس انسانوں کی طرف خاکسارانہ نظریہ اور فرومایہ انسان کا وصف زندگی کو بھانپ لینا ہے"

لوک کہاوتوں کے عناصر یہ ہیں : اختصار، لذت، معنی کی گہرائی، ایجاز کہاوت کی روح ہے۔ یہ مختصر اور جامع ہوتی ہے یہی وہ اوصاف ہیں جن سے کہاوتیں زبان زد خلائق ہوتی ہیں۔ ظرافت کی چاشنی انھیں چٹخارا دیکر چٹکیلا بنا دیتی ہے اور لوگ انھیں مزہ لے لے کر پڑھتے ہیں چینی کہاوتوں کی یہی خصوصیات ہیں۔ الفاظ نکتہ خیز، پر تخیل اور پر معنی ہیں۔ اکثر سہل ممتنع کے معیار پر پوری اترتی ہیں مختصر یہ کہ یہ کہاوتیں ایجاز لفظ و اعجاز معنی کے گوہر ہیں

# کہاں جا بسی ہو؟

یہ شبنم کی لرزیدہ سیمیں ردائیں
یہ مخمور و پُرکیف رنگیں ہوائیں
غزلخواں سنہری سی دوشیزہ کلیاں
یہ سبزے کی مستانہ دلکش ادائیں
انھیں چھوڑ کر تم کہاں جا بسی ہو؟

یہ پنگھٹ کے پرکیف و سیمیں نظارے
تبسم فشاں گنگناتے ستارے
یہ میخانہ بر دوش کالی گھٹائیں
یہ ساغر بکف جھومتے ابر پارے
انھیں چھوڑ کر تم کہاں جا بسی ہو؟

گجر دم یہ دھندلاہٹوں کا تبسم
لب خامشی پر حسیں سا تکلم
یہ چاندی میں لپٹی ہوئی سرد راتیں
یہ شبنم فشاں مسکراتے سے انجم
انھیں چھوڑ کر تم کہاں جا بسی ہو؟

حسیں قہقہوں سے ہے ابتک چراغاں
جہاں کا ہر اک ذرّہ رشکِ گلستاں
ابھی تک ہے خاموش بے ربط رستے
جہاں تھی جوانی تمہاری غزلخواں
انھیں چھوڑ کر تم کہاں جا بسی ہو؟

در و بام ہیں رشک صد طور اب بھی
فضائیں ہیں جلووں سے معمور اب بھی
تمہارے تبسم کی رنگینیوں سے
ہیں ندی کی لہریں تو مخمور اب بھی
انھیں چھوڑ کر تم کہاں جا بسی ہو؟

انور قریشی

# فرزانہ

ڈرامہ (۱)

## افراد

(۱) طومان ۔ یونان کا حکیم ۔ یاسمین کا شوہر ۔ فرزانہ کا باپ
(۲) عورت ۔ ایک اجنبی اور مصیبت زدہ عورت ۔
(۳) یاسمین ۔ طومان کی بیوی ۔ فرزانہ کی ماں ۔
(۴) ملکہ ۔ یونان کی ملکہ ۔
(۵) عالم پناہ ۔ یونان کا شہنشاہ ۔
(۶) شبنم ۔ ملکہ کی خادمہ ۔
(۷) فرزانہ ۔ طومان کی لڑکی ۔ عالم پناہ کی منظور نظر ۔
نوجی ۔ جلاد ۔ آوازیں چند ۔

## منظر اول

مریضوں کا مجمع لگا ہوا ہے ۔ چیخ و پکار مچی ہوئی ہے

**ایک شخص:** ۔ رحم کر طومان رحم کر ۔ انسانیت کے نام پر رحم کر ۔

**طومان:** ۔ پتھر میں جونک نہیں لگ سکتی میرے پاس اس دوا کے صرف دو قطرے باقی ہیں ۔

**شخص:** ۔ ترس کھا ظالم ! ترس کھا ! میرا باپ دم توڑ رہا ہے ۔

**طومان:** ۔ اسے اب جینے کا حق نہیں ۔ مر جانے دو ۔

**شخص:** ۔ (غصہ ہو کر) بدزبان ۔ فریبی ۔ مکار ۔ اگر تو دوا نہیں دے سکتا تو خدا سے دعا مانگوں گا ۔

**طومان:** ۔ جا ! جا ! چالیس روز سے پہلے دوا تیار نہیں ہو سکتی ۔

**ایک عورت:** ۔ تو کیا میں بھی خالی ہاتھ لوٹ جاؤں ۔

**طومان:** ۔ افسوس ! تیرے بچہ کے لئے بھی میں کچھ نہیں کر سکتا ۔

**عورت:** ۔ میری ممتا تڑپ رہی ہے طومان ! جدائی کی گھڑیاں نزدیک آ رہی ہیں ۔

**طومان:** ۔ زندگی ایسی ہی تلخ حقیقتوں کا نام ہے ۔

**عورت:** ۔ (رو کر) یہ کلی مرجھائی جا رہی ہے ۔ میرے گھر کا چراغ گل ہوا جا رہا ہے طومان !

**طومان:** ۔ کلی مرجھانے ہی کے واسطے ہوتی ہے ۔ چراغ گل ہو ہی جایا کرتا ہے ۔

**عورت:** ۔ کٹھور نہ بن طومان ! مرد کی بلند فطرت کو پست نہ کر ۔ مظلوم عورت کی التجا کو نہ ٹھکرا ۔

**طومان:** ۔ خدمت کر ۔ اس انمول دوا کے لئے سب کچھ ٹھکرایا جا سکتا ہے ۔

**عورت:** ۔ تم میری ممتا کی قدر کر سکتے ہو ، تم صاحب اولاد ہو ، میرا دل رو رہا ہے طومان !

**طومان:** ۔ رونے دو ، ہنسنے والے کو رونا بھی چاہئے ۔

**عورت:** ۔ تجھے "فرزانہ" کی قسم ۔ دے دے اب بھی دے دے میری اجڑی ہوئی کوکھ آباد کر دے ۔

**طومان:** ۔ جا ! جا ! اپنی کوکھ کے اجڑنے کا اب تماشا دیکھ ۔

**عورت:** ۔ (رو کر) تماشہ ! خداوندا ! طومان کو اس کی کوکھ کے اجڑنے کا تماشا دکھا ۔

**طومان:** ۔ بددعا ! بددعا ! اچھا لے ! لے ! یہ دوا ..... اب کچھ بھی باقی نہیں رہا ....

**عورت:** ۔ اہا ! آنکھ کھول دی اس نے تو .... تو بھی اسی طرح خوش اور ٹھنڈا رہے جیسا تو نے اس وقت مجھے رکھا ہے ۔ اللہ تیری بیٹی کو رہتی دنیا تک آباد رکھے ۔

**طومان:** ۔ جا جا ! تو اس کے باپ کو دکھا کر اس کو خوش کر .... مگر میرے پاس تو ایک قطرہ بھی دوا نہیں ....

**عورت:** ۔ دوا ..... اللہ نہ کرے جو تجھ کو ضرورت پڑے (جاتے ہوئے کچھ دور جا کر) ظالم موت کبھی تیرے گھر نہ آئے ۔

**طومان:** ۔ عورت اور پھر ماں ! کتنا چھوٹا دل ہوتا ہے ۔ رنجیدہ ہوئی بددعا دے بیٹھی ، خوش ہوئی دعائیں دینے لگی ۔

(زور سے رونے اور چیخنے چلانے کی آواز نزدیک آتی جاتی ہے)

**یاسمین:** ۔ یہ حال ہے فرزانہ کا طومان !

**طومان:** ۔ کون ؟ یاسمین فرزانہ کی ماں ! کیا ہوا میری بچی کو — فرزانہ — فرزانہ ! کیا ہوا تھا اس کو ۔

**یاسمین:** ۔ سینہ میں درد اٹھا ، حالت غیر ہو گئی اور بس !

**طومان:** ۔ درد ! کتنی ذرا سی بات ہے ۔ ابھی اچھا کرتا ہوں ..... مگر ... مگر

**یاسمین:** ۔ کیا سوچنے لگے ؟ دوا کیوں نہیں دیتے ؟ دوا جلدی دو ، اس کی حالت بگڑ رہی ہے ۔

**طومان:** ۔ دوا ؟ گھبرا کر ۔ کہاں سے دوں ؟ اپنی بیٹی کو کس طرح بچاؤں !

**یاسمین:** ۔ کیوں طومان ؟ کیا حالت ہو رہی ہے فرزانہ کی ۔ میں اپنی بیٹی تم سے لوں گی طومان !

**طومان:** ۔ افسوس ! دو منٹ پہلے ختم ہو گئی ..... سکتہ ہو گیا ہے اس کو

**یاسمین:** ۔ میرا سہارا ٹوٹا جا رہا ہے طومان ۔

**طومان:** ۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو جھلک رہے ہیں یاسمین ! ...... کروں ، دو قطرے باقی تھے ، وہ لے گئی ، لے گئی ، وہ ماں ..... مفلس !

اویس احمد ادیب

نادار! قلاش! غریب ماں!

**یاسمین:۔** فرزانہ کی نبضیں چھوٹ گئیں۔ اس کی آنکھیں بھی پتھرا گئیں طومان! (روتی ہے) آہ! میری فرزانہ۔

**طومان:۔** (روتا ہے) آہ یاسمین! فرزانہ تمہاری بچی! نہیں نہیں میری بچی! فرزانہ! تیرا باپ! آہ تیرا باپ! حکیم طومان! مردوں کو زندہ کر دے اور تجھ کو نہ بچا سکے (چلاتا ہے) اب کیا ہو سکتا ہے یاسمین.... وہ..... وہ..... وہ عورت۔ مجھے دھوکا دے گئی..... لے گئی ..... لے گئی (اور زور سے چلاتا ہے) کہاں ہے وہ! کدھر ہے وہ مکار... فریبی عورت..... وہ عورت، اس کا بچہ چھین لوں گا... چھین لوں گا... ظالم، سفاک، بیدرد..... اپنے آنسوؤں سے میرے دل کو موم کر کے لے گئی....... (آواز رک جاتی ہے)

**یاسمین:۔** کیا اب کوئی تدبیر نہیں چل سکتی طومان؟

**طومان:۔** نہیں ... کسی حکیم کو بلا کر دکھا لو شاید اچھی ہو جائے! اس دغاباز عورت کی وجہ سے ایسا ہوا...... اس کا بچہ..... اس کی گود..... خوشی...... میرا گھر اور موت... میری بیٹی اور موت..... موت (چلاتا ہے) موت، ظالم موت! ابھی جاتا ہوں... جاتا ہوں۔

**یاسمین:۔** کہاں جاتے ہو طومان؟

**طومان:۔** (ہنستا ہے) وہیں جہاں وہ عورت ہوگی.... جہاں وہ خوشی سے گاتی ہوگی.... اس کا بچہ چھین لوں گا... اس کا بھی گلا گھونٹ دونگا.... میں دکھی ہوں اس کو بھی دکھی بناؤں گا (پھر ہنستا ہے) ہاہاہا! ہاہاہا! اس کا گھر..... ماتم کدہ ہوگا موت ہوگی اور اس کا بچہ..... موت...... دونوں جگہ موت.....

**یاسمین:۔** میں جاتی ہوں دوسرے حکیم کو بلانے طومان؟

**طومان:۔** علاج کر دیکھو! مگر اب اس میں رکھا کیا ہے...... جاؤ.... جلدی جاؤ!.... میں بھی جاتا ہوں... انتقام لینے (ہنستا ہے) انتقام.... بدلہ..... اس ظالم اور بدبخت عورت سے بدلہ..... ظالم انسانیت اور اندھی خوشامد دونوں سے بدلہ..... (جاتا ہے اور آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی جاتی ہے)..... بدلہ!..... بدلہ..... بدلہ! (فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

**عورت:۔** (جاتے ہوئے) خدا کرے طومان بھی ایسا ہی ٹھنڈا ہے جیسا اس نے مجھ کو ٹھنڈا کیا... میرا رنج خوشی سے بدل دیا....

**طومان:۔** (دور سے) مل گئی... مل گئی.... وہ مل گئی...... وہ آواز۔

**عورت:۔** خداوندا! تو طومان کو ایسی خوشی دیجیو جو آج تک کسی کو نصیب نہ ہوئی ہو۔

**طومان:۔** (نزدیک آکر) خوشی! مجھے اور خوشی۔ مجھے دکھی بنانے والی خوشامدی عورت۔ میری خوشی.... تو نے رنج سے بدل دی۔ تیری خوشی بھی میں رنج سے بدل دوں گا۔ بدل دوں گا، ابھی۔ تیری دعائیں اب مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔

**عورت:۔** کون طومان؟

**طومان:۔** ہاں ہاں! طومان، وہی طومان جس کی خوشی تو نے لوٹ لی جس کا گھر تو نے ویران کر دیا جس کی امیدیں تو نے خاک میں ملا دیں۔

**عورت:۔** اس قدر خوفناک اور اس قدر خونخوار ——— کیوں؟ طومان!

**طومان:۔** ابھی سمجھ جائے گی۔ میری طرح تیری گود بھی اس بچے سے خالی ہو نے دے۔ اس ٹھنڈی ماتا کو بچہ کے بغیر جلنے دے۔

**عورت:۔** کیا آگ کے شعلے بجھانے آئے ہو طومان؟

**طومان:۔** ہاں! کٹھور۔ ضدی عورت ——— کہاں ہے تیرا بچہ؟

**عورت:۔** میرا بچہ! میں نہیں دوں گی۔

**طومان:۔** نہیں دے گی تو! دیکھوں کیسے نہیں دیتی؟

**عورت:۔** اُف، ہاتھ ٹوٹ جائے گا۔ بازو کٹ جائے گا.... مر جائے گا یہ طومان!

**طومان:۔** مر جانے دو ——— میں ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ فرزانہ کا بدلہ....

**عورت:۔** چھوڑ دے، چھوڑ دے۔ ظالم۔ ارے سفاک۔ اس کا گلا دب رہا ہے.... میرا بچہ ——— ہائے!

**طومان:۔** انتقام ——— انتقام ——— بدلہ...... صرف بدلہ

**عورت:۔** (رو کر) اب تو اس کا گلا چھوڑ دے۔ مر گیا۔

**طومان:۔** نہیں۔ نہیں۔ کہیں اسے ایک سانس اور نہ آ جائے۔

**عورت:۔** اب تو ہاتھ اٹھا لے۔ اس کی آنکھیں بھی باہر نکل آئیں۔

**طومان:۔** فرزانہ کی آنکھیں بھی موت کے ظالم ہاتھ نے بے نور کر دی تھیں۔ لے یہ ہے تیرا بچہ۔

**عورت:۔** (سسکیاں لے کر) جلاد ——— سرکش۔

**طومان:۔** (ہنستا ہے) اب میری روح خوش ہوئی۔ خوش ——— بالکل خوش۔ بہت خوش۔

**عورت:۔** ہنس، خوب ہنس۔ ظالم۔ ایک دن یونہی تجھ کو رونا بھی پڑے گا۔ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔

**طومان:۔** (ہنستا ہے) جا! جا! خدا کے سینکڑوں بندوں کو میں نے مرنے سے بچایا اور اس نے مجھے یہ بدلہ دیا ——— فرزانہ کو مجھ سے چھین لیا۔ تجھ سے انتقام لے چکا۔ دیکھتی جا، ہرے خدا کے بندوں سے کیسا خوفناک انتقام لیتا ہوں۔ ایسے خدا!..... ایسے دنیا کے خدا... تیرے نام لینے والوں کو دنیا سے نہ مٹا دوں تو سہی....

اتنا بڑا خدا ہو کر طومان کو ایک جان نہ بخش سکا۔

**عورت:۔** بدزبان ۔ مغرور ۔ بے لگام ـــــ اپنی زبان قابو میں رکھ نہیں تو

**طومان:۔** (غصہ سے) نہیں تو! کیا تیرا خدا تباہ کر دے گا، مار ڈالے گا ـــ اس نے پہلے ہی مار ڈالا ۔ میں تجھے دکھی دیکھ کر خوش ہوں اور تیرے خدا کی مخلوق کو دکھی بنا کر ہمیشہ خوش ہوں گا ۔ (ہنستا ہے) ہا! ہا! ـــ ـــ ہا ہا ہا! (آواز دور ہوتی جاتی ہے اور فضا میں غائب ہو جاتی ہے)

**عورت:۔** اللہ کرے تو کتے کی موت مرے طومان ۔

## منظر دوم

### شہنشاہ یونان کا محل

**ملکہ:۔** کہاں گئی تھی شبنم؟

**شبنم:۔** بائیں باغ میں تھی سرکار!

**ملکہ:۔** فریب کار ۔ میں نے باغ اور محل دونوں کا کونہ کونہ ڈھونڈ ڈالا ۔

**شبنم:۔** ملکۂ عالم!

**ملکہ:۔** بتاتی کیوں نہیں ہے تو؟

**شبنم:۔** نہ پوچھئے ملکۂ عالم اب!

**ملکہ:۔** بدذات ۔ بے وقت محل سے غائب ہونے کے کیا معنی؟

**شبنم:۔** میں قبرستان گئی تھی ملکۂ عالم

**ملکہ:۔** قبرستان؟ وہاں تیرا کون سہارا ہے؟

**شبنم:۔** خلق خدا کا وہاں ایک سہارا ہے ۔ خلق اُس پر ٹوٹی پڑی ہے ۔ وہاں بیمار لوگ سجدے کرتے ہیں ملکۂ عالم ۔

**ملکہ:۔** سجدے؟ کس کو؟

**شبنم:۔** خدا کو ـــــ خدا رسیدہ بزرگ کو ۔

**ملکہ:۔** کون ہیں یہ؟ کیا ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ کب سے یہاں ہیں؟

**شبنم:۔** فقیر ۔ پہنچے ہوئے ۔ لمبے لمبے بال ۔ سرخ انگارا سی آنکھیں ۔ بڑھے ہوئے ناخن ۔ دل کا حال ان کو معلوم ہو جاتا ہے ملکۂ عالم ۔

**ملکہ:۔** سچ! بزرگوں سے مجھے بہت عقیدت ہے ۔ تم وہاں کس لئے گئی تھیں ۔

**شبنم:۔** عرصہ ہوا میرا بچہ گم ہو گیا ۔ اسی لئے وہاں گئی تھی ۔ بزرگ نے کہا دس برس بعد آئے گا ۔

**ملکہ:۔** کیا وہ ہمارے محل میں آ جائیں گے؟

**شبنم:۔** آج تک انھوں نے درگاہ سے باہر قدم نہیں نکالا ۔

**ملکہ:۔** تو مجھے بھی وہیں لے چل!

**شبنم:۔** وہاں جانے میں ملکہ کے وقار کو ٹھیس لگے گی ـــــ دنیا کہے گی "ملکۂ عالم فقیر کے آستانہ پہ"

**ملکہ:۔** پھر؟

**شبنم:۔** ایک تدبیر ہے؟ عالم پناہ کے گوش گذار کر دیجئے اور یہ بتائیے کہ فقیروں کی برکت سے سلطنت پر کبھی زوال نہیں آتا ۔

**ملکہ:۔** مگر مردوں کو فقیروں پر اعتبار بہت کم ہوتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ عالم پناہ ان کو کوئی اہمیت نہ دیں ۔

**شبنم:۔** تو پھر ایک تدبیر ہو سکتی ہے ـــــ جیسے ہی عالم پناہ محل میں داخل ہوں، آپ دردِ سر میں مبتلا ہو جائیں ۔ ایسا دردِ سر ہو کہ وہ کسی دوا سے نہ جائے، تب میں وہاں جانے کی تجویز پیش کروں گی ۔

**ملکہ:۔** اگر یوں کام نکل گیا تو میں تجھ کو نہال کر دوں گی ۔

**شبنم:۔** میں ادنیٰ سی خادمہ ہوں ملکۂ عالم!

(آہٹ ـــــ عالم پناہ کا آنا ۔ پیروں کی چاپ)

**عالم پناہ:۔** محل میں یہ بے ترتیبی کیسی؟

**شبنم:۔** ملکۂ عالم دردِ سر کی وجہ سے بے ہوش ہیں ۔

**عالم پناہ:۔** پھر کوئی علاج؟

**ملکہ:۔** آہ! درد! سر میں درد! سر پھٹا جا رہا ہے عالم پناہ ۔ شبنم ۔

**شبنم:۔** حاضر ہوں ملکۂ فلک وقار ۔

**ملکہ:۔** سر ٹکڑے ہوا جا رہا ہے ۔

**عالم پناہ:۔** شاہی طبیب کو بلاؤ ۔

**ملکہ:۔** آنکھیں نکلی پڑ رہی ہیں عالم پناہ!

**شبنم:۔** شاہی طبیب گھر گئے ہیں عالم پناہ! رخصت پر!

**ملکہ:۔** اُف! اُف ۔ جان نکلی اب تو!

**شبنم:۔** جان کی امان پاؤں تو عرض کروں عالم پناہ!

**عالم پناہ:۔** کہو! جلدی بولو!

**شبنم:۔** درگاہ میں ایک بزرگ آئے ہیں ۔ ان سے رجوع کیا جائے ۔

**عالم پناہ:۔** بلوا بھیجو ۔

**شبنم:۔** وہ کہیں آتے جاتے نہیں عالم پناہ! اللہ والے آدمی ہیں ۔

**عالم پناہ:۔** حکم کی خلاف ورزی کی تو سزا پائیں گے ۔

**ملکہ:۔** (کراہ کر) بزرگوں کو سزائیں نہیں دی جاتیں ۔ اجازت ہو تو میں ان کو دکھا آؤں ۔

**عالم پناہ:۔** اس میں شہنشاہ کی توہین ہے ۔

**ملکہ:۔** مذہبی معاملات میں توہین نہیں ہوتی ...... آہ اب دم نکلنے کی وجہ

**عالم پناہ:۔** لے جاؤ ...... میں بھی وزیر کے ہمراہ آتا ہوں ۔

**شاہ صاحب:۔** سر کے درد سے بے حال ہو بچی ۔

**ملکہ:۔** ہاں! شاہ صاحب!

**شاہ صاحب:۔** گھبراؤ نہیں ـــ فائدہ ہو جائے گا .....

**شبنم:۔** آپ ہی کا سہارا لے کر یہاں آئے ہیں ہم ۔ سب علاج کر چکے کچھ دوا دارو کام نہ آئی ۔

شاہ صاحب:۔ ابھی افاقہ ہو جائے گا..... چھو..... چھو.....
چھو؟ کچھ درد کم ہوا؟

ملکہ:۔ آنکھیں کھل گئیں۔ دوبارہ زندگی مل گئی شاہ صاحب!

شاہ صاحب:۔ چھو..... چھو..... چھو..... اب کیا حال ہے؟

ملکہ:۔ اب تو درد بالکل بھی نہیں.......

شبنم:۔ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں شاہ صاحب!

شاہ صاحب:۔ جا! بچی جا! اپنے گھر کی راہ لے۔ فقیر خود دوسروں کی سیوا کرتے ہیں۔

شبنم:۔ شاہ صاحب! آپ کے سامنے عالم پناہ اور ملکۂ عالم موجود ہیں۔

شاہ صاحب:۔ عالم پناہ! فقیروں کو دنیا سے لینا ہی کیا۔

عالم پناہ:۔ میں چاہتا ہوں آپ محل میں چل کر قیام کریں۔

شاہ صاحب:۔ شہر خموشاں کے باسی آبادی میں نہیں رہا کرتے عالم پناہ!

ملکہ:۔ مگر آپ کو محل میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

شاہ صاحب:۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیجئے، ملکۂ عالم! فقیروں کو ستانا اچھا نہیں ہوتا۔

عالم پناہ:۔ فقیر ضد نہیں کیا کرتے۔

شاہ صاحب:۔ اچھا عالم پناہ! میں تیار ضرور ہوں مگر۔

عالم پناہ:۔ مگر —— کیا کوئی شرط؟

شاہ صاحب:۔ شرط نہیں درخواست عالیجاہ! درگاہ میں کوئی عمارت نہیں جہاں میرے مرید، زائرین اور دوسرے لوگ جاڑے، گرمی اور برسات کی مصیبت سے بچے رہیں۔

ملکہ:۔ تیار ہو جائے گی ایسی عمارت! تو آپ ہمارے ساتھ چلئے۔

شاہ صاحب:۔ قوالی کا وقت آگیا ہے ملکۂ عالم! میری آرزو ہے کہ آپ بھی سنیں۔

ملکہ:۔ کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

قوالی:۔ نشۂ عشق کا گر ذوق دیا تھا مجھ کو عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل کو میرے خُم و خمخانہ بنایا ہوتا
اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیراں کیا کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا
تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

(قوالی ختم ہوتی ہے۔ عالم پناہ ایک لڑکی کو دیکھتے ہیں)

عالم پناہ:۔ یہ کون لڑکی ہے شاہ صاحب!

شاہ صاحب:۔ معلوم نہیں۔ عرصہ سے یہاں مقیم ہے۔

عالم پناہ:۔ یہاں آ او لڑکی!

لڑکی:۔ (دور سے) حاضر ہوئی عالم پناہ! (نزدیک آکر) فرمائیے عالم پناہ!

عالم پناہ:۔ تمہارا چہرہ غمگین ہے۔ چہرہ پر خوشی کے آثار قطعی نہیں ہیں۔

لڑکی:۔ مصیبت زدہ کے چہرہ پر خوشی عالم پناہ!

شاہ صاحب:۔ مگر نغموں سے تو روح میں بیداری پیدا ہو جانا چاہئے تھی۔

لڑکی:۔ عالیجاہ! روح میں بالیدگی، ذہن میں بیداری اور دل میں شگفتگی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انسان دکھ سے آزاد ہو۔

ملکہ:۔ مگر موسیقی مردہ جذبات کو زندہ کر دیتی ہے۔

عالم پناہ:۔ بیشک! ٹھنڈے دلوں کو گرماتی ہے۔

شاہ صاحب:۔ اور حوصلوں کو بڑھاتی ہے۔

لڑکی:۔ یہ سب اس وقت جب دل میں زندگی کے آثار موجود ہوں مصیبت...

شاہ صاحب:۔ مصیبت —— چونکہ مصیبت میں ہوش و حواس درست رکھتی ہے۔

عالم پناہ:۔ یہ بڑے گھرانے کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔

شاہ صاحب:۔ مگر اب تو نہیں ہے عالم پناہ!

لڑکی:۔ میں ایک گدڑی کی لعل ہوں میں اور اسی میں رہنا چاہتی ہوں۔

عالم پناہ:۔ اگر تمہیں کوئی تاج کا نگین بنانا چاہے تو۔

لڑکی:۔ غریب ایسے خواب نہیں دیکھا کرتے..... مجھے اس درگاہ کی فقیری...

عالم پناہ:۔ درگاہ کی فقیری میں تم کو کیا ملے گا؟

لڑکی:۔ دنیا اور عقبیٰ —— دونوں۔

عالم پناہ:۔ عقبیٰ کا حال کس کو معلوم ہے —— اپنی دنیا تو بنا لو۔

ملکہ:۔ میں چاہتی ہوں اس کو اپنی کنیزوں میں داخل کروں۔

لڑکی:۔ وہاں کیا کرنا ہوگا ملکۂ عالم!

ملکہ:۔ باغ سے پھول توڑ کر لانا ہوں گے۔

لڑکی:۔ تو پھر میں شاہ صاحب کے پاس نہ آسکوں گی؟

ملکہ:۔ تم کو اس کی مہلت دی جایا کرے گی۔

(باقی آئندہ)

# منحوس ہیرا

خاکہ

اسٹینلے کلارک

دنیا میں صرف انسان ہی "سبز قدم" نہیں اور بھی بہت سی چیزیں ہیں اور انہی بہت سی چیزوں میں ہیرے جواہرات ہیں۔ قیمتی پتھروں کے اچھے اور برے اثرات کی کہانیاں ہم نے اور آپ نے بہت سنی ہیں۔ لیکن شاید "ہوپ ڈائمنڈ" کی کہانی سب سے عجیب وغریب ہے۔

بیضوی شکل اور ہلکے نیلے رنگ کی جھلک دینے والے اس ہیرے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے ساتھ بلا لے جاتا ہے اس کے مالک کو ہمیشہ غم واندوہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ حقیقت تمام دنیا میں ایک ضرب المثل بن گئی ہے کہ جو کوئی اس ہیرے کو چھو لے اسے ہر امید سے مایوس ہو جانا چاہئے۔

یہ خوبصورت ہلکے نیلے رنگ کا پتھر برما کے کسی مندر میں ایک مورتی کی آنکھ میں جڑا ہوا تھا۔ ۳۰۰ سال پہلے کوئی برمی اسے وہاں سے چرا کر ہندوستان لے آیا۔ یہاں یہ ہیرا ایک فرانسیسی سیاح جین بیپٹسٹی ٹیورنیر کے ہاتھ لگا جسے ہیرے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ جب یہ سیاح پیرس واپس پہنچا تو اس نے اس ہیرے کو اپنے بادشاہ لوئی چاردہم کی نذر کر دیا۔

یہ تو نہیں معلوم کہ بادشاہ لوئی نے اس ہیرے کی کیا قیمت ادا کی لیکن خود اس نے اور اس کے جانشینوں کو اسے اپنی املاک میں رکھنے کا زبردست خمیازہ بھگتنا پڑا۔ سیاح ٹیورنیر کو بیرن بنا دیا گیا تھا اور وہ اپنے اس نئے اعزاز کے ساتھ اور ہیروں کی تلاش میں ماسکو جانے کے لئے روانہ ہوا۔ اس عجیب وغریب نیلے ہیرے کی پہلی نحوست یہیں ظہور میں آئی۔ روسی دارالخلافے میں جنگلی کتوں کے ایک غول نے ٹیورنیر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔

گویا ۱۶۸۹ء میں ٹیورنیر کی ناگہانی موت اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی جس نے اس مشہور ہیرے سے متعلق مصیبتوں اور اموات کی تاریخ مرتب کر رکھی ہے اور زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی ہے۔

بادشاہ لوئی چہاردہم نے یہ ہیرا اپنی محبوبہ میڈم دی مونٹسپان کو تحفتاً دے دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سال میں میڈم ڈی مینٹینن اسکی جگہ آگئی اور اس نے میڈم ڈی مونٹسپان کو نکال باہر کیا۔ بادشاہ لوئی نے بلینہم۔ رامیلیز۔ اوڈی نرڈے اور مال پلاکوئٹ کی لڑائیوں میں مال بورو سے شکست کھائی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی یورپ کی چودھراہٹ بھی ختم ہو گئی۔

پھر یہ نیلا ہیرا جو حیات انسانی پر اثر انداز ہونے کی عجیب وغریب قوت حاصل کر رہا تھا بادشاہ لوئی پنجدہم کی املاک میں آیا اور یہ بادشاہ کس مپرسی کی حالت میں ایک ملعون کی موت مرا۔

اس کے بعد یہ ہیرا بادشاہ لوئی شانزدہم کی املاک میں آیا جس نے اسے میری اینٹونٹ (MARIE ANTOINETTE) کو بطور تحفہ دے دیا۔ انقلاب فرانس میں بادشاہ لوئی اور اس کی ملکہ میری اینٹونٹ کے سر گلوٹین سے اڑا دئے گئے۔ اور ان کے محل سے جہاں اور شاہی جواہرات لٹے یہ نیلا ہیرا بھی لٹ گیا اس کے بعد یہ ہیرا کچھ عرصے تک غائب رہا۔ اور آخرکار پیرس کے ایک بہت مالدار شخص فرنیکوز بیولیو نے اسے اس چور سے خرید لیا۔ دس سال کے اندر اندر بیولیو بھوکوں مر گیا اور یہ ہیرا ایمسٹرڈم کے ایک ہیروں کے تاجر ولیم فالز کے ہاتھ لگا۔ اس نے اس کو نئی طرز سے کاٹا اور اس کا وزن ۱۱۲ قیراط سے گھٹا کر ۴۴½ قیراط کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اس ہیرے کو سرے کے رہنے والے مسٹر ہنری ٹامس آف ڈیب ڈین کے ہاتھ جو ایمسٹرڈم کا ایک بینکر تھا ۱۸۰۰۰ پونڈ میں بیچ دیا۔ کچھ ہی سال بعد ولیم فال کا کاروبار تباہ ہو گیا اور وہ ایک ایک پیسہ کو محتاج مرا۔

ہوپ خاندان میں اگرچہ یہ ہیرا تقریباً سو سال رہا لیکن اس خاندان کے کسی فرد کی موت کسی حادثے سے نہ ہوئی۔

نیوکیسل کے آٹھویں ڈیوک کو یہ ہیرا اپنی ماں سے ورثہ میں ملا۔ اس نے ایک دفعہ کہا کہ اس پتھر کے اثر سے میرے خاندان پر تو کوئی بھی مصیبت نازل نہیں ہوئی ہمیں کوئی وجہ ایسی نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے اس ہیرے کی نحوست کا یقین کیا جائے۔ ڈیوک نے یہ بیان ۱۹۳۸ء میں دیا تھا۔ ڈیوک نے یہ ہیرا اس سے ۲۹ سال پہلے بیچ دیا تھا لیکن ڈیوک کی پہلی بیوی مے یوہی جو گے نائٹ ٹیز میں مزاحیہ کردار کا پارٹ ادا کرتی تھی اپنی بعد کی مصیبتوں کو اسی ہیرے سے منسوب کرتی تھی۔

دو بار طلاق لینے کے بعد اس نے کیپٹن جون سمٹس سے شادی کی جو جنوبی افریقہ کے فیلڈ مارشل سمٹس کا رشتہ دار تھا۔ شادی کے تھوڑی مدت میں وہ ہوٹل جس میں اس نے اپنی تمام پونجی لگا رکھی تھی جل کر خاک ہو گیا۔ اور اس کا شوہر مسلسل بیمار رہا۔ اور مے یوہی خود مفلس و نادار مری۔

نیوکیسل کے آٹھویں ڈیوک نے ہوپ ڈائمنڈ کو ۱۹۰۹ء میں ۱۲۰۰۰ پونڈ میں سوسر جیکس کولٹ کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس ہیرے کے خریدنے کے بعد ایک سال کے اندر اندر کولٹ ایک سٹاک مارکیٹ فیل ہو جانے سے برباد ہو گیا اور اس نے خودکشی کر لی۔

اس کے بعد یہ ہیرا ایک روسی شہزادے کانی ٹوو سکی کی املاک میں آیا جو پیرس میں رہتا تھا۔ اس نے یہ ہیرا ایک فرانسیسی ایکٹرس کو عاریۃً دے دیا اور پھر اسے گولی سے مار دیا۔ اس کے دو ہی دن بعد محدود

ایک گروہ نے جواہر کا پیچھا کرتے ہوئے روس [illegible] کی گلیوں میں خنجر گھونپ کر اسے جان سے مار دیا۔

اس کے بعد یہ نیلا ہیرا ایک یونانی امیر سائمن مونتھرائڈز کے ہاتھ لگا۔ چند ہی مہینوں بعد اس ہیرے کا نیا مالک۔ اس کی بیوی اور دو بچے جب اپنی موٹر میں سفر کر رہے تھے۔ تو موٹر پہاڑوں میں ایک سیدھی چٹان سے ٹکرائی اور سب کے سب ہلاک ہو گئے

اس کے بعد ہوپ ہیرا ترکی کے بادشاہ سلطان عبدالحمید استنبول کے محل [illegible] ہیروں کے ذخیرے [illegible] پہنچا۔ سلطان نے اس [illegible] [illegible] ملکہ سلمہ زبیدہ کی نذر کر دیا۔ ایک روز معمول کے خلاف سلطان [illegible] میں لیا اور اسے اس خوبصورت [illegible] پتھر کے لیئے دکھ [illegible] مار دیا۔ اس کے چند ہی مہینوں بعد نوجوان ترکوں نے سلطان کو تخت سے اتار دیا۔

اس کے بعد یہ ہیرا حبیب نامی ایک ایرانی تاجر کے ہاتھ لگا جو اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد سنگاپور سے آگے ایک دخانی [illegible] کے ساتھ ڈوب گیا۔

اس کے بعد یہ ہیرا امریکہ کے واشنگٹن ڈی سی کے میکلین [illegible] نے خرید لیا۔ یہ ہیرا اب انہی کے پاس ہے۔ اس ہیرے کو [illegible] کے وقت یہ عہدنامہ ہوا کہ اگر چھ ماہ کے اندر میکلین خاندان میں کوئی حادثہ یا موت واقع ہوئی تو اس ہیرے کو ہم قیمت ہیرے [illegible] بدل لیا جائے گا۔

مسز ایولین میکلین کا ایک دس سالہ لڑکا ونسن تھا جسے ہوپ ۰۰۰۰۰۰۰ ۲ پونڈ والا بچہ کہتے تھے۔ مسز ایولین میکلین نے اس ہیرے کو خریدنے کے کچھ ہی دن بعد خود اپنی آنکھوں سے اس بچے کی موت دیکھی میکلین کی واشنگٹن والی حویلی کے عین سامنے یہ بچہ موٹر کے نیچے آیا اور مر گیا۔

مسز میکلین نے اپنے بچے کی موت کو اس ہیرے کی نحوست سے منسوب نہیں کیا اور اس کے کچھ سال بعد کہا کہ اس ہیرے نے مجھ پر تو کوئی اثر نہیں ڈالا لیکن میرے دوستوں پر جو اس کے اثرات ہوئے ان سے خوف آتا ہے۔ صرف ایک سال گزرا کہ میری ایک سہیلی نے اس پتھر کو چھوا اور اس کی نحوست سے انکار کیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد اسے کسی نے گولی کا نشانہ بنایا اور وہ مری ہوئی پائی گئی۔ چھ سال گزرے ایک شخص نے اس ہیرے کو چھوا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے زہر کھا لیا اور تین دن میں مر گیا۔

سالہا سال گزرتے رہے اور یہ احساس ہونے لگا کہ ہوپ ہیرا میکلین خاندان کے افراد پر منحوس اثر ڈالنے میں ناکامیاب ہو رہا ہے لیکن گزشتہ ستمبر کا حادثہ ہوپ ہیرے کے تین سال پرانے ڈرامے کا تازہ ترین باب ہے۔

ہوپ ہیرے کی مالکہ مسز ایولین میکلین کی پچیس سالہ لڑکی مسز ایولین میکلین رینولڈز اپنے پلنگ پر ترچھی لیٹی ہوئی مردہ پائی گئی۔ پلنگ کے قریب [illegible] گولیوں کی ایک بوتل پڑی ہوئی تھی جو خالی تھی۔ تھا ہوپ ہیرے کا یہ نیا شکار تھا۔

آخر اس ہیرے کی نحوست کے قصے کی حقیقت کیا ہے۔ اس ہیرے کے تقریباً تمام مالکان نے اس خیال کا مذاق اڑایا کہ کیا [illegible] ہیرے جیسی بے جان چیز بنی نوع انسان کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ ایسے قصوں کے متعلق ان کا خیال نہایت قابل [illegible] ہے یعنی اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ کار روشن خیالی کے منافی ہوگا۔

تاہم ایک سوال تشنۂ جواب ہے۔ یہ نیلم جیسا نیلا خوبصورت ہوپ ہیرا جسے برما کے معبد سے کسی برہمن نے چرایا تھا۔ [illegible] کے بعد سے بہت سے لوگوں کے پاس رہا اور ان میں ہر ایک کو مصائب، حادثات اور موت سے دوچار ہونا پڑا۔ [illegible] لٹمس فیچر سے ماخوذ

# خواہران ہاشمی

[illegible] ہوا [illegible]

[illegible] پوچھ [illegible]

[illegible] ضیا خانہ [illegible]

[illegible]

اسے تم سے ہزاروں کی نگاہ [illegible]

[illegible]

[illegible] خوف نہیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سرخ [illegible]

[illegible]

جس آب شفق رنگ میں [illegible]

[illegible]

مطلوب ہو [illegible]

[illegible]

حمید علیم ہاشمی [illegible]

## غزل

**ندرت میرٹھی**

عشق کے سجدہ ریز کو عذر قیام چاہیے
راہ طلب میں ہر جگہ لغزش کا کام چاہیے

دل کو بھی شغل چاہیے لب کو بھی کام چاہیے
آپ کی یاد چاہیے۔ آپ کا نام چاہیے

منہ سے لگاتے ہی جسے دور ہو نشۂ خودی
مجھکو وہ بادہ چاہیے۔ مجھکو وہ جام چاہیے

یوں نہ قدم بچا کے رکھ دل کو مرے مٹا کے چل
راہ میں نقش شوخیٔ حسن خرام چاہیے

موت ہو یا حیات ہو یہ تو انھیں ہے اختیار
انکی طرف سے کچھ نہ کچھ مجھکو پیام چاہیے

رنگ نہ دیگی جام میں صرف جھلک شراب کی
عکس بھی تیری آنکھ کا زینتِ جام چاہیے

میرا مذاق سجدہ ہے طالبِ شان امتیاز
دیر و حرم سے اک الگ مجھکو مقام چاہیے

پیرِ مغاں تری شراب زینتِ خم ہی کیوں رہے
شیشہ بشیشہ چاہیے جام بجام چاہیے

ندرت اُڑا رہا ہے تار دامن چاک چاک کے
عشق جنوں نواز کو کوئی تو کام چاہیے

## غزل

**ناظر فاروقی ردولوی**

جھلکتے ہیں پلکوں پہ ان کی ستارے
گزرا جا رہا ہوں ندامت کے مارے

نگاہوں سے اوجھل ہیں دونوں کنارے
کہو ناخدا سے خدا کو پکارے

کھٹکتے ہوں آنکھوں میں جس کی ستارے
وہ آخر شب ہجر کیسے گذارے

وہی اپنا جادہ وہی اپنی منزل
جہاں بیٹھ جائیں مصیبت کے مارے

بوقت جدائی جو آنکھوں نے دیکھا
وہ عالم کوئی دل سے پوچھے ہمارے

کئی بار کشتی چلی سوئے منزل
مگر ہو گئے آ کے حائل کنارے

یہ دنیا جو منزل میں حائل ہے ناظر
ہٹاؤ اسے راستے سے ہمارے

## غزل

**منظور عارف**

جو چپ ہیں سفر حائل راہ و مقام ہوتی ہے
وہ ایک رہرو خستہ کی شام ہوتی ہے

وہ زندگی جسے ہم موت سے ڈراتے ہیں
فنا میں کھو کے بقائے دوام ہوتی ہے

مے نو تبسم کے پی چشم مست ساقی سے
بغیر اسکے ہر اک مے حرام ہوتی ہے

کسی کو دیتی ہے شب بھی نوید صبح بہار
کسی کی صبح بھی ہمرنگ شام ہوتی ہے

بسایا جاتا ہے برسوں میں دل کی بستی کو
مگر یہ چشم زدن میں تمام ہوتی ہے

مرے سکوت پہ حیراں نہ ہو زمانہ کہ زیست
خموش ہوتی ہے جب تیز گام ہوتی ہے

یہاں کی ہر تگ و دو بے سبب نہیں عارف
ہر ایک چیز اسیر نظام ہوتی ہے



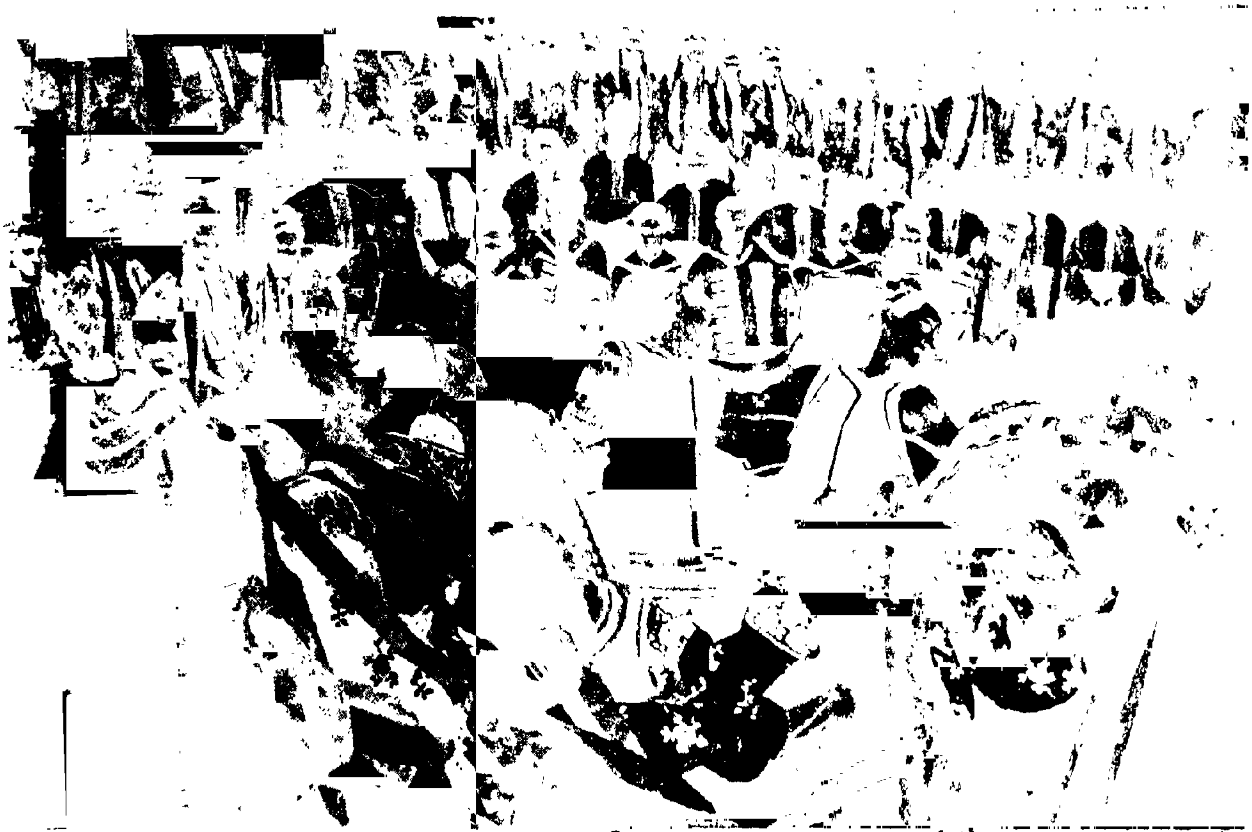
# نئے اور پرانے وائسرائے

هندوستان کے نئے وائسرائے هوائی جهاز سے ذریعه ۲۲ مارچ کو نئی دهلی پهنچ گئیے۔ هوائی اڈے پر پرانے وائسرائے لارڈ ویول' آنریبل مسٹر لیاقت علیخاں' پنڈت جواهرلال نہرو اور دیگر عمائدین حکومت نے انکا استقبال کیا۔ لارڈ ویول انهیں وائسرائے محل میں لیگئے۔ هندوستان کی تاریخ میں یه دوسری مثال هے که دو وائسرائے بیک وقت اس سرزمین پر موجود پائے گئے۔ تیسرے دن دربار هال میں نئے وائسرائے نے حلف وفاداری اٹھایا۔ یه رسم بڑی شان کے ساتھ ادا کی گئی۔ انهوں نے اس موقع پر هندوستان کے مستقبل پر مختصراً اپنے خیالات کا اظهار بھی کیا۔ یه ایسی بات تھی جو اس سے قبل کبھی عمل میں نهیں آئی۔ رسم کی ادائیگی کے وقت وائسرائے کی کابینه کے بهت سے اراکین بھی موجود تھے۔

هندوستان کے نئے وائسرائے لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن پرانے وائسرائے لارڈ ویول کے همراه وائسرائے محل کیطرف جا رهے هیں۔

وائسرائے محل کے دوبار هال میں نئے وائسرائے هندوستان کے چیف جسٹس آنریبل سر پیٹرک اسپنز کے سامنے حلف وفاداری اٹھا رهے





اوک ناچ کر مشق کی جا رہی ہے۔

# روسی طلبا کا
# مظاہرہ رقص و موسیقی

پچھلے سال موسم سرما میں عطائی فنکاروں کا ایک جلسۂ رقص و موسیقی ماسکو میں منعقد ہوا تھا۔یہ تصاویر اسی موقعہ پر لی گئی تھیں۔



روسی ناچ کا ایک مشہور ہدایت کار چند اوکرینی طالب علموں کے جھرمٹ میں جنھوں نے اسکے ساتھ ایک کھیل میں حصہ لیا



مدرسے کے طلبا اپنے خاص قومی لباس میں ایک ناچ کی مشق کر رہے ہیں۔

# اکٹ کے ذریعے ہوائی سفر

جامعہ ملیہ (دہلی)

موجودہ دور کے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کرۂ زمین سے دوسرے سیاروں میں راکٹ کے ذریعہ پنہچا جاسکتا ہے ۔ اکثر لوگوں کو جنھیں راکٹ کے متعلق معلومات کم ہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک موٹر کی وضع کا راکٹ بھی ہے جو ایسے طبقات میں بھی پرواز کرسکتا ہے جہاں ہوا کا نام کو بھی گزر نہیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ موٹر راکٹ ان طبقات میں جہاں ہوا نہ ہو زیادہ آسانی سے اڑسکتا ہے ۔ اور موٹریں تو پٹرول سے چلتی ہیں ۔ یہ موٹر راکٹ اکسیجن سے چلتی ہے ۔

راکٹ چلانے کی مشین ایک توپ کی مانند ہوتی ہے ۔ جس طرح ایک توپ گولہ پھینکنے کے بعد ذرا پیچھے ہٹ جاتی ہے اسی طرح راکٹ چلانے والی مشین راکٹ چل جانے کے بعد ذراسا پیچھے ہٹ جاتی ہے ۔

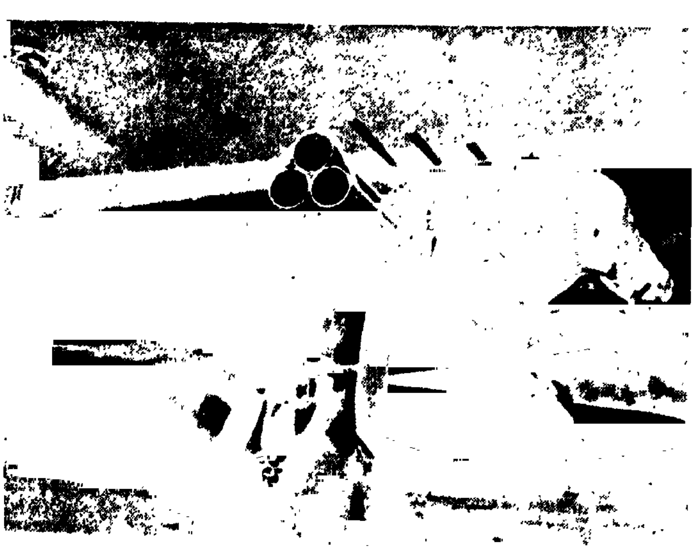


راکٹ والی مشینوں سے راکٹ چلائے جا رہے ہیں۔




ایک موٹر راکٹ جو آکسیجن سے چلتی ہے۔ لیکن آکسیجن کو پہلے مائع کی شکل میں تبدیل کر لیا جاتا ہے۔

۱۹۱۹ء میں ڈاکٹر رابرٹ گوڈارڈ نے ایک کتاب بعنوان «انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کے طریقے» لکھی ۔ اس میں ڈاکٹر گوڈارڈ نے اپنے نظریے اور ذاتی تجربات پیش کیئے اور آخر میں یہ خیال ظاہر کیا کہ راکٹ کے ذریعے چاند تک پہنچنا کوئی غیر ممکن بات نہیں ۔



ایک طیارہ جس میں تین دھن کی راکٹ چلانے والی مشین نصب ہے۔



ثریا

روایتی افسانہ

# دل تھا کہ نہیں

اشرف صبوحی دہلوی

کہتے ہیں اگلے زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ نہایت سخی، نیک اعتقاد والا۔ رعایا خوش، ملک آباد۔ ہر طرح کے عیش و آرام میں گزرتی تھی لیکن اولاد کی طرف سے میاں بیوی دونوں کے نصیبے کھوٹے تھے۔ جوانیاں یونہی گزگئیں اور گود میں ارمان کھیلتے نہ دکھائی دئے۔ نہ کلیجہ کی ٹھنڈک نہ تخت کا وارث۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رو یا کرتے جب پیر فقیر منتیں مرادیں ہو چکیں اور ساری تدبیروں سے ہار بیٹھے تو ایک دن محلدارنی نے خبر دی کہ بادشاہ بیگم امید سے ہیں۔ سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ نوبت نقارے خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ بڑی اللہ آمین سے نو مہینے گذرے۔ سارے آثار لڑکے کے تھے لیکن خدا کے کارخانے میں انسان کا کیا دخل۔ پیدا ہوئی تو بیٹی۔ دلوں کے ولولے دلوں میں رہ گئے۔

بادشاہ کو بڑا صدمہ تھا کہ خدا نے آرزو بھی پوری کی تو ادھوری کی۔ بارہ برس پیچھے کوکھ میں پھول آیا دیکھی بیرائے گھر کا۔ سلطنت کا چراغ گل کا گل رہا۔ بیٹی ذات بڑھاپے کا ٹھن ہوتی ہے مگر قسمت سے کہیں لڑا جاتا ہے۔ دھم ہو کر رہ گئے۔ وقت کی مصلحت اور اپنا شوق۔ بیٹی کو بیٹا مشہور کیا۔ لڑکوں کی طرح پرورش ہونے لگی۔ ہوش سنبھالا تو ہر فن کے استاد رکھے گئے تعلیم تربیت شہسواری۔ نیزہ بازی۔ سارے کرتب شہزادوں کے سے سکھائے۔ اسی کو اپنا ولی عہد بنایا۔ بادشاہ کی بیٹی۔ سانولی کی آب و ہوا چند روز میں کہیں سے کہیں نکل گئی۔ وہ حسن و رعنائی پاؤں نکالے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ لڑکپن جا رہا تھا اور جوانی آ رہی تھی۔ تیرہویں برس سے گذر کر چودھویں سال میں قدم رکھا تھا کہ بادشاہ کو موت کے فرشتہ نے آگھیرا۔ بڑھاپے کی طاقتیں کیا مقابلہ کرتیں۔ بادشاہی اور تخت سے اتر کر تختے پر آ بیٹھے۔

شاہزادی بنا ہوا شہزادہ تخت پر بیٹھا۔ مرنے والے کے ماتم سے فرصت ملی تو نئے بادشاہ کو سلام مجرے ہونے لگے۔ بڑے دھوم سے دربار ہوا خلعت بٹے انعام ملے۔ کچھ عرصہ تک تو شہزادی بادشاہت کرتی رہی اور اسے اپنی لڑکی ہونے کا خیال بھی نہیں آیا۔ لیکن کہاں تک۔ عورت ذات تھی کب تک دل کو مارتی۔ یہ حسن کی رت اور شباب کا موسم یونہی نکلا جاتا تھا۔ ادھر تو راز فاش ہونے کا ڈر ادھر مزاج کے موافق طبیعت کا جوڑ ملنا خدا ساز بات ہے۔ اپنے بس کا نہیں۔ آخر سوچتے سوچتے یہ صلاح ٹھہری کہ یہاں سے نکل چلو۔ خلقِ خدا ملک خدا۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی مائی کا لال مل ہی جائیگا۔

یہ منصوبہ گانٹھ وزیروں کو بلا کر کہا کہ "آپ جانتے ہیں ابا بدولت پر ابھی سلطنت کا بوجھ پڑا ہے۔ والد کی جدائی کا صدمہ اور ملک داری کی جھنجھٹ نے طبیعت پریشان کر دی۔ ہم چاہتے ہیں کہ تھوڑے دن سیر و شکار سے جی بہلائیں۔ آپ سب مل کر بادشاہت کے کام انجام دیں۔" وزیروں نے بڑی حجت کے بعد یہ بات منظور کی۔ اب شہزادی محل میں آئی اور اپنی والدہ سے ارادہ ظاہر کیا۔ انھوں نے پہلے تو بہت سمجھایا زمانے کی اونچ نیچ دکھائی لیکن جب وہ کسی طرح نہ مانی تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "اچھا بیٹی جاؤ۔ اللہ کو سونپا"۔ ماں سے اجازت پاتے ہی شہزادی اشرفیوں اور جواہرات سے خرجیاں بھر سپاہی بن گھوڑے پر بیٹھ ایک طرف کو نکل گئی ؎

ذرا سے بدن کی لی اور سنگل کی لی ؛ نکل محل سے راہ جنگل کی لی

ملکوں ملکوں پھری۔ سینکڑوں شہر چھان مارے۔ جس بستی میں گئی وہاں کے امیروں شریف زادوں سے ملی۔ نول کا دھنی۔ بات کا پورا۔ میل جول کا سچا کسی کو نہ پایا۔ کوئی کسوٹی پر پورا نہ اترا۔ جب تاؤ دیا کھوٹ نظر آئی۔ آخر مایوس ہو کر واپسی کا ارادہ کیا۔ اسباب سنبھال۔ دل میں طرح طرح کے خیال اپنے گھر کی طرف لوٹی۔

تھکے مسافر کی طرح اداس منزلیں طے کرتی چلی آ رہی تھی کہ ایکدم سامنے سے ایک سوار کمسن۔ خوش رو۔ تنا ہوا وضعدار ہتھیار لگائے گھوڑا اڑائے آتا دکھائی دیا۔ وہ صورت شہزادی کی نظروں میں کھب گئی۔ دل کو سنبھال کر للکارا "او چھوکرا جوان کہاں جاتا ہے موت تیرے قریب آ گئی"۔ یہ سنتے ہی سوار چوکنا ہوا۔ تیوری بدل۔ پیٹری جما۔ باگ کا پودا گانٹھ سنبھل بیٹھا اور قریب آ کر کہا

"دوست! میں نے تیری کیا خطا کی ہے جو تو میری جان کا لاگو ہوا ہے"

شہزادی:۔ ہم قزاق ہیں اور یہی کام ہے۔ جہاں اکیلے دکیلے کسی کو پایا۔ لوٹا کھسوٹا اور چلتے ہوئے ایک ہاتھ بھی لگا دیا۔ دشمنی اور قصور کیسا۔ اگر جان پیاری ہو تو جو کچھ گانٹھ میں ہو رکھ دو اور ٹھنڈے ٹھنڈے اپنا رستہ لو۔

سوار:۔ چہ خوش۔ چوروں پر مور اسی کو کہتے ہیں۔ میاں ہم خود اسی فکر میں تھے۔ شکر ہے سویرے سویرے بوہنی تو اچھی ہوئی۔ اب دیر نہ کرو یا تو یہ بیرہن گھوڑا۔ یہ نفیس ہتھیار اور جو کچھ مال تمہاری خرجیوں میں ہے ہم نے لیا یا ہمارے دو چار ٹوٹے پھوٹے ٹھیکرے تمہارے ہاتھ آئے۔ لیکن سامنا کرنا ہے۔ لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے۔

شہزادی: ۔ میں نے بھی ایسی ویسی کا دودھ نہیں پیا ہے اگر جیداری کا امتحان لینا ہے تو ان بے زبانوں کو کیوں ہلکان کرو۔ اتر پڑو۔ دو دو ہاتھ ہو جائیں۔

دونوں فوراً گھوڑوں پر سے کود تلوار سونت ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ بجلیاں کوندنے لگیں۔ ایسی کھٹ پٹ ہوئی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ آخر دونوں کا دم چڑھ گیا۔ کمال یہ تھا کہ کسی کی تلوار چلی اور کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اچھا اب صلح ہو جائے پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ بارے زندہ صحبت باقی۔

شہزادی: ۔ مگر یار یہ تو بتاؤ کہ تم ہو کون ہو اور کس فراق میں نکلنا ہوا ہے

سوار: ۔ خفت سے

ہا ۔ حال سے خود عرض حال ہو تا ہو ۔ نقیا آپ کی صورت سوال ہو تا ہے بھائی لمبی وقت کہا سناؤں۔ پھر کبھی فرصت ہوا تو سن لینا۔ اس وقت تو نوکری کی تلاش ہے۔ کوئی قدردان مل جائے تو ۔۔۔ ہاتھ بٹاؤں تو رہیں

شہزادی: ۔ [illegible] تو ۔۔۔ فیصلہ نہیں؟

سوار: ۔ کے ساتھ ۔۔۔ آتی ہو۔

شہزادی: ۔ تو پھر ۔۔۔ سے ہمارے ساتھ رہو۔ جو کچھ ہاتھ آئے آدھا آدھا بانٹ لو۔

سوار: ۔ سو ۔۔۔ مجبوری ہے ۔۔۔ کرنی ہوتی تو کیا ہوتا ہے ۔۔۔ ہاتھ میں مہندی لگی ہے ۔۔۔ کے ۔۔۔ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

شہزادی: ۔ اچھی تم ۔۔۔ کسی کی نگری کا تنہا ہم جانیں اور ہمارا کام۔ لیکن ہمارے ساتھ رہنا ورنہ ہماری بھائی بندی بگڑ جائے گی۔

الغرض عہدوپیمان ہو کر دونوں ساتھ آگے بڑھتے۔ بھوک لگی ہوئی تھی اتفاق سے ایک ہرن نظر آیا۔ شکار کیا۔ شہزادی نے کہا کہ بغیر نمک مرچ مزہ کیا آئے گا۔ تم کباب بھونو میں کہیں سے مصالحہ لاؤں۔ وہ کسی گاؤں کی تلاش میں گئی۔ سوار نے گوشت کے پارچے سینکے۔ ۔۔۔ کی مثل مشہور ہے کہ بھوک میں کواڑ بھی پاپڑ ہو جاتے ہیں۔ سوندھی سوندھی خوشبو جو ناک تک پہونچی تو کیا نمک اور کہاں کی مرچ۔ یونہی ایک بوٹی چکھ گئے۔ اب جو مزہ لگا تو پورا ایک پارچہ بمعہ کلیجی بھوں بھون کے دل دکھ لی دی۔ اسے بھی نوش جان کیا ساتھی کا دھیان بھی نہ آیا۔ اتنے میں شہزادی نمک مرچ لے کر آ گئی۔ اور الاؤ کے پاس بیٹھ کر پہلے کلیجی پر ہاتھ مارا۔ دیکھا تو دل کا پتہ نہیں۔ بہت ملال ہوا کہ پہلی بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ یہ شخص تو حد کا خود مطلب نکلا۔ کہنے لگی ۔۔۔ عزیز شاید اس ہرن کا دل نہ تھا یا تم نے چٹ کیا۔ سوار میاں بہت جھینپے کہ ابھی اچھا نہیں ہوا۔ ایسی پا دھاپلی کس کام کی۔ اب مکر جاؤ اسی میں بچاؤ ہے۔ بولا بھائی میں بھی حیران ہوں۔ یہ کیسا ہرن تھا جس کے دل نہیں۔ شہزادی نے

جھلا کر کہا دوست مفت اشتبہ مردوں سے بھی ۔۔۔ لگی۔ کہیں سنا بھی ہے کہ ہرن کے دل نہ ہو۔ خیر گزشتہ را صلواۃ آئندہ را احتیاط۔ ظاہر میں مذاق کر کے ٹال دیا۔ مگر دل میں ٹھان لی کہ اس ہاتھ چھانٹی کا بدلہ نہ لیا ہو اور تیری زبان سے نہ قبلوایا تو بات ہی کیا۔

بات آئی گئی ہوئی۔ دونوں کھا پی آگے بڑھے۔ چلتے چلتے رات آئی۔ صاف ستھری جگہ دیکھ کر مقام کیا۔ سواریاں تھکے ماندے دوسرے کی دن کے پیٹ بھر کر کھانا ملا تھا لیٹتے ہی اشغال ہو گئے۔ شہزادی اپنے داؤں بیتی دونوں ہاتھ باندھ کے ۔۔۔ لٹکا دیا۔ اب جو سوار صاحب کی آنکھ کھلی ۔۔۔ تو جو ۔۔۔ کی طرح کنویں میں لٹکے ہوئے ہیں اور آقا صاحب تلوار سونتے سر پر کھڑی گرا کر کے پوچھ رہے تو ذرا یہ کیا حرکت ہے۔ جانتے ۔۔۔ جیا تو سوتے پر ہاتھ صاف کیا ۔۔۔ کو جواب دی ہیں۔ شہزادی نے ۔۔۔ نامردی اور ۔۔۔ ہوتے ۔۔۔ قصہ ختم لیکن ۔۔۔ اگر جان پیاری ہے تو یہ بتا ۔۔۔ نہیں۔

سوار نے ۔۔۔ جواب دیا "۔۔۔ آپ سے کوئی ۔۔۔ پھانسا کھا ۔۔۔ تو پہلے کہہ دیتے۔ ۔۔۔ بھڑک رہیں ۔۔۔ سے ۔۔۔ بات نہایت ہوا ۔۔۔

شہزادی: ۔ ۔۔۔ پانی تھا ۔۔۔ بیٹھے تھے۔

سوار: ۔ ۔۔۔ تو بھی ۔۔۔ خیر معاف ۔۔۔ چاہو تو کوئی چکمہ چلیں گے۔

شہزادی: ۔ دوست تو نے ٹھیک جواب دیا ہے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔ یاری میں ۔۔۔ ہرن کا دل تو نے ضرور رکھا ہے مگر اس کا خیر دیکھ لیا جائے گا۔

چلو یوں رات گزری ۔۔۔ مگر دن دونوں ۔۔۔ چلے یہ مثل مشہور ہے بھلے اور نہیں ۔۔۔ صبح ہوتے ہی ۔۔۔ تیاری کی۔ سوار نے اوپری دل سے انکار کیا۔ شہزادی نے سمجھا بجھا کر راضی کر لیا۔ اور دونوں روانہ ہوئے۔ دوسرے دن ایک شہر کے قریب پہنچے۔ شہزادی نے فصیل سے کچھ دور ایک پرانے مقبرے میں ڈیرے ڈالے۔ گھوڑوں کے دانے گھاس اور اپنے کھانے پینے کا سامان کیا۔ کچھ لیٹے کچھ بیٹھے۔ باتوں میں جب ۔۔۔ آدھی کے قریب آ چکی تو شہزادی ۔۔۔ سوار سے کہا "چلئے نوکری کا وقت آ گیا"۔ سوار جھجکا یا مگر کیا کرتا۔ کہ ۔۔۔ سے ۔۔۔ تھا۔ چپکا ساتھ ہو لیا۔ دروازے بند تھے۔ مورچی ۔۔۔ شہر میں داخل ہوئے دیکھ بھالتے بادشاہ کے محل کی دیوار کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ شہزادی نے ادھر ادھر دیکھ کمند کا لچھا ہاتھ میں تول دیوار پر پھینکا اور دونوں کے دونوں رسی کے

سہارے چھت پر چڑھ گئے۔ دیکھا کہ بادشاہ اپنی بیگم کے ساتھ آرام خاص میں ہیں۔ چار حبشنیں ننگی تلواریں لئے پہرہ پر ہیں۔ ایک جو سامنے آئی شہزادی نے سنگوانا چاہا۔ باقی تینوں بھی جھرمٹ کر کے آگئیں۔ یہاں بلا کی پھرتی۔ تیار رہا تھ۔ اس پھرتی سے سب کا کام تمام کیا کہ کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ چاروں کی منڈیاں دھڑ دھڑ رہیں اور جانیں ہوا ہو گئیں۔ پھر گہنے کا صندوقچہ جو سکھ سیج کی پٹی کے نیچے دھرا تھا اٹھا سوار کے پاس آئی۔ یہ بے چارہ ایک ستون کی آڑ میں دبکا کھڑا تھا۔ آتے ہی کمند کی ڈوری اس چالاکی سے پھینکی کہ حلقے گردن میں۔ ستون سے چھپکلی کی طرح چپک کر رہ گیا۔ اور ساتھ ہی پوچھا "سچ بتا اس ہرن کے دل تھا یا نہیں۔ دیکھو جان جوکھوں کا معاملہ ہے جھوٹ نہ بولنا"۔ سوار نے بگڑ کر کہا "جانے آپ ہماری زبان کو تولتے ہیں۔ ارے میاں دوسری بات دوغلے بولتے ہیں۔ ایک دفعہ کہہ دیا۔ ہزار دفعہ سن لو کہ اس ہرن کا دل ہوتا تو ہم پہلے ہی کہہ دیتے"۔

ہر چند شہزادی نے دم دلاسے دے کر پوچھا۔ ڈرایا دھمکایا لیکن سوار بھی اپنی بانی کا ایک ہی تھا نہ قبولنا تھا نہ قبولا۔ آخر جھلا اٹھی اور اس بے خطا کو وہیں ستون سے بندھا چھوڑ رفوچکر ہو گئی۔ بادشاہ کی جو آنکھ کھلتی ہے تو چراغ گل اور پگڑی غائب۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہرہ دارنیوں کو آواز دی۔ ایک جگہ تھکی بیٹھی ہیں اور بولتی نہیں۔ گوشمالی کرنی چاہی۔ پاس جا کر جس کو ہاتھ لگایا وہ مردہ۔ اتنے میں بیگم بھی چونکیں۔ ہلڑ مچ گیا۔ روشنی آئی۔ ایک مرد کی صورت دکھائی دی۔ بادشاہ نے کہا "لیجئے این گل دیگر شگفت۔ چوری اور سینہ زوری۔ آپ کون صاحب ہیں؟"

سوار:۔ چور۔

بادشاہ:۔ حرام خور تجھے کس نے باندھا؟

سوار:۔ حضور کے اقبال نے۔ مگر حرام خور نہیں۔

بادشاہ:۔ پھر کون ہے؟ نامراد!

سوار:۔ جی ہاں نامراد! قسمت کا ہیٹا۔

بادشاہ:۔ بڑا زبان دراز ہے۔

اسی حیص بیص میں دن نکل آیا۔ بادشاہ سلامت دربار میں تشریف لائے۔ اراکین سلطنت جمع ہوئے۔ چور کو بلا کر پوچھا "سچ بتا تو محل میں کیونکر آیا۔ پہرے والیاں کس طرح ماری گئیں اور تجھ کو کس نے باندھا؟

سوار:۔ کہہ دیا کہ یہ سب حضور کے اقبال کی یاوری یا میرے دنوں کا چکر ہے۔

بادشاہ:۔ بدبخت اپنے خون میں ناحق اپنے ہاتھ نہ بھر۔ جو بات ہو سچ سچ کہہ دے۔ نہیں تو بے گناہ مارا جائے گا۔ لیکن سوار اڑیل ٹٹو۔ اڑ گئے سو اڑ گئے۔ لاکھ طرح پوچھا وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔ بادشاہ کو بھی غصہ آگیا۔ قتل کا حکم دے دیا۔ سوار میاں کشاں کشاں خونی میدان میں لائے گئے جلاد تیغہ لے پینترہ بدل حکم کا منتظر کھڑا ہوا۔

سوار ناکردہ گناہ۔ پیٹ کا مارا۔ قول ہارا ہوا گھڑی گھڑی منہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا تھا کہ اللہ میاں میں کس بلا میں پھنسا۔ خاصہ بھلا چنگا اپنے ہاتھوں اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال بیٹھا۔ خیر جو تیری مرضی۔ اگر تیرا انصاف یہی ہے کہ خطا کرے ڈاڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا تو اچھا۔ دو حکم آ چکے تھے تیسرے کی دیر تھی کہ سامنے سے ایک گرد اٹھی۔ قریب آئی تو معلوم ہوا ایک سوار ہے۔ لوگ سمجھے کہ شاید آخری حکم لایا ہے۔ وہ سوار آتے آتے مجرم کے پہلو میں آ کھڑا ہوا۔ جلاد سے کہا ذرا ٹھہر جا اور اس کے کان سے منہ ملا کر پوچھا "سچ کہنا ہرن کے دل تھا یا نہیں"۔ قیدی جان سے بیزار جلا بھنا تھا چیخ کر بولا "ارے جا اپنا کام کر کہیں تجھ پر کوئی بلا نہ آ جائے۔ سن لے مردوں کا ایک قول ہوتا ہے۔ اس ہرن کا دل ہوتا تو ہم اسی وقت کہہ دیتے۔ شہزادی نے جھٹ کمند کا حلقہ کمر میں ڈال کر جو جھٹکا دیا تو زمین سے اچکا زین پر بٹھا لیا۔ پھر کیا تھا یہ جا وہ جا۔ لینا پکڑنا دوڑنا جانے نہ پائے کا غل مچتا رہا اور یہ آناً فاناً میں نظروں سے غائب۔

بادشاہ کو اس حال کی خبر ہوئی بہت بگڑا۔ پہرے والوں پر بڑی لے دے کی اور شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا کہ ما بدولت اس چور کی جیداری کے قائل ہیں مگر ایک دفعہ پھر وہ اپنے کو سرکار کے حوالے کر دے اور اس کا ساتھی پھر اسے چھڑا لے جائے تو جو مانگے پائے"۔

شہزادی شہر میں سیر گشت کرنے آئی ہوئی تھی "خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا" جو کہتے سنا کان لگے۔ مطلب سمجھ کر جلدی جلدی اپنی جگہ آئی اور اپنے ساتھی سوار سے کہا "یار کچھ سنا بھی۔ اللہ میاں بھی اللہ میاں ہی ہیں۔ بھئی واہ۔ ذرا سی کڑی اور جھیل ڈالو۔ بس پھر وارے نیارے ہیں"۔ سوار دکھیا منہ دیکھنے لگا۔

شہزادی:۔ دیکھئے کیا ہوا تھا۔

سوار:۔ بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔

شہزادی:۔ میاں ذرا سے کسالے میں راوی چین لکھتا ہے۔

سوار:۔ برائے خدا میری جان چھوڑ دیجئے۔ چولہے میں جائے آپ کا کسالا۔ مجھے چین نہیں چاہیئے۔ اللہ کے بندے تو کیوں میرا دشمن ہوا ہے۔

شہزادی (مسکرا کر) دشمنی کیسی میں تو تمہاری تقدیر بنا رہا ہوں۔

سوار:۔ قربان آپ کی تقدیر بنانے کے۔ نہیں بھئی بس کی تو بہ ہے میرا نصیب بگڑا ہی رہنے دو۔ میں بادشاہت کا بھوکا نہیں۔ جان ہے تو جہان ہے۔ اب تو حضور مجھ کو آزاد کر دیں۔

شہزادی:۔ (سوار کے گلے میں باہیں ڈال کر) اچھا اب تو بتا دو کہ اس ہرن کے دل تھا یا نہیں۔

سوار:۔ (آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) دیکھو جی یہ سوال پھر نہ کرنا۔ تم ہمیں آزماتے ہو۔ اس کم بخت ہرن کے دل ہوتا تو ہم کہیں تم سے چھپاتے۔

شہزادی :- (تیوری بدل کر) یہ بات ہے تو آپ کو بادشاہ کے پاس چلنا ہوگا۔ خوشی سے نہ چلو گے تو زبردستی جاؤ گے۔

یہ کہتے ہی کچھ ایسی بری نظروں سے گھورا کہ سوار میاں قہر درویش برجان درویش خون کا سا گھونٹ پی کر ساتھ ہولئے۔ دولت سرائے شاہی پر آکر شہزادی نے چوبدار کے ہاتھ بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ " ڈھنڈورے کی آواز چور اور اس کے ساتھی کو حضور میں لے آئی ہے۔ فرمائیے کیا ارشاد ہوتا ہے۔" حکم ہوا کہ ما بدولت اپنے اقرار پر قائم ہیں۔ چور کو اس کا ساتھی ہمارے حوالے کر دے۔ اب کے اگر وہ چھڑا لے گیا تو جاگیر اور انعام کے علاوہ منہ مانگی مراد ملے گی۔

شہزادی اقرار مدار کر سوار میاں کو بندی میں دے پینٹی پھرتی نظر آئی۔ ادھر چوبدار صاحب مشکیں کس آگے پیچھے پہرے لگا قتل گاہ میں پہنچا گئے۔ ساری فوج میدان میں گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ جب حفاظت کا بندوبست ہو لیا تو بادشاہ نے خاص مردھے کو بلا کر حکم دیا کہ تم ابھی جاؤ اور ہزار حکم کا ایک حکم ہے کہ اپنی آنکھوں کے سامنے اسے قتل کرا کے اسکا سر میرے سامنے پیش کرو۔ بہت ہوشیاری سے جانا اور میرا ابھی دوسرا حکم نہ سننا۔" مردھے صاحب تسلیمیں کرتے پچھلے قدموں ہٹے۔ باہر نکل عصا سنبھال گھوڑے پر سوار ہو چوکے خونی میدان کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی کوئی آدھا راستہ طے کیا ہوگا کہ جھاڑی کی اوٹ سے ایک سوار چھیلا نکلا اور گھوڑے سے گھوڑا ملا کمر میں ہاتھ ڈال بڈھے میاں کو زمین پر دے پٹکا۔ چھاتی پہ گھٹنا رکھ گلے کو ایسا دبایا کہ بے چارے دنیا سے خفا ہو گئے۔ اس نے انھیں تو دہیں چھوڑا ان کی پگڑی اور چوغہ پہن۔ عصا ہاتھ میں لے گھوڑا بڑھایا۔

ادھر لیجئے کہ مقتل میں ہر شخص اونچی بنا ٹکٹکی باندھے بادشاہ کے حکم کا منتظر تھا۔ مردھے کو جو آتا دیکھا سمجھے کہ حکم لے کر آرہے ہیں۔ جب حضرت سلامت قریب پہنچے تو صورت دیکھ کر دو چار بولے کہ یہ بڑے مردھے تو معلوم نہیں ہوتے۔ ان کی تو سفید بگلا سی ڈاڑھی ہے۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت رنگت میں بھی سانولے۔ یہ تو بے ڈاڑھی مونچھ۔ چودہ برس کا جوان۔ مہہ و شہاب۔ دیکھتے نہیں کس انوٹ سے گھوڑے پر بیٹھا ہے۔ دوسرے

# غزل

## آفاق دہلوی

راس آیا نہ کبھی اس کو گلستاں ہونا
تھا مقدر میں بیاباں کے بیاباں ہونا

لے اڑے ہیں کبھی شاید مرے دل کا انداز
کس سے سیکھا ہے یہ ذرّوں نے پریشاں ہونا

ہیں جیوں گا تو بنا دل گا تجھے بھی جاوید
مجھ سے اے عمر گریزاں نہ گریزاں ہونا

کس لئے گردش دوراں یہ تامل آخر
مجھے منظور ہے خود بے سر و ساماں ہونا

جب تک آنکھوں میں ہے تماشے کی قوت باقی
نہیں ممکن دل آباد کا ویراں ہونا

بازوؤں کو مرے بے چین کئے دیتا ہے
تیرے شانوں پہ یہ زلفوں کا پریشاں ہونا

مار ڈالے گا اسے شادی و غم کا احساس
آدمی کے لئے اک جبر ہے انساں ہونا

کس لئے بحر حوادث میں ابھرنے والے
ڈوبنے کے لئے منت کش طوفاں ہونا

ہاتھ آئے گا نہ کچھ دل کی تباہی کے سوا
تم نہ آفاق اسیر غم دوراں ہونا

کہنے لگے " بھائی آپ لوگوں پر تو وہم سوار ہو گیا ہے۔ بڑے مردھے نہ سہی چھوٹے سہی۔ دربار سرکار میں مردھوں کی کمی ہے۔ یہ کہو کہ بادشاہی ملازم ہے یا کوئی اور۔" اتنے میں نوجوان مردھے نے پکار کر کہا " بھائیو! خاموش میں شاہی حکم لایا ہوں۔ ذرا مجھے رستہ تو دو۔" یہ کہتے ہوئے مردھے میاں صفوں کو لانگتے پھلانگتے دراتا اپنے یار کے پاس جا دھمکے۔ وہاں جلاد نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر گردن پر خط لگا دیا تھا۔ مردھے بولے او بزدل نامراد قیدی۔ تیری عمر ختم ہوئی۔ یہ آخیر وقت ہے۔ اب تو سچ بول دے ورنہ کوئی دم کا مہمان ہے اور جھک کر کان میں کہا " کیوں اس ہرن کا دل نپھا یا نہیں۔" جان جائے اور آن نہ جائے۔ قیدی نے ڈپٹ کر جواب دیا " دیوانے سمجھے باولے کتے نے کاٹا ہے جس کی بار بار ترس اٹھتی ہے۔ مرد کہیں موت سے ڈر کر زبان بدلا کرتے ہیں۔ افسوس بندھا ہوا ہوں ورنہ جی تو یہ چاہتا ہے کہ تیری بات کا جواب ہاتھ سے دوں۔ جا چلا جا۔ ایک دفعہ کہہ دیا ہزار دفعہ کہہ دیا کہ اس ہرن کے دل نہ تھا۔ جیتے جی کیا مرنے کے بعد میری خاک سے بھی پوچھو گے تو یہی سنو گے۔"

بناوٹی مردھے نے کمر سے قرولی نکال آنکھ جھپکتے بندکاٹ ہاتھ پکڑ گھوڑے پر بٹھالیا۔ اور آواز دی کہ ہم اپنا ساتھی دن دہاڑے اتنے لوگوں میں سے لئے جاتے ہیں۔ ہے روکنا ہو روکے۔" یہ سننا تھا کہ فوج میں کھلبلی پڑ گئی۔ بڑے بڑے تلواریوں کے اوسان جاتے رہے۔ سواروں نے گھوڑے اٹھائے۔ پیدلوں نے تیغے تانے۔ بہتیری دوڑ دھوپ کی مگر جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ آقا اور نوکر دونوں چھوٹے صاف اور بے لاگ نکل گئے۔ خبرداروں نے فوراً بادشاہ کو پرچہ گزارا۔ بہت طیش آیا۔ افسروں پر غصی آئی۔ کوئی نکالا گیا کسی کو قید میں ڈالا۔ یہاں تو یہ دھوم دھڑکا ہو رہی تھی۔ وہاں وہ دونوں اللہ کے شبیر جب اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو تھوڑی دیر دم لیا اور ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ پھر شہزادی مسکرا کر کہنے لگی " دو منشی برا نہ ماننا۔ واللہ میں تمہارا دلی دوست ہوں۔ کلفت کے دن دور ہوئے اب کوئی دم میں سارا بھید کھلا جاتا ہے۔

سوار :- بس حضت بس۔ دیکھ لی آپ کی دوستی دشمنی۔ بھر پایا۔

شہزادی :- کیوں ناراض ہوگئے۔ چلو من جاؤ۔ اٹھو کپڑے پہن کر دربار کی تیاری کرو۔

سوار :- میری توبہ ہے۔ آپ ہی تشریف لے جائیے۔

شہزادی :- ایسا ہو سکتا ہے۔ مصیبت میں تو ساتھ دے راحت کا وقت آیا تو تمہیں چھوڑ دوں۔

یہ کہہ کر شہزادی نے اپنے ہاتھ سے میاں سوار کو زرق برق کپڑے پہنائے خود بھی آراستہ ہوئی۔ دونوں گھوڑوں پر سوار ہو بادشاہ کے دربار عام میں آئے۔ اطلاع ہوئی بلائے گئے۔ تنتنے مسکراتے پہنچے۔ قاعدے سے نذریں پیش کیں۔ اشارہ پایا۔ قرینے سے مودب شہزادوں کی طرح داہنی جانب بیٹھے۔ بادشاہ سلامت نے بھرے دربار میں تعریف کی کہ حقیقت میں دلیری اور جوانمردی میں تم ہی دونوں اپنا جوڑ ہو۔ مابدولت تم سے بہت خوش ہیں۔ اب مانگو کیا مانگتے ہو۔ شہزادی نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "جہاں پناہ کی عمر میں ترقی اور اقبال بلند ہو۔ خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ حضور کا سا قدردان ہو تو کس بات کی کمی۔ لیکن ذرا کی ذرا اکیلے میں ہماری سن لیجئے۔" تخلیہ ہوگیا تو شہزادی سر جھکا کر کہا "پیر و مرشد میرا قصہ دیوانی جوانی کی کہانی ہے۔ میں مرد نہیں بلکہ شہزادی ہوں۔ چودہ برس تک لڑکا بنی ہوئی تعلیم و تربیت پاتی رہی۔ قبلہ گاہی کے بعد وزیروں امیروں نے مجھے تخت پر بٹھایا۔ ظاہر ہے حکومت کرنی تھی اور دل یہ سوچا کرتا تھا کہ آخر یہ راز کب تک چھپے گا۔ عورت بے شوہر کیوں کر خوشی سے جی سکتی ہے۔ آخر شامت کی مار ایک دن کیا سوجھی کہ گھر سے نکل چلئے اور کوئی ایسا مرد تلاش کیجئے جو اور خوبیوں کے ساتھ بات کا پکا اور قول کا مضبوط ہو۔ دھن کچی نہ تھی۔ کوچہ گردی شروع کی۔ خدا خدا کرکے بہت دنوں میں محنت ٹھکانے لگی۔ ایک شریف اصل نسل والے ہیں جو بات ہونی چاہیئے وہ تھوڑی بہت اس شخص میں پائی اس لئے چاہتی ہوں کہ زندگی کے باقی دن اس کے ساتھ بسر کردوں۔ اس چھوٹے مردپنے اور دھوکے کے کپڑوں سے ہاتھ اٹھاؤں۔ اتنی تکلیف کیجئے کہ قاضی کو بلا کر اپنے سامنے ہمارا نکاح پڑھوا دیجئے"۔ بادشاہ کو حیرت ہوگئی اور سوار میاں کو بے مانگی مراد ملی۔ نہال ہوگیا۔ اسی وقت زنانہ جوڑا آیا۔ بیگم بیٹی کی ماں اور بادشاہ بیٹے کے باپ بنے۔ قاضی صاحب طلب ہوئے اور خدا کی شان ہے کہ لمحہ بھر میں ڈاکو اور سوار۔ نوکر اور آقا میاں بیوی بن گئے۔ خاص بارہ دری رہنے کو ملی۔ کھانے سے فراغت پاکر دولھا میاں جو مسہری پر لیٹے نوشاہزادی نے گھونگھٹ میں سے پوچھا "سنو اب تو جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ ہمارا تمہارا عمر بھر کا ساتھ ہے۔ پردہ کاہے کا۔ بھلا اتنا تو بتاؤ کہ اس ہرن کے دل تھا یا نہیں" جوان نے دانتوں تلے انگلی دبا کر کہا کہ "ہا! ایسی بات پھر نہ کہنا۔ یہ چونچلے مجھ کو نہیں بھاتے۔ مجھے دغا سمجھتی ہو۔ اس ہرن کا دل کیسا اگر ہوتا تو آج کا دن نصیب نہ ہوتا۔" شاہزادی بھڑک گئی اور تکئے کے نیچے سے بچھوا نکال کر دکھایا کہ "تمہاری جان کی قسم! اب بھی اگر دوسری بات زبان پر لاتے تو یہ ناگن سینے کے اندر تیرتی ہوتی۔"

# رُت رنگیلی

پھر ٹھنڈی ہوائیں سنکی ہیں پھر بادل اُمڈا آتا ہے
اُٹھتی ہیں اُمنگیں دل میں لیکن دل کیوں بیٹھا جاتا ہے

اس طرح شفق میں پھیلی ہے ہونٹوں پہ تبسم کی بجلی
جیسے کوئی دل کی دنیا میں پھر آگ لگاتے آتا ہے

ہو منکا ڈھلا نبضیں ڈوبیں اب تم بھی جیتے جی جاؤگے
اب موجیں ٹھیری جاتی ہیں اب دریا اترا جاتا ہے

دریائے الم میں ہل چل ہے ساحل سے چلی کس کی کشتی
کیوں موجیں ابھری جاتی ہیں کیوں طوفاں اُمڈا آتا ہے

رات کے کھلنے والے پھولو چاند سے اتنا تم ہی پوچھو
اُجلی اُجلی راتوں میں کیوں یاد کوئی آجاتا ہے

کیا دل کی دھڑکن کہتی ہے فرقت کی یہ ہچکی کیسی
ہر سانس میں ہمیں رنج کیوں اب موت کی آہٹ پاتا ہے

نرگس کے اشارے گل کی ہنسی غنچوں کی مسکن بھولی پر
گلشن مجھے گذری باتوں کا افسانہ یاد دلاتا ہے

کیا تم نے کہا کیا میں نے سنا کیوں عمر رواں رستہ بھولی
یوں سانس کے پاؤں اکھڑے ہیں جیسے کوئی ٹھوکر کھاتا ہے

آنکھوں کے تڑپتے اشکوں میں اب جرأت لغزش بھی نہ رہی
غم اپنے سفینوں کو یا رب کیوں ساحل پر ٹھیراتا ہے

میرے دل کے شراروں میں جگنو ہیں یا تارے ہیں
دل کی فضا کا شام غم یوں نقشہ کھینچا جاتا ہے

دھندلے دھندلے شام سویرے کٹنے لگے رین بسیرے
شام فرقت آتی ہے جب دور غربت جاتا ہے

ناکامی گریہ ہائے غضب مژگاں پہ نہ ٹھیرا اشک کوئی
پھل غم کی شاخوں پر یارب جو آتا ہے گر جاتا ہے

آہیں نہ سہی یہ ٹھنڈی سانسیں شاید پنکھے جھلتی ہیں
خورشید سلگتی آگ کو دل کی کوئی تو بھڑکاتا ہے

**خورشید سہارنپوری**

# ترقی پسند ادب

۲

معین احسن جذبی

## داخلی اور خارجی ادب

ادب کو ہم فنون لطیفہ کی ایک شاخ تصور کرتے ہیں تو اس کے دوسرے پہلو کو قطعی نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ادب کو ہم اس کے جمالیاتی عناصر کی بنا پر فنون لطیفہ میں شمار کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ ایک ایسا آلہ بھی ہے جو سماج کے ذہن و شعور پر ایک گہرا نقش چھوڑتا ہے۔ ادب میں یہ دونوں باتیں کچھ اس طرح ملی جلی ہوتی ہیں کہ ہم ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔

ادب کی بنیاد دراصل انسانی تجربات پر ہے۔ تجربات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ داخلی اور خارجی۔ رنج و غم، مسرت و شادمانی، پریشانی، کشمکش، سرخوشی، سرشاری اور اس قسم کے تمام محسوسات و جذبات جو صرف ہماری ذات تک محدود ہیں، ہمارے داخلی تجربات میں شامل ہیں۔ داخلی ادب میں ان ذاتی اور انفرادی تجربات کی مصوری ہوتی ہے اور احساس حسن ہی کو ادب کا مقصد سمجھا جاتا ہے۔ ہم ہر شے کو اس کے اردگرد کی چیزوں سے الگ کرکے دیکھتے ہیں اور وہ بھی محض جمالیاتی نقطہ نظر سے۔ مثلاً اگر ہم غم کا ذکر کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ ہمیں اس میں ایک لذت ملتی ہے اور ایک حسن نظر آتا ہے۔ غم کے اسباب پر ہماری نظر نہیں جاتی نہ ہم ان کی تلاش کرتے ہیں کیونکہ غم منتہود بالذات سی ایک چیز ہوتی ہے۔

خارجی تجربات کو جمالیاتی یا ذہنی کیفیات سے بحث نہیں۔ ہماری نظر گرد و پیش کی تمام اشیا پر پڑتی ہے لیکن ہم کسی شے کو اس کے اردگرد کی اشیا سے علیحدہ کرکے نہیں دیکھتے۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ اس شے کا دوسری اشیا سے کیا ربط و رشتہ ہے اور اس حرکت و عمل کا دوسرے حرکت و عمل سے کیا تعلق ہے۔ دنیا حرکت و عمل کے تسلسل کا نام ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ہر حرکت یا عمل ہمیں آخر لے کہاں جاتا ہے۔

اکثر ادیب داخلیت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر رفتہ رفتہ خالص جمالیاتی ہو کے رہ جاتا ہے۔ ادب برائے ادب کا نظریہ اسی خالص جمالیاتی نقطہ نظر کی پیداوار ہے۔ ادب برائے ادب کے ماننے والے صرف اسی ہیجان، مسرت کو ادب کی غایت سمجھتے ہیں جو تخلیق حسن سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ حسن سے مسرت حاصل ہوتی ہے اور مسرت ہی اصل میں زندگی کا مقصد ہے۔ لہٰذا ادب کا مقصد بھی صرف تخلیق حسن ہونا چاہئے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مسرت بذات خود کوئی چیز نہیں۔ یہ بھی سماج کی پیداوار، ہماری معاشرت اور ہمارے تہذیب و تمدن کا نتیجہ ہے۔ ادب برائے ادب کے نظریہ میں خیالات کی صحت یا عدم صحت کی کوئی اہمیت نہیں۔ ادیب صرف اپنا نقطہ نظر پیش کر دے اور اس انداز سے کہ دل و دماغ میں وقتی طور پر ایک ہیجان و ہنگامہ برپا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ آرٹ کو کتنا محدود کر دیتا ہے۔ داخلیت سماجی قدروں کو بالکل نظرانداز کر دیتی ہے اس لئے کہ آرٹ سماج سے بالا و برتر ہے۔ یہاں حسن کی تخلیق بھی زیادہ تر اس دنیا میں کی جاتی ہے جسے ہم صرف تخیل کی آنکھوں ہی سے دیکھ سکتے ہیں اور جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ بھی اکثر اس دنیا کی مسرت نہیں ہوتی۔ داخلیت ہی بڑھ کر جذباتیت یا جذبات پرستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اپنا غم، اپنا اندوہ، اپنی خواہشیں، اپنی مسرتیں غرضیکہ ادیب بس اپنی دنیا میں گم ہو جاتا ہے اور ایسا گم ہوتا ہے کہ اسے پھر اپنی دنیا یا باہر کی دنیا میں کسی قسم کا رشتہ یا تعلق نظر نہیں آتا۔

"داخلیت" پریم چند کے الفاظ میں "وہ شے ہے۔ جو ہم کو اپنی کاہل انکاری کی طرف لے جاتی ہے اور ایسا آرٹ ہمارے لئے نہ انفرادی حیثیت سے مفید ہے نہ اجتماعی حیثیت سے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان میں تولتا ہوں۔ بے شک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے۔ لیکن ایسی کوئی ذوقی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی ہے اور غم بھی۔ آسمان پر چھائی ہوئی شفق بے شک ایک خوشنما نظارہ ہے۔ لیکن اساڑھ میں اگر آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ ہمارے لئے خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔ اس وقت تو ہم آسمان پر کالی گھٹائیں دیکھ کر ہی مسرور ہوتے ہیں۔ پھولوں کو دیکھ کر ہم اس لئے محظوظ ہوتے ہیں کہ ان سے پھل کی امید ہوتی ہے۔ فطرت سے ہم آہنگی اسی لئے ہماری روحانی مسرت کا باعث ہے۔ وہی دوسرے کے لئے رنج کا سبب بن سکتی ہے۔ ایک رئیس اپنے شگفتہ شاداب باغیچہ میں بیٹھ کر چڑیوں کے نغمے سنتا ہے تو اسے جنت کی مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن ایک نادار لیکن باخبر انسان اس امارت کے لوازمے کو مکروہ ترین سمجھتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے خون سے داغدار ہو رہی ہے۔"

پریم چند دراصل اسی حسن کو حسن اور اسی مسرت کو مسرت سمجھتے ہیں جو ماحول پر فتح پانے کی امنگ ہمارے دلوں میں پیدا کرے۔ ابتدائے آفرینش سے انسان ماحول پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس کی بہت سی خواہشیں، بہت سی اہم ضرورتیں ماحول کی ناسازگاری

کی وجہ سے پوری نہیں ہوتیں۔ انسان اور ماحول کی یہ کشمکش ازل سے جاری ہے اور دنیا کی ترقی کا راز بھی یہی ہے، لیکن یہ کشمکش حسن سے خالی نہیں۔ آرٹسٹ جب حسن کی تخلیق کرتا ہے تو دراصل وہ اسی کشمکش کو دکھاتا ہے اور ہم میں وہ جرأت اور جذبہ پیدا کرتا ہے کہ ہم ماحول کو عام انسانی ضروریات اور خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی جد و جہد میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ آرٹسٹ کے لئے عام ضروریات اور خواہشات کا مدنظر رکھنا بہت ہی ضروری ہے ورنہ پھر وہ محض اپنے ذاتی جذبات و احساسات کا شکار ہو جائے گا۔ آرٹ کی افادیت سے مراد یہی ہے کہ ہم میں حرکت و عمل کا جذبہ پیدا ہو۔ ہم آگے بڑھیں پیچھے نہ ہٹیں۔

داخلیت ادب کو زندگی سے دور رکھتی ہے، اس وجہ سے ادیب اکثر رومانیت یا روحانیت میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ رومانیات یا شبابیات سے اردو ادب بھرا پڑا ہے۔ ہمارے بیشتر ادیبوں کی فکر صرف حسن و عشق ہی کا جائزہ لیتی یا پھر تصوف کے منازل طے کرتی رہی۔ ان کے نزدیک زندگی صرف عشق بازی کا نام تھا۔ اب یہ عشق خواہ کسی کمسن دوشیزہ سے ہو خواہ باری تعالےٰ سے ہو۔ بہرحال عشق ہونا چاہیئے۔ سچ پوچھئے تو عشق اور ہوس پرستی ان کے یہاں مترادف الفاظ تھے۔ روحانیت، خانقاہیت اور رہبانیت کی تعلیم تھی۔ ادب کی جو گت ان لوگوں کے ہاتھوں بنی وہ آج ہمارے سامنے ہے کبھی نفسانیت سے آلودہ ہوا تو کبھی مسلا چیتھڑا بن کر رہ گیا۔ زندگی سے بہرحال دوری بڑھتی گئی۔

جس طرح ضرورت سے زیادہ داخلیت بلند پایہ ادب کے منافی ہے اسی طرح ضرورت سے زیادہ خارجیت بھی۔ جو ادب کی بنیاد صرف خارجی عناصر ہی پر رکھتے ہیں وہ اس کے جمالیاتی پہلو کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کی یہ خارجیت پسندی کسی خاص اخلاقی، مذہبی یا روحانی مقصد کی تبلیغ ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ اخلاق و مذہب کے اصولوں کی اشاعت ہی کو ادب کا مقصد سمجھتے ہیں۔ جذبات و احساسات کو وہ ادب میں جگہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ وہ صرف ایسے اخلاقی اور اصلاحی ادب کے قائل ہیں جس کی بنیاد عقل و منطق پر ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب کو اب تک عقل و منطق سے علیحدہ رکھا گیا ہے، اس لئے اس میں مادیت پیدا ہو گئی ہے۔ ادب کو صرف انسان کی عظمت و وقار کا آئینہ دار ہونا چاہیئے اور یہ عظمت و وقار صرف روحانی بلندی ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ دنیا کی ساری مصیبتوں اور تباہیوں کا علاج ان کے پاس صرف یہی روحانی معراج ہے۔ ان کو اس سے مطلب نہیں کہ دنیا میں کون کون سی قوتیں ہماری زندگی پر اثر ڈال رہی ہیں۔ عہد حاضر کے نئے خیالات و رجحانات ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ وہ تو ان چیزوں سے اس طرح منہ موڑ لیتے ہیں جیسے اس دنیا کے باشندے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک زندگی دو خانوں میں منقسم ہے۔ ایک خانہ وہ ہے جہاں انسان عظمت و بلندی محسوس کرتا ہے۔ دوسرا وہ جہاں ہم سب رہتے ہیں۔ ان کو موخرالذکر یعنی اس دنیا سے نہ کوئی خاص لگاؤ ہے اور نہ اس کے آلام و افکار اور فکر و مصائب سے کوئی دلچسپی۔

## ادب اور جدید رجحانات

ہمارا زمانہ سیاسی شعور اور بیداری کا زمانہ ہے۔ زندگی کو اس کے سیاسی رجحانات سے محفوظ رکھنا ناممکن ہے۔ ادب چونکہ زندگی کا ترجمان ہے۔ اس لئے اس میں سیاسی رجحان کا پیدا ہونا ہمارے لئے حیرت کا باعث نہیں۔ سیاست ہمیں آپس میں مل جل کر رہنے کے طریقے بتاتی ہے۔ ادیب کو سیاست سے یوں دلچسپی ہے کہ وہ بھی سماج کا ایک فرد ہے۔ اسے بھی عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا ہوتی ہے۔ سماج سے الگ ہو کر زندگی بسر کرنا شاید کسی زمانہ میں ممکن ہو لیکن موجودہ زمانہ میں تو ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ سماج پر آلام اور مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹتے ہیں ادیب کو بھی سماج کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ان سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور جب وہ ان سماجی پریشانیوں اور مصیبتوں کے اسباب کی جستجو کرتا ہے تو لامحالہ اس کے قدم سیاست میں پڑنے لگتے ہیں۔ اسے ان تمام سیاسی تحریکات کا جائزہ لینا پڑتا ہے جس کا تعلق براہ راست عوام کی زندگی سے ہے۔ اسے دنیا کے معاشی نظام کی جانچ کرنی پڑتی ہے کیونکہ معاشیات پر نہ صرف سیاست کا دار و مدار ہے بلکہ فرد اور جماعت کی خوش حالی بھی اس پر منحصر ہے۔

ادیب کی حیثیت ایک جماعت کے نمائندہ کی سی ہے۔ وہ صرف اپنا ہی دکھ درد بیان نہیں کرتا بلکہ دوسروں کی تکالیف اور پریشانیوں کی بھی ترجمانی کرتا ہے اور چونکہ ہماری موجودہ پریشانیاں سیاسی اور معاشی بنا پر ہیں۔ اس لئے ادیب سیاسیات اور معاشیات سے کسی طرح روگردانی نہیں کر سکتا۔

اس دور میں جہاں سیاسیات اور معاشیات کی گرم بازاری نے ہمیں زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے پر مجبور کیا وہاں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نفسیات کے مطالعہ کی وجہ سے زندگی کی بہت سی الجھنوں اور گرہوں کو سمجھنے میں مدد ملی ہے اور مذہبی احساس کا پھر سے تجزیہ ممکن ہوا ہے۔ نفسیات کی دنیا میں اب تک بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔ فرائڈ نے اس زمانے میں انسانی ذہن و شعور کی اہمیت کو اتنا نمایاں کر دیا ہے اور نفسیاتی تجزیہ اتنا عام ہو گیا ہے کہ اب ہم اپنی حرکت اور ہر فعل کی وجہ یا نیت دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب صرف پرانے اخلاقی اور مذہبی سہارے ہماری تسکین و تشفی کا باعث نہیں ہوتے۔ نفسیاتی تجزیہ کی بدولت ہماری تمام پرانی قدریں بدلتی چلی جا رہی ہیں۔ روح کا ایک انقلابی تصور آج ہمارے سامنے ہے۔ انسانی کردار کو بھی ہم

ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگے ہیں۔ نفسیات اخلاقیات کے چکر میں نہیں پڑتی لیکن اس کا یہ دعویٰ ضرور ہے کہ وہ اخلاقی نظام جو نفسیاتی بنیادوں پر قائم ہوگا اس میں خلوص، محبت اور صداقت کے اصل جوہر نمایاں ہوسکتے ہیں اور یہ نیا مذہب اور یہ نئی تہذیب ہی انسان کے لئے باعث نجات ہوسکتی ہے۔

اس دور کا بیشتر ادب اسی انقلابی ذہنیت کا حامل ہے۔ شاعری اور خاص طور سے افسانہ نگاری میں تو نفسیاتی تجزیہ کی بڑی کامیاب کوشش ملتی ہے۔

## انفرادی اور اجتماعی ادب

اجتماعی ادب ادیب کے سماجی اور سیاسی رجحانات کی پیداوار ہے۔ طبقاتی امتیازات اور کشمکش کا احساس اسے ایسے ادب کی پیداوار پر مائل کرتا ہے جس میں اجتماعی زندگی کے تاریک سے تاریک اور روشن سے روشن پہلوؤں کو نمایاں کیا جاسکے۔ اس کا نصب العین جماعت کی پیداوار ہے۔ اس مقصد کی تحت میں اس کی ساری کوششیں جماعت کے مسائل اور اس کے احساسات وجذبات کی ترجمانی میں صرف ہوتی ہیں۔ وہ اپنا نفسیاتی تجزیہ بھی اس لئے کرتا ہے کہ یہ تجربات جماعت کی ذہنی زندگی کی عکاسی میں مدد دیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ادیب کے ذاتی تجربات اور محسوسات کی اس اجتماعی مقصد کے سامنے کوئی اہمیت نہیں۔ اس سے ہم اس کے انفرادی تجربات اور محسوسات کو پیش کرنے کا حق نہیں چھین سکتے۔ بہت سے تجربات بذات خود اتنے حسین ہوتے ہیں کہ آرٹسٹ کے قلم سے غیر اختیاری طور پر ٹپک پڑتے ہیں۔ انہیں صرف جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھنا پڑے گا۔ لیکن ان میں سے بعض تجربات ایسے بھی نکل آئیں گے جو آرٹسٹ کی انفرادیت کا عکس ہونے کے باوجود جماعتی مقصد کے معیار پر بھی پورے اتریں۔ دوسرے ادب آرٹسٹ کی انفرادیت سے کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ خاص طور پر اس کا نقطۂ نظر اور اسلوب بیان تو اس کی انفرادیت ہی کی پیداوار ہیں۔ ادب کو ادیب کی انفرادیت سے دور رکھنے کی صدائیں اس لحاظ سے کتنی بے معنی ہیں!

طالسطائی کے نزدیک وہی ادب ادب ہے جو عوام کو متاثر کرسکے یہ معیار بھی ایک طرح کی تنگ نظری پر مبنی ہے۔ طالسطائی کے نظریہ کی رو سے وہ تمام ادبی سرمایہ جس سے عوام لطف اندوز نہیں ہوسکتے ردی کی ٹوکری کی زینت ہونا چاہیئے۔ اب تک ادب متوسط یا بالائی طبقہ ہی کی جاگیر رہا ہے اور اس وقت تک رہیگا جب تک کہ عوام کو ذہنی نشو و نما کی وہ تمام سہولتیں میسر نہیں آئیں جو متوسط یا بالائی طبقہ کو حاصل ہیں۔ عوام کے پاس اپنا کوئی ذاتی کلچر ہے نہ ادبی سرمایہ۔ اس لئے ادیب جب کچھ لکھے گا اسے اونچے طبقہ کی ادبی روایتوں ہی سے کام لینا پڑے گا جا سے ورثہ میں ملی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا ادب ایک خاص طبقہ ہی کو متاثر کرسکتا ہے۔ جب تک عوام تعلیم و تہذیب اور معاشرت کے اعتبار سے پستی میں پڑے ہوئے ہیں، ہمارا ادب ان کے لئے کوئی خاص معنی اور کوئی خاص کشمکش نہیں رکھتا۔ ادب غیر طبقاتی سوسائٹی ہی میں پھل پھول سکتا ہے جس میں ہر شخص انفرادی طور پر تعلیم و تہذیب، تمدن و معاشرت کی نعمتوں سے یکساں طور پر بہرہ مند ہوسکے۔ عہد حاضر کے ادیب اسی لئے ایک غیر طبقاتی سوسائٹی کے قیام کے آرزو مند ہیں۔ تب وہ اپنے خیالات وافکار سے صرف ایک طبقہ کو نہیں بلکہ پورے سماج کو متاثر کرسکیں گے۔

## حقیقت نگاری

جدید ادب میں حقیقت نگاری خاص طور سے قابل توجہ ہے۔ رومانیت اور روحانیت کی کھوکھلی بنیادوں پر ادب کی عمارت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔ ادب اگر زندگی کا ترجمان ہے تو اس کی بنیاد بھی زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر ہونی چاہیئے۔

حقیقت نگاری سے اکثر یہ مراد لی جاتی ہے کہ کسی انفرادی یا خارجی حقیقت کی ہو بہو عکاسی کردی جائے۔ یہ دراصل مرقع نگاری ہے۔ حقیقت نگاری اپنے انفرادی تجربات اور باہری دنیا کی ایک بڑی حقیقت میں ایک قسم کے ربط پیدا کرنے کا نام ہے۔

ادیب سماجی زندگی کو ناقدانہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا کام زندگی کے ان تمام تاریک اور گندے پہلوؤں کو بھی نمایاں کرنا ہے جو سماج کو تباہی اور پستی کی طرف لے جارہے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ادیب انہیں فنکارانہ طور پر پیش کرنے کی کوشش میں اتنا حسین بنا دیتا ہے کہ انکی تاریکی اور گندگی باقی نہیں رہتی۔ وہ خود بھی اپنے آرٹ کی پیدا کی ہوئی لطافتوں میں گم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سوسائٹی کی اصلاح نہیں ہو پاتی بلکہ ایسا نظر آتا ہے جیسے آرٹسٹ ہر طرح کی برائی، کمزوری اور جبر واستبداد کا علمبردار اور حامی ہے۔

حقیقت نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے دور کے ان تمام سیاسی اور سماجی رجحانات سے پوری پوری طرح واقف ہو جن کا اثر کسی نہ کسی طرح ہماری زندگی پر پڑتا ہے۔ سماجی مسائل کی تحلیل حقیقت نگاری کا بنیادی اصول ہے۔ مسائل سے تو کم و بیش ہر شخص واقف ہوتا ہے۔ ادیب کا فرض یہ ہے کہ ان مسائل پر اسباب و نتائج کی روشنی میں کچھ اضافہ کرے۔ اسی اضافہ میں اس کا اصلاحی نقطۂ نظر بھی آجاتا ہے۔ یہی دراصل حقیقت نگاری ہے اور ایسا ہی ادب انقلابی ادب کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

وہ ادیب جنکے پاس سماجی مسائل کا کوئی حل نہیں داخلیت یا انفرادیت کے بہت جلد شکار ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں قنوطیت یا فراریت ہی کے دامن میں تسکین ملتی ہے۔

## انقلابی ادب

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دور حاضر کی ادبی کاوشوں میں فرانسیسی اور روسی ادب کے

اثرات بڑی حد تک نمایاں ہیں۔ ہمارے ترقی پسند ادیب سوشلزم کے انقلابی تصور سے بھی بہت متاثر ہیں۔ سماج کے اس بوسیدہ نظام کو ختم کر دینے کی خواہش اور نئے نظام کا دھندلا سا خاکہ ہمیں ہر ادیب کے یہاں ملتا ہے۔ ہندوستان کی غلامانہ کیفیت اور سیاسی سرگرمیوں نے ان کی ذہنیتوں کو جتنا بدلا ہے وہ ان کی سیاسی انقلاب کی شدید آرزو میں نظر آتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ انقلاب کی یہ شدید آرزو اکثر دہشت انگیزی کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بہت سے ترقی پسند ادیب اب تک انقلاب کا کوئی صحیح اور واضح تصور نہیں قائم کر سکے۔ خون اور آگ ہی کو انہوں نے اصل انقلاب سمجھا اور وہی انقلابی ادب ٹھہرا جس میں زیادہ سے زیادہ تخریبی عناصر کا امتزاج ہو۔

مارکس نے انقلاب کو کبھی خونی رنگ میں نہیں پیش کیا۔ شاید قاضی نذر الاسلام کی شاعری کا اثر تھا جس نے ہمارے ترقی پسند ادیبوں کو اس قدر خونی اور دہشت انگیز بنا دیا۔ سیاسی نعرے، بغاوت کی تلقین، مذہب پہ حملے، یہی دو چار موضوع تھے جن پر لکھنے والوں کی ساری جولانئ طبع صرف ہوئی چنانچہ ادب محض پروپگنڈا ہو کر رہ گیا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں نے سیاسی اور سماجی مسائل کا بھی گہری نظر سے مطالعہ نہیں کیا۔ انہوں نے سیاسی اور سماجی مسائل پر قلم اٹھایا مگر وہ علم حاصل نہ کر پائے جو صحیح، گہرا اور متوازن ہو۔ وہ مستقبل کی تعمیر یا حال کی تخریب میں پچھلے قیمتی اور کارآمد سرمائے کو نظر انداز کر گئے۔ یہی ان کی سب سے بڑی غلطی اور سب سے بڑی کمزوری تھی۔ دوسرے انہوں نے ادب کو ایک سیاسی پروپگنڈے سے زیادہ اہمیت بھی نہیں دی۔ ادب سے پروپگنڈے کا کام تو لیا جا سکتا ہے لیکن پروپگنڈا ادب نہیں ہو سکتا۔ سیاسی نعرے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مجمع کو وقتی طور پر متاثر کیا جائے لیکن ادب کا کام مجمع کو متاثر کرنا نہیں۔ ادب ہر فرد سے تنہائی میں گفتگو کرتا ہے اور اس کے دل و دماغ کے تاروں کو اس انداز سے چھیڑتا ہے کہ وہ ایک عرصہ تک تھرتھراتے رہتے ہیں۔

انقلابی ادب میں جمالیاتی عناصر کی بھی کمی بڑی حد تک پائی جاتی ہے۔ ترقی پسند ادیب شاید یہ سمجھتے ہیں کہ انقلابی یا اشتراکی ادب محض اقتصادیات یا سیاسیات کے اصولوں کی ترجمانی کا نام ہے۔ یہ ان کی بھول ہے۔ خود مارکس نے ایسے ادب کو جس میں جمالیاتی عنصر نہ ہو ادب نہیں سمجھا۔ وہ تو بالزک جیسے رجعت پسند ناولسٹ کو بھی ان ترقی پسند ادیبوں پر ترجیح دیتا ہے جو ذوقِ حسن سے محروم ہیں۔

انقلابی ادب دراصل طبقاتی کشمکش کی بنیاد پر اپنی عمارت قائم کرتا ہے۔ سرمایہ دار مزدور، زمیندار اور کسان، اونچے اور نیچے طبقہ میں جو جنگ جاری ہے، ترقی پسند ادیب کو زمانے کے اقتضا کے مطابق یہیں سے اپنا مواد اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن زندگی یہیں تک محدود نہیں ہے زندگی کے اور بھی سینکڑوں پہلو ہیں، روشن بھی اور تاریک بھی۔ ترقی پسندی کے یہ معنی نہیں کہ ان تمام پہلوؤں کو اور اپنے انفرادی تجربات کو سرے سے نظر انداز کر دیا جائے۔ ادب زندگی کا پرتو ہے۔ اسے بھی اتنا ہی وسیع ہونا چاہئے جتنی کہ خود زندگی ہے۔

ترقی پسندی کی آڑ میں جنسیاتی ادب کا بھی ایک طوفان امڈا۔ ہمارے ادیبوں نے جنسی مسائل سے تو کم بحث کی، گندگی اور غلاظت زیادہ اچھالی۔ اس میں شک نہیں کہ جنسیاتی مسائل بھی ہماری زندگی میں کافی اہمیت رکھتے ہیں لیکن لذت پرستی کے تحت میں جو ادب پیدا ہو، چاہے وہ یقیناً ہمارے اخلاق پر کچھ اچھا اثر نہ ڈالے گا۔

اس چھ سات سال کے عرصہ میں ہمارے بہت سے ترقی پسند ادیب سنبھل گئے ہیں انکا نقطۂ نظر بھی وسیع ہوتا جا رہا ہے اور کچھ ادبی خوبیاں بھی ان کے یہاں نظر آنے لگی ہیں گر گر کر سنبھلنے اور سنبھل سنبھل کر آگے بڑھنے ہی کا نام ترقی ہے۔

## بانسری

نعیم صبا

رات کی خموشی میں دور میری نظروں سے
جب کہ ماہِ تاباں کی پھیکی پھیکی کرنوں میں
دیکھتا ہوں میں اکثر اپنی چشمِ پرنم سے
وہ اداس تصویریں اپنے دورِ ماضی کی
جس کے ساز میں پنہاں اک صدا ہے بے معنی
زندگی کی وہ کرنیں جو مرے شبستاں میں
ان دنوں منور تھیں میرے دل کے تاروں پر
چھڑ رہا تھا اک نغمہ حسن کا، محبت کا
یاد آ رہی ہیں اب پردۂ تخیل میں
خواب کے مناظر میں وہ حسین تصویریں
اور میری آنکھوں سے رس رہے ہیں کچھ قطرے
محوِ خواب ہے دنیا اور رو رہا ہوں میں!
بانسری بجاتا ہے دور کوئی غم دیدہ
دھیمی دھیمی لے اس کی تھرتھرا رہی ہے یوں
میرے دل کے تاروں کا راگ بھی فسردہ ہے
اور ماہ و انجم کی مشکبو فضاؤں میں
آہ مٹ رہی ہے وہ
اور کھو رہا ہوں میں

# کشمیر کا ایک زندہ جاوید شاعر غنی کاشمیری

از پریم ناتھ پردیسی

کشمیر نے جہاں دیگر علوم وفنون میں ترقی کرکے اپنا نام ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید بنا رکھا ہے۔ وہاں شعر وشاعری میں بھی اس کی سرزمین سے وقتاً فوقتاً ایسے جادو بیان شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ جو زمانے کی ناقدری اور اپنی مالی بدحالی کے باوجود اب تک زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہینگے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ انہیں اپنے وطن نے یہ اعزاز بخشا۔ بلکہ یہ کہ ان کا کلام ہی ایسا ہے جو مطالعہ کرنے والے کو ان کی منزلت کا، ان کے فن کی پختگی کا، مشاہدے کی ہمہ گیری اور بلندئ معانی کا احساس دلاتا ہے۔ آج کا کشمیر جو زمانے کی اس قدر ترقی کے باوجود بھی ایک دور افتادہ اور پسماندہ ملک ہے، ان دنوں کیا ہوگا جب تک بھگ ساری دنیا جہالت اور پسماندگی کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ لیکن نہیں۔ تاریخ گواہ ہے۔ وہ کشمیر آج کے کشمیر سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی اپنی تہذیب تھی اپنا تمدن تھا۔ وہ سارے ہندوستان کے لئے بلکہ چین اور تبت کے لئے ایک صحیح اور مکمل راہنما کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج بھی محکمۂ آرکیولاجی کے ذریعے سے جو آثار قدیمہ دریافت کئے جاتے ہیں۔ ان کے ملاحظہ سے یقین ہوتا ہے کہ ترقی کا وہ دور جسے اپنانے کے لئے آج ساری دنیا بے چین ہے۔ کشمیر میں ہو چکا ہے۔ تہذیب کو برقرار اور محفوظ رکھنے کے لئے ادب میں جتنے بھی شعبے ہو سکتے ہیں وہ تمام کے تمام پرانے کشمیر میں موجود تھے۔ علم طب میں موٹے آلات سے لے کر موشگافی کے آلات تک ایجاد ہوئے تھے۔ علم ریاضی میں عام قاعدے سے ستاروں کی گردش کے صحیح اوقات تک دریافت ہوئے تھے۔ فن تعمیر میں باریک سے باریک سنگتراشی سے لیکر مارتنڈ کے مندر کی تعمیر تک ہو چکی تھی۔ فن مصوری میں نقل پر اصل کا دھوکا ہونے والی تصاویر تک کھینچی گئی تھیں۔ اور اسی طرح شعر وشاعری میں دوہوں سے لیکر ان کتابوں تک کی تصنیف ہو چکی تھی جن کے طاق مصرعوں سے رامائن کی کہانی بیان ہوتی تھی اور جفت مصرعوں سے مہابھارت کی کہانی۔ لیکن افسوس زمانے کے بے درد ہاتھوں سے اور بیرونی حملہ آوروں کی گرسنگی سے یہ سب کچھ فنا ہو گیا۔ خیر مجھے اس مضمون میں کشمیر کے غلط ... پارینہ پر آنسو بہانا مقصود نہیں یہاں میں صرف ایک ایسے شاعر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو آج بھی اگر کشمیر یا ہندوستان میں زندہ جاوید نہیں مگر شیراز اور ایران میں زندہ جاوید ہے جس نے اپنی حیات میں وہاں کے اہل کمال کو انگشت بدنداں بنا دیا۔ لیکن جسے اپنے وطن نے نہ جینے جی کوئی قدر کی نہ مرنے کے بعد کوئی خدمت کی۔ یہ بدقسمت شاعر مولانا محمد طاہر غنی کاشمیری تھے۔

سری رنبیر گنج کے عقب میں ایک محلہ راجوری کدل کے نام سے اب بھی موجود ہے وہاں آج سے تقریباً سوا تین سو سال پہلے عشائی خاندان کی ایک شاخ آباد تھی جس کے ایک متوسط گھرانے میں سال ۱۰۴۰ھ مطابق ۱۶۲۱ء میں محمد طاہر غنی پیدا ہوئے۔ قبول صورت ہونے کے علاوہ چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ جو اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ یہ لڑکا اپنی مختصر سی زندگی میں اس کمال کو پہنچیگا جس کے لئے بڑے بڑے سخنور ترستے رہتے ہیں۔ چنانچہ بچپن کے چند برس گذارنے کے بعد میں محلہ قطب الدین پورہ کے فارسی مکتب میں حصول تعلیم کے لئے بٹھایا گیا۔ جو ملا محسن فانی کے زیر اہتمام تھا۔ وہ خود بھی باکمال شاعر تھے اور اپنے وقت کے مانے ہوئے استاد۔ استاد کی دوررس نظر پہلے روز ہی محمد طاہر کے گوشت و پوست کو چیرتی ہوئی وہاں پہنچی۔ جہاں حقیقت میں محمد طاہر نہ تھا۔ بلکہ وہ نور تھا۔ جسے مطلع شاعری پر آفتاب کی طرح چمکنا تھا ملا فانی نے اس بچے کی تعلیم و تربیت میں اس وجہ سے زیادہ دلچسپی لینی شروع کی۔ شروع شروع میں اسے دینیات کی تعلیم دی۔ پھر فارسی پڑھائی۔ اور جب اسے اطمینان ہوا۔ کہ اندر کے نور کو چمکنے کے لئے مطلع صاف ہو گیا۔ تو فنون شاعری کی تعلیم دی۔ اور ان بحث و مباحثوں میں اسے شریک کرتے رہے۔ جو آئے دن ان کے ہاں ہوتے رہتے تھے۔ استاد کی اس شفقت کے غنی کے تخیل میں وسعت فن میں پختگی اور نظر میں ہمہ گیری پیدا ہو گئی۔ قدرت نے روز ازل ہی ایسا دماغ بخشا تھا۔ جو ہر چیز کی حقیقت اور ہر شے کا تجزیہ کر سکتا تھا اس پر ملا فانی کی صحبت و تربیت سونے پر سہاگے کا کام کر گئی۔ چنانچہ ابھی بیس سال ہی کی عمر تھی کہ شعر کہنے شروع کئے۔ غنی کا تخلص بھی عمر کے اسی لحاظ سے منتخب کیا۔ جو ابجد کے حساب سے ۱۰۶۰ھ بنتا ہے۔

جوں جوں طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف بڑھتا گیا دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس پیدا ہوتا گیا۔ ہر شے میں ناپائداری سی نظر آنے لگی۔ اور اپنا آپ تن تنہا سا دکھائی دینے لگا۔ اس میں کچھ اپنی مالی بدحالی کا بھی حصہ تھا اور کچھ زمانے کی ناقدری کا بھی۔ چنانچہ طبیعت خلوت نشینی کی طرف مائل ہو گئی، لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ بحث و مباحثوں سے بھی غیر حاضر رہنے لگے۔ البتہ ہر وقت شعر وشاعری کی دھن میں اور عشق مجازی کی تلاش میں کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ جس سے صحت پر برا اثر پڑا جسم نحیف و لاغر ہو گیا۔ بہی خواہوں، عقیدت مندوں اور قرب میں

رہنے والے مخصوص شاگردوں میں تشویش پھیل گئی۔ چنانچہ اس کی طرف اشارہ کرکے ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

از گشتہ شدنِ چہرۂ عاشق نشود زرد
این داغ بہ پیشانیٔ سیماب نہادند

اپنے وطن اور زمانے سے انہیں ہمیشہ شکایت رہی۔ اس کے ساتھ ہی اپنی قسمت سے بھی شاکی رہے۔ جس نے ایسے باکمال سے یاوری نہ کی ذیل کے اشعار میں فرماتے ہیں ؎

(۱) در انجمن خود بار مدہ ہیچ منے را
افسردہ دلِ افسردہ کند انجمنے را

(۲) انقلاب نعم آباد جہاں می خواہم
شاید ایں طالع برگشتۂ من برگردد

(۳) کس بعد مرگ گریہ بعالم نمی کند
در زندگی چو شمع بگریم بحالِ خویش

(۴) نیک و بد را امتیازے نیست در بازارِ دہر
می شود در ہر ترازو سنگ با گوہر طرف

اور

(۵) مرا زِ کس نبود چشم التفاتِ غنیؔ
زِ پشتِ آئینہ پیداست صورتِ عالم

غنیؔ نے شاعری میں اپنے لئے بالکل ایک راستہ اختیار کیا۔ وہ تتبع کے قائل نہ تھے۔ جو چیز آج بھی انہیں دیگر فارسی شعراء سے ممتاز بناتی ہے وہ ان کی شاعری میں صنعتِ تضاد ہے۔ شعر کے پہلے مصرعے میں وہ جو دعوے کرتے ہیں۔ دوسرے میں وہ اس کا جواز پیش کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ اصنافِ سخن پر انہیں پوری قدرت تھی۔ انہوں نے اپنے کلام کو ہمیشہ حشو و زوائد سے پاک رکھا۔ کلام کی فصاحت کے ساتھ ساتھ ایسی چست بندشیں استعمال کی ہیں۔ کہ بے اختیار منہ سے واہ واہ نکلتا ہے۔ ان کے دیوان میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جسے بھرتی کا شعر کہا جا سکے۔ ہر شعر میں نیا خیال ہے نئی جدت ہے۔ نیا دعوےٰ اور نئی دلیل ہے۔ مثلاً ؎

(۱) اگر شہرت ہوس داری اسیرِ دامِ عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نامِ عنقا را

(۲) آدمی خاکی ز خامی دارد از مے اجتناب
کوزۂ گل پختہ چون گردد نمی ترسد ز آب

(۳) بے نیازی از سخن ہرگز بنا شد گوش را
سیرچشمی حاصل از نعمت نہ شد سرپوش را

گر محبت در میاں باشد تکلف گو مباش
شیر مادر را حلاوت بے نیاز از شکرست

(۵) ز شعرِ من شدہ پوشیدہ فضل و دانشِ من
چو میوۂ کہ بماند بزیر برگ نہاں

یہ ہے غنیؔ کی صنعتِ تضاد کا کمال، اور اسی قسم کے شعروں سے سارا دیوان بھرا پڑا ہے۔

ایک بار غنیؔ کا یہ شعر کسی طرح سے ایران پہنچا ؎

موے میانِ تو شدہ کرالہ بن
کرد جدا کاسۂ سر یا ز تن

کرالہ بن چونکہ خالص کشمیری لفظ تھا۔ لہٰذا ایران کے ادبی حلقوں میں اس پر کافی لے دے ہوئی۔ بالآخر مرزا صائب جو اسوقت ایران کے باکمال شاعر تھے۔ کشمیر چلے آئے۔ اور غنیؔ سے ملاقات کی۔ جب کرالہ بن کے معنی دریافت کئے۔ تو غنیؔ مسکرا کر بولے "کرالہ بن نام رشتۂ ایست کہ کوزہ گراں کاسہ را از چرخ جدا مے سازند"۔ مرزا صائب یہ تشریح سنکر جھوم اٹھے۔ دوسری بار پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ غنیؔ نے مندرجہ دو شعر کہے اور مرزا صائب کو دکھائے۔ ؎

صرف بے دردیٔ من کرد رقم بہرِ رقیب
کشتۂ زخمِ زبانِ قلمِ یار شدم
حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر
دامِ ہمرنگِ زمیں بود گرفتار شدم

مرزا نے جب دوسرا شعر پڑھا۔ تو وجد میں آکر ناچنے لگے بولے سبحان اللہ۔ کیا تشبیہ ہے کیا زبان ہے۔ کاش تم مجھ سے میرا سارا دیوان لیتے اور مجھے اسی کے عوض صرف یہی ایک شعر دیتے۔

غنیؔ چونکہ فطرتاً سادگی پسند تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں بھی سادگی جھلکتی ہے۔ البتہ اندازِ بیان اتنا موثر اور دلنشیں ہے کہ پڑھنے والا مسحور ہو جاتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں بھی انہوں نے اس سادگی کو برقرار رکھا دنیا سے طبیعت اچاٹ ہونے کے بعد نقل مکان کیا اور راجوری کدل سے نکل کر عالی کدل چلے آئے۔ جہاں ایک چھوٹی سی دکان میں تجرد کی زندگی بسر کرنے لگے۔ جب اندر موجود ہوتے۔ تو دکان بند رہتی۔ جب باہر جاتے تو دکان کھلی چھوڑتے۔ ایک مرتبہ ایک عقیدت مند ملنے کیلئے آگئے دیکھا کہ دکان کھلی ہے۔ اور اندر غنیؔ موجود نہیں۔ مایوس ہو کر لوٹے۔ دوسری بار پھر آئے۔ تو دکان بند تھی۔ دستک دی۔ اندر سے غنیؔ نکلے۔ پوچھا "مولانا۔ اس میں کیا بھید ہے۔ جب آپ یہاں نہ تھے۔ تو دکان کھلی تھی۔ اب کہ آپ تشریف فرما ہیں۔ دوکان بند ہے" غنیؔ ہنس دیئے۔ بولے "دکان کی پونجی میں ہی ہوں۔ جب اندر ہوتا ہوں تو چوروں کے ڈر سے دکان بند کرتا ہوں۔ البتہ جب باہر جاتا ہوں تو کھلی چھوڑتا ہوں" اس پر دونوں خوب ہنسے۔

غنی دنیا کی بے ثباتی سے بے حد متاثر ہو چکے تھے۔ لہذا ان کی طبیعت میں ضرورت سے زیادہ خودداری تھی۔ کسی کی بے جا تعریف و توصیف نہ کرتے تھے۔ جو اس زمانے میں شاعروں کا محبوب شغل تھا۔ نہ کبھی کسی حاکم کو خوش کرنے کے لئے قصیدہ کہا۔ چونکہ ان کی شاعری کشمیر سے نکل کر بہت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ اس لئے ہر جگہ نامور ہو گئے تھے۔ ایک بار شہنشاہ اورنگ زیب نے جو ان دنوں ہندوستان کے حکمران تھے۔ اپنے ناظم کشمیر سیف الدین خاں کو لکھا۔ کہ غنی کاشمیری کو ما بدولت کے دربار میں حاضر ہونے کی ہدایت کر دو۔ خان موصوف غنی کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے۔ اور خود بھی اچھے شعر کہتے تھے۔ وہ غنی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور انہیں منشائے شاہی سے مطلع کیا۔ بھلا غنی کب شہنشاہیت کے رعب میں آنے والا تھا۔ اس نے کہا۔ اپنے بادشاہ کو لکھو کہ غنی ایک دیوانہ ہے۔ جس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں۔"

سیف الدین خاں مسکرا کر بولے۔ "یہ ظلم ہے مولانا۔ کہ ایک عاقل اور باکمال شاعر کو دیوانہ قرار دوں۔" اس پر غنی آپے سے باہر ہو گئے۔ وہیں کپڑے پھاڑ کر دیوانوں کی طرح بھاگنے لگے۔ اور اس کے تین دن بعد یعنی ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۸ء میں اس دار فانی سے چل بسے۔ گویا اس دنیا میں صرف ۳۹ برس زندہ رہے۔ اس وقت عالی کدل کے پاس اپنے استاد ملا محسن فانی کے مقبرے میں آسودۂ خاک ہیں۔ ان کی قبر آس پاس کے محلوں میں غنہ بابا کی قبر سے مشہور ہے۔ جو اب خستہ ہو چکی ہے۔ اور کوئی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ نہ حکومتِ وقت نہ اہلِ شہر۔ ان کی وفات پر عقیدت مندوں نے بے شمار قطعاتِ تاریخ لکھے۔ جن میں سے مندرجہ ذیل قطعات ان کے دیوان میں شامل ہیں۔

از فوتِ غنی گشت کہ وصفِ غمگیں    ہر کس شدہ در ماتم او خاک نشیں
تاریخ وفاتش از سپہر سند گو    پنہاں شدہ گنج سُخنی زیر زمیں

اور

چو دادش فیضِ صحبتِ شیخ کامل محسن فانی    غنی سر حلقۂ احباب در نکتہ دانی شد
تہی چوں کرد بزم شیخ گفتند تاریخش    کہ آگاہی شوی دار البقا از دار فانی شد

ان کی وفات کے بعد ان کے ایک شاگرد محمد علی ماہر نے ان کے کلام کو ترتیب دیا۔ جو بعد میں منشی نول کشور والوں نے زیور طباعت سے آراستہ کیا۔

اپنے ہم عصروں میں وہ مندرجہ ذیل شعرا سے متاثر ہوئے تھے۔
(۱) ابو طالب کلیم (۲) امیر الامرا اسلام خاں (۳) مولانا ظفر خاں احسن اور مرزا صائب

افسوس ہے کہ عمر نے یاوری نہ کی۔ ورنہ کشمیر کا یہ جادو اثر شاعر اپنے پیچھے علم و ادب اور دانش کا ایک گراں بہا خزانہ چھوڑ جاتا۔


لیلا چٹنس لکس
ٹائیلیٹ صابن کے ذریعہ
اپنا روزانہ دستور العمل
آپ سے ظاہر کرتی ہے
میں لکس ٹائیلیٹ صابن کا
بھرپور جھاگ تیار کرتی ہوں اور اسے
جلد پر بلائمیت لگاتی ہوں۔
اسکے بعد میں صاف و
ستھرے اور ٹھنڈے پانی
سے دھو ڈالتی ہوں۔
آخرش باہستگی اپنا چہرہ نرم تولئے سے خشک کرتی ہوں
دلفریب جلد فلمی اسٹارس کے لئے لازمی ہے، اور گرچہ آپ اپنی خوبصورتی کی قدر
کرتے ہیں، تو آپ کے لئے بھی اس کی اہم ضرورت ہے + آپ اپنے
جلد کی احتیاط کیوں نہیں کرتے، جیسا کہ ہندوستان کی مشہور فلمی
اسٹارس اپنے قیمتی رنگ و روپ کو محفوظ رکھتی ہیں! آپ خود
اس آسان طریقۂ حسن کا ۳۰ دن کے لئے آزمائش کیجئے گا ـ
آپ کو لکس ٹائیلیٹ صابن کا بالائی دار، چمکیلا جھاگ بھائے گا +
وہ جلد کو تر و تازہ، ملائم اور صاف و شفاف رکھتا ہے +
LUX
TOILET SOAP
فلمی اسٹارس کا
حسن بخش صابن
LTR. 163-23 UD
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

# مطبوعات کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی

## گنجہائے گرانمایہ

از رشید احمد صدیقی - یہ مضامین ملک کی چند مقتدر ہستیوں کی یاد میں لکھے گئے ہیں، جنہوں نے مصنف کو اپنی گرانمایہ شخصیت، اپنے علم اور کردار سے بیحد متاثر کیا ہے اور رشید صاحب کی غیر معمولی ذہانت، انسان دوستی، اور سنجیدہ، موثر اسلوب کا بہترین نمونہ ہیں - یہ کتاب دوبارہ نظرثانی اور پانچ مضامین کے اضافہ کے ساتھ خاص اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ قیمت مجلد تین روپے۔

## ذاکر صاحب

از رشید احمد صدیقی، پروفیسر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اس کتاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی شخصیت اور سیرت کا مرقع پیش کیا گیا ہے، مداح و ممدوح دونوں میں سے کوئی محتاج تعارف نہیں، ایک ہندوستان کا مایہ ناز ماہر تعلیم اور دوسرا صف اول کا ادیب، اگرچہ یہ ذکر حبیب ہے لیکن کہیں مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

## تنقید کیا ہے

از آل احمد سرور - (سرور صاحب کے تازہ ترین تنقیدی مضامین کا مجموعہ) اس کتاب میں مصنف نے حالی، شبلی، اقبال، سمرسٹ ماگم کے کارناموں کو تنقید کے جدید ترین اصولوں کی روشنی میں پرکھا ہے جدید ادبی مسائل ادبی تحریکوں کا تجزیہ کیا ہے۔ اور آخری مضمون میں اصول تنقید کو نہایت وضاحت سے پیش کیا ہے۔ قیمت مجلد دو روپے

## تنقیدی اشارے

از آل احمد سرور - سرور صاحب کی ان تقریروں کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے جو گذشتہ چند سالوں میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئی ہیں - موجودہ ایڈیشن میں کئی تقریروں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے - قیمت مجلد تین روپے

## سازِ ہستی

محترمہ صالحہ عابد حسین کا شاہکار - چند دلچسپ افسانوں کا مجموعہ جن میں ہمیں اپنی سماجی اور گھریلو زندگی کی سچی اور دردمندانہ تفسیر اور پرخلوص تنقید ملتی ہے - ان کا نظریہ صحیح معنی میں ترقی پسندی ہے۔ قیمت مجلد تین روپے

## بات چیت

یہ ملک کی مشہور ادیبہ محترمہ صالحہ عابد حسین کی تقریروں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتی رہی ہیں - اس کتاب میں محض بات چیت ہی نہیں بلکہ بلند پایہ ادب بھی ہے - قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے

## غزلیاتِ حافظ

شاعری کی دنیا میں لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی کو نہایت بلند مقام حاصل ہے - حال ہی میں ایران نے انکی پچاس غزلیں شائع کی ہیں - ہر غزل ایک آرٹ کارڈ پر چھپی ہوئی ہے - ہر کارڈ پر طرز تحریر، اور ایرانی دمنع کے سنہری نقش و نگار مختلف ہیں ان پچاس کارڈوں کو ایک چھوٹے سے بکس میں بند کر کے سربمہر کر دیا گیا ہے بکس کے اوپر حافظ کے ایک شعر کو ایرانی آرٹ کی تصویر کے ذریعہ مصور کیا گیا ہے - یہ مجموعہ حقیقتاً دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، اپنی ایرانی تحریر، نقش و نگار، تصویر اور طباعت کے اعتبار سے بے مثل ہے - قیمت دس روپے - فہرست کتب مفت حاصل کیجئے

ملنے کا پتہ

**کتابی دنیا لمیٹڈ - فیض بازار - دہلی**

# ہماری نئی مطبوعات

## لندن سے آداب عرض

از آغا اشرف ایم - اے صاحب نے جنگ کے ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا لندن سے آداب عرض اپنی نشریات کا مجموعہ بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا - دوسرا ایڈیشن قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ۱۲/۱

## دلیس سے باہر

آغا اشرف ایم اے صاحب کے تاریخی و ادبی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ آغا اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں ہماری زبان و معاشرت کے متعلق جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے قیمت دو روپے آٹھ آنے

## ادبستان

حضرت خلیقی دہلوی مرحوم کے تیس حسین و دلکش ادبی مقالات و مضامین کا مجموعہ جنکو اختر شیرانی نے مرتب کیا ہے اردو ادب کی واقعی بے نظیر کتاب ہے یہ مجموعہ کئی بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے - تیسرا ایڈیشن قیمت عہ

## معاشیات قومی

مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی، یہ کتاب فریڈرش لسٹ کے حقیقت افروز کی مرہون منت ہے جسے ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ قلم نے اردو کا لباس پہنایا ہے - یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز اور تاریخی روداد ہے - اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف - قیمت مجلد آٹھ روپے

## اوراقِ پارینہ
### شیر جنگ

ایک انقلابی قیدی وہ بھی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں ملکی حالات - غریب مزدور - کسان کی تکالیف - معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے - یہ کتاب انقلابی ذہنوں کے لئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین استعارے، محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ ہے - قیمت ایک روپیہ چار آنے -

## اردو زبان اور ہندو
### ناظم سیوہاروی

... نے اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع عمل و دخل میں ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سرانجام دی ہیں یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرائے گی تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے - قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے ۴/۱

## قرآنی اخلاق دو حصے
### عبدالصمد صارم

انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام ... کو قائم رکھا گیا ہو - قرآن کریم انسانی ضروریات ... مکمل پروگرام پیش کرتا ہے - فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جسکے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات ... مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی - قیمت ایک روپیہ چار آنے ۴/۱

**کتاب منزل - کشمیری بازار - لاہور**

# دیوانِ حافظ کی فالیں

فارسی سے دلچسپی رکھنے والوں کا یہ عام خیال ہے کہ خواجہ حافظ کے دیوان میں کچھ ایسی کرامت ہے کہ اسے بند کرکے جب ایک خاص طریقے سے کھولا جائے تو جو شعر صفحے کے سرے پر نکلتا ہے وہ صراحتاً یا کنایتہً اس امر کے متعلق جو اسوقت پیش نظر ہو صاف خبر دیتا ہے کہ وہ ہوگا یا نہیں، اسکا نتیجہ خواہش کے مطابق ہوگا یا خلاف یا فال دیکھنے والے کا خیال صحیح ہے یا غلط۔ اور غالباً اسی خیال کے ماتحت لوگ اسے "لسان الغیب" کا لقب دیتے ہیں۔ اس قسم کے فال نکالنے کا لوگوں میں بہت رواج رہا ہے اور اب بھی بعض جگہ ایسے لوگ ملتے ہیں جنھیں اسکا یقین ہے کہ دیوانِ حافظ غیب کی بابت خبر دیتا ہے اور اچھائی برائی سے آگاہ کرتا ہے۔ ایسے سینکڑوں واقعات مشہور ہیں جب دیوان حافظ کی فالیں صحیح نکلی ہیں اور اسی کے مطابق ظہور میں آیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں چند ایسے واقعات پیش کرینگے۔

۱: مُلا نگس نامی شاہ اسمٰعیل صفوی کے دربار کا مشہور مُلا تھا۔ اس نے مقبرۂ حافظ کے انہدام کی سعی و کوشش کی اور شاہ کو ابھارا کہ خواجہ حافظ کے کفر و زندقے کی بنا پر اس کی قبر کو پیوند زمین کرنا ضروری ہے تاکہ اساس الحاد ابدی طور پر مستاصل ہوجائے۔ شہریار صفوی نے لسان الغیب سے استمداد کیا تو یہ شعر نکلا ؎

اے مگس عرصۂ سیمرغ نہ جولانگہِ تست ❊ عرض خود میبری و زحمتِ ما میداری

۲۔ شاہ طہماسپ کے پاس ایک گرانقدر انگوٹھی تھی۔ ایک دن اسے ہاتھ میں لےکر بادشاہ سرِ دریا تھے کہ انگوٹھی دفعتہً گم ہوگئی۔ بادشاہ نے اس کو بدفالی تصور کیا اور انگوٹھی کی تلاش شروع ہوئی۔ ساری بساط نیچے اوپر کرڈالی گئی مگر انگوٹھی نہ ملی۔ دیوان حافظ سے پوچھا تو یہ شعر نکلا: ؎

دلے کہ غیب نمای است و جام جم دارد ❊ ز خاتمے کہ دمے گم شود چہ غم دارد

بادشاہ نے حیرت سے سبحان اللہ کہہ کر زانو پر ہاتھ مارا تو معلوم ہوا کہ انگوٹھی شلوار کے پیچ میں موجود ہے۔

۳۔ شاہ عباس کو آذربائیجان کی تسخیر کا خیال رہتا تھا مگر مشکلات کی وجہ سے اس طرف لشکر کشی میں متردد رہتا تھا۔ خواجہ حافظ کا معتقد تھا لشکر کشی کے مطلوب کے متعلق دیوان حافظ سے استشارہ کیا تو یہ شعر نکلا: ؎

عراق و پارس گرفتی بہ شعر خود حافظ ❊ بیا کہ نوبتِ بغداد و وقتِ تبریز است

۴۔ شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ جلال الدین اکبر اور سکندر لودی کی لڑائی سے پہلے دیوان حافظ میں فال دیکھی گئی کہ لڑائی کا کیا انجام ہوگا؟ اس میں یہ شعر نکلا: ؎

سکندر را نمی بخشند آبے ❊ بہ زور و زر میسر نیست این کار

چنانچہ سکندر کو شکست ہوئی اور اکبر کامیاب ہوا۔

۵۔ کنعان بیگ قزوینی کے بھائی کا نام یوسف تھا۔ وہ احمد آباد گجرات کی جنگ میں گم ہوگیا۔ بڑی تلاش کی گئی مگر نہ ملا۔ کنعان بیگ نے مایوس ہوکر خواجہ کی روح سے استدعا کی تو مندرجہ ذیل شعر نکلا: ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

اور اتفاق کی بات ہے کہ دوسرے دن یوسف کی خبر مل گئی

۶۔ شاہانِ اودھ میں کسی کے زمانے کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ محل میں بادشاہ کی بیش قیمت انگوٹھی یا کوئی جواہر گم ہوگیا۔ رات کے وقت اسے چراغ کی روشنی میں تلاش کیا جارہا تھا کہ دیوان حافظ میں فال دیکھی گئی تو سرِ صفحہ پر یہ بیت برآمد ہوئی: ؎

ز فروغِ چہرہ زلفش رہ دیں زند ہمہ شب
چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

چنانچہ جس کنیز کے ہاتھ میں شمع تھی اسی کے پاس سے گمشدہ چیز برآمد ہوئی۔

۷۔ جنگ اموی کے زمانے میں طہران کے دورِ جدید کے مشہور ادیب پژمان نے جنگ کے متعلق خواجہ سے استفسار کیا تو یہ شعر نکلا ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

۸۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ ان کے بڑے بھائی کو جب کہ وہ پولیس میں ملازم تھے ماکثر بیمار رہنے کے سبب ملازمت پوری ہونے سے پہلے پنشن لینے اور ڈاکٹری معائنہ کرانے پر مجبور کیا گیا مگر وہ چاہتے تھے کہ جب ملازمت پوری ہوجائے اسوقت خود درخواست کرکے پنشن لیں۔ چنانچہ ڈاکٹری معائنہ کی تاریخ سے ایک دن پہلے انھوں نے دیوان حافظ میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا ؎

ہر چند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم
ہرگہ کہ روئے خوب تو دیدم جواں شدم

انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ڈاکٹر ان کی خواہش کے مطابق رائے دے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۹۔ مشہور ہے کہ ایک پری روقبائے زرنگاری پہنے مزار حافظ پر آیا۔ مزار پر دیوان موجود تھا۔ اس نے یوں ہی اٹھا کر دیکھا تو یہ شعر نظر پڑا ؎

سرمست در قبائے زرافشاں چو بگذری
یک بوسہ نذرِ حافظِ پشمینہ پوش کن

پری رو ہنس پڑا اور کہا

ارجمند مسیح الزماں ادیب

"بچشم! دو بوسہ خواہم داد" اور چلا گیا۔ چند دنوں کے بعد پھر ادھر سے گزرا تو دیوان دیکھنے کا شوق ہوا۔ اُٹھا کے دیکھا تو یہ شعر سامنے تھا:۔

گفتہ بودی کہ شوم مست و دو بوست بدہم
وعدہ از حد بشد و ما نہ دو دیدیم و نہ یک

نازنین حیران رہ گیا اور کہا "اطاعت دارم اگر سہ بوسہ ہم بخواہی بدہم"۔ اور چلا گیا۔ عرصہ کے بعد پھر جب ادھر سے نکلا اور دیوان کھولا تو یہ بیت نکلی:۔

سہ بوسہ کز دو لبت کردۂ وظیفۂ من ؛ اگر ادا نکنی قرضدار من باشی

نازنین بے اختیار تعویذ لحد سے لپٹ گیا اور بار بار اپنے ہونٹوں کو لوحِ مزار کو مس کیا۔

۱۰۔ شیراز کے چند خوش رو باتیں کرتے حافظ کے مزار پر آئے۔ خواجہ حافظ سے پوچھا جائے کہ وہ ان میں سے کسے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا:۔

شہریست پر کرشمہ و خوباں ز شش جہت
چیزیم نیست ورنہ خریدار ہر ششم

۱۱۔ حزین فرمان کا بیان ہے کہ اوائل شباب میں انھیں سعدی کا کلام بہت پسند تھا اور ان کے کلیات کے مقابلے میں ہر شخص کا کلام ہیچ سمجھتے تھے۔ ایک دن اتفاقاً دیوان حافظ کھول کر پڑھنا شروع کیا تو انھیں کچھ لطف نہ آیا۔ ابھی وہ یہ خیال کر ہی رہے تھے کہ خواجہ کے کلام میں شیخ کا سا مزا نہیں کہ ہوا کے جھونکے نے دیوان کے ورق اُلٹ دئے اور فرمان کے سامنے یہ شعر تھا:۔

چو لشنوی سخن اہلِ دل مگو کہ خطا ست
سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجا ست

۱۲۔ ایک فال شیخ علی حزیں سے بھی منسوب کی جاتی ہے۔ شیخ غزل میں اپنے نزدیک خواجہ صاحب کا تتبع کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک دن اسی بات کے دریافت کرنے کو کہ مجھے کہاں تک اس تتبع میں کامیابی حاصل ہے دیوان حافظ میں فال دیکھی تو اس میں یہ بیت نکلی:۔

کہ شعر تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد ؛ یک نکتہ ازیں دفتر گفتیم و ہمیں باشد

یہ اور اسی قسم کے بہت سے واقعات کافی شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اسکا باعث کوئی کرامت یا غیر معمولی کرشمہ نہیں۔ بلکہ وہ مقبولیت ہے جس نے حافظ کی عزت لوگوں کے دل میں بہت بڑھا دی۔ انکی غزلوں میں حسنِ بیان کے علاوہ عشق مجازی کے پیرایے میں عشقِ حقیقی کا بیان ہے جس نے انھیں ہر طبقہ میں مقبول بنا دیا ہے۔ ایک طرف جہاں اس سے آزاد طبع نوجوان لطف اُٹھاتے ہیں تو دوسری طرف مشائخ حال و قال کی مجلسوں میں اس پر وجد کرتے ہیں جسطرح درویشوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں اسی طرح امیروں اور بادشاہوں کی پسندیدگی کا باعث بھی۔

یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ آئندہ کا حال جاننا چاہتا ہے۔ ہاتھ دیکھنا، جوتش، نجوم، رمل، جفر، فال، شگون سب اسی خواہش کے پورا کرنے کے ذرائع ہیں جن سے غیب کی باتیں معلوم ہوتی رہیں۔ ساتھ ہی یہ خاصیت بھی ہے کہ جس شخص سے غیر معمولی عقیدت ہو جائے اُسے معمولی ہستیوں سے بلند سمجھا جانے لگتا ہے اور دل خود بخود اس سے غیر معمولی اور فوق العادت کرشموں کی توقع کرنے لگتا ہے۔ بلکہ یہ تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس کی معمولی باتوں میں بھی بڑی بڑی گہرائیاں اور وسعتیں نظر آنے لگتی ہیں۔

تصوف چونکہ کلام حافظ کا اہم جز ہے اس لئے مذہبی عقیدت کا پہلو اس میں یقیناً موجود تھا اور لوگ اُسے اللہ والے بزرگ اور صاحبِ باطن صوفی کا کلام سمجھ کے اس کی قدر کرتے تھے اور اسے متبرک بھی سمجھتے تھے۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ دنیا داروں اور ہوا و ہوس کے بندوں میں کسی کو اپنی خواہش کی تکمیل کی دھن میں دیوان حافظ سے فال نکالنے کا خیال پیدا ہوا ہو اور حسنِ اتفاق سے نتیجہ صحیح بھی نکلا ہو اور یہ بات رفتہ رفتہ مشہور ہو گئی ہو۔ یہ بات کچھ ایسی غیر معمولی نہیں لیکن انسان چونکہ عجیب باتیں پیش کرنے اور سننے کا مشتاق رہتا ہے اس لئے ایسے اتفاقات کرامتوں کی طرف کھینچ لئے جاتے ہیں۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ دیوان حافظ سے فال دیکھنے کی بنیاد کم و بیش اسی طرح پڑی ہے لیکن اس خیال کو بعد کی مثالوں سے تقویت یوں ہوتی ہے کہ حافظ کا طرزِ بیان اور شاعری کا انداز کچھ ایسا ہے کہ الفاظ عموماً ایسے حاوی اور تجگدار ہوتے ہیں کہ شعر کے متعدد پہلو نکالے جا سکتے ہیں ؛

## ستارے — شیر محمد کراچوی

ستارو! مسکراؤ جھلملاؤ
فضا سے ظلمتِ دوراں مٹاؤ
مرا دل ہے تمہارے دل سے ملحق
کہیں ایسا نہ ہو تم ٹوٹ جاؤ!

چمک اب وہ ستاروں میں نہیں ہے
فضا میں آبشاروں میں نہیں ہے
کوئی انگڑائی لینے کو ہوا ہے
قرار اب بے قراروں میں نہیں ہے

# امریکہ کے اخبار

لیلاوتی

خبریں پہنچانے میں صحت اور تیز رفتاری امریکی پریس کی عام خصوصیت ہے لیکن قارئین کے الگ الگ مذاق کے باعث اس قوم کے مختلف اخبارات کی حیثیت بھی جداگانہ ہے۔ یہ اخبارات عوام کے خیالات کے باہمی فرق کو پیش کرتے ہیں جو ۰۰۰،۰۰۰،۱۴۰ شہریوں کی جمہوریہ میں ناگزیر ہے۔

امریکہ کے آئینی دستور کی رو سے مرکزی حکومت کو ذرا بھی اختیار نہیں کہ وہ تحریری اور تقریری آزادی میں کوئی دخل دے سکے۔ اخبارات حکومت کی اندرونی اور خارجی پالیسی سے عموماً اختلاف کرتے ہیں یہاں تک کہ کوئی نووارد ریاستہائے متحدہ کے اخباروں کی رائیں، اور ان کی جوشیلی تنقیدیں دیکھے تو یقیناً حیران و مضطرب ہو جائے۔ لیکن ایک امریکی کے لئے یہ ایک معمولی بات ہے۔ ایک اوسط درجے کا امریکی کسی اخبار کا انتخاب اس وجہ سے نہیں کرتا کہ اس کے نظریے اور ادارتی تنقیدوں سے اسے اتفاق ہے بلکہ اس لئے کہ اس میں اس کی من بھاتی اور دوسری خبریں ایسے اسلوب سے پیش کی جاتی ہیں کہ اسے خود بخود دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

سیمیول ٹوپ لف جونیر موجودہ امریکی اخبار رسانی کا قائد تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس نے یہ کام شروع کیا کہ بوسٹن کے ایکسچینج کوفی ہاؤس کی نیوز بک میں جہاز رانی کی معلومات اور وہ مختلف خبریں جو اسے سیاحوں سے حاصل ہوتی تھیں لکھ دیتا تھا۔ تاجروں اور جہازوں کے مالکوں کے لئے بحری اطلاعات بہت زیادہ اہم تھیں۔ یہی لوگ قہوہ خانوں کی سرپرستی کرتے تھے اور یہی ایسے مقامات تھے جہاں وہ یہ اطلاعات نیوز بک سے حاصل کر سکتے تھے۔ مسٹر ٹوپ لف ایک چپو والی ناؤ میں بیٹھ کر تمام بندرگاہ میں پھرتے اور تمام آنے والی کشتیوں سے ضروری خبریں حاصل کرتے۔ صحت اور رفتار کے اعتبار سے جلد ہی ان کی یہ خدمت اس زمانے کے اخبارات سے کہیں زیادہ آگے بڑھ گئی۔ اخبار رسانی کی تیز رفتاری کی سہولتیں اور کچے چھاپے خانے کیونکہ کم تھے اس لئے رسالے زیادہ تر نظموں کے خلاصوں، مضمونوں، سیاسی مقالوں اور مذہبی مواعظ سے پُر ہوتے تھے۔

اس سے اگلے دس بیس برسوں میں امریکی اخبار والوں نے اپنے چھاپے خانوں میں جلد خبریں پہنچانے کے لئے اخباری کشتیوں نہری بجروں دوڑنے والوں، خچر ایکسپریس اور خبر رساں کبوتروں سے کام لینا شروع کیا۔ انیسویں صدی کی صحافت میں ایک یہی امتیاز ہے کہ ہر اخبار اس زبردست مقابلے میں بس یہ چاہتا تھا کہ وہ لوگوں تک خبریں پہنچانے میں اپنے رقیب اخبارات میں اول رہے۔ یہ رقابت اب بھی ایک زبردست قوت ہے۔ اگرچہ آمد و رفت کے موجودہ ذریعوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے لیکن انسانی عنصر کسی افسانے یا خبر کے حاصل کرنے اور شائع کرنے کے پیچیدہ کام میں اب بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔

امریکہ میں اخبارات کا عموماً کوئی پھیلا ہوا ادارہ نہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ۱۸۰۰ روزانہ اخباروں میں سے ۵۰ فیصدی اخبارات کی اشاعت ۵،۰۰۰ سے بھی کم ہے اور جن میں نسبتاً کم آدمی کام کرتے ہیں۔ ایسے ایسے چھوٹے چھوٹے فرقوں کے لئے جو ایک روزانہ اخبار کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے ہفتہ وار اخبارات ہیں جن کی تعداد دس ہزار ہے۔ عام طور پر یہ مقامی ناشر کی بڑھی ہوئی سرگرمیاں ہوتی ہیں جو بیشتر کام خود ہی کرتا ہے اور اپنی مدد کے لئے چھاپنے کی دکان میں ایک کلرک اور ایک خبر رساں کو تھوڑے سے وقت کے لئے ملازم رکھ لیتا ہے۔ اس کے برخلاف بین الاقوامی روزانہ اخبار ہے جیسے کہ نیویارک ٹائمز جس کا ادارہ تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا تخلیقی اور تجارتی ادارہ ہزاروں پر مشتمل ہے اور جس کی روزانہ اشاعت پانچ لاکھ ہے۔

چھوٹے چھوٹے اخبار بین الاقوامی روزناموں کے ذرائع کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ ایسے ادارے کی لائن پر کام کرتے ہیں جو زیادہ تر امریکہ کے شہری مرکزوں کے پریس میں مشترک ہے۔

مقامی شعبہ کا تعلق مقامی خبروں سے ہوتا ہے۔ شعبۂ تار برقی ان تمام بیرونی اور مقامی خبروں کا کام کرتا ہے جو نیوز ایجنسیوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ بعض بڑے بڑے اخباروں میں بحری تار کا شعبہ بھی ہوتا ہے جن کے پاس ان کے بیرونی ممالک کے نامہ نگار خبریں بھیجتے ہیں۔ کاپی نویسی کا شعبہ کاپیوں کو ترتیب دیتا ہے اور ان کی سرخیاں لکھتا ہے۔ مقامی خبروں کے ایڈیٹر کا کام تمام حالات و واقعات کا شامل کرنا اور اپنے شعبے کے کارکنوں کو خاص خاص افسانے سپرد کرنا ہے۔ مقامی شعبے کے اراکین میں ڈرامہ، موسیقی اور فلم کے نقاد، کتابوں پر تبصرہ لکھنے والے، عدالتی، بحری اور سیاسی نامہ نگار اور دیگر ایسے لوگ شامل ہیں جو پولیس ہیڈ کوارٹر کی سرگرمیوں کی خبریں مہیا کرتے ہیں۔ اس تمام ادارے کے اوپر ایک ناشر ہوتا ہے جو عام طور پر دو صدر مشیروں کی مدد سے تمام کام چلاتا ہے۔ ان مشیروں میں ایک تو مدیر انتظامی ہوتا ہے جس کے ذمے خبروں کا اکٹھا کرنا اور ان کا چھاپنا ہے۔ اور دوسرا کاروبار کا منیجر ہوتا ہے جس کے ذمہ اخبار کی آمدنی کے دو ذرائع یعنی اشاعت اور اشتہارات ہوتے ہیں۔ ادارتی مقالے عام طور پر ایک مدیر التزامی مخصوصی اور اخباری شعبے کے ذمہ داروں سے مشورہ کرنے کے بعد لکھتا ہے۔ امریکی اخباروں میں اپنے اپنے

کارٹونسٹ ہیں جو اداراتی رائے کو کسی تصویر کی شکل میں پیش کرتے ہیں
اخباری اور اداراتی شعبہ جات کے علاوہ اکثر اخباروں میں مختلف کھیلوں کے شعبہ جات بھی ہیں جن کی قومی پریس میں کافی گنجائش ہے۔ فیچر اور افسانوں کے شعبے بھی ہوتے ہیں جن کی کوئی وقتی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ بڑے اخباروں میں ایک مصوری کا شعبہ ہوتا ہے جس میں فوٹوگرافر نامہ نگاروں کے ہمراہ بہت اہم کاموں میں ساتھ دیتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلیفون کے ذریعے تصویروں کے بھیجنے میں حال ہی میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی وجہ سے امریکی اخباروں میں تصویروں کی اشاعت بہت وسیع ہوگئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے اخبارات کو تصاویر ان فوٹو کی ایجنسیوں سے ملتی ہیں جنھیں وہ چندہ دیتے ہیں۔

امریکی اخبار کے مکانکی شعبوں میں کمپوزنگ اور پریس کے کمرے شامل ہیں۔ کمپوزنگ روم میں ٹائپ اور اشتہارات کو ترتیب دیا جاتا ہے اور پریس روم میں اخبار چھپتا ہے۔ موجودہ تیز رفتار گھومنے والی چھاپنے کی مشین ایک گھنٹے میں ۴۰،۰۰۰ اخبار چھاپ سکتی ہے۔ اخبار کا ادارہ ایسا منظم ہوتا ہے کہ اگر کسی خاص خبر کے لئے ضمیمہ چھاپنے کی ضرورت ہو تو شعبۂ اخبار میں اس خبر کے پہنچنے کے بعد بیس منٹ میں گلی گلی وہ خبر شائع ہوکر پہنچ جاتی ہے۔

بڑے بڑے روزانہ اخباروں میں سے اکثر کا امریکہ کے دارالسلطنت واشنگٹن میں ایک بیوریو ہوتا ہے اور ملک کے دیگر بڑے بڑے اہم شہروں میں نامہ نگار رہتے ہیں۔ بعض اخباروں کا بیرونی ممالک کے ہر دارالخلافے میں ایک نامہ نگار ہوتا ہے۔ گھومنے پھرنے والے مخبر ادھر ادھر سے خبریں جمع کرکے ان نامہ نگاروں کے پاس بھیجتے ہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تین بڑے خبر رساں ادارے ایسوسی ایٹڈ پریس۔ یونائٹڈ پریس اور بین الاقوامی نیوز سروس ہیں۔ اکثر اخبارات ایک یا اس سے زیادہ خبر رساں ایجنسیوں کے ممبر ہوتے ہیں۔ ان خبر رساں ایجنسیوں کے نیویارک اور واشنگٹن میں بڑے بڑے بیوریو ہیں۔ امریکہ کے ہر شہر میں اسی قسم کے چھوٹے بڑے بیوریو قائم ہیں۔ ان کو تمام دنیا میں سہولتیں حاصل ہیں۔ اور وہ ریڈیو۔ تار برقی اور تار برقی ٹائپ سے اپنی خبریں اپنے گاہکوں تک برابر پہنچاتے رہتے ہیں۔

ان ایجنسیوں کی مقامی نیوز بیوریو کی خبریں بیرونی ممالک کے خاص خاص شہروں میں بھیج دی جاتی ہیں۔

روزانہ اخبار کے کاروبار کا ایک بہت اہم حصہ شعبہ تقسیم ہے۔ اس شعبہ کا یہ کام ہے کہ اخبار یا تو گاہکوں کے گھر براہ راست پہنچے یا اخبار بیچنے والی ایجنسیوں میں پہنچایا جائے۔ عام طور پر لوگوں کے گھر اخبار پہنچایا جاتا ہے۔ عموماً لڑکے اپنے اسکول کے بعد پیدل یا سائیکل پر اخبار بانٹنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ اشتہارات کے نرخ کا انحصار اخبار کی اشاعت پر ہے۔ اور تقریباً اخبارات کی آمدنی کا دو تہائی حصہ انہی اشتہارات سے حاصل ہوتا ہے۔

امریکی صحافت میں ایڈیٹر کے نام خطوط کا کالم ایک ہردلعزیز دستور ہے جو رائے عامہ کے لئے کئی طریقوں سے ایک آلہ ہے۔ ان خطوط میں عام طور پر کسی خاص اخبار کی پالیسی یا مسئلے پر تشدد آمیز رائے کا اظہار ہوتا ہے۔

امریکی اخبارات کسی خاص فرد یا کارپوریشن کی ملکیت ہوتے ہیں جن کی اپنی اپنی سیاسی اور معاشرتی پالیسی ہوتی ہے۔ افکار حاضرہ پر اخبار کے جداگانہ نظریے اور اختلافات کو جچے تلے ہوئے انداز میں پیش کرنے کے لئے اداراتی صفحات معین ہوتے ہیں۔ خبروں کے کالم میں اختلاف آراء کا لکھنا اتنا پر زور نہیں ہوتا۔ اخبار نویس کسی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اگر اپنا سیاسی یا معاشرتی نظریہ پیش کر دیتا ہے تو عام طور پر اس کا یہ تبصرہ شعبۂ اشاعت میں حذف کر دیا جاتا ہے۔

امریکی پریس کے نقاد اس پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ اخباری مقالات کو ایسی ہوشیاری اور چالاکی سے ڈھالا جاتا ہے کہ ان میں ناشر کے نظریے جھلکنے لگتے ہیں۔ اور یہ کہ کوئی خاص کہانی جو حقیقت پر مبنی ہو اس کی سرخیاں اس طرح لکھی جاتی ہیں کہ پڑھنے والے کو کھٹکنے لگتی ہیں۔ یا یہ کہ کسی واقعے کو لکھتے وقت اس کے آغاز یا ابتدائی پیراگراف پر غلط زور دیا جاتا ہے یا یہ کہ کوئی ایسا بیان جو ناشر کے نظریوں کے خلاف ہو اسے یا تو بالکل اڑا دیا جاتا ہے یا کسی کالم میں غیر نمایاں طریقے پر ڈال دیا جاتا ہے یا اگر ریکارڈ کے لئے اولیں ایڈیشن میں چھاپا جاتا ہے تو اس کے بعد کے ایڈیشن سے نکال دیا جاتا ہے۔

امریکی صحافت کا کوئی انصاف پسند مبصر اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خبروں کے کالم میں ایسا تعصب ضرور برتا جاتا ہے۔ تاہم یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہوگا کہ امریکہ کی اخبار رسانی کی واقعیت پسندی میں شبہ کی گنجائش ہے۔ اس واقعیت پسندی کی شاید یہ حقیقت ہے کہ امریکی اخباروں کے اداراتی نظریوں سے رائے عامہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس حقیقت کی ایک مستند مثال فرینکلن ڈی لینو روزویلٹ کا متواتر چار بار صدر منتخب ہونا ہے حالانکہ امریکہ کے بڑے بڑے اخبار جم کر سختی کے ساتھ ان کی مخالفت کرتے رہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب امریکی اخبار رائے عامہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تو انھیں کیوں اہمیت حاصل ہے۔ امریکی اخباروں کی اہمیت خبریں دینے پر منحصر نہیں بلکہ دیگر خدمات پر ہے۔ اخبارات عوام کی بہت سی مختلف قسم کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ یہ مقامی سیاسی برائیوں کی خبریں کھلم کھلا ظاہر کرتے ہیں اور صحت کی بہتری حفظان صحت کے اصولوں اور تعلیمی سہولتوں پر زور دیتے ہیں۔ امریکہ کے اخبار رائے عامہ پر بھی ضرور اثر انداز ہوتے ہیں لیکن کسی خیال کو کسی پر تھوپ کر نہیں بلکہ اختلافات و مباحثے کی تحریک کے بعد۔

# کہاں؟

تیج ناتھ زار

اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ جب اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ جوان ہو چکی ہے۔ اور ایک جوان لڑکی زیادہ دیر تک اپنے ماں باپ پر بوجھ بن کر نہیں رہ سکتی۔ اسی شام اس نے اپنے گھر میں ایک غیر معمولی تبدیلی محسوس کی۔ تمام در و دیوار آراستہ کئے گئے۔ بیٹھک میں نئے قالین بچھ گئے۔ کرائے کے صوفہ سیٹ آئے۔ گھر کے تمام افراد نے اپنے بہترین لباس زیب تن کئے۔ اس کی ماں نے اسے ریشمین ساڑھی پہنائی۔ اس کے بالوں کو بڑی احتیاط سے سنوارا اور چند ضروری ہدائتیں کرکے چائے کا سامان کرنے لگی۔ اسے اپنے جسم کے روئیں روئیں میں ایک عجیب کسمساہٹ کا احساس ہونے لگا۔ جیسے حیا سے سمٹی ہوئی بند کلی کھل جانا چاہتی ہو۔ تھوڑی دیر بعد چند آدمی ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ ایک ادھیڑ عمر کا مرد، ایک ادھیڑ عمر کی عورت، اور موٹی موٹی سرخ آنکھوں والا نوجوان اور اس کے پیچھے اس کا اپنا باپ تھا۔ اسے بیٹھک میں لے جایا گیا۔ اس عورت، مرد اور نوجوان نے نگاہوں نگاہوں اس کے جسم کی بوٹی بوٹی ٹٹول لی۔ اس کے سیاہ گھنیرے بالوں کی لمبائی ماپ لی۔ اس کے جوان ہونٹوں کا رس تول لیا۔

اس کے دو ماہ بعد ——— ان نوجوان سے اس کی شادی ہوگئی۔ مگر پہلی ہی رات وہ یہ جان کر سہم گئی کہ اس کا خاوند شراب پیتا ہے اور نشہ کی حالت میں ایک درندے کی طرح اس کے جسم پر جھپٹتا ہے۔ وہ اس کے پاؤں پڑتی رہی کہ وہ شراب نہ پیئے۔ اس کی منتیں کرتی رہی۔ مگر اس کی لت بڑھتی گئی۔ اور پھر ایک دن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کا ٹھکانا نہ رہا کہ اس کی کلائی پر سے سونے کی گھڑی غائب ہے۔ پھر اس کی اپنی ساڑھیاں لاپتہ ہونے لگیں۔ اس کے گہنوں کی صندوقچی ناپید ہوگئی۔ وہ پھر بھی ایک بے حس پتھر کی طرح سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ پھر اس کا خاوند اکھڑا اکھڑا سا رہنے لگا۔ تمام دن چارپائی میں گڑا رہتا اور اس کے منہ سے لعاب بہتا رہتا۔ ۔ ۔ ۔ مگر ایک رات جب وہ ایک اجنبی کے ساتھ گھر واپس آیا تو وہ ہنس رہا تھا۔ آدھی رات کے وقت جب خوابگاہ کے دروازے پر دستک ہوئی اور اس نے دروازہ کھولا۔ تو مارے حیرت کے اس کا سر پھٹنے لگا۔ اس کے خاوند کی بجائے وہ مخمور اجنبی اپنی خونی آنکھوں سے اس کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ وہ چیخ کے ساتھ دھڑام سے فرش پر گر گئی۔ اور اجنبی بڑھتا گیا۔ اور ایک بھاری بھرکم گالی کے ساتھ کسی نے باہر سے دروازے کی کنڈی لگا دی ۔ !

دوسرے دن صبح ہی وہ کسی سے کچھ کہے سنے بغیر کلکتہ چھوڑ آئی حالانکہ وہ اب تک یہ سوچتی رہی کہ اس نے ایسا کیوں کیا ؟ ۔ ۔ ۔ اس خیال کے آتے ہی ترہینی کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے اور ڈوبتے سورج کی سندوری سے کرن ہر دم اوپر اٹھ رہی تھی۔ جیسے ایک جگہ سے چپکے رہنے کی استطاعت اب اس میں نہ رہی ہو اور دور پرے چوپال میں لَی کے جھٹوں پر پڑنے والی چوٹیں تیز ہو رہی تھیں۔ یکایک اسے خیال ہوا کہ صبح سے پہلے پہلے اسے یہ مکان خالی کر دینا ہوگا۔ وہ کہاں جائے ؟ اس سے گاؤں والوں کو اب کوئی غرض نہیں۔ وہ مرے یا جئے۔ انھیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ بیس سال تک انھوں نے اس سے کام لیا تو تیس روپے ماہانہ کے حساب سے اس کی قیمت بھی تو ادا کی۔ اب وہ بوڑھی ہو چکی تھی۔ پہلی سی سرگرمی سے کام نہیں کر سکتی۔ اس لئے اسے دس روپے مہینہ ہی کافی ہیں۔ گاؤں کہاں کے شہر بازار ہیں جو ہر چیز دام دینے سے ملتی ہے۔ اور پھر روپے کہاں آسمان سے گرتے ہیں جو پسینے برابر خون پسینہ ایک کرو۔ چلچلاتی دھوپ میں چلو۔ کڑاکے کی سردی میں مرو۔ پھر فصل پکے اور تب کہیں روپیہ کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں فقرے ترہینی کے ذہن میں یکدم بج اٹھے۔ یہ ٹھیک ہے۔ اس نے سوچا کہ اب اس میں کام کرنے کی استطاعت باقی نہیں۔ مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ وہی استانی جو پانچ سال اس کے نیچے کام کرتی آئی ہے اب اس پر ہی حکم چلایا کرے گی؟ ۔ ۔ ۔ ۔

عقب کے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ اس نے سوچا۔ پدما ہوگا۔ مگر پدما کیوں ہوگی راما ؟ مگر وہ بھی اس وقت کیوں آنے لگی ؟ بنیا ؟ ہاں شاید بنیا ہو۔ بنیا ؟ آخر یہ لڑکیاں کیوں مجھ سے اتنا پیار کرتی ہیں۔ بھگوان دنیا میں کوئی یتیم نہ ہو! ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھوں میں تمام کا دکھ منظر پھر گیا جب سکول کے احاطہ میں روتی ہوئی آنکھوں اور ہر دم بلند ہوتی ہوئی سسکیوں کے درمیان لڑکیوں نے اسے الوداع کہی تھی اور بنیا نے ٹیگور کی وہ نظم پڑھی ——— اس باغ کی معصوم کلیوں کو کس بیدرد نے نوچ لیا۔ وہ کون ؟ کیا اس چمن میں پھر کبھی بہار نہیں آئے گی ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ مانجھی کشتی ہولے ہولے کھینا۔ تاکہ ہم ساحل پر کھڑے اپنے جانے والے کو دور تک دیکھ سکیں ۔ ۔ ۔ ۔

ترہینی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ دروازہ پر پھر کھٹکا ہوا۔ میلی دھوتی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتی ہوئی وہ دروازے تک آئی اور کانپتے ہاتھوں سے کنڈی کھولنے لگی۔ بیٹی ! ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے وہ کہنا ہی چاہتی تھی کہ خارش زدہ کتیا دہلیز کے پاس سے اٹھ کر پرے ٹنڈ منڈ کھیتوں میں پھیلتے ہوئے اندھیارے میں کھو گئی ۔ ۔ ۔

چاروں طرف ایک ہلکی خاموشی مسلط ہو چکی تھی۔ چوپال میں چھتوں پر پڑنے والی چوٹوں کی صدائیں مدہم ہوتے ہوتے معدوم ہو چکی تھیں۔

شاید یہ کسان لوگ اپنا کام ختم کر چکے تھے اور اب تفریح کی فکر میں تھے۔ یکایک کانسی کے کٹورے بجنے لگے۔ اور ڈھولک کے کناروں سے ٹھک ٹھک کی آواز پھوٹنے لگی۔ الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے بوڑھوں، نوجوانوں اور بچوں نے گیت کی دھن ٹھیک کرنے کے لئے اپنے اپنے گلے کھنکارے سامنے کی پگڈنڈی پر چند آدمی ایک پھڑپھڑاتی ہوئی لالٹین کی روشنی میں چوپال کی طرف جاتے نظر آئے اور ان کے پیچھے دیہاتی عورتوں کی ایک قطار۔ نئے کپڑوں میں ملبوس ہاتھوں میں تھالیاں تھامے چلتی جاتی تھیں۔ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو چند لمحوں کے لئے فضا میں پھیلی اور پھر وہ بلند ہوتی ہوئی موسیقی اور ڈھولک کے کناروں سے پھوٹنے والی ٹھک ٹھک کی صدا۔

تاریکی مکمل طور پر پھیل چکی تھی۔ الاؤ سے نکلنے والی چنگاریاں کبھی کبھی جگنوؤں کے ایک سیلاب کی طرح رات کے سینہ میں چمک اٹھتیں۔ چادر کو اپنے گرد لپیٹتی ہوئی ایک گٹھڑی کی طرح چارپائی پر گر گئی۔ اور چارپائی کے پاس ہی پڑے ہوئے زنگ آلود ٹرنک، میلی دری میں لپٹے ہوئے بستر اور برتنوں کی بوری کو دیکھنے لگی۔ جو اس کی سفید ہوتی ہوئی آنکھوں میں بڑے بڑے سیاہ دھبوں سے زیادہ کچھ دکھائی نہ دئے۔ بیس سال پہلے جب وہ کلکتہ کو کالے کوسوں پیچھے چھوڑ کر اس خاموش دیہات میں آئی تھی۔ تو یہی تین چیزیں اس کی زندگی کا سرمایہ تھیں اور اب جب وہ نوکری سے سبکدوش ہو گئی تھی یہی تین چیزیں پھر اس کا سہارا تھیں معًا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے وہی سوال گھورتا نظر آیا۔ کہ وہ کہاں جائے؟ ـــــ اگر وہ چاہے تو اسی گاؤں میں زندگی کے باقی ماندہ ایام بڑے آرام سے گزار سکتی ہے۔ گاؤں والوں کو اس سے کتنی عقیدت ہے۔ سب بچے اور لڑکیاں اسے اپنی ماں ہی سمجھتے ہیں۔ مگر جس گاؤں میں وہ کبھی ایک شان اور دبدبے کے ساتھ رہی تھی کیا اب وہیں دوسروں کا دست نگر بن کر رہنا ہوگا۔ پدما، بنیا اور راما کو اس سے لاکھ پیار سہی لیکن آخر کوئی کب تک کسی کا بوجھ اٹھائے رکھتا ہے؟ لڑکیاں پرایا دھن ہیں۔ کل انھیں کوئی بیاہ کرلے جائے گا۔ اور پھر یہ بھی کہاں کی شرافت ہے کہ وہ ان کے لئے تکلیف کا باعث بنی رہے۔ یکایک اسے خیال آیا کہ وہ کلکتہ کیوں نہیں چلی جائے؟ ۔۔۔ کلکتہ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور اس خیال کے آتے ہی ایک بجلی سی اسے سر سے پاؤں تک دوڑ گئی۔ ایک عجیب جھرجھری سی محسوس کرتے ہوئے وہ چارپائی پر اچھل سی گئی۔ اور ایک وحشت اس کی آنکھوں میں لہرانے لگی۔ وہی کلکتہ۔ کیا وہ پھر اسی گناہوں کی بستی کو لوٹ جائے گی۔ جہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اب اسے وہاں کون پہچانے گا۔ اس کا اب وہاں کون ہوگا ۔ ۔ ۔ کون؟ مگر اسے ایسا کیوں سوچنا ہے تشنہ عیاش آدمی بھی زیادہ دیر نہیں جیتے اور وہ پھر بیس سال؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اسے ایسا نہیں سوچنا چاہئے تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہ چارپائی سے اٹھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک لمحہ کے لئے اندھیرے میں اِدھر اُدھر گھورتی رہی۔ اور پھر زانوؤں میں سر دئے نیچے ٹرنک پر بیٹھ گئی۔!

چوپال میں دہقان برابر خوشیاں منا رہے تھے۔ مرد خاموش ہو چکے تھے۔ اب عورتوں کی باری تھی۔ دور گھاٹی میں ایک ٹمٹماتی ہوئی روشنی لمحہ بہ لمحہ نیچے اتر رہی تھی۔ شاید اور دہقان مرد اور عورتیں اس تہوار میں شریک ہونے کے لئے آرہے تھے۔ روشنی ایک موڑ پر غائب ہو جاتی اور دوسرے موڑ پر پھر نظر آنے لگتی۔ پاس کی پگڈنڈی پر انسانی قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند سائے آپس میں باتیں کرتے ہوئے گذر گئے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا " یہ دن ان غریب کسانوں کی زندگی میں ہر سال ایک بار آتا ہے۔ آج فصل گھروں کے اندر آگئی۔ اِدھر اُدھر کے دیہاتوں کے سب لوگ آپس میں مل کر خوشیاں مناتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پکوان کھلاتے ہیں۔ خاوند بیویوں کے منہ میں اپنے ہاتھوں سے لقمہ کھلاتے ہیں۔ جوان لڑکیوں اور لڑکوں کی سگائیاں کرتے ہیں۔ اور بیاہ کی بات پکی ہو جاتی ہے۔ سب مل کر ناچتے اور گاتے ہیں اور پھر بڑے اشتیاق سے اس دن کا انتظار کرنے لگتے ہیں" ۔ ۔ ۔ ۔

ساتھ والے آدمیوں نے 'ہونہہ' کے علاوہ اور کوئی جواب نہ دیا۔ ان کے قدموں کی چاپ کٹوروں کی جھنکار اور ڈھولک کی ٹھک ٹھک میں مدغم ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ بالکل ناپید ہو گئی۔

ٹرنک پر بیٹھے بیٹھے ترببنی کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے اندر کا طوفان اسے ختم کر دے گا۔ گرم گرم آنسو اس کی جھریوں میں پھیل گئے اور اس نے اپنے گرد چادر کی لپیٹ کو اور بھی مضبوط کر لیا۔

اسی طرح زانوؤں میں سر دئے وہ بہت دیر تک سوچتی رہی پھر یکدم اسے ایک آواز نے چونکا دیا۔

ہو مالی جی ـــــ

ترببنی نے سر اٹھایا تو سامنے پدما کا نوکر کھڑا تھا اور اسے ٹرنک پر سے اٹھ جانے کو کہہ رہا تھا۔

مگر جب وہ سامان اٹھا کر چلنے لگا۔ تو ترببنی نے اس کا کرتا تھام لیا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ میں مکان پر نہیں جاؤں گی بیٹا مجھے سٹیشن چھوڑ آؤ ۔۔ بیٹا! ۔ ۔ ۔

نوکر نے حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو بڑھیا تیری عقل تو ٹھکانے ہے کیا؟ اور پھر اپنا راستہ چلنے لگا۔

دس قدم اس کے ساتھ چلتی رہنے کے بعد ترببنی نے پھر اس کا کرتا پکڑ لیا۔ " اچھا آج رات نہیں تو کل کلکتہ میل پر (باقی صفحہ ۵۹)

# مراقش

ادارہ

شمالی افریقہ کے دلکش اور اہم حصوں میں سے مراقش کی تہذیب بہت پرانی ہے۔ مراقش آبنائے جبرالٹر پر واقع ہے۔ اور اس کا ماضی بہت شاندار رہا ہے۔ زمانۂ قدیم سے اس دیس کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ رہی ہے کہ یورپ کی بڑی طاقتوں نے جن میں جرمنی، فرانس، سپین اور دوسرے ممالک شامل ہیں ہمیشہ مراقش کو اپنی حریصانہ سرگرمیوں کا نشانہ بنائے رکھا۔ اسی وجہ سے مراقش کی بین الاقوامی اہمیت کبھی کم نہ ہوئی۔ مراقش کو ہم ایک سلطنت کہہ سکتے ہیں۔ اپنی شان و شوکت، اور تعلیمی و مذہبی شاندار روایات کی وجہ سے یہ خالص مشرقی ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ انتظامی امور کے نقطۂ نظر سے یہ مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہے جن میں سے مندرجۂ ذیل کافی اہم ہیں:-

(۱) وہ حصہ جو فرانسیسی سرپرستی میں ہے

(۲) تنجیر کا علاقہ

(۳) تین طبقے جو سپین کی سرپرستی میں ہیں یعنی سپانوی مراقش، افنی، اور جنوبی مراقش۔ مراقش کی سطح زیادہ تر پہاڑی ہے اور قریب قریب سب مشہور شہر پہاڑوں کے دامن میں واقع ہیں۔ دریا بہت سے ہیں اور چھوٹے بڑے دریاؤں کو آبپاشی کے لئے مفید مطلب بنا لیا گیا ہے۔

مراقش کی کل آبادی تقریباً پچاس لاکھ ہے۔ مغربی مراقش سب سے زیادہ گنجان آباد علاقہ ہے۔ کل آبادی کو آپ بہت آسانی سے دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ (۱) بربر لوگ (۲) عرب آبادی۔ ان کے علاوہ یہودیوں اور نیگرو (حبشیوں) کی تعداد بھی کافی ہے یہودی زیادہ تر شہروں میں آباد ہیں۔

طریق زندگی کے لحاظ سے مراقش کی آبادی خانہ بدوشوں اور شہر اور گاؤں کے ساکنوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ مگر یہ تقسیم زیادہ تر جغرافیائی بنیاد پر ہوگی اور عربوں اور بربر لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کرتی۔ دیہات میں زیادہ تر وہ لوگ آباد ہیں جن کے آبا و اجداد دوسرے ملکوں سے مراقش میں وارد ہوئے تھے اور دیہات میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ یہ لوگ زیادہ تر خیموں میں رہتے ہیں۔ گھر بنا کر رہنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ خانہ بدوش لوگ زیادہ تر بڑے شہروں میں رہتے ہیں اور ان کے گھر کچی اینٹوں اور پتھروں کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

مراقش کی تاریخ اور تہذیب بہت قدیم ہے۔ سب سے پہلے باشندے لیبیا سے آنے والے اور مور لوگ تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موجودہ بربر لوگوں کے آبا و اجداد تھے۔

اپنی جغرافیائی حالت کی وجہ سے یہ ملک ہمیشہ حملہ آور قوموں کو دعوت دیتا رہا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور رومی، وندال، بازنطینی، عرب اور فرانسیسی تھے۔ ان حملہ آوروں نے مراقش کی سرزمین پر اپنے نمایاں، واضح اور ایک دوسرے سے الگ نشانات چھوڑے جن کی مستقل حیثیت اب تک قائم ہے۔

رومی سب سے پہلے آئے اور مراقش پر اپنا اقتدار قائم کیا مگر پانچویں صدی عیسوی کے شروع میں ایک دوسری طاقت نے انھیں یہ ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ان لوگوں کے حملہ کا مقصد فتح کرنا اور مال و دولت حاصل کرنا تھا اس لئے نے اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کے نشانات سرزمین مراقش پر ثبت کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔

۴۲۹ء میں سپین سے وندالیوں نے حملہ کیا اور بچے کچے رومیوں کو باہر نکال دیا ان کا اثر بھی سطحی تھا۔ سولہویں صدی میں بازنطینی نمودار ہوئے اور وندالیوں کو شکست دے کر تقریباً سارے ملک پر قابض ہو گئے۔

سترھویں صدی عیسوی میں عرب وارد ہوئے اور اپنے ساتھ ایک نیا مذہب یعنی اسلام لے کر آئے۔ موسیٰ بن نصیر نے مراقش کو فتح کیا اور نئی حکومت کا پرچم لہرا کر ملک میں اپنا قائم مقام گورنر مقرر کر کے رخصت ہو گیا۔

خاندان ادریسی کے افراد نے جو اس کے بعد صاحب اقتدار ہوئے صحیح معنوں میں ملک میں اپنی سلطنت قائم کرنے کی ان تھک، اور جان توڑ کوشش کی۔

انھوں نے نہ صرف سارے ملک میں اسلام پھیلانے کی کوشش کی بلکہ مفتوحہ علاقہ کو اپنے زیر تسلط رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس خاندان کا سب سے مشہور بادشاہ ادریس دوم تھا جس کی معاشی، سیاسی اور مذہبی پالیسی کا اثر بہت دور رس ثابت ہوا۔ یوسف بن تحسین نے ادریس دوم کی سلطنت کا تختہ پلٹ دیا اور خاندان المراود کی حکومت قائم کی ۱۰۶۲ء میں اس نے مراقش کے شہرۂ آفاق شہر کی بنیاد ڈالی۔

مراند خاندان نے جو ان کے بعد سلطنت پر قابض ہوا علوم اور فنون اور ادب کی بے پناہ سرپرستی کی اور اسی زمانہ میں ملک کی علمی زندگی اپنے عروج پر پہنچی۔ ان کی تہذیب اپنے زمانہ میں بے مثال اور لاجواب تھی۔ القارون کی یونیورسٹی جس کی انھوں نے بنیاد ڈالی ساری دنیا میں مشہور اور بے نظیر تھی۔

فاس کے خوبصورت اور شاندار محلات، عظیم الشان مسجدیں اور فقید المثال مدرسے مراند عظمتوں کا گہوارہ تھے۔ سپین، افریقہ اور دور دراز ملکوں سے عیسائی اور دیگر اقوام کے تاجر مسلسل اس شہر کو دیکھنے کے لئے آتے رہتے تھے اور اس طرح فاس بین الاقوامی تجارت کا مرکز اور تہذیبوں کا محور بن گیا تھا۔

اس کے بعد پرتگالیوں اور ہسپانیوں کی آمد نے مراقش کی مذہبی زندگی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور زندگی کے ہر شعبہ نے احیا کا منہ دیکھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں مراقش بدامنی اور طوائف الملوکی سے دوچار تھا۔ سلطان برائے نام بادشاہ تھا اس کی طاقت انحطاط پذیر ہی نہیں تھی بلکہ ختم ہو گئی تھی اور بہت سے قبائلی علاقے سلطان کا جوا کندھے سے اتار کر آزادی اور من مانی کے راگ الاپ رہے تھے۔ مراقش کا مال و دولت اور سونا اگلنے والی زمین اور ایسی صورت حالات تخریب اور دوسرے ملکوں کو حملہ، قبضہ اور تسلط کی کھلی دعوت دے رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی آئے اور بہت آسانی سے ملک پر قابض ہو گئے۔

مارشل لیوتی پہلا ریزیڈنٹ جنرل مقرر ہوا اور لوگ اسے فرانسیسی افریقہ کا معمار کہتے ہیں۔ اس کا نام قونصل کی حیثیت سے انجیریا کے لیوگارڈ اور مدغا سکر کے گلینی کے ہم پلہ سمجھا جاتا ہے۔

جنگ عظیم کے دوران میں لیوتی نے اس بات کو بہت ضروری اور اہم سمجھا کہ وہ تازہ کے سرحد کو جو ریف اٹلس اور وسطی اٹلس کے شمالی علاقہ میں واقع ہے اپنے قبضہ میں لائے اور اسے نہایت مضبوطی سے دبائے رکھے کیونکہ تازہ ہی صرف وہ واحد راستہ تھا جو الجیریا کے تل سے فیض کو اور شمالی اہم شہروں کو اس فوجی مرکز سے ملاتا تھا۔ سارے مراقش میں یہی اہم ترین فوجی مرکز تھا اور لیوتی کے لئے بے حد مددگار بن سکتا تھا۔ چنانچہ فیض اور تازہ کو فتح کرنے کے بعد لیوتی نے وادی مولاویہ کا رخ کیا اور اس طرح وہ اجدا کے مغرب کی طرف سب سے پہلے فتح کئے ہوئے فرانسیسی مقبوضات سے بہت قریب ہو گیا۔

جنگ ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ لیوتی نے بڑے اٹلس کو فتح کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں اس نے وسطی اٹلس سے مکنس کی طرف جانے والی شاہراہ پر جو شمالی مولاویہ کے دریا کے کنارے سے ملتی ہے قبضہ کر لیا۔

مراقش کے طرز حکومت کے بارے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ سلطان اب بھی ظاہر میں نہ صرف سلطنت کا صدر اور فرمانروا ہے بلکہ واحد قانون ساز حاکم ہے۔ اس کے احکامات (ظاہر) ریزیڈنٹ جنرل کے دستخطوں کے بعد مراقش کے سب باشندوں کے لئے جن میں فرانسیسی باشندے اور نوآبادیات بھی شامل ہیں لازمی طور پر مانے جانے چاہئیں۔ سلطان کی مرکزی حکومت جسے مخزن کہتے ہیں مندرجہ ذیل وزیروں اور خاص حاکموں پر مشتمل ہے:۔ (۱) وزیر اعظم (۲) وزیر انصاف، وزیر اوقاف، وزیر املاک، وزیر تعلیم و امور عامہ اور شریفی مجلس اعلیٰ کے صدر اور مجلس شریعت کے بڑے وزیر۔

سلطان کی مذہبی اور قانونی طاقت اور اختیارات چند قائدین کے ذریعے ہیں جو انتظامی امور کے نقطۂ نظر سے مجسٹریٹ ہوتے ہیں۔ عہدوں اور پرائیویٹ ملکیت سے پیدا ہونے والے جھگڑوں کو ملک کی روایات کے مطابق پنچایت طے کرتی ہے۔

مراقش کے مختلف صوبوں میں طرز حکومت مختلف اور جداگانہ ہے۔ ہر ایک صوبہ کی مقامی حالت اور روایات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے اور فرانسیسی حکومت روزانہ کے معمولی معاملات میں زیادہ تر دخل انداز نہیں ہوتی۔ سلطان کی روحانی اہمیت کو بھی کم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی چنانچہ وہ ملک کے لئے اب تک سلطان اور روحانی رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ سلطان اور کاؤنسل دونوں کو قانون اور دوسرے احکامات جاری کرنے کا اختیار ہے مگر ریزیڈنٹ جنرل کی منظوری ضروری ہے۔

لیوتی نے طاقتور قائد لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ضروری سمجھا کہ ان روایاتی طاقت کو تسلیم کرے کیونکہ ان لوگوں کی پشت پر بے شمار پہاڑی باشندے تھے۔ اس مقصد میں لیوتی کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی لیکن پھر بھی بغاوتیں ہوتی رہتی ہیں۔

مراقش کے باشندے اپنے جنگلات اور معدنیات سے بڑی حد تک فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ان کے طریقے ابھی تک پرانے ہیں۔ اور زراعت کے اوزار بنانے، اونی کپڑے بنانے کے لئے اون اکٹھا کرنے، خیمے اور دریاں بنانے تک محدود ہیں۔ بازار کھلے میدان میں لگتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں لوگوں کا پیشہ زیادہ تر گلہ بانی ہے۔ یہ لوگ بھیڑیں اونٹ گھوڑے اور گدھے پالتے ہیں۔ جنوبی نخلستان میں لوگ کھجور کے درخت اگاتے ہیں اور زراعت کے لئے آبپاشی بھی کرتے ہیں۔ تجارتی کاروبار زیادہ تر شہروں میں ہوتا ہے۔

یورپی نوآبادیات کے باشندے جدید آلات کے استعمال سے زراعت کو ترقی دے رہے ہیں۔ فرانسیسی ماہی گیر مچھلی پکڑنے کا کاروبار وسیع پیمانے پر کرتے ہیں۔ اشیائے برآمد میں زیادہ تر سوتی سامان، چائے، شکر اور موم بتیاں شامل ہیں۔

ریف میں لوہے کا سامان بنتا ہے اور ہسپانوی علاقے کے شہر ملیلا سے باہر بھیجا جاتا ہے۔ ملک میں موٹر کی سڑکیں بہت تیزی سے بن رہی ہیں اور ساحلی علاقے کے شہروں کو ملک کے وسطی شہروں سے ملانے کے لئے ریلیں چلتی ہیں۔ اب مغربی طرز پر فیکٹریاں بنتی جا رہی ہیں۔ اور پانی کے ذخیروں سے بجلی بھی پیدا کی جا رہی ہے۔

مراقش کے شہر ہمیشہ اپنے عالموں اور بزرگوں کی کثرت کی وجہ سے مشہور رہے ہیں۔ ان عالموں نے اپنی روایات، اپنے کلچر اور تمدن کو ہمیشہ قائم رکھا ہے اور اب تک عزیز رکھتے ہیں۔ مراقش کی علمی زندگی کا معیار

بہت بلند رہا ہے۔ اس کے فلسفی، منطقی، شاعر اور ادیب عرب دنیا کے علوم میں خاص ہیں۔ انھوں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ سماجی اور انفرادی اصلاحوں میں گذارا ہے۔

عربی ادب میں مراقش نے جو نمایاں اور بلند پایہ اضافے کئے ہیں ان میں سے بیشتر علوم تفسیر قرآن، فقہ، اصول اور قانون سے تعلق رکھتے ہیں۔

فاس ایک بلند علمی معیار کا شہر سمجھا جاتا تھا اور یہاں کی مشہور یونیورسٹی "جامعۃ القرویین" اور جدید فاس کی مسجد کی درسگاہ میں ملک کے طول و عرض سے طلبا آتے تھے۔

"زاویے" جو مذہبی مرکز تھے علمی سرگرمیوں کے بھی میدان بن گئے۔ ابن خلدون مشہور مورخ جس نے شمالی افریقہ اور اسپین کی بھی تاریخ لکھی ہے مراقش ہی کا باشندہ تھا اور نہ صرف مراقش کے لئے بلکہ ساری دنیا کے علم دوست لوگوں کے لئے ابن خلدون کی ذات عزیز اور زندہ جاوید رہے گی۔ ابن خلدون کے علاوہ مشہور جغرافیہ داں الادریسی اور شہرۂ آفاق ابن بطوطہ بھی اسی سرزمین کے مایۂ ناز سپوت تھے۔ علم الادویہ اور قدرتی علاج کے سلسلہ میں ابن رشد، اور ابن زہر کے نام بلند مرتبہ کے حامل ہیں۔ علم نجوم پر ابو علی الحسان نے بہت سی مشہور اور اہم کتابیں لکھیں۔ مختلف علوم پر جن میں حساب، جغرافیہ، الجبرا، علم نجوم، علم قیافہ شناسی اور علم کیمیا شامل ہیں۔ یکساں عبور اور مہارت رکھنے والے عالموں کی فہرست میں احمد بن البناّ کا نام سب سے اوپر نظر آتا ہے۔

فرنچ گورنمنٹ کے استحکام نے مراقش کے ادیبوں اور فن کاروں کے ذہنی اور فکری نظریوں اور زندگی کی قدروں میں نمایاں تبدیلی پیدا کردی ہے اور موجودہ ادیب شاعر اور فن کار مغرب کے طوفانی، ہنگامی اور "دشمن ایمان و آگہی" اور "رہزن تمکین و ہوش" آدرش یا آئیڈیل سے مرعوب اور مغلوب و متاثر ہو کر قدیمی مذہبی، فکری اور تمدنی اقدار سے قدم ہٹا چکے ہیں۔ مراقش کا کلچر جو قومی عزیز سرمایہ ہے مغرب کے طوفان سے ٹکر لے رہا ہے اور "جدید قدیم پر فتح پاتا ہے" کے اصول سے قدامت پسندوں اور ماضی پرستوں کو حقیقی خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مراقش میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں ان میں بربر اور عربی زیادہ اہم ہیں۔ ملکی زبان زیادہ تر عربی ہے اور پہاڑی علاقوں کے علاوہ ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

شہروں میں کاسابیانکا حکومت کی خاص توجہ کا مرکز ہے اور تیزی سے ایک اچھے بندرگاہ کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یہاں فاسفورس سے بہت سی مفید چیزیں بنائی جاتی ہیں۔

سکندریہ شمالی افریقہ میں سب سے بڑا شہر ہے۔ چھوٹے بندرگاہوں میں رباط دریا کے کنارے آباد ہے۔ صافی ایک کھلے میدان میں سٹیشن کی حیثیت رکھتا ہے۔

## غزل

وہی شوق کی حکایت وہی درد کا فسانہ
مری فطرت جنوں کو نہ بدل سکا زمانہ

وہی خار میں نمایاں، وہی گل میں جلوہ فرما
رہوں کس سے محو راز، کروں کس سے دوستانہ

وہ قفس ہو یا نشیمن وہ بہشت یا گلشن
میں پہنچ گیا وہیں پر رکھا جہاں کا آب و دانہ

مری اور ان کی نظریں کشتی
کہ نہ جانے کیا سمجھ کر اسے لے اڑا زمانہ

مرا شوق لاابالی مرا شغل جذب و مستی
مجھے کیا پسند آئے یہ طریق زاہدانہ

وہ بہار کی ہو رونق کہ خزاں کی پائمالی
مرے غم پسند دل کو کوئی چاہیے بہانہ

کوئی کاش آئے دیکھے مری شان بے نیازی
نہ خزاں کا خوف مجھ کو نہ ہے فکر آشیانہ

مرے دل کو دل بنایا فقط اک نگہ میں جس نے
نظر آئے کاش لطفی وہی حسن کافرانہ

لطفی رضوانی

مراقش کی تجارت زیادہ تر فرانس اور برطانیہ سے ہوتی ہے اور یہ ملک تیزی سے جدید اور ترقی یافتہ ملک بنتا جا رہا ہے۔ باہر بھیجی جانے والی چیزوں میں زیادہ تر انڈے، گیہوں، اور دوسرے غلّے، بادام، اون، بیج اور دوسری زرعی پیداوار ہیں۔ ملک کی صنعتوں میں سے ترکی ٹوپی اور چمڑے کا سامان افریقہ اور دوسرے ملکوں میں بھیجا جاتا ہے۔

مراقش کی قومی پارٹیوں کے لیڈر زیادہ تر تعلیم یافتہ شہروں میں سے عروج پاتے ہیں۔ اور موجودہ ملکی پارٹیوں میں سے زیادہ مشہور مکّی الناصری کی جماعت "امیداد مراقی" اور عبدالخالق طورس کی پارٹی "مراقشی قومی اصلاح پارٹی" زیادہ زوردار ہیں لیکن موجودہ عہد میں زیادہ طاقتور جماعت ابراہیم الوزانی کی "قومی دفاعی انجمن" شمار کی جاتی ہے۔ آج مراقش بھی دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح قدیم اور جدید کے دوراہے پر کھڑا ہے اور حالات کیا پیش آتے ہیں اس کا جواب مستقبل ہی دے سکے گا جس کے شاندار ہونے کے آثار اب بھی ہویدا ہیں۔

# نقد و نظر

## ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب

مصنفہ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ۹۳۴ صفحوں کی یہ ضخیم کتاب مکتبۂ جامعہ، دہلی نے تین حصوں میں شائع کی ہے۔ ہر حصہ کی قیمت ۶ر ہے۔

کتاب کی بنیاد فلسفۂ تاریخ کے اس مشہور نظریے پر ہے کہ تہذیب و تمدن کی قیادت کا بوجھ اتنا بھاری ہے کہ کوئی ایک خطہ اسے ہمیشہ نہیں اٹھا سکتا۔ بلکہ مختلف خطے باری باری اٹھاتے ہیں — اور اب جب کہ دنیا کا وہ کندھا جو تہذیب کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے تھکان سے بے حال نظر آرہا ہے نوع انسانی کے مستقبل کے لئے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ دوسرے کندھے کا کیا حال ہے اور وہ اس بار امانت کو اٹھانے کے لئے کہاں تک تیار ہے۔ لیکن جب تک ایشیائی قوموں میں اتنا اعتمادِ فکر پیدا نہ ہو جائے کہ زندگی کے مسائل کو اپنے وجدان، عقل اور تجربے کی روشنی میں خود حل کریں، اس وقت تک یورپ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنی رہیں گی۔ اس لئے قومیت کی بنیاد مستقل تہذیب ہی پر قائم ہو سکتی ہے۔ ایشیا کا جو ملک ایسی تہذیب لے کر اٹھے گا وہی آزادی اور ترقی کی راہ میں مشرق کا رہنما ہوگا۔ زمانہ کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ موقع صرف دو ملکوں سے ہو سکتی ہے — چین یا ہندوستان۔ اس لئے کہ ایشیا کے صرف یہی دو ملک ہیں جنھوں نے مغربی تہذیب کے آگے سر جھکانے میں تامل کیا ہے اور سرکشی سے کام لیا ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے اسی مقصد کے پیش نظر ہندوستان سے بحث کی ہے، اور فاضلانہ، عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں اس سوال کا جواب دیا ہے کہ کیا ہندوستان قومی تہذیب کے مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کر سکتا ہے؟ اور کیا اپنی مثال سے یہ ایشیا کے دوسرے ملکوں کے لئے آزادی کا راستہ صاف کر دے گا اور مشرق کو اس بارِ امانت کے اٹھانے کے قابل بنا دے گا جو شاید تقدیرِ کائنات اس سے اٹھوانے والی ہے؟

اس سوال کا جواب سننے کے لئے ہندوستانی ذہن کو آمادہ کرنا بھی بجائے خود ایک بڑا مسئلہ ہے۔ سوال و جواب کے درمیان لامحدود سیاسی، معاشی، مذہبی اور نفسیاتی الجھنیں حائل ہیں۔ طرح طرح کے کانٹے ہیں جن میں فکر کا دامن الجھ کر تار تار ہو گیا ہے۔ فکر کے اس انتشار کو دور کئے بغیر ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش ریت پر بیج بکھیرنے کے مرادف ہے۔ اور عابد صاحب ریت پر بیج بکھیرنے کے قائل نہیں ہیں۔ انھوں نے کتاب کے مختصر لیکن جامع دیباچہ اور ۵۵ صفحے کے مقدمہ میں اپنے بڑے کام کے لئے زمین ہموار کی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیباچہ اور مقدمہ پڑھ لینے کے بعد پڑھنے والے کا ذہن اس بحث کے لئے پوری طرح تیار ہو جاتا ہے جو ساری کتاب میں پھیلی ہوئی ہے — مقدمہ میں سب سے پہلے تہذیب اور قومیت کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ قومیت کی تعمیر کے لئے جو شرائط ناگزیر ہیں ان میں سے کون کون سی ہندوستان میں موجود ہیں اور کون کون سی آئندہ پیدا ہو سکتی ہیں۔ قوم یا ریاست کی تعمیر کی پہلی شرط جغرافی وحدت ہندوستان میں اس حد تک موجود ہے کہ شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں ہو۔ اس جغرافی وحدت نے ہندوستان کے لئے قدرتی طور پر ایسے وسائل مہیا کئے ہیں کہ اگر اسے پوری آزادی ملے تو وہ معاشی حیثیت سے کسی کا محتاج نہیں رہے گا۔ اس سے مصنف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جہاں جغرافی اور معاشی وحدت اس حد تک ہو وہاں عام تہذیبی وحدت بھی کسی نہ کسی حد تک ضرور ہوگی۔ اس لئے کہ تہذیب کی تشکیل میں طبیعی اور معاشی عناصر کو بہت بڑا دخل ہے۔ اور اسی لئے ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں طرح طرح کے اختلافات کے باوجود اہل ہند کے خیال، احساس اور زندگی میں ایک گہری وحدت موجود ہے جو ترقی اور تنزل کے دور میں بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔ اگر ہم اتحاد کے اس احساس کو شعوری کوششوں سے مدد دیں تو تھوڑے ہی دنوں میں ہماری تہذیبی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ جس میں ہر جماعت کی اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ ایک مشترک عنصر ایسا ہوگا جو کل ہندوستانیوں میں ایک مضبوط رشتۂ اتحاد کا کام دے گا — گویا یہ پوری کتاب اسی دعوے کو ثابت کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔

اس مقدمہ کے بعد کتاب کے پہلے حصہ کو چھ بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہندوستانی تہذیب کا ماخذ، ہندوستان کی قبل ویدک تہذیب کے آثار، ویدک تہذیب اور ویدک ہندو تہذیب کا زمانہ، بودھ تہذیب کا زمانہ، پورانک ہندو تہذیب کا زمانہ، سیاسی اور تہذیبی انتشار کا زمانہ — کتاب کا یہ حصہ ہندوستان کی قدیم تاریخ اور تہذیب کا ایک ایسا مفصل، جامع اور پر بصیرت تبصرہ اور جائزہ ہے جو اردو کے لئے بالکل انوکھی چیز ہے۔ انوکھی اس لئے کہ اردو میں اب تک تاریخ کے اس دور سے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں نہ مطالعہ کی وہ وسعت ہے اور نہ فکر و نظر کی وہ گہرائی جو اس کتاب میں ہے۔ مطالعہ کی وسعت، فکر و نظر کی گہرائی اور اس کے علاوہ شروع سے آخر تک بیان کا علمی، منطقی اور غیر جانبدارانہ انداز اس بے حد اہم کتاب کی چند خصوصیتیں ہیں۔ جو اس کے تینوں حصوں پر چھائی ہوئی ہیں۔ دوسرے حصہ کے چھ بابوں کے عنوان یہ ہیں: اسلام، اسلامی تہذیب، اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کا سابقہ، ہندوستانی تہذیب کا پس منظر، ہندوستانی تہذیب (سلطنت مغلیہ کے زمانۂ عروج میں) اور ہندوستانی تہذیب (سلطنت مغلیہ کے دور زوال میں)، پہلے حصہ اور دوسرے حصہ میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں فاضل مصنف کو ویدک تہذیب، ہندو تہذیب، بودھ تہذیب

د۔ع

اور یورپ تک تہذیبوں کا تاریخی اور تہذیبی تبصرہ کرتے وقت ان کی فلسفیانہ گتھیوں کی تہوں میں جانا پڑا ہے اور اس پیچیدہ فلسفہ کی گہرائیوں میں سے معانی و مطالب کے موتی نکال کر انھیں اس طرح سجایا ہے کہ ہر نظر ان کی حقیقت سے آشنا ہوسکے۔ دوسرے حصہ کے مطالب میں فلسفیانہ نظر کے علاوہ ایک اور چیز کی بھی ضرورت تھی اور وہ یہ کہ تہذیبی آثار کے ایک بے پایاں صحرا میں سے ایسے پھول چنے جائیں جن سے تہذیبی اور قومی وحدت کے گلدستہ کو رنگینی و رعنائی ملی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کے اس دور میں قومی تہذیب کا جو بیش بہا سرمایہ موجود ہے اس سے اب تک کسی بلند نصب العین کے حصول میں مدد نہیں لی گئی۔ کتاب کا یہ حصہ تاریخ اور تہذیب کے سرمایہ کو ایک بلند نصب العین کے حصول کا ایسا ذریعہ بناتا ہے جس کی طرف سے اب تک بے نیازی برتی گئی تھی۔

کتاب کا تیسرا حصہ پہلے دو حصوں سے زیادہ نازک ہے۔ اس لئے کہ اس حصہ میں ہم رفتہ رفتہ ہندوستانی تاریخ اور تہذیب کے اس موڑ پر آجاتے ہیں جہاں چیزوں کو ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر بھی الجھن میں مبتلا ہیں اور کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچتے —— اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمیں کوئی ایسی نظر نہیں ملی جو سب چیزوں کا احاطہ کرسکے اور چیزوں کو گہری نظر میں سمو کر بلندی سے غور و فکر کرسکے۔ اس کتاب میں نظر کی یہ گہرائی بھی ہے اور غور و فکر کی بلندی بھی لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سخت سے سخت متنازعہ مسئلہ پر بھی ایک غیر جانبدارانہ، علمی اور منطقی انداز میں بحث کی گئی ہے اس طرح کے مسائل سے بحث کرتے وقت افراد اور جماعتوں پر لازمی طور پر جو نکتہ چینی کرنی پڑتی ہے اس سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔ اور تنقید و تبصرہ میں ہر جگہ ذہن نے اپنے آپ کو ایک بلند و بالا سطح پر رکھا ہے۔ اور اس طرح بحثوں سے جو نتیجے نکالے گئے ہیں وہ منطقی طور پر قابل قبول اور علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے بے حد موثر ہیں —— اور اس کی سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ کتاب بے پایاں تاریخ دانی، عمیق فلسفیانہ فکر، صحیح منطقی انداز نظر اور علمی و ادبی بیان کا ایک نادر امتزاج ہے۔

---

## کہاں ؟

بقیہ صفحہ ۵۲

ضرور جیو۔ آرام سے آ بیٹھا؟۔

نوکر نے ایک بار اچھا کہا، اور پھر غیر ہموار راستہ پر پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگا۔ ترمینی ایک لمحہ کے لئے اندھیرے میں گھورتی رہی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ راستہ بے حد اذیت ناک تھا۔ قدم قدم پر ابھرے ہوئے نوکیلے پتھر اور ایسے اندھیرا ایسا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔

# سالنامہ کی جھلک

آج کل کے سالنامہ کی ایک جھلک آپ پچھلے پرچہ میں دیکھ چکے ہیں۔ آجکل کے معاونین برابر اپنے رشحاتِ قلم ارسال فرما رہے ہیں۔ اب تک ہمارے دفتر میں جو مضامین موصول ہو چکے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

ادب:- غالب ——— آغا حیدر حسن دہلوی

چند یورپین شعرائے اردو ——— حامد حسن قادری

میر کے لطیفے ——— مسعود حسن رضوی

چند غیر لفظ اردو میں ——— ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

رشید احمد صدیقی ——— آل احمد سرور

عجائب نگارو ہریش چندر ——— حامد اللہ افسر

نئے ادب کی تنقید ——— عبادت بریلوی

چین کا نیا ادب ——— فضل حق قریشی دہلوی

تاریخ:- عہد اکبری کے چند مصور اور خطاط — مرزا محمد عسکری

ہندوستانی تاریخ کا ایک ورق — محمد مجیب

تعلیم:- ایشیا میں تعلیم ——— خواجہ غلام السیدین

انگریزی تعلیم کا ہندوستانی پیام — عبدالغفور

معاشیات:- منصوبہ بندی ——— محمد عاقل

خام اشیاء ——— ابو سالم

نفسیات:- الجھنیں ——— مرزا محمود بیگ

سیر و سیاحت:- بصرہ سے طہران تک ——— ڈاکٹر محمد باقر

کافرستان کی وادی ——— ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

فنونِ لطیفہ:- مشرق کی جمالیاتی روایات — تری وکرم نارائن

مشرق وسطیٰ میں موسیقی ——— شاہد احمد دہلوی

اکسفورڈ یونیورسٹی کی ایک نمائش، آغا محمد اشرف

مضمون نگاروں کے علاوہ جو افسانہ نگار اور شاعر سالنامہ میں شرکت فرما رہے ہیں ان کے نام یہ ہیں:

ل۔ احمد اکبر آبادی، سلطان حیدر جوش، علی عباس حسینی، حجاب امتیاز علی، دیوندر ستیارتھی، ناکارہ حیدر آبادی، غلام عباس، شوکت تھانوی، سہیل عظیم آبادی، تسنیم سلیم چھتاری، صالحہ عابد حسین، محمد یونس احمر، شیر محمد اختر، جوش ملیح آبادی، سیماب اکبر آبادی، ساغر نظامی، اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی، آنند نرائن ملا، روش صدیقی، رجال نثار اختر، مجید ملک، اسد ملتانی، یوسف ظفر، فکر تونسوی، سلام مچھلی شہری، صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی، ثاقب لکھنوی، اثر لکھنوی، آل رضا لکھنوی، قدیر لکھنوی، فراق گورکھپوری، صفیہ شمیم، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، بیتاب بریلوی۔



## آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ انقلاب در مجبوری ........ (نظم) حضرت اختر شیرانی ........

۲۔ ظریف لکھنوی (معہ تصویر) ........ پروفیسر آغا اشہر لکھنوی ....

۳۔ سوڈان ........ جناب سبطین احمد ........

۴۔ راز (افسانہ) ........ جناب ماہر القادری ........

۵۔ شاعری ........ محترمہ صالحہ عابد حسین ........

۶۔ پنڈت جی (افسانہ) ........ جناب ایس پی کھتری ........

۷۔ فارسی کا ایک گمنام پنجابی شاعر .... جناب پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی

۸۔ براعظم امریکہ کی تحقیق ........ محترمہ بیگم حسن آرا ........

۹۔ قاضی نذر الاسلام کی رومانی شاعری ........ جناب محمد یونس احمر ........

۱۰۔ فرزانہ (ڈرامہ) (۲) ........ پروفیسر ادیس احمد ادیب ....

۱۱۔ مقبرہ شاہ سلیم چشتی ........ جناب نور احمد خاں فریدی ...

۱۲۔ بلجیم کی بدنصیب سالگرہ (افسانہ) ........ پیٹر اسٹینورڈ ........

۱۳۔ ہندی شاعری میں گیت ........ جناب چرنجیت ........

۱۴۔ مونترا (افسانہ) ........ جناب نور الحسن انور ........

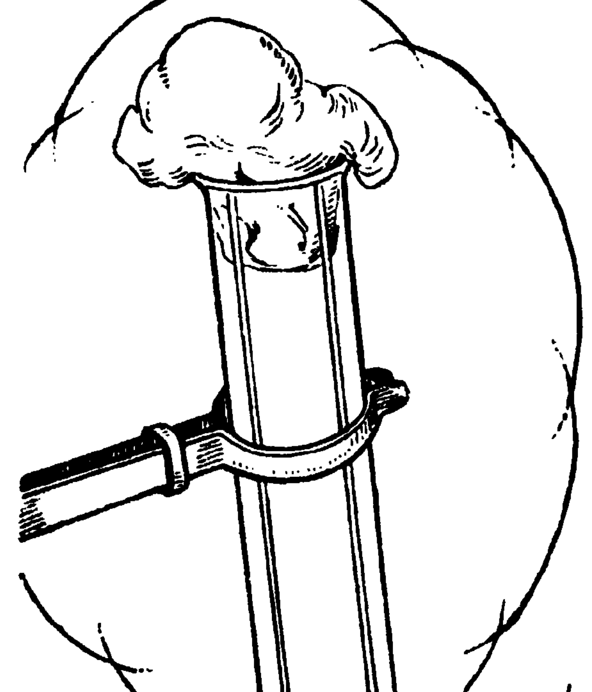
مضامین دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ سے شائع کیا

۱۱۶

# فاسد مادہ کے بغیر
# جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے
## خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر پیٹنکوفر پروفیسر ویانا یونی ورسٹی نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے تو ایک دن انہوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا۔ وہ کلاس کو پڑھا رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضے کے زندہ جراثیم موجود تھے، جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا۔ مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ بھی نہوا۔ آخر کیوں؟ ہیضے کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا؟ صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا۔

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ صافی اسی اصول کے پیش نظر تیار کی گئی ہے۔ یہ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوتِ مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے،



قیمت فی شیشی ایک روپیہ عہ

استعمال کیجیے

# صافی




**Hamdard**

## ہمدرد دواخانہ دہلی

## خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

# آجکل

اردو پندرہ روزہ

تصویر

چندہ سالانہ آٹھ روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۲۳-۲۴ | فہرست | یکم مئی سنہ ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے





مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم
ایم اے

نائب مدیران
فضل حق قریشی
دہلوی
سید آفاق حسین آفاق
بی اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

# رفتار زمانہ

## ہندوستان کے علمی وفنّی نوادر

وہ مسودۂ قانون جو حکومت ہند کے وزیر تعلیمات مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کے علمی وفنی نوادر کے سلسلے میں مرکزی اسمبلی کے روبرو پیش کیا تھا، اتفاق رائے سے منظور ہوگیا ہے۔ اس قانون کے دو عملی پہلو ہیں۔ اوّل یہ کہ قلمی کتابوں، نوشتوں، کتبوں، تصویروں اور ایسی ہی اُن بیش قیمت ونایاب چیزوں کو جو ہندوستان کے تعلیمی، ثقافتی اور فنّی نوادر کے ضمن میں آتی ہیں، آئندہ قانونی طور پر باہر جانے سے روکا جائے۔ دوسرے یہ کہ اسی قسم کی ان نادر و نایاب اشیا کو جو گذشتہ دو سو سال کے دوران میں باہر جاتی رہی ہیں واپس منگانے کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ان چیزوں کو جو انڈیا آفس میں محفوظ تھیں واپس منگانے کے لئے سلسلہ جنبانی ہورہی ہے اور یقین ہے کہ وہ چیزیں ہندوستان میں آجائیں گی۔ غالبًا یہ قانون ان بیرونی اشیا پر بھی اثرانداز ہوگا جو اس وقت ہندوستان میں رہنے والے غیرملکیوں کی ملکیت میں ہیں۔ وہ وطن واپس جاتے وقت ان چیزوں کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکیں گے۔ البتہ اس قانون کی رو سے ان غیرملکی طلبا کو جو اپنے وطن میں رہ کر ہندوستان کی ثقافت و معاشرت کا مطالعہ کرتے ہیں، ان نوادر کی زیارت سے محروم نہیں رکھا جائیگا بلکہ خاص مطالبے اور فرمائش پر مرکزی حکومت کی اجازت اور منظوری سے وہ چیزیں عارضی طور پر بھیج دی جایا کریں گی۔ کیونکہ پیش نظر مقصد صرف یہ ہے کہ ہندوستان کے نوادر عام بازاری اشیا کی طرح بیچے اور خریدے نہ جاسکیں۔ بلکہ وہ محققین کے مطالعہ کے لئے اسی ملک میں محفوظ رہیں۔ مولانا صاحب نے بتایا کہ بہت سے ایشیائی ملک ایسے قانون پہلے ہی منظور کرچکے ہیں۔

## ولندیزی دیو لندن میں

آج کل لندن میں رہنے والے ایک ولندیزی النسل بوڑھے نے جس کا نام جان وان البرٹ ہے بہت سے ماہرین طب کی عقل حیران کر رکھی ہے۔ اس کی عمر چوالیس سال اور قد نو فٹ ساڑھے تین انچ ہے۔ طبی نقطۂ نظر سے طویل القامتی کا سبب بعض غدودوں کی خرابی بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہ شکایت اس شخص کو کبھی لاحق نہیں ہوئی۔ اب بھی وہ تندرست ہے۔ اس کے والدین عام قدوقامت کے انسان تھے۔ اس کے گھرانے میں اور بھی کسی کا قد اتنا بڑا نہیں ہوا۔ پیدائش کے وقت اس کا وزن سترہ پونڈ تھا جبکہ عام طور پر نوزائیدہ بچوں کا وزن پانچ اور آٹھ پونڈ کے درمیان رہا کرتا ہے۔ سات سال کی عمر میں اس کا قد چھ فٹ اور بیس سال کی عمر میں آٹھ فٹ ہوگیا۔ اسکے بعد نشوونما عارضی طور پر بند ہوئی لیکن پانچ سال بعد وہ ایک دم بڑھ کر نو فٹ ساڑھے تین انچ لمبا ہوگیا۔ البرٹ کے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ دن کے وقت گھر سے باہر نہیں نکل سکتا کیونکہ بچے اسے دیکھتے ہی شور مچانے لگتے ہیں۔ وہ مقامات تفریح کی سیر کے لئے بھی نہیں جاسکتا کیونکہ وہاں پہنچتے ہی خود تماشہ بن جاتا ہے۔ خوراک کے راشن کی کم مقدار بھی اس کے لئے تکلیف دہ ہے کیونکہ طویل قامت کے لحاظ سے اس کی بھوک بھی زیادہ ہے۔

## آسٹریلیا سے تجارتی تعلقات

مسٹر اے ڈی اظہر نے جو آسٹریلیا میں ہندوستانی تجارت کے کمشنر مقرر ہوئے ہیں ایک بیان میں فرمایا کہ آسٹریلیا اور ہندوستان کے مابین تجارتی تعلقات کا امکان زیادہ امید افزا اور خوشگوار نظر آرہا ہے وہ مئی کے وسط میں اپنے نئے عہدے کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے آسٹریلیا چلے جائیں گے۔ روانگی سے قبل انھوں نے اس ملک کے بڑے بڑے تجارتی شہروں مثلاً لاہور، کراچی، بمبئی، مدراس اور کلکتے وغیرہ کے دورے لگائے، ارباب تجارت سے گفتگو کی اور آئندہ کے منصوبے تیار کئے۔ ان کا کہنا ہے کہ آسٹریلیا کیساتھ معاملہ کرتے وقت ہندوستانی تجارت کے ضمن میں سَن، چائے اور پارچہ جات کو بڑی اہمیت حاصل ہوگی۔ لیکن کپڑوں کے سلسلے میں ہندوستان کو معیار بلند اور قیمتیں کم کرنی ہوں گی ورنہ اس امر کا اندیشہ ہے کہ کچھ عرصے بعد جاپان، میدان عمل میں آتے ہی،

ہندوستان کا مدمقابل بن جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے کپڑے کی تجارت کرنے والی ذمہ دار ہستیوں کے سامنے تین اصول پیش کئے ہیں یعنی مقابلہ کرنے کی حد تک قیمتوں کی کمی، کپڑے کا عام معیار اور اس معیار کی ہمیشہ برقرار رہنے والی صلاحیت۔ ان کا خیال ہے کہ تجارتی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی ہم کسی قوم کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ اس لئے اس میدان میں ہندوستان کو کسی دوسرے ملک سے ہٹ کر نہیں رہنا چاہئے۔

## بچے کی ماں؟

بمبئی کی ایک مسلمان خاتون نے پولیس میں ایک شیرخوار بچے کے گم ہو جانے کی اطلاع بھیجی۔ وہ بچہ اس کی عیسائی آیا کے بطن سے پیدا ہوا اور اس نے گود لے لیا تھا۔ ابھی بچہ چار ماہ کا تھا کہ یکایک گھر سے غائب ہو گیا بہت تلاش کرنے پر وہ ایک گونگی عورت کے قبضے سے برآمد ہوا جس نے اشاروں کے ذریعہ اظہار خیال کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ بچہ میرا ہے۔ عیسائی آیا اور مسلمان خاتون نے بھی اس بچے کو پہچان لیا۔ دونوں ماؤں نے زچگی کے دو مختلف اسپتالوں کا حوالہ دیا جہاں ان کے قول کے مطابق بچے کی پیدائش عمل میں آئی تھی یہ جھگڑا چکانے کے لئے دونوں اسپتالوں کے عملے سے رائے لی گئی۔ دونوں جگہ کی نرسوں نے اچھی طرح شناخت کر کے اعتراف کیا کہ بچہ انہی کے اسپتال میں پیدا ہوا تھا۔ فی الحال بچے کو ایک پرورش گاہِ اطفال میں بھیج دیا گیا ہے۔ اسی قسم کا ایک مقدمہ حضرت علیؓ کے حضور میں پیش ہوا تھا۔ جس کا فیصلہ انہوں نے اس طرح کیا کہ بچے کے دو ٹکڑے کر کے دونوں عورتوں کو دیدیئے جائیں۔ اس پر بچے کی اصل ماں۔ رو پڑی اور اس نے بچے کے حق سے دستبردار ہو جانا چاہا۔ کیا اچھا ہو اگر یہاں بھی اس نفسیاتی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی تدبیر عمل میں لائی جائے۔ اگر بچہ کم سنی کے باعث قوتِ گویائی سے محروم ہے تو کیا ماں کے دل کی سرگوشیاں بھی ایک متکلمِ بلیغ بن کر اصل راز کا پردہ چاک نہیں کر سکتیں۔

## حلق میں زندہ مچھلی

بربھوم کے شہر سوری میں ایک ماہی گیر ایک بڑے تالاب سے جال کے بغیر مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ وہ اس خیال سے کہ بار بار ساحل تک جانا دشوار ہے، جب ایک مچھلی پکڑ لیتا تو اسے اپنے منہ میں دانتوں کے درمیان دبا لیتا تاکہ کئی مچھلیاں لے کر پانی سے باہر نکلے۔ محض اتفاق ہے کہ ایک بار ایک مچھلی جو اس نے دانتوں کے درمیان دبا رکھی تھی پھسل کر حلق میں چلی گئی اور اس بری طرح پھنسی کہ انتہائی کوشش کے باوجود نہ نکل سکی۔ ماہی گیر نے دوستوں سے مدد لی لیکن پھر بھی مطلب پورا نہ ہوا آخر لوگ اسے اسپتال لے گئے جہاں وہ چند گھنٹے تڑپتے رہنے کے بعد اس جہان سے گذر گیا۔ ایک زمانہ تھا کہ سمندر کی ایک بڑی مچھلی حضرت یونسؑ کو زندہ نگل گئی لیکن خدا کے فضل و کرم سے نہ ان کا بال بیکا ہوا اور نہ مچھلی کو نقصان پہنچا۔ یہاں انسان نے زندہ مچھلی نگل لی اور خود مر گیا۔ مچھلی کا انجام معلوم نہیں وہ اگلے وقتوں کے نبیوں کی کرامات تھی اور یہ اس زمانے کے ایک ماہی گیر کا حادثہ۔

## سمندر پار ملکوں سے

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں کے پاس جو کچھ اناج بچ رہتا ہے اس سے وہ ہندوستان کی مدد برابر کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اسکا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:-

| قسم اناج | ہفتہ مختتمہ ۲۰ مارچ | ہفتہ مختتمہ ۲۷ مارچ |
|---|---|---|
| گیہوں وغیرہ | × | ۱,۶۵۰۰ ٹن |
| چاول | ۸,۱۶۰ ٹن | × |
| جوار | ۱,۰۰۰ " | ۱,۳۰۰ " |
| جو | ۱۱,۰۰۰ " | × |
| میلو | × | ۱۱,۹۰۰ " |
| کل وزن | ۲۰,۱۶۰ ٹن | ۲۹,۷۰۰ ٹن |

## کرۂ ارض کے گرد

ہوائی جہازوں میں اڑ اڑ کر منچلے نوجوان بڑی ہوشربا مہمیں سر کر چکے ہیں، کبھی انہوں نے آسمان کی وسعتوں میں بلند ترین پرواز کی اور وہاں سے چھلانگ لگائی کبھی راستے میں رکے بغیر ہزاروں میل کا سفر طے کر لیا اور کبھی دنیا کے گرد چکر لگا کر اس کے گول ہونیکا ثبوت پیش کیا۔ اس وقت تک سب سے کم مدت یعنی ۹۰ گھنٹے اور ۱۰ منٹ میں دنیا کے گرد چکر لگانے کا ریکارڈ ۱۹۳۸ء میں ہوورڈ ہیوز نے قائم کر رکھا تھا لیکن اب شکاگو کے رہنے والے ایک شخص ملٹن رینالڈز نے جو قلموں کے کارخانے کا مالک ہے۔ حال ہی میں اس مہم کو صرف ۷۸ گھنٹے ۵۵ منٹ میں سر کر لیا۔ اگر اسے سرزمین روس کو عبور کرنے کی اجازت مل جاتی تو وہ اپنے دعوے کو زیادہ جلدی پورا کر دیتا لیکن چونکہ حکومت روس نے اس نمائشی پرواز کی اجازت نہیں دی، اسلئے اسے ضرورت سے زیادہ پھر گھوم کر پانچ ہزار میل کی زیادہ مسافت طے کرنی پڑی اور اسطرح کچھ وقت زیادہ صرف ہو گیا تاہم اعداد و شمار کی اوسط لیکر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موخر الذکر نے چکر لگانے میں غیر معمولی سرعت دکھائی۔ اگر جہازوں کی رفتار کا یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں ہوگا جبکہ ہر شخص ایک ہفتے کی چھٹی میں ساری دنیا کی سیر کر لیا کریگا۔

## ہندوستانی فلموں کی آمدنی

گذشتہ چند سال میں ہندوستان کی فلمی صنعت نے جس سرعت

سے ترقی کی ہے، اسکا اندازہ ان اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے جو فلموں کی آمدنی اور فلموں کی نمائش پر وصول ہونے والے تفریحی ٹیکس کے سلسلے میں شائع ہوئے ہیں ۴۵-۱۹۴۴ء کے مقابلے میں ۴۶-۱۹۴۵ء کی آمدنی اور ٹیکس کی رقمیں بنگال اور آسام کے سوا ہر جگہ زیادہ رہی ہیں - صرف ۴۶-۱۹۴۵ء کے اعداد و شمار درج ذیل ہیں:-

| صوبہ کا نام | آمدنی | ٹیکس |
|---|---|---|
| بمبئی | ۳,۲۱,۱۳,۹۷۶ | ۹۰,۲۸,۴۹۴ |
| سرحد | ۱۹,۵۴,۶۷۵ | ۳,۹۰,۹۳۵ |
| پنجاب | ۷۶,۹۵,۸۷۵ | ۱۳,۷۹,۱۷۵ |
| صوبہ متحدہ | ۹۳,۵۳,۱۱۴ | ۲۷,۷۵,۹۳۴ |
| سندھ | ۶۶,۶۴,۰۲۵ | ۱۳,۷۲,۹۴۵ |
| بنگال | ۲,۲۰,۹۶,۸۳۶ | ۵۷,۲۴,۲۰۹ |
| آسام | ۱۶,۸۷,۰۸۰ | ۱,۶۸,۷۰۳ |
| بہار | ۴۱,۳۹,۴۲۵ | ۸,۲۷,۸۸۵ |
| مدراس | ۱,۵۱,۳۶,۶۶۶ | ۴۵,۴۱,۰۰۰ |
| صوبہ متوسط اور برار | ۴۴,۱۴,۲۷۶ | ۱۱,۰۳,۵۷۹ |

## سیاہ مرچ کی برآمد

حکومت ہند کے فیصلے کے مطابق اس سال اپریل سے ستمبر تک کے چھ مہینوں میں چھ ہزار ٹن سیاہ مرچ ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں بھیجی جائے گی۔ تفصیل حسب ذیل ہے:-

ریاستہائے امریکہ:- ۲۰۰۰ ٹن۔ برطانیہ:- ۱۲۴۰ ٹن۔ آئرستان ۳۵ ٹن۔ آسٹریلیا:- ۱۳ ٹن۔ نیوزی لینڈ:- ۳۵ ٹن۔ کینیڈا:- ۲۰۰ ٹن۔ بلجیم:- ۸۰ ٹن۔ ایشیائی ممالک ۸۰ ٹن۔ ڈنمارک:- ۷۰ ٹن۔ سویڈن ۱۳۰ ٹن۔ ناروے:- ۳۵ ٹن۔ سولستان:- ۱۵ ٹن۔ پرتگال:- ۷۰ ٹن۔ اٹلی:- ۷۰ ٹن۔ یونان:- ۳۵ ٹن۔ بلجیم:- ۳۰ ٹن۔ مالٹا:- ۱۵ ٹن۔ ہسپانیہ اور ہسپانوی مراکش:- ۷۰ ٹن۔ ترکی:- ۷۰ ٹن۔ برطانوی مشرقی افریقہ:- ۱۵ ٹن مشرق وسطیٰ، افریقہ اور خلیج فارس کی آبادیاں:- ۱۰۰۰ ٹن۔ افغانستان:- ۷۰ ٹن۔ لنکا:- ۳۵ ٹن مغربی خطے کے دوسرے ممالک:- ۴۰۰ ٹن اور برطانوی جزائر غرب الہند:- ۷۰ ٹن

## امن و عافیت کی اپیل

وائسرائے ہاؤس سے جاری ہونے والے ایک بیان میں بتایا گیا ہے کہ ہز ایکسلینسی وائسرائے ہند کے ایماء و استدعا پر مسٹر گاندھی اور مسٹر جناح نے مندرجہ ذیل اعلان پر دستخط کئے ہیں اور اسے شائع کرنے کا اختیار دیا ہے:-

ہم حد درجہ اظہار افسوس کرتے ہیں قانون شکنی اور ہنگامہ پروری کے ان موجودہ حادثات پر جو ہندوستان کی بے داغ پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ثابت ہوئے نیز بے گناہ اور معصوم لوگوں کے لئے مصیبت کا باعث بنے قطع نظر اس سے کہ ان میں ظالم کون تھا اور مظلوم کون -

ہم سیاسی اغراض کے حصول میں طاقت کے استعمال کو ہر حالت میں برا سمجھتے ہیں اور ہندوستان کے تمام فرقوں سے خواہ وہ کسی عقیدے کے حامی ہوں، اپیل کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف ہنگامہ پروری اور قانون شکنی کے افعال سے انحراف کریں بلکہ تقریر و تحریر میں ان تمام اشتعال انگیز باتوں سے جو ان افعال کا سبب بن سکتی ہوں، احتراز کریں ٭

## بندر کے نام راشن

ریاست کشمیر کے ضلع بھمبر سے اطلاع ملی ہے کہ وہاں پچھلے ایک سال سے ایک بندر کے نام کا راشن کارڈ بنا ہوا ہے۔ اسے ہر ماہ اٹھارہ سیر گیہوں اور دوسری اشیائے ضرورت جن پر راشن ہے۔ نہایت باقاعدگی کے ساتھ مل جاتی ہیں - صرف مٹی کا تیل نہیں ملتا۔ بندر کا نام سنت رام ہے - اگر اس طرح انسانوں کی فہرست میں بندروں کا شمار ہونے لگا تو چارلس ڈارون کا نظریۂ ارتقا آسانی سے ثابت ہو جائے گا۔ بشرطیکہ یہ بھی ثابت ہو جائے کہ وہ راشن دراصل بندر ہی کے کام آتا ہے ٭

## سالنامہ آج کل

یکم مئی کا پرچہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ سال کا آخری پرچہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس کے بعد ایک پرچہ ۱۵ مئی کو بھی آپکی خدمت میں پیش کیا جاتا لیکن اس سال ہم ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ اسکی تلافی ایک تو اسطرح ہوگی کہ یکم مئی اور ۱۵ مئی کے اس مشترک پرچہ میں کچھ صفحے بڑھا دیئے گئے اور دوسرے سالنامہ کی ضخامت بھی اس سال پچھلے سالنامہ سے زیادہ ہوگی۔ تفصیلی اعلان اس پرچہ کے آخر میں دیکھئے۔

## سانحۂ ارتحال

صنعتی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ۸ اپریل کی رات کو مسٹر ہنری فورڈ جو صنعت موٹر سازی کے سلسلہ میں دنیا بھر میں مشہور تھے اس دار فانی سے چل بسے۔ ان کا شمار امریکہ کے کروڑ پتیوں میں نمایاں حیثیت سے ہوتا تھا - وہ ۲۹ جولائی ۱۸۶۳ء کو ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ سترہ سال کی عمر میں وہ بجلی کے ایک کارخانے میں ملازم ہوئے اور ترقی کرتے رہے۔ ان میں تحقیقات کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ ۱۹۰۳ء میں انہوں نے اپنی فورڈ کمپنی قائم کرلی جس میں اس وقت ۵ لاکھ آدمی ملازم ہیں۔ مرنے کے وقت انکی صحت اچھی تھی۔

# انقلاب اور مجبوری

اختر شیرانی

زمیں کو کیسے بدلیں آسماں کو کسطرح بدلیں
بتا ساقی کہ ہم بزمِ جہاں کو کس طرح بدلیں

ہے دل کو آرزو اک ساقیِ گلرو کی و مُن کی
طریقِ کہنۂ پیرِ مغاں کو کس طرح بدلیں

مناسب ہے بدل دیں بجلیاں ہی راستہ اپنا
ہم اہلِ آشیاں اب آشیاں کو کس طرح بدلیں

طوافِ کعبہ میں بھی ہے ادائے بُت گری پنہاں
حرم والے رہ و رسمِ بتاں کو کس طرح بدلیں

ہے میرِ کارواں گمراہ، اہلِ کارواں غافل
بتا اے دل کہ راہِ کارواں کو کس طرح بدلیں

یہ میخانہ تو کیا اک جام میں دنیا بدل جائے
مزاجِ ساقیٔ نامہرباں کو کس طرح بدلیں

یہ حالت ہے کہ خود اپنی روش بدلی نہیں جاتی
تو پھر اے ہمنشیں سارے جہاں کو کس طرح بدلیں

جوانی لوٹ آئے پھر اسی شاداب منزل میں
مگر ہمدم، رہِ عمرِ رواں کو کس طرح بدلیں

بہار آنے میں ہے دیر اور دل اپنا بہت نازک
چمن والوں کے اندازِ فغاں کو کس طرح بدلیں

مزاجِ دوست تو ہمدم، بدلنے کو بدل جائے
یہ رونا ہے مزاجِ آسماں کو کس طرح بدلیں

دلِ آتش بجاں بدلے تو بدلے رنگِ ہستی بھی
یہ آفت ہے دلِ آتش بجاں کو کس طرح بدلیں

سمجھتا ہی نہیں کوئی کہ مقصودِ فغاں کیا ہے
دلِ غمگیں مقاماتِ فغاں کو کس طرح بدلیں

خزاں آنے نہ پائے اور بہاروں کا رہے سایہ
بتائیں لالہ و گل گلستاں کو کس طرح بدلیں

ترے بندوں کی حشر آرائیاں دیکھی نہیں جاتیں
خداوندا، بتا تیرے جہاں کو کس طرح بدلیں

بدل دیں قسمتِ ہندوستاں کوشش ہے ہم اختر
مصیبت تو یہ ہے ہندوستاں کو کس طرح بدلیں

# ظریف لکھنوی

ظرافت ایک فطری جذبہ ہے جو مخصوص لمحات زندگی میں ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ اب جس شخص کی طبیعت میں جسقدر تفریحی جراثیم پائے جاتے ہیں انھیں کی مناسبت سے وہ اسکا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے جس کے ذریعے سے ذاتی تفریح کے ساتھ ساتھ دوسروں کے خشک جذبات میں تراوٹ پیدا کرنا بھی شامل ہوتا ہے ــــ اصل تو یہ ہے کہ تمدن انسانی کی ابتدا سے صرف اہل دولت کے دربار اس تفریح ناک مسلکے کی ترقی کے ذمہ دار ہیں کیونکہ ان کے تفریحی رجحانات نے ظریف طبع افراد میں ایک قسم کی غیر معمولی گدگدی پیدا کر کے اس جذبے کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ اور یہ صورت دنیا کے ہر متمدن گوشے کے اہل دولت کی صحبتوں میں شدت سے پائی جاتی ہے۔ اس سے یورپ۔ عرب۔ عجم۔ کوئی خطہ خالی نہیں۔ امرائے عالم کے درباروں میں بے شمار تمسخر نواز اصحاب ملتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جذبۂ ظرافت قدما میں بھی درجۂ کمال پر موجود تھا جس سے زیادہ تر۔ ہجو۔ بدگوئی۔ تمسخر و استہزا کا کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ دوسرے ممالک سے قطع نظر کرتے ہوئے ہمارے ہندوستان میں بھی علاوہ امیر خسرو علیہ الرحمتہ کے اس فہرست کے سیکڑوں نام ملتے ہیں۔ مثلاً شہنشاہ اکبر کے عہد میں رد غنی استرآبادی۔ ظریفی۔ سادجی اور ملا دوپیازہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح دوسرے بادشاہوں کے درباروں میں ظریف ہستیوں کی کمی نہیں۔ سودا۔ انشا۔ میر ضاحک جن کے آخری فرد ہیں۔

جہاں تک درباری تفریحات کا تعلق رہا ظرافت تمدنی۔ ذاتی دائرے تک محدود رہی۔ لیکن جس نقطے سے زوال سلطنت اور ارباب دولت کی سرد بازاری شروع ہوتی ہے وہاں سے ظرافت شعر مذاق وقت کے مطابق دوسرے مضامین اختیار کر لیتی ہے۔ میاں جیر کین کے لباس کلام میں کثافت طبع کی بو آتی ہے۔ جان صاحب نسائیات کی اوڑھنی اوڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن جس وقت سے ہندوستانی تمدن پر مغربیات کا رنگ چڑھا ہمارے شعراء و نثار حضرات بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کسی نے مغربی فیشن پر پھبتیاں اڑانی شروع کر دیں تو کسی نے سیاسیات وقت پر ظریفانہ پہلو سے تبصرے کرنا شروع کر دئے اور سچ تو یہ ہے کہ اس آخری صنف ظرافت کے موجد و خاتم ادب اردو میں حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم ہیں۔ جنہوں نے پردۂ ظرافت میں اصلاح معاشرت اور نظریۂ سیاست وغیرہ کے متعلق بہت کچھ کہہ ڈالا ہے اور اس مقالے کے موضوع ظریف لکھنوی مرحوم اسی لسان العصر شاعر کے ہم عصر ہیں

ــــ سید مقبول حسین

ظریف مرحوم لکھنؤ کے مسلم الثبوت استاد حضرت عشقی کے چھوٹے بھائی تھے۔ چنانچہ انھوں نے طبع ظریف میں آثار ظرافت نمایاں دیکھ کے ان کو بذلہ گوئی کی طرف مائل کر دیا۔ حتیٰ کہ کچھ عرصے کے بعد ظریف کے فطری جوہر ابھر آئے اور خوب خوب کہنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ استاد عشقی بھی قابل ستائش ظریفانہ ہیں کہ باوجود ایک سنجیدہ مذاق شاعر ہونے کے انھوں نے معاملۂ اصلاح میں اپنے جذبۂ ظرافت کو بھی اچھا خاصہ نمایاں کیا ہے۔ اگرچہ ایک حقیقی ظریف شاعر کو کسی ایسے استاد سے ضرورت اصلاح نہیں جو اس کی مذاق فکر سے مغائرت رکھتا ہو۔ بہرحال جو کچھ ہو ظریف مرحوم نے اپنا جادۂ ظرافت سب سے علیحدہ بنایا اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ لیکن ان کی ظرافت نگاری درحقیقت سوسائٹی کی وقتی تفریحات کے دائرے تک محدود رہی۔ جس میں تمدنی اصلاحات یا سیاسی رجحانات کا عنصر اگرچہ پایا جاتا ہے لیکن بہت کم کیونکہ اس صنف سخن کے مرد میدان صرف اکبر مرحوم ہی تھے۔ البتہ ظریف کے شعر میں اردو شعر کے معمولات قدیمہ پر استہزار یا موجودہ تمدنی و معاشرتی روش پر تمسخر بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ جو ان کے اشعار ذیل سے واضح ہو جاتا ہے جس کا اظہار خود ان مرحوم نے ایک مشاعرۂ لکھنؤ منعقدہ ۱۸۸۹ء میں ایک قطعہ تمہیدی کے ذریعے سے اس طرح کر دیا تھا۔ اور اسی ردیف و قافیہ میں ان کی پہلی ظریفانہ غزل بھی تھی جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

(قطعہ تمہیدی۔ مرسلہ جناب وقتی لکھنوی)

کروں کیا اختیار اس کو جو ایسا شعر کا فن ہو
کہ محسود جہاں ہوں اک زمانہ اپنا دشمن ہو
ہوائے شوق اگر مجھکو یونہی مجبور کرتی ہے
وہاں چل کر کروں گلگشت جو بے خار گلشن ہو
پنہاؤں فکر کو اس حسن سے جامہ ظرافت کا
کشادہ ہر طرف تہذیب کا جیبیں کہ دامن ہو

(غزل)

گرہ ہو گتھیاں ہوں پیچ و خم سے جس کے الجھن ہو
یہی مضمون جو بٹنا ہیں تو زلفیں کیوں ہوں پھر سن ہو
دہن کلھیا سا ہو۔ چہرہ طباق۔ اور پیٹ مٹکی سا
قباحت کچھ نہیں پھر گر صراحی دار گردن ہو
ہمارا جو بنج پھلواری میں ہے کوئی نہیں کہتا
یہی کہتے ہیں یارب باغ میں اپنا نشیمن ہو

**آغا شاعر لکھنوی**

ظریف انصاف سے کہد دو وہ عاشق ہے کہ چوہا ہے
زمین قصر جاناں میں جو یہ چاہے کہ مدفن ہو

---

خیالی نجد کے میدان کی سنسان منزل ہے
کہیں کوسوں نہ مجنوں ہے۔ نہ لیلیٰ ہے نہ محمل ہے

۱۸۸۹ء میں جس مشاعرے کے انعقاد کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہیں سے لکھنو کے مذاق شعر بدلنے کی تاریخ بھی شروع ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ شاعر کا شعر اس کی مہارت علوم مشرقیہ کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج وہ تمام خصوصیات قصہ پارینہ ہو کے رہ گئیں اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ اس لئے کہ جب شعر میں استعارات و تشبیہات ذوق سلیم کی حد سے متجاوز ہو جاتے ہیں تو اس کی لطافت خاک میں مل جاتی ہے۔ جوہر مضمون کیسا ہی لطیف کیوں نہ ہو پتھروں میں دب کے رہ جاتا ہے۔ لکھنو اور دہلی ہی میں نہیں بلکہ تمام ہندوستان میں ۱۹۰۰ء تک پرانے خصوصیات شعر کی پیروی نظر آتی ہے اور مضامین غیر مناسب از معلومات کہن کا عمل محسوس ہوتا ہے۔ مگر آگے چل کے زمانے نے بتایا کہ اب اردو کے شعر کو دوسرے جدید قالب کی ضرورت ہے کیونکہ تمام تلمیحات و مصطلحات قدیمہ فرسودہ اور بے کیف ہو چکے۔ اب سینۂ فکر کو چاک کر کے مضمون کا جدید آفتاب پیدا کرنا چاہیے۔ کیونکہ آفتاب ناسخیت کو داغول نے بڑھ کے تاریک کر دیا۔ اور اس مطلع کی روشنی باقی نہیں رہی (تابعین ناسخیت کے لئے)

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

چنانچہ ایک مشاعرے میں ظریف مرحوم اس جادۂ قدیم کو اپنے شوخی قدم سے یوں ٹھکراتے ہیں اور طرز کہن کو ظرافت کا ٹھینگا دکھاتے ہیں

الجھتا ہے جو دامن سے کوئی کانٹا بیاباں کا
دکھاتا ہے اسے ٹھینگا الف چاک گریباں کا

یہی دن بھر رٹا کرتا تھا مجنوں جا کے مکتب میں
الف چاک گریباں کا۔ الف چاک گریباں کا

اس مشاعرے میں کارخانۂ ظرافت کے ڈھلے ہوئے اور چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فراق حضرت حوا میں تو موجد ہے اے آدم
ترا چاک گریباں باپ ہے چاک گریباں کا

یعنی چاک گریباں کی قدامت کا اعتراف اور ابتدائے حسن و عشق مادی کی طرف اشارہ لطف سے خالی نہیں۔

معمول قدیم تھا کہ بیشتر فارسی و عربی الفاظ و تراکیب سے شعر سجایا جاتا تھا اور خوش آئند نہیں بلکہ تلخ آہنگ الفاظ بھی مولوی نما شعرا کے قلم سے مستعمل ہو جاتے تھے۔ یہ دیکھ کے بے پناہ استہزائی ملکہ رکھنے والا ظریف بھلا کاہے کو چوکتا۔ جناتی زبان میں بول اٹھا۔

جو طائر کو تفحص ہو دم تعشیش اعغاں کا
افانین ہلہف کو تعہد ہو توا زعاں کا

حالانکہ عین اسی وقت جبکہ علوم مشرقیہ کی قابلیت پیدا کرنا زینت انسانیت متصور ہوتا تھا۔ میر تقی علیہ الرحمتہ نے اردو اشعار سیدھی سادی زبان میں کہے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ اردو زبان ثقالت و جزالت کی متحمل نہیں ہو سکتی اور اس کی فطری مٹھاس کسی قند سیاہ کا قوام برداشت نہیں کر سکتی۔ کسی وقت بھی اگر آمیزشات کا گلگلہ مذاق سلیم کے حلق میں زبردستی ٹھونس دیا جائیگا تو وہ فوراً اگل دے گا۔ اس پر بھی ہزاروں ہندیوں کے دیوان اشعار فارسی میں پائے جاتے ہیں جن میں دو ہی ایک قابل اعتنا ہیں۔ باقی تضیع اوقات کے نمونے۔ ظریف کا قلم بھی اصلاحات مذاق کا سبق رٹتے ہوئے یوں رینگتا ہے۔

فارسی میں کسی ہندی کا جو دیوان نکلا
سامنے بلبل شیراز کے ٹیاں نکلا

معشوق کی زلف دراز کی وسعت نہ پوچھئے کتنی مانی گئی ہے۔ ظریف اس طویل بحث کو یوں مختصر کرتے ہیں۔

شیطان کی جو آنت سے ہوتا مقابلہ
کھل جاتا حال آپ کی زلف دراز کا

تشکیل و صورت انسانی میں ڈارون کا نظریہ ہمیشہ سوسائٹی کا دلچسپ مضمون رہا ہے۔ ظریف بھی اس سلسلے میں اپنی شوخیٔ طبع کا مصرف نکالتے ہیں۔ یعنی بندر اور انسان کی ہمیشہ کھوئی ہوئی کڑی کو ظریفانہ شرارت سے جوڑ دیتے ہیں۔

ظریف آئینہ دے کر ڈارون صاحب کو سمجھا دو
نہ ہو جبتک شریر انسان بندر ہو نہیں سکتا

عرض کیا جا چکا ہے کہ سیاسی میدان میں ظریف کا تصرف۔ یا فلسفۂ جدید کے مسائل کی ظریفانہ تعبیریں اس حیثیت سے نہیں تھیں۔ جیسی اکبر مرحوم کی وجہ یہ تھی کہ وہ مرحوم علوم و سیاست مغربیہ کے ماہر۔ اور خود ایک ممتاز جج تھے۔ دوسرے سر سید مرحوم۔ مولوی ذکاء اللہ مرحوم۔ وقار الملک مغفور اور مسٹر محمود ایسے زعمائے اسلام سے یکجہتی تعلقات رکھنے والے بھلا سیاسی و فلسفیانہ معاملات میں ان کا کیا پوچھنا۔ وہ بھی اسی ارتقائی تشکیل حیوانی کے متعلق انقلاب نظریات کی مضحکانہ تصویریوں پیش کرتے ہیں۔ اور خود ولیم ڈارون پلٹ پڑتے ہیں۔

ارتقا نے بوزنہ کو کردیا انسان تو کیا
انقلاب حرف نے مولی کو ولیم کردیا

سیاسی ماحول سیاسی دماغ پیدا کرتا ہے۔ ظریف مرحوم لکھنؤ کی نوابانہ فضاؤں میں زندگی بسر کرنے والے۔ خوش باش اور خوش خوراک صحبتوں میں وقت گزارنے والے۔ جہاں اپنی ہی تہذیب و تمدن کی صحیح داستانیں آج تک ختم نہ ہوئیں۔ رنگ ظرافت کو سیاسی پختگی دینے کے لئے مال مسالہ کہاں سے مہیا کرتے۔ اور اگر اس رخ سے انھوں نے کچھ کہا بھی ہے تو برائے بیت اپنے ذاتی علم سے جس میں ہینگ لگی نہ پھٹکری۔ لہذا کہا جا سکتا ہے کہ ظریف مرحوم اپنے دسترس سیاسی کے مطابق صرف اخباری مسائل کو رنگ ظرافت میں ڈبو کے عوام کے سامنے پیش کرنے کے اہل ہوسکتے تھے اور اسی صورت سے ہوئے لیکن اکبر مرحوم کی طرح اس سے صحیح نتائج کا برآمد کرنا وہ نہ اپنے بس کا روگ تھا نہ ان کے عیش نواز ماحول کا۔ اثرات کا دیکھئے کونسلوں کی ممبری اور پیر اہل و نااہل کی حکومت میں شرکت کا خاکہ ظریف مرحوم اس طرح اڑاتے ہیں گویا ایک حقیقت حالی کا اظہار ہے اور بس۔ کونسلوں نے دونوں کو آنریبل بنا دیا۔

تھی جو صفت شریف کی اب ہے وہی چمار میں

لیکن اکبر مرحوم کا شعر ذیل میں پڑھئے تو نہ معلوم کون کون سے سیاسی نقشے دماغ میں گھومنے لگتے ہیں جن میں کبھی ظرافت سیاست کو دبا لیتی ہے۔ اور کبھی سیاست ظرافت پر چھا جاتی ہے۔ ایک چمار کیا۔ تخم فروش و جاروب نواز بھی اسی حلقے میں دکھائی دیتے ہیں۔

جب نے عشووں کے نقشے زیب ٹیبل ہوگئے
سیکڑوں بندے خدا کے آنریبل ہوگئے

غزل کے معمولات قدیمہ کی متابعت میں ظریف نے واعظ کا مضحکہ یوں اڑایا ہے جس سے صرف رندانہ مزاح سامعین کی تفریح ہوسکتی ہے۔ اور کوئی مقصد نہیں نکلتا۔

سفیدی خانۂ دل میں سیہ کاروں کے پھیریں گے
نہیں ممبر پہ واعظ پاڑ پر معمار بیٹھے ہیں

برخلاف اس کے اکبر مرحوم نے بھی شیخ مسجد پہ ہاتھ صاف کیا ہے مگر ان کا ظریفانہ تخیل مسلمانوں کی موجودہ مذہبی رجحانات سے بے پروائی۔ واعظین ملت کی کساد بازاری اور کس مپرسی کی تصویر یوں پیش کرتا ہے کہ سبحان اللہ۔

گوشۂ مسجد میں کار شیخ اب بنتا نہیں
پیٹ کو تسکین پاتا ہے۔ مگر تنتا نہیں

لیکن ظریف اپنے خاص رنگ میں سموئے جو کچھ کہتے ہیں وہ گوناگوں دلچسپیوں سے لبریز ہوتا ہے۔ چنانچہ ناکامی فرزند کے چکنے کے بعد میاں مجنوں کے والد ماجد کی بیتابی قابل ملاحظہ ہے۔

کہا کرتے تھے والد قیس کے فرط محبت سے
نہیں معلوم کس جنگل میں برخوردار بیٹھے ہیں

کچہریوں کے دفتروں کے لئے۔ اور لگے ہاتھوں۔ دفتر والوں کے لئے بھی۔ اتوار سے زیادہ کوئی منحوس دن نہیں۔ وہ چہل پہل اور گرما گرمی کہاں۔ اجڑا ہوا بازار معلوم ہوتا ہے۔ جہاں آدمی نہ آدم زاد۔ صرف صاحب کی کرسی اور مسلوں کی الماریاں۔ مگر چونکہ خلا محال ہے کسی کا وجود وہاں لازمی ہونا چاہئے۔ ظریف مرحوم اس خلا کو اپنی ظرافت سے یوں پُر کرتے ہیں۔

گئے ہم پیر کے اک روز پہلے جب تو کیا دیکھا
کچہری بند۔ دفتر میں میاں اتوار بیٹھے ہیں

ہندوستان میں قومی کشمکش کا سوال مدتوں سے دورہ کر رہا ہے اور آفتاب مغرب اسے اپنی سنہری کرنوں میں لپیٹے ہوئے چلا آرہا ہے۔ ظریف مرحوم ہندو مسلم کشمکش اور حصول خود مختاری کی بے سود جدوجہد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تمام قراردادوں کو شیخ چلی کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے اس طرح ظرافت نوازی فرماتے ہیں۔

میاں فرہاد و مجنوں شیخ چلی ہیں جو لڑتے ہیں
یہ کہتے ہیں عرب میرا وہ کہتے ہیں عجم میرا

اس وقت نہ تو عرب و مصر میں اپنے صحیح معنوں میں قومی حکومت ہے نہ عجم میں۔ بھلا ہندوستانی دو علے میں کیسے قائم ہوسکتی ہے۔ ہاں ان سیاسی مضامین کے علاوہ مذاق عامہ سے جو مضمون قریب تر ہوتے ہیں ان میں ظریف کا جواب ابھی تک ادب اردو میں نہیں ملتا کہتے ہیں۔

سنا رہے جو ہے ان کے معاملہ دل کا
پڑا ہوا ہے کھٹائی میں فیصلہ دل کا

ظریف حشر میں ہوگی تلاشی اعمال
فرشتے کھول کے دیکھیں گے پوٹلا دل کا

ظریف کا اصلی رنگ دیکھنا ہو تو ذیل کے اشعار میں دیکھئے:۔

اک ان کا گال ہوتا اک میرا گال ہوتا
یہ زرد زرد ہوتا وہ لال لال ہوتا

غزل کا مضمون خاص۔ وصل و ہجر ہے۔ بہت سے اسباب ہیں جو مانع وصل ہوا کرتے ہیں۔ ظریف نے نہایت مضحک انداز سے وصل کا ایک مانع پیش کیا ہے۔ اگر پردۂ قبر کو علیحدہ کرکے دیکھئے تو آپ کا جذبہ تفریح آخری نقطے تک پہونچ سکتا ہے۔ بقول شخصے موقع و محل کا تصور شرط ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وہ قبر پر کھڑے ہیں بیٹھا ہی تو لحد میں — اٹھا نہ ہر گز لے کیونکر وصال ہوتا

ناقۂ لیلیٰ کی تشریحات اور مشہور مثلوں کی ظریفانہ توجیہ ملاحظہ ہو۔

دولتی سے سمندِ ناز کی عاشق کا مر جانا
یہی تو ہے طویلے کی بلا بندر کے سر جانا
بھگانا دیکھ کے بگٹٹ وہ اس کا اپنے ناقہ کو
میاں مجنوں کا چلّانا کہ بی لیلیٰ! ٹھہر جانا

.....................

دوسرے میدانوں میں شتر ظرافت کی بھاگ دوڑ۔

نجد سے لیلیٰ کو لے بھاگا یہی الزام تھا
اونٹ بے چارہ اسی باعث سے شہر میں بدنام تھا
اور اضافہ ہو گیا قیس کے خلفشار میں
نجد میں جب الجھ گئی ناقے کی دُم جھاڑ میں

.....................

پڑ گئی ہیں چھتیاں خونِ جگر کا رنگ شامل ہے
الہ آباد کا امرود یا عشاق کا دل ہے
لگی ٹھوکر تو سارا عشق لیلیٰ دب گیا آخر
کہ نیچے قیس۔ اوپر اونٹ ہے۔ اور سر پہ محمل ہے

.....................

در و دیوار یہ کیوں کانپ رہے ہیں تھر تھر
کیا مرے گھر میں گھس آیا ہے بیاباں ہونا
میز پر کھول کے رکھ دینا وہ ٹائی۔ کہ ہم
وہ بہ تہذیب مرا چاک گریباں ہونا

اس انتخاب کا آخری مطلع اس یادگار غزل سے ہے جو چوک لکھنو کے سبزانِ آزاد کے مجمع میں پڑھی گئی اور تیر بہدف ثابت ہوئی۔

ذرا دیکھو تو مجنوں کے جنونِ فتنہ ساماں کو
میانی تک بڑھا کر لے گیا چاکِ گریباں کو

.....................

ظریف مرحوم اپنے معزز احباب کی صحبتوں میں اکثر اوقات گزاری کرتے تھے۔ اور اگر کوئی واقعۂ حاضرہ ان کی توجہِ ظریفانہ سے تعلق رکھتا تھا تو اسے فوراً نظم کا جامہ پہنا کے محفل کو طرب آگین کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ نوازگنج میں حضرت تیغ مرحوم لکھنوی کے یہاں شام کو عزیز مرحوم۔ محشر مرحوم۔ جویا مرحوم۔ حکیم آفتاب مرحوم۔ ظریف مغفور وغیرہم بیٹھے تھے اور سب کے بعد اللہ کے فضل و کرم سے راقم مقالہ بھی موجود تھا۔ حضرت آفتاب کے مکان سے اطلاع آئی کہ فرزند نیک اختر کی ولادت ہوئی ہے۔ فوراً ظریف مرحوم نے چار مصرعے نظم کر کے پڑھے جس سے حاضرین نہایت محظوظ ہوئے۔

قطعہ

عالیجناب آپ ہیں اور وہ جنابچہ    نکلا کتابِ علم کے باہر۔ کتابچہ
سولہ رجب کو برجِ حمل میں ہوا طلوع    کوشش سے آفتاب کی آفتابچہ

.....................

اسی طرح لکھنؤ کے مشہور طبیب نباض الحکماء حکیم مئے آغا صاحب فاضل مرحوم نے محرم کی مجلس میں ایک روز مرغی کے انڈے تبرک کے طور پر تقسیم کئے جس میں ظریف مرحوم بھی شریک تھے۔ بھلا ان کا مرغِ فکر کاہے کو خاموش رہتا۔ بازو پھیلا کے یوں آواز دینے لگا۔

دشمن نہ ترا کبھی تجھے غم کا دے    اللہ سخاوت کا صلہ سچا دے
ہر طرح سے ہم تیرے دعاگو ہیں حکیم    انڈے بانٹے خدا تجھے بچہ دے

.....................

ظریف مرحوم نے اپنا سفرنامہ عراق۔ موسومہ بہ "سیاحتِ ظریف" بھی نظم کیا تھا جو طبع ہو چکا ہے جس کے صرف دو بند نمونتاً یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ جب کربلا کے لئے ریل چھوٹتی ہے تو اس میں زائرین کی بڑی بھیڑ ہو جاتی ہے جس کا اظہار ظریفانہ رنگ سے اسطرح کیا گیا ہے۔

کچھ ریل گھر کا حال کروں مختصر بیاں    وہ نو بجے کا وقت۔ وہ ہنگامے کا سماں
قلیوں کا لانا لاد کے وہ پیٹیاں بکس    بجنا وہ گھنٹیوں کا وہ انجن کی سیٹیاں
گاڑی میں مسافروں کی بھی اک یادگار تھی
عورت پہ مرد۔ مرد پہ عورت سوار تھی

ظریف کے ہمراہ جہاز پر لکھنؤ کے ایک فرد نواب رفیع الشان بھی تھے جن کی دو بیبیاں بھی تھیں۔ سوءِ اتفاق کہ نواب صاحب سے اور ان سے کچھ بدمزگی ہو گئی۔ ان کے چھوٹے بڑے سب ان سے برسرِ پیکار ہو گئے۔ ذیل کا شاندار بند ان کی ہجو میں ہے۔

اک اژدہا فلک نما ہی پر خدا کی شان    چھوٹے بڑے سمجھے ہیں بڑا پر خدا کی شان
مادائیں جنکی نشانیاں قدرت الٰہی شان    میں جن کے ہمرے چوہے چھچھوندر خدا کی شان
گر ہم سے پوچھئے ہو تو انسان کون تھا
دو بی بی والا یا دریا۔ نشان کون تھا

.....................

جتنی بازیاں لکھنؤ کے نچلے اہلِ دولت کی جولانگاہ ہیں ان سب میں پتنگ بازی کا دوسرا نمبر ہے۔ اس ذلت سوز مشغلے کے پیچ میں پڑ کے سیکڑوں خاندان برباد ہو گئے۔ ظریف مرحوم نے ایک نظم "بادہوائی" کے نام سے میدان پتنگ بازی کی تاریخ میں اڑا دی۔ جس کی ہوا اب تک نہ بندھ سکی۔ نوابوں سے مخاطب ہو کے کہتے ہیں۔ (از مثنوی "بادہوائی")

اے معین المہام لہو و لعب　　قوم کی فاتہ مستیوں کے محب
صدر آرائے رزم گاہ پتنگ　　پون تاوا نوا دتکل جنگ
بیٹر یا قدر مانگدار الملک　　جبد مصر الدولہ وکٹار الملک
غافلانِ زمانہ کے سردار　　مزرع مسرفاں کے پٹی دار
زیب ہیں اب یہ بازیاں ان کو　　سود دیتا نہیں زیاں جنکو
من سے لنگر لڑائے کیوں پوا　　ہنس کی چال کیوں چلے کوا
پیچ میں جو شریک تھے جبکی　　کنکوں پر ڈگریاں ہوئیں ابکی
آپ کی ہو رہی ہے بربادی　　مانجھے والے کے گھر میں ہے شادی
غرض کٹے ۔ تو گرہ سے کچھ کھویا　　کاٹنے میں ملا بتا سیئے کیا؟
یہی نا ۔ اک صدا کا آرا ٹا　　واہ استاد واہ ۔ وہ کاٹا!

- - - - - - - - - -

ظریف مرحوم کی ظرافت لطیفہ کا آخری شاہکار ان کا نہایت محنت سے کہا ہوا ایک مسدس ہے جس میں انھوں نے اوّل سے آخر تک الکشن کے تمام مدارج کی تصویر کھینچی ہے ۔ اس نظم کا نام "شامتِ الکشن" ہے جو ۱۹۳۴ء میں کہی گئی تھی اور جس میں چند خصوصیات ایسی ہیں جو ان کے وقارِ ظرافت کو بلند تر کر دیتی ہیں۔ میونسپلٹی کی ممبری کا شوق دیہاتی ووٹروں کی بے اعتنائی۔ ان کی ٹھیٹ پوربیہ زبان پھر اس میں ظرافت کے تفریح ناک گوشے اس صنف کی تمام نظموں سے اسے ممتاز کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

میونسپلٹی کی ممبری کا خبط:۔

واہ بی مینوسپلٹی جان کیا کہنا ترا　　تو بھی لیلی ای کی ۔ عاشق تیرا مجنوں کا چچا
اپنی خودداری کو کھو کر تجھ پہ جو شیدا ہوا　　بیخودی میں یہ زبان حال سے کہتے سنا
لیک دیوانہ شدم عقل رسا در کار نیست　　عاشق مینوسپلٹی را حیا درکار نیست
تیرا خواہشمند ہر قید لیاقت سے بری　　جس کا جی چاہے لڑے ۔ اور لے کے لیلے ممبری
عہد آزادی نے ایسی ڈالدی ہے ابتری　　اب تو ہر تا نیت وتذکیر میں ہے ہمسری
تجکو کیا رنڈی ہو کوئی یا کہ رنڈی باز ہے　　تیرا دروازہ کسی ناکس کا دیر باز ہے

(ایک امیدوار ووٹ حاصل کرنے نکلتے ہیں اور میاں بدھو کو چچا بنا کر ووٹ مانگتے ہیں۔)

جب پہلے انکو جس ووٹر کے گھر جانا پڑا　　شیخ بدھو نام تھا اور تھا جولاہہ قوم کا
دھوتی باندھے مرزئی پہنے تنا بیٹھا ہوا　　اک سڑا مٹی کا حقہ پی رہا تھا کج ادا
جاتے ہی تسلیم کی جب اسکو با صد احترام　　مونہہ کو ٹیڑھا کر کے بولا "تو ہی؟ بالیکم سلام"

وہ کہتا ہے:۔

ساس یہ مینا سپلٹی ہے نہ جانے کیا بلا　　اور تم لمبر جو ہوئی چہیو۔ تو ہمرا بچا مدا
ہم کبھو تم کا نہ دیکھا اور نہ تمرے باپ کا　　آ دسے ہی آرت۔ بنا یو بن نہک ہمکا چچا
ہوئی گوا ہشیار بڑھوا ہم چکے ہو چوٹ دی　　کان پکڑا ساٹ جا اب ہم کہو کا ووٹ دے

ممبر ہو جانے کے بعد پبلک سے ممبروں کی بے توجہی کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔

ہم بھی ترپا یہ اک دن بیٹھ کے موتا جرا　　کا کہی ہو جب تے سجالاں ہمرا ہوئی گوا
جب گو ولمبر بنا آوا اور نہ پوچھیں کیا ہوا　　ہم کبھیری ماں بجھتر سے اجرا ری کیا
مکدما جھوٹا ہو صاحب ہم مال یہ لوا ہیں　　سچ کہی مینا سپلٹی پر کبھو موتا نہیں

(میاں بدھو امیدوار صاحب سے مخاطب ہو کے دو ٹوک فیصلہ کر رہے ہیں۔ اور دس روپے طلب کرتے ہیں۔)

سن لیو ساری کتھا ۔ یہو کنا ہیں بیتا او　　ووٹ مانگے آئے ہو ہم سے تو ہمکا کچھ دلاؤ
کرچکیں بکواس ۔ اب بجیانہ ہمرا موڑ کھاؤ　　کہدیا بس کہدیا اب جاؤ چپکے گھر کا جاؤ
جو رکم تم سے کہا سب پیشگی لے لیب ہم　　ووٹ تے موٹر پہ لے جیہو تو ہاں کر دیب ہم

- - - - - - - - - -

ہر دور میں عوام کے رجحانات پر نظر رکھتے ہوئے شعر و ادب بھی ان کے تاثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ نظم تو نظم جو اسی مقصد سے وضع کی گئی ہے کہ اس میں تسلسل مضامین ہو۔ لیکن غزل جس کو صرف داستانِ حسن و عشق اور اس کے متعلقات کے دائرے میں مقبولیت حاصل تھی۔ آج اپنے مرکز سے ہٹی ہوئی ہے۔ اور سیاسی غزل کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ ظریف مرحوم اگرچہ کسی سیاسی نقطۂ نظر کو رنگ ظرافت میں واضح کرنا اپنا مقصدِ اصلی نہیں سمجھتے تھے پھر بھی بعض مقامات پر ان کے ظرافت مآب قلم کا رخ بدل گیا ہے۔ لیکن اسی حد تک جہاں وہ اپنے دیرینہ رنگِ ظرافت کو خندہ پیشانی سے نبا سکتے تھے اگر ایسا نہ کرتے تو لباسِ ظرافت میں گویا ایک ناخوشگوار پیوند کا اضافہ کرتے ۔ اس آخر وقت موجودہ رئیس محمود آباد کی قدردانی کام آگئی تھی ۔ دسمبر ۱۹۳۷ء میں ۷۸ سال کی عمر پانے کے بعد پھر خاکِ لکھنو میں مل گئے اور وطن مالوف کا چراغِ ظرافت گل کر گئے ۔ حضرت صفی نے کیا خوب کہا ہے ۔ ذرا یہ دیکھو ستم ظریفی ہنسانے والا رُلا رہا ہے ۔

# سوڈان

## سلطین احمد

سوڈان درحقیقت افریقہ کے ایک بہت بڑے خطہ کا نام ہے جو مصر اور ریگستان سہارا کے جنوب میں شرقاً غرباً بحر اوقیانوس سے قلزم تک پھیلا ہوا ہے۔ چونکہ اس خطے کی آبادی سیاہ فام حبشی النسل قبائل پر مشتمل تھی، اہل عرب اس کو بلاد السودان یعنی کالے آدمیوں کا ملک کہتے تھے۔ اس طویل و بسیط ملک پر آج تمام تر یورپی قوموں کا تسلط ہے۔ مغربی سوڈان پر فرانس وسطی پر بلجیم اور مشرقی حصہ پر انگلستان قابض ہیں۔ سوڈان کا یہ مشرقی حصہ اینگلو ایجپشین سوڈان کہلاتا ہے اور بجائے خود ایک وسیع ملک ہے جو رقبہ میں یورپ کے ایک چوتھائی کے برابر ہے۔ اس کے شمال میں مصر مغرب میں فرانسیسی سوڈان، جنوب میں دریائے کانگو کی وادی اور مشرق میں بحر قلزم ارٹیریا اور حبشہ واقع ہیں۔ لیکن اس طول و عرض پر اس کی آبادی تازہ ترین اطلاع کے بموجب صرف تریسٹھ لاکھ بیالیس ہزار پانسو ہے۔

یہ علاقہ کہنے کو انگریزوں اور مصریوں کی مشترکہ ملکیت مگر درحقیقت انگلستان کی تنہا ملکیت ہے۔ زمین کی نوعیت کے اعتبار سے اس کا شمالی حصہ بے آب و گیاہ ریگستان اور سہارا کا ایک جزو ہے۔ وسط میں دریائے نیل سے جانب غرب سبزہ زار میدان ہیں جو شمالی ریگستان کو جنوب کے زرخیز علاقے سے جدا کرتے ہیں۔ جنوبی حصہ شاداب سیراب اور بعض جگہ دلدل سے بھرا ہوا ہے۔ نیل کے مشرق میں کوہستان ہے جو ساحل قلزم کے متوازی چلے گئے ہیں۔ ساحل کا طول تقریباً چار سو میل ہے جس پر سوڈان اور ساکین نامی دو بندرگاہ واقع ہیں۔

محل وقوع کے لحاظ سے اس ملک کو نہ زرخیز ہونا چاہیے نہ ہے۔ شمال کی طرف تو زمین بھی قابل کاشت نہیں۔ جنوب میں بھی جہاں پانی کی افراط ہے، کچھ آب و ہوا کی خرابی اور کچھ اہل ملک کی سستی زمین سے پورا فائدہ اٹھانے کا موقعہ نہیں دیتی۔ البتہ نیل کے کنارے کنارے ہر جگہ زراعت ہوتی ہے اور خصوصاً حال کے زمانے میں نیل ابیض اور نیل اخضر کا درمیانی علاقہ روئی پیدا کرنے لگا ہے۔ اہل ملک کی غذا زیادہ تر مکا ہے۔ غلہ کی قسم سے کوئی چیز اتنی نہیں پیدا ہوتی کہ دوسرے ممالک کو جاسکے۔ البتہ روئی جو مصر کی روئی سے ہمسری کرتی ہے کثیر مقدار میں باہر جاتی ہے۔ زرعی پیداوار کے علاوہ سوڈان کے جنگل بہت سی کارآمد چیزیں مثلاً گوند، ہاتھی دانت اور آبنوس مہیا کرتے ہیں۔ بلکہ اول الذکر دو اشیاء دنیا بھر سے زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔

سوڈان کے اصلی باشندے وہ حبشی قبائل ہیں جو جنوب کی طرف بحر الغزل کے نواح میں آباد ہیں۔ ان کی زندگی ابھی تک نیم وحشیانہ ہے اور طبعاً اتنے سست واقع ہوئے ہیں کہ جنگل کی لکڑی کاٹ کاٹ کر روزی پیدا کرتے ہیں اور زمین کی شادابی سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ان قبائل کے علاوہ سوڈان کی بقیہ تمام آبادی عربی النسل قبائل پر مشتمل ہے جن میں سے بعض حبشیوں کے ساتھ مخلوط ہو گئے ہیں۔

سوڈان میں عربوں کی آمد ساتویں صدی سے شروع ہوئی۔ ابتدا میں کچھ اموی عرب جو بنو عباس کی خلافت کے باہر پناہ لینے کے لئے ٹھکانے ڈھونڈتے تھے سوڈان پہنچے اور ساحل نیل پر آباد ہو گئے۔ اس کے بعد مہاجرین کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ بعض نے حبشیوں سے شادی کرنا شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ تمام سوڈان ایک عربی اور اسلامی ملک بن گیا۔ عربوں نے اس خطے کو تہذیب و تمدن سے روشناس کیا۔ اور دو بڑی سلطنتوں کی بنیاد ڈالی جو عروج و زوال کی منزلیں طے کرنے کے بعد انیسویں صدی میں محمد علی پاشا حاکم مصر کے ہاتھوں فنا ہوگئیں۔

سوڈان کی تاریخ کا دور جدید ابتدا محمد علی کی فتوحات سے شروع ہوتا ہے۔ محمد علی ایک البانوی سپاہی تھا جو ترکی فوج میں بھرتی ہو کر مصر پہنچا اور پہلے نپولین اور پھر مملوک سلاطین کے خلاف لڑتا رہا۔ ان خدمات کے صلہ میں پہلے قاہرہ کے شیوخ نے اس کو والی مصر منتخب کیا اور پھر ترکی سلطان نے فرمان سے اس انتخاب پر جوازہ کی مہر لگا دی۔ جس وقت عرب میں عبدالوہاب نجدی نے ترکوں کے خلاف ہنگامہ برپا کیا تو محمد علی اپنے لشکر لے کر جا پہنچا اور ایک طویل جنگ کے بعد حجاز پر قابض ہو گیا۔ اس کامیابی کے بعد وہ ایک وسیع سلطنت کی بنیاد رکھنے کا خواب دیکھنے لگا۔ چنانچہ اس نے ارادہ کیا کہ سوڈان کو فتح کر کے جدید اضافہ کر لیا جائے۔ اس کے بیٹے اسمٰعیل پاشا نے ۱۸۲۰ء سے ۱۸۲۲ء تک دو سال کے اندر سوڈان کی عربی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا اور ایک نئے شہر خرطوم کی بنیاد رکھ کر اس کو دارالحکومت قرار دیا۔ مملوک سلاطین جو مصر سے نکلنے کے بعد سوڈان کے بعض علاقوں پر قابض ہو گئے تھے اسمٰعیل پاشا کے ہاتھوں صفحۂ تاریخ سے مٹ گئے۔

۱۸۴۹ء میں محمد علی کا انتقال ہو گیا۔ محمد علی کے ہی زمانے سے مصر اور سوڈان دونوں جگہ افرنگی اثرات بڑھنے لگے تھے۔ فتوحات کے منصوبے مجبور کرتے تھے کہ یورپی اقوام کے طرز جنگ کو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ محمد علی مغربی افسروں کو فوجوں کی سپہ سالاری پر مامور کرتا تھا اور بیش قرار تنخواہیں دیتا تھا۔ اس کا پوتا اسمٰعیل پاشا مغربی روش اور مغربی اداروں کا حد سے زیادہ دلدادہ اور فتوحات کا شائق تھا۔ اس کے زمانے میں مصری فتوحات کا سلسلہ اگنڈا کی سرحد تک پہنچ گیا۔ یہ نیا علاقہ جو خط استوا کے قریب واقع تھا جنرل بیکر کی سپہ سالاری میں فتح ہوا اور کامیابی کے صلے میں بیکر ہی کو اس علاقہ کا گورنر بنا دیا گیا۔ بیکر کے بعد اس حکومت پر دوسرے انگریز جنرل گارڈن کا تقرر ہوا۔ اور بعد ازاں مصر کے جنوب میں تمام مصری

مقبوضات اس کی ولایت میں دے دیے گئے۔ اسمٰعیل پاشا کی مغرب پرستی نے ایک طرف تو فرنگی افسروں کو مصری حکومت کا شریک بنا دیا اور دوسرا نقصان یہ پہنچا یا کہ مصری حکومت کو نوّے لاکھ پونڈ کا مقروض بنا دیا۔

محاصل کی زیادتی سے رعایا پریشان اور ملک بدحال ہو رہا تھا مغربی ساہوکار جنھوں نے اسمٰعیل کو قرضے دئے تھے ڈرتے تھے کہ مبادا کوئی انقلاب ہو جائے اور قرضہ مارا جائے۔ اس لئے انگریزی اور فرانسیسی حکومتوں نے مداخلت کی۔ محمد علی کے زمانے سے مصر ایک آزاد ریاست بن گیا تھا پھر بھی سلطان ترکی برائے نام مصر کا شاہنشاہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور ترکی سلطنت اس زمانے میں روسی منصوبوں کے خوف سے انگلستان اور فرانس کی اعانت چاہنے پر مجبور تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی سلطان کی وساطت سے اسمٰعیل پاشا کی معزولی عمل میں لائی گئی۔ ایک انگریز اور ایک فرانسیسی مشیر مال مصر کے خزانے کی نگرانی پر مامور کئے گئے اور اس کے علاوہ دائنان یورپ کے نمائندوں کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کو اختیار دیا گیا کہ ریل اور تار کے محکموں، بندرگاہ اسکندریہ اور چار مصری صوبوں کی تمام آمدنی قرضوں کے حساب میں براہ راست وصول کرے۔ مصری مالیہ کو یوں مفلوج کر دینے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مصری حکّام میں فرنگی افراد اور زیادہ بڑھ گئے۔

آخر قومی غیرت جوش میں آئی اور مصری فوج کے ایک افسر عرابی پاشا نے بغاوت کی۔ مگر برطانیہ کے جہازوں نے اسکندریہ پر وہ آگ برسائی کہ بغاوت ٹھنڈی پڑ گئی اور اس مظاہرے کی سزا میں مصر اور سوڈان دونوں جگہ مختلف مقامات پر انگریزی فوجیں متعین کر دی گئیں۔ اسی زمانے میں فرانس نے مصری معاملات سے دست کشی اختیار کر لی اور تنہا برطانیہ کو مصر پر مسلّط ہو جانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ کیونکہ نہر سوئز کھل جانے کے سبب برطانیہ کا فائدہ مصر سے زیادہ وابستہ ہو گیا تھا۔ اس کے معاوضے میں برطانیہ نے وعدہ کیا کہ الجزائر اور مراکش میں فرانسیسی اثرات کی ترقی میں برطانیہ مداخلت نہیں کرے گا۔

انگریزوں کے اس فوجی تسلّط کے خلاف سوڈان میں اگلے ہی سال یعنی ۱۸۸۳ء میں ایک سوڈانی درویش محمد احمد نے علم بغاوت بلند کیا۔ اور مہدی موعود ہونے کا مدعی بنا۔ سوڈان کے قبائل جوق جوق مہدی کے پرچم کے نیچے جمع ہونے لگے۔ مصری حکومت کی جانب سے مسٹر ہکس کو مہدی کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا گیا جس کی تمام فوج درویشوں نے تباہ کر دی۔ دوسری فوج جنرل گارڈن کے ماتحت خرطوم پہنچی۔ قبائل نے خرطوم کو گھیر لیا اور گارڈن کمک کا انتظار کرتے کرتے موت کا شکار ہو گیا۔ اس طرح سوڈان نے ۱۸۸۵ء میں انگریزی تسلّط سے چند روزہ نجات حاصل کر لی۔

۱۸۹۶ء میں مصری حکومت نے سوڈان کو دوبارہ فتح کرنے کا قصد کیا اور اس کے محرک تین اسباب تھے۔ اول تو کچھ انگریزی افسر اور پادری درویشوں کے ہاتھ میں ابھی تک اسیر تھے۔ دوسرے مصری حکومت کے اخراجات نئے ذرائع آمدنی تلاش کرنے کے لئے مجبور تھے۔ مگر سب سے زیادہ قوی محرک یہ تھا کہ بعض فرانسیسی سیاح وسط افریقہ کے ان علاقوں میں پہنچ رہے جہاں سے دریائے نیل نکلتا ہے۔ اندیشہ یہ تھا کہ ان علاقوں پر اگر فرانس قابض ہو گیا تو ممکن ہے فرانسیسی انجنیئر نیل کا پانی اس خطّے کی سیرابی کے لئے اس طرح استعمال کرنے کا انتظام کر دیں کہ سوڈان اور مصر کی زراعت ناممکن ہو جائے۔ چنانچہ ایک انگریزی اور ایک مصری فوج کچنر کے ماتحت روانہ ہوئی اور مہدی کے خلیفہ سے ملک چھین لیا گیا۔ اس مہم پر جو کچھ صرف ہوا مصری خزانے سے صرف ہوا۔ مگر مصری وسائل ناکافی تھے اس لئے انگلستان سے آٹھ لاکھ پونڈ قرض لینا پڑا۔

فتح سوڈان کے بعد مصر اور انگریزی حکومت کے درمیان ۱۸۹۹ء میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے سوڈان کو مصر اور انگلستان کا مشترکہ مقبوضہ قرار دیا گیا اور سوڈان کی حکومت ایک گورنر جنرل کے سپرد ہوئی جس کا تقرر برطانیہ کی نامزدگی اور خدیو مصر کی منظوری سے ہونا طے پایا۔ اس گورنر جنرل کے ایک مجلس شوریٰ بھی تھی جس کے ارکان انگریز افسر ہوتے تھے۔ مگر گورنر جنرل مختار کل تھا اور کامل انتظامی اختیارات کے علاوہ قانون بنانے کا بھی مجاز تھا۔ اس معاہدے نے سوڈان کو ایک انگریزی مقبوضہ بنا دیا مصر کی سیادت و قیادت برائے نام رہ گئی۔ ملک کے تمام صوبے دار اور ان کے ماتحت عہدہ دار انگریز مقرر ہوئے۔ البتہ فوج میں کچھ مصری افسر اور مصری سپاہی جو کچنر کے ساتھ فتح سوڈان میں شریک تھے اب بھی باقی رہ گئے۔

بیسویں صدی میں ۱۹۱۴ء میں جب لڑائی چھڑی اور ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تو انگلستان نے مصر اور سوڈان سے دولت عثمانیہ کا وہ برائے نام تعلق جو ابھی تک رسمی طریقے سے تسلیم کیا جاتا تھا ختم کر دیا اور ان علاقوں کو اپنے تحفظ میں رکھنے کا اعلان کر دیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد دنیا کی تمام محکوم قوموں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ مصر میں بھی قومی تحریک زاغلول پاشا کی قیادت میں قوت پکڑنے لگی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۲ء میں برطانیہ نے مصر کی آزادی تسلیم کر لی۔ خدیو مصر شاہ مصر ہو گئے اور مصری خزانے پر جو نگرانی تھی اٹھا لی گئی۔ مگر انگریزی فوجیں پھر بھی مسلّط رہیں اور سوڈان کے متعلق یہ طے پایا کہ اس کا انتظام بدستور رہے گا۔ کیونکہ ملنر کمیشن نے جو اس معاہدے سے قبل مقرر ہوا تھا اپنی سفارشات میں لکھا تھا کہ مصر اور برطانیہ کے معاملات کسی نہج پر طے ہوں یا نہ ہوں، مگر سوڈان میں انگریزی تسلّط جیسا ہے ویسا ہی رہنا چاہیے۔

قدرتی طور پر مصری قوم پرستوں کو برطانوی مراعات سے تشفی نہ ہوئی۔ انگریزی افواج اور سوڈان کا مسئلہ اب بھی نزاعی رہا۔ ۱۹۲۴ء میں زاغلول اور مزدور جماعت کے پہلے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ میں پھر نئے سمجھوتے کی گفتگو ہوئی اور ناکام رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوڈان میں مصری

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

# راز

افسانہ

ماہر القادری

غضب خدا کا دیاسلائی کی ایک ڈبیہ دو آنے میں آتی ہے اور وہ بھی بڑی دوڑ دھوپ کے بعد! پان سگرٹ بیچنے والوں کی چاندی ہی چاندی ہے، دیاسلائی کی گرانی کا یہی عالم رہا تو شاید تاریخ اپنے کو دہرا کر رہے گی، اور لوگ پتھروں کو رگڑ رگڑ کر آگ نکالیں گے...... اکرم نے آپ ہی آپ کہتے ہوئے لالٹین کی چمنی اٹھا کر، بتی کی لو سے سگرٹ جلانے کی کوشش کی، چمنی کے اوپر اٹھتے ہی ہوا کا جھونکا آیا اور لالٹین گل ہو گئی —— یہ لیجئے —— اکرم کہنے لگا...... ہم نے ایک دیاسلائی کی بچت کرنی چاہی تھی اس کوشش میں لالٹین ہی بجھ گئی، اب ایک کی جگہ دو دیاسلائیاں خرچ ہوں گی، اس ہوا کے نامراد جھونکے کو بھی اسی وقت آنا رہ گیا تھا، قدرت کو بھی بعض وقت بڑے تکلیف دہ مذاق کی سوجھتی ہے۔

اکرم نے دیاسلائی کا بکس اٹھا کر دیاسلائی جلانی چاہی، مسالہ کچھ سیلا ہوا سا تھا دو تین رگڑوں میں تیلی سے چھٹ کر زمین پر گر پڑا.... بسم اللہ ہی غلط ہو گئی.... اکرم نے کہتے ہوئے دوسری تیلی کو قدرے جھنجلا کر رگڑا، جھنجلاہٹ نے انگلیوں کی گرفت ضرورت سے زیادہ سخت بنا دیا تھا، دیاسلائی ٹوٹ گئی...... دوسری دیاسلائی کا خون ناحق... اکرم کہتا جاتا تھا اور تیسری تیلی کو ڈبیہ سے نکال رہا تھا۔ تیسری کے بعد چوتھی اور چوتھی کے بعد پانچویں یہاں تک کہ ساتویں دیاسلائی پر لالٹین جلی اور وہ بھی اس طرح کہ اس نے جلدی سے چمنی کو نیچے کر دیا ورنہ ہوا کا جھونکا بتی کی لو کو تھرتھرا چکا تھا اور اس غریب کی کوشش کا دم لبوں پر آ ہی گیا تھا۔

لالٹین جل جانے کے بعد اکرم ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے مسکرایا — اس کی مسکراہٹ میں طنز، خفگی، جھنجلاہٹ اور مزاح کی آمیزش تھی ---- پھر وہ بولا... دو تین منٹ میں مابدولت سے ایک نہیں سات حماقتیں سرزد ہوئی ہیں۔ احتیاط اور کفایت کی غیر ضروری کوشش میں بعض وقت اچھا خاصہ آدمی بیوقوف بن جاتا ہے۔ اور...... متکلم و حاضر اکرم کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ راستے سے کچھ آدمی تیز تیز گفتگو کرتے ہوئے گزرے جیسے وہ کسی غیر معمولی حادثہ کا ذکر کر رہے ہیں، اکرم نے بیٹھک کا دروازہ کھول کر گزرنے والوں سے پوچھا... بھئی کیا ہوا؟ تم لوگ اتنے بدحواس اور ڈرے ہوئے سے کیوں ہو--- ان لوگوں نے جواب دیا کہ لال دروازے کے پاس جو سینما ہال ہے اس میں فساد ہو گیا، بات اتنی سی تھی کہ ایک تماشائی نے بے خیالی کے عالم میں سگرٹ جلا کر دیاسلائی قریب کے آدمی پر پھینک دی، دیاسلائی پوری طرح بجھی نہ تھی اس آدمی کی شیروانی کا دامن جل گیا اس پر دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی، جھگڑا تھا دو آدمیوں کا اور اس نے صورت اختیار کر لی فرقہ وارانہ فساد کی۔! دسیوں آدمی زخمی ہو گئے، ہم تو سینما ہال میں چاقو چلتے چھوڑ آئے ہیں---

اکرم نے اس پر تیزی کے ساتھ کہا... صاحب! یہ ذرا سی دیاسلائی فتنہ کی جڑ ہے اس کا دم سلامت ہے تو روز خون خرابے ہوا کریں گے، ہم جیسے امن پسندوں کو اس مردار دیاسلائی کی بدولت خون کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں —— اکرم کی باتوں پر راہ گیر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

[illegible] جاڑے کی راتیں بہت خوشگوار ہوتی ہیں، بیمار اور کمزور آدمی کے دل میں امنگوں کا طوفان اٹھنے لگتا ہے، اور جوان آدمی کے لئے تو ان راتوں کی تنہائیاں بہت زیادہ صبر آزما بن جاتی ہیں۔ اکرم گرم و جوان جذبات کی تسکین کی خاطر ناول پڑھنے لگا۔ ناول بہت رنگین اور رومان آفریں تھا جس سے جذبات کی تسکین تو کیا ہوتی، دبی چنگاریاں اور بھڑکنے لگیں مگر جذبات کے سفینہ کو بہرحال کسی نہ کسی ایک رخ پر بہنا تھا اور تصورات کا انتشار، کچھ دیر کے لئے یکسوئی چاہتا تھا —— خیالات کے انتشار اور تصورات کی پراگندگی کو آدمی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا، ایسی حالت میں وہ کمزور سے کمزور سہارا ڈھونڈتا ہے اور چلتی پھرتی پرچھائیوں کو ہمراز بنا کر باتیں کرنے لگتا ہے۔

اکرم بہت رات گئے تک ناول پڑھتا رہا۔ مطالعہ میں وہ دل سے نگاہ تک ڈوبا ہوا تھا، اس کے ماتھے کی سلوٹوں کا جلد جلد ابھرنا، پھیلنا، تن جانا۔ اس کے جذبات کے اتار چڑھاؤ کی غمازی کر رہا تھا، ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتے ہوئے اس نے کتاب کا ورق الٹا تو لالٹین کی چمنی پر نظر پڑی جس سے کئی پتنگے چمٹے ہوئے تھے، پتنگوں کے مارنے کے لئے اس نے ہاتھ کو جنبش دی ہی تھی کہ کسی خیال نے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو بریک لگا کر ٹھہرا دیا.... وہ دل ہی دل میں کہنے لگا... یہ ناسمجھ پروانے تو تھوڑی دیر میں چمنی سے سر ٹکرا ٹکرا کر خود ہی جل مریں گے۔ مجھے ان کا خون اپنے سر لینے کی کیا ضرورت ہے، مرتے ہوئے کو مارنا حماقت ہی نہیں بزدلی بھی ہے — گھنٹہ گھر کی گھڑیال سے ٹن، ٹن کی دو آوازیں آئیں اور اکرم نے "ارے! دو بج گئے"۔ کہتے ہوئے کتاب بند کر دی اور پلنگ پر جا کر لیٹ گیا۔ جوانی کی نیندیں بھی بڑی حاضر باش ہوتی ہے کہ آنکھیں بند کیں اور غائب ہو گئے اور اکرم تو کئی گھنٹہ سے مطالعہ کر رہا تھا اسے تو پلک جھپکاتے نیند آ گئی۔ ناول کے اثرات اس کے دماغ پر مسلط تھے، سوتے میں وہ ناول کے ہیرو اور ہیروئن کی بات چیت، آنکھ مچولی اور چھیڑ چھاڑ ہی کا خواب دیکھا کیا، یہاں تک کہ صبح جب اس کی آنکھ کھلی ہے تو ناول کا یہ شعر:-

کیا رخصت یہ کہہ کر صبح کے تاروں کو حسرت سے
کہ جس کا شام سے تھا آسرا اب تک نہیں آیا

اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اکرم جاگ گیا گویا گیا مگر اس کے پپوٹے نیند سے بوجھل ہو رہے تھے، جوانی تو آٹھوں پہر سونا چاہتی ہے، شب بیداری تو بوڑھوں کا حصہ ہے جن کی راتیں کھانستے کھانستے اور کروٹ بدلتے بدلتے بسر ہوتی ہیں۔

دن خوب چڑھ چکا تھا، دھوپ ہوا کی خنکی کو کم کر رہی تھی، اکرم اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا رخساروں کے نودمیدہ سنہرے روئیں کو سیفٹی ریزر کی دھار سے کھرچ رہا تھا، آئینہ پر اس کی نگاہیں گڑی تھیں۔۔ وہ آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا ۔۔۔۔ ڈاڑھی مونڈ کر کتنا خوبصورت ہو جاتا ہے۔۔۔ مگر بھئی! وجاہت اور رعب تو ڈاڑھی سے ہی ٹپکتا ہے ۔۔۔۔۔۔ میں بھی خدا کے خوبصورت اور وجیہ رو جوان ہوں ـــ ہاں! ذرا ناک خمیدہ ہے (دل گرفتگی کے ساتھ) لیکن اس چوڑی پیشانی کا بھی کوئی جواب ہے اس نے اس کمی کی پوری پوری تلافی کر دی (خوش ہو جاتا ہے۔۔)۔۔۔ ان خیالات اور سوالات و جوابات سے جی اکتایا تو وہ گنگنانے لگا، فارسی کے اس شعر کو:۔

یارم بخانہ آمد و جام شراب نیست

درحیرتم کہ صبح دمید آفتاب نیست

اکرم نے خوب مزے لے کر اور لہرا لہرا کر گایا ۔۔۔ اتنے میں اس کا پڑوسی آ گیا۔ بھئی! بڑی عمر ہے آپ کی ۔۔ اقبال صاحب! آپ کے سر کی قسم ابھی ابھی آپ کو یاد کیا تھا ـــ اکرم نے صابن کے جھاگ تولیے سے پونچھتے ہوئے کہا۔ آپ کی یاد فرمائی کا شکریہ ۔۔ !کہئے وہ ناول آپ نے ختم کر لیا ۔۔ کیا؟ ـــ اقبال نے دریافت کیا۔

بس ایک چوتھائی حصہ رہ گیا ہے، دوپہر سے پہلے پہلے پڑھ لوں گا۔ کیا ناول لا کر دیا ہے آپ نے! خدا کی قسم جی خوش ہو گیا، اتنا دلچسپ، رنگین اور نفسیاتی ناول میری نظر سے آج تک نہیں گزرا ۔۔۔۔ اکرم نے جواب دیتے ہوئے اقبال کو سگرٹ پیش کی اور تھوڑی دیر کے وقفہ کے بعد بات چیت کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر جڑ گیا۔

میری چھوٹی بہن کو کتابوں کا بہت شوق ہے۔ یہ ناول اسی کا ہے، آپ اسے ختم کر لیں گے تو دوسری کتاب لا دوں گا۔

مہربانی کا پیشگی شکریہ! اور نقد شکریہ تو میں ادا ہی کر چکا ۔۔ آپ کی بہن کے ذوقِ انتخاب کی داد نہیں دی جا سکتی، کتابوں کے انتخاب ہی سے آدمی کے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

اکرم اور اقبال میں بہت دیر تک اس ناول کی خصوصیات پر بات چیت ہوتی رہی، اقبال نے ناول کے ابواب اور عنوانات کا تجزیہ کر کے بتایا کہ ناول نویس کی انشا پردازی کہاں کہاں معجزہ بن کر ظاہر ہوئی ہے اور کتاب کے تمام حصے کس قدر مربوط اور ہم آہنگ ہیں، اکرم بھی اس منزل میں کسی سے پیچھے رہنے والا نہیں تھا اس نے پہلے تو ناول نویسی کے فن پر جامع اور پرمغز تقریر کی اور پھر زیر بحث ناول کے کمزور حصوں کی طرف اشارہ کر کے ثابت کر دیا کہ اتنی بہت سی خوبیوں کے بعد ناول میں کچھ کوتاہیاں بھی ہیں اور ناولسٹ کے قلم نے جہاں پھول برسائے ہیں وہیں کچھ کانٹے بھی گرائے ہیں اور بعض بعض جگہ اس سے بھول چوک ہو گئی ہے۔ اکرم کی تنقید کا انداز منطقی اور فلسفیانہ ہی نہیں انتہائی دلنشین، مربوط اور سلجھا ہوا بھی تھا، اقبال حیرت کے ساتھ اکرم کا منہ تک رہا تھا کہ اتنی عمری میں یہ نوجوان اس قدر وسیع معلومات رکھتا ہے اور لٹریچر کی نزاکتوں پر اس کی اتنی گہری نظر ہے۔

اقبال کے جانے کے بعد اکرم نے ناول کو پڑھنا شروع کر دیا اور پڑھتے پڑھتے وہ یکبارگی چونک پڑا جیسے کوئی حیرت انگیز بات اسے یاد آ گئی ۔۔۔ وہ سوچنے لگا ۔۔۔ جو نوجوان لڑکی اس قسم کے رنگین ناولوں سے شوق رکھتی ہے اسے آوارہ نہیں تو کم سے کم رنگین مزاج ضرور ہونا چاہئے ۔۔۔ ناول کے بعض حصے تو اتنے چٹخارے دار ہیں کہ کسی خاص تصور کے بغیر میری سانس تیز ہو گئی ۔۔۔ عورت کے جذبات تو اور زیادہ نازک شدید اور حساس ہوتے ہیں ۔۔۔ سوچتے سوچتے وہ کتاب کے اوراق ادھر ادھر سے الٹنے لگا۔ ایک ورق الٹ کر وہ رک گیا، کتاب کا یہ سب سے زیادہ رنگین حصہ تھا، جس کی پہلی سطر ان جملوں سے:۔

"جذبات کے شعلے نصیحت کے چھینٹوں سے اور بھڑک جاتے ہیں"

شروع ہوتی تھی اور صفحہ ختم ان لفظوں پر ہوتا تھا:۔

"گرمیٔ آغوش سے کھیلتی ہوئی تمنائیں ۔۔ ایک اور تنہائی کی منتظر تھیں"۔

کتاب کا یہ صفحہ شکن آلود اور ملگجا سا تھا جیسے کسی نے اسے بار بار پڑھا اور چھوا ہے۔ دو تین سطروں کے نیچے پنسل کی بہت باریک لکیریں اور چھین نشان بھی تھے ـــ اکرم مسکرانے لگا اس کی مسکراہٹ کسی رنگین آغاز، دلچسپ اقدام اور غیر متوقع نوید کا ۔۔۔ اتا پتا دے رہی تھی۔

اقبال نے اپنی چھوٹی بہن رضیہ سے اکرم کی بہت کچھ تعریف کی کہ یہ شخص بہت زیادہ باخبر، اہل نظر اور صاحب ذوق ہے، اسی مذاق کے آدمیوں کو حقیقت میں کتابیں پڑھنے کا حق پہنچتا ہے۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے یہ کہہ دیا کہ اکرم تمہارے حسن انتخاب اور ذوق ادبی کی تعریف کر رہا تھا۔ اس دن سے یہ ہوا کہ کتاب اکرم نے رضیہ کے پاس بھجوا دی اور رضیہ کے یہاں سے ایک ناول اکرم کے گھر آ گیا۔ رفتہ رفتہ اقبال کا واسطہ بھی درمیان میں نہ رہا، نوکروں اور نوکرانیوں کے ذریعے کتابیں آتی جاتی رہیں ـــ دونوں طرف سے کتابوں کے بعض شعروں، جملوں، اور فقروں پر نشانات لگائے جاتے اور انہی نشانوں، لکیروں اور نقطوں کے ذریعہ باتیں ہوتیں اور دونوں ایک دوسرے کا مفہوم سمجھ لیتے۔ مثلاً رضیہ کی بھیجی ہوئی کتاب کے اس جملہ پر:۔

"محبت کا آغاز آپس کی دلچسپی ہی سے ہوتا ہے"
اکرم نے استفہامی نشان (؟) لگا دیا اور اکرم کی کتاب کے اس فقرے کے آگے:-

"محبت کرنے والے دو دلوں کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی"
رضیہ نے صاد (ص) بنا دیا۔ بظاہر یہ کتابیں آجا رہی تھیں مگر حقیقت میں سلام و پیام کا تبادلہ ہو رہا تھا، خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا —— محبت کے اشارے علم ہندسہ کے مقرر کردہ اشاروں (SYMBOLS) سے زیادہ واضح یقینی اور جاندار ہوتے ہیں، علم حساب کے اشاروں میں نام کو بھی جذب و اثر نہیں ہوتا اور محبت کا ایک ایک لفظ تاثیر و کشش کے کوہ مقناطیس اپنے اندر رکھتا ہے —— یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ دلچسپی مستقل تعلق خاطر میں تبدیل ہو گئی —— دلچسپی تاک جھانک کی منزل سے بھی گزر چکی تھی!

رضیہ کے باپ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اکرم کے شہر میں وہ دو ڈھائی سال تک متعین رہ کر لکھنؤ چلے گئے۔ رضیہ کے گھر والوں سے اکرم کا اچھا خاصہ میل جول ہو گیا تھا، اس لئے وہ لکھنؤ بھی برابر آتا جاتا رہا۔ ڈپٹی صاحب بیٹی کے بیاہ کے لئے بر کی تلاش میں تھے، اکرم کی طرف سلسلہ جنبانی ہوئی، رضیہ کی ذہانت اندر ہی اندر زمین ہموار کر چکی تھی، بات پکی ہو گئی اور مناسب تاریخ مقرر ہونے پر بارات آئی، نکاح ہوا، دو دن خوب چہل پہل رہی اور اکرم اپنی بیوی رضیہ کو لے کر گھر آ گیا۔ رضیہ خوبصورت ہی نہیں سلیقہ مند بھی تھی، سسرال والوں نے اسے آنکھوں پر بٹھایا اور سب لوگ اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے —— شوہر کی چہیتی بیوی کی سسرال میں عام طور پر عزت کی جاتی ہے چاہے وہ ذات کی نیچ اور ناک نقشہ کی بری ہی کیوں نہ ہو اور جسے شوہر نہ چاہے تو پری اور حور کی چال ڈھال میں لوگ عیب نکالتے ہیں اور دن رات تھکا فضیحتی ہوتی رہتی ہے۔

میاں بیوی دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا تھا، طبیعتیں بھی ہم رنگ تھیں، اختلاف کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ اکرم اور رضیہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے —— ازدواجی تعلقات کی بنیاد محبت اور ہمدردی پر ہوتی ہے اور یہاں دونوں چیزیں موجود تھیں، میاں بیوی کے اس میل جول اور ربط و محبت کو دیکھ کر گھر والے بھی خوش اور مطمئن تھے، رضیہ نے دوسری دلہنوں کی طرح سسرال میں آ کر اپنا اقتدار قائم رکھنے کی کوشش نہیں کی اس لئے ساس نندیں اس سے بہت خوش تھیں، اس کے اخلاق کی بدولت سسرال ہی اس کا میکہ بن گیا، ہر کسی کے دل میں اس کے لئے جگہ تھی یہاں تک کہ گھر کی مامائیں بھی رضیہ کو چاہتی تھیں —— پورا ایک سال ہنستے کھیلتے گزر گیا۔

رضیہ دو چار مہینے کے بعد آتی جاتی رہتی تھی، دس پانچ دن وہاں رہی اور پھر سسرال چلی آئی، مگر بقرعید پر جو وہ میکے گئی تو پورا ایک مہینہ ہو گیا۔ شروع شروع میں اس کی ماں کی طبیعت ناساز ہوئی، پڑی رہیں جیسے تیسے کر کے اچھی ہوئیں تو ڈپٹی صاحب کو قولنج کے دورے پڑنے لگے۔ اکرم بلانے کے لئے خط پہ خط بھیج رہا تھا لیکن ماں باپ کو پلنگ پر چھوڑ کر سسرال کو اکیلا اکیلی چل پڑنا کسی طرح ممکن نہ تھا، کوئی نالائق سے نالائق بیٹی بھی ایسا نہیں کر سکتی اور رضیہ تو ماں باپ پر جان چھڑکتی تھی —— والدین کی بیماری کے سبب رضیہ شوہر کے خطوں کا جواب بھی وقت پر نہ دے سکی، ایک دو خط اس نے لکھے بھی تو وہ نوکروں کی بے پروائی کی نذر ہو گئے۔ پوسٹ بکس میں ان کو ڈالا ہی نہیں گیا، اکرم کے پاس کس طرح پہنچتے —— اکرم کو بہت طیش آیا تھا، میں تو چار چار صفحے کے خط پہ خط بھیجے چلا جا رہا ہوں اور بیوی کو دو حرفوں کا کارڈ بھی لکھنا نصیب نہیں ہوتا۔۔۔ یہ اکی رضیہ کو آخر ہو کیا گیا ہے؟ اب سے پہلے تو وہ اتنے خط بھیجتی کہ اس کے کئی کئی جواب مجھ پر چڑھاؤ رہتے اور اس دفعہ جو اس خدا کی بندی نے چپ سادھی ہے تو ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتی —— اس کے رویہ اور طرز عمل میں آخر یہ تبدیلی کیوں ہوئی؟ پیچ در پیچ خیالات اور مختلف قسم کے تصورات کے ساتھ کبھی کبھار بدگمانی کی ہلکی سی لہر بھی پیدا ہو جاتی —— خوبصورت بیویوں کا حسن و جمال ایسے موقعوں پر شوہروں کے دلوں میں شکوک پیدا کر ہی دیتا ہے —— اس عالم کون و فساد میں ہر جنت اپنے پہلو میں دوزخ بھی رکھتی ہے۔

ڈپٹی صاحب اچھے ہو چکے تھے، رضیہ نے اکرم کو خط لکھا کہ میں بہت جلد آ رہی ہوں، اکرم بیوی کا خط پہنچنے سے پہلے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا، ڈپٹی صاحب کے بنگلہ میں پہنچتے ہی اس کے چھوٹے سالے نے ایک گورے چٹے ہنس مکھ جوان آدمی سے اکرم کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میرے دوست مسٹر وحید ہیں، یہ ان کی مہربانی ہے جو اپنے کاروبار کی مصروفیات کے باوجود اکثر ہمارے یہاں تشریف لا کر میزبانی کا شرف بخشتے ہیں، آپ ان کا گانا سن کر خوش ہو جائیں گے۔ یہ گانے نہیں جادو کرتے ہیں۔ وحید کی شان میں سالے کی یہ قصیدہ خوانی اکرم کو اچھی نہ لگی، ان باتوں کو سن کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اندر زنانہ میں پہنچا تو بیوی نے بھی سلام دعا، مزاج پرسی اور تھوڑے بہت حال احوال کے بعد وحید کی تعریفیں کرنی شروع کر دیں کہ ہمارے یہاں کا گانا سننے کے قابل ہے، گھنٹوں گاتے ہیں مگر آواز کھلتی جاتی ہے آواز میں پتی نہیں آتی اور صاحب! باجا تو ایسا بجاتے ہیں کہ انسان تو انسان در و دیوار کو وجد آنے لگتا ہے، آپ ذرا ہاتھ منہ دھو کر چائے پی لیجئے پھر گانے کی محفل جمے گی۔

بیوی کی باتیں سن کر اکرم کا ماتھا ٹھنکا کہ وحید کی نغمہ سنجیوں سے غیر معمولی دلچسپی رنگ لا رہی ہے۔ شاید اسی لئے رضیہ نے میرے خطوں کا جواب دینے میں غفلت برتی اور بے پروائی سے کام لیا۔ شام کی چائے کے بعد وحید نے گانا گایا، وحید اور دوسرے مرد باہر کے کمرے میں تھے زنانہ کمرے کے دروازے پر چلمن پڑی تھی جس کے پیچھے عورتوں کی نشست گاہ

انتظام تھا۔ وحید نے پہلے ہارمونیم پر نغمہ بجایا آدمی واقعی مشاق اور باکمال تھا، ساز کے پردوں پر اس کی انگلیاں بجلی کی طرح دوڑتی تھیں، مختلف پردوں کی آوازوں کو ہم آہنگ بنا کر اس نے ایک کیفیت پیدا کر دی سننے والے جھومنے لگے مگر اکرم اس تصور سے گھٹا جاتا تھا کہ اس کی بیوی دلچسپی کے ساتھ غیر مرد کا باجا سن رہی ہے وہ محسوس کر رہا تھا کہ پردوں سانس کی ہر جنبش اس کی غیرت کو چیلنج دے رہی ہے۔

ہارمونیم پر گت بجانے کے بعد وحید نے غزل چھیڑی جس کے شروع کے بول تھے۔

؎ محبت منزل آغاز میں ہے

اس مصرعہ کو سن کر اکرم چونکا کہ گانے بجانے سے دلچسپی دوسرا رخ اختیار کر رہی ہے۔ بہت دیر تک گانا ہوتا رہا، وحید کی آواز میں مٹھاس ہی نہیں درد بھی تھا، فن سے بھی واقفیت تھی، ٹھمری گاتے میں خاص طور پر ایسی ایسی مرکیاں لیتا اور زمانے لگاتا کہ سننے والے اٹھ اٹھ بیٹھتے۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ راگ الاپتے میں اس کا منہ نہ بگڑتا وہ مسکرا مسکرا اور جھوم جھوم کر گاتا جیسے کوئی ہلکا پھلکا افسانہ سنا رہا ہے ——— سب لوگ لطف لے رہے تھے مگر اکرم انگاروں پر لوٹ رہا تھا، رسیلی تان اس کے کان کے پردوں میں چبھ رہی تھی، گانے کی چیزوں میں جب بھی کہیں "محبت" "وصل" "جدائی" "پریم" "نیہ بھرے نین" "انگڑائی" "شوق دید" "بے تابی" "مستی گناہ" "تمکنت لیبہ" جیسے لفظ آتے تو اکرم کے کلیجہ میں ہوکیں اٹھنے لگتیں کہ موسیقی کی زبان میں یہ محبت کی باتیں ہو رہی ہیں، وحید دانستہ کسی کو سنانے کے لئے ایسی چیزیں چھانٹ چھانٹ کر گا رہا ہے اور سننے والی سمجھ کر سن رہی ہے بلکہ لطف لے رہی ہے۔

بدگمانی شکوک و شبہات کی خندق کو ایک ہی جست میں پھاندنا چاہتی تھی، شک میں یقین کا رنگ پیدا ہو چلا تھا۔ گانا ختم ہونے کے بعد اکرم زنانہ میں گیا تو بیوی نے پوچھا۔ کہو! گانا پسند آیا۔ لاؤ مٹھائی کھلاؤ ایک ہزار روپیہ کی اجرت کا گانا سنوایا ہے تم کو! ۔۔ اکرم نے جواب دیا۔۔ جس گانے کو تم پسند کرو۔۔ اسے اچھا ہونا ہی چاہیئے! ——— اکرم کے انداز کلام میں طنز پنہاں تھی ——— شدید طنز ——— خوفناک عتاب ——— دل کی بھڑاس ——— رقابت کی شعلہ سامانی ——— غیرت کا طوفانی احساس ——— مگر رضیہ خالی الذہن تھی شوہر کے اس خطرناک انداز کو وہ سمجھ نہ سکی۔

اکرم بیوی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہا تھا وہ مسکرا کر بات کرتی تو اکرم یہی سمجھتا کہ اس مسکراہٹ میں وحید کا تصور شامل ہے اور رضیہ کے چہرے کی شادابی وحید کے نغموں کے ارد گرد گھوم رہی ہے ——— اکرم کا تخیل شک و یقین کے اسی عالم میں کروٹیں بدل رہا تھا اور بدگمانی واقعات کی کڑیاں ملانے میں مصروف تھی کہ اتنے میں باہر سے چھوکرا ایک کتاب لے کر آیا اور رضیہ سے بولا۔۔۔ گانے والے سرکار نے یہ کتاب بھیجی ہے اور کہا ہے کہ آپ کی یہ کتاب ہمیں بہت پسند آئی، کوئی دوسری کتاب دیجئے ———

اکرم دلچسپی اور ہوس کی ان بھول بھلیوں سے گزر چکا تھا، واقعات کی اس آخری کڑی نے رہی سہی بدگمانی کو یقین محکم سے بدل دیا، رقابت کے شعلے اور غیرت کی آگ یکبارگی بھڑک اٹھی، اس نے "او بے وفا، بدچلن اور نامراد عورت" کہتے ہوئے رضیہ کے زور سے لات ماری، رضیہ زمین پر گر پڑی، اکرم فرط غضب اور فرط طیش سے بدحواس ہو رہا تھا اس کے اوسان بجا نہ تھے، زمین پر گری ہوئی رضیہ کے اوپر اس نے پلنگ الٹ دیا اور پلنگ پر چڑھ کر بولا۔ میں تجھے جان سے مار کر چھوڑوں گا۔۔۔ اور تیرے آشنا وحید کو بھی موت کے گھاٹ اتاروں گا۔ دو بدکار آدمیوں کے جنازے ساتھ ہی ساتھ نکلیں گے ——— گھر کی عورتوں نے جیسے تیسے اکرم کو چارپائی سے نیچے دھکیلا، اکرم وہاں سے اٹھ کر سیدھا مردانہ میں آیا اور وحید سے لپٹ پڑا، اکرم کے مقابلہ میں وحید بہت زیادہ تندرست، چھریرا، پھرتیلا اور کم عمر تھا مگر اکرم میں جوش غیرت اور جذبۂ انتقام نے غیر معمولی طاقت پیدا کر دی تھی، دس آدمی بھی اس کے خوفناک حملہ کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے، اس وقت اگر وہ ہاتھی کے مستک پر گھونسا مارتا تو شاید ہاتھی چنگھاڑنے لگتا، وحید نے اپنے کو بہت کچھ سنبھالا مگر اکرم نے اسے رگید ڈالا، ملازم بچانے کے لئے دوڑے تو اکرم نے دو تین کو لاتوں سے زمین پر لٹا دیا۔ وحید نے بھی اکرم کو لات گھونسوں اور نوچ کھسوٹ سے جواب دینے کی کوشش کی، مگر یہ زخمی شیر اور حیرت زدہ بکری کا مقابلہ تھا، اکرم کے زوردار جھٹکے نے وحید کو گرا دیا، دیوار کے پتھر کی نوک اس کے تالو میں چبھ کر بہت نیچے تک اتر گئی اور وحید دو چار بار تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا ——— "خون، خون قتل قتل" کے شور نے آس پاس کے لوگوں کو بھی ڈپٹی صاحب کے بنگلہ میں جمع کر دیا، باہر کے لوگ نہ آتے تو شاید یہ واقعہ عدالتی نوعیت اختیار نہ کرتا، حادثہ کی شہرت ہو چکی تھی خونریز واردات کا اخفا خود ڈپٹی صاحب کے لئے خطرے اور مصیبت کا سبب بن جاتا۔

اکرم گرفتار ہو گیا اور عدالت میں مقدمہ کی کارروائی شروع ہو گئی۔

اکرم کے باپ نے بیٹے کے مقدمہ کی پیروی میں زمین آسمان ایک کر دیئے، روپیہ کنکری کی طرح اٹھ رہا تھا۔ وکیلوں نے مشورہ دیا کہ اکرم کو عدالت میں یہ بیان دینا چاہیئے کہ میں نے وحید کو اپنی بیوی کے ساتھ تنہا کمرے میں چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا یہ منظر دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور اس عالم میں نہ جانے میں کیا کر بیٹھا؟ ——— اس طرح اشتعال کا فائدہ ملزم کو پہنچے گا، صفائی کو مضبوط اور باوثوق بنانے کے لئے دو چار گواہ بھی عدالت میں پیش کر دیئے جائیں گے کہ وحید اور رضیہ کو ہم نے بازاروں اور پارکوں میں ساتھ ساتھ گھومتے دیکھا ہے ——— اکرم نے اس پر کہا کہ میں جھوٹا بیان قیامت نہیں دونگا چاہے مجھے پھانسی ہی کیوں نہ ہو جائے، لوگوں نے اسے بہت کچھ سمجھایا مگر انکار ہی کرتا رہا۔

اکرم دراصل اپنی بیوی کے واقعہ کو شہرت دینا نہ چاہتا تھا، مگر عدالت کے سوالات نے اس کے قفلِ خامشی کو ٹوٹنے پر مجبور کر دیا۔

**عدالت:۔** ثبوت کے گواہ نمبر (۲) نے بیان کیا ہے کہ مقتول نے تمہاری موجودگی میں کوئی کتاب رضیہ کے پاس بھیجی تھی۔

**اکرم:۔** جی ہاں! بھیجی تھی۔

**عدالت:۔** اور اس کتاب کو دیکھ کر تم نے اپنی بیوی کو لات مار کر گرا دیا۔

**اکرم:۔** ایسا ہی ہوا تھا۔

**عدالت:۔** اس کتاب میں آخر کیا تھا جس نے تمہیں اپنی بیوی کو زدوکوب کرنے پر مجبور کیا۔

**اکرم:۔** یہ نہ پوچھئے۔

**عدالت:۔** تمہیں بتانا ہوگا۔۔۔ عدالت پہلے سوال کا واضح جواب چاہتی ہے

**اکرم:۔** اس کتاب میں وہ سب کچھ تھا جسے کوئی غیرت مند شوہر برداشت نہیں کر سکتا۔

**عدالت:۔** اس کتاب میں کوئی خط رکھا تھا۔

**اکرم:۔** جی نہیں!

**عدالت:۔** کتاب کے کسی صفحہ پر قلم یا پنسل سے کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی۔

**اکرم:۔** نہیں!

**عدالت:۔** تو پھر اس کتاب میں کیا چیز تھی۔۔۔؟ صاف صاف کہو (حاکم نے قدرے تیز لہجہ میں سوال کیا)

**اکرم:۔** اس سادہ کتاب میں اوروں کے لئے کچھ نہیں میرے لئے سب کچھ تھا۔ جس پہ گزرتی ہے وہی جانتا ہے کہ کتابوں کے سادہ ورق اور کورے صفحے بھی دو آدمیوں کے درمیان پیام رسانی کا فرض انجام دیتے ہیں، ہارمونیم کی آواز پر بھی دل کی باتیں کہی جاتی ہیں، غزلوں اور ٹھمریوں کے پردے میں بھی دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ طبلہ کی تھاپوں سے دل کی دھڑکنوں کی صدائے بازگشت آتی ہے، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا، عدالت میری بات نہ سمجھ سکے تو وہ مجھے خوشی سے سزا دے سکتی ہے میں اس کے لئے تیار ہوں۔۔۔ (حاکم نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کو چھو چھو کر رہ گئی ——— اکرم کے وکیل نے حاکم عدالت سے آنکھیں ملا کر اپنے ہاتھ کی انگلی سے دماغ کی طرف اشارہ کیا یعنی یہ کہ ملزم کے دماغ میں خرابی معلوم ہوتی ہے ——)

صفائی کے گواہوں نے جب رضیہ اور وحید کے تعلقات پر روشنی ڈالی تو اکرم نے کہہ دیا کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں ان میں سے ایک آدمی بھی واقفِ راز اور اہلِ خبر نہیں ہے، ایسا ملزم جو قتل کے مقدمہ میں ماخوذ ہوتے ہوئے خود اپنے گواہوں کو جھٹلاتا ہو، اس کے دماغ کی خرابی، عقل کے فتور اور حواس کے اختلال میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے، صفائی کے وکلا نے اکرم کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے یہی مناسب سمجھا کہ کسی طرح اکرم کو فاترالعقل ثابت کر دیا جائے۔ حاکمِ عدالت کو بھی اس کے بیانات سے اس قسم کا شبہ پیدا ہو چلا تھا، بہت کچھ رقم دے دلا کر سول سرجن کو تیار کیا گیا۔ عدالتی گواہوں نے بیان دیئے کہ ملزم کے دادا بھی مراقی اور جنونی تھے اور مرض خاندانی ہے۔ قرائن اور واقعات بھی اس کی تائید کر رہے تھے کہ جو شخص صرف ایک سادہ کتاب کو بیوی کے ہاتھ میں دیکھ کر اتنا مشتعل ہو جائے کہ اپنے موہومہ اور مفروضہ رقیب کو قتل کر ڈالے اور اپنے بچاؤ کے لئے بھی عدالت میں کوئی مناسب تدابیر اختیار نہ کرے بلکہ اس کے بیانات مقدمہ کو خراب کر دیں اور اس کی باتوں سے ثبوت کو الٹا فائدہ پہنچ جائے۔۔۔ اسے دیوانہ اور مجنون ہونا ہی چاہیئے پاگلوں کے سینگ نہیں ہوتے ان کی باتوں اور حرکتوں سے پاگل پن ظاہر ہوتا ہے۔

مقدمہ کی نوعیت ہی بدل گئی۔ ثبوت کا سارا طلسم ہی ٹوٹ گیا۔۔۔ اکرم پھانسی کے تختہ کی بجائے پاگل خانہ میں ٹھنڈی دوائیں پی رہا تھا اور پھانسی کے پھندے کی جگہ الجھی ہوئی ڈوری اسے سلجھانے کے لئے دی جا رہی تھی ——— رضیہ کے لئے یہ صدمہ غیر معمولی تھا، شدتِ فکر و غم سے اس پر ہسٹیریا کے شدید دورے پڑنے لگے ——— بات پوری طرح سے کھلی نہ تھی۔ رضیہ اور اکرم دونوں کے گھر والے حیران تھے کہ آخر یہ ہوا کیا؟ ——— اکرم نے کسی سے اپنے دل کی بات نہ کہی تھی ——— بہت سے راز آدمی کے ساتھ قبر میں دفن ہو جاتے ہیں ———

دو خاندانوں کی عزت آبرو کا سوال تھا، مقدمہ کی نوعیت بدل جانے کے بعد طرفین کے تعلقات کی کشیدگی بھی کم ہو گئی ——— بڑے بوڑھوں نے بہت کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد آخر یہ رائے قائم کی کہ دشمنوں نے میاں بیوی پر جادو کر دیا ہے۔۔۔ یہی غلط فہمی ہمیشہ پردہ حائل بنی رہی ——— دیوانوں اور آسیب زدوں میں تعلقات قائم کرانے کے لئے کوشش بھی کون کرتا؟ دونوں زندگیوں کا انجام اپنے آغاز کی بے راہ روی کا کفارہ بن کر رہ گیا ——— شاید راز بعض وقت خطرناک گناہ بن جاتی ہے ———!

---

## سوڈان ———

بقیہ صفحہ ۱۲

فوج نے بغاوت کی اور قاہرہ میں انگریزی ہائی کمشنر پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوڈان سے مصری افواج کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا جس کو مصر نے نامنظور کر دیا۔ اس کے بعد سوڈان کے گورنر جنرل کو یہ ہدایت کی گئی کہ تمام مصری افواج کو جبراً خارج کر دیا جائے۔ اس طرح ۱۹۲۴ء میں سوڈان کے تسلط میں مصری افواج کی غیر موثر شرکت بھی ختم ہو گئی۔ مصر کا تعلق صرف اتنا باقی رہ گیا کہ برطانیہ کے نامزد کئے ہوئے گورنر جنرل کا تقرر منظور کر لے۔

# شاعری

صالحہ عابد حسین

ہر ملک اور ہر قوم کے ادب میں سب سے زیادہ محبوب شے شاعری رہی ہے۔ کسی زبان کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے ابتدائی زمانے میں بھی جب کہ وہ صرف بول چال کی زبان تھی اور اسے ادبی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی، لوگوں نے اس میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اکثر گیت جو لوگوں کی زبانوں پر ہوتے ہیں، زبان کے بالکل ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں گو ان کا ادبی معیار بلند نہ ہو اور ان میں کوئی خاص خوبی نہ ہو لیکن پھر بھی وہ شعر ضرور ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ زبان اور بیان زیادہ صاف اور دلکش ہوتا جاتا ہے اور شعر ادب کے معیار پر پورا اترنے لگتا ہے۔

اردو میں سے اسی وقت سے جب وہ محض بول چال کی زبان تھی، گیت اور دوہے وغیرہ کہے جانے لگے تھے۔ آگے چل کر جب اس نے ادبی زبان کی حیثیت حاصل کی تو فارسی گو شعراء میں سے اکثر نے اردو شاعری کی طرف توجہ کی۔ ابتدائی دور میں کئی صدی تک ہمیں نثر کی کتابیں خال خال نظر آتی ہیں لیکن مختلف شاعروں کے دیوان بکثرت ملتے ہیں جنہوں نے اردو زبان کو مانجھنے اور سنوارنے میں بڑی محنت کی۔ یہ ان ہی بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اردو زبان آج بام ترقی پر پہنچ چکی ہے۔ ان شاعروں کے احسان سے ہماری زبان کی گردن ہمیشہ جھکی رہے گی۔

آئیے پہلے یہ سوچیں کہ یہ شاعری آخر ہے کیا چیز۔ اس بارے میں لوگوں کے مختلف نظریے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاعری جذبات کے اظہار یعنی انہیں خوشنما اور ہم آہنگ طریقے سے ادا کرنے کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ شاعری فطرت کی مصوری ہے۔ فطرت کے دلکش اور حسین مناظر سے متاثر ہو کر ان کو خوبی سے بیان کرنا اور دوسروں کی چشم تصور کو ان کی تصویر دکھا دینا شاعری کہلاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ زندگی کی نقش گری یعنی حیات انسانی کے گوناگوں مرقعے الفاظ کے پردے پر دوسروں کو دکھانے کا نام شاعری ہے۔ ۔۔ دراصل شاعری ان سب کا مجموعہ ہے۔ زندگی کی تصویر کھینچنا، کائنات کی حقیقتوں کو بیان کرنا، جذبات کا اظہار، فطرت کی مصوری یہ سب شاعری کے مختلف پہلو ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی محدود دائرے میں طبع آزمائی کرتا ہے کوئی وسیع دائرے میں۔ کوئی شاعری کا صرف ایک پہلو لیتا ہے کوئی اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ لیکن اگر شاعری کی شرطیں پوری کرتا ہے تو ہر حال میں اس کی شاعری سچی شاعری ہے۔

یوں تو مختلف چیزوں سے متاثر ہونا انسان کی عام صفت ہے لیکن بعض لوگ خاص طور پر حساس دل لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ دلی واردات اور جذبات مناظر فطرت۔ زندگی کی حقیقتیں اور زمانے کے اہم واقعات، عام لوگوں سے بہت زیادہ ان کے دل پر اثر ڈالتے ہیں۔ مشاہدہ، خیال اور فکر ان کے حساس دل پر اس قدر اثر کرتا ہے کہ وہ جذبہ بن جاتا ہے۔ یہ جذبہ کبھی رنگ اور موقلم کے ذریعے مصوری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، کبھی سنگتراشی کے جوہر دکھا کر پتھر میں جان ڈال دیتا ہے، کبھی ساز کے پردوں سے موسیقی بن کر نکلتا ہے اور کبھی الفاظ کا جامہ پہن کر شعر بن جاتا ہے۔ شاعر اس احساس کو موزوں اور مناسب الفاظ میں ڈھالتا ہے اور جو اثر اس پر پڑا ہے، وہی ان الفاظ سے دوسروں کے دلوں میں بھی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی کا نام شعر ہے۔ شاعری کے لئے یہ کوئی لازمی شرط نہیں کہ اس میں وزن ضرور ہو بعض اوقات نثر اس قدر دلگداز اور پر اثر ہوتی ہے کہ شعر معلوم ہونے لگتی ہے۔ دراصل شعر کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ دوسروں کو متاثر کرے۔ خواہ اس میں وزن ہو یا نہ ہو۔ (آپ نے شاید سنا ہو کہ بعض بہت اچھے نثر نگاروں کے لئے بھی لوگ کہہ دیتے ہیں کہ وہ تو نثر میں شاعری کرتا ہے) لیکن یہ ضرور ہے وزن سے شعر میں موسیقیت اور ترنم پیدا ہو جاتا ہے جس سے اس کا حسن دلکشی اور تاثیر زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ فن کی دوسری خوبیاں ہیں جو شعر کی خوبی کو دوبالا کرتی ہیں۔ چنانچہ شاعر کے لئے پہلی اور لازمی شرط تو یہ ہوئی کہ وہ حساس دل رکھتا ہو اور اثر پذیری کی صلاحیت اس میں پوری طرح پائی جاتی ہو۔ یہ چیز خداداد اور قدرت کی دین ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ شاعر بنتے نہیں، پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جو کیفیت اس پر طاری ہوئی ہے اسے الفاظ میں اس طرح ادا کر سکے کہ سننے اور پڑھنے والوں پر کسی نہ کسی حد تک وہی کیفیت طاری ہو جائے۔ پہلی چیز قدرت کا عطیہ ہے دوسری اکتسابی ہے جسے پہلی نعمت خدا کی طرف سے ملی ہے اسے دوسری کوشش اور محنت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

جس شخص میں مندرجہ بالا دونوں شرطیں موجود ہوں وہ قدیم طرز میں شعر کہے یا جدید طرز میں اس کا موضوع محدود ہو یا وسیع ہر صورت میں شاعر ہے خواہ وہ میر کی طرح محض سوز و الم کی کیفیتوں کو بیان کرتا ہو یا درد کی طرح تصوف کے مسائل پر روشنی ڈالتا ہو یا غالب کی طرح انسانی جذبات اور فلسفہ حیات کو شعر میں ڈھالتا ہو یا انیس ہو جو میدان مرثیہ گوئی میں اپنے کمالات دکھاتا ہو یا حالی ہو جو قوم کا مرثیہ سناتا ہو، اقبال ہو جو عمل کی راہ کھولتا ہو، یا حسرت، جگر اور جوش ہو جو سیاسی اور انقلابی نظمیں اور غزلیں سناتا ہو۔ میر نے حسن انسانی کی کیسی پیاری اور دلکش تصویر دکھائی ہے کون ہے جو سن کر پھڑک نہ جائے

آپ کی نیم باز آنکھوں میں ✦ ساری مستی شراب کی سی ہے
نازکی ان لبوں کی کیا کہیئے ✦ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

کس کے دل پر یہ شعر اثر نہ کرے گا ؎

جنبشِ وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا ✦ صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

اور اس شعر کو پڑھ کر تو اہل ذوق دل پکڑ لیتے ہیں ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

درد کے اشعار ان لوگوں کو جو تصوف سے ذوق رکھتے ہیں تڑپا دیتے ہیں ؎

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں سے ستم دیدہ ⁂ گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ
کاش تا شمع نہ ہوتا گذر پروانہ ⁂ تم نے کیا قہر کیا بال و پر پروانہ
ایک ہی جست میں لی منزل مقصود اس نے ⁂ راہ رو رشک کی جا ہے سفر پروانہ
جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا ⁂ تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری ⁂ آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا

زندگی کی بے ثباتی کا کیا مکمل نقشہ ہے ؎

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے ⁂ کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس ⁂ تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں ⁂ چشم نم آئے تھے دامن تر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ ⁂ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اور غالب کے تو چند جز کے دیوان میں وہ جواہر پارے بھر دئے ہیں جن کی تعداد و قیمت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ لاثانی شاعر جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے بس قلم توڑ دیتا ہے۔ ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق ⁂ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ⁂ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے ⁂ پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے ⁂ غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے ⁂ تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

یا پھر انیس جیسا نادر الکلام شاعر بظاہر صرف مرثیہ شہدائے کربلا کہتا ہے لیکن اسی ایک صنف میں کیا کچھ جوہر نہیں دکھاتا۔ اس کی شاعری میں واقعہ نگاری، منظر نگاری، سیرت نگاری، جذبات کی عکاسی سبھی کچھ تو آ جاتا ہے۔ جب وہ صبح کا سماں دکھاتا ہے تو سامنے ہو بہو نقشہ کھینچ دیتا ہے۔ ؎

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور ⁂ یاد خدا میں زمزمہ پردازی طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور ⁂ خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو ملک آسمان پر
جاری تھا ذکر قدرت حق ہر زبان پر

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دم بدم ⁂ مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم ⁂ سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

وہ نور صبح اور وہ صحرائے سبزہ زار ⁂ تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیم صبح کا رہ رہ کے بار بار ⁂ کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغ بہشت نعیم کے
ہر سو رواں تھے وقت میں جھونکے نسیم کے

غرض ان قدیم طرز کے شاعروں نے گو اپنے محدود دائروں میں وہ وہ کمالات دکھائے کہ ان کا نام رہتی دنیا تک باقی رہے گا اور شاعری کی پہلی صف میں ان کو ہمیشہ نمایاں جگہ حاصل رہے گی۔

قدیم طرز کی شاعری کے بعد جدید شاعری کا دور آیا [illegible] نے شاعری میں جدتیں پیدا کیں۔ اول تو غزل گوئی [illegible] کے دائرے سے نکالا اور اس میں صداقت اور اصلیت [illegible] جدید قسم کی نظمیں کہنی شروع کیں جن سے قومی اور اصلاحی شاعری [illegible] مناجات بیوہ ان کی چھوٹی بحر کی نظموں میں سب سے [illegible] جس کو پڑھ کر ہر اہل دل خصوصاً عورتیں تڑپ جاتی ہیں۔ ہندوستان [illegible] بیوہ عورت کی حالت اور دلی جذبات کی جو تصویر حالی نے دکھائی اس سے بہتر [illegible] آج تک کوئی نہ دکھا سکا۔ ذرا چند شعر سنئے: ؎

اے مرے زور اور قدرت والے ⁂ حکمت اور حکومت والے
بے آسوں کی آس تو ہی ہے ⁂ جاگتے سوتے پاس تو ہی ہے
میں لونڈی تیری دکھیاری ⁂ دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن ⁂ جان ہے اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری ⁂ میکے اور سسرال پہ بھاری
دل پر ہیں برچھی داغ ہیں جتنے ⁂ منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
بیاہ کے دم پائی تھی نہ جینے ⁂ لینے کے یاں پڑ گئے دینے
پیت نہ تھی جب پایا پیتم ⁂ پیت ہوئی تو گنوایا پیتم
سہتے بچپن کہلے رنڈاپا ⁂ دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا
میں ہی اکیلی نہیں ہوں دکھیا ⁂ پڑی ہے لاکھوں پہ یہی بپتا
کوئی نہیں جو غور کرے اب ⁂ نبض پہ ان کی ہاتھ دھرے اب
چوٹ نہ جن کے دل پہ لگی ہو ⁂ وہ کیا جانیں دل کی لگی ہو
بے دردوں سے پڑا ہے پالا
تو ہی اب ان کا ہے رکھوالا

لیکن حالی کی شاعری کا شباب اور کمال ان کی مشہور و معروف مسدس مد و جزر اسلام المعروف مسدس حالی میں نظر آتا ہے۔ قوم کی پستی اور زبوں حالی شاعر کے دل کو تڑپا دیتی ہے اور وہ اس درد و سوز کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر جادوگر کی طرح لوگوں کو مسحور کر لیتا ہے دل سے نکلی ہوئی بات ٹھیک دل پر جا کر بیٹھتی ہے۔ مسدس حالی کی اس مقبولیت کی اصلی وجہ اس کے خلوص کی وہ روح ہے جو پوری نظم میں جاری و ساری

ہے۔ اس کے علاوہ مسدس حالی کے درد و اثر، جوش، سادگی بیان، ترنم اور روانی بھی ہم ہے اس کے بعد بہت سی اسلامی مسدس اور اسلامی نظمیں لکھی گئیں لیکن کسی نے مسدس حالی کے برابر مقبولیت نہیں پائی۔ نمونہ کے چند بند سنئے۔

پیغمبر اسلام صلعم اور دین اسلام کے سلسلہ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی سیرت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا ٭ مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا ٭ وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا ٭ بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا ٭ قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کی تصویر دیکھئے ؎

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے ٭ مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے ٭ خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے
جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

اور جب ناامیدی میں امید کی کرن چمکتی ہے تو یہی ٹوٹے ہوئے دلوں کی آس بندھاتی ہے ؎

بس اے ناامیدی نہ یوں دل بجھا تو ٭ جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کی ڈھارس بندھا تو ٭ فسردہ دلوں کے دل آ کر بڑھا تو
ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

حالی کے بعد اقبال اردو شاعری کے آسمان پر آفتاب بن کر نمودار ہوئے۔ حالی نے قوم کو ان کے عروج و زوال کی تصویر دکھا کر اور ان کے عیبوں سے آگاہ کر کے خواب غفلت سے جگایا۔ اقبال نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ انہوں نے سوچا اور غور کیا کہ آخر قوم کی اس زبوں حالی، پستی اور بے عملی کی وجہ کیا ہے۔ تو انہیں معلوم ہوا کہ تصوف کے غلط تصور نے لوگوں میں بے عملی اور پست ہمتی پیدا کر دی ہے۔ اپنی خودی اور ہستی کو مٹا دینا زندگی کا سب سے اونچا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اقبال کو یہ خیال یقیناً ان کے حساس دل تک پہنچ کر جذبہ بن گیا اور یہ جذبہ شعر بن کر ان کی زبان سے نکلا۔ انہوں نے بتایا کہ انسان کو اپنی خودی کی حفاظت کرنا اور راہ عمل پر گامزن رہنا چاہیے عشق حقیقی کی روشنی میں اپنی خودی کو محکم کرنا اور زندگی کی مشکلات اور مصائب پر عمل کے ذریعے غالب آنا انسان کا فرض ہے اور یہی انسانیت کی معراج ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ٭ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے ٭ خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے راز درون حیات ٭ خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی شیر مولا جہاں اس کا صید ٭ زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید
ہر چیز ہے محو خودنمائی ٭ ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود زندگی موت ٭ تعمیر خودی میں ہے خدائی

اور عمل کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم ٭ جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ٭ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ٭ ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا ٭ کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اور عشق کا تصور اقبال کے یہاں کیا ہے ؎

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ ٭ عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو ٭ عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفیٰ ٭ عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مضراب سے نغمۂ تار حیات ٭ عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

موجودہ زمانے کے جدید شعرا نے شاعری کو اور زیادہ وسعت دی۔ غلامی، افلاس، بھوک، بے کاری، سرمایہ داری، مزدور، انقلاب وغیرہ۔ غرض دنیا کے ہر مسئلے پر وہ خامہ فرسائی کر رہے ہیں ان کی نظر جزویات تک پہنچ جاتی ہے اور وہ اسے بے نقاب کر دینا چاہتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا شاعری کے لیے دو شرطیں لازمی ہیں۔ پہلی خداداد صلاحیت۔ دوسری جذبات اور دلی کیفیت کو موزوں الفاظ میں ڈھالنے پر قدرت۔ ہمارے جدید شعرا میں سے بعض میں قدرتی صلاحیت موجود ہے مگر مشق کی کمی کی وجہ سے زبان اور بیان پر پوری قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ بعض ایسے ہیں جو محض نقالی کرتے ہیں بعض عام پسندیدہ موضوعوں کو لے کر اس پر لکھتے ہیں اور آجکل کی عام ہوا کے مطابق بہت جلد شہرت بھی پا جاتے ہیں۔ لیکن اہل ذوق شاعر اور متشاعر کا فرق فوراً پہچان لیتے ہیں۔ نوجوان شعرا میں جو حقیقی شاعر ہیں، زبان اور بیان پر عبور بھی رکھتے ہیں اور اپنی صلاحیت کو بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ان کا کلام پراثر اور مقبول ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایک دن ترقی کر کے اردو کے بہترین شعرا کی صف میں جگہ نہ پا لیں۔

جہاں تک شاعری کی قدرتی صلاحیت کا تعلق ہے عورتوں کو مردوں سے کم حصہ نہیں ملا۔ احساس کی شدت، درد، تڑپ، سوز، تخیل کی رنگینی، ذوق جمال تو مشاہدہ ہے یہ سب چیزیں عورتوں میں عموماً مردوں سے زیادہ ہوتی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ عورتوں میں شاعر کم ہوتی ہیں؟

اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ عورتوں کی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے

بذریعہ ت کو آرٹ کا جامہ پہنانے کے بجائے عمل کا جامہ پہنائیں۔ بجائے اظہار محبت کرنے کی جگہ زندگی میں محبت کا اثبات کریں اور سراپا محبت بن جائیں دوسرے جن عورتوں میں شاعری کا قدرتی مادّہ ہوتا ہے۔ ان میں سے اکثر کو اس کے نشو و نما [illegible] کا موقع نہیں ملتا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا شاعری کی صلاحیت کو قوت سے فعل میں لانے کے لئے بڑی محنت اور مشق کی ضرورت ہے۔ اور عورتوں کو زندگی کے [illegible] اس کی فرصت بہت کم ملتی ہے اور یوں بھی عام طور پر عورتیں دماغی محنت زیادہ مدت تک نہیں کر سکتیں لیکن یہ وہ دقتیں ہیں جن پر کوشش کر کے عورتیں غالب آ سکتی ہیں اور غالب آتی ہیں۔ اردو شاعری میں اگرچہ عورتوں نے کوئی نمایاں درجہ نہیں پایا پھر بھی بعض اچھی کہنے والیاں گذری ہیں۔

میں نے اپنی ایک تقریر میں (جو ادب کی تعمیر کے عنوان سے اسی انجمن کے ایک جلسے میں کی تھی) کہا تھا [illegible] عورتوں کو [illegible] موضوعوں پر قلم اٹھانا چاہیئے جن کو انہیں واقفیت [illegible] زندگی [illegible] چاہئیں بجائے اس کے کہ وہ مردوں کی طرح [illegible] شاعری [illegible] عورتوں کو انہیں موضوعوں پر شعر کہنا چاہیئے جو درحقیقت ان کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ وہ دراصل ان کے دل کو متاثر کر سکتے ہیں۔ آرٹ میں خلوص [illegible] بڑی چیز ہے ہر صنف میں مرد شعرا کا تتبع کرنا اور ایسی باتیں کہنا جن سے ابھی تک ہندوستان کی عورت بیگانہ ہے محض نقالی ہے۔ جو ظاہر ہے کہ کوئی قابل قدر چیز نہیں۔ ابھی تک عام طور پر ہمارا مشاہدہ گھریلو زندگی تک محدود رہے ہیں۔ اپنے مشاہدے کو وسیع کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ کوشش جہاں تک زمانے کے حالات اجازت دیتے ہیں کی بھی جا رہی ہے۔ لیکن جب تک اس میں پوری کامیابی نہ ہو ہمیں اپنی زندگی کے محدود دائرے ہی کو اپنی فکر کی جولان گاہ بنانا چاہیئے۔ اس تنگ دائرے میں بھی نظر غور سے دیکھنے والے کے لئے بے انتہا حقیقتیں موجود ہیں جنہیں موضوع شعر بنایا جا سکتا ہے۔ معاشرتی خرابیاں، تعلیمی نقائص، اخلاقی کمزوریاں، مذہبی توہمات، بچوں کی خراب تربیت، عورتوں کی جہالت اور پستی، تعصب، افلاس۔ ان سب خرابیوں کو دور کرنے کی خلش، بیوہ عورتوں، یتیم بچوں، بے کس محتاجوں کی امداد کا جذبہ اور دوسروں کی زندگی کو بہتر اور آرام دہ بنانے کی آرزو کو نظر میں رکھ کر ادب اور شاعری کے میدان میں قدم رکھئے اور اپنی خداداد صلاحیت سے کام لیجئے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا عام ادب کی طرح شاعری میں بھی عورتوں کے لئے یہ شرط ہے کہ تخریب کے بجائے تعمیر، انتشار کے بجائے ہم آہنگی کا نصب العین ان کے پیش نظر ہو کیونکہ وہ زندگی کی امین، خاندان کی خالق اور سماج کی بنیاد ہیں اور ان کے طرز ادا میں بھی بناوٹ، بدلباسی اور ظاہری جوش و خروش کے بجائے سادگی، ضبط، پاکیزگی اور شگفتگی ہونا چاہیئے۔

اگر شاعر عورتیں ان باتوں کو خیال رکھیں اور اپنے کلام میں یہ خوبیاں پیدا کریں تو ان کا کلام اور ان کا نام ضرور بقائے دوام حاصل کرے گا۔

**نوٹ:۔ ریویو کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔ ادارہ**

# پنڈت جی

افسانہ

ایس پی کھتری

کل ہی کی بات ہے۔ میں کمرے میں بیٹھا ہوا زمانے کا حال اخبار کھول کر پڑھ رہا تھا کہ اتنے میں ہی ایک تار گھر کا چپڑاسی، سائیکل کی گھنٹی بجاتا ٹن ٹن کرتا، جیسے آگ بجھانے والا انجن ٹن ٹن کرتا ہے، سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ تار والے کی شکل دیکھتے ہی میرے دل کی کیفیت ویسی ہی ہوئی جیسے شب عروسی کے روز نئی دلہن کی ہو۔

پہلے تو میں نے سمجھا کہ شاید کہیں سے نوکری کا پیغام آیا ہے کیوں کہ جنگ کے زمانے میں یار لوگ عمدہ عمدہ نوکریوں کی تاک میں ویسے ہی رہتے تھے جیسے بھوری بلی گھاس پر بیٹھی گلہری کی تاک میں دم ہلایا کرتی ہے۔ اسی خیال سے کہ کہیں تیر بیٹھ ہی جاوے میں نے بھی دو ایک سفارشی گھوڑے دوڑا دیئے تھے اور منگل اتوار، اپنی بیوی کے اصرار سے منومان جی کو لڈو چڑھا کر چپ چاپ دبے ہی بھاگتا تھا جیسے کلکتے کے پرانے شاطر گرہ کٹ۔ اس حرکت سے، ہاں ایک فائدہ ضرور ہوتا تھا۔ وہ یہ کہ میری بیوی، مہینے بھر کا حساب جوڑتے وقت، ان لڈوؤں کی قیمت جو منومان جی کے نام پر ہم لوگ سک جاتے تھے۔ نہیں جوڑواتی تھیں اور اس رقم کو اپنے پاس ہی سے دینے کی ضد کرتی تھیں۔ اور میں نے بھی اپنی بھلمنساہت میں جس کا آج کل کا نام 'بھیا کے تاؤ' یا 'بے وقوفی' ہے، کبھی بھی نہ دریافت کیا کہ لڈو والی رقم کہاں سے آئی۔ اتنے میں ہی چپڑاسی نے اپنے داہنے کان میں کھونسی ہوئی پنسل میرے حوالے کی۔ جی میں تو یہ آیا کہ دستخط بعد میں کروں اور تار پہلے پڑھ لوں۔ مگر یہ سوچ کر کہ کہیں اگر اچھی خبر ہوئی تو چپڑاسی شکل سے دیکھتے ہی بھانپ جائیگا جیسے دیسی چوہے تیل کی پکوڑیاں بڑی دور سے سونگھ لیتے ہیں اور شائد انعام کا تقاضا بھی کر بیٹھے۔ اسی گھبراہٹ میں میں نے جلدی جلدی دستخط اور ٹیڑھے میڑھے تار کے سامنے اور آدھے اور لکھے ہوئے نام کے سامنے بنا کر کاغذ واپس کیا اور شکل ایسی بنائی جیسے چھچھوندی کی عرضی خارج کرنے وقت پل کا مالک بناتا ہے۔ اس حرکت سے وہ جاتے وقت سلام کرنا یا تو بھول گیا یا جان بوجھ کر ٹال گیا۔ خیر۔

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے لفافہ اٹھا کر اوپر کیا اور روشنی میں اندر کے کاغذ کی تہہ دیکھ کر اوپر سے اس کا منہ پھاڑ دیا۔ یہ احتیاط اس لئے ضروری تھی کہ اسی طرح کی لاپرواہی سے میں نے اپنی بیوی کا ایک خط پھاڑ ڈالا تھا اور لفافہ ٹھیک اسی جگہ سے پھٹا جہاں انہوں نے اپنے پہنچنے کی تاریخ لکھی تھی۔ جب ہر طرح کی چپکانے والی چیزیں بیکار ثابت ہوئیں تو میں اندازاً گاڑی آنے کا وقت سمجھ کر اپنی چھوٹی سی موٹر لئے اسٹیشن پہنچا۔ مگر کوئی آیا ہو تب تو دکھے۔ اچک اچک کر گاڑیوں کے ڈبے جھانکتا رہا، مگر نہ کہیں میری بیوی اور نہ کہیں ان کی پرچھائیں۔ اتفاقاً جب دوسرے روز شام کو ان کی ایک سہیلی کو میں ان کے گھر پہونچانے جا رہا تھا کہ راستے میں دیکھتا کیا ہوں کہ میری بیوی ایک بلا رڈ کے یکے پر بیٹھی چلی آ رہی تھیں۔ پلندے کے اوپر میرے سب سے بڑے صاحبزادے یکے والے کی ٹک ٹک میں اپنی ٹک ٹک کا سر ملاتے ہوئے اور اپنے ناک پونچھنے والے رومال کے چابک سے یکے والے کی سر کی پگڑی کو گھوڑا سمجھ کر ہانکتے چلے جا رہے تھے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ کترا جاؤں، مگر شام کی 'اسپیچ' کے خطرے سے فوراً ہی رک گیا اور ڈاک گھر، ڈاک بابو اور ڈاکئے کے رکھوں کو برا بھلا کہہ کر فوراً انہیں اس ذلیل سواری سے اتار کر موٹر پر بٹھلایا اور شریف گھر کی عورت بنا کر واپس گھر آیا۔ یکے والے کو تھوڑی بہت محبت کے بعد تین چوتھائی کرایہ دے کر راضی کر لیا کیونکہ بیوی نے آدھے ہی راستے سواری تبدیل کر دی تھی اور وہ حد سے حد آدھا ہی کرایہ دینے پر راضی تھیں۔ انہوں نے آنے کی تاریخ ۲۳ لکھی تھی اور جب میں نے لفافہ پھاڑا تو وہ کمبخت ٹھیک ۳ کے نصف و نصف اس طرح پھٹا کہ میں ۲۲ ہی تاریخ کو اسٹیشن جا دھمکا تھا۔

ہاں تو جوں ہی میں نے لفافہ پھاڑا تو کہاں آمدنی بڑھنے کے خواب اور کہاں خرچ کا ایک نیا ذریعہ۔ میرے بھائی کا تار تھا اور اپنے کل کے پنڈت جی کی خاطر داری کا بھار سونپا گیا تھا۔ اس خبر کو لے کر گھر میں ویسے ہی گھسا جیسے کوئی فیل لڑکا اپنی ناکامیابی کا کارڈ لئے اندر اپنے والد کے سامنے آئے۔ میں نے اسی سستی سے کہا: "سنتی ہو! یہ لوبھیا کا تار ہے، لکھا ہے کہ پنڈت جی آنے والے ہیں، کل ہی آمد ہے، خاطر کا ذمہ تمہارا" یہ تار کا نام سنتے ہی وہ پہلے چونکیں کہ شائد ان کے بابوجی نے انہیں کشمیر بلایا ہو کیونکہ جب سے ان کا تبادلہ وہاں ہوا وہ بیٹی کو بلانے اور میری صحت بنانے کی دھمکی کئی بار دے چکے تھے۔ پنڈت جی کا نام سنتے ہی ان کی حالت ویسے ہی ہو گئی جیسے کہ لال ٹماٹر پر کسی کا اچانک پیر پڑ جاوے منہ تین کونے کا بنا کر بولیں: "آتے ہیں آویں، میں کون جھاڑو لئے کھڑی ہوں۔ کئی روز سے ڈوم۔ کوا بار بار چوکے کی چھت پر کاؤں کاؤں کر رہا تھا، وہی ہوا، غریبی میں آٹا گیلا۔" میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا "وہ تو بیویاں ہمیں لوگوں کی خاطر رکھتی ہیں نہ کہ بہوؤں کے لانے والے پنڈتوا کے لئے۔" اتنا کہہ کر میں دفتر کے لباس میں لیس ہو کے چل پڑا۔

شام ہوئی اور میں گھر لوٹتے ہی پھر پنڈت جی کو اسٹیشن سے لانے پیدل ہی چل پڑا کیونکہ آجکل ایسے ہی خاص خاص موقعوں پر صحت بنانے کی غرض سے گھر کی سواری چھوڑ دی جاتی ہے۔ اسٹیشن پہونچتے ہی پتہ لگا کہ گاڑی آدھ گھنٹہ "لیٹ" ہے۔ اس وقت کو کاٹنے کا تو بہت ہی آسان طریقہ تھا۔ کچھ دیر تک میں نے اسٹیشن کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بیٹھے مسافروں، ان کے چال ڈھال، مال اسباب کی طرف جھانکا جھونکی کی

بقیہ وقت وہیلر کے اسٹال پر جاکر فلمی رسالوں کو الٹ پلٹ کر فلمی اسٹاروں کی رنگین تصویروں کو، جن سے تحولی کے لڑکے سے لے کر بڑے بڑے نام [illegible] تک [illegible] کلی میں دیکھنے لگا اور جب تک گاڑی آئے آئے میں نے اسٹال کے منیجر کی آنکھ بچاکر ایک پورا مضمون کھڑے کھڑے صاف کر دیا۔ گاڑی آتے ہی میں ایک طرف ایسے بھاگا جیسے کچھ اسکولی لڑکے "انٹرویل" کی گھنٹی ختم ہوتے ہی کھیل کا دوناچھینک درجوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ جونہی گاڑی کی رفتار کچھ دھیمی ہوئی، میں انٹرکلاس کے ڈبوں کے ساتھ ساتھ ایسے ہی بھاگنے لگا جیسے کچھ گاؤں کے دیہی کتے موٹر سائیکل کے ساتھ ساتھ کچھ دور بھونکتے چلتے ہیں۔ انٹر کلاس کے ڈبوں سے پیچھے [illegible] گاڑی کے میں نے فوراً ہی سوچ لیا تھا کہ بھائی ذرا کل کے پنڈت جی یا انٹر کلاس [illegible] ہی دیا ہوگا۔ کیونکہ وہ خود سیکنڈ میں ہی چلنے کے قائل تھے۔ جوں ہی گاڑی رکی میں پنڈت جی کو ڈھونڈنے لگا مگر پنڈت جی [illegible] بہت پھیلی [illegible] نے انٹر کلاس [illegible] قوم میں بھی ایک سرسری نگاہ ڈال دی۔ کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ کچھ بلا ٹکٹ مسافر گاڑی کھڑے ہوتے ہی [illegible] روم [illegible] برستے ہیں۔ مگر پنڈت جی وہاں بھی نہیں۔ اپنے شکی مزاج کی [illegible] پیچھے کی طرف مڑا۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہ پڑی ہوگی۔ "فرسٹ" اور "سیکنڈ" کے ڈبوں کو یاد آیا نہیں تھا جو ہمیشہ [illegible] جاتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ ڈبے یعنی [illegible] اور [illegible] سے بھرے رہتے ہیں شاید اس ڈر سے کہ کہیں [illegible] جان ایسے ہی بھگت لیں۔ مجھے ان گاڑیوں پہ چلنے والوں کو دیکھتے ہی [illegible] کے ان چھوٹے بچوں کا خیال آیا جن کے پلنگ پر دا ہنے بائیں [illegible] موٹے موٹے گاؤ تکیے اس لئے رکھ دئے جاتے ہیں کہ [illegible] اپنی نسل کے مطابق کہیں لڑھک نہ جائیں۔

پنڈت جی کو میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔ [illegible] نیچے ہوئے میری جسمانی اور روحانی ترقی کی دعا کرتے۔ [illegible] شاید انہیں کی دعاؤں کا اثر تھا جو میں کئی سخت بیماریوں سے [illegible] علاج کے باوجود بھی چنگا ہو گیا۔ بلا محنت کے کھٹا کھٹ [illegible] اور چار پیسے کمانے دھمانے کے لائق ہوا۔ ان کی ڈریس [illegible] گیروا نہیں ہوئی پگڑی اور شربتی مالوی ڈیزائن کا لمبا [illegible] جوتا۔ یاد تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پنڈت جی نے آجکل کے [illegible] لوگوں کی طرح، موسم کے حساب سے ڈھنگ تبدیل کی ہوگی۔ یعنی آجکل کے سیاسی فیشن نے ان کے کپڑوں کو نہ بدلا ہوگا کہ کبھی ولایتی سوٹ [illegible] کبھی ٹھیٹھ کھدر کا کرتا اور جواہر بنڈی۔ کھوجنے کی [illegible] کہ آواز آئی "چھوٹے بھیا! [illegible] بھیا! میں نے فوراً ہی پنڈت جی کی تیکھی آواز پہچان لی اور یہ بھی یقین کر لیا کہ اس شبہ میں [illegible]

پکارنے والا اور [illegible] کون [illegible] پہلے تو مجھے پکار میں یہ نام سن کر الجھن ہوئی تھی مگر [illegible] دوسرے ساتھیوں کے نام شاید نہ تھا گاڑی کے [illegible] میں [illegible] مجھے یہ نام غنیمت جان پڑا۔ ان خیالات کی لہریں ذہن میں اٹھتے [illegible] لگا کہ میں نے پنڈت جی کی سوچی ہوئی تصویر کو ایک تیسرے درجے کی کھڑکی سے آدھے اندر اور آدھے باہر لٹکے دیکھا۔ ان کا بایاں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پکڑے ان کے [illegible] گاڑی کی دیوار سے اوپر [illegible] تھا جیسے کوئی ادھ بھرے گھڑے کو کنوئیں میں [illegible] ہی کی دیوار پر جگہ تو یا شیدان تو نہیں اور جب پنڈت جی [illegible] میں ناکامیاب رہے ہوں گے۔ تبھی مجبوراً [illegible] کیا ہوگا۔ باہر کے آدمی بھی اسی [illegible] دروازہ [illegible] کھڑے ہوئے [illegible] پنڈت جی آمد و رفت کی حالت میں [illegible] باہر [illegible] تھے۔ میں انگریزی لباس میں تھا ہی۔ فوراً [illegible] انگریزی کے جملے جھاڑ دیے۔ اتنا کرتے ہی بھیڑ ایسی [illegible] جیسے [illegible] سے جلیبی پر کی مکھیاں اڑ جاتی ہیں۔ میں نے پنڈت جی کو اپنے [illegible] کا سہارا دے کر اتارا۔ مجھ انگریزی ہی میں [illegible] راستے سے گاڑی کے اندر داخل ہو کر سامان [illegible] اور [illegible] لگایا۔ کیونکہ یہ انگریزی ہونے کے [illegible] بہت ضروری [illegible] جوتوں کے کش چھوڑتے ہوئے میں انگریزی زبان کی کامیابی [illegible] جس کو کچھ تجربہ کار ہندوستان ایسے ملک [illegible] ہیں۔ [illegible] کہ اگر میں نے یہ "رام بان" نہ استعمال کیا ہوتا [illegible] کی بجائے اسپتال پہنچانا پڑتا اور ان کا اسباب کسی [illegible] کے ہاتھ لگتا۔ شاید سانپ نکلنے، پولیس کے آنے یا ٹکٹ بابو کے [illegible] اتنا اثر نہ دکھایا ہوتا جتنا انگریزی کے [illegible] نے کر دکھایا۔ [illegible] اور رفتار انگریزی کو ویسے ہی [illegible] دینے [illegible] نوکر [illegible] آیا [illegible] کرتی ہیں۔

پنڈت جی نے [illegible] کو جھاڑ جھوڑ کر ٹھیک کر لیا تھا۔ [illegible] دھوتیوں اور ٹیکوں کا ڈھیر لگا یا کہ [illegible] زبان کی [illegible] سے آ گئے اور کچھ سخت ہندوستانی ہوئے۔ [illegible] میں نے سوچا کہ ٹکٹ بابو نے اگر یہ [illegible] نے والوں کے سامنے نکالے ہوتے [illegible] مطلب انگریزی ٹامی سے ہے) ان کی [illegible] پر [illegible] بانگ دیتے نظر آتے۔ پنڈت جی [illegible] ڈھونڈنے لگے۔ ادھر میں سگرٹ کے [illegible] چلا جا رہا تھا۔ پنڈت جی نے اپنا

صاف اور انگریزی امید سے جھاڑنا شروع کیا جیسے امید میں عاشق بستر جھاڑتا ہے۔ پنڈت جی نے سوچا ہو کہ شاید ان کا ٹکٹ بھی عاشق کی حالت کو پہونچ گیا ہو ؎

ناتوانی نے لاغری سے جب نظر آیا میں
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہئے

اصل بات یہ تھی کہ پنڈت جی کا ٹکٹ ان کی دھوتی کے پھینٹے میں بہت دور سرک کر آرام کر رہا تھا۔ جلدی اور گھبراہٹ میں آدمی عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہے۔ ابھی اسی دن کی بات ہے کہ میری بیوی کے کان کا "رنگ" کھو گیا۔ وہ لگیں میرا پیکدان کھڑکھڑانے، میں نے بہت سمجھایا کہ یہ پیکدان ہے کوئی زیور کا صندوق نہیں وہ ماننے والی کب۔ یہاں تک کہ ہر جگہ وہ رنگ تلاش کیا گیا! ردی کی ٹوکری میں، کتابوں کے پیچھے، دوات کے اندر، جوتے کے اندر اور پتلون کی جیب میں۔ غضب یہ کہ میری ہی تمام چیزیں الٹی پلٹی جا رہی تھیں یہی حال پنڈت جی کا بھی تھا، انہوں نے سب بلندے ٹٹولے۔ بجائے چمڑو دے کو ٹیکا، مگر جب آدھی دھوتی کھول کر ننگا جھولی دی تو وہ پیٹ سے گرا۔ ٹکٹ ملتے ہی میری الجھن ختم ہو گئی اور میں نے ہمت سے کہا۔ "ویل! واٹ ڈو یو وانٹ! (آپ کیا چاہتے ہیں؟) یہ از مائی گیسٹ! (یہ میرے مہمان ہیں) میری نائٹ کیپ اور چھڑی اور انگریزی نے پھر عزت بچائی اور میں پنڈت جی کو لے دے کر گھر آ پہونچا۔

گھر پہونچتے ہی میری بیوی نے پنڈت جی کا سارا سامان گیسٹ روم میں رکھوا دیا اور سامنے آکر ہاتھ جوڑ کر اور پھر پیٹھ دکھائی۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ پنڈت جی نے کچھ ناخوشی سے دیکھا دی۔ مگر میں میری بیوی کا کیا قصور۔ یا تو وہ مہمان کی مورت کے آگے سجدہ کرتی یا میرے آگے جو ساری تنخواہ ان کے ہاتھ میں رکھ دیتا تھا۔ پھر انٹرفیل بیوی سے سماج کے گذشتہ رواجوں پر بحث کرنا بھڑ کے چھتے کو چھیڑنا تھا۔ اگر کوئی بحث ہو تو زد و کد سے پست کر دیا جائے اور اگر محض رامائن پڑھنے والی ہو تو اسے رعب میں لے لیا جائے مگر اس سخت ہار کی ناؤ سے کون بازی مار سکتا ہے جس طرح ریل کے انٹر کے ڈبے میں نہ تو پہلے بکتے لوگ ملتے ہیں جن سے خاکساری کی امید کی جائے اور نہ دیہاتی ہی جنہیں رعب میں لے لیا جائے۔

یہی طبقے کی انٹرفیل بیویاں سمجھئے۔ ان سے کنارہ کر کے پنڈت کو ڈنڈوت کرنا اور نمستے، پرنام کیرتن کلب میں مہمان کرنا۔ عربی گھوڑے کو چابک مار کر اسے لیپ تنک مارنے پر مجبور کرنا تھا۔

پنڈت جی جب نہا دھو کر تیار ہوئے تو میری بیوی نے پھرتی سے ناشتہ کھانے کے کمرے میں ٹیبل پر چینی کی رکابیوں میں بڑے قرینے سے سجا دیا اور دھیرے سے کہا۔ مہاراج چلئے ناشتہ تیار ہے۔ پنڈت جی اٹھے تو بڑے جوش میں مگر ٹیبل کے نزدیک پہونچتے اور کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے بیٹھ گئے۔

"نارائن! نارائن! چھوٹے بھیا تم تو بالکل کرشچان (عیسائی) ہو گئے۔ اور بھیا تم تو نرک بنائے ہوئے" میں نے کچھ تیزی سے کہا۔

پنڈت جی! اگر نرک میں صاف میز پر کھانے پینے کی ذائقہ دار چیزیں سلیقہ سے رکھی ہوں، صاف برتن ہوں، اور میری بیوی جیسی پرسنے والی ہوں تو نرک کوئی ایسی بری جگہ نہیں معلوم دیتی۔ میں نے اس جملہ میں اپنی بیوی کی تعریف کے ٹکڑے جان بوجھ کر اس لئے جوڑ دیئے تھے کہ پنڈت جی سوتے وقت سیر بھر دودھ پیتے تھے اور جب سے دودھ چھٹانک کے حساب سے ملنے لگا تھا، میری بیوی نے خود دودھ پینا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس تعریف کے بعد وہ آسانی سے دودھ والے کو پھر سے اس پر بہت کیلئے لگا لیں گی۔

میرا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے مجھ سے الگ بلا کر کہا۔ "دودھ والے سے کہہ دوں نا" میں نے چھوٹتے ہی کہا۔ "ہاں، ہاں، دیکھو! تمہیں ہی خیال رہا۔ میں تو بھول ہی گیا تھا!" اس چوٹ نے اور بھی کام پورا کر دکھایا اور میں نے سنا کہ وہ دودھ والے کو دو سیر روز کا آرڈر دے رہی تھیں۔

ادھر پنڈت جی نے اپنی آواز دبا کر ایسے ہی کہا جیسے کسی بڈھے باپ کا جوان بیٹا اور درد نکل گیا ہو۔ "چھوٹے بھیا! انگریزی پڑھ کر بدھی ماری جاتی ہے، اب تم سمجھ رہے ہو گے۔ ڈرتا ہے کہ بھیا کو بھی وہی کچھ سکھا رہے ہو" میں رامائن کو پہاڑا بڑی جلدی جلدی من ہی من میں پڑھ رہا تھا کیونکہ میری بیوی ان لفظوں کی جھنکار سے الگ، دودھ والے کو تاکید کر رہی تھیں، نہ جب تو رات کو پنڈت جی کو دودھ کے بجائے ٹھن ٹھن گوپال ملتے۔

بیٹھے بیٹھے پنڈت جی نے ملائی کے لڈو، کھیر موہن، گاجر کی برفی، بوندی اور گلاب جامن اپنے ہاتھوں کو دونے کی تصویر بنا کر ان میں ایک کے بعد ایک رکھ کر کھانا شروع کیا اسی طرح جیسے ملیریا بخار سے اٹھا ہوا بیمار۔

رات کو پنڈت جی نے "اچھا بھوجن" کیا جس کا مطلب تھا۔ بینگن کی تین پاؤ کی تہہ، پھر بارہ سولہ دبیز پوریاں، قریب ڈیڑھ پاؤ کے دہی اور دہی بڑے، قریب آدھ سیر کلاقند اور اتنی ہی مقدار پیڑوں کی۔ نوکا دہاں ذرا ہلکی پڑتی ہیں۔ اس سے اچھا بھوجن میں ان کی طبیعت نہیں۔ پنڈت جی کھاتے جا رہے تھے اور مجھے رہ رہ کر ایک بے تحاشہ کی کہانی یاد آ رہی تھی جو اپنے بیٹے کو لے کر ججمان کے یہاں کھانے گئے اور جب لڑکے نے تھوڑا تھوڑا کھانے کے بعد تھوڑا تھوڑا پانی پینا شروع کیا تو غصے میں آ کر دھیں پر ایک گہرا طمانچہ اس کے گالوں پر رکھ دیا اور پتل چھوڑ اٹھ بیٹھے۔ اور گھر آ کر کہا کہ اگر پانی ہی پینا تھا تو کیا میونسپلٹی کے نلبے ٹوٹ گئے تھے۔ لڑکا

جیب تو ہو رہا کر فوراً اندر گیا اور ایک ٹوکری راکھ اور ایک چھوٹے سے گھڑے کو باپ کے سامنے رکھ کر دھیرے دھیرے پانی کی چھینٹیں دے کر ساری راکھ اس میں سمونے لگا۔ دیکھتے دیکھتے ساری راکھ اس میں سما گئی۔ لڑکا بڑے دھیرے سے بولا "دیکھو باپو جی! پانی کی کرامات"۔ اتنا سنتے ہی باپ اٹھے اور دونے زور سے دوسرے گال پر ایک کرارا طمانچہ رسید کیا۔ اور کہا "دھت تیرے کی! ہوا ں سارے کا سارا ناس کر دیا"۔ اسی قصے کو یاد کرتے کرتے میں نے کہا۔ "پنڈت جی! شام کے کھیر موہن ابھی ہیں۔ اگر اچھا ہو تو......؟" پنڈت جی فوراً بولے۔ "ہاں، ہاں بھیّا، کھیر موہن تو کلکٹر صاحب ہیں، ان کے لئے تو پیٹ سے پیٹ میں بھی جگہ مل جاتی ہے۔" رات کو سیر بھر دودھ سے منہ صاف کر کے پنڈت جی سو رہے۔

قریب دو گھنٹے بعد جب میں بھی پڑھ لکھ کر سونے چلا تو معلوم ہوا کہ جیسے دو تین گائیں مل کر بھڑا رہی ہوں۔ ادھر ادھر دیکھا، بیوی کو اٹھایا، کیونکہ آوازوں کی پرکھ میں میں ان کے کان کا قائل ہوں۔ میری بیوی نے سراغ لگا ہی لیا۔ پتہ چلا کہ اچھا بھوجن کے بعد پنڈت جی کی ناک خوشی میں سرگم بجا رہی تھی۔ میری نیند تو حرام ہو ہی گئی تھی، تمام رات ایک ناول کے سہارے کاٹ دی۔ ہاں کبھی کبھی پنڈت جی کے میرے طرز حیات پر بگڑنے کی یاد آتی رہی۔ صحیح تھا ان کا نئی روشنی سے بھڑکنا، بھموکاٹ میں جتنا ہوا ٹیر کا گھوڑا ابھی یہی چال چلتا ہے۔

پنڈت جی کا قیام میرے غریب خانے پر قریب ہفتہ بھر رہا اور میری بیوی ان کی خاطر لگاتار کرتی گئیں۔ کیونکہ ان کے اصول سے میں بہت گھبراتا تھا جس میں آدمی ایک دن تو تھا مہمان، دوسرے دن بھان اور تیسرے دن بے ایمان۔ تاکہ انہیں فلسفہ یاد نہ آئے۔ تیر نشانہ پہ لگا اور وہ کاٹھیاواڑی بیل کی طرح جھوم جھوم کر کام میں جٹی رہتی تھیں۔

ساتویں روز جب میں شام کو گھر واپس ہوا تو دیکھا کہ پنڈت جی اپنا سارا سامان باندھ کر تیار تھے اور ہمارے گھر سے سالانہ شیکس میں ملا ہوا مٹھائی پوری کا پٹلا کس رہے تھے۔ میں نے دنیا داری کے ناتے کہا۔ پنڈت جی دو ایک دن اور رہتے۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے۔ مگر پنڈت جی بولے۔ "نہیں بھیّا، ابھی کئی ججمانوں کے یہاں جانا ہے۔ منع نہ کرو۔" میں نے ان کی بات سر آنکھوں لی۔ وہ پھر بولے۔ "بھیّا ذرا بازار چلا چل۔ مجھے ایک جوڑا خریدنا ہے، اسی لئے پہلے سے تیار ہو گیا ہوں۔" میں فوراً ہی تیار ہو گیا اور چپراسی سے سارا سامان اسٹیشن روانہ کرنے کو کہہ کر بازار کی طرف چل پڑا۔ میں دیسی جوتوں کی دوکان کی گلی کی طرف مڑ ہی رہا تھا کہ پنڈت جی نے کہا۔ "بھیّا اچھا جوڑا دلائیو، چیز اچھی ہو۔" اتنا اشارہ پاتے ہی میں نے انہیں "فلیکس" کی ایجنسی پر لا کھڑا کیا۔ انہوں نے فوراً ہی ایک "پیٹنٹ شو" پسند کر لیا۔ میں نے روپے دیئے اور پنڈت جی اس جوتے

# مغنیہ سے!

جنبشِ زخمۂ مضراب سے تاروں کو نہ چھیڑ
غم میں سوئے ہوئے مجروح اشاروں کو نہ چھیڑ

تیرے نغموں میں ترنم تیری جھنکاروں میں
ایک شاعر کی تمناؤں کی تعبیر سہی
تیرا مدہوش ترنم ترے پائل کی صدا
میرے بکھرے ہوئے افکار کی تشہیر سہی

تیری بکھری ہوئی زلفوں کی پناہگاہوں میں
یہ سسکتے ہوئے لمحات گزرتے جاتے
تیرے ہونٹوں پہ مچلتی ہوئی دھیمی لے میں
تیرے الجھے ہوئے انفاس سنورتے جاتے

روحِ احساس نے لیکن یہ گوارا نہ کیا
میرے افکار ترے لب کا سہارا ڈھونڈیں
رگِ تخئیل میں چبھتے ہوئے مبہم فقرے
کوئی آمادۂ الطاف اشارہ ڈھونڈیں

چند ہنستے ہوئے افکار کی تخلیق کے بعد
غم سے بیتاب نگاہوں کو تو دیکھا ہوتا
نغمہ و شعر کی دنیا کی حسیں شہزادی
اس تبسم میں کراہوں کو تو دیکھا ہوتا

جنبشِ زخمۂ مضراب سے تاروں کو نہ چھیڑ
غم میں سوئے ہوئے مجروح اشاروں کو نہ چھیڑ

**ممتاز قاسمی**

کو بغل میں دبائے چل دیئے۔

میں یہ سوچتا گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ جو تبدیلی میں نے سرے سے شروع کی وہ ہمارے پنڈت جی نے پیر سے شروع کی۔ گھر پہونچتے ہی میں نے ایک تانگے پر پنڈت جی کو بٹھلایا اور گاڑی چھوٹ جانے کا تھوڑا بہت ڈر دکھا کر آخری دکھشنا دس روپے کی ان کے ہاتھوں پر رکھی اور نمسکار کیا۔ بیوی نے بھی انہیں دور ہی سے نمسکار کیا اور گھوڑا چل پڑا۔ جوں ہی میں برآمدے کی طرف مڑا تو دیکھتا کیا ہوں کہ دودھ والا آواز دے رہا تھا "ہو جی! دودھ۔" فوراً میری بیوی کچھ طیش میں باہر آئیں اور جھڑک کر بولیں۔ "دودھ کیا ہوگا؟ کیا سدا برت بٹے گا؟ پنڈت جی گئے!"

# فارسی کا ایک گمنام پنجابی شاعر

لبھورام جوش ملسیانی

عبرت کدۂ عالم میں خدا جانے کتنے ... ایسے ہوگزرے ہیں جن کے شاہکار نہایت قابلِ قدر ہونے کے باوجود پردۂ گمنامی میں چھپ کر رہ گئے۔ آج اس جماعت کا کوئی فرد جب کسی اتفاق سے اپنے جواہر پاروں کی صورت میں سامنے آجاتا ہے تو دیدۂ عبرت خون کے آنسو بہاتا ہے اور اس کی گمنامی زمانے کی ناشناسی اور بے اعتنائی کا ماتم کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

"اندرجیت متخلص بہ منشی" کا شاعرانہ کمال بھی اسی گمنام اور غیر معروف سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ فارسی زبان کا یہ پختہ گو اور خوش نوا شاعر جس قصبہ کا باشندہ تھا آج اس قصبہ (نکودر ضلع جالندھر پنجاب) میں ادبی مذاق کے فقدان کا یہ عالم ہے کہ نہ کوئی اس فاضل مصنف کے نام سے واقف ہے اور نہ کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ وہ کون تھا اور کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ دو ڈھائی سو سال میں ایک ہنرمند شاعر کی یاد اور اس کے حسب نسب کا اس طرح مٹ جانا قابلِ افسوس ہے ؎

کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی
یہ چمن زارِ جہاں میں گلِ صحرائی تھا

سسّی اور پنّوں کی داستانِ عشق زبان زدِ عوام ہے۔ ملیانے اس قصۂ پارینہ کی یاد اب تازہ کر دی ہے۔ اندرجیت نے بھی یہ قصہ فارسی نظم میں تصنیف کیا ہے جو قلمی مسودے کی صورت میں اب تک منشی غلام دستگیر صاحب نامی ساکن لاہور کے خاندانی قلمی کتب خانہ کی زینت ہے۔ اسی مثنوی کو دیکھ کر معلوم ہوا ہے کہ یہ تصنیف ایک ہندو فاضل کی ہے جو اپنا نام اندرجیت تخلص منشی اور وطن نکودر لکھتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ میں سنہ ۱۱۲۴ھ میں لاہور سے نواب صاحب کے ہمراہ ملتان آیا۔ وہاں ۱۹ سال شیخ عالم کی ملازمت میں رہا۔ ان کی وفات پر سید شہامت خاں نے میری دستگیری کی۔ اب عبدالصمد خاں کا منشی ہوں۔

اندرجیت نے اس مثنوی کا نام "نامۂ عشق" رکھا ہے۔ یہ بقول مصنف سنہ ۱۱۴۲ھ میں جب کہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کا دسواں سن جلوس تھا تصنیف کی گئی۔ قلمی مسودہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسے صدرالدین کاتب نے ۵ رپوس سمت ۱۸۹۵ بکرمی میں یعنی تصنیف سے ایک سو گیارہ سال بعد نقل کر کے منشی غلام دستگیر صاحب کے نانا پیر غلام محی الدین شاہ کے سپرد کیا۔ گویا جو مسودہ اس وقت وہاں موجود ہے وہ اصل کی نقل ہے۔

نامۂ عشق ۸۴ صفحوں کا ہے۔ تقریباً ایک ہزار شعر اس میں شامل ہیں۔ کلام کو دیکھ کر ہر صاحبِ ذوق مصنف کی خوش بیانی اور تر زبانی اور اس کے ذوقِ صحیح کی تعریف کرے گا۔ یہی خوش بیانی اس مضمون کی محرک ہے۔ جو مختصر حالات اوپر لکھے گئے ہیں۔ ان کی تائید میں مصنف کے مندرجہ ذیل اشعار موجود ہیں ؎

سن ہجری ہزار و یک صد و چل — کہ از لاہور بستم محمل دل
بہ ملتان آمدم ہمراہ نواب — دل خورشید طبع و روح شاداب
چہ ملتان جلوہ خیزِ ناز خوباں — چہ ملتاں روضۂ حوران و غلماں
چہ ملتاں در جہاں دار الامانے — چہ ملتاں راحت افزا بوستانے
چہ ملتاں مظہر نورِ ہدایت — چہ ملتاں در جہاں زوے روایت
ز رونق کوچہ و بازار لب ریز — ہوائش ہمچو نسیمِ صبح گل خیز
زمینِ فیضِ ارواحِ بزرگاں — بود ایں شہر رشکِ افزائے بستاں
دریں بستاں سرائے شاد و خرم — کہ بودم یک زماں فارغ من از غم
شنیدم از لبِ آتش بیانے — ز حسن و عشق رنگیں داستانے

آخری دو شعر گریز کے لئے آئے ہیں۔ اس کے بعد داستان شروع کرتے ہیں اور مثنوی کے اختتام پر فرماتے ہیں ؎

بحمد اللہ کہ نوکِ خامۂ عشق — رقم زد ایں نگاریں نامۂ عشق
چو حسنِ گل رخاں رنگیں بہارے — ز جوشِ داغِ دل ہا لالہ زارے
بہ شوقِ دل نوشتم داستانے — کہ باشد از من مسکیں نشانے
منم خاکِ رہِ دانش پرستاں — منم جویائے لطف و فیضِ مستاں
ز استادانِ کامل بہرہ اندوز — دبستانِ سخن را ابجد آموز
منم یک مورِ منظورِ سلیماں — کہ بوئے مے برم از خوانِ احساں

اس انکسار کے بعد چند شعر تعارف کے لئے کہے ہیں ؎

مرا در عرف اندرجیت نام است — مرا منشی تخلص در کلام است
وطن گاہم بود در ملکِ پنجاب — نکودر قصبۂ سرسبز و شاداب
مرا چوں از وطن قسمت جدا کرد — بہ بزمِ شیخ عالم آشنا کرد
بہ جانِ شاد و طبعِ فارغ البال — نمودم خدمتش تا نوزدہ سال
چو شیخ از دارِ فانی رخت بر داشت — مرا سید شہامت خاں نگہ داشت
انیس و ہمدم و ہم راز بودم — ز ہم جنسانِ خود ممتاز بودم
کنونم منشیِ عبدالصمد خاں — خدا را صد ہزاراں فضل و احساں
الٰہی ظلِ فضلش باد ممدود — عدوے دولتش مطرود و مردود

ازیں پس تا چہ انجامد ندانم    سخن کوتاہ کن واللہ اعلم
اگر از خامہ ام سر زد خطائے    زاستاداں بود چشم عطائے
در ایام مبارک ماہ رمضان    بہار آورد ایں رنگین گلستان
سن عشر از جلوس ظل سبحان    محمد شاہ غازی شاہ شاہاں

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوؤں کو اسلامی حکومت میں تحصیل فارسی کا ویسا ہی شوق تھا جیسا اب انھیں انگریزی کا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملتان کے امرا فراخ دلی سے مصنفوں اور شاعروں کے قدردان تھے۔ ادبیات میں مذہب و ملت کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اسی قدردانی کا یہ نتیجہ ہے کہ نواب صاحب۔ شیخ عالم۔ سید شہامت خاں اور عبدالصمد خاں کا نام بخشی کی تصنیف سے زندہ رہ گیا۔ اگر آج ملتان میں ان کا کوئی نام لیوا ہے تو وہ فخر کر سکتا ہے کہ ہمارے اجداد کا ذکر نامۂ عشق میں موجود ہے۔

کلام کی نوعیت اور بخشی کی شاعرانہ قابلیت ظاہر کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس مثنوی میں سے بعض مقامات بطور انتخاب پیش کئے جائیں تاکہ اہل ذوق اس گم نام فارسی شاعر کی قوت بیانیہ کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ اب تک جو انتخاب درج کیا گیا ہے وہ تو صرف تمہید اور خاتمۂ کتاب سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے مناجات ملاحظہ ہو ؎

الٰہی بر دلم نور صفا بخش    بہ چشم از خاک راہت طوطیا بخش
بروئے من در توفیق وا کن    جبینم بر در خود سجدہ سا کن
الٰہی آہ گرم و چشم تر دہ    بہ حسن گل رخاں ذوق نظر دہ
سر شکم را گہر ریز اثر کن    مژہ را شاخ مرجان جگر کن
بہ جام دیدہ ام خون دل انداز    نگاہم رشتۂ یاقوت تر ساز
کرامت کن دل درد آشنائے    بہ عشق زلف خوباں مبتلائے
دلم آئینۂ حسن بتاں کن    بہ دل داغ محبت گل فشاں کن
کرامت کن دل شیدا چو بلبل    گریباں چاک چوں پیراہن گل
رگ آرام را بے تابئے دہ    بہ چشم بستہ ام بے خوابئے دہ
زبانم را بہ حرف عشق وا کن    فغانم را اجابت آشنا کن
کہ گویم داستان عاشق زار    دہم شرح جمال عارض یار

بخشی بارگاہ الٰہی سے جو چیزیں طلب کرتا ہے وہ بلا شبہ ایسی ہیں کہ ان کے بغیر کوئی داستان عشق کامیابی سے نظم نہیں ہو سکتی۔ اس نظریہ کے مطابق یہ مناجات معنوی پہلو سے نہایت مناسب حال اور برمحل ہے۔ اس کا ایک ایک شعر درد عشق کی تصویر ہونے کے علاوہ حسن بیان اور پختہ کلامی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ درخواست کہ مجھے آہ گرم۔ چشم تر۔ بے خوابی اور بے تابی کرامت فرما۔ تاکہ میرے منہ سے حرف عشق کے سوا اور کچھ نہ نکلے اور آہ و فغاں درجۂ قبول حاصل کرے۔ کتنی دردناک ہے۔

اس مناجات کے بعد شاعر توحید الٰہی کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے قدرت کی نیرنگیاں پیش کرتا ہے۔ یہاں اس نے اپنی قوت بیانیہ کا اظہار اور بھی وسعت سے کیا ہے۔ مناجات میں بھی جدت آرائی سے کام لیا گیا تھا۔ یہاں حمد میں بھی وہی جدت آرائی ہے ؎

بہ نام آں کہ نامش بے نیاز است    دل ہر قطرہ زو سربستہ راز است
ز نورش دیدۂ خورشید انور    ز بحرش قطرۂ دریائے اخضر
کواکب شعلۂ برق جمالش    شب از زنگی غلامان رکابش
سحر از صبح خنداں خیالش    ملائک شبنم صبح جمالش
بہشت از گلشن لطفش بہارے    جہنم ز آتش قہرش شرارے
ز حسن اوست رنگین عارض گل    ز عشق او فغان و شور بلبل
ز شوق سجدہ اش خم شاخ عرعر    از و حسرت نصیب چشم عبہر
بروئے لالہ رنگش غازۂ اوست    درونش نقش داغ تازۂ اوست
ز سحر فیض او شبنم گہر بار    سمن چوں پشت ماہی زو درم دار
گہر از کیمیائے صنعت او    گل صد برگ راز ربخیت بر رو
براہش گام مے زد سرو آزاد    ز حیرت ہر کجا استادہ استاد
زبان سبزہ گویا در ثنائش    بود ہر برگ فرد ماجرائش

اس کے بعد حمد کا سلسلہ عشاق کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ تطابق مضمون کے لئے یہ ضروری بھی تھا ؎

رخ عذرا بہ نور قدرت افروخت    دل وامق بہ شوق او جگر سوخت
از و شد حسن یوسف عالم آرا    ز بام افتاد از و طشت زلیخا
از و شد جلوۂ رخسار لیلےٰ    شرار خرمن مجنون شیدا
لب شیریں ازو داد شکر داد    بہ شوقش تیشہ زد بر سینہ فرہاد
از و حسن دمن زد صد چمن جوش    نل از عشقش ردائے ہجر بر دوش
چناں انداخت سوزا اندر دل ہیر    کہ خورد از عشق رانجھا در جگر تیر

اس کے بعد پھر پہلے سلسلۂ کلام کی طرف واپس آتے ہیں ؎

جنون مدہوش از مے خانۂ او    خرد نور چراغ خانۂ او
تعالی اللہ نگار حسن پرور    کہ باشد در بر و بیگانہ در بر
دو عالم زو بود آئینہ خانہ    بہ ہر جانب ز عکس او نشانہ

اس کے بعد یہ تین شعر کیا خوب کہے ہیں ؎

گل از روئے بلبل از گلشن از وے    عمارت خانۂ جان و تن از وے
از و تخم و از و شاخ و از و بار    ز باغ قدرتش پیدا گل و خار
ز آب و آتش و از خاک و ز باد    رواق شش جہت را کرد بنیاد
سمند عشق در اندیشہ اش لنگ    بساط فکر در صحرائے او تنگ
قلم در شرح صنعت ہائے بیچوں    بریزد ہر نفس در مغز جاں خوں

اتنا کچھ کہنے کے بعد دو شعر انکسار کے اور دو شعر رواج قدیم کے مطابق ساقی نامہ کے کہے ہیں ؎

کجا منشی کجا اظہارِ توحید — نیارد ذرّہ تاب نورِ خورشید
بہ لب خوش تر بود ہر خموشی — خموشی بہتر از بے ہودہ کوشی
بیا ساقی مرا از خود رہا کن — لبم با ساغرِ مدح آشنا کن
زبانم از سخن کن چاشنی یاب — کہ گویم قصۂ پنّوں بے تاب

دونوں عنوانوں کے ماتحت جو کچھ کہا گیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ منشی نے باکمال سخنوروں کی آنکھیں دیکھی ہیں اور اپنے زمانے کے کسی قابل ترین استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ طبیعت کا رنگ عشقیہ مثنوی کے لئے بہت ہی مناسبت اور تطابق رکھتا ہے۔ دردمند دل اس کی خوش بیانی کو اور بھی لے اڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شعر تاثیر کی دولت سے بے بہرہ نہیں۔ وہ حسن بیان کا حق ہر شعر میں ادا کرتا چلا جاتا ہے۔ الفاظ کا دروبست اس کے ہاں زیادہ سے زیادہ مضبوط ہے۔ اسلوب بیان بھی بالکل اسی زمانے کا ہے جس میں منشی نے اپنی زندگی بسر کی۔ ہر شعر کی بندش۔ الفاظ کی تراش۔ ترکیبوں کی نفاست اسی زمانے کے اندازِ سخن گوئی کی یاد دلاتی ہے۔ مثلاً رگِ آرام را بےتابئ دہ۔ فغانم را اجابت آشنا کن۔ مژہ را شاخِ مرجان جگر دہ۔ ملائک شبنمِ صبح جبالش یکمن چوں پشتِ ماہی زو درم دار وغیرہ مصرعے اور اسی قبیل کے اشعار اسی زمانے کی معنی آفرینی و رنگین بیانی کا نمونہ ہیں۔ جس کی آب و ہوا میں منشی اور اس کی شاعری نے نشوونما پائی۔ زمرۂ عشاق کی گنتی بیان کرنے میں "ہیر" اور "رانجھے" کا نام ایک پنجابی ہی کو سوجھ سکتا ہے۔ اسی ضمن میں "نل دمن" کا نام ایک ہندو شاعر ہی کے خیال میں آسکتا ہے۔

یہاں تک جو اقتباس درج کیا گیا ہے وہ ابتدائی حصوں کا ہے۔ شاعر کی خوش بیانی اور مشقِ سخن کا جائزہ لینے کے لئے اصل داستان کے بعض حصوں کا انتخاب بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس گمنام شاعر کی فارسی شاعری کس پائے کی ہے۔ مناجات اور توحید کے عنوانوں پر زورِ قلم دکھانے کے بعد منشی مرحوم نے جو آب دار موتی صفحۂ قرطاس پر بکھیرے ہیں ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ جوہریانِ سخن ہی کو بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ چار سال کی عمر میں سسّی کا کیا عالم تھا۔ یہ جاننے کے لئے اس شعر کو پڑھیئے ؎

چہارم سال از رنگیں بیانی — رباعی شد ز دیوانِ فغانی

اسی طرح سات سال کی عمر میں جو کیفیت تھی وہ بھی ملاحظہ ہو ؎

بہ ہفتم سال چوں بربست ہر ہفت — عنانِ ہوش ہفت انجم ز کف رفت

معنی آفرینی۔ نزاکتِ خیال اور رنگین گفتاری کے ثبوت میں یہی دو شعر کافی ہیں۔ یہ دو شعر دو قصیدوں پر بھاری معلوم ہوتے ہیں۔ تمام انتخاب میں حسن بیان کا یہی عالم جا بجا نظر آتا ہے۔ نہایت افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ زمانے کے شیوۂ کمال ناشناسی نے ایسے گراں مایہ اور نغز گو شاعر کو پردۂ خمول میں رکھا۔ اور سب سے زیادہ ماتم اس بات کا ہے کہ سوائے ان دو تین باتوں کے جو مرحوم نے نظم کردی ہیں اور تفصیلی حالات اس کے وطن مالوف میں بھی کوئی شخص بیان نہیں کرسکتا۔

## مالک نامی گازر کی تعریف

جس نے سسّی کا صندوق دریا سے نکالا اور کھولا۔

زعوّامِ محیطِ خانہ پرداز — بگوشِ من رسید ایں گوہرِ راز
کہ آں صندوق یا آں گوہرِ ناب — چو نزدیک کنار آمد ز گرداب
کنارِ بحر مالک نام گازر — بجذبِ ویشۂ خود بود حاضر
چہ گازر داغ شوئے جامۂ دل — صفا بخش بیاضِ نامۂ دل
چہ گازر صاف مشرب عیسیٰ انفاس — مقیمِ بحر ہمچو خضر و الیاس
چناں استاد بود اندر فنِ آب — کہ مے شستے کلف از روئے مہتاب
اگر بردے بہ صابونِ دست پاک — بشستے رنگِ نیل از روئے افلاک
اگر مے شد بدستِ او حوالہ — فرو شستے سواد از روئے لالہ

دھوبی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ دل کے داغ۔ لالہ کے داغ۔ چاند کے سیاہ دھبے۔ آسمان کا نیلا رنگ دھو ڈالتا تھا تلاش مضمون کی انتہا ہے۔ خیال فرمائیں کہ ایک دھوبی کے متعلق شاعر کا تخیل کہاں کہاں پہنچا ہے۔

## وجہ تسمیہ سسّی اور اس کے حسن کی تعریف

بوقتِ نیک روز بہجت اندوز — سسّی کردند نام آں دل افروز
بلفظِ ہندی اش شد نام مہتاب — ازیں رو نام او سسّی است دریاب
نخستیں سال کرد آں عشوہ پرداز — کتابِ حسن را بسم اللہ آغاز
دو سالہ چوں شد آں آشوبِ آفاق — شرابِ حسن زد جوشش دو بالا
بہ سالِ ثالث آں برقِ زمانہ — شرر زد از ہوالیدسہ گانہ
چہارم سال از رنگیں بیانی — رباعی شد ز دیوانِ فغانی
گذشت از عمرِ او چوں سال پنجم — حواسِ اہلِ دید از دید شد گم
چو شد شش سالہ آں مہ پارۂ حسن — زد اندر شش جہت نقارۂ حسن
بہ ہفتم سال چوں بربست ہر ہفت — عنانِ ہوش ہفت انجم ز کف رفت
بہشت آں گلشنِ حسنِ خداداد — بہشت تازہ گردید بنیاد
چو شد نہ سالہ آں بے باک و گستاخ — فتاد آوازۂ حسنش بہ نہ کاخ
دہم سال آں فریب کج کلاہاں — شدہ عاشورۂ قتل بے گناہاں
چو از دہ سال دیگر رفت بالا — دو ہفتہ ماہ شد آں سرو رعنا

اس کے بعد سراپا لکھا ہے۔ اس کے چند شعر بھی ملحوظ ہوں ؎

بہ فرقِ سر زکلکِ دُر تو شہوار — نمایاں کہکشاں اندر شبِ تار
شب از گیسوے او یک حلقۂ موئے — سوادِ ہند را زو رنگ و بوئے
جبینش بدرِ کامل بے کم و بیش — ہلالِ عید را ابرو جفا کیش
نمود اعجازِ حسن آں فسوں ساز — ہلال و بدر یک جا جلوہ پرداز

زمژگان سیاہے ناوک انداز — خدنگ ناز کردہ گرم پرواز
دو چشمانش دو آہوئے خطائی — دو عالم پر ز شور آشنائی
نگاہ سرمگین سرمہ سایش — بدست حسن شمشیر جفایش
فروغ عارضش روشن تر از ماہ — چو انوار شفق تابان سحرگاہ
نگہ از جلوہ اش بے تاب رفت — زچشم مہر تاباں آب مے رفت
سیہ خال معنبر مشک سا داشت — چو مردم در بیاض چشم جا داشت
بگوش آویزہ ہائے گوش وارہ — چو برگرد قمر چرخ ستارہ
بہ بینی اش دو لولوئے مصفا — دو نقطہ یافت بالائے الف جا

سراپا کا یہی انتخاب کافی ہے۔ اب باغ کے منظر سے منظر نگاری کا اندازہ فرمائیں ؎

قضا را گاہ ذرے افسردہ احوال — بہ اندک مدتے شد صاحب مال
برائے سیر باغے او بنا کرد — ارم بروئے گیتی رونما کرد
بہار افروز باغ دل کشائے — چہ باغ آئینہ جنت نمائے
رقم زد خامۂ نقاش چالاک — بہشتے دل فزا بر صفحۂ خاک
بہر سو لالہ و گل صد چمن جوش — بہر سو چشم نرگس حسرت آغوش
دل افزا سبزہ اش بر گرد ریحان — چو خط سبزہ بر رخسار خوباں
بہر سو قامت آرا سرو آزاد — ہم رنگ قد خوبان پری زاد
گیاہے سبزہ رنگین نو دمیدہ — بہ صحنش فرش سبزہ بر کشیدہ
نسیمے مغز عالم را تواں بخش — چو انفاس مسیحا بود جاں بخش

اس کے اس باغ میں سستی کی سیر و تفریح اور گل گشت کا مذکور ہے ؎

بتے رنگیں ادائے یاسمن فام — در آن گلشن شدے ہر صبح ہر شام
کف پائش چناں رنگیں اثر بود — کز و رنگ حنا خون در جگر بود
امیں او پرستاران گل چہر — ہمہ دل بستہ بر زلفش بہ صد مہر
ہمہ پروانۂ شمع جمالش — ندروان سہی سروان نہالش
ہمہ چوں عندلیبان چمن زار — بہارش را بہ نقد جاں خریدار
بجز ناز و تنعم ہر شب و روز — نبودہ شغل آں ماہ دل افروز
زحسنش رفتہ در عالم فسانہ — خریدارش سلاطین زمانہ
کرداند آں چناں رعنا تذروے — شود آخر اسیر دام سروے

آخری شعر آئندہ واقعات کی بنا پر مربوط کیا گیا ہے۔ اس کے بعد وہی ساقی نامہ ہے ؎

بیا ساقی بیا اے غارت ہوش — بیا اے آہوئے الفت فراموش
بکامم از شراب آرزو خیز — بہ یاد حال مجنوں جرعہ ریز

یہاں بھی آئندہ واقعات کے اشارات دونوں شعروں میں موجود ہیں۔ آہوئے الفت فراموش اور شراب آرزو خیز کی ترکیبیں ربط کلام۔ مناسبت اور مذاق سلیم کا نمایاں ثبوت ہیں۔ دونوں شعر مستغنی عن التوصیف ہیں۔

طول کلام کا خوف دامن گیر تھا۔ اس لئے فنی لحاظ سے میں نے بہت کم لکھا ہے۔ امید ہے۔ کہ اس خوش نوا اور شکر گفتار شاعر کا نام زندہ رکھنے کے لئے یہ مضمون اور یہ انتخاب کلام کافی ثابت ہوگا۔ آخر میں دعا ہے۔ کہ خدا کرے اس مثنوی کے علاوہ منشی مرحوم کا اور کلام بھی جو اس نے زندگی میں کہا ہوگا اور یقیناً کہا ہوگا۔ کسی نہ کسی ذریعہ سے دنیائے ادب کے سامنے آجائے۔ یہ مثنوی تو اسی کے قول کے مطابق صرف ایک مہینے کی فکر سخن کا نتیجہ ہے۔

## غزل

عشرت رحمانی

جفا پرور جو زندان تحمل سے نکل آیا
وہ بدبخت آج ہر قید تغافل سے نکل آیا

خزاں کا سلسلہ کیوں موسم گل سے نکل آیا
کہ اک مجبور آنسو چشم بلبل سے نکل آیا

وہ گیسو کوئی گیسو ہیں جو الجھیں اور سلجھ جائیں
وہ شانہ کوئی شانہ ہے جو کاکل سے نکل آیا

تصور میں نظر آتی ہے اک میت تمنا کی
نتیجہ عشق کا غور و تامل سے نکل آیا

جسے اہل چمن نے آج تک آنکھوں میں رکھا تھا
وہ حسن بے محابا ہر رگ گل سے نکل آیا

خدا شاہد ہے کس کمبخت کو دل کی توقع تھی
مگر دزدیدہ نظروں کے توسل سے نکل آیا

پرستش نے بہت رنگینیاں بھر دیں محبت میں
خدا بن کر کوئی میرے تخیل سے نکل آیا

بہت رنگین تھا دامان گل پر قطرۂ شبنم
مگر اس پر بھی آنسو چشم بلبل سے نکل آیا

مبارک جنبش امواج کو گہوارہ جنبانی
کوئی ڈوبا ہوا ان کے توسل سے نکل آیا

سمایا رنگ و بو بن کر حجاب لالہ و گل میں
کمال حسن عشرتؔ شوق بلبل سے نکل آیا

# عابد زندہ ہے

(اکلوتے بیٹے محمد عابد کی یاد میں جسکا ۶ اگست ۱۹۴۶ء کو ۶ برس کی عمر میں انتقال ہوا)

جسم فانی اور جاں پائندہ ہے[1]
ہے یقیں مجھکو کہ عابد زندہ ہے

زندگی خالق کا ہے فیضِ عمیم
بے طلب سب پر ہے احسانِ عظیم
دے کے لے لینا نہیں کارِ کریم
ہے یقیں مجھکو کہ عابد زندہ ہے

وہ نہیں گیر زندہ جو بخشندہ ہے
وہ جہاں جس میں نہیں ہے غم کا نام
وہ جہاں جس کو بقا ہے و دوام
جس جہاں کا نام ہے دارالسلام
ہے یقیں مجھکو کہ عابد زندہ ہے

اس جہاں میں زندہ و پائندہ ہے
عالمِ ارواح کا پنہاں فلک
جس فلک پر رہتے ہیں حور و ملک
ہم نے دیکھی ہی نہیں جس کی جھلک
ہے یقیں مجھکو کہ عابد زندہ ہے

اس فلک کا اخترِ تابندہ ہے
عین طفلی میں خودی تھی استوار
زندگی کا جذبہ ہے اختیار
اس کو رکھتا تھا ہمیشہ بے قرار
ہے یقیں مجھکو کہ عابد زندہ ہے

تھا وہ یاں جو بندہ وہاں پائندہ ہے
اس جہاں کی مختصر سی زندگی
چھ برس اور چار دن کی زندگی
بن گئی ہے جاودانی زندگی
ہے یقیں مجھکو کہ عابد زندہ ہے

جس سے عمرِ خضر بھی شرمندہ ہے
ہو گیا پورا دلی مقصد وہاں
تھی کشش اسکے لئے بے حد وہاں
ارجمند و ارشد و امجد[2] وہاں
ہے یقیں مجھکو کہ عابد زندہ ہے

ان کے ساتھ اب زندہ و بالندہ ہے
اس کا جی سیرِ جہاں سے بھر گیا
اب وہ سوئے جنت و کوثر گیا
کون کہتا ہے کہ عابد مر گیا
ہے یقیں مجھکو کہ عابد زندہ ہے

مردہ میں ہوں اور عابد زندہ ہے
دل کو ملنے کے یقیں سے ہے سکوں
انا للہ و انا الیہ راجعون
عہدِ رفتہ ہے فسانہ اور فسوں
ہے یقیں مجھ کو کہ عابد زندہ ہے

اب نظر میری سوئے آئندہ ہے

**اسد ملتانی**

[1] جاں نہ گردد گیر زندہ ہو بخشندہ دیگر گیرند ۔ انساں بمیر د از بے یقینی (اقبالؒ)
[2] عابد کے تین مرحوم بھائی

# آخر کار

اک اچٹتی سی نگاہ ڈال کے ماضی کی طرف
جب بھی خوابوں میں خیالات کو الجھاتا ہوں
کوئی چہرہ کوئی خاکہ نہیں ملتا شاداب
ہر حقیقت پہ فسانے کی جلا پاتا ہوں
کہیں ابہام کی الجھن کہیں اوہام کا بوجھ
اپنے اجداد کی میراث پہ شرماتا ہوں

زخم ہی زخم تھے اور کوششِ درماں معدوم
شمعِ تابندہ نہ تھی صحنِ شبستاں کے لئے
ہر تمنا کو کسی غم نے دبا رکھا تھا
شعلۂ رقصاں تھے ہر اک خار و خسِ جاں کیلئے
کہیں کانٹے کہیں زنجیرِ گراں تھی موجود
کوئی منزل کوئی رستہ نہ تھا انساں کے لئے

چاک داماں تھی محبت کی حسیں شہزادی
پس چلمن کہیں لہرائے نہ رنگیں آنچل
دل میں ویرانیٔ صحرا کے سوا کچھ بھی نہ تھا
اشک آنکھوں کے گھروندوں میں پڑے تھے بیکل
گھٹ کے آسائیں مرِیں تنگ سیہ خانوں میں
ہر طرف تیرگی تھی کون جلاتا مشعل؟

اب بھی جانسوزیٔ انساں کا وہی عالم ہے
بارہا میں نے یہ سوچا کہ بغاوت کر دوں
توڑ ڈالوں یہ تراشیدہ صنم رسموں کے
ہر سیہ خانہ میں کرنوں کی حرارت بھر دوں
اک نئے خواب کی تعبیر بتا دوں سب کو
زنگ آلودہ دماغوں کو مصفا کر دوں

آخر کار یہ زنجیرِ گراں ٹوٹ گئی
کہنہ خاکوں کو نئے رنگ میں ڈھالا میں نے
سرد موجوں کو ابھرنے کا اشارہ کر کے
ناؤ کو اک نئے طوفان میں ڈالا میں نے
دے کے زندانِ تمدن کو شعارِ گلشن
زیست کو قیدِ مسلسل سے نکالا میں نے

**احمد ریاض**





# امن و عافیت کی اپیل

"ہم حد درجہ اظہارِ افسوس کرتے ہیں قانون شکنی اور ہنگامہ پروری کے ان موجودہ حادثات پر جو ہندوستان کی بے داغ پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ثابت ہوئے، نیز بے گناہ اور معصوم لوگوں کے لئے مصیبت کا باعث بنے، قطع نظر اس سے کہ ان میں ظالم کون تھا اور مظلوم کون۔

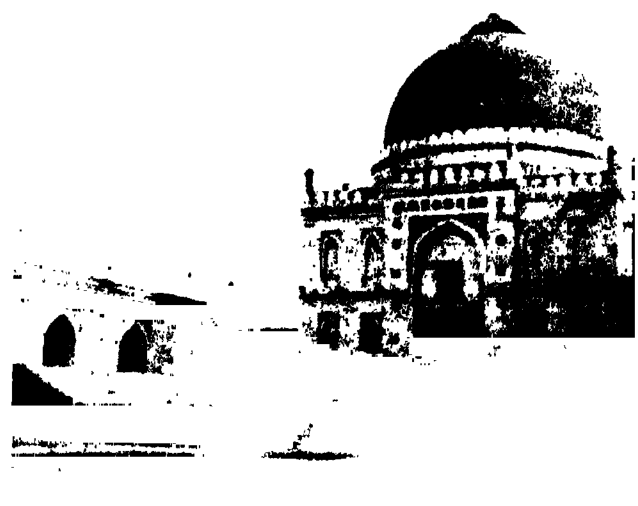
ہم سیاسی اغراض کے حصول میں طاقت کے استعمال کو ہر حالت میں برا سمجھتے ہیں۔ اور ہندوستان کے تمام فرقوں سے خواہ وہ کسی عقیدے کے حامی ہوں، اپیل کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف ہنگامہ پروری اور قانون شکنی کے افعال سے انحراف کریں بلکہ تقریر و تحریر میں ان تمام اشتعال انگیز باتوں سے جو ان افعال کا سبب بن سکتی ہوں، احتراز کریں۔"

محمد علی جناح　　۱۵/اپریل ۱۹۴۷ء　　موہن داس کرم چند گاندھی









## سلاطین لودھی کے مقبرے

دھلی کے پرانے قلعہ سے تقریباً دو میل جنوب مغرب میں یا صفدر جنگ سے تقریباً پانچ فرلانگ مشرق میں اس سڑک کے کنارے جو نظام الدین جاتی ہے ایک قدیم بستی خیر پور کہلاتی تھی۔ اب سرکاری کوارٹر وغیرہ بننے کے باعث اسکے نشانات مٹ چلے ہیں۔ اسی بستی کے قریب ۲۶۳ فٹ مربع فصیل نما چار دیواری کے اندر جسے احاطہ اسلام شاہ کہتے ہیں' ایک مسجد اور تین مقبرے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جو چوکور وضع کا ہے' نظام شاہ سکندر لودھی کا مقبرہ ہے جسنے ۱۴۸۸ع سے ۱۵۱۷ع تک حکومت کی۔ اگرچہ اس کا انتقال آگرہ میں ہوا تھا مگر اسکی لاش یہیں لا کر دفن کی گئی اور مقبرہ اسکے بیٹے ابراھیم لودھی نے بنوایا۔ دوسرا مقبرہ جو ہشت پہل ہے سکندر لودھی کے باپ بہلول لودھی کا بنایا جاتا ہے۔ لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ خاندان سادات کے تیسرے بادشاہ محمد شاہ کا مقبرہ ہے اور بہلول لودھی روشن چراغ دھلی میں دفن ہے۔ تیسرے مقبرے میں غالباً خیرپور کے اس رئیس کا مزار ہے جس کے نام پر بستی آباد کی گئی تھی۔ اسکی بنائی ہوئی مسجد بھی موجود ہے جس کے بام و در اور گنبد دیکھکر گمان

[illegible]

# تیراکی کے کھیل



طہران کی «امجدیہ» نامی ورزشگاہ میں فن تیراکی سیکھنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے ایک حوض صرف بچوں کیلئے مخصوص ہے باقی دو حوضوں میں جو نسبتاً زیادہ گہرے ہیں بڑی عمر کے لوگ اتر سکتے ہیں۔ تیراکی کا فن سکھانے کیلئے اعلی ہنر مند ملازم ہیں۔ یہ کھیل دلچسپ ہونے کے علاوہ صحت کے نقطہ نظر سے بھی مفید ہے۔ امجدیہ اسکول کے تمام طالبا اسمیں ذوق و شوق سے حصہ لیتے ہیں کبھی کبھی ان میں مقابلے بھی ہوتے ہیں۔

حوض اسکا پانی اور چاروں طرف کھڑے ہونے کے چبوتروں کو خاص اہتمام کے ساتھ صاف ستھرا رکھا جاتا ہے تاکہ ماحول صحت بخش رہے۔

☆

اونچائی سے کودنے کی تین منزلیں۔ آخری منزل سے کودنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔

☆

تین کم سن لڑکیاں اپنے استاد کی مدد سے تیرنا سیکھ رہی ہیں۔



# فلائی کا مہ

مصر کے عہد قد

کا

ایک عجوبہ



آئسس دیوی کے مندر کی
تصویر جو جزیرۂ فلائی کے
سرے سے لی گئی ہے۔ پس
میں باب ہیکل ہے اور سام
غلام گردش جہاں سے ہوکر ا
پہنچتے تھے۔

«کوشک فرعون»۔ یہ تصویر مندر سے لی گئی ہے۔ پس
کی پہاڑی پر دریائے نیل کے سالانہ سیلاب کے نشانات نظ
ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ پانی کسقدر چڑھ جاتا ہے

اور فلائی مندر کا ایک نظارہ جو دریائے نیل کے مشرقی ساحل
کیا ہے۔ خوبصورت و مستحکم عمارتیں مصر کے عہد قدیم
مت و شان اور اسکی ثقافتی کی روایات حامل ہیں۔







فلاٹی نامی مندر کا ایک نظارہ جو مصر کے عہد قدیم میں بہت مشہور تھا۔ دیوار پر بنے ہوئے نقوش میں بطلیموس دیوتاؤں کے حضور میں دکھایا گیا ہے۔

فلائی کی دریائے نیل کے کنارے ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے ۔ یہ ان مندروں کی وجہ سے مشہور ہے جو بطلیموس اور بعد میں حکومت کرنے والے خاندان کے بادشاہوں نے بنوائے تھے۔ ان عمارتوں کو دیکھکر اس عظمت و شان کا اندازہ ہوتاہے جو بطلیموسی عہد میں فراعنہ مصر کو حاصل تھی۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور آکسس دیوی کا مندر جو نخت سفر نے بنوایا تھا ۔ یہ مصری النسل بادشاہوں میں سے آخری بادشاہ تھا جس نے چوتھی صدی

قبل مسیح مین حکومت کی ۔ مندر کے بہت بڑے
کو نیل کے سالانہ سیلابوں نے تباہ کردیاہے ۔ چھ
عیسوی کے وسط میں بت پرستی سارے مصر میں مم
دیدی گئی مندروں کے دروازے بند کردئے
قسطنطنیہ پہنچادئے گئے۔ اس وقت اس کوشک فر
کھنڈر سب سے زیادہ دلکش ہین جو تراجان م
تکمیل رہ گیا تھا ۔

# لیوانت

## مشرق و مغرب کا سنگم

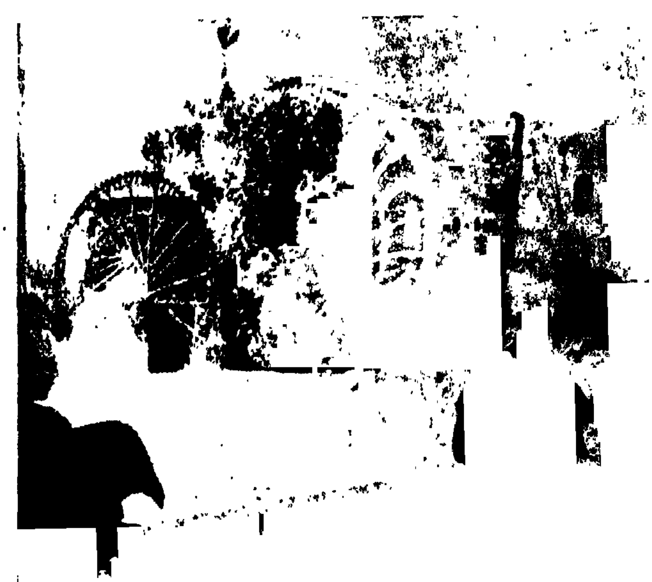
ریاست‌ہائے لیوانت جن میں سے شام و لبنان خاص طور پر قابل ذکر ہیں کسی زمانے میں مشرق و مغرب کا سب سے اہم سنگم تھیں۔ اگرچہ امتداد زمانہ کے ہاتھوں شہروں کی اصل شان برقرار نہیں رہی تاہم پرانے نقوش جن پر مغربی اثرات حاوی ہو چلے ہیں اپنی جھلک دکھاتے نظر آتے ہیں- پرانے زمانہ کے کھنڈر اور نئے زمانے کی عمارتیں قدیم و جدید حسن تضاد پیش کرتی ہیں- اس سلسلے میں دمشق کو سب سے بڑا مرتبہ حاصل ہے- اگرچہ بعض لوگ بیروت کو ترجیح دیتے ہیں- شاید اسلئے کہ وہ ساحل سمندر سے قریب ہونے کے باعث زیادہ دلکش مناظر کا حامل ہے- تاہم دمشق کی سی بات کہاں- شام کے کھنڈرون مین سب سے زیادہ دلچسپ بعلبك کے آثار ہین جو کسی زمانے میں «بعل» یعنی سورج دیوتا کی پرستش کا مرکز تھا- تاریخی اور تعمیری اعتبار سے وہ یونانی و لاطینی نقوش کا حامل ہے۔ پہلی صدی عیسوی میں وہ رومن مقبوضات مین شامل تھا-



«عالی» کا ایک بازار - شام اور لبنان کی سرحدوں پر یہ شہر موسم گرما کا یک اچھا فرحت بخش مقام ہے



سر زمین لبنان کے مخصوص خدوخال کا حامل یہ دیہاتی اپنے [illegible] دوست اور مددگار خچر کے ساتھ کیسا خوش نظر آرہا ہے



لیوانت کے شہر «حما» کی ایک جھلک- ایرانی وضع کا یہ بھاری بھرکم رہٹ گذشتہ سو سال سے آبیاری کی

# کانسی کی مورتیں

کانسی کے بنے ہوئے ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کے مجسمے جنوبی ہند کے قدیم مندروں میں عام طور پر نظر آتے ہیں - انہیں دیکھکر انکی مختلف شکلوں اور کیفیتوں کا بھی پتہ لگایا جاسکتا ہے -

ان مورتوں سے یہ بھی اندازہ ہوسکتا کہ وہ فنی اعتبار سے کتنی اعلی. دلکش اور متناسب ہیں

شیو دیوتا نٹ راج کے روپ میں . اسطرح رقاص کے انداز میں کھڑے ہوناشیوکا ایک خاص روپ ہے جسے تھانڈو کہتے ہیں - وہ اپنے پاوں سے اگیان دیو کو کچل رہے ہیں تاکہ دنیا سے جہالت کی تاریکی دور ہوجائے

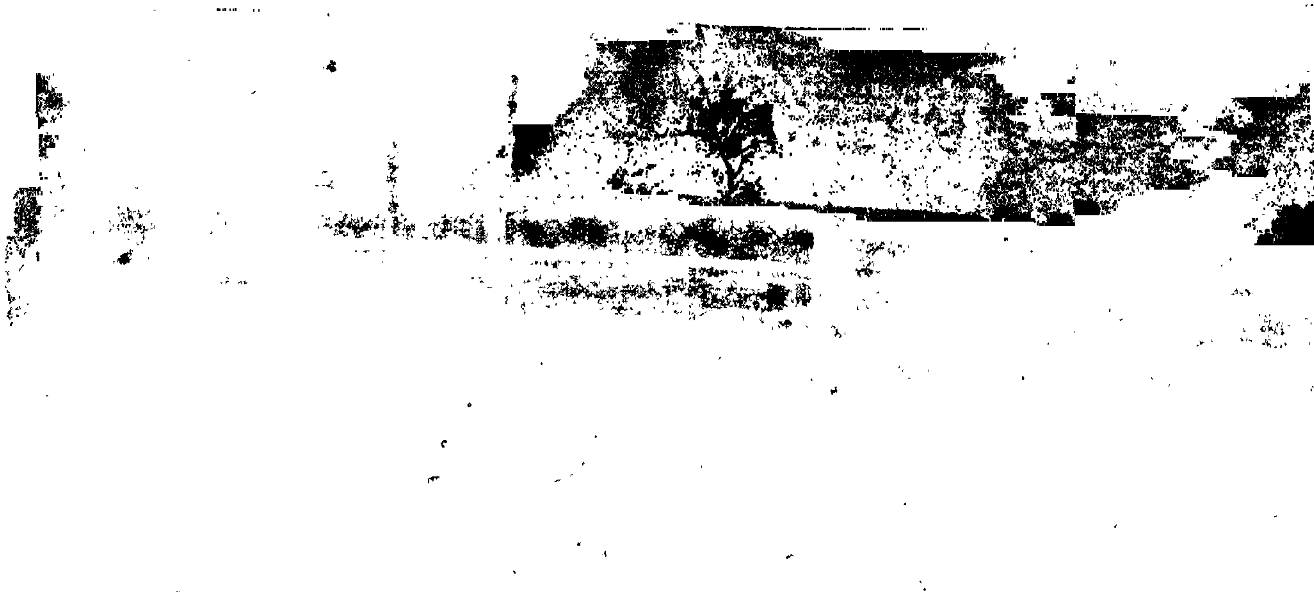


بدھ مت کے بانی مہاتما گوتم بدھ خاص انداز میں بیٹھے اپنے دو چیلوں کو سبق دے رہے ہیں





کا ایک اور روپ شنکر بھگوان کی حیثیت سے .
پاربتی دیوی قریب بیٹھی ہیں



نئی ریل کا خوبصورت انجن

# نئی ریلیں

جنگ ختم ہوتے ہی زندگی کو زیادہ پرسکون بنانے کی جو کوششیں شروع ہو ئیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ریل کے سفر کو مسافروں کیلئے زیادہ سے زیادہ آرام دہ بنایا جائے اسی خیال کے ماتحت اب نئی طرح کی ریلیں بنائی جارہی ہیں ۔

نئی ریل میں تیسرے درجہ کا ڈبہ



سکنڈ کلاس کا ڈبہ



## غزل — جلیل قدوائی

عاشق وہ کیا جو دل سے کسی کے اتر گیا
جیتا بھی گر رہا تو یہ سمجھو کہ مر گیا

رنجش ذرا سی ان سے ہوئی تھی جو شام کو
اس کا اثر نہ دل سے مرے تا سحر گیا

پھر جب انہوں نے صبح کو خود ہی منا لیا
اک بار سا تھا دل پہ مرے سو اتر گیا

دیوانگانِ عشق کا اللہ رے مزاج
معشوق سے بھی تن کے ملے گرچہ سر گیا

بجلی سی اک چمک کے مرے دل پہ گر پڑی
پہلو سے شب جو اٹھ کے وہ زریں کمر گیا

کرنے چلے تھے عشق میں میرا مقابلہ
وہ روز ہی میں پھول سا چہرہ اتر گیا

جانے کی میں نے ان کو اجازت تو دی مگر
میں کیا بتاؤں دل پہ جو عالم گذر گیا

اس دشمنِ وفا سے بھلا کب تھی یہ امید
دل ہی تو ہے نوازشِ پیہم سے ڈر گیا

ناگفتنی تو شیخ کی حالت ضرور تھی
صحبت میں میکشوں کے جو بیٹھا سدھر گیا

ایسا کچھ انقلاب زمانہ ہوا جلیل
شیرازۂ حیات ہی سارا بکھر گیا!

## فریب — سلامت اللہ خاں

اپنے جذباتِ محبت کو کچلنے کے لئے
آج تک تم سے گریزاں ہی رہا

یہ سمجھتا تھا کہ طوفاں ہے گذر جائے گا
اور گذر جانے پہ کیا لوٹ کے پھر آئے گا
تیرے کمہلائے سے چہرے کی ادا میرے لئے
میں یہ سمجھا تھا ہے سیلابِ بلا میرے لئے
تیری آنکھوں نے دیا تھا کوئی پیغام مجھے
یاد ہے اب بھی وہ افسردہ حسیں شام مجھے
اب بھی بہکی ہوئی ہر سو ہے گلستاں کی ہوا
آج بھی تازہ ہے دل میں ترا پیمانِ وفا
جھانکتا ہے کوئی افلاک کے ایوانوں سے
اب بھی چھپ چھپ کے کوئی دیتا ہے آواز مجھے
اب بھی بھولے ہوئے افسانوں کی یاد آتی ہے
رات یہ اور بھی تاریک ہوئی جاتی ہے
سوگ میں اب بھی ہے ڈوبی ہوئی مغموم فضا
یہ سبھی کچھ ہے، صحیح ہے، مگر اے جانِ وفا
یہ سمجھتا ہوں کہ طوفاں ہے گذر جائے گا
اور گذر جانے پہ کیا لوٹ کے پھر آئے گا؟

آج بھی تم سے گریزاں ہوں میں
اپنے جذباتِ محبت کو کچلنے کیلئے

## غزل — ضیا فتح آبادی

ہر بہار و ہر خزاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں
انقلابِ گلستاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

گھر کے آتا ہے، برستا ہے، چلا جاتا ہے ابر
اور بیرونِ آسماں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

واقفِ آغاز بھی ہوں، محرمِ انجام بھی
بجلیوں میں آشیاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

میری پروازِ تخیل نے ابھی وسعت طلب
تنگیٔ کون و مکاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

راہِ منزل اور منزل، ایک دھوکا، اک فریب
ذوقِ سعیِ رائیگاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

چھوڑ آیا ہوں حدِ سود و زیاں کو دور اب
حاصلِ سود و زیاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

اُف مری مجبوریاں، محرومیاں، لاچاریاں
حادثاتِ ناگہاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

اے ضیا تیری متاعِ فکر کا قائل نہیں
حسنِ اندازِ بیاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

[redacted]



# براعظم امریکہ کی تحقیق

بیگم حسن آرا

تاریخ کی ورق گردانی سے یہ امر واضح طور پر نمایاں ہوتا ہے کہ سلطنت برطانیہ کی وسعت کے لئے گذشتہ چند صدیوں سے ان تھک کوششیں کیجا رہی ہیں۔

اس سلسلہ میں بہت سی ہستیاں قابلِ ذکر ہیں۔ مگر ہزار افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے اکثر کے کارنامے ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ دنیا صرف ان چند ہستیوں سے متعارف ہے جنہوں نے دوسروں کے رکھے ہوئے سنگِ بنیاد پر عمارت کی تکمیل کی ہے۔ اول الذکر جماعت کے جن ہزاروں افراد کے متعلق دنیا کچھ بھی نہیں جانتی ان میں سے ایک جان کیبٹ کی نہ فنا ہونے والی ہستی ہے۔ جس کے کارناموں کی تفصیل ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے۔ دنیا یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ براعظم امریکہ کے دریافت سے قبل کیا حیثیت رکھتا تھا نیز اس عظیم الشان کارنامہ کے بعد اس کا کیا حشر ہوا۔

۱۴۸۵ء میں رچرڈ سوئم کے مقابلہ میں فتح حاصل کرکے ہنری ہفتم نے برطانیہ کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس نے تقریباً ایک صدی کی خانہ جنگیوں اور فسادات کے بعد ملک میں امن و امان قائم کرکے ایک مستحکم حکومت کی بنیاد ڈالی۔ وہ شروع سے ہی اس امر کا کوشاں رہا کہ انگریزی تجارت کو ہر ممکن صورت سے فروغ دیا جائے۔ اس کا نظریہ تھا "تجارت کی ترقی سے ملک میں بہتر ملاحوں کی کافی تعداد ہو سکتی ہے۔ نیز آئے دن کی ضروریات کے مطابق تجارتی اور جنگی جہازوں میں جدید تبدیلیاں بھی کی جا سکتی ہیں۔ اور ان صورتِ حالات میں قومی محاذ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو سکتا ہے۔" انگریزی ملاحوں نے قرب و جوار کے سمندروں میں بادشاہ کی مدد سے اپنی جہازرانی کے جوہر دکھائے اس لئے کہ بادشاہ اس قسم کی ہر مہم پر زیادہ سے زیادہ دولت خرچ کرنے کو ہر وقت تیار رہتا تھا۔

اسی زمانہ میں جان کیبٹ نامی اطالوی ملاح برسٹل کے شہر میں اپنے خاندان کے ساتھ پُرسکون زندگی بسر کرتا تھا مسلسل کئی سال تک بحیرۂ قلزم کے ساحلی ممالک میں بغرضِ تجارت جاتا رہا تھا۔ اس نے عربوں کی زبانی سنا تھا کہ مشرقِ بعید میں چین اور جاپان دو ملک ہیں جو اپنی دولت صنعت و حرفت کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔

کولمبس کی طرح کیبٹ کا بھی خیال تھا کہ اگر یورپ سے مغرب کی جانب سفر کیا جائے تو کچھ عرصے کے بعد ایشیا کے مشرقی ساحل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اتفاقاً ۱۴۹۶ء میں بادشاہ برسٹل گیا۔ کیبٹ کو اچھا موقع ہاتھ آیا اور اس نے اپنی تجاویز ہینری کے سامنے پیش کیں۔ بادشاہ نے بخوشی اس کو نئے ملک دریافت کرنے کے لئے اجازت اور شاہی فرمان عطا فرما کر ہمت افزائی کی۔ ان دنوں برطانیہ کے لوگ دور دراز کے سفر کرنے کے عادی نہ تھے۔ نیز ان کو غیر ممالک سے تجارت کرنے میں ابھی زیادہ مہارت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے بہ ہزار دقت کیبٹ ایک جہاز حاصل کر سکا جس پر صرف اٹھارہ ملاح تھے مئی ۱۴۹۷ء میں برسٹل کی بندرگاہ سے اپنے مغربی سفر پر روانہ ہو گیا۔ تقریباً چھ ہفتے کے سفر کے بعد اس کو زمین کے آثار نظر آئے۔ نئی دنیا کے ساحل پر پہنچ کر کیبٹ نے اپنے مذہبی اصولوں کے مطابق خداوندِ عالم کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے اس سرزمین پر کئی ہفتے قیام کیا مگر وہ کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔

انگلستان واپس آکر اس نے جو بیان دیا اس سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ "اس سرزمین کی آب و ہوا برطانیہ کی آب و ہوا سے ملتی جلتی ہے نیز جنگلات کی کثرت ہے انسانی بود و باش کے آثار ضرور پائے جاتے ہیں مگر کوئی ذی روح نظر سے نہیں گزرا" کیبٹ نے ساحل کے قریب کچھ ہڈیوں کے اوزار بھی پائے جو پرانے زمانے میں وحشی ماہی گیر استعمال کیا کرتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایشیا کے مشرقی ساحل تک پہنچ گیا ہے۔ مگر حقیقت میں اس نے نئی دنیا دریافت کرلی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کولمبس صرف مغربی الجزائر تک پہنچ سکا تھا۔ خوراک کی کمی نے کیبٹ کو جلدی واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔

اس نے لندن پہنچ کر اپنے سفر کی تفصیلات پیش کیں۔ لوگ جوق جوق اس کی جانب آتے رہے اور جلدی ایک دوسرے سفر کی تیاریاں ہو گئیں۔ انگریزی تاجروں کا خیال تھا کہ وہ ایشیا کے ملکوں سے بے روک ٹوک تجارت کر سکیں گے۔ اور جلد ہی مالا مال ہو جائیں گے۔ مگر دنیا اور خود کیبٹ یہ نہ جانتا تھا کہ وہ انگریزوں کے لئے چین اور جاپان سے بھی زیادہ بہتر سرزمین دریافت کر چکا ہے۔ بہرحال مئی ۱۴۹۸ء میں بڑے اہتمام کے ساتھ سامان تجارت سے لدے ہوئے جہاز مغرب کی جانب روانہ ہوئے نہیں کہا جا سکتا کہ اس مہم کا کیا حشر ہوا۔ کیونکہ کیبٹ یا اس کے جہاز کبھی انگلستان واپس نہ آئے۔ ساتھ ہی یہ بھی یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پارٹی ایشیا کے ساحل تک نہیں پہنچ سکی۔ مگر اتنا ضرور ماننا پڑتا ہے کہ کیبٹ کی اس مہم سے نئی دنیا کا بھید یا راستہ دریافت کر لیا گیا۔

کچھ عرصہ کے لئے جان کیبٹ کو دنیا نے بالکل فراموش کر دیا مگر شمالی امریکہ کی دریافت کے سلسلے میں اس کی یاد تازہ ہو گئی اور آج تمام مورخین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ جان کیبٹ دنیا کا پہلا شخص تھا جو براعظم امریکہ کے ساحل تک پندرھویں صدی میں سب سے پہلے پہنچا۔

# قاضی نذرالاسلام کی رومانی شاعری

اب تک ہندوستان کے آتش نوا شاعر قاضی نذرالاسلام کی جتنی نظمیں اردو ادب میں منتقل ہوئی ہیں وہ اپنی شعلہ پروری اور حریت آموزی کی وجہ سے انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہندوستان کے کسی شاعر نے آج تک نذرالاسلام جیسی باغیانہ اور انقلابی نظمیں نہیں کہی ہیں۔ لیکن اگر اس کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت نمایاں ہو جائے گی کہ جہاں اس کے خیالات کی رفعتوں میں صدیوں کی غلامی میں تڑپتے ہوئے سسکتے ہوئے اور کراہتے ہوئے اپاہج انسان اشک فشاں ہیں وہاں رومان اور محبت کا حسین جل ترنگ بھی پرجوش رہا ہے۔ اس کی شاعری میں شعلہ و شبنم کا امتزاج اتنا گہرا اور من موہ لینے والا ہے کہ اس کی نظمیں پڑھنے کے بعد ہماری رگوں میں بھی جلال و جمال کی نہریں بہنے لگتی ہیں اور ہم احساس کے اس مینارۂ روشنی پر جا پہونچتے ہیں جہاں بغاوت بھی ہے اور مست آگیں فضا بھی، جہاں انگارے بھی ہیں اور پھلجھڑیاں بھی۔ شاعری کا اتنا حسین امتزاج معدودے چند شاعروں میں نظر آتا ہے۔ اردو شعرا میں جوش ملیح آبادی اور اسرارالحق مجاز پیش پیش ہیں، ان کی نظموں میں بھی اگر ایک طرف بغاوت و سرکشی کی گونج پوشیدہ ہے تو دوسری طرف بیک دبجل گیت بھی ہماری روحوں میں وجدانی کیفیت طاری کر رہے ہیں۔

نذرالاسلام کے حالات زندگی کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نقطۂ نظر تک پہونچتے ہیں کہ اس کی رومانی شاعری کے آغاز کی محرک خود اس کی رومانی زندگی ہے اور یہ حقیقت تو سب پر روشن ہے کہ کس طرح ایک بنگالی ساحرہ شاعر کی زندگی پر برق و باد بن کر آئی لیکن ساتھ ہی ہمیں حیرت بھی ہوتی ہے کہ اس رومان کے ساتھ ساتھ اس نے آتشیں نظمیں کس طرح قلم بند کیں اور اپنے رنگین الفاظ میں شعلے کیسے بھر دئے۔

بنگال کے تمام شاعروں کو خواہ وہ انقلاب کے نعرے لگائیں یا بغاوت کا راگ گائیں انہیں محبت جیسے لطیف جذبہ سے نجات نہیں مل سکتی۔ کیونکہ بنگال کی اودی اودی گھٹائیں، نوخیز اور شرربار جوانیاں ان کے گنبد خیالات پر برابر چھائی رہتی ہیں بنگال کی فطرت ہی کچھ ایسی سحرزا اور طرب ناک واقع ہوئی ہے کہ ہر ہر قدم پر نیا رومان نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہمارا شاعر بھی مجبور ہو گیا کہ اپنی آتش نوائی سے تھوڑی دیر کنارہ کش ہو کر برہا کے راگ الاپے، کاجل بھری نینوں کا گیت گائے، چنچل اور مخمور جوانی کو دیکھکر جھوم اٹھے ——— ٹیگور کے مست آگیں گیت بھی بنگال کی حسین فضا کے مرہون منت ہیں۔

نذرالاسلام نے بنگال کی ڈبڈبائی ہوئی ندیوں میں رومان دیکھا، اس نے دیکھا یہاں کا ذرہ ذرہ زندگی میں امرت ٹپکاتا ہے۔ ناممکن تھا کہ وہ یہاں کی سحر آفرینی سے کترا جاتا۔ چنانچہ ایک نظم میں اپنی بے قراری اور بے چینی کا اظہار اس طرح کرتا ہے ؎

اور کتنے دن رنگین دل کے اندر دل کی بات ٭ کیا گذر جائیگی یونہی زندگی کی گرم رات
کب تپلے ہونٹ پر ناچ کی رنگین تان
جھوم جھوم اٹھینگے جیسے سنکر زمین و آسمان!
کب تمہاری دھکتی نینوں کے شیریں مزے
شرم کا پھول بن کر کھل اٹھیں گے میری زندگی کے سوز کر

یہ نظم بہت طویل ہے میں نے نمونتاً صرف تین اشعار پیش کئے ہیں ان ہی تین اشعار سے شاعر کی رومانی بے تابی کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ کس طرح اپنی ملکۂ دل سے اس بات کی بھیک مانگ رہا ہے کہ وہ ایک دفعہ اپنے دل کی چھپی ہوئی کہانی اس کے سامنے بیان کر دے۔ اس کی تمنا کتنی یاس آگیں اور درد افزا ہے۔

ایک دوسری نظم "ازلی محبوبہ" میں اپنے لازوال خیالات اس طرح پیش کرتا ہے :- ؎

بجھ نہ جائے بیقراری میں تخیل کا چراغ ٭ اور کتنے دن تمہاری یاد میں رویا کروں
دیکھ سکتی ہو فلک پر میرے اشکوں کی قطار ٭ کب تلک اشکوں سے اپنا باغ دل صحرا کروں
میری شمع زندگی بجھتی رہی ہے بار بار ٭ آنکھ کی پلکیں تمہاری دید میں ہیں بیقرار

مذکورہ بالا اشعار میں شاعر کا تخیل آسمان کی لامحدود وسعتوں میں پرواز کر رہا ہے۔ ان اشعار میں کتنی تڑپ ہے، کتنا ہیجان ہے اور کتنی اضطراری کیفیت ہے۔ وہ اپنی رانی کو صرف ایک نظر دیکھنے کا متمنی ہے۔ مگر اس یاس و ناامیدی کے گھنگھور بادلوں کے اندر بھی روشنی کی ایک کرن پاتا ہے اور اس کی آس بندھ جاتی ہے کہ اس کی یہ بیقراریاں چند روزہ ہیں۔ ؎

آہ لیکن یک بیک آکاش میں پھوٹی کرن ٭ جگمگا اٹھا تاروں کا اندھیرا کارواں
میں نے دیکھے مسکراتے ہونٹ میں لعل و گہر ٭ اور آنکھوں میں مسرت کی دمکتی کہکشاں
تم نے ہاتھوں کے اشارے سے بلایا اپنے پاس ٭ اور یوں گویا ہوئیں "اے میرے دل کے رازداں"

پھر شاعر التجا آمیز الفاظ سے یوں مخاطب ہوتا ہے ؎

لکھتے لکھتے رات کو رک جائے گر میرا قلم
"میں تمہارے پاس ہوں" کہدینا مجھ سے میری جان

آخری شعر میں کتنے ولولے اور کتنی تمنائیں پرورش پا رہی ہیں۔ وہ اپنی محبوبہ کی قربت سے اپنے بوجھل دماغ کے اندر بھی ایک قسم کی طمانیت اور فرحت محسوس کرتا ہے۔ اسکا تبسم اسکے لئے امرت سے کم نہیں اسکی پلکوں کی جنبشیں اسے نئی زندگی سے ہم کنار کرتی ہیں۔

اس کے ایک مختصر مگر کرب انگیز گیت "وداع" کے چند بول سنئے ؎

اے میری تمنا کی رانی ٭ میں ہار چکا ہوں بازی اپنی
وہ دیکھو سنہرے رتھ پر کیا ہے ٭ ہر رنگ کا آنچل اڑتا ہے
آنچل ہے شباب رنگیں کا ٭ یا عکس ہے ماہ دیروز کا
تم جیت کے بازی روتی ہو ٭ یوں مفت میں جیون کھوتی ہو

الوداعی گھڑیاں کسقدر روح فرسا اور دردناک ہوتی ہیں۔ اسکا اندازہ وہی

محمد یونس احمر

لئے گئے ہیں جن کی زندگی پیلے لمحات سے خالی نہیں ہے۔ شاعر بھی اپنے مخصوص انداز میں ورانی بکھری کی اندوہناک تصویرکشی کرتا ہے۔ اس گیت کا ایک ایک لفظ آنکھوں کی لڑیوں اور آہوں کی تیخ نوائیوں سے پرو دیا ہوا ہے

آنکھوں میں اشک زندگی ٭ روشن ستاروں کی طرح
جھلمل کرے کیوں بار بار
ٹوٹا ہوا ہے دل مرا! ٭ گاؤ نہیں بہرِ خدا!
نغمے جدائی کے ابھی!
تم نے گذاری زندگی ٭ ہنس ہنس کے مثلِ چاندنی
ہنسنا پڑے گا آج بھی
وقتِ جدائی ہے تو کیا ٭ روؤ نہیں بہرِ خدا
روؤ نہیں بہرِ خدا!

نذرالاسلام کی رومانی شاعری میں زندگی اور امید کی جھلکیاں پیش پیش رہتی ہیں۔ وہ ناامید ہو کر بھی اس کا دامن نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ وہ اپنے آنسوؤں کے گرم گرم قطروں کے اندر بھی مستقبل کی امیدیں دیکھتا ہے۔ وہ شدتِ درد سے بے قرار ہوتا ہے لیکن اس کی اس بے قراری اور درد میں خاص لذت ہے۔ اس کی نظم "امید" کے چند شعر سنئے:-

آکاش کے رنگیں دامن میں ٭ یا غنچہ و گل کے دامن میں
پھر آنکھ لڑے گی ممکن ہے!
تخیل کے چنچل جھرنوں میں ٭ یا چاندنی سیمیں کرنوں میں
پھر آنکھ لڑے گی ممکن ہے!
لائی ہے پیامِ دل افزا ٭ یہ مست ہوا اور شوخ ہوا
پھر آنکھ لڑے گی ممکن ہے!

جب محبت کرنے والوں کے مکانوں کے درمیان دریا حائل ہو جاتا ہے اس وقت دونوں کے مضطرب دلوں کے اندر ملاقات کی کتنی امیدیں کسماتی ہیں کتنے ارمان سینے میں گھٹ گھٹ کر مر جاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے ؎

ہے بیچ میں دریا اسے رانی پھر دل کا فسانہ کیا چھیڑوں
اُس پار تمہاری کٹیا ہے اِس پار ترانہ کیا چھیڑوں
ممکن ہو اگر تو جانِ تمنا ہاتھ ہوا میں لہرا دو!
جو ایک نظر کا طالب ہے تم اس کی طبیعت بہلا دو!

اندھیری رات کے گہرے سناٹے میں جب شاعر کے بحرِ تخیل کی خاموش موجوں پر کسی کی یاد کا سنگ ریزہ گرتا ہے اس کا دل فوراً ڈوبنے لگتا ہے اور آنکھیں ساون بھادوں بن جاتی ہیں۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ ماضی کی یہ المناک داستان پھر اس کی ویران زندگی میں زلزلہ نہ بن جائے۔ چنانچہ اسی کیفیت کے ماتحت وہ کہتا ہے ؎

بیکراں رات کے سناٹے میں ٭ جھلملاتے ہیں آنکھوں میں تارے

کس کا بھولا خیال آتا ہے ٭ کون دیتی ہے دل میں انگارے
خود فسردہ ہے زندگی میری ٭ نصف شب میں خیال کیوں آئے
جسکی یادوں کا بجھ گیا ہے چراغ ٭ وہ پری وش جمال کیوں آئے
کل بھی ایسا خیال آیا تھا ٭ کل بھی آنکھیں بنی تھیں میخانہ
کل بھی دل میں تھا آگ کا شعلہ
کل بھی شمع تھی اور پروانہ

نذرالاسلام ایسا شاعر ہے جو بیک وقت انگاروں سے کھیلتا ہے اور پھولوں کو چومتا ہے۔ کبھی آنکھوں میں انقلاب کی چنگاریاں دوڑتی ہیں کبھی ان میں جوانی کا نقش جاگتا ہے۔ وہ چنگھاڑتا بھی ہے مسکراتا بھی ہے۔ اسکی رگوں میں حدتِ جلال بھی ہے اور حدتِ جمال بھی۔ وہ جب بے چین ہوتا ہے تو بانسری کی مدھر تان میں اپنے کو گم کر دیتا ہے، بپھرتا ہے تو طوفان اور بجلیوں کا رقیب بن جاتا ہے۔ اس کے خیالوں کی وسعتوں میں بنگال کی مست آگیں فطرت مسکراتی ہے۔ یہاں کی بل کھاتی ہوئی ندیاں اور جھومتی ہوئی کالی گھٹائیں اس کی نظمیں ہیں۔ وہ زندگی کے نغمے الاپتا ہے لیکن موت سے کھیلنا بھی اسکا کام ہے۔

"پجارن" میں اس کے خیالات کی بلند پروازی ملاحظہ کیجئے:-

عہدِ ماضی کی اندھیری راہ سے ——— آگئیں؟
سُن چکا ہوں میں تمہارے زمزمے ——— نازنیں!
یہ حسیں نغمہ، یہ آوازوں کا لوچ ——— بے کراں
مست آنکھوں میں جوانی کی شراب ——— الاماں!
یہ تبسم، یہ ادائے دل بری ——— کیا کہوں
جانتا ہوں، جانتا ہوں میں تمہیں
اس لئے راحتِ جانِ حیات ٭ میں تمہیں بھولا نہیں!
کتنی مدت سے تمہاری چاہ میں ٭ داغِ دل دھویا نہیں!
دے رہا ہوں میں تمہیں آواز کیوں ٭ جانتی ہو نازنیں؟
تم ہو میری، میں تمہاری زندگی ٭ اے نگاہِ سرمگیں!

نذرالاسلام کی رومانی نظموں میں جذباتی تڑپ کا فقدان نہیں۔ وہ جذبات کے رواں دواں دھاروں ہی پر اپنے تخیل کی عکاسی کرتا ہے۔ اسکا یہ جذباتی ہیجان وقتی نہیں بلکہ دل میں نقش کا مجسم بن جاتا ہے جس طرح اردو شاعری کے اندر عشق کی پاکیزہ وحدانیت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح بنگالی شاعری میں نذرالاسلام کا ہر شعر اس وصف سے مرصع ہے۔ وہ جب ہجر کا راگ الاپنے بیٹھتا ہے تو اسی میں گم ہو جاتا ہے اور جب اس کی مشتاق نگاہیں اپنے سامنے محبوبہ کی جھلک دیکھتی ہیں تو ان میں مسرت کے آنسو امنڈ آتے ہیں۔

نذرالاسلام کی رومانی نظموں میں موسیقی اور سنگیت کا ایسا آہنگ ہے جو پڑھنے والے کی روحوں کو اپنے اندر بہائے جاتا ہے چونکہ وہ فطرتاً موسیقار ہے اور ہزاروں سروں کا موجد اس لئے اس کے گیتوں اور (باقی صفحہ ۵۱ پر)

# فرزانہ

ڈرامہ (۳)

## منظر سوم

(شہنشاہ کا باغ —— لڑکی پھول توڑ رہی ہے)

**لڑکی:**۔ (گاتی ہے) جھوم رہے ہیں پودے، کیسے چھائی ہوئی ہریالی
پتہ پتہ پھول رہا ہے جھول رہی ہے ڈالی ڈالی
(گانا آہستہ آہستہ ختم ہوتا ہے)

(عالم پناہ کا آنا —— آہٹ)

**عالم پناہ:**۔ بڑا اچھا گاتی ہو تم! ...... ایں ..... وہ کیا نام ہے تمہارا؟

**لڑکی:**۔ میرا نام! ........ فرزانہ!

**عالم پناہ:**۔ فرزانہ! بہت دلکش! بہت موزوں! کیا کر رہی ہو یہاں؟

**لڑکی:**۔ گل توڑ رہی ہوں عالم پناہ!

**عالم پناہ:**۔ تو گل بلبل کا ہونا بھی ضروری ہے۔

**لڑکی:**۔ میں خادم ہوں عالیجاہ!

**عالم پناہ:**۔ مگر خادم مالک بن سکتا ہے۔

**لڑکی:**۔ جھوٹے موتیوں میں آب نہیں ہوتی۔

**عالم پناہ:**۔ مگر ان سے سچے موتیوں کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔

**لڑکی:**۔ جھوٹی آب سے پرکھ بھی غلط ہو جاتی ہے عالم پناہ!

**عالم پناہ:**۔ قدر دانوں کے پاس پہنچ کر جھوٹے موتیوں کی بھی قیمت بڑھ جاتی ہے۔

**لڑکی:**۔ یہ باتیں .....

**عالم پناہ:**۔ بہت دن ہوئے .... جب .... جب .... جب تم اس محل میں آئی تھیں نا ..... میری یہ تمنا تھی کہ تم کو ۔

**لڑکی:**۔ میرا ہاتھ ... چھوڑ دیجئے .... کوئی

**عالم پناہ:**۔ یہ شاہی باغ ہے یہاں کوئی نہیں آ سکتا

**لڑکی:**۔ چھوڑ دیجئے، اُف میری کلائی، چھوڑ دیجئے، میں محبت

**عالم پناہ:**۔ تم کو محبت کرنا ہوگی۔

**لڑکی:**۔ اچھا، پہلے چھوڑ دیجئے، اللہ چھوڑ دیجئے۔

**عالم پناہ:**۔ لو .......

**لڑکی:**۔ (بھاگتی ہے ...... قدموں کی آہٹ) اف دوپٹہ ... الجھ گیا الجھ گیا ..... کمبخت

**عالم پناہ:**۔ (دور سے ہنستا ہے اور پھر نزدیک آ کر کہتا ہے) باغ کے کانٹے بھی کہتے ہیں کہ تم کو میری محبت کا ...

**لڑکی:**۔ [illegible] توڑ لاؤں —— [illegible]

**عالم پناہ:**۔ (جلدی سے) میں [illegible]

**لڑکی:**۔ اف! خون تک [illegible]

**عالم پناہ:**۔ تمہارا خون [illegible] تمہاری آنکھیں [illegible] ہاں جو دل کشا ہیں۔ یہ سب بہت [illegible] ہیں [illegible] [illegible] ہیں اگر یہ [illegible] ناؤں تو کیا

**لڑکی:**۔ [illegible] منہ سے تیری بات اچھی نہیں لگتی عالم جاہ۔

**عالم پناہ:**۔ [illegible] ضرور ایک [illegible] جاؤ گی۔ مجھے [illegible] ——

**لڑکی:**۔ محبت یکطرفہ نہیں ہوتی۔

**عالم پناہ:**۔ کیا تم محبت سے واقف نہیں؟

**لڑکی:**۔ نہیں —— میں، عالی جاہ، اپنے آقا کی کنیز ہوں، کہ آگے نہیں بڑھ سکتی

**عالم پناہ:**۔ محبت تمہارا مرتبہ بلند کر دے گی۔

**لڑکی:**۔ میں اسی حال میں خوش ہوں۔

**عالم پناہ:**۔ یہ تمہاری مشکلیں ختم کر دے گی۔

**لڑکی:**۔ تلخ زندگی بھلی ہوتی ہے

**عالم پناہ:**۔ یہ تمہاری تقدیر بدل دے گی۔

**لڑکی:**۔ تقدیر اٹل ہے میں [illegible] پسند کرتی ہوں

**عالم پناہ:**۔ یہی آزادی پریم دوار ہے جس میں تم کو بھی ہے، یہ زندگی پھر نور ہو جائے گی اس زندگی کی سب ظلمتیں دور ہو جائیں گی —— بہار آ جائے گی فرزانہ تیری زندگی میں۔

**لڑکی:**۔ مگر زمانہ —— یہ گردش دوراں —— یہ ظالم آسمان —— کبھی

**عالم پناہ:**۔ یہ سب ظالم رحم دل ہو جائیں گے اور بغض و حسد کا دامن چاک ہو جائے گا۔

**لڑکی:**۔ یہ سب فریب ہے۔

**عالم پناہ:**۔ یوں تو زندگی ہی فریب ہے مگر محبت میں گم ہو کر فریب باقی نہیں رہتا، آسمان کی سی بزرگی حاصل ہوتی ہے۔

**لڑکی:**۔ مگر اس کی راہ بہت کٹھن ہے عالم پناہ! میں نہ چل سکوں گی۔

**عالم پناہ:**۔ ضرور چل سکو گی۔ محبت دو دلوں کو ایک کر دیتی اور بے پناہ قوت عطا کرتی ہے۔

**لڑکی:**۔ مگر دل نوازی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہتی۔

**عالم پناہ:**۔ یہ اجڑی بستی بھی آباد کر دیتی ہے۔ آقا اور غلام کا امتیاز باقی نہیں رکھتی۔

**لڑکی:**۔ غلامی کی زنجیر مشکل سے ٹوٹتی ہے۔

**عالم پناہ:**۔ مگر یہ زنجیر ٹوٹتے ہی دل کی نگاہیں کھول دیتی ہے۔ لو ..... یہ ہار ... پہن لو!

**اے۔ ایس احمد ادیب**

**لڑکی:۔** ڈرتی ہوں عالم پناہ۔ اس عزت افزائی کا شکریہ!

**عالم پناہ:۔** شکریہ صرف زبانی ۔ سر جھکاؤ، پہلے اس ہار کو اپنے گلے کی زینت بننے دو۔

**لڑکی:۔** آپ نے ذرہ کو آفتاب بنا دیا....

**عالم پناہ:۔** میں بہت خوش ہوں..... اچھا! امراء جمع ہوں گے میں دربار جا رہا ہوں — (جاتا ہے)

**لڑکی:۔** بڑی دیر ہوگئی — چلوں جلدی سے نہیں تو ملکۂ عالم ناراض ہوجائیں گی

(ملکہ داخل ہوتی ہے)

**ملکہ:۔** فرزانہ! ٹھیر جا! کہاں جا رہی ہے تو۔ (نزدیک آکر) اتنی دیر!

**لڑکی:۔** پھول توڑ رہی تھی ملکۂ عالم!

**ملکہ:۔** اتنی دیر میں اور صرف اتنے سے پھول!

**لڑکی:۔** دیر ہوگئی ملکۂ عالم!

**ملکہ:۔** اور یہ ہار — یہ میرا ہار — تیرے گلے میں۔ تو نے یہ کہاں سے پایا۔

**شبنم:۔** یہ ہاتھ کی بھی تیز معلوم ہوتی ہے ملکۂ عالم!

**لڑکی:۔** میں چور نہیں ہوں ملکۂ عالم!

**ملکہ:۔** پھر تجھے یہ ہار کہاں سے ملا؟

**لڑکی:۔** یہیں — باغ سے۔

**ملکہ:۔** سچ سچ بتا! تجھے کس نے دیا؟

**لڑکی:۔** کسی نے نہیں ملکۂ عالم!

**ملکہ:۔** پھر یہ باغ میں ہار اگتا ہوگا؟

**لڑکی:۔** (خاموش)

**شبنم:۔** ضرور کچھ دال میں کالا ہے

**ملکہ:۔** شبنم۔ لے جاؤ اس کو۔ یہ چور ہے۔ اسے قید میں ڈالدو..... کل اس کا مقدمہ ہوگا.....

(عالم پناہ داخل ہوتے ہیں)

**عالم پناہ:۔** کس کا مقدمہ؟ کیسا مقدمہ؟

**ملکہ:۔** چوری کرنے لگی فرزانہ! یہ ہار چرا لیا؟

**لڑکی:۔** میں بے قصور ہوں ملکۂ عالم!

**ملکہ:۔** چوری اور سینہ زوری۔

**لڑکی:۔** عالم پناہ! میں نے چوری نہیں کی۔

**ملکہ:۔** بے حیا! عالم پناہ سے کیا کہتی ہے۔ (غصہ میں) شبنم۔ لے جاؤ اس کو اور جلاد کے حوالے کردو۔ سو درّے ابھی لگا دے۔

**عالم پناہ:۔** سو درّے — اتنی سی چوری پر!

**ملکہ:۔** ہاں یہ میرا حکم ہے۔

**عالم پناہ:۔** مگر سزا ایسی ہونی چاہئے کہ مجرم برداشت کرسکے۔ اگر وہ مرگئی تو سزا کیا ہوئی؟

**ملکہ:۔** اس کا مرجانا ہی بہتر

**عالم پناہ:۔** ایک عورت کو دوسری عورت پر اتنا زبردست ظلم کرتے میں نے نہیں دیکھا۔

**ملکہ:۔** اب دیکھ لیجئے، عورت بھی آفت ہوتی ہے غصہ میں!

**عالم پناہ:۔** سچ کہتی ہو، مگر عورت فطرتاً کمزور ہوتی ہے۔ غریب گھرانے کی لڑکی، ہار دیکھ کر جی چاہ گیا ہوگا۔ یہ چوری نہیں، عورت کی فطرت ہے۔

**ملکہ:۔** تو آپ ہی کوئی سزا تجویز کیجئے۔

**عالم پناہ:۔** اس کو نکال دیا جائے۔

**ملکہ:۔** خیر — نکل جا یہاں سے!

**لڑکی:۔** عالم پناہ!

**ملکہ:۔** بس! یہ آخری فیصلہ ہے۔ عالم پناہ اس میں دخل نہ دیں گے۔

**لڑکی:۔** جا رہی ہوں عالم پناہ!

**ملکہ:۔** جاؤ — نکل جاؤ — اب کوئی گنجائش باقی نہیں۔

**فرزانہ:۔** (جاتی ہے) (کچھ دور جا کر گاتی ہے)

آہ کروں تو گھر جرے اور جنگل بھی جر جائے
پاپی جیورا نہ جرے جا میں آہ سمائے

(آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی جاتی ہے)

(درگاہ)

**شاہ صاحب:۔** عالم پناہ! وہ پانچ سو خدا پرست یہ ہیں۔ ان کے قتل کا حکم عنایت کیجئے۔

**عالم پناہ:۔** میں ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہوں مگر ان بے گناہوں کا خون....

**شاہ صاحب:۔** وہم میں پڑ کر سلطنت کا وارث نہ کھوئیے عالم پناہ!

**ملکہ:۔** حکم دیجئے عالم پناہ!

**شاہ صاحب:۔** یہ خدا پرست نہیں ہیں، شیطان ہیں۔ یہ خدا کی مخلوق کو لوٹتے ہیں

**عالم پناہ:۔** پھر بھی ان کا خون کرنا.....

**شاہ صاحب:۔** درست اور ٹھیک ہے عالم پناہ، ان کی خانقاہیں گناہوں کے مرکز ہیں۔

**عالم پناہ:۔** ایک جان کے لئے پانچسو جانیں۔

**ملکہ:۔** پھر ہرج ہی کیا ہے۔ تخت و تاج کا وارث تو پیدا ہوجائے گا۔

**شاہ صاحب:۔** وعدہ سے ہٹنا درست نہیں۔

**عالم پناہ:۔** کیسے اجازت دوں۔ ملک میں عام بغاوت ہوجائے گی۔

**شاہ صاحب:۔** اگر ان خدا پرستوں کی قربانی نہ ہوئی تو تخت و تاج کا وارث ہی نہ پیدا ہوگا۔

**ملکہ :-** میں نے اپنی ذمہ داری پر ان کو پکڑوایا ہے عالم پناہ! دیجئے اجازت ان کے قتل کی۔

**عالم پناہ :-** اور ان بے گناہوں کا گناہ ؟

**شاہ صاحب :-** اس کی فکر نہ کیجئے، میں رعایا کو بھی بے چین بنا چکا ہوں۔

**عالم پناہ :-** اس کا خیال آتے ہی زمین و آسمان ہلتے نظر آنے لگتے ہیں۔ دنیا کی ہر شے میں رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

**ملکہ :-** یہ بزدلی ہے عالم پناہ! میدان جنگ میں لاکھوں مارے جاتے ہیں۔

**عالم پناہ :-** ان کی کل تعداد پانچ سو ہے ؟

**ملکہ :-** ہاں! ان میں ۴۹۹ مرد اور ایک عورت ہے۔

**شاہ صاحب :-** جلدی اجازت دیجئے عالم پناہ! شبھ لگن گذری جا رہی ہے، پھر ان کی قربانی سے بھی کچھ نہیں ہو سکے گا۔

**ملکہ :-** ہائے! کہیں وہ گھڑی نہ گذر جائے۔ دیدو ..... اجازت،

**عالم پناہ :-** خیر ——— اجازت ہے۔

**شاہ صاحب :-** نوجی ——— جلاد!

**نوجی :-** پیرو مرشد!

**شاہ صاحب :-** اپنا کام شروع کرو۔

**نوجی :-** ملکۂ عالم زندہ باد۔ عالم پناہ زندہ باد۔ وارث سلطنت زندہ باد۔

**شاہ صاحب :-** تم ہی گننے بھی جانا نوجی!

**نوجی :-** اجازت ہے پیرو مرشد!

**شاہ صاحب :-** شاہی فرمان کے مطابق اجازت ہے۔

**نوجی :-** (آواز۔ کھٹ) ایک (آواز۔ کھٹ) دو (آواز۔ کھٹ) تین۔ (آواز۔ کھٹ) چار۔

**عالم پناہ :-** یوں تو بہت وقت لگ جائے گا۔

**شاہ صاحب :-** پھر؟

**ملکہ :-** دس دس کی قربانی ایک ساتھ۔

**نوجی :-** بہتر۔ (آواز کھٹ) دس۔ (آواز کھٹ) بیس۔ (آواز کھٹ) تیس (اسی طرح ساٹھ اور ستر تک ہوتا ہے)

**شاہ صاحب :-** (قہقہہ) اب میرا دل خوش ہوا؟ پورا پورا انتقام لے لیا!

**عالم پناہ :-** ٹھیر جا! نوجی ——— !

**شاہ صاحب :-** اب حکم منسوخ نہیں ہو سکتا ——— نوجی ——— قربانی جاری رکھو۔ گردنیں اڑاتے جاؤ۔

**عالم پناہ :-** روک دو۔ بالکل بند کر دو ——— یہ فریب ہے۔

**ملکہ :-** قربانی بند نہیں ہو سکتی۔

**شاہ صاحب :-** قربانی جاری رہنے دیجئے، ورنہ اولاد نہ ہو گی۔

**ملکہ :-** ہمیں اولاد کی ضرورت ہے۔ قربانی ہونے دو خدا پرستوں کی۔

(دور سے شور و غل ہوتا ہے اور نزدیک آ جاتا ہے)

**ایک آواز :-** مار ڈالو اس فقیر کو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ خدا پرست قربان نہیں کئے جا سکتے۔

**دوسری آواز :-** قتل کر دو ان سب کو۔

**تیسری آواز :-** گرفتار کر لو ایسے حکمرانوں کو۔

**شور و غل :-** سب کو مار ڈالو۔ تباہ کر دو۔

**شاہ صاحب :-** ارے باغی عالم پناہ! فوج بلوا لیجئے

**شہنشاہ :-** فوج نہیں آ سکتی۔

**شاہ صاحب :-** پھر بچائیے

**پہلی آواز :-** تم سب ہمارے قیدی ہو ——— اف یہ خون کی ندی، بے گناہ خدا پرستوں کا قتل (زور سے) کیا ہوتا ہے فیصلہ ان قیدیوں کے لئے۔

**سب :-** قتل۔ قتل۔ قتل۔

**پہلی آواز :-** جلاد۔ ان سب کو بھی اسی طرح قتل کر۔

**دوسری آواز :-** یہ سب شاہ صاحب کی کرتوت ہے۔

**تیسری آواز :-** خدا پرستوں کی طرح ان کو بھی قتل کیا جائے۔

**جلاد :-** یہ شاہ صاحب ہیں ——— کھٹ۔ قہقہہ (ایک آواز) اپنے کئے کی اب سزا پائی

**جلاد :-** یہ عالم پناہ ہیں ——— کھٹ۔ قہقہہ۔ (دوسری آواز) ایسے بادشاہ کا قتل ضروری ہے۔

**جلاد :-** یہ ملکۂ عالم ہیں ——— کھٹ۔ قہقہہ۔ (تیسری آواز) وہم پرست عورتوں کو فنا کرنا ضروری ہے۔

**ایک آواز :-** جلاد ... کتنے خدا پرست ابھی اور باقی ہیں۔

**جلاد :-** چار سو کے قریب! اور ایک عورت!

**آواز :-** رہا کر دو ان سب کو ——— چلو ——— سب واپس چلو۔ (شور و غل

**لڑکی :-** (آہستہ سے) افسوس۔ میں جیت کے ہار گئی۔ یہ سمجھی تھی کہ قسمت جاگ اٹھی مگر ........ نہ باپ ملا اور نہ دلبر ———

(گاتی ہوئی جاتی ہے)

آہ کروں تو گھر جلے اور جنگل بھی جر جائے
پانی تیبو را نہ جرے، جا میں آہ سمائے

(آواز رفتہ رفتہ غائب ہو جاتی ہے)

# مقبرہ شاہ سلیم چشتی

نور احمد خاں ترمذی

اکبر اعظم کی عمر ۲۸ برس کی ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی تک اس کی گود [illegible] کے دامن سے محروم تھی۔ اس لئے وہ ہندوستان جیسی عظیم الشان سلطنت کا مطلق العنان تاجدار ہونے کے باوجود ہمیشہ مغموم رہتا۔ اسے گوشہ نشین درویشوں سے دلی عقیدت تھی۔ اسے یقین تھا۔ کہ ان کی دعائیں ضرور اثر رکھتی ہیں جو ہر وقت دعا کرتے ہیں [illegible] قبولیت تک [illegible] استقبال کو [illegible] اسی خیال [illegible] سلطنت کے کاروبار سے فرصت ملتی مشائخ اور فقراء کی خدمت میں جاکر اولاد کی زندگی کے لئے دعا کرتا۔ اسی دھن میں اپنے [illegible] کا وہ سب سے بڑا سلطان خواجہ معین الدین چشتی کے [illegible] پر حاضر ہوا۔ اور منت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے جیتا جاگتا بیٹا عنایت فرمائے۔ [illegible] سے اجمیر شریف تک (۱۴۰ کوس) پیدل [illegible] دوں گا۔

## سیکری کا پیر مرد

جن دنوں مغل اعظم اوزبکوں کی مہم سے فارغ ہوکر دارالسلطنت آگرہ کو واپس آرہا تھا۔ اس کا گذر سیکری کے مقام سے ہوا۔ امراء نے بتایا کہ اس [illegible] میں ایک درویش رہتا ہے۔ جس کی دعا کا تیر کبھی خالی نہیں جاتا۔ بادشاہ کو اس سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔

اچانک ایک غلغلہ سا برپا ہوا۔ کہ جلال الدین اکبر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شیخ کی زیارت کے لئے حاضر ہو رہا ہے۔ دفعتہً نوبتیں بج گئیں۔ اور شاہانہ سواری ستائیس برس کا باوقار انسان [illegible] شیخ محمد بخاری اور معین الملک خضر راہ بن کر آگے چلے۔ بادشاہ پیادہ پا فقیر کے جھونپڑے کی طرف روانہ ہوا۔ سیکری کے سنگتراش اپنا کام چھوڑ کر تماشا دیکھنے جمع ہو گئے۔ لیکن وہ بوڑھا فقیر جس کے ملنے کو اکبر سا جوان بڑھا چلا آتا تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر یاد الٰہی میں محو تھا۔ ابھی درویش کا جھونپڑا دور ہی تھا۔ کہ شہنشاہ نے ادب سے جوتے اتار دیئے۔ گویا انقیاد جذبہ نے فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى کا فرمان سنا کر اسے متنبہ کر دیا تھا۔ کہ وہ وادی ایمن پہنچ چکا ہے۔ اس لئے اسے اپنے جوتے اتار دینے چاہئیں۔ جونہی بادشاہ بوریہ نشین درویش کے قریب پہنچا اس نے مراقبہ سے سر اٹھا کر [illegible] تاجدار پر نظر ڈالی۔ [illegible] کا چار ہونا تھا۔ کہ وہی مغل اعظم جس کی حکومت کا فرمان برماسے بلخ و بخارا سے سمرقند تک جاری تھا۔ شیخ کے [illegible] کیا دیکھا۔ کہ جس کے دربار سے لاکھوں [illegible] ہوتے ہیں۔ جو محتاجوں کو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بخش دیتا ہے۔ خود ایک بے نوا درویش کے آگے دست احتیاج دراز کئے بلک بلک کر بقائے نسل اور قیام سلطنت کے لئے ایک فرزند کی بھیک مانگ رہا ہے۔ فقیر کی بارگاہ میں شہنشاہی سرنگوں ہے۔ طاغوتی توتیں پامال ہو رہی ہیں۔ انکسار۔ فروتنی۔ رقت۔ سوز و گداز۔ اور خاکساری کے پاکیزہ جذبات بیدار ہو رہے ہیں۔ اکبر اعظم کا یہ نیاز خدا کو پسند آیا۔ درویش کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ نورانی چہرہ پوری تابانی سے دمکنے لگا۔ ارشاد ہوا [illegible] رکھ۔ میرا پروردگار۔ تجھے تین فرزند عطا کرے گا۔ خوشی سے بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ قدم بوس ہوکر بولا۔ اے [illegible] بے کساں وائے تکیہ گاہ تہی داماں!! میں عہد کرتا ہوں کہ پہلے بیٹے کو آپ کے قدموں میں لا ڈالوں گا۔ تاکہ آپ کے دامن کے سایہ کی برکت [illegible] محافظ ہو۔ اور وہ زندہ و سلامت رہے۔"

شیخ کی نگاہ ایک دفعہ پھر اٹھی۔ اور فرمایا۔ مبارک باشد ما ہم [illegible] یعنی مبارک ہو۔ ہم نے اس لڑکے کو اپنا ہمنام بنایا۔ [illegible] حضرت شاہ سلیم چشتی تھے۔ جو حضرت خواجہ فریدالدین مسعود شکر گنج (پاک پٹن) کی اولاد سے تھے۔ اور یہاں گوشۂ گمنامی میں اپنی پاکیزہ زندگی کے مبارک ایام اللہ اللہ میں بسر کرتے تھے۔

## سلیم کے گھر میں سلیم کی پیدائش

خداوند عالم کے فضل و کرم سے چند دنوں کے اندر ہی اندر اکبر اعظم کی ملکہ جو راجہ بہارا مل والئے جے پور کی صاحبزادی تھی۔ [illegible] اکبر نے اسے سیکری میں بھیجدیا۔ تاکہ بچے کی ولادت بھی شیخ کے گھر میں ہو۔ چنانچہ شیخ سلیم کے مکان میں ہی ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ کو سلطان ہند کا جگر گوشہ تولد ہوا۔ ممالک محروسہ میں وسیع پیمانہ پر خوشیاں منائی گئیں۔ قیدی رہا ہوئے۔ امراء و وزراء کو خلاع فاخرہ مرحمت ہوئے۔ ملکہ مریم زمانی کے [illegible] سے سرفراز ہوئیں۔ اور خواجہ حسن مروی نے اس موقعہ پر ایک عجیب و غریب قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ جس کے پہلے مصرعہ سے اکبر کا جلوس اور دوسرے سے جہانگیر کی ولادت کی تاریخ نکلتی تھی۔ (چند اشعار ملاحظہ ہوں) ؎

| | |
|---|---|
| [illegible] جاہ و جلال شہریار | گوہر مجد از محیط عدل آمد در کنار |
| [illegible] گر دارد کسے | ہر کہ دارد گو بیا چیزے کہ دارد بیار |
| [illegible] جلوس بادشاہ | از دوم مولود نور دیدۂ عالم برآر |

بادشاہ اس قصیدہ کو سن کر بے حد محظوظ ہوا۔ اور دو لاکھ اشرفیاں انعام

میں عطا فرمائیں۔ جس کمرے میں جہانگیر پیدا ہوا۔ اس کا اصلی نام رنگ محل تھا۔ یہ مکان اب تک جامع مسجد کے جنوب مغربی گوشے میں مسجد سنگتراشاں کے نزدیک واقع ہے۔ اس کا طول ۹½ فٹ عرض ۸¾ فٹ اور بلندی دس فٹ دس انچ ہے۔ جہانگیر اپنی توزک میں لکھتا ہے۔ کہ "حضرت شیخ کی مرضی کے موافق میرا نام سلطان رکھا گیا۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ میرے باپ نے مجھے سلطان سلیم یا سلیم کہہ کر پکارا ہو وہ مجھے ہمیشہ محبت اور پیار سے شیخو جی اور شیخو بابا کہا کرتے تھے۔ یعنی حضرت شیخ سلیم چشتی کے لقب شیخ سے مجھے برکت دیتے تھے۔"

## لال پتھروں کا شہر

سیکری ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ سلیم کے پیدا ہونے پر اکبر نے اسے اپنے لئے ایسا مبارک خیال کیا کہ اس نے مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ اور شیخ کی خواہش پر اسی گاؤں کے قریب جہاں شہنشاہ بابر نے رانا سانگا پر فتح پائی تھی سنگ سرخ سے ایک شہر کی تعمیر کا سلسلہ شروع کیا۔ اگرچہ یہاں ریگستانی گرمی، سموم اور طوفان، گرد و غبار اور خوبصورت مناظر کا اس قدر فقدان درپیش تھا کہ اگر انسان دیکھے تو دل بیٹھ جائے۔ اور ایسے بیابان میں گلستان کا خواب دیکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ مگر اکبری ذوق و ہمت نے وہ لالہ زار بنا دیا کہ یہ مقام تمام عالم میں انتخاب ہو گیا۔" اکبر نے سنہ ۱۵۶۹ء میں اس شہر کی تعمیر شروع کی تھی۔ اور سنہ ۱۵۸۴ء میں جا کر ختم ہوا۔ یہ شہر چھ میل کے محیط میں پھیلا ہوا تھا۔ تین اطراف میں سنگین فصیل اور ایک جانب جھیل تھی۔ فصیل میں سات دروازے تھے۔ دہلی دروازہ، آگرہ دروازہ، اجمیری دروازہ، گوالیاری دروازہ، چندر پھول دروازہ اور متھرا دروازہ۔ چونکہ اکبر اعظم اسے اپنا دار الخلافہ بنانا چاہتا تھا۔ اس لئے اسی لئے مرکز سے چاروں طرف پیمائش شروع کرائی۔ پہلے موضع کا نام آدم پور دوسرے کا شیث پور اور تیسرا ایوب پور۔ غرضیکہ یہ تمام مواضعات پیغمبروں کے ناموں سے موسوم کئے جائیں۔ سنہ ۹۸۹ھ میں ٹکسال بھی یہیں جاری ہوئی۔ اور پہلے پہل چار گوشہ روپے بنائے گئے۔ جب شاہی محلات اور دیوان خاص و عام کی خوشنما عمارتیں بن چکیں۔ تو تمام امراء نے بھی سنگ سرخ کی عمارتیں بنوانی شروع کیں۔ چوڑے چوپڑ کے بازار بنائے گئے۔ ہوادار۔ بالاخانے۔ مدرسے۔ خانقاہیں۔ حمام۔ زنانے اور مردانے باغ بن کر تیار ہوئے۔ ادنیٰ درجہ کے لوگوں نے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق مکانات بنوائے۔ بادشاہ نے شہر کی تعمیر میں یہ خاص اہتمام ملحوظ رکھا۔ کہ مکان خواہ امیر کا ہو یا غریب کا سنگ سرخ سے تعمیر ہو۔ غریبوں کو پتھر مفت مہیا کئے گئے۔ زمینیں بھی بلا معاوضہ عطا ہوئیں۔ اور کئی قسم کی مراعات سے نوازا گیا۔

سنہ ۹۷۹ھ میں پانچ لاکھ کے مصارف سے جامع مسجد بن کر تیار ہوئی۔ یہ شمالاً جنوباً ۴۳۸ فٹ اور شرقاً غرباً ۵۴۲ فٹ تھی۔ اس میں داخل ہونے کے لئے ایک دروازہ مشرق میں اور دوسرا جنوب کی طرف رکھا گیا۔ یہ اس شہر کی سب سے عالیشان عمارت تھی۔ [illegible] اکبر نے اس مسجد میں جمعہ کے موقعہ پر بحیثیت امام کے خطبہ پڑھنا چاہا۔ مگر جونہی منبر پر قدم رکھا۔ خوف الٰہی سے لرزنے لگا۔ اور فیضی کے یہ اشعار پڑھ کر نیچے اتر آیا۔

خداوندے کہ مارا خسروی داد — دل دانا و بازوئے قوی داد
بعدل و داد مارا رہنموں کرد — بجز عدل از خیال ما بروں کرد
بود وصفش ز حد فہم برتر — تعالیٰ شانہ اللہ اکبر

جب شہر تعمیر ہو گیا۔ تو اکناف و اطراف سے لوگ آنے لگے۔ دیوان عام اور خاص میں اکبر اعظم کے دربار منعقد ہونے شروع ہوئے۔ داد و دہش کے دروازے کھول دئے گئے۔ آئے دن فتح و نصرت کی اطلاعیں پہنچتیں۔ دربار میں اکبری جشن ہوتے۔ بہادروں اور جاں سپاروں کی حوصلہ افزائی ہوتی۔ بڑے بڑے مہاراجے کوہ پیکر ہاتھیوں پر سوار ہو کر آتے۔ ان کا شایان شان استقبال ہوتا۔ بادشاہ بغل گیر ہو کر اپنے پہلو میں جگہ دیتا۔ اور عزت و احترام کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے پاتا۔ معزز مہمان خوشی کے مارے اپنے جامے میں پھولے نہ سماتے۔ امرائے دربار کو توقع سے بڑھ کر صلہ ملتا۔ ابو الفضل اور فیضی جیسے دانائے روزگار۔ منعم خاں۔ مرزا عزیز کوکلتاش۔ حسین خاں ٹکریہ۔ مہیش داس راجہ بیربر۔ ملا دو پیازہ۔ شیخ عبدالنبی صدر۔ شیخ عبدالقادر بدایونی۔ راجہ ٹوڈرمل۔ راجہ مان سنگھ۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں۔ حکیم ابو الفتح گیلانی۔ حکیم ہمام۔ حکیم نور الدین قراری۔ فتح اللہ شیرازی سے باکمال امراء ہر وقت دربار میں حاضر رہتے۔ جن کے مذاکرات علمیہ سے دیوان عام گونجتا رہتا۔ رزم کے معاملات دیوان خاص میں طے ہوتے۔ بنگالہ۔ دکن۔ کابل۔ اور قندھار کے خان زماں۔ علی قلی خاں شیبانی جیسے سرکشان کینہ توز کی سرکوبی کے لئے بڑے بڑے شجاع اور جاں سپار افغان اور مہاراجے عزت کے ساتھ رخصت کئے جاتے۔ اکبر اعظم کے لشکر جرار مغلیہ پرچم لہراتے ہوئے روانہ ہوتے۔ شاہان ممالک غیر کے سفراء شرف باریابی حاصل کرنے کے بعد اپنے فرمانرواؤں کے ارشادات پیش کرتے۔ بڑے بڑے سوداگر کالے کوسوں کے سفر طے کرتے ہوئے اکبری نام سن کر یہاں حاضر دربار ہوتے۔ اور نادرۂ روزگار تحائف پیش کر کے منہ مانگا انعام پاتے۔ مرزا غیاث سے آشوب زمانہ کے شکار اور علی قلی خاں سے فتنہ جفا پیشہ کے ہاتھوں ظلم و ستم اٹھا کر یہاں پہنچتے۔ اور پانصدی و پانچ ہزاری منصب حاصل کر کے ہندوستان کی قسمتوں کے مالک بن بیٹھتے۔ لطف و اکرام کی غیر فانی بارشوں نے اور اکبر کی قدر شناسیوں نے فتح پور کو وہ شہرت بخشی کہ اکناف و اطراف عالم میں دہلی و آگرہ اور طہران و قاہرہ کی طرح مشہور ہو گیا۔

## مسٹر ریلف فچ کا بیان

مسٹر ریلف فچ پہلا انگریز سیاح۔

جس نے ہندوستان کا سفر کیا۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ آگرہ بہت بڑا شہر ہے۔ اور سرتاسر پتھروں سے تعمیر ہوا ہے۔ جمنا اس سے ٹکرا کر بہتی ہے۔ اس کے پاس ہی بہت بڑا قلعہ اور اس کے گرداگرد عمیق خندق ہے۔ یہاں سے ہم فتح پور سیکری گئے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں بادشاہ دربار لگاتا ہے۔ آگرہ کی نسبت یہ شہر زیادہ لمبا چوڑا ہے۔ یہ دونوں شہر لندن سے بہت بڑے ہیں۔ آگرہ سے فتح پور کو جو سڑک جاتی ہے۔ اس پر جگہ جگہ اس کثرت سے سرائیں اور دوکانیں واقع ہیں۔ کہ اس پر ایک لمبے بازار کا گمان ہوتا ہے۔"

## جہانگیر کے ریمارکس

اب جہانگیر اعظم کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ لکھتا ہے:-

والد بزرگوارم موضع سیکری را کہ محل ولادتِ من بود برخود مبارک داشتہ پائے تخت ساختند و در عرض چہاردہ پانزدہ سال آں کوہ و جنگل پر دد ددام شہر شد مشتمل برانواع باغات و عمارات و منازل متنزہ عالی بناہائے خوش و دلکش۔ بعد از فتح گجرات ایں موضع بہ فتح پور موسوم شدند۔ (تزوک)

## شیخ کا انتقال

دیکھتے ہی دیکھتے جہاں چند سال پہلے چند بیابان جھونپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہاں اتنا عظیم شان شہر بن گیا۔ کہ اگر یہاں نقارے پر چوٹ پڑتی۔ تو بنگال سے بخارا تک لوگ سوتا کانپ اٹھتے۔ ہندوستان۔ ایران اور دیگر ممالک کے بہترین دماغ یہاں کھچ کھچا کر جمع ہو گئے۔ آگرہ سے سیکری تک کی شاہراہ ایک بڑا بازار نظر آنے لگی۔ ہزاروں ہاتھی گھوڑے اور اونٹ ہر وقت اصطبل شاہی میں بندھے نظر آتے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ لیکن شیخ سلیم سب کچھ جانتے ہوئے اس ماحول سے اس قدر بے نیاز تھے۔ گویا وہاں کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ نہ کبھی دربار میں چل کر گئے۔ اور نہ کبھی دربار والوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ حسب دستور دنیا سے مستغنی۔ اپنی دنیا کے آپ شہنشاہ گوشہ فقر و غنا میں بیٹھے قال اللہ و قال الرسول سے اپنے دل کو گرماتے رہے۔

جہانگیر لکھتا ہے "ایک دن میرے والد نے حضرت سے پوچھا کہ حضرت کی برکت اس دنیا میں ہمارے سروں پر کب تک سایہ ڈالتی رہے گی۔؟ فرمایا جب سلیم پہلی بار کوئی موزون فقرہ زبان سے کہے گا۔ ہم اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ یہ بات سن کر میرے والد کو بڑا فکر ہوا۔ اور انھوں نے میرے نوکروں کو حکم دیا۔ کہ شیخو جی کے سامنے کوئی شعر یا موزون فقرہ نہ پڑھا جائے۔ لیکن مشیت ایزدی میں کون دخل دے سکتا ہے۔ ایک دن ایک عورت نے مجھے یہ دعا سکھائی "الٰہی غنچۂ امید بکشا"۔ مجھے یہ دعا بہت پسند آئی۔ اور میں اس کو پڑھتا ہوا اپنے حضرت کے پاس چلا گیا۔ اور حضرت کے سامنے جا کر "الٰہی غنچۂ امید بکشا" پڑھا۔ حضرت خوشی سے اچھل پڑے۔ اور مجھے گود میں لے کر خوب پیار کیا۔ اور میرے والد کو بلا کر فرمایا۔ اب ہمارا وقت آگیا۔ چنانچہ اسی دن بیمار ہوئے اور وفات پائی۔" حضرت کی وفات آرسی۔ آروڑہ کے بیان کے بموجب ۱۵۷۱ء میں ہوئی پیدائش ۱۴۷۸ء بیان کی جاتی ہے۔ گویا حضرت ۹۳ برس کے ہو کر فوت ہوئے۔

## شیخ کا مقبرہ

شیخ کے وصال کے بعد اکبر نے جامع مسجد کے شمالی مشرقی گوشے میں دفن کر کے اس پر سنگ سرخ کا خوبصورت مقبرہ تعمیر کیا تھا۔ جب جہانگیر تخت پر بیٹھا تو اس نے سنگ سرخ کے پتھر اکھڑوا کر اس کی جگہ سنگ مرمر کا حسین و جمیل گنبد اور گرداگرد مرمریں مرغولی برآمدہ بنوایا۔ مقبرہ کی عمارت ۴۷ فٹ ۱۱ انچ مربع ہے۔ فرش سے چھت تک خالص سنگ مرمر ہے۔ تناسب اور نفاست میں اس روضہ کا دنیا کی بہترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اصلی قبر تہ خانے میں ہے۔ بالائی قبر پر سلیپ کا خوشنما کٹہرہ ہے جو اتنی چابکدستی اور کاریگری سے بنا ہوا ہے۔ کہ دور دور سے سیاح اسے دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔

شیخ کی پائنتی میں سنگ سرخ کا ایک اور مقبرہ ہے۔ اس میں شیخ کا پوتا نواب اسلام خاں محو خواب ہے۔ جہانگیر کے زمانہ میں یہ بزرگوار بنگال کے گورنر تھے۔ جہانگیر لکھتا ہے۔ کہ جب اجمیر میں مجھ پر بیماری کا غلبہ ہوا۔ تو بنگال میں نواب اسلام خاں کو عالم غیب سے یہ خبر پہنچ گئی۔ وہ بہت گھبرایا اس نے خیال کیا۔ کہ اگر کوئی عزیز چیز مجھ پر سے تصدق کرے۔ تو ضرور شفا ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے فرزند ہوشنگ کے فدا کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر اس کی کم عمری کے سبب [illegible] اس کی جگہ اپنے آپ کو مجھ پر تصدق کیا۔ خدا نے اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا سن لی۔ وہ آناً فاناً فوت ہو گیا۔ اور میں بستر مرض سے اٹھ بیٹھا۔" آرسی۔ آروڑہ کے بیان کے بموجب نواب اسلام خاں نے ۱۶۱۳ء میں وفات پائی۔ اس کی لاش کو بڑے اعزاز و اکرام سے فتح پور میں لا کر شیخ کے قدموں میں سپرد خاک کیا گیا۔

## فتح پور کی بربادی

اکبر اعظم نے کامل پندرہ برس فتح پور سیکری کو اپنا پایۂ تخت بنائے رکھا۔ ۱۵۸۵ء کو اچانک دفاتر شاہی لاہور کو منتقل کر دئیے گیے۔ ۱۵۹۸ء تک چودہ برس بادشاہ لاہور میں ہی رہا۔ ۱۶۰۱ء میں آگرہ کو واپسی ہوئی۔ اور پھر مستقل طور پر یہیں رہا۔ تا اینکہ ۱۶۰۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فتح پور سیکری کی اس روشن دنیا پر ظلمت کیوں چھا گئی۔ اور اکبر کے اس گلشن پر دفعتہ خزاں کا گذر کیوں ہوا۔ تاریخ داں حضرات یہ کہتے ہیں بعض سیاسی مصالح ایسے پیدا ہو گئے تھے۔ جن کی بنا پر شہنشاہ کے لئے عنانِ توجہ کا لاہور اور پھر آگرہ کی طرف مبذول کرنا ناگذیر ہو گیا تھا۔ متصوفین حضرات یہ سب کچھ تسلیم کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں۔ کہ فتح پور کی آبادی و بربادی میں آغاز سے انجام تک شیخ سلیم رحمتہ اللہ علیہ کا روحانی تصرف کارفرما رہا۔ یعنی حضرت کے انتقال کے بعد جب اکبری امراء سے اخلاقی لغزشیں ظہور میں آئیں۔ اور شیخ کے

مزار کے قریب شراب کا دور علی الاعلان ہونے لگا۔ تو غیرت خداوندی جوش میں آئی۔ اور اس خدایا دانسان کی مقدس ہڈیوں کو اس ناشروع ماحول سے بچانے کے لئے بادشاہ کی توجہ کو لاہور کی طرف پھیر دیا گیا۔ اور وہ محلات جن میں آٹھوں پہر ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔ اچانک ویران ہو کر رہ گئے۔ اب یہ کیفیت ہے۔ کہ وہاں دن کو بھی جاتے ہوئے ہول آتا ہے۔ لیکن شیخ کے مزار پر نور پر رات کو بھی چہل پہل رہتی ہے۔ شبانہ چاندنی راتوں میں مرمریں مسجد کے اندر مرمریں عنبرے کا انعکاسی عمل عجیب کیفیات پیدا کرتا ہے۔ الغرض جس طرح اکبر اعظم اس نے نوا درویش کے آگے جھکا تھا۔ آج اس کے پر شکوہ مگر ویران محل اسی طرح اس مرمریں گنبد کے آگے سجدہ ریز نظر آتے ہیں یہ حالت زائر دیکھتا ہے۔ تو اس کی زبان پر بے ساختہ قرآن حکیم کی یہ آیات جاری ہو جاتی ہیں۔

وہ بہت سے باغات اور چشمے چھوڑ گئے۔ اور کتنی کھیتیاں اور عمدہ و نفیس مقامات اور ایسی ہی کتنی نعمتوں سے کہ جن سے وہ مزے لیا کرتے تھے۔ محروم ہو گئے۔ یہ بات اسی طرح ہے۔ اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان کا وارث قرار دیا۔ اور جو ہزاروں سال سے اس سرزمین میں کوس لمن الملکی بجا رہے تھے۔ ایک دن اقوام عالم کی نگاہ سے ایسے پوشیدہ ہوئے کہ آسمان اور زمین نے ایک آنسو بھی ان کی یاد میں نہ بہایا اور نہ ان کو مزید مہلت دی گئی" (قرآن حکیم)

## قاضی نذرالاسلام کی رومانی شاعری :- (بقیہ صفحہ ۴۲)

نغموں میں بھی سنگیت کے میٹھے بول موجود ہیں۔ نذرالاسلام سے ایک دن دوران ملاقات میں جب میں نے یہ سوال کیا کہ آپ پہلے موسیقار ہیں یا شاعر تو انہوں نے لبوں پر تبسم لاتے ہوئے جواب دیا تھا کہ میری شاعری تو ایک حادثہ عظیم ہے لیکن موسیقی میری روح ہے، میری زندگی ہے۔ میری دنیا ہے میں موسیقی کی گود میں پیدا ہوا، اس کی گود میں پروان چڑھا اور شاید اسی کی گود میں چراغ حیات بجھ جائے۔" ان حقائق کے پیش نظر میں بلا تامل کہوں گا کہ جو لوچ اور حسن نذرالاسلام کے گیتوں اور ... نظموں میں ہے۔ وہ ٹیگور کے یہاں معدوم ہے۔ نذرالاسلام کے گیت میں ... دل کی پکار ہے اور ٹیگور کے گیت میں فطرت کی عکاسی ہے۔



## گردش — زہرہ جمال

گلشن زیست سے معدوم ہے موج تسنیم
غنچہ و گل سے نکلتی نہیں پہلی سی شمیم
اب نہ وہ شوق نظارہ ہے نہ وہ ذوق سیم
ہاں مگر گردش ایام وہی باقی ہے

نہ وہ اوقات زر افشاں ہیں نہ وہ شیشہ و جام
اب نہ وہ بزم مسرت ہے نہ وہ عشرت عام
نہ وہ امید کا عالم ہے نہ وہ ذوق تمام
ہاں مگر گردش ایام وہی باقی ہے

اب نہ رودادِ الم ہے نہ وہ افسانۂ دل
نہ کوئی موج تمنا ہے نہ کوئی ساحل
اب نہ آوازِ جرس ہے نہ نشانِ منزل
ہاں مگر گردش ایام وہی باقی ہے

دامنِ یوسف کنعاں کی حکایت ہے خموش
قیس کی بادیہ پیمائی میں باقی نہیں جوش
آج عالم کو نہیں دامنِ عذرا کا کچھ ہوش
ہاں مگر گردش ایام وہی باقی ہے

آج آوازِ انا الحق کا کہیں نام نہیں
زیبِ ارنی کی صداؤں کا وہ انجام نہیں
جس میں صہبائے حقیقت تھی وہ اب جام نہیں
ہاں مگر گردش ایام وہی باقی ہے

شمع امید میں باقی نہیں اب کوئی گداز
کوئی ساقی ہے۔ نہ صہبا ہے۔ نہ نغمہ ہے۔ نہ ساز
خالی خالی سی نظر آتی ہے آغوشِ نیاز
ہاں مگر گردش ایام وہی باقی ہے

سازِ دل سے جو نکلتے تھے وہ نغمات نہیں
جن سے ہل جاتے تھے افلاک وہ جذبات نہیں
جن میں پنہاں تھی حیات آہ! وہ لمحات نہیں
ہاں مگر گردش ایام وہی باقی ہے

ان نگاہوں کا تو حج ہوا بے نام و نشاں
غنچۂ دل کے تبسم پہ ہے اک خواب گراں
چشمِ امید نظر آتی ہے حیران و پریشاں
ہاں مگر گردش ایام وہی باقی ہے

# بلجیم کی بدنصیب ساحرہ

پیٹر اسٹیفورڈ

جس طرح نوعِ انسانی کی تاریخ واقعات کو برابر دہراتی رہتی ہے اسی طرح دردناک واقعات بھی انسانی زندگی میں بار بار لوٹ کے آتے ہیں۔ ان دنوں یورپ میں ہنگامے اور اضطراب کا دور دورہ ہے لیکن کسی کو کیا معلوم کہ کتنے غدار پوری آزادی سے بازاروں میں چل پھر رہے ہیں اور کتنے بے گناہ مردوں اور عورتوں کو غدار سمجھ کر قید خانوں میں بند کیا جا رہا ہے جہاں یہ بیچارے اپنی بدنصیبی پر کڑھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ اولوالعزمی اور جوانمردی کے شہید!

دردناک واقعہ جتنا تازہ ہو اتنا ہی پرانا ہے۔ اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے اٹھارھویں صدی عیسوی میں جب یورپ میں ہر طرف بےچینی پھیلی ہوئی تھی بلجیم میں ایک کسان کی لڑکی رہتی تھی جس کا نام تھیروئن تھا۔ یہ لڑکی اپنے مسحور کن حسن کے باعث تمام ملک میں مشہور تھی۔ اس کی آواز بے حد دلکش تھی۔ شاید اسی لئے وہ جب اپنے کام میں مشغول ہوتی تو گاتی بھی جاتی۔

ایک دن ایک نوجوان انگریز اُدھر سے گزرا۔ اس لڑکی کو دیکھا اور اس کا گانا سنا تو اس پر فریفتہ ہو گیا۔ یہ محبت پہلی ہی ملاقات میں شدید بھی ہو گئی اور دونوں کے دل میں برابر کا گھر کر لیا۔ اس نوجوان نے تھیروئن سے کہا کہ پیاری تم میرے ساتھ انگلستان چلو۔ لڑکی راضی ہو گئی۔

لندن میں اس غریب لیکن ذہین لڑکی کو وہی فضا مل گئی جس کی اسے سخت ضرورت تھی۔ اس نے جلد ہی شہری زندگی کے آداب سیکھ لئے۔ وہ موسیقی میں ماہر ہو گئی۔ زبانیں بھی اس نے جلد ہی سیکھ لیں اب وہ ایک تیز فہم اور خوش گو عورت بن گئی یہاں تک کہ جو کوئی اس کی باتیں سنتا اس کی نکتہ سنجی اور دلربائی کی داد دیتا۔

لڑکی کا عاشق مالدار تو پہلے سے بھی تھا لیکن ایک اور بڑی جائداد کی میراث سے اور بھی زیادہ مالدار ہو گیا۔ اس کی طبیعت عیش پسند تھی۔ پہلے بھی عیاشی میں اس کا بہت سا وقت صرف ہو جاتا تھا لیکن اب تو وہ اس رنگ میں ڈوب گیا۔ دوستوں کے بہلاوے پھسلاوے میں آکر اس کی زندگی عیش و طرب کا مرکز بن گئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ عیاشیوں پر پانی کی طرح روپیہ خرچ ہونے لگا۔ اور عیاشی جنون کی حدوں سے جا ملی۔ تھیروئن نے ہر امکانی کوشش کی وہ زندگی کے سیدھے راستے پر آ جائے لیکن کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ لیکن اس نے تھیروئن کو خاموش کرنے کی ترکیب سوچی۔ اور وہ یہ کہ ایک دن اس نے تھیروئن سے شادی کی پیشکش کی۔ تھیروئن ایک ذہین لڑکی تھی۔ وہ جلد ہی اس پیشکش کی تہہ کو پہنچ گئی۔ ایک شدید اندرونی کشمکش کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی آزادی کو ایک ایسے شخص پر قربان نہیں کر سکتی جسے اس نے جلد ہی اپنی نظروں سے گرانا شروع کر دیا تھا۔ ان ہی دنوں اسے یہ معلوم کر کے سخت صدمہ پہنچا کہ اس کے عاشق کی مالی حالت خراب ہو گئی ہے۔ اس کے خوابوں کی دنیا ٹوٹ گئی اور آخر وہ شکستہ دل ہو کر اٹلی بھاگ گئی۔ یہاں آکر اس نے اپنی تمام تر توجہ موسیقی پر وقف کر دی کہ شاید اس طرح اپنی کم نصیبی کو بھول سکے۔

اس کے کچھ ہی عرصے بعد یورپ اور ساری دنیا میں انقلابِ فرانس کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ یہ خبر بے حد خوفناک اور اشتعال انگیز تھی۔ حکمتِ عملی سے کام لینے والوں اور سیاست دانوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔ شہریوں اور کسانوں کو جہاں اس خبر میں خوف کی جھلک نظر آئی وہاں امید کی کرن بھی دکھائی دی۔ آزادی۔ مساوات اور برادرانہ تعلقات ایسے الفاظ تھے جن کا احترام بھی کیا جاتا تھا اور جن سے جان بھی نکلتی تھی محض غیر جانبدار رہنا ایسی صورت میں ناممکن تھا۔

انقلابِ فرانس کی خبر تھیروئن کو اٹلی میں ملی۔ اس کے لئے اس سے زیادہ کوئی آسان بات نہ تھی کہ وہ تاریخ کے اس خوفناک دور سے الگ رہے۔ لیکن اس کی سرگرم اور جوان طبیعت کے لئے یہ راہ ناقابلِ فہم تھی۔ اس کے تخیلات فرانس کے واقعات کے گرد گھومتے رہے۔ اسے جو شدید صدمہ تھا اسے کوئی بھیانک مصروفیت ہی دبا سکتی تھی۔

اس لئے وہ جلد پیرس پہنچی۔ بغیر کسی خوف و ہراس کے اس نے شدید سرگرمی کے ساتھ سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ وہ نیشنل اسمبلی کی گیلری میں باقاعدگی سے جانے لگی۔ اس نے ایک سیاسی کلب کی بنیاد ڈالی۔ اس کی دلفریبی اور نکتہ سنجی کے باعث اس کلب کے جلسوں میں روبس پیر ڈینٹن۔ ڈےمیس اور دوسرے تمام نمایاں اشخاص جو انقلابِ فرانس کی بڑھتی ہوئی کامیابی میں حصہ لے رہے تھے شریک ہونے لگے۔ جب پیرس کے لوگ شاہِ فرانس اور اس کی ملکہ کو گرفتار کرنے کے لئے ورسیلز گئے تو ان لوگوں کے سرداروں میں تھیروئن بھی تھی۔ یہ ایک توپ پر سوار تھی اور اس کی پیٹی میں ایک پستول تھا۔

بلجیم کی اس نوجوان کسان لڑکی کی شہرت بحیثیت ایک انقلابی کے بہت بڑھ گئی۔ اس فوجی اقتدار کے بعد اب اسے حکمتِ عملی سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ تجویز یہ ہوئی کہ نیدرلینڈز میں آسٹریا کے باشندے جو اب تک سکون سے بیٹھے ہیں ان میں بےچینی پیدا کرنے کے لئے تھیروئن کو بھیجا جائے۔ پیرس میں اس وقت آسٹریا کا بوڑھا تجربہ کار سفیر کاونٹ مرسی ڈارنٹیو

موجود تھا۔ کسی طریقہ سے اسے خوفناک سازش کا علم ہوگیا۔ اسے اس لڑکی کی مستقل مزاجی اور اخلاقی قوت کا خوف اور پورا پورا احساس تھا اور اس لئے اس نے تہیہ کرلیا کہ جس طرح بھی ہوگا اس سازش کو پورا نہ ہونے دے گا۔ یہ سوچ کر اس لڑکی کے خلاف ایک سازش کی۔ ایک رات دو فرانسیسی تھیروئن کے سونے کے کمرے میں گھس گئے۔ انھوں نے اسے یقین دلایا کہ وہ کٹر قسم کے انقلابی ہیں اور ان کا منشا صرف یہی ہے کہ اسے اس کے دشمنوں سے بچایا جائے۔ ایک موٹر کار باہر انتظار کررہی تھی۔ اسے جلدی سے اس میں بٹھا کر فرانس سے باہر لے گئے اور آسٹریا کے ایک قلعے میں قید کردیا۔

آسٹریا کا شہنشاہ ملکہ میری انٹائنٹ کا بھائی تھا۔ جب اس نے اس لڑکی کی غیر معمولی کارگزاریوں کا ذکر سنا تو اس نے ایک خاص کمیٹی بنائی تاکہ وہ اس کے مقدمے کی تفتیش کرے۔ اس اثنا میں فرانسیسی اخبارات میں تھیروئن کی تقدیر پر سخت تشویش پیدا ہوگئی۔ اس واقعہ سے تمام دنیا میں سنسنی پھیل گئی۔ ہر شخص کا تخیل ایک ہی داستان کے گرد چکر کاٹنے لگا جس کا تعلق بلجیم کے کسان کی لڑکی سے تھا اور جو ایک انگریز امیر کی بیوی ہوتے ہوتے ایک انقلابی بن گئی تھی۔ تفتیش کے دوران میں تھیروئن نے بڑی مصلحت اندیشی سے کام لیا اور زبانی بیانات دینے سے انکار کردیا۔ اس نے اصرار کیا کہ ہر سوال و جواب تحریری ہونا چاہئے جرح چھ ماہ تک چلتی رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس کمیٹی کا صدر اس قیدی پہ فریفتہ ہوگیا اور اس مقدمے کی کاروائی ختم کرکے اسے بری کردیا اور وائنا لے جاکر اسے شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ اس لڑکی کی شخصیت میں اس قدر جاذبیت تھی کہ خود شہنشاہ بھی اس کے حسن سے مسحور ہوگیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسے بروسیلز بھیج دیا جائے اور وہ وہاں کے نوجوان گورنر میٹرنچ سے ملے۔ تھیروئن اس ماہر سیاست داں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس لئے اس پر جو نگرانی ہوتی تھی ہٹالی گئی اور وہ بھاگ کر پیرس آگئی۔

انقلاب کا طوفان اس وقت عروج پر تھا۔ تھیروئن ٹھیک اس وقت پیرس پہنچی جب ٹولریز پر ہلّا بولا جارہا تھا۔ اس کی بے چین طبیعت کا تقاضا تھا کہ وہ عوام کی سرکردگی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ عوام نے اس کو اسی وقت پہچان لیا۔ لیکن اس کے بجائے کہ اس کا ایک پرجوش استقبال کیا جاتا جس کا ہر وہ انقلابی جو دشمن کے ہاتھوں سے بچ نکلے، مستحق ہے۔ لوگوں نے اس پر غصہ اتارنا شروع کیا۔ پیرس کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ انقلاب کے رازوں کو ظاہر کردینے کی وجہ سے چھوڑ دی گئی ہے۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ وہ اپنی ہوشیاری سے آسٹریا سے بھاگ آئی ہے۔ تھیروئن کو پکڑ لیا گیا اور اس کے کپڑے اتار کر اسے بے رحمی سے مارا گیا۔ اس میں کچھ سانس باقی تھا کہ اسے ایک تالاب میں پھینک دیا گیا۔

## رس ترنگ

ڈر کیا ہے سب اپنے ساتھی سب اپنے پیارے بیٹھے ہیں
پتوار سے اپنے پیار کی ہم یہ ناؤ سہارے بیٹھے ہیں
جو کہ کے گئے تھے آئیں گے آئے نہیں اب کیا آئیں گے
جو ان کے بھروسے بیٹھے تھے اب تک وہ بچارے بیٹھے ہیں
جب بیچ بھنور میں آتی ہے کیسے نیّا چکراتی ہے
اس ہلچل کو وہ کیا جانیں جو لوگ کنارے بیٹھے ہیں
او کھیوٹ لنگر کھول بھی دے اب کھولے یا اس پار لگے
بھگوان کی آشا پر لے چل سب اس کے سہارے بیٹھے ہیں
دیپک پہ پتنگا جل بجھ کر کیا منہ کو ہمارے تکتا ہے
ہم نے بھی داؤں لگایا تھا ہم بھی کچھ ہارے بیٹھے ہیں
منجدھار میں ڈر کر آپس میں اک دوسرے پر کیوں دوش رکھیں
اب مرنا جینا ساتھ کا ہے اک ناؤ میں سارے بیٹھے ہیں
گھبرا کے دکھوں سے جیون کے اکتا کے مزاشا سے جگ کی
مت چھیڑ کہ ہم اپنے من میں کچھ اور بچارے بیٹھے ہیں
اے کوئل اتنی کوک نہ تو اک ہوک سی من میں اٹھتی ہے
تیرے ہی جیسے اور یہاں کچھ پریت کے مارے بیٹھے ہیں
رہ رہ کر بجھتے جاتے ہیں آشا کے سب دیپک عشقی
ہم گھور اندھیرے میں پھر بھی جگنو کے سہارے بیٹھے ہیں

عشقی جبلپوری

عین وقت پر اس کے کچھ ہی خواہوں نے اسے بچا لیا۔

اس عجیب و غریب برتاؤ نے تھیروئن کی ہمت پست کردی۔ اس کی غیور طبیعت اس ذلت اور بے حرمتی کے خیال تک کو برداشت نہ کرسکتی تھی جو غیر منصفانہ طور پر اس کے ساتھ برتی گئی۔ اس کا دماغ الٹ گیا۔ اور اسے سالپٹریر کے مشہور پاگل خانے میں ڈال دیا گیا۔ یہ آخری مدت بھی کتنی ہیبتناک اور عبرتناک تھی کہ وہ انھیں ٹورنیہ کے سامنے بیس سال پاگل خانے میں قید رہ کر چل بسی۔ اس کے کپڑے ہمیشہ اس کے آنسوؤں سے تر رہتے اور وہ اپنے برہنہ جسم کو آنسوؤں سے اس طرح بھگوتی جیسے وہ اپنی ذلت۔ بے حرمتی اور تضحیک کو دھو ڈالنے کی ناکام کوشش کررہی ہو۔ وہ بھی زمانہ تھا جب تھیروئن کا نام ہر کس و ناکس کی زبان پر تھا لیکن اس کی موت ایک لاچار غریب، بے کس اور بے بس کی موت تھی۔

(انیلس میچز کے شکریہ کے ساتھ)

# ہندی شاعری میں گیت

چرنجیت

لفظ گیت سنسکرت کے مصدر "گئی" ( गै ) سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں گانا۔ چنانچہ موٹے طور پر گیت سے مراد وہ خاص نظم ہے جو باقاعدہ سُر اور تال میں گائی جاسکے۔ تو گیت کے لئے اس کا گایا جانا شرط ہے۔ اس لئے یہ بند ہلکا اور مختصر سا ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ نرم و نازک شیریں اور لوچدار ہوتے ہیں۔ بندش سیدھی سادی، معنوی پہلو کی نسبت صوتی پہلو زیادہ نمایاں، ہر مصرع ایسا کہ سنتے ہی سمجھ میں آجائے۔ ایک بھی مبہم اور پیچیدہ مصرع سارے گیت کی خوبصورتی اور لطافت کو تباہ کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ گیت کا مضمون بھی بہت گہرا، ازحد فلسفیانہ، اور خشک نہیں ہونا چاہئے۔ سارے گیت میں ٹیپ کا مصرع سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اسے ٹیک یا ستہائی بھی کہتے ہیں۔ اسی ایک مصرع پر سارے گیت کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اسی ایک مصرع سے گیت کی یکجہتی قائم رہتی ہے' اسے ایک دھاگا! سمجھئے جو بکھرے ہوئے مصرعوں یا بندوں کو ہئیت اور موضوع کے اعتبار سے ایک مالا میں گوندھے رہتا ہے۔ موسیقی کے نقطۂ نظر سے بھی ٹیپ کا مصرع بہت اہم ہے۔ دو چار ہم قافیہ مصرعوں کے بعد تال کے سم کی طرح جب اس کا اعادہ ہوتا ہے تو ایک عجیب سی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔

بعض لوگ موضوع کے لحاظ سے گیت کے دائرے کو بہت ہی محدود کر دیتے ہیں۔ وہ صرف اسی چیز کو گیت کہتے ہیں جس کا موضوع صرف حسن و عشق ہو۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ گیت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے داخلی انداز نظر۔ چنانچہ مندرجہ بالا ہئیت کی جو بھی گائی جانے والی نظم انسانی قلب کے لطیف جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اسے ہم گیت ہی کہیں گے۔ اس طرح گیت کے موضوعات حسن و عشق کے علاوہ اور بھی کئی ہو سکتے ہیں۔

ہندی شاعری میں گیت کی عمر لگ بھگ پانچ سو سال ہے۔ اس پانچ سو سال کے عرصے میں اس میں ہئیت اور موضوع کے لحاظ سے کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ بذات خود گیت کا لفظ سنسکرت کا ہونے کی وجہ سے بہت ہی پرانا ہے۔ سنسکرت کے لٹریچر میں اس کا کافی استعمال ہوا ہے۔ کالیداس کے ڈراموں میں یہ لفظ گائی جانے والی نظموں کے لئے اکثر آتا ہے۔ لیکن ہندی کے گیت پر جس سنسکرت نظم کا سب سے زیادہ اثر پڑا وہ گیت گووند۔ اسے بکرم کی بارھویں صدی میں بنگال کے جے دیو نامی ایک مشہور سنسکرت شاعر نے لکھا تھا۔ اس میں جے دیو نے رادھا اور کرشن کو ہیرو اور ہیروئن تصور کر کے حسن، محبت اور فرقت کے بارے میں نہایت ہی لطیف اور دلکش انداز میں الگ راگنیوں کے ڈھانچوں میں پر ایسے چھوٹے چھوٹے پدوں کی تخلیق کی کہ سنسکرت ادب میں ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔ سنسکرت شاعری میں تک بندی کا سرے سے ہی رواج نہیں۔ سب سے پہلے جے دیو نے ہی اپنے گیت گووند میں تک کا استعمال کیا۔ اسی طرح اس نے انجانے ہی آنے والے ہندی شاعروں کے لئے ہئیت اور موضوع کے لحاظ سے گیت کا موڈل سا تیار کر دیا۔

دھیرے دھیرے سنسکرت عام جنتا کی زبان سے بچھڑتی گئی۔ اس کی جگہ پراکرت نے لے لی۔ اسی نے آگے چل کر لوک گیتوں کو جنم دیا۔ اور ان لوک گیتوں نے ہی ہندی گیتوں کے لئے میدان تیار کیا۔ شروع کی ہندی میں تو زیادہ تر رزمیہ نظمیں ہی لکھی گئیں تو بھی کہیں کہیں ہمیں ناتھ پنتھیوں اور بھاٹوں کے رچے ہوئے گیت ملتے ہیں۔ امیر خسرو کی بہت سی چیزوں کو ہم گیت کہہ سکتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً ہندی شاعری میں گیتوں کی روایت بزم کی چودھویں صدی سے شروع ہوتی ہے جبکہ بھگتی کی لہر ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی۔ اس زمانہ میں سنت اور بھگت کویوں نے گائی جانے والی نظموں کے ذریعے اپنے متوں اور عقیدوں کا عوام میں پرچار کیا۔ اولین بھگت کوی ودیاپتی نے سنسکرت کے شاعر جے دیو کی طرح رادھا اور کرشن کی پاک اور روحانی محبت کو لے کر رس بھرے رنگین گیت لکھے یہ گیت فن شاعری کے ایسے شہ پارے ہیں کہ صدیاں بیت جانے پر بھی ان کی دلکشی اور تازگی میں فرق نہیں آیا۔ ودیاپتی کے بعد مہاتما کبیر کا جنم ہوا اور ان کی بانی سے ملک کا کونہ کونہ گونج اٹھا۔ عام طور پر لوگ ان بھگت اور سنت کویوں کی سموچی بانی کو پدوی یا بھجنوں کے نام سے پکارتے ہیں لیکن ادبی لحاظ سے ہم انھیں گیت ہی کہیں گے۔ کبیر جیسے سنت کویوں نے جہاں تصوف کے رنگ میں رنگ کر اپنے آستری اور ایشور کو اپنا پریتم سمجھ کر پکارے ہیں' وہاں ہمیں گیت کا صحیح نمونہ ملتا ہے۔ مہاتما کبیر کے علاوہ گورو نانک، دادو اور ریداس کی بانی میں بھی ہمیں گیتوں کا خزانہ ملتا ہے ان میں تڑپ ہے کسک ہے، مستی ہے اور خلوص۔

ان سنت کویوں کے بعد سورداس، تلسی داس اور میرا جیسے کرشن اور رام بھگت کویوں کا زمانہ آتا ہے۔ تلسی داس جی تو رامائن کی وجہ سے ہی زیادہ مشہور ہیں جو چوپائیوں اور دوہوں میں لکھی گئی ہے۔ انہوں نے بھگتی بھاؤ کے پد بھی لکھے۔ لیکن سورداس اور میرا کے ہاں ہمیں ہندی گیت کی

تکنیک کا نکھرا ہوا روپ ملتا ہے۔ سورداس جی برج بھاشا کے کوی تھے۔ جتنی مٹھاس، لوچ، اور موسیقی برج بھاشا میں ہے اتنی شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں ہو۔ ایسی بھاشا کو جب سورداس جیسا فن کار مل جائے تو سونے پر سہاگے والی بات سمجھئے۔ سورداس جی بھگت اور شاعر ہونے کے علاوہ موسیقی کے بھی ماہر تھے، چنانچہ انھوں نے اپنا ہر ایک پد لے، سر اور تال میں راگ راگنیوں کے ڈھانچے پر ہی تیار کیا۔ بھگوان کرشن کے جیون کی ساری کہانی انھوں نے گیتوں میں ہی بیان کی جو سور ساگر کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں وہ جواہر پارے بھرے ہوئے ہیں کہ آدمی عش عش کر اٹھتا ہے۔ ایک ایک سطر میں فن شاعری، موسیقی اور بھگتی کی تربینی بہتی ہے۔ برہ کی شاعری میں تو یہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ بھرمر گیت (بھونرے کا گیت) نام کے مجموعہ میں سورداس نے فرقت زدہ انسانی قلب کے احساسات اور جذبات کی سچی تصویریں کھینچ کر رکھ دی ہیں۔

جہاں تک خلوص، سادگی اور داخلی انداز نظر کا تعلق ہے میرا کے گیت سورداس کے گیتوں کو بھی مات کرتے ہیں۔ اپنے گردھر گوپال کے پریم میں ڈوب کر میرا نے جو کچھ بھی گایا، اس میں اپنی سچی لگن بیکلی اور کسک کو انڈیل کر رکھ دیا ہے۔ ان گیتوں میں نہ تو تصنع ہے اور نہ سجاوٹ۔ پریم دیوانی میرا اپنے محبوب کے قدموں میں گیتوں کے پھول چڑھاتی جاتی ہے اور بے سدھ ہو کر ناچتی جاتی ہے حتیٰ کہ بھگت اور بھگوان میں بھید ہی مٹ جاتا ہے۔

بھگتی لہر کے دور میں گیت لکھنے والوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جاتی ہے۔ تقریباً سبھی سنت اور بھگت شاعروں نے اپنے محبوب کے دربار میں گیتوں کے ہی ذریعہ اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کیا۔ اسی دور کو اگر ہم ہندی گیتوں کا سنہری زمانہ کہیں تو بجا ہوگا۔ اس کے بعد ہندی شاعری میں ڈیڑھ دو سو سال کا ایک ایسا دور آتا ہے جب شاعری قانون اور قاعدوں میں بندھ کر رہ گئی اور اس میں تصنع آگیا۔ بیشتر کوی راجاؤں، مہاراجاؤں کے دربار میں پناہ گزیں ہو کر نفس پرستی

## طوفانِ تمنّا ——— شاد صابری انبہٹوی

اللہ رے افزائش ارمانِ تمنّا ‏ — ہے دل سے فزوں وسعتِ دامانِ تمنّا
دنیائے محبت ہی پریشانِ تمنّا ‏ — ہے قابلِ عبرت مرا ارمانِ تمنّا
صحرا ہوا پرنور مرے داغِ جنوں سے ‏ — ہر ذرّہ بنا شمعِ شبستانِ تمنّا
تحریرِ مقاصد کی نئی شان تو دیکھو ‏ — جو حرف مٹا، بن گیا عنوانِ تمنّا
اے چارہ گرو حال پہ میرے مجھے چھوڑو ‏ — انسان کے بس میں نہیں درمانِ تمنّا
وہ رنگ تمنّا ہوا ہر رگ سے نمایاں ‏ — ہر ایک سمجھتا ہے مجھے جانِ تمنّا
محرومیٔ مقصود کا شاید یہ اثر ہے ‏ — تجدید تمنّا ہوئی اعلانِ تمنّا
یہ سوچ کے آیا ہوں سرِ عالمِ بالا ‏ — ہوتا ہے یہاں تذکرۂ شانِ تمنّا
مجروحِ محبت کی طرف آپ بھی دیکھیں ‏ — ہر زخم ہے رشکِ گلِ بستانِ تمنّا
اے قلزمِ امید تری موج کے صدقے ‏ — ہر قطرہ سے پیدا کیا طوفانِ تمنّا

آنکھیں بھی ہیں زیرِ اثرِ کاوشِ دل شاد
ہر اشک ہے شرمندۂ احسانِ تمنّا

اور نسوانی حسن و عشق کی باریک بینیوں میں گم ہو گئے۔ یہ زمانہ "ریت کال" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں گیتوں یا پدوں کی جگہ زیادہ تر کوت اور سویے ہی لکھے گئے۔ ویسے تو اس دور میں بھی گیتوں کی تخلیق جاری رہی، لیکن کوئی بھی شاعر سورداس اور میرا کے پائے کو نہ پہنچ سکا۔

۱۸۵۰ء میں بھارتیندو ہریش چندر جی پیدا ہوئے۔ انھوں نے ہندی شاعری کو "ریت کال" کی دلدل سے نکالا اور موجودہ دور کی چوکھٹ پر پہنچایا۔ بھارتیندو جی کا زمانہ ہندی شاعری کا عہد نو کہلاتا ہے۔ پہلے پہل انھوں نے ہی روایتی اسلوب سے بغاوت کی۔ شاعری کی ہیئت اور موضوع دونوں میں ہی تبدیلیاں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔ برج بھاشا کی جگہ کھڑی بولی لینے لگی۔ ملک میں حب الوطنی اور قومیت کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ ہندی کے شاعروں نے اپنی قومی گراوٹ پر نظر ڈالی۔ ان تمام باتوں کا گیتوں کی شاعری پر بھی اثر پڑا۔ بھارتیندو ہریش چندر موسیقی میں بھی دخل رکھتے تھے۔ اپنے دور کے تمام رجحانات کے مطابق انھوں نے اعلیٰ پائے کے گیت لکھے۔ دیش بھگتی اور قومی گراوٹ کے علاوہ انھوں نے محبت کے پاک جذبہ کو بھی گیتوں کا موضوع بنایا۔

ان کے بعد برج بھوشن کی کوئل، کملا نے ونسے، پنڈت ستیہ نارائن کوی رتن، پنڈت شری دھر پاٹھک اور دوسرے نئے شاعروں نے بھی جدت کا ثبوت دیا۔ پنڈت شری دھر پاٹھک کے سکوٹ لڑکوں کے لئے لکھے گئے مارچنگ گیت بہت مشہور رہے۔

اب ہم موجودہ دور میں پہنچتے ہیں۔ ہندی ادب کے ہر شعبے میں انقلاب پیدا ہوا۔ برج بھاشا کی جگہ کھڑی بولی نے لے لی۔ ہندی شاعری کی کایا ہی پلٹ گئی۔ زبان اور مضمون کے لحاظ سے نئے نئے تجربے ہونے لگے۔ نئی بحریں نئے استعارے، اشارے کنائے، نئی تشبیہیں نئی ترکیبیں استعمال میں آنے لگیں۔ نئے نئے موضوعوں پر طبع آزمائی ہونے لگی۔ کوت۔ سویے۔ دوہے اور چھپے وغیرہ لکھنے کا رواج جاتا رہا۔ شاعرانہ اظہار کے لئے صرف دو ذریعوں نے ہی مقبولیت حاصل کی

یعنی نظم اور گیت جو ماتراؤں کے حساب سے لکھے جاتے ہیں۔ شروع شروع میں کھڑی بولی گیتوں کے لئے موزوں نہیں تھی۔ برج بھاشا جیسی مٹھاس لوچ اور نزاکت اس میں نہ تھی۔ لیکن نئے شاعروں کی پیہم کوششوں سے دھیرے دھیرے اس میں بھی وہی بات پیدا ہو گئی۔ اس سلسلے میں جے شنکر پرشاد میتھلی شرن گپت، مہا دیوی ورما، نرالا، سمترا نندن پنت اور رام کمار ورما کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شروع میں گیتوں کی شاعری پر انگریزی لریک اور ٹیگور کے گیتوں کا کافی اثر پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ ہر شاعر نے نئی راہیں ڈھونڈ نکالیں اور گیت کی ٹیکنیک کو کمال کی حد تک پہنچا دیا۔

جے شنکر پرشاد (مرحوم) ہندی ادب میں رومانٹک شاعری کے جنم داتا مانے جاتے ہیں۔ بھارتیندو دور کی شاعری کے خاکے میں انھوں نے ہی رنگ روپ اور زندگی بھری۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی نظریں زیادہ ہندوستان کے شاندار ماضی کی طرف رہیں۔ لیکن گیت کار کے روپ میں ہم انھیں حال، ماضی، اور مستقبل کی حد بندیوں سے بہت اوپر پاتے ہیں۔ ایک ایک سطر انسانی قلب کی دھڑکن، پیاس، تڑپ اور مستی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ایک ایک بیت حسن اور شباب کے دربار میں سجدہ کرتا ہے۔ جے شنکر پرشاد نے بھی نظموں کے علاوہ لگ بھگ ایک درجن اعلےٰ پائے کے ڈرامے لکھے۔ ان ڈراموں میں جگہ جگہ موتیوں کی طرح گیت بکھرے ہوئے ہیں۔

نرالا اور سمترا نندن پنت اسی سکول کے شاعر ہیں۔ لیکن دونوں کا اپنا اپنا رنگ ہے۔ سوریا کانت ترپاٹھی نرالا سنسکرت، انگریزی اور بنگلہ کے عالم ہیں اور موسیقی میں دسترس رکھتے ہیں۔ گیتوں کی ساخت کے اعتبار سے انھوں نے سب سے زیادہ تجربے کئے ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں نئی بحریں، نئی ترکیبیں اور نئی تراشیں ملتی ہیں۔ ہر ایک گیت علم موسیقی کے اصولوں پر پورا اترتا ہے۔ بعض گیت انھوں نے آزاد نظم میں بھی لکھے ہیں جن کی لے اور ترنم میں ایک عجیب سی دلکشی رہتی ہے۔ پہلے ان پر رومان اور تصوف کا رنگ غالب تھا جس کی وجہ سے ان کے گیت ابہام سے پاک نہ تھے۔ ان کے نئے گیتوں میں ہیئت موضوع اور اظہار کے اعتبار سے بہت ہی سادگی آگئی ہے۔ ان کے آج کے گیت جنتا کے گیت ہیں۔

سمترا نندن پنت بنیادی طور پر رومان کے شاعر ہیں۔ لیکن آجکل ترقی پسندوں کے علمبردار ہیں۔ کھڑی بولی کو شاعری کے قابل بنانے میں ان کا سب سے زیادہ ہاتھ رہا ہے۔ اپنے گیتوں اور نظموں میں نرم و نازک اور حسین الفاظ استعمال کرنے کے لئے مشہور ہیں جتنے حسین ان کے الفاظ ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کا تخیل ہے۔ ان کے گیتوں میں ایک خاص قسم کا ترنم اور روانی ہوتی ہے۔ آج کل پنت جی فلمی دنیا میں پہونچے ہوئے ہیں۔

جہاں تک خالص گیت کا تعلق ہے موجودہ شاعروں میں کوئی بھی مہا دیوی ورما کی برابری نہیں کر سکتا۔ ان کے گیت ایک لحاظ سے شاعری کی معراج ہیں۔ مہا دیوی ورما کو اگر میرا بائی کا اوتار کہا جائے تو بجا ہوگا۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں میرا کا محبوب انسانی پیکر میں تھا وہاں مہا دیوی کا محبوب کوئی غیب میں بسنے والی ذات ہے۔ ان کے گیتوں کے لفظ لفظ میں دل کی گلابی کسک پیاسی آنکھوں کی رنگینی بے کلی سموئی ہوئی ہے۔ ہندی کے موجودہ دور کی یہ واحد صوفی شاعرہ ہیں، ان جانے اور ان دیکھے محبوب کے انتظار میں جلتا ہوا زندگی کا عنبریں چراغ لگاتار گیتوں میں اور خوشبو بکھیر رہا ہے۔

ڈاکٹر رام کمار ورما اسی صوفیانہ سکول کے شاعر ہیں۔ رام کمار کے گیتوں میں مٹھاس اور لوچ کسی سے کم نہیں۔ احساسات تو اتنے گہرے نہیں ہاں تخیل کی پرواز خاصی بلند ہے۔ گیتوں میں زندگی کا فلسفہ تو ہے، لیکن کافی رنگین اور لطیف انداز میں۔ ہندی کے اس گروپ کے گیت کاروں میں بھگوتی چرن ورما کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ان کی رومانیت میں ایک عجیب سی تلخی اور پیاس سموئی رہتی ہے۔ ان کا زیادہ رجحان حقیقت نگاری کی طرف ہے۔

پنڈت بال کرشن شرما نوین بھی پرانے اور سریلے ہوئے گیت کاروں میں سے ہیں مستی اور والہانہ پن ان کے گیتوں کی خصوصیت ہے۔ قومی شاعر میتھلی شرن گپت نے زیادہ تر منظوم داستانیں لکھی ہیں لیکن گیتوں کی طرف بھی انھوں نے توجہ دی ہے یشودھرا نام کی اپنی ایک مشہور کتاب میں انھوں نے گیتوں کے ہی ذریعے مہاتما بدھ کی بیوی کی پرسوز کہانی بیان کی ہے۔ گیت کار کی حیثیت سے دو نوں شاعروں کے نام بہت اجاگر ہیں۔ میری مراد ہے بچن اور نریندر شرما سے۔ بچن کا رنگ تو سب سے نرالا اور جدت لئے ہوئے ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے ہندی شاعری میں اپنا ایک الگ سکول قائم کیا ہے جسے عوام میں سب سے زیادہ مقبولیت ملی ہے۔ ان کے گیت ابہام سے پاک اور سیدھے سادے ہوتے ہیں اور ایک عام انسان کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں قنوطیت اور داخلیت کا عنصر بہت ہی نمایاں ہے بچن کا ہر ایک گیت حقیقت نگاری کا مجسمہ ہے۔ بعض جگہ بچن نے نفسیاتی جذبات کی ترجمانی کرتے وقت کافی بیباکی سے کام لیا ہے۔ بعض گیتوں میں موجودہ سماج، نظام اور مذہب کے خلاف بغاوت کے سر بھی ہیں۔ آسان اور محاورے دار زبان کے استعمال میں یہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اسلوب بیان تو نہایت ہی دلکش ہے۔ فنی اعتبار سے ان کے گیت بہت اونچے ہیں۔

نریندر شرما کے گیت بھی فنی اعتبار سے اونچے درجے کے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہیں۔ ان پر بھی قنوطیت اور داخلیت کا رنگ غالب ہے۔ نریندر شرما نے لوک گیتوں کے ڈھنگ پر بھی کچھ ایک اچھے گیت لکھے ہیں۔ ہجر و وصال کے موضوع پر لکھے گئے ان کے

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

# موئترا

افسانہ

نورالحسن انور

میں نے اپنے دوست کے دروازہ کی گھنٹی پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ یکایک دروازہ کھلا اور دو چمکدار سیاہ آنکھوں نے میری طرف دیکھا۔ میں اس سے پہلے بھی ان آنکھوں کو دیکھ چکا تھا — چمکدار سیاہ آنکھیں — اور پھر ایک نقرئی آواز نے مجھ سے سوال کیا۔ -کون؟- دروازہ کے پٹ بند کر دئے گئے۔ میں نے اپنا نام بتایا اور اس حسین دوشیزہ نے اپنے خاص لہجہ میں جواب دیا — "وہ! معاف فرمائیے۔ آپ کو زحمت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے کچھ دوستوں سے ملنے کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔" یہ کس قدر حسین جواب تھا۔ میں نے اپنے کسی دوست کے ہاں کبھی اس طرح کا جواب نہیں سنا تھا۔ نوکر! بھلا ان بیچاروں کو تہذیب اور زبان کہاں سے آئے۔ اس لڑکی کے جواب سے مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس سے کچھ اور باتیں کروں۔ میں نے اس سے اپنے دوست کے متعلق کچھ اور سوالات کئے مثلاً وہ گھر سے کب گئے ہیں اور کب واپس آئیں گے اور مجھے ہر سوال کا انتہائی دلچسپ جواب ملتا رہا۔ میں جب کبھی اس لڑکی سے باتیں کرتا تو مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوتا کہ میں ایک نوکرانی سے باتیں کر رہا ہوں بلکہ میں سمجھتا کہ میں کسی جوان خاتون سے مصروف گفتگو ہوں۔ میں محبت بھری نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا۔ مجھے اس کا چہرہ بے حد پسند تھا۔ اس کی چمکدار سیاہ آنکھوں میں معصومیت اور مایوسی کی جھلک تھی۔ جب وہ ابتداً میرے دوست کے گھر آئی تھی تو وہ صحیح اردو بول نہیں سکتی تھی مگر اپنی ذہانت کے سبب اب اس نے اردو گفتگو میں خوب مہارت پیدا کی۔ اس کی آواز میں لوچ تھا — غضب کا لوچ۔

مجھے کئی بار خیال آیا کہ اپنے دوست سے اس لڑکی کے متعلق دریافت کروں۔ اس کے لہجے اور لباس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بنگالی لڑکی ہے۔ اگرچہ مجھے اس لڑکی سے بے حد دلچسپی پیدا ہو گئی تھی مگر یہ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اپنے دوست سے یا خود لڑکی سے اس کے متعلق کچھ دریافت کروں۔ میں اس تجسس کو ان دونوں میں سے کسی پر بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بالآخر ایک دن میرا دوست اور میں ندی کی سیر کرنے گئے۔ موسم انتہائی خوشگوار تھا اور ہم دونوں میں دلچسپ گفتگو ہو رہی تھی۔ باتوں باتوں میں ان بیاہوں کا ذکر آیا۔ غیر شادی شدہ انسان کی زندگی بھی کتنی غیر دلچسپ اور خشک ہوتی ہے ——

مجھے مدتوں سے چھپی ہوئی خواہش کے پورا کرنے کا موقع مل گیا ——

"جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے اپنے غیر شادی شدہ ہونے کا کوئی افسوس نہیں۔ میں شادی کے جملہ فائدوں کا لطف اٹھاتا ہوں۔ اور جہاں تک شادی کے نقصانات کا تعلق ہے —— میری موئترا مجھے اس سے محفوظ رکھتی ہے۔"

"تمہاری موئترا" میں نے جواب دیا۔ "وہی حسین اور شریف لڑکی جو روزانہ میرے لئے دروازہ کھولتی ہے؟ وہ ایک شریف نوکرانی معلوم ہوتی ہے! اس کی ہر حرکت اس کی نفاست کا ثبوت دیتی ہے۔"

"وہ میرے لئے کچھ بھی ہو" ڈاکٹر نے کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے اس کے متعلق کچھ نہ کہنا چاہئے لیکن میں اپنی خوش مزاجی اور بعض معاملات میں وسیع النظری کے لئے موئترا کا ممنون ہوں۔ وہ ایک بنگالی لڑکی ہے۔ میں نے اسے گذشتہ سفر میں اتفاقاً پا لیا۔"

"میں ہمیشہ یہ خیال کرتا تھا کہ وہ بنگالی ہے —— کیا وہ یتیم ہے؟ مجھے اس کی افسردگی میں کوئی دردناک قصہ پوشیدہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مظلوم چہرہ نے مجھے عجیب طور پر متاثر کیا ہے۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر کچھ تامل محسوس کر رہا تھا لیکن پھر اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے میں اس غریب لڑکی کی کہانی تمہیں سنا دوں۔ اس امید پر کہ تمہیں معلوم ہو کہ اس لڑکی کے متعلق میرے ارادے نیک ہیں —— تو پھر سنو۔ اپنے بنگال کے سفر کے دوران میں مجھے ایک دیہات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ پیر کا دن تھا اور ایک دریا کے کنارے مندر سے گھنٹی کی لطیف آواز سنائی دے رہی تھی۔ سندر ناریاں اپنی سکھیوں کے ساتھ پوجا کے لئے مندر جا رہی تھیں۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ ان کا بھڑک دار لباس اور ادائیں بتا رہی تھیں کہ وہ امیر گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ خوش مزاج نوجوان بھی مندر کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے ان سب لڑکیوں میں دو چیزیں مشترک نظر آئیں۔ ان کی خاص طریقہ کی ساڑی اور ان کی لمبی لمبی زلفیں۔ میں سراپا توجہ بنا ہوا ان ناریوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ مندر کی طرف چل دیا اور شمالی جانب برگد کے سایہ تلے کھڑا ہو گیا۔ یہاں میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک حسین لڑکی جس کا چہرا گیندے کے پھول کی طرح زرد تھا سفید ساڑی پہنے ہوئے مندر کی طرف تیزی سے جا رہی تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس نے بعض لڑکیوں کو پرنام کیا مگر کسی نے اس کا جواب نہ دیا اور اس طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس لڑکی کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو اس کے زرد رخسار پر ڈھلک گئے: جیسے گیندے پر شبنم۔ اب وہ لڑکی ایک املی کے درخت کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ میں اس کے قریب ہی کھڑا تھا مگر اسے میری موجودگی کا احساس نہ تھا۔ وہ سرد آہیں بھرتی ہوئی انتہائی مایوسی سے اپنے ہاتھ مل رہی تھی۔ اس مظلوم لڑکی سے مجھے کچھ ہمدردی سی ہو گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کس طرح گاؤں کی لڑکیاں اس پر نفرت کی نظر سے، اس پر مسکراتی ہوئی مندر میں داخل ہو رہی تھیں اور وہ اکیلی اپنی قسمت پر رو رہی تھی۔ شاید لڑکیوں کے مذاق کا اس کے پاس یہی جواب تھا۔

میں حیران تھا کہ آخر اس لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جاتا ہے۔ اتنے میں میں نے کچھ نوجوانوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا مجھے کچھ اشارہ مل گیا۔ اس بدنصیب لڑکی کے غم کا سبب کچھ کچھ میری سمجھ میں آیا۔ وہ غریب لڑکی ہنسی، مذاق، نفرت آمیز گفتگو اور طنزیہ فقروں کا مقابلہ کرتی ہوئی بڑی دیر تک اس درخت کے نیچے کھڑی رہی، حسین زرد چہرے والی غریب لڑکی ——— دفعتاً وہ بالکل سیدھی کھڑی ہو گئی جیسے کہ کسی طاقتور جذبہ نے اسے بیدار کیا ہو اور ایک تنگ وادی کی سمت چلنے لگی۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ ندی کے کنارے وہ رک گئی۔ میں فوراً اس کے پیچھے آگیا اور اسے میری موجودگی کا کوئی احساس نہ تھا۔ وہ دوزانو ہو کر بیٹھ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی ——— وہ خاموش عبادت میں مشغول تھی۔ اس کے بعد خود کو ندی کی موجوں کے حوالے کرنے کے لئے کھڑی ہو گئی ..... اس نے بڑی دیر بے ہوش رہنے کے بعد آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ وہ میرے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی جو گاؤں کی سرائے میں تھا۔ میں ندی سے اسے یہاں اٹھا کر لے آیا تھا۔ مجھے گاؤں والوں کی نکتہ چینی کی کوئی پروا نہ تھی مجھے ان کی نفرت کا کوئی ڈر نہ تھا۔ جب اچھی طرح ہوش میں آ گئی تو میں نے اسے بتایا کہ میں کون ہوں۔

میں نے جو کچھ کہا اس نے اس پر عمل کیا اور اسے گہری نیند میں دیکھ کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس سے مجھے لڑکی کے متعلق تفصیلات دریافت کرنے کا موقع مل گیا۔ سرائے کے مالک، میرے میزبان نے جو اس لڑکی کا استاد بھی تھا مجھے لڑکی کے سارے حالات سنائے۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس نے اپنی گفتگو میں غیر ضروری مبالغہ اور بھونڈے مذاق کو زیادہ جگہ دی ہے۔ میرے لئے اس گفتگو سے سچائی کو الگ کرنے میں کوئی مشکل نہ تھی۔ اس غریب لڑکی کی کہانی اس طرح کہی جا سکتی ہے۔

یہ گاؤں جہاں مجھے ایک انسانی زندگی بچانے کا موقع ملا اس لڑکی کا پیدائشی مقام تھا۔ یہ گاؤں چونکہ وادیوں میں، دیگر مقامات سے دور واقع تھا اس لئے یہاں کے بسنے والوں میں عجیب عجیب عقیدے، عادات اور خیالات پیدا ہو گئے تھے۔ یہاں کے رہن سہن کے طریقے بھی دوسرے دیہاتوں سے بالکل مختلف تھے۔ لڑکی کے بچپن ہی میں اس کے بوڑھے باپ کا انتقال ہو گیا جو ایک غریب کسان تھا۔ ایک بڑھیا نے جو اس کے پڑوس ہی میں تھی اس لڑکی کو اپنی بیٹی کی طرح پالا۔ اس بڑھیا کے پاس ناولوں کا ایک کتب خانہ تھا۔ لڑکی کو بڑھیا نے گھر پر تعلیم دی۔ اس لڑکی کو ناول پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ اس سستے لٹریچر کا زہر آہستہ آہستہ لڑکی کے مزاج میں حل ہونے لگا۔ اس کی رومانی تنہائی میں یہی ناول اس کی نفسانی غذا تھے۔ سخت قسم کی تنہائی، دنیاوی معاملات سے قطعی لاعلمی اور کسی ذہنی سرپرست کی عدم موجودگی سے اس کے خیالات و جذبات کے دھاروں کو غلط سمت میں جانے کا بہت موقع ملا۔ اچانک بڑھیا کا انتقال ہو گیا، اور یہ لڑکی دوبارہ یتیم ہو گئی، ایسے وقت جبکہ وہ عادتاً کے ارتقا کے انتہائی نازک دور میں قدم رکھ چکی تھی، وہ قسمت پر چھوڑ دی گئی۔ وہ مہربان سلوک اور مہذب ماحول کی عادی ہو چکی تھی اس لئے گاؤں کی اس سرائے میں، جہاں میں مقیم تھا، نوکر ہو گئی۔ یہ سرائے چھوٹی تھی مگر یہاں اکثر اچھے لوگ ہی ٹھیرا کرتے تھے۔ شہر کے مصروف اور غبار آلود ماحول سے گھبرا کر بعض لوگ اس گاؤں کے پرامن اور خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ادھر آ جایا کرتے تھے۔ یہ لڑکی اپنی غیر معمولی تعلیم کے سبب ان مسافروں میں بہت جلد مقبول ہو گئی اور میرا میزبان اور اس کی بیوی بھی اس پر مہربان ہو گئے۔

ایک دن اس سرائے میں ایک آرٹسٹ آیا ——— جب میں نے اس لڑکی کو یقین دلایا کہ اس کی جیون کہانی مجھے اچھی طرح معلوم ہے تو خود اس نے مجھے یہ واقعہ سنایا ——— وہ نوجوان تھا۔ سیاہ گھنگریالے نرم بال، بار موچھیں اور خشخشی داڑھی۔ آتشی آنکھیں، اونچی پیشانی، اپنی حرکات اور لباس میں لاپروا مگر اپنی گفتگو میں انتہائی دلچسپ ——— جلد ہی وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچے۔ وہ آرٹسٹ ایک امیر آدمی کا ہمراہی تھا۔ اس لئے سرائے میں قیام کی مدت میں اس کی مرضی کو دخل نہ تھا۔ بہر حال وقت کے پینٹ کرنے ——— دو انگوٹھیوں کے تبادلے ——— اور جلد ہی منگنی کے ہونے میں کافی مدت گذر گئی۔ اس منگنی نے غریب لڑکی کی پرمسرت زندگی کو زہر آلود کر دیا۔ آرٹسٹ وہاں سے چلدیا ——— اپنی مرضی کے خلاف اور بقول اس کے شکستہ دل ——— بہر حال وہ چلا گیا۔ دور پہاڑوں اور وادیوں سے بہت دور ——— اور اس لڑکی اور آرٹسٹ کے تعلقات کے متعلق افواہیں پھیلنے لگیں۔ جلد ہی روحانی کرب نے اس کی زندگی تلخ کر دی۔ آخر کار کمزور اور بیمار۔ کئی کئی دنوں بھوکی۔ ہر شخص کے غصہ کا شکار بنتی اور ہر شخص سے سخت سست سنتی۔ اس لڑکی نے زندگی کے دن تنہائی میں کاٹے ——— آخر وہ دن آیا ——— پیر کا دن تھا میں اسی گاؤں میں آیا تھا ——— مندر سے گھنٹیوں کی آواز آ رہی تھی اور لڑکی کے دل میں مندر جانے کی خواہش پیدا ہوئی ——— ایک لطیف احساس نے اس کے دل سے گناہ کا بوجھ ہلکا کر دیا اور وہ دیوتاؤں کی قیام گاہ میں قدم رکھ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہتی تھی۔ وہ دوبارہ پاک ہونا چاہتی تھی! مگر اس کے پاس پہننے کے لئے کپڑے نہ تھے وہ اپنے نازک اور بیمار بدن کو ایک پھٹی ہوئی میلی چادر میں لپیٹے رکھتی تھی۔ اس نے مندر میں جانے کے لئے سرائے کی نوکرانی سے کپڑے طلب کئے۔ نوکرانی نے اس لڑکی کو خالی کمرے میں

جانے کے لئے کہا۔ وہاں ایک ساڑی رکھی ہوئی تھی۔ لڑکی خوف سے کانپنے لگی۔ اب اسے سفید ساڑی پہننی پڑے گی۔ وہ اس میں اپنی انتہائی تذلیل محسوس کرتی تھی۔

"اس گاؤں میں ایک پرانا طریقہ رائج تھا کہ اگر کوئی لڑکی اس قسم کے گناہ کی مرتکب ہو جاتی تو اسے سفید ساڑی کے علاوہ کسی اور رنگ کی ساڑی پہننے کی اجازت نہ تھی۔ تاکہ اسے ہر وقت اپنے گناہ کی یاد آتی رہے اور گاؤں کی دیگر دوشیزاؤں کے لئے عبرت کا سبق ہو۔ ایسی لڑکی کو مندر میں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ دعوتوں میں نہیں بلایا جاتا تھا۔ تہواروں کے موقع پر ایسی لڑکی ناچ کی محفل میں شریک نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سے حد درجہ بھونڈا مذاق کیا جاتا تھا اور جب وہ اپنی قسمت کی شکایت کرتی تو لوگ کہتے اس کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہئے۔ دیکھو تو اس نے سفید ساڑی پہنی ہے۔"

اس لڑکی کو تلخ تجربات نے بتایا تھا کہ محض ایک سفید ساڑی اس پر کس قدر مصیبت نازل کر سکتی ہے۔ سفید ساڑی — ایک دوشیزہ کے لئے انتہائی خوفناک چیز تھی۔ مگر لڑکی مجبور تھی۔ یہ ساڑی پہننے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ وہ ساڑی پہن کر باہر نکلی۔ ہر طرف لڑکے اور لڑکیاں رنگین خوشنما لباسوں میں ملبوس مندر کی طرف جا رہے تھے۔

گاؤں کی اکثر لڑکیاں، موئترا — ہاں یہ لڑکی موئترا ہی تھی — کی بچپن کی سہیلیاں تھیں مگر وہ اب اسے اچھوت سمجھتی تھیں۔ اس کے سایہ سے بھی بچنا چاہتی تھیں — !! موئترا اٹھتے بیٹھتے اس ذلت پر آنسو بہاتی اور مجھ سے یہ دیکھا نہ جاتا تھا۔

میں نے اپنے گھر واپس جانے کا ارادہ اس پر ظاہر کیا اور اسے خود بھی اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ میں نے اس سے اپنے گھر کا سارا انتظام اس کے سپرد کرنے اور اسے عزت سے رکھنے کا وعدہ کیا۔

"میری سادہ طبیعت، میری بے غرض ہمدردی اور میری اچانک دعوت، المختصر میری ہر چیز نے اسے میرے ساتھ چلنے پر آمادہ کیا۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ وہ میری ہر چیز میں شریک ہے۔ اسے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ سوائے —"

"شاید ہم اسے کبھی دیکھ سکیں"۔ میں نے کہا۔ "اس کی بدنصیبی کا سبب کون شخص ہے؟"

"ہاں اس کے یہاں مل جانے کا بہت امکان ہے"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ وہ آرٹسٹ اسی علاقہ کا رہنے والا ہے۔ اور موئترا اب بھی یہی کہتی ہے کہ آرٹسٹ برے دل کا آدمی نہ تھا۔ وہ بے وفا نہیں۔ اور میرے دوست! اگر میں اس آرٹسٹ کو پاؤں تو دونوں کو — کیوں کیا خیال ہے تمہارا؟"

ڈاکٹر یہ تمہارا مشہور ترین کیس ہوگا۔ ایک ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنا! یہ کتنی عظیم الشان کامیابی ہوگی۔ میں نے آج تک جاسوسی نہیں کی ہے۔ لیکن اگر میں اس قسم کے گھنگریالے بال، آتشی آنکھوں، چھوٹی مونچھ اور خشخشی داڑھی والے آرٹسٹ سے ملوں تو اس سے دوستی پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔ ایک گھنٹہ کی ملاقات میں اس کے دل کو چھوؤں گا۔ اس کے ضمیر کے نازک ترین گوشہ میں پہنچ کر اسے بھولا ہوا قصہ یاد دلاؤں گا۔ میں اسے ایک قرض کی یاد دہانی کراؤں گا جو اب تک واجب الادا ہے۔ ایک معصوم لڑکی سے بے وفائی! اگر وہ یہ کہے کہ میری زندگی کی آخری تمنا یہی ہے کہ میں اس غلطی کا کفارہ ادا کروں — تو ڈاکٹر میں کس مسرت سے اس طرف ہاتھ بڑھاؤں گا اور پیارے ڈاکٹر اسے تمہارے پاس لے آؤں گا۔ قسمتوں میں اس طرح انقلاب ایک رحمانی چیز ہوگی!"

خاموشی سے ڈاکٹر نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ بالکل اسی وقت موئترا کمرہ میں داخل ہوئی۔ شاید اس نے دیکھ لیا کہ جب ہم اس کی طرف دیکھ رہے تھے تو ہماری آنکھیں اشک آلود تھیں!!!

---

## ہندی شاعری میں گیت —— بقیہ صفحہ ۵۶

ان کے بعض گیت ہندی شاعری میں بے نظیر ہیں۔

ان کے علاوہ موجودہ دور میں بیسیوں اور ایسے شاعر ہیں جنہوں نے کافی اچھے گیت لکھے ہیں۔ جیسے پنڈت ماکھن لال چترویدی۔ اودے شنکر بھٹ، سیارام شرن گپت، انچل، دِنکر، آرسی پرشاد سنگھ گربا کمار ماتھر، سمترا کماری سنہا، ودیاوتی کوکل، تارا پانڈے، ہوم وتی دیوی چندر مکھی اوجھا سُدھا۔ نیپالی، ہنس کمار تیواری، سمن سدھینہ وغیرہ۔ پچھلے پانچ چھ سال سے نظم لکھنے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہر ایک شاعر گیت کو ہی اپنے شاعرانہ اظہار کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ شاید ہی کسی اور زبان میں گیتوں کی اتنی افراط ہو۔ موجودہ دور کے تقریباً سبھی فلسفوں، تحریکوں اور ذہنی رجحانوں کا ہندی گیت پر اثر پڑ رہا ہے۔ حسن و عشق کے علاوہ انسانی زندگی کے ہر ایک اہم مسئلہ کو گیتوں میں جگہ ملی ہے۔ ملکی آزادی اور اشتراکیت کی ہمہ گیر تحریک نے ان گنت گیتوں کو جنم دیا ہے اور یہ تو طے ہے کہ آج کا گیت ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے میرا اور سورداس کے گیتوں سے بہت مختلف ہے۔

نوٹ:- ۵ مئی کا آجکل شائع نہیں ہوگا۔ اسی شمارے کا صفحہ ۲ ملاحظہ ہو (ادارہ)

# انڈونیشیا کی تہذیبی و تمدنی زندگی

قاسم حسن

انڈونیشیا جزیروں کے اس مجموعہ کا نام ہے جو بحرالکاہل میں ایشیا کے جنوب مشرق کی طرف واقع ہے اور جسے مشرقی مجمع الجزائر یا ایسٹ انڈیز بھی کہتے ہیں انڈونیشیا جن جزیروں سے بنا ہے ان میں سماترا، جاوا، بورنیو اور سیلی بیز تو بڑے جزیرے ہیں اور بالی، لمبک، سمباوا، فلورس وغیرہ چھوٹے جزیرے ہیں۔ اس کل مجموعہ کا رقبہ ۷۳۵،۰۰۰ مربع میل ہے۔

یہ جزیرے خط استوا پر شرقاً غرباً قریب قریب ۴۶ درجہ طول البلد پر اور شمالاً جنوباً ۶ درجہ عرض البلد سے ۱۱ درجہ عرض البلد تک پھیلے ہوئے ہیں اور بحر ہند کو بحرالکاہل سے ملاتے ہیں۔ دنیا کی دوسری جنگ عظیم سے پہلے ان جزیروں پر ڈچ قوم حکمراں تھی لیکن حال میں انڈونیشیا نے بیرونی حکومت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا ہے اور اب وہ ایک جمہوری نظام حکومت رکھنے والا ملک ہے۔ انڈونیشیا یونانی زبان کے دو لفظوں سے بنا ہے۔ ایک "انڈوس" ہے جس کے معنی ہیں انڈیا یعنی ہندوستان اور دوسرا "نیساس" جس کے معنی ہیں جزائر۔ اس طرح پورے لفظ کے معنی ہوئے ہندوستان کے جزائر۔ اسی وجہ سے ہم اردو میں اسے مشرقی جزائر ہند کے نام سے پکارتے ہیں۔

انڈونیشیا کی وہ پرانی تاریخی عمارتیں ہیں جو آٹھویں اور نویں صدی میں بنی تھیں اور آج تک موجود ہیں۔ صناعی کے اعتبار سے اس زمانہ کی یورپی عمارتوں سے کہیں بہتر ہیں۔ اسی طرح اس زمانہ کی جاوی شاعری، تخیل کی بلندی، جذبات کی لطافت اور بیان کی نازکی میں اپنا جواب آپ ہے

قدیم زمانہ میں لکھنے کے فن میں بھی سماترا کے لوگ بہت ترقی یافتہ تھے یہ لوگ اس وقت تحریر کے مختلف طریقوں سے واقف تھے۔ یہ اپنے ملک کے ایک درخت کی اندرونی چھال کے ورق کاٹ لیتے تھے۔ ان ورقوں پہ روشنائی سے عبارت لکھی جاتی تھی اور ان کو لپیٹ کر رکھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی بانس کی گرہ کو بیچ سے چیر کر دو دو تین تین انچ کے ٹکڑے بنا لئے جاتے تھے اور ان ٹکڑوں پر چاقو یا خنجر کی نوک سے حروف کھودے جاتے تھے۔ لکھائی میں صفائی اور خوش خطی پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ انڈونیشیا کے باشندے بالخصوص تبک اور لیمپانگ قومیں جو سماترا میں رہتی ہیں لکھنے پڑھنے میں ہمیشہ مشہور رہے ہیں اور اپنی اس خصوصیت میں وہ آج بھی یورپ کی اکثر قوموں کے برابر ہیں۔ فن موسیقی کے ساتھ بھی انڈونیشیا والوں کو خاص دلچسپی ہے۔ اس فن میں بھی وہ کافی ترقی یافتہ ہیں جاوا اور بالی کے لوگ ہمیشہ موسیقی میں مشہور رہے ہیں۔ رقص اور اداکاری میں بھی یہ لوگ بے مثل سمجھے جاتے ہیں۔ گو یورپ والے تقریباً تین صدیوں سے ان جزیروں پر قابض ہیں لیکن یہاں کے فنون لطیفہ پر یورپ کا اثر بالکل نہ پڑ سکا اور اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ اس معاملہ میں خود انڈونیشیا والوں کے اندر ایجاد کا مادہ اتنا زیادہ موجود ہے کہ یہ تقلید کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس فن میں نئی نئی ایجادیں کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کلاسیکی موسیقی میں بھی تبدیلی کر لینا ان کے نزدیک جائز ہے۔ جاوا اور بالی کو چھوڑ کر انڈونیشیا کے دوسرے حصوں کی موسیقی میں بیرونی اثرات ضرور نظر آتے ہیں اور یہ ان لوگوں کی وجہ سے ہیں جن کی طبیعتوں کو یورپ کی تعلیم نے تربیت کی طرف مائل کر رکھا ہے یا پھر اس نئی نسل کی وجہ سے ہیں جو امریکی مذاق کے سینما سے دلچسپی رکھتی ہے اور اس سے اثر لیتی ہے۔

نغمہ کی اس محبت نے انڈونیشیوں کی خیال کی دنیا میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی ہے، نغمہ جس کی سب سے بڑی خصوصیت سروں کا ربط اور ہم آہنگی ہے چونکہ نغمہ ان لوگوں کی فطرت کا جزو بن گیا ہے اس لئے ہم آہنگی بھی ان کے تخیل پر اس طرح چھا گئی ہے کہ یہ ہمیشہ اپنے ماحول میں اسی کے متلاشی رہتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ لوگ فطرتاً بہت روادار ہو گئے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی کے ساز سے خوشنما نغمے ہر وقت برآمد ہو سکتے ہیں جبکہ اس ساز کے تمام پردے ہم آہنگ ہو کر سُر پیدا کریں۔ یہی بنی نوع انسان کی عام اتحاد ہے۔ اپنے ابنائے جنس کے ساتھ ربط و اتحاد کا یہی جذبہ ان کو زندگی کی ان اعلیٰ قدروں سے ہم آہنگ کر دیتا ہے جو انسان کی شخصیت کو خدا ترسی کے سانچے میں ڈھال دیتی ہیں

انڈونیشیا کی کل آبادی ملایا نسل سے ہے لیکن ملک کی قدرتی ساخت کے اختلاف کی وجہ سے باشندے بھی مختلف قبیلوں اور فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ مختلف خاندان جو اصل اور نسل کے لحاظ سے ایک ہی تھے ایک دوسرے سے الگ ہو کر تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگے یہاں تک کہ ان میں کچھ نہ کچھ جداگانہ خصوصیات پیدا ہو گئیں اور اب یہ حالت ہے کہ ہم اگر ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کریں تو ہمیں طرح طرح کی صورت شکل، وضع قطع اور طور طریقے رکھنے والے لوگ ملیں گے۔ سماترا کے انتہائی شمالی حصہ کے لوگوں کا رنگ ذرا سانولا ہے اور شکل و صورت میں یہ لوگ

ہندوستانیوں سے ملتے جلتے ہیں لیکن جنوب کی جانب تھوڑے ہی فاصلہ پر اس جزیرے کے بسنے والوں کا رنگ گندمی ہو جاتا ہے جو ملایا کے جزیرہ نما کے باشندوں سے ملتا ہے۔ پھر اگر ہم سماترا کے مغرب کی جانب نیاس کے جزیرہ تک پہنچ جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس علاقہ کے لوگ رنگ میں پیلے ہیں اور جاپانی قوم سے مشابہ ہیں۔ سماترا کے جنوب کے باشندے جو کمپانگ کہلاتے ہیں۔ رنگ روپ میں چین سے ملتے جلتے ہیں۔ اسی طرح سے ملورس کے جزیرے کے بسنے والے جو پیپوئن کہلاتے ہیں۔ رنگ میں سیاہ ہیں یہ لوگ نیوگنی تک پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود انڈونیشیا کے ان سب قبیلوں کو اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان سب میں ناک نقشے اور چہرے مہرے کے انداز ایک سے ہیں اور یہ مشترک خصوصیت اسقدر نمایاں ہے کہ دیکھنے والا ایک نظر میں پہچان جاتا ہے کہ یہ لوگ انڈونیشیا کے رہنے والے ہیں، ان سب کا قد میانہ ہوتا ہے۔ رنگ گندمی اور بال نرم اور کالے، ان میں صرف پیپوئن قوم اور رہبوائن کے باشندے ایسے ہیں جو حلفی نسل سے ہیں اور سیاہ فام ہیں اور جن کے بال بھی سخت اور گھونگر والے ہیں۔

تہذیب اور شائستگی کے لحاظ سے انڈونیشیا میں سب قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ جاوا، سماترا، بالی، بورنیو کے بعض حصے سیلی بیز اور ملکا تہذیب کا اونچا معیار رکھنے والے علاقے ہیں، لیکن بورنیو کے وسطی حصے اور نیوگنی کے بسنے والے جو ڈائک اور پیپوئن کہلاتے ہیں۔ تہذیب کے اعتبار سے بالکل پست اور وحشی ہیں۔ اب سے کوئی پچاس سال قبل تک ان کے وحشی پن کا یہ حال تھا کہ محض تفریح کے طور پر ایک قبیلہ کے لوگ دوسرے قبیلے کے لوگوں پر حملہ کرتے تھے۔ اور ان کے سر کاٹ کر فتح کی نشانی کے بطور در و دیوار پر سجاتے تھے۔ اسی طرح نیوگنی کے اندرونی حصوں کے بسنے والے پیپوئن قوم کی تہذیب کا اب سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے تک وہ معیار تھا جو پتھر کے زمانہ کی تہذیب کا تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔

ان مثالوں کے باوجود انڈونیشیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو مغربی معیار کے لحاظ سے تو شاید نا مہذب کہے جائیں لیکن مشرقی تہذیب کے معیار پر وہ پورے اترتے ہیں۔ عہد وسطیٰ میں جب یورپ تہذیب کی روشنی سے محروم تھا انڈونیشیا میں علم و ہنر ترقی پر تھے اور ملکی تہذیب اپنے پورے نشو و نما پر تھی۔ انڈونیشیا کی آبادی میں اکثریت مسلمانوں کی ہے، چنانچہ یک دلی اور اتفاق کا اظہار سب سے زیادہ ان کے دو تیوہاروں یعنی عید اور بقر عید پر ہوتا ہے عید ملتے اور آپس میں ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد دیتے وقت ہر انڈونیشی دوسرے سے اپنی گزشتہ غلطیوں کی اس طرح معافی مانگتا ہے "اگر مجھ سے کسی قسم کی غلطی سرزد ہوئی ہے تو مجھے امید ہے آپ اسے معاف فرمائیں گے" معافی کی یہ درخواست دوستوں ہی تک محدود نہیں بلکہ یہ لوگ اپنے دشمن سے بھی اسی طرح معافی طلب کرتے ہیں بظاہر یہ چیز کچھ زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتی لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو اسی ایک چیز سے ان لوگوں کی فطرت کی سادگی، دل کی گنجائش، طبیعت کی نرمی، دوسروں کے ساتھ رواداری اور عفو و درگزر کی عادت کا بہ آسانی پتہ چل سکتا ہے۔ یہی تمام خوبیاں ان کی قومی سیرت بن گئی ہیں اور انہیں کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ انڈونیشیا میں کبھی آج تک مذہبی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوئے۔ حالانکہ اس ملک میں مختلف مذہبوں کے لوگ آباد ہیں۔ مثلاً سماترا کی بہت قومیں اور شمالی سیلی بیز کی منہاسا قوم عیسائی مذہب کے پیرو ہیں۔ بالی میں برہمن مذہب پایا جاتا ہے مگر پھر اسی جزیرے میں بدھ مذہب کے پیرو بھی ہیں، بدھ مت لوگوں کی آبادی جاوا کے جزیرے میں بھی ہے، ڈائک اور پیپوئن قدیم عقائد کی جاننے والی وحشی قومیں ہیں۔ اس مذہبی اختلاف کے باوجود بھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی ایک مذہبی فرقہ کا شخص دوسرے مذہب والے کی توہین کرے، یا اسے ایذا پہنچائے۔ قومی نقطہ نظر سے اس قسم کے واقعات نہایت شرمناک سمجھے جاتے ہیں۔

جسطرح موسیقی کے ساتھ انڈونیشیا والوں کو ایک فطری لگاؤ ہے اسی طرح آرٹ بھی ان کی فطرت کا ایک لازمی جز بن گیا ہے، موسیقی اور فن تعمیر میں ایک معمولی گنوار بھی اچھے برے کا امتیاز رکھتا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی سے انڈونیشیا میں اعلیٰ قسم کے مندر بننا شروع ہوئے اور آٹھویں اور چودھویں صدی کی درمیانی مدت میں سماترا، جاوا کا فن تعمیر انتہائی عروج پر پہنچ گیا جس کی مثالیں آج بھی بالی کے جزیرے میں ملتی ہیں اور اس جزیرے میں اس قدیم طرز کی روایات ابتک زندہ ہیں۔ اپنے پرانے فن تعمیر کو مدت تک انڈونیشیوں نے اصل حالت پر رکھا لیکن پھر بیرونی اثر سے دوچار ہونا ہی پڑا اور گو اس اثر کی وجہ سے فنی حیثیت سے ان کی عمارتوں میں خامیاں پیدا ہو گئیں پھر بھی انڈونیشیا کی بہت سی نئی عمارات جیسے سماترا میں فورٹ ڈی کاک کی اور سیلی بیز میں جو ما دیہ کی عمارتیں صناعی اور دلآویزی کے بہترین نمونے پیش کرتی ہیں۔

انڈونیشی زندگی کے ذکر میں اس قوم کے تفریحی مشغلوں کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے۔ انڈونیشیا کے باشندے کھیلوں کے بڑے شائق ہیں، یہ لوگ کھیل کو فن بناکر کھیلتے ہیں مثلاً ان کے یہاں وہ کھیل سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے جس میں سب سے زیادہ جان جوکھم ہو چنانچہ اس قسم کے پرانے کھیلوں میں سے ایک کھیل ہرن کا شکار ہے لیکن ہرن کا شکار یہ لوگ اس طرح سے نہیں کرتے جیسے دنیا کے اور ملکوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں جدت یہ ہے کہ شکاری گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر گھوڑے کو پہاڑیوں میں ہرن کے پیچھے دوڑاتا ہے، سوار کے پاس کسی قسم کا

ہتھیار نہیں ہوتا۔ ہرن کا پیچھا کرنے میں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ گویا ہرن کو اپنی ٹاپوں سے روند ڈالے۔ اس کھیل میں جتنا خطرہ ہرن کے لئے ہے اس سے کہیں زیادہ خود شکاری کے لئے ہوتا ہے لیکن وہاں تو کھیل کے فن کا معیار ہی یہ ہے کہ کھلاڑی کو موت قریب تر نظر آئے تاکہ اس میں ہمت اور دلیری بڑھے اور خطرات کا مقابلہ کرنے کی عادت پیدا ہو۔

انڈونیشیوں کا سب سے محبوب کھیل پنچک ہے جس میں دو آدمی محض ہاتھ پاؤں سے لڑتے ہیں اور وہ بھی مقررہ قواعد کے ماتحت، کبھی کبھی چاقو کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کھیل کو سیلاٹ کہتے ہیں۔ اس قسم کے کھیل قدیم کھیلوں کی یادگار ہیں، موجودہ زمانے میں یورپ کے کھیل تیزی کے ساتھ ملک میں عام ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں ٹینس، باسکٹ بال، بیس بال وغیرہ بھی کھیلے جاتے ہیں۔ لیکن فٹ بال کا رواج بہت زیادہ ہے۔

انڈونیشیا والے لکڑی کے مکانوں میں رہتے ہیں جو عام طور پر بانس اور ناریل کی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں۔ جاوا کے لوگ بانس سے مکان بناتے ہیں۔ یہ مکان نہایت پائدار ہوتے ہیں اور آسانی سے ہٹائے جا سکتے ہیں۔ مکان ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں تاکہ گاؤں کی سی شکل ہو جائے۔ اور گاؤں کے بسنے والے آپس میں ایک دوسرے کی مدد اور حفاظت کر سکیں۔ سماترا میں گاؤں کو دوسون اور جاوا میں ڈیسا کہلاتے ہیں۔ اکثر گاؤں دریاؤں کے کنارے پر بسائے گئے ہیں تاکہ دریا کی وجہ سے نہانے دھونے میں آسانی رہے اور دریا کے ذریعے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہو سکے۔ مکانات کی ترتیب ایسی ہوتی ہے کہ ہر محلہ کی شکل ایک مستطیل سے مشابہ ہو جاتی ہے اس میں مکانوں کے بیچ بیچ آمد و رفت کے لئے سڑکیں اور گلیاں ہوتی ہیں۔ غریب طبقہ کے مکانوں میں اناج رکھنے کے لئے کٹیاں بھی بنی ہوتی ہیں۔ گاؤں کے وسط میں گاؤں کا پنچایت گھر ہوتا ہے جہاں گاؤں والوں کی عام سماجی زندگی کے مسائل پر گفتگو ہوتی ہے اور سماج کے رواجی قانون پر بحث کی جاتی ہے۔ اس پنچایت گھر کو انڈونیسی زبان میں 'بالے' کہتے ہیں۔ بالے ایک قسم کا بڑا سا کمرہ ہوتا ہے۔ یہ پچاس فٹ سے سو فٹ تک لمبا ہوتا ہے اور تین سے پانچ فٹ تک اونچے ستونوں پر اس کی چھت کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ یہ کمرہ دونوں طرف سے کھلا رہتا ہے۔ خاص خاص موقعوں پر چٹائیوں کے پردے لٹکا دئیے جاتے ہیں یا کسی خاص شادی کے موقع پر خوشنما کپڑے کے پردوں سے وقتی طور پر اس کی آرائش کی جاتی ہے ورنہ عام طور پر اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے یہ گاؤں کی سادگی کا نمونہ ہوتا ہے۔

انڈونیشیا کی جماعتی زندگی کا سب سے زیادہ مفید پہلو یہ ہے کہ اس سماج میں امیر غریبوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اسی طرح جو لوگ طاقتور ہیں وہ ہمیشہ کمزوروں کی حمایت کے لئے تیار رہتے ہیں۔ گاؤں کے سربرآوردہ لوگ سماج کی فلاح و بہبود کے سلسلہ میں بہت سی باتوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ گاؤں کے قصے قضیے یہی لوگ چکاتے ہیں، پھر دیہات کے غریب اور نادار لوگوں کی راحت و آرام کے لئے بندوبست کرنا بھی انھیں کے ذمہ ہوتا ہے۔ اس طرح سماج کی ترقی کے لئے گاؤں کے چھوٹے بڑے سب مشترک طریقہ پر کوشاں رہتے ہیں۔

انڈونیشیا کا سماجی قانون فرد کو ملکیت کا کلی حق نہیں دیتا۔ مشرق کے دوسرے ملکوں کی طرح انڈونیشیا والے بھی اپنے مال و متاع کو بانٹ کر صرف میں لاتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کے یہاں کھیتی ہوتی ہے کھیتی کے تمام مصارف وہ خود برداشت کرتا ہے۔ لگان اور مال گذاری وہ خود دیتا ہے لیکن جب فصل کاٹی جاتی ہے تو بلا کسی معاوضہ کے وہ پڑوس کے مستحق لوگوں کو بھی فصل میں شریک کر لیتا ہے۔ قدیم روایات کے مطابق فصل کا پانچواں حصہ تو فصل کاٹنے والوں ہی کا ہو جاتا ہے۔ اس طرح غریب سے غریب آدمی کو بھی ملک کی پیداوار سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور مل جاتا ہے۔ آپس کی روا داری اور باہمی امداد کی ایک اچھی مثال ہمیں ہر سال کھیتوں کی بتائی کے وقت نظر آتی ہے۔ جب نئی فصل بونے کا وقت آتا ہے تو گاؤں کے امیر غریب سب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور آپس کے سب جھگڑے، اختلافات اور غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ کھیتی کیاری کے اس بڑے کام میں جہاں سب کی مدد درکار ہے۔ سب خوشدلی کے ساتھ مصروف ہو جائیں اور اس مشترک کام کو جس پر ان سب کی روزی کا دارومدار ہے خوشی خوشی انجام دیں۔ آپس کے میل جول کو بڑھانے کے لئے ہر اس موقع سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ مثلاً شادی کے موقع پر تمام براتی انتہائی سرگرمی کے ساتھ برات کے انتظام اور تقریب کے اہتمام میں دولہا کی مدد کرتے ہیں۔ اگر دلہن کسی دوسرے مقام سے بیاہ کر لائی جاتی ہے تو اس کی منہ دکھائی کے لئے گاؤں کی تمام عورتوں کو دعوت دی جاتی ہے۔ اس طرح شادی پورے گاؤں کے لئے آپس کا ربط ضبط بڑھانے اور مل جل کر خوشی منانے کا موقع مہیا کر دیتی ہے۔ خوشی میں ساتھ دینے والے اسی طرح رنج میں بھی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں اور اس طرح سماجی زندگی کی خوشگواریاں اور ناخوشگواریاں دونوں کا بوجھ سماج کے افراد پر یکساں طور پر بٹ جاتا ہے۔ جہاں تک انڈونیسی قوم کے عام عقائد کا تعلق ہے اس قوم میں توہم پرستی بہت زیادہ ہے۔ جنوبی سماترا میں جمعہ کے دن سفر کرنا منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اگر ایسی ہی سخت ضرورت درپیش ہو جس کی وجہ سے اس دن سفر کرنا ناگزیر ہو تو بطور نذر کے سفر کرنے والے شخص کو ایک دعوت کا

(باقی صفحہ ۶۷ پر)

# سکینہ

ڈرامہ

## افراد

| | |
|---|---|
| عذرا | جاوید کی خالہ زاد بہن |
| جاوید | ایک چوبیس سالہ نوجوان |
| سکینہ | ایک یتیم لڑکی |

## منظر

ایک مغربی طرز پر آراستہ و پیراستہ کمرہ، جس کا ایک دروازہ جنوبی دیوار میں کھلتا ہے، اور دوسرا مشرقی دیوار میں، جنوبی دروازے کے سامنے برآمدہ ہے، اور مشرقی دیوار کا دروازہ ملحقہ کمرے میں کھلتا ہے۔ شمالی دیوار کے ساتھ ایک میز ہے، میز کے قریب ایک کرسی پڑی ہے جس کی پشت پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے جاوید کھڑا ہے۔ جاوید ایک چوبیس سالہ خوبصورت نوجوان ہے چہرے سے شگفتگی طبع اور ذہانت ظاہر ہوتی ہے۔ میز سے کچھ دور، جاوید کی خالہ زاد بہن عذرا کمرے کا جائزہ لے رہی ہے۔ مگر اس کے دیکھنے کے انداز سے معلوم ہوتا ہے، جیسے اس کمرے میں اس کی دلچسپی کی کوئی چیز بھی موجود نہیں ہے۔ عذرا ایک صحت مند عورت ہے عمر اٹھائیس اور تیس کے درمیان ہوگی۔

**جاوید:۔** میرا تو خیال تھا باجی! آپ میرا کمرہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گی!

**عذرا:۔** وہ کیوں؟

**جاوید:۔** وہ کیوں؟ — وہ اس لئے کہ آپ زندگی کا ایک اچھا خاصہ حصہ وطن سے باہر گزار کر آ رہی ہیں۔ اتنے لمبے عرصے کے بعد واپس آ کر آپ جس چیز کو بھی دیکھیں گی اس میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور پائیں گی۔

**عذرا:۔** یہ تو ٹھیک ہے میں پورے تیرہ سال کے بعد تمہارا کمرہ دیکھ رہی ہوں۔ لیکن مجھے تو یہاں کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آتی۔

**جاوید:۔** یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ یہاں کی تو دنیا ہی بدل چکی ہے یہ فرنیچر آپ نے پہلے بھی یہاں دیکھا تھا؟

**عذرا:۔** فرنیچر یقیناً وہ نہیں ہے جو یہاں پہلے تھا مگر یہ فرنیچر جس انداز سے رکھا گیا ہے اس سے تمہارے تصور کی کسی خاص تبدیلی کا اظہار نہیں ہوتا۔ میں فرنیچر نہیں دیکھا کرتی، یہ دیکھا کرتی ہوں کہ اس سے کمرے کی سجاوٹ میں کیا کام لیا گیا ہے؟

**جاوید:۔** ابا جان ٹھیک ہی تو کہتے ہیں! آپ واقعی فلسفی بن گئی ہیں!

**عذرا:۔** فلسفی بن گئی ہوں — وہ کیونکر؟

**جاوید:۔** ہر چیز کو فلسفیانہ انداز سے جو دیکھتی ہیں

**عذرا:۔** فلسفی ولسفی تو میں کیا بنوں گی البتہ اتنے عرصے میں میں نے انسانی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے۔

**جاوید:۔** کچھ بھی ہو آپ فلسفی بن گئی ہیں۔ (جیب سے کنگھی نکال کر بال ٹھیک کرتے ہوئے) باجی! میرے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ (مسکرا کر) صاف صاف کہئے۔

**عذرا:۔** تمہارا یہ سوال بہت تفصیل چاہتا ہے۔ اور میں کسی تفصیل میں جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

**جاوید:۔** میرا مطلب ہے آپ کے نقطہ نظر سے میں کیسا ہوں۔

**عذرا:۔** (ہنس کر) جیسا تمہیں ہونا چاہئے تم ہر لحاظ سے ایک امیرزادے ہو!

**جاوید:۔** میرا خیال ہے باجی! آپ نے ٹال دیا ہے مجھے۔

**عذرا:۔** اور میرا خیال ہے مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا ہے اسی فقرے میں۔ (میز کے اوپر دیوار سے ٹنگی ہوئی تصویر دیکھ کر) جاوید! یہ فیملی گروپ ہے؟

**جاوید:۔** جی۔

**عذرا:۔** مگر اس میں یہ لڑکی کون ہے۔ یہ عذرا کے پیچھے۔

**جاوید:۔** سکینہ

**عذرا:۔** کون؟

**جاوید:۔** یہ پوچھ کر کیا کیجئے گا باجی (آہ بھر کر) بس سمجھ لیجئے ایک لڑکی تھی بیچاری۔

**عذرا:۔** معلوم ہوتا ہے اس لڑکی کو تمہاری زندگی سے کوئی گہرا تعلق ہے جبھی بتانے سے گریز کر رہے ہو۔

**جاوید:۔** گریز کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ سننا چاہتی ہیں تو سن لیجئے۔ آج سے دس گیارہ سال پہلے مرحوم امی جان ایک یتیم لڑکی کو گھر لے آئی تھیں۔ اس لڑکی کا نام سکینہ تھا اور اس بیچاری کا دنیا میں کوئی سہارا نہیں تھا۔ عمر میں مجھ سے ایک دو سال چھوٹی ہوگی [illegible] تھا کہ کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ شروع شروع میں وہ [illegible] آپ کو بالکل اجنبی محسوس کرتی تھی مگر آہستہ آہستہ [illegible] دور ہوتا گیا۔ اور وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگی۔ سکینہ [illegible] محنتی لڑکی تھی [illegible] اپنے کام میں مصروف رہتی [illegible]

**عذرا:۔** گھر میں [illegible]

**جاوید:۔** یہی سمجھ لیجئے [illegible] دیکھ کر [illegible]

پڑھا دی۔ اب کیا تھا۔ کام سے جب فرصت ملتی کتاب لے کر بیٹھ جاتی تھوڑے عرصے میں اس نے کئی کتابیں ختم کر ڈالیں۔ اسی گھر میں وہ جوان ہوئی مگر اس کی فطری سادگی اور معصومیت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

عذرا:۔ کیا مطلب؟

جاوید:۔ میرا مطلب ہے اس کے اندازِ گفتگو اور عادتوں میں فرق نہیں پڑا تھا۔

عذرا:۔ تم اس کی ذات میں بدستور دلچسپی لے رہے تھے؟

جاوید:۔ اسے میرا بہت خیال تھا۔ مجھے اپنی کسی ضرورت کا کبھی احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس صورت میں میں اس کی ذات میں کیوں نہ دلچسپی لیتا؟

عذرا:۔ تمہارے گھر والوں کو اس بات پر کوئی اعتراض تو نہیں تھا؟

جاوید:۔ ضرور تھا امی اکثر کہتی رہتی تھیں تم سکینہ کی عادتیں بگاڑ رہے ہو۔ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگی ہے۔

عذرا:۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوگی

جاوید:۔ کوئی بات نہیں تھی۔ امی جان کو وہم ہو گیا تھا کہ وہ بناؤ سنگار میں مصروف رہتی ہے!

عذرا:۔ تو یہ معاملہ تھا۔

جاوید:۔ حالات میں کوئی تبدیلی نمایاں نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مجھے محسوس ہونے لگا تھا جیسے ماحول میں کسی سازش کی بو آہستہ آہستہ پھیل رہی ہے۔ صغریٰ کی آنکھوں سے شرارت جھانکتی رہتی تھی۔

عذرا:۔ تمہاری یہ بہن تو بچپن ہی سے شریر ہیں۔

جاوید:۔ مگر اب معاملہ کچھ اور تھا۔ کم بخت صغریٰ سکینہ کی موجودگی میں میرے سامنے سکینہ کی تعریف کرنے لگتی تھی۔ سوچتا تھا یہ بات کیا ہے۔ یہ تعریف کیوں کی جا رہی ہے ــ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک دن میں بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میری نظر دروازے پر پڑی، وہاں سکینہ کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ اور دیوار پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ میں نے پوچھا سکینہ کیا ہے؟ وہ کچھ گھبرائی۔ اتنے میں باہر سے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ سکینہ نے خوفزدہ ہو کر میری طرف دیکھا اور چپ چاپ چلی گئی۔ میں تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا۔ صغریٰ بھاگ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

عذرا:۔ تم نے اس سے پوچھا ہوگا آخر بات کیا ہے؟

جاوید:۔ بہتیرا پوچھا مگر اس نے ٹال دیا۔ اس زمانے میں کریمن ہمارے یہاں خادمہ تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اصل میں معاملہ کیا ہے؟

عذرا:۔ تو کیا تھا معاملہ؟

جاوید:۔ میری دونوں بہنیں سمجھتی تھیں کہ سکینہ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔

عذرا:۔ واقعی؟

جاوید:۔ ہاں۔ اور وہ کوشش کر رہی تھیں کہ یہ کھیل کچھ عرصے کے لئے ہوتا رہے۔

چنانچہ وہ سکینہ کو یقین دلاتی رہتی تھیں کہ مجھے اس کا بڑا خیال ہے اور میں اس کی تعریفیں کرتا رہتا ہوں! کریمن سے یہ بات سن کر مجھے سخت غصہ آیا۔ آخر انہیں حق کیا پہنچتا تھا کہ ایک بے کس لڑکی کو ستم ظریفی کا نشانہ بنائیں ــ اس کی معصومیت اور سادگی کو تفریح کا سامان سمجھ لیں۔ میں حقیقتاً اس کی ذات میں گہری دلچسپی لینے لگا۔ مجھے یہ خیال ہر وقت ستاتا رہتا تھا کہ کہیں اس کا دل ٹوٹ نہ جائے۔

عذرا:۔ گویا تم اس سے محبت کرنے لگے تھے۔

جاوید:۔ آپ یوں بھی کہہ سکتی ہیں میں نے اسے کہہ دیا۔ خاندان میں کوئی شخص بھی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ مگر امی نے مخالفت کا وہ طوفان اٹھایا کہ خدا کی پناہ۔ ایک دن سکینہ میرے کمرے میں آئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھ پر بہت اثر ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر میرے دل میں گر رہے ہیں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے مجھے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور پھر کچھ کہے بنا کمرے سے نکل گئی۔ صبح مجھے معلوم ہوا وہ گھر سے جا چکی ہے!

عذرا:۔ کہاں؟

جاوید:۔ یہ معلوم نہیں۔ مجھے اس کے جانے کا بہت افسوس ہوا۔

عذرا:۔ تم نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی ہوگی

جاوید:۔ ضرور کی تھی۔

عذرا:۔ مگر یہ کوشش ــ کوئی خاص کوشش نہیں ہوگی ورنہ وہ ضرور ملتی

جاوید:۔ مجھے یہ اطمینان تو ضرور تھا کہ وہ جہاں بھی ہوگی میری بہنوں کے ہاتھ سے تو محفوظ ہوگی ــــ اسے یہاں سے رخصت ہوئے تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔

عذرا:۔ (تصویر کی طرف دیکھ کر) بیچاری سکینہ۔ کاش جانے سے پہلے اسے معلوم ہو گیا ہوتا کہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟

جاوید:۔ کونسی حقیقت؟

عذرا:۔ (جاوید کی طرف دیکھے بغیر) وہ ابھی یہیں ہے ــ اس کے خیالوں کی جنت یہیں آباد ہے ــ اس سنہرے سپنوں کی رنگینیاں یہیں بکھری پڑی ہیں ــ تم نے غلطی کی جاوید!

جاوید:۔ کونسی غلطی؟

عذرا:۔ یہ تم خود بھی نہیں جانتے۔

جاوید:۔ (بات کا رخ بدلتے ہوئے) باجی! ٹہلنے کے لئے چلیں گی؟

عذرا:۔ اصغر سو رہا ہے نہ جانے کب جاگ پڑے۔

جاوید:۔ ابھی آجاتا ہوں۔ بیس پچیس منٹ تک۔ اچھا۔

(جاوید جنوبی دروازے کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ عذرا جاوید کے

ساتھ دروازے تک آتی ہے۔ باہر سے جاوید کی سیٹی کی آواز آتی ہے جو آہستہ آہستہ مدھم ہوتی ہوتی غائب ہو جاتی ہے۔ عذرا جاوید کی میز کے پاس پہنچتی ہے۔ فوٹو کو دیکھتی ہے اور شرقی دروازے کی طرف رخ کرکے جانے لگتی ہے ـــــ (وقفہ) جنوبی دروازے میں سکینہ آتی ہے۔ ڈرتے ہوئے جھجکتے ہوئے اندر جھانک کر دیکھتی ہے۔ اندر آتی ہے۔ چند قدم چل کر رک جاتی ہے۔ عذرا ابھی تک شرقی دروازے میں کھڑی ہے مگر سکینہ کی نظر ابھی تک اس پر نہیں پڑی۔ سکینہ اُدھر دیکھتی ہے۔ عذرا اس کے قریب آتی ہے۔ دونوں کی نظریں ملتی ہیں)

**عذرا:۔** سکینہ!

(سکینہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے)

**سکینہ:۔** آپ؟

**عذرا:۔** بیٹھ جاؤ۔

**سکینہ:۔** مجھے ـــــ جاوید صاحب سے ملنا ہے۔

**عذرا:۔** میں جانتی ہوں۔ جاوید سیر کے لئے گیا ہے۔ ابھی آجائے گا واپس۔ بیٹھ جاؤ نا۔

(عذرا سکینہ کو صوفے پر بٹھا دیتی ہے اور خود اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

**سکینہ:۔** ابھی آجائیں گے؟ اچھا۔

(عذرا کی طرف اس انداز سے دیکھتی ہے جیسے پوچھ رہی ہو آپ کون ہیں)

**عذرا:۔** (اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر) میں جاوید کی خالہ زاد بہن ہوں تم نے مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ جب تم یہاں آئیں میں برما جا چکی تھی۔ تیرہ سال ہندوستان سے باہر رہ کر چند دن ہوئے واپس آئی ہوں اور آج سے یہاں مہمان ہوں ـــــ ابھی ابھی جاوید نے تمہاری ساری کہانی سنائی ہے!

**سکینہ:۔** ابھی ابھی؟

**عذرا:۔** تمہارے متعلق ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا تم ایک نہ ایک دن ضرور آؤ گی۔

**سکینہ:۔** آپ کو یقین تھا؟

**عذرا:۔** جو خلش تم یہاں سے لے کر گئی تھیں اس نے تمہیں ہمیشہ بے چین رکھا ہوگا۔

**سکینہ:۔** یہ ٹھیک ہے۔

**عذرا:۔** سکینہ! اپنی بڑی بہن سمجھ کر میرے قریب آنے کی کوشش کرو۔ چائے پیو گی؟

**سکینہ:۔** جی نہیں، شکریہ۔

**عذرا:۔** اتنی مدت تم رہیں کہاں؟

**سکینہ:۔** میں ایک دور کے رشتہ دار کے ہاں چلی گئی۔ لوگوں کے کپڑے سی سی کر گزارہ کرتی رہی۔

**عذرا:۔** تمہیں جاوید سے سچی محبت تھی۔ تھی نا؟

**سکینہ:۔** (نظریں جھکاتے ہوئے) جی؟

**عذرا:۔** میں جانتی ہوں تمہیں جاوید سے گہری محبت تھی اور پھر مگر تم چلی کیوں گئیں؟

**سکینہ:۔** میں گھبرا گئی تھی ـــــ

**عذرا:۔** تم نے شکست تسلیم کر لی ـــــ؟ سچی محبت تو زندگی کے طوفان میں کبھی شکست تسلیم نہیں کرتی۔

**سکینہ:۔** میں نے سخت غلطی کی۔ (جذباتی تاثر میں) میں نے انتہائی کوشش کی اسی طرح اپنی زندگی گزار دوں۔ اسی طرح ان سے دور رہوں۔ مگر ہر گھڑی ہر لحظہ میرے کانوں میں ایک آواز آتی رہی "سکینہ! تو نے غلطی کی۔ تو اسے چھوڑ کر کیوں چلی آئی۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہے۔ وہ تیرا انتظار کرتا رہے گا" میں آواز کو سنتی رہی۔ سنتی رہی لیکن میرے پاؤں ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا قسمت نے جو دروازہ بند کر دیا وہ اب کھل نہیں سکتا۔ اب تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ آنسوؤں کے سیلاب میں بہتے بہتے ایک دن موت کے ساحل پر جا پہنچے۔ مگر آج۔ آج نہ جانے میرے پاؤں میں کیوں ہمت آگئی۔ میں کیوں چلی آئی۔

**عذرا:۔** (کرسی سے اٹھ کر سکینہ کے پہلو میں بیٹھ کر) تم اپنے دل کی آواز پر مجبور ہو کر چلی آئیں۔

**سکینہ:۔** ہاں۔

**عذرا:۔** کاش تین سال پہلے تمہیں حقیقت معلوم ہو چکی ہوتی۔

**سکینہ:** کونسی حقیقت؟

**عذرا:۔** دنیا میں بڑی بڑی تلخ حقیقتیں ہیں۔

**سکینہ:۔** میرے معاملے میں کونسی حقیقت ہے؟

**عذرا:۔** ہمارے جذبات ہوتے کچھ ہیں اور ہم انھیں سمجھتے کچھ اور ہیں۔

**سکینہ:۔** میں کچھ نہیں سمجھی!

**عذرا:۔** مجھے افسوس ہے میری بات سن کر تمہیں بڑا دکھ ہوگا۔ مگر حقیقت چھپانے سے چھپ نہیں سکتی۔

**سکینہ:۔** آپ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں۔

**عذرا:۔** میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جس جنت کو ڈھونڈنے یہاں آئی ہو ـــ وہ صرف تمہارے خوابوں میں ہے۔

**سکینہ:۔** آپ کا خیال ہے جاوید کو اب مجھ سے محبت نہیں رہی۔

**عذرا:۔** اسے تم سے کبھی بھی محبت نہیں تھی۔

**سکینہ:۔** تو مجھے دھوکا دیتا رہا؟

**عذرا:۔** اس نے ارادتاً دھوکا کبھی نہیں دیا۔

**سکینہ:۔** آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

**عذرا:۔** جس جاوید کو تم نے اپنا سمجھا تھا ـــ اور اب تک اپنا سمجھ رہی ہو۔ وہ صرف تمہاری اپنی تخلیق ہے۔ وہ جاوید صرف تمہاری دنیا میں سانس لے رہا ہے۔ یہ جاوید، جسے تم اپنا سمجھ کر اپنا بنانے آئی ہو ـــ کبھی بھی تمہار

جاوید نہیں تھا ــــ کبھی بھی تمہارا جاوید نہیں ہو سکتا۔

سکینہ:۔ میں کچھ نہیں سمجھی ۔

عذرا:۔ جب تم یہاں آئیں تو بے آسرا تھیں۔ جاوید نے تم پر رحم کھایا اور تمہیں اپنی توجہ کا حصہ دار بنا لیا۔ تمہاری ذات میں دلچسپی لی۔ تمہاری ضرورتوں کا خاص طور پر خیال رکھا۔ تم نے اس رحم کو، اس ہمدردی کو کسی اور رنگ میں لے لیا۔ جب اس کی بہنوں نے تمہاری خود فریب محبت کو تفریح کا سامان بنا لیا تو اس کا رحم اور بڑھ گیا۔ اس کی ہمدردی اور گہری ہو گئی۔ رحم اور محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے سکینہ!

سکینہ:۔ آپ غلط کہہ رہی ہیں آپ (شدت تاثر میں اسے اپنا مفہوم ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے) جھوٹ کہہ رہی ہیں۔

عذرا:۔ کاش یہ جھوٹ ہی ہوتا۔

سکینہ:۔ جاوید نے کہا تھا میں تمہارا ساتھ دوں گا۔

عذرا:۔ یہ الفاظ محبت نے نہیں رحم نے کہلوائے تھے۔ اگر اسے تم سے محبت ہوتی تو وہ تمہاری تلاش کرتا ــ تمہیں ڈھونڈے بغیر چین سے نہ بیٹھتا۔ محبت کی آگ کبھی سرد نہیں ہوتی لیکن رحم کا جذبہ جس تیزی کے ساتھ ابھرتا ہے اسی تیزی کے ساتھ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

سکینہ:۔ میں یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

عذرا:۔ تم سمجھتی ہو جاوید تمہیں دھوکا نہیں دے سکتا۔ مگر جب اس نے محبت ہی نہیں کی تو وہ محبت سے انکار کیا کرے گا۔ سکینہ بہن! یہ جاوید کا بھی قصور نہیں۔ ہمارا سماج مختلف طبقوں میں بٹ چکا ہے۔ یہ طبقے سیڑھیاں بن گئی ہیں۔ اونچی سیڑھی والے لوگ نچلی سیڑھی پر آنے کے لئے تیار نہیں ہیں وہ نچلے طبقے پر رحم کر سکتے ہیں، محبت نہیں کر سکتے۔ ہم نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی کہ اپنے آپ کو اعلیٰ اور ادنیٰ سمجھنے کی بجائے صرف انسان سمجھیں، صرف انسان سمجھ کر ایک دوسرے سے محبت کریں۔ جب انسانیت اس بلندی پر پہنچ جائے گی تو رحم اور ہمدردی کا جذبہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

سکینہ:۔ میں اپنے یقین کو جھٹلا نہیں سکتی۔

عذرا:۔ تم حقیقت کو آزمانا چاہتی ہو۔ اچھا یونہی سہی۔

(دور سے سیٹی کی آواز)

تم (مشرقی دروازے کی طرف اشارہ کرکے) اس پردے کے پیچھے چھپ جاؤ میں اس سے تمہارے بارے میں پوچھوں گی۔ اگر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ تم پر رحم کر رہا ہے تو ــ

سکینہ:۔ تو ــ تو ــ ؟؟

عذرا:۔ جاوید آ رہا ہے۔

(سکینہ مشرقی دروازے کے پردے کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔ جاوید آتا ہے)

جاوید:۔ باجی! آپ ابھی تک یہیں ہیں؟ اصغر سو رہا ہے؟

عذرا:۔ ابھی سو رہا ہے۔

جاوید:۔ اچھا شب بخیر۔ بڑی جلدی نیند آ رہی ہے آج تو۔

(مشرقی دروازے کی جانب جانے لگتا ہے)

عذرا:۔ ایک بات تو سنو جاوید!

(جاوید رک جاتا ہے)

جاوید:۔ فرمائیے

عذرا:۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ میں سکینہ کو جانتی ہوں۔

جاوید:۔ (جوش سے) آپ جانتی ہیں وہ کہاں ہے؟

عذرا:۔ ہاں۔ ملو گے؟

جاوید:۔ کیوں نہیں۔ کس حال میں ہے؟

عذرا:۔ جس حال میں تم نے اسے چھوڑا تھا۔ کس وقت ملنا چاہتے ہو؟

جاوید:۔ اسی وقت چلتے ہیں۔ آپ جانے کے لئے تیار ہیں نا؟

عذرا:۔ مجھے بھلا کیا عذر ہو سکتا ہے۔ بیچاری تین سال سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

جاوید:۔ اچھا ــــ بہت اچھی اور نیک لڑکی ہے۔

(میز کی دراز کھول کر اس میں سے بٹوا نکالتا ہے اور اسے جیب میں ڈال لیتا ہے)

عذرا:۔ یہ کیا ہے؟

جاوید:۔ بٹوا ہے۔

عذرا:۔ جاوید! سکینہ کو تمہارے روپوں کی نہیں، تمہاری ضرورت ہے۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تم نے اسے یقین دلایا تھا کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔

جاوید:۔ (قدرے گھبرا کر) باجی ــــ

عذرا:۔ (فیصلہ کن انداز میں) تم اس سے نہیں مل سکتے۔ جاؤ جا کر سو رہو۔

جاوید:۔ مگر سکینہ کہاں ہے ــــ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔

عذرا:۔ ضرور ملو اس سے۔ مگر پہلے اسے اپنے خوابوں کا گلا گھونٹ لینے دو اس چراغ کو بجھا لینے دو جس کی روشنی میں وہ زندگی کا تاریک راستہ طے کر رہی تھی۔ ان امیدوں کو چکنا چور کر لینے دو جنہیں وہ اب تک پرورش کرتی رہی ہے ــــ جاؤ۔ تمہاری آنکھوں میں نیند آ رہی ہے جاؤ سو رہو۔ تمہارا پلنگ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

جاوید:۔ باجی!

عذرا:۔ (اپنی غلطی کا احساس کرکے) اوہ جاوید! میں بھی سب کچھ جاننے کے باوجود کبھی کبھی جذباتی بن جاتی ہوں ــــ (مشرقی دروازے کی طرف رخ کرکے) سکینہ۔

(سکینہ پردے سے نکلتی ہے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں)

جاوید:۔ (فرط حیرت سے) سکینہ!

(سکینہ دوسرے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں)

جاوید۔ ٹھیرو سکینہ! ٹھیرو۔ (آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے) میں تمہیں مایوس نہیں کر سکتا۔ تم جو چاہتی ہو وہی ہوگا۔

سکینہ۔ (دروازے پر نظریں جمائے ہوئے) رحم اور محبت ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔

(جانے لگتی ہے)

جاوید۔ مگر اب رحم نہیں ہے۔ (عذرا سے) باجی روکو اسے۔ میں محبت کرونگا۔

سکینہ (زہرخندہ) میں اب اپنے کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ چھوڑ دیجئے۔ مجھے محبت نما رحم کی ضرورت نہیں ہے۔ چھوڑ دیئے۔

جاوید سکینہ کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے ــــ سکینہ دروازے سے نکل جاتی ہے۔ جاوید عذرا کی طرف دیکھتا ہے جو مشرقی دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔

---

## انڈونیشیا کی تہذیبی وتمدنی زندگی ــــ بقیہ صفحہ ۶۲

اہتمام کرنا پڑتا ہے جس میں خوشبوئیں جلائی جاتی ہیں اور نہایت عقیدت کے ساتھ سفر پر جانے والے کی واپسی کے لئے دعا کی جاتی ہے۔ اسی طرح بعض مقامات پر یہ اعتقاد عام ہے کہ کوئی بڑا کام منگل کے دن شروع نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کے نزدیک چونکہ منگل کا دن منحوس ہے اس لئے اس کام کے تکمیل تک پہنچنے کی امید نہیں ہوتی۔ جاوا میں وارنجن درخت کو مقدس اور متبرک سمجھا جاتا ہے اور کسی زمانہ میں تو یہ عقیدہ تھا کہ ان کے مردوں کی روحیں اسی درخت میں رہتی ہیں۔

انڈونیشیا والوں کے یہاں زرعی پیداوار میں چاول بہت عام ہے اس وجہ سے بھی ملک کی عام غذا ہے۔ عام طور سے یہ لوگ دن میں دو دفعہ چاول کھاتے ہیں۔ کبھی کبھی صبح کو ناشتے پر بھی چاول اور سے ہوئے شیلے ہوتے ہیں۔ چاول کھانے کے معاملہ میں ان کا مذاق ہندستانی مذاق سے کسی حد تک ملتا ہے۔ یہ لوگ، سبزی، گوشت اور مچھلی کے شوربے سے چاول کھاتے ہیں اور عام طور پر شوربہ بہت پتلا ہوتا ہے۔ چونکہ ان کے ملک میں گرم مسالہ کی پیداوار زیادہ ہے۔ اس لئے یہ چیز ان کے روزمرہ کے استعمال میں بھی زیادہ آتی ہے۔ یہ اپنے شوربہ کو گرم مسالہ سے خوب چٹ پٹا کر لیتے ہیں۔

**تصحیح**

یکم مارچ کے شمارے میں "ترکی کا آئین" کے عنوان سے ایک ریڈیو تقریر شائع ہوئی تھی۔ اس کے مصنف ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نہیں بلکہ جناب نریندرناتھ سیٹھ ہیں۔ ادارہ معذرت خواہ ہے۔

---

## فکرِ مآلِ کار

بقیدِ زیست قیامت کا انتظار نہ کر!
کسی کے وعدۂ فردا پہ اعتبار نہ کر

یہ التفات وکرم مجھ پہ بار بار نہ کر!
تسلیوں سے مرے دلکو بیقرار نہ کر

مقدرات پہ قابو نہیں گلستاں میں
قفس میں رہ کے کبھی شکوۂ بہار نہ کر

اب آگیا ہوں میں زنداں میں عمر بھر کیلئے
ادھر کا رخ بھی اب اے دورِ روزگار نہ کر

نہ مسکرا کے دکھا اب مجھے کوئی غنچہ!
مری نظر کو مرے دل کا سوگوار نہ کر

خزاں کا دور ہے گل میں نہ موجِ نکہتِ گل
اب ایسے وقت میں وحشی کو ہوشیار نہ کر

یہی ہے عشرتِ دنیا یہی ہے عیشِ حیات
کہ زندگی میں کبھی زندگی سے پیار نہ کر

شکستہ پا ہوں مگر گامزن ہے پائے نظر
تباہ ہوں تو مجھے پردۂ غبار نہ کر

ابھی تڑپتے تڑپتے لگی ہے آنکھ ذرا
ابھی مریضِ محبت کو ہوشیار نہ کر

یہ بات ہوش کی ہے ہوش تک ہی رہنے دے
جنونِ عشق میں فکرِ مآلِ کار نہ کر

وہ آج گورِ غریباں کی سمت جاتا ہے
اب اپنی بزم میں اختر کا انتظار نہ کر

اختر انصاری اکبرآبادی

# چین کا پرانا ادب

فضل حق قریشی دہلوی

کہا جاتا ہے کہ چینی ادب کے بیش بہا خزانے میں ہزاروں دُرہائے ناسفتہ چھپے پڑے ہیں" لیکن وہ خزانہ کون سا ہے اور دُرہائے ناسفتہ کی نوعیت کیا ہے؟ — اس کا صحیح جواب دینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ لاتعداد کتابوں کے محض نام حافظے کی لوح پر باقی رہ گئے ہیں۔ ان کی بابت یہ رائے قائم کرنی بھی دشوار ہے کہ ان کے مصنف کون تھے اور ان کا اصل موضوع کیا تھا۔ اس کے چار سبب ہیں:-

۱- چینی زبان کی دقت پسندی جس کے باعث عوام کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا بہت ہی مشکل کام تھا، تعلیم کے راستے میں زبردست رکاوٹ بنی رہی۔ عوام کی زبان علم و ادب کے لئے موزوں نہیں سمجھی جاتی تھی، اس لئے اس میں کچھ لکھنا لکھانا خلاف شان تصور ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی چین میں ہندوستان سے زیادہ جہالت کا سکہ رواں ہے۔ علمی زبان "وین لی" اور عام بول چال کی زبان "پئی ہُوا" کہلاتی تھی۔ لسانی اختلاف کے علاوہ رسم الخط کے اس انوکھے پن نے کہ وہ حروفِ ابجد سے بے نیاز ہے، زیادہ دشواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ ہر لفظ اور ہر خیال کے لئے ایک علیحدہ علامت مقرر ہے اور اس طرح تشکیلی اور صوتی اعتبارات سے قائم کی ہوئی چھ مختلف قسم کی علامتوں کی کل تعداد ۴۴۴۴۹ ہے اور ان کو سیکھنا گویا کسی دوسری زبان کے حروف ابجد سیکھنے کے مترادف ہے۔

۲- ولادتِ مسیح سے ۲۱۴ سال پہلے چین کے ایک شہنشاہ شی ہوانگ تی نے ملک بھر کے کتب خانوں کی تمام کتابیں نذرِ آتش کرا کے ان کی راکھ دیوارِ چین کی بنیادوں میں بھروا دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ تاریخ چین کی ابتدا صرف اس کے عہد حکومت سے ہو۔ اس سے پہلے کی ہر چیز صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ اس لئے ان تحریروں کے سوا جو لوگوں کو زبانی یاد تھیں، باقی سب کچھ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گیا۔ زبانی یاد رہ جانے والی تحریروں میں بھی اس قدر تعریف ہوئی کہ ان کو اصل کے مطابق کہنا کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا۔ ہر دور سے گذرنے وقت ہر راوی کے ذاتی خیالات کا پرتو ان پر نیا رنگ جماتا رہا۔

۳- ہندوستان کے پرانے پنڈتوں کی طرح چین کے عہد قدیم میں بھی ایک طبقہ علم و ادب کے ہر شعبے پر چھایا رہا اور اس نے عام لوگوں کو اس امر کا موقع نہیں دیا کہ وہ لکھ پڑھ کر اپنا جوہر ذاتی دکھا سکتے۔ اس حق تلفی کے خلاف بارہا صدائے احتجاج بلند کی گئی لیکن ۴ مئی ۱۹۱۹ء کی تحریک سب سے زیادہ کامیاب رہی اور طبقۂ علما کا زور ہمیشہ کیلئے گھٹ کر رہ گیا۔

۴- ٹانگ خاندان کے عہد حکومت میں علوم کی تقسیم جو چینی عالموں کے نقطۂ نظر سے کی گئی تھی، نہایت ناقص تھی۔ اس کے مطابق ادب کو کوئی اہم درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ ان کے علوم چار حصوں میں تقسیم ہوئے۔ یعنی (۱) مخطوطاتِ قدیم (۲) تواریخ (۳) فلسفہ۔ اور (۴) خیالاتِ لطیف۔ بظاہر یہ تقسیم بھی بری نہیں ہے لیکن ہر شعبے کے تحت جن چیزوں کو شامل کیا، ان سے اصل نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مخطوطاتِ قدیم کے تحت صرف تین مجموعے ہیں (۱) چار کتابیں۔ (۲) پانچ نوشتے۔ اور (۳) بانس والی کتابیں۔ "چار کتابیں" تشریحاتِ کنفیوشیس، علوم عالیہ، اصول اخلاق اور مین سی اس کے کارناموں پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح "پانچ نوشتوں" میں تغیرات، تواریخ قدیمہ، منظومات، رسم و رواج اور کوائفِ بہار و خزاں سے متعلق پانچ رسالے ہیں۔ "بانس والی کتابیں" دراصل بانس کے ریشوں سے بنی ہوئی تختیاں ہیں جن پر ایک لاکھ سے زیادہ علامتی حروف نقش ہیں۔ یہ تختیاں ۲۷۹ء میں وی کے بادشاہ ہسیانگ کے مقبرے سے نکالی گئی تھیں۔ اس بادشاہ کا انتقال ۲۹۵ قبل مسیح میں ہوا تھا۔

اب علم کی دوسری قسم یعنی تواریخ کو لیجئے۔ اس میں بادشاہوں اور بڑے لوگوں کے شجرے، تفصیلاتِ حسب و نسب، سوانح حیات اور ان کے کارنامے وغیرہ شامل ہیں۔ جغرافیائی اور طبقاتی حالات بھی اسکے تحت آتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ان کو نئے سرے سے "چوبیس تواریخ" کے زیر عنوان ۳۲۶۴ جلدوں میں جمع کیا گیا تو بیس مختلف مصنفوں کو اپنی ساری عمر اس مقصد کے لئے صرف کر دینی پڑی۔

تیسری قسم یعنی "فلسفہ" سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس کی ضمنی تقسیم چودہ حصوں پر مشتمل ہے یعنی افسانوی ادب، فوجی حالات، قانون، زراعت، طب و حکمت، فلکیات و ریاضی، الہیات، فنون، فرمیں، لغات، مضامین، اخلاق، تاؤمت اور بدھ مت ان میں سے بعض شعبوں میں چینیوں کا علم نہایت قدیم، جامع اور مکمل ہے۔

چوتھی قسم کے تین حصے ہیں۔ ادب لطیف، شاعری اور تشریحات اس طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ چین میں ادب اور خصوصاً افسانوی ادب کو کوئی درجۂ قبول حاصل نہیں تھا۔ چنانچہ فلسفیانہ استدلال کے طور پر عالموں کا قول تھا:-

ادب ایک فن ہو سکتا ہے،

تمام فنوں کی کوئی نہ کوئی سماجی اہمیت ہوتی ہے۔

افسانوں اور ناولوں کی کوئی سماجی اہمیت نہیں،
لہٰذا افسانے اور ناول ادب میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔
چنانچہ عصر جدید کی انقلابی تحریکات کے رونما ہونے سے قبل عالموں کا طبقہ مخطوطاتِ قدیم پر اپنی سب سے توجہ صرف کرتا تھا۔ عموماً ان کی زندگی کا بیشتر حصہ انہی نوشتوں کو پڑھنے، ان کی نقل تیار کرنے اور انہیں اچھی طرح سمجھنے میں گذر جاتا اور جب اس طرح فارغ التحصیل ہو کر وہ اپنی طرف سے دنیا کو کوئی نیا درس دینے کے لئے خود قلم اٹھاتے تو عموماً موت کا بھیانک آغوش ان کے سامنے کھل جاتا اور وہ اس میں پہنچ کر دائمی نیند سو جاتے۔ تفریحاتِ دنیا سے یکسر خالی الذہن اور عمیق مطالعے میں مسلسل اور ہمہ تن مصروف رہنے کے باعث ان کی صحت خراب ہو جاتی اور وہ ہڈیوں کے ڈھانچے سے زیادہ کچھ نظر نہ آتے۔ عوام جنہیں یہ علما کبھی وقعت کی نظر سے نہ دیکھتے، ان کا خوب مذاق اڑاتے چنانچہ ایک لطیفہ مثال کے طور پر یہاں پیش کیا جاتا ہے جو ان کی ہیئت کذائی پر ایک دلچسپ طنز ہے۔

ایک روز جنگل کے وحشی جانوروں کی ایک ٹکڑی پہاڑی کے سرے پر جمع ہوئی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ سب مختلف سمتوں میں جا کر شکار کریں اور شام کو اپنا اپنا مالِ غنیمت اس جگہ لے آئیں تاکہ مشترکہ طور پر ایک جشن ضیافت منایا جا سکے۔ شام کے وقت صرف شیر خالی ہاتھ واپس۔ دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ مجھے سب سے پہلے ایک کسان نظر آیا جس کا جسم نہایت غلیظ اور مکروہ تھا۔ اسے محض دیکھنے ہی سے جی متلانے لگتا تھا۔ میں نے گھن کھا کر اسے چھوڑ دیا۔ پھر مندر کا ایک پجاری ملا۔ اس کی توند پھولی ہوئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس میں متعفن ہوا کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ لہٰذا اسے بھی جانے دیا۔ سہ پہر کے وقت ایک مجتہد العصر، فاضل اجل عالم نظر پڑا۔ اسکے جسم پر گوشت کا تو ذکر ہی کیا، ہڈیاں بھی سوکھی ہوئی تھیں، اسے نوچتے اور چباتے وقت ہمارے ناخن اور دانت بالکل گھس جاتے، پھر بھی کوئی ریشہ کسی کے پیٹ میں نہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ خالی ہاتھ واپس آ رہا ہوں۔
بعض لطیفے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں کہ علما سارے علم و ادب کے اجارہ دار بننے کے باوجود اسے صرف اپنے ہی لئے مخصوص نہ رکھ سکے۔ کیونکہ عوام نے بھی اپنی عام بول چال کی زبان میں ایسے بہت سے قصے گھڑ ڈالے جن کا افادی پہلو نہ سہی، تفریحی پہلو ضرور تھا۔ ان قصوں کا نہ تو انداز بیان قابل ذکر ہوتا اور نہ خیالات میں کسی قسم کی گہرائی ہوتی۔ عموماً وہ ضبط تحریر میں بھی نہ لائے جاتے۔ انہیں سن سنا کر یاد کیا جاتا، وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے اور نت نئے چولے بدلتے رہتے۔ چونکہ عوام کی زبان ہر صوبے اور ہر ضلع میں مختلف تھی اور رسم و رواج میں بھی تھوڑا بہت فرق تھا، اسلئے قدرتی طور پر وہ قصے اپنے اصل قالب میں رہنے نہ پاتے بلکہ جب کوئی قصہ دور دراز حصوں کی سیر کرتا کرتا اپنے وطن میں واپس آتا تو اسکی صورت اتنی مختلف ہوتی کہ عوام اسے نئی چیز ہی سمجھنے لگتے۔

داستان گو زیادہ تر دیہات کی چوپالوں اور بازار کے چوکوں میں جمع ہو کر قصے بیان کرتے اور ان کے حلق تر رکھنے کیلئے آس پاس کے شوقین لوگ کچھ پیسے ان کی چائے پانی کے لئے اکٹھے کر لیتے تھے۔ بس یہی ان کی اجرت ہوتی تھی۔
ان قصے کہانیوں میں کبھی عوام کی اپنی زندگی کی کوئی جھلک نظر آتی اور کبھی ان بادشاہوں اور درباریوں کے نجی حالات پر نمک مرچ لگا کر رنگ آمیزی کی جاتی چنانچہ کر عالموں کے محدود دائرے سے نکل کر ان کے پلے پڑ جاتا تھا۔ وہ بیان کرتے کہ کس طرح بادشاہ اپنی بے اولاد ملکہ سے لڑتا ہے، کس طرح بادشاہ کی منظور نظر داشتائیں آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتی ہیں اور کس طرح محل کے کسی خواجہ سرا کو اپنے ساتھ ملا کر ملکہ اس وزیر کو زہر دلوانا چاہتی ہے جو بادشاہ کے لئے روز نت نئی داشتائیں لا کر اس کے دل میں زیادہ سے زیادہ جگہ پانے کی کوشش کرتا ہے۔
یہ لوگ ان درباریوں اور حاشیہ نشینوں پر بھی قصے گھڑتے سے نہ چوکتے جن کی زبانی محل کی سن گن ملا کرتی تھی اور پھر لطف یہ ہے کہ یہی درباری اور حاشیہ نشین محل میں جا کر وہ قصے بادشاہ کے روبرو بیان کر دیتے اور بادشاہ حیران ہوا کرتا کہ رعیت کو میری نجی زندگی کے حالات کس طرح معلوم ہو جایا کرتے ہیں نیز ان عالموں کی طرح وہ میری شان میں قصیدہ خوانی کرنے کے بجائے طنز و استہزا کے رنگ میں میری برائی کیوں کرتے ہیں۔ بادشاہ اس سلسلے میں عالموں سے استصواب رائے کرتا اور وہ اپنی عقل سے کوئی جواب دینے کی بجائے مخطوطاتِ قدیم کی ورق گردانی کرنے لگتے کہ شاید کنفوشیس یا لاؤتزے نے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے کہیں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہو۔ اور پھر چند دن بعد بادشاہ کے کان اس واقعہ کو بھی ایک نئے قصے کے پیرائے میں سننے لگتے بادشاہ جو عموماً عالموں سے مرعوب رہا کرتا تھا، ان بے نام و نمود کے مصنفوں پر دانت پیستا رہ جاتا جو محلاتِ شاہی کے اسرار و رموز کو طشت از بام کرنے کے سلسلے میں برطانوی رینالڈز سے کسی طرح کم نہیں تھے۔

عوام کے یہی قصے اور کہانیاں ذرا طویل ہو کر چینی ناول کا ایک ایک باب بن جاتیں، اس ناول کا باب جو عصر جدید کی ٹکنیک کے مطابق ناقص کہا جا سکتا ہے لیکن اس زمانے اور اس ماحول کے لحاظ سے قابل قدر ہوتا تھا۔ آج بھی اس زمانے کے بہت سے ناول چینی ادب میں موجود ہیں جن کے مصنفوں کا صحیح اتہ پتہ نہیں ملتا۔ کیونکہ وہ لوگ بالکل گمنام رہتے یا زیادہ تر قلمی نام اختیار کر لیتے تھے۔ اسوقت کی یہ روش آج تک برقرار ہے۔ چنانچہ ترقی یافتہ زمانے کے بھی پچاس فیصدی سے زیادہ ادیب محض قلمی ناموں سے

میدان ادب میں روشناس ہیں۔ آجکل تو نہیں لیکن پچھلے زمانے میں یہ نام بڑے دلچسپ بلکہ مضحکہ خیز ہوتے تھے۔ مثلاً موسم بہار کی سہانی راتوں میں کھلا ہوا پھول، سمندری اژدھے کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو یا محبت زدہ برساتی مینڈک کی دلسوز ٹرٹراہٹ۔

اگر وہ طویل قصے معیاری ناول نہیں کہلائے جا سکتے تھے تو نہ سہی، وہ اپنے دامن میں اچھے ناولوں اور ڈراموں کے موضوع ضرور پوشیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اگر چین میں شیکسپیئر یا اسکاٹ کے ہم سر موجود ہوتے تو وہ اسی شیرازے کو جمع کرکے اپنے دونوں ہاتھوں سے طویل ڈرامے یا داستانیں لکھ ڈالتے جن کی قدر و قیمت ارباب نقد و نظر کی محفل میں خوب ہوتی۔

ان قصہ نویسوں نے اپنی جولانیٔ طبع کو صرف بادشاہوں، وزیروں اور درباریوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ مذہبی عقائد و توہمات سے اثر لیتے ہوئے معجزات و کرامات کی قسم کی باتیں بھی بیان کر ڈالیں اور جب وہاں بدھ مت کو فروغ حاصل ہوا تو آوا گون اور مکتی کے کرشمے بھی اپنے رنگ جمانے لگے۔ ان کے ساتھ ہی تمثیلی قصوں کا پیرایہ بھی شروع ہو گیا اور مصنف خواب و خیال میں عالم طلسمات کی سیر کرنے لگے۔ لیکن اس طلسماتی دنیا کا ماحول کسی نہ کسی اعتبار سے اہل چین ہی کی زندگی کا آئینہ دار ہوتا تھا اور سمجھنے والے آسانی سے رمز و کنایہ کی حقیقت کو سمجھ جاتے تھے۔ چنانچہ ہان خاندان کا عہد حکومت (۹۴۷ تا ۹۵۰) مختصر ہونے کے باوجود چین کے عوامی ادب کا عہد زریں کہلاتا اور آج تک اچھے لفظوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ اسی لئے اس زمانے کے بہت سے ادیب اپنا شجرۂ نسب اس عہد کے ادیبوں سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔

پھر ایک وقت آیا کہ قصے کہانیوں میں تفریحی عنصر کو کم کرکے افادیت پیدا کی جانے لگی۔ عشق و محبت کی ایسی داستانیں لکھی گئیں جن میں ارادتاً شاہدان بازاری کو بیگمات حرم پر یہ کہکر ترجیح دی گئی کہ وہ لکھی پڑھی، گانے بجانے کی شوقین اور ظاہری زیب و زینت سے آراستہ ہونے کے باعث ان مردوں کا دل موہ لیتی ہیں جن کی گھریلو زندگی جاہل اور زرد رو بیویوں کے ہاتھوں سوگوار بنی رہتی ہے۔ ان افسانوں کا مقصد یہی تھا کہ عورتیں اپنی زندگی کو سدھار کر اپنے شوہروں کی صحیح معنوں میں شریک حیات بننے کی کوشش کریں۔ لیکن لکیر کے فقیر بنے رہنے والے عالموں کو یہ بات انقلاب انگیز اور فتنہ پرور معلوم ہوئی اور انہوں نے محسوس کیا کہ اس طرح خود ان کی اہمیت کو زوال نصیب ہونے لگیگا۔ لہٰذا انہوں نے قصر شاہی کا کنگورہ تھام کر فریاد کی اور کوشش کی کہ ایسے ادیبوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتروا دیا جائے۔ لیکن وہ سیلاب جو ذہنی بنیادوں کو ہلا دینے کی ہمت رکھتا ہو، ایسی تدبیروں سے رک نہیں سکتا۔ اصلاحی جذبے نے ترقی کی اور بہت سے مشہور پرانے قصوں کو نئے پیرائے میں لکھا جانے لگا۔

اس ضمن میں "ہوئی چن چی" کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کہانی کی اولین تشکیل میں ایک ایسے نوجوان عالم کی محبت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو ہمہ وقت ینگ ینگ نامی حسینہ کے عشق میں تڑپتا رہتا ہے۔ لیکن بزرگ عالموں کے سمجھانے پر یہ کہتے ہوئے اس کی طرف سے منہ موڑ لیتا ہے کہ دنیا بھر کی حسین عورتیں مکر و فریب کا ایک ایسا جال ہیں جس میں ایک بار پھنس کر مرد کے لئے رہائی ممکن نہیں ہو سکتی۔ وہ دنیا میں تباہی اور غارتگری کا ایسا ہتھیار ہیں جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔ وہ قصر شاہی سے لیکر کسان کے جھونپڑے تک ہر جگہ حکومت اور اپنے ہی کرتوت سے اس حکومت کا تختہ الٹ دیتی ہیں۔ لہٰذا اپنی تباہی کی گھڑی آنے سے قبل میں عورت ذات سے دور بھاگتا ہوں۔ یہ سن کر بیکس محبوبہ "اچھا تمہاری مرضی" کہکر چپ ہو جاتی اور خاموشی کے ساتھ اپنے حسرت نصیب آنسوؤں کو مایوسی کے دامن میں چھپا لیتی ہے۔

اور جب پانچ سو سال بعد اس قصے کو نئے پیرائے میں لکھا تو نوجوان عالم کے کردار میں اتنی استقامت و استواری دکھائی گئی کہ بزرگ عالموں کے پند و نصائح اسکے جذبۂ عشق کو سرد نہ کر سکے اور وہ اپنی محبوبہ سے شادی کرکے مسرت و شادمانی کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنے لگا۔ یہ قصہ اتنا مشہور ہوا کہ چاؤ تہ لیانگ نامی شاعر نے اسے منظوم کیا اور ٹنگ چائی یو نے اسکو غنائی تمثیل کا جامہ پہنا دیا۔

یہ سنگ خاندان کا (۹۶۰ تا ۱۲۷۶) عہد حکومت تھا۔ اس دوران میں ناول کو اچھی طرح ترویج ہوتی رہی کہ یوآن خاندان (۱۲۷۷ تا ۱۳۶۷) یعنی کے عہد میں اسے عروج کامل حاصل ہو گیا۔ جب منگول ترکِ وطن کرکے فاتح کی حیثیت سے چین میں داخل ہوئے تو ان کے پیٹ بھرے ہوئے لیکن دماغ خالی تھے اور وہ اپنے دماغوں کو ان مخطوطاتِ قدیم کے بے کیف و بے رنگ صفحوں سے بھرنا غیر مناسب سمجھتے تھے جن کو درسگاہوں کے پرانے جغادری بھی چاٹنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

انہوں نے ایسے ناول نویسوں اور تمثیل نگاروں کی سرپرستی شروع کر دی جو زندگی کو نئے انداز میں پیش کرنے اور اسے تاریکی سے روشنی میں لانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کے دو ناول "شوئی ہو چوان" اور "سان کنو" خاص طور پر مشہور ہوئے۔ عالموں کی جماعت نے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ان کو بھی خطرناک، انقلاب انگیز اور فتنہ پرور ثابت کرنا چاہا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ کیونکہ عوام نے انہیں اور سینے سے لگا کر دل کی آنکھوں سے پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر انہیں حکومت کی بھی سرپرستی حاصل تھی، اسلئے ان پر کوئی آنچ آنے نہ پائی۔

پہلا ناول "شوئی ہو چوان" بڑی حد تک تاریخی اور شہنشاہ چیوئی جنگ کے عہد سے متعلق ہے۔ اس میں ایسے رہزنوں کے کارنامے درج ہیں جو

ماسلین آج سے کچھ عرصہ پہلے تک خان تنگ میں موجود تھا۔ اس شہنشاہ کے ایسی بدنظمی اور بے ترتیبی پیدا ہوئی کہ امیروں کی شانِ امارت اور غریبوں کی مفلسی ڈاویوں پر برابر بڑھتی رہی حتیٰ کہ ان انصاف پسند رہزنوں کو اس غلط تقسیم کا احساس ہوا اور انہوں نے امیروں کا مال متاع لوٹ کر غریبوں کو دینا شروع کر دیا۔ رچہ اس ناول کے پیش نظر ایڈیشن پر شیہ نائی آن کا نام مصنف کی حیثیت سے درج ں دراصل وہ کئی ادیبوں کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ شیہ نائی آن نے صرف ی ہے۔ اصل ناول کے ایک سو بیس ابواب ہیں، لیکن ستر ابواب کا ایک یڈیشن بھی شائع ہوا ہے۔ اس ناول کے ترجمے یورپ کی کئی زبانوں میں ہیں۔ امریکہ کی مشہور مصنفہ پرل بک نے اسے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے۔ ی میں اس کا نام ہے "سب لوگ بھائی بھائی ہیں"۔ اس ناول کی سب سے بڑی ہے کہ اسے ہر زمانے سے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانچ سو سال بعد س کی وہی قدر و قیمت ہے۔ چین کے اشتراکیوں نے بھی اسے پسند کیا اور اپنے لے اس کا ایک نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

سرا ناول "سان کتو" (یعنی تین سلطنتیں) بھی تاریخی ہے۔ اسکے بھی اصل مصنف کا بھا۔ تاہم نئی صورت میں ترتیب دینے کا سہرا لوگوآن چنگ کے سر ہے جسکی س ہے کہ وہ شیہ نائی آن کا شاگرد اور ادبی رفیق کار تھا۔ وہ یوآن خاندان عہد میں پیدا ہوا اور مِنگ خاندان کے شروع تک زندہ رہا۔ اس نے بہت ے بھی لکھے لیکن وہ اپنے ناولوں، خصوصاً "سان کتو" کی وجہ سے مشہور رہے۔ ر کے زمانے میں ماؤ چین کان نے نظرثانی اور ترمیم و تنسیخ کے بعد اس کا سخہ تیار کیا جو اس وقت بھی رائج ہے۔ اس نے بہت سے واقعات کے ساتھ ی بدل دیا۔ یہ ناول چینیوں کے اصول جنگ اور اس کے سائنسی پہلوؤں کے لئے اچھی تصنیف ہے۔ چنانچہ چینی فوجوں کا شاید ہی کوئی سپاہی ایسا اس ناول کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ کیونکہ سرکاری طور پر بھی اس کی اشاعت آ چکی ہے۔ جاپان سے لڑتے وقت اپنے مورچے پر بیٹھا ہوا ہر چینی سپاہی دل میں سوچا کرتا تھا کہ تین سلطنتوں کے جنگجو آپس میں کس طرح لڑے طریقوں سے کامیابی حاصل ہوئی۔ اس میں حملوں، مدافعتوں، محاصروں ں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے اور لڑائی کے وہ ہتھکنڈے بتائے ہیں ویں صدی عیسوی میں رائج تھے اور جن پر آج بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔

تیسرا بہت مشہور ناول "ہنگ ومینگ" ہے۔ اسکو مانچو عہد حکومت مائو سو یہ چنگ نے ۱۷۶۵ء میں لکھنا شروع کیا لیکن مکمل نہ کر سکا۔ چنانچہ بعد اس کی تکمیل کاؤ آو نے کی۔ اس کا پیرایہ بظاہر نہایت سادہ لیکن ت بہت پیچیدہ ہے۔ کیونکہ اس میں انسانی تاثرات کا عمیق مطالعہ اور ہ کیا گیا ہے۔ اس میں ایک ایسے امیر گھرانے کا ذکر ہے جسکے افراد کو بادشاہی میں باریابی حاصل تھی لیکن گردش زمانہ کے ہاتھوں وہ نیاز برقرار نہ رہ سکی۔ برے دن اپنا رنگ جمانے لگے اور بس یہیں سے

ناول کی ابتدا ہوتی ہے۔ ناول کا ہیرو اس گھرانے کا اکلوتا لڑکا چیا یاؤیو ہے جس کی زندگی کے بہت سے واقعات فوق الفطرت بلکہ توہماتی ہیں۔ ہر چند اس کا موضوع یکسر سماجی ہے اسے پڑھ کر چینیوں کی بالکل گھریلو زندگی کا بہت قریبی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم عالموں نے بتایا کہ وہ تمثیلی انداز میں دراصل ایک سیاسی خاکہ ہے جس میں مانچو حکومت کا زوال دکھایا ہے۔ لیکن ان کی بعید از قیاس تاویل کسی نے تسلیم نہ کی اور انہیں ایک بار پھر منہ کی کھانی پڑی۔

ان تینوں ناولوں کی زبردست اہمیت کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جب بھی کسی چینی کے سامنے لفظ "ناول" کہا جائے تو فوراً اس کا ذہن انہیں کی طرف منتقل ہوتا ہے اور وہ انہیں کا نام لینے لگتا ہے۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ ان میں حیاتِ انسانی کی وہ صداقتیں اپنا رنگ جماتی نظر آتی ہیں جنکو تصنع اور بناوٹ سے یکسر پاک رکھا جاتا ہے۔ ان میں خود ان کی زندگی بہت قریب سے گاتی، ناچتی اور مسکراتی نظر آتی ہے۔ ان میں گیت ہیں جنہیں وہ گا سکتے ہیں، چٹکلے ہیں جن کی لطافت سے خوش ہو سکتے ہیں اور کارآمد مشورے ہیں جن سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتے ہیں۔

ان ناولوں کے بعض ضمنی قصے بجائے خود اس درجہ مکمل ہیں کہ صرف انہیں کو بنیاد بنا کر کئی علیحدہ ناول تیار کئے جا چکے ہیں۔ مثلاً "چنگ ہنگ مینگ" دراصل "شوئی ہوچوان" کے ایک مختصر سے قصے کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ناول ہیں جنکا سرسری ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک سب سے زیادہ عجیب و غریب ناول "چنگ ہوا یوا ین" ہے۔ اس میں ایک ایسی خیالی سرزمین کا نقشہ کھینچا گیا ہے جہاں عورت کی حکومت ہے اور ذمہ داری کے تمام کام صرف عورتوں ہی کے سپرد ہیں۔ اسکا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ عورتیں زندگی کی کسی منزل میں بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہیں اسلئے وہ مردوں کی ہم سر اور ہم پلہ ہی نہیں بلکہ ہر لحاظ سے ہم رتبہ ہونی چاہئیں۔ لیکن آخر میں عورتوں کی ہار اور مردوں کی جیت دکھا کر مصنف نے اپنی جنس کی حاکمانہ ذہنیت کا مظاہرہ کر دیا ہے۔

چین کے پرانے ادب میں مختصر افسانے بھی موجود ہیں لیکن زیادہ تر ان کا انداز دیومالا اور فوق الفطرت ہی رہا۔ مت کے فروغ کے بعد بودھی کہانیوں نے بھی رنگ جمایا اور انہیں چینی پس منظر کے ساتھ نئے طرز میں لکھا جانے لگا۔ لیکن صحیح قسم کے معیاری افسانے تلاش و تجسس کے بعد بھی مشکل ہی سے نظر آئیںگے۔ ادبی مضامین لکھنے کی طرف عوام نے کبھی توجہ نہیں دی، یہ افتخار صرف عالموں کو حاصل رہا۔ ان کی اپنی زندگی بے کیف گذرتی لیکن عبارت میں اتنی رنگینی اور دلآویزی ہوتی کہ پڑھنے والے کو اس نثر ہی میں شاعری کا لطف آجاتا تھا۔ وہ اپنے مضامین میں الفاظ کے ذریعے نت نئی گلکاریاں کرتے اور ہر موسم میں کا رنگ دکھانے کے عادی تھے۔ گویا اردو زبان کا "نیا اسکول" وہاں شروع سے موجود تھا۔ عوام کی زبان میں نہ اس نوع کی طرزِ نگارش کا امکان تھا اور نہ ان میں اتنی ہمت و صلاحیت تھی کہ وہ اپنی تحریر میں الفاظ کا جادو جگا سکتے۔

# نقد و نظر

و س ع

## مکتبۂ نفسیات، لاہور کی مطبوعات

پس پردہ ۔ مولفہ شبیر محمد اختر ۹۶ صفحات
احساس برتری ۔ مولفہ شبیر محمد اختر ۹۴ صفحات
آپ اور بچہ ۔ مولفہ شبیر محمد اختر و اختر رضی ۹۶ صفحات
سمجھ بوجھ ۔ مولفہ عبدالواحد ۸۰ صفحات

فلسفہ کے علوم میں نفسیات کو زندگی سے جو گہرا اور قریبی تعلق ہے وہ کسی اور علم کو نہیں۔ پھر بھی ہندوستان میں نفسیات کا مطالعہ عموماً ایک اونچی علمی سطح پر کر کیا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اردو میں نفسیات کے موضوع پر جو گنی چنی کتابیں ہیں وہ ایک مخصوص ذہنی سطح رکھنے والوں کے لئے تو کام کی ہیں لیکن اوسط درجہ کے پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ان میں نہ دلچسپی کا کوئی سامان ہے نہ افادیت کا کوئی پہلو۔ اردو میں ایسی علمی کتابوں کی بے حد ضرورت ہے جو عام پڑھے لکھے لوگوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی جائیں۔ اس طرح ان کی ذہنی سطح خود بخود بلند ہوگی اور زندگی کے عام اخلاقی معیار میں بھی غیر محسوس طور پر نمایاں تبدیلیاں ظہور میں آئیں گی۔ اس طرح کی علمی کتابوں میں تاریخ، سائنس، ادب، تہذیبی اور تمدنی علوم، معاشیات، سیاست غرض بے شمار موضوعوں کی کتابیں آتی ہیں لیکن سب سے اہم جگہ میرے نزدیک نفسیات کی کتابوں کی ہے۔ اس لئے کہ نفسیات جو ایک فلسفیانہ علم کی حیثیت سے ایک بے حد ٹھوس اور بلند چیز ہے، اس تعلق کی وجہ سے جو انسانی فطرت، سیرت اور کردار سے ہے بڑی دلکش اور سحر آفریں بھی ہے لیکن اب تک ہوا یہ ہے کہ لوگوں کو اس کے دلکش اور سحر آفریں پہلو سے بیگانہ رکھا گیا ہے۔ بیسویں صدی [illegible] نفسیات اور تحلیل نفسی کی ایک گہری دوڑ ہی اور اس کا اثر بالواسطہ افسانوی اور شعری ادب پر پڑا۔ چنانچہ اردو کا نیا ادب بھی اس سے بڑی حد تک متاثر ہوا اور اس طرح افسانہ اور شعر پڑھنے والوں کے ذہنوں میں کچھ نفسیاتی اصطلاحیں چکر لگانے لگیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ نفسیات کے بالواسطہ شعور نے عام ذہنوں میں الجھنیں پیدا کر دی ہیں اور ان میں اس سلسلہ میں خاصا انتشار سا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان پڑھنے والوں کو نفسیات کے مسائل سے روشناس کرایا جائے۔ بلند علمی سطح پر اڑ کر نہیں بلکہ زندگی کی سطح پر چل پھر کر۔ یہ کام ادبی حیثیت سے بھی اہم ہے اور قومی نقطۂ نظر سے بھی۔ ادبی حیثیت سے یوں کہ نفسیات اور زندگی کے قریبی تعلق کو سمجھ کر عوام میں ادب کا وہ صحیح مذاق پیدا ہوگا جس کی ہمارے ہاں اب تک شدید کمی ہے۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ کام اس لئے اہم ہے کہ انسانی ذہن جن طرح طرح کی پیچیدگیوں میں پھنسا ہوا ہے نفسیات کا مطالعہ ان کی عقدہ کشائی کرتا ہے۔

مکتبۂ نفسیات کی یہ چاروں کتابیں وقت کی اہم ضرورت اور ادب کے مفید تقاضے کو پورا کرتی ہیں۔ چاروں کتابوں میں روزمرہ زندگی کے ایسے واقعات لے کر جن سے ہم ہر وقت دوچار ہوتے ہیں نفسیاتی باریکیوں کی تشریح کی گئی ہے اور اس طرح جس چیز کو لوگوں نے اب تک ایک خشک اور بے مزہ چیز سمجھ کر نظر انداز کر رکھا تھا وہ ان کی جانی بوجھی حقیقت بن گئی ہے۔ کتابوں کا انداز عام فہم اور نقطۂ نظر علمی ہے اور اس لئے نفسیات کے مطالب اور نکات اوسط درجے کے پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی قابل فہم اور قابل عمل بن گئے ہیں۔

مکتبۂ نفسیات کے سامنے اس طرح کی بہت سی کتابیں نکالنے کا ایک پرحوصلہ پروگرام ہے۔ اس پروگرام میں ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں دوہرا فائدہ ہے۔ لکھنے والوں کا بھی اور پڑھنے والوں کا بھی۔

ان کتابوں میں قیمت کہیں درج نہیں لیکن قیاس کہتا ہے کہ قیمت ۱۲ سے لے کر ۱ر تک ہوگی۔

## ارادے

مصنف نریندر ناتھ سیٹھ۔ ناشر انڈین اکیڈمی، لاہور۔ صفحات ۱۹۶، قیمت ۳ روپیہ۔ یہ کتاب سیٹھ صاحب کے ایک ایکٹ کے ۸ ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ ڈراموں کے موضوع ایک دو نہیں بہت سے ہیں اور یہ اس لئے کہ ہماری موجودہ زندگی کا کوئی ایک موضوع بھی ایسا نہیں جو اپنے ساتھ موضوعوں کا ایک اچھا خاصا لشکر لے کر نہ چلتا ہو۔ تعلیم، بیکاری، مقابلہ کا امتحان، مجبوری کی شادیاں، مزدوروں کی ہڑتال، بچوں کے معصوم کھیل، خاموش محبت، الکشن، بظاہر بالکل الگ الگ چیزیں ہیں لیکن ان میں سے ہر چیز کا سلسلہ موجودہ دور کی سیاسی اور معاشی کشمکشوں سے ملتا ہے۔ سیٹھ صاحب کے ڈرامے زندگی کے اسی متنوع اور یک رنگی کے ترجمان ہیں۔ ڈراموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف پڑھنے کے لئے نہیں ہیں۔ ان میں سے اکثر کو کامیابی سے اسٹیج بھی کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک ایکٹ کے ڈراموں پر دو مختصر لیکن پراز معلومات مقدمے بھی شامل ہیں۔

## رسالہ "دوست"

ایڈیٹر الیاس احمد مجیبی۔ بچوں کا ایک ڈیڑھ [illegible] چندہ سالانہ ۳ روپے، قیمت فی پرچہ ۶ آنے

بچوں کا یہ چھوٹا سا ماہنامہ جنوری میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ اب تک اس کے [illegible] شائع ہو چکے ہیں۔ اور اسے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ میرے نزدیک یہ امتیاز محض اتفاقی نہیں بلکہ ایڈیٹر صاحب کی اس سوجھ بوجھ کا ثمر ہے جو انھیں بچوں کے ادب کی تخلیق کے سلسلہ میں حاصل ہے۔ "دوست" صحیح معنوں میں بچوں کا دوست ہے۔ حسن صورت میں بھی اور حسن سیرت میں بھی۔ کتابت طباعت دیدہ زیب اور خوبصورت۔ مضامین سب کے سب دلچسپ، سبق آموز اور دل میں گھر کرنے والے۔ بچوں کے کسی رسالہ میں میں نے اتنے اچھے لکھنے والوں کو یکجا نہیں دیکھا۔ یہ رسالہ گھروں اور مدرسوں میں رکھنا بچوں کی صحیح خدمت

مضامین دلی پرنٹنگ ورکس میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارۂ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۲۶ سے شائع کیا